

5

برقاة المفاتیح
شرح اُردو
مشکوٰۃ المفاتیح

للعلامه شیخ الفاری علی بن سلطان محمد الفاری

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

www.KitaboSunnat.com

مکتبۃ رحمانیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی رومہ
معدنہ البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 library@mohaddis.com

مِرْقَاةُ الْمَفَاتِيحِ

للعلاءة شيخ الفاری علی بن سلطان محمد الفاری هجری ۱۰۴

شرح

مَشْكُوتَةُ الْمَصَابِيحِ

للإمام العلاءة محمد بن عبد اللہ الخلیل البزیری المتوفی ۷۴۱

مترجم: مولانا راجو محمد نسیم

جلد پنجم

www.KitaboSunnat.com

مکتب رحمانیہ



اقرأ سنتر عذری سنٹر، اردو بازار لاہور
فون: 042-37224228-37355743

MAKTABA-E-RAHMANIA

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جملہ حقوق ملکیت بحق ناشر محفوظ ہیں



مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: مَرْقَاةُ الْمَفَاتِحِ (جلد پنجم)

مترجم: مولانا راؤ محمد سدید

ناشر: مکتبہ رحمانیہ

مطبع: لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکرگزار ہوں گے۔ (ادارہ)

فہرست

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۸۳	سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے ذریعے پناہ پکڑا کرو.....	۱۷	کِتَابُ فَصَائِلِ الْقُرْآنِ
۸۷	قراءت قرآن کی فضیلت دوسرے اعمال پر.....	"	فضائل قرآن کا بیان
۸۹	آیۃ الکرسی کی اہمیت و عظمت.....	۲۱	لوگوں میں سے بہترین اشخاص قرآن سیکھنے و سکھانے والے...
۹۱	سورۃ آل عمران کی آخری آیات کی فضیلت.....	۲۲	قرآن پاک سیکھنے کی فضیلت.....
۹۲	جمعہ کے دن آل عمران پڑھنے کی فضیلت.....	۲۵	قرآنی آیات کی فضیلت.....
۹۳	سورۃ بقرہ کی آخری آیات کی قدر و منزلت.....	۲۶	انک انک کر پڑھنے والے کو ذرا اجر ملے گا.....
۹۴	سورۃ ہود جمعہ کے دن پڑھنے کی ترغیب.....	۲۷	حد صرف دو چیزوں میں جائز ہے.....
۹۵	سورۃ الم تنزیل قاری کی شفاعت کرے گی اور جھگڑا کرے گی.....	۳۰	فرشتوں کا قرآن سننا.....
۹۶	سورۃ الزلزال ایک جامع سورت ہے.....	۳۲	تلاوت قرآن سے سکینہ نازل ہوتی ہے.....
۱۰۸	باب	۳۶	سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھنے والوں کی لیے باعث برکت ہے
"	(یہ باب متعلقات قرآن وغیرہ کے بیان میں ہے)	۳۹	آیۃ الکرسی کی فضیلت.....
"	قرآن کریم غفلت سے بھول جاتا ہے.....	۴۳	سورۃ فاتحہ اور بقرہ کا آخری حصہ اللہ کی طرف سے دنور ہیں...
۱۱۵	آپ ﷺ کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے قراءت کا سننا	۴۷	سورۃ اخلاص سے محبت.....
۱۱۶	آپ ﷺ کا ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے سامنے قرآن پڑھنا.....	۵۱	سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے ذریعے دم کرنا.....
۱۱۹	فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے خوشخبری.....	۵۵	قرآن کریم سے خالی دل ویران گھر کی طرح ہے.....
۱۲۶	قرآن کو اونچی اور آہستہ آواز سے پڑھنے کی بہترین مثال.....	۵۷	قرآن پر عمل باعث نجات ہے.....
۱۲۹	قرب قیامت میں لوگ دنیاوی مقاصد کے لیے قرآن پڑھیں گے.....	۶۵	حافظ قرآن دس آدمیوں کی سفارش کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی.....
"	عرب کے لہجوں میں قرآن پاک کی تلاوت کرنا پسندیدہ ہے..	۶۶	سورۃ فاتحہ کی اہمیت.....
۱۳۰	باب اختلاف القراءت و جمع القرآن	۶۹	لوح محفوظ میں زمین و آسمان پیدا ہونے سے دو ہزار سال قبل
۱۳۴	اختلاف قراءت اور جمع القرآن کا بیان	۷۶	قرآن لکھا گیا.....
۱۳۸	قرآن کریم کو سات قراءتوں میں پڑھنے کی اجازت ہے.....	۷۹	سورۃ الملک عذاب قبر سے نجات دلانے والی ہے.....
	قراءت میں اختلاف کرنے کی ممانعت.....		سورۃ ہشر کی آخری تین آیات کی فضیلت.....

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
"	رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کا بیان	۱۳۹	قرآن کریم کی مختلف قراءت کا مسئلہ.....
۳۹۶	آپ ﷺ پر بندوں کے لیے بھی رحمت بن کر تشریف لائے ...	۱۴۶	قراءت کا مختلف ہونا آسانی کا باعث ہے
۳۹۸	اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر رحمت کا نزول	۱۴۸	قرآن پڑھ کر لوگوں سے مانگنا منع ہے
۳۹۹	نیکی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے	۱۵۰	عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک شخص کا مکالمہ
۴۰۰	ایمان والا ہر حال میں جنتی ہے خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہو		قرآن پاک جمع کرنے سے پہلے پتھر، کھجور کی چھال وغیرہ پر
۴۰۱	بَاب مَا يَقُولُ عِنْدَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ وَالْمَسَامِ	۱۵۲	موجود تھا
	صبح، شام اور سوتے وقت پڑھی جانے والی دعاؤں کا	۱۵۹	عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمات جمع قرآن کے بارے میں
"	بیان	۱۶۳	عثمان رضی اللہ عنہ کا واضح کرنا کہ دونوں سورتیں علیحدہ علیحدہ ہیں
۴۰۲	آپ ﷺ سے منقول صبح و شام کی دعائیں	۱۶۹	کِتَابُ الدَّعَوَاتِ
۴۰۳	سو کر اٹھنے کی مسنون دعا	"	یہ کتاب دعاؤں کے بیان میں ہے
۴۰۶	سونے کا مسنون طریقہ	۱۷۱	قیامت کے دن نبی کریم ﷺ امت کی شفاعت کریں گے
۴۰۸	سونے کے لیے بستروں کو جھاڑنا مسنون ہے	"	نبی کریم ﷺ جہان والوں کے لئے رحمت بن کر آئے
۴۱۵	صبح و شام کی دعا	۱۷۲	دُعا کرتے وقت خدا تعالیٰ پر پورا یقین ہونا چاہئے
۴۱۶	حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے تجویز کردہ وظیفہ	۱۷۵	غائب کی دُعا غائب کے لئے بہت جلد قبول ہوتی ہے
	مذکورہ دعا پڑھنے سے اللہ تعالیٰ اس کو بیماری سے حفاظت میں رکھتا	۱۷۶	بد دُعا کرنے سے ممانعت
۴۱۷	ہے	۱۷۷	ہر حاجت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو
۴۲۰	صبح و شام کی دعا	۱۷۹	دُعا عبادت کا مغز ہے
۴۲۱	آپ ﷺ اپنی بیٹیوں کو مذکورہ دعا سکھلاتے تھے	۲۰۲	بَابُ ذِكْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَالتَّقَرُّبِ إِلَى اللَّهِ
	مذکورہ وظیفہ پڑھنے سے غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا	"	ذکر اللہ اور تقرب الی اللہ کا بیان
۴۲۳	ہے	۲۳۶	کِتَابُ أَسْمَاءِ اللَّهِ تَعَالَى
۴۲۵	مذکورہ دُعا پڑھنے کی برکت سے آگ سے خلاصی کا وعدہ	"	اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ
۴۲۶	مذکورہ دُعا پر آپ ﷺ کی مواظبت	۳۰۳	بَابُ ثَوَابِ التَّصْبِيحِ وَالتَّحْمِيدِ وَالتَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ
۴۲۸	مذکورہ کلمات کو پڑھنے سے اللہ گناہوں کو معاف فرماتا ہے	"	تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کے ثواب کا بیان
۴۲۹	صبح و شام کے پڑھنے کا وظیفہ	۳۱۹	ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو
۴۳۰	سوتے وقت کی مسنون دعا	۳۳۷	استغفار تو یہ تو بیان
"	سونے کا مسنون طریقہ	۳۸۱	باب رَحْمَةِ اللَّهِ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۴۶۲	مشرکین کے خلاف بددعا	۴۳۱	سوتے وقت آپ ﷺ یہ مذکورہ دعا پڑھا کرتے تھے
۴۶۶	چاند دیکھتے دقت کی دعا	"	استغفار کی فضیلت
"	مصیبت زدہ کو دیکھ کر مذکورہ دعا پڑھنی چاہے	"	قرآن پاک کی سورت کے پڑھنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ایک
۴۶۷	بازار میں داخل ہونے کی دُعا	"	فرشتہ مقرر فرمادیتے ہیں
"	جنت کا داخلہ پوری نعمت ہے	۴۳۳	نماز کے بعد اور سوتے وقت تسبیحات کا بیان
۴۶۸	مجلس سے اٹھتے وقت کی دعا	۴۳۵	صبح و شام کے وقت مذکورہ دعا پڑھنے کی فضیلت
"	سواری پر سوار ہوتے وقت کی دُعا	۴۳۶	سوتے وقت کی ایک اور دُعا
۴۶۹	مسافر کو رخصت کرنا مسنون عمل ہے	۴۳۸	سوتے وقت آپ ﷺ کا معمول مبارک
"	مسافر کو الوداع کرنے کا طریقہ	۴۴۰	سوتے وقت آپ ﷺ کی جامع دعا
"	اپنے اکابرین سے دعا کروانے کا ثبوت	"	آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبح کے وقت مذکورہ دعا تلقین کیا کرتے
"	مسافر کو نصیحت کرنا مسنون ہے	"	تھے
۴۷۰	تکلیف دینے والی چیزوں سے پناہ مانگنا	۴۴۳	انسان کو عافیت مانگنی چاہیے
۴۷۱	جہاد کے موقع پر آپ ﷺ کی دعا	۴۴۴	صبح کے دقت کی دُعا
"	دشمن سے خوف کے وقت کی دعا	۴۴۶	آپ ﷺ بعض وقت میں یہ دعا بھی پڑھا کرتے تھے
"	گھر سے نکلتے وقت کی مسنون دعا	۴۴۷	بَابُ الدَّعَوَاتِ فِي الْأَوْقَاتِ
۴۷۲	گھر سے نکلتے وقت جامع دعا	"	مختلف اوقات کی دعاؤں کا بیان
"	گھر میں داخل ہونے کی دعا	"	جماع کے وقت کی دُعا
۴۷۳	نکاح کے وقت مبارک بار دینا مسنون ہے	۴۴۹	فکر و غم کی شدت کے وقت مذکورہ دعا پڑھنی چاہے
"	اپنے اہل والوں کے لیے خیر و برکت کی دعا کرنا	۴۵۰	غصے کو دور کرنے کا وظیفہ
"	غزودہ کی دُعا	۴۵۲	شیطان سے پناہ مانگو
۴۷۴	قرض کی ادائیگی کی دعا	۴۵۳	سفر کے وقت آپ ﷺ کی دعا
"	ادائیگی قرض کے لیے دعا	۴۵۶	حضور ﷺ سفر کی مشقتوں سے پناہ مانگا کرتے تھے
۴۷۵	مجلس سے اُٹھتے وقت کی دعا	۴۵۷	مکان میں داخل ہوتے وقت کی دعا
"	چاند دیکھنے کی دعا	۴۵۸	بچھو کے ڈسنے کی دعا
"	غم و فکر کے وقت کی دعا	۴۵۹	سفر کی حالت میں سحری کے وقت خدا کی تعریف کرنا
۴۷۶	بلندی پر چڑھتے وقت اور اترتے وقت کی دعا کا ذکر	۴۶۱	جہاد یا عمرہ سے واپس لوٹتے وقت کی دعا

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۵۰۴	فرض نماز کے بعد وظیفہ پڑھنے کا ذکر	"	پریشانی کے وقت کی دعا
۵۰۵	کفر اور قرض سے پناہ مانگو	"	خوف کے وقت کی دعا
۵۰۶	باب جامع الدُّعَا	۴۷۷	بازار میں داخل ہونے کی دعا
"	جامع دُعَاوَلں کا بیان	"	باب الاِسْتِعَاذَة
"	جامع دعا	"	پناہ مانگنے کا بیان
۵۰۸	دین و دنیا کی اصلاح کی دعا	۴۷۸	آزمائش سے پناہ مانگنا
۵۰۹	ہدایت اور تقویٰ مانگنا	۴۸۰	اندیشہ اور غم سے نجات کے لیے جامع دعا
"	افعال و گفتار کی درستی کا سوال کرنا	"	جامع دُعا
۵۱۰	نئے مسلمان کو مذکورہ کلمات سہل یا کرتے تھے	۴۸۱	دنیا و برزخ میں لاحق ہونے والی پریشانیوں سے پناہ مانگنا
۵۱۲	دین و دنیا کی نعمتوں کا سوال	۴۸۳	اچانک عذاب اور غضب خداوندی سے پناہ مانگنا
"	اللہ تعالیٰ سے کفار پر فتح کا سوال کرنا	۴۸۴	آپ ﷺ کی ایک جامع دعا کا بیان
۵۱۵	اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو	۴۸۶	چار چیزوں سے پناہ مانگنے کا بیان
۵۱۶	سب سے بہتر دعا عافیت مانگنا ہے	۴۸۷	پانچ چیزوں سے پناہ پکڑنے کا بیان
۵۱۷	اللہ تعالیٰ سے محبت کا سوال کرنا	۴۸۸	ذلت اور محتاجی سے پناہ مانگنے کا بیان
۵۱۸	ایک جامع دعا	۴۸۹	نفاق اور برے اخلاق سے پناہ مانگنے کی دعا
۵۲۲	علم کی زیادتی کا سوال کرنا	۴۹۰	بھوک اور خبیانت سے پناہ مانگنے کا بیان
۵۲۳	وحی کی کیفیت کا بیان	۴۹۱	کوڑھ اور جذام اور دیوانگی سے پناہ مانگنے کا بیان
۵۲۴	بینائی کی محرومی پر صبر کرنے سے جنت کا وعدہ	۴۹۲	برے عملوں اور اخلاقی سیرے سے پناہ مانگنے کا بیان
۵۲۷	اللہ تعالیٰ سے محبت کا سوال کرنا	۴۹۳	جامع دعا
۵۲۹	جامع دعا		زہریلے جانوروں اور اچانک ہلاک کر دینے والی چیزوں سے
۵۳۳	نجر کی نماز کے بعد کی دعا	۴۹۴	پناہ پکڑنا
۵۳۴	ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا خاص وظیفہ	۴۹۷	چاند کے غروب ہونے سے پناہ پکڑنا
۵۳۵	جسمانی و روحانی صحت کا سوال کرنا	۴۹۸	مختصر اور جامع دعا کا بیان
۵۳۶	نفاق ریاکاری، جھوٹ وغیرہ سے پناہ مانگنا	۵۰۰	تعویذ کا ثبوت تا بالغ بچے کے لیے
	صحابی کی دعا حضور ﷺ کا دنیا و آخرت کی عافیت مانگنے کی	۵۰۱	جنت کا سوال کرنا اور آپ ﷺ سے پناہ مانگی
۵۳۷	نصیحت کرنا	۵۰۲	جاد و غیرہ سے بچنے کی دعا

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۵۶۷	حج بدل کرنے والے پہلے اپنا حج کرے	۵۳۸	بلاؤں میں گرفتار ہو جانا اپنے نفس کو ذلیل کرنے کے مترادف ..
۵۶۸	اہل مشرق کا میقات	۵۳۹	ظاہر باطن کی بہتری کے لیے دعا مانگنا
"	احرام کی جگہ کا تعین	۵۴۰	کتابت المناسک
۵۶۹	حج انسان کے گناہوں کے بخشش کا ذریعہ ہے	"	انفعال حج کا بیان
۵۷۰	سفر کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنا توکل کے معنی نہیں ہے	۵۴۲	حج کرنا زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے
۵۷۱	عورتوں کا جہاد	۵۴۵	دوران معصیت سے پرہیز کرے
۵۷۲	وسعت کے باوجود حج نہ کرنے پر وعید	۵۴۶	ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک کفارہ ہے
"	حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں	۵۴۷	رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت
۵۷۳	حاجی سے سلام و مصافحہ کا ثبوت	۵۴۸	تابالغ کو نفل حج کا ثواب ملتا ہے
"	حج و عمرہ کرنے والے کو جہاد کرنے والے کے برابر ثواب ملتا ہے	"	دوسرے کی طرف سے حج کرنے کا مسئلہ
"		۵۵۰	حج بدل کا مسئلہ
۵۷۵	بَابُ الْأَحْرَامِ وَالْتَلْبِيَةِ	۵۵۱	عورت کے ساتھ سفر میں محرم کا ہونا ضروری ہے
"	احرام باندھنے اور لبیک کہنے کا بیان	۵۵۲	عورتوں کا جہاد حج ہے
"	بَابُ الْأَحْرَامِ وَالْتَلْبِيَةِ	"	عورت کو بغیر محرم سفر کرنے کی اجازت نہیں ہے
"	احرام باندھنے اور لبیک کہنے کے بیان میں ہے	۵۵۳	مواقیت حج
"	احرام کی حالت میں خوشبو لگانے کا مسئلہ	۵۵۶	میقات احرام کا بیان
۵۷۷	بلند آواز سے تلبیہ کہنا	۵۵۷	آپ ﷺ کے عمروں کا بیان
۵۸۰	بلند آواز سے تلبیہ کہنے کا ثبوت	۵۵۹	آپ ﷺ کے عمروں کا ذکر
۵۸۱	بلند آواز سے تلبیہ کہنا	"	حج سال میں ایک مرتبہ فرض ہے
"	حج کرنے والوں کی اقسام	۵۶۰	حج کی فرضیت کے لیے شرائط
۵۸۲	حج کو عمرے کے ساتھ داخل کرنا	۵۶۲	استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے پر وعید
۵۸۳	احرام میں سلعے ہوئے کپڑے پہننے کی اجازت نہیں ہے	"	ارادہ حج کی تکمیل جلدی ہونی چاہے
"	تلبیہ کرنے کی اجازت ہے	۵۶۳	حج قرآن کرو
"	بلند آواز سے تلبیہ کہنا	۵۶۴	حج کن چیزوں کی وجہ سے واجب ہوتا ہے
۵۸۶	لبیک کہنے والے کی عظمت	۵۶۵	حاجی کی صفات کا بیان
"	احرام باندھنے کے بعد آپ ﷺ کا معمول مبارک	۵۶۶	حج بدل کا ثبوت

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۶۳۷	خانہ کعبہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ اٹھانا.....	۵۸۹	اللہ تعالیٰ سے خوشنودی مانگنا اور طلب معافی کرنا.....
"	طواف نماز کی طرح ہے.....	۵۹۰	آپ ﷺ کا حج کے لیے اعلان کرنا.....
۶۳۸	حجر اسود جنت کا پتھر ہے.....	۵۹۱	مشرکوں کا تلبیہ پڑھنا.....
۶۳۹	حجر اسود قیامت کے دن گواہی دے گا.....	"	باب قِصَّةِ حَجَّةِ الْوُدَّاعِ
۶۴۰	حجر اسود اور مقام ابراہیم جنت کے یا قوت ہیں.....	"	حجۃ الوداع کے واقعہ کا بیان
۶۴۱	طواف کرتے وقت آداب و سنن و آداب کا لحاظ کرنا ضروری ہے.....	"	حجۃ الوداع کا ذکر.....
۶۴۲	دونوں رکنوں کے درمیان پڑھنے والی دعا.....	۶۱۵	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حج کا واقعہ احرام باندھنے کا طریقہ.....
۶۴۳	سحی کی اہمیت.....	۶۱۸	حدیث مذکورہ میں حضور ﷺ کے متبع اور قارن ہونے کا ذکر.....
۶۴۴	نبی کریم ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر سعی فرمائی.....	۶۲۱	حج کے مہینوں میں عمرے کا جواز.....
۶۴۵	اضطباع کا طریقہ.....	"	احرام کی تبدیلی کے حکم صحابہ کرام کا حامل.....
۶۴۶	اضطباع کرنا سنت ہے.....	۶۲۴	احرام کی تبدیلی حکم پر لوگوں کا متردد ہونا.....
"	رکن یمانی اور حجر اسود کو ہاتھ لگانا.....	"	باب دُخُولِ مَكَّةَ وَالطَّوَّافِ
۶۴۸	عذر کی وجہ سے سوار ہو کر طواف کرنے کی اجازت ہے.....	"	مکہ میں داخل ہونے اور طواف کرنے کا بیان
"	حجر اسود کو بوسہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے.....	"	حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا دخول مکہ کے وقت معمول.....
۶۵۰	رکن یمانی پر ستر فرشتے متعین کیے گئے ہیں.....	۶۲۵	آپ ﷺ کے دخول مکہ کا ذکر.....
۶۵۲	طواف کی فصیلت.....	۶۲۶	طواف کرنے کے لیے پاکی شرط ہے.....
۶۵۳	﴿﴾ بَابُ الْوُقُوفِ بِعَرَفَةَ ﴿﴾	۶۲۸	طواف کی کیفیت کا ذکر.....
"	وقوف عرفات کا بیان	۶۲۹	طواف میں چلنے کی کیفیت کا بیان.....
"	عرفات کے دن بکبیر و تہلیل کہنا.....	"	آپ ﷺ کا حجر اسود کو بوسہ دینا.....
۶۵۵	وقوف کے مقامات کا ذکر.....	۶۳۰	آپ ﷺ کے حجر اسود کو بوسہ دینے کا ذکر.....
"	عرفہ کے دن کی فضیلت.....	"	آپ ﷺ خانہ کعبہ کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے مگر درکنول کو.....
۶۵۶	موقف عرفات کا ذکر.....	"	آپ ﷺ کے حج کے ساتھ بوسہ دیتے تھے.....
۶۵۷	موقوفوں کا بیان.....	۶۳۳	آپ ﷺ نے بیت اللہ کا طواف اونٹ پر سوار ہو کر کیا.....
۶۵۸	سواری پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا جائز ہے.....	۶۳۴	خدا رکڑی کے سرے کو آپ ﷺ بوسہ دیتے تھے.....
"	بہترین دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے.....	۶۳۵	مشرک کو خانہ کعبہ کے طواف کرنے کی ممانعت.....
۶۶۰	عرفہ کے دن شیطان کی رسوائی.....	۶۳۶	خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگنی چاہے.....

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۶۸۳	کنکریاں پھینکنے کا طریقہ	۶۶۱	عرفہ کے دن اللہ اپنے بندوں پر یعنی حاجیوں پر نغز کرتا ہے
۶۸۴	حضور ﷺ نے اونٹنی پر سوار ہو کر رمی فرمائی (جمرة العقبہ کی) ..	۶۶۲	اللہ تعالیٰ اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ کو وقوف عرفہ کا حکم فرمایا
۶۸۵	منیٰ کی جگہ سب لوگوں کے لیے برابر ہے	۶۶۳	آپ ﷺ کی دعاء امت کے حق میں قبول ہونے پر شیطان کا
۶۸۶	ابن عمر رضی اللہ عنہما کے وقوف کا ذکر	۶۶۳	واویلہ کرنا
۶۸۷	بَابُ الْهُدْيِ	۶۶۶	بَابُ الدَّفْعِ مِنْ عَرَفَةَ وَالْمَرْؤِ ذَلْفَةَ
"	ہدی کا بیان	"	عرفات اور مزدلفہ سے واپسی کا بیان
"	ہدی کو قلاوہ پہنانا جائز ہے	"	آپ ﷺ میدان عرفات سے کس طرح لوٹے تھے
۶۸۸	ہدی کے گلے میں ہار ڈالنا جائز ہے	۶۶۷	اونٹوں کو تیز چلنے کے لیے مارنا منع ہے
"	ہدی دینے کا جواز	۶۶۸	آپ ﷺ ہمیشہ لبیک کہتے رہے
۶۸۹	بدنوں کو ہار پہنانا جائز ہے	"	مغرب اور عشاء دونوں غاروں کو مزدلفہ میں جمع کرنا
۶۹۰	مطلق ہدی پر سوار ہونا ممنوع نہیں ہے	۶۶۹	مغرب اور عشاء کی نمازوں کو مزدلفہ میں جمع کرنا
۶۹۱	ہدی پر سوار ہونے کا مسئلہ	۶۷۰	ضعیفوں کو پہلے بھیج دینا مزدلفہ کی رات کو
۶۹۲	قریب المرگ ہدی کا مسئلہ	۶۷۱	رمی جمار کے لیے کنکریاں مزدلفہ کے راستے اٹھائیں
۶۹۵	نحر کرنے کا طریقہ	۶۷۲	میدان محشر میں آپ ﷺ اونٹنی تیز چلایا کرتے تھے
۶۹۶	گوشت جھول وغیرہ اور چمڑہ کو صدقہ کرنا چاہے	۶۷۳	آفتاب کو پگڑیوں کے ساتھ تشبیہ دینا
"	قربانی کے گوشت تین دن سے زیادہ رکھنا جائز ہے	۶۷۴	رات میں رمی جائز نہیں
۶۹۸	ذبح ہونے والی ہدی کا حکم	۶۷۵	امام شافعی کی مستدل حدیث اور اس کی تاویل
۶۹۹	قربانی کے دن کی فضیلت	۶۷۶	مقیم یا عمرہ کرنے والا حجر اسود کو بوسہ دے
۷۰۱	قربانی کا گوشت کا مسئلہ	۶۷۷	عرفات سے واپسی کا ذکر
۷۰۳	بَابُ الْحَلْقِ	۶۷۸	ظہر و عصر کی نماز جمع کرنا آپ ﷺ کی سنت ہے
"	سرمنڈانے کا بیان	۶۷۹	بَابُ زَمِي الْجِمَارِ
"	سرمنڈانا افضل ہے	"	مناروں پر کنکریاں پھینکنے کا بیان
"	سرمنڈانے والوں کے اللہ کے رسول ﷺ نے رحمت کی دعا	"	حج کرنے سے پہلے حج کے احکامات سیکھنے ضروری ہیں
۷۰۴	فرمائی	۶۸۰	کنکریاں پھینکنے کا طریقہ
۷۰۸	نحر کے دن خوشبو کا استعمال	۶۸۱	چاشت کے وقت کنکریاں مارنا
۷۱۰	عورت کو سرمنڈانا ممنوع ہے	۶۸۲	اللہ اکبر کہہ کر کنکریاں پھینکنا

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۷۴۵	احرام کی حالت میں آنکھوں پر لپ کرنے کی اجازت ہے ...	"	بَابُ
۷۴۶	احرام کی حالت میں سورج کی گرمی سے سایہ کرنا جائز ہے	"	گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان
۷۴۷	مجبوری کی بنا پر سر منڈانا جائز ہے	۷۱۱	افعال حج میں تقدیم و تاخیر سے کوئی گناہ نہیں ہے
۷۴۸	عورت کے منظورات احرام	۷۱۳	افعال حج میں تقدیم و تاخیر معاف ہے
۷۴۹	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا احرام کی حالت میں منہ کھولنے کا طریقہ	۷۱۴	بَابُ حُطْبَةِ يَوْمِ النَّحْرِ وَرَمِيْ اَيَّامِ التَّشْرِيقِ وَالتَّوْدِيْعِ
۷۵۰	احرام کی حالت میں خوشبو کا استعمال ممنوع ہے		قربانی کے دن خطبہ ایتام تشریق میں رمی اور طواف
۷۵۱	سلاہوا کپڑا پہننا محرم کے لیے منع ہے	"	رخصت کا بیان
۷۵۲	حالت احرام میں سینگلی لگوانا جائز ہے	۷۱۵	منی کے مقام پر خطبہ
"	احرام کی حالت میں بچھے لگوانا	۷۱۶	رمی کے وقت کا بیان
۷۵۳	حدیث مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بغیر احرام کی حالت کے نکاح فرمایا	۷۱۹	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کنکریاں مارنے کا طریقہ
"	بَابُ الْمُحْرَمِ بِحُجَّتَيْهِ الصَّيْدِ	۷۲۱	منی میں رات ٹھہرنے کا حکم
"	محرم کے لئے شکار کی ممانعت کا بیان	۷۲۲	آب زَمَزَمِ پلانا ثواب ہے
۷۵۵	احرام کی حالت میں گور ضرکا ہد یہ قبول نہ کرنا	۷۲۳	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمرۃ القضاء کا بیان
۷۵۶	حنیفہ کا استدلال	۷۲۵	طواف وداعِ افاقی کے لیے ضروری ہے
۷۵۸	احرام کی حالت میں مذکورہ جانوروں کو مارنا گناہ نہیں ہے	۷۲۶	حانضہ کے لیے طواف وداع کی ضرورت نہیں ہے
۷۵۹	مذی جانوروں کو مارنے کا حکم	۷۲۸	حج اکبر کے دن کا ذکر
۷۶۰	محرم کو شکار کرنے کا ممانعت	۷۳۰	منی میں آپ ﷺ نے سوار ہو کر خطبہ دیا
۷۶۱	الجراد یعنی مڈی	۷۳۲	کنکریاں مارنے کے اوقات
۷۶۲	حملہ کرنے والے درندے کو مار ڈالنے کا حکم	۷۳۴	بَابُ مَا يَحْتَبِيهِ الْمُحْرَمُ
"	چرغ کے شکار کا حکم	"	جن چیزوں سے محرم کو بچنا چاہئے ان کا بیان
۷۶۳	چرغ کے شکار کرنے پر جزا	"	محرم کن کن چیزوں سے پرہیز کرے
"	چرغ اور بھیڑے کا مسئلہ	۷۳۷	محرم کے لیے رخصت کا ذکر
۷۶۴	محرم کے لیے شکار کا گوشت کھانے کا حکم	۷۳۸	محرم کو خوشبو لگانا منع ہے
۷۶۵	بَابُ الْاِحْصَارِ وَفَوْتِ الْحَجِّ	۷۳۹	محرم کے آدی نکاح نہ کرے اور نہ کسی کا نکاح کرائے
"	احصار اور حج کے فوت ہو جانے کا بیان	۷۴۳	حالت احرام میں ہم بستر ہونا ممنوع ہے
"		۷۴۴	حالت احرام میں مردھونا جائز ہے

۸۰۰ حرمت مدینہ کا بیان	۷۶۶ احصار کا حکم
۸۰۱ مدینہ مندرہ کے درخت کاٹنے کی ممانعت	۷۶۸ حدیبیہ کا واقعہ
۸۰۲ مدینہ منورہ کے لیے برکت کی دعا	" احضار کی وجہ سے حج قضاء کرے
۸۰۳ مدینہ کی وہاں کا ذکر	۷۷۰ احصار کی وجہ سے احرام کھولنا جائز ہے
۸۰۴ حضور ﷺ کی اہل مدینہ کے بارے میں پیشینگوئی	۷۷۱ جانوروں کو بدلنے کا حکم
۸۰۵ مدینہ منورہ کی دوسری بستیوں پر فضیلت	" احصار دشمن کے علاوہ بھی ممکن ہے
۸۰۷ مدینہ میں رہنا آپ ﷺ کو محبوب تھا	۷۷۲ حج کا رکن اعظم وقف عرفہ ہے
۸۰۹ مدینہ منورہ میں دجال اور طاعون کا داخلہ ممنوع ہے	۷۷۳ بَابُ حَرَمِ مَكَّةَ حَزْرَتِهَا اللَّهُ تَعَالَى
۸۱۰ مدینہ والوں سے مکرو فریب کرنا ناممکن ہے	" حرم مکہ کا بیان اللہ تعالیٰ اس کو آفات سے محفوظ رکھے
" آپ ﷺ کو مدینہ بہت زیادہ محبوب تھا	۷۷۴ حرم کے احرام کا بیان
۸۱۱ اُحد پہاڑ سے آپ ﷺ کی اظہار محبت	۷۷۸ بغیر ضرورت کے مکہ مکرمہ میں ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے
۸۱۲ حرمت مدینہ کا بیان	" حرم پاک میں قصاص کا مسئلہ
۸۱۳ مدینہ کے درخت کاٹنے کی ممانعت	۷۷۹ دخول مکہ کے وقت آپ ﷺ سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے
۸۱۴ مقام ورج کی فضیلت و اہمیت	۷۸۰ تحریب کعبہ لشکر کا ذکر
۸۱۵ مدینہ مرنے کی فضیلت	۷۸۱ خانہ کعبہ کی خرابی حبشی کے ہاتھوں ہوگی
۸۱۷ دجال مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہوگا	" خانہ کعبہ کو خراب کرنے والے شخص کا ذکر
۸۱۹ روضہ اطہر کی زیارت کی فضیلت	۷۸۲ حرم میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت
۸۲۰ سرزمین مدینہ کی فضیلت بوجہ روضہ اطہر کے	۷۸۳ مکہ کی فضیلت
۸۲۱ وادیِ تحقیق کی فضیلت	" زمین میں سب سے زیادہ محبوب مقام مکہ ہے
۸۲۳ کِتَابُ الْبَيْتِ	۷۸۶ حرمت مکہ کا بیان
" خرید و فروخت کا بیان	۷۸۹ تعظیم مکہ کا بیان
۸۲۴ بَابُ الْكُتْبِ وَ طَلَبِ الْحَالِ	۷۹۰ بَابُ حَرَمِ الْمَدِينَةِ حَزْرَتِهَا اللَّهُ تَعَالَى
" کسب اور طلب حلال کا بیان	" حرم مدینہ کا بیان (اللہ اس کو آفات سے محفوظ رکھے)
۸۵۸ بَابُ الْمُسَاهَلَةِ فِي الْمَعَامَلَةِ	۷۹۳ احترام مدینہ کا بیان
" معاملات میں نرمی کرنے کا بیان	۷۹۶ حرمت مدینہ کا بیان
۸۶۵ بَابُ الْخِيَارِ	۷۹۸ مدینہ منورہ کی سکونت کی فضیلت
" خیار کا بیان	۷۹۹ نیک پھل دیکھ کر آپ ﷺ مدینہ کے لیے دعا فرماتے

۹۰۹	پانی بیچنے کی ممانعت	۸۷۲	عقد بیع کے بعد شیخ کا اختیار
"	ضرورت سے زائد پانی کو بیچنے کی ممانعت	"	باب الزبوا
۹۱۰	فریب دہی سے سے بچو	"	سود کا بیان
۹۱۱	بیع ثنیا کی ممانعت	۸۷۳	سود لینے دینے والے پر لعنت
"	پھل اور کھیتی پکنے۔ بعد ہی فروخت کی جائے	۸۸۱	ہم جنس اشیاء کا تبادلہ
۹۱۲	ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے کی ممانعت	"	سونے کے خرید و فروخت کا مسئلہ
"	بیعنا کا مسئلہ	۸۸۳	سود کے بارے میں آپ ﷺ کی پیشگوئی
۹۱۳	بیع مضطر کی ممانعت	"	مختلف الجنس چیزوں کے دست بدست باہمی لین دین میں کمی
۹۱۴	زکوٰۃ پر چھوڑنے کی اجرت لینا ممنوع ہے	"	بیشی جائز ہے
"	جو چیز اپنے پاس نہ ہو اس کی بیع نہ کرو	۸۸۴	خشک اور تازہ پھلوں کا تبادلہ
۹۱۵	ایک بیع میں دو بیع نہ کرو	۸۸۵	گوشت اور جانور کے باہمی تبادلے کا مسئلہ
۹۱۶	بیع کو قرض کے ساتھ نہ ملاؤ	"	غیر مثلی چیز کے عوض لینے کا مسئلہ
۹۱۷	ادائیگی قیمت میں سکہ کی تبدیلی جائز ہے	۸۸۶	ادھار لین دین میں سود کا مسئلہ
۹۱۹	آپ ﷺ سے متعلق ایک بیع کا ذکر	۸۸۷	سود کھانے پر وعید
۹۲۰	بطریق نیلام بیع جائز ہے	۸۸۹	سود خور پر آپ ﷺ کی لعنت
"	عیب دار چیز دھوکہ سے بیچنے والے کیلئے وعید	"	ربا کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد
۹۲۱	باب	۸۹۰	قرض خواہ کا مقروض سے قحط وصول کرنا
"	گزشتہ باب کے تعلقات کا بیان	۸۹۲	باب الْمَنْهِي عَنْهَا مِنَ الْبَيْعِ
"	پھلدار درخت کی بیع کا مسئلہ	"	جن بیعوں سے منع کیا گیا ہے ان کا بیان
۹۲۳	مشروط بیع کا مسئلہ	"	بیع شمر خام کی ممانعت
۹۲۴	حق ولاء آزاد کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے	۸۹۸	پھلدار درختوں کو کئی سالوں کے لئے بیٹھگی بیع ڈالنے کی ممانعت
۹۲۸	حق ولاء کو بیچنا یا اس کو ہبہ کرنا جائز ہے	۹۰۰	اشیاء منقولہ میں قبل قبضہ دوسری بیع جائز نہیں ہے
۹۲۹	جو نقصان کا ذمہ دار ہے وہی نفع کا بھی حقدار ہے	۹۰۵	شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے
۹۳۰	بالغ اور مشتری کے نزاع کی صورت میں کس کا قول معتبر ہوگا	۹۰۶	بیع بلا صورت اور منابذت کی ممانعت
۹۳۱	اقالہ بیع کا مسئلہ	۹۰۷	بیع حصاۃ اور بیع غرر کی ممانعت
"	ایک سبق آموز واقعہ	"	بیع جب اجملہ کی ممانعت
۹۳۲	باب التَّسْلَمِ وَالزَّهْنِ	۹۰۸	زکوٰۃ پر چھوڑنے کی اجرت کی ممانعت

۹۵۷	دیوالیہ کا حکم	"	بیع سلم اور رہن کا بیان
۹۵۸	قرض دار کی روح قرض کی ادائیگی تک معلق رہتی ہے	۹۳۳	بیع سلم کی شرائط صحت
۹۶۰	بلا عذر قرض ادا نہ کرنے والا مستطیع شخص قابل ملامت ہے	"	ادھار خریدنا اور گروہی رکھنا جائز ہے
۹۶۱	قرض دار مرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنے سے آنحضرت ﷺ کا انکار	۹۳۶	شے مرصون راہن کی ملکیت سے جاہر نہیں ہوتی
۹۶۲	قرض کے بوجھ سے ہلکا ہو کر مرے والے کیلئے بشارت	"	حقوق شرعیہ میں بییان اور وزن کا اعتبار
"	بالکل مفلسی کے حالت میں قرض دار مرنا ایک بڑا گناہ ہے	۹۳۸	ناپ تول میں کمی کرنے والوں کیلئے وعید
۹۶۳	حرام چیزوں میں صلح ناجائز ہے	۹۳۹	بیع سلم کی بیع کو قبل قبضہ فروخت کرنے کی ممانعت
۹۶۴	آنحضرت ﷺ کا پانچواں خریدنا	"	بَابُ الْإِحْتِكَارِ
۹۶۵	قرض کی واپسی میں غیر مشروط زیادتی جائز ہے	"	احتکار کا بیان
"	ادائیگی قرض کا جلد انتظام کرو	۹۴۰	احتکار کرنے والا گنہگار ہے
۹۶۶	مہلت دینے والے کو ثواب ملتا ہے	"	احتکار کرنے والے کیلئے وعید
"	دین میراث پر مقدم ہے	۹۴۱	حاکم اپنی طرف سے نزع مقرر نہ کرے
۹۶۷	بار بار کی شہادۃ بھی قرض کا کفارہ نہیں ہو سکتی	"	غذہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کیلئے موعظت
۹۶۸	بَابُ الشَّيْءِ كَمَا فِي الْوَسْكَالَةِ	۹۴۲	وعبرت
"	شرکت اور وکالت کا بیان	۹۴۳	بَابُ الْأَفْلَاسِ وَالْإِنْتِظَارِ
"	عقود میں شرکت جائز ہے	"	افلاس اور مہلت دینے کا بیان
۹۷۰	انصار کے مال میں مہاجرین کی شرکت	۹۴۴	مفلس ہو جانے والے کے بارے میں ایک مسئلہ
۹۷۱	معاملات میں وکیل بنانا جائز ہے	"	مفلس ہو جانے والے کی امداد کرنے کا حکم
۹۷۲	امانت دار شرکاء کا اللہ تعالیٰ محافظ رہتا ہے	۹۴۵	وصولی قرض میں درگزر کرنے کا اجر
"	خان سے انتقام کا جذبہ تمہیں خیانت پر نہ اُکسا دے	۹۴۷	خوبی کے ساتھ قرض ادا کرنے والا بہترین شخص ہے
۹۷۳	آنحضرت ﷺ کا وکیل	۹۴۸	قرض خواہ تقاضا کر سکتا ہے
"	شرکت مضاربت میں خیر و بھلائی ہے	۹۵۰	ادائیگی قرض پر قادر ہونے کے باوجود قرض ادا نہ کرنا ظلم ہے
۹۷۴	ایک واقعہ	۹۵۱	قرض خواہ و قرض دار کا تنازعہ ختم کرانا جائز ہے
۹۷۵	بَابُ الْغَضَبِ وَالْعَارِيَةِ	۹۵۲	ادائیگی قرض میں تاخیر کرنے والوں کیلئے ایک عبرتناک واقعہ
"	غضب اور عاریت کا بیان	۹۵۴	قرض کو ادا کرنے کی نیت رکھنے والے کی اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے
۹۷۶	کسی جانور کا دودھ مالک کے اجازت کے بغیر نہ دھو	۹۵۵	اللہ تعالیٰ حقوق العباد معاف نہیں کرتا
		۹۵۶	قرض دار کی جنازہ پڑھنے سے آنحضرت ﷺ کا اجتناب

۱۰۰۰ ہمسایہ کو حق شفعہ حاصل ہوتا ہے	۹۷۷ ایک واقعہ
۱۰۰۱ بیوی کا درخت کاٹنے پر وعید	۹۷۸ کسی مسلمان کا مال لوٹنا حرام ہے
 ہر غیر منقول جائیداد میں شفعہ ہے خواہ وہ تقسیم ہو سکتی ہے یا ناقابل تقسیم ہو	۹۷۹ حاجیوں کا سامان چرانے والے کا عبرتناک حشر
"	۹۸۱ جانور کا عاریتہ مانگ لینا جائز ہے
۱۰۰۲ بَابُ الْمَسَاقَاةِ وَالْمُزَارَعَةِ	۹۸۲ بجز زمین کو آباد کرنے والا اس زمین کا مالک ہے
" مساقات اور مزارعت کا بیان	۹۸۳ کسی دوسرے کا مال بغیر اجازت حلال نہیں ہے
" خیر کی زمین کا بندوبست کسی کا مال لوٹنے والا اسلامی برادری کا فرد بننے کے قابل نہیں ہے
۱۰۰۳ مخابرات کی ممانعت	۹۸۴
۱۰۰۵ اجرت یا لگان پر زمین دینے کا ذکر	۹۸۵ کسی کی کوئی چیز ہنسی مذاق میں لیکر ہڑپ نہ کر جاؤ
۱۰۰۷ مزارعت کی ایک ممنوع صورت	" اپنا چوری کا مال جس کے پاس دیکھو اس سے لے لو
" کسی کو اپنی زمین بطور عاریت دینا بہتر ہے	" جس سے کوئی چیز لو اس کو واپس کر دو
۱۰۰۹ اپنی زمین کو بیکار نہ چھوڑو	" کسی کے باغ وغیرہ کو جانور کے نقصان پہنچانے کا مسئلہ
۱۰۱۰ زراعت میں مشغولیت کی وجہ سے جہاد ترک کرنے پر وعید	۹۸۸ حالت اضطرار میں دوسرے کے جانور کا دودھ پینے کی اجازت دوسرے کے باغ کا پھل مالک کی اجازت کے بغیر کھانے کا
" کسی کی زمین میں بلا اجازت کاشت نہ کرو	" مسئلہ
۱۰۱۱ مزارعت کا ثبوت مستعار لی ہوئی چیز امانت کے حکم میں ہے
۱۰۱۲ بَابُ الْإِحْزَارَةِ	۹۸۹ مستعار چیز کو واپس کر دینا واجب ہے
" اجارہ کا بیان	۹۹۰ درخت سے گرے ہوئے پھل اٹھانے کا مسئلہ
" اجارہ کا جواز	۹۹۱ زمین غصب کرنے کی مزا
۱۰۱۳ سرکارِ دو عالم ﷺ نے اجرت پر بکریاں چرائی ہیں	"
۱۰۱۴ مزدور کو اس کی مزدوری نہ دینے والے کیلئے وعید	۹۹۳ بَابُ الشُّفْعَةِ
۱۰۱۵ جھاڑ پھونک کرنے والا اجرت لے سکتا ہے	" ملانے کا بیان
 جس طرح غیر شرعی جھاڑ پھونک نا جائز ہے اسی طرح اس کی اجرت بھی حرام ہے	۹۹۴ حق شفعہ صرف شریک کو حاصل ہوتا ہے یا ہمسایہ کو بھی
۱۰۱۶ مزدور کو اس کی مزدوری دینے میں تاخیر نہ کرو	۹۹۵ حق شفعہ صرف زمین اور مکان کے ساتھ مخصوص ہے
۱۰۱۸ مزدور کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر	۹۹۶ ہمسایہ کو حق شفعہ حاصل ہونے کی دلیل
۱۰۱۹ دین کی تعلیم پر اجرت لینے کا مسئلہ	۹۹۷ ہمسائیگی کا حق
۱۰۲۰	۹۹۸ راستے کے سلسلے میں ایک ہدایت
۱۰۲۱ بَابُ احْتِیَاءِ الْمَوَاتِ وَالشُّرْبِ	۹۹۹ غیر منقولہ جائیداد کو بلا ضرورت بیچنا مناسب نہیں ہے

الموضوع

صفحة	عنوان	صفحة	عنوان
٤٣٢	باب مَا يَجْتَنِبُهُ الْمُحْرِمُ	١٤	كِتَابُ فَضَائِلِ الْقُرْآنِ
٤٥٣	بابُ الْمُحْرِمِ مِ يَجْتَنِبُ الصَّيْدَ	١٣٠	باب اختلاف القراءات وجمع القران
٤٦٥	بابُ الْأَحْصَارِ وَقَوَاتِ الْحَجِّ	١٦٩	كِتَابُ الدَّعَوَاتِ
٤٤٣	بابُ حَرَمِ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللَّهُ تَعَالَى	٢٠٢	بابُ ذِكْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَالتَّقَرُّبِ إِلَى اللَّهِ
٤٩٠	بابُ حَرَمِ الْمَدِينَةِ حَرَّمَهَا اللَّهُ تَعَالَى	٢٣٦	كِتَابُ أَسْمَاءِ اللَّهِ تَعَالَى
٨٢٣	كِتَابُ الْبُيُوعِ خرید و فروخت کا بیان	٣٠٣	بابُ تَوَابِ التَّسْبِيحِ وَالتَّحْنِيثِ وَالتَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ باب رحمة الله
٨٢٣	بابُ الْكُفْبِ وَطَلْبِ الْخَلَالِ	٣٠١	بابُ مَا يَقُولُ عِنْدَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ وَالْمَتَامِ
٨٥٨	بابُ الْمَسَاهَلَةِ فِي الْمَعَامَلَةِ	٣٣٤	بابُ الدَّعَوَاتِ فِي الْأَوْقَاتِ
٨٦٥	بابُ الْخِيَارِ	٣٤٤	بابُ الْإِسْتِعَادَةِ
٨٤٢	بابُ الرِّبَا	٥٠٦	بابُ جَامِعِ الدُّعَاءِ
٨٩٢	بابُ الْمُنْهَيِّ عَنْهُمَا مِنَ الْبُيُوعِ	٥٣٠	كِتَابُ الْمَنَاسِكِ افعال حج کا بیان
٩٣٢	بابُ السَّلْمِ وَالرَّهْنِ	٥٤٥	بابُ الْإِحْرَامِ وَالتَّلْبِيَةِ
٩٣٩	بابُ الْإِحْتِكَارِ	٥٤٥	بابُ الْإِحْرَامِ وَالتَّلْبِيَةِ
٩٣٣	بابُ الْأَفْلَاسِ وَالْإِنْظَارِ	٥٩١	بابُ قِصَّةِ حَجَّةِ الْوَدَاعِ
٩٦٨	بابُ الشَّرْكََةِ وَالْوَكَالَةِ	٦٢٢	بابُ دُخُولِ مَكَّةَ وَالطَّوْفِ
٩٤٥	بابُ الْعُصْبِ وَالْعَارِيَةِ	٦٥٣	بابُ الْوُقُوفِ بِعَرَفَةَ
٩٩٣	بابُ الشُّفْعَةِ	٦٦٦	بابُ الدَّفْعِ مِنْ عَرَفَةَ وَالْمَزْدَلِقَةِ
١٠٠٢	بابُ الْمَسَاقَاةِ وَالْمُرَارَعَةِ	٦٤٩	بابُ رَمِي الْجِمَارِ
١٠٢١	بابُ إِحْيَاءِ الْمَوَاتِ وَالشَّرْبِ	٦٨٤	بابُ الْهَدْيِ
١٠٣٦	بابُ الْعَطَايَا	٤٠٣	بابُ الْخَلْقِ
١٠٥٩	بابُ اللَّفْطَةِ	٤١٣	بابُ خُطْبَةِ يَوْمِ النَّخْرِ وَرَمِي آيِ امِ التَّشْرِيقِ وَالتَّوْدِيْعِ
١٠٤٠	بابُ الْفَرَايِضِ		
١٠٩٢	بابُ الْوَصَايَا		

الموضوع

صفحة	عنوان	صفحة	عنوان
٤٣٢	باب مَا يَجْتَنِبُهُ الْمُخْرِمُ	١٤	كِتَابُ فَصَائِلِ الْقُرْآنِ
٤٥٣	باب الْمُخْرِمِ مَنِ اجْتَنَبَ الصَّيْدَ	١٣٠	باب اختلاف القراءات وجمع القران
٤٦٥	باب الإخضرار وقوت الحج	١٦٩	كِتَابُ الدَّعَوَاتِ
٤٤٣	باب حَرَمِ مَكَّةَ حَرَّسَهَا اللَّهُ تَعَالَى	٢٠٢	باب ذِكْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَالتَّقَرُّبِ إِلَى اللَّهِ
٤٩٠	باب حَرَمِ الْمَدِينَةِ حَرَّسَهَا اللَّهُ تَعَالَى	٢٣٦	كِتَابُ أَسْمَاءِ اللَّهِ تَعَالَى
٨٢٣	كِتَابُ الْبُيُوعِ خرید و فروخت کا بیان	٣٠٢	باب ثَوَابِ التَّسْبِيحِ وَالتَّحْمِيدِ وَالتَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ
٨٢٢	باب الْكُنْسِ وَطَلَبِ الْحَلَالِ	٣٠٢	باب رحمة الله
٨٥٨	باب الْمُسَاهَلَةِ فِي الْمَعَامَلَةِ	٣٠١	باب مَا يَقُولُ عِنْدَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ وَالْمَتَامِ
٨٦٥	باب الْخِيَارِ	٣٣٤	باب الدَّعَوَاتِ فِي الْأَوْقَاتِ
٨٤٢	باب الرِّبَا	٣٤٤	باب الْإِسْتِعَاذَةِ
٨٩٢	باب الْمُنْهَيِّ عَنْهَا مِنَ الْبُيُوعِ	٥٠٦	باب جَامِعِ الدَّعَا
٩٣٢	باب السَّلْمِ وَالرَّهْنِ	٥٢٠	كِتَابُ الْمَنَاسِكِ
٩٣٩	باب الْإِخْتِكَارِ	٥٢٠	انفال حج کا بیان
٩٣٣	باب الْأَفْلَاسِ وَالْإِنْظَارِ	٥٤٥	باب الْإِحْرَامِ وَالتَّلْبِيَةِ
٩٦٨	باب الشُّبْرِكَةِ وَالْوُكَّالَةِ	٥٤٥	باب الْإِحْرَامِ وَالتَّلْبِيَةِ
٩٤٥	باب الْعُصْبِ وَالْعَارِيَةِ	٥٩١	باب قِصَّةِ حَجَّةِ الْوَدَاعِ
٩٩٣	باب الشُّفْعَةِ	٦٢٢	باب دُخُولِ مَكَّةَ وَالطَّوَّافِ
١٠٠٢	باب الْمَسَاقَاةِ وَالْمَزَارَعَةِ	٦٥٣	باب الْوُقُوفِ بِعَرَفَةَ
١٠٢١	باب إِحْيَاءِ الْمَوَاتِ وَالشُّزْبِ	٦٦٦	باب الدَّفْعِ مِنْ عَرَفَةَ وَالْمُزْدَلِقَةِ
١٠٣٦	باب الْعَطَايَا	٦٤٩	باب رَمِي الْجِمَارِ
١٠٥٩	باب اللَّفْطَةِ	٦٨٤	باب الْهَدْيِ
١٠٤٠	باب الْفَرَائِضِ	٤٠٣	باب الْحَلْقِ
١٠٩٢	باب الْوَصَايَا	٤١٢	باب خُطْبَةِ يَوْمِ النَّحْرِ وَرَفِي أَيَّامِ التَّشْرِيقِ وَالتَّوْدِيْعِ

کِتَابُ فَضَائِلِ الْقُرْآنِ

فضائلِ قرآن کا بیان

عمومی طور پر (اور) بعض سورتیں و آیات خصوصاً (مراد) ہیں۔ فضیلت سے مراد کسی چیز کو دوسری چیز پر برتری دینا۔ کہا جاتا ہے: "الفلان فضیلة" یعنی اچھی خصلت۔ طبی پبلیکیشنز کہتے ہیں: اس کا اکثر استعمال صفت محمودہ پر ہوتا ہے جس طرح فضول کا استعمال اکثر مذموم اوصاف پر ہوتا ہے۔ فضیلت فعل لازم کی صفت ہوتی ہے اور فاضلہ متعدی کی صفت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی فضیلت علوم میں استعمال ہوتی ہے، اور فاضلہ اخلاق کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ "الاتقان" میں فرماتے ہیں: لوگوں میں اختلاف ہے کہ قرآن میں کوئی چیز دوسری چیز سے افضل ہے۔ امام ابوحنیفہ اشعری، ابو بکر باقلانی اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے منع کیا ہے چونکہ سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، چونکہ بعض کو بعض پر فضیلت دینے سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ فضیلت والے سے دوسرے کی فضیلت میں نقص ہے۔ یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ دوسرے جمہور ہیں جو احادیث کے ظواہر سے فضیلت کو قبول کرتے ہیں۔ قرطبی کہتے ہیں: صحیح بات یہی ہے۔ ابن حصار کہتے ہیں: ان پر تعجب ہے، جو ان وارد نصوص پر اختلاف کرتے ہیں، جن میں تفصیل (فضیلت) بیان ہوئی ہے۔

غزالی رحمۃ اللہ علیہ "جواہر القرآن" میں کہتے ہیں: شاید آپ کہیں کہ میں نے قرآن کی بعض آیات کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کلام تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ تو بعض بعض سے کیسے اشرف ہو سکتا ہے؟ آپ جان لیں کہ بصیرت کی روشنی وہ تیری راہنمائی نہیں کرے گی کہ آیت الکرسی اور آیت مدانیات میں کیا فرق ہے؟ سورۃ الاخلاص اور سورۃ لہب میں کیا فرق ہے؟ آپ اپنے نفس کو فرق والے اعتقاد سے تقلید کے ساتھ روک سکتے ہیں۔ وہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید جن پر یہ قرآن نازل کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یسر قلب القرآن"، یسین قرآن کا دل ہے۔ سورۃ فاتحہ قرآن کی سورتوں سے افضل ہے۔ آیت الکرسی قرآن کی آیات کی سردار ہے۔ سورۃ الاخلاص ایک تمہائی قرآن کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار آیات ہیں، جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔

پھر کہا گیا ہے کہ فضیلت والی زیادہ آجری طرف لوٹی ہے۔ ثواب کا دو گنا ہونا، ان آیات کی وجہ سے ہے۔ ان کی خشیت اور تدبر کی وجہ سے ہے۔ ان کے بلند اوصاف کی وجہ سے جو وارد ہوئے ہیں، ان میں تفکر کی وجہ سے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بلکہ وہ بذات خود لفظ ہے جیسا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کو متضمن ہے: ﴿وَالْهَكْمُ لِلَّهِ الْوَاحِدِ﴾ [البقرة: ۱۶۳] آیت الکرسی، سورۃ حشر کی آخری آیات اور سورۃ اخلاص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور صفات پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ سورۃ لہب اور اس جیسی سورتوں میں نہیں ہے۔ تفصیل معانی کی خوبصورتی

اور اس کی کثرت کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم

پھر قرآن کا اطلاق کلام قدیم پر ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ الفاظ اس کلام پر دلالت کرتے ہیں۔ یہاں دوسرا مراد ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس معنی کے ساتھ وہ حادث ہے۔ ہمارے اور معتزلہ کے درمیان ”نفسی“ پر اختلاف ہے۔ انہوں نے اپنی ناقص عقلموں کی وجہ سے اس کی نفی کی ہے۔ وہ اس کو کلام نہیں لفظ کہتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ پر مجال ہے، اسی تعطیل پر ان کے اس قول کی بنیاد ہے: اللہ تعالیٰ کے منتظم ہونے سے مراد کہ اس نے بعض اجسام میں کلام کو پیدا کیا ہے۔ ہم نے جو کتاب و سنت میں وارد اسمائے شرعیہ ہیں ان سے عملاً اس کو ثابت کیا ہے۔ یہ تو لغت عرب سے بھی معلوم ہے، کہ کلام بذات خود یا اشتراک کے ساتھ حقیقی طور پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں دونوں معنی پر اطلاق ہے لفظی اور نفسی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَا يَكْتُمُهُمْ مِنْ ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِمْ مُّحَدَّثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ﴾ [الانبیاء: ۲] ”ان کے پاس کوئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں“ ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾ [النساء: ۱۶۴] ”اور موسیٰ (علیہ السلام) سے تو خدا نے باتیں بھی کیں“ اور لفظ اللہ تعالیٰ پر مجال ہے درخت کے لئے اس نے کلام کو مجازاً پیدا کیا ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بات پر اعتقاد ہے کہ قرآن قراءت کے معنی میں ہے۔ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یا قراءت سے فعلان کے وزن پر جمع کے معنی میں ہے، یہ معنی سورتوں کو جمع کرنے کے علوم کی اقسام کے لحاظ سے ہے، اور مہموز ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں: یہ نفل کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ شاطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ص

ونقل قرآن والقرآن دو اؤنا

”قرآن کو نقل کیا گیا ہے اور یہ ہماری شفاء ہے“

یہ ان کے خلاف ہے جنہوں نے کہا: یہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانا ہے اس لیے کہ آیات اور سورتیں قرآن میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے عجیب و غریب بات کہی ہے: قرآن کلام اللہ کا اسم علم ہے، یہ مہموز نہیں ہے، اور نہ ہی قراءت سے ماخوذ ہے۔ سیوطی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہ ہمارے ہاں پسندیدہ موقف وہی ہے اس مسئلہ میں جس پر امام شافعی نے تصریح کر دی ہے۔ رہا ابن حجر رحمہ اللہ کا قول کہ امام شافعی کا قول شاید زیادہ فصیح ہے تو زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ قول مردود ہے، کہ جمہور کے ہاں مہموز سے ہے، اور وہی مشہور ہے۔ ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ وہ ہمزہ کی طرف لوثا ہے، اسی پر بقیہ مشتقات اللہ تعالیٰ کے فرامین سے دلالت کرتے ہیں۔ ﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾ [العلق: ۳] ”پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے“ ﴿فَإِذَا قَرَأْتَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ [القیامۃ: ۱۸] ”جب ہم دُجی پڑھا کریں تو تم اس کو سنا کرو اور پھر اس طرح پڑھا کرؤ“ اور اس جیسی اور بھی امثال ہیں۔

عرض مرتب آداب تلاوت!

تلاوت کے آداب یہ ہیں: وضو کے ساتھ کرے اور اچھی جگہ متواضع اور قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور اپنے آپ کو حقیر سمجھے اور حضور دل کے ساتھ بیٹھے۔ اس طرح کہ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے بیٹھا ہے دعا شروع کرے اور تعوذ اور تسبیح کے ساتھ شروع کرے اور یہ جانے کہ میں خدا تعالیٰ کا کلام بغیر واسطے کے سن رہا ہوں آہستہ آہستہ تدبر، تفکر اور ترتیل کے ساتھ پڑھے اور وعدہ و رحمت کی آیات پر خوش دل ہو کر دعا کرے اور اپنے لیے مغفرت و رحمت مانگے اور عذاب و وعید کی آیت پر پناہ مانگے۔

اور تنزیہ و تقدیس کی آیت پر تہنیت کہتے۔ یعنی جس آیت پر اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان ہو اس پر سبحان اللہ کہے اور پڑھنے کے درمیان

روئے اور اگر روانہ آئے تو مختلف نمکین ہو کر رونے والی صورت بنالے اور جلدی ختم کرنے کی کوشش نہ کرے اس لیے تھوڑا قرآن پاک پڑھنا۔ غور و فکر کے ساتھ زیادہ پڑھنے سے بہتر ہے جو ان کو مذکورہ چیزوں سے خالی ہو اور زیادہ پڑھنے میں سوائے ختم کے کرے بلکہ ممنوع امر کا مرتکب ہونا لازم آتا ہے اور یہ جو اس زمانے میں رواج آیا ہے ایک دن میں ختم کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ نہایت بری بات غفلت و نادانی ہے۔

اور بعض بزرگان سے جو زیادہ پڑھنے کے بارے میں آیا ہے وہ ان کی کرامت ہے دوسروں لوگوں کو ان کی پیروی کرنی اچھی بات نہیں ہے پس جس قدر ذوق و شوق اور حضور قلبی میسر ہو اس پر اکتفا کرے اور جس مجلس میں لوگ دوسرے کاموں میں مشغول ہوں وہاں تلاوت نہ کرے اگر اس کے علاوہ کوئی دوسری جگہ میسر نہ ہو تو نو اشتر پڑھے اور لوگ مستعد ہو کر سن رہے ہوں اور خاموش ہوں تو بلند آواز سے پڑھنا افضل ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ پڑھنے والا اور سننے والا اجر میں دونوں شریک ہوتے ہیں اور اسی طرح قرآن پاک کو دیکھ کر پڑھنا زبانی پڑھنے سے افضل ہے۔ اس لیے کہ اس میں آنکھیں اور اعضاء بھی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور حضور قلبی زیادہ حاصل ہوتا ہے اور قرآن کریم رحل پر یا بلند چیز پر رکھ کر پڑھنا چاہے۔ تاکہ تعظیم حاصل ہو جائے اور تلاوت کلام پاک کے دوران دنیاوی باتوں اور کھانے پینے اور تمام کاموں سے رکاوٹ ہے اور اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو قرآن کریم کو بند کر کے کرے۔

پھر اس کے بعد دوبارہ تعوذ (یعنی اعوذ باللہ پڑھ کر شروع کرے اور غلط پڑھنے سے پرہیز کرے اور تیل و تجوید کے ساتھ بلا تکلف کے پڑھے اور تلاوت کرتے وقت کسی کی تعظیم نہ کرے۔ مگر استاد عالم باعمل اور والدیم کی قیام و تعظیم جائز ہے اور ختم قرآن لوگوں کے مجمع میں کرے اور اپنے محبت اور اپنے رشتے داروں کو حاضر کرے اور دعا میں سب کو شامل کرے۔ کیونکہ قبولیت کا وقت ہوتا ہے اور تکیہ لگا کر اور لیٹ کر قرآن پاک پڑھنا جائز ہے لیکن افضل صورت یہی ہے کہ مودب بیٹھ کر پڑھے اور اسی طرح پڑھنا جائز ہے۔ اگر جنگل ہو تو پکار کر پڑھے۔ ورنہ چپکے سے پڑھے۔ ناپاک جگہ میں اور مکروہ جگہ میں جیسے مہام اور کیلے اور کوڑے وغیرہ پڑھنا مکروہ ہے اور قرآن کی تقطیع بہت چھوٹی اور متفرق ٹکڑے ٹکڑے نہ کرے اور قرآن کریم کو اس لشکر میں نہ لے جائے کہ اس پر اعتماد امن پر نہ ہو اور دار الحرب میں نہ لے جائے؟ تاکہ کہیں کافروں کے ہاتھ نہ لگ جائے اور وہ اس کے بی حرمتی کریں اور قرآن کریم یا ذکر ناتی مقدار میں جس سے نماز جائز ہو جائے فرص عین ہے اور تمام قرآن کا یاد کرنا فرض کفایہ ہے۔

سفر میں حفاظت کی خاطر مصحف کی خربی (بیگ زنبیل اور جھولا) میں رکھ کر اس پر سوار ہونا یا تکیہ کے نیچے رکھ کر سونا میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، جس مکان میں یا کمرہ میں مصحف رکھا ہو اس میں جماع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جب قرآن شروع ہو تو پہلے یہ دعاء پڑھئے:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَشْهَدُ أَنَّ كِتَابَكَ الْمُنَزَّلُ مِنْ عِنْدِكَ عَلَى رَسُولِكَ مُحَمَّدٍ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ
وَأَتْبَاعِهِ أَجْمَعِينَ وَكَلَامُكَ النَّاطِقُ عَلَى لِسَانِ نَبِيِّكَ جَعَلْتَهُ هَادِيًا مِنْكَ لِخَلْقِكَ وَجَبَلًا مُتَصِلًا فِيْنَا بَيْنَكَ
وَبَيْنَ عِبَادِكَ اللَّهُمَّ فَاجْعَلْ نَظْرِي فِيهِ عِبَادَةً وَقِرْآئِي فِكْرًا وَفِكْرِي فِيهِ إِعْتِبَارًا إِنَّكَ أَنْتَ الرَّئُوفُ الرَّحِيمُ رَبِّ
أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ .

’اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری یہ کتاب تیری طرف سے تیرے رسول پر اتاری گئی ہے جن کا نام محمد ابن عبد اللہ ہے رحمت ہو اللہ کی ان پر ان کی اولاد پر ان کے اصحاب پر اور ان کے تمام تابعداروں پر اور میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ تیرا

کلام ناطق ہے تیرے رسول کی زبان پر اس کلام کو تو نے اپنی طرف سے اپنے مخلوق کے لئے ہدایت کرنے والا بنایا ہے اور اس کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان واسطہ متصل بنایا ہے لہذا اے اللہ! تو میری نظر کو اس میں عبادت گزار میری قراءت کو اس میں بالفکر اور میرے فکر کو اس میں عبرت پذیر بنا، بلاشبہ تیری ذات بڑی مہربان ہے اور تو بڑا رحم کرنے والا ہے اے میرے رب! میں شیاطین کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اے میرے رب! میں اس بات سے تیری پناہ کا طلب گار ہوں کہ میرے پاس شیاطین آئیں۔“

اس دعا کے بعد قل اعوذ برب الناس الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھے اور پھر یہ دعا مانگئے:

اللَّهُمَّ بِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَالْحَقِّ نَزَلَ اللَّهُمَّ عَظَمَ رَغْبَتِي فِيهِ وَأَجْعَلْهُ نُورًا لَبْصَرِي وَشِفَاءً لصدْرِي وَذَهَابًا لِهَمِّي وَحَزْنِي وَبِضْ بِهِ وَجْهِي وَأَرْزُقْنِي تِلَاوَتَهُ وَفَهْمَ مَعَانِيهِ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ.

”اے اللہ! تو نے قرآن کو حق کے ساتھ اتارا اور یہ حق کے ساتھ اترا، اے اللہ! قرآن میں میری رغبت بڑی بنا، اے میری آنکھوں کا نور، میرے سینے کیلئے شفاء اور میرے فکر و غم کے دور ہونے کا سبب بنا، اس کے ذریعہ میرے چہرے کو روشن و منور فرما اور اپنی رحمت کے صدقہ اے ارحم الراحمین! اس کی تلاوت مجھے نصیب کر اور اس کے معنی کی سمجھ مجھے عطا فرما۔“

ہر روز تلاوت کے بعد ہاتھ اٹھا کر یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْآنَ لَنَا فِي الدُّنْيَا قَرِينًا وَفِي الْآخِرَةِ شَافِعًا وَفِي الْقَبْرِ مُؤْنَسًا وَفِي الْقِيَامَةِ صَاحِبًا وَعَلَى الصِّرَاطِ نُورًا وَفِي الْجَنَّةِ رَفِيقًا وَمِنَ النَّارِ سِتْرًا.

”اے اللہ! قرآن پاک کو میرے لئے دنیا میں ہم نشین، آخرت میں شافع، قبر میں غم خوار، قیامت میں مؤنس، پل صراط پر نور، جنت میں رفیق اور آگ سے پردہ بنا۔“

پھر آپ نے دینی اور دنیوی مقاصد و عزائم کے لئے جو بھی دعا چاہیں مانگیں انشاء اللہ آپ کی ہر درخواست مجیب الدعوات کی بارگاہ میں شرف قبولیت کے ساتھ نوازی جائے گی۔

اگر ایک شخص مشرق و مغرب کے درمیان میں سے کوئی حفظ کرے۔ تو سب کے ذمے سے ساقط ہو جاتا ہے اور سورۃ فاتحہ کا یاد کرنا اور ایک سورۃ کا تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ ذاتی الفتادہ الجنہ اور باقی قرآن پاک کا سیکھنا اور اس کے احکام کا سیکھنا اور اس کی سمجھ رکھنا نماز نفل سے اولیٰ ہے کہ ذاتی الخانیۃ۔ اگر سامنے قرآن (الماری میں) ہو تو پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتا ہے اور اگر قرآن پاک کھوٹی پر لٹکا ہوا ہو یا طاق میں رکھا ہو۔ تو اس طرف پاؤں پھیلا کر نایم نہیں ہے اور خرصی میں رکھ کر سفر کرنا اور اس پر سواریا سفر میں سر کے نیچے رکھنا حفاظت کے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اگر قرآن پاک مکان میں رکھا ہوا ہو تو اس میں جماع کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ کذا فی الخانیۃ

ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب قرآن شریف ختم کرتے تو کھڑے ہو کر یہ دعا فرماتے تھے اور یہی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے ابو ہریرہ سے کہ جو شخص قرآن پڑھے اور اپنے رب کی حمد بیان کرے اور نبی پر درود بھیجے اور اپنے رب سے بخشش مانگے اس نے خیر طلب کی درست ٹھکانے سے اور یہی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ جب قرآن کریم ختم فرماتے تو اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوتے۔

فائدہ: جان لینا چاہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کی فضیلت تمام عبادتوں سے افضل ہے خصوصاً جب کہ نماز میں ہو۔ اس کی فضیلت اور ثواب ایسا ہے جو تحریر میں آنا ناممکن ہے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور نماز میں پچیس اور قرآن پاک کے پڑھنے سے خدا

کا قرب نصیب ہوتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا اور قیامت موسفارش کرے گا اور جعل متین سے مراد قرآن کریم ہے اور مقصد اعلیٰ تلاوت سے یہ ہے کہ وہ تفکر کے باعث ہو اور تذکر کے یعنی امور دین کے یاد دلانے کے اور اس سے آخرت کی فکر نصیب ہوتی ہے اور تلاوت کلام کی کثرت کی وجہ سے احکام الہی یاد اور متحضر ہوں تاکہ اس پر عمل کیا جائے اور عبرت پکڑی جائے نہ یہ کہ محض آواز و حرف کو آراستہ کر کے پڑھیں اور دل غافل رہے جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل نہ کرے تو قرآن اس کا دشمن ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے: رب قال للقرآن والقرآن یلعنہ۔ "یعنی بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن کریم لعنت کرتا ہے ان کو" اور اس کا قرآن پڑھنا اس طرح حجت ہوگا، نعوذ باللہ منہ۔ اس کے بعد جاننا چاہے تفکر و تذکر و افہیم معانی قرآن کریم کا استحضار آہستہ پڑھنے اور ترتیل اور حضور دل کے ساتھ پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے اسی لیے قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ پڑھنا لازمی ہے اور قرآن کریم کا تھوڑا پڑھنا شروع ہے چنانچہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے قرآن کے حق کی ادائیگی کے لیے کافی ہے کہ وہ چالیس دن میں ختم کرے بلکہ ایک سال میں کافی ہے اور عبادت کے لیے بھی سات دن سے کم میں ختم نہیں کرنا چاہیے اور جس قدر اس سے زیادہ عرصہ میں ختم کرے افضل ہے اور جو شخص قرآن کے معانی وغیرہ نہ سمجھے اس کو بھی چاہیے کہ حضور دل سے شروع کرے اور ہمیشہ اپنے دل میں مشق کرے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے احکام ہیں جو انہوں نے اپنے بندوں پر کیے ہیں ایسی عاجزی سے تشریف فرما ہو گیا کہ اللہ عزوجل کا کلام ساعت فرما رہا ہے۔

الفصل الاول:

لوگوں میں سے بہترین اشخاص قرآن سیکھنے اور سکھانے والے ہیں

۲۱۰۹: عَنْ عُمَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ - (رواه البخاری)

احرجہ البخاری فی صحیحہ ۷۶۱۹۔ حدیث رقم ۵۰۲۷۔ وابوداؤد فی السنن ۱۴۷/۲ حدیث رقم ۱۴۵۲۔ والترمذی ۱۶۱/۵ حدیث رقم ۲۹۰۹۔ وابن ماجہ ۷۶۱/۱ حدیث رقم ۲۱۱۔ والدارمی ۵۲۸/۲ حدیث رقم ۳۳۳۷۔ واحمد فی المسند ۵۷/۱۔

ترجمہ: "حضرت عثمان سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔" (بخاری)

تشریح: عن عثمان رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ خیرکم: یعنی قراء کی جماعت یا اے امت! تم میں سے افضل وہ ہے جیسے کہ روایت میں ہے۔ من تعلم القرآن: "یعنی جو اس کو سیکھے گا۔" و علمہ: یعنی اس کی تعلیم کا حق ادا کرے اور اس سے صرف علوم شرعیہ کی فروعات و اصول کا احاطہ ہوگا۔ اس کے ساتھ عوارف قرآنیہ اور معارف فوقانیہ حاصل ہوں گے۔ ایسا شخص اپنے نفس کے لحاظ سے کامل اور غیر مکمل کرنے والا ہوگا۔ یہ مومنین میں مطلقاً افضل ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے کہ "من علم وعمل وعلم یدعی فی الملکوت عظیماً"۔ اس جنس میں اکمل فرد وہ صرف نبی ﷺ ہیں۔ پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ اس کا ادنیٰ جو کتاب کا فقیہ ہے۔ واللہ اعلم۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: لوگوں میں سیکھنے سکھانے کے اعتبار سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یعنی تم میں سے بہتر سیکھنے اور سکھانے کے اعتبار سے وہ ہے جس کے متعلق حدیث میں ہے۔ میں کہتا ہوں: تمام جو وارد ہوا ہے، وہ سیکھنے اور سکھانے میں داخل ہے۔ یہ وہ نہیں ہونا چاہئے کہ عمل ان دونوں سے خارج ہے۔ کیونکہ علم جب عمل کے لئے موجب نہیں ہوگا، تو شریعت

میں علم نہیں ہوگا۔ اس بات پر اجماع ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، وہ جاہل ہے۔ امام احمد سے کہا گیا علم کب تک ہے اور عمل کیسے؟

انہوں نے کہا: ہم نے علم عمل کے ساتھ حاصل کیا۔ پھر حدیث میں خطاب عام ہے صحابہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اور اگر ان کے ساتھ خاص کیا گیا ہے تو ان کے علاوہ دوسرے بالاولیٰ اس طریق کے حقدار ہیں۔ قرآن کا اطلاق اس کے کل اور بعض پر ہوتا ہے۔ دوسرا معنی صحیح ہے یہاں اس اعتبار سے کہ جس نے اس کے سیکھے اور سکھانے کو پایا، اگرچہ کوئی ایک آیت سیکھ لے، وہ اس سے بہتر ہے، جس نے وہ بھی نہیں سیکھی۔ اس کے بہتر ہونے کی وجہ حدیث صحیح سے معلوم ہوتی ہے: ”من قرأ القرآن فقد أدرج النبوة بين جنبیه غیر أنه لا یوحی الیه“۔ دوسری صحیح حدیث میں ہے: ”أهل القرآن هم أهل الله وخاصته“۔ حاصل کلام یہ ہے کہ بہترین کلام اللہ تعالیٰ کا ہے، تو نبیوں کے بعد بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے سکھاتے ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ تعلیم و تعلم کو اخلاص کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔ امام نووی فتاویٰ میں کہتے ہیں: قرآن پاک سیکھنے اور سکھانے کی جو مقدار فرض ہے، وہ فضیلت میں برابر ہے۔ اس فقہ کے ساتھ جس کو سیکھنا ضروری ہے اور جو واجب پرزائد ہے، اس میں فقہ افضل ہے (یعنی سمجھنا)۔

اس بحث میں جو امام نووی نے کہا ہے وہ محل نظر ہے قطع نظر اس کے کہ ان سے اس کا اطلاق درست نہیں ہوا۔ چونکہ قرآن سیکھنے کی جو مقدار واجب ہے، وہ علم یقینی ہے، اور فقہ علم ظنی ہے۔ تو دونوں فضیلت میں کیسے برابر ہیں۔ فقہ افضل ہے اس لئے کہ قرآن کے معنی ہیں جو اس کے مقابل نہیں۔ جی ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کے معنی کی معرفت اس کے لفظ کی معرفت سے افضل ہے۔ واجب حقدار سے مراد مثال کے طور پر سورہ فاتحہ ہے ان کے مذہب کے مطابق یہ رکن ہے، اور فقہ سے رکوع کے رکن ہونے کی معرفت حاصل ہوتی ہے، یہ کسی بھی وجہ سے برابر نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

قرآن پاک سیکھنے کی فضیلت

۲۱۰: وَعَنْ عُقَبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَنَحْنُ فِي الصَّفَةِ فَقَالَ أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ يَعُدَّ وَكُلَّ يَوْمٍ إِلَى بَطْحَانَ أَوْ الْعَقِيْقِي قِيَامِي بِنَا قَتَيْنٍ كَوْمًا وَيُنْ فِي غَيْرِ إِيْمٍ وَلَا قِطْعٍ رَحِمَ فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ كُنَّا نُحِبُّ ذَلِكَ فَقَالَ أَفَلَا يَعْذُوكُمُ إِلَى الْمَسْجِدِ فَيَعْلَمُ أَوْ يقرأ آيَتَيْنِ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ خَيْرٌ لَهُ مِنْ نَاقَتَيْنِ وَثَلَاثِ خَيْرٌ لَهُ مِنْ ثَلَاثٍ وَأَرْبَعٍ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَرْبَعٍ وَمِنْ أَعْدَادِهِنَّ مِنَ الْإِبِلِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۵۵۲/۱ حديث رقم (۲۵۱-۸۰۳)۔ وابدوداؤد في السنن ۱۴۹/۱ حديث رقم ۱۴۵۶۔

ترجمہ: ”حضرت عقبہ بن عامر سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کہا ہر آئے تو ہم ”صفہ“ پر بیٹھے تھے آپ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے کون یہ پسند کرتا ہے کہ وہ ہر روز بطحان یا عقیق کی طرف جائے اور وہاں سے بڑے کوہان والی دو اونٹنیاں بغیر کسی گناہ کے اور بغیر قطع رحمی کے لائے؟ ہم نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ! ہم سب اس بات کو پسند کرتے ہیں“ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو شخص مسجد میں جائے اور وہاں کتاب اللہ کی دو آیتیں کسی کو سکھائے یا خود پڑھے تو وہ اس کے لئے اس سے بدرجہا بہتر ہے تین آیتیں اس کے لئے تین اونٹنیوں سے اور چار آیتیں اس کے لئے چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ حاصل یہ کہ آیتوں کی تعداد اونٹنیوں کی تعداد سے بہتر ہے۔“ (مسلم)

تشریح: وعن عقبه بن عامر قال : خرج رسول الله ﷺ ونحن في الصفه : مختصر نہا یہ میں ہے کہ اہل صفہ

مہاجر بن نضر تھے جو مسجد کے سایہ میں بیٹھے تھے۔ قاموس میں ہے: اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے، جو آپ ﷺ کی مسجد کے چبوترے پر

رات گزارتے تھے۔ سیوطی نے بخاری پر جو حاشیہ لگا گیا ہے، اس میں ہے: ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ میں ان کی تعداد سو شمار کی ہے۔ صفحہ۔ اس جگہ کا نام جو مسجد کے آخر میں تھی، وہ غریب لوگوں کے ٹھہرنے کے لئے تھی، جن کی کوئی جائے پناہ اور خاندان نہ تھا۔ ابن حجر کہتے ہیں: یہ جگہ مسجد کے آخر میں تھی، جو ان فقیر صحابہ کے لئے تھی، جن کا خاندان نہ تھا، ان کی تعداد بڑھتی بڑھتی دو سو تک پہنچ گئی تھی، ان کو جہاد میں بھیجا جاتا۔ وہ قرآن کی تعلیم سیکھتے، معرفت کے لئے ان کا نام صوفیہ تھا، چونکہ ان کے اوصاف اہل صفہ کے اوصاف سے ملتے جلتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے۔

بعض کہتے ہیں: ان کا یہ نام صوف (اون) پہننے کی وجہ سے تھا، یا ان کے اسرار صاف ہونے کی وجہ سے یا ان کے معاملات پاک ہونے کی وجہ سے، چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے صف اول کے امیدوار تھے۔ یا پھر نیکیوں کی طرف لپکنے والے، اطاعت کے کاموں میں جلدی کرنے والے تھے، پھر کہا کہ جنہوں نے ان کی نسبت ”صفہ“ یا صوف کی طرف کی ہے تو یہ ان کی ظاہری حالت سے تعبیر ہے، چونکہ یہ وہ لوگ تھے، جنہوں نے دنیا کو چھوڑ دیا اور اپنے وطن سے نکل گئے، اپنے خاندانوں کو چھوڑا، اپنے لئے بھوک برداشت کی، بیٹوں کو قربان کیا، عریاں ہونا پڑا، انہوں نے صرف اپنے ستر ڈھانپنے اور تھوڑی سی خوراک ساتھ لی باقی دنیا کے سارے اسباب ترک کر دیے۔ وطن چھوڑنے کی وجہ سے ان کا نام غرباء اور کثرت سفر کی وجہ سے سیاحین ہے۔ کم کھانے کی وجہ سے جو عیب، املاک چھوڑنے کی وجہ سے فقراء بالوں کے بنے ہوئے کھر درے اور اون کے کپڑے پہننے کی وجہ سے ان کا نام صوفیہ تھا۔ یہ تمام صفات اہل صفہ کی تھیں، جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے وہ فقراء وغرباء اور مہاجرین تھے۔ وہ اپنے گھروں اور اموال سے نکل پڑے۔ ان کے اوصاف ابو ہریرہؓ اور فضالہ بن عبید نے بیان کیے ہیں۔ وہ بھوک سے گرے ہوتے تھے، لوگ ان کو مجنون سمجھتے تھے۔ ان کے لباس اون کے تھے، جب ان کو پیدہ آتایا بارش سے گیلے ہونے سے ”ضان“ (بھیڑ) کی بو آتی ہے۔

فقال ایکم یحب ان یغدو : صبح جانا۔ یہ صبح چلنے کا وقت ہوتا ہے۔ (کل یوم الی بطحان : ”باء“ کے ضمہ کے ساتھ اور ”طاء“ کے سکون کے ساتھ مدینہ کی ایک وادی کا نام ہے۔ اس کی وسعت کی وجہ سے اس کا یہ نام ہے۔ ابن اثیر نے اس کو ”باء“ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ (والعقیق : کہا گیا ہے کہ عقیق اصغر مراد ہے وہ مدینہ سے تین میل یا دو میل کے فاصلے پر ہے۔ دونوں کو خاص کیا گیا ہے چونکہ یہ ان جگہوں کے قریب ہیں، جہاں مدینہ میں اونٹ دوڑائے جاتے ہیں۔ ”او“ نوع کے لئے ہے لیکن جامع اصول میں ہے: او قال الی العقیق : یا عقیق کا کہنا، یہ راوی کی شک پر دلالت ہے۔ (فیاتی بناقتین کوماوین : تثنیہ ہے کوماوین کی، ہمزہ کو واو میں بدل کر یہ اصل میں ”کوم“ علو کے معنی میں ہے، یعنی بڑی اونٹنیاں۔ یہ عربوں کا پسندیدہ مال ہے۔ اور جو ابن حجر نے ذکر کیا ہے، کہ ان میں سے بعض کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے، اس کی کوئی توجیہ ظاہر نہیں، گویا کہ ان کو وہم ہوا، جو مختصر نہایتیہ میں واقع ہے: ”نحن یوم القیامۃ علی کوم“ فتح کے ساتھ بلند جگہوں کو کہتے ہیں۔ اس کی واحد ”کومۃ“ ہے، اس سے ”کومۃ من ذہب“ ہے۔ ومن طعام، یعنی ڈھیر۔ ان میں سے بعض نے ”کاف“ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا گیا ہے وہ ضمہ کے ساتھ اسم ہے ”کوم“ کا۔ فتح کے ساتھ اسم ایک دفعہ کے فعل کے لئے۔ ”ناقة کوماء“ سے مراد وہ اونٹنی جس کی بلند کوبان ہو۔

فی غیر اثم : چوری اور غصب شدہ موجب اثم کا نام اثم مجاز ہے۔ (ولا قطع رحم : اس میں جو واجب ہے۔ یہ تخصیص عموم کے بعد ہے اور فی سمیت کے لئے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَمَسَّكُمْ فِیْ مَا اَقْتَضَمُ﴾ [النور: ۱۴]، ﴿لَمَتْنِیْ فِیْہِ ط﴾ [یوسف: ۳۲] فقلنا یا رسول اللہ کلنا نحب ذلک : نون کے ساتھ، جامع اصول میں ہے کلنا یحب ذلک، ”یا“ کے ساتھ۔ یہ ان کے اختیار کے منافی ہے۔ انہوں نے ایسی چیز کو اختیار کیا جس کا (لفظاً) آخرت میں اجر نہیں، اسی لئے ان کو فقراء اور مسکین پر لوثا یا جائے گا،

تا کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کو تیار کریں۔ نبی ﷺ نے ان کو اسی وجہ سے بلند مرتبہ دینے کا ارادہ کیا، ان کی نسبت اولیاء عظام کی طرف کرنا باعث تعجب ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا طالب الدنیا لتبر تر کک الدنیا ابر۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”لو أن رجلا فی حجره دراهم یقسمها و آخر ید ذکر الله کان الذاکر لله افضل“۔ اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے، ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے۔ یہ بات ثابت ہے کہ صابر فقیر، غنی شاکر سے افضل ہے۔ عالم عابد سے بہتر ہے۔

جو ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ یہ اس کے برعکس نہیں (لیکن اجر ان کے لئے ہے) جو ورع اور زہد پر ہیں۔ انہوں نے اس بات کو پسند کیا ہے۔ میں اس سے زیادہ نہیں کہوں گا کہ یہ محبت زہد کے منافی نہیں ہے لیکن ورع سے افضل ہے اور دونوں کا جمع ہونا کفایت سے زیادہ ہے، یہ ظاہر سے معلوم ہوتا ہے۔

قال أفلا یغدو: یعنی ان کو چھوڑ کر صبح نہیں کروں گا۔ جو ابن حجرؒ نے عبارت مقدر نکالی ہے وہ عقل سے بہت دور ہے۔ یعنی اذا کنتم كذلك أفلا یغدو۔ (أحدکم الی المسجد فیعلم: تشدید کے ساتھ اور ایک صحیح نسخ میں تخفیف کے ساتھ ہے۔ أو یقرأ: رفع اور نصب کے ساتھ۔ میرک یرید کہتے ہیں: کہ یہ کلمہ اس بات کا تحمل ہے کہ عرض ہو یا نفی، لیکن اس میں ”فاء“ عرض ہونے کے لئے مانع ہے، پھر کہا: یہ قول کہ ”یعلم“ اور ”یقرأ“ پہلے کی تقدیر پر منصوب ہیں اور دوسرے پر مرفوع ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ دوسرے پر منصوب ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ نفی کے جواب میں ہے۔ پھر کہا: ”یعلم“ تعلیم سے ہے، مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں ہے۔

شرح میں ہے: جو جامع الاصول میں ہے وہ صحیح ہے: ”یعلم“ ”یا“ کے فتح اور عین کے سکون کے ساتھ ہے۔ او، یہ راوی کی طرف سے شک ہے۔ یہ اس وہم کو دفع کرنے کے لئے ہے، کہ یہ ”تعلیم“ سے ہے۔ ”او“ نوع کے لئے ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ طبریؒ نے ذکر کیا ہے۔ آیتین من کتاب اللہ: اس میں دو فعلوں کا تنازع ہے۔ خیر: مبتداء محذوف کی خبر ہے وہ ”ہما“ یا ”الغدو“ ہے۔

وثلاث: یعنی آیات۔ (خیر له من ثلاث: یعنی اونٹوں سے۔) (وأربع خیر له من أربع ومن أعدادهن: عدد کی جمع۔) (من الاصل: تعداد بیان کرنے کے لئے ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ”من أعدادهن“ کا متعلق ایک محذوف ہے، اس کی تقدیر یوں ہوگی: وأكثر من أربع آیات خیر من أعدادهن من الابل، فخمس آیات خیر من خمس ابل۔ اس پر باقی کو بھی قیاس کر لو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا بھی احتمال ہے مراد دو آیتیں دو اونٹیوں سے بہتر ہے۔ اسی طرح اونٹوں کی گنتی، تین آیات تین اونٹوں سے بہتر ہے، اسی طرح اونٹوں کی گنتی ہے۔ اسی طرح کا قول طبریؒ نے ذکر کیا ہے۔

اوپر جو ذکر کیا گیا وہ اس قول کے متعلق ہے و آیتین وثلاث وأربع، ان کی گنتی کا مجرور ہونا ان عددوں کی طرف لوٹتا ہے جو ان سے پہلے ہیں، اور مجرور ہیں، ابل أعدادهن سے بدل ہے، یا اس کے لئے بیان ہے: ”آیتان خیر من عدد کثیر من الابل“ اسی طرح تین اور چار آیات ہیں۔ چونکہ قرآن پاک کی منفعت اور اس کا نفع بخلاف اونٹ کے دنیا و آخرت میں بہت زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ آپ ﷺ نے باقیات کی ترغیب دلائی ہے۔ اور فانیات سے ڈرایا ہے، اس کو انہوں نے بات سمجھانے کے لئے تقریب اور تمثیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، وگرنہ ساری دنیا اللہ تعالیٰ کی ایک آیت کے مقابلے میں حقیر ہے (یعنی آیت کی پہچان) یا اس کے بدلے جو بلند و بالا درجات ہیں، جو اُسے بطور ثواب ملیں گے۔

اس جیسی مثال ہمارے شیخ ابو حسن بکری کے ساتھ پیش آچکی ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ان کے بعض تاجر ساتھیوں نے جدہ بندر گاہ پر مکہ سے آتے ہوئے انہیں ڈھونڈا، یہ وہ دن تھے جب دوسرے ملکوں کے لوگ بحری سفروں سے آتے تھے۔ ڈھونڈنے والے اس لیے ڈھونڈ رہے تھے تاکہ شیخ کے تشریف لانے سے ان کے تجارتی مال میں برکت ہو، اور شاید شیخ کی خدمت کرنے سے منافع کی مقدار بڑھ

جائے۔ شیخ نے انکار کیا، اور انہوں نے کچھ اہم معاملات کی وجہ سے نہ آنا چاہا۔ وہ ساتھی بات کو نہ سمجھے انہوں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ شیخ نے کہا: تمہارے اس سفر میں نفع کی کیا مقدار ہے؟ تم نے کیا نتیجہ اور اثر حاصل کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: احوال اور اموال کے مختلف ہونے کی وجہ سے نتیجہ بھی مختلف ہے۔ اکثر نفع ایک درہم سے دو درہم اور ایک سے دو گنا ہوا۔ شیخ نے مسکراتے ہوئے کہا: تم اتنے کم نفع کے لئے اتنی سخت محنت کرتے ہو، اور ہم حرم کی بدولت ملنے والی کئی گنا نیکیاں کیسے چھوڑ دیں؟ رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ایک ہزار نیکیاں ایک کے بدلے ملتی ہیں، یہ فرمان اقدس جاری ہو چکا ہے ﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ [البقرہ: ۶۰] ”ہر انسان نے اپنے اپنے گھاٹ کو پہچان لیا ہے“۔ اور ان کی حالتیں مختلف ہیں: ﴿كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۵۳] ”اور ہر گروہ جو وہ اس کے پاس ہے اس پر خوش ہے۔“ اور لوگ غفلت میں ہیں، جب وہ فوت ہو جائیں گے، تب اس خواب غفلت سے بیدار ہوں گے۔

قرآنی آیات کی فضیلت

۲۱۱۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَيُّ حُبِّ أَحَدِكُمْ إِذَا رَجَعَ إِلَىٰ أَهْلِهِ أَنْ يَجِدَ فِيهِ ثَلَاثَ خَلْفَاتٍ عِظَامٍ سِمَانٍ نَعْمَ قَالَ فَثَلَاثُ آيَاتٍ يَقْرَأُ بِهِنَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ خَيْرٌ لَهُ مِنْ ثَلَاثِ خَلْفَاتٍ عِظَامٍ سِمَانٍ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۵۵۲/۱ حدیث رقم (۲۵۰ - ۸۰۲)۔ و ابو ماجہ فی السنن ۱۲۴۳/۲ حدیث رقم ۳۷۸۲۔
والدارمی ۵۲۳/۲ حدیث رقم ۳۳۱۴۔ واحمد فی المسند ۳۹۷/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جب وہ لوٹ کر گھر پہنچے تو وہاں تین حاملہ اور فریبہ بڑی اونٹنیاں پائے؟“ ہم نے عرض کیا کہ ”جی ہاں“ آپ نے ارشاد فرمایا ”قرآن کی وہ تین آیتیں جو تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں پڑھتا ہے تو وہ اس کے لئے تین حاملہ اور بڑی موٹی اونٹیوں سے بہتر ہے۔“

تشریح: وعن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ ايحب احدكم اذا رجع الى اهله ان يجد فيه : يعني ان کے پاس لوٹنے میں۔ ایک قول ہے: اس کے راستے میں۔ ابن حجر کہتے ہیں: اہل سے مراد ان کے محلوں میں۔ (ثلاث خلفا: خلفۃ کی جمع فتح اور کسرہ کے ساتھ، عربوں میں کہاوت ہے: خلفت الناقة، یعنی اونٹنی حاملہ ہوگئی۔) عظام: بگیت اور ہیئت میں۔ (سبحان: کیفیت اور حالت میں۔) قلنا، نعم: یعنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق۔ یا جس طرح شریعت کا حکم ہو، تاکہ وہ آخرت میں ذریعہ (نجات) بن جائے۔ (قال: یعنی جب تم یہ کہو، اور غفلت کرو، اس سے جو اولیٰ ہے۔) (ثلاث آیات: یعنی کہ تم جان لو! تین آیات کی قراءت تین خلفات (اونٹیوں) سے بہتر ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں: اگر تم یہ پسند کرتے ہو، تو وہ تین آیات ہیں۔ اس کا عدم سبب مخفی نہیں، اسی لئے طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہنے میں تکلف کیا ہے کہ ”فا“ جو ”ثلاث“ میں ہے، یہ ایک محذوف شرط کی جزاء ہے، جو تم نے اپنے گمان سے معنی محبت کا مقرر کیا ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ پس تحقیق وہ صحیح ہے، اگر ان کے ساتھ فضیلت دی جائے، میں اس کو تمہارے لئے تین آیات کی قراءت سے ذکر کروں گا، کیونکہ یہ الباقیات والصالحات میں سے ہیں، باقی رہنے والی نیکیاں ہیں۔ (یقرأ بہن احدکم: طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ”باء“ زائدہ ہے، یا الصناق کے لئے ہے۔

فی صلاتہ: بیان اکل اور افضلیت کو مقید کرنے کے لئے ہے۔ (خیر له من ثلاث خلفات عظام سمان۔
طیبی بسید کہتے ہیں: بکرہ تعظیم اور تمیم کے لئے ہے۔

اَلْاٰتِکَ کَرِیْمَہُ وَاللّٰہُ اَجْرَہُ

۲۱۱۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبُرَّةِ وَالَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ حدیث رقم ۴۹۳۷۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۷۵۱۵ حدیث رقم ۲۹۰۴۔ وابن ماجہ ۱۲۴۲/۲ حدیث رقم ۳۷۷۹۔ والدارمی ۵۳۷/۲ حدیث رقم ۳۳۶۸۔ واحمد فی المسند ۴۸/۶۔

ترجمہ: ”سیدہ عائشہ سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ماہر قرآن ان فرشتوں کے ساتھ ہے جو لکھنے والے اور بزرگ و نیکو کار ہیں اور وہ شخص کہ جو قرآن کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور قرآن کی تلاوت اس کے لئے مشکل ہو تو اس کے لئے دوہرا ثواب ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن عائشہ رضی اللہ عنہا قالت: قال رسول اللہ ﷺ الماهر بالقرآن: یعنی باکمال، ہوشیار، اس سے مراد اچھے طریقے سے حفظ یا عمدہ طریقے سے لفظوں کی ہے، یادوں مراد ہیں، یا پھر وہ مراد لیا جائے، جو ان دونوں سے عام ہو۔ طیبی بسید کہتے ہیں: اس سے مراد کامل حفظ جس میں وہ قراءت کو موقوف نہیں کرتا، اور نہ اس پر اس کی مشقت ہے۔

بہر قراءت کرام کا وصف یوں بیان کرتے ہیں: ہر وہ شخص جس نے چنگی سے قرآن پاک حفظ کیا، اس کے پڑھنے کا حق اداء کیا، اس کے الفاظ کو تجوید سے آراستہ کیا، اس کے آغاز اور اختتام کو جانا، اس کی قراءت کی روایت کو یاد کیا، اس کی وجہ اعراب اور لغت کو جانا اس کے مشققات اور تصرفات کو سیکھا، ناخ منسوخ میں رسوخ حاصل کیا، تغیر و تاویل کا ایک اچھا خاصہ حصہ حاصل کیا، اور اپنی رائے سے بیان کرنے سے بچ گیا۔ عربی قیاسات سے دور رہا اور اس کام میں اُسے لمبا عرصہ بیت گیا۔ اس کا وقار عام ہو گیا، اور وہ عادل، بیدار مغز اور زہد و ورع والا تھا، دنیا سے منہ موڑ کر آخرت پر توجہ دینے والا، اللہ تعالیٰ کا قرب چاہنے والا۔ یہی وہ شخص ہے جو امام ہے، اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس پر اعتماد کیا جائے گا، اس کے اقوال قابل اقتداء اور افعال راہنما ہوں گے۔

مع السفارة: مافر کی جمع ہے، اس سے مراد رسول، جو لوگوں کی طرف اللہ تعالیٰ کے پیغامات کے ساتھ بھیجے گئے۔ ایک قول یہ ہے ”سفرہ“ سے مراد لکھنے والے فرشتے ہیں، یہ قول طیبی بسید نے بیان کیا ہے۔

میرک بسید کہتے ہیں: یعنی الکتبہ، یہ ”سَفَرٌ“ سے ”سافر“ کی جمع ہے۔ اس کی اصل کشف ہے، چونکہ کتاب جو لکھا جاتا ہے، اس کو اچھی طرح بیان اور واضح کرتی ہے۔ اس سے کہا گیا ہے ”للکتاب سفر“ سین کے کسرہ کے ساتھ، چونکہ وہ حقائق کو کھول کر بیان کرتی ہے، اور اسے روشنی حاصل ہوتی ہے، اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہوں نے لوح محفوظ کو اٹھا یا ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿بَابِئِی سَفَرَةَ کَرَامِ بَرَّة﴾ [عبس: ۱۵-۱۶] ان کا یہ نام اس لئے، کہ وہ کتاب الہی کو انبیاء کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ اُسے حرف بجز نقل کرتے تھے۔ ابن الملک کہتے ہیں: اس کا جامع معنی وحی کی حفاظت اور کتابوں کی امانت ہے۔ میرک بسید کہتے ہیں: ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد اصحاب رسول ﷺ ہیں، جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کو لکھا۔ کہا گیا ہے: ”سفرہ“ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بندوں کے نامہ اعمال لکھتے ہیں یا پھر یہ سفار سے بمعنی اصلاح ہے۔ اس وقت اس سے مراد فرشتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے احکامات لے کر نازل ہوتے ہیں، جن بندوں کو آفات اور نافرمانی سے بچانا اور ان کے دلوں میں خیر کا بہاؤ وغیرہ کرنے جیسی مصححتیں

شامل ہیں۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں: اس بات کا احتمال ہے کہ اس کا فرشتوں کے ساتھ ہونے سے مراد آخرت میں فرشتوں کی رفاقت میں درجات ہوں گے، ان فرشتوں کی یہ بھی صفت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اٹھانے والے ہوں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی طرح کام کرنے والے، ان (فرشتوں) کے طریقے پر چلنے والے جیسے وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں، اور مؤمنوں کی طرف لوٹاتے ہیں، اور جو چیز ان پر..... ہو جائے وہ اس کو کھول کر بیان کر دیتے ہیں، اسی طرح ماہر ہوتا ہے۔ (الکرام: کریم کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مکرم ہیں اور اپنے مولا کے پاس مقرب ہیں، اور وہ معصیت و مخالفت کی گندگی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ البدرة: ”بار“ کی جمع ہے، مراد نیکی کرنے والا۔ طیبیؒ کہتے ہیں: نیکی کے کاموں کو بجالانے والے اور یہ اطاعت ہے۔ یعنی آخرت میں فرشتوں کے ساتھ جن کا یہ وصف کہ جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اٹھانے والے ان کے ساتھ درجات میں ہوں گے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد وہ ان جیسا کام کرنے والے، حفاظت اور پہنچانے میں ان کے طریقے پر چلنے والے، یہ کام وہ مؤمنین کے لئے کرتے ہیں۔

والذی یقرأ القرآن ویستمتع فیہ: یعنی متردد ہے، اور اس پر اس کی زبان اکتی ہے۔ وہ عدم مہارت کی وجہ سے قراءت میں رکتا ہے، اس کے کلام میں لکنت ہے، مراد توقف ہے، اور زبان روانگی سے نہ چلے۔ وهو: یعنی قرآن کا حصول یا اس میں اس کا متردد ہونا۔ علیہ: یعنی اس پر پڑھنے والے پر۔ شاق: یعنی اس کو شدید مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاق جملہ حالیہ ہے۔ لہ اجران: قراءت کا اجر اور مشقت اٹھانے کا اجر۔ اس قراءت کے حصول پر (پڑھنے) ابھارنا ہے۔ یہ معنی نہیں ہے کہ جو ایک ایک کر پڑھتا ہے اس کا اجر ماہر سے زیادہ ہے بلکہ ”ماہر القرآن“ افضل ہے اور اس کا اجر ”مع السفارة“ کے ساتھ زیادہ ہے۔ اس کے لئے بہت زیادہ اجر ہیں، اللہ کے مقرب فرشتوں یا انبیاء و رسل یا صحابہ کرامؓ کے طریقے پر چلنے کی بدولت ہے۔

چاروں ائمہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

حسد صرف دو چیزوں میں جائز ہے

۲۱۱۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا حَسَدَ إِلَّا عَلَىٰ اثْنَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُومُ بِهِ أَنَاءَ اللَّيْلِ وَأَنَاءَ النَّهَارِ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَا لَا فَهُوَ يَنْفِقُ مِنْهُ أَنَاءَ اللَّيْلِ وَأَنَاءَ النَّهَارِ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۷۳/۹ - حدیث رقم ۵۰۲۵ - و مسلم فی صحیحہ ۵۵۸۱ - حدیث رقم (۲۶۶ - ۸۱۵)۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو قسم کے آدمیوں پر حسد (جائز) ہے ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نعمت عطا فرمائی اور وہ شخص دن رات اس قرآن میں مشغول رہتا ہے، اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو اور وہ اس کو رات دن خرچ کرتا ہو“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ لا حسد إلا على اثنين - (علی اثین: ایک قول یہ ہے

کہ اگر حسد جائز ہوتا تو ان دو پر ہوتا۔ (رجل: بدل ہونے کی وجہ سے مجبور ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں کی تقدیر کے ساتھ مرفوع ہے یا فہما یا أحدهما کے ساتھ۔) آتاه الله القرآن: یعنی اس پر احسان کیا، اس نے کما حقہ اس کو حفظ کیا۔ (فہو یقوم بہ: یعنی اس کی تلاوت، اور اچھی طرح حفظ کرنے کے ساتھ، اس کے احکام اور معانی یاد کرنے اور عمل کرنے کی وجہ سے، اس کے اوامر و نواہی ماننے کے ساتھ۔ یا اس کے ساتھ دعا مانگتا ہے، اور اس کے آداب کا لحاظ رکھتا ہے۔) آتاه اللیل و آتاه النهار: ان دونوں گھڑیوں میں۔ ”انہی“ کی جمع ہے، کسرہ کے ساتھ بروزن ”معی“۔ وانو، وانہی، نون کے سکون کے ساتھ، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ بہت وقت میں اس

سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ (ورجل: دو وجہوں کے ساتھ۔) آتاه اللہ ما لا: یعنی رزق حلال۔ (فہو ینفق: یعنی خیر کے کاموں کے لئے۔) آناء اللیل و آناء النهار: یعنی دونوں اوقات میں اعلانیہ اور پوشیدہ، شاید یہی نکتہ ہے کہ دونوں جگہوں پر ”لیل“ کو مقدم کیا ہے۔ میرک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: حسد کی دو قسمیں ہیں: حقیقی و مجازی۔ حقیقی یہ ہے کہ اپنے بھائی سے زوالِ نعمت کی خواہش کرنا۔ یہ نصوص صریحہ کے ساتھ حرام ہے اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے۔ جو مجازی ہے، وہ رشک ہے، یہ کہ جو غیر کے پاس نعمت ہے اس کا سوال کرنا، اپنے ساتھی سے ان نعمت کے زائل ہوئے بغیر۔ یعنی رشک ان دنیاوی امور میں مستحب ہے جو مباح ہیں، اگر وہ اطاعت والے ہوں، تو مستحب ہے، حدیث میں مراد یہ ہے کہ ان دو خصلتوں میں رشک جو قابلِ تعریف ہے جائز ہے یعنی ان دونوں اور جوان دونوں کے ہم مثل ہیں۔ اسی لئے مظہر نے کہا: کسی کے لئے لائق نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی طرح نعمت طلب کرے، مگر جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو، جیسے قرآن پاک کی تلاوت، صدقہ مال اور ان کے علاوہ جو نیکی کے دوسرے کام وغیرہ ہیں۔ یعنی بدنی عبادات اور مالی عبادات۔

۲۱۱۴: وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ الْأُتْرَجَةِ رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ التَّمْرَةِ لَا رِيحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلُوٌّ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِي لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ لَيْسَ لَهَا رِيحٌ وَطَعْمُهَا مَرٌّ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ الرَّيْحَانَةِ رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مَرٌّ (متفق علیہ) وَفِي رِوَايَةٍ الْمُوْمِنُ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَعْمَلُ بِهِ كَالْأُتْرَجَةِ وَالْمُوْمِنُ الَّذِي لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَعْمَلُ بِهِ كَالتَّمْرَةِ.

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۵۵/۹۔ حدیث رقم ۵۴۲۷۔ و مسلم فی صحیحہ ۵۴۹/۱۔ حدیث رقم (۲۴۳۔ ۷۹۷) و ابوداؤد فی السنن ۱۶۶/۵۔ حدیث رقم ۴۸۲۹۔ و اخرجه الترمذی ۱۳۸/۵۔ حدیث رقم ۲۸۶۵۔ و النسائی ۱۲۴/۸۔ حدیث رقم ۵۰۲۸۔ و ابن ماجہ ۷۷/۱۔ حدیث رقم ۲۱۴۔ و الدارمی ۵۳۵/۲۔ حدیث رقم ۳۲۶۳۔ و احمد فی المسند ۳۹۷/۴۔

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو مسلمان قرآن کریم پڑھتا ہے اس کی مثال سنگترے کی سی ہے کہ اسکی خوشبو بھی اچھی اور اس کا مزہ بھی اچھا اور جو مسلمان قرآن کریم نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ اس میں خوشبو نہیں ہوتی البتہ اس کا مزہ شیریں ہوتا ہے اور وہ منافق جو قرآن کریم نہیں پڑھتا اس کی مثال اندرائن کے پھل کی سی ہے جس میں خوشبو بھی نہیں اور ذائقہ بھی نہایت کڑوا ہے۔“ (بخاری و مسلم) ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ وہ مسلمان جو قرآن کریم پڑھتا بھی ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے تو اس کی مثال سنگترے کی سی ہے اور وہ مسلمان جو قرآن پڑھتا تو نہیں مگر اس پر عمل کرتا ہے اس کی مثال کھجور کی سی ہے۔“

تشریح: وعن أبي موسى قال: قال رسول الله ﷺ: مثل المؤمن يقرأ القرآن: جس طرح اس کے شایان شان ہے۔ اس کو فعل مضارع کے ساتھ بار بار (مکرر) افادہ کے لئے تعبیر کیا گیا ہے تاکہ وہ اس پر ہمیشگی کرے، اور اس کی عادت اس شخص جیسی ہو جائے جو مہمان نوازی کرتا ہے، حرام سے بچتا ہے، اور یتیم کو دیتا ہے۔

مثل الا ترجة: ہمزہ کے ضمہ ”تاء“ کے سکون، راء کے ضمہ اور جنیم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ بخاری کی روایت میں نون ساکن اور راء و جنیم کے درمیان تنوین ہے۔ قاموس میں ”الانترج الترجة“ بمعنی ترنج، ترنجة کے ہے (سنگترہ)، یہ ایک پھل ہے اور عربوں کے ہاں بہت پسندیدہ ہے اور یہ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے۔ صفراء فاقع لونہا تسر الناظرین۔

ریحہا طیب، و طعمہا طیب: ابن الملک کہتے ہیں: یہ مفید ہے، خوش بودار ہے، معدے کو صاف کرتا ہے، اور ہاضمے کو قوت

دیتا ہے۔ کتب طب میں اس کے بہت زیادہ فوائد ذکر کیے گئے ہیں۔ اسی طرح مؤمن قاری کی مثال ہے، جو باذوق ہوتا ہے اس لیے کہ اُس کے دل میں ایمان اور ہوتا ہے، لوگ اس کی قراءت سے استراحت پاتے ہیں، اور سننے کی وجہ سے ثواب کماتے ہیں، اور اس سے قرآن پاک سیکھتے ہیں۔ (مثل المؤمن الذی لا یقرأ القرآن مثل النمرۃ لا یریح لها وطعمها حلو، و مثل المنافق لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلۃ لیس لها یریح وطعمها مر، و مثل المنافق الذی یقرأ القرآن مثل الريحانة یریحها طیب و طعمها مر: طیبیٰ کہتے ہیں: حقیقت میں تمثیل کا وصف معنی معقول کے ساتھ موصوف ہے، اس کی پوشیدگی صرف محسوس مشاہد کی تصور کے ساتھ ظاہر ہو سکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا کلام جس کی تاثیر بندے کے ظاہر و باطن پر ہے، بندے اس میں متفاوت ہیں۔ ان میں سے بعض جن کے لیے اس تاثیر سے وافر حصہ ہے، وہ مؤمن قاری ہے۔ بعض جن کے لئے کوئی حصہ نہیں، وہ حقیقی منافق ہے۔ بعض کے لئے ظاہری تاثیر ہے باطنی نہیں جس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے یہ وہ مؤمن ہے جو اس کی قراءت نہیں کرتا۔ ان معانی کا ظہور اور محسوسات کے ساتھ ان کا تصور ہے جو حدیث میں مذکور ہے، جو اس کی موافقت نہیں پاتا، وہ ملامت کے قریب ہے اور نہ وہ اس اجماع میں شامل ہے۔ مشبہ اور مشبہ بہ کا وارد و حاصل کلام پر ہے۔

(۱) چونکہ لوگ یا تو مؤمن ہیں یا غیر مؤمن۔ (۲) یا منافق ہیں یا ان سے ملحق بہ۔ پہلا طریقہ (مؤمن) یا تو اس کی قراءت پر پیشگی کرتا ہے یا نہیں۔ اسی پر مشبہ بہ کے نتیجے کو قیاس کرو۔

اور مذکورات میں وجہ شبہ دو محسوس امر میں تنازع ہے، وہ ہیں طعم و روح اور وہ الگ الگ نہیں ہیں۔ جیسا کہ امر و القیس کا شعر ہے:

كأن قلوب الطیر رطبیا و یأبسا ☆ لدی و کرھا العناب و الحشف البالی

خشکی اور تری کے اعتبار سے پرندوں کے دل ان عنابوں اور لالی کھجوروں کی طرح ہیں جو ان کے گھونسلے کے پاس ہیں۔ (وفی روایۃ المؤمن الذی یقرأ القرآن و یعمل بہ کالآ ترجة : کہا گیا ہے کہ اس گھر میں جن داخل نہیں ہوتا، جس میں سگترہ ہو۔ اس سے قاری قرآن کی مشابہت کی حقیقت اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ ابن رومی کہتے ہیں:

کل الخلال التی فیکم محاسنکم
تشابہت فیکم الأخلاق و الحلق
کانکم شجر الأترج طاب معاً
حملاً و نوراً و طاب العود و الورق

”ہر وہ عادت جو تمہارے اندر اچھے اخلاق کا باعث ہو تو تمہاری عادات اور اخلاق میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ گویا کہ تم سگترے کے ایسے درخت ہو جو پھل میں اور روشنی میں بھی عمدہ ہے اور ٹہنیوں میں پتوں میں بھی عمدہ ہے۔“

(والمؤمن الذی لا یقرأ القرآن و یعمل بہ کالنمرۃ).

۲۱۱۵: وَعَنْ عَمْرِ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ

آخَرِينَ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۵۵۹/۱ حدیث رقم (۲۶۹ - ۸۱۷)۔ وابن ماجہ ۹۷/۱ حدیث رقم ۲۱۸۔ والدارمی ۵۳۶/۲

حایت رقم ۳۳۶۵۔

ترجمہ: ”حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ کتنے لوگوں

کو اس کتاب کی بدولت بلند کرتا ہے اور اس کی بدولت کتنے لوگوں کو پست کرتا ہے۔“ (مسلم)

تشریح: وعن عمر بن الخطاب قال: قال رسول الله ﷺ: ان الله يرفع بهذا الكتاب: یعنی اس پر ایمان، اس کی عزت و تکریم اور عمل کرنے کی بدولت۔ کتاب سے مراد قرآن پاک جو اپنے شرف میں مکمل، دلیل کے ظہور میں بلیغ ہے، اس سے پہلے نازل شدہ آسمانی کتابوں جو رسل پر نازل ہوئیں، اس بلیغ کے درجہ کو نہیں پہنچیں۔ اقواما: یعنی دنیا اور آخرت میں لوگوں کے بہت زیادہ درجات ہیں، وہ دنیا میں انہیں حیات طیبہ کے ساتھ نوازتا ہے، اور آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ ملا دے گا جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام کیا ہے۔ (ویضع بہ آخرین: وہ لوگ جو اس کے برعکس اور خلاف ہیں وہ انہیں اکمل لوگوں میں سے اٹھا کر اسفل لوگوں میں کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾ [البقرة: ۲۶] اس کے محبت کرنے والوں کے لیے پانی ہے اور اس سے اعراض کرنے والوں کے لئے خون ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَزَّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ الْاِحْسَارًا﴾ [الاسراء: ۸۲]۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: جس نے اس کو پڑھا اور اس پر عمل کیا خالص اللہ تعالیٰ کے لئے، اللہ تعالیٰ اس شخص کو اونچا کر دے گا۔ جس نے ریا کاری کے لئے پڑھا، اللہ تعالیٰ اُسے اسفل لوگوں میں کر دے گا۔

بغوی نے معالم میں اپنی اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نافع بن حارث عمر بن خطاب سے (عسفان میں) ملے۔ حضرت عمرؓ نے مکہ والوں پر عامل مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: تو نے اہل مکہ پر کس کو خلیفہ بنایا، اس نے کہا: ابن ابزی کو۔ پوچھا کون ابن ابزی؟ اس نے کہا ہمارے موالی میں سے ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: تو نے ان پر ایک موالی (آزاد کردہ غلام) کو خلیفہ بنا دیا۔ اس نے جواب دیا: وہ آدمی قاری قرآن اور علم فرائض کا عالم اور قاضی ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہمارے نبی ﷺ کا فرمان ہے: ”ان الله تعالى يرفع بهذا القرآن أقواما ويضع به آخرين“۔

فرشتوں کا قرآن سننا

۲۱۱۶: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ أُسَيْدَ بْنَ حُضَيْرٍ قَالَ بَيْنَمَا هُوَ يَقْرَأُ بِاللَّيْلِ سُورَةَ الْبَقَرَةِ وَقَرَسُهُ مَرْبُوطَةٌ عِنْدَهُ إِذَا جَالَتِ الْفُرْسُ فَسَكَّتْ فَسَكَّتْ فَقَرَأَ فَجَالَتْ فَسَكَّتْ فَسَكَّتْ ثُمَّ قَرَأَ فَجَالَتِ الْفُرْسُ فَأَنْصَرَفَ وَكَانَ ابْنُهُ يَحْيَى قَرِيبًا مِنْهَا فَاشْفَقَ أَنْ تُصِيبَهُ وَلَمَّا آخَرَهُ رَفَعَ رَأْسَهُ إِلَى السَّمَاءِ فَإِذَا مِثْلُ الظَّلَّةِ فِيهَا أَمْثَالُ الْمَصَابِيحِ فَلَمَّا أَصْبَحَ حَدَّثَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ اِفْرَأْنَا ابْنَ حُضَيْرٍ قَالَ فَاشْفَقْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنْ تَطَأَ يَحْيَى وَكَانَ مِنْهَا قَرِيبًا فَأَنْصَرَفْتُ إِلَيْهِ وَرَفَعْتُ رَأْسِي إِلَى السَّمَاءِ فَإِذَا مِثْلُ الظَّلَّةِ فِيهَا أَمْثَالُ الْمَصَابِيحِ فَخَرَجْتُ حَتَّى لَا أَرَاهَا قَالَ وَتَدْرِي مَا ذَاكَ قَالَ لَا قَالَ تِلْكَ الْمَلَائِكَةُ دَنَّتْ بِصَوْتِكَ وَلَوْ قَرَأْتَ لَا صَبَحَتْ يَنْظُرُ النَّاسُ إِلَيْهَا لَا تَتَوَارَى مِنْهُمْ. متفق عليه ولللفظ للبخارى وفي مسلم عَرَجَتْ فِي الْجَوِّ بَدَلًا فَخَرَجَتْ عَلَى صِبْغَةِ الْمَتَكَلِّمِ -

اخرجه البخارى فى صحيحه ۶۳/۹ حديث رقم ۵۰۱۸۔ و مسلم فى صحيحه ۵۴۸/۱ حديث رقم (۲۴۲)۔ (۷۹۶)۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدریؓ حضرت اسید ابن حضیرؓ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ رات کو سورہ بقرہ پڑھ رہے تھے ان کا گھوڑا ان کے قریب ہی بندھا تھا دفعتاً گھوڑا اچھل کود کرنے لگا چنانچہ انہوں نے پڑھنا بند کر دیا

گھوڑے نے بھی اچھل کود بند کر دی۔ پھر پڑھنا شروع کر دیا، گھوڑے نے پھر اچھل کود شروع کر دی وہ پھر رک گئے تو گھوڑا بھی رک گیا، پھر جب انہوں نے پڑھنا شروع کیا تو گھوڑے نے اچھل کود شروع کی انہیں احساس ہوا کہ گھوڑے کی اچھل کود یوں ہی نہیں ہے بلکہ اس کی خاص وجہ ہے چنانچہ انہوں نے پڑھنا موقوف کر دیا ان کا بچہ جس کا نام بیچی تھا گھوڑے کے قریب ہی تھا انہیں خوف ہوا کہ کہیں گھوڑا اس بچہ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دے جب انہوں نے بچہ کو وہاں سے ہٹایا اور ان کی نظر آسمان کی طرف اٹھی تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ بادل کی مانند کوئی چیز ہے، جس میں تیز چراغ جل رہے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو اسیدؓ نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے روبرو بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ابن حنیض! تم پڑھتے رہتے“ اسید نے عرض کیا ”یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ کہیں گھوڑا بیچی کو نہ روند دے کیونکہ بیچی گھوڑے کے قریب ہی تھا چنانچہ جب میں بیچی کی طرف پھرا اور اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی چیز بادل کی مانند ہے جس میں چراغوں کی مثل کوئی چیز ہے پھر میں باہر نکلا مگر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا ”جانتے ہو وہ کیا تھا؟“ انہوں نے کہا کہ ”نہیں! فرمایا“ وہ فرشتے تھے جو تمہاری قراءت کی آواز سننے کے لئے قریب آگئے تھے اگر تم اسی طرح پڑھتے رہتے تو اسی طرح صبح ہو جاتی اور لوگ فرشتوں کو دیکھتے اور وہ فرشتے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتے“ اس روایت کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے مگر الفاظ بخاری کے ہیں ”مسلم کی روایت میں فخر جت کے بجائے عَرَجَتْ فِي الْجَوِّ (یعنی وہ چیز زمین و آسمان کے درمیان ہوا میں چڑھ گئی) کے الفاظ ہیں۔“

تشریح: وعن أبي سعيد الخدري، أن أسيد بن حنيز: تصغير کے ساتھ (دونوں تصغیر میں) اور ”حاء“ کے ساتھ۔

(قال: اپنے بارے میں بتا رہے ہیں۔) (بینما هو: یعنی اُسید۔) (بقرأ من الليل: یعنی رات کی بعض گھڑیوں میں۔) (سورة البقرة، و فرسہ مربوطہ عندہ: کہا گیا ہے: ”مربوطہ“ میں تائے تانیث ”ذابہ“ کی وجہ سے ہے درست بات یہ ہے کہ ”فرس“ کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں پر ہے۔ اسی طرح جوہری نے کہا ہے۔ اور جملہ حالیہ ہے۔) (اذ: ظرف ہے یقرأ کی وجہ سے۔) (جالت الفرس: گھومنا پھرنا شروع ہوا مضطرب اور حیران و پریشان کی طرح جو کسی خوف سے ہو۔ فسکت: یعنی اُسید قراءت سے رک گئے، تا کہ اس کے اچھلنے کودنے کا سبب جان سکیں۔ فسكنت: یعنی گھوڑا، اس حرکت سے رک گیا۔ انہوں نے سمجھا شاید اچھلنے کودنے کا سبب اتفاقی ہے۔ فقرا فجالت فسکت: یعنی اسی طرح۔) (فسكنت: انہوں نے سمجھا کہ کوئی معاملہ ہے۔ ثم قرا: پھر اُسید نے ارادہ کیا، کہ وہ معاملے کی حقیقت کو دیکھیں، کچھ دیر رکنے کے بعد پھر پڑھنا شروع کیا۔ فجالت الفرس: انہوں نے سمجھ لیا، کہ کوئی معاملہ ہے جس نے گھوڑے کو اس کی جگہ سے پریشان کر دیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ گھوڑے نے اس وجہ سے حرکت کی کہ فرشتے قرآن پاک سننے کے لئے نازل ہو رہے تھے وہ ان سے خوف کی وجہ سے ڈر رہا تھا۔ جب وہ آسمان کی طرف چڑھنا شروع کر دیتے تو وہ ساکن ہو جاتا، یا ان کی عدم ظہور کی وجہ سے یا گھوڑا تلاوت قرآن کی قراءت کے ذائقہ سے حرکت کرتا، جب اُسید رضی اللہ عنہ قراءت چھوڑ دیتے، تو وہ بھی یہ ذوق ختم ہونے کی وجہ سے اچھلنا کودنا چھوڑ دیتا۔ فانصرف: یعنی اُسید نماز یا قراءت سے فارغ ہوئے۔ فاشفق: یعنی اُسید ڈرے۔ ان تصبیہ اس کے اچھلنے کودنے کی وجہ سے اپنے بیٹے کے بارے میں ڈرے۔ وہ اپنے بیٹے کو گھوڑے سے دور ہٹانے کے لئے چلے۔ ولما آخرہ: یعنی اپنے بیٹے کی کو گھوڑے کے قریب تھا۔ رفع رأسه الى السماء فاذا: ہی، مفاجات کے لئے ہے۔ مثل انطلت: ضمہ کے ساتھ جس کے ساتھ آدمی سورج اور بارش وغیرہ سے بچتا ہے۔ یعنی کوئی چیز بادل کی طرح زمین اور آسمان کے درمیان ان کے سر پر تھی۔ فیہا: یعنی اس چھتری (سائبان) میں۔ أمثال المصابيح: نورانی لطیف اجسام۔ فلما أصبح: یعنی اُسید نے جب صبح کی۔ حدث

النبی ﷺ: وہ سارا قصہ بیان کیا جو انہوں نے دیکھا، اور گھبراہٹ ان پر طاری ہوئی۔ فقال: یعنی نبی ﷺ نے اس کی گھبراہٹ کو زائل کیا اور انہیں بلند چیز کے بارے میں بتلایا، اور ان کی طمانینیت میں اضافہ کیا۔

اقرا یا ابن حَضِیرِ اِقْرَا یا ابن حَضِیرِ : دومرتبہ کہا، تین مرتبہ نہیں جو کہ ابن حجر کی شرح میں تاکید کے لئے ہے، اُس پر دلیل ہے۔ انہوں نے قراءت پر دوام یعنی اس عجیب حالت پر سمجھاتے ہوئے جس کا اس جیسا سبب ہو کہ وہ اس کو نہ چھوڑے، اگر مستقبل میں ایسا واقعہ ہو تو بلکہ اس حالت کو جاری رکھے، اور تلاوت قرآن سے مستفید ہو۔ طبی ہینید کہتے ہیں: لفظ ”اقرا“ حال میں قراءت کے امر پر متقاضی ہے، اس کا معنی تخصیص کا ہے، اور زائد ماضی میں طلب میں اضافہ کرتا ہے، گویا کہ وہ جب اُسے وہ عجیب و غریب حالت دوبارہ ملے، تو آپ ﷺ نے اُس کو حکم دیے ہوئے اس پر ترغیب دی ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے کہا، تو اور زیادہ کیوں نہ کیا۔ اسی لئے انکا قول ہے۔ قال فأشفقت: ایک نسخہ میں ”أشفقت“۔ یا رسول الله! أن تطلأ..... یعنی میں ڈر گیا کہ اگر یہ اسی حالت میں رہا تو کہیں یحییٰ کو نہ روند دے، جو اُس کے قریب ہے۔ وکان منها قریباً فانصرفت: یعنی قراءت سے۔ الیہ: یعنی یحییٰ پر رحم کرتے ہوئے۔ ورفعت رأسی الی السماء، فاذا مثل الظللة فیها أمثال المصابیح: یہ اس حالت کرنے یا چھوڑنے کے لحاظ سے تھی۔ واللہ اعلم۔ جب اُس نے آپ ﷺ سے قصہ کا بیان شروع کیا اور قراءت کے وقت گھوڑے کا ہلنا جلنا جو تھا آپ ﷺ نے فرمایا: ”اقرا“ یعنی قراءت میں اور اضافہ کر، تو اُسید نے ترک قراءت کا عذر بیان کیا۔ (فخرجت: یعنی اپنے گھر سے نکلا۔ حتی راها: یعنی اُس فزع (گھبراہٹ) کے بعد ان چراغوں کو۔

قال: یعنی نبی ﷺ (متدری ما ذاك: یعنی تو جانتا ہے، کون سی چیز دیکھی ہے؟ قال: لا قال تلك الملائكة دنت: یعنی نازل ہوئے اور قریب ہوئے۔ (لصوتك: یعنی قراءت کے ساتھ۔ (ولو قراءت: یعنی صبح تک۔ لأصاحت: یعنی فرشتے۔ ينظر الناس إليها لا تتواری منهم: یعنی غائب نہ ہوتے، اور فرشتے لوگوں سے مخفی نہ رہتے۔ مذکورہ تشبیہ کی وجہ کہ فرشتوں نے سماع قرآن پر ازدحام کیا، گویا کہ وہ اسی طرح اس کے اور آسمان کے درمیان ہو گئے گویا کہ کوئی لنگی ہوئی ہے۔ یہ مصابیح ان کے چہرے تھے۔ کوئی مانع نہیں کہ نورانی اجسام جب ازدحام (بھیڑ) کرتے ہیں، تو وہ سائبان کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ایسے نہیں ان میں سے بعض کا چہرہ بعض سے روشن ہوتا ہے، جیسے ابن حجر نے بیان کیا ہے۔

وفی مسلم عرجت: یعنی فرشتے اوپر چڑھے اور بلند ہو گئے، اُس قراءت کے انقطاع کی وجہ سے جس کو وہ سننے کے لئے نازل ہوئے تھے۔ فی الجوّ: جیم کے فتح واؤ کی تشدید کے ساتھ، یعنی زمین و آسمان کے درمیان ہوا میں۔ بدل فخرجت: یعنی اس کا کلمہ کی جگہ یہ لفظ۔ علی صیغۃ المتکلم: یعنی اس میں اور صیغۃ غائب پر اُس میں۔

تلاوت قرآن سے سیکنہ نازل ہوتی ہے

۳۱۱: وَعَنِ الْبُرَاءِ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يَقْرَأُ سُورَةَ الْكَهْفِ وَالِی جَانِبِهِ حِصَانٌ مَرْبُوطٌ بِشَطْنَيْنِ فَنَعَسَتْهُ سَحَابَةٌ فَحَمَلَتْ تَدْنُو وَتَدْنُو وَجَعَلَ قَرَسُهُ يَنْفِرُ فَلَمَّا أَصْبَحَ آتَى النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ فَقَالَ تِلْكَ السَّكِينَةُ تَنْزَلَتْ بِالْقُرْآنِ - (متفق علیہ)

باخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۷۱۹۔ حدیث رقم ۵۰۱۱۔ ومسلم فی صحیحہ ۵۴۷۱/۱ حدیث رقم (۲۴۰۔ ۷۹۵) والترمذی فی السنن ۱/۴۸۱/۵ حدیث رقم ۲۷۷۵۔ واحمد فی المسند ۴/۲۸۱۔

ترجمہ: ”حضرت براء سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص سورہ کہف کی تلاوت کر رہا تھا اس کی ایک جانب

میں اس کا گھوڑا اور سیبوں سے بندھا تھا کہ اسے ایک ابر کے ٹکڑے نے ڈھا تک لیا وہ قریب سے قریب ہونے لگا یہاں تک کہ گھوڑے نے اچھل کود شروع کی جب صبح ہوئی تو وہ آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے ماجرا کہہ سنایا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”وہ سیکنہ تھی جو قرآن پڑھنے کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وغن البراء قال : كان رجل يقرأ سورة الكهف والى جانبه : یعنی دائیں طرف یا بائیں طرف۔ (حصان) : کسرہ کے ساتھ یہ اعلیٰ گھوڑا ہے، اور مذکر ہے یہ ”التحصن یا التحصين“ سے ہے۔ چونکہ وہ عرب اسے اپنے پانی پجانے کی بچاتے تھے وہ اعلیٰ گھوڑے پر سواری کرتے تھے، پھر اس کا استعمال کثرت سے ہونے لگا، یہاں تک کہ انہوں نے ہر مذکر گھوڑے کو یہ کہنا شروع کر دیا۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔ (مربوط : یعنی وہ گھوڑا۔) (بشطنین : ”الشطن“ دونوں فتح کے ساتھ لمبی اور سخت رسی، یہ اس گھوڑے کی قوت اور طاقت پر تعریف ہے۔) (فتغشته : یعنی آدمی۔) (سحابہ : یعنی پردہ چھتری جیسے سر پر سائبان ہوتا ہے۔) (فجعلت : یعنی سائبان شروع ہوا۔) (تدنو : یعنی قریب تھوڑا سا۔)

وتدنو : یعنی بلندی سے پستی کی طرف۔ (وجعل : یعنی شَرَعَ۔) (فرسہ ينفَرُ : ”فاء“ کے کسرہ کے ساتھ یہ ”نفور“ سے ہے یعنی وہ زیادہ مشابہ ہے، بخاری کی روایت میں ينفَرُ ”قاف اور زاء“ کے ساتھ یعنی اس سے ڈرنے لگا۔) (فلما اصبح اتى النسي ﷺ فذكر ذلك له فقال تلك : یعنی وہ سائبان۔) (السكينة : یعنی سکون اور اطمینان، جس کی طرف دل اطمینان پکڑتا ہے اور عرب ختم ہو جاتا ہے۔) طیبی بوسید کہتے ہیں: مؤمن کی طمانینت بڑھ جاتی ہے جب ان جیسی نشانیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد رحمت ہے۔ ”قبيل“ وقار مراد ہے۔ کہا گیا ہے کہ فرشتوں کی رحمت۔ ابن حجر کہتے ہیں: فرشتے۔ اسی سے سکینت ہے جس کا نطق حضرت عمرؓ کی زبان سے ہے۔ (تنزلت : یعنی اس کا نزول ظاہر ہونا۔) (بالقرآن : یعنی اس کے سبب کی بدولت۔)

۲۱۱۸: وَعَنْ أَبِي سَعِيدِ بْنِ الْمُعَلَّى قَالَ كُنْتُ أُصَلِّي فِي الْمَسْجِدِ فَدَعَانِي النَّبِيُّ ﷺ فَلَمَّ أُجِبُهُ ثُمَّ آتَيْتُهُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي كُنْتُ أُصَلِّي قَالَ أَلَمْ يَقُلِ اللَّهُ اسْتَجِبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ ثُمَّ قَالَ أَلَا أَعْلَمُكُمْ أَعْظَمَ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَأَخَذَ بِيَدِي فَلَمَّا أَرَدْنَا أَنْ نَخْرُجَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّكَ قُلْتَ لِأَعْلَمَنَّكَ أَعْظَمَ سُورَةٍ مِنَ الْقُرْآنِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيْتُهُ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۴۱۹۔ حدیث رقم ۵۰۰۶۔ والترمذی فی السنن ۱۴۳/۵ حدیث رقم ۲۸۷۵ والنسائی ۱۳۹۱/۴ حدیث رقم ۹۱۳۔ واحمد فی المسند ۲۱۱/۴۔

ترجمہ: ”حضرت سعید ابن معلی سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے بلایا اس وقت میں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ! میں نماز پڑھ رہا تھا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اللہ اور رسول کو جواب دو جب کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں بلائیں اور ان کے حکم کی اطاعت کرو؟“ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ”تیرے مسجد سے نکلنے سے پہلے کیا میں تجھے قرآن کی ایک بڑی سورت نہ سکھا دوں؟“ پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور جب ہم مسجد سے نکلنے کو ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ کیا میں تمہیں قرآن کی ایک بڑی سورت نہ سکھاؤں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا ”وہ سورت الحمد للہ رب العالمین ہے وہ سات آیتیں ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں

اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا فرمایا گیا ہے“

تشریح: وعن ابي سعيد بن المعلى: لام مفتوحه كى تشديدكے ساتھ۔ (قال كنت اصلى فى المسجد :ابن الملك كبتے ہیں: ان کا قصہ اس طرح ہے کہ انہوں نے کہا میں ایک دن مسجد کے پاس سے گزرا اور رسول اللہ ﷺ منبر پر تھے، میں نے سوچا کوئی نیا حکم ہے۔ میں بیٹھ گیا۔ رسول اللہ نے پڑھا ﴿قد نرى تقلب وجهك فى السماء﴾ [البقرة: ۱۷۴] میں نے اپنے ساتھی سے کہا: اوہم رسول اللہ ﷺ کے منبر سے اترنے سے پہلے پہلے دو رکعتیں ادا کریں۔ ہم پہلے تھے جنہوں نے نماز پڑھی، میں نماز پڑھ رہا تھا۔

فدعانى النبى ﷺ فلم اوجه: یہاں تک کہ میں نے نماز پڑھی، جیسا کہ دوسرے نسخہ میں ہے۔ (ثم أتيتہ فقلت: لعني عذر پیش کرتے ہوئے۔ (يا رسول الله! انى كنت اصلى قال الم يقل الله استجبوا لله وللرسول اذا دعاكم) [الانفال: ۲۳] ضمیر واحد لائى گئی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی دعوت رسول اللہ ﷺ سے ہی سنی جاتی ہے۔ صاحب المدارک کہتے ہیں: استجابہ سے مراد اطاعت و فرمان برداری اور دعوت سے مراد نبوت اور لوگوں کو ترغیب دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿لما يحييكم﴾ [الانفال: ۲۳] یعنی دین اور شریعت کے علوم، چونکہ علم زندگی ہے جیسا کہ جہالت موت ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

لا تعجبن الجهول حلتہ ☆ فذاك ميت وثوبه كفن

”تم جاہل آدمی کی میت کو دیکھ کر تعجب میں نہ پڑو، وہ خود مردہ ہے اور اس کا جوڑا اس کا کفن ہے۔“

طبی بیہودہ کہتے ہیں: حدیث دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات کا جواب دینے سے نماز باطل نہیں ہوتی جیسا کہ آپ ﷺ کا یہ خطاب ”السلام عليك ايها النبى“ اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ بیضاوی کہتے ہیں: اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ آپ ﷺ کا بلانا نماز کو ختم نہیں کرتا، چونکہ نماز اسی طرح ایک قسم کی اجابت ہے۔ ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کا بلانا حکم جس میں تاخیر کا احتمال نہیں ہے۔ نمازی کے لئے ضروری ہے کہ وہ نماز کو ختم کر دے، یہاں تک کہ اس کے مطابق حدیث کا ظاہر ہے۔ حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ پکارا جواب مطلقاً واجب ہے آپ ﷺ کے حق میں۔ جس طرح کہ آیت کے مطلق سے سمجھا رہا ہے۔ اس نماز کے بطلان اور نہ ہونے پر دلالت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بطلان ادلہ کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم

ثم قال، الا اعلمك اعظم سورة: یعنی افضل۔ کہا گیا ہے کہ جو اجر میں بہت زیادہ ہو یہ پہلے قول کی طرح ہے۔ (فى القرآن: کہا گیا ہے کہ ”سور“ سے مراد وہ منزل جس کی بنیاد ہو، اسی سے قرآن کی ”سور“ ہیں، کیونکہ وہ منزل کے بعد منزل ہیں، اور ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ بیضاوی نے کہا: یہ مترجم قرآن کی جماعت ہے، جس کی کم از کم تین آیات ہیں۔ اس کے اشتقاق میں وسعت ہے اور اس کی وضع کی حکمت کے بیان میں ہے۔ طبی بیہودہ کہتے ہیں: اس لیے کہ وہ اپنی قدر منزلت کے اعتبار سے بڑی سورت ہے، اور اس کی ایک کو اس سے خاص کیا ہے، دوسری سورتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ چونکہ بہت زیادہ فوائد اور معانی پر مشتمل ہے اور اس کے الفاظ میں اختصار ہے۔

کہا گیا ہے کہ تمام منازل اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت گھومتی ہیں: ﴿اياك نعبد و اياك نستعين﴾ [الفاتحة: ۵]۔ بلکہ بعض عارفین نے کہا ہے کہ تمام پہلی کتابوں کو قرآن پاک میں جمع (خلاصہ) کیا گیا ہے، اور پورے قرآن کا خلاصہ سورۃ فاتحہ میں ہے، اور اس فاتحہ کا بسم اللہ میں۔ اور اس کا ”باء“ کی نقطہ میں۔ یہ تمام حقائق اور دقائق کو گھیرے ہوئے ہے۔ شاید کہ آپ ﷺ کا اشارہ نقطہ توحید کی طرف ہے جس پر اہل حق کے چلنے کا مدار ہے۔ کہا گیا ہے: اس کا جمع ”باء“ کے نیچے ہے۔ شاید اس کی وجہ کہ تمام علوم کا مقصد بندے

کا اپنے رب کی طرف پہنچنا ہے۔ یہ ”باء“ الصاق کے لئے ہے۔ یہ بندے کو اپنے رب سے ملاتی ہے اور یہ کمال درجے کا مقصود ہے۔ اس قول کو فخر رازی نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن نقیب دونوں نے اپنی اپنی تفسیر میں۔ دونوں نے حضرت علیؑ سے بیان کیا ہے: ”انہ قال : لو شئت او قر سبعین بعیرا من تفسیر ام القرآن لفعلت“. (قبل أن تخرج : یعنی تو۔ من المسجد : وہ اس کو ابتداء میں جانتے تھے، یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے ذہن کو اس طرف لگائیں، اور مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہوں۔

فأخذ بیدی : صیغہ مفرد کے ساتھ۔ (فلما أردنا أن نخرج قلت يا رسول الله انك قلت : لأعلمنك أعظم سورة من القرآن : سورة الفاتحة کا نام بڑی سورت اسی لئے رکھا گیا، چونکہ یہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کے ان کلمات پر مشتمل ہے، جو اس کی شایان شان ہیں۔ امر اور نبی کا حکم ہے۔ وعدے کا ذکر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ذکر میں زیادہ بلیغ اور اشمل ہے۔ وعید کا ذکر جیسے ”یوم الدین“ سے دلالت ہے، یعنی جزاء بدلہ اور اسی طرح ”غیر المغضوب“ اس نے اپنے آپ کو مفرد ”ملک“ اپنی بندگی و عبادت کے لئے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے سے مدد مانگنے اور سوال کرنے کا کہا ہے۔ نیک اور بد بختوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان چیزوں پر مبنی جن پر تمام سورتیں مشتمل ہیں۔ قرآن پاک میں کوئی سورت ثواب میں اس جیسی نہیں۔ یہ کیفیت کے لحاظ سے بری ہے اگرچہ قرآن پاک میں کیت (مقدار) کے لحاظ سے بڑی سورتیں بھی ہیں۔ (الحمد لله) [الفاتحة : ۲] یعنی یہ سورة الحمد ہے۔ (رب العالمین) [الفاتحة : ۲] اس میں بسملہ پر دلالت ہے یا نہیں؟ ہی السبع المثانی : کہا گیا ہے لام عہد کے لئے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان : ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ [الحجر : ۸۷] اس کا نام ”سبع“ اس لئے کہ یہ سات آیات پر مشتمل ہے، بالاتفاق۔ بعض آیات میں بصریوں اور کوفیوں میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ اس میں سات آداب ہیں۔ ایک قول ہے کہ یہ سات حرفوں سے خالی ہے: ”شاء، جیم، خاء، زاء، شین، طاء اور فاء“۔ اس قول کا رد یہ ہے کہ نام اس کے ساتھ رکھا جاتا ہے، جو چیز اس میں موجود ہونے کے جو اس سے گم ہو۔ اس کا دفاع ممکن ہے کہ اس کا نام ضد کے ساتھ ہو، جیسے اسود کے لئے کا فور ہے۔ ان میں سے کوئی بھی سات آیات کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ دارقطنیؒ نے حضرت علیؑ سے بیان کیا ہے: مثالی نماز میں تکرار کی وجہ سے ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے حسن سند کے ساتھ ہے انہوں نے کہ: ”السبع المثانی فاتحة الكتاب تنفي في كل ركعة“. ایک قول ہے کہ دوسری سورتوں سے زیادہ پڑھی جاتی ہے، یا پھر ایک دفعہ مکہ میں نازل ہوئی اور دوسری مرتبہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ یہ اس کی تعظیم اور اہتمام شان کی بدولت ہے۔ ایک قول ہے کہ یہ سورة اس امت کے لئے استثناء ہے۔ اس سے پہلے کسی امت پر نازل نہیں ہوئی۔ یا اس میں ثناء مفاعل ہے جو ثنی کی جمع ہے جیسے المحمودة بمعنى ”حمد“ ہے یا مثنیة مفعلة کے وزن پر الثنی سے بمعنى التثنیة، یا اسم مفعول ہے التثنیة سے تکرار کے معنی میں۔ (والقرآن العظيم : ”سبع“ پر عطف ہے۔ صفت کا عطف صفت پر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ عطف عام عطف خاص پر ہے۔ (الذی اوتيته : اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ﴾ : یا اس اعطاء کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ قرآن کا اطلاق بعض پر جائز ہے۔

۲۱۱۹: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي يُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۵۳۹/۱ حديث رقم (۲۱۲ - ۷۸۰)۔ والترمذی فی السنن ۱۴۵۰/۵ حديث رقم ۲۸۷۷۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اپنے گھروں کو مقبرے نہ بناؤ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورة بقرہ پڑھی جاتی ہے۔“ (مسلم)

تشریح: وعن ابي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ لا تجعلوا بيوتكم: ضمدا وكرهه كساته۔ (مقابر: یعنی جو گھر ذکر اور نیکی کے کاموں سے خالی ہوں، وہ قبرستان کی طرح ہیں۔ گویا کہ اس میں مردے رہتے ہیں، یا اس کے معنی ہے اپنے مردوں کو اس میں دفن نہ کرو۔ پہلا معنی زیادہ راجح ہے۔) ان الشیطان: استناف تعلیل کی طرح ہے۔ (بنفرو: "فء" کے کسرہ کے ساتھ، وہ نکل کر بھاگتا ہے۔

من البيت الذي تقرأ فيه سورة البقرة: یعنی شیطان اور اس کے چیلے چاننے اس سورت کی برکت سے اس گھر کے رہنے والوں سے ناامید ہو جاتے ہیں۔ یا جوان گھردالوں میں سے دین کے لئے کوشش کرتا ہے، اور طلب یقین کے لئے کوشش کرتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، چونکہ یہ سورۃ لمبی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء اور احکام کثرت کے ساتھ وارد ہیں۔ اس سورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں سوامر، سونواہی، سوحکم اور سواخبار ہیں۔ حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ اس کو سورۃ البقرۃ کہنے کی کراہت نہیں، اور اس کے خلاف بھی دلیل ہے، جو یہ کہتا ہے کہ اس میں بقرۃ کا ذکر ہے، اس لئے اس کا نام البقرۃ ہے۔

ترمذی اور نسائی نے ابو ہریرہ سے دوسری حدیث ان الفاظ سے بیان کی ہے: "ان الشیطان یفر من البيت الذي تقرأ فيه البقرۃ"۔

سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھنے والوں کی لیے باعث برکت ہے

۲۱۲۰: وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اِقْرَأُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعًا لِأَصْحَابِهِ اِقْرَأُوا الزَّهْرَاوِينَ الْبَقْرَةَ وَسُورَةَ آلِ عِمْرَانَ فَإِنَّهُمَا تَأْتِيَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ أَوْ غَيَابَتَانِ أَوْ فُرْقَانٍ مِنْ طَيْرٍ صَوَّافٍ تُحَاجَّجَانِ عَنْ أَصْحَابِهِمَا اِقْرَأُوا سُورَةَ الْبَقْرَةِ فَإِنْ أَخَذَهَا بَرَكَةٌ وَتَرَكَهَا حَسْرَةٌ وَلَا يَسْتَطِيعُهَا الْبَطْلَةُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۵۵۳/۱ حديث رقم (۲۵۲-۸۰۴)۔ واحمد في المسند ۱۰۴/۱۴۔

ترجمہ: "حضرت ابوامامہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "قرآن کریم پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کرے گا اور دو روشن سورتیں یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس طرح ظاہر ہوں گی گویا کہ وہ ابر کی دو ٹکڑیاں ہیں یا وہ دو سیاہ بادل ہیں جن کے درمیان چمک ہے یا پرندوں کی صف باندھے ہوئے دو ٹکڑیاں ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے بھگتیں گے اور سورۃ بقرہ پڑھو کیونکہ (اس کے پڑھنے پر مدامت اس کے مفہوم و معانی ہیں غور و فکر اور) اس پر عمل کرنا برکت ہے اور اس کو ترک کرنا قیامت کے دن حسرت ہوگا اس کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی طاقت وہی لوگ نہیں رکھتے جو اہل باطل اور کسل مند ہوتے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: وعن ابي امامة قال سمعت النبي ﷺ يقول: اقرءوا القرآن: یعنی اس کی قراءت کو غنیمت سمجھو اور اس کی تلاوت پر تیشگی کرو۔ (فانہ یاتی یوم القیامۃ شفیعاً: یعنی سفارش کرنے والا۔) (لأصحابہ: یعنی اس کے آداب کو قائم کرنے والے۔) (اقرأوا: یعنی خصوصی طور پر۔) (الزہراوین: الزہراء کی تشبیہ۔) (زہر کی تائیس۔) (شیدروشنی یعنی دونوں سورتیں ہدایت اور روشنی کے نور ہیں، اور ان دونوں کا بہت زیادہ اجر ہے۔ گویا کہ ان دونوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے ہے جیسے دو چاند ستاروں میں ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ دونوں چاند کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے مشہور ہیں۔

البقرة وسورة آل عمران: بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہیں یا ”اعنی“ کو مقدر مانیں گے، اور دونوں کو ردع دینا بھی جائز ہے۔ ان دونوں کا نام زہرا وین احکام شریعی کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے علیہ کی بناء پر ہے۔ دوسری میں سورت کا ذکر پہلی کے علاوہ یہ بتانے کے لئے کہ ہر ایک کا جواز ہے۔ (فانہما: یعنی ان دونوں کا ثواب جو ان پر عمل کرے گا وہ اس ثواب کو پائے گا۔ تأتیان: وہ دونوں حاضر ہوں گی۔) (یوم القيامة کانہما غمامتان: یعنی دو بدلیاں جو اپنے عامل کو گرمی کی جگہ پر بچائیں گی۔ ایک قول ہے جو وضو کرتا ہے، وہ اس کی شدید کثافت کو مٹا دے گا۔) (أو غیبتان: دو ”یاء“ کے ساتھ، جو ان دونوں میں کثافت کے قریب ہو، اور اپنے ساتھی کے قریب ہو جیسے بادشاہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور اس سے سایہ اور وضو اکٹھا حاصل ہوتا ہے۔) (او فرقان: ”فاء“ کے کسرہ کے ساتھ یعنی دو جماعتیں۔) (من طیر: طائر کی جمع۔) (صواف: صافہ کی جمع، یہ وہ جماعت جو صف پر کھڑی ہوتی ہے، یا اپنے پروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملائے ہوئے کھڑی ہوتی ہے۔ یہ پہلے دونوں اقوال سے زیادہ ظاہر ہے۔ اس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں سوائے اس کے جو سلیمان کا واقعہ ہے۔) (أو: راوی کی طرف سے شک کا احتمال ہے، ان دونوں سورتوں کی تشبیہ میں اختیار ہے اولیٰ یہ ہے کہ دونوں کی تقسیم متواتر ہو۔ چونکہ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے نہ کہ راویوں کا تردد ہے۔ راوی ایک راستے پر نہیں چلتے۔ طبی بیہوشی کہتے ہیں: او، نوع بیان کرنے کے لئے ہے۔ پہلا وہ جو ان دونوں کو پڑھا ہے اور معافی نہیں سمجھتا۔ دوسرا وہ ہے جو پڑھتا ہے اور معافی بھی سمجھتا ہے۔ تیسرا وہ ہے ان کے ساتھ دوسری تعلیم بھی ملاتا ہے۔ تحاجان: یعنی دونوں سورتیں جھگڑا کر کے جہنم سے بچائیں گی، یا اپنے رب سے جھگڑا کریں گی۔

عن أصحابہما: یہ شفاعت میں مبالغہ سے کنایہ ہے۔ (اقرأ وسورة البقرة: طبی بیہوشی کہتے ہیں: عموم کے بعد تخصیص ہے۔ پہلے قراءت قرآن پھر اس کے ساتھ شفاعت معلق ہے، پھر زہرا وین کو خاص کیا گیا ہے۔ ان دونوں پر نجات اور قیامت کے دن کی گرمی سے خلاصی کی بنیاد ہے۔ اور تیسرا اکیلی بقرة اور اس پر تین امور کی بنیاد ہے جس نے کہا۔) (فان اخذھا: اس کی تلاوت پر بیہوشی، اس کے معافی پر تندرادر جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرنے والا۔) (بروكة: یعنی بہت بڑا منافع۔) (وتو رکھا: نصب کے ساتھ اور رفع بھی جائز ہے۔ یعنی اس کو چھوڑنا اور اس کی ہم مثل کو چھوڑنا۔) (حرة: یعنی قیامت کے دن ندامت ہوگی جیسا کہ حدیث ہے: ”لیس ینحسر اهل الجنة الا على ساعة مرت ولم یذکر واللہ فیھا“۔) (ولا یستطیعھا: مذکر اور مؤنث دونوں کے ساتھ۔ یعنی اس کے حاصل کرنے پر قدرت نہ رکھتے تھے۔) (البطلۃ: اس کے طول کی وجہ سے سستی کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ جادوگر جو باطل ہوتے ہیں۔ اس باطل فعل کی وجہ سے اس کا نام رکھا ہے، وہ اس کے اہل نہیں اور اس کی موافقت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہا جائے اس کا معنی ہو کہ وہ اس کے ابطال پر قدرت نہ ہو یا جس کے ساتھی پر جادو ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے ﴿وما ہم بضارین بہ من احد الا باذن اللہ﴾ [البقرة: ۱۰۲]۔

۲۱۲: وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَهْلُهُ الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ بِهِ تَقْدُمُهُ سُورَةُ الْبَقَرَةِ وَالْإِمْرَانِ كَأَنَّهُمَا عَمَّا مَتَّانٍ أَوْ ظَلَّتَانِ سَوْدَاوَانٍ بَيْنَهُمَا شَرْقًا أَوْ كَأَنَّهُمَا فِرْقَانٍ مِنْ طَيْرٍ صَوَّافٍ تَحَاجَّانِ عَنْ صَاحِبَيْهِمَا (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۵۵۴/۱ حديث رقم (۲۵۳-۸۰۵)۔ والترمذى فى السنن ۱۴۷/۵ حديث رقم ۲۵۸۳ والدارمى ۵۴۳/۲ حديث رقم ۳۳۹۱۔ واحمد فى المسند ۳۶۱/۵۔

ترجمہ: ”حضرت نواس ابن سمعان سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا

کہ قیامت کے دن قرآن لایا جائے گا اور ان لوگوں کو بھی جو قرآن پڑھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے قرآن (اس شان سے آئے گا کہ اس) کے آگے دوسورتیں سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران ہوں گی اس طرح گویا کہ وہ ابر کے دو ٹکڑے ہیں یا سیاہ بادل کے دو ٹکڑے ہیں اور ان میں ایک چمک ہے یا گویا دو ٹکڑیاں صف بستہ پرندوں کی ہیں جو پڑھنے والوں کی طرف سے بھگڑیں گی۔“ (رواہ مسلم)

تشریح: وعن النواس : نون کے فتحہ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ۔ (ابن سمعان : سین کے کسرہ اور فتح کے ساتھ۔) قال سمعت النبی ﷺ يقول يؤتى بالقرآن : یعنی تصور غ۔ یا اس کا ثواب۔ (يوم القيامة واهله : قرآن پر عطف ہے۔) (الذین كانوا يعملون به : اس پر دلالت کہ جس نے قراءت (پڑھا) کی اور عمل نہ کیا، وہ اہل قرآن میں سے نہیں، نہ اس کی سفارش کرے گا۔ بلکہ قرآن ان پر رحمت ہوگا۔) (تقدمه : یعنی اس کا اہل مقدم ہوگا یا قرآن۔) (سورة البقرة وآل عمران : جر کے ساتھ اور ایک قول : رفع کے ساتھ۔) طیبی بسید کہتے ہیں : تقدمه میں ضمیر قرآن کے لئے ہے یعنی ان دونوں کا ثواب قرآن کا ثواب ہے۔ ایک قول ہے کہ کل کو تصور لوگوں کے اعمال و وزن کے اعتبار سے ہے۔ اس جیسی مثالوں پر ایمان لانا واجب ہے اگرچہ عقلمیں اس سے عاجز ہوں۔ (كانهما عمامتان او ظلتان : فاء کے ضمہ کے ساتھ یعنی بدلیاں۔

سودوان : ان دونوں کی کثافت اور ان دونوں کا بعض کے ساتھ مل جانا، اور بادلوں میں مطلوب ہے۔ ایک قول ہے کہ ان دونوں کو سائبان بنایا گیا ہے تاکہ ان کا خوف اور زبردست محبت دلوں میں پیدا ہو جائے، چونکہ ظلمہ میں اکثر خوف ہوتا ہے۔ مظہر بسید کہتا ہے : اس کا احتمال ہے کہ ان دونوں کے پڑھنے سے قیامت کے دن سایہ ہوگا۔ بینہما شروق : شین کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد قاف ہے۔ اور کبھی کبھی ”راء“ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ پہلا قول مشہور ہے ضوء اور نور شروق سے مراد سورج ہے یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ وہ دونوں کثافت کے ساتھ ان کی روشنی پردے میں نہیں ہوگی۔ ایک قول ہے کہ شروق سے مراد شق ہے۔ یعنی ان کے درمیان فاصلہ اور خلاء ہے جس طرح ان دونوں میں اور بسملہ میں قرآن میں ہے۔ ان کی ضوء سے مراد اس کی استغناء ہے اس قول کے ساتھ : ”ظلتان عن بیان البینونة“ ان کا نام ظلتین ہے، اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ ہے۔ اگر کہا جائے تیبان کے لئے ہے، نہ کہ سائبان کے اوپر سائبان بلکہ وہ آپس میں آمنے سامنے ہوں گے، اس احتمال کے ساتھ کہ وہ دونوں دیکھنے میں متصل اور اعتبار کے لحاظ سے منفصل ہوں گے۔ (او کانہما فرقان : یعنی دو گروہ۔) (من طیر صواف تحاجان عن صاحبہما)۔

۲۱۲۲: وَعَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا أَبَا الْمُنْدِرِ أَنْدِرِي أَيُّ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى مَعَكَ أَعْظَمُ قُلْتُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ يَا أَبَا الْمُنْدِرِ أَنْدِرِي أَيُّ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى مَعَكَ أَعْظَمُ قُلْتُ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ قَالَ فَضَرَبَ فِي صَدْرِي وَقَالَ لِيَهِنَكَ الْعِلْمُ يَا أَبَا الْمُنْدِرِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۵۵۶/۱ حديث رقم (۲۵۸- ۸۱۰)۔ وابوداؤد في السنن ۱۵۱/۲ حديث رقم ۱۴۱۰۔ واحمد في المسند ۱۴۲/۵۔

ترجمہ: ”حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”ایا المنذر! کیا تمہیں معلوم ہے کہ کتاب اللہ کی کون سی آیت تمہارے پاس سب سے عظیم ہے؟“ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی سب سے زیادہ جاننے والے ہیں نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ ”ابو المنذر! تم جانتے ہو کہ تمہارے پاس کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟ میں نے کہا کہ: اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ حضرت ابی بن کعب کہتے ہیں

کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا ابوالمزدر! خدا کرے تمہارا علم خوشگوار ہو۔“ (مسلم)

تشریح: وعن ابی بن کعب قال: قال رسول الله ﷺ يا ابا المنذر: فاعل کے صیغہ کے ساتھ۔ ابی بن کعب کی کنیت ہے۔ (اتدری ای ائیة: اسم استفہام لازم الاضافہ ہے۔ اس کو مذکر اور مؤنث لانے میں اختیار ہے، اگر اس کی اضافت مؤنث کی طرف ہو۔) من کتاب اللہ تعالیٰ معک: یعنی وہ تیرا ساتھی ہوگا۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ بیان کی جگہ پر ہے کہ جب وہ کتاب اللہ حفظ کرے گا۔ کلمہ مع مصاحبت پر دلالت کرتا ہے۔ اُسید نے آپ ﷺ کی زمانے میں ہی مکمل قرآن حفظ کر لیا تھا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے تین پچازاد بیٹوں نے۔ (اعظم: اسحاق بن راہویہ وغیرہ نے کہا ہے۔ یہ بہت زیادہ ثواب اور اجر کے معنی میں ہے۔ اور یہی قول مختار ہے۔ اسی طرح طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔) قلت اللہ ورسولہ أعلم: پہلے جواب کو مختار بنایا پھر اس کا جواب دیا۔ اور آپ ﷺ سوال اور ”معاد“ اس پر اپنے اس قول کے ساتھ بار بار کہا۔ (قال یا ابا المنذر! تدری الی ائیة من کتاب اللہ تعالیٰ معک أعظم: یہ گمان ہے کہ آپ علیہ السلام کی مراد اس چیز کے متعلق پوچھنا ہے جو اُس کے پاس تھی، صحابی نے اپنے اس قول کے ساتھ یوں جواب دیا: (اللہ لا الہ الا هو الحی القيوم) [البقرة: ۲۵۵] آیت الکرسی مکمل کی۔ اسی طرح ابن حجر کا قول ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ پہلا ادب کے لئے تھا، دوسرا پوچھنے پر جواب تھا۔ ادب اور اطاعت کو جمع کرنا یہ ارباب کمال کی عادت مبارک ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: آپ ﷺ کا صحابی سے سوال کرنا اُس کو سننے پر ابھارنا تھا، کبھی کبھی کسی کے علم اور فہم کی مقدار کو جانچنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلے آپ ﷺ نے ادب کی رعایت رکھی، جب دیکھا کہ وہ علم میں بے نیاز نہیں ہے، مقصود اُس کے پوشیدہ علم کو ظاہر کرنا تھا، پس جواب دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم کا انکشاف ہوا، یا رسول اللہ ﷺ کی برکت کی بدولت جب اس نے معاملہ آپ ﷺ کی سپرد کیا اور سوالات پر حُسن ادب کو ملحوظ رکھا۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت الکرسی بہت عظیم آیت ہے، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید، تمجید اور تعظیم کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات علیہ کا ذکر ہے۔ اور اس میں ذکر معانی پر غور و فکر اور تدبر کرنا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہے۔ (قال: یعنی میرے باپ نے کہا۔) (فضرب: یعنی نبی ﷺ نے۔) (فی صدری: یعنی محبت کے ساتھ، اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿واصلح لی فی ذریعتی﴾ [الاحقاف: ۱۵] یعنی اللہ تعالیٰ نے ان میں درستی پیدا کر دی، اور وہ ایسے ہو گئے جیسے شاعر کا قول ہے: **صُحِرَ یجرح فی عراقیہا نصلی**

اس حدیث میں اشارہ ہے کہ ان کا سینہ علم و حکمت سے بھر گیا۔ وقال لیہنک العلم: ایک نسخہ میں ”نون“ کے بعد ہمزہ ہے اور تخفیف کی وجہ سے حذف کر دیا گیا تاکہ علم تیرے (سینے میں) لیے ودیعت ہو۔ یا ابا المنذر: یقال ہنأنی الطعام لیہنأنی، وھنأت ای تھننات بہ۔ ہر وہ معاملہ جو کسی مشقت کے بغیر مل جائے اس کو ”ھنسی“ کہتے ہیں۔ یہ دو عالم میں آسانی اور رسوخ کے لئے ہے۔ یہ اس صحابی کے بارے میں خبر ہے کہ وہ عالم تھے، اور یہی مقصود ہے۔ اس لئے ابو منذر کا بہت بڑا اعزاز ظاہر ہوتا ہے۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت

۲۱۳۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ وَكَلَّمَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِحِفْظِ زَكَاةِ رَمَضَانَ فَأَتَانِي ابْنٌ فَجَعَلَ يَحْضُرُنِي الطَّعَامَ فَأَخَذْتُهُ وَقُلْتُ لَا رَفْعَ لَكَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِنِّي مُحْتَاجٌ وَعَلَيَّ عِيَالٌ وَلِي حَاجَةٌ شَدِيدَةٌ قَالَ فَخَلَيْتُ عَنْهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ الْبَارِحَةَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ شَكَا حَاجَةً شَدِيدَةً وَعِيَالًا فَرَحِمْتُهُ فَخَلَيْتُ سَبِيلَهُ قَالَ أَمَا إِنَّهُ قَدْ كَذَبَكَ وَسِعُودٌ فَعَرَفْتُ أَنَّهُ سِعُودٌ

لَقَوْلِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ سِعُودٌ فَرَصَدْتُهُ فَجَاءَ يَحْتُوُ مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ فَقُلْتُ لَا رَفْعَتَكَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ دَعْنِي فَإِنِّي مُحْتَاجٌ وَعَلَى عِيَالٍ لَا أَعُوذُ فَرَحِمْتُهُ فَخَلَيْتُ سَبِيلَهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ شَكَا حَاجَةً شَدِيدَةً وَعِيَالًا فَرَحِمْتُهُ فَخَلَيْتُ سَبِيلَهُ فَقَالَ أَمَا إِنَّهُ قَدْ كَذَبَكَ وَسِعُودٌ فَرَصَدْتُهُ فَجَاءَ يَحْتُوُ مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ فَقُلْتُ لَا رَفْعَتَكَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهَذَا آخِرُ ثَلَاثِ مَرَّاتٍ إِنَّكَ تَزْعُمُ لَا تَعُوذُ ثُمَّ تَعُوذُ قَالَ دَعْنِي أَعْلَمْتُكَ كَلِمَاتٍ يَنْفَعُكَ اللَّهُ بِهَا إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَأْ آيَةَ الْكُرْسِيِّ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ حَتَّى تَخْتِمَ الْآيَةَ فَإِنَّكَ لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ اللَّهِ حَافِظٌ وَلَا يَقْرُبُكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ فَخَلَيْتُ سَبِيلَهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ قُلْتُ زَعَمْتُ أَنَّهُ يَعْلِمُنِي كَلِمَاتٍ يَنْفَعُنِي اللَّهُ بِهَا قَالَ أَمَا إِنَّهُ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوبٌ وَتَعَلَّمُ مِنْ تَخَاطُبِ مُنْذُ ثَلَاثِ لَيَالٍ قُلْتُ لَا قَالَ ذَاكَ شَيْطَانٌ۔

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۸۷۱۴ حدیث رقم ۲۳۱۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی زکوٰۃ کی گنہبانی پر مجھے مامور فرمایا ایک شخص آیا اور اپنے ہاتھوں سے غلہ بھرنا شروع کر دیا، میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا، اس نے کہا کہ ”میں محتاج ہوں، میرے اوپر میرے اہل و عیال کا نفقہ ہے اور میں سخت حاجت مند ہوں حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اسے چھوڑ دیا، صبح کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”اے ابو ہریرہ تمہارے گزشتہ رات کے قیدی کا کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! وہ مجھ سے اپنی سخت حاجت اور عیال داری کا رونا رونے لگا اس لئے مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”خبردار! اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے، وہ دوبارہ آئے گا آپ ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور آئے گا چنانچہ میں اس کا منتظر رہا، وہ آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے غلہ بھرنا شروع کر دیا، میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا، اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو، میں ضرور تمہیں ہوں میرے ذمہ اہل و عیال کا نفقہ ہے اب آئندہ نہیں آؤں گا، مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا (اس لئے کیا کہ اس نے آئندہ نہ آنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ تو اپنے حاجت و ضرورت کے بارے میں اس کا جھوٹ مجھ کو بھروسہ دیا یعنی نبی کریم ﷺ کی زبانی معلوم ہو ہی چکا تھا) جب صبح ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پھر فرمایا کہ ”ابو ہریرہ! تمہارے قیدی کا کیا ہوا؟“ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! وہ میرے سامنے اپنی شدید حاجت اور عیال داری کا رونا رونے لگا، اس لئے مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا، آپ ﷺ نے فرمایا، ”ہوشیار رہنا! اس نے جھوٹ بولا ہے وہ پھر آئے گا۔“ چنانچہ میں اس کا منتظر رہا اور وہ پھر آیا، جب اس نے غلہ بھرنا شروع کیا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ ”میں آج تجھے ضرور ہی نبی کریم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا یہ آخری تیسرا موقع ہے تو نے تو کہا تھا کہ آئندہ نہیں آؤں گا مگر تو پھر آ گیا“ اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں تمہیں ایسے کلمات سکھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے نفع پہنچائے گا جب تم اپنے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی لا الہ الاہو

الحی القيوم آخر تک (یعنی وهو العلی العظیم) تک پڑھو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ہمیشہ ایک نگہبان (فرشتہ) رہا کرے گا اور صبح تک تمہارے پاس کوئی شیطان (خواہ وہ انسان میں سے ہو یا جنات میں سے دنیوی تکلیف و اذیت پہنچانے کے لئے) نہیں آئے گا“ میں نے (یہ سن کر) اسے اس مرتبہ بھی چھوڑ دیا، جب صبح ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پھر فرمایا کہ تمہارے قیدی کا کیا ہوا، میں نے عرض کیا کہ ”اس نے (جب) مجھ سے کہا کہ وہ مجھے چند کلمات سکھائے گا، جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا (تو میں نے اس مرتبہ بھی اس کو چھوڑ دیا) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”آگاہ رہو (اگرچہ) اس نے تم سے (ان کلمات کے بارے میں) سچ کہا ہے (مگر) وہ (دوسری باتوں میں) جھوٹا ہے اور تم جانتے ہو کہ تم ان تین راتوں میں کس سے مخاطب تھے؟“ میں نے کہا کہ نہیں!“ آپ ﷺ نے فرمایا وہ شیطان تھا (جو اس طرح مکر و فریب سے صدقات کے مال میں کمی کرنے آیا تھا)۔“ (بخاری)

تشریح: وعن ابی ہریرۃ قال وکلنی رسول اللہ یحفظ زکوٰۃ رمضان : یعنی صدقہ فطر پر، تاکہ رسول اللہ ﷺ اس کو فقراء پر تقسیم کریں۔ ابن حجر کہتے ہیں: اس کی حفاظت پر یعنی ان کو سونپا گیا۔ وکالت، لغوی معنی میں ہے۔ اور یہ مطلق طور پر کسی کو معاملہ سپرد کرنا ہے۔ طیبی ۲۷۱ کہتے ہیں: اضافت ادنیٰ ملاہست کے لئے ہے۔ یہ صدقہ فطر اس لیے مشروع ہے کہ جو اس سے روزے کے دوران کوئی ظلم و زیادتی، افرات و تفریط ہوئی ہو وہ معاف ہو جائے۔ یہ لام کے معنی میں ہے۔ (فانانی آت : یعنی ایک آنے والا آیا۔) (افجعل : یعنی وہ شروع ہوا۔) (یحشو : یعنی وہ بغیر ماپ کے لے رہا تھا۔)

من الطعام : وہ اس کو اپنے برتن اور چادر میں مٹی کے ڈالنے کی طرح ڈال رہا تھا۔ کھانے سے مراد گندم وغیرہ ہے جو چیز فطر میں دی جاتی ہے۔ (فأخذته وقلت له لا رفعتک : رفع سے مراد معاطلے کو حاکم کے پاس لے جانا یعنی میں تجھ کو ساتھ لے کر چلوں گا۔) (الی رسول اللہ : تاکہ وہ تیرا ہاتھ کاٹ دیں، چونکہ تو چور ہے۔ یہ قول ابن الملک کا طیبی ۲۷۱ کی طرح ہے۔ اُس میں ہے کہ جب مال کو حفاظت سے رکھا گیا ہو اور وہ اس مال سے چرائے حالانکہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے اس وقت اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔) (قال انی محتاج : یعنی میں بہت فقیر ہوں۔) (وعلی عیال : یعنی ان کا نان و نفقہ بھی میرے ذمہ ہے، یہ اس نے فقیری کو زیادہ زیادہ ظاہر کرنے کے لئے کہا۔) (ولی حاجة : یعنی بہت سخت ضرورت۔) (شدیدة : یعنی موت کی طرح سخت، یا نفاس، قرض خوار کے مطالبے۔ یا سخت بھوک یا ایسی جیسی امثال جن میں سخت ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تاکید کے بعد پھر ایک تاکید ہے۔ طیبی ۲۷۱ کہتے ہیں: اس کے نفس میں فقیری تھی، وہ اپنے اہل و عیال کی وجہ سے یہ کرنے پر مجبور ہوا، اور یہ ضرورت مندوں کے لئے ہے۔ اس حدیث میں جنوں کو دیکھنے پر دلالت ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان : ﴿إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف: ۲۷] یعنی یہ ہے کہ ہم انہیں اس اصل شکل میں نہیں دیکھ سکتے جس پر ان کی تخلیق کی گئی ہے۔ اُس لیے کہ ہمارے اور ان کے درمیان بہت دوری ہے۔ چونکہ ان کے ناری اجسام چھپنے اور اشتباہ میں انتہاء درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اسی لیے امام شافعی نے کہا: جس نے دعویٰ کیا کہ اُس نے جن دیکھا، اس نے قرآن کی مخالفت کی، بخلاف اس کے کہ وہ دوسری صورت اختیار کر لیں۔

قال : یعنی ابو ہریرہ نے کہا۔ (فخلیت : یعنی اس کا راستہ۔) (عنه : یعنی میں نے اس کو چھوڑ دیا اس میں یہ دلالت نہیں، کہ اس نے غلہ لیا تھا یا نہیں اُس میں احتمال ہے کہ وہ ان پر سبقت لے جائے۔ ابن حجر نے اپنے مذہب کے قواعد کے مطابق احادیث کو تطبیق دی ہے۔) (فاصبحت فقال النبى ﷺ يا ابا هريرة ما فعل : فاعل ہونے کی بناء پر۔) (أسيرك : یعنی جن کو تو نے پکڑا تھا۔) (البارحة : گزشتہ رات۔) طیبی ۲۷۱ کہتے ہیں: اس میں نبی ﷺ نے غیب کے متعلق خبر دی ہے۔ اس میں ممکن ہے کہ ابو ہریرہ نے شیطان کو پکڑا اور اس کو

ذلیل و رسوا کر کے واپس لوٹا دیا۔ یہ نبی ﷺ کی متابعت کی برکت ہے۔ حدیث میں صدقہ فطر جمع کرنے کے دلیل ہے۔ پھر کسی ایک کو اس کو تقسیم کرنے پر مقرر کرنے کی راہنمائی ہے۔ (قلت یا رسول اللہ شکی حاجة شدیدة و عیالا فرحمته فخلیت سبیلہ، قال : یعنی نبی ﷺ نے کہا۔) ما تخفیف کے ساتھ تنبیہ کے لئے ہے۔ (انہ قد کذبک بتخفیف کے ساتھ یعنی حاجت کو ظاہر کرنے کے لئے۔) (وسیعودہ : یعنی اس سے دفاع کے لئے تیار ہو جا۔) (فعرفت أنه سيعود لقول رسول الله ﷺ انه سيعود فرصدته : میں نے اس کا انتظار کیا۔ ابن حجر کہتے ہیں : دوسری رات پر دلالت نہیں۔ بلکہ اس کے عدم پر دلالت ہے، چونکہ نبی ﷺ نے اس کو مقید نہیں کیا : ”ما فعل أسيرك الاتى يقوله البارحة“۔ (فجاء یحسو : حال مقدر ہے، چونکہ ”حسو“ معجی کے بعد ہے نہ کہ اس کے ساتھ۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس کی تقریروں ہو : ”فجاء فجعل یحسو اعتماد اعلیٰ ما سبق“ معنی یہ ہے کہ وہ مال چراہا تھا یا چرانے کا ارادہ کر رہا تھا۔) (من الطعام فأخذته فقلت لأرفعنك الی رسول الله ﷺ قال دعنی : یعنی مجھ کو چھوڑ دے۔

فأنی محتاج وعلی عیال : فرحمته : شاید اس کے یہ کہنے کی وجہ سے ”لا أعود“ مگر اس کا جھوٹ محتاج ہونے کے بارے میں آپ ﷺ کی زبان سے عیاں ہو گیا تھا۔ ایک قول ہے کہ اس نے اپنے جھوٹ سے توبہ کر لی۔) (وخلیت سبیلہ فأصاحت فقال لی رسول الله ﷺ یا أبا هريرة ما فعل أسيرك فقلت یا رسول الله شكا حاجة : یعنی سخت حاجت جیسا کہ صحیح نسخ میں ہے۔) (وعیالا فرحمته فخلیت سبیلہ : چونکہ اس نے نہ آنے کا وعدہ کر لیا تھا، شاید کہ راوی نے اختصار کی بناء پر اسے حذف کر دیا ہو۔) (فقال أما انه قد کذبک : یعنی لوٹ نہ نہیں آنے کا جھوٹ کہا ہے۔) (سيعود، فرصدته، فجاء یحسو من الطعام فأخذته فقلت لأرفعنك الی رسول الله ﷺ : اس سے قطع ید کا ذکر کیا، کہ اس میں وہ مطلق ہے، صحابی نے کہا۔) (وهذا آخر ثلاث مرات انك : ابن حجر کہتے ہیں : یہ جو تین مرتبہ کا لفظ لائے ہیں، یہ تعطیل ہے، اور اس کلام کو بھی شامل ہے کہ وہ مطلق نہیں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ”هذا“ مبتداء ہے، ”آخر“ اس سے بدل ہے۔ ”انك“ خبر ہے۔ (تزعیم : تو گمان کرتا ہے، یا کہتا ہے۔) (لا تعود، ثم تعود : ایک نسخہ میں ”تزعیم أن لا تعود“ یعنی تو گمان کرتا ہے کہ تو لوٹ کر نہیں آئے گا، تو پھر لوٹ آتا ہے۔) (طبی بیہید کہتے ہیں : انك تزعیم یہ ”ثلاث مرات“ کی صفت ہے۔ اس باطل قول کے ساتھ موصوف ہو گا اور ضمیر مقدر ہے یعنی ”فیہا“۔) (هذا آخر ثلاث مرات) اس پر دلالت ہے کہ اس نے پہلے مرتبہ بھی نہ آنے کا وعدہ کیا تھا، جس کو اختصار کی غرض سے ساقط کر دیا گیا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں : کلام شارح عقل سے بعید ہے چونکہ اس نے یہ نہیں کہا : میں صرف لوٹوں گا، اور وہ دوسری دفعہ آیا تھا۔ اس کا دفع ممکن ہے کہ نہ لوٹنے کا التزام صریحا یا ضمنا تحقق ہے۔ یہ بات جان لی گی ہے کہ مستغیث دعویٰ کرتا ہے کہ وہ دوبارہ نہیں لوٹے گا۔

قال دعنی : یعنی مجھے چھوڑ دے۔ (أعلمك : رفع کے ساتھ، ایک نسخہ میں جزم کے ساتھ۔) (کلمات ینفعلک اللہ بہا اذا أویت : قصر اور مد کے ساتھ، یعنی جب تو ارادہ کرے۔) (الی فراشک : نیند کی وجہ سے ”ونزلت فیہ“۔) (فاقرأ آية الكرسي، اللہ لا اله الا هو الحي القيوم ﴿البقرة : ۲۵۵﴾ حتی تختم الایة یعنی وهو العلی العظیم تک) اس کا ظاہر کوئی مذہب پر دلالت ہے کہ ”القیوم“ اس الایہ نہیں ہے اور بصری اس کے برعکس ہیں۔ (فانك : یعنی جب تو یہ کرے گا۔) (لن یزال علیک من اللہ : اس (اللہ) کی طرف سے یا اس (اللہ) کے حکم سے۔) (حافظ : اپنی قدرت سے یا فرشتوں کی طرف سے۔) (ولا یقریک : راہ کے فتح کے ساتھ۔) (شیطان : نہ کسی دینی نہ دنیاوی کے لئے اور یہ ماقبل کی تاکید ہے۔) (حتی تصبح : اس کی انتہاء صبح ہے، اس کی غایت ”لن“ ہے، ایک قول یہ ہے کہ اسناد کا ترک اس کی وضاحت کی وجہ سے ہے۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ کہا جائے اس کے لئے یہ کھول دیا گیا۔ یہ قول طبی بیہید نے ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں : صحیح بات جو نبی علیہ السلام نے ثابت کی ہے۔ آپ ﷺ کا قول جس کو یہی نے روایت کیا

ہے: ”من قرأها یعنی آیۃ الکرسی حین یاخذ مصجعه آمنه الله تعالیٰ علی داره ودار جاره وأهل دویرات حوله“۔ (فخلیت سبیلہ فأصبحت فقال لی رسول الله ﷺ ما فعل أسیرک : یہ نہیں کہا گزشتہ رات۔ اسی طرح پیچھے گزر چکا ہے۔) قلت زعم أنه یعلمنی کلمات ینفعی الله بها قال أما انه صدقک : یعنی سکھلانے میں۔ (وہو کذوب : یعنی اپنے تمام اقوال میں، یا اغلب احوال میں، یا اپنی مثالوں میں کبھی کبھی سچ بول دیتا ہے۔ تعلم : یعنی اتعلم۔

من تخاطب : یعنی معین شخص سے۔ (منذ ثلاث : یعنی راتیں۔) قلت لا، قال ذاک شیطان بتوین کے ساتھ مرفوع ہے۔ اگرچہ اس کا ظاہر منسوب کا تقاضا کرتا ہے، چونکہ اس قول میں آپ ﷺ کا پوچھنا ”من تخاطب“ مفعول ہے، اور جملہ اسمیہ کی طرف عدول ہے۔ اس کو اسم اشارہ کے ساتھ خاص مزید تعین کے لئے ہے، اور اس (شیطان) کے مکر و فریب سے ہمیشہ کے لئے بچاؤ ہے۔ یہ قول طبری بیہید کا ہے۔ واحد سے مراد شیاطین ہیں یا ابلیس۔ وجہ صاف کہ یہ ”ظطن“ سے ماخوذ یعنی ”بعد“ کے معنی میں۔ قاموس میں ہے : اس مادہ میں شیطان معروف ہے اور ”تشیطن“ اس کا فعل جو اس نے کہا۔ طبری بیہید کہتے ہیں : کہ دونوں جگہ شیطان ان دونوں کے تغایر پر دلالت ہے اور اس کی اجازت ہے اور یہ مشہور ہے کہ نگرہ جب انہی الفاظ کے ساتھ لایا جائے تو پہلے کے علاوہ ہوتا ہے۔ وجہ تغایر کہ پہلا جنس کے لئے ہے چونکہ اس سے مراد ”نئی قربان“ ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اس جنس میں سے ایک ہے۔ یعنی شیطانوں میں سے ایک ہے۔ اگر معرّف ہو تو مقصود کے خلاف وہم ہے، چونکہ یا تو اشارہ پہلے کی طرف ہے یا جو لوگوں میں مشہور ہے۔ تو ان دونوں کا کلام واضح نہیں ہے۔

ابن الملک کہتے ہیں : حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ علم سیکھنا جائز ہے، اس سے جو اس قول پر عمل نہیں کرتے جنہوں نے تحسین علم کے حصول پر شرط لگائی ہے۔ اگر کوئی عمل کی تحسین اور قباحت کو نہیں جانتا، تو وہ صرف اس شخص سے سیکھے جس کی دیانت مشہور ہو اور وہ صالح ہو۔ اس بحث میں موضوع احادیث اچھے ظاہر معنوں کے لئے ہیں، جیسے سورتوں عبادات اور دعوات وغیرہ میں ہے، ان جیسی سورتوں میں تحصیل علم صرف ثقات سے سیکھنا جائز ہے۔

سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کا آخری حصہ اللہ کی طرف سے دونوں ہیں

۲۱۲۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَيْنَمَا جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَاعِدٌ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ سَمِعَ نَقِيضًا مِنْ فَوْقِهِ فَرَوَعَ رَأْسَهُ فَقَالَ هَذَا بَابٌ مِنَ السَّمَاءِ فَتُحِ الْيَوْمَ لَمْ يَفْتَحْ إِلَّا الْيَوْمَ فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ فَقَالَ هَذَا مَلَكٌ نَزَلَ إِلَى الْأَرْضِ لَمْ يَنْزِلْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ فَسَلَّمَ فَقَالَ أَبَشِرْ بِنُورٍ يُنْ أَوْ تَيْتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيمُ سُورَةِ الْبَقَرَةِ لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِنْهُمَا إِلَّا أُعْطِيَتْهُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۵۵۴/۱ حدیث رقم (۲۵۴-۸۰۶)۔ والنسائی ۱۳۸۲/۱ حدیث رقم ۹۱۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ جب جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے اوپر کی طرف دروازہ کھلنے کی سی آواز سنی چنانچہ انہوں نے اپنا سراو پراٹھایا اور کہا کہ ”یہ آسمان کا دروازہ ہے جو آج ہی کھولا گیا“ آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا“ جب ہی اس دروازے سے ایک فرشتہ اتر آیا حضرت جبرئیل نے کہا کہ ”یہ فرشتہ آج سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اتر آیا“ اس فرشتے نے آپ ﷺ کو سلام کیا اور کہا کہ ”خوشخبری ہو کہ آپ کو وہ دونوں عطا فرمائے گئے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے اور کسی نبی کو نہیں دیئے گئے اور وہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کا آخری آیتیں ان میں سے آپ ﷺ کوئی حرف بھی پڑھیں گے تو آپ کو اس کے عوض ثواب ملے گا

آپ ﷺ کی دعا قبول کی جائے گی۔“ (مسلم)

تشریح: وعن ابن عباس قال بينما جبريل عليه السلام قاعدا: ايك نسخه في رفعه كساته به اور وہی ظاہر ہے۔ شاید کہ اس کا نصب ”کان“ کو مقدر ماننے کے ساتھ ہے۔ عند النبی ﷺ: ابن الملک بھی طیبی ﷺ کی طرح کہتا ہے: ان اوقات وحالات کے دوران جو آپ ﷺ کے پاس تھے۔ میرک ﷺ کہتے ہیں: ”بینا، بینما“ اور ”بین“ اس کا معنی ”وسط“ ہے۔ ”بین“ طرف مکان ہے جیسے آپ کا کہنا: ”جلست بین القوم و بین الدار“ یا زمان کے لئے جیسا کہ یہاں پر اس کا ذکر ہے۔ یعنی وہ وقت جس میں جبریل امین آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ (سمع: ايك نسخہ میں ”اذ سمع“ یعنی جبریل نے سنا۔ (رفع: یعنی جبریل نے۔) (راسہ فقال: یعنی جبریل نے اپنا سرا اٹھایا۔ طیبی ﷺ کہتے ہیں: کہ تینوں ضمیریں جو ”سمع، رفع اور ”قال“ میں ہیں، جبریل کی طرف راجع ہیں۔ چونکہ اسان کے احوال کی اکثر اطلاع وہی دیتے ہیں۔ ایک قول ہے کہ نبی ﷺ کی طرف راجع ہیں۔ اور (قال) کی ضمیر جبریل امین کے لئے ہے، چونکہ وہ آپ ﷺ کے پاس کسی عجیب امر کی خبر کے لئے حاضر ہوئے تھے، اور نبی ﷺ اس امر سے واقف ہو گئے۔ ابن حجر کہتے ہیں: قول مختار یہی ہے۔

هذا: یعنی یہ آواز۔ (باب: یعنی دروازے کی آواز۔) (من السماء: یعنی آسمان دینا۔) (فتح اليوم: یعنی اب۔) (لم يفتح قطالا اليوم فنزل منه ملك: یہ راوی کا قول ہے، اس کی حکایت میں جو اس نے رسول اللہ ﷺ سے سنایا اس کو آپ ﷺ سے پہنچا۔) (فقال: جبریل یا نبی ﷺ نے کہا۔) (هذا: اترنے والے فرشتے کے متعلق کہا۔) (ملك نزل الى الارض لم ينزل قط الا اليوم فسلم: یعنی فرشتے نے سلام کیا۔) (على النبی ﷺ فقال: صحیح نسخہ میں ”وقال“، یعنی فرشتے نے کہا۔) (ابشر: ہمزہ کے فتح اور شین کے کسرہ کے ساتھ یعنی خوش ہو جاؤ۔) (بنورین: ان دونوں کا نام اس لئے ہے کہ ان میں سے ہر ایک نور ہے جو اپنے ساتھی کے سامنے دوڑ رہا ہوگا۔) (یا وہ دونوں صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کر رہے ہوں گے، اس کے معانی میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔) (جود آیات میں روشنی ہے۔

واوتيتهما لم يؤتتا: صیغہ مجہول کے ساتھ یعنی وہ دونوں کسی کو نہیں دی گئیں۔) (نبی قبلك“ فاتحة الكتاب: جر کے ساتھ۔) (آخری دو جہیم جائز ہیں۔) (و خواتيم سورة البقرة: میرک ﷺ کہتے ہیں: ہمارے شیخ کے ہاں جو تمام نسخے پڑھے جاتے ہیں، ان میں اسی طرح ہے۔ اسی طرح مسلم، نسائی اور حاکم کی اصل میں ہے۔ دوسرے نسخہ میں ہے کہ سورة البقرة کا جو آخر (آخری آیات) ہے۔ ”امن الرسول“ [البقرة: ۲۸۵] سے مراد کے متعلق اسی طرح کہا گیا ہے اور ابن حجر نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ زیادہ اظہر جمع کے صیغہ کے ساتھ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہو: ﴿لله ما فی السموات وما فی الارض﴾ [البقرة: ۲۸۴] پھر میں نے ابن حجر کو کہتے ہوئے دیکھا کہ پہلے انبیاء پر آیت الکرسی، اور سورة البقرة کی آخری اور آخری سے پہلے ”امن الرسول“ کی آیات نازل نہیں ہوئیں۔ کعب سے اس پہلے کی آیات روایت کی ہیں: ﴿لله ما فی السموات وما فی الارض﴾ [البقرة: ۲۸۴] لن تقرا: یہ آپ ﷺ سے خطاب ہے۔ مراد آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت ہے۔ ہر اس چیز میں آپ ﷺ کی امت شامل ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوا، ہوائے اس کو جو آپ ﷺ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔

بحرف منهما: یعنی فاتحہ اور خواتیم کا ہر حرف۔ تورپشتی ﷺ کہتے ہیں: ”باء“ زائدہ ہے۔ کہا جاتا ہے: ”أخذت زمام الناقة، وأخذت زمامها“۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کے ساتھ قراءت کو ملایا گیا ہو، اور مراد اس سے اس کا ایک حصہ ہے شی کی کاحرف اس کی طرف ہوتی ہے اور اس سے مراد مستقل جملہ ہے۔ الا اعطيته: یعنی آپ کو وہ چیز عطا کی جائے گی: جس پر سوال کے متعلق یہ جملہ مشتمل ہے: کقولہ: ”اهدنا الصراط المستقیم“ [الفاتحة: ۶]، اسی طرح آپ ﷺ کا کہنا: ”غفرانک ربنا“ [البقرة: ۲۸۵]، اور

جو اس سے ملتی جلتی مثالیں ہیں۔ جو ”غیر مسئلہ“ پر مشتمل ہے، اُس میں حمد و ثناء ہے۔ تجھے اس کا ثواب دیا جائے گا۔ میرک مجیبہ کہتے ہیں : کہ حرف سے مراد حرف تہجی ہو یہ بھی ممکن ہے اس قول کا۔ (اعطیتہ : اس وقت تجھ کو دیا جائے گا، جب تو دنیوی اور آخری حاجات کے متعلق سوال کرے گا۔

نسائی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں : ظاہر یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مستند روایت کے متعلق ہے اس میں آپ ﷺ سے توفیق ہے اور اس کی سند کو واضح ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا ہے۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر تمام حالت کو مکمل تمثیل کے ساتھ بیان کر دیا ہو۔ جبریل امین کے ذریعے یہاں تک آپ ﷺ نے دیکھ لیا۔ آپ ﷺ نے اپنا سراٹھایا اور آسمان سے اترنے والے فرشتے کو دیکھا، جیسے آپ ﷺ کے لئے تمثیل بیان کی گئی ہے۔ اس قول کے متعلق نقض سنا گیا ہے، اور اسکے بعد دوسرا مخفی نہیں ہے۔

۲۱۲۵: وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْإِيتَانِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مَنْ قَرَأَهُمَا فِي لَيْلَةٍ كَفَّتَا هُ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۱۷/۷ - حدیث رقم ۴۰۰۸ - و مسلم فی صحیحہ ۵۵/۱ حدیث رقم (۲۵۵ - ۸۰۷) -
و الترمذی فی السنن ۱۴۷/۵ حدیث رقم ۲۸۸۱ - وابن ماجہ ۴۳۵/۱ حدیث رقم ۱۳۶۸ - والدارمی ۵۴۲/۲ حدیث
رقم ۳۳۸۸ - واحمد فی المسند ۱۱۸/۴ -

ترجمہ: ”حضرت ابو مسعود سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص رات میں سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں یعنی امن الرسول سے آخر تک پڑھتا ہے تو اس کے لئے وہ کافی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن ابی مسعود : یعنی الصاری۔

قال : قال رسول الله ﷺ الايتان : یعنی جو ہونے والی ہیں۔

من آخر سورة البقرة : یعنی ”امن الرسول“ سے لیکر آخر تک۔

من قرأ بهما فی لیلۃ کفتناہ : یعنی وہ دونوں اس سے شر اور ناپسندیدہ چیزوں کو روکے رکھیں گی، یہ بات ”کفی یکفی“ سے ہے، یعنی جب کسی سے کوئی چیز دور کر دی جائے، اور اس کو مستغنی کر دیا جائے۔ ایک قول ہے: اس کو قیام اللیل کی جگہ کافی ہوں گی، یا اس کو سارے ذکروں سے کافی ہوں گی یا ان دونوں سے مراد جو ان کو قیام اللیل میں کم از کم کفایت کرجائیں گی۔ ابن حجر کہتے ہیں: اس کا احتمال ہے کہ جو ان کا نظم ہے اس لحاظ سے وہ تجدید ایمان کے لئے کافی ہوں گی۔ اس کی شرح میں یہ بات بھی ہے کہ ان کے ساتھ کچھ مخفی چیزیں بھی ظاہر ہوتی ہیں یہ قطعاً غیر مناسب ہے۔ یقیناً ان کے ساتھ تجدید ایمان کا حصول ہے اور یہ دونوں اس سے کفایت کرتی ہیں۔ پس آپ اس پر غور کریں۔ یہ پھسلنے کی جگہ ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ تجدید کی اصطلاح فقہاء سے ہے وہ حالت ارتداد کو مجہول ہے، اگر صوفیہ کی اصطلاح ہو تو مراد تجدید ہے، اس کو مؤکدا و مؤید مانا گیا ہے، چونکہ یہ ہر ظاہر سے توحید کے معنی کو شامل ہے اور ہر طرح کی غفلت کو دور کرتا ہے۔ اسی لئے ابن الفارض نے کہا ہے:

ولو خطرت لی فی سواک ارادة ☆ علی خاطر ی سہوا حکمت بردتی

اگر تیرے سوا میرے دل پر بھول کر بھی کوئی خیال آجائے تو میرے مرتد ہونے کا حکم لگا دیا جائے۔

اہل علم نے یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے اخذ کیا ہے: ﴿يا ايها الذين امنوا امنوا﴾ [النساء: ۱۳۶] یعنی اپنے ایمان کو

لازم پکڑو۔ آپ علیہ السلام کا قول ہے: ”حدودا ایمانکم“، قالوا یا رسول اللہ! کیف نجدد ایماننا؟ قال اکثرنا من قول لا الہ الا اللہ“۔ اس حدیث کو چاروں نے روایت کیا ہے۔

۲۱۲۶: وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ حَفِظَ عَشْرَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ الْكَهْفِ عَصِمَ

مِنَ الدَّجَالِ - [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحيحه ۵۵۵/۱ حدیث رقم (۲۵۷- ۸۰۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۹۷/۳ حدیث رقم ۴۳۲۳۔
والترمذی ۱۴۹/۵ حدیث رقم ۲۸۸۶۔ واحمد فی المسند ۱۹۶/۵۔

ترجمہ: ”حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص سورہ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد کرے تو وہ دجال کے شر سے محفوظ رہے گا۔“ (مسلم)

تشریح: وعن ابی الدرداء قال : قال رسول اللہ ﷺ من حفظ عشر آيات من اول سورة الكهف عصم :
یعنی اس کو یاد کیا۔

من الدجال : یعنی اس کے شر سے ایک دوسری روایت میں ہے: دجال کے فتنہ سے۔ طبی بیسید کہتے ہیں: جیسے ان دس آیات کو حفظ کرنے والی جماعت کو اللہ تعالیٰ بچائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ قاری قرآن کو سرکش لوگوں سے بچائے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا سبب اس میں عجائب اور نشانیوں کا ہونا ہے، جو ان میں غور و فکر کرے گا دجال سے بچا لیا جائے گا۔ ان کو جمع کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے۔ یہ اس خصوص کے ساتھ ظاہر ہے۔ لام عہد کے لئے ہے یہ آخری زمانے میں نکلے گا، اور الوہیت کا دعوے دار ہوگا، جس کے لئے خلاف عادت نشانیاں ظاہر کرے گا۔ جیسے آسمان سے کہے گا، بارش برسائے تو وہ اس وقت بارش برساے گا۔ زمین سے کہے گا، تو اُگا، وہ اُسی وقت اُگا دے گی۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہوگی۔ اس سے بڑا فتنہ روئے زمین پر کوئی اور نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے اپنی قوم کو ڈرانے کے لئے بھیجا ہے۔ سلف اپنے بچوں کو دجال کی حدیث بھی یاد کراتے تھے یا یہ جنس کے لئے ہے۔ دجال سے اکثر جھوٹ اور باطل ہوگا۔ حدیث ہے: ”لا تقوم الساعة فی آخر الزمان دجالون، کذابون“ یعنی وہم پیدا کرنے والے۔ دوسری حدیث میں ہے: ”لا تقوم الساعة حتی یخرج ثلاثون دجالاً“۔ اسی طرح ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی کی روایت میں ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے: ”من قرأ ثلاث آيات من أول الكهف عصم من فتنة الدجال“۔ ایک قول ہے: تین اور دس میں جمع کرنے کی توجیہ: دس والی حدیث متاخر ہے، جس نے دس پر عمل کیا اس نے تین پر بھی عمل کر لیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ تین والی حدیث متاخر ہے، جو تین سے بچا لیا گیا، تو اس کو دس کی ضرورت نہیں رہا، جس نے تین کو حفظ کر لیا، اس کو دس کی ضرورت نہیں۔ یہ احکام نسخ کے بہت قریب ہے۔

میرک بیسید کہتے ہیں: صرف احتمال سے نسخ ثابت نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں: نسخ اخبار میں داخل نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ حدیث عشر حفظ کے لئے ہے اور حدیث ثلاث قراءت کے لئے ہے۔ جس نے دس کو حفظ کیا اور تین کی قراءت کی، اس کو کافی ہوں گی، اور دجال کے فتنہ سے بچا لیا گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ جس نے دس آیات کو یاد کیا، وہ اس کی ملاقات سے محفوظ رہے گا، جس نے تین آیات قراءت کی وہ اس کے فتنہ سے محفوظ کر لیا گیا، اگرچہ وہ اس سے ملاقات کرے۔ کہا گیا ہے کہ حفظ سے مراد دل سے قراءت کرنا ہے، اور عصمت سے مراد دجال کی آفات سے محفوظ رکھنا ہے۔

۲۱۲۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اَبْعِزُّ أَحَدِكُمْ أَنْ يَقْرَأَ فِي لَيْلَةٍ ثَلَاثَ الْقُرْآنِ قَالُوا وَكَيْفَ يَقْرَأُ

ثُلُثُ الْقُرْآنِ قَالَ قُلُّ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ تَعَدَّلُ ثُلُثُ الْقُرْآنِ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۵۵۶/۱ حديث رقم (۲۵۹-۸۱۱)۔ وابدؤادؤ فى السنن ۱۵۲/۲۔ حديث رقم ۱۷۱/۲۔ والنسائى ۲۸۹۶۔ والنسائى ۱۷۱/۲ حديث رقم ۹۹۶۔ وخرجه مالك فى الموطا۔

ترجمہ: ”حضرت ابودرداء سے مروى ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کیا تم میں سے کوئى ایک رات میں تہائى قرآن پڑھنے سے عاجز ہے؟“ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ”تہائى قرآن کیسے پڑھا جاسکتا ہے؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قل هو اللہ احد (سورۃ اخلاص) تہائى قرآن کے برابر ہے مسلم۔“

تشریح: وعنه : یعنی ابودرداء سے۔ (قال : قال رسول اللہ ﷺ ايعجز أحدكم ان يقرأ فى ليلة الثلث القرآن : لام کے ضمہ اور سکون کے ساتھ)۔ (قالوا وكيف يقرأ : یعنی کوئى بھی)۔ (ثلث القرآن : چونکہ اس پر ہمیشگی کرنا عادتاً مشکل ہے۔ قال، قل هو اللہ احد : مکمل سورت یا آخر تک۔

يعدل : مذکر اور مونث یعنی دونوں طرح ٹھیک ہے۔ (ثلث القرآن : چونکہ معانى قرآن کی تعليم تین علوم پر مشتمل ہے : علم توحيد، علم شرايع، علم تہذيب اخلاق اور تزکيۃ نفس۔ سورت الاخلاص سب سے اشرف قسم پر مشتمل ہے، بہ نسبت دوسرى آخرى دو قسموں کے۔ علم توحيد سب سے بٲن ہے۔ طیبى بيبيہ کہتے ہیں : یہ اس ليے ہے کہ قرآن تین چیزوں پر مشتمل ہے : قصص، احکام اور اللہ تعالیٰ کی صفات۔ اور ”قل هو اللہ احد“ [الاخلاص] مکمل سورت [صفات پر مشتمل ہے۔ اور یہ ثلث قرآن ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا ثواب ثلث قرآن کے برابر بڑھایا جائے گا، اس میں کى نہ ہوگی۔ پہلے قول پر قول کو بالاستيعاب اور اس کو ختم کرنا ضرورى نہیں۔

میرک بيبيہ کہتے ہیں : ابو عبید نے حدیث ابودرداء بیان کی ہے، اور کہا: ”جزأ النبى ﷺ القرآن ثلاثة اجزاء مجعل قل هو اللہ احد جزءا من القرآن“، قرطبی کہتے ہیں : بعض نے ثلاثی کو حصول ثواب پر محمول کیا، پس انہوں نے کہا: ثلث قرآن کا معنی اس کی قراءت کا ثواب ہے، قارى کو اس کی مثل ثواب حاصل ہوتا ہے، جو ثلث قرآن پڑھتا ہے۔ ایک قول ہے کہ اس کی مثل بغیر دو گنے کے ملتا ہے۔ یہ دعوىٰ بغیر دلیل کے ہے۔ جب اس کو ظاہر پر محمول کیا جائے، تو یہ ثلث قرآن سے معین ہے، یعنی ثلث جو اس سے فرض کیا گیا۔ اس میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ دوسرے قول سے لازم آتا ہے کہ جس نے تین بار سورۃ اخلاص کو پڑھا وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے مکمل قرآن پاک پڑھا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد جس نے شامل توحيد اور اخلاص پر عمل کیا، وہ اس شخص کی طرح ہے، جس نے ثلث قرآن پڑھا۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں : جس نے اس حدیث کی تاویل نہیں کی، وہ اس شخص سے زیادہ محفوظ ہے، جس نے رائے کے ساتھ جواب دیا۔ یہ مذہب احمد اور اتحق بن راہویہ کا ہے۔ ان دونوں نے حدیث کو اس بات پر محمول کیا ہے، کہ اسکا معنی اس کے ثواب کی فضیلت اس سورت کی تعليم پر ابھارنا ہے، مگر اسکی تین بار قراءت پورے قرآن کی قراءت کی طرح ہے۔ یہ درست نہیں اگر چہ دو سو بار پڑھے۔ عن أبى الدرداء.

۲۱۲۸ : و رواه البخارى عن ابى سعيد -

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۴۷/۱۳۔ حديث رقم ۷۳۷۴۔

ترجمہ: امام بخاری نے اس روایت کو ابو سعید سے روایت کیا ہے۔

سورۃ اخلاص سے محبت

۲۱۲۹ : وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلًا عَلَى سَرِيَّةٍ وَكَانَ يَقْرَأُ لِأَصْحَابِهِ فِي صَلَاتِهِمْ فَيَحْتَمُ بِقُلِّ

هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ فَلَمَّا رَجَعُوا ذَكَرُوا ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ سَلُوهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذَلِكَ فَسَأَلُوهُ فَقَالَ لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمَنِ وَأَنَا أَحِبُّ أَنْ أَقْرَأَهَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ أَخْبِرُوهُ أَنَّ اللَّهَ يُحِبُّهُ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۴۷/۱۳ - حديث رقم ۷۳۷۵ - ومسلم فى صحيحه ۵۵۷/۱ حديث رقم (۲۶۳ - ۸۱۳) - والنسائي ۱۷۰/۲ حديث رقم ۹۹۳ -

ترجمہ: ”سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا وہ شخص نماز میں اپنے رفقاء کی امامت بھی کرتا تھا اور (قرأت کو قفل ہو اللہ احد پر ختم کرتا تھا جب وہ واپس آئے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس آدمی سے دریافت کرو کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ ”یہ اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورۃ میں رحمن کی صفت بیان کی گئی ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں کہ اس سورۃ کو پڑھتا ہوں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”اسے خبر کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: عن عائشة رضی اللہ عنہا ان النبی ﷺ بعث رجلاً : یعنی اس کو امیر بنا کر بھیجا۔ (علی سریة : یعنی کسی لشکر پر۔) (و کان یقرأ لأصحابه : گویا کہ وہ ان کا امام تھا۔) (فی صلاتهم ب ”قل هو اللہ احد“) (الاخلاص : ۱) جیسا کہ مصابیح میں ہے۔ فیختم : یعنی نماز میں اپنی قرأت کو ”قل هو اللہ احد“ کے ساتھ ختم کرتا، حصول برکت اور اس سورت کے ساتھ محبت کی وجہ سے یعنی ہر رکعت کے آخر میں فاتحہ کے بعد ہر نماز میں یہ سورت پڑھنا۔ ابن حجر کہتے ہیں : یعنی اپنی قرأت کو فاتحہ کے لئے ختم کرتا۔ یا اس کے کچھ حصہ قرآن کی تلاوت کے بعد پڑھتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے پہلے پر محمول کیا ہے۔ یہ بلا خلاف مکروہ نہیں ہے۔ طیبیؒ کی عبارت یعنی اس کی عادت تھی، وہ اس کو فاتحہ کے بعد پڑھتا تھا، تمام صورتوں کا احتمال ہے۔ ابھی ایک شکل کا ذکر ہوگا جو آنے والی حدیث میں بیان ہوئی ہے یہ زیادہ اولیٰ اس لیے ہے کہ اس کی صحت سند پر اعتماد ہے۔ (فلما راجعوا ذکرُوا ذلك : یعنی جو اس نے کیا۔) (للنبي ﷺ فقال سلوه لای شیء یصنع ذلك : کیا وہ اختصار کے لئے، یا اس کے علاوہ کوئی دوسری سورت یاد نہ تھی، یا کوئی اور وجہ تھی۔) (فسألوه فقال لانها : میں نے اس وجہ سے کیا کہ وہ۔) (صفة الرحمن : شاید کہ رحمن کا ذکر اشارہ ہے کہ اس کا ذکر وسیع رحمت کی امید کا باعث ہے۔

وَأَنَا أَحِبُّ أَنْ أَقْرَأَهَا : کہ یہ کام ہمیشہ کروں۔ جس کو کسی چیز سے محبت ہوتی ہے وہ اکثر اس کا ذکر کرتا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں : ”قل هو اللہ احد“ لا الہ الا اللہ کے معنی میں ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت دو طرح ہے، وہ اکیلا ہے۔ وہ صمد ہے تمام مخلوقات کی حاجات اس کی طرف لوٹتی ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کسی دوسرے صمد کا تصور کیا جائے تو نظام عالم خراب ہو جائے۔ اسی وجہ سے لفظ ”اللہ“ مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ الصمد کو معرّف ذکر کیا ہے، اس لیے کہ لفظ اللہ کی خبر ہے، جملہ متانفہ بیان موجب کے لئے ہے۔ دوسری وجہ : یہاں اللہ کی وحدانیت الوہیت کے لئے ہے، اگر اس کے علاوہ کسی دوسرے الہ کا تصور کیا جائے، تو وہ یا تو اس سے اوپر ہو یا نیچا ہے، قرآن نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے : ﴿لَمْ یُولَدْ﴾ یا اس سے نیچے۔ یہ درست نہیں ہے۔ یہ واضح اشارہ موجود ہے ﴿لَمْ یَلِدْ﴾ یا اس کے مساوی ہو یہ اسی طرح محال ہے۔ اس بات کی طرف اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے : ﴿وَلَمْ یَکُنْ لَهُ کُفُوًا أَحَدٌ﴾ [الاخلاص]۔ (فقال النبی ﷺ أَخْبِرُوهُ ان اللہ یحبہ : اس سورت کے ساتھ محبت کی وجہ سے یا اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ سورت بہت محبوب ہے۔

مازریؒ کہتے ہیں : اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت سے مراد ثواب اور نعمتیں دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ ایک قول ہے کہ بذات خود ثواب اور نعمتیں۔ پہلے قول پر یہ صفات ذات ہیں۔ دوسرے قول پر صفات فعل ہیں۔ بندوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے یہ ہے کہ وہ ان

سے اعراض نہیں کرتا، وہ اس صفت سے پاک ہے۔ ان کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کی اطاعت میں استقامت اختیار کرتے ہیں۔ استقامت محبت کا پھل ہے۔ حقیقی محبت ان کی طرف اللہ تعالیٰ کا متوجہ ہونا ہے۔ تمام وجوہات سے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا مستحق ہے۔ طبی سید کہتے ہیں: محبت کی حقیقت نفس کا لذت والی اشیاء کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے، تو اس کی محبت کو ارادہ ثواب پر یا نفس ثواب پر محمول کریں گے۔ بندوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے میں احتمال ہے کہ وہ بندے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور تمام وجوہات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ اس کا مستحق ہے۔ یا اس سے مراد نفس کی استقامت اس کی اطاعت پر ہے۔ اس سے حاصل کلام پہلی توجیہ کی طرف لوٹتا ہے، کہ استقامت محبت کا پھل ہے۔

۲۱۳۰: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ إِنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَحَبُّ هَذِهِ السُّورَةَ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ قَالَ إِنَّ حَبْلَكَ يَاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ. (رواه الترمذی وروالبخاری معناه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۵۳/۲۔ حدیث رقم ۷۷۴۔ و الترمذی فی السنن ۱۵۶/۵ حدیث رقم ۲۹۰۱۔

ترجمہ: ”حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اس سورۃ یعنی قل هو اللہ احد سے محبت کرتا ہوں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”تمہاری اس سورت سے محبت تمہیں جنت میں داخل کرے گی“ (ترمذی امام بخاری نے اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے۔“

تشریح: وعن انس قال : ان رجلاً : میرک سید کہتے ہیں: اس کا نام کلثوم ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا ”کرزم“ ہے، پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

قال يا رسول الله انى أحب هذه السورة : یعنی اس کی قراءت کرنا اور سننا۔ (قل هو الله احد : اس کی تفسیر ہے یا بدل ہے۔ قال ان حبك اياها ادخلك الجنة : یہ تجھ کو جنت کے بلند درجات میں لے جائے گی۔ طبی سید کہتے ہیں: اگر آپ کہیں کہ اس جواب اور پچھلی حدیث والے جواب میں کیا موافقت ہے؟ ”اخبروہ ان اللہ یحبہ“ میں کہتا ہوں: یہ جواب اس جواب کا نتیجہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا، تو اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔ یہ کلام کی باریکی اور بلاغت ہے، پہلے قول میں صرف سبب پر اکتفاء کیا گیا ہے سبب کو چھوڑ دیا ہے۔ دوسرے میں اس کے برعکس ہے۔ وہ خوبصورتی اور حسن میں بہت زیادہ ہے۔ ابن جریر نے عجیب و غریب بات کہی ہے، اشارہ کا گمان ہے کہ وہاں دخول حقیقی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا ثمرہ اس میں ہے کہ جنت میں دخول اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے بندے کے ساتھ اس کا نتیجہ ہے۔

معناه: اس میں مصنف پر اعتراض ہے، اور اس کا دفاع کیا گیا ہے۔ حسن میں ”حاء“ اور ”ثاء“ کے ساتھ اشارہ ہے۔

میرک سید کہتے ہیں: دونوں ہی حدیث انسؓ بیان کرتے ہیں: ”قال : كان رجل من الأنصار يؤمهم في مسجد قباء. وكان كلما افتتح بسورة يقرأ بها لهم في الصلوة مما يقرأ به افتتح بقل هو الله أحد، حتى يفرغ منها، ثم يقرأ سورة أخرى معها، وكان يصنع ذلك في كل ركعة فكلّمه أصحابه انك تفتح بهذه السورة ثم لاترى انها تجزى حتى تقرأ أخرى، فاما ان تقرأ بها واما ان تدعها وتقرأ أخرى، فقال ما أنا تباركها ان أحببت ان أؤمكم بذلك فعلت وان كرهتم تركت، وكانوا يرون أنه من أفضلهم وكرهوا ان يؤمهم غيره، فلما اتاهم النبي ﷺ أخبروه الخبر فقال : يا فلان ما منعك ان تفعل ما يأمرك به أصحابك؟ وما يملكك على لزوم هذه السورة في كل ركعة فقال : انى أحبها فقال : حبك اياها ادخلك الجنة“۔ پھر کہا کہ آپ جان لیں! اس حدیث کو امام بخاری نے معلق

ذکر کیا ہے، ترمذی نے موصولاً ذکر کیا ہے، اس حدیث کو بزاز اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو حسن صحیح ہے۔

۲۱۳۱: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اَلَمْ تَرَ اَيَاتِ اَنْزَلَتْ لِلْبَيْلَةِ لَمْ يَرِ مَعْلَهُنَّ قَطُّ قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۵۵۷/۱ حديث رقم (۲۶۴ - ۸۱۴)۔ والترمذی في السنن ۱۵۷/۵ حديث رقم ۲۹۰۲۔ والنسائی ۱۵۸/۲ حديث رقم ۹۵۴۔

ترجمہ: ”حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”آج کی رات ایسی عجیب آیتیں اتاری گئی ہیں کہ ان جیسی پہلے نہیں دیکھی گئیں اور وہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہیں۔“ (مسلم)

تشریح: وعن عقبه بن عامر قال : قال رسول الله ﷺ الم تر : اکثر نسخوں میں معروف صیغہ کے ساتھ ہے۔ ابن الملک کہتے ہیں: کہ ”الاراءة“ سے منی علی الجہول ہے یعنی الم تعلم؟ ابن حجر کہتے ہیں: یعنی اے نیک انسان، چونکہ اس کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطاب عام ہے۔ درست بات یہ ہے کہ خطاب راوی کو خاص ہے، اور اس سے مراد عام ہے۔ (آیات انزلت: آیات کی صفت ہے۔

الليلة: ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ طیبی بیحد کہتے ہیں: تعجب ہے اور تعجب کی طرف اشارہ اس قول کے ساتھ ہے۔ لم ير مثلهن: اس باب میں وہ یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے ”رفع مثلهن“۔ ایک نسخہ میں مخاطب کے ساتھ صیغہ فاعل ہے ”نصب مثلهن“ (قط: ماضی منہی کی تاکید کے لئے ہے۔ قل اعوذ برب الفلق [الفلق: ۱] اور قل اعوذ برب الناس) [الناس: ۱] شریر کے شر سے بچنے کے لئے آیات اور پوری سورتیں قاری کے لئے ان سورتوں کی مثل اور نہیں ہیں۔ ظاہر کہ بسم اللہ ان دونوں سورتوں کی آیات میں سے نہیں ہے۔

ہمارے اصحاب میں سے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سورتوں میں فصل کے لئے ہے۔ آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ جنوں اور انسانوں کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے جب یہ سورتیں نازل ہو گئیں، تو آپ ﷺ نے ان کے سوا دوسرے تمام اذکار کو چھوڑ دیا، اور ان کو اپنالیا۔ جب آپ ﷺ پر جادو کیا گیا، تو ان دونوں سورتوں کے ساتھ ہی آپ کو شفاء ملی۔

ابن الملک کہتے ہیں: یہ اس پر دلالت ہے کہ معوذتین قرآن کا حصہ ہیں، بعض اس کے خلاف ہیں یعنی انہوں نے اس کو قرآن پاک کا حصہ شمار نہیں کیا۔ جواہر الفقہ میں ہے: وہ کفر کا مرتکب ہو جس نے معوذتین کا قرآن ہونے سے بغیر تاویل کے انکار کیا۔ بعض متأخرین کہتے ہیں: کافر ہے تاویل کی ہو یا نہ کی ہو۔ بعض فتاویٰ میں معوذتین کا قرآن ہونے سے انکار کرنے پر مشائخ میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ کفر ہے جیسا کہ ”مفتاح السعادة“ میں ہے۔ صحیح بات یہ ہے جو آدمی نے ”خلاصہ“ میں کہی ہے، اس نے کہا: معوذتین قرآن کا حصہ نہیں ہیں، جس نے یہ کہا وہ کفر کا مرتکب نہیں ہے۔ یہ عبد اللہ بن مسعود اور ابی بن کعب سے روایت کیا گیا ہے، انہوں نے کہا ”لیستا من القرآن“ بعض متأخرین کہتے ہیں: وہ کفر کرتا ہے اس لیے کہ یہ اجماع ہے کہ وہ قرآن کا حصہ ہیں۔ پہلا قول صحیح ہے کہ وہ کفر نہیں کرتا۔ اجماع بعد میں ہے شروع میں اختلاف کو دور نہیں کیا گیا۔

ابن حجر کہتے ہیں: حدیث نے اس قول کو فائدہ دیا ہے کہ معوذتین قرآن پاک کا حصہ ہیں، اس پر امت کا اجماع ہے۔ اور جواہر مسعود سے نقل کیا گیا ہے۔ یا تو ان پر جھوٹ ہے یا صحیح ہے۔ جیسا کہ بعض حفاظ نے کہا ہے لیکن انہوں نے اپنے علم کے اعتبار سے نفی کی

ہے، پھر ان کی نفی کے خلاف اجماع بھی ہے۔ اور لفظ ”قل“ جو بسم اللہ کے بعد ہے قرآن پاک کی سورتوں میں یہ قرآن پاک کا حصہ ہیں، اس پر امت کا اجماع ہے۔

سورة الفلق اور سورة الناس کے ذریعے دم کرنا

۲۱۳۲: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَوَىٰ إِلَىٰ فِرَاشِهِ كُلَّ لَيْلَةٍ جَمَعَ كَفَيْهِ ثُمَّ نَفَثَ فِيهِمَا فَقَرَأَ فِيهِمَا قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ وَقُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ثُمَّ يَمْسَحُ بِهِمَا مَا اسْتَطَاعَ مِنْ جَسَدِهِ ه يَدُّهُمَا عَلَىٰ رَأْسِهِ وَوَجْهِهِ وَمَا أَقْبَلَ مِنْ جَسَدِهِ يَفْعَلُ ذَلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ - (متفق عليه) وسند ذكر حديث ابن مسعود لما اسرى برسول الله ﷺ في باب المعراج ان شاء الله تعالى.

اخرجه البخارى فى صحيحه ۶۲/۹ - حديث رقم ۵۰۱۷ - والترمذى فى السنن ۴۴۱/۵ حديث رقم ۳۴۰۲ وابن ماجه ۱۲۷۰/۲ حديث رقم ۳۸۷۵ - واحمد فى المسند ۱۱۶/۶ -

ترجمہ: ”سیدہ عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ روزانہ رات کو جب اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تو اپنے دونوں ہاتھ ملا کر قل هو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر ان پر پھونک مارتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے جسم پر جہاں تک ہو سکتا پھیرتے پہلے آپ ﷺ اپنا ہاتھ اپنے سر منہ اور بدن کے آگے حصہ پر پھیرتے آپ ﷺ کی عمل تین مرتبہ کرتے تھے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن عائشة ان النبي ﷺ كان اذا اوى الى فراشه جمع كفيه ثم نفث فيهما: قصر اور مد کے ساتھ۔

الى فراشه: یعنی آتے اور اس پر ٹھہرتے۔ (کل ليلة جمع كفيه ثم نفث فيهما: کہا گیا ہے کہ نفث سے مراد وہ ہوا جو منہ سے نکالی جاتی ہے، جس کے ساتھ کچھ تراوٹ وغیرہ ہوتی ہے۔ جزری مقابح میں کہتے ہیں: نفث ”نفخ“ کے مشابہ ہے، اور یہ ”نفث“ سے کم ہے۔ ”نفث“ کے ساتھ تھوک وغیرہ ہوتا ہے۔ اس کی موافقت ہدایہ اور قاموس میں ہے۔ (فقراً: یعنی ”نفث“ کے بعد۔) (فيهما: دونوں ہتھیلیوں میں۔) (قل هو الله أحد“ [الاخلاص: ا] و ”قل اعوذ برب الفلق“ [الفلق: ا] و ”قل اعوذ برب الناس“ [الناس: ا]:) طیبی بیحد کہتے ہیں: اس حدیث میں دلالت ہے کہ نفث قراءت سے پہلے ہے۔ ایک قول ہے: جادو کی مخالفت ہے، یا معنی یہ ہے یا بمعنی پھر ”نفث“ کا ارادہ کیا، پھر پڑھا، پھر ”نفث“ والا عمل کیا۔ مصابیح کے بعض شارحین نے کہا ہے۔ صحیح بخاری میں قراءت ہے اور یہی بہتر ہے کیونکہ ”نفث“ کی قراءت پر تقدیم اس بحث میں سے ہے ج کسی نے نہیں کہی۔ یہ واؤ سے نہیں ”حاء“ سے لازم آتا ہے۔ یا ”فاء“ راوی یا کاتب کا سہواً (بھول) ہے۔

ابن الملک کہتے ہیں: راویوں نے غلطی کی ہے جو انہوں نے ان کے لے رائے سے پیش کیا اس نے غلطی کی اس سے عدول کر کے انہوں نے غلطی کی ہے۔ کیوں نہیں، انہوں نے اس ”فا“ کو اس پر قیاس کیا جو اس قول میں ہے: ﴿فاذا قرأت القرآن فاستعذ بالله﴾ [النحل: ۹۸] [فعبوا الى بارئکم] [البقرة: ۱۰۴] اس پر کہ توبہ قتل سے مؤخر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اپنی ہتھیلیوں کو اکٹھا کیا، پھر ان دونوں میں پھونکا، پھر اس پر پڑھا (قراءت کی)، رہا یہ قول کہ توبہ قتل سے مؤخر ہے، اس کی کوئی وجہ نہیں، چونکہ ان کی توبہ کی علامت تھی یا شرط تھی۔ ابن حجر کہتے ہیں: ”ثم“ کے ساتھ عطف ان دونوں میں ”نفث“ کی ترتیب کے لے ہے، پھر ”فاء“ ہے تاکہ بتلایا جائے یہ نفث اکیلا نہیں ”ریق“ کے ساتھ ہے۔ اور قراءت بھی ساتھ ہے۔ یہ ابتدائے نفث پر مرتب اور بقیہ کے ساتھ ملانے کے لئے ہے۔ طیبی بیحد کہتے ہیں: اس نے دعویٰ کیا ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث واؤ کے ساتھ مردود ہے، چونکہ اس میں ”فاء“ کے ساتھ ہے۔

احتمال ہے کہ صحیح نسخہ میں ہو، ثبت منفی پر مقدم ہے۔ (ثم یمسح بہما ما استطاع من جسده یبدأ : بیان کے لئے یا یسمع سے بدل ہے۔) (بہما : یعنی ان دونوں کو چھونے کی وجہ سے۔) (علی رأسہ ووجہہ وما اقبل من جسده : یعنی یا اس کے الٹ ہے۔) (یفعل ذلك ثلاث مرات : متفق علیہ : جزری حصن میں کہتے ہیں : اسے امام بخاری اور چاروں ائمہ نے روایت کیا ہے۔) واللہ اعلم

وسند کر حدیث، ابن مسعود لما أسری برسول اللہ ﷺ فی باب المعراج ان شاء اللہ تعالیٰ : یا تو وہ تکرار کی وجہ سے یا وہ اس باب میں زیادہ لائق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میں یہاں حدیث کو شرح کے ساتھ ذکر کرتا ہوں جو مصابیح میں نہیں ہے۔ وہ حدیث ابن الملک نے بیان کی ہے کتاب کے فائدہ کے تتر کے لئے ہے۔ لما أسری برسول اللہ ﷺ - ”اسری یسر اذا سوری لیلاً“ یہاں مراد لیلۃ المعراج ہے۔ اس کی انتہاء سدرة المنتہیٰ تک ہے۔ یہ جنت میں درخت ہے جہاں اولین و آخرین کے علم کی اتہمی ہو جاتی ہے۔ اس سے کوئی آگے نہیں بڑھتے، یا بندوں کے اعمال، یا سیر کرنے والوں کے نفوس ملا الاعلیٰ میں۔ وہ وہاں لوگوں کی اجتماعی مجلسوں میں جمع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ آپ ﷺ کو تین چیزیں دی گئیں۔ پانچ نمازیں، خواہ تم، سورۃ البقرۃ، اور ہر اس شخص کی مغفرت کر دی گئی جو اللہ تعالیٰ کے ذرہ برابر بھی شرک نہیں کرتا، یعنی آپ ﷺ کو اپنے امت کے اہل کبار کے متعلق سفارش عطا کی گئی ہے۔

الفصل الثانی:

۲۱۳۳: عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ ثَلَاثَةٌ تَحْتَ الْعُرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْقُرْآنُ يُحَاجُّ الْعِبَادَةَ ظَهْرُهُ وَبَطْنُهُ وَالْأَمَانَةُ وَالرَّحِمُ تُنَادِي أَلَا مَنْ وَصَلَنِي وَصَلَهُ اللَّهُ وَمَنْ قَطَعَنِي قَطَعَهُ اللَّهُ. (رواه فی شرح السنۃ)

اخرجه البغوی فی شرح اسئلۃ ۲۲/۱۳ حدیث رقم ۳۴۳۳۔

ترجمہ: ”حضرت عبدالرحمن بن عوف“ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تین چیزیں قیامت کے دن عرش کے نیچے ہوں گی ایک تو قرآن جو بندوں سے جھگڑے گا اور قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن دوسری چیز امانت ہوگی تیسری چیز رحم ہوگا جو پکارے گا، خبردار: جس شخص نے مجھے بلایا (یعنی میرے حق کی رعایت کی بایں طور کہ میرے احکام کی فرمانبرداری کی جو حق اس پر ہے اسے اداء کیا) تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ملائے گا اور جس شخص نے مجھے قطع کیا تو اللہ تعالیٰ بھی اس شخص کو قطع کرے گا۔“

تشریح: عن عبد الرحمن بن عوف عن النبي ﷺ قال : ثلاثة : اشیاء یا اعمال۔ (تحت العرش يوم القيامة : یعنی جس دن لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے۔) (القران : اس کو مقدم کیا گیا، کیونکہ وہ رتبہ اور عظمت کے لحاظ سے جلیل القدر ہے، اسی لئے اس کے اور معطوف کے درمیان فاصلہ ہے۔ بقولہ (يحاج العباد : وہ ان سے اس بارے میں جھگڑا کرے گا، جو انہوں نے ضائع کیا ہوگا اور اس کے احکام اور حدود سے اعراض انہوں نے کیا ہے، یا وہ ان سے جھگڑا اور خصامت ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے کرے گا، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ یا اپنے اصحاب کے بارے میں جھگڑا کرے گا، جیسا کہ حدیث میں ہے : ”القران حجة لك أو عليك. عباد كونب نزع عن الخافض کی وجہ سے ہے۔

لہ : یعنی قرآن مجید۔ (ظہر : ظاہر معنی جو غور و فکر سے خالی ہے۔ اکثر لوگ اس کو سمجھتے ہیں حالانکہ اکثر طور ان کے پاس سمجھنے کے قواعد و ضوابط نہیں ہوتے۔) (وبطن : یعنی خفیہ معنی جس میں خفیہ اشارات کی مدد سے تاویل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو خاص علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جو اپنی استعداد اور امداد حصول کے ساتھ سمجھتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کے ظاہر سے مراد تلاوت کرنا جیسے وہ نازل ہوا ہے

اور بطن سے مراد مذہب ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: ظاہر سے مراد جس میں مکلفین ایمان اور عمل اور جوان کا تقاضہ ہے، اس میں برابر ہیں، اور بطن سے مراد جو بندوں میں فہم کا تفاوت ہے۔ اس کے بعد جو قول ہے ”یحاج العباد بقوله ظهر و بطن“ اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر ایک اتنی مقدار طلب کرے جو اس کے پاس سیکھنے کی اور سمجھنے کی استطاعت کتاب اللہ کی ہے، جملہ حالیہ ہے، جو یحاج کی ضمیر سے ہے، یعنی جس نے ظواہر اور اس کے بواطن کی پیروی کی۔ یعنی اس نے بعض حقوق ربوبیت اداء کیے۔ جس نے اس کو قائم کیا، تو وہ اس وجہ افضل ہے۔ الامانة: یہ ہر وہ حق جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یا ایسی چیز جس کا اداء کرنا افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر ہے ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الاحزاب: ۷۲]، یا اللہ تعالیٰ کے واجب حقوق میں سے ہے، چونکہ یہ اہم ہے۔ (و الرحمن: استعارة) لوگوں میں قربت کے لئے لیا گیا ہے۔ (تنادی: تانیث کے صیغہ کے ساتھ، یعنی صلہ رحمی کی قربت یا ہر ایک جس کا تعلق رحم اور امانت سے ہے۔ ایک قول ہے، ہر ایک کا تعلق تین سے ہے۔) (الآ: صرف تنبیہ ہے۔) (من وصلنی وصلہ اللہ یعنی رحمت۔

ومن قطعنی قطعہ اللہ: یعنی جو اس سے اعراض کرے گا۔ اس میں خبر اور دعا کا احتمال ہے۔

قاضی نے اس قول کے متعلق کہا ہے: ”ثلاثة تحت العرش“، یعنی اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا اجر ہے۔ جو اس پر محافظت کرے گا وہ اس کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔ یا وہ اس کو معاف نہیں کرے جس نے ان کا ضائع کیا۔ یا ان سے اعراض کیا۔ ان مقربین کا حال ہے جو بادشاہوں کے تحت کے پاس ہوتے ہیں۔ ان سے ملنا اور ان سے اعراض کرنا، شکر اداء کرنا، ان کی شکایات کرنا اس کی بہت تاثیر ہوتی ہے۔ ان تینوں کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، کیونکہ انسان جو بھی کام کرتا ہے یا تو اس کا تعلق اللہ اور بندے کے ساتھ ہے، کسی غیر کا اس میں کوئی تعلق نہیں، یا اس کے اور عامل لوگوں کے درمیان ہو یا اس کے اور اس کے عزیز و اقارب اور اہل کے درمیان ہو۔ قرآن اسے حق ربوبیت کی ادائیگی کی طرف چلاتا ہے، امانت عام لوگوں کو شامل ہے۔ ان کے خون، اموال، ان کی عزتیں اور تمام حقوق ان کے درمیان امانتیں ہیں، جس نے ان کو قائم کیا، اس نے عدل کیا۔ جس نے صلہ رحمی کو ملایا، اقارب کا خیال رکھا، یعنی ان کے ساتھ دنیاوی امور میں اور دینی میں احسان کیا، تو اس نے ان کے حقوق کو ادا کر دیا۔ قرآن کو مقدم رکھنے کی وجہ اس لئے کہ حقوق اعظم ہیں، اور دوسروں دونوں کو بھی شامل ہے۔ اس کے بعد امانت ہے، وہ رحم سے اعظم ہے اور وہ ادا اسے حق رحم پر مشتمل ہے، اور رحم کو صراحتاً ذکر کیا گیا ہے، یہ پہلے دو حکموں کو شامل ہے، اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ حقوق العباد کا بہت زیادہ خیال رکھو۔

جزری کہتے ہیں: اس کی اسناد میں کثیر بن عبد اللہ ہے وہ بہت کمزور ہے۔

۲۱۳۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اِقْرَأْ وَاَرْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا

كُنْتَ تُرْتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنَزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرُؤُهَا۔ (رواه احمد والترمذی و ابو داود او لنسائی)

احرجہ ابو داؤد فی السنن ۱۵۳۱۲ حدیث رقم ۱۴۶۴۔ والترمذی ۱۷۷۱۵ حدیث رقم ۲۹۱۴۔ واحمد فی المسند ۱۹۲/۲۔

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ” (قیامت کے دن)

صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور پڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا پس

جہاں تو آخری آیت پڑھے گا وہیں تیری منزل ہوگی۔“ (احمد ترمذی ابو داؤد نسائی)

تشریح: وعن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ يقال: یعنی جنت میں داخل ہونے کے وقت۔ عالمین کو

ان کے اعمال کے مراتب کے لحاظ متوجہ کیا جائے گا۔ (لصاحب القرآن: یعنی جو تلاوت کرنا اور اس پر عمل کرنے کو لازم سمجھتا ہے نہ کہ وہ

جو اس کو پڑھتا ہے اور وہ اس پر لعنت کرتا ہے۔) (اقرا و ارتق: یعنی جنت کے درجات کی طرف یا قرب کے مراتب کی طرف۔ ورتل:

یعنی جنت میں اپنی قراءت پر جلدی نہ کر یہ صرف لذت کے لئے ہے۔ اور بہت بڑا شہود ہے جیسے فرشتوں کی عبادت۔ کما کنت ترتل : یعنی تیری قراءت۔ اس میں اشارہ ہے کہ اعمال کی جزاء کیت او کیفیت کے اعتبار سے ہے۔ (فی الدنيا : تجوید حروف، علوم قرآن اور معارف قرآن کی معرفت کے ساتھ۔

فان منزلک عند آخر آیة تقرؤھا : حدیث میں وارد ہے کہ جنت کے درجات قرآن پاک کی آیات کی گنتی کے برابر ہیں۔ حدیث میں ہے: "من اهل القرآن فلیس فوقه درجۃ فالقراء یتصاعدون بقدرھا"۔ دانی کہتا ہے: اس بات پر اجماع ہے کہ تعداد آیات (6000) ہے۔ پھر اس سے زیادہ ہونے میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے: (204) آیات ہیں۔ ایک قول پندرہ، ایک قول انیس۔ ایک قول (25) ایک قول (36) آیات ہیں۔ دیلمی والی حدیث کی سند میں کذاب راوی ہے۔ جنت کے درجات قرآن مجید کی آیات کے برابر ہیں۔ ہر آیت کے بدلے درجہ ہے۔ آیات کی تعداد 6 ہزار 2 سو سولہ ہے۔ ہر درجہ کے درمیان زمین و آسمان جتنا فاصلہ ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: چڑھنے سے مراد وہ ہمیشہ چڑھتا جائے گا۔ جب اس کی قراءت اختتام کے قریب پہنچے گی، تو وہ دوبارہ شروع کر دے گا، جس کا کوئی انقطاع نہیں، وہ اسی طرح قراءت کرتا ہوا چڑھتا جائے گا، جس کی کوئی انتہاء نہیں۔ یہ اس کی قراءت فرشتوں کی تسبیح کی طرح ہے، یہ تسبیح کی لذت بڑی عظیم ہے، یہ ان کو کسی اور کام میں مشغول نہیں کرتی۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس حدیث سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ عظیم ثواب حافظ قرآن کو حاصل ہوگا، جس نے اس کی اداء اور قراءت کو پختہ کیا، جیسے اس کی شایان شان ہے۔ اگر آپ کہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ صرف حافظ کے لیے ہے، وہ شخص نہیں جس نے مصحف کی قراءت کو لازم پکڑا۔ میں کہتا ہوں: اصل میں جنت میں اس کی حکایت کی گئی ہے، جو وہ دنیا میں کرتا تھا۔ (فی الدنيا : اس پر صرت ہے کہ اس کا قراءت کو لازم اختیار کرنا محل نظر ہے، اس کو مطلق حافظ قرآن نہیں کہا جاسکتا۔ یہ صرف اس کو کہا جائے گا جو کسی بھی حالت میں قرآن سے جدا نہیں ہوتا۔ احمد کی روایت میں ہے کہ صاحب قرآن سے کہا جائے گا: "اذ دخل الجنة اقرأوا صدع، فبقراً ویصد بکل آیة درجۃ حتی یقرأ شیاً معہ"۔ "معہ" اس بات کی صراحت ہے کہ وہ حافظ ہو۔

رامہرمزی نے حدیث نقل کی ہے: "فاذا قام صاحب القرآن یقراتہ اثناء اللیل و اثناء النہار ذکرہ وان لم یقم بہ نسیہ"۔ بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے: "من قرأ ثم مات قبل ان یتظہرہ اتاہ ملک لیعلمہ فی قبرہ ویلقی اللہ وقد استظہرہ"۔ طبرانی اور بیہقی کی حدیث میں ہے: "من قرأ القرآن وهو یتلف منہ ولا یدعہ فلہ اجرہ مرتین، ومن کان حریصاً علیہ ولا یتطیعہ ولا یدعہ بعثہ اللہ یوم القیامۃ مع اشراف اہلہ"۔ حاکم وغیرہ نے روایت بیان کی ہے: "من قرأ القرآن فقد استدرج النبوة بین جنیہ غیرانہ لا یوحی الیہ لا ینبغی لصاحب القرآن ان یجھل مع من یجھل وفی جوفہ کلام اللہ"۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس کی منزلت جو حدیث میں ہے تو بندہ اس کو حفظ میں اور تلاوت جو منزلت ہوگی، اس اعتبار سے ہوگا اس کے علاوہ نہیں، یہ ہم نے اصل دین سے سمجھا ہے۔ کتاب اللہ پر عمل کرنے والا۔ اور اس پر تدریک کرنے والا حافظ سے بہتر ہے، جب وہ (حافظ) عمل اور تدریک کرے۔ صحابہ کرام میں صدیقؓ سے زیادہ حافظ کون تھا؟ اور اکثر تلاوت ان سے ثابت ہے۔ وہ ان سے مطلق افضل ہیں۔ اس لئے کہ ان پر اس کے علم میں سبقت، تدریک اور عمل میں سبقت کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم دوسرے کی طرف جائیں، تو وہ دو جہتوں کے ساتھ مکمل ہے۔ درجات سے مراد آیات کے ساتھ ان کا مستحق ہوگا، تو اس وقت تلاوت کی مقدار عمل کے برابر ہے۔ کوئی بھی

ایک آیت پڑھنے کی تلاوت کرے استطاع نہیں رکھتا، مگر جس نے اس کے وجوہات کا لحاظ رکھا، اور اس کے استکمال کو ملحوظ رکھا۔ یہ نبی ﷺ کے لئے ہے پھر اس کے بعد آپ ﷺ کی امت کے لیے ہے، ان کے مراتب و منازل دین میں اور معرفت یقین کے ساتھ ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اس کی قراءت کی مقدار کو تدبر اور عمل کے لحاظ سے لازم کر لیا۔

یہ انتہا درجے کی خوبصورتی اور حسن ہے۔ نہایت درجے کی وضاحت اور جلاء ہے۔ ابن حجرؒ کے طعن اور کلام میں تضعیف کی کوئی حیثیت نہیں۔ انہوں نے اس کو تکلف اور حدیث کے ظاہر کے منافی قرار دیا ہے۔ پس تحقیق جیسا کہ حدیث سے مستفاد ہے، اور ان من عمل بالقرآن فکانہ یقرآء ہ دائماً وان لم یقرآء ومن لم یعمل بالقرآن فکانہ لم یقرآء وان قرآءہ دائماً۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقُرْآنُ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل عقل نصیحت پکڑیں“ صرف تلاوت اور حفظ کا اعتبار نہیں کہ اس پر جنت عالیہ کے مراتب ملیں گے۔

هذا حدیث حسن صحیح: اسی طرح امام ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے حسن درجے کی روایت بیان کی ہے: ”فیقول القرآن یارب : حلہ فیلبس تاج الکرامة فیقول یارب زدہ فیلبس حلہ الکرامة فیقول یارب ارض عنہ فیرضی عنہ ویقال له اقرأ وارق“۔

قرآن کریم سے خالی دل ویران گھر کی طرح ہے

۲۱۳۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الَّذِي لَيْسَ فِي جَوْفِهِ شَيْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ كَالْبَيْتِ الْخَرِبِ . (رواه الترمذی والداری وقال الترمذی هذا حدیث صحیح)

ترجمہ: ”حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص کے دل میں قرآن کا کچھ حصہ نہ ہو تو وہ ویران گھر کی طرح ہے۔“ (ترمذی داری) امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔“

تشریح: وعن ابن عباس قال : قال رسول الله ﷺ ، ان الذي ليس في جوفه : یعنی اس کا دل۔ شئیء من القرآن كالبيت الخرب : ”خاء“ کے فتح اور راء کے کسرہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں ہے۔ یعنی خواب، چونکہ دل کی آبادی ایمان کے ساتھ ہے۔ قراءۃ قرآن، باطن کو اعتقادات حق کے ساتھ مزین کر کے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور و فکر کرنے کے ساتھ ہے۔ طیبی کہتے ہیں: جوف کا اطلاق کر کے دل مراد لیا ہے۔ یہ اسم عمل کا اطلاق ہے حال پر اور کبھی کبھی حقیقی معنی کے لیے بھی مستعمل ہے۔ ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه [الاحزاب : ۴] : اس کو ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے تھی، تاکہ تشبیہ خراب گھر کے ساتھ مکمل ہو جائے۔ بے شک قرآن کا جوف میں جمع کرنا، گویا اس کو آباد کرنا اور اس کی قلت و کثرت کے لحاظ سے مزین کرنا ہے۔ جب اس سے خالی ہوگا، تو گویا تصدیق، اعتقاد حق، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تفکر اور اس کی محبت و صفات سے خالی ہوگا جس کے بغیر چارہ نہیں، اس وقت یہ دل اُجڑے گھر کی طرح ہے، جو خوبصورتی اور تجمل سے فارغ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب قرآن سے گھر خالی ہو، تو اس پر خراب کا ظہور ہوگا۔ ابن حجرؒ نے اس پہلو سے غفلت برتی ہے اور غفلت پر آمین کی نفی اور اثبات پر محمول کیا ہے، اور ایسا اعتراض کیا ہے جو اس کے مناسب نہیں ہے۔

۲۱۳۶: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالَى مَنْ شَعَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِي

وَمَسْأَلَتِي أَعْطَيْتُهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِيَ السَّائِلِينَ وَفَضَّلُ كَلَامِ اللَّهِ تَعَالَى عَلَى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللَّهِ عَلَى خَلْقِهِ .

(رواه الترمذی والدارمی والبيهقی فی شعب الايمان وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب)

انخرجه الترمذی فی السنن ۱۸۴/۵ - حديث رقم ۲۹۲۶ - والدارمی فی السنن ۵۳۳/۲ - حديث رقم ۳۳۵۶ -

ترجمہ: ”حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ بزرگ و برتر فرماتا ہے کہ جس شخص کو قرآن کریم میرے ذکر اور مجھ سے مانگنے سے مشغول رکھتا ہے تو میں اس کو اس چیز سے بہتر عطا کرتا ہوں جو سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور کلام اللہ کو دیگر تمام کلاموں کے مقابلہ میں وہی عظمت و بزرگی حاصل ہے جو اللہ رب العزت کو اس کی تمام مخلوقات پر بزرگی اور برتری حاصل ہے۔ ترمذی داری، بیہقی نیز امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔“

تشریح: وعن أبي سعيد الخدري قال : قال رسول الله ﷺ يقول رب تبارك وتعالى من شغله القرآن :

یعنی اس کو حفظ کیا، معانی پر تدبر کیا، اور اس کے احکامات پر عمل کیا۔

عن ذکری ومسألتي أعطيته : صیغہ متکلم کے ساتھ۔ ایک قول ہے: قرآن کو اپنے واجبات اور حقوق کے ساتھ قائم کیا، مسألتي عطف تفسیری ہے۔ شیخ عارف ابو عبد اللہ بن خفیف قدس اللہ سرہ سے منقول ہے کہ شغل قرآن سے مراد اس کے واجبات کو قائم کرنا یعنی فرائض کو بجالانا اور مجاہد سے اجتناب کرنا ہے، جب آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے، گویا کہ یہ اس کا ذکر ہے اگرچہ وہ صوم و صلاۃ بھی ادا کرے، اگر وہ اس کی نافرمانی کرے گا، وہ اس کو بھلا دے گا، اگرچہ اس کی نمازیں اور روزے کثرت کے ساتھ ہوں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ذکر اور مسئلہ سے مراد وہ دونوں قرآن میں نہیں ہیں، جیسے دعوات وغیرہ اس قول کے قرینہ سے:

وفضل كلام الله : یہ الکلام الہی پر دلالت ہے، اس کا شرف مدلول کے اعتبار سے ہے۔

علی سائر الکلام کفضل الله علی خلقه : جس طرح اعتقال اور المشتغل بہ کی فضیلت کسی دوسرے پر ہے۔ ذاکرین اور سائلین کے ذکر سے مستغنی کرنے کی وجہ کہ وہ بالجملہ سائل بالفعل اور بالقوة ہیں، جب کہ زبان کا حال کہ ہر مخلوق ناطق ہے، کہ وہ اچھی نعمت کی طرف اس کو پھیلانے کی محتاج ہے، اس کی ایجاد کے بعد۔ یہ فضیلت اسی لحاظ سے ہے مگر اس کا مکمل جو اس کے علاوہ اذکار اور ادعیہ مذکورہ مشروع نہیں ہیں۔ حدیث میں قرآن کے مقدم ہونے کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ وہ محدثین اور مفسرین کا مذہب ہے، اور مخالف محدثین پر رد ہے۔

میرک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اس کا احتمال ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کے قول کا تتمہ ہو، تو اس وقت اس میں التفات ہے، جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ وہ نبی ﷺ کا کلام ہو یہ زیادہ واضح ہے، چونکہ التفات کا مرتکب ہونے کی ضرورت نہیں۔ امام بخاری سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ ابوسعید خدری کا کلام ہے۔ اس کو حدیث میں مدرج ذکر کیا ہے۔ مرفوع ہونا ثابت نہیں۔

عسقلانی کہتے ہیں: عطیہ عوضی کے سوا تمام راوی ثقہ ہیں، اس راوی میں ضوف ہے۔

وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب : میرک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: داری میں یہ الفاظ ہیں: ”من شغله ذکری عن مسألتي“۔ ”ذکری“ سے مراد معنی عام ہے یا خاص، وہ ظاہر ہے کہ جمع السب ہے، یہ استفادہ اضافت تشریفیہ سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿هَذَا ذِكْرُ مَبَارَكٍ أَنْزَلْنَاهُ﴾ [الانبیاء: ۵۰]۔

۲۱۳۷: وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ

بِعَشْرِ امْتَالِهَا لَا اَقُولُ اَلَمْ حَرْفٌ اِلْفُ حَرْفٌ وَلَا م حَرْفٌ وَمِيمٌ حَرْفٌ .

(رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۵/۵ حدیث رقم ۲۹۱۰۔ والدارمی فی السنن ۵۲۱/۲ حدیث رقم ۳۳۰۸۔

ترجمہ: ”حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص قرآن کا ایک حرف پڑھے تو اس کے لئے ہر حرف کے عوض ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے میں یہ نہیں کہتا کہ سارا اَلَمْ ایک حرف ہے الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے (ترمذی دارمی) اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن صحیح غریب ہے۔“

تشریح: وعن ابن مسعود قال : قال رسول الله ﷺ من قرأ حرفاً : یعنی آنے والے حرف سے جو جدا ہونے کے قابل یا یہ تشبیہاً مراد ہے۔

من كتاب الله : یعنی قرآن پاک۔ فله به حسنة : یعنی عطیہ۔

والحسنة بشر امثالها : یعنی اس کو دس گنا بڑھایا جاتا ہے۔ یہ سب سے کم بڑھانا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرمان ہے:

﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَا﴾ [الانعام : ۱۶۰] ﴿وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ [البقرة : ۲۶۱] حرف کا اطلاق

مطلق حروفِ تجزی اور معانی پر ہے۔ جملہ مفیدہ اور مختلف کلمات اس کی قراءت میں ہیں، اور مطلق کلمہ ہے اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا۔

لا أقول اَلَمْ حرف الف : مکائی اعراب کے ساتھ سکون پر مبنی ہے۔ ایک قول توین کے ساتھ ہے۔

حرف، ولام حف، ومیم حرف : طیبی پر یہ کہتے ہیں: ”مسی“ ”الف“ حرف ہے۔ اسم تین حروف پر ہوتا ہے۔ اسی طرح

مسی میم اور ”مہ“ حرف ہے۔ جب اس کو مقرر کیا، تو لفظ میم اس مسی کے لئے قرار دیا گیا، حرف کو حدیث میں مجازی طور پر مذکورات پر

محمول کیا گیا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے قول: ”ضرب الله مثلاً“ ان میں سے ہر ایک ”ض، ر، ب“ اس پر اگر مراد الم سے سورۃ

الفیل کا آغاز ہو تو نیکیوں کی تعداد تیس ہوگی۔ اگر مراد سورۃ البقرۃ یا اس کے ہم مثل سورتیں ہوں تو گنتی نوے (90) ہے۔ سورہ فیل کے

شروع میں جو حروف ہیں، ان نیکیوں کی تعداد تیس ہے جیسا کہ وہ مختصر عبارت ہے۔ یہ مراد نہیں کہ لفظ حدیث دونوں کو مشتمل ہے۔ چونکہ

ابن ابی شیبہ اور طبرانی کی روایت میں صراحتاً ہے: ”من قرأ حرفاً من القرآن كتب له به حسنة له أقول (اتم ذلك الكتاب)

ولكن الالف، واللام والميم، والذال، واللام، والكاف“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حساب میں اعتبار حروف کا ہے لفظوں کا نہیں

ہے۔ بہت سی روایت میں ہے:

”لا أقول بسم الله ولكن باء وسين وميم. ولا أقول اَلَمْ ولكن الالف، واللام، والميم.“

یعنی اس کا متن غریب نہیں، بس سند غریب ہے اور کہا کہ بعض نے اس کو موقوف قرار دیا ہے۔

قرآن پر عمل باعث نجات ہے

۲۱۳۸: وَعَنِ الْحَارِثِ الْأَعْوَرِ قَالَ مَرَرْتُ فِي الْمَسْجِدِ فَإِذَا النَّاسُ يَخْوَضُونَ فِي الْأَحَادِيثِ فَدَخَلْتُ

عَلَى عَلِيٍّ فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ أَوْ قَدْ فَعَلُواهَا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ أَمَا إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ الْإِنِّهَا

سَتَكُونُ فِتْنَةً قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ كِتَابُ اللَّهِ فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَيْرٌ مَا بَعْدَكُمْ

وَحُكْمٌ مَا بَيْنَكُمْ هُوَ الْفُضْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلُ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللَّهُ وَمَنْ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ

أَصَلَّهُ اللَّهُ وَهُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَتِينُ وَهُوَ ذِكْرُ الْحَكِيمِ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ وَهُوَ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ
الْأَهْوَاءُ لَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ وَلَا يَسْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا يَنْقُضِي عَجَابُهُ هُوَ
الَّذِي لَمْ تَنْتَهِ الْجِنَّ إِذَا سَمِعَتْهُ حَتَّى قَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرَّشِيدِ فَأَمَّا بِهِ مَنْ قَالَ بِهِ
صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ أُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هَلَاىَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ -

(رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث اسناده مجهول وفي الحارث مقال)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۸/۵ حدیث رقم ۲۹۰۶۔ والدارمی ۵۲۶/۲ حدیث رقم ۳۳۳۱۔

ترجمہ: ”حضرت حارث اعور سے روایت ہے کہ میں مسجد میں سے گزرا تو لوگ احادیث میں بحث کر رہے تھے میں
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اس کے بارے میں بتایا، انہوں نے فرمایا ”کیا انہوں نے
واقعی ایسا کیا ہے میں نے کہا ”جی ہاں!“ انہوں نے فرمایا ”تو پھر سن لو! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا
ہے کہ خبردار! عنقریب ایک فتنہ واقع ہوگا میں نے عرض کیا کہ ”حضرت ﷺ پھر اس سے نجات پانے کا کیا راستہ ہے؟
آپ ﷺ نے فرمایا ”کتاب اللہ جس میں امم سابقہ کے احوال ہیں اور ان باتوں کی بھی خبر دی گئی ہے جو تمہارے بعد
واقع ہونے والی ہیں اور اس قرآن میں وہ احکام بھی مذکور ہیں جو تمہارے درمیان ہیں ایمان کفر، اطاعت و گناہ حلال و
حرام اور اسلام کے شرائع نیز آپس کے تمام معاملات وغیرہ کے بارے میں احکام بیان کئے گئے ہیں جو پوری انسانی
برادری کے لئے ضروری ہیں اور وہ کتاب حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے وہ کوئی بیکار و لالی چیز نہیں ہے
اور جس متکبر نے قرآن کو چھوڑ دیا اس کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر ڈالے گا اور جو شخص اس قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز سے
ہدایت و روشنی چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا وہ قرآن اللہ کی مضبوط سیدھی رسی ہے قرآن ذکر حکیم ہے۔ قرآن
بالکل سیدھا اور صاف راستہ ہے قرآن وہ سرچشمہ ہدایت ہے جس کے اتباع کے نتیجے میں خواہشات انسانی حق سے
باطل کی طرف مائل نہیں ہوتیں اور زبانیں التباس کا شکار نہیں ہوتیں علماء اس سے سیر نہیں ہوتے اور مزاوت سے پرانا
نہیں ہوتا اور نہ اس کے عجائب ختم ہوتے ہیں قرآن کریم وہ کلام ہے جس کو جنات نے سنا تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے کہ ہم
نے قرآن سنا جو ہدایت کی عجیب راہ دکھاتا ہے لہذا ہم اس پر ایمان لائے جس شخص نے قرآن کے مطابق کہا اس نے سچ
کہا اور جس نے اس پر عمل کیا اسے ثواب دیا جائے گا جس شخص نے قرآن کے مطابق فیصلہ و انصاف کیا اور جس نے
اس کی طرف بلا یا اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی ہے داری اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند مجہول ہے اور اس
کے راوی حارث اعور کے بارے میں کلام ہے۔“

تشریح: وعن الحارث الاعور: اصحاب علیؑ میں سے تابعی ہے۔

قال مررت فی المسجد: یعنی ان لوگوں کے پاس جو مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ طبری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ”فی المسجد“:

ظرف ہے اور ”الممرور بہ“ محذوف ہے، اس پر یہ قول دلالت کر رہا ہے

فاذا الناس یخوضون یعنی داخل ہو رہے تھے۔ دخول میں مبالغہ ہے۔

فی الأحادیث: یعنی لوگوں کی وہ باتیں جو بے کار، حکایات اور قصص پر مشتمل ہوں، اور وہ قرآن کی تلاوت کو ترک کیے ہوئے

تھے۔ اور اس چیز کو جو اذکار، آثار اور انوار برہان کا تقاضہ تھا۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: ظاہر یہ ہے کہ احادیث سے مراد صفات متشابہ ہیں، اس ظہور کی وجہ واضح نہیں ہے، یا وہ احادیث نبویہ کی بحث میں مبالغہ کرتے تھے، اور آیات قرآنی کے ساتھ کو ترک کر دیتے تھے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: الخوض، الشروع فی الماء والمرور فیہ اور شروع کے لئے مستعار ہے۔ اکثر جو قرآن میں ذکر ہے اس میں شروع کی مذمت ہے۔

فدخلت علی علی رضی اللہ عنہ: خاص کرنے کی وجہ شاید ان کی خلافت ہے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کو اپنے اس قول سے ممتاز کرنا مقصود ہے

أنا مدینة العلم وعلی بابها) اس کے خلاف ہے جس نے کہا کہ وہ موضوع ہے، یا جس نے ضعیف قرار دیا، مگر اس اعتبار سے کہ اس کے طرق میں افراد ہے، جیسے ابن حجرؒ نے ذکر کیا۔

فأخبرته: یعنی خبر۔ فقالہ، أو قد فعلوها: یعنی قرآن کو چھوڑ دو، تو انہوں نے چھوڑ دیا، یعنی وہ بے کار باتوں میں مشغول ہو گئے، یا مقدر مانا جائے کہ وہ منکرات کو سرانجام دینے لگے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کہ انہوں نے اس فتیح فعل کا ارتکاب کیا، باطل باتوں میں پڑ گئے، ہمزہ اور واو عاطفہ ”فعل منکر“ کی دعوے دار ہیں۔ جس پر عطف ڈالا گیا ہے۔ یعنی انہوں نے اُس برے کام کو سرانجام دیا۔

قلت نعم، قال أما: تنبیہ کے لئے ہے۔

إنی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ألا: تنبیہ کے لئے ہے۔

انہا: یعنی قصہ اور اس کے بیان کے لئے ہے۔

ستكون فتنة: یعنی بہت بڑا اور عام آزمائش ہوگی۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: کہ فتنہ سے مراد جو صحابہ کرام کے درمیان واقع ہوا یا تاتاریوں کا خروج یا دجال کا خروج ہے یا جانور کا ظاہر ہونا ہے۔ پہلا قول یہاں غیر مناسب ہے۔

قلت: ما المخرج منها: یعنی اس سے نکلنے اور بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ اے اللہ کے رسول! طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: نکلنے کی جگہ یا ایسا سبب جس کے ذریعے آدمی فتنہ سے نکل سکے۔

قال: کتاب اللہ: یعنی اس سے نکلنے کا طریقہ جس نے کتاب اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا، یہ اضافت کی بناء پر مقدر ہے۔ ابن حجرؒ نے عجیب بات کہی ہے: مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ مراد اس قول سے واضح ہی ہے: ”ما المخرج؟“ یعنی ایسا سبب جو اس فتنہ سے پیدا ہونے والی گمراہیوں میں پڑنے سے مانع ہو۔

فیہ نبأ ما قبلکم: یعنی پہلی امتوں کے احوال۔

وخیر ما بعدکم: یہ وہ آنے والے امور ہیں، جو قیامت کی شروط میں سے ہیں، اور احوال قیامت ہیں۔ عبارت میں تفسیر ہے۔ وحکم ما بینکم: ”حاء“ کے ضمہ اور کاف کے سکون کے ساتھ ہے، یعنی یہ تمہارے درمیان ہونے والے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا ہے یا جو تمہارے درمیان کفر و ایمان کی بدولت واقع ہو۔ اطاعت و نافرمانی، حلال و حرام اور تمام شرائع اسلام اور مابانی احکام کی وجہ سے ہو۔

هو الفصل: یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے یا غلطی اور درستگی میں فیصلہ دہیز ہے، جس پر ثواب اور عذاب کا مراد ہے۔ مصدر وصف کے لئے بطور مبالغہ ہے۔

لیس بالهزل: یعنی وہ تمام کا تمام حق اور سچ ہے: لا تاتیہ الباطل من بین یدیه ولا من خلفه. هزل، اصل میں ایسا قول

ہے جو پسندیدہ (اچھے) معنی سے خالی ہو اور یہ ہزال سے مشتق ہے، جو ”سمن“ کی ضد ہے۔ حدیث میں اقتباس اس قول الہی سے ہے: ﴿وَإِنَّ لِقَوْلٍ فَصْلًا وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ [الطارق: ۱۳-۱۴]، اس کو حق و باطل کے درمیان فصل کہا ہے اور مبالغہ کے لئے مصدر پڑنا گیا ہے۔ جیسے رجل عدل یعنی ”انہ مفصول بہ“ یا قطعی طور پر وہ حق ہے، اور مابعد کے موافق ہے یا فیصلہ کرنے اور دین میں جس چیز کی ضرورت ہو اس کو بیان کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل ہے: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ﴾ [النحل: ۸۹] من تر کہہ: یعنی قرآن کو ایمان و عمل کے لحاظ سے۔

من جبار قصمہ اللہ: یعنی اس کو ہلاک کر دے گا، یا اس کی گردن توڑ دے گا۔ اصل میں قصم کا معنی توڑنا اور الگ کرنا ہے، معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کو کاٹ دے گا، اور اپنی رحمت سے دور کر دے گا، یا وہ قطعی حجت ہے، بخلاف اس کے جس نے قرآن کے ساتھ عمل کیا، اللہ تعالیٰ اس کو کمال کے اعلیٰ مراتب پر فائز کرے گا اور وہ وصال کے اعلیٰ و خوبصورت منازل کو پائے گا۔ یہ جملہ اس پر بددعا ہے، یا صرف خبر ہے، اسی طرح ابن الملک اور طیبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے، ان دونوں کی ابن حجر نے متابعت کی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ دونوں ضد ہیں جیسے حدیث کی یقینہ اخبار میں ہے۔ جس نے جبار کی وجہ سے ترک کیا، تا کہ وہ اس پر دلالت کرے کہ اس کو ترک پر ابھارنے والا اس کا سرکش ہونا یا حماقت ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: جس نے قرآن کی کسی آیت یا کلمہ جس پر عمل کرنا واجب تھا، اسے تکبر کی بناء پر یا کفر کی وجہ سے اس کو پڑھنا چھوڑ دیا یا اس کے لئے ہے جس نے سستی، کمزوری اور عجز کی وجہ سے چھوڑا، باوجود اس کے کہ اس کا اعتقاد اس کی تعظیم پر ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں، یعنی قراءت کو چھوڑنے کی وجہ سے لیکن وہ محروم ہے۔
ومن ابتغی الهدی: یعنی گمراہی سے ہدایت مانگی۔

فی غیرہ: یعنی کتب اور علوم جو اس سے ماخوذ نہیں ہیں، اور نہ اس کے موافق ہیں۔ ابن حجر کہتے ہیں: فی سمیت کے لئے ہے۔ یہ بات کسی پر مخفی نہیں کہ ”فی“ ظرفیت کے لئے ہے، اور اس دلالت پر زیادہ بلیغ ہے کہ ہدایت اس میں منحصر ہے بجائے اس کے کہ اس علاوہ اسباب ہدایت ہوں۔

أضله اللہ: یعنی سیدھے راستے اور اس کو گمراہی پر ڈال دے گا۔ اس میں گمراہ بدعتیوں پر رڈ ہے۔
وہو: یعنی قرآن مجید۔ جبل اللہ المتین: یعنی محکم قوی، جبل کو وصل کے لئے مستعار لیا گیا ہے۔ ہر اس چیز کے لئے مستعمل ہے جس کے ساتھ کسی دوسری چیز کی طرف پہنچا جاتا ہے، یعنی ایسا قوی سبب جس کے ذریعے رب کی پہچان اور اس کی قربت کی سعادت حاصل ہوتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے متقرب ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ [آل عمران: ۱۰۳] وہو الذکر: یعنی جس کے ساتھ حق تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے، یا جس کے ساتھ مخلوق نصیحت حاصل کرتی ہے۔

الحکیم: یعنی علم و عمل کی حکمت والا یا ہر کتاب پر حاکم ہے، یا ہر مکلف پر کہ وہ اس پر عمل کرے۔ یا اس محکم قوی آیات پر مشتمل ہے جو قیامت تک منسوخ نہیں ہوں گی، تمام مخلوق اسکی مثل لانے سے عاجز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يَاتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ [فصلت: ۴۲]، یا مراد ذکر سے شرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اس پر دلیل ہے: ﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ [الزخرف: ۴۴] ایک قول ہے کہ بمعنی ”مذکر“ مراد ہے حکیم جو بہت زیادہ حکمت والا ہو۔ یہ مذکورہ تفسیر جو مذکر کے ساتھ کی گئی ہے، جیسا کہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے عقل سے بعید ہے۔

وهو الصراط المستقیم) [الافتاحہ: ۶]: یعنی قوی راستہ جو افراط و تفریط کے درمیان ہے۔ جیسے تمثیل اور تعطیل وغیرہ اور جو اس

جیسی گمراہ اقسام ہیں، اور یہ بھی درست ہے کہ اس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہو: ﴿اهدنا الصراط المستقیم﴾، جو اس پر چلا وہ نجات پا گیا۔ جس نے اس سے اعراض کیا وہ گمراہ ہو گیا۔

هو الذی لا یتغیّب: مؤنث اور مذکر کے صیغہ کے ساتھ، یعنی وہ حق سے مائل نہیں ہوتا۔ بہ: یعنی اس کی اتباع کے ساتھ۔

الا ہواء: یعنی جب اُس کی خواہش پر اس ہدایت کے موافق ہو تو گمراہ ہونے سے بچ گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ راستے پر بدعتی اور گمراہ لوگ نہیں چل سکتے۔ ایک حکایت ہے کہ شیخ ابواسحاق کازرونی سے کہا گیا کہ اہل بدعت بھی قرآن سے استدلال کرتے ہیں، جیسا کہ اہل سنت دلیل کے وقت اس کو بطور حجت پکڑتے ہیں، تو انہوں نے کہا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یضلل بہ کثیراً ویہدی بہ کثیراً﴾ [البقرة: ۲۶]۔

ہم کہتے ہیں: کہ گمراہی کا سبب اس سے عدم استدلال ہے۔ اہل ”ہوا“ (خواہش پرست) نے احادیث نبویہ کو ترک کر دیا جو مقاصد قرآنی کے لئے ہی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وما آتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فانتہوا﴾ [الحشر: ۷] انہوں نے قرآن پاک کو جس طرح پہچاننے کا حق ہے اس طرح نہیں پہچانا، انہوں نے اس قرآن پاک کو تھا ما جو اپنی ادلہ کی پہچان میں کامل ہے تو وہ بھی اسی گھڑے میں رگر پڑے جس میں اکثر حدیث کا انکار اور رد کرنے والے لگتے ہیں۔ اسی لئے جنید نے کہا: جو قرآن پاک کی محافظت نہیں کرتا، اور حدیث نبوی کو لکھتا نہیں ہے، اس کی اقتداء نہیں کی جائے گی، جو ہمارے طریقہ پر بغیر علم کے داخل ہوا، اور جہالت پر قائم رہا، تو یہ شیطان کے لئے ہنسنے اور مذاق کرنے کا ذریعہ ہے۔ چونکہ ہمارا علم کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے۔ واللہ اعلم طیبی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”اہل الهواء“ کے پاس اس میں تغیر و تبدیل اور اس سے مائل ہونے کی قدرت نہیں ہے یہ غالیوں کی تحریف، باطل لوگوں کا اپنا راستہ اور جاہلین کی تاویل کے وقوع کی طرف اشارہ ہے۔ ”باء“ متعدی کے لئے ہے۔

ایک قول ہے: ”الروایۃ من الازاغۃ“ صحیح نہیں بمعنی امالہ سے ہے۔ ”باء“ تعدیہ کی تاکید کے لئے ہے۔ یعنی گمراہ لوگ سیدھے راستے اور حتم سے ٹیڑھ پن اور عدم صراط مستقیم کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ یہود کا نفل تھا۔ انہوں نے تورات کے کلمات کو ان کی اصل جگہوں سے بدل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ان نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون﴾ [الحجر: ۹]

ولا تلتبس بہ الالسنۃ: یعنی مومنوں کی زبانوں پر مشکل نہیں ہے یعنی اگر چہ وہ غیر عرب ہوں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فانما یسرناہ بلسانک﴾ [مریم: ۹۸] ﴿ولقد یسرنا القرآن للذکر﴾ [القمر: ۱۷]

ایک قول ہے کہ اس میں کوئی دوسرا کلام خلط ملط نہیں ہوا، اس لحاظ سے کہ کوئی حکم مشتبہ ہو جائے، اور حق و باطل خلط ملط ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ ایک قول ہے کہ رب کا کلام کوئی دوسرے کلام سے خلط ملط نہیں ہوتا، اس کا اس بات سے پاک ہونا اس کے اعجاز پر دلالت ہے۔ اس لئے وہ اس میں ہا کا سا بھی نقص نہیں پاتے۔

وقولہ تعالیٰ: ﴿ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً﴾ [النساء: ۸۲]

ولا یشبع منہ العلماء: یعنی اس کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے، وہ اسکی مزید طلب سے رک جاتے ہیں جیسے کوئی کھانے سے سیر ہو جائے۔ بلکہ جب بھی وہ کسی چیز کی حقیقت کو پالیتے ہیں تو وہ پہلی سے زیادہ دوسری چیز کے مشتاق ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

ولا یخلق: ”باء“ کے فتح اور لام کے ضمہ کے ساتھ اور ”یاء“ کے فتح اور لام کے کسرہ کے ساتھ، یہ ”خلق الثوب اذا بلی“ سے

ہے، اسی طرح ”اخلق“۔

عن كثرة الرد : یعنی اس کی قراءت کی لذت دائمی ہے، اس کی تلاوت کی قراءت، اس کے اذکار کا استماع اور خبروں کی کثرت تکرار دائمی ہے۔ مخلوق سے کثرت تکرار صادر نہیں ہوتا، جیسے اللہ تعالیٰ کے کلام کے علاوہ دوسرے کلام ہیں۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے :

اعد ذکر نعمان لنا أن ذكره ☆ هو المسك ما كررته يتضوع

”ہمارے نعمان کا ذکر بار بار کرنا اس کا ذکر تو کستوری ہے، جتنا تو اس میں تکرار کرے گا، اتنی زیادہ اس کی مہک پھیلے گی۔“

اس لئے جب کوئی آدمی اس کی قراءت کو بار بار کرتا ہے، یا تلاوت بار بار سنتا ہے، تو اس کی مٹھاس میں اضافہ ہو جاتا ہے، اگرچہ وہ اس کا معنی نہ بھی سمجھ پائے، لیکن وہ اس کے حصول کا متمنی ہے۔ اسی لئے شاطبی نے کہا: و ترداده يزداد فيه تجملاً: اور اس کا تکرار اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ ابن حجر کے اس قول سے اولیٰ ہے، جس میں ہے کہ ”عن“ بمعنی ”مع“ ہے۔

ولا ينقصى عجائبه : اس کے عجائب کی انتہاء نہیں ہے، جو انسان کو تعجب میں ڈالتے ہیں۔ ایک قول ہے کہ عطف تفسیری ہے پچھلے دو قرینوں کی وجہ سے۔ یہ قول طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن حجر نے اس کی اتباع کی ہے۔ اس کو تاسیس پر محمول کرنا اولیٰ ہے، عجائب کا ظہور اس حیثیت سے کہ وہ ختم نہیں ہوتے، یہ علماء کے سیر نہ ہونے سے زیادہ قوی ہے، اور ”بلی“ کی نفی ہے۔ بلکہ اعلیٰ اور گراں قدر ہے، یہ کوئی مخفی نہیں ہے۔

هو الذى لم ينته الجن : مذکور اور مؤنث کے ساتھ۔ اذ سمعته : یعنی قرآن پاک کو۔ ایک نسخہ میں ”اذ اسمعته“ ہے۔ حتی قالوا : یعنی جب ان کو سننے کا وقت ملا تو وہ ٹھہرے نہیں سنتے رہیں بلکہ وہ اس پر اچھی طرح متوجہ ہوئے، بلکہ انہوں نے ایمان کی طرف بداہت کے راستے پر علم ضروری کے حصول کے لئے جلدی کی۔ اور انہوں نے اس کی بہت زیادہ تعریف کی اور یوں کہا: ”ان سمعنا قرآناً عجیباً“ یعنی جو وہ اس لحاظ سے ہے کہ بہت جزیل ہے اور اس کے معنی بہت عمدہ ہیں۔

یہدی الی الرشید : یعنی جو درست راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے، یا اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ لوگوں کو حق راستے کی ہدایت عطا کرتا ہے۔

فأما به : یعنی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا لازم ہو جاتا ہے۔ من قال به : جس نے اس کی خبر دی۔ صدق : یعنی اس کے خبر کے بارے میں۔ یا جس نے ایسا قول کہا، جو کہ اس کے قواعد کے مطلق اس کے قوانین و ضوابط کے موافق ہے اس نے سچ کہا۔

من عمل به : یعنی قرآن کی دلالت پر۔

أجر : یعنی اس کے عمل پر اس کو بہت بڑا ثواب دیا جائے گا، اس لیے کہ اس کی دلالت صرف اور صرف مکارم اخلاق و اعمال اور محاسن آداب و احوال پر ابھارنا ہے۔

ومن حکم به : لوگوں کے اور ان کے جھگڑوں کے درمیان۔

عدل : یعنی اس کے فیصلے میں، کیونکہ وہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

ومن دعا : یعنی لوگوں کو۔ الیہ : یعنی اس پر ایمان لانے اور اس کے ساتھ عمل کو لازم پکڑنے میں۔

هدی الی صراط المستقیم : ابن الملک کہتے ہیں : یعنی جس کو دعوت دی گئی اور اس میں مقصود کا حصول ہے۔ ابن حجر کہتے

ہیں: اس کو بنی علی الفاعل اور مفعول بنانا صحیح ہے۔ یہ عقلی احتمال ہے، مگر صحیح نسخوں میں بنی علی الجہول ہے۔ صحیح بات وہ ہے جس کو طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے مجہول بیان کیا ہے، یعنی جس نے اس کی دعوت دی، تو اس نے مزید طلب ہدایت کی موافقت کی۔

ظاہر ہے کہ اس کی سند میں مجہول ہے۔ وفی الحارث: یعنی جو راوی ہے۔ اور علی سے بیان کرتا ہے۔ مقال: اس پر طعن ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: شععی نے حارث اعمور سے روایت کیا ہے اور گواہی دی ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ مؤلف کہتے ہیں: کہ وہ حضرت علیؑ کی صحبت میں مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے: اس نے آپؐ سے چار احادیث سنی ہیں۔ امام نسائی وغیرہ کہتے ہیں: وہ قوی نہیں ہے۔ ابن ابو داؤد کہتا ہے: وہ لوگوں سے زیادہ فقیہ، فرائض کو جاننے والا اور لوگوں سے زیادہ سمجھنے والا تھا، اور جو مسلم کی شرح میں ہے جو نووی نے لکھی ہے۔ شععی سے روایت ہے انہوں نے حارث اعمور سے بیان کیا ہے کہ وہ جھوٹا ہے کو اس پر محمول کیا ہے اس سے کبھی کبھی جھوٹ صادر ہو جاتا ہے، اسی لئے اس کو "کذاب" نہیں کہا، باوجود اس کے کہ جھوٹا کبھی کبھی سچ بول دیتا ہے۔ اسی لئے ان سے روایت کیا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس کی حدیث اسناد اضعیف ہے، اگرچہ اس کے معنی کے صحیح ہونے میں شک نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ ضعیف حدیث فضائل میں بالاتفاق معمول بہ ہے۔

۲۱۳۹: وَعَنْ مُعَاذِ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ الْبَسَ وَالِدَاهُ تَابَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءٌ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بَيوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ فَمَا ظَنَنْكُمْ بِاللَّذِي عَمِلَ بِهِذَا.

(رواہ احمد و ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۴۸/۲ حدیث رقم ۱۴۵۳۔ و احمد فی المسند ۴۴۰/۳۔

ترجمہ: "اور حضرت معاذ جہنیؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص قرآن پڑھے اور اس کے مطابق عمل کرے تو قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی دنیا کے گھروں میں چمکنے والے آفتاب کی روشنی سے زیادہ اچھی ہوگی اگر تمہارے گھروں میں آفتاب ہو تو خود اس شخص کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس نے قرآن پر عمل کیا ہے۔"

تشریح: وعن معاذ الجهنی: جیم کے ضم اور "ہاء" کے فتح کے ساتھ۔

قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ القرآن: یعنی اس کے مطابق فیصلہ کیا، جیسے کہ روایت میں ہے، یعنی اس پر یقین کیا۔ ابن حجر کہتے ہیں: اس کو دل سے یاد کیا۔

وعمل بما فيه البس والده تاجاً يوم القيامة: طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ ملک اور سعادت سے کنایہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ اس قول سے ظاہر ہے: "ضوءه أحسن" اس کو روشنی اور چمک کے ساتھ پسند کیا ہے، یہ نشانی ہے کہ تاج کی تشبیہ جو اس میں عمدہ جواہر ہیں ان کی سورج کے ساتھ ہے۔ اکیلی روشنی اور چمک مراد نہیں، بلکہ اس کی زینت اور حسن کی بھی رعایت ہے۔

من ضوء الشمس: یہ اس کی حالت کا بیان ہے۔

فی بيوت الدنيا: اس میں اُسے مکمل طور پر جلنے سے بچانا ہے۔ لو كانت: یعنی سورج فرض اور تقدیر کے لحاظ سے۔

فيكم: یعنی تمہارے گھروں میں، مبالغہ کے لئے ہے۔ اگر سورج اپنی روشنی اور حُسن کے ساتھ ہمارے گھروں میں داخل ہو جائے، تو وہ بہت پیارا اور مکمل ہوگا، اگر چہ وہ اُس سے باہر ہو۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یعنی تمہارے گھروں میں داخل ہونا۔ ابن الملک۔

کہتے ہیں: یعنی تم میں سے کسی کے گھر میں۔ ایک روایت میں ہے: ”فی بیت من بیوت الدنیا لو كانت فیہ“۔
فما ظنکم: یعنی جب یہ بدلہ والدین کو اس وجہ سے ملے گا۔

بالذی عمل بهذا: ایک روایت میں ہے: ”عمل بہ“ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ظن کے مطابق یہ چھوٹا ہے، اس لیے کہ وہ اس
پہچان سے ناواقف ہے، جو عامل قاری کو کرامت اور ملک کے لئے دیا جائے گا، جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں، اور کسی
آدمی کے دل میں اس کا خیال نہیں آیا، جیسا کہ ”ما“ استفہامیہ عقل کو حیران کر دینے والے معنی کی تاکید کے لئے ہے۔

۲۱۴۰: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ لَوْ جُعِلَ الْقُرْآنُ فِي إِهَابٍ ثُمَّ الْقِيَ فِي
النَّارِ مَا احْتَرَقَ - (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۲۲/۲ حدیث رقم ۳۳۱۰۔ واحمد فی المسند ۱۰۵۵/۴۔

ترجمہ: ”حضرت عقبہ ابن عامرؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ
”اگر قرآن کو کسی کھال میں رکھ کر اسے آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ جلے گا نہیں۔“ (دارمی)

تشریح: وعن عقبہ بن عامر قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول لو جعل القرآن: ابن حجر کہتے ہیں: یعنی اس
کے جسم کو فرض سمجھتے ہوئے۔ کیونکہ معانی کا جسم جائز ہے اگرچہ غریب ہے۔ اگر اس سے مراد ”الكلام النفسی“ ہے تو یہ صحیح نہیں۔ اگر
کوئی اور معنی مراد ہے تو اس فرض کے صحیح ہونے اور مصحف کو رکھنے کی تاویل کی ضرورت نہیں۔

فی اِهاب: ایسا چیز جس کو رنگ نہ گیا ہو۔ اسی طرح فقہاء کا قول ہے۔ درست بات یہ ہے کہ مطلق چیز مراد ہے، یا تو اصل پر اعتماد
ہے یا اس پر اطلاق ہے اور اس پر جس کو دباغت نہیں دی گئی، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے اس قول میں تکلف کیا ہے کہ
”اہاب“ کے ساتھ جو مثال بیان ہوئی ہے، یہ وہ چیز ہے جو رنگ نہ گیا ہو۔ چونکہ فساد اس میں جلد آجاتا ہے۔ اس میں آگ پھونکی جاتی ہے
جو اس کے خشک ہونے میں مدد دیتی ہے، بخلاف جس چیز کو رنگ نہ گیا ہو۔ پھر ہمارے لئے بغیر مدبوغ کے ساتھ وجہ تشبیہ واضح ہوتی ہے، اگر
قاری قرآن ”غیر مرتاض“ ہو تو قرآن اس کو نفع دے گا۔

ثم القی فی النار: طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”ثم“ تراخی زمان کے لئے نہیں بلکہ اِهاب اور آگ میں ڈالنے کے درمیان تراخی
کے لئے ہے۔ یہ دونوں معاملات قرآن کے مرتبہ کے منافی ہیں۔ دوسرا پہلے سے زیادہ بڑا ہے۔ ابن حجر نے غریب قول کہا ہے کہ ”ثم
علی بابہا“ اس کی کوئی وجہ نہیں۔ ظاہر بات یہ ہے کہ وہ ”فاء“ کے معنی میں ہے۔

ما احترق: یعنی چمڑے کو قرآن کی برکت کی وجہ سے۔ اس میں رحمت کے چشمے اور حکمت کی نہریں ہیں، جو اس آگ کو بجھا دیتی
ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ”جنزیا مؤمن فان نورک أطفأ لہی“ جب اس حقیر چمڑے کے ساتھ یہ معاملہ ہے، تو اس پیٹ
(دل) کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جس نے اس کو حفظ کیا اور وہ جسم جس نے اس پر عمل کیا، اور جس میں یہ قرآن پاک سما گیا، اور سب
عرصہ اُس جسم کے ساتھ رہا۔ تو یہ حفظ اس کو آگ سے بچائے گا، اور پردہ بن کر اس میں دوری پیدا کر دے گا۔ جہنم کی آگ اس سے زیادہ
اولیٰ، بیخ اور قوی ہے۔ آگ سے مراد ”نار اللہ الموقدۃ“ جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ اس قول کو قاضی نے ترجیح
دی ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شاید جنس زیادہ قریب اور اولیٰ ہے۔ اِهاب کے ساتھ تمثیل تحقیر کے لئے ہے۔ چونکہ تمثیل مبالغہ اور فرض کے
لئے ہے۔ تقدیر یوں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قل لو كان البحر مداداً﴾ [الکہف: ۱۰۹] میں کہتا ہوں: کہ مثال میں

زیادہ واضح ﴿ولو ان قرانا سيرت به الجبال او قطعت به الارض او كلهم به الموتى﴾ [الرعد: ۳۱] یعنی زیادہ لائق اور حق یہ ہے کہ قرآن اس حقیر چیز میں ہوتا، اور اس کو آگ میں ڈالا جاتا، تو آگ اس کو نہ چھوٹی، تو مؤمن جو اللہ تعالیٰ کی اشرف اور افضل مخلوق ہے، تو اس کو کیسے چھوئے گی۔ اس نے اُسے اپنے سینے میں محفوظ کیا، اس کے معانی پر غور و فکر کیا، اس کی قراءت پر ہیشگی کی، اس کے احکامات پر اپنے جسم کو کھپایا، تو اس کو وہ کیسے جلائے گی، اس کی فضیلت کی بدولت۔

اس نے کہا ہے: اس تاویل کے ساتھ اس حدیث اور پہلی حدیث میں مناسبت واقع ہوگئی ہے۔ معنی یہ ہے کہ جس نے قرآن پڑھا اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کیا اس کے والدین کو تاج پہنایا جائے گا، تو قاری قرآن عامل کی کیا کیفیت ہوگی؟ اگر قرآن کو کسی صحیفے میں رکھ کر آگ میں ڈالا جائے، تو آگ اس کو نہیں چھوٹی۔ تو جو اس پر عمل کرنے والا ہے، اس کو کیسے چھوئے گی۔

یہ تکلف اس سے مستغنی ہے۔ چونکہ دونوں جملے جو پے در پے لفظ نبوت کے ساتھ وارد ہیں، وہ دونوں ان کے درمیان مناسبت کے لئے ہیں۔ کتاب میں دونوں حدیثوں میں بھی مناسبت کافی ہے، کہ ان کا ذکر فضائل قرآن میں ہے۔ اگرچہ ایک حدیث اپنے صاحب کی فضیلت کے بارے میں ہے۔ اس کا فضل اس سبب کے ساتھ ہے اس وجہ سے اس مناسبت کا ذکر صحیح نہیں ہے۔ چونکہ پہلی شرط تھقیق ہے، اور دوسری فرض ہے۔ کہا گیا ہے یہ نبی ﷺ کا معجزہ ہے۔ یہ قول طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

مصباح میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: ”لو كان القرآن في اهاب ما مسته النار“۔ جیسا کہ ”معالم“ میں انہی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، پھر کہا ہے کہ اس کے معنی کے بارے میں کہا گیا ہے جس نے قرآن مجید حفظ کیا، اس کی قراءت کی تو قیامت کے دن اس کو آگ نہیں چھوئے گی۔

طبری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اکثر نسخوں میں روایت ”مستہ“ کے لفظ سے ہے اور یہ ”احترق“ سے زیادہ اولیٰ ہے۔ اس سے مراد کہ وہ ”ابلق“ ہے، نہ کہ وہ زیادہ صحیح ہے۔ صحیح نسخوں میں لفظ احترق پر اتفاق ہے۔ شاید ان کی مراد مصباح کے اکثر نسخے ہیں۔ واللہ اعلم۔ یہ امام احمد بن حنبل سے روایت کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم کی توفیق دی، اس کو قیامت کے دن آگ نہیں جلائے گی۔ گویا کہ حافظ قرآن کا جسم اس ”اہاب“ کی طرح ہوگا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جو ”شرح السنہ“ میں ابوامامہ سے منقول ہے: ”احفظوا القرآن فان الله لا يعذب بالنار قلباً وعلی القرآن“۔

اور طبرانی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ”لو كان القرآن في اهاب ما اكلته النار“۔

حافظ قرآن دس آدمیوں کی سفارش کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی

۲۱۴: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَاسْتَظْهَرَهُ فَاحْلَ حَلَالَهُ وَحَرَمَ حَرَامَهُ اَدْخَلَهُ اللَّهُ الْجَنَّةَ وَسَقَمَهُ فِي عَشْرَةِ مِثْقَالٍ مِنْ اَهْلِ بَيْتِهِ كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ۔ (رواه احمد والترمذی وابن ماجه والدارمی)

وقال الترمذی هذا حدیث غریب وحفص بن سلیمان الراوی لیس هو بالقوی يضعف فی الحدیث

اخرجه الترمذی فی السنن ۱-۸۱۵ حدیث رقم ۲۹۰۵۔ وابن ماجه ۷۸۱۱ حدیث رقم ۲۶۶۔ واحمد فی المسند ۱۴۸۱۔

ترجمہ: ”حضرت علیؑ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص نے قرآن مجید پڑھا پھر اسے یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کے ان دس عزیزوں کے حق میں اس کی سفارش قبول فرمائے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی“ (احمد ترمذی ابن ماجہ دارمی) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اس کا ایک راوی حفص بن سلیمان قوی نہیں ہے بلکہ ضعیف شار

کئے جاتے ہیں۔“

تشریح: وعن علی رضی اللہ عنہ قال : قال رسول اللہ ﷺ من قرأ القرآن فاستظہرہ : یعنی اس کو حفظ یاد رکھا۔ حفظ دل کے ساتھ ہوتا ہے، یا اس کی پختگی پر مظاہرت طلب کی اور یہ معاونت ہے یا جب کسی حکم کو پڑھا اور دیکھا، تو اس کو یاد رکھنے میں خوب محنت کی۔ معنی یہ ہوا کہ جس نے قرآن پاک حفظ کیا اور اس سے دین کی معاملہ میں قوت اور مدد طلب کی۔

فأحل حلالہ و حرم حرامہ : اس کی حرمت اور اطاعت کی حفاظت کی۔ ایک قول یہ ہے کہ دو ”فاء“ کی دلیل کے ساتھ یہاں یہ تمام معانی مراد ہیں۔ ابن حجر کا قول ہے : یعنی ان دونوں پر اعتقاد پہلے فعل کے ساتھ دوسرے کو چھوڑ کر صحیح نہیں، اس اعتبار سے کہ وہ پہلے فعل کے ساتھ مقید ہے۔ آپ اس پر غور کریں۔

أدخله اللہ الجنة و شفعه : تشدید کے ساتھ، یعنی سفارش سے پہلے۔ ابن الملک کہتے ہیں : کہ اس کو سفارشی بنا دے گا۔

فی عشرة من اهل بيته کلهم : تمام دس۔

قد وجبت له النار : مفرد ضمیر لفظ ”کل“ کی وجہ سے ہے۔ طبری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں : اس میں ان لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں کہ سفارش بلند درجات کے لئے ہوگی، نہ کہ گناہوں کو مٹانے کے لئے۔ ان کی بنیاد اس مذہب پر ہے جو انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، کہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب وہ ہمیشہ آگ (جہنم) میں رہے گا۔ اس کی معافی ممکن نہیں، یہ وجوب وعدے کی بناء پر ہے۔ صحیح نسخہ میں ہے : ”والدارمی“۔

هذا حدیث غریب، و حفص بن سلیمان الراوی : ”یاء“ کے سکون کے ساتھ۔

لیس هو بالقوی : یعنی کسی حکم میں اسی کے ساتھ۔ یضعف : تشدید کے ساتھ۔ ضعف کی طرف نسبت ہے۔

فی الحدیث : یعنی اس کی روایت میں۔

سورۃ فاتحہ کی اہمیت

۲۱۳۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِأَبِي بِنِ كَعْبٍ كَيْفَ تَقْرَأُ فِي الصَّلَاةِ فَقَرَأَ أُمَّ الْقُرْآنِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا أَنْزَلْتُ فِي التَّوْرَةِ وَلَا فِي الْإِنْجِيلِ وَلَا فِي الزَّبُورِ وَلَا فِي الْقُرْآنِ مِثْلَهَا وَأَنْهَا سَبْعَ مِّنَ الْمُثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُعْطِيَتْهُ - (رواه الترمذی وروی الدارمی من قوله ما انزلت

ولم يذكر ابی بن کعب وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۳۵ حدیث رقم ۲۸۷۵۔ والنسائی ۱۳۹۲ حدیث رقم ۹۱۴۔ واحمد فی المسند ۳۵۷/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب سے فرمایا تم نماز میں کیسے قراءت کرتے ہو؟ انہوں نے سورۃ فاتحہ پڑھی آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ایسی سورت نہ تو تورات نہ تو انجیل اور زبور میں اتری ہے اور نہ ہی (باقی) قرآن میں سورۃ فاتحہ سبع مثنائی ہے اور یہ ”قرآن عظیم“ ہے جو مجھے دیا گیا ہے“ ترمذی دارمی نے اس روایت کا ما انزلت سے نقل کیا ہے اور ان کی روایت میں ابی بن کعب کا ذکر نہیں ہے نیز امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔“

تشریح: وعن ابی ہریرۃ قال : قال رسول اللہ ﷺ لأبى بن كعب، كيف تقرأ في الصلوة فقراً : یعنی میرے

ام القرآن: یعنی سورۃ فاتحہ، اس کا نام اس لئے کہ قرآن کے تمام احکامات اس میں اجمالی طور پر موجود ہیں۔ یا ”ام“ سے اصل ہے۔ یہ قواعد قرآن کی بنیاد ہے۔ اس پر تمام احکام ایمان کا دار و مدار ہے۔

طبی بیہ کہتے ہیں: اگر آپ کہیں کہ جواب سوال کے مطابق کیسے ہے؟ اس قول کے ساتھ ”کیف تقرأ“ سوال قراءت کے متعلق ہے نہ کہ اس کی ذات کی متعلق۔ میں کہتا ہوں: اس کو اس پر محمول کیا جائے کہ اُس نے سورۃ فاتحہ کو ترتیل اور تجوید کے ساتھ پڑھا۔ یا یہ احتمال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کی حالت میں قراءت کے متعلق سوال کیا۔ کی یہ جامع سورت ہے، جو قرآن کے معانی کو گہرے ہوئے ہے یا نہیں اسکو ”ام القرآن“ کہا، اور ذک کے ساتھ خاص ہے۔ یہ معانی قرآن کیلئے جامع ہے اور اسکی بنیاد ہے۔

فقال رسول الله ﷺ: والذى نفسى بيده ما انزلت فى التوراة ولا فى الانجيل ولا فى الزبور ولا فى القرآن: یعنی بقیہ قرآن میں کوئی بھی سورت۔

مثلا وانها سبع من الثانى: احتمال ہے کہ ”من“ بیان کے لئے ہے، یا تجزیہ ہے۔

والقرآن العظيم: مباحثہ کے لئے ”کل“ کا اطلاق جزیر ہے۔

الذى اعطية: یعنی میرے سوا کسی نبی کو نہیں دی گئی۔ یعنی شروع سے آخر تک۔ ما انزلت ولم يذكر: یعنی داری نے۔

ابى بن كعب: یعنی حدیث کے شروع میں، جو پیش آنے والا قصہ ہے۔ (وقال الترمذى هذا حديث حسن صحيح).

۲۱۳۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ فَأَقْرَأُوهُ فَإِنَّ مَثَلَ الْقُرْآنِ لِمَنْ تَعَلَّمَ فَقَرَأَ

وَقَامَ بِهِ كَمَثَلِ جِرَابٍ مَحْشُوقٍ مُسْكًا تَفُوحُ رِيحُهُ كُلِّ مَكَانٍ وَمِثْلُ مَنْ تَعَلَّمَهُ فَرَقَدَّ وَهُوَ فِي جَوْفِهِ كَمِثْلِ

جِرَابٍ أَوْ كَمِيٍّ عَلَى مِسْكِ. (رواه الترمذى والنسائى وابن ماجه)

اخرجه الترمذى فى السنن ۱۴۴۵/۱۰ حديث رقم ۲۸۷۶ وابن ماجه ۷۸۱/۱ حديث رقم ۲۱۷۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قرآن سیکھو اور اسے پڑھو

اس شخص کی مثال جو قرآن سیکھتا ہے پھر اسے پڑھتا ہے اور اس میں مشغولیت کے لئے شب بیداری کرتا ہے اس تھیلی کی

سی ہے جو مشک سے بھری ہو جس کی خوشبو ہر جگہ پھیل جاتی ہے اور اس شخص کی مثال جس نے قرآن سیکھا اور سوراہا اس کی

مثال کستوری کی بند تھیلی کی ہے۔“ (ترمذی نسائی ابن ماجہ)

تشریح: وعنه: یعنی ابو ہریرہؓ سے۔

قال: قال رسول الله ﷺ تعلموا القرآن: یعنی لفظاً اور معناً۔ ابو محمد جوینی کہتے ہیں: قرآن پاک کو سیکھنا، اس کی تعظیم فرض

کفایہ ہے، شاید اس لئے کہ اس کو تو اتر حاصل نہیں ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی اور تحریف نہیں ہوتی۔ زرکشی کہتے ہیں: جب کی شہر یا بستی

میں کوئی بھی نہ ہو جو قرآن پڑھے تو وہ سبھی گنہگار ہوں گے۔ ابن حجر کہتے ہیں: اس سے مخاطب تمام امت ہے۔ یہ تو اتر سے ثابت ہے کہ جو

کوئی اس کو یاد کرے گا تو سارے گناہ گار ہونے سے بچ جائیں گے۔ مذکورہ تو اتر کی تعداد کا تعین اسلام کے مختلف شہروں کے اعتبار سے

ہے۔ اس لحاظ سے کہ اگر کوئی بھی ایک حرف میں تبدیلی یا تحریف کرنے کا ارادہ کرے، تو سبھی اُس کو روکیں گے۔

زرکشی کے کلام سے ظاہر ہے کہ جملہ ہرستی میں کوئی نہ کوئی قرآن پڑھنے والا ہوتا ہے، اس لیے کہ قرآن پاک کا بعض حصہ یاد کرنا

فرض ہے۔ اگر وہاں پر کوئی بھی پڑھانے والا نہ ہو، تو تمام گنہگار ہوں گے۔ جو بات زرکشی نے کہی ہے اس کو تو اتر حاصل نہیں ہے وگرنہ ہر

شہری کہے گا کہ ہم پر قرآن سیکھنا فرض نہیں ہے۔ تو عالم میں فساد برپا ہوگا۔ واللہ اعلم۔ اس پر نووی کا قول دلالت کرتا ہے۔ فاتحہ سے مزید

قرآن سیکھنا نقلی نماز سے بہتر ہے، چونکہ وہ فرض کفایہ ہے۔ بعض متأخرین نے فتویٰ دیا ہے کہ حفظ میں مصروف ہونا فرض کفایہ میں مشغول ہونے سے بہتر ہے۔ باقی علوم سے سوائے اس کے جو فرض عین ہے۔

فاقر اوہ: یعنی اس کو سیکھنے اور اس کے بعد۔ ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ اکمل کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ علم سیکھنے کے ساتھ ہے اور تجوید واجب ہے۔ یہ بات مشائخ سے لی گئی ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ”فاقر اوہ“ میں ”فاء“ اسی طرح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿استغفروا ربکم لم توبوا الیہ﴾ [ہود: ۵] یعنی قرآن سیکھو اور اس کی تلاوت پر ہمیشگی کرو اور عمل اس کا تقاضا وہ تغلیل (علت) کرتی ہے جو اس قول میں ہے: ”فان مثل القرآن لمن تعلم فقراً وقام بہ“ یعنی اس قراءت پر ہمیشگی کی یا اس پر عمل کرنے میں ہمیشگی کی۔

کمثل جراب: کسرہ کے ساتھ، عمومی طور پر فتح دیا جائے گا۔ ایک قول ہے کہ ”جراب“ کو فتح نہیں دیا جاتا اور ”قندیل“ کو کسرہ نہیں دیا جاتا، یہاں جراب کا ذکر خاص احتراماً ہے چونکہ وہ خوشبو کو محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہاں مثال بیان کرنا ”تعلیم“ کے لئے ہے جیسے ”جراب“ کی تمثیل ہے۔ ”مفل“ مبتداء ہے، اور مضاف محذوف ہے۔ ”لمن“ میں جو لام ہے کہ تعلیم محذوف کے متعلق ہے اور یہ قول ہے: ”کمثل علی تقدیر اعضاء ایضاً“ تشبیہ یا تو مفروغ ہے یا مرکب ہے۔

محشو: یعنی جو بہت زیادہ بھری ہوئی ہو، یہاں تک کہ اُس مزید دوسے کے لئے جگہ نہ ہو۔

مسکاً: تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

تفوح ریحہ: یعنی اس کی خوشبو ظاہر ہوتی ہے۔

کل مکان: ابن الملک کہتا ہے: قاری کا سینہ ”جراب“ کی طرح ہے، اور قرآن اس میں مسک کی طرح ہے جب وہ اس کو پڑھے گا، اُس کی برکت اُسے اور سننے والے کو حاصل ہوگی۔ میں کہتا ہوں: مکان کا اطلاق مبالغہ کے لئے ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”تدمر کل شیء و اوتینا من کل شیء“۔ اس میں تدمیر اور ایتاء خاص ہیں۔

ومثل من تعلمہ: رفع اور نصب کے ساتھ یعنی ہوا کی مثال جس نے اُسے سیکھا۔

فرقد: یعنی قیام نہ کیا، سو گیا، یا قراءت سے غفلت کی یا ترکِ عمل سے کنایہ ہے۔

وهو: یعنی قرآن مجید۔ فی جوفہ: یعنی اُس کے دل میں۔ کمثل جراب او کسبی: جینہ مجہول کے ساتھ، یعنی باندھ رکھا۔

علی مسک: طیبی کہتے ہیں: یعنی تختی سے باندھا تسمہ کے ساتھ۔ یہ وہ دھاگہ ہے جس کے ساتھ برتنوں کو باندھا جاتا ہے۔

منظہر کہتے ہیں: جس نے قراءت کی (پڑھا) تو اس کی برکت اس کے گھر میں پہنچ جائے گی، اور سننے والوں کو حاصل ہوگی۔ استراحت اور ثواب کا حصول وہاں تک ہوگا جہاں تک اُس کی آواز پہنچے گی۔ یہ اس تھیلی کی طرح ہے جو خوشبو سے بھری ہوئی ہو جب اس کا منہ کھولا جائے، تو اس کی خوشبو ارد گرد تمام جگہ پھیل جاتی ہے۔ جس نے قرآن پاک سیکھا، اور اسے پڑھا نہیں، تو اس برکت صرف اسے ہی حاصل ہوگی۔ تو وہ اس تھیلی کی طرح ہو گیا جس کا منہ تختی سے باندھ دیا گیا ہو، تو اس کی خوشبو کسی تک نہیں پہنچتی صرف تھیلی میں رہتی ہے۔

۲۱۳۳ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ حَمَّ الْمُؤْمِنِ إِلَى إِلَيْهِ الْمَصِيرُ وَأَيَّةُ الْكُرْسِيِّ حِينَ يُصْبِحُ

حُفِظَ بِهِمَا حَتَّى يُمْسِيَ وَمَنْ قَرَأَ بِهِمَا حِينَ يُمْسِي حُفِظَ بِهِمَا حَتَّى يُمْسِيَ.

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۵/۵ حدیث رقم ۸۷۹۔ والدارمی ۵۴۱/۲ حدیث رقم ۳۳۸۶۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص صبح کے وقت حمّہ کہ وہ سورہ مؤمن ہے الیہ المصیر تک اور آیت الکرسی پڑھے تو وہ ان کی برکت سے شام تک محفوظ رہے گا اور جو شخص ان کو شام کے وقت پڑھے تو وہ ان کی برکت سے صبح تک محفوظ رہے گا۔ ترمذی داری اور امام ترمذی نے ارشاد فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: وعنه: یعنی ابو ہریرہؓ سے۔

قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ حم، المؤمن: میم کے کسرہ اور فتح کے ساتھ۔ مؤمن کو جز اور نصب کے ساتھ۔ الی

(المصیر)

یعنی ﴿حَمَّ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ طَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ط إِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾ [المؤمن: ۱-۳] ”حمّ۔ اس کتاب کا اتارا جانا خدائے غالب و دانائے طرف سے ہے جو گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے اور سخت عذاب دینے والا اور صاحب کرم ہے اسکے سوا کوئی معبود نہیں اسی کی طرف پھر کر جانا ہے۔“

واية الكرسی: واو مطلق جمع کے لئے ہے۔ ان میں تقدیم و تاخیر جائز ہے۔ جو بات ہم نے کہی ہے اس پر حصن کی روایت دلالت کرتی ہے جس میں آیت الکرسی مقدم ہے۔

حين یصبح: یعنی صبح کی نماز سے پہلے یا اسکے بعد یا ”یقرأ“ سے ظرف ہے۔ حفظ بہما: یعنی ان دونوں کی قراءت اور برکت۔ حتی یمسی: یعنی جب رات ہو جائے۔ امساء: اصباح کی ضد ہے، جیسا کہ ”قاموس“ اور ”صحاح“ میں ہے۔ ومن قرأ بہما: قراۃ، اس میں دو لغات ہیں۔ حین یمسی حفظ بہما حتی یصبح۔

لوح محفوظ میں زمین و آسمان پیدا ہونے سے دو ہزار سال قبل قرآن لکھا گیا

۲۱۳۵: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ كِتَابًا قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِأَلْفِي عَامٍ أَنْزَلَ مِنْهُ آيَاتٍ خَتَمَ بِهِمَا سُورَةَ الْبَقَرَةِ وَلَا تَقْرَأُ فِي دَارٍ ثَلَاثَ لَيَالٍ فَيَقْرُبُهَا الشَّيْطَانُ۔ (رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۷/۵ حدیث رقم ۲۸۸۲۔ والدارمی ۵۴۲/۲ حدیث رقم ۳۳۸۸۔ واحمد فی المسند ۲۷۴/۴۔

ترجمہ: ”حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل کتاب لکھی اس کتاب میں سے وہ دونوں آیتیں نازل فرمائیں جن پر سورہ بقرہ کا اختتام ہوتا ہے یعنی امن الرسول سے آخری سورہ تک یہ آیتیں جس گھر میں تین رات تک پڑھی جاتی ہیں شیطان اس کے قریب نہیں آتا۔ ترمذی داری امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: وعن النعمان: نون کے ضمہ کے ساتھ۔

ابن بشیر، قال: قال رسول الله ﷺ ان الله كتب كتاباً قبل ان يخلق السموات والارض بالالف عام: یعنی فرشتوں کو لوح محفوظ میں قرآن پاک لکھنے کا حکم دیا۔ ایک قول ہے یعنی اس میں ثبت کرنے کا حکم دیا۔ یا اس کے علاوہ میں علوم غیبیہ کی اطلاعیں تھیں۔

قبل ان يخلق السموات والارض بالالف عام: طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مخلوقوں کی مقدار ان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال

پہلے لکھ دی تھیں، یہ قرآن پاکی کتابت ایک ہزار سے پہلے کی منافی نہیں ہے۔ چونکہ لوح محفوظ میں لکھنے کی کتابت کے جواز میں اختلاف ہے، اور اس جواز میں کہ اس سے مراد تجدید نہیں ہے۔ صرف سبقت لے جانا شرف پر دلالت ہے۔ یادوںوں کتابوں کی مغایرت کے جواز میں۔ یہ زیادہ ظاہر ہے۔ آپ اس پر غور کریں۔

اور یہ قول بھی اس پر دلالت کرتا ہے: ”انزل منہ“ من جملہ جو اس کتاب میں مذکور ہے، اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں ہے: ”انزل فیہ“ اور ان سے اسی طرح روایت ہے جیسا کہ بعض شارحین نے کیا ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: خلاصہ یہ ہے کہ تمام ہونے والے اعمال لوح محفوظ میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے لکھے گئے اور ان میں سے قرآن بھی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں وغیرہ کو پیدا کیا اور ان پر قرآن کی کتابت کو واضح کیا، زمین و آسمان کی تخلیق سے ایک ہزار سال پہلے اور دونوں آیات کو ان سے خاص کیا۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ بات مصابیح کے نسخوں میں ہے۔ اس میں نازل کیا گیا۔ ایک روایت میں ”انزل منہ“ ہے۔

آیتین: وہ دونوں آیات یہ ہیں: ”امن الرسول سے آخر تک“۔

ختم بہما سورة البقرة ولا تقرآن فی دار ثلاث لیلال: یعنی کوئی گھر وغیرہ۔

فیقر بہا الشیطان: ”راء“ کے فتح کے ساتھ منصوب اور مرفوع ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: فاء تعقیب کے لئے ہے، اور منفی پر عطف ہے، اور نفی تمام پر ہے۔ ایک قول ہے کہ وہ جمع کے لئے ہے۔ یعنی شیطان کا قرب اور قرأت اکٹھی نہیں ہوتیں۔

۲۱۳۶: وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ ثَلَاثَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ الْكَهْفِ عَصِمَ مِنْ فِتْنَةِ

الدَّجَالِ . (رواه الترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح)

احرجہ الترمذی فی السنن ۱۴۹/۵ حدیث رقم ۲۸۸۶۔

ترجمہ: ”حضرت ابو الدرداءؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص سورہ کہف کی ابتدائی تین آیتیں پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا“ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔“

تشریح: وعن أبي الدرداء قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ ثلاث آيات من أول الكهف عصم من فتنة الدجال: اس پر کلام گزر چکی ہے۔ شاید کہ تین پر اقتصار اس بات کو متضمن ہے کہ کتاب اس کجی سے محفوظ ہے، جو یہ لعین چاہتا ہے اور مومنوں کو احسن اجر کی بشارت ہے اور کافروں کو ڈران کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کے عذاب کی وعید ہے۔

۲۱۳۷: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ قَلْبًا وَقَلْبُ الْقُرْآنِ يَسِيْرٌ وَمَنْ قَرَأَ يَسِيْرَ كَتَبَ اللَّهُ لَهُ بِقِرَاءَةِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ عَشْرَ مَرَّاتٍ .

(رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

احرجہ الترمذی فی السنن ۱۴۹/۵ حدیث رقم ۲۸۸۷۔ والدارمی ۵۴۸ حدیث رقم ۳۴۱۶۔ واحمد فی المسند ۲۶/۵۔

ترجمہ: ”حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل سورہ یسین ہے جو شخص یسین پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے کی وجہ سے دس مرتبہ قرآن پڑھنے کا ثواب لکھتا ہے۔“ (ترمذی دارمی) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: وعن أنس قال: قال رسول الله ﷺ ان لكل شيء قلباً، وقلب القرآن: یعنی اس میں مقصود کو خالصاً

بیان کیا ہے۔

یس: اس میں احوال قیامت کے قصے بیان ہیں۔ اس لحاظ سے کہ کسی دوسری سورت میں اس کی مثل نہیں ہیں۔ اسی لئے قریب المرگ لوگوں کے لئے اس سورت کو خاص کیا گیا ہے۔ یا پھر اس کی قراءت مردوں اور زندوں کے دلوں کو زندہ کرتی ہے، اور غفلت کو ہٹا کر اطاعات اور عبادات کی طرف موٹ دیتی ہے۔

ابن الملک کہتے ہیں: اگر اس کا دل ہونا ممکن ہوتا تو یس اس کا دل ہوتا۔ میں کہتا ہوں: یہ دل کا کلام ہے۔ جس کا دل ہو اس کی طرف ضرورت نہیں ہوتی۔ طبی بیہوشی نے بہت عمدہ بات کہی ہے: وہ مختصر ہونے کے باوجود براہین، قطعی آیات، پوشیدہ علوم، دقیق معانی، وعد و وعید اور بلیغ زواجر پر مشتمل ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے: کہ جس نے حقائق اور معانی کا ادراک نہیں کیا، اس کی محسوس نظر الفاظ اور معانی پر محصور ہے۔ اس کا نام قلب اس لئے کہ وہ سبع مثنائی کے بائیں جانب ہے۔ اور احسن وہ ہے جو غزالی بیہوشی نے کہا ہے: ایمان کا صحیح ہونا حشر و نشر کی اعتراف کے ساتھ ہے اور یہ بلیغ وجہ سے مقرر ہے، اور قرآن کا دل اس لیے ہے۔ فخر رازی نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے۔

نفسی کہتا ہے کہ اس میں تین اصول وحدانیت رسالت اور حشر بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق صرف دل کے ساتھ ہے۔ اس کا تعلق زبان اور دوسرے مذکورہ ارکان کے ساتھ نہیں ہے، جب اس میں اعمال قلبی ہیں دوسرے نہیں ہیں۔ تو اس کا نام قلب رکھا گیا۔ اسی لئے آپ ﷺ نے ”محتضر“ کی قراءت کے وقت حکم دیا کہ اس وقت جنین کی قوت کمزور اور اعضاء ساقط ہوتے ہیں۔ لیکن دل اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوا، یہ دوسرے اقوال سے راجع ہے۔ اس کے پاس اس کی قراءت کی جاتی ہے، جس سے اس کے دل میں قوت بڑھ جاتی ہے اور اصول ثلاثہ کی تصدیق پر وہ سختی سے کار بند ہو جاتا ہے۔

ابن حجر نے عجیب و غریب بات کہی ہے۔ اس میں ”کالذی قلبہ“ محل نظر ہے چونکہ ہر ایک پہلا معنی ہے اور دوسرا سورۃ الاخلاص میں موجود ہے۔

ومن قرأ یس کتب اللہ له بقراتها قراءۃ القرآن: یعنی اس کا ثواب۔

عشر مرات: یعنی اس کے علاوہ۔ اللہ تعالیٰ اشیاء میں سے جس کی فضیلت کو چاہے، بڑھا دے۔ جیسے زمانوں میں سے لیلۃ القدر اور جگہوں میں سے حرم ہے۔

طبی بیہوشی کہتے ہیں: ایک راوی ہارون بن محمد جس کو رجال حدیث کے ماہر لوگ نہیں جانتے۔ وہ ایسا لکڑھ ہے جس کو معرّف نہیں بتایا جا سکتا۔

حسن میں روایت ہے: ”قلب القرآن یس لا یقرأها رجل یرید اللہ والدار الاخرة الا غفر له اقرؤھا علی متواترکم“ اس حدیث کو نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور حبان نے معقل بن یسار سے روایت کیا ہے۔ اس کو احمد اور حاکم نے روایات کیا ہے، اور حاکم بیہوشی نے صحیح کہا ہے۔

مرسل حدیث جس کو حضرت علیؑ سے موصولاً بیان کیا گیا ہے:

”ان القرآن أفضل من کل شیء دون اللہ، فمن قرأ القرآن وقر اللہ، ومن لم یقر القرآن فقد استخف بحق اللہ وحرمة القرآن عند اللہ کحرمة الوالد علی ولده، القرآن شافع مشفع، وما حل مصدق، فمن شفع له القرآن شفع، ومن محل به القرآن صدق، ومن جعل القرآن امامه قاده الی

الجنة، ومن جعله خلفه ساقه الى النار، وحملة القرآن هم المحفوفون برحمة الله اكملتسون بنور الله، المتعلمون كلام الله. من عداهم فقد عادى الله ومن والاہم فقد والى الله يا حملة كتاب الله استجيبوا لتوقير كتابه يزدكم حباً ويحبكم الى خلقه، يدفع عن مستمع القرآن سوء الدنيا، ويدفع عن تالى القرآن بلوى الآخرة، ومستمع آية من كتاب الله خير له من صبر ذهباً وتالى آية من كتاب الله خير له مما تحت اديم السماء وان فى القرآن لسورة عظيمة عند الله يدعى صاحبها الشريف عند الله، يشفع صاحبها يوم القيامة فى اكثر من ربعة وحضر وهى سورة يس۔

۲۱۳۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَرَأَ ظُهُوَّ وَیَسَّ قَبْلَ أَنْ یَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِأَلْفِ عَامٍ فَلَمَّا سَمِعَتِ الْمَلَائِكَةُ الْقُرْآنَ قَالَتْ طُوبَى لِمَنْ یُنزِلُ هَذَا عَلَیْهَا وَطُوبَى لِأَجْوَابِهَا تَحْمِلُ هَذَا وَطُوبَى لِمَنْ لَسِنَةٍ تَتَكَلَّمُ بِهَذَا۔

اخرجه الدارمی فى السنن ۵۴۷/۲ حدیث رقم ۳۴۱۴۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین کی تخلیق سے ایک ہزار برس پہلے سورہ طہ اور سورہ یسین پڑھی جب فرشتوں نے قرآن سنا تو کہنے لگے اس امت کے لئے خوشخبری ہو جس پر یہ قرآن اتارا جائے گا، اور ان دلوں کے لئے خوشخبری ہو جو اسے یاد کریں گے اور ان زبانوں کے لئے خوشخبری ہو جو انہیں پڑھیں گی۔“

تشریح: وعن ابی ہریرة قال : قال رسول الله ﷺ ان الله تعالى قرأ ”طه، ويس“ : یعنی ان دونوں کی قراءت کو

واضح کیا، اور ان کی تلاوت کا ثواب بیان کیا۔ ابن الملک کہتے ہیں: یعنی فرشتوں نے۔ اور ان کا معنی الہام کیا۔

ابن حجر کہتے ہیں: بعض کو ان کی قراءت کا حکم دیا یہ باقی لوگوں کے ان دونوں سورتوں کے شرف ہونے پر علامت ہے۔ اس کے باقی کا ظاہر پر احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام نفسی کو ان دونوں سورتوں کے ذریعے ان کو سنایا۔ اس اساع کو قراءت کہتے ہیں جیسا کہ کلام نفسی کا نام قرآن حقیقی ہے۔ ان دونوں سورتوں کو خاص کیا گیا ہے اس لئے کہ ان دونوں کا آغاز آپ ﷺ کے اسماء کے ساتھ ہے، جو کہ آپ ﷺ کی اکملیت اور انتہائی عظیم بلند درجے کی طرف اشارہ ہے۔

قبل ان یخلق السوات والأرض بألف عام فلما سمعت الملائكة القرآن : حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کی تخلیق زمین و آسمان کی تخلیق سے بہت عرصہ پہلے کی ہے۔ ایک قول ہے کہ قرآن سے مراد قراءت ہے اور جائز ہے کہ یہ اسم ہو یعنی یہ جنس قرآن سے ہے۔ اس کا نام قرآن ان دونوں کی عظمت کو بڑھانے کے لئے ہے۔ ایک قول ہے کہ اس کا اطلاق حقیقتاً بعض پر ہوتا ہے۔

قالت : یعنی وہ فرشتے جنہوں نے دونوں سورتوں کو سنا۔

طوبی : یعنی اچھی حالت اور مکمل راحت حاصل ہوگی۔ لاهة ينزل : جینہ مجہول یا معلوم کے ساتھ۔

هذا : یعنی قرآن۔ چونکہ اس کا ذکر قریب ہی ہے یا جو ظہ اور یس سے تعلق ہے۔ وہ سیاق سے ظاہر ہے، یا ”هذا“ یا اس جیسے

عموم سے ظاہر ہے۔

عليها : یعنی ان دونوں پر ایمان لانے کے سبب سے۔ ایک قول ہے کہ ”طوبی“ سے مراد جنت میں درخت ہے، اور جنت کے تمام گھروں میں اس کی ٹہنیاں ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ ”طوبی“ اس طوبی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّلَاحِ طُوبَى لَهُمْ وَحَسُنَ مَا يَبْرَأُونَ [الرعد: ۲۹]

و طوبی لأجواف تحمل هذا: یعنی اس کو حفظ کرنے اور محافظت کے ساتھ۔

و طوبی لألسنة تتكلم بهذا: یعنی اس کو زبانی پڑھتے ہیں، یاد رکھ کر پڑھتے ہیں۔ شاید اسی لئے نہیں کہا کہ: طوبی ان کانوں کے لئے ہے جو اسے سنتے ہیں، تا کہ اس کے ساتھ امت میں داخل ہو جائے جس پر نازل ہوئی ہے۔

۲۱۴۹: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ حَمْدَ الدُّخَانَ فِي لَيْلَةٍ أَصْبَحَ يَسْتَعْفِرُ لَهُ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب وعمر بن ابی خنعم الراوی یضعف وقال محمد یعنی البخاری هو منکر الحدیث)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۰/۵ حدیث رقم ۲۸۸۸۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص رات کو حمد الدُّخَانَ پڑھتا ہے تو وہ اس حالت میں صبح کرتا ہے کہ ستر ہزار ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں“ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس حدیث کے راوی عمر بن ابی خنعم ضعیف شمار کئے جاتے ہیں نیز محمد یعنی امام بخاری نے فرمایا کہ وہ منکر الحدیث ہیں۔“

تشریح: وعنه: یعنی ابو ہریرہؓ سے ہی یہ روایت ہے۔

قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ حمد الدخان: اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔

فی لیلۃ: جب رات ہو۔

أصبح: یعنی صبح کی یا قراءت کے بعد صبح ہوگی۔

یستغفر له سبعون ألف ملك: ابن الملک کہتے ہیں: یعنی اس کی قراءت سے لے کر صبح تک۔ یہ محل نظر ہے۔ اس سے وہ قول اور بھی عجیب و غریب ہے جو ابن حجرؒ نے کہا ہے۔ یعنی اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہمیشہ کے لئے وسیع ہو جاتا ہے۔

وعمر بن ابی خنعم الراوی یضعف: یعنی حدیث میں جو راوی ہے۔

وقال محمد: یعنی ابن اسماعیل۔ یعنی: امام ترمذی کی مراد محمد بن اسماعیل البخاری ہے۔

البخاری: یہ بات ظاہر ہے کہ اس کا تعلق مصنف کی کلام سے ہے۔ ہو: یعنی عمر بن ابی خنعم۔

منکر الحدیث: شرح منخب میں ابن حجرؒ کہتے ہیں: منکر الحدیث ضعیف کہنے سے زیادہ سخت جرح ہے۔

۲۱۵۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ حَمْدَ الدُّخَانَ فِي لَيْلَةِ الْجُمُعَةِ غُفِرَ لَهُ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب ضعیف وهشام ابو المقدم الراوی یضعف)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۸۸۹۔ والدارمی ۵۴۹/۲ حدیث رقم ۳۴۲۰۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص جمعہ کی رات کو حمد الدُّخَانَ پڑھتا ہے تو اسے بخش دیا جاتا ہے“ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور ہشام ابو المقدم روایت حدیث میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔“

تشریح: وعنه: یعنی ابو ہریرہؓ۔

قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ حمد الدخان فی لیلۃ الجمعة: جمیم ویمیم کے ضمہ یا میم کے سکون کے ساتھ۔

غفر له : ایک صحیح نسخہ میں ”غریب ضعیف“ کے الفاظ ہیں۔ ایک دوسرے نسخہ میں اس کے برعکس ہے۔ ایک نسخہ میں غریب کی جگہ ضعیف ہے، ایک اور نسخہ میں ضعیف کی جگہ غریب ہے۔

ہشام ابو المقدام الراوی یضعف۔

۲۱۵۱: وَعَنِ الْعُرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ الْمَسْبُوحَاتِ قَبْلَ أَنْ يَقْرَأَ الْقُرْآنَ إِنَّ فِيهِنَّ آيَةً خَيْرٍ مِنْ أَلْفِ آيَةٍ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۰۴۱۵۔ والترمذی فی السنن ۱۶۶۶۵۔ حدیث رقم ۲۹۲۱۔ واحمد فی المسند ۱۲۸/۴۔

ترجمہ: ”حضرت عرباض ابن ساریہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سونے سے پہلے مسبحات یعنی سورۃ الاسراء الحدیر، الحشر، الصف، الجمعۃ، التغابن اور الاعلیٰ پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان میں ایک آیت ہے جو ہزار آیتوں سے بہتر ہے۔

ترمذی ابوداؤد۔

تشریح: وعن العرباض : عین کے کسرہ کے ساتھ۔

ابن ساریہ، ان النبی ﷺ کان یقرأ المسبحات : ”باء“ کے کسرہ کے ساتھ۔ مجازی نسبت ہے اور اس سے مراد وہ سورتیں ہیں جن کے شروع میں ”سبحان“ یا ”سبح“ ماضی کے صیغہ کے ساتھ یا ”یسبح“ یا ”سبح“ امر کا صیغہ ہے۔ ان کی تعداد سات ہے۔ سبحان الذی اسرئ، الحديد، الحشر، الصف، الجمعة، التغابن الاعلیٰ۔

قبل ان یوقد : یعنی سونے سے پہلے۔

یقول : استنفاہ اس بیان کے لئے ہے کہ ان سورتوں کی قراءت پر ہر رات سونے سے پہلے ترغیب دلانا مقصود ہے۔

ان فیہن : یعنی مسبحات میں۔ آیت : یعنی بہت عظمت والی۔ خیر : یعنی یہ بہتر ہے۔

من آلف آیت : کہا گیا ہے کہ یہ آیت ”لو أنزلنا هذا القرآن“ : یہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء میں سے سب سے زیادہ فضیلت والا نام اللہ اکبر ہے۔ اسی وجہ سے ان سورتوں کے مجموعے میں ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ سے مروی ہے کہ وہ نام ”هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شیء علیم“ یہ آیت تسبیح کے ساتھ شروع ہوتی ہے، اور اس میں جمع معنی ہیں اور خیر یہ صفت تزییہ ہے جو اثبات کی صفت کو شامل ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں : اس آیت میں اسی طرح اخفاء ہے جیسے راتوں میں لیلۃ القدر کا اخفاء ہے۔ جمع کے دن قبولیت کی گھڑی کا اخفاء تمام قراءت کی محافظت کے لئے ہے۔ شاید اسی لئے یہ آیت الگ تھلک ہے۔

یعنی عرباض سے روایت کیا ہے۔

اور وہ سات سورتیں ہیں : سورۃ بنی اسرائیل، الحديد، الحشر، الصف، الجمعۃ، التغابن اور سورۃ الاعلیٰ۔

قبل ان یوقد : یعنی سونے سے قبل۔ یقول : جملہ استنفاہی اس بیان کے لئے ہے۔ آیت : یعنی عظیم آیت ہے۔

خیر : یعنی وہ آیت بہتر ہے۔ من آلف لیلۃ : بعض نے کہا ہے کہ وہ آیت لو أنزلنا هذا القرآن هذا القرآن اور یہ اللہ کے نام کی طرح کے اس کے دوسرے ناموں میں یہ فضیلت کے لحاظ سے بڑے ہیں۔ اسی پر قیاس کر لیں۔

فیہن : ان میں یعنی ان تمام میں اور حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں وہ آیت هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شیء علیم ہے۔ زیادہ واضح یہ بات ہے کہ وہ آیت وہی ہو سکتی ہے جس میں تسبیح یعنی سج کا مادہ اور فیہن بمعنی جمیعہن یعنی ان

تمام کے مجموعہ میں اور بہترین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس بہترین معنی کو شامل ہے جو صفت تزیینی ہے جو موصوف کے اثبات کے لئے لازم ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ان میں آیت کو پوشیدہ رکھا گیا ہے، جس طرح کہ راتوں میں سے لیلۃ القدر کا مخفی ہونا اور جمعہ کے دن میں قبولیت کی گھڑی کا پوشیدہ ہونا، یہ اخفاء اس وجہ سے ہے کہ ان کو مکمل پڑھا جائے، نہ کہ صرف اسی آیت کو نادر سمجھ کر پڑھا جائے۔
عرباض سے روایت کیا ہے۔

۲۱۵۲: ورواہ الدارمی عن خالد ابن معدان مرسلًا۔ وقال الترمذی هذا حدیث غریب۔

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۰۰/۲ حدیث رقم ۳۴۲۴۔

ترجمہ: نیز دارمی نے اس روایت کو خالد بن معدان سے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: عن خالد بن معدان: میم کے فتح اور عین ساکن کے ساتھ۔

مرسلا: کیونکہ وہ تابعین میں سے تھے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ستر صحابہ کی زیارت کی ہے اور وہ شامی ثقہ راویوں میں سے تھے جیسا کہ مؤلف نے ان کو ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث نسائی نے عرباض سے مرفوع روایت کی ہے، اور حدیث کے راویوں میں ایک راوی ہیں، معاہیہ بن صالح ان کے قول سے موقوف روایت کی ہے، اور وہ الحدید، الحشر، الصف اور الجمعہ اور التغابن اور الاعلیٰ ہیں۔ انھن میں بھی اسی طرح ہے اور اس کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جس کو ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ”انہ کان لاینام حتی یقرأ بنی اسرائیل والذمر“ ہے کہ آپ سورۃ بنی اسرائیل اور الزمر پڑھنے سے پہلے نہیں سوتے تھے۔
اس کو امام ترمذی نسائی اور حاکم رحمۃ اللہ علیہم نے عاصم سے روایت کیا ہے۔

۲۱۵۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ سُورَةَ فِي الْقُرْآنِ ثَلَاثُونَ آيَةً شَفَعَتْ لِرَجُلٍ حَتَّى غُفِرَ لَهُ وَهِيَ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ (رواه احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۱۹/۲ حدیث رقم ۱۴۰۰۔ والترمذی فی السنن ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۸۹۱۔ وابن ماجہ ۱۲۴۴/۲ حدیث رقم ۳۷۸۶۔ واحمد فی المسند ۲۹۹/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”قرآن میں تیس آیات کی ایک سورت ہے اس سورۃ نے ایک آدمی کی سفارش کی یہاں تک کہ اس کی بخشش ہو گئی اور وہ سورۃ ملک تبارک الذی بیدہ الملک ہے“ (احمد ترمذی ابوداؤد نسائی ابن ماجہ)

تشریح: وعن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ ان سورة: یعنی عظیم سورۃ۔

فی القرآن: یعنی قرآن میں موجود ہے، کائنۃ منصوب ہے کیونکہ یہ ان کے اسم کی صفت بن رہا ہے اور یہ ابن حجر کے اس قول کا محتاج نہیں ہے، جو کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ من کے معنی کے میں ہے۔ (ثلاثون آية: مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی ہی ثلاثون اور جملہ بھی ان کے اسم کی صفت بنے گا۔

شفعت: تخفیف کے ساتھ یہ ”ف“ مشدودہ نہیں ہے یہ ان کی خبر بن رہا ہے۔ اسی طرح طیبی نے کہا، اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ ان کا قول ثلاثون، ان کی خبر ہے اور شفعت خبر ثانی ہے بہر حال ابن حجر کا قول کہنا یہ جملہ استنافیہ ہے۔ اس لحاظ سے ابن حجر کا یہ قول

معنی سے بہت دور ہے۔

الازہار میں فرماتے ہیں: کہ شفعت مجہول کا صیغہ ہے، اس میں عین کلمہ ”ف“ مشدود بھی ہے یعنی اس کی شفاعت قبول کی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ عین کلمہ ”ف“ مخفف ہے اور فاعل میں معروف ہے اور یہ بات زیادہ صحیح ہے۔ اھ۔ اور اسی پر صحیح قراءت کی کتابت ہے۔

سورۃ کا شفاعت کرنا یا تو (اللہ کے علم میں) حقیقی طور پر ہے، اور یا پھر استعارہ کے طور پر ہے۔ اور یہ بات کہ اس کو جسم کی ہیئت دی جائیگی، جیسے کہ گزر چکا۔ اور یہ تمام کلام ابہام پر مبنی ہے۔

پھر یہ تفسیر سورت کی تعظیم ظاہر کرنے کے لئے ہے کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ: ”ان سورة تبارك شفعت“ تو یہ بات اتنی اہمیت و الٰہی نہ ہوگی۔

اسی حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ بسم اللہ ہر سورت کی آیت کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اس کی آیات مکمل ہیں۔ کیونکہ اس کی تیس آیات ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ اگر ہم اس کو فرض کر لیں وہ ایک ایک مکمل ہے۔ حالانکہ اس کے علاوہ اس کی تیس آیات پوری ہیں، یا تو یہ اس کی آیت سرے سے ہی نہیں ہے، جیسے کہ امام ابو حنیفہ اور مالک اور اکثر کا مذہب ہے۔ یا پھر یہ مکمل آیت نہیں ہے، بلکہ پہلی آیت کا ٹکڑا (جزو) ہے، جیسا کہ امام شافعی کے مذہب میں اسی طرح کی روایت ہے۔

لرجل حتی غفر له : شفعت کا متعلق ہے، اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ ماضی کے معنی میں ہو خیر دی، جار ہی ہو یعنی کہ آدمی اس کو پڑھتا تھا اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھتا تھا اس کی تعظیم کرتا تھا۔ جب فوت ہوا اس سورت نے اس کی سفارش کی حتی کہ اس سے عذاب کو ہٹا دیا اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مستقبل کے معنی میں ہو یعنی اپنے پڑھنے والے کی قبر میں یا قیامت کے دن سفارش کرے گی۔ طیبی فرماتے ہیں: رجل کو نکرہ لانا افراد کے لئے ہے یعنی آدمیوں میں سے آدمی کی سفارش کرے گی اور اگر شفعت بمعنی تشفع ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وَنَادَى اصْحَابَ الْجَنَّةِ﴾ [الاعراف: ۴۴] اور ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ [الفتح: ۱] تو یہ غیب کے بارے میں خبر دینا ہے اور جو آدمی اس کو پڑھے یہ سورت اس کی شفاعت کرے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک کو ابھارنا اور ترغیب دینا کہ ہر ایک اسی کو پڑھنے پر پیشگی کرے۔

وہی تبارک الذی بیدہ الملک) [الملک: ۱] یعنی آخر تک مکمل سورت ہے۔

ابن حبان اور حاکم نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے ابن عباس سے روایت نقل کی ہے۔ کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ سورت ہر مؤمن کے دل میں ہو یعنی اس کو یاد ہو۔

سورۃ الملک عذاب قبر سے نجات دلانے والی ہے

۲۱۵۴: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ صَرَبَ بَعْضُ اصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ خِجَاءً عَلٰى قَبْرِ وَهُوَ لَا يَحْسِبُ اِنَّهُ قَبْرٌ فَاِذَا فِيهِ اِنْسَانٌ يَّقْرَأُ سُورَةَ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ حَتَّى خْتَمَهَا فَاتَى النَّبِيَّ فَاخْبَرَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ هِيَ الْمَانِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ تَنْجِيهِ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۸۹۰۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص نے اپنا خیمہ ایک قبر پر نصب کر

لیا اسے معلوم نہ تھا کہ یہاں قبر ہے دفعتاً انہوں نے سنا کہ اس میں ایک شخص تبارک الذی بیدہ الملک پڑھ رہا ہے یہاں تک کہ اس نے وہ سورت ختم کی وہ خیمہ نصب کرنے والے صاحب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ آپ ﷺ کے گوش گزار کیا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”سورۃ ملک عذاب کو روکنے والی اور نجات دینے والی ہے یہ سورت اپنے پڑھنے والے کو اللہ کے عذاب سے چھٹکارا دلاتی ہے“ امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: وعن ابن عباس قال ضرب بعض اصحاب النبی ﷺ خباءہ : خاء کے کسرہ کے ساتھ اور اس کے بعد مد ہے اور اس کے بعد ضمیر ہے یعنی خیمتہ، اپنا خیمہ اور ایک نسخہ میں خباۃ نکرہ آیا ہے۔ طبری فرماتے ہیں: عرب کے گھروں میں سے ایک گھر کی قسم ہے، جو کہ پشم یا اون کا بنا ہوتا ہے، بالوں سے نہیں اور اس کے دو یا تین ستون ہوتے ہیں یعنی چھوٹا سا خیمہ۔
علی قبر : یعنی قبر کی جگہ پر۔ و هو : یعنی صحابی۔ لا یحسب : سین کا فتح اور کسرہ دونوں صحیح ہیں یعنی انہیں پتا نہیں تھا۔
انہ قبر : یعنی یہ قبر والی جگہ ہے۔ فاذا : اذا فجائیہ ہے۔ فیہ : یعنی اس جگہ میں۔
انسان : یعنی جو وہاں دفن شدہ تھا، اس نے اس کو نیند میں سنا یا بیداری کی حالت میں، اور یہ زیادہ ظاہر ہے، اس کے معین اور مبہم ہونے میں بھی احتمال ہے۔

یقرأ سورة تبارک الذی بیدہ الملک حتی ختمها [الملک: ۱]، کہتے ہیں کہ شاید یہ انسان وہی ہو جس کا پہلی حدیث میں ذکر گزر چکا ہے۔ اگر اس بات کو لے لیں، تو یہ ماضی کے بارے میں خبر ہوگی اور اگر اس سے اس حدیث کو مراد نہ لیں، تو یہ غیب کے بارے میں بتانا خبر ہوگی یہ بات الطیبی نے کہی ہے، اور یہ بات محل نظر بھی ہے۔ ابن الملک کہتے ہیں اس میں اس چیز کی دلیل بھی ہے کہ بعض وہ کام مردوں سے صادر ہوتے ہیں جو زندہ سے صادر ہوتے ہیں۔

فاتی النبی ﷺ : یعنی خیمہ والا آدمی۔ فأخبرہ : یعنی جو اس نے سنا تھا بیان کیا۔ فقال النبی ﷺ ہی : یعنی سورۃ الملک۔
المانعہ : یعنی عذاب قبر کو روکنے والی ہے یا ان گناہوں سے روکتی ہے جو عذاب قبر کو لازم کر دیتے ہیں یا پھر پڑھنے والے سے میدان حشر میں ہر قسم کی تکلیف کو روک دے گی۔

ہی المنجیۃ تنجیہ من عذاب اللہ : یعنی جہنم کے عذاب سے یا دوسری صفت پہلے کی تاکید کے لئے ہے، اور قبر عذاب مطلق یا مقید ہوگا۔ اور اس پر یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ قبر کے عذاب سے بچانے والی ہے یا دوسرا جملہ پہلے کی تفسیر کرتا ہے اور یہیں پر اس کے بعد یہ قول لایا تنجیہ یعنی اور کو بچاتی ہے محفوظ رکھتی ہے پھر پہلی حدیث میں دو جملے شفاعت کی وضاحت کرتے ہیں۔

۲۱۵۵. وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَنَامُ حَتَّى يَقْرَأَ آتَمَ تَنْزِيلُ وَتَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ. (رواه احمد

وترمزى ولذا مى قال الترمذى هذا حديث صحيح وكذا فى شرح السنة وفى المصايح غريب.)

اخرجه الترمذى فى السنن ۱۵۲/۵ حديث رقم ۲۸۹۲۔ والدارمى ۵۴۷/۲ حديث رقم ۳۴۱۱ واحمد فى المسند

۲۰۱۳

ترجمہ: ”حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ آتَمَ تَنْزِيلُ اور تبارک الذی بیدہ الملک پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے۔ (احمد ترمذی، دارمی) امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، بحی السنۃ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے لیکن مصابح میں کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: وعن جابر أن النبی ﷺ علیه وسلم كان لا ینام حتی یقرأ آلم تنزیل : حکائی اعراب رنؑ ہے اور آفب نؑخے میں نصبی ؑالؑ بھی مذکور ہے؁ اعنی کو مقدر کرتے ہوئے اور مضاف الیه بھی ہو سکتا ہے۔

وتبارك الذی بیده الملك [الملك: ۱] طیبیؑ فرماتے ہیں: حتی انثناء کے لئے آیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اعنی یہ ہو کہ نیند کا وقت داخل ہونے کے بعد ان دونوں سورتوں کو پڑھنے سے قبل سوتے نہیں تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مطلق طور پر سونے سے پہلے ان دوسورتوں کو پڑھتے تھے ان کے پڑھے بغیر سوتے نہ تھے؁ اور معنی یہ ہے کہ ان سورتوں کے پڑھنے سے پہلے سونا ان کی عادت نرا نہ تھی اس لحاظ سے سورتوں کا پڑھنا سونے کے وقت کے داخل ہونے سے پہلے ہے جو بھی وقت ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ ان کو رات کو پڑھا کرتے تھے تو اس سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اھ۔

اور افادہ سے مراد یہی پہلے والا فائدہ ہے؁ اور اس میں کوئی ترد نہیں ہوتا کہ دوسرا احتمال زیادہ ظاہر ہے؁ اس قول کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے کیونکہ یہ ہمیں تنگی کی طرف پہنچا دیتا ہے اور انتہائی عجیب بات ہے؁ کہ ابن حجرؑ فرماتے ہیں: آپ کا کہنا لا ینام یعنی نیند کا ارادہ نیند کے وقت کے داخل ہونے سے پہلے نہیں کرتے تھے۔ تاکہ فائدہ دے اس چیز کا جس کو ائمہ نے برقرار رکھا؁ کہ وہ ان دوسورتوں کا دوسری سورتوں کے ساتھ پڑھنا سنت کہتے ہیں۔ ہر رات کوسونے سے پہلے اور اس کی تائید نسائی کی حدیث کرتی ہے؁ دوسرے احتمال کہ ”من قرأها کل لیلۃ منعه اللہ بها من عذاب القبر“ جو اس سورت کو ہر رات پڑھے گا؁ اللہ اس کو عذاب قبر سے محفوظ رکھے گا؁ یہاں پر جو شارح کے لئے ہے وہ اس کے خلاف کا تقاضا کرتا ہے اور وہ ان کا قول یہ کہ آپ علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ ان دوسورتوں کو پڑھنے سے قبل نہیں سوتے تھے؁ اگرچہ نیند کا وقت داخل ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ ہو؁ غفلت کی وجہ سے جس کو ائمہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ جس سے میں نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہ اس پر محمول ہے کہ نہ طیبیؑ کی بات سمجھ میں آئی اور نہ دیگر ائمہ کی بات؁ اور اگر اس طرح نہ ہو تو طیبیؑ کے کلام اور ان ائمہ کے کلام کے درمیان اہل فہم کے لئے کوئی تفاوت نہیں ہے؁ ان کی عبارتوں کی اجنبیت کے باوجود یہ کہ وہ نیند کا ارادہ نہیں کیا کرتے تھے۔ وکذا: یعنی یہ والی مذکورہ روایت۔

فی شرح السنة وفی المصابیح غریب : یعنی یہ حدیث غریب ہے۔ الطیبیؑ فرماتے ہیں: یہ غریب ہونا اس کے صحیح ہونے کی نفی نہیں کرتا؁ کیوں کہ غریب حدیث بھی کبھی کبھار صحیح ہوتی ہے۔ اھ۔ نسائی نے اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں یہ روایت ذکر کی ہے اور سب نے جابرؑ سے روایت کی ہے۔

۲۱۵۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا زُلْزِلَتْ تَعْدِلُ نِصْفَ الْقُرْآنِ وَقُلُّ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ تَعْدِلُ ثَلَاثُ الْقُرْآنِ وَقُلُّ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُونَ تَعْدِلُ رُبْعَ الْقُرْآنِ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۳/۵ حدیث رقم ۲۸۹۴۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباسؑ اور حضرت انس بن مالکؑ دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”سورہ اذا زلزلت نصف قرآن کے برابر ہے سورہ قل هو اللہ تہائی قرآن کے برابر ہے اور سورہ قل یا ایہا الکفرون چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔“ (ترمذی)

تشریح: وعن ابن عباس وأنس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ ﴿اذا زلزلت﴾ [الزلزلة: ۱]؁ تعدل نصف

القرآن و ﴿قل هو الله احد﴾ [الاخلاص: ۱]؁ تعدل ثلث القرآن و قل ﴿يا ايها الكافرون﴾ [الكافرون: ۱] تعدل ربع القرآن: طیبیؑ فرماتے ہیں: قرآن سے مقصود مبتداء کا؁ آخرت کا بیان اور اذا زلزلت اجمالی طور پر آخرت کے ذکر پر مشتمل ہے اور بعض

روایات میں ہے کہ یہ چوتھائی قرآن کے برابر ہے

انہا تعدل ربع القرآن۔ اس کا بیان یہ ہے کہ مضامین قرآن چار قسموں پر مشتمل ہیں توحید، نبوت و رسالت اور گزر بسر کے احکام اور آخرت کے حالات اور یہ سورت بیان آخرت پر مشتمل ہے، اور قل یا ایہا الکافرون، توحید کے بیان پر محسوس ہے، کیونکہ شرک سے بیزاری توحید کا اثبات ہے۔ پس ان میں سے ہر ایک ربع قرآن کے برابر ہو جاتی ہے۔ اس سے مکمل برابری (آیات و واقعات کے لحاظ سے) مراد نہیں ہے، تاکہ سورۃ اخلاص پر از انزلت کی فضیلت و برتری ثابت نہ ہو جائے، اھ۔ اس میں یہ بھی ہے کہ سورۃ اخلاص میں تسویہ حقیقی یعنی حقیقی برابری نہیں ہے، اسی طرح اس میں بھی تاویل تو جیہہ کی جائے گی۔

پھر یہ کہا گیا ہے کہ یہ توجیہات ہمارے علم و فہم کے مطابق ہیں، جو کہ تصور و احتمال سے خالی نہیں ہو سکتی، بہر حال حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ سے اس طرح مروی ہے اور یقیناً وہ ایسی ہستی ہیں جن تک چیزوں کی حقیقت کی معرفت کی انتہاء ہوتی ہے۔ اور خفیہ علوم بھی ان پر کشف ہوتے رہے ہیں۔

پہلا کلمہ اترندی اور حاکم بن روایت ہے جو کہ ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے جب کہ دوسرا حصہ بخاری، ابوداؤد، ترمذی اور حاکم کی روایت ہے اور یہ سب ابوذرؓ سے روایت کرتے ہیں۔

سورۃ حشر کی آخری تین آیات کی فضیلت

۲۱۵۷: وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ اَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ فَقَرَأَ ثَلَاثَ آيَاتٍ مِنْ اٰخِرِ سُورَةِ الْحَشْرِ وَكَلَّمَ اللّٰهُ بِهٖ سَبْعِينَ اَلْفَ مَلَكٍ يُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ حَتّٰى يُمِيسَ وَاِنْ مَاتَ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مَاتَ شَهِيدًا وَمَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُمِيسُ كَانَ يَتْلُكَ الْمَنْزِلَ لَهٗ . (رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۷/۵ حدیث رقم ۲۹۲۲۔ والدارمی ۵۵۰/۱۲ حدیث رقم ۳۴۲۵۔

ترجمہ: حضرت معقل بن یسار رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ اعوذ باللہ السميع العليم من الشيطان الرجيم اور سورۃ حشر کی آخری تین آیتیں یعنی هو اللہ الذی لا اله الا هو سے آخر سورت تک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے متعین کرتا ہے جو اس کے لئے شام تک رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں اور اس کے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور اگر وہ شخص اس دن میں مرجاتا ہے تو شہادت کی موت پاتا ہے اور جو شخص اعوذ باللہ..... اور ان آیتوں کو شام کے وقت پڑھے تو صبح تک اسے یہ سعادت حاصل ہوتی ہے (ترمذی، دارمی) امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: وعن معقل بن يسار عن النبي ﷺ قال من قال حين يصبح : یعنی صبح کرے۔

ثلاث مرات اعوذ بالله السميع : یعنی اس کلمہ کو پڑھے۔ العليم : میرے حال کو۔

من الشيطان الرجيم : یعنی اس کے مکر و فریب سے۔ دعائیں تکرار یعنی تین دفعہ پڑھنا عاجزی کی وجہ سے ہے۔ اور یہ جملہ لفظاً خبریہ ہے، اور معنایاً انشائیہ دعائیہ ہے۔ یا تین دفعہ پڑھنا آیات کی تعداد کی مناسبت سے ہے، تاکہ قاری (پڑھنے والا) اس کے پڑھنے سے نر کے اور اس کے معانی میں تدبر کرے، اور اس میں جو اخلاقیات ہیں ان کو اپنائے۔

فقراً : یعنی مذکورہ تعویذ کے بعد۔ اور ظاہر یہی وہ دلیل بھی اس سے ٹوٹ جاتی ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول کے ظاہر سے

﴿فَاذْ قُرْءَاتِ الْقُرْءَانِ فَاَسْتَعِذُّ بِاللّٰهِ﴾ [النحل: ۹۸] امام الطیسیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے اس قول ”فاستعذ باللہ“ میں فاء مقابلے کے لئے ہے۔ کیونکہ آیت ظاہری طور پر قراءت کو تعوذ سے پہلے واجب قرار دیتی ہے، اور حدیث اس کے خلاف ہے۔ یہ ایسے ہے کہ کہا جائے گا۔ جب قراءت کا ارادہ کرے تو پناہ طلب کر لے، اور حدیث میں یہ تاویل مناسب نہیں ہے۔

ثلاث آیات من آخر سورة الحشر: یعنی اللہ کے فرمان: ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ﴾ [الحشر: ۲۲] سے لے کر مکمل سورت تک، کیونکہ اکثر کے نزدیک یہ آیات اسم اعظم پر مشتمل ہیں۔

وكل الله به سبعين ألف ملك يصلون عليه: یعنی اس کے لئے نیکی کرنے کی توفیق اور گناہ سے دور رہنے کی دعا کرتے ہیں یا اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

حتى يمسي وان مات في ذلك اليوم مات شهيدا: یعنی حکمی شہید۔

ومن قالها: یعنی ان کلمات کو اور ابن حجر نے انتہائی عجیب بات کی ہے، کہ اس مذکورہ قصے کو کہے گا۔

حين يمسي كان بتلك المنزلة: یعنی اس لکھے ہوئے مرتبہ پر ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ بعض رواۃ سے نقل بالمعنی اختصاراً ذکر کیا گیا ہے۔

جان لو! صبح سے مراد قاموس اور دیگر لغت کی کتابوں میں فجر ہے، یا دن کا ابتدائی حصہ، اور اس میں اشارہ ہے کہ پہلا شریعت کا اطلاق ہے، اور دوسرا معنی ہے ستاروں کی گردش سے کائنات کے احوال معلوم کرنے والوں کا، پھر فرمایا: المساء اور الامساء یہ الصباح اور الاصبح کی ضد ہیں، اور ابن حجرؒ نے یہاں بھی عجیب بات کہی ہے، کہتے ہیں: ظاہر ہے کہ صبح سے مراد عموماً دن کا ابتدائی حصہ اور شام سے مراد رات کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے، اسی طرح ہر اس ذکر کے بارے میں کہا جائے گا جو صبح یا شام سے متعلقہ ہو اور یہاں ان کا لغوی معنی مراد نہیں ہے، کیونکہ اس طرح صبح تو آدھی رات سے زوال تک ہوتی ہے، اور شام زوال سے آدھی رات تک ہوتی ہے، جیسا کہ ثعلب اور اس کے ہم مذہب لوگوں کا قول ہے اھ۔

بالفرض اگر بعض لغویوں کے نزدیک اس کو صحیح مان لیا جائے تو بھی — جمہور کے قول سے ثعلب کی طرف عدول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انہوں نے اس کا (ہر لغت) کا اطلاق کیا ہے پھر عرف شرعی سے جو لغت کے مطابق ہو اس کا عرف عامہ کی طرف اس کا کوئی معنی نہیں۔ حدیث اور آیت میں کے پہلے قول سے پھیرنے والی کوئی چیز نہیں اور دوسرے پر ابھارنے والی کوئی چیز نہیں۔

عرض مرتب:

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں سورۃ حشر کی آخری تین آیات یعنی: ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلِيمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ ﴿۲۲﴾ ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلْمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ ﴿۲۳﴾ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ﴿۲۴﴾ کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ جو شخص ان کی تلاوت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ستر ہزار فرشتے متعین کر دیتے ہیں جو اس کے لیے خیر کی توفیق کی اور شر کے دفع ہونے کی دعا مانگتے ہیں اور اس کے ناموں کی بخشش مانتے ہیں اور اگر اس دن مرے گا۔ تو شہید ہو کر مرے گا۔

۲۱۵۸: وَعَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ كُلَّ يَوْمٍ مَاتِي مَرَّةً قُلَّ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ مُحِيَّ عَنْهُ ذُنُوبٌ

خَمْسِينَ سَنَةً إِلَّا أَنْ يَكُونَ عَلَيْهِ دَيْنٌ. رواه الترمذی والدارمی وفي روايته خَمْسِينَ مَرَّةً وَلَمْ يَذْكُرْ إِلَّا أَنْ

يَكُونُ عَلَيْهِ دَيْنٌ

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۴۱۵ حدیث رقم ۲۸۹۸۔ والدارمی ۵۵۳۱۲ حدیث رقم ۳۴۳۸۔

ترجمہ: ”حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص ہر روز دو سو مرتبہ قل هو اللہ احد پڑھے تو اس کے پچاس برس کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں الا یہ کہ اس پر دین ہو (کہ وہ معاف نہیں ہوتا) (ترمذی داری) ایک اور روایت میں پچاس مرتبہ ذکر ہے نیز اس روایت میں الا یہ کہ اس پر دین ہو کے الفاظ مذکور نہیں ہے۔“

تشریح: وعن انس عن النبي ﷺ قال من قرأ كل يوم مائة مرة ﴿قل هو الله احد﴾ [الاخلاص: ۱]: یعنی آخر

قرآن تک مکمل سورۃ یا یہ سورت۔

محی عنہ: یعنی اس کے نامہ اعمال سے۔

ذنوب خمسين سنة الا أن يكون عليه دين: یعنی اس طور پر کہ ان گناہوں کا تعلق حقوق العباد میں سے کسی کے حق کے ساتھ ہو جیسے کہ قرض وغیرہ کی عدم ادائیگی میں اور مرنے کے وقت وصیت نہ کرنا۔ یہ مجھے سمجھ آئی ہے اور وہ اسی طرح ہے جیسا کہ امام مسلم روایت کرتے ہیں: ”يغفر للشهيد كل شيء الا الدين“ کہ شہید کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے سوائے قرض کے۔ طیبی فرماتے ہیں: قرض کو گناہوں کی جنس میں شامل کرنے کا مقصد اس کو خوفناک بنا کر بُرا بنانا ہے۔ اور ابن حجر نے بھی یہی بات کہی ہے، لیکن انہوں نے صغیرہ گناہوں کی قید لگائی ہے وہ بھی وہ جو اللہ تعالیٰ کے متعلقہ ہیں۔

روایت ہے یعنی داریؓ کی روایت میں اور ایک نسخہ میں اور ایک داریؓ کی روایت میں۔

خمسين مرة: یعنی پچاس مرتبہ پڑھنے کے بدلے، اور یہ مناسبت میں زیادہ ظاہر ہے عمل اور اس پر حاصل ہونے والے ثواب کے بائین اور پہلی روایت کی توجیہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام سے زیادہ مشہور ہے۔

ولم يذكر: یعنی داریؓ نے اس روایت میں۔

الا ان يكون عليه دين: کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ حقوق العباد میں کوئی نرمی نہیں ہوگی۔ اور رہا ابن حجر کا قول کہ مطلق قرض مراد ہے، اگرچہ اللہ کا ہی کیوں نہ ہو جیسے زکوٰۃ اور کفارہ یہ اس طرح نہیں معاف ہوں گے، کیونکہ ان میں آدمی کے لئے مضبوط شائبہ ہے۔ کیونکہ جو اس کو اس طرف پھیرتا ہے، کہ یہ گناہ معاف نہیں ہوں گے تو یہ بات رد ہے کیونکہ اگر قرض سے مراد لوگوں کا قرض ہو تو اس پر اس کا اطلاق درست نہیں، اور اگر اس سے مراد اللہ کا قرض ہو پھر اس قسم میں استثنا کی کیا ضرورت ہے۔

۲۱۵۹: وَعَنْ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مَنْ ارَادَ اَنْ يَنَامَ عَلٰى فِرَاشِهِ فَنَامَ عَلٰى يَمِيْنِهِ ثُمَّ قَرَأَ مِائَةَ مَرَّةٍ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ يَا عَبْدِيْ اَدْخُلْ عَلٰى يَمِيْنِكَ الْجَنَّةَ .

(رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۴۱۵ حدیث رقم ۲۸۹۸۔

ترجمہ: ”حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص اپنے بستر پر سونے کا ارادہ کرے اور پھر اپنی داہنی کروٹ پہ لیٹ کر سو مرتبہ قل هو اللہ احد پڑھے تو قیامت کے دن پروردگار اس سے فرمائے گا کہ اے میرے بندے اپنی دائیں جنت میں داخل ہو جا“ (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا

ہے یہ حدیث غریب ہے۔“
تشریح: وعنه: یعنی انسؓ سے۔

عن النبی ﷺ من اراد: اور ایک نسخہ میں ہے: قال من اراد اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

ان ینام علی فراشه فنام: اس کا عطف آزاد پر ہے، اور فاء تعقیب کے لئے ہے۔

علی یمینہ: یعنی سنت طریقے کے مطابق۔ (ثم قرأ مائة مرة: ثم، تراخی کے لئے ہے ترتیب کے ساتھ۔

﴿قل هو الله احد﴾ [الاخلاص: ۱] اذا كان يوم القيامة يقول له الرب: شرط اپنی اس جزاء کے ساتھ ہو بقول ہے،

پہلی شرط کے لئے جزاء ہے جو کہ ”من“ ہے، اور شرط ثانی اپنی جزا میں عمل نہیں کر سکتی میری مراد بقول ہے کہ شرط ماضی ہے اس میں عمل نہیں کرے گی تو جزاء میں بھی عمل نہیں کرے گی۔

یا عبدی!: اے میرے خاص بندے! میری توحید میں مبالغہ کرنے والے۔

ادخل علی یمنک: ادخل کے فاعل سے حال ہے، یہ اس کے مطابق ہو گیا، فنام علی یمینہ یعنی تو نے جب میرے رسول

کی اطاعت کی اور دائیں کروٹ لیٹ کر اس سورت کی تلاوت کی جس میں میری صفات ہیں، اس وجہ سے آج تو اصحاب الیمین میں سے ہے، اور دائیں طرف سے جنت میں داخل ہو جا۔

الجنة: اس حدیث میں اشارہ ہے کہ جنت کے جو باغات اور محلات دائیں جانب ہوں گے وہ بائیں جانب سے افضل ہیں،

اگر چہ اس کی دونوں طرفیں دہنی ہی ہیں۔ اور اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جنت والے تین اقسام میں منقسم ہوں گے، پہلی قسم مقربوں یہ علیین والے ہوں گے، اور ابرار یعنی نیکو کار یہ دائیں طرف والے ہوں گے، اور بخشے ہوئے یا سفارش کئے ہوئے یا پاک (عذاب سے پاک) کئے ہوئے گنہگار ہوں گے اور وہ بائیں طرف والے ہوں گے۔

یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اخذ ہوئی ہے: ﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ ۗ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ ۗ يُؤْتِنُ اللَّهُ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ۗ جَنَّتٌ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا﴾ [فاطر: ۲۲-۲۳]

”پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں سے چن لیا ہے ممتاز کر لیا ہے ان میں سے کچھ اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ درمیانے اور کچھ اللہ کے حکم سے نیکی کے کاموں میں سبقت لے جانے والے ہیں، یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے جس میں یہ لوگ داخل ہوں گے“ اھ۔ یعنی ان تینوں قسموں کے ممتاز لوگ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ابن الملک فرماتے ہیں یہ اجر (ثواب) آدمی کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے دائیں پہلو لیٹنے اور اس سورۃ کے پڑھنے

کا بدلہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اس کے بدلے اللہ اصحاب الیمین سے بنا دے گا اور جنت میں دائیں طرف سے دخول نصیب فرمائے گا۔

علماء فرماتے ہیں یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے جس کو بھی فضائل اعمال سے کوئی چیز پہنچے وہ اس پر عمل کرے اگرچہ ایک دفعہ ہی

کیوں نہ ہو اور اگرچہ وہ حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ اس پر عمل اتفاقی طور پر کر رہا ہے۔

۲۱۶۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَمِعَ رَجُلًا يَقْرَأُ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ فَقَالَ وَجَبَتْ قُلْتُ وَمَا وَجَبَتْ؟

قَالَ الْجَنَّةُ (رواه مالك والترمذی والنسائی)

رقم ۸ من کتاب القرآن۔ واحمد فی المسند ۲/۲۰۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو قتل ہوا اللہ احد پڑھتے سنا تو ارشاد فرمایا ”واجب ہوگئی؟ میں نے عرض کیا کہ کیا چیز واجب ہوگئی؟ فرمایا جنت۔“ (مالک ترمذی نسائی)

تشریح: وعن ابی ہریرۃ ان النبی ﷺ سمع رجلاً یقرأ قل هو اللہ احد فقال وجبت : یعنی اس کے لئے۔ فقلت ما وجبت : یعنی آپ کی اس بات کا کیا مطلب اس کے پڑھنے والے پر ثواب واجب ہو جاتا ہے یا جو کرے وہ ہے۔ قال الجنة : یعنی اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق ہے، اور اس کے اس فضل کے مطابق جس کی خلاف ورزی وہ نہ کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ان اللہ لا یخلف المیعاد﴾ [الرعد: ۳۱] ”یقیناً اللہ تعالیٰ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔“

۲۱۶۱: وَعَنْ فُرُوۡةَ بْنِ نُوۡفَلٍ عَنْ اَبِيۡهِ اَنَّهُ قَالَ قَالَ يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ عَلِمْنِيۡ شَيْئًا اَقُوۡلُهُ اِذَا اُوۡتِيَ اِلٰی فِرَاشِيۡ فَقَالَ اَقْرَأْ قُلْ يَاۡ اَيُّهَا الْكٰفِرُوۡنَ فَاِنَّهَا بَرَاۡءَةٌ مِّنَ الشِّرْكِ. (رواه الترمذی و ابو داود و الدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۰۳/۵ حدیث رقم ۵۰۵۵۔ و الترمذی فی السنن ۴۴۲/۵ حدیث رقم ۳۴۰۳۔ و الدارمی

۵۵۱/۲ حدیث رقم ۳۴۲۸۔ واحمد فی المسند ۵/۵۶۷۔

ترجمہ: ”حضرت فروہ ابن نوفل اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز سکھلا دیجئے جسے میں اپنے بستر پر جا کر پڑھ لیا کروں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا قل یا ایہا الکفرون پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ سورت شرک سے براءت کا اعلان ہے۔“ (ترمذی ابو داؤد دارمی)

تشریح: وعن فوروۃ بن نوفل عن ابیہ : تقریب التہذیب میں ہے کہ فروہ بن نوفل اشجعی کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کے والد صحابی تھے انہوں نے اپنے باپ سے سب علم کیا تھا اور یہ فروہ طبقہ ثالثہ کے راویوں میں سے تھے۔

انہ قال یا رسول اللہ علمنی شیناً قوله اذا اوتی : اوتی، قصر اور مد دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

الی فراسہ فقال اقرأ قل یا ایہا الکافرون [الکافرون: ۱]: یعنی مکمل سورت اور بعض روایات میں ہے پھر انکے اختتام پر سو جا۔

فانہا : یعنی یہ سورت۔ (برآءة من الشرك : یعنی شرک سے بیزاری اور توحید کے لئے موید ہے۔

اس کونسائی اور ابن حبان اور حاکم نے اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔

سورة الفلق اور سورة الناس کے ذریعے پناہ پکڑا کرو

۲۱۶۲: وَعَنْ عُقَبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ بَيْنَا اَنَا اَسِيرٌ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ الْجُحْفَةِ وَالْاَبْرَاءِ اِذْ غَشِيَتْنَا رِيۡحٌ وَظُلْمَةٌ شَدِيۡدَةٌ فَجَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَتَعَوَّذُ بِاَعُوذِ بَرِّبِ الْفُلُقِ وَاَعُوذِ بَرِّبِ النَّاسِ وَيَقُوۡلُ يَا عُقَبَةُ تَعَوَّذْ بِهِمَا فَمَا تَعَوَّذْ مَتَعَوَّذْ بِمِثْلِهِمَا۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۱۵۳/۲ حدیث رقم ۱۴۶۳۔

ترجمہ: ”حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جحفہ اور ابواء کے درمیان چل رہا تھا کہ اچانک سخت آندھی اور شدید اندھیرے نے ہمیں آگھیرا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اعوذ برب الفلق اور اعوذ برب الناس کے ذریعے پناہ مانگی شروع کی اور مجھ سے فرمایا کہ ”عقبہ“ ان دونوں سورتوں کے ذریعے پناہ مانگو کیونکہ کسی پناہ چاہنے والے نے ان دونوں کی مانند کسی چیز کے ذریعے پناہ نہیں چاہی ہے۔“ (ابو داؤد)

تشریح: وعن عقبہ بن عامر قال بین انا اسیر مع رسول اللہ ﷺ بین الجحفة : اور یہ اہل شام اور اہل مصر اور اہل مغرب کا قدیم میقات تھا۔ اس دوران اس کا نام رابع تھا اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ سیول نامی پرندے اس کو اپنے پروں میں لے لیا تھا اور یہ وہی جگہ ہے جس کی طرف آپ ﷺ نے مدینہ کے نجا رک کو بھیجا تھا، یہاں سے اگر کوئی کبوتر بھی گزرتا تو اس کو بھی بخار ہو جاتا تھا۔ یا تو اس کے پانی کی قلت کی وجہ سے یا پناہ کے بارے کثرت خوف کی وجہ سے لوگ رابع سے اپنے احرام تبدیل کرتے تھے، جو کہ امن اور پانی کی فراوانی میں مشہور ہے۔

عرض مرتب:

والابواء : ہمزہ کے فتح اور باء کے سکون اور مد کے ساتھ، مکہ اور مدینہ کے درمیان پہاڑ ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہی وہ بستی اور وہی مقام ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے وفات پائی۔ اس کے اور چھ کے درمیان 20 بیس یا تیس میل کا فاصلہ ہے۔

اذ غشیتنا ریح وظلمة شدیدة فجعل : یعنی آپ نے پڑھنا شروع ہو۔

رسول اللہ ﷺ يتعوذ ﴿اعوذ برب الفلق﴾ [الفلق: 1] : یعنی مخلوق کے شر سے یا جہنم کے عذاب سے۔

اعوذ برب الناس [الناس: 1] : یعنی یہ دو سورتیں اس پر مشتمل ہیں۔ (ویقول : اور ظاہر یہ ہے کہ روایت میں قال ہے یہ استقبال کی طرف عدول ہے ماضی اور حال کی موجودگی میں، باوجود اس کے کہ آپ علیہ اسلام سے تکرار کا وقوع اس پر ابھارنے اور ترغیب دینے کی غرض سے ہے۔

اور ابن حجر کی بات بہت ہی عجیب و غریب ہے کہ انہوں نے واؤ کو حالیہ کہا، فرماتے ہیں: یعنی اور حال یہ ہے کہ جب بھی ان دو سورتوں کی قراءت سے فارغ ہوتے، فرماتے۔

یا عقبہ تعوذ بما تعوذ متعوذ بمثلہما : یعنی بلکہ یہ دونوں افضل تعویذ (پناہ) ہیں اور اسی وجہ سے جب رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا تھا ایک سال تک آپ محسور رہے، حتیٰ کہ اللہ نے آپ کو یہ دو سورتیں سکھانے کے لئے دو فرشتے بھیجے، پس آپ نے پڑھیں تو آپ سے جادو کا اثر زائل ہو گیا۔

۲۱۶۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ حَبِيبٍ قَالَ خَرَجْنَا فِي لَيْلَةِ مَطَرٍ وَظَلْمَةٍ شَدِيدَةٍ نَطَلُّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

فَأَذْرَكُنَاهُ فَقَالَ قُلْ قُلْتُ مَا أَقُولُ؟ قَالَ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ حِينَ تَصْبِحُ وَحِينَ تُمْسِي ثَلَاثَ

مَرَاتٍ تَكْفِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ. (رواه الترمذی ابو داؤد والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۲۰/۵ حدیث رقم ۵۰۸۲۔ والترمذی ۵۳۰/۵ حدیث رقم ۳۵۷۵ والنسائی ۲۵۰/۸

حدیث رقم ۵۴۲۸۔

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن حبیب فرماتے ہیں کہ ہم برسات کی ایک سخت اندھیری رات میں رسول اللہ ﷺ

کو تلاش کرتے ہوئے نکلے چنانچہ ہم نے آپ کو پالیا، آپ نے فرمایا کہ پڑھو ”میں نے عرض کیا کہ ”کیا پڑھوں“

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ”صبح اور شام کے وقت تین مرتبہ قل هو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب

الناس پڑھ لیا کر دیکھتے تمہیں ہر چیز سے کفایت کریں گی۔“ (ترمذی ابو داؤد نسائی)

تشریح: وعن عبد الله بن حبيب قال خرجنا في ليلة ماطر وظلمة : یعنی بارش اور اندھیری رات میں۔

نطلب رسول الله ﷺ : یعنی آپ کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے (آپ کے تیز چلنے کی وجہ سے) :-

فأدر كناه فقال قل : یعنی پڑھ۔ قلت ما أقول : یعنی میں کیا پڑھوں؟

قال قل هو الله احد [الاخلاص : ۱] : قل هو الله احد کی نصی حالت ہے اُقرأ، فعل محذوف مانا جائے گا، والمعوذتین : واڈ کے کسرہ کے ساتھ اور فتح بھی پڑھا جاسکتا ہے، معطوف علیہ ہے۔

حين تصبح وحين تمسی ثلاث مرات تكفيك : تکفی مؤنث کا صیغہ استعمال کیا یعنی تین سورتیں یا مذکر بھی ہو سکتا ہے یا پھر اس سے مراد اللہ تعالیٰ تجھے کافی ہوگا۔

من كل شیء : طیبی فرماتے ہیں: تجھ سے ہر قسم کی برائی ہٹا دیں گی۔ من زائدہ اثبات میں ہے ایک جماعت کے مذہب کے مطابق اور جمہور کا مذہب بھی یہی ہے، کیونکہ یکفیک یہ نفی کو متضمن ہے، اس کی تفسیر سے سمجھا جاسکتا ہے۔ تدفع کے ذریعے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ من ابتداء الغایة کے لئے ہے، یعنی تجھ سے برائی سے نچلے مرتبہ سے لے کر یعنی چھوٹی برائی سے لے کر بڑی سے بڑی برائی (مصیبت) کو تجھ سے روک لے گا۔ یا پھر من تبعیضیہ ہے یعنی مصیبت کی اقسام میں سے کچھ برائیوں کو روک دیں گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی ہو تجھے اس کے علاوہ سے غنی (بے پرواہ) کر دیں گی۔ اور دوسرے معنی کی تائید پہلی حدیث کا مفہوم بھی کرتا ہے، جو کہ عقبہ روایت کرتے ہیں کہ ”ما تعوذ متعوذ بمثلها“ اور یہ تعیف ابن حجر کے خلاف ہو جاتی ہے، ان کا پہلا قول آنے والی روایت کے ساتھ ہے اور یہ محل نظر ہے، کیونکہ آنے والی حدیث میں سورۃ الناس اکیلی ہے اور فضائل میں قیاس کا کوئی اعتبار نہیں، وجہ جو میں وہاں ذکر لوں گا اس پر غور کرنا، پس ان کی یہ بات بغیر غور فکر صادر ہوئی ہے۔

۲۱۶۳: وَعَنْ عَقَبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَقْرَأُ سُورَةَ هُودٍ أَوْ سُورَةَ يُوسُفَ قَالَ لَنْ تَقْرَأَ شَيْئًا أَبْلَغَ عِنْدَ اللَّهِ مِنْ قُلِّ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ - (رواه احمد والنسائي والدارمي)

اخرجه النسائي في السنن ۱۵۸/۲ حديث رقم ۹۵۳۔ والدارمي ۵۵۳/۲ حديث رقم ۳۴۳۹۔ واحمد في المسند ۱۴۹/۴۔

ترجمہ: ”حضرت عقبہ ابن عامر کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ ﷺ کیا میں سورۃ ہود پڑھا کروں یا سورۃ یوسف آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم اللہ کے نزدیک قل اعوذ برب الفلق سے بلیغ تر کوئی چیز نہیں پڑھ سکتے۔“

تشریح: وعن عقبه بن عامر قال قلت يا رسول الله ﷺ اقرأ : یہاں اُقرأ ہے، ہمزہ الاستفہام حذف ہو گیا یا یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو مد کے ساتھ پڑھا جائے یعنی اُقرأ، پھر بغیر حذف کے بھی استفہام کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔

سورة هود : هود منصرف اور غير منصرف دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔

أو سورة يوسف : یعنی میں اپنی پریشانی اور مصیبت کو دور کرنے کی خاطر ان میں سے کوئی ایک سورت پڑھ لوں؟

قال لن تقرأ شيئاً أبليغ عند الله : یعنی پناہ مانگنے اور مصیبت کے ٹالنے کے لئے مکمل ہے۔

عند الله : یعنی یہ کلام اللہ کی سورتوں میں سے یا اس کی قضاء اور تقدیر کے فیصلے کے مطابق۔

من قل اعوذ باب الفلق [الفلق : ۱] : یعنی اس سورت سے۔ اور طیبی فرماتے ہیں: یعنی ان دوسورتوں سے آپ کے اس قول

تعوذ بهما کے مطابق اور ابن الملک فرماتے ہیں: اس سے ان دوسورتوں کو پناہ کے لئے پڑھنے کی ترغیب مزاد ہے، گویا کہ دونوں کا مقصد یہ ہے کہ یہ حدیث دو قرینوں میں سے ایک قرینے کے ساتھ دوسری سے اکتفاء کرتی ہے۔

اور یہ دونوں حدیثیں متفق علیہ ہیں، اور مسلم کی اس حدیث کے مطابق ہیں جو معوذتین کے بارے میں مذکور ہیں، ان کی طرح کی

نہیں دیکھی گئیں۔

ایسے موقع پر ابن حجرؒ کی اس بات کی کوئی ضرورت نہیں رہتی جو انہوں نے بہت زیادہ تکلفات اور بہت عجیب و غریب باتیں ذکر کی ہیں، اور جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کو انہوں نے بہت دور چھوڑ دیا ہے۔

الفصل الثالث:

۲۱۶۵: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَعْرَبُوا الْقُرْآنَ وَاتَّبِعُوا غَرَائِبَهُ وَعَرَائِبُهُ فَرَأَيْتُمْ
وَحُدُودَهُ. (البیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۴۲۷/۲ حدیث رقم ۲۲۹۳۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قرآن کے معانی بیان کرو اور اس کے غرائب کی اتباع کرو اور اس کے غرائب اس کے فرائض اور حدود ہیں۔“

تشریح: عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ اعرابوا: یعنی اے اہل علم حضرات!

القرآن: یعنی قرآن میں جو غریب الفاظ ہیں اور جو اعراب کی بارے باتیں ہیں ان کو واضح کرو۔

واتبعوا غرائبہ: یعنی اس میں جو غریب الفاظ اور اجنبی لغتیں ہیں، تاکہ تکرار لازم نہ آئے اس لئے اس قول کے ساتھ تفسیر فرمادی۔
وغرائبہ فرائضہ و حدودہ: فرائض سے مراد احکام حدود سے مراد منہیات یعنی جن کاموں سے روکا گیا ہے۔ یا فرائض سے علم الفرائض یعنی وراثت کا علم اور شرعی احکام یا مطلق طور پر قرآنی احکام اور حدود میں سے جن کے بارے علم حاصل کیا جاسکتا ہے میری مراد باریک مسائل اور اشارے کے سمجھنے اور معنی کا حاصل بیان کریں جن پر قرآن کی آیات دلالت کرتی ہیں، ان احکام سے جن کا سمجھنا دشوار ہے، اور جو انوکھے احکام ہیں اور خرق عادت معجزات اور ایسے اخلاق اور ایسے آداب اور وعظ و نصیحت کے مقامات وعدے اور وعید اور وہ مضامین جو ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہیں، اور ان تمام کو طلباء کے لئے واضح کریں۔ تاکہ وہ اس کو سیکھیں، اور نیکی کے مقابلہ جات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور اس کے ذریعے کرامات میں آگے بڑھیں، یا قرآن کے مشکل الفاظ اور مشکل عبارتوں اعراب کو بیان کریں اور اس کے مجملات کو حل کریں، اور اس کے پوشیدہ معانی کو حل کریں، اور یہ اعراب کے بدلنے سے جو مختلف معانی ہوتے ہیں، ان کو یاد کرنا پلے باندھنا کیونکہ معنی و مفہوم اعراب کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

لیکن دو اعتبار سے دونوں قولوں کے درمیان کو تفاضل نہیں ہے۔ حسن بصری نے اس آدمی کو کہا جس نے پوچھا تھا کہ قراءت کو درست کرنے کے لئے عربی علوم کس سے سیکھوں؟ تو فرمایا بیٹے ضرور سیکھو، کیونکہ آدمی جب کوئی آیت پڑھتا ہے پھر اس کو منہ میں یاد کرتا ہے، پس وہ اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔ قرآن کے اعراب کے بارے سب سے پہلے ضروری بات یہ ہے کہ اس کے اعراب کے مطابق اس کے معانی کو سمجھا جائے۔ وہ بھی آیت کی مراد کے مطابق سیاق و سباق کے مطابق۔

بس اتنا ہی کافی ہے جو کہ اس کے بارے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ ”اعراب معانی کی فرع ہے اور اسی لئے سورتوں کے ابتدائی مشابہ الفاظ پر اعراب پڑھنا منع ہے یعنی الم، لحم وغیرہ جن کا علم اللہ نے اپنے پاس ہی رکھا کسی اور کو نہیں دیا۔ مشہور قول کے مطابق یہی مشابہ ہر قوم کا مذہب ہے۔ ابن ہشام فرماتے ہیں: اور اکثر ترکیب دان قرآن کے اعراب پر کتابیں لکھنے والوں کے قدم ڈگمگائے کہ انہوں نے معنی سے ہٹ کر صرف لفظ پر نظر رکھی۔ معنی نے اپنی کتاب میں اس کی کئی ایک مثالیں ذکر کی ہیں، ان سے ایک یہ ہے کہ کسی نے قیما کو عوجا کی صفت بنایا سورۃ کہف کے شروع میں اور اللہ تعالیٰ حفص پر رحم کرے کہ انہوں نے عوجا پر خاموشی اختیار کی کسی کجی وغیرہ سے بچتے ہوئے۔“

قراءتِ قرآن کی فضیلت دوسرے اعمال پر

۲۱۶۶: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ قِرَاءَةُ الْقُرْآنِ فِي الصَّلَاةِ أَفْضَلُ مِنْ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ فِي غَيْرِ الصَّلَاةِ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ فِي غَيْرِ الصَّلَاةِ أَفْضَلُ مِنَ التَّسْبِيحِ وَالتَّكْبِيرِ وَالتَّسْبِيحِ أَفْضَلُ مِنَ الصَّدَقَةِ وَالصَّدَقَةُ أَفْضَلُ مِنَ الصَّوْمِ وَالصَّوْمُ جَنَّةٌ مِنَ النَّارِ - (البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۴۱۳/۲ حديث رقم ۲۲۴۳۔

ترجمہ: ”سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”نماز میں قرآن پڑھنا نماز کے علاوہ قرآن پڑھنے سے افضل ہے اور نماز کے علاوہ قرآن کا پڑھنا تسبیح و تکبیر سے زیادہ ثواب رکھتا ہے اور تسبیح صدقہ سے افضل اور صدقہ روزہ سے افضل ہے اور روزہ دوزخ کی آگ سے ڈھال ہے۔“

تشریح: وعن عائشة أن النبي ﷺ قال قراءة القرآن في الصلاة: کیونکہ یہ دوسری عبادتوں سے ممتاز ہے یا پھر اس میں ادب حضور حاضری کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

أفضل من قراءة القرآن في غير الصلاة: دیگر شغل وغیرہ سے روکنے والی ہوتی ہے، اکثر اور اس میں توجہ بھی ہوتی ہے۔
وقراءة القرآن في غير الصلاة أفضل من التسبيح والتكبير: یعنی ان کے ہم مثل دیگر تمام اذکار اور دعائیں قرآن کے اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے اور اس میں اللہ کا حکم اور اس کے احکام بھی موجود ہیں۔
والتسبيح: یعنی اور اس کی ہم مثل تکبیر وغیرہ۔

أفضل من الصدقة: یعنی ذکر سے خالی صرف صدقہ ہو کیوں کہ تمام عبادتوں کیوں کا مقصد اللہ کا ذکر ہی ہے۔
والصدقة أفضل من الصوم: یعنی نفلی روزے سے، کیونکہ صدقہ کا نفع تجاوز کرنے والا ہے اور روزہ قاصر ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ روزہ تب فائدہ دیتا ہے کہ جب آدمی اپنا کھانا صدقہ کر دے اور اگر کھانا صدقہ نہ کرے تو فائدہ نہ دے گا کہ آدمی اپنے آپ کو روکے رکھے، پھر کیلا ہی کھا جائے۔ اور طیبی فرماتے ہیں: ایک قول یہی ہے جو کہ گزر چکا۔ کہ ”أن كل عمل ابن آدم يضاعف الحسنة بعشر أمثالها إلى سبعمائة ضعف إلا الصوم“۔ ”ابن آدم کے ہر عمل کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے، سوائے روزے کے“۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ روزہ افضل ہے۔ اس کی تطبیق اس طرح ہوگی کہ جب نفس عبادت کی دیکھا جائے تو نماز صدقے سے افضل ہے اور صدقہ روزے سے افضل ہے۔ اور جب ہر ایک کو دیکھا جائے اور ان کی خصوصیات کو دیکھا جائے جو کہ ایک دوسرے میں مشترک نہیں ہیں، تو روزہ افضل ہے۔

والصوم جنة: یعنی آگ سے بچاؤ ہے یعنی ان اسباب سے جو دنیا میں اس کو آگ کی طرف کھینچتے ہیں اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچاؤ ہے۔ پس جب یہ روزے کے فوائد ہیں تو تیرا اس صدقہ کے بارے کیا خیال ہے جو اس روزہ سے افضل ہے۔

۲۱۶۷: وَعَنْ عُمَانَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَوْسٍ الثَّقَفِيِّ عَنْ جَدِّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قِرَاءَةُ الرَّجُلِ الْقُرْآنَ فِي غَيْرِ الْمُصْحَفِ الْكُفْرُ بِجَدِّهِ وَقِرَاءَتُهُ فِي الْمُصْحَفِ تَصَعَّفَ عَلَيَّ ذَلِكَ إِلَى الْفِي ذَرْجَةٍ.

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۴۰۷/۲ حديث رقم ۲۲۱۸۔

ترجمہ: ”حضرت عثمان ابن عبد اللہ بن اوس ثقفی اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”آدمی کا قرآن سے دیکھے بغیر پڑھنا ہزار درجہ ثواب رکھتا ہے اور قرآن سے دیکھ کر پڑھنے کا

ثواب دو ہزار درجہ تک زیادہ کیا جاتا ہے۔“

تشریح: وعن عثمان بن عبد اللہ ابن اوس الثقفی عن جده قال: قال رسول اللہ ﷺ قراءۃ الرجل القرآن فی غیر المصحف: یعنی اپنے حافظے سے۔

الف درجہ: یعنی ہزار درجات والا، یا اس کا ثواب ہزار درجے ہے اور ہر درجے میں نیکیاں ہیں۔ طیبی فرماتے ہیں الف درجہ۔ آپ علیہ السلام کے قول قراءۃ الرجل کی خبر ہے مضاف کو مقدر مانتے ہوئے یعنی ذات الف درجہ۔ تاکہ اس پر محمول صحیح ہو، جیسا کہ باری تعالیٰ کا فرمان ﴿ہم درجات﴾ ای ذو درجات، درجات والے اور ابن حجر نے ایک منفرد بات ہی کی ہے، انہوں نے قراءۃ کو اس الف سے مجاز بنایا ہے، جیسے رجل عدل، تو آپ بھی غور کر لیں۔

قراءۃ فی المصحف یضعف: یضعف، مذکر اور مؤنث دونوں طرح اور اس عین مشدد ہے یعنی زیادہ ہوتا ہے۔ علی ذالک: یعنی زبانی پڑھنے پر۔

الی الفی درجہ: طیبی فرماتے ہیں: کہ قرآن میں دیکھنا اور اس کو اٹھانا اور اس کو چھونا اور اس میں تفکر کرنا، اور اس کے معانی کا مستبط کرنا۔ یعنی کہ یہ ان حیثیتوں سے افضل ہے اگر یہ مقاصد نہ ہوں تو نہیں۔ پس تحقیق یہ حدیث گزر چکی کہ ”ان المہر فی القرآن مع السفارة البررة“ قرآن پڑھنے میں ماہر نیک معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ اور کبھی حافظ کے لئے زبانی پڑھنا بھی ضروری ہوتا ہے، یاد کرنے کی غرض سے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: کہ الی کے ساتھ غایت تضعیف کی انتہا کے لئے ہے دو ہزار درجات پر کیونکہ اس کے پڑھنے کی عبادت کے ساتھ انہوں نے قرآن میں دیکھنے کے اجر کو بھی ملا دیا کیونکہ اس میں قراءت کا ثواب اور مصحف میں دیکھنے کا ثواب مل گیا ہے۔ یہیں سے بعض نے دلیل لی ہے کہ قرآن میں دیکھ کر تلاوت کرنا مطلق طور پر افضل ہے۔ کئی دوسرے ائمہ نے زبانی پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے اس لئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا عمل تھا۔ اور صحیح درمیانہ قول ہے کہ ان میں سے جس بھی طرح سے اس کا خشوع اور تدبر اور اخلاص زیادہ ہو وہ افضل ہے وگرنہ دوسرا یعنی دیکھ کر ہی پڑھ لے۔ کیونکہ زبانی پڑھنے سے دیکھ کر پڑھنے میں تدبر اور قراءت کے دوران غور و فکر کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔

۲۱۶۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: اِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدُأُ كَمَا يَصْدُأُ الْحَدِيدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا جَلَاؤُهَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ.

روی البیہقی الا حدیث الاربعۃ فی شعب الایمان۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”یاد رکھو یہ دل زنگ پکڑتے ہیں جیسا کہ لوہا پانی لگنے سے زنگ پکڑ لیتا ہے“ عرض کیا گیا کہ ”یا رسول اللہ! اس کی صفائی کا ذریعہ کیا ہے!“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت کثرت سے کرنا۔“

تشریح: وعن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ ان هذه القلوب: یعنی وہ دل جن کے ذریعے اللہ علام الغیوب کی ذات کا علم اور احوال اور عیوب کے مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: یعنی یہ معلوم دل کبھی رفعت کی انتہا کو ہوتے ہیں اور کبھی انتہائی ذلیل و رذیل ہوتے ہیں، کیونکہ یہ جسموں میں بادشاہوں کی طرح ہوتے ہیں، جب یہ درست ہوں گے تو پورا وجود درست ہوگا اور جب یہ خراب ہوں گے تو پورے وجود فساد کا شکار ہوں گے۔

تصدأ : ہمزہ کے ساتھ یعنی غفلتوں کے انبار اور شہوات کی زیادتی کی وجہ سے ان پر میل کچیل پڑ جاتی ہے۔

كما يصدأ الحديد : یعنی زنگ آلود ہونا۔

اذا اصابه الماء : یعنی اس کے استعمال..... دلوں کا گناہوں میں مشغول ہونا اور محبوب کے ذکر اور اپنے مطلوب و مقصود کی فکر سے غافل ہونا اور یہ وہی زنگ ہے جس کا قرآن میں ذکر موجود ہے: کلاب ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون۔

قیل یا رسول اللہ وما جلاؤھا : جیم کے کسرہ کے ساتھ یعنی عیوب کی میل کچیل کے زنگ کو دلوں سے دور کرنے کا آلہ، جو زنگ محبوب کے سامنے آنے سے آڑے آتا ہے، اور محبوب کے دیدار اور جاننے سے روکتا ہے۔

مشہور حدیث میں ہے: ”المؤمن مرآة المؤمن“، ”مؤمن، مؤمن کا آئینہ ہے۔“

قال كثرة ذكر الموت : یہ ایک خاموش نصیحت کرنے والا ہے اور اس کی موافقت یہ حدیث بھی کرتی ہے: ”اکثروا ذکر ہاذم اللذات“ ہاد، دال کے ساتھ اور ہاذم، ذال کے ساتھ دونوں طرح ہے یعنی لذتوں کو توڑنے والی یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿ایکم احسن عملاً﴾ [الملک: ۲۰] کی تفسیر بھی یہی کی گئی ہے کہ کون زیادہ موت کو یاد کرتا ہے۔

تلاوة القرآن : رنح اور جردنوں جائز ہیں اور یہ بولنے والا واعظ ہے زبان حال اور بیان القال کے ذریعے سمجھانے والا ہے۔ یہ دونوں چیزیں آدمیوں کے دلوں سے غیر کی محبت یعنی مال و مرتبہ کی محبت کی غلاظتوں لے جاتی ہیں۔

آیۃ الکرسی کی اہمیت و عظمت

۲۱۶۹: وَعَنْ أَيُّفَعِ بْنِ عَبْدِ الْكَلَّاعِيِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَيُّ سُوْرَةِ الْقُرْآنِ أَعْظَمُ قَالَ قُلُّ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ قَالَ فَأَيُّ آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ أَعْظَمُ قَالَ آيَةُ الْكُرْسِيِّ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ قَالَ فَأَيُّ آيَةٍ يَا نَبِيَّ اللَّهِ تُحِبُّ أَنْ تُصَيِّبَكَ وَأُمَّتَكَ قَالَ خَاتِمَةُ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فَإِنَّهَا مِنْ خَزَائِنِ رَحْمَةِ اللَّهِ تَعَالَى مِنْ تَحْتِ عَرْشِهِ أَعْطَاهَا هَذِهِ الْأُمَّةَ لَمْ تَتْرُكْ خَيْرًا مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ إِلَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ۔ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۴۰۱۲ حدیث رقم ۳۳۸۰۔

ترجمہ: ”حضرت ایفیع ابن عبد الکلاعی کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے سے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ! قرآن مجید میں سب سے افضل سورت کون سی ہے؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قل هو اللہ احد!“ اس نے عرض کیا کہ ”قرآن کریم میں سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آیت الکرسی اللہ لا الہ الا هو الحي القيوم اس نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! وہ کون سی آیت ہے جس کے بارہ میں آپ ﷺ پسند کرتے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو مل جائے“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا سورہ بقرہ کا آخری حصہ بیشک وہ خدا کی رحمت کے خزانوں میں عرش کے نیچے سے اتری ہے اور اس امت کو عطا کی گئی ہے اور دنیا و آخرت کی ایسی بھلائی نہیں ہے جو اس میں نہ ہو۔“ (ترمذی)

تشریح: وعن أيُّفَعِ : ہمزہ مفتوحہ اور ”ی“ ساکنہ اور ”ف“ مفتوحہ ہے۔

ابن عبد : تنوین کے ساتھ۔

الکلاعی : کاف کے فتح کے ساتھ جیسا کہ جامع الاصول میں ہے، اور مشکاۃ کے بعض نسخوں میں ضمہ بھی ہے، جیسا کہ طیبیؒ کہا ہے۔ اور جامع الاصول میں ایفیع بن ناکور ہے، یمن سے ان کا تعلق ہے اور کاف کے فتح کے ساتھ ذی الکلاعی کے نام سے مشہور

ہے نا کو ”ن“ کے ساتھ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ اپنی قوم کے سردار تھے۔ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف خط لکھا تھا اسود عسی کو قتل کرنے کے تعاون کے لئے اس نے نبی علیہ السلام سے ملاقات کی خاطر آپ کی طرف ہجرت کی لیکن رسول اللہ سے اس کی ملاقات سے قبل ہی رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے اور اس نے رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں شرکت نہیں کی یعنی وہ صحابی نہیں۔ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ عمرو بن عوف بن مالک کے علاوہ کسی اور سے ان کی روایت کو میں نہیں جانتا۔

قال: قال رجل يا رسول الله اى سورة القرآن : اى سورة من القرآن کے الفاظ ہیں۔ اعظم : یعنی توحید کی شان میں اور یہ آپ کے اس قول کے منافی نہیں ہے جو سورۃ فاتحہ کے بارے میں آپ سے منقول ہے کہ ”انها افضل سورة القرآن“۔ وہ قرآن کی سورتوں میں سے سب سے افضل سورت ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے ”اعظم سورة“ اعظم یعنی سب سے بڑی سورت ہے اور یہ اس کی محتاج نہیں ہے جو ابن حجر نے کہا کہ فاتحہ کی افضلیت والی حدیث کے سارے طرق صحیح ہیں، اس حدیث کے برعکس اور ایک قول یہ بھی ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد یہ سورۃ یعنی اخلاص اعظم ہے۔

قال قل هو الله احد قال [الاحلاص: ۱]

فای آية : یعنی قرآن میں، جیسا کہ صحیح نسخہ میں فی القرآن کے الفاظ ہیں۔ اعظم : یعنی صفات الہی کے بیان میں۔ قال اية الكرسي الله لا اله الا هو الحي القيوم [البقرة: ۲۵۵] یعنی آخر تک مکمل آیت مبارکہ۔ قال فای اية يا رسول الله : اور ایک نسخہ میں یا نبی اللہ کے الفاظ ہیں۔

تحب أن تصيبك و امتك : یعنی اس کا فائدہ اور اس کا ثواب نہ کہ اس سے اس کا نازل ہونا مراد ہے اور اس پر دلیل آپ کا یہ قول ہے کہ ”لم تترك خيرا“ آخر تک روایت۔

قال خاتمة سورة البقرة : یعنی ﴿امن الرسول﴾ [البقرة: ۲۸۵] سے لے کر آخر سورت تک یعنی یہ آیات میں پسند کرتا ہوں کہ مجھے اور میری امت کو ان کا فائدہ پہنچے باقی قرآن کی سے پہلے۔

فانها : یعنی اس کے نتائج یا نازل ہوئی۔

من خزائن رحمة الله من تحت عرشه : خبر کے بعد خبر ہے، یعنی اس کا نزول عرش کے نیچے سے ہے۔ یا خبر مقدر ہوگی من خزائن رحمة الله الكائنة یا كائنة من تحت عرشه اور یہ اعراب کے مطابق ہے اور رہا اس کا معنی تو ہم اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔

اعطاها : یعنی نفس آیت یا اس میں قبولیت کے جو مراتب ہیں وہ۔

هذه الامة : غموں کو دور کرنے کے لئے اس امت کی خصوصی عزت و تکریم کے لئے۔

لم تترك خيرا من خیر الدنيا والآخرة الا اشتملت : یعنی سورۃ البقرۃ کی یہ آخری آیات۔

عليه : یعنی اس خیر و بھلائی پر عبارۃ اور اشارۃ دونوں طرح۔

۲۱۷۰: وَعَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي فَاتِحَةِ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ.

(رواه الدارمی والبيهقی فی شعب الايمان)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۳۸/۲ حدیث رقم ۳۳۷۰۔ وشعب الايمان۔

ترجمہ: ”حضرت عبد الملک ابن عمیر بطریق ارسال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”سوہ فاتحہ ہر

عِنْدَ رَبِّهِمْ طَانَ اللَّهُ سَرِيعَ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۲۰۰﴾ کی تلاوت کرے گا رات میں یعنی شروع رات میں یا آخر رات میں تو اس کے لئے تہجد پڑھنے کا ثواب لکھا جائے گا اور اسکا پڑھنا حضور ﷺ سے ثابت ہے جب آپ ﷺ تہجد کے لیے بیدار ہوتے اور وضو فرماتے تو اس وقت پڑھا کرتے تھے۔

جمعہ کے دن آل عمران پڑھنے کی فضیلت

۲۱۷۲: وَعَنْ مَكْحُولٍ قَالَ مَنْ قَرَأَ سُورَةَ آلِ عِمْرَانَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ إِلَى اللَّيْلِ.

(رواہما الدارمی)

اخرجه الدارمی ۵۴۶۱۲ حدیث رقم ۳۳۹۷۔

ترجمہ: ”حضرت مکحول فرماتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۃ آل عمران پڑھتا ہے تو اس کے لئے رات تک فرشتے دعائیں کرتے ہیں یہ دونوں روایتیں دارمی نے نقل کی ہیں۔“

تشریح: وعن المكحول : مشہور تابعی ہیں، کہا گیا ہے کہ یہ بھی موقوف ہے، جب رائے نہ ہو تو مرفوع کے حکم میں ہے۔

قال من قرأ سورة آل عمران يوم الجمعة صلت عليه الملائكة : یعنی فرشتے اس کے لئے دعا کرتے ہیں، اور استغفار کرتے ہیں۔

الی اللیل رواہما : یعنی ان دونوں حدیثوں کو۔

سورۃ بقرہ کی آخری آیات کی قدر و منزلت

۲۱۷۳: وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ نَفِيرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِنَّ اللَّهَ خَتَمَ سُورَةَ الْبَقَرَةِ بِآيَتَيْنِ أُعْطِيَهُمَا مِنْ كَنْزِهِ الَّذِي تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَعَلَّمُوهُنَّ وَعَلِّمُوهُنَّ نِسَاءَ كُمْ فَإِنَّهَا صَلَاةٌ وَقُرْبَانٌ وَدُعَاءٌ.

رواہ الدارمی مرسلًا

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۴۲۱۲ حدیث رقم ۳۳۹۰۔

ترجمہ: ”حضرت جبیر ابن نفیر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کو دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے یہ دو آیتیں مجھے اس خزانے سے عطا فرمائی گئی ہے جو عرش کے نیچے ہے لہذا انہیں خود بھی سیکھو اور اپنی عورتوں کو بھی سکھاؤ کیونکہ دو آیتیں باعث رحمت ہیں خدا کے قرب کا ذریعہ ہیں اور تمام دینی و دنیاوی بھلائیوں کے حصول کے لئے دعا ہیں اس روایت کو دارمی نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔“

تشریح: وعن جبیر بن نفیر : یعنی انحضری، انہوں نے جاہلیت کا زمانہ بھی پایا اور اسلام کا زمانہ بھی، اور وہ ثقہ شامیوں میں سے تھے۔ اور نفیر، نون کے ضمہ اور فاء کے فتح اور ”می“ ساکن اور آخر میں راء ہے۔ مؤلف نے ان کو اسماء الرجال میں تابعین میں شمار کیا ہے اور اسی طرح مغنی نے بھی لکھا ہے جو بعض نسخوں میں راء کی جگہ لام یعنی نفیر کی جگہ نیل ہے، وہ نسخہ لکھنے والے کی پڑھنے یا سننے میں غلطی کی وجہ سے ہے۔

ان رسول قال ان الله ختم سورة البقرة بآيتين أعطيهما من كنزه : یعنی معنوی خزانہ۔

الذی تحت العرش فنعلموهن : یعنی ان کے کلمات کو اور ابن حجر فرماتے ہیں: یہاں پر تثنیہ کی ضمیر نہیں ذکر کی اس کی وجہ یہ

ہے کہ کسی کو یہ وہم نہ پڑ جائے کہ اس سے مراد ان دونوں آیات کا مجموعہ ہے، پس جب تثنیہ سے جمع کی طرف عدول کیا تو سمجھ آگئی کہ اس سے مراد ان کا تمام ہے۔ نہ کہ ان دو کا مجموعہ مراد ہے، اور اس کی مثال قرآن میں ﴿هَذَانِ خَصْمُنِ اِخْتَصِمُوا﴾ [الحج: ۱۹] اور ﴿وَ اِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا﴾ [الحجرات: ۹] ہیں۔

اس کے دعویٰ کی مراد معنوی طور پر اس کی مثال لفظاً ہے یہ بات اس کی محل نظر۔

و علموہن نسانکم : شاید کہ عورتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ عورتیں دوسروں کی بہ نسبت ان کو سیکھنے کی زیادہ محتاج ہیں نہ کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کے علاوہ ان کو کوئی اور نہ سیکھے۔

فانہا : یعنی ان کے کلمات یا ان دونوں میں سے ہر ایک آیت مبارکہ۔

صلاة : یعنی استغفار یا اسکے جوا اسکے ساتھ نماز پڑھی جاتی ہے۔ اور یہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ استغفار ہی دعا ہے، پھر تکرار ہو جائیگا۔

وقربان : قاف کے ضمہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں قاف کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے۔ یعنی وہ ان اعمال سے ہے جن کے ذریعے

اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے جو کہ ان میں اذکار اور گریہ زاری اور مدد طلب کرنا ہے۔

ودعاء : یا تو زبان حال کے ساتھ اور یا صرف کہنے کی حد تک ہے۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ﴿لَا تَوَاخِذْنَا﴾ [البقرة: ۲۸۶] طیبی

فرماتے ہیں: ان دو آیتوں کے بارے آپ کے قول انہا میں ضمیر کلمات و حروف کے مجموعہ کی طرف راجح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسی فرمان کی

طرح ﴿وَ اِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا﴾ [الحجرات: ۹] اور صلاة کے لفظ سے ارکان نماز کا قصد نہیں کیا، کیونکہ وہ اس کے

علاوہ ہے اور نہ اس سے مراد دعا ہے، اس سے تکرار لازم آتا ہے، بلکہ صلاة سے استغفار مراد لیا ہے، جیسے غفرانک و اغفر لنا اور

قربان سے مراد یا تو اللہ کا تقرب ہے، جیسے اللہ کا فرمان ﴿وَ اِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ [البقرة: ۲۸۰] اور یا پھر رسول اللہ کی طرف جیسے اللہ کا

فرمان ﴿آمِنِ الرَّسُولِ﴾ [البقرة: ۲۸۰]۔

حاکم نے اس روایت کو ابو ذر سے مرفوع روایت کیا ہے اور حاکم کی روایت میں قربان کی جگہ قرآن ہے یعنی یہ دو آیتیں نماز میں

پڑھی جاتی ہیں۔

اور قرآن پڑھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ دعا کی جاتی ہے اور حاکم نے آپ کے قول نسانکم کے بعد ابناء کم کا اضافہ کیا ہے۔

سورۃ ہود جمعہ کے دن پڑھنے کی ترغیب

۲۱۷۴: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِقْرَأُوا سُورَةَ هُودٍ يَوْمَ الْجُمُعَةِ . (رواه الدارمی مرسلًا)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۴۵/۲ حدیث رقم ۳۴۰۳۔

ترجمہ: ”حضرت کعب بن انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جمعہ کے دن سورۃ ہود پڑھا

کرو۔“ (دارمی)

تشریح: وعن كعب ان رسول الله ﷺ قال اقرأوا سورة هود : هود كومنصرف اور غير منصرف دونوں طرح

پڑھا جاسکتا ہے۔

يوم الجمعة : ميم ساکن اور ميم مضموم دونوں طرح صحیح ہے۔

حدیث مرسل ہے اور مرسل حدیث جمہور کے نزدیک حجت ہے، اور تمام کے نزدیک فضائل میں اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

۲۱۷۵: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْكُحُفِ فِي يَوْمِ الْجُمُعَةِ أَصَابَهُ لَهُ النُّورُ مَا بَيْنَ

الْجُمُعَتَيْنِ -

رواه البيهقي في الدعوات الكبير

ترجمہ: ”حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھتا ہے تو اس کے لئے ایمان و ہدایت کا نور دو جمعوں کی درمیانی مدت کے لئے روشن رہتا ہے یہی ہے جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھتا دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔“

تشریح: وعن ابی سعید أن رسول الله قال من قرأ سورة الكهف في يوم الجمعة اضاء له النور : یعنی اس کے دل میں، یا اس کی قبر میں، یا حشر کے دن بڑے اجتماع میں۔
ما بین الجمعین : اس جمعہ کی مقدار جو اس کے بعد آنے والا ہے۔

اور اسی طرح ہر وہ جمعہ جس میں قرآن کی اس سورت کی تلاوت ہوگی۔ طیبی فرماتے ہیں: اضاء، یا تو باب لازم سے ہوگا اور بین الجمعین، ظرف ہوگا۔ پس ہوگا نور کی روشنی کا پھوٹنا ان ایام میں جو دو جمعوں کے درمیان والے ہیں، نور کی روشنی کے پھوٹنے کے مرتبہ پر مبالغہ کے طور پر۔ اور یا تو فعل متعدی ہوگا تو پھر ما بین مفعول بہ ہوگا یہی دونوں ترکیب اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿فلما اضاءت ما حوله﴾ [البقرة: ۱۷۸]۔

اور آخری محل نظر ہے دونوں حدیثوں کے معنی کے اعتبار سے۔

حاکم نے اس حدیث کو ابوسعید سے مرفوع روایت کیا ہے اور الدارمی نے ابوسعید کے قول سے موقوف روایت کیا ہے کہ: ”من قرأها ليلة الجمعة اضاء له من النور فيما بينه وبين العتيق“۔ ”جو اس سورت (کہف) کو جمعہ کی رات پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے اور بیت اللہ کے مابین اس کے لئے نور کی روشنی کر دے گا“۔ نسائی اور حاکم دونوں نے ابوسعید کی حدیث سے روایت کی ہے۔ اور لفظ نسائی کے ہیں، اور نسائی نے کہا ہے کہ اس کو مرفوع کہنا غلط ہے، اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ موقوف روایت ہے:

”من قرأها كما انزلت كانت له نورا من مقامه الى مكة ومن قرأ العشر آيات من آخرها فخرج الدجال لم يسلطه عليه“۔ ”جس نے اس سورت (الکہف) کو اسی طرح جس طرح نازل ہوئی اس کے لئے اس جگہ سے لے کر مکہ تک نور ہی نور ہو گا۔ اور جس نے اس کی آخری دس آیات پڑھیں اور پھر دجال کا خروج ہو جائے تو دجال اس پر غلبہ نہیں پاسکے گا“۔ اور طبرانی نے الاوسط میں ابوسعید سے روایت نقل کی ہے اور اسی طرح اسکے مرفوع اور موقوف ہونے میں بھی اختلاف ہے:

”من قرأ سورة الكهف كانت له نورا يوم القيامة، ومن قرأ بعشر آيات من آخرها ثم خرج الدجال لم يضره“۔ ”جس نے سورہ الکہف پڑھی، اسکے لئے قیامت کے دن نور ہوگا، اور جس نے اس کی آخری دس آیات پڑھیں، پھر دجال کے خروج کا وقت آجائے تو دجال اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا“۔

اور بزار وغیرہ نے مرفوع روایت کی ہے: ”من قرأ سورة الكهف عند مضجعه كان له نورا يتلأ لأ في مضجعه الى مكة حشو ذلك النور ملائكة يصلون عليه وان كان مضجعه بمكة كان له نورا يتلأ لأ في مضجعه الى البيت المعمور حشو ذلك النور ملائكة يصلون عليه حتى يستيقظ“۔ ”جو سورہ کہف کو سونے کے وقت پڑھے، اس کے لئے نور ہو گا، جو کہ مکہ تک چمک رہا ہوگا، فرشتے اس کے لئے رحمت کی دعا کر رہے ہوں گے، اور جو آدمی مکہ میں لیٹا ہو تو بیت المعمور تک نور چمک رہا ہوگا، اور فرشتے بیدار ہونے تک اس کے لئے رحمت کی دعا کر رہے ہوں گے“۔

اور مدارک میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: ”من قرأ ”قل انما انا بشر مثلکم“ [الکہف: ۱۱] عند مضجعه.....“ اسی طرح مکمل حدیث ذکر کی۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں ایک انتہائی لطیف اشارہ ہے، اور بہت معزز اچھی بشارت ہے کہ جو بھی اس کو پڑھنے والا ہوگا تو مکہ کے زیادہ قریب ہوگا اتنی مقدار کے برابر جو مسافت سفلیہ اس کا نور بننے کے لئے کمی کا سبب ہوگی، وہ مسافت علویہ کی وجہ سے زیادہ بڑھا دیا جائے گا۔

اور جو مکہ میں لیٹا ہوگا، اس کے لئے زائد آسمانی بلندی کی ترقی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ آسمان اور زمین کے درمیان ۵۰۰ سال کی مسافت ہے اسی طرح تمام آسمانوں کے درمیان پانچ پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اور اسی طرح ہر آسمان کی چوڑائی، اور البیت المعمور ساتویں آسمان میں ہے، اس کے مطابق جو امام بغوی نے المعالم کے اندر ذکر کیا ہے۔

سورة الم تنزیل قاری کی شفاعت کرے گی اور جھگڑا کرے گی

۲۱۷۶: وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ قَالَ اقْرَأَ الْمُنَجِّبَةَ وَهِيَ الْمَ تَنْزِيلُ فَإِنَّهُ بَلَّغَنِي أَنَّ رَجُلًا كَانَ يَقْرَأُهَا مَا يَقْرَأُ شَيْئًا غَيْرَهَا وَكَانَ كَثِيرَ الْخَطَايَا فَتَشَرَّتْ جَنَاحَهَا عَلَيْهِ فَأَلْتِ رَبَّ اغْفِرْ لَهُ فَإِنَّهُ كَانَ يَكْثُرُ قِرَاءَتِي فَشَفَعَهَا الرَّبُّ تَعَالَى فِيهِ وَقَالَ اُكْتُبُوا لَهُ بِكُلِّ حَاطِيَةٍ حَسَنَةٍ وَارْفَعُوا لَهُ دَرَجَةً وَقَالَ أَيضًا إِنَّهَا تُجَادِلُ عَنْ صَاحِبِهَا فِي الْقَبْرِ تَقُولُ اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتُ مِنْ كِتَابِكَ فَشَفِّعْنِي فِيهِ وَإِنْ لَمْ أَكُنْ مِنْ كِتَابِكَ فَاْمَحْنِي عَنْهُ وَإِنَّهَا تَكُونُ كَالطَّيْرِ تَجْعَلُ جَنَاحَهَا عَلَيْهِ فَتَشْفَعُ لَهُ فَتَمْنَعُهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَقَالَ فِي تَبَارُكٍ مُلْكُهُ وَكَانَ خَالِدٌ لَا يَبِيتُ حَتَّى يَقْرَأَهَا وَقَالَ طَاءُ وَسُ فَضَلْنَا عَلَى كُلِّ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ بِسِتِّينَ حَسَنَةً۔ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۴۶/۲ حدیث رقم ۳۴۰۸۔

ترجمہ: ”حضرت خالد بن معدان سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا اس سورت کو پڑھا کرو جو عذاب سے نجات دینے والی ہے اور وہ سورۃ الم تنزیل ہے کیونکہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ ایک آدمی صرف یہی سورت پڑھا کرتا تھا وہ اس سورۃ کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھتا تھا اور وہ شخص بہت زیادہ گنہگار تھا چنانچہ اس سورۃ نے اس پر اپنے بازو پھیلادئے اور فریاد کی آواز پروردگار! اس شخص کی بخشش فرما کیونکہ یہ مجھے بہت زیادہ پڑھا کرتا تھا۔“ (حق تعالیٰ نے اس شخص کے حق میں اس سورت کی شفاعت قبول فرمائی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے ہر گناہ کے بدلہ نیکی لکھ دو اور اس کے درجات بلند کرو“ حضرت خالد بن معدان یہ بھی فرماتے تھے کہ ”بے شک یہ سورت اپنے پڑھنے والے کی طرف سے قبر میں جھگڑا کرتی ہے کہ اے اللہ اگر میں تیری کتاب میں سے ہوں جو لوح محفوظ میں لکھا ہے تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما اور اگر میں تیری کتاب میں سے نہیں ہوں تو مجھے اس میں سے مٹا دے“ نیز حضرت خالد نے فرمایا ”یہ سورۃ ایک پرندہ کی مانند آئے گی اور اس پر اپنے بازو پھیل کر اس کے لئے شفاعت کرے گی۔“ حضرت خالد نے سورۃ تبارک الذی بیدہ الملک کے بارے میں بھی یہی کہا ہے حضرت خالد کا معمول یہ تھا کہ وہ یہ دونوں سورتیں پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے“ حضرت طاووس فرماتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کو قرآن کریم کی ہر سورت پر ساٹھ نیکیوں سے فضیلت دی گئی ہے۔ (دارمی) یعنی ان دونوں رداہیوں کو جن میں سے ایک حضرت خالد سے اور دوسری حضرت طاووس سے

منقول ہے، دارمی نے نقل کیا ہے۔“

تشریح: وعن خالد بن معدان : ان کے بارے میں گزر چکا ہے کہ تابعی ہیں۔

قال اقرؤا : یعنی رات کے پہلے حصے میں جس طرح کہ حدیث کے آخر سے سمجھ آ رہی ہے۔

المنجیۃ : یعنی عذاب قبر اور قیامت کے عذاب سے۔ وہی آلم تنزیل فانہ : یعنی ضمیر شان ہے۔

بلغنی : یعنی صحابہ سے، کیونکہ انہوں نے ستر صحابہ سے ملاقات کی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہوگی،

اور یہ جمہور کے نزدیک واقعی حجت ہے۔ اور سب کے نزدیک فضائل اعمال میں اس پر عمل کیا جاسکتا ہے، اور ابن حجر کو وہم ہوا ہے وہ سمجھے ہیں کہ خالد بن معدان صحابی ہیں، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے، اور اس کے ساتھ طیبیؒ پر بھی آنے والے کلام میں اعتراض وارد ہوتا ہے۔

ان رجلا : یعنی اس امت سے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: ان کا یہ قول جو انہوں نے کہا کہ یشعربان الحدیث موقوف علیہ، اس

سے یہ سمجھ آتی ہے کہ حدیث موقوف علیہ ہے۔ پس ان کا قول اقرؤا میں احتمال پیدا ہوتا ہے، کہ رسول اللہ کے کلام سے ہے اور ان کا قول

بلغنی ان رجلا رسول اللہ ﷺ سے حدیث نقل کرتا ہے۔ جیسے آپ نے اس حدیث میں فرمایا ”ان سورة فی القرآن

نفعت لرجل“ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ راوی کا اپنا کلام ہے۔ کان یقرء ہا : یعنی اس کو اپنا وظیفہ بنا لیا تھا۔

ما یقرأ شیئا غیر ہا : یعنی اپنے لئے اس کے علاوہ کوئی اور وظیفہ خاص نہیں کیا۔ اور ابن حجر فرماتے ہیں: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس

سے مراد یہ ہو کہ اس نے سورۃ الفاتحہ کے مابعد اس کے علاوہ کوئی دوسری یاد ہی نہ کی ہو، اور ظاہر بات ہے کہ یہ بہت دور کی بات ہے۔

وکان کثیر الخطایا فنشرت : یعنی سورۃ کو کسی تصویر میں بنایا جائے گا یا اس کا ثواب پرندے کی شکل میں بنا دیا جائے گا۔

جانہا علیہ : یعنی اس پر وہ سایہ کرے گی۔ یا اس کی رحمت کے پر پڑھنے والے پر سایہ کر لیتے ہیں، اس کو ڈھانپنے کی غرض سے۔

قالت : زبان حال سے یا زبان قال سے۔ اور وہ نشرت سے بدل بعض ہے یا بدل الاشتمال ہے کیونکہ النشر یعنی پھیلا نا مشتمل

ہے۔ اس کے پڑھنے سے حصول شفاعت پر۔

رب اغفر لہ فانہ کان یکثر قراءتہ فشفعہا : شد کے ساتھ، یعنی شفاعت کی طرف سے۔

الرب تعالیٰ فیہ : یعنی اس کے حق میں۔ وقال : یعنی رب تعالیٰ۔ اکتبوا لہ بكل خطیئۃ : یعنی ان کو تبدیل کر دو۔

حسنة : یعنی فضل واحسان اور عزت اور اکرام ونوازش، اور طیبیؒ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿فَاُولٰٓئِكَ

يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ [الفرقان: ۷۰] اور اس میں یہ بھی ہے کہ اولئك هم النّٰبون، یہ لوگ توبہ استغفار کرنے والے ہیں۔

اللّٰهُ تَعَالٰی کے اس قول کے مطابق کہ ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ.....﴾ [الفرقان: ۷۰] ”مگر جس

نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کئے، تو ان لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں میں بدل دے گا“۔

وارفعوا لہ درجۃ وقال : یعنی خالد نے کہا۔ ایضا : یعنی پہلے قول ہی کی طرح موقوف۔ انہا : یعنی سورۃ الم تنزیل السجدۃ۔

تجادل عن صاحبہا : یعنی جو اس کو کثرت سے پڑھتا ہوگا۔

فی القبر : یعنی اس سے سوال و جواب کی آسانی کرنے اور اس کے عذاب میں تخفیف یا اس کی قبر کا وسیع ہونا اور قبر کا روشن ہونا اور

اسی طرح اس کی مش دگر سہولیات کے بارے سفارش شفاعت کرے گی۔

تقول : مجادلہ جھگڑا کا بیان ہے اور یہ جھگڑا اور اس کے پڑھنے والے پر پروں کا پھیلا نا اس جھگڑا کرنے والی اور سائے بان کی

طرح ہونے والی کے مثل ہے، جن کا الزہراوین یعنی بقرہ، آل عمران میں ذکر کیا گیا۔

اللهم ان كنت : یعنی جب میں تھی۔ من کتابک : یعنی لوح محفوظ میں جو قرآن مجید لکھا ہوا ہے۔

فشفعنی : تشدید کے ساتھ یعنی میری شفاعت قبول کر۔ فیہ : یعنی اس کے حق میں۔ وان لم راکن فی کتابک : یعنی فرض کر لیں۔ فامحنی : حاء کے ضمہ کے ساتھ۔

عنه : یعنی اپنی کتاب سے یا اس کے دل (سینے) سے، کیونکہ تو جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور تیرے پاس ام الکتاب ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: اس کی مثال بعض بادشاہوں کے خواص پر دلالت کرتی ہے جیسے کوئی بادشاہ کو کہے اگر میں تیرا بندہ ہوں تو میری اس کام میں سفارش کر اور اگر نہیں تو مجھے سچ دے۔

طیبی فرماتے ہیں: یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ کوئی باپ اپنے اس بیٹے کو جو اپنے والد کے حق کا خیال نہیں رکھتا، کہے اگر میں تیرا باپ ہوں تو میرے حق کا خیال رکھ اور اگر میں تیرا باپ نہیں ہوں تو پھر ہرگز میرا حق اداء نہ کرنا۔ اور اس سے مراد کہ خیال رکھنا طبعی طور پر لازم ہے، جب کہ حقیقت میں تردید نہیں ہے، اور جب باپ کے حقوق کا خیال رکھنا زیادہ لازم ہے بیٹے کے خیال رکھنے سے نہیں کہے گا، اس طرح جس طرح بیٹا اپنے باپ کو کہتا ہے، باوجود اس کے کہ مناسبت میں وہ زیادہ ظاہر ہے اور شفاعت میں بالکل واضح ہے اور اسی لئے تیرے لئے واضح ہو چکا ہے کہ طیبی کا مثال ذکر کرنا بہت احسن اور زیادہ بلیغ ہے۔

اس مثال سے جو حافظ ابن حجر نے بیان کی ہے پھر فرمایا اور اپنی مثال بیان کرنے میں فرمایا: یہ اس سے بہتر ہے جو شارح نے مثال بیان کی ہے، جیسا کہ غور و فکر کرنے سے پتا چل جائے گا۔ پس غور و فکر کرو۔

وانہا : یعنی اور خالد نے کہا انہا۔ تکون : یعنی قبر میں۔

کالطیر : یعنی اس جگہ اسی طرح ہے جیسا پہلے گزر چکا ہے۔ اور شاید کہ اس کو مقدم کرنا اس کی تعظیم کی وجہ سے ہو۔

تجعل جناحها علیہ : اس کو بچانے کے لئے۔

اور ابن حجر کا قول لفظہ بیان پر مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس کا مقام میدان حشر ہے۔

فتشفع له فتمنعه من عذاب القبر وقال : یعنی خالد نے کہا۔

فی تبارک : یعنی اس کی سورت کی فضیلت کے بارے میں۔

مثله : یعنی اسی طرح جس طرح سورۃ السجدۃ کے بارے میں فرمایا۔ وکان خالد لا بییت : یعنی سوتے نہ تھے۔

حتى یقرأهما وقال طاؤس : کبار تابعین میں سے تھے۔ فضلنا بشدد کے ساتھ یعنی سورۃ السجدۃ اور سورۃ الملک۔

علی کل سورۃ فی القرآن ستین حسنة : اور یہ اس صحیح حدیث کی نفی نہیں کرتی جس میں ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد قرآن کی سب سے افضل سورۃ سورۃ البقرۃ ہے۔ کبھی کبھار مفضل میں ایسی فضیلت ہوتی ہے جو کہ فاضل میں نہیں پائی جاتی یا اس کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے اس وقت یا اس موجودہ حالت کے ساتھ جیسا کہ یہ بات کامل علم رکھنے والے اصحاب علم پر مخفی نہیں ہے، مگر جو چیز آپ کے مشاہدے میں آ رہی ہے کہ سورۃ الاعلیٰ، الکافرون اور سورۃ الاخلاص کا ورتوں میں پڑھنا، دوسری سورتوں سے افضل ہے۔

اسی طرح سورۃ السجدۃ اور سورۃ الدھر کا جمعہ کے دن فجر کی نماز کے ساتھ خاص ہونا یہ ان کے علاوہ سورتوں کے پڑھنے سے افضل ہے۔ پس (یہ بات) جواب میں اس قول کی کوئی محتاج نہیں، جو ابن حجر کا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اور یہ اس طرح نہیں یعنی ضعیف ہے۔

یعنی موقوف روایت نقل کی ہے، اور لیکن یہ مرفوع مرسل کے حکم میں ہے۔ پس یقیناً اس بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رائے ہے۔

۲۱۷۷: وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي رَبَاحٍ قَالَ بَلَّغْنِي أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ يَسَّ فِي صَدْرِ النَّهَارِ قُضِيَتْ

حَوَاجَةُ . (رواه الدارمی مرسلًا)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۴۹/۲۰ حدیث رقم ۳۴۱۸۔

ترجمہ: ”حضرت عطاء ابن ابی رباح کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص دن کے شروع حصہ میں سورۃ یٰسین پڑھتا ہے تو اس کی (دینی و دنیوی) حاجتیں پوری کی جاتی ہیں واری نے اس روایت کو بطریق ارسال نقل کیا ہے۔“

تشریح: وعن عطاء بن ابي رباح : رباح، راء کے فتح کے ساتھ۔ مصنف فرماتے ہیں: کہ گھنگھریالے بالوں والے سیاہ فام چوٹی ناک والے، بیمار ہاتھ والے کی انگلیاں کٹی ہوئیں، کالے اور پھر نابینا ہو گئے تھے۔ جلیل فقہاء میں سے تھے، کلی تابعی تھے۔ اوزاعی فرماتے ہیں: وہ جس دن فوت ہوئے وہ لوگوں کے ہاں اہل زمین میں سے سب سے زیادہ محبوب تھے۔ احمد بن حنبل فرماتے ہیں: کہ علم خزانے ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ ان لوگوں میں تقسیم کرتا ہے جو اس کے محبوب ہیں، یعنی اپنے محبوب لوگوں میں تقسیم کرتا ہے، اگرچہ کسی کو علم کے ساتھ خاص کرتا، تو رسول اللہ کا خاندان اس کا زیادہ حقدار ہوتا۔ عطاء بن ابی رباح حبشی النسل تھے۔

قال بلغني أن رسول الله ﷺ من قرأ يس : سين کے سکون کے ساتھ اور ایک قول فتح کا بھی ہے۔
فی صدر النهار : یعنی دن کے شروع میں۔

قضيت حوائجه : یعنی دینی اور دنیاوی حاجات یا مطلق حاجات اور یہ ہی زیادہ ظاہر ہے۔

۲۱۷۸: وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ الْمُرْزِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ يَسَّ ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ تَعَالَى غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ فَأَقْرَأُهَا عِنْدَ مَوْتِكُمْ . (رواه البيهقي في شعب الایمان)

اخرجه البيهقي في شعب الایمان ۴۷۹/۲ حدیث رقم ۲۴۵۸۔

ترجمہ: ”حضرت معقل ابن یسار مرزئی روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ رب العزت کی رضا کے لئے سورۃ یٰسین پڑھتا ہے تو اس کے وہ گناہ بخشش دیئے جاتے ہیں جو اس نے پہلے کئے ہیں لہذا اس سورۃ کو اپنے مردوں کے سامنے پڑھو۔“ (بیہقی)

تشریح: وعن معقل بن يسار : مؤلف کہتے ہیں: یہ ان صحابہ میں شامل ہیں، جو درخت کے نیچے بیعت رضوان میں بھی شریک تھے۔ المزنی، میم کے ضم کے ساتھ، اور زاء کے فتح کے ساتھ مزینہ قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

ان النبي ﷺ قال من قرأ يس ابتغاء وجه الله تعالى : یعنی اللہ کی رضا کو طلب کرتے ہوئے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور غرض ہو۔

غفر له ما تقدم من ذنبه : یعنی صغیرہ گناہ اور اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کبیرہ بھی معاف کر دیئے جائیں گے۔

فاقرؤها عند موتك : یعنی قریب الموت آدمی کے پاس یا اپنے مردوں کی قبروں کے پاس، کیونکہ یہ مغفرت کے زیادہ محتاج ہیں۔ اور یطبی کہتے ہیں: فاء محذوف شرط کے جواب میں آیا ہے یعنی کہ جب سورۃ یٰسین کی تلاوت اخلاص کے ساتھ ہوگی، گناہ مٹ جائیں گے۔ پس اس کو قریب الموت کے پاس پڑھو حتیٰ کہ وہ اس کو سن لے اور اس کے دل پر جاری ہو، پس وہ اس کے گذشتہ گناہوں کو ماف کر دے گا۔ اور ممکن ہے کہ الموتی (مردوں) سے مراد جہالت ہو، یا اہل غفلت مراد ہوں۔

۲۱۷۹: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّهُ قَالَ إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ سَنًا مَّا وَإِنَّ سَنَامَ الْقُرْآنِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ وَإِنَّ لِكُلِّ

رواهما البيهقي في شعب الايمان

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤٩١/٢ حديث رقم ٢٤٩٨-

ترجمہ: ”حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص سورۃ الواقعة پڑھے گا وہ کبھی فاقہ کا شکار نہ ہوگا“ حضرت ابن مسعودؓ اپنی صاحبزادیوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ ہر رات میں یہ سورت پڑھا کریں، ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الايمان میں نقل کیا ہے۔“

تشریح: وعن ابن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ سورة الواقعة في كل ليلة لم تصبه فاقة أبدا :

یعنی اسے فقر و فاقہ کبھی نقصان نہ دے گی جو کہ اس کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے یا اس کو دلی فقر و تنگدستی پہنچے گی اس وجہ سے کہ جو اللہ تعالیٰ سے یعنی کشادہ دل اور رب تعالیٰ کی معرفت اور اللہ پر توکل اور اعتماد اور نفس کی سلامتی عطا کر دیتا ہے اور معاملہ اللہ کی طرف سونپ دینا جو فائدہ اس سورت کی آیات سے کرتا ہے اور معانی کے بیان سے بھی یہ مستفیض ہوتا ہے اس سورت میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ تصویر میں سانچے کی طرح ہیں۔

خصوصاً اس سے متعلق ذکر ہے اللہ کا قول ﴿اَفْرَايْتُمْ مَا تُحْرُثُونَ﴾ [الواقعة: ٦٣] اور اللہ کا یہ قول ﴿وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ اَنْكُمُ تَكْذِبُونَ﴾ [الواقعة: ٨٢] اور تم اُس کو اپنا رزق بنا رہے ہو، کہ تم جھٹلاتے ہو (یعنی کیا تکذیب کو اپنا رزق بنا رہے ہو؟)۔ (وکان ابن مسعود یا امر بناتہ یقرآن بہا کل لیلۃ : اور ایک دوسرے نسخہ میں فی کل لیلۃ کے الفاظ ہیں۔ یعنی دونوں حدیثوں کو۔

٢١٨٢: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُحِبُّ هَذِهِ السُّورَةَ سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى-

ترجمہ: ”حضرت علیؓ کی رم اللہ وجہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس سورت یعنی سج اسم ربک الاعلیٰ کو بہت پسند کرتے تھے۔“

تشریح: وعن علی قال کان رسول اللہ ﷺ یحب هذه السورة ”سبح اسم ربک الاعلیٰ“ [الاعلیٰ: ١] یعنی

زیادہ محبت اور وہ اس کی مثال ہے جو کہ سورۃ الفتح کے بارے میں وارد ہے کہ جن چیزوں پر سورج طلوع ہوتا ہے ان میں سے سب سے محبوب سورۃ الفتح ہے۔

بخاری، نسائی اور ترمذی نے عمرؓ سے مرفوع روایت کی ہے، عارف جامی، شمس الوجود میں فرماتے ہیں اور اگر اس طرح نہ ہو تو ساری دنیا کے معمور اس سے زیادہ حقیر ہے کہ اس کو حبیب کی نظر میں بڑا بنا کر پیش کرے یہ کہ وہ محبوب ہو اور..... اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح كافر لما سقى كافراً منها شربة ماء“۔ اگر دنیا کی قدر منزلت رب تعالیٰ کے ہاں چھھر کے پر کے برابر بھی ہوتی، تو کسی کافر کو اس دنیا سے پانی کا گھونٹ بھی نہ پلاتا۔ سورۃ الفتح میں محبت کی زیادتی اس لئے ہے کہ اس میں فتح کی بشارت ہے اور مغفرت کا اشارہ ہے۔ اور اسی طرح یہ سورۃ یعنی الاعلیٰ ہر مشکل میں آسانی والی کاموں پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ﴿وَنَسِرْكَ لِلْيَمِينِ﴾ [الاعلیٰ: ٨] ”اور ہم آپ کے لئے آسانی کو آسان کر دیں گے۔“

اور رسول اللہ ﷺ اس کی قراءت پر ہمیشگی کرتے تھے، و ترو کی پہلی رکعت میں اور دو توحید والی سورتوں یعنی الکافرون اور الاخلاص کو و ترو کی آخری دو رکعتوں میں ”کان النبی ﷺ یواظب علی قراءتہا فی اول رکعات الوتر و قراءۃ الاخلاصین فی الرکعتین الاخریین“۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس سورت سے اس لئے محبت ہو کہ اس میں صحف ابراہیم و موسیٰ کا تذکرہ ہے۔

ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے روایت بیان کی ہے اور حاکم کہتے ہیں کہ صحیح الاسناد روایت ہے:

”عن ابی ذر قال: قلت یا رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم ما کان صحف ابراہیم؟ قال: کانت أمثالا کلھا. ایھا الملک المسلط المبتلی المغرور انی لم أبعثک لتجمع الدنیا بعضها علی بعض ولكن بعثتک لتردنی دعوة المظلوم فانی لا أردھا ولو کانت من کافر وعلی العاقل ما لم یکن مغلوبا علی عقله أن یشکر له ثلاث ساعات یناجی فیھا ربہ ساعة یحاسب فیھا نفسه، وساعة یتفکر فیھا فی صنع اللہ تعالیٰ، وساعة ینخلو فیھا لحاجته من المطعم والمشرب، وعلی العاقل ان لا یشکر ظاعنا الا لثلاث تزود لمعاد او لمرمة لمعاش او لذوق فی غیر محرم وعلی العاقل أن یشکر بصیرا بزمانه، مقبلا علی شأنه حافظا للسانه، ومن حسب کلامه من عملہ قل کلامه الا فیما یعنیہ قلت یا رسول اللہ ﷺ فما کان فی صحف موسیٰ؟ قالت کانت عبرا کلھا عجبت لمن أیقن بالموت ثم هو یشکر، عجبت لمن أیقن بالنار ثم هو یضحک عجبت لمن أیقن بالقدر ثم هو ینصب، عجبت لمن راعی الدنیا وتقلبھا بأهلھا. ثم اطمأن الیھا عجبت لمن أیقن بالحساب غدا ثم لا یشکر، قلت یا رسول اللہ ﷺ أو صنی. قال أو صیک بتقوی اللہ فانھا رأس الأمر کلہ، قلت یا رسول اللہ ﷺ زدن، قال علیک بتلاوة القرآن و ذکر اللہ تعالیٰ فانه نور لك فی الأرض وذخر لك فی السماء. قلت یا رسول اللہ ﷺ زدن، قال: ایاک و کثرة الضحک فانه یمیت القلب و یدھب بنور الوجه، قلت: یا رسول اللہ ﷺ زدن، قال: علیک بالجهاد فانه رهبانیه امتی، قلت یا رسول اللہ ﷺ قال أحب المساکین و جالسهم، قلت: یا رسول اللہ ﷺ زدن، قال انظر من هو تحتک ولا تنظر الی من هو فوقک، فهو أجدر أن لا تزدری نعمة اللہ عندک، قلت یا رسول اللہ ﷺ زدن، قال لیردک عن الناس ما تعمله من نفسک ولا تجد علیهم فیما تاتی و کفی بک عیبا أن تعرف من الناس ما تجهلہ من نفسک و تجد علیهم فیما تاتی، ثم ضرب بیده علی صدری، فقال: یا أبا ذر لا عقل کالتدبیر ولا ورع کالكف ولا حسب کحسن الخلق“.

ابو ذر سے مروی ہے فرماتے ہیں: کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: وہ تمام مثالیں تھے، اے آزمائش میں پڑے ہوئے سلطنت والے اور مغرور بادشاہ! میں نے تجھے اس لئے نہیں بھیجا کہ تہ بہ تہ دنیا جمع کر، لیکن میرا تجھے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ تو مجھ سے مظلوم کی بددعا کو لوٹائے کیونکہ میں اس کی بددعا کو رد نہیں کرتا ہوں، اگرچہ وہ کسی کافر کی ہی کیوں نہ ہو۔ اور عاقل بالغ پر جب تک کہ اس کی عقل خراب نہ ہو جائے، کہ اس کے تین وقت ہوں جن میں وہ اپنے رب سے گفتگو کرے، سرگوشی کرے ایک ساعت میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اور دوسری ساعت میں اللہ کی تخلیق کائنات میں غور و فکر کرے، اور تیسری ساعت میں علیحدہ ہو جائے اپنے کھانے اور پینے کی حاجت کے لئے یعنی صرف اپنے طعام و شراب کے لئے دعا کرے۔ اور عاقل پر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سفر نہ کرے، مگر صرف تین وجوہ سے یعنی وہ تین وجوہ کے بغیر سفر بھی نہ کرے (۱) آخرت کے ساز و سامان کی

خاطر، (۲) معاش کی بہتری کے لئے۔ (۳) غیر حرام میں لذت تلاش کرنے۔

اور عاقل پر یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے وقت کو دیکھنے والا ہو۔ اپنے حال پر رہنے والا ہو۔ اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا ہو۔ جس کا کلام اس کو اس کے عمل سے روک دے وہ اپنے کلام کو کم کرے اگر ہو تو با مقصد ہو یعنی لغو باتیں نہ ہوں،۔ ابو ذر فرماتے ہیں: میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: وہ سارے کے سارے عبرت پر مشتمل تھے۔ اس آدمی پر تعجب ہے جو موت پر یقین بھی رکھتا ہے ہشاش بشاش بھی رہتا ہے اور اس آدمی پر تعجب ہے جو جنم پر یقین بھی رکھتا ہے پھر اس کے باوجود وہ ہنستا بھی ہے، اور اس پر بھی تعجب ہے جو تقدیر پر یقین رکھتا ہے پھر بھی اپنے آپ کو تھکا دیتا ہے، اور اس پر بھی تعجب ہے جس نے دنیا کو دیکھا اور اس کی تبدیلیوں کو (اس کے الٹ پلٹ ہونے کو) اور اس پر بھی تعجب ہے جو کل روز قیامت حساب پر بھی یقین رکھتا ہے اور عمل بھی نہیں کرتا۔

میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے وصیت کیجئے، آپ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کے ڈر یعنی تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ یہ تمام اعمال کی بنیاد (جڑ) ہے۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے اور (یعنی زیادہ وصیت کیجئے) آپ نے فرمایا: قرآن پاک کی تلاوت کو اور اللہ کے ذکر کو اپنے اوپر لازم کرلو، کہ یہ تمہارے لئے زمین باعث نور ہے، اور آسمان میں تیرے لئے ذخیرہ ہے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے اور وصیت کیجئے، آپ نے فرمایا: کہ زیادہ ہنسنے سے اجتناب کرو کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتے ہیں اور چہرے کا نور چلا جاتا ہے، میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے اور نصیحت کریں، آپ نے فرمایا: جہاد کو لازم پکڑ لو کہ یہ میری امت کی رہبانیت ہے، میں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے اور وصیت فرمائیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: مساکین کے ساتھ محبت کرو، اور ان کے پاس بیٹھا کرو۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے اور وصیت کریں، آپ نے فرمایا: اپنے سے نچلے طبقہ کے لوگوں کی طرف دیکھو، اور اپنے سے اونچے طبقے (یعنی دنیاوی مال و متاع و اسباب کے اعتبار اور دینی بھی مراد ہو سکتا ہے) والوں کو نہ دیکھو، کیونکہ یہ بات زیادہ لائق ہے مناسب معلوم ہوتی ہے تو اللہ کی نعمتوں کو حقیر نہ جانے۔ میں نے کہا اے اللہ کے پیارے رسول! مجھے اور وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا جو چیز تو اپنے بارے میں جانتا ہے چاہئے کہ وہ تجھے لوگوں سے روک رکھے، اور تو ان پر ناراض نہ ہو اس کام میں جس کا تو خود مرتکب ہوتا ہے، اور تیرے لئے یہ عیب ہی کافی ہے کہ تو لوگوں کے ان عیوب یا ان باتوں کو پہچاننے جو تیرے میں موجود ہیں اور تجھے ان کا علم نہیں ہے اور تو ان پر اس کام پر غصہ کرتا ہے جن کا تو خود مرتکب ہوتا ہے۔ پھر آپ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ مبارک میرے سینے پر مارا، فرمایا: اے ابو ذر! تدبیر کی طرح کوئی عقل نہیں اور سوال سے بچنے کی طرح کا کوئی تقویٰ نہیں، اور حسن اخلاق کی طرح کا کوئی حسب و نسب نہیں۔

سورة الزلزال ایک جامع سورت ہے

۲۱۸۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ أَتَى رَجُلٌ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ أَقْرَبُنِي يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ اقْرَأْ ثَلَاثًا مِنْ ذَوَاتِ الرَّأْفِ فَقَالَ كَبُرَتْ سِيئِي وَاسْتَدَّ قَلْبِي وَغَلَطَ لِسَانِي قَالَ فَأَقْرَأْ ثَلَاثًا مِنْ ذَوَاتِ لَحْمٍ فَقَالَ مِثْلَ مَقَالَتِهِ قَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَقْرَأْنِي سُورَةَ جَامِعَةً فَأَقْرَأَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا زُلْزِلَتْ حَتَّى فَرَّغَ مِنْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أَزِيدُ عَلَيْهِ أَبَدًا نَمَّ أَذْبَرَ الرَّجُلُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَفْلَحَ

الرُّوَيْجِلُ مَرَّتَيْنِ. (رواه احمد و ابوداؤد)

ابوداؤد، کتاب الصلاة، باب تحریب القرآن، ح ۱۲۹۹

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے پڑھائیں! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قرآن کریم کی آیتوں میں سے تین سورتیں پڑھ لو“ اس نے عرض کیا ”میری عمر زیادہ ہو چکی ہے اور میرا دل سخت ہو گیا ہے نیز میری زبان موٹی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تو پھر تم حمّہ والی سورتوں میں سے تین سورتیں پڑھ لو اس نے کہا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی جامع سورت پڑھائیے چنانچہ آپ ﷺ نے اسے ”سورۃ اذالزلزلت“ پڑھائی جب آپ ﷺ اس سے فارغ ہوئے تو اس شخص نے کہا کہ ”قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اس پر کبھی بھی زیادتی نہیں کروں گا“ پھر اس شخص نے پیٹھ پھیری تو نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ”یہ شخص فلاح یاب ہو گیا۔“ (احمد، ابوداؤد)

تشریح: وعن عبد الله بن عمرو : عمرو، واؤ کے ساتھ ہے۔

قال أتى رجل النبي ﷺ فقال أقرني : ہمزہ کے فتح اور راء کے کسرہ کے ساتھ یعنی مجھے سکھائیے۔

یا رسول اللہ ﷺ فقال اقرأ ثلاثا : یعنی تین سورتیں۔

من ذوات الرّاء : اور ایک دوسرے نسخے میں ذوات الرّاء کا لفظ ہے، مد کے ساتھ اور اس کے بعد ہمزہ بھی ہے۔ طبری کہتے ہیں:

یعنی وہ سورتیں جن کے شروع میں راء ہے، یا راء سے شروع ہوتی ہیں۔

فقال کبرت : باء کے ضمہ کے ساتھ اور کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ سنی : یعنی میری عمر زیادہ ہو چکی ہے۔

واشدت قلبی : میرے دل پر تھوڑا حفظ ہونا اور زیادہ بھولنا غالب آچکا ہے۔

وغلظ لسانی : یعنی بوجھل ہو چکی ہے، اس طرح سے کہ قرآن کے سیکھنے میں میری فرمانبرداری نہیں بنتی، مراد یہ کہ قرآن سیکھنے کی

استطاعت نہیں رکھتا اور نہ لمبی سورتیں یاد کر سکتا ہوں۔

قال : اگر تو ان کو پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

فاقرأ ثلاثا من ذوات حمّ : اگر قصر پڑھا جائے یعنی حمّ مد کے علاوہ تو ذوات الرّاء یعنی لا والی سورتوں بھی سے کم لمبا کر مراد

چھوٹا کر۔ فقال مثل مقاتلہ : یعنی پہلی بات۔

قال الرجل یا رسول اللہ ﷺ اقرانی سورۃ جامعۃ : یعنی وضاحت کیجئے میرے لئے ایسی سورت جس کے الفاظ کم اور

معانی زیادہ ہوں۔

فاقرأ رسول اللہ ﷺ اذا زلزلت حتی فرغ منها : یعنی نبی ﷺ زیادہ آدمی فارغ ہوا قراءت سے۔ طبری فرماتے ہیں: گویا

کہ اس کو فلاح حاصل ہوگئی۔ جب وہ اس پر عمل کرے۔ اسی لئے سورۃ جامع کہا اور اس سورت میں ایک ایسی آیت ہے کہ اس پر کسی اور

آیت کی ضرورت نہیں وہ یہ ہے: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ [الزلزلة: ۷] کہ ”جو نیکی کرے گا اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرا

برابر بھی برائی کرے گا اس کو دیکھ لے گا“۔ اور اسی لئے یہ تطبیق کی جس کے لئے کوئی حد نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب آپ سے گھر یلو

گدھوں کے بارے میں پوچھا گیا۔ اس بارے کوئی آیت اس آیت سے جامع اور جمل نازل نہیں ہوئی، یعنی: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ [الزلزلة: ۷-۸] طبری فرماتے ہیں: اس کی وضاحت یہ ہے کہ اعمال کے پیش ہونے میں

اور اس پر ثواب کے بیان کے لئے وارد ہوئی ہے۔ جیسا کہ باری تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ﴾ [الانبیاء: ۴۷] ”اور وہاں قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کریں گے) سو! کسی پر ذرا برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا، تو ہم اُس کو (وہاں) حاضر کر دیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔“

فقال الرجل والذی بعنک بالحق لا ازید علیہ ابدًا: یعنی اس عمل پر جو آپ نے مجھے پڑھایا ہے، کہ نیکی کے کام سے اور شر یعنی برائی کے چھوڑنے سے اور شاید اس کے قسم کھانے کے ساتھ اس کا قصد پختہ عزم کی تاکید اور مکمل تائید تھا۔ یقیناً آپ علیہ السلام کے سامنے جو کہ آپ کی حاضری بیعت اور عہد کی جگہ ہے اور حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ آدمی کی خیر اور شر سے مراد ان کا عام یعنی جنس شر اور خیر کے لئے تھا، نہ کہ بشمول استغراق مراد ہے۔

بہر حال ابن حجر کا خیر سے فقط واجب افعال اور شر سے فقط محرمات کی قید لگانا، پھر ان کا کہنا اور رہا مسئلہ نوافل کا وہ میں نے عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دوں گا، اور میں یہ کام اپنے دل کی حتی کی وجہ سے کرتا ہوں۔ پس حلف یعنی قسم سے ارادہ صرف یہ تھا کہ وہ واجبات کو اداء کریں گے اور محرمات کو ترک کریں گے، نہ کہ وہ اس سے مستغنی ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ اس پر حدیث کے لئے کوئی دلالت ہی نہیں ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: گویا کہ اس نے کہا: ”حسبی ما سمعت ولا ابالی الا اسمع غیرها“۔ کہ میرے لئے یہ کافی ہے جو میں نے سن لیا اور کسی دوسرے سے سننے کی ضرورت نہیں۔

ثم ادبر الرجل: یعنی اس نے اپنی پشت پھیر لی، اور چلا گیا۔

فقال رسول اللہ ﷺ أفلح: یعنی اپنے مطلوب کے ساتھ کامیاب ہو گیا، نجات پا گیا۔ اور محبوب کی طرف کامیاب و کامران ہو گیا۔

الرویعجل: طیبی کہتے ہیں: تغیر اس کی بعید نظری اور قوت ادراک کی وجہ سے بیان کی۔ اور یہ تغیر بھی شاذ ہے، کیونکہ قاعدے کے مطابق رجل کی تغیر ”رجل“ آتی ہے، اور یہ رجول و جیل ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ راجل بمعنی چلنے والا کی تغیر ہو۔
موتین: یا تو تاکید کے لئے ہے یا ایک بار دنیا کے لئے اور ایک بار آخرت کے لئے فرمایا۔ اور یہ بھی قول ہے کہ آپ علیہ السلام کی اس کے بارے شدت پسندی کی وجہ سے۔ حدیث کو روایت کیا ہے احمد اور ابوداؤد نے۔

۲۱۸۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَا يَسْتَطِيعُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأَ آيَةَ فِي كُلِّ يَوْمٍ قَالُوا وَمَنْ يَسْتَطِيعُ أَنْ يَقْرَأَ آيَةَ فِي كُلِّ يَوْمٍ قَالَ أَمَّا يَسْتَطِيعُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأَ الْهَلْكَمُ التَّكَاثُرُ. (رواه البيهقي

فی شعب الایمان)

اخرجه البيهقي في شعب الایمان ۴۹۸/۲ حدیث رقم ۲۵۱۸۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کیا تم میں سے کوئی شخص ہر روز ایک ہزار آیات پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ”روزانہ ایک ہزار آیات کون پڑھ سکتا ہے؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم میں سے کوئی روزانہ الْهَلْكَمُ التَّكَاثُرُ (ہی) نہیں پڑھ سکتا۔“ (بیہقی)

تشریح: وعن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ أَلَا يَسْتَطِيعُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأَ آيَةَ فِي كُلِّ يَوْمٍ قَالُوا وَمَنْ يَسْتَطِيعُ أَنْ يَقْرَأَ آيَةَ فِي كُلِّ يَوْمٍ؟: یعنی اتنی آیات بیشکی کے ساتھ روزانہ ہر ایک نہیں پڑھ سکتا۔

قال اما يستطيع أحدكم أن قرأ الهکم التکثیر؟ [التکثیر: ۱] یعنی اس کے آخر تک مکمل سورت۔ یہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے علم یقین کی رغبت میں ایک ہزار آیات کی قراءت کی طرح ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن چھ ہزار اور کچھ اوپر آیات پر مشتمل ہے، اور جب اوپر والی زائد کو چھوڑ دیا جائے تو ہزار ہزار والے چھ نکلے بن جاتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مقاصد قرآن چھ (۶) ذکر کئے ہیں۔ تین اہم ہیں اور تین ان کو مکمل کرنے والے ہیں ان چھ میں سے ایک آخرت کی معرفت ہے، جس پر یہ سورت مشتمل ہے، اور اس معنی سے ہزار آیات کا معنی تعبیر کرنا زیادہ بہتر ہے، اس سے کہ اس کو سوس القرآن تعبیر کیا جائے، اور ہاں اگر اس سے ثلث القرآن تعبیر کیا جائے، تو صحیح ہے۔

۲۱۸۵: وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيْبِ مَرَّسًا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ عَشْرَ مَرَّاتٍ بِنِي لَهُ بِهَا قَصْرٌ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ قَرَأَ عَشْرِينَ مَرَّةً بِنِي لَهُ بِهَا قَصْرَانِ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ قَرَأَهَا ثَلَاثِينَ مَرَّةً بِنِي لَهُ بِهَا ثَلَاثَةُ قُصُورٍ فِي الْجَنَّةِ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِذَا النُّكْبَرُ نَ قُصُورًا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اللَّهُ أَوْسَعُ مِنْ ذَلِكَ - (رواه الدارمی)

احرجہ الدارمی فی السنن ۵۵۱/۲ حدیث رقم ۳۴۲۹۔

ترجمہ: ”حضرت سعید بن مسیب بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص قل هو اللہ احد دس بار پڑھے تو اس کے بدلہ میں جنت میں اس کے لئے ایک محل بنایا جاتا ہے جو شخص اس کو بیس مرتبہ پڑھے تو اس کے بدلہ میں جنت میں اس کے لئے دو محل بنائے جاتے ہیں اور جو شخص اس کو تیس مرتبہ پڑھے تو اس کے بدلہ میں جنت میں اس کے لئے تین محل بنائے جاتے ہیں“ حضرت عمر بن خطابؓ کہنے لگے کہ ”خدا کی قسم! اے اللہ کے رسول ﷺ! پھر تو اب ہم اپنے بہت زیادہ محل بنالیں گے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ کشائش و فراخی والا ہے“ (یعنی اس سورت کی فضیلت اور اس کا ثواب بہت عظیم اور بہت وسیع ہے لہذا اس بشارت پر تعجب نہ کرو بلکہ اس کے حصول کی کوشش کرو اور اس کی طرف راغب ہو)۔“

تشریح: وعن سعید بن المسيب: یہ تابعین کے سرداروں میں سے تھے، بلکہ کہا گیا ہے کہ وہ ان کے بزرگ اور ان کے افضل ترین تابعی تھے۔

مرسلا: صحابی کو حذف کرنے کے ساتھ۔

عن النبي ﷺ قال من قرأ قل هو الله احد [الاخلاص: ۱] عشر مرات بنى له بها قصر في الجنة ومن قرأ عشرين مرة بنى له بها ثلاثة قصور في الجنة ومن قرأها: یعنی سورت کو۔

ثلاثين مرة بنى له بها ثلاثة قصور في الجنة: شاید کہ اس کو مکرر لائے ہیں، تا کہ دس کے ہند سے میں ہی حصر یعنی بند کرنے کا وہم بیدار نہ ہو اور سمجھا جائے کہ جتنے عدد زیادہ ہوں گے، اتنے ہی درجات بڑھائے جائیں گے۔

فقال عمر بن الخطاب رضي الله عنه والله يا رسول الله اذا: اذا، تنوین کے ساتھ جواب اور جزاء ہے اس میں تعجب کا معنی ہے۔

لنكثرن قصورنا: الاكثر باب افعال سے ہے۔ اور اس میں تشدید یعنی باب تفعیل بھی جائز ہے۔

طبی فرماتے ہیں: یعنی جب معاملہ اس طرح ہے جس طرح آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ دس مرتبہ پڑھنے پر جنت میں محل بن جاتا ہے

تو ہم زیادہ محل بنائیں گے۔ اس سورت کی کثرت سے تلاوت کے ساتھ۔ پس جب محلات بے حد و حساب ہوں گے اور نہ ہی جنت سے وسیع کوئی چیز ہے۔

فقال رسول الله ﷺ الله أوسع : یعنی کثرت عطا کے لحاظ سے یعنی بہت زیادہ عطاء کرنے والا ہے۔

من ذلك : یعنی اس کی قدرت اور اس کی رحمت اس سے زیادہ وسیع ہے۔ پس تم تعجب نہ کرو۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ ابن حجر دو قولوں اور ان کی تلفیق میں غلط ملط ہو گئے

جب انہوں نے یہ کہا کہ اس کی قدرت عطاء کرنے کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔

۲۱۸۶: وَعَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ فِي لَيْلَةٍ مِائَةَ آيَةٍ لَمْ يُحَاجَّهُ الْقُرْآنُ تِلْكَ اللَّيْلَةَ وَمَنْ قَرَأَ فِي لَيْلَةٍ مَا تَنَّى آيَةَ كُتِبَ لَهُ قَنُوتُ لَيْلَةٍ وَمَنْ قَرَأَ فِي لَيْلَةٍ خَمْسَ مِائَةٍ إِلَى الْإِلْفِ أَصْبَحَ وَلَهُ قِنطَارٌ مِنَ الْأَجْرِ قَالُوا وَمَا الْقِنطَارُ قَالَ إِنَّمَا عَشْرَ أَلْفًا (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۵۷۱۲ حدیث رقم ۳۴۵۹۔

ترجمہ: ”حضرت حسن بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص رات میں سو آیات پڑھے تو رات میں قرآن اس سے نہیں جھگڑے گا جو رات میں دو سو آیات پڑھے تو اس کے لئے شب بیداری کا ثواب لکھا جاتا ہے اور جو شخص رات میں پانچ سو سے ہزار تک آیات پڑھے تو وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کیلئے قنطار کے بقدر ثواب ہوتا ہے“ صحابہ نے عرض کیا کہ ”قنطار کیا ہے“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”بارہ ہزار۔“ (دارمی)

تشریح: وعن الحسن : یعنی حسن بصری۔

مرسلا : کیونکہ یہ تابعی ہیں، اور انہوں نے صحابی کو حذف کیا ہے۔

أن النبي ﷺ قال من قرأ في ليلة مائة آية لم يحاجه القرآن : یعنی اس سے اس کی کوتاہی کے بارے میں جھگڑا نہیں کرے گا۔

تلك الليلة : یعنی اس رات کی جہت سے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: اس رات اس کی پاسداری میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے اس سے قرآن جھگڑا نہیں کرے گا، کیونکہ اس میں کوتاہی اس سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے عمل نہ کرنے کی وجہ سے جھگڑے گا اگر اس نے عمل نہیں کیا اس طرح جو کہ حدیث میں ہے کہ وہ اپنے جھگڑے میں اپنے بعض حافظوں کے بارے میں کہتا ہے، وہ مجھ سے سو گیا اور مجھ پر عمل نہیں کیا، یعنی میرے مطابق اس نے عمل نہیں کیا، کہ اس کو میرے بارے میں علم بھی تھا۔

وہ اس سے دو جوہات سے جھگڑا کرے گا، پہلی یہ کہ اس کے عہد میں کوتاہی برتنا کیونکہ وہ اس کو نسیان (بھلا) دے گا۔ اور دوسری وجہ اس کے مطابق عمل کرنے کے بارے میں، کیونکہ اس میں اس کے حق کے بارے میں غفلت برتنا ہے (بہت فریفتہ ہونا/ لہو و لعب میں مشغول)۔

اور ممکن ہے کہ قیام اللیل کے لئے عمل پر ابھارنا ہو جیسا کہ یہ زیادہ قریب اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

طبی فرماتے ہیں: یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قرآن کی تلاوت ہر انسان پر لازم ہے، اور اس پر واجب بھی ہے۔ جب پڑھے گا نہیں تو قرآن اللہ کے حضور اس کے بارے میں جھگڑا کرے گا اور حجت کیا تو وہ اس پر غالب آجائے گا، جھگڑے کی طرف نسبت مجازی ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: یہ تمام کا تمام محل نظر ہے، بہر حال ان کا یہ کہنا کہ ”لازمة لكل انسان و واجبة عليه“ کہ ہر انسان پر لازم اور واجب ہے، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کلام حافظ کے بارے میں ہے وہ پڑھے جو اس کو یاد ہو۔ پس سمجھ لو کہ جھگڑا اس حافظ کے ساتھ ہوگا جس کو یاد ہو اس کو پڑھنا نہیں، نہ کہ اس سے مراد وہ ہے جس نے بالکل قرآن پڑھا ہی نہیں اور نہ اس سے وہ مراد ہے جس نے بالکل قرآن پڑھا ہی نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس جگہ پر جو قرینہ سمجھا جا رہا ہے وہ معلوم ہے، بے شک ہر آدمی سے ان کی مراد حافظ قرآن ہیں، اس کے اطلاق کے زیادہ فائدہ کے ساتھ یہ اشارہ ہے قرآن کے پڑھنے کے وجوب کی طرف تھوڑا ہویا زیادہ، جیسا کہ شرعی قواعد میں مقرر شدہ ہے، اور جائز ہے سو کے عدد کو اس کے تکرار پر اور عدم تکرار پر محمول کرنا اور اسی طرح اس کے اطلاق کو بھی اشارہ کرتے ہوئے ائمہ کرام کے قول کی طرف کہ قرآن حفظ کرنا فرض کفایہ ہے، یعنی ان اعمال میں سے ہے جو فرض کفایہ ہیں، تو اس حدیث کے ساتھ ہر زمانے کی ساری امت کو مخاطب کیا ہے کہ اچھا ہے اگر اس قرآن کو ان میں سے ایک جماعت حفظ کر لے، تو فرض کفایہ اداء ہو جائے گا، تو سب کی طرف سے اداء ہو جائے گا اور ایک جماعت یعنی چند لوگ ہی حفظ نہ کریں، تو سارے بستی والے گنہگار ہوں گے۔

وہ فرماتے ہیں کہ رہا مسئلہ آپ علیہ السلام کے اس قول کا کہ یخاصمہ کا ذکر قرآن جھگڑا کرے گا، تو اس کے بارے میں جو اشکالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا رد پیچھے کی بارگزر چکا ہے۔ مقرر قاعدہ کے ساتھ کہ شارع علیہ السلام کے الفاظ جیسے ہوں ان کو ان کے ظاہر پر باقی رہنا اس سے نہیں پھیرنا اور یہ قرآن کے جھگڑا کرنے کی بقا کے ساتھ ممکن ہے اس کے ظاہر کے مطابق یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی بولنے والی چیز کو شکل دے دے، اور اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو کسی غیر ظاہر صورت میں بنا دے جو حدیث میں ہے۔ باوجود اس کے کہ قرآن کریم حقیقت میں یا تو کلام نفس ہے اور یا پھر ہماری زبانوں پر جاری ہونے والا کلام ہے۔

اور قرآن و سنت مجاز کے استعمال سے بھرے ہوئے ہیں، بلکہ یہ مجاز حقیقت سے بہت زیادہ بلیغ ہے جیسا کہ کنا یہ صریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ علماء علم بیان اور اہل التفسیر علماء کی تصریح کے مطابق۔ بلکہ بڑے بڑے صوفیاء نے کہا ہے کہ اللہ کا فرمان: ﴿قل يتوفاكم ملك الموت﴾ [السجدة: ۱۱] کہ ”ان سے کہہ دیں تمہیں ملک الموت فوت کرے گا“۔ یہ نسبت مجازی ہے، اور باری تعالیٰ کا فرمان: ﴿اللہ يتوفى الانفس﴾ [الزمر: ۴۲] ”اللہ ہی ذی روح چیزوں کو فوت کرتا ہے“۔ یہ نسبت حقیقی ہے۔ تو اس کے کلام میں اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن شاعر کا قول ہے:

وعین الرضا عن کل عیب کليلة ☆ ولكن عیون السخط تبدی المساویا

”اور رضا مندی کی آنکھ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، لیکن ناراضگی کی آنکھ بڑی باتوں کو ظاہر کر دیتی ہے“۔

یعنی محاسن کو بھی برادکھاتی ہے، اور تو دیکھ ان افراد کی طرف جو رضا کی آنکھ رکھتے ہیں۔ اور ان کی طرف جو جماعت ناراضگی والی آنکھ رکھتی ہے۔ یہ بات آپ کے لئے لطیف نکتہ اور اس کی باطنی و ظاہری حکمت کو عیاں کر دے گی۔

من قرأ فی لیلة ماتی آية کتب له قنوت لیلة: یعنی اس رات کی عبادت اور قیام لکھ دیا جاتا ہے۔

ومن قرأ فی لیلة خمسمائة الی الالف أصبح وله قنطار: یعنی اس کے عدد کے برابر ثواب یا اس کے وزن کے برابر

ثواب۔

من الاجر قالوا وما القنطار؟ قال اثنا عشر الفا: یعنی بارہ ہزار درہم یا دینار۔ طبی فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ قنطار

سے مراد ایک ہزار دو سو اوقیہ ہیں۔ اور اوقیہ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے (یعنی دنیا و ما فیہا) اس سے بہتر ہے اور ابن حجر کا قول

”اثناعشر الفا من الاطال“ کہ بارہ ہزار رطل یہ کی نقل صحیح یا کسی صریح دلیل کا محتاج ہے۔

باب

(یہ باب متعلقات قرآن وغیرہ کے بیان میں ہے)

توین کے ساتھ اور ساکن بھی ہو سکتا ہے۔ یہ باب بھی احکام فضائل کے تابع ہے، اس لحاظ سے کہ اس میں مزید زائد چیزیں (یعنی فضائل) وغیرہ کی رعایت رکھتے ہوئے ذکر کیا ہے۔

الفصل الاول:

قرآن کریم غفلت سے بھول جاتا ہے

۲۱۸: عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَعَاهَدُوا الْقُرْآنَ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَهَوَّ أَشَدُّ تَفْصِيًّا مِنَ الْإِبِلِ فِي عُقْلِهَآ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۷۹۱۹ - حديث رقم ۵۰۳۳ - ومسلم فى صحيحه ۵۴۵۱ - حديث رقم (۲۳۱ - ۷۹۱) - والدارمى فى السنن ۵۳۱/۲ - حديث رقم ۵۳۳۴۹ - واحمد فى المسند ۳۹۷/۴ -

ترجمہ: ”حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”قرآن کی خبر گیری کرتے رہو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے قرآن سینوں سے اتنی جلدی نکل جاتا ہے کہ اونٹ بھی اتنی جلدی اپنی رسی سے نہیں نکلتا“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن ابى موسى الأشعري قال: قال رسول الله ﷺ: تعاهدوا القرآن: یعنی اس کی حفاظت کرو اور اس کو محافظت کے ساتھ یاد کرو، اور اس کی تلاوت پر بیہوشی اختیار کرو۔ طیبی فرماتے ہیں: تعاهد سے مراد محافظت اور تجدید عہد ہے، یعنی اس کی قراءت پر مداومت کرو، اور اس کو بار بار پڑھو تاکہ بھول نہ جائے۔

هو الذى نفسى بیده لهو: یعنی قرآن۔

اشد تفصيا: یعنی بھاگنے میں دوڑنے میں جان چھڑا کر نکل جانے میں۔

من الابل: طیبی فرماتے ہیں: التفص سے مراد جدا ہونا، زائل ہونا۔ کہا جاتا ہے (قرض سے نجات پائی) تفصیت الديون، اس وقت کہا جائے گا جب اس سے نکل جائے۔

فى عقلا: عین کے ضمہ کے ساتھ اور قاف کے ضمہ کے ساتھ۔ عقال کی جمع ہے، جیسے کتاب سے کتب، اور لغة قاف کو ساکن کرنا بھی جائز ہے لیکن صحیح روایت اس کے ضمہ پر ہے اور اس سے مراد وہ رسی ہے جس کے ساتھ اونٹ کا گھٹنا باندھا جاتا ہے، اور اسی سے آپ علیہ السلام کا قول مبارک ہے: ”اعقل وتوکل“۔

طیبی فرماتے ہیں: عقلت الابل، اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کا گھٹنا باندھا جائے گا، اور ان دونوں کو ذراع کے وسط میں باندھا جائے گا۔ یہ العقل وہی رسی ہے، اھ۔ اور ”فی“ اس میں ”من“ کے معنی میں ہے یعنی لہو اشد ذہابا من الابل اذا تخلصت من العقال یعنی یہ بھاگنے میں اونٹ سے زیادہ جلد باز ہے، جب اس کا گھٹنا کھل جائے، پس یہ نکل جاتا ہے، حتیٰ کہ یہ گمان ہوتا ہے اب یہ نہیں

پڑ جائے گا، اور ایک دوسری روایت میں ہے:

”یہ قرآن لوگوں کے دلوں سے نکلنے میں اونٹ سے بھی تیز ہے، جوڑی سے نکل کر بھاگتا ہے۔“

طیبی فرماتے ہیں: یہ اس لئے ہے کہ قرآن کسی بشر کا کلام نہیں ہے، بلکہ طاقتور اور قدرت والے خالق کا کلام ہے، اس کی اور بشر کے درمیان کوئی قریب کی مناسبت بھی نہیں ہے، کیونکہ بشر حادث ہے اور وہ ذات قدیم ہے۔ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی کامل توفیق و مہربانی اور اپنی قدیم تو قیر و رحمت کے ساتھ ان پر یعنی انسانوں پر احسان کیا اور انہیں یہ عظیم نعمت عطاء کی۔ پس اس کے لائق ہے کہ اس کو حفظ کر کے اور پیشگی سے حتی الوسع اس کو پڑھنے پر مداومت کی جائے۔ اس کی تجدید کی جائے یعنی بار بار تلاوت کی جائے۔

امام احمد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

۲۱۸۸: وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِنَسَمٍ مَا لِأَحَدِهِمْ أَنْ يَقُولَ نَسِيتُ آيَةَ كَيْتٍ وَكَيْتٍ بَلْ نُسِيٍّ وَاسْتَذَكَّرُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ أَشَدُّ تَفْصِيًّا مِنْ صُدُورِ الرِّجَالِ مِنَ النَّعَمِ. متفق عليه وزاد مسلم بعقلها۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۷۹۱۸۔ حدیث رقم ۵۰۳۲۔ ۵۔ و مسلم فی صحیحہ ۵۴۴۱/۱ حدیث رقم (۲۸۸۔ ۷۹۰)۔
والترمذی فی السنن ۱۷۷۱۵ حدیث رقم ۲۹۴۲۔ والنسائی ۱۵۴۱۵ حدیث رقم ۹۴۳۔ والدارمی ۵۳۱۱۲ حدیث رقم ۳۳۴۷۔ واحمد فی المسند ۳۸۲/۱۔

ترجمہ: ”حضرت ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کسی شخص کے لئے یوں کہنا بہت برا ہے کہ میں فلاں فلاں آیت بھول گیا ہوں بلکہ وہ اس طرح کہے کہ مجھے بھلا دی گئی، اور قرآن کریم یاد کرتے رہا کرو کیونکہ وہ لوگوں کے دل سے جانوروں سے بھی جلدی نکل جاتا ہے (بخاری و مسلم) مسلم کی روایت میں لفظ بعقلها بھی ہے یعنی جو اپنی رسی میں بندھے ہوئے ہوں۔“

تشریح: وعن ابن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ بنس ما لأحدهم: ما نكره موصوفه ہے۔

ان يقول: مخصوص بالذم ہے، جیسے کہ باری تعالیٰ کا فرمان: ﴿بِنَسَمًا اسْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ [البقرة: ۹۰] یعنی بری ہے وہ چیز جو اس آدمی کے لئے ہے۔

نسیت آية كيت و كيت، بل نسي: تشدید کے ساتھ۔ اور ایک روایت میں ہے: ”بل هو نسي“ کے الفاظ ہیں، اور یہ مقدار مستقل حدیث ہے۔ امام احمد اور بخاری و مسلم اور ترمذی اور نسائی نے اس کو روایت کیا ہے، اور یہ تلقین اور تعلیم دی جا رہی ہے کہ آدمی یہ کہے مجھے بھلا دی گئی نہ کہ میں بھول گیا۔ جیسا کہ صحیحین میں وارد ہے: ”لا يقل احدكم نسيت آية كذا بل هو نسي“۔ تم میں سے کوئی بھی یہ نہ کہے میں فلاں آیت بھول گیا، بلکہ اس کو بھلا دی گئی۔“

امام نووی فرماتے ہیں کہ وہ ”میں فلاں آیت بھول گیا“ کہنے کو ناپسند سمجھتے تھے، بلکہ کہے مجھے وہ آیت بھلا دی گئی۔ پہلی میں عدم التقصیر کی سمجھ آتی ہے اور اس فعل کی طرف اشارہ ہے جو قضاء اور تقدیر کے خلاف ہے۔ اور دوسری میں بھولنے کی نسبت ترک کے معانی میں ہے، جو کہ اس کی ذات سے گناہ کا صدور ہے۔

اس ابہام کے ساتھ کہ عدم توجہ کے ساتھ، اور ہا ابن حجر کا قول کہ تو یہ نہ کہہ کہ میں فلاں آیت بھول گیا، کیونکہ وہ نہیں بھولا۔ یعنی مطلق طور پر بھولنے میں اس کا کوئی عمل دخل ہی نہیں، اھ۔ اور یہ بات ان کے اطلاق کے مطابق درست نہیں ہے۔

طیبی فرماتے ہیں: ان کا قول بل نسی یہ یاد رکھنے میں اس کی عدم کوتاہی کی طرف اشارہ ہے بلکہ اللہ نے اس کو کسی مصلحت کی وجہ

سے بھلا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ما ننسخ من آية أو ننسها نأت بخير منها﴾ [البقرة: ۱۰۶] اور ان کا قول ”نسیت“ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے قرآن کو اچھی طرح یاد نہیں کیا تھا۔

اور ایک دوسرے شارح فرماتے ہیں: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص ہو۔ اور آپ کے قول ”نسیت“ کا معنی یہ ہوگا یعنی اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی۔ اور اس قول سے منع اس لئے کیا کہ قرآن کے محکمات کے ضیاع کا وہم پیدا نہ ہو۔ پس ان کو بتلادیا کہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہے جب اس میں حکمت دیکھی یعنی تلاوت کا منسوخ ہو جانا۔

ابن حجر فرماتے ہیں: کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے اس کو کسی سبب سے بھلا دیا، چونکہ اس نے اس پر توجہ چھوڑ دی۔ اس کا توجہ کو چھوڑ دینا اس کی نسیان کا سبب اور عادت بن گئی، اس کے علاوہ کوئی دوسرا سبب نہیں۔ پھر فرمایا، میں نے شارحین کو دیکھا ہے کہ انہوں نے اس کو اسی طرح برقرار رکھا ہے جس طرح میں نے ذکر کیا، لیکن ہمارے ائمہ کے اقوال اس کا رد کرتے ہیں: انسان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ کہے میں فلاں آیت بھول گیا۔ وہ یہ کہا کرے: اُنسیتھا، یا اسقطتھا یعنی مجھے بھلا دی گئی، جب صحیح حدیث میں موجود ہے: ”أنه سمع رجلا يقرأ بالليل، فقال يرحمه الله لقد أذكرني آية كنت اسقطتها“۔

جب رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو سنا تھا جو رات کے وقت تلاوت کر رہا تھا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اللہ اس آدمی پر رحم فرمائے اس نے مجھے وہ آیت یاد کروادی جو مجھے بھلا دی گئی تھی۔ اور ایک صحیح روایت میں ہے: ”كنت أنسيتها“ اھ۔ اور یہ یاد اور انوکھا رد ہے، اور عجیب وجہ ہے۔

ابو عبیدہ کہتے ہیں: جو آدمی قرآن کے حفظ پر حریص ہو اور اس کی تلاوت میں مسلسل لگا رہے لیکن اس پر نسیان غالب آجائے، تو اس حدیث کی دلیل کے ساتھ وہ اس حکم میں داخل نہ ہوگا۔ اور کہا گیا ہے کہ نسیت یعنی عوقب بالنسیان علی ذنب کہ نسیت یعنی کسی گناہ کی وجہ سے بطور سزا اس پر نسیان طاری کیا گیا۔ یا غیر ذمہ داری کی وجہ سے اور یہ بھی اللہ کے اس قول سے ماخوذ ہے: ﴿إِن تَنَسَّاتْنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَى﴾ [طہ: ۱۲۶] اور مشہور حدیث میں ہے:

”عرضت علی ذنوب امتی فلم أر اعظم ذنبا من رجل أوتى آية فنسيتها“

ترجمہ: ”کہ مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کئے گئے، میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا، کہ کسی آدمی کو کوئی آیت بطور علم دی گئی ہو اور وہ اس کو بھول چکا ہو“۔

پھر ہمارے علماء کے مطابق نسیان اس حالت پر محمول ہوتا ہے جو آدمی کی طاقت سے بالاتر ہو چاہے وہ حافظ ہو یا غیر حافظ ہو۔ واللہ اعلم واستذکرہ القرآن: یعنی دل میں اس کا استحضار (ہر وقت یاد ہو موجود ہو) کرو، اور دوا یا استنافیہ ہے یا جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: کہ ”تا“ مبالغہ کے لئے ہے، یعنی اپنے دلوں میں قرآن کے ذکر کو طلب کرو۔ اور وہ بنس.... پر عطف ہے باعتبار معنی۔ یعنی قرآن کو پختہ یاد کرنے میں سستی اور غفلت نہ برتو، اور اس کو یاد کرو۔ (فانہ اشد تفصیا: یعنی بدکے میں۔ من صدور الرجال: یعنی حفاظ اور من ”تفصیا“ کے متعلق ہوگا۔

من النعم: نون اور عین کا فتح ہے جیسا کہ قاموس میں ہے، اور کبھی عین کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے اس سے مراد اونٹ اور بکری وغیرہ ہیں یا اونٹ کے لئے خاص ہے۔ جمع اس کی انعام آتی ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: یہ پرانے والا مال ہے، اور اس کا استعمال اکثر اونٹ پر ہی ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اشد کے متعلق ہوگا یعنی ”اشد من تفصی النعم المعقلة“ اور رجال کا لفظ لاکر مذکر کو خاص اس لئے کیا گیا کہ قرآن کو یاد کرنے والے زیادہ تر مرد ہی ہوتے ہیں اور انہیں کی صفت ہے۔ (وزاد مسلم بعقلها: عین اور قاف کے ضمہ کے ساتھ۔

۲۱۸۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ إِنَّمَا مَثَلُ صَاحِبِ الْقُرْآنِ كَمَثَلِ صَاحِبِ الْإِبِلِ الْمُعْقَلَةِ إِنْ عَاهَدَ عَلَيْهَا أَمْسَكَهَا وَإِنْ أَطْلَقَهَا ذَهَبَتْ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۷۹/۹ - حديث رقم ۵۰۳۱ - ومسلم فى صحيحه ۳۴۳/۱ حديث رقم (۲۲۶ - ۷۸۹) والنسائى فى السنن ۱۵۴/۲ حديث رقم ۹۴۲ - وابن ماجه ۱۲۴۳/۲ حديث رقم ۳۷۸۳ ومالك فى الموطا ۲۰۲/۱ حديث رقم ۶ من كتاب القرآن - واحمد فى المسند ۱۷/۲

ترجمہ: ”حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ قرآن کی مثال بندھے ہوئے اونٹ کے مالک کی سی ہے اگر وہ اونٹ کی خبر گیری کرتا ہے تو وہ بندھا اور رکا رہتا ہے اور اگر اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ جاتا رہتا ہے (اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم برابر نہ پڑھے اور یاد نہ کرتا رہے تو قرآن اس کے سینہ سے نکل جاتا ہے)۔“
(بخاری و مسلم)

تشریح: وعن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال إنما مثل صاحب القرآن : اس کی عجیب صفت، عجیب حالت دلیل کے ساتھ۔

کمثل صاحب الابل المعقلة : قاف مشد و مفتوح یعنی رسیوں کے ساتھ بندھا ہوا۔
ان عاهد : یعنی ہمیشہ اس کی تلاوت کرے اور اس پر توجہ دے، حافظ قرآن اس کو یاد کرتا رہے۔
عليها أمسكها : یعنی رسیوں کے ساتھ یا اس کی مثل کوئی چیز۔
وان أطلقها : یعنی اس کو چھوڑ دے اور کھول دے۔ (ذہبت :

۲۱۹۰: وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اِقْرَأُوا الْقُرْآنَ مَا ائْتَلَفْتُمْ عَلَيْهِ قُلُوبُكُمْ فَإِذَا اخْتَلَفْتُمْ فَفَقُّومُوا عَنْهُ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۱۰۱/۹ - حديث رقم ۵۰۱۰ - ومسلم فى صحيحه ۲۵۳/۱ حديث رقم (۲۶۶۷/۳ - والدارمى ۵۴۳/۲ حديث رقم ۳۳۶۱ - واحمد فى المسند ۳۱۳/۴ -

ترجمہ: ”حضرت جندب بن عبد اللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن اس وقت تک پڑھو جب تک کہ تمہارے دل کی خواہش ہو، جب تمہارے خیالات منتشر ہو جائیں تو کھڑے ہو جاؤ۔“ (بخاری و مسلم)
تشریح: وعن جندب : جیم اور وال مضموم ہے، اور فتح بھی جائز ہے۔

ابن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ اقرأوا القرآن ما ائتلفت عليه قلوبكم : یعنی جب تک تمہارے دل اور تمہارے ذہن قرآن کی قراءت کی جانب مبذول رہیں، مکمل دلچسپی اور قرآن کی تلاوت کے سرور کے ساتھ، یعنی دوران تلاوت سرور حاصل ہو رہا ہو۔

فاذا اختلفتم : یعنی جب تمہارے دل مختلف ہو جائیں، اور تم اکتا جاؤ، اور تمہارے خیالات منتشر ہو جائیں اور تم سستی کا شکار ہو جاؤ۔ (فقو موا عنه : یعنی اس کو چھوڑ دو۔

ابن الملک فرماتے ہیں: یہ زیادہ بہتر ہے کہ قرآن کی دل کی حاضری کے بغیر پڑھا جائے یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک تم اس کی صحیح قرات پر اور اس کے معانی کے اسرار کی تحقیق پر متفق رہو تو پڑھتے رہو، پس جب تم اختلاف کا شکار ہو جاؤ، تو قرآن کو چھوڑ دو کیونکہ

اختلاف بھگڑے کی طرف لے جاتا ہے اور بھگڑا انکار کی طرف لے جاتا ہے، اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیتا ہے اللہ کریم اپنے فضل کے ساتھ ہمیں اس مصیبت سے محفوظ رکھے۔

۲۱۹۱: وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ سِئِلَ اَنَسُ كَيْفَ كَانَتْ قِرَاءَةُ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ كَانَتْ مَدًّا مَدًّا ثُمَّ قَرَأَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ يَمْدُ بِسْمِ اللّٰهِ وَيَمْدُ بِالرَّحْمٰنِ وَيَمْدُ بِالرَّحِیْمِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۹/۹۔ حدیث رقم ۵۰۴۶۔ و ابوداؤد فی السنن ۱۰۴/۲ حدیث رقم ۱۴۶۵۔ والدارمی ۵۶۳ حدیث رقم ۳۴۹۰۔ واحمد فی المسند ۱۱۹/۳۔

ترجمہ: ”حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی قراءت کیسی ہوتی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ کی قراءت مد کے ساتھ ہوتی تھی پھر انہوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ اس طرح بسم اللہ کو دراز کرتے تھے، رحن کو دراز کرتے تھے اور رحیم کو دراز کرتے تھے۔“ (بخاری)

تشریح: وعن قتادة : جلیل القدر تابعی ہیں۔

قال: سئل انس: كيف كان: ابيك دوسرے نسخے میں ”كيف كانت“ کے الفاظ ہیں۔

قراءة النبي ﷺ: یعنی ترتیل سے پڑھتے تھے یا ٹھہر ٹھہر کر۔

فقال: یعنی انس بن مالک نے۔ كانت: یعنی آپ علیہ السلام کی قراءت۔

مَدًّا: یعنی مد والی اور ایک نسخے میں ہے کہ مَدَّآءُ بِالْمَدِّ فَعَلَاءُ تَانِيَتْ أَمَدًا، یعنی بہت زیادہ مدوں والی اور اس سے مراد یہ ہے کہ جو بھی کلام اللہ میں حروف مد اور حروف لین ہیں، ان کو معروف مقدار کے مطابق لبا کر کے، اور اس قاعدے کے مطابق جو قراء کے ہاں معلوم ہے۔

تورپشتی بی بی فرماتے ہیں: یعنی مد والی، اور بخاری میں ہے یمد مدًّا، اور ایک روایت میں ہے: كان مدًّا یعنی آپ مد کیا کرتے تھے۔ اور مصابح کے اکثر نسخوں میں مد آء ہے، فعلاء کے وزن پر۔ اور ظاہر بات یہ ہے کہ یہ تخمینہ کے قول پر ہے۔

مظہر فرماتے ہیں: اس کی تفسیر اس طرح کی جائے گی کہ آپ علیہ السلام کی قراءت بہت زیادہ مد والی ہوتی تھی۔ طبی فرماتے ہیں: حروف المد تین ہیں، اگر ان کے بعد ہمزہ ہو تو ایک الف کی مقدار لبا کیا جائے گا، اور ایک قول کے مطابق دو الفوں سے لے کر پانچ (۵) الفات تک۔ اور الف کی مقدار سے مراد تیری آواز کی مقدار، جب تو تلفظ کرے گا، یا یاتا کا اور اگر اس کے بعد تشدید ہو تو بالافتاق چار الف کی مقدار لبا کیا جائے گا۔ جیسے آ آ آ آ، اور اگر ساکن ہو تو دو الف کی مقدار لبا کیا جائے گا۔ جیسے صا صا اور یعملون اور ان حروف کے علاوہ کوئی اور حرف ہو اس کو صرف اس کے مخرج کے مطابق ہی لبا کیا جائے گا۔ اور اس قاعدہ میں ہم ان کے ساتھ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کہ قابل اعتماد یہ ہے کہ جب حرف مد پایا جائے جو کہ مد کی شرط ہے اور وہ دو زیادتی کو واجب کر دینے والے اسباب نہیں پائے جائیں جو کہ ہمزہ اور سکون ہیں تو مد کے لئے ضروری ہے کہ مد کے مقدار الف کے برابر ہو یہ بالافتاق ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق اس کے مقدار ایسے ہو سکتی ہے ”الف“ اور الف لکھنے کے برابر یا انگلی کے پورے کے برابر۔ اس کا نام طبعی، ذاتی اور اصل ہے، جب دو اسباب میں سے کوئی ایک پایا جائے تو زیادہ کرنا ضروری ہے۔ اس کا نام فرعی ہے۔ اگر سب ہمزہ ہو تو اصل زیادتی کی مقدار میں خلاف ہے اس کی مقدار قراء کے درمیان متصل اور منفصل میں۔ متصل مطلق میں بالافتاق۔ اور بعض کا منفصل میں اختلاف ہے۔ کم از کم زیادتی ایک الف اور نصف اور زیادہ سے زیادہ چار الف ہے۔ اگر سب سکون ہو اور لازم ہو، مشدہ ہو یا مخفف جیسے ”دابة“ صا۔

تمام ایک ہی سبج پر پڑھتے ہیں۔ اس کی مقدار تین الف ہیں۔ اگر عارض ہو جیسے یعملون اس میں قصر جائز ہے، اس کی مقدار الف ہے۔
توسط اس کی مقدار دو الف ہے، اور مد اس کی تین اقسام ہیں۔ اس مسئلہ میں تفصیل ہے جو مزید مشکل کا باعث ہے۔
ثم قرأ : یعنی اس نے۔

بسم الله الرحمن الرحيم، ومد بسم الله : یعنی لفظ اللہ میں مد اصلی کرتے جو ایک الف کی مقدار ہے۔
ویمد بالرحمن : یعنی اسی طرح لفظ الرحمن میں الف میں۔

ویمد بالرحيم : یعنی اس کی یا میں مد اصلی یا مد عارضی۔ اس قسم میں حالت وقف میں تین وجہیں جائز ہوتی ہیں، لمبا کرنا، درمیانہ اور قصر کرنا۔ سکون کے ساتھ اور ایک تیسرے طریقہ قصر اور روم کے ساتھ یعنی بعض حرکات کا ہلکی پوشیدہ آواز کے ساتھ لانا۔

۲۱۹۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا أَذِنَ اللَّهُ لِشَيْءٍ مَا أَذِنَ لِنَبِيِّ يَتَعَنَّ بِالْقُرْآنِ . (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۸۱۹۔ حدیث رقم ۵۰۲۳۔ و مسلم فی صحیحہ ۵۴۵۱ حدیث رقم (۲۳۲-۷۹۲)۔
والنسائی ۱۸۰۱۲ حدیث رقم ۱۰۱۸۔ والدارمی ۵۶۳/۲ حدیث رقم ۳۴۹۰۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جس طرح نبی ﷺ کی آواز سنتا ہے جب کہ وہ قرآن کریم کو خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اس طرح اور کوئی آواز نہیں سنتا۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ ما أذن الله لشئء ما أذن لنبي : پہلا ”ما“ نافیہ ہے اور دوسرا ”ما“ مصدریہ ہے، یعنی کسی چیز کی آواز کو نہیں سنا جیسے اپنے نبی کی آواز کو سنا۔ یعنی محبت اور رحمت کو سنا چونکہ اللہ تعالیٰ سمع حاسہ سے منزہ ہے۔
یتعنى : یعنی خوبصورت بنائے اپنی آواز کو۔

بالقرآن : یعنی اس کی تلاوت کے ساتھ۔ اور ایک قول یہ ہے کہ مصدر بمعنی قراءۃ یا مقروءۃ ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ قرآن سے مراد آسمانی کتابوں سے جو بھی پڑھا جائے، اور نبی کا نکرہ لانا اس پر دلالت کرتا ہے طبری کہتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ اذن، اذنا، سنتنا۔ یہاں مراد مقرب بنانا اور ثواب عطا کرنا ہے تغنی سے مراد حسن صوت اور اس میں ترقیق و تجزین ہے جیسا کہ یہی امام شافعی کا قول ہے، اور اکثر علماء کا بھی ہے۔

سفیان ابن عیینہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم مذہب جماع کا قول ہے کہ اس کا معنی لوگوں سے مستغنی ہونا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کے علاوہ احادیث اور کتابوں سے مستغنی ہونا اور از ہری فرماتے ہیں: یتغنی بہ سے مراد ہے اونچا پڑھتے۔

جیسا کہ اس پر دوسری روایت دلالت کرتی ہے اور استغنا کے ساتھ پڑھنے پر ابھارنے پر محمول کرنا لغوی اعتبار سے غلط ہے، اھ۔

لیکن لغت کے لحاظ سے تخطئه میں غلطی کی ہے۔ نہا یہ میں ہے: رجل ربطها تغنياً یعنی وہ لوگوں سے مانگنے سے مستغنی ہو

گیا۔ من لم یغنی بالقرآن سے مراد جو اس کے ساتھ دوسرے سے مستغنی نہ ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے انہوں نے اس کو مراد لیا ہے جو اونچا نہیں پڑھتا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے خوبصورت آواز

سے قراءت کرنا اور اتار چڑھاؤ کا خیال رکھنا، اور قاموس میں ہے تغنیست استغنیست کے معنی میں ہے، اور ابن حجر فرماتے ہیں: ابن حجر کا

قول لغۃ یعنی جو کہ امام شافعی نے کہا۔ اور دوسروں سے لغت کے زیادہ ماہر ہیں، بلکہ ان کے لئے مخصوص لغۃ ہے، اھ۔ وهو لا طائل

تحتہ۔

پھر اس کو غریب کہا اور کہا اگر یتغنی کا معنی یتغنی ہوتا، تو کہتے: یتغانی۔

عیاض نے کہا ہے کہ یتغنی اور یتغانی بمعنی یتستغنی صحیح نہیں۔ یتغنی کا مادہ معنی کے لحاظ سے یتغانی سے مختلف ہے۔ اس کا علم نہ ہونا پر دلالت ہے، لہذا اور لفظ معنی کے لحاظ سے۔ واضحات میں سے ہے کہ یتقطع اور تقاطع کا مادہ ایک ہے۔ اختلاف باب میں ہے جیسا کہ اولوالالباب کے ہاں متفق علیہ ہے۔

۲۱۹۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا أذنَ اللَّهُ لِشَيْءٍ مَّا أذنَ لِنَبِيِّ حَسَنِ الصَّوْتِ بِالْقُرْآنِ يَجْهَرُ بِهِ .

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۱۸/۱۳۔ حدیث رقم ۷۵۴۴۔ ومسلم فی صحیحہ ۵۴۵/۱ حدیث رقم (۲۳۳-۷۹۲)۔ وابوداؤد

فی السنن ۱۵۷/۲ حدیث رقم ۱۴۷۳۔ والدارمی فی السنن ۴۱۶/۱ حدیث رقم ۱۴۸۸۔ واحمد فی المسند ۴۵۰/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنا کہ وہ اپنے نبی کو خوش الحانی کے ساتھ بلند آواز سے قرآن پڑھتے ہوئے سنتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعنه: یعنی ابو ہریرہؓ سے۔

قال: قال رسول الله ﷺ ما أذن الله لشيء: یعنی ما استمع، یہ قبولیت سے کنایہ ہے۔

ما أذن لنبی حسن الصوت: صفت ہے۔

بالقرآن يجهر به: یعنی اپنی نماز میں یا اپنی تلاوت میں یا دعوت و تبلیغ کے وقت۔

۲۱۹۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۰۲/۱۳۔ حدیث رقم ۷۵۲۷۔ وابوداؤد فی السنن ۱۵۵/۲ حدیث رقم ۱۴۶۹۔

والدارمی ۴۱۷/۱ حدیث رقم ۱۴۹۰۔ واحمد فی المسند ۱۷۲/۱۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص خوش الحانی سے قرآن نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں۔“ (بخاری)

تشریح: وعنه: یعنی ابو ہریرہؓ سے۔

قال: قال رسول الله ﷺ ليس منا: یعنی باعتبار سیرت و اخلاق یا ہمارے ساتھ یا ہمارا پیروکار ہمارے مکمل طریقہ میں اتصال

کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض﴾ [التوبة: ۶۷] اور حدیث ہے لست من دد ولا الذد منی، یعنی نہ میں ابو ولعب کے ساتھ ہوں اور نہ ہی ابو ولعب کا میرے ساتھ کوئی تعلق ہے۔

من لم يتغن بالقرآن: یعنی اس کے ساتھ اپنی آواز کو خوبصورت نہیں کرتا، یا اسکو اونچا نہیں پڑھتا یا اس کی وجہ سے دوسرے سے مستغنی نہیں ہوتا یا اس کو گا کر نہیں پڑھتا یا ٹمگین آواز میں۔ یا اس کے ساتھ نفس کی غنا کا مطالبہ نہیں کرتا، یا لم یروج به غنی الید۔ یہ سات معانی فتح الباری سے ماخوذ ہیں، وہاں سے استخراج ملاحظی قاری نے کئے ہیں۔

طبی فرماتے ہیں: آپ کا قول لم يتغن کے بارے میں یہاں پر یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ استغناء کے معنی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ النغنی کے معنی میں ہو۔ جب کہ یہ پچھلے کے لئے بیان نہیں ہے اور لاحق کے لئے مبین ”وضاحت کرنے والا“ نہیں ہے۔ جیسا کہ گذشتہ حدیث میں ہے۔

اور تورپشتی بریل نے استغناء کے معنی کو راجح قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ ہمارے طریقے والوں میں سے نہیں ہے،

اور نہ ہی ان میں سے ہے جنہوں نے ہمارے کام میں ہماری اتباع کی ہے، اور یہ وعید ہے۔ اور امت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کہ قرآن پڑھنے والے کو قرآن کی قراءت پر ثواب ہوتا ہے جو اپنی آواز کو تخمین نہیں بناتا، پس کہے اس کو وعید کا مستحق ہونے پر محمول کیا جائے، حالانکہ ثواب اور اجر کا باعث ہے، اھ۔

اور طبری نے اس کا تعاقب کیا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: مما لا یجدی نفعاً۔

آپ ﷺ کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قراءت کا سننا

۲۱۹۵: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ عَلَيَّ الْيَمِينِ اِقْرَأْ عَلَيَّ قُلْتُ اَقْرَأْ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ اَنْزَلَ قَالَ اِنِّي اِحْبُ اَنْ اَسْمَعَهُ مِنْ غَيْرِي فَقَرَأْتُ سُورَةَ النَّسَاءِ حَتَّى اَتَيْتُ اِلَى هَذِهِ الْاَيَةِ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَيَّ هُوَ لَآءٍ شَهِيدًا قَالَ حَسْبُكَ الْاَنَ فَالْتَفَتُّ اِلَيْهِ فَاِذَا عَيْنَاهُ تَدْرِ فَاِنِ . (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۹۴/۹ - حديث رقم ۵۰۵۰ - ومسلم فى صحيحه ۵۵۰/۱ حديث رقم (۲۴۵ - ۷۹۹)۔

وابوداؤد فى السنن ۷۴/۴ حديث رقم ۳۶۶۸ - والترمذى ۲۲۲/۵ حديث رقم ۳۰۲۵ - واحمد فى المسند ۳۸۰/۱۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت جب کہ آپ ﷺ منبر پر تھے مجھ سے فرمایا کہ ”مجھے قرآن سناؤ“ میں نے عرض کیا کہ ”آپ ﷺ کے سامنے میں قرآن کریم پڑھوں؟ حالانکہ قرآن کریم آپ ﷺ پر اتارا گیا ہے“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”میں اپنے علاوہ کسی دوسرے سے سننا چاہتا ہوں!“ میں نے سورۃ النساء پڑھی یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَيَّ هُوَ لَآءٍ شَهِيدًا بھلا اس دن یہود وغیرہ کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ بلائیں گے اور ہم آپ ﷺ کو اس امت کو گواہ بنا کر بلائیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”بس رک جاؤ یعنی بس کرو۔ پھر جب میں آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن عبد الله بن مسعود قال: قال لى: خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔

رسول الله ﷺ وهو على المنبر اقرأ على: تا کہ میں سن لوں۔

قلت اقرأ: یعنی میں پڑھتا ہوں۔

عليك و عليك انزل؟: یعنی قرآن۔ اور جملہ حالیہ ہے، یعنی حکمت کا حکیم کی زبان سے جاری ہونا زیادہ میٹھا ہے، اور محبوب کا

کلام حبیب کی زبان پر زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اور یہ اسلاف کا طریقہ ہے کہ وہ قرآن اور حدیث کو پڑھتے تھے اور طلباء کرام ان سے سنتے تھے اور وہ ان سے رغبت کے ساتھ قبول کرتے تھے۔

قال انى احب: یعنی بعض ان احوال کے بارے میں جس میں عارف کو خاموشی اچھی لگتی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: ”من عرف

الله كل لسانه“ اور اسی سے آپ علیہ السلام کا قول ”کلمینى یا حمیر آء“ اور اس کے لئے ایک دوسری حالت بھی ہے جس میں کہا جاتا ہے من عرف الله طال لسانه۔

ان اسمعه من غیرى: دو فضیلتوں کو جمع کرنے کے لئے۔ حتی کہ کہا گیا ہے کہ قرآن سننا افضل ہے، لیکن اس کو اس پر محمول کیا

جائے گا کہ جب تعلیم کی غرض سے ہو۔ اسی لئے اسلاف قرآن اور حدیث میں کرام سے اخذ علم کرتے تھے جیسا کہ وہ تلامذہ اور طلباء سے قرآن اور

حدیث کا سماع کرتے تھے اور یہ متاخرین کے فہم کی نسبت ضبط (یاد ہوئے محفوظ) کے زیادہ قریب ہے اور پہلے لوگ تو اعلیٰ مرتبہ پر تھے وہ تو سماع کے ذریعے وافر اور اعلیٰ حصہ پالیا کرتے تھے۔ اور ابن حجرؒ کا قول جو کہ انہوں نے کہا کہ اقرا غلی وان کان انزل علی، فانی احب“ یہ ان کا وہم ہے کہ روایت میں ”قا“ ہے، حالانکہ ایسا بالکل نہیں بلکہ تصحیح شدہ نسخہ میں ”ف“ کے بغیر ہی ہے۔

فقراء ت سورة النساء حتى اتيت الى هذه الآية ”فكيف“ : یعنی یہ کفار اور یہود اور ان کے علاوہ دیگر منکرین۔

اذا جننا من كل امة بشهيد [النساء : ۴۱] : یعنی ہم ان میں سے ان کے اعمال پر ان کے خلاف گواہ حاضر کریں گے۔ اور وہ

ان کا نبی ہی ہوگا۔

وجنناك على هؤلاء [النساء : ۴۱] : یعنی آپ کی امت کو۔ اور ابن عبد الملک نے کہا ہے کہ یعنی جھٹلانے والوں پر۔

شہیدا [النساء : ۴۱] حسبك : یعنی جو تو نے اس قرآن کو پڑھا ہے یہ تجھے کافی ہے۔

الآن : یعنی اور کچھ نہیں پڑھنا، کیونکہ میں اس آیت میں تفکر غور و فکر کر رہا ہوں اور مجھے رونا آ گیا ہے اور رونے کی حالت سماع قرآن کے مانع ہے۔

فالتفت : یعنی آپ علیہ السلام کی طرف، جیسا کہ صحیح نسخہ میں ”الیہ“ کے الفاظ مذکور ہیں۔

فاذا عيناه تذرفان : راء کے کسرہ کے ساتھ، یعنی آنسو بہا رہی تھیں، اور ان سے آنسو جاری تھے یا تو اپنی امت پر رحمت کی وجہ سے یا اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے ظاہر ہونے سے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس آیت کی قراءت کے وقت اسلاف کی جماعتوں نے رونا شروع کیا، اور ایک گروہ اس کے سبب سے فوت ہو گئی۔

فرماتے ہیں: کہ صحیح بات عدم انکار ہے سوائے اس کے جو اعتراف کرے کہ اس نے یہ کام بناوٹ کی غرض سے کیا۔ اور کتاب الاذکار میں فرماتے ہیں: اگر اس پر رونا مشکل ہو تو رونے کی صورت بنا لی جائے، چنانچہ احمد اور بیہقی کی روایت موجود ہے کہ: ”ان لهذا القرآن نزل بحزن و کتابة فاذا قراء تموه فابکوا فان لم تبکوا فتابکوا وتغنوا به فمن لم يتغن فليس منا“۔ ”یہ قرآن غم و کتابت کے ساتھ نازل ہوا، جب اس کو پڑھو تو روؤ، اگر رونہ سکو تو رونے کی ہیئت بنا لو، اور اس کو ترنم کے ساتھ پڑھو، جو قرآن کو اچھی آواز سے نہیں پڑھتا، وہ ہم میں سے نہیں۔“

آپ ﷺ کا حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن پڑھنا

۲۱۹۲: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِأَبِي بِنِ كَعْبٍ إِنَّ اللَّهَ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ قَالَ اللَّهُ سَمَانِي لَكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَقَدْ ذُكِرْتُ عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِينَ قَالَ نَعَمْ فَذَرَفَتْ عَيْنَاهُ وَفِي رِوَايَةٍ إِنَّ اللَّهَ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا قَالَ وَسَمَانِي قَالَ نَعَمْ فَبَكَى - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۷۲۵۱۸ - حديث رقم ۴۹۶۰ - واحمد فى المسند ۲۱۸/۳

ترجمہ: ”حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہیں قرآن سناؤں؟ حضرت اُبیؓ نے عرض کیا کہ ”کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے میرا نام لیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”ہاں! حضرت اُبیؓ نے کہا کہ ”دونوں جہاں کے پروردگار کے پاس میرا ذکر کیا گیا؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”ہاں حضرت اُبیؓ کی دونوں آنکھوں سے (خوشی کے) آنسو بہنے لگے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت اُبیؓ سے ارشاد فرمایا کہ ”مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ

میں تمہارے سامنے سورہ کلمہ یٰسٰیکن الذین کفروا پڑھوں“ حضرت ابی نے عرض کیا کہ ”اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟“
آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”ہاں؟“ حضرت ابیؓ رونے لگے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن انس قال: قال رسول الله ﷺ لابی بن کعب ان الله امرنى ان اقرأ عليك القرآن: یعنی باقی

صحابہ میں سے خصوصی طور پر۔

قال الله: دو ہمزوں کے ساتھ، پہلا ہمزہ برائے استفہام اور دوسرے کو الف سے بدل دیا گیا، ہمزہ استفہام کو باقی رکھنے کی غرض سے، اور اس کو تسہیل کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ اور اس کا حذف بھی جائز ہے۔ اس کے معلوم ہونے کی وجہ سے یہ معنی طیبی کے قول کا ہے۔ ”اللہ“ مذ کے ساتھ بغیر حذف کے اور اللہ مذ کے بغیر حذف کی صورت میں۔

سمانی لك: یعنی آپ کے سامنے میرا نام ذکر کیا ہے۔

اور اس سے مقصود تعجب ہے یا تو اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہوئے، یعنی میرے لائق یہ مقام کیسے ہو سکتا ہے؟ یا اس عالی شان مرتبہ کی خوشی محسوس کرتے ہوئے۔

قال نعم وقد ذكرت: یعنی میرے لئے یہ اور حال ”قد ذكرت“ خصوص کی وجہ سے یا اس وجہ مخصوص کے ساتھ۔ طیبی فرماتے ہیں: یہ کلمہ تعجب کے لئے ہے۔

عند العالمين: یعنی اللہ کی عظمت کے اور میری حقیر ذات کے باوجود۔ طیبی فرماتے ہیں: کہ ”عند“ یہاں پر ذات اور اس کی عظمت سے کنایہ ہے اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ اس کے تقرب اور رحمت کی زیادتی سے کنایہ ہے۔

قال نعم فدرت عيناه: یعنی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یعنی قراءت کا حکم دینے میں اللہ رب العالمین کا خاص انہی کا نام لینے کی خوشی و مسرت کی وجہ سے یا پھر اللہ کی اس عظیم نعمت کا شکر یہ بجالانے کی عاجزی کے خوف سے اور ابی بن کعب کو اس کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کے حفظ کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دی اور یہ انہیں کے لائق تھا، حتیٰ کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ”تم میں سے زیادہ قرآن پڑھنے کے لحاظ سے ابی بن کعب ہیں“۔ اور جب ان کے لئے امامت کو مقدر کر دیا گیا اس حالت میں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو حکم دیا کہ ابی پر تلاوت کریں، تاکہ ان سے رسم التلاوة کو اخذ کریں۔ جس طرح اللہ کے نبی علیہ السلام نے قرآن جبرئیل علیہ السلام سے پڑھا۔ پھر اسی طرح ہر بعد والا اپنے سے پہلے والے سے سب علم القرآن کرتا رہا اور بعد والے پہلے والوں سے اور ابی بن کعب سے بہت سے تابعین نے قرآن سیکھا پھر ان سے تبع تابعین نے اور اسی طرح۔

وفی رواية: ان الله امر فی ان اقرأ عليك ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [البینة: ۱] کہا جاتا ہے کہ اس میں اہل کتاب کا واقعہ ہے۔ اور ابی بن کعب یہودی علماء میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارادہ بنا کہ ابی یہودی کی حالت کو جان لیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا خاص انہی کو خطاب کرنا اس لئے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان کا مضبوطی سے اقرار کر لیں، پھر یہ احتمال بھی ہوتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے لئے پہلی روایت میں وضاحت کرنے والی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا قصہ ہو۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے کئی مسائل مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں کہ ماہر قرآن پر اور اہل علم پر قراءت کا استحباب اور یہ کہ اگرچہ قاری مقروء علیہ (جس پر پڑھا جا رہا ہو) سے افضل ہو اور ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ ابی بن کعب کا ایک عالی شان مرتبہ بھی واضح ہوتا ہے اور ہم اس مرتبہ میں ان کا ہم سر نہیں جانتے۔

اور رہا مسئلہ لم یکن کی تخصیص کا وہ اس لئے ہے کہ یہ سورت اصول الدین کے بہت سے قواعد اور وعدوں اور وعیدوں کے اہم

موضوعات پر مشتمل ہے اور اسی طرح اس میں اخلاص اور دلوں کی تطہیر کا ذکر بھی ہے، اور وقت اختصار کا تقاضا کرتا ہے اور حدیث سے یہ دلیل بھی ثابت ہوتی ہے کہ جو کہ علماء کہتے ہیں، قرآن کا اطلاق کل پر بھی کیا جاسکتا ہے، اور جزو پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جب کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب پر مکمل قرآن پڑھا ہو۔ (قال وسمانی؟ : یعنی لك کے الفاظ بھی ہیں جیسا کہ ایک دوسرے نسخہ میں بھی موجود ہے۔) (قال نعم فبکی :

۲۱۹۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى أَرْضِ الْعَدُوِّ. متفق عليه وفي رواية لمسلم لَا تُسَافِرُوا بِالْقُرْآنِ فَإِنِّي لَا أَمْنُ أَنْ يَنَا لَهُ الْعَدُوُّ.

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۳۳/۶۔ حدیث رقم ۲۹۹۰۔ و مسلم فی صحیحہ ۱۴۹۰/۳ حدیث رقم (۹۲-۱۸۶۹)۔

وابوداؤد فی السنن ۸۲/۳ حدیث رقم ۲۶۱۰۔ وابن ماجہ ۹۶۱/۲ حدیث رقم ۲۸۷۹۔ واحمد فی المسند ۶/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دشمن ملک (یعنی دارالحرب) کی طرف قرآن لے کر سفر کرنے سے منع فرمایا ہے (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ فرمایا، قرآن لے کر سفر نہ کرو اس لئے کہ مجھے یہ اطمینان نہیں ہے کہ دشمن (یعنی کافر) اسے چھین لے۔“

تشریح: وعن ابن عمر قال نهى رسول الله ﷺ أن يسافر به إلى أرض العدو، یعنی کوئی بھی سفر کرے۔

بالقرآن : یعنی وہ صفحات جن پر قرآن درج ہو۔ طبعی فرماتے ہیں: باء زائدہ ہے کیونکہ یہ مفعول بہ پر داخل ہوئی ہے، جو کہ نائب الفاعل ہے اور یہ اس طرح نہیں ہے جیسا کہ آپ کا قول ”لا تسافروا بالقرآن“ یہ حال ہے یعنی اس حال میں کہ تم اس کو لئے ہوئے ہو۔ ”حال کو نکم و صاحبین لہ۔“

الى ارض العدو : یعنی دارالحرب۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کا اس سے منع کرنا اس وجہ سے ہے کہ مکمل قرآن تمام صحابہ کے پاس محفوظ تھا۔ پس اگر کچھ صحابہ دشمن کے علاقے کی طرف چلے جاتے اس سمیت جو ان کے پاس قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے، اور وہ وہیں فوت ہو جاتے، تو اتنی مقدار قرآن کی ضائع ہو جاتی، اور اس کنا یہ کی طرف اس لئے گئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں قرآن نسخہ کی صورت میں تھا ہی نہیں۔

طبعی فرماتے ہیں: کیوں نہیں جائز کہ قرآن سے مراد بعض آیات ہیں جو منسوخ ہو گئیں اور آپ کے عہد ہی میں لکھی گئیں یا غیب کے بارے میں خیر دنیا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ صحیفہ کو دار کفر میں لے کر جانا مکروہ ہے، اور اگر کفار کی طرف کوئی خط وغیرہ لکھا جائے اور اس میں کوئی آیت ذکر کی جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ علیہ السلام نے ہر قل کی طرف جو خط لکھا تھا، اس میں یہ آیت بھی تھی: ﴿قُلْ يَا هِذِهِ الْقُرْآنُ كَلِمَةٌ سَوَاءٌ مِّنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: ۶۴] ”کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی ہے) اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا کسی کو کارساز نہ سمجھیں اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (خدا کے) فرمانبردار ہیں۔“

اور ظاہر ہے کہ یہ آپ علیہ السلام کی خصوصیات سے ہے لیکن آپ علیہ السلام کو آیت کے شروع ”قل“ کے ساتھ حکم دیا گیا ہے آپ پر تبلیغ کے فرض ہونے کے لئے، لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے: کہ قوم میں شیخ اپنی امت میں نبی کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ علماء اور امراء

آیت اور اس کی مثال لکھا کریں۔ جس طرح کہ جگہ اور حال تقاضا کرتے ہیں، تاکہ آخرت میں ان پر حجت پوری ہو جائے۔ اور بعض نے حدیث میں اضافہ کیا ہے ”مخافۃ ان ینالہ العدو“ کہ کہیں دشمن کے ہاتھ نہ چڑھ جائے۔

اور اس کو نبی ﷺ کے لفظ سے شمار کیا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ تو امام مالک علیہ الرحمہ کا قول ہے،
وفی روایۃ لمسلم: لا تسافروا بالقرآن فانی لا آمن: یعنی میں امن نہیں محسوس کرتا۔

من ان ینالہ العدو: یعنی کافر اس کو پالے گا۔ پھر اس کو جلا دے گا یا اس کو حقیر سمجھے گا، یا اس کو کسی نامناسب جگہ میں پھینک دے یا تمہیں واپس نہ کرے کہیں ضائع ہی نہ ہو جائے۔

ابن حجر نے جو کہا وہ صحیح نہیں ہے، کہ اس میں بہت بلیغ رد ہے جس کا شارح نے دعویٰ کیا ہے کہ نبی صرف آپ علیہ السلام کے زمانے تک ہی خاص تھی کیونکہ اس وقت قرآن صحابہ کے پاس متفرق اوراق میں لکھا ہوا تھا۔ اگر اس قرآن سے کچھ بھی ضائع ہو جاتا، تو اس کا عوض نہیں ہو سکتا تھا، اھ۔

کیونکہ اس کے لئے علت بھی شامل مشترک ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

عرض مرتب:

اس کا جواب یہ ہے اگرچہ تمام قرآن مصحف میں نہیں لکھا گیا تھا۔ لیکن جو کچھ نازل ہوتا تھا ہر کوئی اپنے لئے صحیفے میں لکھ کر رکھ لیتا یا آپ ﷺ نے غیب کی خبر دی کہ میرے زمانے کے بعد جو کچھ لکھا جائے گا اس کو کفار کے ملک میں لے کر نہ جانا اور بعض علماء نے کہا ہے کہ کلام اللہ دار الکفر کی طرف لے جانا مکروہ ہے اور اگر کوئی کفار کو خط بھیجے اور اس میں آیت لکھے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لیے کہ حضور ﷺ نے ہر قل کے خط میں یہ آیت لکھی تھی: ﴿قُلْ يَا هَذِهِ أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا آيَاتًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران: ۶۴) ”کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی ہے) اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا کسی کو کارساز نہ سمجھیں اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (خدا کے) فرمانبردار ہیں“۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثانی:

فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے خوشخبری

۲۱۹۸: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ جَلَسْتُ فِي عِصَابَةٍ مِنْ ضَعْفَاءِ الْمُهَاجِرِينَ وَإِنَّ بَعْضَهُمْ لَيَسْتِيرُ بَعْضُ مِنَ الْعُرَى وَقَارِي يَقْرَأُ عَلَيْنَا إِذْ جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَامَ عَلَيْنَا فَلَمَّا قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سَكَتَ الْقَارِيُّ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ مَا كُنْتُمْ تَصْنَعُونَ فَلَمَّا كُنَّا نَسْتَمِعُ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي جَعَلَ مِنْ أُمَّتِي مَنْ أُمِرْتُ أَنْ أَصْبِرَ نَفْسِي مَعَهُمْ قَالَ فَجَلَسَ وَسَطْنَا لِيُعَدِلَ بِنَفْسِهِ فِينَا ثُمَّ قَالَ بِيَدِهِ هَكَذَا فَتَحَلَّفُوا وَبَرَزَتْ وَجُوهُهُمْ لَهُ فَقَالَ أَبْشُرُوا يَا مَعْشَرَ صَعَالِكِ الْمُهَاجِرِينَ بِالنُّورِ النَّامِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ قَبْلَ أَغْنِيَاءِ النَّاسِ بِنِصْفِ يَوْمٍ وَذَلِكَ خَمْسُ مِائَةِ سَنَةٍ۔ (رواه ابوداؤد)

ترجمہ: ”حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں غرباء مہاجرین کی ایک کمزور جماعت کے درمیان بیٹھا تھا ان میں سے کچھ ننگے بدن ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور قاری ہمارے سامنے قرآن پڑھ رہا تھا کہ اچانک رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور ہمارے پاس کھڑے ہو گئے پڑھنے والے نے جب آپ ﷺ کو کھڑے ہوئے دیکھا تو وہ چپ ہو گیا اس وقت آپ نے ہمیں سلام کیا اور ارشاد فرمایا کہ ”تم لوگ کیا کر رہے ہو؟“ ہم نے عرض کیا کہ ہم کتاب اللہ سن رہے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے میری امت میں وہ لوگ پیدا کئے ہیں جن کے بارے میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں“ راویؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہمارے درمیان بیٹھ گئے تاکہ آپ ﷺ کی ذات اقدس کا تعلق ہمارے سب کے ساتھ یکساں رہے پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلی سے اس طرح اشارہ کیا کہ سب لوگ حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور ان سب کے چہرے آپ کی طرف ہو گئے اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اے مہاجرین فقراء جماعت تمہیں قیامت کے دن بھر پور نور کی خوشخبری حاصل ہو اور تم مالدار لوگوں سے آدھے دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور یہ آدھا دن پانچ سو برس کے برابر ہوگا۔“ (ابوداؤد)

تشریح: وعن ابی سعید الخدری قال جلست فی عصابة : عین کے کسرہ کے ساتھ یعنی جماعت، گروہ۔
من ضعفاء المهاجرین : یعنی اصحاب صفہ میں سے۔

وان بعضهم لیستتر ببعض من العری : یعنی
کے ساتھی سے کم تھا، وہ اپنے ساتھی کے پیچھے چھپ کر بیٹھتا تھا، اور جملہ حالیہ ہے، عری ننگے ہونے سے مراد ستر سے علاوہ جسم ہے۔ ستر وہ جگہ ہے جس کو کھولنے کی اجازت نہیں، جس کو عادتاً کھولا نہیں جاتا۔

وقاریء یقرأ علینا : یہ جملہ بھی حالیہ ہے، تاکہ ہم سنیں اور سیکھیں۔

اذ جاء رسول اللہ ﷺ : اذ، مفا جاسیہ ہے، مفاجات کے لئے آیا ہے اچانک کا معنی دیتا ہے۔
فقام : ٹھہر گئے، رک گئے۔

علینا : یعنی ہمارے سروں پر یعنی کہ ہم آپ علیہ السلام کی آمد سے بے خبر تھے، ہم نے دیکھا کہ اچانک آپ ہمارے سروں پر آ کھڑے ہیں اور قرآن کریم کو غور سے سماعت فرما رہے ہیں۔
فلما قام رسول اللہ ﷺ سکت القاری : یعنی آپ کی موجودگی کا ادب و احترام کرتے ہوئے اور آپ کے کسی حکم کا انتظار کرتے ہوئے۔

فسلم : یعنی رسول اللہ نے سلام کیا۔ ثم قال : یعنی نبی علیہ السلام نے فرمایا۔

ما کنتم تصنعون ؟ : آپ علیہ السلام کے سوال کرنے کا مقصد باوجود ان کے بارے علم ہونے کے یہ تھا تاکہ انہیں جواب دیں جو ان کی حالت پر مرتب ہوگا۔

قلنا : کنا نستمع الی کتاب اللہ : یعنی قرآن کی قراءت کی طرف دھیان لگائے ہوئے تھے یا اس کے پڑھنے والے کی طرف۔

فقال : الحمد لله الذی جعل من امتی من امرت أن اصبر نفسی معہم : یعنی جس ذات نے ان کو فقراء میں سے بنایا قرآن کے ساتھ چپے رہنے والے اور خلوص نیت والے اللہ تبارک و تعالیٰ پر توکل کرنے والے اللہ کے دربار میں مقرب اس وجہ سے اللہ

نے ان کے ساتھ ٹھہرنے کا مجھے حکم دیا ہے اپنے اس فرمان میں ﴿وَأَصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعُشِيِّ يَرْجُونَ وَجْهَهُ﴾ [الكهف: ۲۸] ”اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ٹھہرائیے جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں، اس کی رضا و خوشنودی کو چاہتے ہیں۔“ ان کے اعمال کی تعریف کرتے ہوئے اور کفار پر رذ کرتے ہوئے جب کہ انہوں نے کہا تھا کہ ان فقراء و مساکین لوگوں کو اپنے پاس سے بھگا دو، تاکہ ہم آپ کی مجلس میں بیٹھیں اور آپ پر ایمان لے آئیں۔

اور ابن حجرؒ کا قول فملت الی ما قولوا: مردود ہے کیونکہ یہ ابن حجر کے علاوہ کسی اور کی طرف سے منقول نہیں ہے، اور نہ ہی آپ ﷺ سے وارد ہے۔ بلکہ اگر وارد ہوتا تو ہم اس کو ”انی قاربت ان الیہم“ پر محمول کریں گے۔

واصبر: کیونکہ اس سے مراد ہیبتگی ہے، جیسا کہ یہ کمال صبر ہے۔ جیسا کہ رب رحمان کے اس قول کے بارے میں کہا گیا جو کہ یہ ہے: ﴿یا ایہا النبی اتق اللہ﴾ [الاحزاب: ۱] قال: یعنی راوی فرماتے ہیں۔

فجلس: یعنی نبی علیہ السلام بیٹھ گئے۔

وسطنا: سین ساکن کے ساتھ اور کبھی سین کو فتح بھی دیا جاتا ہے، یعنی ہمارے درمیان نہ کہ ہم میں سے صرف کسی ایک کے پہلو میں بیٹھے۔

لیعدل بنفسه فینا: یعنی ہمارے درمیان بیٹھنے میں بھی انصاف کو ملحوظ خاطر رکھا یعنی ہر ایک کے قریب تھے، سب کا فاصلہ برابر تھا۔ ”جی فرماتے ہیں: تاکہ اپنے آپ کو عدل بنا لیں۔ بعض نے یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں کہ اس ان کے بیٹھنے میں تواضع ہے اور رغبت کرتے ہوئے اس میں جس پر ہم ہیں۔“

ثم قال: یعنی اشارہ فرمایا۔

بیدہ ہکذا: یعنی دائرے کی شکل میں بیٹھو۔

فتحللوا: یعنی دائرے کی شکل میں اپنے اپنے چہرے رسول اللہؐ کی طرف موڑ کر اس پر آپ کا یہ قول دلالت کرتا ہے۔

وبرزت: یعنی سامنے ہو گئے۔

وجوہہم: آپ علیہ السلام کی طرف، کہ ان میں سے ہر ایک کا چہرہ آپؐ دیکھ سکیں۔ اللہ کے اس قول کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے: ﴿ولا تعد عینک عنہم﴾ [الكهف: ۲۸] یعنی ظاہری اور باطنی۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یعنی ان کی ظاہر رنگ و روغن کو دیکھ کر مائل ہونا، یہاں تک کہ اس حلقہ میں شامل ہو جائے

اور یہ بات دلیل کی محتاج ہے باوجود اس کے کہ آپ اس سے مستغنی تھے۔

فقال ابشروا: یعنی خوش ہو جاؤ۔

یا معشر صعالبک المهاجرین: یعنی مہاجرین فقراء کی جماعت۔ صعالبک صعلوبک کی جمع ہے۔

بالنور التام: یعنی کامل و مکمل نور۔

یوم القيامة: اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ انغیاء لوگوں کا نور تام و مکمل نہیں ہوگا، اور اسی لئے آپ علیہ السلام نے فرمایا: ”من أحب آخرته أضرب بدنیاه ومن أحب دنیاہ أضرب آخرته فأثر ما یبقی علی ما یغنی“ پس باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو۔

تدخلون الجنة: جملہ استنافیہ ہے لیکن اس میں تعلیل کا معنی ہے۔

قبل اغنیاء الناس : یعنی شکر گزار لوگوں سے۔

بنصف یوم : جان لو! کہ فقراء سے مراد صبر کرنے والے صلحا ہیں، اور اغنیاء سے مراد شکر گزار صلحا لوگ ہیں جو اپنے اموال کے حقوق کو اداء کرتے ہیں، یعنی اپنے حلال مالوں سے جو اللہ نے ان کے لئے حلال قرار دیا ہے، یہ حساب کی غرض سے میدانِ محشر میں ٹھہریں گے ان سے مال کے بارے پوچھا جائے گا، کہ کہاں سے حاصل کیا اور کہاں پر خرچ کیا؟ اور یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ قیامت کو فقراء کا حصہ اغنیاء سے زیادہ ہوگا۔ کیونکہ اہل ثروت نے دنیا میں لذت و راحت بھی پائی تھی اور اس لئے ان کا مقام جنت میں اعلیٰ وارفع ہوگا، کیونکہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ”أجوعکم فی الدنیا أشبعکم فی الآخرة“۔ دنیا میں تم سے سب سے زیادہ فاقہ کاٹنے والا آخرت میں تم میں سے سب سے زیادہ سیر ہوگا۔ اور یہ حدیث اس بات پر بطور نص ہے، کہ صبر کرنے والا فقیر، شکر گزار مالدار سے افضل ہے۔

وذلك : یعنی قیامت کا آدھا دن۔ خمس مائة سنة : اللہ تعالیٰ کے اس قول: ﴿وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ [الحج: ۴۷] اور تمہارے رب کے ہاں ایک دن تمہاری گنتی کے مطابق ہزار سال کے برابر ہے۔ اور شاید کہ یہ مقدار اور اندازہ عام مؤمنین کی نسبت ہو اور بعض مؤمنوں پر اللہ اس وقت کو بالکل کم کر دے گا، جو خاص لوگ ہیں ان کے لئے ایک نماز کے وقت کے برابر یا ایک گھڑی کے برابر اور یہ بات بھی وارد ہے کہ یہ دن بعض مؤمنین پر فجر کی دو رکعتوں کے برابر ہوگا۔ اور اللہ کے اس قول ﴿واحسن مقیلاً﴾ کہ اس کے برابر یہ دن لمبا ہوگا بعض مؤمنوں پر وہ تقریباً فجر سے زوال تک ہوگا، اور یہ آخرت کے ایک ہزار سال لے لے دن کا آدھا دن ہوگا۔ اللہ عزوجل کے اس قول سے مراد ”کہ تیرے رب کے ہاں ایک دن تمہاری گنتی کے مطابق ہزار سال کا ہے۔“ اور رب باری تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ [المعارج: ۴] کہ اس دن کا اندازہ پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ تو یہ کافروں کے لئے مخصوص ہے، اور یہ دن کافروں پر آسان نہیں بلکہ بہت بھاری اور گراں گزرے گا۔

۲۱۹۹: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ زَيْنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ.

(رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ و الدارمی)

احرجہ ابو داؤد فی السنن ۱۵۵۱۲۔ حدیث رقم ۱۴۶۸۔ والنسائی ۱۷۹/۲ حدیث رقم ۱۰۱۵۔ وابن ماجہ ۴۲۶/۱۔

حدیث رقم ۱۳۴۲۔ و الدارمی ۵۶۵ حدیث رقم ۳۵۰۰۔ واحمد فی المسند ۲۸۵/۴۔

ترجمہ: ”حضرت براء ابن عازبؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن کریم کو اپنی آوازوں سے مزین کرو (یعنی زینت بخشو)۔“ (احمد ابو داؤد ابن ماجہ دارمی)

تشریح: وعن البراء ابن عازب قال قال رسول الله ﷺ زینوا القرآن : یعنی اس کی قراءت کو۔

باصواتکم : یعنی اچھی آوازوں کے ساتھ، یا قرآن کی زینت و خوبصورتی کو اپنی آواز کے اچھا کرنے کے ساتھ واضح کرو۔ قاضی فرماتے ہیں: اس کے قلب کے بارے میں بھی ایک قول ہے اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ حضرت براء بن عازب سے اس کے برعکس روایت بھی مروی ہے، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تزئین سے مراد ترتیل، تجوید اور آواز کا نرم رکھنا اور اس کی تزئین ہے اور ”تغنی“ جو حاصل ہوتی ہے حروف میں زیادتی یا کمی ہو یہ حرام ہے، پڑھنے والا بھی گنہگار ہوگا اور سننے والا بھی موجب سزا ہوگا۔ اور اس کا انکار واجب ہے کیونکہ یہ بدترین بدعت اور انتہائی فحش بدعت ہے۔

اور نسائی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور ابن حبان اور حاکم نے بھی، اور حاکم نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے:

”فان الصوت الحسن يزيد القرآن حسناً“ کہ اچھی آواز قرآن کے حسن کو دو بالا کر دیتی ہے۔

اور طبرانی نے روایت کیا ہے کہ ”حسن الصوت زینۃ القرآن“ کہ آواز کا خوبصورت ہونا قرآن کی زینت ہے۔

اور عبدالرزاق نے روایت کیا ہے: ”لکل شی حلیۃ وحلیۃ القرآن الصوت الحسن“

کہ ہر چیز کا گہنا (زیور) ہوتا ہے اور قرآن کا زیور اچھی آواز ہے۔

یعنی جس طرح زیورات وغیرہ حسینہ کے حسن کو بڑھا دیتے ہیں، اسی طرح اچھی آواز سے قرآن کا حسن دو بالا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات تجربہ شدہ ہے۔ پس یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے برعکس جو روایت ہے اس کو قلب پر محمول کیا جائے گا نہ کہ اس کے برعکس پر، پس غور و فکر کرو اور دونوں کو جمع بھی کر سکتے ہیں۔

اور بالتحقیق ہمارے سردار اور ہمارے پیشوا مولانا القطب الربانی غوث صدیقی، الشیخ عبدالقادر جیلانی روح اللہ روحہ و درز قاف توح اپنی کتاب غنیۃ الطالبین جو کہ سالکین کے بارے میں ہے، میں رقمطراز ہیں کہ وہ روایت کرتے ہیں عبداللہ بن مسعود سے کہ وہ ایک دن کوفہ کے مضافات میں سے ایک جگہ سے گزرے اچانک کیا دیکھتے کہ کچھ بدکار نافرمان قسم کے لوگ ان میں سے ایک آدمی کے گھر میں جمع تھے اور شراب پی رہے تھے اور ان کے ساتھ ایک گلوکار تھا، جس کو ”زازان“ کہا جاتا تھا وہ سارنگی بجا رہا تھا اور خوبصورت آواز میں گارہا تھا۔ جب عبداللہ بن مسعود نے اس کی آواز سنی تو کہا کہ اس کی آواز کتنی پیاری ہے اگر یہ اس پیاری آواز کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتا تو کتنا اچھا ہوتا؟ اور انہوں نے اپنی چادر اپنے سر پر ڈالی اور چل پڑے۔

ادھر زازان نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا عبداللہ بن مسعود صحابی رسول تھے، کہنے لگا، کیا کہہ رہے تھے؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ اس نوجوان کی آواز کتنی سریلی اور پیاری ہے اگر یہ اس آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا، تو کتنا بہتر تھا؟ اس کے دل میں خوف خدا طاری ہوا اور وہ اٹھا سارنگی کو زمین پر پٹخ دیا، وہ ٹوٹ گئی پھر چلا اور عبداللہ بن مسعود کو پالیا، اس نے چادر کو اپنی گردن میں ڈال دیا اور عبداللہ بن مسعود کے سامنے زار و قطار رونے لگا۔ عبداللہ بن مسعود نے اسے گردن سے اتار دیا اور وہ دونوں رونا شروع ہو گئے۔ پھر عبداللہ بن مسعود کہنے لگے، میں اس آدمی سے کیوں نہ محبت کروں جس سے اللہ محبت کرتا ہے، اس کے سارنگی وغیرہ بجانے سے تو یہ کر لی اور عبداللہ بن مسعود کا ہم سفر ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس نے قرآن سیکھا اور علم کا ایک بڑا حصہ سیکھا، بڑی مقدار میں علم حاصل کیا۔ حتیٰ کہ وہ علم میں امام بن گیا۔

اور صحیح روایت موجود ہے کہ آپ ﷺ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو فرمایا: ”لقد اوتیت مزاراً من مزامیر آل داؤد۔“

اور آپ علیہ السلام نے فرمایا: ”لقد رأیتنی وأنا أستمع لقراء تک البارحة“۔ میں نے تمہیں خواب میں دیکھا کہ میں گذشتہ رات تمہاری تلاوت سن رہا تھا۔“

اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے: ”لله اشد اذناً“ یعنی اقبال الی ارجل الحسن الصوت بالقراءة من اصحاب القینۃ

الی قینتہم“۔

اور طبرانی نے روایت کیا ہے: ”أحسن الناس قراءة من قرأ القرآن يتحزن فيه“۔ قراءت کے لحاظ سے لوگوں میں سے

سب سے بہترین وہ ہے جو قرآن کو پڑھتا ہے اور اس میں اس کو حزن بھی لاحق ہوتا ہے۔“

اور ابو یعلیٰ نے روایت نقل کی ہے: ”أقرؤوا القرآن بالحزن فانه نزل بالحزن“۔ ”کہ قرآن کو حزن کے ساتھ پڑھو کیونکہ یہ حزن کے ساتھ نازل ہوا ہے۔“

اور وہ حاکم کی اس حدیث کی نفی نہیں کرتی جس میں آپ علیہ السلام نے فرمایا: ”نزل القرآن بالشفخیم“۔ ”کہ قرآن تعفیم کے

ساتھ نازل ہوا ہے۔ کیونکہ تفسیر بمعنی تعظیم ہے، اور رہا ابن حجر کا قول ”کہ تفسیر کا معنی یہ ہے کہ اس کو مردوں کے لہجے میں پڑھو اور اپنی آواز کو لپک دار نہ بناؤ، کہ وہ عورتوں کی آواز کے مشابہ ہو جائے، تو یہ حدیث کی مراد سے بہت سے بعید ہے۔ واللہ اعلم

۲۲۰۰: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ أَمْرٍ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ ثُمَّ يَنْسَاهُ إِلَّا لَقِيَ اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَجْذَمًا. (رواه ابو داود و الدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۱۵۸/۲ حدیث رقم ۱۴۷۴۔ ز الدارمی ۵۲۹/۲ حدیث رقم ۳۳۴۰۔ واحمد فی المسند ۲۸۴/۵۔

ترجمہ: ”حضرت سعد بن عبادہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا جو شخص قرآن پڑھنا ہو پھر

اسکو بھول جائے تو وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کریگا کہ اسے کوڑھ لاحق ہوگا۔“ (ابو داؤد دارمی)

تشریح: عن سعد بن عبادۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ ما من امریء یقرأ القرآن ثم ینساہ: یعنی ہمارے نزدیک ناظرہ پڑھنا بھی بھول جائے یا بھلا دے اور امام شافعیؒ کے نزدیک زبانی یاد کرنے کے بعد اپنے حفظ سے بھول جائے یا اس کا معنی یہ ہے کہ پھر اس یعنی قرآن کی قراءت کو چھوڑ دے چاہے بھول جائے یا نہ بھولے۔

الا لقی اللہ یوم القیامۃ اجذم: یعنی گرے ہوئے دانتوں کے ساتھ یا کوڑھی کی حالت پر یا اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا، یا اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جس کو وہ بھولنے کے عذر میں پکڑے، یا اس کا سر بارگاہ خداوندی میں جھکا ہوا ہوگا شرم و ندامت کی وجہ سے جو اس نے اس کے پاک کلام کو اور اس کی عظیم کتاب کو بھلا دیا۔

طیبی فرماتے ہیں کہ کوڑھ کی وجہ سے اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا۔ اور وہ کٹنا ہی تو ہے۔

اور یہ قول یہ ہے کہ وہ ”مقطوع الاعضاء ہوگا۔“ کہا جاتا ہے رجل اجذم، اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کے اعضاء کوڑھ کی وجہ سے کٹ جائیں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ وہ ایسا ہوگا جس کے پاس نہ دلیل ہو اور نہ زور بیان، یعنی اس کے پاس نہ کوئی دلیل ہوگی اور نہ بولنے والی زبان کہ جس کے ذریعے وہ اپنی صفائی پیش کر سکے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بھلائی سے اس کا ہاتھ خالی ہوگا اور ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

”مجھ پر میری امت کے اجر پیش کئے گئے حتیٰ کہ ایک تنکا بھی جس کو کوئی آدمی مسجد سے نکالتا ہے اس پر بھی اجر ملتا ہے اور تنکے پر میری امت کے گناہ پیش کئے گئے میں نے اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ قرآن کی کوئی سورت یا آیت کسی آدمی کو دی گئی، پھر اس نے اس کو بھلا دیا ہو۔“

۲۲۰۱: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَمْ يَفْقَهُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي أَقَلِّ مِنْ ثَلَاثٍ.

(رواه الترمذی و ابو داؤد و الدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۱۱۶/۲ حدیث رقم ۱۳۹۴۔ و الترمذی ۱۸۲/۵ حدیث رقم ۳۳۴۹۔ واحمد فی المسند ۲۸۴/۵۔

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ ابن عمروؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے تین

رات سے کم مدت میں قرآن پڑھا اس نے قرآن کو اچھی طرح نہیں سمجھا (یعنی قرآن فہمی سے محروم رہا)۔“

(ترمذی ابو داؤد دارمی)

تشریح: وعن عبد الله بن عمرو: واؤ کے ساتھ عمرو۔

ان رسول اللہ ﷺ قال: لم يفقه: یعنی اس نے قرآن کو مکمل طور پر سمجھا نہیں۔ ومن قرأ القرآن: یعنی اس کو ختم کیا۔ فی اقل من ثلاث: یعنی راتیں۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یعنی دنوں میں بھی۔ اور اس میں تفصیل ہے، کیونکہ جب اس طرح ہو گا تو اس کے لئے قرآن میں تدبر و تفکر ممکن نہیں ہو سکتا جلدی اور تیزی کی وجہ سے۔ طبیٰ فرماتے ہیں: یعنی قرآن کے ظاہری معانی نہیں سمجھا رہے قرآن کے دقائق (باریک معانی) بلکہ قرآن کا ایک کلمہ بھی تو نفی الفہم سے ثواب کی نفی مراد نہیں ہے پھر لوگوں اور ذہنوں کے مطابق فہم کا تفاوت ہے۔

اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: رہا اس کی تلاوت کا ثواب تو وہ اسی کو ہو گا جو سمجھے گا/ یعنی سمجھ کر پڑھے گا، اور جو بالکل سمجھ نہ سکتا ہو، اس کے الفاظ کو عبادت کے طور پر پڑھے اسکے علاوہ اذکار سے، تو اس کو اس پر ثواب نہ حاصل ہوگا، مگر اسی کو ثواب ہوگا جو سمجھے، اگرچہ مقصد کچھ بھی ہو اور ابن حجرؒ کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ ثواب کی نفی کیلئے کسی دلیل کی ضرورت ہے، کتاب اللہ سے یا کسی حدیث سے دلیل ضروری ہے۔

اور قیاس یہی کہتا ہے کہ ان کے درمیان اصل ثواب میں کوئی فرق نہیں، اگرچہ قرآن اور اس کے علاوہ کے درمیان تفاوت ہو اور جو سمجھے اور جو نہ سمجھے ان میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اور اسی پر صلحاء کا عمل ہے کہ انہوں نے اذکار اور ادعیہ ماثورہ وغیرہ کو ورد بنایا ہوا تھا۔ اور وہ اس پر پیشگی کرتے رہے اور جو چیز مسلمانوں کے ہاں اچھی ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فضل وسیع ہے۔

پھر حدیث کے ظاہر پر اسلاف کی جماعت کا عمل رہا ہے۔ وہ ہمیشہ تین دنوں میں قرآن ختم کرتے رہے اور تین دنوں سے کم میں قرآن ختم کرنے کو ناپسند سمجھتے تھے۔ اور دوسرے لوگوں نے اس سے دلیل لی ہے، یہ دیکھتے ہوئے کہ اصحابین کے نزدیک صحیح ترین قول کے مطابق عدد کا مفہوم حجت نہیں ہے۔ ایک جماعت قرآن کو ایک دن رات میں ایک مرتبہ ختم کرتی رہی اور کچھ دوسرے ایک دن رات میں دو مرتبہ اور کچھ دوسرے تین مرتبہ تک بھی ختم کرتے رہے۔

اور بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ایک رکعت میں قرآن ختم کیا ہے اور کچھ نے ایک رکعت میں تین تین مرتبہ بھی ختم کیا ہے۔ اور ایک جماعت اس کو ہر دو ماہ میں ایک مرتبہ ختم کرتی رہی اور کچھ دوسرے ہر ماہ میں قرآن ختم کرتے رہے اور کئی دس دن میں ایک ختم قرآن کرتے اور کچھ ہر ہفتہ میں اور اس پر اکثر صحابہ اور ان کے علاوہ تابعین وغیرہ کا عمل بھی رہا ہے۔ اور شیخین نے روایت نقل کی ہے: ”اقراء فی سبع ولا تزدد علی ذالک“۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن عمروؓ سے کہا کہ سات دن میں ختم قرآن کرو، اور اس سے زیادہ میں نہ کرو۔“

اور اس کا نام ”ختم الاحزاب“ اور اس کی ترتیب ہی سب سے درست اور صحیح ہے، بلکہ ایک اثر یہ بھی منقول ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہے: ”فمعی بشوق“ انہوں نے فاء کے ساتھ سورۃ الفاتحہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور اس کو مجموعہ کے ساتھ کھولا گیا ہے، اور میم سے سورۃ المائدہ ”می“ سے سورۃ یونس باء سے بنی اسرائیل پھر شین سے شعراء پھر واؤ سے والصفۃ اور پھر ”ق“ سے ”سورۃ“ ”ق“ تا آخر القرآن۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: پسندیدہ قول یہ ہے کہ یہ مختلف اشخاص کے ساتھ مختلف ہے۔ جس کے لئے باریک بینی اور معارف ظاہر ہوں تو وہ اس پر اقتصار کرے جتنے پر اسے کمال فہم کا اندازہ ہو۔ اور جو علم کی اشاعت میں یا لوگوں کے معاملات، بھگڑے وغیرہ کے فیصلوں میں مشغول ہو وہ بھی اسی قدر پڑھے، جس سے اس کا کام چلتا رہے۔ اور جس کو اس طرح کی مصروفیات نہ ہوں وہ ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ پڑھے، تجوید کی حد کے اندر رہتے ہوئے۔ یا قراءت کے ساتھ اور وہ جلدی سے پڑھنا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: السید جلیل ابن کاتب صوفی چار قرآن دن میں اور چار قرآن رات میں ختم کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں: کہ اس کو زبان کی طمی اور زمانے کی کشادگی پر محمول کرنا ہے۔

اور الشیخ موسیٰ الدرانی سے جو کہ شیخ ابی مدین المغربی کے اصحاب میں سے ہیں، روایت کیا گیا ہے: کہ وہ دن رات میں ستر ہزار مرتبہ قرآن ختم کرتے تھے اور انہی سے نقل کیا گیا کہ انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دینے کے بعد شروع کیا اور دروازے کے برابر آنے تک اختتام کر لیا جسے بعض تلامذہ نے حرف بحرف سنا۔ اور یہ وضاحت کتاب ”نفحات الأنس فی حضرات القدس“ میں بڑی تفصیل سے مذکور ہے۔

قرآن پاک کو اونچی اور آہستہ آواز سے پڑھنے کی بہترین مثال

۲۲۰۲: وَعَنْ عَقَبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْجَاهِرُ بِالْقُرْآنِ كَالْجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ وَالْمُسِرُّ بِالْقُرْآنِ

كَالْمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ - (رواه الترمذی و ابوداؤد و النسائی و قال الترمذی هذا حدیث حسن غریب)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۳۱۲ حدیث رقم ۱۳۲۳ - و الترمذی فی السنن ۱۶۵۱۵ حدیث رقم ۲۹۱۹ - و النسائی ۸۰۱۵ حدیث رقم ۲۵۶۱ - و احمد فی المسند ۱۵۱/۴ -

ترجمہ: ”حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بلند آواز سے قرآن پڑھنے والا شخص ظاہری صدقہ دینے والے کی طرح ہے (یعنی علانیہ صدقہ کرنے کی طرح ہے) آہستہ قرآن پڑھنے والا شخص چھپا کر صدقہ دینے والے کی طرح ہے“ (ترمذی، ابوداؤد نسائی) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔“

تشریح: وعن عقبہ بن عامر قال: قال رسول الله ﷺ: الجاهر: یعنی اونچی آواز سے پڑھنے والا۔

والمسر: یعنی آہستہ آواز میں پڑھنے والا۔

بالقرآن كالمسر بالصدقة: طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ قرآن کی باواز بلند تلاوت کی فضیلت کے آثار بھی موجود ہیں، اور قرآن کو آہستہ آواز میں پڑھنے کی فضیلت کی احادیث بھی آئیں ہیں، اور ان احادیث کے درمیان جمع و تطبیق کی صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ جو ریاکاری سے ڈرے اس کے لئے سری آہستہ آواز میں تلاوت کرنا افضل ہے اور جس کو ریاکاری کا خوف نہیں اس کا اونچا پڑھنا افضل ہے، بشرطیکہ اس کے اونچی آواز میں پڑھنے سے کسی کو تکلیف نہ ہو چاہے نمازی ہو یا سونے والا یا کوئی دوسرا بیمار یا کام وغیرہ میں مشغول شخص تنگ نہ ہو۔

اور یہ اس لئے ہے کہ جبراً عمل کرنے سے عمل کرنے والے کے علاوہ دیگر کو بھی نفع پہنچتا ہے یعنی سننے سے یا سیکھنے سے یا ذوق حاصل کرنے کی صورت میں ہے، یا وہ دین کے شعار میں ہے، اور اسلئے بھی کہ پڑھنے والے کا دل بیدار رہتا ہے، اور سکی توجہ متوجع ہوتی ہے اور اس سے نیند بھاگ جاتی ہے اور عبادت میں چستی آ جاتی ہے۔ پس جب ان نیتوں میں سے کوئی نیت کر کے پڑھے تو اونچا پڑھنا افضل ہے۔

۲۲۰۳: وَعَنْ صَهْبِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهُ.

(رواه الترمذی و قال هذا حدیث لیس اسنادہ بالقوی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۵۱۵ حدیث رقم ۲۹۱۸ -

ترجمہ: ”صہیبؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں لایا جو اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال جانے“ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد قوی نہیں ہے۔“

تشریح: وعن صہیب : تصغیر کے ساتھ۔

قال رسول اللہ ﷺ ما آمن بالقرآن : یعنی اس کی حکم یا حقیقت میں۔

من استحل محارمہ : محرم کی جمع ہے بمعنی حرام جو کہ محرم ہے حرام ہے اور محارمہ میں ”ہ“ ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، اور مرد اس جنس سے فرد ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: جو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال قرار دے، تو اس نے مطلق طور پر کفر کا ارتکاب کیا۔ لیکن قرآن کو اس کی بزرگی اور عظمت کی وجہ سے خاص فرمایا۔

میں کہتا ہوں: یا اس کے قطعی ہونے کی وجہ سے۔ یا اس لئے کہ اس کے علاوہ دوسرا دلیل کے لحاظ سے بھی پہچانا جاتا ہے۔

۲۲۰۳: وَعَنِ اللَّيْثِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ أَبِي مُلَيْكَةَ عَنْ يَعْلَى بْنِ مَمْلُوكٍ أَنَّهُ سَأَلَ أُمَّ سَلَمَةَ عَنْ قِرَاءَةِ النَّبِيِّ

ﷺ فَإِذَا هِيَ تَنْتَعُ قِرَاءَةً مَفْسَرَةً حَرْفًا. (رواه الترمذی و ابوداؤد النسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۵۴۱۲ حدیث رقم ۱۴۶۶۔ و الترمذی ۱۶۷/۵ حدیث رقم ۲۹۲۳۔ و النسائی ۱۸۱۱۳ حدیث رقم ۱۰۳۲۔

ترجمہ: ”حضرت لیث بن سعد حضرت ابن ابی ملیکہ سے نقل کرتے ہیں وہ حضرت یعلیٰ ابن مملک کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ سے نبی کریم ﷺ کی قراءت کے بارے میں پوچھا کہ آپ ﷺ قرآن کس طرح پڑھتے تھے؟ حضرت ام سلمہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ قراءت واضح اور جدا جدا حروف کے ساتھ تھی۔“

تشریح: وعن الليث بن سعد عن ابی ملیکہ : ملیکہ تصغیر کے ساتھ ہے۔

عن یعلیٰ بن مملک : پہلی یم اور لام کے فتح کے ساتھ۔

انه سأل ام سلمة عن قراءة النبي ﷺ فاذا هي : یعنی ام سلمہ۔

تنتع : یعنی صفت بیان کرنے لگیں۔

قراءة مفسره : یعنی واضح کر کے۔

حرفا حرفا : یعنی اس طرح پڑھتے تھے کہ جو پڑھتے تھے اس کے حروف کی تعداد کو گننا ممکن تھا یا اس سے مراد حسن الترتیل اور

تجوید کے ساتھ قرآن پڑھنا ہو سکتا ہے۔

طیبی فرماتے ہیں: یہاں دو دو جمیں ہو سکتی ہیں: پہلی یہ کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ علیہ السلام کی قراءت اس طرح تھی۔

دوسری یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ترتیل کے ساتھ پڑھنے لگیں جس طرح رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے ان کی قراءت کی طرح۔

ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں ایک سورت ترتیل تجوید کا لحاظ کرتے ہوئے پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے، اس سے کہ میں سارا

قرآن بغیر ترتیل کے پڑھوں۔

اور ابو یعلیٰ نے روایت کی ہے: ”کہ میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو دقل کی نشر کی طرح قرآن کی تلاوت کریں گے۔

علامہ جزری نشر میں فرماتے ہیں اور ہمارے بعض ائمہ نے کتنی ہی اچھی بات کی فرماتے ہیں: کہ ترتیل کے ساتھ قراءت کا ثواب عظیم و

جلیل ہے اور عدد کے لحاظ سے بھی ثواب کثرت میں ہے، اھ۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کیفیت کا اعتبار کثرت کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہے کہ ایک جو ہر ہزاروں درہموں اور دیناروں

کے برابر ہوتا ہے۔

۲۴۰۵: وَعَنْ ابْنِ جُرَيْجٍ عَنِ ابْنِ أَبِي مُلَيْكَةَ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقْطَعُ قِرَاءَتَهُ يَقُولُ
الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ثُمَّ يَقِفُ ثُمَّ يَقُولُ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ثُمَّ يَقِفُ. رواه الترمذی وقال ليس اسناده بمتصل لا
ن اللیث روى هذا الحديث عن ابن ابی ملیکہ عن یعلی بن مملک عن ام سلمة وحديث اللیث اصح۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۹۴/۴ حدیث رقم ۴۰۰۱۔ والترمذی ۱۷۰/۵ حدیث رقم ۲۹۲۷۔ واحمد فی المسند ۳۰۲/۶۔
ترجمہ: ”ابن جریر حضرت ابن ملیکہ سے اور وہ حضرت ام سلمہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قراءت
علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی یعنی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے تھے الحمد للہ رب العالمین پڑھتے اور پھر وقف فرماتے پھر الرحمن
الرحیم پڑھتے اور وقف فرماتے امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ اس
سلسلہ کی سند یہ ہے حضرت ابن ملیکہ نے نقل کیا حضرت یعلیٰ ابن مملک سے اور انہوں نے نقل کیا حضرت ام سلمہ سے
اور حضرت لیث کی حدیث زیادہ صحیح ہے۔“

تشریح: وعن ابن جریج : دونوں جیم ہیں، اور مضمر ہے۔

عن ابن ابی ملیکہ عن ام سلمة قالت كان رسول الله ﷺ يقطع قراءته : باب تفعليل تقطع سے ہے، یعنی ہر آیت پر
وقف کرتے۔

يقول : يقطع كإعلان ہے۔ یہ بات طیبی نے کہی ہے، اور وہ یقطع سے بدل یا حال یا جملہ اسنا فیہ بھی ہو سکتا ہے۔

الحمد لله رب العالمين [الفاتحة: ۱-۲] ثم يقول الرحمن الرحيم [الفاتحة: ۱-۲] ثم يقف۔

کہا جاتا ہے کہ یہ روایت درست نہیں ہے، بلکہ یہ ایک لہجہ ہے جس کو اہل بلاغہ پسند نہیں کرتے اور وقف تام مالک یوم الدین پر
ہوتا ہے۔ اور اسی لئے اس پر استدراک کیا ہے اور لیث بن سعد والی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ طیبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔
اور اس میں یہ بھی ہے کہ وقف مستحسن تین قسموں پر مشتمل ہے۔ حسن، کافی اور تام۔ قرآء عظام کے نزدیک ہر قسم پر وقف جائز ہے،
اور علامہ جزیری نے بھی یہ کہتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

وهي لتمام فان لم يوجد تعل او كان معنى فابعد، فالتمام فالكافي ولفظا فامعن الا رؤوس الآي جوز فالحسن.

اور یہ جب مکمل ہو پس اگر کوئی تعلق نہ پایا جائے یا کوئی معنی تو ابتدا سے پڑھ۔ پس وقف تام اور کافی اور لفظی طور پر۔“

اور اس کی تشریح لمبی ہو جائے گی پھر ارباب وقوف نے آیت وقف کرنے کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے، جب کہ وہاں کوئی لفظی
تعلق موجود ہو، جس طرح کہ جس بحث میں ہم ہیں۔ اور اسی حدیث سے استدلال کیا ہے اور اسی پر امام شافعی کا عمل بھی ہے اور جمہور نے
اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ علیہ السلام کا وقف کرنا اس لئے تھا کہ سامعین کے لئے آیات کے آغاز اور اختتام واضح ہو جائیں اور جمہور
اس کے قائل ہیں کہ وصل اس میں زیادہ بہتر ہے اور علامہ جزیری اس پر وقف کو مستحب قرار دیتے ہیں انفصال کے ساتھ ساتھ۔

اور طیبی نے حیرت انگیز بات ہی کہی کیونکہ انہوں نے کہا کہ لیث والی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ جب کہ بحث میں اس کا کوئی دخل نہیں،
کہ حدیث کے بعض طرق بعض سے زیادہ صحیح ہوتے ہیں، باوجود اس کے کہ حدیث متصل ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح ہو، اس کے ساتھ
متصل صحیح سند والی حدیث اس حکم کو قوی کر دیتی ہے جو متصل سند والی سے مستفاد ہو۔ مضاف کے قول میں تدبر کریں۔

کیونکہ ابن ابی ملیکہ نے ام سلمہ کو نہیں دیکھا تو واسطہ کے چھوڑنے کی وجہ سے حدیث منقطع ہوگی۔

لان اللیث روی هذا الحدیث عن ابن ابی ملیکہ، عن یعلی بن مملک، عن ام سلمة. وحديث اللیث : یعنی اس کی سند میں کیونکہ ابن مملک کے ذکر کرنے سے متصل ہو جاتی ہے۔

اصح : یعنی ابن جریر والی حدیث سے زیادہ صحیح ہے، جو کہ عن ابن ابی ملیکہ عن ام سلمہ ہے، اس کے منقطع ہونے کی وجہ سے۔

مؤلف علیہ الرحمۃ تابعین کی فصل میں رقمطراز ہیں کہ یہ لیث بن سعد ہیں، اہل مصر کے فقیہ ہیں، انہوں نے ابن ابی ملیکہ عطاء، زہری سے روایت کیا ہے، یعنی یہ ان کے اساتذہ ہیں اور ان سے بہت زیادہ لوگوں نے روایت کیا ہے ان کے تلامذہ میں سے ابن مبارک ہیں، جو بغداد شریف لائے، منصور نے انہیں مصر کا ولی بننے کی فرمائش کی، جس سے انہوں نے انکار کر دیا اور استعفی دے دیا۔
تقیہ بن سعید کہتے ہیں کہ لیث بن سعد ہر سال بیس ہزار (۲۰۰۰۰) دینار کا غلہ حاصل کرتے لیکن ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی، کیونکہ وہ اس پر سال گزرنے ہی نہ دیتے بلکہ پہلے ہی تقسیم فرمادیتے۔

اور یعلیٰ بن مملک تابعی ہیں، یہ ام سلمہ سے روایت کرتے ہیں، اور یعلیٰ سے ابن ابی ملیکہ روایت کرتے ہیں اور جب انہوں نے کہا کہ حدیث اللیثی اصح، یعنی پہلی روایت مراد ہے۔ اور ام سلمہ والی روایت دوسری حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ دوسری حدیث نہ سند کے اعتبار سے درست اور نہ ہی لہجہ کے مطابق، کیونکہ یہاں موصوف اور صفت کے درمیان فاصلہ ہے، اہ۔

اور یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ اس وقف کا نام حسن رکھا جاتا ہے۔ ناپسندیدہ لہجہ کے ساتھ یہ قبیح ہوگا، پھر یہ کہ یہاں پر دو روایتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی روایت ہے لیکن اس کی سندیں دو ہیں۔ ایک سند منقطع ہے اور دوسری متصل۔ اور دوسری روایت زیادہ صحیح ہے۔ اور اصح صحیح کے مقابلہ میں ہے کہ ضعیف حدیث پر فضائل اعمال میں عمل کیا جاسکتا ہے۔ ان کا قول: لیست بسدیدۃ سے مراد یہ ہے کہ لیس بسدید علی الصواب۔

اور ”ذہول“ محدثین اور قرآء کی اصطلاح میں انہوں نے غلط جواب کے بارے میں ہے اور بصیرت سے خالی ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کی مراد پہلی روایت سے پہلی حدیث ہے چونکہ ہم اس کا رد کرتے ہیں۔ اس کا کہنا کہ پہلی حدیث سے احتراز کرتے ہوئے اس حدیث کو روایت کیا گیا ہے۔ پس آپ غور کریں۔

الفصل الثالث:

قرب قیامت میں لوگ دنیاوی مقاصد کے لیے قرآن پڑھیں گے

۲۴۰۶: عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَفِينَا الْأَعْرَابِيُّ وَالْأَعْجَمِيُّ فَقَالَ اِقْرَؤْا فِكُلُّ حَسَنٍ وَسَيِّئِي أَقْوَامٌ يُقِيمُونَهُ كَمَا يَقَامُ الْقَدْحُ يَتَعَجَّلُونَهُ وَلَا يَتَأَجَّلُونَهُ۔

(رواہ ابو داؤد والبیہقی فی شعب الایمان)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۵۲۰/۱ حدیث رقم ۸۳۰۔ واحمد فی المسند ۱۵۵/۳۔ والبیہقی فی شعب الایمان ۵۳۸/۲

حدیث رقم ۲۶۴۲۔

ترجمہ: ”حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ ہم قرآن پڑھ رہے تھے ہم میں دیہاتی لوگ اور عجمی بھی تھے آپ ﷺ نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ ”پڑھو! تم پڑھو! درست ہے عنقریب ایک ایسی

جماعت پیدا ہونے والی ہے جس کے افراد قرآن کریم کو اس طرح سیدھا کریں گے جس طرح تیر سیدھا کیا جاتا ہے اور اس کا بدلہ جلدی ہی حاصل کرنا چاہیں گے آخرت کے لئے کچھ نہیں چھوڑیں گے۔‘ (ابوداؤد بیہقی)

تشریح: عن جابر قال: خرج علينا رسول الله ﷺ ونحن نقرأ القرآن، وفينا: يعني پڑھنے والوں کے گروہ میں۔ الاعرابی: یعنی دیہاتی۔

والعجمی: اور ایک دوسرے نسخہ میں والاعجمی کا لفظ ہے۔ عربی کے علاوہ فارسی ہو یا رومی یا حبشی جیسا کہ سلمان فارسی، صہیب رومی اور بلال حبشی رضی اللہ عنہم۔ طیبی اس قول کے قائل ہیں۔ طیبی فرماتے ہیں: تو کہہ فینا..... اس میں دو احتمال ہیں، پہلا یہ کہ تمام صحابہ ان دو قسموں میں منحصر تھے۔ دوسرا یہ کہ ہم میں عرب اصحاب النبیؐ کا گروہ ہیں، یا ہم میں وہ دو جماعتیں ہیں۔ اور یہ وجہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ نبی علیہ السلام نے عربی اور اعرابی کے درمیان فرق کیا ہے، اس کی مثال آپ علیہ السلام کے خطبہ میں موجود ہے۔ مہاجر ہے اعرابی نہیں ہے۔ آپ علیہ السلام نے مہاجر کو اعرابی کی ضد بنایا۔ اور اعراب سے مراد عرب کے دیہاتوں کے باشندے ہیں۔ جو شہروں میں نہیں رہتے۔ اور نہ ہی شہروں میں بغیر کسی حاجت کے داخل ہوتے ہیں، اور ”عرب“ لوگوں میں سے اس زمانے کے مشہور لوگوں کے نام ہے اور نہ ہی اس کا واحد ہے۔ برابر ہے کہ وہ دیہات میں رہنے والا ہو یا شہر کا۔

اور اس کا ما حاصل یہ ہے کہ ”عرب“ ”اعراب“ سے زیادہ عام ہیں اور اسی سے باری تعالیٰ کا قول: ﴿وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمْ الدُّوَابُّ﴾ [التوبة: ۹۸] فقال اقروا: یعنی تم سب۔

فکل حسن: یعنی تم میں سے ہر ایک کی قراءت اچھی ہے ثواب کی امید کی جاسکتی ہے جب تم آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور تم پر ضروری نہیں کہ تم اپنی زبانوں کو تیروں کی سیدھا کرو، قدح ایسے تیر کو کہا جاتا ہے۔

سیحی اقوام یقیمونہ: یعنی قرآن کے الفاظ اور کلمات کو درستگی کے ساتھ اداء کریں گے، اور مخارج اور صفات کا خیال رکھنے میں بہت تکلف کریں گے۔

كما يقام القدح: یعنی قرآن کی قراءت میں بہت مبالغہ کریں گے ریا کاری، شہرت اور باہم فخر کی وجہ سے۔ طیبی فرماتے ہیں: حدیث میں حرج کے دور کرنے اور آسانی کی طرف حکم دینے کی بنا پر ظاہر ہے۔

اور ثواب کی امید و ارادہ عمل میں اخلاص کی کوشش کرنا، اور قرآن کے معانی میں تفکر کرنا اور اس کے احکام کی حقیقت تک پہنچنا، اور ہا ابن حجر کا قول ”ومع ذلك هم مذمومون لانهم راعوا هذا الامر السهل“۔ باوجود اس کے وہ مذموم ہوں گے کیونکہ انہوں نے اس آسان کام میں بہت زیادہ تکلف شروع کر دیا اور اس قباحت میں بڑھ گئے کہ انہوں نے اسی غفلت کو اپنا لیا، کہ وہ قرآن کو دنیا کے چند ٹکوں کی خاطر پڑھتے ہیں۔ تو یہ قابل تعریف بات نہیں ہے، جب کہ آسان کام کا خیال رکھنے میں ان کا مبالغہ آرائی کرنا یہ مذموم نہیں ہے بلکہ خدمت اس چیز کی ہے کہ انہوں نے اہم کام کو چھوڑ دیا یعنی غور و فکر کو چھوڑ دیا اور ظاہری الفاظ کے مخارج و صفات کے تکلف میں پڑ گئے۔

يتعجلونہ: یعنی اس کا ثواب دنیا میں ہی چاہتے ہیں۔

ولا يتأجلونہ: آخرت میں اجر و ثواب کی طلب نہیں رکھتے بلکہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، اور توکل نہیں کرتے۔

عرب کے لہجوں میں قرآن پاک کی تلاوت کرنا پسندیدہ ہے

۲۲۰۷: وَعَنْ حُدَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اِقْرُوا الْقُرْآنَ بِلُحُونِ الْعَرَبِ وَأَصْوَاتِهَا وَإِيَّاكُمْ

وَلُحُونَ أَهْلِ الْعِشْقِ وَلُحُونَ أَهْلِ الْكِتَابَيْنِ وَسَيَجِيءُ بَعْدِي قَوْمٌ يَرْجِعُونَ بِالْقُرْآنِ تَرْجِيعَ الْغِنَاءِ وَالنُّوحِ لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ مَفْتُونَةٌ قَلُوبُهُمْ وَقُلُوبُ الَّذِينَ يُعْجِبُهُمْ شَأْنُهُمْ۔

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۵۴۵۰/۲ حديث رقم ۲۶۴۹۔

ترجمہ: ”حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم قرآن کریم اہل عرب کی طرح یعنی عربی لہجے میں اور ان کی آوازوں کے مطابق پڑھو اہل عشق اور اہل کتاب کے لہجوں سے بچو میرے بعد ایک جماعت پیدا ہوگی جس کے افراد راگ اور نوحہ کی طرح آواز بنا کر قرآن پڑھیں گے ان کا حال یہ ہوگا کہ قرآن ان کے حلق سے آگے نہیں اترے گا نیز انکی قراءت سن کر خوش ہونے والوں کے قلوب فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔“ (تمہی رزین)

تشریح: وعن حذيفة قال: قال رسول الله ﷺ اقرأوا القرآن بلحون العرب وأصواتها: عطف تفسیری ہے یعنی مدات کے نعمات میں بلا تکلف حرکات میں سکنات میں بغیر تکلفات کے پڑھنا۔

وایاکم ولحون اهل العشق: یعنی اصحاب فسق و فجور کے لہجہ میں پڑھنے سے منع فرمایا۔
ولحون اهل الكتابین: یعنی یہود و نصاریٰ میں سے ارباب کفر کے لہجوں سے بھی پرہیز کرو، کیونکہ ”من تشبه بقوم فهو منهم“ جو جس قوم کے ساتھ مشابہت کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔
طیبی فرماتے ہیں: اللحون، لحن کی جمع ہے، اور وہ سُر لگا کر پڑھنا اور آواز کا حلق میں گھمانا۔ جامع الاصول کے مصنف لکھتے ہیں: کہ یہ اس سے ملتا جلتا ہے جو ہمارے زمانے کے قراء عظام کر رہے ہیں۔ عجیب سُر لگاتے ہیں قرآن پڑھنے میں، حالانکہ رسول اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

وسيجي: یعنی سیاتی یعنی غنقریب آئے گی جیسا کہ ایک نسخہ میں یہ لفظ بھی ہے۔

بعدي قوم يرجعون: تشدید کے ساتھ یعنی رد کریں گے۔

بالقرآن: یعنی اس میں تحریف کریں گے۔

ترجيع الغناء: کسرہ اور مد کے ساتھ گانے کے معنی میں ہے۔

والنوح: نون کے فتح کے ساتھ نوحہ کرنا اور اس سے مراد اُس کے مخرج سے نکل جانے کی تردید ہے۔

طیبی فرماتے ہیں: قرآن میں ترجیع سے مراد حروف کا عیسائیوں کی قراءت کی طرح پڑھنا ہے۔ (لا یجاوز) یعنی انکا قرآن کو پڑھنا۔

حناجرهم: یعنی ان کے حلق سے اور یہ عدم قبولیت سے کنایہ ہے اور مقام وصول سے رد ہے۔

اور تجاوز صعود اور حدود یعنی چڑھنے اور نیچے اترنے دونوں معنوں کے لئے آتا ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: ان کے گلے سے آسمان کی طرف نہیں چڑھے گا، ان کا تلاوت کرنا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ ان سے قبول کرے گا۔ اور نہ ہی ان کے حلق سے ان کے دلوں میں اترے گا ان کا تلاوت کرنا، کہ وہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اس کے مقتضاء پر عمل پیرا ہوں۔

مفتونة: حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور مرفوع بھی ہو سکتا ہے کہ قوم کی دوسری صفت بنالی جائے۔ اور طیبی نے اسی پر

اقتصار کیا ہے یعنی دنیا کی محبت کے ساتھ آزما یا جائے گا۔ اور لوگوں کا اس کی تعریف کرنے کے ساتھ۔

قلوبهم: فاعلیت کی بنا پر مرفوع ہے اور معطوف علیہ ہے۔

وقلوب الذين يعجبهم شأنهم: ہمزہ کے ساتھ۔ اور ابدال ہے، یعنی ان کی قراءت کو اچھا سمجھتے ہیں اور ان کی تلاوت کو غور

سے سنتے ہیں اور اسی طرح طبرائی نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۲۰۸: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ حَسِنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ فَإِنَّ الصَّوْتِ الْحَسَنَ يَزِيدُ الْقُرْآنَ حُسْنًا. (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۱۵/۲ حدیث رقم ۳۵۰۱۔

ترجمہ: ”حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”قرآن کو اچھی آواز کے ساتھ پڑھو کیونکہ اچھی آواز قرآن کریم کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔“ (دارمی)

تشریح: وعن البراء بن عازب قال سمعت رسول الله ﷺ حسنوا القرآن: یعنی اس کو مزین کر کے پڑھو۔ باصواتکم: طیبی فرماتے ہیں اور یہ ترتیل کے ساتھ ہے اور آواز کا خوبصورت بنانا نرمی اور تجرین کے ساتھ ہے، اور یہ حدیث قلب پر محمول نہیں کی جاسکتی جیسا کہ پچھلی حدیث کو قلب پر محمول کیا ہے اس قول کی وجہ سے۔

فان الصوت الحسن يزيد القرآن حسنا.

۲۲۰۹: وَعَنْ طَاوُوسٍ مُّرْسَلًا قَالَ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ أَيْ النَّاسِ أَحْسَنُ صَوْتًا لِلْقُرْآنِ وَأَحْسَنُ قِرَاءَةً قَالَ مَنْ إِذَا سَمِعْتَهُ يَقْرَأُ أُرَيْتَ أَنَّهُ يَخْشَى اللَّهَ قَالَ طَاوُوسٌ وَكَانَ طَلَقَ كَذَلِكَ. (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۶۳/۲ حدیث رقم ۳۴۸۹۔

ترجمہ: ”حضرت طاووسؓ بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ قرآن پڑھنے کے سلسلے میں آواز کے لحاظ کون شخص سب سے بہتر ہے اور پڑھنے کے اعتبار سے کون شخص بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”وہ شخص جس کو تم قرآن کریم پڑھتے ہوئے سنو تو تمہارا گمان ہو (یعنی تمہیں محسوس ہو) کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہے“ حضرت طاووسؓ کہتے ہیں کہ حضرت طلقؓ میں یہی بات تھی کہ قرآن پڑھتے تو محسوس ہوتا کہ خشیت الہی ان پر غالب ہے۔“ (دارمی)

تشریح: وعن طاووس: جلیل القدر تابعی تھے۔

مرسلا، قال سمع النبي ﷺ أي الناس أحسن صوتا للقرآن؟: ایک قول یہ ہے کہ لام تمیز کیلئے ہے۔

وأحسن قراءة: یعنی ترتیل اور ادائیگی کے اعتبار سے۔

قال من اذا سمعته يقرأ أريت: مجہول کے صیغے کے ساتھ یعنی حسبہ و ظننتہ۔

أنه يخشى الله: اور تیرا دل اس سے متاثر ہو، یا اس پر خشیت کے آثار ظاہر ہوں، جیسا کہ اس کا رنگ متغیر ہونا، یا اس کے کثرت کے رونے سے۔ طیبی فرماتے ہیں کہ جواب حکمت والے کے اسلوب سے ہے۔ کیونکہ اچھی آواز کا جواب دینے کی بجائے یہ جواب دیا کہ جو شخص خوف الہی کے ساتھ پڑھے وہ اچھا ہے۔

قال طاووس: وكان طلق كذلك: یعنی اس وصف سے متصف تھے۔ طیبی فرماتے ہیں: یہ ابوعلی طلق بن علی بن عمرو النخعی

الیمامی تھے، اہ۔ مولف رحمہ اللہ نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے اور ان سے ان کے بیٹے قیس نے روایت کی ہیں۔

۲۲۱۰: وَعَنْ عُبَيْدَةَ الْمَلِيكِيِّ وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّسُوا الْقُرْآنَ وَاتْلُوهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ مِنْ أَنْاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَافْشُوهُ وَتَغَنُّوهُ وَتَدَبَّرُوهُ مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ وَلَا تَعْجَلُوا ثَوَابَهُ

فَإِنَّ لَهُ ثَوَابًا. (رواه البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البخارى في صحيحه ۷۳/۵ - ح ديث رقم ۲۳۱۹ - ومسلم في صحيحه ۵۶۰/۱ حديث رقم (۲۷۰ - ۸۱۸) -
وابوداؤد في السنن ۱۵۸/۲ حديث رقم ۱۴۷۵ - والترمذی ۱۷۷/۵ حديث رقم ۲۹۴۳ - والنسائي ۱۵۰/۲ حديث رقم
۹۳۶ - ومالك في الموطا ۲۰۱/۱ حديث رقم ۵ من كتاب القرآن - واحمد في المسند -

ترجمہ: ”حضرت عبیدہ ملیکیؓ جو نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی تھے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا
”اے اہل قرآن! قرآن سے تکیہ نہ کرو (یعنی اس کے معاملے میں سستی و تغافل سے کام نہ لو) اور صبح و شام پڑھا کرو
جیسا کہ اس کو پڑھنے کا حق ہے قرآن کو ظاہر کر دیا سے خوش آوازی کے ساتھ پڑھو جو کچھ اس میں مذکور ہے اس میں غورو
فکر کرو تاکہ تمہارا مطلوب حاصل ہو اور اس کا ثواب حاصل کرنے میں جلد بازی نہ کرو کیونکہ آخرت میں اس کا بڑا اجر
ہے۔“ (بیہقی)

تشریح: وعن عبیدة: ”عین“ کے فتح کے ساتھ، یہ ابن حجر کا قول ہے۔ دوسرے نسخہ میں ضمہ اور فتح کے ساتھ۔
الملیکی: تصغیر کے ساتھ۔

وكانت له صحبة: یعنی نبی ﷺ کے ساتھ، اور یہ جملہ معترضہ ہے۔ یہ بیہقی کا یا کسی اور کا کلام ہے۔

قال: قال رسول الله ﷺ يا اهل القرآن: خطاب کے ساتھ خاص کئے گئے۔ کیونکہ ان پر قرآن کے حقوق کی ادائیگی میں
مبالغہ واجب ہے، دوسروں سے کیونکہ قرآن ان کے گوشتوں اور خون کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ اس سے تمام مؤمنین کو مراد لیا گیا ہو، کیونکہ مؤمن قرآن کے بعض سے علیحدہ نہیں ہوتے یا اہل قرآن
سے مراد قرآن پر ایمان رکھنے والے ہو سکتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا یا اهل البقرة کہنا۔

لا تتوسدوا القرآن: یعنی اس کو اپنا تکیہ نہ بناؤ، کہ اس کو پڑھتے ہو اور پھر اس پر سر رکھ کر سو جاتے ہو اور اس سے غافل ہو جاتے
ہو، اور اس کے حقوق کے قیام سے بھی غفلت برتتے ہو، اور اس میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہو، بلکہ اس کے لفظی حقوق کے ساتھ کھڑے ہو
جاؤ، اور اس کے سمجھنے اور اس کے علم اور اس پر عمل کے ساتھ اس کے حق کو قائم کرو۔

واتلوه حق تلاوته: یعنی اس کو اس طرح پڑھو جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے، اور اس کی اتباع کرو، جیسا کہ اس کی اتباع
کا حق ہے۔ امام نوویؒ شرح المہذب میں الشیخ ابو محمد الجوبینی سے روایت نقل کرتے ہیں، اگر کسی نے ”نستعین“ لطف وقف کے ساتھ
سین اور ”ثناء“ کے درمیان پڑھا، تو حرام ہے کیونکہ یہاں وقف نہیں ہے، اور نہ ہی قراء عظام میں سے کسی ایک کے نزدیک آیت کا اختتام
ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ قراءت میں مخرج، مد اور ان کے علاوہ کسی دوسری چیز پر اجماع ہو جائے۔ تو اس کا سیکھنا
واجب اور اس کی مخالفت حرام ہے۔

من آناء الليل والنهار: یعنی اس کی بہت زیادہ تلاوت کرو، دن رات کی گھڑیوں میں لیکن اس کے حقوق پورے کرتے رہو۔

www.KitaboSunnat.com

اور اس کی تلاوت کرو جس طرح اس کی تلاوت کرنے کا حق ہے۔

طیبی فرماتے ہیں: لا تتوسدوا سے دو مفہوم اخذ ہو سکتے ہیں۔

﴿۱﴾ یہ کہ سستی اور بے پرواہی سے کتایہ ہو، یعنی اس کو تکیہ نہ بناؤ کہ تم اس پر سوتے ہو اور اس سے غافل ہو جاتے ہو، بلکہ کھڑے ہو

جاؤ اور رات کی گھڑیوں اور دن کے کناروں میں اس کی تلاوت کرو کیونکہ جس طرح اس کا حق ہے۔

﴿۲﴾ یہ کتایہ ہو غفلت سے کہ جس نے قرآن کو تکیہ بنایا وہ ضرور سوئے گا اور سونا اور غفلت لازم و ملزوم ہیں یعنی قرآن کے معانی میں

تدبر کرنے اور اس کے اسرار کو کھولنے سے غافل نہ ہونا اور نہ ہی اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنے میں سستی کرنا، اور اس کے اخلاص میں بھی کوتاہی نہ کرنا اور اس قول کا معنی ہے ﴿حق تلاوتہ﴾ [البقرہ: ۱۲۱] جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَدُورُونَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُورَ﴾ [فاطر: ۲۹] ”یقیناً وہ لوگ جو کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور ہمارے دیئے ہوئے سے خرچ کرتے ہیں، پوشیدہ بھی اور ظاہری بھی۔ وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا“۔ یہ آیت دو معانی کو جمع کرنے والی ہے! باری تعالیٰ کا فرمان ﴿اقموا﴾ [فاطر: ۲۹] اور ﴿أنفقوا﴾ دونوں ماضی ہیں اور یتلون پر عطف ہے جو کہ مضارع ہے تو یہ تلاوت میں دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے جو نتیجہ خیر عمل میں تجدید کی باعث ہے جس سے امید کے ساتھ نفع مند تجارت ہوگی۔

اور ابن حجرؒ نے یہاں کلام میں مبالغہ کرتے ہوئے فقہی فروع کا ذکر کر کے جو کہ قرآن کے متعلقہ ہیں، قرآن کے ساتھ تکیہ لگانا اور اس کے کی حرمت کے بارے میں اور قرآن پر کوئی چیز رکھنے کے بارے میں اور اس کی طرف پیٹھ پھیرنے اور اس کے روندنے اور اس کو نشانہ بنانے اور اس کے لفظوں کی حرمت کے بارے میں اور اس کو چومنے کے جواز اور اس سے فال لینے کی کراہت کے بارے میں اور فال کی حرمت بعض مالکیہ سے بھی ثابت ہے۔ اور بعض حنابلہ اس کے جواز کے بھی قائل ہیں اور اس کی امثلہ اپنی جگہ پر فتاویٰ اور خلافیات کی کتابوں میں موجود ہیں۔

انہیں اس بحث میں ائمہ کے کلام پر بھروسہ نہیں ہے، اور صرف اپنے فہم سے بات کی ہے جو کہ اچھا نہیں ہے۔ اور وہ عدم فہم پر مبنی ہے۔ کلام الطیبیؒ اھ۔

ائمہ کا کلام فروع فقیہ میں ہے اور آدمی جس کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہوتا ہے۔ ﴿وقد علم كل اناس مشربهم﴾ [البقرہ: ۶۰] ﴿وكل حزب بما لديهم فرحون﴾۔ برتن میں جو ہوتا ہے وہی اچھلتا ہے۔

افشوہ : یعنی اونچا پڑھنے کے ساتھ اور تعلیم کے لئے اور عمل کے ساتھ اور لکھنے کے ذریعے اور اس کی تعظیم کر کے۔
وتغنوه : یعنی غناء کے علاوہ دوسری اچھی طرز پر پڑھو، جیسا کہ گزر چکا ہے۔

وتدبروا ما فيه : یعنی فضیلت والی آیات میں اور زبردستی میں اور مکمل وعدوں اور وعیدوں میں۔

لعلکم تفلحون : تاکہ تم فلاح پاؤ۔ یا اس حال میں کہ تم فلاح کے لئے پُر امید ہو جاؤ۔ اور وہی کامیابی مطلوب ہے۔
ولا تعجلوا : جیم مشد مکسورہ اور ایک نسخہ میں ”ت“ بھی مفتوح ہے، اور جیم بھی مفتوح مشد ہے۔ یعنی اس کا ثواب جلدی نہ طلب کرو۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی جلدی دنیاوی سامان نہ بناؤ۔
فان له ثواباً : یعنی آخرت میں بہت بڑا ثواب ہے۔

باب اختلاف القراءات وجمع القرآن

اختلاف قراءات اور جمع القرآن کا بیان

الفصل الاول :

قرآن کریم کو سات قراءتوں میں پڑھنے کی اجازت ہے

۲۲۱: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيمٍ بْنِ حِزَامٍ يَقْرَأُ سُورَةَ الْفُرْقَانِ عَلَى غَيْرِ مَا أَقْرَأَهَا وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَقْرَأَ نَيْهَا فَكَدَّتْ أَنْ أَعْجَلَ عَلَيْهِ ثُمَّ أَمَهَلَتْهُ حَتَّى أَنْصَرَفَتْ ثُمَّ لَبِيَتْهُ بِرِدَائِهِ فَحُجَّتْ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي سَمِعْتُ هَذَا يَقْرَأُ سُورَةَ الْفُرْقَانِ عَلَى غَيْرِ مَا أَقْرَأْتَيْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَرْسَلُهُ أَقْرَأَ فَقَرَأَ الْقِرَاءَةَ الَّتِي سَمِعْتُهُ يَقْرَأُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَلْ كَذَا أَنْزَلْتُ ثُمَّ قَالَ لِي أَقْرَأْ فَقَرَأْتُ فَقَالَ هَلْ كَذَا أَنْزَلْتُ إِنَّ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْزَلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ فَأَقْرَأُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۷۰۱۵ حدیث رقم ۲۴۳۰۔ واحمد فی المسند ۱۲/۱۔

ترجمہ: (امیر المؤمنین) حضرت عمر بن الخطاب فرماتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم بن حزام کو سنا کہ وہ سورہ فرقان اس انداز کے خلاف پڑھ رہے تھے جس طریقہ کے مطابق میں پڑھتا ہوں اور جس طریقہ سے نبی کریم ﷺ نے وہ سورت مجھے سکھائی تھی تو قریب تھا کہ میں ان کی طرف جھپٹ پڑوں یعنی قراءت ختم کرنے سے پہلے ہی میں ان سے لڑ پڑوں یعنی تعرض کروں مگر پھر میں نے ان کو اتنی مہلت دی کہ وہ پڑھنے سے فارغ ہوئے اس کے بعد میں نے ان کی چادر ان کی گردن میں ڈالی اور انہیں کھینچتا ہوا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میں نے سنا ہے کہ یہ سورت فرقان اس انداز کے خلاف پڑھ رہا ہے، جس طریقہ سے آپ ﷺ نے مجھے وہ سورت پڑھائی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "عمر! انہیں چھوڑ دو، پھر ہشام سے کہا کہ تم پڑھو پھر ہشام نے اسی انداز سے پڑھا جس انداز سے میں نے انہیں پڑھتے سنا تو نبی کریم ﷺ نے ان کی قراءت سن کر فرمایا کہ "یہ سورت اس طرح اتاری گئی ہے، پھر مجھ سے فرمایا کہ "اب تم پڑھو، چنانچہ میں نے پڑھا تو فرمایا کہ "یہ سورت اس طرح اتاری گئی ہے یاد رکھو کہ یہ قرآن سات طریقہ (سات لہجوں میں مجھ پر اتارا گیا ہے لہذا ان میں سے جس طریقہ پر آسان ہو پڑھو!" (اس روایت کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے مگر الفاظ مسلم کے ہیں)۔

تشریح: عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال سمعت ہشام بن حکیم بن حزام : زاء سے پہلے حاء کے کسرہ کے ساتھ۔ طبری فرماتے ہیں: حکیم بن حزام قریشی ہیں، اور وہ ام المؤمنین خدیجہ الکبریٰ کے چچا زاد بھائی تھے۔ اور وہ جاہلیت اور اسلام دونوں ادوار میں قریش کے اشراف میں سے تھے، فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا اور ان کی اولاد کو بھی رسول اللہ کا صحابی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

یقرأ سورة الفرقان على غير ما أقرأها : یعنی قراءت سے۔

وكان رسول الله ﷺ أقرأنيها : یعنی سورة الفرقان۔

فكدت أن اعجل عليه : ہمزہ اور جیم کے فتح کے ساتھ۔ اور ایک نسخہ میں جیم مشدود ہے، یعنی میں قریب تھا کہ اس سے جھگڑ پڑتا، یا الجھ پڑتا۔ اور میرا اس پر غصہ ظاہر ہوا قراءت کے دوران جلدی کی وجہ سے۔

ثم أمهلته حتى انصرف : یعنی قراءت سے۔

ثم لبنته : تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے ہے۔

بر دانه : یعنی میں شروع ہوا ان کی گردن کو پکڑنے اور اس کو کھینچنے لگا۔ طیبی فرماتے ہیں: کہ لبنت الرجل تلبیبا، تب کہا جائے جب پکڑے جمع کر لئے جائے جھگڑے سے پہلے۔ ثم جردتہ، یہ قول ان کے قرآن کے ساتھ اہتمام پر دلالت کرتا ہے، اور جس طرح سنا ہوا اسی طرح اس کو یاد رکھنے پر محافظت کی دلیل ہے۔ اور اس سے بغیر اعراف کیے جس کو عرب نے جائز کیا ہے۔

فجنت بہ رسول اللہ ﷺ : یعنی الیہ آچکی طرف۔

فقلت یا رسول اللہ انی سمعت هذا یقرأ سورة الفرقان علی غیر ما أقرأت تنیها : کہا جاتا ہے کہ قرآن لغت قریش میں نازل ہوا، لیکن جب دوسروں لغتوں والوں پر گراں گزرا، تو قرأت میں سات مشہور قبائل کی لغات کی اجازت مل گئی۔ جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے، اور یہ سات سے زیادہ لغات کی قرأت کی نفی نہیں کرتا، ہر قبیلہ کی لغت کے مختلف ہونے کی وجہ سے اگر چہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اور لغات میں اختلاف کے ممکن ہونے کی وجہ سے اور ایک قول یہ ہے کہ موجودہ تمام قرءات ان حروف سے ایک ہی لغت ہے اور باقی چھ متردک ہو چکی ہیں اس قول کے قائل طیبی ہیں۔ اور ظاہری بات ہے کہ یہ بات صرف ایک قول کی حیثیت ہی رکھتی ہے، اور حرف واحد سے مراد وہ نوع جو ان حروف کے مجموع سے بنائی گئی ہے مختار ہے اور جو ان کے علاوہ وہ منسوخ ہیں۔

اور وہ وہی ہے جو مصحف عثمان میں جمع کی گئی، اور پہلا نسخہ ابو بکر صدیق کے جمع کردہ مصحف کے موافق ہے۔

فقال رسول اللہ ﷺ ارسله : یعنی اے عمر! اور حضرت عمر کے اس فعل پر نرمی اس لئے اختیار کیا گیا کہ انہوں نے کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے یہ کام نہیں کیا تھا، بلکہ اپنے گمان کے مطابق بعض نذ یہ کام کیا تھا۔ اور ہابن حجر کا قول کہ حضرت عمر کی نسبت ہشام کے لئے اس طرح تھی جیسے کسی معلم کی متعلم کے لئے تو یہ قول مردود ہے کیونکہ کوئی بھی معلم پہلی ہی دفعہ اپنے شاگرد کے ساتھ اس طرح نہیں پیش آتا۔

أقرأ : یعنی اے ہشام! فقراً : یعنی ہشام نے۔ القراءة النبی سمعته : یعنی سمعت ہشاماً ایہ، مفعول ثانی کو حذف کیا گیا۔

یقرأ : یعنی یقرأھا وہی سورت پڑھنے لگے۔ فقال رسول اللہ ﷺ هكذا أنزلت : یعنی یہ سورت یا قرأت۔

ثم قال لی أقرأ. فقراءت فقال هكذا أنزلت : یعنی جبریل کی زبانی، جیسا کہ ظاہر ہے، یا اسی طرح اختیاری نازل کی گئی۔

ان هذا القرآن : یعنی مکمل قرآن۔

أنزل علی سبعة احواف : یعنی سات لغات یا سات قرأتیں یا سات اقسام پر۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی میں اکتالیس (۳۱) اقوال میں اختلاف کیا گیا ہے، یعنی اکتالیس مختلف اقوال اس کے معنی میں وارد ہوئے ہیں، ان میں سے..... مثلاً ایک یہ کہ اس کا معنی نہیں جانا جاسکتا۔ دوسرا یہ کہ حرف کا لفظ لغوی طور پر حرف ہجا، کلمہ معنی اور جہت پر صادق آتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں، کہ یقیناً قرأتیں اگر سات سے زیادہ بھی ہوں وہ اختلافات میں سے سات وجوہات کی طرف ہی راجع ہیں۔

پہلی بذات خود کلمہ کا اختلاف کسی زیادتی یا نقصان کے ساتھ جیسے باری تعالیٰ کا قول ﴿ننشرها. وننشرها﴾ [البقرة: ۲۵۹] اور

﴿سارعوا. وسارعوا﴾ [آل عمران: ۱۲۳]

دوسری واحد اور جمع کا تغیر جیسے ﴿کتبہ، کتابہ﴾ [البقرة: ۲۸۵]

تیسری وجہ مذکور اور موث کا اختلاف جیسے کہ ﴿یکن، نکن﴾ میں۔

چوتھی وجہ حرنی اختلاف یعنی تشدید اور تخفیف کا فرق جیسے ﴿بکذبون، یکذبون﴾ [البقرة: ۱۰] اور فتح اور کسرہ کا اختلاف جیسے

(يَقْنَطُ، يَقْنَطُ)۔

پانچویں وجہ اعراب کا اختلاف جیسے باری تعالیٰ کا قول ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ﴾ [البروج: ۱۰] دال پر رفع اور جر میں۔
چھٹی وجہ اداۃ کا اختلاف جیسے (لَكِن الشَّيْطَانِ) [البقرة: ۱۰۲] اُن مشددا اور مخفف دونوں طرح۔
ساتویں وجہ لغات کا اختلاف فقہیم اور امالہ یعنی پُر پڑھنا اور باریک پڑھنا۔

اگر ان میں سے کوئی نہ ہو تو قرآن میں کوئی بھی کلمہ ایسا نہیں پایا جاتا، جو ان سات وجوہات کے علاوہ پڑھا جاتا ہو، سوائے چند ایک کے جیسے عَبْد الطاغوت اور ولا تقبل لہا اف [الاسراء: ۲۳] اور یہ سب کچھ اس امت مرحومہ کی آسانی کی خاطر ہے۔ اسی لئے آپ علیہ السلام نے فرمایا: فاقراوا ما تيسر منه کہ اس قرآن سے جو تمہیں آسان لگے پڑھو۔ یعنی قراءتوں کی اقسام میں سے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے برخلاف ﴿فاقراوا ما تيسر منه﴾ [المزمل: ۲۰] کیونکہ اس کے عموم سے مراد مقدار، جنس اور نوع ہے۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے اجازت دی ہے کہ اس طرح پڑھیں، جس طرح آپ علیہ السلام سے تو اتر سے ثابت ہے، آپ علیہ السلام کے اس قول کی دلیل کے ساتھ ”انزل علی سبعة احرف“ کہ قرآن سات لغتوں میں نازل ہوا ہے اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ سات کے عدد سے مراد بیشتر ہے کہ تحدید یعنی متعین حد۔ پس کیونکہ یہ اقوال میں سے کسی قول پر نہیں رہا جاسکتا۔

امام نووی صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں: ان اقوال میں سے صحیح ترین اور حدیث کے معنی کے قریب اس کا قول ہے جیسا کہ کہا اس سے مراد کلمات کے بولنے کی کیفیت ہے ادغام، اظہار، موٹا پڑھنے اور باریک پڑھنے اور امالہ کرنے میں، اور مدۃ اور قصر اور نرمی سے حروف کا اداء کرنا ہے کیونکہ عربوں کی لغات ان وجوہات میں مختلف تھیں، تو اللہ نے ان پر آسانی فرمادی کہ ہر ایک اپنی لغت کے موافق پڑھے، اور جو اس کی زبان پر آسان ہو اس لغت میں پڑھے۔

اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہ اس کے اطلاق پر نہیں ہے، کیونکہ ادغام مثلاً کئی جگہوں پر اس کا اظہار جائز نہیں اور کئی مقامات ایسے ہیں جہاں ادغام جائز نہیں، اور اسی طرح باقی صفات کو سمجھ لو۔
اور اس میں یہ بھی ہے کہ لغات کا اختلاف صرف انہی وجوہات میں منحصر نہیں ہے، وہ وجوہات جو میم جمع اور قصر کے لئے ہے۔
اور ضمیر ”ھا“، عمل کرتی اور اس کا ترک کر دینا وہ بعض کے اتفاق پر ہے۔

جیسے کہ البخل اور البخل کے اختلاف کی طرح اور یحسب اور یقنط اور ”الصراط اور السراط“ راہہ قول جو ابن عبد البر سے منقول ہے اور اس کو انہوں نے اکثر علماء رحمہم اللہ کی طرف منسوب کیا ہے ”کہ سات سے مراد معانی متفقہ کی سات وجہیں الفاظ کے اختلاف کے ساتھ ہیں“ جیسے: اقبل وتعال اور عجل وهم وأسرع سب ایک ہی معنی میں ہیں پس لفظ کو اس کے مترادف لفظ سے بدلنا جائز ہے یا جو اس کے معنی کے قریب ہونہ کہ اس کے الٹ سے بدلنا جائز ہے۔ اور احمد کی جید سند والی حدیث اس بارے میں صریح ہے اور اسی طرح امام احمد کے پاس جید سند والی حدیث ابو ہریرہ سے مروی ہے ”انزل القرآن علی سبعة احرف: علیما حکیمما غفوراً رحیمما“۔ کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا علیماً، حکیمما، غفوراً رحیمما، اور احمد کی ایک حدیث جو کہ جید سند کے ساتھ ہے اس میں ہے کہ قرآن سارے کا سارا درست ہے جب تک مغفرت کو عذاب یا عذاب کو مغفرت نہ بنا دے، اور اسی لئے ابی بن کعب کلمتا اصناء لہم مشوا فیہ [البقرة: ۲۰] کو کلمتا اصناء لہم سعوا فیہ پڑھتے تھے۔ اور ابن مسعود انظر ونا [الحديد: ۱۳] کی جگہ امهلونا اخر ونا پڑھتے تھے۔ اور اس بحث میں یہ بھی ہے کہ صحابہ سے ایسا ہونا بہت بعید ہے خصوصاً ابی اور ابن مسعود سے کہ وہ اپنے پاس سے لفظ بدل دیتے تھے، اس کے بجائے جو انہوں نے نبی علیہ السلام سے سنا ہوتا تھا اور اس کو اپنی تلاوت میں قائم رکھتے۔

کچھ بات یہ ہے کہ یہ الفاظ ان کی تفسیر ہوا کرتی تھی، یا ان دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے مختلف قراءت سنی ہوں، ایک مرتبہ اس طرح اور دوسری مرتبہ اس طرح۔ جیسا کہ اب بھی قراء کے ہاں قرآن میں اختلاف کی بناء پر قراءت کی مختلف اقسام معروف ہیں۔ اور اسی طرح امام طحاوی فرماتے ہیں: کہ یہ رخصت صرف اس وقت تھی جب اکثریت کے لئے ایک ہی قراءت پر تلاوت مشکل تھی، اور کتابت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے عدم ضبط اور عدم اتقان حفظ ہونے کی وجہ سے پھر عذر ختم ہونے سے اور کتابت اور یاد کرنے میں آسانی کی وجہ سے یہ حکم منسوخ ہوگا، اور اسی طرح ابن عبد البر، باقلانی اور دیگر نے کہا ہے۔ یہ اور گویا کہ آپ علیہ السلام کے لئے واضح کر دیا گیا تھا، کہ آپ کی امت میں قراءت متواترہ سات حروف پر قائم رہے گی، اور وہی اب موجود ہے جس کے تواتر پر اتفاق ہے۔ اور جمہور کہتے ہیں: اس موجود قراءت کے علاوہ جو ہے وہ شاذ ہے اس کی قراءت جائز نہیں۔ بالمعنی یہ روایت متفق ہے۔

حدیث کہ: "نزل القرآن علی سبعة أحرف" کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا۔ ابو عبیدہ نے اس کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے کیونکہ یہ روایت اکیس (۲۱) صحابہ کرام سے مروی ہے، اور تواتر سے اس کی مراد التواتر اللفظی ہے، رہا مسئلہ تواتر معنوی کا تو اس میں کوئی اختلاف نہیں، اور صحیحین یعنی بخاری و مسلم کی حدیث میں وارد ہے، کہ جبرئیل نے مجھے ایک لغت پر پڑھایا، میں مراجع کرتا رہا پس میں ان سے اور زیادہ کا مطالبہ کرتا رہا اور وہ مجھے زیادہ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ سات قراءتوں تک پہنچ گیا۔"

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے "فرددت الیہ ان ہون علی امتی فارسل الی ان أقرأ علی سبعة أحرف"۔ میں اللہ کی طرف بار بار لوٹا تا رہا کہ میری امت پر آسانی کرو، تو اللہ نے میری طرف پیغام بھیجا کہ میں اس قرآن کو سات حروف پر پڑھوں۔ علماء فرماتے ہیں: کہ قرآن کا سات حروف پر نازل ہونے کا سبب تخفیف اور آسانی ہے۔ اسی لئے آپ علیہ السلام نے فرمایا: "ہون علی امتی" میری امت پر آسانی کرو۔ اور جیسا کہ دوسری حدیث میں اس کی صراحت ان الفاظ سے فرمادی: "فاقرأوا ما تیسر منہ"۔

قراءت میں اختلاف کرنے کی ممانعت

۲۲۳. وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ سَمِعْتُ رَجُلًا قَرَأَ وَسَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقْرَأُ خِلَافَهَا فَجِئْتُ بِهِ النَّبِيَّ ﷺ فَأَخْبَرْتُهُ فَعَرَفْتُ فِي وَجْهِهِ الْكَرَاهِيَةَ فَقَالَ كَلَّا كَمَا مُحْسِنٌ فَلَا تَخْتَلِفُوا فَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اِخْتَلَفُوا فِهَلْ كُتِبُوا۔ (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا اور نبی کریم ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ کی قراءت اس شخص کی قراءت سے مختلف تھی چنانچہ میں اس شخص کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے آیا اور میں نے آپ ﷺ کو بتایا پھر میں نے محسوس کیا کہ آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کے آثار نمایاں ہے بہر کیف آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں صحیح اور اچھا پڑھتے ہو (یعنی تم دونوں درست ہو) آپس میں اختلاف نہ کرو کیونکہ جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں یعنی پہلی امتوں کے لوگ وہ آپس کے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے یعنی وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو جھٹلایا کرتے تھے۔ (بخاری)

تشریح: وعن ابن مسعود قال: سمعت رجلاً قرأ وسمعت النبي ﷺ يقرأ لا خلافاً: یعنی اس آدمی کی قراءت کے علاوہ اور ضمیر اس مصدری معنی کی طرف راجع ہے۔ جو من قراء سے سمجھ آ رہا ہے۔

فجنت به: یعنی میں نے اس کو پیش کیا۔

النبي ﷺ فأخبرته: یعنی جو میں نے اس سے رسول اللہ کے قراءت کے خلاف دوسری قراءت سنی۔

فعرفت فی وجهہ الکراهیة : ی، مخفف ہے، نہ کہ مشدد یعنی ناپسندیدگی کے آثار دیکھے اختلاف کرنے کی وجہ سے خوف محسوس کرتے ہوئے اہل کتاب کے اختلافات کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے۔

کیونکہ صحابہ سارے عدول ہیں اور ان کا نقل کرنا بھی صحیح ہی ہوگا، تو اس میں اختلاف کی تو کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔

فقال : کلا کما محسن : یعنی قراءت کے روایت کرنے میں۔ طیبی فرماتے ہیں : کہ آدمی کے بارے میں جو کہا کہ محسن ہے تو اس کی قراءت کے بارے میں فرمایا اور جو ابن مسعود کو کہا تو وہ ان کے نبی علیہ السلام سے سماع کے بارے میں فرمایا۔ اور کراہیہ ناپسندیدگی کا اظہار یہ جھگڑے کی طرف..... حق تو یہ تھا کہ ابن مسعود اس کی قراءت پر پڑھتے اور پھر نبی علیہ السلام سے سوال کرتے، اھ۔

اور اس میں یہ بحث بھی ہے کہ اگر وہ ان کی قراءت پر پڑھتے بھی تو وہ قراءت متوترہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ خیر آحاد اور شاذ ہوتی اور شواذ کے ساتھ قراءت جائز نہیں ہے۔ اور ابن الملک فرماتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے ابن مسعود کے اس آدمی کے ساتھ قرآن میں اختلاف کو اس لئے ناپسند فرمایا کہ قرآن کی قراءت مختلف وجوہات پر جائز تھی، اور ان بعض وجوہ کا انکار قرآن کا انکار تھا، جو کہ جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں : کہ ابن مسعود سے یہ کام مختلف قراءتوں کے جواز کے علم سے پہلے سرزد ہوا۔ اگر اس طرح نہیں تو یہ ناممکن بات ہے کہ وہ علم کے باوجود اس چیز کا انکار کریں، جس سے قرآن کا انکار لازم آتا ہے، اور وہ قرآن کے علم کے اعتبار سے جلیل القدر صحابہ میں سے تھے، اور احکام القرآن میں بھی ان میں سے سب سے زیادہ فقیہ تھے۔

اور اس سے اس کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے ان کی قراءت کی تاویل کو پیچھے ذکر کیا ہے، کہ انظرونا کی جگہ اہملو نا اور اٰخرونا پڑتے تھے، اور شاید کے آپ علیہ السلام کے چہرے پر ناخوشگواری کے اثرات ابن مسعود کے اس آدمی کو پیش کرنے کی وجہ سے تھے، کیونکہ ان کا حق بنتا تھا کہ اس کے ساتھ اچھا گمان رکھیں اور اس کے واقعہ کے بارے رسول اللہ ﷺ سے سوال کریں۔ اور ممکن ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے یہی کام کیا تھا، تو اس وقت بھی آپ علیہ السلام کے چہرے پر ناخوشگواری کے اثرات نمودار ہوئے ہوں۔ لیکن عمرؓ اپنے غصے کی شدت کی وجہ سے محسوس نہ کر سکے ہوں، یا آپ علیہ السلام نے ان پر بردباری کا مظاہرہ کیا ہو جب آپ علیہ السلام ان کو سخت غصہ کی حالت میں دیکھا تھا۔ یا رسول اللہ ﷺ نے تعظیماً ان کو کچھ نہ کہا ہو کہ وہ جلیل القدر صحابہ میں سے تھے، اور یہ اس موضوع پر ان کی اہم خدمت ہے اور یہ زیادہ بہتر ہے اس سے جو ابن حجرؒ نے احتمال کے وجہ سے ذکر کیا ہے۔ اور طیبیؒ پر اعتراض کیا ہے اس کے اس قول کے بارے میں ان الکراہہ راجعة الی الجدال اور اللہ ہی اصل حالت کو خوب جاننے والا ہے۔

فلا تختلفوا : یعنی اے صحابہ! یا اے امت محمدیہ! اور تم روایت میں اپنے میں سے ایک دوسرے کی تصدیق کیا کر دو۔ معتبر شرط کے ساتھ۔

فان من كان قبلکم : یعنی یہود و نصاریٰ میں سے۔ اختلافوا : آپس میں ایک دوسرے کی تکذیب کے ساتھ۔

فہلکوا : اپنی کتاب کو ضائع کرنے کی وجہ سے۔

قرآن کریم کی مختلف قراءت کا مسئلہ

۲۲۱۳: وَعَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ قَالَ كُنْتُ فِي الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ يُصَلِّيُ فَقَرَأَ قِرَاءَةً أَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ ثُمَّ دَخَلَ آخَرَ فَقَرَأَ قِرَاءَةً سِوَى قِرَاءَةِ صَاحِبِهِ فَلَمَّا قَضَيْنَا الصَّلَاةَ دَخَلْنَا جَمِيعًا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ فَقُلْتُ إِنَّ هَذَا قَرَأَ قِرَاءَةً أَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ وَدَخَلَ آخَرَ فَقَرَأَ سِوَى قِرَاءَةِ صَاحِبِهِ وَأَمَرَهُمَا النَّبِيُّ ﷺ فَقَرَأَ فَحَسَنَ شَأْنَهُمَا

فَسَقَطَ فِي نَفْسِي مِنَ التَّكْذِيبِ وَلَا اِذْ كُنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَلَمَّا رَأَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا قَدْ عَشَيْتُنِي صَرَبَ فِي صَدْرِي فَصَيْتُ عَرَقًا وَكَانَمَا انْظُرُ اِلَى اللَّهِ فَرَقًا فَقَالَ لِي يَا اَبِي اُرْسِلْ اِلَيَّ اَنْ اَقْرَأَ الْقُرْآنَ عَلَيَّ حَرْفٍ فَرَدَدْتُ اِلَيْهِ اَنْ هَوْنٌ عَلَيَّ فَرَدَّ اِلَيَّ التَّانِيَةَ اَقْرَأْ هُ عَلَيَّ فَرَدَّ اِلَيَّ التَّالِيَةَ اَقْرَأْ هُ عَلَيَّ سَبْعَةَ اَحْرَفٍ وَكَذَلِكَ بِكُلِّ رَدَّةٍ رَدَدْتُهَا مَسْأَلَةً تَسْأَلْنِيهَا فَقُلْتُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَامْتِي اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَامْتِي وَاخْرَتُ التَّالِيَةَ يَوْمَ يَرْغَبُ اِلَى الْخَلْقِ كُلّٰهُمَّ حَتَّى اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۵۶۱/۱ حديث رقم (۲۷۳ - ۸۲۰)۔ واحمد في المسند ۱۲۴/۵۔

ترجمہ: حضرت ابی ابن کعبؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص وہاں آیا اور نماز پڑھنے لگا اس نے نماز ہی میں یا نماز کے بعد ایسے انداز سے قراءت پڑھی کہ میں نے اسے درست نہیں سمجھا پھر دوسرا آدی آیا اور اس نے پہلے شخص کے خلاف طریقہ (یعنی دوسرے انداز سے) سے قراءت پڑھی جب ہم سب نماز سے فارغ ہو چکے تو نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے میں نے عرض کیا کہ حضرت، اس شخص نے ایسی قراءت پڑھی ہے جسے میں نے درست نہیں سمجھا اس کے بعد یہ دوسرا شخص آیا اس نے پہلے شخص کے خلاف طریقہ یعنی برعکس سے قراءت پڑھی! نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر دونوں کو اپنے سامنے قرآن پڑھنے کا حکم دیا ان دونوں نے پڑھا آپ ﷺ نے ان دونوں کی قراءت کی تحسین و توثیق کی (یعنی سراہا) یہ دیکھ کر میرے دل میں اس بات کی تکذیب کا دوسوہ پیدا ہو گیا ایسا دوسوہ اور شبہ جو ایام جاہلیت میں پیدا نہیں ہوا تھا جب نبی کریم ﷺ نے میری یہ کیفیت دیکھی جو مجھ پر طاری تھی یعنی جب نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ میرے دل میں تردد و شبہ پیدا ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا تا کہ اس کی برکت سے دوسوہ ختم ہو جائے چنانچہ میں پسینے سے شرابور ہو گیا اور خوف کی وجہ سے میری ایسی حالت ہو گئی کہ گویا میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اس کے بعد آپ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ ابی! جب قرآن نازل ہوا تو میرے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ یہ حکم بھیجا گیا کہ میں ایک طریقہ یعنی ایک قراءت یا ایک لغت پر قرآن پڑھوں میں نے بارگاہ الوہیت (یعنی اللہ کے حضور) میں درخواست پیش کی کہ میری امت پر آسانی فرمائی جائے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ مجھے یہ حکم دیا گیا کہ میں دو قراءتوں پر قرآن پڑھوں! میں نے پھر درخواست پیش کی کہ میری امت کو مزید آسانی عطا فرمائی جائے چنانچہ تیسری مرتبہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کریم کو سات لہجوں میں سے یعنی سات لغات یا سات قراءت کے مطابق پڑھوں اور یہ بھی فرمایا گیا کہ جتنی مرتبہ ہم نے آپ ﷺ کو حکم دیا اتنی ہی مرتبہ آپ ہم سے دعا مانگئے ہم اسے قبول کریں گے چنانچہ میں نے اللہ کے دربار میں دو مرتبہ یہ دعا کی کہ اے اللہ میری امت کو بخش دے اے اللہ میری امت کو بخش دے اور تیسری دعا میں نے اس دن کے لئے رکھ چھوڑی ہے جس دن مخلوق مجھ سے سفارش و شفاعت کی خواہش کرے گی یہاں تک کہ حضرت ابراہیم بھی مجھ سے شفاعت کی رغبت کریں گے۔“

تشریح: وعن ابی بن کعب قال كنت في المسجد فدخل رجل يصلی : جمله مستأنف ہے یا حالہ ہے۔

فقراً قراءتہ : یعنی اپنی نماز میں یا نماز کے بعد۔

انکر تھا علیہ : یعنی دل میں یا زبان سے۔

ثم دخل آخر فقراً قراءتہ سوی قراءتہ صاحبہ : یعنی اس پر بھی میں نے تنکیر کی۔ انکار کیا۔

فلما قضينا الصلاة : یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ابی بن کعب بھی نماز میں تھے اور ظاہر ہے کہ وہ چاشت کی نماز تھی یا اس کے علاوہ کوئی نقلی نماز تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی تقدیری عبارت ہو: ”فلما قضينا جميعاً الصلاة المفروضة التي حضرنا لاجلها“۔ کہ جب ہم سب اس فرض نماز سے فارغ ہوئے جس کے لئے ہم حاضر ہوئے تھے۔ اور پہلا معنی اس کی تائید کرتا ہے، جو کہ نسخہ میں ہے، یعنی جب فلما قضينا الصلاة ہم نماز سے فارغ ہوئے۔

دخلنا جميعاً : یعنی ہم سب یا جمع ہوئے تھے وہ سب۔

علی رسول اللہ ﷺ : یعنی مسجد میں اپنی نماز کی مخصوص جگہ پر یا آپ کے حجروں میں سے کسی حجرے میں۔

فقلت: ان هذا لما دخل المسجد قرأ قرآناً نكروها عليه ودخل آخر فقراً سوى قراءة صاحبه : یعنی میں نے اس پر بھی تکمیر کی جیسا کہ کلام کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے۔

فامرهما النبي ﷺ فقراً : تشبیہ کے لفظ کے ساتھ، یعنی ان دونوں نے۔

فحسن شأنهما فسقط في نفسي من التكذيب : سید جمال الدین فرماتے ہیں: مشکاة کے اکثر نسخوں میں مجہول کا صیغہ ہے، لیکن ہمارے سماع کے مطابق صحیح مسلم کی روایت میں فعل معروف کا صیغہ ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول اس کی تائید کرتا ہے، جو مصابیح کے شارحین نے نقل کیا ہے۔ ابن الملک وغیرہ کی طرح یعنی مجہول کے صیغہ کی اور فی المعنی یہ صحیح ہے جیسا کہ عنقریب آپ کے سامنے واضح ہو جائے گا، پس روایت اور روایت میں مطابقت ہو جائے گی، اور علامہ ابن حجر دوسرے قول کے قائل ہیں، کیونکہ انہوں نے فرمایا کہ: ای وقع في خاطري امر عظيم لا اقدر على وصفه، یعنی میرے نفس میں ایک بہت بڑی بات پیدا ہو گئی۔ جس کی صفت بیان کرنے پر میں قدرت نہیں رکھتا اور فاعل معلوم کو حذف کرنا جائز ہے۔ کے خیال سے کنایہ میں دل کو معانی میں استعمال ہے، اجسام کے سقط کے ساتھ جو مستعمل ہیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ دل پر سخت اور ثقیل ہیں۔

اور اگر زیادہ کیا جائے اور کہا جائے: اس خاطر کا سقوط غیر اختیاری ہے۔ اہل صل و عقد کے ہاں بروزن اعتبار حسن ہوگا۔ سقط کے لئے۔ طبری فرماتے ہیں: بعض نسخوں میں سقط مجہول کا صیغہ ہے یعنی پشیمان ہوئے۔ پس تدبر کیجئے۔ پس اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اھ۔ گویا کہ ابی بن کعب کو وہم ہوا کہ ان کا قول شاید جھوٹ پر مبنی ہے، کہ آپ علیہ السلام نے انکار کیا ہے اس سے۔ پس تدبر کیجئے۔

ولا اذ كنت في الجاهلية : طبری فرماتے ہیں: کہ یعنی میرے دل میں نبی علیہ السلام کی تکذیب کا کھٹکا پیدا ہوا کہ انہوں نے دونوں کی قراءت کو صحیح کہہ دیا، جیسے میں اسلام سے قبل تکذیب کرتا تھا۔ کیونکہ اسلام سے قبل وہ غافل تھے یا شک میں تھے اور اس حالت کو بڑا اس لئے سمجھا کیونکہ دین کے معاملہ میں جو ان کو شک داخل ہوا تھا تو وہ یقین کے ساتھ تھا۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ سقط کا فاعل محذوف ہے یعنی میرے دل میں ایسی تکذیب کا کھٹکا پیدا ہوا، جس کی صفت بیان کرنے کی میں قدرت نہیں رکھتا۔ اور میں نے اس کی مثل پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا اور نہ ہی میں نے اس جیسی کوئی چیز پائی، جب کہ میں جاہلیت کے دور میں تھا اور ابی بن کعب اکابرین صحابہ میں سے تھے، اور جو چیز ان کے دل میں کھٹکی تھی وہ شیطان کا کچوکھا تھا، پس جب ان کو نبی علیہ السلام کے ہاتھ مبارک کی برکت پہنچی تو ان سے غفلت اور انکار زائل ہو گئی۔ اور وہ گویا ایسے ہو گئے جس طرح اس جگہ پر حاضر اور مشاہدہ کیا اور اس میں ابن الملک بھی اسی قول کے قائل ہیں۔ اور فرماتے ہیں: میں نے مکمل اور پہچان کے بعد اس کی اتباع کی ہے۔ اور ان دونوں کے کلام کا حاصل نعوذ باللہ آپ کی تکفیر ہے، اور یہ قبیح حرکت اور بہت بڑی جرأت ہے۔

جب کسی کی عبارت ننانوے وجوہات کے لحاظ سے کفر پر محمول ہوگی، اور ایک وجہ اس کے خلاف ہو، اس کے متعلق جائز نہیں کہ اس

پر اترنا دکھ لگائیں۔ چنانچہ ایک اس بات پر حکم لگائیں جو صحابہ کرامؓ سے وارد ہوا اور جو قراءت کے بارے میں اکمل تھے اللہ کی توفیق کے ساتھ اس کے ہاتھ میں تحقیق کی لگام ہے۔

لفظ "سقط" اللہ تعالیٰ کے فرمان میں: ﴿وَلَمَّا سَقَطَ فِي أَيْدِيهِمْ﴾ [الاعراف: ۱۴۹] ضمہ کے ساتھ قراءت متواترہ سے ثابت ہے۔ روایت حدیث کو ان دونوں کے درمیان مطابقت پر محمول کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿فِي أَيْدِيهِمْ﴾ [الاعراف: ۱۴۹] اور آپ کا فرمان: "فِي نَفْسِي" ایک ہی معنی میں ہے۔ چونکہ اکثر نے "ایدی" کو نفس سے تعبیر کیا ہے، وگرنہ قرآن کی بلاغت اور اس کی فرقیاتی فصاحت انتہاء درجہ کی بلندی کو پہنچ چکی ہے۔ اور اس کو عبارت حسنٰی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قاضیؒ کہتے ہیں: یہ ان کی سخت ندامت و حسرت سے اشارہ ہے، حسرت کرنے والا اپنے ہاتھ کو غم کی وجہ سے کاٹے گا، پس اس کا ہاتھ اس میں ستوٹ ہو جائے گا۔ "سقط" کوئی علی الفاعل پڑھا گیا ہے۔ بمعنی کہ اس میں ہاتھ کو چبانا واقع ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کے نفسوں میں ندامت چھا جائے گی۔

قاموس میں ہے کہ "سقط" "وقع" کے معنی میں ہے، ضمہ کے ساتھ ندامت اور حیرانگی کے معنی میں ہے۔ ایسی ندامت جو اسلام میں اس کی مثل نہیں، فتح والی روایت کے مطابق اس کا معنی ان دونوں کی قراءت کی تکذیب پر میرے نفس میں ندامت واقع ہے اور عاقل صرف اس کی نفی کرتا ہے جو عقل اور نقل کے منافی ہو۔ جب "صادق المصدق علی اللہ" نے خبر دی ہے کہ وہ دونوں صحیح ہیں۔ تو اس جیسا سب کیسے درست ہے، جو ثابت شدہ نبوت جو معجزات سے ظاہر ہے اس میں شک کا باعث ہو۔

پھر میں نے دیکھا ابن حجرؒ نے میری موافقت کی ہے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ واؤ عطف کے لئے ہے اور معطوف علیہ منفی ہے اور ان لا اس نفی کی تاکید کے لئے ہے جیسے "ولا غریبہ"۔ ولا اذ کنت مخذوف مصدر کی صفت ہے، چونکہ واؤ عاطفہ مانع ہے، اور حال بنا بھی جائز ہے کیونکہ وہ تکلف سے بعید ہے۔

اس میں ہے کہ اس کا کلام وہم والا ہے، اس کا کہ قرآن کی تکذیب واقع ہوئی ہے اور حالانکہ ایسا نہیں ہے چونکہ قراءت تو اتر سے ثابت نہیں ہے۔ اس کا انکار قرآن کی تکذیب نہیں ہے گویا کہ اس کی مراد تکذیب کی صورت ہے حقیقتاً نہیں۔ باوجودیکہ یہ قلبی خطرات ہیں، چونکہ اس میں واقع ہو جانے والا معذور ہے۔ یہ نوویؒ کے قول کا معنی ہے۔ اس کا معنی ہے: شیطان نے میرے لئے تکذیب کا دوسوہ ڈالا اتنا سخت کہ میں اس کے متعلق لاعلم تھا۔ چونکہ جہالت میں وہ غافل اور شک میں تھا اس وقت شک یقین میں بدل گیا، اھ۔ گویا کہ ان کی مراد شک کا داخل ہونا دوسوہ کے لحاظ سے رات کی طرح تھا، پھر ان کا پہلا کلام شک کے داخل ہونے سے دوسوہ لازم نہیں آتا، حصول اور تکرار کی وجہ پر۔ جیسا کہ ابن حجرؒ نے کہا ہے آپ اس پر غور و فکر اور تدبر کیجئے۔

فلما رأى رسول الله ما قد غشيتني : یعنی مجھ پر ندامت و خجالت کے آثار نمودار ہوئے جب رسول اللہ کو میرے دل کی کیفیت کا سبب معجزہ علم ہو گیا جو دوسوہ پیدا ہوا تھا۔

ضرب فی صدری : یا تو ادب سکھانے کے لئے یا اپنے ہاتھ کی برکت کے ساتھ دوسوہ کو ختم کرنے کے لئے یا زمی کے لئے اور، یا پھر حفظ کا ارادہ کرتے ہوئے، یا اس واقعہ کو یاد رکھنے کے لئے اور دوبارہ اس طرح کا کام نہ کرنے کے لئے۔

ففصنت : دوسری فاء مکسورہ ہے۔

عوقا : تمیز بن رہا ہے یعنی میرے سارے بدن سے پسینے چھوٹ گئے، آپ علیہ السلام کے سامنے شرمسار (شرم کرتے ہوئے) ہونے کی وجہ سے، اور اپنے عمل پر ندامت کی وجہ سے، نفس کے کھپانے کی وجہ سے اور حالت کے انعام کی وجہ سے۔

وکانما : ایک نسخہ میں فکانما ہے۔

أنظر الى الله فرقا : یعنی خوف کی وجہ سے، اس کے بارے میں ایک قول ہے کہ یہ تمیز ہے لیکن زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ بوجہ مفعول لہ منصوب ہے یعنی گویا کہ اپنے عمل پر خوف کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے پایا۔
فقال لی : یا اہی : یعنی تسلی دیتے ہوئے اور وضاحت و تیسیمین کی غرض سے۔
أرسل الی : فعل مجہول یعنی اللہ نے جبریل کو پیام دے کر بھیجا اور ایک نسخہ میں فعل معروف ہے، یعنی اللہ نے میری طرف پیغام بھیجا۔

أن أقرأ القرآن : امر کے صیغہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں فعل بھی معروف ہے صیغہ بھی متکلم کا۔ طیبی فرماتے ہیں : کہ ن تفسیر یہ ہے سیبویہ کے مذہب میں اس کے مصدر یہ ہونے کو بھی جائز کہا گیا ہے۔ اگرچہ امر پر ہی کیوں نہ داخل ہو۔
علی حرف : یعنی ایک ہی قراءت۔ (فرد دت : یعنی جبریل۔ الیہ : یا میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کر لی۔
أن ہون : یعنی آسانی کر، آسان و سہل کر۔

علی امتی : أن، مصدر یہ ہے، اور اس کا امر پر داخل ہونا صحیح ہے کیونکہ سیبویہ کے نزدیک اس پر داخل ہو سکتا ہے، یا تفسیر یہ ہے معنی قول کے رد میں۔ کہا جاتا رد الیہ جب لوٹائی جائے۔ اور رہا ابن حجر کا قول ای فقلت له قولاً متکراً، یعنی میں نے ان کو تکرار کے ساتھ کہا۔ تو ابن حجر کے اس قول پر نہ کوئی روایت دلالت کرتی ہے اور نہ کوئی روایت۔
فرد الی الثانية : رد، ماضی مجہول ہے یا معلوم ہے یعنی باری تعالیٰ نے دوسری مرتبہ وحی کی طرف لوٹا دیا۔
أقرأه : امر کا یا متکلم کا صیغہ ہے، اور وہ ان کے بغیر ہے جیسا کہ تصحیح شدہ نسخہ میں ہے۔ اس کے برعکس جس کو ابن حجر کی عبارت نے وہم میں ڈال دیا ہے۔

طیبی فرماتے ہیں : رد ہے اس کا جو یا تو مشاکلت کے راستے پر ہے، یا جو گزر چکا ہے آپ سے سوال جو قراءت کی کیفیت کے بارے میں تھا۔

اور رد سے مراد کلام کو لوٹانا اور جواب دینا ہے۔

علی حرفین : یعنی دو قسموں پر۔

فرد دت الیہ أن ہون علی امتی : یعنی آسانی کر اضافہ سے۔ فرد : دو وجوہوں کے ساتھ۔

الی الثالثة. أقرأه : دو حالتوں کے ساتھ۔ علی سبعة أحرف، ولك بكل ردة رد دتکھا :

مسألة تسألینہا : ابن الملک فرماتے ہیں : یہ جملہ صفت مؤکدہ ہے، یعنی قطعی طور پر مستجاب دعا ہے۔

اور طیبی فرماتے ہیں : یعنی مناسب ہے کہ تو مجھ سے اس کے بارے میں سوال کرے اور میں تیرا سوال پورا کر دوں۔

فقلت : اللهم اغفر لامتی : شاید کے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں۔

اللهم اغفر لامتی : یعنی صغیرہ گناہوں والوں کو۔

اور ابن حجر نے اس کے برعکس مفہوم بیان کیا ہے، یعنی پہلی بار سے اہل الصغائر اور دوسری بار سے اہل الکبائر مراد ہیں۔ اور شارح فرماتے ہیں : ضرورت مند آپ کے امت کے درجہ بدرجہ مغفرت میں منتقم ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے اطاعت میں حد سے گزرنے والے کے لئے استغفار کی، اور دوسری طرف ظالم کے لئے جو معصیت میں، حد سے گزرنے والا ہے یا پھر پہلی دعا خواص کے لئے کیونکہ ہر ایک

میں کوئی نہ کوئی کوتاہی ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ کے حقوق کے بارے میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿كَلِمًا لِّمَا يَقْضَىٰ مَا أَمْرَهُ﴾ ہرگز تم اس کے حکم کے تقاضے کے مطابق عمل نہیں کر سکتے۔

اور دوسری عام لوگوں کے لئے ہے یا پہلی دعا دنیا میں اور دوسری آخرت میں۔

واخوات العالفة: یعنی تیسری دعا اور وہ شفاعت کبریٰ ہے۔ لیوم: یعنی اس دن کی وجہ سے یا اس دن تک۔

یورغب: یعنی محتاج ہوتا ہے۔ الی: ی، مشدّد کے ساتھ۔ الخلق: یعنی مکلفین مراد ہیں۔

کلہم: جب یہ کہیں گے نفسی نفسی، یعنی ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔

حتیٰ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام: مرفوع ہے، کیونکہ اس کا عطف خلق پر ہے۔ اور اس میں تمام انبیاء پر ابراہیم علیہ

السلام کی عظمت کی دلیل ہے۔ اور ہمارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر فضیلت کی دلیل بھی ہے۔

۲۳۱۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ قَالَ أَقْرَأْنِي جِبْرِيلُ عَلَيَّ حَرْفٍ فَرَأَجَعْتُهُ فَلَمْ أَزَلْ أَسْتَزِيدُهُ

وَيَزِيدُنِي حَتَّىٰ انْتَهَىٰ إِلَيَّ سَبْعَةَ أَحْرَافٍ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ بَلَّغْنِي أَنَّ تِلْكَ السَّبْعَةُ الْأَحْرَافُ إِنَّمَا هِيَ فِي الْأَمْرِ

تَكُونُ وَاحِدًا لَا تَخْتَلِفُ فِي حَلَالٍ وَلَا حَرَامٍ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۳۴۸ - حدیث رقم ۴۹۹۱ - واملسم فی صحیحہ ۵۶۱۱/۱ حدیث رقم (۸۱۹/۲۷۲)

واحمد فی المسند ۲۶۴/۱

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”حضرت جبریل علیہ السلام نے

پہلی مرتبہ مجھے ایک قراءت یعنی ایک لہجہ پر قرآن پڑھایا پھر میں نے اپنی امت کی آسانی کے لئے اللہ کی طرف رجوع

کیا اور میں آسانی کے لئے مسلسل زیادتی طلب کرتا رہا جس کے نتیجہ میں مجھے زیادہ آسانی حاصل ہوتی رہی یہاں تک

کہ سات قراءتوں (یعنی سات لہجوں) تک نوبت پہنچ گئی اور یہ آخری فیصلہ دے دیا گیا کہ قرآن کریم سات لغات پر

پڑھا جاسکتا ہے اس حدیث کے راوی ابن شہاب زہریؒ کہتے ہیں کہ یہ بات مجھ تک تحقیقی طور پر پہنچی ہے کہ قراءت کے

یہ سات طریقے دینی احکام و امور میں متفق و متحد (یعنی دین کے معاملے میں ایک ہی ہیں) ہیں حلال و حرام میں ان سے

کوئی اختلاف واقعی نہیں ہوتا۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن ابن عباس قال: ان رسول الله ﷺ قال: اقراني جبريل على حرف واحد: یعنی پہلی بار۔

فراجمته: یعنی اللہ یا جبریل مراد ہیں۔

فلم أزل أستزیده: یعنی میں اللہ سے اور زیادہ طلب کرتا رہا، یا جبریل سے مطالبہ کرتا رہا کہ وہ اللہ سے اور زیادہ کا مطالبہ کریں

قبولیت کے بعد۔

ویزدنی، حتیٰ انتھی: یعنی زیادہ کا مطالبہ اور قبولیت یا قرآن کا معاملہ (حکم)۔

الی سبعة احرف: یعنی ان کے عطا کرنے تک۔

قال ابن شہاب: یعنی امام زہری۔

بلغنی أن تلك السبعة الأحرف: موصوف ہونے کی بناء پر منصوب ہے، اور اس کو اضافت کی بناء پر مجرور بھی کہا گیا ہے۔

انما هي في الأمر: یعنی فی الواقع اور نفس الامر میں۔ تکون: تانیث کے ساتھ اور مذکر بھی بولا جاسکتا ہے۔

واحدالا یختلف : دو وجہوں کے ساتھ۔

فی حلال ولا حرام : یعنی تمام کا مرجع معنی میں ایک ہی ہے۔ اور بے شک لفظ کا اختلاف اس کی ہیئت میں ہے اور رہا اختلاف مثبت منفی کا اور حلال و حرام کا تو یہ چیز قرآن میں جائز نہیں ہے، کیونکہ باری تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لَوْجِدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾ [النساء: ۸۲] ”اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہوتا تو ضرور وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔“

اور یہ قرآن جب ہے ہی اللہ کی طرف سے تو اس میں معمولی سا اختلاف بھی وہ نہ پائے۔ اور ابن شہاب زہری نے اس قول کے ساتھ مشہور قول کے رد کا قصد کیا ہے۔ کہ سات حروف سے مراد یہ ہے کہ قرآن سات حصوں میں نازل ہوا۔ کہنے والوں نے پھر اختلاف کیا ہے کہ وہ سات حصے کون سے ہیں؟ بعض نے کہا کہ امر، نہی، حلال، حرام، محکم، متشابہ اور مثالیں اور انہوں نے حاکم اور بیہقی کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے کہ: ”کانت الاوّل تنزل من باب واحد علی حرف واحد ونزل القرآن من سبعة أبواب علی سبعة أحرف زاجرا و امر و حلال و حرام و محکم و متشابہ و أمثال.“ پہلی کتاب سادہ ایک ہی دروازے سے نازل ہوتی تھیں، ایک ہی حرف پر، اور قرآن سات دروازوں سے نازل ہوا، سات حروف پر زاجر، امر، حلال، حرام محکم، متشابہ، أمثال۔ اور کچھ لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس سے مراد مذکورہ بالا حدیث مبارکہ میں موجود احکام مراد نہیں ہیں، کیونکہ سیاق ان کو ان پر محمول کرنے کا انکاری ہے۔ جب کہ اس سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دو لہجوں میں پڑھے یا تین میں حتیٰ کہ سات تک پڑھ سکتا ہے۔ آسانی اور سہولت کی خاطر اور ایک ہی چیز کسی آیت میں حلال اور حرام نہیں ہو سکتی اور اس چیز کو بعض لوگوں نے بڑی تاکید سے بیان کیا ہے اور کہا کہ جس نے اس طرح کی تاویل کی، تو وہ فاسد ہے۔ اور جن لوگوں نے اس قول کو ضعیف کہا ان میں ابن عطیہ بھی ہیں، فرماتے ہیں: کہ اس بات پر اجماع ہے کہ وسعت حلت کے بارے میں نہیں واقع ہوئی اور نہ ہی حرمت کے بارے میں وسعت ہے اور نہ ہی مذکورہ بالا معانی میں سے کسی کے بدلنے کے بارے میں وسعت ہے اور ماوردی نے بھی اس کی تصریح کی ہے اور ان کے علاوہ کئی ایک نے کہا ہے۔

فی الحدیث زاجر، : یہ استناف ہے یعنی قرآن ڈانٹنے والا بھی ہے اور حکم دینے والا بھی ہے اور اس کی تائید روایت میں زاجر کا منصوب ہونا ہے، یعنی ”نزل من سبعة أبواب علی سبعة أحرف، حال کونہ زاجرا“.....۔ زاجرا حال ہے۔ ابوشامہ فرماتے ہیں: یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ تفسیر ابواب کے لئے ہونے کے حروف کے لئے یعنی سبعة ابواب من ابواب الکلام و أقسامہ، یعنی قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ان قسموں پر نازل کیا کسی ایک قسم پر اقتصار نہیں کیا۔ قرآن کے علاوہ دوسری کتابوں کی طرح۔ اور وہ ظاہر اور واضح ہے۔ اور رہی بات فقہ کے اصولیین کی، کہ ان اقسام سے مراد مطلق اور مقید، خاص اور عام، نص اور مؤول، ناخ اور منسوخ اور مجمل اور مفسر اور استثناء اور اس کی اقسام ہیں۔ اور اگر قرآن میں موجود ہیں تو اس میں نازل ہوئی ہیں، اگر اس میں موجود نہیں ہی تو ان کو اختیار پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ اور مفہوم تبدیل ہو سکتا ہے اس وجہ سے حدیث میں وارد سبب سے اور قرآن وحدیث کے منطوق سے فاقر او ما تیسر من القرآن۔

اور اسی طرح جو کہ اہل لغت بیان کرتے ہیں کہ ان سے حذف اور وصل، تقدیم اور تاخیر، استعارہ اور تکرار، کنایہ اور حقیقت مجاز اور مرسل مفسر اور ظاہر اور غریب الفاظ مراد ہیں۔

اور اس قیاس پر جو کہ نحو یوں سے منقول ہے کہ اس سے مراد تذکیر و تانیث، اور شرط اور جزاء، گردان کرنا اور اعراب، قسمیں اور ان

زبان امالہ پر چلتی ہے، اور بعض کی زبان سے موٹے حروف کا تلفظ ہوتا اور ان میں کچھ ایسے ہیں کہ ان کی زبان پر ادغام یا اظہار غالب آ جاتے ہیں اور اسی طرح اور اس کے ساتھ ساتھ۔

منہم العجوز والشیخ والکبیر : اور یہ دونوں آدمی بڑھاپے کی وجہ سے دیکھنے سے عاجز ہیں۔

والغلام والجاریة : اور یہ دونوں چھوٹی عمر کے ہیں ان کیلئے قرآن ممکن نہیں۔ والرجل : یعنی ان میں سے متوسط آدمی بھی ہے۔

الذی لم یقرأ کتابا قط . قال : یعنی دہرائی کرنے کے بعد۔

یا محمد ان القرآن أنزل علی سبعة أحرف : یعنی سات لغتوں پر، پس ہر ایک اس طرح پڑھے جیسے اس کو آسان ہو اور اس سے قراءت میں ترکیب اور توڑنے کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن محققین نے ایک ہی نفس میں نبی تنزیہی کی وجہ سے روکا ہے۔ اور اسی طرح انہوں نے کہا اس سے منع کرنے کا جس سے معنی تبدیل ہو جائے یہ نبی تحریمی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ابی کی روایت جبریل سے اس اجمال پر اس سے روایت بالمعنی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ابی نے نبی علیہ السلام سے سنا اور رسول اللہ ﷺ جبریل سے نقل کرتے ہیں، جس کے بارے میں تفصیل گزر چکی ہے۔ کہ ہمیشہ زیادہ کا مطالبہ کرتے رہے حتیٰ کہ سات تک پہنچ گئے۔ یہاں پر اس کا حاصل ہے۔ پس بے شک وہ زیادہ کا مطالبہ کرنے کے بعد سات حروف پر نازل ہوا، اور اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے جب جبریل علیہ السلام سے ذکر کیا جو کہ حدیث میں ہے کہ فرماتے ہیں: ”ان القرآن نزل من اللوح المخفوظ الی بیت العزرة علی سبعة أحرف لكنها متوقفة علی سؤالک فسألها واحدا بعد واحد حتی تعطاها کلها“۔ بے شک قرآن لوح محفوظ سے بیت العزرة کی طرف سات حروف پر نازل ہوا لیکن آپ کے سوال پر موقوف ہے، پس ایک کے بعد دوسرا سوال کریں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ آپ پر ساری قراءتیں نازل کر دے۔

وفی رواية لاحمد وأبی داؤد قال : یعنی جبریل نے الأحرف کے بعد یعنی یہ قول کہنے کے بعد کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا۔

لیس منها : یعنی ان حروف میں سے کوئی حرف نہیں ہے۔

الاشاف : یعنی فہم مقصود میں مریض کے لئے۔

وکاف : بلاغت کے اظہار میں معجزے کے لئے ہے۔ ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ شاف یعنی معنی میں اتفاق کی وجہ سے مؤمنوں کے سینوں کو شفا بخشنے والا ہے۔ اور نبی علیہ السلام کی صداقت پر دلیل کے طور پر کافی ہے۔

وفی رواية للنسائی قال : ان جبریل ومیکائیل أتیانی فقعده جبریل عن یمینی ومیکائیل عن یماری فقال :

یعنی مجھے۔

جبریل اقرأ القرآن علی حرف : قال میکائیل استزده : یعنی قرآن کی قراءت کی زیادتی (یعنی تعداد میں) طلب کر ایک حرف پر اللہ سے یا جبریل سے کہ وہ اللہ کے حضور آپ کے مطالبہ کو پیش کریں، تم مسلسل یہی کہتے رہے۔ اور وہ زیادہ کا مطالبہ کرتے رہے، اور ان کو جواب دیا جاتا رہا یعنی ان کی بات سنی جا رہی۔

حتى بلغ سبعة أحرف، فکل حرف شاف : یعنی مؤمنوں کے لئے مطلوب کے اثبات میں۔ کاف : کافروں پر جنت

کے لئے۔

قرآن پڑھ کر لوگوں سے مانگنا منع ہے

۲۲۱۶: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّهُ مَرَّ عَلَى قَاصٍ يَقْرَأُ ثُمَّ يَسْأَلُ قَاصِمًا قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَلَيْسَ سَأَلَ اللَّهَ بِهِ فَإِنَّهُ سَيَجِيءُ أَقْوَامٌ يَقْرَأُونَ الْقُرْآنَ يَسْأَلُونَ بِهِ النَّاسَ - (رواه احمد والترمذی) اخرجہ الترمذی فی السنن ۱۶۴/۵ حدیث رقم ۲۹۱۷ - واحمد فی المسند ۴۳۲/۴ -

ترجمہ: ”حضرت عمران بن حصینؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ ایک مرتبہ واعظ کے پاس سے گزرے جو قرآن کریم پڑھتا تھا اور لوگوں سے سوال کرتا تھا۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا، پھر انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے ذریعہ اللہ ہی سے مانگے اور وہ وقت آنے والا ہے جب لوگ قرآن کریم پڑھیں گے اور اس کے ذریعہ (یعنی اس کے عوض) دوسروں کے آگے (دست سوال) دراز کریں گے۔“ (احمد و ترمذی)

تشریح: وعن عمران بن حصین أنه مر علی قاص: صاکی تشدید کے ساتھ یعنی جو قصہ کہانیاں بیان کرتا ہے، قصہ گو۔ یقرأ: یعنی قرآن کو یہ حال بنتا ہے یا الگ جملہ استنافیہ ہے۔

ثم یسأل: یعنی ان سے رزق وغیرہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ فاسترجع: یعنی عمران نے کہا ان اللہ وانا الیہ راجعون، کیونکہ یہ بدعت ہے اور واضح نافرمانی اور قیامت کی نشانی ہے۔ ثم قال: یعنی عمران نے۔

سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من قرأ القرآن فلیسأل اللہ به: یعنی دنیا اور آخرت کے متعلقہ معاملات میں سے جو چاہے وہ قرآن کے ذریعے اللہ سے ہی مانگے، نہ کہ لوگوں سے، یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب آیت رحمت پڑھے تو اللہ سے رحمت کا سوال کرے اور عذاب و سزا کی آیت پر سے گزرے تو اس سے اللہ کی پناہ کا مطالبہ کرے اور یا یہ کہ تلاوت کے بعد اذیعیہ ماثورہ کے ذریعے باری تعالیٰ سے دعا مانگے اور یہ بھی زیادہ لائق ہے کہ آخرت کے امور سے متعلقہ دعا کرے اور مؤمنوں کی معیت اور ان کی آخرت کی اصلاح کے بارے دعا کرے۔

فانه: یعنی ضمیر شان سیجی اقوام یقرأون القرآن یسألون بہ الناس: یعنی زبان کے ساتھ کہہ کر، یا اپنی حالت بیان کر کے۔

الفصل الثالث:

۲۲۱۷: عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ يَتَاكَلُ بِهِ النَّاسَ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهُ عَظُمَ لَيْسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ - (رواه البيهقي في شعب الایمان)

اخرجہ البيهقي في شعب الایمان ۵۳۲/۲ حدیث رقم ۲۶۲۵ -

ترجمہ: ”حضرت بریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص قرآن کریم اسلئے پڑھتا کہ اس کے ذریعہ لوگوں سے کھائے تو وہ قیامت کے دن اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرہ پر صرف ہڈیاں ہوں گی اور گوشت کا (نام و نشان) بھی نہ ہوگا۔“

تشریح: عن بریدة قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قرأ القرآن يتاكل به الناس: یعنی اس کے ذریعے لوگوں سے کھانا مانگے۔ طیبی فرماتے ہیں: يتاكل بمعنى يستاكل ہے جیسے تعجل بمعنى استعجل ہے، اور ”به“ میں باء آلہ کے لئے یعنی ان کے

مالوں کو اخذ کرنے کا ذریعہ بنائے۔

جاء يوم القيامة و وجهه عظم ليس عليه لحم : اس کو اشرف الاعضاء بنایا گیا اور اوڑھنے کا ذریعہ۔ قیامت کے دن نہایت قبیح صورت میں ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں: مردار کو گانے بجانے والے آلات کے ذریعے کھینچنا۔ مردار کو قرآن کے ذریعے کھینچنے سے بہت کم گناہ ہے اور بعض روایتوں میں ہے کہ: ”من طلب بالعلم المال كان كمن مسح أسفله مداسه ونعله بمحاسنه لينظفه“۔ جو علم کے ذریعے مال کو طلب کرے، وہ اس شخص کی طرح ہے جو اپنے محاسن کی غرض سے اپنے جوتے کو اپنی پگڑی سے صاف کرنے کے لئے رگڑے۔

حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: کہ رسیوں پر کھیلنے والا مداری، ان علماء سے بدرجہا بہتر ہے جو مال کی طرف مائل ہوتے ہیں کیونکہ مداری دنیا کو دنیا کے بدلے کماتا ہے اور کھاتا ہے، جب کہ یہ بد بخت دنیا کو دین کے ذریعے کھاتے ہیں۔ ان پر اللہ کا یہ فرمان بالکل صادق آتا ہے: ﴿اولئك الذين اشتروا الضلالة بالهدىٰ فما ربحت تجارتهم وما كانوا مهتدين﴾ [البقرة: ۱۶۵] ”یہ لوگ ہیں جنہوں کے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خرید لیا، پس ان کو ان کی تجارت نے ذرہ بھی فائدہ نہ دیا اور نہ ہی وہ ہدایت یافتہ ہیں۔“

علامہ شاطبی نے قرآن سبچہ اور ان کے رواۃ کی مدح اپنے ان الفاظ میں کی:

تخبرهم نقادهم كل بارع ☆ وليس على قرآنه متاكلا
۲۲۱۸: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَعْرِفُ فَصْلَ السُّورَةِ حَتَّىٰ يَنْزِلَ عَلَيْهِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۹۹/۱ حدیث رقم ۷۸۸۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک سورت سے دوسری سورت کا فرق نہیں کر پاتے تھے (یعنی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا) یہاں تک کہ آپ ﷺ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوتی۔“ (ابوداؤد)

تشریح: وعن ابن عباس قال: كان رسول الله ﷺ لا يعرف فصل السورة: فصل، بغير نقطه کے صاد کے ساتھ ہے، یعنی اس کا جدا ہونا اور مکمل ہونا یا دوسری سورت سے علیحدہ ہونا۔

حتى ينزل ”بسم الله الرحمن الرحيم“ [الفاتحة: ۱]: ہمارے اصحاب نے اس کے ساتھ اس طرح تعلق بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: کہ بسم اللہ ایک آیت ہے جو فصل کے لئے نازل ہوئی۔ اور حدیث کا ظاہر بھی یہی ہے کہ انزال مکرر ہے (یعنی کئی بار نازل ہونے سے تکرار ہو گیا)۔ اور اس میں کوئی قابل احترام نہیں ہے۔ بلکہ تکرار اسکی فضیلت پر دلالت کرتا ہے، یعنی اس قول سے فاتحہ کا نازل ہونا۔ طیبی فرماتے ہیں: یہ حدیث اور کچھ آگے آنے والی حدیث جو کہ باب کے آخر میں ہے، دونوں حدیثیں اس پر واضح دلیل ہیں کہ بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہے اور اس کے تکرار سے نزول کی وجہ سورتوں کے مابین فصل ہے۔

میں کہتا ہوں: ان دونوں حدیثوں میں کوئی دلیل نہیں، نہ ہی جزئیات کے طریق پر اور نہ کلی طور پر بلکہ اس میں اجمالی دلیل ہے کہ یہ آیات قرآن میں سے ہے اور فرقان حکیم کا ٹکڑا ہے۔ بلکہ باقلانی نے کہا ہے کہ اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ بسم اللہ قرآن نہیں ہے، یہ تو صرف دوسورتوں کے درمیان فصل کرنے والی ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت ہے کیونکہ یہ بھی نازل ہونے کی صفت سے متصف ہے، اور شاید کہ امام غزالی نے اسی لئے کہا ہے:

کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا، بلکہ اس کو مسترد کر دے گا اور اس کو ضعیف قرار دے گا۔ لیکن یہ کسی سورت کے متعلق نہیں ہے یعنی کسی سورت کا حصہ نہیں ہے سوائے سورۃ نمل کے، اور اس کی دلیل سورۃ توبہ کی ابتداء میں بسم اللہ کا نہ ہونا ہے۔ علیؑ سے مروی ہے کہ ”بسم اللہ آیت رحمت ہے اور سورۃ توبہ برأت اور قائل کو متضمن ہے، اور شاطیٰ کے قول کا بھی یہی مطلب ہے۔

اور رہا ابن حجرؒ کا قول کہ اس سے جو کہ ہمارے مذہب پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ صحیح ترین قول کے مطابق ہمارے نزدیک ہر سورت کی مکمل آیت ہے، سوائے سورۃ توبہ کے اور اس پر اجماع ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث کے مطابق جو کہ انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ اچانک آپؐ پر اونگھ طاری ہوئی لفظ اونگھ کے بعد آپؐ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا تو ہم نے کہا اے اللہ کے نبی! آپؐ کو کس بات نے ہنسیا ہے؟ تو آپؐ علیہ السلام نے فرمایا: ابھی ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپؐ نے تلاوت فرمائی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾ اِنَّا اعطینکَ الْکُوْثُرَ [الکُوْثُرُ: ۱] الی آخر السورۃ.

اور اس میں یہ ہے کہ یہ مطلوب پر کوئی دلالت نہیں کرتی کیونکہ آپؐ علیہ السلام کا اس کی قراءت بسم اللہ سے شروع کرنا سورۃ کی فضیلت کا اظہار ہے یا بسم اللہ کے ساتھ برکت حاصل کرن کی وجہ سے تھانہ کہ اس سے یہ دلیل اخذ ہوتی ہے کہ یہ سورۃ کا حصہ ہے۔ اس سے سمجھتے ہو کہ یہ ہر سورت کے شروع میں مکمل آیت ہوتی ہے، پھر فرمایا کہ: انہی یعنی انسؓ سے بخاری کی حدیث جو کہ پیچھے گزر چکی ہے کہ انسؓ سے رسول اللہ کی قراءت کے بارے سوال کیا گیا۔ تو انسؓ نے فرمایا کہ ”کانتم مدا ثم قرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم: بسم اللہ ویمد الرحمن ویمد الرحیم“ آپؐ کی قراءت مد والی ہوتی تھی پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر سنائی، بسم پر مد کرتے اور الرحمن کو بھی لمبا پڑھا اور الرحمن پر بھی مد کی، اہ۔

اور جمہور کے نزدیک یہ فصل کے لئے ہے۔ اور جان لو! کہ بسم اللہ کا انکار کرنے والا کافر نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس کے اثبات والا اجماع کے ساتھ اس کے برعکس جو دونوں طرفوں میں اس کے بارے مغالطہ کا شکار ہو گیا۔ اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک شخص کا مکالمہ

۲۲۱۹: وَ عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ كُنَّا بِحِمصَ فَقَرَأَ ابْنُ مَسْعُودٍ سُورَةَ يُوْسُفَ فَقَالَ رَجُلٌ مَّا هَلْ كُنَّا اَنْزَلْتُمْ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ وَاللّٰهِ لَقَرَأْتُهَا عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اَحْسَنْتْ فَبَيْنَا هُوَ يَكْتُمُهُ اِذْ وَجَدَ مِنْهُ رِيْحَ الْخَمْرِ فَقَالَ اَتَشْرَبُ الْخَمْرَ وَتَكْتُمُ بِالْكِتَابِ فَضَرَبَهُ الْحَدَّ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۷/۹۔ حدیث رقم ۵۰۰۱۔ ومسلم فی صحیحہ ۵۰۱/۱ حدیث رقم (۲۴۹ - ۸۰۱)۔
واحمد فی المسند ۳۷۸/۱۔ ف

ترجمہ: ”حضرت علقمہؓ کہتے ہیں کہ ہم ”حمص“ ملک شام میں مقیم تھے وہیں ایک مرتبہ ابن مسعودؓ نے سورت یوسف کی تلاوت سنی تو ایک شخص نے ان کی تلاوت سن کر کہا کہ یہ سورت اس طرح نازل نہیں کی گئی ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! میں نے یہ سورۃ اسی طرح نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پڑھی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اسے سن کر فرمایا کہ تم نے بہت خوب پڑھا،“ وہ شخص جب حضرت ابن مسعودؓ سے گفتگو کر رہا تھا تو اچانک حضرت ابن مسعودؓ نے اس کے منہ سے شراب کی بو محسوس کی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے فرمایا کیا تم شراب پیتے ہو؟ یعنی قرآن کے خلاف عمل

کرتے ہو اور اس پر طرہ یہ کہ قرآن کریم (یعنی اس کی قراءت کو یا قراءت کے لہجہ و طرز ادا کی کو جھٹلاتے بھی ہو) پھر حضرت ابن مسعودؓ نے اس پر حد جاری کی (یعنی شراب پینے کی سزا کے طور پر اسے کوڑے مارے۔) (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن علقمة: جلیل القدر تابعی ہیں۔

قال كنا بحمص: جاءه كسرہ اور ميم ساكن کے ساتھ، اور یہ غیر منصرف ہے لیکن کبھی منصرف بھی ہو جاتا ہے، اور ملك شام کا ایک شہر ہے۔

فقراً ابن مسعود سورة يوسف وقال رجل: ما هكذا أنزلت: یعنی یہ سورت یا قرآن۔
فقال عبد الله والله لقرأتها على عهد رسول الله ﷺ: یعنی آپ کے زمانے میں اور مجھ پر کسی نے بھی تکمیر نہیں کی، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے پڑھی تھی اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: علی عهد سے مراد یعنی کہ آپ علیہ السلام کی موجودگی میں اور آپ علیہ السلام سن رہے تھے۔
فقال: یعنی نبی علیہ السلام نے۔

أحسننت: یعنی تو نے ترتیل و تجوید وغیرہ کا خیال رکھتے ہوئے قراءت کی اور یہ اس کی عظیم منقبت ہے انہوں نے اس کو فخر کی وجہ سے نہیں بیان کیا بلکہ اللہ کی نعمت کے طور پر بیان ہے اور اللہ کے دشمنوں پر رحمت قائم کرنے کے لئے۔
فبینا: ایک دوسرے نسخہ میں فبینما ہے۔

هو: یعنی ابن مسعود۔
یکلمه: یعنی اس آدمی سے اور اس کا الٹ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی ابن مسعود سے کلام کرنے لگا۔ اذ وجد: یعنی ابن مسعود نے۔

ريح الخمر. فقال: اشرب الخمر: یعنی کیا تو قرآن کے معانی اور حکم کی مخالفت کرتا ہے۔
وتكذب بالكتاب؟ اس کو پڑھنے یا اس کے حقوق کی ادائیگی میں۔
فضربه الحد: یعنی ان کے نگران ہونے کی وجہ سے۔

طبی فرماتے ہیں: اور یہ تغلیط ہے کیونکہ کتاب اللہ کی تکذیب کفر ہے، اور قراءت کا انکار کلمہ کے جوہر میں کفر سے کم ہے اسی لیے اُس پر شراب کی حد جاری کی نہ کہ ارتداد من الدین کی حد کا نفاذ کیا۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف قول پر مبنی ہے کیونکہ اداء والی روایات متواتر نہیں۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ جس پر قرآن نے اجماع کر لیا وہ مطلقاً متواتر ہی ہوگی۔ اور اس کا منکر زمرہ کفر میں آجائے گا۔ جی ہاں! یہ احتمال بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے جس کا انکار کیا اس وقت اس جہت سے متواتر نہ ہوئی ہو، تو وہ اس کے ساتھ کفر نہیں ہے، اگرچہ آپ علیہ السلام سے صحیح بات ہو کہ آپ نے اس کو پڑھا ہے۔

پھر حدیث کے ظاہر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے شراب کی بوکی بناء پر اس پر حد جاری کی، اور یہ ایک جماعت کا مذہب ہے، جب کہ ہمارا مذہب اور امام شافعیؒ کا مذہب اس کے برعکس ہے، کیونکہ صرف بد بو سے حد نہیں لگا جاسکتی کیونکہ ایسی بد بو دوسری بعض چیزوں میں بھی ہوتی ہے جیسے کہ خراب سبب اور اسی طرح بہی دانہ یہ بھی شراب کی بوکی مانند ہوتے ہیں، اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے اسے شراب زبردستی پلائی گئی ہو یا مجبوری کی حالت میں، اور صحیح حدیث میں موجود ہے کہ: "ادروا الحدود بالشبهات"۔

حدود کوشہات کی وجہ سے جاری نہ کرو۔ شاید کہ اس نے اقرار کر لیا ہو یا اس کی کسی نے گواہی دی ہو یا پھر حد سے مراد تعزیر ہو۔ اور کلام کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ آپ نے اس پر تعزیر نہیں لگائی، بلکہ حد لگائی، جیسا کہ ان کا قول: ما ہکذا انزلت تھا، کیونکہ حق تو این مسعود کا تھا غیر القرآن کی قراءت کی نسبت جو ان کی طرف تھی، تو اس کے حق سے درگزر فرمادیا۔

قرآن پاک جمع کرنے سے پہلے پھر کھجور کی چھال وغیرہ پر موجود تھا

۲۲۲۰: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ ارْسَلَ إِلَيَّ أَبُو بَكْرٍ مَقْتَلًا أَهْلَ الْيَمَامَةِ فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عِنْدَهُ قَالَ أَبُو بَكْرٍ إِنَّ عُمَرَ آتَانِي فَقَالَ إِنَّ الْقَتْلَ قَدْ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِقِرَاءِ الْقُرْآنِ وَإِنِّي أَحْسَىٰ إِنْ اسْتَحَرَّ الْقَتْلَ بِالْقِرَاءِ بِالْمَوَاطِنِ فَيَذُوبُ كَثِيرٌ مِنَ الْقُرْآنِ وَإِنِّي أَرَىٰ أَنْ تَأْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْآنِ قُلْتُ لِعُمَرَ كَيْفَ تَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ عُمَرُ هَذَا وَاللَّهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِي حَتَّىٰ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرِي لِذَلِكَ وَرَأَيْتُ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ رَأَىٰ عُمَرُ قَالَ زَيْدٌ قَالَ أَبُو بَكْرٍ إِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌ عَاقِلٌ لَا تَنْهَمُكَ وَقَدْ كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَتَسْبِعُ الْقُرْآنَ فَاجْمَعُهُ فَوَاللَّهِ لَوْ كَلَّفُونِي نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الْجَبَلِ مَا كَانَ أَنْقَلُ عَلَيَّ مِمَّا أَمَرَنِي بِهِ مِنْ جَمْعِ الْقُرْآنِ قَالَ قُلْتُ كَيْفَ تَفْعَلُونَ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ هُوَ وَاللَّهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ أَبُو بَكْرٍ يُرَاجِعُنِي حَتَّىٰ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ لَهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرُ فَتَسَبَّحَتْ الْقُرْآنَ أَجْمَعَهُ مِنَ الْعُسْبِ وَاللِّخَافِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ حَتَّىٰ وَجَدْتُ الْآخِرَ سُورَةَ التَّوْبَةِ مَعَ أَبِي خَزِيمَةَ الْإِنصَارِيِّ لَمْ أَجِدْهَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ حَتَّىٰ خَاتَمَةَ بَرَاءَةَ فَكَانَتِ الصُّحُفُ عِنْدَ أَبِي بَكْرٍ حَتَّىٰ تَوَفَّاهُ اللَّهُ ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَيَاتَهُ ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۰/۱۹ حدیث رقم ۴۹۸۶۔

ترجمہ: ”حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ جن دنوں اہل یمامہ کا قتل ہوا۔ یعنی معرکہ یمامہ کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے میری طرف پیغام بھیجا۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا اور وہاں پہنچ کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس حضرت عمر فاروقؓ بیٹھے ہوئے ہیں حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ عمرؓ میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کے بہت سے قراء جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اسی کثرت سے مختلف جگہوں میں قاریوں کی شہادت ہوتی رہی تو قرآن کا بہت بڑا حصہ جاتا رہے گا لہذا مجھے اسی میں بہتری اور مصلحت نظر آتی ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دے دیں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ میں نے یہ سن کر حضرت عمرؓ سے کہا کہ تم اس کام کو کس طرح سرانجام دو گے جسے نبی کریمؐ نے نہیں کیا عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم! اس کام میں بھلائی اور بہتری ہے عمرؓ نے اس مسئلہ کے بارے میں مسلسل مجھ سے گفتگو کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے میرا سینہ کھول دیا اور مجھے بھی اس میں وہی بہتری نظر آئی جو عمرؓ نے دیکھی ہے حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تم ایک سمجھ دار نو جوان مرد ہو تمہاری نیک نیتی اور سعادت کی وجہ سے قرآن کو جمع کرنے اور نقل کرنے کے سلسلے میں جھوٹ وغیرہ کا تم پر کوئی الزام نہیں لگا سکتا کیونکہ تم نبی کریمؐ کی وحی لکھا کرتے تھے لہذا تم قرآن کو تلاش (اکٹھا) کرو اور اس کو صحف میں جمع کرو۔“ حضرت زیدؓ کا بیان ہے کہ اللہ کی قسم! اگر پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو اٹھا کر منتقل

کرنے کی خدمت میرے سپرد کی جاتی تو یہ خدمت میرے لئے اس خدمت سے زیادہ سخت اور بھاری نہ ہوتی (یعنی آسان ہوتی) جو ابوبکرؓ نے قرآن جمع کرنے کی میرے سپرد فرمائی تھی۔ حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ بہر کیف میں نے یہ حکم سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرض کیا!؟ کہ آپ وہ کام کس طرح کریں گے جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ”اللہ کی قسم! اس کام میں بھلائی اور بہتری ہے“ حضرت ابوبکرؓ مجھ سے اس سلسلہ میں گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے میرا بھی سینہ اس طرح کھول دیا جس طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سینہ کھولا تھا چنانچہ میں نے قرآن تلاش کرنا شروع کیا اس طرح کہ میں اس کو جمع کرتا تھا۔ کھجور کی شاخوں و سفید پتھروں میں سے اور لوگوں کے سینوں میں سے (یعنی حافظوں سے) یہاں تک کہ میں نے سورت تو بہ کا آخری حصہ ابو خزیمہ انصاریؓ کے پاس پایا اور یہ حصہ مجھے ان کے سوا اور کسی کے پاس سے نہیں ملا اور وہ حصہ یہ ہے: لقد جانکم رسول من انفسکم آخر سورۃ برات تک وہ صحیفے جو میں نے جمع اور نقل کئے تھے یہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ان کی زندگی تک رہے اور پھر حضرت عمرؓ کی زندگی میں ان کے پاس رہے اور پھر آپؓ کی بیٹی حفصہؓ کے پاس رہے۔ (بخاری)

تشریح: وعن زید بن ثابت قال ارسل الی : یعنی کسی ایک کو۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ مقتل اہل الیمامہ : ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے یعنی ان کے قتل کے زمانے سے بعد۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: الیمامہ القصد کا الیمام کہ یمامہ یمام کی طرح ہے۔ اور ایک نیلگوں آنکھوں والی لڑکی تین دن کی مسافت سے قافلہ کو دیکھ لیتی تھی شہر کی فضا اس کی طرف منسوب ہیں۔ اور اس کے نام پر ان کے نام رکھے گئے۔ کیونکہ وہاں سارے حجاز سے زیادہ کھجور ہوتی تھی اور ادھر ہی سے سیلہ کذاب نمودار ہوا تھا اور یہ مدینہ سے مشرق وسطیٰ کی جانب مکہ سے سولہ بصرہ سے سولہ اور کوفہ سے بھی اتنا ہی ہے اور ابن حجرؒ نے تو عجیب ہی بات کی کہ یمام طائف اور کوفہ کے درمیان ایک بستی ہے۔ دو دن یا ایک دن کی مسافت پر۔

طیبی فرماتے ہیں: ابوبکر صدیقؓ نے خالد بن ولید کو مسلمانوں کا لشکر دے کر روانہ کیا تھا یمامہ کی طرف اور بنو حنیفہ نے ان سے ایسی جنگ کی کہ مسلمانوں نے اس جیسی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس روز سات سو قرأ (صحابہ) شہید ہو گئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ بارہ سو مسلمان شہید ہوئے۔ مسلمانوں میں سے ایک جماعت براء بن مالک وغیرہ کی طرح کے لوگوں نے مسلمانوں کے لوگوں پر ہلہ بول دیا۔ اور مسلمان ان کے پیچھے چلے اور انہوں نے سیلہ کذاب اور اس کے حواریوں کو قتل کیا اور سیلہ کو حضرت وحشی نے قتل کا جو کہ غزوہ احد میں امیر حمزہ کے قاتل تھے۔ اور مسلمانوں نے انہیں کہا: ہذہ بتلک، یہ اس قتل کے بدلے ہے۔

فاذا عمر : یعنی زید فرماتے ہیں: کہ میں ان کے پاس آیا کہ اچانک حضرت عمرؓ ابن الخطاب عنده : یعنی ابوبکر کے پاس تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے آنے کا سبب بھی یہی تھا کہ انہوں نے قرآن کے جمع کرنے کے لئے بلایا تھا، جو کہ منقطع سند سے وارد ہے کہ انہوں نے کسی آیت کے بارے سوال کیا، تو جواباً انہیں کہا گیا کہ وہ آیت فلاں کو یاد تھی تو انہوں نے فرمایا: انا للہ وانا الیہ راجعون اور قرآن جمع کرنا شروع کیا، تو حضرت ابوبکر قرآن جمع کرنے والے پہلے آدمی تھے۔ اور پہلے قرآن کو جمع کرنے والے سے مراد قرآن کے جمع کرنے میں سبب بننے والے۔ (قال أبو بکر : یعنی زید کو۔ ان عمر أتانی فقال : یعنی عمر نے۔

ان القتل قد استحو : ”الحمر“ سے بمعنی شدت یعنی زیادہ ہو گیا اور بڑھ گیا، شہادت کے واقعات۔

یوم الیمامہ بقرآء القرآن وانی أخصی ان استحو القتل : ہمزہ کے فتح کے ساتھ اور کسرہ بھی ہو سکتا ہے، ان۔

بالقرآء : استححر فعل کے متعلق ہو سکتا ہے یا قتل کے متعلق ہو سکتا ہے۔

بالمواطن : ظریفہ ہے، یعنی جنگ کے دوسرے میدانوں میں، کیونکہ اسلام کے دشمنوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے جنگ کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

طیبی فرماتے ہیں: یعنی میں اس جنگ کی شدت سے خوف کھاتا ہوں، اور اس سے عموماً یومِ بیمانہ کا معرکہ مراد تھا۔ کیونکہ خوف یہ اس قسم سے تھا جو ناپسندیدہ امور میں سے نہیں یعنی یہاں خشیت ہونا کوئی ناپسندیدہ عمل نہ تھا۔

ان کا قول: ان استححر. آخشی کے مفعول ہے اور فیذہب میں فاء تعقیب کے لئے اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان استححر میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ان ہو، اور جملہ شرطیہ آخشی کے مفعول پر دلالت کرتا ہے۔

فیذہب کثیر من القرآن : بعض نسخوں میں کثیراً منصوب ہے اور یہ ظاہر ہے کہ لفظاً اور معناً استححر پر عطف ہوگا۔ ان مصدر ہونے کی وجہ سے اور یہ صحیح روایت ہے اور اکثر تصحیح شدہ اور شیوخ پر پڑھے گئے نسخوں میں رفع کے ساتھ ساتھ ہمزہ مفتوحہ بھی ہے، یعنی ان میں۔

پس ایک قول یہ بھی ہے کہ رفع کی وجہ یہ ہے کہ یہ شرط محذوف کی جزاء ہے یعنی اذا استححر فیذہب..... یا حال پر عطف ہے، ابی آخشی سے۔ یعنی تب اس دور کے بہت زیادہ قرآء کے چلے جانے سے بہت سا قرآن ضائع ہو جائے گا۔

وانی اری ان تأمر : رأی سے ہے یعنی میرا خیال ہے کہ آپ وحی کے لکھنے کا حکم دیدیں۔

بجمع القرآن : اس دور کے قرآء کے منتشر ہونے سے قبل۔

قلت : یعنی ابو بکر کہتے ہیں: میں نے کہا۔

لعمر : کیف تفاعل : مخاطب کا صیغہ بولا۔ ایک قول متکلم یعنی نفعول کا صیغہ بولنے کا بھی ہے، یعنی آپ یا ہم۔

شیئاً لم یفعله رسول اللہ ﷺ : یہ بات اس روایت کی نفی نہیں کرتی جو حاکم نے اپنی مستدرک میں ذکر کی ہے: "جمع

القرآن ثلاث مرات احداها بحضور النبی ﷺ" کہ قرآن تین بار جمع ہوا، ایک بار رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں..... پھر

حاکم نے ایک سند کے ساتھ شیخین کی شرط پر حدیث ذکر کی ہے، جس کے راوی زید فرماتے ہیں: "کننا عند النبی ﷺ یولف القرآن

فی الرفاع" کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس رفاع میں قرآن کی تالیف کیا کرتے تھے..... کیونکہ یہ جمع اور ہے اور وہ جمع کرنا اور جس میں

ہم تھے۔ اسی لئے بیہی نے فرمایا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تالیف سے مراد قرآن کی سورتوں میں جو متفرق آیات تھیں، مختلف سورتوں میں ان کو

ان کی جگہ پر جمع کیا ہو، رسول اللہ کی ہدایات کے مطابق۔

فقال عمر: هذا والله خیر : یعنی یہ ایک مصحف میں جمع کرنا بہتر ہے اگرچہ یہ نئی بدعت ہے لیکن یہ قرآن کی حفاظت کی غرض

سے ہے، خالص بہتری کی نیت سے۔

فلم یزل عمر یراجعنی : یعنی مجھے رغبت دلاتے رہے۔ خطاب اور جواب کے ذریعے میں۔

حتى شرح الله صدری لذلك : یعنی اس جمع کرنے کو واجب کر لینا عدم تفرق کے لئے۔

ورأیت فی ذالک : یعنی جو جمع کرنے کے بارے ذکر کیا گیا یا شرح صدر کے بارے۔

الذی رأى عمر. قال زید: قال ابو بکر : یعنی اس حکم کے ذکر کرنے کے بعد جو پورے جمع کے ساتھ اجز کے لئے ہے۔

انک رجل : یعنی تو کامل مرد ہے۔

شاب عاقل : طیبی فرماتے ہیں: دورانہدیشی اور قوت کی طرف اشارہ ہے اور قوت ضبط کی طرف اور حفظ و امانت و دیانت کی طرف اشارہ ہے۔

لا تنہمک : یعنی تاء مشدّد کے ساتھ۔ یعنی ہم آپ کے نقل کرنے کی عدالت کی وجہ سے آپ پر تہمت نہیں لگاتے۔ قاموس میں ہے: اتہمہ بكذا اتہاماً. واتہمہ کافتعلہ أدخل علیہ التہمہ کهمزة، ای ما یتہم علیہ فاتہم ہو۔

وقد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ ﷺ : یعنی اغلیبیت کی بناء پر کیونکہ کاتبین وحی کی تعداد تقریباً ۲۴ چوبیس تک پہنچی ہے، جن میں خلفائے اربعہ اور دیگر صحابہ کرام ہیں، جیسا کہ الموابہب میں مذکور ہے، اور حاصل معنی یہ ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے اور اس کی کتابت میں امانت دار ہیں۔ ففتیح القرآن : باب تفعّل سے امر ہے یعنی اس کے حصول کی خاطر مختلف مقامات تک رسائی حاصل کر۔

فاجمعہ : یعنی ایک ہی مصحف میں کلی طور پر جمع کر دتا کہ بوقت ضرورت مراجع کیا جاسکے۔

فو اللہ : یعنی زید نے کہا اللہ کی قسم!

لو کلفونی : یعنی ابوبکر، عمر اور ان کے ماتحت لوگ یا اس لئے انہوں نے دو کے لئے جمع کا صیغہ بولا کہ کم سے کم جمع دو ہوتی ہے، اور یا اس سے مراد صرف صدیق اکبرؓ ہی ہیں، اور جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے استعمال کیا ہو۔

نقل جبل من الجبال : یعنی یہ امور مکہ میں سے ہے۔

ما کان أثقل علی مما أمرنی بہ من جمع القرآن : ابن جریر فرماتے ہیں: اس لئے کہ اس میں جسم کی تھکاوٹ بہت ہوتی ہے، اور اس میں روح تھک جاتی ہے، اھ۔

اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے، کہ یہ مباح کام ہے، اور ان کے وہم و گمان کے مطابق شریعت میں یہ جائز نہ تھا، اور اسی لئے۔

قال : یعنی زید نے کہا۔ فقلت : یعنی ابوبکر کو یا عمرؓ کے ساتھ۔

کیف تفعلون : اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ خطاب کی اغلیبیت پر اس کو محمول کیا جائے۔

شیناً لم یفعلہ رسول اللہ ﷺ : اور نہ ہی اس کے بارے حکم دیا۔ پس گویا کہ اس پر اکتفاء کیا جو پہلے گزرا، اور اس کے بعد ان کا سینہ کشادہ نہیں ہوا۔ اور نہ وہ تقلید کے ساتھ راضی ہوئے مشکل فیصلے کو طلب کرنے کی وجہ سے کام کرنے کے لئے، کیونکہ قطعی دلالت کے ساتھ اثبات قرآن کی طرف ضرورت ہے۔

قال : یعنی ابوبکرؓ نے۔ ہو : یعنی قرآن کا جمع کرنا۔

واللہ خیر فلم یزل ابو بکر یراجعنی : یعنی ابوبکر سب ذکر کرتے رہے، اور میں اعراض کرتا رہا۔

حتی شرح اللہ صدری للذی شرح : یعنی اللہ نے۔

لہ صدر ابی بکر و عمر : کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن کو ایک مصحف میں جمع نہیں کیا، جب آپ کی وفات کے ساتھ نزول قرآن مکمل ہو گیا، تو اللہ نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پر اس کے بارے الہام کیا۔ اپنے سچے وعدے کو پورا کرتے ہوئے جو کہ اس نے اس امت پر اس کی حفاظت کی ضمانت دی تھی۔ تو اس کی ابتداء حضرت عمر کے مشورہ سے صدیق اکبرؓ کے ہاتھوں ہوئی۔ فرضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اور وہ روایت جو امام مسلم نے اپنی کتاب میں ابوسعید خدریؓ کی حدیث سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لا تکتبوا عنی شیناً غیر القرآن“ قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ نہ لکھو (لمبی حدیث ہے)۔

تو یہ اس کی نفی نہیں کرتی کیونکہ اس حدیث میں مخصوص کتابت اور مخصوص صفت کے بارے میں کلام ہے اور بالتحقیق قرآن سارے کا سارا رسول اللہ ﷺ کے دور میں لکھا جا چکا تھا۔ لیکن کسی ایک جگہ جمع نہ تھا، اور نہ ہی سورتیں مرتب شدہ تھیں۔ اور حارث کتاب فہم السنن میں فرماتے ہیں: ”کہ کتابت قرآن بدعت نہیں، کیونکہ آپ ﷺ اس کا حکم دیا کرتے تھے، لیکن اس وقت تک قرآن متفرق تھا پتوں اور اس جیسی دیگر چیزوں میں۔ اور ابو بکر صدیقؓ نے جو حکم دیا، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جمع کرنے کا حکم دیا اور یہ بمنزلہ اوراق کے تھا جو کہ رسول اللہ کے گھر سے پائے گئے جن میں قرآن منتشر حالت میں تھا، جمع کرنے والے نے ان کو جمع کیا اور دھاگے سے باندھ دیا، تاکہ اس سے کچھ بھی ضائع نہ ہو۔ اسی طرح الاتفاق میں مذکور ہے۔

فتبعت القرآن اجمعه : فاعل یا مفعول سے حال ہے۔

من العصب : دونوں پر ضمر ہے عسیب کی جمع ہے، کھجور کی شاخ، اور یہ وہ شاخ ہوتی ہے جس پر پتے نہ اُگتے ہوں۔ النہایہ میں اسی طرح ہے۔ البتہ قاموس میں صاحب قاموس نے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ کھجور کی سیدھی اور باریک ٹہنی ہوتی ہے، جس کے پتے اترے ہوئے ہوں، اور جس پر پتے نہ اُگے ہوں، وہ سعف ہے اور السعف، کھجور کی ٹہنی ہے یا اس کا پتا ہے اور زیادہ اس کو کہا جاتا ہے جب وہ خشک ہو جائے۔

اللخاف : لام کے کسرہ کے ساتھ لخفة ”نقطے والی خاء کے ساتھ“ کی جمع ہے، اور یہ ایک قسم کا سفید پتھر تھا جو پتلا ہوتا تھا اور قراء صحابہ کے پاس ہوا کرتا تھا۔

اور ایک روایت میں ہے: والرقاع، اور یہ زقعة کی جمع ہے اور کبھی یہ کھال کا ہوتا ہے یا پھر کبھی پتے کا۔ اور ایک دوسری روایت میں ”وقطع الأديم کے الفاظ ہیں یعنی رنگے ہوئے چیزوں کے ٹکڑوں پر، اسی طرح ایک اور روایت میں والاکتاف کا لفظ ہے اور ایک روایت میں اضلاع کا لفظ ہے اور یہ دونوں کسف یا ضلع کی جمع ہیں، جو کہ اونٹ کی یا بکری کے ہوتے ہیں، جب وہ خشک ہوتی تو اس پر لکھ لیتے۔

اور اسی طرح ایک روایت میں الاقتاب کے الفاظ ہیں جو کہ قتب کی جمع ہے، اور یہ وہ ٹکڑی ہوتی ہے جو سواری کے لئے اونٹ کی پیٹھ پر رکھی جاتی ہے۔ وہ اس میں اس لئے لکھتے تھے کہ ان دونوں ان کے ہاں اوراق کی کمی کی وجہ سے۔ اسی طرح اس کو ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔ یا پھر وہ ان کو بمنزلہ تختیوں کے شمار کرتے تھے، اور یاد کرنے کے لئے لکھا کرتے تھے، پھر ان کو دھو دیتے تھے اور منادیتے تھے یعنی یاد کرنے کے بعد۔

وصدور الرجال : یعنی ان میں حفاظ کرام۔ اگر کہا جائے کہ ثقایت کیسے واقعی ہوتی ہے اصحاب الرقاع اور آدمیوں کے سینوں سے (کہ وہ محفوظ رہا ہو) تو کہا جائے گا کیونکہ وہ معروف نظم و نسق اور تالیف سے ظاہر کرتے تھے۔ اور انہوں نے بیس سال نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تلاوت کا مشاہدہ کیا تھا۔ خوف صرف یہ تھا کہ اس کے صحیح میں سے کچھ ضائع نہ ہو جائے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اور وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو جمع کیا یعنی انہوں نے حفظ کیا آپ علیہ السلام کے دور میں وہ چار ہیں، اور سب کے سب انصار میں سے تھے۔ ۱) ابی بن کعب ۲) زید بن ثابت (یہی جمع کرنے والے)، ۳) معاذ بن جبل، ۴) ابو زید۔ اور ایک روایت میں ان حفاظ میں ابو درداء کا ذکر بھی ہے۔

حتی وجدت آخر سورة التوبة مع ابن خزيمة : خزيمة، خاء کے ضمہ اور زاء کے فتح کے ساتھ۔

الانصاری : طیبی فرماتے ہیں: جو کہ جامع الاصول میں مذکور ہیں کہ من الصحابة خزيمة بن ثابت الانصاری الأوسی،

یعنی جامع الاصول میں ان کے بارے لکھا ہے کہ خزیمہ بن ثابت الانصاری الاوی صحابہ میں سے تھے۔ جو کہ اگلی حدیث میں مذکور ہیں اور ایک ابوخیثمہ الانصاری السلمی الخزرجی ہیں، پس غور و فکر کریں۔

اور مصنف علیہ الرحمۃ نے اسماء الرجال میں صرف خزیمہ لکھا ہے شاید کہ انہیں ابو خزیمہ بھی کہا جاتا ہو۔ لم أجد مع أحد غیرہ : غیرہ، مجرد ہے بدل ہونے کی وجہ سے یعنی میں نے ان کے علاوہ کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہیں دیکھی کیونکہ وہ کتابت کے علاوہ صرف حفظ پر اکتفاء نہیں کرتے تھے۔ یہ بات الحافظ ابوشامہ نے کہی ہے۔

طبری فرماتے ہیں: یہ قول اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں ہے کہ ایک جماعت نے آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں مکمل قرآن حفظ کر لیا تھا، جیسے کہ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابودرداء حفظ کے بعد نسیان کے جواز کے لئے۔ جب بھولنے والوں نے دوسروں سے سنا تو انہیں یاد آ گیا، جس طرح کہ اس پر آپ علیہ السلام کا یہ قول دلالت کرتا ہے جو کہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے کہ: "فقدت آية من الاحزاب " کہ سورۃ احزاب کی ایک آیت مجھ سے رہ گئی۔

لقد جاءكم رسول من انفسكم [سورة التوبة: ۱۲۸] حتى خاتمة براءة :

صاحب اتقان لکھتے ہیں: کہ ابن ابی داؤد، یحییٰ بن عبدالرحمن بن حاطب کے طریق سے روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ عمر آئے اور کہنے لگے جس کسی نے بھی رسول اللہ ﷺ سے جو قرآن سیکھا ہے وہ اسے لے آئے، اور وہ اس کو صحیفوں میں اور تختیوں اور چیزوں پر لکھا کرتے تھے، اور حضرت عمرؓ سے کچھ بھی نہ قبول کرتے حتیٰ کہ دو گواہ اس پر گواہی نہ دے دیں۔ اور یہ بات ہر اس پر دلالت کرتی ہے کہ اکیلے زید کے لکھا ہوا پانے پر اکتفاء نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ اس پر کوئی گواہی نہ دے جس نے اس کو سماع کرتے دیکھا ہو۔ باوجود اس کے کہ زید حافظ قرآن بھی تھے۔

اور یہ کام احتیاط میں مبالغہ کے لئے کرتے تھے۔ سخاوی جمال القراء میں فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دو گواہ اس چیز کی گواہی دیتے تھے کہ یہ مکتوب رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا، یا اس سے مراد یہ ہو سکتا ہے کہ یہ مکتوب انہی قراءتوں میں سے ہے جن پر قرآن نازل ہوا۔ ابوشامہ فرماتے ہیں: ان کا مقصد اور غرض یہ تھی کہ صرف عین وہی لکھا جائے جو رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں لکھا گیا نہ کہ مجرد الفاظ۔

میں کہتا ہوں: یا تو مراد یہ ہے کہ وہ دو گواہ یہ گواہی دیں کہ یہ اسی میں سے ہے، جو رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ان کی وفات کے سال پیش کیا گیا

اور ابن ابی شیبہ نے باب المصاحف میں لیث بن سعد سے روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں: کہ سب سے پہلے قرآن کو جمع کرنے والے ابوبکرؓ ہیں اور زید بن ثابت نے اس کو لکھا اور لوگ زید بن ثابت کے پاس آتے لیکن زید دو عادل گواہوں کی گواہی کے بعد ہی لکھتے، اور سورۃ توبہ کی آخری آیت خزیمہ بن ثابت الانصاری کے علاوہ کسی سے نہیں ملیں، تو ابوبکرؓ نے فرمایا: اس آیت کو لکھ لو کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے خزیمہ کی شہادت کو دو مردوں کی شہادت کے قائم مقام بنایا ہے۔ تو زید نے لکھ لیا۔ اور حضرت عمرؓ آیت رجم لے کر آئے تو زید نے نہ لکھی کیونکہ وہ اکیلے ہی تھے، اھ۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ انہوں نے زلفظی طور پر قطعی دلیل کے ثابت ہو جانے اور اس کی کتابت پر ظنی دلیل کے ثابت ہونے کے بعد ہی جمع کیا۔

فكانت الصحف : یعنی جمع کرنے کے بعد۔

عند ابی بکر حتی توفاه الله ثم عند عمر فی حیاتہ : یعنی آپ کی زندگی کے ایام میں۔

ثم عند حفصۃ بنت عمر : یعنی اس وقت تک کہ عثمان نے ان سے لیا پھر اس سے دوسرا یا تیسرا نسخہ مرتب کیا اور حفصہؓ کے پاس قرآن کے رکھنے کا سبب یہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی میں خلیفہ کا تعین نہیں کیا تھا، اور حفصہؓ ان کی بیٹی تھیں اور ام المؤمنین تھیں، اس لئے ان کے پاس رکھ دیا۔

حسن سند کے ساتھ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ: مصاحف کے بارے میں لوگوں میں سے سب سے زیادہ اجر حاصل کرنے والے ابو بکر ہیں اللہ کی رحمتیں ہوں ابو بکر پر، کیونکہ یہ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کو جمع کیا اور یہ روایت اس روایت کے معارض نہیں ہے، جو کہ آپ سے مروی ہے کہ ”جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو میں نے قسم کھالی کہ میں اپنی چادر نہیں لوں گا، جمعہ کی نماز کے علاوہ حتیٰ کہ میں قرآن کو جمع کروں، پھر انہوں نے اس کو جمع کیا“۔ کیونکہ یہ ضعیف ہے اور اگر اس کو صحیح بالفرض مان لیا جائے، ان کے جمع کرنے سے مراد اپنے سینے میں حفظ کرنا ہے یا ان کے جمع کرنے سے مراد انفرادی طور پر جمع کرنا ہے، اور وہ نقصان پر محمول ہے۔ جب کہ ابو بکر صدیقؓ کا جمع کرنا یہ بالا جماع جمع کرنا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جمع کا اعتبار زیادہ اور نقصان کے عدم احتمال کے ساتھ ہوگا۔ پس ابو بکر اس کے زیادہ لائق ہیں کہ ان کے بارے میں کہا جائے کہ قرآن جمع کرنے والے سب سے پہلے وہی ہیں۔ اور اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جس میں ہے کہ ابو بکر صدیق کی بیعت کے بعد حضرت علیؓ اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ ابو بکر کو کسی نے کہا کہ حضرت علیؓ آپ کی بیعت کو اچھا نہیں سمجھتے تو ان کی طرف ابو بکر نے پیغام بھیجا بلایا اور پوچھا کیا تم میری بیعت کو برا سمجھتے ہو؟ تو علی بن ابی طالب نے کہا، نہیں اللہ کی قسم! پوچھا میرے پاس نہ بیٹھنے کی وجہ؟ کہنے لگے میں دیکھ رہا ہوں کہ کتاب اللہ میں زیادتی کی جا رہی ہے، تو میرے دل میں یہ بات آئی اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں اس وقت تک چادر نہ پہنوں گا حتیٰ کہ قرآن کو جمع نہ کر لوں سوائے جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے لئے۔ ابو بکرؓ نے انہیں کہا تمہارا خیال بہت اچھا ہے اور اسی طرح منقطع سند کے ساتھ مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے قرآن کو مصحف میں جمع کیا وہ سالم ہیں جو کہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اس وقت اپنے کپڑے نہیں پہنوں گا سوائے جمعہ کے دن کے جب تک میں قرآن جمع نہ کر لوں۔ پس انہوں نے جمع کر دیا۔ اس روایت کے رجال ثقہ ہیں، لیکن سند میں انقطاع ہے۔

بالتحقیق ابو بکرؓ نے عمرؓ اور زیدؓ کو کہا تھا کہ تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ، جو کوئی کتاب اللہ کا کچھ ٹکڑا دو گواہوں کی موجودگی میں لے کر آئے، اسے لکھ لو۔ علامہ العسقلانی فرماتے ہیں: گویا کہ دو گواہوں سے مراد حفظ اور کتابت ہیں۔

حارث صحابی اپنی کتاب فہم السنن میں فرماتے ہیں کہ: قرآن کی کتابت بدعت نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے، لیکن اس وقت قرآن جمع نہ تھا کھرا ہوا تھا ابو بکر صدیقؓ نے اس کو جمع کیا اس میں سے کچھ اوراق کی صورت میں تھا، جو کہ رسول اللہ کے گھر میں سے ملے تھے، جن میں قرآن بکھرا پڑا تھا۔ جمع کرنے والے نے ان کو جمع کی، اور ان کو دھاگے سے باندھ دیا تاکہ اس سے کچھ بھی ضائع نہ ہو۔ یہ قرآن کی چنگلی اور محفوظ رہنا ہے، رقاع اور اس جیسی دوسری چیزوں کے ساتھ۔ آدمیوں کے سینوں میں بھی اس لئے کہ وہ سینوں میں محفوظ ظاہر کرتے تھے۔ اس کو معروف نظم میں آپؐ سے بیس سال مشاہدہ کیا۔ (تفصیل بیچھڑ چکی مترجم)

موطا بن وہب میں مالک سے ان کی سند کے ساتھ عبد اللہ بن عمر تک۔

ابو بکرؓ نے قرآن کو کاغذوں میں جمع کیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ زیدؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے مجھے حکم دیا، تو میں نے قرآن کو چمڑوں کے ٹکڑوں اور کھجور کی شاخوں پر رقم کیا، جب ابو بکرؓ فوت ہو گئے اور عمرؓ خلیفہ بن گئے، تو اس قرآن کو ایک صحیفے میں لکھ دیا

گیا جو کہ ان کے پاس تھا۔ عسقلانی فرماتے ہیں: پہلی بات صحیح ہے کہ قرآن چھڑوں اور ہڈیوں میں تھا ابو بکر کے عہد میں اس کے جمع کرنے سے پہلے پھر ابو بکر کے دور میں ایک مصحف میں جمع کیا، جیسا کہ ہم معنی آثار اس پر دلالت کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: جمع اس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ پہلے قرآن چھڑوں اور ہڈیوں میں بکھرا پڑا تھا لوگوں کے پاس غیر مرتب حالت میں تھا تو انہوں نے آیات اور سورتوں کے درمیان ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے جمع کیا، لیکن پھر بھی وہ چھڑوں کے ٹکڑوں اور ہڈیوں میں لکھا ہوا تھا۔ پھر اس کا جمع ہونا ابو بکر صدیقؓ کے دور میں ہوا تھا۔ پھر ایک صحیفے میں جمع کیا گیا یا کئی صحیفوں میں اور اوراق پر لکھنے کے ساتھ جمع کیا۔ واللہ اعلم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمات جمع قرآن کے بارے میں

۲۲۲۱: وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ حَدِيثَةَ بِنَ الْيَمَانِ قَدِمَ عَلَى عُثْمَانَ وَكَانَ يُغَازِي أَهْلَ الشَّامِ فِي فَتْحِ أَرْمِينِيَّةَ وَأَزْرُبِجَانَ مَعَ أَهْلِ الْعِرَاقِ فَأَفْزَعَ حَدِيثَةَ إِخْتِلَافَهُمْ فِي الْقِرَاءَةِ فَقَالَ حَدِيثَةُ لِعُثْمَانَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَدْرِكْ هَذِهِ الْأُمَّةَ قَبْلَ أَنْ يَخْتَلِفُوا فِي الْكِتَابِ اخْتِلَافَ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى فَأَرْسَلَ عُثْمَانَ إِلَى حَفْصَةَ أَنْ أَرْسِلِي إِلَيْنَا بِالصُّحُفِ نَنْسُخُهَا فِي الْمَصَاحِفِ ثُمَّ نَرُدُّهَا إِلَيْكَ فَأَرْسَلَتْ بِهَا حَفْصَةُ إِلَى عُثْمَانَ فَأَمَرَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ الزُّبَيْرِ وَسَعِيدُ بْنُ الْعَاصِ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْحَارِثِ بْنُ هِشَامٍ فَنَسَخُوا فِي الْمَصَاحِفِ وَقَالَ عُثْمَانُ لِلرَّهْطِ الْقُرَشِيِّينَ الثَّلَاثِ إِذَا اخْتَلَفْتُمْ أَنْتُمْ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فِي شَيْءٍ مِنَ الْقُرْآنِ فَارْتَبِعُوا بِلسَانِ قُرَيْشٍ فَإِنَّمَا نَزَلَ بِلسَانِهِمْ فَفَعَلُوا حَتَّى إِذَا نَسَخُوا الصُّحُفَ فِي الْمَصَاحِفِ رَدَّ عُثْمَانُ الصُّحُفَ إِلَى حَفْصَةَ وَأَرْسَلَ إِلَى كُلِّ أَقْبَى بِمَصْحَفٍ مِمَّا نَسَخُوا وَأَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْآنِ فِي كُلِّ صَحِيفَةٍ أَوْ مَصْحَفٍ أَنْ يُحْرَقَ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَأَخْبَرَنِي خَارِجَةُ بْنُ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ أَنَّهُ سَمِعَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ فَقَدْتُ آيَةً مِنَ الْأَحْزَابِ حِينَ نَسَخْنَا الْمَصْحَفَ قَدْ كُنْتُ أَسْمَعُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقْرَأُ بِهَا فَاتَّمَسْنَاهَا فَوَجَدْنَاهَا مَعَ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيِّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَالْحَقْنَاهَا فِي سُورَتِهَا فِي الْمَصْحَفِ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۱/۹ - حدیث رقم ۴۹۸۷ - واحمد فی المسند ۱۸۸/۵

ترجمہ: ”حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حدیفہ بن یمانؓ حضرت عثمانؓ غنیؓ کے پاس آئے۔ اس وقت حضرت عثمانؓ شام و عراق کے آرمینیا اور آذربائیجان کی جنگوں کی غرض سے سامان جہاد کی فراہمی اور تیاری میں مصروف تھے۔ حضرت حدیفہؓ لوگوں کے اختلاف قراءت کی وجہ سے پریشان تھے کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ لوگ بلا جھجک آپس میں ایک دوسرے کی قراءت کا انکار کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ ”امیر المؤمنین! اس امت کے بازے میں تدراک کی کوئی راہ نکالنے قبل اس کے وہ یہود و نصاریٰ کی طرح کلام اللہ میں اختلاف کا شکار ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی بات سن کر حضرت حفصہؓ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ آپ وہ صحیفے جو حضرت ابو بکرؓ نے جمع کئے تھے ہمارے پاس بھیج دیجئے۔ ہم ان کی نقلیں تیار کر کے واپس بھیج دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ تمام صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے حضرت عثمانؓ نے انصار میں سے زید بن ثابتؓ کو اور قریش میں عبد اللہ ابن زبیرؓ سعید بن عاصؓ اور عبد اللہ بن حارث بن ہشامؓ کو ان صحیفوں کے نقل کرنے پر مامور کیا۔ ان سب حضرات نے ان کی

نقلیں تیار کیں۔ حضرت عثمانؓ نے تینوں قریشیوں سے فرمایا کہ اگر قرآن کے لغات میں کسی جگہ تم میں اور زید بن ثابت میں اختلاف ہو جائے تو وہاں لغت قریش کے مطابق لکھو کیونکہ کلام اللہ لغت قریش کے مطابق ہی نازل ہوا ہے چنانچہ ان سب نے اس پر عمل کیا اور جب مصاحف میں صحیفے نقل کئے جا چکے تو حضرت عثمانؓ نے ان صحیفوں کو تو حضرت حفصہؓ کے پاس بھیج دیا اور ان مصاحف کو تمام علاقوں میں بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حکم جاری فرمایا کہ ان مصاحف کے علاوہ ہر اس صحیفے یا مصحف کو جلادیا جائے جس میں قرآن لکھا ہوا ہے، حضرت ابن شہابؒ فرماتے ہیں کہ زید بن ثابتؓ کے صاحبزادے خارجہ بن زید بن ثابت نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنے والد حضرت زید بن ثابتؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس وقت کہ ہم قرآن کریم نقل کر رہے تھے مجھے سورہ احزاب کی ایک آیت نہیں مل رہی تھی حالانکہ میں نبی کریم ﷺ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ پھر ہم نے اس کو تلاش کیا تو مجھے یہ آیت حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس سے لکھی ہوئی ملی اور وہ آیت یہ ہے: **مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رَجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ** پھر میں نے یہ آیت مصحف میں اس کی سورت یعنی سورہ احزاب کے ساتھ ملادی۔“ (بخاری)

تشریح: ان حدیثہ بن الیمان قدم علی عثمان وکان : یعنی حضرت حدیفہ۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: واؤ حالہ ہے۔ یغازی : یعنی لڑ رہے تھے۔

اہل الشام : مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے۔ اور ایک نسخہ میں مرفوع بھی ہے پھر کان میں ضمیر ضمیر شان ہوگی اور یہی بہتر ہے جو سخاویؒ نے شرح الرایتہ میں کہا کہ: جب عثمانؓ کی خلافت تھی مسلمان مغربی ممالک میں غزوہ آرمینیا میں جمع ہوئے۔ یعنی عراقی لشکر اور شامی لشکر۔

تو انہوں نے قرآن میں اختلاف کیا، ایک دوسرے کی قراءت سنتے تو اس کا انکار کر دیتے، حالانکہ ہر ایک کی قراءت درست تھی اور منزل من اللہ ہی تھی، حتیٰ کہ بعض نے یہاں تک بھی کہنا شروع کر دیا کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے۔ (فی فتح ارمینیا: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔

عسقلائی فرماتے ہیں: ابن سمعان کے نزدیک ہمزہ کے فتح کے ساتھ اور دیگر کے نزدیک ہمزہ کو کسرہ دیا جائے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے: مثلث راء کے سکون اور میم کے سکون کے ساتھ اس کے بعد یاء ہے، پھر نون کسور پھر یاء غیر مشدّد مفتوحہ۔ اور کبھی یہ ثقیل بھی ہو جاتا ہے، یہ یز اور مشہور شہر ہے، جیسا کہ مقدمہ میں مذکور ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ یہ آذر بایجان کا شہر ہے۔

اذر بانیجان : تخصیص کے بعد تعمیم ہے اور وہ اسی طرح ہے جس طرح اکثر نونوں میں ہے یعنی ہمزہ مددوہ کے ساتھ اور ذال کے فتح راء کے سکون اور باء کسور اور اس کے بعد ”می“ ساکن پھر جیم ہے، لیکن تہذیب الاسماء میں فرماتے ہیں: یہ ہمزہ مفتوحہ غیر مد کے ساتھ ہے پھر ذال ہے نقطہ والی پھر راء مفتوحہ پھر باء کسور پھر یاء ہے پھر جیم پھر الف پھر نون اسی طرح مشہور ہے اور اس کا ضبط بھی اور اس کا اعراب بھی اکثر اسی طرح ہے۔ عسقلائی فرماتے ہیں: کبھی ہمزہ کو لمبا کیا جاتا ہے اور کبھی کسرہ دیا جاتا ہے، اور کبھی حذف کر دیا جاتا ہے۔ اور کبھی با کو فتح دیا جاتا ہے، اور کبھی اوس کے بعد الف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، مد اولیٰ کے ساتھ۔ اور المقدمہ میں پہلے دو پر فتح اور راء ساکنہ اور باء کسور اور اس کے بعد یاء ساکنہ پھر جیم ہے، معروف شہر ہے۔ اور الاصلیٰ نے اس کا اعراب مد کے ساتھ لگایا ہے، اور اسی طرح ”ب“ کے فتح کا اعراب بھی حکایت کیا گیا ہے۔

مع اهل العراق، فافزع : کان پر عطف ہے۔

حذیفہ : منصوب ہے۔

اختلافہم : رفع کے ساتھ یعنی لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے گھبراہٹ واقع ہوگئی۔ یا اہل عراق کے اختلاف کا خوف پیدا ہو گیا جو ان کے شانہ بشانہ تھے۔

فی القراءۃ : یعنی قرآن کی قراءت میں حذیفہ کی مثل جیسا کہ بعض نے کہا یہ لفظ قرآن کا ہے، یا نہیں ہے۔ اور بعض نسخوں میں حذیفہ کے رفع کا اعراب ہے اور بعض میں نصب۔

اور ان کے لئے کوئی وجہ ظاہر نہیں ہوئی اور اس کو قلب پر محمول کرنے کو اور قلب نے قبول نہیں کیا۔

أدرک هذه الامۃ : ادراک سے امر ہے، تدراک کے معنی میں ہے کہ تدراک کیجئے۔

قبل أن یختلفوا فی الکتاب : یعنی قرآن میں۔

اختلاف اليهود والنصارى : منصوب ہے، یعنی جس طرح انہوں نے تورات اور انجیل میں اختلاف کیا حتیٰ کہ تحریف کر دی اور کی بیشی بھی کی۔ سخاوی نے اضافہ کیا ہے: فما کنت صانعاً جب کہا جائے گا کہ فلاں کی قراءت اور فلاں کی قراءت جس طرح اہل کتاب نے کہا، پس تو ایسے کر کہ جمع کر دے۔ عثمانؓ نے لوگوں کو جمع فرمایا، اور اس وقت ان کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے تو یہ خبر ملی ہے، کہ بعض لوگ ان میں سے کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے، اور یہ بات قریب ہے کہ کفر ہو جائے یعنی یہ بات کفر کے قریب ہے، یا یہ بات انکار کے قریب ہے۔ وہ کہنے لگے، آپ کا کیا خیال ہے؟ تو عثمان نے کہا میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کریں، نہ کوئی فرق رہے اور نہ کوئی اختلاف باقی رہے۔ لوگ کہنے لگے، آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ انہوں نے پختہ عزم کیا اس پر جس کی طرف حذیفہ اور دیگر مسلمانوں نے اشارہ کیا تھا۔

فارسل عثمان الی حفصۃ أن أرسلی الینا بالمصحف، نسیخها : جزم کے ساتھ اور رفع کے ساتھ دونوں طرح

درست ہے۔

فی المصاحف : یعنی مجموعہ۔ ثم نردھا : دال پر ضمہ اور فتح دونوں جائز ہیں۔

البک فارسلت بها حفصۃ الی عثمان فأمر زید بن ثابت : یعنی انصار میں سے اور۔

وعبد اللہ بن الزبیر وسعید بن العاص وعبد اللہ بن الحارث بن ہشام : یعنی یہ قریش میں سے۔

فنیسخوها فی المصاحف : یعنی متعدد نسخے۔ وقال عثمان للرهط القریشیین الثلاث : یعنی زید کے علاوہ۔

إذا اختلفتم أنتم وزید بن ثابت فی شیء من القرآن فاکتبوه بلسان قریش : یعنی ان کی لغت میں۔

فانما نزل : یعنی غالباً۔

بلسانہم : طبی فرماتے ہیں: یعنی پہلی بار ان کی زبان میں نازل ہوا پھر رخصت دے دی کہ ساری لغتوں میں پڑھ سکتے ہو۔

سخاوی فرماتے ہیں: انہوں نے لفظ التابوت میں اختلاف کیا، زید کہنے لگے ”التابوہ“ اور دوسرے ”التابوت“، تو انہوں نے حضرت

عثمانؓ کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ”ت“ کے ساتھ لکھو، یعنی التابوت، کیونکہ یہ قریش کی لغت میں ہے، اور حضرت عثمان سے

انہوں نے ”لم یتسنن“ کے بارے میں پوچھا تو تو آپؓ نے فرمایا اس میں ”ھا“ بھی لگا دو، یعنی لم یتسننہ۔

اگر کہا جائے کہ عثمانؓ نے ان کو یعنی ان کا تین کو زید کی طرف سہارا لینے کا کیوں کہا؟ حالانکہ ابو بکرؓ نے یہ کام نہیں کیا؟ میں کہتا ہوں:

ابو بکر صدیقؓ کا مقصد اور غرض قرآن کو اس کے ان تمام حروف اور وجوہ کے اعتبار سے جمع کرنا تھا، جن پر وہ نازل ہوا۔ اور یہ لغت قریش پر

بھی تھا اور اس کے علاوہ پر بھی، تو ابو بکرؓ نے جو جمع کیا وہ حضرت عثمانؓ کے جمع سے مختلف ہے۔

اگر کوئی کہے: کہ اس مصحف کو حاضر کرنے کا کیا مقصد تھا حالانکہ زید موجود تھے، اور حفظ کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے، میں کہتا اس سے مقصد لوگوں کی غلط فہمیوں کی باتیں کرنے کا دروازہ بند کرنا تھا۔ اور اس سے کوئی گمان کرنے والا یہ گمان کر بیٹھے کہ جو مصحف میں تھا قرآن نہیں تھا۔ اور تا کہ کوئی انسان یہ خیال نہ کرے کہ اس میں انہوں نے کوئی ایسی چیز بھی لکھی ہے جو قرأت نہیں کی گئی۔ تو وہ اس کا انکار کر دے تو مصحف کے لانے کا مقصد یہ تھا کہ جو انہوں نے مصحف لکھا اس سارے کا یہ مصحف شاہد بن جائے۔

ففعلا: یعنی انہوں نے جمع کرنا شروع کیا۔ حتیٰ اذا نسخوا: یعنی لکھ لیا انہوں نے۔

أفق: ہمزہ اور فاء کے ضمہ کے ساتھ یعنی تمام اطراف میں۔ بمصحف مما نسخوا: سخاوی فرماتے ہیں: کہ حضرت عثمانؓ نے ان میں سے ایک نسخہ کو فروان کیا اور ایک بصرہ اور ایک شام کی طرف بھیجا، اور ایک مصحف مدینہ میں باقی رکھا۔ پھر فرماتے ہیں اور یہ بھی مروی ہے کہ عثمانؓ نے اسی طرح ایسے ہی بحرین کی طرف ایک مصحف بھیجا اور ایک مکہ کی طرف اور ایک یمن کی طرف اس طرح یہ سارے دس مصاحف ہو گئے، اور اس بارے میں مختلف روایات ہیں، ایک قول پانچ نسخوں کا ہے یعنی چار یہ مذکورہ بالا اور پانچواں مکہ کی طرف جو بھیجا اور جو بحرین اور یمن والا مصحف ہے تو اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: تحقیق یہ ہے کہ چار کاتبین کے ہاتھوں سب سے پہلے صرف چار ہی نسخے لکھے گئے تھے، تین مذکورہ شہروں کی طرف روانہ کیے اور ایک مدینہ میں رکھا اور ظاہر ہے کہ جو مدینہ میں رکھا وہ زید کا تحریر کردہ تھا کیونکہ وہ کاتبین وحی میں جلیل القدر تھے۔ تو ان کا رسم الخط زیادہ لائق ہے کہ وہ مدینہ میں اصل محفوظ رہے، پھر عثمانؓ نے اس سے دیگر مصاحف لکھوائے اور پھر سارے شہروں کی طرف روانہ کئے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے مسلمانوں کے لشکروں میں سے ہر لشکر کی طرف ایک ایک مصحف روانہ کیا۔
و أمر بما سواہ من القرآن: یعنی منسوخ تحریر شدہ۔

فی کل صحیفۃ أو مصحف أن یحرق: بغیر نقطہ کے حاء کے ساتھ احواق سے ہے جلانا۔ اور یہ نقطہ والی حاء سے بھی مروی ہے یعنی ختم کر دے یا کاٹ دے۔ طیبیؒ نے یہ قول ذکر کیا ہے۔ اور عسقلانی فرماتے ہیں: کہ اکثر روایات میں نقطہ والی حاء کے ساتھ ”یحرق“ کے الفاظ ہیں اور مروزی نے بغیر نقطہ کے کہا ہے اور الاصلیٰ نے دونوں کو کہا ہے اور ابو داؤد اور طبرانی وغیرہ کی ایک روایت میں ہے جو کہ بغیر نقطہ کے حاء پر دلالت کرتی ہے۔

سخاوی فرماتے ہیں: جب عثمان مصاحف کے معاملات سے فارغ ہوئے، تو اس کے ماسوا سب کو جلا دیا اور حصہ والا مصحف کو واپس کر دیا اور وہ انہی کے پاس رہا جب مروان مدینہ کا گورنر بنا، اس نے حضرت حصہؓ سے وہ مصحف جلانے کے لئے طلب کیا، لیکن ام المؤمنین نے نہ دیا اور نہ ہی اس کو اس بارے میں کوئی جواب دیا، جب وہ فوت ہو گئیں تو مروان ان کے جنازے میں شریک ہوا اور ان کے بھائی عبداللہ بن عمر سے وہ مصحف طلب کر لیا اور اس کام کے کرنے کا پختہ کیا، واپس پلٹے تو اس کو نکالا، اور اس کو اس ڈر سے جلا دیا کہ کہیں یہ ظاہر نہ ہو جائے اور لوگ سابقہ اختلاف کی طرف پھر پلٹ آئیں۔

اور علماء نے مصحف کے پھٹے ہوئے اوراق کے بارے اختلاف کیا ہے جب کہ ان سے کوئی نفع باقی نہ رہے کہ زیادہ بہتر بہانا ہے یا جلانا ہے۔ کہا گیا ہے کہ دوسرا یعنی جلانا، دھونے سے بہتر ہے کہ تحقیر کی ساری صورتوں کو ختم کر دیتا ہے، کیونکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ دھو ڈالنا اور دھو کر پاک جگہ میں پانی بہا دینا کیونکہ جلانے میں تحقیر کی قسم آ جاتی ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اور حضرت کا نفل جلانے کو ترجیح دیتا ہے ان کے جلانے کا مقصد مکمل طور پر حفاظت کے لئے تھا، اس میں تحقیر تو ہیں کا کوئی پہلو نہیں تھا۔

اور ہمارے ائمہ نے جلانے کی حرمت کو اس پر محمول کیا ہے جب کہ اس میں مال کے ضیاع کا احتمال ہو، کیونکہ جس مکتوب میں قرآن ہوگا جلانے سے اس کی قیمت کا نقصان ہوگا۔ میں کہتا ہوں: کہ یہ نہایت مضحکہ خیز تاویل ہے اور عجیب استنباط ہے کیونکہ مسئلہ کی بناء اس صورت میں ہے جب کوئی فائدہ نہ ہو اور حضرت عثمانؓ کے فعل پر قیاس جائز نہیں کیونکہ ان کے فعل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن نہیں تھا، یا اس میں بہت زیادہ اختلاط وغیرہ تھا جو کہ جدا جدا کرنے کو قبول نہیں کرتا اور انہوں نے جلانا اس لئے بہتر سمجھا کہ بعض قرآن کے چھوڑنے کے بارے شک زائل ہو جائے گا۔ جب کہ اگر وہ قرآن ہوتا تو کسی مسلمان کے لئے اس کو جلانا جائز ہی نہیں اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ راکھ کی حفاظت کرے کہ وہ نجاست میں گرے اس بنیاد پر کہ وہ ایک صفت سے دوسری صفت میں نہیں رہی جیسا کہ شافعیہ نے بھی یہی کہا ہے، اور یہاں پر جو کلام ہے وہ قطعی طور پر ثابت ہے۔ جلانے اور دھونے میں فرق کی وجہ سے اور جلانے میں اہانت کے ظہور کی وجہ سے دھونا متعین ہے اور مناسب ہے کہ اس کا پانی پی لیا جائے، کیونکہ یہ ہر بیماری کی دوا ہے اور سینے کی بیماریوں کی شفاء ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہ اختلاف آج اس موجودہ دور میں بھی باقی ہے تو تمہارا اتفاق کو دعویٰ کہاں گیا؟ میں بتاتا ہوں: وہ قراءتیں جن پر ہم آج قائم ہیں، ان مذکورہ مصاحف سے باہر نہیں ہیں، جن میں زیادتی یا کمی کی طرف رجوع کیا جائے اور جو بھی اختلاف ہے وہ اعراب یا نقطوں کا ہی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، کیونکہ ان مصاحف کے رسم الخط نقطوں کے بغیر تھے اور ان میں تمام سارے اعراب اور نقطوں کا احتمال تھا جیسا کہ پڑھا جاتا ہے: ”فَصْرُ هُنَّ“ صاد کے ضمہ کے ساتھ اور کسرہ کے ساتھ ”کَلِمَةُ اللَّهِ“ رفع اور نصب دونوں کے ساتھ اور ”ویبصرکم“ اور ”بصركم“ اور ”یقض اور یقض الحق۔

شاطبی فرماتے ہیں: تمام مصاحف کا رسم الخط مصحف عثمانیہ کے رسم الخط کے موافق ہونا چاہئے۔ مالک فرماتے ہیں: قرآن کتاب میں لکھا گیا نہ تو آج کے اس نئے انداز میں تھا اور نہ اس طرح سطر میں تھیں اور ابو عمر والدانی امام مالک کے قول کے بعد فرماتے ہیں کہ اس میں ان کا کوئی مخالف نہیں۔

قال ابن شہاب: یعنی الزہری۔ فأخبرني خارجة بن زيد بن ثابت، انه سمع زيد بن ثابت قال: فقدت آية من الاحزاب حين نسخنا: یعنی میں نے اور قریشی صحابہ نے۔
المصحف: یعنی مصاحف۔

قد كنت أسمع رسول الله ﷺ يقرأ بها، فالتمسناها، فوجدناها مع خزيمه بن ثابت الانصاري: یعنی لکھی ہوئی جیسے کہ گزر چکا ہے۔ طبری فرماتے ہیں: یہ ابو عمارہ الاودی تھے بدر اور اس کے بعد والے غزوات میں شریک ہوئے اور جنگ صفین میں حضرت علی کے لشکر میں تھے جب عمارؓ شہید ہوئے تو انہوں نے اپنی تلوار نکلی کر لی اور لڑتے رہے حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔

﴿م المؤمنین رجال صدقوا.....﴾ [الاحزاب: ۲۳]

فالحقناها في سورتها في المصحف: اس میں اشکال ہے اور وہ یہ کہ اس کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت مصحف میں موجود نہ تھی اور ہر مصحف میں بعد میں لکھی گئی۔ لیکن یہ بہت دور کی بات ہے، پس درست بات یہ ہے کہ مصحف سے مراد پہلے پہل والے صحائف ہیں، جو کہ پہلی جمع کے وقت اس میں لکھے گئے تھے۔ اور متکلم کی ضمیر ”ن“ کے ساتھ تعظیمی ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس حدیث میں واضح بیان ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دو گتوں کے درمیان قرآن کو جمع کیا کہ قرآن جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا اور بعض حفاظ صحابہ کے جانے سے انہیں قرآن کے بعض حصے کے ضائع ہونے کا خوف ہوا تو انہوں نے اس کو اسی طرح لکھا جس طرح انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے وہ قرآن سنا تھا اور رسول اللہ ﷺ صحابہ کو تلقین کرتے تھے

اور جو بھی آپ پر قرآن نازل ہوتا، تو اس کی ترتیب توقیفی ہے جو اب ہمارے مصاحف میں موجود ہے، یہ ترتیب صحابی کرام کو حضور ﷺ نے سکھائی جس کی راہنمائی جبریل امین آپ کی کرتے تھے اور یہ ترتیب توقیفی ہے اور نشاندہی کرنا ہر آیت کے نزول کے وقت کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھی ہے۔ اور اس کا مفہوم حضرت عثمانؓ سے مروی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واضح کرنا کہ دونوں سورتیں علیحدہ علیحدہ ہیں

۲۲۲۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قُلْتُ لِعُمَرَ مَا حَمَلَكُم عَلَىٰ اَنْ عَمَدْتُم اِلَى الْاَنْفَالِ وَهِيَ مِنَ الْمَنَافِي وَالْيَ بَرَاءَةٌ وَهِيَ مِنَ الْمَيْمِينِ فَقَرَأْتُمْ بَيْنَهُمَا وَلَمْ تَكْتُبُوا سَطْرًا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَوَضَعْتُمُو هَا فِی السَّبْعِ الطُّوْلِ مَا حَمَلَكُم عَلَىٰ ذٰلِكَ قَالَ عُمَرَانُ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِمَّا يَأْتِیْ عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَهُوَ يُنَزَّلُ عَلَيْهِ السُّورَةُ ذَوَاتِ الْعَدَدِ وَكَانَ اِذَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ شَيْءٌ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُوْلُ صَعُوْا هٰؤُلَاءِ الْاٰیَاتِ فِی السُّورَةِ الَّتِیْ يَدْكُرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا فَاِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْاٰیَةُ فَيَقُوْلُ لَضَعُوْا هٰذِهِ الْاٰیَةَ فِی السُّورَةِ الَّتِیْ يَدْكُرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا وَكَانَتْ الْاَنْفَالُ مِنْ اَوَّلِ مَا نَزَلَتْ بِالْمَدِیْنَةِ وَكَانَتْ بَرَاءَةٌ مِنْ اٰخِرِ الْقُرْآنِ نَزُوْلًا وَكَانَتْ فِصَّتَهَا شَبِيْهَةً بِفِصَّتِهَا فَفِصَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَانَتْ لَنَا اَنْهَا مِنْهَا فَمِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ قَرَأْتُمْ بَيْنَهُمَا وَلَمْ تَكْتُبْ سَطْرًا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَوَضَعْتُمُو فِي السَّبْعِ الطُّوْلِ - (رواه احمد الترمذی و ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۸۹/۱ حدیث رقم ۷۸۶۔ والترمذی فی السنن ۲۵۴/۵ حدیث رقم ۳۰۸۶۔ واحمد فی المسند ۵۷/۱۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے سورۃ انفال کو جو ”مثنائی“ (سورتوں) میں سے ہے اور سورت برأت (یعنی نوبہ) کو جو ”مئیین“ میں سے ہے پاس رکھا ہے اور دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر فرق بھی قائم نہیں کیا ہے پھر یہ کہ آپ نے سورۃ انفال کو سات لمبی سورتوں کے درمیان رکھا ہے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں وقت گزرتا رہتا تھا اور آیتوں والی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں چنانچہ آپ ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ جب قرآن کی کوئی آیت یا اس کا کچھ حصہ آپ ﷺ پر نازل ہوتا تو آپ ﷺ کا تاجان میں سے کسی کو یعنی زید بن ثابت وغیرہ کو بلا تے اور فرماتے کہ اس آیت کو اس سورت میں شامل کر دو جس میں فلاں فلاں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد پھر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اس کے بارے میں فرماتے کہ اسے اس سورت میں شامل کر دو جس میں فلاں فلاں کا ذکر ہے اور سورۃ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جب کہ سورت برأت قرآن کا وہ حصہ ہے جو آخر میں نازل ہوا ہے لیکن سورۃ انفال میں مذکورہ باتیں سورۃ برأت میں مذکور باتوں کے مشابہ ہیں یعنی دونوں سورتوں میں کافروں سے برسریکار ہونے اور عہد ختم کرنے کا بیان ہے۔ (یعنی بلحاظ مضمون دونوں آپس میں مشابہت رکھتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن ہمیں یہ نہیں بتا گئے کہ سورۃ برأت انفال کا ہی حصہ ہے یا نہیں؟ لہذا نبی کریم ﷺ کے نہ بتانے کے سبب اور دونوں سورتوں میں از روئے مفہوم معنی مماثلت و مشابہت ہونے کے باعث ہم نے دونوں سورتوں کو ملا دیا ہے لیکن ہم نے دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر فرق قائم نہیں کیا اور پھر ہم نے ان دونوں سورتوں کو قریب

قریب سات بڑی سورتوں کے درمیان رکھا لیکن ان دونوں کے درمیان فاصلہ رکھا یعنی دونوں کو الگ الگ رکھا کیونکہ جس طرح دونوں کے دوہونے میں شبہ تھا اسی طرح دونوں کے ایک ہونے میں بھی شبہ تھا۔“ (احمد ترمذی، ابو داؤد)
تشریح: وعن ابن عباس قال: قلت لعثمان: ما حملکم: یعنی ترغیب دینے والی ابھارنے والی چیز اور کیا سبب ہے تمہارے اس کام کا۔

علیٰ ان عمدتہم: میم کے فقرے کے ساتھ یعنی تم نے قصد کیا۔
 الی الأنفال وہی من المثانی: یعنی سبع مثانی میں سے اور وہ ہی سبع طوال ہیں، اور ان میں بعض مفسرین نے کہا کہ قرآن میں جو مثانی ہیں، ان سے مراد وہ سورتیں ہیں جن کی آیات کم ہوں سو سے۔
 اور سارے قرآن کا نام بھی مثانی رکھا جاتا ہے آیت رحمت کا آیت عذاب کے ساتھ ملے ہونے کی وجہ سے اور فاتحہ کو بھی مثانی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہے یا اس کے نزول کے وقت دوبار نازل ہوئی۔ والی براءۃ: یعنی اس کی سورت۔
 وہی: کہ اس کی (ایک سو تیس) آیات ہیں۔

من المثین: مائتہ کی جمع ہے، اور مائتہ کی اصل مائئی ہے معنی کی طرح اور ہاء، واؤ کے عوض میں آئی ہے، اور تم مائتہ کی جمع بناؤ تو مئون کہو گے اور اگر آپ منات کہیں تو بھی جائز ہے۔

فقرنتم بینہما ولم تکتبوا سطر بسم اللہ الرحمن الرحیم و وضعتموها فی السبع الطول؟ :
 الطول، طاء کے ضمہ اور واؤ کے فقرے کے ساتھ۔

ما حملکم علی ذالک: ایک نسخے میں علی ذالکم؟ ہے۔ اور یہ تکرار تاکید کے لئے ہے، اور سوال کی توجیہ ہے کہ انفال سو سے کم آیات والی ہونے کی وجہ سے سبع طوال میں نہیں ہے، کیونکہ اس کی تو صرف ستر (77) آیات ہیں۔
 قال عثمان: کان رسول اللہ ﷺ مما یاتی علیہ الزمان: یعنی لمبا عرصہ اور آپ پر کچھ بھی نازل نہ ہوا۔ اور کبھی کبھی آپ پر ایک زمانہ گزر جاتا۔

وهو: یعنی نبی علیہ السلام۔ اور واؤ حالیہ ہے۔

تنزل: اگر معروف پڑھیں گے تو مونث کے لئے اور اگر مجہول پڑھیں گے تو مذکر کے لئے ہوگا۔

علیہا السور ذوات العدد، وکان اذا نزل علیہ شیء: یعنی نقص دغیرہ میں سے۔

دعا بعض من کان یکتب: یعنی وحی لکھنے والے جیسے کہ زید بن ثابت اور معاویہ بن سفیان وغیرہ۔

فیقول: ضعوا هؤلاء الآیات فی السورۃ التی یدکر فیہا کذا وکذا: جیسا کہ صود اور یونس علیہما السلام کا قصہ۔

فاذا نزلت علیہ الأیۃ فیقول: ضعوا هذه الایۃ فی السورۃ التی یدکر فیہا کذا وکذا: جیسا کہ طلاق اور حج وغیرہ

کا ذکر اور یہ جواب کی زیادتی اس کے ساتھ آپؐ نے دلالت کے لئے تبرع کیا، کہ آیات کی ترتیب تو قیفی ہے اور اس پر اجماع بھی ہے، اور

بہت سی نصوص بھی موجود ہیں، اور رہی سورتوں کی ترتیب تو اس میں اختلاف ہے جیسا کہ اتقان میں ہے۔

کانت الانفال من أوائل ما نزلت: اور ایک نسخے میں نزل کے الفاظ ہیں۔

بالمدينة و كانت براءة من آخر القرآن نزولا : یعنی یہ بھی مدنی سورت ہے۔ اور ان کے درمیان ترتیب کی نسبت میں پہلی اور آخری کی نسبت ہے، ان دونوں کے درمیان جمع کی وجہ میں سے یہ ایک توجیہ ہے۔ اور اس کی تائید اس کے بعد والی روایت کرتی ہے کہ میں نے گمان کیا کہ یہ اسی میں سے ہے اور یہ بات بھی مستند ہے جس نے کہا کہ یہ دونوں ملا کر ایک ہی سورت ہے اور یہ وہ روایت ہے جو ابوالشیخ دوق سے اور ابوالعلیٰ نے مجاہد سے اور ابن ابی حاتم نے سفیان سے اور ابن لہیعہ یہ سارے کہتے ہیں کہ سورۃ توبہ انفال کا حصہ ہے، اسی لئے ان کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ ان دونوں کے مضامین کے ملنے جلنے کی وجہ سے اور نبی ﷺ سے ان دونوں کا الگ الگ مستقل نام ہے۔ قشیری کہتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ بسم اللہ اس میں ہے ہی نہیں، کیونکہ جبریل اس میں بسم اللہ لے کر ہی نہیں آئے اور ابن عباس سے مروی ہے کہ سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ اس لئے نہیں لکھی گئی کہ بسم اللہ امان ہے اور اور یہ سورت تو تلوار کے ساتھ نازل ہوئی۔ اور مالک سے روایت ہے کہ اس سورت کا ابتدائی حصہ جب منسوخ ہونے کی وجہ سے حذف ہو گیا تو اس کے ساتھ بسم اللہ بھی ساقط ہو گئی، کیونکہ بالتحقیق روایت ثابت ہے کہ یہ سورت توبہ اتنی لمبی تھی کہ سورۃ البقرۃ کے برابر تھی، اور ایک قول کے مطابق بسم اللہ ثابت ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ ابن مسعود کے مصحف میں تھا اور اس پر کوئی اعتماد نہیں۔

و كانت قصتها : یعنی الانفال۔

شبيهة بقصتها : یعنی براءة کے اور ضار میں اس کا عکس بھی جائز ہے اور یہ دوسری توجیہ معنوی ہے۔ اور شاید کے مشابہت قتال کے معاملہ میں ہو جیسا کہ سورۃ توبہ میں فرمان الہی ﴿قاتلوهم يعدبهم الله﴾ [التوبة: ۱۴] اور اسی طرح کی دیگر آیات اور عہد کے توڑنے کے بارے سورۃ انفال میں ﴿فانبد اليهم﴾ [الانفال: ۵۸] اور ابن حجر فرماتے ہیں: کیونکہ سورہ انفال نے مشرکین مکہ کے رسول اللہ کے ساتھ جو معاملات ان کو بیان کیا ہے اور سورۃ توبہ نے اہل مدینہ کے منافقین کے رویہ اور کردار کو واضح کیا ہے اور حاصل یہ ہے کہ جو چیز میرے لیے ہوئی وہ یہ ہے کہ ان دونوں میں حکم مشترک ہے۔

فقدض رسول الله ﷺ ولم يبين لنا أنها : یعنی سورۃ توبہ۔

منها : یعنی انفال سے ہے یا اس کا حصہ نہیں ہے۔

فمن اجل ذلك : یعنی جو اس میں عدم وضاحت کا ذکر ہے اور جو وجہ ہمارے لئے ظاہر ہوئیں وہ یہ ہیں کہ ان کے درمیان

مناسبت ہے۔

قرنت بينهما، ولم اكتب سطر "بسم الله الرحمن الرحيم" : یعنی عدم علم کی وجہ سے آیا کہ یہ مستقل سورۃ ہے کیونکہ آپ علیہ السلام پر بسم اللہ فصل کے لئے نازل ہوتی تھی اور یہاں نازل نہ ہوئی اور نہ میں نے لکھی۔

اور وہ قول اس کی نفی نہیں کرتا، جو حضرت علیؓ سے منقول ہے: کہ "بسم اللہ کے نہ نازل ہونے میں حکمت ہے وہ یہ کہ ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا، کہ کیوں نہیں لکھی گئی؟ تو علیؓ نے کہا کہ بسم اللہ تو امان ہے، جب کہ سورۃ توبہ میں امن نہیں ہے، بلکہ وہ تلوار کے ساتھ نازل ہوئی اور عرب کا رواج تھا کہ وہ صلح کے مراسموں میں بسم اللہ لکھتے تھے اور جب عہد توڑتے تو بسم اللہ نہیں لکھتے تھے اور قرآن بھی اسی اصطلاح پر نازل ہوا تو بسم اللہ امان کی علامت ہو گئی اور اس کی عدمیت عہد کے توڑنے کی علامت۔ ان کے قول امان کا یہ معنی ہے اور ان کا قول کہ بسم اللہ آیۃ رحمت ہے اور اس کا نہ ہونا عذاب ہے، اسی طرح عہد کی بھی اس کو ذکر کیا ہے۔

و وضعتها فی السبع الطون : طیبی فرماتے ہیں: کہ یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ یہ دونوں بمنزلہ ایک سورت کے نازل ہوئی ہیں، اور اس کو ملا کر سب طوال مکمل ہوتی ہیں، پھر ایک قول ہے کہ سب طوال یہ ہر ابقرة اور توبہ، اور جو سورتیں ان کے مابین ہیں اور یہ مشہور قول ہے۔ لیکن نسائی اور حاکم نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ سب طوال بقرة اور الاعراف اور ان کے درمیان والی سورتیں ہیں۔ راوی کہتے ہیں: اور انہوں نے ساتویں بھی ذکر کی تھی لیکن مجھے بھول گئی اور یہ احتمال بھی ہے کہ: سورۃ الفاتحہ ہو کیونکہ وہ بھی سب مثنائی سے ہے، یا وہ بھی سب مثنائی ہے، اور اس کی سات آیات 200 کے برابر ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ انفال، اکیلی یا اس کے متصل بعد والی سے مل کر مثنائی میں سے ہو اور ابن جبیر سے صحیح روایت مروی ہے کہ وہ یونس ہے اور اسی جیسی روایت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

شاید اس کی توجیہ یہ ہو کہ سورۃ انفال اور اس کے بعد والی سورت یعنی توبہ کے مثنائی ہونے میں اختلاف ہے۔

اور ان میں سے ہر ایک سورۃ ہے یا یہ دونوں سورتیں ہیں۔

اور اسی طرح نسائی اور ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کی ہے۔

اور حضرت علیؓ سے صحیح روایت مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ عثمانؓ کے بارے میں کلمہ خیر کے سوا کچھ نہ کہو۔ اللہ کی قسم! انہوں نے مصاحف کے بارے میں جو کیا وہ ہماری موافقت اور حمایت سے ہی کیا۔ فرمایا انہوں نے یعنی حضرت عثمانؓ نے کہا تھا کہ تم اس قراءت کے بارے میں کیا باتیں کرتے ہو؟ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم آپس میں سے ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے اور یہ تو کفر کے قریب ہے؟ میں نے کہا: آپ کا کیا خیال ہے؟ تو عثمانؓ نے کہا میرا خیال ہے کہ لوگ ایک ہی مصحف پر جمع ہو جائیں کہ نہ کوئی فرقہ رہے اور نہ کوئی اختلاف۔ میں نے کہا کہ آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔

ابن التین فرماتے ہیں: کہ ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے جمع قرآن کے درمیان فرق یہ ہے کہ ابو بکرؓ کے جمع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں ڈر تھا کہ قرآن کے حفاظ کے دنیا سے جانے سے قرآن میں سے کچھ ضائع نہ ہو جائے۔

کیونکہ اس وقت تک قرآن کسی ایک جگہ میں جمع نہیں تھا، تو انہوں نے قرآن کو صحائف میں سورتوں کی آیات کو اسی ترتیب پر مرتب کر کے جس پر ان کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چھوڑا تھا، جمع کیا۔

اور حضرت عثمانؓ کے جمع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ جوہ قراءت میں اختلاف زیادہ ہو گیا، جب لوگوں نے لغات کی وسعت پر اپنی اپنی لغتوں میں پڑھنا شروع کر دیا۔ تو انہوں نے ایک دوسرے کی قراءت کو غلط کہا۔ تو حضرت عثمانؓ اس بڑے معاملے سے جو قرآن کے متعلق ہے ڈر گئے اور تمام صحف کو ایک صحیفے میں سورتوں کے اعتبار سے لکھ دیا۔ اور ساری لغات میں سے صرف لغت قریش پر اقتصار کیا اس سے دلیل لیتے ہوئے کہ قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا، اور اس کی قراءت میں دیگر لغتوں کی وسعت بھی وہ شروع شروع میں حرج و مشقت کے دور کرنے کی خاطر تھی۔

پس انہوں نے دیکھا کہ اب اس کی ضرورت ختم ہو گئی، تو انہوں نے ایک ہی لغت پر اقتصار کر لیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ وہیم ڈالا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کو بھی چھوڑ دیا جس کا قرآن ہونا ثابت تھا، یعنی وہ واقعتاً قرآن ہی تھا۔ اور درست بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ابو بکرؓ کی جو جمع تھی، اس منسوخات اور متواتر قراءت بغیر کسی تہذیب و ترتیب کے کلی طور پر جمع تھیں۔

عثمانؓ نے منسوخات کو چھوڑ دیا، اور متواترات کو باقی رکھا اور رسم الخط کو خوبصورت کر کے لکھوایا اور سورتوں اور آیات کی ترتیب مقرر

کی، عرضہ اخیرہ کے موافق جو تمام نسخے اس کے مطابق تھے جو لوح محفوظ میں ہے اگرچہ اس کے حالات و مقامات کے تقاضے کے مطابق تھوڑا تھوڑا نازل ہونے پر اختلاف کیا گیا ہے۔

اور اسی لئے باقلانی فرماتے ہیں: حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح صرف قراءت کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے تو صرف نبی علیہ السلام سے مروی عام معروف قراءت پر صحابہ کو جمع کرنے کا قصد کیا تھا، اور اس میں کوئی الغاء نہیں ہے۔ اور ان کو ایک مصحف میں جس میں نہ کوئی تقدیم ہے نہ تاخیر تھی اکٹھا کر دیا۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ یہ مقدار اس طرز و طریقہ پر ہے جو اللہ بلند و برتر کا کلام ہے متواتر طرق سے جس پر محدثین کا اجماع بھی ہے، جو اس میں کمی بیشی کرے وہ کفر میں داخل ہو گیا، پھر اس بات پر بھی اتفاق ہو گیا کہ آیات کی موجودہ ترتیب تو قینی ہے کیونکہ باعتبار نزول آخری آیت: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ [البقرة: ۱۸۲] ہے تو جبریل نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا تھا کہ اس آیت کو آیت مداینہ اور آیت الربا کے درمیان رکھیں، اسی لئے قرآن کی موجودہ ترتیب کے الٹ کو حرام کہا گیا ہے، البتہ سورتوں کی ترتیب پڑھنے میں آگے پیچھے کی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں اختلاف ہے، اور بلا عذر اس کی مخالفت صحیح نہیں، کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے سورۃ النساء کو سورۃ آل عمران سے پہلے پڑھا، جواز کے بیان کے لئے یا نسیان کے ساتھ، تاکہ اس کی صحت کا علم ہو جائے، اس کے باوجود صحیح بات یہ ہے کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب تو قینی ہے، اگر صحابہ کے مصاحف مختلف تھے عرضہ اخیرہ سے پہلے جس پر حضرت عثمانؓ کے جمع شدہ مصحف کا مدار ہے کسی نے نزول کے اعتبار سے ترتیب دی تھی، اور یہ حضرت علیؓ کا مصحف تھا اس کی ترتیب اسی طرح تھی۔ سب سے پہلے سورۃ اقرء، پھر مدثر، پھر نون، پھر مزمل، پھر تبت، پھر تکویر، اسی طرح آخر تک کی اور مدنی سورتیں۔

اور یہ چیز بھی اس ترتیب کے توفیقی ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ حوامیم 'تسلسل' کے ساتھ ہیں اور اسی طرح طواسین یعنی طس والی سورتیں جبہ مسجات کو تسلسل کے ساتھ مرتب نہیں کیا۔

بلکہ ان سورتوں کے درمیان فصل کیا ہے اور اسی طرح کی اور مدنی سورتیں کس ہیں یعنی کئی سورتوں کا مدنی سورتوں کے ساتھ اختلاط

ہے۔ واللہ اعلم



کِتَابُ الدَّعَوَاتِ

یہ کتاب دعاؤں کے بیان میں ہے

دعوات : دعوة بمعنی دعا کی جمع ہے۔ دُعا کے معنی ہیں کہ ”اعلیٰ ذات سے ادنیٰ چیزوں میں سے کچھ چیزیں بطریق عاجزی طلب کرنا“ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کے علماء اس بات پر متفق رہے ہیں کہ دعا مانگنا مستحب ہے ان کی دلیل قرآن و حدیث کے ظاہری اور واضح مفہوم کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کا فعل بھی ہے کیونکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام دعا مانگا کرتے تھے۔ لیکن بعض زاہدین و عارفین کا کہنا ہے کہ ترک دعا (یعنی دعا نہ مانگنا) افضل ہے کیونکہ اس طرح رضاء مولیٰ اور اپنی قسمت اور تقدیر کے ساتھ راضی ہونے کا مکمل اظہار ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پیش آیا کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے اور اپنے پروردگار سے اپنی نجات و سلامتی کے لئے درخواست کیجئے تو انہوں نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جل شانہ میرا حال جانتا ہے مجھے کوئی درخواست کرنے اور دعا مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اگر مسلمانوں کیلئے دعا مانگتا ہے تو یہ مستحسن ہے اور اگر صرف اپنے لئے مانگتا ہے تو مستحسن نہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ اگر دعا کا کوئی باعث ہو تو دعا مانگنا مستحب ہے وگرنہ نہیں۔

الفصل الاول :

قیامت کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کی شفاعت کریں گے

۲۲۲۳ : عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ فَتَعَجَّلْ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهُ وَرَأَيْتِي اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِّأُمَّتِي إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَهِيَ نَائِلَةٌ إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِي لَا يَسْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا۔ (رواه مسلم و للبخاری اقصمته)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۷۰/۱۱ حدیث رقم ۶۳۶۱۔ و مسلم فی صحیحہ ۴/۲۰۰۷ حدیث رقم (۲۶۰۰۸۸) و أحمد المسند ۳۱۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کے لئے ایک دعا ہوتی ہے جو قبول کی جاتی ہے پس ہر نبی نے دعا کرنے میں جلدی کی۔ اور تحقیق میں اپنی دعا چھپا رکھی ہے اپنی امت کی شفاعت کے واسطے مؤخر کر دی ہے قیامت کے دن تک۔ پس ہر اس شخص کو پہنچنے والی ہے اگر اللہ نے چاہا میری امت میں سے جن کو

موت آئی اس حال میں کہ اس نے شریک نہیں کیا اللہ کے ساتھ۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے اور بخاری شریف کی روایت اس سے کمتر ہے۔

تشریح: قوله: ان لكل نبي دعوة مستجابة فتعجل كل نبي دعوته:

ہر ایک نبی کے لئے ایک دعا ہے جو قبول کی جاتی ہے اس جملہ کی دو تشریحات بیان کی گئی ہیں:

❖ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو حکم فرمایا تھا کہ اپنے مخالفین کی تباہی کے لئے بددعا کریں لہذا وہ بددعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ اسے منظور فرماتا تھا چنانچہ نبی نوح علیہ السلام نے اپنی امت کی ہلاکت و تباہی کے لئے بددعا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پوری امت طوفان میں غرق کر دی گئی۔

اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی امت کی تباہی کے لئے بددعا کی اور امت ان کی حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ایک آواز کے ذریعہ ہلاکت ہوئی وادیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذن ہو گئی (لیکن میں نے اپنی دعا کو محفوظ رکھا)۔

❖ یہ بات طے ہے کہ ہر نبی کی ایک دعائینی طور پر قبول کی جائے گی۔ بخلاف باقی دعاؤں کے باقی دعاؤں کی اجابت کی طمع کی جاسکتی ہے۔

قوله: وانی اختبأت دعوتی شفاعة لامتی فهی نائلة إن شاء الله من مات من امتی لا یشرک باللہ شیئاً:

”اختبأت“ اختباء سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں چھپانا۔ لام تعلیلیہ ہے۔ ائی لأجل أن اصرفها لهم خاصة بعد العامة (شفاعة حال ہے) ائی حال کونہا شفاعة۔ قوله: ”إلی یوم القیامة“ (کا متعلق محذوف ہے) ائی مؤخرہ ائی ذلك الیوم۔ اور ایک نسخہ میں ”یوم القیامة“ ہے۔ اس صورت میں یہ ”شفاعة“ کے لئے ظرف ہوگا۔

”مَنْ“ مفعول ثانی ہے نائلة کے لئے اور ”مَنْ“، ”مَنْ“ کا بیان ہے اور لا یشرک باللہ ”مات“ کی ضمیر سے حال ہے۔ ”شیئاً“ میں ترکیبی دو احتمال ہیں: (۱) مفعول بہ ہو۔ (۲) مفعول مطلق ہو۔

اور اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ میں نے اپنی دعا کو محفوظ رکھا۔ بایں طور کہ اپنے مخالفین کی ایذا پر صبر کیا اور ان کے لئے بددعا نہ کی۔ اور ”امت“ سے مراد امت اجابت ہے۔ قیامت کے دن اس دنیا میں بددعا کے بجائے ہر اس امتی کے حق میں شفاعت فرمائیں گے جو ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا ہو اگرچہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہو۔

”إن شاء الله“ کہنے کی حکمت:

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس (شفاعت) کا حصول یقینی ہونے کے باوجود ”إن شاء الله“ فرمانا از روئے ادب اور اس آیت کریمہ کے اتشال کی خاطر تھا: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَعْمَلُ بِشَاءِ اللَّهِ﴾ [الکہف: ۲۳] اہ اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہاں ”إن شاء الله“ کے کلمات فرمانا بطور تبرک کے تھا آیت میں امر سے مراد دنیا میں واقع ہونے والے افعال ہیں آخرت میں پیش آنے والی اخبار سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق اگلے جملہ ”من مات من امتی“ کے ساتھ ہو۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ مخلوقات میں سے کسی بھی چیز کا اللہ کے ذمہ کوئی بھی حق نہیں ہے۔

ایمان میں استثناء:

محققین کا کہنا ہے کہ ایمان میں استثناء کا مسئلہ اختلافی ہے۔ لیکن یہ اختلاف لفظی ہے لہذا جس کا ارادہ تعلق فی الحال کا ہوگا وہ کافر ہو جائیگا، اور اگر تبری محض کا ارادہ تھا یا مال پر نظر کرتے ہوئے تھا بالافتاق وہ شخص کافر نہیں ہوگا۔ ہمارے اصحاب نے ”انا مؤمن ان شاء اللہ“ کہنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں ایہام ہے۔

قولہ: و البخاری اقصر منه: عرض مرتب: مرقات کے تحتانی متن میں ”اقتصر“ از باب افتعال ہے اور فوقانی متن میں ”اقصر“ از باب افعال ہے۔ مرقاۃ کے بخشی فوقانی متن کی بابت لکھتے ہیں:

هكذا في الأصل ولها وجه في اللغة وهي على وزن افعال، بينما في المشكاة ”أقصر“ على وزن أفعال۔

نبی کریم ﷺ جہان والوں کے لئے رحمت بن کر آئے

۲۳۳۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اللَّهُمَّ إِنِّي اتَّخَذْتُ عِنْدَكَ عَهْدًا لَنْ تَخْلِفَنِيهِ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ فَأَيُّ الْمُؤْمِنِينَ أَذْيَبُهُ سَمْتَهُ لَعْنَتُهُ جَلَدْتَهُ فَأَجْعَلْهَا لَهُ صَلَوةً وَرِزَاةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُهُ بِهَا إِلَيْكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق عليه)

آخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۳۹۱۱ حدیث رقم ۶۳۳۸۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۶۳/۴ حدیث رقم (۷-۶۷۸)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا الہی میں نے تجھ سے ایک حاجت مانگی ہے مجھے اس کے ساتھ بہرہ مند کر دیجئے اور مجھے اس میں ناامید نہ کر۔ یعنی میں ناامیدوار ہوں کہ تو ضرور قبول کرے گا۔ پس سوائے اس کے نہیں کہ میں بشر ہوں۔ پس کسی مؤمن کو میں نے ایذا دی ہو میں نے برا کیا ہو۔ میں نے اس کو لعنت کی ہو میں نے اس کو مارا ہو پس ان سب چیزوں کو اس کے حق میں رحمت سمجھو اور گناہوں سے پاکی اور نزدیکی کا سبب کہ تو نزدیک کرنے اس کو ان سب چیزوں کی وجہ اپنی طرف قیامت کے دن۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللہم انی اتخذت عندک عہدا لن تخلفنیہ: باب افعال ”اخلاف“ مصدر سے ہے۔ بعض کا کہنا

ہے کہ اصل کلام یوں تھا: انی طلبت منک حاجۃ أسعفنی بها ولا تخیننی فیہا۔

”حاجۃ“ کی جگہ لفظ ”عہد“ ذکر فرمایا، اس میں حاجت کے پورا ہونے کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے اور لا تخیننی کی

جگہ لن تخلفنیہ ذکر فرمایا۔

بعض کا کہنا ہے کہ لفظ ”عہد“ کو موضع ”وعد“ میں ذکر فرمایا ہے۔ مبالغہ مقصود ہے اور اشعار ہے کہ یہ وعدہ ہے عہد کی طرح، اس میں تحلف نہیں ہو سکتا اور اسی وجہ سے ”عہد“ کے بعد ”خلف“ استعمال فرمایا، ”نقض“ ذکر نہیں فرمایا۔ یہ اسلوب تعبیر زیادت تاکید کی خاطر اختیار فرمایا۔ بعض کا کہنا ہے کہ عہد سے مراد ”امان“ ہے۔ اسی: أسألك أمانا لن تجعله خلاف ما أترقبه وأترجیه۔ یعنی میری اس امان کو روپ نہ فرمائیے۔ چونکہ انبیاء کرام رضی اللہ عنہم کی دعا رد نہیں ہوتی اور موضع سوال میں ”اتخاذ“ کو ذکر فرمانا تحقیق رجاء کی بنیاد پر ہے کہ وہ حاصل ہے یا اجابت دعا کے ساتھ موعود ہے۔ شیء موعود کی جگہ مستول معہو کو ذکر فرمایا اور پھر لن تخلفنیہ کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ کے وعدہ میں خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

قولہ: فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ: ایک روایت میں آتا ہے: أغضب کما یغضب البشر۔

”فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ“ عذر کی تمہید ہے کہ میں بھی انسان ہوں کبھی کبھی بتقاضاے بشریت کسی پر خفا بھی ہو جاتا ہوں۔

ابن ملک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ" فرماتے ہیں بشر کی ظلومیت و جہولیت کی طرف اشارہ ہے۔ اھا اور حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کے دربار میں آہ و زاری کرتے ہوئے یہ دعا فرمائی ہے کہ اے میرے رب مجھے میرے نفس کے سپرد مت فرما۔ جیسا کہ ایک حدیث میں بھی ایسا ہی آیا ہے: ((اللهم لا تكلني الى نفسي طرفة عين))۔

قولہ: فای المؤمنین آذیتہ..... یوم القیامۃ: یہ جملہ ناقص کلام کیلئے بمنزلہ بیان و تفصیل کے ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مولیٰ سے یہ بات طلب کی ہے کہ اگر مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوگئی ہو جو بشریت کے مقتضی کے لائق نہ ہو تو عفو و مغفرت کے ذریعہ اس کا تذکرہ فرما دیجئے اور اس کے عوض میں میرے معتبورین کو انواع و اقسام کی عطا فرما۔

"شمتہ" آذیتہ کے لئے بیان ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے حرف عطف کو ذکر نہیں فرمایا۔

امام طہی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ذکر هذه الأمور علی سبیل التعداد بلا تنسيق؛ وقابلها بانواع الالطاف متناسقة لیجمعها کل واحد من تلك الأمور و لیس من باب اللف۔ ان امور کو علی سبیل التعداد ذکر کرنا ان میں تسبیق قائم کئے اور ان کے مقابلہ میں تسبیق کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ لفظ شمر تب کے باب میں سے نہیں ہے۔

ابن الملک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "تقربه بها" یہ جملہ صلاة و زکاة و قربہ کی صفت ہے۔ اسی تقربہ بتلك الأذیة، او بكل واحد من الصلاة و اختیه۔

دُعا کرتے وقت خدا تعالیٰ پر پورا یقین ہونا چاہیے

۲۲۲۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ اِنْ شِئْتَ اِرْحَمْنِيْ اِنْ شِئْتَ اَرْزُقْنِيْ اِنْ شِئْتَ وَاَلَيْعِزُّمْ مَسْأَلَتُهُ اِنَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَلَا مُكْرِهَ لَهٗ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۳۹۱۱ حدیث رقم ۶۳۳۸۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۶۳۴ حدیث رقم (۷- ۶۷۸)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو یہ نہ کہے اے الہی! مجھے بخش دے اگر چاہے، اگر چاہے تو مجھ پر رحم کر اور اگر چاہے تو مجھ کو روزی دے اور چاہے کہ عزم بالجزم کرے اپنے مانگنے میں شک کا کلمہ نہ کہے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس پر کوئی زبردستی کرنے والا نہیں ہے۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: فلا یقول..... ان شئت: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگو جزم و یقین کے ساتھ مانگو یعنی "یہی کہو کہ" اے اللہ! ہمارا فلاں مطلب پورا کر۔ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اس لئے یہ نہ کہو "کہ اگر تو چاہے تو ہمارا فلاں مطلب پورا کر دے۔" کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت دعا میں شک پیدا کرنا ہے حالانکہ قبولیت دعا میں یقین ہونا چاہئے کیونکہ اس نے قبولیت دعا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کیا کرتا وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اس لئے اپنی دعا کے ساتھ یہ کہنا کہ "اگر تو چاہے" بالکل بے فائدہ اور لا حاصل ہے۔

قولہ: ولیعزم مسألته انه یفعل ما یشاء:

"انہ یفعل ما یشاء" یہ جملہ متانفہ ہے، تعلیل کے معنی کو مضمّن ہے۔ ایک نسخہ میں "انہ" ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے۔

ابن الملک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: روایت معتبرہ میں "انہ" ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ "لیعزم" کا مفعول لہ ہے۔ اسی لئے یفعل ما یشاء۔ یا مسالۃ کیلئے مفعول بہ ہے۔ اسی لیعزم مسألته فعل ما شاء اھ۔ مفعول بہ ہونا معنی کے اعتبار سے درست نہیں۔ (فتاویٰ)

۲۲۲۶: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ اِنْ شِئْتَ وَلٰكِنْ لِيُعْزِمَ لِيُعْظِمَ الرَّغْبَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَتَعَاطَمُهُ شَيْءٌ اَعْطَاهُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۹۵/۴ حديث رقم (۹-۲۷۳۵)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت تم سے کوئی دعا مانگے پس یہ نہ کہے الہی مجھے کو بخش اگر تو چاہے۔ لیکن طلب کرے بغیر شک کے یقین کے ساتھ اور رغبت زیادہ کرے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز دینی مشکل نہیں ہے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وليعظم..... الخ: "ليعظم" (باب تفعليل سے ہے) طاء مشددة ہے۔

"لا يتعاطمه": اہل عرب کہتے ہیں: تعاطم زيد هذا الامر۔ اى كبر عليه وعسر۔

اور مطلب یہ ہے کہ کسی بھی شئی کا عطا کرنا اللہ کے نزدیک بڑا نہیں۔ بلکہ تمام موجودات اس کے حکم میں آسان ہیں، وہ ہر شئی پر قادر ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

لو اجتمع الأولون والآخرون على صعيد واحد، فسأل كل مسألة وأعطيه اياها ما نقص ذلك من ملكي شيئا۔
"اگر اگلے اور پچھلے ایک جگہ جمع ہوں اور تم میں سے ہر شخص اپنی انتہائی آرزو و خواہش کے مطابق مانگے (یعنی جس کے دل میں جو بھی آرزو اور خواہش ہو مجھ سے مانگے) اور پھر تم میں سے ہر شخص کو (اس کی خواہش کے مطابق دوں) تو اس سے میری خدائی میں کچھ بھی کمی نہیں ہوگی۔"

عرض مرتب: اس کے ہم معنی دو روایات آگے بھی آرہی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: حدیث ۲۲۲۶ اور حدیث: ۱۲۳۵۰ھ۔

۲۲۲۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِاِسْمِ اَوْ قَطِيعَةٍ رَحِمَ مَا لَمْ يَسْتَعِجِلْ قَبْلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا اِسْتَعْجَلُ؟ قَالَ يَقُولُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَ يُسْتَجَابُ لِيْ فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِكَ وَيَدْعُ الدُّعَاءَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۹۵/۴ حديث رقم (۹-۲۷۳۵)۔ (۱) الترمذی فی السنن حدیث رقم ۳۵۰۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے یعنی بندے کی دعا قبولیت کی شرطوں کے بعد جب تک کہ وہ گناہ کی دعا نہ مانگے یا رشتہ توڑنے کی دعا نہ مانگے۔ جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کہا گیا یا رسول اللہ جلدی کیا ہے آپ نے فرمایا: وہ کہے کہ تحقیق میں نے دعا مانگی اور تحقیق میں نے دعا مانگی، یعنی اکثر بار میں نے دعا مانگی۔ پس میں نے دیکھا کہ قبول میری دعا نہ ہوئی۔ پھر وہ تھک جائے اور دعا مانگنی چھوڑ دے۔

تشریح: قوله: يستجاب للعبد ما لم يدع باسْم او قطيعة رحِم: "ما" يستجاب كيلئے طرف ہے۔ اى مدة

كونه۔

یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مؤمن کی دعا اس وقت قبول ہوتی ہے جب کہ وہ نہ گناہ کی کوئی چیز طلب کرے اور نہ ناتوازی کی دعا کرے اور نہ جلد بازی سے کام لے۔

گناہ کی چیز مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یہ دعا مانگنے لگے "اے اللہ! مجھے فلاں شخص کو (جو مسلمان ہے) قتل کر دینے کی صلاحیت عطا فرما یا یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شراب یا کوئی حرام وغیرہ عطا فرما یا یہ کہے کہ "اے اللہ! فلاں شخص کو بخش دے درنا خلیکہ اس بارے میں یقین

ہے کہ وہ کافر مہر ہے ظاہر ہے اس قسم کی دعا مانگنا اور پھر ان کی قبولیت کی توقع ہی رکھنا دیدہ دلیری ہی کہا جاسکتا ہے اس طرح محال اور غیر ممکن الوقوع چیزوں کی دعا مانگنا اور ان کی قبولیت کی امید رکھنا بھی انتہائی حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے مثلاً کوئی عقل کا اندھا یہ دعا مانگے کہ اے اللہ! تو مجھے دنیا ہی میں حالت بیداری میں اپنا ذیاد عطا فرما۔ ”ناتہ توڑنے کی دعا“ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بد باطن شخص یہ دعا مانگنے لگے کہ ”اے اللہ! مجھ میں اور میرے باپ میں جدائی اور تفریق کر دے“ اس حدیث کے مفہوم کے مطابق مؤمن کی ایسی غیر ایمانی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

حدیث کے آخر میں الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات بندہ مؤمن کی شان کے لائق نہیں ہے کہ اگر قبولیت دعا میں تاخیر محسوس ہو تو تھک کر بیٹھ جائے اور دعا مانگنا ہی چھوڑ دے کیونکہ دعا بھی عبادت ہے اور عبادت سے اس طرح اکتاہٹ یا دل گرفتگی مؤمن کے لئے کسی بھی حال میں مناسب نہیں ہے پھر یہ کہ قبولیت دعا میں تاخیر یا تو اس لئے ہوتی ہے کہ اس کا وقت نہیں آتا کیونکہ ازل ہی میں ہر چیز کے وقوع اور تکمیل کا ایک وقت مقرر ہے جب تک وہ وقت نہیں آیا وہ چیز بھی وقوع پذیر نہیں ہوتی یا یہ دعا مانگنے والا جو دعا مانگتا ہے اس کی تقدیر میں اس کی دعا کا اس دنیا میں قبول ہونا لکھا نہیں ہوتا اس صورت میں اسے اس کے بدلہ میں آخرت کا ثواب عطا کیا جاتا ہے یا پھر قبولیت میں تاخیر اس لئے ہوتی ہے تاکہ دعا مانگنے والا دعا مانگنے میں پوری عاجزی و انکساری سچی لگن اور تڑپ اور کمال عبودیت کا اظہار کرتا رہے کیونکہ دعا میں ان چیزوں کو اختیار کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے۔

”أو قطیعة رحم“: یہ تخصیص بعد از تعیم ہے۔

”مالم یتستعجل“: امام طبری فرماتے ہیں: بظاہر مالم یتستعجل کے ساتھ حرف عطف ذکر کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اس بات پر تنبیہ کی خاطر ترک فرمایا کہ یہ دونوں مستقل قیودات ہیں۔ اسی: یتستجاب مالم یدع یتستجاب مالم یتستعجل۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: فی تخلید المؤمن والرؤیة نظر ظاہر، فان الخلاف شہیر اھ۔

ابن حجرؒ کا یہ کلام مردود ہے، چونکہ خوارج اور معتزلہ کے اختلاف کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے۔ اور روایت باری تعالیٰ شرعاً محال ہے، موسیٰ علیہ السلام کا روایت باری تعالیٰ کا سوال کرنا اس بناء پر تھا کہ روایت باری تعالیٰ عقلاً محال نہیں ہے۔ چنانچہ جب انہیں افاقہ ہوا اور روایت باری تعالیٰ کا شرعاً محال ہونا معلوم ہوا تو پکاراٹھے: ﴿سبحانک تبت الیک وأنا اول المسلمین﴾ [الاعراف: ۱۷۴] یعنی کہ آپ کو دنیا میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ کہا گیا ہے کہ: ”ومنہ اخف زلننا عن الکرام الکاتبین۔ نعم، ان قصد التوفیق للتوبة عقب الزلة حتی لا یکتبها الملك جاز۔ اس کی دلیل ابن عساکر کی یہ حدیث ہے: اذا تاب العبد أنسی اللہ تعالیٰ الحفظۃ ذنوبہ، وأنس ذلك جوارحه ومعامله من الأرض، حتی یلقى اللہ تعالیٰ ویس علیہ شاهد من اللہ بذنوبہ۔ اور اسی قبیل سے وہ احادیث آحاد ہیں جو اس کے ثبوت پر دلالت کر رہی ہیں۔ مثلاً: اللہم اغفر للمسلمین جمیع ذنوبہم۔ چونکہ احادیث صحیحہ اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ ایک جماعت لازمی طور پر جہنم میں جائے گی۔ اور یہ قول بھی اس کے منافی نہیں: اللہم اغفر لی ولجمیع المسلمین۔ چونکہ اس کا محل وہ صورت ہے کہ جب مسلمانوں کیلئے مطلق مغفرت کا سوال کرے۔ البتہ جب اپنے لئے اور ان کیلئے آخرت میں عموم مغفرت کا ارادہ ہو تو یہ محل حرمت میں ہے، چونکہ اس صورت میں یہ شخص احادیث صحیحہ کی تکذیب کا مرتکب ہو رہا ہے۔ عجمی زبان میں مانگی گئی ہر مجہول المعنی دعا بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور اس قبیل سے یہ بد دعا بھی ہے کہ جب کسی نے اس پر بالکل ظلم نہ کیا ہو اور یہ اس کیلئے بد دعا کرے۔ یا ظالم کے ظلم سے بڑھ کر اس کے خلاف کوئی بد دعا کی جائے۔ سعد بن زید کا قصہ اس کے منافی نہیں کہ انہوں نے اپنے اوپر کئے جانے والے ظلم سے بڑھ کر ان کے حق میں بد دعا کی تھی، یہ صحابی کا مذہب ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث میں

آتا ہے: من دعا علی ظالمه فقد انتصر۔

کسی ظالم کے سوءِ خاتمہ کی بدعا کرنے:

کسی ظالم کے بارے میں سوءِ خاتمہ کی بدعا کرنے میں جواز و عدم جواز کا اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مباح ہے۔ جیسا کہ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی تھی: ﴿وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضِلَالًا﴾ [نوح: ۲۴] اور موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الہی میں عرض کیا: ﴿وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ [یونس: ۸۸] عتبہ بن ابی وقاص نے جنگِ احد میں جب نبی کریم ﷺ کے دندان مبارک شہید کئے اور آپ ﷺ کا چہرہ انور زخمی کیا تو آپ ﷺ نے اسے یہ بدعا دی: ”اللهم لا تحل عليه الحول حتى يموت كافرا“۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ممنوع ہے۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: بعض اہل علم نے دونوں کے درمیان جمع کی صورت یہ بیان کی ہے کہ اول کو ایسے سرکش پر محمول کیا ہے جس کا ظلم عام ہو۔ اور دوسری صورت کو غیر ظالم پر محمول کیا ہے۔ اہد درست یہ ہے کہ پہلی صورت کافر پر محمول ہے اور دوسری صورت مسلم پر محمول ہے۔

قوله: ما الاستعجال فلم أر: (روایت بمعنی علم ہے یا بمعنی ظن ہے۔) أى فلم أعلم أو أظن دعائى۔ یہ مفعول اول ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ (کذا قاله الطيبي) اور زیادہ واضح یہ ہے کہ يستجاب سے پہلے ”أن“ مقدر ہے۔ یا بغیر ان کے بتاویل مصدر ہے۔

میں نے دعا کو قبول ہوتے نہیں دیکھا کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی دعا کی قبولیت کے آثار نہیں دیکھے۔ (یہ کہنا دو حال سے خالی نہیں کہ یا تو) یہ ”استبطاء“ ہے یا اظہار ”یاس“ ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں مذموم ہیں۔

”استبطاء“ اس وجہ سے مذموم ہے کہ اجابت کا ایک وقت معین ہے، جیسا کہ مروی ہے:

ان بين دعا موسى وهارون على فرعون وبين الأجابة أربعين سنة

کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے فرعون کیلئے جو بدعا کی اس کی قبولیت میں چالیس سال کا عرصہ لگا

اور ”یاس“ اس وجہ سے مذموم ہے کہ یہ حکم قرآنی کے مخالف ہے: ﴿فَلَا يَأْسُ مِنْ رُوحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ﴾

اجابت دعا کی اقسام:

واضح رہے کہ اجابت کی دو قسمیں ہیں: (ل) عین مطلوب بروقت مطلوب حاصل ہو جائے۔ (ب) عین مطلوب کسی اور وقت میں حاصل ہو، اور اعتقاد یہ ہو کہ اللہ نے کسی حکمت کے پیش نظر اس کو مؤخر کر دیا ہے۔

غائب کی دُعا غائب کے لئے بہت جلد قبول ہوتی ہے

۲۲۲۸ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ دَعَا المَرْءِ المُسْلِمِ لِأَخِيهِ بظَهْرِ الغَيْبِ مُسْتَجَابَةٌ

عِنْدَ رَأْسِهِ مَلَكٌ مُوَكَّلٌ كُلَّمَا دَعَا لِأَخِيهِ بِخَيْرٍ قَالَ المَلَكُ المُوَكَّلُ بِهِ أَمِينٌ وَلَكَ بِمِثْلِ - (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابی درداءؓ سے روایت ہے کہ مسلمان آدمی کی دعا اپنے مؤمن بھائی کے لئے اس کے پیٹھ پیچھے (یعنی غائب آدمی کی دعا غائب کے لئے قبول کی جاتی ہے۔ اس کے لئے ایک فرشتہ متعین کر دیا جاتا ہے یعنی دعا مانگنے والے کے لئے ایک فرشتہ متعین کیا جاتا ہے جب وہ اپنے بھائی کے لئے بھلائی کی دعا مانگتا ہے متعین کیا گیا فرشتہ کہتا ہے کہ یا اللہ اس کی دعا قبول کر۔ اور تیری بھی اسی طرح سے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: دعوة المرء المسلم لآخيه بظهر الغيب مستجابة:

امور نحویہ: ”المرء“ مرد و عورت دونوں کو شامل ہے۔ لفظ ”ظہر“ ”متمم للتاکید ہے۔ (اصل عبارت یوں ہے): أى: فى غيبة المدعوله عنه۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ”بظہر الغیب“ مضاف الیہ سے حال ہونے کی بناء پر موضع نصب میں ہے، چونکہ لفظ ”دعوة“ مصدر اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصدر کیلئے ظرف ہو اور ”مستجابة“ اس کی خبر ہو۔ یہاں تو بطور خاص اس دعا کی قبولیت کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے مسلمان بھائی کے لئے اس کی عدم موجودگی میں زبان سے نکلے لیکن ایسے ہی اگر کوئی مسلمان کے لئے اس کے سامنے اپنے دل میں چپکے سے دعا کرے تو وہ دعا بھی اس بشارت کے تحت آتی ہے کیونکہ جس طرح غائبانہ دعا میں خلوص کا فرما ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں دعا قبول ہوتی ہے اسی طرح اس کی موجودگی میں اپنے دل میں یا چپکے سے دعا کرتے وقت بھی پوری طرح خلوص ہی کی کار فرمائی ہوتی ہے۔

قوله: عند رأسه ملك موكل: جملہ متانفہ ہے، استجابہ کا بیان ہے۔

قوله: كلما دعا لآخيه..... لك بمثل: ”آمین“: (اسم بمعنى فعل امر ہے) أى: استجب له يا رب۔

”لك“ میں ”التفات“ ہے۔ یا اصل عبارت یوں ہے: استجاب الله دعاك فى حق أخيك

”بممثل“: میم کے سرہ، ثنائے مثلثہ کے سکون اور لام کی تینوں کے ساتھ ہے۔ ابن حجر کا یہ کہنا کہ ”دونوں کے فتح کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔“ بے موقع محل ہے۔ أى: و لك مشابه هذا الدعاء۔

امام طیبیؒ لکھتے ہیں: ”بممثل“ مبتدا پر داخل یہ باء زائدہ ہے، جیسا کہ بحسبک الدرہم میں باء زائدہ ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ دعا قبول کرنے والے کے ساتھ جو فرشتہ متعین کیا جاتا ہے کہ وہ دعا کے وقت بارگاہ حق شانہ میں یہ سفارش پیش کرتا ہے کہ الہی اس شخص کی دعا اس کے بھائی کے حق میں قبول فرما اور پھر وہ دعا کرنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ”جس طرح اس دعا کے نتیجے میں تیرا بھائی خیر و بھلائی کو پہنچے گا اسی طرح خدا کرے کہ تجھے بھی خیر و بھلائی حاصل ہو۔“

دعا کا ایک انداز:

بعض کا کہنا ہے کہ بعض سلف کی عادت تھی کہ جب وہ اپنے لئے کوئی دعا مانگنے کا ارادہ کرتے تو بعینہ وہی دعا اپنے مسلمان بھائی کیلئے مانگتے تھے، تاکہ فرشتہ ان کیلئے بھی اس کے مثل کی دعا دے اور قبولیت کیلئے زیادہ معین ہو۔ اہ
لیکن یہ بظاہر نبی کریم ﷺ کے فعل کے مخالف ہے، چنانچہ عنقریب آجائے گا کہ نبی کریم ﷺ کے فعل کے مخالف ہے، چنانچہ عنقریب آجائے گا کہ نبی کریم ﷺ پہلے اپنے لئے دعا فرماتے تھے، اور پھر دوسرے کیلئے دعا فرماتے تھے۔

بدو دعا کرنے سے ممانعت

۲۲۴۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَدْعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ وَلَا تَدْعُوا عَلَى أَوْلَادِكُمْ وَلَا

تَدْعُوا عَلٰی اَمْوَالِكُمْ لَا تَوَافِقُوا مِنَ اللّٰهِ سَاعَةً يُسْأَلُ فِيْهَا عَطَاءٌ فَيَسْتَجِيبُ لَكُمْ۔ (رواه مسلم)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۸۸/۲ حديث رقم ۱۰۳۲۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی جانوں کے خلاف بدعا نہ کرو۔ اور نہ ہی اپنی اولاد کے خلاف بدعا کرو۔ اور نہ ہی اپنے مالوں کے خلاف بدعا کرو۔ یعنی غلام و لونڈیوں کے خلاف اور جانوروں کے خلاف تاکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسی ساعت کہیں نہ ہو کہ اس میں تمہارے لئے بخشش مانگی جائے اور اللہ تعالیٰ تمہارے لئے قبول کر لے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله لا تدعوا على انفسكم لا توافقوا من الله ساعة:

”عطاء“: مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب ہے، ایک نسخ میں مرفوع ہے، اس صورت میں یہ ”یسأل“ کا نائب فاعل ہوگا۔

”عطاء“ کہتے ہیں ہر عطا کردہ چیز، خواہ وہ خیر ہو، خواہ وہ شر ہو۔ اس کا اکثر و بیشتر استعمال ”خیر“ کے معنی میں ہوتا ہے۔

(فیستجیب) مرفوع ہے۔ چونکہ اس کا عطف ”یسئل“ پر ہو رہا ہے، یا اس لئے کہ جملہ متانفہ ہے۔ ای فہو یستجیب

سید جمال الدین رقطراز ہیں کہ ہم نے اس کو مرفوع ہی سنا ہے۔ اھ۔

اور کچھ شارحین فرماتے ہیں: ”یسئل“ میں ضمیر لفظ جلالہ کی طرف راجع ہے۔ اور یہ جملہ ”ساعة“ کی صفت واقع ہے اور

”فیستجیب“ منصوب ہے کیونکہ یہ ”لا توافقوا“ کا جواب ہے۔ امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ یہ جواب نبی ”لا تدن من الاسد

فياكلك“ کے قبیل سے ہے۔ امام کسائی کے مذہب کے مطابق اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مرفوع ہو تقدیری عبارت یوں ہو: ”فہو

یستجیب“۔

کچھ اوقات ایسے ہوتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر دعا کو شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم

جس وقت اپنے لئے یا اپنی اولاد یا اپنے مال کے لئے بدعا کرو وہی وقت قبولیت دعا کا ہو اور پھر تمہاری بدعا قبول ہو جائے جس کے نتیجے

میں پشیمانی بھی ہو لہذا اس سے معلوم ہوا کہ جو نادان کسی مصیبت و تکلیف یا غصہ کے وقت اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے اپنے اموال کے

لئے بدعا کرتے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔

قوله: اتق دعوة المظلوم: یہ پوری حدیث اس طرح ہے: ”اتق دعوة المظلوم، فانه ليس بينها وبين الله حجاب“

یعنی جب وہ ظالم کیلئے بدعا کرتا ہے تو وہ قبول ہوتی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کر، یوں کہ کسی سے اس کا حق چھین لو، یا کسی

کے حق کو روک لو، یا بہتان باندھ کر کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال دو تاکہ وہ تجھے بدعا نہ دے۔

قوله بھی کتاب الزکوٰۃ: چونکہ یہ دعا وہاں ایک طویل حدیث کے ضمن میں مذکور ہے تکرار کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں کی، فقط اس

کی طرف اشارہ کر دیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

الفصل الثالث:

ہر حاجت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو

۲۲۳۰: وَعَنِ النَّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اَلدَّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ وَقَالَ رَبُّكُمْ اَدْعُوْ

نِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ (رواه احمد و الترمذی و ابو داؤد و النسائی و ابن ماجہ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴/۲۷۹ حدیث رقم ۴۰۴۹۔ وابن ماجہ ۱۲۵۸/۲ حدیث رقم ۳۸۲۸ واحمد فی المسند ۲۶۷/۴

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارسا دفرمایا دعا عبادت ہے پھر یہ آیت پڑھی اور تمہارے پروردگار نے کہا کہ مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا تمہارے لئے اس کو امام احمد اور ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ نے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: قولہ: الدعاء هو العبادہ: یعنی یہی وہ حقیقی اور اصلی عبادت ہے جو عبادت کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے، کیونکہ اس میں اللہ کی طرف توجہ اور غیر اللہ سے اعراض ہوتا ہے۔ بایں طور کہ نہ تو داعی کو کسی غیر سے امید ہوتی ہے اور نہ ہی غیر سے کوئی خوف رکھتا ہے۔ اس کا یہ عمل فرضیت عبودیت کا عکاس ہے اور اس کی ربوبیت کے اعتراف کا آئینہ دار، نیز یہ نعت ایجاد کا دل سے معتقد ہے اپنی مراد کے موافق اللہ کی مدد اور سعادت مندی کی توفیق کا طالب۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ ”عبودية“ اظہار ذلت کا نام ہے اور دعا سے بڑھ کر کوئی افضل عبادت نہیں کیونکہ اس میں انتہا درجہ کا اظہار تدلل ہے اور اس کا مستحق بس وہی ہستی ہو سکتی ہے جس میں انتہائی درجہ کی برتری ہو۔

امام طبری فرماتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ عبادت کو اس کے لغوی معنی پر محمول کیا جائے جو انتہائی درجہ کے تدلل احتیاج اور مسکینی کو کہتے ہیں اور عبادت بھی اس لئے شروع کی گئی ہے کہ اس میں خالق تعالیٰ کے سامنے عجز و انکساری ہو اور اس کے سامنے اپنی احتیاج کا اظہار ہو اس کی تائید آیت کے اگلے حصہ: ﴿ان الذين يستكبرون عن عبادتي سيدخلون جهنم داخرين﴾ [غافر: ۶۰] سے بھی ہوتی ہے چنانچہ اس میں عدم انتقار و تدلل کی تعبیر تکبر سے کی گئی ہے۔ اور ”دعائی“ کے بجائے ”عبادتی“ کہا گیا ہے، نیز استکبار کی سزاء ذلت و خواری قرار دی گئی ہے۔

علامہ میرک فرماتے ہیں کہ درمیان میں ضمیر فصل اور خبر معرفت باللام لائی گئی ہے۔ تاکہ اس بات پر دلالت ہو کہ عبادت دعا کے سوا کچھ نہیں۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا عظیم عبادت ہے، جیسے کہا جاتا ہے ”الحج عرفہ“ حج میں ایک عظیم رکن و قوف عرفہ ہے۔ اور اس کا یہ ہے کہ دعائی عبادت ہے۔ خواہ قبول ہو یا نہ ہو کیونکہ یہ بندہ کی طرف سے اظہار و احتیاج ہے، اور اس میں یہ اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول کرنے پر کامل قدرت رکھتا ہے، وہاں بخل کا گذر ہے نہ فقر کا، نہ وہاں ضرورت و احتیاج ہے تاکہ وہ اپنے لئے کچھ ذخیرہ کرے اور اپنے بندوں سے روکے رکھے اور یہی چیزیں عین عبادت ہیں۔

حافظ ابن جریر نے غریب بات فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں شارح نے فرمایا کہ عبادت نہیں ہے مگر دعایہ مقلوب ہے اور درست یہ ہے کہ دعائیں ہیں مگر عبادت الخ۔

یہ حافظ صاحب کی غلطی ہے پہلی ہی بات درست ہے۔ کیونکہ یہ مبالغہ پر دلالت کرتی ہے اس حصر کی وجہ سے جو فصل لانے اور خبر کو معرفت باللام ذکر کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ جیسے علم معانی اور علم بیان میں مذکور ہے۔

قولہ: ثم قرأ: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ [غافر: ۶۰] کہا گیا ہے کہ اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ دعا عبادت ہے کیونکہ آیت میں دعا مامور بہ ہے اور مامور بہ عبادت ہوتا ہے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں: کہ آیت سے استشہاد اس لئے کیا ہے کہ مطلوب دعا پر اس طرح مرتب ہوتا ہے جس طرح جزاء شرط پر اور مستب سبب پر مرتب ہوتا ہے اور یہ کامل ترین عبادت ہوتا ہے۔ اس کی قریب وہ حدیث ہے جس میں ہے: ”الدعاء مع العبادۃ“ کہ

دنہ عبادت کا مغز ہے یعنی خلاصہ ہے۔

دُعا عبادت کا مغز ہے

۲۲۳۱: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۵/۵ حدیث رقم ۳۴۳۱۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دعا عبادت کا مغز ہے۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: الدعاء مخ العبادۃ: یعنی خلاصہ ہے اور یہی عبادت سے مقصود بالذات ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ ”مخ الشیء“ خالصہ، کہ مخ ہر چیز کے خلاصہ کو کہا جاتا ہے چنانچہ ”مخ الدماغ“ خالص تھا اور ”مخ العین و مخ العظم“ یعنی آنکھ اور ہڈی کی چربی۔ مطلب یہ ہے کہ عبادت کا وجود دعائے ہی سے ہے جیسے انسان کی بقا و قیام مغز سے ہے۔

۲۲۳۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللَّهِ مِنَ الدُّعَاءِ۔

(رواه الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۵/۵۔ وابن ماجہ ۱۲۵۸/۲۔ حدیث رقم ۳۸۲۹۔ واحمد فی المسند ۳۶۲/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کے نزدیک ”دعا سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی چیز نہیں ہے۔“ (ترمذی ابن ماجہ اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے)۔“

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قولہ: لیس شیء اکرم علی اللہ.....: ”اکرم“ یہ ”لیس“ کی خبر ہے اور ”علی“ بمعنی ”عند“ ہے۔

یعنی اذکار و عبادت میں سے۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿إِن كُورم عند اللہ اتقا کم﴾ [الحجرات: ۱۳] کے معارض نہیں حتیٰ کہ اس کے جواب کیلئے تکلف کرنے کی ضرورت پڑے جیسا کہ امام طیبی نے اختیار کیا ہے گو کہ ان کے جواب کا مال بھی وہی ہے جو ہم نے کہا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ہر چیز کی افضلیت و اشریت کا اپنا اپنا باب ہے۔

حافظ ابن حجر نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے فرمایا کہ شارح کی مذکورہ تشریح کچھ بلا ضرورت ہے اور کچھ ہمارے مسئلہ کے مطابق نہیں۔ لیکن حافظ صاحب کا مذکورہ طعن مبہم اور علامہ کی بات کو نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔

خواہ دعا بزبان حال ہو، خواہ بزبان قال ہو، چونکہ دعا مانگنے میں بندہ کی عاجزی و افتقار، تذلل اور انکسار کا اظہار ہوتا ہے اور اللہ جل شانہ کی قوت و قدرت غنی و مہنی ہونے کا اعتراف ہے، اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعتراف ہے اور اس بات کا اعتراف ہے کہ اللہ جل شانہ نہ ہی وہ ذات ہیں جو اپنے دشمن کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتی ہے تو اپنے احباء و اولیا کے قلوب متکسرہ کا بخیار کیوں نہیں فرمائیں گے۔

۲۲۳۳: وَعَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَرُدُّ الْقَضَاءُ إِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا يَرِيدُ فِي الْعَمْرِ

إِلَّا الْبُرُ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۰۳/۳۔ حدیث رقم ۲۲۲۵۔ وابن ماجہ ۳۵/۱۔ حدیث رقم ۹۰۔ (۱) البخاری فی صحیحہ

۱۷۹/۱۰۔ حدیث رقم ۵۷۲۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تقدیر کو دعا کے علاوہ اور کوئی

چیز نہیں بدلتی اور عمر کو نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بڑھاتی۔“ (ترمذی)

تشریح: قولہ: لا یرد القضاء الا الدعاء: ”قضاء“ اس امر کو کہتے ہیں جو تقدیر میں لکھا گیا ہو اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قضاء سے مراد وہ مصیبت جس کا انسان کو خطرہ ہو اور وہ اس سے بچنے کی تدبیر کرتا ہو پس جب اسے دعا کی توفیق ہو جاتی ہے تو اللہ اس سے اس مصیبت کو ہٹا دیتا ہے تو اس کو قضاء کے نام سے موسوم کرنا مجاز ہے۔ بچنے کی تدبیر کرنے والے کے اعتقاد کے موافق اس کی وضاحت آنحضرت ﷺ کے جھاڑ پھونک کے بارے میں اس فرمان مبارک سے ہوتی ہے: ”هو من قدر الله“ یہ اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر ہے، آنحضرت ﷺ نے علاج کرنے اور دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے باوجودیکہ جو نوشتہ، تقدیر ہے وہ ہو کے رہنے والا ہے کیونکہ اس کا وجود اور عدم وجود لوگوں سے پوشیدہ ہے۔

حضرت عمرؓ جب شام پہنچے اور انہیں یہ خبر ملی کہ یہاں طاعون کی وبا ہے تو وہاں سے واپس ہوئے اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا ”انصر من القضاء“ امیر المؤمنین آپ قضاء سے بھاگ رہے ہیں! اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا ابو عبیدہؓ کا ش یہ بات آپ نہ کہتے اور فرمایا: ”نعم نفر من قضاء الله الى قضاء الله“ جی ہاں ہم اللہ کی قضا سے اللہ کی قضا کی طرف بھاگتے ہیں۔ یارہ قضاء سے مراد اس کو آسان کر دینا اور اس میں اتنی تخفیف کر دینا ہے کہ گویا کہ وہ مصیبت نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی تائید آنحضرت ﷺ کی اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے:

”الدعا یفعل مما نزل ومما لم یزل“

”بے شک دعا اس چیز کے لئے نافع ہے جو پیش آچکی ہے اور اس چیز کے لئے بھی نافع ہے جو پیش نہیں آئی ہے۔“

بعض لوگ فرماتے ہیں کہ دعا ڈھال کی طرح اور مصیبت تیر کی مانند ہے اور قضاء ازلی تقدیر ہے۔

قولہ: ولا یزید فی العمر الا البرّ:

”العمر“: میم کے ضم کے ساتھ اور ساکن بھی پڑھا جاتا ہے۔ ”البرّ“: ”باء“ کے کسرہ کے ساتھ بمعنی احسان و طاعت۔

بعض کہتے ہیں ہفتیہ عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿وما یعمر من معمر.....﴾

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿یمحو الله ما یشاء.....﴾ [الرعد: ۳۹]

کشاف میں مذکور ہے کہ نہیں طویل ہوتی عمر کسی انسان کی اور نہ کم ہوتی ہے مگر ایک کتاب میں درج ہے اور اس کی شکل یہ ہے کہ لوح محفوظ میں یہ درج کر دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص اگر حج نہ کرے غزوہ میں نہ جائے تو اس کی عمر چالیس برس ہوگی اور اگر وہ حج پر جائے اور غزوہ کرے تو اس کی عمر ساٹھ برس ہوگی پس جب وہ یہ دونوں کام کرے اور اس کو ساٹھ سال کی عمر نصیب ہو جائے تو اس کی عمر طویل ہوگی۔

اور اگر اس نے ان دونوں میں سے ایک کام کیا اور اس کی عمر چالیس (۴۰) سال سے آگے نہ بڑھی تو اس کی وہ عمر جس پر اس کی انتہاء تھی یعنی ساٹھ سال کم ہوگی۔ معاملہ امتزجیل میں اسی طرح کا مضمون وارد ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ حسن سلوک کرے گا تو اس کی عمر ضائع نہیں ہوگی (بلکہ اس میں برکت ہوگی اور کم عمر میں زیادہ کام کر جائے گا) تو گویا کہ اس کی عمر بڑھ گئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نیکی کے کام طویل عمر کے لیے سبب فرض و مقدر کئے گئے ہیں۔ جیسے کہ دعا کو مصیبت ٹالنے کا سبب مانا گیا ہے چنانچہ والدین اور دیگر رشتہ داروں کیلئے دعا عمر میں اضافہ کرتی ہے بایں طور کہ اس کی عمر میں برکت دی جاتی ہے چنانچہ وہ تھوڑی سی عمر میں اتنے نیک اعمال کر جاتا ہے کہ جو عام آدمی زیادہ عمر میں بھی کر نہیں پاتا۔ لہذا یہ زیادت مجازی ہے کیونکہ موت کے اوقات مقرر ہیں وہ

ان سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: جان لو کہ اللہ کی تقدیر علمی جب اس بات سے متعلق ہوگی کہ مثلاً زید سن ۵۰۰ ہجری میں وفات ہوگا تو اب یہ بات محال ہے کہ زید اس وقت سے پہلے یا بعد میں مرے، لہذا یہ ناممکن ہے کہ جن عمروں سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر علمی متعلق ہو چکی ہے اس میں کمی بیشی ہو۔ اب یہ شکل متعین ہے کہ یہ زیادتی و کمی ملک الموت یا اس کے علاوہ ان فرشتوں کی بہ نسبت ہو جو قبض ارواح پر من جانب اللہ موکل و مامور ہیں۔

بایں طور کہ اللہ نے ان فرشتوں کو اس کا حکم دیا یا لوح محفوظ میں اسے درج کیا اس میں سے کم کر دے یا بڑھادے۔ یہ باری تعالیٰ کے اس قول: ﴿يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ﴾ [الرعد: ۳۹] کے ہم معنی ہے اور اس معنی پر باری تعالیٰ کے اس قول کو محمول کیا جائے گا: ﴿ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا وَأَجَلٌ وَسَمِيُّ عِنْدَهُ﴾ [الانعام: ۲۰۲]

اس میں ”اجل“ اول سے مراد جو کچھ لوح محفوظ میں درج ہے اور اجل ثانی سے مراد جو باری تعالیٰ کے اس قول: ﴿وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ اور ﴿إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ﴾ [الاعراف: ۳۴] میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ قضائے معلق میں تبدیلی ہوتی ہے اور قضائے مبرم میں نہیں۔ ابن حبان اور حاکم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

”لا يرد القدر الا الدعاء ولا يزيد في العمر الا البر وان الرجل ليحرم الرزق بالذنب يذنبه“

۲۲۳۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزَلْ فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللَّهِ بِاللُّدْعَاءِ . (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۱۲/۵ حدیث رقم ۳۶۱۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ دعا اس چیز کے لئے نافع ہے جو پیش آچکی ہے اور اس چیز کے لئے بھی نافع ہے جو پیش نہیں آئی ہے لہذا اے اللہ کے بندو! دعا کو اپنے لئے ضروری سمجھو۔“ (ترمذی)

تشریح: قوله: ان الدعاء ينفع مما نزل ومما لم ينزل:

دعا نازل شدہ مصیبت میں بایں طور نافع ہے کہ اگر وہ قضائے معلق ہو تو اس کو ہٹا کر اور اگر وہ قضائے مبرم ہو تو برداشت میں سہولت پیدا فرما لیتے ہیں اور اس کو صبر عطا فرمادیتا ہے۔ اور راضی بالقضاء کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسے اس کے برعکس کی تمنا ہی نہیں رہتی بلکہ اسے اس مصیبت میں لذت محسوس ہوتی ہے جیسے کہ دنیا داروں کو دنیا کی نعمتوں سے لذت ملتی ہے۔

اور غیر نازل شدہ مصیبت میں بایں طور نافع ہے کہ وہ مصیبت اس سے پھیر لے اور دور کر دے، یا اس کے ساتھ پیشگی مدد کر اور اس کو اس طرح سے مضبوط و مستحکم بنا دے کہ اس پر اس مصیبت کا جھیلنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔

رد قضاء ممکن نہیں تو دعا کا کیا فائدہ؟

امام غزالیؒ فرماتے ہیں اگر یہ سوال ہو کہ جب قضاء کارآمد ممکن نہیں تو پھر دعا کا کیا فائدہ؟

تو جان لو! کہ یہ بھی قضاء میں سے ہے کہ دعا سے مصیبت ہٹے دعا مصیبت کوٹالنے اور رحمت کے وجود میں آنے کا سبب ہے جیسا کہ ڈھال تیر کو دور کرنے کا اور پانی زمین میں سے نباتات کے خروج کا سبب ہیں اور اعتراف بالقضاء کیلئے یہ شرط نہیں کہ نہتا ہو جایا جائے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء میں فرمایا ہے: ﴿لِيَاخُذُوا حُذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ﴾ [النساء: ۱۰۲]
اللہ تعالیٰ نے امور اور ان کے اسباب بنائے ہیں۔

دعا میں کئی فوائد ہیں۔ اس میں حضور قلب اور اظہار محتاجی ہے اور یہی عبادت و معرفت کی غایت اور روح ہے۔

قولہ: فعليكم عباد الله بالدعا: ”عباد اللہ“: (یہاں حرف نداء محذوف ہے۔)

اے اللہ کے بندو! جب دعا کی یہ شان ہے تو دعا کو لازم پکڑو۔ کیونکہ یہی اس عبودیت کے لوازمات میں سے ہے جس سے حق ربوبیت کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔

۲۲۳۵: ورواه احمد عن معاذ بن جبل وقال الترمذی هذا حدیث غریب۔

اخرجه احمد فی المسند ۲۳۴/۵۔

ترجمہ: اس کو احمد نے حضرت معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث (سند کے لحاظ سے) غریب ہے۔

۲۲۳۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ أَحَدٍ يَدْعُو بِدُعَاءِ الْإِلَهِ مَا سَأَلَ أَوْ كَفَّهْ

عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهُ مَا لَمْ يَدْعُ بِأَسْمِ أَوْ قَطِيعَةٍ رَحِمَ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۰/۵۔ حدیث رقم ۳۴۴۱۔ واحمد فی المسند ۳۶۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو بھی شخص دعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ یا تو

اسے وہ چیز عطا فرمادیتا ہے جو وہ مانگتا ہے بشرطیکہ اس چیز کا دینا ازل میں اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہو یا اس کے عوض

میں اس سے برائی روک دیتا ہے یعنی اس چیز کا اگر دینا اس کے مقدر میں لکھا نہیں ہوتا تو اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ اس

کے لئے مانگنے کے بقدر اس سے مصیبت و بلا کو دور کر دیتا ہے جب تک وہ گناہ کی کوئی چیز یا ناتہ توڑنے کی دعا نہیں

مانگتا۔“ (ترمذی)

تشریح: قولہ: ”ما من احد يدعو بدعا الا آتاه الله ما سأل“ یعنی اگر ازل ہی تقدیر میں اسے اس کا ملنا مقرر ہو (او

کف عنه من السوء مثله) یعنی مانگی ہوئی شئی نہ دینے کے عوض میں اس سے وہ مصیبت ہٹادی جاتی ہے جو اس پر آئی ہوتی ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ ایک سوال ہے کہ جلب منفعت کو دفع مضرت کا کس طرح مثل قرار دیا گیا اور دونوں میں وجہ تشبیہ کہا ہے۔

اسکا جواب یہ ہے کہ وجہ تشبیہ یہ دونوں (جلب منفعت اور دفع مضرت) ایسے ہیں کہ سائل ان کا محتاج ہے اور اسے ان سے استغناء نہیں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: کہ اللہ اس سے اس تکلیف کو ہٹا دیتا ہے جس سے اس کو ایسی راحت نصیب ہوتی ہے جو مانگی ہوئی چیز کی

راحت کے بقدر ہوتی ہے۔ لہذا مثلیت بلحاظ اس راحت کے ہے جو مصیبت کے دفع کرنے اور مانگی ہوئی شئی کے ملنے میں ہے۔ پھر

پر سرت انداز میں یہ فرمایا کہ جو تقریر میں نے ذکر کی ہے وہ زیادہ واضح بلکہ زیادہ درست ہے بہ نسبت شارح کے تقریر کے۔

میں کہتا ہوں کہ زیادہ درستگی کے اطلاق میں حافظ صاحب غلطی کر رہے ہیں کیونکہ امام طیبی کی مراد مثلیت حقیقیہ ہے چنانچہ اگر

قضائے معلق میں یہ بات ہو کہ اس کے مال میں سے ایک دینار لیا جائے گا۔ اور وہ اللہ سے ایک دینار زیادہ طلب کر رہا ہو۔ تو اب یا تو اللہ

اسے اپنے فضل سے ایک دینار زیادہ دے دے گا یا اس سے چور ڈاکو پھیر دے گا اور وہ اس کا مال نہ لے جائے گا۔ اور یہ راحت جو مرتب

ہو رہی ہے امام طیبی کے قول سے مفہوم ہوتی ہے۔ باوجودیکہ دفع تکلیف میں راحت مجازی ہے اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ نا امید کی دو

راحتوں میں سے ایک ہے۔

قوله: ما لم يدع بائنا او قطيعة رحم: "او قطيعة رحم": اس میں تخصیص بعد از تعمیم ہے۔
 ۲۲۳۷: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ أَنْ يُسْأَلَ
 وَأَفْضَلُ الْعِبَادَةِ أَنْتَظَارُ الْفَرَجِ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب)
 اخرجہ الترمذی فی السنن ۲۲۵/۵ حدیث رقم ۳۶۴۲۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا جائے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں کہ ان سے مانگا جائے اور عبادت کی سب سے بہتر چیز کشادگی کا انتظار کرنا ہے۔" امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: وعن ابن مسعود: ایک نسخہ میں "ابن مسعود" کی جگہ ابی مسعود ہے۔ (سَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ) یعنی کچھ فضل، چنانچہ اللہ کا فضل وسیع ہے اور وہاں کوئی مانع بھی نہیں۔ حافظ ابن حجر کا "من" کو تعلیلیہ قرار دینا ظاہر کے خلاف ہے۔
 قوله: فان الله يحب ان يسأل ان يسأل: اس بناء پر کہ سخی، انعام کرنے والا، بہت بخشش کرنے والا، دینے والا، غنی، غنی کرنے والا اور پھیلانے والا ہے۔ يجب ان يسأل اس کا فضل مانگا جائے۔ اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ کی طرح عدل کر نہیں کر سکتا۔

قوله: وافضل العبادۃ انتظار الفرج یعنی مصیبت اور غم کے ٹلنے کی امید رکھنا، وہ یوں کہ غیر کے سامنے جزع فزع نہ کیا جائے۔

اور اس کا افضل عبادت ہونا اس لحاظ سے ہے کہ مصیبت کے وقت صبر کرنا تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے نصیب کرتا ہے۔

۲۲۳۸: وَعَنِ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللَّهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ.

اخرجہ الترمذی فی السنن ۱۲۶/۵ حدیث رقم ۳۴۳۳۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے (کیونکہ ترک دعا اللہ سے تکبر اور استغناء کی علامت ہے)۔" (ترمذی)
تشریح: قوله: من لم يسأل الله يغضب عليه: جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے کیونکہ نہ مانگنا تکبر اور استغناء ہے۔ جس کا بندہ کسی صورت حقدار نہیں۔

غضب سے مراد عقوبت رسائی کا ارادہ کرنا ہے۔ اور شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

اللہ يغضب ان تركت سؤاله ☆ وبنی آدم حين يسئل يغضب .

"اللہ سے نہ مانگو تو اللہ ناراض ہوتا ہے جبکہ انسان اس کے برعکس مانگنے سے غصہ ہوتا ہے۔"

امام طیبی فرماتے ہیں: یہ اس لئے کہ اللہ اس پر خوش ہوتا ہے کہ اس سے اس کا فضل مانگا جائے اور پس جو سوال نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں، جس سے خفا ہو جایا جائے تو وہ یقینی طور پر مغضوب علیہ ہوتا ہے۔

اور ایک حدیث میں وارد ہے کہ: "ازهد فی اللہ یحبک اللہ وازهد فی ایدی الناس یحبک الناس"

دنیا سے بے رغبت ہو جائے تو اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے۔ اور لوگوں کے مال سے بے رغبت ہو جائے لوگ تجھے چاہنے لگ جائیں گے۔

اور حدیث صحیح میں یہ بات گزر چکی ہے ”من شغلہ ذکرى عن مسألتي اعطيته افضل ما اعطى السائلين“ جس کو میری یاد نے میرے سامنے مانگنے سے مصروف کر دیا تو میں اسے افضل ترین چیز جو میں سائلین کو عطا کرتا ہوں سے نواز لوں گا۔ گویا کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زبان حال سے طلب کرنا حصول کمال کا زیادہ موثر سبب ہے، زبان قال سے۔ اس بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ”حسبى من سؤالى علمه بحالى“ میرے لئے مانگنے سے اس کا میری حالت کا علم کفایت کر جاتا ہے۔ اور یوں شاعر کہتا ہے:

”اذا أثنى عليك المرء يوماً ☆ كفاه من تعرضه الثناء“

یعنی جب کوئی ثنا خواں تیری ثنا میں لگا رہے تو اس کی ثنا خوانی، مانگنے سے اس کیلئے کفایت کر جاتی ہے۔

۲۲۳۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فَتَحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الرَّحْمَةِ وَمَا سئِلُ اللَّهَ شَيْئًا يُعْنِي أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ أَنْ يُسْأَلَ الْعَافِيَةَ۔ (رواه الترمذی)

احرجہ الترمذی فی السنن ۲۱۲/۵ حدیث رقم ۳۶۱۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم میں سے جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھولا گیا (یعنی جس شخص کو پورے آداب و شرائط کے ساتھ بہت دعا مانگنے کی توفیق عطا کی گئی) تو سمجھو کہ اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز نہیں مانگی جاتی یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب بات یہ ہے کہ اس سے عافیت مانگی جائے۔“ (ترمذی)

تشریح: قولہ: من فتح له منكم باب الدعاء فتحت له ابواب الرحمة:

یعنی اسے کثرت کے ساتھ شرائط و آداب کے ساتھ دعا مانگنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

”فتحت له ابواب الرحمة“ یہ: جملہ دعائیں و خبریہ دونوں ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ خبریہ ہونے کی صورت میں دوسرا جملہ پہلے جملے کیلئے جزا بھی بن سکتا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلا جملہ دوسرے کیلئے علامت ہو۔

اور مطلب یہ ہے کہ کبھی مانگی ہوئی چیز دی جاتی ہے۔ اور کبھی اس کے بقدر اس سے کوئی تکلیف و سختی ہٹا دی جاتی ہے۔ جیسے کہ بعض نسخوں میں اس کے بجائے ”فتحت له ابواب الاجابة“ اور بعض دیگر نسخوں میں ”فتحت له ابواب الجنة“ وارد ہے۔ یعنی اللہ کی دنیوی و اخروی نعمتوں و راحتوں کے دروازے۔

قولہ: وما سئل الله شيئا. یعنی احب اليه. من ان يسئل العافية:

امام طبری فرماتے ہیں کہ ”احب اليه“ مطلق کو ”یعنی“ کے ذریعے مقید کیا گیا ہے اور یہ درحقیقت ”شينا“ کی صفت ہے اھ۔ اس مقام پر ”یعنی“ بے معنی ہے کیونکہ ”یعنی“ کا ذکر وہاں ہوتا ہے جہاں اس سے پہلے کلام تام مقید ہو اور الفاظ میں اس کی تہقید کی ضرورت ہو یا معنی میں اس کی تفسیر کی حاجت ہو حالانکہ یہاں کلام ”یعنی“ کے مابعد سے پورا ہو رہا ہے اور وہ ”احب“ کا لفظ ہے۔

اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لفظ ”یعنی“ اکثر کتب حدیث میں مذکور نہیں چنانچہ حصن وغیرہ میں بھی نہیں ہے۔

اب بعض کا یہ خیال ہے کہ ”شينا“ مفعول مطلق ہے اور احب اس کی صفت ہے۔ اور (من ان يسئل العافية) میں ”ان“

مصدر یہ ہے۔ اور تقدیر عبارت ”ما سئل اللہ سواً احب الیہ من سوال العافیۃ“ یعنی عافیت کے سوال سے بڑھ کر اللہ کے ہاں کوئی سوال زیادہ محبوب نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ”سوالاً“ مفعول بہ ہو یعنی اللہ سے مانگی ہوئی کوئی چیز عافیت سے بڑھ کر محبوب نہیں اور ”یسأل“ کا اضافہ مسؤل کی شان کے اہتمام کیلئے ہے اور اس بات پر آگاہی کیلئے ہے کہ محبوب ترین سوال عافیت ہے نہ کہ نفس عافیت، حافظ ابن حجر نے ان کی متابعت کی ہے وہ مزید آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ: کیونکہ یہ صفات محدثات میں سے ہیں۔

لیکن حافظ صاحب کی اس تعلیل میں اشکال ہے کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ سوال محبوب ترین ہے اس لئے کہ یہ احتیاج اور عبودیت کو متضمن ہے اور اس میں اظہار کمال ربوبیت ہے اس حکمت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے مشقتیں اور مصیبتیں پیدا فرمائی ہیں۔ اگر نفس عافیت اللہ کو محبوب ترین ہوتی تو اللہ اس کے اضداد پیدا نہ فرماتا۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اصل کلام یہ تھا (ما سئل اللہ شیئاً احب الیہ من العافیۃ) مفسر نے درمیان میں یہ لفظ ”ان یسأل“ کلام نبوۃ میں سے نہیں ہے۔ اور اس کی کوئی ظاہری وجہ نہیں ہو سکتی۔ الا یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہ کسی راوی کا کلام ہے اس کی آخری توجیہ یہ ہو کہ ”یعنی“ کے بعد والا کلام نقل روایت بالمعنی ہو۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ لفظ: یعنی کو اپنے مقام سے مقدم کیا گیا اور موصوف ”شیئاً“ اور اس کی صفت ”احب“ کے درمیان اس کو فاصل بنایا گیا جبکہ اصل عبارت اس طرح تھی: ”وما سئل اللہ شیئاً احب الیہ یعنی من ان یسأل العافیۃ“ کیونکہ پہلا کلام تفسیر میں زیادہ واضح ہے اور اس لئے بھی کہ اس کا موصوف وصف کے درمیان آنا اس کے مفسرہ ہونے کی واضح دلیل ہے، جو خبر کی تفسیر بننے کی واضح دلیل ہے، جو خبر کی تفسیر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں کہتا ہوں عبارت میں مناقشہ سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ بات مدلول ہے کہ ”من ان یسأل“ کلام نبوت میں سے نہیں ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں کیونکہ اس کے بغیر کلام تام نہیں ہوتا اور اس کے ماقبل پر اکتفاء کرنا درست نہیں۔

عافیت کیا ہے؟ تمام شرح کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عافیت سے مراد صحت ہے یہ امام طیبی کی عبارت ہے، اور عافیت اس لئے اس کے ہاں محبوب ترین ہے کہ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو دنیا و آخرت کے تمام خیر کیلئے جامع ہے۔ جیسے دنیا میں صحت اور دنیا و آخرت کی سلامتی وغیرہ، اس لئے کہ عافیت یہ ہے کہ انسان امراض و شدائد سے محفوظ ہو جائے اور یہی معنی مرض کے وقت صحت کا ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ عافیت سے مراد دین کے معاملہ میں مصیبت سے حفاظت و سلامتی ہے اس کے ساتھ جسم کی صحت ہو یا نہ ہو۔

ابن عطاء فرماتے ہیں کہ ایک شخص میرے آقا شیخ ابوالعباس مری کے پاس اس وقت تشریف لائے جب میرے شیخ کسی درد میں مبتلا تھے اس شخص نے کہا: ”عافاک یا سیدی“ اس پر میرے شیخ خاموش رہے اور اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اس شخص نے دوبارہ یہ کہا تو میرے شیخ نے اسے کہا ”ما انا سالت اللہ العافیۃ، قد سألته العافیۃ والذی انا فیہ هو العافیۃ“ یعنی میں نے جسم کی سلامتی اللہ سے نہیں مانگی بلکہ میں نے دین کی سلامتی کی دعا مانگی ہے اور یہ سلامتی مجھے نصیب ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اللہ سے عافیت کی دعا مانگی ہے اس کے باوجود فرمایا۔ ”ما زالت أكلة خبیر تعاونی فإلآن قطع ابھوی“ یعنی خبیر کے زہر یا کھانے کا اثر بار بار آ رہا ہے اور اب کے تو اس نے میری رگ جان کو کاٹ ڈالا۔

حضرت ابو بکرؓ نے بھی عافیت کی دعا مانگی حالانکہ زہر کی وجہ سے شہید ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے بھی عافیت کی دعا مانگی لیکن نیزہ مار کے

شہید کئے گئے۔ حضرت عثمان نے بھی اللہ سے عافیت طلب کی حالانکہ ذبح کئے گئے۔ حضرت علیؑ نے بھی اللہ سے عافیت مانگی حالانکہ شہید کئے گئے۔ لہذا جب تم اللہ سے عافیت مانگو تو جو اللہ کے ہاں آپ کیلئے عافیت ہے وہ مانگو۔

شبلیؒ سے منقول ہے کہ وہ جب کسی دنیا دار کو دیکھتے تو فرماتے: ”اسأل اللہ العافیۃ“ میں اثر سے عافیت کا خواستگار ہوں۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ عافیت ”عفاء“ کو دور کرنے کا نام ہے اور ”عفاء“ ہلاکت کو کہتے ہیں اور یہاں پر مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس ضرورت کی غذا ہو، عبادت کرنے کیلئے جسم میں قوت ہو۔ دین کے ساتھ علم و عمل کے اعتبار سے مشغولیت ہو، جس چیز میں خیر نہ ہو یا اس کی ضرورت نہ ہو، اس کو ترک کر رہا ہو، ان سب کیلئے عافیت سے بڑھ کر کوئی اور جامع لفظ نہیں یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سے ان کے چچا حضرت عباسؓ نے یہ درخواست کی کہ مجھے ایسی دعا سکھائیے جو میں اللہ سے مانگتا رہوں تو آپ ﷺ نے ”عافیۃ“ کے لفظ کو اختیار فرمایا اور عباسؓ سے کہنے لگے: چچے! میں آپ سے محبت کرتا ہوں اللہ سے دنیا و آخرت میں عافیت طلب کرنا۔

۲۳۳۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَسْتَجِيبَ اللَّهُ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْيَكْثِرِ

الدُّعَاءَ فِي الرَّخَاءِ. (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

احرحہ الترمذی فی السنن ۱۳۰/۱۵ حدیث رقم ۳۴۴۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص کے لئے یہ بات پسندیدگی اور خوشی کا باعث ہو کہ تنگی اور سختی کے وقت اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرے تو اسے چاہئے کہ وہ وسعت و فراخی کے زمانہ میں بہت دعا کرتا رہے۔“ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: قولہ: من سرہ ان یتستجیب اللہ له عند الشدائد: یعنی جس کو یہ بات بھلی معلوم ہو اور اس کا دل خوش ہو اور

اس کو مسرور بنائے۔

”شدائد“ شدیدۃ کی جمع ہے اور یہ سخت حادثہ کو کہا جاتا ہے اور ”حصن“ کے اندر ”کعب“ کا اضافہ ہے۔ کعب کعبہ کی جمع ہے یہ دل پر گرفت کرنے والے نعم کو کہتے ہیں۔

قولہ: فلیکثر الدعاء فی الرخاء: ”رخاء“ براء کے فتح کے ساتھ ہے۔

خوشحالی، صحت، فراغت اور عافیت کی حالت میں۔ کہتے ہیں کہ قدردان (۱) مومن کی علامت یہ ہے کہ تیر بھیکنے سے پہلے ہی اس پر لگائے اور سختی اور مشقت آنے سے قبل ہی اللہ کی طرف رجوع کرے اور اسی کے حضور میں پناہ لے۔

۲۳۳۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ادْعُوا اللَّهَ وَأَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ وَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ لَا

يَسْتَجِيبُ دُعَاءَ مَنْ قَلِبَ غَافِلٌ لَآ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب۔

احرحہ ترمذی فی السنن ۱۷۹/۱۵ حدیث رقم ۳۵۴۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قبولیت دعا کا یقین رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ غافل اور کھیلنے والے دل کی دعا قبول نہیں کرتا یعنی اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی جس کا دل دعا مانگتے وقت اللہ تعالیٰ سے غافل اور غیر اللہ میں مشغول ہو امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور

کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: قولہ: ”ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابة: واو حالیہ ہے۔“

یعنی در آن حالیکہ تم دعا کے وقت ایسی حالت پر ہو جاؤ کہ تمہاری دعا قبول ہونے کے قابل ہو جائے، بایں طور کہ نیکی کرو، برائی سے اجتناب کرو دعا کی شرائط ”جیسے حضور قلب اوقات شریفہ اور مقامات عالیہ کی تاک میں لگے رہنا اور انساب کے لمحات و حالات سے فائدہ اٹھانے“ جیسے سجدہ وغیرہ کی حالت کی رعایت رکھو۔ تاکہ دعا کی قبولیت کی امید اس کے مسترد ہونے کے مقابلہ میں زیادہ غالب ہو۔

یا مراد یہ ہے کہ تم یہ اعتقاد رکھو کہ اللہ تم کو نافرمان نہیں کرے گا کیونکہ وہ بڑی کریم ذات ہے اور اس کی قدرت کامل ہے اور اس کا علم محیط ہے۔ یہ اعتقاد امید کی صدق کو ثابت کرنے اور دعا کے خالص ہونے کیلئے ضروری ہے۔ کیونکہ داعی کی امید جب مضبوط نہ ہو تو اس کی طلب صادق نہیں کہلاتی۔

قولہ: **واعلموا ان اللہ لا يستجيب دعا من قلب غافل لاه**: مطلب عدم قبولیت کا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ عموماً اس شخص کی دعا قبول نہیں کرتا... اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا کامل طور پر قبول نہیں کرتا....

”قلب غافل“ میں اضافت و ترک اضافت دونوں جائز ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے اعراض کر رہا ہو یا اپنی دعا سے۔

”لاہ“ یہ ”لہو“ سے ماخوذ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی دعاء سے استہزاء کر رہا ہو یا وہ غیر اللہ کے ساتھ مشغول ہو رہا ہو۔ حضور قلب آداب دعا میں سے عمدہ ترین ادب ہے اس لئے صرف اسی کو ذکر کیا۔

۲۲۳۲: وَعَنْ مَالِكِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَاسْأَلُوهُ بِطُؤُنٍ أَكْفِكُمْ وَلَا تَسْأَلُوهُ بِظُهُورِهَا۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۸۱۲ حدیث رقم ۱۴۸۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت مالک بن یسار روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس وقت تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو اس سے اپنے ہاتھوں کے اندرونی رخ کے ذریعے مانگو اس سے اپنے ہاتھوں کے اوپر کے رخ کے ذریعہ نہ مانگو۔“

راوی حدیث:

مالک بن یسار۔ یہ مالک یسار کے بیٹے ”سکونی“ اور ”عوفی“ ہیں۔ ان کا شمار اہل شام میں ہے۔ ”ابو بحر“ نے ان سے روایت کی ہے۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ ”سکونی“ میں سین پرفتحہ اور کاف اور نون ہے۔

تشریح: قولہ: **اذا سألتم الله فاسألوه ببطون اكفكم**: یہاں سؤال کا مفعول بہ محذوف ہے جو ”شینا“ ہے مطلب یہ ہے کہ جب تم اللہ سے حصول نفع یا رفع مضرت کو طلب کرو۔

”اکف“ ”کف“ کی جمع ہے مطلب یہ ہے کہ ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر۔

یہاں پر ”باء“ آل کیلئے ہے۔ جبکہ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ ”با“ مصاحبت کے معنی میں ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں: کیونکہ یہ حالت ہوتی ہے جو لینے کا انتظار کر کے طلب کر رہا ہو۔ لہذا اس حالت کی رعایت ہر حالت میں کی جائے گی جیسے حدیث سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔ اور یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے وقت نیک شگونی اور پلٹنے کی حالت کی رعایت کرتے ہوئے ہاتھوں کے پشتوں کو اوپر کر لے۔ اھ۔ لیکن یہ نص کے مقابلہ میں قیاس ہے لہذا یہ غیر مقبول ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں: مردی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے استسقاء میں اپنے ہاتھوں کے بالائی حصہ سے دعا مانگی ہے اور اس کا معنی یہ

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ انتہائی طور پر بلند کئے یہاں تک آپ ﷺ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، اور آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک سر مبارک کے برابر میں آگئے۔ آنحضرت ﷺ اس حالت سے اس بات کو طلب فرما رہے تھے کہ اللہ مجھے سر تا پا اپنی رحمت و سبوح میں گھیر لے۔

۲۲۳۳: وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَلُوا اللَّهَ بِطُؤُنِ اَكْفُكُمْ وَلَا تَسْأَلُوهُ بِظُهُورِهَا فَاِذَا فَرَعْتُمْ فَاَمْسَحُوا بِهَا وَجُوهَكُمْ. (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۸/۲ حدیث رقم ۱۴۸۵۔

ترجمہ: ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے ہاتھوں کے اندرونی رخ کے ذریعہ مانگو اور جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کو اپنے منہ پر پھیر لو (تاکہ وہ رکت جو ہاتھوں پر اترتی ہے منہ کو بھی پہنچ جائے)۔“ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: سلوا اللہ بطون اکفکم ولا تسالوہ بظہورہا: حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اسلئے کہ جب انسان کسی شے کے حصول کو طلب کرتا ہو تو اس کیلئے مناسب یہی ہے کہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو عاجزی کرتے ہوئے دراز کر لے اور پھیلانے۔ تاکہ وہ (اللہ تعالیٰ) اسے اپنے وسیع و عریض عطا سے لبریز کر دے۔

تاہم اگر کوئی کسی مصیبت کے دور کرنے کا خواستگار ہو جو اس پر پڑی ہو تو پھر سنت طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کے بالائی حصہ (پشتوں) کو اٹھائے، یہ حضور ﷺ کے اتباع میں اور اول میں اس کی حکمت مقصود حصول کی نیک شگوننی ہے۔ اور ثانی میں مصیبت کے دور ہونے کا شگون ہے۔

اور شارح کا طرز عجیب ہے کہ انہوں ایسی تاویل کی ہے جو اس کے ائمہ کے کلام اور ان کے اس تفصیل کے جس کو میں نے ذکر کیا ہے مخالف ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ شارح نے ان کے کلام میں غور نہیں فرمایا۔

اور جمہور کے ہاں یہ (ہاتھ کے بالائی حصہ کے ساتھ) اشارہ بہ تقدیر صحت استسقاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ چادر پلٹنے کی طرح نیز اس میں تاویل بھی کی جاسکتی ہے اور روایت کے اندر ”اشارہ“ کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دعا ہاتھ کے پشتوں سے نہیں مانگی گئی ہے۔ اور حق کی اتباع زیادہ مناسب ہے۔

اور مصنف محقق سے انوکھی بات نہیں کہ وہ ظاہر متبادرالی الفہم دلیل ذکر کر لے اور تقلید کے اس دائرے سے نکل جائے جو بیمار معذور کے شایان شان ہے۔ لہذا یہ رویہ غیر مناسب ہے کہ اس وجہ سے کسی کی نسبت جہالت کی طرف کی جائے۔ اگرچہ بفرض تقدیر کسی زعی جزئیہ کا ان سے ذہول بن جائے۔ (فاذا فرغتم) یعنی جب دعا سے فارغ ہو جاؤ (وامسحوا بہا) یعنی اپنے ہاتھ ہتھیلیوں سے۔ (وجوہکم) کیونکہ ہاتھوں میں اللہ کی رحمت کے آثار کا نزول ہوتا ہے تو اس کی برکت چہروں تک پہنچے گی۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں میں نے اس کو ایک حدیث میں دیکھا ہے اور یہ چہرے پر اللہ کی عطا کو بہانا ہے قبولیت کے متحقق ہونے کی شگون کیلئے اور شیخ ابن عبدالسلام کا یہ قول کہ ہاتھوں سے چہرے کو مسح کرنا خلاف سنت ضعیف ہے اس لئے کہ مسح کی حدیث کا ضعیف ہونا مضرت نہیں کیونکہ یہ بات طے ہے کہ فضائل میں ضعیف حدیث بھی بالاتفاق حجت ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات ہے کہ علامہ جزری نے ”حصن“ میں ”وانت علیہ مسح الوجه بالیدین“ کو آداب دعا میں سے شمار کیا ہے اور اس کی اسناد ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم کی طرف فرمائی ہے۔

حافظ ابن حجر نے خوب مبالغہ سے کام لیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں اس حدیث اور اس سے پیوستہ گذشتہ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر دعائیں رفع الیدین الی السماء مسنون ہے، بہ کثرت صحیح احادیث کے اندر وارد ہے۔

علامہ نووی فرماتے ہیں: ”ومن ادعی حصرها فقد غلط غلطا فاحشا، وهذه الروایة لكونها مثبتة مقدمة علی روایة الشیخین الذی الأصل فیہ الایصال، علی أن المراد أنه كان لا یبالغ فی رفع یدیه فی شیء من الدعا الا الاستسقاء“ اھ۔ اگرچہ شیخین کی روایت میں اتصال اصل ہے۔ باوجودیکہ یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ کسی بھی دعائیں رفع الیدین مبالغہ کے ساتھ نہیں فرماتے تھے سوائے صلاۃ استسقاء کے۔

اس میں کئی اباحت ہیں مجملہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مذکورہ حدیث اور اس سے پیوستہ گذشتہ حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو رفع پر نفیاً یا اثباتاً دلالت کرتی ہو البتہ حضرت ابن عمرؓ کی آنے والی حدیث اس سلسلہ میں صریح ہے۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ حافظ صاحب کا یہ فرمانا ”فی کل دعاء“ ہر دعائیں یہ بھی درست نہیں اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ قاتل حصر کی تغلیط بھی کھلا تخمینہ ہے۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کا یہ فرمانا ”ان هذا الروایة“ کو ”علی تقدیر تسلیم الافادۃ“ تسلیم کر لیا جائے اور ابوداؤد کی روایت کو بھی صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ابوداؤد کی روایت کو شیخین کی روایت پر مقدم کرنا تو اصول محدثین کے قاعدہ کی خلاف ورزی ہے۔ لہذا درست بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان دونوں میں کوئی مضافات نہیں کیونکہ دونوں کو جمع کرنا ممکن ہے کہ نفی سے مراد نبی مبالغہ فی الرفع ہے۔

۲۲۲۳: وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ رَبِّكُمْ حَيِّيْ كَرِيْمٌ يَسْتَحِيْ مِنْ عَبْدِهِ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ

اَنْ يَرُوْدَ هُمَا صَفْرًا . (رواه الترمذی و ابو داؤد و البيهقی فی الدعوات الكبير)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۸/۲ حدیث رقم ۱۴۸۸۔ و الترمذی ۲۱۷/۵ حدیث رقم ۳۶۲۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت سلمانؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تمہارا پروردگار بہت حیا مند ہے یعنی وہ حاجت مندوں کا سا معاملہ کرتا ہے وہ بغیر مانگے دینے والا ہے اور وہ اپنے بندہ سے حیا کرتا ہے کہ اسے خالی ہاتھ واپس کر دے جب کہ اس کا بندہ اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے۔“ (ترمذی ابوداؤد بیہقی)

تشریح: قولہ: ان ربکم حی کریم: ”حی“ حیاء سے فعل کا وزن ہے۔ جو برائے مبالغہ ہے یعنی انتہاء کا حیا دار۔ اللہ تعالیٰ کے حق میں اس سے مراد اس کا غرض و نیت ہے اور کسی شی سے حیا دار ہونے کا غرض اس کو ترک کرنا ہوتا ہے اس لئے کہ حیاء دار اصل ایسے تغیر اور ٹوٹ پھوٹ کا نام ہے کہ کسی ایسی چیز کے خوف کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ معیوب و مذموم ہو جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں متمتع ہے لیکن اس کی غرض خوش کن کام کو کرنا اور مضر امر کو ترک کرنا ہے۔

یا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مستحسن کا معاملہ کرنے والا ہے۔

”کریم“: یہ ایسی ہستی کو کہا جاتا ہے جو مانگے بغیر عطا کرے۔ لہذا مانگنے سے تو بطریق اولیٰ عطا کرے گا۔

قولہ: يستحي من عبده ان یردھا صفرا یعنی مؤمن بندے سے

”صفر“: صاد کے کسرہ اور ”فا“ کے سکون کے ساتھ یعنی خالی یعنی رحمت سے فارغ اور خالی۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ اس میں مذر و مؤنث تشبیہ و جمع سب برابر ہیں۔

۲۲۳۵: وَعَنْ عَمْرٍو قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يُحِطْهُمَا حَتَّى يُمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ . (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۱/۵ حدیث رقم ۳۴۴۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب دعائیں اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تو انہیں اس وقت تک نہ رکھتے جب تک کہ اپنے منہ پر نہ پھیر لیتے۔“ (ترمذی)

تشریح: قولہ: کان رسول اللہ اذا رفع یدیه فی الدعاء:

کہتے ہیں کہ ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہ دعا کا قبلہ، رزق وحی اور برکت اترنے کا سرچشمہ ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ داعی اپنی نگاہ آسمان کی طرف نہ اٹھائے ایک حدیث کی وجہ سے جو انہوں نے بیان کی۔

اس پر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: لیکن یہ حدیث امام غزالی کی دلیل نہیں اس لئے کہ یہ صحیح مسلم کی روایت ہے اور یہ دعائی ”حالة الصلوة“ کے ساتھ مقید ہے میرے نزدیک راجح روایت ابن عماد کی ہے چنانچہ انہوں نے دفع البصر الی السماء کو مسنون قرار دیا ہے۔ اھ۔

اور یہ عجیب سی بات ہے کیونکہ مسلم کی حدیث از روئے قیاس امام غزالی کیلئے وزنی دلیل ہے کیونکہ منع کی علت اللہ تعالیٰ کیلئے مکان و جہت ہونے کا ابہام ہے اور یہ علم نماز و خارج نماز دونوں حالتوں میں موجود ہے۔ پھر ایک اور عجیب بات کہ انہوں نے رفع البصر کے سنت ہونے کو ترجیح دی ہے حالانکہ یہ کسی بھی حدیث میں وارد نہیں۔

امام جزریؒ نے ”حسن“ میں آداب دعائیں سے یہ بھی شمار کیا ہے کہ آسمان کی طرف نگاہ نہ اٹھائے اور اس کی اسناد مسلم اور نسائی کی طرف ہے۔

پھر حافظ ابن حجرؒ نے ذکر فرمایا کہ ہاتھوں کے بلند کرنے کا محل یا تو بالائی حصہ کو بلند کرنا ہے یا پھر اندرونی حصہ کو حائل کے ساتھ صحیح قول کے مطابق لیکن اندرونی حصہ کو حائل کے بغیر بلند کرنا تو یہ مکروہ ہے۔

یہ تفصیلی مناقشہ سے صرف نظر کرتے ہوئے حدیث کے اطلاق کے منافی ہے۔ (واللہ اعلم)۔

قولہ: ہم یحطھما حتی یمسح بہما وجہہ:

ابن الملک فرماتے ہیں یہ اس نیک شگون کا عکاس ہے کہ دونوں ہاتھ آسمانی برکات اور انوار الہیہ سے بھر گئے ہیں۔ اھ۔

یہ بڑی اچھی بات فرمائی ہے تاہم ”کان“ (جو بمعنی شاید ہے) کا کلمہ آنحضرت ﷺ کی دعا کے شایان شان نہیں البتہ غیروں کے مناسب ہے اور یوں ہی ’تفاوت‘ کا لفظ کیونکہ وہاں دعا کے قبول ہونے اور برکات کے حصول میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

۲۲۳۶ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَيَدْعُ مَا سِوَى ذَلِكَ .

۔۔۔ حہ ۔۔۔ ذہ فی السنن ۷۷۱۲ حدیث رقم ۱۴۸۲۔

ترجمہ: ”اور سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ان دعاؤں کو پسند کرتے تھے جو جامع ہیں اور ان دعاؤں کو چھوڑ دیتے تھے جو جامع نہیں ہیں۔“ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: کان رسول اللہ ﷺ يستحب الجوامع من الدعاء:

”یہ وہ دعا ہوتی ہے جو تمام نیک اغراض پر مشتمل ہو یا وہ دعا جس میں اللہ کی ذات کی ثناء ہو اور دعا کے آداب کا لحاظ ہو۔“

مظہر فرماتے ہیں یہ وہ دعا ہوتی ہے جس کے الفاظ مختصر اور معنی کثیر ہوں ”ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار“

”اللهم انی أسألك العفو والعافية فی الدنیا و الدنیا و الآخرة“

”اللهم انی أسألك الهدی و التقی و العفاف و الغنی“ یا جیسے فلاح و کامرانی کی دعا۔

قولہ: و یدع ما سوا ذلک یعنی جو جامع دعا نہیں ہوتی تھی اسے چھوڑ دیتے تھے۔ بایں طور کہ وہ کسی جزوی امر کو طلب کرنے کیلئے ہوتی تھی جیسے یہ کہہ کہ اللہ مجھے خوبصورت بیوی دے دے۔

سب سے بہترین دعا :

زیادہ بہتر اور مانگنے کے لائق دعا یہ ہے کہ یا اللہ دنیا و آخرت کی راحت نصیب کر دے۔

اس لئے کہ یہ ایسی جامع دعا ہے جو اس کے اس مدعا وغیرہ سب کو شامل ہے۔

۲۳۳۷: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ أَسْرَعَ الدُّعَاءِ اجَابَةً دَعْوَةُ غَائِبٍ لِّغَائِبٍ

. (رواه الترمذی و ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۹/۲ حدیث رقم ۱۵۳۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا زیادہ قبول ہونے والی وہ دعا ہے جو غائب غائب کے لئے کرے۔“ (ترمذی ابوداؤد)

تشریح: قولہ: وعن عبد اللہ بن عمرو: عمرو بن العین ہے بضم العین نہیں۔

قولہ: قال رسول اللہ ﷺ ان اسرع الدعاء اجابة: اجابۃ کا لفظ منصوب علی التمییز ہے۔

غائب کی دعا غائب کے لئے بہت جلد اس لئے قبول ہوتی ہے کہ ایسی دعا مخلصانہ اور نیت صاف ہوتی ہے نیز ایسی دعا میں ریاء اور شہرت نہیں ہوتی۔

۲۳۳۸: وَعَنْ عَمْرٍو بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ اسْتَأْذَنْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الْعُمْرَةِ فَادْنَى لِي وَقَالَ اشْرِكْنَا يَا اُخْتَى فِي

دُعَا نِكَ وَلَا تَنْسَنَا فَقَالَ كَلِمَةً مَا يَسُرُّنِي اَنْ لِي بِهَا الدُّنْيَا.

(رواه ابوداؤد و الترمذی و انتہت روايته عند قوله ولا تنسنا)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۰/۲ حدیث رقم ۱۴۹۸۔ و الترمذی ۲۲۰/۵ حدیث رقم ۳۶۳۳۔ و ابو ماجہ فی لسس

۹۶۶/۲ حدیث رقم ۶۸۹۴۔ و آخر فی المسند۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمر بن خطاب روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نبی کریم ﷺ سے ادا بیگی عمرہ کے لئے

اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے مجھے اجازت عطا فرمائی اور فرمایا کہ ”اے میرے چھوٹے بھائی اپنی دعا میں ہمیں بھی

شریک کر لینا اور دعا کے وقت مجھے نہ بھولنا! حضرت عمر کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ اگر اس کے

بدلہ میں مجھے تمام دنیا بھی دے دی جائے تو مجھے خوشی نہ ہوگی۔ (ابوداؤد امام ترمذی) نے اس روایت کو لفظ ولا تنسنا

پر ختم کیا ہے۔“

تشریح: قولہ: استأذنت النبی فی العمرة: یہ عمرہ مدینہ سے تھا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ قضا عمرہ تھا جس کی انہوں

نے جاہلیت میں نذر مانی تھی۔

قوله: قال: اشركنا في دعائك يا اُحى ولا تنسنا:

”اشركنا“ جمع متكلم كاصيغہ استعمال فرمانے میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جمع تعظیسی ہو یا مراد یہ ہو کہ مجھے اور میرے قمعین کو۔ ”اُحى“ یہ تفسیر ہے اُح کی۔ یہاں تفسیر برائے تحقیر نہیں بلکہ برائے عنایت و نوازش ہے۔ اور ایک روایت ’یا اُحى‘ یعنی تفسیر کے بغیر وارد ہے۔

اس (دعا کی درخواست) میں مقام عبودیت اور عجز و انکساری کا مظاہرہ ہے۔ چنانچہ اس میں دعا کا التماس ایسے شخص سے کیا ہے جس کا راہ ہدایت پر ہونا معروف ہے۔

اور اس میں امت کو اس بات پر برا بیخنتہ کرنا ہے کہ امت کے صالح اور عبادت گزار لوگوں سے دعائیں کروائی جائیں۔ نیز اس میں اس بات پر تنبیہ کرنا بھی مقصود ہے کہ دعا صرف اپنے ہی لئے مخصوص نہ کرواں اس طرح کہ اپنے دوسرے اقارب و احباب کو شریک نہ کرواں خاص کر کے ایسی دعاؤں جن کی قبولیت کی خاص امید ہو، اس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی شان کی رفعت کی شہادت ہے اور اس امر کی طرف رہنمائی ہے جو دعا کو مسترد ہونے سے محفوظ کرتی ہے۔

”ولا تنسنا“: یہ تاکید ہے، یا تائیس ہے اور مراد ساری حالتیں ہیں۔

قوله: فقال كلمة ما يسرنى ان لى بها الدنيا: فقال “كاعطف” قال اشركنا“ پر ہے اور ”فء“ تعقيب كیلئے ہے اور معطوف معطوف عليه كیلئے بیان ہے۔ یہاں ”قال“ بمعنی تكلم ہے۔ ”بها“: باء بدل کے معنی میں ہے۔ ”ما“ نافية ہے اور ”ان“ اپنے اسم و خبر کے ساتھ مل کر ”يسرنى“ کا قائل ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے ”ما يسرنى كون جميع الدنيا لى بدلها“ یعنی اس کے بدلہ میں ساری دنیا میری ہو مجھے اس پر کوئی خوشی نہ ہوگی۔

وہ خوش کن کلمہ کونسا تھا؟ اس میں کئی احتمال ہیں: ۱- یہ کلمہ ”اشركنا“ تھا۔ ۲- لفظ ”یا اُحى“ تھا۔ ۳- لفظ ”ولا تنسنا“ تھا۔

۳- کوئی اور کلمہ ہے جسے انہوں نے تقاضا یا اس جیسے دوسری آفت نفسیہ سے بچنے کی خاطر ذکر نہیں کیا۔

۲۲۳۹: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَا تَرُدُّ دَعْوَتَهُمُ الصَّانِمُ حِينَ يُفْطِرُ وَالْإِمَامُ الْعَادِلُ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُومِ يَرْفَعُهَا اللَّهُ فَوْقَ الْغَمَامِ وَتَنْفُحُ لَهَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَيَقُولُ الرَّبُّ وَعِزَّتِي لَا نُصْرَتِكَ وَلَوْ بَعْدَ حِينٍ . (رواه الترمذی)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۵۵۷۱ حدیث رقم ۱۷۵۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین شخص ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی (۱) روزہ دار جب وہ افطار کرتا ہے (۲) لوگوں کا سردار حاکم جو عدل و انصاف کرے (۳) مظلوم کی دعا جب مظلوم دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو بادلوں کے اوپر اٹھاتا ہے اور اس دعا کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور پروردگار فرماتا ہے کہ ”قسم ہے مجھے اپنی عزت کی“ میں تیری مدد ضرور کروں گا اگرچہ وہ کچھ مدت بعد ہی ہو۔“ (ترمذی)

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا ترد دعوتهم: یعنی تین شخص، یہ تفسیر حافظ ابن حجر کی تفسیر ”من الرجال“

سے زیادہ بہتر ہے، چنانچہ وہاں رجال کا ذکر نقلیں ہے۔

کہتے ہیں کہ مانگنے والے کی دعا کا جلد قبول ہونا یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ صالح ہوتا ہے یا اس لئے کہ اس کی دعا میں اللہ کے سامنے عجز و انکسار زیادہ ہوتی ہے۔

قولہ: الصائم حین یفطر (یعنی روزہ داروں میں سے کوئی ایک۔

حین یفطر) کیونکہ یہ دعا ایک عبادت کے بعد ہوتی ہے نیز یہ حالت عجز و مسکنت کی ہوتی ہے۔

قولہ: والامام العادل: کیونکہ حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک لمحہ کا عدل ساٹھ لمحات کی عبادت سے بہتر ہے۔

قولہ: ودعوة المظلوم: ظاہر کا تقاضا یہ تھا ”والمظلوم“ کہہ دیا جاتا (یعنی مضاف دعوت کو حذف کر دیا جاتا) لیکن چونکہ مظلومیت کے مطلوب بذاتہ ہونے کا ابہام تھا اس کو دور کرنے کیلئے لفظ دعوت کو شروع میں بڑھا دیا۔

امام طیبی نے الصائم اور الامام کے شروع میں بھی لفظ ”دعوة“ کو (تفسیر میں) ”دعوة المظلوم“ کے قرینہ سے بڑھا دیا۔

ترکیب میں یہ گزشتہ ”دعوة“ سے بدل ہوگا اور ”یرفعها“ کا جملہ حال ہوگا یہ ترکیب سلف سے منقول ہے۔

لیکن زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ ”یرفعها“ کا جملہ ”دعوة المظلوم“ مبتدا کیلئے خبر ہو اور اس قسم کو سابقہ دونوں قسموں سے اس لئے قطع کیا گیا ہے تاکہ مظلوم کی دعا کی شدت اہتمام ظاہر ہو اگرچہ وہ کافر و فاسق ہو۔

اس ترکیبی صورت کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ”ویقول الرب“ جملہ کا عطف ”وتفتح“ جملہ پر ہو رہا ہے اور یہ عطف پہلی ترکیبی صورت کے مناسب نہیں کیونکہ اس صورت میں یرفعها کی ضمیر منصوب متصل کا مرجع لفظ ”دعوة“ ہوگا نہ کہ لفظ ”دعوة المظلوم“۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یرفعها کی مذکورہ ضمیر کا مرجع دونوں ترکیبی صورتوں میں ”دعوة المظلوم“ ہے۔

اور مظلوم کی دعا کی قبولیت میں مبالغہ اس لئے کیا گیا کہ جب اسے آتش ظلم نے جھلسایا اور اس کے اندرون کو ظلم نے جلایا تو اس کے دل سے دعا عجز و انکساری کے ماتھ زبان پر آئے گی اور اس کو اضطراب کی صورت حاصل ہوگی لہذا اس کی دعا یقینی طور پر قبول ہوگی چنانچہ اللہ تعالیٰ کافر مان مقدس ہے: ﴿امن یجیب المضطر اذا دعاه ویکشف السوء﴾ [سورۃ النمل: ۱۲]

قولہ: یرفعها اللہ فوق الغمام.....: کا مطلب یہ ہے کہ وہ بادلوں سے اوپر تجاوز کر جاتی ہے۔

”یفتح“ کا لفظ تذکیر و تانیث، مجہول کے صیغے کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ”رفع“ اور ”فتح“ جلدی قبول ہونے اور مطلوب تک پہنچنے سے کنایہ ہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ دعا کا بادلوں کے اوپر اٹھانا اور اس کیلئے آسمان کے دروازوں کا کھلنا کنایہ ہے اس بات سے کہ وہ آسمانی اسباب و آثار کو اس کی مدد کیلئے بھارتا ہے اور جمع کرتا ہے کہ وہ ظالم سے انتقام لیں اور اس پر سختی و مشقت نازل کریں۔

قولہ: ویقول الرب: وعزنی لانصرنک..... الخ: ”کاف“ کے فتح کے ساتھ بتقدیر مظلوم اور یوں ہی ”کاف“ کے کسرہ کے ساتھ تضریر دعا ”حین“ کا اطلاق مطلق وقت پر بھی ہوتا، چھ ماہ کے عرصہ پر بھی اور چار سال کی مدت پر بھی (واللہ اعلم بالمراد)۔

مطلب یہ ہے کہ بندے میں تیرا حق ضائع نہیں کروں گا اور نہ ہی تیری دعا کو مسترد کروں گا گو کہ اس دوران طویل عرصہ گزر جائے اس لئے کہ میں حلیم ذات ہوں۔ میں بندوں کو سزا دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتا میں انہیں مہلت دیتا رہتا ہوں کہ شاید یہ ظلم و ستم ترک کر کے توبہ کرے اور مظلوم کو راضی کر لیں اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وولا تحسبن اللہ غافلاً عما یعمل الظالمون﴾ [ابراہیم: ۴۲] اور ارشاد ہے: ﴿وربک الغفور ذوالرحمة﴾ [الکہف: ۵۸]

۲۳۵۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثٌ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَكَّ فِيهِنَّ دَعْوَةُ الْوَالِدِ وَدَعْوَةُ الْمَسْأُفِرِ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُومِ. (رواه الترمذی و ابوداؤد وابن ماجه)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۹/۲ حدیث رقم ۱۵۳۶۔ والترمذی فی السنن ۱۶۴/۵ حدیث رقم ۳۵۰۹۔ وابن ماجه ۱۲۷۰/۲ حدیث رقم ۳۸۶۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں تین دعائیں قبول کی جاتی ہیں ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں ایک تو باپ کی دعا، دوسری مسافر کی دعا اور تیسری مظلوم کی دعا۔“ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: ثلاث دعوات مستجابات.....: ”ثلاث“ یہ مبتدأ ہے اور ”مستجابات“ اس کی خبر ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ گذشتہ حدیث میں لفظ ثلاثہ (بالتانیث) تھا اور مذکورہ حدیث میں لفظ ثلاث (بالتذکیر) وارد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ حدیث میں ثلاثہ کی تین داعی (دعا کرنے والا) مذکور ہے۔ وہاں کلام داعی کی شان اور راہ قبولیت میں اس کی کوشش و جستجو دعا کی قبولیت کا مدار ہے یعنی صوم اور عدل میں ہے۔

اس کے برعکس مذکورہ دعا میں والد اور مسافر کی دعا (مونث) تیز ہے۔ کیونکہ یہاں پر دعا کی قبولیت کیلئے انہیں کسی قسم کی عملی جدوجہد کی ضرورت نہیں۔ (سوائے مسافر و والد ہونے کے) اھ۔

یہ ایک نفیس نکتہ اور عالی حکمت اور اس کی بلاغت و فصاحت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔

اور حافظ ابن حجرؒ کا قول انتہائی عجیب ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں وہاں لفظ ”ثلاثہ“ مونث مذکور ہے اور اس جگہ لفظ ”ثلاث“ مذکور ہے اور انہوں نے اس کے علاوہ کے ساتھ فرق کرنے کو عجیب قرار دیا ہے اور فرمایا کہ اس میں پوشیدگی اور تکلف کا ارتکاب لازم آتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو پوشیدگی کی بات ہے وہ تو یہ ہے کہ اس لئے کہ یہ دقیق قسم کی باتیں فصیح و بلیغ علماء پر واضح ہو سکتی ہے۔

اور رہا ان کا یہ خیال کہ امام طیبیؒ نے معدود کے تذکیر و تانیث کے اعتبار سے ثلاثہ اور ثلاث میں فرق نہیں کیا تو یہ ایسی بے بنیاد اور غلط بات ہے جو کسی سے بھی مخفی نہیں۔ کیونکہ امام طیبیؒ عمر بیت کے امام ہیں اور قرآن اور حدیث کے الفاظ کے حل میں علم کے بلند اور بڑے پہاڑ ہیں۔

البتہ وہ فقہی فروعات میں شہرہ نہیں رکھتے تھے لیکن یہ اس کیلئے قادر نہیں۔

”لا شک فیہن“ کے الفاظ میں بنسبت کجھلی حدیث کے زیادہ تاکید ہے، جس میں ”لا ترد“ کے الفاظ ہیں۔ اس جگہ قبولیت کی تاکید کی وجہ یہ ہے کہ یہاں دعا طلب صادق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

قولہ: دعوة الوالد: یعنی والد کی دعا اپنی اولاد کے حق میں یا ان کے خلاف اس کی بددعا۔ ربی والدہ تو اس ذکر اس لئے ترک کر دیا گیا ہے کہ اس کو حق والد سے بڑھ کر ہے لہذا اس کی دعا کی قبولیت بطریق اولیٰ ثابت ہوگی۔

اور یا اس کو ترک کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ماں کی بددعا اولاد کیلئے قبول نہیں ہوتی کیونکہ اولاد پر رحم کرتی ہے اور اولاد کیلئے بددعا دل سے نہیں دیتی۔ ”کذا ذکرہ زین العرب“، لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ والد کی دعا بھی بطور شفقت کے ہوتی ہے اور تہ دل سے ہوتی ہے اس طرح اس کی بددعا کیونکہ ان کی بددعا بھی اس بات کا پر زور مظاہر ہے کہ اولاد نے اسکے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔

لہذا بہتر یہ ہے والدہ کو بطریق اولویت والد پر قیاس کیا جائے۔ جیسے یہ مفہوم ایک حدیث میں وارد ہے کہ والد کیلئے دو تہائی حسن سلوک ہے اور والدہ کیلئے ایک تہائی۔

کیونکہ حمل، ولادت، رضاعت، پرورش کی جو تکالیف ماں برداشت کرتی ہے وہ ان تکالیف سے بڑھ کر ہیں جو والد کو اس کے کھانے پینے کی کفالت اور لباس کے انتظامات کے سلسلہ میں اٹھانی پڑتی ہیں۔

جیسے کہ یہ باری تعالیٰ کے اس قول کریم کا مدلول ہے: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمِيْلَتِهٖ اِمْرًا وَّهٰنَا﴾ [لقمان: ۱۴] چنانچہ اس آیت کریمہ میں ”حملتہ امہ“ کا جملہ مفسر یعنی ”ان اشکرنی“ اور مفسر یعنی ”وصینا“ کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے لایا گیا۔ اور اس جملہ معترضہ کو لانے کا فائدہ والدین کے حق کی تلقین میں زور پیدا کرنا خاص کر والدہ کے حق میں کیونکہ اس نے حمل و رضاعت وغیرہ کی بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں اور اس لئے بھی کہ والدہ زیادہ شفیق اور نرم دل ہوتی ہے اس لئے اس کی دعا قبولیت کے زیادہ لائق ہوتی ہے۔

قولہ: ودعوة المسافر: مسافر کی دعا سے مراد یا تو احسان کرنے والے کے حق میں اچھی دعا ہے یا پھر برائی کرنے والے کے خلاف بددعا ہے کیونکہ اس کی دعا بھی دل سے ہوتی ہے۔

قولہ: ودعوة المظلوم: یہ مراد ہے کہ مظلوم کی دعا اس شخص کیلئے جو اس کی مدد و اعانت کرتا ہے۔ یا اسے تسلی دے کر مصیبت کو سہل کر دیتا ہے اور یا مراد اس شخص کے خلاف جس نے کسی طرح کا ظلم کیا ہو۔

الفصل الثالث:

۲۲۵۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَيَسْأَلُ اَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا حَتَّى يَسْأَلَهُ شَيْعَ نَعْلِهِ اِذَا انْقَطَعَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۴۲/۵ حدیث رقم ۲۶۸۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی حاجتیں اپنے پروردگار سے مانگے یہاں تک کہ اگر اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی خدا سے مانگو۔“

تشریح: قولہ: یسأل احدکم ربہ حاجتہ کلہا: یہ مفعول بہ ثانی ہے۔ (کلہا) یہ مفعول بہ ثانی کی تاکید ہے۔ یعنی اپنی تمام مرادیں میں مانگیں اس میں اس بات پر تشبیہ و اعلان ہے کہ ہمہ وقت مدد و استعانت کی ضرورت و احتیاج ہو۔

قولہ: حتی یسأله شیع نعلہ اذا انقطع: یعنی اللہ سے اور ایک صحیح نسخہ میں ”حتی یسأل“ ضمیر مضرب کے بغیر بھی آیا ہے۔ ”شیع“ شین کے کسرہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے بمعنی جوتے کا تسمہ۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”شیع“ جوتے کے دو تسموں میں سے ایک کو کہتے ہیں اور یہ از باب تشبیہ ہے کیونکہ اس سے ما قبل از قبیل مہمات ہے اس کے بعد از قبیل تممات ہے۔

۲۲۵۲: زَادَ فِي رِوَايَةٍ عَنْ ثَابِتِ الْبَنَانِيِّ مُرْسَلًا حَتَّى يَسْأَلَهُ الْمِلْحَ وَحَتَّى يَسْأَلَهُ شَيْعَهُ اِذَا انْقَطَعَ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/حدیث رقم ۳۶۸۳۔

ترجمہ: ترمذی نے ایک اور روایت میں جو ثابت بنانی سے بطریق ارسال نقل کی ہے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ یہاں تک کہ نمک بھی اس سے مانگے اور اگر جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اس سے مانگے۔“ (ترمذی)

تشریح: قولہ: زاد فی روایۃ: مصنف کو یہ کہنا چاہئے تھا (وفی روایۃ) یا یوں کہنا چاہئے تھا کہ: رواہ الترمذی وزاد

فی روایۃ۔

قولہ: حتی یسأله الملح: یہی وہ اضافہ ہے جو امام ترمذی نے ثابت بنانی کے طریق سے مرسل روایت کیا ہے۔

”حتیٰ یسالہ“ کا کمر اس بات پر دلالت کرنے کے واسطے ہے کہ وہاں مانگنے والے کو اس کے مطلوب سے روک ٹھوک کرنے والا نہیں کیونکہ جس سے مانگا گیا وہ انتہائی مہربان ذات ہے اور ہمہ وقت مطلوب کو عطا کرنے پر تیار تاکہ بندہ اس کی طرف التجا کرتا رہے اور اس پر بھروسا کرتا رہے۔

”شسع نعلہ“ تو دونوں روایتوں میں موجود ہے البتہ مقدار زائد پر تنبیہ کیلئے دوسری روایت کے اس حصہ کو بھی ذکر کیا۔

۲۲۵۳: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَرْفَعُ فِي الدُّعَاءِ حَتَّى يَرَى بَيَاضَ إِبْطِئِهِ

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دعا کے وقت اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے تھے کہ آپ ﷺ کی بظلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔“

تشریح: قولہ: وعن انسؓ: اس مقام پر عنہ کے بجائے عن انسؓ اس لئے کہا کہ یہ وہ نہ ہو کہ ضمیر کا مرجع ثابت بنانی ہے گو کہ ایک نسخ میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

قولہ: كان رسول الله ﷺ يرفع يديه..... الخ: ”حتیٰ یری“: یہ بصیغہ مجہول ہے اور روایت کے معنی میں ہے۔

یعنی نبی کریم ﷺ دعا کے بعض مخصوص مواقع پر اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے تھے کہ آپ ﷺ کی بظلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ بظلوں کی سفیدی سے مراد اطراف بغل کی سفیدی ہو۔ کہ نبی کریم ﷺ دعا کے مواقع پر اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے تھے کہ آپ ﷺ کی بظلوں کی اطراف کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔

یہ اس حدیث کے منافی نہیں جسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ ”المسألة ان ترفع يديك حذو منكبيك“ کیونکہ یہ حدیث محمول ہے کم از کم رفع پر یا اکثر اوقات پر اور وہ حدیث محمول ہے بیان جواز پر یا مخصوص حالات و اوقات پر جیسے استقاء وغیرہ، یا دعا میں مبالغہ پر۔

۲۲۵۴: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ كَانَ يَجْعَلُ أَصْبَعَهُ حَذَاءَ مَنْكِبَيْهِ وَيَدْعُو.

ترجمہ: ”اور حضرت سہل ابن سعدؓ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی دونوں انگلیوں یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے اپنے مونڈھوں کے برابر لے جاتے اور پھر دعا مانگتے۔“

تشریح: قولہ: عن النبي ﷺ قال: كان يجعل أصبعيه.....

یہ حدیث رفع یدین کے سلسلہ میں میانہ روی کی دلیل ہے۔ اور یہ اکثر حالات میں ہے اور گذشتہ حدیث میں زیادہ ہے اور وہ مبالغہ اور دعا کے الحاح و زاری کی حالت میں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے اپنے مونڈھوں کے برابر لے جاتے اور پھر ہاتھ اٹھانے کے بعد دعا مانگتے۔

۲۲۵۵: وَعَنْ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا دَعَا فَرَفَعَ يَدَيْهِ مَسَّحَ وَجْهَهُ بِيَدَيْهِ.

(رواه البيهقي الا حاديث الثلاثة في الدعوات الكبير)

ترجمہ: ”اور سائب بن یزید اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب دعا مانگتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تو اپنے منہ پر دونوں ہاتھوں کو پھیرتے۔“ (مذکورہ بالا تینوں حدیثیں بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔“

تشریح: قولہ: فرغ يديه: یہ ”دعا“ پر عطف ہے۔

قولہ: مسح وجہہ بیدیدہ: حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ جملہ ”اذا“ کا جواب ہے۔ اھ۔
لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ ”کان“ کی خبر ہے اور ”اذا“ اس کیلئے ظرف ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب آپ ﷺ ہاتھ دعا میں نہ اٹھاتے تو پھر چہرے مبارک پر نہ پھیرتے اور یہ ایک اچھا قید ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ بکثرت دعا مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ نماز کی حالت میں مانگتے تھے طواف کی حالت میں مانگتے تھے اس کے علاوہ حالات و اوقات میں مانگتے تھے۔ جیسے نمازوں کے بعد کی دعائیں، سوتے وقت کی دعا کھانے کے بعد کی دعا وغیرہ ذلک، آپ ﷺ جب ہاتھ نہ اٹھاتے تو پھر منہ پر نہ پھیرتے۔

اور رہا حافظ ابن حجر کا یہ قول: کہ لفظ حدیث سے جو یہ استفادہ ہے کہ آپ ﷺ جب ہاتھ اٹھائے بغیر دعا مانگتے تو پھر منہ پر نہ پھیرتے تو یہ فرضی بات ہے کیونکہ یہ بات گذر چکی ہے کہ آپ ﷺ ہر دعا میں ہاتھ مبارک اٹھاتے تھے۔ اھ۔
یہ قول مردود ہے اس لئے کہ سابق میں ایسی کوئی بات نہیں گذری جو کلیتہً پر دلالت کرے اور رہا ان کا آپ ﷺ کے فعل کے بارے میں یہ کہنا کہ فرضی بات ہے، بے فائدہ ہے۔

۲۲۵۶: وَعَنْ عُرْمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ الْمَسْأَلَةُ أَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَ مَنْكِبَيْكَ أَوْ نَحْوَهُمَا وَالْإِسْتِغْفَارُ أَنْ تُشِيرَ بِإِصْبَعٍ وَاحِدَةٍ وَالْإِبْتِهَالُ أَنْ تَمُدَّ يَدَيْكَ جَمِيعًا وَفِي رَوَايَةٍ قَالَ وَالْإِبْتِهَالُ هَلْكَدًا وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَجَعَلَ ظُهُورَهُمَا مِمَّا يَلِي وَجْهَهُ۔ (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۹/۲ حدیث رقم ۱۴۸۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ”سوال کرنے کا ادب طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں کے برابر یا ان کے قریب تک اٹھاؤ استغفار کا ادب یہ ہے کہ تم اپنی انگلی کے ذریعہ اشارہ کرو اور دعا میں انتہائی عجز و مبالغہ اختیار کرنا یہ ہے کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو اکٹھے دراز کر دینے اتنے اٹھاؤ کہ بظلوں کی سفیدی نظر آنے لگے۔“ (ابوداؤد) ایک روایت میں یوں ہے کہ انہوں نے کہا ”دعا میں انتہائی عاجزی کا اظہار اس طرح ہے اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور ان کی پشت کو اپنے منہ کے قریب کیا۔ ابو داؤد

تشریح: قولہ: المسألة..... أو نحوهما: مسالہ مصدر میسی ہے بمعنی مانگنے کے۔ یہاں پر ”مسالہ“ سے پہلے مضاف مقدر ہے یہ تقدیر حمل درست ہونے کی خاطر ہے تقدیر عبارت ہے، آداب المسألة۔

”نحو“ بمعنی ”قریب“ کے ہیں یعنی کاندھوں کے قریب لیکن اوپر کی طرف گذشتہ حدیث کے قرینہ کی بنا پر۔

قولہ: والاستغفار ان تشير باصبع واحدة: امام طیبی فرماتے ہیں استغفار کے آداب میں سے یہ ہے کہ شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا جائے نفس امارہ اور شیطان کی تذلیل اور ان دونوں سے پناہ مانگتے ہوئے۔

ایک انگلی کے ساتھ مقید کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ دو انگلیوں سے اشارہ کرنا مکروہ ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے مروی ہے۔ کہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو دو انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ”احد احد“ یعنی وہ ایک ہے وہ ایک ہے۔

قولہ: والابتہال ان تمد يدبك: یعنی عجز و انکسار نفس سے سختی و مشقت دور کرنے کیلئے دعا کے اندر مبالغہ اور تضرع کرنا یہ آداب دعائیں سے ہے یعنی اتنی مقدار کہ آپ کے بظلوں کی سفیدی نظر آنے لگے۔

قوله: والابتھال هكذا ورفع.....: یہ تعلیم بالفعل ہے جس کی تفسیر اگلے الفاظ میں ہے۔ ورفع یدیه رجعل ظهورهما مما یلی وجھہ یعنی آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک انتہائی بلند فرمائے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک سر مبارک کے برابر میں ہو گئے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: شاید آپ ﷺ نے ابتھال سے پیش آنے والے تخیلاتی عذاب کا دفاع مراد لیا ہے۔ اور اپنے دست مبارک کو ذہال بنا لیا تاکہ اس عذاب سختی سے بچاؤ ہو۔

۲۲۵۷: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ يَقُولُ إِنَّ رَفْعَكُمْ أَيْدِيَكُمْ بِدَعَا مَا زَادَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَيَّ هَذَا يَعْنِي إِلَيَّ

الصَّدْر - (رواه احمد)

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ”تمہارا اپنے ہاتھوں کو بہت زیادہ“

اٹھانا بدعت ہے نبی کریم ﷺ اکثر اس سے زیادہ یعنی سینہ سے زیادہ اوپر نہیں اٹھاتے تھے۔“ (احمد)

تشریح: قوله: ان رفعكم ايديكم بدعة: یعنی ہاتھ بلند کرنے میں مبالغہ کرنا۔

قوله: ما زاد رسول الله ﷺ علي هذا: یعنی اعلیٰ و اکثری حالات و اوقات میں۔

علیٰ هذا یعنی: مشارالیه سے مراد ہے۔ (الی الصدر)۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ لفظ ”یعنی“ کے ساتھ ابن عمرؓ کے فعل کی تفسیر کی گئی ہے کہ رفع یدین سینے تک ہے، حضرت ابن عمرؓ نے عمومی

حالات میں رفع یدین میں مبالغہ پر تکیہ فرمائی ہے۔

نیز اس بات پر کہ تمام حالات کے اندر یکساں ہاتھ اٹھائے جائیں۔ چنانچہ بعض حالات میں سینے تک بعض حالات میں کاندھوں

تک ہیں۔ جبکہ بعض دیگر حالات کے اندر کاندھوں سے اوپر تک ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کی یہ تطبیق بہت لائق تحسین ہے، اس سے حافظ ابن

حجرؒ کا۔ یہ قول بے وزن ہو جاتا ہے کہ ابن عمرؓ کے اس قول کا استناد ان کا علم ہے وہ زائد کی نفی کر رہے ہیں جبکہ ان کے علاوہ دوسرے

حضرات آپ ﷺ سے کاندھوں تک اٹھانا اور اس سے اوپر تک اٹھانا نقل کر رہے ہیں تو ان حضرات کا قول مثبت ہے اور مثبت کے قول کا

اعتبار ہوتا ہے، تعجب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے بڑے فخر یہ انداز میں یہ کلام کیا ہے کہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ایسی تقریر کی ہے

جو اشکال اور ابہام سے خالی نہیں لہذا اس سے اجتناب کیا جائے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے یوم عرفہ میں دعا کے اندر اپنے دونوں ہتھیلیوں کو یکجا کیا اور سینے کے برابر اٹھایا کھانا طلب

کرنے والے مسکینی کی کیفیت میں دعا مانگی۔

۲۲۵۸: وَعَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا ذَكَرَ أَحَدًا فَقَدَعَالَهُ بَدَأَ بِنَفْسِهِ.

رواه الترمذی وقال هذا حدیث حسن غریب صحیح

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۱/۵ حدیث رقم ۳۴۴۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کا ذکر کرتے اور پھر اس کے لئے دعا کرتے تو

پہلے اپنے لئے دعا کرنا شروع کرتے اس کے بعد اس شخص کے لئے دعا کرتے امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے

اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: قوله: اذا ذكر احدًا فدعا له: ”دعا“ کا عطف ہے ”ذکر“ پر ہے۔

مراد ہے جب آپ ﷺ کسی کیلئے دعا کرنا چاہتے تھے تو پہلے اپنے لئے دعا کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی مستغنی نہیں۔ صحیح حدیث کے اندر یہ بات آئی ہے کہ آپ ﷺ نے ”ابدأ بنفسك“ یعنی اپنے سے ابتدا کر۔ اس میں امت کیلئے تعلیم ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اپنے حق میں اس دعا قبول ہو جائے گی تو دوسرے کے حق میں اس کی دعا مسترد نہیں ہوگی۔

۲۲۵۹: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا اِثْمٌ وَلَا قَطِيعَةٌ رَحِمَ إِلَّا اَعْطَاهُ اللَّهُ بِهَا اِحْدَى ثَلَاثٍ اِمَّا اَنْ يُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ وَاِمَّا اَنْ يَدْخِرَ هَالِكُهُ فِي الْاٰخِرَةِ وَاِمَّا اَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا قَالُوْا اِذَا نَكِيْهُ قَالَ اَللّٰهُ اَكْثَرُ. (رواه احمد)

احمد فی المسند ۱۸/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو بھی مسلمان کوئی دعا مانگتا ہے ایسی دعا کہ اس میں نہ تو گناہ کی کوئی چیز کی طلب ہو اور نہ نات توڑنے کی تو اللہ تعالیٰ اسے اس دعا کے نتیجے میں تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور دیتا ہے یا تو یہ کہ جلد ہی اس کا مطلب عطا فرمادے یا یہ کہ اس کے لئے اس دعا کو ذخیرہ آخرت بنا دے“ کہ دنیا میں اس کا مطلب حاصل نہ ہونے کی صورت میں اس کے عوض آخرت میں اجر عطا کرے یا یہ کہ اسے اس کی دعا کے بقدر برائی سے بچائے، صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم تو اب بہت زیادہ دعائیں مانگیں گے کیونکہ ہمیں دعا کے بڑے فائدے معلوم ہو گئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ کا فضل بہت زیادہ ہے۔“ (احمد)

تشریح: قولہ: ما من مسلم..... احدى ثلاث: (لیس فیہا اثم) یعنی اپنے تک محدود مصیبت۔ (ولا قطیعة رحم) یعنی دوسروں تک تجاوز برائی۔ (الا اعطاه اللہ بها) یعنی اس دعا سے (احدی ثلاث) یعنی تین خصلتوں میں سے۔ قولہ: اما ان یعجل له دعوتہ..... مثلها یعنی یعنی بچانے یا اس کی جنس میں سے کچھ دنیا ہی میں دے دیتا ہے اگر دنیا میں اس کا ملنا مقدر ہو۔

واما ان یدخرها: یعنی اس کا وہ مطلوب یا اس کا مثل یا اس سے افضل و برتر یا اس کا ثواب اور متبادل۔ (له) یعنی دعا مانگنے والے کیلئے (فی الآخرة) یعنی اگر دنیا میں اس کا وقوع مقدر نہ ہو۔ (واما ان یصرف) بمعنی یدفع۔ (عنه من السوء) دین و دنیا کے معاملہ میں نازل ہونے والی کوئی مصیبت یا بیماری وغیرہ۔ (مثلها) یعنی کم و کیف کے اعتبار سے اگر اس کا وقوع دنیا میں مقدر نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس کا وقوع دنیا میں مقدر نہ ہو تو اس دعا میں داعی کیلئے دو میں سے ایک چیز ہے۔ یا تو اس کے لیے ذخیرہ آخرت بنا لیتا ہے، یا پھر اس کے بقدر اس پر آنے والی آفت مصیبت کو روک دیتا ہے۔ اس میں گذشتہ حدیث کی بہ نسبت یہ اضافہ ہے کہ جو مقدر نہ ہو دنیا میں تو اس کے بقدر اس سے آفت و مصیبت روک دی جاتی ہے۔

قولہ: قالوا اذا نكحوا: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جب دعا مسترد نہیں کی جاتی اور دعا مانگنے والے کو محروم نہیں کیا جاتا۔ (نکحوا) یعنی دعا بکثرت مانگیں گے کیونکہ اس کے فوائد بڑے بڑے ہیں۔ (شارح فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ نکحوا فعل منصوب ہے۔ لیکن موجودہ تمام صحیح نسخوں میں سید جمال الدین کے نسخوں میں سے بالرفع منضبط ہے۔

اور رفع کی صورت میں ”اذا“ کے مدخول فعل سے حال کا معنی مراد لینا شرط ہے اور یہ ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ متبادرالی الفہم یہ ہے کہ ہم دعا بکثرت کریں گے مستقبل میں۔

البتہ یہ مراد ہو سکتا ہے کہ حال سے حال الحیاة مراد ہو، یا جلد قبولیت کا لحاظ کر کے مبالغہ استقبال سے حال مراد ہو۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ

الخال)۔

تحقیق مقصود کی خاطر جو بات بطور استیناس کے ذکر کی جاسکتی ہے وہ ہے کہ جسے حسنِ حلیمیٰ نے مطول کے حاشیہ میں تحریر کیا ہے کہ حال ماضی کے آخر اور مستقبل اول اجزاء کا نام ہے اور مقدار حال کی تعیین افعال کے مطابق عرف کے سپرد ہے۔ اس کیلئے کوئی مخصوص مقدار متعین نہیں چنانچہ کہا جاتا ہے ”زید یا کل“ ”زید کھاتا ہے“ ”ویمشی“ ”اور چلتا ہے“ ”ویحج“ ”حج کرتا ہے“ ”ویکتب القرآن“ ”قرآن کریم لکھتا ہے“ یہ حال شمار کیے جاتے ہیں حالانکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کے زمانے کے تقادیر مختلف ہیں۔

اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حال کے اندر یہ بات ہر حال میں ضرور ہے کہ فاعل سے حالت تکلم میں فعل کا صدور ہو رہا ہو اور موجودہ صورت حال میں فی الوقت تو دعا بھی موجود نہیں چہ جائیکہ اکثر ہو۔ الایہ کہ نیت فعل کو فعل کا قائم مقام تصور کیا جائے۔

قوله: قال: اللہ اکثر: اکثر یعنی ”بالثناء المثلثة“ ہے جبکہ ایک نسخہ میں ”اکبر“ ”بالباء المؤحده“ وارد ہے۔ تو پھر یہ ہوگا کہ اللہ اس سے بہت بالاتر ہے کہ اس پر کوئی چیز بڑھ جائے، اور پہلے نسخہ کے مطابق امام طیبی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ قبول کرنے میں تمہاری دعاؤں سے بہت زیادہ ہے اور میرے ہاں ظاہر بات یہ ہے کہ اللہ کا فضل بہت زیادہ ہے یعنی اللہ جو اپنے فضل اور وسیع کرم سے عطا کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو وہ تمہیں تمہارے مانگنے سے عطا کرتا ہے۔

یا مراد یہ ہے کہ اللہ اکثر میں غالب ترین ہے کہ تم زیادہ مانگ کر عاجز نہیں کر سکتے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے خزانے ختم ہونے اور اس کے عطیات فنا ہونے سے مبرا ہیں۔ پھر میں نے حافظ ابن حجر کو اپنے ساتھ کچھ موافقت کرتے پایا، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ اللہ ثواب و عطا کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر ہے جو تمہاری نفوس میں طلب ہے تو جو چاہو کثرت سے طلب کرو۔ کیونکہ اللہ کریم تمہاری دعاؤں سے زیادہ اور بڑا عطا کرے گا۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ میری تقریر سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ شارح کی یہ بات غیر ضروری ہے کہ اللہ کی طرف سے قبولیت تمہاری دعا سے بڑھ کر ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کریم کی اجابت کا میدان وسیع ہے، تمہاری دعا سے اس کے باب میں اور یہ قریب قریب اس قول کی طرح ہے، ”العسل احل من النخل۔ والسیف احمر من الشتاء“۔ یعنی سہد سرکہ سے زیادہ شیریں اور موسم گرم جاڑے کے موسم سے زیادہ گرم ہے۔

اور ”اکثر“ ”بالثناء“ کا لانا تکثر کے مشاکلت کی رعایت کے لحاظ سے ہے اور میرے قول (مما نفوسکم) سے یہ مذکورہ خرابی بھی دور ہوگئی، شارح کہتا ہے اس میں دو غیر مناسب ایہام ہیں۔

اول یہ کہ ان کے نفوس میں یہ بات ہے کہ اللہ کی اجابت اکثر نہیں حالانکہ یہ حقیقت نہیں۔

دوم یہ کہ اس میں اکثریت مقید ہے حالانکہ وہ مطلق ہے۔ اس کی کوئی انتہا اور غایت نہیں۔

۲۲۶۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ خَمْسُ دَعَوَاتٍ يُسْتَجَابُ لِهِنَّ دَعْوَةُ الْمَظْلُومِ حَتَّى يَنْتَصِرَ وَدَعْوَةُ الْمَحَاجِّ حَتَّى يَصْدَرَ وَدَعْوَةُ الْمُجَاهِدِ حَتَّى يَقْعَدَ وَدَعْوَةُ الْمَرِيضِ حَتَّى يَبْرَأَ وَدَعْوَةُ الْآخِ لِآخِيهِ بَطْهَرِ الْغَيْبِ ثُمَّ قَالَ وَأَسْرَعُ هَذِهِ الدَّعَوَاتِ اجَابَةُ دَعْوَةِ الْآخِ بِطَهْرِ الْغَيْبِ۔ (رواه البيهقي في الدعوات الكبير)

اخرجه فی صحیحہ ۲۰۷/۴ الحدیث رقم (۳۹- ۲۷۰۰)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ دعائیں ہیں جنہیں شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے (۱) مظلوم کی دعا یہاں تک کہ وہ ظالم سے اپنے ہاتھ سے یا اپنی زبان کے ذریعہ بدلہ لے لے (۲) حاجی کی دعا یہاں تک کہ وہ اپنے شہر اور اپنے اہل و عیال کے پاس واپس آجائے یا حج سے فارغ ہو جائے (۳) جہاد کرنے والے کی دعا یا طلب علم و عمل میں سعی و کوشش کرنے والے کی دعا یہاں تک کہ وہ جہاد سعی و کوشش سے فارغ ہو کر بیٹھ جائے (۴) مریض کی دعا یہاں تک کہ وہ اچھا ہو جائے یا مر جائے (۵) ایک بھائی کی اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا۔“ پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ان دعاؤں میں سب سے جلدی قبول ہونے والی ایک بھائی کی اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا ہے۔“

قوله: خمس دعوة: ”خمس“ مبتدأ ہے اور ”دعوة“ اس کی خبر ہے۔

قوله: دعوة المظلوم حتی ینتصر یعنی اس وقت تک کہ جب وہ ظالم سے ہاتھ یا زبان کے ذریعہ انتقام نہ لے لے۔

کیونکہ اگر اس نے شرعی حق کے بقدر اپنا انتقام لیا، تو اس نے اپنا حق پورا وصول کر لیا۔ یا اپنے حق سے کم وصول کیا، تو بھی صورت واضح ہے، یا اپنے شرعی حق کے علاوہ انتقام لیا، ہو گا یا اس سے زائد لیا ہو گا تو ضرور ظالم ہو جاوے گا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ”حتی“ ان چاروں مقامات میں ”الی“ کے معنی میں ہے۔ جیسے اس قول کے اندر ”حتی“ بمعنی ”الی“ ہے۔ سرت حتی تغیب الشمس کیونکہ ”حتی“ کا مابعد اس کے ماقبل میں داخل نہیں ہے۔

قوله: ودعوة الحاج حتی یصدر: سے یا حج اکبر مراد ہے یا حج اصغر۔ (حتی یصدر) یہ ”دال“ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور معنی ہے کہ وہ اپنے شہر اور گھر لوٹ آئے، یا حج سے فارغ ہو کر واپس آجائے۔

قوله: ودعوة المجاهد حتی یقعد یعنی اللہ کے راستہ میں، یا مراد علم و عمل کے میدان میں سعی و کوشش کرنے والا ہے۔ (حتی یقعد) یہ قاف کے سکون اور عین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور معنی ہے کہ جہاد سے آکر بیٹھ جائے یا مجاہدہ سے فارغ ہو کر بیٹھ جائے، اور ایک صحیح نسخہ میں ”یفتقد“ یعنی ”فا“ کے سکون اور ”قاف“ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ”ای یفتقد ما یستتب له من مجاہدته ای حتی یفرغ منها او استتب له الأمر ای تھیاً واستقام۔ (علی ما فی الصحاح) ابن حجر آخری معنی پر اکتفاء کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”هو من فقد یفتقد کضرب یضرب، ای: الی أن لا یجد أمة جہادہ لفرغها، أو سرقتها، أو الی أن یفرغ من جہادہ او۔“

لہذا آخری ہی درست ہے کیونکہ اول الذکر و ثانی الذکر تو دعا کی قبولیت کو اور قوی کرتے ہیں چہ جائیکہ وہ دعا کی قبولیت کیلئے مانع ہوں۔ علامہ میرک نے حاشیہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ ”حتی یفتقد“ قاف کے سکون اور ”فا“ کے کسرہ کے ساتھ ہے جو رجوع کے معنی ہے اور اسی وجہ سے نیک شگون کی خاطر قافلہ کو قافلہ کہا جاتا ہے اور اس پر ”ظاء“ کا نشان لگا کر اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہی ظاہر ہے لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ حدیث کے اس لفظ کو ظاہر پر محمول کرنا ممکن نہیں بالخصوص جب دوسری دو روایات ثابت ہیں اور ان کا معنی بھی واضح ہے۔

www.KitaboSunnat.com

قوله: ودعوة المریض حتی یبرأ: یعنی تندرست ہو جائے یا فوت ہو جائے۔

قوله: ودعوة الاخ لاخیه بظہر الغیب یعنی مسلم بھائی کی غیر موجودگی میں جب تک اس سے مل نہ لے۔

قوله: واسرع هذه..... بظهر الغيب:

یعنی اپنی بھائی کیلئے (بظهر الغیب) کیونکہ یہ دعا خلوص نیت اور صفائے نرسرت کے ساتھ ہوتی ہے رہے باقی لوگ تو ان کی دعا میں ان کے نفسانی ساجھا اور طبعی اغراض ملی ہوتی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہے:

ان الله في عون العبد مادام العبد في عون أخيه المسلم

”اللہ بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے مسلمان بھائی کی اعانت میں ہوتا ہے۔“

بَابُ ذِكْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَالتَّقَرُّبِ إِلَى اللَّهِ

ذکر اللہ اور تقرب الی اللہ کا بیان

علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر فقط تسبیح و تہلیل و تکبیر میں منحصر نہیں بلکہ جو بھی اپنے اعمال و افعال میں اللہ کا فرمانبردار ہوگا وہ ذکر شمار ہوگا۔

اور سب سے بہتر اور افضل ذکر تلاوت قرآن ہے، تاہم جہاں قرآن کی تلاوت کا موقع نہ ہو جیسے رکوع و سجود کی حالت، پھر آگے جا کر فرماتے ہیں ہر ذکر جو شرعاً مشروع ہو یعنی اس کا حکم ہو وہ واجب ہو یا مستحب اس وقت تک معتبر نہیں جب تک اس کا اس طرح تلفظ نہ ہو کہ خود اس کو سن سکے اھ۔ اس سے ان کا مقصود فقہی حکم بیان کرنا ہے یعنی کہ اگر قراءت کی حالت میں اپنے دل میں پڑھا یا اس طور کہ خود اس کو نہ سن سکا یا رکوع، سجود کی حالت میں اسی طرح سے آہستہ پڑھا تو وہ فرض قراءت اور سنت تسبیح کو ادا کرنے والا نہ ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ ذکر قلبی پر اخروی اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا۔

چنانچہ ابو یعلیٰ نے حضرت عائشہؓ کی روایت کی تخریج کی ہے وہ فرماتی ہیں۔ ”کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس ذکر خفی کا اجر جسے حفظ فرشتے بھی نہ سن سکیں، وہ ستر گنا ہے، جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو حساب و کتاب کے لئے جمع کر لے گا اور حفظ فرشتے اپنے لکھے اور محفوظ کئے ہوئے کو حاضر کر لیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا دیکھو کیا تمہارے پاس اس کا کچھ مزید ہے وہ کہیں گے نہیں، جو کچھ ہم نے جانا اور معلوم کیا سب ہم نے لکھ کر محفوظ کر لیا ہے۔

اس پر اللہ کہے گا میرے پاس آپ کی ایک ایسی نیکی ہے جسے آپ بھی نہیں جانتے اور میں آپ کو اس کا بدلہ دوں گا اور وہ ذکر خفی ہے، امام سیوطیؒ نے (البدور المسافرة فی احوال الآخرة) میں ذکر کیا ہے (والتقرب الیہ) یعنی اللہ کا ذکر کر کے اللہ کے قریب ہونا یا نوافل کی ادائیگی سے اللہ سے قریب ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ یہ باب ان احادیث کے بیان میں ہے جو ان دونوں سے متعلق وارد ہیں۔

الفصل الاول:

۲۲۶۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَأَبِي سَعِيدٍ قَالَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَقَعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا أَحَقَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَعَشِيَّتُهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ. (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحہ ۲۰۷/۴ الحدیث رقم (۲۷۰۰ - ۳۹)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ اور ابو سعید خدریؓ دونوں روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب بھی کوئی جماعت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے بیٹھتی ہے تو ان کو وہ فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان کو رحمت اپنی آغوش میں لے لیتی

ہے اور ان پر سیکہ کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان ذکر کرنے والوں کا تذکرہ اپنے پاس والوں میں کرتا ہے۔“ (مسلم)
تشریح: قولہ: لا یقعہ قوم یدکرون اللہ: اگر اس مقام میں ”قعود“ سے مراد قیام کا ضد ہو تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ ذکر کی سب سے بہتر کیفیت یہی ہے کیونکہ اس ہیئت میں ظاہر و باطنی حواس مجتمع ہوتے ہیں، اور اگر یہ استمرار سے کنایہ ہو تو پھر اس میں مداومت ذکر کی طرف اشارہ ہوگا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ”قعود“ کے ساتھ تعبیر غالب اعتبار سے ہے۔ کیونکہ اصل مقصود اپنے نفس کو اللہ کے ذکر کا پابند بنا کر ذکرین کی صف میں شامل ہونا ہے تاکہ اپنی سانسوں کی برکات اور ذکر کے ساتھ مانوس ہونے کا پورا حصہ ان کو ملے۔ لہذا کسی اطاعت جیسے طواف نماز جنازہ، طلب علم، وعظ و نصیحت کا سننا وغیرہ کیلئے اٹھ کھڑے ہونا اس کے منافی نہیں۔

قولہ: الا حففتہم الملائکۃ..... الخ: یعنی انہیں وہ فرشتے جو گلیوں کو چوں میں گھومتے ہیں اور اہل ذکر کو تلاش کرتے ہیں۔ (وغشیتہم الرحمة) یعنی وہ رحمت الہی ان کی ڈھانک لیتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو بکثرت یاد کرنے والے مردوں اور عورتوں کیلئے خاص ہوتی ہے۔ (ونزلت علیہم السکینۃ) یعنی طمانیت اور وقار اور اس کی دلیل باری تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے: ﴿الا بذکر اللہ تطمنن

[الرد: ۲۸]

القلوب﴾ [الفتح: ۰۴] اسی طرح باری تعالیٰ کا قول: ﴿هو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایماناً﴾ [الفتح: ۰۴] (و ذکرہم اللہ) یعنی فخر و مباہات کے طور پر ان کے عمل کی تحسین کر کے اور ان کیلئے بڑے اجر کا وعدہ کر کے (فیمن عنده) یعنی مقرب فرشتے اور نبیوں اور رسولوں کے ارواح، عندیت سے مراد عندیہ رتبہ ہے عندیت مکان نہیں کیونکہ وہ مکان و زمان کے قیود سے منزہ اور نقص و حدود کے تمام امارات سے مبرا ہے۔

۲۲۶۲: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَسِيرُ فِي طَرِيقِ مَكَّةَ فَمَرَّ عَلَى جَبَلٍ يُقَالُ لَهُ جُمْدَانٌ فَقَالَ سِيرُوا هَذَا جُمْدَانٌ سَبَقَ الْمُفْرَدُونَ قَالُوا وَمَا الْمُفْرَدُونَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ الذَّاكِرُونَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتُ۔

اخرجه في صحيحه ۲۰۶۲/۴ الحديث رقم (۱۶۷۶/۴)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مکہ کے راستہ پر چلے جا رہے تھے کہ ایک پہاڑ کے پاس سے گزرے جس کا نام جمدان تھا آپ ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمایا ”چلے چلو یہ جمدان ہے مفردون سبقت لے گئے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مفردون کون ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”وہ مرد جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کریں اور وہ عورتیں جو اللہ کو بہت یاد کریں۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: کان رسول اللہ ﷺ یسیر فی طریق مکہ:

یعنی ظاہری طور پر مکہ کے راستہ میں تھے جبکہ باطنی پر سیر کے لحاظ سے رب کعبہ کی راہ میں تھے۔ یہ سفر مدینہ سے مکہ کی طرف تھا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے برعکس مکہ سے مدینہ کی طرف ہو۔

قولہ: فمرَّ علی جبل یقال له جمدان: یہ مدینہ سے ایک دن کے فاصلہ پر تھا۔

”جمدان“ ”جیم“ کے ضمہ اور ”میم“ کے سکون کے ساتھ ہے اور اس کے آخر میں نون ہے۔ یہ اپنے ٹھوس اور جامد ہونے کے باوجود حُجُن کے ذکر کا اعلان کر رہا ہے اور اہل معرفت میں سے جو اس پر گزرتا ہے اس سے خوش ہوتا ہے۔ جیسے کہ روایات میں وارد ہے کہ

ایک پہاڑ نام لے کر دوسرے پہاڑ کو پکارتا ہے اور کہتا ہے: ”ای فلان هل مرّ بک احد ذکر اللّٰه؟ فاذا قال: نعم استبشر۔ کہ اے فلان کیا آپ کے اوپر کسی ایسے شخص کا گزر ہوا ہے جو اللہ کو یاد کر رہا ہو؟ جب اس کا جواب ہاں میں ہو تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اور عوارف المعارف میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ما من صباح ولا رواج الا وبقاع الارض ینادی بعضها بعضا هل من بک الیوم احد صلّی علیک او ذکر اللّٰه علیک فمن قائله: نعم ومن قائله: لا، فاذا قالت: نعم علمت ان لها بذالك فضلا علیها“۔

قولہ: فقال: سیروا هذا جمندان: یعنی اچھی چال چلو جس میں اللہ کا ذکر اور دھیان ہو۔ شکر اور سرور ہو (هذا جمندان) یہ حرکت میں ہے اگرچہ تم اسے حیران شخص کی طرح ساکن خیال کر رہے ہو۔ حضرت جنید سے پوچھا گیا کہ آپ نے سماع کیوں چھوڑی؟ اس پر انہوں نے جواب میں فرمایا: کہ اللہ نے فرمایا: ﴿وتروی الجبال تحسبها﴾ [النمل: ۸۸] قولہ: سبق المفردون یہ ”را“ مکسورہ مشدودہ یا مخففہ کے ساتھ ہے۔ یعنی وہ لوگ جو دوسرے ہمسروں سے اپنے آپ کو یکتا بنائے اور تقرب الہی حاصل کر لیں، بلند درجات کی طرف ترقی کر کے اپنی حالت و ہیئت کو دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز بنا لیں۔ کیونکہ یہ اللہ کا ذکر کر کے غیر ذاکرین کے مقابلہ میں یگانہ ہیں۔

یا مراد یہ ہے کہ انہوں نے اکیلے اللہ کا ذکر کیا اس کے ماسوا کے ذکر کو ترک کر لیا اور یہی اس جگہ حقیقی تفرید ہے۔

قولہ: قالوا: وما الفردون؟ کہتے ہیں کہ سوال صفت کے بارے میں ہے یعنی تفرید یا افراد کے بارے میں، کیونکہ ”ما“ کے ذریعہ جس طرح کسی ”شے“ کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں سوال ہوتا ہے اسی طرح شے کے وصف کے بارے میں بھی سوال ہوتا ہے جیسے فرعون نے کہا تھا (وما رب العلمین) موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جواب میں فرمایا تھا۔ (رب السموات والارض) یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ نے (من ہم) نہیں فرمایا۔ بس آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ حقیقی قابل اعتبار تفرید تو یہ ہے کہ بندہ اکثر و بیشتر اوقات میں اپنے نفس کو اللہ کے ذکر کیلئے اکیلا اور ہلکا پھلکا کرے تو گویا کہ صحابہؓ نے یہ دریافت کیا کہ مفردین کی کیا صفت ہے تاکہ ہم ان کی اقتدا کر کے ان غایتوں کی طرف سبقت لے جائیں جن کی طرف وہ سبقت لے گئے ہیں۔ اور ہم بھی ان اسرار پر مطلع ہوں جن پر وہ مطلع ہو گئے ہیں۔

قولہ: الذاکرون اللّٰه کثیرا والذاکرات: کثیرا مفعول مطلق ہے تقدیری عبارت یہ ہے ”ذکرا کثیرا“ کہتے ہیں کہ کثرت سے کثرت حالات مراد ہیں۔ جیسے ایک اور حدیث شریف میں اس کی تفسیر اسی طرح وارد ہے۔ (والذاکرات) یہاں پر مفعول بہ لفظ ”اللّٰه“ کو سابق میں مذکور ہونے کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے یہ بھی ایک آیت کریم کا حصہ ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ ضمیر مفعول ہے اور ایسی ضمیر کا حذف عام اور شائع ہے۔

اس کا یہ قول یہ آیا کہ یہ کاحصہ ہے بالکل درست ہے۔ اور ذکر کثیر وہ کہلاتا ہے جو کسی بھی حال میں اللہ کو نہ بھولے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ کثرت الفاظ کے ساتھ ذکر کرتا ہے اور ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے خاص کر لیں۔

اسی کی یاد دوسروں سے کٹ اسی کے ہو کر رہیں دوستوں کو چھوڑے اور وطن کو ترک کریں تمام وسائل و اسباب سے کٹ کر اس کے دروازے سے چھٹیں۔ شہوات سے الگ تھلگ ہوں اور لذتوں کو ترک کریں ان کی لذت بس اس کی یاد ہے اور ان کی نعمت بس اس کا شکر ہے کیونکہ مقام تفرید تحقیق توحید کے بعد ان اشیاء کے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وتبسل الیہ تبتیلاً﴾ [المزمل: ۰۸] یعنی دوسروں سے بالکل الگ تھلگ ہو کر اسی کا ہو کر رہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”ما“ ”من“ کے معنی میں ہو لیکن زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ”ما“ اس جگہ غیر عقلا تغلیب کی وجہ سے ہے کیونکہ غیر عقلاء، عقلاء کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ تمام اشیاء کا ذکر تسبیح خداوندی اور اس کی معرفت و خوف کا اپنا اپنا حصہ ہے۔ جس کی وضاحت اپنے مقام پر کی گئی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ جب مدینہ کے قریب آئے اور اپنے وطنوں کے شوق میں ان میں سے ایک جماعت آگے بڑھی اس پر آنحضرت ﷺ نے پیچھے رہنے والے لوگوں سے فرمایا: چلے چلو وطن قریب آ پہنچا، یہ حمد ان پہاڑ ہے مفردون سبقت لے گئے عرب کہتے ہیں: فرد برأیہ وافر، و فرد، بمعنی انفراد بہ۔ یعنی انفرادی اور کہا جاتا ہے: ”فرد نفسہ“ جب وہ عبادت کیلئے سب سے کٹ جائے اور الگ ہو جائے اور رہا ان کے سوال کا آپ ﷺ کی طرف سے جواب تو وہ اسلوب حکیم کے طور پر ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنا یہ سوال ترک کرو کیونکہ یہ تو بالکل واضح ہے، اور جو بھلائیوں کی طرف سبقت لے گئے ہیں ان کے بارے میں سوال کرو وہ جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے ذکر کیلئے خالص کر لیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے ان کا تعاقب کیا اور فرمایا اس توجیہ کی بنیاد ایک امید اور ایک شک پر ہے جس کے وقوع و عدم وقوع کا علم نہیں۔ چنانچہ فرمایا: لعلمهم كانوا راجعين الى المدينة ولما قربوا اھ۔

یہ مسلم کی روایت ہے اور ترمذی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ جواب کے اندر یہ ہیں ”قال المستهترون“ ”دونوں تاؤں کے فتر کے ساتھ“ یعنی اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرنے والے اللہ کا ذکر ان پر سے ان کا بوجھ اتارتا ہے تو وہ قیامت کے روز ہلکے ہلکے ہو کر آئیں گے۔

۲۲۶۳: وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۰۸/۱۱ الحدیث رقم ۶۴۰۷۔ و مسلم فی ۵۳۹/۱ الحدیث رقم (۲۱۱-۷۷۹)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو موسیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص اپنے پروردگار کو یاد کرتا ہے اور جو شخص اپنے پروردگار کو یاد نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ شخص اور مردہ شخص کی سی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: مثل الذی..... مثل الحی والمیت: اس میں لف نشر مرتب ہے۔

(لا یذکرہ) یعنی اپنے رب کو خواہ اس کے غیر کا ذکر کرتا ہے یا نہیں۔ پس جو زندہ ہوتا ہے اس کا ظاہر نور حیا اور نمشا کے مطابق تصرف تام کرنے سے زندہ ہوتا ہے اور اس کا باطن علم و ادراک کی کوسے، یوں ہی ذکر کرنے والے کا ظاہر نور طاعت اور باطن معرفت کی روشنی سے مزین ہوتا ہے جبکہ غیر ذکر کا ظاہر بے کار اور باطن بے حقیقت ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تشبیہ میں وجہ شہدہ وقتی کرنے والے کو نفع دینے اور دشمنی کرنے والے کو ضرر دینا ہے لیکن یہ میت میں جاری نہیں ہو سکتا یہ کہنا بھی خارج از امکان نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسی ذات کا ذکر جو ابدی زندہ ہے جس پر موت نہیں آتی وہ ذکر کیلئے حیات ابدی کا ضامن ہے جس پر کبھی فنا نہیں آئے گی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے اولیاء مرتے نہیں بلکہ ایک جہاں سے دوسرے جہاں میں منتقل ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

جبکہ مسلم کے الفاظ یہ ہیں: ”البیت الذی یذکر اللہ فیہ والبیت الذی لا یذکر اللہ فیہ مثل الحی والمیت“ اس کی معنوی تقریر یوں ہوگی۔

مثل بیٹی الحیٰ و المیت، یا پھر ”بیت“ سے مراد دل ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کا بیت ہے پس وہ شخص لائق تحسین و بشارت ہے جس نے اس کو زندہ اور آباد رکھا۔ اور تأسف ہے ایسے نالائق پر جس نے اس کو اجاڑا اور برباد کیا۔

۲۲۶۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى لِي أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَأْ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَأْ خَيْرٍ مِنْهُمْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۸۴/۱۳ الحدیث رقم ۷۴۰۵ و مسلم فی ۲۰۶۱/۴ الحدیث رقم (۲- ۲۶۷۵)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے جب وہ دل سے یا زبان سے مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں پس اگر وہ اپنی ذات میں یعنی خفیہ طور پر اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنی ذات میں یاد کرتا ہوں یعنی نہ کہ اس کو صرف پوشیدہ طور پر ثواب دیتا ہوں بلکہ اس کو از خود ثواب دیتا ہوں ثواب دینے کا کام کسی اور کے سپرد نہیں کرتا اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: انا عند ظن عبدی بی: ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے: ”ان ظن خیرا وان ظن شرا“ اور ایک روایت میں ہے ”فلیظن بی ما شاء“

اور ایک اور روایت میں ہے: ”فلا یظن بی الا خیراً“ مطلب یہ ہے کہ میرا مقابلہ بندے کے ساتھ اس کے میرے بارے میں یقین کے مطابق ہے، میری مہربانی پر اعتماد کرنے میرے وعدے پر بھروسہ کرنے، میری وعیدوں سے ڈرنے اور جو انعامات میرے پاس ہیں ان کے اندر رغبت کرنے میں، جو وہ مجھ سے مانگتا ہے میں اسے عطا کرتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار کو سنتا ہوں۔

امام طیبی فرماتے ہیں: ”ظن“ شک اور یقین کے درمیان کی کیفیت کا نام ہے۔ لہذا جب اس کے اندر علامات قوی ہوں تو یہ معنی یقین کے ہوتا ہے جب علامات ضعیف ہوں تو یہ معنی شک کے ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ کے اس قول: ﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبَّهُمْ﴾ [البقرة: ۴۶] میں یہ معنی اول یعنی یقین پر محمول ہے جب کہ باری تعالیٰ کے قول: ﴿وَضُنُّوا أَنَّهُمُ الْبَاطِلُ لَا يَرْجِعُونَ﴾ [الفصص: ۳۹] میں ”ظن“ معنی ثانی یعنی شک پر محمول ہے۔

اور مذکورہ حدیث میں یہ بھی جائز ہے کہ ”ظن“ کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے اور مطلب یہ ہو کہ میں اس کے ساتھ اس کے میرے بارے میں ”ظن“ کے مطابق معاملہ کروں گا اور جو مجھ سے توقع کرے گا اچھے یا برے سلوک کا تو اس کے ساتھ اسی طرح سے پیش آؤں گا۔ اور اس سے مقصود اس بات پر برآہنجت کرنا ہو کہ خوف پر امید کو غالب رکھا جائے اور اللہ کریم سے متعلق گمان اچھا رکھا جائے۔

چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ”لا یموتن احدکم الا وهو یحسن الظن باللہ“ یعنی تم میں سے کوئی نہ مرے مگر یہ کہ وہ اللہ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو۔ اور یہ جائز ہے کہ ”ظن“ سے مراد یقین ہو اور مطلب یہ ہو کہ میں اپنے بارے میں بندے کے یقین کے مطابق پیش آتا ہوں کہ اس کا پلٹنا میری طرف ہے اس کا حساب و کتاب میرے ذمہ ہے اور یہ کہ جو اس کے خیر و شر کے متعلق میری قضا ہے اس کو کوئی نالنے والا نہیں جو میں روکوں وہ کوئی عطا نہیں کر سکتا، اور جو میں عطا کروں اس کا کوئی روکنے والا نہیں۔ یعنی جب بندہ مقام توحید میں راسخ ہو جائے ایمان اور اللہ کریم پر بھروسہ کرنے میں مستحکم ہو جائے تو اسے قرب الہی نصیب ہوتا ہے اور درمیان کے پردے

اٹھ جاتے ہیں اب جب وہ اسے بلاتا ہے تو وہ اس کی پکار سنتا ہے اور جب وہ اس سے کچھ مانگتا ہے تو وہ اس کو عطا کرتا ہے۔ جیسے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول حدیث قدسی میں ہے: ”اذا علم عبدی ان له رباً یغفر الذنب ویأخذ به غفرت له“۔ جب بندہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہوں کو معاف کرتا ہے اور ان پر مواخذہ کرتا ہے تو میں اس کے گناہوں کو معاف کر لیتا ہوں۔

ابو طالب مکی فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ قسم اٹھا کے کہتے تھے کہ کوئی بندہ ایسا نہیں جو اپنا گمان اللہ کے بارے میں اچھا کر لے اور اللہ اسے عطا نہ کرے کیونکہ بھلائی سب کے سب اسی کریم ذات کے دست قدرت میں ہے، پس جب اس نے اپنے بارے میں حسن ظن کی دولت اس کو عطا کر دی تو جو یہ گمان رکھے اس کریم ذات کے بارے میں وہ اس کو عطا کرے گا۔ کیونکہ جس ذات نے اپنے بارے میں اس کے گمان کو اچھا کیا ہے وہی اس کے گمان کے تحقق کا ارادہ کرتا ہے۔

حضرت ابن عطاء فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے اچھے اوصاف کی وجہ سے آپ حسن ظن نہیں رکھتے تو اس کے اپنے ساتھ معاملہ کی وجہ سے حسن ظن رکھ، اس نے آپ کو خوبی کا عادی بنایا اور اس نے تیرے ساتھ احسان ہی کا سلوک کیا۔

شارح حکم بن عبد فرماتے ہیں، کہ اللہ کے بارے میں ”حسن ظن“ دنیوی و اخروی دونوں امور میں مطلوب ہے، دنیا کے معاملہ میں تو اس طرح کہ وہ یہ بھروسہ رکھے کہ اللہ بغیر مشقت کے یا ہلکے پھلکے مشقت کے ساتھ جس کی اجازت ہے، اور وہ باعث اجر بھی ہے اگر وہ فرض یا نفل میں سے کسی کی توفیق کا باعث نہیں منافع اور سہولیات بہم پہنچاتا ہے، تو یہ احساس کے اس اطمینان قلبی اور جسمانی راحت کا باعث ہوگا، تو اب اسے کسی چیز کا طلب مشتعل نہیں کرے گا، اور نہ ہی وہ کسی سبب سے گھبرائے گا یا پریشان ہوگا اور آخرت کے معاملہ میں یوں کہ وہ اپنے اعمال صالحہ کی قبولیت کی قوی آس لگائے رکھے اور دارالجزا میں ان پر پورا اجر ملنے کا پوری امید رکھے یہ احساس اللہ کے اوامر کی تعمیل پر اسے اس کے گوار نیک اعمال کی تکثیر پر بھی اسے ایک گونہ مٹھاس رُشک اور لذت و نشاط کا احساس ہوگا۔

اور اللہ کے بارے میں حسن ظن کے مواقع میں سے ایک موقع یہ ہے کہ انسان نختیوں، مشقتوں اور اہل و مال میں آفتوں کے نزول کے وقت میں اس شخص کے وہم کو نہ چھوڑے تاکہ اس مرہم کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ جزع فزع اور ناگوار صورتحال سے دوچار نہ ہو۔ حضرت ابن عطاء فرماتے ہیں کہ اللہ کی قضا سے لطف و کرم کے انفکاک کا مدعی ہے تو یہ اس کا قصور نہیں ہے۔

میں نے اس سلسلہ میں تفصیل سے کلام اس لئے کیا ہے کہ اکثر لوگ غرور و حسن ظن کو خلط کر کے دونوں میں تمیز نہیں کرتے۔ قولہ: وانا معہ اذا ذکرنی: یعنی توفیق، حفاظت اور مدد کے ساتھ، یا یہ کہ میں اس کی بات کو سنتا ہوں، یا یہ کہ اس کی حالت کو جانتا ہوں اس کی گفتگو میں سے کچھ بھی میرے پر پوشیدہ نہیں۔ (اذا ذکرنی) یعنی اپنی زبان یا دل سے قولہ: فان ذکرنی فی نفسہ ذکرته فی نفسہ:

یہ سابق پر تفریح ہے اور اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ اللہ ذکر کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ اپنے دل میں یاد کرے یا غیر کے سامنے۔ (فی نفسہ) یعنی پوشیدہ طور پر یا اخلاص کے ساتھ (ذکرته فی نفسہ) یعنی میں اس کے اجر و ثواب کو اس کے طرز عمل کی طرح پر مخنی رکھ لیتا ہوں اور اس کا اجر میں بذات خود دوں گا کسی اور پر نہیں چھوڑوں گا۔

قولہ: وان ذکرنی فی ملاء..... خیر منہم: یعنی مؤمنین کے جماعت کے ساتھ یا ان کی موجودگی میں (ذکرته) یعنی تحسین کے الفاظ کے ساتھ، عظیم اجر عطا کر کے، حسن قبول کے ساتھ اور آمد کی توفیق کے ساتھ۔

بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد بندے کو اس کے فعل سے زیادہ اچھا بدلہ عطا کرنا اور اس کے لائے ہوئے عمل سے افضل و برتر اجدینا ہے۔

(فی ملا خیر منہم) یعنی ذاکرین کی جماعت سے یہ برتری اس لحاظ سے ہے کہ وہ جماعت معصوم ہے معاصی کے ارتکاب سے معصوم ہے طاعت و امتثال اور میں شدید قوی ہے الوہیت کے اسرار و رموز پر کامل اطلاع رکھتے ہیں، انوار ملکوتی کا مشاہدہ کرتی ہے۔
حسن کے الفاظ میں ”منہم“ کے بجائے ”منہ“ مفرد لفظ کے ساتھ ہے۔ اس میں ”ملا“ کے لفظ کا لحاظ ہے۔

علامہ میرک حصن کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ اصل سماع میں اسی طرح ہے اور حسن کے تمام موجودہ نسخوں میں بھی یوں ہے یعنی بصیغہ مفرد لیکن اصول یعنی بخاری، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ میں ”منہم“ بصیغہ جمع وارد ہے۔
امام طیبی فرماتے ہیں کہ برتر جماعت سے مقرب فرشتے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ارواح مراد ہیں، پس اس میں فرشتوں کے بشر سے افضل ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا انسان فرشتوں سے افضل ہیں کہ نہیں، ہر قول کے مرتحسین موجود ہیں کہتے ہیں کہ مختار مذہب یہ ہے کہ خواص بشر جیسے انبیاء کرام خواص ملائکہ جیسے جبرئیل امین وغیرہ سے افضل ہیں۔

رہے عوام بشر تو وہ ہرگز فرشتوں سے افضل نہیں لہذا آپ ﷺ کے قول شریف ”فی ملا خیر منہم“ میں برتری کی حالت ہے کیونکہ فرشتوں کی حالت طاعت و کوشش پیہم میں انسان کی حالت سے برتر و افضل ہے۔ چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد گرامی ہے: ﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ﴾ [التحریم: ۴۶]

اور مومنین کی حالتیں طاعت و معصیت میں اور کوشش و کابلی میں یکساں نہیں اور امام طیبی کی مراد یہ ہے کہ جنس بشر جنس ملک سے افضل ہے اور مشہور تفصیل اس کے منافی نہیں۔

اور رہا حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ وہ جماعت جو اس وصف کے ساتھ موصوف ہے کہ وہ بشر سے افضل ہے، وہ مقرب فرشتوں کی جماعت ہے وہ جن کے بارے میں یہ بات محقق ہے کہ وہ عوام بشر سے افضل ہیں۔

اس وقت یہ حدیث اس تفصیل کے منافی نہیں جو اہل سنت کے ہاں اصح ہے اور اس سے شارح کے قول کا مسترد ہونا معلوم ہو رہا ہے۔ یہ (حافظ کا) قول مردود ہے کیونکہ بشر کی وہ جماعت جو ذکر کرے ممکن ہے کہ اس میں کوئی نبی ہو تو پھر امام طیبی والی تاویل کام آئے گی۔ یا پھر برتری کو سستی امر پر یا استغراق پر یا غلبہ پر محمول کرنا لازم آئے گا۔

بزاز نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مرفوع روایت ذکر کی ہے جس میں ہے: (قال: قال تبارک وتعالیٰ: یا ابن آدم اذا ذکر تنی خالیا ذکر تک خالیا واذا ذکر تنی فی ملا ذکر تک فی ملا خیر من الذین تذکرنی فیہم) یعنی اے انسان جب تو مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی تجھے ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اس جماعت سے افضل ہے جس میں تو مجھے یاد کرتا ہے۔

۲۲۶۵: وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَأَزِيدُ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَحَزَاءٌ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا أَوْ أَغْفَرُ وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شَبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا وَمَنْ أَتَانِي بِمِشْيِ أَتَيْتُهُ هَرُولَةً وَمَنْ لَقِينِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ حَطِيبَةً لَا يُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَقَيْتُهُ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً - (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۹۵/۱۳ حدیث رقم ۷۴۰۵ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۶۸/۴ حدیث رقم (۲۲- ۲۶۸۷)۔

والترمذی فی السنن ۲۰۸/۵ حدیث رقم ۳۶۰۸۔ وابن ماجہ ۱۲۵۵/۲ حدیث رقم ۳۸۲۱ واحمد فی المسند ۱۶۹/۵۔
ترجمہ: ”اور حضرت ابو ذرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو اس جیسی دس نیکیوں کے برابر ثواب ملتا ہے اور اس سے زیادہ بھی دیتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اس کو اس سے صدق و اخلاص کے مطابق سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب دیتا ہوں جو شخص کوئی برائی کرتا ہے تو اس کی اسی برائی کے برابر سزا ملتی ہے یا میں اسے بھی معاف کر دیتا ہوں جو شخص اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعے ایک باشت میری طرف آتا ہے تو میں ایک گز اس کی طرف آتا ہوں یعنی میں اس کی توجہ و التفات سے کہیں زیادہ اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھولتا ہوں جو شخص میری طرف اپنی چال سے آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں اور جو شخص زمین کے برابر برابر بڑھتا ہوں جو شخص میری طرف اپنی چال سے آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں اور جو شخص زمین کے برابر بھی گناہ لے کر مجھ سے ملے گا بشرطیکہ اس نے میرے ساتھ شریک نہ کیا ہو یعنی شرک میں مبتلا نہ ہو تو اگر میں چاہوں گا تو اس کو زمین کے برابر ہی مغفرت عطا کروں گا۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: من جاء بالحسنة فله عشر امثالها وازيد: جسے لغو ہونے سے بچائے رکھے اسی وجہ سے ”من فعل

الحسنة“ نہیں فرمایا اور یہ حسنہ وہی ہے جو: ﴿من جاء بالحسنة فله عشر امثالها﴾ [الانعام: ۱۶۰] میں مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی ایک نیکی لے کے آگئے، (فلہ عشر امثالها) یعنی اس طرح کے دس نیکیوں کا ثواب، میسر جو موصوف تھا اس کو حذف کیا گیا اور صفت کو اس کا قائم مقام بنایا گیا۔ حاصل یہ ہے کہ اس کو دس بدلے ملیں گے ان میں سے ہر ایک کیفیت میں اس نیکی کے مثل ہوگا۔ وعدہ کے مطابق یہ حرم کے علاوہ میں تضعیف کا کم از کم مقدار ہے اس لئے فرمایا (وازيد) یعنی اہل سعادت میں سے جس لئے چاہو دس گنا سے بڑھا کر سات سو گنا یا ایک لاکھ گنا یا اس سے زائد تک بڑھا دوں۔

قولہ: ومن جاء بالسینة..... او اغفر:

یعنی ایسی برائی جس کا کفارہ نہ ہو۔ یہ وہی سینہ ہے جو باری تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿فجزاء سینة مثله﴾ بقاضائے عدل۔ (او اغفر) بمقتضائے فضل واحسان۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ جزاء کا ذکر ثانی یعنی سینہ کے ساتھ خاص کر لیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو صلہ نیکی کے عوض میں دیا جاتا ہے وہ سراسر فضل و اکرام ہی ہوتا ہے اور جو سینہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے وہ عدل و قصاص ہوتا ہے لہذا یہ ثواب کی طرح مقصود بالذات نہیں ہوتا اس لئے اس کو جزاء کے ساتھ خاص کیا گیا۔

اور ربی ”سینہ“ کو دوبارہ نکرہ لانے کی حکمت سو وہ یہ ہے کہ: ”السینة“ معرفہ میں جو وحدت کا معنی بہم طور پر پایا جاتا ہے اس کی تنصیص اور تقریر ہو جائے۔ اور ”وازيد“ میں ”واو“ مطلق جمع کیلئے ہے اگر زیادت سے مراد اللہ کریم کا دیدار ہو۔ جیسے کہ باری تعالیٰ کا فرمان اقدس ہے: ﴿للذین احسنوا الحسنیٰ و زیادۃ﴾ [یونس: ۲۶] اور اگر زیادہ سے مراد اضعاف ہوں تو پھر ”واو“ بمعنی اس ”واو“ کے جو توبیح کا فائدہ دے۔ جیسے کہ ”او اغفر“ میں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کی بات زیادہ واضح ہے کہ دس گنا اور اس سے زائد کا اجتماع ممکن ہے، جبکہ برائی کا بدلہ اور مغفرت دونوں جمع نہیں ہو سکتے لہذا ”او“ جو احد الامرین کے وقوع پر دلالت کیلئے ہے کالا نا ضروری تھا۔

قولہ: ومن تقرب منی شبرا تقربت منه ذراعاً: (تقرب ہونا چاہا) (منی) اطاعت کے ساتھ (شبرا) یعنی کچھ تھوڑا سا

- امام طیبی فرماتے ہیں مذکورہ حدیث میں شبرا، ذراعاً اور باعاً کے الفاظ شرط و جزاء دونوں میں منسوب ہیں۔ کیونکہ یہ ظرف ہیں۔ یعنی جو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے۔

(تقرب) یعنی رحمت کو قریب کرتا ہوں۔ (منہ ذراعاً) بعض کہتے ہیں کہ میں اس کے تقرب سے زیادہ اس تک اپنی رحمت پہنچاتا ہوں، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ جو نیکی لے کر قریب آتا ہے میں اس سے کئی گنا بڑھا کر بدلہ عطا کرتا ہوں۔ رہا جزاء و ثواب کو تقرب کا نام دینا سو یہ مشاکلہ و مقابلہ کے قبیل سے ہے اور یا اس لئے کہ ثواب تقرب کا سبب ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ کے تقرب سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہدایت نصیب کرے اور اللہ کی طرف قریب ہونے کیلئے اس کے سینے کو کھول دے اور مطلب یہ ہوا کہ جب بندہ قرب کا قصد و عمل کرتا ہے تو اللہ اس سلسلہ میں اس کی اعانت کرتا ہے۔ اور وہ اس کیلئے اسے آسان بنالیتا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں یہ حدیث احادیث صفات متشابہ میں سے ہے اس کو اس کے ظاہر پر محمول کرنا ممکن نہیں تو اب مطلب یہ ہوا کہ جو طاعت کر کے میرے قریب ہوتا ہے تو میں رحمت کے ساتھ اس کے قریب ہوں گا۔

قولہ: ومن تقرب منی ذراعاً تقربت منہ باعاً: باع دو ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر مقدار تو کہتے ہیں اس نسبت سے جب بندہ کے تقرب کا مقدار بڑھے گا تو اللہ کریم کی طرف سے رحمت بڑھے گی۔

لہذا ذراع وغیرہ کا تذکرہ بندہ کے تقرب کے صلہ میں اللہ کے لطف و کرم کے تصعیف مجازات کے سلسلہ میں محض تمثیلی و تصویری ہے۔ قولہ: ومن اتاننی یمشی اتیتہ هرولة؛ لگہ جملہ (یمشی) حال ہے۔ مراد ہے میری اطاعت میں چلتا ہے۔ (اتیتہ هرولة) ”هرولة“ دوڑنے سے کم تیز چلنے کو کہتے ہیں اور مراد ہے میں اس پر اپنی رحمت بہالیتا ہوں۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو معمول کے چال چل کر میری طرف بڑھتا ہے میری رحمت لپک کر اس کی طرف بڑھتی ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”هرولة“ مصدر بمعنی مفعول حال ہے یا مفعول مطلق ہے کیونکہ ”هرولة“ ”اتیان“ کی ایک نوع ہے تو یہ ترکیب ”رجعت القہقری“ کی مانند ہے لیکن اس کو حال پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ اس کا مقابل ”یمشی“ حال ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ سابق میں دس گنا عطا کرنے کے وعدہ کیلئے بمنزلہ تشریح کے ہے۔

اور نیکی کے مقابلہ میں بندوں کیلئے اجر کی تضعیف کے وعدہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم کی وسعت اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہے۔ جس کا کوئی ہمصر نہیں۔ یہ میں کہتا ہوں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کا قول (اغفر) اللہ کی مغفرت کی وسعت پر دال ہے۔

قولہ: ومن لقیننی بقرب الارض: یہ قاف کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے یہ قرب سے ماخوذ ہے جو مثل کے معنی میں ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے صغیرہ و کبیرہ گناہوں کی اتنی مقدار جو قریب قریب زمین کو بھر دے۔

(خطینۃ) یہ تمیز ہے (لا یشرک بی) یہ لقینی کے ضمیر فاعل جو ”من“ کی طرف راجح سے حال ہے (شیناً) یہ مفعول مطلق ہے یا مفعول بہ ہے، یہ مفہوم اس قرآنی آیت سے ماخوذ ہے: ﴿ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ.....﴾ [النساء: ۴۸] [لقیتہ بمثلہ مغفراً۔ اگر میں یہ چاہوں اس کیلئے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿و یغفر ما دون ذلك لمن یشاء﴾ [النساء: ۴۸] لیکن حدیث میں (اس شرط کے) حذف کا نکتہ یہ ہے کہ یہ شرط اس کا مذکورہ آیت سے معلوم ہو رہا ہے، اور امید کی وسعت میں مبالغہ پر دلالت کیلئے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث کا مقصد گناہوں کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہونے والی مایوسی کو ختم کرنا ہے۔ لہذا یہ مناسب نہیں کہ اس کی وجہ سے دھوکہ میں مبتلا ہو جایا جائے اور کثرت سے گناہ کرتا رہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ وہ جسے چاہتا ہے بخشا ہے جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کن میں سے ہے۔ اھ۔ یعنی وہ جسے چاہتا ہے بڑے گناہ پر معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چھوٹے گناہ پر سزا دے دیتا ہے یا وہ جس کے چاہے بہت سارے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور جسے چاہے چھوٹے گناہ پر عذاب دے دیتا ہے یہ حدیث آخری حصہ کا مقصد ہے۔

اور حدیث کے ابتدائی حصہ سے مقصود عبادت و طاعت میں مجاہدہ کی ترغیب ہے۔ اور اس پر برا بیچتہ کرنے کا درس ہے، سستی اور کاہلی کو ختم کرنے کی غرض سے یہ حدیث سالکین کے دلوں کیلئے ایک مفید معجون مرکب ہے اور طالبین کے اشتیاق میں تحریک پیدا کرنے والا نیز گناہگاروں کے سینوں کیلئے قوت بخش غذا ہے۔

اور جان رکھو! کہ احادیث میں اس قدر امید افزا حدیثیں کم ہی ہیں چنانچہ یہاں فقط عدم اشراک پر ”لقیتہ بمثلہا مغفرة“ کو مرتب کر دیا گیا ہے اور اعمال صالحہ کا تذکرہ سرے سے نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بات کسی کو زیب نہیں دیتی کہ وہ اس سے دھوکہ میں پڑے اور کہے کہ جب معاملہ یہ ہے تو گناہ بکثرت کرو۔ تاکہ اللہ کی مغفرت زیادہ سے زیادہ ہو جائے اور اللہ کا یہ فرمان تو فقط اس مقصد کیلئے ہے کہ گناہ گار اللہ کی مغفرت و رحمت سے مایوس نہ ہو جائیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے پاس مغفرت و عقوبت دونوں ہیں لیکن اس کی رحمت و مغفرت غالب ہے۔ لیکن کسی بھی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ وہ مغفورین کی فہرست میں شامل ہے یا معذبین کی فہرست میں کہ باری تعالیٰ کا یہ فرمان ﴿فریق فی الجنة و فریق فی النار﴾ [الشوری: ۷، ۱۰] مبہم ہے۔ لہذا اب یہی مناسب ہے وہ خوف و امید کے درمیان رہے۔ کیونکہ جو بات متواتر المعنی احادیث سے ثابت ہے اور وہ بدیہی طور پر معلوم ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کے مؤحدین کی ایک جماعت کا آگ میں جانا پھر اس سے نکلنا ضروری ہے اس کے ساتھ ساتھ ایمان پر خاتمہ کا اعتبار ہے اور یہ بات مبہم ہے۔

رواہ مسلم: قال ابن حجر، كما في النسخة المعتمدة واغتر شارح بنسخة سقيمة وجدها مخالفة

لذلك فاعترض بسببها على المصابيح بما ليس في محلها۔ ولم يعرف الشارح ولا وجه للاعتراض فهو تجهيل مجهول عند اهل العلم غير مقبول، اذ ليس تحته محصول۔

۲۲۶: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنَهُ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِي لِأَعْطِيَنَّهُ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَا أُعِيدَنَّهُ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدَّدْتُ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَ تَهْ وَلَا بَدْلَ لَهُ مِنْهُ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۱/ج ۳ الحدیث رقم ۶۵۰۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میرے ولی کو ایذا پہنچاتا ہے تو میں اس کے ساتھ اپنی لڑائی کا اعلان کرتا ہوں اور میرا کوئی بندہ مؤمن میرا تقرب ایسی چیز کے ذریعہ حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ہو جیسے ادائیگی فریضہ کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا ہے ہمیشہ نوافل

کے ذریعہ یعنی ان اطاعات و عبادات کے ذریعہ جو فرائض کے علاوہ اور فرائض سے زائد ہیں میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا دوست بنا لیتا ہوں اور جب میں اسے اپنا دوست بنا لیتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ وہ اس کے ذریعہ سنتا ہے میں اس کی بینائی بن جاتا ہوں وہ اسی کے ذریعہ دیکھتا ہے میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ پکڑتا ہے میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ چلتا ہے اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور وہ برائیوں اور کمروہات سے میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں اور میں اس طرح تردد نہیں کرتا جس طرح کہ میں بندہ مؤمن کی جان قیض کرنے میں تردد کرتا ہوں کیونکہ وہ موت کو پسند نہیں کرتا حالانکہ اس کی ناپسندیدگی کو میں ناپسند کرتا ہوں اور موت سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔“

تشریح: قولہ: من عادی لی ولیا: یعنی میرے اولیاء میں کسی کو ولی ”فعلیل“ کے وزن پر بمعنی مفعول ہے اور یہ ولی ہوتا ہے جس کی ذمہ داری اللہ لے لیتا ہے اور ایک لمحہ کو بھی اسے اس کے نفس کے حوالہ نہیں کرتا چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد گرامی ہے: ﴿وہو یتولی الصالحین﴾ [الاعراف: ۱۹۶] اور یا یہ فعلیل برائے مبالغہ فاعل ہے اور معنی ہے ایسا شخص جو لگاتار بغیر محصیت کے اللہ کے اطاعت میں لگا رہے۔

اول کو مراد اور مجذوب سا لک کا نام دیا جاتا ہے، جبکہ موخر الذکر کو مرید اور سالک مجذوب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ مذکورہ دونوں میں سے کون سا افضل ہے، تو واقعی اور حقیقی بات یہ ہے کہ ہر مرید مراد اور ہر مراد مرید ہوتا ہے۔ البتہ ابتداء، انتہاء اور اہتمام اور عایت کے اعتبار سے دونوں میں قدرے تفاوت ہے۔

قولہ: فقد آذنتہ بالحرب: یہ باب افعال سے ہے بمعنی ”اعلمتہ“ (بالحرب) یعنی میری طرف سے اس کے ساتھ جنگ کا میرے ولی کی وجہ سے یا اس کی طرف سے میرے ساتھ جنگ ہے گویا کہ وہ میرے مقابلہ میں لڑنے والا ہے۔ ائمہ فرماتے ہیں کہ معاصی میں یہ اور سود کو چھوڑ کر باقی کوئی ایسی محصیت نہیں جس کے ارتکاب کرنے والوں کو اللہ کے ساتھ تحارب کی وعید دی گئی ہو چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد پاک ہے: ﴿فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ﴾ [البقرہ: ۲۷۹] اور یہ وعید ان دو گناہوں کے زیادہ خطرناک ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اللہ کے بندے کی مخالفت کا مطلب یہی ہے کہ انجام برا ہوگا اس لئے اللہ جس کا مخالف ہو جائے وہ کبھی بھی فلاح نہیں پاسکتا۔

قولہ: وما تقرب الی عبدی..... مما افترضت: یعنی مؤمن بندہ، وصف عبدیت کی ترجیح اس وجہ سے ہے کہ عبدیت کی شان یہ ہے کہ عباد اپنے آقا کی طرف طرح طرح کی خدمت و طاعت کے ذریعہ تقرب حاصل کرتا رہتا ہے۔

(بشیء) کوئی بھی عمل کر کے (احب الی مما افترضت) یعنی جو کچھ میں نے لازم قرار دیا اس کو ادا کر کے۔ (علیہ) یعنی ادا کر کے تعمیل کرنا اور ذواجر سے اجتناب و پرہیز کرنا اور ”احب“ کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ قرب کے بہت وسائل و ذرائع ہیں لیکن ان سب میں افضل فرائض کی ادائیگی ہے۔ تو اس قرب کے رسائل میں نوافل وغیرہ مندرج ہوں گے۔ اس لئے آگے فرمایا (قولہ: وما یزال عبدی..... حتی أحبہ) جو فرائض کے قرب سے مالا مال ہو۔ (یتقرب) یعنی وہ مزید قرب طلب کر رہا ہوتا ہے۔

(اتی بالنوافل) یعنی فرائض وہ واجبات سے زائد طاعات کے قرب کے ساتھ۔ (حتی أحببتہ) اور ایک نسخہ میں ”حتی أحبہ“ کے الفاظ ہیں اور یہاں محبت سے مراد کامل محبت ہے جو فرائض و نوافل کو جمع کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے یہ تفصیل اس کے برخلاف ہے۔ جو امام طبری کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے وہ یہ کہ ”ما یزال“ میں اس بات کا بیان ہے: کہ مفضل علیہ یعنی نوافل کا جب حال

ہے تو مفضل یعنی فرائض کا پھر کیا کہنا!

قولہ: فاذا احببته..... التی یمشی بہا: (فکنت سمعہ) اور ایک صحیح نسخہ میں ہے: (فاذا احببته کنت سمعہ) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: کہ مشہور آخذ کے اندر ”حتی احببته فکنت سمعہ“ کے الفاظ ہیں۔ یہ باب افعال سے ہے۔ ”طا“ کے کسرہ کے ساتھ بمعنی پکڑنے کے۔ (بہا ورجلہ التی یمشی بہا)۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ: (اس کا مطلب یہ ہے کہ) ان آلات کی طرف منسوب کاموں کو اس کیلئے سہل بنا دیتا ہوں اور میں اسے اس طرح توفیق بخشا ہوں کہ گویا کہ میں ہی یہ آلات ہوں۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ: (اس کا مطلب یہ ہے کہ) اللہ اس کے حواس اور آلات کو اپنی رضا کے وسائل و ذرائع بنا دیتا ہے پس وہ وہی سنتا ہے جس کو اللہ پسند کرتا ہو اور اس سے خوش ہوتا ہو لہذا یہ ایسا ہو گیا جیسے (واللہ اعلم) اللہ ہی اس کے سننے کا آلہ ہے۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ (اس کا مطلب یہ ہے کہ) اللہ اپنی محبت اس پر غالب کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ نہیں سنتا اور دیکھتا مگر وہی جو اللہ پسند کرتا ہو اور وہ نہیں کرتا مگر وہی جو اللہ کو پسند ہو۔

اور ان امور میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کا مؤید معاون اور وکیل ہوتا ہے۔ وہ اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کو ان تمام کاموں سے محفوظ رکھتا ہوں جو میری ناراضگی کا باعث بنے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ (اس کا مطلب یہ ہے کہ) کہ میں اس کی حاجت روائی میں اس کے کانوں کے سننے، آنکھوں کے دیکھنے، ہاتھوں کے چھونے اور پاؤں کے چلنے سے زیادہ غفلت کرتا ہوں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ: جب فرائض کے ادا ہونے کے ذریعے قرب حاصل کرتا ہے اور نوافل وغیرہ جو فرائض کے مکملات ہی میں سے اس کے قرب میں ترقی کرتا ہے۔ من جملہ ان میں سے ذکر پر مداومت ہے وہ وصول کے مشاہدہ اور حصول کے خوشیوں اور مسرتوں کا سبب ہے اور فرائض اور بقا برہہ کا مقام ہے۔ تو اس کیلئے اللہ کے ازلی محبت کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور اس کے ابدی قرب کے انوار اس پر منکشف ہونے لگتے ہیں اور پھر اسے یہ حقیقت دکھائی دیتی کہ سننے، دیکھنے کی قوت اور دیگر تمام قوتیں دراصل اللہ کے دیکھنے، سننے اور دیگر قوتوں کا پر تو ہے، اور رہی اپنی ذات تویح ہے پس وہ جہاں میں اللہ کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ وہ جو سنتا ہے، جو دیکھتا ہے، جو پکڑتا ہے جو چلتا ہے تو اس احساس اور دھیان کے ساتھ کہ ان سب کا ایجاد کنندہ اور قدرت دینے والا بس وہی (اللہ) ہے۔ پس وہ میرے ان تمام انعامات کا جو اس پر ہوئی ہوتی ہیں کو بس اسی طرف پھیرتا ہے جس کے لیے ان کو پیدا کیا گیا ہے یعنی اللہ کی اطاعت کی طرف۔

پس وہ اپنے کان اور دیگر حواس کو بس میری رضا جوئی اور قرب میں استعمال کرتا ہے۔ پس وہ جس چیز کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے تو اس کے دیکھنے اور سننے کے مقام و مرکز میں ہوتا ہوں۔ میں اس کا کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، معاون کارساز، محافظ اور مددگار ہوتا ہوں۔ یہ حقیقت بس اہل معرفت پر کھل سکتی ہے۔

رہے ان کے علاوہ لوگ تو عبادت کی اختصار کی وجہ سے ان سے ان توہمات اور مغالطوں کے خطرات موجود ہیں جو نا حقیقت شناس لوگوں کو ہوتے ہیں مثلاً حلول و اتحاد وغیر قسم کے لغویات۔

اور شریعت کے طوق کو اتار کر ضلالت کی تنگیوں میں جا گھسنا اور اس تفضیل سے ایک اہم قاعدہ واضح ہو رہا ہے وہ یہ کہ اولیاء اللہ کے عبارات میں سے اگر کسی میں اشتباہ ہو جائے تو اگر اس کی تاویل کرنا ممکن ہو تو دیر مت کر جیسے ابو یزید گایہ قول: (لیس فی العجبة غیر

اللہ) اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اگر وہ مقام غیب میں ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس وقت مکلف ہی نہیں اگر میں اس میں شک ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہنے والے میں۔ اور اگر وہ اس کے ہوش و احواس کے قیام کی حالت میں ہو تو پھر اس پر اس کا شرعی حکم لاگو کیا جائے گا کیونکہ ولی معصوم نہیں ہوتا، محفوظ ہوتا ہے۔ اور محفوظ سے کبھی کبھی ایسے امور کا صدور ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے اس پر عتاب ہو جاتا ہے اور پھر سے وہ اپنی حالت پہ ہو جاتا ہے۔

قولہ: وان سألني لأعطينه..... لا عيذنه: تاکید کے صیغے کے ساتھ۔ ”اذا“ کے بجائے ”ان“ سے تعبیر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ کبھی وہ ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ اس بھروسہ سے سوال ترک کرتا ہے کہ اللہ اس کے حال سے واقف ہے اور یا اس لئے کہ اسے اس برتر بادشاہ کے علاوہ کی طلب ہوتی ہی نہیں۔

(وان استعاذني) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دو طریقوں کے ساتھ ضبط ہے اول ”زال“ کے بعد ”نون“ کے ساتھ دوم ”زال“ کے بعد ”با“ کے ساتھ اول الذکر زیادہ مشہور ہے۔
(لا عيذنه) یعنی اس بعد سے جس کا اسے خطرہ ہے۔

قولہ: وما ترددت عن شيء وانا فاعله ترددى عن نفس المؤمن:

اور ایک نسخ میں اس کے بجائے (عن قبض نفس المؤمن) ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: جیسے ایک روایت میں وارد ہے۔ کہتے ہیں کہ ”تردد“ دو کاموں میں اس طرح کی تخییر کو کہا جاتا ہے، جس میں یہ نہ سمجھے کہ کسے اختیار کیا جائے؟ اس معنی میں اس کا ذات باری پر اطلاق ممنوع ہے لہذا علماء نے اس میں تاویل کرتے ہوئے اس کو تردید اسباب و وسائل پر محمول کیا ہے۔ اور موسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ کے ملک الموت کے ساتھ قصہ کو اپنے موقف کی دلیل بنایا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ”تردد“ سے مراد ”مؤمن“ ہے تو مؤمن کو مذکورہ اسباب کے ساتھ بتدریج زندگی کی قیمت جو اس کو دامنگیر ہے سے پیچھے کھینچنے کو ”تردد“ کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ صفت کے لحاظ سے کسی متردد کا فعل ہو سکتا ہے۔

قاضی فرماتے ہیں ”تردد“ دو رویوں اور خیالوں کے تعارض اور آگے پیچھے آنے کو کہتے ہیں۔ یہ اگرچہ اللہ کے حق میں محال و ناممکن ہے۔ لیکن اپنی غایت و انتہاء کے اعتبار سے جو کہ توقف اور آہستگی اختیار کرنے کے اعتبار سے اس کا اطلاق اس ذات اقدس پر کرنا درست ہے۔ یہی حال ان تمام صفات کے اطلاق کا ہے جو مخلوق کی صفات ہیں مثلاً غضب، حیاء اور کرم وغیرہ۔ اور مطلب یہ ہے: کہ کوئی بھی کام جسے میں سرانجام دیتا ہوں۔

میں کسی امر میں متردد شخص کی طرح نہیں رکا اور توقف نہیں کیا جس طرح کا توقف میں اپنے مؤمن بندے کی روح قبض کرنے میں کرتا ہوں میں اس کی روح قبض کرنے میں توقف کرتا ہوں اور اسے وہ راحتیں، نعمتیں اور اغراضات دکھاتا ہوں جو میں نے اس کیلئے تیار کر رکھی ہے، تاکہ موت اس کیلئے سہل دکھائی دے اور اس کا دل اللہ کی طرف مائل ہو جائے اس اشتیاق میں کہ وہ مقربین کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ اور اعلیٰ علیین میں جگہ پائے۔

قولہ: یکره الموت وانا اکره مساءته ولا بد له منه: یہ جملہ مستانفہ ہے یہ اس سوال کے جواب میں ہے کہ اس تردد کا سبب کیا ہے؟ اور مراد یہ ہے کہ وہ موت کی شدت کو بقاضائے بشری ناپسند کرتا ہے تاہم نفس موت تو اس کیلئے ایک بیش بہا تحفہ ہے جو اس کے اور اللہ کے مابین ملاقات کا ذریعہ ہے تو پھر اسے ناگواری کیسی؟

(وانا اکره مساءته) ابن الملک فرماتے ہیں: یعنی موت کی اذیت و پریشانی کی وجہ سے جو ایذا سے پہنچتی ہے اس کی

ناپسندیدگی کو حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ میں اس کو تکلیف دینے والی چیز کو ناپسند کرتا ہوں کیونکہ میں اس کے ساتھ اس کے والدین سے بھی بڑھ کر شفیق ہوں، لیکن موت سے تو چارہ نہیں کیونکہ یہ غموں اور کدورتوں کی جگہ سے نعمتوں اور خوشیوں کے گھر میں منتقل ہونے کیلئے ناگزیر ہے میں بس اس نعمت کبریٰ اور بڑی خواہش سے سرفراز کرنے کی خاطر اسے اس ناگواری سے دوچار کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک مشفق باپ اپنے بیٹے کو تعلیم کی سختیوں اور کلفتوں میں ڈالتا ہے اس کمال کے پیش نظر جو اس سے وابستہ ہے اگرچہ یہ بیٹے کو ناگوار ہوتا ہے۔ یہ امام طبریؒ کے کلام کا خلاصہ ہے۔

ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ مساء ؓ کی اضافت از قبیل اضافۃ المصدر الی مفعولہ ہے لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے تو پھر خارج میں اس کا وجود نہ ہوتا کیونکہ اشیاء کا وجود اللہ کی قدرت سے ہے اور وہ اللہ کے ارادے پر موقوف ہے اور اللہ کو اشیاء کی ایجاد میں کوئی مجبور کرنے والا تو ہے ہی نہیں۔

لہذا ظاہر یہ ہے کہ ”مساء ؓ“ کی اضافت اپنے فاعل کی طرف ہو اور یہ اللہ کے ارادے کا منافی نہیں چنانچہ اپنے مقام پر ارادے اور مشیت اور رضا و کراہت کے درمیان فرق واضح ہو چکا ہے۔

چنانچہ بعض مراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناپسندیدہ ہوتے ہیں، مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اس کی موت کی کراہت کو ناپسند کرتا ہوں۔ اس لئے کہ موت کو ناپسند کرنا مناسب نہیں بلکہ اس کے ساتھ محبت کرنی چاہئے کیونکہ جو اللہ کے ساتھ ملنے کو پسند کرتا ہے اللہ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ اس کے ساتھ ملنے کو ناپسند کرتا ہے۔

اور ایک صحیح نسخہ میں اس طرح ہے: (ولا بدله منہ)۔ علامہ میرک کے اصل نسخہ میں اس طرح ہے۔ نیز ابن الملک کے شرح المصابیح میں بھی اسی طرح ہے۔ اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں جیسے ایک روایت میں ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ مؤمن کیلئے موت ایک ناگزیر حقیقت ہے اس لئے ناگواری چہ معنی دار! یہی وجہ ہے کہ میں موت کو مؤمن بندے سے دور نہیں کرتا۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾

کہتے ہیں کہ حدیث کا یہ آخری حصہ کتاب بخاری، جمیدی، جامع الاصول شرح السنہ میں ہے۔ ان میں ”فاذا احببته“ کے الفاظ نہیں جس طرح مصابیح کے نسخوں میں ہیں اسی طرح ”نفس المؤمن“ کے شروع میں ”قبض“ کا لفظ نہیں اور حدیث کے آخر میں ”ولا بدله منہ“ حضرت انس نے روایت کیا ہے جو شرح السنہ میں ہے۔

۲۲۶۷: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ لِلَّهِ مَلَائِكَةً يَطُوفُونَ فِي الطَّرِيقِ يَلْتَمِسُونَ أَهْلَ الذِّكْرِ فَإِذَا وَجَدُوا قَوْمًا يَذْكُرُونَ اللَّهَ تَنَادَوْا هَلُمُّوا إِلَيْنَا حَاجَتِكُمْ قَالَ فَيَحْفُوهُمْ بِأَجْنِحَتِهِمْ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا قَالَ فَيَسْأَلُهُمْ رَبُّهُمْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ مَا يَقُولُ عِبَادِي قَالَ يَقُولُونَ يُسَبِّحُونَكَ وَيُكَبِّرُونَكَ وَيُبْحِمُونَكَ وَيُحْمِدُونَكَ وَيُسَبِّحُونَكَ وَيُسَبِّحُونَكَ قَالَ فَيَقُولُونَ لَا وَاللَّهِ مَا رَأَوْنَاكَ قَالَ فَيَقُولُ كَيْفَ لَوْ رَأَىٰ رَبِّي قَالَ فَيَقُولُونَ لَوْ رَأَوْنَاكَ لَكُنَّا أَشَدَّ لَكَ عِبَادَةً وَأَشَدَّ لَكَ تَمَجُّدًا وَأَكْفَرَ لَكَ تَسْبِيحًا قَالَ فَيَقُولُ فَمَا يَسْأَلُونَ قَالُوا يَسْأَلُونَكَ الْجَنَّةَ قَالَ يَقُولُ وَهَلْ رَأَوْهَا قَالَ فَيَقُولُونَ لَا وَاللَّهِ بَارَبِّ مَا رَأَوْهَا قَالَ يَقُولُ كَيْفَ لَوْ رَأَوْهَا قَالَ يَقُولُونَ لَوْ أَنَّهُمْ رَأَوْهَا كَانُوا أَشَدَّ عَلَيْهَا حِرْصًا وَأَشَدَّ لَهَا طَلَبًا وَأَعْظَمَ فِيهَا رَغْبَةً قَالَ فِيمَنْ يَتَعَمَّوْنَ دُونَ قَالَ يَقُولُونَ مِنَ النَّارِ قَالَ فَهَلْ رَأَوْهَا قَالَ يَقُولُونَ لَا وَاللَّهِ يَا رَبِّ مَا رَأَوْهَا قَالَ يَقُولُ

فَكَيْفَ لَوْ رَأَوْهَا قَالَ يَقُولُونَ لَوْ رَأَوْهَا كَانُوا أَشَدَّ مِنْهَا فِرَارًا وَأَشَدَّ أَلَهَا مُحَاقَةً قَالَ فَيَقُولُ فَأُشْهِدُكُمْ
 إِنِّي قَدْ عَفَرْتُ لَهُمْ قَالَ يَقُولُ مَلِكٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ فِيهِمْ فَلَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ إِنَّمَا جَاءَ لِحَاجَةٍ قَالَ هُمْ
 الْجُلَسَاءُ لَا يَشْفِي جَلِيسُهُمْ (رواه البخارى وفى رواية مسلم) قَالَ إِنَّ لِلَّهِ مَلَائِكَةً سَيَّارَةً فَضَلَا بَيْنَهُنَّ
 مَجَالِسَ الذِّكْرِ فَأَذَا وَجَدُوا مَجْلِسًا فِيهِ ذِكْرٌ قَعَدُوا مَعَهُمْ وَخَفَّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا بِأَجْنِحَتِهِمْ حَتَّى يَمْلَأُوا
 مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَإِذَا تَفَرَّقُوا عَرَجُوا وَصَعِدُوا إِلَى السَّمَاءِ قَالَ فَيَسْأَلُهُمُ اللَّهُ وَهُوَ أَعْلَمُ مِنْ
 آيِنَ جَنَّتُمْ فَيَقُولُونَ جَنْنَا مِنْ عِنْدِ عِبَادِكَ فِي الْأَرْضِ يُسَبِّحُونَكَ وَيُكَبِّرُونَكَ وَيُهَلِّلُونَكَ وَيُمَجِّدُونَكَ
 وَيُسَئَلُونَكَ قَالَ وَمَاذَا يَسْأَلُونِي قَالُوا يَسْأَلُونَكَ جَنَّتِكَ قَالَ وَهَلْ رَأَوْ جَنَّتِي قَالُوا لَا آيَ رَبِّ قَالَ وَكَيْفَ
 لَوْ رَأَوْ جَنَّتِي قَالُوا وَيَسْتَغْفِرُونَكَ قَالَ وَمِمَّا يَسْتَغْفِرُونَ قَالُوا مِنْ نَارِكَ قَالَ وَهَلْ رَأَوْ نَارِي قَالُوا لَا قَالَ
 فَكَيْفَ لَوْ رَأَوْ نَارِي قَالُوا يَسْتَجِيرُونَكَ قَالَ فَيَقُولُ قَدْ عَفَرْتُ لَهُمْ فَأَعْطَيْتُهُمْ مَا سَأَلُوا وَأَجْرْتُهُمْ مِمَّا
 اسْتَجَارُوا قَالَ يَقُولُونَ رَبِّ فِيهِمْ فَلَنْ عَبْدٌ خَطَاءٌ إِنَّمَا مَرَّ فَجَلَسَ مَعَهُمْ قَالَ فَيَقُولُ وَلَهُ عَفَرْتُ هُمْ
 الْقَوْمُ لَا يَشْفِي بِهِمْ جَلِيسُهُمْ

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۴۸/۱۱ حديث رقم ۶۵۰۲ - ومسلم فى صحيحه ۲۰۶۹/۴ حديث رقم (۲۵ - ۲۶۶۹)
 واحمد فى المسند ۳۸۲/۲

ترجمہ: ”اور ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی فرشتے مسلمانوں کے راستے پر پھرتے ہیں اور ذکر کرنے والوں کو ڈھونڈتے ہیں تاکہ ان سے ملیں اور ان کا ذکر سنیں چنانچہ جب وہ ان لوگوں کو پالیتے ہیں جو ذرا الہی میں مشغول رہتے ہیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو پکار کر کہتے ہیں کہ اپنے مطلوب کی طرف جلدی آ جاؤ! نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کے بعد وہ فرشتے ان لوگوں کو اپنے پروں سے آسمان دنیا تک گھیر لیتے ہیں۔“ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ان فرشتوں سے ان کا پروردگار ان لوگوں کے بارے میں پوچھتا ہے کہ میرے بندے کیا کہتے ہیں حالانکہ پروردگار ان فرشتوں سے کہیں زیادہ ان لوگوں کے بارے میں جانتا ہے“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”فرشتے جواب دیتے ہیں کہ وہ تیری پاکی کی تسبیح کرتے ہیں تجھے یاد کرتے ہیں تیری بڑائی بیان کرتے ہیں تیری تعریف کرتے ہیں اور بزرگی و عظمت کے ساتھ تجھے یاد کرتے ہیں“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ ان فرشتوں سے پوچھتا ہے ”کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اس کے جواب میں فرشتے کہتے ہیں کہ ”نہیں خدا کی قسم انہوں نے تجھے نہیں دیکھا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ ان فرشتوں سے کہتا ہے کہ ”اچھا اگر وہ مجھے دیکھتے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ تجھے دیکھتے تو پھر وہ تیری عبادت بہت ہی کرتے بزرگی و عظمت کے ساتھ تجھے بہت ہی یاد کرتے اور تیری تسبیح بہت ہی کرتے“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ وہ بندے مجھ سے مانگتے کیا ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تجھ سے جنت مانگتے ہیں“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”فرشتے کہتے ہیں کہ ”نہیں! اے پروردگار! خدا کی قسم انہوں نے جنت کو

نہیں دیکھا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ اچھا اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو جنت کے لئے ان کی حرص کہیں زیادہ ہوتی، اس کے لئے ان کی خواہش و طلب کہیں زیادہ ہوتی اور اس کی طرف ان کی رغبت کہیں زیادہ ہوتی کیونکہ کسی چیز کے بارے میں محض علم ہونا اس کے دیکھنے کے برابر نہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ ”اچھا وہ پناہ کس چیز سے مانگتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”فرشتے جواب دیتے ہیں کہ وہ دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کیا انہوں نے دوزخ کو دیکھا ہے؟“ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ نہیں ”ہمارے پروردگار! خدا کی قسم! انہوں نے دوزخ کو نہیں دیکھا“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ اگر وہ دوزخ کو دیکھ لیتے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”فرشتے جواب دیتے ہیں ”کہ اگر انہوں نے دوزخ کو دیکھ لیا ہوتا تو وہ اس سے بہت ہی بھاگتے یعنی ان چیزوں سے بہت ہی دور رہتے جو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنتی ہیں اور ان کے دل کہیں زیادہ ڈرنے والے ہوتے“ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ”کہ میں تمہیں اس بات پر گواہ بنانا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا“ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”یہ سن کر فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے ”ذکر کرنے والوں میں وہ فلاں شخص ذکر کرنے والا نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے کسی کام کے لئے آیا تھا پھر وہ وہیں ذکر کرنے والوں کے پاس بیٹھ گیا اس لئے تو وہ اس مغفرت کی بشارت کا مستحق نہیں اللہ اُس سے فرماتا ہے کہ اہل ذکر ایسے بیٹھنے والے ہیں کہ ان کا ہم نشین بے نصیب نہیں ہوتا۔ (بخاری) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی فرشتے ایسے ہیں جو پھرنے والے اور زیادہ ہیں چنانچہ وہ فرشتے ذکر کی مجلس ڈھونڈتے پھرتے ہیں جب وہ کسی ایسی مجلس کو پالیتے ہیں جس میں اکثر ذکر ہی ہوتا ہے تو وہ اس میں بیٹھ جاتے ہیں اس وقت وہ فرشتے آپس میں ایک دوسرے کو اپنے پروں میں گھیر لیتے ہیں تاکہ ذکر والوں اور آسمان کے درمیان فرشتے ہی فرشتے بھر جائیں جب ذکر سے فراغت کے بعد مجلس برخاست ہو جاتی ہے تو وہ فرشتے بھی اوپر چڑھتے ہیں اور ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ تم کہاں سے آئے ہو“ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں فرشتے کہتے ہیں کہ ہم تیرے ایسے بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو زمین پر ہیں تیری تسبیح کرتے ہیں تیرا کلمہ پڑھتے ہیں تجھے بزرگی و عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور تجھ سے مانگتے ہیں“ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ وہ مجھ سے کیا مانگتے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تجھ سے تیری جنت مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا انہوں نے میری جنت دیکھی ہے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں پروردگار اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تیری پناہ بھی مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وہ کس چیز سے میری پناہ مانگتے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں ”وہ تیری آگ سے پناہ مانگتے ہیں“ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا انہوں نے میری آگ کو دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ نہیں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر وہ میری آگ کو دیکھ لیتے تو پھر ان کی کیا کیفیت ہوتی؟ فرشتے کہتے ہیں ”وہ تجھ سے بخشش بھی طلب کرتے ہیں۔“ نبی کریم ﷺ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے ان کی مغفرت کر دی، فرشتے یہ سن کر عرض کرتے ہیں کہ پروردگار اس میں فلاں بندہ تو بہت ہی زیادہ گناہ گار ہے تو وہ

وہاں سے صرف اپنے کام سے گزر رہا تھا کہ ان کے پاس بیٹھ گیا نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اسے بخش دیا کیونکہ وہ ذکر کرنے والے ایسے لوگ ہیں کہ جن کے سبب سے اور جن کی برکت کی وجہ سے ان کا ہم نشین بنے نصیب نہیں ہوتا۔“

تشریح: قولہ: ان لله ملائكة..... يذكرون الله: (فی الطرق) یعنی مسلمانوں کے راستوں میں۔ (یلتمسون اهل الذکر) یعنی ان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تاکہ ان کی زیارت ہو جائے اور ان کا ذکر سن لیں۔ (فاذا وجدوا قومًا يذكرون الله) یعنی کسی بھی طرح سے اللہ کو یاد کر رہے ہوں۔

رہا امام طیبی کا یہ قول کہ ذکر سے مراد: تسبیح، تکبیر، تمجید اور تمجید ہے۔ تہلیل کا ذکر نہیں کیا تاہم تمجید سے یہ مفہوم ہوتا ہے، اس کی تائید مسلم شریف کی اس حدیث سے ہو رہی ہے جس میں تمجید کی جگہ تہلیل کے الفاظ ہیں۔ تو حدیث کی ظاہر پر مبنی ہے اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں پر مراد اعم ہو۔ اور رہی مذکورہ تعین تو یہ بطور تمثیل کے ہے یا ذکر سے ماثور و منقول اذکار مراد ہیں۔ فتأمل۔ اس لئے کہ تلاوت کلام پاک ہر ذکر سے افضل ہے دعائیں، استغفار، اذکار ہی کی قبیل سے ہے اور اس میں اس بات پر دلیل بھی ہے کہ اجتماعی ذکر کی اپنی ایک خصوصیت و مرتبہ ہے۔

قولہ: تتادوا هلموا الی حاجتکم: یعنی بعض فرشتے دوسروں کو آواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں جلدی آؤ (الی حاجتکم) یعنی ذکر سننے، ذکر کرنے والے کی زیارت کرنے، اور یاد کئے جانے والے کی اطاعت کرنے کیلئے۔ اور یہاں ”ہلم“ کا استعمال بنو تمیم کے لغت کے مطابق ہے یعنی بنو تمیم اس کو تشنہ، جمع ورتانیث کے ساتھ بھی استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ حجازین کا مسلک اس کے برعکس ہے، وہ اس لفظ کو ثنی فرج قرار دیتے ہیں اور تمام تشنہ، جمع اور مؤنث تمام حالتوں میں اس کو ایک صورت میں رکھنے کے قائل ہیں۔ اس کا مؤید باری تعالیٰ کا قول: ﴿هلم شهداءکم﴾ [الانعام: ۱۰۰] بھی ہے۔

قولہ: فيحفونهم بأجنحتهم الی السماء الدنيا: بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ”با“ تعدیہ کیلئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے پروں کو ڈاکرین کے ارد گرد گھمادیتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ”با“ استعانت کیلئے ہے اور مطلب یہ ہے: کہ وہ فرشتے ان کے ارد گرد گھومتے ہیں اور طواف کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا آسمان تک مؤمنین کا احاطہ کرنا پروں ہی کے ذریعہ ممکن ہو سکتا ہے۔

اور جو بات مسلم شریف کی آئندہ حدیث سے واضح ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں بعض دوسروں کو اپنے پروں کی استعانت سے گھیرتے ہیں تاہم ان دونوں میں اس طرح تطبیق کرنا ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ پہلے وہ ڈاکرین کو گھیرتے ہیں پھر ایک دوسرے کا احاطہ کرتے ہیں اور متوجہ ہوتے ہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں: کہ ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہوتے ہیں اور آسمان تک پہنچ جاتے ہیں اور رہا حافظ ابن حجر کا یہ قول کہ فرشتوں کی ایک جماعت ان کی طرف آگے بڑھتی ہے اور ان کا احاطہ کرتی ہے اور ان کو اپنے پروں کے ساتھ ڈھانک لیتی ہے پھر اس کے بعد دوسری جماعت آتی ہے وہ ان کو گھیر لیتی ہے اور ڈھانک لیتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے حتیٰ کہ وہ آسمان کے دامن تک پہنچ جاتے ہیں تو اس قول کی صحت کسی مرفوع روایت پر موقوف ہے، ورنہ تو یہ مردود قول ہوگا کیونکہ یہ خواہ مخواہ کی ضرورت سے زائد تکلف ہے۔

آگے جا کر وہ ایک اس سے بڑی عجیب بات لکھتے ہیں چنانچہ امام طیبی سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ظاہر یہ ہے کہ ”با“ استعانت کیلئے ہے پھر فرمایا اور اس کا ظاہر ہونے میں تردد ہے اس کی غرابت کی وجہ یہ ہے کہ حافظ صاحب کا قول (ویسترو نهم

(بأجنتهم) خود اس بات کی تصریح ہے کہ ”با“ استعانت کیلئے ہے تعدیہ کیلئے نہیں۔ پھر اس کا معارضہ صریح مناقضہ ہے۔

قولہ: فیسألہم ربہم وهو اعلم بہم ما یقول عبادی: یعنی ان فرشتوں سے زیادہ علم رکھتا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: ”وہو اعلم“ کا جملہ حالیہ ہے لیکن اس کا معترضہ ہونا زیادہ اچھا ہے، اس توہم سے بچنے کی

وجہ سے کہ ممکن ہے کہ حال مشقلہ ہو حالانکہ یہ حال مؤکدہ ہے۔ یہ انتہائی باریکی کی بات ہے کہ حد درجہ کی تحقیق ہے۔

حافظ ابن حجر نے عجیب بات کی ہے وہ کہتے ہیں: اس توہم کا بغرض تسلیم کوئی اعتبار نہیں۔ کیسے حالانکہ ”فیسألہم“ سے پیدا شدہ

وہم کو دور کرنا مقصود ہے۔ اچھی طرح غور کر لو۔ (ما یقول عبادی) یائے متکلم کی طرف اضافہ تشریحی ہے مسؤل کا علم ہونے کے باوجود

سوال کا فائدہ فرشتوں پر ان کے اس قول: ﴿اتجعل فیہا من یفسد فیہا﴾ [البقرة: ۳۰] کی وجہ سے تعریض کرنا ہے۔ (قال) یعنی نبی

کریم ﷺ نے فرمایا۔

قولہ: یقولون: یسبحونک.....ویمجدونک:

یحمدونک) یہ تنقیف میم ہے۔ (ویمجدونک) یہ بتشید ید الجیم ہے۔ یعنی تیری عظمت کا چرچا کر رہے تھے، یا آپ کو عظمت

واکرام کی طرف منسوب کر رہے تھے۔ بعض کا قول ہے کہ اس سے مراد ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ کہنا ہے۔ مسلم شریف کی آنے

والی روایت میں ”تمجید“ کی جگہ تہلیل ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان الفاظ کا تذکرہ بطور اشتراط کے نہیں بلکہ بطور تمثیل کے ہے کیونکہ

مقصود ان میں سے کچھ سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اور ان کے علاوہ سے بھی اور سب سے غرض اس تہلیل کا افادہ ہے جو تو حید کا لب لباب

اور اللہ کو ایک ماننے کا خلاصہ ہے۔

قولہ: لا واللہ ما راؤک: ذا کرین کی مدح میں مبالغہ کے پیش نظر فرشتوں نے قسم کھائی ہے۔ (ما راؤک) اس میں اس بات پر

تنبیہ ہے کہ انسانوں کی تسبیح و تقدیس اعلیٰ اور اشرف ہے کیونکہ یہ موانع کے باوجود عالم غیب میں ہے اور فرشتوں کی تقدیس بغیر کسی رکاوٹ

کے عالم شہادۃ میں ہے۔

قولہ: قال: فیقول: کیف لو راؤنی: اس میں تعجب بھی ہے اور تعجب میں ڈالنا بھی اور اس سوال کا جواب بھی جو ”کیف“ کا

مدلول ہے کیونکہ ”کیف“ حال سے متعلق سوال کیلئے موضوع ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مجھے دیکھتے تو پھر ذکر کا عالم کیا ہوتا تھا؟

قولہ: فیقولون: لو راؤک کانوا اشد.....لک تسبیحا:

اور ایک نسخہ میں یقولون بغیر ”فاء“ کے ہے۔

اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدمت کی مشقت کا تحمل معرفت و محبت کے بقدر ہوتا ہے۔

قولہ: فما یسئلون؟ قالوا یسئلونک الجنة: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کا سوال کرنا کسی بھی طرح مذموم

نہیں کیونکہ وہ تو ہے ہی دارالجزاء واللقاء، البتہ مذموم وہ ہے جو فقط جنت کی امید اور آگ کے خوف کی وجہ سے اللہ کی عبادت کرے کیونکہ

اللہ عبادت کا لذاتہ مستحق ہے نہ کہ کسی غیر کی وجہ سے۔

قولہ: وہل راؤھا فیقولون: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت مخلوق ہے اور اس کا وجود حسی ہے۔

(فیقولون) اور ایک نسخہ میں ”قال: فیقولون“ یعنی ”قال“ کے زیادتی کے ساتھ ہے۔

قولہ: فممن یتعوذون: یعنی کس چیز سے (”من“ جارہ اور ”ما“ استفہامیہ ہے)

قولہ: یقولون من النار: کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے غضب و عقاب کی علامت ہے اور اللہ کی پھینکار پڑے لوگوں کا ٹھکانہ بھی۔

قوله: كانوا اشد منها فراراً و اشد لها مخافة: ان چیزوں سے فرار کہ جو جنہم میں جانے کا سبب ہیں۔ (و اشد لها مخافة) یعنی وہ بکثرت اس سے پناہ مانگیں گے بوجہ دلی خوف کے۔

سوال وجواب خوب بسط و تفصیل کے ساتھ کئے گئے جس کا مقتضی ان مؤمنین کی طرف سے عقلمندوں کی جماعت ہیں۔ رب الارباب کے ذکر کی کثرت ہے اور یہی اس وعدہ کا مظہر ہے: ”من ذکرني في ملاء ذكrote في ملاء خيرٍ منه“ اور اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ غیب کی حالت میں عبادت افضل ہے۔ جیسے کہ ایمان بالغیب ایمان بالشہادۃ سے افضل ہے۔ اس وجہ سے امت کے اولیا کو مکاشفہ تامہ ہوتا ہے۔

پھر یہ جو کچھ بتایا گیا ہے یہ امت کے مؤمنین کے بارے میں ہے کہ کافر لوگ تو ان کے بارے میں تو اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿ولو ردوا العادوا لما نهو عنه وانهم لكاذبون﴾ [الانعام: ۲۸]

قوله: انى قد غفرت لهم: یعنی ان کے ذکر کی وجہ سے کیونکہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

قوله: فيهم فلان وليس منهم انما جاء لحاجة: یہ اس مبیہ شخص کے نام و نسب سے کنایہ ہے۔ (ولیس منهم) یعنی ذاکرین میں سے نہ تھا۔ یہ خبر کے اندر مستتر ضمیر سے حال واقع ہے بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ یہ ”فلان“ سے حال ہے۔ یہ قول سیبویہ کے مذہب کے مطابق ہے۔ (لحاجة) یعنی اپنی دنیوی ضرورت کے لئے آیا اور ان کے پاس بیٹھا اس فرشتے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مغفرت کا استحقاق نہیں رکھتا۔

قوله: هم المجلساء لايشقى جلسهم: جو کامل طور پر ذکر کیلئے جمع ہیں۔ (لايشقى) یا کے فتح کے ساتھ۔ (جلسهم) یعنی ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا۔ امام طبری فرماتے ہیں: یہ ایسا مجمع ہے کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا ان کے بخشش و جود سے نامراد نہیں ہوتا کہ بد بخت ہو۔ طبری کی بات پوری ہو گئی۔ اس حدیث مبارک میں اہل ذکر کے ساتھ میل جول کی ترغیب ہے۔

چنانچہ اللہ کریم کا بھی ارشاد گرامی ہے: ﴿يا ايها الذين اتقوا الله وكونوا مع الصادقين﴾ [التوبة: ۱۱۹] بعض عارف حضرات کا قول ہے اللہ کے دوست بنو اگر یہ نہ کر سکو تو ان لوگوں کے ساتھی بنو جو اللہ کے ساتھی بنے ہیں۔

قوله: ان لله ملائكة سياره فضلاء: یعنی بہت گھومنے والے اسی سے صوفیاء کی سیاحت ماخوذ ہے۔

(فضلاً) یہ ”ملائکہ“ کی صفت ثانیہ ہے یہ ”فاء“ و ضاد کے ضموں اور ثانی کے سکون کے ساتھ بھی ہے اور ایک نسخہ میں ”فضلاء“ بروزن علماء کا لفظ ہے علامہ سید جمال الدین فرماتے ہیں، ہماری روایت مشکوٰۃ میں ”فا“ کے فتح اور ”ضاد“ کے سکون کے ساتھ، اور ”فا“ کے ضمہ اور ”ضاد“ کے سکون کے ساتھ اور ”فا“ اور ”ضاد“ دونوں کے ضمہ کے ساتھ، اور ”فاء“ کے ضمہ اور ”ضاد“ کے فتح کے ساتھ اور ان چاروں وجوہات میں نصب کے ساتھ۔

اور مسلم کی شرح میں ہے: کہ ”فضلاً“ کو ہم نے چار طریقوں سے ضبط کیا ہے۔ اول جو سب سے راجح اور ہمارے ہاں سب سے مشہور ہے ”فضلاً“ ”فا“ اور ”ضاد“ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ دوم: ”فاء“ کے ضمہ اور ”ضاد“ کے سکون کے ساتھ۔ بعض حضرات نے اس کو کثیر اور زیادہ درست قرار دیتے ہوئے راجح قرار دیا ہے۔ سوم: ”فاء“ کے فتح اور ”ضاد“ کے سکون کے ساتھ۔ قاضی فرماتے ہیں کہ مسلم و بخاری میں ہمارے جمہور مشائخ کی روایت اسی طرح ہے۔ چہارم: ”فاء“ اور ضاد کے ضمہ کے ساتھ مرفوع ہے۔ بنا بریں کہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ اور ایک طریقہ ”فضلاء“ بالمد ہے جو فاضل کی جمع ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ تمام روایات کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ یہ دوسرے حفظ فرشتوں سے برتر ہیں۔ ذکر کے حلقوں میں جانے

کے علاوہ ان کا کوئی اور کام نہیں ہے اور ترمذی شریف کی روایت میں ہے۔ (ان لله ملائكة سياحين في الارض فضلا من كتاب الناس)۔

قولہ: يتبعون مجالس الذكر: یعنی طلب کرتے ہیں یعنی ڈھونڈتے ہیں۔ (مجالس الذكر) اور ایک نسخہ میں ہے (يتبعون) ”تا“ کی تشدید اور ”با“ کے کسرہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں ”تا“ کی تخفیف اور ”با“ کے فتح کے ساتھ ہے اور ایک صحیح نسخہ میں ”يتبعون“ از باب تفعّل وارد ہے۔

اور مسلم شریف کی شرح میں ہے کہ علماء نے اس کو دو طرح سے ضبط کیا ہے۔ اول: بے نکتہ ”عین“ کے ساتھ جو ”تبع“ سے ماخوذ ہے بمعنی جستجو تفتیش اور دوم: نکتہ والے ”عین“ کے ساتھ جو ”ابتغاء“ سے ماخوذ ہے۔

قولہ: فاذا وجدوا مجلساً فيه ذكر..... كيف لو راوا جنتي: یعنی غالب اس میں ذکر ہو۔ (قعدوا معهم) یعنی ذاکرین کے ساتھ۔ (وحف بعضهم) یعنی کچھ فرشتے (بعضاً) یعنی بعض دوسرے فرشتوں کو (باجنتهم) یعنی ان کی مدد سے (حتی يملأوا) یعنی وہ فرشتے (ما بينهم) یعنی ذاکرین کے درمیان۔ (وبين السماء الدنيا فاذا تفرقوا) یعنی جب اہل ذکر منتشر ہو جاتے ہیں۔ (وصعدوا) صا د کے کسرہ کے ساتھ۔

(الى السماء) یعنی ساتویں آسمان پر (قال: فيسألهم الله وهو اعلم) یعنی ان سے یا ان کے حال سے جیسے کہ دو مختلف نسخوں میں وارد ہے۔ (من أين جئتم فيقولون جئنا من عند عبادك) اس میں اولاد آدم کی انتہاء درجہ کی تکریم ہے۔ (في الأرض) یہ حال ہے۔ (يسبحونك ويكبرونك ويهللونك..... وماذا يسألوني) نون کی تشدید کے ساتھ اور اس کو تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں: کہ ”لو“ کا جواب ”کیف“ کا مدلول ہے۔ کیونکہ ”کیف“ حال کے بارے میں سوال کیلئے موضوع ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ میری جنت کو دیکھتے تو ان کے ذکر کا عالم کیا ہوتا؟

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ بخاری میں ”کیف“ کا جواب فرشتوں کی طرف سے مذکور ہے جب اس کے برعکس مسلم شریف کی روایت میں ”کیف“ کا جواب مذکور نہیں ان دونوں میں کیا فرق ہے۔

جواب یہ ہے کہ بخاری شریف کی روایت میں ”کیف“ فقط حال سے متعلق سوال کیلئے ہے جب کہ مسلم شریف کی روایت میں یہ تعجب کرنے اور تعجب میں ڈالنے کے واسطے ہے۔

قولہ: ويستجبرونك قال: ومما يستجبرونني؟ اس کا عطف ”ويستلنونك“ کے اوپر ہے اور یہ سوال و جواب کا جملہ درمیان میں معترضہ ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ تیری پناہ طلب کر رہے تھے۔ (قال: ومما يستجبرونني؟) دونوں طریقوں پر (یعنی بالتشديد والتخفيف)

قولہ: يستغفرونك: یعنی یوں ہی، اور ایک روایت میں ”ويستغفرونك“، یعنی واو عاطفہ وارد ہے۔

قولہ: قد غفرت لهم فاعطيهم ما سألوا: ”واو“ سے ”فاء“ کی طرف عدول اس حکمت کے پیش نظر ہے کہ یہ عطاء کرنا مغفرت پر مرتب ہے۔

قولہ: أجزتكم مما استجاروا: یہ ”أجاز يعجير“ سے ماخوذ ہے۔ جب کسی خطرہ سے بے خوف کر لے اور امان دے۔

قولہ: يقولون رب فيهم فلان عبد خطاء یعنی بہت گنہگار، یا گناہ سے نہ جدا ہونے والا۔ ”عبد خطاء“ ترکیب نحوی میں ”فلان“ سے بدل ہے۔

قوله: وانما مرّ فجلس معهم: یعنی کسی حاجت و ضرورت کیلئے (فجلس معهم) امام طیبی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس فلان نے تو فقط مرور کا کام کیا ہے اور اس کے بعد بیٹھنا ہے اس نے تو اللہ کریم کا ذکر نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے بالقصد ذکر نہیں کیا یا اخلاص کے ساتھ نہیں کیا ورنہ تو ذکر سنا بھی ذکر کرنے کے مترادف ہے۔

قوله: وله غفرت: یعنی میں نے اس کو بھی انہیں کی طرح معاف کر دیا یا میں نے اس کو ان ذاکرین کے طفیل و برکت سے معاف کر دیا۔ امام طیبی فرماتے ہیں اول الذکر ”غفرت“ دونوں فریقوں کو شامل تھا یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے ان ذاکرین کے مجمع کی بھی اور اس نو وارد کی بھی مغفرت کر دی پھر دوبارہ وہ غفرت مزید تاکید و تقویت کیلئے ہے۔ (ہم القوم) امام طیبی فرماتے ہیں: خبر کا معرف باللام لاناس کے کمال کا مظہر ہے۔ یعنی یہ جس سعادت کے اندر ہیں اس میں انہیں کمال حاصل ہے۔ (ولا یشقی) یعنی مشقت نہیں پاتا یا بد بخت و نامراد نہیں ہوتا۔ (بہم) یعنی ان کے سبب و برکت سے (جلسہم) ان کے ساتھ مجالست کرنے والا۔ یہ آخری جملہ ”القوم“ کی صفت ہے کیونکہ ”القوم“ قوت نکرہ میں ہے اس لئے کہ اس کے اندر ”اللام“ عہدی ہیں جو افادہ تعریف سے معزی ہے۔

یابہ جملہ حال ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جملہ متانفہ ہو زیادہ کمال بتانے کیلئے لایا گیا ہو۔

ابن الملک فرماتے ہیں: (مطلب یہ ہے) کہ یہ اجر و ثواب سے محروم نہیں ہوگا بلکہ یہ ان کی برکت سے اپنا حصہ پائے گا۔ اور اس میں بندوں کیلئے اس بات کی ترغیب ہے کہ صلحاء کے مجالس سے جدا نہ ہوں کہ آپ کو بھر پور حصہ ملے۔

۲۲۶۸: وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ الرَّبِيعِ الْأَسَدِيِّ قَالَ لَقَيْتَنِي أَبُو بَكْرٍ فَقَالَ كَيْفَ أَنْتَ يَا حَنْظَلَةُ قُلْتُ نَافِقٌ حَنْظَلَةُ قَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ مَا تَقُولُ قُلْتُ نَكُونُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يُدَكِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ كَأَنَّا رَأَى عَيْنٍ فَإِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَافَسْنَا الْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَ وَالصَّيِّغَاتِ نَسِينَا كَثِيرًا قَالَ أَبُو بَكْرٍ قَوْلَ اللَّهِ إِنَّا لَتَلْقَىٰ مِثْلَ هَذَا فَاَنْطَلَقْتُ أَنَا وَأَبُو بَكْرٍ حَتَّىٰ دَخَلْنَا عَلَىٰ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقُلْتُ نَافِقٌ حَنْظَلَةُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَمَا ذَاكَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ نَكُونُ عِنْدَكَ تُدَكِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ كَأَنَّا رَأَى عَيْنٍ فَإِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِكَ عَافَسْنَا الْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَ وَالصَّيِّغَاتِ نَسِينَا كَثِيرًا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوُتَدُوْمُونَ عَلَىٰ مَا تَكُونُونَ عِنْدِي وَفِي الذِّكْرِ لَصَافِحَتَكُمْ الْمَلَائِكَةُ عَلَىٰ فُرُشِكُمْ وَفِي طُرُقِكُمْ وَلَكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةٌ وَسَاعَةٌ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۱۰۶/۴ حديث رقم (۱۲)۔ (۲۷۵۰)۔ والترمذی فی المسند ۷۵/۴ حديث رقم ۲۶۳۳۔
واحمد فی المسند ۳۴۶/۴ بتغير بسيط۔

ترجمہ: ”اور حضرت حنظلہ بن ربیع اسیدی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے حضرت ابو بکر صدیق کی ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہو حنظلہ! تمہارا کیا حال ہے یعنی نبی کریم ﷺ جو کچھ وعظ و نصیحت فرماتے ہیں اس پر تمہاری استقامت کیسی ہے؟ میں نے کہا کہ حنظلہ تو منافق ہو گیا حضرت ابو بکر نے کہا کہ ”سبحان اللہ حنظلہ! یہ تم کیا کہتے ہو! یعنی ابو بکر نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ کیا بات کہہ رہے ہو اس کا مطلب تو بیان کرو میں نے کہا کہ جب ہم نبی کریم ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور جس وقت آپ ﷺ ہمیں دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہیں یا جس وقت آپ ﷺ ہمیں جنت کی نعمتوں کی بشارت سناتے ہیں تو اس وقت اس محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم جنت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ

رہے ہیں مگر جب ہم نبی کریم ﷺ کی صحبت سے جدا ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں، اپنی اولادوں، اپنی زمینوں اور اپنے باغات میں مشغول ہوتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ اب جب کہ تم نے اپنی یہ حالت بیان کی ہے تو سنو کہ خدا کی قسم ہم بھی اسی حالت کو پہنچے ہوئے ہیں یعنی ہمارا بھی یہی حال ہے کہ حاضر و غائب میں تفاوت ہے اس کے بعد میں اور حضرت ابو بکرؓ دونوں چلے یہاں تک کہ ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ“ حنظلہ منافع ہو گیا! نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ کیا مطلب ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں بطور تذکیر و نصیحت جنت و دوزخ کے بارے میں بتاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مگر جب ہم آپ کے پاس سے اٹھ جاتے ہیں اور اپنی بیویوں، اپنی اولاد، اپنی زمینوں اور باغات میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم نصیحت کی بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم پر ہمیشہ وہی کیفیت طاری رہے جو میری صحبت اور حالت ذکر میں تم پر ہوتی ہے یعنی تم ہر وقت صاف دل اور اللہ سے ڈرنے والے رہو تو یقیناً فرشتے تم سے تمہارے بچھوٹوں پر اور تمہارے راستوں میں مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہ! یہ ایک ساعت ہے اور وہ ایک ساعت ہے اور آپ ﷺ نے یعنی حنظلہ ساعة و ساعة تین مرتبہ فرمایا۔“ (مسلم)

راوی حدیث:

حنظلہ بن الربیع۔ یہ حنظلہ بن الربیع ”بنو تمیم“ میں سے ہیں۔ ان کو ”کاتب“ کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کی۔ پھر وہ مکہ تشریف لے گئے اور وہاں سے فرقاً پہنچ کر اقامت گزین ہو گئے اور حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں انتقال کیا ان سے ابو عثمان نہدی اور یزید بن ثعلبہ روایت کرتے ہیں۔

”ربیع“ راء کے ضمہ ہائے موحده کے فتح اور ہائے مکسورہ مشدده کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ”ربیع“ بروزن ”سبیح“ ہے۔ یہی راجح ہے۔ ابن حجرؒ مقدمہ میں لکھتے ہیں الربیع کثیر و بالتصغیر امرأتان اھ ”اسیدی“ میں ہمزہ مضموم، سین مہملہ مفتوح اور یا مشدده مخفف دونوں طرح ہے۔ شرح مسلم کے مطابق یا مشددا صح و مشہور ہے واضح رہے کہ یہ وہ حنظلہ نہیں ہیں جو غسیل الملائکہ کہلاتے ہیں۔

تشریح: قولہ: وعن حنظلہ بن الربیع الاسیدی: یہ وہ حنظلہ نہیں جو غسیل الملائکہ ہے بلکہ یہ اور حنظلہ ہے جو آنحضرت ﷺ کے کاتب محترم تھے۔ (ابن الربیع) ”راء“ کے ضمہ ہائے ”باء“ کے فتح اور ”یاء“ مشدده مکسورہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں یہ لفظ ”راء“ کے فتح، ”باء“ کے کسرہ اور ”یا“ کے سکون کے ساتھ بھی ہے۔

شارح بخاری علامہ کرمانی کے مخطوطہ میں یوں ہی ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے مقدمہ میں کہا ہے کہ الربیع کثیر و بالتصغیر امرأتان ”کہ ربیع کے نام کے بہت شخصیات ہیں اور تصغیر کے ساتھ یہ دو عورتوں کے نام ہیں۔ لہذا اس پر اعتماد مناسب ہے۔ (الاسیدی) ہمزہ مفہوم، سین مفتوح کے ساتھ اور ”باء“ کی تشدید و تخفیف دونوں کے ساتھ البتہ اول الذکر زیادہ مشہور ہے جیسے کہ شرح مسلم میں ہے۔

قولہ: قال: لقینی ابو بکرؓ: شاید یہ اس وقت مغلوب الحال تھے چنانچہ ادب کا تقاضا یہ تھا کہ وہ یوں کہتے: ”لقیت ابا بکرؓ“ کہ میں نے حضرت ابو بکرؓ سے ملاقات کی۔

قولہ: فقال: کیف انت یا حنظلہ: یہ حال سے متعلق سوال ہے یعنی آپ کا ان باتوں پر استقامت کا کیا حال جو

آنحضرت ﷺ سے سنتے ہیں۔ یا وہ بدستور قائم ہے یا نہیں؟ امام طیبی فرماتے ہیں کہ: آیا آپ راہ مستقیم پر ہیں کہ نہیں؟
 قوله: قلت نافق حنظلة: اپنی نفس کی تعبیر غائب۔ (علم) کے لفظ کے ساتھ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ وہ نفس سے دور تھے۔
 اور مطلب یہ ہے کہ: وہ منافق ہو گیا لیکن اس مقام پر نفاق سے مراد ایمان کا نفاق نہیں بلکہ حال کا نفاق مراد ہے۔ امام طیبی فرماتے
 ہیں کہ اس میں تجربہ ہے، اصل کلام یہ تھا ”نافقت“ پھر اس نے اپنے نفس سے اس کی طرح کا ایک شخص منترع کیا اب یہ اس کے بارے
 میں خبر دے رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ جب اس نے اپنے نفس سے ہو غیر مرضی اھ۔ دیکھے مثلاً باطن کا ظاہر سے مخالف ہونا۔
 قوله: سبحان الله ما تقول؟: یہ تعجب کے واسطے ہے۔ یا تزیہ کے بیان کیلئے (ما تقول؟) یعنی اپنی بات کا مطلب و معنی بیان
 کرو۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ”ما“ استفہامیہ ہے۔ اور ”تقول“ کا جملہ متعجب معنی پر ہے۔ یعنی آپ کے اس قول جس میں تو نے اپنے اوپر
 نفاق کا حکم لگایا سے مجھے تعجب ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہم سب آپ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں۔ اور صیغہ جمع لانے کی حکمت یہ ہے
 کہ یہ بات کو معلوم ہے کہ حاضرین مکہ جمع میں بہت سے ایسے ہوں جو اس واصف میں حنظلہ کے مشابہ ہوں گے۔ اور ”نافقنا“ نہیں فرمایا
 تاکہ عموم کا وہم نہ ہو۔

قوله: نکون عند رسول الله ﷺ نسینا کثیرا:

(یدکونا) یہ تشدید کے ساتھ ہے یعنی ہمیں وعظ فرماتے ہیں (بالنار) یعنی کبھی جہنم کے عذاب کے ساتھ۔ (والجنت) یعنی کبھی
 جنت کی نعمتوں اور آسائشوں کے ساتھ بطور ترغیب و ترہیب کے یا یہ مطلب ہے کہ وہ ہمیں ان کے ذریعہ اللہ کی یاد دلاتے ہیں یا ان کے
 قرب کے ذریعہ، یا اس بنا پر کہ یہ اللہ تعالیٰ کے صفات جلال و جمال کے مظاہر ہیں۔ (کانا) یعنی حتیٰ کہ ہم اس طرح ہو جاتے ہیں
 کہ (رأی عین) یہ منصوب ہے۔ بنا بر مفعول مطلق اور تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ”کانا نری اللہ أو الجنة والنار رأی عین“
 یعنی اس کا عامل ”نری“، فعل مضمر ہے۔

اور ایک نسخہ میں ”رفع“ کے ساتھ ہے۔ اور تقدیریوں ہے ”کانا رأوت نا بالعین“ بایں طور کہ ”رأی“ مصدر بمعنی اسم فاعل ہو اور
 یا یہ جملہ مبالغہ ہے اور یہ خبر ہے جیسے کہ ”رجل عدل“ میں ہے۔ (فاذا خورجنا) یعنی جب ہم منتشر ہو کے جدا ہو جاتے ہیں (من عند
 رسول الله عافسنا الا زواج والا اولاد“

یعنی ہم ان سے رل مل جاتے ہیں اور کھیل کود میں لگ جاتے ہیں اور ان کے کاموں اور مصلحتوں میں مگن ہو جاتے ہیں۔
 (والضیعات) یعنی زمینوں اور باغات میں اور امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”ضیحة“ کسی شخص کی ایسی چیز جس پر اس کے معاش کا انحصار
 ہو۔ جیسے زراعت، تجارت وغیرہ (نسینا) یہ ”عافسنا“ سے بدل اشتمال ہے۔ اور یا یہ ”اذا“ کا جواب ہے رہا عافسنا کا جملہ تو وہ اس
 توجیہ کے مطابق حال ہے اور اس کے شروع میں ”قد“ مقدر ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم بکثرت بھول جاتے ہیں جیسے کہ ایک صحیح نسخہ
 میں لفظ کثیر موجود ہے۔ یعنی بہت سی وہ باتیں جس کی ہمیں یاد دکرانی گئی تھی، ہم بھول جاتے ہیں یعنی کثیر مفعول بہ ہے اور بعض کا قول یہ ہے
 کہ یہ مفعول مطلق ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے: ”نسینا نسیاناً کثیراً“ (قال ابو بکر) جب آپ نے یہ تذکرہ کیا۔ یعنی اہل
 کمال کے صحبت کے اثرات کا یہ تفاوت۔ (وما ذالک) یعنی اس کہنے کا سبب کیا ہے۔ (قلت نسینا کثیراً) امام طیبی فرماتے ہیں
 یا یہ لفظ کثیر مفعول بہ ہے اور تقدیریوں ہے ”کثیراً مما ذکرنا بہ“ اور یا یہ مفعول مطلق ہے اور تقدیریوں ہے (نسیناناً کثیراً) بہت
 بھول جاتے ہیں جیسے کہ ہم نے آپ سے کبھی کبھی سنا ہی نہ ہو۔ اور یہ آخری توجیہ ”رأی عین“ کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

قولہ: لو تدومون وفی طرفکم: یعنی تمہارے میرے پاس غیر موجودگی کی حالت میں (علیٰ ما تکنونا عندی) یعنی صفائے دل اور خوف خدا کا وہی عالم ہو جو میرے پاس موجودگی کے وقت ہوتا ہے یہ امام طیبیؒ کی تشریح ہے۔ اور یا مرد دوام ذکر اور کامل دھیان ہے۔ آخر الذکر تو جہد کے مطابق۔

اگلا لفظ (وفی الذکر) ”علیٰ ما تکنونا“ کیلئے عطف تفسیری ہوگا۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ: ”وفی الذکر“ کا عطف تکنونون کی خبر ”عندی“ پر ہے۔ اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں: کہ ”واو“ بمعنی ”او“ ہے۔ اور تقدیریوں ہے: ”لو تدومون فی الذکر“ یا ”علیٰ ما تکنونون فی الذکر“۔

یعنی اس حالت میں جب تم مجھ سے جدا اور دور ہو یعنی اگر تم اس میں مگن ہو جاؤ۔ (لصافحتکم الملائکۃ) بعض کا قول ہے کہ اس مصافحہ سے علانیہ مصافحہ مراد ہے کیونکہ اہل ذکر سے فرشتوں کا مطلق مصافحہ تو مسلمہ حقیقت ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تمام احوال کے اندر سرعام اگرچہ تم (علیٰ طرفکم وفی طرفکم) یعنی فراغت و مشغولیت کے تمام حالات کے اندر نیز دن اور رات کے اوقات کے اندر ہوں، کیونکہ جب تم حضور و غیبت دونوں احوال میں مذکورہ وصف پر ہو جاؤ گے تب تم ہمیشہ کامل ترین حالت میں ہو گے۔ اور جو بشری رکاوٹوں اور نفسانی دیواروں کے باوجود اس کیفیت میں ہوگا تو یقیناً وہ فرشتوں کو اپنے سامنے زانو کے تبرک ٹیکے۔ اور ہر زمان و مکان میں اس کی تعظیم کرتے دیکھے گا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دوام ہے۔

قولہ: ولوکن یا حنظلہ ساعة: یعنی ایک گھڑی نافرہ کی ہے (وساعة) یعنی ایک گھڑی مشق و مزارت کی ہے۔

اور مصابیح کے اندر ”ساعة فساعة“ (”فاء“ کے ساتھ) ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں دوسرے ”ساعة“ کے اندر ”فا“ اس بات کی آگہی کیلئے ہے کہ ایک گھڑی دوسری کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور بعض نسخوں میں ”واو“ کے ساتھ ہے اھ۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے انسان منافق نہیں ہوتا کہ ایک زمانے میں وہ کامل دھیان و حضور کے کیف میں ہوتا ہے اور ایک زمانے میں اس پر فوراً آجاتا ہے تو تم حضور کے لمحات اپنے رب کے حقوق کی ادائیگی میں لگے رہتے ہو اور فتور کی کیفیت میں حاجتیں و خواہشیں پوری کرتے ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ ”ساعة وساعة“ کے الفاظ رخصت دینے اور تحفظ کیلئے ہوں تاکہ نفس کو عبادت سے اکتاہٹ نہ ہو جائے۔

حاصل یہ ہے کہ حنظلہ! یہ مذکورہ امور پر مداومت ایسی تکلیف ہے کہ ہر کوئی اس کا تحمل نہیں ہو سکتا اس لئے کوئی اس کا مکلف نہیں بنایا گیا اور جس کا اکثر انسان تحمل ہو سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کبھی اس حالت پر ہو، اور اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ کبھی اپنے آپ کو مذکورہ مشق مزارت کی طرف پھیر دے اور آپ کی کیفیت بھی یہی ہے۔ لہذا آپ راہ راست پر ہیں اور نفاق کا آپ کے پاس سے بھی گذر نہیں ہوا لہذا آپ کا یہ گمان سراسر غلط ہے۔ خبردار اس عقیدے سے باز آ۔ یہ وہ موسم ہے جسے شیطان سالکین کے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔ تاکہ انہیں ان کے مقصد و منزل سے ہٹا دے اور شیطان مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں تاکہ یہ لوگ یکسر عمل کو ترک کر دیں۔ (فلا تہ موات) یعنی حضور ﷺ نے یہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں یہ بھی امکان ہے کہ آپ ﷺ نے والدی نفس بیدہ سے آخر تک تین مرتبہ فرمایا ہو۔ جیسے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ آخری جملہ ”ولوکن یا حنظلہ ساعة فساعة“ تین مرتبہ فرمایا ہو۔ امام طیبیؒ نے آخری احتمال کو پسند فرمایا ہے اس کے متحقق ہونے کی وجہ سے یہ علامہ کی تحقیق کی دلیل ہے۔

اس سے حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ ”شارح کی تعیین پر کوئی دلیل نہیں“ مسترد ہو گیا میں کہتا ہوں کہ جملوں کے بعد استثناء کا آنا اس

بحث کا مثل ہے چنانچہ ہمارے محققین ائمہ کے نزدیک یہ استثنا آخری جملہ کی طرف عائد ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف شوافع کا مذہب ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک سابق میں مذکور پورے کلام کی طرف عائد ہوتی ہے جیسے کہ باری تعالیٰ کے قول: ﴿وَلَا تَقْبَلُوهُمْ شَهَادَةً اٰبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ [النور: ۴-۵]

چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک تازف کی گواہی توبہ کے بعد مقبول ہے جبکہ ہمارے نزدیک قبول نہیں۔

اور ”ابدًا“ کا لفظ اس بات کا مؤید ہے کہ ”ثلاث مرّات“ تا کید کے واسطے ہے۔ اور حنظلہ کے اندرونی غم و کرب کا ازالہ بھی مقصود ہے۔ نیز اس بات کو بیان کرنے کیلئے کہ کسی فتور کے بغیر ہمہ وقتی حضور بندوں کی بس کی بات نہیں ہے۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ فرمایا: کہ کوئی گھڑی ذکر و حضور میں لگا رہے گا اور کوئی وقت ازواج و اولاد وغیرہ کے ساتھ مصروف و مشغول ہوگا۔

اور اس میں حنظلہؒ کی اس حالت کی تقریر ہے جس پر وہ اس وقت قائم تھے اور انہیں اس سے ناگواری ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت حنظلہؒ کا نام لے کر پکارا تا کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ وہ راہ راست پر جا رہی و ساری ہے اور وہ کبھی بھی منافق نہیں ہوئے یعنی عرفی نفاق کے ساتھ موصوف نہیں ہوئے اور وہ یہ ہے کہ کوئی دل میں کفر رکھے اور ایمان کا اظہار کرے۔

اور حضرت حنظلہؒ نے ”نافق حنظلہ“ میں نفاق سے یا تو نفاق لغوی مراد لیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے پاس ایک حالت پر ہوتے تھے اور جب وہاں سے ہتے تو حالت بدل جاتی۔ اور یا یہ تشبیہ حال ہے یعنی اس کی حالت منافق کی حالت کے مشابہ ہے کہ ہمہ جہتی یکسانیت نہیں۔

الفصل الثانی:

۲۲۶۹: عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اَلَا اٰنْبِئْكُمْ بِخَيْرٍ اَعْمَا لَكُمْ وَاَزْكَاَهَا عِنْدَ مَلِيْكِكُمْ وَاَزْكَاهَا فِيْ دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ اِنْفَاقِ الدَّهَبِ وَالْوَرِيْقِ وَخَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ اَنْ تَلْقَوْا عَدُوْكُمْ فَتَضْرِبُوْا اَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوْا اَعْنَاقَكُمْ قَالُوْا بَلٰى قَالَ ذِكْرُ اللّٰهِ (رواه مالك و احمد و الترمذى و ابن ماجه) الا ان ما لكا وقفه على ابى الدرداء۔

اخرجه الترمذى فى السنن ۱۲۷/۵ حديث رقم ۳۴۳۷۔ وابن ماجه ۱۲۴۵/۲ حديث رقم ۳۷۹۰ و مالك فى الموطأ۔ و احمد فى المسند ۴۴۷/۶۔

ترجمہ: ”حضرت ابودرداءؒ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ”کیا میں تمہیں ایک ایسے عمل سے آگاہ نہ کروں جو تمہارے اعمال میں بہت بہتر تمہارے بادشاہ کے نزدیک بہت پاکیزہ تمہارے درجات بلند اور تمہارے رویہ اور سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے اور اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے دشمنوں سے ملو اور تم ان کی گردنیں مارو اور اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ”ہاں اور ہمیں بتائیے کہ وہ کون سا عمل ہے؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”خدا کا ذکر“ اس روایت کو مالک احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے لیکن امام مالک نے اس روایت کو حضرت ابودرداء سے بطریق موقوف نقل کیا ہے۔“

تشریح: قولہ: الا انبئکم و يضربوا اعناقكم:

وازا کاھا: یعنی زیادہ بڑھوتری والا اور پاک صاف (عند ملیککم) یعنی تمہارے پروردگار کے فیصلہ میں۔ (والورق) ”راء“ کے کسرہ کے ساتھ اور کبھی اسے ساکن بھی پڑھا جاتا ہے بمعنی چاندی یعنی اللہ کی رضا جوئی میں ان اشیاء کو خرچ کرنے سے زیادہ بہتر و افضل۔ (وخیر لکم من ان تلقوا عدوکم) یعنی اللہ کی راہ میں مال و جان قربان کرنے سے زیادہ اچھا (فتضربوا اعناقہم) یعنی کچھ کافروں کے گردنوں کو (ویضربوا) یعنی بعض تمہارے گردن اڑائیں، یہ مجاہدۃ فی سبیل اللہ کی اعلیٰ مراتب کی تصویر کشی ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے قول میں ”ضمیر“ مجرور ہے اس کا عطف معنوی طور پر خیر اعمالکم پر ہے کیونکہ اس کی معنوی تقدیر یہ ہے ”الا انبشکم بما“ ہو خیر لکم من بذل اموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ“۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: کہ اس کا عطف ”خیر اعمالکم“ پر ہے اور یہ عطف از قبیل عطف خاص علی العام ہے۔ کیونکہ اول الذکر مطلقاً خیر الاعمال ہے۔ اور یہ مال و جان کے صرف کرنے سے افضل ہے، اور یہ عطف برائے مغائرت ہے بایں طور کہ اعمال سے اعمال لسانی مراد ہوں تو یہ (صرف مال و جان) اس کا متضاد ہوگا کیونکہ مال و جان قربان کرنا عملی افعال ہیں اور یہاں خبر سے مغائر مراد ہے۔

قولہ: قال ذکر اللہ: ابن الملک فرماتے ہیں کہ ذکر سے ذکر قلبی مراد ہے کیونکہ یہی وہ ذکر ہے جسے مال و جان کو صرف کرنے پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہ دل کا فعل ہے اور دل کا کام اعضاء کے کام سے زیادہ مشقت والا ہوتا ہے بلکہ یہ تو جہاد اکبر ہے نہ کہ ایسا ذکر جو زبان سے چیخ و پکار کے ساتھ ہو اور اس میں گردن کو حرکتیں دی جائیں اور جسم کو کثرت سے موڑا جائے، جسے بعض لوگ اس احساس کے تحت کرتے ہیں کہ یہ دھیان لانے کا باعث ہے اور سرور کا سبب ہے۔

سبحان اللہ! یہ تو النا دھیان کو ختم کرنے کا سبب ہے اور نرا غرور ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر کا اطلاق ذکر قلبی اور ذکر لسانی دونوں پر ہوتا ہے لیکن مدار دل پر ہے جو کہ ذکر کی وجہ سے حالت غمیبہ سے حالت حضور کی طرف پلٹتا ہے اور رہا ذکر لسانی تو یہ ایک وسیلہ ہے اور اس در تک پہنچ کر حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

مبتدی کیلئے ان دونوں میں سے کون سا افضل ہے؟ اس میں مشائخ کا اختلاف ہے اگرچہ منتہی کی انتہاء بھی ذکر قلبی کی طرف ہوتی ہے۔ اور رہے اس سلسلہ میں بدعات اور خرافاتی امور اور دنیوی اغراض تو وہ ذکر سے یکسر خارج ہیں۔

اور یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ دونوں انواع کو جمع کرنا کمال ہے۔ اور ثواب کے حصول میں زیادہ افضل صورت ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہاں پر یہی مراد ہے کیونکہ مذکورہ مجاہد اور مقاتل ذکر قلبی سے عاری نہیں۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ کہا جائے کہ مذکورہ مجاہد کا ذکر قلبی جو جہاد باطنی ہے اس کی اس جہاد و مقاتلہ سے افضل ہے جو جہاد ظاہری ہے۔ تو اس توجیہ پر یہ حدیث آپ ﷺ کے اس قول کی نظیر ہو جائے گی۔ (لو ان رجلاً فی حجرہ دراہم یقسمہا و آخر یدکر کان الذاکر للہ افضل) جیسے کہ اس کو طبرانی نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے۔

اور اس تقریر سے حافظ ابن حجرؒ کی وہ حیرت بھی جاتی رہے گی جو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ذکر جو تلاوت قرآن کو شامل ہے کا بقیہ لسانی اعمال سے افضل ہونے میں تو کوئی خفا نہیں لیکن اللہ کیلئے جان و مال کے خرچ کرنے سے افضل ہونے میں تامل ہے، چنانچہ ہمارے ائمہ کے کلام کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔

مذکورہ اشکال کو دور کرنے کیلئے شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلام نے اپنے قواعد میں لکھا ہے: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ تو اب تمام عبادات کا بقدر مشقت نہیں بلکہ کبھی اللہ کریم کم عبادت پر بھی کثیر عبارت کا اجر عطا کر دیتا ہے تو گو کہ ثواب کا ترتیب شرف میں تفاوت مراتب پر ہے۔ یہ بالکل برحق بات ہے اور رہا حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ: اب یہ رواج ہو چلا ہے کہ ظاہر حدیث پر عمل ہوتا ہے اور

ائمہ کرام کے کلام کے مقتضیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو یہ فری تقلید ہے۔

پھر آگے اور بھی عجیب بات کہہ دی، فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بخل کی بیماری کو ختم کرتا ہے اس کی وجہ سے نفس سے بزدلی کی بیماری ختم ہو جاتی ہے، جبکہ ذکر کی پابندی مذکورہ دونوں خمیشت ترین بیماریوں یا ان میں سے کسی ایک کا خاتمہ نہیں کرتی وہ تو بس مقصود کی حد کا فائدہ دیتی ہے۔

لیکن یہ بات حافظ صاحب کی ذکر کے مفہوم و حقیقت سے غفلت پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ تمام ظاہری و باطنی اثرات کا ارتقاع ذکر کی وجہ سے ہے جس کی تاثیر براہ راست تمام اعضاء کے رکیں دل پر ہوتی ہے۔

اور یہی پھر نفس و مال کے صرف کرنے کا داعی و باعث بنتا ہے۔ اور اس کے بغیر یہ سب مالی خسارہ اور بے فائدہ جانی ضیاع ہے۔ چنانچہ اس میں یہ دونوں قرب کا ذریعہ نہیں۔

اس وجہ سے شارح نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ ذکر کی یہ ارفعیت اور خیریت کی وجہ یہ ہو کہ سونا چاندی خرچ کرنا، دشمن کے ساتھ مقاتلہ و مجاہدہ کرنا اور دیگر عملی افعال تو اللہ کے قرب کے ذرائع و وسائل ہیں اور ذکر ہی مقصود اعلیٰ ہے اور بلند و رفع مطلوب ہے اور ذکر کی فضیلت کے سلسلہ میں آپ کو اللہ کا یہ فرمان کافی ہے: ﴿فَاذْكُرُونِي اذْكَرْكُمْ﴾ [البقرة: ۱۰۲] اور اسی طرح حدیث شریف میں ہے ”اَنَا جَلِيسٌ مِنْ ذِكْرِنِي وَاَنَا مَعَهُ اِذَا ذَكَرْنِي“، یعنی میں ذکر کا جلیس ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے پاس ہوتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہی وجہ ہے کہ امام غزالی نے مقام ذکر میں داخل ہونے کے بعد فرمایا: کہ میں نے عمر کا ایک حصہ وجیز، وسیط اور بیط میں صرف کر کے ضائع کر دیا بلکہ عارفین حضرات تو غفلت کو بلا مبالغہ ارتداد کے انواع میں شمار کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ کچھ لہجہ کو ہو۔ جیسے ایک شاعر کا قول

ولو خطرت لی فی سواک ارادۃ ☆ علی خاطر ی سہوا حکمت بردتی

”یعنی اگر میری خاطر میں کبھی آپ کے علاوہ کا خیال بھی بھول کر آئے تو میں اپنی ارتداد کا فیصلہ صادر کر دوں گا۔“

پھر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ سب سے افضل ذکر ”لا الہ الا اللہ“ ہے۔ اور یہی وہ اساس ہے جس پر ارکان دین کی عمارت کھڑی ہے، یہی عالیشان کلمہ ہے اور یہی وہ مجہود ہے جس کے گرد دین کی چمکی گھوم رہی ہے اور یہی ایمان کا بلند و بالا شعبہ ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں: بلکہ یہی سارا دین ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلٰى اِنَّمَا الْهٰكِمِ الْوٰحِدِ﴾ اس میں وحی کو اللہ کی وحدانیت پر محصور کیا گیا ہے۔ کیونکہ وحی کا سب سے بڑا مقصد تو حید ہے باقی ساری تکلیفیں اس کی شاخیں ہیں پھر آگے فرمایا: یہی وجہ ہے کہ آپ عارفین اور اہل دل حضرات کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس کلمہ کی درد کی دوسرے تمام اذکار پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس کلمہ کے ان خواص کا ادراک کیا جو بس وجدان صحیح اور ذوق سلیم سے معلوم ہو سکتے ہیں اھ۔

اس بات کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ: حضرت علی بن میمون مغربی نے جب شیخ علوان جموی کے بارے میں تصرف کیا جو مفتی اور مدرس تھے تو انہوں نے شیخ صاحب کو ذکر کے علاوہ تمام مصروفیات سے روک دیا۔ نادان لوگوں نے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ انہوں نے شیخ الاسلام کو گمراہ کر دیا اور لوگوں کو نفع رسانی سے اسے روک رکھا، اس کے بعد حضرت علی بن میمون کو پتہ چلا کہ شیخ صاحب کبھی کبھار قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو انہوں نے اس سے منع فرمادیا، جس پر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو زندیق قرآن کریم کی تلاوت بھی نہیں کرنے دیتا جو ایمان کا محور و مدار ہے اور یقین کی پختگی میں معاون بھی، لیکن مرید بسلسل موافقت کرتے رہے حتیٰ

کہ اس کی ترقی ہوگی اور آئینہ دل صاف ہو گیا اور رب کا مشاہدہ ہونے لگا، تب انہوں نے اسے تلاوت قرآن کریم کی اجازت دے دی پھر جب انہوں نے قرآن کریم کو کھولا تو ان پر ازلی، ابدی فتوحات کھلیں اور ظاہری باطنی معارف کے خزانے نمودار ہونے لگے۔ تو جناب علی بن میمون کہنے لگے: میں نے آپ کو تلاوت کلام پاک سے نہیں روکا تھا بلکہ میں نے تو آپ کو صرف زبان کو حرکت دینے اور قرآنی حقائق سے غافل ہونے سے منع کیا تھا اور اللہ ہی سے مدد کی درخواست ہے۔

قولہ: الا ان مالکا وقفه علی ابی الدرءاء:

امام مالکؒ نے اسے حضرت ابوالدرءاءؒ پر موقوف کیا ہے یعنی باقی حضرت نے اسے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ لیکن اس سے کچھ حرج واقع نہیں ہوگا کیونکہ اعتبار وصل کا ہوتا ہے نہ کہ وقف کا اس لئے کہ وصل کرنے والے کے پاس وصل کا اضافی علم ہے اور ثقہ کا اضافہ معتبر ہے اور اس لئے بھی کہ یہ ایسی بات ہے جو اپنی رائے سے کہی جاسکتی ہے لہذا یہ وقف بمنزلہ رفع ہے۔

۲۲۷۰: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بَسْرٍ قَالَ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ فَقَالَ طُوبَى لِمَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسَنَ عَمَلُهُ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ قَالَ أَنْ تُفَارِقَ الدُّنْيَا وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ - (رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۸۷/۳ حدیث رقم ۲۴۳۱۔ والدارمی فی السنن ۳۹۸/۲ حدیث رقم ۲۷۴۸۔ واحمد فی المسند ۴۳/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! کون شخص بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”خوش بختی ہے اس کے لئے جس کی عمر دراز ہوئی اور اس کے اعمال نیک ہوئے“ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! کونسا عمل بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”یہ کہ جب تم دنیا سے جدا ہو تو تمہاری زبان خدا کے ذکر سے تر ہو۔“ (ترمذی احمد)

تشریح: قولہ: عن عبد اللہ بن بسر: ”باء“ کے ضمہ اور ”سین“ کے سکون کے ساتھ۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کہ ایک نسخہ میں ”بسر“ کے بجائے ”نمیر“ ہے۔ اھ۔ لیکن یہ کھلی تحیف (غلطی) ہے۔

قولہ: طوبی لمن طال عمره وحسن عمله: یہ ”طیب“ سے بروزن فعلی ہے، اس سے مقصود اس کی تحسین اور دنیا و آخرت میں اس کے لیے خوشحالی کی دعا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ خبر ہے کیونکہ یہ ”ای الناس خیر“ کے جواب میں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”طوبی“ سے جنت مراد ہو یا اس سے جنت کا ایک درخت جو اہل جنت پر چھائے ہوگا مراد ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ جواب ”من طال عمره وحسن عمله“ سے شروع ہو گیا کہ یہ فرمایا کہ یہ بات مخفی نہیں کہ سب لوگوں میں بہترین مذکورہ لوگ ہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے لوگوں کیلئے دعا کی جائے تاکہ ان کی برکت سے مستفیض ہوں اھ۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان کی موافقت کرتے ہوئے فرمایا: کہ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس کی خوشحالی اور خوبی و انجام کی خبر ہے، آپ ﷺ کی گفتگو کی بلاغت کی وجہ سے یہ جواب کو بھی متضمن ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ مسئول عنہ کی ذات سے عدول کر کے ایسی علامات بتائی گئیں جو مسئول عنہ کے اندر ہیں یعنی دنیا و آخرت کی سعادت جب اس کی عمر طویل اور عمل اچھا ہو کیونکہ مسئول عنہ کی ذات کا علم ان امور غیبیہ میں سے ہے جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

اس کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ بالکل غیر مربوط اور بے وزن کلام ہے پر میرے خیال میں آیا کہ ”طوبی“ کا کلمہ شاید اس لئے بڑھایا تاکہ یہ ایک جامع کلام ہو اور چوتھی مستقل حکمت ہو جو سوال کا تابع نہ ہو اسی طرح اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور ابو نعیم نے اس کو ”حلیہ“ میں روایت کیا ہے لیکن اس میں آمد کے سبب کا ذکر نہیں۔

قوله: ان تفارق الدنيا ولسانك رطب من ذكر الله :

”واؤ“ حایہ ہے۔ (رطب) یعنی حال ہی میں ذکر کیا ہو، یا یہ مراد ہے کہ اس کی زبان ذکر سے تر ہو اور حرکت کر رہی ہو۔

ذکر اللہ سے ذکر جلی و ذکر خفی دونوں مراد ہو سکتے ہیں جیسے زبان سے زبان قلبی اور زبان قالی دونوں مراد ہیں۔ اور مراد لینے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں بلکہ مقام جمع میں تو یہ بطریق اولیٰ مراد لیا جاسکتا ہے۔

اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ افضل ترین اعمال وہ ہیں جن پر احوال کا خاتمہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ دنیا سے مفارقت و جدائی سے زہد عن الدنیہ مراد ہو، اور ”رطب اللسان“ اللہ کے ذکر سے دلوں کی تروتازگی مراد ہو۔

کیونکہ برتن سے وہی ٹپکتا جو اس کے اندر ہوتا ہے اور جو کس شے سے محبت کرتا ہے وہ اسے بکثرت زبان سے یاد کرتا ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ ”رطوبة اللسان“ سے مراد ذکر کا سہولت و آسانی کے ساتھ زبان پر جاری ہونا ہے۔ جیسے ”بیس لسان“ سے اس کے متضاد (رکنے) کا کتنا یہ کہا جاتا ہے اور روانی زبان مداومت ذکر سے ہوتا ہے۔

تو گویا کہ یہ کہا گیا کہ افضل الاعمال مداومت الذکر کیونکہ ذکر مقصود ہے اور دیگر اعمال اس کے ذرائع و وسائل ہیں۔

اور ابن حبان، بزار، طبرانی نے حضرت معاذؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ آخری بات جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر علیحدہ ہوایہ ہے کہ: میں نے کہا۔ ”ای الاعمال احب الی اللہ قال: ان تموت ولسانك رطب من ذکر اللہ“ اور طبرانی میں اضافہ ہے: ”قلت یا رسول اللہ! اوصنی قال: عليك بتقوى اللہ ما استعت واذکر اللہ عند کل حجر و شجر وما عملت من سوء فاحدث للہ فیہ توبۃ السر بالسرہ والعلانیہ بالعلانیہ“ یعنی میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ مجھے وصیت کیجئے آپ ﷺ نے فرمایا ”آپ پر اللہ کا تقویٰ حسب استطاعت لازم ہے اور ہر حجر و مدرز کے پاس اللہ کا ذکر کیا کیجئے اور جو برائی آپ سے صادر ہو تو علانیہ گناہ سے علانیہ توبہ کر اور پوشیدہ گناہ کا پوشیدہ توبہ کر۔ اھ“۔

علامہ میرزا فرماتے ہیں کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ نے ان کو یمن کی طرف حاکم بنا کر بھیج رہے تھے بوقت رخصت یہ فرمایا تھا۔

۲۲۷۱: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوا قَالُوا وَمَا رِيَاضُ الْجَنَّةِ

قَالَ حَلَقُ الدِّكْوَرِ۔ (رواه الترمذی)

رواه الترمذی فی السنن ۱۹۴/۵ حدیث رقم ۳۵۷۷۔ واحمد فی المسند ۶۵/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جب تم جنت کے باغات میں سے گزرو تو میوہ خوری کرو“ صحابہ نے عرض کیا کہ جنت کے باغات سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ذکر کے حلقے“۔

تشریح: قوله: اذا مررتم برياض الجنة فارتعوا: یہ از قبیل تسمیہ الشیء باعتبار مال کے ہے یا باعتبار ایصال و دلالت کے

ہے۔ (فارتعوا) یہ کامل و وافر حصہ ملنے سے کنایہ ہے۔

قوله: قال حلق الذکر: ”حلق“ حاء کے کسرہ اور لام کے فتح کے ساتھ اور کبھی ”حاء“ کو فتح بھی دیا جاتا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ”حلق“ بکسر الحاء وفتح اللام حلقۃ کی جمع ہے۔ جیسے ”قصعة“ کی جمع قصعۃ آتی ہے۔ اور یہ لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں جو دائرے کے شکل میں بیٹھے ہوں۔

علامہ جوہریؒ فرماتے ہیں: ”حلقۃ“ (فتح الحاء) کی علی خلاف القیاس جمع ہے۔

علامہ ابن عمرو نے یہ حکایت کی ہے کہ اس کا مفرد ”حلقۃ“ جو با تحریک ہے اور اس کا جمع حلق بالفتح ہے اھ۔ گویا کہ یہاں جمع سے مراد جنس ہے بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ: یہ حدیث مکان اور ذکر کے سلسلہ میں مطلق ہے تو اس کو اس مقید پر محمول کیا جائے گا جو باب المساجد میں مذکور ہے اور وہ ذکر سبحان اللہ، الحمد للہ ہے۔ امام طیبیؒ نے یہ ذکر کیا ہے بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حلال و حرام کے مجالس ہیں۔

لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کو عموم پر محمول کیا جائے، اور کسی مخصوص کامل فرد کا ذکر منصوص کے عموم کے منافی نہیں۔ اور حاصل معنی یہ ہے کہ: جب تم ایسی جماعت کے پاس سے گذرو جو اللہ کا ذکر کرتی ہو تو تم بھی ان کی موافقت میں اللہ کا ذکر کرو کیونکہ وہ تو جنت کے باغات میں سے ہیں۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: کہ جس طرح ذکر کرنا مستحب ہے یوں ہی اہل ذکر کے پاس بیٹھنا بھی مستحب ہے، اور یہ ذکر کبھی قلبی ہوتا ہے اور کبھی لسانی اور بہترین وہ ہے جو قلب و لسان دونوں سے ہو۔

اور اگر کوئی ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کرنا چاہے تو پھر دل زیادہ افضل ہے اور یہ نامناسب ہے کہ اپنے متعلق ریاء کے خیال کے خوف کی وجہ سے ذکر لسانی بالا خلاص کو ترک کیا جائے۔

اور علامہ فیض صاحب سے منقول ہے کہ لوگوں کی وجہ سے عمل ترک کرنا ریاء ہے اور لوگوں کی وجہ سے عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ ان دونوں سے اللہ خلاصی نصیب کرے۔

لیکن اگر انسان لوگوں کے رعایت کا دروازہ اپنے اوپر کھول دے۔ اور ان کے ظنون باطلہ کے پیش آنے سے بھی بچنا چاہے تب تو خیر و بھلائی کے اکثر دروازے اس پر مسدود ہو جائیں گے اھ۔

مروی ہے کہ کچھ مریدین نے اپنے شیخ سے عرض کیا کہ میں اللہ کا ذکر کرتا ہوں مگر میرا دل غافل رہتا ہے۔ اس پر شیخ نے اس سے فرمایا کہ ذکر کرتا جا اور شکر بجالا کہ اس نے تیرے ایک عضو کو اپنے ذکر میں مشغول کر دیا ہے اور اس ذات سے یہ طلب کر کہ وہ آپ کو دلی دھیان بھی نصیب کرے۔

قاضی عیاضؒ نے ایک انوکھی بات کہی ہے کہ ذکر بالقلب میں کوئی ثواب نہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ امام طیبیؒ جیسے آدمی نے اس پر یہ فرمایا کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں یہ بالکل برحق بات ہے۔

لیکن ممکن ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا کلام محمول ہو اس ذکر پر جس کے بارے میں شریعت کا مقررہ حکم یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنانا ضروری ہے جیسے کہ علامہ جزیریؒ حصن میں رقمطراز ہیں: ہر وہ ذکر جو شرع میں مامور بہ ہے واجب ہو یا مستحب ہو اس کا اس وقت تک اعتبار نہیں جب تک اس کا تلفظ نہ ہو اور ذکر اسے خود نہ سن لیوے۔ اھ۔

لہذا مطلقاً یہ کہنا کہ ذکر قلبی میں ثواب نہیں درست نہیں چنانچہ ابو یعلیٰؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں: وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فضلؓ سے فرمایا: الذکر الخفی الذی لا یسمعه الحفظۃ سبعون ضعفا اذا کان یوم القیمۃ جمع اللہ

الخالق لحسابہم وجاءت الحفظۃ بما حفظوا وکتبوا قال لهم: انظروا هل بقى له من شیء؟ فيقولون: ما تركنا شیئاً مما علمناه وحفظناها الا وقد اُحصيناه وکتبناه فيقول اللہ: ان لك عندى حسناً لا تعلمه، وانما اجرک به وهو الذکر الخفی اه۔

یعنی ذکر خفی جس کو ملائکہ حفظ کے علاوہ دیگر مخلوق نہ سنے وہ سترگنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے جب روز قیامت ہوگا اور اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو حساب کیلئے جمع فرمائے گا اور حفظ فرشتے اپنے محفوظ کردہ اعمال لے کر حاضر ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرمائے گا۔ دیکھو میرے اس بندے کے کچھ اعمال تمہارے پاس باقی تو نہیں؟ تو وہ عرض کریں گے یا اللہ! ہمارے علم کے اندر اس کے جو جو اعمال تھے وہ ہم نے ان صحیفوں میں درج کر کے محفوظ کر لیے ہیں ہم نے کچھ چھوڑا نہیں ہے۔ تب اللہ فرمائے گا ہاں! آپ کا میرے پاس ایک ایسا عمل ہے جس کو تو نہیں جانتا اس کا بدلہ میں ہی آپ کو دوں گا اور وہ عمل آپ کا ذکر خفی ہے اچھی۔ اور آپ ﷺ کے ارشاد ”الذکر الخفی خیر من الذکر الجلی“ کا یہی مطلب ہے۔ یعنی حضرت انسؓ سے اور انہوں نے ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث میں ان الفاظ سے ذکر کی ہے ”اذا مررتم بربیاض الجنة فارتعوا“ قلت وما ربیاض الجنة؟ قال المساجد قلت: وما الرتع یا رسول اللہ قال: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔“

۲۳۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَعَدَ مَقْعَدًا لَمْ يَذْكُرِ اللَّهَ فِيهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللَّهِ تَرَةً وَمَنْ اضْطَجَعَ مَضْجَعًا لَا يَذْكُرُ اللَّهَ فِيهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللَّهِ تَرَةً۔ (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۶۴/۴ حدیث رقم ۴۸۵۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص“ کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں اللہ کو یاد نہ کرے تو اس میں اس کا بیٹھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قضاء و قدر کے سبب سے اس کے لئے حسرت اور ٹوٹے کی بات ہوگی اور جو شخص اپنی خوابگاہ میں لیٹے اور اس میں اللہ کو یاد نہ کرے تو یہ اللہ کی طرف سے اس کے لئے حسرت اور ٹوٹے کی بات ہوگی۔“ (ابو داؤد)

تشریح: قولہ: من قعد مقعداً..... من اللہ ترة: ”مقعداً“ یہ ظرف ہے یعنی مجلس یا مصدر میسی ہے بمعنی قعود۔ (ولم یذکر اللہ فیہ) یعنی اس مجلس میں اور اس بیٹھنے کے دوران (کانت) بلفظ مونث بتاویل ”قعدۃ“ اور ایک نسخہ ”کان“ مذکر لفظ کے ساتھ ہے بتاویل ”قعود“۔ (علیہ) یعنی ”علی القاعد“ ضمیر کا مرجع قاعد ہے۔ (من اللہ) یعنی اللہ کے حکم، امر قضاء و قدر کی جہت سے (ترۃ) یہ لفظ ”تا“ کے کسرہ اور ”را“ کی تخفیف کے ساتھ ہے جس کا معنی عتاب اور ننگی ہے یا نقصان اور حسرت کیلئے مستعمل ہے جس کا مادہ استقاق ”وتر“ بھی ”نقص“ ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ”وترہ حقہ“ بمعنی نقصہ اور یہ حسرت و افسوس کا سبب ہے اور اس معنی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ولن یتروکم اعمالکم﴾ [محمد: ۳۵] اور اس لفظ کے آخر میں جو ”تا“ مربوط ہے یہ دراصل ”قائے کلمہ“ سے حذف شدہ حرف علت کے عوض ہے یعنی ”عدۃ“ کی طرح اور یہ منصوب ہے بنا بر خبریت فعل ناقص۔ اور ایک نسخہ میں بالرفع بھی ہے بنا برین کہ ”کان“ تامہ بمعنی وجد ہو۔

قولہ: ومن اضطجع مضجعاً..... من اللہ ترة: یہ ظرف بمعنی موضع وضجعة وافتراش ہے یعنی لیٹنے اور دراز ہونے کی جگہ (لا یذکر اللہ فیہ کانت) ضمیر کا مرجع اضطجاعت ہے یعنی لیٹنا یا اس سے مراد عدم ذکر اللہ ہے جو ”لا یذکر اللہ“ سے مفہوم ہے۔ (علیہ من اللہ ترة) گذشتہ ”ترۃ“ میں مذکور دونوں اعرابی صورتوں اور توجیہوں کے ساتھ۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ”کانت“ دونوں جگہوں میں ابوداؤد اور جامع الاصول دونوں کتابوں کے اندر بلفظ تانیث وارد ہے اور اس کے بعد آنے والی دو حدیثوں میں ان دونوں کتابوں کے اندر بلفظ مذکر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بصورت تانیث لفظ ”کانت“ اور رفع ”تورۃ“ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ”کانت“ کے اندر کی ضمیر کا مرجع القعدۃ ہو یا الاضطجاعۃ ہو جائے۔

جولفظ ”القعدۃ“ اور ”الاضطجاعۃ“ اس صورت میں ”مقروۃ“ مبتدا ہوگا اور جار مجرور ظرف مستقر اس کی خبر ہوگی اور مبتدا خبر مل کر جملہ محمول منصوب کانت کی خبر ہے۔

اور یہی وہ روایت جس میں ”کان“ بلفظ مذکر اور ”تورۃ“ منصوب ہے جیسے کہ مصابیح میں ہے تب تو ظاہر ہے۔ اور جار مجرور کا تعلق ”تورۃ“ کے ساتھ ہے۔ آنے والی احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ”کانت“ کی تانیث کی خبر کی تانیث کی وجہ سے ہے۔ پھر مذکورہ دونوں مکانوں کے ذکر سے مقصود تمام جگہوں کا استیعاب ہے جیسے دوزمانوں ”بکرة وعشیا“ کا اطلاق کیا جاتا ہے اور مراد استیعاب ازمنہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ جس نے لمحہ بھر کسی بھی جگہ کسی بھی حالت میں مثلاً بیٹھنے، کھڑے ہونے، سونے کی حالت میں تو یہ اس کیلئے حسرت و ندامت کا باعث ہوگا۔ کیونکہ اس نے ذکر کا عظیم ثواب ضائع کر دیا چنانچہ ایک حدیث شریف میں وارد ہے کہ اہل جنت کو اس بات کے علاوہ کسی بات پر افسوس نہیں ہوگا کہ انہوں نے دنیا میں کوئی ایک لمحہ کو اللہ کے ذکر کے بغیر گزارا۔

پھر اس حدیث کے اندر پہلے جملہ کے ساتھ ”لم“ اور دوسرے جملہ کے ساتھ ”لا“ ذکر کیا گیا ہے یہ ”تلفن“ کی غرض سے ہے۔ اور یونہی اگلی دونوں حدیثوں میں اسی غرض سے ایسا کیا گیا ہے۔

امام خطاب فرماتے ہیں کہ ”لم تراعوا“ کا معنی ہے ”لا تخافوا“ خوف مت کرو اور عرب ”لم“ کو ”لا“ کی جگہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

۲۲۴۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ قَوْمٍ يَقُومُونَ مِنْ مَجْلِسٍ لَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ فِيهِ إِلَّا قَامُوا

عَنْ مِثْلِ جَيْفَةَ حِمَارٍ وَكَانَ عَلَيْهِمْ حَسْرَةٌ۔ (رواه احمد و ابوداؤد)

اخرجه اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۲۶۴/۴ حدیث رقم ۴۸۵۵ واحمد فی المسند ۳۸۹/۲۔

ترجمہ: ”اور ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو لوگ کسی نشست کے بعد اٹھیں اور اس نشست میں خدا کا ذکر نہ ہو تو وہاں سے ان کا اٹھنا مردار گدھے کی مانند ہے اور یہ حسرت و افسوس کا سبب ہوگا۔“ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ: ما من قوم یقومون مثل جیفۃ حمار (یعنی ان کا اٹھنا ایسا ہی ہے یہاں ”قاموا“ ”تجاوزوا“ اور ”تعبدوا“ کے معنی کو متضمن ہے اس لئے ”عن“ اس کے صلہ میں لایا گیا ہے۔ یہ امام طبری کی تحقیق ہے۔

یعنی ان کا یہ قیام مردار کھا کر منتشر ہونے والوں کے قیام کی طرح ہے وہ مردار جو گندگی اور نجاست کی انتہا پر ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ گدھے کی تخصیص اس بنا پر ہے کہ یہ تمام مردار جانوروں میں انسانوں کے زیادہ قریب ہے۔ اٹھی۔ یا اس لئے کہ یہ تمام حیوانات میں بلید تر ہے یا اس لئے کہ اس کا شیطان کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے ہنہانے کے وقت خدائے رحمن کی پناہ مانگی جاتی ہے۔

قولہ: وکان علیہم حسرة: مذکورہ بالا دونوں اعرابی وجہوں کے ساتھ

روایات باب: نسائی، ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے تاہم ان کے الفاظ یہ ہیں: ما من قوم جلسوا مجلسا وتفرقوا ولم یذکروا اللہ فیہ الا کانما تفرقوا عن جیفۃ حمارٍ وکان علیہم حسرةٌ یوم القیمة وما مشیٰ احدٌ ممشیٰ لم یذکر اللہ فیہ الا کان علیہ ترة وما اوی احد الی فراشہ ولم یذکر اللہ فیہ الا کان علیہ ترة یہ اور اس جیسی ایک اور روایت جس کو حضرت معاذؓ نے مرفوعاً روایت کیا ہے وہ ہے کہ اہل بہشت کو کوئی حسرت نہیں (یعنی قیامت والے دن جیسے کہ ایک روایت میں ہے) مگر اس گھڑی پر جس کو انہوں نے اللہ کے ذکر کے بغیر گزارا ہوں۔ (طبرانی نے اس کو روایت کیا ہے۔)

۲۲۷۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا لَمْ يَذْكُرُوا اللَّهَ فِيهِ وَلَمْ يُصَلُّوا عَلَيَّ

نَبِيَّهِمْ إِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ تَوْرَةٌ فَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُمْ وَإِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُمْ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۹/۵ حدیث رقم ۳۴۴۰ واحمد فی المسند ۴۵۳/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں اور وہاں نہ تو اللہ کا ذکر کریں اور نہ اپنے نبی پر درود بھیجیں تو وہ مجلس ان کے لئے باعثِ افسوس ہی ہوگی اب چاہے تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب میں مبتلا کرے اور چاہے تو انہیں بخش دے۔“ (ترمذی)

تشریح: قولہ: لم یذکروا اللہ فیہ ولم یصلوا علی نبیہم: یہ تخصیص بعد التعمیم ہے (الا کان) یعنی وہ مجلس (علیہم ترة فان شاء عذبہم) یعنی ان کے سابقہ گناہوں کی وجہ سے اور آنے والے تقصیرات کی وجہ سے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ (تورہ) سے مراد ہے ”تبعہ“ ناراضگی اور خفگی ہے۔

اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ”ان شاء عذبہم“ یہ تشدید اور تغلیظ کے طور پر فرمایا گیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ شاید اہل مجلس سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جائے جو موجب عقوبت ہو اور اس حدیث میں ”صلاة علی الرسول“ کے ذکر میں اشارہ ہے باری تعالیٰ کے قول: ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا﴾ [النساء: ۶۴] کی طرف۔

قولہ: و ان شاء غفرلہم: اور چاہے تو اپنی رحمت اور فضل کی بنا پر انہیں بخش دے اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب وہ ذکر کرتے ہیں تو یقینی طور پر وہ عذاب سے بچ جائیں گے بلکہ حتی طور پر مغفرت ہوگی۔

۲۲۷۵: وَعَنْ أُمِّ حَبِيبَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُلُّ كَلَامٍ أَدَمُ ابْنِ آدَمَ عَلَيْهِ لَأَلَهُ إِلَّا أَمْرٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

نَهْيٍ عَنْ مُنْكَرٍ أَوْ ذِكْرُ اللَّهِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۱۳۱۵/۲ حدیث رقم ۳۹۷۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت ام حبیبہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ابن آدم کا ہر کلام اس کے لئے وبال ہے علاوہ اس کلام کے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے ہو۔“ اس روایت کو ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: قولہ: کل کلام ابن آدم علیہ لا لہ: یعنی اس کلام کا نقصان اور وبال اس پر ہوگا یعنی ”علی“ ضرر کیلئے ہے اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ معنی یہ ہے ”یکتب علیہ“ (لیس لہ) یعنی اس میں اس کا نفع نہیں یا وہ اس کیلئے نہیں لکھا جائے گا۔ یا

سابقہ جملہ مضمون کیلئے تاکید ہے۔

قولہ: الا امرٌ بمعروفٍ.....: او امر شرعیہ میں سے جن کے اندر غیر کا نفع ہو (اونہی ما عن منکر) امور منہی عنہا سے لوگوں کی موعظت اور نصیحت ہو (او ذکر اللہ) یعنی جن اذکار الہیہ میں اللہ کی رضاء اور خوشنودی ہو جیسے تلاوت قرآن کریم صلوٰۃ علی النبی، تسبیح، تہلیل اور والدین کیلئے دعا اور اس جیسی دیگر باتیں۔

اس حدیث مبارکہ کے ظاہر سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ لوگوں کیلئے کلام کا کوئی نوع مباح نہ ہوتا ہم اگر اس حدیث کو مبالغہ اور تاکید کی الزجر پر محمول کیا جائے تو پھر یہ اشکال وارد نہ ہوگا۔ البتہ بعض نسخے ایسے ہیں جن میں ”علیہ“ کا لفظ نہیں ہے ان کے مطابق کوئی اشکال نہیں ہے اور مقصود بھی ظاہر ہے۔

کہا گیا ہے کہ ”لا لہ“ کا لفظ ”علیہ“ کی تفسیر ہے اور یہ بات محقق ہے کہ مباح کلام کا مال نفع سے خالی ہے۔
یہ مطلب ہوگا کہ ابن آدم کا سارا کلام اس کیلئے حسرت کا باعث ہوگا اس میں اس کا کوئی نفع نہیں ہوگا سوائے مذکورہ اذکار کے تب یہ باقی ذکر شدہ احادیث کے موافق ہو جائے گا۔ اور یہ باری تعالیٰ کے قول: ﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ﴾ [النساء: ۱۱۴] کے مطابق ہے اور اسی سے امر مباح بارے میں شرح کا اضطراب رفع ہوگا۔

۲۲۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللَّهِ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ

ذِكْرِ اللَّهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ إِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللَّهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۲۵/۴ الحدیث رقم ۲۴۱۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ذکر اللہ کے علاوہ زیادہ کلام نہ کرو کیونکہ ذکر اللہ کے علاوہ کلام کی کثرت دل کی سختی کا باعث ہے اور یاد رکھو کہ آدمیوں میں اللہ سے دور سب سے وہ شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔“ (ترمذی)

تشریح: قولہ: لا تكثر الكلام بغير..... قسوة للقلب: اس میں اشارہ ہے کہ کچھ کلام مباح ہوتا ہے اور وہ کلام جو مقصود ہو (فان كثرة الكلام بغير ذكر الله قسوة) یعنی قساوت قلبی کا سبب ہے اور ”قسوة“ سماع حق سے گریز مخلوق سے اختلاط کی طرف میلان، خشیت الہی کی کمی، عجز و زاری کا فقدان اور اس دار البقاء سے کثرت غفلت کو کہتے ہیں۔
قولہ: وان ابعد الناس من الله القلب القاسی: یعنی اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت اور نگاہ کرم سے دور (القلب القاسی) یعنی صاحب قلب قاسی اور یا یہ مطلب ہے ”ابعد قلوب الناس القلب القاسی“ اور یا یہ مراد ہے۔ ”ابعد الناس من له القلب القاسی“۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ قلب کا اطلاق کر کے صاحب قلب مراد لیا جائے۔ اس لئے کہ آدمی قلب ہی سے ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: ”المرء باصغریہ“ اور اس سے مراد قلب اور لسان ہے۔ تب یہ ضرورت بھی نہ رہے گی کہ موصول بمعنی بعض صلہ حذف ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ﴾ [البقرة: ۷۴] اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الَّذِينَ يَأْتُونَكَ مِنَ الْمُنَافِقِينَ أَتَوْكَ مُتَوَلِّينَ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْإِيمَانِ أَتَأْتِيهِمْ كَلِمَةٌ يَحْتَسِبُونَ﴾ [الحديد: ۱۶]

۲۲۷: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَالَّذِينَ يَكْتُمُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ كُفْرًا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي بَعْضِ

أَسْفَارِهِ فَقَالَ بَعْضُ أَصْحَابِهِ نَزَلَتْ فِي الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ لَوْ عَلِمْنَا أَنَّ الْمَالَ خَيْرٌ فَتَحَدُّهُ فَقَالَ أَفْضَلُهُ

لِسَانَ ذَاكِرٍ وَقَلْبَ شَاكِرٍ وَزَوْجَةً مُؤْمِنَةً تَعِينُهُ عَلَىٰ اِيْمَانِهِ۔ (رواه احمد و الترمذی وابن ماجہ)

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۵۹۶/۱ حدیث رقم ۱۸۵۶ مع تغییر۔ و احمد فی المسند ۲۷۸/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت والذین یکنزون الذہب والفضۃ الایۃ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں..... نازل ہوئی تو اس وقت ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ کسی سفر میں تھے بعض صحابہؓ نے کہا کہ سونے اور چاندی کے بارے میں تو یہ آیت نازل ہوگی اور ہمیں ان چیزوں کا حکم اور ان کی مذمت معلوم ہوئی کاش ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ سونے اور چاندی کے علاوہ اور کون سا مال بہتر ہے تاکہ ہم اسے جمع کریں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”خدا کا ذکر کرنے والی زبان شکر ادا کرنے والا دل اور مسلمان بیوی جو اپنے شوہر کے ایمان کے مددگار ہو“ بہترین مال ہیں“ (احمد ترمذی ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: قولہ: لِمَا نَزَلَتْ..... فَنَتَّخِذُہ:

یعنی یہ آیت کریمہ سونے اور چاندی کے بارے میں اتری ہے۔ اور ہم نے اس کا حکم اور مذمت معلوم کر لی ہے۔ (لو علمنا) ”لو تمنا یہ ہے۔ (ای المال خیر) یہ مبتدا اور خبر جملہ اسمیہ قائم مقام دو منفعلوں کا علمنا کیلئے تعلق کے طور پر (فَنَتَّخِذُہ) ”فا“ جواب تمنی کیلئے ہے اور اس کے بعد ”ان“ مقدر ہے ”نَتَّخِذُہ“ اس کی وجہ سے منصوب ہے۔ کہتے ہیں اگرچہ بظاہر یہ سوال تعیین مال کے بارے میں ہے۔ لیکن ان کی مراد یہ تھی کہ جب ساری حاجتیں، کونسا مال نفع بخش ہے۔ اس لئے آگے مذکورہ جواب دیا گیا تو یہ ایک طرح کا اسلوب حکیم کے طرز کا جواب ہے۔

قولہ: اَفْضَلُہ لِسَانَ ذَاكِرٍ، وَقَلْبَ شَاكِرٍ، یعنی افضل مال یا وہ بہترین چیز جس کو انسان سرمایہ بنائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والی زبان، قدر دان دل اور ایمان والی رفیقہ حیات۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ افضلہ کی ضمیر مجرور کا مرجع ”مال“ ہے۔ نافع کی تاویل یعنی اگر ہمیں نفع کے اعتبار سے سب سے افضل چیز کے بارے میں معلوم ہوتا تو ہم اسے اپنے لئے ذخیرہ بنا لیتے، یہی راز ہے کہ اللہ تعالیٰ ”مَنْ اَتَىٰ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ“ کی ”یَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا مَبْنُونٌ“ سے استثناء کی ہے۔

اور قلب جب آفات سے سالم ہو تو وہ اللہ کا شکر گزار رہتا ہے پھر یہ زبان تک سرایت کرتا ہے اور وہ اللہ کی ثنا میں تر رہتی ہے اور یہ سب کچھ فراغ قلب اور ایک ایسے معاون رفیق کے بغیر ممکن نہیں جو اللہ کی اطاعت میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ اتمی کلام۔

اسی وجہ سے فرمایا

قولہ: زَوْجَةً مُؤْمِنَةً تَعِينُهُ عَلَىٰ اِيْمَانِهِ: یعنی اس کے دین میں اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ بایں طور کہ اسے نماز، روزہ اور دیگر عبادات کی یاد دہانی کراتی ہے اور اسے زنا اور دیگر معاصی سے باز رکھتی ہے۔

آپ ﷺ نے مذکورہ جواب اس لئے دیا کہ کیونکہ مال انسان کیلئے نفع بخش نہیں اور مذکورہ اشیاء سے بڑھ کر انسان کیلئے کوئی فائدہ کی چیز نہیں۔

امام طیبیؒ کے کلام سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ان کے نسخہ میں ”قلب“ کا ذکر ”لسان“ کے ذکر پر مقدم ہے اس لئے انہوں نے اس پر بنیاد رکھ کر یہ بات فرمائی ہے ورنہ تو یہ کہا جائے گا کہ جب وہ لسان سے اللہ کو یاد کرے گا تو یہ اس کے دل تک سرایت کر جائے گا پھر وہ اس احسان پر شکر کرے گا پھر اللہ اس کو ایسے مونسہ بیوی عطا کرے گا جو اس کے ساتھ اس کے دین میں اعانت کرے گی یہی مریدین کا طریقہ

ہے اور اکثر سالکین کا مسلک ہے، اور جو امام طیبی نے ذکر کیا ہے وہ مرادین مجذوبین کا راستہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وقلیل ماہم.....﴾ ﴿وقلیل من عبادی الشکور.....﴾

الفصل الثالث:

۲۳۷۸: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ خَرَجَ مُعَاوِيَةَ عَلَى حَلَقَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ مَا أَجَلَسَكُمْ قَالُوا جَلَسْنَا نَذْكُرُ اللَّهَ قَالَ اللَّهُ مَا أَجَلَسَكُمْ إِلَّا ذَلِكَ قَالُوا اللَّهُ مَا أَجَلَسْنَا غَيْرَهُ قَالَ أَمَا إِنِّي لَمْ أَسْتَحْلِفْكُمْ تَهْمَةً لَكُمْ وَمَا كَانَ أَحَدٌ بِمَنْرِلَتِي مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَقَلَّ عَنْهُ حَدِيثًا مِنِّي وَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ خَرَجَ عَلَى حَلَقَةٍ مِنْ أَصْحَابِهِ فَقَالَ مَا أَجَلَسَكُمْ هُنَا قَالُوا جَلَسْنَا نَذْكُرُ اللَّهَ وَنُحَمِّدُهُ عَلَى مَا هَدَانَا لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ بِهِ عَلَيْنَا قَالَ اللَّهُ مَا أَجَلَسَكُمْ إِلَّا ذَلِكَ قَالُوا اللَّهُ مَا أَجَلَسْنَا إِلَّا ذَلِكَ قَالَ أَمَا إِنِّي لَمْ أَسْتَحْلِفْكُمْ تَهْمَةً لَكُمْ وَالِكِنَّ آتَانِي جَبْرِيلُ فَأُخْبِرُنِي أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يُبَاهِي بِكُمْ الْمَلَائِكَةَ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في واحمد في المسند ۹۲/۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت امیر معاویہؓ ایک حلقہ کے پاس پہنچے جو ایک مسجد میں جما ہوا تھا انہوں نے حلقہ والوں سے پوچھا کہ تمہیں یہاں کس چیز نے بیٹھایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ”ہم یہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں“ حضرت امیر معاویہؓ نے کہا کہ ”بخدا تمہیں خدا کے ذکر ہی نے یہاں بیٹھایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں صرف خدا کے ذکر ہی نے یہاں بیٹھایا ہے؟ حضرت معاویہ نے کہا ”دیکھو! میں نے تم پر تہمت رکھنے کے لئے تمہیں قسم نہیں دی بلکہ میں نے نبی کریم ﷺ کے اتباع کے پیش نظر قسم کھلائی ہے کہ آپ ﷺ نے بھی اسی طرح کہا تھا اور پھر معاویہؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث کو کم نقل کرنے کے سلسلہ میں میرے برابر کوئی نہیں تھا یعنی میں احتیاطاً بہت کم احادیث روایت کرتا تھا کہ مبادا کہیں کوئی کمی و زیادتی ہو جائے اور پھر اس کا وبال میری گردن پر ہو اس بات سے حضرت معاویہؓ کا مقصد یہ آگا ہی تھی کہ روایت حدیث میں مجھ سے کوئی بھول نہیں ہوتی کیونکہ نسیان کا احتمال تو اسی شخص کے لئے ہوتا ہے جو بہت زیادہ روایت کرے اور ظاہر ہے کہ میں ایسا نہیں تھا بہر کیف حضرت معاویہؓ نے کہا کہ اسی طرح ایک دن نبی کریم ﷺ اپنے صحابہؓ کے ایک حلقہ کے پاس پہنچے آپ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ”یہاں تمہیں کس چیز نے بیٹھایا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا! ہم یہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور ہم اس کی اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اسلام کی ہدایت بخشی اور اس کے ذریعہ ہم پر احسان کیا“ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بخدا تمہیں صرف اسی چیز نے یہاں بیٹھایا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ خدا کی قسم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمیں اس چیز نے یہاں بیٹھایا ہے“ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو میں تم پر جھوٹ کی تہمت رکھنے کے لئے تم سے قسم نہیں کھلائی بلکہ میرے پاس جبرئیل آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ اللہ عز و جل اپنے فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: خرج معاویة علی حلقة فی المسجد: حلقہ لام کے سکون کے ساتھ ہے اور کبھی اس کو فتح بھی دیا جاتا

ہے دائرے کے شکل میں بیٹھے لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ جو آئے سامنے بیٹھے ہوئے اپنی اجتہاد سے ذکر کر رہے تھے۔

قوله فقال: ما اجلسکم: یعنی وہ کو مناسب ہے جس نے تمہیں اس خاص کیفیت پر بیٹھنے پر مجبور کیا ہے ”ما“ استفہامیہ ہے۔
 قوله: جلسنا نذکر اللہ قال: اللہ ما اجلسکم الا ذلك: یعنی ہمارے بیٹھنے کا باعث اللہ کے ذکر کیلئے اجتماع ہے۔
 ”اللہ“ شروع میں ہمزہ مدودہ اور آخر میں جر کے ساتھ (ما اجلسکم الا ذلك) یہ ”ما“ نافیہ ہے۔ سید جمال الدین فرماتے ہیں کہ یہ بالجہ درست ہے کیونکہ محقق شریف نے اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ہمزہ استفہام جب حرف قسم کا بدل بن کر آئے تو اس کے ساتھ جروا جب ہے۔ انتہی۔ نیز مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں اور صحیح مسلم میں بالجہ واقع ہے۔ جبکہ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بالنصب وارد ہے۔ انتہی۔
 اس سے یہ معلوم ہوا کہ سید شریف کا مشکوٰۃ کے اوپر جو حاشیہ ہے وہ طبی کا خلاصہ ہے اور یہ بات لوگوں میں مشہور بھی ہے لیکن یہ بعید ہے اولاً تو اس لئے کہ اس کا ذکر کی تالیفات میں نہیں ہے اور ثانیاً اس لئے کہ وہ اپنی جلالت شان کے باوجود ایسا کیسے کر سکتا ہے کہ کچھ تصرف کے بغیر مجرد اختصار کرے۔

نیز علامہ عقیف الدین کے نسخہ میں چاروں جگہ نصب ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں ”اللہ“ بالنصب ہے اور تقدیر ہے ”انقسمون باللہ“ تو ”با“ حرف جر کو حذف کر کے اسے فعل کے ساتھ ملایا گیا بطور حذف و ایصال کے پھر فعل کو بھی حذف کر لیا گیا۔ انتہی۔
 حافظ ابن حجر نے گرفت کی ہے تاہم ان کی گرفت میں تکلف اور سینہ زوری ہے۔

قوله قالوا: اللہ ما اجلسنا غیرہ: یعنی ہاں ہمیں اللہ کی قسم ہے۔ (ما اجلسنا غیرہ) یہاں ہمزہ ”ای“ کی جگہ واقع ہوا ہے مشاکلت کی غرض سے۔

لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمزہ حرف قسم کے بدلہ میں آیا ہے تو پھر مشاکلت چہ معنی وارد ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جواب میں ایک طرح کا اطناب واقع ہوا ہے چنانچہ ”لعم“ ”امی“ نہیں کہا گیا۔

قوله: اما انی لم استحلفکم..... حدیثنا منی: (ما) یہ تخفیف کے ساتھ ہے حرف تنبیہ ہے (انی) یہ حرف بالکسر ہے صحیح نسخوں میں۔

اور رہا حافظ ابن حجر کا یہ قول کہ ”اما“ یا استفتاحیہ ہے اور یا بمعنی ”حقاً“ ہے اور اس کے بعد ”انی“ معنی اول کے مناسبت سے مکسور اور معنی ثانی کے مناسبت سے مفتوح یہ ان کی اپنی اختراع ہے تاہم ”اما“ کا حقاً کے معنی میں ہونا کسرہ کے منافی نہیں۔ (لم استحلفکم تہمة لکم) ”تہمة“ کا لفظ ”ہا“ کے سکون کے ساتھ ہے اور کبھی اس کو فتح بھی دیا جاتا ہے۔

”نہایہ“ میں ہے کہ ”تہمة“ کا لفظ کبھی مفتوح الہاء بھی استعمال ہوتا ہے جو ”وہم“ کے مادہ سے ”فعلتہ“ کا ہم وزن ہے اس کے شروع کی ”تا“ واؤ سے مبدل ہے۔ کہا جاتا ہے ”اتہمتہ“ یعنی جو اس کی طرف منسوب ہے میں نے اس کو اس میں خیال کیا۔ اور قاموس میں ہے کہ ”تہمة“ ”ہمزہ“ کی طرح ہے، اور مطلب یہ ہے کہ میں نے تم سے قسم اس لئے نہیں لی کہ میں تمہیں متہم بالکذب کر رہا ہوں بلکہ میں نے تو فقط متابعت اور مشابہت رسول اللہ ﷺ کیلئے ایسا پوچھا ہے چنانچہ ایسا واقعہ حضور ﷺ اور صحابہ کے درمیان بھی ہوا ہے۔ اور انہوں نے آپ ﷺ نے اپنا قرب نقل کر حدیث کا تذکرہ کر کے اپنے اوپر سے تہمت کذب کی نشی کی ہے اپنے نقل کردہ کلام میں۔ (ومان کان احدٌ بمنزلتی) یعنی جو قرب رسول کے لحاظ سے میرا مرتبہ ہے۔ (من رسول اللہ) کیونکہ ایک تو وہ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ کے بھائی تھے اسی وجہ سے مولانا روم نے مثنوی میں ”خال المؤمنین“ سے انہیں تعبیر کیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ وہ جلیل القدر لوگوں میں سے ایک تھے کو کتابت وحی پر مامور تھے۔ (اقل) یہ ”کان“ کی خبر ہے۔ (عنه) یعنی رسول اللہ ﷺ سے۔ (حدیثنا منی) کیونکہ میں

حدیث کے نقل میں احتیاط سے کام لیتا تھا ورنہ ان کی قربت کا تقاضا تو یہ تھا۔ یہ روایت حدیث میں سب سے آگے ہوتا اور یہ شاید اس لئے بھی کہ یہ روایت بالمعنی کو ناجائز تصور کرتے تھے۔

قوله: وان رسول اللہ ﷺ من اصحابہ امام طیبی فرماتے ہیں کہ مقصد یہ ہے کہ میں نے تم سے قسم نہیں اٹھو اما لیکن رسول اللہ ﷺ کی قسم نہ لے۔

لکنہ اتانی جبرئیل "اور درمیان میں" وما کان جملہ معترضہ ہے یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بات نہیں بھولے اور "ان رسول اللہ" انی لم استحلفکم کے ساتھ متصل ہے۔ جیسے کہ استدرک مستدرک کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔

قوله: ما اجلسکم الا ذلک: انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ ہم بیٹھے اللہ کو یاد کر رہے ہیں اور اللہ پاک نے ہمیں جو اسلام کی ہدایت سے نوازا اور اسلام کی وجہ سے ہم پر احسان کیا ہم اس پر اللہ پاک کی تعریف کر رہے ہیں۔ یعنی اللہ پاک نے ہم پر اپنی یاد اور اسلام کے سبب ہم پر احسان کیا۔ (علینا) یعنی لوگوں میں ہمیں ہدایت عطا فرمائی۔ جیسا کہ اللہ پاک اہل جنت کا مقولہ حکایت فرماتے ہیں: ﴿الحمد لله الذي هدانا للاسلام وما كنا لنهتدي به لولا ان هدانا الله﴾ [الاعراف: ۴۳] یہ آیت کریمہ صحابہ کرامؓ کے اس شعر کی ترجمانی ہے۔ "لو لا الله ما اهتدينا۔ ولا تصدقنا ولا صلينا"۔

(فقال الله ذلک) شاید آپ نے اپنی اس بات سے اخلاص کا ارادہ کیا ہے (یعنی خالصتاً تم اللہ ہی کے ذکر کیلئے جمع ہو اور کوئی غرض نہیں۔

قوله: اما انی لم استحلفکم تهمه لکم: کیونکہ مؤمنین کی بات کی صداقت کو پرکھنے کیلئے قسم لینا یہ مؤمنین کے ساتھ حسن ظن کے منافی ہے۔

قوله: ولکنہ اتانی جبرئیل الملائکة: یعنی "لکنہ" میں ضمیر ضمیر شان ہے اور ایک نسخہ میں لکنی بھی منقول ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ذاکرین کی وجہ سے اللہ رب العزت کے مہابت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک فرشتوں کو فرماتے ہیں کہ میرے ان بندوں کو دکھو میں نے ان پر ان کے نفوس، خواہشات، شہوات، شیطان اور اس کے لشکر کو کیسے مسلط کر رکھا ہے اور اس کے باوجود ان کو ترک عبادت و ذکر و باطل کی طرف تقویٰ کی مخالفت کیلئے میں نے ان کی ہمت کو تقویت عطا فرمائی ہے۔

تو لہذا بنا بریں وہ تم سے زیادہ تعریف کے مستحق ہیں اس لئے کہ تم کو کسی طرح بھی عبادت کیلئے مشقت نہیں اور اس عبادت کا تم سے صدور اس طرح ہوتا ہے جس طرح انسانوں سے سانس کا صادر ہونا (یعنی جس طرح سانس بے قصد از خود کرتا رہتا ہے اس طرح تم سے عبادت بھی از خود بے قصد صادر ہوتی ہے۔

اس سانس لینے میں نفس انسانی کیلئے انتہائی راحت اور خوشگوار ہو کر تھی ہے (اسی طرح تمہارے لئے عبادت راحت کا سبب ہے نہ کہ مشقت کا)۔ امام طیبی فرماتے ہیں آپ ﷺ کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ میں تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ اس اکٹھے ہونے کا سبب کیا ہے سبب دریافت ہونے کے باوجود قسم لینا مزید پختگی اور تاکید کیلئے ہے نہ کہ کسی تہمت کی وجہ سے جبکہ اصل وضع تحلیف اور قسم لینے کی رفع تہمت ہی کیلئے ہے اس لئے جو شخص متہم ہی نہ ہو تو اس سے قسم بھی نہیں لی جاتی۔

۲۲۷۹: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُسْرِ بْنِ رَجُلٍ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ شَرَّ أَعْيُنِ الْإِسْلَامِ قَدْ كَفَّرَتْ عَلَيَّ فَأَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ أَتَشَبَّثُ بِهِ قَالَ لَا يَزَالُ لِسَانَكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ.

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۶/۵ حدیث رقم ۳۴۳۵۔ وابن ماجہ ۱۲۴۶/۲ حدیث رقم ۳۷۹۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اسلام کے احکام مجھ پر بہت بھاری ہیں یعنی نوافل اتنے ہیں کہ میں اپنے ضعف و عجز کی بنا پر ان کی ادائیگی سے معذور ہوں اس لئے آپ مجھے ایسی چیزیں بتادیتے کہ جن کو میں لازم پکڑوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہمیشہ تر ”یعنی جاری رہتی چاہئے“ (ترمذی ابن ماجہ) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔“

تشریح: قولہ عن عبد اللہ بن بسر: لفظ بسر میں باء مضموم اور سین ساکن ہے۔

قولہ: ان شرائع الاسلام قد کثرت علی: امام طیبیؒ شریعت لغت میں جاری پانی پر اونٹ کے وارد ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور حدیث میں شریعت سے مراد وہ چیز ہے جس کو اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لیے ظاہر فرمائی ہیں۔ اٹھلی کلامہ، اور ظاہر یہاں یہ ہے کہ حدیث مبارکہ میں شریعت سے مراد نوافل ہیں، شریعت سے نوافل مراد لینے کا قرینہ آپ ﷺ کا یہ قول ہے (قد کثرت علی) ہے اور لفظ کثرت ثاء کے ضمہ اور فتح دونوں کے ساتھ ہے یعنی یا رسول اللہ! مجھ پر نوافل کی کثرت غالب آگئی ہے میں اپنے ضعف کی وجہ سے نوافل سے عاجز آچکا ہوں۔

قولہ: فاخبرنی بشیء اتشبت بہ: کہا گیا ہے کہ سائل کی مراد شے سے یہ ہے کہ شے تو تھوڑی ہو لیکن اس کا اجر بڑا ہوتا کہ میں اس شے قلیل کی وجہ سے اپنے اوپر غالب آنے والے اور مشقت رساں نوافل سے مستغنی ہو جاؤں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ”بشیء“ میں تکثیر برائے تفتیل ہے اور تفتیل بھی ایسی جو تعظیم کے معنی کو متضمن ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَرِضْوَانٍ مِنَ اللَّهِ الْكَبِيرِ﴾ [التوبة: ۷۲] سائل کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آسان چیز مجھے بتلائیے جو نفع کثیر کھینچ لانے والی ہو۔ اٹھلی کلامہ۔

(اتشبت) اسی تعلق (بہ) یعنی ایسی جامع عبادت جو ایک مخصوص مکان میں یا کسی مخصوص زمانہ میں یا کسی مخصوص حال میں علاوہ، مثلاً کھانے پینے کی حالت اٹھنے اور بیٹھنے کی حالت لوگوں سے ملنے اور ان سے جدا ہونے کی حالت جوانی اور بڑھاپے کی حالت مانع ہونے کی وجہ سے مشقت میں ڈالنے والی نہ ہو۔ (بلکہ ہر حالت ہر مکان و زمان میں ادا کی جاسکتی ہو)۔

قولہ: قال لا يزال لسانك رطبا من ذكر الله: یعنی وہ عبادت یہ ہے کہ ہمیشہ (لسانك) یعنی زبان سے مراد یا تو زبان قالب یعنی ظاہر آگوشت کی لوٹ پوٹ ہونے والی زبان یا دل کی زبان مراد ہے۔ (رطبا) اسی طریقاً ہر قریب زمانہ میں مشغول ہونے والی۔

۳۲۸۰: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَمِعَ أُمَّ الْعِبَادِ أَفْضَلَ وَأَرْفَعُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ الدَّاكِرُونَ اللَّهُ كَثِيرٌ وَالذِّكْرَاتُ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمِنَ الْغَايِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ لَوْ ضَرَبَ بِسَيْفِهِ فِي الْكُفَّارِ وَالْمُشْرِكِينَ حَتَّى يَنْكَسِرَ وَيَخْتَضِبَ دَمًا فَإِنَّ الدَّاكِرَ لِلَّهِ أَفْضَلُ مِنْهُ دَرَجَةً

(رواه احمد و الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۷/۵ حدیث رقم ۳۴۳۶۔ و احمد فی المسند ۷۵/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا بندہ بہتر ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلندتر درجہ کا مالک ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے مرد اور عورتیں“ عرض کیا گیا کہ ”یا رسول اللہ! کیا یہ جہاد کرنے والوں سے بھی افضل ہیں اور بلند مرتبہ ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر کوئی شخص کفار اور مشرکین پر اپنی تلوار مارے یہاں تک کہ وہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین ہو جائے تو اس میں

کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا شخص باعتبار درجہ کے اس شخص سے بہتر ہے۔“ (احمد ترمذی) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قولہ: سنن ای العباد افضل..... والذاکرات: یعنی جو حصول ثواب کے اعتبار سے بہت زیادہ ہو۔

ذاکرین اور ذاکرات کا مفعول یہ لفظ اللہ ہے (یعنی اللہ کا زیادہ ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں افضل العباد ہیں) اور بعض نسخہ جات میں ذاکرات کا لفظ نہیں ہے اور کہا گیا کہ ان بندوں سے مراد وہ بندے ہیں جو اللہ کے ذکر و فکر پر مداومت کرنے والے ہوں اللہ کی فرمانبرداری پر قائم رہنے والے ہوں اور اس کے شکر پر مواظبت اختیار کرنے والے ہوں اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ بندے جو حدیث میں وارد ہونے والے اذکار کو تمام اوقات و احوال میں بجالانے والے ہوں اور حقیقت میں یہی بات مراد ہے اس لئے کہ یہ صورت اکثر اوقات کو مشغولی ذکر کے ساتھ ضبط کرنے والی ہے

قولہ: من الغازی..... افضل منه درجۃ: کہا گیا کہ منشاء اس سوال کا یہ ہے کہ ذاکرین غیر ذاکرین سے تو افضل ہیں کیا ذاکرین غازی فی سبیل اللہ بھی افضل ہیں یہ بات انہوں نے بر بنائے تعجب کہی۔

”لو ضرب بسيفه في الكفار“ حدیث کا یہ جملہ یہ ”یحرح فی عزاقیہا نصلی) کے قبیل سے ہے یعنی وہ شخص زخم کرتا ہے اس کی کونچوں میں یعنی کونچوں کو یہاں بھی مفعول بہ کی جگہ مفعول فیہ کو لایا گیا ہے اور یہ ارتکاب کہ ان کافروں میں ضرب بالسيف پائے جانے اور ان کو مکان ضرب ٹھہرانے کیلئے مبالغہ کے طور پر کہا گیا اور اس بات کی توضیح علامہ ابن حجر کے اس قول سے بھی ہوتی کہ وہ فرماتے ہیں ان کو ضرب بالسيف کیلئے مکان اور ظرف بنانا ان کو صرف مضروب بالسيف بنانے سے ابلغ ہے۔ (والمشركین) یہ تخصیص بعد التمیم مشرکین کی اہتمام شان کی وجہ سے ہے کیونکہ مشرکین موحدین کی ضد ہے (اس لئے عام کفار کے بعد خاص کفار کا ذکر کیا)۔ (حتی ینکسر) ینکسر کا فاعل سیف ہے۔ (ویختضب) یختضب کا فاعل یا تو غازی یا اس کی تلوار ہے۔ (دمًا) یہ غازی کے مرتبہ شہادت پر فائز ہونے سے کنایہ ہے۔ (فان الذاکر) تکرار برائے تاکید و چنگلی۔ (اللہ) یعنی ذکر سے مراد اللہ کا ذکر ہے نہ کہ اللہ کے غیر کا ذکر۔ (افضل منه) اور ایک دوسری روایت اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ہے یعنی افضل من الغازی ہے۔ (درجۃ) اور جہ میں یہ بھی احتمال ہے کہ تاء برائے وحدۃ ہو جس کا بدرجۃ واحده عظیمۃ (یعنی ذاکر غازی سے ایک عظیم درجہ افضل ہے)۔ اور درجہ جس کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ یعنی ذاکر متعدد درجات کے ساتھ نمازی سے افضل ہے اور ایک روایت لکان الذاکرون اللہ افضل بھی آیا ہے۔

۲۲۸۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الشَّيْطَانُ جَائِمٌ عَلَى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ فَإِذَا ذَكَرَ اللَّهُ حَنَسَ وَإِذَا غَفَلَ وَسُوسَ۔

رواه البخاری تعلیقاً

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”شیطان انسان کے دل سے

چپکا رہتا ہے جب وہ دل سے اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے“ اس روایت کو بخاری نے بطریق تعلیق نقل کیا ہے۔“

تشریح: قولہ: الشيطان جائم على قلب ابن آدم: یعنی ہمیشہ چمٹنے والا اور لازم الجلوس ہے

قولہ: فاذا ذكر الله.....: ذکر کا فاعل یا ابن آدم ہے یعنی اپنے دل سے اپنے اللہ کو یاد کرتا ہے۔ یا ذکر کا فاعل قلب ابن آدم ہے یعنی ابن آدم کا دل اللہ کو یاد کرتا ہے۔

(یعنی خنس) یعنی شیطان منقبض ہو جاتا ہے ذاکر سے پیچھے ہٹ کر چھپ جاتا ہے اور شیطان کا وسوسہ کمزور پڑ جاتا ہے اور شیطان کا ضرر کم ہو جاتا ہے۔ (واذا غفل) غفل کا فاعل یا تو ذاکر ہے یا ذاکر کا قلب یعنی جب ذاکر یا ذاکر کا دل اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا تو (وسوس) یونی اس ذاکر کی طرح وسوسہ ڈالتا ہے اور ذاکر قلب پر مکمل تسلط جمالیتا ہے تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غفلت وسوسہ شیطان کا سبب ہے۔ عام علماء صوفیاء کے نزدیک یہی بات مشہور ہے۔

(اس کو بخاری نے روایت کیا تعلیقاً) یعنی تعلق کا مطلب ہے حدیث کو بلا سند ذکر کرنا۔ علامہ جزری نے اپنی کتاب حصن میں وسوسہ شیطان کے واقعہ کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

ما من آدمی الا ولقلبه بيتان في احدهما الملك وفي الآخر الشيطان فاذا ذكر الله خنس واذا لم يذكر الله

وضع الشيطان منقاره في قلبه ووسوس اليه

”ابن آدمی کے دل میں دو گھر میں ایک میں فرشتہ دوسرے میں شیطان ہوتا ہے جب آدمی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو شیطان اپنی چونچ ابن آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے اور وسوسہ ڈالتا ہے۔“

اس کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں ذکر کیا ہے اور ظاہر بات یہ ہے کہ شیخ قدس سرہ کا اس حدیث کو اپنی کتاب میں لانا یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے لیکن صاحب سلاح نے اس کو عبد اللہ بن شقیق سے موثوقاً نقل کیا ہے۔

اور صاحب سلاح نے حدیث کے آخر میں یہ بات ذکر کی ہے کہ اس کو ابن ابی شیبہ نے کتاب فضائل القرآن میں روایت کیا ہے اور اسی طرح اس کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف ابن ابی شیبہ کتاب میں بھی روایت کیا ہے اور اس روایت کے تمام راوی صحیح ہیں۔ اتنی کلامہ۔ اس ساری قیل وقال کے بعد اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں مرفوع ہو اور کتاب فضائل القرآن میں موقوف اور حضرت انس کی حدیث جو مرفوعاً منقول ہے (اسی مضمون پر مشتمل ہے) وہ بھی اس حدیث کے مرفوع ہونے کی شہادت دیتی ہے حدیث انسؓ یہ ہے:

ان الشيطان واضح خروطومه على قلب ابن آدم فان ذكر الله خنس فان نسى التغم قلبه۔ ”شیطان ابن آدم کے قلب پر اپنا سونٹھ رکھ لیتا ہے اگر وہ اللہ کا ذکر کرے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اگر غافل ہو جائے تو اس کے دل کو لقمہ بنا لیتا ہے۔

(ابن ابی دنیا اور ابو یعلیٰ اور یحییٰ نے اس حدیث کی تخریج کی ہے یہ جملہ احادیث بعض عارفین کے اس قول کی تائید کرتی ہیں کہ کسی عارف نے اللہ پاک سے سوال کیا اے اللہ! سب انسانوں کے قلب پر وسوسہ شیطان کی کیفیت کو اس پر کھول دیجئے تو عارف نے دیکھا کہ شیطان بائیں کندھے کی نرم ہڈی کے نیچے بیٹھا ہوا ہے پھر کی طرح اس کا سونٹھ لبا۔ دتا ہے تو اپنے منہ کو اسی مقام پر دھنسا دیتا، یہاں تک کہ اس کا سونٹھ ابن آدم کے قلب تک پہنچ جاتا ہے اگر وہ دیکھتا ہے کہ ابن آدم ذکر کر رہا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور باز آ جاتا ہے۔ اور اگر غافل پاتا ہے تو وہ اپنا سونٹھ انسان کے قلب کی طرف بڑھا دیتا ہے اور قلب انسان میں وہ خباثت ڈال دیتا ہے جس کا اللہ پاک ارادہ فرماتے ہیں پھر شیطان اپنا یہ کام ہمیشہ جاری رکھتا یہاں تک قلب انسانی میں ذرا بھر بھی خیر باقی نہیں رہتا۔ حضرات علماء آپ ﷺ کے اس ارشاد کے مطلب کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ان الشيطان يعجرى من ابن آدم مجرعى الدم.....

بعض حضرات نے فرمایا ہے حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے کیونکہ اللہ پاک نے شیطان کو ایسی قوت اور قدرت عطا کی ہے کہ وہ انسان کے باطن اور اس کی رگوں کے خون دوڑنے کی جگہ میں دوڑتا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ شیطان کے کثرت و سادس سے کناہیہ ہے گویا کہ وہ شیطان انسان سے جدا نہیں ہوتا جس طرح انسان کا خون اس

سے جدا نہیں ہو پاتا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ شیطان انسانی بدن کے باریک سوراخوں میں وسوسہ ڈالتا ہے وہاں سے وہ وساوس قلب انسانی تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

۲۴۸۲: وَعَنْ مَا لِكَ قَالَ بَلَّغْنِي أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ ذَاكِرُ اللَّهِ فِي الْغَائِلِينَ كَالْمُقَاتِلِ خَلْفَ الْفَارِيزِ وَذَاكِرُ اللَّهِ فِي الْغَائِلِينَ كَغُصْنِ أَخْضَرَ فِي شَجَرٍ يَا بَسِ-

رواہ رزین۔

ترجمہ: ”اور حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ”غافلوں کے درمیان خدا کا ذکر کرنے والا بھاگنے والوں کے پیچھے لڑنے والے کی مانند ہے جو میدان کارزار میں اپنے لشکر کے بھاگ کھڑے ہونے کے بعد تنہا ہی کافروں کے مقابلہ میں ڈٹتا رہے ایسے شخص کی بہت ہی زیادہ فضیلت منقول ہے اور غافلوں کے درمیان خدا کا ذکر کرنے والا خشک درخت میں سرسبز شاخ کی مانند ہے۔“

تشریح: قولہ: ذاکر اللہ فی الغافلین کالمقاتل خلف الغافلین: غافلین کا صلہ عن ذکر اللہ یعنی اللہ کی یاد سے غافل لوگ (کالمقاتل) مقاتل کا صلہ للكفار ہے یعنی کافروں سے قتال کرنے والا۔ (خلف الغافلین) ای المنہر مین شکست خوردہ۔

قولہ: وذاکر اللہ فی الغافلین کغصن اخضر فی شجر یابس:

لفظ ذاکر اللہ کا تکرار نا اس وجہ سے ہے تاکہ ہر دفعہ میں اس کے ساتھ وہ چیز متعلق ہو جائے جس چیز نے دوسرے لفظ ذاکر اللہ کا تعلق پکڑا ہے اور ذاکر اللہ کے تکرار لانے سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر ایک ایسا امر عظیم ہے جس کے متعدد فوائد ہیں اور ہر فائدہ اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ (فی الغافلین) یعنی غافلین کے درمیان رہ کر ذکر اللہ کرنا خواہ وہ غافلین مسجد میں ہوں یا بازار میں۔

فی حرف جار ظرف کیلئے ہے اس لئے فی الغافلین بینہم کے معنی میں ہے اس لئے کہ فی کا ظرفیت کیلئے ہونا ظاہر بات ہے۔ یا بملہ فی الغافلین محلاً مرفوع اس بنا پر کہ یہ صفت ہے موصوف محذوف کیلئے تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ ”الذاکر الکاثن فی الغافلین“ باقی رباعی علامہ ابن حجر کا قول کہ تقدیر عبارت ”ذاکر اللہ حال کونہ فی الغافلین ای بینہم“ ابن حجر کے اس قول کو ضابطہ کے خلاف سمجھا گیا جس پر جمہور ہیں۔ یعنی مبتدا سے حال بنانا درست نہیں ہے۔

(کغصن اخضر فی شجر یابس) یعنی ذاکر غافلین میں اس طرح ہے جیسا کہ سرسبز درخت خشک درختوں کی ایک جانب میں

کھڑا ہو۔

۲۴۸۳: وَفِي رِوَايَةٍ مَثَلُ الشَّجَرَةِ الْخَضْرَاءِ فِي وَسْطِ الشَّجَرِ وَذَاكِرُ اللَّهِ فِي الْغَائِلِينَ مِثْلُ مِصْبَاحٍ فِي بَيْتٍ مُظْلِمٍ وَذَاكِرُ اللَّهِ فِي الْغَائِلِينَ يُرِيهِ اللَّهُ مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهُوَ حَيٌّ وَذَاكِرُ اللَّهِ فِي الْغَائِلِينَ يَغْفِرُ لَهُ بَعْدَ كُلِّ فَيْصِحٍ وَأَعْجَمٍ وَالْفَيْصِحُ بَنُو آدَمَ وَالْأَعْجَمُ الْبُهَائِمُ - (رواہ رزین)

رواہ رزین۔

ترجمہ: ”ایک روایت میں یوں ہے کہ ”درختوں کی درمیان سرسبز و شاداب درخت کی مانند ہے اور خدا کا ذکر کرنے

والا اندھیرے گھر میں چراغ کی مانند ہے اور غافلوں میں خدا کا ذکر کرنے والا ایسا شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کی زندگی ہی میں جنت میں اس کی جگہ دکھلاتا ہے یعنی یا تو بذریعہ مکاشفہ دکھاتا ہے یا خواب میں اور یا اس کو ایسا یقین بخشتا ہے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور غافلوں میں خدا کو یاد کرنے والا ایسا شخص ہے جس کے گناہ ہر فصح اور اعجم کے عدد کے بقدر بخشے جاتے ہیں، فصح سے مراد انسان اور اعجم سے مراد جانور ہیں۔“ (رزین)

تشریح: قوله: مثل الشجرة الحضرء في وسط الشحر :

لفظ مثل میم اور ثاء کے فتح کے ساتھ ہے اور ایک نسخ میں میم کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ ہے اور لفظ کغض سے بدل (فی وسط الشجره) شین کے فتح اور سکون دونوں کے ساتھ ہے۔ اور شجر سے خشک درخت مراد ہیں، یہی مطلب اس حدیث کا ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔

قوله: وذاكر الله في الغافلين مثل مصباح في بيت مظلم: یعنی اللہ کا ذکر کرنے والا چراغ کی مثل ہے۔ (فی بیت مظلم) اس لئے کہ اللہ کا ذکر روشنی خوشی اور حضوری ہے لیکن غفلت سراسر اندھیرا نفرت اور غیبت ہے۔

قوله: وذاكر الله من الجنة وهو حي: یعنی وہ جگہ جو اللہ نے خصوصی طور پر ذکر و شام کیلئے تیار کر رکھی ہے۔

”وہو حی“ جملہ حالیہ ہے یعنی اس کی حالت حیات ہی میں اس کو جنت کا ٹھکانا دکھلایا جاتا شاید یہ جنت کا ٹھکانہ بذریعہ کشف دکھلایا جائے گا یا جان کنی کے وقت فرشتوں کے نازل ہونے کے ساتھ ہی جنت کا ٹھکانہ دکھلایا جائے گا اس پر قرینہ قرآن حکیم کی یہ آیت ہے: ﴿ان الذين قالو ربنا الله ثم استقاموا﴾ (فصلت: ۳۰)

قوله: وذاكر الله في الغافلين يغفر له ای ذنوبہ یعنی اس کے گناہوں کو بخش دیا جاتا ہے۔ (بعد دکل فی صیح واعجم) اس لئے کہ خداوند قدوس نے ضابطہ بیان کیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔

اس کو بزار اور طبرانی نے بھی اپنی کتاب اوسط میں روایت کیا ہے اور یہ دونوں روایتیں حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً ان الفاظ کے ساتھ منقول ہیں: ذاکر اللہ فی الغافلین بمنزلة الصابر فی الفارین۔

۲۲۸۳: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ مَا عَمِلَ الْعَبْدُ عَمَلًا أَنْجِي لَهُ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ

(رواه مالك والترمذی وابن ماجه)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۸۱۵ حدیث رقم ۳۴۳۷۔ وابن ماجه ۱۲۴۵۱۲ حدیث رقم ۳۷۹۰۔ وملك-

ترجمہ: ”اور حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ ”ایسا کوئی عمل نہیں ہے جسے بندہ کرے جو ذکر اللہ سے زیادہ اللہ کے عذاب سے نجات دلائے۔“ (مالک ترمذی ابن ماجہ)

تشریح: اسنادی حیثیت: یہ حدیث حضرت معاذ پر موقوف نہیں بلکہ اگر ہو بھی تو بھی یہ مرفوع کے حکم میں ہوگا۔ کیونکہ صحابی اس قسم کی بات اپنی رائے سے نہیں کر سکتا۔

قوله: ما عمل العبد عملاً: یعنی عمل سے مضبوط قسم کا مسنون اور مستحب عمل مراد ہے یا مطلقاً عمل مراد ہے۔

قوله: انجی له من عذاب الله من ذكر الله: پہلا ”من“ بیان کیلئے اور دوسرا ”من“ وہ ہے جو اسم تفضیل کے ساتھ استعمال

ہوتا ہے۔

روایات باب: اسی مضمون کی حدیث کو احمد طبرانی ابن ابی شیبہ نے مرفوعاً ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا:

ما عمل آدمی انجلی له من عذاب اللہ من ذکر اللہ قالوا ولا الجهاد فی سبیل اللہ الا ان یضرب بسیفه حتی یقطع قاله ثلاث مرات -

”ایسا کوئی عمل نہیں ہے جسے کوئی بندہ کرے وہ ذکر اللہ سے زیادہ اللہ کے عذاب سے نجات دلائے۔ تو صحابہ نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! کیا جہاد فی سبیل اللہ اللہ کے ذکر سے زیادہ نجات دینے والا نہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ بھی ایسا نہیں الا یہ کہ مجاہد اپنی تلوار چلائے اور اتنی چلائے کہ وہ ٹوٹ جائے تو اس قسم کا جہاد فی سبیل اللہ انجلی من ذکر اللہ آپ نے یہ بات تین دفعہ ارشاد فرمائی۔“

۲۲۸۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يَقُولُ أَنَا مَعَ عَبْدِي إِذَا ذَكَرَنِي وَتَحَرَّكَتْ بِي شَفَاتُهُ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری تعليقاً ۵۸۰/۱۳ فی باب ((ولا تحرك لسانك لتعجل به))۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر کے لئے اپنے دونوں ہونٹ ہلاتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔“ (بخاری)

تشریح: قولہ: انا مع عبدی اذا ذکرنی و تحرکت بی یعنی معیت سے مراد اعانت، توفیق رحمت، اور رعایت کی صورت میں معیت ہے اور بعض نے کہا کہ معیت کنایہ ہے شرف و قربت سے اس لئے کہ حدیث یہی میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں ”انا جلیس من ذکرنی اور جیسا کہ کہا جاتا ہے ”فلان جلیس السلطان یعنی فلاں آدمی بادشاہ کے ہاں معزز و مقرب ہے اور یہ حدیث اثبات قربت کے سلسلہ میں مبلغ اس لئے کہ یوں نہیں فرمایا کہ وہ میرے ساتھ ہوتا بلکہ یوں فرمایا کہ میں اس کا ساتھی ہوں۔ (اذا ذکرنی) یعنی دل کے ساتھ مجھے یاد کرتا ہے یا زبان کے ساتھ۔ (و تحرکت بی) ای بذکری یعنی میرے ذکر کی وجہ سے۔ (شفاتاً) امام طہیٰ فرماتے ہیں کہ ”اذا ذکرنی باللسان“ کی نسبت ”اذا ذکرنی و تحرکت بی شفاتاً میں زیادہ مبالغہ ہے۔ (اس لئے کہ وہاں ذکر باللسان محض ہے) اور یہاں حرکت لسان کے ساتھ حرکت شفقتہ کا ذکر ہے لیکن یہ ساری تقریر اس صورت میں جبکہ واؤ کو حالیہ بنایا جائے۔ اگر واؤ کو عاطفہ بنایا جائے تو پھر ذکر باللسان و ذکر بالقلب کے جمع ہونے کا بھی احتمال ہے اور یہ تاویل ثانی زیادہ بہتر ہے کیونکہ مؤثر اور نافع ایسا ذکر باللسان ہے جو حضور قلبی کے ساتھ ہو۔ (یعنی حضور قلبی کی حیثیت تابع کی سی ہو)۔ باقی یکبارگی مستقل طور پر زبان اور قلب کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا زیادہ نافع نہیں ہے بلکہ یہ محض مشغولی کا باعث ہے۔

۲۲۸۶: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ لِكُلِّ شَيْءٍ صَفَالَةٌ وَصَفَالَةُ الْقُلُوبِ ذِكْرُ اللَّهِ وَمَا مِنْ شَيْءٍ أَنْجَى مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ قَالُوا وَلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ وَلَا أَنْ يَضْرِبَ بِسَيْفِهِ حَتَّى يَنْقُطِعَ. (رواه البيهقي في الدعوات الكبير)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۱۴/۱۱ حدیث رقم ۶۴۱۰ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۶۲/۴ حدیث رقم (۵- ۲۰۷۷)۔

وابن ماجہ ۱۲۶۹/۲ حدیث رقم ۳۸۰- ۸۳۸۶۱ و احمد فی المسند ۲۶۷/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”ہر چیز کے لئے صفائی ہے اور قلوب کی صفائی خدا کا ذکر ہے اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو ذکر الہی کے برابر خدا کے عذاب سے بہت نجات دلائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ”کیا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا بھی ایسی چیز نہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”نہیں!

اگر چہ وہ مجاہد اپنے تلوار اتنی مارے کہ اس کی تلوار ٹوٹ جائے۔“ (بیہقی)

تشریح: لکل شی یعنی ہر چیز کے زنگ کیلئے ہقیقۃً یا مجازاً (صقالۃ) صقالۃ کا معنی ہے روشن کرنا، خالی کرنا، پاک اور صاف کرنا باقی علامہ ابن حجر کا قول ”لکل شی صقالۃ“ کی توضیح کرتے ہوئے آیت ”یصلق بها صدوۃ.....“ کے الفاظ سے ظاہر نہیں ہو پاتا۔

قولہ: صقالۃ القلوب ذکر اللہ: اس لئے کہ اللہ کے ذکر کی وجہ سے قلب اغیار اللہ کی گردوغبار سے چھٹ جاتا اور دل مطالعہ آثار کیلئے صاف شفاف آئینے کی مانند ہو جاتا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ دلوں کا زنگ رین ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے: ﴿کلا بل ان علی قلوبہم ما یکسون﴾ [مطففین: ۱۷]۔ کسب قلب سے مراد خواہش نفس کی پیروی کرنا ہے۔ جس کا ذکر ایک دوسری آیت سے اس طرح ہے۔ ﴿افرأیت من اتخذ الہۃ ہواہ﴾ [الفرقان: ۴۳] پس کلمہ لا اللہ دل کا تخیل ہے یعنی غیر اللہ سے دل کو خالی کر لینا کلمہ الا اللہ دل کا تجلیہ ہے یعنی دل روشن ہو جاتا ہے۔ علامہ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں۔ کہ جب بندہ لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو اس کا دل صاف و شفاف ہو جاتا ہے اور بندہ کا الا اللہ صاف و شفاف دل کو لگتا ہے (و ما من شی انجلی) یعنی ذاکر کیلئے (من عذاب اللہ) یعنی عذاب سے اللہ کا عقاب اور بندے کو رویت سے محروم کرنے کیلئے حجاب میں رہنا مراد ہے۔ (حتی ینقطع) ینقطع کا فاعل یا تو مجاہد ہے یا اس کی تلوار ہے۔

کِتَابُ اَسْمَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰی

اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ

اللہ کا وہ نام کہ جس کا ذات باری تعالیٰ پر اطلاق کیا جاتا ہے اور یا تو یہ نام ذات کے اعتبار سے ہوگا جیسے اللہ یا یہ نام باعتبار صفت سلبیہ کے ہوگا جیسے قدوس اس کا معنی ایسی پاکیزہ ذات جس سے جملہ عیوب مسلوب ہوں یا وہ نام ہقیقۃً ثبوتیہ کے اعتبار سے ہوگا جیسے علیم اور قادر علم اور قدرت یہ دونوں ایسی حقیقتیں ہیں جو ذات باری تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں یا وہ نام اضافت کے اعتبار سے ہوگا جیسے حمید اور ملوک یا وہ نام اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے کسی فعل کے اعتبار سے ہوگا جیسے رزاق اور خالق۔

اسم وہ لفظ ہے جو وضع کے اعتبار سے معنی پر دلالت کرتا ہو اور مسٹی اسم کے معنی موضوع کو کہتے ہیں اور تسمیہ اس لفظ کے اس معنی کیلئے وضع کو کہتے ہیں یا اس لفظ کے اس معنی پر اطلاق کو تسمیہ بولتے ہیں۔ اور کبھی اسم کا اطلاق کر کے معنی بھی مراد لیتے ہیں تو تقدیر ثانی پر اسم سے مراد مسٹی ہوگا گویا اسم بول کر مسٹی مراد لیا گیا ہے۔ نقدیوں کی صورت میں اسم مسٹی کا غیر ہے اسی وجہ سے اہل سنت والجماعت اور معتزلہ کا اختلاف ہو جاتا ہے کہ آیا اسم مسٹی کا عین ہے یا اسم مسٹی کا غیر ہے معتزلہ کہتے ہیں اسم تسمیہ کو کہتے ہیں مسٹی کو نہیں لیکن ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ تسمیہ اس لفظ کو کہتے ہیں جو مسٹی پر دلالت ہو اور اسم مسٹی یہ کہتے ہیں (گویا اسم اور تسمیہ الگ الگ چیزیں ہیں) علامہ ابن حجر فرماتے ہیں امام اشعری کا مذہب یہ ہے کہ اسم کبھی تو مسٹی کا عین ہوتا ہے جیسے اسم اللہ اللہ کی ذات کا عین ہے (اس کا ذات باری تعالیٰ سے کسی صورت میں انفکاک نہیں ہو سکتا)۔ اور اسم کبھی مسٹی کا غیر بھی ہوتا ہے جیسے اسم خالق (اس لئے کہ فعل خلق ہر گھڑی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہوتا) اور کبھی اسم مسٹی کا غیر بھی ہوتا ہے اور نہ عین ہوتا ہے جیسے عالم اس لئے کہ علم اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین اور نہ ہی اس کا غیر اس لئے کہ غیر اس کو کہتے ہیں جس کا جائین سے انفکاک اور جدا ہونا ممکن ہو حالانکہ نہ تو علم کا انفکاک ذات باری تعالیٰ سے ممکن ہے اور نہ ذات باری تعالیٰ کا انفکاک علم سے ممکن ہے۔

اور یہ بات بھی جان لیجئے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی صفات ہیں وہ اللہ کی ذات کا عین نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ معانی جیسے پیدا کرنا رزق دینا وغیرہ۔ صفات باری تعالیٰ سے لغت اور عقل کے اعتبار سے سمجھے جاتے ہیں اور اگر یہ صفات ذات باری تعالیٰ کیلئے ثابت نہ ہوتی ذات باری تعالیٰ میں نقص کی خرابی لازم آتی ہے اس لئے کہ یہ جتنی بھی صفات ہیں ساری صفات کمال ہیں اور اگر یہ صفات ذات باری تعالیٰ کیلئے ثابت ہوں تو بالضرورہ زائد ہی ہوگی۔ (زائد اس معنی میں کہ یہ صفات ذات باری تعالیٰ کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں) اور وجہ یہ بھی ہے کہ جو معانی ان صفات سے اخذ ہوتے ہیں ان پر قائم ہونا اپنی ذات کے اعتبار سے نہیں بلکہ یہ صفات کی وجہ سے ساتھ قائم ہوئے تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جتنی بھی صفات ہیں نہ تو وہ ذات باری تعالیٰ کا عین ہیں اور نہ ہی ذات باری تعالیٰ کا غیر ہیں اس لئے کہ وہ دو چیزیں جو آپس میں ایک دوسرے کا غیر ہوں تو ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ممکن ہونا (حالانکہ صفات باری کا ذات باری سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے) اور فلاسفہ کا نظریہ یہ ہے کہ صفات ذات باری تعالیٰ کا عین ہیں انہیں کے قریب ہی معتزلہ کا قول ہے اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ عالم ہے علم کی وجہ سے نہیں بلکہ ذات کی وجہ سے (گویا کہ وہ صفات کے معانی کا کوئی اعتبار نہیں کرتے)۔ بہر کیف اس بحث کا محل عقائد کی کتب ہیں سلف نے اس بحث میں پڑنے کا تکلف نہیں کیا طلب سلامتی کیلئے۔

الفصل الاول :

۲۴۸: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ لِلَّهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ إِسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَفِي رِوَايَةٍ وَهُوَ وَتُرِيحُ الْوُتْرَ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں یعنی ایک کم سو جس شخص نے ان ناموں کو یاد کیا وہ ابتداء ہی میں بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہو گیا۔“ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ”اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: ان لله تسعة وتسعين اسماً: ایک نسخ میں زیادتی ہے (تعالیٰ) کی۔ یہاں اسم سے مراد صفت ہے۔

قولہ: مائة الا واحداً: اور ایک نسخ میں الا واحداً ہے علامہ زین العرب فرماتے ہیں کہ مصابیح کتاب میں الا واحداً کا لفظ آیا ہے اور امام طبری فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں الا واحداً کا لفظ ہے اس لئے یا تو واحداً سے پہلے کلمۃ کا لفظ محذوف ہے یا فقہ کا لفظ یا تسیرہ کا لفظ بہر کیف تینوں صورتوں میں لفظ واحداً صفت ہے۔ (یعنی کلمۃ واحداً یا صفت واحداً یا تسیرہ واحداً ہے)۔

بعض شارحین مصابیح نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کا قول (مائة الا واحداً) یہ ان کے اسم یعنی تسعة وتسعين سے بدل اکل ہے اسی لئے کہ ننانوے اور سو ایک کم ایک چیز ہے۔ یا مائة الا واحداً منسوب ہے اس سے پہلے اعلیٰ فعل محذوف ہے۔ باقی تسعة وتسعين کے بعد مائة الا واحداً کا ذکر کرنا یہ اس کے باری تعالیٰ میں زیادتی اور نقصان کے معنی میں تاکید اور مبالغہ ہے اس لئے کہ اسمائے تعالیٰ تو یقینی ہیں ان میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے دوسری وجہ مائة الا واحداً کو ذکر کرنے کی یہ بھی ہے تاکہ تسعة وتسعين کا سبب تسعين کے ساتھ التباس لازم نہ آئے۔ سبب میں سین کے مقدم ہونے کی وجہ سے یا سبب تسعين کے ساتھ التباس نہ ہو اس لئے کہ سبعین میں سین مقدم ہے یہ التباس لکھائی کی لغزش اور قلم کے پھسلنے کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ تو لہذا نتیجہ یہ نکلے گا سنا ہوا لکھے ہوئے سے مختلف ہو جائے گا اس مائة الا واحداً کے ساتھ تاکید لائے تاکہ اختلاف کا مادہ منقطع ہو جائے اور اس باب میں احتیاط کی طرف رہنمائی ہو جائے یا مائة الا واحداً سے اس لئے تاکید کی کہ تسعة وتسعين میں جو واؤ ہے اس واؤ کے بارہ میں احتمال ہے کہ یہ او کے معنی میں ہو اس لئے کہ اس کی نظیر ارشاد باری تعالیٰ میں موجود ہے: ﴿ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةً إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ [البقرة: ۱۹۶]۔ یہاں واؤ بمعنی

اوپے اس احتمال کے دفعیہ کیلئے مائة الا واحدہ سے تاکید لائے۔

صاحب معالم التزیل نے معالم التزیل میں آیت: ﴿وَذُرُوا الَّذِينَ يَلْحَدُونَ فِيْ اَسْمَائِهِمْ﴾ الاعراف: ۱۸۰ کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اسمائے باری تعالیٰ میں الحادیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام کے ساتھ موسوم کرنا جس کو کتاب وسنت واجماع نے بیان نہ کیا ہو یہی وجہ ہے کہ جو نام ذات باری تعالیٰ کا ان اصول ثلاثہ میں وارد ہوا ذات باری تعالیٰ کی توصیف میں اسی نام کا اطلاق کرنا واجب ہے۔

علامہ ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں اسمائے باری توفیقی ہیں (یعنی ان اصول ثلاثہ پر موقوف ہیں) اس وجہ سے ان اسماء کے بارہ میں کتاب وسنت واجماع کی رعایت از حد ضروری ہے۔ جو اسماء ان اصول ثلاثہ میں پائے جاتے ہیں ان کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر درست ہوگا اور جو اسمائے ان اصول ثلاثہ میں نہیں پائے جائے ان کا اطلاق بھی ذات باری تعالیٰ پر درست نہ ہوگا اگرچہ اس کا معنی درست ہی کیوں نہ ہو۔

علامہ راغب اصفہائی فرماتے ہیں کہ معتزلہ کا نظریہ ہے کہ جس اسم کا معنی درست ہو اس کا ذات باری تعالیٰ پر اطلاق درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی صحیح فہم اور عقل سلیم کو ذات باری تعالیٰ کی صفات اختیار کرنے میں گنجائش اور مجال ہے۔ لیکن علامہ راغب اصفہائی فرماتے ہیں کہ بات وہی درست ہے جو اصحاب حدیث نے کی۔ (یعنی اسمائے باری تعالیٰ توفیقی ہیں عقل اور رائے کو دخل نہیں) علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہمارے آئمہ کے نزدیک اصح بات یہی ہے کہ اسمائے ذات باری تعالیٰ توفیقی ہیں۔ امام غزالی و باقلانی کے علاوہ کیونکہ وہ اس باب میں معتزلہ کے ہمنوا ہیں۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ امام نووی نے امام قشیری سے یہ بات نقل کی ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اسم اور معنی ایک ہی چیز ہیں کیونکہ اگر ان دونوں کے درمیان علاقہ مغایرت ثابت کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ اسماء معنی کے غیر کیلئے بھی ہو سکتے ہیں۔ قاضی صاحب نے اسامیہ مفہوم کی تلخیص کر کے اس پر ہونے والے اعتراض کا جواب دیا ہے۔

سوال یہ ہوتا کہ بقول کسی کے اسم اور معنی ایک ہی چیز ہیں ان میں غیریت کا علاقہ نہیں تو پھر آپ ﷺ کے قول ”ان لله تسعة وتسعين اسماً“ سے تعدد الہ کا حکم لازم آتا ہے۔ (اس لئے کہ اسم کے متعدد سے معنی کا تعدد ہو گیا)۔

تو اس کا جواب دو طریقوں سے ہے۔ (۱) اسم سے مراد یہاں لفظ ہے اور اسم کے لفظ کے معنی میں وارد ہونے میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ جھگڑا تو اس بات میں ہے کہ کیا اسم کا اطلاق کر کے اس سے عین معنی مراد لیا جاسکتا ہے اور اسماء کے تعدد سے معنی کا تعدد لازم نہیں آتا ہے۔ (۲) جتنے بھی الفاظ کا اطلاق کا ذات باری پر کیا جاتا ہے تو وہ سارے الفاظ ذات باری پر صفة حقیقیہ کے اعتبار سے دلالت کرتے ہیں اور اس بات سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی (اس کی صفات متعدد ہیں) اور یہ بات کوئی محال نہیں کہ ایک شخصیت اور ذات کی متعدد صفات ہو سکتی ہیں باقی آپ ﷺ کا قول تسعة وتسعين برائے حضر نہیں کیونکہ قرآن مجید میں ان ننانوے ناموں کے علاوہ بھی منقول ہے۔ اسی طرح حدیث پاک میں حنان منان دائم اور جمیل وغیرہ بھی وارد ہوا ہے باقی ذکر کے اعتبار سے ان اسماء کی تلخیص اس وجہ سے کیونکہ یہ اسماء لفظ اور معنی کے اعتبار سے زیادہ مشہور ہیں اور دوسری وجہ یہ بھی ہے زیادہ واضح اور روشن اسماء اور سب اسماء میں سے اصولی اسماء جو اپنے علاوہ دیگر اسماء کے معانی کو بھی مشتمل ہیں وہ یہی اسماء ہیں اور جملہ من احصاھا یہ تسعة وتسعين کی صفت ہے اور یہ اسماء حضر پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ اگر یوں کہا جائے کہ فلاں کی ہزار بکریاں ایسی ہیں جن کو اس نے مہمانوں کے لئے تیار کر رکھی ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی ملک میں اس کو علاوہ بکریاں ہی نہیں۔ قولہ: من احصاھا دخل الجنة: یعنی جو ان اسماء پر ایمان لائے اور ان کو شمار کرے اور ترتیل کے طریقہ پر بطور تہرک و اخلاص ان اسماء کو الگ الگ کلمہ کر کے پڑھے یا ان اسماء کی بناؤں کو یاد کرے اور ان

اسماء کے معانی کو جانے اور جو کچھ ان معانی میں پنہاں ہے ان کو اپنے اخلاق بنائے وہ ابتداء ہی میں بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہو گیا۔ یا مقام عظمت و عزت میں دخول مراد ہے یا جنت کے اعلیٰ اور ارفع مقام میں داخل ہونا مراد ہے۔

ترمذی اور مسلم کی روایت میں ہے ”من حفظها دخل الجنة“ یعنی اس جنت سے مراد یا تو وہ جنت حسی جو آخرت میں فرمانبرداروں کو ملتی ہے یا جنت سے مراد دنیا کے اندر جنت معنوی مراد ہے (یعنی دنیا میں رہ کر بھی جنت کا سامنا آئے)۔

قوله: وفي رواية: ميركٌ نے حصن کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ الفاظ بخاری کی ایک روایت میں ہیں۔

قوله: وهو وتر يحب الوتر: ”وتر“ واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا ہے نہ تو کوئی اس کے مشابہ ہے اور نہ ہی کوئی اس کی مثل ہے۔ وہ اعمال و اذکار میں سے وتر کو پسند کرتا ہے۔ یعنی جو اعمال اخلاص کے طریقہ پر اللہ کے لیے متفرد ہو کر کئے جائیں۔ ان کو پسند کرتا ہے یہی امام طیبی کے قول یغیب علی العمل الخ کا مطلب ہے یعنی جو عمل وتر کے طریقہ پر بجایا جائے اللہ اس پر عمل و کامل جزا عنایت فرماتے ہیں (گویا کہ محبت اثابتہ معنی میں ہے) اس لئے کہ کسی عمل کو وتر اور تفرّد کے طریقہ پر بجالانا یا قلباً اور لساناً اور ایمان و اخلاص کے مطالب فردیہ پر تنبیہ ہوتی ہے۔

روایات باب: بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: لا يحفظها احد الا دخل الجنة

”جو بھی ان اسماء کو حفظ کرے گا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔“

الفصل الثاني:

٢٣٨٨: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ لِلَّهِ تَعَالَى تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّمُنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ الْوَهَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ الْحَكَمُ الْعَدْلُ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ الْعَلِيمُ الْعَظِيمُ الْغَفُورُ الشَّكُورُ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ الْخَفِيفُ الْمُقِيتُ الْحَسِيبُ الْجَلِيلُ الْكَرِيمُ الرَّقِيبُ الْمُجِيبُ الْوَاسِعُ الْحَكِيمُ الْوَدُودُ الْمَجِيدُ الْبَاعِثُ الشَّهِيدُ الْحَقُّ الْوَكِيلُ الْقَوِيُّ الْمُتِينُ الْوَكِيلُ الْحَمِيدُ الْمُحْصِي الْمُبْدِي الْمُعِيدُ الْمُحْيِي الْمُمِيتُ الْحَيُّ الْقَيُّومُ الْوَاحِدُ الْوَاحِدُ الْوَاحِدُ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخَّرُ الْأَوَّلُ الْآخِرُ الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِي الْمُتَعَالَى الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنتَقِمُ الْعَفُورُ الرَّءُوفُ مَالِكُ الْمُلْكِ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِيِّ الْمُغْنِي الْمَانِعُ الضَّارُّ النَّافِعُ النَّوْرُ الْهَادِي الْبَدِيعُ الْبَاقِي الْوَارِثُ الرَّشِيدُ الصَّبُورُ۔

(رواه الترمذی و البیهقی فی الدعوات الکبیر و قال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٩٢١٥ حدیث رقم ٣٥٧٤۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص ان ناموں کو یاد کرے وہ جنت میں داخل ہوگا وہ اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اسم ذات لفظ اللہ کے علاوہ ننانوے ہیں نام یہ ہیں: (١) الرحمن (٢) الرحیم (٣) الملک (٤) القدوس (٥) السلام (٦) المؤمن (٧)

المیسین (۸) العزیز (۹) الجبار (۱۰) المتکبر (۱۱) الخالق (۱۲) البارئ (۱۳) المصور (۱۴) الخفار (۱۵) القہار (۱۶) الوہاب (۱۷) الرزاق (۱۸) الفتاح (۱۹) العليم (۲۰) القابض (۲۱) الباسط (۲۲) الرافع (۲۳) المعز (۲۴) الخافض (۲۵) المذل (۲۶) السميع (۲۷) البصير (۲۸) الحكيم (۲۹) العدل (۳۰) اللطيف (۳۱) الخبير (۳۲) الحليم (۳۳) العظيم (۳۴) الغفور (۳۵) الشکور (۳۶) العلي (۳۷) الکبير (۳۸) الخفيظ (۳۹) المقيت (۴۰) الحسيب (۴۱) الجليل (۴۲) الکريم (۴۳) الرقيب (۴۴) الجيب (۴۵) الواسع (۴۶) الحکيم (۴۷) الودود (۴۸) المجيد (۴۹) الباعث (۵۰) الشہيد (۵۱) الحق (۵۲) الوكيل (۵۳) القوي (۵۴) المتين (۵۵) الولي (۵۶) الحميد (۵۷) المحصي (۵۸) المبدی (۵۹) المعيد (۶۰) الحی (۶۱) الممیت (۶۲) الحی (۶۳) القيوم (۶۴) الواجد (۶۵) الاحد (۶۶) الصمد (۶۷) القادر (۶۸) المتقدر (۶۹) المقدم (۷۰) المومخر (۷۱) الاول (۷۲) الاخر (۷۳) الظاهر (۷۴) الباطن (۷۵) الوالی (۷۶) المتعالی (۷۷) البر (۷۸) التواب (۷۹) المنتقم (۸۰) العفو (۸۱) الرؤف (۸۲) مالک الملک (۸۳) ذوالجلال والاکرام (۸۴) المقسط (۸۵) الجامع (۸۶) المغنی (۸۷) الغنی (۸۸) المانع (۸۹) الضار (۹۰) النافع (۹۱) النور (۹۲) الہادی (۹۳) البديع (۹۴) الباقي (۹۵) الوارث (۹۶) الرشيد (۹۷) الصبور (۹۸) الماجد (۹۹) الواحد۔ اس روایت کو ترمذی نے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان لله تعالى تسعة وتسعين اسما:

امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے زیادہ مشہور نام لفظ اللہ ہے اس لئے کہ سارے اسماء کی اضافت اللہ ہی کی طرف ہوتی ہے اور یہ بات بھی منقول ہے کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہی ہے۔ مالکی نحوی کہتے ہیں کہ لفظ اللہ اسم اعظم ہے اسم صفت نہیں (باقی اسماء اگرچہ اسم صفت ہیں) کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہر اسم اللہ ہی کے اسماء میں سے ہے اس لئے کہ اللہ کا ہر نام اللہ ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ مثلاً یوں کہا جاتا ہے کہ کریم اللہ کے اسماء میں سے ہے۔ اور یوں نہیں کہا جاتا کہ کریم کے اسماء میں سے اللہ بھی ہے۔

قوله: من احصاها دخل الجنة:

یعنی اللہ کے اسماء کو یاد کیا۔ اکثر حضرات نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ اس تفسیر کی تائید اس روایت صحیح سے بھی ہوتی جس کو امام نووی نے ذکر کیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”من حفظها دخل الجنة“۔ امام طیبی بھی فرماتے ہیں ”ای حفظها“ جیسا کہ بعض روایات صحیحہ میں اسی طرح آیا ہے۔ اس لئے کہ حفظ احصاء و تکرار کے مجموعے سے حاصل ہوتا ہے۔ احصاء کنایہ ہے حفظ سے، یا احصاء کنایہ ہے اسماء باری تعالیٰ کے ضبط سے۔ یعنی ان کو حصر، ایمان، تعداد، علم و عمل کے اعتبار سے ضبط کرنے سے، یا احصاء کنایہ ہے اسمائے باری تعالیٰ کے حق کو حسب استطاعت قائم کرنے اور اسماء باری تعالیٰ کے مقتضی پر عمل بجالانے سے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ اسماء باری تعالیٰ کے معانی کا اعتبار کیا جائے۔ اسماء باری تعالیٰ میں جو صفات ربوبیت اور احکام بندگی پوشیدہ ہیں ان کا اپنے نفس سے مطالبہ کیا جائے کہ ان امور کو بطور اخلاق اپنایا جائے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ مثلاً جب بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اللہ پاک سمیع و بصیر ہے تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے کان کو ناجائز کام سے روک لے اور اسی طرح باقی اسماء کا حال ہے۔ (آئینی)

اسمائے باری تعالیٰ کو اپنا اخلاق بنانے کے بارے میں امام غزالی نے اپنی کتاب ”المقصد الاسمی“ میں بڑا بسیط کلام کیا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہر نام اخلاق بنانے کیلئے ہے، سوائے لفظ اللہ کے، کہ یہ ذات باری تعالیٰ سے تعلق جوڑنے کیلئے ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو ان اسماء کو یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ اس روایت کے منافی نہیں کہ جس میں ارشاد فرمایا کہ جو ان اسماء میں زیادتی کرے گا تو جنت میں اس کیلئے بھی زیادتی ہو جائے گی اس لئے کہ ابن ماجہ کی روایت میں ایسے اسماء بھی ہیں جو اس روایت میں نہیں ہیں مثلاً تام قدیم و ترشید کافی ابد وغیرہ۔ اور اسی طرح قرآن حکیم میں بھی چند ایسے اسماء وارد ہوئے ہیں جو اس روایت میں موجود نہیں ہیں مثلاً ”المجید ذو الطول ذو القوۃ ذو المعارج ذو العرش الکرم لا علیٰ احکم الحاکمین ارحم الرحمین احسن الخالقین رفیع الدرجات وغیرہ (انہی) اور اس کے علاوہ رب العالمین اور مالک یوم الدین بھی ہیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ جزاء دخل ماضی کی صورت میں بطور تحقیق کے ذکر کی گئی ہے۔ (گویا کہ دخول جنت تحقیقی اور یقینی ہے جس طرح امر ماضی یقینی ہوتا ہے)

قوله: هو الله الذي لا اله الا هو:

اسماء کی تعداد بیان کر کے شمار میں صرف لفظ اللہ کو لایا گیا ہے جملہ اسماء میں سے اور یہ جملہ ذات باری تعالیٰ کیلئے الہیت اور معبودیت کے حصر اور اثبات کا اور اللہ تعالیٰ کے غیر سے معبودیت کی نفی کا فائدہ دیتا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مستانفہ ہے یا تو یہ ان اعداد کی مقدار بیان کرنے کیلئے ہے کہ آپ ﷺ کے قول ”ان لله تسعة وتسعين“ اسماء میں کون سے اسماء ہیں۔ باقی ضمیر کا ذکر خبر کی رعایت کرتے ہوئے (یعنی ہو مبتدا ہے اور آگے جملہ اس کی خبر ہے) یا یہ جملہ آپ ﷺ کے قول من احصاها میں ذکر کردہ احصاء کی کیفیت کو بیان کرنے کیلئے ہے۔ یعنی اللہ کے اسماء کا احصاء کیسے کیا جائے۔ اور ضمیر ہوسنی کی طرف لوٹتی ہے جس پر آپ ﷺ کا قول (لله) دلالت کر رہا ہے۔ گویا کہ جب کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ ہیں تو سوال کیا گیا کہ وہ اسماء حسنیٰ کیا ہیں تو جواب دیا گیا کہ هو اللہ یا جب کہا گیا کہ ”من احصاها دخل الجنة“ تو سوال کیا گیا کہ ان کا احصاء کیسے کیا جائے تو جواب دیا کہ یوں کہ هو اللہ۔ تو اس احتمال پر ضمیر ضمیر شان ہوگی اور مبتدا بنے گی اور لفظ اللہ مبتدا ثانی ہے اور آپ ﷺ کا قول ”الذی لا اله الا هو“ اس کی خبر ہے اور پورا جملہ مبتدا اول کی خبر ہے اور موصول جملہ لفظ اللہ کی صفت ہے۔

اس کلمہ کے کئی مراتب ہیں:

(پہلا مرتبہ) یہ ہے کہ منافق آدمی محض زبان کے ساتھ تو اس کلمہ کا تکلم کرتا ہے لیکن یہ تکلم تصدیق قلبی سے خالی ہوتا ہے تو یہ کلمہ منافق آدمی کے لیے تو دنیا میں اس کے خون مال و جان کے محفوظ ہونے کے سلسلہ میں نفع پہنچانے کا لیکن آخرت میں نہیں۔

(دوسرا مرتبہ) یہ ہے کہ آدمی یقین قلبی اس کلمہ کے مضمون پر محض بر بنائے تقلید کرتا ہے (یعنی دوسروں کی دیکھا دیکھی میں) اس کلمہ کی صحت کے بارے میں اختلاف ہے لیکن صحیح بات یہی ہے کہ یہ کلمہ صحیح اور معتبر ہے۔ (نافع فی الدنیا والآخرہ ہے)۔

(تیسرا مرتبہ) یہ ہے کہ آدمی کلمہ کے مضمون پر اعتقاد محض تقلید کے وجہ سے نہیں بلکہ علامات توحید کی وجہ سے رکھتا ہے۔ اکثر حضرات اس کلمے کا اعتبار کرتے ہیں۔

(چوتھا مرتبہ) یہ ہے کہ اس کلمے پر اعتقاد جازم ہو بوجہ قطعی کی وجہ سے یہ کلمہ تو بالاتفاق مقبول اور معتبر ہے۔

(پانچواں مرتبہ) یہ ہے کہ کلمہ پڑھنے والا اپنی بصیرت کی وجہ سے کلمہ کے مفہوم کو خوب کھول کر رکھ دے یہ تمام مراتب میں بلند مرتبہ ہے۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں امام اشعری سے جو کچھ عوام کے ایمان کی عدم صحت کے بارے میں نقل کیا گیا ہے یہ درحقیقت امام اشعری پر جھوٹا الزام ہے کیونکہ اکثر عوام الناس درحقیقت ایمان کے بارہ میں غیر مقلد ہوتے ہیں۔ (یعنی بصیرت ذاتی کی وجہ سے ایمان ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کی تقلید میں) اتنی بات ضرور ہے کہ وہ ایمان بالتوحید کے اثبات کیلئے متکلمین کے قواعد کے طرز پر ترتیب برہان سے عاجز

ہوتے ہیں بلکہ ترتیب برہان کے بعد ایمان لانے والے کیلئے بہتر تو اس شخص کا ایمان ہے کہ جس کا اعتقاد بالتوحید محض ظن و گمان کی وجہ سے پیدا ہو۔ پھر وہ شخص بہتر ہے جس کو اعتقاد بالتوحید میں قطعیت حاصل ہوگی ایسے شخص کے کمال ایمان کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس شخص کا ایمان نافع فی الدنیا والآخرۃ ہے اور اگر یہ ایمان فقط دل کے ساتھ ہو تو دیکھا جائے گا عدم اقرار باللسان عذر فی اللسان کی وجہ سے ہے۔ جیسے گونگا پن وغیرہ۔ تو بالافتقار اس کا ایمان بھی نافع فی الدنیا والآخرۃ ہوگا اگر یہ بات کسی عذر کی وجہ سے نہ ہو تو پھر علامہ نووی نے اہلسنت والجماعت کا اجماع نقل کیا ہے کہ اس قسم کا ایمان نافع فی الآخرۃ نہ ہوتا لیکن امام غزالی اور ان کے تبعین محققین اس ایمان کے نافع فی الدنیا والآخرۃ ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ایمان بالقلب فقط اس وقت معتبر ہوگا جبکہ اس سے اقرار باللسان کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو اگر مطالبہ کے بعد وہ اقرار باللسان سے باز آجاتا ہے تو یا لا جماع ایسا شخص کافر ہی کہلائے گا جیسا کہ ابوطالب کا واقعہ مشہور ہے۔ اہل اشارہ کہتے کہ توحید کا قائل اگر مقالہ توحید میں مخلص ہو تو وہ اسی اخلاص کی حالت میں جنت میں داخل ہو جائے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَمَن خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ﴾ [الرحمن: ۶۷] دو جنتوں سے جو دنیاوی جنت ہے وہ ہے فرما بیداری کی حلاوت اور مناجات کی لذت اور اخروی جنت ہے قبولیت اعمال اور بلند کی درجات۔ اتنی کلامہ۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ ہو اللہ الذی میں اشارہ کیلئے اور اہل اشارہ کے نزدیک ہو کے ذریعہ سے انتہائی اثبات توحید کی خبر ہے اس لئے کہ جب اثبات توحید میں لفظ ہو کہتا ہو کہنے والوں کے دل میں سوائے حق تعالیٰ کی ذات کے کوئی نہیں آتا۔

اور کہا جاتا ہے کہ لفظ اللہ اصل میں لاہا ہے جو سریانی زبان کا لفظ ہے پھر عربی میں لفظ اللہ استعمال ہونے لگا اور بعض حضرات کہتے ہیں یہ اصل میں عربی ہی ہے اور علم کی طرح مخصوص ذات کیلئے وضع کیا گیا ہے اس لئے کہ علم کی طرح لفظ موصوف تو بن سکتا ہے لیکن حقیقت نہیں لیکن حق بات یہ ہے کہ یہ اصل میں وصف ہے اس لئے کہ اللہ کی من حیث الذات امر حقیقی یا اس کے علاوہ کسی اور امر کا اعتبار کئے بغیر انسانی سمجھ میں آنے والی نہیں تو جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی لفظ کو وضع کر کے پھر اس پر لفظ کا اطلاق کرے اس کی طرف اشارہ ناممکن ہے لیکن جب لفظ اللہ کا غلبہ استعمال ذات باری تعالیٰ پر ہو اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کے علاوہ کیلئے استعمال نہیں ہوتا تو آپ پر علم کی طرح ہو گیا۔ جس طرح علم پر اوصاف جاری ہوتے ہیں تو یہ اجراء اوصاف میں علم کے قائم مقام ٹھہرا تو لہذا لفظ اللہ کے ذریعہ کسی کی صفت تو بیان نہیں کی جاسکتی۔ ہاں اگر یہ موصوف بن سکتا ہے علم کی طرح۔ اور اس کی طرف شرکت کا احتمال تک نہیں جاسکتا ہے اور لفظ اللہ کا معنی ہے مستحق عبادت۔

حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مادہ استعمال اللہ ہے۔ وزن ومعنی اور صیغہ کے اعتبار سے عبد کی طرح اور اللہ بمعنی مانوۃ کے ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ یلیہ، لیہا اور لاہا سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چھپ جانا بلند ہو جانا اور چونکہ ذات باری تعالیٰ بھی آنکھوں کے ادارک سے محبوب ہے اور جو چیز ذات باری تعالیٰ کے لائق نہیں اس سے وہ بلند و بالا ہے اس لئے ذات باری تعالیٰ کو انہ سے موسوم نہیں کیا جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ اللہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے حیران و سرگردان ہو جانا۔ اور چونکہ اہل عقل کی عقول ذات باری تعالیٰ کی صفات کی معرفت میں حیران و سرگردان ہیں چہ جائیکہ وہ ذات کی کما حقہ معرفت کر سکیں (اس ذات باری تعالیٰ کو الہ کہا جاتا ہے)۔

کہا گیا ہے کہ یہ مشتق ہے اللہ بمعنی فزع سے گھرا جانا اور چونکہ لوگ ذات باری تعالیٰ سے گھبراتے ہیں اور اس کی طرف گھبرا کر دوڑتے ہیں اس لئے اللہ کہا جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ الہت الی کذا سے مشتق ہے۔ اور الہت الی کذا یہ سکنت الیہ کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ قلوب ذات

باری تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں اور روحیں اس کی معرفت کی وجہ سے سکون حاصل کرتی ہیں۔ (اس لئے ذات باری تعالیٰ کو اللہ کہا جاتا ہے)۔

اکثر علماء کے نزدیک نانوے اسماء میں سے یہی اسم اعظم ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ذات پر دلالت کرتا ہے جو تمام صفات الوہیت کو جامع ہے۔

قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہی ہے بشرطیکہ جب لفظ اللہ کہیں تو آپ کے دل میں اللہ کے سوا کوئی چیز بھی نہ کھلنے پائے۔

کہا گیا ہے کہ یہ اسم شریف عوام الناس کیلئے تو اس طور پر ہے کہ وہ اس کو زبان پر جاری کریں۔ خشیت و تعظیم کے طریقہ پر اس نام کا ذکر کریں۔ اور خواص کیلئے یہ ہے کہ وہ اس کے معنی میں غور و فکر کریں اور بات کو جانیں کہ اس اسم شریف کا اطلاق صرف ایسی ذات پر کیا جا سکتا ہے جو موجود بے انتہا سخاوت والا ہے (یعنی جس کی سخاوت کی کوئی انتہا نہیں) اور وہ ذات جو تمام صفات الوہیت کی جامع اور ربوبیت کے صفات کے ساتھ متصف ہے۔ اور جو لوگ خواص الخواص ہیں ان کیلئے یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو ذات باری تعالیٰ میں مستغرق کر دیں اللہ کے علاوہ کسی کی طرف ذرا بھر بھی التفات نہ کریں۔ پیش آمدہ چیز کے بارے میں امید اور خوف صرف ذات باری تعالیٰ ہی سے رکھیں اس لئے کہ وہی ذات حق و ثابت ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز باطل ہے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں نقل کیا ہے کہ لیبید شاعر نے کیا عی سچی بات کہی ہے اور وہ یہ ہے: "الا کل شیء ما سوا اللہ باطل" یعنی خبر دار اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ (یہاں باطل سے مراد وہ چیز ہے جس کو قرآن دوام نہ ہو) پھر کہا گیا ہے کہ اگر اللہ سے مراد اعم لیا جائے (یعنی اللہ کے سوا سب سے معبودیت کی نفی کی جائے) تو تقدیر عبارت یوں ہوگی "لا الہ معبود بحق الا ہو" یعنی نہیں کوئی معبود برحق مگر وہی ذات۔ (اگرچہ معبود باطل لوگوں نے اور بھی بنا رکھے ہیں)۔ اور اگر اللہ سے مراد احض لیا جائے کہ وہی معبود برحق ہے تو پھر تقدیر عبارت یوں ہوگی "لا الہ موجود الا ہو" یعنی اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق موجود ہی نہیں ہے۔ بہر حال جو بھی تقدیر عبارت ہو۔ لفظ ہو محلاً مرفوع ہے ہاں البتہ نصب بھی جائز ہے۔ (رفع مبتدہ ہونے کی وجہ سے۔ اور نصب اعمی فعل مقدر ماننے کی وجہ سے)۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ لا سے نفی اور اس کے بعد حرف الا وغیرہ سے استثناء کا فائدہ غایت اثبات ہے کیونکہ لا اخ لی سواک یعنی میرا تیرے سوا کوئی بھائی نہیں۔ یہ جملہ انت اخی یعنی تو میرا بھائی ہے سے زیادہ مؤکد ہے (کیونکہ جملہ ثانیہ میں مخاطب کیلئے اخوت کے اثبات کے ساتھ اس کے غیر سے اخوت کی نفی نہیں بخلاف پہلے جملہ کے)۔ بہر کیف لا اور الا وغیرہ کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اس چیز کی نفی ہو جاتی ہے جس کا اصل سے وجود ہی محال ہے۔ اور وہ شریک اور اس چیز کا اثبات ہے جس کا عدم محال ہے اور وہ ہے ذات باری تعالیٰ۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اس نفی اور اثبات کے اعتقاد کو ظاہر کرے جو ایمان مطلوب کی صحت کیلئے شرط کے درجے میں ہے۔ کیونکہ اس نفی اور اثبات کے اعتقاد کی وجہ سے معرفت و یقین کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

قولہ: الرحمن الرحیم: امام طہی فرماتے ہیں کہ یہ دونوں صیغے مصدر رحمت سے بطور مبالغہ کے ہے۔ اور رحمت لغت میں ایسی رقت قلبی اور مہربانی و نرمی کو کہتے ہیں جو من رق لہ یعنی جس کیلئے انسان نرم دل ہو اس پر فضل و احسان کا تقاضا کرے۔ (باقی رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کیلئے رقت قلبی کا اثبات اللہ کی شان اقدس کے منافی ہے تو جو ابا عرض ہے) کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات کا وجود غایات کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے جو افعال ہیں نہ کہ مبادی کے اعتبار سے ہے۔ جیسے (مشتعل ہونا اور کسی چیز کے اثر کو قبول کرنا اللہ کی شان کے منافی

ہے نہ کہ فعل)۔

عارف کا حصہ ان دونوں اسماء میں یہ ہے کہ وہ پوری پوری طرح ذاتِ رحمن کی پاکیزہ بارگاہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور اسی پر بھروسہ رکھے اور جو چیز اس کیلئے تکلیف دہ ہے اس چیز کے بارے میں اسی کی طرف التجا کرے اور اپنے باطن کو اس کے ذکر سے مشغول رکھے اور اس کے غیر سے اعراض کر کے اسی سے مدد طلب کرے۔

جب عارف آدمی ان دونوں اسماء سے یہ بات سمجھ لے کہ ذاتِ رحمن ورحیم ہی منعم حقیقی ہے اور حقیقی بھی نعمتیں ہیں موجودہ یا آئندہ ان سب کی مالک ذاتِ رحمن ورحیم ہی ہے تو وہ عارف اللہ کے بندوں پر رحم کرے جس کی صورت یہ ہے کہ مظلوم کی معاونت کرے ظالم کو اس کے ظلم سے احسن طریقہ کے ساتھ باز رکھنے کی کوشش کرے خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے آدمی کو بیدار کرے۔ اور گناہگار کو رحمت کی نظر سے دیکھے تاکہ حقارت کی نظر سے اور منکر کے ازالہ میں سعی کرے اور حسب استطاعت احسن طریقے پر اس کو مٹائے اور اپنی وسعت اور طاقت کے بقدر محتاج لوگوں کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

”اللہ کی رحمت بندوں پر“ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① اس سے مراد اللہ کا اپنے بندوں انعام کا ارادہ کرنا اور ان سے ضرر کا دفع کرنے کا ارادہ کرنا ہے۔ اس صورت میں رحمن ورحیم دونوں صفات ذات کے اسماء ہوں گے۔

② یعنی ارادہ فعل نہیں بلکہ نفس فعل ہے) اس صورت میں رحمن ورحیم افعال کی صفات کہلائیں گے۔ صفت فعل اور صفت ذات میں فرق یہ ہے کہ صفت کے متقاضی ہونے، نقص اور عیب لازم آتا ہے جبکہ صفت فعل کے متقاضی ہونے سے نقص لازم نہیں آتا۔ لفظ رحمن لفظ رحیم سے ابلغ ہے کیونکہ مبنی میں الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے اور یہ زیادتی کبھی مقدار و کمیت کے اعتبار سے پائی جاتی ہے اور کبھی کیفیت کے اعتبار سے۔ تو پہلی صورت میں یا رحمن الدنیا اور یا رحیم الآخرة کہا جائے گا اس سے دنیاوی رحمت مؤمن و کافر سب کو عام ہے اور اخروی رحمت محض مؤمنین کے ساتھ خاص ہے اور زیادتی بصورت کیفیت ہو تو اس صورت میں یا رحمن الدنیا والآخرۃ اور یا رحیم لآخرۃ کہا جائے گا۔ اس لئے کہ آخرت کی ساری نعمتیں مکمل ہیں اور دنیا کی نعمتیں حلیل وحقیر، قلیل وکثیر اور تام اور غیر تام کی طرف تقسیم ہوتیں ہیں اور رحمن کا معنی ہوگا وہ منعم حقیقی جس کی رحمت تام اور اس کا احسان عام ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا اطلاق ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کسی پر نہیں کیا جاسکتا۔ اور رحمن کو خاص اللفظ عام المعنی کہا جاتا ہے۔ بخلاف لفظ رحیم کے کہ اس کو عام اللفظ خاص المعنی کہا جاتا ہے۔ (اس لئے کہ اس کا اطلاق ذات باری اور اس کے غیر پر کیا جاسکتا ہے اور اس کی رحمت دنیا کے ساتھ خاص ہے)۔

قولہ: الملک یعنی مکمل بادشاہت والا۔ مکمل بادشاہت والا ہونے سے مراد ایجاد و اختراع پر قادر ہونا ہے، اس لئے کہ یہ اہل عرب کا مقولہ ہے ”فلان یملک الا ننتفاع بکذا“ یعنی فلاں آدمی اتنا نفع پہنچانے کا مالک ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ وہ آدمی اتنا اتنا نفع پہنچانے اور ایجاد کرنے پر قدرت و دسترس رکھتا ہو۔ تو ملک بھی قادر کی طرح اسماء صفاتی میں سے ہے۔

کہا گیا ہے کہ ملک کا مطلب ہے ایسی ذات جو چیزوں کو وجود میں لانے اور ان کو ختم کرنے میں ان کو زندہ کرنے اور مارنے میں مکمل متصرف ہو۔ تو اس صورت میں لفظ ملک اسماء افعالی میں سے ہوگا خالق کی طرح۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ علی اسلوب التکلیل لفظ ملک کا حدیث میں واقع ہونا یہ ”مالک یوم الدین“ کے قرآن مجید میں واقع ہونے کی طرح ہے۔ (اس لئے کہ قرآن مجید میں بھی جن تین اسماء کے بعد ”ملک یوم الدین“ ہے انہیں تین اسماء کے بعد حدیث میں

بھی ہے) اس لئے کہ جب اللہ نے اس چیز کا ذکر کیا جو نعمتوں اور مہربانیوں پر دلالت کرتی ہے تو اس کے بعد اس چیز کا ذکر کیا جو غلبہ اور قوت پر دلالت کرتی ہے وہ یہ کہ اللہ بادشاہ حقیقی ہے اور اس کے سوا کائنات کا کوئی مالک نہیں اور بندہ اپنے وجود میں اللہ ہی کا محتاج اور محتاج ہونا بادشاہت کے منافی ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ بندے کیلئے مطلقاً بادشاہت نہیں ہو سکتی۔

ہاں اگر بندے کی طرف بادشاہت کی اضافت کی بھی جاتی ہے تو مجازاً کی جاتی ہے ورنہ حقیقی بادشاہت تو اللہ ہی کی ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے جب اوصاف باری تعالیٰ میں صفت ملک کو بیان کیا تو چونکہ اس صفت کے ساتھ افراد مخلوق بھی متصف ہوتے ہیں تو اس سے خالق کے ساتھ مخلوق کی تشبیہ کا گمان ہوتا ہے تو اس لئے اس کے بعد صفت قدوس لائے۔ اسی طرح چلتے جائیں سارے اسماء باری تعالیٰ ذات باری کی ثناء میں بیان کئے گئے ہیں۔

اسم ملک سے عارف کی ذمہ داری یہ ہے کہ عارف اس بات کو سمجھے کہ ذات باری تعالیٰ ہر چیز سے علی الاطلاق مستغنی ہے اور اس کے ہر چیز اپنے وجود اور اس کی بقاء میں اس کی طرف محتاج ہے اور ہر چیز اس کے فیض اور حکم کے تابع ہے۔ اور وہ آقا اور سردار ہونے میں لوگوں سے مستغنی ہے اور وہ اپنی مملکت خاصہ کے اندر جو انسان کا دل اور اس کا جسم ہے تصرف کرنے میں پوری طرح مستقل ہے۔ اور اس اپنے طاقتور لشکر اور رعایا اور ان کو دارین کی بھلائی میں استعمال کرنے پر مکمل تسلط اور غلبہ حاصل ہے۔

بعض حضرات ملک کے معنی میں فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے نفس کا مالک ہو تو وہ آزاد ہے اور جس شخص کی خواہش نفس اس کی مالک ہو تو وہ غلام ہے۔

قولہ: القدوس: قدوس بھی رحمن و رحیم کی طرح مبالغہ کے لیے ہے۔

اس کا معنی ہے ایسی ذات جو فی نفسہ نقصان کی تمام علامت سے ظاہر اور منزہ ہو۔

امام تشریحی فرماتے ہیں کہ جس شخص نے یہ پہچان لیا کہ اللہ تعالیٰ قدوس ہے تو اس کی ہمت بلند ہو جاتی ہے یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کو اس کے عیوب و آفات سے پاک فرمادیتے ہیں۔ اور اس کو جملہ حالات میں گناہوں کی میل کچیل سے پاکیزہ رکھتے ہیں تو ایسا شخص اپنے وقت کو کمردتوں سے صاف رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ جمیع اوقات میں اچھے انداز سے اللہ سے استعانت کیلئے رجوع کرتا ہے۔ جس شخص کی زبان کو اللہ پاک غیبت سے پاک فرمادیتے تو اللہ پاک اس کے دل کو بھی غیبت سے پاک فرمادیتے اور جس شخص کے دل کو اللہ پاک غیبت سے پاک فرمادیتے ہیں تو اللہ پاک اس شخص کی آنکھ کو شک و شبہ کی نگاہ سے پاک فرمادیتے اور جس شخص کی آنکھ کو اللہ پاک شک و شبہ کی نگاہ سے پاک فرمادیتے ہیں تو اس اللہ اس شخص کے باطن کو اپنی قریبی قربت و موانع و حجابات سے پاک فرمادیتے ہیں۔

ابراہیم بن ادہم سے حکایت نقل کی گئی ہے کہ وہ راستے میں ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جو نشہ میں لت پت لڑا پڑا تھا اور اس نے تے کر رکھی تھی۔ ابراہیم بن ادہم نے اس شخص کو نظر رحمت سے دیکھا اور کہا کہ اس زبان کو یہ آفت کیونکر پہنچی حالانکہ کبھی تو اس نے اس زبان سے اللہ کو یاد کیا ہوگا آگے بڑھے اور اس کے منہ کو دھویا۔ جب اس شخص کو آفاقہ ہوا اور اس کو سارے واقعات کی خبر دی گئی تو وہ بہت شرمندہ ہوا اور اس نے نشہ کرنے سے توبہ کی۔ ابراہیم بن ادہم نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ اے ابراہیم بن ادہم! تم نے اس آدمی کے منہ کو ہماری وجہ سے دھویا ہم نے اس کے دل کو تمہاری وجہ سے دھویا۔ (یعنی توبہ کی توفیق دے دی)۔

قولہ: السلام: یہ مصدر ہے اس کے ساتھ اللہ کی صفت بطور مبالغہ لائی گئی ہے۔

ایسی ذات جو مطلقاً ذات وصف اور فعل کے اعتبار سے آفات پیش آنے سے سلامتی والی ہو، تو وہ ہستی ہے جس کی ذات عیب سے سلامت ہو اور جس کی صفات نقص سے سلامت ہوں اور جس کے افعال شرمحض سے سلامت ہوں۔ سلام کا شمار بھی اسماء تزییہ میں سے

ہوتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ سلام کا معنی ہے ایسا مالک جو بندوں کو خوفناک اور ہلاکت خیز چیزوں سے محفوظ رکھے۔ تو نتیجہً اس کا مال اور مرجع صفت قدرت ہی بنتی ہے۔ جو ذات کی صفات میں شمار ہوتی ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ سلام کا معنی ہے ایسی ذات جو جنت میں اپنے بندوں پر سلام بھیجنے والی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سَلَامٌ قَوْلَ مَنْ رَبِّ رَحِيمٍ﴾ ایس: ۵۸: تو اس صورت میں سلام کا مرجع کلام قدیم ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ صفت قدوس اور صفت سلام کے درمیان فرق یہ ہے کہ صفت قدوس کسی چیز کے ایسے نقص سے برآء پر دلالت کرتی ہے جس نقص کا تقاضا خود ذات کرتی ہو اور وہ نقص اس ذات کے ساتھ قائم ہے اور صفت سلام کسی چیز کے ایسے نقص سے پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے جو نقص اس چیز کو کسی آفت کے پیش آنے یا اس چیز سے کسی فعل کے صادر ہونے کی وجہ سے لاحق ہو۔ تو گویا قدوس شے کی ذاتی طہارت و پاکیزگی کو کہتے ہیں۔

اور اسی کے قریب بعض حضرات کا قول ہے جو یوں فرق بیان کرتے ہیں کہ قدوس اس چیز کے سلسلہ میں جو ہمیشہ رہی ہو اور سلام اس چیز کے سلسلہ میں جو ہمیشہ رہے گی اور باقی عارف کی ذمہ داری یہ ہے کہ صفت سلام کے ساتھ پختگی حاصل کرے۔ بایں طور کہ وہ اپنے دل کو کینہ حسد اور خیانت اور ایسے ارادہ شر سے جس کے ضمن میں خیر کا قصد نہ کیا گیا ہو محفوظ رکھے۔ اور اپنے اعضاء کو ممنوعات اور گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ رکھے۔ اور اہل اسلام کی سلامتی چاہنے والا ہو۔ اور جس کو کبھی دیکھے اس پر سلام پیش کرے خواہ وہ اس کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

اور بعض عارفین سے یہ بات بھی منقول ہے کہ بندوں میں سے سلیم وہ شخص ہے جو اپنے کی مخالفتوں سے حالت سرواعلانہ میں محفوظ رہے اور ظاہری امور باطنی عیوب سے جدا ہو جائے۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ جو شخص اس اسم شریف کو بطور اخلاق اپنانا چاہتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے آقا کی طرف قلب سلیم کے ساتھ لوٹے۔ بعض عارفین فرماتے ہیں کہ اسم سلام جب مصدر سلامت سے مشتق ہے تو عارف بھی اس اسم شریف کی وجہ سے سلامتی کا طالب ہوتا ہے۔ اور ہر وقت اس کو طلب سلامت کی فکر ہی دائمگیر رہتی ہے تاکہ اس کیلئے جملہ احوال میں کمال تزیین جمع رہے۔

اور صفت سلام کو بطور اخلاق اپنانے میں یہ بھی ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ بلکہ مزید مسلمانوں پر شفقت اور مہربانی کا معاملہ کرے۔ پس جب اپنی عمر سے بڑے آدمی کو دیکھے تو اس کے بارے میں کہے کہ یہ مجھ سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ اس کی نیکی مجھ سے زیادہ ہے اور ایمان و معرفت کے لحاظ سے مجھ سے سابق ہے۔ اور اگر اپنی عمر سے چھوٹے کو دیکھے تو اس کے بارے میں بھی یہی کہے کہ یہ مجھ سے بہتر ہے کیونکہ اس کے گناہ مجھ سے کم ہیں اور جب اپنے کسی مسلمان بھائی کی جانب سے معصیت کو ظاہر ہوتا دیکھے تو اس کیلئے ستر مرتبہ معذرت طلب کرے اگر اس کیلئے اس کی ہدایت واضح ہو جائے تو فہماور نہ لوٹ کر اپنے نفس ہی کو ملامت کرے کہ تو بھی برا آدمی ہے کہ تیرے بھائی کی جانب سے ستر عذر قبول نہ کئے گئے۔

قولہ: المؤمن: جس نے اپنی مخلوق کو ضرر رساں چیزوں کو دفع کرنے کیلئے آلات کا فائدہ پہنچا کر مامون کر دیا۔

یا نیک لوگوں کو قیامت کے دن کی بڑی گھبراہٹ سے مامون کر دیا۔

یا اپنے بندوں کو ظلم سے مامون کر دیا بلکہ اللہ پاک اپنے بندوں کے ساتھ جو معاملہ کریں گے وہ یا تو مبنی بر فضل ہوگا یا مبنی بر عدل (اور

یہ دونوں معاملے ظلم سے پاک ہیں) اور سراسر امان ہیں تو بایں صورت مؤمن کا مرجع اسماء افعال ہیں یا مؤمن کا معنی ہے اپنے نبیوں کی

تصدیق مجربات کے ساتھ فرمائی۔ تو اس صورت میں مؤمن کا مرجع کلام قدیم ہے۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ موافقت فی الاسماء مشابہت فی الذوات کا تقاضا نہیں کرتی اس لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا مؤمن ہونا درست ہے۔ (اگرچہ مؤمن بندے کی صفت بھی ہے) تو اس مشابہت فی الصفات کی وجہ سے بندہ رب کے مشابہ نہیں ہو جاتا (کیونکہ حق سبحانہ و تعالیٰ کا مؤمن ہونا اور حیثیت سے ہے اور بندے کا مؤمن ہونا اور حیثیت سے) دونوں ایمانوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ اتنی کلام۔

اور عارف کی ذمہ داری صفت مؤمن کے بارے میں یہ ہے کہ وہ حق کی تصدیق کرے اور اس تصدیق کو مزید پختہ کرے اور کسی پر ظلم کرنے یا کسی کو ضرر پہنچانے سے باز آجائے اور اس طرح ہو جائے کہ لوگ اس کی تکالیف سے مامون ہو جائیں بلکہ مزید خوفناک چیزوں اور دین و دنیا کے امور میں رخنہ انداز مفاسد کے دفع کیلئے لوگ اس سے تقویت حاصل کریں۔

کہا گیا ہے کہ جب آدمی اس بات کو جان لے کہ حق تعالیٰ اپنے وعدہ میں صادق ہے اور اپنے بندوں میں سے جس کی چاہے تصدیق فرماتا ہے تو ایسے شخص کو حق تعالیٰ کی تصدیق کے علاوہ سکون ہی نہ آئے اور مؤمن کا عطف سلام پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ امن دینے والا معنی مؤمن میں سلام کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مؤمن کا معنی ہے کسی کے طلب امن کو قبول کر کے اس پر امن دینے کیلئے متوجہ ہو جانا یعنی قبول و اقبال۔ واللہ اعلم۔

قوله: المہيمن: یعنی ایسا نگہبان جو انتہائی حفاظت اور نگہبانی کرنے والا ہو۔ اسی سے ماخوذ ہے ”مہيمن الطائر“ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی پرندہ اپنے بچوں کی حفاظت کیلئے ان پر اپنے پروں کو بچھا دے۔ اور مہيمن اسماء افعال میں سے ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ مہيمن کا معنی ہے شاہد اور شاہد بمعنی عالم ہے یعنی ایسی جاننے والی ذات کہ جس سے رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی چیز چھپنے نہ پائے۔ تو اس صورت میں مہيمن کا مرجع علم ہے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ مہيمن کا معنی ہے وہ ذات جو ہر نفس کے عمل و سبب پر گواہی دے گی۔ تو اس صورت میں مہيمن کا مرجع قول ہے۔ اور اس سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ [المائدة: ۴۸] یہاں مہيمن بمعنی شاہد ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ مہيمن ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جو مخلوق کے اعمال اور ان کے رزق اور ان کی عمریں اور ان کی اخلاق جیسے امور کو قائم کرنے والی ہو۔ تو اس صورت میں مہيمن کا مرجع قدرت ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کی اصل مؤمن ہے ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا یہ فعلیل کے وزن پر ہے اور مہيمن یہ املتہ سے ہے یعنی ایسی ذات جو اپنے وعدہ میں صادق ہو۔ تو اس صورت میں مؤمن کا مرجع کلام ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ کتب قدیمہ میں یہ ذات باری تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ مہيمن ایسی ذات کا نام ہے جس میں تین صفات جمع ہوں:

(۱) کسی چیز کے حال کو جاننا۔ (۲) اس چیز کی مصلحتوں کی رعایت پر مکمل قدرت۔ (۳) اس چیز کی مصلحتوں کا قیام۔

باقی رہا مہيمن سے عارف کا حصہ وہ یہ ہے کہ عارف اپنے دل کی مکمل نگہبانی کرے اور دل کے احوال کو درست کرے اور اپنے اعضاء اور توئی ایسے شغل سے محفوظ رکھے جس کے نتیجہ میں اس کا ذات باری تعالیٰ کی پاکیزہ بارگاہ سے اعراض کرنے لگے اور یہ اعراض حق تعالیٰ شانہ اور عارف کے درمیان حائل ہو جائے کسی کہنے والے نے کہا ہی خوب بات کہی ہے کہ جو شخص یہ جان لے کہ ذات باری تعالیٰ

مہیمن ہے تو وہ جملہ احوال میں اس کے جلال کے سامنے پست رہے۔

قوله: العزیز:

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ﴾ [یوسف: ۲۱]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ عزیز کا معنی ہے جس کی کوئی مثال نہیں تو اس صورت میں عزیز کا مرجع تنزیہ ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں عزیز ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جس کا اس کے اوصاف کے ساتھ احاطہ مشکل ہو۔

باقی رہا عارف کی ذمہ داری اسم عزیز سے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو عزت والا بنائے اور اپنے نفس کو لوگوں سے سوال کی وجہ سے اور ان کی طرف احتیاجی ظاہر کرنے کی وجہ سے گھسیانہ بنائے۔

ابو العباس فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے عزت مخلوق سے اپنا قصد اٹھالینے میں ہی دیکھی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اللہ کو عزیز وہ جانتا ہے جو اس کے حکم اور بندگی کو بڑا سمجھے، اور جو شخص اللہ کے اوامر کو ہلکا سمجھتا ہے تو یہ بات محال ہے کہ وہ اللہ کے عزیز ہونے کا پختہ اعتقاد رکھتا ہو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهِۦ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [المنافقون: ۸]

قوله: العجبار: اس کی بناء جبر مصدر سے بطور مبالغہ ہے جبر کہتے ہیں سختی کے ساتھ شے کی اصلاح کرنا۔ اور اس کا اطلاق مخلص اصلاح پر بھی کیا جاتا۔ جیسے کہ جناب علی کرم اللہ وجہ سے منقول ہے ”یا جابر کل کسمیر“ اے ہر ٹوٹی ہوئی چیز کی اصلاح کرنے والی ذات۔ اور اس طرح جبر کا اطلاق قہر محض پر ہوتا ہے جیسے کہ وارد ہوا (لا جبر ولا تفریض) یہاں جبر مطلقاً قہر محض کے معنی میں ہے اور پھر مجازاً ایسی بلندی پر بھی جبر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے جو علو اور بلندی قہر اور غلبے کے سبب سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظمہ کو بھی جبارۃ کہا جاتا ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ جبار بندوں کے امور کی اصلاح کرنے والی ذات کو کہتے ہیں۔ جو ذات مؤمن کو اس کے فقر سے بے پرواہ کر دے اور مؤمن کی کسر نفسی سے اس کی عظمت شان کی اصلاح کر دے۔ اور جبار یہ اسماء افعال میں سے ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ جبار ایسی بلند و بالا ذات کو کہتے ہیں کہ جس کو مکاروں کا مکمل لاحق نہ ہو سکے اور قاصدین کا قصد نہ پاسکے تو اس صورت میں ”جبار“ کا مرجع تنزیہ باری تعالیٰ ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جبار کا معنی ہے ایسی ذات جو بندوں کو اپنے ارادے پر قہر مجبور کر دے خواہ وہ ارادہ امر سے متعلق ہو یا نہی کے متعلق۔ ایسی ذات جو علی سبیل لا جبار، ان سے اپنا ارادہ صادر ہونے پر مجبور کر دے پس بندے کی خوشی ناخوشی اللہ کے ارادے کے مطابق ہو جائے۔ خواہ وہ ارادہ اخلاق کے متعلق یا اعمال کے متعلق بندوں کے رزق کے متعلق ہو یا ان کی عمروں کے متعلق اور اس صورت میں جبار صفات ذات میں سے ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ عارف کی ذمہ داری اس اسم شریف سے یہ ہے کہ وہ اپنے نفس پر متوجہ ہو کمال فضائل کے حصول کے ساتھ نفس کے ذرائع کی اصلاح اور تلافی کرے اور نفس کو رزائل سے بچنے پر ہمیشہ براہیختہ کرے اور مختلف قسم کے لمحے کی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ساتھ نفس کی خواہش و شہوات کو توڑ ڈالے اور حق تعالیٰ شانہ کے علاوہ سے علیحدگی اختیار کرے۔ مخلوق کی طرف التفات نہ کرے وقار و سکون والے اخلاق اپنائے۔ بایں حقیقت کہ حوادث زمانہ کا پے در پے آنا اس کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کر پائے اور اسی طرح مصائب کا مسلسل نازل ہونا اس میں مؤثر نہ ہو۔ بلکہ اصلاح اور رہنمائی کی صورت میں نفوس انسانی اور جہان میں تاثیر کیلئے مضبوطی اختیار کرے۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ جب کوئی اسم ایسے کوئی معانی کا احتمال رکھتا جن میں سے بعض کو ذات باری تعالیٰ کی صفت میں لانا درست ہو تو جو شخص ذات باری تعالیٰ کو اسم کے ساتھ پکارے گا تو گویا اس نے انہیں معانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ جل شانہ کی ثناء کی ہے۔ (یعنی جن معانی کا ذات باری تعالیٰ کی صفت میں لانا درست ہے) تو اس لئے اللہ پاک جبار باری معنی کہ وہ ایسا عزیز و متکبر ہے جو اپنے بندوں پر احسان کرنے والا ہے۔ کوئی چیز اس کی بادشاہت میں اس کی مراد کے خلاف جاری نہیں ہو سکتی جو شخص یہ بات جان لے کہ اللہ کو اس کی بلندی قدرت کی وجہ سے کوئی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ تو اس بات کا یقین کر لے کہ اس کو قدرت استعمال کرنے سے روکنے کیلئے کوئی راستہ نہیں اور بندے کو اس کی طرف سے لطف و احسان بھی پہنچتا ہے۔ آج اس کی معرفت ہے تو کل اس کی مغفرت۔ عارف جب یہ بات جان لے کہ وہ مخلوق کو اپنے ارادے پر مجبور کر سکتا ہے اور اس کی سلطنت و بادشاہت میں اس چیز کا اجراء نہیں ہو سکتا جس چیز کو وہ ناپسند سمجھتا ہے اور جس چیز کا وہ انکار کرتا ہے۔ تو آپ عارف کو چاہئے کہ وہ اپنی چاہت کو چھوڑ دے اور اپنے مولیٰ کے حکم کے تابع ہو جائے۔ تو ایسا عارف سوچ و فکر کی مشقت اور امور تدبیر کی تھکاوٹ سے راحت حاصل کرے گا۔ جیسا کہ بعض کتب میں یہ حدیث قدسی منقول ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے تو بھی ارادہ کرتا ہے میں بھی ارادہ کرتا ہوں، اور ہوتا وہی ہے جس چیز کا میں ارادہ کرتا ہوں۔ اگر تو میرے ارادے اور میری چاہت پر راضی ہو جائے تو میں تیرے ارادے اور تیری چاہت کی طرف سے کفایت کر دوں گا اگر تو میرے ارادے پر راضی نہ ہو تو میں تجھے تیرے ارادے کے حصول میں تھکا ڈالوں گا پھر بھی ہونا وہی ہے جو میرا ارادہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ابوزید کو کہا گیا کہ آپ کیا ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ میں ارادہ نہ کرو۔

ابو عبد اللہ انصاری نے کہا کہ عدم ارادہ کا ارادہ بھی ارادہ ہے۔ امام غزالی نے جبار کا حاصل اور خلاصہ بیان پر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بندوں میں سے جبار وہ ہے جو اپنے رب کی اتباع کی وجہ سے بلند ہو جائے اور دوسرے کو اپنے تابع کرنے کا درجہ پالے اور اپنے بلندی مرتبہ کی وجہ سے بایں انداز منفرد ہو جائے کہ مخلوق کو اپنی خاص ہیئت و صورت کے ساتھ اپنی اقتدار اور اپنی خصلت و سیرت کی اتباع پر مجبور کر ڈالے۔ مخلوق خدا کو فائدہ پہنچائے ان سے فائدہ طلب نہ کرے۔ دوسروں میں مؤثر ہو دوسروں سے متاثر نہ ہو۔ یہ مقام علی وجہ الکمال صرف اور صرف ہمارے نبی ﷺ کو حاصل ہوا۔ اسی وجہ سے آپ نے فرمایا ”لو کان موسیٰ حیاً لما وسعہ الا اتباعی وانا سید ولد آدم ولا فخر“ یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام بھی اگر زندہ ہوتے ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ چارہ نہ ہو۔ اور میں اولاد آدم کا سردار ہونا اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔

قولہ: المتکبر: معنی ہے ذوالکبریاء یعنی بڑائی والی ذات اور وہ ذات پروردگار اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ متکبر کا معنی ہے ایسی ذات جو مخلوق کی صفات سے بلند و بالا ہو۔ اور کہا گیا ہے کہ متکبر کامل و اکمل ذات کو کہتے ہیں۔ ذات باری تعالیٰ کے علاوہ متکبر کسی کی صفت نہیں لائی جاسکتی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ متکبر کا معنی ہے ایسی ذات جو اپنی ذات کی نسبت اپنے علاوہ کو حقیر سمجھے اور وہ اپنے علاوہ کو اس طرح دیکھے جیسے مالک اپنے غلام کو دیکھتا ہے۔

متکبر کا لفظ جب مطلقاً بولا جائے تو ذات باری تعالیٰ کے علاوہ تصور کسی اور طرف نہیں ہو جاتا پس ذات باری تعالیٰ ہر چیز کی نسبت ہر طرح سے عظمت و کبریائی میں منفرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متکبر کا اطلاق صرف ذات باری تعالیٰ کیا جاتا ہے اگر ذات باری تعالیٰ کے غیر پر متکبر کا اطلاق کیا بھی جاتا ہے تو مذمت کے زمرے میں کیا جاتا ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ متکبر باب تفعیل سے ہے اور باب تفعیل کی خاصیت اور وضع ایسی چیز کیلئے ہے جو

حقیقت میں تو نہ ہو اس کے اظہار کیلئے تکلف سے کام لیا جائے۔ تو مناسب یہ ہے کہ متکبر کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر نہ کیا جائے۔ امام طبریؒ جواب دیتے ہیں کہ بات تفعل میں جو بالفعل تکلف ہے وہ مبالغہ کو بھی متضمن ہے اس لئے لفظ متکبر کا اطلاق جب ذات باری تعالیٰ پر کیا جائے گا تو اس کو تکلف بالفعل سے مجرد کر کے محض مبالغہ ہی ملحوظ ہوگا اور اس کی نظائر کلام عرب میں شائع ذائع ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ باب تفعل تکلف کے علاوہ کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے قمص اور ترمم جس کا معنی ہے محض قمیص پہننا عامہ باندھنا ہے یہاں کوئی تکلف والا معنی نہیں۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جس نے اللہ پاک کی بلند کی شان اور اس کی کبریائی کو پہنچان لیا تو اس کو چاہئے کہ وہ عاجزی کے طریقے کو لازم پکڑے تذل اور تواضع کے راستے پر چل پڑے۔ بعض حضرات کہتے ہیں جو شخص اپنے مرتبے سے تجاوز کرتا ہے تو وہ اپنا ہتک ستر کر بیٹھتا ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ فقیر اپنے پرانے کپڑوں میں اس آدمی سے اچھا ہے جو دوسرے کے نئے کپڑے پہنے پھر رہا ہو۔ اور سرداروں کی موجودگی میں خدام کیلئے تواضع سے بڑھ کر کوئی اچھی چیز نہیں۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص اللہ کی محبت میں سچا اور اس کی مودت میں مخلص ہے تو اللہ کو جو اس کے نہ دینے میں لذت آتی ہے وہ لذت اس لذت سے کہیں بڑھ کر ہے جو لذت اس کو عطاء کرنے میں ہے۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ متکبر سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ جب آپ نے اس کی کبریائی کا مشاہدہ کر لیا تو آپ کو چاہئے کہ آپ شہوات کی طرف مائل ہونے اور مرغوبات کی طرف سکون حاصل کرنے سے تکبر اختیار کریں۔ (یعنی ان چیزوں کا ارتکاب نہ کیجئے)۔ اس لئے ان چیزوں میں تو جانور بھی آپ کے ساتھ شریک ہیں بلکہ ہر ایسی چیز سے تکبر اختیار کر لیجئے جو آپ کے دل کو حق تعالیٰ سے مشغول کر دے اللہ کی پاکیزہ بارگاہ کی طرف پہنچنے کے علاوہ دنیا و آخرت کی ہر لذت چیز کو حقیر سمجھے اور آپ سے بڑائی کے سارے دعوے زائل ہو جانے چاہئیں تاکہ آپ کا نفس صاف ستھرا ہو جائے اور اس پر حق کی مہر چھاپ جائے۔ یہاں تک کہ نفس کی بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو جائے اور اس کے نشانات ختم ہو جائیں۔ نفس کا کوئی اختیار باقی نہ رہے اور نفس کو حق تعالیٰ کے علاوہ قرار و سکون نہ ہو۔

قوله: الخالق بیه خلق مصدر سے ہے۔ اور اس کا معنی ہے درست اور سیدھا اندازہ کرنا اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فیتبارک احسن الخالقین﴾ [المؤمنون: ۱۴] تو خالقین مقدرین کے معنی ہے یعنی اللہ بہترین اندازہ کرنے والے ہیں اور اس طرح: ﴿وتخلقون افکا﴾ [العنکبوت: ۱۷] تقدرون کذباً کے معنی میں ہے اسی طرح خلق بمعنی ابداع استعمال ہوتا ہے یعنی کسی چیز کو انوکھے انداز میں پیدا کرنا۔

اسی طرح شیء کو بغیر اصل کے ایجاد کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿خلق السموات والارض﴾ [الانعام: ۱۰]۔

اور اسی طرح تکوین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿خلق الانسان من نطفة﴾ [النحل: ۱۰۴] اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اللہ خالق کل شیء﴾ میں خالق قادر اور موجد کے معنی میں ہے یعنی اصل سے یا بغیر اصل کے اندر ہر چیز کے مقدر اور موجد ہیں۔

قوله: الباری: اس کے آخر میں ہمزہ ہے یعنی وہ ذات جس نے مخلوق کو تفاوت اور فرق سے بڑی اور پاک کیا۔
قوله: المصور: واؤ مشدودہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی وہ ذات جو انوکھے انداز میں ایجادات کی صورتیں بنانے والی ہے اور اس کی مزین اور مرتب کرنے والی ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مصور ایسی ذات کو کہتے ہیں جو چیز کی صورت ایسی ہیئت پر بنائے کہ جس کی وجہ سے اس کے خواص و افعال مکمل ہو جائیں۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اصل یا بغیر اصل ایجاد کرنے والا اور اس چیز کے بارے میں بغیر کسی خلل اور فرق اللہ و جل شانہ کی بات سبقت کر چکی ہے۔ اور اللہ ایسی صورت کا مصور ہے کہ جس پر اس کے خواص مرتب ہوتے ہیں اور اس پر اس کا کمال تام ہو جاتا ہے یہ تینوں اسماء نہیں ہیں (بلکہ معانی کے لحاظ سے بہت تفاوت ہے۔ ”کما عرفت معانیہا المختلفہ فی السابق“۔

عارف کا حصہ صفت مصور سے وہ یہ ہے کہ وہ کسی امر کا تصور نہ کرے۔ ہاں البتہ ایسی چیز میں ضرر و غور و غوض کرے جس میں حق جل شانہ کی واضح قدرت اور اس کی کارگیری کے عجائبات چھلک رہے ہوں۔ تاکہ وہ مخلوق سے خالق کی طرف ترقی کر جائے اور مصنوع کا ملاحظہ کرنے کی وجہ سے صانع کی طرف منتقل ہو جائے۔ حتیٰ کہ وہ ایسا بن جائے کہ جب بھی وہ کسی چیز کی طرف نظر کرے تو اس چیز کے ہاں وہ اللہ ہی کو پائے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ بندہ جب یہ بات جان لے نہ تو وہ کوئی چیز تھا اور نہ ہی عین تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو شے بنایا اور اس کو عین بنا دیا۔ تو مناسب یہ ہے کہ بندہ اپنے حال پر عجب پسندی سے کام نہ لے اور نہ ہی اس کے افعال عجب پر دال ہوں۔ اور بندے پر اس کے انجام کا حکم مخفی کر دیا گیا ہے اور ایسا شخص کیونکہ عاجزی نہیں کرے گا جو یہ جانتا ہوں کہ وہ ابتداء میں ایک حقیر نطفہ تھا اور انتہا کے اعتبار سے وہ ایک مردار ہوگا اور وہ فی الحال واضح بھوکا اور پیٹ بھرا قیدی ہے۔ اور اس بندے میں اتنے نقائص ہیں کہ اگر وہ ان میں ذرا بھی غور و فکر کرے تو اس کو اپنے رب کے جلال اور اس کی بزرگی کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔

پھر جان لیجئے کہ یہ تیرہ اسماء جن کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔ اسم جلال یعنی اسم اللہ کے علاوہ اپنے اپنے معانی پر دال ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر ایک اسم شریف اپنے سے سابق و مقدم کے اسم شریف کے مقابلہ میں زیادتی معنی کا فائدہ بھی دیتا ہے اور سورہ حشر کے اختتام پر بھی یہ اسماء اسی ترتیب سے وارد ہوئے ہیں۔ لیکن وہاں ان کے ساتھ عالم الغیب اور العزیز الحکیم کی زیادتی بھی ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ سورہ حشر کا آخر اللہ کے اسم اعظم پر مشتمل ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ: الغفار: یعنی ایسی ذات جو دنیا میں گناہوں اور عیبوں پر پردہ ڈال کر ڈھانپ دے اور آخرت میں عذاب عقاب نہ کرنے کی صورت میں پردہ ڈال کر ڈھانپ دے۔

زیادتی الفاظ کی وجہ سے یہ لفظ غفور سے مبلغ ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں غفار میں مبالغہ کیفیت و مقدار کے اعتبار سے ہے اور غفور میں مبالغہ کیفیت کے اعتبار سے ہے اور غفر کا اصل معنی ڈھانپنا ہے اور یہ اسماء افعال میں سے ہے۔

آپ کا حصہ صفت غفار سے تو وہ یہ کہ آپ اس بات کا یقین کر لیں کہ ذات باری تعالیٰ کے علاوہ گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں اور آپ کو بھی چاہئے کہ اللہ کے بندوں کی سز پوشی کریں اور ان سے معافی تلافی والا معاملہ کریں اور استغفار کو لازم پکڑیں خصوصاً اوقات حرم میں۔

امام قشیریؒ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ...﴾ (النساء: ۱۱۰) کے بارے میں فرماتے ہیں کہ تم تو احمق کا تقاضا کرتا ہے۔ تو گویا اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جس نے اپنی ساری عمر لغزشوں میں گزار دی۔ اور اپنی حیات مستعار کو اپنے پروردگار کی مخالفتوں میں فناء کر دیا اور اپنی جوانی کو غلط کاموں میں برباد کر دیا پھر وہ موت سے پہلے شرمندہ ہو گیا تو وہ اپنے اللہ کی

جانب اپنے گناہوں کی معافی ہی پائے گا۔ من یعمل سوءاً ۱ میں بندے کے فعل کی خبر دی گئی اور ثم ۱ يستغفر اللہ میں بندے کے قول کی خبر دی گئی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے جن لوگوں کی لغزشیں ان کی حالت ہے۔ اور ان کی توبہ ان کی بات ہے اے مخاطب! اللہ پاک نے آپ پر معاملہ سہل کر دیا کہ آپ کی جانب سے ایک بات پر وہ راضی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ آپ نے جو عمل کیا سو وہ کیا ہے۔ استغفار محض مغفرت کا تقاضا کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں یجد اللہ گناہگار کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے لایا گیا جیسے وہ مغفرت طلب کرے یا اللہ کو پالے گا۔

قوله: القهار یعنی وہ ذات کہ موجودات میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کی قدرت کے نیچے مشہور اور اس کے فیصلے اور تقدیر کے سامنے تابع نہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ﴾ [الانعام: ۱۸] اور قہار کا مرجم قدرت ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ قہار ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بڑے بڑے ظالموں کو رسوا کر دے اور ان کو ہلاک کر کے ان کی کمریوں کو توڑ دے۔ اس صورت میں ”قہار“ اسماء افعال میں سے ہے۔

کہنے والے نے کیا ہی اچھی بات کہی ہے کہ ”قہار“ وہ ذات ہے کہ اس کے حملے کے سامنے ہر سرکش اور جابر کا حملہ مضحل اور کمزور ہو جائے۔ اور اس کی شان و شوکت کے سامنے بادشاہوں اور اہل فخر و تکبر کے قوی ختم ہو جائیں۔ خصوصاً اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿لَمَنَ الْمَلِكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [الغافر: ۶۶] کے وقت کہا ہوں گے شاہانِ فاری اس خطاب کے وقت اور کہاں ہوں گے انبیاء اور اسل اور مقرب فرشتے اس عتاب کے وقت کہاں ہوں گے، حاملینِ ضلالت و ایجاد۔ اور حاملینِ توحید و ارشاد کہاں ہوں گے آدم علیہم السلام اور ان کی اولاد کہاں ہوں ابلیس اور اس کا گروہ۔ گویا کہ وہ ختم ہو چکے گویا کہ وہ اس کائنات میں کبھی رہے ہی نہ تھے جانیں نکل چکی ہوں گی اور رومی اپنے مقام پر پہنچ چکی ہوں گی اور جیسا کہ متفرق ہو چکے ہوں گے۔ صرف ایک ایسی ذات موجود رہے گی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کے علاوہ اول تا آخر ساری چیزیں ختم ہو جائیں گی انسانوں کے جوڑ اور ان کے اعضاء متفرق ہو چکے ہوں گے۔ اور بطور فائدہ یہ بات بھی جان لیجئے کہ اللہ پاک نے عابدین کے نفوس کو اپنے حقوقِ عبودیت کے ساتھ اور عارفین کے قلوب کو اپنی قربت کی شان و شوکت کے ساتھ اور رواجدین کو اپنی کشفِ حقیقت کے ساتھ مقہود کر رکھا ہے۔ عابد بے نفس ہوا کرتا ہے کیونکہ عابد کے نفس کے افعال پر باری تعالیٰ کی حجتِ غلبہ پانچنی ہوتی ہے۔ اور عارف بے دل ہوا کرتا ہے اس لئے کہ اس کے دل پر ذاتِ باری کی توجہ حجتِ غلبہ پانچنی ہوتی ہے اور رواجد بے روح ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی روح پر اس کے جلال و جمال کے کشف پر غلبہ پانچنی ہوتا ہے۔

قوله: الوهاب یعنی ہمیشہ دینے والی کثیر النعمۃ ذات جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ [النحل: ۱۸]

النحل: ۱۸ ﴿وَأَنْ تَعْدُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تَحْصُوهَا﴾ [النحل: ۱۸]

بہ حقیقتاً اس کو کہتے ہیں جو اعراض اور اغراض کی غرض سے خالی ہو لہذا جو کسی غرض سے دیتا ہے گویا وہ اپنا عوض کرنے والا ہے وہ واجب نہیں ہے اور و اہب اسماء افعال میں سے ہے۔

قوله: الرزاق یعنی وہ ذات جو ان رزاق و اسباب کی خالق ہے جن رزاق و اسباب سے نفع اٹھایا جاتا ہے اور رزق اس چیز کو کہتے ہیں جس سے نفع اٹھایا جائے خواہ وہ چیز مباح ہو یا ممنوع۔ لیکن معتزلہ کہتے ہیں رزق وہ کہلائے گا جو انسان کی ملک میں ہوگا لیکن ان کے اس قول کا فاسد ہونا طرذ اور عطفاً ظاہر ہے۔ طرذ اذ فاسد ہونا اس لئے ظاہر ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز ملک ہو سکتی ہے لیکن ہر چیز رزق نہیں کہلاتی۔ اور عطفاً اس لئے فاسد ہے کہ اللہ پاک نہ جانوروں کو ان کا رزق عطا کرتے ہیں کیونکہ ارشاد باری: ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي

اس رزق کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) ظاہری جو بدن وغیرہ کیلئے ہوتا ہے جیسے اشیاء خورد و نوش اور دیگر ساز و سامان۔ (۲) باطنی۔ جو قلوب اور نفوس کیلئے ہوتا ہے جیسے علوم و معارف وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین کہتے ہیں کہ رزاق اس ذات کو کہتے ہیں جو دلوں کو اپنے لطف کے فوائد اور روحوں کو اپنے کشف کے عوائد کا رزق عطا کرے۔

بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ رزاق وہ ذات ہے جو نیک لوگوں کے نفوس کو اپنی توفیق عطا کرے اور بہترین لوگوں کے قلوب کو اپنی توفیق سے روشن کر دے۔

باقی رہا عارف کا حصہ صفت رزاق سے یہ ہے کہ وہ رزاق کے معنی کا خوب تحقیق کرے تاکہ اس کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ رزاق کہلانے کا مستحق اللہ ہی ہے رزق کا انتظار اور اس کی توقع صرف اللہ ہی سے کی جاسکتی ہے اور اپنے معاملہ کو اللہ کے سپرد کرے۔ اور رزق کے سلسلہ میں اللہ ہی پر بھروسہ کرے۔ اور اپنے ہاتھ کو اپنے رب کا خزانہ بنا دے اور اپنی زبان کو اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان تعلیم صرف مال اور ان کے حق میں دعائے خیر کے واسطہ سے ان کی طرف روحانی جسمانی رزق پہنچانے کی صورت میں واسطہ بنا ڈالے تاکہ وہ بھی اس صفت حسنہ سے حصہ وافر پالے۔

امام تشریحی فرماتے ہیں جو شخص یہ پہچان لے کہ اللہ ہی رزاق ہے تو اس کو چاہئے کہ ہمیشہ اللہ پر بھروسہ کرنے کی صورت میں اسی طرف قصد کرے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ جیسا کہ عارفین میں سے کسی ایک سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپ کھاتے کہاں سے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ جب سے میں نے اپنے خالق کو پہچانا ہے تو رزق کے سلسلہ میں میں کبھی بھی تشکیک کا شکار نہیں ہوا۔ اور اسی طرح کسی عارف سے جب سوال کیا گیا کہ آپ کی روزی کیا ہے تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میری روزی ایسی زندہ ذات کا ذکر ہے جس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔

اسی طرح بعضے، از عارفین کا یہ قول بھی منقول ہے کہ وہ حقیر چیز کا سوال حقیر سے کرتا ہے تاکہ وہ اس کے بدلے اس کو بڑی اور خفیہ چیز دیدے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يقرضُ اللّٰهَ قرصًا حسنًا﴾ [البقرہ: ۲۴۵] اسی سے ملتا جلتا واقعہ حضرت شبلیؒ کا ہے انہوں نے ایک مالدار آدمی کی طرف اپنا قاصد بھیجا کہ ہمیں بھی وہ اپنی دنیا میں سے کچھ دے تو مالدار نے جواب میں لکھ بھیجا کہ اپنے مولیٰ سے اپنے لئے دنیا کا سوال کرو تو شبلیؒ نے جواب میں فرمایا کہ دنیا بھی حقیر ہے اور تو بھی حقیر ہے تو اس لئے کہ میں حقیر چیز کا سوال حقیر ہی سے کرتا ہوں۔ میں اپنے مولیٰ سے تو اپنے عظیم مولیٰ کو طلب کرتا ہوں۔ اس سے کوئی اور چیز طلب نہیں کرتا۔

اور باقی یہ واقعات اس روایت کے منافی نہیں جس میں یہ وارد ہوا کہ ”یا موسیٰ سلنی حتی ملح عجبینک“ کہ اے موسیٰ! مجھ ہی سے سوال کرو اگرچہ یہ سوال آئے کے نمک کے سلسلہ ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ مخلوق سے اس چیز کے بارے میں سوال کرنا جو عموماً ان کے پاس پائی جاتی ہیں۔ یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ اللہ سے اس چیز تک پہنچنے کے اسباب کی آسانی کا سوال کیا جائے۔

قولہ: الفتحاح یعنی مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے والی ذات۔ یہ فتح سے ہے اور فتح بمعنی حکم ہے اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ربنا افصح بیننا وبين قومنا وانت خیر الفاتحین﴾ [الاعراف: ۸۹] اور حکم کو فتح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ حکم اور فیصلہ بھی نھمیں کے درمیان امر مطلق کو کھول دیتا ہے اور اللہ پاک نے رسولوں کو بھیجے اور کتابوں کو نازل کرنے اور عقلی اور نقلی دلائل قائم کرنے کی صورت میں حق کو ظاہر کر کے اس کو واضح کر دیا اور باطل کو ظاہر کر کے اس کو مٹا دیا۔ اس صورت میں صفت فتح کا مرجع علم بنتا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتح ایسی ذات کو کہتے ہیں جو مختلف قسم کی مخلوقات پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وعندہ مفاتیح الغیب لا یعلمہا الا هو﴾ [الانعام: ۵۹] اور اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ما یفتح

اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ﴿۱۰۲﴾ [الفاطر: ۱۰۲]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مفتاح یہ فتح سے ہے اور فتح کہتے ہیں حسی اور معنوی تنگی کو کھول دینا جیسے وہ شخص جو اپنے فیصلے کے ذریعے حق کے سلسلے میں خصمین کی تنگی کو کھول دیتا ہے۔

بعض بزرگوں سے یہ بھی منقول ہے کہ فتح وہ ذات ہے کہ جو گناہوں کی وجہ سے نعمت کے راستوں کو بند نہ کرے اور بھلا دینے کی وجہ سے ایصالِ نعمت نہ چھوڑے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتح اس ذات کو کہتے ہیں جو مؤمنین کے دلوں کو اپنی معرفت کے نور کی وجہ سے کھول دے اور گنہگاروں پر اپنی مغفرت کے دروازے کھول دے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتح اس ذات کو کہتے ہیں جو نفوس پر اپنی توفیق کا دروازہ اور دلوں پر اپنی تحقیق کا دروازہ کھول دے۔

آپ کا حصہ صفتِ فتح سے وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان فتح کی سعی اور کوشش کریں اور آپ مظلوموں کی نصرت کریں اور مخلوقِ خدا پر جو دینی یا دنیاوی امور گراں یا مشکل ہیں ان کو آسان کرنے کا ارادہ کریں تاکہ آپ کیلئے بھی اس اسم شریف سے حصہ ہو جائے۔

امامِ قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جب بندہ یہ بات جان لے کہ بند دروازوں کو کھولنے والی اور اسباب کو آسان کرنے والی جملہ امور کو درست کرنے والی ذات وہی ہے تو پھر اس کو چاہئے کہ وہ اپنے دل کو اس کے علاوہ کسی بھی ذات کے ساتھ معلق نہ کرے اور اس کی سوچ و فکر اس کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول نہ ہو اگر اللہ کی طرف سے مصیبت و آزمائش میں زیادتی ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعتماد اور امید میں اضافہ کر دینا چاہئے اور یہ بھی جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نفوس کیلئے توفیق کی برکات کو اور قلوب کیلئے تحقیق کے درجات کو کھول دیتا ہے اور نفوس کا مجاہدات کے ساتھ مزین ہونا اسی کی توفیق کی برکات کی وجہ سے ہوتا ہے اور قلوب کا مشاہدات کے ساتھ مزین ہونا اسی کی تحقیق کے درجات کی وجہ سے ہوتا ہے اور جو شخص یہ بات جان لے کہ اللہ کی ذات ہی فتح ہے تو اس کے آداب میں سے یہ ہے کہ اس کے کرم کے حصول کیلئے اس کو حسنِ انتظار سے کام لینا چاہئے اور اس کے لطف و مہربانی پانے کیلئے ہمیشہ منتظر رہنا چاہئے اور اس کے اجرائے حکم کے تحت ساکن رہنا چاہئے اور وہ اس بات کو جان لے کہ جس چیز کو اس نے مؤخر کر دیا ہے اس کو کوئی مقدم کرنے والا نہیں اور جس چیز کو اس نے مقدم کر دیا ہے اس کو کوئی مؤخر کرنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک آدمی نے حضرت علیؑ کی لونڈی کو کہا کہ مجھے تجھ سے محبت ہے تو اس لونڈی نے یہ بات حضرت علیؑ کو ذکر کی تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اس کو جا کر کہہ دو کہ میں بھی تجھ سے محبت کرتی ہوں تو اس کے بعد کیا کرنا ہے تو اس لونڈی نے یہ بات جا کر کہہ دی تو اس آدمی نے کہا صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان وصال کا فیصلہ فرما دے تو لونڈی نے یہ ساری بات جا کر حضرت علیؑ کو ذکر کی تو حضرت علیؑ نے اس آدمی کو بلایا اور اس سے سارے قصے کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو اس نے ساری بات سچ سچ بتلا دی حضرت علیؑ نے فرمایا اس لونڈی کو لے جاؤ یہ تیری ہے اللہ نے تمہارے درمیان وصال کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ فتح اسمائے افعال میں سے ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتح اس ذات کو کہتے ہیں جو فتح اور نصرت کو انوکھے انداز میں پیدا کر دے اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ

ہے: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ [الفتح: ۱۰۱]

قولہ: العليم:

ایسی عالم ذات جو علم میں انہما کو پہنچی ہوئی ہو اور اس کا علم محیط ہو اور اس کا علم تمام چیزوں کے ظاہر و باطن سے اور ان کے چھوٹے

اور بڑے سے اور ان کی کلیات و جزیات سے سبقت کرنے والا ہے اور یہ عظیم صفات ذات میں سے ہے اور ایسی عالم ذات اللہ کی ہے جو اپنی ذات و صفات اور اپنے اسماء کو جانتا ہے جو کچھ ہو چکا اس کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ ہو تو سکتا ہے لیکن ہوگا نہیں اس کو بھی جانتا ہے اور اگر وہ چیز ہو جائے تو اس کی کیا کیفیت ہوگی اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ اور محال چیز کو اور وہ کس اعتبار سے محال ہے اس کو بھی جانتا ہے اور اگر بفرض محال وہ محال نہ رہے تو اس پر کیا مرتب ہوگا وہ اس کو بھی جانتا ہے جیسا کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلَا اللّٰهِ لَفَسَدَتَا﴾ [الانبیاء: ۲۲] (یعنی تعدد الہ محال ہے اگر ہو جائیں تو فساد مرتب ہوگا۔ تو خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ ایسی عظیم ذات ہے کہ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

کیا ہی اچھی بات ہے جو کسی قائل نے کہی ہے کہ جس شخص نے یہ پہچان لیا کہ اللہ اس کی حالت کو بخوبی جانتا ہے تو ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اس کی آزمائش پر صبر کرے اور اس کی عطا پر شکر کرے اور اپنی خطاؤں سے معافی مانگے۔ امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے یہ جان لیا کہ اللہ تمام مخفی چیزوں کو بخوبی جاننے والا ہے اور دل کے کھٹکوں سے بخوبی باخبر ہے تمام حالات میں تمام حوادث میں سے کوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ایسے آدمی کیلئے لائق یہ ہے کہ وہ اس کی اطلاع پانے کی جگہوں سے حیا کرے اور اس کی اچھی پردہ پوشی کی وجہ سے دھوکے میں پڑنے سے بچے بعض کتابوں میں یہ حدیث قدسی منقول ہے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو اگر تم یہ نہیں جانتے کہ میں تم کو دیکھ رہا ہوں تو پھر تمہارے ایمان میں خلل ہے اور اگر تم یہ جانتے ہو کہ میں تم کو دیکھتا ہوں تو پھر تم اپنی طرف دیکھنے والوں میں سے مجھے زیادہ ہلکا کیوں سمجھتے ہو۔

قوله: القابض الباسط:

یعنی وہ ذات جو جس پر چاہے جسے چاہے رزق وغیرہ تنگ کر دے یا فراخ کر دے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ قابض ایسی ذات کو کہتے ہیں جو موت کے وقت جسموں سے روحوں کو قبض کرے اور حیات کے وقت

روحوں کو ان جسموں میں پھیلا دے اور یہ دونوں صفات افعال میں سے ہیں۔

بعض عارفین کہتے ہیں کہ ان دونوں کا معنی یہ ہے کہ کبھی ضلالت و ہدایت کی صورت میں دلوں کو قبض کرے۔ اور ان میں فرانی پیدا

کر دے اور کبھی خوف اور امید کی صورت میں دلوں کو قبض کرے اور ان میں فرانی پیدا کر دے۔ (امید اور ہدایت کا تعلق بسط سے ہے

خوف اور ضلالت کا تعلق قبض سے ہے) اور بعض کہتے ہیں وہ ذات ہے جو آپ پر اپنے جلال کو کھول کر آپ کو فنا کر ڈالے اور آپ پر اپنا

جمال کھول کر آپ میں غناء پیدا کر دے جیسے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ يَبْسُطُ﴾ [البقرة: ۲۴۵] یعنی ہر چیز میں اللہ

قبض اور بسط کرتا ہے۔ خواہ وہ چیز اخلاق سے تعلق رکھتی ہو یا رزق سے یا اسی طرح اس چیز کا تعلق روحوں سے ہو یا دلوں سے جب قبض

کرے تو کوئی طاقت نہیں جب بسط اور فرانی کر دے تو کوئی فائقہ نہیں اور یہ دونوں صفات اللہ کی پختہ حکمت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی

ہیں اور باقی رہا ان دونوں صفتوں سے آپ کا حصہ تو سو وہ یہ ہے کہ آپ قبض اور بسط دونوں حالتوں کا خیال رکھیں مخلوق میں سے کسی کو عیب

مت لگائیں۔ اور آپ مصیبت کی حالت میں اللہ سے مایوس نہ ہوں اور اس کی عطا پر بے خوف نہ ہو جائیں اگر آپ بطور عدل کے اللہ کی

جانب سے حالت قبض پائیں تو صبر کیجئے اور اگر اس کی جانب سے آپ بطور فضل بسط کی کیفیت پائیں تو شکر کیجئے اور آپ اس کے فیصلے پر

فی المال اور فی الحال راضی ہو جائیے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں یہ دونوں صفات اہل معرفت پر ایک دوسرے کے بعد وارد ہوتی ہیں جب عارف پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ

منقبض ہو جاتا ہے اور جب امید کا غلبہ ہوتا ہے تو اس میں انبساط آ جاتا ہے حضرت جنید بغدادیؒ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ وہ فرماتے ہیں

کہ خوف مجھے منقبض کر دیتا ہے اور امید مجھ میں انبساط پیدا کر دیتی ہے اور حق مجھے سمیٹ دیتا ہے اور حقیقت مجھے جدا کر دیتی ہے اور وہ ان تمام حالتوں میں مجھے وحشت دلانے والا ہوتا ہے، میرا مؤنس نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ حالت قبض میرے لئے باعث وحشت اور حالت بسط میرے لئے باعث انس ہوتی ہے اتنی کلامہ۔ بندے کیلئے مناسب یہ ہے کہ وہ حالت قبض میں اکتانے سے بچے اور حالت بسط میں ترک ادب اور حد سے زیادہ چوڑا ہونے کا ارتکاب نہ کرے اور ہمارے بڑے حالت بسط میں اس چیز سے ارتکاب سے ڈرتے رہے ہیں۔

قولہ: الخافض، الرفع: یعنی وہ ذات جو میزان عدل کے پلڑے کو جھکاتی اور بلند کرتی ہیں۔

وہ ذات جو کافروں کو ذلت و رسوائی کی صورت میں پست کرتی ہے اور مؤمنین کو مغفرت و عزت کی صورت میں بلندی کرتی ہے۔

وہ ذات جو اپنے دشمنوں کو دور کر کے ان کو پست کرتی ہے اور اپنے دوستوں کو سعادت سے بہر مند کر کے ان کو بلند کرتی ہے۔

آپ کا حصہ خافض اور رافع میں یہ ہے کہ آپ اپنے احوال میں کسی حال پر اعتماد نہ کریں۔ اور اپنے علوم و اعمال میں کسی چیز پر بھروسہ نہ کریں۔ خافض اور رافع کو بطور اخلاق کے اپنانا اس طرح ہے کہ جس چیز کو اللہ نے آپ کو پست رکھنے کا حکم دیا ہے اس کو پست رکھیں جیسے نفس اور خواہش اور جس چیز کے بارے میں اللہ نے آپ کو بلند کرنے کا حکم دیا ہے اس کو بلند کریں جیسے قلب اور روح۔ جیسے ایک آدمی کو ہوا پر اڑتا دیکھا گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ آپ ہوا پر کیسے اڑ رہے ہیں تو اس نے جواب دیا میں نے اپنی ہوا یعنی خواہش کو قدموں کے نیچے رکھ دیا تو اللہ نے میرے لئے ہوا کو مسخر کر دیا۔

قولہ: المعز المذل: "اعزاز" کہتے ہیں کسی چیز کو ایسا کمال والا بنا دینا کہ جس کی وجہ سے چیز مرغوب اور قلیل المثل بن جائے۔

اذلال اعزاز کی ضد ہے اور حقیقی اعزاز انسان کا حاجت اور اتباع شہوت کی ذلت سے چھٹکارا پانا ہے۔ اور اپنے نفس کو مقہور کر کے اپنے آپ کو اپنی مراد پر غالب کرنا ہے۔

بعض عارفین فرماتے ہیں معز وہ ذات ہے جو اپنے دوستوں کو محصیت سے محفوظ کر کے ان کے اعزاز بخش دے اور پھر ان اپنی رحمت سے معاف کر دے اور پھر ان کو اپنے عزت کے گھر کی طرف منتقل کر دے پھر وہاں اپنے دیدار اور مشاہدے کی صورت میں ان کو اعزاز بخشنے۔ اور مذل وہ ذات ہے جو اپنے دشمنوں کو اپنی معرفت سے محروم کر دے۔ اور پھر ان کو اپنے دارِ عقوبت کی طرف منتقل کر دے اور پھر وہاں ان کو دھتکار کر اپنے رحمت سے دور فرما کر ان کی اہانت کر دے۔

معز اور مذل والی صفت سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ آپ اللہ کے غیر سے عزت طلب نہ کریں اور اللہ کے غیر کیلئے اپنے آپ کو ذلیل نہ کریں۔ اور آپ حق اور اہل حق کی عزت کریں اور باطل اور اہل باطل کو ذلیل کر دیں۔ اور اللہ جل شانہ سے اپنی عزت کے اسباب کی توفیق مانگیں اور اللہ عزوجل سے ذلت سے پناہ مانگیں۔

مشائخ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اللہ عزاسمہ اس کے نفس کی کی رسوائی کی طرف راہنمائی کر دیں تو اس سے بڑھ کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا اور جس شخص کو عزت کے وہم میں مبتلا کر دیں تو اس سے بڑھ کر کوئی اذلال نہیں ہو سکتا۔

اللہ عزاسمہ کے اس ارشاد: ﴿وَتَعَزَّزُ مِنَ تَشَاءِ وَتَذَلُّ مِنَ تَشَاءِ﴾ [آل عمران: ۳۶] کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ اللہ پاک موحدین محمدین عارفین زاہدین اور عابدین میں سے ہر ایک کو اس کے مقام کے مناسب اعزاز عطا کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ اللہ عزاسمہ زاہد کو اپنے نفس کے دنیا سے موڑ لینے کی صورت میں اعزاز عطا فرماتے ہیں اور عابد کو ترک خواہش خدمت مولیٰ کی صورت میں اعزاز عطا فرماتے ہیں اور مریدین کو مخلوق کی صحبت سے زہد اختیار کر لینے کی صورت میں عزت بخشنے ہیں اور عارف کو مقام سرگوشی کا اہل بنانے کی صورت میں عزت بخشنے ہیں اور محبت کو کشف و ملاقات کی صورت میں عزت کے عطا کرتے ہیں اور موحد کو ایسی

ذات کی جلالت اور بزرگی کی حضوری کی صورت میں عزت بخشے ہیں کہ جس ذات کے لئے ہمیشہ کی بقاء اور پر رونق عظمت ہے۔

قولہ: السميع البصير: سمع اور بصر کہتے ہیں سنائی دینے والی اور دکھائی دینے والے چیزوں کا انکشاف تام اور کامل صورت میں ادراک کرنے کو۔

اللہ کی آٹھ ذاتی صفات میں سے یہ دو صفیتیں بھی ہیں اور یہ دونوں صفیتیں صفتِ علم کا غیر ہیں کیونکہ یہ دونوں صفیتیں دکھائی دینے والی اور سنائی دینے والی چیزوں کے ادراک کے ساتھ مختص ہیں۔ اور صفتِ علم ان دونوں اور ان دونوں کے علاوہ سے عام ہے۔ جیسے یہ بات سابق میں گذر چکی ہے۔ اور باقی رہا علامہ ابن حجر کا یہ قول کہ ان دونوں صفیتوں کی وجہ سے انکشاف تام ہوتا ہے۔ یہ ان کا قول ناقص ہے۔ (انکشاف تام تو کہہ سکتے ہیں انکشاف تام تہا درست نہیں)۔ کیونکہ یہ دونوں صفیتیں صفتِ علم کی طرف لوٹتی ہیں۔ (کیونکہ مسموعات اور مبصرات کا ادراک بھی ایک قسم کا علم ہے)۔ اور یہ دونوں صفتِ علم سے زائد نہیں ہیں (کیونکہ خاص عام سے زائد نہیں ہوا کرتا)۔ اور یہ بات بھی مسلمات سے ہے کہ رویت یعنی دیکھنا علم کی قسم ہے اس سے سننا بھی ایک قسم کا علم ہے۔ تو انتہائی بات یہی ہے کہ یہ دونوں صفیتیں ادراک کے معنی میں ہو کر صفتِ علم کی طرف لوٹتی ہیں۔ لیکن پھر بھی عقیدے کے سلسلے میں علیم کے ضمن میں صفتِ علم کے اجمالی اثبات سے صفتِ سمع اور بصر کے کتاب و سنت میں وارد ہونے والے الفاظ کے ضمن میں صفتِ سمع اور بصر کے تفصیلی اثبات سے استغناء نہیں برتا جاسکتا اس لئے کہ جو کچھ کتاب و سنت میں وارد ہوا ہے ہم اس کے پابند ہیں۔

شرح موافق میں ہے کہ یہ دونوں صفیتیں صفتِ علم سے زائد ہیں۔ بالآخر قیل وقال میں یہی کہا جائے گا کہ سمع اور بصر کے الفاظ چونکہ کتاب و سنت میں وارد ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم ان کے اثبات برائے ذات باری تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ سمع اور بصر معروف دو آلوں یعنی آنکھ اور کان کے ذریعہ سے نہیں (اس لئے کہ اللہ ان چیزوں سے پاک ہے) بلکہ ہم یہ برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں ان کی حقیقت سے واقفیت نہیں۔

باقی رہی علامہ ابن حجر کی یہ بات کہ جس نے صفتِ سمع و بصر کو علم کے مترادف ٹھہرایا ہے اس کو وہم ہوا ہے ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ (کہ صفتِ سمع اور بصر علم کے مترادف نہیں ہیں) بلکہ میرا گمان تو یہ ہے کہ اہل علم میں سے کسی کو ان دونوں کے مترادف علم ہونے کا وہم نہیں لگا ہوگا نہ ہی اللہ کے حق میں اور نہ ہی مخلوق کے حق میں اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا اتم ہونا مخلوق کے حق میں قاصر اور ناقص ہے اللہ کے حق میں نہیں بلکہ ہمارے حق میں علم یقینی حس تک پہنچنے کے علاوہ نہیں ہوتا جو شخص چکھے نہ شے کا ذائقہ جانتا نہیں۔ باقی رہا اللہ کا علم دکھائی دینے والی سنائی دینے والی کڑوی اور میٹھی چیزوں کلیات اور جزیات کو محیط ہے۔ صفات میں بغیر کسی فرق کے۔

آپ کا ان دو عظیم اسموں اور عمدہ وصفوں سے حصہ وہ یہ ہے کہ آپ بھی یقین کر لیں کہ آپ اللہ کے سننے اور دیکھنے کی جگہ پر ہیں وہ اللہ آپ پر مطلع ہے اور وہ آپ کی طرف دیکھ رہا ہے اور وہ آپ کے جملہ احوال پر نگہبان ہے خواہ وہ احوال افعال سے تعلق رکھتے ہوں یا اقوال سے اس بات سے ڈریں کہ اللہ آپ کو وہاں دیکھے جہاں آپ کو مع کیا ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ جو شخص اس چیز کو جس کو وہ اللہ سے نہیں چھپاتا وہ اس چیز کو غیر اللہ سے چھپاتا پھر رہا ہے۔ تو ایسے شخص نے اللہ کی نظر کو ہلکا سمجھا اور جو شخص کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہو حالانکہ وہ جانتا ہے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے کیا ہی اس کی جرأت ہے کیا ہی اس کی جسارت ہے۔ اور جو یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ اس کو دیکھ نہیں رہا تو کیا ہی اس کا کفر ہے کیا ہی اس کی ناشکری ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب تم اپنے مولا کی نافرمانی کرو تو ایسی جگہ نافرمانی کرو جہاں اللہ آپ کو دیکھ نہ رہا ہو۔ اس بات سے مراد تعلق بالجمال (یعنی اللہ کا کسی جگہ نہ دیکھنا) محال ہے تو لہذا کسی جگہ بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے۔ اور اللہ کی اپنے بندوں کے ساتھ مہربانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ

اللہ ان کے کان اور آنکھ کی حفاظت کرتے ہیں اور کسی کی طرف اللہ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے۔ حدیث قدسی ہے ”كنت لہ سمعاً وبصراً فبی یسمع وبی یبصر“ یعنی میں اپنے بندے کا کان اور آنکھ بن جاتا ہوں وہ میرے ذریعے سنتا ہے وہ میرے ذریعے دیکھتا ہے۔ اور آداب میں سے یہ بھی ہے کہ آپ اللہ کی صفت سمع اور بصر کی وجہ سے آپ اپنے ذاتی انتقام سے باز آجائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ارشاد فرمایا: ﴿لقد نعلم انک یضیق صدرک﴾ [الحجر: ۹۷] یعنی ہم جانتے ہیں کہ آپ کا سینہ تنگ ہو جاتا لیکن پھر دیکھئے کہ اللہ پاک نے آپ ﷺ کو کیسے تسلی دی اور آپ سے آپ کی آزمائش کے بوجھ کو آپ پر خفیف اور ہلکا کر دیا اور آپ ﷺ کی توجہ ان موذی کافروں سے اپنے اس فرمان کے ذریعہ ہٹا دی: ﴿فصبیح بحمد ربک﴾ [] یعنی آپ ہماری مدح و ثنا جو دوشہود کو بیان کیجئے مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو ان کی طرف سے کوئی برائی سننے کی وجہ سے دل آزاری ہو تو ہماری مدح کر کے راحت طلب کیجئے۔

قولہ: الحکم یعنی ایسی ذات کہ جس کے فیصلے کو کوئی ٹالنے والا نہ ہو اور جس کے حکم کو کوئی روکنے والا نہ ہو۔ تو اس صورت میں صفت کا مرجع یا تو ایسا قول بنے گا جو حق و باطل کے درمیان فاصلہ کرنے والا ہو۔ اور نفس نے جو اچھا یا برا کام کیا ہے اس کی جزا و سزا کو واضح کرنے والا ہو یا اس کا مرجع ایسا قول بنے گا جو بد بخت اور خوش قسمت کے درمیان ثواب و عقاب کے ذریعے فرق کرنے والا ہو یا صفت حکم کا مرجع ایسا فعل بنتا ہے جو دلائل اور نشانیوں کے قیام کی صورت میں حق و باطل شقی و سعید پر دلالت کرنے والا ہو (یعنی دلائل اور نشانیوں کو تسلیم کر کے توحید کو مان لینے کی صورت حق اور سعادت ہے۔ اور عدم تسلیم کی صورت باطل اور شقاوت ہے) بعض حضرات کہتے ہیں حکم کا اصل معنی ہے منع کرنا یہی وجہ ہے کہ علوم کو بھی حکم کہا جاتا کیونکہ علوم صاحب علم کو جاہل لوگوں کی عادت اپنانے سے روکتے ہیں۔

آپ کا صفت حکم سے حصہ تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے یہ پہچان لیا کہ اللہ کی ذات حکم ہے۔ تو آپ اس کو حکم تسلیم کیجئے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم ہو جائیے اس لئے کہ اگر آپ اللہ کے فیصلے پر راضی نہ بھی ہوں تو اللہ اپنے فیصلے کو آپ کے بارے میں جبراً نافذ کر دے گا۔ اگر بخوشی قلب اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاتے ہیں تو اللہ پاک آپ کے ساتھ اپنے لطف خفی کا معاملہ فرمائیں گے۔ آپ راضی اور خوش ہو کر زندگی بسر کریں گے۔ جب آپ اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جائیں تو آپ کو کسی اور کی طرف اپنا فیصلہ لے جانے کی حاجت نہیں۔ اور اسی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا آپ فرماتے ہیں ”اللهم لك اسلمت و بک آمنت و الیک حاکمت و بک خاصمت“ اور صفت حکم کے ذریعے اللہ کا تقرب بطور تعلق کے یوں حاصل کیا جاسکتا ہے کہ ہر پیش آمدہ چیز کے بارے میں اللہ ہی کی طرف شکوہ کیا جائے۔ اور ہر معاملے میں اللہ ہی کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اور صفت حکم کو بطور اخلاق اپنانا اس طرح ہے کہ آپ اپنے قلب و نفس کے درمیان حکم بن جائیے۔

امام تشریحی فرماتے ہیں کہ اللہ نے ازل میں اپنی مشیت کے مطابق اپنے بندوں کیلئے حکم فیصلہ کر دیا ہے پس بندوں میں سے بعضے شقی ہیں اور بعضے قریب ہیں اور بعضے اللہ سے بعید۔ جس کیلئے اللہ نے ازل سے سعادت کا فیصلہ کر دیا وہ کبھی شقی نہ ہوگا اور جس کے حق میں شقاوت کا فیصلہ صادر فرما دیا وہ بھی سعادت سے بہر مند نہ ہوگا۔ اسلئے کہتے ہیں کہ جس کو پہلی چیزوں نے کنارے لگادیا ہو تو وسائل بھی اس کے قریب نہیں بھٹکتے اور اسی طرح دانا لوگوں نے یہ بھی کہا کہ جس کا بخت بیٹھ جائے تو اس کو اس کا دادا بھی کھڑا نہیں کر سکتا۔ بطور فائدہ یہ بات بھی جان لیجئے کہ لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔

◊ اصحاب سوابق۔ ان کی فکر و سوچ ہمیشہ اس چیز کے بارہ میں ہوتی ہے جو ازل میں ان کے رب کی جانب سے ان کیلئے سبقت کر چکی وہ جانتے ہیں کہ ازلی فیصلے کو بندے کا ہاتھ پاؤں مارنا تبدیل نہیں کر سکتا۔

۲ اصحاب عواقب۔ ان لوگوں کی فکر ہمیشہ اس چیز کے بارے میں ہوتی ہے جس چیز پر ان کے معاملے کا اختتام ہونا ہے اس لئے کہ امور کا اعتبار خاتمے پر ہوگا۔ اور انجام مخفی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ کو وقت کا سازگار ہونا دھوکے میں نہ ڈالے۔ اس لئے کہ اس وقت کے نیچے نجانے کتنی آفات پنہاں ہیں کتنے ارادہ کرنے والے لوگ ہوتے ہیں کہ ان پر ان کے ارادے کے انوار چمک رہے ہوتے ہیں اور ان پر ان کی سعادت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ان کی شہرت جہاں میں پھیل جاتی ہے اور لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ علی الاطلاق اولیاء میں سے ہیں لیکن وقت کی سازگاری وحشت سے بدل جاتی ہے اور اس کی چمک دمک اندھیروں سے بدل جاتی ہے۔

۳ اصحاب وقت: یہ لوگ سابقہ اور لاحقہ چیزوں کے بارے میں سوچ و فکر میں مشغول نہیں ہوتے بلکہ اپنے موجودہ وقت کی رعایت کرتے اور اس وقت میں جس حکم کے وہ مکلف ہوتے ہیں اس کی ادائیگی کر کے ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ عارف اپنے وقت کا بیٹا ہوتا ہے۔

۴ اصحاب شہود: یہ وہ لوگ ہیں جن پر حق کا ذکر غالب آچکا ہوتا ہے وہ ہمیشہ حق کی حضوری میں پکڑے رہتے ہیں اوقات کی رعایت کئے بغیر وہ وقت اور زمانے کی رعایت کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے اور نہ ہی ان کو کسی وقت کی حضوری پر اطلاع ہوتی ہے۔
قولہ: العدل یعنی وہ ذات جو عدالت میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ عدل سے مراد وہ ہے جو ظلم کا مخالف ہے۔ عدل اصل میں مصدر ہے لیکن اس کو صفت عادل کے قائم مقام ٹھہرایا گیا ہے عدل عادل سے ابلیغ ہے کیونکہ مستحی کی ذات کو بطور مبالغہ عدل ٹھہرایا گیا ہے جو یقیناً مبالغہ ہے۔ اور عدل صفات افعال میں سے ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ عدل ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جو اپنے احکامات میں اور اپنے افعال میں ظلم و جور سے بری اور پاک ہو۔

بانی رہا آپ کا حصہ صفت عدل سے تو وہ یہ ہے کہ آپ گواہی دیجئے کہ اللہ پاک اپنے فیصلوں میں عادل ہے اور اللہ کے احکام کی وجہ سے آپ اپنے جی جزع فزع اور ان احکام کو توڑنے کی صورت میں کسی قسم کا حرج نہ پائیں اور آپ اپنے آپ کو اللہ کی طرف سپرد کرنے اور اس پر بھروسہ اور اعتماد کرنے میں راحت حاصل کیجئے اور جو چیز بھی اللہ کی جانب سے آئے اس کو حق اور عدل پر مبنی سمجھئے اور اللہ کی طرف سے جو کچھ آپ کو پہنچا ہے اس کو استعمال کیجئے۔ جہاں عقل و شریعت مناسب سمجھے اور اللہ کے عدل کی شان و شوکت خائف رہے اور اس کے فضل کی نرمی کے امید وار رہیئے اور اللہ کی تدبیر سے بے خوف مت ہوں اور اس کے فضل سے مایوس نہ ہوں اور اپنے بڑے بڑے امور میں افراط و تفریط سے بچئے۔ مثلاً افعال شہویہ میں یا تو افراط سے کام لیتے ہوئے زنا میں پڑ جائیں یا تفریط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل بچھ جائیں یا اسی طرح افعال غضبیہ میں یا تو افراط سے کام لیتے ہوئے آپے سے باہر ہو جائیں یا تفریط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل بزدلی اختیار کر لیں۔ بلکہ ان افعال میں میا نہ روی کو اختیار کیجئے۔ مثلاً افعال شہویہ میں عفت اور افعال غضبیہ میں بہادری جن دونوں کے مجموعے کو عدالت سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿كَذٰلِكَ وَجَعَلْنَا كَمَا وَسَطًا﴾ البقرة: ۱۴۳ کے تحت مندرج ہو سکے۔

قولہ: اللطیف: یعنی اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی کرنے والی ذات ایسی بھلائی جو ان بندوں کو ایسی چیز کی طرف پہنچا دے جس چیز سے وہ دنیا و آخرت میں نفع اٹھائیں۔ اور وہ بھلائی ان کیلئے ایسی چیز مہیا کر دے کہ جس چیز کے ذریعے وہ اپنی مصلحتوں کی طرف ایسی جگہ سعی اور کوشش کریں۔ جس جگہ کا نتوان کو علم ہو اور نہ ہی گمان رکھتے ہوں اور صفت خیر اسمائے افعال میں سے ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ جمیل بھی مجمل کی طرح ہے۔

بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ لطیف ایسی ذات کو کہتے ہیں جو مخفی اور باریک امور کو جاننے والی ہو اور کہا گیا ہے کہ لطیف کا معنی ہے ایسی ذات جو ادراک سے مخفی ہو۔

ابن عطاء اپنی حکمت کی باتوں میں فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے لطف کو اللہ کی تقدیر سے جدا گمان کرتا ہے تو اسکی قصور نظر کا نتیجہ ہے۔ باقی رہا اس اسم شریف کو بطور اخلاق اپنانا تو وہ یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ ان کی حق کی جانب راہنمائی کرنے کی صورت میں لطف اور مہربانی کا معاملہ کیا جائے۔

قولہ: الحیسر: یعنی اشیاء کے باطن کو جاننے والی ذات۔ یہ خیرۃ سے مشتق ہے اور خیرۃ کہتے ہیں مخفی اور باطنی چیزوں کا جاننا۔ آپ کا حصہ صفت خیر سے تو وہ یہ ہے کہ جب آپ اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ آپ کے راز پر مطلع ہے اور آپ کے اندرونی معاملہ کو بخوبی جاننے والا ہے تو آپ اللہ کے علم پر اکتفا کیجئے اور اللہ کے غیر کو اللہ کی یاد کے پہلو میں منسوب کیجئے۔

تقویٰ کی لگام کو مضبوطی سے باندھ لیجئے اور گمراہی کے راستے سے باز آجائیے۔ لزومِ اخلاص اور ترکِ ریاء کی صورت میں اپنی اعانت کیجئے تاکہ آپ اہل اختصاص کے مقام تک رسائی حاصل کر سکیں اور آپ اپنے باطنی احوال سے غافل نہ ہوں مزید برآں اپنے باطنی احوال کی اصلاح میں مشغول رہیں اور باقی احوال سے جو آپ کے سامنے قباحِ ظاہر ہوں ان کو فلاح کی طرف گرداننے کی صورت میں تلافی کیجئے اور اپنے دینی اور دنیاوی معاملہ کے سلسلہ میں خوب باخبر رہیے اور جو چیز آپ پر واجب ہے یا آپ کیلئے استحباب کے درجہ میں ہے ایسی چیز کے سلسلہ میں حزب بین رہیے۔

قولہ: الحلیم: ایسی ذات جو ایمان والوں کو سزا دینے میں جلدی نہ کرنے بلکہ ان کی سزا کو اس وجہ سے مؤخر کر دے شاید وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حلیم ایسی ذات کو کہتے ہیں جس کو غصہ بے قابو نہ کر پائے اور غصہ اس کو جلد سزا دینے پر برا بیخستہ نہ کر سکے۔ اسم حلیم کے ذریعے اللہ کا تقرب بطور تعلق یوں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے حلم کے سلسلہ میں احسان کا شکر یہ ادا کیجئے لیکن اللہ کی مہربانی کی وجہ سے دھوکے میں پڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔

بطور اخلاق صفت حلیم کو یوں اپنایا جائے کہ آپ اپنے غصہ کو پنی جائیں اور حلم کے ذریعے غصہ کی آگ کو بجھا ڈالیں اور کامل درجے کا حلم یہ ہے کہ آپ اس شخص کے ساتھ بھی بھلائی کا معاملہ کریں جو آپ کے ساتھ برائی سے پیش آئے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے فی الحال اپنے فضل سے پردہ پوشی فرمادی تو امید کی جاتی ہے کہ فی المال (آئندہ) بھی اللہ پاک اپنی مہربانی سے معاف کر دیں گے اور صفت کا مرجع تنزیہ باری تعالیٰ ہے۔

قولہ: العظیم: یہ عظیم الشئی سے ماخوذ ہے اور عظیم الشئی کا معنی ہے کسی چیز کی عظمت کا بڑا ہو جانا پھر مجازاً عظیم ہر ایسے بڑی مقدار والے جسم کو کہا جاتا ہے جس مقدار کبیر آنکھ کو کھڑ کر دے جیسے ہاتھی اور اونٹ وغیرہ۔ یا جس کی مقدار کبیر تمام جوانب سے احاطے بصر کو روک دے جیسے آسمان اور زمین۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ پھر کبیر المقدار چیز کے مراتب ہیں۔ مطلق عظیم ایسی ذات کو کہتے ہیں جو عظمت کے مراتب میں سے انتہائی مرتبہ کو پہنچی ہوئی ہو۔ اور ایسی ذات وہ کہ عقل اس کے تصور سے قاصر ہو۔ اور عقل علی وجہ البصیرۃ اس کا تمام احاطہ نہ کر سکے۔ اور مطلق عظیم ذات اللہ تعالیٰ کی ہے اور عظیم کا مرجع تنزیہ ذات باری تعالیٰ ہے۔

اور باقی رہا آپ کا حصہ صفت عظیم سے تو وہ یہ ہے جب آپ نے اللہ کی عظمت کا مشاہدہ کر لیا تو آپ کی آنکھ میں اللہ کے سوا ہر چیز چھوٹی نظر آنے لگے۔ ہاں مگر وہ چیز جس کو عظمت ہی نسبت مع اللہ کی وجہ سے ملی ہو اور اپنے نفس کو بھی حقیر جائیئے۔ اور اپنے نفس کو اللہ کے

اور مرجالانے اور اس کی نواہی سے اجتناب کی صورت میں ذلیل کر کے اپنے نفس پر اللہ کو کلی طور پر متوجہ کر لیجئے اور ہر ایسی چیز کے بارے میں کوشش کیجئے جو اللہ کی پسندیدہ اور مرضی کی ہو۔

صفتِ عظیم کے ذریعے تقرب بطور معلق یوں کہ آپ تذلّل اور احتیاج کو علی طریق الدوام لازم کر لیجئے۔ اور صفتِ عظیم کو بطور اخلاق یوں اپنایا جائے کہ آپ مذموم اوصاف اور گناہوں کے ارتکاب سے بلندی اختیار کر لیجئے۔

قولہ: الغفور: یعنی کثیر المغفرت۔ کہتے ہیں بندے کے گناہ معاف کر کے اس کو اس مزا سے بچالینا جس کا وہ مستحق ہو چکا ہو۔ یہ غفر سے مشتق ہے اور غفر کا معنی چیز کو ایسی چیز کے ساتھ ڈھانپ دینا یا پہنانا کہ جس کی وجہ سے چیز میل کچیل سے محفوظ رہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ غفار غفور سے ابلغ ہے زیادتی بناؤ کی وجہ سے ہے لیکن بہترین بات وہ ہے کہ جو بعض حضرات نے غفور اور غفار کے درمیان فرق کرتے ہوئے کہی ہے کہ غفار میں مبالغہ "من جهة الكيفية" اور غفور میں مبالغہ "من جهة الكمية" ہے۔ اور شاید رحمت اور مغفرت کو اللہ کے ننانوے ناموں میں مبالغہ کے وزن پر لانے کی وجہ رحمت اور مغفرت کے معاملہ کی تاکید ہے۔ (رحمت کی مبالغہ والی بناؤں رحمن و رحیم ہیں اور مغفرت کی غفار اور غفور ہیں)۔ اور ان بناؤں کو لا کر اس بات پر دلالت مقصود ہے کہ اللہ عظیم الرحمت ہے رحمت کے عام ہونے کے اعتبار اور کبیر المغفرت ہے۔ مغفرت کے کثیر ہونے کے اعتبار سے اور اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اللہ کی رحمت اللہ کے غضب پر غالب ہے اور اس کی مغفرت مزا پر غالب ہے۔

اس لئے بعض حضرات نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ [فصلت: ۴۶] پر وارد ہونے والا مشہور اشکال کا جواب دیا ہے اور اشکال یہ ہے کہ مبالغہ کی نفی سے اصل فعل کی نفی لازم نہیں آتی تو اس لئے ظلام کی نفی سے ظالم ہونے کی نفی لازم نہیں آتی۔ اللہ پاک سے تو اصل ظلم ہی منفی ہے کیونکہ ظلم کہتے ہیں وضع اشئی فی غیر محلہ کو یا تصرف فی ملک الغیر کو اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ سے محال ہیں۔ جواب دیا کہ اللہ جس وصف کے ساتھ بھی موصوف ہوتے ہیں تو علی وجہ الکمال موصوف ہوئے ہیں۔ اللہ پاک نے مبالغہ کا صیغہ ظلام لا کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اگر اللہ بضر محال صفت ظلم کے ساتھ موصوف ہوتے تو علی وجہ الأبلغیۃ ہوتے مبالغہ کی نفی سے اصل فعل کی نفی لازم آتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت مبالغہ سے جدا نہیں ہو پاتی یہی وجہ ہے کہ سماع کے معنی میں سماع کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر درست نہیں کیونکہ سماع میں مبالغہ فوت ہو جاتا ہے۔

باقی رہا علامہ جزری کا قول: یقول راجی عفو رب سامع۔ میں جو اللہ تعالیٰ پر سماع کا اطلاق کیا گیا ہے اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اللہ پکارنے والے کی پکار کا جواب دینے والا ہے اور جو شخص اس سے امید وابستہ کرے وہ اس کو سوا کرنے والا نہیں۔ صفت غفور کے ذریعے اللہ کا تقرب بطور تعلق کے وہ اس طرح ہے کہ انسان دن اور رات استغفار کو لازم پکڑے خصوصاً اوقات سحر میں اور صفت غفور کے ذریعے اخلاق یوں اپنائے کہ جو شخص آپ کے درپے آزار ہو آپ کا جواب معافی تلافی میں ہو۔

قولہ: الشکور: یعنی ایسی ذات جو تھوڑے سے کام پر بہت زیادہ اجر عطا کرے اور اس کا مرجع صفات فعلیہ ہیں۔ ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک مرنے والے آدمی کو کسی نے خواب میں دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ تو اس نے جواب میں کہا کہ اللہ نے مجھ سے حساب و کتاب لیا میری نیکیوں کا پلڑا ہلکا پڑ گیا پھر دفعہً اس پلڑے میں ایک تھیلی آگری تو میں نے عرض کی کہ اے اللہ یہ کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ مٹی کا ایک پل ہے جو تو نے کسی مسلمان کی قبر میں ڈالا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے

ہیں: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ [الزلزلة: ۷]

کہا گیا ہے کہ شکر اور ایسی ذات کو کہتے ہیں جو فرمانبرداروں کی تعریف کرے تو اس صورت صفت شکر کا مرجع صفات قولیہ ہیں۔

کہتے ہیں شکور ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بندوں کو ان کے شکر پر جزا دے تو اس صورت میں یہ باب مقابلہ سے ہوگا (کیونکہ جانبین سے شکر یہ ہے) تو اس صورت میں یہ معاملہ کے مرتبہ میں ہوگا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَكْرُوهٌ وَمَكْرُوهٌ﴾ [آل عمران: ۵۴] اور ﴿وَجَزَاءٌ سِئَمًا سِئَمًا مِّثْلُهَا﴾ [الشوری: ۴۰]

بندے کا حصہ صفت شکور سے یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانے اور اس کے شکر کے تقاضوں کو بجالائے اور اس کے امر کے وظائف پر مواعظت کرے۔ اور لوگوں کی نیکیوں اور بھلائیوں پر ان کا بھی شکر یہ بجالائے کیونکہ حدیث پاک میں ہے: ”لَا يَشْكُرُ اللَّهُ مِنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ“ یعنی جو انسانوں کا شکر یہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر یہ بھی ادا نہیں کرتا تو گویا اس صورت لفظ اللہ اور الناس منصوب ہیں، شکر فعل کا مفعول ہونے کی وجہ سے علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ دونوں مرفوع بھی ہو سکتے ہیں اور منصوب بھی۔ یا ان میں سے ایک مرفوع اور دوسرا منصوب ہے۔ (اگر دونوں مرفوع ہوں تو دونوں یشکر فعل کا فاعل ہوں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی اس آدمی کا شکر یہ نہیں کرتے جس کا لوگ شکر یہ نہ کریں۔ یا اللہ مرفوع ہو کر فاعل ہو اور الناس منصوب ہو کر مفعول ہو تو معنی ہوگا اللہ اس آدمی کا شکر یہ نہیں کرتا جو لوگوں کا شکر یہ ادا نہیں کرتا ہو)۔ بہر کیف ساری صورتوں میں مرجع واسطہ کی تعظیم ہے (یعنی اللہ کے شکر کا واسطہ لوگوں کا شکر یہ ہے) باوجود اس کے کہ منعم حقیقی صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔

شکر کی مشہور تعریف یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو اپنے رب کی اس عبادت میں خرچ کر ڈالے جس کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ بعض حضرات اللہ کے ارشاد: ﴿قَلِيلٌ مِنَ الْعِبَادِ الشَّاكِرُونَ﴾ [سبا: ۱۳] کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے تھوڑے بندے ایسے ہیں جو اس بات کی گواہی دیں کہ نعمت میری جانب سے ہے۔ اس لئے کہ شکر کی حقیقت ہے منعم کی حضوری کی وجہ سے حضوری نعمت سے غیبت اختیار کر لینا۔ شاکر مالدار کو صابر فقیر پر فضیلت دینے کی بحث کا اس مطلب میں کوئی دخل نہیں جبکہ اس کو علامہ ابن حجر نے اولیاء اور جمہور علماء کے اجماع کے خلاف ذکر کیا ہے۔

قولہ: العلیٰ نیاء کی تشدید کے ساتھ فعلیل کے وزن پر علو سے مشتق ہے۔ اور علی ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بلندی مرتبہ میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہو اس طرح کہ ہر مرتبہ اس مرتبہ سے بہتر ہو۔

کہا گیا ہے کہ علی ایسی ذات کو کہتے ہیں جو اپنی ذات کے ادراک سے بلند اور اپنی صفات کے تصور سے بڑی ہو۔

بعض دیگر حضرات کہتے ہیں کہ علی ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ قلوب اس ذات کے جلال میں حیران و سرگردان ہو اور عقول اس کے وصف کمال سے عاجز آجکی ہوں۔

صفت علی سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ جب آپ ذات باری تعالیٰ کی بلندی کا مشاہدہ کریں تو آپ کی ہمت بھی ذات باری کی طرف بلند ہو جائے۔ اور جمیع احوال میں آپ اپنی ہمت کو ذات باری تعالیٰ پر موقوف کر دیں اور اپنے نفس کو اس کی ظاہری اور باطنی عبادت و طاعات میں منقاد بیچئے۔ اور اپنی روح کو علم و عمل میں خرچ کر دیجئے۔ یہاں تک آپ پاکیزہ حالات اور انسانی کمالات اور علم و عمل سے متعلق بلند درجات کی انتہا کو پہنچ جائیں۔ اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ پاک بلند امور کو پسند فرماتے ہیں اور گھٹیا امور کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا کہ بلندی ہمت ایمان کا حصہ ہے۔

مشائخ نے ہمت اور خدمت کی افضلیت میں اختلاف کیا ہے۔ میرے نزدیک خدمت بھی ہمت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جو بات حقیقت ہو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کرتا۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی بلندی شان میں سے یہ ہے کہ وہ بندوں کی بڑائی بیان کرنے کی وجہ سے یا بندوں کا اس کی بزرگی

بیان کرنے کی وجہ سے وہ بڑا یا بزرگ نہیں بنتا بلکہ وہ جس کو اپنی بزرگی بیان کرنے کی توفیق دیدے، تو وہ شخص اس کی توفیق کی وجہ سے بزرگ ہے اور جس کی تائید اپنی بڑائی یا تعظیم کرنے کی صورت میں فرمادے تو گویا اللہ نے اس کے مرتبہ کو بلند کر دیا اور جو شخص اللہ کی عظمت کو پہچان لے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی مخلوق کے سامنے ذلیل نہ ہو ہاں البتہ اللہ کی رضا کیلئے مخلوق خدا کیلئے تو اضع اپنائے۔ اس لئے کہ جو شخص اللہ کیلئے اپنے نفس کو تذلل اور تواضع پر مجبور کر دے تو اللہ پاک انسانوں میں اس کی قدر و منزلت بلند فرمادیتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ مؤمن کیلئے تکبر زیا نہیں بلکہ اس کیلئے تو عزت ہے اور مؤمن کو تواضع زیادتی ہے نہ کہ ذلت۔

قولہ: الکبیر: کبیر کی ضد صغیر ہے۔ صغیر اور کبیر یہ دونوں اجسام کی مقداروں اور مراتب کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں اور یہاں حضور اور کبر باعتبار رتبہ مراد ہے۔ ذات باری تعالیٰ کبریائی باعتبار رتبہ ہے یا تو اس لئے ہے کہ ذات باری تعالیٰ موجودات میں سے اکمل و اشرف ذات ہے کیونکہ وہ جمیع موجودات کی نسبت قدیم اور ازلی ذات ہے اور ذات باری تعالیٰ علی الاطلاق غنی ہے اور باقی موجودات بالاتفاق ایجا و امداد میں اس کی طرف محتاج ہو کر حادث ہیں۔

یا ذات باری تعالیٰ کی کبریائی باعتبار رتبہ کے اس طرح ہے کہ وہ عقولوں کے ادراک اور اس کے مشاہدہ سے بلند اور بڑا ہے۔ دونوں صورتوں میں کبیر اسماء تنزیہ میں سے ہوگا۔

بعض حضرات نے اللہ اکبر کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ اس سے بھی بہت بڑا ہے، کہ اس کیلئے اکبر کہا جائے یا اللہ اس سے بہت بڑا ہے کہ اللہ کا غیر اس کی کبریائی کا تمام ادراک نہ کر سکے۔

اور باقی رہا آپ کا حصہ صفت کبیر سے تو وہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ ذات باری تعالیٰ کی کبریائی کے شاہد رہیے یہاں تک آپ اس کے علاوہ کی کبریائی بھول جائیں اور آپ اپنے نفس کی علمی اور عملی تکمیل کی کوشش کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کا کمال آپ کے غیر کی طرف متعدی ہو جائے اور آپ کے نقش قدم کی پیروی کی جائے اور آپ کے انوار سے روشنی اخذ کی جائے۔

اس اسم شریف کے ذریعے تقرب بطور تعلق یہ ہے کہ آپ تواضع میں مبالغے سے کام لیں اور اس اسم شریف کے ساتھ تعلق بایں انداز ہے کہ آپ لزوم خدمت اور حفاظت حرمت کے ساتھ سوء ادب سے بچیں۔ صحیح روایت میں آتا ہے کہ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں ”الکبرياء ردائی والعظمة ازارى فمن نازعنى واحداً منهما قصمته“ یعنی بڑائی میری چادر اور عظمت میرا تہ بند ہے۔ ”کما یلیق بشانہ“ پس جو مجھ سے ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک کے بارے میں جھگڑا کرے گا تو فرمایا میں اس کے ٹکڑے کر دوں گا یعنی میں اس کو ہلاک کر دوں گا۔ اور اس کی گردن توڑ کر رکھ دوں گا۔ حدیث قدسی میں عظمت کو ازار کے ساتھ اور کبریائی کو رداء کے ساتھ خاص کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیر فخریہ میں تعظیم سے اوپر ہوا کرتا ہے۔ اگر چہ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے کسی بھی وجہ سے ان میں اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کسی ایک کے بارے میں جھگڑنے والے کو توڑنے پھوڑنے کا فرمایا۔

قولہ: الحفیظ یعنی ایسی ذات جو حفاظت میں انتہائی مبالغہ کرنے والی ہے جو ذات موجودات کو اوقات میں سے جتنی مدت چاہے زوال و اختلال سے محفوظ رکھے۔ اور اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا يُؤَدُّهُ حَفِظُهُمَا﴾ [البقرة: ۲۵۵] یعنی زمین و آسمان اور ان کے مابین کی جتنی چیزیں ہیں اللہ کو ان کی حفاظت تھکا نہیں پاتی۔

یا ایسی ذات جو بندوں کے اعمال و اقوال کی حفاظت کرے۔ اور اسی سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِظًا﴾

صفت حفیظ سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ آپ اپنے اعضاء کی گناہوں سے اور اپنے باطن کی ملاحظہ اغیار سے حفاظت کریں۔ اور جملہ

امور میں اللہ فی تدبیر پر اکتفاء کیجئے اور اس کے اچھے فیصلے اور تقدیر پر راضی ہو جائیے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جو اللہ کیلئے اپنے اعضاء کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی حفاظت کرتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے اپنے دل کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حصے کی حفاظت فرماتا ہے۔

صالحین میں سے کسی کی نظر ممنوع چیز پر پڑ گئی تو عرض کی کہ الہی میں اپنی نگاہ سے تیرا ارادہ رکھتا ہوں اور وہ نگاہ جب تیرے حکم کی مخالفت کا سبب بن گئی تو الہی اس نگاہ کو سلب کر لے، بعینہ یہی ہو۔ اور وہ صالح آدمی رات کو نماز پڑھا کرتے تھے۔ تو ان کو وضو کیلئے پانی درکار تھا لیکن پانی کے حصول پر قدرت نہیں ہو پارہی تھی۔ تو عرض کی کہ الہی میں نے عرض کیا تھا کہ میری نگاہ کو اپنی رضا کیلئے لے لے تو اب جبکہ رات کے وقت میں اس نگاہ کا تیرے لئے ہی محتاج ہوں تو اللہ پاک نے اس صالح آدمی بصارت اور نگاہ واپس لوٹا دی۔

قولہ: المقیت: میم کے ضمہ قاف کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے یعنی بدنی اور معنوی ارزق اور پیدا کرنے والی ذات اور پھر رزق بدنی کو جسموں تک اور رزق معنوی کو روحوں تک پہنچانے والی ذات، یہ اوقات یقینہ سے ہے۔ اور اوقات کا معنی ہے اعطاء القوت یعنی اس کو روزی عطا کی اور اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”کفنی بالمرء انما ان یضیع من یقیت“ یعنی کسی آدمی کے گناہگار ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ اس کو ضائع کر ڈالے جو اس کو روزی دیتا ہے اور مقیت اسماء افعال میں سے ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مقیت کسی شی پر شاہد اور مطلع ذات کو کہتے ہیں اور یہ اوقات الٰہی سے ہے۔ اور اوقات الٰہی کا معنی ہے ”اطلع علی الشیء“ بہر کیف دونوں صورتوں میں مقیت صفات ذات میں سے شمار ہوگا اور مقیت کے یہ آثار حصے بہت مناسب ہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ: ﴿وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا كُلِّ شَيْءٍ مَّقِيتًا﴾ [النساء: ۸۰] تو یہاں مقیت مقتدر اور شاہد و مطلع دونوں معنوں میں موزوں ہے۔

اور باقی رہا آپ کا حصہ صفت مقیت سے تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے ذات تعالیٰ کے مقیت ہونے کی معرفت حاصل کر لی۔ تو پھر آپ مقیت کے ذکر کی وجہ سے قوت یعنی روزی کا ذکر بھول جائیے۔ جیسا کہ حضرت سہلؓ سے روزی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا ”هو الحسی الذی لا یموت“ یعنی میری روزی ایسی زندہ ذات ہے جس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ شاید حضرت سہلؓ سبب روزی سے مستبب یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہو گئے تو ان کو کہا گیا کہ ہم نے آپ سے قوت دینے والی چیز کے بارے میں سوال کیا ہے تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ قوت دینے والی چیز علم ہے۔ شاید وہ جسموں کو قوت دینے والی چیز سے روحوں کو قوت دینے والی چیز کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس لئے کہ ہر برتن سے وہی چیز نکلتی ہے جو چیز اس برتن میں ہو (چونکہ حضرت سہلؓ صاحب علم آدمی تھے) تو انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ سے جسمانی غذا کے بارے میں پوچھا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا آپ اپنی اور اپنے جسم کی فکر میں پڑے ہیں، چھوڑو جو اس جسم کا اول امر میں متولی وہی اس کا آخر امر میں متولی ہے اور باقی رہا کہ اگر کسی کام کو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کو تھکا رہا ہے تو اس کام کو اس کے صنایع اور کارگیری کی طرف لوٹا دیں، کیونکہ وہ ان کو جانتا ہے۔ تو گویا کہ حضرت سہلؓ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم اصلاح باطنی کے سلسلہ میں مامور ہیں۔ اگرچہ حقیقت میں علی الاطلاق مصلح اللہ کی ذات ہے اور اس میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جو حدیث ”من حسن السلام ترک ما لا یعینہ“ میں وارد ہوا ہے۔ مفہوم حدیث یہ ہے کہ لا یعنی چیز کو ترک کر دینا انسان کے حسن اسلام کی علامت ہے۔

آپ کا صفت معیت کے ذریعہ تقرب بطور تعلق تو وہ بائیں طور ہوگا کہ آپ روزی اور طاقت اپنے مولیٰ ہی سے طلب کریں۔ اللہ

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ان من شیء الا عندنا خزائنه﴾ [الحجر: ۲۱]

صفت مقیت کے ذریعے تخلیق اس طریقہ پر ہوگا جو بھی آپ سے متعلق ہو آپ اس کو اس کی استحقاقی روزی دیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ”ابدأ بنفسک ثم بمن تعول“ یعنی ابتدا اپنے نفس سے کیجئے اور پھر جس کی پرورش آپ کے ذمہ ہے آپ کی عادت نفع پہنچانا، بھوکے کو کھانا کھلانا اور بھٹکے ہوئے کو راہ راست لانا ہو۔

امام قشیری فرماتے ہیں اقوات مختلف ہیں اللہ کے بعضے بندے ایسے ہیں کہ اللہ نے ان کے نفس کی روزی عبادات کی توفیق اور ان کے دل کی روزی مکاشفات کی تحقیق اور ان کے ارواح کی روزی مشاہدات کا دوام مؤانست کا لزوم بنائی ہے۔ ہر ایک کو مقامات اور حالات کے مناسب چیز کے ساتھ خاص کیا ہے۔ جب اللہ اپنے کسی بندے کو اپنی طاعت میں مشغول کر دیتا ہے تو اللہ پاک اس کیلئے ایسا آدمی کھڑا کر دیتا ہے جو اس کے مطیع بندے کی خدمت اور کام سرانجام دیتا ہے۔ اور جب بندہ اپنی خواہش نفس کی طرف لوٹتا ہے تو اللہ پاک اس کو اس کے حول و قوت کی طرف لوٹا دیتے ہیں اور اس سے اپنی عنایت و حمایت کا سایہ اٹھالیتے ہیں۔

قولہ: الحسیب: کا معنی کافی، یہ حسب مصدر سے مشتق ہے سین کے سکون ساتھ حسب کا معنی ہے اکتفاء یا کفایت۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿من یتوکل علی اللہ فہو حسبہ﴾ [الطلاق: ۳] اور حسیب فعلیل کے وزن پر مفعول بکسر العین کے معنی میں ہے۔ جیسے الیم مؤلیم اور بدیع مبدع کے معنی میں ہے یعنی بندوں کو ان کی بقدر کفایت عطا کرنے والی ذات۔

یا ان کیلئے ان کے امور کے سلسلہ میں کفایت کرنے والی ذات۔ یہ اہل عرب کے قول حبسی بمعنی یکفینی سے مشتق ہے۔ اور یہ بناء کے اعتبار سے اتم اور معنی کے اعتبار سے اعم ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ حسب مصدر سے مشتق ہے۔ اور حسب سردار اور شرافت کے معنی میں ہے۔ اور حسیب علی الاطلاق اللہ کی ذات ہے اس لئے کہ کفایت کا حصول ان تمام اشیاء میں جن کی طرف شی اپنے وجود اور اپنی بقا اور جسمانی و روحانی کمال میں محتاج ہوئی ہے ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کسی سے ممکن نہیں۔ تو اس صورت صفت حسیب کا مرجع فعل ہوگا۔ اور اپنے مولیٰ کے ارادے کے بغیر کوئی بھی شرافت اور سرداری تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

یا حسیب شریف کے معنی میں ہے تو اس صورت میں اس کا مرجع صفت ہوگا اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حسیب حساب مصدر سے مشتق ہے۔ یعنی وہ اللہ قیامت کے دن تمام مخلوقات سے حساب لینے والا ہے اور حسیب فعلیل محاسب مفاعل کے معنی میں ہے جیسے مجلس مجالس کے معنی میں ہے۔ اگر محاسب سے مکافاة یعنی اعمال کی جزا دینا مراد لیا جائے تو بھی اس کا مرجع فعل بنتا ہے اور امر محاسبہ سے مراد سوال و عتاب اور جو نیکیاں اور برائیاں کیں ان کی گنتی مراد لی جائے تو اس صورت میں صفت حسیب کا مرجع قول ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حسیب کا معنی ہے مخلوقات کے سانس کا حساب اور گنتی کرنے والی ذات۔ اور بعض حضرات نے دو معنوں کو جمع کر کے یوں کہا کہ حسیب اس ذات کو کہتے ہیں جو آپ کے سانسوں کی گنتی کرے اور اپنے فضل سے آپ کی تکلیف وغیرہ پھیر دے اور حسیب کے معنی میں کہا گیا ہے کہ اللہ آپ کے ساتھ ہے تو پھر آپ کو کس چیز کا خوف ہے اور اگر اللہ ساتھ نہیں تو کس سے امید رکھتے ہو؟ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے کہا ”حسبنا اللہ ونعم الوکیل“ اور سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ”حسی اللہ لا الہ الا ہو علیہ توکلت و هو رب العرش العظیم“۔

امام قشیری فرماتے ہیں اللہ کی بندے کیلئے کفایت یہ ہے کہ اللہ اس کو اس کے جمیع احوال و اشغال میں کفایت کر دے۔ اور کفایات میں سے اعلیٰ درجے کی کفایت یہ ہے کہ اللہ بندے کو شئی بمطلوبہ منفع کا ارادہ عطا فرمادیں۔ اور جس شخص نے یہ جان لیا کہ اللہ اس کو کافی ہے

تو اگر ساری مخلوق بھی اس سے اعراض کرے تو وحشت محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے اس بات پر بھروسہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے حصہ میں تقسیم ہو کر آگئی ہے تو وہ اس سے کسی صورت فوت نہیں ہوگی اور جو چیز اس کی قسمت میں نہیں تو وہ کسی صورت میں اس تک پہنچ نہیں پائے گی۔ اگرچہ ساری مخلوق اس پر متوجہ ہو جائے۔ اور اپنے احوال کے سلسلہ میں اللہ کی بہتر تولیت پر اکتفا کر لیتا ہے تو عن قریب اس کا مولیٰ اپنی پسندیدہ چیز سے اس کو راضی کر دے گا۔ تو اس وقت پھر وہ نہ ہونے کو ہونے پر اور فخر کو غنی پر ترجیح دے گا۔ اور وہ اپنے مولیٰ کے تصرف کا مشاہدہ کرنے کی وجہ سے فقدان اسباب کی طرف راحت حاصل کرے گا۔ جیسا کہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ فتح معلیٰ مشہور بزرگ رات کے وقت اپنے گھر لوٹے لیکن انہوں نے گھر میں رات کے کھانے اور چراغ نام کی کوئی چیز نہ پائی تو انہوں نے اللہ کی حمد اور آرزواری میں مبالغہ کیا ہے اور کہنے لگے الہی کون سے سبب کی وجہ سے اور وسیلے اور اتحقاق کی وجہ سے تو نے میرے ساتھ وہ معاملہ کیا جو معاملہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا ہے۔

قولہ: الجلیل یعنی ایسی ذات جو صفات جلال کے ساتھ متصف ہے اور جلال کی تمام صفات پر ”علیٰ وجہ الکمال“ حاوی ہے۔ بایں طور کہ کسی کیلئے یہ ممکن نہیں کہ مرتبہ میں اس کے قریب ہو۔ چہ جائے کہ کوئی مرتبہ میں اس کے مساوی ہو اور بعض حضرات کہتے ہیں ان بعض میں امام فخر الدین رازی بھی ہیں کہ حقیقت جلال کمال صفات کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ صفت کبر عظمت ذات کی طرف لوٹتی ہے۔ اور صفت عظیم کمال صفات اور عظمت ذات دونوں کی طرف لوٹتی ہے۔ لیکن زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ جلیل ایسی ذات کو کہتے ہیں جو خاص طور پر صفات جلال کے ساتھ متصف ہو۔ جیسا کہ منتقم قہار اور شدید العقاب تینوں خالصہ اور خاصہ صفات جلال کا مظہر ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ذوالجلال والا کرام بھی دلالت کرتا ہے۔ اس طرح کہ آیت میں صفت جلال اور صفت اکرام کا امتیاز ہے اور کریم غفور اور ان جیسی دیگر صفات اللہ کی صفات حالیہ و کمالیہ میں سے ہیں۔ اور صفت جلیل جمال کمال اور جلال تینوں صفات کی جامع ہے۔ اور باقی یہ ساری صفات یعنی جلیل ہو یا کریم غفور وغیرہ دو عظیم صفتوں کا مظہر اور دو عمدہ صفتوں کے مشاہدہ کی جگہ ہیں۔ یعنی صفت جمال و کمال۔

آپ کا حصہ صفت جلیل سے یہ ہے کہ جب آپ کے سامنے ذات باری تعالیٰ کا جلال واضح ہو چکا اور تمام جہانوں میں اس کی بزرگی ظاہر ہو چکی تو آپ کے دل میں اس کی ہیبت بھی بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ آپ کی ذات باری تعالیٰ سے محبت ہونی چاہئے اور اس کے ساتھ آپ کا انس ہونا چاہئے۔ اور اللہ کی کتاب اور اس کے محبوبین کا آپ کے دل میں احترام ہونا چاہئے۔

آپ کا تقرب بطور تعلق یہ ہے کہ آپ اللہ کے علاوہ کسی سے محبت نہ کریں۔ اور اس کی رضایں آپ کا مطلوب ہو۔ اور صفت جلیل سے تعلق بایں طور ہے کہ آپ اپنے نفس کو گھنیا اور حقیر امور سے خالی کر دیں۔ کیونکہ آپ اشرف المخلوقات ہیں۔ ابن عطاء اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے آپ کو اپنے ملک اور ملکوت کے درمیانی عالم میں رکھا ہے۔ تاکہ آپ کو تمام مخلوقات کے درمیان سے اپنی قدرت کی جلالت سمجھا دے کیونکہ آپ ایک ایسے جوہر ہیں کہ آپ پر اللہ کی مکنونیات کی سپیائیں لپٹی ہوئی ہیں۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے عابدین کے قلوب کو اپنے ثواب و انعام اور اپنے عذاب و سزا کی حضوری میں رکھا ہے۔ جب وہ اللہ کے فضل و انعام میں غور و فکر کرتے ہیں تو ان کی رغبت بڑھ جاتی ہے اور جب وہ اللہ کے عذاب میں سوچ و پکار کرتے ہیں تو ان کے خوف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ پاک نے عارفین کے اسرار کی پاکیزگی کو اپنے جلال و جمال کی حضوری میں رکھا ہے۔ جب ان پر صفت جلال کھولی جاتی ہے تو ان کے احوال بجاؤ در بجاؤ میں ہوتے ہیں اور جب ان پر صفت جمال کھولی جاتی ہے ان کے احوال انس در انس میں ہو جاتے ہیں۔

قولہ: الکریم: کریم ایسی کثیر الجود و العطاء ذات کو کہتے ہیں جس کی عطا ختم نہ ہو۔ اور اس کے خزانے فناء نہ ہوں۔ یہ ذات کریم

مطلق ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کریم ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بغیر وسیلہ اور سوال کے از خود فضل کرے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کریم ایسے معاف کرنے والی ذات کو کہتے ہیں جو سزا میں انتہا نہ کرے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کریم اس ذات کو کہتے ہیں جو جب قادر ہو تو معاف کر دے اور جب وعدہ کو پورا کرے۔ اور جب دے تو امید سے بڑھ کر دے۔ اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ کس کو دیا ہے اور کتنا دیا ہے اور اگر بندہ حاجت کو اس کے غیر کی طرف لے جائے تو وہ اس بات کو ناپسند کرے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں ”ان لنا للآخرة والاولیٰ“۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کریم ایسی ذات کو کہتے ہیں نقائص سے پاک ہو اور عمدہ صفات کے ساتھ متصف ہو۔ کیونکہ اہل عرب بھی نفیس اموال کو نفاست کی بناء پر اموال کرائم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور حدیث پاک میں بھی ”ایاکم وکرائم اموالہم“ ہے تو یہاں کرائم اموال سے نفیس اموال مراد ہیں۔ اسی وجہ سے انکور کے درخت کو بھی کرم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انکور بھی عمدہ پھل اور حصول کے اعتبار سے ہاتھوں کے قریب ہوا کرتا ہے۔ بخلاف کھجور وغیرہ کے کہ ان میں یہ صفات نہیں۔

بندے کا حصہ صفت کریم سے بطور تخلق کے تو وہ یہ ہے کہ قدرت کے باوجود معاف کر دے بغیر وعدہ کے عطاء کرے۔ گھنٹیا اخلاق اور ایذا رساں افعال سے اجتناب کرے۔

قولہ: الرقیب برقیب ایسی حفیظ ذات کو کہتے ہیں جو اشیاء کی اس طرح نگرانی کرے کہ آسمان اور زمین میں کوئی چیز بھی رائی کے داند کے برابر اس سے مخفی نہ ہو۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ رقیب ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بندوں کے احوال و افعال کو جانتی ہو۔ اور ان کے سانسوں کی تعداد کا احاطہ کرتی ہو۔ اور ان کی طبعی عمروں کا علم رکھتی ہو۔ تو اس صورت میں صفت رقیب کا مرجع صفت ذات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ان الله كان علیکم رقیباً﴾ [الاحزاب: ۵۲] ﴿وكان الله علی کل شیء رقیباً﴾ [النساء: ۱۰]

آپ کا حصہ صفت رقیب سے تو وہ یہ ہے کہ آپ کو ہر حال میں اللہ کا خیال رہے۔ اور سوال کے سلسلہ میں اس کے غیر کی طرف متوجہ نہ ہوں اور آپ بھی رقیب بن جائیے۔ خصوصاً اس پر جس پر آپ کو راعی (نگہبان) بنایا گیا ہے۔ آپ تمام احوال میں اس کی طرف ہمہ تن متوجہ رہیں اور حدیث پاک میں آتا ہے ”کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ“ یعنی تم میں سے ہر ایک نگران ہے اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ مراقبہ صوفیاء کے گروہ کے ہاں یہ ہے کہ بندے پر اس کے رب کا ذکر کفلی غالب ہو جائے۔ اور بندے کو اس بات کا علم ہو کہ اس کا رب اس کے حال پر مطلع ہے۔ اور بندہ ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اور ہر وقت ذات باری سے بابت رہے۔ اور صاحب مراقبہ اللہ کے عقوبت کے خوف سے نئے گناہوں کو ترک سے زیادہ اللہ سے حیا اور مصیبت کی وجہ سے مخالفت کو چھوڑ دیتا ہے۔ دل کی حفاظت کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے سانسوں کو اللہ کے ذکر کے ساتھ شمار کرے اور وہ اپنے سانس کو اللہ کے ذکر کے بغیر ضائع نہیں کرتا۔ اور اللہ کی طاعات سے ایک لمحہ خالی نہ رہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ اس سے ہر چیز کا حساب لے گا۔ چھوٹی ہو یا بڑی۔ جیسا کہ بعض حضرات سے یہ حکایت نقل کی گئی ہے کہ ان کو کوئی آدمی خواب میں دکھایا گیا اس سے سوال کیا گیا کہ اللہ نے آپ سے کیا معاملہ کیا تو اس نے جواب دیا اللہ نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مجھے بخش دیا۔ ہاں البتہ اللہ پاک نے مجھ سے حساب لیا اور مجھ سے اس ایک دن کا مطالبہ کیا جس دن میں روزے دار تھا اور جب اظہار کا وقت ہوا تو میں اپنے دوست

کے صندوق سے بغیر اجازت گندم لے لی اور اس کو کوٹا پھر مجھے یاد آیا کہ گندم تو میری نہیں ہے۔ تو پھر میں نے اس کوٹی ہوئی گندم کو دوست کی گندم پر ڈال دیا تو اللہ پاک نے مجھ سے گندم کے کوٹنے کی مقدار کے جرمانے میں نیکیاں لے لیں۔ جس کو اس بات کا یقین ہو جائے تو وہ اپنی عمر غلط کاموں میں ضائع نہیں کرتا اور اپنا وقت غفلتوں میں ختم نہیں کرتا۔ اٹھی کلامہ۔ اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ [الحشر: ۱۸] اور حدیث پاک میں آتا ہے: ”حاسبو انفسکم قبل ان تحاسبو“۔ اپنے نفسوں کا محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب و کتاب لیا جائے۔

قولہ: المحجیب: مجیب ایسی ذات کو کہتے ہیں جو پکارنے والے کی پکار کا جواب دے اور مضطر اور مجبور آدمی جس چیز کی درخواست اور تمنا کرے اس کی درخواست اور تمنا کے سلسلہ میں اپنے آقا و مولیٰ کی بات کو قبول کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلِيَوْمَا بِي﴾ [البقرة: ۱۸۶] پھر اللہ پاک اپنے بندوں سے ان کے سوال کو پورا کرنے اور ان کو جواب دینے کی صورت میں ملاقات کرتا ہے۔

امام قشیریؒ حدیث ”ان اللہ يستحي ان يرد يدي عبده صفراً“ یعنی اللہ پاک اپنے بندے کو خالی ہاتھ لوٹانے سے حیا فرماتے ہیں کے بارے میں فرماتے ہیں۔ اللہ پاک جب جان لیتے ہیں کہ میرے دوستوں نے دل کے ساتھ میرے سامنے اپنی حاجت کو پیش کیا ہے تو اللہ پاک ان کی مراد کو پورا فرماتے دیتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ کے دوست اللہ کو زبان سے یاد کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کا حال ان پر تنگ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ اللہ ان کی پکار کا جواب نہیں دے گا تو اللہ پاک ان کی مایوسی کا تدارک اپنی بہترین ایجاد اور اچھی امداد کی صورت میں فرماتا ہے۔ اٹھی کلامہ۔ اور ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا﴾ [الشورى: ۲۸]

اور مجیب میں نبی اکرم ﷺ کے ارشاد مع اللہ لمحہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ مع بمعنی اجاب اور احسن خطاب کے ہے۔ لیکن بعض عارفین کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ کیلئے اجابت دعا کی ذمہ داری اٹھائی ہے لیکن اس چیز کے سلسلہ میں جس کو اللہ سبحانہ آپ کیلئے پسند کرتا ہے نہ کہ اس چیز میں جس کو آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ اور قبولیت دعاؤں کی ضمانت اس وقت میں ہے جس وقت میں اللہ کا ارادہ قبولیت دعا کا ہونہ کہ جس وقت میں آپ کا ارادہ ہے۔

صفت مجیب سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ آپ دست سوال اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے دار نہ کریں اور جو کچھ مانگنا ہو اللہ سے مانگیں۔ یہاں تک کہ اپنا آنا گوندھنے کیلئے نمک تک اللہ سے مانگیں اور امام احمد دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ جس طرح آپ نے میرے چہرے کو اپنے غیر کے سجدہ سے محفوظ رکھا ہے تو اسی طرح میرے چہرے کو بھی اپنے غیر سے سوال کرنے سے بھی محفوظ رکھ اور حدیث صحیح میں آتا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابة“ یعنی تم اللہ سے قبولیت دعا کے یقین کے ساتھ دعا مانگو اس لئے کہ قبولیت دعا ہر حال میں ہوگی خواہ قبولیت دعا متعجل ہو یا فی المسأل۔

صفت مجیب کے ساتھ باہ تخلق میں سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے ”لو دعیت الی کرا ع راجبت“ یعنی اگر مجھے کرا ع کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس داعی کی دعوت کو قبول کر دوں گا۔ کرا ع یہ ایک جگہ کا نام ہے اس جگہ اور مدینہ کے درمیان آٹھ دن کی مسافت ہے یا کرا ع سے مراد کرا ع الغنم ہے اور اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے: ”من لم یجب الداعی فقد عطی ابا القاسم“ ”جو داعی کی دعوت کو قبول نہ کرے تو اس نے ابو القاسم ﷺ کی نافرمانی کی ہے۔“

قولہ: الواسع: وہ ذات کہ جس کی کرسی زمین و آسمان سے کشادہ ہے۔ اور وہ ملک اور ملک کے اعتبار سے وسیع ہے اور اس کی رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔ وہ کثیر الرحمۃ والعتاء ہے۔ کوئی چیز اپنی ابتداء اور انتہا میں اس کی عطاء سے مستغنی نہیں۔ اور اس ذات نے علم کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا اور جملہ موجودات فلکیات و جزئیات کو جاننے والا ہے اس کی برہان و سلطان کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اس کے احسان کی کوئی حد نہیں۔

صفت واسع سے بندے کا حصہ یہ ہے کہ بندہ اپنے اخلاق و معارف کی کشادگی میں کوشش کرے اور غناء نفس کے اعتبار سے بالطبع جواد بن جائے اور اس کا دل فوت شدہ چیز کے مفقود ہونے کی وجہ سے تنگ نہ ہونے پائے اور حصول ضروریات کا زیادہ اہتمام نہ کرے۔ امام قشیری فرماتے ہیں کہ بندے پر واجب ہے کہ وہ اس بات کو جانے کہ خواہش نفس تک رسائی اور امید کے حصول پر قدرت اور اسباب دنیا کا اکتھا ہو جانا یہ اللہ کے جملہ انعامات نہیں ہے بلکہ بندوں سے دنیا کا ہٹا دینا یہ اللہ کا بہت بڑا لطف اور بندوں کی طرف اللہ کا بہت زیادہ وافر مقدار میں احسان ہے۔ کیونکہ بندے کا اللہ سے قرب دنیا سے دوبری کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور بعض کتب میں یہ بات مذکور ہے کہ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں ”زیادہ پہل چیز جو میں کسی عالم کے ساتھ کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب دنیا کی طرف میلان اختیار کرتا ہے تو میں اس سے اپنی مناجات اور اپنی بندگی کی لذت چھین لیتا ہوں۔“

قولہ: الحکیم:

حکیم صاحب حکمت ذات کو کہتے ہیں اور حکمت کہتے ہیں کامل علم اور پختہ عمل کو۔
یا حکیم فعیل یعنی حاکم فاعل کے ہے۔ تو اس صورت میں حکیم مبالغہ حاکم ہوگا۔ اس لئے کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کا ارادہ کر لے اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے فیصلے پر کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں۔
فعیل مفعول کے معنی میں ہے (یعنی حکیم معنی محکم) کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اشیاء کو محکم اور مضبوط کرتا ہے۔ اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿صنَعَ اللَّهُ الَّذِي اتَّفَقَ كُلُّ شَيْءٍ﴾ [النمل: ۸۸] بایں طور کہ معارف الہیہ کے حصول کی صورت میں اپنے توائے نظریہ کی تکمیل کی کوشش کریں۔ اور اپنے نفس کو رزائل سے خالی کرنے اور اس کو فضائل سے مزین کرنے اور اس کو اچھی خصائل سے روشن کرنے کی صورت میں اپنی قوت عملیہ کا کمال حاصل کریں۔ جو آپ کیلئے بلند درجات کی اور قرب مولیٰ کا موجب ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں حکمت سے نواز دیتے ہیں۔ اور جو شخص حکمت سے نواز دیا گیا تو گویا کہ وہ خیر کثیر سے نواز دیا گیا۔ اور حکمت کتاب و سنت کا علم ہے نہ کہ فلاسفہ کے علوم۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ اللہ کا حکم اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کو بغیر استحقاق و سبب کے بلا کوشش و طلب حکیم سعادت کے ساتھ مخصوص فرما دیتا ہے۔ بلکہ اللہ کا علم قدیم اس کو سعادت مند ٹھہرانے کے متعلق اور اللہ کا حکم ازل اس سعادت کو وجود میں لانے کے متعلق ہو چکا ہوتا ہے اور کسی قوم کو اللہ پاک رندہ درگاہ ہی دوری کے ساتھ مخصوص فرما دیتا ہے بغیر کسی سابقہ جرم کے اور اکتساب گناہ کے اس کی قدر و منزلت کو اپنے بندوں کے درمیان سے گھٹا دیتا بلکہ کلمہ شقاوت اس کے حق میں ثابت ہو چکا ہوتا اور اللہ کی مشیت اس کے دل کی قیادت اور انکار کی صورت میں نافذ ہو چکی ہوتی ہے۔ جو بندہ اللہ کے حکم میں شقی ہو چکا ہوتا ہے تو اللہ اس کو اپنے دوستوں کی صف میں ظاہر فرماتے ہیں۔ پھر اسی کی انتہائی مذمت فرماتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿فَمَعْلَهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ اور جو اللہ کے حکم میں سعید ہو چکا ہوتا ہے تو اللہ پاک اس کو کتے کی صورت میں پیدا کر کے اس کا حشر اپنے دوستوں کی جماعت میں فرماتا ہے۔ اور اس کتے کا ذکر اپنے جملہ خاص دوستوں میں کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿رَابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ [الکہف: ۲۲] اتنی کلامت۔ یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿لَا

يسأل عما يفعل وهم يسألون ﴿۲۳﴾ [الانبیاء: ۲۳]

قولہ: اللودود: یہ مبالغہ واد ہے اور ود مصدر سے مشتق ہے اور ود محبت کو کہتے ہیں یعنی ”ودود“ وہ ذات ہے جو تمام مخلوقات کیلئے بھلائی کو محبوب رکھے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ودود ایسی ذات کو کہتے ہیں جو اپنے دوستوں سے محبت کرے۔ اور یہی بات زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿واللہ یحب المحسنین﴾ [آل عمران: ۱۱۴] اور دوسری آیت ہے: ﴿انہ لا یحب الظالمین﴾ (شوری: ۴۰)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صفت ودود کا مرجع ارادہ مخصوص ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ فعل ودود بمعنی مفعول ودود و محبوب کے ہے۔ کیونکہ اللہ پاک اپنی تمام مخلوقات کے دلوں میں محبوب اور اپنی تمام مصنوعات کی وجہ سے مطلوب ہے۔ اور حقیقت میں جیسا کہ اصحاب شہود کا نظریہ یہ ہے کہ عالم کون میں اللہ کے سوا کسی کا وجود نہیں اور وہی محبت اور محبوب ہے جبکہ وہ حامد و محمود شاہد و مشہود ہے۔

بندے کا حصہ صفت ودود سے یہ ہے کہ مخلوق خدا کیلئے بھی اس چیز کا ارادہ رکھے جس چیز کا وہ اپنے حق میں ارادہ رکھتا ہے۔ اور اپنی قدرت اور گنجائش کے مطابق مخلوق خدا کے ساتھ احسان کرے۔ اسی کی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے۔ ”لا یومن احدکم حتی یحب لا خیہ ما یحب لنفسہ“۔ یعنی تم میں سے کوئی کمال ایمان حاصل نہیں کر سکتا۔ تا وقتیکہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ اپنے بھائی کیلئے پسند کرے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کی صفت کے سلسلہ میں ودود کا معنی ہے ایسی ذات جو مؤمنین سے محبت کرے اور مؤمنین اس سے محبت کریں جبکہ اللہ ارشاد فرماتا ہے: ﴿یحبہم ویحبونہ﴾ [المائدہ: ۵۴]۔ حق تعالیٰ شانہ کا اپنے بندوں سے محبت کرنے کا مطلب بندوں پر رحمت کرنا اور ان کیلئے اچھائی کا ارادہ کرنا اور ان کی تعریف کرنا ہے اور بندوں کی اللہ سے محبت ان کا اللہ کی اطاعت اور اس کے حکم کی موافقت اور اس کی تعظیم اور اس سے ڈرتے رہنے کے معنی میں ہوگی۔ اتنی کلام۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات سیجعل لہم الرحمن و قد﴾ [سورہ مریم: ۹۶] یعنی اپنے اور ان کے درمیان یا اپنے اور مخلوق کے درمیان اور ان دو محبتوں کو جمع کرنے سے کوئی رکاوٹ نہیں ایک حدیث قدسی ہے اللہ پاک فرماتا ہے کہ میری طرف محبوب وہ ہے۔ میری عبادت بغیر عطاء کے کرتے تاکہ وہ ربوبیت کو اس کا حق ادا کر دے۔

قولہ: المجید: یہ مبالغہ ماجد ہے اور مصدر مجد سے مشتق ہے۔ مجد کرم کی کشادگی کو کہتے ہیں اور مجید وہ ذات ہے کہ جس کے کرم کی کشادگی کا ادراک نہ کیا جاسکے۔ اور اس کی لگا تار بڑوں اور احسانات کی کوئی انتہا نہ ہو۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے بڑے انعامات جو اپنے بندوں پر ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی توحید اور ان کے دین کی حفاظت کی ہے جس کی وجہ سے وہ راہ راست سے ٹیزھے اور ہٹنے نہیں پاتے اگر اس کا لطف و احسان نہ ہوتا وہ گمراہ ہو کر راہ راست سے ہٹک جائے۔ اور اللہ کے بڑے احسانات جو اکثر مخلوق سے مخفی نہیں وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان قلوب کو محفوظ رکھا اور ان کے اوقات کو کدورتوں سے پاک رکھا۔ اس لئے کہ سب سے بڑی نعمت قلوب کا اچھا ہونا ہے۔ جیسا کہ سب سے بڑی مشقت قلوب کی مشقت ہے۔

یا مجید مجد سے مشتق ہے اور مجد انتہائی شرف کو کہتے ہیں اور اللہ وہ ذات ہے جس کیلئے شرف ذات اور اچھی صفات ہیں۔

کہا گیا ہے کہ مجید عظیم اور بلند مرتبہ ذات کو کہتے ہیں اور عظیم فعل مفعول کے معنی میں ہے۔

بندے کا حصہ صفت مجید سے تو وہ یہ ہے کہ بندہ لوگوں کے ساتھ کرم اور اچھے اخلاق والا معاملہ کرے تاکہ لوگوں میں ماجد اور اللہ کے ہاں پائی جانے والی خیر کا واجد بن جائے۔

قولہ: الباعث یعنی احکام اور حکمتیں دے کر رسولوں کو امتوں کی طرف مبعوث کرنے والی ذات۔

یاد وہ ذات جو حشر و نشر کیلئے قبروں میں پڑے ہوؤں کو اٹھائی گئی۔

کہا گیا ہے کہ باعث سے مراد ایسی ذات ہے جو اپنے بندے کی طرف ایسی جگہ سے رزق بھیجتی ہے جہاں سے بندے کا گمان نہ گذرا اگرچہ بندہ ہاتھ پاؤں نہ بھی مارے۔

کہا گیا ہے کہ باعث ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جو توحید کے پیانوں میں ارادوں کو ترقی کی طرف اٹھا دے اور بندوں کی صفات کو ظلم سے پاک کرنے کی طرف۔

بندے کا حصہ صفت باعث سے یہ ہے کہ اولاً باعث کے مطالب پر ایمان لائے اور متوجہ ہو۔ ابتداء اپنی ذات سے کرے پھر اس کو جو اس کے اعتبار سے زیادہ قریب ہو اور رتبہ کے اعتبار سے اس سے ادنیٰ ہو۔

قولہ: الشہید یہ مبالغہ شاہد ہے اور مصدر شہود بمعنی حضور سے مشتق ہے اور شہید کا معنی ہے ایسی ذات جو اشیاء کے ظاہر کو اور ایسی چیزوں کو جن کا مشاہدہ ممکن ہے بخوبی جاننے والی ذات جیسا کہ خیر ایسی ذات کو کہتے ہیں جو باطن اشیاء کو اور ایسی چیزوں کو جن کا احساس ممکن نہ ہو جاننے والی اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿عالم الغیب والشہادۃ﴾ [الانعام: ۷۳]

شہید شہادۃ مصدر سے شاہد کا مبالغہ ہے اور معنی ایسی ذات جو روز قیامت اپنے علم کی وجہ سے مخلوق پر گواہی دے گی اور مخلوق میں سے گواہ بنائے گی اور اس سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿و کفی باللہ شہیداً﴾ [سورۃ النساء: ۷۹]۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ اہل معرفت اللہ کے ساتھ اللہ کے سوا کسی کو موس نہیں بناتے بلکہ وہ اپنے احوال پر بطور شہید کے اور اپنے افعال و امور پر بطور علیم اللہ کے ساتھ راضی ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو حالانکہ وہ رازوں اور انتہائی خفیہ باتوں کو جانتا ہے۔ اور سرگوشی کو سنتا ہے۔ تکلیف اور مصیبت کو ٹالتا ہے۔ بھلائی کو بڑھاتا ہے اور گھٹیا چیز کو پھیرتا ہے۔ دنیا و آخرت کا مالک ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اولم یکف بربک انہ علی کل شیء شہید﴾ [فصلت: ۵۳]

اور باقی رہا آپ کا حصہ صفت شہید سے تو وہ یہ ہے کہ آپ ہر وقت اپنے پروردگار کا خیال رکھیں یہاں تک کہ اللہ پاک آپ کو وہاں نہ دیکھے جہاں سے آپ کو منع کیا ہے۔ اور وہاں سے آپ کو گم نہ پائے جہاں کا آپ کو حکم دیا ہے اور آپ اپنی ضروریات کو غیر کی طرف لے جائے اور نیکی و بھلائی کیلئے طلب غیر کی طرف مائل ہونے سے اللہ کے علم پر اکتفا کریں۔

صفت شہید سے آپ کا تعلق تو وہ یہ ہے کہ آپ حق کے شاہد اور سچ کی رعایت کرنے والے بن جائیں تاکہ آپ جملہ لوگوں میں سے مقبول الشہادۃ ہو جائیں جن لوگوں کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿و سئلک جعلنکم امة وسطاً﴾ [البقرۃ: ۱۴۳]

قولہ: الحق یعنی ایسی ثابت ذات کہ جس کے وجود کا یقینی ہونا متحقق ہو چکا ہو اور اس کے غیر کا تحقق بھلا اس کے فضل و کرم سے ہو اور حق کی ضد باطل آتی ہے۔ معدوم کو یا ایسی موجود چیز کو جو حق کے مقابلہ میں مہوم کے مرتبہ میں ہو باطل کہتے ہیں۔ اور جملہ موجودات اس حیثیت سے کہ وہ ”فی حد ذاتہا“ ممکن ہے اور ان کا ثبوت از خود نہیں بلکہ ساری موجودات کا ثبوت اللہ کی جانب سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹتا ہے۔ تو اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ اس حیثیت سے کہ کوئی بھی چیز اس کی اپنی ذات کی جانب سے یا اپنی ذات میں ہتھیہ نہیں چہ جائیکہ وہ چیز ثابت رہ جائے اسی کی طرف ارشاد باری تعالیٰ: ﴿کل شیء ہالک الا وجہاً﴾ [الفصص: ۸۸] اور ﴿کل من علیہا

فان ﴿الرحمن: ۲۶﴾ سے اشارہ ہے۔ من مستعمل برائے ذوالعقول لانا ”تغلیباً“ ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب یہ فناء ہو جائیں گے تو غیر ذوالعقول تو بدرجہ اولیٰ فنا ہو جائیں گے اور جس شاعر کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ گواہی دی کہ زیادہ سچی بات وہ ہے جو لبید شاعر نے کہی اور اس کی بات ”الا کل شیء ما خلا اللہ باطل“ کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی باطل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز فناء اور زوال کو قبول کرنے والی ہے۔ بلکہ ارباب شہود کی نظر میں ہر چیز ہمیشہ کمزوری کے مرتبہ میں ہے۔ اور ہمارے شیخ المشائخ ابو الحسن بکریؒ کے قول ’استغفر اللہ مما سوی اللہ‘ کا بھی مطلب ہے۔ جیسا کہ میں نے اس قول کو شرح کے ساتھ شرح حزب الفتح میں تحریر کیا ہے۔ اور حضرت لبیدؒ کی جلالت شان پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ جب حضرت لبیدؒ اسلام لائے تو انہوں نے شعر کہنا چھوڑ دیئے اور فرمایا کہ مجھے قرآن کافی ہے تو بہر کیف حق اس معنی کی وجہ سے صفات ذات میں سے شمار ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حق کا معنی ہے حق یعنی حق کو ظاہر کرنے والی ذات۔ یا شی کو اس کی حکمت کے مقتضی کے مطابق ایجاد کرنے والی ذات تو اس صورت میں صفت حق صفات افعال میں سے ہوگی۔

آپ کا حصہ صفت حق سے تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے یہ پہچان لیا کہ وہ ذات حق ہے تو آپ مخلوق کا ذکر بھول جائیں۔ اور باقی رہا آپ تخلیق تو وہ یہ ہے کہ آپ جمیع اقوال افعال اور احوال میں حق کو لازم پکڑیں۔

قولہ: الوکیل: یعنی بندوں کے امور کو قائم کرنے والی اور ان کی مصلحتوں کی کفالت بردار ذات۔

بعض حضرات کہتے ہیں وکیل اس ذات کو کہتے ہیں کہ جس کی طرف اقامت اور کفایت کے اعتبار سے بندوں کی تدبیریں سونپ دی گئیں ہو اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ شی کی اقامت کے لحاظ سے ہر چیز پر وکیل اور کارساز ہے۔ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا وکیل ہونا دو چیزوں کی طرف مشیر ہے: (۱) کہ مخلوق مناسب انداز میں اپنے جملہ امور کے قیام سے عاجز ہے اس لئے کہ عموماً کوئی عاقل آدمی اپنا کام دوسرے کی طرف سپرد نہیں کرتا۔ الا یہ کہ اس کیلئے خود اس کام کو کرنا مشکل یا محض ہر جو جائے۔ (۲) کہ اللہ مخلوق کے حال کو جانتا ہے اور جس چیز کی طرف مخلوق کو احتیاجی ہے وہ اس پر قادر ہے۔ اور مخلوق پر مہربان ہے اور جو شخص اپنے اندران صفات کو جمع نہ کر سکتا ہو تو اس کی طرف کام سپرد کرنا بھی اچھا نہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿و کفی باللہ وکیلاً﴾ [نساء: ۸۱] ﴿و علی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین﴾ [المائدہ: ۲۳] ﴿ومن یتوکل علی اللہ فهو حسبہ﴾ [الطلاق: ۰۳] ﴿وتوکل علی الحی الذی لا یموت﴾ [الفرقان: ۵۸] ﴿وتوکل علی العزیز الرحیم﴾ [الشعراء: ۲۱۸]

اور باقی رہا صفت وکیل کے ساتھ تخلیق تو وہ اس طرح ہے کہ آپ بندگان خدا کے امور اور ان کے مطالب کو قائم کیجئے۔ اور ان کی ضرورت پروری کی کوشش کیجئے۔

قولہ: القوی: مرتبہ کے اعتبار سے قوت کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے اور اس کا انتہائی رتبہ ایسی کامل درجہ کی قدرت ہے جو انتہا کو پہنچنے والی اور تمام اشیاء کو گھیرنے والی اور درجہ کمال کو ملنے والی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اسی معنی میں قوی ہے۔ اور اگر غیر کو قدرتے قوت حاصل ہے بھی صحیح تو وہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے۔ اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ اولاً انسان جو اپنے اندر عمل کا ایک احساس سا پاتا ہے اس احساس کو حول کہتے ہیں۔ اور پھر اپنے اعضاء میں اس کام کی طاقت رکھنے کا جو احساس پاتا ہے اس کو قوت کہتے ہیں۔ اور پھر پکڑنے اور لینے کی صورت میں جو انسان پر عمل ظاہر ہوتا ہے اس کو قدرت کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لاحول ولاقوتہ کو جنت کے خزانوں میں سے خزانہ قرار دیا گیا۔ کیونکہ یہ کلمہ تمام امور کے اللہ کی طرف لوٹنے پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جب آپ نے اللہ کے غیر سے لاحول ولاقوتہ کی صورت میں قوت کے پہلے دو درجوں کی نفی کر دی تو بہتر

یہی ہے کہ آپ قوت کے تیسرے درجے یعنی قدرت کی بھی غیر اللہ سے نفی کر دیں۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ کی یہ بات قابل اشکال ہے کیونکہ تیسرے درجے یعنی قدرت کا اللہ کے غیر سے منفی ہونا ظاہر ہے۔ تو لہذا نفی کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کوئی سفیہ آدمی بھی اپنی ذات کیلئے قدرت کا وہم نہیں کرتا؛ چہ جائیکہ علماء سے اس وہم کا صدور ہو۔ ہاں البتہ حول اور قوت کے بارے میں اپنے نفسوں کی طرف نسبت کا وہم کبھی جہالت اور غفلت کی بناء پر پیدا ہو جاتا ہے اس لئے ان کی نفی ذکر کی گئی۔ جیسا کہ معتزلہ کا گمان بھی یہی ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں بندے ہی کرتے ہیں اس لئے ان کے وہم کا دفعیہ کیا گیا اور ان کی سمجھ کو غلط قرار دیا گیا۔

آپ کا تقرب بطور تعلق صفت قوی سے تو وہ بایں طور ہے کہ آپ تدبیر کو ساقط کر دیجئے اور تقدیر کا جھگڑا ترک کر دیجئے اس لئے کہ دیر کسی قسم کی تبدیلی قبول نہیں کرتی۔ اور دعویٰ کہ ارد گرد چکر مت کا ٹیٹے اور دنیا کے غموں کی پرواہ مت کیجئے۔ اور باقی رہا اس کے ساتھ آپ کا تعلق تو وہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی ذات کے سلسلہ میں اس طرح قوی ہو جائیے کہ آپ اللہ کے راستہ میں کسی بھی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کیجئے۔

قولہ: المتین: یہ متانت اور شدت سے ہے۔ اور متین اور قوی کا مرجع وصف کمال قدرت اور شدت قوت ہے اور اللہ تعالیٰ بالغ القدرة اور دائم القدرة ہونے کی حیثیت سے قوی ہے۔ اور شدید القوتہ ہونے کی حقیقت سے متین ہے۔ کہا گیا ہے کہ متین متانہ سے اور متانت کہتے ہیں کہ شئی کا اس طرح مضبوط اور مستحکم ہونا کہ وہ شئی کسی سے متاثر نہ ہونے پائے تو گویا متین وہ ذات جو دوسری شئی میں مؤثر تو ہو لیکن دوسرے شئی سے متاثر نہ ہو۔ اور وہ ذات ہے کہ جس پر نہ تو غلبہ پایا جاسکے اور نہ ہی وہ کسی سے مغلوب ہو پائے اور نہ ہی وہ ذات اپنی قوت میں کسی مادے اور سبب کی محتاج ہو۔ جیسا ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان اللہ هو الرزاق ذو القوتہ المتین﴾ [الذاریات: ۵۸] اور اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو اگر کسی بندے کو ہلاک کرنا چاہے تو اپنی قدرت سے ہلاک کر دے۔ ذبح کی صورت میں یا اس کے علاوہ گلا گھونٹنے اور جلانے اور غرق کرنے کی صورت میں۔ اسی طرح استاذ علی دقاق فرماتے ہیں ایسی ذات سے ڈر جو تیری ہلاکت کیلئے مدد کی محتاج نہیں۔ اگر وہ تجھے ہلاک کرنا چاہے تو وہ تجھے تیرے ہاتھوں سے بھی ہلاک کر کے بھی تیری جان نکال سکتا ہے۔

آپ کا حصہ صفت متین سے تو وہ یہ ہے کہ آپ اللہ پر بھروسہ اور اس کی طرف سہارا لیں۔

قولہ: الولی: یعنی اپنے دوستوں سے محبت کرنے والی ذات اور ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کرنے والی ذات خواہ ان کے دشمن ان کے نفسوں کی صورت میں ہوں یا خواہشات کی صورت میں یا اس کے علاوہ ہر ایسی چیز جو ان کو اللہ کے غیر کی ملاقات کی طرف بلائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿واللہ ولی المتقین﴾ [الحاثیہ: ۱۹] ﴿وہو الولی الحمید﴾ [الشوری: ۲۸]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ولی کا معنی ہے ایسی ذات جو اپنی ساری مخلوق کے امور کی متولی ہو۔ اور اپنی حکمت کے مطابق ان کے بارے میں جو جانتی ہے کرتی ہے۔ اور اپنی عزت کی وجہ سے جس چیز کا ارادہ کرتی ہے فیصلہ کر دیتی ہے۔

ولی ایسی ذات کو کہتے ہیں جو اپنے بندوں میں سے خاص بندوں کو منتخب کرنے اور ان کو سعادت مند بنانے کی صورت میں ان کے امور کی متولی ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور﴾ [البقرہ: ۲۵۷]

صفت ولی سے آپ کا حصہ تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے یہ پہچان لیا کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کا ولی ہے تو آپ اللہ اور اس کی محبت کے علاوہ کسی سے دوستی نہ کریں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ومن یتول اللہ ورسولہ والذین آمنوا فان حزب اللہ ہم الغالبون﴾ [المائدہ: ۵۶] تو آپ ولایت خاصہ کے اس درجے کو پالیں گے جس کی طرف اللہ پاک نے اپنے ارشاد: ﴿الا ان اولیاء اللہ لا خوف

عليهم ولا هم يحزنون الذين آمنو وكانوا يتقون ﴿﴾ [يونس: ۶۲-۶۳] میں اشارہ کیا ہے۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ اللہ کی اپنے بندے کی ولایت کی علامات میں سے ہے کہ اللہ پاک اپنے بندے کو توفیق داعی سے نوازتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر بندہ کسی برائی کا ارادہ کرے یا کسی ممنوع چیز کا قصد کرے تو اللہ پاک اس کو اس کے ارتکاب سے محفوظ فرمادیتے ہیں۔ اور اگر بندہ اس کی اطاعت کے سلسلہ میں کسی کوتاہی کی طرف جھکنے لگے تو اللہ پاک اس کو جھکنے نہیں دیتے بلکہ مزید اس کو طاعت کیلئے توفیق اور تائید مہیا کرتے ہیں۔ اور ساری علامت سعادت کی اور اس کے برعکس جملہ علامات شقاوت کی ہیں۔

اور اللہ کی ولایت کی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ پاک اپنے دوستوں کے دلوں میں اپنے بندے کی محبت بٹھادیتے ہیں۔ اور اللہ ہر وقت اپنے دوستوں کے دلوں کی طرف نظر فرماتے ہیں۔ جب ان کے قلوب میں کسی بندے کیلئے جگہ دیکھتے ہیں تو ان کی طرف نظر لطف فرماتے ہیں اور جب اللہ پاک اپنے اولیاء میں سے کسی ولی کے ارادے کو کسی بندے کے حال کے بارے میں دیکھتے ہیں یا اپنے ولی کو کسی شخص کے حال کے بارے میں دعا کرتے ہوئے سنتے ہیں تو اللہ پاک اسے روک دیتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ اس کی طرف فضل و احسان کرے اور اللہ نے سنت کریمہ اس طرح جاری رکھی ہوئی ہے۔

میں نے شیخ ابوعلی دقاق کو سنا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر اولیاء اللہ میں سے کوئی ولی کسی شہر سے گزر جائے تو اہل شہر اس ولی کے گزرنے کی برکت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ ان اہل شہر کو معاف کر دیتے ہیں۔

ولایت کی خصوصیات میں سے یہ خصوصیت ہے کہ اہل ولایت ”ذلت“ سے منزه ہوا کرتے ہیں ”کما قال تعالیٰ: ﴿ولم یکن لہ ولی من الذل﴾ [الاسراء: ۱۱۱] اور اولیاء اللہ ہمیشہ دنیا و آخرت میں اپنے مولیٰ کی عزت میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اللہ پاک اپنے اولیاء سے راضی ہوتے ہیں۔ اور اللہ پاک اپنے کرم و احسان سے ہمیں بھی اپنے زمرہ اولیاء میں شامل فرمائے آمین۔

قولہ: الحمید یعنی محمود اور ثناء کی مستحق ذات۔ اس لئے کہ اللہ پاک ہر کمال سے موصوف اور ہر عطاء کا مالک ہے۔ اور فعال کل ہونے کی وجہ سے شکور ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ علی الاطلاق محمود ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وان من شیء الا یسبح بحمده﴾ [الاسراء: ۴۴] ہر چیز کا تسبیح بیان کرنا یا تو بیان قول کے ساتھ ہوگا یا زبان حال کے ساتھ کہا گیا ہے کہ اللہ پاک نے ازل میں جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے اپنی تعریف کی۔ اور بندے ہمیشہ اللہ کی الہام کردہ تعریف کرتے رہیں گے۔ اور وہ اللہ ہمیشہ تعریف کا مستحق ہے۔ بلکہ حقیقت میں حامد اور محمود وہی ہے۔ جیسا کہ اس پر صیغہ حمید فعلیل دلالت کرتا ہے کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ یہ حامد اور محمود فاعل کو مفعول کے معنی میں ہو جیسا کہ احمد الحامدین ﷺ کا ارشاد ہے: سبحانک لا احصى ثناء علیک کما انیت علی نفسک، یعنی جس طرح تو نے اپنی تعریف آپ کی ہے۔ میں اس طرح تیری تعریف کرنے سے قاصر ہوں اور آپ کا حصہ صفت حمید سے تو وہ ہے جو صاحب حکم نے فرمایا ہے یعنی مؤمن کو اللہ کی ثناء اس کو اپنی ذات کا شاکر ہونے سے مشغول رکھے۔ اور اس کو اللہ کے حقوق اپنے ذاتی حقوق کی یا و آوری سے مشغول رکھیں۔

صفت حمید کے ذریعہ تقرب بطور تعلق یہ ہے کہ آپ جملہ احوال میں کثرت سے اس کی حمد میں رطب اللسان رہیں۔

صفت حمید سے تعلق تو وہ بایں طور ہے کہ آپ اچھی صفات اور اچھے افعال سے اپنے آپ کو مزین کرنے کی کوشش کریں۔

امام قشیری فرماتے ہیں بندے کی اللہ کیلئے حمد بندے کا شکر ہے۔ تو مناسب ہے کہ یہ شکر حضور نبی منعم کے ساتھ ہونا چاہئے اس لئے کہ شکر کی حقیقت کا یہ ہے کہ منعم کی حضوری کی وجہ سے حضور نبی نعت سے غیبت اختیار کر لینا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جناب داؤد علیہ السلام نے اپنی مناجات میں عرض کی کہ الہی میں آپ کا شکر کیسے ادا کروں اس لئے کہ میرا آپ کا شکر ادا کرنا درحقیقت یہ بھی تو آپ کی جانب سے مجھ

پر ایک نعمت ہے۔ اللہ نے جناب داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اے ابوداؤد تو نے اب میرا شکر ادا کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ شکر سے عاجز آجانا یہ بھی شکر ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ادراک کے درک سے عاجز آجانا بھی ادراک ہے۔ پھر کتنے بندے ہیں جو بظاہر نعمت میں ہیں تو ان پر اس کا شکر واجب ہے کیونکہ وہ درحقیقت ایک قسم کی مشقت میں صبر ضروری ہے۔ اس لئے فی الحقیقت نعمت وہ ہے جو آپ کو نعمت کی طرف پہنچا دے۔ نہ آپ کو نعمت سے ہٹا دے اور نعمتیں حقیقت میں دیدیہ بھی ہوا کرتی ہیں۔ ہاں اگر ان کے ساتھ دنیا کی راحتیں بھی میسر ہو جائیں تو یہ نور اور سرور علی سرور ہے۔ اور سید شاذلی کی دعا بھی کچھ اسی قسم کی ہے کہ ”اللہم یسر اموناً مع الرحۃ لقلوبنا.....“ اے اللہ ہمارے امور کو راحت قلبی کے ساتھ آسان فرما۔ پھر اگر بندہ نعمت کو اس مصرف میں خرچ کرنے کی صورت میں کہ جس طرف کیلئے اس نعمت کی تخلیق ہوئی ہے شکر کی توفیق پاتا ہے۔ تو یہ بہت اچھا ہے اگر ایسا نہیں تو مشقت محض مشقت ہی رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾ [الاعراف: ۱۴۱] میں بلاء کی تفسیر نعمت اور نعمت سے کی گئی ہے اور اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ﴾ [الاسراء: ۸۲]

قولہ: المحصی: یعنی ایسی جاننے والی ذات کہ جس نے معلومات و موجودات کا اس طرح احاطہ کر رکھا ہو جیسا کہ گننے والا گننے جانے والی چیز کا یا ضبط کرنے والا ضبط کی جانے والی چیز کا اجمالاً اور تفصیلاً احاطہ کر لیتا ہے۔ اگرچہ بندے کیلئے بعض ممکنات کو حصر میں لانا اور بعض معدودات تک رسائی ممکن ہے لیکن وہ اکثر اور اغلب معدودات کے احصاء اور ضبط سے عاجز ہے۔ اور بندے کی جہالت اس کے علم سے زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَمَا أَوْتِيتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [الاسراء: ۸۵] بندے کیلئے مناسب یہی ہے کہ وہ اپنی ذات سے متعلق اعمال کا احاطہ کرتا رہے۔ اس سے قبل کہ اس کا احاطہ کیا جائے۔ اور استقصاء سے قبل اپنے قبیح اعمال کی تلافی کرتا رہے۔ اور کہا گیا ہے کہ محصی ایسی قادر ذات کو کہتے ہیں کہ جس سے مقدرات میں سے کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔ تو اس صورت میں صفت محصی کا مرجع صفت علم یا صفت قدرت ہے۔ صفت محصی سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ آپ سے کسی سکون اور حرکت میں کسی لمحہ اور لحظہ سے غفلت واقع ہونے نہ پائے۔

صفت محصی کے ذریعہ آپ کا تقرب بطور تعلق یہ ہے کہ آپ تمام سانسوں میں اپنے نفس کا اس طرح محاسبہ کریں کہ آپ کا کوئی سانس اللہ کی فرمانبرداری کے بغیر نہ پایا جائے۔ اسی وجہ سے وارد ہوا کہ اہل جنت صرف اسی گھڑی پر حسرت کریں گے جو ان کی بغیر اللہ کی یاد گذر گئی ہو۔ اور کہا گیا ہے کہ جب دنیا ایک ساعتہ ہے تو اس دنیا کو آپ اللہ کی طاعت اور فرمانبرداری میں لگا ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَان تَعُدُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تَحْصُوهَا﴾ [ابراہیم: ۳۴] یعنی تم تو اللہ کی نعمتوں کو گننے کی طاقت نہیں رکھتے چہ جائیکہ تم ان نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

بعض بزرگوں کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے بیخ کو شمار کر رہے تھے تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ اس پر شمار کر رہے ہیں۔ فرمایا نہیں بلکہ اس کیلئے شمار کر رہا ہوں۔ پس آدمی پر واجب ہے کہ اپنے آپ کی رعایت کرے اور اپنے گناہوں کو شمار کرے اور جس اچھی چیز کا وہ مالک ہو اسے اس پر شکر ادا کرے۔ اور آنے والے بیخ سے بچنے اور طاعات سے خالی ایام کو یاد کرے۔ اور غفلتوں میں گزرے اوقات ماقیہ پر انفسوس کرے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ وقت سے زیادہ نفیس اور عمدہ کوئی چیز نہیں۔ اس لئے کہ وقت کے علاوہ کوئی ایسی نفیس چیز نہیں کہ جس کا عوض لانا ممکن نہ ہو۔ اس لئے بعض حضرات کہتے ہیں کہ وقت کاٹنے والی تلوار ہے اور وقت تلوار کی مثل ہے۔ اگر آپ اسے نہیں کاٹیں گے تو یہ آپ کو کاٹ ڈالے گا۔ اگر آپ وقت عبادت کی صورت میں نہیں کاٹیں گے تو یہ آپ کو غلط کاموں کی صورت میں کاٹ ڈالے گا۔ اور اسی طرح بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ صوفی ابن الوقت اور ابوالوقت ہوا کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان دقیق فرق ہے۔ جو اس

جگہ کے علاوہ میں زیادہ مناسب ہے۔

قولہ: المبدیٰء: ہمزہ کے ساتھ ہے اور اس ہمزہ کو وقف سے بدلنا بھی جائز ہے۔

مبدیٰ ایسی ذات کو کہتے ہیں جو اپنے جوہر کو عدم سے کائنات کو عدم سے وجود کی طرف ظاہر کرنے والی ہو۔ اور مبدیٰ خالق کے معنی میں ہے۔

مبدیٰ ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ بغیر کسی مثال سابق کے اشیاء کی مخترع اور نشئی ہو اور معید کے مقابلہ میں یہی زیادہ مناسب ہے۔
قولہ: المعید: معید ایسی ذات کو کہتے ہیں جو دنیا میں مخلوق کو حیات سے ممات کی طرف لوٹاتی ہے اور ممات کے بعد ان کو حیاتِ اخروی کی طرف لوٹائے گی۔ امام طبریٰ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک اشیاءِ محدثات کا ان کے جوہر اور اعراض کے منعدم ہونے کے بعد اعاد کرنے والا ہے۔ اور یہ بات ان حضرات کے مخالف ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ اعادہ شی کی مثل کو پیدا کرنے کا نام ہے نہ کہ بغیر مثل کے شی کو پیدا کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مکلفین کے تمام اجزاء متفرقہ کا اعادہ ہو اس لئے کہ جب اللہ ساری مخلوق کو اٹھائے گا اور ان کو اکٹھا کرے گا تو ان کا اعادہ بھی کرے گا۔

کیفیت اعادہ کے بارے میں اختلاف ہے کرامیہ کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ اشیاء کے جوہر منعدم نہیں ہوتے بلکہ متفرق ہو جاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو جمع کرے گا اور ان کو پہلے طریقے سے جوڑ دے گا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ جوہر بھی منعدم ہو جائیں گے۔ ہاں مگر وہ جس کے عدم انعدام کے بارے میں نص وارد ہوئی وہ منعدم نہیں ہوتا۔ پھر بقیہ اس کا اعادہ کیا جائے گا۔ آپ ﷺ کے ارشاد ”کل ابن ادم یفنی الا عجب الذنب“ یعنی سارے انسان فنا ہو جائیں گے مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی اور مسئلہ فلسفی ہے جیسا کہ اس کی امام غزالی رحمۃ اللہ نے صراحت کی ہے۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں حق بات یہ ہے کہ جو چیز منعدم ہو چکی ہے اس کا بقیہ اعادہ ہوگا۔ اور جو چیز متفرق ہوگی اس کو جوڑ دیا جائے گا۔ لیکن یہ ساری قیل وقال انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کے حق میں ہے۔ کیونکہ اللہ نے زمین پر اس بات کو حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو مٹائے۔ اور یہی حال شہدا کا ہے کیونکہ وہ زندہ ہوا کرتے ہیں تو لہذا ان کی طرف اعادہ کی نسبت سے مردان کی روحوں کا ان کے جسموں کی طرف اعادہ ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ مبدیٰ اور معید دونوں ایک ہی اسم ہیں اس لئے کہ مبدیٰ کا معنی معید کے ساتھ پورا ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایسا تعلق ہے۔ جو ان کا ک کو قبول نہیں کرتا۔ جیسا کہ پہلے بھی اس طرح کے اسماء گذرے ہیں۔ جیسے خافض اور رافع معزز اور مدلل، قابض اور باسط۔ اور جو صفات متقابلہ آگے آرہی ہیں یہ دونوں اس کے مشابہ ہیں۔ جیسے محی اور ممیت اور مقدم و مؤخر وغیرہ۔ اس لئے یہ اشکال وارد نہیں ہوگا کہ ان دونوں کو اسم واحد کہنا نص کے منافی ہے۔

مبدیٰ اور معید سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ جب آپ نے اللہ کے مبدیٰ اور معید ہونے کی شہادت دے دی تو آپ کو چاہئے کہ آپ ہر چیز کے معاملہ میں اولاً اور ثانیاً اسی طرف رجوع کریں۔ اس لئے کہ ہر چیز کی ابتداء بھی اسی سے ہوئی اور ہر چیز اسی کی طرف لوٹ جائے گی۔ اور ہر موجود چیز کے ظہور سے مقصود اللہ کی ذات ہی ہے۔ اور ہر چیز میں اللہ کیلئے ایک شاہد ہے۔ جو اللہ کی وحدانیت پر دال ہے۔

ان دونوں صفتوں کے ذریعے آپ کا تقرب بطور تعلق اس طرح ہے کہ آپ ہر مقصد میں اسی کی طرف توجہ کریں۔ اور ہر شی سے پناہ مانگیں۔ ان دونوں صفتوں کے ذریعے آپ کا تعلق باس طور ہے کہ آپ اپنی نظر کو ابتداء کی طرف لوٹائیں اور اس نظر کی وجہ سے نفس کو ہدایت کی طرف ڈال دیں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ”النهاية هي الرجوع الى الهداية“ یعنی انتہاء یہ ابتداء کی طرف لوٹنا ہے۔

قولہ: المحیی الممیت: ان دونوں کا مرجع صفت افعال ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿خلق الموت والحياة﴾

الملک: ۲] اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [الروم: ۱۹] ﴿وَيُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ [يونس: ۳۱] نبی اکرم ﷺ نے حضرت عکرمہؓ ابن ابی جہل کو جب مشرف باسلام ہونے کے وقت دیکھا تو یہی آیت تلاوت فرمائی اور اشارہ کر دیا اس بات کی طرف کہ اللہ پاک قلوب کو ایمان و اسلام معارف و علوم کے ذریعے حیات بخشتا ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک قلوب کو جہالت و ضلالت لہو و لعب کی صورت میں مردہ کر دیتا ہے۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَنْ كَانَ مَيِّتًا فَاحْيِينَاهُ﴾ [الانعام: ۱۲۳]

اور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”مثل الذی یدکر ربہ والذی لا یدکرہ مثل الحی والمیت“ یعنی ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی طرح ہے۔ اسی طرح اس سلسلہ میں صوفیاء کا کلام بھی ہے کہ اللہ تو وہ ذات ہے جو عارفین کے قلوب کو اپنے انوار کی معرفت کے ساتھ اور ان کی ارواح کو اپنے مشاہدہ کے لطف کے ساتھ حیات بخشتی ہے۔ اور غفلت کی صورت میں قلوب کو اور شبوہ کی صورت میں نفوس کو مردہ کر دیتی ہے۔ اللہ پاک حیات کا خالق اور اس حیات کو دوام عطا کرنے والا ہے اور اسی طرح اس موت کو مقدر فرمانے والا ہے جو حیات پر عدم طاری کر دیتی ہے۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد ”الحمد لله الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور“ موت و حیات کے معنی میں مجاز ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ احیاء کہتے ہیں جسم میں حیات پیدا کرنے کو اور امات کہتے ہیں جسم سے حیات کو زائل کر دینے کو۔ اگر آپ یہ اشکال کریں کہ موت تو عدم حیات کو کہتے ہیں اور عدم ایک ایسی چیز ہے جو فاعل سے صادر نہیں ہوتا ہے۔ تو میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ عدم اصلی تو اسی طرح ہے کہ وہ فاعل سے صادر نہیں ہوا کرتا۔ لیکن عدم متجدد فاعل ہی سے صادر ہوتا ہے۔ لیکن فاعل عدم والا فعل نہیں کرتا بلکہ جو چیز عدم کو مستزیم ہوتی ہے۔ (جیسے فعل امانۃ مستزیم ہے عدم حیات کو تو اللہ امانۃ کرتا ہے نہ کہ عدم حیات)۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ثُمَّ مِمَّنْكُمْ﴾ [البقرة: ۲۸] ترجمہ: ”اور تم مردہ تھے پھر اس نے تمہیں حیوۃ بخشی“ پھر وہی تمہیں موت دے گا۔“

اللہ پاک نے موت ثانی کی نسبت تو اپنے فضل کی طرف کی ہے لیکن موت اول کی نہیں۔ اس لئے کہ موت اول عدم اصلی ہے اور آپ کا حصہ ان دونوں صفتوں سے یہ ہے کہ آپ موت و حیات کی فکر میں مت پڑیں بلکہ اپنے معاملہ کو اللہ کے حکم و قضاء و قدر کے سپرد کر دیں یہ کہتے ہو جو آپ کے ارشاد میں وارد ہے: ”اللهم احینى ما کانت الحیاة خیراً لى وتوفینى اذا کانت الوفاة خیراً لى واجعل الحیاة زیادة لى فى کل خیراً واجعل الموت راحة لى من کل شر“ یعنی اے اللہ مجھے وہ زندگی عطا فرما جو زندگی میرے حق میں بہتر ہو اور مجھے موت اس وقت دینا جس وقت موت میرے لئے بہتر ہو اور زندگی کو میرے زیادتی غیر کا سبب اور موت کو ہر شر سے راحت کا سبب بنا دے۔ امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جس پر حق تعالیٰ متوجہ ہو جائیں اس کو حیات بخشتے ہیں۔ اور جس سے اعراض فرما لیں اس کو موت و فنا کے گھاٹ میں اتار دیتے ہیں۔

قولہ: الحی: یعنی ابدی اور ازلی حیات والی ذات اور حی فعال اور دژاک ذات کو کہتے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ہمارے اکثر اصحاب اور معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ حی اللہ کی صفت حقیقہ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اس صفت حقیقہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا جاننا اور اندازہ لگانا درست ہے۔ اور بعض دیگر حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ حی کا معنی ہے ایسی ذات جس کا علم اور اندازہ منتزع نہ ہو۔ یہ ساری بات ذات باری تعالیٰ کے حق میں ہے۔ باقی ہمارے حق میں حیوۃ جنس حیوان کے ساتھ مزاج مخصوص کے معتدل ہونے کا نام ہے۔

کہا گیا ہے کہ حیاۃ ایسی قوت کو کہتے ہیں جو جنس حیوان کے تابع ہو اور ارادی حس و حرکت کے قبول کیلئے تیار شدہ ہو۔

بندے کا حصہ صفت جی سے تو وہ یہ ہے کہ بندہ اللہ کی وجہ سے ایسا جی اور زندہ ہو جائے کہ اس کو موت نہ آنے پائے۔ اس لئے کہ اللہ کے اولیاء کو موت نہیں آیا کرتی بلکہ وہ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا

تَحْسِبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أحياءٌ عند ربهم﴾ [آل عمران: ۱۶۹]

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جب بندہ یہ بات جان لے کہ اللہ پاک ایسا جی ہے کہ اس کو کبھی موت نہیں آئے گی اور وہ عالم و قدیر ذات ہے تو اس کا اللہ پر بھروسہ درست ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ لَا يَمُوتُ﴾ [الفرقان: ۵۸] اس لئے کہ جو شخص مخلوق پر سہارا کرتا ہے اور اپنی حاجت کے دن کیلئے مخلوق پر بھروسہ کرتا ہے تو اس بات پر احتمال ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت بھی اس کی طرف محتاج ہوگا۔ اور اس کے ہاں اس کی آس و امید ضائع ہو جائے گی۔

صفت جی کے ذریعہ آپ کا تعلق بطور تقرب یہ ہے کہ آپ اللہ کے سامنے اس طرح رہیں جیسے نہلانے والے کے سامنے میت اور صفت جی کے ذریعہ تعلق تو وہ اس طرح ہے کہ آپ اپنی معرفت کے انوار کے ساتھ دلوں اور اپنے مشاہدہ کے اسرار کے ساتھ روحوں کو زندہ کیجئے۔

قولہ: القيوم: یعنی ایسی ذات جو بنفسہ قائم ہو کر دوسرے کو قائم کرنے والی ہو۔ اور صفت قیوم اطلاق و عموم کے اعتبار سے صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اس لئے کہ ذات باری تعالیٰ کا قوام بذاتہ ہے۔ اور کسی طرح بھی غیر پر موقوف نہیں اور ہر چیز کا قوام ذات باری تعالیٰ کی ہی وجہ سے ہے۔ اس لئے کہ اشیاء کا وجود اور دوام ذات باری تعالیٰ کے وجود ہی کے ساتھ متصور ہو سکتا ہے۔ اور بندے کا قائم بنفسہ ہونے میں صرف اتنا سا دخل ہے کہ بندہ اللہ کے ماسوا اور لوگوں کی امداد سے مستغنی ہوا کرتا ہے اور صفت قیوم کی ترکیب اوصاف جلال و صفات افعال سے ہے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں جو شخص اللہ کے قیوم ہونے کو جان لیتا ہے تو وہ شخص تدبیر کی مشقت اور شغل کی تھکاوٹ سے راحت پاتا ہے۔ اور تفویض و تسلیم کی راحت کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اپنے دل میں دنیا کو گراں قیمت نہیں بناتا ہے۔

قیوم مفعول کے وزن پر قائم کا مبالغہ ہے جیسے دیوم دائمہ کا مبالغہ ہے۔

شیخ سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ قیوم ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جس کو کسی اور زیادتی اور تغیر لاحق نہ ہونے پائے۔ زیادتی تو اس لئے کہ وہ غایت سے قاصر اور نقصان اس لئے کہ وہ انتہا سے مختلف ہے اور وہ غایات نہایات کا خالق ہے۔

قولہ: الواحد:

جیم کے ساتھ یعنی ایسی ذات کہ وہ جس چیز کا ارادہ کرے یا اس کو طلب کرے تو اس کو پالے اور اس سے کوئی چیز فوت نہ ہونے پائے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ واحد کا معنی نئی ہے اور یہ وجد سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اسْكُنْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكُنْتُمْ مِنْ وِجْدِكُمْ﴾ [الطلاق: ۶] تو یہاں وجد غنی کے معنی میں ہے۔ امام طبریؒ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ظاہر یہی ہے کہ دوسرا معنی پہلے معنی سے اعم ہے اور باقی رہا علامہ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ دوسرا معنی پہلے معنی کے مترادف ہے مغایر نہیں۔ یہ قول اس قول کے خلاف ہے۔ جو کلام شارح سے وہم پیدا ہوتا ہے تو لہذا یہ شارح کی جانب سے وہم اور سہو ہے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہاں وجد وہ احوال ہیں کہ بغیر تکلیف اور طلب کے اس کے مقابل ہو جائیں۔ ثوریؒ فرماتے ہیں کہ وجد ایک ایسا شعلہ ہے جو دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور شوق کی وجہ سے کھینچا چلا آتا ہے۔ اور رود وجد کے وقت اعضاء خوشی یا

غم کے اعتبار سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ وجد حبیب کی خوشبو پانے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿انّی لا جدد ریح یوسف﴾ [یوسف: ۹۴] جیسا کہ صوفیاء کے ہاں بھی یہ مشہور ہے اگرچہ کتب حدیث میں یہ بات مجھے نہیں ملی اور وہ ہے ’’انّی لا جدد نفس الرحمن قبل الیمین‘‘ واللہ اعلم۔

قولہ: الماجد مجد سے مشتق اور مجد کشادگی، کرم اور انتہائی شرف کو کہتے ہیں۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ماجد مجید کے معنی میں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ مجید میں مبالغہ ہے اور ماجد میں مبالغہ نہیں ورنہ دونوں مجد سے مشتق ہیں اتنی کلامہ۔

اور اس میں ایک ایسی چیز کا ابہام ہے جو مخفی نہیں اور ابہام یہ ہے کہ اللہ کی جملہ صفات غایت کمال میں ہیں۔ خواہ وہ صفات صیغہ مبالغہ کے ساتھ ہوں جیسے مجید اور عظیم وغیرہ یا بغیر صیغہ مبالغہ کے جیسے ماجد اور عالم۔ اور باقی یہ جو ذکر کیا گیا ہے کہ مجید میں مبالغہ ہے اور ماجد میں نہیں یہ مبنی کے اعتبار سے ہے اصل معنی کے لحاظ سے نہیں۔ (اصل معنی کے اعتبار سے مجید اور ماجد دونوں میں مبالغہ ہے) لیکن پھر ظاہر التکرار کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب دونوں کا معنی ایک ہے تو تکرار ہوا اور تکرار محقق لوگوں کے ہاں پسندیدہ چیز نہیں ہے۔

جواب کے طور پر میرے دل میں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ مجید کے بعد ماجد کے اعادہ میں نکتہ یہ ہے کہ ماجد اپنے سے سابق اسم واجد کے مقابل میں لایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کعبہ کا غلاف تھامے ہوئے ’’یا واجد یا ماجد۔ لا تنزل عنی نعمۃ انعمت بہا علی‘‘ کہتے سنائے یعنی اے واجد اور ماجد ذات جو انعام تو نے مجھ پر کیا ہے اس کو ہمیشہ رکھ۔

قولہ: الواحد:

اور ایک نسخ میں اس کے بعد احد کی زیادتی ہے۔ امام طیبی جامع الاصول میں فرماتے ہیں کہ الواحد کے معنی الاحد ہے۔ لیکن جامع ترمذی اور بیہقی کی کتاب الدعوات اور شرح السنۃ میں الاحد کا لفظ موجود نہیں۔

واحد کا معنی ایسی ذات جس کی تخریج نہ ہو سکے اور صفات میں اس کی کوئی نظیر نہ ہو۔ اور افعال میں اس کا کوئی شریک نہ ہو اتنی کلامہ۔ مصابیح کے بعض شراح فرماتے ہیں کہ واحد ایسی متفرد بالذات ذات کو کہتے ہیں کہ جس کا کوئی شریک نہ ہو۔ اور احد ایسی ذات کو کہتے ہیں جو صفات کے اعتبار سے متفرد اور صفات میں اس کا کوئی شریک نہ ہو۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ وحدۃ کا اطلاق کر کے اس سے مراد عدم تجزی اور عدم انقسام ہوا کرتا ہے۔ اور واحد اس معنی میں اکثر استعمال ہوتا ہے اور کبھی وحدۃ کا اطلاق کثرت اور تعدد کے مقابل بھی کیا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں اکثر اطلاق احد ہوتا ہے اور اللہ پاک اس حیثیت سے بلند و بالا ہے۔ کہ اس کیلئے کوئی مثل ہو جس کے نتیجے میں اس کی طرف تعدد اور اشتراک راہ پیدا کر لیں۔ اس معنی کے اعتبار سے احد ہے۔ اور اس حیثیت سے کہ ترکیب اور مقدار وغیرہ سے منزہ ہو کر تقسیم اور تجزی کو قبول نہیں کرتا واحد ہے۔ اور یہ قول زیادہ ظاہر ہے واللہ اعلم۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ احد اور واحد دونوں وحدۃ سے ماخوذ ہیں اور احد اصل میں وحد تھا واد کو ہمزہ سے بدل دیا گیا اور واحد اور احد کے درمیان لفظ کے اعتبار سے کئی وجہ سے فرق ہے۔

پہلی وجہ: احد اثبات کے سلسلہ میں غیر اللہ پر استعمال نہیں ہوتا اس لئے اللہ احد تو کہا جاتا ہے لیکن زید احد نہیں کہا جاسکتا۔ اور زید واحد کہا جاسکتا ہے۔ گویا کہ وہ عدد کی نئی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ: احد کی نفی عام ہوتی ہے اور واحد کی نفی کبھی عام ہوتی ہے اور کبھی نہیں اس لئے ”لیس فی الدار واحد بل فیہا اثنتان“ کہنا درست ہے۔ (اگر واحد کی نفی عام ہوتی تو اثنتان کی بھی نفی ہو جاتی)۔ اور احد کے بارے میں یہ درست نہیں۔

تیسری وجہ: لفظ واحد سے عددوں کا افتتاح کیا جاتا ہے لفظ احد سے نہیں۔ جیسے کہاوا احد اثنان ثلاث، لیکن احد اثنان وغیرہ نہیں کہا جاتا۔ چوتھی وجہ: لفظ واحد کو تاء لاحق ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے واحدہ۔ لیکن لفظ احد کو تاء لاحق نہیں ہوتی اس لئے احدہ کہنا درست نہیں ہے۔ اور معنی کے اعتبار سے بھی ان دونوں کے درمیان کئی وجوہ سے فرق ہے۔

پہلی وجہ: لفظ احد بناء کے اعتبار سے واحد سے ابلغ ہے کیونکہ لفظ احد ان صفات تشابہات کے قبیل سے ہے جن کی بنا برائے معنی اثبات ہوا کرتی ہے۔

دوسری وجہ: کبھی وحدۃ کا اطلاق کرے اس سے عدم تجزی مراد ہوتا اور کبھی عدم تشبیہ دوسرے کی مثال جیسے وحدۃ الشمس۔ کیونکہ یہ سورج کا تشبیہ نہیں ہے۔ واحد کا اطلاق اکثر پہلے معنی پر ہوتا ہے اور احد کا اغلب استعمال دوسرے معنی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احد کی جمع لائی جاتی ہے۔ علامہ ازہری فرماتے ہیں کہ احمد بن یحییٰ سے سوال کیا گیا کہ احد واحد کی جمع ہے تو آپ نے فرمایا معاذ اللہ۔ احد کی جمع نہیں ہے۔ اور یہ بعید نہیں کہ کہا جائے کہ احد واحد کی جمع ہے جیسے اشھاد شہد کی جمع ہے۔ اور واحد سے عدد کا آغاز و افتتاح نہیں کیا جاتا۔ اور جس نے یہ کہا کہ احد وصل کیلئے اور واحد فصل کیلئے ہے اس نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تیسری وجہ وہ ہے جو بعض متکلمین نے ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ واحد ذات کے اعتبار سے ہے اور احد صفات کے اعتبار سے ہے یعنی وہ احد اس اعتبار سے ہے کہ صفات میں اسکی کوئی نظیر اور شبیہ نہیں ممکن ہے کہ احد کو ننانوے اسماء میں ذکر نہ کرنے کا سبب بھی یہی ہو۔ کیونکہ ظاہر احد کا عدم ذکر تعداد اسماء کے منافی ہے اس لئے بطور اکتفاء اسم احد پر اسم واحد کو باعتبار یعنی غلبہ دے دیا جاتا ہے اس لئے اسم احد کو ذکر نہیں کیا جاتا۔

بندے کا حصہ صفت واحد سے یہ ہے کہ بندہ توحید کے چشمہ میں گھس جائے اور تفرید کے دریا میں غرق ہو جائے یہاں تک کہ ازل سے ابد تک واحد اور احد کے علاوہ وہ کسی کو نہ دیکھے۔

امام قشیری فرماتے ہیں توحید تین قسم پر ہے:

اول: حق تعالیٰ کی توحید اپنی ذات کیلئے وہ یہ ہے کہ اللہ کا اپنے واحد ہونے کے متعلق علم اور اسکی اپنے بندوں کو خبر دینا جیسے میں کہتا ہوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿شہد اللہ انہ لا الہ الا هو﴾ [آل عمران: ۱۸]

دوم: حق تعالیٰ کی اپنے بندے کے لئے توحید وہ یہ ہے کہ توحید کی توفیق دے میں کہتا ہوں اس کی دلیل جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاعْلَم انہ لا الہ الا اللہ﴾ [محمد: ۱۹]

سوم: بندے کی اپنے رب کے لئے توحید وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے میں کہتا ہوں اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ہو اللہ الذی لا الہ الا هو﴾ [الحشر: ۲۲] میں اشارہ ہے۔

علامہ جندی فرماتے ہیں کہ توحید قدم کو حدث سے جدا کر دینے کا نام ہے۔

آپ کا حصہ صفت واحد سے تو وہ یہ ہے کہ آپ اپنے قلب کو اللہ کیلئے متفرک کر لیں کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ان اللہ وتر یحب الوتر اور حدیث پاک میں وتر سے اللہ تعالیٰ کیلئے منفرد قلب ہے جیسا کہ شاعر نے کہا۔

وہ ذات جس کو تو چاہتا ہے جب وہ حسن میں واحد ہے تو تو بھی اس کی حجت میں یکسو ہو کر واحد ہو جا اگر تو اس کو چاہتا ہے۔

قوله: الصمد یعنی ایسا سردار جس پر سرداری کی انتہا ہو جاتی ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ صمد ایسی ذات کو کہتے ہیں جس کا کوئی پیٹ نہ ہو وہ دوسروں کو کھلاتا ہو اور خود کھانے سے پاک ہو۔

کہا گیا ہے کہ صمد ایسی ذات کو کہتے ہیں جو حاجت پیش آنے اور آفت لاحق ہونے سے پاک ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں یہ صمد باقی رہنے والی اور نہ زائل ہونے والی ذات کو کہتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں صمد ہمیشہ رہنے والی ذات کو کہتے ہیں۔

اور بعض دیگر حضرات نے اس کے علاوہ بھی اس بارے میں کلام کیا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں صمد ایسی ذات کو کہتے ہیں جس کی طرف مرغوبات میں احتیاجی کی جائے اور مصائب میں اس کا قصد کیا

جائے اور وہ معتد ذات ہے اور صمد وہ ذات ہے کہ لوگ اپنی دنیا و دین کی جملہ مہمات (میں جو ان کیلئے مشقت رسانی ہوں) کے سلسلہ میں

اس طرف قصد کریں۔ اور جو شخص تو حید میں پختہ مر جائے اور دین مصلوب بن جائے کہ مصائب کے پے در پے آنے کی وجہ سے متزلزل نہ

ہو پائے تو ایسے شخص نے اس وصف عظیم سے حصہ پالیا۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں، جو شخص اللہ کی اس وصف کے ساتھ معرفت حاصل کر لے تو اس شخص کا حق ہے کہ اپنے نفس کی فناء اور زوال

اور سفر باندھ لینے کی صورت میں معرفت حاصل کرے۔ اور کائنات کو فناء اور انتقال کی آنکھ سے ملاحظہ کرے اور دنیا کے ساز و سامان سے

زہد اختیار کرے حرام تو دور کی بات ہے اس کے حلال میں بھی رغبت نہ کرے۔

اور جو شخص اس بات کی معرفت حاصل کر لیتا ہے کہ اللہ پاک خود کھانے سے پاک ہے دوسروں کو کھلاتا ہے تو ایسے شخص کو چاہئے کہ

وہ اپنی تمام تر رغبتیں ضروریات کے وقت اللہ کی طرف متوجہ کر دے اور جملہ حالات میں اپنے توکل کو دکھلائے۔ اور رزق کے معاملہ میں

تفکر نہ ہو۔ اور جس طرح وہ اسکی مخلوق میں سے کسی سے استعانت نہیں لیتا تو اسی طرح اس کے رزق میں بھی اس کا کسی کو شریک نہ بنائے

اور جب بندہ یہ پہچان لے کہ تمام تر حاجات میں اسی کی طرف احتیاجی کی جاتی ہے تو اپنی حاجت اور فاقہ کے وقت اسی کی طرف شکوہ

کرے اور اس کے سامنے اپنی حاجت اور فاقہ پیش کرے اور اس کے تصرف کے ساتھ تعلق پکڑے اور اس کے توکل کے مختلف اقسام

کے ساتھ قرب حاصل کرے۔

قوله: القادر المقدر: ان دونوں کا معنی ہے قدرت والی ذات لیکن مقدر قادر سے الگ ہے اس لئے کہ مقدر کے وزن میں

تکلف اور اکتساب والا معنی ہے اگرچہ ہیئت تکلف اور اکتساب والا معنی ذات باری تعالیٰ کے حق میں متبع ہے لیکن یہ معنی مقید برائے مبالغہ

ہے۔ اور جو لوگ دونوں کے معنی میں برابر کے قائل ہیں ان کی مراد حق ہے کیونکہ ان دونوں اسموں سے مراد مبالغہ فی القدرت ہے۔

باقی رہا ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ ان دونوں اسموں کے مستوی فی معنی ہونے کا گمان کرنا مراد سے بعید ہے تو خود علامہ ابن حجرؒ کا یہ قول ہی

مراد سے بعید ہے کیونکہ ساری کلام ہی معنی میں ہے اور اختلاف معنی میں ہے اور یہ بات ذکر کردی گئی ہے کہ تکلف اور اکتساب والا ہی ذات

باری تعالیٰ کے حق میں محال ہے (اس لئے استواء فی المعنی کا قائل ہونا پڑے گا)۔

کہا گیا ہے کہ ان دونوں اسموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت لانے سے اللہ تعالیٰ سے اس چیز کے سلسلہ میں جس چیز کا اللہ ارادہ کرتا

ہے عجز کی نفی کرنا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کا قدرت مطلقہ کے ساتھ موصوف ہونا محال ہے۔ اگرچہ لفظوں کے اعتبار سے غیر اللہ پر

قدرت مطلقہ کا اطلاق کر دیا جائے۔

امام طبری فرماتے ہیں ان دونوں اسموں کا حق یہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ غیر اللہ کو موصوف نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ قادر بالذات اور ممکنات پر مقتدر ذات اللہ ہی کی ہے اور اللہ کا غیر اگر بعض حالات میں بعض چیزوں پر قدرت رکھتا بھی ہے تو اللہ ہی کی عطائے قدرت کی وجہ سے قادر ہے اس لئے لائق یہی ہے کہ غیر اللہ کو قادر مقتدر نہ کہا جائے یا تقیید کا مقصد کر کے کہا جائے۔

قولہ: المقدم المؤخر: ان دونوں کا معنی ہے قریب اور دور کرنے والی ذات جس کو اس نے قریب کر دیا تو اس کو مقدم کر دیا اور جس کو دور کر دیا تو اس کو مؤخر کر دیا۔ کہا گیا ہے کہ مقدم اور مؤخر وہ ذات ہے بعض چیزوں کو بعض چیزوں پر مقدم کر دے یہ تقدیم یا تو ذات کے اعتبار سے ہوتی ہے جیسے بساط لکھنے پر تقدیم مرکبات پر دانا ہوا کرتی ہے۔ یا تقدیم وجود کے اعتبار سے ہوگی جیسے اسباب کی مسببات پر تقدیم یا یہ تقدیم شرف و قرب کے اعتبار سے ہوگی جیسے انبیاء اور صالحین کی اپنے ماسوا پر تقدیم یا یہ تقدیم مکان کے اعتبار سے ہوتی ہوگی جیسے اجسام علویہ کی اجسام سفلیہ پر تقدیم یا یہ تقدیم زمانہ کے اعتبار سے ہوگی جیسے بعض قرون کی تقدیم بعض پر۔

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ مقدم وہ ذات ہے جو نیک لوگوں کو مختلف نیکیوں کی صورت میں مقدم کر دے اور مؤخر وہ ذات ہے جو گناہگار لوگوں کو مؤخر کر کے ان کو اغیار کے ساتھ مشغول کر دے۔

اور بندے کا حصہ ان دونوں صفوں سے یہ ہے کہ بندہ اپنے معاملہ کی فکر کرے اور معاملات میں سے جو اہم ہے۔ اس کو مقدم رکھے اسی طرح اہم فالہم کو مقدم کرتا جائے خوف اور امید کے درمیان رہے۔

قولہ: الاول: یعنی ایسی اول ذات جس کی اولیت کی کوئی ابتداء نہ ہو۔

قولہ: الآخر: یعنی اپنی ساری مخلوق کے فناء ہونے کے بعد باقی رہنے والی ذات اور ایسی ذات کہ جس کی آخریت کو انتہا نہ ہو۔ اسی سے ہر معاملہ کی ابتداء ہوتی ہے اور اسی کی طرف ہر معاملہ لوٹتا ہے اور وجود کے مراتب میں وہی مقصود ذات ہے۔

قولہ: الظاهر الباطن: یعنی وہ ذات جس کے وجود کا ظاہر آیات باہرہ کی وجہ سے ظاہر ہو چکا ہو۔ اور اس کی ذات کی حقیقت عقول ماہرہ سے چھپ چکی ہو۔

کہا گیا ہے کہ ظاہر وہ ذات ہے کہ جس کے وجود کے شواہد آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کی تخلیق کی وجہ سے ظاہر ہو جائیں۔

کہا گیا ہے کہ ظاہر وہ ذات ہے جو ہر چیز پر ظاہر اور بلند ہو چکی ہو۔ اور کہا گیا ہے کہ ظاہر وہ ذات ہے جس کو اس کے افعال اور اوصاف کے ظاہر ہونے کی وجہ سے استدلال عقلی کے طریقہ پر پہنچانا جائے۔ اور باطن وہ ذات ہے جو مخلوق کی نگاہ اور عقل کی نظر سے اپنی کبریائی کے پردے میں مخفی ہو آ نکھ اس کا ادراک نہ کر سکے اور وہم اس کا احاطہ نہ کر سکے۔

کہا گیا ہے کہ باطن وہ ذات ہے جو چھپی ہوئی چیز کو جان لے جیسا کہ جب آپ کسی معاملہ کی حقیقت کو جان لیں تو کہا جاتا ہے مطنت الامر یعنی عرف باطن۔

کہا گیا ہے کہ ظاہر و باطن وہ ذات ہے جو اپنی نعمت کے ساتھ ظاہر اور اپنی رحمت کے ساتھ باطن ہو۔

کہا گیا ہے کہ وہ ذات جو بعض لوگوں کیلئے ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ اس کی توحید بیان کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں سے باطن اسی وجہ سے وہ انکار کرتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ وہ جو ہر چیز سے اول اور ہر چیز سے آخر ہو۔ اپنی قدرت کی وجہ سے ظاہر اور فکروں سے باطن ہے۔

کہا گیا ہے کہ وہ ذات جو بلا ابتداء اور بلا انتہا آخر اور بغیر قریب ہونے کے ظاہر اور بغیر چھپنے کے باطن ہو۔ اور شاید آیت: ﴿ھو﴾

لاول والآخر والظاهر والباطن ﴿﴾ میں مرتبہ جمع کی طرف اشارہ اور وہم تناقص کے رفع کا اظہار ہے۔ اسی وجہ سے بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ظہور کے باوجود شدت ظہور کی وجہ سے مخفی ہے۔ اس کا ظہور اس کے مخفی ہونے کا سبب ہے۔ اور اس کا نور اس کے نور کا پردہ ہے اور ہر وہ چیز جو اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو وہ اپنی ضد کی طرف انعکاس پزیر ہوا کرتی ہے۔

قولہ: الوالی: یعنی وہ ذات جو جملہ امور کی متولی اور غم و خوشی کے اعتبار سے جملہ امور میں حاکم ہو۔

قولہ: المنتعالی: مبالغہ کی ایک نوع کے ساتھ علی کے معنی میں ہے اور کہا گیا ہے کہ متعالی وہ ذات ہے جو بلندی میں انتہاء کو پہنچنے والی ہو اور جملہ نقائص سے بلند و بالا ہو۔

قولہ: البر:

یعنی وہ حسن ذات جو نیکی اور احسان میں انتہاء کو پہنچنے والی ہے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک جس کے ساتھ احسان فرماتا ہے تو اس کو اپنے نفس کی مخالفت کی وجہ سے گناہ سے معصوم رکھتے ہیں اور اس کو اپنے انس کے لطائف کے فنون کے ساتھ دوام بخشنے ہیں اور اس کے دل کو خوشی مرحمت فرمادیتے ہیں۔ اور اس کی مراد پوری فرما کر تقویٰ کو اس کیلئے توشہ بنا دیتے ہیں۔ اور اس کو اپنی مہربانیوں سے غمی فرمادیتے ہیں۔ اور اپنی توجہ کی برکت سے اس کو اپنے مخالفت بچا لیتے ہیں وہ ایسا بادشاہ ہے جو لشکر اور تعداد کی وجہ سے غلبہ حاصل نہیں کرتا اور وہ ایسی غمی ہے جو مال اور گنتی کی وجہ سے متمول نہیں ہوتا۔ اور حکمت کی باتوں میں سے ہے کہ اللہ پاک جب آپ کو عطا کرتے ہیں تو آپ کو اپنے احسان پر گواہ بنا لیتے ہیں اور جب آپ سے روک دیتے ہیں تو آپ کو اپنے قہر پر گواہ بنا لیتے ہیں وہ ان تمام حالات میں آپ کو اپنی بیچان کرواتے ہیں اور آپ پر لطف کے وجود کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں۔

قولہ: التواب: یعنی وہ ذات جو التزام طاعت کی طرف رجوع کرنے والے ہر گناہگار پر اس کی قبول توجہ کی صورت میں رجوع بالانعام فرمائے۔ یہ توب سے مشتق ہے۔ اور توب کا معنی ہے رجوع۔

کہا گیا ہے کہ توب ایسی ذات کو کہتے ہیں جو گناہ گاروں کیلئے اسباب توبہ کو آسان فرمادے۔ اور ان کو توبہ کی توفیق مرحمت فرمادے۔ تو گویا شی کے مسبب کا نام شی کے فاعل کے نام پر رکھ دیا (کیونکہ توب بندہ ہے اور مسبب اللہ ہے یہی توب اللہ کا نام ہے)۔

اور کہا گیا ہے کہ توب وہ ذات ہے جو بار بار اپنے بندوں کی توبہ قبول کرے۔

اور بندے کا حصہ صفت توب سے یہ ہے کہ بندہ قبول توبہ کا پختہ یقین رکھے اور نزول رحمت سے مایوس نہ ہو اور مجرمین سے درگزر کرے۔ عذر خواہوں کا عذر قبول کرے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں اللہ کی بندے پر توبہ کا مطلب بندے کو توبہ کی توفیق مرحمت فرمانا ہے تو جب توبہ کی ابتداء اور اصل اللہ کی جانب سے ہے تو توبہ کا تمام بھی اللہ پر ہی ہوتا ہے۔

اور اگر اللہ بندے پر رجوع نہ کرتا تو پھر بندے کیلئے توبہ کی توفیق کہاں سے ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿لَم تَاب عَلَيْهِم

لِئَسُوْا﴾ [التوبة: ۱۱۸]

قولہ: المنتقم: گناہ گاروں کو ان کے برے افعال پر سزا دینے والی ذات۔

یہ رقم الشی سے باب استعمال ہے۔ اور رقم الشی کا معنی کسی چیز کو انتہائی ناپسند کرنا،

انتقام کی صفت بندے کیلئے اس وقت محمود ہوئی جبکہ بندے کا انتقام اللہ کی رضا کیلئے اللہ کے دشمنوں سے ہو۔ اور دشمنوں میں سے

انتقام کے زیادہ لائق اس کا اپنا نفس ہے۔ لہذا اس کا نفس جب بھی معصیت سے ملنے پائے یا طاعت سے جدا ہونے پائے تو اسی کو اس چیز کی مخالفت پر مجبور کر کے اس سے انتقام لے۔

قوله: العفو: اصل میں یہ غفور وزن فعول ہے وہ ذات جو سبباً کو مٹا ڈالے اور معاصی سے درگزر کر دے۔

یہ غفور سے ابلغ ہے۔ اس لئے کہ غفران ستر پوشی کا نام ہے اور غفو کا معنی محو یعنی مٹا دینا ہے اور غفو اصل میں کسی شی کے لینے کے قصد کو کہتے ہیں اور محو غفو اس لئے کہتے ہیں کہ محو بھی محو کے ازالہ کا قصد ہوتا ہے۔

امام قشیری فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے غفور ہونے کو پہچان لیتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کے غفو کو طلب کرے۔ اور اس کے غفو کی طلب میں سے یہ بھی ہے کہ وہ شخص اس کی مخلوق سے درگزر کرے اس لئے اللہ پاک نے اپنے بندوں کو یہ ادب سکھلایا ہے اور اسی کو ادب کی طرف اپنے ارشاد ﴿وَلِعَفْوًا وَلِيَصْفَحُوا﴾ الا تحبون ان يغفر الله لكم ﴿[النور: ۲۲]

قوله: الرؤف: یعنی صاحب رأفة ذات۔ اور رأفة شدت رحمت کو کہتے ہیں۔ رؤف رحیم سے ایک مرتبہ ابلغ ہے۔ اور راحم سے دو مرتبہ۔ اسی طرح امام طیبی نے ذکر کیا ہے۔ لیکن علامہ ابن حجر تحفیف کر کے راحم کی جگہ رحمن لائے ہیں۔ اور شارح امام طیبی پر ”وہو عجیب من اشرار“ کہہ کر اعتراض کیا ہے۔ اور علامہ ابن حجر راحم کی جگہ رحمن اس لئے لائے ہیں کیونکہ رحیم رحمن سے ابلغ ہے۔ (اور رؤف جب رحیم سے ایک درجہ ابلغ ہے تو رحمن سے دو درجہ ابلغ ہوتا) حالانکہ یہ قول مشہور نہیں ہے۔

حکایت نقل کی گئی ہے کہ ایک آدمی اپنے شریر ہمسائے کی نماز جنازہ سے پیچھے ہٹ گیا اس مرنے والے ہمسائے کو کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ اللہ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا تو اس ہمسائے نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھے بخش دیا اور ساتھ ہی یہ کہا فلاں یعنی میرے ہمسائے کو پیغام دے دینا ”لو انکم تملکون خزائن رحمة ربی لا سکتم خشية الانفاق“۔

قوله: مالک الملک: بوجہ ذات اپنے جوائے ملک میں اپنی مشیت کو نافذ کر ڈالے اور اپنے ملک میں جملہ امور کو باقی رکھنے یا فناء کرنے یا ایجاد کرنے یا معدوم کرنے کے اعتبار سے جس طرح چاہے جاری کر ڈالے اس کے فیصلے کو رد کرنے والا کوئی نہیں اس کے حکم پر اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ علامہ شاذلی فرماتے ہیں کہ ایک دروازے پر آ کر کھڑا ہوتا کہ تیرے لئے کئی دروازے کھول دیئے جائیں۔ اور ایک بادشاہ کے سامنے جھک جاتا کہ کئی گردنیں تیرے لئے جھک جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿و ان من شیء الا عندنا خزائنه﴾ [الحجر: ۲۱]

قوله: ذو الجلال والاكرام: کہا گیا ہے کہ ذو الجلال والاكرام اس ذات کو کہتے ہیں کہ ہر قسم کا شرف و کمال اسی کیلئے ہو اور ہر قسم کی عزت اور جائے عزت اسی کی جانب ہو۔ اور اللہ کا جلال اللہ کی ذات میں ہے اور اكرام اس کی جانب سے اس کی جملہ مخلوقات پر بہنے والا ہو۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے: ”الظواہب ذوالجلال والاكرام“۔

کہا گیا ہے کہ ذو الجلال والاكرام اسم اعظم ہے، جب بندہ اس کے ذریعے پکارتا ہے تو اللہ اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔
قوله: المقسط:

جب کوئی ظلم کرے تو کہا جاتا ہے ”قسط فلان“ اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿واما القاسطون فکانوا لجهنم حطباً﴾ [الحن: ۱۵] ترجمہ:

اور کوئی عدل کر کے ظلم کا ازالہ کرے تو اقط فلاں کہا جاتا ہے۔

اور مقسط اس ذات کو کہتے ہیں جو ظالموں سے مظلوموں کو انصاف دلائے اور کمزور لوگوں سے ناانصافی کے حرج کا ذیعیہ کرے۔

اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان الله يحب المقسطين﴾ [الحجرات: ۹۰]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿واقموا الوزن بالقسط﴾ [الرحمن: ۹۰] یعنی بالعدل تو یہاں قسط اقط کا اسم مصدر ہے نہ کہ قسط کا مصدر اس لئے کہ اگر ایسا ہو تو دو معنوں میں تضاد آتا ہے۔

قولہ: الجامع یعنی وہ ذات ہے جو عالم حقیر اور عالم کبیر میں متضاد اور مختلف قسم کے حقائق کو بطور مجاورت اور بطور علامت جمع کر ڈالے۔ کہا گیا ہے کہ جامع وہ ذات ہے جو حمد و ثناء کے جملہ اوصاف کی جامع ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اس طرح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ”جامع الناس لیوم لا ریب فیہ“۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے دوستوں کے قلوب کو اپنی تقدیر کی حضوری کی طرف جمع فرما دیتا ہے۔ یہاں تک اللہ کا دوست اسباب کے تفرقہ سے خلاصی پا کر خوش عیشی کی زندگی گزارتا ہے اس لئے کہ مؤمن کو اللہ کی ملاقات کے بغیر چین ہی نہیں۔ مؤمن آدمی وسائط کو ملحوظ نہیں رکھتا اور حادثات کی طرف تقدیر کی آنکھ سے نظر نہیں کرتا۔ اگر کوئی نعمت میسر ہو تو وہ جان لیتا ہے کہ یہ نعمت عطیہ من جانب اللہ ہے۔ اور اگر کسی سختی سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس سختی کو زائل کرنے والی اللہ ہی کی ذات ہے۔

قولہ: الغنی: یعنی وہ جو اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے ہر چیز سے اور ہر چیز کے بارے میں مستغنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿يا ايها الناس انتم الفقراء الى الله واللّٰه هو الغنى الحميد﴾ [الفاطر: ۱۵]

قولہ: المغنی: وہ ذات جو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے جس چیز کے ساتھ چاہے نئی کر ڈالے۔

کہا گیا ہے کہ معنی اس ذات کو کہتے ہیں جو اپنے خاص بندوں کو اپنے ماسوا سے نئی کر ڈالے۔ بایں طور کہ ان کی ہر حاجت اللہ ہی کی طرف ہو۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے بعض بندوں کو اپنے بعض بندوں سے ہتھیقہ بے پرواہ کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ جملہ حاجات و ضروریات میں جو شخص اللہ کی طرف اشارہ کر کے پھر اپنی حاجات کے سلسلہ میں غیر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو احتیاج الی الخلق میں مبتلا فرما دیتا ہے اور مخلوق کے دل سے رحمت کو کھینچ لیتا ہے۔ اور جو شخص اپنی احتیاج کے وقت اللہ کی طرف حاضر ہو جاتا ہے اور حسن معرفت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو ایسی جگہ سے غنی کر دیتا ہے کہ جہاں سے اس کا گمان تک نہیں ہوتا۔ اور اللہ پاک اس کو ایسی جگہ سے عطا کرتا ہے جو جگہ اس کے حاشیہ خیال میں نہیں ہوتی۔

اللہ کا اپنے بندوں کو غنی کرنا دو قسم پر ہے: (۱) بعض بندوں کے مال میں اضافہ کر کے ان کو غنی کر دیتا ہے (۲) اور بعض بندوں کو ان کے احوال کا تصفیہ کر کے ان کو غنی کر دیتا ہے اور حقیقی غنی یہی لوگ ہیں۔

قولہ: المانع: ادیان اور ابدان میں ہلاکت اور نقصان کے اسباب کو دفع کرنے والی ذات۔

کہا گیا ہے کہ المانع منجہ سے مشتق ہے یعنی وہ ذات جو اپنے دوستوں کا احاطہ اور اپنے خواص کی نصرت کرتی ہے۔

کہا گیا ہے کہ نافع منجہ سے مشتق ہے۔ یعنی اس سے روک لے جو روکے جانے کا مستحق ہے۔ اور اسی سے آپ ﷺ کا ارشاد ”لا مانع

لما اعطی ولا معطى لما منع“، یعنی جس سے اللہ پاک روک دے اس کو دینے والا کوئی نہیں اور جس کو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں۔

ابن عطاء فرماتے ہیں بسا اوقات اللہ آپ کو دیتے ہیں اس کے بعد روک لیتا ہے اور بسا اوقات آپ سے روک دیتا ہے پھر آپ کو

عطاء کر دیتا ہے۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ایک میں المعطى المانع ہے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں ذات باری تعالیٰ کی صفت میں مانع کا معنی ہے۔ اپنے دوستوں سے مصیبت کو دور کرنے والی ذات۔ اور

اپنے دوستوں اور دشمنوں میں جس سے چاہے عطاء کو روک دینے والی ذات اور کبھی اللہ پاک امیدوں اور شہوات کو عوام سے ارادات اور اختیارات کو خواص کے قلوب سے روک دیتا ہے اور یہ چیز ان بڑی نعمتوں میں سے ہے جس کے ساتھ اپنے مقرب بندوں کو خواص کر دیتا ہے۔ اور اپنے اولیاء عارفین کا اس کے ذریعہ اکرام کرتا ہے۔

قولہ: الضار النافع: یہ دونوں ایک صفت کے درجہ میں ہیں۔ یہ صفت ایسی قدرت ہے جو ضرر اور نفع دونوں کو شامل ہے۔ کہا گیا ہے کہ ضار اور نافع کا مطلب خالق ضرر اور خالق نفع ہے۔ یا وہ ذات جس سے نفع اور ضرر صادر ہو۔ یہ ضرر اور نفع کا صدور کبھی بلا واسطہ ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں صفتوں کے معنی میں توحید کی جانب اشارہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کی ملک میں ہر چیز کا حدوث اللہ کی ایجاد اور اس کی حکمت اور اس کے ارادے کے اور مشیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو شخص اس کے حکم کو تسلیم کر لیتا ہے۔ تو وہ راحت کی زندگی گزارتا ہے۔ اور جو شخص اپنے نفس کے اعتبار کو ترجیح دیتا ہے تو ہر آفت میں واقع ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ بات وارد ہوئی ہے کہ اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے:

”میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں جو میرے فیصلے کو تسلیم کر لیتا ہے اور میرے آزمائش پر صبر کرتا ہے اور میری نعمتوں پر شکر بجالاتا ہے تو وہ میرا حقیقی بندہ ہے اور جو شخص میرے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا اور میری بلاء پر صبر نہیں کرتا اور میری نعمتوں پر شکر نہیں بجالاتا تو میرے سوا کوئی اور رب ڈھونڈ لے۔“

۲۲۸۹: وَعَنْ بُرَيْدَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُ بِأَنَّكَ أَنْتَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ فَقَالَ دَعَا اللَّهُ بِأَسْمِهِ الْأَعْظَمِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أُعْطِيَ وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ۔ (رواه الترمذی وابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۹۱۲ حدیث رقم ۱۴۹۳ والترمذی فی السنن ۱۷۸۱۵ حدیث رقم ۳۵۴۲ وابن ماجہ ۱۲۶۷/۲ حدیث رقم ۳۸۵۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو یہ دعا مانگتے ہوئے سنا کہ ”اے الہی میں تجھ سے اپنا مقصود مطلوب اس وسیلہ کے ساتھ مانگتا ہوں کہ تو اللہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ایسا یکتا اور بے نیاز ہے کہ نہ تو اس نے کسی کو جنا اور نہ اسے کسی نے جنا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے ساتھ دعا مانگی ایسا اسم اعظم کہ جب اللہ تعالیٰ سے اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو وہ سوال پورا کرتا ہے اور جب اس کے ذریعہ دعا مانگی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے یعنی وہ دعا اکثر قبول ہوتی ہے۔“ (ترمذی، ابو داؤد)

تشریح: قولہ: ان رسول اللہ ﷺ سمع رجلاً يقول: رجل سے مراد ظاہر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ہی ہیں جبکہ آئندہ حدیث عنقریب آئے گا۔

قولہ: اللهم انی استلک انت) یہ انت ما قبل کی تاکید کیلتے ہے۔

قولہ: الاحد الصمد: یعنی ذات وصفات کے اعتبار سے احدیت مراد ہے۔ (الصمد) یعنی تو ہی مقود کلی اور مطلوب حقیقی ہے۔

قولہ: الذی لم یلد ولم یولد) یعنی وہ حدوث نقصان کی جملہ جہات سے پاک ہے۔

قوله: ولم یکن له کفواً احد: یعنی ذات میں کوئی اس کی مثل اور صفات میں کوئی اس کے مشابہ اور افعال میں کوئی اس کی نظیر نہیں۔ دعائیں صحابی نے مسؤول کو ذکر نہیں کیا۔ (ممکن ہے کہ محض تعظیم ہی مقصود ہو)۔ اس لئے مسؤول کو ذکر کرنے کی حاجت نہیں۔
قوله: دعا اللہ باسمہ الاعظم: یعنی دعا کا فاعل رجب ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں اعظم عظیم کے معنی میں ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے سارے اسماء ہی عظیم ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ۔ ہر وہ اسم جس میں دوسرے اسم کی نسبت اللہ کی تعظیم زیادہ ہے تو وہ اکثر تعظیم والا اسم اقل تعظیم والے اسم کی نسبت اعظم ہے۔ تو اس لئے اسم رجب اسم رجب کی نسبت اعظم ہے۔ اس لئے کہ رجب میں رجب کی نسبت مبالغہ اور الفاظ زیادہ ہیں۔

(اللہ) اللہ یہ رب کی نسبت اعظم ہے۔ کیونکہ اسم اللہ میں اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ نہ ہی اضافت کی صورت میں اور نہ ہی اضافت کے علاوہ کی صورت میں، لیکن رب کا اطلاق بصورت اضافت مرئی اور آقا پر بھی کیا جاتا ہے۔

قوله: الذی اذا سئل اجاب:

اجابت دعا مجب کے نزدیک داعی کی وجاہت پر دلالت کرتی ہے۔ اور اجابت دعا ضرورت کو پورا کر دینے کو بھی مشتمل ہے۔ بخلاف اعطاء کے (یعنی معطی کے اعطاء کی وجہ سے معطی لڑکی کی وجاہت پر کوئی دلالت نہیں ہوتی)۔ اس وجہ سے اجاب اعطی کی نسبت ابلغ ہے اس بات کو امام طیبی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ اللہ کے اسماء میں سے ایک ایسا اسم اعظم ہے جس کے ذریعے اللہ کو پکارا جائے۔ تو اللہ پاک داعی کی پکار کا جواب مرحمت فرماتے ہیں۔ اور یہی بات یہاں حدیث میں مذکور ہے۔ یہ حدیث ان لوگوں پر حجت ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر اللہ کا نام جو اخلاص کامل کے ساتھ ماسوا سے اعراض کرتے ہوئے ذکر کیا جائے وہ اسم اعظم ہے اس لئے کہ محض حرف کو کوئی شرف نہیں (اس لئے کوئی مخصوص اسم اسم اعظم نہیں) اور دیگر احادیث میں بھی اس قسم کی بات ذکر کی گئی ہے۔ اور ان احادیث میں ایسے اسماء کا بھی ذکر ہے جو اس حدیث میں مذکور نہیں۔ لیکن لفظ اللہ جملہ احادیث ہی میں مذکور ہے۔ تو اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ اللہ ہی اسم اعظم ہے۔ اتنی کلامہ اور جہور کا قول بھی یہی ہے اور اس کی شرط پہلے گزر چکی ہے۔

۲۳۹۰: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ وَرَجُلٌ يُصَلِّي فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ اَسْأَلُكَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ دَعَا اللّٰهُ بِاسْمِهِ الْاَعْظَمِ الَّذِيْ اِذَا دُعِيَ بِهِ اَجَابَ وَاِذَا سُوِّلَ بِهِ اُعْطِيَ۔

(رواه الترمذی و ابو داؤد والنسائی وابن ماجه)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۹۱/۲ حدیث رقم ۱۴۹۵۔ والنسائی واخرجه ابن ماجه ۱۲۶۸/۲ حدیث رقم ۳۸۵۸۔

واحمد فی المسند ۱۲۰/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نبیؐ کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا اور ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے یہ دعا مانگی ”یا الہی!“ میں تجھ سے اپنا مطلب اس وسیلہ کے ساتھ مانگتا ہوں کہ تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو بہت مہربان بہت دینے والا اور آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے اے بزرگی و بخشش کے مالک! اے زندہ! اے خبر گیری کرنے والے! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں!“ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے اس کے بڑے نام کے ساتھ دعا مانگی ایسا بڑا نام کہ جب اللہ تعالیٰ سے اس کے ذریعہ دعا کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے اور جب اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو وہ سوال پورا کرتا ہے۔“ (ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: اللهم انى اسالك: شاید یہاں مسؤل کے علم پر اکتفا کرتے ہوئے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔
قوله: بان لك الحمد: یہاں حرف جار کی تقدیم برائے اختصاص ہے۔

قوله: لا اله الا انت الحنان المنان: یعنی کثیر العطاء، بہت زیادہ دینے والی ذات۔ اور یہ مصدر منته سے مشتق ہے۔ اور منته کا معنی ہے یا تو محض نعمت ہے یا نعمت ثقیلہ۔ اور منته مخلوق کی جانب سے مذموم چیز ہے کیونکہ مخلوق کسی چیز کی مالک حقیقی نہیں۔ صاحب صحاح فرماتے ہیں کہ مَنْ عَلَيْهِ مَنَاءٌ نَمٌّ كَالْمَنَانِ یعنی منان منته بمعنی احسان مشتق ہو۔ کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندوں پر مختلف قسم کے احسانات اور ان کی ایمان کی طرف رہنمائی اور ان کو عدم سے وجود میں لانے کی صورت میں زیادہ احسان کرنے والے ہیں۔ اور صحیح نسخہ میں حنان منان سے مقدم ہے۔ اور کتاب مفاہیح سے بھی یہی کچھ مفہوم ہوتا ہے۔ اور نہایت میں ہے کہ حنان کا معنی ہے۔ اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی کرنے والی ذات اور حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں حنان اس ذات کو کہتے ہیں جو اس آدمی پر بھی متوجہ ہو جو اس سے اعراض کر رہا ہو۔ اور منان اس ذات کو کہتے ہیں جو بندے کے سوال سے پہلے بندے کو از خود نعمت سے نواز دے۔ یہ بات ابن صلاح کی کتاب سے لی گئی ہے۔

قوله: بدیع السموت والارض: بدیع کو مرفوع بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اور منصوب بھی رفع کی دو ذمیں ہیں۔ (۱) بدیع منان کی صفت ہے۔ (۲) مبتدأ محذوف هُوَ يَا اَنْتَ كِي خَيْرٍ هِيَ۔ زیادہ ظاہر رفع ہی ہے۔ اور ندا کی بناء پر منصوب بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اس کی تقویت اس روایت سے بھی ہوتی۔ جس کو علامہ واحدی نے اپنی کتاب کتاب الدعا میں نقل کیا ہے وہاں 'یا بدیع السموت والارض' ہے۔ اسی طرح جزریؒ کی اس شرح میں ہے جو انہوں نے مصابیح پر لکھی ہے۔ اور بدیع السموت والارض کا معنی ہے۔ مبدعہما یعنی بغیر نمونے کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والی ذات۔ اور لغت کی کتاب صحاح میں ہے کہ ابدعت الشئ - اختر عنه لا على مثال سبق کے معنی میں ہے۔ یعنی ابداع کے بغیر مثال سابق کے کسی چیز کو ایجاد کرنا۔

قوله: يا ذا الجلال والاكرام: یعنی صاحب عظمت و احسان ذات۔

قوله: يا حى يا قيوم اسالك: یعنی تیرے علاوہ میں کسی کے سامنے دسبت سوال دراز نہیں کرتا اور تیرے سوا میں کسی سے طلب نہیں کرتا۔ یا جو بھی میں مانگتا ہوں تو تجھ سے مانگتا ہوں یا یہ اسالك پہلے اسالك کی تاکید ہے۔ لیکن یہ دوسرا اسالك کتاب حصن میں مذکور نہیں۔

قوله: رواه الترمذی..... وابن ماجه بلامه ابن حجر فرماتے ہیں کہ ایک نسخہ میں واہن ماجه کے ساتھ والداری بھی ہے۔ علامہ جزریؒ نے مصابیح پر لکھے جانے والی اپنی شرح میں فرمایا ہے کہ ترمذی ابو داؤد، نسائی، ابن ماجه کے علاوہ احمد و ابن حبان و حاکم و ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کو نقل کیا ہے۔ لیکن احمد کی روایت میں لفظ اسم الاعظم اور باقیوں کی روایت میں اسم العظیم کا لفظ ہے۔ اور ابن ماجه نے پوری روایت کے بعد "لا اله الا انت وحدك لا شريك لك" کا بھی اضافہ کیا ہے اور ابن حبان نے الحنان کو المنان سے پہلے نقل کیا ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے یا حى یا قيوم کا تذکرہ نہیں کیا۔

۲۲۹۱: وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ إِسْمُ اللَّهِ الْاَعْظَمُ فِى هَاتَيْنِ الْاَيْتَيْنِ وَالْهَكْمُ إِلَهُ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ وَفَاتِحَةُ اَلْ عِمْرَانَ اَلَمْ لِلَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَىُّ الْقَيُّومُ.

(رواه الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجه و الدارمی)

حدیث رقم ۳۸۵۵۔ والدارمی ۵۴۲/۲ حدیث رقم ۳۳۸۹۔

ترجمہ: ”حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ کا سب سے بڑا نام ان دونوں آیتوں میں ہے وَاللّٰهُمُّ اِلٰهَ وَاَحَدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (تمہارا معبود وہ ایک معبود ہے اس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں اور وہ بخشنے والا اور مہربان ہے) اور سورہ آل عمران کی یہ ابتدائی آیت اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اَلَمْ یَلَمْ اللّٰهُ کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے اور خبر گیری کرنے والا ہے۔“ (ترمذی ابوداؤد ذابن ماجہ دارمی)

راوی حدیث:

اسماء بنت یزید بن سکین انصاریہ۔ بہت ہی عقلمند اور دین دار خاتون تھیں۔ سکین میں سین مہملہ اور کاف دونوں مفتوح ہیں مؤلف علیہ الرحمۃ نے الاکمال میں ان کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا۔ مرتب عرض کرتا ہے علامہ طاہر ثنبی لکھتے ہیں کہ جنگ یرموک میں انہوں نے ایک لکڑی کے ذریعہ نو (۹) کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور اسی جنگ میں شہید ہو گئیں۔

بعض روایات میں اسماء بنت یزید اور بعض احادیث میں اسماء بنت یزید بن سکین آیا ہے یہ دونوں علیحدہ علیحدہ خواتین کے نام ہیں یا ایک ہی خاتون ہیں اس کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ اھ اسماء بنت سکین صحابیہ ہیں۔ (المغنی فی ضبط اسماء الرجال ص: ۱۲۹)

تشریح: قولہ: عن اسماء بنت یزید: یعنی یزید سے مراد یزید ابن سکین ہے۔ یہ بات علامہ میرک نے ذکر کی ہے اور مؤلف نے اسماء کا ذکر ”الاکمال“ میں ذکر نہیں کیا۔

قولہ: و فاتحة..... ال عمران: لفظ فاتحہ یا تو مجرور ہے اس بناء پر کہ یہ اور اس کا قبل ”الاینین“ دونوں کی وجہ ظاہر ہے۔ (یعنی نصب اس لئے کہ فاتحہ سے قبل اعنی فعل محذوف مانا جائے گا اور رفع اس لئے کہ یہ خبر ہے مبتدا (وف ہی کی)۔ اسم اعظم کونسی سورت میں ہے؟

حاکم نے اسم اللہ تعالیٰ الاعظم فی ثلاث سورہ البقرہ وال عمران وظہ۔ روایت کیا ہے۔ یعنی اللہ کا اسم اعظم تین سورتوں میں ہے اور وہ تین سورتیں بقرہ، آل عمران اور طہ ہیں اور قاسم بن عبد الرحمن شامی تابعی فرماتے ہیں کہ میں نے سوحابہؓ سے ملاقات کی اور میں نے ان تین سورتوں میں اسم اعظم تلاش کیا تو میں نے اسم اعظم الحی القیوم کو پایا۔ اور امام فخر الدین رازی نے اس روایت کی تقریر فرمائی ہے یعنی اسم اعظم الحی القیوم ہی ہے۔ اور استدلال انہوں نے ان دونوں کے اسم اعظم ہونے پر اس طرح کیا ہے کہ یہ دونوں صفات ربوبیت پر دلالت کرتے ہیں ان دونوں کے علاوہ دیگر اسماء اس طرح صفات ربوبیت پر دلالت نہیں کرتے۔ اور علامہ نووی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور علامہ جزری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اسم اعظم لا الہ الا هو الحی القیوم ہے۔ اور علامہ فخر الدین رازی نے بھی بعض اصحاب کشف سے یہ نقل کیا ہے کہ اسم اعظم ہو ہے۔ اور استدلال یوں کیا ہے کہ جو شخص کسی کی موجودگی میں کلام معظم کو تعبیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ انت نہیں کہتا ہو کہتا ہے۔ اتمحی کلام۔

اور یہاں اسم اعظم کی تعیین میں دیگر اقوال بھی ہیں ان میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اسم اعظم رب ہے۔ اس کا ذکر ابن عباسؓ اور ابودرداءؓ کی روایت میں ہے۔ جس کی تخریج حاکم نے کی ہے کہ وہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ اسم اللہ الاکبر رب رب یعنی اللہ کا اسم اعظم رب رب ہے کہ ان اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اسم اعظم اللہ اللہ اللہ الذی لا الہ الا هو رب العرش العظیم ہے۔ اس روایت کو زین العابدین سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا اسم اعظم ہونا خواب میں دیکھا ہے۔ اور ان اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اسم اعظم کلمہ توحید ہے۔ اس کو قاضی عیاض نے بعض علماء سے نقل کیا ہے۔ اور ان اقوال میں سے ایک قول

یہ بھی ہے کہ اسم اعظم اللہ ہے۔ کیونکہ اس اسم کا اطلاق اللہ کے علاوہ پر نہیں کیا جاتا اور اس وجہ سے بھی کہ اسماء حسنیٰ میں سے بنیادی اسم اللہ ہے۔ اور اس کے علاوہ باقی اسماء کی اضافت اسی کی طرف کی جاتی ہے۔ اور ان اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اسم اعظم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ شاید اس کی دلیل وہ روایت ہے جس کی تخریج ابن ماجہ نے کی ہے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ مجھے اسم اعظم سکھلا دیجئے لیکن آپ نے نہیں سکھلایا۔ حضرت عائشہؓ نے نماز پڑھی اور یوں دعا مانگی ”ادعوك اللہ وادعوك الرحمن وادعوك الرحيم وادعوك باسمائك الحسنی ما علمت منها ومالا اعلم“ یعنی میں تجھے اللہ پکارتی ہوں رحمن اور رحیم پکارتی ہوں اور تجھے تیرے اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارتی ہوں جن کو میں جانتی ہوں یا نہیں جانتی۔ اور اسی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو فرمایا کہ یہی اسماء اسم اعظم ہیں۔ جن کے ذریعے سے تم نے دعا کی۔ میں کہتا ہوں اس روایت کی سند ضعیف ہے اور اس سے استدلال پکڑنا بھی ضعیف ہے۔ علامہ سیوطی نے ان تمام اقوال کو اپنے رسالہ میں بالاستیعاب ذکر کیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اسم اعظم اسماء حسنیٰ میں مخفی ہے اور اس کی تائید حضرت عائشہؓ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اور بعض علماء نے اللہ کے بعض اسماء کو بعض اسماء پر ترجیح دینے کے سلسلے میں انکار کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ ترجیح جائز نہیں کیونکہ یہ ترجیح مفضول کے افضل سے ناقص ہونے کے اعتقاد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور جن بعض روایات میں کسی اسم کے اسم اعظم ہونے کے بارے میں یہ تعین ہے بھی صحیح تو وہاں وہ اسم اعظم کی تاویل عظیم سے کرتے ہیں اس لئے کہ اللہ کے سارے اسماء ہی عظیم ہیں۔

علامہ ابو جعفر طبرانی فرماتے ہیں کہ اسم اعظم کی تعین کے بارے میں آثار مختلف ہیں۔ میرے نزدیک سارے اقوال صحیح ہیں اس لئے کہ کسی بھی اسم کے بارے میں یہ خبر وارد نہیں ہوئی کہ یہی اسم اعظم ہے۔ اس سے اعظم کوئی چیز نہیں گویا کہ علامہ طبرانی فرماتے ہیں کہ اللہ کے اسماء میں سے ہر اسم کا وصف اعظم کے ساتھ لایا جاسکتا ہے۔ اور یہ اسم اعظم عظیم کے معنی میں ہو کر لوٹے گا۔

ابن حبان فرماتے ہیں کہ احادیث میں اسماء کے سلسلے میں جو وصف اعظمیت وارد ہوا ہے۔ اس سے مراد دعا کرنے والے کے ثواب میں زیادتی ہے۔ جبکہ وہ ان احادیث میں وارد شدہ اسماء کے ذریعے دعا کرے۔ جیسا کہ ان اسماء کا اطلاق قرآن مجید میں بھی ہوا ہے۔ وہاں قرآن پڑھنے والے کے ثواب میں زیادتی مراد ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ اسم اعظم سے مراد اللہ کے اسماء میں سے ہر ایسا اسم ہے جس کے ذریعے بندہ مستغرق ہو کر دعا کرے اور استغراق کا یہ عالم ہو کہ اس حالت استغراق میں اس کے دل اور سوچ میں اللہ کے سوا کوئی نہ ہو یہ بات امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ نے اسم اعظم کے علم کو مخفی رکھا ہے اس پر آج تک کوئی مطلع نہیں ہوا اور بعض دیگر حضرات نے اسم اعظم کو ثابت کیا ہے۔ لیکن اس اثبات کے سلسلے میں بھی ان کے قول مضرب ہیں۔ جیسا کہ بعض اقوال ہم نے ذکر کیے ہیں۔ اور بعض کو خود مصنف نے ذکر کیا ہے۔

۲۲۹۲: وَعَنْ سَعْدِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ دَعْوَةُ ذِي النُّونِ إِذَا دَعَا رَبَّهُ وَهُوَ فِي بَطْنِ الْحُوتِ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِي شَيْءٍ إِلَّا اسْتَجَابَ لَهُ . (رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۱/۵ حدیث رقم ۳۵۷۲۔ واحمد فی المسند ۱۷۰/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مچھلی والے یعنی حضرت یونس علیہ السلام کی وہ دعا جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے پروردگار سے مانگی تھی یہ ہے لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو پاک ہے بلا شک میں ظالموں میں سے تھا) جو مسلمان شخص اس دعا کے ذریعہ خدا سے کوئی چیز مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا سوال پورا کرتا ہے۔“ (احمد ترمذی)

تشریح: قوله: ذی النون یعنی مچھلی والا اس سے مراد یونس علیہ السلام ہیں۔

قوله: اذا دعا ربہ وهو فی بطن الحوت: یعنی اپنے رب کو پکارا صحیح نسخہ میں اسی طرح ہے۔ اور ترمذی کے اندر رہہ کا لفظ مذکور نہیں لیکن کتاب الاذکار کے ضمن میں موجود ہے۔ کتاب مفتح میں بھی اسی طرح ہے اور یہ لفظ دعوت کیلئے ظرف ہے۔ (وہو فی بطن الحوت) یہ جملہ حالیہ ہے۔

قوله: لا اله الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین: یہ سارا دعائیہ جملہ ہے دعوت مصدر سے بدل ہے یعنی وہ دعائیہ ہے کیونکہ اصل میں یہ سارا جملہ یکبارگی دعائیہ ہے اور یہاں مراد مدعو یہ ہے ساتھ اس وسیلہ کے جو اس میں مذکور ہے۔ جو قبولیت دعا کا سبب ہے۔

قوله: لم يدع بها رجل مسلم في شئ..... الخ: ضمیر کا مرجع یا تو مصدر دعوت ہے یا کلمات ہیں۔

(رجل مسلم في شئ) یعنی حاجات میں سے کسی حاجت کے بارے میں۔ (الا استجاب الله له) اس دعا کے ذریعے قبولیت دعا شاید اللہ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: ﴿فاستجبنا له ونجیناه من الغم وكذلك نجی المؤمنین﴾ [الانبیاء: ۸۸]۔
قصہ یونس علیہ السلام:

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ مختصراً یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں موصل شہر کی بستی نیوی میں مبعوث فرمایا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے ان کو ایمان کی طرف بلایا۔ لیکن وہ ایمان نہ لائے۔ پس اللہ پاک نے یونس علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کو بتا دو کہ تین دن کے بعد ان پر عذاب نازل ہوگا۔ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم سے نکل گئے اس کے بعد ایک سیاہ بادل ظاہر ہوا اور قوم کے قریب ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ بادل ان کے شہر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس سے دھواں ظاہر ہونے لگا۔ جب ان کو یقین ہو گیا کہ غمغریب ہم پر عذاب نازل ہو جائے گا تو وہ لوگ اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو لے کر صحرا کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور جانوروں اور انسانوں میں سے ماؤں اور بچوں کے درمیان جدائی کر دی گئی اور اللہ کے سامنے آہ و زاری کی صورت میں انہوں نے اپنی آوازیں بلند کر دیں اور ایمان لے آئے اور کفر و معصیت سے توبہ تاب ہو گئے اور یوں دعا گو ہوئے ”یا حی حین لا حی لا حی لا الہ الا انت“ یعنی اے زندہ پائندہ رکھنے والی ذات جو اس وقت بھی زندہ پائندہ ہوگی جس وقت کوئی زندہ نہ ہوگا۔ نہیں کوئی معبود مگر تو ہی۔ تو اللہ نے ان سے عذاب نال دیا۔ حضرت یونس علیہ السلام تین دن کے بعد جب ان کے شہر کے قریب گئے تاکہ ان کے حال سے باخبر ہوں۔ دور سے دیکھا کہ شہر حسب سابق آباد ہے۔ اور اہل شہر زندہ ہیں۔ تو جناب یونس علیہ السلام شرمائے کہ میں نے تو ان کو کہا تھا کہ عذاب تین دن بعد اتر پڑے گا لیکن عذاب تو ابھی تک نازل نہیں ہوا۔ لیکن اس سے باخبر نہ ہوئے کہ عذاب اتر کر ان سے اٹھا بھی لیا گیا ہے۔ یونس علیہ السلام واپس چل پڑے ساحل دریا پر پہنچے کشتی میں سوار ہوئے جب کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی رک گئی۔ سب نے کشتی چلانے کی انتھک کوشش کی لیکن کشتی نے چلنے کا نام ہی نہ لیا۔ اور کشتی بانوں نے کہا کہ کوئی بھاگا ہو اغلام کشتی میں آگھسا ہے جس کی وجہ سے کشتی چلنے نہیں پارہی۔ تو لہذا انہوں نے کشتی والوں کے درمیان قرعہ اندازی کی۔ قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا تو حضرت یونس علیہ السلام نے کہا کہ میں ہی بھاگا ہو اغلام ہوں۔ اور اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ مچھلی نے جناب یونس علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے لقمہ بنا لیا۔ اور اللہ نے مچھلی کو حکم دیا کہ وہ یونس علیہ السلام کی حفاظت کرے۔ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ حضرت یونس علیہ السلام لے کر دریائے نیل کی طرف وہاں سے دریائے فارس اور پھر وہاں سے دجلہ کی طرف لے چلی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں یہ دعا کی ”لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین“ یعنی میں ظالموں میں سے ہوں بوجہ نکلنے میرے اپنے قوم سے آپ کی اجازت سے قبل اللہ

نے ان کی دعا قبول کی اور پھلی کو حکم دیا کہ وہ یونس علیہ السلام کو شام کے شہر نصیبین میں ڈال دے۔

الفصل الثالث:

۲۴۹۳: عَنْ بَرِيْدَةَ قَالَتْ دَخَلْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الْمَسْجِدَ عِشَاءً وَإِذَا رَجُلٌ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ اتَّقُولُ هَذَا مُرَاءٍ قَالَ بَلَى مُؤْمِنٌ مُنِيبٌ قَالَ وَأَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيُّ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهُ فَجَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَسَمَّعُ لِقِرَاءَةِ تَبَهُ ثُمَّ جَلَسَ أَبُو مُوسَى يَدْعُو فَقَالَ اللَّهُمَّ إِنِّي أَشْهَدُكَ أَنْكَ أَنْتَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَحَدًا صَمَدًا لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَقَدْ سَأَلَ اللَّهُ بِاسْمِهِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أُعْطِيَ وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أُخْبِرُهُ بِمَا سَمِعْتُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ فَأَخْبَرْتُهُ بِقَوْلِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ لِي أَنْتَ الْيَوْمَ لِي أَخٌ صَدِيقٌ حَدَّثْتَنِي بِحَدِيثِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ (رواه رزين)

احقرجہ رزین۔

ترجمہ: ”حضرت بریدہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ عشاء کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوا تو وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص قرآن کریم پڑھ رہا ہے اور اپنی آواز بلند کر رہا ہے میں نے کہا کہ یا رسول اللہ کیا آپ ﷺ اس شخص کو ریا کار نہیں کہیں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”نہیں“ بلکہ مؤمن ہے جو رجوع کر رہا ہے۔“ بریدہ کہتے ہیں کہ ”ابوموسیٰ باوا قرآن کریم پڑھتے رہے اور نبی کریم ﷺ ان کی قراءت سنتے رہے پھر ابوموسیٰ بیٹھے اور بارگاہ الہی میں یوں عرض رساں ہوئے! اے الہی! میں تجھ کو گواہ بنا کر تیرے حق میں یہ اعتقاد و قرار کرتا ہوں کہ تو اللہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ایسا یکتا و بے نیاز ہے کہ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اسے کسی نے جنا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اس نے خدا سے اس کے نام کے ساتھ سوال کیا ایسا نام کہ جب اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو اللہ وہ سوال پورا کرتا ہے اور جب اس کے ذریعہ دعا مانگی جاتی ہے تو دعا قبول کرتا ہے“ حضرت بریدہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! میں نے آپ ﷺ سے جو یہ بات سنی ہے اسے ابوموسیٰ تک پہنچا دوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”ہاں“ چنانچہ میں نے ابوموسیٰ تک آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی پہنچایا تو انہوں نے کہا کہ آج کے دن سے تم میرے سچے بھائی ہو کہ تم نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد مجھ تک پہنچایا ہے۔“ (رزین)

تشریح: قولہ: دخلت مع رسول اللہ المسجد عشاء: یعنی میں آپ ﷺ کے ہمراہ وقت عشاء میں یا عشاء کی نماز

میں داخل ہوا۔

قولہ: فاذا راجل یا رسول اللہ اتقول؟: اذامفا جاتیہ ہے۔ یعنی اچانک۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اتقول ”اتری“ کے معنی میں ہے۔ یعنی آپ کیا رائے ہے۔ اور یہ شارح کے قول ”ای اتعتقد او تحکم“ سے بہتر ہے یعنی آپ کیا اعتقاد رکھتے ہیں یا آپ کیا حکم لگاتے ہیں شرح السنہ کی روایت اتراء مرانیہ یعنی کیا آپ اس آدمی کو ریا کار سمجھتے ہیں۔ اتخی کلام۔ اور اس میں بھی اشکال ہے کہ ترکی بھی شارح کی تفسیر کا محتاج ہے جس طرح آپ دیکھ رہے ہیں۔

قولہ: هذا مرأء: مشارالیه رجل ہے۔ یعنی لهذا رجل۔ (مرأء) یعنی منافق ہے شہرت اور ریاء کاری کے طور پر پڑھ رہا ہے۔

جس کا قرینہ اس کا آواز کو بلند کرنا ہے۔ جس پر احتمال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ریاء کا رہی ہوگا۔

قوله: قال بل مؤمن منیب: یعنی غفلت سے یاد الہی کی طرف لوٹنے والا ہے اس لئے کہ انابت خاص لوگوں کی توجہ کو کہتے ہیں اور یہ عوام کی توجہ سے انحصار ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ عوام کی توجہ معصیت سے طاعت کی لوٹنے کی صورت میں ہوتی ہے۔

قوله: و ابو موسیٰ الاشعری یقرأ و یرفع صوته: یعنی حضرات ابو موسیٰ اشعری بھی رجل کی طرح آواز بلند قراءت کر رہے تھے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ قال کا فاعل آپ ﷺ ہیں تو اس صورت میں ابو موسیٰ کی واو حالیہ ہوگی۔ یعنی آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی یعنی مؤمن منیب اس حالت میں حضرت ابو موسیٰ بلند آواز سے قراءت کر رہے تھے اور علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ قال کا فاعل حضرت بریدہ ہی ہیں۔ یعنی حضرت بریدہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ بات یعنی اتقول ہذا مرآء جب نبی اکرم ﷺ کو کہی تو اس وقت حضرت ابو موسیٰ اشعری آواز بلند قراءت کر رہے تھے۔ لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ دونوں قول مقصد سے بعید ہیں اور ظاہر میں تقدیر عبارت وہ جو ہم نے تقریر کلام اور تحریم نظام میں ذکر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلا آدمی تو انجینی اور نیر معروف۔ (یعنی جس کے بارے میں حضرت برآء نے اتقول مرآء کا جملہ کیا اور اس کی قراءت میں منکر من القول و زورا کا احتمال ہے۔) (یعنی اخلاص سے نہ ہو بلکہ ریاء سے ہو) اسی وجہ سے حضرت بریدہ نے اس کی رفع صوت والی حالت کو ریاء سمجھ کر نبی اکرم ﷺ سے پوچھا اور آپ ﷺ نے ان کو بیان کیا اور باقی رہے حضرت ابو موسیٰ اشعری وہ تو اجلاء صحابہ میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں ریاء اور نفاق کا گمان کرنا انتہائی بعید ہے۔ مگر روایت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ رافع صوت حضرت ابو موسیٰ اشعری ہی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ابتداء حدیث میں رجل سے مراد حضرت ابو موسیٰ اشعری ہی ہیں۔ باقی رہا حضرت بریدہ کا ان کے بارے میں ظن ریاء اور اس کے نتیجہ میں اتقول ہذا مرآء کا قول کرنا یہ عدم معرفت پر محمول ہوگا۔ یعنی وہ اس سے قبل حضرت ابو موسیٰ اشعری کو جانتے نہ تھے۔

قوله: ثم جلس ابو موسیٰ یدعو: یہ جلوس یا تو نماز میں تھا یا بعد از نماز۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قراءۃ مع رفع صوت کھڑے ہو کر کر رہے تھے۔

قوله: فقال: اللهم انی اشهدك..... کفوا احد: یعنی قال کا فاعل ابو موسیٰ اشعری ہیں یعنی انہوں نے اپنی دعائیں کہا (اللهم انی اشهدك) یعنی تیرے بارے میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ (انک انت..... حمداً) احد اور حمداً اختصاص کی بناء پر منصوب ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ...﴾ [آل عمران: ۱۸] تک اور شرح السنہ کی روایت میں نکرہ کے بجائے الاحد الحمد معرفہ ہیں۔ اور مرفوع ہیں کیونکہ یہ دونوں اللہ کی صفیتیں ہیں۔ (لم یلد) یعنی اس کی کوئی اولاد نہیں کیونکہ اولاد حادث ہوتی ہے اور قدیم حادث کا محل نہیں ہو سکتا۔ اللہ کا کوئی والد اور والدہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ قدیم ذات جو حدوث اور توالد سے منزہ ہے۔ کفو کا معنی ہے شبیہ اور نظیر۔ یعنی مخلوق میں سے کوئی بھی آپ کے مشابہ اور مثل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿لیس کمثله شیء﴾ [الشوری: ۱۱] کا بھی یہی مطلب ہے۔

قوله: لقد سأل الله..... دعی به اجاب: (یعنی سأل کا فاعل جناب ابو موسیٰ اشعری ہیں۔ یہ اسم اعظم کی تعریف ہے۔

قوله: أخبره بما سمعت منك؟: حرف استفہام محمدوف ہے۔

قوله: فقال لی: انت الیوم لی.....: قال ثانی کا فاعل ابو موسیٰ اشعری ہیں۔ یعنی میں نے جب آپ ﷺ کی ساری بات

حضرت ابو موسیٰ کو ذکر کی تو حضرت ابو موسیٰ اشعری نے خوشی کے طور پر مجھے فرمایا۔ (انت الیوم لی) یوم بمعنی زمانہ ہے۔ (أخ صدیق) یعنی تو اخوت اور دوستی کو جمع کرنے والا ہے۔ (حدثتنی) یہ جملہ یا تو حال ہے۔ انت ضمیر یا جملہ استینافیہ۔

بَابُ ثَوَابِ التَّسْبِيحِ وَالتَّحْمِيدِ وَالتَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ

تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کے ثواب کا بیان

یہ باب تسبیح و تحمید و تہلیل و تکبیر کے ثواب کے بیان میں ہے۔ باب ذکر اللہ کے بعد یہ باب تھیں بعد التسمیٰ کے قبیل سے ہے۔ اور علامہ ابن حجرؒ کے نسخہ میں تہلیل کو سہواً تحمید پر مقدم کیا گیا ہے۔ اور پھر اس تقدیم کی توجیہ بیان کرنے میں تکلف سے کام لیا گیا ہے۔

الفصل الاول:

۲۳۹۴: عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَفْضَلُ الْكَلَامِ أَرْبَعُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَفِي رِوَايَةٍ أَحَبُّ الْكَلَامِ إِلَى اللَّهِ أَرْبَعُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ لَا يَضُرُّكَ بِأَيِّهِنَّ بَدَأْتَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه الرواية الاولى البخارى تعليقا ۵۶۶/۱۱ باب ۱۹ من كتاب الايمان والنذر واخرجه ابن ماجه في السنن ۲۵۳/۲، حديث رقم ۳۸۱۱ واحمد في المسند ۱۰/۵ واخرج الرواية الثانية مسلم في صحيحه ۱۶۸۵/۳ حديث رقم (۱۲- ۲۱۳۷)۔

ترجمہ: حضرت سرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”انسان کے کلام میں سب سے بہتر کلام چار ہیں سبحان اللہ الحمد للہ لا الہ الا اللہ اکبر ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کلام چار ہیں (۱) سبحان اللہ۔ (۲) الحمد للہ۔ (۳) لا الہ الا اللہ۔ (۴) اللہ اکبر۔ ان میں سے کسی بھی کلمہ سے شروع کرنا تمہارے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: قال افضل الكلام اربع: کلام سے مراد انسان کا کلام ہے اس لئے کہ چوتھی چیز قرآن مجید میں موجود نہیں۔ جو چیز قرآن میں نہ ہو وہ قرآن مجید میں مذکور موجود چیز سے افضل نہیں ہو سکتی۔ اور کلام بشر مراد ہونے پر آپ ﷺ کا ارشاد ”ہی افضل الكلام بعد القرآن وهى من القرآن“ یعنی ان چار میں سے اکثر قرآن مجید میں سے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ چار چیزیں کلام اللہ کو بھی شامل ہیں۔ کیونکہ ان میں سے تین تو لفظاً کلام میں موجود ہیں۔ یعنی تسبیح تحمید اور تہلیل۔ اور چوتھی یعنی تکبیر اگرچہ کلام اللہ میں لفظاً تو موجود نہیں لیکن معنی وہ بھی کلام اللہ میں موجود ہے۔ اور تکبیر کی افضلیت مطلقاً ہے اس لئے کہ تکبیر تنزیہ تو حید کے جمیع معانی اور حمد و ثناء کی جملہ اقسام کو جامع ہے۔ تنزیہ تو حید و حمد و ثناء کا ہر کلمہ تو کلام اللہ سے شمار کیا جاتا ہے۔ اور وہی من القرآن جو وارد ہوا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ یعنی یہ چاروں کلام اللہ میں سے ہیں۔ اور باقی رہا ان کا کسی مخصوص وقت یا کسی مخصوص حالت میں پڑھے جانے کا منقول ہونا تو اس صورت میں ان کے ساتھ مشغول ہونا قرآن پڑھنے سے افضل ہوگا۔ ورنہ قرآن کا پڑھنا مطلق عن الوقت یا مطلق عن الحال تسبیح و تہلیل سے افضل ہوگا۔ یہ ساری کلام امام طہیؒ کی اور شیخ ابن حجرؒ ان کے ہمنوا ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا ”افضل الذکر بعد کتاب اللہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر“۔ باقی رہا ان چاروں کی افضلیت کا سبب تو وہ یہ ہے کہ یہ چاروں ذکر کی جملہ انواع تنزیہ یا تو حید۔ تحمید ہو یا تسبیح وغیرہ سب کو شامل ہیں۔ اور چاروں جملے مطالب الوہبہ پر اجمالاً دال ہیں۔ اور بہت ساری احادیث میں ان کو باقیات صالحات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ ان کو باقیات کہا گیا ہے حالانکہ آخرت

کے جملہ اعمال باقی رہنے والے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ان کو باقیات فناء ہونے والی چیزوں جیسے مال اور اولاد وغیرہ کے مقابلہ میں کہا گیا ہے۔ جیسا کہ مال اور اولاد کا ذکر باقیات صحاحات والے جملہ سے قبل بیان کردہ مثال میں ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اہل دنیا کے اکمل اسباب میں سے مال اور اولاد ہیں۔ اور اہل آخرت کی عبادات میں سے افضل یہ مذکورہ چار کلمات ہیں۔ کیونکہ یہ چاروں اللہ کی صفات کا خلاصہ، اور اللہ کے عمدہ کلمات میں سے ہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں اس حدیث سے بعض حضرات نے استدلال کیا ہے کہ اگر کسی نے یوں قسم اٹھائی کہ اللہ کی قسم میں آج کے دن کلام نہیں کروں گا اور پھر اس نے اسی دن سبحان اللہ یا لا الہ الا اللہ یا اللہ اکبر پڑھ لیا تو وہ حانث ہو جائے گا کیونکہ ان کو افضل الکلام کہا گیا ہے۔ تو گویا یہ سارے کلمات کلام اور حث کی شرط میں موجود ہے۔ اور بعض علماء کا قول بھی یہی ہے لیکن علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں یہ آدمی حانث نہیں ہوگا کیونکہ حدیث پاک میں آتا ہے یہ نماز لوگوں کے کلام کا مکمل نہیں بلکہ یہ نماز تسبیح و تہلیل اور ان کے علاوہ اللہ کے ذکر کا مکمل ہے۔ تو گویا تسبیح اور تہلیل وغیرہ کلام الناس میں سے نہیں ہیں۔

ہمارے علماء فرماتے ہیں: عدم حث کی وجہ وہ نہیں جو علامہ ابن حجر نے بیان کی بلکہ عدم حث کی وجہ یہ ہے کہ تسبیح اور تہلیل وغیرہ کو عرف میں کلام نہیں کہا جاتا اور قسموں کا اعتبار عرف کے لحاظ سے ہے۔

قولہ: سبحان اللہ: یعنی اللہ صفت حدیثیہ اور نقصان سے منزہ ہے۔

قولہ: والحمد للہ: یعنی اللہ پاک جلال و جمال اور صفات کمال کے ساتھ متصف ہے۔

قولہ: ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر: یعنی ذاتا اکیلا اور صفاتا یکتا ہے۔ اللہ کیلئے کبریائی اور عظمت کے اثبات کے ساتھ متصور حمد کا

اعتراف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”اللہم لا احصى ثناءً علیک کما اثبت علی نفسک“۔

قولہ: وفي رواية احب الكلام اللہ اکبر:

یعنی مسلم اور ترمذی کی روایت میں ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جو اس کی کمال صفات اور جمال ذات کے لائق نہیں میں اس سے منزہ ہونے کا اعتقاد رکھتا ہوں۔ اور یہ تخیل کے مرتبہ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد وہ کلمات لائے جو اللہ کے اسمائے حسنی اور بلند صفات کے ساتھ متصف ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اور وہ ذات اس بات کی مستحق ہے کہ اس کے شکر و ثناء کو ظاہر کیا جائے اور یہ کلمات تخلیہ کے مرتبہ میں ہیں۔

”الحمد للہ ولا الہ الا اللہ“ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ پاک صفات سلیمیہ و ثبوتیہ میں اکیلا ہے۔ پھر اپنے آنے والے قول اللہ اکبر سے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اللہ کی عظمت و کبریائی کی رداء (چادر) اور ازار (تہبند) کی حقیقت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

قولہ: لا یضربک بایہن بدات: یعنی اگرچہ یہ ترتیب اہل تہذیب و تادیب کے مفہوم کا تقاضا ہے۔ لیکن امام طیبی فرماتے ہیں اس مذکورہ ترتیب کے مطابق پڑھنا عزیمت اور اولیٰ ہے۔ باقی اس ترتیب کے علاوہ اگر پڑھے تو رخصت اور جواز ہے۔ علامہ ابن ملک فرماتے ہیں کہ بایہن بدات کا مطلب یہ ہے کہ سبحان اللہ سے ابتدا کریں یا الحمد للہ سے یا لا الہ الا اللہ سے یا اللہ اکبر سے تمام صورتیں جائز ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر جملہ مستقبل ہے مذکورہ ترتیب کے مطابق کسی کا ذکر ضروری نہیں۔ ہاں البتہ اس نظم اور ترتیب کی رعایت بہتر ہے۔ اس لئے کہ جو چیز معارف کے زمرے میں آتی ہو تو وہاں اولاً اس چیز کی صفات جلالیہ کی معرفت حاصل کی جائے یعنی اس سے مراد اس ذات کا ایسی چیز سے منزہ ہونا جو چیز اس ذات میں موجب نقص ہو۔ پھر اس کو صفات کمالیہ کے ساتھ پہچانا جائے۔ اور

اس سے مراد صفات ثبوتیہ ہیں جن صفات کی وجہ سے وہ ذات حمد کی مستحق قرار پائی۔ پھر یہ جانا جائے کہ اس صفت میں اس کا کوئی مماثل نہیں اور اس کے علاوہ الوہیت کا کوئی مستحق نہیں۔ تو ان ساری چیزوں سے اس کے سامنے اس ذات کا اکبر کھل جائے گا اس لئے کہ اس کی ذات علاوہ ہر چیز ہلاکت سے دوچار ہونے والی۔ اتنی کلام اور یہ سارا کلام ابتدا اور انتہا کے اعتبار سے بہتر ہے۔

۲۳۹۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَآنْ أَقُولَ سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ - (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۰۶/۱۱ حدیث رقم ۶۴۰۵۔ و مسلم فی صحیحہ من حدیث طویل ۲۰۷/۱۴ حدیث رقم (۲۸۔ ۲۶۹۱)۔ و احمد فی المسند ۳۷۵/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میرا سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہنا بلاشبہ میرے نزدیک اس چیز پر جس پر طلوع ہوتا ہے زیادہ پسندیدہ ہے۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: سبحان اللہ: سبحان اللہ مصدر منصوب ہے ایسے فعل کی وجہ سے جس کو محذوف ماننا واجب ہے۔ یعنی تقدیر عبارت یوں ہے ”سبح سبحان اللہ۔“

قولہ: والحمد للہ: اللہ جار مجرور متعلق ثابت کے ہے یعنی اللہ کی کوئی تعریف کرے یا نہ کرے۔ تمام تعریفیں اللہ کیلئے ثابت ہیں۔ (ولا الہ الا اللہ) یعنی موجود معبود اور مشہود اللہ ہی ہے۔

قولہ: واللہ اکبر: یعنی اللہ پاک بہت بڑا ہے۔ اس سے بھی بڑا کہ اس کی کبریائی کی حقیقت کو پہچانا جائے۔

قولہ: احب الی مما طلعت علیہ الشمس: یعنی دنیا اور دنیا میں جو مال اسباب وغیرہ ہیں ان سب سے مجھے یہ کلمات زیادہ محبوب ہیں۔ علامہ ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہاں احب صیغہ اسم تفضیل اپنی حقیقت پر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ کلمات کثیر ثواب ہونے کی وجہ سے ساری دنیا سے زیادہ محبوب ہیں۔ کیونکہ دنیا فناء اور زائل ہونے والی چیز ہے اور یہ حدیث رکعتا الجور خیر من الدنیا وما فیہا کی طرح ہے۔ عارف حائمی فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں شمس سے مراد شمس وجودی ہے یعنی جن چیزوں پر جسم کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ علامہ ابن عربی فرماتے ہیں ان کلمات کے کہنے اور جن چیزوں پر سورج طلوع ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے کا فضیلت میں مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور دو چیزوں کے درمیان فضیلت کے مقابلے کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ دونوں چیزیں اصل معنی کے اعتبار سے تو برابر ہوں لیکن پھر ان میں سے ایک دوسرے سے بڑھ جائے۔ حالانکہ دنیا کی چیزیں اور یہ کلمات اصل معنی میں بھی برابر نہیں۔ علامہ ابن بطال نے جواب یہ دیا ہے جن چیزوں پر سورج طلوع ہوتا ہے یہ کنایہ ہے۔ ہر چیز سے یعنی مجھے یہ کلمات ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے کہ شمس اور چیز دنیا اور آخرت ہی ہیں۔

اور ظاہر یہ ہے کہ دنیا کے سوا آخرت ایک ایسی شے ہے جو اصل معنی میں ان کلمات کے برابر ہے۔ اور علامہ ابن عربی نے جواب دیا ہے کہ کبھی فعل اسم تفضیل سے محض اصل فعل ہی مراد ہوتا ہے وہاں مفاضلہ کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مستقراً واحسن مقیلاً﴾ [الفرقان: ۲۴] یعنی جنت جہنم کے مقابلہ میں بہتر جائے قرار اور قبولے کی اچھی جگہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جنت اور جہنم کے درمیان کوئی مفاضلہ نہیں۔ تو لہذا احسن حسن کے معنی میں ہے۔

یابہ خطاب اکثر لوگوں کے نفس میں قرار پانے والی چیز پر واقع ہوا اس لئے کہ اکثر لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ دنیا کی طرح کوئی چیز نہیں۔ اور دنیا ہی مقصود ہے۔ تو اسلئے آپ ﷺ نے ناخبر کر دیا کہ یہ کلمات مجھے اس دنیا سے زیادہ محبوب ہیں۔ جس کے بارے میں تمہارا

گمان یہ ہے کہ اس سے کوئی چیز افضل نہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ مراد اس سے یہ ہو کہ یہ کلمات مجھے اس بات سے زیادہ محبوب ہیں کہ ساری دنیا میری ہو جائے۔ اور میں اس کو صدقہ کر ڈالوں بہر کیف خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو ثواب ان کلمات کے کہنے پر مرتب ہوتا ہے۔ وہ ثواب اس ثواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو ثواب صدقہ جمع الدنیا کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

اور حدیث پاک سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

”لو ان رجلاً فی حجرہ دراهم یقسمہا و آخر یذکر اللہ کان الذاکر اللہ افضل“

”ایک آدمی کے پاس درہم ہوں اور وہ ان کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے اور دوسرا آدمی بیٹھا اپنے رب کو یاد کر رہا ہے تو یہ ذکر قاسم درہم سے افضل ہے۔“

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ یہ کلمات مجھے دنیا جمع کرنے اور کمانے سے زیادہ محبوب ہیں۔ کیونکہ اہل عرب جمع اموال کا سلسلہ میں تفاخر کیا کرتے تھے۔

۲۳۹۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ فِي يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ حُطَّتْ خَطَايَا
وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۰۶/۱۱ حدیث رقم ۶۴۰۵۔ و مسلم فی صحیحہ من حدیث طویل ۲۰۷۱/۴ حدیث رقم (۲۸-۲۶۹۱)۔ واحمد فی المسند ۳۷۵/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص نے کسی دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ و بحمدہ پڑھا تو اس کے گناہ ختم کر دیئے جاتے ہیں اگر چہ وہ دریا کے جھاگ کی مانند یعنی کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔“

تشریح: قولہ: سبحان اللہ و بحمدہ: یہاں بجزہ کی بابت برائے مقارنت ہے۔ اور اس سے پہلے واؤ زائدہ ہے۔ یعنی میں اللہ کی ایسی پاکی بیان کرتا ہوں جو اس کی تعریف کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اسحی، تسبیحاً مقرونہ بجزہ یا بجزہ جار مجرور متعلق ہے۔ فعل محذوف ابتدائی وغیرہ کے۔ تو اس صورت میں واؤ عطف ہوگی اور عطف الجملہ علی الجملہ ہوگا۔ اور تقدیر عبارت ہوگی ”ابتدئی بحمدہ واثنی بشنائہ“ یعنی میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کی حمد کے ساتھ ابتداء کرتا ہوں۔

قولہ: فی یوم مائة مرة: یعنی یوم سے مراد اجزاء یوم ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں یوم سے مراد مطلق یوم ہے یعنی لا علی التعمین اوقات یوم میں سے کسی وقت میں یہ کلمات کہے۔ یوم کو کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں کیا جائے گا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ یہ کلمات سو مرتبہ یکبارگی کہے یا متفرق کر کے ایک مجلس میں کہے یا مختلف مجالس میں دن کے اول حصہ میں کہے یا دن کے آخری حصہ میں۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ ان کو دن کے ابتدائی حصہ میں کہا جائے۔ اتنی کلام۔

بقول امام طیبیؒ دن کے ابتدائی حصہ میں اولویت شاید اس وجہ سے ہے کہ اس میں اذکار اور ادا کی طرف مساعت اور پائی جاتی ہے ورنہ آنے والی حدیث میں مساء اور صباح کی قید ہے۔

قولہ: حطت خطایاہ: یعنی اس کے اعمال نامہ سے مٹا دی جاتی ہیں۔ (خطایاہ) صغیرہ گناہ مراد ہیں۔ کبیرہ کا بھی احتمال ہے۔

قولہ: وان كانت مثل زبد البحر: سمندر کی جھاگ سے مماثلت کیفیتاً اور کمیتاً دونوں طرح ہے۔ یعنی سمندر کے جھاگ جیسے گناہ ہوں یا جھاگ جتنے گناہ ہوں۔ یہ مثال اور اس جیسی اور مثالیں کتنا یہ ہوتی ہیں عرفان سے کثرت تعبیر کی جاتی ہے۔

تفہیم: یہ بات بڑی قابل تعجب ہے کہ شیخ جزئی نے اس حدیث کو اپنی کتاب حسن میں ابو عوانہ کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

۲۲۹۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحُ وَحِينَ يُمْسِي سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ مَا نَأَتْ مَرَّةً لَمْ يَأْتِ أَحَدٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَفْضَلٍ مِمَّا جَاءَ بِهِ إِلَّا أَحَدًا قَالَ مِثْلَ مَا قَالَ أَوْ زَادَ عَلَيْهِ۔

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۷۱/۴ حديث رقم (۲۹- ۲۶۹۲)۔ والترمذی فی السنن ۱۷۰/۵ حديث رقم ۳۵۳۶۔
واحمد فی المسند ۳۷۱/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جس نے صبح کے وقت اور شام کے وقت سو مرتبہ سبحان اللہ و بھمدہ کہا تو قیامت کے دن کوئی شخص اس عمل سے بہتر عمل نہیں لائے گا علاوہ اس شخص کے جس نے اس کی مانند یا اس سے زیادہ کہا۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: من قال حين يصبیح:

قولہ: وحين بمسئ مرة: یعنی صبح اور شام سو مرتبہ سبحان و بھمدہ کہے۔ باین طور کہ کچھ مقدار صبح اور کچھ مقدار شام کو کہے یا صبح اور شام دونوں وقتوں سو سو مرتبہ کہے۔ اور زیادہ ظاہر بات بھی یہی ہے۔ لیکن علامہ نوویؒ کا آنے کا والا کلام پہلے قول کا مؤید ہے۔ گویا علامہ نوویؒ نے اقل جو یقینی اس کا اعتبار کیا ہے۔

قولہ: لم یأت احد..... مما جاء) جاء کا فاعل مذکورہ کلمات کا قائل ہے۔ (بہ) ضمیر کا مرجع سو مرتبہ کلمات کا کہنا ہے۔

قولہ: الا احد قال..... زاد علیه: مشہور اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں یا تو استثناء منقطع ہے یا او بمعنی واؤ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں جملہ لم یأت احد.....، ”کا مطلب یہ ہے کہ جو قائل یہ کلمات لایا ہے یہ کلمات افضل ہوں گے ان کلمات سے جو کلمات ان کے علاوہ قائل لایا ہو۔ ہاں البتہ ان کلمات سے افضل نہیں ہوں گے جو قائل انہیں کی مثل کلمات لایا ہو یا اس پر زیادتی کی ہو۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص عدد مذکور یعنی سو مرتبہ پر زیادتی کرے گا تو اکیلے اجر مذکور بھی ہوگا اور زیادتی اجر بھی ہوگی۔ اور جو عدد ذکر کئے گئے ہیں یہ کوئی ایسی تحدید نہیں کہ جس پر زیادتی ناجائز ہو جیسا کہ عدد طہارت اور عدد رکعات میں زیادتی ناجائز ہوا کرتی ہے۔ اتنی کلام۔

اور شاید عدد مذکور اور زیادتی میں فرق یہ ہو کہ عدد مذکور برائے تشریح ہوں اور زیادتی برائے ترغیب ہو۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اگر یہی کلمات دن میں سو مرتبہ سے زائد بھی کہے تو بھی اس کیلئے یہی اجر مذکور ہوگا۔

۲۲۹۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ حَبِيبَتَانِ الْرَّحْمَنِ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ الْعَظِيمِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۵۶۶/۱۱ حديث رقم ۶۶۸۲۔ و مسلم فی صحيحه ۲۰۷۲/۴ حديث رقم (۳۱- ۶۹۴)۔
الترمذی فی السنن ۱۷۴/۵ حديث رقم ۳۵۳۴۔ وابن ماجه ۱۲۵/۱۲ حديث رقم ۳۸۰۶۔ و احمد فی المسند ۳۳۲/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا دو کلمے جو زبان سے کہنے سے تو ہلکے ہیں لیکن ترازو میں بھاری ہیں اور بخشنے والے خدا کے نزدیک بہت پیارے ہیں اور وہ دو کلمے یہ ہیں۔ سبحان اللہ۔

تشریح: و بھمدہ سبحان اللہ العظیم یعنی اللہ پاک ہے اور اپنی حمد کے ساتھ موصوف ہے جو اللہ بڑا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

قولہ: کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان: یعنی دو کلموں سے مراد دو مفید جملے ہیں۔ یعنی زبان پر آسانی جاری ہو جاتے ہیں۔ ترازو میں جزا کے اعتبار سے وزنی ہیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں یہاں خفت کتنا یہ ہے سہولت سے اس کلام کے زبان پر آسانی سے جاری ہونے کو تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض اٹھائی جانے والی چیزوں میں سے ایسی چیز کے ساتھ کہ جس کا اٹھانا اٹھانے والے پر ہلکا ہو اور اس کو اس کا اٹھانا باعث مشقت نہ ہو تو یہاں ذکر مشبہ یعنی خفت کا ہے اور مراد مشبہ بہ یعنی سہولت ہے۔ اور باقی رہا نقل تو اس سے حقیقت مراد ہے۔ کیونکہ اعمال ترازو پر مجسم ہو کر رکھ جائیں گے اتنی کلاماً۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اعمال کے دفتر تو لے جائیں گے۔ اور اس پر حدیث بطاقہ و سجالات دلالت کرتی ہے۔ اور دفتر اعمال از قبیل اجسام ہیں اعراض نہیں۔ واقعات میں یہ بات نقل کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ نیکی گراں لگتی ہے اور برائی آسان، تو آپ نے جواب دیا کہ کڑواہٹ سامنے آ جاتی ہے اور اس کی حلاوت اور مٹھاس غائب ہے۔ اس وجہ سے نیکی تم کو گراں لگتی ہے لیکن نیکی کا گراں گزرنا تمہیں ترک پر برا بیچتہ نہ کر پائے۔ کیونکہ روز جزا نیکی کی وجہ ہی سے میزان بوجھل ہوگا اور برائی آسان اس لئے لگتی ہے کیونکہ اس کی حلاوت سامنے ہوتی ہے۔ اور اس کی کڑواہٹ غائب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمہیں آسان لگتی ہے۔ لیکن برائی کا آسان ہونا تم کو ارتکاب پر آمادہ نہ کرے۔ اس لئے کہ برائیوں کی وجہ سے روز جزا میزان ہلکا ہو جائے گا۔

قولہ: جیتان الی الرحمن: حیستان یہ تشبیہ ہے حیبتہ کی اور حیبتہ محبوبہ کے معنی میں ہے۔ اور ان دونوں کلموں کے محبوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اللہ کی تعریف ہے۔ صفات سلبیہ اور صفات ثبوتیہ کے ساتھ صفات سلبیہ پر تزیینہ دلالت کرتی ہے اور صفات ثبوتیہ پر حمد اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کلمات کا کہنے والا اللہ کا محبوب ہے۔ اور اللہ کی بندے کے ساتھ محبت یہ ہے کہ اللہ پاک بندے کو بھلائی پہنچانے کا ارادہ فرمائیں۔ اور باقی رہی رحمن کو خاص طور پر ذکر کرنا تو وجہ تخصیص یہ ہے کہ اللہ کے صفاتی ناموں میں سے رحمن کا ذکر کر کے اللہ کی وسعت و رحمت پر تشبیہ مقصود ہے۔ اس طرح کہ اللہ عمل قلیل کے بدلے میں اجر جزیل عطا فرمائیں گے۔

فائدہ: صحیح بخاری کی آخری حدیث ہے۔

۲۲۹۹: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ أَيَعْجِزُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَكْسِبَ كُلَّ يَوْمٍ أَلْفَ حَسَنَةٍ فَسَأَلَهُ سَائِلٌ مِنْ جُلَسَائِهِ كَيْفَ يَكْسِبُ أَحَدُنَا أَلْفَ حَسَنَةٍ قَالَ يَسْبِعُ مِائَةَ تَسْبِيحَةٍ فَيَكْتَسِبُ لَهُ أَلْفَ حَسَنَةٍ أَوْ يُحِطُّ عَنْهُ أَلْفُ حَطِيئَةٍ. (رواه مسلم وفي كتابه في جميع الروايات عن مؤسسي الجهنِّي أَوْ يُحِطُّ قَالَ أَبُو بَكْرٍ الْبُرْقَانِيُّ وَرَوَاهُ شُعْبَةُ وَأَبُو عَوَانَةَ وَيَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْقَطَّانُ عَنْ مُوسَى فَقَالُوا أَوْ يُحِطُّ بِغَيْرِ الْفِ هَكَذَا فِي كِتَابِ الْحَمِيدِ)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۷۳/۴ حديث رقم (۳۷-۲۶۹۸)۔ واحمد في المسند ۱۷۴/۱۔

ترجمہ: ”حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ ایک دن جب کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ارشاد فرمایا ”کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ہر روز ایک ہزار نیکیاں حاصل کرے؟ مجلس میں موجود صحابہ میں سے ایک صحابی نے پوچھا کہ ”ہم میں سے کوئی شخص ایک ہزار نیکیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہے؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ایک سومرتبہ سبحان اللہ پڑھ لے اس کے لئے ایک ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی یا اس کے ایک ہزار گناہ دور کئے جائے گے (مسلم) ابو بکر برقانی کہتے ہیں کہ صحیح مسلم میں موسیٰ جنسی سے جو روایتیں منقول ہیں ان سب میں لفظ او یحط ہی نقل کیا گیا ہے لیکن شعبہ ابو عوانہ اور یحییٰ ابن سعید قطان نے موسیٰ جنسی سے ہی یہ روایت

نقل کی ہے اس میں لفظ ويحط بغیر الف کے ذکر کیا ہے اور کتاب حمیدی یعنی جمع بین الصحیحین میں بھی اسی طرح منقول ہے۔“

تشریح: قوله: ايعجز الف خطينة: جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ ایک نیکی کے بدلے میں اس کی مثل دس نیکیوں کی جزا ملے گی۔ یہ مغافت جزا کی اقل تعداد ہے۔ جس کا قرآن کریم میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرَ امْثَالِهَا﴾ [انعام: ۱۱۶]

﴿وَاللَّهُ يضاعف لمن يشاء﴾ [اور حرم محترم کی ایک نیکی کے بدلے میں ایک لاکھ نیکی کی جزا ملے گی۔ خطیہ میں حقیرہ اور کبیرہ دونوں احتمال ہیں۔ اور یہ ساری اللہ کی مشیت کے مطابق ہے۔ علامہ نووی نے کتاب الاذکار میں ويحط کہا ہے۔ یعنی واؤ کے ساتھ اور مسلم کے عام نسخوں میں بھی اسی طرح ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی تائید ترمذی نسائی اور ابن حبان کی روایت کے ساتھ میں ہوتی ہے۔ کہ ويحط واؤ کے ساتھ ہے، او کے ساتھ نہیں۔

قوله: وفي كتابه: في جميع الروايات عن موسى الجهني اويحط: کتاب سے مراد مسلم شریف ہے۔ (فی جمع الروايات عن موسى الجهني اويحط) یعنی الف کے ساتھ ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں۔ موسیٰ الجھنی سے مراد ابو عبد اللہ موسیٰ بن عبد اللہ جھنی کوفی ہیں۔ اور انہوں نے حضرت مجاہد ومصعب بن سعید سے سماع کیا ہے اور ان سے حضرت شعبہ اور یحییٰ بن سعید قطان نے روایت حدیث کی ہے۔

قوله: قال ابو بكر البرقاني :باء الكسره ارفع دونوں کے ساتھ ہے۔ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں۔ ابو بکر برقانی سے مراد احمد بن محمد خوارزمی برقانی ہیں۔ باء راء اور قاف کے ساتھ۔ (فقالو) صحیح نسخوں میں جمع کے صیغے کے ساتھ ہے۔ اور قالو کی ضمیر کا مرجع شعبہ اور ابو عوانہ اور یحییٰ بن سعید ہیں۔ اور ایک نسخہ میں قال واحد کا صیغہ ہے۔ یعنی قال کا فاعل موسیٰ ہیں۔ (ويحط بغیر الف) یعنی او نہیں بلکہ واؤ کے ساتھ ہے۔ (هكذا) اسم اشارہ کا مشار الی قول: وفي كتابه الی آخر ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ جب واؤ سے مراد احلام میں ہو تو پھر واؤ کا معنی مختلف ہو جاتا ہے اور اگر واؤ بمعنی اس سے بیان نوع کا ارادہ کیا جائے تو پھر او اور واؤ دونوں مقصد میں برابر ہیں۔ اور بھی واؤ بمعنی او بھی ہوا کرتی ہے تو پھر او اور واؤ والی دونوں روایتوں میں کوئی منافات نہیں تو پھر معنی ہوگا کہ جس نے یہ کلمات کہے اس کیلئے ایک ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی اگر اس کے ذمہ کوئی گناہ نہ ہو۔ اور اگر اس کے ذمہ کوئی گناہ ہو تو پھر بعض گناہ گرا دیئے جائیں گے اور بعض نیکیاں لکھ دی جائیں گی اور ممکن ہے کہ او بمعنی واؤ ہو یا بمعنی بل ہو تو اس صورت میں ہزار گناہوں کا مٹانا اور ہزار نیکیوں کا لکھنا دونوں جمع ہو جائیں گے۔ اور اللہ کا فضل اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

۲۳۰۰: وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَيُّ الْكَلَامِ أَفْضَلُ قَالَ مَا أَصْطَفَى اللَّهُ لِمَلَائِكَتِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۹۳/۴ حديث رقم (۸۴ - ۲۷۳۱)

ترجمہ: ”حضرت ابو ذر کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا کلام بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”وہ کلام جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے چن لیا ہے اور وہ یہ ہے سبحان اللہ وبحمدہ۔“ (مسلم)

تشریح: قوله: اى الكلام افضل؟ یعنی تمام اذکار میں سے کون سا ذکر۔

قوله: ما اصطفى الله لملائكته: یعنی وہ ذکر جسے اللہ نے ملائکہ کے لئے چن لیا ہے۔

دوام کا حکم کیا ہے۔

قولہ: سبحان اللہ وبحمدہ: نبی اکرم ﷺ نے ان کلمات کے ذریعے اللہ کے ارشاد: ﴿نحن نسبح بحمدك ونقدس لك﴾ [البقرة: ۱۳۰] کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور یہ سابقہ چار کلمات کا اختصار ہے۔ اس لئے کہ تسبیح نئی شریک کو متضمن ہے۔ اور شریک باری کی نفی تہلیل کہلاتی ہے اور ذات باری کا اکبر ہونا بھی لازم آتا ہے۔

۲۳۰۱: وَعَنْ جُوَيْرِيَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَرَجَ مِنْ عِنْدِهَا بِكُرَّةٍ حِينَ صَلَّى الصُّبْحَ وَهِيَ فِي مَسْجِدِهَا ثُمَّ رَجَعَ بَعْدَ أَنْ أَضْحَى وَهِيَ جَالِسَةٌ قَالَ مَا زِلْتُ عَلَى الْحَالِ الَّتِي قَارَفْتِكِ عَلَيْهَا قَالَتْ نَعَمْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكَ أَرْبَعَ كَلِمَاتٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتَ مِنْذُ الْيَوْمِ لَوَزَنْتَهُنَّ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ وَرِضَا نَفْسِهِ وَزِينَةَ عَرْشِهِ وَمَدَادَ كَلِمَاتِهِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۹۰/۴ حديث رقم (۷۹-۲۷۲۶)۔ وابن ماجه ۱۲۵۱/۲ حديث رقم ۳۸۰۸۔

ترجمہ: ”حضرت جویریہ سے منقول ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ صبح کے وقت نماز فجر کے لئے ان کے پاس سے نکلے اور وہ اپنے مصلیٰ پر بیٹھی ہوئی تھی جب نبی کریم ﷺ اشراق کے وقت واپس تشریف لائے تو وہ اپنی جگہ مصلیٰ پر بدستور بیٹھی ہوئی تھیں آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر ان سے فرمایا کہ ”جس حالت میں تمہیں چھوڑ گیا تھا کیا اس طرح مسلسل بیٹھی ہوئی ہو؟ (یعنی صبح کے وقت سے اب تک اشراق کا وقت آ گیا ہے مصلیٰ پر بیٹھی ہوئی اسی طرح ذکر الہی میں مشغول ہو) انہوں نے کہا ”جی ہاں“ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”میں نے تمہارے پاس سے جانے کے بعد چار کلمے تین مرتبہ کہے ہیں وہ چار کلمے ایسے ہیں اگر ان کو اس چیز سے تو لا جائے جس کے کہنے میں تم ابتداء دن سے اب تک مشغول رہی ہو تو یقیناً چار کلمے اس چیز پر بھاری رہیں گے اور وہ چار کلمے یہ ہیں سبحان اللہ وبحمدہ عدد خلقہ ورضاء نفسه وزینة عرشہ ومداد کلماتہ“ میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کی تعریف کرتا ہوں اس کی مخلوقات کی تعداد کی بقدر اور اس کی ذات کی مرضی کے موافق اور اس کے عرش کے وزن کے مطابق اور اس کے کلموں کی مقدار کے مانند ہے۔“ (مسلم)

www.KitaboSunnat.com

راوی حدیث:

جویریہ ام المؤمنین۔ یہ جویریہ ”حارث“ کی بیٹی ہیں۔ ”جویریہ“ جاریہ کی تصغیر ہے۔ ازواج مطہرات ﷺ میں سے ہیں۔ ان کو آنحضرت ﷺ نے غزوہ مریسج میں قید کیا تھا۔ (اسی غزوہ کو غزوہ بنوالمصطلق کہتے ہیں جو ۵ھ میں واقع ہوا تھا)۔ یہ ”ثابت بن قیس“ کے حصہ میں آئی تھیں اور ثابت بن قیس نے ان سے ”مکاتبت“ کر لی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے بدل کتابت ادا فرمایا اور اس کے بعد ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت کے شرف سے نوازا۔ ان کا نام ’برہ‘ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے بجائے جویریہ نام رکھ دیا۔ ربیع الاول ۵۶ھ میں وفات پائی اور ان کی عمر پینٹھ (۶۵) سال کی ہوئی۔ حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم ان سے احادیث روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قولہ: عن جویریہ: تصغیر کے ساتھ ہے۔ جویریہ بنت حارث زوجہ رسول اللہ ﷺ ہر اد ہیں۔

قولہ: ان النبی ﷺ خرج مسجدہا: یعنی دن کے ابتدائی حصہ میں (حین صلی الصبح) یعنی صبح کی نماز پڑھنے کا

ارادہ کیا۔ (وہی فی مسجدھا) مسجدِ نجیم کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔ یعنی وہ نماز کے سجدہ کی جگہ پر تھیں۔
 قولہ: ثم رجع..... فارقتك عليها: یعنی حضرت جویریہ کی طرف لوٹے۔ (بعد ان اضحیٰ) یعنی آپ وقت ضحوة میں داخل ہوئے تھے اور ضحوة کہتے ہیں سورج کا ایک نیزے کی مقدار بلند ہو جانا اور بعض حضرات کہتے ہیں بعد الضحیٰ کا مطلب ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت ادا کرنے کے بعد تشریف لائے۔ (وہی جالسۃ) یعنی اپنی جگہ میں۔ (قال مازلت) تاء کے کسرہ کے ساتھ۔ (علی الحال) اور لفظ حال اس کا مذکر اور مؤنث دونوں لانا جائز ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے فرمایا۔ (التی فارقتك علیہا) یعنی حالت سے مراد جلوس لذر اللہ کی حالت ہے۔

قولہ: قال النبی ﷺ، لقد قلت بعدك اربع كلمات ثلاث مرات: یعنی تیرے پاس سے نکلنے کے بعد۔
 (اربع كلمات) کلمات محلاً مصدر مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے۔ تکلمت بعد مفارقتك اربع كلمات یعنی تجھ سے جدا ہونے کے بعد میں نے چار کلمات کہیں ہیں۔ (ثلاث مرات) مرات منصوب بر بنا کے ظرفیت ہے۔
 قولہ: لو وزنت بما قلت منذ اليوم لوزنتهن: زیادہ صحیح قول کے مطابق وزنت مجہول کا صیغہ ہے اور وزنت قبولت کے معنی میں ہے۔ (لما قلت) یعنی اس سارے ذکر کے مقابلہ میں جو تو نے کیا ہے۔ (منذ) ميم کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔ (اليوم) زیادہ صحیح قول کے مطابق یوم مجرور ہے اور رفع بھی جائز ہے۔ یہ ساری تفصیل قاموس میں موجود ہے۔ یعنی اس دن میں یا اس مذکورہ وقت میں۔ (لوزنتهن) یعنی یہ کلمات تخییر سے سارے ذکر پر غالب آجائیں گے۔ اور اجر و ثواب میں تیرے سارے ذکر سے بڑھ جائیں گے۔ جبکہ کہا جاتا ”وازنه فوزنه“ یعنی فلاں نے فلاں سے مقابلہ کیا اور پھر وہ اس پر غالب ہو گیا۔ اور وزن میں اس سے بڑھ گیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ”حاجبته فحجبته“ یعنی میں دلیل سے اس کا مقابلہ کیا اور پھر میں دلیل میں اس پر غالب آ گیا۔ یا لوزنتهن لساوتهن کے معنی میں ہے۔ (یعنی میرے چار کلمات تیرے سارے ذکر کے برابر ہوں گے) جیسا کہ کہا جاتا ہے ”هذا يزي درهماً“ یعنی یہ درہم کے مساوی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ”لو كانت الدنيا تزن عند الله جناح بعوضة لما سقى كافراً منها شربة ماء“ میں بھی وزن مساوات کے معنی میں ہے۔ یعنی اگر اللہ کے ہاں پتھر کے پر کے مساوی بھی دنیا کی قدر و قیمت ہوتی تو اللہ کسی کافر کو اس دنیا سے ایک گھونٹ پانی نہ پلاتا یہ ساری امام طیبیؒ کے کلام کی توضیح ہے۔ یعنی لو زنتهن یا لساوتهن کے معنی میں ہے یا غلبتھن کے معنی میں ہے۔ اور لوزنتھن کی ضمیر معنی ما کے متنتھی کی طرف راجع ہے۔ وما قلت میں لفظ ما کی طرف راجع نہیں اور اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ کلمات کثیر المعنی ہیں اگر ان کا مقابلہ اس ذکر سے کیا جائے جو تو نے کیا تو یہ کلمات اس سارے ذکر کے برابر ہوں گے۔

قولہ: سبحان الله و بحمده: یعنی تقدیر عبارت بحمده احمدہ ہے۔

قولہ: عدد خلقه: لفظ عدد حرج جرباء کے حذف کی وجہ سے منصوب ورنہ تقدیر عبارت بعد دخل واحد بن مخلوقا قہ ہے۔
 علامہ سیوطی فرماتے ہیں نصب بر بنائے ظرفیت ہے یعنی قدر عدد۔

قولہ: رضاء نفسه: یعنی میں اتنی مقدار میں اس کی تسبیح اور تحمید کرتا ہوں کہ جتنی مقدار اس کو رضی کر دے اس کیلئے خالص اور مخلص ہو اور نفس سے مراد ذات ہے۔ اور معنی ہے میں تسبیح اور تحمید اس کی رضامندی طلب کرنے کیلئے کرتا ہوں۔

قولہ: زنة عرشه: یعنی میں اس کے عرش کے ثقل کے برابر یا اس کے عرش کی مقدار کے برابر اس کی تسبیح و تحمید کرتا ہوں۔

قولہ: مداد كلماته: مداد مذکور کی طرح مصدر ہے اور مداء کہتے ہیں زیادتی اور کثرت کو یعنی میں اللہ کی تسبیح اور تحمید اتنی مقدار میں

کرتا ہو جو مقدار کثرت میں اللہ کے کلمات کے مساوی یہ مساوات خواہ معیار کے ذریعہ ہو یا وزن اور کیل کے ذریعے یا اس کے علاوہ حصر اور انداز کرنے کے دیگر ظروف کے ذریعے اور اس بیان کردہ تمثیل سے ارادہ تقریب افہام کا کیا گیا۔ (یعنی اس مثال کی وجہ سے بات جلد سمجھ آ جاتی ہے)۔ ورنہ کلام کیل میں نہیں آسکتا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کلمات سے مراد اللہ کی کلام اور صفت ہے۔ وہ بھی شمار اور انحصار میں نہیں آسکتی تو گویا حقیقت مراد نہیں بلکہ مجازاً امثالہ فی الکثرت مراد ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اولاً مخلوق کے عدد کثیر کا ذکر کیا۔ جس عدد کو ضبط میں لایا جاسکتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس چیز کی جانب ترقی فرمائی جو اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے اور جس کے عدد کا احصاء ناممکن ہے۔ یعنی ایسی حمد جیسے اللہ تعالیٰ کے کلمات کہ سارے ممکن نہیں۔

نام طیبیٰ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ منصوب ہیں بر بنائے مصدر مفعول مطلق یعنی تقدیر عبارت یوں ہے 'اعدت تسبیحہ، المقرون بحمدہ عدد خلقہ' یعنی میں گنتی کرتا ہوں اس کی ایسی تسبیح کی جو اس کی حمد کے ساتھ ملی ہوئی اس کی مخلوق کے گنتی کے برابر اور اس طرح "اقدر مقدار ما یرضی بنفسہ ووزنہ عرشہ و مقدار کلماتہ" ہیں اور مرداد اشی اور مرداد اشی کہتے ہیں شی کا لمباز زیادہ اور کثیر ہو جانا۔ اور یہاں مراد مقدار ہے۔ یعنی تقدیر عبارت یوں ہے۔ اسبحة واحمدہ بمقدار کلماتہ یعنی میں اللہ کے کلمات کی مقدار کے برابر اس کی تسبیح اور تحمید کرتا ہوں۔ اور اللہ کے کلمات سے مراد اس کی کتابیں اور نازل شدہ صحائف ہیں۔ اور کلمات کا اطلاق اللہ کے جملہ امر اور جملہ موجودات پر بھی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ ذکر کے ذہن میں کیفیت فی الذکر مذکورہ تصور کے اعتبار کمیت اور مقدار سے زیادہ راجح ہے۔ جو مقدار مذکورہ کیفیت سے خالی ہو۔ و هذا القیاس قرآن کریم کی قراءت تدبر تفکر اور حضور قلبی و حصول نصیحت کے ساتھ اگر چند مذکورہ صفات ایک آیت ہی میں کیوں نہ پائی گئی ہو لیکن اس کے باوجود یہ ایک آیت ایسی بہت زیادہ قراءت ہے جو ان صفات سے خالی ہو فضیلت رکھتی ہے۔ اس ساری کیفیت کے ذکر سے آپ ﷺ کی مراد ام المؤمنینؓ کو ذکر کے سلسلہ میں حضور قلب پر برائی بخت کرنا اور ترغیب دینا ہے۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ جو کلمات آپ ﷺ کی زبان اقدس پر وارد ہوئے ہیں۔ وہ ان تمام اذکار سے افضل ہیں جو اذکار آپ ﷺ کے علاوہ کی زبان پر وارد ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۲۳۰۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ لُحْمٌ
وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ فِي يَوْمٍ مِائَةٌ مِائَةً مِائَةً مِائَةً مِائَةً مِائَةً مِائَةً مِائَةً مِائَةً مِائَةً
حَسَنَةً وَمَحِيَّتَ عَنْهُ مِائَةٌ سَيِّئَةٌ وَكَانَتْ لَهُ حِرْزًا مِنَ الشَّيْطَانِ يَوْمَهُ ذَلِكَ حَتَّى يُمَسِّيَ وَكَمْ يَأْتِ أَحَدًا بِأ
فُضِّلَ مِمَّا جَاءَ بِهِ إِلَّا رَجُلٌ عَمِلَ أَكْثَرَ مِنْهُ - (متفق عليه)

اخرجه البحاری فی صحیحہ ۲۰۱/۱۱ - حدیث رقم ۶۴۰۳ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۷/۱۴ حدیث رقم ۲۸۱ -

۲۶۹۱ - والنرمذی فی السنن ۱۷۵/۵ حدیث رقم ۳۵۳۵ - واحمد فی المسند ۶۰/۴ -

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص یہ کلمات لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو کہتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں" لہ الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير "اس کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے" دن میں سو مرتبہ کہے اس کو سونگلاموں کے آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے اس کے لئے سونگلیاں لکھی جاتی ہیں اس کے سونگناہ دور کئے جاتے ہیں اور اس کو اس دن شام تک شیطان سے پناہ حاصل رہتی ہے اور کوئی اس کے لئے ہونے سے بہتر کوئی عمل لے کر نہیں آئے گا علاوہ اس شخص کے جس نے ان کلمات کو اس سے زیادہ پڑھا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: لا اله الا الله وحده لا شريك له: یعنی وجود میں کوئی معبود برحق نہیں۔ صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ ”وحده“ حال برائے تاکید ہے۔

قوله: له الملك: یعنی ملکوت کی بادشاہی ملکوں کی بادشاہی علم کی بادشاہی قناعت کی بادشاہی اور اس طرح اور چیزوں کی بادشاہی۔ یعنی جمیع امور کی بادشاہت اسی کے ارادے اور تقدیر اور تصرف کے ساتھ ہے۔

قوله: وله الحمد: یعنی حقیقت میں ثناء جزیل علی طریق الجمیل اللہ کیلئے ہے۔ اگرچہ اللہ کے علاوہ کی بھی کبھی مجازاً اور صورتہ تعریف کر دی جاتی ہے۔

قوله: وهو علی کل شیء قدیر: یعنی شی سے مراد یا تو ایسی چیز ہے جس کو اللہ چاہتا ہے اور اس کا ارادہ کرتا یا شی سے مراد مطلق ہے۔ یعنی ہر چیز (قدیر) یعنی وہ قدرت میں انتہا کو پہنچنے والا ہے اور قوت میں کامل ہے۔ کمزوری اور عجز سے پاک ہے۔

قوله: فی یوم مائة مرة: یعنی سو مرتبہ اکٹھا کہے یا متفرق طور پر۔

قوله: كانت له عدل عشر رقاب: كانت کے بجائے کان مذکر ہے۔ تو پھر کان کا اسم ما ذکر محذوف مانا جائے گا لیکن کانت کے بجائے کان حدیث کے آخر حصہ سے مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ وہاں کانت اور حرز مذکور ہے۔ (لہ) یعنی ضمیر کا مرجع اس کلمے کا قائل ہے۔

(عدل عشر رقاب) لفظ عدل میں کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ ہے۔ اور عدل مثل کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کیلئے دس غلاموں کو آزاد کرنے کے ثواب کی مثل ہوگا۔ رقاب رقبہ کی جمع ہے۔ اور رقبہ اصل میں گردن کو کہتے ہیں لیکن یہاں انسان کی جمع ذات مراد ہے۔ یہ تسمیہ اشیء بحفیہ کے قبیل سے ہے۔ یعنی پوری چیز کا نام اس کے ایک حصہ کے نام پر رکھ دیا جائے یعنی اس کلمہ کے ثواب کو اتنا بڑھا کر دیا جائے گا تاکہ وہ ثواب اصل عتق کے ثواب کے مثل ہوگا۔

قوله: وکتبت له یومہ ذالک: یعنی ثابت ہوں گی۔ اسی دن میں جس دن اس نے یہ کلمہ کہا ہے۔ (حتی یمسی) ظاہراً تقابل سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر قائل نے یہ کلمہ رات کے وقت کہا تو اس کیلئے رات بھر شیطان سے حفاظت ہوگی یہاں تک کہ صبح ہو جائے۔ احتمال یہ ہے کہ اختصار راوی کی جانب سے ہو یا آپ ﷺ نے رات کا ذکر واضح ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا۔ اور باقی رہی دن کی تخصیص تو یہ اس لئے ہے کہ دن کے وقت رات کی نسبت شیطان سے حفاظت کی طرف زیادہ احتیاجی ہے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں یہ اجر تو سوکا ہے۔ اگر کوئی اس پر زیادتی کرتا ہے تو اس کے ثواب میں بھی زیادتی ہوگی اور اس سو (۱۰۰) سے مراد بھی عام ہے خواہ یہ سوپے درپے کہے یا متفرق انداز میں لیکن پے درپے کہنا اور دن کے ابتدائی حصہ میں کہنا زیادہ بہتر ہے تاکہ دن بھر شیطان سے حفاظت رہے۔ (قوله: ولم یأت احد..... محل اتیان قیامت کا دن ہے۔

ایک روایت میں اکثر منہ کے بجائے من ذالک ہے۔ یعنی وہ زیادہ ذکر مذکورہ ذکر کی جنس سے ہو یا اس کی جنس کے علاوہ سے۔

امام طبری فرماتے ہیں اس حدیث میں تہلیل کو سینات کی مقدار معلوم یعنی سو برائیوں کو مٹانے والا قرار دیا گیا ہے اور تسبیح والی حدیث میں تسبیح کو سمندر کی جھاگ کے برابر برائیاں مٹانے والا کہا گیا ہے۔

اس سے تسبیح کا تہلیل سے افضل ہونا لازم آتا ہے۔ اور حالانکہ تہلیل والی مذکورہ حدیث میں ”ولم یأت احد باقصل مما جاء بہ“ فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تہلیل ہر ذکر سے افضل ہے۔

قاضی عیاض نے جواب دیا ہے کہ اس مذکورہ حدیث میں جس تہلیل کا ذکر کیا گیا ہے تہلیل تسبیح سے افضل ہے کیونکہ تسبیح کے جزاء

میں سمندر کی جھاگ کی مقدار جو سینات ہے اور یہاں جزاء جو سینات پر بھی مشتمل ہے اور اس کے علاوہ دس غلاموں کو آزاد کرنے اور سو نیکیوں کے اثبات اور حفاظت از شیطان پر بھی جزا میں شامل ہیں۔

۲۳۰۳: وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي سَفَرٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَجْهَرُونَ بِالتَّكْبِيرِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَيُّهَا النَّاسُ اذْبَعُوا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ إِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ أَصَمًّا وَلَا غَائِبًا إِنَّكُمْ تَدْعُونَ سَمِيعًا بَصِيرًا وَهُوَ مَعَكُمْ وَالَّذِي تَدْعُونَهُ أَقْرَبُ إِلَيَّ أَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِي رَاحِلَتِهِ فَقَالَ أَبُو مُوسَى وَأَنَا خَلْفُهُ أَقُولُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ فِي نَفْسِي فَقَالَ يَا عَبْدَ اللَّهِ بِنِ قَيْسٍ إِلَّا أَذُلُّكَ عَلَيَّ كُنْزٍ مِنْ كُنُوزِ الْجَنَّةِ فَقُلْتُ بَلَىٰ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۸۷/۱ - حدیث رقم ۶۳۸۴ - ومسلم فی صحیحہ ۲۰۷۶/۴ حدیث رقم ۴۴ - ۲۷۰۴ -

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۲/۵ حدیث رقم ۳۵۲۸ -

ترجمہ: ”حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے کہ لوگوں نے پکار پکار کر تکبیر کہنی شروع کر دی آپ ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا ”لوگو! اپنی جانوں کے ساتھ نرمی اختیار کرو کیونکہ تم کسی بہرے یا غیر موجود کو نہیں پکارتے یا یاد نہیں کرتے بلکہ اس کو پکارتے ہو جو سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو چاہے تم اسے باواز بلند یاد کرو چاہے آہستہ آواز سے اس کے لئے دونوں برابر ہیں اور جس کو تم پکارتے ہو وہ تم میں سے ہر شخص کے اس کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے“ حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے پیچھے اونٹ پر یا پیادہ تھا اور اپنے دل میں یہ پڑھ رہا تھا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”عبداللہ ابن قیس! یہ حضرت ابو موسیٰ کا نام ہے کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتلا دوں؟ میں نے عرض کیا ”ہاں یا رسول اللہ ﷺ! ضرور بتائیے؟“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”وہ خزانہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: بجہرون بالتکبیر: یعنی یہ اظہار اور جہر بالتکبیر بلند مقامات پر تھا کیونکہ بلند مقام پر چڑھتے وقت تکبیر کے سلسلہ میں حدیث وارد ہوئی ہے۔ یا اس سے مراد تکبیر اور تکبیر کی مثل دیگر اذکار ہیں اور شاید آپ ﷺ کسی جہادی سفر میں ہوں تو اس صورت میں تکبیر کی تخصیص جہادی سفر کے مناسب ہے۔ یا اس سے مراد مطلقاً تعظیم ہے۔ جو تکبیر اور کبیر کے علاوہ کو بھی شامل ہے۔

قولہ: ایہا الناس اذبعوا علی انفسکم: ایک نسخہ میں حرف نڈایا کے ساتھ یا ایہا الناس ہے۔ ”اربعوا“ باء کے فتح کے ساتھ ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ اپنے نفسوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو اور اس جہر سے باز آ جاؤ جو تمہارے لئے مضر ہے۔

قولہ: انکم لا تدعون..... من عنق راحلتہ:

یہ جملہ استنافیہ اور بیان علت کے معنی میں ہے۔ ”لا تدعون“ کا مفعول لفظ اللہ ہے یعنی تم نہیں پکار رہے اللہ کو تکبیر کے ذریعہ سے یا لا تدعون لا تذکرون کے معنی میں ہے۔ علامہ ابن حجرؒ کا گمان یہ ہے کہ لا تدعون، تسألون اور تطالبون کے معنی میں ہے۔ پس فرمایا کہ تدعون، تعبدون کے معنی میں ہے کیونکہ ان سے صادر ہونے والی چیز محض اللہ اکبر تھا۔ جیسا کہ لفظ تکبیر سے اس طرف اشارہ ملتا ہے۔ (اور محض اللہ اکبر کہنا عبادت ہے)۔ اور یہ محض اس بارے میں دعویٰ ہے ہاں یوں کہا جائے گا کہ یہ عبادت کے ساتھ معنی دعا کو بھی

شامل ہے جیسا کہ اس میں امیہ بن صلت کے قول سے اشارہ ملتا ہے جس میں امیہ بن صلت کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کاد ان یسلم قریب ہے۔ کہ امیہ بن صلت مشرف باسلام ہو جائے اور آپ ﷺ کا امیہ بن صلت کے اشعار کی طرف جھکاؤ بھی تھا اور امیہ بن صلت کا قول یہ ہے۔ ”اذا انی علیک المرء یوماً کفاه من تعرضه الشناء“۔

(اصم ولا غائباً انکم) یہ تاکید (تدعون سمیعاً بصیراً) امام طیبی فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ سوال کریں کہ دعا کے مقام پر بصیراً کی زیادتی کا کیا فائدہ۔ تو میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ سمیع اور بصیر یہ ضریح یعنی کورنگاہ اور اعلیٰ یعنی اندھا کے مقابلہ میں ادراک کے اعتبار سے اشد اور احساس کے اعتبار سے اکثر ہیں۔ لیکن زیادہ ظاہر جواب وہ ہے جو علامہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ سمیع تو رحم کے مقابلہ میں ہے اور بصیر کو اس لئے لایا گیا ہے کیونکہ ذکر کے سلسلہ میں بصیر سمیع کو لازم ہے۔ (یعنی عموماً ان دونوں کو معاً ذکر کیا جاتا ہے) کیونکہ ان دونوں کے درمیان ادراک کی مناسبت موجود ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ جواب یوں دیا جائے کہ جب دعا عبادت توی اور فعلی دونوں کو شامل ہے تو اس لئے سمیع اور بصیر دونوں کو اکٹھا لائے۔ (کیونکہ عبادت توی سننے سے اور عبادت فعلی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے)۔ لیکن زیادہ حق بات یہ ہے کہ بصیر کو اس لئے لائے تاکہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ سمیع اور بصیر یہ دونوں ایسی صفیتیں ہیں جو ایک دوسرے کو لازم ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آگے وہو معکم سے ایسی معیت کو بطور تکمیل لارہے ہیں جس سے یہ علم ہوتا ہے۔ (یعنی جو ساتھ ہوگا تو اس کو ساتھ کے حالات کا علم بھی ہوگا)۔ اور سمیع اور بصیر دونوں سے اعم ہے۔ کما مر۔ (وہو معکم) یعنی وہ علم کی صورت میں تمہارے پاس حاضر ہے اور اس کو تمہارے احوال پر اطلاع ہے تم جہاں بھی ہو خواہ تم اپنے احوال ظاہر کرو یا اسے پوشیدہ رکھو۔

اور معکم ظاہر کے اعتبار سے آپ ﷺ کے ارشاد غائباً کے مقابلہ میں ہے۔ اور پھر اس معیت معنوی کے اثبات میں جو انتہائی شرافت و عظمت پر دل ہے۔ اپنے ارشاد: لا والذی تدعونہ اقرب الی احدکم من عنق راحلتہ“ سے اضافہ فرمایا بلکہ وہ تو شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور مقام کی مناسبت کے اعتبار سے یہ ایک تمثیل ہے جو بات کو ایک عاقل کے فہم سے قریب کرنے کیلئے ہے۔ مطلب ہے کہ وہ قریب سے بھی قریب ہے اور وہو معکم سے اس میں مزید ترقی ہوگی۔

قوله: ونا خلفه اقول لا حول ولا قوۃ الا باللہ فی نفسی: یعنی ظاہر میں کوئی حرکت نہیں۔ باطن میں کوئی استطاعت نہیں۔ نہیں ہے کسی چیز سے پھرنا اور نہ ہی کسی چیز پر طاقت مگر اللہ کے ارادے اور اس کی مشیت کے ساتھ۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حول بمعنی حیلہ ہے اس لئے کہ اللہ کی مدد کے سوا کسی چیز کو دفع کرنا یا منع کرنا محض حیلہ سے ممکن نہیں۔

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ لا حول ولا قوۃ یہ کلمہ تفویض ہے یعنی کسی معاملہ میں بندہ کسی چیز کا مالک نہیں۔ اور دفع شرمیں

اس کے پاس کوئی حیلہ نہیں اور جلب خیر کیلئے اس کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ ہاں مگر سب کچھ اللہ کے ارادے سے ہوگا۔ اتنی کلامہ۔

اور کلمہ لا حول کے سلسلہ میں بہترین بات وہ ہے جو ابن مسعود سے منقول ہوئی کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں لا حول الخ

پڑھا تو آپ نے فرمایا ابن مسعود جانتے ہو کہ اس کی تفسیر کیا ہے۔ تو میں نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔ تو

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کی تفسیر لا حول عن المعصیۃ الا بعصمۃ اللہ ولا قوۃ علی طاعة اللہ الا بعون اللہ یعنی اللہ کی

حفاظت کے بغیر معصیت سے بچا نہیں جاسکتا اور اللہ کی مدد کے بغیر بچا نہیں جاسکتا۔

اور باقی رہا آپ ﷺ کا حول اور قوت کو معصیۃ اور طاعت کے ساتھ خاص کرنا تو یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ دونوں دین کے اہم امور

میں سے ہیں۔ (فی نفسی) جار مجرور اقول کے متعلق ہے۔ اور احتمال ہے کہ حضرت ابو موسیٰ کی مراد یہ ہو کہ میں یہ کلمہ اپنے دل میں کہہ

رہا تھا یا آواز کو بلند کئے بغیر اس کلمہ کو اپنی زبان سے کہہ رہا تھا۔ اور یہی زیادہ مناسب ہے۔ اور باقی رہا کہ آپ ﷺ کا سماع تو وہ یا تو اس لئے کہ آپ ﷺ کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے دل میں یہ بات منکشف ہو گئی ہو یا ان کلمات کو بار بار پڑھنے کی وجہ سے آپ ﷺ نے حضرت ابوموسیٰؓ سے سن لیا ہے۔

قوله: فقال يا عبد الله كنز من كنوز الجنة: یہ ابوموسیٰ اشعری کا نام ہے۔ ”کنز“ کی تین برائے تعظیم ہے۔ یعنی خزانے سے مراد عظیم خزانہ ہے۔ اس کلمہ کا تسمیہ کنز کے ساتھ اس لئے ہے کیونکہ یہ کلمہ بھی اپنی نفاست اور لوگوں کی نظروں سے محفوظ ہونے کی وجہ کنز کی مثل ہے۔ یا اس لئے کہ یہ کلمہ جنت کے ذخائر میں سے ہے۔ یا اس لئے کہ یہ کلمہ جنت کو عمدہ چیزوں کے انتخاب میں سے ہے۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ کنز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کہنے کی وجہ سے ایسا عمدہ ثواب ہوتا جو اس کلمے کے قائل کیلئے جنت میں ذخیرہ ہو جاتا ہے۔

قوله: فقلت بلى يا رسول الله: یعنی ضرور بتلائے۔ کیونکہ نیکی کا کام بتلانے والا بھی نیکی کرنے کی والے کی مثل ہے۔ ابویوب انصاریؓ سے روایت کیا ہے کہ جس رات نبی اکرم ﷺ کو معراج کرائی گئی تو آپ کا گذر جناب ابراہیم علیہ السلام پر ہوا تو جناب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اے محمد! اپنی امت کو حکم دو کہ وہ جنت میں زیادہ سے زیادہ درخت لگائیں اور جنت کا درخت ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ ہے۔ اس کی تخریج احمد و ترمذی نے بھی کی ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور بعض روایات میں آتا ہے کہ لا حول..... جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ شاید اس کے نتائج کا اختلاف اس کے کہنے والے لوگوں کے مراتب کے اختلاف کی وجہ سے ہو۔

الفصل الثانی:

۳۳۰۳: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ غُرِسَتْ لَهُ نُخْلَةٌ فِي الْجَنَّةِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۴/۵ حدیث رقم ۳۵۳۲۔

ترجمہ: ”حضرت جابرؓ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس شخص نے“ سبحان اللہ العظیم و بحمدہ کہا اس کے لئے جنت میں کھجور کا درخت لگا دیا جاتا ہے۔“ (ترمذی)

تشریح: قوله: سبحان اللہ العظیم و بحمدہ: کہا گیا ہے کہ و بحمدہ کی واؤ زائدہ ہے یعنی میں ایسی تسبیح کرتا ہوں جو اللہ کی حمد کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

قوله: غرست له نخلة في الجنة: یعنی یہ غرس ہر مرتبہ کہنے کی وجہ سے ہوگا۔ ”نخلة“ کی تکمیل برائے تعظیم ہے۔ نخلة عظیم۔

یعنی وہ جنت جو اس کے قائل کیلئے تیار کی گئی ہے۔ اور درختوں میں سے کھجور کی تخصیص اس کی منفعت کے کثیر اور اس کے پھل کے عمدہ ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک نے مؤمن اور مومن کے ایمان کی مثال کھجور اور اس کے پھل کے ساتھ بیان کی ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿الم تر كيف ضرب الله مثلا كلمة طيبة﴾ [ابراہیم: ۲۴] اور کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ توحید ہے اور شجرہ طیبہ کھجور کا درخت ہے۔

فائدہ: بزار نے ”فانها عبادة الخلق وبها تقطع ارزاقهم“ کی زیادتی کی ہے۔ یعنی یہ کلمہ مخلوق کی عبادت ہے اور اسی کلمہ کی وجہ

سے مخلوق کے رزق متعین کئے جاتے ہیں۔

۲۳۰۵: وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ صَبَاحٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ إِلَّا مَنَادٌ يُنَادِي سَبِّحُوا الْمَلِكَ الْقُدُّوسَ . (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۲۳/۵ حدیث رقم ۳۶۲۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ایسی کوئی صبح نہیں ہوتی کہ جس میں ایک فرشتہ پکارنے والا پکار کر یہ نہ کہتا ہو“ ”کہ پاک بادشاہ کو اس کی پاکی کے ساتھ یاد کرو۔“ (ترمذی)

تشریح: قولہ: ما من صباح یصبح العباد فیہ: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ صباح کمرہ سیاق نفی میں واقع ہوا ہے اور شمول کا فائدہ پہنچانے کیلئے اس کے ساتھ من استغراقیہ کو ملا دیا گیا۔ اور پھر مزید احاطہ کیلئے یصبح صباح کی صفت مؤکدہ لائی گئی ہے۔ اس کی نظر کلام اللہ میں بھی جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ [۱۰۶: ۱۰۶] ترجمہ:

قولہ: الا مناد ینادی الملک القدوس: یعنی ایسی چیز سے اس کی تنزیہ بیان کرو جس سے وہ نفس الامر میں منزہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کا اعتقاد رکھو کہ وہ منزہ ہے مراد انشاء تنزیہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو ازل اور ابد کے اعتبار سے منزہ ہے۔ اس کو انشاء تنزیہ کی احتیاج نہیں یا مطلب یہ ہے کہ اس کو تسبیح کے ساتھ یاد کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ان من شیء الا یسبح بحمده﴾

[الاسراء: ۴۴]

اسی وجہ سے امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ سبحو کا مطلب ہے قولو سبحان الملک القدوس یا قولو سبحو قدوس رب الملائکة والروح، یا ان کی مثل سبحان اللہ وبحمده سبحان العظیم وبحمد وغیرہ۔

۲۳۰۶: وَعَنِ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلَّهِ.

(الترمذی وابن ماجہ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۰/۵ حدیث رقم ۳۴۴۳۔ وابن ماجہ فی السنن ۲۲۴۹/۱۲ حدیث رقم ۳۸۰۰۔

ترجمہ: ”حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا سب سے بہتر ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد للہ ہے“ (ترمذی ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: افضل الذکر لا الہ الا اللہ: ایک روایت میں افضل الذکر کے بجائے افضل الحسنات آیا ہے۔ جس روایت کو احمد نے نقل کیا ہے وجہ افضلیت یہ ہے کہ اس پر صحت ایمان موقوف ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض محققین نے یہ بات ذکر کی ہے کہ تہلیل کو افضل الذکر اس لئے قرار دیا گیا ہے کیونکہ تہلیل کو ان صفات مذمومہ سے جو ذکر کے باطن میں معبود کا درجہ رکھتے ہیں۔ تطہیر باطن میں ایک خاص قسم کی تاثیر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿افرایت من اتخذ الہہ ہوا﴾ [الحجۃ: ۲۳] یعنی کیا دیکھا ہے آپ نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔ لا الہ سے عام الہ کی نفی ہوتی ہے اور الا اللہ سے توحید ثابت ہوتی ہے اور ذکر ظاہر لسان سے باطن قلب کی طرف عود کرتا ہے اور پھر ذکر قلب میں جگہ بنا لیتا ہے اور ذکر کے اعضاء پر غلبہ پالیتا ہے۔ اور اس ذکر کی حلاوت وہی شخص پاتا ہے جس نے اس کو چکھا ہو۔

قولہ: وافضل الدعاء الحمد للہ: کیونکہ دعا نام ہے اللہ کے ذکر کا اور اللہ سے اپنی حاجت طلب کرنے کا اور الحمد تو ان دونوں چیزوں کو شامل ہے بایں طور کہ جس نے اللہ کی تعریف کی تو گویا اس نے اللہ کی تعریف اللہ نعمت پر کی اور نعمت پر اللہ کی تعریف یہ مزید نعمت کو

طلب کرنا ہے۔ اور یہی چیز شکر کی بنیاد ہے۔ اتنی کلامہ۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لَنْ نَشْكُرَكَ لَا زَيْدًا نَكْفِيكَ﴾ [ابراہیم: ۱۰۷] یہی وجہ ہے کہ الحمد للہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے فاتحہ کو ام القرآن قرار دیا گیا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ الحمد پر دعا کا اطلاق علی طریق المجاز ہے۔ اور شاید الحمد للہ کو افضل الدعاء ٹھہرانا اس حیثیت سے ہے کہ الحمد للہ ایسا لطیف قسم کا سوال ہے کہ جس کا راستہ انتہائی دقیق ہے جیسا کہ کسی شاعر امیہ بن ابی صلت کسی بادشاہ کے دربار میں حصول عطاء کے لئے کہا۔

وَ اِذَا نَسِيتُ عَلَيْكَ الْمَرْءَ يَوْمًا ☆ كَفَاهُ مِنْ تَعْرِفِهِ الشَّاءِ

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ کا قول الحمد للہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی طرف اشارہ اور تلمیح کے باب سے ہو۔ (یعنی پوری فاتحہ افضل دعا ہے) کیونکہ فاتحہ میں مذکور ”اهدنا الصراط المستقیم“ سے زیادہ جامع اور افضل و اکمل دعا کون سی ہو سکتی ہے۔

۲۳۰۷: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ مَا شَكَرَ اللَّهُ عَبْدًا لَا يَحْمَدُهُ.

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۹۶/۴ الحديث رقم ۴۳۹۵

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”حمد شکر کا سر ہے جس بندہ نے خدا کی حمد نہیں کی اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا“۔

تشریح: قولہ: الحمد لله رأس الشكر: یعنی الحمد کا صلہ اللہ محذوف ہے۔ جیسا کہ ایک نسخہ میں ہمد صراحتہ مذکور ہے۔ گویا

کہ الحمد کے علاوہ دیگر الفاظ شکر غیر معتد بہا ہیں۔

قولہ: ما شکر الله عبدا لا يحمدُهُ: گویا کہ الحمد للہ کا تارک رأس الشکر سے اعراض کرنے والے کی طرح ہے۔ بعض شارحین فرماتے ہیں کہ حمد صرف زبان سے ہوا کرتی ہے اور شکر زبان دل اور اعضا سب سے ہوتا ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ زبان سے حمد شکر کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے اور شکر کا بعض ہے اور کسی چیز کا رأس یعنی سر بھی شی کا بعض ہوا کرتا ہے۔ تو اس جہت سے حمد باللسان بھی شکر کا بعض ہے۔ اور باقی رہا بعضیت میں حمد باللسان کو رأس کیوں قرار دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کے ساتھ کسی نعمت کا تذکرہ کرنا اور پھر مولیٰ نعمت کی ثناء کرنا یہ پوشیدگی اعتقاد کی وجہ مکان نعمت پر زیادہ دلالت کرنے والا ہے۔ چونکہ دیگر اعضاء کے اعمال تو احتمال ہے لیکن عمل لسان یہ بات نہیں کیونکہ عمل لسان ہے نطق یعنی بولنا۔ جو دیگر اعضاء کے اعمال کی نسبت زیادہ واضح اور کھلا ہوا ہے۔

ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو

۲۳۰۸: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَوَّلُ مَنْ يُدْعَى إِلَى الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الَّذِي

يَحْمَدُونَ اللَّهَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ۔ (رواهما البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۹۰/۴ الحديث رقم ۴۳۷۳

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن جنت کی طرف جن لوگوں کو پہلے بلایا جائے گا وہ ہوں گے جو خوشی کے وقت بھی اور سختی کے وقت بھی اللہ کی تعریف کرتے ہیں ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الايمان میں نقل کیا ہے“

تشریح: قیامت کے دن جنت کی طرف جن لوگوں کو پہلے بلایا جائے گا ان میں وہ ہوں گے جو صحت اور مرض میں یا

سختی اور خوشحالی میں یا غنی یا فقیر یعنی وہ لوگ کہ جن پر ان کے مولیٰ کی جانب سے جو بھی حکم جاری ہوا خواہ وہ حکم غنا کا ہو یا فقر کا سختی کا ہو

یا آسانی کا ہر حکم میں وہ اپنے مولیٰ سے راضی رہتے ہیں۔ یعنی مراد اس سے ان کی ہمیشہ کی رضاء ہے اور اس انداز میں کسی چیز کے دوام کو بیان کرنا بدیع کے فن کے اسلوبوں میں سے ایک اسلوب ہے۔

۲۳۰۹: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا رَبِّ عَلِّمْنِي شَيْئًا أَذْكُرُكَ بِهِ أَوْ أَدْعُوكَ بِهِ فَقَالَ يَا مُوسَى قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَقَالَ يَا رَبِّ كُلُّ عِبَادِكَ يَقُولُ هَذَا إِنَّمَا أُرِيدُ شَيْئًا تَخْصُنِي بِهِ قَالَ يَا مُوسَى لَوْ أَنَّ السَّمَوَاتِ السَّبْعَ وَعَامِرَهُنَّ غَيْرِي وَالْأَرْضِينَ السَّبْعَ وَضِعْنَ فِي كَفِّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فِي كَفِّهِ لَمَا لَتَّ بِهِنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ (رواه فی شرح السنه)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۹۲/۵ الحدیث رقم ۳۴۳۰۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ پروردگار! مجھے کوئی ایسی چیز سکھلا دے جس کے ذریعہ میں تجھے یاد کروں اور تجھ سے دعا مانگوں! پروردگار نے فرمایا! موسیٰ! لا الہ الا اللہ کہو! موسیٰ نے عرض کیا ”میرے پروردگار! تیرے تمام بندے یہ کلمہ کہتے ہیں میں تو کوئی ایسی چیز چاہتا ہوں جسے تو میرے ہی لئے مخصوص کر دے جس میں میرا اور کوئی شریک نہ ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور میرے علاوہ ان کے سارے کلمین اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور لا الہ الا اللہ یعنی اس کا ثواب دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً ان چیزوں کے پلڑے سے لا الہ اللہ کا پلڑا جھک جائے۔“ (شرح السنہ)

تشریح: قولہ: علمنی شینا اذکوک بہ او ادعوک یعنی اذکار میں سے کوئی ذکر (اذکوک بہ) یہ مرفوع کیونکہ یہ خبر ہے۔ تقدیر عبارت انا اذکوک بہ ہے۔ بعض حضرات نے اسی طرح کہا ہے لیکن اس کو خبر بنانے کی حاجت نہیں کیونکہ یہ شینا کی صفت ہے اور یہ امر کا جواب بھی نہیں اس کی دلیل آپ ﷺ کا فرمان ”او ادعوک“ ہے۔ او ادعوک حرف عطف کے ساتھ زیادہ صحیح ہے اور اکثر کے ہاں او ہے اور اقل کے نزدیک واؤ ہے اور ادعوک میں واؤ پڑھی جائے گی۔

اور پھر حدیث میں لفظ او بظاہر بیان نوع کیلئے ہے کیونکہ واؤ والی روایت اس پر وال ہے۔ (یعنی شی کی ایک نوع ذکر ہے اور ایک نوع دعا ہے)۔ اور احتمال یہ بھی ہے کہ او برائے شک ہو۔ (یعنی آپ ﷺ کو شک گذرا کہ حضرت ابو موسیٰ نے اذکوک کہا یا ادعوک)۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ شی کی تعین دعا سے کی جا رہی ہے یا ذکر سے۔ کیونکہ ہر دعا ذکر ہے اور ہر ذکر دعا ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ ایک لطیف قسم کا سوال ہے۔ یا ادعوک میں دعا بمعنی عبادت ہے اور تقدیر عبارت ہے: ”عبدک بذکرہ“۔ یعنی میں اس شی کو ذکر کر کے یا اس شی کے مضمون کو ذکر کر کے، میں آپ کی عبادت کروں۔

قولہ: فقال یا موسیٰ قل لا الہ الا اللہ: اس لئے کہ لا الہ الا اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ذات اور یکتائی صفات پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ دعا اور ذکر میں سے ہر ایک کو شامل ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ سوال کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ذکر یا دعا کا مطالبہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے علاوہ پر فائق ہو جائیں تو یہاں سوال اور جواب کی مطابقت نہیں (کیونکہ یہ ذکر اور دعا تو دوسرے بھی کرتے ہیں)۔ تو میری طرف سے جواب یہ ہے کہ گویا اللہ نے فرمایا اے موسیٰ تو نے ایک شی حال کو طلب کیا ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ افضل ذکر اور دعا ہے نہیں۔

قولہ: فقال یا رب کل عبادک تخصصی بہ: یعنی موحدین بندے (يقول) يقول صیغہ مفرد لفظ کی اعانت کی وجہ سے

ہے اس کے معنی کا لحاظ کئے بغیر۔ (بہ) یعنی اپنے عام بندوں کے درمیان سے مجھے اس چیز کے ساتھ خاص کر دے۔ کیونکہ طبیعت انسانی اس وقت اچھی طرح خوش نہیں ہوتی جب تک اس کو دوسروں سے ہٹ کر کسی چیز کے ساتھ خاص نہ کر دیا جائے۔ جیسا کہ ایک انسان کے پاس ہیرا موجود ہو جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ یہی حال اسماء و ادعیہ اور انوکھے علوم اور عجیب فنون کا ہے باوجود اس کے کہ جس طریقہ پر عادت اللہ جاری ہے اور یہ اللہ کی عادت رحمت شاملہ اور کامل مہربانی میں سے ہیں۔ زیادہ نافع اور مفید اور گراں قدر چیز وجود کے اعتبار سے زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ جیسے گھاس پھوس نمک اور پانی وغیرہ۔ نہ کہ یا قوت موتی اور زعفران۔ (کیونکہ اول الذکر ان چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں بخلاف ثانی الذکر چیزوں کے) اور اس طرح قرآن مجید یہ کتابوں میں سے گراں قدر کتاب ہے۔ اور دوسری کتابوں کی نسبت زیادہ بھی ہے اور سستی بھی۔ اور اسی طرح علم کیمیا اور اس جیسے دیگر علوم جو محض خیالات فاسدہ ہیں ان علوم کا حامل جبلاء میں سے ہے لیکن وہ علم کیمیا کی وجہ سے جتنا خوش ہوتا اتنا کتاب و سنت کے علم سے نہیں۔ اور حجر اسود زمین میں اللہ کا دانیایاں ہاتھ ہے کما یلیق شانہ اور اللہ کے بندے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں یہ اس مقام ابراہیم سے افضل ہے جس مقام میں جناب ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں ثبت ہو گئے تھے۔ لیکن عوام کا لانعام حجر اسود کے استلام کے مقابلہ میں مقام ابراہیم کی زیارت سے زیادہ خوش ہوتے ہیں اور انہیں گراں قدر چیزوں میں سے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت بھی ہے۔ جو کلمات میں سے زیادہ اشرف اور عبادات میں سے زیادہ نفیس اور اذکار میں سے زیادہ افضل اور نیکیوں میں سے زیادہ اکمل ہے۔ اور یہ وجود کے اعتبار سے اکثر اور حصول کے اعتبار سے زیادہ آسان ہے لیکن عوام اس کو چھوڑ کر انوکھے اسماء اور عجیب دعاؤں کی مواظبت کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ جن غریب اسماء اور عجیب ادعیہ کی غالباً کتاب و سنت میں کوئی بنیاد تک نہیں ہوتی۔ تو گویا کہ اللہ پاک نے اپنے کلیم کی زبان پر وہ چیز جاری فرمادی جو رب عظیم کی جانب سے جواب کا سبب بن جائے تاکہ خواص و عوام کے سامنے اس کلمہ کی جلالت شان ظاہر ہو جائے کہ وہ حصول مقصود کے حصول کیلئے ہر زمانے اور ہر مکان میں اس کلمہ کا اہتمام کریں۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کیونکہ یہ کلمہ دائرہ اذکار کا قطب اور نقطہ اسرار کا مرکز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں وارد ہوا ہے کہ ”لا الہ الا اللہ“ اور اللہ کے درمیان کو حجاب نہیں یہ کلمہ فوراً اللہ کی طرف پہنچ جاتا ہے۔

قولہ: لو ان السموات السبع..... الخ: امام طیبی فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ملنے والے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اے موسیٰ! تو نے ایسے امر کا مطالبہ کیا ہے جو تیرے ساتھ مختص ہو اور تمام اذکار پر فائق ہو یہ مجال ہے کیونکہ یہ کلمہ آسمان اور اہل زمین اور اس کے پہاڑ ان تمام کائنات پر راجح اور غالب ہے۔ اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ خلاصہ جواب یوں ہے کہ یہ کلمہ افضل ذکر ہے جیسا کہ حدیث سابق میں گذرا ہے۔ اور خواص کی خصوصیت اس کلمہ کے معانی کو سمجھنے اور اس کی معانی کی تحقیق اور جو کچھ اس کلمہ میں ہے اس پر یقین کرنے اور اس کلمہ کے ذکر میں اخلاص اور اس پر بیٹگی کرنے اور اس کی طرف محبت کا میلان کرنے اور اسی کی وجہ سے لذت و سرور حاصل کرنے اور صاحب کلمہ کا مراقبہ اور مشاہدہ کرنے کے اعتبار سے ہے۔

(وعامروہن) یہ منصوب ہے اور اس عطف ہے السموات پر۔ اور عامر الشیعی کے محافظ مصلح اور مدبر کو کہا جاتا ہے جو شی کو ضلل پڑنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کے رہائشی اور مقیم کو عامر کہا جاتا ہے اور یہ عمرت المکان سے ہے۔ اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب آپ کسی مکان میں اقامت اختیار کر لیں۔ اور یہاں معنی اعم یعنی ساکن مراد ہے تاکہ اللہ کے ارشاد غیبی کا استثناء درست ہو سکے۔

(غیبی) یہ بات امام طیبی نے کہی ہے اور بعض نے غیرہ کہا ہے۔ ضمیر کا مرجع ساکن یعنی ان کے ساکن کے علاوہ اس صورت میں استثناء منقطع ہے۔ یا عامرہن سے ممسکین مراد لیا جائے تو اس صورت میں استثناء متصل ہوگا۔ کیونکہ اللہ بھی ممسک ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان اللہ یمسک السموات والارض ان تزولا﴾

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ عامرہن سے آسمانوں کے عاجزی جنس مراد ہے۔ خواہ وہ فرشتہ ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور۔ اور اللہ بھی آسمانوں کی حفاظت اور نور پیدا کرتے کے اعتبار سے عامرہ ہے۔ تو لہذا اللہ بھی عامر آسمان کی جنس میں اس حیثیت سے داخل ہیں کہ آسمانوں کی صلاح ذات باری تعالیٰ پر موقوف ہے۔ جیسا کہ ان کی صلاح ساکن پر موقوف ہے۔ اسی وجہ سے استثناء فرمایا یا اور ایک صورت یہ ہے کہ یاغیری یا عامر سے مراد حاضر لیا جائے۔ تو اللہ بھی ان آسمانوں میں علم اور اطلاع کے اعتبار سے حاضر اور موجود ہے۔

(والارضین) راء کے فتح اور سکون کے ساتھ ہے۔ (السبع) یعنی سات طبق مراد ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سات اقلیم مراد ہیں۔ لیکن یہ بات ان کی ضعیف ہے۔ (وضعن) مجہول کا صیغہ ہے۔ (فی کفۃ) کاف کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یعنی میزان کے دو پلوں میں ایک پلڑا ہے۔ اور کفۃ کا اطلاق ہر گول چیز پر کیا جاتا ہے۔ (ولا الہ الا اللہ) یعنی اس کلمے کا مفہوم یا اس کلمے کا ثواب رکھا جائے۔ (فی کفۃ) اور اس پر حدیث بطاقتہ بھی دلالت کرتی ہے۔ (لمالت بہن) یعنی یہ کلمہ ان ساری چیزوں کے مقابلہ میں راجح اور غالب ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ساری چیزیں اللہ کے سوا اللہ کے وجود کے پیش نظر معدوم کی مثل ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاکت سے دوچار ہونے والی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ معدوم چیز ثابت اور موجود چیز کا موازنہ اور مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور حدیث بطاقتہ میں آپ ﷺ نے فرمایا ”لا یغفل مع اسم اللہ شیء کا یہی مطلب ہے یعنی اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز ذوق نہیں ہو سکتی۔ (لا الہ الا اللہ) یہ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لانے کے قبیل سے ہے۔ ممکن ہے کہ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لا الہ الا اللہ کو لانا برائے تعجب یا بر بنائے چنگلی تلقین ہو۔

اختلاف روایت: اس کو ابن حبان اور نسائی نے ابوسعید خدریؓ سے اور بزار نے ابن عمر سے مرفوعاً ”لَوْنِ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ السَّبْعِ فِي كَفَّةٍ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فِي كَفَّةٍ مَّالَتْ بِهِمْ“ کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یعنی کلمہ لا الہ الا اللہ ان ساری چیزوں پر راجح اور زیادہ ہو جائے گا۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ باء برائے تعدیہ ہے۔ تو مالت بہم املتہن کے معنی میں ہوگا۔ تو اس صورت میں رجب اور زیادتی والی تفسیر بالالزام ہوگی۔ (اس لئے کہ کسی کو جھکا دینا یا لازم ہے راجح ہونے کو)۔ اور مالت بہم میں ہم ضمیر برائے ذوی العقول ذوی العقول کی شرافت کے پیش نظر لائی گئی ہے۔ جیسا کہ اس کے برعکس صن ضمیر غیر ذوی العقول تعلیمیا ان کی کثرت کی وجہ سے لائی گئی ہے۔ اور یہ حدیث اس بات کی بہت زیادہ صراحت کرنے والی ہے کہ افضل الذکر لا الہ الا اللہ ہے کیونکہ اس کے ثواب سے بڑھ کر کوئی ثواب نہیں ہے۔

۲۳۱۰: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ صَدَّقَهُ رَبُّهُ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا وَأَنَا أَكْبَرُ وَإِذَا قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ يَقُولُ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا وَحْدِي لَا شَرِيكَ لِي وَإِذَا قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا لِي الْمُلْكُ وَلِي الْحَمْدُ وَإِذَا قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا لِي وَكَمَا يَقُولُ مَنْ قَالَهَا فِي مَرَضِهِ ثُمَّ مَاتَ لَمْ تَطْعَمَهُ النَّارُ. (رواه الترمذی وابن ماجہ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۶۱۵ حدیث رقم ۳۴۹۰۔ وابن ماجہ ۱۲۴۶۱۲ حدیث رقم ۳۷۹۴۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدریؓ و حضرت ابو ہریرہؓ دونوں کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص یہ کہتا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ بہت بڑا ہے تو اس کا رب اس کی تصدیق کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لا الہ الا انو انا اکبر بیشک میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں بہت بڑا ہوں جب وہ شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو کیتا

ہے اس کا کوئی شریک نہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں میرے ہی لئے بادشاہت ہے اور میرے ہی لئے تعریف ہے اور جب وہ شخص یہ کہتا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گناہوں سے بچنا اور اطاعت کی قوت پانا اللہ ہی کی مدد سے ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں گناہوں سے بچنا اور اطاعت کی قوت پانا میری ہی مدد سے ہے نیز نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص ان کلمات کو اللہ تعالیٰ کے جوابوں کے علاوہ اپنی بیماری میں کہتا رہے اور پھر مرجائے تو اسے آگ نہیں جلانے کی یعنی وہ دوزخ کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔ (ترمذی وابن ماجہ)

تشریح: قولہ: (قال رسول ﷺ..... قال) یعنی قال کا فاعل ربہ ہے۔ یعنی اس کا رب اسکے بیان کی تصدیق کے طور پر فرماتا ہے۔ (لا الہ الا انا وانا اکبر) یہ اللہ پاک کے قائل کیلئے صحت کہنے سے زیادہ بلیغ ہے۔ (واذا قال) یعنی قال کا فاعل عبد ہے۔ (لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک له یقول اللہ) یعنی اپنے بندے کی تصدیق کے طور پر کہا جاتا ہے۔ (لا الہ الا انا وحدی ولا شریک لی) یعنی ذات و صفات میں میرا کوئی شریک نہیں۔ اور یہاں جملہ صدقہ ربہ کو اس لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ ما قبل سے اس کا علم ہو جاتا ہے۔ بطور تفسیر فی الکلام یہاں اللہ کے فرمان کو یقول کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور اس سے سابق میں اور آئندہ آنے والے مقام میں یقال سے تعبیر کیا۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اختلاف تعبیر میں ایک مقام پر یقول سے تعبیر کرنا اس حالت مستمرہ دائمہ کے ازلی اور ابدی طور پر استحضار کی وجہ سے ہو۔ (یعنی اللہ کی یہ تصدیق و امانہ امانی کے ساتھ مقید نہیں بلکہ جس وقت سے بندے یہ کہتے آ رہے ہیں اور کہتے رہیں گے۔ اللہ پاک بھی تصدیق کرتے آ رہے ہیں کرتے رہیں گے۔ تو حیدر محض اور تفرید محض پر مشتمل ہونے کی وجہ سے دیگر کلمات کی نسبت اس کلمے کی خصوصیت کے طرف اشارہ ہے۔

(واذا قال لا الہ الا اللہ له الملك وله الحمد) یعنی حمد اس کے غیر کیلئے نہیں جیسا کہ یہ حصر تقدیم مفعول سے سمجھا جا رہا ہے۔ اور لہ کلام برائے ملک و تحقیق و اختصاص ہے (یعنی حمد اور ملک اللہ کی ملک ہے اور اللہ ہی ان کا مستحق ہے اور یہ چیزیں اللہ ہی کے ساتھ مختص ہیں)۔

(قال لا الہ الا انا لی الملك ولی الحمد) یعنی جس طرح میرے بندے نے کہا۔ (واذا قال لا الہ الا اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ) اور ولا حول میں واویا تو برائے عطف ہے یا برائے حال لیکن اس کا حالیہ ہونا زیادہ ظاہر ہے یہی وجہ ہے کہ آنے والے جملہ میں واؤ کو ترک کر دیا گیا۔ (قال لا الہ الا انا لا حول) اور ایک نسخہ میں ما قبل والے ولا حول سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے ولا قوۃ ہے۔ (ولا فوق الا بی) یعنی جیسا کہ میرے بندے نے اس کا اقرار کیا ہے۔ (وکان) یعنی جناب نبی اکرم ﷺ ہیں۔

(یقول من قالها) یعنی ضمیر کا مرجع یہ کلمات ہیں ان کے جوابات نہیں۔ (فی مرضہ ثم مات) یعنی موت اسی مرض کی وجہ سے ہو۔ (لم تطعمہ النار) یعنی آگ ان کلمات کے قائل کو نہ تو جھلسائے گی نہ جلانے گی۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ لم تطعمہ لم تاکلہ کے معنی میں ہے اور یہاں بطور مبالغہ استعارۃً طعم کو جلانے کے معنی استعمال کیا گیا ہے۔

۲۳۱: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ أَنَّهُ دَخَلَ مَعَ النَّبِيِّ عَلَى امْرَأَةٍ وَبَيْنَ يَدَيْهَا نَوْمٌ أَوْ حَصَى تُسَبِّحُ بِهِ فَقَالَ
أَلَا أُخْبِرُكَ بِمَا هُوَ أَيْسَرُ عَلَيْكَ مِنْ هَذَا أَوْ أَفْضَلُ سُبْحَانَ اللَّهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي السَّمَاءِ وَسُبْحَانَ اللَّهِ عَدَدَ
مَا خَلَقَ فِي الْأَرْضِ وَسُبْحَانَ اللَّهِ عَدَدَ مَا بَيْنَ ذَلِكَ وَسُبْحَانَ اللَّهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ وَاللَّهُ أَكْبَرُ مِثْلَ ذَا
لِكَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ مِثْلَ ذَلِكَ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مِثْلَ ذَلِكَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ مِثْلَ ذَلِكَ.

(رواہ الترمذی و ابو داؤد و قال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۰/۲ حدیث رقم ۱۵۰۰۔ و الترمذی فی السنن ۲۲۲/۵ تحت رقم ۳۶۳۹۔

ترجمہ: ”حضرت سعد بن وقاصؓ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ایک خاتون کے ہاں گئے اس خاتون کے سامنے کھجور کی گھلیاں یا کنکریاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ ان پر تسبیح پڑھ رہی تھی نبی کریم ﷺ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا ”کیا میں تمہیں ایک ایسی تسبیح نہ بتا دوں جو اس تسبیح کے مقابلہ میں تمہارے لئے بہت آسان بھی ہے بلکہ وہ تسبیح بہت بہتر ہے اور وہ تسبیح یہ ہے: سُبْحَانَ اللَّهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي السَّمَاءِ وَسُبْحَانَ اللَّهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي الْأَرْضِ وَسُبْحَانَ اللَّهِ عَدَدَ مَا بَيْنَ ذَلِكَ وَسُبْحَانَ اللَّهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ۔ اللہ کے لئے پاکی ہے اس مخلوق کی بقدر جو زمین و آسمان کے درمیان ہے اور اللہ تعالیٰ کیلئے پاکی ہے اس مخلوق کی تعداد کے بقدر جو اسکے بعد ازل سے ابد تک کی جانے والی ہے اور اللہ اکبر بھی اسی طرح پڑھے اور الحمد للہ بھی اسی طرح پڑھے اور لا الہ الا اللہ بھی اسی طرح پڑھے اور لا حول وال قوۃ الا باللہ بھی پڑھے۔ (ترمذی ابو داؤد) امام ترمذی فرماتے ہیں: ”یہ حدیث غریب ہے“ اور ایک نسخہ میں حسن غریب کے الفاظ ہیں۔

تشریح: انہ دخل مع النبی ﷺ علی امراة: یعنی یہ عورت یا تو آپ ﷺ کی محرم تھی۔ یا یہ واقعہ حکم جناب نازل ہونے سے پہلے کا ہے پھر داخل ہونے سے دیکھنا لازم نہیں آتا اور اگر روایت پائی جائے تو اس پر حصول شہوت لازم نہیں آتا۔ (وبین یدہا) واو حال یہ ہے۔ (نوی) یہ نواۃ کی جمع ہے۔ اور نواۃ کھجور کی گھلی کو کہتے ہیں۔ (او حصی) یہ شک راوی کی جانب سے ہے۔ (تسبیح) فاعل امراة ہے۔ (بہ) یعنی ضمیر کا مرجع گھلی یا کنکری ہے اور یہ حدیث آپ ﷺ کی تقریر کی وجہ سے دانوں والی تسبیح کے جواز کیلئے صحیح بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ یہ تسبیح بھی ان کنکریوں اور گھلیوں کے معنی میں ہے اس لئے کہ جس چیز سے شمار کیا جائے خواہ وہ پروٹی ہو یا بکھری ہوئی ہو اس میں کوئی فرق نہیں۔ لہذا جو لوگ اس مردجہ تسبیح کو بدعت کہتے ہیں ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔

اور بعض مشائخ کہتے ہیں کہ یہ تسبیح شیطان کا گھوڑا ہے اور یہ واقعہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ ایک دن کسی نے حضرت جنیدؒ کی وصول اللہ کی انتہائی حالت میں ان کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی اور پوچھا کہ حضرت یہ کیا تو آپ نے جواب دیا کہ ہم اسی تسبیح کی وجہ سے تو اللہ کی طرف پہنچے ہیں۔ اب بھلا اس کو کیسے پھوڑ دیں۔ حضرت جنیدؒ کا یہ قول شاید صوفیاء کے قول النہایۃ ہی الرجوع الی البدایۃ کے مطالب میں سے ایک مطلب ہے یعنی انتہا درحقیقت ابتدا کی طرف لوٹنا ہے۔

(فقال) قال کا فاعل نبی اکرم ﷺ ہیں۔ (والا اخبرک بما هو یسر) یعنی زیادہ آسان اور ہلکا (علیک من هذا) یعنی اس تعداد سے۔ (او افضل) بعض حضرات کہتے ہیں کہ او یہ حضرت سعدؓ کے جانب سے شک یا ان کے علاوہ کی جانب سے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ او واؤ کے معنی میں ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ او بل کے معنی میں اور بل کے معنی میں ہونا اس کا زیادہ ظاہر۔

علامہ ابن ملکؒ امام طبریؒ کی متابعت میں فرماتے ہیں کہ ان کے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات میں اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ بایں طور کہ بندہ اس کی ثناء کا احاطہ کرنے پر قادر نہیں۔ اور گھلیوں سے شمار کرنے میں اس بات پر اقدام ہے کہ وہ احصاء اور احاطہ پر قادر ہے۔ اتمی کلام۔

لیکن ابن ملک کی یہ بات قابل اشکال ہے اس لئے کہ گھلیوں سے شمار کرنے میں اس قسم کا اقدام لازم نہیں آتا۔ اور اس قسم کی چیز پر اقدام عوام کا انعام ہی کر سکتے ہیں۔ بلکہ مراد کو اللہ زیادہ جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے اس عورت کی کثرت الفاظ کے عالم سے

حقائق اور معانی کی وحدۃ کی طرف ترقی کا ارادہ کیا ہو۔ اور حقائق و معانی کی وحدت گنتی سے خارج ہے بلکہ یہ مدد امداد پر موقوف ہے۔ یا یہ ہے کہ اذکار کے سلسلہ میں شمار اس عورت کے دل میں ایک حال سا پیدا کر دیتا ہو۔ جو حال ہر حالت میں اس کے دل میں کھٹکتا رہتا ہو۔ اور یہ چیز ارباب کمال کے ہاں عیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب کمال میں کسی نے اپنے دوست کو فرمایا جو گن گن کر دے رہا تھا کہ تو گناہ اندازے کے ساتھ کرتا ہے اور معصیت بغیر لکھنے کے اور اللہ کو حساب سے یاد کرتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ جب اللہ بندے پر انعام بلا احصاء کرتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِن تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تَحْصُوْهَا﴾ [ابراہیم: ۳۴] تو اس لئے معاملہ میں بہتر مقابلہ علی وجہ الممانئہ ہونے چاہئے۔ (یعنی جس طرح نعمت من جانب اللہ بلا حساب ہے تو اس کی یاد بھی بلا حساب ہونی چاہئے)۔ تو اس لئے سالک اللہ کو بغیر حساب کے یاد کرے یا اس حدیث میں جمیع اشیاء کی تسبیح کی صورت میں مقامِ مکاشفہ کی طرف اشارہ ہے۔ ”کما قال تعالیٰ: ﴿ان من شیء الا یسبح بحمدہ و لکن لا تفقہون تسبیہہ﴾ [اسراء: ۴۴]

(وسبحان اللہ عدد ما خلق فی الارض) یعنی جملہ عالم سفلیات ہیں۔ بعض حضرات نے اسی طرح کہا ہے لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں متعین زمین و آسمان ہی مراد ہیں۔ اس کی دلیل آپ ﷺ کا ارشاد (وسبحان اللہ عدد ما بین ذالک) ہے یعنی مذکورہ آسمان و زمین کے درمیان کی چیزیں خواہ وہ ہوا ہو یا پرندے یا اس کے علاوہ بادل وغیرہ۔ (وسبحان اللہ عدد ما خلق) یعنی ان چیزوں کی تعداد کے برابر جن کا وہ خالق ہے یا جن چیزوں کو بعد میں پیدا کرنے والا ہے اور اسی کو علامہ ابن حجر نے اختیار کیا ہے اور زیادہ ظاہر بھی یہی ہے۔ لیکن زیادہ دقیق اور مخفی قول وہ ہے جس کے قائل امام طیبی ہیں۔ یعنی جن چیزوں کا وہ اول سے ابد تک خالق ہے ان چیزوں کی تعداد کے برابر اللہ کی پاکی، اور مراد اس سے دوام و استمرار ہے اور یہ چیزوں کی تفصیل کے بعد ان کا اجمال ہے اسلئے کہ جب اسم فاعل کا اسناد ذات باری تعالیٰ کی طرف ہو۔ تو اس میں ابتدائے خلق سے ابد تک استمرار ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ جب آپ یوں کہتے ہیں کہ اللہ قادر عالم تو اللہ کے علم و قدرت کے سلسلہ میں آپ کا قصد کسی زمانہ متعین کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔

(واللہ اکبر مثل ذالک) امام طیبی فرماتے ہیں۔ کہ عدد ماہو خالق میں لفظ عدد قرآن سابقہ کی وجہ سے مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔ اور بعض شارحین نے نزل کو بھی منصوب کہا ہے۔ کیونکہ یہ مثل بھی عدد کے معنی میں ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی: ”اللہ اکبر عدد ما ہو خالقہ“ یعنی جن چیزوں کا اللہ خالق ہے ان چیزوں کی تعداد کے برابر اللہ اکبر۔ تو گویا اشارہ ذالک کا مرجع مذکورہ زیادہ قریبی کو بنایا گیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ مشار الیہ مذکورہ تمام چیزیں ہیں تقدیر عبارت یوں ہوگی ”اللہ اکبر عدد ما خلق فی السماء واللہ اکبر عدد ما خلق فی الارض واللہ اکبر عدد ما بین ذلک۔ واللہ اکبر عدد ما ہو خالق۔“

(الحمد للہ مثل ذالک) یعنی اس طریقے پر۔ (ولا الہ الا اللہ مثل ذالک) یعنی اس حالت پر (ولا حول ولا قوۃ الا باللہ مثل ذالک) یعنی اسی طرح۔ اظہر بات یہی ہے کہ یہ اختصار راوی کی جانب سے ہے۔ راوی نے ملالت طوالت کے ڈر سے حدیث کے آخری حصہ کو بالمتنی نقل کر دیا ہے۔ اور یہ جو ہم نے کہا ہے اس پر بعض آثار دلالت کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۲۳۱۲: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ سَبَّحَ اللَّهُ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعِشِيِّ كَانَ كَمَنْ حَمَلَ عَلَى مِائَةِ فَرَسٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَنْ هَلَّلَ اللَّهُ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعِشِيِّ كَانَ كَمَنْ أَعْتَقَ مِائَةَ رَقَبَةٍ مِنْ وُلْدِ إِسْمَاعِيلَ وَمَنْ كَبَّرَ اللَّهُ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعِشِيِّ لَمْ يَأْتِ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ أَحَدٌ بِأَكْثَرِ مِمَّا أَتَى بِهِ إِلَّا

مَنْ قَالَ مِثْلَ ذَلِكَ أَوْ زَادَ عَلَيَّ مَا قَالَ. (رواه الترمذی وقال هذا حدیث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۶/۵ حدیث رقم ۳۵۳۸۔

ترجمہ: ”حضرت عمر و ابن شعیب اپنے والد مکرم سے اور وہ اپنے جد محترم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص سومرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سومرتبہ دن کے آخری حصہ میں سبحان اللہ کہے تو وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے سوچ کئے ہوں جو شخص سومرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سومرتبہ دن کے آخری حصہ میں الحمد للہ کہے تو اس شخص کی مانند ہے جس نے سو آدھیوں کو خدا کی راہ میں سو گھوڑوں پر سوار کرایا ہو جو شخص سومرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سومرتبہ دن کے آخری حصہ میں لا الہ الا اللہ کہے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے سو غلام آزاد کئے ہوں اور جو شخص سومرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سومرتبہ دن کے آخری حصہ میں اللہ اکبر کہے تو اس دن کوئی شخص اس ثواب سے زائد ثواب لے کر نہیں آئے گا جو وہ لائے گا علاوہ اس شخص کے جس نے اس کی مانند مذکورہ تعداد میں کہا ہوگا تو یہ شخص درجہ ثواب کے اعتبار سے اس کے برابر ہوگا یا وہ شخص جس نے اس سے زائد کہا ہوگا۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے فرمایا: ”یہ حدیث حسن غریب ہے۔“

تشریح: مائتہ: یعنی جس نے سومرتبہ سبحان اللہ کہا۔ (بالعدۃ) غین اور دال دونوں مفتوح ہیں ان کے بعد الف ہے اور غین کا مضموم ہونا اور دال ساکن ہونا بھی جائز ہے اس صورت میں دونوں کے بعد واؤ ہوگا۔ یعنی غدوۃ۔

(ومائتہ بالعشی) یعنی دن کے ابتدائی حصہ میں اور رات کے ابتدائی حصہ میں یا صبح اور رات بھر۔ (کان کمن حج مائتہ حجۃ) یعنی حج سے مراد حج نفل ہے۔ حدیث اس بات پر دال ہے کہ ایسا ذکر جو ذات باری تعالیٰ کی حضوری شرط کے ساتھ باسانی ہو جائے وہ غفلت کی حالت میں کی ہوئی عبادات شاقہ سے افضل ہے۔ ممکن ہے کہ حدیث مبالغہ فی التزیغ کی وجہ سے ناقص کو کامل کے ساتھ لاحق کرنے کے قبیل سے ہو۔ حدیث سے دگنے اجر والی تسبیح اور غیر دگنے اجر والے حج کے درمیان تساوی کا ارادہ کیا گیا ہو۔

(ومن حمد اللہ مائتہ بالبداء و مائتہ بالعشی کان کمن حمل) حمل تخفیف کے ساتھ یعنی سو آدھیوں کو سوار کیا۔ (علی مائتہ فرس فی سبیل اللہ) سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے۔ یہ سوار کرنا صدقہ کے طور پر ہو یا عادت کے طور پر۔ اس حدیث میں ذکر کیلئے ذکر کے بارے میں ترغیب ہے۔ تاکہ وہ دنیا کی طرف التفات نہ کرے۔ اور اپنے ارادے کو اپنے مولیٰ کی حضوری میں مجتمع کرے۔ اس لئے کہ مولیٰ کی حضور ہی جمیع عبادات بدنیہ و مالیہ سے مقصود ہے۔ اور ان عبادات مالی و بدنی کا مرکب اللہ کا ذکر ہے۔ اور مطلوب وسیلہ سے زیادہ بہتر ہوا کرتا ہے۔ (یعنی ذکر اللہ وسیلہ سے اس سے مطلوب حضوری مع اللہ)۔

(ومن هلل) یعنی جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ (مائتہ مرۃ بالغدوۃ و مائتہ بالعشی کان کمن اعتق مائتہ رقبۃ) اس جملہ حدیث میں ان ذکرین کیلئے تسلی ہے۔ جو بوجہ فقر ان عبادات مالیہ سے عاجز ہیں جو مالدار لوگوں کے ساتھ مختص ہوتی ہیں۔ (من ولد اسماعیل) لفظ ولد واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے اور ان دونوں کا مفتوح ہونا بھی درست ہے۔ یعنی ولد اس کا اطلاق واحد تنزیہ جمع سب پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ عرب جو جناب اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ کیونکہ غلاموں کی اصناف میں سے یہ افضل صنف ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہمارے نبی ﷺ کے اقارب میں سے ہیں۔ اور یہ معنی محقق میں ایک قسم کا مبالغہ اور تعظیم ہے۔

(ومن کبر اللہ..... ذالک الیوم) یوم سے مراد یوم قیامت ہے۔ (باکثر) یعنی اس سے اکثر ثواب نہیں لائے گا۔ یا اس سے مراد افضل عمل نہیں لائے گا۔ اس لئے کہ اکثر افضل کے معنی میں ہے۔ (مما اتی بہ) یعنی جو اس ذکر کو لایا ہے یا اس کی مثل کو۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ آخری ذکر ماقبل والے تمام اذکار سے افضل ہے۔ اور جس چیز پر احادیث صحیحہ کثیرہ دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ افضلیت کی ترتیب یوں ہے۔ پہلے تہلیل پھر تہمید پھر تکبیر پھر تسبیح۔ (حالانکہ یہاں تکبیر سب سے افضل ہے)۔ تو اس لئے یہاں

تادیل کی جائے گی اور تقدیر عبارت کے طور پر یوں کہا جائے گا 'لم یات فی ذالک الیوم احد غیر المهمل والحامد۔ اکثر مما اتی بہ' یعنی قیامت کے دن کوئی صلیل اور حامد کے علاوہ اس سے بڑھ کر ثواب نہیں لائے گا جو یہ مذکور لایا ہے۔

۲۳۱۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ التَّسْبِيحُ نِصْفُ الْمِيزَانِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ يَمْلُؤُهُ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَيْسَ لَهَا حِجَابٌ دُونَ اللَّهِ ﷻ حَتَّى تَخْلُصَ إِلَيْهِ .

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب ولیس اسنادہ بالقوی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۷/۵ حدیث رقم ۳۵۸۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا 'سبحان اللہ کہنا آدمی میزان اعمال کو بھر دیتا ہے الحمد اللہ کہنا پوری میزان عمل کو بھر دیتا ہے اور لا الہ الا اللہ کے لئے خدا تک کوئی پردہ حائل نہیں یہ سیدھا خدا تک پہنچاتا ہے' امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ 'یہ حدیث غریب ہے، اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔' اھ۔ یعنی اس کی سند ضعیف ہے۔ لیکن اعمال کی فضیلت کے سلسلہ میں اس حدیث پر عمل کیا جائے گا۔

تشریح: نصف المیزان: یعنی اس کا ثواب مجسم ہونے کے بعد نصف میزان کو بھر دے گا اس سے مراد میزان کے دو پلڑوں میں سے ایک پلڑا مراد ہے جو نیکیاں رکھنے کیلئے بنایا گیا ہے۔ (والحمد للہ یملاہ) یعنی پورے میزان کو بھر دے گا یا نصف میزان کو۔ دوسرا احتمال زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ جملہ اذکار و چیزوں میں منحصر ہیں۔ (۱) تحمید۔ (۲) تنزیہ۔ (اور یہاں صرف تحمید ہے اس لئے یہ نصف ذکر ہے نصف میزان کو بھرے گا)۔

امام طیبی فرماتے ہیں۔ نصف میزان تسبیح ہے اور دوسرا نصف تحمید ہے۔ تسبیح اور تحمید مسادی ہیں۔ اور حدیث ثقیلتان فی المیزان اس کے زیادہ مناسب ہے۔ اور تحمید کی تسبیح پر فضیلت کا بھی احتمال ہے۔ کہ اکیلا الحمد للہ میزان کو بھر دے گا۔ کیونکہ یہ تنزیہ کو بھی شامل ہے۔ اس لئے کہ الحمد للہ یہ وصف بالکمال ہے اور وصف بالکمال نقصان کی نفی کو بھی متضمن ہے۔ اور نقصان کی نفی تنزیہ کہلاتی ہے۔ اور اس کی تائید جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد (ولا الہ الا اللہ لیس لہا.....) سے ہوتی ہے کیونکہ یہ تہلیل تحمید اور تنزیہ دونوں کے متعلق ہے۔ اسی وجہ سے یہ تہلیل موجب قرب باری تعالیٰ ہے۔ اور آپ ﷺ کے ارشاد (حتی تخلص) کا یہی مطلب ہے تخلص لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ (الیہ) یعنی اللہ کے پاس پہنچ جائے۔ اور محل قبولیت میں جا پڑنے۔ لیس لہا حجاب والے جملے یا اس کی مثل دوسرے جملوں سے سرعت قبولیت اور کثرت اجر و ثواب مراد ہے۔ اور اس حدیث میں اس بات پر ظاہری دلالت ہے کہ لا الہ الا اللہ سبحان اور الحمد للہ سے افضل ہے۔

۲۳۱۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷻ مَا قَالَ عَبْدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُخْلِصًا قَطُّ إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ

أَبْوَابُ السَّمَاءِ حَتَّى يُفِضَ إِلَى الْعَرْشِ مَا اجْتَنَبَ الْكِبَائِرَ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۳۳/۵ حدیث رقم ۳۶۶۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی بندہ خلوص قلب کے ساتھ یعنی بغیر ریا کے لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو اس کلمہ کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ عرش تک پہنچتا ہے یعنی جلد قبول ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کلمہ کہنے والا کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: عبد: یعنی اپنی عبدیت اور اپنے وجود کے حدوث کا شعور رکھتے ہو۔ اور اپنے رب کی الوہیت اور اپنے معبود کی واحدانیت کو یاد کرتے ہوئے۔ (لا الہ الا اللہ مخلصاً) یعنی ریاء اور شہرت کی نیت سے نہ کہے یا مؤمن ہونا مقنی نہ ہو۔ (ابواب السماء حتی یفرضی) لفظ یفرضی یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ای یصل۔ (الہی لعرش ما اجتنب) اجتنب کا فاعل قائل ہے۔ (الکباثر) اور ایک نسخہ میں اجتنب صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور کبار نیابت فاعل کی بناء پر مرفوع ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں حدیث سابق تہلیل کے تجاویز من العرش پر دلالت کرتی ہے۔ حتی کہ تہلیل اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچ جاتی ہے۔ لیکن مراد چونکہ اس سے سرعت قبولیت ہے۔ اور کبار سے اجتناب سرعت قبولیت کی شرط ہے۔ ثواب قبولیت کی شرط نہیں۔ اس طرح کبار سے اجتناب کمال ثواب کی شرط ہے یا قبولیت کے اعلیٰ مراتب کی شرط ہے۔ اس لئے کہ برائی نیکی کو ضائع نہیں کرتی بلکہ نیکی برائی کو ختم کر دیتی ہے۔ اور اس حدیث کا یہ مطلب حدیث سابق کے مطابق ہے۔ اور باقی علامہ ابن حجر کا الا فتحت لہ کی وضاحت کرتے ہوئے: ای لروحه عقب موتہ کی تقدیر عبارت تقدیر غیر مجملہ ہے۔ (یعنی اس عبارت کی تقدیر اس محل کے مناسب نہیں ہے)۔ اور نہ ہی اس کی طرف احتیاج ہے اور پھر اس تقدیر عبارت کی یہ علت بیان کرنا کہ وہ قائل چونکہ مؤمنین میں سے ہے اور مؤمنین کیلئے آسمان کے دروازے کھولے جاتے کافروں کیلئے نہیں۔ اس لئے قائل مؤمن کی روح کیلئے اس کی موت کے بعد آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ یہ علت بیان کرنا بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث میں کبار سے اجتناب کے ساتھ مقید ہے۔

۲۳۱۵: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَقِيْتُ اِبْرَاهِيمَ لَيْلَةَ اُسْرَى بِي فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِقْرَأْ اُمَّتَكَ مِثِّي السَّلَامَ وَاخْبِرْهُمْ اَنَّ الْجَنَّةَ طَيِّبَةُ التَّرْبَةِ عَذْبَةُ الْمَاءِ وَاَنَّهَا قِيَعَانٌ وَاَنَّ غِرَّاسَهَا سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا اِلَهَ اِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ اَكْبَرُ . (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۳/۵ حدیث رقم ۳۵۲۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس رات مجھے معراج کی سعادت نصیب ہوئی اس رات میں ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے سے فرمایا کہ ”محمد! اپنی امت کو میرا سلام کہئے گا اور انہیں بتا دیجئے گا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے اس کا پانی شیریں ہے اس کا میدان خالی ہے اور اس کے درخت ہیں سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا اِلَهَ اِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ اَكْبَرُ۔ امام ترمذی اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت باعتبار اسناد کے غریب ہے۔“

تشریح: امر ہم: اس سے مراد جناب خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جیسا کہ ایک نسخہ میں خلیل کی صراحت ہے۔ (لیلۃ اسری بی) لفظ لیلۃ مابعد کی طرف مضاف ہے اور ایک نسخہ میں لفظ لیلۃ تنوین کے ساتھ ہے۔ یعنی لیلۃ اسری فیہا بی اور اس سے مراد معراج کی رات ہے۔

(فقال) قال کا فاعل حضرت ابراہیم ہیں۔ اور یہ اس رات ساتویں آسمان میں اپنے مقام پر بیت المعمور کی طرف ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ (یا محمد اقرئ امتک) یعنی ان کو پہنچا دیجئے۔ (من السلام) اور ایک نسخہ میں اقرأ امتک منی ہے۔ یعنی میری جانب سے یا میرے ہاں سے۔ لغت کی کتاب نہایت میں ہے کہ کہا جاتا ہے اقرأ فلان فلاناً السلام یعنی فلاں نے فلاں کو سلام پڑھایا۔ اور اقرأ علیہ السلام یعنی اس کو سلام پڑھادے۔ گویا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اس کو سلام پہنچائے گا تو اس کو اس بات پر برا بھینتے

کرنا کہ وہ سلام پڑھے اور اس کو واپس لوٹائے۔ مقدمہ میں اسی طرح ہے لیکن لغت کی کتاب صحاح اور قاموس میں یوں ہے کہ: قرأۃ السلام اور اقرأۃ السلام ایک ہی معنی میں ہیں۔ تو جناب ابراہیم علیہ السلام کے سلام کو جو شخص بھی سنے تو اس کو چاہئے کہ وہ یوں کہے علیہ السلام ورحمة اللہ وبرکاتہ۔

(واخبرهم ان الجنة طيبة التربة) تربت سے مراد تراب یعنی مٹی ہے۔ کیونکہ جنت کی مٹی کستوری اور زعفران ہیں اور ان میں سے زیادہ عمدہ کوئی چیز نہیں۔ (قیعان) قاف کے کسرہ کے ساتھ قاع کی جمع ہے اور قاع ایسی زمین کو کہتے ہیں جو برابر اور درختوں سے خالی ہو۔ (وان) فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔ (غراسها) غین مجمہ کے کسرہ کے ساتھ اور فتح الغین غرس کی جمع ہے۔ اور غرس ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں۔ جس کو زمین میں چھپایا جائے۔ جیسے بیج وغیرہ تاکہ وہ اس چھپائے جانے کے بعد آگ آئے اور جب مٹی عمدہ ہو اور اس کا پانی شیریں ہو تو پودا بہت عمدہ ہوتا ہے اور خصوصاً جبکہ یہ کھیتی کلمات طیبہ ہوں جن کو باقیات صالحات کہا گیا ہے۔

(سبحان والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر) اور مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت کے لوگوں کو یہ بتلا دیں یہ کلمات اور اس کی مثل دیگر کلمات اپنے قائل کیلئے دخول جنت کا اور کثرت اشجار کا سبب ہیں جن اشجار میں اس قائل کا ٹھکانہ ہوگا۔ اس لئے کہ جب ان کلمات کو بار بار پڑھے گا تو ان کی تعداد کے برابر درخت اگتے جائیں گے۔ علامہ ابن ملک فرماتے ہیں یعنی یہ کلمات اپنے قائل کو جنت کا وارث بنادیں گے تو گویا سبب یعنی کلمات سے مراد مستبب یعنی جنت لی گئی ہے۔ اتنی کلام۔ اور اس میں مزید بحث بھی ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں اس حدیث میں ایک اشکال ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جنت کی زمین درختوں اور محلات سے خالی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿جنت تجری من تحتها الانهار﴾ [البقرة: ۲۵] اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت کی زمین درختوں سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ اس کا نام جنت ہی ایسے درختوں کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ جو درخت نہنیوں کے آپس میں ملنے کی وجہ سے گھنے اور سایہ دار ہیں۔ جو اب اشکال کا یہ ہے کہ جنت کی زمین اصل کے اعتبار سے تو چٹیل میدان ہی تھی پھر اللہ پاک نے عارفین کے اعمال کے اعتبار سے اس میں درخت اور محلات پیدا فرمادیئے۔ اور ہر عامل کیلئے اس کے عمل کے سبب سے وہ چیز ہوگی جو اس کے ساتھ مختص ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس کیلئے پیدا کردہ عمل کی تفسیر فرمائی تاکہ وہ اس کی وجہ سے ثواب کو پاسکے تو اس عامل کو مجازاً اور درخت لگانے کی طرح قرار دیا۔ سبب کا مسبب پر اطلاق کرنے کے طور پر اور دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ حدیث میں جنت کے کلی طور پر درختوں اور محلات سے خالی ہونے پر دلالت نہیں اس لئے کہ صاف میدان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اکثر حصہ پر تو درخت لگے ہوئے ہیں لیکن اس حصہ کے علاوہ اور بھی بہت ساری وسیع جگہیں ہیں جہاں درخت نام کی کوئی چیز نہیں تاکہ ان کلمات کے ذریعے درخت لگائیں جاسکیں۔ اس درخت اصلی جو بغیر کسی سبب کے لگے ہوئے ہیں اور وہ درخت جن کا سبب یہ کلمات ہیں۔ جدا جدا ہیں۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اکثر حصہ پر تو درخت لگے ہوئے ہیں تاکہ وہ درخت ان کلمات کے علاوہ دیگر اعمال صالحہ کے مقابلہ میں ہو سکیں۔ اور باقی درخت ان کلمات کی وجہ سے لگتے ہیں۔ تاکہ ان کلمات کا ثواب اپنی عظیم فضیلت کی وجہ سے ممتاز ہو جائے۔ جیسا کہ احادیث سابقہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ اتنی کلام۔

لیکن علامہ ابن حجر کے سارے کلام کا دونوں جوابوں کا حاصل ہونے یا کسی ایک جواب کا حاصل ہونے میں اشکال ظاہر ہے۔ تا مل کیجئے۔ اور میرے دل میں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اہل جنت میں اقل وہ ہوگا جس کے درخت ہوں گے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ولمن خاف مقام ربہ جنتان﴾ [الرحمن: ۴۶] اور کہا جاتا ہے کہ جنت میں درخت نہریں یہ ساری چیزیں محض نفل کے طور پر پیدا کی گئی ہیں۔ اور دوسری جنت میں مذکورہ چیزیں ہونے کے اعمال و اذکار حدوث کی وجہ سے پائی جائیں گی اور ان کا تعلق باب عدل

سے ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں بعض صوفیاء کے قول جنت فی الدنیا و جنت فی العقبیٰ کا یہی مطلب ہے۔ یعنی ایک جنت دنیا میں ہے جو اعمال و اذکار ہیں۔ اور ایک جنت آخرت میں وہ فضل خداوندی ہے۔

اختلاف روایت: ابن ماجہ حاکم طبرانی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرویاً یغرس لك لكل واحدة شجرة فی الجنة روایت کیا گیا ہے۔

۲۳۱۶: وَعَنْ يَسِيرَةَ كَانَتْ مِنَ الْمُهَاجِرَاتِ قَالَتْ قَالَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَيَّكَ بِالتَّسْبِيحِ وَالتَّهْلِيلِ وَالتَّقْدِيسِ وَاعْقِدَنَّ بِالْأَنَامِلِ فَإِنَّهُنَّ مَسْئُولَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ وَلَا تَغْفُلَنَّ فَتَنْسِينَ الرَّحْمَةَ. (رواه الترمذی و ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۱۱۲ حدیث رقم ۱۵۰۱۰۔ و الترمذی فی السنن ۲۳۰۱۵ حدیث رقم ۳۶۵۳۔ و احمد فی المسند ۳۷۱/۶۔

ترجمہ: ”حضرت یسیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو مہاجرات میں سے ہیں فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم عورتوں سے ارشاد فرمایا کہ سبحان اللہ لا الہ الا اللہ سبحان الملك القدوس یا سبحو القدوس رب الملائكة کو پڑھنا اپنے لئے ضروری قرار دو اور ان مذکورہ تسبیحات کو اپنی انگلیوں پر شمار کرو کیونکہ ان انگلیوں سے پوچھا جائے گا اور ان کو گویائی دی جائے گا اور یاد رکھو ذکر سے غافل مت ہونا یعنی ذکر کو ترک نہ کرنا ورنہ رحمت سے تمہیں بھلایا جائے گا یعنی ذکر کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤ گی تو اس کے بے شمار ثواب سے محروم ہوگی۔“ (ترمذی، ابو داؤد)

راوی حدیث:

یسیرہ۔ یہ یسیرہ ”یاسر“ کی والدہ ہیں۔ یہ مہاجر عورتوں میں سے ہیں۔ ان سے ان کی پوتی ”حمیضہ بنت یاسر“ نے روایت کی۔ ”یسیرہ“ میں یاء پر ضمیمہ سین مہملہ پر فتح یاء ساکن اور راء ہے۔ ان کو ”أسیرہ“ بھی کہا جاتا ہے۔

تشریح: وعن يسيرة: ياء کے ضمہ اور سین فتح کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ اسیرہ ہمزہ کے ساتھ ہے اور یہ ام یاسر انصاریہ صحابیات میں سے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مہاجرات میں ہیں۔ اور ظاہر یہی ہے اس لئے کہ متن میں و کانت من المهاجرات ہے۔ اور باقی رہا ابن ملک کا قول کہ یہ راویہ بنت یاسر ہیں۔ یہ ان کے قلم کا سہو ہے۔ (قالت قال لنا) یعنی عورتوں کی جماعت کو فرمایا۔ (رسول اللہ ﷺ علیکن) یہ اسم فعل الزمن اور اسکن کے معنی میں ہے۔ یعنی تم عورتیں لازم پکڑو۔ (بالتسبیح والتہلیل والتقدیس) یعنی سبحان الملك القدوس یا سبحو قدوس رب الملائكة و ارواح وغیرہ کہنا۔ ممکن یہ ہے کہ آپ ﷺ کی مراد تقدیس سے تکبیر ہو۔ کیونکہ اس کو ان معدودات میں ذکر کرنا جن کا ذکر اس کے موافق و دیگر روایات میں بھی پایا جاتا ہے اس پر دال ہے۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اہل عرب کی عادت ہے ایک کلمہ جب تکرار سے ان کی زبانوں پر آتا ہو تو وہ تسہیل تکرار کیلئے اس کلمے کے بعض حروف کو بعض حروف کے ساتھ ملا کر مختصر کر لیتے ہیں جیسے دو قلمہ جعبلہ، بسلمہ اور جیسے تہلیل وغیرہ یہ تہلیل لا الہ الا اللہ سے ماخوذ ہے۔ جب کوئی لا الہ الا اللہ کہے تو اہل عرب کہتے ہیں ”ہیلل الرجل و هليل الرجل۔ یعنی آدمی نے لا الہ الا اللہ کہا۔ لیکن علامہ ابن حجر کی یہ بات کئی وجہ سے درست نہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بسم اللہ جیسے دیگر کلمات مصنوعہ ہیں۔ اہل عرب کے وضع کردہ نہیں ہیں۔ (اس لئے ان کو عادت عرب کی طرف منسوب کرنا درست نہیں)۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اختصار والی بات حوقلمہ جعبلہ وغیرہ میں درست ہے۔ لیکن تسبیح اور تقدیس یہ دونوں قیاسی مصدر ہیں کیونکہ تقدیس اور تسبیح کا معنی ہے اللہ کو صحیح اور قدس بنانا یعنی اللہ کو ذکر و اعتقاد کی صورت میں صفات حلول

حدوث اور اتحاد سے منزہ کرنا۔ اور تہلیل کا معنی ہے اللہ کو مہلبل بنانا اور احلال کا معنی ہے رفع الصوت یعنی اللہ کی توحید اور اس کی یکتائی کی اثبات کی صورت میں اس مرفوع الصوت بنانا۔ ہاں البتہ ہیلبل یہ بسمل کے قبیل سے ہے نہ کہ تہلیل اس طرح کہ سحل اور قدسل میں یہ سارے کلمات مختصر ہیں لیکن تسبیح اور تقدیس تہلیل وغیر مصادیق قیاسی ہیں۔ اگر سحل اور قدسل سے جائیں یا ان کی بناء کی جائے تو درست ہے کیونکہ ان دونوں کے مقابل کلمات کی دلالت پائی جا رہی ہے۔ (یعنی جس طرح دیگر کلمات کا اختصار بن سکتا ہے تو ان کا بھی)۔ لیکن مذکورہ تسبیح تہلیل اور تقدیس وغیرہ میں ایسی بات نہیں اور یہ بات بھی ہے کہ یہ مصادیر یا باب تفعیل کے موضوع طریقے پر ہیں۔ مصدر موضوع صرف باب فعللہ کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ یہ بات طے شدہ ہے۔

اور باقی رہا ان کا تسبیح کی تفسیر سبحان اللہ سے کرنا اور تہلیل کی لا الہ الا اللہ سے اور تقدیس کی سبحان الملک القدس سے تو یہ ہماری بات کو مضرب نہیں کیونکہ یہ تفسیر معنوی ہے جو معنی کلی کی طرف سے جو مفہوم مصدری ہے کفایت کرنے والی ہے۔ (واعقدن) قاف کے کسرہ کے ساتھ یعنی سج اور تہلیل اور تقدیس کے عدد کو شمار کرو۔ (بالا نامل) یعنی پوروں کے جوڑوں یا ان کے سیروں کے ذریعے جیسا کہ کہا جاتا عقد الشمسی بالا نامل۔ یعنی اس نے چیز کو پودوں کے ذریعے شمار کیا۔ باقی رہا علامہ ابن حجر کا یہ کہنا کہ اعقدن کا معنی عدھن یا تقدیر عبارت اعقدن ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ان عورتوں کو اس بات پر تحریر کی ہے کہ ان کلمات کا اپنے پوروں کے ذریعے احصاء کریں تاکہ ان کلمات کے ذریعے ان کے وہ گناہ زائل ہو جائیں جن کا وہ ارتکاب کرتی ہیں۔ اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ عورتیں ضبط حساب کو جانتی تھیں۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں ایک جماعت کے مذہب کے مطابق بالا نامل میں باء اثبات میں زائد ہے۔ (یعنی نفی میں باء زائد نہیں ہوتی بلکہ اثبات میں زائد ہوتی ہے تو اس لئے باء بمعنی من ہوگی یعنی من الانامل) لیکن باء کو اثبات میں زائد کہنا اور اس سے من کی طرف انتقال محض وہم ہے۔ وگرنہ باتفاق جو معنی اللیب کتاب میں ضابطہ ہے وہ یہ ہے کہ مفعول میں باء کی زیادتی کثیر ہے اور یہ زیادتی اثبات اور نفی کے ساتھ مقید نہیں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهَزَىٰ لَيْكُ بِجَمْعِ النَّخْلَةِ﴾ [مریم: ۲۵] اور: ﴿فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبِ آلِي السَّمَاءِ﴾ [الحج: ۱۵] اور: ﴿وَمَنْ يَرُدْفِيهِ بِالْحَادِ﴾ [الحج: ۲۵] اور ﴿فَطْفُقْ مَسْحًا بِالسُّوقِ﴾ [ص: ۳۳] اور ﴿وَلَا تَلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرة: ۱۹۰] اور ظاہر یہی ہے کہ انامل سے مراد اصابع یعنی انگلیاں ہیں اور یہ بعض کا اطلاق کر کے کل مراد لینے کے قبیل سے ہے۔ اور یہ مبالغہ کے طور پر جو ارشاد باری تعالیٰ: ﴿يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ﴾ [البقرة: ۱۹] میں وارد ہوا ہے۔ اس کے برعکس ہے۔ (یعنی یہاں اصابع کل بول کر انامل بعض مراد ہے)۔ اور اس حدیث میں اذکار کے شمار اور ابرار کی دانوں والی تسبیح کا جواز ہے اور حضرت ابو ہریرہ کے پاس ایک دھاگہ تھا جس میں گانٹھیں تھیں اور حضرت ابو ہریرہ اس دھاگے کے ذریعے تسبیح کیا کرتے تھے۔ اور مردہ تسبیح کے عدم جواز کا گمان درست نہیں۔ کیونکہ اس کی اصل سنت سے ثابت ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اصحابی کالنجوم باہم اقتذبتہم اھدیتہم“ اس لئے حضرت ابو ہریرہ کی اقتدا بھی باعث ہدایت ہے۔ اور عقد کو انامل کے ساتھ مقید کرنا افضل ہونے پر دلالت ہے۔ اس لئے کہ اس پر اس کی علت دلالت کرتی ہے۔ اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: (فانھن) یعنی انگلیوں کے یہ پورے بھی دیگر اعضاء کی طرح (مسؤلات) یعنی انگلیوں کے ان پوروں سے ان کے کیے ہوئے کے بارے میں سوال کیا جائیں۔ اور یہ سوال کیا جائے گا کہ ان کو کس کام استعمال کیا گیا ہے۔ (مستنطقات) طاء کے فتح کے ساتھ ہے۔ یعنی ان میں قوت گویائی پیدا کی جائے گی جس کی وجہ سے کلام کریں گے اور صاحب انامل کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمُ السُّنْتُمْ وَايْدِيَهُمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾

﴿یعملون﴾ [النور: ۲۴] اور ﴿وما کنتم تسترون ان یشہد علیکم ولا ابصارکم ولا جلودکم﴾ [فصلت: ۲۲] اس میں اعضاء کو اپنے رب کی مرضی میں استعمال کرنے پر ترغیب اور اعضاء کو فواحش اور گناہوں سے محفوظ رکھنے پر تحریض ہے۔ (ولا تغفلن) فاء کے ضمہ کے ساتھ اور فاء کا مفتوح ہونا غلط ہے۔ اور اس کا صلہ عن الذکر ہے۔ یعنی تم عورتیں ذکر کو مت چھوڑنا۔ (فتنسنین) تاء کے فتح کے ساتھ یعنی فتن کر کن۔ (الرحمة) یعنی غفلت کے سبب سے اور نسیان مراد رحمت کے اسباب کو بھول جانا ہے۔ یعنی تم عورتیں ذکر کو مت چھوڑنا اس لئے کہ اگر تم نے ذکر کو چھوڑ دیا تو تم اس کے ثواب سے محروم ہو جاؤ گی۔ گویا کہ تم اللہ کی رحمت کو چھوڑ بیٹھو گی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فاذکرونی﴾ [البقرہ: ۱۵۲] یعنی مجھے طاعت کی صورت میں یاد کرو اذکروکم یعنی تم کو رحمت کی صورت میں یاد کروں گا اور ایک نسخہ میں باب انساء سے مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ یعنی تم کو ذکر رحمت کا محافظ بنایا گیا ہے۔ اور تم ان کے سوال کے متعلق حکم دیا گیا ہے اور جب غفلت اختیار کرو گی تو گویا تم جو چیز تمہارے پاس ودیعت رکھی گئی تھی تم نے اس کو ضائع کر ڈالا اور تم نے اللہ کی رحمت کو چھوڑ ڈالا۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ لا تغفلن میں دو چیزوں کی نہیں ہے۔ یعنی جو چیزیں ذکر کی ہیں اس سے غفلت اختیار نہ کرنا لیکن عدم غفلت اس طرح ہو کہ ذکر اور اس کی حفاظت اور اس کو تو شیئا انگلیوں کے ساتھ شمار کرنے پر لزوم ہو۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد فتنسنین یہ جواب لو ہے یعنی اگر تم اس چیز جس کو ذکر کیا ہے۔ غافل ہو گئیں تو تم اللہ کی رحمت کو چھوڑ بیٹھو گی اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿لا تطغوا فیہ فیحل علیکم غضبی﴾ [طہ: ۸۱]

یا مطلب یہ ہے کہ تمہارے جانب سے غفلت نہ ہو ورنہ اللہ کی جانب سے ترک رحمت ہوگا۔ تو گویا نسیان کو ترک رحمت سے تعبیر کیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وکذلک الیوم تنسی﴾ [طہ: ۱۲۶] ترجمہ:

الفصل الثالث:

۲۳۱۷: عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ عَلَّمْنِي كَلِمًا أَقُولُهُ قَالَ قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ اللَّهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ كَثِيرًا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ قَالَ فَهَلْؤَلَا لِرَبِّي فَمَا لِي فَقَالَ قُلِ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَاهْدِنِي وَارْزُقْنِي وَعَافِنِي شَكَ الرَّاوي فِي عَافِيِي۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۷۲/۴ حدیث رقم (۲۳-۲۶۹۶)۔

ترجمہ: ”حضرت سعد ابن وقاص کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا ذکر بتادیتے جسے میں کہتا رہوں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ پڑھ لیا کرو۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ اللَّهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ كَثِيرًا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اللہ بہت بڑا ہے اور اللہ ہی کے لئے بہت تعریف ہے اور پاکی ہے اللہ کے لئے جو پالنہارے تمام عالم کا گناہ سے بچنے کی طاقت اور عبادت کرنے کی قوت اللہ ہی کی مدد سے جو غالب حکمت والا ہے۔ اس دیہاتی نے عرض کیا کہ کلمات تو میرے پروردگار کے ذکر کے لئے ہیں میرے لئے وہ کون سے کلمات ہیں جن کے ذریعہ میں اپنے لئے دعا مانگوں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس طرح مانگو۔ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَاهْدِنِي وَارْزُقْنِي..... اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے مجھ پر رحم فرما مجھے ہدایت پر ثابت قدم

رکھنا مال حلال سے مجھے روزی دے اور مجھے عافیت بخش! راوی کو لفظ عافی کے بارے میں شک ہے آیا روایت میں یہ لفظ بھی ہے یا نہیں۔“ (مسلم)

تشریح: الی رسول اللہ: اور ایک نسخہ میں الی لینی ﷺ ہے۔ (قال قل لا اله الا الله وحده لا شريك له) آپ ﷺ نے ابتداء بالتوحید علی طریق الترفید فرمائی۔ اس لئے کہ توحید ہی ہر عبادت کا آغاز ہے۔ اور مرید و مراد کی کل سعادت کا اختتام ہے۔ (اللہ اکبر) یعنی ہر کبیر سے اکبر ہے۔ یا یہ کہ اس سے کہ اس کی کبریائی کا احاطہ کیا جائے اکبر ہے اور یہی مطلب زیادہ بہتر ہے۔ (رب العالمین) یعنی تمام مخلوقات کا رب ہے اور العالمین جمع برائے ذوالعقول کو شرافت کی وجہ سے غلبہ دیا گیا ہے۔ (ولا حول ولا قوة الا باللہ العزیز الحکیم) اور بزرگی روایت میں العلی العظیم کے الفاظ ہیں اور زبانوں پر بھی یہی کلمہ زیادہ مشہور ہے۔ اگرچہ یہ کلمہ صحیح مسلم میں وارد نہیں ہوا۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اکثر روایات میں یہ وارد نہیں ہوا۔ صرف امام احمد بن حنبل ہی جملہ کے بعد یہ کلمہ لائے ہیں۔ (قال) قال کا فاعل اعرابی ہے۔ (فہو لاء) مشار جملہ کلمات ہیں۔ اور ایک صحیح نسخہ میں ہولاء بغیر فاء کے ہے۔ (لربی) یعنی یہ کلمات تو میرے رب کے ذکر کیلئے وضع شدہ ہیں۔ (فمالی) یعنی میری ذات کیلئے کیا دعا ہے۔ (فقال قل اللهم اغفر لی) یعنی برائیوں کو مٹانے کی صورت میں۔

(وارحمنی) یعنی جملہ حرکات و سکنات میں توفیق اطاعت کی صورت میں رحم فرما۔ (واهدنی) یعنی اچھے احوال کی طرف راہنمائی فرما۔ (وارزقنی) یعنی مال حلال۔ (شک الراوی فی عافی) راوی کو لفظ عافی کے اثبات اور نفی میں شک ہے۔ لیکن اولی عافی کے سلسلہ میں اثبات ہے کیونکہ اختتام دعا کے بعد اس کو لانے میں تو کوئی خرابی نہیں۔ باقی رہا علامہ ابن حجر کا یہ کہنا کہ راوی کو لفظ عافی میں شک گزرا ہے کہ آیا لفظ عافی نبی اکرم ﷺ کی کلام سے ہے یا نہیں اور یہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے اس بات پر مبنی ہے کہ راوی جس کو شک گزرا ہے وہ صحابی ہی ہو۔ حالانکہ راوی متعین نہیں تو اس لئے احتمال ہے کہ صحابی کے علاوہ کسی اور راوی کی جانب سے یہ شک ہو اور پھر علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ عافی کو احتیاطاً ذکر کیا جاتا ہے اس احتمال کی رعایت کے پیش نظر کہ ممکن ہے آپ ﷺ نے عافی کا لفظ فرمایا ہو اور باقی رہا علامہ ابن حجر کا یہ کہنا کہ اس کی نظیر ”رب انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً“ ہے کہ اس میں کثیراً اور کبیراً دونوں کو پڑھا جائے۔ تاکہ جو بھی روایت میں وارد ہوا ہے۔ اس کا ذکر یقینی ہو جائے۔ امام نووی کا یہ قول نقل کرنا یہ بات قاری صاحب کی نظر میں قابل اعتراض ہے کیونکہ اس طریقہ پر جمع کرنا وارد نہیں ہو۔ بلکہ جمع کے سلسلہ میں صحیح طریقہ یہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ دعائیں سے ایک مرتبہ کثیراً کہے اور دوسری مرتبہ کبیراً۔ واللہ اعلم۔

۲۳۱۸: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَرَّ عَلَى شَجَرَةٍ يَا بَسَّةَ الْوَرْقِ فَضَرَبَهَا بِعَصَاهُ فَتَنَاتَرَ الْوَرْقُ فَقَالَ إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ تُسَاقِطُ ذُنُوبُ الْعَبْدِ كَمَا يَتَسَاقَطُ وَرَقُ هَذِهِ

الشَّجَرَةِ - (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

احرجہ الترمذی فی السنن ۲۰۳/۵ حدیث رقم ۳۵۹۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ خشک پتوں والے ایک درخت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اپنا عصا مبارک اس کی ٹہنیوں پر مارا جس کی وجہ سے پتے جھڑنے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ الحمد لله وسبحان الله لا اله الا الله والله اكبر پڑھنا بندوں کے گناہوں کو اسی طرح جھاڑتا ہے جس طرح اس درخت کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: فضر بها: یعنی درخت کی شاخوں کو۔ (بعضاہ فتاثر الورق) ای تساقط کرنے گئے۔ (فقال ان الحمد لله) اعراب حکائی کی بناء پر یا مبتدا ہونے کی وجہ سے الحمد مرفوع ہے اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ لیکن نصب ضعیف ہے۔ (وسبحان الله) اس کا نصب مصدر مفعول مطلق کی بناء پر ہے۔ یعنی سبحت سبحان الله۔ (ولا اله الا الله والله اكبر) امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ کلمات اسم ان منصوب ہیں اور اس کی خبر (تساقط) ہے۔ تاء کے ضمہ کے ساتھ۔ (ذنوب العبد) یعنی مذکورہ کلمات کو کہنے والا بندہ۔

(کما يتساقط) امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ تقدیر عبارت ہے ای تساقط فتساقط کما يتساقط۔ (ورق هذه الشجرة) آپ ﷺ کے قول کما يتساقط کو اگر مصدر تساقط محذوف کی صفت بنائے جائے تو پھر دو مصدروں کے درمیان مطابقت نہیں رہتی۔ اور اگر اس کو ذنوب سے حال بنایا جائے تو درست ہے۔ اور تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ يتساقط الذنوب شبهًا تساقطها يتساقط الورق یعنی گرتے ہیں گناہ در آنحالیکہ ان کا گرنا مشابہ ہوتا ہے پتوں کے گرنے کے۔ امام طیبیؒ کی تحقیق بھی اس طرح ہے لیکن علامہ ابن حجر نے اس موقع پر بہت غریب کلام کیا وہ فرماتے ہیں کہ کما میں مازائدہ ہے۔ اور کاف مثل کے معنی میں ہو کر حال ہے۔ اور تقدیر عبارت یوں ہوئی حال کون تساقط الذنوب مثل تساقط ورق هذه الشجرة۔ یعنی در آنحالیکہ گناہوں کا گرنا اس درخت کے پتوں کے گرنے کی مثل ہے۔ یہ عبارت شارح کے مسلک سے اولیٰ ہے کما لا یخفی اور اس کی غرابت کی وجہ تقدیر عبارت میں بعینہ عبارت کو لانا ہے۔

۲۳۱۹. وَعَنْ مَكْحُولٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَكْثَرُ مِنْ قَوْلٍ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ كَنْزِ الْجَنَّةِ قَالَ مَكْحُولٌ فَمَنْ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا مُنْجَا مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ كَشَفَ اللَّهُ عَنْهُ سَبْعِينَ بَابًا مِنَ الضُّرِّ أَذْنَاهَا الْفَقْرُ. رواه الترمذی وقال هذا حديث ليس اسناده بمتصل ومكحول لم يسمع عن ابي هريرة.

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۳۸/۵ ۳۶۷۱۔ واحمد فی المسند ۴/۳۳۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت مکحولؒ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: لا حول ولا قوۃ الا باللہ کثرت سے کہا کہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ مکحولؒ فرماتے ہیں جو شخص لا حول ولا قوۃ الا باللہ ولا منجاء من اللہ الا الیہ یعنی ضرورت نقصان کو دفع کرنے کی قوت اور نفع حاصل کرنے کی طاقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور اس کی قدرت کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات اسی پر منحصر ہے، تو اللہ تعالیٰ اس سے ضرورت نقصان کی ستر قسمیں دور کر دیتا ہے جس میں ادنیٰ قسم فقر محتاجگی ہے امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ سے حضرت مکحولؒ کی سماعت ثابت نہیں ہے۔“

تشریح: (وعن مکحول) حضرت مکحولؒ جلیل القدر تابعی سوڈان سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ زہریؒ فرماتے ہیں کہ علماء چار ہیں۔ مدینہ میں سعید ابن مسیب، کوفہ میں امام نعیمی اور بصرہ میں حضرت حسنؒ اور شام میں مکحول۔ اور یہ مفتی شام تھے جب تک لا حول ولا قوۃ الا باللہ نہ پڑھ لیتے اس وقت تک فتویٰ نہ دیتے اور انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ وائلہ بن اسحق ابو ہند الوزان وغیرہم سے سماع کیا ہے اور ان سے علامہ زہریؒ امام اوزاعیؒ یحییٰ بن یحییٰ العسلیؒ، ابن جریجؒ اور مالک بن انس نے سماع کیا ہے۔ (عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ اکثر من قول لا حول) یعنی ضرورت ختم کرنے سے۔ (ولا قوۃ) یعنی جلب

منفعت پر۔ (الا باللہ) یعنی اسی کی حفاظت و قدرت کے ساتھ۔ (فانها من كنز الجنة) یعنی یہ جنت کے ایسے ذخائر اور نئیس چیزوں میں سے ہے جو ایسے دن میں اپنے کہنے والے کو نفع پہنچائیں گے جس دن مال و اولاد سو مند ثابت نہ ہوگی۔

(ادنا) یعنی جس ضرر کا اقل درجہ۔ (الفقر) یعنی فقر کا ضرر ہے اور ایک صحیح نسخہ میں ادناؤں کے بجائے ادرناہا ہے۔ یعنی تکلیف کے ستر درجوں میں سے سب سے پست اور مغفرت کی نوع کے مراتب میں سے ادنیٰ مرتبہ فقر ہے۔ اور فقر سے مراد فقر قلبی ہے۔ جس کا ذکر ”کاد الفقر ان یكون کفراً“ والی حدیث میں آیا ہے۔ اس لئے کہ جب ان کلمات کا قائل ان کلمات کے معنی کا تصور کرے گا تو کلمات اس کے ہاں پختہ ہو جائیں گے۔ اور اس کے قلب میں اس بات کا یقین بیٹھ جائے گا کہ معاملہ سارا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ نفع اور ضرر اللہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے اور عطاء کر دینا اور روک دینا اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تو نتیجتاً بندہ معیت سے صبر اور نعمت پر شکر بجالاتا ہے۔ اور اپنے معاملے کو زمین و آسمان کے پروردگار کی طرف سونپ دیتا ہے۔ اور اللہ کی تقدیر اور اس کے فیصلے پر راضی ہو کر صف اولیاء اللہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

اور پھر اس عدم اتصال کو (و مکحول لم یسمع عن) سے بیان کیا ہے۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ اور مشہور من ہے یعنی لم یسمع من ہے عن کے جگہ۔ میں کہتا ہوں کہ مشہور اس کا بنفسہ ایک کی طرف متعدی ہونا ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ دو کی طرف تو تقدیر عبارت یوں ہوگی ”لم یسمع مکحول الحدیث ناقلاً او روایاً عن (ابی ہریرۃ) اور یہ وہ نکتہ ہے جو حضرت مکحول نے مؤلف کی جاری شدہ عادت کے خلاف ابتدائے حدیث میں ذکر کیا ہے۔ تاکہ انقطاع حدیث کی طرف اشارہ ہو جائے۔ لیکن مؤلف کی تقویت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مرفوع روایت کی وجہ سے ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے ”فقل لا حول ولا قوۃ الا باللہ فانها کنز من کنوز الجنة“ اس طرح صحاح ستہ کی جماعت نے روایت کیا ہے۔ اور نسائی و بزار نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ کو صحیح“ لا منجا من اللہ الا الیہ کنز من کنوز الجنة“ روایت کیا ہے۔

۲۳۲۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ذَا وَءٍ مِنْ تِسْعَةٍ وَتِسْعِينَ ذَاً أَيْسَرُهَا لَهُمْ .

اخرجه ابن ابی الدنيا ذكره في كنز العمال ٤٥٤١١ الحديث رقم ١٩٥٦ -

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ننانوے بیماریوں کی دوا ہے جس میں سے ادنیٰ بیماری غم ہے۔“

تشریح: (وعن ابی ہریرۃ..... دواء) یعنی ایسی معنوی دواء کہ جس کی تاثیر قوی ہے۔ (من تسعة وتسعين داء) یعنی دنیا اور آخرت کی بیماریوں میں سے۔ (ایسرها) یعنی ان میں اقل اور اہل۔ (الہم) مراد جنس ہم ہے خواہ دین کے متعلق ہو یا دنیا کے متعلق یا معاش کا حصہ اور آخرت کا غم۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مرض ہم، غم نفس اور تنگی نفس کا موجب اور ضعف قوی اور اختلال اعضاء کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے اللہ پاک نے اپنے نبی یونسؑ کو غم سے عافیت دے کر احسان جتلیا یا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فاستجبنا له ونجيناہ من الغم و كذلك ننجی المؤمنین﴾ [الانبیاء: ۸۸]

۲۳۲۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى كَلِمَةٍ مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ مِنْ كُنْزِ الْجَنَّةِ

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى أَسْلَمَ عَبْدِي وَأَسْتَسَلِمَ (رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعَوَاتِ الْكَبِيرِ)

اخرجه الحاكم في المستدرک -

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تمہیں ایک ایسا کلمہ نہ بتا دوں جو عرش کے نیچے والے بہشت کے خزانے سے اترتا ہے اور وہ یہ ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ جب کوئی بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ”میرا بندہ تابعدار اور بہت فرمانبردار ہوا“ یہ دونوں حدیثیں بیہتی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔“

تشریح: قال..... کنز الجنة: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ من تحت العرش یہ کلمہ کی صفت ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من برائے ابتداء ہو یعنی تقدیر عبارت تلك الكلمة ناشئة كائنة تحت العرش ہوگی اور من كنز الجنة میں من بیان یہ ہے اور جب عرش کو جنت کی چھت قرار دے دیا جائے تو پھر من كنز الجنة کا من تحت العرش سے بدل بنا بھی جائز ہے۔ اتنی کلام۔

اور مطلب یہ ہے کہ یہ کلمہ عرش کے معنوی خزانوں اور بلند و بالا جنت کے ذخائر میں سے ہے۔ نہ کہ فانی حسی اور مغلی خزانوں میں سے۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ”ای کلمة انزلت من الكنز الذي تحت العرش“ یعنی یہ کلمہ اس خزانے میں سے ہے جس کو عرش کے نیچے اتارا گیا ہے اور یہ بات گذر چکی ہے کہ عرش کے نیچے خزانہ ہے۔ اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں بھی اسی خزانہ میں سے نازل کی گئی ہیں۔ اور یہ بھی جنت کے خزانہ میں سے ہیں۔ من كنوزك من برائے جمعیں ہے جیسا کہ حدیث کھول میں اس کی صراحت ہو چکی۔

(لا حول ولا قوۃ الا باللہ) یعنی دنیا اور آخرت کے امور میں۔ (يقول اللہ تعالیٰ) بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ استینافہ ہے ان کلمات اور ان کے قائل کی بیان فضیلت کیلئے۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ شرط محذوف کی جزء ہے۔ اور وہ شرط ”اذ قال العبد هذه الكلمة“ ہے۔ یعنی جب بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اللہ کا یہ قول برائے ملائکہ ہوتا یعنی اللہ پاک اس کلمہ کے قائل کے کمال اور اس کے معنی کی عمدگی کو ملائکہ کے سامنے بیان کرنے کیلئے ملائکہ کو فرماتا ہے۔

(اسلم عبدی) یعنی میرا بندہ عبادت ترک کر کے میرے تابع ہو گیا ہے اور ربوبیت کو تسلیم کرنے کی صورت میں عبودیت میں مخلص ہو گیا ہے۔ (واستسلم) یعنی مکمل تابعداری اختیار کر لی ہے یا تابعداری میں انتہا کو پہنچ کر اس نے بندوں سے قطع نظر کر لیا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں ”ای غوص امور.....“ یعنی بندے نے کائنات کے جملہ امور اللہ کی طرف سونپ کر خود مخلص فی الدین ہو کر اللہ کی تابعداری اختیار کر لی ہے۔

۲۳۲۲: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ هِيَ صَلَوةُ الْخَلَائِقِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ كَلِمَاتُ الشُّكْرِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَلِمَةُ الْإِخْلَاصِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ تَمَلَّا مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى أَسْلَمَ وَاسْتَسْلَمَ . (رواه رزین)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۰۱/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۰۷۔ وابن ماجہ فی السنن ۱۲۵۴/۲ حدیث رقم ۳۸۱۶۔
واحمد فی المسند ۳۴۱/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا سبحان اللہ مخلوقات کی عبادت ہے الحمد للہ شکر کا کلمہ ہے۔ لا الہ الا اللہ اخلاص کا کلمہ ہے اور اللہ اکبر کا ثواب زمین و آسمان کے درمیان کو بھردیتا ہے اور جب کوئی بندہ حضور قلب کے ساتھ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندہ فرمانبردار ہوا اور اس نے مکمل فرمانبرداری کی۔“

تشریح: (سبحان اللہ ہی صلاة الخلائق) یعنی یہ ان کی عبادت و اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ان من

اس کو امام طیبیؒ نے ذکر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿كُلُّ قَدِّعِلْمٍ صِلْوَتُهُ وَتَسْبِيحُهُ﴾ [طور: ۴۱] تسبیح یا زبان حال سے ہوتی ہے یا زبان قائل سے۔ اس طرح کہ وہ تسبیح صانع پر اور اس کی قدرت حکمت پر دال ہو۔ (والحمد لله کلمة الشکر) یعنی عمدۃ الشکر اور اُس الشکر ہے جیسا کہ گذر چکا ہے۔ (ولا اله الا الله کلمة الاخلاص) یعنی ایسا کلمہ توحید ہے جو اپنے قائل کیلئے اخلاص من النار کا موجب ہے یا یہ ایسا کلمہ ہے جو صدق و اخلاص کے بغیر سو مند نہیں ہے۔ (والله اکبر تملأ) تملأ صیغہ مؤنث کلمہ کی صفت کے پیش نظر ہے۔ اور لفظوں کے اعتبار سے یہ مذکر ہے یعنی یملاً ثوابها او عظمتہ، یعنی اس کا ثواب یا اس کی عظمت بھردیتی ہے۔

(ما بین السماء والارض) اس لئے کہ زمین آسمان میں جو بھی بڑی چیز ہے وہ ان دونوں کی نسبت حقیر ہے۔ (واذ قال العبد ولا حول ولا قوة الا بالله) یعنی کہ مبنی کا تصور اور اس کے معنی کا یقین کر لے۔ (قال الله تعالیٰ اسلم) یعنی اسلاماً کلاماً۔ (واستسلم) یعنی ظاہر اور باطن کے اعتبار سے تابع ہو چکا۔

بَابُ الْاِسْتِغْفَارِ وَالتَّوْبَةِ

استغفار و توبہ کا بیان

استغفار کا معنی طلب مغفرت ہے اور کبھی لفظ استغفار توبہ کے معنی کو متضمن ہوتا ہے اور کبھی متضمن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے علیحدہ طور پر لفظ توبہ لائے ہیں یا استغفار زبان سے ہوتا ہے اور توبہ دل سے اور پھر توبہ و استغفار معصیہ سے توبہ کی طرف یا غفلت سے ذکر کی طرف اور رعیت سے حضور کی طرف لوٹ جانے کو کہتے ہیں۔ اور یہ شریعت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد ہے۔ اور سالک آخرت کے مقامات میں سے پہلا مقام ہے۔ اور اللہ کی بندے کیلئے مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک دنیا میں بندے کے گناہ کو اس طرح چھپا دے کہ کسی کو اس پر اطلاع نہ ہونے پائے اور آخرت میں اس گناہ پر سزا نہ دے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ توبہ ابتدا میں گناہ کو اس کی قباحت کی وجہ سے ترک کر دینے اور جو کچھ اس سے صادر ہوا ہے اس پر شرمندہ ہو جانے اور ترک معاوۃ پر پختہ ارادہ کرنے اور ممکن حد تک تدارک کرنے کا نام ہے۔ لہذا متروکہ اعمال کا اعادہ کی صورت میں تدارک کرے یہ امام راغب کا کلام ہے۔

علامہ نوویؒ کچھ زیادتی کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں کہ اگر گناہ بنی آدم کے متعلق ہے تو اس کیلئے یہ بھی شرط ہے کہ دبایا ہو احق صاحب حق کی طرف رد کرے یا اس سے براۃ حاصل کرے۔ اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ پھر اگر اس پر کوئی حق ہو جیسے قضاء نماز تو وہ وقت کو نفل یا فرض کفایہ میں خرچ کرنے کی وجہ سے تسامح سے کام نہ لے۔ اس لئے کہ فسق سے نکلنا اس قضاء نماز کی ذمہ داری سے نکلنے پر موقوف ہے تو وہ آدمی مثلاً جب تک نفل پڑھتا رہے گا تو وہ اسی فسق میں باقی رہے گا۔ باوجودیکہ اس کو اس سے پر نکلنے پر قدرت ہے۔ اور قضا نماز کے باوجود نفل میں باقی رہنا فسق ہے جیسا کہ یہ بات واضح ہے۔

الفصل الاول :

۲۳۲۳: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنِّي لَا سَتَغْفِرُ اللَّهُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ

سَبْعِينَ مَرَّةً. (رواه البخاری)

واحمد فی المسند ۳۴۱/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قسم ہے اللہ کی میں دن میں ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں“۔ (بخاری)

تشریح: قال رسول اللہ ﷺ واللہ بیہ قسم برائے تاکید خبر ہے۔ (انی لا استغفر اللہ) یعنی طاعت میں اپنی کوتاہی کی وجہ سے یا عبادت میں اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کی وجہ سے یہی وجہ ہے آپ ﷺ اپنی نماز کے بعد ترجیح اور تکرار کی صورت میں استغفار بجا لاتے۔ (واتوب الیہ) یعنی اس کی شریعت اور شعائر کے بعد اس کے احکام کی طرف رجوع کرتا ہوں یا ممکن ہے کہ لفظ استغفار سے اس کی طرف توبہ کے جدا ہونے کا اشارہ ہے۔ یا استغفار اشتغال بالخلق کو اور توبہ التفات الی الحق کو کہتے ہیں۔

(فی الیوم اکثر من سبعین مرۃ) اس میں تحدید کا احتمال ہے جیسا کہ ماہرہ دونوں روایتوں کے پیش نظر جو آگے آ رہی ہیں اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ سبعین مرۃ اور مائتہ مرۃ دونوں روایتوں سے تفسیر مراد ہو۔ ابن ملک فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ہر دن میں ستر مرتبہ توبہ اور استغفار گناہ کی وجہ سے نہ تھی اس لئے کہ آپ ﷺ معصوم ہیں بلکہ ذوالجلال والاکرام ذات کی بارگاہ کے شایان شان عبودیت کی عدم بجا آوری کے سلسلہ میں اعتقاد تصور کی وجہ سے تھا جب آپ ﷺ معصوم ہونے اور تمام مخلوقات سے بہتر ہونے کے باوجود ہر دن میں ستر مرتبہ سے اکثر اپنے رب کی طرف توبہ اور استغفار کرتے تھے تو گناہ گاروں کو تو اس سے بھی زیادہ کرنا چاہئے۔ اور استغفار کہتے ہیں قول فعل کے ساتھ اللہ سے مغفرت طلب کرنا اور اللہ کی جانب سے مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو عذاب پہنچنے سے محفوظ کر دے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ زمین پر اللہ کے عذاب سے دو امان تھے۔ ایک امان تو اٹھالیا گیا تو لہذا تم دوسرے امان کو اختیار کر کے اس کو مضبوطی سے تھام ہو جو امان روئے زمین سے اٹھالیا وہ امان جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہیں۔ اور جو امان روئے زمین پر باقی ہے وہ استغفار ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَا كَانَ اللَّهُ مَعَدِبُهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ میں کہتا ہوں کہ جب استغفار کا فروں کیلئے مفید ہے تو یہ استغفار مومنین کو کیونکر نہ نافع ہوگا اور کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا استغفار اپنے لئے نہ تھا بلکہ اپنی امت کیلئے تھا تو لہذا آپ ﷺ کا استغفار امت کے حق میں شفاعت کے مرتبہ میں ہوگا۔

۲۳۲۳. وَعَنِ الْأَعْرَابِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّهُ لَيَعَانُ عَلَى قَلْبِي وَإِنِّي لَا سَتَغْفِرُ اللَّهُ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ (رواه مسلم)

اندرجہ مسلم فی صحیحہ ۲۰۷۵/۴۔ حدیث رقم ۴۱-۲۷۰۲۔ واحمد فی المسند ۴۱۱/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت اعزمیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک میرے دل پر پردہ ڈالا جاتا ہے اور میں دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں“۔ (مسلم)

راوی حدیث:

الاعرابی المزنی۔ یہ ”اعزمی“ صحابی ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ”جہنی“ ہیں ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے ابن عمرؓ اور معاویہ بن قمرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ ”اعرابی“ میں ہمزہ مفتوح اور نین معجمہ مفتوح اور نین معجمہ مشدود ہے۔ ”مزنی“ قبیلہ ”مزینہ“ کی طرف منسوب ہے صحاح ستہ میں ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

تشریح: (عن الاعرابی) ہمزہ اور نین کے فتح اور راء کی تشدید کے ساتھ۔ (المزنی) یہ نسبت ہے قبیلہ مزنیہ کے ساتھ اور مزنیہ تصغیر ہے اور نے نسبت جہنی ذکر کی ہے۔ ان کو آپ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس حدیث کے علاوہ صحاح ستہ کے کتب میں

ان سے کوئی روایت مروی نہیں ہے۔ یہ بات علامہ میرک نے ذکر کی ہے۔ (قال قال رسول اللہ ﷺ انه) یعنی یہ ضمیر شان ہے۔ (لیغان) یاء کے ضمہ کے ساتھ یعنی بیطقی یغشی یستر یغطی سب کا معنی ڈھانپ لینا ہے۔ (علی قلبی) یعنی میرے رب کے ارادہ کے وقت۔ (وانی لاستغفر اللہ) یعنی اس عین کی وجہ سے عین کے ساتھ حجاب میں کے ساتھ این کے مرتبہ سے بڑھ کر۔ (فی الیوم) یعنی اس سے مراد یا تو وقت ہے جس کا آپ ﷺ نے ارادہ کیا ہے یا وہ وقت مراد ہے کہ جس میں مرید مراد میں گم ہو جاتا ہے یہ وہی وقت ہے جس میں وقت کی وجہ سے صوفیہ کے بارے میں کہتا جاتا ہے کہ صوفی ابن الوقت ہے یا ابو الوقت ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ سے بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرا ایک اللہ کے ساتھ ایک ایسا مخصوص وقت ہے جس وقت میں میرے ساتھ نہ تو کسی نبی مرسل کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ ہی کسی مقرب فرشتہ کی ملک سے جبرائیل علیہ السلام اور نبی مرسل سے آپ کی اپنی ذات مراد ہے۔ (مائۃ مرۃ) اس سے کثرت مراد ہے اس لئے کہ اس مقام میں زمانہ کو پھیلا دیا جاتا ہے اور زبان پلیٹ دی جاتی ہے۔

۲۳۲۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا أَيُّهَا النَّاسُ تَوُبُّوا إِلَى اللَّهِ فَإِنِّي أَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ.

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۷۵/۴ حدیث رقم ۴۲-۲۷۰۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت اغر مزنی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو میں دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتا ہوں“۔ (مسلم)

تشریح: (یا ایہا الناس) بظاہر لوگوں سے مراد مومنین ہیں۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [النور: ۳۱] یہ آیت اور حدیث باب دونوں اسی بات پر دلیل و شاہد ہیں کہ ہر شخص اپنے حال و مقام کے مطابق توبہ کی کمال کیلئے رجوع کا محتاج ہے۔ اور ہر شخص حق عبودیت کی کماحقہ ادائیگی سے قاصر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَلَّا لَمَا يَقْضُ مَا أَمَرَهُ﴾ [عبس: ۲۳] اور حدیث کا اگلا جملہ بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے: ”فانی اتوب الیہ ای أرجع رجوعا یلیق الی شہودہ أو سؤالہ أو اظهار الافتقار بین یدیه“۔

۲۳۲۶: وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِيمَا يَرَوِي عَنِ اللَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى إِنَّهُ قَالَ يَا عِبَادِي إِنِّي حَرَمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالِمُوا يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ فَاسْتَهْدُونِي فَاسْتَكْسُونِي أَكْسُكُمْ يَا عِبَادِي إِنَّكُمْ تُحْطِنُونَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَأَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا فَاسْتَغْفِرُونِي أَغْفِرْ لَكُمْ يَا عِبَادِي إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوا ضِرِّي فَتَضُرُّونِي وَلَنْ تَبْلُغُوا نَفْعِي فَتَنْفَعُونِي يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوْلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَأَنْسَكُمْ وَجِنْتُمْ كَانُوا عَلَى أَنْفِي قَلْبَ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا زَادَ ذَلِكَ فِي مُلْكِي شَيْئًا يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوْلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَأَنْسَكُمْ وَجِنْتُمْ كَانُوا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوْلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَأَنْسَكُمْ وَجِنْتُمْ قَامُوا فِي صَعِيدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُونِي فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِمَّا عِنْدِي إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمَخِيطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ يَا عِبَادِي إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أَحْصَيْهَا عَلَيْكُمْ ثُمَّ أَوْقَيْكُمْ يَا هَا فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيُحْمَدِ اللَّهَ وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذَلِكَ فَلَا يَلُومَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ۔

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۹۹۴/۴ حدیث رقم (۵۵-۲۵۷۷)۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان حدیثوں کے سلسلہ میں کہ جو آپ ﷺ اللہ تبارک و تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا کہ (ایک حدیث قدسی یہ بھی ہے کہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے (یعنی میں ظلم سے پاک ہوں) اور چونکہ میرے حق میں بھی ایسا ہے جیسے کہ تمہارے حق میں اس لئے میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دیا ہے پس تم آپس میں (ایک دوسرے پر) ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں ہدایت بخشوں پس تم سب مجھ سے ہدایت چاہو، میں تمہیں ہدایت دوں گا، اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو (یعنی کھانے کے محتاج) ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں کھلا دوں۔ پس تم سب مجھ سے کھانا مانگو میں تمہیں کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم سب ننگے یعنی ستر پوش کے لئے کپڑے کے محتاج ہو (علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے پہننے کے لئے دیا پس تم سب مجھ سے لباس مانگو میں تمہیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم اکثر دن رات خطائیں کرتے ہو اور میں تمہاری خطائیں بخشا ہوں پس تم سب مجھ سے بخشش مانگو میں تمہیں بخشوں گا۔ اے میرے بندو! تم ہرگز میرے ضرر کو نہیں پہنچ سکو گے تاکہ مجھے نقصان پہنچا سکوا اور ہرگز میرے نفع کو نہیں پہنچ سکو گے تاکہ مجھے فائدہ پہنچا سکو (یعنی گناہ کرنے سے بارگاہِ صمدیت میں کوئی نقصان نہیں اور اطاعت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ دونوں کا نقصان و فائدہ صرف تمہیں ہی پہنچتا ہے چنانچہ آگے اس کی تفصیل فرمائی کہ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر بھی تم میں سے کسی ایک نہایت پرہیزگار دل (والے شخص) کی مانند ہو جائیں تو اس سے میری مملکت میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی (یعنی اگر تم سب کے سب) اتنے ہی پرہیزگار اور اتنے ہی نیک بن جاؤ جتنا کہ کوئی شخص پرہیزگار و نیک بن سکتا ہے مثلاً تم سب محمد ﷺ ہی کی طرح پرہیزگار بن جاؤ کہ روئے زمین پر کوئی بھی ایسا شخص باقی نہ رہے جس کی زندگی پر فسق و فجور اور گناہ و مصیبت کا ہلکا سا اثر بھی ہو تو اس سے میری سلطنت و میری مملکت میں ادنیٰ سی بھی زیادتی نہیں ہوگی) اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے، تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب) مل کر تم میں سے ایک نہایت بدکار دل (والے شخص) کی مانند ہو جائیں (یعنی تم سب مل کر شیطان کی مانند ہو جاؤ) تو اس سے میری مملکت کی کسی ادنیٰ سی چیز کو بھی نہیں نقصان پہنچے گا، اے میرے بندو! اگر تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر کسی جگہ کھڑے ہوں اور مجھ سے پھر مانگیں اور میں ہر ایک کو اس کے مانگنے کے مطابق (ایک ہی وقت میں اور ایک ہی جگہ) دوں تو میرا یہ دینا اس چیز سے جو میرے پاس ہے اتنا ہی کم کرتی ہے جتنا کہ ایک سوئی سمندر میں گر کر (اس کے پانی کو کم کرتی ہے) اے میرے بندو! جان لو میں تمہارے اعمال یاد رکھتا ہوں اور انہیں تمہارے لئے لکھتا ہوں، میں تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا، پس جو شخص بھلائی پائے (یعنی اسے اللہ تعالیٰ کی نیک توفیق حاصل ہو اور وہ عمل خیر کرے) تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جو شخص بھلائی کے علاوہ پائے (یعنی اس سے کوئی گناہ سرزد ہو) تو وہ اپنے نفس کو ملامت کرے (کیونکہ اس سے گناہ کا سرزد ہونا نفس ہی کے تقاضا سے ہوا)۔ (مسلم)

تشریح: (انہ) بکسر الہمزہ اور بالفتح دونوں طرح درست ہے۔ (یا عبادی) یا خطاب ”تقلین“ کو ہے چونکہ تقویٰ و فجور کا اظہار یہی دو مخلوقات کرتے ہیں۔ اور احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب ملائکہ کو بھی ہو۔ اس صورت میں اس خطاب کے مخاطب ہونا نہ صدور فجور پر موقوف ہوگا اور نہ امکان صدور فجور پر۔ اھ۔ یہی بات حاجت طعام و لباس میں بھی ہے لیکن امکان عقل پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔ یا خطاب

تغلیبی پر محمول کیا جائے۔

(وجعلنہ بینکم محرما) ابن حجر فرماتے ہیں: اسی تحریم غلیظا جدا، فهو آكد من حرمتہ علیکم، فلذا عدل الیہ۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ عدول اس وجہ سے کیا تاکہ معنی تحریم میں مشارکت کا وہم نہ ہو۔ (فلا تظالموا) تاء مفتوح ہے۔ ایک تاء کو تخفیف کی غرض سے حذف کر دیا گیا ہے۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم مت کرو، چونکہ مظلوم کی طرف سے میں ظالم سے انتقام لوں گا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ (يقول الله تعالى جل جلاله، لا تنصرون للمظلوم ولو بعد حين) اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿ولا تحسبن الله غافلا.....﴾ [ابراہیم: ۴۲] وہ ذہیل دیتا ہے چھوڑتا نہیں ہے۔ (یا عبادى کلکم ضال الا من ہدیتہ) یا عبادى یہ خطاب عام ہے جو ہر خاص و عام کو شامل ہے نیز اس اسلوب میں تا نیس تا م بھی ہے۔ مکرر ارشاد فرمایا، اپنی عظمت اور علو شان پر تنبیہ کیلئے۔ قالہ ابن حجر۔ اور اظہر یہ ہے کہ متعقبات عبودیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ تم میں افتقار ہے تم حقوق ربو بیت کی رعایت رکھو۔ کلکم ضال الا من ہدیتہ۔ بعض کا کہنا ہے اس سے مراد آنحضرت ﷺ کی بعثت سے قبل لوگوں کی حالت مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ تم لوگ گمراہی میں پیدا کئے گئے ہو۔

کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس سے دنیا اور دین کا ہر کمال، ہر سعادت اور تمام ہی بھلائیاں ہوں ہر شخص کے اندر کچھ نہ کچھ کی اور کوتاہی ضرور ہوتی ہے اور اگر کوئی دینی اور اخروی اعتبار سے اپنے اندر کوئی کمی اور کوتاہی مگر ابھی رکھتا ہے تو کسی کے اندر دنیاوی امور کے اعتبار سے کوئی نہ کوئی کمی اور کمی ہوتی ہے اس لئے فرمایا کہ تم سب گمراہ ہو۔ یعنی دنیوی اور دینی دونوں اعتبار سے درجہ کمال سے ہٹے ہوئے ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی مراد یہ ہے کہ اگر لوگوں کو ان کی اس حالت و کیفیت پر چھوڑ دیا جو ان کی طبیعت اور ان کے نفس کی بنیاد ہوتی ہے تو وہ خود درخت کی طرح جس طرح چاہیں بڑھیں اور جس سمت چاہیں چلیں، جس کا نتیجہ گمراہی اور بے راہ روی ہے اس لئے میں جس کو چاہتا ہوں اسے فکروذہن کی سلامت اور اعمال نیک کی ہدایت بخشتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا نفس صحیح راستہ پر چلتا ہے اور اس کی طبیعت نیک ہی کی سمت بڑھتی ہے اس بات کو نبی کریم ﷺ نے اس طور پر بیان فرمایا ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فِي ظُلْمَةٍ ثُمَّ رَشَّ عَلَيْهِمْ مِنْ نُورِهِ: "اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا اور پھر ان پر اپنے نور کا چھینٹا دیا۔"

اس موقع پر یہ خلیجان پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ یہ بات اس حدیث: كُلُّ مَوْلُودٍ يُوَلَّدُ عَلَى الْفِطْرَةِ "ہر بچہ فطرت (اسلام کی فطرت) پر پیدا کیا جاتا ہے۔"

کے منافی ہے کیونکہ "فطرت" سے مراد "توحید" ہے اور "ضلالت یا عظمت" سے مراد احکام ایمان کی تفصیل اور اسلام کے حدود و شرائط کا نہ جاننا ہے۔

اور اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ووجدك ضالاً فهدى﴾ [الضحیٰ: ۷] بعض نے اس کے معنی "عاشق" بیان کئے ہیں۔ فاستہدونی اهدکم۔ تم مجھ سے ہدایت کی جو نوع چاہو گے میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ چونکہ میرے سوا کوئی ہادی نہیں۔ اگر میری طرف سے ہدایت نہ ہوتی تو تم راہ راست نہیں پاسکتے تھے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو شخص بھی اخلاص نیت کے ساتھ ہدایت چاہے گا اس کو ہدایت ضرور ملے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ولولا فضل الله عليكم ورحمته لکنتم من الخاسرين﴾ یہاں تک امور دینیہ پر امتنان تھا، آگے امور دنیویہ کا بیان ہے۔

یا عباد کلکم جائع الا من أطمعته، فاستطعمونی أطمعکم: دو اہم امور پر اقتصار کیا، یعنی طعام و لباس پر۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں جنت کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَأَنْ لَّكَ أَنْ لَا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ وَأَنْتَ لَا تَطْمَأَنِّ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ﴾ [طہ: ۱۱۸-۱۱۹] ممکن ہے کہ حدیث میں طعام کا ذکر کرنا اور مشروب کا ذکر نہ کرنا دلالت مقابله کی وجہ سے۔ از باب اکتفاء ہو اور اس آیت کریمہ کے قبیل سے ہو: ﴿سَرَابِيلٌ تَقِيكُمُ الْحَرَّ﴾ [النحل: ۸۱] آی: وبالرہد۔ اور ٹھکانہ کا ذکر اس وجہ سے نہیں کیا کہ ”کسوہ“ بھی بمنزلہ ”سترہ“ کے ہے۔ امام طیبی فرماتے اگر یہ اشکال کیا جائے کہ الا من أطمعته و کسوۃ کے استثناء کا مطلب کیا ہے؟ چونکہ ہم میں سے کوئی شخص ان دونوں نعمتوں سے محروم نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اطعام و کسوۃ کو نفع تام اور رزق میں کشادگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ان دونوں چیزوں کے نہ ہونے کو تقصیر و تضييق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اللَّهُ يَسِّطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ﴾ [الرعد: ۲۶] اس سے جواب بآسانی مل جاتا ہے۔ اس ساری تقریر سے ظاہر ہوا کہ مستثنیٰ منہ میں اثبات جوع و عری سے، شیع و کسوۃ کی بالکل نفی مراد نہیں ہے۔ اور نہ ہی مستثنیٰ میں شیع و کسوۃ کا مطلق اثبات ہے۔ بلکہ بسط و تکثیر مراد ہے۔ فصل ثانی کی چودھویں حدیث اس کی مزید وضاحت کر رہی ہے۔ کہ اس میں الفاظ یوں ہیں: ”کلکم فقراء الا من أغنیته“ کہ یہ حمد بالکل اپنے موقع محل میں ہے۔ اھ۔ یہ کلام انتہائی خوبصورت ہے۔ ابن حجر نے بھی بعینہ یہی کلام لیا ہے۔

یا عبادى انکم تخطون باللیل والنهار وأنا اغفر الذنوب جميعا: یعنی اکثر لوگ بالفعل اور تھوڑے لوگ بالقوہ خطا میں کرتے ہیں۔ ابن حجر کا کہنا ہے کہ اس کلام کے مخاطب غیر معصوم سابقین و لاحقین سب کو شامل ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے: حسنات الابوار سیئات المقربین واستغفارہم غیر استغفار المذنبین“۔ اور دن کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ دن میں گناہوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ﴾ [الانعام: ۶۰]

”وَأَنَا اغْفِرُ الذَّنُوبَ جَمِيعًا“۔ میں تمہاری تمام خطا میں بخشا ہوں۔ کامل تو یہ کر لو گے تو تمام خطا میں بشمول کفر و شرک کے معاف کر دوں گا۔ یا استغفار و اذکار وغیرہ کے ذریعہ تمام خطا میں معاف کر دوں گا۔ ”انکم لم تبلغوا اضری فتضرونی، ولن تبلغوا نفعی فتنبفعونی: ضاری: ضار پر فتحہ ضمہ دونوں درست ہیں۔ فتضرونی اور فتنبفعونی دونوں جو اس جہتی ہیں۔ اس لئے حالت نصی میں ہیں۔ اور نون اعرابی کو حذف کر دیا گیا ہے۔ وانسکم و جنکم: یہ تفصیل و تبیین ہے۔ یا تعیم بعدا عمیم برائے تاکید ہے۔ ”وکانوا علی اتقی قلب واحد منکم: ای لو کنتم علی غایۃ التقوی بان تکونوا جميعا علی تقوی اتقی قلب رجل، واحد منکم“ قاضی نے اس جملہ کی توضیح یوں کی ہے۔ ”ای: علی تقوی اتقی احوال قلب رجل، ای: کان کل واحد منکم علی هذه الصفة۔“

امام طیبی فرماتے ہیں: ان دونوں میں سے ایک تقدیر بہر حال ضروری ہے تاکہ اتقی کی خبر کان میں واقع ہونا درست ہو جائے۔ واضح رہے کہ شارع کی مراد یہ نہیں کہ سب لوگ مل کر بمنزلہ رجل واحد اتقی کے ہو جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر ہر فرد بمنزلہ رجل اتقی کے ہو جائے۔ چونکہ یہ مفہوم ابلیغ ہے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں۔ رکبوا فوسمہم۔ یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی طرح ہے: ﴿حَتَّمُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ﴾ [البقرہ: ۱۰۷]

صیغہ فعل کی نکرہ مفردہ کی طرف اضافت اس پر دال ہے۔ کہ اے مخاطب اگر مخلوقات میں سے ہر ہر فرد کے دل کو بھی ٹٹولے تو اس شخص سے زیادہ متقی تو کسی کو نہ پائے اھ۔ چنانچہ اسی وجہ سے اتقی قلب رجل کی تفسیر حضرت محمد عربیؐ کے ساتھ اور قلب اتقی کی تفسیر قلب ابلیس کے ساتھ کی گئی ہے۔

یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿یوم تبيض وجوه وتسود وجوه فأما الذين اسودت وجوههم﴾ [آل عمران: ۱۰۶] (ما نقص ذلك من ملكي شيئا) نقص تخفيف کے ساتھ ہے۔ اور ذک کا مشار الیہ ماز کر ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: اگر نقص کو فعل متعدی مان لیا جائے تو شیئاً مفعول بہ ہے، اور اگر ناقص کہا جائے تو مفعول مطلق ہے۔ ان: نقص نقصانا قليلا۔ اور توین برائے تحقیر ہے۔ اور اس کی دلیل اگلی حدیث مبارکہ کا یہ جملہ جناح بعوضہ ہے۔ یہ کلام ”لن یبلغوا اخری فیضرونی“ کی طرف راجع ہے۔ اور ابن حجر نے عجیب بات کہی کلام افصح کے مطابق نقص متعدی بد مفعول ہے۔ اور شیئاً اس کا مفعول ثانی ہے۔ جیسا کہ لم ینقصوکم شیئاً اھ۔ اور وجہ غرابت یہ ہے کہ اس حدیث میں دوسرا مفعول تو ہے ہی نہیں۔ چہ جائیکہ مفعول ثانی ہو۔ اور شاید کہ ان کو یہ وہم ہوا کہ ذک مفعول اول ہے، فساد معنی کی وجہ سے اس کا خطا ہونا بالکل واضح ہے۔ درست بات یہ ہے کہ ذک فاعل ہے نقص کا۔

چنانچہ امام طیبی کا کلام بالکل درست ہے۔ البتہ جس مسئلہ میں آیت سے استدلال کیا ہے یہ درست نہیں، چونکہ شیئاً میں ایک احتمال یہ ہے کہ منصوب علی المصدریۃ ہو۔ ای شیئاً من النقص۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ منصوب علی المفعولیۃ ہو۔ ای شیئاً من شروط العہد۔ اس صورت میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ ینقصوکم باب حذف والیصال سے ہو۔ ای: لم ینقصوکم منکم ای من عہودکم شیئاً۔ ابوالبقاء فرماتے ہیں: جمہور نے اس کو صاد کے ساتھ پڑھا ہے، البتہ ضاد کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ ”ای عہودکم“ مضاف کو حذف کر دیا گیا اور شیئاً موضع مصدر میں ہے۔ (کانوا علی أفعول) یہاں مضاف محذوف ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: قاموا فی صعید کی قید اس لئے لگائی کہ سوالات کا تراجم اور سائلین کا ازدحام یہ ان چیزوں میں سے ہیں۔ جو مسؤل کو مدہوش کر چھوڑتی ہیں۔ اور مسؤل کیلئے سائلین کے مطالب و مقاصد کو پورا کرنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، اور پورا کرنا مشکل کر دیتی ہیں۔ کما ینقص: اس ”ما“ کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ (۱) یہ ما مصدریہ ہے۔ ”ای: کانلنقص“۔ (۲) ”با“ ما موصوفہ ہے۔ ای الشئ الذی ینقصہ۔ المخیط: بکسر الهمیم و سکون الخاء۔ ای: الابرة۔ سوئی۔ البحر: اذخل کا مفعول ثانی ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: سوئی سمندر میں گر کر اس کے پانی کو جس قدر کم کرتی ہے وہ کمی نہ محسوس ہوتی ہے اور نہ اہل عقل کے ہاں کسی شمار میں آتی ہے۔ بلکہ وہ حکماً کا عدم ہوتی ہے۔ تو یہ مثال چونکہ اقرب الحسوسات تھی کہ جس کے ذریعہ تمام مخلوقات کو ان کی حوائج عطا کرنے کے مشابہ قرار دیا جاسکتا تھا کہ اللہ اگر اس کم و کیف کے ساتھ ہے تو اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اور ابن الملک فرماتے ہیں: یا یہ کہا جائے کہ یہ بات بطور فرض و تقدیر کے فرمائی، یعنی فرض کر لو کہ اللہ کی مخلوقات میں کمی آجائے گی تو بس اسی قدر آئے گی۔

امام طیبی فرماتے ہیں: حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا مفہوم درحقیقت قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿وان من شیء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم﴾ [الحجر: ۲۱]۔ یہ حدیث باب حدیث خضر کی نظیر ہے۔ کہ جب حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کشتی میں سوار ہوئے تو ایک چڑیا اس کے کنارے پر آ بیٹھی، اس نے سمندر میں چونچ ماری، یہ دیکھ کر حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ما نقص علمی و علمک من علم اللہ الا کما نقص هذا العصفور من هذا البحر۔ شرح کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کلام از باب فرض و تنزیل ہے۔ ای: لو فرض النقص لکان مقداره مقدار الممثل بہ، اگر سمندر میں کمی واقع ہوئی ہے تو بات یہ ہے کہ سمندر تنہا ہی محدود ہے۔ لیکن اس میں آنے والی قلت، مراتب قلت میں سے اتنے ادنیٰ درجہ کی ہے کہ اس کو محسوس بھی نہیں کیا جاسکتا، ملا علی قاری فرماتے ہیں: نقص کی صرف صورت ہی متصور ہے ورنہ تو حقیقت میں یہ جنس کثیر سے شیء قلیل کا انتقال ہے دوسری طرف حقیقت میں کوئی کمی نہیں آ رہی ہے۔ بلکہ اس میں زیادہ افادہ ہے، چونکہ اس قطرہ پانی میں چڑیا کی جان و حیاں ہے۔ اور بعض علوم شرعیہ و لدنیہ کا حصول ہے موسیٰ و خضر علیہما السلام کی طرف۔ یہ علم بدیع کی قسم ہے۔ اس کو ”باب تاکید

الحکم بما يشبه الاستثناء“ کہتے ہیں۔ جیسا کہ ان آیات میں کہا ہے: ﴿وما نقموا منهم الا أن يؤمنوا بالله العزيز الحميد﴾ [البروج: ۸] ﴿لا يسمعون فيها لغوا الا سلاما﴾ [مریم: ۶۲] اور شاعر کا یہ قول:

ولا عيب فهم وغير أن سيوفهم
بهن فلو لا من قراع الكتاب

اس (شعر) کو از باب تاکید المدح بما يشبه الزم قرار دیا ہے۔

یا عباد! انما هي..... الا نفسه“ ابن الملک فرماتے ہیں: یہ حدیث اس مسئلہ میں صریح ہے: ”الخير من الله والشر من النفس“ اہ۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: یہ بڑی عجیب و غریب بات کہی حالانکہ عقیدہ کا پکا ٹھکا مسئلہ ہے۔ ”الخير والشر كله من الله خلقا ومن العبد كسبا“۔ اہل بدعت میں سے خوارج و معتزلہ اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ادب مع اللہ تعالیٰ کا تقاضا یہ ہے کہ شر کو نفس کی طرف منسوب کیا جائے۔ جیسا کہ اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے: ﴿وإذا مرضت فهو يشفين﴾ [الشعراء: ۸۰] اور یہی معنی آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی: ”الخير بيدك والشر ليس اليك“ کے ہیں۔

ابو ادريس خولانی جب اس حدیث کو بیان فرماتے تو تعظیم باری تعالیٰ کے غلبہ سے ”جاشیہ“ (گھٹنوں کے ہل) بیٹھ جاتے۔

۲۳۲۷: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَانَ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةَ وَتِسْعِينَ إِنْسَانًا ثُمَّ خَرَجَ يَسْأَلُ فَاتَى رَاهِبًا فَسَأَلَهُ فَقَالَ اللَّهُ تَوْبَةٌ قَالَ لَا فَقَتَلَهُ وَجَعَلَ يَسْأَلُ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ أَنْتَ قَرِيْبَةٌ كَذَا وَكَذَا فَأَذْرَكَهُ الْمَوْتُ فَنَاءَ بِصَدْرِهِ نَحْوَهَا فَأَخْتَصَمَتْ فِيهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَمَلَائِكَةُ الْعَذَابِ فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ هَذِهِ أَنْ تَقْرَبِي وَإِلَى هَذِهِ أَنْ تَبَاعِدِي فَقَالَ فَيَسْأَلُ مَا بَيْنَهُمَا فَوَجِدَ إِلَى هَذِهِ أَقْرَبَ بِشَيْرٍ فَعَفَّرَ لَهٗ. (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۱۲/۶ حديث رقم ۳۴۷۰۔ وخرجه مسلم فى صحيحه ۲۱۱۸/۴ حديث رقم (۴۶-۲۷۶۶)

ترجمہ: ”اور حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بنی اسرائیل (حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں) ایک شخص تھا جس نے ننانوے آدمیوں کو قتل کیا اور پھر (لوگوں سے یہ) پوچھنے نکلا (کہ اگر میں توبہ کر لوں تو وہ توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟) چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ ایک عابد و زاہد کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ کیا اس (اتنے بڑے گناہ سے یا اس اتنے بڑے گناہ کرنے والے) کے لئے توبہ ہے؟ یعنی کیا اس کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ اس عابد و زاہد نے کہا کہ نہیں! اس شخص نے (یہ سنتے ہی) اس عابد و زاہد کو بھی قتل کر دیا اور پھر (دوسرے لوگوں سے) پوچھنے لگا ”ایک شخص نے اس سے کہا کہ تم فلاں بستی میں جاؤ۔ چنانچہ وہ شخص اس بستی کی طرف چل کھڑا ہوا ابھی آدھے ہی راستے پر پہنچ پایا تھا کہ اچانک اسے موت نے آدبوچا (چنانچہ اسے موت کی علامت محسوس ہوئیں) تو اس نے اپنا سینہ اس بستی کی طرف جھکا دیا اور پھر اس کی روح قبض کرنے کے وقت رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے جھگڑنے لگے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو جس کی طرف وہ توبہ کرنے جا رہا تھا حکم دیا کہ وہ میت کے قریب آ جائے اور اس بستی کو جہاں سے وہ قتل کر کے آ رہا تھا حکم دیا کہ وہ میت سے دور ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں سے فرمایا تم دونوں بستیوں کے درمیان پیمائش کرو اگر میت اس بستی کے قریب ہوگی جہاں وہ توبہ کے لئے جا رہا تھا تو اسے رحمت کے فرشتوں کے حوالہ کیا جائے گا اور اگر اس بستی کے قریب ہو جہاں سے وہ قتل کر کے آ رہا تھا تو عذاب کے فرشتوں کے حوالہ کیا جائے گا۔ چنانچہ جب فرشتوں نے پیمائش کی تو وہ توبہ کے لئے جس بستی کی طرف جا رہا تھا اس سے ایک باشت

قریب پایا گیا پس حق تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: راہب کی تعریف: ہو عابد زاہد معتزل عن الخلق مقبل علی الحق غالب علیہ الخوف فقال أله توبة؟ ضمیر مجرور فعل یا فاعل کی طرف راجع ہے۔ ”أی: لهذا الفعل أو لهذا الفاعل؟“ ابن حجر لکھتے ہیں: فقال له: أی: صحیحہ۔ بعض کا کہنا ہے کہ بخاری کی روایت میں ہمزہ نہیں ہے۔ اور شیخ کا کہنا ہے کہ ”لہ توبة“ میں اداءۃ استفہام محذوف ہے۔ اس میں تجرید ہے، چونکہ قیاس کا تقاضا یہ کہ عبارت یوں ہو: ألی توبة؟ ایک روایت میں ”هل لی توبة“ کے الفاظ مروی ہیں۔ اور مصابیح کے نسخہ میں ألی توبة کے الفاظ ہیں۔ قال: لا۔ یہاں دونوں مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) لا توبة له۔ (۲) لا توبة لك۔ جعل یسأل۔ یہ جعل بمعنی شرع ہے۔ ائت قرية کذا و کذا: پہلا کذا کتنا یہ از نام ہستی اور دوسرا کذا کفایہ از وصیف ہستی ہے۔ ای: ائت قرية کذا باسمہاء و کذا بوصفہا ای القرية الفلانية التي أهلها حاصلحاء۔ فأدرکہ الموت۔ اس جملہ کا عطف کلام محذوف پر ہے: أی: فقصدہا وسار نحوها وقرب من وسط طریقہا۔ أن تباعدی: تاء کے فتح کے ساتھ، اور صلہ محذوف ہے۔ ای: عن الميت یہ کہنا کہ اشارہ ملائکہ کی طرف ہے۔ درایۃ وروایۃ ہر دو طرح غلط ہے۔ قیسوا: یہ خطاب ملائکہ متخاصمین سے ہے۔

(قال: لا) یعنی اس عابد وزاہد نے اس قاتل سے کہا کہ تمہارے لئے توبہ نہیں۔ اس زاہد نے یہ کیوں کہا؟ یا تو اس وجہ سے کہ وہ توبہ کے بارے میں جانتا نہیں تھا، یا اس کا گمان یہ تھا کہ اس طرح کے شخص کی توبہ مقبول نہیں۔ اگرچہ مستحقین و متعلقین راضی ہی ہوں۔ امام طیبی فرماتے ہیں: یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر ہم ”ناں“ کہتے ہیں تو نصوص کی مخالفت لازم آتی ہے اور اگر ”ہاں“ کہیں تو تب بھی شریعت کی مخالفت لازم آتی ہے۔ چونکہ حقوق العباد توبہ سے تو ساقط ہوتے نہیں۔ حقوق العباد سے توبہ کی یہی صورت ہے کہ مستحقین کو ان کا حق دیا جائے، یا حلال کر لیا جائے، کہ جب کوئی بندہ قلب و نیت کے اخلاص کے ساتھ بارگاہ الوہیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے حق کا مطالبہ کرنے والوں کو بھی اس سے راضی کر دیتا ہے۔

فاختصمت فیہ ملائكة الرحمة وملائكة العذاب: ابن ملک کہتے ہیں کہ جب ملک الموت نے اس شخص کی روح قبض کی تو رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے دونوں ملک الموت سے اس کی روح لینے کے لئے جھپٹنے لگے، رحمت کے فرشتے تو یہ کہتے تھے کہ چونکہ یہ شخص توبہ کے لئے اس ہستی کی طرف متوجہ ہونے کی بنا پر تائب تھا اس لئے ہم اسے رحمت خداوندی کی طرف لے جائیں گے اور عذاب کے فرشتے یہ کہتے تھے کہ اس شخص نے چونکہ ایک سو آدمیوں کو ناحق قتل کیا ہے اور ابھی تک اس نے توبہ نہیں کی تھی اس لئے ہم اسے عذاب الہی کی طرف لے جائیں گے! چنانچہ حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ جس طرح فرمایا وہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

نوآمد: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ طالب توبہ کیلئے حق تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کسی قید اور حد کی پابند نہیں ہے اسکی بے پایاں رحمت خلوص قلب کے ساتھ اپنی طرف متوجہ ہونے والے بڑے سے بڑے سرکش اور گنہگار کو بھی اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے نیز توبہ کی ترغیب ہے اور مایوسی سے ممانعت ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں: مسلم کی روایت میں بھی اسی سے ملتا جلتا مفہوم ہے:

فدل علی رجل عالم، فقال: انه قتل مائة نفس هل له من توبة؟ قال: نعم ومن يحول بينه وبين التوبة، انطلق الى ارض كذا وكذا، فان بها اناسا يعبدون الله فاعبدهم ولا ترجع الى ارضك فانها ارض سوء۔ فانطلق حتى نصف الطريق اتاه الموت فاخصمت ملائكة الرحمة ملائكة العذاب، فاتاهم ملك في صورة آدمي فجعلوه بينهم فقال قيسوا ما بين الارضين فالى ايتهما ادنى فهو له۔ فوجدوه ادنى الى الارض التي اراد قبضته ملائكة الرحمة اھ۔

اس حدیث سے عالم کی عابد پر فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

۲۳۲۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ كُمْ تَذُنُّوْا لَدَهَبَ اللَّهُ بِكُمْ
وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذُنُّونَ فَيَسْتَغْفِرُونَ اللَّهَ فَيَغْفِرُ لَهُمْ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۱۱۳/۴ حدیث رقم (۱- ۲۷۴۹) و اخرجه احمد فی المسند ۳۰۹/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے اگر تم لوگ گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اٹھالے اور (تمہاری جگہ) ایسے لوگ پیدا کر دے جو گناہ کریں اور خدا سے بخشش و مغفرت چاہیں اور پھر اللہ تعالیٰ انہیں بخشے۔“ (مسلم)

تشریح: (لو لم تذنبوا) یہ خطاب تمام مکلفین سے ہے، یا مسلمانوں سے ہے۔ دونوں احتمال ہیں۔ لذهب اللہ بکم: یہ باء برائے تعدیہ ہے۔ اگلا جملہ بھی اسی طرح ہے۔ یذنبون: یعنی تمہارے ہم جنس یا کسی اور جنس کے افراد کو لے آئے گا جن سے گناہ کا وقوع ممکن ہوگا۔ اور بعض سے بالفعل گناہ صادر بھی ہوں گے۔ چنانچہ جب وہ توبہ کریں گے تو اللہ سے مطلقاً مغفرت طلب کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی صفات غفار و غفور اور عاف الذنب کے مقتضی کے مطابق ان کو معاف فرمائے گا۔ زین العرب فرماتے ہیں: اس حدیث میں ابھارا جا رہا ہے کہ رجاؤ کو خوف پر غالب رکھو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کے ذریعہ گناہ کی ترغیب مقصود نہیں ہے کیونکہ گناہ سے بچنے کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور اپنے پیغمبر ﷺ کو اس دنیا میں اسی لئے بھیجا ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کو گناہ و معصیت کی زندگی سے نکال کر طاعت و عبادت کی راہ پر لگائیں۔ بلکہ اس حدیث میں اللہ جل شانہ کی صفت عفو کا بیان ہے۔ اس ارشادِ گرامی کا مقصد مغفرت اور رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کو بیان کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اسم پاک ”غفور“ کی شان کو ظاہر کرنے کیلئے اتنا بخشش کرنے والا ہے اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ اس جملہ میں مراد یہ ہے کہ جیسے اللہ جل شانہ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ نیوکاروں پر عطائیں کی جائیں۔ اسی طرح اس بات کو بھی پسند کرتا ہے کہ بدکاروں سے عفو و درگزر کیا جائے۔ اس (صفت) پر اللہ جل شانہ کے بہت سے اسماء حسنی دلائل کرتے ہیں۔ چنانچہ غفار، حلیم، ثواب، عفو وغیرہ اسی شان کا اظہار ہیں۔ اللہ جل شانہ نے اپنے (تمام) بندوں کیلئے ایک ہی شان نہیں رکھی۔ (بلکہ کل یوم ہو فی شان) مثلاً جیسا کہ ملائکہ تنزہ عن الذنوب ان کی جبلت میں رکھا گیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں بعض ایسے لوگ پیدا کرتا ہے۔ کہ جو طبعاً اپنی خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہوتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ اس کو مکلف بنا دیتا ہے اور اس کو ڈراتا ہے اور توبہ سے روشناس کرتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ (اپنی توبہ کو) پورا کرتا ہے۔ تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اگر راستہ بھٹک جاتا ہے تو توبہ پھر اس کے سامنے ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشادِ گرامی میں اس حقیقت کا اجاگر کیا ہے کہ اگر تمہاری جبلت، ملائکہ والی ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اٹھالے اور تمہارے جگہ ایسے لوگ پیدا کرے جو گناہ کریں، اللہ ان پر اپنی حکمت کے مقتضی صفات کے ساتھ ان پر تجلی فرمائے گا۔ چونکہ ”غفار“ مغفور کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ ”رزاق“ ”مرزوق“ کو چاہتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حدیث کی ابتداء میں قسم کا ذکر فرمانا رد ہے ان پر جو لوگ عبادت سے ذنوب کے صدور کے منکر ہیں۔ اور گناہوں کو بندہ کے حق میں مطلقاً نقص شمار کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے گناہوں کے صدور کا ارادہ نہیں کیا، جیسا کہ معتزلہ اور ان کے ہم نوا کہتے ہیں۔ انہوں نے ظاہر کو دیکھا کہ وہ باعث فساد ہے اور اس راز کو نہیں پایا کہ یہ جالب توبہ ہے، توبہ اللہ جل شانہ سے محبت کی ایک امید ہے کہ ﴿ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطہرین﴾ [البقرہ: ۲۲۲] وان اللہ بیسط یدہ باللیل لیتوب

مسیٰ النهار، واللہ أشد فرحاً بتوبة عبده۔“ صفات کرم، حلم اور غفران کے اظہار میں شاید یہی راز ہے کہ اگر یہ صفات (بالفعل) نہ پائی جائیں تو صفات الوہیہ کی ایک جانب کا ظہور نہ ہو پائے گا۔ انسان تو اللہ کی دھرتی پر اس کا خلیفہ ہے۔ اس پر اپنی صفات و جلال و اکرام، قہر، لطف، انعام کے ساتھ تجلی فرماتا ہے۔ ملائکہ نے جب اللہ جل شانہ کے قہر و جلال پر نظر ڈالی تو پکارا اٹھے: ﴿أَجْعَل فِيهَا مِنْ يَفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ [البقرة: ۳۰] اور جب اللہ جل شانہ نے اپنی صفت لطف و اکرام پر نظر ڈالی تو فرمایا: ﴿وَإِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ [البقرة: ۳۰]۔ چنانچہ حدیث مبارکہ کا یہ جملہ: ”لذهب الله بكم“ اس معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے: ”ولم يذنبوا الجاء الله بقوم يذنبون“ پر اکتفاء نہیں فرمایا۔ چنانچہ یہ اس حدیث کی نظیر ہے۔ ”كلكم خطاؤون، وخير الخطائين التوابون“۔

۲۳۲۹: وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ النَّهَارِ وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوبَ مُسِيءَ اللَّيْلِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۱۱۳/۴ حديث رقم (۱۱- ۲۷۴۹)۔ واحمد في المسند ۳۹۵/۴۔

ترجمہ: ”حضرت ابو موسیٰ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ رات میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن میں گناہ کرنے والا توبہ کرے اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات میں گناہ کرنے والا توبہ کرے یہاں تک کہ سورج مغرب کی سمت سے نکلے۔“ (مسلم)

تشریح: (ان اللہ یبسط یدہ): (یہ کلام تشابہات کے قبیل سے ہے۔ چنانچہ اس میں متعدد تاویلات کی جاتی ہیں)۔ ۱۔ بسط الید ”ہاتھ پھیلانا“ ”ہاتھ پھیلانا“ دراصل کنایہ ہے طلب کرنے سے چنانچہ جب کوئی شخص کسی سے کچھ مانگتا ہے تو اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے ”لہذا اللہ تعالیٰ رات میں ہاتھ پھیلاتا ہے“ الخ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو توبہ کی طرف بلاتا ہے! بعض حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ پھیلانا اس کی رحمت و مغفرت سے کنایہ ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں: بسط، کنایہ ہے قبول توبہ اور عرض توبہ سے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو توبہ کی طرف بلاتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ بسط عبارت ہے توسع فی الجود و العطاء و التنزه عن المنع سے۔

فوائد حدیث: اس حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے، وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے بہت زیادہ درگزر کرتا ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں: یہ تمثیل اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ توبہ اللہ کے ہاں مطلوب ہے۔ محبوب پاپ ہے، گویا کہ اللہ جل شانہ گناہ گار شخص سے توبہ کا تقاضا کر رہا ہے۔ حدیث کے آخری الفاظ یہاں تک کہ سورج مغرب کی طرف سے نکلے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طلب توبہ کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ قرب قیامت میں سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے کیونکہ جب آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا تو توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر کسی کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَوْمَ تَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا﴾ [الانعام: ۱۵۸]

اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ حکم اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس نے اس کا طلوع پایا ہو، چنانچہ جو شخص اس کے بعد پیدا ہوگا، یا بالغ ہو اور وہ کافر تھا اور ایمان قبول کر لیا، یا گناہ گار تھا اور توبہ کر لی تو اس کا ایمان مقبول ہے۔ اس کی توبہ مقبول ہے، عدم مشاہدہ کی وجہ سے۔

۲۳۳۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری ۴۳۱/۷۔ حدیث رقم ۴۱۴۱۔ و مسلم في صحيحه ۲۱۲۹/۴۔ حدیث رقم (۵۶- ۲۷۷۰)۔

ترجمہ: ”اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب بندہ (اپنے گناہ کا ندامت و شرمندگی کے ساتھ) اعتراف کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: ارکان توبہ چار ہیں: (۱) ندامت۔ (۲) خلع (یعنی گناہ چھوڑنا)۔ (۳) عزم نہ کرنے کا پکا ارادہ کرنا)۔

(۳) تدارک۔

تاب اللہ علیہ: اللہ جل شانہ کا اپنے بندہ کی توبہ کا قبول فرمانا اپنے اس ارشاد کے بموجب ہے: ﴿هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ﴾ [الشوریٰ: ۲۰] امام طبریؒ فرماتے ہیں: اس (یعنی قبول توبہ) کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت فرماتا ہے۔
۲۳۳۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۷۶/۴ حديث رقم (۴۳- ۲۷۰۳) واحمد في المسند ۵۰۶/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص مغرب کی سمت سے آفتاب طلوع ہونے سے پہلے پہلے توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔“ (مسلم)

عرض مرتب: اس کی تشریح کچھلی حدیث کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۳۳۲: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَللَّهِ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ حِينَ يَتُوبُ إِلَيْهِ مِنْ أَحَدِكُمْ كَأَنَّ رَاحِلَتَهُ بَارِضٌ فَلَاةٌ فَأَنْقَلَتَتْ مِنْهُ وَعَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ فَأَيَسَ مِنْهَا فَأَتَى شَجْرَةً فَأَصْطَجَعَ فِي ظِلِّهَا قَدْ آيَسَ مِنْ رَاحِلَتِهِ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَلِكَ إِذْ هُوَ بِهَا قَائِمَةٌ عِنْدَهُ فَاخَذَ بِخَطْمِهَا ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفُرْحِ اَللَّهُمَّ أَنْتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّكَ أَخْطَأُ مِنْ شِدَّةِ الْفُرْحِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۱۰۴/۴ حديث رقم ۲۷۴۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ اس شخص سے جو اس کے سامنے توبہ کرتا ہے اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے کہ جتنا تم میں وہ شخص بھی خوش نہیں ہوتا جس کی سواری بیچ جنگل بیابان میں ہو اور پھر وہ جاتی رہی ہو (یعنی گم ہوگئی ہو) اور اس سواری پر اس کا کھانا بھی ہو اور پانی بھی ہو اور وہ (اس کو تلاش کرنے کے بعد) ناامید ہو جائے اور ایک درخت کے پاس آ کر اپنی سواری سے ناامیدی نیا حالت میں (انتہائی مغموم و پریشان) لیٹ جائے اور پھر اسی حالت میں اچانک وہ اپنی سواری کو اپنے پاس کھڑے ہوئے دیکھ لے۔ چنانچہ وہ اس سواری کی مہار پکڑ کر انتہائی خوشی میں (جذبات سے مغلوب ہو کر) یہ کہہ بیٹھے ”اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں“ مارے خوشی کی زیادتی کے اس کی زبان سے یہ غلط الفاظ نکل جائیں۔“

(للہ) یہ لام ابتداء ہے یا لام قسم ہے۔ (کان راحلته) ایک نسخہ میں کانت راحلته کے الفاظ ہیں۔ (قد آيس من راحلته) یہ جملہ حالیہ ہے۔ (بارض فلاة) اضافت و تونین ہر دو کے ساتھ مروی ہے۔ من احدکم: یہاں حذف مضاف ہوا ہے۔ ای من فرح احدکم۔ یعنی تم میں سے کسی کی خوشی سے۔

(للہ أشد فرحاً بتوبة.....) امام طبریؒ فرماتے ہیں۔ اس سے مراد کمالِ رضا ہے۔ چونکہ فرح متعارف کا اطلاق اللہ جل شانہ کی

ذات اقدس پر درست نہیں ہے۔ اور متقدمین محدثین نے ان الفاظ کے معانی کی چھان پھانک نہیں کی، اور یہی طریقہ اسلام ہے۔ بعض مرتبہ راجحین کے قدم بھی ڈگمگاتے ہیں۔ ”وعلیہا طعامہ وشرابہ“: ان دو چیزوں کی وجہ تخصیص یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس کے زندہ رہنے کے اسباب میں سے ہیں۔ اذہو بہا قائمۃ عنده: اس کی تقدیری عبارت یوں ہے: ”اذ الرجل حاضر بتلك الراحلة حال كونها قائمۃ عنده“۔

من شدة الفرح: اس کو مکرر لاکر اس کے عذر اور سبب کی طرف اشارہ فرمایا۔ کہ خوشی اور غم کی شدت سے بعض مرتبہ آدمی مدہوش ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی عقل بدبھیات کے ادراک سے عاجز آ جاتی ہے۔ اور گاہے آدمی اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

عرض مرتب: اور شاید کہ اس موقع پر یہ کہنا بے موقع نہ ہو۔ صرّ ہر چیز کی بہتات میں نقصان بہت ہے۔

۲۳۳۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ عَبْدًا أَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ أَذْنَبْتُ فَأَغْفِرُهُ فَقَالَ رَبُّهُ أَعْلَمَ عَبْدِي أَنْ لَّهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ عَفْرَتُ لِعَبْدِي ثُمَّ مَكَتَ مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ أَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ أَذْنَبْتُ فَأَغْفِرُهُ فَقَالَ أَعْلَمَ عَبْدِي أَنْ لَّهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ عَفْرَتُ لِعَبْدِي ثُمَّ مَكَتَ مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ أَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ أَذْنَبْتُ ذَنْبًا آخَرَ فَأَغْفِرُهُ لِي فَقَالَ أَعْلَمَ عَبْدِي أَنْ لَّهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ عَفْرَتُ لِعَبْدِي فَلْيَفْعَلْ مَا شَاءَ . (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۶۶۱۳۔ حدیث رقم ۷۵۰۷۔ ومسلم فی صحیحہ ۲۱۱۲/۴ حدیث رقم (۲۹)۔

(۲۷۵۸)۔ واحمد فی المسند ۴: ۵۰۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ایک بندے نے گناہ کیا اور پھر کہنے لگا ”اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے“ اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں سے) فرمایا ”کیا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو (جس کو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے) اس کے گناہ بخشتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے) اس کے گناہ پر مواخذہ کرتا ہے (تو جان لو) کہ میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا۔ وہ بندہ اس مدت تک کہ اللہ نے چاہا (گناہ کرنے سے) باز رہا، اس کے بعد اس نے پھر گناہ کیا اور عرض کیا کہ ”اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے“ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا ”کیا یہ میرا بندہ یہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے؟ میں نے اس بندہ کو بخش دیا“۔ وہ بندہ اس مدت تک کہ اللہ نے چاہا گناہ سے باز رہا اور اس کے بعد پھر اس نے گناہ کیا اور عرض کیا کہ ”اے میرے پروردگار! میں گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا ”کیا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے میں نے اس بندہ کو بخش دیا جب (تک وہ استغفار کرتا رہے) جو چاہے کرے“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: (اذنب ذنباً فقال): بظاہر اس کا عطف اذنب پر ہو رہا ہے۔ امام طبریؒ فرماتے ہیں: خبر ان ہے، اس کا اسم نکرہ

موصوفہ ہے۔ رب اذنبت: حرف نداء محذوف ہے۔ امی: یا رب: فاغفرہ: ضمیر غائب ”ذنب“ کی طرف راجع ہے۔ اور فاء سیبہ ہے۔

(اعلم) ہمزہ استفہامیہ ہے۔ اور ”علم“ فعل ماضی ہے۔ ”ثم اذنب ذنباً“: ثم مفید تراخی ہے۔ تراخی فی الذنوب کا فائدہ دے رہا

ہے۔ اور دوسرا ثم اس کی تاکید ہے۔ (فلیفعل ما شاء): ایک نسخہ میں ”فلیفعل ما شاء“ کے الفاظ ہیں۔ ”ان له ربا“: تنوین برائے

تعمیم ہے۔

فأغفره: اپنے گناہ کے اعتراف کو سبب مغفرت قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور وعدہ اپنے اوپر مغفرت کو واجب کیا ہے۔ کہ ان تائبین کیلئے کہ جو اپنے گناہوں کے مقترف ہو۔ اور ظاہر یہ محمول کرنا بھی صحیح ہے کہ اس نے مغفرت بغیر توبہ کے چاہی ہو۔ بیان وسعت رحمت میں یہ مفہوم زیادہ بلیغ ہے۔ أعلم عبدی: امام طیبی فرماتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ کلام باری تعالیٰ مباہاتہ کیلئے ہے، یا استفہام تقریر و تعجب کیلئے ہے۔ اور علم عبدی کی صیغہ خطاب سے صیغہ غائب کی طرف عدول کرنے میں اس کے فعل کی تحسین ہے۔ ثم اذنب ذنبا: ثم کا مفہوم مخصوص (الا) میں ہونا یہ مذنب کی عظمت دلالت کرتا ہے کہ اس کی طاعت اس کی معصیت پر غالب ہے اور یہ کہ وہ طلب مغفرت کے معاملہ میں سربلج الرجوع (جلد رجوع کرنے والا) ہے۔ غفرت لعبدی: اس میں سبب مغفرت کا اظہار ہے باری طور کہ وہ میرا بندہ ہے چونکہ اس سے جب بھی گناہ صادر ہوتا ہے وہ مجھے ”رب“ کہہ کر پکارتا ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: ای ما شاء من الذنب التي بيني وبينه مما لا يتعلق بفعل العباد، ثم ليتب اھ۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں یہ قید بلا دلیل ہے۔ اور بلا دلیل ہونے کی دلیل یہ ہے: ”ان الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء“۔ (فلیفعل ماشاء) یہ صیغہ تلمیح اور اظہار عنایت و شفقت کیلئے ہے۔ یعنی اے بندے جو توبہ کر رہا ہے اگر اس سے کئی گنا کرے، استغفار کرے تو میں مغفرت کروں گا۔ چونکہ میں گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی: ”ما أصر من استغفر ولو عاد في اليوم سبعين مرة“ کے بھی یہی معنی ہیں۔

عرض مرتب: یہی حدیث آگے متن میں بھی آرہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: حدیث: ۲۳۴۰۔

ابن الملک نے بڑی عجیب بات کہی: ما دمت تتوب وتستغفر عنها، ولكن ذلك مشروط بأن تكون نيته أن لا يعود الى الذنب اھ“ اس لئے کہ جس چیز کو انہوں نے بطور شرط ذکر کیا ہے وہ درحقیقت ارکان توبہ میں سے ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ای اعمل ما شئت ما دمت تذنّب ثم تتوب انى أغفر لك“۔ یہ عبارت مقام سخط و ناراضگی میں استعمال ہوتی ہے جیسا کہ یہاں: ﴿اعملوا ما شئتم﴾ [فصل: ۴۰] اور مقام جفاوت یعنی مقام تلمیح میں بھی استعمال ہوا جیسا کہ حدیث میں ہے اور حاطب ابن ابی بلتعہ کے بارے میں یہ ارشاد نبوی: ”لعل الله اطلع على أهل بدر فقال: اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم“۔ نیز اسی طرح جب آپ کا محبوب آپ کو اذیت دے تو اس سے بھی یوں کہتے ہیں: ”اصنع ما شئت فلست...“ تم جو چاہے کرو میں تمہیں نہیں چھوڑنے والا۔ قصہ مختصر یہ فعل کی ترغیب نہیں بلکہ اظہار جفاوت ہے۔

امام طیبی نے فرمایا: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہ کی طرف عود کرنا، اگرچہ ابتدائے گناہ سے زیادہ قبیح ہے چونکہ اس میں نقض توبہ کا گناہ بھی ہے۔ لیکن توبہ کی طرف عود کرنا ابتدائے توبہ سے زیادہ بہتر ہے۔ چونکہ اس میں ایک کریم ذات سے طلب مسلسل ہے۔ اس سے مانگنے میں الحاج و زاری ہے، اور اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کے علاوہ کوئی بھی گناہوں کو معاف نہیں کرنے والا۔ امام نووی فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہ اگرچہ مکرر بار صادر ہوں، سو مرتبہ ہوں خواہ ہزار مرتبہ ہوں خواہ اس سے زیادہ ہوں وہ ہر بار توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ اور اگر تمام گناہوں سے ایک توبہ کرتا ہے تو اس کی یہ توبہ بھی صحیح ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: یہ آخری بات اجماع سے ثابت ہے۔ البتہ اس صورت میں اختلاف ہے۔ کہ جب بعض گناہوں سے توبہ کرتا ہے (اور بعض سے نہیں کرتا) یا جب توبہ توڑ ڈالے، اس صورت میں صحیح بات یہی ہے کہ اس کی توبہ صحیح ہے۔ سبکی کبیر فرماتے ہیں: استغفار طلب مغفرت کا نام ہے، خواہ وہ (طلب مغفرت) زبان کے ذریعہ ہو، خواہ دل کے ذریعہ ہو۔ خواہ دل و زبان دونوں کے ذریعے ہو۔ پہلی صورت نافع ہے، اور تیسری

صورت اس سے بھی زیادہ نافع ہے کیونکہ یہ چپ رہنے سے تو بہتر ہے پھر اس میں ایک اچھی بات کی عادت ہے اور دوسری صورت بہت مفید ہے لیکن یہ دونوں (دل و زبان) گناہ کو نہیں ختم کرتے حتیٰ کہ توبہ کی جائے، جو عاصی مصر مغفرت کا طالب ہوتا ہے، لیکن یہ وجود توبہ کو مستلزم نہیں اہ۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: ”بکی“ کے اس قول ”لا یمحصان الذنب حتیٰ توجد التوبۃ“ کی مراد یہ ہے: ”لا یمحصان قطعاً وجزماً لا اُنہ لا یمحصان اصلاً“ چونکہ استغفار ایک دعا ہے، کبھی اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی دعا قبول فرماتا ہے۔ چنانچہ اس کے گناہ کو ختم کر دیتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ تحقیص کبھی اللہ جل شانہ کے فضل سے بھی ہو جاتی ہے اور کبھی بندہ کی کسی طاعت کے بدلہ میں ہو جاتی ہے اور کبھی کسی آزمائش کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔

(امام بکی اسی سلسلہ کلام میں آگے) فرماتے ہیں: میں نے یہ جو ذکر کیا کہ استغفار کے معنی توبہ سے ہٹ کر ہیں یہ باعتبار وضع لفظ کے ہے۔ لیکن اکثر لوگ بیشتر اوقات استغفر اللہ کو توبہ کے معنی میں لیتے ہیں۔ پس جس شخص کا یہ اعتقاد ہو تو وہ توبہ مراد لیتا ہے۔ آگے فرمایا: بعض علماء فرماتے ہیں کہ توبہ بغیر استغفار کے تام نہیں ہوتی۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِنِ اسْتَغْفَرُوا رَبَّهُمْ نَبْذُوا إِلَيْهِ﴾ [ہود: ۳۰]

اور مشہور یہ ہے کہ یہ شرط نہیں ہے اہ۔ واضح رہے کہ اکثر شرح نے استغفار کو توبہ پر محمول کیا ہے۔ اور ظاہر حدیث اس بات پر دلالت رہی ہے کہ بندہ کا اعتراف گناہ ہی اس کی مغفرت کا سبب ہے۔ اس سے عدول کا کوئی موجب نہیں ہے، بلکہ اس حدیث میں ان قائلین پر تعریض ہے جو یہ کہتے ہیں: ”انہ تعالیٰ لا یغفر الا بالتوبۃ“۔ جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حدیث کے آخری الفاظ ”پس جو چاہے کرے“ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندہ جب تک گناہ کرتا رہے گا اور استغفار کرتا رہے گا اس کے گناہ بخشا رہوں گا لہذا جملہ سے خدا نخواستہ گناہ کی طرف رغبت دلانا مقصود نہیں ہے بلکہ استغفار کی فضیلت اور گناہوں کی بخشش میں استغفار کی تاثیر کو بیان کرنا مقصود ہے

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۳۳۳: وَعَنْ جُنْدُبٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَدَّثَ أَنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللَّهِ لَا يَغْفِرُ اللَّهُ لِفُلَانٍ وَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ مَنْ ذَا الَّذِي يَنْتَالِي عَلَيَّ إِنِّي لَا أَعْفِرُ لِفُلَانٍ فَإِنِّي قَدْ عَفَرْتُ لِفُلَانٍ وَأَحْبَبْتُ عَمَلَكَ أَوْ كَمَا قَالَ.

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۲۳/۴ الحديث رقم (۱۳۷ - ۲۶۲۱)۔

ترجمہ: ”اور حضرت جندبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بیان فرمایا ”اس امت میں سے یا گزشتہ امتوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا“ پھر آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو میری قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا اور یہ جان لے کہ میں نے اس شخص کو بخش دیا اور تیرے عمل کو ضائع کیا (یعنی تیری قسم کو جھوٹا کیا)۔“ (مسلم)

تشریح: (واللہ لا یغفر اللہ لفلان) اس شخص نے یہ جملہ کیوں کہا؟ اس میں متعدد احتمالات ہیں یا اس وجہ سے کہ اس کے گناہ کو بہت بڑا سمجھتا تھا۔

ان اللہ تعالیٰ: ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھنا درست ہے۔ ای أن اللہ تعالیٰ۔ اور ہمزہ کو کسور پڑھنا بھی درست ہے۔ ”ای والحال ان اللہ تعالیٰ۔ احببت عملک: مظہر اس کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں یعنی میں نے تیری قسم کو باطل کر دیا، اور تیرے حلف کو کاذب کر دیا، چونکہ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے ”من ینتالی علی اللہ یکذبہ“۔ معتزلہ کیلئے اس حدیث سے مسئلہ

ذیل میں تمسک درست نہیں: صاحب مرتکب کبیرہ عدم احتلال کے باوجود بھی مخلد فی النار ہوتا ہے۔ جیسا کہ کفر اسکے عمل کو حبط کر دیتا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: یہ استفہام انکاری ہے، بظاہر یوں کہنا چاہئے تھا: "أنت الذی یتألی علی"۔ اس کی دلیل اگلا کلام ہے: "أحبطت عملک"۔ صیغہ خطاب سے عدول اولاً تو اس وجہ سے کیا کہ اس کے فعل سے شکایت ہے اور ثانیاً اس سے اعراض مقصود ہے۔ حدیث سابق کے برعکس۔

لہذا کسی بھی شخص کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہنا کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی ہے جائز نہیں ہے ہاں قرآن وحدیث نے وضاحت کے ساتھ جن لوگوں کو جنتی ودوزخی کہا ہے ان کو قطعی طور پر جنتی یا دوزخی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسا کہ عشرہ مبشرہ۔ ہم اگر یہ کہیں کہ اس کا یہ قول (واللہ لا یغفر اللہ لفلان) کفر ہے تو فاحبطت عملک ظاہر ہے۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ یہ معصیت ہے تو معتزلہ کے مذہب پر اس کا جواب وہی ہے۔ (جو اوپر گزرا) اور اہل سنت کے مذہب کے مطابق یہ تغلیظ پر محمول ہے۔ اھ۔ اس میں اعتراض ہے۔ اس کو کفر پر محمول کرنا بعید ہے۔ اور علی سبیل التنزل ان کا قول بالکل ظاہر ہے۔ ہمارے مذہب پر۔ چونکہ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ "احباط" کیلئے کفر پر موت شرط ہے۔ اور معتزلہ کے مذہب میں یہ بات معروف نہیں کہ ہر معصیت سارے اعمال کو حبط کر دیتی ہے۔ پھر یہ کہ کلام کو ہماری ذکر کردہ توجیہ پر محمول کرنا تغلیظ پر محمول کرنے سے اولیٰ ہے۔ نیز وہ اس کے منافی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ "او کما قال": راوی کو شک یہ ہے کہ اس کلام کا قائل نبی کریم ﷺ ہیں، یا کوئی اور، نیز بیچنہ یہی بات کہی تھی یا اس کے مثل یہ نقل بالمعنی پر تنبیہ ہے یہ اولیٰ ہے تاکہ نقل باللفظ کا تو ہم نہ ہو۔

۲۳۳۵: عَنْ شَدَادِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سَيِّدُ الْإِسْتِغْفَارِ أَنْ تَقُولَ اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوءُ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ قَالَ وَمَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مَوْقِفًا بِهَا قَمَاتٍ مِنْ يَوْمِهِ قَبْلَ أَنْ يُمْسِيَ فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلِ وَهُوَ مُوقِفٌ بِهَا قَمَاتٍ قَبْلَ أَنْ يَصْبِحَ فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی الصحيح ۹۷/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۰۶۔ والترمذی ۱۳۵/۵۔ حدیث رقم ۳۴۵۳۔

ترجمہ: "اور حضرت شداد بن اوس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "افضل استغفار یہ ہے کہ تم یوں دعا مانگو: اے اللہ! تو ہی میرا پروردگار ہے تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں! میں تیرے عہد پر ہوں (یعنی عہد میثاق پر قائم ہوں) اور تیرے وعدے پر ہوں (یعنی تو نے حشر وغیرہ کے بارے میں جو وعدہ کیا ہے اس پر یقین کامل رکھتا ہوں) میں اپنی طاقت کے بقدر اس برائی (یعنی گناہ سے) تیری پناہ چاہتا ہوں جس میں میں مبتلا ہوں۔ میں تیری نعمتوں کو جو تو نے مجھے عنایت فرمائیں اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں پس تو مجھے بخش دے۔ کیونکہ گناہوں کو تیرے علاوہ کوئی نہیں بخشتا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جو شخص ان کلمات کو دن میں ان کے معنی پر یقین رکھ کر پڑھے اور پھر اسی دن شام سے پہلے مرجائے تو وہ جنتیوں میں سے ہے اور جو شخص ان کلمات کو رات میں ان کے معنی پر یقین رکھ کر پڑھے اور اسی رات صبح ہونے سے پہلے مرجائے تو وہ جنتیوں میں سے ہے۔" (بخاری)

تشریح: (ان تقول) کے بعد عبارت محذوف ہے: ای ایہا الراوی، یا ایہا المخاطب، اس میں خطاب عام ہے۔

خلقتنی: جملہ متانفہ ہے، تربیت کا بیان ہے۔ وانا عبدك جملہ حالیہ ہے۔

موقنابہا: منصوب علی الحالیہ ہے۔ ای حال کو نہ معتقدا..... من شر ما صنعت: من تعلیلیہ ہے۔ ای: من اجل ترضعی۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ”استعیر لفظ السيد من الرئيس المقدم الذى یعمد الیه فی الحوائج لهذا الذى هو جامع لمعانى التوبة كلها، وقد سبق أن التوبة غاية الاعتذار اه۔ ابن حجر نے امام طیبی کی اتباع کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ استغفار سے مراد توبہ ہے، اور حدیث کے ظاہر سے بھی اطلاق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن توبہ کے معنی کو جامع ہونا ممنوع ہے۔ جیسا کہ مخفی نہیں۔ چونکہ اس میں صرف اعتراف باللذنب لנاشی عن الندامة ہے، عدم عود کا عزم، اور حقوق کی ادائیگی وغیرہ۔ اس سے بالکل مفہوم نہیں ہوتی۔ وانا علی عہدک کی دوسری تشریح یہ ہے: اے اللہ آپ پر ایمان لانے، اور اخلاص کے ساتھ آپ کی طاعت کی بجا آوری کا میں نے آپ سے جو عہد و پیمانہ کئے ہیں میں ان پر قائم ہوں۔ اور میں بھی قائم ہوں، اور مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں، آپ کے عہد کو اور آپ کی طرف سے اجر و ثواب کے پورا کرنے کو عہد کو۔ استطاعت کی شرط لگانا درحقیقت اپنی عاجزی کا اظہار ہے، قصہ مختصر یہ کہ اے اللہ میں آپ کی کما حقہ عبادت پر قادر نہیں، لیکن اپنی طاقت کے بقدر بھر پور کوشش کروں گا۔

عرض مرتب: علی عہدک و وعدک میں بظاہر اضافت الی المفعول اور اضافت الی الفاعل ہر دو کا احتمال ہے اھ۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: واستثنى بقوله: ”ما استعطت“ موضع القدر السابق لأمره أى: ان كان قد جرى القضاء على أن انقض العہد يوما، فانی أمیل عند ذلك الى الاعتذار لعدم الاستطاعة فى دفع ما قضيت۔ أبو ذہبى: ابن حجر فرماتے ہیں: ”أى الذنب العظيم الموجب للقطعية لو لا واسع عفوك و هامع فضلك اه۔ ابن حجر سے یہاں ذہول اور غفلت دونوں کا صدور ہوا ہے، انہوں نے اس بات کی طرف دھیان نہیں کیا کہ یہ کلام کس کا ہے۔ یہ کلام تو رسول اللہ ﷺ کا ہے، وہ تو معصوم ہیں حتیٰ کہ ”زلّہ“ سے بھی۔ اور اس سے عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے امام طیبی کی بات پر طعن کیا ہے۔ باوجودیکہ ان کا کلام کمال حسن رکھتا ہے۔ چنانچہ (امام طیبی) لکھتے ہیں: ”اعترف أو لا بأنه تعالى أنعم عليه ولم يقيدہ يشمل كل الانعام ثم اعترف بالتقصير، وأنه لم يقم بأداء شكرها، وعده ذنبا مبالغة فى هضم النفس تعليما الأمانة“۔

فمات من يومه: اس کی احتیاج پیش آئی باوجودیکہ فاء برائے تعقیب موجود ہے، چونکہ ہر شی کی تعقیب اس کے مناسب حال ہوتی ہے۔ مثلاً تزوج فولدہ، و هذا لا یوجب قولها فى ذلك اليوم۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ حسن میں مروی ہزار کی روایت میں الفاظ یوں ہیں ”سید الاستغفار ان یقول الرجل واذا جلس فى صلاته“۔

الفصل الثانی:

۲۳۳۶: عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلَى مَا كَانَتْ فِيكَ وَلَا أَبَا لِي يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عِنانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَ تَنِي غَفَرْتُ لَكَ وَلَا أَبَا لِي يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوَلَّيْتَنِي بِقَرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقَيْتَنِي لَا تَشْرِكُ بِي شَيْئًا لَا تَبْدُكَ بِقَرَابِهَا مَغْفِرَةً. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۰۸/۵ حدیث رقم ۳۶۰۸۔

ترجمہ: ”حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! جب تک

تو مجھ سے گناہوں کی معافی مانگتا رہے گا اور مجھ سے امید رکھے گا میں تجھے بخشوں گا تو نے جو بھی برا کام کیا ہوگا اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہوگی (یعنی تو چاہے کتنا ہی بڑا گناہ گار ہو تجھے بخشا میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے) اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے بخشش چاہے تو میں تجھ کو بخش دوں گا اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہوگی اے ابن آدم! اگر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ تیرے ساتھ گناہوں سے بھری ہوئی زمین ہو تو میں تیرے پاس بخشش و مغفرت سے بھری ہوئی زمین لے کر آؤں گا۔ بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔ (یعنی شرک میں مبتلا نہ ہوا ہو) ترمذی

تشریح: (ما دعوتنی) ما مصدریہ ظرفیہ ہے۔ (یعنی ما بمعنی مادام ہے)۔ اے: ما دمت تدعونی و ترجوننی یعنی فی مدة دعائك و رجائك۔ غفرت لك علی ما كان فيك: حال ہے۔ اے: حال كونك سمتر اعلیٰ ما وجدته فيك من الذنب۔ ولا ابال: یہ جملہ بھی حالیہ ہے۔ ابن آدم انك۔ ایک روایت میں یا ابن آدم ہے۔

لا تشرك بی شینا: یہ جملہ فاعل سے حال ہے یا مفعول سے حال ہے۔ لا یتك: ایک روایت میں بصیغہ مضارع متکلم لا یتك ہے۔ ”مغفرة“: یہ بھی تمیز ہے۔ عنان السماء: بعض کا کہنا ہے کہ یہ اضافت از باب ”تاکید“ ہے۔ جیسا کہ یہ آیت: ﴿فخبر علیہم السقف من فوقہم﴾ [النحل: ۲۶] ابن حجر فرماتے ہیں: آسمان کا اطلاق جرم معبود پر بھی ہوتا ہے۔ اور سحاب کی مانند ہر بلند چیز پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تقریر پر یہ اضافت بیان ہے۔ اے: سحاب هو السماء اھ۔ اور یہ بات درست نہیں، چونکہ اضافت بمعنی من بیان ہے میں عموم و خصوص من وجہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ خاتم فطہ۔ لو بلغت ذنوبك عنان السماء: کی معنوی تقدیر یوں ہے۔ ”لو تجسمت ذنوبك وملأت بین السماء والأرض۔ (غفرت لك ولا ابالی) اور جملہ کو مکرر لایا گیا ہے۔ اس میں معتزلہ پر رد یلغ ہے۔ ثم یقتنی لا تشرك بی شینا: امام طیبی فرماتے ہیں: ”ثم“ تراخی کیلئے ہے عدم شرک مطلوب اولیٰ ہے۔ اس وجہ سے یقتنی کی قید کا اضافہ فرمایا۔ وگرنہ تو اتنا کہہ دینا بھی کافی تھا: خطایا لا تشرك۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں۔ اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ موت تو حید پر ہوئی چاہئے۔

۲۳۳۷: ورواہ احمد والدارمی عن ابی ذر وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب۔

اخرجه الدارمی فی سننہ ۴۱۴/۲ حدیث رقم ۲۷۸۸۔ واحمد فی المسند ۱۴۷/۵۔

ترجمہ: اور احمد و دارمی نے اس روایت کو ابو ذر سے نقل کیا ہے۔ نیز امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

۲۳۳۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى مَنْ عَلِمَ اَنِّي ذُو قُدْرَةٍ عَلَيَّ مَغْفِرَةٌ الذُّنُوبِ غَفَرْتُ لَهُ وَلَا اَبَالِي مَا لَمْ يُشْرِكْ بِي شَيْئًا. (رواه فی شرح السنه)

شرح السنه ۳۸۸/۱۴ الحدیث رقم ۴۱۹۱۔ والحاكم فی المستدرک ۲۶۲/۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص نے یہ جانا کہ میں گناہوں کو بخشنے پر قادر ہوں تو اسے بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو“۔ (شرح السنہ)

تشریح: (من علم انی ذو قدرۃ.....)۔ شرک کا استثناء کرنے کی ضرورت نہیں چونکہ یہ اعتقاد مؤمن کے علاوہ کسی اور

کا نہیں ہو سکتا۔ امام طبری فرماتے ہیں: یہ کلام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اس بات کا اعتراف مغفرت کا سبب ہے۔ یہ اس حدیث مبارکہ کی نظیر ہے۔ انا عند ظن عبدی بی۔ اور ذوقدرہ میں وعید بھری تعریف ہے۔ ان پر جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں یعنی معتزلہ: انہ لا یغفر الا بالتوبۃ۔ اس کی دلیل اگلا جملہ ولا ابالی ہے۔ مالک یسروک ہی: یہ قید اس کی حکمت کا مقتضی ہے۔ واللہ اعلم بھا۔ وگرنہ جہت عقل وکمال فضل اس سے کوئی مانع نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مقتضی اللہ جل شانہ کے اسماء جلالیہ اور صفات جبروتیہ: قہار، منتقم، اور شدید العقاب وغیرہ ہوں۔ ان صفات کیلئے مظاہر کا ہونا ضروری ہے تاکہ آثار شیطانیہ وغضب کا اظہار ہو سکے۔ جس طرح کے اسماء جلالیہ اور نعوت رجوتیہ کیلئے مظاہر ہیں۔ غفاریت اور غفوریت کیلئے بھی مظاہر ہیں۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ کو اس بات کا جاننا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت پر قادر ہے اس کی مغفرت و بخشش کا سبب ہے کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش پر قدرت رکھتا ہے وہ اس سے امید رکھتا ہے اور جو شخص کریم سے امید رکھتا ہے کریم اسے محروم نہیں رکھتا لہذا یہ حدیث قدسی اس حدیث قدسی انا عند ظن عبدی بی میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے کے مانند ہے۔

منقول ہے کہ حضرت سفیان ثوری بیمار ہوئے تو حضرت حماد بن سلمہ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت سفیان ثوری نے حضرت حماد سے کہا کہ کیا آپ کو اس بات کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ جیسے کو بخش دے گا؟ حضرت حماد نے جواب دیا کہ ”اگر مجھے اس بات کا اختیار دے دیا جائے کہ حساب کتاب کے لئے چاہے تو میں اپنے باپ کے سامنے پیش ہو جاؤں چاہے اللہ تعالیٰ کے سامنے تو میں اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے پیش ہونے کو ترجیح دوں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ باپ سے زیادہ مجھ پر رحم کرتا ہے۔“ گویا حماد کے اس جواب کا مقصد یہ تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و بخشش کی امید رکھئے اس کی رحمت پر بھروسہ کیجئے کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے اور اس فصل الخطاب کے ضمن میں جواب بھی ہو گیا۔

۲۳۳۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ لَزِمَ الْإِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللَّهُ لَهُ مِنْ كُلِّ ضِعْفٍ مَخْرُجًا وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (رواه احمد و ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۵/۲ حدیث رقم ۱۵۱۸۔ وابن ماجہ ۱۲۵۴/۲ حدیث رقم ۳۸۱۹۔ واحمد فی المسند ۲۴۸/۱

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر تنگی سے نکلنے کی راہ نکال دیتا ہے اور اسے ہر رنج و غم سے نجات دیتا ہے نیز اس کو ایسی جگہ سے (پاک و حلال) روزی بہم پہنچاتا ہے۔ جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔“ (احمد ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: من لزم الاستغفار:

”استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لینا کا“ مطلب یہ ہے کہ جب بھی گناہ سرزد ہو جائے یا کوئی آفت و مصیبت اور رنج و غم ظاہر ہو تو استغفار کرے! یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ استغفار پر مداومت و ہمیشگی اختیار کرے کیونکہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں انسان استغفار کا محتاج نہ ہو اس لئے سرکارِ دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

طوبى لمن وجد في صحيفته استغفارا كثيرا: ”خوش بختی ہے اس شخص کے لئے جس نے اپنے نامہ اعمال میں استغفار کی کثرت پائی۔“

اس حدیث کو ابن ماجہ نے سند ”حسن صحیح“ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ”من کل ضیق مخرجا: جار مجرور ”مخرجا“ کے متعلق ہے۔ اور شدت اہتمام کے باعث یہاں اور اگلے جملہ میں جار مجرور کو مقدم کیا ہے۔ من حیث لا یحتسب: یعنی نہ جہاں سے اس کو گمان ہوتا ہے، نہ امید ہوتی ہے اور نہ اس کے دل میں یہ خیال گزرا ہوتا ہے۔ اس جملہ میں صوفیہ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے۔ المعلوم شوم: چونکہ دل اس میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور تعلق و توکل تو قادر مطلق ہی کی ذات پر ہونا چاہئے۔ حدیث میں مذکورہ بالا فضیلت کی بنیاد یہ ہے کہ جو شخص استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس کے قلب کا تعلق اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کا اعتماد مستحکم و قوی ہوتا ہے اور اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اس کا شمار ”اللہ سے ڈرنے والوں“ اور اللہ کی ذات پر اعتماد کرنے والوں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو مذکورہ بالا حدیث کی بنیاد بھی ہے کہ:

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ
”جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (ہر تنگی سے) نکلنے کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی بہم پہنچاتا ہے جہاں اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ پر اعتماد کرتا ہے اللہ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔“
استغفار کی فضیلت اور اس کا فائدہ مند ہونا اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَيَبِينْ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا

”پس میں نے کہا کہ تم اپنے رب سے بخشش مانگو کیونکہ وہ بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر بکثرت بارش برسائے گا اور تمہیں مال اور اولاد دے گا اور تمہارے لئے باغ بنائے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا۔“ حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک شخص نے ان سے قحط سالی کی شکایت کی تو انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ سے استغفار کرو پھر ایک اور شخص نے محتاجی کا شکوہ کیا اور ایک اور نے اولاد نہ ہونے کا اور ایک اور نے زمین کی پیداوار میں کمی کی شکایت کی انہوں نے سب ہی سے کہا کہ استغفار کرو! لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کے پاس کئی شخص آئے اور سب نے اپنی الگ الگ پریشانی ظاہر کی۔ مگر آپ نے سب ہی کو استغفار کرنے کا حکم دیا اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے اس کے جواب میں مذکورہ بالا آیت فقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا پڑھی اور اس طرح انہیں بتایا کہ میں نے جن باتوں کے لئے استغفار کا حکم دیا ہے اس آیت سے وہ سب ثابت ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۳۳۰: وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا أَصْرَ مَنْ اسْتَغْفَرَ وَإِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِينَ مَرَّةً. (رواه الترمذی و ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۴/۲ حدیث رقم ۱۰۱۴۰۔ و الترمذی ۲۱۸/۵ حدیث رقم ۳۶۳۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص نے (اپنے گناہ) پر استغفار کیا اس نے اپنے گناہ پر اصرار نہیں کیا اگرچہ وہ دن میں ستر بار گناہ کرے۔“ (ترمذی و ابوداؤد)

تشریح: (ما اصر) مانا یہ ہے۔ ستر کا عدد بظاہر تکریر و تکثیر کیلئے ہے۔ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں: مصر وہ ہے جو نہ استغفار کرے اور نہ اپنے گناہ پر شرمندہ و شرمسار ہو۔ اور اصرار کا مطلب ہے بکثرت کرنا۔ ابن الملکؒ بھی تقریباً یہی فرما رہے ہیں: الاصرار

الثبات والدوام علی المعصية یعنی من عمل معصیہ، ثم استغفر، فندم علی ذلك خرج عن كونه مصرًا۔ امام طیبی فرماتے ہیں: الاستغفار يرفع الذنوب: استغفار رافع ذنوب ہے۔ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے۔ لا صغيرة مع الاصرار ولا كبيرة مع الاستغفار: تو بعض کا کہنا ہے کہ اصرار کی حد یہ ہے کہ اس سے گناہ صغیرہ کا بار بار صدور ہو، ابن حجر فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ استغفار سے مراد توبہ ہو۔ اس صورت میں نفی اصرار بالکل واضح ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ استغفار سے مراد خود استغفار مع ذلت واستخفاف ہو۔ چونکہ اس معیت کے ساتھ کبھی گناہ جو کر دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ ماقبل میں معلوم ہوا۔ آگے فرماتے ہیں: ويشعر بقلة مبالاة كاشعار الكبيرة، وكذا اذا اجتمعت صفائر مختلفة الأنواع بحيث يشعر مجموعها بما يشعر به أصغر الكباثر۔

اس ارشاد گرام کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی گناہ پر شرمندہ ہوتا ہے اور اس سے استغفار کرتا ہے خواہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ تو وہ حد اصرار سے خارج ہوتا ہے چاہے اس سے اس گناہ کا ارتکاب کتنی ہی مرتبہ کیوں نہ ہو کیونکہ گناہ پر ارتکاب کرنے والا تو اسی کو کہیں گے جو بار بار گناہ کرے مگر نہ تو وہ اس گناہ سے شرمندہ و نادم ہو اور نہ ہی استغفار کرے۔

۲۳۳۱: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ۔ (رواه

الترمذی وابن ماجه والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۷۰/۴۔ حدیث رقم ۲۶۱۶۔ وابن ماجه ۱۴۲۰/۲۔ حدیث رقم ۴۲۵۱۔ واحمد فی المسند

۱۹۸/۳

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہر انسان خطا کار ہے (یعنی ہر انسان گناہ کرتا ہے علاوہ انبیاء کرام کے کیونکہ وہ معصوم عن الخطاء ہیں) اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں۔“ (ترمذی ابن

ماجداری)

تشریح: (خطاء) (مبالغہ کا صیغہ ہے) بمعنی کثیر الخطا۔ لفظ کل کی ظاہری رعایت کے پیش نظر ”خطاء“ کو مفرد لایا گیا ہے۔ اور ایک روایت میں خطاؤن ہے، اس میں لفظ ”کل“ کے معنی کی رعایت کی گئی ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ”کل“ مراد ہے من حیث هو کل أو کل واحد۔ کل بنی آدم خطاء کے مفہوم سے انبیاء کرام مخصوص و مستثنیٰ ہیں، (چونکہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں) یا یہ کہ وہ اصحاب صفار ہیں۔ پہلی توجیہ اولیٰ ہے۔ چونکہ انبیاء کرام کے (جو) امور (ان کی بلند شان کے موافق نہیں معلوم ہوتے) وہ ترک اولیٰ کے قبیل سے ہیں۔ یا حسنات الأبرار سیئات المقربین کے قبیل سے ہی۔ یا چند شیاء کی بابت ان کے امور عما لا تلیق بشانہم کے صدور کو ان کو ”زلات“ کہا جائے۔ اس تفصیل کے ساتھ کہ وہ امور ان سے خطاً و نسیاناً صادر ہوئے۔ قصد عصیان کے بغیر۔ التوابون: یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے۔ ”ای: رجاعون“۔ اس کا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے۔ بہترین خطا کار وہ ہیں جو معصیت سے توبہ کر کے طاعت کے ذریعہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بہترین خطا کار وہ ہیں جو غفلت کو ترک کر کے انابت کے ذریعہ ذکر (یعنی ذکر اللہ) کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ بہترین خطا کار وہ ہیں جو ”غیبت“ سے ”حضور“ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

۲۳۳۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ كَانَتْ نُكْمَةً سَوْدَاءَ فِي قَلْبِهِ

فَإِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُفِّلَ قَلْبُهُ وَإِنْ زَادَتْ حَتَّى تَعْلُوَ قَلْبُهُ فَذَا لَكُمْ الرَّأْيُ الَّذِي ذَكَرَ اللَّهُ تَعَالَى كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ. (رواه احمد و الترمذی وابن ماجه وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۰۵/۵ حدیث رقم ۳۳۹۰۔ وابن ماجه ۱۴۱۸/۲ حدیث رقم ۴۲۵۱۔ واحمد فی المسند ۱۹۸/۳

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی مومن گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ اس گناہ سے توبہ کر لیتا ہے اور استغفار کرتا ہے تو اس کا دل (اس نقطہ سیاہ سے) صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر زیادہ گناہ کرتا ہے تو وہ سیاہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے۔ پس یہ ران یعنی زنگ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ یوں ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر اس چیز (یعنی گناہ) کا زنگ ہے جو وہ کرتے تھے (یہاں تک کہ ان کے دلوں پر خیر و بھلائی بالکل باقی نہیں رہی) اس روایت کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔“

تشریح: (نکتہ) بمعنی ”اثر“، کانت نکتۃ سوداء: امی: وحدثت فہی تامۃ۔ اور ایک نسخہ میں منسوب ہے۔ اس صورت میں یہ ضمیر ذنب کے مدلول سیرہ کی طرف راجع ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: کانت نکتۃ امی: الذنب بتاویل السینۃ۔ وروی یرفع نکتۃ علی ان کان تامۃ فیقدر منہ امی: من الذنب۔ یہ نکتہ کاغذ پر نکلے جانے والی سیاہی کے نکتہ کی مانند ہوتا ہے، اور اس کی مقدار حسب معصیت ہوتی ہے۔ بعض حضرات نے اس کو ازباب تمثیل و تشبیہ قرار دیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: دل کو کپڑے کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے اور وجہ تشبیہ سفیدی اور صفائی ہے۔ اور معصیت کو انتہائی سیاہی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو کپڑے پر لگ گئی ہو۔ تو لازمی بات ہے کہ اس داغ کی وجہ سے اس کپڑے کا حسن و جمال جاتا رہے گا۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ جب وہ معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا اس کے دل کے اگلے سفید کپڑے پر معصیت کا کالا سیاہ دھبہ لگ گیا۔ چنانچہ اگر وہ گناہ سے توبہ کر لیتا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کر لیتا ہے تو اس کا دل تجلیات ربانی کی بدولت صاف شفاف ہو جاتا ہے۔ چونکہ توبہ بمنزلہ صیقل کے ہے جو اس کے دل کی حقیقی یا تمثیلی میل کچیل کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کو حقیقت پر محمول کرنا تمثیل و تشبیہ پر محمول کرنے سے ادلی ہے۔ ابن حجر نے بڑی عجیب و غریب بات کہی کہ بلاشبہ یہ بات تمثیل سے ہے۔

”یہاں تک کہ وہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں گناہ میں زیادتی ہوتی جاتی ہے توں توں وہ سیاہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے قلب پر حاوی ہو جاتا ہے اور قلب کے نور کو ڈھانپ لیتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مومن دل کی بینائی سے محروم ہو جاتا ہے چنانچہ نہ تو نفع دینے والے علوم اور نفع دینے والے نیک اعمال ہی کی کوئی اہمیت اس کی نظروں میں باقی رہتی ہے اور نہ فائدہ مند عقل و حکمت کی باتوں کا اس پر کوئی اثر ہوتا ہے اس طرح وہ شفقت و رحمت کے حیات آفرین وصف سے خالی ہو جاتا ہے کہ نہ اپنے اوپر رحم کرتا ہے اور نہ دوسروں کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کرتا ہے اور آخر کار اس کے قلب میں ظلم و جہل اور شر و فتنہ کی تاریکی اپنا تسلط جمالیاتی ہے جس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ گناہ پر اس کی جرأت بڑھ جاتی ہے اور معصیت آمیز زندگی ہی اس پر چھا جاتی ہے۔

فذلکم: بعض کا کہنا ہے کہ اس کلام کے مخاطب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ الران: ران پرال کے دخول کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ ران فعل ہے، البتہ حکایت لفظ مقصود ہے، اسم کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ یا بمنزلہ مصدر ہے۔ ”ران“ بمعنی ”رین“ یعنی الطبع و النغصیہ۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ران اور رین دونوں یکساں ہیں۔ جیسا کہ ”عاب“ اور ”عیب“۔ مذکورہ بالا آیت کافروں کے

بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا کہ اگر مسلمان گناہوں کا ارتکاب کریں گے تو دل سیاہ ہو جائیں گے، دل کی سیاہی کے اعتبار سے کافروں کے مشابہہ ہو جائیں گے، اور اگر پے در پے گناہوں کا ارتکاب کرتے رہے تو یہ سیاہی بڑھتی چلی جائے گی۔ (اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ سارا دل سیاہ ہو جائے گا اور پھر وہی ہوگا جو اوپر مذکور ہوا) ابن الملک نے بھی تقریباً یہی بات فرمائی ہے: ہذہ الآیۃ مذکورۃ فی حق الکفار، لکن ذکرھا رسول اللہ ﷺ تخویفاً للمؤمنین کی یحترزوا عن کثرة الذنب کیلا تسود قلوبہم کما اسودت قلوب الکفار، ولذا قیل: المعاصی برید الکفر۔

۲۳۳۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُعْرِ غُرًّا.

(رواہ الترمذی وابن ماجہ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۵۶۱۵ حدیث رقم ۳۶۰۳۔ وابن ماجہ ۱۴۲۰/۲ حدیث رقم ۴۲۵۳۔ واحمد فی المسند ۱۳۲/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک

قبول کرتا ہے جب تک کہ غرغره کی کیفیت شروع نہ ہو جائے۔“ (ترمذی ابن ماجہ)

تشریح: (ان اللہ یقبل توبۃ العبد) ظاہر کے اعتبار سے ”عبد“ مطلق ہے، لیکن بعض حنفیہ نے اس کے ساتھ کافر کی قید

لگائی ہے۔

اس ارشاد گرامی میں ”جب تک کہ غرغره کی کیفیت شروع نہ ہو جائے“ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک موت کا یقین نہیں ہوتا اس وقت تک تو توبہ قبولیت سے نوازی جاتی ہے مگر جب موت بالکل یقینی ہو جائے یعنی مذکورہ بالا کیفیت شروع ہو جائے تو اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اس حدیث کے ظاہری اور واضح مفہوم سے تو یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ مرنے کے وقت مطلقاً توبہ صحیح نہیں ہوتی خواہ کفر سے توبہ ہو یا گناہوں سے یعنی اس وقت نہ تو کافر کا ایمان لانا صحیح و درست ہوگا اور نہ مسلمانوں کی گناہوں سے توبہ صحیح ہوگی چنانچہ قرآن کریم کی آیت وَكَيْسَتِ التَّوْبَةُ الْعَرَّةِ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے لیکن بعض علماء اس بابت کے قائل ہیں کہ گناہوں سے توبہ صحیح ہوگی لیکن کفر سے توبہ صحیح نہیں ہوگی گویا ان حضرات کے نزدیک (یاس نا امید) کا ایمان غیر مقبول ہے اور یاس کی توبہ مقبول ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ حدیث مذکورہ بالا کے تحت جو حکم بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق گناہوں سے توبہ کرنے سے ہے کہ حالت غرغره میں توبہ قبول نہیں ہوتی لیکن ایسی حالت میں اگر کسی سے اس کا کوئی حق معاف کرایا جائے اور وہ صاحب حق معاف کر دے تو یہ صحیح ہوگا۔

اسی طرح اگر چیز کی وصیت کی، یا کسی کو اپنے بچہ کا ولی مقرر کر دیا یا کسی خیر کے کام کیلئے کسی کو ولی مقرر کر دیا تو اس کی یہ وصیت صحیح ہوگی۔ اھ۔ عدم المعاودة کی شرط لگانا مذہب جمہور کے خلاف ہے۔ اس طرح وصیت کی بابت جو کچھ فرمایا ہے، ابن حجر نے اس کا

www.KitaboSunnat.com

تعاقب کیا ہے کہ احکامات میں فرق نہیں ہوتا۔

امام طبری غرغره کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے۔ الغرغرة أن يجعل المشروب فی الفم، ویرد الی أصل الحلق ولا یتلغ۔ حدیث میں مذکور مسئلہ کی بنیاد یہ ہے کہ شرائط توبہ میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی ہے اس کے ترک اور عدم معاوادة کا عزم کرے۔ اور یہ شرط تب ہی متحقق ہو سکتی ہے کہ تائب کو تمکن حاصل ہو، اس شرط کو اختیار کرنے کا وقت بھی ہے، چنانچہ جب موت کا یقین ہو گیا تو اس چیز کے پورا کرنے کا موقع کہاں رہا۔

بعض کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے موت کی تعبیر معانہ ملک الموت کے ساتھ کی ہے۔ تو یہ حکم اٹھی ہے، چونکہ بہت سارے لوگ تو ملک الموت کو دیکھ ہی نہیں پاتے۔ اور بہت سے لوگ غرغره سے پہلے دیکھتے ہیں۔ ابن حجر نے بڑی دور کی بات کہی چنانچہ

لکھتے ہیں: ورد بان قوله تعالى ﴿قل يتوفاكم ملك الموت الذي وكل بكم﴾ [السجدة: ۱۱] يدل على أن كل أحد يراه فمدعى العدم يلزمه الدليل عليه اه۔ وجہ غرابت یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں رویت کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ اور دلیل کا مطالبہ ”مانع“ سے نہیں کیا جاتا، ہاں اگر ابن عباسؓ کے بارے میں یہ بات ہوتی کہ انہوں نے یوں کہا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توہ کی تو یہ کواں وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ وہ بندہ ملک الموت کو نہ دیکھ لے۔ اسی طرح کی موقوف روایت حکماً مرفوع ہوتی ہے، چونکہ اس قسم کی بات عقل کے ذریعے نہیں کہی جاسکتی، یا یہ کہ ان کا کلام دوسروں پر حجت ہے یا یہ کہ وہ امام المفسرین ہیں، البتہ ان کی بات پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ﴿فلم يك ينفع ايمانهم لما راؤ باسنا﴾ [غافر: ۸۵] اور پچھلی آیت بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حقیقت میں حضور ملک کے علاوہ نہیں ہے، یا موت کیلئے ہے تو اس صورت میں یہ مجازاً ہوگا۔ اور نسبت ھقیقۃً نسبت مجازیہ سے اولیٰ ہے۔ چنانچہ اس قبیل سے ہوگا: ﴿واسال القرية﴾ [یوسف: ۸۲]

تقدیری عبارت یوں ہوگی: حضر احدہم ملک الموت واللہ اعلم۔

مکرین کی جانب سے روح کشی کی حکمت: بعض کا کہنا ہے کہ انسان کی روح کشی کی ابتداء پیروں سے ہوتی ہے تاکہ دل اور زبان ذکر میں رہیں۔ اور اللہ کی طرف رجوع کریں، لوگوں سے اپنے مظالم معاف کرائیں کارہائے خیر کی وصیت کرے، اور تاکہ اس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہو۔

۲۳۲۲: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَالَ وَعِزَّتِكَ يَا رَبِّ لَا أَبْرَحُ أُغْوِي عِبَادَكَ مَا دَامَتْ أَرْوَاهُمْ فِي أَجْسَادِهِمْ فَقَالَ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ وَعِزَّتِي وَجَلَالِي وَارْتَفَاعِ مَكَانِي لَا أَزَالُ أَعْفُو لَهُمْ مَا اسْتَعْفَرُونِي. (رواه احمد)

اخرجه احمد في المسند ۲۹/۳

ترجمہ: ”اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ قسم ہے تیری عزت کی اے میرے پروردگار! میں تیرے بندوں کو ہمیشہ گمراہ کرتا رہوں گا جب تک کہ ان کی رو میں ان کے جسم میں ہیں! پروردگار عزوجل نے فرمایا: ”قسم ہے اپنی عزت اور بزرگی کی اور اپنے مرتبے کی بلندی کی میرے بندے جب تک مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے۔ میں بھی ہمیشہ ان کو بخشتا رہوں گا“۔ (احمد)

تشریح: (وان الشيطان) ایک روایت میں ”ابلیس“ آیا ہے۔ قال: بعزتک: ایک روایت میں و جلالک کا اضافہ ہے۔ لا اغوی: از باب افعال، فعل مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ لا ازال: ایک روایت میں لا ابرح ہے۔ لا ازال والی روایت صنعت تفسیر وتین کے باعث اولیٰ ہے۔

اس حدیث سے اشارہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابلیس رئیس الضلال و منظر الجلال ہے، جیسا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ منظر عنایت و جلال ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ یہ حدیث مبارکہ اس آیت کریمہ کے معارض ہے: ﴿لا غوینہم اجمعین الا عبادک منهم المخلصین قال: فالحق والحق اقول لاملان جهنم منک ومن تبعک منهم اجمعین﴾ [ص: ۸۴-۸۵] یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ تخلصین ہی ”ناجی“ ہیں۔ فقط، اور حدیث کی دلالت اس پر ہے کہ غیر تخلصین بھی ”ناجی“ ہوں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ”ممن تبعک“ کی قید سے مستغفرین ہی خارج ہیں چونکہ ممن تبعک کا مطلب ہے کہ جو متابعت پر استمرار کے ساتھ قائم رہے، نہ رجوع الی اللہ کیا اور نہ استغفار کیا۔ اه۔ ابن حجر نے بھی یہی بات کہی ہے اور کہا: ”ولم یوجع الی

بالتوبة۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: اس اشکال کا زیادہ ظاہر جواب جس میں معتزلہ کا رد بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تخلصین سے مراد وہ موحدین ہیں کہ جن کو اللہ جل شانہ نے شرک سے خلاصی عطا فرمائی ہے۔ اور لفظ تخلصین لانے میں شاید یہ حکمت ہو کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ خوف بیٹھا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تخلصین بھی کافروں کے ہمراہ جہنم میں چلے جائیں۔
تخریج: اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے۔

۲۳۳۵: وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى جَعَلَ بِالْمَغْرِبِ بَابًا عَرَضَهُ مَسِيرَةَ سَبْعِينَ عَامًا لِلتَّوْبَةِ لَا يُغْلَقُ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ مِنْ قِبَلِهِ وَذَلِكَ قَوْلُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ أَمَنَتْ مِنْ قَبْلُ - (رواه الترمذی وابن ماجه)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۵۰۱۵ حدیث رقم ۳۶۰۲۔ وابن ماجه ۱۳۵۳/۲ حدیث رقم ۴۰۷۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت صفوان بن عسال راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مغرب کی جانب ایک دروازہ بنایا ہے جو توبہ کے لئے ہے اور جس کی چوڑائی ستر سال کی مسافت (کے بقدر) ہے اور یہ دروازہ اس وقت تک بند نہیں کیا جائے گا۔ جب تک کہ آفتاب مغرب کی سمت سے نکلے (یعنی مغرب کی سمت سے آفتاب کا نکلنا قبولیت توبہ کا مانع ہے) اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کہ ”اس دن آئیں گی بعض نشانیاں تیرے پروردگار کی، نہیں نفع دے گا کسی ایسی جان کو ایمان لانا جو پہلے سے ایمان نہیں لائی تھی“ کا یہی مطلب ہے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: (جعل بالمغرب بابا): اس میں دونوں احتمال ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ دروازہ حسی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے معنوی ہو۔ عرضہ مسیرۃ سبعین عاما: یعنی جب اس دروازہ کی چوڑائی اتنی ہے تو لمبائی کتنی ہوگی۔ اس دروازہ کی وسعت میں مبالغہ مقصود ہے۔ للتوبة: (ہاں کچھ عبارت محذوف ہے)۔ ای مفتوحة لأصحاب التوبة: یعنی وہ دروازہ اصحاب توبہ کیلئے کھلا ہوا ہے۔ علامۃ لصحة التوبة وقبولها: یعنی وہ دروازہ صحت توبہ اور اس کی قبولیت کی علامت ہے۔ ما لم تطلع الشمس من قبله: من قبلہ کے معنی من جانب الباب۔ (قالہ ابن الملک) ابن حجر نے اس کی وضاحت من المغرب کے ساتھ کی ہے۔ یہ توضیح واضح ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: اس میں احتمال یہ ہے کہ وہ دروازہ حقیقتاً ہو یہی ظاہر ہے اور اس دروازے کو بند کرنے کا فائدہ درحقیقت ملائکہ کیلئے اعلان ہے کہ توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے یہ تمثیل ہو۔ امام طبری فرماتے ہیں: ”جو توبہ کے لئے ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کرنے والوں کے لئے کھلا ہوا ہے یا یہ کہ وہ توبہ کے صحیح ہونے اور توبہ کے قبول ہونے کی علامت ہے! حاصل یہ کہ جب تک آفتاب مغرب کی جانب سے نہیں نکلتا لوگوں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس کا جی چاہے اپنے شرک اور کفر سے توبہ کرے اور جس کا جی چاہے اپنے گناہوں سے توبہ کرے کہ اس دروازہ کے ذریعہ آخرت کی حیات ابدی راحتوں اور سعادتوں کا مستحق ہو جائے۔ جب مغرب کی سمت سے آفتاب نکلے گا تو توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ حدیث میں جس آیت کریمہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ پوری یوں ہے:

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ أَمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيْمَانِهَا خَيْرًا.....

”اس دن آئیں گی بعض نشانیاں تیرے پروردگار کی (یعنی قرب قیامت پروردگار بعض نشانیاں ظاہر کرے گا ان ہی میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ ایک دن آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا اس دن نہیں نفع دے گا کسی ایسی جان کو ایمان لانا جو پہلے سے (یعنی پروردگار کی نشانی ظاہر ہونے سے پہلے) ایمان نہیں لائی تھی اور اس جان کو کہ جس نے حالت ایمان میں بھلائی (یعنی توبہ) نہیں کی تھی (اس دن اس کی توبہ کوئی نفع نہیں دے گی)۔“

اس آیت کا حاصل یہی ہے کہ جس دن آفتاب مغرب کی سمت سے طلوع ہوگا تو جو شخص اس سے پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا یا ایمان پر تو ہوگا مگر توبہ نہیں کی ہوگی اب نہ اس کا ایمان نفع دے گا اور نہ اس کی توبہ کوئی فائدہ پہنچائے گی۔

توبہ اور ایمان کے عدم قبولیت کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگ اس منظر کا اپنی نگاہوں سے مشاہدہ کر لیں گے تو ایمان اور توبہ کی طرف مجبور ہو جائیں گے، چنانچہ اس وقت انہیں اس توبہ اور ایمان کا فائدہ نہ ہوگا جیسا کہ حضرت کو اس کا فائدہ نہ ہوگا۔ اور دروازہ کا بند ہونا مغرب میں ہے تو پتہ چلا کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا بھی مغرب ہی میں ہے۔ اور میسورہ سبعین عامہ کے الفاظ میں اس دروازہ کے توسع کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ یا تقدیر عبارت یوں ہے: لعرض الباب بمقدار ما يسده جرم الشمس الطالع من المغرب۔ وذلك (کا مشار الیہ محذوف ہے)۔ اسی طلوع الشمس من مغربها المانع من قبول التوبة معنی قوله ﴿یوم تأتي لم تکن آمنت من قبل﴾ [انعام: ۱۰۸]

یہ جملہ حالیہ ہے، او کسبت کا عطف آمنت پر ہے۔ اسی اولم تکن النفس کسبت فی حال ایمانہا توبہ من قبل۔ اس تقدیر پر حدیث اور آیت کے درمیان مناسبت تامہ واضح ہو جاتی ہے۔ اور طلوع شمس کا معائنہ کرنا نظیر ہے حضور موت کی۔ اور مناسبت دونوں میں یہ ہے کہ اس وقت نہ قبول ایمان کوئی فائدہ دے گا، نہ توبہ کوئی نفع پہنچائے گی۔ اس تقریر سے معتزلہ کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ بغیر اعمال کے ایمان محض ذرہ برابر بھی نفع نہیں پہنچائے گا۔ شرح طبری میں لکھتے ہیں: لم تکن آمنت من قبل: نفسا کی صفت ہے۔ اور: ﴿او کسبت فی ایمانہا خیرا﴾ [الانعام: ۱۰۸] کا عطف آمنت پر ہے۔ اور معنی یہ ہوں گے: ان اشرط الساعة اذا جاءت وهي آيات لمجینة ذهب اوان التکلیف عندها۔ فلم ینفع الايمان حينئذ نفسا غیر مقدمتہ من قبل ظهور الآيات، او مقدمة ایمانہا غیر کاسبہ خیر فی ایمانہا۔ چنانچہ نفس کا فرہ میں جب وہ غیر وقت ایمان میں ایمان لائے، اور نفس مؤمنہ میں۔ جو بروقت ایمان لایا ہو لیکن اعمال خیر نہ بجالایا ہو، کوئی فرق نہیں کیا۔ واضح رہے کہ: ﴿والذین آمنوا وعملوا الصالحات﴾ میں دونوں کو جمع فرمایا ہے تاکہ مکلف فلاح وسعادت حاصل کرے۔ چنانچہ ان دونوں کو جدا جدا کرنا ٹھیک نہیں، وگرنہ توبہ بدبختی و ہلاکت ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں: جواب یہ ہے کہ اگر ان کی کہی ہوئی بات پر محمول کریں گے ”فی ایمانہا“ کا فائدہ نہ ہوگا چونکہ آمنت پر عطف کرنے کی وجہ سے حصول کسب کا ایمان میں داخل ہونا لازم ہو جائے گا۔ لہذا توجیہ یہ کی جائے کہ لف تقدیری پر محمول کیا جائے یعنی یوں کہا جائے: ”لا ینفع نفسا ایمانہا حينئذ او کسبہا فی ایمانہا خیرا حينئذ لم تکن آمنت من قبل، او کسبت فی ایمانہا خیرا من قبل والایجاز من حلیة النزیل اھ۔ اس (تفسیر) کو ابن عطیہ، ابن حاجب اور ابن ہشام نے ذکر کیا ہے، اور میری تقریر و تحریر کی تائید اگلی حدیث سے ہو رہی ہے۔

۲۳۳۶: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَنْقَطِعُ الْهَجْرَةُ حَتَّى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ وَلَا تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ

حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا. (رواه احمد وابوداود والدارمی)

انخرجه ابوداؤد فی السنن ۳/۳ حدیث رقم ۲۴۷۹۔ واحمد فی المسند ۳۱۲/۲ والدارمی فی السنن ۳۱۲/۲ حدیث رقم ۲۵۱۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت معاویہؓ فرمادیے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہجرت (یعنی گناہوں سے توبہ کی طرف رجوع) موقوف نہیں ہوگی تا وقتیکہ توبہ موقوف نہ ہو اور توبہ اس وقت تک موقوف نہیں ہوگی جب تک کہ آفتاب مغرب کی طرف سے نہ نکلے۔“ (ابوداؤد احمد دارمی)

تشریح: (لا تنقطع) صیغہ مذکر مؤنث ہر دو طرح پڑھا گیا ہے۔ (لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة): ابن الملک

فرماتے ہیں: ہجرت سے مراد کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہونا، دارالشرک سے دارالسلام کی طرف منتقل ہونا اور معصیت سے توبہ کی طرف رجوع کرنا ہے اور ملا علی قاری فرماتے ہیں آخری صورت میں عموم ہے جو سب کو شامل ہے۔ امام طہیٰبی فرماتے ہیں: ہجرت سے بکثرت مدینہ کی طرف ہجرت کرنا مراد نہیں ہے، چونکہ یہ ہجرت موقوف ہو چکی ہے، اور نہ ہجرت من الذنوب مراد ہے، چونکہ ایک حدیث میں آتا ہے۔ ”والمہاجرین ہجر الذنوب والخطایا“۔ چونکہ یہ نفس توبہ ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں۔ اس میں کوئی مانع نہیں ہے، چونکہ آل کمال یہ ہے کہ توبہ کا سلسلہ موقوف نہیں ہوگا۔ جب تک کہ طلوع شمس نہ ہو۔ (ابن الملک آگے) لکھتے ہیں: بل الہجرة من مکان لا یتمکن فیہ من الأمر بالمعروف والنہی عن المنکر و اقامة حدود اللہ، ﴿الم تکن أرض اللہ واسعة﴾

[النساء: ۹۷]

”ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس من مغربها“۔ حدیث کے اس جملہ کی تشریح ماقبل میں گزر چکی۔

۲۳۳۷: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ رَجُلَيْنِ كَانَا فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ مُتَعَابَيْنِ أَحَدُهُمَا مُجْتَهِدٌ فِي الْعِبَادَةِ وَالْآخَرُ يَقُولُ مُذْنِبٌ فَجَعَلَ يَقُولُ أَقْصِرْ عَمَّا أَنْتَ فِيهِ فَيَقُولُ خَلِيْنِي وَرَبِّي حَتَّى وَجَدَهُ يَوْمًا عَلَى ذَنْبٍ اسْتَعْظَمَهُ فَقَالَ أَقْصِرْ فَقَالَ خَلِيْنِي وَرَبِّي أَبْعَثْ عَلَيَّ رَقِيبًا فَقَالَ وَاللَّهِ لَا يَغْفِرُ اللَّهُ لَكَ أَبَدًا وَلَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ فَبَعَثَ اللَّهُ إِلَيْهِمَا مَلَكًا فَقَبَضَ أَرْوَاحَهُمَا فَاجْتَمَعَا عِنْدَهُ فَقَالَ لِلْمُذْنِبِ ادْخُلِ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِي وَقَالَ لِلْآخِرِ اسْتَطِيعَ أَنْ تَحْظَرَ عَلَى عَبْدِي رَحْمَتِي فَقَالَ لَا يَأْرَبُ قَالَ إِذْ هَبُوا بِهِ إِلَى النَّارِ .

اخرجه احمد في المسند ۲/۳۲۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بنی اسرائیل میں دو شخص تھے جو آپس میں دوست تھے ان میں سے ایک تو عبادت میں بہت ریاضت کرتا تھا اور دوسرا گناہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں گناہگار ہوں (یعنی وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتا تھا) چنانچہ عبادت کرنے والے نے اس سے کہنا شروع کیا جس چیز میں تم مبتلا ہو (یعنی گناہ میں) اس سے باز آ جاؤ گناہ گار اس کے جواب میں کہتا کہ ”تم میرے پروردگار پر چھوڑ دو! کیونکہ وہ غفور الرحیم ہے وہ مجھے معاف کرے گا) یہاں تک کہ ایک دن اس عابد نے اس شخص کو ایک ایسے گناہ میں مبتلا دیکھا جسے وہ بہت بڑا گناہ سمجھتا تھا اس نے اس سے کہا کہ تم اس گناہ سے باز آ جاؤ گناہگار نے جواب دیا کہ تم مجھے میرے پروردگار پر چھوڑ دو! کیا تم میرے داروغہ بنا کر بھیجے گئے ہو؟ (عابد نے یہ سن کر) کہا کہ ”خدا کی قسم! اللہ تمہیں کبھی نہیں بخشے گا اور نہ تمہیں جنت میں داخل کرے گا اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس فرشتہ بھیج کر ان کی روحمیں قبض کرائیں اور پھر جب وہ دونوں (یعنی ان کی روحمیں) حق تعالیٰ کے حضور (برزخ میں یا عرش کے نیچے) حاضر ہوئیں تو حق تعالیٰ نے گناہگار سے تو فرمایا کہ تو میری رحمت کے سبب جنت میں داخل ہو جا اور دوسرے سے فرمایا کہ ”کیا تو اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ میرے بندے کو میری رحمت سے محروم کر دے؟“ اس نے کہا کہ ”نہیں“ پروردگار پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو (جو دوزخ پر مامور ہیں) فرمایا کہ اس کو دوزخ کی طرف لے جاؤ“۔ (احمد)

تشریح: (رجلین کانا فی بنی اسرائیل) ممکن ہے کہ یہ دونوں آدمی خود بھی بنی اسرائیل میں سے ہوں، اور یہ بھی ممکن

ہے کہ بنی اسرائیل میں سے نہ ہوں۔ بلکہ کسی اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں لیکن بنی اسرائیل کے ساتھ رہتے ہوں۔ متحابین: اس میں

ایک احتمال تو یہ ہے کہ ان میں باہم رشتہ محبت کسی دنیاوی سبب سے ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور سبب سے ہو۔ لیکن اللہ کی خاطر نہیں تھا مطیع وعاصی کی باہمی محبت کا کوئی جوڑ نہیں بنا، جوڑ کی اصل علت تو جنسیت ہوتی ہے چونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ [المجادلة: ۲۲]۔ اور دوسری جگہ یوں فرمایا: ﴿الْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ [الزخرف: ۶۷]۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اولاً ”متحابین“ (دونوں دوست) ہوں، پھر ان دونوں میں سے ایک معصیت میں چارچا ہو، اور اور یہی اظہر ہے۔ اور پھر بھائی چارگی اور نصیحت کے طور پر اس کو سمجھا رہا ہو۔

بعض صوفیہ کے نزدیک قطع صحبت کے مقابلہ میں نصیحت کا عمل اولیٰ ہے۔ اور (ان کی) دلیل یہ آیت ہے: ﴿فَإِنْ عَصَاكَ فُعِلْ بِهَا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِلَّهِ الْعُدْوَانُ عَظِيمٌ﴾ [الشعراء: ۲۱۶] کہ یہاں منکرم نہیں فرمایا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ منکرم مقدر ہو، اور ”مما تعملون“ علت براءت ہو۔ جیسا کہ بعض کا یہی مذہب ہے اور ”الحب فی اللہ والبغض فی اللہ“ والی حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اور حدیث کو ابتدا پر محمول کرنا اطلاق کے ظاہر کے خلاف ہے۔ والآخر یقول: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یقول کافعال نبی کریمؐ (نبی کریمؐ کی طرف سے)۔ ای: الرسول ﷺ مذنب: (ہو مبتدا محذوف کی خبر ہے)۔ ای: ہو مذنب۔ ابن الملکؒ نے مظہر کی اتباع کرتے ہوئے یوں لکھا ہے: ای یقول الآخر: انا مذنب۔ ای معترف بالمذنب۔ (یقول کافعال الآخر ہے، اور مذنب کا مبتدا انا ہے)۔ اور یقول کی بناء یہی اظہر، چونکہ پہلے قول کے اختیار کرنے کی صورت میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے، اور اس صورت میں حسن مقابلہ کی بھی ضرورت نہیں کہ یوں کہا جائے مجتہد فی المعصیۃ۔ چنانچہ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: یمکن أن یقال: ان المعنی والآخر منہمک فی الذنب لیطابق قوله مجتہد فی العبادۃ، لأن کثیرا ما یعبر بہ فی الأفعال المختلفۃ بحسب المقام۔ وفيه أنه لا دخل للقول حينئذ فی المقال، كما لا يخفى علی ذوی الآفہام، بظاہر والآخر مذنب کہنے کے بجائے والآخر یقول: مذنب کی تعبیر کی طرف عدول اس لئے کیا تاکہ اس کا قول اس کی طرف رعایت ادب کے ساتھ منسوب ہو، چونکہ نبی کریمؐ تو یہ بات جانتے تھے کہ یہ شخص اپنے رب کے ہاں خوش بخت ہے۔ مغفور ہے۔ اور بعینہ اسی نکتہ کی وجہ سے (یعنی اپنے علم کی بنیاد پر) مجتہد فرمایا، صالح یا عابد ارشاد نہیں فرمایا۔ فجعل یقول: جعل فعل شروع کے معنی میں ہے۔ أقصر: باب افعال سے امر کا صیغہ ہے۔ أبعثت: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور استفہام انکاری ہے۔ ولا یدخلک الجنة: اس میں مبالغہ درمبالغہ ہے۔ (گویا کہ اس نے حد کردی) ابن حجرؒ لکھتے ہیں، تاکید لما قبلہ، لأن عدم الغفران لازم لعدم دخول الجنة۔ ابن حجر کا یہ فرمانا درست نہیں، اس لئے کہ اہل سنت کا مذہب ہے: المؤمن المذنب قد لا یغفر اللہ له فیعدبہ ثم یدخلہ الجنة۔ قبض أرواحہما: یہ کلام اس آیت کریمہ کے قبیل سے ہے: ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾ [التحریم: ۳]

وقال الآخر مجتہد کی تعبیر سے الآخر کی تعبیر کی طرف عدول کرنے میں جو نکتے وہ پوشیدہ نہیں، وہ یہ کہ اس کا اجتہاد فی العبادۃ اس کے قلت عمل، اور اپنے رب کی صفات سے عدم واقفیت کی بناء پر ضائع ہو گیا۔ سادرا معاملہ پلٹا کھا گیا۔ اور یہ ”مجتہد“ گناہ کے اعتبار سے دوسرے شخص کی طرح ہو گیا، اور وہ ”مذنب“ اپنے حسن عقیدت، تفسیر فی المعصیۃ کے اعتراف کے باعث بمنزلہ مجتہد کے ہو گیا۔ استطیع: ہمزہ انکاری ہے، ان تحظر: ظاء معجمہ کے ضمہ کے ساتھ۔ فقال: اذہوا بہ۔ یہ خطاب ان ملائکہ کو تھا جو جنہم کے موکل تھے، یا اسی فرشتہ کو تھا، اور جمع برائے تعظیم ہے، یا (چونکہ وہ جسمانی طور پر بہت بڑا تھا) اس کے کبر جش کے اعتبار سے گویا کہ وہ بمنزلہ کنی کے ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ادخالہ النار کان مجازاۃ لہ علی قسمہ بأن اللہ لا یغفر للمذنب ذنبہ، لأنه جعل الناس آیسین من رحمۃ اللہ، وحکم بأن اللہ غیر غفور اھ۔ ابن الملکؒ کے اس کلام میں غرابت ہے، اس لئے کہ اس کلام سے یہ مفہوم مستفاد

نہیں ہو رہا، اس نے تو محض امر بالمعروف میں مبالغہ سے کام لیا تھا، اس سے کلام غصہ کی حالت میں صادر ہوا تھا، اگر یہ کلام صرف اللہ کیلئے ہوتا، تو یقیناً اس سے مسامحت ہو جاتی، لیکن چونکہ اپنے اجتہاد عبادت پر مغرور تھا، اور مذنب کو حقیر سمجھ رہا تھا، اس وجہ سے کہ وہ ایسے گناہ پر بار بار بار اصرار کر رہا تھا جو مستوجب عقوبت تھا، اس وجہ سے کہا گیا ہے: معصیۃ اورثت ذلاً واستصغاراً خیر من طاعة أو جبت عجباً واستکباراً۔

چونکہ عبادت کرنے والے نے اپنی عبادت اور اپنے نیک اعمال پر غرور و تکبر کا اعتماد کیا اور اس گنہگار کو اپنے سے حقیر جان کر اس سے یہ کہا کہ حق تعالیٰ تمہیں نہیں بخشے گا اس لئے اسے مستحق عذاب قرار دیا گیا اسی لئے کسی بزرگ کا قول ہے کہ جو گناہ اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھنے کا باعث ہو وہ اس طاقت و عبادت سے بہتر ہے جو غرور و تکبر اور نخوت میں مبتلا کر دے۔

لا یارب: ابن حجرؒ لکھتے ہیں: أکذب نفسه وحلفه فاستحق العتاب، فمن ثم قال: اذهبوا به الی النار لأنه آیس من رحمة الله: والبأس منها کفر لمن استحله کهذا الرجل، كما دلّ علیه حلفه السابق المتضمن للحکم علی الله تعالیٰ بأنه لا یغفر الذنوب، وعلی صاحبه بأنه لیس من رحمة الله۔ ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ مجتہدؒ ’یاس‘ کا شکار ہو گیا تھا اور گویا کہ مستحل ہو گیا تھا، اور مال کار کا فر ہو گیا تھا، یہ باتیں درست نہیں ہیں اور علی سبیل التنزیل سے معتزلہ کا مذہب ہے کہ وہ صاحب گناہ کبیرہ کی عدم مغفرت کے قائل ہیں، اور اہل سنت میں سے کسی نے بھی خوارج و معتزلہ کی تکفیر نہیں کی، البتہ اس حدیث میں معتزلہ کے عقیدہ پر ردّ بلغ ہے، بایں طور کہ اللہ تعالیٰ گناہگار کی نہ صرف یہ کہ مغفرت کرتا ہے، بلکہ اس کے عدم رجوع و توبہ کے باوجود اس کو اپنی رحمت کے ساتھ نسبت میں بھی داخل کرتا ہے۔ امام بغویؒ اپنی سند کے ساتھ معالم میں تھمضم بن جوس سے نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں: میں مدینہ کی مسجد میں داخل ہوا تو مجھے ایک بوڑھے نے پکارا اور مجھ سے کہا او یمامی! اودھر آ۔ میں ان صاحب کو نہیں پہچانتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا: تم کسی بھی شخص سے یوں ہرگز مت کہنا کہ اللہ بھی تیری مغفرت نہیں کرے گا۔ اور تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ میں نے عرض کیا اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ ہیں کون؟ وہ بولے: ابو ہریرہ۔ راوی کہتے ہیں میں نے کہا ہم میں سے کوئی آدمی جب غصہ میں ہوتا ہے تو اپنے گھر والوں، یا بیوی یا خادم سے یہ کلمہ کہہ جاتا ہے۔ ابو ہریرہ نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ دو آدمی..... اور پھر ابو ہریرہؓ نے فرمایا: والذی نفسی بیدہ لتکلم بکلمة اوبقت بدنیاه و آخرته۔

ابن حجر اس کی علت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لأنها صیرته الی النار المؤبدۃ علیہ۔ شیخ ابن حجرؒ کے اس کلام کا کھلم کھلا خطا ہونا بالکل واضح ہے۔

۲۳۳۸: وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ یَزِيدَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ یَقْرَأُ یَا عِبَادِیْنَ الَّذِیْنَ أَسْرَفُوا عَلَیْ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِیعًا وَلَا یَبْأَلِیْ.

(رواہ احمد و الترمذی وقال هذا حدیث حسن غریب وفی شرح السنة بقول بدل یقرأ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۸۱۵ حدیث رقم ۳۲۹۰۔

ترجمہ: ’اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ یہ آیت کریمہ پڑھا کرتے تھے: یا عِبَادِی الَّذِیْنَ أَسْرَفُوا عَلَیْ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِیعًا۔ اے میرے وہ بندو جنہوں نے (گناہ کرنے کے سبب) اپنے نفس پر زیادتی کی ہے رحمت خداوندی سے مایوس مت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ سب گناہ بخشتا ہے۔ (نیز آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ کو اس کی پرواہ نہیں کہ بندے کتنے ہی

گناہ کرتے ہیں اور وہ سب کو بخش دیتا ہے) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور شرح السنہ میں لفظ یقرأ کی بجائے لفظ یقول ہے۔

تشریح: (یا عبادی): یاء کے فتح اور سکون دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ لا تقنطوا: نون کے فتح اور کسرہ ہر دو کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً: یہ جملہ متانفہ، تعلیمیہ ہے۔

”اللہ تعالیٰ سب گناہ بخشتا ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کو تو توبہ کے ساتھ بخشتا ہے کہ اگر کوئی کافر اپنے کفر و شرک سے توبہ کر کے ایمان کی دولت قبول کر لے تو اسے حق تعالیٰ ابدی نجات و بخشش کا مستحق قرار دے دیتا ہے اور مؤمن کو توبہ کے ساتھ بھی بخشتا ہے اور اپنے بے پایاں فضل و کرم کی بنا پر اگر چاہتا ہے تو بغیر توبہ کے بھی بخش دیتا ہے۔

یہ حدیث فرقہ ”وعیدیہ“ کا رد کر رہی ہے۔ اس آیت کے بارے میں ایک احتمال یہ ہے کہ آیت منسوخ ہے۔ اور اس بات کا احتمال بھی ہے کہ ان یكون زیادة من عنده عليه الصلوة والسلام كالتفسير الآیة: امام بغوی فرماتے ہیں: سعید بن جبیر از ابن عباس روایت کرتے ہیں: أن أنا سامن أهل المشرق كانوا قتلوا وأكثروا، وزنوا فأكثروا، فأتوا النبي ﷺ فقالوا: ان الذي تدعوننا اليه لحسن لو تخبرنا أن لما عملناه كفارة، فنزلت هذه الآية: اه۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں خطاب کفار سے ہے، اور مطلب یہ ہوا کہ اللہ ان کے گناہوں کو ایمان کی بدولت معاف فرمادے گا۔ چونکہ ایمان پچھلی باتوں کو منہدم کر دیتا ہے۔ اسی تفسیر کی بنیاد پر ابن حجر کی بات کا دفعیہ بھی ہو جائے گا، کہ اضافت اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ مسلمان تھے۔

۲۳۳۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى إِلَّا إِلَهُكُمْ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ تَغْفِيرَ اللَّهُمَّ تَغْفِيرُ جَمًّا وَأَيُّ عَبْدٍ لَكَ لَا أَلَمَّا . (رواه الترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۷۱۵ حدیث رقم ۲۳۳۸۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول الا الہم کے تفسیر کے ضمن میں روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے پڑھا

إِنْ تَغْفِرُ اللَّهُمَّ تَغْفِيرُ جَمًّا ☆ وَأَيُّ عَبْدٍ لَكَ لَا أَلَمَّا

اگر بخشے تو اے الہی تو بڑے گناہ بخش دے اور تیرا کون سا بندہ ہے جس نے چھوٹے گناہ نہ کئے ہوں

امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے

تشریح: (کبانو): کبیرہ کی جمع ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ گناہ ہے جس میں ”حد“ مقرر ہے اور فواحش، فاحشہ کی جمع ہے۔ فواحش سے مراد وہ گناہ ہیں جن پر وعید آئی ہے، یا زنا کے ساتھ مخصوص ہے۔ لمم: بروزن قلم، اس کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں۔ (۱) صغائر۔ (۲) قیل نظرة، غمزہ قبلہ۔ (۳) قیل: الخطرة من الذنب۔ (۴) قیل کل ذنب لم يذكر الله فيه حلا ولا عذابا۔ امام طیبی فرماتے ہیں: الا اللمم میں استثناء منقطع ہے، چونکہ لم کہتے ہیں چھوٹے گناہ کو، ألم بالمكان اس وقت کہتے ہیں جب قیام تھوڑے عرصہ کیلئے ہو۔ لمم کے معنی ہیں پڑاؤ ڈالنا، اور ألم کہتے ہیں جب کسی فعل لم کا صدور ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ الا بمعنی غیر ہو، اور ”لمم“ صفت ہو۔ جما: بمعنی کثیر و کبیر۔ الما: فعل ماضی ہے صیغہ واحد مذکر غائب ہے،

اور الف برائے اطلاق ہے۔ لا ألمم کا مطلب ہے: لم یلم بمعصیة۔

إِلَّا اللَّمَمَ۔ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اور وہ پوری آیت یہ ہے:

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّغْمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاَسِعُ الْمَغْفِرَةَ

”اور (جن نیکوکاروں کا پیچھے ذکر ہوا) یہ وہ لوگ ہیں جو پرہیز کرتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے علاوہ چھوٹے گناہوں کے (کہ جن سے بچنا ممکن نہیں ہے) اور بے شک تیرا رب مغفرت کا وسیع کرنے والا ہے۔“

پس آیت میں چھوٹے گناہوں کا جو استثناء کیا گیا ہے اسی کی دلیل کے طور پر آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا شعر پڑھا کہ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی مؤمن صغیرہ گناہوں سے خالی نہیں ہوتا۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ پروردگار! تیری شان رحمت ایسی ہے اور تیرے فضل و کرم کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر تو چاہے تو کبیرہ گناہوں کو بھی بخش دے چھوٹے گناہوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے اور پھر تیرا کون سا بندہ ایسا ہے جو چھوٹے گناہ نہیں کرتا اور تو اسے نہیں بخشا بلکہ تو ان چھوٹے گناہوں کو نیکوں کے ذریعہ جھاڑتا رہتا ہے اور اس طرح ان بندوں کو چھوٹے گناہوں کے بوجھ سے بھی بچاتا ہے۔

تیرے سارے ہی بندے خطا کار ہیں، اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: ﴿ان ربك واسع المغفرة﴾ [النجم: ۳۲]

امام طیبیؒ لکھتے ہیں: البیت لأمیة بن أبی الصلت انشدہ النبى ﷺ ای من شانك اللهم ان تغفر غفرانا كثيرا للذنوب العظيمة، واما الجرائم الصغيرة فلا تنسب اليك لانها لا يخلوا عنها احد، وانها مكفرة باجتناوب الكبائر۔ انتھی۔ وتبعه ابن حجر۔ اس عبارت پر اشکال یہ ہے کہ مذکورہ بالا تکفیر، یہ بعض معتزلہ کا مذہب ہے۔ جیسا کہ شرح العقائد میں لکھا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان تغفیریں: ان برائے شک نہیں بلکہ تعلیل کیلئے ہے۔ جیسے کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين﴾ [آل عمران: ۱۳۹]۔ اسی: لأجل انكم مؤمنون لا تهنوا: چنانچہ اس مصرعہ کا مطلب یہ ہوا: لأجل انك غفار غمما۔ جیسے بادشاہ سے کہا جاتا ہے: ان كنت سلطانا فأعط العزيل۔ اس سلسلہ کلام میں آگے فرماتے ہیں: یہ شعر کئی محاسن پر مشتمل ہے مثلاً ان میں سے ایک یہ ہے کہ اتحاد شرط و جزاء ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: امام طیبیؒ نے یہ بات ”جمما“ کی قید سے غفلت کے باعث فرمائی ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ان بمعنی ”اذ“ ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿وخافون

ان كنتم مؤمنين﴾ [آل عمران: ۱۷۵]

چنانچہ امام طیبیؒ کی بات ساقط (ساقط الاعتبار) ہے۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ حاصل دونوں کا ایک ہے۔ چونکہ ”اذ“، تعلیل کیلئے بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں: تب بھی تعلیل کے معنی مراد لینے میں کوئی مانع نہیں۔ لہذا اسقوط کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ علاوہ ازیں شعر میں ظرفیت کے معنی مراد لینا درست نہیں، چونکہ اللہ جل شانہ کا غفار ہونا کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہے، اور پھر امام طیبیؒ کے کلام پر نقض وارد کرتے ہوئے جو حقیقت امام طیبیؒ کے مقصود کی اتباع ہی ہے۔ فالمعنى لأجل انك غفار.....

عرض مرتب: آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک پر اشعار آنے کی بابت تفصیلی کلام جلد ہشتم باب الشعر میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۳۵۰: وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى يَا عِبَادِي كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُ فَاسْتَأْذِنُوْنِي الْهُدَى اِهْدِكُمْ وَكُلُّكُمْ فُقْرَاءٌ اِلَّا مَنْ اَغْنَيْتُ فَاسْأَلُوْنِي اَرْزُقْكُمْ وَكُلُّكُمْ مُذْنِبٌ اِلَّا مَنْ عَاقَيْتُ فَمَنْ عَلِمَ مِنْكُمْ اَتَى ذَوْقُدْرَةَ عَلَى الْمَغْفِرَةِ فَاسْتَغْفِرْنِي غَفَرْتُ لَهُ وَلَا اَبَالِي وَلَوْ اَنَّ اَوْلَ لَكُمْ وَاخِرَكُمْ وَحَيْكُمْ وَمَيْتَكُمْ وَرَطْبِكُمْ وَيَا بَسْكُمْ اجْتَمَعُوا عَلَى اَنْتَفَى قَلْبِ عِبْدِي مِنْ عِبَادِي مَا زَادَ ذَلِكَ فِي مُلْكِي جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ وَلَوْ اَنَّ اَوْلَ لَكُمْ وَاخِرَكُمْ وَحَيْكُمْ وَمَيْتَكُمْ وَرَطْبِكُمْ وَيَا بَسْكُمْ اجْتَمَعُوا عَلَى اَشْفَى

قَلْبِ عَبْدٍ مِنْ عِبَادِي مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِي جَنَاحَ بَعُوضَةٍ وَلَوْ أَنَّ أَوْلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَحَيْكُمْ وَمَيْتَكُمْ
وَرَطْبَكُمْ وَيَا بِسْمِكُمْ اجْتَمَعُوا فِي صَعِيدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلَ كُلُّ إِنْسَانٍ مِنْكُمْ مَا بَلَغَتْ أُمِّيَّتُهُ فَأَعْطَيْتُ كُلَّ سَائِلٍ
مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِي إِلَّا كَمَا لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ مَرَّ بِالْبَحْرِ فَمَسَّ فِيهِ إِبْرَةً ثُمَّ رَفَعَهَا ذَلِكَ بَأَنِّي جَوَادٌ
مَا جَدُّ أَفْعَلُ مَا أُرِيدُ عَطَائِي كَلَامٌ وَعَدَائِي كَلَامٌ إِنَّمَا أَمْرِي لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْتُ أَنْ أَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ .

(رواه احمد والترمذی وابن ماجه)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۷/۴ حدیث رقم ۲۶۱۳۔ وابن ماجه ۱۴۲۲/۲ حدیث رقم ۴۲۵۷۔ واحمد فی المسند ۱۵۴/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! تم سب گم کردہ راہ ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے ہدایت بخشی پس تم سب مجھ سے ہدایت چاہو میں تمہیں ہدایت بخشوں گا۔ تم سب ظاہر و باطن میں محتاج ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے غنی بنا دیا پس تم سب مجھ سے روزی مانگو جس تمہیں (پاک و حلال) روزی دوں گا تم سب گنہگار ہو (یعنی سب ہی سے گناہ متصور ہے) علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے بچا لیا ہو (یعنی انبیاء کرام) پس تم میں سے جس شخص نے جانا کہ میں بخشے پر قادر ہوں اور پھر اس نے مجھ سے بخشش مانگی تو میں اس کو (یعنی اس کے سب گناہ) بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہوگی اور اگر تمہارے پچھلے اگلے تمہارے زندہ تمہارے مردے تمہارے تر اور تمہارے خشک (یعنی تمہارے جوان و بوڑھے) اور یا تمہارے عالم و جاہل اور یا تمہارے فرمانبردار و گنہگار غرض کہ ساری مخلوقات) میرے بندوں میں سب سے زیادہ متقی دل بندہ (محمد ﷺ) کی طرح ہو جائیں تو اس سے (یعنی تمام مخلوقات کے عابد و متقی ہو جانے سے) میری خدائی میں ایک مچھر کے برابر بھی زیادتی نہیں ہوگی اور اگر تمہارے اگلے تمہارے پچھلے تمہارے زندے تمہارے مردے تمہارے تر اور تمہارے خشک (غرضیکہ ساری مخلوقات) میرے بندوں میں سب سے زیادہ (بد بخت بندہ شیطان لعین) کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری خدائی میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی کمی نہ ہوگی اور اگر تمہارے اگلے تمہارے پچھلے تمہارے زندے تمہارے مردے تمہارے تر اور تمہارے خشک ایک جگہ جمع ہوں اور تم میں سے ہر شخص اپنی انتہائی آرزو و خواہش کے مطابق مانگے (یعنی اس کے دل میں جو بھی آرزو و خواہش ہو مجھ سے مانگے) اور پھر تم میں سے ہر شخص کو (اس کی خواہش کے مطابق دوں) تو اس سے میری خدائی میں کچھ بھی کمی نہیں ہوگی (ہاں اگر بفرض مجال کی ہو بھی) تو اسی قدر مثلاً تم میں سے کسی شخص کا دریا پر گزر ہو اور وہ اس میں سوئی ڈال کر پھر اسے نکالے (یعنی اگر بفرض مجال کسی کی کا تصور بھی کیا جائے تو وہ اسی قدر ہوگی جتنا کہ ایک سوئی پر پانی لگ جاتا ہے ورنہ حقیقت میں خدا کی خدائی میں کمی کے کسی بھی درجہ کا کیا سوال وہ کتنا بھی دے اس کے ہاں ہرگز کمی نہیں ہوتی) اور اس کا سبب یہ ہے کہ میں بہت سخی ہوں۔ بہت دینے والا ہوں اور جو چاہتا ہوں کرتا ہوں (یعنی یہ تمام سخاوت اور کرم میرے ارادہ و اختیار کے ہی تحت ہے اس میں کسی بندے کے ارادے کو دخل نہیں ہے) میرا دینا صرف حکم کرنا ہے اور میرا عذاب صرف حکم دینا ہے (یعنی یہ سب چیزیں صرف میرے ایک حکم سے ہو جاتی ہیں میں ذرائع اور اسباب کا محتاج نہیں ہوں اور میں کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہوں تو اس کیلئے میرا صرف اتنا ہی حکم ہے کہ میں کہہ دیتا ہوں ”ہو جا“ اور وہ ہو جاتی ہے۔“ (احمد ترمذی ابن ماجہ)

عرض مرتب: اس حدیث کے قریب ما قبل میں ایک حدیث گذری ہے اس حدیث کے کئی جملہ اس حدیث سے کافی حد تک مناسبت

رکھتے ہیں۔ ان جملوں کی وضاحت پچھلی حدیث میں ملاحظہ کر لی جائے۔ یا عبادی: کلکم ضال الا من ہدیت، فاستلونی الہدی اھدکم: اس جملہ کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے، حدیث: ۲۳۲۶۔ وکلکم فقراء الا من اغیت: اس کی ذات سے کسی بھی لمحہ استغناء ممکن نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ﴾ [محمد: ۳۶] الا من عافیت: عافیت میں تمہیہ ہے کہ ”ذنب“ مرض ذاتی ہے، اس سے صحت یابی اللہ کی عصمت و حفظ و امان ہی کے ذریعہ ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص بالفعل گناہگار ہے، اور ہر شخص کا ذنب اس کے مقام کے مناسب ہے، سوائے اس شخص کے جس کو میں مغفرت و رحمت اور توبہ و اوبہ کے ذریعہ عافیت عطا کروں۔ فمن علم منکم انی ذو قدرۃ علی المغفرۃ فاستغفرنی غفرت لہ: اس جملہ کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۲۳۳۸۔ ولو ان اولکم و آخرکم میں احاطہ و شمول مراد ہے، اور حکیم میتکم و رطبکم و یابسکم، یہ کلام ارادۃ الاستیعاب کی تاکید ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: رطب سے مراد نبات و شجر ہے اور یابس سے مراد مدرو حجر ہے۔ اور ممکن ہے کہ ان دونوں سے مراد بحر و برہوں۔ یعنی ان کے اہل مراد ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ بحر و بر میں جو بھی مخلوقات ہیں مثلاً شجر و حجر، مچھلیاں اور تمام جانور آدمی بن جائیں۔

تشریح: امام طیبی فرماتے ہیں: یہ دونوں، استیعاب تام سے عبارت ہیں، جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ [الانعام: ۵۹] اور ضمیر مخاطب کی طرف اضافت نوع انسانی میں استیعاب کی مقتضی ہے، چنانچہ یہ تاکید بعد التأكيد ہوگی، برائے شمول، اور تقریر بعد التقریر ہے۔ اتنی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ اور ان کی عصمت کے مسئلہ کو اس کے تحت داخل کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی، جیسا کہ ابن حجر نے کہا ہے۔ ”اجتمعوا علی اتقی..... ثم دفعها“ اس عبارت کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۲۳۳۶۔

جواد: (مبالغہ کا صیغہ ہے) کثیر الجواد۔ ماجد: واسع العطاء۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ”الماجد، الجواد“ سے ابلغ ہے، چونکہ مجد کہتے ہیں وسعت کرم کو، چنانچہ ان (دونوں اسماء کو اس ترتیب سے ذکر کرنے) میں صنعت ترقی ہے۔ افعال ما آرید: ایک حدیث قدسی میں آتا ہے: ”ترید و آرید، ولا یکون الا ما آرید۔ ابو زید سے پوچھا گیا: ما ترید؟ انہوں نے جواب میں فرمایا: آرید ان لا آرید۔

ندیم الباری شیخ الاسلام عبداللہ انصاری فرماتے ہیں: ”هذا أيضا وارادة للذین احسنوا الحسنی و زیادۃ۔ ان اقول لہ کن فیكون“: مرفوع و منصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ یہ جملہ تفسیر ہے عطائی کلام و عدابی کلام کی۔ قاضی فرماتے ہیں: میں جب کسی کیلئے عطاء یا عذاب کا ارادہ کرتا ہوں تو رد و کد اور مزاولت عمل کی حاجت پیش نہیں آتی، بلکہ اپنی مراد کے حصول و وصول کیلئے صرف اس کے ہونے کا ارادہ کافی ہے۔ صاحب کشف لکھتے ہیں: کن، فعل تام ہے۔ ای احدث فیحدث۔ یہ تمثیل پر محمول ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ جس امر کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس کے ہونے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ چیز ہو جاتی ہے، اور وہ چیز بغیر کسی امتناع و توقف کے معرض وجود میں آ جاتی ہے، اس مطیع مامور کی طرح کہ جس کو حکم دیا جائے۔ چنانچہ وہ امتثال امر کرتا ہے، اور انکار نہیں کرتا۔

۲۳۵۱: وَعَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَرَأَ هُوَ أَهْلَ التَّقْوَىٰ وَأَهْلَ الْمَغْفِرَةِ قَالَ قَالَ رَبُّكُمْ أَنَا أَهْلُ أَنْ أَتَّقَىٰ فَمَنْ اتَّقَانِي فَاَنَا أَهْلُ أَنْ أَعْفِرَهُ (رواه الترمذی وابن ماجہ والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۰۲۵ حدیث رقم ۳۳۸۴۔ وابن ماجہ ۱۴۳۷/۲ حدیث رقم ۴۲۹۹۔ والدارمی ۳۹۲/۲

حدیث رقم ۲۷۲۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (وہی صاحب تقویٰ ہے اور صاحب بخشش ہے) پھر آپ ﷺ نے اس کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ میری شان کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ میرے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے پرہیز کریں لہذا جو شخص شرک سے بچتا ہے تو پھر میرے لائق یہی ہوتا ہے کہ میں اسے بخش دوں۔“ (ترمذی ابن ماجہ واری)

تشریح: (قال ربکم) یہاں سے آگے حدیث قدسی ہے یا تفسیری معنی ہے۔ اہل: کی اضافت ہو رہی ہے مابعد کی طرف۔ اتقی: فعل مجہول ہے۔ معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے: انا حقیق و جدید بان یتقی من الشرب بی۔ فمن اتقانی: ترمذی کی روایت میں اتنا اضافہ ہے: فلم يجعل معنی الہا:

مذکورہ بالا آیت کا مضمون اس آیت کے مضمون کی مانند ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ اللَّهُ تَعَالَىٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اس (شرک) کے علاوہ (ہر گناہ) کو جس کے لئے چاہے معاف کر دیتا ہے۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: اغفر له ما فرط منه فان ذلك قليل في جنب اعماله سالحة۔ ومن ثم ورد: ان اجتناب الكبائر مكفر لا ارتكاب الصغائر۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: دلیل اور مدلول کے درمیان ربط نہیں ہے، ان کے قول کی دلیل یہ آیت کریمہ ہو سکتی ہے: ان الحسنات يذهبن السيئات ﴿١١٤﴾ [ہود: ١١٤] اور ابن حجر کا یہ کہنا: ما ورد..... معلول ہے، چونکہ یہ ثابت نہیں ہے، مزید یہ کہ ہم ماقبل میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ مذہب معتزلہ کا ہے۔

٢٣٥٢: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ إِنْ كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي الْمَجْلِسِ يَقُولُ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُورُ مَا نَأْتِي مَرَّةً (رواه احمد والترمذى وابود اود وابن ماجه)

احرجہ ابوداؤد فی السنن ٨٥١٢ حدیث رقم ١٥١٦۔ والترمذی ١٥٨١٥ حدیث رقم ٣٨١٤۔ وابن ماجه ١٢٥٣٢ حدیث رقم ٣٨١٤۔ واحمد فی المسند ٢١١٢۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم یہ شمار کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں سو مرتبہ یہ کہا کرتے تھے رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُورُ میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما بلاشبہ تو ہی بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔“ (احمد ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: ان: مخفف من المشقلة ہے۔ لنعُد: میں لام فارقة ہے، اور رسول اللہ ﷺ بعد کے متعلق ہے۔ الحسن کی روایت میں الواحد کا اضافہ بھی ہے۔ يقول: مرفوع ہے، اور بتقدیر ان منصوب ہے۔ التواب الغفور: یہ دونوں صیغہ مبالغہ کے ہیں۔ مائة مرة: لنعُد کیلئے مفعول مطلق ہے۔ رب اغفر لی: شاعر کے اس قول کی طرح ہے: احضر الوعی۔ تب علی کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) ارجع علی بالرحمة۔ (۲) وفقنی للتوبة۔ مجھے توبہ کی توفیق عطا فرما۔ (۳) اقبل توبتی۔ میری توبہ کو قبول فرما۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔ البتہ ابن حبان اور ابوداؤد کی روایت میں الغفور کے بجائے الرحیم ہے۔

٢٣٥٣: وَعَنْ هَلَالِ بْنِ يَسَارٍ بْنِ زَيْدٍ مَوْلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ جَدِّي أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

يَقُولُ مَنْ قَالَ اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الَّذِي لَا إِلَهَ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ غُفِرَ لَهُ وَإِنْ كَانَ قَدْ فَرَّ مِنَ الرَّحْفِ .

(رواه الترمذی و ابو داؤد و الکنہ عند ابی داؤد ہلال ابن بسار و قال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۵/۲ حدیث رقم ۱۰۱۷۔ و الترمذی ۲۲۸/۵ حدیث رقم ۳۶۴۸۔

ترجمہ: ”اور نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید کے پوتے حضرت ہلال بن یسار کہتے ہیں کہ میرے والد (حضرت یسار) نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی جسے انہوں نے میرے دادا (حضرت زید) سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت زید) رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص یہ کہے اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الَّذِي لَا إِلَهَ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ میں اللہ سے بخشش چاہتا ہوں وہ اللہ کہ نہیں معبود علاوہ اس کے جو زندہ ہے اور خبر گیری کرنے والا ہے۔ تو اس کی بخشش کی جاتی ہے اگرچہ وہ جہاد سے بھاگا ہوا ہو (جو ایک بہت بڑا گناہ ہے) اس روایت کو ترمذی اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے لیکن ابو داؤد کے نزدیک (ہلال بن یسار کی بجائے) ہلال بن یسار ہے۔ نیز امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

راوی حدیث:

ہلال بن یسار۔ یہ ہلال بن یسار کے بیٹے جو زید کے بیٹے تھے جو کہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ تھے۔ اور یہ زید بن حارثہ نہیں ہیں جو اسامہ کے والد تھے۔ انہوں نے اپنے باپ سے اور دادا سے روایت کی ہے اور ان سے ”عمرو بن مرہ“ نے روایت کی۔ ان کی حدیثیں بصرہ والوں میں رائج ہیں۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ زید یسار کے والد ہیں صحابی ہیں ان سے صرف ایک حدیث مروی ہے اور ابو موسیٰ مدینی نے ذکر کیا ہے کہ وہ ”عبدنوبی“ تھے۔

تشریح: مولیٰ النبی، ”زید“ کا بیان ہے۔ ایک نسخہ میں مولیٰ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ہیں۔ امام طبری فرماتے ہیں الحی القیوم کو منصوب پڑھنا بھی درست ہے (جیسا کہ ایک روایت میں مروی ہے) لفظ جلالہ کی صفت ہونے کی وجہ سے، یا مدح ہونے کی وجہ سے۔ اور مرفوع پڑھنے کی صورت میں (ہو) خبر سے بدل ہیں۔ یا مدح ہیں، مبتدا محذوف کی خبر ہیں اھ۔ اکثر ”بدل“ بناتے ہیں اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں: کہ یہ دونوں اسم ہو کی صفت ہونے کی بناء پر مرفوع ہیں۔ ابن حجر نے اسی ترکیب پر اکتفا کیا ہے۔ یہ قول مرجوح ہے، اور کسائی کی طرف منصوب ہے۔ جمہور کا کہنا ہے کہ الضمیر لا یوصف۔ وان کان فر: ایک نسخہ صحیحہ میں ”قد فر“ ہے۔ حصن میں اسی طرح ہے۔ الزحف: امام طبری فرماتے ہیں: الزحف الجيش الكثير الذي يروى لكثرة كانه يزحف۔ اور صاحب النہایہ لکھتے ہیں: من زحف الصبي اذا دب على استه قليلا قليلا۔ مظہر فرماتے ہیں: هو اجتماع الجيش في وجه العدو۔

کوئی بھی دعا، کوئی بھی ذکر ہو اور کوئی بھی عمل ہو اور دہو جب تک نیت و مقصد کا اخلاص اور دل کی تڑپ و لگن زبان کی ہمنوا نہ ہونہ اس دعا کا اثر ہوتا ہے نہ اس ذکر و عمل کا۔ اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ جب بھی استغفار پڑھا جائے تو خلوص دل اور خلوص نیت کے ساتھ پڑھا جائے کیونکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ گناہ سے استغفار کرنے والا درنا خالی کہ وہ اس گناہ پر قائم ہوا اپنے پروردگار سے ٹھٹھول کرنے والا ہے۔ (نعوذ باللہ)۔ ان المستغفر من الذنب وهو مقيم عليه كالمستهزئ بربه:

عرض مرتب: اس حدیث کی تخریج کیلئے ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۲۲۶۳ کی تخریج۔

مظہر فرماتے ہیں: واضح رہے کہ میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنا گناہ کبیرہ ہے، ہاں اگر کفار کی تعداد مسلمانوں سے دو گنی ہو، یا تحریف

تجزیہ کی نیت سے بھاگتا ہے تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ ابن الملک شرح مصابیح میں ذکر کرتے ہیں: قیل: هذا يدل على أن الكبائر تغفر بالتوبة والاستغفار اه۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے اس میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ ہلال بن یسار: اعراب کے اعتبار سے مرفوع ہے۔ البتہ حکایہ کی تقدیر پر مجبور ہے۔

حافظ منذری فرماتے ہیں: اسنادہ جيد متصل، فقد ذكر البخاری فی تاریخہ ان بلالا سمع اباہ یسار او هو سمع من ابيه زيد مولى رسول الله ﷺ وقد اختلف فى يسار والد بلال انه بالباء الموحدة او بالياء المشناة التحتانية، وذكر البخاری فی تاریخہ بالموحدة والله تعالى اعلم۔ اور اس کو امام حاکم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ روایت شیخین کی شرط پر ہے۔ البتہ ان کی روایت میں تین بار کہنے کا ذکر ہے۔ اه۔

حسن کی روایت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ترمذی کی روایت میں ثلاث مرات کا اضافہ ہے۔ اور ابن حبان نے انہیں زید سے اور طبرانی نے ابن مسعود کے قول کے طور پر موثوقاً ذکر کیا ہے۔ صاحب السلاخ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذی نے ابوسعید سے نقل کیا ہے۔ اس میں تین بار کا ذکر ہے۔ اه۔ ابوسعید سے مروی ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: من قال حين يأوى الى فراشه استغفر الله الذى لا اله الا هو الحى القيوم واتوب اليه ثلاث مرات غفر الله له ذنوبه، وان كانت مثل زيد البحر۔ وان كانت عدد ورق الشجر، وان كانت عدد رمل عالج، وان كانت عدد ايام الدنيا۔ اس میں میدان جنگ سے فرار کا ذکر نہیں ہے۔ امام ترمذی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے۔ ہم اس کو صرف اسی طریق سے جانتے ہیں۔ (میرک)

الفصل الثالث:

۲۳۵۴: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيُرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِي الْجَنَّةِ فَيَقُولُ يَا رَبِّ انى لى هذِهِ فَيَقُولُ بِاسْتِغْفَارٍ وَلَيْدَكَ لَكَ (رواه احمد)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۱۲۰۷/۲ حديث رقم ۳۶۶۰۔ واحمد فى المسند ۵۱۹/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ عزوجل جنت میں اپنے بندہ نیک بخت و صالح کا درجہ بلند کرتا ہے تو وہ پوچھتا ہے: ”میرے پروردگار مجھے یہ درجہ کیسے حاصل ہوا؟“ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”تیرے لئے تیرے بیٹے کے استغفار کی وجہ سے“۔ (احمد)

تشریح: فى الجنة: ليرفع کے متعلق ہے۔ ولدك لك: ولد کا اطلاق مذکر مؤنث دونوں پر ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد مؤمنین ہیں۔

۲۳۵۵: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مَيِّتُ فِي الْقَبْرِ إِلَّا كَالْعَرِيقِ الْمَتَّعِثِ يَنْتَظِرُ دَعْوَةَ تَلْحَقُهُ مِنْ أَبِي أَوْ أُمِّ أَوْ أَخٍ أَوْ صَدِيقٍ فَإِذَا لِحِقْتُهُ كَانَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا وَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَيُدْخِلُ عَلَى أَهْلِ الْقُبُورِ مِنْ دُعَاءِ أَهْلِ الْأَرْضِ أَمْثَالَ الْجِبَالِ وَإِنَّ هَدِيَّةَ الْأَحْيَاءِ إِلَى الْأَمْوَاتِ الْإِسْتِغْفَارُ لَهُمْ . (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

اخرجه البيهقى فى شعب الايمان ۲۰۲/۶ الحديث رقم ۷۹۰۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قبر میں مردہ کی حالت ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص ڈوب رہا ہو اور کسی کو پکار رہا ہو (کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی سے باہر نکالے) چنانچہ مردہ ہر وقت اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ اس کے باپ کی طرف سے یا اس کی ماں کی طرف سے یا اس کے بھائی کی طرف سے یا اس کے دوست کی طرف سے اس کو دعا پہنچے پس جب اسے (کسی کی طرف سے دعا پہنچتی ہے تو یہ دعا کا پہنچنا اس کے لئے دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ قبر والوں کی طرف سے دعا کا ثواب پہاڑ کی مانند (یعنی بہت زیادہ ثواب اور رحمت و بخشش) پہنچاتا ہے اور زندوں کی طرف سے مردوں کے لئے بہترین ہدیہ استغفار ہے۔“ (بیہقی)

تشریح: صدیق کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ساتھی، محبت یار رفیق۔ اور یہ ممکن ہے کہ اس سے مراد ولد ہو۔ فاذا الحقته: ابن حجرؒ نے فرمایا: اجماع امت ہے کہ یہ دعائیت کو پہنچتی ہے۔ کان أحب الیہ: کان کی ضمیر کا مرجع لحقوقہا ہے۔ من الدنيا وما فیہا سے مراد دنیا کے مسئلہات ہیں۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: لو عاد الیہا۔ (یعنی یہ دعا کا پہنچنا اس کیلئے دنیا و ما فیہا کی طرف لوٹ آنے سے زیادہ محبوب ہوتا ہے)۔ من دعا اهل الارض: یہ من تعلیلہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابتدائی یہ ہو۔ أمثال الجبال: یعنی دعا کے ثواب کو اگر جسمانی صورت دی جائے تو وہ پہاڑ کی مانند ہوں۔

۲۳۵۶ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُسْرِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ طُوبَى لِمَنْ وَجَدَ فِي صَحِيفَتِهِ اسْتِغْفَارًا ۱

کثیراً (رواہ ابن ماجہ وروی النسائی فی عمل یوم ولیلہ)

اخرجه النسائی عمل الیوم ولیلہ۔ وابن ماجہ فی السنن ۱۲۵۴/۲ حدیث رقم ۳۸۱۸۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبد اللہ بن بسرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”خوش بختی ہے اس شخص کے لئے جس نے اپنے نامہ اعمال میں بہت استغفار کی (یعنی مقبول استغفار پایا) ابن ماجہ اور نسائی نے اس روایت کو اپنی کتاب عمل یوم ولیلہ میں نقل فرمایا ہے۔“

تشریح: طوبی کے کئی معنی آتے ہیں: (۱) الحاله الطیبۃ۔ (۲) العشیۃ الراضیۃ۔ (۳) الشجرۃ المشهورۃ فی

الجنة العالیۃ۔ استغفار سے مراد استغفار مقبول ہے۔ رابعہ عدویہ فرماتی ہیں: استغفارنا یحتاج الی استغفار کثیر۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: شارع علیہ السلام نے طوبی لمن استغفر کثیرا کے بجائے مذکورہ بالا تعبیر اختیار فرمائی۔ اس عدول کا کیا فائدہ ہے؟ یہ کنایہ ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ فضیلت مشروط بالآ خلاص ہے، چونکہ جو شخص صدق دل کے ساتھ استغفار نہیں کرے گا، اس کا یہ عدم صدق کے ساتھ استغفار کرنا اس کے خلاف دلیل و حجت بنے گا۔

تخریج: اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ (میرک) وروی النسائی: مصنف کو چاہئے تھا کہ وہ بذریعہ عطف یوں فرماتے: والنسائی، یا یوں فرماتے: ورواہ النسائی۔

اور بزار نے حضرت انس سے مروعا نقل کیا ہے:

ما من حافظین یرفعان الی اللہ فی یوم صحیفۃ فیری ای اللہ فی اول الصحیفۃ وفی آخرها استغفار الا قال

تبارک وتعالیٰ: غفرت لعبدی ما بین طرفی الصحیفۃ۔

اور طبرانی اوسط میں زبیر بن عوام سے مروعا نقل کیا ہے:

من اھب ان تسره صحیفۃ فلیکثر فیھا من الاستغفار ای لعلہ یقبل واحد منها
استغفار کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک یہ حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے جسے بزار نے حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع روایت کیا ہے
کہ اعمال لکھنے والے دونوں فرشتے جب بندے کا اعمال نامہ لے کر اوپر جاتے ہیں تو حق تعالیٰ اس اعمال نامہ کے اول و آخر میں استغفار
دیکھ کر فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندے کے وہ تمام گناہ بخش دیئے جو اس نامہ اعمال کے دونوں کناروں کے درمیان ہیں۔ اس حدیث کا
حاصل یہ ہے کہ جو شخص صبح و شام استغفار کرتا ہے اسے یہ فضیلت و سعادت حاصل ہوتی ہے۔

۲۳۵۷: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ الَّذِينَ إِذَا أَحْسَنُوا اسْتَبْشَرُوا وَإِذَا

أَسَاءُوا اسْتَغْفَرُوا. (رواه ابن ماجہ والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۰۲/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۰۸۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۱۰۲/۴ حدیث رقم (۳- ۲۷۴۴)
واحمد فی المسند ۳۸۳/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ”اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنا
جو نیکی کریں تو خوش ہوں اور برائی کریں تو استغفار کریں“۔ (ابن ماجہ بیہقی)

تشریح: احسان سے مراد احسانِ علم و عمل ہے۔ اور اس تو فیق پر خوش ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ
وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلِيفرِحُوا﴾ [یونس: ۵۸] اور جب برائی کریں یعنی علم و عمل میں ان سے کوئی تقصیر ہو تو استغفار کریں۔ صفت مقابلہ کا
تقاضا یہ تھا کہ (استغفر واکے بجائے) حزن و افراتے۔ (یعنی واذا احسنوا استبشروا واذا أسأوا حزنوا فرماتے) تعبیر کے اس
عدول میں درحقیقت داء سے دوا کی طرف اشارہ مقصود ہے، کہ صرف ”حزن“ کافی و مفید نہیں ہے۔ حزن اسی وقت مفید ہوگا کہ جب وہ
مقرون بالاستغفار المزیل للاصرار ہو۔

۲۳۵۸: وَعَنِ الْحَارِثِ بْنِ سُوَيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ حَدِيثَيْنِ أَحَدُهُمَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ
وَالْآخَرَ عَنْ نَفْسِهِ قَالَ إِنَّ الْمُؤْمِنَ يَرَى ذُنُوبَهُ كَأَنَّهُ قَاعِدٌ تَحْتَ جَبَلٍ يُخَافُ أَنْ يَقَعَ عَلَيْهِ وَإِنَّ الْفَاجِرَ
يُرَى ذُنُوبَهُ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلَى أَنْفِهِ فَقَالَ بِهِ هَلْكَدَا أَيْ بِيَدِهِ فَذَبَّهُ عَنْهُ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ
يَقُولُ لَللَّهِ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ نَزَلَ فِي أَرْضٍ دَرِيَّةٍ مُهْلِكَةٍ مَعَهُ رَاحِلَتُهُ عَلَيْهَا طَعَامُهُ
وَسَرَابُهُ فَوَضَعَ رَأْسَهُ فَنَامَ نَوْمَةً فَاسْتَيْقَظَ وَقَدْ ذَهَبَتْ رَاحِلَتُهُ فَطَلَبَهَا حَتَّى إِذَا اشْتَدَّ عَلَيْهِ الْحَرُّ وَالْعَطَشُ
وَمَا شَاءَ اللَّهُ قَالَ أَرْجِعْ إِلَيَّ مَكَانِي الَّذِي كُنْتُ فِيهِ فَإِنَّمَا حَتَّى أَمُوتَ فَوَضَعَ رَأْسَهُ عَلَى سَاعِدِهِ لِيَمُوتَ
فَاسْتَيْقَظَ فَإِذَا رَاحِلَتُهُ عِنْدَهُ عَلَيْهَا زَادُهُ وَسَرَابُهُ قَالَ لِلَّهِ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ هَذَا بِرَاحِلَتِهِ
وَزَادِهِ. (روى مسلم المرفوع الى رسول الله منه فحسب وروى البخارى الموقوف على ابن مسعود ايضا)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۰۲/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۰۸۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۱۰۲/۴ حدیث رقم (۳- ۲۷۴۴)
واحمد فی المسند ۳۸۳/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت حارث بن سویدؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے مجھ سے دو حدیثیں بیان کیں ایک
تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی اور دوسری اپنی طرف سے بیان کی۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا: ”مؤمن اپنے
گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ ایک پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو اور خوفزدہ ہو کہ پہاڑ اس کے اوپر نہ گر پڑے اور فاجر

اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے اس کبھی کو جو اس کی ناک پراڑے اور وہ اس کی طرف اس طرح یعنی اپنے ہاتھ سے اشارہ کرے اور اسے ازادے (حاصل یہ کہ مؤمن گناہ سے بہت ڈرتا ہے اور اسے اس بات کا خوف رہتا ہے کہ کہیں میں اس گناہ کی پاداش میں پکڑا نہ جاؤں اس لئے اس کی نظر میں چھوٹے چھوٹے گناہ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن فاجر اپنے گناہوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اس کی نظر میں بڑے سے بڑے گناہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی) پھر حضرت عبداللہ نے (آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کی توبہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے (جو اپنے سفر کے دوران) کسی ایسے ہولناک میدان میں اترے جہاں سبزہ و درخت کا نام و نشان تک نہ ہو اور اس کے ساتھ جو سواری ہو اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو پھر (وہ استراحت کے لئے) وہیں زمین پر سر رکھ کر ایک نیند سو گیا ہو اور جب جاگنے کے بعد اسے معلوم ہو کہ سامان سے لدی ہوئی اس کی سواری گم ہو گئی ہے تو وہ اس کی تلاش میں مصروف ہو گیا ہو یہاں تک کہ گرمی کی تیش اور پیاس کی شدت اور گرمی اور پیاس کے علاوہ دوسری تکلیف اور پریشانی کی) ان چیزوں نے جو اللہ کو منظور تھیں اس پر غلبہ پالیا ہو تو اس نے یہ کہا ہو کہ میں اپنی جگہ لوٹ چلوں جہاں میں (سر رکھ کر سو یا تھا) وہیں سو جاؤں تاکہ نیند کی حالت میں میرا خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر موت کی انتظار میں سو رہا ہو کہ اس کی آنکھ کھل جائے اور اچانک وہ دیکھے کہ اس کی سواری اس کے سامنے موجود ہو جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندہ کی توبہ کی وجہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی سواری اور اپنے کھانے پینے کا سامان پا کر خوش ہوتا ہے۔ مسلم نے ان دونوں روایتوں میں سے صرف اس روایت کو نقل کیا ہے جسے ابن مسعود نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے (یعنی جس میں مؤمن بندہ کی توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بہت خوش ہونے کا بیان ہے) اور اس روایت کو نقل نہیں کیا ہے جسے ابن مسعود نے اپنی طرف سے بیان کیا ہے اور جس میں گناہ کے بارے میں مؤمن اور فاجر کے فرق کو بیان کیا گیا ہے) اور بخاری نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے جسے ابن مسعود نے اپنی طرف سے بیان کیا ہے۔ حاصل یہ کہ حدیث مرفوعہ کو تو بخاری و مسلم دونوں نے نقل کیا ہے لیکن حدیث موقوفہ کو صرف بخاری نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

الحارث بن سويد۔ یہ حارث بن سويد تميمی کوفی ہیں۔ یہ کبار تابعین میں سے ہیں محدثین کے نزدیک قابل اعتماد ہیں۔ انہوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث کی ہے اور ان سے ابراہیم تميمی نے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے آخردور میں انہوں نے وفات پائی۔

تشریح: حدیثین: مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یری ذنوبہ: امام طبری فرماتے ہیں: ذنوبہ، مفعول اول ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ ای کالجبال۔ اس کے حذف کی دلیل اگلے جملہ میں موجود لفظ ”کذاب“ ہے۔ ای بیدہ: اشارہ کی تفسیر ہے۔ ای دفع الذباب بیدہ۔ فذبه عنه: یہ بائبل کی تفسیر ہے۔ ای دفع الذباب عن نفسه۔

یہ حدیث اس بات کے منافی نہیں کہ خوف ورجاء میں اعتدال مطلوب و محبوب ہے، چونکہ مؤمن کو اپنے رب سے رجاء اور حسن ظن انتہاء درجہ کا ہوتا ہے۔

من رجل: أفرح کے متعلق ہے۔

دویۃ: بتشدیدالواوالباء نسبة للدواى الهلاك - وفى رواية داوية بقلب احدى الواوین الفا والدوة المغازة الخالية ذكره الطیبی۔ قال النووی: بتشدید الواو والباء جميعا وذكر مسلم فى رواية اخرى بزيادة الالف وهى بتشدید الباء ايضا وهى الارض القفر والمغازة الخالية۔ فالدویه منسوبة الى الدو واما الداویة فبإبدال احدى الواوین الفا كالتائى۔

اقول فى قوله بزيادة الف مسامحة اذ ینافیہ الإبدال فكأنه اراد الزيادة اللغوية لا الصرفية الوزنية وقوله: كالتائى نظیر لا مثیل فى القاموس: الطاء ة كالتاعة الابعاد فى المرعى، ومنه ابو القبيلة او من طاء يطوء اذا ذهب وجاء والنسبة طائى والقياس كما جى حذفوا الباء الثانية فبقى طىء فقلبوا الباء الساكنة الفاء ووهم الجوهرى۔

مهلكة: میم کے فتح کے ساتھ ہے، اور لام کو مفتوح وکسور دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ اور بعض نسخوں میں بضم المیم وکسر اللام ہے۔ والعطش: چونکہ گرمی کی وجہ سے پیاس لگتی ہے اس لئے صرف پیاس کا ذکر کیا (کھانے کا ذکر نہیں کیا)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ از باب اکتفاء ہو۔ او ماشاء اللہ: امام طیبی فرماتے ہیں: راوی کو شک ہے۔ اور تقدیریوں ہے: قال رسول اللہ ﷺ ذلك۔ یا۔ قال ماشاء اللہ۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ”او“ برائے تنويع ہو۔ أى: اشتد الحر أو ماشاء اللہ من العذاب اه۔ کلامه فى المختصر۔ اور اظہر یہ ہے کہ اذ بمعنی واؤ ہے، اس صورت میں یہ تعیم بعد تخصیص ہوگی۔ أى و ماشاء اللہ بعد ذلك۔ اور برائے تنويع قرار دینے کی صورت میں یہ وہم ہوتا ہے کہ حر و عطش اللہ کی مشیت سے خارج ہیں۔ حاشا للہ۔ میں نے امام طیبی کی عبارت دیکھی تو لکھتے ہیں: أى ماشاء اللہ من العذاب والبلاء غیر الحر والعطش اه۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ان کی مختصر عبارت مخل ہے۔

پہلی فصل میں بھی اس قسم کی حدیث گزر چکی ہے وہاں بھی بتایا گیا ہے کہ بندہ کی توبہ سے اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ خوش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ سے راضی ہوتا ہے اور اس کی توبہ قبول کرتا ہے گویا اس حدیث سے اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ** ”اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے“۔

حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ ایک بہت بڑے عالم باعمل حضرت استاد ابی اہلج اسفرائی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے اللہ سبحانہ تعالیٰ سے مسلسل تیس برس تک یہ دعا کی کہ مجھے توبہ نصوح کی سعادت سے بہرہ مند فرمائے لیکن میری دعا قبول نہیں ہوئی میں نے اپنے دل میں بہت تعجب کیا اور کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی پاک اور مستغنی ہے کہ میں نے تیس برس تک اپنی ایک خواہش کی تکمیل کی دعا لیکن وہ بارگاہ الوہیت میں قبولیت سے نوازی نہیں گئی کہ جب ہی میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔ ”تمہیں اس بات پر تعجب ہے کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم مانگ کیا رہے ہو؟ تمہاری دعا کا حقیقی منشاء تو یہی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوست اور محبوب رکھے؟ تو کیا تم نے اللہ تعالیٰ کی یہ بشارت نہیں سنی کہ **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ** لہذا اس خواہش کی تکمیل نہ صرف یہ کہ بہت ہی آسان ہے بلکہ اس کی بشارت بھی دی جا چکی ہے۔

اس حدیث میں لطیف اشارات ہیں کہ حضرت عبداللہ نے (آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کی توبہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے (جو اپنے سفر کے دوران) کسی ایسے ہولناک میدان میں اترے جہاں سبزہ و درخت کا نام و نشان تک نہ ہو اور اس کے ساتھ جو سواری ہو اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو پھر (وہ استراحت کے لئے) وہیں زمین پر سر رکھ کر ایک نیند سو گیا ہو اور جب جاگنے کے بعد اسے معلوم ہو کہ سامان سے لدی ہوئی اس کی سواری گم ہو گئی ہے تو وہ اس کی تلاش میں مصروف ہو گیا ہو یہاں تک کہ گرمی کی پیش اور پیاس کی شدت اور گرمی اور پیاس کے علاوہ دوسری تکلیف اور پریشانی کی) ان چیزوں نے

جو اللہ کو منظور تھیں اس پر غلبہ پالیا ہو تو اس نے یہ کہا ہو کہ میں اپنی جگہ لوٹ چلوں جہاں میں (سر رکھ کر سویا تھا) وہیں سو جاؤں تاکہ نیند کی حالت میں میرا خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر موت کی انتظار میں سو رہا ہو کہ اس کی آنکھ کھل جائے اور اچانک وہ دیکھے کہ اس کی سواری اس کے سامنے موجود ہو جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کی توبہ کی وجہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی سواری اور اپنے کھانے پینے کا سامان پا کر خوش ہوتا ہے۔

اسنادی حیثیت کی توضیح: حدیث مرفوعہ متفق علیہ ہے، اور حدیث موقوف بخاری کی مقررہ روایات میں سے ہے۔

۲۳۵۹: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْمُتَّقِنَ التَّوَابَ

اخرجه احمد في المسند ۸۰/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اس بندہ مومن کو بہت دوست رکھتا ہے جو گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور بہت زیادہ توبہ کرتا ہے۔“

تشریح: عبد مومن سے مراد وہ مومن ہے جو عبودیت میں کامل ہو، اور اوصاف عبودیت کا نہ صرف مقرر ہو بلکہ تہ دل سے ان کی تصدیق بھی کرتا ہو۔ المقتن: کے تین مطلب بیان کئے ہیں: (۱)۔ جو گناہوں میں بہت زیادہ مبتلا ہوتا ہو۔ (۲)۔ غفلتوں کا شکار۔ (۳)۔ المحجوب عن الحضرات۔ اللہ اس عبد مومن کو اس وجہ سے پسند کرتا ہے کہ ایسا عبد مومن عجب وغرور جیسے کبار میں مبتلا نہ ہو۔ یہ دونوں گناہ اعظم الذنوب ہیں۔

عرض مرتب: اس لفظ تواب کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے: حدیث: ۲۳۴۱ میں ذکر کردہ لفظ توابوں کی تشریح۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: المقتن الممتحن یمتحنہ اللہ بالذنب، ثم یتوب، ثم یرعود الیہ، ثم یتوب منہ وھکذا ہو صریح فی صحۃ التوبۃ مع وقوع العودۃ۔

۲۳۶۰: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَا أَحَبُّ أَنْ لِي الدُّنْيَا بِهَذِهِ الْآيَةِ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ يَنْ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا الْآيَةَ فَقَالَ رَجُلٌ فَمَنْ أَشْرَكَ فَسَكَتَ النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ قَالَ أَلَا وَمَنْ أَشْرَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ

اخرجه احمد في المسند ۲۷۰/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے تھے: ”میں اس آیت یا عبادی الذین انفسہم لا تقنطوا الیہ کے مقابلہ میں اپنے لئے تمام دنیا کا حصول بھی پسند نہیں کرتا“ ایک شخص نے پوچھا کہ جس شخص نے شرک کیا (کیا وہ بھی اس آیت کی بشارت کا مستحق ہے؟) نبی کریم ﷺ نے (کچھ دیر) خاموشی اختیار فرمائی (تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آنے کے بعد یا پھر غور و فکر کر کے جواب دیں) پھر وحی آنے کے بعد یا خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جان لو! جس شخص نے شرک کیا اور اپنی زندگی ہی میں اس سے توبہ کر لی اور پھر اس کی توبہ قبول بھی ہوئی تو وہ بھی اس آیت کی بشارت کا مستحق ہے۔ یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمائی۔“

عرض مرتب: حدیث میں مذکور آیت کریمہ سے متعلق اختلاف قراءت وغیرہ ماقبل میں حدیث: ۲۳۴۸ کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۳۶۱: وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَيَغْفِرُ لِعَبْدِهِ مَا لَمْ يَقْعِ الْحِجَابُ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَمَا الْحِجَابُ قَالَ أَنْ تَمُوتَ النَّفْسُ وَهِيَ مُشْرِكَةٌ رَوَى الْأَحَادِيثُ الثَّلَاثَةُ (احمد

وروی البیہقی الاخیر فی کتاب البعث والنشور)

اخرجه احمد فی المسند ۱۷۴/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے (گناہوں میں سے جنہیں چاہتا ہے ان کو) بخشا ہے جب تک بندہ اور رحمت حق کے درمیان پردہ حائل نہ ہو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! پردہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”یہ کہ آدمی شرک کرتا ہو (یعنی شرک مرے) مذکورہ بالا تینوں روایتیں امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔ نیز یہ آخری روایت بیہقی نے ”کتاب البعث والنشور“ نقل کی ہے۔“

تشریح: تمام انواع کفر شرک کے حکم میں داخل ہیں۔

۲۳۶۲: وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ لَقِيَ اللَّهَ لَا يَعْدِلُ بِهِ شَيْئًا فِي الدُّنْيَا كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ جِبَالِ ذُنُوبٍ غَفَرَ اللَّهُ لَهُ۔ (رواه البیہقی فی کتاب بعث والنشور)

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۱۴۱۷/۲ حدیث رقم ۴۲۵۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے (یعنی اس حال میں مرے) کہ وہ دنیا میں خدا کی مانند کسی کو نہ مانتا ہو (یعنی شرک میں مبتلا نہ ہو) تو اگر مرنے کے بعد اس کے اوپر پہاڑ کی مانند بھی گناہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا تو) اس کے ان سب گناہوں کو بخش دے گا۔“ (بیہقی)

تشریح: شینا فی الدنيا: شینا منصوب بزعم الخافض ہے۔ اے: لا يتجاوز عنه الی غیرہ۔ مثل جبال: یہ کان کی خبر ہے، اور اسم ”ذنوب“ ہے۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: بیان للواقع، اذا لا شراك انما يكون فيها، وأما الآخرة فكل الناس فيها مؤمنون، وان لم ينفع أكثرهم ايمانهم اه۔ اس عبارت میں ابہام ہے، ان کو یہ تعبیر اختیار کرنی چاہئے تھی: وان لم ينفع الكفار ايمانهم۔

۲۳۶۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (رواه

ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان وقال تفرد به النهر انی وهو مجهول وفي شرح السنة رواه عنه مو قوفا قال النَّدْمُ تَوْبَةٌ وَالتَّائِبُ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ۔

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۱۴۱۷/۲ حدیث رقم ۴۲۵۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”گناہوں سے (صحیح اور پختہ) توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ (بیہقی) بیہقی نے کہا ہے کہ اس روایت کو صرف نہرانی نے نقل کیا ہے سو وہ مجہول ہیں۔ نیز بغویؒ نے شرح السنہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت موقوف نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا (گناہوں پر شرمندگی اور) پشیمانی کا مطلب توبہ ہے اور توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔“

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں سے صحیح اور پختہ توبہ کرنے والا شخص عدم مؤاخذہ کے اعتبار سے اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ (یعنی جس طرح بے گناہ شخص سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، اسی طرح گناہ گار تائب سے بھی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ قصہ مختصر بے گناہ اور گناہ گار تائب دونوں کا مؤاخذہ نہ ہوگا)۔ اس کی تائید حضرت رابعہ سے منقول قصہ کے ذریعہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل زمانہ، سفیانین اور ثوری وغیرہ پر فخر کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں: ان ذنوبی بلغت من الکثرة ما لم تبلغه طاعتکم، فیتوبتی منها بدلت حسنات تحقیقہ کہاں گئیں یا جن پر زیادت مضاعف کا ترتب ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تحقیق بات یہ ہے کہ سفیانین کی ایک نیکی مثلاً کوئی ایک سنت کہ جس پر قیامت تک عمل ہوتا رہے گا، کی نقل کرتے ہیں تو یہ نیکی، رابعہ کی تمام نیکیوں سے بڑھ کر ہے۔ سفیانین کا ان کہی خدمت میں حاضر ہونا، اور ان سے طلب دعا کرنا درحقیقت نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں تھا، بلکہ (ممکن ہے) ان کو ایسے امور دینیہ سے آگاہ کر کے نفع پہنچاتے ہوں کہ جن کا وہ علم نہ رکھتی ہوں۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں: یہاں مبالغہ مقصود تھا اس لئے الحاق الناقص بالکامل کا اسلوب اختیار کیا۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: زید کالأسد: یہ بات بلا شک ہے کہ مشرک تائب، نبی معصوم کی طرح نہیں ہو سکتا، ابن حجر ان کی بات کا تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: المراد بمن لا ذنب له من هو عرضة له لكنه حفظ منه، فخرج الأنبياء والملائكة فليسوا مقصودين بالتشبيه۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: چنانچہ اختلاف لفظی ہے، اصل اختلاف ان دو اشخاص کے بارے میں ہے کہ جس میں سے ایک شخص سے گناہ کا صدور ہوا اور پھر اس نے توبہ کر لی اور دوسرا شخص وہ ہے کہ جس نے گناہ کا ارتکاب سر سے کیا ہی نہیں۔ ان دونوں میں سے کون افضل ہے۔ تو بعض کا کہنا ہے کہ پہلا شخص یعنی گناہ گار تائب افضل ہے، چونکہ اس نے لذت معصیت چھٹنے کے بعد توبہ کی ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کا صدق اور ایمان اتوی پایا جاتا ہے، چونکہ اس نے مانع کا ارتکاب کرنے کے بعد اس کو چھوڑا ہے بخلاف دوسرے کے، اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ شخص بے گناہ افضل ہے، چونکہ اس نے اپنے آپ کو گناہوں میں ملوث و پراگندہ ہی نہیں کیا، بخلاف اول کے اور ان دونوں باتوں میں کس قدر فرق ہے۔ لہذا یہ اختلاف لفظی نہیں۔ چنانچہ بعض عارفین فرماتے ہیں: اما عصمة من الأول واما توبة في الآخر۔ اور ظاہر یہ ہے کہ انبیاء و ملائکہ معصومین اور اولیاء و اصطفیاء محفوظین کی مشابہت رکھنے والا شخص افضل ہے، چونکہ یہ عبد اکمل ہے، چونکہ اگرچہ اس کی مغفرت کر دی گئی لیکن حیاء و خجالت سے تو خالی نہیں۔ اور ابن حجرؒ نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے۔

یہ بات جان لینی چاہئے کہ جب کوئی گناہ گار شخص صدق دل کے ساتھ اپنے گناہ پر شرمندہ و نادم ہوتا ہے اور شرائط معتبرہ کے ساتھ توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کیونکہ وہ حق تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ اور (اللہ) ایسا ہے جو اپنے بندہ کی توبہ قبول کرتا ہے۔

اور "استغفار" جو توبہ کے بغیر ہو اور جس کا تعلق خدا کے سامنے اپنے عجز و انکساری اور کسر نفسی کے اظہار سے ہو کبھی تو گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور کبھی نہیں مٹاتا لیکن اس پر ثواب بہر صورت ملتا ہے گویا اس کا انحصار مشیت ایزدی پر ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے استغفار کے ذریعہ گناہ کو دور کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے دور نہیں کرتا لیکن ثواب دونوں صورتوں میں دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام حاکم نے حضرت ابوسعید سے نقل کیا ہے۔ نہرانی مجہول الحال بھی ہو سکتے ہیں اور مجہول الذات بھی۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: مع هذا لا يضر لأن الحديث الضعيف يعمل به في الفضائل۔ شرح السنن میں مروی حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت اگرچہ سزا موقوف ہے لیکن حکما مرفوع ہے۔

الندم توبة: یعنی توبہ کا رکن اعظم ندامت و شرمساری ہے۔ چونکہ بقیہ امکان توبہ کا ترتب اسی پر ہوتا ہے، یہ جملہ، الحج عرفہ کی

نظیر ہے، مگر اس میں عکس مبالغہ ہے۔

تخریج: امام قشیریؒ نے اپنے رسالہ میں، اور ابن نجار نے حضرت انس سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے: التائب من الذنب كمن لا ذنب له، واذا أحب الله عبداً لم يضره ذنب۔ بیہقی اور ابن عساکر نے اس حدیث کو بحوالہ ابن عباس ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: التائب من الذنب كمن لا ذنب له، والمستغفر من الذنب وهو مقيم عليه كالمستهزئ بربه، ومن آذى مسلماً كان عليه من الذنوب مثل منابت النخل۔ (کذا ذكره السيوطي في الجامع الصغير) ابن الرنج فرماتے ہیں: حدیث التائب من الذنب كمن لا ذنب له، أخرجه ابن ماجه، والطبرانی في الكبير، والبيهقي في شعب الایمان۔ ورجاله ثقات، وحسنه ابن حجر بشواهدہ۔

باب رحمة الله

رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کا بیان

لفظ باب کو ضمہ کی تونین کے ساتھ پڑھنا اور وقفاً ساکن پڑھنا دونوں طرح درست ہے۔ اس باب کی اکثر بیشتر احادیث رحمت باری تعالیٰ کے بیان میں ہیں، رحمت باری تعالیٰ تو بہ کا باعث ہے، موجب امید ہے اور مغفرت کی امید دلاتی ہے۔

الفصل الاول:

۲۳۶۳: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَمَّا قَضَى اللَّهُ الْخَلْقَ كَتَبَ كِتَابًا فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ عَرْشِهِ إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي وَلِي رِوَايَةٌ رَوَاهُ عَبْدُ غَضَبِي۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۲۲/۱۳۔ حدیث رقم ۷۴۰۴۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۱۰۷/۴ حدیث رقم (۴۱)۔ (۲۷۵۱)۔ وابن ماجه فی السنن ۱۴۳۵/۲ حدیث رقم ۴۲۹۵۔ واحمد فی المسند ۴۳۳/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (جب بیثاق) کے دن مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا (یا یہ کہ جب مخلوقات کو پیدا کرنا شروع کیا) تو ایک کتاب لکھی (یعنی فرشتوں کو وہ کتاب لکھنے کا حکم دیا یا قلم کو لکھنے کا حکم فرمایا) وہ کتاب حق تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر ہے اس کتاب میں لکھا ہوا ہے ”بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے“ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ”میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: فہو: اس ضمیر کی مراد میں دو احتمال ہیں: ① کتاب مراد ہے، چنانچہ کتاب بمعنی مکتوب ہے۔ ② علم مراد ہے۔

عندہ: یہاں عندیہ مکانہ مراد ہے، ناکہ عندیہ مکان، چونکہ اللہ جل شانہ علامات حدوث سے مبرا و منزہ ہے۔ فوق عرشہ: یہ جملہ اس کتاب کی عظمت شان کو ظاہر کرتا ہے۔ امام طبریؒ فرماتے ہیں: فان اللوح المحفوظ تحت العرش۔ ابن حجر اس پر اضافہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: لأنه فی جبهة اسرافیل رئیس حَمَلَةُ العرش والكتاب المشتمل علی هذا الحکم فوق العرش لجلالة قدرہ۔

بعض کا کہنا ہے: المراد بالكتاب اما القضاء الذي قضاه الله وأوجه، فعلى هذا يكون معنى قوله: فہو عندہ

فوق عرشہ اسی فعلمہ عنده تعالیٰ فوق العرش لا ینسی ولا ینسخہ ولا یبدلہ واما اللوح المحفوظ المذكور فیہ الخلق و بیان احوالہم و ارزاقہم و الأفضیۃ النافذۃ فیہم، و احوال عواقب امورہم، فحینئذ یکون معنایہ فذکرہ عنده۔ جس کتاب میں حق تعالیٰ کی طرف سے بشارت عظمیٰ لکھی ہوئی ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے اس کتاب کی عظمت اور بزرگی قدری کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب کی اس عظیم و بزرگ قدری کے پیش نظر حق تعالیٰ نے اس کو اپنے پاس عرش کے اوپر رکھا ہے۔

ان رحمتی: ان کو بکسر الہزہ اور فتح الہزہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ عسقلانی فرماتے ہیں: کتاب سے بدل ہونے کی صورت میں بفتح الہزہ ہوگا، اور مضنون کتاب کی حکایت کے طور پر پڑھیں تو بکسر الہزہ ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: دوسرے احتمال کی تائید بخین کی اس روایت سے ہوتی ہے: ان رحمتی تغلب غضبی، حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میری رحمت کے آثار، میرے غضب کے آثار پر غالب ہیں۔ یہ ماقبل کی تفسیر ہے۔ اس جملہ میں خود صفات کا ایک دوسری پر سبقت لے جانا مراد نہیں کیونکہ اللہ جل شانہ کی صفات سبقت و غلبہ کے ساتھ موصوف نہیں ہو سکتیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں: یعنی جب اللہ جل شانہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو یہ حکم جازم فرمایا، اور یہ وعدہ لازم فرمایا کہ جس میں کوئی خلاف ورزی نہیں: ان رحمتی سبقت غضبی، جب کوئی ذات اپنے کسی حکم میں مبالغہ ہے وہ اپنے ارادہ میں احکام چاہتی ہے تو ایک تحریر بناتی ہے اور محفوظ کر لیتی ہے۔

تضای خلق اور سبقت رحمت میں مناسبت یہ ہے کہ مخلوق عبادت کیلئے پیدا کی گئی ہے تاکہ وہ اللہ جل شانہ کی بیش بہا نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ اور کوئی بھی شخص اللہ جل شانہ کے کما حقہ ادائے شکر پر قادر نہیں، اور بعض لوگ اس میں تقصیر بھی کرتے ہیں، چنانچہ اللہ جل شانہ کی رحمت شاکر کے حق میں سبقت کر جاتی ہے۔ بایں طور کہ اس کو پورا پورا بدلہ دیتا ہے اور مزید بھی اس قدر عطا کرتا ہے کہ جس کا کوئی احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اور اس کی رحمت مقصر کے حق میں بھی سبقت کرتی ہے بایں طور کہ گناہ گار جب توبہ کرتا ہے تو اللہ جل شانہ اس کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ فرماتا ہے، اور سبقت رحمتی میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اکثر و اغلب احوال میں میری رحمت میرے غضب پر غالب و حاوی ہوتی ہے۔

۲۳۶۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ لِلَّهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ أَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ فَبِهَا يَتَعَاطَفُونَ وَبِهَا يَتَرَاحَمُونَ وَبِهَا تَعَطَّفُ الْوَحْشُ عَلَيَّ وَكَلِدَهَا وَأَخْرَجَ اللَّهُ تِسْعًا وَتِسْعِينَ رَحْمَةً يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (متفق علیہ)

اخرجه البحاری فی صحیحہ ۴۳۱/۱۰ - حدیث رقم ۶۰۰ و مسلم فی صحیحہ ۲۱۰۸/۲ حدیث رقم (۱۷-۲۷۰۲)۔
و الترمذی فی السنن ۲۰۹/۵ حدیث رقم ۳۶۰۹۔ وابن ماجہ ۱۴۳۵/۲ حدیث رقم ۴۲۹۳۔ والدارمی ۴۱۳/۲ حدیث رقم ۲۷۸۵۔ واحمد فی المسند ۵۱۴/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک رحمت تو جنات، انسان، چوپایوں اور زہریلے جانوروں میں اتاری ہے چنانچہ اسی ایک رحمت کے سبب وہ آپس میں میل ملاپ رکھتے ہیں اور اسی کے سبب وہ آپس میں رحم کرتے ہیں اور اسی کے سبب وحشی جانور اپنے بچوں سے الفت رکھتا ہے اور نانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ نے رکھ چھوڑی ہیں جن کے ذریعہ وہ قیامت کے

دن اپنے (مومن) بندوں پر رحم کرے گا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: رحمة: یہاں رحمت کے انتہائی معنی یعنی ”نعت“ مراد ہیں، چونکہ اللہ جل شانہ حقیقت رحمت کے تعدد سے منزہ ہیں۔ رحمة واحدة: سے مراد روحانی تعطف اور نفسانی میلان ہے۔ یہاں اس جگہ رحمت کو اس کے حقیقی معنی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ یہ رحمت اللہ جل شانہ کے آثار رحمت میں سے ہے، اور انزال کے ذریعہ تمثیل میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رحمت امور طبعیہ میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ امور سماویہ میں سے ہے، جس کی تقسیم مخلوقات کی استعداد کے مطابق کی گئی ہے۔ ہوام: میم مشدّد ہے۔ ہامۃ کی جمع ہے۔ ہرزہ ریلی چیز کو ”ہامۃ“ کہتے ہیں۔ اور کبھی اس کا اطلاق زمین پر ریگنے والی چیزوں پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ حشرات اور جوئیں۔ (کذا فی النہایۃ) اس میں اشارہ ہے کہ رحمت اب غیر طبعی ہے، اور جب سلب کی جاتی ہے تو بالکل سلب کی جاتی ہے۔ تعطف الوحش علی ولدھا: اولاد کی تخصیص شاید اس وجہ سے ہے کہ جانوروں میں باہمی طور پر تعطف کا معاملہ نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ جانوروں کی اولاد خود اپنے والدین پر بھی مہربانی نہیں کرتی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں بھی رحمت ہوتی ہو۔ جیسا کہ اس حدیث: اُحَدِثَ جَبَلٌ وَنَجْبَةٌ سَمْتًا مَعًا وَتَمْتًا مَعًا ﴿۱۷۴﴾ اور اس آیت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے: ﴿وَإِن مِّنْ حَجَارَةٍ لَّمَّا يَتَفَجَّرْ مِنْهَا أُنْهَارٌ﴾ البقرۃ: ۱۷۴ اور تمام اشیاء کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے۔ مثلاً نباتات کا ظہور، اشیاء کے خواص، آگ اور ہوا سے منفعت وغیرہ۔

وآخر اللہ: امام طیبی فرماتے ہیں: اس کا عطف ”انزل منها رحمة“ پر ہے اور ضمیری جگہ اسم ظاہر لانا اللہ جل شانہ کی اخروی رحمت کی شدت عنایت کا بیان ہے۔ یوم القیامۃ: امام طیبی فرماتے ہیں: اللہ جل شانہ کی رحمت لامتناہی ہے۔ چنانچہ جو کچھ ذکر فرمایا ہے اس میں بھی تحدید مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اہل ایمان کے ساتھ آخرت میں جو عدل و انصاف کا معاملہ ہوتا ہے اور تمام مخلوقات کے ساتھ دنیا میں جو عدل و انصاف کا معاملہ ہے دونوں معاملات میں انتہائی فرق ہے۔ یہ تفسیر منافی نہیں اس تفسیر کے کہ جس میں رحمت کی تفسیر نعمت کے ساتھ کی ہے، اور نہ تقسیم رحمت بمعنی مہربانی ہی اس کے منافی ہے۔ جیسا کہ وارد ہے کہ ہر روز ایک سو بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں، ساٹھ رحمتیں طواف کرنے والے کیلئے کعبہ پر نازل ہوتی ہیں، اور چالیس رحمتیں نمازیوں کیلئے نازل ہوتی ہیں، اور بیس رحمتیں ناظرین کیلئے نازل ہوتی ہیں۔ ابن حجر نے امام طیبی کا تعاقب کیا ہے، مگر مذکورہ بالا توجہ سے اس تعاقب کا بھی دفعہ ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں اشارہ ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے مسلمان بندوں پر انتہائی فضل و کرم فرماتا ہے، اور اشارہ ہے کہ اللہ جل شانہ ارحم الراحمین ہے۔

۲۳۶۲: وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ سَلْمَانَ نَحْوَهُ وَفِي آخِرِهِ قَالَ وَإِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اكْمَلَهَا بِهَذِهِ الرَّحْمَةِ

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۱۰۹/۴ الحديث رقم (۲۱) - (۳۷۵۳)

ترجمہ: اور مسلم نے ایک روایت حضرت سلمان سے اسی کے مانند نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پس جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان ننانوے رحمتوں کو اس رحمت کے ساتھ (جو دنیا میں اتاری گئی ہیں) ”پورا فرمادے گا“۔

۲۳۶۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللَّهِ مِنَ الْعُقُوبَةِ مَا طَمَعَ بِجَنَّتِهِ أَحَدٌ وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللَّهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهِ أَحَدٌ (متفق عليه)

اخرجه البخاری في صحيحه ۳۰۱/۱۱ - حديث رقم ۶۴۶۹ - و مسلم في صحيحه ۲۱۰۹/۴ حديث رقم (۲۳) -

”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اگر مؤمن یہ جان لے کہ خدا کے ہاں کس قدر عذاب ہے تو پھر کوئی شخص اس کی جنت کی امید بھی نہ رکھے (یعنی عذاب کی فراوانی اسے جنت سے مایوس کر دے)

اور اگر کافر یہ جان لے کہ اللہ کی رحمت کس قدر ہے تو پھر کوئی اس کی جنت سے ناامید نہ ہو۔“ (بخاری مسلم)

تشریح: عنہ: ایک نسخہ میں عن ابی ہریرہؓ ہے۔ یہ زیادہ واضح ہے، چونکہ ضمیر کی صورت میں ضمیر کے مرجع کے بارے میں یہ وہم ہونا ہے، کہ جو پیچھے قریب ترین مذکور ہے وہ مرجع ہو اور وہ حضرت سلمانؓ ہیں اگر اقرب مذکور مراد لیں تو وہ مسلمان ہیں۔ اور مشہور نسخوں کے مطابق اصل یہی ہے گویا کہ عنوان پر اعتماد کیا ہے۔ ما عند اللہ من العقوبة: یہ ”ما“ کا بیان ہے۔ ما طمع بجنة احد کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو حدیث کے ترجمہ میں بین القوسین ذکر کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”اخذ“ اپنے عموم پر ہو۔ اس حدیث کا منشاء درحقیقت اللہ کی رحمت اور اس کے عذاب کی کثرت کو ظاہر کرنا ہے تاکہ مؤمن تو اس کی رحمت پر اعتماد کر کے نہ بیٹھ جائے اور اسکے عذاب سے بالکل بے خوف و نڈر نہ ہو جائے اور کافر اس کی رحمت سے ناامیدی نہ اختیار کر لے اور توبہ کرنا نہ چھوڑے اور حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ بین الخوف والرجاء (خوف اور امید کے درمیان) رہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت پر امید بھی رکھے اور اس کے عذاب سے بھی ڈرتا رہے چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا ”اگر قیامت کے دن یہ اعلان کیا جائے کہ ایک شخص جنت میں داخل ہوگا تو میں امید رکھوں گا کہ وہ شخص میں ہوں اور اسی طرح اگر یہ اعلان کیا جائے کہ ایک شخص دوزخ میں داخل کیا جائے گا تو میں گمان رکھوں گا کہ وہ شخص میں ہی ہوں۔“

من جنتہ احد کی تشریح امام طیبیؒ وغیرہ نے من الکافرین سے کی ہے، اور ابن الملک نے یوں کی ہے: اذا دخل فی الاسلام، اور حسن مقابلہ کا تقاضا یہ ہے کہ مقید نہ کیا جائے، چونکہ عدم تقید مفید مبالغہ ہے، مزید یہ کہ شرطیہ غیر لازمتہ الوقوع ہے۔ ”انہ لو نودی فی القيامة ان یدخل احد الجنة ارجو ان اکون انا، وكذا فی النار۔“

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اللہ جل شانہ کی صفت قہر و رحمت کا بیان ہے، جیسے اللہ جل شانہ کی دوسری صفات غیر متناہیہ ہیں، اور ان کی ”کنہ“ کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، یہی معاملہ ان دونوں صفات کا بھی ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ مؤمن اللہ جل شانہ کی صفت قہریت کی کنہ سے واقف ہے، تو اس سے وہ کچھ ظاہر ہوگا چنانچہ کوئی بھی شخص جنت کی طمع نہیں کرے گا، ضمیر کی جگہ لفظ مؤمن صراحتاً ذکر کئے جانے کی صورت میں یہ معنی مراد ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ المؤمن میں جنس کے معنی علمی سبیل الاستغراق مراد ہوں۔ اس صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی، احد منهم۔ اس کے ایک اور معنی بھی ممکن ہیں وہ یہ کہ مؤمن مختص ہے، کہ وہ جنت کی طمع کرے، چنانچہ جب مؤمن کی بابت طمع کی نفی ہوگی تو سب سے نفی ہو جائے گی، اسی طرح کافر مختص بالقو طے ہے، چنانچہ جب کافر کے تیس قنوط کی نفی ہوگی تو سب سے نفی ہو جائے گی۔

۲۳۶۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلَيَّ أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ وَالنَّارُ مِثْلُ ذَلِكَ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۱۲/۱۱۔ حدیث رقم ۶۴۸۱۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۱۰۹/۴ حدیث رقم (۲۴-۲۷۰۶)

ترجمہ: ”اور حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جنت تم میں سے ہر شخص کے جوتے کے تیسے سے زیادہ اس کے قریب ہے اور دوزخ بھی اسی طرح ہے۔“ (بخاری)

تشریح: شراک: بروزن کتاب، جوتے کا تسمہ، امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اہل عرب شراک کو ضرب المثل کے طور پر استعمال کرتے

ہیں۔ چونکہ ثواب و عقاب کے حصول کا سبب پندہ کی سعی و کوشش ہوتی ہے۔ اور سعی اقدام کے ذریعہ ہوتی ہے، اور جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرے گا وہ جنت کا حقدار اس کے وعدہ کے بموجب ہوگا۔ اور جو بھی شخص کوئی نیک عمل کرے گا وہ جنت کا مستحق اس کی وعید کے بموجب ہوگا، غرضیکہ اس کا ہر وعدہ ہر وعید پوری ہو کر رہے گی، تو گویا کہ دونوں حاصل ہیں اھ (یعنی گویا کہ وعدہ اور وعید دونوں پورے ہو گئے)۔ اس سے ایک لطیف نکتہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو اپنے نعلین مبارک عنایت فرما کر بھیجا تھا۔ چونکہ شراک انفاک کو قبول کرتا ہے، بخلاف عمل کے، اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿کل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ﴾ [الاسراء: ۱۳] پس جو چیز گلے میں مستقل طور پر لٹکی ہوئی ہے بلاشبہ اقرب ہے اس چیز کے مقابلہ میں جو بعض ایام میں پاؤں کے نیچے لٹک رہی ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم اشارات کلام سید الانام، والنار مثل ذلك: ذلک سے امر مذکور کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی: النار مثل الجنة فی کونها اقرب من شراک النعل۔ بظاہر یہ اقتصار راوی کی طرف سے ہے، پھر بعض کا کہنا ہے کہ یہ اس سبب سے ہے کہ کسی بھی شخص کے دخول جنت و نار کا سبب یعنی عمل صالح اور سیہ اس شخص کے جوتے کے تسمیہ سے زیادہ قریب ہے، چونکہ وہ اس کا مجاور ہے اور عمل وہ صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے۔

اور ابن حجر کا یہ کہنا: اُوہی نفسہا باعتبار سرعة انقضاء الدنيا التي يليها دخولها، اگرچہ نفس الامر کے اعتبار سے صحیح ہے، لیکن بظاہرہ من کونہ اقرب من الشراک غیر صحیح ہے۔ الا یہ کہ مبالغہ و ادعا پر محمول کیا جائے، جیسا کہ مخفی نہیں، اور ان کا یہ کہنا: اُو نزل الوعد بها الناجز لمن عمل عملا صالحا منزلة حصولها نفسها، یہ بعینہ وہی قول ہے جس کو امام طبری نے اقتصار کیا ہے، اور یہی معتد و معقول ہے۔

۲۳۶۹: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ رَجُلٌ لَمْ يَمْعَلْ خَيْرًا قَطُّ لَأَهْلِهِ وَفِي رِوَايَةٍ أُسْرَفَ رَجُلٌ عَلَى نَفْسِهِ فَلَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ أَوْصَى بِنَيْبِهِ إِذَا مَاتَ فَحَرِّقُوهُ ثُمَّ اذْرُوا نِصْفَهُ فِي الْبَرِّ وَنِصْفَهُ فِي الْبَحْرِ فَوَاللَّهِ لَئِنْ قَدَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ لَيُعَذِّبَنَّ عَذَابًا لَا يُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ فَلَمَّا مَاتَ فَعَلُوا مَا أَمَرَهُمْ فَأَمَرَ اللَّهُ الْبَحْرَ فَجَمَعَ مَا فِيهِ ثُمَّ قَالَ لَهُ لِمَ فَعَلْتَ هَذَا قَالَ مِنْ خَشْيَتِكَ يَا رَبِّ وَأَنْتَ أَعْلَمُ فَغَفَرَ لَهُ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۱۲/۱۱۔ حدیث رقم ۶۴۸۱۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۱۰۹/۴۔ حدیث رقم (۲۴-۲۷۰۶)

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک شخص تھا جس نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی تھی اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس پر زیادتی کی تھی یعنی بہت ہی زیادہ گناہ کئے تھے جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب وہ (یعنی خود) مر جائے تو اس کو (یعنی مجھے) جلا کر آدھی راہ جنگل میں اڑا دینا اور آدھی راہ دریا میں بہا دینا کیونکہ قسم ہے خدا کی! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے مواخذہ کر لیا اور حساب میں سختی کی تو وہ اس کو ایسا عذاب دے گا کہ آج تک عالم کے لوگوں میں سے کسی کو نہ دیا ہوگا چنانچہ جب وہ شخص مر گیا تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا (کہ اس کو جلا کر آدھی راہ تو جنگل میں اڑا دی اور آدھی کو دریا میں بہا دیا) اللہ تعالیٰ نے دریا کو (اس کی راہ جمع کرنے کا حکم دیا) اور اس نے وہ راہ جو اس کے اندر تھی جمع کی اور جنگل کو حکم دیا اور اس نے بھی جو راہ اس کے اندر تھی جمع کی (جب دریا اور جنگل نے اس کے اجزاء جمع کر لئے تو اس شخص کو ان اجزاء سے استوار کر کے حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا، حق تعالیٰ نے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ پروردگار! تیرے خوف سے تو حقیقت حال کو خوب جانتا ہے ”اللہ تعالیٰ نے یہ سن کر اسے بخش

دیا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: امور نحو یہ: رجل لم يعمل: (یہ جملہ کل رفع میں) رجل کی صفت ہے۔ فلما حضرہ الموت..... فحرقوہ: امام طیبی فرماتے ہیں: پہلی روایت کی تقدیر پر قال کا مقولہ ہے۔ اور دوسری روایت کی بناء پر اوصی کا معول ہے، جس میں تنازع ہے۔ اہ۔ اور یہی درست ہے، چونکہ ایک روایت اوصی بنیہ تک ہے۔ جملہ معترضہ ہے بخلاف زین العرب کے، وہ کہتے ہیں: پہلی روایت کی تقدیر پر کلام یوں ہے: رجل لم يعمل قط خیرا لأہلہ فلما حضرہ الموت.....، اور دوسری روایت کی بنیاد پر آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کی ابتداء أسرف رجل علی نفسه سے ہے، اور (أسرف علی نفسه کا) مطلب یہ ہے کہ اس نے بہت زیادہ گناہ کئے تھے اہ۔ اصل کلام یوں تھا: اذا أنا مت فحرقونی۔ اس اسلوب کو چھوڑ کر غائب کی تعبیر اختیار کرنے میں عدم اعتناء کی طرف اشارہ ہے اور اس چیز کو مقدم ذکر کیا کہ جس کے باعث وہ سعادت کے مراتب سے غائب ہو گیا۔ (كذا قالہ ابن حجر)۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اس عبارت میں صنعت التفات ہے (بعض کے مذہب پر) تقریباً یہی بات امام طیبی نے فرمائی ہے: لو حکمی ما تلفظ بہ الرجل لکان ینبغی أن یقال: اذا مات فحرقونی، ثم اذا نصغی، ولو نقل معنی ما تلفظ بہ الرجل لقال: اذا مات فلیحرقہ قومہ م لیدروا، فعدل عن ضمیر المتکلم الی الغائب تحاشیا عن وصمة نسبة التحریق، وتوهم الشک فی قدرة اللہ الی نفسه اہ۔

ابن حجر لکھتے ہیں: وکلامی اولی مما قیل عدل..... لأن هذا العدول لا يمنع اليها له الشک فی قدرة اللہ تعالیٰ۔ ابن حجر سے غفلت و ذہول ہوا ہے، بایں طور کہ معدول عنہ کلام یہ ہے: لنن قدر اللہ علی..... قدر اللہ علیہ۔ اگرچہ اس کو امام طیبی نے بھی ذکر نہیں کیا۔ ثم اذروا: ہمزہ وصلی ہے، الذری یعنی التذریۃ سے ماخوذ ہے، اور اس ہمزہ کو قطعی بنا کر پڑھنا بھی درست ہے۔ عرب کہتے ہیں: ذرتہ الوبیح وأذرتہ، اذا أطارتہ۔ نصفہ: یہاں درمیان میں مضاف محذوف ہے)۔ ای نصف رمادہ۔ فواللہ علیہ: ابن حجر لکھتے ہیں: ایک نسخہ میں علی ہے، امام نووی نے بھی اس پر اعتماد کیا ہے۔ بظاہر یہ کسی کا تب سے سہوا ہے، چونکہ یہ تحریف فی الکتاب ہے۔ اس کے ضعف پر اگلا جملہ بھی دلالت کر رہا ہے۔ لیعذبہ، چونکہ جملہ شرطیہ اور جملہ قسمیہ کے دو اجزاء کے درمیان التفات معبود نہیں ہے اور اس کے ثبوت کی تقدیر پر اس کو اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ وہ شخص مدہوش و دہشت زدہ تھا۔ عذابا (باب تفعیل کا مصدر ہے، جیسے سلام اور کلام) ای: تعذیب۔ لا یعذبہ: (ضمیر منسوب متصل عذاب کی طرف راجع ہے) ای: ذلك العذاب۔ لنن قدر اللہ علیہ سے کیا مراد ہے؟ (۱) قدر قدرۃ سے ماخوذ نہیں۔ چونکہ قدرت باری تعالیٰ میں شک کرنا کفر ہے۔ بلکہ قدر، قدر بمعنی تصفیق سے ماخوذ ہے، چنانچہ مطلب یہ ہوگا: لنن ضیق اللہ علیہ، وناقشہ فی الحساب۔

حدیث کے آخر میں آیا ہے: خشیتک و غفرلہ، اور کافر نہ اللہ سے ڈرتا ہے، اور نہ اس کی مغفرت ہوگی۔ اس میں دو تاویلیں کی گئیں ہیں۔ پہلی تاویل یہ ہے کہ قدر تخفیف کے ساتھ ہے، بمعنی ضیق۔ یہ آیت کریمہ بھی اسی قبیل سے ہے: ﴿قدر علیہ رزقہ﴾ اس کو تخفیف و تشدید دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اور یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی قبیل سے ہے: ﴿فظن أن لن نقدر علیہ﴾ [الانبیاء: ۸۷] اور دوسری تاویل یہ ہے کہ قدر تخفیف و تشدید ہر دو کے ساتھ بمعنی قضا ہے، لیکن حدیث کے بعض طرق میں آتا ہے: فلعلی اصل اللہ؟ ای اوفتہ۔ یعنی ممکن ہے میں اللہ تعالیٰ سے بچ جاؤں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کی مغفرت کی خبر دی ہے، لہذا کوئی نہ کوئی ایسی توجیہ کرنا ضروری ہے کہ اس توجیہ کے ہوتے ہوئے وہ مؤمن بھی شمار ہو۔ چنانچہ بعض کا کہنا ہے: اس شخص کا ظن یہ تھا کہ جب وہ یہ کام کر گزرے گا تو اس کا

”نشور“ نہیں ہوگا اور عذاب بھی نہیں ہوگا، اور جہاں تک تعلق ہے اس کے قول لئن قدر اللہ، اور ”فلعلیٰ أضل اللہ کا، سو وہ اس بات سے جاہل تھا۔ اس جیسے شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟ بخلاف اس شخص کے جو صفت قدرت کا منکر ہو اور بعض کا کہنا ہے: هذا ورد مورد التشکک فیما لا شک، علم بلاغہ کی اصطلاح میں اس کو ”جاہل عارفانہ“ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فان كنت فی شک﴾ [یونس: ۹۴] اور بعض کا کہنا ہے کہ وہ اس قدر ڈر گیا کہ دہشت زدہ ہو گیا، اور اس کی عقل مسلوب ہو گئی تھی، خبر کی وجہ سے وہ اپنی بات تمہید و توضیح کے ساتھ بیان نہیں کر سکا۔ اور اس کے منہ سے جلدی میں ایک گری ہوئی بات نکل گئی، اور اس شخص سے جو کلام یہاں صادر ہو وہ گویا ایسے شخص کا کلام تھا کہ جو اس کی حقیقت کا معتقد نہ ہو۔ یہ تو جبہ سب سے ”اسلم“ ہے۔ واللہ اعلم۔ امام طیبی فرماتے ہیں: یہ کلام اس سے غلبہ حیرت و دہشت کی وجہ سے صادر ہوا، چنانچہ اس نے اپنے کلام میں تذبذب نہیں کیا، جیسا کہ غافل اور ناسی کا حال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے کلام پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے: قال تعالیٰ: لم فعلت؟ قال: من خشيتك يا رب وانت أعلم۔ واللہ اعلم۔

اور بعض کا کہنا ہے: اس پر اور اس جیسا واقعہ جیسا کہ ما قبل میں واجد الضا کا گزرا تھا، مواخذہ نہیں۔ امام طیبی کی اتباع میں ابن حجر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ یہ بات محل نظر ہے، چونکہ ”واجد الضالة“ سے وہ کلام سہواً و نطاً صادر ہوا تھا، بخلاف اس شخص کے، لہذا اس کا ”مقیس“ ہونا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ کسی ایک وصف کا انکار ہو مگر دوسرے اوصاف کا اقرار کرتا ہو تو مستوجب کفر نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں ایک وصف سے جہالت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ امام طیبی لکھتے ہیں: یہ شخص اللہ جل شانہ کی صفات میں سے ایک صفت سے جاہل تھا، چنانچہ ایسے شخص کی تکفیر کا مسئلہ علماء کے درمیان اختلافی ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں: ومن کفرہ ابن جریر الطبری، وقال به أبو الحسن الأشعری أولاً، وقال آخرون: لا یکفر به، بخلاف جحدھا، والیہ رجوع أبو الحسن، وعلیہ استقر مذہبہ، قال: لأنه لم یعتقد ذلك اعتقاداً یقطع بصوابه ویراه دیناً شرعاً، وانما یکفر من اعتقد أن مقالته حق، وقالوا: لو سئل الناس عن الصفات لوجد العارف بها قليلاً۔ وهذا من بدیع استعمالات العرب، ویسمى مزج الشک بالیقین، والمراد یقین، کقولہ تعالیٰ: ﴿فان كنت فی شک﴾۔

امام طیبی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اہل کتاب کے معاملہ میں نبی کریم ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا ہے وہ نبی کریم ﷺ کے تئیں پختہ ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کو اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے۔ اس اسلوب کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو براہِ یقین کیا جا رہا ہے تاکہ آپ ﷺ کو مزید سوخ و نبات حاصل ہو جائے، اس طرح یہ آدمی بھی جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو زندہ کرنے اور عذاب دینے پر قادر ہے۔ اور اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے: أن اللہ یقدر علی أن یعدبنی۔ چنانچہ اس شخص کا ارادہ اپنی قوم کو اپنی وصیت کی تنفیذ پر ابھارنا تھا، چنانچہ اس نے اپنے کلام کو معرض تشکیک میں پیش کیا، تاکہ وہ لوگ اس کی وصیت میں سستی نہ کریں، اور ٹھیک ٹھیک پوری کریں اھ۔ حدیث اور آیت کریمہ کے درمیان عدم مناسبت کسی پر مخفی نہیں چونکہ آیت میں اللہ جل شانہ کا کلام ہے اور مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں، اور یہ کلام علی سبیل الفرضیۃ ارشاد فرمایا ہے، نبی کریم ﷺ کی بابت تو شک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: لا أشک ولا أسأل۔ اور حدیث میں جس شخص کے کلام کا ذکر ہے وہ غیر معصومہ ہے اس شخص کی بابت ابتداء یا انتہاء شک متصور ہو سکتا ہے، اور دوسری روایت سے بھی تائید نہیں ہوتی، چونکہ یہ معنوی اعتبار سے بلاغبار ہے، اور صحیح ہے، لیکن اس روایت کے مابین ہے، چونکہ وہ موہم ہے، ہاں یہ روایت اس پر ضرور دلالت کرتی ہے کہ وہ شخص مؤمن تھا، اس کا کلام محتاج تاویل ہے، اور بہترین تاویل وہی ہے جو اس آیت کریمہ: ﴿فظن أن لن نقدر علیہ﴾ میں کی گئی ہے۔ اور اصل اللہ والی

روایت اضعیع طاعته کے معنی پر محمول ہے، اور ”لعل“ برائے اشفاق ہے۔ اور اس کی دلیل ”من خشیتک یا رب“ کے الفاظ ہیں، یہ ”لعل“ ترحی کے معنی کیلئے نہیں ہے، جیسا کہ شرح نے ترحی کے معنی پر محمول کیا ہے، اور خود اپنے اوپر اشکال کر بیٹھے، اور اس شخص کی تکفیر کر ڈالی، اور غایت فی الباب یہ ہے کہ اس نے مضارع کا صیغہ حال ماضیہ کے استحضار کیلئے ذکر کیا تھا، اس پر کوئی منظور لازم نہیں آتا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اس شخص کا یہ واقعہ زمانہ فترت کا ہے، اور زمانہ فترت میں مجرد توحید نافع ہوتی ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: مذہب صحیح کے مطابق ورود شرع سے پہلے تو ”تکلیف شرعی“ ہے ہی نہیں۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ [الاسراء: ۱۰] یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ زمانہ تکلیف کا تھا ہی نہیں، اور توحید بھی محقق تھی تو خوف کے کیا معنی؟ نیز امام طیبی کا کلام خود ان کے اپنے مذہب کے مقتضی کے مطابق نہیں ہے، چونکہ شافیہ کے نزدیک زمانہ فترت میں بالکل توحید وغیرہ سے متعلق ”تکلیف“ نہیں ہے۔ قال: من خشیتک یا رب! و انت أعلم: بعض کا کہنا ہے کہ اس نے یہ وصیت اس وجہ سے کی تھی کہ وہ اپنے آپ کو حقیر سمجھتا تھا، اور اپنے گناہوں کے باعث سزا سے بھی ڈرتا تھا، اور اس بات کی امید بھی رکھتا تھا کہ اللہ اس پر رحم کرتے ہوئے معاف فرمادے گا۔ اس توجیہ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ لئن قدر بمعنی ضیق ہے، ابن حجر لکھتے ہیں: المراد لئن بمعنی، وان ههنا بمعنی اذا، او اذ علی حد: ﴿و خافون ان کنتم مؤمنین﴾ [آل عمران: ۱۷۰] ابن حجر کا یہ کلام مردود ہے۔ چونکہ لام موطنہ صرف شرط ہی پر داخل ہوتا ہے۔

۲۳۷۰: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَدِمَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ سَبِيًّا فَإِذَا امْرَأَةٌ مِنَ السَّبْيِ قَدْ تَحَلَّبَتْ نَدِيهَا تَسْعَى إِذَا وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ أَخَذَتْهُ فَأَلْصَقَتْهُ بِبَطْنِهَا وَارْضَعَتْهُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اتْرُونِ هَذِهِ طَارِحَةٌ وَكَذَهَا فِي النَّارِ فَعَلْنَا لَا وَهِيَ تَقْدِيرُ عَلَيَّ أَنْ لَا تَطْرَحَهُ فَقَالَ اللَّهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هَذِهِ بَوْلِدِهَا (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۲۶۱۰۔ حدیث رقم ۵۹۹۹۔ ومسلم فی صحیحہ ۲۱۰۹/۴۔ حدیث رقم (۲۲-۲۷۵۴)

ترجمہ: ”اور حضرت عمر بن خطابؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے جن میں ایک عورت بھی تھی (اور دودھ کی کثرت کی وجہ سے) اس کی چھاتیاں بہ رہی تھیں (کیونکہ اس کا بچہ نہیں تھا جو اس کا دودھ پیتا) وہ اپنا دودھ پلانے کی خاطر کسی بچہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتی تھی چنانچہ جب وہ قیدیوں میں سے کسی بچہ کو پالیتی تو (اپنے بچہ کی محبت میں) اسے لے کر اپنے پیٹ سے لگاتی اسے دودھ پلانے لگتی (یہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ ”کیا تمہارے خیال میں یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟ (یعنی جب یہ غیر کے بچے کے ساتھ اتنی محبت کرتی ہے تو کیا اس بات کا خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟ ہم نے کہا ہرگز نہیں ڈالے گی۔ بشرطیکہ وہ ڈالنے پر قدرت رکھتی ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ عورت اپنے بچے پر جتنا رحم و پیار کرتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے (مؤمن) بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم و پیار کرتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قد تحلب: باب تفعّل سے ہے، اترون: تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ فقلنا لا: یہاں تقدیری عبارت یوں ہے: لانظن أنها طارحة۔ ابن حجر نے تقدیری عبارت یوں بیان کی ہے: لا تطرحہ۔ مگر مقدم الذکر تقدیری عبارت ابن حجر کی عبارت سے اولیٰ ہے۔ اختلاف نسخ و روایت: تسعی: اس عبارت کی بابت نسخوں میں طویل اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ اختلاف بعینہ ذکر کیا جا رہا ہے۔ وروی: تسقی اى توضع الولد قال العسقلانى: للكشمهينى بسقى بكسر الموحدة وفتح المهملة وسكون القاف وتنوين التحتانية وللباقين تسعى بفتح العين المهملة من السعى قال الشارح اى تعدوا وروى فى كتاب

مسلم تبغی ای تطلبولدها و اما تسقی علی ما فی بعض النسخ للمصباح و البخاری ایضا فلیس بشیء قلت نسبتہ الی البخاری لیس بشیء لماتقدم من کلام العسقلانی من ان رواۃ البخاری منحصرۃ فی الصیغین لکن فی شرح الطیبی قال القاضی الصواب ما فی رواۃ البخاری تسقی بالقاف من السقی اقول قوله و فی کتاب البخاری تسقی کما فی بعض نسخ المصباح ان کان ردا للروایۃ فلا کلام فیہ، وان کان الرد من حیث الدراریۃ فغیر مستقیم، لان تسقی جعل حالا مقدرۃ من ضمیر المرأۃ بمعنی قد تحلب ثدیہا مقدرۃ السقی فای بعد فیہ - اہ کلامہ والذی ینظر لی ان المراد بقول القاضی الصواب ما فی رواۃ البخاری تسقی بالقاف من السقی بالقاف وتبعہ النووی بقولہ الصواب ما فی البخاری تسقی بالسین من السقی ہو رواۃ الکشمینی لیطابق نقل العسقلانی وقولہما من السقی بالقاف احتراز من السعی بالین ولادلالة فی کلامہما علی انه بصیغۃ المصدر المدخول علیہ حرف الجر او علی انه بصیغۃ المضارع فیتعین حمل کلامہما علی الاول جمعا بین النقول واما الشارح الذی زیف ما فی بعض النسخ المصباح و کتاب البخاری فہی تسقی بصیغۃ المضارع من السقی بالقاف من جهة الروایۃ فتامل فانه موضع زلل فاندفع بہ کام ابن حجر فعجیب نب هذه الجسارۃ علی الروایۃ الصحیحۃ وردہا بمجرد محمل لا حقیقۃ لہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے: مشکوٰۃ کے متن میں تسعی ہے۔ یعنی بفتح العین المہملہ سعی سے ماخوذ ہے۔ بخاری کے تمام نسخوں میں بھی یہی لفظ ہے۔ البتہ کشمینی اور مصابیح کے بعض نسخوں میں تسقی بالقاف من السقی ہے۔ مسلم کی روایت میں تبغی ای تطلب ولدها کے الفاظ ہیں۔

فقال: اللہ ارحم بعبادہ من هذه بولدہا: ملا علی قاری لکھتے ہیں: و ہنا یفتح باب القدر والقضاء، ویموج بحر الہی الالہی الذی یضیق فیہ القضاء، فالتسلیم فیہ أسلم واللہ أعلم، ولا ین حجرہنا اعتراض وکلام مما لا یلتفت الیہ فی المقام۔

۲۳۷۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَنْ يُنْجِيَ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ قَالُوا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَّعَمَدَنِي اللَّهُ مِنْهُ بِرَحْمَتِهِ فَسَدَّدُوا وَقَارِبُوا وَأَعْدُوا وَرَوْحُوا وَشَيْءٌ مِنَ الدَّلْجَةِ وَالْقَصْدِ الْقَصْدَ تَبَلَّغُوا. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۹۴۱/۱۱ حدیث رقم ۲۴۶۳۔ و مسلم فی ۲۱۶۹/۴ حدیث رقم (۷۸-۲۸۱۶)

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے کسی کا عمل اسے (آگ سے) نجات نہیں دے گا (یعنی صرف عمل ہی نافع نہیں ہوگا بلکہ جب حق تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت بھی شامل حال ہوگی تب ہی عمل بھی فائدہ دے گا) صحابہؓ نے عرض کیا کہ ”کیا آپ ﷺ کو بھی (آپ ﷺ کا عمل باوجود کامل ہونے کے نجات نہیں دلائے گا) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے۔ لہذا تم لوگ اپنے اعمال کو تیر کی طرح راست و درست کرو، عمل میں میانہ روی اختیار کرو (یعنی کسی عمل کو کسی و زیادتی کے ساتھ نہ کرو) دن کے ابتدائی حصہ میں بھی عبادت کرو دن کے آخری حصہ میں بھی عبادت کرو اور رات میں بھی کچھ عبادت کرو (یعنی نماز تہجد پڑھو) اور عبادت میں میانہ روی اختیار کرو میانہ روی اختیار کرو اپنی منزل کو پاؤ

گے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: لن ینجی: اس کے معنی میں تین احتمال ہیں: (۱)۔ مجرد نفی کیلئے ہے۔ (۲)۔ بعض کا کہنا ہے تو کید نفی کیلئے ہے۔ (۳)۔ اور معتزلہ کا مذہب ہے کہ تائید کیلئے ہے۔ اس موقع پر یہ سب معانی مراد لینا درست ہے۔ ولا أنت یا رسول اللہ؟ امام طبری فرماتے ہیں: بظاہر عبارت یوں ہے: ولا ایاک۔ کیونکہ اس کا عطف ”أحدًا“ پر ہو رہا ہے، جملہ فعلیہ سے جملہ اسمیہ کی طرف عدول کرنا برائے مبالغہ ہے۔ ائی: ولا أنا ممن یتنی عملہ..... الا أن یتغمدنی اللہ عنہ برحمته: یہ استثناء منقطع ہے۔

الدلجة: بعض نسخوں میں دال کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور انھایہ میں ہے کہ دلجہ دال کے فتح اور ضمہ کے ساتھ ہے۔ اس کے معنی ہیں: رات کو چلنا۔ اور القاموس میں ہے کہ دلجہ دال کے ضمہ اور فتح کے ساتھ، رات کے اول حصہ میں چلنے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: قد اذلجوا۔ اگر رات کے آخری حصہ میں چلنے کے معنی میں ہو تو کہا جاتا ہے: فاذلجوا۔

بالتشديد: خلاصہ یہ ہے کہ دلجہ بروزن رحمة و ظلمة ہے، رات کے وقت، رات کے ابتدائی وقت میں چلنا۔ اور باب افعال سے ہوتو اس کے معنی ہوتے ہیں: رات کے آخری حصہ میں چلنا۔ شی من الدلجة: شی مرفوع علی الابتداء ہے اور خبر مقدر ہے۔ ائی: اعملوا فہی أو مطلوب عملکم فیہ أو مطلوب عملکم فیہ۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہے: ولیکن شی من الدلجة۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ مجرور ہے، اور اس کا معطوف علیہ مقدر ہے۔ ائی: اعملوا بالغدوة والروحة وشی من الدلجة۔ اور عسقلانی فرماتے ہیں: شیئا محذوف کیلئے منصوب ہے۔ ائی افعلاواھ۔ لیکن رسم الخط اس توجیہ کی تائید نہیں کرتا۔

والقصد القصد: اس کا فعل محذوف ہے۔ اور تکرار برائے تاکید ہے یا باعتبار اخلاق و اعمال کے ہے۔ ائی الزموا القصد۔ تبغوا کا مفعول محذوف ہے۔ ائی تبغوا المنزل۔ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ لن ینجی أحدًا منکم عملہ: بلکہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہی نفع دے گی۔ اللہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو مطیع کو عذاب دے، اور عاصی کو ثواب سے نواز دے، نیز عمل اگرچہ کسی بھی حد کو کیوں نہ پہنچ جائے وہ تقصیر سے خالی نہیں، اور تقصیر موجب رد ہوتی ہے۔ اگر اللہ اپنا فضل فرماتے ہوئے اس کو قبول نہ کرے۔ حدیث مبارکہ میں نہ تو عمل کی توہین مقصود ہے اور نہ اس کی نفی مطلوب ہے، بلکہ بندوں کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ عمل، اللہ کے فضل و رحم سے ہی تام ہوتا ہے۔ تاکہ کہیں لوگ اپنے اعمال پر گھمنڈ نہ کرنے لگیں۔ زین العرب فرماتے ہیں: یعنی نجات اور کامیابی اللہ جل شانہ کے فضل و رحم ہی کے ذریعہ ہے، ان میں اعمال غیر مؤثر ہیں۔ خطاب اگرچہ صحابہ سے ہے، مگر مراد بنی آدم ہیں، یا تغلیباً مکلفین مراد ہیں۔ الا أن یتغمدنی اللہ منہ برحمته۔ سوائے اس کے کہ مجھے اپنی رحمت کا لباس پہنادے، اور مجھے جنت میں داخل فرمادے۔ تمند کے معنی آتے ہیں: ستر، یعنی مجھے اپنی رحمت سے چھپادے اور میری ایسی حفاظت فرمائے کہ جیسے غمد (یعنی تلوار کی نیام) کے ذریعہ تلوار کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور اس کی رحمت میرا احاطہ اس انداز سے کر لے کہ جیسے نیام تلوار کا احاطہ کرتی ہے۔ اور حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عمل مجرد نافع نہیں، عمل تب ہی مفید ہوگا کہ جب اللہ کا فضل اور اس کی رحمت شامل ہو۔ امام طبری کا کلام بھی زین العرب کے کلام کی مانند ہے، چنانچہ طبری لکھتے ہیں: ائی النجاة من العذاب والفوز بالثواب بفضل اللہ ورحمة۔ والعمل غیر مؤثر فیہا علی سبیل الايجاب بل غایبہ أنه يعد العامل لأن یتفضل علیہ ویقرب الرحمة الیہ وکذا قال فسدوا۔ فسدوا: تہید میں اور اچاہے صواب اور فعل میں مبالغہ اختیار کرو، اور قول سدید (سیدھی بات) کہو۔ چونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾ [الاحزاب: ۷۰] ائی صوابا وعدلا۔ وقاربوا: تمام امور کو دھیان کے ساتھ سرانجام دو، تمہارے اعمال افراط و تفریط سے پاک ہوں، یا مطلب یہ ہے کہ کثرت قربات کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرو۔ لیکن اس کا لحاظ رہے کہ طاعات

و عبادات میں تمہیں ملال نہ ہونے لگے۔ واغدوا وروحوا: یعنی اللہ کی عبادت کرو، دن کے دونوں اطراف میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ نبی کریم ﷺ کا یہ جملہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَزُلْفَا مِنَ اللَّيْلِ﴾ [ہود: ۱۱۴]۔ زلفا من اللیل کے مفہوم کو شی من الدلبہ کے ذریعہ بیان فرمایا ہے۔ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: شبہا هذه الأوقات من حيث انها توجه الى مقصد وسعى للوصول اليه بالسلوك والسير وقطع المسافة في هذه الأوقات: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اولاً تو یہ بیان فرمایا کہ عمل نجات نہیں دے گا، تا کہ لوگ اعمال پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں، اور آخر میں عمل پر ابھارنا کہ عمل میں تفریط نہ کریں کہ جب عمل کا ہونا نہ ہونا برابر ہے تو عمل کی کیا ضرورت ہے؟

۲۳۷۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَدْخُلُ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُجِيرُهُ مِنَ النَّارِ وَلَا أَنَا إِلَّا بِرَحْمَةِ اللَّهِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۱۷۱/۴ حديث رقم ۷۷-۲۸۱۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کسی کا عمل نہ اسے جنت میں داخل کرے گا اور نہ اسے دوزخ سے بچائے گا اور نہ مجھے میرا عمل جنت میں داخل کرے گا ہاں وہ جو اللہ کی رحمت کے ساتھ ہو۔“ (مسلم)

تشریح: لا یدخل: باب افعال سے معروف کا صیغہ ہے۔ علمہ: فاعل ہے لا یدخل کا۔ ولا أنا: اس میں وہی تقریر ہے جو پچھلی حدیث میں گزری۔ الا برحمة اللہ: تقدیری عبارت یوں ہے۔ الا عملاً مقروناً برحمتہ۔ چنانچہ یہ استثناء متصل ہے۔ عرض مرتب: اس حدیث کی تشریح کیلئے پچھلی روایت ملاحظہ فرمائیے۔

۲۳۷۳: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسَنَ إِسْلَامَهُ يَكْفُرُ اللَّهُ عَنْهُ كُلَّ سِنَةٍ كَانَ زَلْفَهَا وَكَانَ بَعْدَ الْقِصَاصِ الْحَسَنَةَ بَعَشْرًا مِثْلًا لَهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةٍ ضَعْفٍ إِلَى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ وَالسِّنِّيَّةُ بِمِثْلِهَا إِلَّا أَنْ يَتَجَا وَزَا اللَّهُ عَنْهَا (رواه البخاری)

اخرجه البخاری في صحيحه ۹۸۱/۱ - حديث رقم ۴۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب کوئی بندہ اسلام قبول کرتا ہے اور اس کا اسلام اچھا ہوتا ہے (یعنی نفاق سے پاک صاف ہوتا ہے) کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ تمام گناہ دور کر دیتا ہے جو اس نے قبول اسلام سے پہلے کئے تھے اور اس کے بعد اسے بدلہ ملتا ہے جس کا حساب یہ ہے کہ) ایک نیکی کے بدلہ میں دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں (یعنی اسلام لانے کے بعد وہ بھی جو عمل کرتا ہے) بلکہ سات سو سے بھی زیادہ اور برائی کا بدلہ اسی کے مانند ملتا ہے یعنی جتنی برائی کرتا ہے وہ اتنی ہی لکھی جاتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی درگزر کرتا ہے۔“ (بخاری)

تشریح: کان زلفها: لام کی تشدید کے ساتھ ہے، زلفی بمعنی قرب و تقدم سے مأخوذ ہے۔ وکان بعد القصاص۔ زین العرب فرماتے ہیں: بعض نسخوں میں لفظ ”بعد“ مبنی علی الضم ہے، اور لفظ ”قصاص“ مرفوع ہے۔ اور بعض نسخوں میں اضافت کے ساتھ ہے (یعنی بعد اپنے مابعد کی طرف مضاف ہے) اور بعض نسخوں میں والحسنة بعشر أمثالها وادعاطف کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں بغیر واؤ کے ہے۔

عطف کی صورت میں پہلے معنی یہ ہوں گے: وکان بعد الاسلام اى يثبت عليه بعده القصاص ان جنى على احد، أو وکان بعد القصاص ان كان عليه لأحد حق مالي، ويثبت له الحسنه بعشر أمثالها، والسيئة بمثلها۔ بغیر عطف کے معنی بالکل ظاہر ہیں چونکہ الحسنہ..... قصاص کا ”بیان“ ہوگا۔ اى المجازاة والتتبع الذى يفعل معه فى حسناته وسيناته، عطف کے ساتھ دوسرے معنی یہ ہوں گے: وکان اى المذكور من تكفير الله عنه كل سيئة كان زلفها بعد القصاص اى الاسلام وعقبه دون التمهّل والترافى الى ظهور حسن، وکان له أيضا عقيب اسلامه الحسنه بعشر أمثالها۔ چنانچہ اس صورت کے مطلق حسنہ کا عطف کان کی ضمیر مستتر پر ہوگا، اور یہ عطف بغیر تاکید منفصل کے بھی درست ہے چونکہ ظرف کا فصل آگیا ہے۔ اس کے معنی بغیر حرف عطف کے بھی ظاہر ہیں، چونکہ کان کا فاعل حسنہ ہوگا، اور قصاص، معنی میں ہوگا اسلام کے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ”قود“ ہو۔ القصاص الحسنه بعشر أمثالها: یہ جملہ، قصاص کیلئے بیان و تفسیر ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: وفى بعض النسخ: والحسنه بواد العطف يعنى: و كانت الحسنه بعشر أمثالها..... بخلاف ما قبل الاسلام، فانه اذا عمل حسنة فى الكفر، ثم أسلم يعطى بكل حسنة ثواب حسنة واحدة۔ ان کا یہ دعویٰ دلیل و برہان کا محتاج ہے، چونکہ کافر سے حالت کفر میں جو اچھے اعمال صادر ہوتے ہیں وہ محض صورت ہی ”حسنة“ ہوتے ہیں، (حقیقۃً حسنة نہیں ہوتے)۔

قصاص: نقص سے ماخوذ ہے اس کے معنی ہیں: تتبع الاثر، وهو رجوع الرجل من حيث جاء۔ اس ارشاد باری تعالیٰ میں بھی یہی معنی ہیں: ﴿فارتدا على آثارهما قصصا﴾ [الكهف: ۶۴] تو دو ”قصاص“ بھی کہا جاتا ہے۔

۲۳۷۲: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمَلَهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلَى سَبْعِ مِائَةٍ ضَعْفٍ إِلَى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمَلَهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۲۳/۱۱۔ حديث رقم ۶۴۹۱۔ ومسلم فى صحيحه۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھیں (یعنی فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ لوح محفوظ میں نیکیوں اور برائیوں کے بارے میں یہ تفصیل لکھ دیں کہ) جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور وہ اس پر عمل نہ کر سکے (یعنی ارادہ کے باوجود وہ کسی عذر کی بنا پر اس نیکی کو کرنے پر قادر نہ ہو سکے) تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے اپنے ہاں اس ارادہ ہی کو (کی پوری نیکی لکھ لیتا ہے اور جو شخص نیکی کا ارادہ کرے اور پھر اس نیکی کو کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے ہاں دس گنا سے سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکیاں لکھ لیتا ہے (یعنی اپنے بندوں میں سے جس کے لئے اللہ چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے بحسب اخلاص اور ادائیگی شرائط و آداب کے زیادہ ثواب لکھتا ہے) اور جو شخص کسی برائی کا ارادہ کرے اور پھر (خدا کے خوف کی وجہ سے) اس برائی میں بھی مبتلا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے ہاں ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے اور جس شخص نے کسی برائی کا ارادہ کیا تو پھر اس برائی میں مبتلا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک ہی برائی لکھتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: ان اللہ کتب الحسنات والسيئات: اس کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں: (۱)۔ أثبتهما فى سابق

علمه وأرا الملائكة بكتبها فى اللوح المحفوظ۔ (۲)۔ بينهما وعينهما فى كتابه۔ (۳)۔ قضاها قدرهما۔ (۴)۔ أمر

الحفظۃ بکتابتہما لیواز نہما۔ (۵)۔ صحفہما یوم القیامۃ۔ اربعین کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ثم بین ذلك۔ اٰی مقدارہما وعین مبلغہما للسفرۃ الکرام.....، یا نبی کریم ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل اپنے مابعد کلام کے ذریعہ فرمادی۔ چنانچہ یہ کلام راوی کا ہوگا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اس کو ترک کر دیا ہے، اور باعتبار مذکور کے اسم اشارہ کو ذکر کیا۔ حسنات سے مراد واعمال ہیں جن کو کرنے سے ثواب ملتا ہے اور سینات سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو کرنے سے عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ فمن ہم: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ فاء تفصیلہ ہے بایں طور کہ کتب الحسنات مجمل تھا، کیفیت کتابت مجہول تھی، کتبہا اللہ له عندہ حسنة كاملة: کتب میں تصمین ہے، تصیر کے معنی کو مضمّن ہے، یا حال موطنہ ہے۔

فمن ہم بحسنة.....:

جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور وہ نیکی کسی وجہ سے نہ کر سکے تو اس کے لئے بھی ایک نیکی اس لئے لکھی جاتی ہے کہ کسی بھی عمل کا ثواب نیت پر موقوف ہے اور مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر اور افضل ہوتی ہے بلکہ یوں کہتے کہ اصل تو نیت ہی ہے عمل کا درجہ اس کے بعد ہے کیونکہ عمل کے بغیر صرف نیت پر تو ثواب دیا جاتا ہے مگر نیت کے بغیر صرف عمل پر ثواب نہیں دیا جاتا۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ بغیر عمل کے نیت پر جو ثواب ملتا ہے وہ مضاعف نہیں ہوتا۔

سید نے لکھا ہے: نیکی پر ثواب کے مضاعف ہونے کی مقدار کو سات سو تک بیان کیا جاتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ثواب میں کتنا اضافہ کرتا ہے اس کی آخری حد اور مقدار کسی کو معلوم نہیں ہے کیونکہ سات سو کے بعد مقدار کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف رغبت دلانے کے لئے اس کو معین کر کے ذکر کرنے کی بجائے مبہم کرنا زیادہ موثر ہوتا ہے اس لئے فرمایا گیا ہے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ۔

حدیث قدسی میں آتا ہے: أعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا أذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ ومن ہم بسینۃ فلم یعملہا..... اور اس کمال کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص ”من خاف مقام ربہ“ اور ”نہی النفس عن الہوی“ کا مصداق ہے، چونکہ اس شخص نے اس سیر پر قدرت حاصل ہونے کے باوجود اللہ جل شانہ کے خوف و مراقبہ کے باعث چھوڑا ہے۔ عدم قدرت کے باعث نہیں چھوڑا۔ فان ہو: یہ ضمیر شان بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس کا مرجع فعل سیر کا ارادہ کرنے والا شخص بھی ہو سکتا ہے۔

ہم بہا فعلہا: دونوں قیودات خطأ و زلل سے احتراز ہیں۔ اربعین کی روایت میں لفظ ”ہو“ موجود نہیں ہے۔ باقی الفاظ یوں ہیں: وان ہم بہا فعلہا۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: وانما کان كذلك لأن رحمة أكثر من غضبه: قال ابن حجر: فیہ دلیل علی أن لا مؤاخذۃ بالہم وهو الأصح، خلافا لمن زعم المؤاخذۃ بہ، والکلام کما علمت من الحدیث فی الہم الذی لم ینضم الیہ تصمیم، أما المنضم الیہ ذلك فهو سینۃ علی الأصح أيضاً۔

یہ بات علی الاطلاق درست نہیں ہے۔ بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ عدم مؤاخذہ ان امور میں ہے جہاں اس کا کوئی اختیار نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وان السمع والبصر والفؤاد کل أولئک کان عنہ مسؤول﴾ [الاسراء: ۳۶]۔ اور دوسری دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: انما یحشر الناس علی نیاتہم۔ اور تیسری دلیل اجماع ہے کہ عجب کبیر اور ”ریا“ پر مؤاخذہ ہے۔ الایہ کہ اللہ جل شانہ کے خوف سے باز آجائے، اور وہ اس کو جو کر دے۔ یا اس کا ارتکاب کر گزرے اور اس کے نامہ اعمال میں سیرۃ واحدہ ہی لکھا جائے، اللہ جل شانہ کے فضل کے باعث۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اے بھائی غور کر۔ اللہ مجھے اور تجھے اپنے لطف اور ان الفاظ میں تامل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

لفظ ”عنده“ اللہ جل شانہ کی اعتناء کی طرف اشارہ ہے۔ اور کاملہ تاکید ہے اور شدت اعتناء کا اظہار ہے۔ اور سیرہ کی بابت یہ فرمانا: کتبها اللہ عنده حسنة كاملة، یعنی حسنہ کو کاملہ کے ذریعہ مؤکد فرمایا ہے۔ اور اگر اس کو کرگزار تو سینہ واحده لکھی جائے گی، تقلیل کو واحده کے ساتھ مؤکد فرمایا ہے، فلله الحمد والمنه۔

الفصل الثاني:

۲۳۷۵: عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ مَثَلَ الَّذِي يَعْمَلُ السَّيِّئَاتِ ثُمَّ يَعْمَلُ الْحَسَنَاتِ كَمَثَلِ رَجُلٍ كَانَتْ عَلَيْهِ دِرْعٌ ضَيْفَةٌ قَدْ خَنَقَتْهُ ثُمَّ عَمِلَ حَسَنَةً فَأَنْفَكَتْ حَلْقَةً ثُمَّ عَمِلَ أُخْرَى فَأَنْفَكَتْ أُخْرَى حَتَّى تَخْرُجَ إِلَى الْأَرْضِ. (رواه في شرح السنة)

اخرجه احمد في المسند ۱۴۵/۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص برائیاں کرتا ہو اور پھر نیکیاں کرنے لگے اس کی حالت اس شخص کی سی ہے جس کے جسم پر تنگ زرہ ہو اور اس زرہ کے حلقوں نے اس کے جسم کو بھیج رکھا ہو۔ پھر وہ نیکی کرے اور اس کی زرہ کا ایک حلقہ کھل جائے پھر وہ دوسری نیکی کرے اور دوسرا حلقہ کھل جائے۔ یہاں تک کہ (اسی طرح) اس کے حلقے کھلتے رہیں اور وہ ڈھیلی ہو کر زمین پر گر پڑے۔“ (شرح السنہ)

تشریح: نم عمل حسنة: تنوین برائے تنگ ہے۔ ای: ای حسنة کانت۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ برائی کرنے سے سینہ تنگ و تاریک ہو جاتا ہے اور برائی کرنے والا نہ صرف یہ کہ اپنے تمام امور میں ضمیر کی صحیح رہنمائی سے محروم ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی تمام فکری اور عملی راہوں پر یقین و اعتماد اور سکون و استقلال کے نور کی بجائے تیر و گھبراہٹ اور اضطراب و عدم استقلال کے تاریک سایہ ہوتے ہیں بلکہ وہ لوگوں کی نظروں میں بے وقعت اور کمتر ہو جاتا ہے اور تمام ہی نیکی پسند انسان اسے غصہ اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اس کے برعکس نیکی کرنے سے سینہ کشادہ اور فراخ ہوتا ہے اور نیکی کرنے والا اپنے ہر کام میں آسانی و سہولت اور یقین و اعتماد کے سکون آمیز اثرات محسوس کرتا ہے نیز یہ کہ وہ لوگوں کی نظر میں محبوب و پسندیدہ اور باوقعت رہتا ہے۔

حدیث بالا میں اسی بات کو تنگ زرہ سے مشابہت دی گئی ہے کہ تنگ زرہ پہننے سے جسم تنگی اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس زرہ کا بدن پر سے کھلنا فراموشی اور خوش دلی کا باعث ہوتا ہے۔

ابن حجر لکھتے ہیں: أي أوصل نعمة لمن له قدرة على فك حلق تلك الدرع، فجازاه بفك واحده منها۔ ابن حجر کے اس کلام پر دو نقض وارد ہوتے ہیں۔ (۱)۔ یہ ذکر کردہ توضیح، تخصیص کا وہم پیدا کر رہی ہے۔ (۲) تمثیل معنوی ہے۔ ابن حجر کی تقریر کی تقدیر پر یہ امر حسی ہو جائے گا اور اگلی بات بھی عجیب لکھی: وما قررته في عمل حسنة هو الذي يصح به ترتيب الحديث، ويتضح به التمثيل، بخلاف ما أوهم كلام شارح من بقاء الحسنه على معناها من مجرد عمل العبادة، لأنه لا مناسبة بين عملها وفك تلك الحلق فتأملہ۔ ہم نے بہت تامل کیا، تامل کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ آپ کا کلام غیر مقبول المعنی ہے۔ کیونکہ کسی شخص کے ساتھ یکے بعد دیگرے بایں طور احسان کرنا ہر بار میں ایک حلقہ کھل کر گر جائے، یہ مشکل ہے، بلکہ عادت بھی معتذر ہے، نیز جس شخص نے ایسی تنگ زرہ پہنی ہوئی ہو کہ جس سے گلابھی گھٹتا ہو، وہ اس کو اتارنے پر بھی قادر ہوتا ہے، وہ اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ ایک طویل زمانہ تک لوگوں کے ساتھ احسان کرتا رہے، یہاں تک کہ اس مشکل سے چھکارا حاصل ہو جائے۔ حتی تخرج الی

الأرض: اس کی وضاحت دو طرح سے کی گئی ہے۔

۱۔ اى: حتى تسقط الدرع۔ یہاں تک کہ زرہ گر جاتی ہے۔ (۲)۔ امام طیبی فرماتے ہیں: اى: حتى تنحل وتنفلک بالکلیه، ویخرج صاحبها من ضیقها۔ تخرج الی الأرض: یہ اس کے سقوط سے کنایہ ہے۔ اھ۔ یہ حدیث ایک تمثیل ہے، اور درحقیقت اس آیت کی تفسیر ہے: ﴿ان الحسنات یدھبن السیئات﴾

۲۳۷۶: وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُصُّ عَلَيَّ الْمُنْبِرِ وَهُوَ يَقُولُ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ قُلْتُ وَإِنْ زُنِي وَإِنْ سَرَقَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ قُلْتُ النَّبِيُّ ﷺ وَإِنْ زُنِي وَإِنْ سَرَقَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ قُلْتُ النَّبِيُّ ﷺ وَإِنْ زُنِي وَإِنْ سَرَقَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي الدَّرْدَاءِ. (رواه احمد)

اخرجه احمد في المسند ۴۴۲/۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر وعظ و نصیحت فرماتے ہوئے سنا چنانچہ (ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ یعنی اور جو شخص (قیامت کے دن حساب کے لئے) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔“ میں نے (یہ سن کر ازراہ تعجب) پوچھا کہ ”یا رسول اللہ! اس (ڈرنے والے) نے زنا ہی کیا ہوا اور چاہے اس نے چوری ہی کی ہو“ (تب بھی اسے دو جنتیں ملیں گی؟) آنحضرت ﷺ نے پھر دوسری مرتبہ یہی ارشاد فرمایا: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ﴾ میں نے پھر دوسری مرتبہ پوچھا: یا رسول اللہ! چاہے اس نے زنا ہی کیا ہوا اور چاہے اس نے چوری ہی کی ہو؟ آپ ﷺ نے پھر تیسری مرتبہ فرمایا: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ﴾ میں نے پھر تیسری مرتبہ پوچھا کہ ”یا رسول اللہ! چاہے اس نے زنا ہی کیا ہوا اور چاہے اس نے چوری ہی کی ہو۔“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اگرچہ ابو درداءؓ کی ناک خاک آلودہ ہی کیوں نہ ہو“۔ (احمد)

تشریح: وهو يقول: یہ جملہ حالیہ ہے۔ ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ [الرحمن: ۴۶] مقام سے مراد وہ موقف ہے کہ جہاں مخلوق خدا قیامت کے دن حساب کتاب کیلئے ٹھہری ہوئی ہوگی۔ امام طیبی فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ موقف ہے جہاں بارگاہ تعالیٰ میں اعمال پیش کئے جائیں گے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے: ولمن خاف من القيام بحضرة ربه يوم القيامة: قال تعالى: ﴿يوم يقوم الناس لرب العالمين﴾ [مطففين: ۶] ويجوز أن يراد به أن الله تعالى قائم عليه اى: حافظ مهيمن من قوله: ”أفمن هو قائم“ الآية۔ فهو يراقب ذلك ولا يجزأ على معصية۔

عرض مرتب: ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ [الرحمن: ۴۶] میں لفظ مقام میں گویا کہ تین احتمال ہیں۔ (۱) ظرف ہے۔ (۲) مصدر۔ مصدر کی صورت میں پھر دو احتمال ہیں کہ مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے۔ یا مفعول کی طرف۔ پہلے کی دونوں مفہوم، مقام کو ظرف ماننے کی تقدیر یہ ہیں، تیسرا مفہوم اضافت المصدر الی الفاعل اور چوتھا مفہوم اضافت المصدر الی المفہوم تقدیر پر ہے۔ اھ۔ واضح رہے کہ اس آیت میں جن دو جنتوں کا ذکر ہے یہ جنتیں ان جنتوں کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کی ہوں گی جن کا ذکر ”من دونہا“ کے تحت کیا گیا ہے۔ دو جنتیں دینے کی خاص وجہ: بعض کا کہنا ہے کہ ایک جنت اعمال طاعت بجالانے پر ہے اور دوسری جنت ترک سیئات پر ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ایک جنت ازراہ عدل، ثواب کے طور پر ہے اور دوسری جنت ازروئے فضل، اقتراب کے طور پر ہے۔

دو جنتوں کا دیا جانا اس بناء پر ہے کہ اللہ جل شانہ کا خوف، دوام مراقبہ حق اور اعمال صالحہ کے دوام پر ابھارتا ہے اور نیک اعمال، مقامات عالیہ تک پہنچاتے ہیں۔ بعض صوفی فرماتے ہیں: جنة معجلة في الدنيا بالحضور مع المولى وحنة مؤجلة في الآخرة بلقاء المولى والدرجات العلی۔ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ دو جنتوں کے بارے میں بعض احادیث میں آیا ہے کہ ایک جنت تو ایسی ہے جس میں مکان، محل، برتن اور زیورات وغیرہ سب کے سب سونے کے ہیں اور ایک جنت ایسی ہے جس میں اسی طرح سب سامان چاندی کا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جنت سابقین کیلئے ہو اور ایک جنت اصحاب یمن کیلئے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جنت ان کے دائیں جانب اور ایک جنت ان کی بائیں جانب ہو۔ وان زنی وان سرق: ان وصیله ہے۔ معنوی طور پر عبارت یوں ہے: ولو زنی وسرق الخائف له جنتان۔

ابن حجر فرماتے ہیں: وان سبق منه قبل هذا الخوف نحو الزنا والسرقة، يصح على بعد۔ وان فعلهما مع هذا الخوف، ووجه بعده اجتماع هذا الخوف وفعل ذينك وأمثالهما اه۔ دوسرا مفہوم ظاہر ہے۔ اور مقید بالخوف ہے، چونکہ پچھلا خوف جو توبہ کا باعث بنا اس کے بارے میں پوچھا جائے گا اور نہ وہ عجیب ہے۔

حدیث کا ظاہر ”من“ کے عموم پر دلالت کر رہا ہے، اور خائف سے مراد مؤمن ہے۔ چنانچہ یہ حدیث باب ابو ذر سے مروی اس حدیث مرفوع کی نظیر ہے: ما من عبد قال لا اله الا الله ثم مات على ذلك الا دخل الجنة، قلت: وان زنی وان سرق؟ قال: وان زنی وان سرق ثم قال في الثالثة أو الرابعة على رغم أنف أبي ذر۔ یہ حدیث کتاب کی ابتداء میں گزر چکی ہے۔ وان رغم: کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ (۱)۔ قيل: معناه ذل۔ (۲)۔ قيل: اضطر ب۔ (قيل: غضب۔ ابن ملک نے یہاں بہت کی دور کی بات کہی: یعنی من خاف الله في معصية فتر كها۔ يعطيه الله أجرا غفر تلك الزنية والسرقة۔

آپ ﷺ پرندوں کے لیے بھی رحمت بن کر تشریف لائے

۲۳۷۷: وَعَنْ عَامِرِ الرَّامِ قَالَ بَيْنَا نَحْنُ عِنْدَهُ يُعْنَى عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ إِذَا أَقْبَلَ رَجُلٌ عَلَيْهِ كِسَاءٌ وَفِي يَدِهِ شَيْءٌ قَدِ التَّفَّ عَلَيْهِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَرَرْتُ بِغَيْضَةٍ شَجَرٍ فَسَمِعْتُ فِيهَا أَصْوَاتَ فِرَاحٍ طَائِرٍ فَأَخَذْتُهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ فِي كِسَائِي فَجَاءَتْ أُمَّهُنَّ فَاسْتَدَارَتْ عَلَيَّ رَأْسِي فَكَشَفْتُ لَهَا عَنْهُنَّ فَوَقَعَتْ عَلَيْهِنَّ فَلَقَفْتُهُنَّ بِكِسَائِي فَهَنَّ أَوْلَاءِي مَعِيَ قَالَ ضَعْنَهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ وَأَبَتْ أُمَّهُنَّ إِلَّا لَزُوهُنَّ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اتَّعَجِبُونَ لِرَحْمِ أُمَّ الْفِرَاحِ فَوَالَّذِي بَعَثَنِي بِالْحَقِّ اللَّهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ أُمَّ الْفِرَاحِ بِفِرَاحِهَا إِرْجِعْ بِهِنَّ حَتَّى تَضَعَهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَخَذْتَهُنَّ وَأُمَّهُنَّ مَعَهُنَّ فَرَجَعَ بِهِنَّ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۱۸۲/۳ حديث رقم ۳۰۸۹۔

ترجمہ: عامر تیر انداز سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں اس وقت نبی کریم ﷺ کے نزدیک تھا۔ کہ اچانک ایک شخص آیا اور اس کے ہاتھ میں کملی تھی اور اس کے ہاتھ میں کچھ چیز تھی اس پر کملی لپیٹ رکھی تھی اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ میں درختوں کے پاس سے گزرا پس اس میں سے میں نے پرندوں کے بچوں کی آوازیں سنی۔ پس میں نے ان کو پکڑ لیا اور ان کو میں نے اپنی کملی میں رکھ لیا۔ پھر بچوں کی ماں میرے پاس آئی میرے سر پر پھرنے لگی۔ پس میں

نے ماں کے لیے بچوں کے ادھر سے کملی کھول دی۔ تاکہ بچوں کو دیکھ لے۔ پس وہ ان پر گر پڑی۔ پھر میں نے ماں اور بچوں کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا پس یہ سب میرے پاس ہیں آپ ﷺ نے فرمایا رکھ دے پس میں نے ان کو رکھ دیا یعنی اور کھولا ان کو اور ان کی ماں نے چھوڑ دی ہر چیز سوائے چھٹنے کے۔ ان سے پھر رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم بچوں کی ماں کے رحم کرنے کے بارے میں تعجب کرتے ہو۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس نے بھیجا ہے مجھ کو حق کے ساتھ۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے بہ نسبت بچوں والی ماں کے جو اپنے بچوں پر کرتی ہے پھر مجھ سے فرمایا ان کو لے جا یہاں تک کہ رکھ دے جہاں سے تو نے ان کو پکڑا تھا اور ان کی ماں اس کے ساتھ ہو۔ پھر وہ لے گیا ان کو۔ نقل کی یہ ابوداؤد نے۔

تشریح: یعنی عند النبی ﷺ۔ یہ جملہ حدیث کے راوی "رامی" کا ہے، جو ماقبل کی تفسیر کر رہا ہے۔ کساء: بروزن رجال۔ قد التف علیہ ضمیر مجرور شی کی طرف راجع ہے۔ فقال: سوال مقدار کا جواب ہے۔ اے باہذا الشئ۔ لہذا یہ فاء "فصیحہ" ہے۔ فراخ: بروزن "رجال" ہے، فرخ کی جمع کثرت ہے۔ اس کی جمع قلت أفراخ آتی ہے۔ اس حدیث میں جمع قلت اور جمع کثرت دونوں آئی ہیں۔ اتسع کی وجہ سے یا اشتراک فی الجمیعہ کی وجہ سے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ﴿والمطلقات یتربصن بأنفسھن ثلاثۃ قروء﴾ [البقرہ: ۲۲۸] یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قلت عادت سے خارج تھی اور حد کثرت کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی تائید اگلے جملوں میں موجود ضمائرسے بھی ہوتی ہے۔ (کذا حقیقۃ الطیبی)۔

فکشف لھا: لام تعلیلیہ ہے۔ اے: امتنعت الازومہن۔ اے: ما فارتقہن بعد کشف الکساء بل ثبت معہن من غایۃ رحمتھا بہن۔ لرحم: راء کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے جیسا کہ رحمۃ اور لفظ عسر کی مانند ترکیب الحاء بالضم بھی درست ہے۔ فراخھا: منصوب علی المفعولیۃ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ منصوب بنزع الخافض ہو۔ اس کی تائید ایک نسخہ سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں بفراخھا کے الفاظ آئے ہیں۔ حتی تضعہن من حیث أخذتہن: یہ "من" فی کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ: "اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعة" اور بعض کا کہنا ہے "ابتدائیہ" ہے۔ اے: تجعل ابتداء وضعہن مکانا أخذتہن منه ان لا تضعہن مکانا آخر۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ زائدہ ہے۔ اس قول کی بناء انخفص کے مذہب پر ہے۔ وامنہن معہن: یہ جملہ حالیہ ہے۔ حتی تضعہن من حیث أخذتہن: یہ قید اس لئے بڑھائی کہ عموماً تمام مخلوقات اور خصوصاً پرندوں کو اپنے ہی آشیانہ سے اُلفت و محبت ہوتی ہے۔ شیئ قد التف: ابن حجر لکھتے ہیں: اے ذلك الکساء۔ لیکن اس جزم کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ غیضۃ شجر: غیضۃ کے معنی ہیں: غاب و هو مجتمع الأشجار (جنگل) غیضۃ کی شجر کی طرف اضافت بیان مزید کیلئے ہے، یا اس سے مراد "الشجر المرعی" ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ فأی بی الشجر اے بعد بی المرعی والشجر۔ ابن حجر لکھتے ہیں: الاضافۃ بیانیۃ اے غیضۃ ہی شجر ملتف بعضہ علی بعض لکثرتہ۔ ابن حجر کا یہ کلام صاحب النہایہ کے ظاہر کلام پر مبنی ہے، چنانچہ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: ان الغیضۃ ہی الشجر الملتف اور چونکہ اضافت بیانیۃ اس معنی پر درست نہیں ٹپکتی۔ چونکہ اول خاص ہے اور ثانی عام ہے، تو سوال و جواب کے انداز میں فرمایا: فان قلت: لیست الغیضۃ اسما لمطلق الشجر، بل للشجر الملتف فلا تكون الاضافۃ بیانیۃ۔ قلت: تنوینھا للتکبیر، فکأنہ قال غیضۃ اسما لمطلق الشجر کبیر، ومن لازمہ الالفاف غالباً۔ تنوین کے بارے میں درست بات یہ ہے کہ "تعظیم" کیلئے ہے اور غالباً کی قید کے باوجود اس کا اضافت بیانیۃ ہونا صحیح نہیں، بلکہ اس قید کے بغیر بھی۔ جیسا کہ خاتم فاضل میں کہ ان کے درمیان عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ لہذا درست بات وہی ہے جو ہم نے

تاموس کی مطابقت میں ذکر کی ہے۔

الفصل الثالث:

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر رحمت کا نزول

۲۳۷۸: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي بَعْضِ غَزَوَاتِهِ فَمَرَّ بِقَوْمٍ فَقَالَ مَنْ الْقَوْمُ قَالُوا نَحْنُ الْمُسْلِمُونَ وَامْرَأَةٌ تَحْضِبُ بِقَدْرِهَا وَمَعَهَا ابْنٌ لَهَا فَإِذَا ارْتَفَعَ وَهَجَ تَنَحَّتْ بِهِ فَاتَتْ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَتْ أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي أَلَيْسَ اللَّهُ أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ قَالَ بَلَى قَالَتْ أَلَيْسَ اللَّهُ أَرْحَمَ بِعِبَادِهِ مِنَ الْأُمِّ بَوْلِدِهَا قَالَ بَلَى قَالَتْ إِنْ الْأُمُّ لَا تُلْقِي وَلَدَهَا فِي النَّارِ فَكَبَّرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَبْكِي ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ إِلَيْهَا فَقَالَ إِنْ اللَّهُ لَا يُعَذِّبُ مِنْ عِبَادِهِ إِلَّا الْمَارِدَ وَالْمُتَمَرِّدَ وَالَّذِي يَتَمَرَّدُ عَلَى اللَّهِ وَأَبَى أَنْ يَقُولَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ - (رواه ابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱۴۳۶/۲ حديث رقم ۴۲۹۷۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں تھے پھر حضور ﷺ کا گزرا ایک قوم پر ہوا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم کون لوگ ہو۔ انہوں نے عرض کیا ہم مسلمان ہیں اور ایک عورت ہانڈی کے نیچے آگ جلاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کا بیٹا تھا جس وقت آگ کی لپٹ اٹھتی لڑکے کو دوڑ کرتی یعنی تاکہ آگ کی گرمی سے رنج نہ اٹھائے پھر وہ عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا تم خدا کے رسول ہو فرمایا ہاں۔ اس عورت نے کہا میرا ماں اور میرا باپ آپ پر قربان ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ بہت زیادہ رحم کرنے والا نہیں ہے رحم کرنے والوں میں سے فرمایا کہ ہاں اس عورت نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر زیادہ رحم کرنے والا نہیں ہے ماں کے اپنے بچے کے ساتھ فرمایا کہ ہاں اس عورت نے کہا کہ تحقیق ماں نہیں ڈالتی اپنے بچے کو آگ میں پس نبی کریم ﷺ نے روتے ہوئے اپنا سر جھکایا پھر اس عورت کی طرف اپنا سر اٹھایا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عذاب نہیں کرتا یعنی ہمیشہ مگر سرکشی کرنے والے کو ایسے سرکش پر کہ وہ اللہ تعالیٰ پر سرکشی کرے یعنی اس کے حکم کے خلاف کرے اور لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا انکار کرے اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: و امرأة تحضب: یہ جملہ اسمیہ حال واقع ہو رہا ہے۔ اور تحضب: حاء مہملہ اور ضاد مجمہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ وهج: ہجاء کے فتح کے ساتھ، اى حور النار اور هاء کے سکون کے ساتھ مصدر ہے۔ البتہ یہاں پہلے معنی میں مستعمل ہے۔ ایک نسخہ میں فاذا ارتفعت کے الفاظ ہیں۔ یہاں مضاف الیہ سے کسب تانیث کیا ہے۔ فقالت انت رسول الله: کلمۃ استفہام محذوف ہے۔ بأبی وأمی: اس کی ترکیب جلدنہم میں ملاحظہ فرمائیے۔ ان الله لا يعذب من عباد الا الماردا المتمرد الذى يتمر على الله وأبى۔ من عباد میں اضافت برائے استغراق ہے۔ بأی: من جميع عبادہ۔ اور اس کی دلیل استثناء کا ہونا ہے۔ ابن حجر نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور من عبادہ کی توضیح من عبادہ المؤمنین کے ساتھ کر دی۔ المترو: 'مارد' کا مبالغہ ہے۔ اور أبی کا عطف يتمرد پر ہو رہا ہے۔ یا یہ عطف تفسیری ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: وقد أبى۔

نحن المسلمون: امام طیبیؒ فرماتے ہیں بظاہر جواب یوں دینا چاہئے تھا: نحن مضربون أو قرشيون أو طائون، اور ظاہر

سے عدول کرتے ہوئے، حصر کی غرض سے خبر کو معرّفہ ذکر کیا۔ اسی: نحن قوم لا نتجاوز الاسلام، اس خیال سے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ نے انہیں غیر مسلم نہ سمجھ لیا ہو۔ ابن حجرؒ نے بھی امام طیبیؒ کے کلام کی اتباع کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام طیبیؒ نے تکلف سے کام لیا ہے۔ تینحت بہ فانت النبی ﷺ: اپنے کام کو چھوڑ چھاڑ کر اس خاتون کا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا بظاہر داعیہ یہ ہوا ہوگا کہ جب اس نے اس سارے عمل میں اپنے بچہ پر اپنی خصوصاً شفقت کو دیکھا، تو اسے اللہ جل شانہ کی اپنے بندوں پر خصوصی رحمت کرنا یاد آیا، اسی غرض سے وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اللہ کی رحمت کی بابت آپ ﷺ سے سوال فرمایا۔

فقال: أنت رسول اللہ: اس کلام کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کا سوال حقیقی تھا، یہ اس بات کے معنائی نہیں کہ وہ اس بات کو جملاً جانتی ہو اور مسلمان بھی ہو۔ اگرچہ آپ ﷺ کی ذات اقدس کے بارے میں معلوم نہیں تھا (کہ نبی آخر الزمان یہی شخص ہیں) اس سوال سے مقصود تقریر و استلذاذ بھی ہو سکتا ہے، چونکہ نبی کریم ﷺ کو نبی عام شخص تو نہ تھے بلکہ اللہ کے نبی تھے، اور اس کے خلیفہ تھے۔ پہلے احتمال کی تائید اگلے کلام سے ہوتی ہے۔ أليس الله أرحم الراحمين؟ قال: بلى: یہ اسلوب کلام، اس کلام باری کی طرز پر ہے: ﴿ألست بربکم قالوا بلى﴾ [الاعراف: ۱۷۲]

عرض مرتب: حدیث مبارکہ کا اگلا کلام: قالت: أليس الله أرحم بعباده من الأم بولدها؟ قال: بلى۔ بھی اسی قبیل سے معلوم ہوتا ہے۔ اھ۔ ان اللہ لا يعذب من عباده: کا ایک مطلب تو ترجمہ میں بین القوسین ذکر کر دیا گیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف کافروں کو عذاب دیتا ہے، عاصیوں (کو عذاب نہیں دیتا ان) کی تہذیب کرتا ہے۔ اللہ جل شانہ کی عبودیت کا منکر شخص اس شخص کی مانند ہے جو اپنی ماں سے کہتا ہے، تو میری ماں نہیں، میری ماں کوئی اور ہے؟ اور اس کی نافرمانی بھی کرتا ہے، اور ماں کی نگاہوں میں یہ شخص کتے اور خنزیر کی شکل رکھتا ہو۔ تو بلاشبہ یہ ماں اس سے اظہار براعت کرے گی، اور اگر اس میں قدرت ہوئی تو اس کو سزا بھی دے گی۔

نیکی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے

۲۳۷۹: وَعَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَلْتَمِسُ مَرْصَاةَ اللَّهِ فَلَا يَزَالُ بِذَلِكَ فَيَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لَجِبْرِيْلَ إِنَّ فَلَانًا عَبْدِي يَلْتَمِسُ أَنْ يُرَضِّيَنِي أَلَا وَإِنَّ رَحْمَتِي عَلَيْهِ فَيَقُولُ جِبْرِيْلُ رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَى فَلَانٍ وَيَقُولُهَا حَمَلَةُ الْعُرْشِ وَيَقُولُهَا مَنْ حَوْلَهُمْ حَتَّى يَقُولَهَا أَهْلُ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ ثُمَّ تَهْبِطُ لَهُ إِلَى الْأَرْضِ۔ (رواه احمد)

احرجه احمد في المسند ۲۷۹/۵

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق نیک بندہ البتہ تلاش کرتا ہے اللہ کی مرضی (رضا) یعنی نیکیوں کو ادا کرنے کے ساتھ پھر ہمیشہ اس کو تلاش کرتا رہتا ہے پس اللہ تعالیٰ جبرئیل کو فرماتا ہے کہ میرا فلاں بندہ تلاش کرتا ہے یہ کہ وہ مجھ کو راضی رکھے۔ خیر دار میری رحمت کا ملنا اس پر ہے پھر جبرئیل علیہ السلام کہتے ہیں کہ خدا کی رحمت فلاں نے پرہوار یہی بات عرش کے اٹھانوالے فرشتے کہتے ہیں اور وہ فرشتے بھی کہتے ہیں جو ان کے گرد ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس بات کو ساتوں آسمانوں کے فرشتے کہتے ہیں پھر اس شخص کے لیے رحمت اترتی ہے زمین کی طرف اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: فلا یزال بذلك: تقدیری عبارت یوں ہے: فلا یزال ملتبسا بذلك الالتماس۔ ان فلانا: یہ اس کے نام

ووصف سے کنایہ ہے۔ عبدی: سے اضافت تشریفی ہے۔ اُلا: برائے تشبیہ ہے۔ ثم تهبطہ: مضارع معروف کا صیغہ ہے۔ بعض روایات میں بصیغہ مجہول آیا ہے۔ اُی تنزل الرحمة لأجلہ: اور لال تعلیلہ ہے۔ اُلی الأرض: یہاں مضاف محذوف ہے۔ اُی اُلی اهل الأرض۔ یعنی محبة اللہ ایاہ ثم یوضع له القبول فیہا۔ امام طیبی فرماتے ہیں: یہ حدیث اور حدیث محبت متقارب ہیں۔ اہ۔ حدیث محبت سے مراد مسلم شریف کی یہ حدیث ہے جو ابو ہریرہؓ سے مروی ہے وہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام حاملین عرش اور دیگر تمام ملائکہ مقررین سے افضل ہیں۔ ابن حجر لکھتے ہیں: اُن قول الشارح: ثم تهبطہ اُی الرحمة لأجلہ اُلی الأرض انما یصار الیہ ان صح أن تهبط بالمشناة الفوقیة والا فالسیاق والمعنی معاً قاضیان بأنه بالمشناة التحتیة وأن ضیمرہ لجبریل اہ۔ ابن حجر کا یہ کلام غیر موبہ ہے، چونکہ تصحیح شدہ نسخہ جات، اور اصول معتدہ ضبط بالمشناة الفوقیہ پر متفق ہیں۔ اس کے ضبط میں جو اختلاف تھا وہ اوپر ذکر کر دیا گیا ہے۔ تصحیح لفظ و روایت سے پہلے حدیث کے معنی بیان کرنے کا اقدام درست نہیں ہے، ان کا مذکورہ بالا کلام ان کے اس زعم پر مبنی ہے: ان جبریل یُنزل بین ملائکة اهل الأرض فیقول: رحمة اللہ علی فلان فی الأرض الأولى، ویقولہا ملائکتها، ثم یقولہا فی الثانية، وھكذا حتی ینتہی اُلی الأرض السابعة.....

ایمان والا ہر حال میں جنتی ہے خواہ وہ گنہگار رہی کیوں نہ ہو

۲۳۸۰: وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِي قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ قَالَ كُلُّهُمْ فِي الْجَنَّةِ۔

رواہ البیہقی فی کتاب البعث والنشور۔

ترجمہ: اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے نقل کیا ہے۔ اللہ عزوجل کے قول کی تفسیر میں کہ بعض ان میں سے ظالم ہیں۔ اپنے نفس پر اور بعض ان میں سے میانہ رو ہیں یعنی میانہ روی کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے سبقت کرنے والے ہیں نیکیوں میں۔ فرمایا یہ بہشت میں ہیں اس کو یہ بھی نے بعث و نشور میں نقل کیا ہے۔

تشریح: مُقْتَصِدٌ: باب افتعال اسم فاعل بمعنی میانہ روی کرنے والا۔

اس حدیث میں جس آیت کریمہ کی تفسیر کے ضمن میں مذکورہ بالا بشارت ارشاد فرمائی گئی ہے وہ پوری یہ ہے: ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ۔ ”پھر ہم نے کتاب و شریعت دی ان لوگوں کو کہ جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے (ایمان و اسلام کے ذریعہ) برگزیدہ کیا پس ان برگزیدہ لوگوں (یعنی مسلمانوں) میں سے بعض اپنے نفس کے حق میں ظالم ہیں (بایں طور کہ وہ ممنوع چیزوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہوں میں مبتلا کرتے ہیں) اور ان میں سے بعض میانہ رو ہیں (بایں طور کہ وہ نیکیاں بھی کرتے ہیں) اور ان میں سے بعض نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں (بایں طور کہ وہ علم حاصل کرنے اور عمل کرنے میں بہت سعی اور جدوجہد کرتے ہیں اور اپنے علم و عمل کے ساتھ دوسروں کو بھی اپنے علم تذکیر و نصیحت کے ذریعے رشد و ہدایت کے راستے پر لگاتے ہیں)۔

واضح رہے کہ فمِنْهُمْ كَيْفَ تَفْصِيلِيَّةٌ ہے، جو ما قبل کلام کی تفصیل بیان کر رہی ہے: ﴿جَنَاتٍ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا﴾ [الفاطر: ۳۳] مبتدا خبر ہیں، اور ضمیر ان تینوں (اقسام کے افراد) کی طرف راجع ہے، یا مقصد اور سابق کی طرف عائد ہے، چونکہ ان دونوں سے مرا جنس ہے۔ اور اس آیت کریمہ: ﴿وَذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾ [الفاطر: ۳۲] میں اسم اشارہ کا مشار الیہ ایراث، اصطفاء یا سبق ہے۔ (علی مآقرہ القاضی)۔

صاحب کشف نے اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے: ”من أن جنات بدل من الفضل الكبير المعنى به السبق، وأخرج الظالم والمقتصد من هذا العام ومن الفضل الكبير والجنات، ويطلق التفسير الأول قولهم: ان ربنا لغفور شكور۔ أي كثير الغفران للظالم وكثير الشكر أي: الاتامة للسابق، فالتمام السابق واللاحق۔ یہ تفسیر درست نہیں ہے۔ ابن مردویہ نے اور یہی بتی نے ”کتاب البعث والنشور“ میں حضرت عمر سے مروی نقل کیا ہے:

سابقنا سابق، ومقتصدنا ناج، وظالمنا مغفور له۔

حضرت عائشہؓ سے منقول ہے: اما السابق فمن مضى على عهد رسول الله ﷺ وشهد له بالجنة، واما المقتصد فمن تبع اثره من اصحابه حتى لحق به، واما الظالم فمثلى ومثلك۔ حضرت علی سے مروی ہے:

الظالم انا، والمقتصد انا، والسابق انا۔ کہ میں ظالم ہوں، میں مقتصد بھی ہوں، اور میں سابق بھی ہوں۔ پوچھا گیا وہ کیسے؟ فرمایا میں اپنی معصیت کے سبب ظالم ہوں، اور اپنی توبہ کی بدولت مقتصد ہوں، اور اپنی محبت کے باعث سابق ہوں۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ”سبقت کرنے والے“ سے وہ شخص مراد ہے جس کی نیکیاں برائیوں پر غالب ہوں یعنی نیکیاں زیادہ کرتا ہو اور برائیوں میں کم مبتلا ہوتا ہو! میانہ رو وہ شخص ہے جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور ”ظالم“ سے مراد وہ شخص ہے جس کی زندگی میں برائیاں نیکیوں پر غالب ہوں۔

پس حدیث بالا کا حاصل یہ ہے کہ ان تینوں اقسام کے لوگ برگزیدہ بندوں یعنی مؤمنین ہی میں سے ہیں اور یہ سب جنتی ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان کو جنت میں اپنے احوال وافعال کے اعتبار ہی سے درجات ملیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کتنی وسیع اور عام ہے کہ جس طرح اس کے نیکو کار بندے اس کی رحمتوں سے نوازے جائیں گے اسی طرح اس کے گنہگار بندے بھی اسی کے سایہ رحمت میں ابذی سعادتوں سے ہمکنار ہوں گے۔

بَابُ مَا يَقُولُ عِنْدَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ وَالْمَنَامِ

صبح، شام اور سوتے وقت پڑھی جانے والی دعاؤں کا بیان

قوله: ما يقول عند الصباح والمساء والمنام:

ممکن ہے کہ صبح و مساء سے مراد دن کے دونوں اطراف ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد لیل و نہار ہوں۔ یہ معنی زیادہ ظاہر ہیں۔ اسی معنی کی تائید اس دعا سے بھی ہوتی ہے: أسألك خير هذه الليلة۔ ”المنام“ کو ظرف زمان اور ظرف مکان دونوں معنی میں لینا درست ہے۔ اسی فی مکان النوم أو زمانہ۔ اور اگر مصدر می مائیں تو مصدری معنی مراد ہوں گے۔ اسی: عند ارادة النوم۔

صبح و شام کے وقت کی تعیین:

”صبح“ سے مراد ہے آفتاب طلوع ہونے تک دن کا بالکل ابتدائی حصہ۔ ”شام“ سے مراد ہے آفتاب کے غروب ہونے کے وقت سے شفق کے غروب ہونے کے وقت تک دن کا بالکل آخری حصہ لہذا جو دعائیں صبح کے وقت پڑھنے کے لئے منقول ہیں ان کو چاہے نماز فجر سے پہلے پڑھا جائے نماز فجر کے بعد دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے اسی طرح شام کے وقت جن دعاؤں کا پڑھنا منقول ہے ان کو بھی چاہے تو مغرب کی نماز سے پہلے پڑھا جائے چاہے مغرب کی نماز کے بعد۔

صبح و شام وغیرہ کے اذکار کی حکمت:

علماء فرماتے ہیں سونے اور جاگنے کے وقت یہ اذکار و ادعیہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ (دن بھر کے) اعمال کا خاتمہ بھی عبادت و طاعت پر ہو اور (دن کے) افعال کی ابتداء بھی عبادت ہی سے ہو۔ (ماخوذ از نوآمد حدیث)

الفصل الاول:

آپ ﷺ سے منقول صبح و شام کی دعائیں

۲۳۸۱: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أُمْسَى قَالَ أَمْسَيْنَا وَأَمْسَى الْمَلِكُ لِلَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ هَذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرِ مَا فِيهَا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيهَا اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَسُوءِ الْكِبَرِ وَفِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَإِذَا أَصْبَحَ قَالَ ذَلِكَ أَيْضًا أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمَلِكُ لِلَّهِ وَفِي رِوَايَةٍ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ وَعَذَابٍ فِي الْقَبْرِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۱/حدیث رقم ۶۳۶۵۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۸۱/۴ حدیث رقم (۷۴-۲۷۲۳)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت شام کرتے تھے، ہم شام میں داخل ہوئے اور ملک شام میں داخل ہوا۔ اس حال میں کہ ملک اللہ تعالیٰ کے واسطے ہے اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے لیے بادشاہیت ہے اور اس کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے الہی تحقیق میں مانگتا ہوں اس کی بھلائی سے اور بھلائی اس چیز کی سے جو اس میں ہے یعنی جو چیز رات میں پیدا ہوتی ہے اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ (یعنی تجھ سے) اس رات کی برائی سے اور برائی اس چیز کی سے جو اس میں ہے اے الہی! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔ نیکی کرنے میں کاہلی سے اور نہایت بڑھاپے سے کہ بعض قوی میں خلل آ جائے اور بڑھاپے کی برائی سے یعنی عقل جاتی ہے اور وہ چیزیں کہ جن کی وجہ سے برا حال پیدا ہوا اور میں دنیا کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ یعنی دنیا کے فتنوں سے اور دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے سے اور قبر کے عذاب سے اور جس وقت حضور ﷺ صبح کرتے کہتے وہ یعنی شام کے وقت پڑھتے تھے وہ صبح میں بھی پڑھتے تھے لیکن امسینا کے بدلے اور امسی الملک اللہ کے اصحنا واصبح الملک اللہ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اے میرے رب میں پناہ مانگتا ہوں جہنم کے عذاب سے اور عذاب قبر سے۔ (مسلم)

حل لغات: أمسینا: شام میں داخل ہونا، اصبحنا: صبح میں داخل ہونا۔ الكسل: بروزن "قلم"۔ استطاعت ہونے کے باوجود طاعت میں بوجھل پن کرنا۔ اور امام طیبی فرماتے ہیں: ایسے امور میں سستی کرنا کہ جن میں سستی مناسب نہیں، اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ظہور استطاعت کے باوجود، نفس کا خیر کیلئے آمادہ نہیں ہوتا۔ الہرم: بروز قلم: بڑھاپے کی وہ عمر کہ جس میں قوی جسمانیہ ضعیف و مضحل ہو جاتے ہیں، یعنی ارذل عمر۔

تشریح: سوء الکبر: باء کے فتح کے ساتھ روایت و درایت کے اعتبار سے یہی ضبط اصح ہے۔ سوء الکبر سے مراد وہ عوارض ہیں جو بڑھاپے میں لاحق ہو جاتے ہیں۔ مثلاً قوت کا دھل جانا، عقل میں فرق آ جانا، اختلاط رائے وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ بڑھاپے کی

بد حالی سے پناہ چاہی ہے۔ الکبیر: باء کے سکون کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اس سے مراد ”بطر“ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: درایت پہلی روایت کی مؤید ہے۔ چونکہ بطر و ہرم کو بذریعہ عطف جمع کرنا ایسا ہے جیسا ”ضب“ و ”نون“ کو جمع کرنا ہے۔ ابن حجرؒ ان سے نزاع فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: الاول اصح ای: أشهر رواية وأما دراية فالثاني يفيد ما لا يفيدہ ما قبلہ، وهو الہرم فهو تأسیس محض بخلاف الاول، فانه انما يفيد ضربا من التاكيد والتأسیس خیر من التاكيد اھ۔ ابن حجرؒ کی یہ بات عجیب ہے، چونکہ ان دونوں کے درمیان مغایرت تو حد درجہ واضح ہے۔ ان میں ایسی مغایرت ہے جیسی ضب اور نون میں کلام تو متعاطفین کے درمیان مناسبت ملائمہ پر ہے، اس کا اعتبار تو علماء معانی نے بھی کیا ہے۔

علاوہ ازیں امام طیبیؒ نے اس کو تاکید پر محمول نہیں کیا ہے، بلکہ سوء الکبیر کی تفسیر یہ کی ہے سوء الکبیر ناشی از ہرم ہے۔ چنانچہ دونوں میں تغایرت بالکل واضح ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ سوء کو ذکر فرمایا ہے جو کبر بفتح الباء کے مناسب ہے، چونکہ ”کبر“ بسکون الباء تو مطلقاً مذموم ہے۔ عذاب: کی تئوین برکے تقلیل ہے، تخم کیلئے نہیں ہے ابن حجرؒ کو اس بارے میں وہم ہوا ہے انہوں نے اس کے برعکس یہاں بیان کیا ہے۔

امور نحویہ: أمسینا وأمسی الملك لله کی ترکیب: (۱) تقدیری عبارت یوں ہے: أمسینا وأمسی الملك كاننا لله ومختصا بہ۔

(۲)۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ (بعد والا جملہ) جملہ حالیہ ہے ”تقدیر“ ”قد“ بھی ہو سکتا ہے، اور ”قد“ کی تقدیر کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ ای أمسینا وقد صار بمعنى كان ودام الملك لله۔ والحمد لله۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا عطف أمینا وأمسی الملك پر ہے۔ ای صرنا نحن وجميع الملك وجميع الحمد لله ای عرفنا فيه أن الملك لله وأن الحمد لله لا لغيره۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ الحمد لہٰذا یک مستقل جملہ ہو۔ اور تقدیری عبارت یوں ہو: والحمد لله على ذلك۔

ولا اله الا الله: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا عطف الحمد پر ہے، اور تاویل یوں ہوگی: أمسی الفردانية والوحدانية مختصین بالله۔ (وحدہ): حال مؤکدہ ہے۔ ای منفردا بالالوہیہ۔

له الملك: اپنے ماقبل جملہ (لا شریک لہ) کی تاکید ہے۔ ”ال“ جنیہ ہے۔ ای جنسہ مختص لہ۔ ولہ الحمد۔ یہ ”ال“ استغراق کا ہے۔ ای بجمیع افرادہ۔ اللهم انی أسألك: (فعل کا معمول مخذوف ہے)۔ ای نصیباً وافرًا وحظاً وافياً۔ وخیر ما فیہا سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

(۱) امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ ای: من خیر ما ینشأ فیہا وخیر ما یسکن فیہا۔ قال تعالیٰ ﴿وله ما سکن فی اللیل﴾ [

الانعام: ۱۳]

(۲) ابن حجرؒ لکھتے ہیں: ای مما أردت وقوعہ فیہا لخواص خلقک من الكمالات الظاہرة والباطنة، وخیر ما یقع فیہا من العبادات التي أمرنا بها فیہا أو المراد خیر الموجودات التي كان وجودها هذه الليلة وخیر کل موجود الآن۔ وأعوذ بک من شرها وشر ما فیہا: اس حدیث مبارکہ سے اظہار عبودیت اور افتقار الی تصرفات الربوبیہ کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) تمام امور شر و غیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ (۳)۔ بندہ کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ (۴) امت کو آداب کی تعلیم ہے۔

ابن الملكؒ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کا ان اوقات مخصوصہ میں اللہ جل شانہ سے مختلف چیزوں کا سوال کرنا، درحقیقت ان اوقات میں کی جانے والی طاعات سے مجاز ہے، اور استعاذہ ان ((اوقات میں سرزد ہونے والے ذنوب سے) طلب عفو سے مجاز ہے۔

قوله: اللهم انى أعوذ بك من الكسل والههم وسوء الكبر وفتنة الدنيا وعذاب القبر:

ان امور سے خصوصی طور پر پناہ مانگی ہے چونکہ ان امور سے متصف شخص مقصود حیات یعنی علم و عمل سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اس لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمِ شَيْئًا﴾ [النحل: ۷۰] اس تقریر کے ذریعہ ابن حجر کے کلام کا دفعیہ بھی ہو گیا، وہ لکھتے ہیں: حضور ﷺ "ہرم" سے اس وجہ سے پناہ مانگی کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے کہ جس کی کوئی دوا نہیں جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے: "وفتنة الدنيا: من الافتنان بها ومجتها۔ أو الابتلاء بفتنة فيها۔"

"عذاب القبر" سے مراد نفس عذاب قبر بھی ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے موجبات عذاب قبر مراد ہوں اور بظاہر دوسرے معنی مراد ہیں۔ واذا أصح.....

جب یہ دعا صبح کے وقت پڑھی جائے گی تو اس میں اللیلۃ کی بجائے الیوم پڑھا جائے گا یعنی یوں پڑھیں گے اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ هَذَا الْیَوْمِ نیز جہاں رات کی رعایت سے مَوْنُث کی ضمیریں استعمال ہوتی ہیں وہاں دن کی رعایت سے مذکر ضمیریں استعمال ہوں گی یعنی ہا کی جگہ ہ پڑھا جائے گا بقیہ عبارت جوں کی توں رہے گی۔

سوکر اٹھنے کی مسنون وعا

۲۳۸۲: وَعَنْ حَدِيثِهِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَخَذَ مَضْجَعَهُ مِنَ اللَّيْلِ وَضَعَ يَدَهُ تَحْتَ خَدِّهِ ثُمَّ يَقُولُ
اللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوتُ وَأَحْيَىٰ وَإِذَا سُبِقْتُ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ۔

(رواه البخاری ومسلم عن البراء)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۱۳ حدیث رقم ۷۳۹۴۔ وابوداؤد فی السنن ۳۱۱/۴ حدیث رقم ۵۰۴۹۔ والترمذی فی

السنن ۱۴۶/۵ حدیث رقم ۳۴۷۷۔ وابن ماجہ فی السنن ۱۲۷۷/۲ حدیث رقم ۳۸۸۰۔ واحمد فی المسند ۱۵۴/۵۔

ترجمہ: حضرت حدیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت بچھونے پر تشریف لاتے تھے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھتے یعنی دائیں رخسار کے نیچے رکھتے تھے پھر کہتے اے الہی تیرے نام کے ساتھ مرتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں میں تیرے نام کے ساتھ یعنی سوتا ہوں اور جاگتا ہوں اور جس وقت جاگتے تو کہتے سب تعریفیں اس خدا کے واسطے ہیں کہ جس نے جلایا (یعنی جگایا) ہم کو ہمارے مارنے کے بعد یعنی سلانے کے بعد اور اس کی طرف لوٹنا ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ براء سے۔

تشریح: قوله أخذ مضجعه من الليل وضع يده تحت خده:

مضجعه: جیم کے فتر کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: ضجع كمنع وضجعا وضجوعا وضع جنبه بالأرض،

والمضجع كمقعد موضعه اه۔

عرض مرتب: حدیث ۲۳۰۳ کے تحت اس کا امکان بھی لکھا ہے۔

أخذ مضجعه من الليل كما مطلب ہے: اتی فراشه ومرقده فی بعض أجزاء اللیل۔ امام طیبی نے یہاں تکلف سے کام لیا ہے، اور ابن حجر نے ان کی اتباع کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "كانه قيل أخذ حظه من الليل، إذ لكل أحد منه حظ

بالسكون والنوم والراحة، قال تعالى: ﴿جعل لكم الليل والنهار لتسكنوا فيه﴾ [القصص: ۷۳]

والمضجع مصدر اه۔

ایک روایت میں تحت خدہ کے بجائے ”تحت راسہ“ کے الفاظ آئے ہیں۔
عرض مرتب: اس حصہ سے متعلقہ کچھ کلام حدیث ۲۴۰۰ کے تحت آرہا ہے۔

اس بیعت میں اشارہ ہے کہ سونے والے شخص کو گویا کہ قبر میں رکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ جس شخص کو یہ بات متحضر ہوگی اس کی نیند میں نخت ہوگی اور دن اچھا گزرے گا۔

قولہ: اللهم باسمك اموت واحيي: بعض کا کہنا ہے کہ (اسم بول کر) سٹیٰ مراد ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ اسم زائد ہے۔ ای ربك جیسا کہ شاعر کے اس کلام میں ہے: ع الى الحول ثم اسم السلام عليكما۔

اموت واحيي: یعنی سوتا ہوں اور جاگتا ہوں۔ بعض نے اس کے معنی یوں بیان کئے ہیں: باسمك اعميت اموت وباسمك المحي اجا، او يذكر اسمك المحي احياء۔ او يذكر اسمك احياءا اجيت وعليه اموت۔

قرطبی فرماتے ہیں: باسمك اموت دلالت کر رہا ہے کہ اسم ہی سٹیٰ ہے۔ ای: انت تميتني وانت تحييني۔ یہ کلام اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرح ہے: ﴿سبح اسم ربك الاعلى﴾ [الاعلى: ۱۰] ای سبح ربك هكذا۔ (نقلہ ميرك)۔

قولہ الحمد لله احيانا بعد ما امانتنا واليه النشور: یعنی ہماری وہ قوت و حرکت ہمارے جسموں میں دوبارہ لوٹا دی کہ جس کو ہماری نیند کی حالت میں ہم سے زائل کر دیا گیا تھا۔

”اليه النشور“ نشور: نشر الميت نشورا اذا عاش بعد الموت وانشره الله۔ کا ایک مطلب یہ ہے کہ آخر کار موت کے بعد حساب اور جزاء و سزا کیلئے اس ذات باری تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بظاہر نشور سے مراد نیند کے بعد چاک و چوبند ہو کر تفرق فی طلب المعاش وغیرہ ہے۔ یہ دونوں امور موت اور بعث بعد الموت کے مشابہ ہیں۔

امام نووی فرماتے: ”امانتنا“ سے مراد ”نوم“ ہے، اور ”نشور“ نام ہے احياء للبعث بعد الموت کا۔ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں تشبیہ فرمائی ہے کہ نیند کے بعد بیداری، موت اور بعث بعد الموت کی طرح ہے۔

نیند کو موت کہنے کی وجہ:

ابو اسحاق زجاج فرماتے ہیں: نیند کے وقت جو نفس جسم سے جدا ہوتا ہے یہ نفس برائے تمیز ہے اور موت کے وقت جو نفس جسم سے جدا ہوتا ہے یہ نفس برائے حیات ہے اور یہ وہ نفس ہے کہ جس کے جسم سے رخصت ہو جانے کے بعد عمل نفس ختم ہو جاتا ہے، اور نیند کو موت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ عقل، حرکت، تمثیل و تشبیہ سب کچھ زائل ہو جاتا ہے اور کبھی موت پر مشقت احوال، فقر، زلت، سوال، ہرم، معصیت و جہل کیلئے بطور استعارۃ استعمال ہوتا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں: انقطاع تعلق الروح بالبدن ایسا مفہوم ہے جو نوم اور موت دونوں کو جامع ہے کبھی یہ ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ نیند۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں: ”النوم اخو الموت“۔ اور کبھی یہ باطناً ہوتا ہے، یہی موت ہے۔ قصہ مختصر نوم پر موت کا اطلاق مجاز کے قبیل سے ہے، چونکہ یہ دونوں انقطاع تعلق الروح بالبدن میں مشترک ہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں: نوم پر موت کا اطلاق کرنے کی حکمت یہ ہے کہ انسان کا حیات کے ذریعہ انقاع، اللہ کی رضا جوئی اس کی طاعت کا قصہ، اس کے سخط و عقاب سے اجتناب کرنے میں ہے، چنانچہ جس شخص سے یہ انقاع بالکل فوت ہو گیا تو گویا وہ میت کی طرح ہے۔ لہذا اللہ کی حمد و ثناء اس نعمت کے ہونے، اور اس مانع کے زائل ہونے پر ہے، اور یہ تاویل املنا واملنا الملك لله والحمد

للہ کے بھی مطابق ہے اور ان ارسلتها فاحفظها..... کے بھی موافق ہے۔ اسی اسلوب پر الیہ النشور بھی ہے۔ اسی والیہ المرجع والمآب فی نیل الثواب بما یکتسب فی الحیاة۔

علماء فرماتے ہیں سونے اور جاگنے کے وقت یہ اذکار وادعیہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ (دن بھر کے) اعمال کا خاتمہ بھی عبادت و طاعت پر ہو اور (دن کے) افعال کی ابتداء بھی عبادت ہی سے ہو۔

۲۳۸۳: وَمُسْلِمٌ عَنِ الْبَرَاءِ۔

اخرجه مسلم فی صحیحہ۔

ترجمہ: لیکن مسلم نے (حضرت حذیفہؓ) کی بجائے حضرت براءؓ سے روایت کیا ہے۔

فائدہ: واضح رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے، البتہ راوی مختلف ہیں اس حدیث کو حضرت حذیفہ سے اسی طرح امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

سونے کا مسنون طریقہ

۲۳۸۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَوَى أَحَدُكُمْ إِلَى فِرَاشِهِ فَلْيَنْفُضْ فِرَاشَهُ بِدَاخِلَةِ إِزَارِهِ فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي مَا خَلَفَهُ عَلَيْهِ ثُمَّ يَقُولُ بِاسْمِكَ رَبِّي وَضَعْتُ جَنْبِي وَبِكَ أَرْفَعُهُ إِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِي فَأَرْحَمَهَا وَإِنْ أَرَسَلْتَهَا فَأَحْفَظْهَا بِهَا تَحْفَظْ بِهٖ عِبَادَتِكَ الصَّالِحِينَ وَفِي رِوَايَةٍ ثُمَّ لِيَضْطَجِعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ ثُمَّ لِيَقْبَلْ بِاسْمِكَ (متفق علیہ) وَفِي رِوَايَةٍ فَلْيَنْفُضْهُ بِصِنْفَةٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَإِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِي فَأَغْفِرْ لَهَا۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۱۵/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۲۰۔ ومسلم فی صحیحہ ۲۰۸۴/۴۔ حدیث رقم (۶۴)۔

(۲۷۱۴)۔ ابوداؤد فی السنن ۳۱۱/۴۔ والترمذی فی السنن ۱۳۹/۵۔ حدیث رقم ۳۴۶۱۔ وابن ماجہ ۱۲۷۵/۲۔ حدیث

رقم ۳۸۷۴۔ والدارمی ۳۷۶/۲۔ حدیث رقم ۲۶۸۴۔ واحمد فی المسند ۲۹۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی سونے کے لیے اپنے بستر پر آئے پس اس کو چاہیے کہ اپنے بستر کو جھاڑے اپنی لنگی کے اندر کے حصے کے ساتھ کیونکہ وہ نہیں جانتا ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے بستر پر کیا چیز تھی اور پھر یہ دعا پڑھے۔ باسمک ربی وضعت جنبی و بک ارفعہ ان امسکت نفسی فارحمها وان ارسلتها فاحفظها بها تحفظ بها عبادتک الصالحین اور ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے بستر پر آئے تو اس کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنے بستر کو جھاڑے پھر اپنی داہنی کروٹ پر لیٹے اور پھر باسمک مذکورہ مال دعا آخر تک پڑھے۔ تخریج: اس حدیث کو اصحاب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

تشریح: اذا اوى: بقصر ومد دونوں طرح درست ہے۔ فلینفض: فاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ داخلة ازارہ: اسکے متعدد

مطلب بیان کئے گئے ہیں: (۱)۔ وہی حاشیة التی قلبی الجسد وتماسه۔ ۲۔ قیل ہی طرفہ مطلقا۔ ۳۔ قیل: مما یلی

طوقہ-۴۔ و فی القاموس: طرفہ الذی علی الجسد الایمن۔ خلفہ: بروزن نصر،

صنفة: اس لفظ کے ضبط و معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔: ففی مختصر النہایة صنفة ازارہ بکسر النون طرفہ مما یلی طرفتہ۔ قلت زاد الفارسی وقیل جانبہ الذی لا ھذب لہ۔ و فی القاموس صنفة الثوب کفرحة۔ و صنفة صنفتہ بکسرهما حاشیتہ ای جانب کان او جانبہ الذی لا ھذب لہ او الذی فیہ الھذب۔ اہ و فی المشارف فلینفضہ بصنفة ثوبہ بفتح الصاد و کسر النون فقیل طرفہ وقیل حاشیتہ وقیل ہی الناحیة التی علیہا ھذب وقیل الطرة و المراد هنا طرفہ فما ذکرہ ابن حجر بفتح المہملة و النون و الفاء مخالف لما فی کتب اللغۃ و الروایة۔

خلاصۃ الآراء: ۱۔ یہ لفظ تین طرح ضبط کیا گیا ہے: ۱۔ صاد کے فتح، اور نون کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ۲۔ ابن حجر کا بیان کردہ ضبط لغت و روایت ہر دو اعتبار سے اس کے مخالف ہے۔ ۳۔ اس کے معانی مندرجہ ذیل ہیں: ۱۔ طرف الثوب۔ ۲۔ حاشیۃ الازار التی تلی الجسد۔ ۳۔ طرفہ مما یلی طرفتہ۔ ۴۔ طرة۔ ۵۔ طرف۔

فلینفض: لنگی کے کونے سے جھاڑنے کا حکم اس لئے فرمایا کہ باہر کے کونے سے جھاڑنے سے اوپر کا کونہ یا حصہ میلا ہو جائے گا، جس سے بدنمائی پیدا ہوگی، پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثر اہل عرب کی حالت یہ تھی کہ ان کے پاس جسم کے کپڑوں ازار و رداء کے علاوہ کوئی کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ اس میں سہولت ہے چوتھی بات یہ کہ اس صورت میں کشف عورت کم سے کم ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس بناء پر تھا کہ اہل عرب کا رواج یہی تھا کہ سونے کا بستر دن رات بچھا ہی رہتا تھا (تمہ نہیں کرتے تھے)۔ فانہ لا یدری ما خلفہ: فانہ کی ضمیر شان بھی ہو سکتی ہے، اور اُحد کم کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے۔ اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ بستر تو بچھا ہوا تھا، تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے بستر پر کوئی کیڑا اکوڑا کوئی زہریلی چیز چڑھ گئی ہو۔ تمہارے بستر پر گرد و غبار، کوئی میل کچیل یا کوئی نجاست ہو، امام طیبی فرماتے ہیں: قام مقام بعدہ من تراب أو قذاة أو ہامة۔ ما خلفہ: میں ”ما“ استفہامیہ بھی ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ موصولہ ہو۔

باسمک ربی: آی باسمک القوى والقادر۔ ایک روایت میں بسم اللہ کے الفاظ ہیں۔ وضعت جنبی و بک: یہاں دو احتمال ہیں: (۱) آی باسمک۔ (۲) بمعونتك بحولك وقوتك و ارادتك و قدرتك۔ ان أمسکت نفسی: ایک روایت میں ان أمتھا کے الفاظ ہیں۔ وان أرسلتها: ایک روایت میں وان رددتھا کے الفاظ ہیں۔

”لنگی کے اندر کونے“ سے مراد کپڑے کا وہ حصہ یا کونا ہے جو اندرونی طرف اور بدن سے لگا ہوا ہوتا ہے خواہ وہ لنگی ہو یا کوئی اور لباس! نیز لنگی کے کونے سے جھاڑنے کے لئے اس لئے فرمایا ہے کہ باہر کے کونے سے جھاڑنے سے اوپر کا کونہ یا حصہ میلا ہو جائے گا جس سے بدنمائی پیدا ہو جائے گی۔

جب انسان سوتا ہے تو وہ گویا مردے ہی کے حکم میں ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کی روح عارضی طور پر قبض کر لیتا ہے پھر اس کے بعد اس کی روح کو اس کے جسم میں بھیج دیتا ہے یعنی اسے نیند سے بیدار کر دیتا ہے یا اس کی روح کو چھوڑتا ہے یعنی مستقل طور پر قبض کر لیتا ہے اور اس شخص پر موت طاری کر دیتا ہے چنانچہ اسی چیز کے بارے میں مذکورہ بالا دعا میں درخواست ہے کہ ”پروردگار! اگر تو سونے کی حالت میں میری روح کو رکھ چھوڑے اور مجھ پر موت طاری فرمادے تو اس صورت میں مجھے بخش دیجئے اور اگر میری روح کو واپس بھیج دے اور مجھے زندہ رکھے تو پھر اسی طرح میری نگہبانی فرمائیے جس طرح تو اپنے نیک بندوں کی نگہبانی فرماتا ہے یعنی نیکی و بھلائی کی توفیق دیجئے گناہوں سے بچائیے اور میرے ہر کام و فعل میں میرا معین و مددگار بنئے۔

”نیک بندوں“ سے مراد وہ بندے ہیں جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری اور عبادت و طاعت کے ذریعہ اللہ کا حق بھی ادا کرتے ہیں اور بندوں کے حقوق بھی جو ان کے ذمہ ہوتے ہیں پورا کرتے ہیں۔

دائیں کروٹ میں سونے میں حکمت یہ ہے کہ دل چونکہ بائیں پہلو میں ہوتا ہے اس لئے دائیں کروٹ سونے کی صورت میں دل لٹکار رہتا ہے جس کی وجہ سے نیند میں استراحت اور غفلت زیادہ نہیں ہوتی اور نماز تہجد وغیرہ کے لئے جاگنا آسان ہوتا ہے جب کہ بائیں کروٹ سونے کی صورت میں دل اپنی جگہ ٹھہرا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے نیند میں غفلت اور استراحت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ بات ہماری نسبت سے ہے، نبی کریم ﷺ کی بابت یہ بات درست نہیں، چونکہ نبی کریم ﷺ کا قلب اطہر سونا نہیں ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کے حق میں دائیں کروٹ یا بائیں کروٹ سونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

دائیں کروٹ پر سونے کی وجہ:

نبی کریم ﷺ دائیں کروٹ پر سونے کو (کئی وجہ سے) ترجیح دیتے تھے:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آپ ﷺ تمام مہتمم بالشان امور میں دائیں جانب کو پسند کرتے تھے۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت کو تعلیم دینا چاہتے تھے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ حالت درحقیقت حالت موت اور میت کے قبر میں رکھے جانے کے مشابہ ہے۔

سونے کے لیے بستر کو جھاڑنا مسنون ہے

۲۳۸۵: وَعَنِ الْبُرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَوَىٰ إِلَىٰ فِرَاشِهِ نَامَ عَلَىٰ شِقِّهِ الْأَيْمَنِ ثُمَّ قَالَ اللَّهُمَّ أَسَلَمْتُ نَفْسِي إِلَيْكَ وَوَجَّهْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ وَقَوَّضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِي إِلَيْكَ رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ أَمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَهُنَّ ثُمَّ مَاتَ تَحْتَ لَيْلَتِهِ مَاتَ عَلَىٰ الْفِطْرَةِ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِرَجُلٍ يَا فُلَانُ إِذَا أَوَيْتَ إِلَىٰ فِرَاشِكَ فَتَوَضَّأْ وَضُوءَكَ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ اصْطَجِعْ عَلَىٰ شِقِّكَ الْأَيْمَنِ ثُمَّ قُلِ اللَّهُمَّ أَسَلَمْتُ نَفْسِي إِلَيْكَ إِلَىٰ قَوْلِهِ أَرْسَلْتَ وَقَالَ فَإِنْ مِتُّ مِنْ لَيْلَتِكَ مِتُّ عَلَىٰ الْفِطْرَةِ وَإِنْ أَصْبَحْتَ أَصْبَحْتَ خَيْرًا - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۶۲۱/۱۳ - حدیث رقم ۷۴۸۸ - و مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۱/۴ حدیث رقم (۵۶) - (۲۷۱۰) - و الترمذی فی السنن ۱۳۵۰/۵ حدیث رقم ۲۳۴۵۴ - و ابن ماجہ ۱۲۷۵/۲ حدیث رقم ۳۸۷۶ - و الدارمی ۳۷۶/۲ حدیث رقم ۲۶۸۳ - و احمد فی المسند ۲۸۵/۴ -

ترجمہ: حضرت براء بن عازب کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے بستر پر سوتے تو دائیں کروٹ پر سوتے تھے اور سونے سے پہلے یہ دعا پڑھتے تھے - اللھم اسلمت نفسی الیک ووجھت ووجهی الیک وافرقت امری الیک وابتحت ظہری الیک لا رغبت ولا رهبة الیک لا ملجأ ولا منجأ منک الا الیک امنت بکتابک الذی انزلت وبنبیک الذی ارسلت - آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے سونے سے پہلے ان کلمات کو پڑھا اور پھر وہ اسی رات مر گیا تو وہ دین اسلام پر مرا - ایک اور روایت میں یوں آیا ہے کہ حضرت براء کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

ایک شخص سے فرمایا۔ اے فلاں شخص جب تم اپنے بستر پر لیٹو تو نماز کے وضو کی طرح وضو کرو اور پھر داہنی کروٹ پر لیٹو اور اللہم اسلمت نفسی ازسنت تک پڑھو۔ یعنی مذکورہ بال دعا پڑھو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس رات تمہاری موت واقع ہو جائے تو تم دین اسلام پر مرو گے اور اگر تم نے صبح کر لی تو بہت زیادہ بھلائیوں کو پالو گے۔

تشریح: شقہ: شین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نفسی: یاء کو مبنی علی السکون اور مبنی علی الفتح دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ الیک: ای مائلة الی حکمک۔

عرض مرتب: اس تقدیری عبارت سے یوں لگتا ہے کہ الی کا متعلق مذکورہ نہیں بلکہ مائلة محذوف ہے جو حال واقع ہو رہا ہے۔ اور الیک اصل میں الی حکمک تھا، مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اسی کی جگہ رکھ دیا گیا ہے۔ رغبة ورہبہ: بعض کا کہنا ہے کہ یہ مفعول لہ ہیں البجات کیلئے اور امام طیبی فرماتے ہیں: یہ دونوں اسم منصوب علی العلة (یعنی مفعول لہ) ہیں، البتہ لف وشر ہے۔ (گو یا اصل عبارت یوں ہے): ای: فوضت اموری طمعا فی ثوابک، والبجات ظہری من المکارہ الیک مخافة من عذابک اہ۔ یہ معنی بالکل صحیح ہیں بلکہ اس میں صنعت بدیع بھی ہے۔ ابن جرّ نے اس پر بھی اعتراض کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: هذا تحکم، والوجه بل الصواب ما ذکرته من أن کل ما ذکر معلل بالرغبة والرہبہ اہ۔ اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ دونوں اسم (اسم فاعل کے معنی میں ہو کر) حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

ای: راغباً وراہباً: یا منصوب علی الظرفیہ ہیں ای: فی حال الطمع والخوف۔ ان دونوں میں ما قبل کے تمام افعال کا تنازع ہے۔ الیک: رغبة کے متعلق ہے، اور رہبہ کا متعلق محذوف ہے۔ ای: منک۔ بالخذوف ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہے: متوجھا لہما الیک۔ علامہ کرمائی فرماتے ہیں: ای طمعا فی ثوابک وخوفاً من عقابک اور الیک: رغبة کے متعلق ہے، جیسا کہ عرب کا یہ قول: علفتھا تبنا و ماء اباردا، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ ان دونوں کا الیک کے بارے میں تنازع ہو۔ ای: رغبتی الیک۔ یہ مفہوم بالکل واضح ہے، ورہبتی الیک اور اس کے معنی یہ ہوں گے: انی حالة الخوف لا ارجع الا الیک فانہ لا ملجأ ولا منجأ منک الا الیک۔ ملجأ: مہوڑ ہے اور منجأ مقصور ہے۔ کبھی ”ازدواج“ کی وجہ سے منجأ کو بھی مہوڑ العین پڑھا جاتا ہے اور کبھی اسی وجہ سے اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

عرض مرتب: بظاہر یوں سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی ازدواج کی وجہ سے منجأ کو بھی مقصور پڑھ دیا جاتا ہے۔ اہ۔

کرمائی فرماتے ہیں: منجأ اسم مقصور ہے، اس کا اعراب ”عصا“ کی طرح ہے باقی رہی یہ بات کہ اس کو توین کے ساتھ پڑھا جائے یا بغیر توین کے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ترکیب چونکہ لا حول ولا قوۃ کی طرح ہے، لہذا اس کو بھی پانچ طرح سے پڑھنا درست ہے۔ حالت نصی اور مبنی علی الفتح میں توین کے ذریعہ فرق ہوگا، اور توین کے وقت الف ساقط ہو جائے گا۔ فرماتے ہیں: منجأ اور منجأ گردونوں مصدر ہوں تو ان دونوں کا منک کے بارے میں تنازع ہوگا، اور اگر یہ دونوں اسم مکان ہوں تو (تنازع) نہیں ہوگا، کیونکہ اسم مکان عمل نہیں کرتا، اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: لا ملجأ منک الی أحد الا الیک ولا منجأ الا الیک۔ آمنت: جملہ متانفہ تعلیلیہ ہے۔

نفسی سے مراد ذات ہے، اور وجہی سے مراد جہتی و توجہی و قصد قلبی ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہاں اس حدیث میں ”نفس“ اور ”وجہ“ دونوں ذات کے معنی میں ہے یعنی جعلت ذاتی طائعة لحکمک و منقادۃ لک۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ان أسلمت اشارة الی أن جوارحہ منقادۃ لله تعالیٰ فی أوامره و نواہیہ امام طیبی کا یہ کلام انتہائی مستقیم ہے، اس پر ابن جرّ نے اعتراض کیا ہے: یہ مقام نوم ہے یہاں کسی ”تکلیف“ یہ اعتراض یوں دور ہو جاتا ہے کہ امام طیبی کی مراد تحقق نوم کا وقت نہیں ہے، جیسا کہ کسی بھی شخص

پر مخفی نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ارادہ نوم کے وقت یا نوم سے پہلے مطلقاً۔ اس حدیث مبارکہ سے لطیف یہ اشارہ ملتا ہے کہ مسلمان کیلئے مناسب ہے کہ وہ اس وقت بھی اللہ کی طرف متوجہ ہو، تاکہ جب سوئے تو مطہج ہونے کی حالت میں ہو۔ ہماری اس بات کی تائید امام طیبیؒ کے اس کلام سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں: فوضت أمری الیک: فیہ اشارۃ الی أن أمورہ الخارجة والداخلة مفوضة الیہ لا مدبر لها غیرہ اھ۔

اور مطلب یہ ہے کہ میں اپنے تمام امور میں آپ پر توکل کرتا ہوں۔ والعجبت ظہری الیک: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: فیہ اشارۃ الی أنه بعد تفویض أمورہ الی ہو مفتقر الیہا وبہا معاشہ وعلیہا مدار أمرہ ملتجئ الیہ مما یضرہ ویؤذیہ من الأسباب الداخلۃ والخارجۃ۔

آمنت بکتابک الذی أنزلت اور منزل علیہ محذوف ہے۔ ائی: أنزلت علی۔ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے کہ جو ان اخلاق بہیہ، مقامات علیہ اور حالات سنہ کو اپنانے پر ابھارتا ہے۔ چنانچہ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ”آمنت بکتابک“ تخصیص بعد التعمیم ہے۔ ابن حجرؒ نے اس عام معنی پر توجہ نہ دی اور امام طیبیؒ پر اعتراض کر بیٹھے: لا تعمیم فیما ذکرہ لأن الفعل فی حیز الاثبات، لا عموم فیہ کالذکرۃ الی بھی کذلک۔ تا مل کرنے سے ابن حجر کی بات کا خلل بالکل واضح ہو جائے گا۔

دینک الذی أرسلت، ایک نسخہ میں نیک کے الفاظ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے اوپر ایمان لانے کا بھی ذکر فرمایا، چونکہ نبی کریم ﷺ رسول برحق تھے، چنانچہ آپ ﷺ پر لازم تھا وہ اس امر ربی کی تصدیق فرمائیں، اور امت کو تعلیم ہے اسی لئے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: وأشهد أنى رسول الله۔ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا۔ احادیث نبویہ سے متعلق علوم خاصہ پر ایمان لانے کو متضمن تھا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: تخصیص از تخصیص ہے۔ ابن حجر نے ان پر عجیب و غریب اعتراض کیا ہے۔ وقال: کما یعلم من تأملک ما قالہ وما قلته۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ابن حجر اگر خود تا مل کر لیتے تو ہمیں تا مل کرنے کا حکم نہ دیتے لہذا تا مل کریں اور اللہ ہی پر توکل کریں۔

ثم مات تحت لیلة: ائی تحت حادثہ فیہا۔ ابن حجرؒ نے ”عجب العجائب“ بات کہی ہے لکھتے ہیں: ائی عقب طلوع فجرہا۔ ایک طرف ابن حجر کی ذکر کردہ تشریح، اگلی حدیث کے منصوص الفاظ کے مخالف ہے: فان مات من لیلتک أو فی لیلتک مت علی الفطرۃ: وان أصبحت أصحبت خیرا۔ دوسری وجہ یہ کہ دوسری طرف طیبیؒ کی اس بات پر اعتراض کیا ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: ومعنى تحت لیلة أنه لم ینجاوز عنہ الی النہار، لأن اللیل یسلخ منہ النہار فهو تحتہ، أو یکون بمعنی: ان مات تحت نازلة علیک من لیلتک وأی من أجل ما یحدث لیلتک۔ اس پر ابن حجر لکھتے ہیں: وفی جمیعہ نظر۔ وکون اللیل سلخ منہ النہار لا یؤید ما ذکرہ أولا فی معنی التحت کما هو واضح، أو یکون: فی غایۃ البعد والتکلف والأحسن عندی أن سبب التعبير بالتحت أن اللہ جعل اللیل لباسا، فالناس مغمورون ومستورون تحتہ کالمستور تحت ثیابہ ولباسہ وهذا معنی واضح جدا، فالعدول الی ما ذکرہ الشارح من الأمرین السابقین عدول عن الجوهراء الی الصراف۔ اھ۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، امام طیبیؒ نے اولاً جو بات ذکر کی ہے وہ بھی بعینہ یہی بات ہے ”جلد“ لباس کے مشابہ ہے، چنانچہ دونوں آیات کا حاصل ایک ہی ہے، باوجودیکہ ابن حجر کا آخری کلام ان کے اپنے آغاز کلام کے مناقض ہے۔ ابن حجر کے اعتراضات کا سبب ان فقہی مسائل میں عجب و غرور اور ضاعات بدیعیہ کے دقائق سے جہالت، اعتبارات عربیہ کے حقائق کی عدم فہم ہے۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود امام طیبیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں: نوکان سبب وقوعہ فیما علمت من المواضع الی رد دتہا علیہ قولہ اول شرح

هذا الحديث أن فيه غرائب وعجائب لا يعرفها الا الفقهاء من أهل البيان۔ فكان ذلك وقع منه تبجحاً، فلم يصب الجادة الواضحة في أكثر شرحه، كما يعلم بتأمل ما ذكره وما ذكرته اه۔ ان دونوں کے کلام میں تامل کے نتیجے میں دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے کہ ابن حجر طیبی کی عقل کو نہیں پہنچ پائے، اور طیبی کی تحقیق و تدقیق کا ارادہ کر بیٹھے۔ اور فضیلت تو متقدم کیلئے ہے، اور اجر کامل بھی اسی کیلئے ہے، اور ان سے جو صادر ہوا وہ ”تبجح“ نہیں تھا بلکہ از روئے تحدّث تھا، اور ان کی سچائی کی علامت یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے ان کو یہ توفیق بخشی کہ وہ ان کے کلام و مرام کو مزین و مبین فرمائیں، اور امید ہے کہ وہ اس حدیث کے مصداق ہیں: ان اللہ یبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها۔ اس حدیث کو ابو داؤد، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ (کما ذکرہ شیخ مشایخنا الحافظ الجلال السیوطی فی جامعۃ الصغیر) اگر ابن حجر کی شرح کا تتبع کیا جائے تو وہ فروغ فقہیہ اور کلمات اعتراضیہ کے علاوہ کوئی چیز ان کے پاس نہ بچے، اور یہ بات انصاف پر مبنی نہ ہوگی کہ حلویات کی نسبت خود ان کی طرف اور مریات کی اسناد ان کے زعم کے مطابق ان کے بھائی کی طرف کی جائے، بلکہ ان کیلئے کی جائے۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود ہم اللہ جل شانہ سے امیدوار ہیں کہ وہ ان پر مؤاخذہ نہیں کرے گا۔

قال رسول الله ﷺ لرجل: امام طیبی کا بیان ہے کہ وہ صاحب اسید بن حضیر تھے، سوتے وقت وضو کرنا مندوب ہے۔ فتوضاً ووضوءك: (یہاں تقدیری عبارت یوں ہے): ووضوءك كاملاً مثل وضوءك للصلاة: (اس تقدیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوءك سے پہلے مضاف محذوف ہے، جو نائب عن المفعول المطلق بن رہا ہے)۔ وقال: فان..... اس قال کا فاعل ہے نبی کریم ﷺ ہوں تو اس قال کے قائل حضرت براء ہوں گے، اور اس کا عطف قال رسول الله لرجل: پر ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا فاعل حضرات براء ہوں، اُمی قال البراء ایضاً، علیہ السلام، اس صورت میں اس کا عطف قال پر ہوگا، لیکن اس تقدیر سے وقف کا شبہ ہوتا ہے، اگرچہ اس جیسی بات عقل کے بل بوتے پر نہیں کہی جاسکتی۔ اس حصہ کے مرفوع ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہ خطاب صحابی سے ہے اور کسی صحابی کو اس قسم کی بات کہنا روانہ نہیں۔ فان مت: میم پر ضمر پڑھنا بھی درست ہے اور کسرہ پڑھنا بھی درست ہے۔ من لیلتك: ایک نسخہ میں فی لیلتك ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس روایت کے بعض طرق میں یوں آتا ہے: قال: قلت: ورسولك الذي ارسلت۔ فقال: ونبیک۔ آنحضرت ﷺ ان کی تردید اس لئے کی کہ ورسولك کہنے کی صورت میں الذي ارسلت محض مفید تائید ہوگا، بعض لوگوں کے اس کلام کا مطلب بھی یہی ہے: لأن البیان صار مكرراً من غير افادة زيادة في المعنى وذلك مما بأمانة التبليغ اه۔

اور ممکن ہے کہ فائدہ مقدر ہو، کہ یہ کہا جائے: الذي أرسلته اليها أو أرسلته الى الخلق، كافة۔ باوجودیکہ تائید و بلغاء کے کلام میں بھی واقع ہوئی ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ [انعام: ۳۸] ﴿فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ [النحل: ۲۶] البتہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ما من صباح يصبح العباد فيه اس قبیل سے نہیں ہے، بخلاف ابن حجر کے، انہیں وہم ہوا ہے۔ زیادہ واضح وجہ تردید یہ ہے کہ ما ثور دعاؤں میں تغیر لفظی نہ کیا جائے، اور اسی طرح احادیث بھی، اور ”تصانيف“ بھی اسی معنی میں ہیں۔ حدیث کو بالمعنی نقل کرنے کی اجازت بھی اسی وقت ہے کہ جب مجبوری ہو اور الفاظ بعینہ یاد نہ ہوں، چونکہ مالا یدرک و کلمہ لا یتروک کلمہ الفاظ حدیث یاد ہونے کے باوجود نقل بالمعنی کرنے میں اندیشہ ہے کہ کہیں اس حدیث کی وعید میں نہ آجائے۔ من کذب علی متعمداً فليتبوأ مقعده من النار۔ اسی وجہ بعض محققین فرماتے ہیں: قواعد نحویہ کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے، محافظت بخارج اور صفات حرفیہ کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: النبی فعیل بمعنی فاعل للمبالغہ، نبی بمعنی خبر سے ماخوذ ہے۔ وجہ مناسبت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ جل شانہ کی خبریں دیتے ہیں۔ اس لکھ میں تحقیق ہمزہ بھی درست ہے۔ اور تخفیف ہمزہ کے ساتھ ”نبی“ پڑھنا، بھی درست ہے، اس صورت میں یہ نباوۃ بمعنی شئی مرتفع (بلند چیز) سے ماخوذ ہوگا، جس وقت حضرت براء نے ورسولک الذی ارسلت فرمایا، تو نبی کریم ﷺ نے ان کا رد فرمایا، تا کہ دونوں لفظ مختلف ہو جائیں، اور ارتفاع وارسال دونوں طرح کی ثناء جمع ہو جائے، اور دونوں حالتوں میں نعت شمار ہو، اور دونوں صورتوں میں تعظیم ”مستہ“ بھی حاصل ہو جائے۔ نبی کی علت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ رسول ہونے سے پہلے نبی تھے، میں نے نووی کا کلام دیکھا ہے کہ انہوں نے ماوردی وغیرہ کے بیان کردہ سبب نبی کو مستحسن قرار دیا ہے، کہ اذکار تعبد میں یہ مروی الفاظ پر (ہی) اقتصار کرنا چاہئے، اور جزاء بھی اس کے ساتھ متعلق ہے اور ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ان کلمات کی وحی آئی ہو۔ لہذا ان کی ادائیگی بعینہ متعین ہے۔ اھ۔ فالحمد لله علی التوارد فی المحافظة علی الواردة۔

ایک روایت میں الفاظ آئے ہیں: ولیجعلهن آخر ما یتکلم به۔

۲۳۸۶: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا أَوَى إِلَى فِرَاشِهِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَّفَنَا وَأَوَانَا مِمَّنْ لَا كَافِيَ لَهُ وَلَا مُؤْوَى۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۵/۴ حدیث رقم (۶۴۔ ۷۱۵)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۱۲/۳ حدیث رقم ۵۰۵۳۔
والترمذی ۱۳۶/۵ حدیث رقم ۳۴۵۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے بستر پر تشریف لاتے تو یہ کہتے: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَّفَنَا وَأَوَانَا مِمَّنْ لَا كَافِيَ لَهُ وَلَا مُؤْوَى۔ (مسلم)

تشریح: کفانا: یعنی جس نے ہم سے موزیوں کے شر کو دور رکھا، ہماری مہمات کیلئے ہمیں کافی ہو گیا اور ہماری حاجت برآری کی۔ آوانا: امام نوویؒ فرماتے ہیں: اوی ممدود و مقصود دونوں طرح ہے، البتہ مد کے ساتھ فصیح و مشہور ہے، ان دونوں میں تصریح منقول ہے اور مد بھی منقول ہے اہ یعنی اللہ نے ہمیں مسکن عنایت فرمایا۔ ابن حجر اس مفہوم میں اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: مع تيسير الخدم وتوفر المؤن في السلامة خاليامن الأمراض والمحن اھ۔ واضح رہے کہ حدیث سے یہ مفہوم مستفاد نہیں ہو رہا۔

فکم ممن لا کافی له ولا مؤوی: ”کافی“ یا کے فتح کے ساتھ ہے، بعض نسخوں میں (لفظ کافی) ہمزہ کے ساتھ ہے یہ سہو ہے۔ ”مؤوی“ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہاں ”کہ“ مقدر ہے، امی ولا مؤوی لہ۔ یعنی دنیا میں کتنے ایسے افراد ہیں کہ ان کے دشمنوں کے شر سے اللہ ان کی کفایت نہیں کرتا، بلکہ ان کو اور ان کے شر کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے، حتیٰ کہ ان کے دشمن ان پر غالب آگئے۔

دعا کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اس وسیع و عریض دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جو روزمرہ کی تکلیف و پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو تکالیف و پریشانیوں سے محفوظ نہیں رکھتا بلکہ وہ ان پر غالب رہتی ہیں چنانچہ نہ صرف یہ کہ وہ لوگ اپنی روزمرہ کی ضروریات زندگی ہی میں رحمت خداوندی کی التفات سے محروم رہتے ہیں بلکہ قضا و قدر خداوندی کے تحت ان کو سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ بھی میسر نہیں ہوتا بلکہ وہ کوچوں بازاروں میں فٹ پاتھ اور سڑکوں پر اور جنگلات و ویرانوں میں اپنی سخت کوش زندگی کی گھڑیاں گزارتے ہیں نہ انہیں گرمی سے بچنے کی راحت نصیب ہوتی ہے اور نہ سردی کی ایذاء تکلیف سے نجات کی کوئی پناہ گاہ۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہاں آوانا کے معنی ہیں: رحمننا، چنانچہ ممن لا مؤوی لہ کا مطلب ہوگا: امی لا راحم و عاطف

امام طبری فرماتے ہیں: ایسا قلیل و نادر ہے، یہ مفہوم، ”کم“ کے مقتضی کے مناسب نہیں، چونکہ ”کم“ کثرت کے معنی رکھتا ہے، مزید یہ کہ کلام کا آغاز بھی اطعمنا سقانا سے ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حدیث مبارکہ اس آیت قرآنی جیسا مفہوم رکھتی ہو: ﴿ذَلِكَ بَانَ اللّٰهُ مَوْلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاِنَّ الْكَافِرِيْنَ لَمَوْلٰى لَهُمْ﴾ [محمد: ۱۱] چنانچہ (حدیث کا) مطلب یہ ہوگا کہ ہم اللہ جل شانہ کی حمد و ثناء بیان کرتے ہیں اس بات پر کہ اس نے اپنی نعمتوں کی ہمیں پہچان کروائی اور پھر ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی، بہت سے منعم علیہ ایسے ہیں کہ وہ اپنے رب کی نعمتوں کو نہ پہچانتے ہیں اور نہ شکر ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح (آیت کا مطلب یہ ہے کہ) اللہ کل کائنات کا مولیٰ ہے بایں معنی کہ وہ سب کا رب ہے، سب کا مالک ہے، لیکن مددگار و محبت صرف مسلمانوں کا ہے، لہذا ”فکم“ کی فاء تعلیلیہ ہے، مولانا عصام الدین رحمہ اللہ (بھی تقریباً یہی) فرماتے ہیں: قوله: فکم ممن لا کافی له من قبیل قوله تعالیٰ ﴿لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ مع ان الله تعالیٰ مولى كل احد اى لا يعرفون مولى لهم فلم لم يتفرع على كفانا بل على معرفة الكافى التى يستفاد من الاعتراف و انما حمد الله تعالى على الطعام و السقى و كفاية المهمات فى وقت الاضطجاع لان النوم فرغ الشبع و الرى و فراغ الخاطر عن المهمات و الامن من الشرور۔ وقال النووى معنى آوانا هنا رحمتنا و قوله کم من من لا مؤوى له اى لا راحم له ولا عاطف عليه

۲۳۸۷: وَعَنْ عَلِيٍّ اَنْ فَاطِمَةَ اَتَتْ النَّبِيَّ ﷺ تَشْكُرُ اِلَيْهِ مَا تَلَقٰى فِى يَدِهَا مِنَ الرَّحْمٰى وَبَلَغَهَا اَنَّهُ جَاءَهُ رَفِيْقٌ فَلَمْ تَصَادِفْهُ فَذَكَرَتْ ذَلِكَ لِعَائِشَةَ فَلَمَّا جَاءَ اَخْبَرَتْهُ عَائِشَةُ قَالَتْ فَجَاءَنَا وَقَدْ اَخَذْنَا مَضْجِعَنَا فَذَهَبْنَا نَقُوْمٌ فَقَالَ عَلِيٌّ مَكَانِكُمْمَا فَجَاءَ فَقَعَدَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهَا حَتّٰى وَجَدْتُ بُرْدَ قَدَمِيْهِ عَلٰى بَطْنِيْ فَقَالَ اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى خَيْرٍ مِّمَّا سَأَلْتُمَا اِذَا اَخَذْتُمَا مَضْجِعَكُمَا فَسَبِّحَا ثَلَاثًا وَتَلَايْنِ وَاَحْمَدَا ثَلَاثًا وَتَلَايْنِ وَكَبِّرَا اَرْبَعًا وَتَلَايْنِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِّنْ خَادِمٍ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۰۶/۹۱۔ حديث رقم ۵۳۶۱ و مسلم ۲۰۹۱/۴ حديث رقم (۸۰۔ ۲۷۲۷) و ابوداؤد فى السنن ۳۱۵/۴ حديث رقم ۵۰۶۲۔ و الترمذى ۱۴۲/۵ حديث رقم ۳۴۶۹ و احمد ۸۰/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ (میری زوجہ محترمہ اور نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی) حضرت فاطمہؓ نبی کریم ﷺ کے ہاں اس غرض سے حاضر ہوئیں کہ چکی پیسنے کی وجہ سے ان کے ہاتھ جس زحمت و مشقت میں مبتلا تھے اس کی شکایت آنحضرت ﷺ سے کریں (اور کوئی خدمتگار مانگیں) کیونکہ حضرت فاطمہؓ کو معلوم ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ غلام آئے ہیں مگر (اس وقت) آپ ﷺ سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا (یعنی ان سے کہا کہ جب آنحضرت ﷺ تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ فاطمہؓ اپنی مشقت و تکلیف کے پیش نظر ایک غلام مانگنے حاضر ہوئی تھیں) پھر جب آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ کا پیغام آپ ﷺ تک پہنچا دیا۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ ہمارے ہاں اس وقت تشریف لائے جب کہ ہم اپنے بستر پر لیٹ چکے تھے (آپ ﷺ کو دیکھ کر ہم نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اپنی جگہ پر لیٹے رہو“ پھر آپ ﷺ ہمارے نزدیک) تشریف لائے اور میرے اور فاطمہؓ کے درمیان بیٹھ گئے یہاں تک کہ میں نے اپنے پیٹ پر آپ ﷺ کے مبارک قدموں کی ٹھنڈک محسوس کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا (مجھے فاطمہؓ کا پیغام مل گیا ہے) کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتلا دوں جو اس چیز (یعنی غلام)

سے بہتر ہے جو تم نے مانگی تھی اور وہ یہ کہ جب تم اپنے بستر پر آؤ تو تینتیس بار سبحان اللہ تینتیس بار الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر کہو تمہارے لئے خادم سے یہ چیز بہتر ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: تشکو الیہ مفعول لہ ہے، اور ان کو تخفیف کی غرض سے حذف کر دیا ہے، اے أنت الیہ ارادۃ ان تشکو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ أنت کے فاعل سے حال مقدرہ ہے، اے مقدرۃ الشکوٰی، فی یدھا۔ ایک نسخہ میں ”فی یدیہا“ کے الفاظ ہیں۔ من الحی: (یہاں دو مضاف محذوف ہیں)۔ اے انور اداۃ الروحی۔ وبلغھا: أنت کی ضمیر سے حال ہے (اور تو مقدر ہے) اے: وقد بلغ فاطمہ۔ اُنہ: یہ ضمیر شان ہے۔ رقیق: کے معنی ہیں: مملوک، کبھی اس کا اطلاق جمع پر بھی ہوتا ہے، فذکرت کا عطف أنت پر ہے۔ فلما جاء اخبرته عائشہ۔ متون کے نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے، بخلاف شرح کے نسخوں کے۔ فجاءنا وقد أخذنا مضاجعنا: (وقد أخذنا مضاجعنا حال ہے، اور جاء کی ضمیر ذوالحال ہے)۔ اے: جاء النبی ﷺ حال کوننا مضطجعین۔ ابن حجر کا (اس جملہ کی بابت تشریح کی) کلام فجا آنا اے: هو وہی بظاہر عربیت کے مطابق نہیں ہے۔

فذهبنا نقوم: (ذهب فعل شروع کرنے کے معنی میں ہے) اے شرعنا و قصدنا لنقوم لہ۔ علی مکارنکما: اے: اثبتنا علی ما أنتما علیہ من الاضطجاع۔ ابن حجر لکھتے ہیں: اے الزماہ ولا تقوما اور مراد یہ ہے: دو ما و اثبتنا علی ما أنتما علیہ، ابن حجر نے برعکس کیا، چونکہ پہلے معنی حاصل معنی ہیں۔ بورد قدمہ: ایک نسخہ میں بورد قدمیہ ہے۔

فجاء فقعد..... علی بطنی: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ اور حضرت علیؑ ایک ہی لحاف میں تھے، اور حضرت علیؑ کا ستر کے علاوہ باقی بدن برہنہ تھا۔ ابن حجر کا یہ کہنا بلا دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی قدمہاں مبارک (ان کے اوپر) رکھے تھے۔ اور اسی طرح یہ کہنا بھی بلا دلیل ہے: اُنہ وضع قدمیہ علی بطنھا لیسری الیہما۔ ان دونوں کا غلام مانگنا ممکن ہے کہ بزبان قال ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بزبان حال ہے، یا ان کی رضا بمنزلہ سوال کے ہو، یا اس وجہ سے کہ عورتوں کی ضرورت مردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ (غلام طلب کرنے تو حضرت فاطمہ الزہراءؑ تنہا گئیں تھیں، حضرت علیؑ ان کے ہمراہ نہ تھے لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے طلب غلام کی نسبت ان دونوں کی طرف فرمائی) تقدیم تاخیر۔

ابن حجر کی یہ بات: اَنہ لم تأت للسؤال الا باذن علی۔ احتمال کی حد تک تو درست ہے، بالجزم درست نہیں ہے۔ ابن حجر نے یہاں یہ کلام مقدر بھی ذکر کیا ہے: قالوا: نعم، اس تقدیری کلام کی بھی کوئی حاجت نہیں، چونکہ الامیں احتمال یہ ہے کہ یہ برائے تشبیہ ہو، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ہمزہ استفہام کا ہو، چونکہ دلالت الی الخیر کی طرف میلان معلوم تھا اس لئے جواب سے پہلے ہی فرمادیا: اذا أخذتما.....

مذکورہ بالا کلمات کی ترتیب کے سلسلہ میں جزئی نے شرح مصابیح میں کہا ہے کہ تکبیر پہلے ہے چنانچہ ابن کثیر فرمایا کرتے تھے کہ نمازوں کے بعد تو پہلے سبحان اللہ پڑھنا چاہئے اس کے بعد الحمد للہ اور پھر اللہ اکبر لیکن سوتے وقت پہلے اللہ اکبر ہی پڑھ لینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں علماء لکھتے ہیں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ اکبر کو کبھی تو پہلے پڑھا جائے اور کبھی بعد میں تاکہ اس بارہ میں منقول دونوں روایتوں ہی پر عمل ہو اور یہی اولیٰ اور زیادہ بہتر ہے۔

بظاہر اس عدد کی تحصیل مقصود ہے، اور جن سے بھی ابتدا ہو کوئی نقصان کی بات نہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر لا یضربک بأیہن بذات۔ تکبیر میں زیادتی کی تخصیص اشارہ ہے کہ اثبات عظمت و کبریائی میں مبالغہ مقصود ہے، چونکہ یہ ان تمام صفات تزییہہ اور شوقیہ کو مستلزم ہے کہ جو صفات تسبیح و حمد سے مستفاد ہیں۔ واللہ اعلم۔

خادم: واحد ہے، اور جمع خدم آتی ہے، اس کا اطلاق مذکر مؤنث دونوں پر ہوتا ہے۔
 ارشاد گرامی ”تمہارے لئے یہ چیز خادم سے زیادہ بہتر ہے“ کے ذریعہ حضرت فاطمہؑ کو دنیا کی مشقتوں اور تکالیف اور دنیاوی طور پر ناپسندیدہ چیزوں مثلاً مرض و فقر پر صبر کی ترغیب دلائی گئی ہے نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ شکر کرنے والے مالدار کی بنسبت صبر کرنے والا مفلس زیادہ افضل ہے۔ ابن حجر نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔

۲۳۸۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَتْ فَاطِمَةُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ تَسْأَلُهُ خَادِمًا فَقَالَ أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى مَا هُوَ خَيْرٌ مِنْ خَادِمٍ تَسْبِيحِينَ اللَّهُ ثَلَاثًا وَتَحْمِيدِينَ اللَّهُ ثَلَاثًا وَتَلَاثِينَ وَتَكْبِيرِينَ اللَّهُ أَرْبَعًا وَتَلَاثِينَ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَعِنْدَ مَنَامِكَ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۹۲/۴ حديث رقم (۸۱-۲۷۲۸)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرہؑ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس مقصد سے حاضر ہوئیں کہ آپ ﷺ سے کوئی خادم مانگیں لیکن آپ ﷺ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ جب آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ (حضرت فاطمہؑ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتا دوں جو خادم سے بہتر ہے (اور وہ یہ ہے کہ) ہر نماز کے بعد اور سوتے وقت سبحان اللہ تینتیس بار اور الحمد للہ تینتیس بار اور اللہ اکبر چونتیس بار پڑھ لیا کرو۔“

تشریح: اس حدیث میں سوال کی نسبت خصوصی طور پر حضرت فاطمہ کی طرف ہے، چونکہ طلب خادم کا باعث اصل حضرت فاطمہ تھیں، یا یہ حدیث (روایت باللفظ نہیں ہے بلکہ) روایت بالمعنی ہے یا راوی نے اختصار کیا ہے، واللہ اعلم سونے کے وقت ان تسبیحات کا پڑھنا دن بھر کی مشقت و کوفت اور ہر قسم کے رنج و غم کو دور کرتا ہے۔

الفصل الثالثی:

صبح و شام کی دعا

۲۳۸۹: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَصْبَحَ قَالَ اللَّهُمَّ بِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيَى وَبِكَ نَمُوتُ وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ وَإِذَا أَمْسَى قَالَ اللَّهُمَّ بِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْيَى وَبِكَ نَمُوتُ وَإِلَيْكَ النُّشُورُ . (رواه الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۳۱۷/۴ حديث رقم ۵۰۶۸۔ و الترمذی ۱۳۴۱۵ حديث رقم ۳۴۵۱۔ و ابن ماجه ۱۲۷۳/۲ حديث رقم ۳۸۶۸۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت صبح کرتے تو کہتے اے الہی ہم نے تیرے نام اور قدرت کے ساتھ صبح کی اور تیری قدرت کے ساتھ ہم شام کی اور تیرے نام کے ساتھ ہم جیتے ہیں یعنی زندہ ہوتے ہیں اور تیرے نام کے ساتھ ہم مرتے ہیں اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے اور جس وقت شام کرتے تھے اور کہتے تھے الہی تیری قدرت کے ساتھ ہم نے شام کی اور تیری قدرت کے ساتھ ہم نے صبح کی اور تیری مدد کے ساتھ ہم زندہ رہتے ہیں اور تیری مدد کے ساتھ ہم مرتے ہیں اور میری طرف ہی اٹھنا ہے یعنی مرنے کے بعد۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا

ہے اور ابو داؤد اور ابن ماجہ نے۔

تشریح: اللہم بك اصبحنا: ”ہا“ محذوف کے متعلق ہے اور وہ محذوف اصبحنا کی خبر ہے۔ یہاں مضاف مقدر ماننا ضروری ہے۔ ای: اصبحنا ملتبسین بحفظك۔ اعمورین بنعمتك، أو مشتغلین بذکرک، أو مستعینین باسمک، أو مشمولین بتوفیقک، أو متحرکین بحولک وقوتک، امتقلین بارادتک قدرتک۔ بك فحییٰ اوبك نموت: آئندہ حال کی حکایت ہے، یعنی: یستمر حالنا علیٰ هذا فی جمیع الأوقات وسائر الحالات۔ اس کے مثل حضرت حذیفہ کی یہ حدیث مرفوع ہے: اللہم باسمک اموت وأحی۔ ای: لا أنفک عنہ ولا اھجرہ۔ امام نووی فرماتے ہیں: اس کے معنی ہیں أنت تحییٰ وأنت تمیتنی۔ الیک المصیر: کا مطلب ہے: الیٰ ختمک المرجع فی الدنیا والمآب فی العقبی۔ واذا أمسی: اس کا عطف، اذا أصبح پر عائد ہو رہا ہے۔

امام جزری فرماتے ہیں: اس حدیث کو اصحاب اربعہ و احمد نے، ابن حبان نے اپنی صحیح میں، اور ابو عوانہ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ ”صبح“ کے ساتھ ”النشور“، اور ”مساء“ کے ساتھ ”المصیر“ کے الفاظ ہیں، اور ابو داؤد کی روایت میں صبح مساء دونوں کے ساتھ ”النشور“ نقل کیا ہے اور ترمذی میں دونوں جگہ ”المصیر“ ہے۔ اھ۔

توضیح: اس عبارت کی روشنی میں مصنف علیہ الرحمہ پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ انہوں نے روایت مشہورہ کے برعکس کیا ہے، باوجودیکہ روایت مشہورہ میں مناسبت طرفین بھی ہے، اور توفیق بین الروایتین بھی۔

دوسرا یہ کہ ایسی خاص ترکیب کے ساتھ جوڑا ہے کہ جو روایتا ثابت نہیں ہے۔

عرض مرتب: ”الیک النشور“ کی تشریح حدیث: ۲۳۸۲ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے تجویز کردہ وظیفہ

۲۳۹۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ أَبُو بَكْرٍ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَرُنِي بِشَيْءٍ أَقُولُهُ إِذَا أَصْبَحْتُ وَإِذَا أَمْسَيْتُ قَالَ قُلِ اللَّهُمَّ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيكُهُ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِي وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَشَرِّكَ قُلُّهُ إِذَا أَصْبَحْتُ وَإِذَا أَمْسَيْتُ وَإِذَا أَخَذْتَ مَضْجَعَكَ۔ (رواه الترمذی و ابو داؤد و الدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۱۷/۴ حدیث رقم ۵۰۶۷۔ و الترمذی ۱۳۴/۵ حدیث رقم ۳۴۵۲۔ و الدارمی ۳۷۸/۲ حدیث رقم ۲۶۸۹۔ و احمد فی المسند ۱۹۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کچھ ایسی چیز پڑھنے کو دے دیجئے جس کو میں صبح و شام پڑھتا رہوں۔ فرمایا: کہو۔ اے الہی تو پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے اور آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اے ہر چیز کے رب اور ہر چیز کے مالک میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر تو، میں تجھ سے اپنے نفس کی ہر برائی سے پناہ مانگتا ہوں اور شیطان کی برائی سے اور شیطان کے شریک کروانے سے تو کہہ اس کو جس وقت صبح کرے اور جو جس وقت تو شام کرے اور جس وقت تو اپنے سونے کی جگہ پر جائے اس کو امام ترمذی اور ابو داؤد اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: قال أبو بكر: يا رسول الله: ایک نسخہ میں قلت: يا رسول الله کے الفاظ ہیں۔

قولہ: اللهم عالم الغيب والشهادة فاطر السموات والأرض رب كل شيء ومليكه:

”غیب“ سے مراد بندوں سے غائب امور و اشیاء ہیں، اور شہادت۔ سے مراد ظاہر امور و اشیاء ہیں۔

”فاطر السموات والأرض“ یعنی وہ ذات کہ جس نے آسمان وزمین کو بغیر کسی نمونہ سابقہ کے وجود بخشا۔

فائدہ: (یہاں) علم کو مقدم کیا، (بایں طور کہ پہلے ”عالم الغیب والشهادة“ کو ”فاطر السموات والأرض“ سے مقدم ذکر

کیا، چونکہ علم صفت ذاتیہ قائمہ ہے۔ اور قرآن کریم میں ”فاطر“ کو مقدم فرمایا، چونکہ وہ مقام استدلال ہے۔

”مليكه“ فاعیل بمعنی فاعل، برائے مبالغہ ہے۔ جیسا کہ ”قدیر“ بمعنی ”قادر“

قولہ: أشهد أن لا اله الا أنت، أعوذ بك من شر نفسي ومن شر الشيطان وشركه:

یعنی آپ کی طرف سے خیر ہی آتی ہے، اور میں اپنا کوئی معاملہ آپ کے غیر کے سپرد نہیں کرتا اور میں اپنے نفس کے شر سے اللہ کی پناہ میں

آتا ہوں چونکہ نفس شیع اثر ہے، جیسا کہ دل شیع اسرار ہے۔ اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان کے وسوسہ، اس کے درغلانے اور گمراہ

کرنے سے۔

”شركه“ کو دو طرح ضبط کیا ہے: اول: شین کے کسرہ اورراء کے سکون کے ساتھ۔ روایت کے اعتبار سے مشہور اور روایت کے

لحاظ سے اظہر بھی یہی ہے۔ ائی: ما يدعوا اليه من الاشرار بالله اس صورت میں مطلب یوں ہوگا:

یعنی ان شیطانی باتوں سے میں اپنے رب کی پناہ میں آتا ہوں، جو شرک ہیں۔ یا شرک کی طرف لے جانے والی ہیں۔

ثانی واول: شین اور دونوں کے فتح کے ساتھ۔ ائی: مصانده وحبائله التي يفتتن بها الناس۔ اس صورت میں مطلب

یوں ہوگا: میں اپنے رب کی پناہ میں آتا ہوں شیطان کے کمر و فریب اور اس کے حیلوں سے کہ جو لوگوں کو آزمائش میں ڈالنے والے ہیں۔

پہلی صورت میں مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے، اور دوسری صورت میں اضافت محضہ ہے، اور ہر دو تقدیر، یہ عطف تخصیص بعد از تعمیم

برائے اہتمام ہے۔

مذکورہ دعا پڑھنے سے اللہ تعالیٰ اس کو بیماری سے حفاظت میں رکھتا ہے

۲۳۹۱: وَعَنْ ابَانَ بْنِ عُثْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ أَبِي يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ عَبْدٍ يَقُولُ فِي صَبَاحِ

كُلِّ يَوْمٍ وَمَسَاءٍ كُلِّ لَيْلَةٍ بِسْمِ اللَّهِ الَّذِي لَا يَضُرُّمَعَ اسْمُهُ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيعُ

الْعَلِيمُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَيُصْرَهُ شَيْءٌ فَكَانَ ابَانَ قَدْ أَصَابَهُ طَرْفٌ فَالْحَجَّ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَنْظُرُ إِلَيْهِ فَقَالَ لَهُ ابَانَ

مَا تَنْظُرُ إِلَيَّ أَمَا إِنَّ الْحَدِيثَ كَمَا حَدَّثْتَنِي وَلَكِنِّي لَمْ أَقُلْهُ يَوْمَئِذٍ لِيَمُضِيَ اللَّهُ عَلَيَّ قَدْرَهُ (رواه الترمذی

وابو داود وابن ماجه وفي روايته) لَمْ تُصِبْهُ فُجَاءَةٌ بَلَاءٌ حَتَّى يُصْبِحَ وَمَنْ قَالَهَا حِينَ يُصْبِحُ لَمْ تُصِبْهُ

فُجَاءَةٌ بَلَاءٌ حَتَّى يُمِيسِيَ۔

اخرجه ابو داؤد في السنن ۲۲۳/۴ حديث رقم ۵۰۸۸۔ والترمذی ۱۳۲/۵ حديث رقم ۳۴۴۸۔ وابن ماجه ۱۲۷۳/۲

حديث رقم ۳۸۶۹۔ واحمد في المسند ۱/۶۲۔

ترجمہ: حضرت ابان بن عثمان سے روایت ہے کہ میں نے اپنے باپ سے سنا کہتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا کہ کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ وہ کہے ہر روز صبح کے وقت اور ہر رات شام کو کہ میں نے صبح کی اور میں نے شام کی۔ اللہ کے نام کے ساتھ کہ اس کے نام کے ساتھ کوئی چیز ضرر نہیں کرتی زمین میں اور نہ آسمان میں اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اس کو تین بار کہے کہ ضرر کرے اس کو یعنی جو کوئی صبح و شام اس دعا کو تین بار تین بار پڑھ لے۔ تو کوئی چیز اس کو ضرر نہیں پہنچائے گی۔ اور نہ ہی اس کو کوئی آفت پہنچے گی۔ پس ابان تحقیق ان کو ایک قسم کی فالج کی بیماری پہنچی تھی پس سننے والے شخص نے شروع کیا جو ابان کی طرف دیکھتا تھا۔ یعنی ازراہ تعجب کے دیکھتا تھا کہ یہ روایت کرتے ہیں جو کوئی اس دعا کو پڑھے گا۔ اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا اور خود فالج کی بیماری میں گرفتار ہے پس ابان نے کہا کیا دیکھتا ہے میری طرف خبردار جاؤ۔ تحقیق حدیث اس طرح ہے جس طرح میں نے تجھ سے بیان کی ہے یعنی صبح ہے لیکن میں نے اس دن نہیں پڑھی تھی وہ دعائے اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی تقدیر جاری کرے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ اور ابوداؤد اور ابو داؤد کی روایت میں یہ ہے۔ لم تصبه فجاءه ءبلاء: جو شخص یہ دعا ہر شام کو تین بار پڑھے اس کو ناگہانی مصیبت نہیں پہنچتی صبح تک اور جو شخص صبح کے وقت اس دعا کو پڑھے اس کو ناگہانی بلا شام تک نہیں پہنچی۔

راوی حدیث:

ابان بن عثمان بن عفان قرشی محدثین اہل مدینہ میں سے ہیں، تابعی ہیں اپنے والد عثمان اور دیگر اصحاب سے روایات کرتے تھے اور ان کی روایات بکثرت ہیں۔ ان سے ”زہری“ نے روایت کی ہے۔ یزید بن عبد الملک کے زمانہ میں مدینہ میں وفات ہوئی۔

”ابان“ میں ہمزہ مفتوح ہے اور باء پر تشدید نہیں۔ منصرف ہے چونکہ ”فعال“ کے وزن پر ہے اور اگر غیر منصرف پڑھا جائے تو یہ بھی ممکن ہے چونکہ وزن ”افعل“ ہے البتہ صحیح و مشہور اس کو منصرف پڑھنا ہے۔

تشریح: قوله: فی صباح کل یوم ومساء کل لیلۃ: اى فی أوائلہما۔ ابن حجر کا اس بابت یہ کہنا کہ ”یہ خلاف تصریح ہے“ اور پھر اس کی توجیہ بیان کی ہے جو صحیح نہیں ہے، تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے۔

باسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے) اى: استعین أو أتلف من کل مؤذ باسم اللہ۔ مع اسمہ: (یہاں مضاف محذوف ہے۔) اى مع ذکر اسمہ باعتقاد حسن ونیۃ خالصۃ۔

قوله: ما من عبد یقول..... ثلاث مرات فیضرہ شیء: ”ثلاث“ بقول کا ظرف ہے۔ ”فیضرہ“ ما من عبد کا جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: اور رفع کے ساتھ اس کا عطف بقول پر ہے، اور یہ فاء اس جملہ کی فاء کے مانند ہے: لا یموت لمؤمن ثلاثۃ من الولد فتمسہ النار۔ اى لا یجتمع هذا القول مع المضرة، کما لا یجتمع من النار مع موت ثلاثۃ من الولد بشرطہ۔ اھ۔ ابن حجر نے ان کی اتباع کی ہے، لیکن واضح رہے کہ صحیح شدہ نسخوں اور اصول معتمدہ میں رفع موجود نہیں ہے، لہذا تکلفات مذکورہ کی کوئی حاجت نہیں۔

قوله: فکان ابان قد اصابہ طرف فالج: کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وهو بفتح اللام استرخاء لأحد شقی البدن لا نصاب خلط بلغمی تنسد منه سالک الروح۔

قوله: ما تنظر الی۔ امام طیبی فرماتے ہیں: یہ ”ما“ استفہامیہ ہے، اور اس کا صلہ محذوف ہے، اور تنظر الی: حال ہے۔ اى:

مالك تنظر الی؟ أما: برائے تنبیہ ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ تھا؟ کے معنی میں ہے۔

قوله: لیمضی علی قدرہ: وال کے فتح کے ساتھ ہے۔ ای مقدرہ۔ امام طبری لکھتے ہیں: قوله: لیمضی اللہ علیہ لعدم القول، وليس بغرض له، كما في: قعدت عن الحرب جنأ۔

بعض کا کہنا ہے کہ لام برائے عاقبت ہے جیسا کہ اس قول میں: لدوا للموت وابنوا للحزاب۔

ابن حجر کا یہ کہنا: اللام ليست من الحكمة بالنسبة ونظيره قوله تعالى: ﴿وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون﴾ [الذاریات: ۵۶] ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ چونکہ اللہ جل شانہ کے ”امضاء“ میں کوئی بھی محذور نہیں کہ وہ عدم قول عبد کے باعث علت و سبب ہو۔

امام طبری کے کلام میں نفی کا تعلق عبد کے ساتھ ہے، نا کہ اللہ کے ساتھ و ليس بغرض له أى للعبد لا لله جیسا کہ معتقد کو وہم ہو رہا ہے کہ افعال باری تعالیٰ معلل بالاغراض نہیں، بلکہ مختلف حکمتیں افعال عبد، عمل و ترک اور تذکرہ و نسیان کی مقتضی ہوتی ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ دنا و ذکر کے پڑھنے کو ترک کرنا۔ اسی وجہ سے امام طبری نے اس کو علت سیدہ حقیقیہ یا علت غائیہ مجازیہ قرار دیا ہے (فتاویٰ فی الفرق بین المقامات لئلا تقع فی الزلل من الخیالات الجبریة والخباطات القدیریة)۔

قوله: لم تصبه فجاءة بلاء: اضافت بیان یہ کے ساتھ ہے۔ فجاءة، فاء کے ضمہ اور مد کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں فاء کے فتح اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے۔

مختصر النہایہ میں لکھتے ہیں: فجاء الامر وفجئه فجاء بالضم والمد، وفجاءة بفتح وسكون الجیم من غیر مد، وفجاءة مفاحاة اذا جاء بفتحة من غیر تقدم سببها۔ اس سے اشارہ یہ معلوم ہوا کہ الفجاءة، مصدر بمعنی مفعول ہے۔ ای ما یفجاء به۔ یہ اعم ہے، خواہ بالمد ہو کہ بالقصر ہو۔

امام طبری کی اپنے اس قول سے فیدہ بعضهم بفتح الفاء وسكون الجیم علی المرءة سے مراد ضبط لفظ ہے، اس کی حقیقت یعنی وحدت مراد نہیں ہے۔ ابن حجر کا یہ کہنا: انه يفهم من ذلك انتفاء التدریج بالاولیٰ خلاف اولیٰ ہے۔ چونکہ یہ بات بلا دلیل ہے، وہ مسکوت عنہ ہے۔

وجه تخصیص:

اور اس کی وجہ تخصیص یہ ہے کہ یہ انقطع واعظم ہے، گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے: لم تصبه بلیة عظيمة، چونکہ مؤمن کسی علت، قلت یا ذلت سے خالی نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ روایت: چھٹی روایت میں مذکور لفظ مضرت کے مفہوم کیلئے تفسیر و بیان ہو۔ یا نفی مضرت سے مراد آزمائش کے وقت جزع و فزع کا نہ کرنا مراد ہے، اس توجہ سے دلائل نقلیہ اور عقلیہ میں توافق بھی ہو جائے۔

قوله حتی یصبح..... حتی یمسی: ان دونوں غایتوں میں اشارہ ہے کہ قائل دن کے یارات کے جس حصہ میں خواہ ابتدائی حصہ میں کہے، خواہ درمیانی حصہ میں کہے، جس وقت یہ کلمات کہے گا اسی وقت سے فجاءة و مضرة سے حفاظت کے سلسلہ کا آغاز ہو جائے گا۔

اور ابن حجر کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کہ اگر اس دعا کو دن یارات کے ابتدائی حصہ میں پڑھنے کے بجائے درمیانی حصہ میں پڑھا تو اس کو یہ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ مزید یہ کہ ایک وقت کا اثبات دوسرے وقت کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔

فائدہ: پہلی روایت کو امام نسائی، ابن حبان، حاکم اور ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے، جب کہ دوسری روایت ابوداؤد کی ہے۔

صبح و شام کی دعا

۲۳۹۲: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ إِذَا أَمْسَى أَمْسَيْنَا وَأَمْسَى الْمَلِكُ لِلَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ لَا آلَةَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ رَبِّ أَسْأَلُكَ خَيْرَ مَا فِي هَذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَهَا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِي هَذِهِ اللَّيْلَةِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهَا رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكُسَلِ وَمِنْ سُوءِ الْكِبَرِ أَوْ الْكُفْرِ وَفِي رِوَايَةٍ مِنْ سُوءِ الْكِبَرِ وَالْكَبَرِ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ فِي النَّارِ وَعَذَابِ فِي الْقَبْرِ وَإِذَا أَصْبَحَ قَالَ ذَلِكَ أَيْضًا أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمَلِكُ لِلَّهِ۔

(رواه الترمذی و ابو داؤد و فی روایۃ لم یذکر من سوء الکفر)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۸/۴ حدیث رقم (۷۴-۲۷۲۳)۔ و ابو داؤد فی السنن ۳۱۷/۴ حدیث رقم ۵۰۷۱۔
و الترمذی ۱۳۳/۵ حدیث رقم ۳۴۵۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے جب شام کرتے تھے کہ ہم نے شام کی اور ملک نے شام نے خدا کی واسطے اور تمام تعریفیں خدا کے واسطے ہیں اور کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اے میرے پروردگار میں تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں اس چیز کی جو اس شب میں واقع ہو اور بھلائی اس چیز کی جو اس شب کے بعد واقع ہو اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ اس چیز کی برائی سے کہ اس رات میں واقع ہو اور اس چیز کی برائی سے کہ جو اس رات کے بعد واقع ہو۔ اے میرے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ کابلی سے یعنی عبادت میں اور بڑھاپے کی برائی سے یا کہا کہ کفر کی برائی سے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ بڑھاپے کی برائی سے اور تکریر سے اے میرے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ دوزخ کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے اور جس وقت آپ ﷺ صبح کرتے تو کہتے اس کو۔ یعنی جو شام کے وقت صبح کے وقت بھی پڑھتے لیکن امسینا اور امسی الملک اللہ کی بجائے اصبحنا واصبح الملک للہ پڑھتے۔ اس کو ابو داؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی کی روایت میں من سوء الکفر کا ذکر نہیں ہے۔

تشریح: قولہ: امسینا وامسی..... قدیر:

عرض مرتب: حدیث کے اس قدر حصہ سے متعلقہ اعراب و معانی کی مباحث ماقبل میں گذری چکی ہے۔

قولہ زب! أسألك خیر ما..... بعدھا: ”ما“ سے مراد تقدیرات الہیہ ہیں۔ اور ”ما بعدھا“ سے مراد مطلق (یعنی مطلق

زمانہ) ہے۔ یا یہ کہ اس رات کے بعد آنے والی راتیں مراد ہیں۔

قولہ: أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكُسَلِ وَمِنْ سُوءِ الْكِبَرِ: مرتب عرض کرتا ہے کہ اس حصہ کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے۔ حدیث:

۲۳۸۱۔

قولہ: ومن سوء الكبر أو الكفر وفي رواية من سوء الكبر والكبر: راوی کو شک ہے۔ کفر سے مراد ”كفران“ بھی ہو سکتا ہے۔ پہلا کبر باء کے فتح (بمعنی کبر السن) اور دوسرا باء کے سکون کے ساتھ ہے (بمعنی تکبر عن الحق)۔ ابن حجر کا بیان کردہ ضبط حرکات، صبح شدہ نسخوں کے معارض ہے: بکسر فسکون و بکسر ففتح۔ عرض مرتب: ممکن ہے کہ ابن حجر کا بیان کردہ ضبط

حرکات لف نشیر کے طور پر ہوا ہے۔

قولہ: رَبُّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ فِي النَّارِ: ("فِي النَّارِ" صفت ہے "عَذَابِ" کی) اُمّی عَذَابِ كَائِنِ فِي النَّارِ۔ اس میں تمام انواع عَذَاب سے سہولت کی طرف اشارہ ہے۔ ابن حجر کی بیان کردہ توضیح "اُمّی" بہا "نا مناسب ہے۔ مزید یہ کہ آگ میں ہونے والا عَذَاب، خود آگ اور آگ کے علاوہ کے ذریعہ بھی ہوگا۔ کما هو مقرر فی محلہا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ از روئے لغت باء معنی فی تو آتا ہے، لیکن "فی" "باء" کے معنی میں نہیں آتا ہے۔

اور ابن حجر کا یہ کہنا: وَيُصِحُّ بِقَاوِمِهَا عَلَى ظَاهِرِهَا، وَأُرِيدُ بِالْعَذَابِ الَّذِي فِيهَا مَزِيدُ الْبَعْدِ عَنْ رَحْمَةِ اللَّهِ وَرِضَاهِ بَعْدِ نَهْطِ فَاحِشٍ هُوَ۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کا مقصود استعاذہ یعنی مطلق بعد ہے۔ لہذا ارادہ زیادتہا زیادت ضرر ہے اور قائل کے حق میں کمال نقصان ہے۔ قولہ: وَعَذَابِ فِي الْقَبْرِ: مرتب عرض کرتا ہے کہ اس جملہ کی تشریح بھی حدیث: ۲۳۸۱ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔ قولہ: وَفِي رِوَايَتِهِ لَمْ يَذْكُرْ: "لَمْ يَذْكُرْ" کو معروف و مجہول دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ یہ حدیث فصل اول میں گذر چکی ہے۔ فتامل۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ بظاہر فصل اول کی پہلی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

آپ ﷺ اپنی بیٹیوں کو مذکورہ دعا سکھلاتے تھے

۲۳۹۳: وَعَنْ بَعْضِ بَنَاتِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُعَلِّمُهَا قِيْقُولُ قَوْلِي حِينَ تُصْبِحِينَ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ مَا شَاءَ اللَّهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا فَإِنَّهُ مَنْ قَالَهَا حِينَ يُصْبِحُ حُفِظَ حَتَّى يُمْسِيَ وَمَنْ قَالَهَا حِينَ يُمْسِي حُفِظَ حَتَّى يُصْبِحَ۔ (رواہ ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۱۹/۴ حدیث رقم ۵۰۷۵۔

ترجمہ: نبی کریم ﷺ کی بعض بیٹیوں سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کو سکھلاتے تھے۔ پس فرماتے۔ کہ جس وقت تو صبح کرتے۔ اللہ تعالیٰ پاک ہیں اپنی تعریف کے ساتھ اور نہیں فوت یعنی تسبیح و حمد وغیرہ پر مگر اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ کہ جو چاہا اللہ تعالیٰ کے ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا اور میں جانتا ہوں یعنی اعتقاد رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو از روئے جاننے کے گھیر رکھا ہے۔ پس تحقیق جس شخص نے یہ کلمات کہے صبح کے وقت تو بلاؤں اور خطاؤں سے محفوظ رہتا ہے شام تک اور جس نے شام کے وقت یہ کلمے کہے وہ صبح تک محفوظ رہتا ہے اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: امام میرک فرماتے ہیں: سب نے اس حدیث کو عبد الحمید مولیٰ بنی ہاشم، عن امہ، عن بعض بنات النبی ﷺ روایت کیا ہے۔ ام عبد الحمید کے بارے میں حافظ منذری فرماتے ہیں: ام عبد الحمید لا اعرفها۔ اور شیخ ابن حجر لکھتے ہیں: لم اقف علی اسمها وکانها صحابیة۔

فیقول: اس "فاء" کے بارے میں ایک احتمال عاطفہ ہونے کا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ تفسیر یہ ہو۔ لا قُوَّةَ: ایک نسخہ میں (داؤد کے اضافہ کے ساتھ ہے، یعنی) وَلَا قُوَّةَ هُوَ۔

"سبحان" تسبیح کا علم ہے، اور منصوب علی المصدر یہ ہے۔ (کذا فی المغرب)۔ (سبحان اللہ و بحمده کی تقدیری عبارت یوں ہے): انزجھ من کل سوء وابتدی بحمده۔ اور مغرب میں (اس کی تقدیری عبارت) یوں ہے: سبحنک بجمیع آلائک،

صبح و شام کی دعا

۲۳۹۲: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ إِذَا أَمْسَى أَمْسَيْنَا وَأَمْسَى الْمَلِكُ لِلَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ رَبِّ أَسْئَلُكَ خَيْرَ مَا فِي هَذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَهَا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِي هَذِهِ اللَّيْلَةِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهَا رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَمِنْ سُوءِ الْكِبَرِ أَوْ الْكُفْرِ وَفِي رِوَايَةٍ مِنْ سُوءِ الْكِبَرِ وَالْكِبَرِ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ فِي النَّارِ وَعَذَابِ فِي الْقَبْرِ وَإِذَا أَصْبَحَ قَالَ ذَلِكَ أَيْضًا أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمَلِكُ لِلَّهِ۔

(رواه الترمذی و ابو داود و فی روایہ لم یذکر من سوء الکفر)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۸/۴ حدیث رقم (۷۴-۲۷۲۳)۔ و ابو داؤد فی السنن ۳۱۷/۴ حدیث رقم ۵۰۷۱۔
و الترمذی ۱۳۳/۵ حدیث رقم ۳۴۵۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے جب شام کرتے تھے کہ ہم نے شام کی اور ملک نے شام نے خدا کی واسطے اور تمام تعریفیں خدا کے واسطے ہیں اور کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ تھا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اے میرے پروردگار میں تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں اس چیز کی جو اس شب میں واقع ہو اور بھلائی اس چیز کی جو اس شب کے بعد واقع ہو اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ اس چیز کی برائی سے کہ اس رات میں واقع ہو اور اس چیز کی برائی سے کہ جو اس رات کے بعد واقع ہو۔ اے میرے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ کابلی سے یعنی عبادت میں اور بڑھاپے کی برائی سے یا کہا کہ کفر کی برائی سے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ بڑھاپے کی برائی سے اور تکبر سے اے میرے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ دوزخ کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے اور جس وقت آپ ﷺ صبح کرتے تو کہتے اس کو۔ یعنی جو شام کے وقت صبح کے وقت بھی پڑھتے لیکن امسینا اور امسی الملک اللہ کی بجائے اصبحنا و اصبح الملک لہ پڑھتے۔ اس کو ابو داؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی کی روایت میں من سوء الکفر کا ذکر نہیں ہے۔

تشریح: قولہ: امسینا و امسی..... قدیر:

عرض مرتب: حدیث کے اس قدر حصہ سے متعلقہ اعراب و معانی کی مباحث ماقبل میں گذر چکی ہے۔

قولہ زب! أسألك خیر ما..... بعدھا: ”ما“ سے مراد تقدیرات الہیہ ہیں۔ اور ”ما بعدھا“ سے مراد مطلق (یعنی مطلق

زمانہ) ہے۔ یا یہ کہ اس رات کے بعد آنے والی راتیں مراد ہیں۔

قولہ: أعوذ بك من الكسل ومن سوء الكبر: مرتب عرض کرتا ہے کہ اس حصہ کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے۔ حدیث:

۲۳۸۱۔

قولہ: ومن سوء الكبر أو الكفور فی روایہ من سوء الكبر والكبر: راوی کو شک ہے۔ کفر سے مراد ”كفوران“ بھی ہو

سکتا ہے۔ پہلا الکبر باء کے ففتح (بمعنی کبر السن) اور دوسرا باء کے سکون کے ساتھ ہے (بمعنی تکبر عن الحق)۔ ابن حجر کا بیان کردہ ضبط حرکات، صبح شدہ نسخوں کے معارض ہے: بکسر فسکون و بکسر ففتح۔ عرض مرتب: ممکن ہے کہ ابن حجر کا بیان کردہ ضبط

حرکات لف نشیر کے طور پر ہوا ہے۔

قوله: رب اعد ذلک من عذاب فی النار: ("فی النار" صفت ہے "عذاب" کی) ائی عذاب کائن فی النار۔ اس میں تمام انواع عذاب سے سہولت کی طرف اشارہ ہے۔ ابن حجر کی بیان کردہ توضیح "ای: بھا" نامناسب ہے۔ مزید یہ کہ آگ میں ہونے والا عذاب، خود آگ اور آگ کے علاوہ کے ذریعہ بھی ہوگا۔ کما هو مقرر فی محلہا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ از روئے لغت باء بمعنی فی تو آتا ہے، لیکن "فی" "باء" کے معنی میں نہیں آتا ہے۔

اور ابن حجر کا یہ کہنا: ویصح بقاؤہم علی ظاہرہا، وأرید بالعذاب الذی فیہا مزید البعد عن رحمة اللہ ورضاه بھی خطاً فاحش ہے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کا مقصود استعاذہ یعنی مطلق بعد ہے۔ لہذا ارادہ زیادتھا زیادت ضرر ہے اور قائل کے حق میں کمال نقصان ہے۔ قوله: وعذاب فی القبر: مرتب عرض کرتا ہے کہ اس جملہ کی تشریح بھی حدیث: ۲۳۸۱ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔ قوله: ولی روایتہ لم یدکر: "لم یدکر" کو معروف و مجہول دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ یہ حدیث فصل اول میں گذر چکی ہے۔ فتأمل۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ بظاہر فصل اول کی پہلی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

آپ ﷺ اپنی بیٹیوں کو مذکورہ دعا سکھلاتے تھے

۲۳۹۳: وَعَنْ بَعْضِ بَنَاتِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُعَلِّمُهَا فَيَقُولُ قَوْلِي حِينَ تُصْبِحِينَ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ مَا شَاءَ اللَّهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا فَإِنَّهُ مَنْ قَالَهَا حِينَ يُصْبِحُ حَفِظَ حَتَّى يُمْسِيَ وَمَنْ قَالَهَا حِينَ يُمْسِي حَفِظَ حَتَّى يُصْبِحَ۔ (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۱۹/۴ حدیث رقم ۵۰۷۵۔

ترجمہ: نبی کریم ﷺ کی بعض بیٹیوں سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کو سکھلاتے تھے۔ پس فرماتے۔ کہ جس وقت تو صبح کرتے۔ اللہ تعالیٰ پاک ہیں اپنی تعریف کے ساتھ اور نہیں فوت یعنی تسبیح و حمد وغیرہ پر مگر اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ کہ جو چاہا اللہ تعالیٰ کے ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا اور میں جانتا ہوں یعنی اعتقاد رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو از روئے جاننے کے گھیر رکھا ہے۔ پس تحقیق جس شخص نے یہ کلمات کہے صبح کے وقت تو بلاؤں اور خطاؤں سے محفوظ رہتا ہے شام تک اور جس نے شام کے وقت یہ کلمے کہے وہ صبح تک محفوظ رہتا ہے اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: امام میرک فرماتے ہیں: سب نے اس حدیث کو عبد الحمید مولیٰ بنی ہاشم، عن امہ، عن بعض بنات النبی ﷺ روایت کیا ہے۔ ام عبد الحمید کے بارے میں حافظ منذری فرماتے ہیں: ام عبد الحمید لا اعرفها۔ اور شیخ ابن حجر کہتے ہیں: لم آف علی اسمہا وکانہا صحابیۃ۔

فیقول: اس "فاء" کے بارے میں ایک احتمال عاطفہ ہونے کا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ تفسیر یہ ہو۔ لا قوۃ: ایک نسخہ میں (واؤ کے اضافہ کے ساتھ ہے، یعنی) ولا قوۃ ہے۔

"سبحان" تسبیح کا علم ہے، اور منصوب علی المصدر یہ ہے۔ (کذا فی المغرب)۔ (سبحان اللہ وبحمدہ کی تقدیری عبارت

وبحمدك سبحتك۔ اى: على التسبيح أو التحميد وغيرهما۔

قوله: ما شاء الله كان وما لم يشألم يكن:

یہ ”کان“ تامہ ہے بمعنی ”وجود“ اى ماشاء اللہ وجودہ وجد فى اى وقت ارادہ۔ اور ابن حجر فرماتے ہیں: اى وجد على الفور۔ یہ بات على الاطلاق نہیں ہے، چونکہ یہ کلمہ موضوع ہے لاحاطة المشيئة بالاشياء الكائنة كيلئے۔ اور قيد سے کائنات تدرجیہ خارج ہو جائیں گی، یا اشیاء مراد یہ کا قدم لازم آئے گا، چونکہ ارادہ ازلی ہے، اور دونوں قول بالا جماع باطل ہیں۔ (کما هو مقرر فى كتب الكلاميه وان عريت منهما الفتاوى الفقهية) اور اللہ نے جس شی کا ارادہ نہیں فرمایا، وہ کبھی بھی نہیں ہوگی۔

قوله: اعلم ان الله..... شئى علما: (یہاں علم ”اعتقاد“ کے معنی میں ہے۔) اى اعتقد أن۔

امام طیبی فرماتے ہیں: یہ دونوں صفات یعنی قدرت شاملہ اور علم کامل۔ اصول دین کے ستون ہیں۔ اور انہی دو صفات کے ذریعہ حشر و نشر کا اثبات ہوتا ہے، اور ملاحظہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ جو بعث و حشر اجساد کے منکرین ہیں۔ چونکہ اللہ جل شانہ کو جزئیات و کلیات کا علم ہے، اور زمین کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اجزائے متفرقہ متلاشیہ کی بابت بھی علم محیط رکھتا ہے، چونکہ جب وہ ان کے جمع کرنے پر قادر ہے تو ان کو زندہ کرے گا، اسی وجہ سے یہاں ان دونوں کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا۔ امام طیبی کا یہ کلام انتہائی حسین و تام ہے۔ اور ابن حجر نے جو اس پر طعن کیا ہے سو وہ فہم متصد میں غفلت برتنے کی وجہ سے ہے۔

قوله: فانه من قالها.....: یہ جملہ، ”قولی“ کیلئے ”معللہ“ ہے۔

۲۳۹۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحُ فَسَبَّحَانَ اللَّهَ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ إِلَى قَوْلِهِ وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ أَذْرَكَ مَا فَاتَهُ فِي يَوْمِهِ ذَلِكَ وَمَنْ قَالَهُنَّ حِينَ يُمَسِّي أَذْرَكَ مَا فَاتَهُ فِي لَيْلَتِهِ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد ۳۱۹/۴ حدیث رقم ۵۰۷۶۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح کے وقت کہے پانی کے ساتھ اللہ کو یاد کرو یا نماز پڑھو۔ اللہ تعالیٰ کی اس وقت کہ جب تم شام کرتے ہو۔ یعنی مغرب اور عشاء کے وقت اور اس وقت کے صبح کرتے ہو اور اس کے لیے تعریف آسمانوں اور زمین میں ہے اور پانی کے ساتھ یاد کرو۔ یا نماز پڑھو عصر کے وقت اور ظہر کے وقت اس قول تک و كذلك تخرجون تک جیسے یہ آیتیں صبح کے وقت پڑھیں اس نے وہ چیز پانی جو اس سے رہ گئی تھی اس دن میں اور جس نے یہ آیتیں شام کے وقت پڑھیں اس نے وہ چیز پانی جو اس سے اس رات کے وقت رہ گئی تھی اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وَحِينَ تُمْسُونَ کے بعد یہ آیت یوں ہے: يُخْرِجُ النُّعْمَى مِنَ النُّمُوتِ وَيُخْرِجُ النُّمُوتَ مِنَ النُّعْمَى وَيُحْيِي الْأَرْضَ مَدْمُوتَهَا وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ اور اس وقت پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: ”پاکی کے ساتھ اللہ کو یاد کرو یعنی نماز پڑھو اس وقت جب کہ تم ام کرتے ہو (یعنی مغرب و عشاء کے وقت) اور اس وقت جب کہ تم صبح کرتے ہو (یعنی فجر کے وقت اور زمین و آسمانوں میں تمام ربیض اسی کے لئے ہیں اور پاکی کے ساتھ اللہ کو یاد کرو (یعنی نماز پڑھو) عصر کے وقت اور ظہر کے وقت اللہ تعالیٰ زندہ کو مردے سے لٹا ہے (یعنی بچے کو مٹی سے اور انڈے سے پیدا کرتا ہے) اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے (یعنی مٹی اور انڈے کو جاندار سے نکالتا ہے) اور ن کو مردے کے بعد زندہ کرتا ہے (یعنی زمین کو خشک ہو جانے کے بعد سرسبز کرتا ہے) اور اسی طرح تم بھی (قبر سے) نکالے جاؤ گے۔“

سبحان اللہ کا مطلب ہے کہ اللہ کی تزیہ بیان کرو ان امور سے کہ جو اس کی عظمت شان کے شایان نہیں۔ ایک حدیث مرسل میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بندہ کے قول سبحان اللہ کے بارے میں فرمایا: انھا براءۃ اللہ من السوء۔ یہ نہ کہا جائے کہ نفی مدح نہیں ہوتی، الا یہ کہ ثبوت کو متضمن ہو، چونکہ اللہ جل شانہ سے نقص کی نفی، اثبات کمال کو مستلزم ہے۔ چونکہ سب کے نزدیک اللہ جل شانہ کیلئے کمال مسلم ہے: ﴿وَلَن سألنہم من خلق السموات والأرض ليقولن اللہ﴾ [لقمن: ۲۵]۔ ﴿ويقولون ہؤلاء شفعاءنا عند اللہ﴾ [یونس: ۱۸] لہذا صفات جمال و جلال کا ثبوت کمال اللہ جل شانہ کو ہمیشہ سے حاصل ہے، ہمیشہ حاصل رہے گا، اور مخلوق کو تزیہ عن التشبیہ کا حکم دیا، اسی وجہ سے انبیاء کرام کے آنے کا مقصد محض امر بالتوحید والعبادۃ علی وجہ التفرید تھا۔ یہ مقصد یہ تھا کہ اللہ کیلئے نماز پڑھیں اور اس کو حق عبودیت ادا کریں۔

قولہ: حین تمسون و حین تصبحون: اسی معنی میں ہے جس معنی میں أصبح اور أمسی ہے۔ حین تصبحون: سے صبح کا وقت مراد ہے۔ اور حین تمسون سے مغرب اور عشاء کا وقت مراد ہے۔

قولہ: ولہ الحمد فی السموات والأرض: ثابت کو محذوف کے متعلق ہو کر خبر ہے۔ یہ جملہ مقررہ حالیہ ہے۔ قولہ: وعشیا و حین تطہرون: ”عشیا“ کا عطف ”حین“ پر ہے، اور اس سے عصر کا وقت مراد ہے۔ ”تظہرون“ دوپہر کے وقت میں داخل ہونا، ظہر کا وقت مراد ہے۔ یہ اوقات ان حالات کے ظہور کا محل ہیں، اس لئے اس کے مناسب حال یہ تھا کہ اللہ کی تزیہ بیان کی جائے کہ وہ حدوث و آفات سے منزہ ہے۔

قال نافع من الأزرق لابن عباس: هل تجد الصلوات الخمس فی القرآن؟ قال: نعم وقرأتین الآتین، وقال: جمعت الآیۃ الصلوات الخمس ومواقیتھا۔

معالم التنزیل میں منقول ہے کہ حضرت نافع سے ابن اریق نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا آپ قرآن کریم میں پانچوں نمازوں کا حکم (وقت کے تعیین کے ساتھ پاتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ ”ہاں“ اور پھر انہوں نے یہ مذکورہ بالا آیت پڑھ کر فرمایا کہ ان آیتوں نے پانچوں نمازوں کو اور ان کے اوقات کو جمع کر دیا ہے۔

امام طیبی نے تسبیح کے عمومی معنی یعنی مطلق تزیہ کو اختیار کیا ہے، چونکہ یہ اس کے حقیقی معنی ہیں جو مجازی معنی یعنی اطلاق الجزء و ارادۃ الکل سے اولیٰ ہیں۔ باوجودیکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے تاکہ خصوصی سبب کا۔ چونکہ اعم کا فائدہ اتم ہوتا ہے۔

سوال: آگے فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ ولہ الحمد کو فسبحان اللہ کے بعد ذکر کیا جاتا، جیسا کہ سبحان اللہ و بحمدہ میں ہے۔ اور ”عشیا“ کو ”حین تصبحون“ کے بعد ذکر کیا جاتا۔ لہذا اس فصل کا کیا فائدہ؟ اور تسبیح کو ظرف زمان کے ساتھ، اور تحمید کو ظرف مکان کے ساتھ خاص کیوں کیا؟

جواب: میں کہتا ہوں ما قبل میں گذر چکا ہے کہ حمد تسبیح سے اشمعل ہے، چنانچہ تسبیح کو مقدم ذکر فرمایا، اور اصباح و امساء کو اس کے ساتھ معلق کیا، اور تحمید کو مؤخر کیا اور آسمان و زمین کو اس کے ساتھ معلق کیا۔ اس کو معطوف معطوف علیہ کے درمیان اس لئے داخل کیا تاکہ حمد میں ظرف زمان و مکان دونوں اکٹھے ہو جائیں۔ چونکہ اقتران الشیء بالشیء میں بھی ایک قسم کا معنوی تعلق ہوتا ہے۔ اگرچہ تعلق نہ بھی پایا جائے۔ اور اگر حمد کو مقدم کر دیا جاتا تو دونوں ظرف میں مشترک ہو جائے، اور اگر حمد کو مؤخر کر دیا جاتا تو حمد مکان کے ساتھ مخصوص ہو جاتی۔ اھ۔ ومن فہم حسن کلامہ وطیب مرامہ لا یطعن فیہ بانہ مما لا یکاد یفہم من أصلہ أو مما لا تعلق لہ بما نحن فیہ کما یعلم من تأملہ علی ما ذکرہ ابن حجر رحمہ اللہ فانہ شہادۃ من نفسہ علیہ بقلة الفہم لدیہ وان کان

مرجع بعض الفقهاء الیہ۔ الی قوله: ایک نسخہ میں ”تعالیٰ“ کا اضافہ بھی ہے۔

فائدہ: مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عکرمہ بن ابی جہل کو دیکھا تو یہ آیت پڑھی، تو یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس آیت شہ کی تفسیر ہے کہ ”جی“ سے مراد مؤمن اور میت سے مراد کافر ہے۔ اور انہی معنی میں عالم و جاہل، صالح و فاسق، اور ذاکر و غافل ہیں۔

مذکورہ وظیفہ پڑھنے سے غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے

۲۳۹۵: وَعَنْ أَبِي عِيَّاشٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ قَالَ إِذَا أَصْبَحَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ كَانَ لَهُ عِدْلٌ رَقَبَةٌ مِنْ وُلْدِ إِسْمَاعِيلَ وَكُتِبَ لَهُ عَشْرٌ حَسَنَاتٍ وَحُطَّ عَنْهُ عَشْرٌ سَيِّئَاتٍ وَرُفِعَ لَهُ عَشْرُ دَرَجَاتٍ وَكَانَ فِي حِرْزٍ مِنَ الشَّيْطَانِ حَتَّى يُمِيسَى وَإِنْ قَالَهَا إِذَا أُمْسَى كَانَ لَهُ مِثْلُ ذَلِكَ حَتَّى يُصْبِحَ قَالَ حَمَادُ بْنُ سَلَمَةَ فَرَأَى رَجُلًا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فِيمَا يَرَى النَّاسُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ أَبَا عِيَّاشٍ يُحَدِّثُ عَنْكَ بِكَذَا وَكَذَا قَالَ صَدَقَ أَبُو عِيَّاشٍ۔

(رواہ ابو داؤد و ابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۱۹/۴ حدیث رقم ۵۰۷۷۔ و ابن ماجہ ۱۲۷۳/۲ حدیث رقم ۳۸۶۷۔

ترجمہ: ابو عیاش سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح کے وقت کہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اللہ تعالیٰ تھا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہوتا ہے اس کے لیے غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے اور اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس سے دس برائیاں دور کی جاتی ہیں اور اس کے لیے دس درجے بلند کئے جاتے ہیں اور شیطان سے پناہ میں ہو جاتا ہے یعنی اس کے شر (بہکانے) سے شام تک اور جس نے ان کلمات کو کہا شام کے وقت اس کے لیے اسی طرح صبح تک ہوتا ہے حماد بن سلمہ اس حدیث کے ایک راوی ہیں کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول خدا ﷺ کو خواب میں دیکھا پس کہا اے اللہ کے رسول ﷺ تحقیق ابو عیاش حدیث نقل کرتا ہے آپ سے ایسی اور ایسی یعنی جو مذکور ہوئی ہے فرمایا ابو عیاش نے سچ کہا ہے اس کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

ابو عیاش۔ ابو عیاش زید بن الصامت انصاری ذر قی ہیں ہجرت کے چالیس (۴۰) سال بعد وفات پائی۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

تخریج: ورواہ النسائی و ابن ابی شیبہ و ابن سنی و زاد بعد قوله: وله الحمد کے بعد بحی و میت وهو حی لا یموت۔

تشریح: قولہ: عن ابی عیاش: یاہ تختانیہ اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔ مصابیح کے بعض نسخوں میں تعییف ہوئی ہے، اور اس لفظ کو ابن عباس سے ضبط کیا گیا ہے۔ یہ ابو عیاش وہی ہیں جن کو زید بن صامت انصاری کہا جاتا ہے، یہ صحابی ہیں۔ ان صحابی کی منقبت، اور ان کے صدق پر دلالت کیلئے۔

”صدق ابو عیاش“ فرما دینا ہی کافی ہے۔

قوله: من قال اذا اصبح: "من" شرطیہ ہے۔ اذا اصبح: اذا طر فیہ ہے۔

کان له عدل من ولد اسماعیل: یہ جملہ جواب شرط ہے۔ (یہاں مضاف محذوف ہے)۔ ائی: عدل عتقہا۔ "عدل" عین کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے، بمعنی مثل۔ بعض کا کہنا ہے کہ بالفح وہ مثل کہ جو غیر جنس سے ہو۔ اور بالکسر وہ مثل کہ جو جنس سے ہو۔ اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔ "من ولد اسماعیل" رقبہ کی صفت ہے۔ "ولد" کو دو طرح پڑھا جا سکتا ہے: ۱۔ واؤ اور لام دونوں کے فتح کے ساتھ ۲۔ واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ بمعنی "اولاد" ہے۔ حضرت اسماعیل کی تخصیص کی وجہ ان کی شرافت ہے۔

فائدہ: اس حدیث میں عرب کی غلامی کے جواز و عدم جواز پر کوئی دلالت موجود نہیں ہے۔ جب کہ ابن حجر اس حدیث سے جواز کا قول اخذ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: والقول بمنعہ عجیب۔

قوله: فرأى رجل رسول الله ﷺ لما يرى النائم: امام طیبی فرماتے ہیں: فی النوم ذکر فرما کر اس خواب کی حقیقت پر تنبیہ فرمائی ہے۔ اور یہ کہ یہ خواب اجزاء نبوت میں سے ایک جزء کا ہے۔ اور النائم کا "ال" عہد ذہنی کا ہے۔ ائی النائم الصادق الرویا۔ اور اگر "فی النوم" فرماتے تو احتمال تھا کہ یہ خواب اضعاف احلام کے قبیل سے ہو۔

چونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ خوابوں پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس وجہ سے نہیں کہ خواب میں شک ہے، خواب کا برحق ہونا حدیث صحیحہ میں منصوص ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ نائم اپنے خواب کو ضبط نہیں کر پاتا، بعض مرتبہ سنی ہوئی بات کے برعکس نقل کر دیتا ہے۔ کبھی اس کا کلام تاویل و تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔ اور تفسیر میں اختلاف ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے کہ اگر وہ خواب شریعت کے موافق ہو تو اس کا اعتبار کیا جائے گا، ورنہ اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، چونکہ جب وہ خواب اس کے مخالف ہے تو خواب کے ذریعہ اس (حکم شرعی) کو منسوخ تو نہیں کیا جا سکتا۔

قوله: يحدث عنك بكذا: اور ایک نسخہ میں "کذا" ہے۔ اور یہ تکرار ممکن ہے کہ صبح و شام کے دو جملوں کے اعتبار ہو۔

مذکورہ دُعا پڑھنے کی برکت سے آگ سے خلاصی کا وعدہ

۲۳۹۶: وَعَنِ الْحَارِثِ بْنِ مُسْلِمِ التَّمِيمِيِّ عَنْ أَبِيهِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ أَسْرَأَ إِلَيْهِ فَقَالَ إِذَا أَنْصَرَفْتَ مِنْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ فَقُلْ قَبْلَ أَنْ تَكَلِّمَ أَحَدًا اللَّهُمَّ اجْرِنِي مِنَ النَّارِ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَإِنَّكَ إِذَا قُلْتَ ذَلِكَ نُمِّمَتْ فِي لَيْلِكَ كُتِبَ لَكَ جَوَازٌ مِنْهَا وَإِذَا صَلَّى الصُّبْحُ فَقُلْ كَذَلِكَ فَإِنَّكَ إِذَا مَتَّ فِي يَوْمِكَ كُتِبَ لَكَ جَوَازٌ مِنْهَا۔

احرجہ ابو داؤد فی السنن ۳۲۰/۴ حدیث رقم ۵۰۷۹۔

ترجمہ: حضرت حارث بن مسلم تمیمی سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے چپکے سے ان سے بات کہی۔ پس جس وقت تو مغرب کی نماز سے فارغ ہو جائے تو کسی سے کلام کرنے سے پہلے تو سات بار کہے اے الہی تو پناہ دے مجھ کو آگ سے پس تحقیق تو جس وقت یہ کہے گا اور اس رات اگر مر گیا تو تیرے لیے آگ سے خلاصی لکھی جائے گی اور جس وقت تو صبح کی نماز پڑھے پھر اس کو سات بار کہے کسی سے کلام کرنے سے پہلے پس اگر تو مر جائے گا۔ اس دن تو تیرے لیے آگ سے خلاصی لکھی جائے گی۔ اس کو ابو

داؤد نے نقل کیا ہے

روائی حدیث:

حارث بن مسلم: یہ حارث بن مسلم بن قسیم میں سے ہیں۔ ان کی حدیث شامیوں میں مشہور ہے۔ ان سے عبدالرحمن بن حقان نے روایت حدیث کی ہے۔

فائدہ: امام میرک فرماتے ہیں: سب نے اس حدیث کو مسلم بن حارث سے روایت کیا ہے۔ ان کو حارث بن مسلم تمیمی بھی کہا جاتا ہے۔ اول اصح ہے اھ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تشریح: قولہ: اَنَّهُ اَسْرَ الِیْہِ: اسراء کے لغوی معنی ہیں: اعلان و انخفاء۔ گویا کہ ہمزہ کبھی سلب کیلئے بھی ہوتا ہے۔ بعض شرح نے اسر الیہ کی توضیح تکلم معوضیہ کے ساتھ ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: فی الاسرار ترغیبہ فیہ حتی یتلقاہ، و یتمکن فی قلبہ تمکن السر المکنون لا انصہ اى البخل بہ من غیرہ۔ اذا انصرف: کی توضیح ابن الملک نے رجعت کے ساتھ کی ہے۔ ملا علی قاری نے اس توضیح کو غریب کہا ہے۔

قولہ: فقل قبل ان تکلم سبع مرات: قبل از تکلم کی قید کی حکمت یہ ہے کہ اس وقت تک آدمی پر نماز کا خشوع و تدبر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی حالت میں مانگی گئی دعا علی وجہ الکمال واقع ہوگی۔

”سبع مرات“ قل کیلئے ظرف ہے۔ اى: کور ذلك سبع مرات۔ اور سات کے عدو کی تخصیص شاید یہ ہے کہ جہم کے دروازے اور طبقات بھی ساتھ ہیں یا یہ کہ انسان کے سات اعضاء سے تکلم کیا جائے گا۔

قولہ: ثم مت فی لیلتك کتب لك جواز منها: ”مت“ میم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ، ہر دو طرح درست ہے۔ ”جواز“ جیم کے فتح (اور زاء) کے ساتھ ہے، بمعنی ”خلاص“۔ ”جواز“ اصل میں اس ”براءت“ کو کہتے ہیں جو کسی آدمی کے پاس ہوتی ہے تاکہ اس کو کوئی بھی شخص گزرنے سے روک نہ سکے۔ چنانچہ حدیث باب میں مذکورہ فضیلت کی راہ میں صرف اور صرف تحلہ القسم رافع ہوگی۔

”جواز منها“ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ دخول نار سے خلاصی عطا فرمائے گا۔ (۲) اللہ تعالیٰ خلود نار سے خلاصی عنایت فرمائے گا۔

فائدہ: ابن حجر کی شرح میں ”منہا“ کے بجائے ”من النار“ کے الفاظ آئے ہیں لیکن یہ الفاظ اصول معتمدہ کے خلاف ہیں۔

عرض مرتب: مرقات کے محشی لکھتے ہیں: رواہ ابو داؤد فی سننہ الحدیث رقم ۵۰۷۹، ۵۰۸۰ و لفظہ جوار بالراء، اى اجارک اللہ منہا، واللہ اعلم اھ۔

مذکورہ دعا پر آپ ﷺ کی مواظبت

۲۳۹۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَدْعُ هُوَ لِأَيِّ الْكَلِمَاتِ حِينَ يُمَسِّي وَحِينَ يُصْبِحُ
اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَافِيَةَ فِي دِينِي وَدُنْيَايَ وَأَهْلِي وَمَالِي اللَّهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِي وَامْنِ رَوْعَاتِي اللَّهُمَّ
احْفَظْنِي مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِي وَعَنْ يَمِينِي وَعَنْ شِمَالِي وَمِنْ فَوْقِي وَأَعُوذُ بِعَظَمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ

تَحْنِي يُعْنِي الْحَسِيفُ . (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۱۸/۴ حدیث رقم ۵۰۷۴۔ وابن ماجہ ۱۲۷۳/۲ حدیث رقم ۳۸۷۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کلمات کو صبح کے وقت اور شام کے وقت چھوڑا نہیں کرتے تھے اے الہی تحقیق میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، دنیا و آخرت میں عافیت کا اے الہی تحقیق میں تجھ سے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور عیبوں سے سلامتی اپنے دین کے کاموں میں اور اپنی دنیا کے کاموں میں۔ اپنے اہل اور مال کے حق میں اے الہی میرے عیبوں کو ڈھانک دے اور خوف کی چیزوں سے امن میں رکھ۔ یعنی مجھ سے بلائیں دفع کر اے الہی مجھ کو میرے آگے سے محفوظ رکھ اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں سے اور بائیں سے اور میرے اوپر سے اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے بڑائی سے کہ میں اچانک ہلاک کیا جاؤں اپنے نیچے سے یعنی زمین میں دھنس جانے سے۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: لم یکن رسول اللہ ﷺ یدع حین یصبح:

بظاہر یہ کان ناقص ہے، اور یدع کان کی خبر ہے۔ اسی: لم یکن تارکا لہن فی ہذین الوقتین، بل یدوم علیہا فیہما۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: الظاهر أن یكون تامہ، وأن یدع حملة حالیتہ من الفاعل اسی: لم یوجد رسول اللہ ﷺ حال کو نہ تارکا لہا حین یمسی و حین یصبح اھ۔ ابن حجر کے اس کلام میں غرابت ہے، معنوی رکاکت ہے، اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ ان کا یہ کلام معارض ہے۔ امام طبریؒ ان کے کلام پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وقال الشارح اخذا من کلام الکشاف: لم یکن یدع هؤلاء اسی لا یتأتی منہ ذلك ولا یلیق بحالہ أن یدعھا اھ و فیہ نظر ظاہر، بل یتأتی منہ ترکھا و یلیق بحالہ لیبان جواز ترکھا الواجب علیہ، ولا اشتغال بما هو اھم منها اھ۔ ان کا یہ اعتراض ان کے تناقض کو ثابت کرتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: شارح کی مراد صرف مواظبت میں مبالغہ مقصود ہے، جیسا کہ حدیث سے مستفاد ہوتا ہے۔ وگرنہ تو یہ اجماعی ہے، اور اس کا مراد صرف مواظبت میں مبالغہ مقصود ہے، جیسا کہ حدیث سے مستفاد ہوتا ہے۔ وگرنہ تو یہ اجماعی ہے، اور اس کا ضروریات دین میں سے ہونا معروف بات ہے کہ اس دعا کو ان دو وقتوں میں پڑھنا آپ ﷺ پر لازم نہیں تھا، اور ان دو وقتوں میں تو کیا دیگر اوقات میں بھی پڑھنا ضروری نہیں تھا، چہ جائیکہ وہ کچھ کہا جائے جو کچھ کہ ابن حجر نے فرمایا۔

قولہ: اللهم انی أسألك العافية: اے اللہ میں تمام آفات دیدیہ سے سلامتی مانگتا ہوں، اور دنیاوی حادثات و واقعات پر تحمل و صبر اور رضا بالقضاء مانگتا ہوں۔ تمام بری بیماریوں مثلاً برص، جنون، جذام وغیرہ سے اور مصیبتوں سے حفاظت مانگتا ہوں۔ عافیۃ بروزن فاعلۃ مصدر ہے۔ قولہ: اللهم استر عوراتی و آمن روعاتی: عورات سے مراد عیوب و ذنوب ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میرے عیوب پر پردہ ڈالے رکھ اور میرے گناہوں کو منادے۔ عورات روعات کو اس روایت میں بیضہ جمع لانے میں ان کی کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ امام طبریؒ فرماتے ہیں: عورۃ سے مراد آدمی کا وہ حصہ جس کو وہ چھپاتا ہے اور اس کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اس حصہ کو دیکھے اور دو عورت سے مراد ہے خوف کی چیزیں۔

قولہ: اللهم احفظنی من وعن شمالی: قاضی بیضاویؒ اس آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ لَا تَنبَهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ﴾ [الاعراف: ۱۷] کے تحت لکھتے ہیں: پہلے دونوں (اسماء، بین ایدیہم و خلفہم) کے ساتھ فعل کو حرف ابتداء (یعنی ”من“) کے ساتھ متعدی کیا لانا نہ منہما متوجہ الیہما: چونکہ وہ ان دونوں جانبوں سے ان کی طرف متوجہ ہوگا، اور آخری دونوں (اسموں ایمیانہم اور شمائلہم) کے ساتھ فعل کو حرف مجاوزۃ (یعنی ”عن“) کے متعدی کیا۔ فان الآتی منہما

کالمنحرف عنهم المار علی عرضهم۔ کیونکہ ان دونوں جانبوں سے آنے والا گویا کہ ان سے انحراف کر رہا ہے اور ان پر سے عرضاً گذر رہا ہے۔ اس کی نظیر جلست عن یمینہ ہے۔

قوله: اَعُوذُ بِعَظْمَتِكَ اَنْ يَكُنَّ نَسْمَةٌ مِّنْ اَنْ هُوَ اَعْتَالَ: صَيْغَةُ مَجْهُولٍ كَمَا تَهْتَدُ بِهٖ، دَهْوُكَ سَمِيَّ اَيْسِيٍّ جَلَدٌ لِّكَرْتَلٍ كَرْنَا جِهَانَ كُوْنِي دِيكْهِنُ وَاللَّاهُ يُو۔

امام طیبی فرماتے ہیں: تمام جہات کا ذکر فرمایا چونکہ آفات انہی اطراف سے آتی ہیں اور نیچے کی جہت میں مبالغہ فرمایا، چونکہ اس سمت سے آنے والی آفات بہت گھنیا ہوتی ہیں۔ ابن حجر نے اس کی جو توضیح کی ہے وہ ناقابل التفات ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: لانه لا حيلة في دفع ما يخشى وقوعه فيها بخلاف بقية الجهات فانه يمكن فيها الحيلة حتى جهة الفوق۔

قوله: قال و كعب: يعنى الخسف: قاموس میں لکھتے ہیں: خسف الله بفلان الأرض، أى غيبه فيها۔

مذکورہ کلمات کو پڑھنے سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے

۲۳۹۸: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحُ اللَّهُمَّ أَصْبَحْنَا نَشْهَدُكَ وَنُشْهَدُ حَمَلَةَ عَرْشِكَ وَمَلَائِكَتِكَ وَجَمِيعَ خَلْقِكَ إِنَّكَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ وَحَدَّكَ لَا شَرِيكَ لَكَ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ إِلَّا غَفَرَ اللَّهُ لَهُ مَا آصَابَهُ فِي يَوْمِهِ ذَلِكَ مِنْ ذَنْبٍ وَإِنْ قَالَهَا حِينَ يُمَسِّي غَفَرَ اللَّهُ لَهُ مَا آصَابَهُ فِي تِلْكَ اللَّيْلَةِ مِنْ ذَنْبٍ۔ (رواه الترمذی و ابوداؤد و قال الترمذی هذا حديث غريب)

اخرجه ابوداؤد في السنن ۳۲۰/۴ حديث رقم ۵۰۷۸۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح کے وقت کہے اے الہی ہم نے صبح کی اس حال میں کہ گواہ کرتے ہیں ہم تجھ کو اور گواہ کرتے ہیں ہم تیرے عرش کے اٹھانے والوں کو اور تیرے فرشتوں کو اور تیری سب مخلوقات کو ساتھ اس کے کہ تحقیق تو اللہ ہے کوئی معبود نہیں ہے مگر تو اللہ ہے تیرا کوئی شریک نہیں ہے یعنی اہل صفات میں اور تحقیق محمد ﷺ تیرے بندے ہیں اور تیرے رسول ہیں۔ کوئی شخص نہیں کہتا یہ کلمے صبح مگر اللہ تعالیٰ اس کے وہ گناہ بخش دیتا ہے جو اس سے صادر ہوئے ہیں اس دن میں یعنی سوائے کبیرہ گناہوں اور حقوق العباد کے اور اگر ان کلمات کو شام کے وقت کہے اللہ تعالیٰ اس کے وہ گناہ بخش دیتا ہے جو کہ صادر ہوئے ہوتے ہیں اس سے رات میں نقل کیا۔ اس کو امام ترمذی اور ابوداؤد اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: اللهم اصبحنا نشهدك: ان کلمات کا صبح و شام پڑھنا درحقیقت شہادت کا اقرار بھی ہے، تاکید بھی ہے اور تجبید بھی ہے، اور عرض حال بھی ہے کہ اے اللہ ہم شہادت کے عہد و پیمان سے غافل نہیں۔

قوله: ونشهد حملة عرشك وملائكتك وجمع خلقك: ملائكتك کا عطف "حملة" پر ہو رہا ہے، لہذا منصوب ہے، تعظیم بعداً تخصیص ہے، اور و جمع خلقك دوسری تعظیم ہے۔ انك: ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ (اور باء حرف محذوف ہے)۔ اى على شهادتى واعترافى بانك۔

قوله: الا غفر الله له..... تلك الليلة من ذنب: یہ مستثنیٰ مفرغ ہے؛ بشرط مذکور کے جواب محذوف سے۔ اى ما قال قائل هذا الدعاء الا غفر الله له۔ ایک نسخ میں "فى ليلته تلك" کے الفاظ ہیں۔ "ذنب" (توین برائے تعظیم ہے)۔ اى: اى ذنب

تعالیٰ بھی ہر آن متحضر ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾
 ما أصابه في يوم ذلك: جملہ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحُ میں من معنی کے اعتبار سے نافیہ کی جگہ استعمال ہوا ہے نیز یہ ممکن ہے کہ اَلَّا
 غَفَرَ اللَّهُ لَهُ میں لفظ اَلَّا زائد ہو چنانچہ جملہ وَإِنْ قَالَهَا..... سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ لفظ اَلَّا زائد ہے۔
فائدہ: حصن کی روایت میں ”شہد“ کے بجائے صیغہ مفرد کے ساتھ مذکور ہے۔

صبح و شام کے پڑھنے کا وظیفہ

۲۳۹۹: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَقُولُ إِذَا أَمْسَى وَإِذَا أَصْبَحَ ثَلَاثًا رَضِيَتْ

بِاللَّهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللَّهِ أَنْ يَرْضِيَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۳/۵ حدیث رقم ۳۴۴۹۔ وابن ماجہ ۱۲۷۳/۲ حدیث رقم ۳۸۷۰۔ واحمد فی المسند ۳۶۷/۵

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کوئی مسلمان بندہ شام اور صبح کے وقت تین بار
 کہے کہ اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہوں تو ازارہ فضل و کرم
 اللہ تعالیٰ پر لازم ہوگا کہ اس کو قیامت کے دن راضی کرے (یعنی اتنا ثواب دے گا کہ وہ راضی ہو جائے گا)۔ اس کو
 امام احمد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ما من عبد مسلم يقول..... ثلاثا: ابن الملک فرماتے ہیں: (مسلم کی) تینوں برائے تعظیم ہے۔ ای
 کامل فی اسلامہ۔ ابن حجر نے اس قول کی اتباع کی ہے۔ اور اظہر یہ ہے کہ تینوں محض تغیر کیلئے ہے جیسا کہ من استغفر اقیہ کے عموم
 سے سمجھا جا رہا ہے۔

”ثلاثا“ (کی تینوں طرف ہے)۔ ای: بقول ثلاث کلمات بمعنی جمل مفیدۃ۔ ثلاثا کی تقدیم اس پر دال ہے۔ اور اس کی تائید
 اس سے بھی ہوتی ہے کہ اصول معتمدہ میں یہ موجود ہی نہیں ہے۔

قولہ: رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا: ”ربا“ تمیز ہے۔

رب سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمام احکام شرعیہ اور قضاء قدر پر راضی ہوں اور اگلے جملہ میں تمام مذاہب یہودیت و نصرانیت
 وغیرہ سے براءت کا اظہار ہے۔ اور محمد عربی ﷺ پر ایمان لانا مراتب ایمان کے اجمالاً قبول کو لازم ہے۔

قولہ: الاکان حقا علی اللہ ان یرضیہ یوم القیامۃ: ”کان“ کی خبر ہے، اور اسم مؤخر ہے ان یرضیہ یوم القیامۃ۔ اور پورا
 جملہ ”ما“ کی خبر ہے۔ اور استثناء مفرغ ہے۔

فائدہ: حصن میں ”رضیت“ بصیغہ مفرد کے بجائے بصیغہ جمع ”رضینا“ مروی ہے، اور ”نبیا“ کے بجائے رسولا ہے، نیز ثلاث کے
 الفاظ موجود نہیں ہیں۔ (گویا حصن کی روایت یوں ہے: رضینا باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا) اور فرماتے ہیں: اس
 حدیث کو اصحاب اربعہ، امام حاکم، احمد اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔

امام میرک فرماتے ہیں: یہ حدیث نبی کریم ﷺ کے خادم ابوسلام سے مروی ہے۔ ابن البرق فرماتے ہیں: یہی صحیح ہے اور بعض کا کہنا
 ہے کہ اس حدیث کے راوی ثوبان ہیں۔ اور صاحب حصن نے رضیت بصیغہ مفرد، نبی ثلاث مرات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا:
 اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور ابن السنی نے روایت کیا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں: بعض روایتوں میں لفظ نبیا ہے اور بعض میں رسولا لہذا مستحب یہ ہے کہ دونوں ہی لفظ پڑھے جائیں یعنی یوں

کہا جائے وَبِمَحَمَّدٍ نَبِيًّا وَرَسُولًا اور اگر کسی ایک پراکتفاء کر لے تو تب بھی عامل بالحدیث ہوگا۔
 ”نبیاً“ کو ”رسولاً“ پر مقدم فرمایا حالانکہ آخر کے الفاظ جمہور کی روایت کے ہیں۔ چونکہ وصف نبوت، وصف رسالت پر وجود کے اعتبار سے مقدم ہے۔ یا عموم و خصوص مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

سوتے وقت کی مسنون دعا

۲۳۰۰: وَعَنْ حَدِيثَةِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَنَامَ وَضَعَ يَدَهُ تَحْتَ رَأْسِهِ ثُمَّ قَالَ اللَّهُمَّ قِنِي

عَذَابَكَ يَوْمَ تَجْمَعُ عِبَادَكَ أَوْ تَبْعُثُ عِبَادَكَ - (رواه الترمذی واحمد عن البراء)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۷/۵ حدیث رقم ۳۴۵۸۔ وابن ماجہ ۱۳۷۶/۲ حدیث رقم ۳۸۷۷۔

ترجمہ: حضرت حدیثہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت سونے کا ارادہ کرتے تھے اپنا ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھتے۔ پھر کہتے اے الہی مجھ کو بچا اپنے عذاب سے اس دن کہ جس دن تو جمع کرے گا تو اپنے بندوں کو یا فرمایا تو اٹھاے گا اپنے بندوں کو یعنی راوی کو شک ہوا ہے کہ تَجْمَعُ عِبَادَكَ کہا یا بجائے اس کے تَبْعُثُ عِبَادَكَ کہا اس کو امام ترمذی نے اور احمد نے براء سے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: وَضَعَ يَدَهُ تَحْتَ رَأْسِهِ: ایک روایت میں (یدہ کے ساتھ) الیمنی (کا اضافہ بھی) ہے۔ نیز ایک

اور روایت میں (تحت راسہ کے بجائے) تحت خدہ کے الفاظ ہیں۔ یہ اختلاف اختلاف اوقات پر محمول ہے، ہر راوی نے اپنی روایت کے اعتبار سے ذکر کیا ہے۔ بابرکت ہاتھ کا کچھ حصہ رخسار مبارک کے نیچے ہوتا تھا، اور کچھ حصہ سر مبارک کے نیچے ہوتا تھا۔ ہر راوی نے اس کیفیت کو اپنے غلبہ اعتبار کے لحاظ سے ذکر کیا ہے۔

اس روایت میں تو یہ ہے کہ ”آپ ﷺ دست مبارک سر کے نیچے رکھتے تھے“ جب کہ ایک اور روایت میں منقول ہے کہ رخسار مبارک کے نیچے رکھتے تھے لہذا ان دونوں روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی جائے کہ آپ ﷺ اپنا ہاتھ کبھی تو سر کے نیچے رکھتے ہوں گے اور کبھی رخسار مبارک کے نیچے جس راوی نے جو دیکھا اس کو روایت کر دیا یا یہ کہ ہاتھ کا کچھ حصہ تو سر کے نیچے ہوتا ہوگا اور کچھ حصہ رخسارہ کے نیچے۔ لہذا جس راوی نے ہاتھ کا کچھ حصہ سر کے نیچے دیکھا اس نے یہ بیان کیا کہ آپ ﷺ اپنا ہاتھ سر کے نیچے رکھتے تھے اور جس راوی نے ہاتھ کا کچھ حصہ رخسارہ کے نیچے اس نے رخسارہ کے نیچے رکھنے کو ذکر کیا۔

قولہ: تَجْمَعُ عِبَادَكَ أَوْ تَبْعُثُ عِبَادَكَ: راوی کو شک ہے یا پہلی روایت کی تفسیر ہے۔

عرض مرتب: دائیں کروٹ پر لیٹنے کی حکمت حدیث: ۲۳۸۲ کے تحت ملاحظہ فرمائیے اہ۔

۲۳۰۱: وَاَحْمَدُ عَنِ الْبَرَاءِ .

اخرجه احمد فی المسند ۲۸۱/۴۔

امام احمد نے اس روایت کو براء سے نقل کیا ہے۔

قولہ: وَاَحْمَدُ: ایک نسخہ میں ”ورواہ احمد“ ہے۔

سونے کا مسنون طریقہ

۲۳۰۲: وَعَنْ حَفْصَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ كَانَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَرُقُدَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنَى تَحْتَ خَدِّهِ ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُمَّ

قَبِي عَذَابِكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ - (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۱۰/۴ حدیث رقم ۵۰۴۵۔

ترجمہ: حضرت حفصہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سونے کا ارادہ کرتے تھے۔ تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے گال یعنی (رخسار) کے نیچے رکھتے۔ پھر تین بار کہتے الہی تو مجھ کو اپنے اس دن کے عذاب سے بچا جس دن تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللهم..... ایک روایت میں (اللهم کے بجائے) ”رب“ کے الفاظ ہیں۔

قولہ: تبعث عبادك: ایک روایت میں (تبعث عبادك کے بجائے) ”تجمع عبادك“ کے الفاظ ہیں۔

قولہ ثلاث مرات: اور ایک نسخہ میں (ثلاث مرات کے بجائے) ”ثلاث مرار“ کے الفاظ ہیں۔

سوتے وقت آپ ﷺ کی یہ مذکورہ دعا پڑھا کرتے تھے

۲۴۰۳: وَعَنْ عَلِيٍّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ عِنْدَ مَضْجَعِهِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيمِ وَكَلِمَاتِكَ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّمَا أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ اللَّهُمَّ أَنْتَ تَكْشِفُ الْمَغْرَمَ وَالْمَأْتَمَّ اللَّهُمَّ لَا يَهْزَمُ جُنْدُكَ وَلَا يُخْلَفُ وَعْدُكَ وَلَا يُنْفَعُ ذَا الْجِدِّ مِنْكَ الْجِدُّ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ - (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۱۲/۴ حدیث رقم ۵۰۵۲۔

ترجمہ: حضرت علی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سوتے وقت فرماتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں۔ تیری بزرگی کے ساتھ اور تیرے پورے کلمات کے ساتھ یعنی اسو صفات کے اور اس چیز کی برائی سے کہ اس کی پیشانی کے بال پڑنے والا ہے۔ یعنی جو چیز تیرے قبضہ قدرت میں ہے یعنی ہر چیز کی برائی سے۔ الہی تو قرض کو دور کرتا ہے اور گناہ کو۔ اے الہی شکست نہیں دیا جاتا۔ تیرا لشکر آخر الامر میں مغلوب نہیں ہوتا اور تیرا وعدہ خلاف نہیں کیا جاتا اور دولت مند کو تیرے عذاب سے دولت مندی نفع نہیں دیتی بلکہ عمل صالح نفع دیتے ہیں۔ تو پاک ہے اور پاکی بیان کرتا ہوں تیری تعریف کے ساتھ۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

استغفار کی فضیلت

۲۴۰۴: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِينَ يَأْوِي إِلَى فِرَاشِهِ اسْتَغْفِرُ اللَّهَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ غَفَرَ اللَّهُ لَهُ ذُنُوبَهُ وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ أَوْ عَدَدَ رَمْلِ عَالَجٍ أَوْ عَدَدَ ذَوْرَقِ الشَّجَرِ أَوْ عَدَدَ أَيَّامِ الدُّنْيَا - (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۷/۵ حدیث رقم ۳۴۵۷۔

ترجمہ: حضرت ابی سعید سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے بچھونے پر جاتے ہوئے کہے کہ میں اس اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ قیوم ہے اور میں توبہ کرتا ہوں اس کی طرف تین بار تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اگر چہ وہ دریا کی جھاگ کے برابر ہوں۔ یا ریت کے ذروں کے برابر یا درخت کے پتوں کی تعداد کے برابر یا دنیا کے دنوں کی گنتی کے برابر۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا

ہے یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: استغفر الله الذي لا اله الا هو الحي القيوم: عرض مرتب: اس کی ترکیب جاننے کیلئے حدیث: ۲۳۵۳۔

ملاحظہ فرمائیے۔

واتوب اليه: اس کی تشریح ابھی گزری۔

قوله: من قال..... ثلاث مرات: ”ثلاث مرات“ قال کا ظرف ہے۔

قوله: غفر الله له ذنوبه: عرض مرتب: اس کی تشریح ماقبل گزر چکی ہے۔

قوله: وان كانت مثل زيد البحر او عدد رمل علاج: ”كانت“ کی ضمیر ”ذنوب“ کی طرف راجع ہے۔ اور ”او“ برائے

تولع ہے۔

لفظ ”عالج“ کی تحقیق:

”عالج“ لام کے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، اور لام کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ یہ اسم منصرف ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ غیر منصرف ہے۔ امام طبریٰ فرماتے ہیں: اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ریت بہت زیادہ ہو۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: العالج ما تراکم من الرمل و دخل بعضه على بعض، و جمعه عوالج۔ ”التحریر“ میں لکھا ہے: علاج موضع مخصوص۔ اور بعض کا کہنا ہے ”عالج“ مغرب میں واقع ایک عریض و طویل ریتلی وادی کا نام ہے۔

امام میرک فرماتے ہیں: روایت (میں یہ لفظ) اضافت کے ساتھ ہے، چنانچہ صاحب النہایہ کے قول کی توجیہ یہ ہوگی کہ یہ اضافۃ الموصوف الى الصفة کے قبیل سے ہے۔ یا یہ اضافت ”بیانیہ“ ہے۔ اور ”عدد“ منصوب ہے۔ اس کا عطف ”مثل“ پر ہو رہا ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مجرور ہو اور اس کا عطف ”زید“ پر ہو رہا ہو۔ اگلی عبارت کی ترکیب بھی اسی طرح ہے۔

اس حدیث میں ان تمام چیزوں کو بطور مثال بیان کرنے کی غرض یہ بتانا ہے کہ اگر گناہ بہت زیادہ ہوں گے تب بھی بخشے جائیں گے۔ قوله: عدد أيام الدنيا: میں احتمال ہے کہ دنیا کے اوقات اور گھنٹے مراد ہوں۔

قرآن پاک کی سورت کے پڑھنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر فرمادیتے ہیں

۲۳۰۵: وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَأْخُذُ مَضْجَعَهُ يَقْرَأُ آيَةً مِنْ كِتَابِ اللَّهِ إِلَّا وَكَّلَ اللَّهُ بِهِ مَلَكًَا فَلَا يَفْرُبُهُ شَيْءٌ يُؤْذِيهِ حَتَّى يَهَبَّ مَتَى هَبَّ - (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۱۵ حدیث رقم ۳۴۱۸۔

ترجمہ: حضرت شداد بن اوس سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں ہے کوئی مسلمان کہ جب اپنی خوابگاہ میں آ کر کوئی کسی سورت کو پڑھے۔ مگر کہ اللہ تعالیٰ متعین کرتا ہے اس کے ساتھ ایک فرشتہ کہ ضرر کرنے والی چیزوں سے نگہبانی کرے پس اس کے کوئی چیز نزدیک نہیں ہوتی، جو اس کو ایذا دے۔ یہاں تک کہ جاگے جس وقت جاگے۔ یعنی دیر کے بعد خواہ جلدی اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ما من مسلم يأخذ مضجعه يقرأ سورة: ایک روایت میں یوں ہے: ما من رجل يأوى الى فراشه

فيقرأ سورة: امام میرک حاشیہ حسن میں لکھتے ہیں: ترمذی اور جامع الاصول کی روایت میں بصیغہ مضارع آیا ہے، لیکن مصابح کے بہت

سارے نسخوں میں ”بقراءۃ“ آیا ہے۔ امام طیبی لکھتے ہیں: اسی مقتضی القراءۃ سورۃ۔ (یعنی مفتتحاً سے متعلق ہے جو حال واقع ہو رہا ہے)۔ اور بعض کا کہنا ہے (متلبسا کے متعلق ہے)۔ اسی: متلبسا بہا۔ الا وکل اللہ بہ ملکا: استثناء مفرع ہے۔

قوله: الا وکل اللہ بہ ملکا فلا یقر بہ شیء یؤذیہ.....:

حسن کی روایت میں یوں ہے: الا بعث اللہ الیہ ملکا یحفظہ من کل شیء یؤذیہ

حسن میں لکھا ہے: اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اور بزار نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

اذا وضعت جنبک علی الفراش وقراءت فاتحۃ الكتاب وقل هو اللہ احد فقد امنت من کل شیء الا الموت: (آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا) جب تم اپنے بستر پر اپنا پہلو رکھو یعنی سونے لگو اور اس وقت سورۃ فاتحہ اور سورۃ قل ہو اللہ پڑھ لو تو (جب تک سوتے رہو گے) موت کے علاوہ ہر چیز سے حفاظت میں رہو گے۔

امام ابن ابی داؤد نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے موقوفاً نقل کیا ہے:

ما کنت اری أحدا یعقل ینام قبل أن یقرأ الآيات الثلاث الأواخر من البقرة۔ اس حدیث کی سند شیخین کی شرط پر ہے۔

نماز کے بعد اور سوتے وقت تسبیحات کا بیان

۲۳۰۶: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَلْتَانِ لَا يَحْصِيهِمَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ أَلَا وَهُمَا يَسِيرٌ وَمَنْ يَعْمَلُ بِهِمَا قَلِيلٌ يُسَبِّحُ اللَّهَ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ عَشْرًا وَيَحْمَدُهُ عَشْرًا وَيَكْبِرُهُ عَشْرًا قَالَ فَاِنَّا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَعْقِدُهَا بِيَدِهِ قَالَ فِتْلِكَ خَمْسُونَ وَمِائَةٌ بِاللِّسَانِ وَالْفُ وَخَمْسُ مِائَةٍ فِي الْمِيزَانِ وَإِذَا أَخَذَا مَضْجَعَهُ يُسَبِّحُهُ وَيَكْبِرُهُ وَيَحْمَدُهُ مِائَةً فِتْلِكَ مِائَةٌ بِاللِّسَانِ وَالْفُ فِي الْمِيزَانِ فَايُكْمُ يَعْمَلُ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ الْفَيْنِ وَخَمْسُ مِائَةٍ سَيِّئَةً قَالُوا وَكَيْفَ لَا نُحْصِيهِمَا قَالَ يَا بَنِي آدَمَ أَحَدَكُمْ الشَّيْطَانُ وَهُوَ فِي صَلَاتِهِ يَقُولُ أَذْكَرُ كَذَا أَذْكَرُ كَذَا حَتَّى يَنْفَتِلَ فَلَعَلَّهُ أَنْ لَا يَفْعَلَ وَيَأْتِيهِ فِي مَضْجَعِهِ فَلَا يَزَالُ يَتَوَمَّهُ حَتَّى يَنَامَ (رواه الترمذی و ابوداؤد والنسائی وفي رواية ابی داؤد) قَالَ خَصْلَتَانِ أَوْ خَلْتَانِ لَا يَحْفِظُ عَلَيْهِمَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ وَكَذَا فِي رِوَايَتِهِ بَعْدَ قَوْلِهِ وَالْفُ وَخَمْسُ مِائَةٍ فِي الْمِيزَانِ قَالَ يَكْبِرُ أَرْبَعًا وَثَلَاثِينَ إِذَا أَخَذَ مَضْجَعَهُ وَيَحْمَدُ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ وَيُسَبِّحُ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ وَفِي أَكْثَرِ نُسْخِ الْمَصَابِيحِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو۔

اخرجه ابوداؤد ۳۱۶۷/۴ حدیث رقم ۵۰۶۵۔ والترمذی فی السنن ۱۴۳/۵ حدیث رقم ۳۴۷۱۔ و اخرجه النسائی حدیث رقم۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دو چیزیں ہیں کہ محافظت نہیں کرتا ان پر مسلمان مرد مگر بہشت میں داخل ہوتا ہے یعنی نجات پانے والوں کے ساتھ داخل ہوگا۔ خبردار ہو جاؤ وہ دونوں چیزیں آسان ہیں۔ ان پر عمل کرنے والے کم ہیں یعنی ان پر مداومت کرنے والے نادر ہیں ایک تو یہ ہے کہ پاکی بیان کرے اللہ کی ہر فرض نماز کے بعد (یعنی سبحان اللہ) دس بار کہے اور اللہ کی حمد کرے یعنی الحمد للہ کہے دس مرتبہ اور اللہ اکبر کہے دس مرتبہ۔ ابن عمرو نے کہا ہے پس میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ وہ ان کو گن رہے تھے اپنے ہاتھ سے یعنی انگلیوں پر۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ ڈیڑھ سو ہیں۔ (یعنی پانچوں نمازوں کی وجہ سے) زبان پر اور ڈیڑھ ہزار

میزان میں ہے۔ یعنی میزان میں اس حساب سے کہ ہر نیکی دس کے برابر لکھی جاتی ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ جب سونے کے لیے بستر پر جائے تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرے اور بہت زیادہ تکبیر کہے اور جو شخص ان کلمات کو سو بار پڑھے گا یعنی سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار انشاء اللہ کبر ۳۳ بار۔ پس یہ سو مرتبہ زبان پر ہے اور میزان میں ہزار ہیں پس تم میں سے کون شخص ہے جو دن رات میں اڑھائی ہزار برائیاں کرتا ہو گا صحابہؓ نے عرض کیا ہم کس طرح ان چیزوں میں کہ وہ اپنی نماز میں ہوتا ہے جب شیطان تم میں سے کسی کے پاس آتا ہے اس حال میں وہ کہ اپنی نماز میں ہوتا ہے پھر شیطان کہتا ہے فلائی چیز کو یاد کر فلائی چیز کو یاد کر یعنی امور دنیوی اور احوال نفسانیہ سے یا جو کہ کچھ کہ نماز کے ساتھ متعلق نہیں اگرچہ امور آخرت سے ہو۔ یہاں تک کہ نماز پڑھ کر پھرتا ہے پس شاید کہ وہ ان کلمات پر مخاطب نہ کرے اور شیطان اس کی خوابگاہ میں آتا ہے۔ پس ہمیشہ سلاتا رہتا ہے اس کو یہاں تک کہ سو جاتا ہے اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے ابوداؤد کی روایت میں اختلاف ہے بعض لفظوں میں اسی طرح سے آیا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا دو خصلتیں ہیں یا فرمایا دو خصلتیں ہیں راوی کو شک ہو گیا ہے کہ وہ لفظ فرمایا یہ یعنی دونوں ایک ہی ہیں یعنی دو چیزیں ہیں کہ ان پر مسلمان بندہ محافظت نہیں کرتا بجائے لَا يَحْصِيهِمَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ كَلَّا يَحْفَظُ عَلَيْهِمَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ ہے اور اسی طرح سے ابوداؤد کی روایت میں ہے ان کے قول کے پیچھے وَالْفُ وَخَمْسُ مِائَةٍ فِي الْمِيزَانِ كَلَّا يَحْفَظُ عَلَيْهِمَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ ہے کہ فرمایا اور تکبیر کہے چونتیس مرتبہ جس وقت اپنے سونے کی جگہ پر آئے اور تینتیس مرتبہ حمد کرنے اور تینتیس مرتبہ حمد کرے اور تسبیح کرے مرتبہ اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں عبد اللہ بن عمرؓ ہے یعنی یہ اور فائدہ ذکر کیا گیا ہے کہ مؤلف نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے یہ حدیث نقل کی ہے اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں عبد اللہ بن عمرؓ سے ہے۔

تشریح: قولہ عن عبد اللہ بن عمرو بن عاص: لفظ "عاص" کی تحقیق ماقبل میں بہت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

قولہ: خلطان لا يحصيهما رجل مسلم الا دخل الجنة: "خلطان" خاء کے فتح کے ساتھ ہے۔ ایک روایت میں (لا يحصيهما کے بجائے) لا يحافظ عليهما کے الفاظ ہیں۔ اور "الا دخل الجنة" میں استثناء مفرغ ہے۔

قولہ: لا وهما يسير ومن يعمل بهما قليل: "الا" حرف تنبيه ہے۔ "وهما يسير" جملہ معترضہ ہے۔ واو حال ہے، اور عالمہ معنی تنبيه ہے۔

قولہ: يسبح الله: یہ جملہ خلطان کا بیان ہے، اور ضمیر رجل مسلم کی طرف عائد ہے۔ قال: فتلك: ایک نسخہ میں "فقال" ہے۔ واذا اخذ مضجعه خلّت ثانیہ کا بیان ہے، اور اذا ظرفیت مجرہ کیلئے ہے۔ فأبكم يعمل: فاء، شرط محذوف کا جواب ہے۔ اور استفہام میں ایک قسم کے انکار کے معنی ہیں۔ وكيف لا نحصيهما: ایک نسخہ میں لا نحصيهما ہے۔ یاتی أحد کم: أحد کم مفعول مقدم ہے۔ فلعله: یہ فاء شرط محذوف کی جزاء ہے۔

يعقدها بیده: "يد" سے مراد اصابع، اناہل اور عقدتینوں ہو سکتے ہیں۔ ابن حجر لکھتے ہیں: امر الأمر بالعقد الأناهل فی حدیث فیحتمل أنه مخیر ویحتمل أن المراد بالید الأناهل، ویحتمل العکس۔ حقیقی معنی پر محمول کرنا، مجازی معنی پر محمول کرنے سے اوٹی ہے۔ نیز اناہل کو ذکر کر کے "ید" مراد لینا مقصود سے انتہائی بعید بات ہے۔ فتأمل۔

پس تم میں سے کون ہے؟ یہ جواب ہے شرط محذوف کا اور اس استفہام میں ایک طرح کا انکار ہے یعنی اس استفہامیہ جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جب ان دونوں چیزوں پر محافظت کی اور اس کے بدلہ میں دن رات میں اڑھائی ہزار نیکیاں حاصل ہوئیں تو ان میں سے ہر نیکی

کے بدلہ برائیاں دور کی جاتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں)۔ لہذا تم میں سے ایسا کون ہے جو دن رات میں ان نیکیوں سے زیادہ برائیاں کرتا ہے اور جتنی بھی برائیاں کرتا ہو وہ ان نیکیوں کی وجہ سے معاف نہ ہو جاتی ہوں، اس لئے ایسی صورت میں تمہارے لئے یہ بات کیسے بہتر ہو سکتی ہے کہ تم ان دونوں چیزوں پر محافظت نہ کرو؟ حاصل یہ کہ ان دونوں چیزوں پر عمل کرنے سے نیکیاں برائیوں سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہیں اور پھر نہ صرف یہ کہ وہ برائیاں ان نیکیوں کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں بلکہ نیکیوں کی زیادتی کی وجہ سے درجات بھی بلند ہو جاتے ہیں لہذا تمہیں چاہئے کہ تم پابندی کے ساتھ ان دونوں چیزوں پر عمل کرتے رہو پھر جب صحابہؓ نے ان دونوں چیزوں کا اتنا زیادہ ثواب اور ان کی اتنی فضیلت سنی تو کہنے لگے کہ جب یہ بات ہے تو پھر ہمارے لئے ایسی کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی کہ ہم ان دونوں چیزوں پر محافظت نہ کریں گویا انہوں نے ان چیزوں کے ترک کرنے سے بعید جانا مگر آپ ﷺ نے ان کے اس استبعاد (یعنی بعید جانے کی) تردید فرمائی کہ شیطان جو انسان کی نیکی کا ازلی دشمن ہے۔ اپنی گھلت میں رہتا ہے وہ کب برداشت کرتا ہے کہ کوئی شخص اتنی عظیم سعادت کو حاصل کر لے اس لئے وہ نماز میں وسوسے پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ نماز کے بعد کے اور اداؤں کا رے غافل کر دیتا ہے اسی طرح وہ سوتے وقت ذکر سے غافل کر کے سلا دیتا ہے۔

صبح وشام کے وقت مذکورہ دعا پڑھنے کی فضیلت

۲۳۰۷: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ غَنَامٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحُ اَللّٰهُمَّ مَا اَصْبَحُ بِى مِنْ نِعْمَةٍ اَوْ بِاَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحَدِّكَ لَا شَرِيكَ لَكَ فَالْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ فَقَدْ اَدَى شُكْرَ يَوْمِهِ وَمَنْ قَالَ مِثْلَ ذَلِكَ حِينَ يُمْسِي فَقَدْ اَدَى شُكْرَ لَيْلَتِهِ۔ (رواہ ابو داؤد)

الخرجه ابو داؤد فی السنن: ۳۱۶/۴ حدیث رقم ۵۰۷۳۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن غنام سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت کہے اے الہی جو چیز مجھ کو صبح کے وقت حاصل ہوئی نعمت سے یعنی دینی اور دنیاوی اور ظاہری اور باطنی یا کسی تیری مخلوق سے پس تیری ہی طرف سے ہے تو تمہارے نہیں کوئی شریک تیرا پس تیرے ہی لیے تعریف ہے اور تیرے لیے شکر ہے پس جو شخص یہ دعا صبح کے وقت پڑھے پس تحقیق اس نے اس دن کا شکر ادا کیا اور جو شخص اسی کی طرح (یعنی یہی دعا) شام کے وقت پڑھے پس تحقیق اس نے رات کا شکر ادا کیا۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عبد اللہ بن غنام۔ یہ عبد اللہ بن غنام کو بیاضی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ ان کی صحابیت مختلف فیہ ہے۔ بہر حال ان سے صرف ایک حدیث مروی ہے۔ ان کی حدیث ”دعاء“ کے بارے میں ربیعۃ بن ابی عبدالرحمن عن عبد اللہ بن عنبسۃ عن عبد اللہ بن غنام سند کے ساتھ مروی ہے۔

تشریح: قولہ: عن عبد اللہ بن غنام: غین معجمہ کے فتح اور نون کی تشدید کے ساتھ، یہ وہی ہیں جن کو ”بیاضی“ کہا جاتا

ہے۔

قولہ: اللہم ما اصبح بی من نعمۃ او باحد من خلقک فمنک و حدک لا شریک لک:

”اُو“ برائے توجع ہے۔ اور مراد تقیم ہے۔ ”و حدک“ ضمیر مجرور بحرف جر ”فمنک“ سے حال ہے۔ اُی: فحاصل منک منفردا۔

امام طیبی فرماتے ہیں: یہ فاء جواب شرط پر داخل ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ﴾ [النحل: ۵۳] اور جزاء کیلئے یہ شرط ہے کہ وہ شرط کیلئے سبب ہو، اس آیت مبارکہ میں یہ مفہوم اس صورت میں درست ہے کہ اخبار و تنبیہ علی الخطا مانی جائے، کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے تھے، بلکہ معاصی کے ذریعہ ان کا انکار کرتے تھے۔ تو ان سے خطاب کر کے کہا گیا: ان أخبرکم بأن ما التبتس بکم من نعم اللہ تعالیٰ وأنتم لا تشکرونہا سبب لأن أخبرکم بأنہا من اللہ تعالیٰ حتی تقوموا بشکرہا، اور حدیث میں اس کے برعکس ہے: انی أقرؤ أعترف بأن کل النعم الحاصلة الواصلة من ابتداء الحیاة الی انتهاء دخول الجنة فمنک وحدک، فأوزعنی أن أقوم بشکرہا ولا أشکر غیرک فیہا اھ۔ یہاں بھی ابن حجر نے اپنی عادت کے موافق عبارت سمجھے بغیر تعاقب کیا ہے۔

قولہ: فلک الحمد ولک الشکر: بعض کا کہنا ہے کہ یہ مطلوب کی تقریر کیلئے ہے۔ اسی وجہ سے خبر کو مبتدا پر مقدم کیا ہے جو مفید حصہ ہے۔ گویا قائل یوں کہہ رہا ہے: اذا كانت النعمة مختصة بک، فہا أنا أنقاد الیک، وأخص الحمد والشکر لک قانلاً لک: الحمد لا یغیر کم ولک الشکر لا لأحد سواک۔

قولہ: فقد ادى شکر.....: حدیث مبارکہ کا یہ جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ شکر نام ہے منع حقیقی کے اعتراف اور ہر چھوٹی بڑی نعمت میں غور و فکر کرنے کا اور اس کا (یعنی شکر کا) کمال درجہ یہ ہے کہ حق نعمت بجا لایا جائے اور نعم کی رضا کے موافق مصرف میں لایا جائے۔

سوئے وقت کی ایک اور دُعا

۲۳۰۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ إِذَا أُوِيَ إِلَى فِرَاشِهِ اللَّهُمَّ رَبَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوَى مُنْزِلَ التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِي شَرٍّ أَنْتَ اخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُونَكَ شَيْءٌ أَقْضِ عَنِّي الدَّيْنَ وَاعْنِينِي مِنَ الْفَقْرِ۔

(رواہ ابو داؤد و الترمذی وابن ماجہ و رواہ مسلم مع اختلاف یسیر)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۴/۱۴ حدیث رقم (۶۱ - ۲۷۱۳)۔ و ابو داؤد فی السنن ۳۱۲/۴ حدیث رقم ۵۰۵۱۔

و الترمذی ۱۳۸/۵ حدیث رقم ۵۰۵۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے وہ کہتے تھے جب آپ سونے کے لیے آتے تو کہتے اے الہی! اے آسمانوں کے پروردگار اور اے زمین کے پروردگار اور اے ہر چیز کے پروردگار اور اے دانے کے اور گٹھلی کے پھاڑنے والے۔ یعنی ان کو پھاڑ کر زراعت اور کھجور کا درخت نکالنے والے اے توریت انجیل اور قرآن کے اتارنے والے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ برے کی برائی سے تو اس کی پیشانی کے بال پکڑنے والا ہے یعنی تیرے قبضہ قدرت میں ہے یعنی تو ہی پہلے ہے یعنی قدیم ہے بلا ابتداء کے پس تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں ہے اور تو ہی آخر ہے یعنی بغیر انتہا کے باقی ہے پس تیرے پیچھے کوئی چیز نہیں ہے اور تو ظاہر ہے یعنی باعتبار افعال و صفات کے۔ پس تیرے اوپر کوئی نہیں ہے یعنی تیرے ظہور کے اوپر کوئی چیز تجھ سے ظاہر نہیں ہے اور تو پوشیدہ ہے یعنی باعتبار ذات کے۔ پس کوئی چیز تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے اور مجھ سے قرض یعنی اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق ادا کر دیجئے اور مجھ کو فقر سے غمی کر دے یعنی مخلوق کے محتاج ہونے سے یا دل کی محتاجگی سے اس کو ابو داؤد اور

ترمذی اور ابن ماجہ اور اس کو مسلم نے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله عن النبی ﷺ انه كان يقول اذا اوى الى فراشه: حسن کی روایت میں ”يقول وهو

مضطجع“ ہے۔

قوله: اللهم رب السموات ورب الأرض ورب كل شيء فالق الحب والنوى ومنزل التوراة والانجيل والفرقان: مسلم کی بعض روایات میں (السموات کے ساتھ) ”السبع“ کا اضافہ ہے۔ اور حسن کی روایت میں ”ورب العرش العظيم“ کا اضافہ ہے۔ اور (العظیم کو) مجرور منصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ”ورب كل شيء“ تعین بعد از تخصیص ہے۔ ”فالق“ فلق بمعنی ”شقی“ سے ماخوذ ہے۔ اور ”النوی“ نواۃ کی جمع ہے۔ ”نوی“ کی تخصیص اس کی فضیلت کے باعث ہے یا اس وجہ سے کہ دیار عرب میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ”فالق الحب والنوی“ کا مطلب ہوا: یا من شقهما فأخرج منهما الزرع والنخيل۔

”منزل“ باب افعال سے (اسم فاعل کا صیغہ) ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ باب تفعیل سے (اسم فاعل کا صیغہ) ہے۔ اور حسن کی روایت میں ”القرآن“ کے بجائے ”الفرقان“ آیا ہے۔

والانجيل والقرآن: حسن کی روایت کے پیش نظر اس کی وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ قرآن حق و باطل میں فرق واضح کرتا ہے۔ یہاں زبور کا ذکر نہیں فرمایا چونکہ تورات میں شامل ہے یا اس وجہ سے کہ زبور میں صرف مواعظ تھے، احکامات نہیں تھے۔

امام طیبی فرماتے ہیں اگر آپ کہیں کہ ان قرآن کے درمیان وجہ نظم و مناسبت کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں: وجہ اس کا یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے اللہ جل شہ کی بابت اس کا رب السموات والأرض ہونا ارشاد فرمایا تو اس کے بعد فالق الحب والنوی ذکر فرمایا تاکہ خالقیت اور مالکیت دونوں معنی اکٹھے ہو جائیں۔ چونکہ یہ آیت کریمہ: ﴿يَخْرُجُ الْحَيُّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمِنَ الْمَيِّتِ الْحَيُّ﴾ [الروم: ۱۹] فالق الحب والنوی کی تفسیر ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حیوان نامی کو نطفہ سے پیدا کرتا ہے۔ اور دانہ کو گٹھلی سے پیدا کرتا ہے۔ اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ یعنی ان اشیاء کو حیوان اور نامی سے نکالتا ہے یا یہ کہ حیوان اور نامی کو نکالتا ہے۔ اس کے بعد منزل التوراة ذکر فرمایا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان اشیاء کو عدم سے وجود بخشا محض اس لئے ہے کہ ان کے خالق کو جانے اور اس کی عبادت کی جائے۔ اور اس کی تحصیل نزول کتاب اور بعثت رسول کے بغیر ہو نہیں سکتی۔ گویا کہ یوں فرمایا ہے: یا مالک یا مدبر یا هادي أعود بك: یہ پاکیزہ کلام ہے، اس قابل ہے کہ سونے کے پانی سے لکھا جائے، اور ابن حجر نے اس پر گرفت فرمائی ہے، ابن حجر کا کلام ایسا ہے کہ جس کو ماء زمزم سے اس قدر دھویا جائے کہ ختم ہو جائے۔

قوله: أعود بك من شر كل ذي شر أنت آخذ بناصيته: ایک نسخہ میں واو عاطفہ کے (اضافہ کے) ساتھ ”وأعود“ ہے۔ حسن کی روایت میں (من شر كل ذي شر أنت آخذ بناصيته) میں (أنت آخذ بناصيته کے بجائے) ”من شر كل ذي شر أنت آخذ بناصيتها“ وارد ہوا ہے۔

قوله أنت الأول فليس قبلك شيء وأنت الآخر فليس بعدك شيء: اور حسن کی روایت میں ”اللهم أنت الأول“ کے الفاظ ہیں۔ بعد والا جملہ معنی سابق کی تقریر ہے۔ کہ آپ ہی وہ باقی ذات ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور آپ کی ”آخریت“ کے بعد کوئی شیء ایسی نہیں کہ جس کو بقاء لذاتہ حاصل ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”بعدك“ معنی میں ”غيرك“ کے ہو۔ اور مطلب یہ ہے کہ آپ کا غیر فی حدہ ذاتہ فانی ہے۔ اگرچہ حالت

الصالحين ﴿النمل: ۱۹﴾ أى أجمعنى مندرجا فى جملتهم مغمورا فى برکتهم، بخلاف اجمعنى منهم فانه يصدق أن يكون من جملة عددہم، وهذا ليس فيه كبير فخر *اھ*۔

ابن حجر کے اس کلام میں غرابت ہے، وہ یوں کہ یہ بات اس تقدیر پر درست ہے کہ ”ندی“ سے مراد ”اہل مجلس“ ہیں، جیسا کہ یہی ظاہر ہے، البتہ جب ”ندی“ سے مراد ”مجلس“ ہو تو ”فی“ کا وجود متعین ہے۔ اور ”ابلیغیت“ کا دعویٰ بھی ممنوع ہے۔ اس کی نظیر آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: واحشرنى فى زمرة المساكين۔ چونکہ اس میں مبالغہ فی التواضع کی کئی انواع ہیں۔ بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ ”اجعل“ متعدی بدو مفعول ہے، جیسا کہ ان آیات مبارکہ میں ہے: ﴿رب اجعلنى مقيم الصلاة﴾ [ابراہیم: ۴۰] اور ﴿رب اجعل هذا البلد آمنا﴾ [البقرة: ۱۲۶] میں۔ چنانچہ ”فی“ کے لانے کی صورت میں ”جعل“ میں ”ایقاع“ کے معنی کی تضمین ہوگی جیسا کہ اس جملہ میں ہے:

يجرح فى عراقيبها نصلى۔

چنانچہ اس کے نتیجہ میں ابن حجر کے قول اور ان کی پیش کردہ نظیر ﴿أدخلنى برحمتك فى عبادك الصالحين﴾ [النمل: ۱۹] دونوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ چونکہ ابن حجر کی پیش کردہ نظیر نہ لفظاً نظیر ہے، نہ معنی نظیر ہے۔ ”رہن“ (گروی) سے مراد نفس ہے مطلب یہ ہے کہ میرے نفس کو بندوں کے حق سے آزاد بری الذمہ کر اور میری لغزشوں کو معاف فرما کر اپنے عذاب سے نجات بخش۔

”اعلى“ سے مراد ”ملاؤ اعلى“ ہے، یعنی فرشتے یا فرشتوں کی مجلس مراد ہے۔ أى اجمعنى من المجتمعين فى الملاؤ الاعلى من الملائكة۔

ایک احتمال یہ ہے کہ مقام اعلى سے مراد درجہ رفیعہ اور وہ مقام وسیلہ مراد ہے جس کی بابت نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

انه لا يكون الا لعبد، وأرجو أن أكون أنا هو۔ أى ذلك العبد۔

تو پیشتر فرماتے ہیں: ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد ”نداء اہل الجنة“ ہو، کہ یہ لوگ رتبہ اور مکان کے اعتبار سے اہل نار سے اعلى ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿ونادى أصحاب الجنة أصحاب النار أن قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا﴾ [الاعراف: ۴۴] اور نداء اسفل سے مراد اہل نار کا اہل جنت کو پکارنا ہے: ﴿أن أفيضوا علينا من الماء أو مما رزقكم الله﴾ [الاعراف: ۵۰] اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے اہل جنت میں سے بنا۔

سوتے وقت آپ ﷺ کی جامع دعا

۳۳۱۰۔ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا أَخَذَ مَضْجَعَهُ مِنَ اللَّيْلِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي كَفَانِي وَأَوَانِي وَأَطْعَمَنِي وَسَقَانِي وَالَّذِي مَنَّ عَلَيَّ فَأَفْضَلَ وَالَّذِي أَعْطَانِي فَأَجْزَلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ اللَّهُمَّ رَبِّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيكُهُ وَالْهَ كَلِّ شَيْءٍ أَعُوذُ بِكَ مِنَ النَّارِ۔ (رواه ابو داود)

احرجہ ابو داؤد فی السنن ۳۱۳/۴ حدیث رقم ۵۰۵۸۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ جب اپنی خوابگاہ کی طرف تشریف لے جاتے یعنی رات کو فرماتے سب تعریف خدا کے لیے ہے جس نے مجھ کو کفایت کیا یعنی مخلوق سے بے پروا کیا اور مجھ کو مکان دیا رہنے کو کہ وہ سردی اور گرمی کو دور کرتا ہے پس اس نے بہت دیا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے بہر حال اے اللہ ہر چیز کے پروردگار

اور اس کے مالک اور ہر چیز کے معبود میں تیرے ساتھ یعنی تجھ سے آگ سے پناہ مانگتا ہوں یعنی ان چیزوں سے جو عذاب و دوزخ کا باعث ہیں اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اذا اخذ مضجعه: ایک نسخہ میں من اللیل کا اضافہ بھی ہے۔

قولہ: الحمد لله الذی کفانی و آوانی و اطعمنی و سقانی۔

عرض مرتب: اتنے حصہ کی تشریح حدیث: ۲۳۸۶ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قولہ: والذی من علی فأفضل والذی اعطانی فأجزل: "فأفضل" فاء کے ساتھ ہے، اور ایک روایت میں واؤ کے ساتھ

"وأفضل" ہے۔ افضل کے کئی معنی بیان کئے ہیں: (۱) زاد۔ (۲) أكثر۔ (۳) أحسن۔

امام طیبی فرماتے ہیں: یہ فاء ترتب تفاوت کیلئے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: خذ الأفضل فالأفضل فالأفضل والأفضل

فالأفضل: چنانچہ اعطاء "حسن" ہے: و هكذا المعنون۔ من کو مقدم کیا چونکہ وہ غیر مسبوق بعمل العبد ہے۔ بخلاف اعطاء کے، چونکہ وہ کبھی مسبوق بہ بھی ہوتی ہے۔

قولہ: الحمد لله علی کل حال: اس میں اشارہ ہے کہ تمام حالات، مصائب و بلیات ایسی ہیں کہ ان پر شکر ادا کرنا واجب

ہے، چونکہ یہ چیزیں رافعہ سینات ہوتی ہیں یا رافعہ درجات ہوتی ہیں۔ بخلاف اہل نار کے احوال کے، چونکہ وہ لوگ دنیا میں تھے تو حالت

معصیت میں تھے، اور دار عقبیٰ میں عقوبت میں ہوں گے۔ چنانچہ ان احوال پر شکر نہیں بلکہ اللہ کے حکم پر شکر اور اس کی قدر و قضاء پر رضامند

ہونا چاہئے۔ اللہ جل شانہ ہر حال میں اپنی صفات و افعال محمود ہے۔

قولہ: اللهم رب کل شیء و ملیکہ و الہ کل شیء:

قولہ: و اعود بک من النار: مرتب عرض کرتا ہے کہ اس حصہ کی تشریح ماقبل میں گزر چکی ہے۔

۲۳۱۱: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ سَكَا خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا أَنَا مِنَ اللَّيْلِ مِنَ الْأَرْقِ

فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَقُلْ اللَّهُمَّ رَبَّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَمَا أَظَلَّتْ وَرَبَّ الْأَرْضَيْنِ

وَمَا أَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِينِ وَمَا أَصَلَّتْ كُنْ لِي جَارًا مِنْ شَرِّ خَلْقِكَ كُلِّهِمْ جَمِيعًا أَنْ يَغْرُطَ عَلَيَّ أَحَدٌ

مِنْهُمْ أَوْ أَنْ يَبْغِيَ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ (رواه الترمذی وقال هذا حديث ليس

اسنادہ بالفقوی والحکیم بن ظہیر الراوی قد ترک حدیثہ بعض اہل الحدیث)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۹۵ حدیث رقم ۳۵۸۹۔

ترجمہ: حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ خالد بن ولید نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی پس عرض کیا اے اللہ کے

رسول ﷺ میں رات کو سو نہیں سکتا۔ بے خوابی کی وجہ سے پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تو اپنے سونے کی جگہ کی

طرف جائے پس تو کہے اے الہی سات آسمانوں کے پروردگار اور اس چیز کے جس پر آسمان سایہ کیے ہوئے ہیں اور

اے زمینوں کے پروردگار اور اس چیز لے کر آتا رہی ہیں زمین یعنی مخلوقات اور اے شیطانوں کے پروردگار اور ان کے

کہ ان کو شیطان نے گمراہ آیا ہے۔ یعنی جن و انس ہو میرے لیے پناہ دینے والا اپنی مخلوقات کی سب سے برائی سے اس

سے کوئی مجھ پر کوئی زیادتی کرے ان میں سے یا ظلم کرے تیرا پناہ چاہنے والا غائب ہے اور تیری تعریف بہت بڑی ہے

اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے مگر تو ہی ہے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں

ہے اور حکم بن ظہر اس حدیث کے راوی ہیں تحقیق چھوڑ دی ہے اس کی حدیث بعض اہل حدیث نے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس روایت کی اسناد قوی نہیں ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی حکیم بن ظہیر کی روایت کو بعض محدثین نے ترک کیا ہے۔ اہـ ”حکم“ میں جاء اور کاف دونوں مفتوح ہیں۔ اور سید کے اصل نسخہ میں ”الحکیم“ ہے، یعنی یاء کے ساتھ ہے، اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ ”الحکم“ درست ہے۔ (کما فی الکاشف والتقریب)

تشریح: قولہ: شکا خالد الی النبی ﷺ..... الارق: ”شکا“ صاحب قاموس لکھتے ہیں۔ شکوی: یونون وشکایة بالکسر وشکوت اھ۔ پہلی لغت فصیح ہے۔ اس کے مطابق شکا اُلف کے ساتھ لکھا جائے گا۔ جیسا کہ علم الخط کا مقررہ قاعدہ ہے۔

”ارق“ بروزن قلم ہے۔ (اور ”من“، تعلیلیہ ہے)۔ ای: من أجل السهر۔

قولہ: فقال نبی اللہ ﷺ اذا أویت الی فراشک: ”أویت“ قصر کے ساتھ ہے۔

قولہ: اللهم..... ورب الأرضین وما اقلت: راء کے فتح، نیز سکون کے ساتھ۔

قولہ: ورب الشیاطین وما اضلت: یہاں ”ما“، بمعنی ”من“ ہے، اور ما قبل میں غیر عاقل کو عاقل پر غلبہ دیا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ”ما“ برائے مشکلات ہو، یا تزیل منزلہ کے ہو، یا یہ کہ تمام مواقع میں وصفیت کیلئے ہے۔

قولہ: کن لی جاراً من شر خلقک کلہم جمیعاً: اور ایک روایت میں من شر خلقک أجمعین کے الفاظ آئے ہیں۔

أی کفا لی مانوا ومجیرا وحافظا: استجرت فلانا فأجارتنی: یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی معنی میں ہے: ﴿وہو یجیر

ولا یجار علیہ﴾ [المؤمنون: ۸۸] ”جمیعاً“ حال ہے، تاکید معنوی ہے اور ”کلہم“ تاکید لفظی ہے۔

قولہ: أن یفرط علی احد منهم او ان یغی: شتر ہم سے بدل الاستعمال ہے۔ (یا حرف جر مقدر ہے) لئلا یفرط او

کراہة أن یفرط۔ مفتح میں لکھتے ہیں: ای یقصد باذائی مبرعاً۔ ثناؤک: اضافت الی الفاعل ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اضافت

الی المفعول ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ شئی اس کا غیر ہو یا اس کی ذات ہو۔ چنانچہ ان الفاظ نبویہ کے متشابہ ہوگا: أنت کما أنتیت علی

نفسک۔

قولہ: عز جارك وجل ثناؤک لا اله غیرک لا اله الا أنت: یہ بعد والا جملہ توحید کی تاکید ہے۔ اور ”تفرید“ کی تائید ہے۔

اختلاف روایت: حصن میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام طبرانی نے الأوسط میں اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے، لیکن الفاظ یہ

ہیں: جل ثناؤک ولا اله غیرک کے بجائے تبارک اسمک کے الفاظ ہیں۔ امام میرک نے لکھا ہے: اس حدیث کو امام طبرانی نے کبیر

میں بھی روایت کیا ہے، الکبیر کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: عز جارك وجل ثناؤک ولا اله غیرک۔

الفصل الثالث:

آپ ﷺ کو صبح کے وقت مذکورہ دعائیں کیا کرتے تھے

۲۳۱۲: عَنْ أَبِي مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِذَا أَصْبَحَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمَلِكُ لِلَّهِ

رَبِّ الْعَالَمِينَ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ هَذَا الْيَوْمِ فَتَحَهُ وَنَصْرَهُ وَنُورَهُ وَبَرَكَتَهُ وَهَدَاهُ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ

مَا فِيهِ وَمِنْ شَرِّ مَا بَعْدَهُ ثُمَّ إِذَا أَمْسَى فَلْيَقُلْ مِثْلَ ذَلِكَ۔ (رواه ابو داود)

ترجمہ: حضرت ابی مالکؓ سے روایت ہے تحقیق رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت تم میں سے کوئی صبح کرے پس چاہے کہ وہ کہے ہم نے صبح کی اور ملک نے صبح کی۔ خالص خدا کے واسطے۔ عالموں کا پروردگار ہے۔ اے الہی تحقیق میں تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں اس دن کی کشائش سے یعنی میں مقصود کو پہنچوں اور مدد اس کی یعنی اس دن میں میری مدد کر۔ نفس اور شیطان اور دشمنوں پر غالب ہوں اور اس کا مور مانگتا ہوں یعنی علم و عمل کی اس میں توفیق ہو اور اس کی برکت ہو یعنی اس دن رزق حلال طیب ہاتھ لگے اور اس کی ہدایت یعنی عمل اور اعتقاد حق پر رہوں اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں ہر اس چیز کی برائی سے۔ کہ اس دن میں ہو اور اس چیز کی برائی سے کہ اس کے پیچھے ہو پھر جب کہ شام کرے۔ پس چاہئے کہ کہے اس کے مانند۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس کو ابوداؤد نے سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کو ضعیف قرار نہیں دیا۔

تشریح: قولہ: اصبحنا..... العالمین: ”العالمین“ میں تغلیب ہے، ذوی العقول کو ان کے شرف کی وجہ سے ”غلبہ“ دیا

گیا ہے۔

قولہ: اللهم انی اسالك خیر هذا الیوم فتحه ونصره وبرکتہ وهداه: امام طبریؒ فرماتے ہیں: فتحہ اور اس کے مابعد

اسماء خیر هذا الیوم سے بدل ہیں۔

تشریح: فتح کے معنی ہیں مقصود پر ظفریابی، ہداه: یعنی متابعت ہدی اور مخالفت ہوئی پر ثابت قدمی۔ امام طبریؒ لکھتے ہیں: الفتح هو

الظفر بالتسلط صلحا وقهرا، والنصر الاعانة والاظهار علی العدو۔ وهذا أصل معناهما، ويمكن التعميم فيهما

یعنی فیفید التاکید۔

قولہ: واعوذ بك من شر ما فيه، ومن شر ما بعده: سوال خیر کا مذکورہ بالا اسلوب اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درالمفاسد،

جلب المنافع سے اہم ہے۔

قولہ: ثم اذا امسى فليقل مثل ذلك:

انسان کو عافیت مانگنی چاہیے

۲۴۱۳: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ قَالَ قُلْتُ لِأَبِي يَابَتْ أَسْمَعُكَ تَقُولُ كُلَّ غَدَاةٍ اللَّهُمَّ عَافِنِي فِي

بَدَنِي اللَّهُمَّ عَافِنِي فِي سَمْعِي اللَّهُمَّ عَافِنِي فِي بَصَرِي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ تَكْرَرُهَا ثَلَاثًا حِينَ تُصْبِحُ وَثَلَاثًا

حِينَ تَمْسِي فَقَالَ يَا بَنِي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَدْعُو بِهِنَّ فَإِنَّا أَحِبُّ أَنْ أَسْتَنَّ بِسُنَّتِهِ۔ (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۲۴/۴ حدیث رقم ۵۰۹۰۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ میں آپ کو ہر روز

صبح شام یہ الفاظ کہتے ہوئے سنتا ہوں: اے الہی! مجھ کو میرے بدن میں عافیت دے۔ اے الہی! مجھ کو میری شنوائی (یعنی

میری سماعت میں عافیت دے الہی! مجھ کو میری بینائی میں مدد دے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر تو یہی ہے اس نے کہا اے

میرے بیٹے میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ دعا مانگتے تھے ان کلموں سے پس میں پسند کرتا ہوں کہ پیروی کروں

حضور ﷺ کی سنت کی۔ اس کو امام ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عبدالرحمن بن ابی بکرۃ۔ عبدالرحمن بن ابی بکرہ انصار بنو ثقیف میں سے ہیں۔ بصرہ ہی میں ۱۴ھ میں مسلمانوں کے وہاں پہنچنے پر پیدا ہوئے۔ بصرہ میں مسلمانوں کے یہاں سب سے پہلے ان کی پیدائش ہوئی، تابعی ہیں۔ کثرت سے روایات نقل کرتے ہیں۔ اپنے والد اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے روایات سنی ہیں۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

مرتب عرض کرتا ہے یہ وہی ابوبکرہ ہیں جو حضور ﷺ کے آزاد کردہ ہیں۔

تشریح: قوله: قلت لابی یا أبت اسمعك تقول كل غداة: "أبت" تاء کے کسرہ نیز فتح کے ساتھ ہے۔ "اسمعك" (اصل کلام یوں تھا) ای اسمع کلامک حال کونک۔ "غداة" صبح کو کہتے ہیں۔ اور بظاہر مردان ہے، جیسا کہ اگلے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔

قوله: اللهم عافني..... سمعي..... فی بصری: "سمع" اور "بصر" کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا، چونکہ نگاہ آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ کی نعمتوں کا ادراک کرتی ہے، اور کان رسول پر نازل ہونے والی آیات کا ادراک کرتے ہیں۔ پس یہ دونوں ادنیٰ نقلیہ و عقلیہ ادراک کرتی ہیں، اور "سمع" کو "بصر" پر مقدم ذکر کرنے میں اس کی افضلیت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی قبیل سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

اللهم متعنا بأسماعنا وأبصارنا وقوتنا ما أحييتنا واجعلها الوارث منا۔

قوله: لا اله الا أنت: اقرار الوہیت اور اعتراف ربوبیت کے مجموعہ کا نام کمال عبودیت ہے۔

تکرر ہا ثلاثا حین تصبح وثلاثا حین تمسی: ہا ضمیر سے مراد هذه الجمل یا هذه الدعوات ہیں۔ اور ترکیبی اعتبار سے "تقول" سے بدل ہے، یا حال ہے۔ "حین تصبح" تقول کیلئے طرف ہے اور "حین تمسی" کی بھی یہی ترکیب ہے۔

قوله: فقال يا بنی سمعت رسول الله ﷺ يدعو بهن: "بنی" یاء کے فتح نیز کسرہ کے ساتھ، دونوں طرح درست ہے۔ اور تصغیر برائے شفقت ہے۔ (یدعو بهن کے بعد كذلك محذوف ہے۔) ای كذلك۔

صبح کے وقت کی دُعا

۴۴۴: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَصْبَحَ قَالَ أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمَلَكُ لِلَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَالْكَبِيرُ يَاءٌ وَالْعُظْمَةُ لِلَّهِ وَالْخَلْقُ وَالْأَمْرُ وَاللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَمَا سَكَنَ فِيهِمَا لِلَّهِ اللَّهُمَّ اجْعَلْ أَوَّلَ هَذَا النَّهَارِ صَلَاحًا وَأَوْسَطَهُ نَجَاحًا وَآخِرَهُ فَلَاحًا يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ ذَكَرَهُ النَّوَوِيُّ فِي كِتَابِ الْأَذْكَارِ بِرِوَايَةِ ابْنِ السِّنِّيِّ۔

اخرجه النووي في الاذكار ص ۱۵۵ الحديث رقم ۱۹۲ وابن السني في عمل اليوم والليله ص ۲۳ الحديث ۳۸۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب صبح کرتے تھے تو کہتے کہ میں نے صبح کی اور ملک نے صبح کی۔ خدا کے واسطے اور تمام تعریفیں خدا کے واسطے ہیں اور ذات کی بزرگی اور صفات کی بزرگی خدا کے لیے ہے اور مخلوقات اور حکم اور رات اور دن اور جو رات میں آرام پکڑتے ہیں اور دن میں آرام پکڑتے ہیں۔ اے الہی کردے اس کے پہلے جسے کوخیر بنا دے اور اس کے درمیان کو حجاجات کے برآمد کا سبب بنا دے اور اس کے آخر کو نجات

کاسب بنا دے۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے سب رحم کرنے والوں میں سے علامہ نووی نے یہ حدیث کتاب الاذکار میں نقل کی ہے ابن سی کی روایت کے ساتھ۔

تشریح: قوله: اصبحنا..... والكبرياء والعظمة لله والخلق والامر والليل والنهار وما سكن فيهما:

یعنی صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ اللہ ہی کیلئے ہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں آتا ہے: ”والخلق أى الایجاد التدریجی والأمر أى الایجاد الآتی أو واحد الأوامر والمراد به الجنس أو واحد الأمور“ اور اس سے مراد تصرف و حکم ہے، یا خلق سے مراد ”ایجاد“ اور امر سے مراد ”امداد“ ہے، پہلے سے اشارہ عالم صورت کی طرف ہے اور ثانی سے عالم معانی کی طرف اشارہ ہے۔ ومنه: ”قل الروح من امر ربی“۔ واللیل والنهار سے مراد ان کا زمانہ و مکان مراد ہے۔

وما سكن فيهما، اگرچہ تحرک کا ذکر نہیں مگر مراد وہ بھی ہے، چنانچہ یہ باب اکتفاء سے ہے۔ جیسے ”سرابیل تقیکم الحر“ اسی والبرد: یا سکن بمعنی نبت ہے اور ایک روایت میں وما یضحیٰ، اور مطلب یہ ہے کہ چاشت کے وقت میں جو چیز بھی داخل ہوتی ہے، یا ظاہر و بارز ہوتی ہے اس میں نہ حقیقتہً نہ صورتہً کسی بھی اعتبار سے غیر اللہ کا کوئی دخل نہیں۔

قوله: اللهم اجعل أول هذا النار صلاحا وأوسط نجاحا وآخره فلاحا: بظاہر اول و آخر اور اوسط سے مراد تمام اوقات و ساعات کو اللہ جل شانہ کی عبادت اور طاعات میں صرف کرنا ہے، یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کے ذریعہ دنیا کے حالات و معاملات میں حسن آتا ہے، اور آخرت کے بلند درجات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں: صلاحا فی دیننا بایں طور کہ ہم سے ایسے اعمال صادر ہوں کہ جس کے ذریعہ ہم آپ کے نیک بندوں کے زمرہ میں شامل ہو جائیں، پھر ہمیں نجات عطا فرما، اور ہمارے امر کا خاتمہ کامیابی پر فرما، کہ جو دخول جنت کا سبب ہے، پس ہم ان لوگوں کی لڑی میں شامل ہو جائیں کہ جن کے حق میں فرمایا: ”أولئك علی هدی من ربهم وأولئك هم المفلحون“۔

اسی وجہ سے (علماء) فرماتے ہیں: ”أجمع كلمة فی الشریعة كلمة الفلاح۔ میں کہتا ہوں اسی وجہ سے اللہ جل شانہ نے فرمایا: ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ.....﴾

قوله: یا أرحم الراحمین: ان کلمات پر اختتام دعا فرمایا، چونکہ یہ (ان کلمات پر دعا کا اختتام کرنا) دعا کے جلد قبول ہونے کا سبب ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ حاکم نے اپنی مستدرک میں ابوامامہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے:

ان لله ملكا مؤكلا لمن يقول: يا أرحم الراحمين فمن قالها ثلاثا قال له الملك: ان أرحم الراحمين قد أقبلك فسل:

جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے جس دعا کو ارحم الراحمین پر ختم کیا جائے وہ جلد قبول ہوتی ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس دعا کو انہیں الفاظ پر ختم کیا۔ حاکم نے مستدرک میں ابوامامہ سے بطریق مرفوع بیان کیا ہے کہ یا ارحم الراحمین کہنے والوں پر اللہ تعالیٰ فرشتہ متعین فرما دیتا ہے چنانچہ جو شخص اس جملہ کو تین بار کہتا ہے تو وہ فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ ارحم الراحمین تیری طرف متوجہ ہے جو مانگتا ہے مانگ لو۔

اور ”ثلاثا“ کی قید بظاہر اس لئے ہے کہ غالب یہی ہے کہ جو شخص ان کلمات کو تین مرتبہ کہے گا تو اس کا دل اور خدا کی رحمت متوجہ ہوگی۔

اختلاف روایت: اس حدیث کو امام جزیری نے حصن میں بروایت ابن ابی شیبہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یوں نقل کیا ہے:

”اوسطه فلاحاً، و آخره نجاحاً، أسألك خیر الدنیا والآخرة۔“

آپ ﷺ بعض وقت میں یہ دعا بھی پڑھا کرتے تھے

۲۳۱۵: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِذَا أَصْبَحَ أَصْبَحْنَا عَلَى فِطْرَةِ الْإِسْلَامِ وَكَلِمَةِ الْإِخْلَاصِ وَعَلَى دِينِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ ﷺ وَعَلَى مِلَّةِ آبِنَا إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ (رواه احمد والدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۳۷۸/۲ حدیث رقم ۲۶۸۸۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن ابی زئی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت صبح کرتے تھے تو کہتے تھے ہم نے صبح کی دین اسلام کے اوپر اور کلمہ توحید کے لالہ اللہ محمد رسول اللہ اور اپنے نبی کے دین پر یعنی محمد ﷺ کے اور اپنے باپ کے دین پر یعنی ابراہیم کے دین پر باطل دین سے بیزار ہو کر متوجہ تھے دین حق پر اور ابراہیم مشرکوں سے نہ تھے۔ نقل کی یہ احمد وارداری نے۔

اسنادی حیثیت: صاحب السلاخ کا فرمانا ہے کہ اس حدیث کو امام نسائی نے کئی طرق سے روایت کیا ہے، اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

تشریح: قولہ: اصبحنا علی فطرہ الاسلامو کلمة الاخلاص: فطرت سے مراد خلقت ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ فطرہ اور فطر میں وہی نسبت ہے جو خلق اور خلق میں ہے کہ یہ حالت کا اسم ہے، پھر اس کو خلق کا اسم بنا دیا گیا۔ اس کا اطلاق خصوصاً اس خلقت پر ہوتا ہے جو دین حق کو قبول کرنے والی ہو۔ اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ [الروم: ۳۰] اور حدیث میں آتا ہے: کل مولود یولد علی الفطرة۔ کلمة الاخلاص: سے مراد وہ توحید خالص ہے جو دنیا میں حجاب سے اور عقبی میں عقاب سے چھکارا دلانے والی ہے، یعنی کلمہ توحید اور کلمہ طیبہ: لا اله الا الله محمد رسول الله۔

قولہ: وعلی دیننا محمد: یہ ما قبل سے انحصار ہے، چونکہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کی ملتوں کو ”اسلام“ کا نام دیا جاتا ہے، اور یہی مشہور ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے یہ تمام آیات کریمہ: ﴿ان الدین عند الله الاسلام﴾ [سورۃ آل عمران: ۱۹۰] حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول: ﴿فلا تموتن الا و انتم مسلمون﴾ [البقرہ: ۱۳۲]

تو پیشگی فرماتے ہیں: کذا فی الحدیث وهو غیر ممتنع۔ اور ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کلمات اس لئے جبراً ارشاد فرمائے ہوں تاکہ دوسرے لوگ بھی سن لیں اور سیکھ لیں۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: ”ولعل“ کی تعبیر اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی، چونکہ روایت سماع پر ہی متفرع ہو رہی ہے، اور سماع جہر کے بغیر تحقق نہیں ہوتا۔

قولہ: وعلی ملة ابنا ابراهيم حنيفا: حضرت ابراہیم علیہ السلام ابو العرب ہیں، چونکہ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔ چنانچہ اس میں تغلیب ہے یا یہ کہ انبیاء بمنزلہ آباء کے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿النبی اولی بالمؤمنین من انفسهم وازواجه امهات﴾ [الاحزاب: ۶۰]۔ اور ایک قراءت شازہ میں وهو اب لهم کے الفاظ ہیں۔ اس تخصیص کی احتیاج اس وجہ سے ہے: ﴿ان اتبع ملة ابراهيم حنيفا﴾ [النحل: ۱۲۳]۔ یعنی اصول دین میں یا بعض فروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء فرمائیے، مثلاً ختان اور باقی دس مشہور سنتیں۔

”حنیفا“ کا مطلب ہے تمام ادیان باطلہ سے ملت ثابتہ عادلہ کی طرف مائل شخص کو۔ حنیف کی ضد ملحد، خف اور الحاد کے لغوی معنی مطلق ”میزان“ کے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ حنیف مسلم مستقیم کو کہتے ہیں، اور یہ وصف حضرت ابراہیم علیہ السلام پر غالب ہے۔ یا اس سے مراد مسلم ہے یعنی جو متقاد کامل ہو، بایں طور کہ غیر اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو، حتیٰ کہ جبرائیل علیہ السلام سے کہا: أما الیک فلا۔ اسی قبیل سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: بعثت بالحنیفة السمحة۔

قوله: وما كان من المشركين۔ اس جملہ میں کفار عرب کے اس قول کی تردید ہے: نحن علی دین ابینا ابراہیم، اور یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے۔ یہ جملہ اور قابل والے حال، احوال متداخلہ ہیں، ان کے لانے کا مقصد تقریر ہے، اور اس وہم سے سیانہ مقصود ہے کہ ممکن ہے کہ حنیفا حال منقلہ ہو، چنانچہ اس توہم کی تردید فرمادی کہ وہ ہمیشہ موحد ہی رہے، اور یہ حال مشبہ ہے مومکدہ ہے۔ تخریج: اسی طرح اسی حدیث کو امام نسائی نے اپنی سنن میں اور طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے، مگر احمد اور طبرانی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: فی الصباح والمساء جمیعا۔ اور نسائی کی روایت میں صرف فی الصباح کے الفاظ ہیں۔ (کذا نقلہ الجزری)

بَابُ الدَّعَوَاتِ فِي الْأَوْقَاتِ

مختلف اوقات کی دعاؤں کا بیان

جواز کا یعنی دعائیں وغیرہ شارع سے کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت سے متعلق منقول ہیں ان کو اختیار کرنا اور ان اذکار کو ان کے منقول اوقات میں پورا کرنا ہر شخص کے لئے مسنون ہے اگر ان اذکار کو پابندی کے ساتھ اختیار کیا جائے تو کیا ہی کہنے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم ایک مرتبہ تو ضروری پورا کیا جائے تاکہ آنحضرت ﷺ کی اتباع کی سعادت حاصل ہو جائے۔

ابن حجر لکھتے ہیں: بل ویكون أفضل من غیره حتی القرآن، وان ورد لذلك الغیر فضل أكثر من هذا، لأن فی ن الاتباع ما یرابوا علی غیره، ومن ثم قالوا: صلاة النافلة فی البیت أفضل منها فی المسجد الحرام، وان قلنا بالأصح أن المضاعفة تختص به۔ ان کا یہ کلام کل بحث ہے، چونکہ یہ بات اپنے اطلاق کے ساتھ درست نہیں، چونکہ دعائیں اور اذکار مسنونہ معینہ مثلاً حالت رکوع و سجود وغیرہ کی حالت کے اذکار، بلاشبہ ان کا بجالاتا اس وقت تلاوت قرآن سے افضل ہے، البتہ ان کے علاوہ اذکار دعا خواہ معینہ ہوں یا مطلقہ ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ قرآن سے افضل ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ حدیث قدسی ہے:

”من شغله القرآن عن ذکری و مسألتی أعطیته أفضل ما أعطی السائلین۔“

الفصل الاول:

جماع کے وقت کی دعا

۲۳۱۶: عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ بِسْمِ اللَّهِ اللَّهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْنَا فَإِنَّهُ أَنْ يُقَدَّرَ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِي ذَلِكَ لَمْ يَضُرَّهُ شَيْطَانٌ أَبَدًا۔ (متفق علیہ)

۱۲۳۴)۔ وخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۴۹۱۲ حدیث رقم ۲۱۶۱ والترمدی ۲۷۷۱۲ حدیث رقم ۹۸-۱۔ وابن ماجہ ۶۱۸۱۱ حدیث رقم ۱۹۱۹ والدارمی ۱۹۵۱۲ حدیث رقم ۲۲۱۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے صحبت کرنے کا ارادہ کرے یا اپنی لونڈی سے تو وہ کہے، ہم چاہتے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ اے الہی تو دور رکھ، ہم کو شیطان سے اور شیطان کو اس اولاد سے دور رکھ جو تو ہم کو نصیب کرے۔ پس تحقیق شان یہ ہے اگر مقدر میں ہوا تو اس جماع سے مرد و عورت کو فرزند دے دیا جائے گا۔ شیطان اس کو کبھی ضرر نہیں پہنچائے گا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: لو أن أحدکم اذا اراد ان یاتی اہلہ: ایک نسخہ صحیحہ میں ”أحدہم“ ہے۔ اور ”لو“ میں دو احتمال ہیں۔ (۱) ”لو“ شرطیہ ہے، اور اس کا جواب محذوف ہے۔ ای لنال خیرا کثیرا۔ (۲) برائے تمنیٰ ہے اور اس کی جزاء قال اذا اراد..... ہے۔

عرض مرتب: مرقاۃ کے محشی لکھتے ہیں: ہکذا فی الأصل باثبات (قال) فتبدو مقحمة ولعلہا من فعل النّساح۔ واللہ اعلم اھ۔ اذا اراد: اذا شرطیہ ہے، چنانچہ اس کو جواب کی احتیاج نہیں۔ ای تمنیت ثبوت هذا لأحدکم۔ اور ابن حجر لکھتے ہیں: ”لو“ للتمنیٰ وجزاء ہا تقدیرہ: لو ثبت قول حین اراد أحدہم اتیان اہلہ لکان حسنا، لانہ ﷺ کان یحب لأمتہ ما یحسب لنفسہ واذا خبر ان أو ظرف لخبیرہا۔ ملا علی قاریؒ نے ابن حجر کے اس کلام کی طرف غرابت کی نسبت کی ہے۔ قولہ: قال: بسم اللہ: ای مستعینا بہ وبذکر اسمہ، ”اللہم جنبنا“ ای بعدنا۔ ابن حجر نے اس کی توضیح یوں کی ہے: ای: بعد انا وہی۔ ملا علی قاریؒ نے اس کو جیہرہ کو بھی غریب کہا ہے۔

جنب الشیطان ما رزقتنا: (یہاں تھوڑی سی عبارت محذوف ہے)۔ ای: حینئذ من الولد۔ یہ ”جنب“ کا مفعول ثانی ہے۔ قولہ: فانہ ان یقدر بینہما ولد فی ذلک لم یضرہ: ”فانہ“ یہ جملہ معللہ ہے، اور ضمیر شان ہے۔ اور ”ذلک“ کا مشارالہ ”الوقت“ محذوف ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”الاتیان“ ہو۔ اور ”لم یضرہ“ میں راء پر فتح نیز ضمہ پڑھنا درست ہے۔ أبدا: اس میں اشارہ ہے کہ اس مبارک ذکر کی برکت کے باعث بچہ کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔

اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اکثر لوگ یہ دعا پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی اولاد شیطان کے تصرف اور اس کے ضرر سے محفوظ نہیں رہتی؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ”شیطان کبھی ضرر نہیں پہنچائے“ سے مراد یہ ہے کہ شیطان انہیں کفر کی کھانسیوں میں نہیں پھینک سکتا، لہذا اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحبت کے وقت ذکر اللہ کی برکت سے اولاد خاتمہ بخیر کی سعادت ابدی سے نوازی جاتی ہے یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان اس کی اولاد کو آسیب اور صرع (یعنی ہاتھ پاؤں ٹیڑھے) کر دینے یا اسی قسم کی دوسری بلاؤں میں مبتلا کر کے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں رہتا۔

حضرت امام جوزیؒ کے قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اس شخص کی اولاد کے دین و اعتقاد پر اثر انداز نہیں ہوتا اور جس طرح کہ شیطان دوسروں کے صحیح اعتقادات اور دینی رجحانات میں نقصان پہنچاتا ہے ان کی بہ نسبت اس شخص کی اولاد کے حق میں اس کا ضرر و نقصان بے اثر رہتا ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ پہلے (شیطان کو) معرفہ لانا اور پھر نکرہ ذکر کیا، چونکہ پہلے میں جنس کے معنی مراد ہیں، اور دوسرا اعم ہے، یا دوسرے سے اس کے تمام اعوان مراد ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ولادت کے وقت اس بچہ کو شیطان کچوکا نہیں لگا سکتا گا، بخلاف دوسرے بچوں کے، میں کہتا ہوں، کچوکا نہ لگا سکنے سے مراد سخت قسم کا کچوکا لگانا مراد ہے: چونکہ حدیث سے دو افراد کا استثنا، حضرت عیسیٰؑ اور ان کی

والدہ کا معلوم ہوتا ہے، نیز یہ بات خلاف مشاہدہ بھی ہے، اور کہا گیا ہے کہ: کسی ایک نے بھی اس حدیث کو عموم پر محمول نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ یہ بچہ ہر قسم کے ضرر اور اغواءِ شیطانی دوساوس سے محفوظ رہے گا۔ اھ۔

دوسرے وغیرہ پر محمول کیا بھی کیسے جا سکتا ہے، کہ ان سے تو صرف معصوم ہی محفوظ ہو سکتا ہے، لیکن مخبر صادق نے اس کی خبر دی ہے، چنانچہ کوئی نہ کوئی ظاہر تاثر ضرور ہوگی، وگرنہ تو اس کا کیا فائدہ؟ اور جس شخص کو اللہ جل شانہ نے اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق بخشی ہو تو وہ اپنی اولاد میں اس کی برکت دیکھتا ہے۔ یہ بات تو تحقق ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ﴾

تخریج: اصحاب اربعہ نے یہ حدیث از بن عباس عن النبی ﷺ یوں نقل کی ہے:

قال: لو أن أحدكم إذا أتى أهله قال باسم الله.....، ففضى بينهما ولد لم يضره۔

اور بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: لم يضره شيء أبدا۔

ابن ابی شیبہ ابن مسعود سے متوفی نقل کرتے ہیں: إذا أنزل قال: اللهم لا تجعل الشيطان فيما رزقني نصيبا۔

فائدہ: یہ دعا اپنے دل میں مانگے، یا جماع کر کے علیحدہ ہو چکنے کے بعد مانگے۔ چونکہ حالت جماع میں زبان کے ساتھ ذکر کرنا بالاجماع مکروہ ہے۔

فکر و غم کی شدت کے وقت مذکورہ دعا پڑھنی چاہیے

۴۴۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ عِنْدَ الْكُرْبِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ رَبُّ الْعَرْشِ الْكُرِيمِ۔ (متفق علیہ)

احرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۱/۱۴۵۔ حدیث رقم ۶۳۴۵۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۹۲/۴ حدیث رقم (۸۳)۔

۲۷۳۰)۔ و الترمذی فی السنن ۱۵۹/۵ حدیث رقم ۳۴۹۶ و ابن ماجہ ۱۲۷۸/۲ حدیث رقم ۳۸۸۳۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہتے تھے فکر و غم کی شدت کے وقت۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے بزرگ برباد ہے کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے عرش بڑے کا پروردگار اللہ کے سوا کوئی آسمانوں کا پروردگار نہیں ہے اور زمین کا پروردگار اور بڑے عرش کا پروردگار ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ان رسول اللہ ﷺ كان يقول عند الكرب: "الکرب" کاف کے فتنہ، راء کے سکون اور آخر میں باء

موحده۔

چنانچہ صحاح میں لکھتے ہیں: أى الغم الذى يأخذ النفس۔ (جان لیوا غم) بعض کا کہنا ہے: الکرب أشد الغم (سخت ترین غم) اور ابن حجر نے یوں لکھا ہے: هو ما يدهم المرء مما يأخذ بنفسه فيغمه ويحزنه۔

قولہ: لا اله الا الله العظيم الحليم: یعنی جو اپنی ذات و صفات میں عظیم ہے، کوئی بھی سوال و مسئلہ اس کے تئیں بڑا نہیں۔

"الحليم" وہ ذات جو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، چنانچہ جو اس کے حق خدمت میں کوتاہی برتے اس سے انتقام لینے میں جلدی نہیں کرتا، بلکہ اپنی رحمت کے ذریعہ اس کی مضرت کو دور کرتا ہے،

قولہ: لا اله الا الله رب العرش العظيم: "العظيم" کو مجرور و مرفوع دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

قولہ: لا اله الا الله رب السموات ورب الارض رب العرش الكريم: "الكريم" کو بھی انہی دو وجوہ کے ساتھ پڑھا

گیا ہے۔ ابن اہسین، در اوروی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے "العظيم" کو رفع کے ساتھ روایت کیا ہے، اور "الكريم" کو بھی اسی

طرح روایت کیا ہے، یہ دونوں لفظ ”رب“ کی صفت ہے۔ اس آیت کریمہ: ﴿رَبِّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ﴾ [المؤمنون: ۱۱۶] میں جمہور نے ”الکریم“ کو مجرور پڑھا ہے۔ اور ابن حنیسن نے دونوں میں رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر سے بطور شاذ یہ بھی مروی ہے، اور ابن جعفر سے بھی مروی ہے۔ اور دو غریب وجوہ بیان کی ہیں۔ پہلی تو وہ گزر چکی ہے، اور دوسری یہ ہے کہ رفع کے ساتھ ”عرش“ کی صفت ہو، بایں طور کہ مبتدا محذوف کی خبر ہو، برائے مدح ماقبل سے منقطع کر دی گئی ہو اور اس کو راجع قرار دیا ہے، چونکہ دونوں روایتوں میں توافق ہو جاتا ہے۔ ابو بکر اصم نے پہلی صورت کو راجح قرار دیا ہے، چونکہ ”عظیم“، ”کو“ ”رب“ کی صفت قرار دینا، ”عرش“ کی صفت قرار دینے سے اولیٰ ہے، یہ بات محل نظر ہے، چونکہ ”عظیم“ کی طرف مضاف شی کی صفت ”العظیم“، لانا، ”عظیم“ کی تعظیم میں اولیٰ ہے۔ ”ہد ہد“ نے بلقیس کے بارے میں ”عرش عظیم“ کی تعبیر اختیار کی، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس پر کوئی تکیہ نہیں فرمائی۔ واللہ اعلم۔

اس دعا میں اشارہ ہے کہ غم کو زائل کرنا اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں: یہ وہ ذکر ہے کہ جس (کا ورد کرنے) پر کرب و غم دور ہو جاتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں: اگر کہا جائے کہ یہ ذکر ہے دعا تو نہیں؟ تو اس کے دو جواب ہیں: (۱) اس ذکر سے دعا کی ابتداء کی جائے، پھر جو دعا مانگنا چاہے مانگے۔ (۲) یہ ذکر اس قبیل سے ہے: من شغلہ ذکری عن مسألتي أعطيتہ افضل ما أعطی السائلین اھ۔

(امام نووی کے ذکر کردہ) پہلے (جواب) کی تائید ابو عوانہ کی روایت سے ہوتی ہے (کہ جس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں): ثم یدعو بعد ذلك: یا یہ کہا جائے کہ یہ ثناء متضمن دعا ہے۔ گویا کہ تعریف ہے جیسا کہ سائل اور شاعر انتہائی لطیف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی قبیل سے امیر بن ابی صلت کا یہ شعر ہے کہ جس میں وہ کسی بادشاہ کی تعریف کر رہے ہیں کہ جس سے انعام مقصود ہے۔

اذا اثنی عليك المرء یوما
كفاه عن تعرضه الفناء

اور اسی قبیل سے یہ دعا ہے: افضل الدعاء، یوم عرفه لا اله الا الله وحده..... یا یہ کہا جائے کہ یہ درحقیقت ثناء باللسان ہے، دعا بالجان ہے اور اتکال علی الملک المنان ہے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ خلیل (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام) سے کہا گیا: لا تسأل ربك الجلیل؟ آپ اپنے رب جلیل سے سوال کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: حسبی من سؤالی علمہ بحالی۔

غصے کو دور کرنے کا وظیفہ

۲۳۱۸: وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ صُرَدٍ قَالَ اسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ وَنَحْنُ عِنْدَهُ جُلُوسٌ وَاحِدٌ هُمَا يَسُبُّ صَاحِبَهُ مُغْضَبًا قَدْ احْمَرَّ وَجْهُهُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنِّي لَا اَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَكَدَّهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ مِنَ الْغَضَبِ اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ فَقَالُوا لِلرَّجُلِ الْاَتَمَّعْ مَا يَقُولُ النَّبِيُّ ﷺ قَالَ اِنِّي كَسْتُ بِمَجْنُونٍ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۱۸۱۰۔ حدیث رقم ۶۱۱۵۔ واخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۱۵/۴ حدیث رقم (۱۹)۔

(۲۶۱۰)۔ وابدؤد ۲۴۸/۴ حدیث رقم ۴۷۸۰۔ والترمذی فی السنن ۱۶۷/۵ حدیث رقم ۳۵۱۶۔ وأحمد المسند ۲۴۰/۵

ترجمہ: حضرت سلیمان بن صرد سے روایت ہے فرمایا دو شخصوں نے برا کہا۔ آپس میں نبی کریم ﷺ کے نزدیک اور ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ان میں سے بہت برا کہتا تھا غصے میں بھرا ہوا۔ تحقیق اس کا چہرہ غصے

میں سرخ ہو گیا تھا پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تحقیق میں البتہ ایک کلمہ جانتا ہوں۔ اگر اس کو کہے تو اس کا غصہ جاتا رہے وہ یہ ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کی شیطاں مردود کی۔ پس صحابہؓ نے کہا کہ کیا تو نے نہیں سنا ہے وہ جو کہ نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں اس نے کہا میں دیوانہ نہیں ہوں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: استب رجلان عند النبی ﷺ ونحن عنده جلوس: ”استب“ باب افعال سے ہے اور ”سب“ سے ماخوذ ہے۔

قولہ: واحدهما يسب صاحبه مغضبا قد احمر وجهه: ”مغضبا“ ضاد کے فتح کے ساتھ، ”يسب“ کے فاعل سے ”حال“ ہے۔

شدت غضب کے باعث دل میں بہت زیادہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو صاحب غصہ کیلئے جان لیوا ہوتی ہے، اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ یہ حرارت اعضاء و جوارح خصوصاً چہرہ پر پھیل جاتی ہے، چونکہ چہرہ تمام اعضا کے مقابلہ میں لطیف اور دل کے بہت قریب ہے۔

قولہ: فقال النبی ﷺ: اني لاعلم كلمة لو قالها لذهب عنه مايجد: یہاں ”كلمة“ سے مراد کلمہ لغوی ہے، جو جملہ مفیدہ کو بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ حدیث مبارکہ درحقیقت اس آیت کریمہ سے متنبس ہے:

﴿وَمَا يَنْزَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ [الاعراف: ۲۰۰] امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی استعاذہ آپ کی امت میں سے صرف متقین کو ہی نفع پہنچائے گا۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان الذين اتقوا اذا مسهم طائف من الشيطان تذكروا﴾ [الاعراف: ۲۰۱]

قولہ: لا تسمع مايقول النبی ﷺ اني لست بمجنون: ایک نسخہ میں ”الا تسمع“ ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ کلام ایسے شخص کا ہے جس نے اپنے آپ کو انوار شریعت کے ذریعہ مہذب نہ بنایا ہو اور دین کی سمجھ حاصل نہ کی ہو۔ اور اس کو وہم ہو کہ استعاذہ جنوں کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ غضب نزغات شیطاں میں سے ہے، اور اسی وجہ سے انسان حال اعتدال سے خارج ہو جاتا ہے، اور کلام باطل زبان سے نکالتا ہے۔ اور فعل مذموم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے وصیت طلب کرنے والے شخص کے بارے میں فرمایا تھا: لا تغضب، اس شخص نے اپنا یہ سوال کئی مرتبہ دہرایا مگر دربار نبوت سے ہر بار یہی جواب ملا: لا تغضب اور اپنی اس وصیت میں ”لا تغضب“ کے علاوہ کوئی اور بات ارشاد نہیں فرمائی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ غصہ، اور اس سے ناشی اخلاق و افعال کے بہت بڑے مفسد ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غصہ فر کرنے کا بڑا آسان طریقہ یہ ہے کہ اعوذ باللہ پڑھ لیا جائے اس سے غصہ فرو ہو جائے گا اس حدیث کی بنیاد یہ آیت ہے: ﴿وَمَا يَنْزَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ اور اگر تمہیں شیطاں بہکا کر اپنے جال میں پھانسے تو اللہ سے پناہ مانگو بلاشبہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

جس شخص کو آنحضرت ﷺ نے یہ کلمہ تعلیم فرمایا وہ علم شریعت کے زیور سے آراستہ نہیں تھا اور دین کی سمجھ سے بالکل کور تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ کلمہ پڑھنے کے لئے اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دیوانگی میں مبتلا ہو میں دیوانگی میں مبتلا نہیں ہوں اس لئے یہ کلمہ کیوں پڑھوں۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کی طرف اس شخص کی بے اعتنائی کے سلسلہ میں امام طیبیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص منافق

رہا ہو یا پھر پرلے درجے کا بدخول خدا اور گنوار۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے: غیر اُمی لست بمجنون، فانطلق الیہ رجل فقال له: تعوذ باللہ من الشیطان الرجیم فقال: اُتروی لی بأس أمجنون انا اذهب۔ اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ یہ صاحب معاذ تھے۔ یہ بھی ناشی از غضب، قلت تحمل اور سوء اوب ہے۔ اہ۔ اگر یہ بات صحیح طور پر ثابت ہو کہ یہ معاذ ابن جبل ہی تھے تو اس کی یہ تاویل متعین ہے کہ یہ واقعہ ان کے قبول اسلام کے قریب زمانہ کا ہے اور یعنی شدت غضب کے باعث انہیں یاوند رہا، جیسا کہ ما قبل میں شدت فرح و خوف کا واقعہ گزرا۔ چونکہ حضرت معاذ کا شارح نبی کریم ﷺ کی صحبت بابرکت بعد میں اجلاء و اکابر صحابہ کرام میں ہونے لگا۔ حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

أعلم امتی بالحلال والحرام معاذ بن جبل: اور ایک طویل عرصہ تک ان کو یمن کا گورنر مقرر کئے رکھا، ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: یا معاذ انی أحب لك ما أحب لنفسی، فاذا فرغت من صلاتك فقل: اللهم اعنی علی ذكرك وشكرك وحسن عبادتك۔ اور ما قبل بات کی تائید لا تغضب والی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

شیطان سے پناہ مانگو

۲۴۱۹: زَعْنُ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا سَمِعْتُمْ صِيحَ الدِّيَكَةِ فَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنَّهَا رَأَتْ مَلَكًا وَإِذَا سَمِعْتُمْ نَهْيَ الْحِمَارِ فَتَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ فَإِنَّهُ رَأَى شَيْطَانًا۔ (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۳۵۰۱۶۔ حدیث رقم ۳۳۰۳۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۹۲/۴ حدیث رقم (۸۲۔ ۲۷۲۹)۔
واخرجہ ابو داؤد ۳۲۷/۴ حدیث رقم ۵۱۰۲۔ و الترمذی فی السنن ۱۷۱/۵ حدیث رقم ۳۵۲۴۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم مرغوں کی آواز سنو۔ پس اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو۔ اس لیے تحقیق وہ فرشتے کو دیکھتے ہیں اور جب تم گدھے کی آواز سنو۔ پس تم اللہ تعالیٰ سے شیطان مردود کی پناہ مانگو۔ اس لیے تحقیق وہ شیطان کو دیکھتا ہے اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اذا سمعتم صياح ديك فاسئلوا الله من فضله فانها رأت ملكا: ”دیکہ“ دیک کی جمع ہے، جیسے: ”قرودہ“ قرود کی، اور فیلہ، فیل کی جمع ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ کئی مرغوں کی آواز سننے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا جائے، بلکہ ایک مرغ کی آواز سن لینا بھی کافی ہے۔ ”فاسئلوا“ ہمزہ کے ساتھ اور نقل کے ساتھ بھی درست ہے۔

اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ مرغ فرشتے کو دیکھ کر بانگ دیتا ہے اس سے اس وقت تم خدا سے دعا مانگو تا کہ وہ آمین کہے اور تمہارے لئے بخشش چاہے اور جب گدھے کی آواز سنو تو اَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ پڑھو کیونکہ وہ شیطان کو دیکھ کر ریگتا (آواز نکالتا) ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نیک ہستیوں کے آنے کے وقت اللہ کی رحمت اور برکت نازل ہوتی ہے اور لہذا اس وقت دعا مانگی مستحب ہے نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کافروں پر چونکہ اللہ کا غضب اور عذاب نازل ہوتا ہے اس لئے کفار کے سامنے گزرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا مستحب ہے اس خوف سے کہ کہیں ان بد بختوں کی نحوست اور ان کی برائی کے جراثیم اپنے تک نہ پہنچ جائیں۔

قوله: واذا سمعتم نهيق الحمار فتعوذوا بالله من الشيطان فانه رأى شيطانا: اور ایک روایت میں ”نهيق الحمير“ کے الفاظ ہیں۔ اور ایک روایت میں (من الشيطان کے بعد) ”الرجيم“ کا اضافہ بھی ہے۔ مصابیح میں ”فانه رأى شيطانا“ کے بجائے (الفاظ یوں ہیں: فانها رأَت شیطانا۔ (اس صورت میں ”الحمار“ ”دابة“ کی تاویل میں ہے، ”مقابلہ“ کی رعایت پیش نظر ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: اللہ کا ذکر کرنے والوں کی آواز کے سب سے زیادہ مشابہ مرغ کی آواز ہے، چونکہ اللہ کی رحمت سے دور مخلوقات کی آواز کے سب سے زیادہ مشابہ آواز گدھے کی ہے۔ اھ۔ اور اس وجہ سے جہنم میں پڑے کفار کی چیخ و پکار کی آواز کو گدھے کی آواز کے مانند قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهْقٌ﴾ (ہود: ۱۰۶) اختلاف روایت: ابوداؤد، نسائی اور حاکم عبد اللہ سے نقل کرتے ہیں: أنه كذلك اذا سمع نباح الكلاب۔ امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے، علی شرط مسلم ہے۔

سفر کے وقت آپ ﷺ کی دعا

۲۳۲۰: وَعَنْ ابْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا اسْتَوَى عَلَى بَعِيرِهِ خَارِجًا إِلَى السَّفَرِ كَبَّرَ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرْنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ فِي سَفَرِنَا هَذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوَى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضَى اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هَذَا وَاطْوِلْنَا بَعْدَهُ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيفَةُ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْاَهْلِ وَاِذَا رَجَعَ قَالَهُنَّ وَزَادَ فِيْهِنَّ اَبُوْنَ تَابِيْتُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۷۸/۲۔ حديث رقم (۴۲۵-۱۳۴۲)۔ و ابوداؤد في السنن ۳۴۱/۳ حديث رقم ۲۶۰۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ جب سفر کے لئے نکلتے اور اپنے اونٹ پر سوار ہو جاتے تو اللہ اکبر تین بار کہتے پھر یہ آیت پڑھتے۔ کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے کہ جس نے یہ سواری ہمارے لئے مطیع کر دی ہے اور ہم اس کے واسطے طاقت رکھنے والے نہیں ہیں اور ہم اپنے پروردگار کی طرف پھرنے والے ہیں اور اے الہی! تحقیق ہم تجھ سے اس سفر میں ایسی نیکی تقویٰ اور عمل کا سوال کرتے ہیں جس سے تو راضی ہو جائے۔ یعنی اے الہی! تو اس کو قبول کر لے ہم پر ہمارا سفر آسان کر دے اور ہمارے واسطے لپیٹ دے یعنی اس کی درازگی کو دور کر دے۔ اے الہی! تو ہی ہے سفر میں نگہبانی کرنے والا اور اہل میں خبر گیری کرنے والا۔ اے الہی! تحقیق میں سفر کی مشقت سے اور بری حالت کے دیکھنے سے یعنی اہل و مال میں نقصان دیکھنے سے پناہ مانگتا ہوں اور غمگین اور بھی حالت سے پناہ مانگتا ہوں اور مال اور اہل اور اولاد میں برائی کے آنے سے پناہ مانگتا ہوں یعنی اس چیز سے پناہ مانگتا ہوں کہ سفر سے لوٹ کر آؤں تو اپنے اہل و مال میں نقصان دیکھوں اور رنج اٹھاؤں جب آپ ﷺ سفر سے واپس تشریف لاتے تو اس دعا میں ان الفاظ کے ساتھ اضافہ فرماتے کہ ہم سفر سے سلامتی کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کی طرف پھرنے والے ہیں تو بہ کرنے والے ہیں اور بندگی کرنے والے ہیں اپنے پروردگار کی تعریف کرنے والے ہیں۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اذا استوى على بعيره خارجا الى السفر كبر ثلاثا: سواری پر سوار ہو چکنے کے بعد تکبیر کی حکمت شاید

یہ ہے کہ یہ مقام مقام علو ہے، اور اس میں ایک قسم کی عظمت ہے، چنانچہ اس موقع پر اپنے خالق کی عظمت کو یاد کیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبیر تعجب من التسخیر کی وجہ سے ہو۔ چنانچہ حضرت علیؑ کی یہ حدیث اس کی مؤید ہے: انه عليه الصلوة والسلام كان اذا وضع رجله في الركاب قال: بسم الله، فاذا استوى على ظهرها قال: الحمد لله۔ ثم قال: ايك رواية میں ہے: قرا: یعنی اللہ جل شانہ کے اس فرمان: ﴿وجعل لكم من الفلك والانعام ما تركبون لتستروا على ظهوره ثم تذكروا نعمة ربكم اذا استويتم عليه وتقولوا﴾ [الزخرف: ۱۲-۱۳] کی تکمیل کی خاطر یہ آیت کریمہ: ﴿سبحان الذي سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الي ربنا لمنقلبون﴾ [الزخرف: ۱۳]

قوله: ﴿سبحان الذي سخر لنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الي ربنا لمنقلبون﴾ [الزخرف: ۱۳] یہ دعا درحقیقت اپنے عجز کا اعتراف ہے، اور یہ کہ اس سواری پر سوار ہونے کی قدرت اللہ ہی کے قدرت دینے اور سخر کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ ”لمنقلبون“ کا لام برائے تاکید ہے، اس میں اشارہ ہے کہ انسان کا حیات کی سواری پر استیلاء پانا ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ سواری کی پشت پر ہے، اور عنقریب اس پر زوال آجائے گا، حتیٰ کہ وہ اپنے مولیٰ سے ملاقات کیلئے تیار ہو جائے گا، اور خصوصاً سواری کبھی موت کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ مثلاً خدا نخواستہ سواری کا جانور بدک جائے وغیرہ۔ خواہ کسی بھی سواری پر سوار ہو جائے، خواہ سفر کیلئے سوار ہو جائے یا غیر سفر کیلئے اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے۔ اس آیت کریمہ: ﴿من الفلك والانعام﴾ [الزخرف: ۱۲] میں اس سے مراد اونٹ ہیں۔ چونکہ بلاد عرب میں زیادہ جانور یہی تھا۔ اور راوی کا یہ جملہ: خار جا الی السفر ایک طرف حکایت حال ہے اور دوسرے طرف ضبط مقال پر دلالت کر رہا ہے۔

قوله: اللهم انا نسئلك في سفرنا هذا البر والتقوى ومن العمل ما ترضى: امام طبریؒ فرماتے ہیں: اللہ جل شانہ کی طرف لوٹنا یہ سفر اعظم ہے، لہذا اس کیلئے زور دہونا چاہئے، اللهم: ایک روایت میں وقال اللهم ہے یعنی اے اللہ ہم اپنے اس سفر حسی میں طاعت اور محصیت سے بچاؤ طلب کرتے ہیں۔ یا بر سے مراد لوگوں سے حسن سلوک ہے۔ یا یہ کہ اے اللہ ہمارے ساتھ حسن سلوک فرما۔ اوامر کا بجائانا اور زواج سے اجتناب برتنا یہ بھی تقویٰ کا حصہ ہے۔ (حدیث مبارکہ کے اس جملہ میں درحقیقت) اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے: ﴿وتزودوا فان خير الزاد التقوى﴾ [البقرة: ۱۹۷]

ومن العمل: جنس مراد ہے۔ ما ترضی: کا صلہ محذوف ہے)۔ اے اے اللہ! ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ایک نسخہ میں اس (ما ترضی) کے ماقبل تحجہ کے الفاظ بھی ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اس نسخہ کا صحیح ہونا اللہ ہی جانتا ہے۔ عرض مرتب: ملا علی قاریؒ نے اس سے آگے مشیت، ارادہ رضا، امر و محبت کے درمیان کی نسبت پر کلام کیا ہے، جو ایک صفحہ کے لگ بھگ ہے۔ ہم نے وہ سارا کلام یہاں سے حذف کر کے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ اھ۔

قوله: اللهم هون علينا سفرنا هذا: ہون کیلئے مفعول ہے، یا اس کا ظرف ہے۔ مقبول مقدر ہے۔ اے اے اللہ! ہون امر و ناسی مع الراحة لقلوبنا وابداننا فی سفرنا۔ هذا: اے بالخصوص، لأن الصوفی ابن الوقت۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ظاہر میں اشارہ سفر ظاہری کی طرف ہو، اور باطن میں سفر باطنی کی طرف اشارہ ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے: کن فی الدنیا كأنک غریب أو عا بر سبیل۔ وأشار الشاطبی بقوله: قریبا غریبا، وفي کلام الصوفیة يعبرون عنها بکائن بانن وعرش وفرش ولا نهوتی تاسوتی۔

وقوله: واطولنا بعده: ”اطو“ طئی سے امر کا صیغہ ہے۔

اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس دور کے سفر کو قریب بنا دے، اور اس سفر میں ہماری حاجات کو پورا فرما دے۔ اس جملہ میں اہل معرفت کی اصطلاح پر زمان و مکان کی طرف اشارہ ہے۔ ابن حجرؒ (اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے) لکھتے ہیں: اے اللہ اس سفر کے بعد کو ہمارے لئے حقیقۃً لپیٹ دے۔ چونکہ حدیث میں آتا ہے: ان لله ملائكة يطوون الارض للمسافر كما تطوى القراطيس۔ یا مراد یہ ہے کہ ہماری مشقت کو ہلکا فرما دے۔

قوله: اللهم أنت الصاحب في السفر والخليفة في الأهل والتمال: (یہاں) ”صاحب“ حافظ و معین کے معنی میں ہے، اور اصل میں ”صاحب“ ”ملازم“ کو کہتے ہیں، اور مراد یہ ہے کہ اے اللہ آپ ہمیں اپنی مصاحبت یعنی عنایت و حفظ اور رعایت عطا فرما دیجئے۔ حدیث مبارکہ کے اس جملہ میں تنبیہ ہے کہ بھروسہ اللہ ہی کی ذات پر کرنا چاہئے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں آتا ہے: أنا يدك اللازم فلازم يدك۔

عرض مرتب: مرقاۃ کے محشی لکھتے ہیں: والخليفة في الأهل کا اضافہ مشکوٰۃ سے کیا ہے۔

”الخليفة“ من يقول مقام أحد في اصلاح امره۔ توریشی فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ہی وہ ذات ہیں جس سے میری رجا و وابستہ ہے، میرے سفر میں میرا بھروسہ آپ ہی پر ہے، میرے معین و محافظ ہو جائیے، اور میری غیبت میں میرے اہل خانہ کے نگہبان ہو جائیے، ان کی پراگندگی کو دور کر دیجئے، ان کی بیماریوں میں ان کی تداوی آپ ہی فرمائیے، ان کے دین اور ان کی امانت کی حفاظت فرمائیے۔

قوله: اللهم انى أعوذ بك من وعشاء السفر وكآبة المنظر: ”وعشاء“ واؤ کے فتح اور عین کے سکون کے ساتھ ہے بمعنی شدت و مشقت۔ کآبة: مد کے ساتھ ہے۔ اس کی توضیح میں عبارات مختلف ہیں: (۱) سوء الحال و تغير النفس۔ (۲) قیل: المراد منه الاستعاذة من كل منظر يعقب النظر اليه الكآبة عند النظر اليه۔ (۳) فى النهاية: الكآبة تغير النفس بالانكسار من شدة الهم والحزن۔ تصحیح شدہ نسخ اصول میں لفظ ”المنظر“ ظاء کے فتح کے ساتھ ہے۔ یہ مصدر ہے، ابن حجرؒ لکھتے ہیں: والمنظر بكسر الظاء ما نظرت اليه فأعجبك ويصح اراذته هنا۔ ابن حجرؒ کا یہ کلام روایت و روایت کے مخالف ہونے کی وجہ سے غیر صحیح ہے۔ مزید یہ کہ صاحب قاموس لکھتے ہیں: ان المنظر والمنظرة ما نظرت اليه، فأعجبك أساءك۔ صاحب قاموس نے معنی میں عموم رکھا ہے، کسرہ کی کوئی تخصیص ذکر نہیں کی۔

وسوء المنقلب فى المال والأهل: ”المنقلب“ لام کے فتح کے ساتھ، مصدر مہمی ہے۔ میرے لوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کوئی غم یا بیماری پیش آئے۔ مقصد پورا ہوئے بغیر لوٹ آنے سے اور یہ کہ جان کو کوئی مصیبت پیش آجائے مثلاً بیماری وغیرہ۔ اور مال و متاع کے لٹ جانے اور چوری ہو جانے سے۔ ”اہل“ سے مراد بیوی، خادم اور اقارب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بیمار ہو جائے، یا گم ہو جائے۔

قوله: آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون: ”آئبون“ ہمزہ ممدودہ کے بعد ہمزہ مکسورہ ہے۔ آب یؤوب بمعنی رجوع سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ سلامتی کے ساتھ ہم سفر سے اپنے وطن کی طرف، یا غیبت سے حضور کی طرف یا غفلت سے ذکر کی طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔

”تائبون“ یعنی معصیت سے طاعت کی طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔ تقدیری عبارت بظاہر یوں ہے: نحن آئبون تائبون۔ یہ کلام بطور اخبار کے ہے، تحدیث بنعمۃ اللہ ہے۔ اور اللہ کی طاعت پر ثبات کا قصد ہے۔ ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ یہ خبر بمعنی دعا ہے، صحیح نہیں،

خصوصاً جبکہ ”تائبون“ کی نسبت نبی کریم ﷺ اور اکثر صحابہ کرام کی طرف ہے۔

عابدون لربنا حامدون کے بارے میں بھی کلام کچھ یوں ہی ہے۔ عابدون کے بارے میں ابن حجرؒ لکھتے ہیں: اُمی وفقنا فی رجوعنا هذا للعبادة۔ یہ تکلف ہے، بلکہ تعطف ہے۔ ”لربنا“ عابدون کے متعلق ہے، یا ابجد یعنی ”حامدون“ کے متعلق ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تنازع کے قبیل سے ہو۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ”لربنا“ ممکن ہے کہ ”عابدون“ کے متعلق ہو، چونکہ اسم فاعل کا عمل ضعیف ہے۔ چنانچہ اس ذریعہ اس کو تقویت مل جائے گی۔ یا ”حامدون“ کے متعلق ہے اور مفید تخصیص ہے۔ اُمی نحمد ربنا لا نحمد غیرہ۔ یہ (ترکیب) اولیٰ ہے، چونکہ یہ ایسا ہے جیسا کہ دعا کیلئے خاتمہ اھ۔

اور ابن حجرؒ لکھتے ہیں: لربنا لا لغیرہ، حامدون: مبتدأ مؤخر، فهو خبر بمعنى انشاء الفناء علی اللہ وحدہ اھ۔ اول تو اس کلام میں غرابت ہے، ثانی یہ کہ ان کا یہ کلام پچھلے کلام انہ خبر بمعنى الدعاء کے منقض ہے، اور ثالث یہ کہ حامدون کی بیان کردہ ترکیب درست نہیں، چونکہ یہ حمل درست نہیں۔ مزید یہ کہ خود ان ہی کے کلام لربنا لا لغیرہ سے اس کی تردید ہو رہی ہے۔ اور درست بات یہ ہے کہ ”نحن“ مبتدأ محذوف ہے، اور آئینون تائبون عابدون لربنا حامدون سب اس کی اخبار ہیں، بغیر حرف عطف کے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے: ﴿وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ فَعَالٌ لِّمَا يَرِيدُ﴾ [البروج: ۱۴-۱۶] اور یہ لام اس کی نظیر ہے، بس فرق اتنا ہے کہ حدیث میں افادہ حصر کی خاطر اس کو مقدم کر دیا ہے۔ اور آیت میں رعایت فاعل کے خاطر مؤخر کر دیا ہے۔ (والعلم عند اللہ تعالیٰ) ابن حجرؒ نے اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ لکھی ہے: وما قررته فی لربنا اولیٰ وأظہر من تعلیقه بعابدون، لأن خاتمة الدعاء بالحمد سنة مؤکدة وتعلیقه بعابدون بعید عن السیاق اھ۔ اور وجہ تعجب یہ ہے کہ ان کی ذکر کی ذکر کردہ یہ بات بعینہ وہی ہے جو امام طیبیؒ نے فرمائی ہے۔ فالعجب أنه ذهب الی مذهب ما حصل فیہ الا التعب۔

حضور ﷺ سفر کی مشقتوں سے پناہ مانگا کرتے تھے

۲۳۲۱: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَرْجِسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا سَفَرَ يَتَعَوَّذُ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَأَبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَالْحُورِ بَعْدَ الْكُورِ وَدَعْوَةِ الْمَظْلُومِ وَسُوءِ الْمُنْظَرِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۷۹/۲ حدیث رقم (۴۲۶-۱۳۴۳)۔ والترمذی فی السنن ۱۶۱/۵ حدیث رقم ۳۵۰۲۔ وابن ماجہ ۱۲۷۹/۲ حدیث رقم ۳۸۸۸۔ والدارمی فی السنن ۳۷۳/۲ حدیث رقم ۲۶۷۲۔ واحمد فی المسند ۸۲/۵۔

ترجمہ: عبد اللہ بن سرجسؒ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سفر کرتے تھے تو سفر کی مشقت سے پناہ مانگتے تھے اور بری حالت کے لوٹنے سے اور نقصان سے پیچھے زیادتی میں یعنی اعمال صالح میں اور اہل و مال میں اور مظلوم کی بدعا سے اور اہل و مال کی بری حالت دیکھنے سے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: يتعوذ من وعثاء السفر وكأبة المنقلب والحور بعد الكور ودعوة المظلوم وسوء المنظر في أهل والمال (آگے لکھتے ہیں): وفيه تعمية لطيفة من جهة الكتابة والحساب، فتأمل تدر كهما على وجه الصواب۔ حدیث میں آتا ہے: السفر قطعة من العذاب۔ یعنی جہنم کے عذاب کی ایک قسم ہے۔ اس آیت میں اسی کا ذکر ہے: ﴿سَارَهُقَ صَعُودًا﴾ [المدثر: ۱۷] اُمی سأكلفه عقبة شاقفة المصعد۔ قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں: هو مثل لما یلقى من الشدائد۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ حقیقت پر محمول ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے: انه جبل من نار یصعد فیہ سبعین خریفا، ثم یتھوی فیہ كذلك أبدا۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، حاکم، اور ابن

جہان نے از ابوسعید سندج کے ساتھ روایت کیا ہے۔

”و کآبۃ المنقلب“ فائق میں لکھتے ہیں: هو أن ينقلب الي وطنه فيلقى ما يكتب منه من أمر أصابه في سفره أو فيما يقدم عليه اه۔ (حدیث مبارکہ کے) اس (جملہ) میں دنیا سے آخرت کے وطن کی سفر کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بات استعاذہ کے زیادہ لائق ہے۔ اور اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَسِعِلْمَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ﴾

[الشعراء: ۲۲۷]

قولہ: والحوور بعد الكور۔ یہ دونوں لفظ بروزن ”جوز“ ہیں۔ لفظ ”کور“ کے آخر میں راء ہے، اور بعض نسخوں میں ”کور“ راء کے بجائے ”الحوور“ حاء کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ ہے۔ ”حور“ کے اصل معنی ہیں: نقض العمامة بعد لفها۔ یا عرب کے اس قول سے مأخوذ ہے: حار بعد ما كان۔ کور اصل میں کور العمامة سے مأخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے: کار عمامتہ: ”الکور“ نون کے ساتھ ہے یعنی ”کون“ ہے۔

اس جملہ کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

(۱) النقصان بعد الزيادة۔ (۲) التفرق بعد الاجتماع۔ (۳) قیل: من فساد الأمور بعد اصلاحها۔

(۴) قیل: الرجوع عن الجماعة بعد أن كان فيهم۔ (۵) من التنزل بعد الترقى۔ (۶) من الرجوع الي المعصية بعد التوبة۔ (۷) من الرجوع الي الغفلة بعد الذكر۔ (۸) من الرجوع الي الغيبة بعد الحضور۔ (۹) قیل: من الشذوذ بعد الجماعة۔ (۱۰) من القلة بعد الكثرة۔ (۱۱) من الايمان الي الكفر۔ (۱۲) من احالة القبيحة بعد الحالة الجميلة۔

قولہ: ودعوة المظلوم: امام طیبی فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ مظلوم کی بددعا سے تو بہر حال بچنا چاہئے، خواہ حضر ہو، خواہ سفر ہو۔ میں کہتا ہوں یہی معاملہ حور بعد الكور کا بھی ہے، لیکن سفر چونکہ مظان بلایا ومصائب میں سے ہے، اس لئے خصوصی طور پر ذکر فرمایا۔ اہ۔ اور ان کی مراد یہ ہے کہ اس وقت (یعنی حالت سفر میں) دین و دنیا کے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے، حتیٰ کہ رفقائے سفر وغیرہ کے ساتھ زیادتی تک کی نوبت آجاتی ہے، خصوصاً جب کہ پانی کی تنگی ہو، جیسا کہ سفر صبح میں مشاہدہ ہے، تو دوسرے مواقع کا کیا کہنا۔ اور اسی وجہ سے بعض مشائخ اس کو یہ نام دیتے تھے۔

السنة التي عصيت الله فيها: حتیٰ کہ بعض حضرات اسی وجہ سے مکہ جانے کے بجائے راستے سے واپس آگئے۔ اس کلام سے ابن حجر کے اس کلام کا رد بھی ہو جاتا ہے جو انہوں نے طیبی کے کلام پر اعتراض کرتے ہوئے کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: وهو عجب، لأن جوابه لا يلاقي السؤال أصلاً فتأمل: یا یہ کہا جائے کہ مظلوم جب سفر میں ہوتا ہے تو اس کی دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ دو وجہ سے، (۱) وہ مشکل ومصیبت میں ہوتا ہے۔ (۲) وہ پردیس میں ہوتا ہے۔

قولہ: سوء المنظر: ظاء کے فتح کے ساتھ ہے۔ فی الأهل والمال: یعنی اس بات سے کہ کوئی ظالم یا فاجر میرے اہل و مال میں کوئی طمع کرے۔

مکان میں داخل ہوتے وقت کی دعا

۲۴۲۲: وَعَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ حَكِيمٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ نَزَلَ مِنْزِلًا فَقَالَ أَعُوذُ

بِكَلِمَاتِ اللَّهِ الثَّمَانِيَةِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ يَضُرَّهُ شَيْءٌ حَتَّى يَرْتَجِلَ مِنْ مَنْزِلِهِ ذَلِكَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۸۰/۴ حديث رقم (۵۴ - ۲۷۰۸)۔ وابدوداؤد في السنن ۱۳/۴ حديث رقم ۳۴۹۹۔

والترمذی فی السنن ۱۵۹/۵ حدیث رقم ۳۴۹۹۔ وابن ماجہ ۱۱۷۴/۲ حدیث رقم ۳۵۴۷۔ والدارمی ۳۷۵/۲ حدیث رقم ۲۶۸۰ واحمد فی المسند ۲۹۰/۲۔

ترجمہ: حضرت خولہ حکیم کی بیٹی سے روایت ہے۔ کہ کہا میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے۔ فرمایا کرتے تھے جو کسی مکان میں اترے یعنی سفر میں ہو یا حضر میں پھر وہ کہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے کلموں کے ساتھ کہ پورے ہیں یعنی اسماء و صفات یا اس کی کتابیں اس چیز کی برائی سے جو پیدا کی۔ اس کو کوئی چیز ضرر نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ وہ کوچ کرے اس منزل سے۔ اس کو امام مسلم بیعتل کیا ہے۔

راوی حدیث:

خولہ بنت حکیم۔ یہ ”خولہ“ بنت حکیم حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں۔ بڑی صالح اور فاضل بی بی تھیں ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے ”خولہ“ میں خائے عجمہ مفتوح اور اواس کا ہے۔

تشریح: قولہ: من نزل منزلاً: ابن حجر نے اسے سفر کے ساتھ مقید کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ حضر کا معاملہ بھی یوں ہی ہے، تنوین تکبیر کے باوجود تفسیر کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔

قولہ: أعود بكلمات اللہ التامات من شر ما خلق: یعنی ایسے کامل کلمات کہ جن میں نہ کوئی نقص داخل ہو سکتا ہے، اور نہ کوئی عیب داخل ہو سکتا ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ کلمات نافعہ شافیہ مراد ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ قرآن مراد ہے۔ (ذکرہ النووی)

اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ جل شانہ کے اسماء و صفات ہیں یا کتب منزلہ مراد ہیں، چونکہ وہ قدیم ہیں، ان میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اللہ جل شانہ کا ”کلام نفسی“ مراد ہے، یا اس کا علم مراد ہے، یا اس کے قضا یا مراد ہیں۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ای بشؤونہ المشار الیہا بکل یوم ای وقت ہو فی شان۔ لیکن یہ غیر صحیح ہے، لفظاً تو اس وجہ سے ٹھیک نہیں کہ کلمہ کا اطلاق ”شان“ پر نہیں ہوتا، اور معنی اس وجہ سے کہ اللہ جل شانہ کے شؤون میں سے مخلوقات بھی ہیں، اور وہ خود اس بات کی تصریح کر چکے ہیں کہ تعوذ قدیم سے نہ مانگا جائے، محدث سے نہ مانگا جائے۔ نیز علماء فرماتے ہیں: شؤون بیدہیا ولا یتدیہا، فانہا مقدرۃ قبل وجودہا: نیز من شر ما خلق بھی اس سے مناسبت نہیں رکھتا۔ من شر ما خلق: اس میں اشارہ ہے کہ مخلوق من حیث ہو مخلوق شر سے خالی نہیں۔ اور ممکن ہے کہ اس سے شر کا صدور ہو۔ ابن حجرؒ نے اس مبنیٰ کی طرف دھیان نہیں دیا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: مما فیہ شر۔

قولہ: لم یضروہ شیء حتی یرتحل من منزله ذلک: ”لم یضروہ“ راء کے فتنہ اور ضرر کے ساتھ ہے۔ ”شیء“ کی تنوین سے مستفاد تعمیم مفید بالغہ ہے۔ یہ معنی، ابن حجر کی لگائی ہوئی قید مما فیہ ضرر سے اولیٰ ہے۔ اس حدیث میں اہل جاہلیت کے ایک فعل کا رد بھی ہے، کہ جب وہ کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے تھے تو کہتے: نعوذ بسید اهل الوادی، اس کو ”کبیر الجن“ کا نام دیتے تھے۔ سورۃ جن کی یہ آیت کریمہ بھی اسی معنی میں ہے: ﴿وَ اِنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾ [الجن: ۱۰۶]

اس میں حقیقت ”تفرید“ اور حقیقت توحید کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ غیر اللہ نہ اپنے نفع کا مالک ہے، نہ اپنے نقصان کا، نہ زندگی کا مالک ہے، نہ حیات و نشور کا۔

بلکہ صاحب معرفت کی نظر میں اس کی حقیقت یہ ہے: ”لیس فی الدار غیرہ دیار، وانما السوی فی عین اهل الهوی، کالہباء فی الهواء۔ ایک اور عارف باللہ فرماتے ہیں: سوی اللہ واللہ ما فی الوجود۔

بچھو کے ڈسنے کی دعا

۲۳۲۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا لَقِيتُ مِنْ عَقْرَبٍ لَدَغْتَنِي الْبَارِحَةَ قَالَ أَمَا لَوْ قُلْتِ حِينَ أَمْسَيْتِ أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ النَّامَاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ تَصُرْكَ -

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۱/۴ - حدیث رقم (۲۷۰ - ۹۰)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔ پس اے اللہ کے رسول! میں نے ایک بچھو سے ایذا پائی کہ اس نے مجھ کو گزشتہ رات میں کاٹا ہے۔ فرمایا خبردار ہو جاؤ۔ اگر تو اس وقت کہتا جب شام کی تو نے تو کہتا کہ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے کلموں کے ساتھ کہ پورے ہیں اس چیز کی برائی سے کہ پیدا کی۔ نہ ضرر پہنچائے تجھ کو۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تخریج: وکذا الاربعہ

تشریح: قولہ: ما لقیتم من عقرب لدغتنی البارحۃ: اس ”ما“ کے بارے میں کئی احتمال ہیں:

۱۔ ”ما“ استفہامیہ ہے۔ ای: ای شی لقیتم ای۔ لقیتم وجعا شدیداً۔ ۲۔ ”ما“ تعجیبیہ ہے۔ ای: امر عظیم۔ ۳۔ ”ما“ موصولہ ہے اور خبر مذوف ہے۔ ای: الذی لقیتم لم أصفہ لشدتہ۔ ”البارحۃ“ ای اللیلۃ الماضیۃ۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: لدغتنی بالذال المعجمۃ والغین المعجمۃ ولدغتنی النار بالمعجمۃ ثم المهملة۔ یہ ضبط، نسخ مصحح کے بھی خلاف ہے، اور اصول معتدہ کے بھی مخالف ہے۔ چونکہ یہ لفظ دال مہملہ اور غین معجمہ کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے۔ نیز کتب لغت قاموس اور نہایہ وغیرہ کے موافق ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ صاحب کتاب کے قلم سے سہو ہو گیا ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

قولہ: قال: اما لو قلت حین امسیت: ”اما“ برائے تشبیہ ہے۔ لو قلت: ”لو“ شرطیہ ہے۔

تخریج: اور ترمذی کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: من قال حین یمسی ثلاث مرات لم یضرہ حمۃ تلک اللیلۃ۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے الأوسط میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: من قال حین یصبح ویمسی اور ایک روایت میں فقط ”حین یمسی“ ہے۔ دارمی کی ایک روایت میں اور ابن السنی کی روایت میں ”ثلاث مرات“ کے الفاظ ہیں۔

سفر کی حالت میں سحری کے وقت خدا کی تعریف کرنا

۲۳۲۴: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا كَانَ فِي سَفَرٍ وَأَسْحَرَ يَقُولُ سَمِعَ سَامِعٌ بِحَمْدِ اللَّهِ وَحُسْنِ بَلَائِهِ عَلَيْنَا رَبَّنَا صَا حِينًا وَأَفْضَلُ عَلَيْنَا عَانِدًا بِاللَّهِ مِنَ النَّارِ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۶/۴ - حدیث رقم (۶۸ - ۲۷۱۸)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت سفر میں ہوتے تھے اور سحری کا وقت ہوتا تھا سننے والے میری خدا کی تعریف کر لی سنی سننے والوں نے میری خدا کی تعریف کرنی اچھ میرا اقرار کرنا۔ ساتھ اس کی نعمت کی خوبی کے ہم پر ہے۔ اے ہمارے رب ہماری تکہبانی کر اور احسان کر۔ ہم پر ہم یہ کلام خدا کے ساتھ پناہ مانگتے ہوئے کہتے ہیں۔ آگ سے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان النبی ﷺ کان اذا کان فی سفر یقول: "کان" ائی عادتہ ودأبہ اومن آدابہ۔ اسحر: بحر کے وقت میں داخل ہونا۔ طلوع صبح صادق سے کچھ پہلے کا وقت اور مجشری لکھتے ہیں: رات کا آخری چھٹا حصہ۔
قوله: سمع سامع بحمد اللہ وحسن بلائہ علینا: "سمع" بروزن عَلِمَ، تخفیف کے ساتھ ہے۔ (صورۃ ماضی ہے مگر امر مراد ہے)۔ ائی یسمع سامع لیشہد من سمع أصواتنا۔ "حمد اللہ" (مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، اور فاعل محذوف ہے)۔ ائی بحمدنا اللہ تعالیٰ۔

وحسن بلائہ علینا: (یہاں کچھ عبارت محذوف ہے)۔ ائی باعتبارنا بحسن انعامہ۔ یہ کلام خبر بمعنی امر ہے۔ (قالہ الخطا)۔ اور تورپیشی فرماتے ہیں: ظاہر لفظ کی بناء پر خبر کے معنی پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔ معنوی تقدیر یوں ہے: سمع من کان له سمع بأنا نحمد اللہ ونحسن نعمہ وافضالہ علینا: اور مطلب یہ ہے کہ ہمارا اللہ جل شانہ کی نعمتوں اور اس کے ہم پر انعامات کی تعریف کرنا اس قدر ذائع شائع بات ہے کہ کسی صاحب سماعت پر چٹنی نہیں۔ اور سامع کو نکرہ لانے میں عموم مراد ہے جیسا: تمرة خیر من جرادة میں بلاء سے مراد یہاں "نعمت" ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی مصیبت و مشقت میں ڈال کر آزماتا ہے تاکہ صبر کریں، اور کبھی نعمتیں دے کر آزماتا ہے تاکہ شکر ادا کریں۔ لہذا نعمت و مصیبت امتحان کے مواقع پر دونوں ہی آزمائش ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَالینا تَرْجِعُونَ﴾ [الانبیاء: ۳۵] شرح طبری میں لکھتے ہیں: بعض کا کہنا ہے کہ مسلم شریف کی اکثر روایات میں سمع از باب تفعیل، ماضی معروف واحد مذکر غائب کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا: بلغ سامع قولی هذا الی غیرہ۔ اور یہ تشبیہ کیلئے ارشاد فرمایا کہ یہ وقت دعا و ذکر میں مشغولیت کا ہے، خطابی وغیرہ نے لام مخففہ کے کسرہ کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ ابن حجر نے لکھا ہے: بحمد اللہ کی بقاء تشدید کی صورت میں زائدہ ہے۔ اور تخفیف والی صورت میں بمعنی "علی" ہے۔ اور یہ دونوں باتیں غیر صحیح ہیں، چونکہ عرب یوں استعمال کرتے ہیں: بلغ الناس بكذا اور سمع بهذا الخیر۔ اور جب شہد (کے معنی میں) ہو تو بقاء کا لانا ضروری ہے، چونکہ عرب کا محاورہ یوں ہے: شہد بكذا۔ مشہور اولہ اور مشہور علیہ دونوں برابر ہیں۔ امام طبری لکھتے ہیں: البلاء النعمة أو الاختیار بالخیر یتبین الشکر أو بالشکر لیظہر الصبر۔ اہ۔ امام طبری کا یہ کلام مستحسن ہے۔

اختیار میں دوسرا معنی اظہر ہیں، چونکہ حمد، نعمت کا پتہ دیتی ہے، لہذا البلاء کو اختیار پر محمول کرنا ضروری ہے تاکہ بندہ مراتب کمال کو جامع ہو۔ یہ آیت کریمہ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہے: ﴿ان فی ذلك لآیات لکل صبار شکور﴾ [ابراہیم: ۵] ائی لکل مؤمن: ایمان کے دو حصے ہیں، نصف ایمان صبر اور نصف ایمان شکر ہے۔ اور "علی" کے لانے میں اس طرف اشارہ کا غلبہ دینا مقصود ہے۔ کہ ہم اللہ کے حکم و ارادہ اور قدر و قضاء کے تحت مقہود ہیں، اللہ جل شانہ جس پر چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، ہم مکلف ہیں۔ دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿ان عرضنا الامانة علی السموت والأرض﴾ [الاحزاب: ۷۲] اس تقریر سے وہ اعتراض بھی دور ہو جاتا ہے جو ابن حجر نے امام طبری پر کیا ہے: لو أريد المعنى الثاني لقليل لنا مع أن مناوبة حروف الجر بعضها لبعض شائع سائغ، وأمثال هذه المناقشات من النفسیات لامن المناقسات۔ عجب بات ہے کہ انہوں نے اس بحث سے غفلت برتی ہے اور وحسن بلائہ کی واؤ بمعنی مع واقع ہونا درست بتلایا ہے۔ باوجودیکہ سمع سے عدم مناسبت کے باعث بحمد اللہ علینا نہیں کہا جاسکتا، بلکہ مناسب بات یہ ہے کہ حمد مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہو۔ ائی سمع بحمدنا ایہا وحسن انعامہ الموجب للحمد والشکر علینا: چنانچہ واؤ کا عاطفہ ہونا متعین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کا کلام باطل ٹھہرا۔ اور تقریر سے معلوم ہوا کہ وحسن بلائہ کی واؤ کا عاطفہ ہونا متعین ہونا اور بمعنی واؤ ہونا تشدید و تخفیف کی تقدیر درست ہے۔ اور شارح کا

یہ کہنا کہ تشدید کے ساتھ عطف کیلئے ہے۔ اور تخفیف کی صورت میں بمعنی مع ہے چونکہ حسن البلاء غیر مسموع بلکہ مبلغ ہے اہ۔
 قوله: ربنا صاحبنا و افضل علينا عائذا بالله من النار: ”ربنا“ منادی ہے، اور حرف نداء محذوف ہے۔ ”صاحبنا“ صیغۃ امر کے ساتھ ہے۔ ای: اعنا و حافظنا۔ ”افضل“ صیغۃ امر کے ساتھ ہے۔ عائذا بالله من النار: بعض کا کہنا ہے: تعوذ عیاذا کقولہم: قم قائما ای قیاما، اسم فاعل کو مصدر کے قائم مقام کر دیا گیا ہے، یا بقول کی ضمیر سے حال ہے۔ یا مسحہ۔ اس صورت میں یہ کلام راوی کا ہوگا۔ لفظ عائذ مرفوعاً بھی مروی ہے۔ (مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر)۔ ای: انا عائذ۔ امام طیبی فرماتے ہیں: منصوب علی المصدریتہ ہے۔ ای: اعوذ عودا بالله۔ یا منصوب علی الحالیتہ ہے۔ پہلی تقریر پر نبی کریم ﷺ کا کلام ہوگا اہ۔ ان کی مراد یہ ہے کہ جب عائذ مصدر ہو تو رسول اللہ ﷺ کے کلام کا حصہ ہے۔ اور حال مانیں تو نبی کریم ﷺ سے آگے روایت کرنے والے راوی کا کلام ہے۔ امام نووی نے اس کا حال ہونا جائز قرار دیا ہے۔ اور یہ کہ نبی کریم ﷺ کا کلام ہو۔ گویا کلام یوں ہے: انی أقول هذا فی حال استعاذتی من النار۔ امام طیبی لکھتے ہیں: وهو الأرجح لثلاثین خرم النظم، وأنه ﷺ لما حمد الله على تلك النعمة الخطيرة وأمر باستماعها كل من يتأتى منه السماع لفخامته وطلب الثبات عليه، قاله هضما لنفسه وتواضعا لله، وليضم الخوف مع الرجاء تعليما لأمتہ اہ۔

ابن حجر لکھتے ہیں: نصب علی المصدر، أو نصب علی الحال من ضمیر یقول ای: أقول ذلك فی حال کونی مستعیذا، فعل الأول یكون من کلام النبی ﷺ: غرابت باین طور ہے کہ جب یقول کی ضمیر سے حال ہوگا، تو راوی کا کلام ہوگا، اور جب کہا جائے گا یعنی أقول ذلك..... تو نبی کریم ﷺ کا کلام ہوگا۔ درست بات یہ ہے کہ امام نووی فرماتے رہے ہیں: فعل مقدر أقول کی ضمیر فاعل سے ہے۔ ابن حجر نے امام طیبی کے کلام پر اعتراض کیا ہے: وأما زعم شارح ان عائذا ان كان مصدرا ای: أعوذ عیاذا أقیم اسم الفاعل مقام المصدر، وان كان حالا كان من کلمات الراوی فیرد بأن هذا غفلة عما تقرر فی الحال الرفع لتأويله بالمصدر، ولزعمه أنه حينئذ من کلام الراوی اس کلام پر غور کریں، آپ پر عجائب و غرائب کا ظہور ہوگا۔

تخریج: اس حدیث کو ابو عوانہ اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ ان کی روایت میں اتنا اضافہ ہے: یقول ذلك ثلاث مرات ویرفع بها صوتہ۔

جہاد یا عمرہ سے واپس لوٹتے وقت کی دعا

۲۴۲۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا قَفَلَ مِنْ غَزْوٍ أَوْ حَجٍّ أَوْ عُمْرَةٍ يَكْبِرُ عَلَى كُلِّ شَرْفٍ مِنَ الْأَرْضِ ثَلَاثَ تَكْبِيرَاتٍ ثُمَّ يَقُولُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ الْيَوْمَ تَأْيُومٌ غَابِدُونَ سَاجِدُونَ لِرَبِّنَا حَامِدُونَ صَدَقَ اللَّهُ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَوَحْدَهُ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۱۸/۳ حدیث رقم ۱۷۹۷۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۸۰/۲ حدیث رقم (۴۲۸۔ ۱۳۴۴)۔
 و ابو داؤد فی السنن ۸۸۱/۳ حدیث رقم ۲۷۷۰ و الترمذی ۲۱۳/۲ حدیث رقم ۹۵۷۔ و احمد فی المسند ۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہ جس وقت جہاد سے لوٹے یا حج سے یا عمرہ سے تو تکبیر کہتے ہر بلند جگہ پر تین تکبیریں پھر کہتے کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی کے لئے

ملک ہے اور اسی کے لیے حمد اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہم وطن کی طرف پھرنے والے ہیں۔ تو بہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی (بے شمار) تعریف کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کیا ہے یعنی دین کو غالب کرنے کی اور اپنے بندے کی مدد کرے یعنی حضور ﷺ اور کفار کے گرد ہوں کو تنہا شکست دی۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: كان رسول الله ﷺ اذا قفل من غزو او حج او عمرة يكبر.....: "قفل" فاء کے فتح کے ساتھ

ہے۔ راوی نے تعین انواع کا ذکر کر کے گویا استیعاب کا قصد کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا سفر انہی اغراض و مقاصد کیلئے ہوتا تھا۔

امام طیبی فرماتے ہیں بلندی پر چڑھتے وقت ذکر فرمانے کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ تہجد احوال پر ذکر کو پسند فرماتے تھے، نبی کریم ﷺ اس سلسلہ میں مکان و زمان کی رعایت فرماتے تھے، چونکہ ذکر اللہ ایسی چیز ہے جو ہر حال میں یاد رکھے جانے قابل ہے۔ اہ۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: انه لم يستحضر أنه ﷺ اذا نزل واديا سبح۔

امام طیبی کی مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر وقت اور ہر جگہ کی مناسبت سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ یہ اس بات کے منافی نہیں کہ وہ اترائی سے اترتے وقت اترائی کے مناسب دعا یعنی کلمات تنزیہ سبحان اللہ پڑھا کرتے تھے۔ اور چڑھائی پر چڑھتے وقت عظمت و کبریائی کے مناسب کلمات ادا فرماتے تھے۔

قوله: ثم يقول: لا اله الا الله..... قدیر: اس قدر حصہ کی تشریح ماقبل گزر چکی ہے۔

قوله: آنبون تانبون عابدون: اس قدر حصہ کی تشریح ماقبل گزر چکی ہے۔

قوله: ساجدون لربنا حامدون: ترمذی کی روایت میں ساجدون کے بجائے "سانحون" کے الفاظ ہیں۔ "سانحون"

سارح کی جمع ہے، ساح الماء یسیح اذا جرى على وجه الأرض سے ماخوذ ہے۔

قوله: صدق الله وعده ونصر عبده وهزم الأحزاب وحده:

وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحَدَّكَ سے غزوہ خندق کے موقع پر تائید و نصرت الہی کی طرف اشارہ ہے کہ علاوہ یہود قرظہ و نصیر کے تقریباً دس یا بارہ ہزار کفار مدینہ پر چڑھ آئے تھے اور نبی کریم ﷺ سے جنگ کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر اللہ نے ہوا اور ملائکہ کی جماعت کو کفار کے لشکر پر مسلط کر دیا۔ جس کی وجہ سے جنگ کے بغیر ہی وہ ہلاک و خراب ہو گئے۔

اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ كُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذَا جَاءَ تَكْمُ جُنُودِ فَارِ سَلْنَا عَلَيْهِمْ

رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا﴾ اور بعض کا کہنا ہے کہ عموم مراد ہے، یعنی تمام مواقع پر کفار کو ہزیمت سے دوچار کیا۔

مشرکین کے خلاف بددعا

۲۴۲۶: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى قَالَ قَالَ دَعَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ الْأَحْزَابِ عَلَى الْمُشْرِكِينَ فَقَالَ

اللَّهُمَّ مَنِّزِلِ الْكِتَابِ سَرِيعِ الْحِسَابِ اللَّهُمَّ اهْزِمِ الْأَحْزَابِ اللَّهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْ لَهُمْ۔

(متفق علیہ)

انرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۰۶/۶۔ حدیث رقم ۲۹۳۳۔ و مسلم فی صحیحہ ۱۳۶۲/۳ حدیث رقم (۲۱-۱۷۴۲)۔

وابوداؤد فی السنن ۴۲/۳ حدیث رقم ۲۶۳۱۔ وابن ماجہ فی السنن ۹۳۵/۲ حدیث رقم ۲۷۹۶۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن اوفی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ احزاب کے دن مشرکوں کے خلاف بد

دعا کی۔ پس کہا اے الہی کتاب اتارنے والے حساب کے جلدی کرنے والے (یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آدھے دن میں حساب لے گا)۔ اے الہی کافروں کے گروہ کو شکست دے دے۔ اے الہی شکست دے اور ان کو ہلا دے۔ یعنی ان کو ثابت نہ رکھ۔ مقابلہ میں اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: دعار سول اللہ ﷺ فقال: اللهم منزل الكتاب سريع الحساب: ”دعا“ کی تفسیر ہے۔ یادعا بمعنی ”اراد الدعاء“ ہے۔ ”منزل“ باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ باب تفعیل سے ہے۔ کتاب: سے مراد جس ہے۔ یا قرآن مراد ہے۔ ”سريع الحساب“ یعنی قیامت کے دن اپنی تمام مخلوقات کا حساب تیزی سے لے کر نصف النہار سے پہلے لے کر فارغ ہو جائے گا۔ جیسا کہ مروی ہے۔

قولہ: اللهم اهزمهم تاکید و تعیم ہے۔

۲۴۲۷: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُسْرِ قَالَ نَزَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَيَّ أَبِي فَقَرَّبَنَا إِلَيْهِ طَعَامًا وَوَطْبَةً فَأَكَلَ مِنْهَا ثُمَّ أَتَى بِتَمْرٍ فَكَانَ يَأْكُلُهُ وَيُلْقِي النَّوَى بَيْنَ إِصْبَعَيْهِ وَيَجْمَعُ السَّبَابَةَ وَالْوُسْطَى وَفِي رِوَايَةٍ فَجَعَلَ يُلْقِي النَّوَى عَلَى ظَهْرِ إِصْبَعَيْهِ السَّبَابَةَ وَالْوُسْطَى ثُمَّ أَتَى بِشَرَابٍ فَشَرِبَهُ فَقَالَ أَبِي وَآخَذَ بِلِجَامِ دَائِبَتِهِ أَدْعُ اللَّهُ لَنَا فَقَالَ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيمَا رَزَقْتَهُمْ وَاعْفِرْ لَهُمْ وَارْحَمْهُمْ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۶۱۵/۳۔ حدیث رقم (۱۶۶-۲۰۴۲) و ابو داؤد في السنن ۳۳۸۱۳ حدیث رقم ۳۷۲۹۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ میرے باپ کے پاس بطور مہمان کے تشریف لائے۔ پس ہم نبی کریم ﷺ کے پاس گئے پس ہم حضور ﷺ کے پاس کھانا اور ایک مالیدہ جیسی چیز لے کر گئے۔ پھر آپ ﷺ نے اس میں سے کھایا پھر خشک کھجور لائی گئی۔ پھر حضور ﷺ ان کھاتے اور گھٹلی دونوں انگلیوں کے درمیان میں ڈالتے اور اکٹھی کرتے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیان کی۔ پھر آپ ﷺ کے پاس پانی لایا گیا اور آپ ﷺ نے پیا۔ پھر میرے باپ نے کہا اس حال میں کہ حضور ﷺ کے جانور کی لگام پکڑے ہوئے تھے کہنے لگے میرے لیے دعا مانگو اللہ سے۔ پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اے الہی تو برکت دے ان کے لیے اس رزق میں برکت دے جو تو نے ان کو عطا کیا ہے اور ان کی بخشش فرما اور ان پر رحم کر دے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ففر بنا اليه طعاما وطبة: اس لفظ کے ضبط و معنی میں شدید اختلاف ہے۔ چنانچہ وہ تمام اختلاف من وعن ملاحظہ فرمائیے۔

ووطبة: بو اوین وطاء ساکنۃ فموحدة في جميع نسخ المشكوة المصححة وفي المصايح بلا عاطفة، قال شارح الوطبة بالباء المنقوطة من تحت بنقطة وهي سقاء اللبن من الجلد والمحققون على انها تصحيف وانما هي وطيئة على وزن وثيقة وهي طعام كالحيس سمي به لانه يوطأ باليد ای يمرس ويدلك على صحة ذلك قول الراوى: فاكل منها والوطبة لا يوكل منها بل يشرب وكذا قوله: اتى بشراب فهى صفة طعام وروى بو اوین فعلى هذا يحمل طعام على الخبز

وفي شرح الطيبي قال النووي: الوطبة بالواو واسكان الطاء وبعدها باء موحدة وهو الحيس بجمع التمر البرنى والاقط المدقوق والسمن وقال الحميدى هو براء مضمومة وطاء مفتوحة فى اكثر نسخ مسلم وهو

تصحیف من الراوی وانما هو بالواو وقول ابن حجر: رواه اكثرون بواو فطاء ساكنة فموحدة وآخرون براء مضمومة وطاء مفتوحة ورد بانه تصحيف والذى فى اكثر نسخ مسلم هو الاول غلط لما عرفت من كلام الحميدى ونقل القاضى عياض وطاء بفتح الواو وكسر الطاء بعدها همزة وادعى انه الصحيح وقال هى طعام يتخذ من التمر كالحيس وقيل سقاء اللبن و رد بانه يشرب الا ان يقال غلب الاكل على الشرب وان قوله ثم اتى بشراب يردده الا ان يراد به الماء وفى مختصر النهاية الوطئة بالهمز الغرارة يكون فيها الكعك والقديد وغيرهما وطعام يتخذ من التمر كالحيس وروى بالموحدة وقيل هو تصحيف والوطب الذى يكون فيه السمن واللبن وفى القاموس الوطیئة بالهمز كسفينة تمر يخرج نواه ويعجن بلبن والغرارة فيها القديد والكعك فالظاهر ان المراد بالطعام الخبز بالوطئة وعاء فيها بعض الادم وبه يلتئم اختلاف المقام

خلاصة الآراء:

- ❖ مصباح کے نسخ میں واؤ عاطف ہے، اور مشکوٰۃ کے تمام نسخ صحیحہ میں واؤ عاطف کے ساتھ ہے۔
 - ❖ وطبة: اس لفظ کو ۵ طرح ضبط کیا گیا ہے:
 - ❶ وطبة: واؤ، پھر طاء ساکنہ، پھر بائے موحدة بروزن وهلة۔
 - ❷ وطبة: واؤ، پھر طاء ساکنہ اور پھر یا بروزن وثيقة وسفينة۔
 - ❸ ربطة: شرع میں راء مضمومہ پھر طائے مفتوحہ۔ جیسا کہ مسلم شریف کے اکثر نسخوں میں ہے۔ یہ راوی کی تصحیف ہے۔
 - ❹ وطنه: پہلے واؤ مفتوحہ، پھر طائے مکسورة اور پھر همزه۔ جیسا کہ صاحب نہایہ اور قاضی نے بیان کیا ہے۔ قاضی عیاض نے اس کو درست قرار دیا ہے۔
 - ❺ الوطیئة: بروزن ردینة سفينة۔ یہ ضبط صاحب قاموس کا ذکر کردہ ہے۔ گنگھلی نکال کر وودھ میں گونڈھی گئی کھجور۔
- ملا علی قاری فرماتے ہیں: زیادہ واضح بات یہ ہے کہ طعام سے مراد ضمیر یعنی روٹی ہے، اور وطرے سے مراد وعاء فیہ بعض الادم یعنی سالن کا ڈونگہ کہ جس میں تھوڑا سا سالن تھا۔ اس توجیہ سے تطبیق ہو جاتی ہے۔
- قوله: فأكل منها..... والوسطى: ضمیر ”وطبة“ کی طرف راجع ہے۔ بظاہر ”منها“ کہنا چاہئے تھا، منہ کی صورت میں مذکور کی تاویل ہوگی۔ چنانچہ وہ اس قبیل سے ہے: ﴿والذى يكتزون الذهب والفضة ولا ينفقونها فى سبيل الله﴾ [التوبة: ۳۴] ضمیر مذکور اقرب کی طرف راجع ہے، اور پہلے کو اس کے واضح ہونے کے باعث ترک کر دیا، چنانچہ یہ از باب اكتفاء ہے۔ یلقى: یا اول کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ النوى: ”ال“ جس کا ہے۔ أصبعه: اس لفظ میں نو لغات ہیں۔ مشہور ترین لغت ہمزه کے کسرہ اور باء کے فتح والی ہے۔ علی ظہر أصبعیه السبابة والوسطى: مجرد علی البدلیت یا بیان میں مرفوع اور منصوب پڑھنا بھی درست ہے۔ وفى رواية فجعل يلقى النوى علی ظہر السبابة والوسطى: ابن حجر لکھتے ہیں: هذه الراوية مبينة للمراد من الأولى، یعنی یہ دوسری روایت پہلی روایت (میں موجود بلقی النوى بين اصبعيه ويجمع السبابة والوسطى) کی مراد بیان کر رہی ہے۔ (یعنی پچھلی روایت میں یہ بیان کیف کچھ تشبہ تھا، اس کی یہاں وضاحت ہوگی کہ آپ ﷺ نے گھٹیاں انگلیوں کی پشت پر رکھی ہوئی تھیں، اندرونی حصہ میں نہیں تھیں)۔

ابن حجر کا یہ کہنا مردود ہے کہ وہ روایت وضع بین اصبعیه پر دلالت کر رہی تھی اور یہ روایت وضع النوى علی ظہر ہما پر

دلالت کر رہی ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ دونوں روایتوں میں جمع کیا جائے،

ایک روایت تو یہ بتاتی ہے کہ آپ ﷺ گھٹلیاں دونوں انگلیوں کے درمیان رکھتے جاتے تھے اور ایک روایت یہ بتا رہی ہے کہ دونوں انگلیوں کی پشت پر ڈالتے تھے۔ بظاہر اس بات میں اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ذہن میں یہ بات رہے کہ آپ ﷺ گھٹلیوں کو دونوں انگلیوں کے درمیان کبھی رکھتے جاتے ہوں گے اور کبھی دونوں انگلیوں کی پشت پر ڈالتے جاتے ہوں تو ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نظر نہیں آئے گا اور پھر پشت پر انگلیوں کی گھٹلیوں کو ڈالنے کی وجہ یہ تھی تاکہ ہاتھ کے اندر کارخ گھٹلیوں میں لگے ہوئے لعاب وغیرہ سے ملوث نہ ہو کیونکہ اندر کی صفائی اور سترائی باہر کی صفائی اور سترائی سے اولیٰ ہے۔

ہاں دوسری روایت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں صورتیں ”ظہر“ پر محمود ہیں۔ اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں مراد ہیں۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: وحکمة ذلك تعليم امته ادب اكل التمر ونحوه بأن يلقى على هذه الكيفية حتى لا يمسه باطن الأصابع، فتعاف النفس عودها الى الطعام لما فيها من اثر الريف۔ ابن حجر کا یہ فرمانا کھانے کے آداب سے غفلت کا نتیجہ ہے، کہ اس کا تعلق دائیں کے ساتھ ہوتا ہے تاکہ بائیں کے ساتھ۔

قوله: ثم اتى وأخذ بلجام دابته: أذع الله لنا: یہ جملہ حالیہ ہے، جو قول و مقولہ کے درمیان واقع ہوا ہے۔

یہ حدیث ایسی کئی باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو مہمان اور میزبان کے لئے مسنون کا درجہ رکھتی ہے۔ مثلاً اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اکابر اور مہمان کی سواری کی رکاب اور لگام کو ازراہ تواضع اور خاطر داری پکڑنا مسنون ہے۔ اسی طرح مہمان کو رخصت کرنے کے لئے مکان کے دروازے یا باہر کچھ دور تک اس کے ساتھ جانا سنت ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ میزبان کے لئے تو یہ مسنون ہے کہ وہ مہمان سے طلب دعا کرے اور مہمان کے لئے یہ مسنون ہے کہ میزبان کے لئے دعا کرے۔

أذع الله لنا: ان صحابی کا نبی کریم ﷺ سے اس موقع پر دعا کا طلب کرنا اس دعوت کو کھلانے کے مقابلہ میں احسان کے طور پر نہیں تھا، صحابہ کرام تو اصحاب کرم و مروت تھے، ان کے بارے میں یہ گمان کیسے کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو درحقیقت اس لطف اور نظر رحمت کا سوال تھا کہ جو نظر رحمت و لطف ہر عام و خاص پر فرماتے تھے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ دعا کی درخواست کھانے سے فارغ ہونے کے وقت نہیں کی بلکہ سوار ہونے کے وقت کی۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: لا ينافيه أنه يسن لمن تصدق على فقير أن لا يطلب منه الدعاء، لئلا تكون صدقته في مقابلة الدعاء فيفوت الاخلاص، لأن الضيافة أكد من الصدقة لفقول كثيرين بوجوبها، فلا يتخيل أنها في مقابلة الدعاء۔ ابن حجرؒ کا یہ کلام کئی وجوہ سے مردود ہے۔

۱۔ اتنی بات تو مسنون ہے کہ فقیر جب متصدق کو دعا دے، جیسا کہ آداب میں سے ہے، تو متصدق اس کو جواب دے۔ تاکہ دعا کے مقابلہ میں دعا ہو جائے، اور اس کو صدقہ کا ثواب مل جائے۔ البتہ یہ کہنا کہ ”دعا کا طلب نہ کرنا مسنون ہے“ دلیل کا محتاج ہے۔
۲۔ جب یہ بات ٹھہری کہ طلب دعا، اخلاص کامل کو فوت کر دیتی ہے تو بات یہ ہے کہ صدقہ اور ضیافت میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں قسمیں خواہ واجبہ ہوں خواہ نافلہ ہوں کمال اخلاص کی محتاج ہیں۔

۳۔ اس حدیث سے یہ کہیں معلوم نہیں ہو رہا کہ یہ ضیافت واجبہ تھی۔ ۴۔ نفل کے بابت دعا کے مقابلہ میں ہونے کا خیال تو ہو سکتا ہے، لیکن واجب میں نہیں، اس وجہ سے کہا گیا ہے: الفرض لا يدخل فيه الرباء۔ ۵۔ علماء فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی اور شخص (کے ہاں) کا کھانا کھائے تو اس کیلئے یہ دعا مانگنا مسنون ہے۔ خواہ وہ (میزبان) دعا کی درخواست کرے، خواہ نہ کرے۔ چنانچہ ابن حجر کا یہ کہنا

باطل ٹھہرا: ان من هذا يؤخذ أن المضيف إذا سأل من الضيف أن يدعوا له، سن للضيف أن يدعوله۔

ابن حجرؒ کے اس کلام کا مفہوم (مفہوم مخالف) یہ نکلتا ہے کہ جب میزبان دعاؤں کی درخواست نہ کرے تو مہمان اگر یہ دعا مانگے تو مسنون نہ ہوگا۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ اولیٰ یہ ہے کہ میزبان صحابہ کے فعل کی اقتداء کرے نیز اس پر نبی کریم ﷺ کی تقریر ثابت ہے اپنے مہمان سے دعا کی درخواست کرے۔ ۶۔ انبیاء و اولیاء سے دعا کی درخواست کرنا امر مطلوب ہے، تو اس قسم کی غرض مذموم کا باعث کیا ہے۔
 قوله: فقال: اللهم بارك لهم فيما رزقتم واغفر لهم وارحمهم: اور برکت کی علامت یہ ہے کہ قناعت حاصل ہو جائے، اور طاعت کی توفیق مل جائے۔ واغفر لهم وارحمهم: دونوں افعال سے پہلے واؤ ہے۔ شیخ جزریؒ فرماتے ہیں: والذی رویناہ فی جمیع أصول مسلم: فاغفر لهم بالفاء۔ وكذلك فارحمهم فی أكثرها وليس رواية: فجعل يلقى النوى علی ظهر أصبعیه فی صحیح مسلم: بل هی فی سنن ابی داؤد۔

الفصل الثاني:

چاند دیکھتے وقت کی دعا

۲۳۲۸: عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللَّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى الْهَيْلَالَ قَالَ اللَّهُمَّ أَهْلَهُ عَلَيْنَا بِالْأَمْنِ وَالْإِيمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْإِسْلَامِ رَبِّي وَرَبُّكَ اللَّهُ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۷/۵ حدیث رقم ۳۵۱۵۔ والدارمی ۷/۲ حدیث رقم ۱۶۸۷۔ واحمد فی المسند ۱۶۲/۱

ترجمہ: حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت چاند کو دیکھتے تو کہتے اے الہی تو چاند کو نکال امن کے ساتھ ہم پر اور ایمان اور سلامتی کے اور اسلام کے ساتھ۔ میرا رب اور تیرا رب اللہ ہے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث حسن غریب ہے۔

مصیبت زدہ کو دیکھ کر مذکورہ دعا پڑھنی چاہے

۲۳۲۹: عَنْ عَمْرِو بْنِ الْخَطَّابِ وَأَبِي هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا مِنْ رَجُلٍ رَأَى مُبْتَلًا فَقَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي عَاقَبَنِي مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهِ وَفَضَّلَنِي عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيلًا إِلَّا لَمْ يُصِبْهُ ذَلِكَ الْبَلَاءُ كَأَنَّمَا كَانَ - (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۷/۵ حدیث رقم ۳۴۹۲۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے دونوں نے کہا کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ مبتلائے بلا کو دیکھے پھر وہ کہے سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے مجھ کو بچایا اس چیز سے کہ اس نے گرفتار کیا تجھ کو اس کے ساتھ اور بہتوں پر مجھ کو عزت بخشی ان لوگوں سے دنیا کی بزرگی ان کو بخشی مگر اس کو آرزائش نہیں پہنچتی اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

۲۳۳۰: ورواه ابن ماجه عن ابن عمرو قال الترمذی هذا حدیث غریب وعمرو بن دینار الراوی لیس

اخرجه ابن ماجه ۱۲۸۱/۲ حدیث رقم ۳۸۹۲۔

ترجمہ: اس روایت کو ابن ماجہ نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث غریب ہے اور (اس کے ایک راوی عمرو بن دینار قوی نہیں ہیں)۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اس کے ایک راوی عمرو بن دینار قوی نہیں ہیں۔

بازار میں داخل ہونے کی دُعا

۲۳۳۱: وَعَنْ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ دَخَلَ السُّوقَ فَقَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ كَتَبَ اللَّهُ لَهُ أَلْفَ أَلْفِ حَسَنَةٍ وَمُحَى عَنْهُ أَلْفَ أَلْفِ سَيِّئَةٍ وَرَفَعَ لَهُ أَلْفَ أَلْفِ دَرَجَةٍ وَبَنَى لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ۔ (رواه

الترمذی وابن ماجه وقال الترمذی هذا حدیث غریب وفي شرح السنة من قال في سوق جامع يباع فيه بدل من دخل

(السوق)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۵۱۵ حدیث رقم ۳۴۸۸۔ وابن ماجه ۷۵۲/۲ حدیث رقم ۲۲۳۵۔

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص بازار میں داخل ہو اور وہ کہے کہ کوئی معبود نہیں مگر اللہ کہ وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اس کے لیے تعریف ہے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ زندہ ہے مرے گانہیں اسی کے ہاتھ میں خیر ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ اس کے لیے دس لاکھ نیکیاں لکھتا ہے اور اس سے دس لاکھ برائیاں دور کرتا ہے اور اس کے لیے دس لاکھ درجے بلند کرتا ہے اور اس کے لیے بہشت میں گھر بناتا ہے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ نے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث غریب ہے اور شرح السنن میں دخل السوق کے بدلے یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص کہے یعنی کلمہ مذکور پڑھے بازار میں جہاں خرید و فروخت ہوتی ہے اور اکثر چیزیں بکتی ہیں۔ اس میں۔

www.KitaboSunnat.com

جنت کا داخلہ پوری نعمت ہے

۲۳۳۲: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ رَجُلًا يَدْعُو يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ تَمَامَ النِّعْمَةِ فَقَالَ أَيُّ شَيْءٍ تَمَامُ النِّعْمَةِ قَالَ دَعْوَةٌ أَرْجُو بِهَا خَيْرًا فَقَالَ إِنَّ مِنْ تَمَامِ النِّعْمَةِ دُخُولَ الْجَنَّةِ وَالْقُرُوزَ مِنَ النَّارِ وَسَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ فَقَالَ قَدْ اسْتَجِيبَ لَكَ فَسَلْ وَسَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ رَجُلًا وَهُوَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الصَّبْرَ فَقَالَ سَأَلْتَ اللَّهَ الْبَلَاءَ فَسَلَّهُ الْعَافِيَةَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۰۲/۱۵ حدیث رقم ۳۵۹۵۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دُعا مانگتے ہوئے سنا وہ کہتا ہے اے الہی! تحقیق میں تجھ سے پوری نعمت مانگتا ہوں۔ پس فرمایا پوری نعمت کیا چیز ہے؟ پس اس شخص نے کہا میں اس دعا کے ساتھ بہت زیادہ مال کی امید رکھتا ہوں۔ تحقیق پوری نعمت جنت میں داخل ہونا ہے اور دوزخ سے نجات پانا ہے اور حضور ﷺ نے ایک شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ اے صاحب بزرگی اور بخشش فرمانے والے! آپ ﷺ نے فرمایا تحقیق

تیری دعا قبول کی گئی اور نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ کہہ رہا ہے الہی! تحقیق میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں پس آپ ﷺ نے کہا تو نے اللہ سے بلا مانگی۔ پس اس سے عافیت مانگ۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

مجلس سے اٹھتے وقت کی دعا

۲۴۳۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا فَكَثُرَ فِيهِ لَفْظُهُ فَقَالَ قَبْلَ أَنْ يَقُومَ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ إِلَّا غُفِرَ لَكَ مَا كَانَ فِي مَجْلِسِهِ ذَلِكَ۔ (رواه الترمذی والبیہقی فی الدعوات الكبير)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۸۱۵۔ حدیث رقم ۳۴۹۴۔ واحمد فی المسند ۴۵۰۱۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو شخص ایک جگہ پر بیٹھا ہو اور اس میں بے فائدہ باتیں بہت زیادہ ہوں پھر وہ اٹھنے سے پہلے کہے اے الہی تو پاک ہے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں تیری تعریف کے ساتھ میں گواہی دیتا ہوں۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر تو۔ میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں اور میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں۔ تو اس کے لیے بخشش کی جاتی ہے جو اس مجلس میں گناہ ہو۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور بیہقی نے دعوت کبیر میں۔

سواری پر سوار ہوتے وقت کی دعا

۲۴۳۴: وَعَنْ عَلِيٍّ أَنَّهُ أُتِيَ بِدَابَّةٍ لَيْرٍ كَبَهَا فَلَمَّا وَضَعَ رِجْلَهُ فِي الرَّكَابِ قَالَ بِسْمِ اللَّهِ فَلَمَّا اسْتَوَى عَلَى ظَهْرِهَا قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرْنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ ثُمَّ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ ثَلَاثًا وَاللَّهُ أَكْبَرُ ثَلَاثًا سُبْحَانَكَ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ ثُمَّ ضَحِكَ فَقِيلَ مِنْ أَبِي شَيْءٍ ضَحِكْتَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ صَنَعَ كَمَا صَنَعْتَ ثُمَّ ضَحِكَ فَقُلْتُ مِنْ أَبِي شَيْءٍ ضَحِكْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ إِنْ رَبِّكَ لَيَعْجَبُ مِنْ عَبْدِهِ إِذَا قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ غَيْرِي۔ (رواه احمد والترمذی وابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۴۱۳۔ حدیث رقم ۲۶۰۲۔ والترمذی ۱۶۴۱۵۔ حدیث رقم ۳۵۱۱۔ واحمد فی المسند

۹۷/۱

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ان کے پاس جانور حاضر کیا گیا کہ وہ اس پر سوار ہو جائیں جب انہوں نے اپنا پاؤں رکاب میں رکھا تو بسم اللہ کہا۔ پس جب کہ اس کی پیٹھ پر چڑھ گئے تو الحمد للہ کہا۔ یعنی سواری کی نعمتوں اور اس کے علاوہ کی بھی نعمتوں پر اللہ کا شکر ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ پاک ہے وہ ذات ہے کہ اس نے اس جانور کو ہمارے واسطے تابعدار کیا اور ہم اس کے واسطے طاقت رکھنے والے نہ تھے اور تحقیق ہم اپنے پروردگار کی طرف پھیرنے والے ہیں پھر تین بار الحمد للہ کہا اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا تو پاک ہے میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے پس میرے لیے بخشش کر دے۔ پس تحقیق تیرے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخشتا پھر حضرت علیؓ نے پوچھا گیا کہ اے امیر المؤمنین آپ کس بات پر ہنسے؟ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ انہوں نے ایسا ہی کیا جیسا کہ میں نے کیا۔ پھر میں نے پوچھا تھا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ کس چیز سے ہنسے؟ فرمایا تحقیق اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے راضی ہوتا

ہے پس جب وہ کہتا ہے اے میرے پروردگار! میرے واسطے میرے گناہ بخش دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا بندہ جانتا ہے کہ میرے علاوہ کوئی گناہ نہیں بخشتا۔ اس کو امام احمد اور ترمذی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

مسافر کو رخصت کرنا مسنون عمل ہے

۲۳۳۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا وَدَّعَ رَجُلًا أَحْبَدَ بِيَدِهِ فَلَا يَدْعُهَا حَتَّىٰ يَكُونَ الرَّجُلُ هُوَ يَدْعُ يَدَ النَّبِيِّ ﷺ وَيَقُولُ أَسْتَوْدِعُ اللَّهَ دِينَكَ وَأَمَانَتَكَ وَآخِرَ عَمَلِكَ وَفِي رِوَايَةٍ وَخَوَاتِيمَ عَمَلِكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِي رِوَايَتِهِمَا لَمْ يُذْكَرْ وَآخِرَ عَمَلِكَ -

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۴۱۳ حدیث رقم ۲۶۰۰۔ و الترمذی ۱۶۲۱۵ حدیث رقم ۳۵۰۵۔ وابن ماجه ۹۴۳/۲ حدیث رقم ۲۸۲۶۔ واحمد فی المسند ۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت کسی شخص کو رخصت کرتے تھے تو یعنی مسافر کا ہاتھ پکڑتے تھے پس اس کے ہاتھ کو نہ چھوڑتے تھے یہاں تک کہ وہ شخص نبی کریم ﷺ کے ہاتھ کو چھوڑتا یعنی یہ حسن خلق اور حضور ﷺ کے تواضع کی وجہ سے تھا اور فرماتے تھے کہ میں نے اللہ کو تیرا دین اور تیری امانت سونپی یعنی میں اللہ تعالیٰ سے تیرے لئے حفاظت دین اور تیری امانت اور تیرا آخری عمل یعنی خاتمہ بخیر طلب کرتا ہوں اور ایک روایت میں خواتیم عملک کے بجائے آخر عملک کے الفاظ ہیں یعنی تیرے آخری عمل بھی اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں مطلب وہی تھا جو پہلے جملے کا تھا۔ اس کو امام ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایت میں آخر میں عملک کا لفظ نہیں ہے۔

مسافر کو الوداع کرنے کا طریقہ

۲۳۳۶: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ الْخَطَمِيِّ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَسْتَوْدِعَ الْجَيْشَ قَالَ أَسْتَوْدِعُ اللَّهَ دِينَكُمْ وَأَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيمَ أَعْمَالِكُمْ - (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۴۱۳ حدیث رقم ۲۶۰۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ خطمی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جس وقت لشکر کو رخصت کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو فرماتے میں اللہ تعالیٰ کو تمہارا دین سونپتا ہوں اور تمہاری امانت اور تمہارے آخری اعمال۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

اپنے اکابرین سے دعا کروانے کا ثبوت

۲۳۳۷: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أُرِيدُ سَفْرًا فَزَوِّدْنِي فَقَالَ زَوِّدَكَ اللَّهُ التَّقْوَىٰ قَالَ زِدْنِي قَالَ وَغَفَرَ ذُنُوبَكَ قَالَ زِدْنِي بَابِي أَنْتَ وَأُمِّي قَالَ وَيَسِّرْ لَكَ الْخَيْرَ حَيْثُ مَا كُنْتَ - (رواه الترمذی وقال هذا حدیث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۳۱۵ حدیث رقم ۳۵۰۷۔ والدارمی ۳۷۲۱۲ حدیث رقم ۲۶۷۱۔

ترجمہ: حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا کہنے لگا اے اللہ کے رسول ﷺ تحقیق

میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں پس مجھ کو تھک دیتے یعنی میرے لئے دعا کیجئے کہ اس کی برکت میرے سفر میں ہو تو شے کی طرح۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تجھ کو تقویٰ کا توشہ دے یعنی پرہیزگاری نصیب کرے۔ کہ وہ آخرت کا توشہ ہے اس نے کہا کہ میرے لیے زیادہ دعا کرو۔ اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تیرے گناہ بخشے اس نے کہا کہ زیادہ دعا کیجئے میرے لیے۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ ﷺ نے فرمایا اور اللہ تعالیٰ تیرے لیے آسان کرے اور تجھے دین و دنیا کی بھلائی کی توفیق دے جہاں ہو۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

مسافر کو نصیحت کرنا مسنون ہے

۲۳۳۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَسَافِرَ فَأَوْصِنِي قَالَ عَلَيْكَ بِتَقْوَى اللَّهِ وَالتَّكْوِينِ عَلَى كُلِّ شَرَفٍ فَلَمَّا وُلِيَ الرَّجُلُ قَالَ اللَّهُمَّ اطْوِلْهُ الْبُعْدَ وَهَوِّنْ عَلَيْهِ السَّفَرَ۔ (رواه الترمذی)
اخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۳/۵ حدیث رقم ۳۵۰۸۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ تحقیق ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پس مجھ کو نصیحت فرما دیجئے اپنے اور پر خدا کا تقویٰ کو لازم کرو اور ہر بلند جگہ پر اللہ اکبر کہو پس جب اس شخص نے پشت پھیری تو آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا کی اے الہی تو اس کے لیے سفر کی دوری کو پلیٹ دے یعنی سفر کی مشقت کو دور کر دے بمعنی مسافت کو نزدیک کر دینے کی وجہ سے اور اس پر سفر آسان کر یعنی سفر کے تمام امور اس پر آسان کر دے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تکلیف دینے والی چیزوں سے پناہ مانگنا

۲۳۳۹: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا سَفَرَ فَأَقْبَلَ اللَّيْلُ قَالَ يَا أَرْضُ رَبِّي وَرَبُّكَ اللَّهُ أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شَرِّكَ وَشَرِّ مَا فِيكَ وَشَرِّ مَا خَلَقَ فِيكَ وَشَرِّ مَا يَدُبُّ عَلَيْكَ وَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ أَسَدٍ وَأَسْوَدٍ وَمِنَ الْحَبِيَّةِ وَالْعَقْرَبِ وَمِنَ شَرِّ سَاكِنِ الْبَلَدِ وَمِنَ الْوَالِدِ وَمَا وَكَد۔ (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۴/۳ حدیث رقم ۲۶۰۳۔ واحمد فی المسند ۱۳۲/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب رات آتی تو آپ ﷺ ارشاد فرماتے۔ اے زمین تیرا پروردگار اور میرا پروردگار اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تیری برائی سے پناہ مانگتا ہوں یعنی جو کہ تیری ذات میں برائی ہے مثل نحس وغیرہ یا اس چیز کی برائی سے جو تجھ میں ہے یعنی پانی یا کوئی ایسی بوٹی جو زمین سے پیدا ہو اور ہلاک کر دے میں اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں اور اس چیز کی برائی سے کہ تجھ میں یعنی زہریلے جانور اور ہلاک کرنے والی چیزیں اور اس چیز کی برائی سے کہ جو تجھ پر چلتی پھرتی ہیں یعنی حشرات الارض اور حیوانات کہ ضرر پہنچاتے ہیں اور میں اللہ تعالیٰ سے شیر، کالے سانپ، ہر طرح کے سانپ، بچھو اور شہر میں رہنے والوں کی برائی سے یعنی آدمیوں کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں اور بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد جن ہیں کہ ہر شہر ہر زمین میں رہتے ہیں اور جتنے والے کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے کہ جتا گیا یعنی ابلیس کے شر سے اور اس کی اولاد سے یا ہر جتنے والی کے شر سے اور اس کی اولاد سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

جہاد کے موقع پر آپ ﷺ کی دعا

۲۳۳۰: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا غَزَا قَالَ اللَّهُمَّ أَنْتَ عَضِدِي وَنَصِيرِي بِكَ أَحُولُ وَبِكَ أَصُولُ وَبِكَ أَقَاتِلُ - (رواه الترمذی و ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۲/۳ حدیث رقم ۲۶۲۲۔ واحمد فی المسند ۱۸۴/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب جہاد کرتے تھے تو کہتے تھے اے الہی! تو معتمد علیہ میرا ہے یعنی تجھ پر میرا ہر امر میں بھروسہ ہے اور تو میرا پروردگار ہے تیری قوت کے ساتھ میں کفار کے ٹکر کو دفع کرنے کا حیلہ کرتا ہوں اور تیری قوت کے ساتھ دین کے دشمنوں پر حملہ کرتا ہوں اور تیری مدد کے ساتھ دشمنانِ دین سے لڑتا ہوں۔ اس کو امام ترمذی اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

دشمن سے خوف کے وقت کی دعا

۲۳۳۱: وَعَنْ أَبِي مُوسَى أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا خَافَ قَوْمًا قَالَ اللَّهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِي نُحُورِهِمْ وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شُرُورِهِمْ - (رواه احمد و ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۹/۲ حدیث رقم ۱۵۷۳۔ واحمد فی المسند ۴۱۴/۴۔

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحتی نبی کریم ﷺ کو جس وقت کسی قوم سے اندیشہ ہوتا تو کہتے اے الہی! تحقیق ہم تجھ کو کفار کے مقابل کرتے ہیں یعنی تجھ سے مدد مانگتے ہیں کہ تو ان کے شر کو ہم سے دفع کر دے اور ہمارے اور ان کے درمیان عامل ہو جا اور ہم تیرے ساتھ ان کی برائی سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس کو امام احمد اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

گھر سے نکلنے وقت کی مسنون دعا

۲۳۳۲: وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا خَرَجَ مِنْ بَيْتِهِ قَالَ بِسْمِ اللَّهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ اللَّهُمَّ إِنَّا نَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ نَزِلَّ أَوْ نُضَلَّ أَوْ نُظْلِمَ أَوْ نُظْلَمَ أَوْ نُجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيْنَا رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ وَفِي رِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ وَابْنِ مَاجَةَ قَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ مَا خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ بَيْتِي قَطُّ إِلَّا رَفَعَ طَرَفَهُ إِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُضِلَّ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ أُظْلِمَ أَوْ أُجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ -

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۲۵/۴ حدیث رقم ۵۰۹۵۔ والترمذی ۱۵۴/۵ حدیث رقم ۳۴۸۷۔ وابن ماجہ ۱۲۷۸/۲۔

حدیث رقم ۳۸۸۴۔ واحمد فی المسند ۳۰۶/۶۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ جس وقت اپنے گھر سے نکلتے تو کہتے میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ نکلتا ہوں۔ میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا۔ اے الہی! تحقیق ہم پناہ مانگتے ہیں تیرے ساتھ اس سے کہ ہم پھلسیں یعنی بغیر قصد کے گناہ کریں یا گمراہ ہو جائیں۔ یعنی قصداً گناہ کریں یا ظلم کریں یا ظلم کیے جائیں یا ہم

جہالت برتیں یا ہم پر جہالت کی جائے۔ اس کو امام احمد ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابو داؤد کی روایت میں ہے اور ابن ماجہ کی روایت میں یوں ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی میرے گھر سے نکلتے تو آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتے اور فرماتے اے الہی! تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ کہ میں گمراہ کیا جاؤں یعنی کوئی مجھے گمراہ کر دے یا ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں یا جہالت کروں یا جہالت مجھ پر کی جائے۔

گھر سے نکلتے وقت جامع دعا

۲۳۳۳: عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا خَرَجَ الرَّجُلُ مِنْ بَيْتِهِ فَقَالَ بِسْمِ اللَّهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ يُقَالُ لَهُ حِينَئِذٍ هُدًى وَكُفًى وَوُقِيَئَ فَيَتَنَحَّى لَهُ الشَّيْطَانُ وَيَقُولُ شَيْطَانُ آخِرُ كَيْفَ لَكَ بِرَجُلٍ قَدْ هَدَى وَوُقِيَئَ۔ (رواه ابو داؤد وروى الترمذى الى قوله له الشيطان)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ۳۲۵/۴ حديث رقم ۵۰۹۵۔ و الترمذى ۱۵۴/۵ حديث رقم ۳۴۸۶ وابن ماجه ۱۲۷۸/۲ حديث رقم ۳۸۸۶۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی شخص اپنے گھر سے نکلے پھر وہ کہے میں اللہ کا نام لے کر گھر سے نکلتا ہوں میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا اللہ تعالیٰ کی مدد کے سوا میں گناہوں سے نہیں رک سکتا اور عبادت پر قوت نہیں رکھ سکتا۔ کہتے ہیں کہ اس کے لیے ایک فرشتہ ندا کرتا ہے کہ اے اللہ کے بندے! تجھے راہ راست دکھائی گئی اور تو جمع مہمات میں کفایت کیا گیا اور تو سب برائیوں سے محفوظ رہا۔ پس شیطان اس سے کنارے ہو جاتا ہے (یعنی ایک طرف ہو جاتا ہے) اور دوسرا شیطان کہتا ہے یعنی اس شیطان کی تسلی کے لیے کہ تجھ کو اس شخص پر تسلط اور تعرض کیسے میسر ہوگا کہ تحقیق وہ ہدایت کیا گیا اور کفایت کیا گیا اور سب برائیوں سے محفوظ رہا اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے لفظ: لَهُ الشَّيْطَانُ تک ابن سنی کی کتاب میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔

گھر میں داخل ہونے کی دعا

۲۳۳۳: عَنْ أَبِي مَالِكٍ الْأَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا وَلَجَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ فَلْيَقُلْ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَلِكُ خَيْرَ الْمَوْلِجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللَّهِ وَلَجْنَا وَعَلَى اللَّهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا ثُمَّ لِيُسَلِّمْ عَلَيَّ أَهْلِي۔ (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ۳۲۵/۴ حديث رقم ۳۴۸۶۔

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہو پس چاہیے کہ وہ کہے: الہی! تحقیق میں تجھ سے داخل ہونے کی بھلائی مانگتا ہوں یعنی آنا اور نکلنا بھلائی کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہم داخل ہوتے ہیں اور اللہ ہمارا رب ہے۔ ہم نے اسی پر بھروسہ کیا پھر اپنے اہل کو سلام کرے۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

نکاح کے وقت مبارک بار دینا مسنون ہے

۲۳۳۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَقَّ الْإِنْسَانَ إِذَا تَزَوَّجَ قَالَ بَارَكَ اللَّهُ لَكَ وَبَارَكَ عَلَيْكَمَا وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي خَيْرٍ - (رواه احمد والترمذی و ابو داود وابن ماجه)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۴۱/۲ حدیث رقم ۲۱۳۰۔ والترمذی ۲۷۶/۲ حدیث رقم ۱۰۹۷۔ والدارمی ۱۸۰/۲ حدیث رقم ۲۱۷۳۔ وابن ماجه ۶۱۴/۱ حدیث رقم ۱۹۰۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت کسی آدمی کو دعا دیتے یعنی دعا کا ارادہ کرتے نکاح کے اوپر وقت تو کہتے۔ اللہ تعالیٰ تیرے واسطے برکت دے اور تم دونوں کو برکت دے یعنی میاں بیوی کو یعنی تم پر رحمت ہو اور رزق اور الاود بہت ہو اور جمع کرے تمہارے درمیان بھلائی، یعنی طاعت کرتے رہو اور صحت اور عافیت سے رہو اور آپس میں سکون رہے اولاد نیک ہو اس کو امام احمد اور ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

اپنے اہل والوں کے لیے خیر و برکت کی دعا کرنا

۲۳۳۶: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شَعِيبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِذَا تَزَوَّجَ أَحَدُكُمْ امْرَأَةً أَوْ اشْتَرَى خَادِمًا فَلْيَقُلْ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ وَإِذَا اشْتَرَى بَعِيرًا فَلْيَأْخُذْ بِذُرْوَةِ سَنَامِهِ وَلْيَقُلْ مِثْلَ ذَلِكَ وَفِي رِوَايَةٍ فِي الْمَرْأَةِ وَالْخَادِمِ ثُمَّ لِيَأْخُذَ بِنَاصِيَتِهَا وَلْيَدْعُ بِالْبُرْسِكَةِ - (رواه ابو داود وابن ماجه)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۴۸/۲ حدیث رقم ۲۱۶۰۔ وابن ماجه ۶۱۷/۱ حدیث رقم ۱۹۱۸۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیبؓ سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ یعنی شعیبؓ سے نقل کیا اور انہوں نے اپنے دادا یعنی عبداللہ بن عمرؓ سے اور عبداللہ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ فرمایا جس وقت تم میں سے کوئی کسی عورت سے نکاح کرے یا بردہ (غلام) خریدے پس اس کو چاہیے کہ وہ کہے اے الہی! تحقیق میں تجھ سے اس کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں یعنی اس کی ذات کی بھلائی کا اور اس چیز کی بھلائی کا جس کو تو نے اس میں پیدا کیا یعنی اچھے اخلاق اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے کہ جو تو نے پیدا کی یعنی برے اخلاق و افعال اور جب اونٹ خریدے تو اس کی کوہان کی بلندی کو پکڑے اور کہے اسی طرح یعنی مذکورہ دعا پڑھے اور ایک روایت میں عورت اور بردے (یعنی غلام) کے بارے میں یوں آیا ہے پھر اس کو چاہیے کہ عورت کی پیشانی کو پکڑے اور برکت کے لیے دعا کرے۔ اس کو ابو داؤد سے نقل کیا اور ابن ماجہ نے۔

غمزدہ کی دعا

۲۳۳۷: وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ دَعَوَاتُ الْمَكْرُوبِ اللَّهُمَّ رَحِمَتِكَ أَرْجُو فَلَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ وَأَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ - (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد ۳۲۴/۴ حدیث رقم ۵۰۹۰۔

ترجمہ: حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے غم زدہ آدمی کی دعا ہے کہ اس کے پڑھنے سے غم جاتا رہتا ہے اے الہی تیری رحمت کا امیدوار ہوں پس مجھ کو میرے نفس کے حوالے نہ کرایا لہجہ بھی اس لیے کہ وہ میرا بڑا دشمن ہے اور میری حاجت کو پورا کر دے اور میرے کام کو درست کر دے۔ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

قرض کی ادائیگی کی دعا

۲۳۳۸: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ هُمُومٌ لَزِمْتَنِي وَذُيُوبٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ أَفَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمًا إِذَا قُلْتَهَا أَذْهَبَ اللَّهُ هَمَّكَ وَقَضَىٰ عَنْكَ دَيْنَكَ قَالَ بَلَىٰ قَالَ قُلْ إِذَا أَصْبَحْتَ وَإِذَا أَمْسَيْتَ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعُجْزِ وَالْكَسَلِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ غَلْبَةِ الدِّينِ وَقَهْرِ الرِّجَالِ قَالَ فَفَعَلْتُ ذَلِكَ فَأَذْهَبَ اللَّهُ هَمِّي وَقَضَىٰ عَنِّي دَيْنِي۔

(رواہ ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۹۳/۲ حدیث رقم ۱۰۰۰۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے فکریں لاحق ہیں اور میرے ذمے قرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تجھ کو ایسا کلام نہ سکھا دوں کہ جس وقت تو اس کو کہے اللہ تعالیٰ تیری فکر دور کر دے اور تجھ سے تیرا قرض ادا کر دے۔ میں نے کہا ضرور بتلائیں۔ فرمایا جس وقت تو صبح کرے اور جس وقت شام کرے تو یہ کہہ اے الہی! تحقیق میں فکر و غم سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں عاجزی اور سستی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں بخیلی اور نامردی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں غلبہ دین سے یعنی اس کی کثرت سے اور لوگوں کے غلبہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اس شخص نے کہا میں نے یہ کام کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے میری فکر دور کر دی اور میرا قرضہ ادا کر دیا۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

ادائیگی قرض کے لیے دعا

۲۳۳۹: وَعَنْ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ جَاءَهُ مُكَاتِبٌ فَقَالَ إِنِّي عَجَزْتُ عَنْ كِتَابَتِي فَأَعِنِّي قَالَ أَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ عَلَّمَنِيَنَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَوْ كَانَ عَلَيْكَ مِثْلُ جَبَلٍ كَبِيرٍ دَيْنًا آذَاهُ اللَّهُ عَنْكَ قُلْ اللَّهُمَّ اكْفِنِي بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَأَغْنِنِي بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ۔ (رواہ الترمذی والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۲/۱۵ حدیث رقم ۳۶۳۴۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک مکاتب آیا پس اس نے کہا کہ تحقیق میں اپنا بدل کتابت ادا کرنے سے عاجز ہوں یعنی مال کتابت کے ادا کا وقت پہنچ گیا ہے اور میرے پاس مال نہیں ہے پس مال اور دعا کے ساتھ میری مدد کیجیے فرمایا کہ کیا میں تجھ کو وہ کلمات سکھا دوں جو مجھ کو پیغمبر ﷺ نے سکھائے کہ اگر تجھ پر بڑے پہاڑ کے برابر قرض ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو تیرے ذمے سے ادا کر دے گا۔ تو کہہ اے الہی! مجھ کو اپنے حلال کے ساتھ حرام سے کفایت کر یعنی رزق حلال پہنچا کہ اس کی وجہ سے حرام سے بے پرواہ ہو جاؤں اور مجھ کو بے پرواہ کر ان چیزوں سے جو تیرے سوا ہیں۔ اس کو امام ترمذی نے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

مجلس سے اٹھتے وقت کی دعا

۲۳۵۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا جَلَسَ مَجْلِسًا أَوْ صَلَّى تَكَلَّمَ بِكَلِمَاتٍ فَسَأَلَتْهُ عَنِ الْكَلِمَاتِ فَقَالَ إِنَّ تَكَلَّمَ بِخَيْرٍ كَانَ طَابِعًا عَلَيْهِنَّ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَإِنْ تَكَلَّمَ بِشَرٍّ كَانَ كَفَّارَةً لَهُ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ - (رواه النسائي)

اخرجه النسائي في السنن حديث رقم ۷۷/۶ - واحمد في المسند -

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ جب ایک جگہ پر بیٹھے یا نماز پڑھتے یعنی مجلس سے اٹھتے وقت اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد چند کلمے پڑھتے۔ میں نے ان سے پوچھا یعنی ان کا فائدہ پوچھا پس فرمایا اگر نیک کلام کیا جائے یعنی ان کلموں سے پہلے تو یہ کلمے ان پر میسر ہونگے یعنی نیک کلام پر قیامت تک۔ یعنی وہ کلام محفوظ ہوگا۔ اس کا ثواب محفوظ رہے گا۔ ضائع نہیں ہوگا۔ اگر برا کلام کیا جائے۔ یعنی ان کلموں سے پہلے اگر گناہ کا کلام کیا جائے گا تو یہ کلمے اس کی بخشش کا سبب ہو جائیں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں: اے الہی! تو پاک ہے اور ہم تیری پاکی کے ساتھ تیری تعریف بیان کرتے ہیں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور میں تجھ سے توبہ کرتا ہوں۔ اس کو امام نسائی نے نقل کیا ہے۔

چاند دیکھنے کی دعا

۲۳۵۱: وَعَنْ قَتَادَةَ بَلَّغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى الْهَيْلَالَ قَالَ هَيْلَالَ خَيْرٍ وَرُشْدٍ هَيْلَالَ خَيْرٍ وَرُشْدٍ هَيْلَالَ خَيْرٍ وَرُشْدٍ أَمَنْتُ بِاللَّيْلِ خَلَقَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ يَقُولُ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي ذَهَبَ بِشَهْرِ كَذَا وَجَاءَ بِشَهْرِ كَذَا - (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داود في السنن ۳۲۴/۴ حديث رقم ۵۰۹۲ -

ترجمہ: حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ اس کو یہ بات پہنچی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ جب نئے چاند کو دیکھتے تو کہتے کہ بھلائی کا چاند ہے ہدایت کا چاند ہے بھلائی کا اور ہدایت کا میں ایمان لایا اس ذات پر جس نے تجھ کو پیدا کیا یہ بھی تین بار کہتے پھر کہتے سب تعریف ہے اس خدا کے واسطے کہ اس مہینے کو لے گیا اور لایا اس مہینے کو یعنی گذشتہ ماہ اور آئندہ کا نام لیتے اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

غم و فکر کے وقت کی دعا

۲۳۵۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ كَثُرَ هَمُّهُ فَلْيَقُلْ اللَّهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ وَإِبْنُ عَبْدِكَ وَإِبْنُ أَمَتِكَ وَفِي قَبْضَتِكَ نَاصِيَتِي بِيَدِكَ مَاضٍ فِي حُكْمِكَ عَدْلٌ فِي قَضَائِكَ أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمِيَتْ بِهِ نَفْسِكَ أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ أَوْ أَلْهَمْتَهُ عِبَادَكَ أَوْ اسْتَأْتَرْتُ بِهِ فِي مَكْنُونِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رِيبَ قَلْبِي وَجِلَاءَ هَمِّي وَعَمِي مَا قَالَهَا عَبْدٌ قَطُّ إِلَّا أَذْهَبَ اللَّهُ

عَمَّةٌ وَابْدَ لَهُ بِهِ فَرْحًا۔

رواہ رزین۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کو بہت زیادہ فکر لاحق ہو۔ پس چاہیے کہ وہ کہے اے الہی! تحقیق میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے بندے کا بیٹا ہوں اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں اور میں تیرے قبضے میں ہوں یعنی تیرے ملک و تصرف میں ہوں۔ میری پیشانی کے بال تیرے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی حرکت و قوت نہیں ہے سوائے تیری مدد کے ساتھ جو کہ میرے حق میں جاری ہے یعنی تیرے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں ہے جو کہے اور چاہے وہ وہی ہوگا۔ تیری قضا یعنی فیصلہ میرے امر میں عدل ہے میں ہر نام کے ساتھ تجھ سے وسیلہ مانگتا ہوں۔ وہ تیرے واسطے ہیں تو نے اس کے ساتھ اپنی ذات کا نام رکھا تو نے اس کو اپنی کتاب میں اتارایا تو نے وہ نام اپنی مخلوق کو سکھایا یعنی انبیاء صلی اللہ علیہم وسلم کو الہام کیا۔ کتاب میں ذکر کرنے کے بغیر یا تو نے اس کو غیب کے پردے کے بیچ اپنے نزدیک کسی کو اختیار کیا۔ اس کی اطلاع سوائے تیرے کسی کو نہیں ہے یہ کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار اور میری آنکھوں کی روشنی اور میرے غم کا دور کرنے والا اور خوف اور غم کو دور کرنے کا ذریعہ بنا، اس کو کوئی بندہ کبھی بھی نہیں کہتا مگر اللہ تعالیٰ اس کا غم دور کر دیتا ہے اور غم کی جگہ بدل دیتا ہے اور خوشی کو لے آتا ہے۔

بلندی پر چڑھتے وقت اور اترتے وقت کی دعا کا ذکر

۲۳۵۳: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا إِذَا صَعِدْنَا كَبُرْنَا وَإِذَا أَنْزَلْنَا سَبَّحْنَا۔

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۳۰۱۴۔ حدیث رقم ۲۹۹۳۔ والدارمی فی السنن ۳۷۳/۲ حدیث رقم ۲۶۷۴۔ واحمد فی المسند ۳۳۳/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر سے روایت ہے جب ہم بلند جگہ پر چڑھتے۔ تو اللہ اکبر کہتے اور جب اترتے تو سبحان اللہ کہتے ہیں۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

پریشانی کے وقت کی دعا

۲۳۵۴: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا كَرِهَ أَمْرًا يَقُولُ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ۔ (رواہ

الترمذی وقال هذا حدیث غریب ولیس بمحفوظ)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۲۰۱/۵ حدیث رقم ۳۰۹۳۔

ترجمہ: حضرت انس سے روایت ہے۔ کہ تحقیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی امر غمگین کرتا تو کہتے اے زندہ قائم رہنے والے تیری رحمت کی فریادری کرتا ہوں اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے محفوظ نہیں ہے۔

خوف کے وقت کی دعا

۲۳۵۵: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ هَلْ مِنْ شَيْءٍ نَقُولُ وَقَدْ

بَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ قَالَ نَعَمْ اللَّهُمَّ اسْتَرْعُوْرَاتَنَا وَآمِن رَّوْعَاتِنَا قَالَ فَضْرَبَ اللَّهُ وُجُوْهَ أَعْدَائِهِ

بِالرِّيْحِ وَهَزَمَ اللَّهُ بِالرِّيْحِ۔ (رواہ احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۳/۳۔

ترجمہ: حضرت ابی سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم نے خندق کے دن عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول! کوئی چیز ہے یعنی ذکر و دعا کہ ہم اس کو پڑھیں۔ کیوں کہ ہمارے دل گردن کو پہنچ گئے ہیں۔ یعنی نہایت دشواری اور محنت لاحق ہوتی ہے فرمایا ہاں وہ یہ ہے۔ اے الہی ہمارے عیب ڈھانک اور امن میں رکھ ہم کو ڈر سے۔ ابوسعید نے کہا ہے پس اللہ نے ماری ان کے دشمنوں کے منہ ساتھ یاد کے اور اللہ نے شکست دی بار (یعنی ہوا کے) اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

بازار میں داخل ہونے کی دعا

۲۳۵۶: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ السُّوقَ قَالَ بِسْمِ اللَّهِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ هَذِهِ السُّوقِ وَخَيْرَ مَا فِيهَا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيهَا اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُصِيبَ فِيهَا صَفْقَةً خَاسِرَةً۔

رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بازار میں تشریف لاتے تو فرماتے میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آیا ہوں اے الہی تحقیق میں مانگتا ہوں تجھ سے بھلائی اس بازار کی۔ یعنی رزق حلال میسر ہو اور نفع اور برکت ہو اس میں اور اس چیز کی بھلائی کہ اس میں ہے یعنی لوگ اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ اس کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جو اس میں ہے یعنی عقد فاسد اور نقصان سے اور مفسد لوگوں سے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیری اس سے کہ میں نقصان کے معاملہ کو پہنچوں۔ یہ یہی نقل کی ہے دعوات کبیر میں۔

بَابُ الْإِسْتِعَاذَةِ

پناہ مانگنے کا بیان

الفصل الاول:

آزمائش سے پناہ مانگنا

۲۳۵۷: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ وَسُوءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۱۳/۱۱۔ حدیث رقم ۶۶۱۶۔ ومسلم فی صحیحہ ۲۰۸۰/۴ حدیث رقم (۵۳)۔

۲۷۰۷)۔ واحمد فی المسند ۲/۲۴۶۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے پناہ پڑو۔ بلا کی مشقت سے اور بدبختی کے پہنچنے سے اور بری تقدیر سے اور دشمنوں کے خوش ہونے سے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: تعوذوا باللہ من جہد البلاء: یہ امر برائے ”ندب“ ہے۔ باللہ: اس قید سے غیر اللہ کی نفعی کرنا مقصود

ہے۔ جہد: جیم کے فتح و ضمہ کے ساتھ۔ اس لفظ کی وضاحت میں علماء کی عبارات مختلف ہیں، اگرچہ حاصل ایک ہی ہے۔

(۱) مشقته الى الغاية وشدته الى النهاية۔ (۲) قيل: الجهد مصدر أجهد جهداً أى: أبليغ غايتك۔ (۳) قد يطلق على المشقة۔ وهي المصائب التي تصيب الانسان في دينه أو دنياه، ويعجز عن دفعها، ولا يصبر على وقوعها۔
 جهد البلاء: (۱) امام طیبی فرماتے ہیں: جهد بلاء، اس حالت کو کہتے ہیں جس میں انسان کی اس قدر سخت آزمائش ہو کہ وہ موت کو ترجیح دے اور اس کی تمنا کرنے لگے۔ (۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی تفسیر قلت مال وکثرت عیال سے کی ہے۔ گویا کہ انہوں نے جهد البلاء سے اس کی شدید ترین نوع مراد لی ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں آتا ہے: کاد الفقر أن يكون كفراً۔

قوله يدرك الشقاء، وسوء القضاء، وشماتة الأعداء: ”درك“ بروزن ”شمس وقر“ دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ اس کی بھی مختلف توضیحات کی گئی ہیں۔ (۱) الدرك من الادراك لما يلحق الانسان من تبعته۔ (۲) قال في النهاية: الدرك هو اللحرق والوصول الى شيء، يقال: أدركته ادراكاً ودرکاً۔ امام طیبی فرماتے ہیں۔ (۳) صاحب السلاخ لکھتے ہیں: الدرك بفتح الراء اسم وبالسكون المصدر، والشقاء بفتح الشين بمعنى الشقاوة نقيض السعادة، ويجئ بمعنى التعب كقوله تعالى: ﴿طه ما أنزلنا عليك القرآن لتشقى﴾ [طہ: ۱-۲] (۴) قيل هو واحد دركات، ومعناه من موضع أهل الشقاوة وهي جهنم، أو من موضع يحصل لنا فيه شقاوة، أو هو مصدر اما مضاف الى المفعول، أو الى الفاعل أى: من درك الشقاء اياناً أو من دركنا الشقاء۔ (۵) قيل المراد بالشقاء الهلاك، ويطلق على السبب المؤدى اليه۔

اسی قبیل سے یہ حدیث ہے: لو قال: ان شاء الله لم يحنث و كان در كاله في حاجته وسوء القضاء: (۱) أى ما ينشأ عنه سوء في الدين والدنيا والبدن والمال والخاتمة۔ (۲) قال بعض العلماء: هو ما يسوء الانسان أو يوقعه في المكروه۔ (۳) قال الطيبى لفظ السوء منصرف الى المقضى عليه۔ (۴) قال زين العرب: هو مثل قوله: من شر ما قضيت۔ (۵) قال ابن بطال: المراد بالقضاء المقضى لأن حكم الله كله حسن لاسوء فيه۔ القضاء الحكم بالکليات على سبيل الاجمال فى الأزل۔ والقدر الحكم بوقوع الجزئيات التى لتلك الكليات على سبيل التفصيل۔

قدر تقدير کے ہم معنی ہے، وہ فیصلہ خداوندی جو بندوں کیلئے کر دیا گیا ہے۔

شماتة الأعداء: شامت کی تعریف یہ ہے: وہی فرح العدو بلبيلة تنزل بمن يعاديه۔ چنانچہ دشمن کی خوشی سے پناہ مانگنے سے مراد یہ ہے کہ دین و دنیا کی کسی بھی ایسی مصیبت میں مبتلا ہونے سے میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں جس سے دشمن خوش ہوتا ہے۔ یہ چاروں کلمات تمام انواع بلاء کیلئے جامع مانع ہیں۔ ان کے درمیان عموم خصوص من وجہ ہے۔ جیسا کہ بلغاء وفضحاء کے کلام میں ہوتا ہے۔

ابن حجرؒ سے اس موقع پر چوک ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ولوكون المقام مقام الاطناب لم يؤثر فيه تداخل بعض معانى ألفاظه واغناء بعضها عن بعض اھ۔ حدیث میں بیان کردہ نکات کو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ کلام غایت ایجاز کو پہنچا ہوا ہے، بلکہ اعجاز کے قریب قریب ہے۔ لہذا ابن حجرؒ کا یہ کہنا: ”یہ مقام اطناب ہے“ درست نہیں۔

حسن کے مطابق بخاری کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: اللهم انا نعوذ بك من جهد البلاء..... واضح رہے کہ حدیث کے طرق صحیحین سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل حدیث میں تین جملے مرفوع ہیں، اور چوتھا جملہ سفیان بن عیینہ نے اپنی طرف سے بڑھایا ہے، لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ وہ کونسا کلمہ ہے، اسماعیلی نے اپنی روایت میں سفیان سے نقل کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ سفیان کا اپنی طرف سے بڑھایا ہوا جملہ: ”شماتة الأعداء“ ہے۔

اندیشہ اور غم سے نجات کے لیے جامع دعا

۲۳۵۸: وَعَنْ آتِسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدِّينِ وَعَلْبَةِ الرِّجَالِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۷۸/۱۱ - حدیث رقم ۶۳۶۹ - وابوداؤد فی السنن ۹۰/۲ حدیث رقم ۱۰۴۱ - والترمذی ۱۷۲/۵ حدیث رقم ۳۵۵۱ - واحمد فی المسند ۲۲۶/۳ -

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ پکڑتا ہوں تیرے اندیشہ سے اور غم سے اور عاجز ہونے سے اور سستی سے اور نامردی سے اور بخیلی سے اور دین کے بوجھ سے اور لوگوں کے غلبہ سے یعنی ظالموں سے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تخریج: رواہ ابو داؤد الترمذی والنسائی، والمفہوم من الحصن انہ من افراد البخاری

تشریح: قولہ: اللہم انی اعوذ بک..... والبخل: ”انی“ یاء کو ساکن و مفتوح دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

”اعوذ بک..... والبخل“: ہر ہر کلمہ کے متعلق توضیحات ماقبل میں گزر چکی ہیں۔

قولہ: ضلع الدین وغلبۃ الرجال: ضلع کو بروزن شمس و قمر دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ضلع الدین سے دین کی شدت و ثقل مراد ہے۔ خصوصاً جب کہ قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت نہ دکھائی دیتی ہو اور ادائے قرض کا مطالبہ بھی ہو۔ بعض سلف نے فرمایا: ”ما دخل ہم الدین قلبا الا اذهب من العقل ما لا یعود الیہ“۔ اور اسی وجہ سے مروی ہے: الدین شین الدین۔

”غلبۃ الرجال“: غلبہ سے ان کے تسلط کا قہر و شدت مراد ہے۔ اور ”رجال“ سے ظالم یا دائن مراد ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پناہ چاہی چونکہ اس سے ”وہن فی النفس“ لازم آتا ہے۔

کرمائی فرماتے ہیں: یہ دعا جوامع الکلم میں سے ہے، چونکہ ”رذائل“ کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) بدنہ۔ (۲) نفسانیہ۔ (۳) خارجیہ۔ رذائل نفسانیہ باعتبار قوی کے تین ہیں۔ (۱) عقلیہ۔ (۲) غصبیہ۔ (۳) شہویہ۔ چنانچہ ”ہم و حزن“ کا تعلق عقلیہ سے ہے۔ ”جبن“ کا تعلق ”غصبیہ“ سے ہے۔ ”بخل“ کا تعلق ”شہویہ“ سے ہے، عجز و کسل کا تعلق ”بدنیہ“ سے ہے۔ رذائل بدنہ اس وقت پائے جاتے ہیں جب اعضاء آلات و قوی تمام سلامت ہوں۔ اور پہلا کسی عضو وغیرہ کے نقص و نقصان کے وقت ہوتا ہے، اور ضلع وغلبہ خارجیہ کی وجہ سے ہوتا ہے، چنانچہ پہلا ”مالی“ دوسرا ”جانی“ ہے۔ اور یہ دعا ان تمام کو شامل ہے۔

جامع دعا

۲۳۵۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَمِّ وَالْمُغْرَمِ وَالْمَائِمِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنَى وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ اللَّهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِمَاءِ الثَّلَاجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِي كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَبَا عِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۸۱/۱۱ - حدیث رقم ۶۲۷۵ - ومسلم فی صحیحہ ۲۰۷۸/۴ حدیث رقم (۴۹) - (۵۸۹)۔

والترمذی فی السنن ۱۸۶/۵ حدیث رقم ۳۵۶۰ واحمد فی المسند ۱۸۵/۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے اے الہی! تحقیق میں سستی سے یعنی طاعت میں سستی سے اور بڑھاپے سے یعنی بڑھاپے کی وجہ سے بے حواس ہو جانے سے اور اعضاء کے ناکارہ ہونے سے اور قرض سے اور گناہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے الہی! تحقیق میں تیرے آگ کے عذاب سے اور قبر کے فتنے سے اور قبر کے عذاب سے اور دولت کے فتنے کی برائی سے اور فقر کی فتنے کی برائی سے اور کالے دجال کے فتنے کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے الہی! میرے گناہوں کو برف والے پانی کے ساتھ اور اولوں کے ساتھ دھو دے یعنی مجھ کو گناہوں سے پاک کر دے طرح کی مغفرتوں کے ساتھ پاک کر دے جیسے کہ یہ چیزیں میل سے پاک کرتی ہیں اور میرے دل کو برے اخلاق سے پاک کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے اور میرے درمیان اور میرے گناہوں کے درمیان دوری ڈال دے جیسے کہ تو نے مشرق و مغرب کے درمیان دوری رکھی ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم انی أعود ذ..... وعذاب القبر: ان تمام کی تشریح ماقبل گزر چکی ہے۔

قوله: ومن شرفتنه الغنی: الماداری کا فتنہ بطر و طغیان ہے، مال کو حرام طریقتے سے یا حرام جگہوں سے حاصل کرنا، نافرمانی میں خرچ کرے، یا مال و جاہ پر تفاخر کرے۔

قوله: ومن شرفتنه الفقر: الماداروں سے حسد کرنا، الماداروں کے مال میں لالچ کرنا، اس قدر تذلل اختیار کرنا کہ جس سے عزت خاک میں مل جائے یا دین بدنام ہو۔ اور اللہ کی تقسیم پر راضی نہ ہونا، اور اس کے علاوہ وہ تمام صورتیں بھی اس ضمن میں آتی ہیں کہ جن کا انجام اچھا نہ ہو۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: کاد الفقر أن یكون کفرا: بعض کا کہنا ہے کہ ”فتنہ“ سے یہاں ابتلاء و امتحان مراد ہے، اے من بلا الغنی، و بلاء الفقر۔ یعنی اس غناء و فقر سے پناہ چاہتا ہوں جو بلاء و مشقت ہو، اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ فقر و غنی اپنی ذات کے اعتبار سے دونوں نمود ہیں، اگرچہ جمہور فرماتے ہیں کہ فقر ”اسلم“ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انه کان بعبادہ خبیرا بصیرا﴾ [الاسراء: ۳۰] چنانچہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ ”تسلیم“ افضل ہے، اور رزق کا بسط و قدر ہر بندہ کے مناسب حال ہے۔ حدیث قدسی میں آتا ہے: ان من عبادی من لا یصلحہ الا الفقر، ولو أغنیته لفسد حالہ، وان من عبادی من لا یصلحہ الا الغنی، ولو أفقرته لفسد حالہ۔ پس فقیر کی شرط یہ ہے کہ وہ صابر ہو، اور غنی کی شرط یہ ہے کہ شاکر ہو۔ پس جب دونوں اس طرح کے نہیں ہوں گے تو ہر ایک کیلئے اس کا فقر و غنا فتنہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو رب کے قریب کرے وہ تیرے لئے مبارک ہے۔ اور ہر وہ چیز جو رب سے دوری پیدا کرے وہ تیرے لئے ”شوم“ ہے، خواہ وہ فقر ہو، خواہ وہ غنی ہو۔ بعض محققین نے فرمایا: دونوں کے ساتھ ”شر“ کی قید لگی ہوئی ہے، چونکہ ان میں سے ہر چیز ایک اعتبار سے ”خیر“ ہے، اور ایک اعتبار سے ”شر“ ہے، چنانچہ ”شر“ کی قید سے وہ فقر و غنا خارج ہے جس میں ”خیر“ ہو، خواہ قلیل ہو کہ کثیر۔ امام طبری فرماتے ہیں: اگر فتنہ کی تفسیر محنت و مصیبت کے ساتھ کی جائے تو اس کا شر یہ ہے کہ آدمی مفلسی پر صبر نہ کرے اور جزع کرے، اور اگر امتحان و اختبار کے ساتھ کی جائے تو اس کا شر یہ ہے کہ خوشحالی میں حمد و ثناء نہ بیان کی جائے، اور بد حالی میں صبر نہ ہو۔

امام غزالی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں: غناء کا فتنہ ”حرص“ ہے۔ اور یہ کہ ناجائز طریقہ سے کمانے کی محبت ہو، اور حقوق و واجبات کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے، اور فقر کے فتنہ سے مراد وہ فقر ہے کہ جس فقر پر صبر نہ کر سکے، تقویٰ و ورع کا دامن چھوڑ بیٹھے، اور اس کے سبب

ایسے حضور میں پھنس جائے کہ جو اہل دین و مروت کے شایان شان نہ ہو۔ اور فقر و فاقہ کی وجہ سے حرام کی تیز بھی نہ رہے اور اس پر کوڑ پڑے۔
 قولہ: **ومن شر فتنۃ المسیح الدجال**: جاء مہملہ کے ساتھ ہے، خائے عجمہ کے ساتھ بھی مروی ہے، اس کو ”مسیح“ کہنا اس اعتبار سے ہے کہ اس کی ایک آنکھ مکمل طور پر سبھ ہوگی، اور دوسری آنکھ جزوی طور پر۔ مشکوٰۃ کے تصحیح شدہ معتمد نسخوں میں یہ لفظ خائے مہملہ کے ساتھ ضبط کیا گیا، اور ابن حجر کی عبارت: **بالحاء المہملۃ والمعجمۃ** سے وہم پیدا ہوتا ہے، لہذا ادھوا کہ نہ لگ جائے، اور اس کو اختلاف نسخ پر محمول کرتے ہوئے کوئی نسخہ نہ سمجھ لیا جائے، بلکہ یہ ایک روایت ہے۔

ابن بطلان فرماتے ہیں: آپ ﷺ کا یہ تعوذ ”تعلیمًا للامة“ ہے۔ چونکہ حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ان تمام امور سے مأمون کر رکھا ہے۔ قاضی عیاض نے بھی اسی پر جزم کیا ہے۔ عسقلانی لکھتے ہیں: **أراد التعوذ من وقوع ذلك بامتناعه یا انتقار و عبودیت کا اظہار مقصود ہے۔** کہ اللہ جل شانہ کی ذات عالی مستغنی اور کبریائی والی ہے۔

قولہ: **اللهم اغسل خطایای بماء الثلج والبرد**: البرد: سردی، البرد: بروزن قلم۔ اے اللہ مجھے تمام انواع مغفرت کے ساتھ گناہوں سے اس طرح طاہر کر دیجئے، جیسا کہ یہ اشیاء مطہرہ میل پکیل سے پاک کر دیتی ہیں۔

ابن دینق العبد فرماتے ہیں: یہ تعبیر ”غایت محو“ کیلئے اختیار کی گئی، اس لئے کہ وہ کپڑا کہ جس کو کئی بار دھویا گیا ہو تو وہ انتہائی صاف ستھرا ہوتا ہے۔ عسقلانی فرماتے ہیں: گویا خطایا کو بمنزلہ جہنم کے قرار دیا، چونکہ یہ اس کا سبب ہیں۔ اور غسل کو اطفاء حرارت سے تعبیر کیا، اور انتہائی ٹھنڈے پانیوں کے استعمال کا ذکر مبالغہ فرمایا۔

قولہ: **ونق قلبی کما ینقی الثوب الابيض من الدنس**: اس میں اشارہ ہے کہ اصل فطرت کے تقاضا کے طور پر دل سلیم و نظیف اور ابيض و ظریف ہوتا ہے، گناہوں کے ارتکاب، اور عیوب کے تخلق کے باعث یہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

قولہ: **باعد بنی و بین**: ”أبعد“ کا مبالغہ ہے، چونکہ باب مفاعلہ جب ”مغالبة“ کیلئے نہ ہو تو مبالغہ کیلئے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں توت نکرار ہے۔ فلائی فرماتے ہیں: مباحدہ سے مراد صحو ما حصل منها والعصمة عما سیاتی ہے۔ یہ کلام مجاز پر محمول ہے، چونکہ حقیقت کے اعتبار سے مباحدہ زمان و مکان میں ہوتا ہے، اور التقاء مشرق و مغرب مستحیل ہے، تو گویا مراد یہ ہے کہ لا یبقی منها اثر۔ اے بالکلکیلیہ۔

کر مائی فرماتے ہیں: لفظ ”بین“ کو ککر لایا گیا چونکہ ضمیر مجرور پر عطف کیلئے اعادہ خافض ہوتا ہے، اور فرمایا: احتمال یہ ہے کہ دعوات ثلاثیہ سے ازمنہ ثلاثیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہو۔ غسل سے ماضی کی طرف تنقیہ سے حال کی طرف، اور مباحدہ سے استقبال کی طرف ابن دینق العبد فرماتے ہیں: احتمال یہ ہے کہ یہ تمام اشیاء مجاز ہیں اس صفت سے کہ جس کے ذریعہ محو ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ:

﴿واعف عنا و اغفر لنا و ارحمنا﴾

دنیا و برزخ میں لاحق ہونے والی پریشانیوں سے پناہ مانگنا

۲۳۶۰: **وَ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمٍ سَمَّا نَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْهَرَمِ وَعَدَابِ الْقَبْرِ اللَّهُمَّ اتِ نَفْسِي تَقْوَاهَا وَزَكَّيْهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّيْتَهَا أَنْتَ وَلِيَّهَا وَمَوْلَاهَا اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا**۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت زید بن ارقمؓ روایت ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ عاجز ہونے سے۔ یعنی قدرت نہ رکھنے سے۔ اطاعت پر اور سستی سے یعنی اچھے کاموں میں اور نامردی سے اور بخشی سے اور بڑھاپے سے یعنی ناکارہ ہونے اعضاء کے سے اور برہاپے کی وجہ سے بے خوشی سے اور عذاب قبر سے یعنی قبر کی تنگی سے اور وحشت سے اور گرزوں کے سے مار سے اور پچھوؤں کے ڈنک مارنے سے اور سانپوں کے ڈسنے سے اور ان کی مانند۔ اے الہی میرے نفس کو پرہیزگاری عطا کر اور اس کو پاک کر۔ تو بہترین ہے ان کے لیے جنہوں نے اس کو پاک کیا تو اس کا ساز ہے اور اس کا مالک ہے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے اس کے علم سے کہ جو نفع نہ دے اور اس دل سے کہ نہ ڈرے یا نہ تسکین پائے اللہ کے ذکر سے اور اس نفس سے نہ سیر ہو یعنی حریص ہو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس پر قناعت نہ کرے اور اس دعا سے کہ نہ قبول کی جائے۔

تشریح: قوله: اللهم انى اعوذ بك من العجز..... عذاب القبر: أى عدم القدرة على الطاعة، وعدم القوة على العبادة: یعنی اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ طاعت پر قادر نہ رہوں اور عبادت کے کرنے کی مجھ میں طاقت نہ رہے۔ قوله: اللهم آت نفسي تقواها: أى صيانتها عن المحظورات۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مناسب ہے کہ تقویٰ کی تفسیر اس فجور کے مقابل سے کی جائے، جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿فَالهَمها فجورها وتقواها﴾ [الشمس: ۸] یہاں تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کی متابعت، اور فجور فواحش کے ارتکاب سے بچا جائے، چونکہ حدیث آیت کیلئے تفسیر و بیان کی طرح ہے۔ ”آیت“ دلالت کر رہا ہے کہ آیت میں ”الہام“ سے مراد: خلق الداعية الباعثة على الاجتناب عن المذکورات ہے۔

قوله: وزكها أنت خير من زكاها: یہ دلالت کرتا ہے کہ آیت میں نفس کی طرف تزکیہ کا اسناد، نسبتہ کسب الی العبد کی قبیل سے ہے، ناکہ خلق الفعل والی نسبت، جیسا کہ معتزلہ کا گمان ہے، چونکہ ”خیریت“ مشارکہ بین کسب العبد و خلق القدرة فیہ کی مقتضی ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ولا يلزم من مقابلة التقوى للفجور قصرها على ضد الفجور، خلافا لمن توهمه۔ ابن حجرؒ کا یہ کہنا ”کلم کلاما کبراً“ ہے۔ چونکہ آیت مذکورہ میں ذکر کردہ یہ مقابلہ بالکل صحیح ہے۔

قوله: أنت وليها ومولاها: ”ولی“ یہاں ”ناصر“ کے معنی میں ہے۔ ای: ناصرها: اس جملہ کا تعلق آت نفسي تقواها سے ہے، گویا کہ اصل کلام یوں ہے: انصرها على فعل ما يكون سببا لرضاك عنها لأنك ناصرها۔ مولاها: یہ کلام ”زکھا“ کی طرف راجع ہے، یعنی: طهرها بتأديك اياها۔ كما يؤدب المولى عبده۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: أنت وليها ومولاها مستأنفہ ہے۔ اللہ سے درخواست کی جارہی ہے کہ آت تقواها وزکھا چونکہ اللہ ہی ان امور کا متولی و مالک ہے۔ پس اگر تزکیہ کو تطہیر النفس عن الافعال والااقوال والاخلاق الذميمة پر محمول کیا جائے تو تقویٰ کی نسبت سے ممکن فی الباطن کے مظاہر ہوں گے، اور اگر انما و اعلاء بالتقویٰ پر محمول کیا جائے تو تحلیہ بعد اتحلیہ ہوگا، چونکہ ازروئے شرع وہ شخص متقی ہے جو انہی سے اجتناب کرتا ہو، اور اوامر کو بجالاتا ہو۔ بعض عارفین سے منقول ہے: تقوى البدن الكف عمالا يتيقن حله، وتقوى القلب عما سوى الله فى الدارين وعدم الالتفات الى غيره سبحانه۔

قوله: اللهم انى أعوذ بك من علم لا ينفع: امام طیبیؒ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں:

”غیر نفع بخش علم“ سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جس پر عمل نہ کروں جو دوسروں کو نہ سکھاؤں اور جو اخلاق و افعال کو نہ سدھارے یا پھر اس سے وہ علم مراد ہے جو دین کے لئے ضروری نہ ہو اس طرح وہ علم بھی مراد ہو سکتا ہے جس کو حاصل کرنے کی

شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں: علم اپنی ذات کے اعتبار سے مذموم نہیں، چونکہ ”علم“ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، بلکہ اس (کے مذموم ہونے) کے تین اسباب ہیں۔ یا تو اس وجہ سے کہ وہ ایصال الضرر کا وسیلہ ہے، یا ایصال الشرائی غیرہ کا ذریعہ ہے، جیسا کہ علم السحر اور طلسمیات۔ چونکہ یہ دونوں علوم اضرار بالخلق اور وسیلہ للشر کے علاوہ کوئی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یا اپنے صاحب کو ظاہری طور پر نقصان پہنچائیں گے، جیسا کہ علم النجوم۔ اس لئے کہ یہ سارے کا سارا علم مضر ہے، اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی مضرت یہ ہے کہ آدمی لایعنی کام شروع کر دیتا ہے، اور عمر عزیز جیسی قیمتی ترین پونجی کو بلا فائدہ انتہائی گھائے میں ضائع کر دیتا ہے، یا اس کے دقیق ہونے کی وجہ سے، جیسا کہ دقیق علوم کے جلی ہونے سے پہلے ان کے ساتھ تعلق، اور اسرار الہیہ سے بحث کرنے والا شخص۔ چنانچہ لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اس سے بحث کرنے سے رک جائیں۔ اور اس چیز کی طرف لوٹایا جائے کہ جس کی بابت شریعت نے کلام کیا ہے۔ اھ۔ اس تقریر سے ابن حجرؒ کے اس قول کا فاسد ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے: لا یحیط بہا الا نبی او ولی، چونکہ ”احاطہ“ اللہ جل شانہ کی صفت خاص ہے، اسی وجہ سے امام صاحبؒ نے فرمایا: لجلالة المقام لا یستقل بہا، والوقوف علی طرف بعضها الا الانبیاء والاولیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

قولہ: ومن نفس لا تشبع یعنی ایسے نفس سے پناہ مانگتا ہوں جو اللہ کے عطایا سے سیر نہ ہو۔ تیرے دیئے ہوئے رزق پر قانع نہ ہو، شدت حرص کے باعث مال جمع کرنے سے تھکتا نہ ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے نفس سے پناہ مانگتا ہوں جو سیر نہیں ہوتا اور بہت زیادہ کھاتا ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ایسا نفس جو مال جمع کرنے اور مناصب حاصل کرنے کا حریص ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ حقیقی معنی مراد ہیں، اس کی شدت حرص کی وجہ سے یا دنیا کی حرص سے اس قدر کھانے پر قادر نہیں کہ جو اس کو سیر کر دے۔ یا جوع البقر کے استیلاء کی وجہ سے۔

قولہ: ومن دعوة لا یتستجاب لها: امام طبریؒ فرماتے ہیں: ”لہا“ کی ضمیر ”دعوت“ کی طرف لوٹ رہی ہے، اور لام زائدہ ہے اور جامع الاصول میں یوں ہے: دعوة لا تستجاب اھ۔ اور ایک روایت میں ومن دعا لا یسمع۔ ایک اور روایت میں: ومن هؤلاء الأربع، یہ حدیث صحیح کے جواز پر دلالت کرتی ہے، بشرطیکہ طبع کے موافق ہو، اور بلا تکلف ہو۔

اچانک عذاب اور غضب خداوندی سے پناہ مانگنا

۲۳۶۱ وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ

نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفَجَاءَةِ رِقْمَتِكَ وَجَمِيعِ سَخَطِكَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۲۰۹۷/۴ حدیث رقم (۹۶-۲۷۳۹)۔ و ابو داؤد فی السنن ۹۱/۲ حدیث رقم ۱۰۴۵۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعاؤں میں سے یہ دعا بھی تھی اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے تیری رحمت کے جائے رہنے سے اور تیری عافیت کے بدلنے سے۔ یعنی مثلاً صحت کے بدلے بیماری ہو اور غنا کے بدلے محتاجگی ہو اور تیرے اچانک عذاب سے اور تیری تمام ناراضگی سے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللہم انی اعوذ بک من زوال نعمتک وتحول عافیتک: ”تحول“ واو مشدہ ہے۔ میرک فرماتے

ہیں: اگر یہ سوال کیا جائے کہ ”زوال“ و ”تحول“ میں کیا فرق ہے؟ تو میں کہتا ہوں زوال کی نسبت ایسی شئی کی طرف کی جاتی ہے کہ جو پہلے کسی چیز میں موجود ہو، پھر اس سے جدا ہوگئی ہو، اور تحول یہ ہے کہ شئی میں تغیر آجائے اور غیر سے جدا ہو جائے۔ چنانچہ زوال نعمت کا

مطلب ہوگا: ذہا بہا من غیر بدل، اور تحول کا یہاں مطلب ہوگا: ابدال الصحة بالمرض والغنى بالفقر۔ امام طیبی فرماتے ہیں: اى تبدل ما رزقتنى من العافية الى البلاء والداھية۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: وتحويل عافيتك۔ تحويل باب تفعلیل سے ہے، چنانچہ اضافۃ المصدر الی مفعول کی قبیل سے ہے۔

قوله: وفجأة نقمتك وجميع سخطك: نون کے کسرہ اور فتح کے ساتھ اور قاف ساکن ہے۔ بروزن فرحہ۔ جاء: فاء کے ضم اور مد کے ساتھ۔ ایک نسخ میں فاء کے فتح اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے۔ بمعنی بغتۃ یعنی اچانک۔

”جميع سخطك“، یعنی تمام امور سے کہ جو آپ کے غصہ کا سبب بنیں، دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے غضب کے جمع آثار سے پناہ چاہتے ہیں۔

صفت متجری نہیں ہوتی

ابن حجر کا یہ کلام خطا فاحش پر مبنی ہے: وجميع جزئیات سخطك۔ چونکہ صفت متجری نہیں ہوتی۔

۲۳۶۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ أَعْمَلْ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲۰۸۵/۴ حدیث رقم (۹۵-۲۷۱۶)۔ وابوداؤد فی السنن ۹۲/۲ حدیث رقم ۱۵۰۰۔
واحمد فی المسند ۱۳۹/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں۔ تجھ سے اس کام کی برائی سے جو میں نے کیا اور اس کام کی برائی سے جو میں نے نہیں کیا اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم انى اعوذ بك من شر ما عملت: واضح رہے کہ ”عمل“ سے مراد فعل ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ میں نے جو برے کام کئے ہیں ان سے بھی پناہ مانگتا ہوں بایں معنی کہ ان کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤں اور وہ برے کام معاف فرمادیئے جائیں اور جو کام نہیں کئے ہیں ان سے بھی پناہ مانگتا ہوں بایں معنی کہ آئندہ ایسا کوئی کام نہ کروں جو تیری ناراضگی کا باعث ہو یا یہ کہ برے کاموں کے ترک کو اپنا کمال نہ سمجھوں بلکہ اسے صرف تیرا فضل جانوں۔

۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة﴾ [الانفال: ۲۵] اور ایک احتمال یہ ہے کہ ناکردہ فعل پر تعریف کی خواہش سے پناہ چاہتا ہوں اھ۔ یہ سارا کلام انتہائی وقت ہے۔

قوله: ومن شر ما لم أعمل: ابن حجر نے یہاں عجیب معاملہ کیا ہے کہ من شر ما لم أعمل کی بالکل تشریح نہیں کی۔ گویا کہ انہوں نے لا ادرى نصف العلم پر عمل کیا۔ آگے لکھا ہے: والقول الغامى اقرب، بل فى الاول من البعد عن ظاهر اللفظ ما لا يخفى اھ۔ اور ممکن ہے کہ مالم أعمل سے مراد ایسا فعل جس کا زمانہ مستقبل میں صدور ہوا۔

اختلاف روایت: امام نسائی اور ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو حضرت عائشہ سے بایں الفاظ نقل کیا ہے: اللهم انى اعوذ بك من شر ما عملت ومن شر مالم أعمل۔

آپ ﷺ کی ایک جامع دعا کا بیان

۲۳۶۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ اللَّهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ وَبِكَ أَمِنْتُ وَعَلَيْكَ

تَوَكَّلْتُ وَآلِكَ اَنْبَتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِعِزَّتِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ مِنْ اَنْ تُصَلِّبْنِىْ اَنْتَ الْحَيُّ
الَّذِى لَا يَمُوْتُ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ يَمُوْتُوْنَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۱۱۶/۱ - حديث رقم ۶۳۱۷ - ومسلم ۲۰۸۶/۴ - حديث رقم (۶۷-۲۷۱۷) - والدارمى
فى السنن ۴۱۵/۱ - حديث رقم ۱۴۸۶ - واحمد فى المسند ۹۵/۱ -

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے۔ اے الہی تیرے واسطے میں نے فرمانبرداری
کی اور تجھ پر ایمان لایا اور تجھی پر میں نے توکل کیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا یعنی گناہوں سے تیری اطاعت
کی طرف میں رجوع کیا اور تیری مدد کے ساتھ میں لڑتا ہوں۔ یعنی کافروں سے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیری
عزت کے ساتھ کوئی معبود نہیں ہے مگر تو اس سے کہ تو گمراہ کرے مجھ کو زندہ ہے کہ مرے گانہیں اور جن اور آدمی مرے
گے۔ اس کو امام بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم لك أسلمت وبك آمنت وعليك توكلت: غير الله كوخارج كرويا۔ أسلمت وبك

آمنت: یہاں ”اسلام“ سے مراد اقتیاد ظاہری اور ”ایمان“ سے مراد تہدیق باطنی ہے۔ ”وعليك توكلت“ کے کئی مطلب بیان کئے
ہیں: (۱) اپنے تمام امور کے آغاز و اختتام پر آپ ہی کی ذات پر بھروسہ ہے۔ (۲) میں نے اپنے تمام امور آپ ہی کے سپرد کر دیئے۔
آپ ہی تدبیر فرمائیے، چونکہ میں ان امور میں نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا۔ اور آپ ہی پر ایمان لانا یعنی آپ کی عطا کردہ توفیق سے ہی
میں ان تمام چیزوں پر ایمان لایا جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اپنے تمام امور میں آپ ہی پر بھروسہ کیا۔ ابن حجرؒ نے ”وعليك
توكلت“ کے بارے میں انوکھی بات ذکر کی ہے: عليك ”تجوّز“ وان ضمن توكلت باعتمدت لتعذر تعديه بعلى بدون
التضمن۔ واضح رہے کہ لفظ ”توکل“ ”صرف ”علی“ کے واسطے ہی متعدی ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث اور لغت اس پر شاہد ہے،
تعذیر اور استعلاء کے اعتبار سے ”توکل“ اور ”اعتماد“ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ تضمین کی کوئی ”تک“ نہیں بنتی۔ چونکہ وہ بعینہ
استعلاء کے معنی کا فائدہ دے رہا ہے۔ ”تضمین“ اس وقت صحیح ہوتی اگر اس کا غالب استعمال بغیر ”علی“ کے ہوتا۔ اور کبھی ”علی“ کے ساتھ
استعمال ہوتا تو تضمین میں ایسے فعل کی احتیاج ہوتی جو ”علی“ کے بغیر مستعمل نہ ہو۔ جیسا کہ ارباب عقل و نبی پر مخفی نہیں۔

قوله: واليك أنبت وبك خاصمتك: کے تین معنی ہو سکتے ہیں: (۱) انابة من الغفلة الى الذكر۔ (۲) انابة من المعصية

الى الطاعة۔ (۳) وانابة من الغيبة الى الحضور۔ وبك خاصمتك: (باء برائے استعانت ہے) اى: باعانتك حاربت
أعداءك۔

قوله اللهم انى أعود بعزتك لا اله الا انت ان تضلنى: ”عزة“ سے مراد ”غلبہ“ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فان العزة

للہ جميعا﴾ لا اله الا انت: یعنی جب آپ ہی ”اللہ“ ٹھہرتے تو فلا وجود ولا معبود ولا مقصود الا انت، ولا سؤال الا
منك، ولا استعاذة الا بك ان تضلنى: ”اعوذ“ کے متعلق ہے۔ اور کلمہ توحید (جملہ) معترض ہے، ”عزة“ کی تاکید کیلئے آیا
ہے۔ چنانچہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوا: أعوذ من أن تضلنى بعد اذ هديتنى، ووقفنى للانقياد الظاهر والباطن فى
حكمتك وقضائك، وللانابة الى جنبك، والمخاصمة مع أعداءك، والالتجاء فى كل حال الى عزتك ونصرتك۔

اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا﴾: [آل عمران: ۸]

قوله: أنت الحي الذى لا يموت.....: صيغ غائب کے ساتھ ہے۔ اور حسن کی روایت میں: ”أنت الحي لا تموت“

صیغہ خطاب کے ساتھ ہے۔ اور اسم موصول مذکور نہیں ہے۔ اس میں بھی ”عزۃ“ کی تاکید ہے۔ اور ابن حجرؒ نے یہاں انوکھی بات کہی: قوله: أن تضلني أی: تغيبني عن حضرتك طرفة عين، بل اجعلني دائم الشهود لك، أو عن القيام بأوامرك ونواهيك، بل اجعلني دائم التبعيد لك، أو عن الايمان بك، بل اجعلني دائم التصديق بما جاء من عندك۔ اہ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن حجرؒ کے کلام میں ان تضل بمعنى غاب استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ یہ اضلال سے ماخوذ ہے، جو ضل کا متعدی اور ”هداية“ کا متضاد ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ جملوں کی ترتیب برقرار نہیں ہے، چونکہ ایمان کو اسلام و احسان سے مقدم ذکر کرنا چاہئے تھا، جیسا کہ اہل عرفان میں معروف ہے۔

تیسری بات یہ کہ وہ فرماتے ہیں: ولما كان في الاضلال بكل هذه المعاني الثلاثة نوع من الامامة المعنوية عقب بما يوجب ضده من الحياة الأبدية فقال: أنت الحي..... اہ۔ اس کلام میں اولاً تو تكلف وتعفف ہے۔ ثانياً اضداد کا غلط استعمال ہے۔ بایں طور کہ ”اماتہ معنویہ“ کی ضد ”حیاء حقیقیہ“ ہے۔ اور ”حیاء فانیہ“ کی ضد ”حیاء ابدیہ“ ہے۔ مشہور ضابطہ ہے: انما تبين الأشياء بأضدادها۔

”والجن والانس يموتون“ جن و انس کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا چونکہ یہی دونوں مخلوقات مکلف ہیں، اور ان ہی کو تبلیغ کرنا مقصود ہے۔ گویا کہ یہ دونوں اصل ہیں۔

الفصل الثالثی:

چار چیزوں سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۳۶۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْأَرْبَعِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دُعَاءٍ لَا يُسْمَعُ۔

(رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ و رواہ الترمذی عن عبد اللہ بن عمرو و النسائی عنہما)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۸۱/۵ حدیث رقم ۳۵۴۹۔ و ابن ماجہ فی السنن ۱۲۶۱/۲ حدیث رقم ۳۸۳۷۔ و احمد فی المسند ۱۶۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیری چار چیزوں سے اس علم سے کہ نفع نہ دے اور اس دل سے کہ عاجزی نہ کرے اور اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دعا سے کہ جو قبول نہ کی جائے۔ اس کو امام احمدؒ اور ابو داؤدؒ اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے عبد اللہ بن عمروؓ سے اور نسائی نے ابو ہریرہؓ اور عبد اللہ بن عمروؓ سے۔

تشریح: قوله: اللهم انى اعوذ بك لا يسمع سے مراد لا يستجاب ہے، لا يسمع کی تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ جو دعا قبول نہیں ہوتی گویا کہ اس کا اعتبار ہی نہیں، اور ایسا ہے جیسا کہ دعائی ہی نہیں۔ کہا جاتا ہے: اسمع دعائى: اى اجب، چونکہ سماع سے اجابت و قبول مراد ہوتا ہے۔

ابو طالب کی فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ نے شرک، نفاق اور برے افعال سے پناہ مانگی ہے اسی طرح آپ ﷺ نے علم کی اس ایک قسم سے پناہ مانگی (جو اسلامی عقائد و اعمال کے نقطہ نظر سے مضر ہے اور جو انسان کو تقویٰ اور خوفِ آخرت کی راہ پر لگانے کی

بجائے دنیا کی حرص و محبت کے راستہ پر لے جائے) چنانچہ جس علم کے ساتھ تقویٰ اور خوفِ آخرت نہ ہو وہ دنیا کے دروازوں میں سے ایک دروازہ اور دنیا داری کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔

امام طبری فرماتے: جان لیجئے کہ ان چاروں قرآن میں سے ہر ہر قرینہ اس بات کا مشعر ہے کہ اس کا وجود اس کی غایت پر مبنی ہے۔ اور قرینہ سے یہی غایت اصل غرض ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علوم اس لئے حاصل کئے جاتے ہیں تاکہ ان سے نفع اٹھایا جاسکے، چنانچہ جب علم سے نفع نہیں اٹھائے گا تو برابر سرا بر چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا، بلکہ التا وبال ہوگا، اسی وجہ سے علم غیر نافع سے پناہ چاہی ہے، اور دل کو اس لئے پیدا فرمایا تاکہ اپنے پیدا کرنے والے سے خشوع اختیار کرے، اور اپنا سینہ اسی کیلئے کھلا رکھے اور اس میں نور ڈالے۔ چنانچہ جب ”دل“ ایسا نہیں ہوگا بلکہ ”قاسی“ ہوگا تو اس سے استعاذہ واجب ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: ﴿فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبِهِمْ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ [الزمر: ۲۲] اور نفس کا اعتبار ہی اس وقت ہے جب وہ دار الغرور سے پہلو کشاں ہو، دار الخلو وکی طرف ”راجع“ ہو۔ اور یہی نفس جب حریص ہوگا، دنیا سے سیر نہ ہوگا، تو آدمی کا سب سے بڑا دشمن ہوگا۔ چنانچہ اشیاء میں سے اولیٰ بالاستعاذہ منہ ”نفس“ ہی ہے۔ اور دعا کا قبول ہونا دلیل ہے کہ داعی نے اپنے علم و عمل سے نفع نہیں اٹھایا۔ اس کے دل میں خشوع نہیں، اور نفس سیر نہیں۔ واللہ الهادی الی سواء السبیل وهو حسبنا ونعم الوکیل۔

۲۳۶۵: ورواه الترمذی عن عبد الله بن عمرو و النسائی عنهما۔

ترجمہ: نیز اس روایت کو ترمذی نے حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمروؓ دونوں سے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: عن عبد الله بن عمرو: ”عمرو“ واؤ کے ساتھ ہے۔

پانچ چیزوں سے پناہ پکڑنے کا بیان

۲۳۶۶: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَعَوَّذُ مِنْ خَمْسٍ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَسُوءِ الْعُمْرِ وَفِتْنَةِ الصُّدُورِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔ (رواه ابو داود و النسائی)

اخرجه ابو داؤد ۹۰۱۲ حدیث رقم ۱۵۴۰۔ وابن ماجہ ۱۲۶۳۱۲ حدیث رقم ۳۸۴۴۔ واحمد فی المسند ۲۲۱۔

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ پانچ چیزوں سے پناہ پکڑتے تھے: نامردی اور بخیلی سے اور عمر کی برائی سے۔ یعنی اتنی عمر ہو کہ قوی حواس میں فرق آجائے اور طاعت کی قوت نہ رہے اور سینہ کے فتنے سے یعنی سینے میں برے اخلاق اور برے عقائد جگہ پکڑیں یا حق بات کو قبول نہ کرے اور آزمائشوں کا متحمل نہ ہو ان سے پناہ مانگتے تھے اور عذابِ قبر سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس کو ابو داؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: كان يتعوذ من خمس من الجبن والبخل: زیادت کے منافی نہیں۔

من الجبن والبخل: جبن اور بخل پر کلام ماقبل میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔

قولہ: وسوء العمر وفتنة الصدور: سوء العمر سے مراد سوء الکبر ہے، سوء الکبر کی تفصیل بھی ماقبل میں گزر چکی ہے۔

”فتنة الصدور“ کی متعدد توجیہات کی گئی ہیں: (۱) ان فتنوں سے قساوتِ قلب، حبِ دنیا اور اس جیسے رذائل مراد ہیں۔ (۲) فتنة الصدور سے مراد عقد، عقائد باطلہ اور اخلاقِ سیئہ ہیں۔ (۳) امام طبری فرماتے ہیں: فتنة الصدور سے مراد وہ ”ضیق“ ہے جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا ہے: ﴿ومن یرد ان یرضه یجعل صدره ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء﴾ چنانچہ

فتنة الصدور سے مراد یہ ہے کہ دل اس دار الغرور کی طرف متوجہ ہو جائے کہ جو مؤمن کا قید خانہ ہے۔ اس ”دار الخلود“ سے پہلے تجانی اختیار کرے کہ جو وہ جنت ہے کہ جس کی چوڑائی آسمانوں زمینوں کی طرح ہے متقین کیلئے تیار کی گئی ہے۔ اھ۔ (۴) فتنة الصدور سے مراد اس ”شرح صدر“ کی ضد ہے، کہ جس کا بیان اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿فَمَنْ يَرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ﴾ جب نبی کریم ﷺ سے اس کی علامت پوچھی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”التجافی عن دار الغرور، والانابة الى دار الخلود، والاستعداد للموت قبل نزوله۔“

ذلت اور محتاجی سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۳۶۷: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْقِلَّةِ وَالذَّلَّةِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أَظْلِمَ أَوْ أَظْلَمَ۔ (رواه ابو داود والنسائي)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۹۱/۲ حدیث رقم ۱۵۴۴۔ النسائی ۲۷۱/۸۔ وابن ماجہ ۱۲۶۳/۲ حدیث رقم ۳۸۴۲۔
واحمد فی المسند ۳۰۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں محتاجی سے اور کمی سے اور ذلت سے اور میں پناہ مانگتا ہوں۔ تیرے ساتھ۔ اس کے کہ ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں اس کو ابو داؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللهم انى اعود بك من الفقر: اس کی تفصیل حدیث: ۲۳۵۹ میں ”من شر فتنة الفقر“ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قولہ: والقلة:

”محتاجی“ سے مراد دل کی محتاجی ہے یعنی مال و زرع جمع کرنے کا حریص ہو یا اس سے مراد مال کی محتاجی (افلاس) ہے کہ اس کی وجہ سے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ لہذا حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے محتاجی کے فتنہ سے پناہ مانگی خواہ وہ دل کی محتاجی ہو یا مال کی۔ قلت سے مراد نیکیوں کی قلت (کمی) ہے مال و زر کی قلت مراد نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ تو خود مال و زر میں قلت و کمی رکھتے تھے اور مال کی کثرت و زیادتی کو ناپسند فرماتے تھے یا پھر قلت سے مال کی اتنی قلت مراد ہے کہ وہ قوت لایموت (بقدر بقاء زندگی کی غذا) کے لئے بھی کافی نہ ہو جس کی وجہ سے عبادات میں کوتاہی اور نقصان واقع ہو بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں (صبر کی کمی) مراد ہے

قولہ: والذلة: یعنی اس بات سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں، بایں طور کہ وہ میرے ساتھ استخفاف و حقارت کا معاملہ کریں، اور زیادہ ظاہریہ ہے کہ اس سے وہ ذلت مراد ہے جو کسی معصیت کے نتیجہ میں اٹھانی پڑے۔ یا وہ تذلل ہے جو اپنی مسکنت کے باعث اغنیاء کے ہاں اٹھانا پڑے۔ ”ذلت“ سے مراد گناہوں کے نتیجہ میں ملنے والی ذلت ہے گنہگار اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلیل ہوتا ہے یا پھر مالداروں کی مفلسی یا غربت کی بناء پر ذلیل ہونا مراد ہے۔

قولہ: و اعود بك ان اظلم او اظلم: پہلا ”اظلم“ معروف اور دوسرا ”اظلم“ بصیغہ مجہول ہے۔ ا۔

مرتب عرض کرتا ہے اس جملہ کی تفصیل بھی ماقبل میں گزر چکی ہے۔

نفاق اور برے اخلاق سے پناہ مانگنے کی دعا

۲۴۶۸: وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوءِ الْأَخْلَاقِ - (رواه ابوداؤد والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۹۱۲ حدیث رقم ۱۵۴۶۔ والنسائی ۲۶۶۱۸۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیرے خلاف سے اور نفاق سے اور برے اخلاق سے اس کو ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللہم انی أعوذک من الشقاق:

”خلاف“ سے مراد ہے حق کی مخالفت اور بعض حضرات نے کہا کہ آپس میں اختلاف و عداوت مراد ہے۔ ”نفاق“ سے نفاق کی تمام قسمیں مراد ہیں خواہ عقیدہ میں نفاق ہو یا عمل میں۔ مثلاً دل میں کفر و شرک کی تاریکی رکھنا اور زبان سے اسلام کا اظہار کرنا کسی سے زبان سے تو کچھ کہنا اور دل میں کچھ رکھنا بہت زیادہ جھوٹ بولنا امانت میں خیانت کرنا اور وعدہ کے خلاف کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ارشاد باری تعالیٰ اسی معنی میں ہے: ﴿بل الذین کفروا فی عزة و شقاق﴾ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: الشقاق العداوة ومنه قوله تعالیٰ: ﴿فی عزة و شقاق﴾ طیبیؒ کے اس کلام میں بعد ہے۔ اور ابن حجر کے کلام میں اس سے بھی زیادہ بعد ہے وہ لکھتے ہیں: قبیل فی معنی الشقاق الخلاف والعداوة وفيه نظر لأن المراد بالأول المذموم وبالثانی العداوة لأهل الحق، وحينئذ فهما قول واحد لا قولان اه۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ مخالفت بغیر عداوت کے متصور نہیں ہو سکتی، اور عداوت بغیر مخالفت کے بھی پائی جاتی ہے۔ اور غایت کلام یہ ہے کہ یہاں اہل حق کی عداوت ”اعم“ مراد ہے، خواہ مخالفت صوری موجود ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس کو عداوت لازم نہیں۔ جیسا کہ ابوطالب نبی کریم ﷺ کے مخالف تھے، لیکن ان کو آپ ﷺ سے عداوت نہ تھی، اور نہ صرف عداوت نہ تھی، بلکہ آپ کا دفاع بھی فرماتے، اور حفاظت بھی فرماتے تھے، اور کہا گیا ہے کہ ”خلاف“ کے معنی ہیں ”عداوت“، چونکہ متعادیتین میں سے ہر ایک، ایک شق میں ہوتا ہے، اسی ناحیہ، یا آخرت کی مشقت مراد ہے۔

قولہ: والنفاق: نفاق کے معنی ہیں اسلام ظاہر کرنا اور کفر کو چھپانا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ای: ان تظهر لصاحبك خلاف ما تصبره۔ کہا گیا ہے کہ نفاق عمل میں نمایاں ہوتا ہے، کہ منافق بکثرت جھوٹ بولتا ہے، امانت میں خیانت کرتا ہے، وعدہ خلافی کرتا ہے، اور محاسنت کے وقت فجو رکارت کا بکرتا ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ لام برائے جنس کا ہے۔ چنانچہ جنس کے تمام افراد کو شامل ہے، لہذا بعض اقوال کو بعض اقوال پر ترجیح دینا ایک بے معنی بات ہے، اور دوسرے پر طعن ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے امام طیبیؒ پر کیا ہے، باوجودیکہ ان کا قول تمام اقوال کو شامل ہے۔

قولہ: وسوء الاخلاق: عطف العام علی الخاص کی قبیل سے ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ابتدا میں ذکر کردہ امور اخلاق سیئہ میں عظیم ترین ہیں۔ چونکہ ان کا ضرر ان کے غیر تک پہنچتا ہے۔ (ذکرہ الطیبی)۔ ابن حجرؒ گرفت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: وقضیته ان المراد بها أو صاف النفس المحرمة، كالزنا، والحسد، وحينئذ فليس ذانك أعظمهما بمقتضى ما فسرهما به مما ردتہ، فالوجه أن يراد بها كل خلق ذمه الشرع، وان لم يحرم ككثرة الأكل والنوم، وحينئذ فلا اشعار فيه بما ذكرنا على أنا نمنع كون ذينك أعظمهما، بل من الأخلاق الذميمة ما هو أعظم من ذينك كالحسد والجبروت الذي ينشأ عنه قتل النفس، وهتك الأعراض بنحو الزنا والقذف والأموال بحو السرقة۔

میں کہتا ہوں، سبحان اللہ! اس سے مراد اوصاف نفس محرفہ ہیں۔ مطلق اخلاق ذمیرہ مراد نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہنا، کالزنا۔ یہ تو نطقاً فاحش ہے۔ چونکہ ”زنا“ افعال میں سے ہے، نا کہ اخلاق میں سے۔ اور اسی طرح کثرت اکل و نوم۔ یوں لگتا ہے کہ ابن حجر نے کتب اخلاق میں سے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اگر ان کو کچھ پتہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ افعال محرمہ اور مکروہ سارے کے سارے اخلاق مذمومہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ افعال ذمیرہ ان ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً قتل نفس، لوگوں کے اموال لوٹنا، ہنک اعراض، بلکہ تمام اخلاق مذمومہ بھی اسی کی پیداوار ہیں۔ جیسا کہ حسد و جروت وغیرہ۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لا یؤمن أحدکم حتی یحب لآخیه ما یحب لنفسه۔ امام شافعیؒ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقل صادقاً لولا الوئام وروحہ لطاح الأنام الكل فی الخلف والقلی

اس مشہور مثل: لولا الوئام لهلك الانام کی طرف اشارہ ہے۔ خاص و عام میں اس کا عام مشاہدہ ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل حق اہل خانہ اور اقارب کو اذیت پہنچائی جائے، سخت کلامی سے پیش آیا جائے، ان سے درگزر نہ کی جائے، اور جب ان سے خطا ہو جائے تو عفو کا دامن چھوٹ جائے۔

بھوک اور خیانت سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۳۶۹: وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُوعِ فَإِنَّهُ بِنَسِ الضَّجِيعِ

وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ فَإِنَّهَا بِنَسِ الْبَطَانَةِ. (رواه ابو داود والنسائی وابن ماجه)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۹۱۱/۲ حدیث رقم ۱۰۴۷۔ وابن ماجه ۱۱۱۳/۲ حدیث رقم ۲۳۵۴۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے بھوک سے۔ پس تحقیق وہ بری ہے ہم خواب سے اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ خیانت سے۔ پس تحقیق وہ اندر کی بری خصلت ہے اس کو ابو داؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ نے۔

تشریح: قوله: اللهم انى اعوذ بك من الجوع فانه بنس الضجيع: معدے کے غذا سے خالی ہونے کے وقت

جانداروں کو محسوس ہونے والے الم کو جوع کہتے ہیں۔ کبھی بھوک کی وجہ سے مرض جنم لیتا ہے اور کبھی بھوک کی وجہ سے موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

بھوک سے اس لئے پناہ مانگی کہ اس کی وجہ سے انسان کے بدن، قویٰ اور حواس میں کمزوری ہو جاتی ہے اور اس کا اثر عبادت میں نقصان اور حضوری میں خلل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لہذا بدترین بھوک وہی ہے جو نقصان و خلل کا باعث بنے اور اکثر ہو جب کہ وہ بھوک جو ریاضت و مجاہدہ کے مقصد سے بطریق اعتدال اور اپنی حالت کے موافق ہو بدترین نہیں ہے بلکہ وہ باطن کی صفائی دل کی نورانیت اور بیماریوں سے بدن کی صحت و سلامتی کا سبب ہے۔

اس حدیث سے اس مسئلہ پر بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ جوع مجرد میں کوئی ثواب نہیں۔

قوله: أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ: خیانت ضد ہے ”امانة“ کی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: الخيانة هي مخالفة الحق بنقض العهد

فی السر۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ خیانت تمام ”تکالیف شرعیہ“ کو شامل ہے، جیسا کہ یہ آیت کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے: ﴿إِنَّا

عَرَضْنَا الْإِمَانَةَ عَلَى الْآحْزَابِ [۷۲] اور اسی طرح یہ آیت: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ﴾

خیانت کی تمام اقسام کو شامل ہے۔

قولہ: فانها بنسبت البطانة: باطنی خصلت کو کہتے ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: البطانة، ضد ہے الظہارة کی یہ اصل میں کپڑے کو کہا جاتا ہے، چنانچہ پھر انسان کے باطنی احوال کیلئے بطور استعارہ استعمال ہونے لگا۔ اس کے اور بھی مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) قیل: أى بنس الشئ الذى يستطيعه من أمره ويجعله بطانة حاله۔ (۲) فى المغرب: بطانة الشئ أهله أو خاصته، مستعارة من بطانة الثوب۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ”جوع“، ”کو“ ضجیح“، ”قرار دیا، اور“ ”خیانہ“، ”کو“ ”بطانہ“، ”قرار دیا ہے چونکہ ان کے درمیان ایسی ہی ملاہست ہے، جیسے کہ انسان کو اس کا صبیح اپنا بطانہ اوڑھاتا ہے۔

کوڑھ اور جذام اور دیوانگی سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۴۷۰. وَعَنْ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُدَامِ وَالْجُنُونِ وَمِنْ سَيِّءِ الْأَسْقَامِ. (رواه ابوداؤد والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۹۳۱۲ حدیث رقم ۱۰۵۴۔ واحمد فى المسند ۱۹۲۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے اے الہی تحقیق میں تیری پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ کوڑھ اور جذام سے اور دیوانگی سے اور بری بیماریوں سے اس کو ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللهم انى اعوذ بك من البرص والجذام والجنون: ”برص“، مشہور مرض ہے۔ الجذام: جیم کے ضمہ کے ساتھ، یہ ایک بیماری ہے کہ جس کے سبب سے اعضاء کے بال جھڑ جاتے ہیں، قاموس میں لکھتے ہیں: جذام بروزن غراب، ایک بیماری ہے، جو سارے جسم میں سوداء کے پھیل جانے کے سبب ہوتی ہے، چنانچہ اعضاء انسانی کا مزاج اور ان کی ہیئت بگڑ جاتی ہے۔ اور بعض مرتبہ اس قدر بڑھتی ہے کہ اعضاء کو کھا جاتی ہے۔ الجنون: زوال عقل کو کہتے ہیں۔

قولہ: سبب الاسقام: (بری بیماریوں) کا ذکر تعیم بعد تخصیص کے طور پر ہے یعنی پہلے تو آپ ﷺ نے خاص طور پر چند بری بیماریوں کا نام لیتے ہوئے پناہ مانگی ہے۔ پھر عام طور پر ہر بری بیماری مثلاً استسقاء اور دق وغیرہ سے پناہ مانگی۔ ان بیماریوں سے آپ ﷺ نے پناہ اس لئے مانگی کہ جس شخص کو ان میں سے کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے اکثر لوگ اس سے گھبراتے ہیں اور اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ نیز برص اور کوڑھ تو ایسے مرض ہیں جن کی وجہ سے مریض کا جسم بدہمتی اور بدنمائی کا شکار ہو جاتا ہے اس طرح وہ جسم کے معاملہ میں اپنے ہی جیسے انسانوں کی صف سے باہر ہو جاتا ہے پھر یہ کہ مرض ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ جاتے ہیں جو کبھی اچھے نہیں ہوتے برخلاف اور امراض کے مثلاً بخار سرد وغیرہ کا یہ حال نہیں ہوتا ان میں تکلیف بھی کم ہوتی ہے اور ثواب بھی بہت ملتا ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو مرض ایسا ہو کہ لوگ مریض سے احتراز کرتے ہوں نہ خود مریض دوسروں سے منقطع ہو سکتا ہو اور نہ دوسرے اس سے کوئی فائدہ حاصل کر سکتے ہوں اور مریض اس مرض کی وجہ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے عاجز ہو جاتا ہو تو اس مرض سے پناہ مانگنی مستحب ہے۔

علماء کا خیال ہے کہ کوڑھ اور جذام بالطبع متعدی نہیں ہیں یعنی مرض کسی کو از خود نہیں لگتے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوڑھیوں کے بدن سے اپنا بدن لگانے کی وجہ سے جذامی کی پیپ لگ کر یہ بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اور اضافت بمعنی من نہیں، بلکہ اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کی قبیل سے ہے۔ ان امراض کو ان کی طبیعت کے اعتبار سے متعدی کہنا غلط ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے: فمن أعضی الأول۔ اور دوسری جگہ فرمایا: لا عدوی۔ ای بطبع المعدی: اس خبر صحیح کے

معارض نہیں: وفر من المجزوم فرارك من الأسد، کہ یہ بیان جواز پر محمول ہے، یا یہ اس لئے فرمایا تاکہ مخلوق خدا میں سے کوئی اس میں مبتلا نہ ہو، تاکہ اعداء بالطبع کی طرف منسوب نہ کی جائے۔ اور فساد عقیدہ میں مبتلا نہ ہو جائے کہ غیر اللہ بھی موثر ہے، نبی کریم ﷺ نے دونوں پر عمل کیا ہے، جو درحقیقت اس حدیث سے ناشی اشکال کا جواب ہیں۔ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک مجزوم شخص آیا، تو آپ نے یہ دعا پڑھ کر اس کے ساتھ کھانا تناول فرمایا: بِسْمِ اللّٰهِ ثِقَّةٌ بِاللّٰهِ وَتَوَكَّلَا عَلَيْهِ۔ ایک اور مجزوم بیعت کیلئے آیا تو آپ ﷺ نے اس کی طرف اپنا دست اقدس نہیں بڑھایا اور فرمایا: قَدْ بَايَعْتَ۔ چنانچہ پہلے واقعہ میں آپ ﷺ کی نظر ”مستب“ پر تھی، اور دوسرے واقعہ میں آپ ﷺ کی نظر سب پر تھی، فرق بھی فرمایا اور وضاحت بھی فرمادی کہ یہ دونوں معاملات برحق ہیں، جس شخص پر توکل کا غلبہ ہو، یا وہ مقام جمع پر فائز ہو۔ اس کیلئے پہلا عمل افضل ہے۔ اور دیگر افراد کیلئے دوسرا عمل افضل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

برے عملوں اور اخلاقِ سیئہ سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۴۷۱: وَعَنْ قُطَيْبَةَ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ

وَالْأَعْمَالِ وَالْأَهْوَاءِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۷۵۰ الحدیث رقم ۳۵۹۱۔

ترجمہ: حضرت قطیبہ بن مالک سے روایت ہے کہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الہی تحقیق میں پناہ پکڑتا ہوں برے خلقوں سے اور برے عملوں سے اور بری خواہشوں سے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

قطیبہ بن مالک۔ یہ قطبہ ”مالک“ کے بیٹے ہیں۔ خاندانی اعتبار سے ”بنو ثعلب“ میں سے ہیں۔ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ”ذیبانی“ ہیں۔ یہ صحابی ہیں۔ ان سے ان کے برادر زادہ زیادہ بن علاقہ نے روایت کی۔ ”قطبہ“ قاف کے ضمہ طاء کے سکون اور بائے موحدہ کے فتح کے ساتھ ہے۔

تشریح: قولہ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ:

”منکر“ اسے کہتے ہیں کہ جسے شریعت نے بھلائی میں شمار نہ کیا ہو یا شریعت نے جس کی برائی بیان کی ہو۔

”اخلاق“ سے مراد باطنی اعمال ہیں لہذا منکر الاخلاق سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں دل کے برے اعمال سے مثلاً حسد و کینہ وغیرہ سے۔

قولہ: وَالْأَعْمَالِ وَالْأَهْوَاءِ: ”برے اعمال سے“ مراد ظاہری برے افعال ہیں اور بری خواہشات سے مراد برے عقائد اور غلط

افکار و نظریات ہیں۔

ہوی کی جمع ہے، ہوی یہوی کا مصدر ہے۔

مشتہی کو بھی ہوی کہا جاتا ہے، خواہ محمود ہو کہ مذموم، لیکن غالب احوال میں ہوی کا اطلاق غیر محمود پر ہوتا ہے (کذا فی المغرب) امام طبری فرماتے ہیں: پہلے دو میں اضافت الصفہ الی الموصوف ہے، اریسیرے میں اضافت بیانہ ہے، چونکہ ”اهواء“ ہوتی ہی منکر ہیں اھ۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان تینوں میں ایک ہی طرح کی اضافت ہے۔ اور ”ہوی“ کو اس کے لغوی معنی پر محمول کیا جائے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَغِيرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ﴾ چنانچہ اسی وجہ سے کہا گیا ہے:

الہوی اذا وافق الہدی یكون كالزبدۃ مع العسل۔ یعنی جب کسی عمل میں یہ دونوں جمع ہوں تو وہ بیٹھا ہو جاتا ہے، شاذلی فرماتے ہیں: اذا شربت الحلو البارد أحمد ربی من وسط قلبی۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: اللہم اجعل حبک أحب الیّ من حب الماء البارد۔ یا یہ کہ من چاہے عقائد مراد ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَفَرَأیتَ من اتخذ الہمہ ہواہ﴾ [الحانبہ: ۲۳] پس ”اھواء“ سے مراد مطلق اعتقادات و عقائد ہیں، اور المنکرات الٰہویۃ سے مراد اعتقادات فاسدہ ہیں، یعنی وہ عقائد جو اہل السنۃ والجماعۃ کے دوائمہ ابوالحسن اشعری، اور ابو منصور ماتریدی کے عقائد کے مخالف ہوں۔

توضیح: حصن کی روایت میں ”والادواء“ کا اضافہ ہے، یہ ”داء“ کی جمع ہے، اور ”سعی الاسقام“ کے معنی میں ہے۔ میرک حافیہ حصن میں لکھتے ہیں: جان لیجئے کہ صاحب السلام کے کلام سے یوں مفہوم ہوتا ہے کہ ”والادواء“ کا اضافہ مستدرک حاکم کی روایت میں ہے، نا کہ ترمذی شریف کی روایت میں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”والاھواء“ یہ روایت ترمذی، حاکم اور ابن حبان کی صحیح کی ہے، اور حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے، علی شرط مسلم ہے، اور آخر میں ”والادواء“ کا اضافہ کیا ہے، اور بعض روایات میں ”والآراء“ ہے، یہ الفاظ ترمذی کے ہیں: فتأمل منه واللہ أعلم اھ۔ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ترمذی کی متعدد روایات ہیں، اور متعدد طرق ہیں، اس سے اشکال زائل ہو جاتا ہے۔

جامع دعا

۲۴۷۲ بشتیر بن شکیل بن حمید عن ابیہ قال قلت یا نبی اللہ علی منی تعویذا اتعوذ بہ قال قل اللہم انی اعوذ بک من شر سمعی وشر بصری وشر لسانی وشر قلبی وشر منی۔

(رواہ ابو داؤد و الترمذی و النسائی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۹۲/۲ حدیث رقم ۱۵۵۱۔ و احمد فی المسند ۴۲۹/۳۔

ترجمہ: حضرت شتیر بن شکیل بن حمید سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ اے اللہ کے نبی ﷺ مجھ کو ایک تعویذ سکھاؤ۔ یعنی دعا کہ اس کے ساتھ پناہ پکڑوں فرمایا کہو اے الٰہی تحقیق میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی بری شنوائی سے یعنی برا کلام نہ سنوں اور اپنی بینائی کی برائی سے یعنی بری چیز اس سے نہ دیکھوں اور اپنی زبان کی برائی یعنی برے کلام اور بے فائدہ اس کے نہ کروں اور اپنے دل کی برائی سے۔ یعنی برے عقیدے اور حسد و کینہ وغیرہ دل میں نہ رکھوں اور برے کام پر مصمم (یعنی مضبوط ارادہ نہ کروں) اور اپنی منی کی برائی سے یعنی زنا میں صرف نہ ہو اور شہوت کی نظر سے کسی کو نہ دیکھوں۔ اس کو ابو داؤد و ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

شکل بن حمید۔ یہ شکل بن حمید عیسیٰ ہیں۔ ان کو شرف صحابیت حاصل ہے۔ ان سے ان کے بیٹے ”شتیر“ کے علاوہ اور کوئی روایت نہیں کرتا۔ ان کا شمار کوفیوں میں ہوتا ہے۔ ”شکل“، شین و کاف کے زبر اور لام کے ساتھ ہے۔ ”شتیر“، شتر کی تصغیر ہے۔ ”شکل“، بروزن ”قمر“ ہے اور ”حمید“ بصیغہ تصغیر ہے۔

تشریح: قولہ علی منی تعویذا: امام طیبی فرماتے ہیں: عوذ، معاذ اور تعویذ تینوں ہم معنی ہیں۔

قولہ اللہم انی اعوذ بک من شر سمعی..... شر منی:

”شر منی“ بعض علماء نے فرمایا: المنی، منیہ کی جمع ہے، منیہ کے معنی ”طول الأمل“ ہیں۔ میں کہتا ہوں بظاہر یہ صحیح نہیں ہے، چونکہ منیہ شیم کے فتح کے ساتھ بمعنی موت ہے، اور ”منی“ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مہم کے ضمہ اور کرہ کے ساتھ بمعنی اُمیہ آتا ہے، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں: اور کہا گیا ہے کہ منیہ کی جمع ہے۔ اُمی من شر الموت اُمی قبض روحہ علی عمل قبیح۔ اور اس پر اشکال یہ ہے کہ متکلم واحد کے اعتبار سے کئی اموات کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔

زہریلے جانوروں اور اچانک ہلاک کر دینے والی چیزوں سے پناہ پکڑنا

۲۴۷۳: وَعَنْ أَبِي الْبَسْرِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَدْعُو اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَدْمِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ التَّرْدِي وَ مِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالْهَرَمِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ يَتَخَبَّطَنِي الشَّيْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أَمُوتَ فِي سَبِيلِكَ مُدْبِرًا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أَمُوتَ لَدَيْغًا -

(رواہ ابوداؤد والنسائی وزاد فی روایۃ احری والغم)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۹۲/۲ حدیث رقم ۱۰۵۲۔ واحمد فی المسند ۴۲۶/۳۔

ترجمہ: حضرت ابو بصرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگا کرتے تھے کہ اے الہی! تحقیق میں تجھ سے مکان کے گرنے سے پناہ مانگتا ہوں یعنی مجھ پر دیوار یا مکان نہ گر پڑے کہ ہلاک ہو جاؤں اور میں تجھ سے بلند جگہ سے گرنے سے پناہ مانگتا ہوں اور ڈوبنے سے اور جلنے سے اور بہت زیادہ بڑھاپے سے پناہ مانگتا ہوں اور میں تیرے ساتھ اس سے کہ شیطان مجھ کو مرنے کے وقت حیران کر پناہ مانگتا ہوں۔ مرنے کے وقت یعنی وسوسے ڈالے اور دین کو تباہ کر دے اس سے پناہ مانگتا ہوں اور میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے کہ راستے میں پشت دکھا کر مروں یعنی جہاد میں کفار سے بھاگ کر اور میں تجھ سے سانپ، بچھو اور ان کی مانند زہریلے جانور کے کاٹنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس کو ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے اور نسائی نے ایک روایت میں غم کا لفظ زیادہ کیا ہے یعنی میں تیرے ساتھ غم سے پناہ مانگتا ہوں۔

راوی حدیث:

ابو البسر۔ یہ ابو البسر (یاء پر فتح اور اس کے نیچے دو نقطے اور سین مہملہ پر فتح ہے) ان کا نام ”کعب“ ہے اور یہ ”عمرو“ کے بیٹے ہیں۔ ان کا ذکر حرف کاف میں آچکا ہے۔

کعب بن عمرو۔ یہ ”کعب“ ہیں جو ”عمرو“ کے بیٹے ہیں انصاری اور ”بنو سلیم“ میں سے ہیں۔ بیعت عقبہ اور غزوہ بدر میں موجود تھے۔ انہوں نے جنگ بدر میں ”عباس رضی اللہ عنہ“ بن عبدالمطلب کو گرفتار کیا تھا۔ ۵۵ھ میں بمقام مدینہ طیبہ انتقال فرمایا۔ اس سے ان کے بیٹے عمار اور حنظلہ بن قیس نے حدیث روایت کی۔

تشریح: قوله: اللهم انى اعوذ بك من الهدم: ”الهدم“ دال کے سکون کے ساتھ، عمارت کا گر جانا، اور دال کے فتح کے ساتھ، اسم (ذکرہ الطیبی) ابن جریر نے اتنا اضافہ کیا ہے: اُمی المهدوم۔ لیکن یہ تشریح درست نہیں، چونکہ استعاذہ ”مہدوم“ سے نہیں بلکہ ”ہدم“ سے اور بوقت ہدم منفصل ہونے والی شے سے ہے۔

قوله: واعوذ بك من التردى والغرق والحرق والهزم: ”تردی“ کے معنی ہیں کسی اونچی جگہ سے گر جانا، مثلاً پہاڑ، اور چھت وغیرہ، کسی چٹائی جگہ میں گر پڑنے پر بھی تردی کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً کنویں وغیرہ میں گر جانا۔

”الغرق“ بروز قلم، غرق، غرقا، کا مصدر ہے۔ ”الحرق“: بروز قلم۔

اگرچہ یہ اشکال پیدا ہو کہ حدیث میں مذکورہ چیزیں بعض تو ایسی ہیں جن کے سبب سے موت واقع ہو جانے کی صورت میں شہادت کا درجہ ملتا ہے پھر آنحضرت ﷺ نے ان سے پناہ کیوں مانگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مصیبت و تکلیف اور پریشانیوں کا گویا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے نازک اور سخت موقع پر کوئی صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور شیطان کو موقع مل جائے اور وہ بہکا کر دینی و اخروی سعادتوں کو ملیا میٹ کر دے اس لئے آپ ﷺ نے ان سے بھی پناہ مانگی تاکہ امت کے لوگ ان چیزوں سے پناہ مانگیں۔

اور کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان چیزوں سے شاید اس لئے پناہ مانگی کہ یہ امور ظاہر کے اعتبار سے امراض، مصائب و بلا یا ہیں، ان امراض سابقہ کی طرح کہ جن کا ذکر کچھ اہل احادیث میں گزرا۔ اور ان پر شہادت کا ثواب ملنا، اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عبد مؤمن کو پہنچنے والی ہر تکلیف حتیٰ کہ کاٹنا چھینے پر بھی ثواب عنایت فرماتے ہیں۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود ”عافیت“ زیادہ وسیع ہے۔ دوسری بات یہ ہے شہادت ہقیقہ اور ان امور میں فرق ہے، بایں طور کہ شہادت حقیقی ہر مؤمن کا مطلوب و مقصود ہے۔ بلکہ بعض مرتبہ تو شہادت کی تمنا اور اس کیلئے جرأت دکھانا واجب ہوتا ہے۔ بخلاف تردی وغیرہ کے، اس جیسے امور سے احتراز واجب ہے، اور ان امور میں اگر سعی کرتا ہے تو عاصی ہوگا۔

والہرم: زیادہ بڑھاپے سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے کی برائی سے کہ حواس و قوی میں فرق آجائے بیہودہ ولا یعنی کلام زبان سے نکلنے لگیں اور عبادت میں فتور آجائے ان سے پناہ مانگتا ہوں، منقول ہے کہ جو شخص کلام اللہ یاد کر لیتا ہے وہ ان آفات سے محفوظ رہتا ہے۔

واضح رہے کہ والہرم کے الفاظ تمام نسخ صحیحہ میں موجود ہیں۔ چنانچہ ابن حجر کا کہنا: وفي نسخة: الہرم بے موقع محل ہے۔

وقوله: وأعوذ بك من ان يتخبطني الشيطان عند الموت: شيطان سے مراد ابلیس، یا اس کے احوان و مددگار مراد ہیں۔ کہا گیا ہے کہ تجھ سے مراد ”افساد“ ہے، یعنی عقل و دین کا فساد مراد ہے۔ اور عند الموت کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ مدار خاتمہ پر ہے۔ قاضی فرماتے ہیں: تجھ سے مراد نزعات شیطانی ہیں، یعنی اے اللہ میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ شیطان مجھے و غلائے۔ جس سے میرے قدم بھسل جائیں، اور عقل و وہم پھٹ جائیں۔ تجھ سے اصل معنی ہیں: ان يضرب البعير الشبيء بخف يدہ فيسقط۔

وقوله: وأعوذ بك من ان اموت في سبيلك مدبرا: مدبر کے تین مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) مدبر سے مراد مراد ہے۔ (۲) مدبرا عن ذكرك و مقبلا علی غیرك۔ (۳) امام طبری فرماتے ہیں: مدبرا ای فارا۔ ابن حجر امام طبری کی اتباع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ادبارا محرما او مطلقا۔ اس پر اشکال ہے وہ یہ کہ یہاں موت کی قید مناسب نہیں۔ الایہ کہ یوں کہا جائے ”تائب“ کو نکالنا مقصود ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ دعا درحقیقت اپنی امت کیلئے تعلیم ہے، وگرنہ تو رسول اللہ ﷺ کیلئے تجھ، فرار من الزحف، اور امراض مزمنہ جائز نہیں۔

وقوله: وأعوذ بك من ان اموت لديغا: فعلیل بمعنى مفعول ہے، ”لدغ“ سے ماخوذ ہے، زہریلی چیزوں سانپ، بچھو وغیرہ کے ڈسے کیلئے ”لدغ“ کا لفظ بولا جاتا ہے، اس حدیث مبارکہ کا یہ جملہ طبرانی کی اس روایت کے منافی نہیں: عن علی كرم الله وجه، أنه لدغت النبي ﷺ عقرب وهو يصلي، فلما فرغ قال: لعن الله العقرب لا تدع مصليا ولا غيره۔ ثم دعا بماء وملح فجعل يمسح عليها أي اعلى موضع لدغها، وقرأ: ﴿قل يا أيها الكافرون﴾ و﴿قل أعوذ برب الفلق﴾ و﴿قل أعوذ

برب الناس ﴿﴾۔

وقوله: وزاد فی روایة اخرى: والغم: اس کی وضاحت میں تین اقوال ہیں۔ (۱) الهم الشديد الذى یغم نفس النفس۔ (۲) هم الدنيا۔ (۳) مطلق الهم۔ پس حاصل یہ ہے کہ توکل، تفویض و تسلیم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، یہی سلامتی کا راستہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۴۷۳: وَعَنْ مُعَاذٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنْ طَمَعٍ يَهْدِي إِلَى طَمَعٍ۔

(رواه احمد البيهقي فى الدعوات الكبير)

اخرجه احمد فى المسند ۲۳۲/۵۔

ترجمہ: حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں طمع سے کہ وہ تم کو طمع تک پہنچادے۔ اس کو احمد اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔

تشریح: وقوله: واستعيذ بالله من طمع يهدى الى طمع: "طمع" کے معنی ہیں: نزوع النفس الى الشيء شهوة له۔ "یهدى" اى يدنى ويوصل۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ہدایت کے معنی ہیں کسی شی کی طرف راہنمائی اور دلالت کرنا، پھر یہ لفظ توسعا، ادناء من الشيء والايصال اليه، ابن حجر نے فرمایا: لفظ ہدایت جو دلالت علی الخیر، اور ایصال الی الخیر کے معنی میں مستعمل ہے اس کے یہ معنی بیان کرنا "تہجم" ہے۔ میرے نزدیک زیادہ واضح یہ ہے کہ لفظ "ہدایہ" یہاں "دلالت" کے معنی میں ہے، جیسا کہ طیبی نے نقل کیا ہے اور تجربید کے معنی یہی ہیں، جیسا کہ ابن حجر نے نقل کیا۔ لفظ "ہدایہ" کبھی متعدی بنفسہ ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں: ﴿اهدنا الصراط المستقیم﴾ کبھی لام کے ذریعہ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے: ﴿ان هذا القرآن لهدى للنبي هي اقوم﴾ اور کبھی بواسطہ الی مستعمل ہوتا ہے، جیسے: ﴿وانك لتهدى الى صراط مستقیم﴾ چنانچہ اس کو بمعنی الادناء، یا الايصال ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔

"طمع" کے معنی ہیں مخلوق خدا سے مال و زر کی امید رکھنا اور طمع کے اصل معنی تو ہیں تلوار کو زنگ لگنا، لیکن یہاں اس لفظ سے مراد "عیب" ہے لہذا حدیث بالا کے مطابق "طمع" سے پناہ مانگنے کا مفہوم یہ ہے کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں طمع سے جو مجھے اس مقام پر پہنچا دے جہاں میری زندگی عیب دار ہو جائے اور وہ عیب ہے اہل دنیا کے سامنے تواضع و اعساری اختیار کرنا، کم ظرف، پست خیال اور بد کردار دنیا داروں کے آگے اپنے آپ کو ذلیل کرنا، سب ور یا (کسی بھی کام کے وقت دکھانے سنانے کے جذبہ) کو ظاہر کرنا، سرمایہ داروں کی بے جا تعریف و مدح اور ان کی چالپوسی میں مبتلا ہونا اور اسی قسم کی وہ ذلیل حرکتیں جو طمع کی حالت میں صادر ہوتی ہیں۔

حاصل یہ کہ طمع سے اجتناب ضروری ہے کیونکہ یہی وہ حقیر جذبہ ہے جو انسان کی عزت نفس، خودداری اور ضمیر کے شرف و وقار کے لئے بہت بڑا عیب ہے جس کی وجہ سے انسان نہ صرف دنیاوی طور پر ذلیل و حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے بلکہ دینی طور پر بھی اس کی روح کی بالیدگی اور پاکیزگی کے لئے ایک ناسور سے کم نہیں ہے جو آہستہ آہستہ دین کے تمام گوشوں میں مختلف طریقوں سے زہر کی آمیزش کرتا رہتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ طمع دین کے فساد کی جڑ ہے اور ورع (پرہیزگاری) دین کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔

حضرت شیخ علی متقی فرماتے ہیں کہ "طمع" اسے کہتے ہیں کہ اس مال کی امید رکھی جائے جس کے حاصل ہونے میں شک ہو اگر اس کے حصول کا یقین ہو جیسے کسی پر کوئی حق ہو یا کسی کا وعدہ صادق ہو اور یا کسی سے اتنی راسخ محبت ہو کہ وہ اس کی ہر خواہش کی تکمیل ضرور کرتا

ہو تو اسی صورت میں اس سے توقع رکھنے کو طبع نہیں کہتے۔

ابن حجر نے عجیب سی بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں: الطمع هو أخذ المال من غير حقه أو امساكه عن حقه بخلافه۔ طبع کے معنی ”عیب“ کے ہیں، اور اصل کے اعتبار سے طبع، سیف کے عرض پر موجود ”دس“ کو کہتے ہیں، پھر یہ لفظ گناہوں کی مانند ”دس“ کیلئے استعمال ہونے لگا۔

چاند کے غروب ہونے سے پناہ پکڑنا

۲۳۷۵: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَظَرَ إِلَى الْقَمَرِ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ اسْتَعِيدِي بِاللَّهِ مِنْ شَرِّ هَذَا فَإِنَّ هَذَا هُوَ الْغَاسِقُ إِذَا وَقَبَ - (رواه الترمذی)

اخرجه احمد في المسند ۲۱۵/۶۔ و الترمذی فی السنن ۴۲۱/۵ حدیث رقم ۳۳۶۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ نے چاند کی طرف دیکھا پس فرمایا اے عائشہ! تو اللہ تعالیٰ سے پناہ پکڑ۔ اس کی برائی سے پس تحقیق یہ غاسق ہے اندھیرا کرنے والا ہے جب بے نور ہو جائے۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: نظر الى القمر..... الغاسق: غسق يغسق غسقاً وغسوقاً، ازباب ضرب، اذا اظلم، یعنی رات کا

تاریک ہونا غاسق سے کیا مراد ہے؟ قيل: الغاسق هو الليل اذا غاب الشفق وقوى ظلامه۔ ابن الملک فرماتے ہیں: (من شر هذا) مراد ”شر الیل“ ہے، چونکہ رات ہلاکت کے اعتبار سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس سے استعاذہ کا حکم آیا ہے، چونکہ اس وقت میں ”شر“ دیگر اوقات کے مقابلہ میں زیادہ پھیلتا ہے، مثلاً قتل نفس، بدکاری، اور لوٹ مار وغیرہ۔ یہ اس آیت کی تفسیر ہے، اور جہاں تک تعلق ہے حدیث کا تو وہ بھی اسی پر موقوف ہے، تاکہ حدیث آیت کے ایسے معنی کے موافق ہو جائے کہ جو معنی اکثر مفسرین نے اختیار کئے ہیں، چونکہ نظر الى القمر سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ آپ ﷺ کی مراد بھی چاند ہو۔

”هذا هو الغاسق“ اس میں احتمال ہے کہ اشارہ ”ظلام“ کی طرف ہو، بایں طور کہ وہ اوٹ میں چلا گیا ہے، اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہاں غاسق کا اطلاق قمر پر اس لئے کیا ہے: لانه يظلم اذا خسف، اور ”قوب قمر“ سے مراد اس کا دخول فی الخوف ہے۔

چنانچہ حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا مطلب یہ ہوا: استعیدی باللہ من الآفات والبلیات: امام طیبی فرماتے ہیں:

قرآن مجید کی سورت غاسق اذا وقب کا بھی ذکر ہے یعنی پناہ مانگو اندھیرا پھیلانے والے کی برائی سے جب وہ بے نور ہو جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی نے غاسق اذا وقب کی وضاحت فرمائی کہ اس سے مراد چاند ہے جب وہ گہن میں آجاتا ہے لہذا اس سے پناہ مانگنے کا سبب یہ ہے کہ اس کا گرہن میں آنا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ یہ بلاؤں کے نازل ہونے کا اشارہ دیتا ہے چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ جب چاند کو گرہن لگتا تو اس وقت آنحضرت ﷺ لرزاں و ترساں اٹھ کھڑے ہوتے۔

لیکن اتنی بات ذہن نشین رہے کہ ”بلاؤں کے نازل ہونے سے“ وہ بلائیں اور حادثات مراد نہیں جو منجم یا بد عقیدہ لوگ کسوف و خسوف (چاند سورج کے گرہن لگنے) کے سلسلہ میں بتاتے ہیں کیونکہ اہل اسلام کے نزدیک ان کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اس سے مراد عبرت کے مواقع ہیں۔ مثلاً جب چاند گرہن میں آتا ہے تو وہ ایک بڑے عبرت کا وقت ہوتا ہے جو ہر انسان کو احساس دلاتا ہے کہ جب چاند باوجود اپنی اس نورانیت کے اپنے نور کو کھو چکا ہے اور اس کو اپنے نور کی بقاء پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہے تو ایسا نہ ہو کہ میرے ایمان اور میرے عمل کا نور بھی جاتا رہے اسی اعتبار سے اس سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اسم اشارہ استعمال ہوا ہے، اور اسم اشارہ تعین کے اعتبار سے ایسا ہے جیسا کہ وضع ید۔ اسم اشارہ اور اس کی خبر معرف کے درمیان ضمیر فصل کا لانا دلالت کرتا ہے کہ مشار الیہ ”قمر“ ہی ہے، کوئی اور چیز نہیں، میں کہتا ہوں: کبھی یہ اسلوب ادعا اور ارادہ مبالغہ اور قصد تخصیص کیلئے بھی اختیار کیا جاتا ہے، یہ بتانے کیلئے کہ یہ اپنی نوع کے اعظم افراد میں سے ہے، اور اس سے کتاب و سنت میں جمع بھی ہو جائے گا، اور ان کے اس قول کا جواب بھی ہو جائے گا: وتفسیر الفاسق باللیل یا باہ سیاق الحدیث کل الابیاء۔ ان کے اس قول: اور چونکہ رات کا داخل ہونا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں اپنے بندوں پر اس نعمت کو جتلا یا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿جعل لکم اللیل تسکنوا فیہ﴾ (۲) ﴿فلما جن علیہ اللیل رأی کو کبا﴾۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری آیت میں تو کوئی چیز نہیں ہے جو اتنا ن پر دلالت کرے۔ یہاں پہلی آیت ضرور دال ہے، اس میں کسی کو بھی شک نہیں۔ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿وجعلنا نومکم سباتا وجعلنا اللیل لباسا وجعلنا النهار معاشا﴾ لیکن اس کے نعمت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ناراضگی کو متضمن نہیں۔ اسی لئے اللہ جل شانہ نے سورت کے آغاز میں ہی فرما دیا: ﴿قل أعوذ برب الفلق من شر ما خلق﴾ پہلے یہ اندازِ تعیم اختیار فرمایا۔ پھر اگلی آیات: ﴿من شر غاسق اذا وقب﴾ میں اسلوب تخصیص اپنایا۔ ابن عباس اور مفسرین کی ایک جماعت کی طرف منسوب ہے کہ اس آیت کا مطلب ہے: من شر الذکر اذا قام۔ (آلہ تناسل کا حرکت میں آنا) تو گویا کہ ظلمت نفسانی کی طرف اشارہ فرمایا کہ کبھی یہ معصیت کے ان گٹھائوپ اندھیروں کی طرف دھکیل دیتی ہے کہ جہاں ایمان و معرفت کا نور کامل سلب ہو جاتا ہے، اور قبر کے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہے، بلکہ قیامت کے ایسے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہے کہ جن اندھیروں پر کئی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں، ابن جریر نے اس موقع پر کلام میں اظہار سے کام لیا ہے، نیز ان کے کلام میں تعارض و تدافع ہے، اس لئے میں ان کے کلام کو ذکر کرنے سے اعراض کر رہا ہوں۔

مختصر اور جامع دعا کا بیان

۲۴۷۶: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَا بِيَّ يَا حُصَيْنُ كَمْ تَعْبُدُ الْيَوْمَ الْهَاءَ قَالَ أَبِي سَبْعَةً سِتًّا فِي الْأَرْضِ وَوَاحِدًا فِي السَّمَاءِ قَالَ فَأَيُّهُمْ تَعْبُدُ لِزَعِينِكَ وَرَهَيْتِكَ قَالَ الْإِدَى فِي السَّمَاءِ قَالَ يَا حُصَيْنُ أَمَا إِنَّكَ لَوَأْسَلَمْتُ عَلَمَتِكَ كَلِمَتَيْنِ تَنْفَعَا نِكَ قَالَ فَلَمَّا أَسَلَمْتُ حُصَيْنُ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ عَلِمَتِي الْكَلِمَتَيْنِ اللَّتَيْنِ وَعَدْتَنِي فَقَالَ قُلِ اللَّهُمَّ الْهَمِي رُشْدِي وَأَعِزَّنِي مِنْ شَرِّ نَفْسِي - (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۸۵/۵ حدیث رقم ۳۴۸۲۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے باپ کے (مشرف باسلام ہونے سے قبل) فرمایا: اے حصین! کتنے معبودوں کی آج کے دن بندگی کرتا ہے۔ میرے باپ نے کہا سات معبودوں کی چھ زمین میں یعنی یغوث اور یعوق اور نسر اور لات اور منات اور عزریٰ (بتوں کے نام ہیں) اور ایک آسمان میں کہ جو سب کا خالق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پس تو کس کو ان میں سے امید و ڈر کے شمار کرتا ہے یعنی کس سے بھلائی کی امید رکھتا ہے اور ڈرتا ہے؟ حصین رضی اللہ عنہ نے کہا جو آسمان میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے حصین! خبردار ہو اگر تو اسلام لاتا تو میں تجھ کو دو کلمے سکھاتا کہ تجھ کو داریں میں فائدہ دیتے۔ عمران نے کہا ہے۔ جب حصین مسلمان ہوئے تو انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! مجھ کو وہ دو کلمے سکھائیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہہ اے الہی! میرے دل میں ہدایت ڈال دے اور میرے نفس کی برائی سے مجھ کو پناہ دے۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا

ہے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے اس حدیث کو ”حسن غریب“ قرار دیا ہے۔ (میرک)
تشریح: قولہ: یا حصین: کم تعبد الیوم: ”ال“ عہد حاضر کا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿الیوم اکملت لکم دینکم﴾ الہا، تعبد کا مفعول ہے، اور میز کو استغناء حذف کر دیا گیا، چونکہ وہ اس پر دال ہے۔ ابن حجر کے نزدیک کم استفہامیہ کی تمیز ہونا مختار ہے۔ اور فصل مضربیں، چونکہ غیر اجنبی کا ہے۔ (وفیہ توقف)۔

قولہ: قال ابی: سبعة..... السماء: یہ أعبد فعل محذوف کا مفعول ہے۔ اى أعبد سبعة من الآلهة۔
 امام طیبی نے فرمایا: قرآن کریم میں چھ سات معبودوں کے نام مذکور ہیں: (۱) یغوث۔ (۲) یعوف۔ (۳) نسر۔ (۴) لات۔ (۵) مناتہ۔ (۶) عزی۔ اور چونکہ ان میں اللہ جل شانہ بھی شامل ہیں اس لئے لفظ ”سبعة“ استعمال کیا، جانب تذکیر کو غلبہ دیتے ہوئے، پھر چھ کو مؤنث ذکر کیا، اور ساتوں کو مذکر ذکر کیا۔ اھ۔ (وتبعہ ابن حجر)۔

یہ محل نظر ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ یغوث، یعوق اور نسر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بت تھے، ان اسماء کے مؤنث ہونے کی دلیل موجود نہیں ہے۔ اور عرب کے متعدد الہ تھے، ان میں سے چند کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ اور اکثر ایسے ہیں کہ ان کا نام ذکر نہیں کیا۔ مروی ہے کہ بیت اللہ شریف میں فتح مکہ کے وقت تین سوساٹھ بت تھے، نبی کریم ﷺ کا گزر جس بت پر ہوتا لکڑی کے ساتھ کی اس کی طرف اشارہ فرماتے، اور یہ فرماتے جاتے: ﴿جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقاً﴾۔ چنانچہ بت اپنے چہرے کے بل گر پڑتا۔ رواہ البیہقی۔

لطیفہ: اہل عرب میں سے ایک شخص نے دیکھا کہ اس کے بت پر ایک لومڑی پیشاب کر رہی ہے، یہ دیکھ کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک نو مسلم شخص سے پوچھا: هل نفعك أصنامك یوما؟ اس نے جواب دیا: ہاں مجھے اس بت نے نفع دیا کہ جس کو میں نے ”حصین“ سے بنایا تھا۔ قحط پڑ گیا، میں نے اس بت کو کھالیا، چنانچہ اس بت کے کھانے نے مجھے نفع دیا۔ نبی کریم ﷺ یہ بات سن کر مسکرا پڑے۔

قولہ: قال فایہم تعد لرغبتک ورہبتک: ”ایہم“ یا، پر ضم ہے۔ تعد: تاء کے فتح کے اور عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ لرغبتک ورہبتک۔ اور ایک نسخہ میں يضم الاول، وکسر الثانی ہے: اى تہینہ لینفعلک حین ترجو وتخاف۔ امام طیبی فرماتے ہیں: فاء شرط محذوف کی جزا (پردال) ہے۔ اى: اذا کان كذلك فایہم تخصه وتلتجى الیہ اذا نابتک نائبة۔
 قولہ: قال: الذی فی السماء: اصل عبارت یوں ہے: الذی معبود فی السماء، یہ بات حضرت حصین نے اپنے زعم کے مطابق کہی، اور نبی کریم ﷺ کا سکوت ہو سکتا ہے کہ تالف کیلئے ہو۔

قولہ: قال: یا حصین! اما انک لو اسلمت علمتک کلمتین تنفعانک: برائے تشبیہ ہے، تخفیف کے ساتھ ہے۔ انک: ہمزہ کسورہ کے ساتھ ہے۔ علمتک کلمتین: کلمتین سے مراد دو دعائیں ہیں۔

لو اسلمت علمتک کلمتین تنفعانک: امام طیبی فرماتے ہیں: یہ ارضاء العنان کے باب سے ہے۔ چونکہ ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے اس اقرار کے بعد ان سے کہا جاتا اسلم ولا تعاند۔ ابن حجر نے عجیب سی بات کہی: یہ ”باب ارضاء“ سے نہیں ہے۔ بلکہ الاغراء علی الشئ بذکر ما یحمل علیہ کے باب سے ہے۔

میں کہتا ہوں: عباراتنا شتی وحسنک واحد ☆ فکل الی ذاک الحمال یشیر
 چونکہ دونوں عبارتوں کا حاصل ایک ہی ہے، اسی قبیل سے یہ آیت مبارکہ ہے: ﴿وانا أو ایاکم لعلی ہدی أو فی ضلال

مبین

فقال: قل: بظاہر اس دعا کیلئے کسی وقت کی تخصیص نہیں فرمائی۔ ابن حجرؒ کا اس دعا کو بین السجدتین کے ساتھ مقید کرنا انتہائی بعید ہے۔

قوله: اللهم ألهمني رشدی: رشد کے معنی ہیں: الا هتداء الى الصلاح۔

قوله: وأعدني من شر نفسي: امام طہیٰن فرماتے ہیں: اس میں اشارہ ہے کہ ان الہہ کو معبود بنا نانس امارہ بالسوء کے بہکاوے کے علاوہ کچھ نہیں، آگے لکھتے ہیں: وان الرشد الى الطريق المستقیم والدين القويم هو العلى الحكيم۔

تعویذ کا ثبوت نابالغ بچے کے لیے

۲۳۷۷: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِذَا فَرِعَ أَحَدُكُمْ فِي النَّوْمِ فَلْيَقُلْ أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَحْضُرُ وَنَ فَانَهَا لَنْ تَضُرَّهُ وَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو يُعَلِّمُهَا مَنْ بَلَغَ مِنْ وَلَدِهِ وَمَنْ لَمْ يَبْلُغْ مِنْهُمْ كَتَبَهَا فِي صَلَاتِهِ ثُمَّ عَلَّقَهَا فِي عُنُقِهِ۔ (رواه ابو داود و الترمذی و هذا اللفظ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۱۹/۴ حدیث رقم ۳۸۹۳۔ و الترمذی فی السنن ۵۰۶/۵ حدیث رقم ۳۵۲۸۔ واحمد فی المسند ۱۸۱/۲۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ یعنی شعیب رضی اللہ عنہ سے اور وہ اپنے دادا یعنی عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت تم میں سے کوئی نیند میں ڈر جائے پس چاہیے کہ وہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے کلمات کے ساتھ اس کے غضب سے اور اس کے عذاب سے اور اس کے بندوں کی برائی سے اور شیطانوں کے وسوسے سے اور اس سے کہ میرے شیطان میرے پاس حاضر ہوں پناہ مانگتا ہوں۔ پس ان کلمات کو کہنے والے کو ہرگز نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ یہ کلمات اس کو سکھاتے جو ان کی اولاد میں بالغ ہوتا اور نابالغ ہوتا تو یہ کلمات کاغذ پر لکھ کر اس کو اُس کی گردن میں (بطور تعویذ) لٹکاتے۔ اس کو ابو داؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔

تشریح: قوله: أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ..... ان يحضرون: سے مراد اللہ تعالیٰ کے اسماء، اس کی صفات اور آیات کتب ہیں۔ ومن همزات الشياطين: یہ تخصیص بعد التعمیم ہے، یا اشارہ ہے کہ شیاطین اس کے مخصوص بندوں میں سے نہیں ہیں۔ یا علی الاطلاق ہے۔ اور ان کی جنس سے اظہار نفرت بطور مبالغہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان الشيطان لكم عدو﴾ وأن يحضرون: یا اے متکلم محذوف ہے، اس محذوف پر دلالت کیلئے نون وقایہ پر کسرہ ہے۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیطان میری نماز، قراءت، ذکر، دعوت اور میری موت کے وقت میرے پاس آئیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نیند میں ڈرنا شیطان کے تصرف اور اس کی شرارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نیز یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ گلے میں تعویذ ڈالنا اور لٹکانا جائز ہے اس مسئلہ میں اگرچہ علماء کے اختلافی اقوال ہیں لیکن زیادہ صحیح اور مختار بات یہی ہے کہ حرزات وغیرہ تو گلے میں لٹکانا حرام اور مکروہ ہیں لیکن ایسے تعویذ لٹکانا جائز ہیں جن میں آیات قرآن یا اسمائے الہی لکھے ہوں۔

قوله: كتبها في صلک: اس کی وضاحت صاحب النہایہ اور صاحب قاموس نے ”کتاب“ کے ساتھ کی ہے۔ ابن حجرؒ نے اس کی وضاحت کتف من عظم“ کے ساتھ کی ہے، یہ توضیح لغت اور عرفاً ہر اعتبار سے ”غریب“ ہے۔

تخریج: امام ابوداؤد نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے، اور اسی طرح امام نسائی اور امام حاکم نے روایت کی ہے۔ اور امام احمد نے اس سند کے ساتھ یوں نقل کی ہے: عن محمد بن یحییٰ بن حبان عن الولید بن الولید، أخی خالد بن الولید، أنه قال: یا رسول اللہ! انی أجد وحشة، قال: اذا أخذت مضجعک فقل..... اور پھر آگے روایت باب کے مثل حدیث ذکر کی ہے۔ ابن السنی کی کتاب میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید کو بے خوابی کی شکایت ہوئی، تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی بات سن کر انہیں یہی کلمات پڑھنے کی تلقین فرمائی۔

امام طبرانی نے الاوسط میں نقل کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولید نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ وہ رات کے وقت خوف محسوس کرتے ہیں، جو ان کے اور ان کی نماز کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے خالد بن ولید کیا میں تمہیں چند ایسے کلمات نہ سکھاؤں گی جن کو تین مرتبہ کہنے سے یہ چیز تم سے دور ہو جائے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں، کیوں نہیں یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں نے اس خوف کی شکایت آپ سے اسی امید پر کی ہے۔ (کہ آپ مجھے اس مسئلہ کا کوئی حل ارشاد فرمائیں گے۔) تو آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہا کر: اعود بکلمات التامات من غضبه..... الخ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ چند راتیں ہی گزری تھیں کہ حضرت خالد بن ولید تشریف لائے اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ معوث فرمایا، میں یہ کلمات تین بار کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وہ چیز دور کر دی۔ حتیٰ کہ اگر میں رات کو شیر کی کچھار میں گھسوں تو ڈر نہیں لگتا۔

الخیس: صاحب قاموس لکھتے ہیں: الخیس بالکسر الشجر الملتف موضع الأسد کالخیسة۔ گھنے اور گنجان درخت، شیر کا مسکن۔ خیسہ کے بھی یہی دو معنی ہیں۔

جنت کا سوال کرنا اور آپ ﷺ سے پناہ مانگی

۲۳۷۸: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ سَأَلَ اللَّهَ الْجَنَّةَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ الْجَنَّةُ أَلْهِمَّهُ ادْخُلْهُ

الْجَنَّةَ وَمَنِ اسْتَجَارَ مِنَ النَّارِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ النَّارُ أَلْهِمَّهُ أَجْرُهُ مِنَ النَّارِ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۰۳/۴ حدیث رقم ۲۵۷۲۔ والنسائی فی السنن ۲۷۹/۸ حدیث رقم ۵۵۲۱۔ واحمد فی

المسنن ۲۰۸/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے جنت مانگے۔ تین بار یعنی یوں کہے: اللَّهُمَّ مَنْ سَأَلَكَ اللَّهُ الْجَنَّةَ (اے اللہ! میں جنت میں داخلے کا سوال کرتا ہوں تو) یا کہے: اللَّهُمَّ ادْخُلْهُ الْجَنَّةَ (اے اللہ! مجھے جہنم کی آگ سے بچا) تو جنت کہتی ہے اے الہی تو داخل کر اس کو جنت میں اور جو شخص آگ سے تین بار پناہ مانگے..... تو آگ کہتی ہے الہی تو محفوظ رکھ اس کو آگ سے اس کو امام ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: من سأل الله الجنة قالت الجنة اللهم ادخله الجنة: دخول جنت کی دعا مانگنا زیادہ ظاہر ہے۔

”تین مرتبہ“ چاہے تو ایک ہی مجلس میں یہ دعا مانگی جائے اور چاہے کئی مجلسوں میں گروگڑا کر دعا مانگی چاہئے۔

چونکہ یہ آداب دعا میں سے ہے۔ یہی معنی اس کے ظاہر و متبادر ہیں۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ ثلاث مرات سے ثلاث اوقات مراد ہوں، مثلاً امتثال طاعت کے وقت، انتہاء معصیت کے وقت، اور مصیبت کے وقت، یا یہ تین اوقات مراد ہیں۔ (۱) تصدیق۔ (۲) اقرار۔ (۳) قالت الجنة: اس میں تین احتمال ہیں۔ (۱) جنت یہ کلام بزبان حال کرے گی۔ (۲) جنت یہ کلام بزبان قال کرے

گی، چونکہ اللہ جل شانہ کو انطاق جمادات پر قدرت حاصل ہے۔ (۳) یہ کلام جنت نہیں بلکہ اہل جنت غلمان کریں گے۔ اللہم ادخلہ الجنة: اس میں دو احتمال ہیں۔ (۱) اس دخول جنت سے مراد دخول اولیٰ ہے۔ (۲) اس سے مراد مطلقاً دخول جنت مراد ہے۔

قولہ: ومن استجار من النار ثلاث مرات قالت النار اللهم اجرہ من النار: اس میں دو احتمال ہیں: (۱) دخول نار سے مطلقاً محفوظ فرما۔ (۲) دخول ابدی سے محفوظ فرما۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ضمیر متکلم کی جگہ اسم ظاہر جنت و نار کا ذکر کرنے میں صنعت تجرید ہے، اور ایک قسم کا التفات ہے۔ مزید فرماتے ہیں: جنت و دوزخ کا از خود کلام کرنا حقیقتاً ہے، اس میں کوئی بعد نہیں، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ﴾ اور یہ بھی ممکن ہے کہ استعارہ ہو۔

استحقاق عبد کو اللہ کے وعدہ سے تشبیہ دی۔

اور ان کے ثبوت کو نطق ناطق سے تشبیہ دی، گویا کہ جنت اس کی مشتاق ہے۔ اس کے دخول جنت کی سائل و داعی ہے، اور جنم اس سے نفرت کرتی ہے، اس کیلئے جنم سے دوری کی دعا کر رہی ہے۔ لفظ قول استعمال کر کے، تحقق و ثبوت مراد ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ مضاف مقدر ہو۔ اسی قال خزنتھا، چنانچہ قول حقیقی ہوگا۔ میں کہتا ہوں لیکن اسناد مجازی ہوگا۔ ابن حجر فرماتے ہیں: بزبان حال پر محمول کرنا، اور مضاف مقدر ماننا دونوں باتیں قواعد مقررہ کے مخالف ہیں: ان کل ما ورد فی الكتاب والسنة، ولم يحل العقل حملة علی ظاہرہ لم یصرف عنه الا بدلیل۔ اور جمادات کا تکلم کرنا عرف میں واقع ہوا ہے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ کے دست اقدس میں کنکر یوں کا تسبیح پڑھنا اور کھجور کے تنے کا رونا وغیرہ اہ۔

میں کہتا ہوں یہ قاعدہ ظواہر کے قواعد کے قریب ہے۔ اس آیت: ﴿وَأَسْأَلُ الْقَرْيَةَ﴾ کی تاویل پر مفسرین کا اجماع ہے، کسی ایک بھی مفسر نے یہ نہیں کہا کہ بطور خرق عادت قریہ کا سوال و جواب کرنا ممکن ہے، باوجودیکہ معاملہ نفس الامر میں بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف نظر کرتے ہوئے نقل قطع نظر، عقل مألوف و معتاد کی طرف نظر کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ جمادات کا نطق کرنا محال ہے، علماء نے اطوار آخرت اور اسرار الہیہ بیان کئے ہیں، یہ سارے من وراء العقل، نقل سے ثابت ہیں۔ اسی لئے فلاسفہ اور ان کے تبعین نے ان کا انکار کیا ہے، ان کے اپنے گمان کے مطابق یہ عقل العقلاء ہیں۔ ان کو انبیاء کی ضرورت نہیں، انبیاء کی بعثت تو ”انبیاء“ کی طرف ہوئی ہے۔ بلکہ بہت سے اسلامی فرقے مثلاً معتزلہ وغیرہ نے بعض ایسے امور نقلیہ کا بھی انکار کیا ہے جو متواتر المعنی احادیث سے ثابت ہیں، مثلاً عذاب قبر، میزان، صراط، اور رویت وغیرہ، ان کا مقابلہ بعض ظاہر یہ نے کیا اور قرآن کو اس کے ظاہر پر محمول کیا اور اللہ تعالیٰ کیلئے صفات جسمانیہ ثابت کرنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کیلئے جو ارح مثلاً ہاتھ، آنکھ اور انگلیوں وغیرہ جیسے محالات عقلیہ نقلیہ کے قائل ہو گئے، ان کا معارضہ بعض باطنیہ نے کیا، چنانچہ یہ اہل باطن قرآن و سنت میں تاویل کرنے لگے، اور قرآن و حدیث کو ان کے ظاہر سے پھیرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کہنے لگے کہ موسیٰ سے مراد قلب، فرعون سے مراد نفس وغیرہ ہے۔ اور مذہب اہل السنۃ والجماعہ ہر ذی حق کو اس کا پورا حق دیتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الفصل الثالث:

جادو وغیرہ سے بچنے کی دعا

۲۴۷۹: وَعَنِ الْقَعْقَاعِ أَنَّ كَعْبَ الْأَحْبَارِ قَالَ لَوْلَا كَلِمَاتٌ أَقُولُهُنَّ لَجَعَلْتَنِي يَهُودًا حِمَارًا فَيَقِيلَ لَهُ مَا هُنَّ

قَالَ أَعُوذُ بِوَجْهِ اللَّهِ الْعَظِيمِ الَّذِي لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمُ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا

فَاجْرٍ وَبِأَسْمَاءِ اللَّهِ الْحُسْنَىٰ مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ أَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذُرّاً وَبَرّاً۔ (رواه مالک)

اخرجه مالک فی الموطأ ۹۵۱/۲ حدیث رقم ۱۲ من کتاب السفر۔

ترجمہ: حضرت تعقارؓ روایت ہے کہ کعب احبارؓ نے فرمایا اگر میں یہ کلمات نہ کہتا ہوتا تو البتہ یہود مجھ کو گدھا بنا لیتے۔ پس ان سے کہا گیا کہ وہ کلمے کیا ہیں۔ کعب نے کہا میں اللہ کی اس ذات سے پناہ مانگتا ہوں جو وہ بڑا ہے کہ کوئی چیز اس سے بڑی نہیں ہے اور اللہ کے کلموں سے کہ وہ پورے ہیں کہ ان سے کوئی نیک اور بد تجاوز نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کے اچھے ناموں کے ساتھ جو کچھ کہ میں ان ناموں سے جانتا ہوں اور جو کچھ کہ نہیں جانتا۔ اس چیز کی برائی سے پیدا کی اور برابر کی۔ متناسب الاعضاء کی اس نے۔ اس کو امام مالکؒ نے نقل کیا ہے۔

روائی حدیث:

القعقاع بن حکیم۔ ان کا نام قعقاع ہے۔ یہ ”حکیم“ کے بیٹے ہیں۔ مدینہ کے رہنے والے اور تابعی ہیں۔ جابر بن عبد اللہ اور ابو یونسؒ سے حدیث کی سماعت کی۔ ان سے سعید مقبری اور محمد بن عجلان نے روایت کی۔ ابو یونسؒ حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ ہیں۔

تشریح: قولہ: لولا کلمات اقولهن لجعلتني يهود حماراً: کعب احبار قوم یہود کے ایک بڑے دانشمند فرد تھے وہ اگرچہ آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ میں تھے لیکن آپ ﷺ کے دیدار اور آپ ﷺ کی صحبت کے شرف سے محروم رہے۔ پھر بعد میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایمان و اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے انہیں کعب کا بیان ہے کہ جب میں ایمان لایا اور مسلمان ہوا تو یہود میرے مخالف ہو گئے وہ میرے بارے میں اس قدر بغض و کینہ رکھتے تھے کہ اگر ان کی حرکتیں کامیاب ہو جاتیں اور میں یہ دعانہ پڑھتا تو وہ سحر کر کے مجھے گدھا بنا دیتے یعنی مجھے ذلیل و بے وقوف اور گدھے کی مانند مسلوب العقل کر دیتے۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں: شاید کہ ان کی مراد یہ تھی کہ یہود نے ان پر جادو کر دیا۔ اور اگر میں یہ دعانہ کر رہا ہوتا تو وہ میری حقیقت تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتے اھ۔ یہ درست نہیں، چونکہ ”قلب حقاً“ صرف اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿يَخِيلُ إِلَيْهِمْ سَحْرَهُمْ أَنَّهُمْ تَسْعَىٰ﴾ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ جادو گروں نے فرعون کا تقرب اور مال و جاہ حاصل کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اور جادو کی یہ صورت اس وقت اختیار کی۔ چنانچہ اگر ان کے دست قدرت میں اس سے کچھ بھی زیادہ ہوتا تو وہ بھی کر گزرتے۔ لہذا جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم الشان نبی کے خلاف اس سے بڑھ کر جادو کا کوئی کرتب نہیں دکھا سکتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سید الانبیاء و المرسل کے خلاف اس سے بڑھ کر جادو کو کوئی کرتب دکھا سکیں، چہ جائیکہ حقیقت کو بدل ڈالیں۔ چنانچہ قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں: والمراد بالسحر ما يستعان في تحصيله بالتقرب الى الشيطان مما لا يستقل به الانسان، وذلك لا يستتبه الا لمن يناسبه في الشرارة وخبث النفس، فان التناسب شرط في التضام والتعاون، وبهذا تميز الساحر عن النبي والولي، وأما ما يتعجب منه كما يفعله أصحاب الحيلة بمعونة الآلات والأدوية، فتسميته سحر على التجوز اھ۔

جب شیطان کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو حمار حقیقی بنا ڈالے، تو دوسروں کی کیا جرأت۔ لہذا جو اس کے قریب تو سل کا دامن تھا وہ تو وہ کیسے حقیقت کو بدل سکتا ہے۔ صاحب مدارک لکھتے ہیں: وللسحر حقيقة عند أهل السنة كثرهم الله تعالى، وتخيل وتمويه عند المعتز خذلهم الله۔

راوی حدیث:

مسلم بن ابی بکر۔ یہ ”مسلم“ ہیں ابوبکر کے بیٹے ہیں۔ ثقفی اور تابعی ہیں۔ ان کے والد صحابی تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے اور ان سے ”عثمان شام“ نے روایت کی۔

تشریح: قولہ: یقول فی دبر الصلاة: ”دبر“ لغت مشہورہ اور روایت معروفہ کے مطابق دال مہملہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ابو عمرو مطرزی فرماتے ہیں: دبر: دال کے فتح کے ساتھ۔ نماز وغیرہ کا آخری وقت اور فرمایا: لغت میں یہی معنی معروف ہیں، اور دبر بمعنی پچھلا حصہ دال کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ماوردی نے ابن اعرابی سے نقل کیا ہے: دبر الشئ بالضم وبضمین نقیض القبل، ومن کل شیء عقبہ ومؤخرہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ لفظ دبر تین طریقے سے پڑھا جاتا ہے: (۱) بروز شمس۔ (۲) بروز نکت۔ (۳) بروز نکت۔ (۲) جنس ”الصلاة“ یہاں ”صلوٰۃ“ سے کون سی نماز مراد ہے؟ اس میں متعدد احتمالات ہیں۔ (۱) صلوٰۃ سے مراد فرض نماز ہے۔ (۲) جنس صلوٰۃ مراد ہے۔ اس میں احتمال ہے کہ نماز کے آخر میں سلام سے پہلے یہ دعا مانگتے تھے، زیادہ واضح بات یہ ہے سلام پھیرنے کے بعد یہ دعا مانگتے تھے۔

قولہ: اللھم انی اعوذ بک من الکفر والفقر وعذاب القبر: اس کی تشریح ماقبل میں گزر چکی ہے۔ بنی: یاے مشدودہ کے فتح کے ساتھ ہے کسرہ بھی درست ہے۔ اور یہ تصغیر برائے شفقت ہے۔ قولہ: عمن اخذت هذا؟ اس جملہ میں اشارہ ہے کہ سالک کو چاہئے کہ وہ ادعیہ ماثورہ مانگا کرے، اپنی طرف سے اختراع نہ کرے۔

توضیح: حصن میں لکھا ہے: اس حدیث کو حاکم، ابن ابی شیبہ اور ابن اسنی نے روایت کیا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ قصہ روایت کیا ہے یا کہ نہیں۔

کفر اور قرض سے پناہ مانگو

۲۴۸۱: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الْكُفْرِ وَالذَّيْنِ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَتَعْدِلُ الْكُفْرَ بِالذَّيْنِ قَالَ نَعَمْ وَفِي رِوَايَةٍ لِلَّهِمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ قَالَ رَجُلٌ يَعْدِلُ لِأَنَّ قَالَ نَعَمْ - (رواه النسائي)

اخرجه النسائي في السنن ۲۶۷/۸ حديث رقم ۵۴۸۵۔ واحمد في المسند ۳۸۱/۳۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرماتے تھے کہ میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کفر سے اور دین سے پس ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول آپ ﷺ نے کفر کو دین کے برابر کر دیا فرمایا کہ ہاں اور ایک روایت میں آیا ہے اے الہی! تحقیق میں تیری پناہ مانگتا ہوں کفر کرنے سے اور فقر سے اور ایک شخص نے کہا کہ اس میں برابر کئے جاتے ہیں کفر و فقر فرمایا کہ ہاں اس کو نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اتعدل الکفر بالدين؟ قال نعم:

قولہ: قال رجل: ولا يعدلان؟ ایک نسخہ میں یوں ہے: فقال رجل: يعدلان۔

”یعدلان“ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں بصیغہ معروف ہے۔ اسی یعدل أحدهما بالآخر۔

قولہ قال: نعم: امام طیبی فرماتے ہیں۔ یہاں اصل عبارت یوں ہے: اسی نعم أساوی الدائن بالمنافق.....،

”کفر اور قرض“ کو برابر اس لئے فرمایا کہ قرض کی وجہ سے انسان جھوٹ بولتا ہے، مکاری کرتا ہے اور وعدہ کے خلاف کرتا ہے اور

ظاہر ہے کہ یہ بدترین خصالتیں کفار اور منافقین ہی میں ہوتی ہیں۔

”کفر“ اور ”فقر“ کو برابر بایں معنی کیا گیا ہے کہ فقر کی وجہ سے انسان بے صبری کرتا ہے، اپنی قسمت کو کوستا ہے، تقدیر کا گلہ کرتا ہے اپنی زبان

سے ایسے الفاظ نکال بیٹھتا ہے جو کفر کا باعث ہوتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے: والفقير الذي لم يصبر على فقر أسوأ حالاً من الدائن۔ نیز مروی

ہے: كاد الفقر أن يكون كفراً۔ اور اس لئے بھی کہ کبھی دائن متحمل ہوتا ہے، اور اپنے رب پر توکل کئے ہوتا ہے۔ (وتعقبه ابن

حجر بما لا طائل تحته)۔

بَابُ جَامِعِ الدَّعَا

جامع دُعاؤں کا بیان

امام طیبی فرماتے ہیں: یہ ”اضافۃ الصفة الی الموصوف“ کی قبیل سے ہے۔ اسی: الدعاء الجامع لمعان كثيرة في

الفاظ يسيرة۔ ابن حجر نے لفظ ”الدعوات“ ذکر کیا ہے، یہ ”اصول“ کے مخالف ہے۔ آگے جا کر ابن حجر لکھتے ہیں: ثم قوله اسی:

الدعوات الجامعة فهو من اضافة الصفة الی الموصوف، غير مطابق بين الصفة والموصوف۔ ابن حجر کی یہ بات قابل

تأمل ہے۔

الفصل الاول:

جامع دعا

۲۳۸۲: عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يَدْعُو بِهَذَا الدُّعَاءِ أَللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي
وَجَهْلِي وَسِرَّافِي فِي أَمْرِي وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي جِدِّي وَهَزْلِي وَخَطَايَايَ وَعَمْدِي وَكُلُّ
ذَلِكَ عِنْدِي اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي أَنْتَ
الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَأَنْتَ عَلَيَّ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۹۶/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۹۸۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۷/۴ حدیث رقم (۷۰)۔

۲۷۱۹)۔ واحمد فی المسند ۴۱۷/۴۔

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ تحقیق وہ یہ دعا

مانگتے تھے: اے الہی! میرے لیے میری خطا کو اور میری نادانی کو یعنی جن چیزوں کا جاننا یا عمل کرنا مجھ پر ضروری تھا اور

میں نے نہیں جانا ان کو اس کو بخش دے اور میری زیادتی میرے کام میں اور وہ گناہ کہ جن کو تو خوب جانتا ہے ان کو مجھ

سے یعنی مجھے ان کا علم نہیں ہے جیسا کہ تجھے ہے۔ اے الہی! میرے قصد کرنے اور میری ہنسی کو بخش اور میرے نادانستہ

اور جان بوجھ کر کرنے کو بخش دے۔ اے الہی! میرے لیے میرے گناہ کہ جو میں نے پہلے کئے اور وہ گناہ کہ جو (بالفرض والتقدیر) اس کے بعد ہوں گے اور وہ گناہ جو میں نے چھپ کر کئے ہیں اور وہ گناہ جن کو میں نے اعلانیہ کیا ہے اور وہ گناہ جن کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، بخش دے تو جس کو چاہے اپنی رحمت سے توفیق میں آگے کر دے اور جس کو چاہے اپنی قوت سے پیچھے ڈال دے اور تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم اغفر لی خطیئتی وجھلی واسرافی فی امری :

”خطیئتی“ ہمزہ میں تسہیل کر کے ”خطیہ“ یا ئے مشددہ کے ساتھ بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

خطیئہ کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ (۱) خطیئہ سے مراد ”سیر“ ہے۔

”جھلی“ جھل، ”علم“ کی ضد ہے۔ اسراف: اسراف کہتے ہیں: مجاوزة الحد فی کل شیء کو۔ یہ مجاوزہ بصورت تفسیر بھی

ہوسکتا ہے اور بصورت تجاوز بھی۔

فی امری: کرمائی فرماتے ہیں۔ اس میں احتمال ہے کہ یہ تمام مذکورہ امور کے متعلق ہو۔

قوله: وما انت اعلم وخطیئتی وعمدی:

وما انت اعلم بہ منی: یہ تعمیم بعد التخصیص ہے۔ اس میں اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شیء کو محیط ہے۔ اور اقرار ہے کہ میں خود

اپنے نفس کی معرفت سے بھی عاجز ہوں، چنانچہ کہا جاتا ہے: من عرف نفسه فقد عرف ربه۔

جد: ہزل کا متضاد ہے۔ خطی: صحاح میں لکھا ہے: خطأ، صواب کی نقیض ہے، کبھی مد کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، خطا کے معنی

ہیں ”ذنب“۔

قوله: وکل ذلك عندی: (خبر محذوف ہے اور وہ ہے:) موجود أو ممکن۔ یہ آخری جملہ ما قبل کلام کیلئے بمنزلہ ”تذلیل“ کے ہے۔

امام طیبی نے فرمایا: ای: أنا متصف بجميع هذه الأشياء فاغفرها لی، قاله تواضعا وهضما، وعن علی: أنه عدّ

ترك الأولی وفوات الكمال ذنبا، وقیل: أراد ما كان عليهما عجيبة، فان الأصح المختار عند المحققين أن

الانبياء صلوات الله وسلامه عليهم معصومون قبل النبوة وبعدها من كبائر الذنوب وصغائرها عمدها

وسهوها هـ۔

امام طیبی کا امام نووی کے کلام پر اظہار تعجب خود اکبر العجائب ہے۔ چونکہ امام نووی نے اسی چیز کو مقدمات ذکر کیا ہے جو محققین کے

نزدیک مختار ہے، جیسا کہ انہوں نے لکھا: قاله هضما لفسه، اور پھر اس مذہب مختار کی تقویت و تائید کیلئے حضرت علی کا کلام نقل کیا کہ اس

سے مراد خلاف اولیٰ ہے۔ اور پھر مذہب غیر مختار کو لفظ ”قیل“ سے تعبیر کیا۔ اور قیل اشارہ ہے کہ یہ ان کے نزدیک ضعیف ہے۔ چنانچہ اس

سیاق و سباق کے ہوتے ہوئے اس کو سکوت شمار نہیں کیا جاسکتا، چر جائیکہ اس پر اظہار تعجب کیا جائے۔ اور یہ بھی عجائب میں سے ہے کہ

وکل ذلك عندی کے بعد لکھتے ہیں: ای: أنا متصف بهذه الاشياء..... ممکن ہے کہ جو کچھ مصنف نے ذکر کیا ہو وہ کسی روایت میں

آیا ہو، یا کسی نسخہ میں ہو۔

عرض مرتب: اس حدیث کے ذیل میں ملا علی قاری نے ”انبیاء“ کے معصوم عن الکذب ہونے کا مسئلہ ذکر کیا ہے، ہم نے اسے

یہاں سے حذف کر دیا ہے۔

قوله: اللهم اغفر لی ما قدمت وما آخرت:

ماضی کی تعبیر اختیار فرمائی چونکہ: المتوقع کالمتحقق۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے: ما ترک من العمل أو قلت سأفعل أو سوف أترك۔

قولہ: وأنت علی کل شیء قدير:

اُی اُردتہ من التقدیم والتاخیر وغیرہما۔ ابن حجر نے اس کی وضاحت یوں کی ہے: علی کل شیء تریدہ۔ لیکن یہ وضاحت ”موبہم“ ہے۔ قدير: اس کا مطلب ہے: کامل القدرة تام الارادة۔

توضیح: حسن سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اللہم اغفر لی ما قدمت..... منی تک روایت، افراد مسلم میں سے ہے، اس کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے، البتہ اس کے علاوہ حصہ ”مشفق علیہ“ ہے، لیکن متعدد روایات سے۔

دین و دنیا کی اصلاح کی دعا

۲۲۸۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَدْعُو اللَّهُمَّ أَصْلِحْ لِي دِينِي الَّذِي هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِي وَأَصْلِحْ لِي دُنْيَايَ الَّتِي فِيهَا مَعَاشِي وَأَصْلِحْ لِي آخِرَتِي الَّتِي فِيهَا مَعَادِي وَاجْعَلِ الْحَيَاةَ زِيَادَةً لِي فِي كُلِّ خَيْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِي مِنْ كُلِّ شَرٍّ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۸۷/۴ حديث رقم (۲۷۲۱/۷۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الہی میرے لیے میرا دین درست کر دے جو میرے کام کا بچاؤ ہے یعنی نفس اور مال اور آبرو دین اور میرے لیے میری دنیا کو درست کر دے کہ اس میں زندگانی ہے میری اور میرے لیے میری آخرت کو درست کر دے وہ کہ اسی کی طرف میرا رجوع کرنا ہے اور میرے لیے ہر نیکی میں زندگی کو زیادتی کا سبب بنا دے کہ زیادہ دیر تک زندہ رہوں اور بہت زیادہ نیک کام کروں اور موت کو میرے لیے راحت کا سبب بناؤ ہر برائی سے اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللہم اصلح لی دینی الذی ہو عیصمة امری:

الصالح میں لکھتے ہیں: عیصمة کے معنی ہیں: ”المنع والحفظ“۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمْعًا وَلَا حَبْلَ اللَّهِ﴾ سے مراد ”عہد“ یعنی ”دین“ ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ”دین“ میرے تمام امور کا محافظ ہے، چونکہ جس شخص کے دین میں بگاڑ ہوگا اس کے تمام امور میں بگاڑ ہوگا، وہ شخص غیبت و حضور، حزن و سرور کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی خائب و خاسر ہوگا۔

قولہ: واصلح لی دنیای الی فیہا معاشی:

قولہ: واصلح لی آخرتی الی فیہا معادی:

”معاد“ عاد کا مصدر ہے، بمعنی رجع۔ اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے: وفقنی للطاعة الی ہی اصلاح معادی۔ آخرت کی

درستی و اصلاح کا انحصار جن امور پر ہوتا ہے۔

قولہ: واجعل الحیاة زیادة لی فی کل خیر:

قولہ: واجعل الموت راحة لی من کل شر۔ یعنی میری زندگی کا خاتمہ شہادت، حسن اعتقاد اور توبہ پر ہوتا کہ میری موت دنیا کی مشقتوں سے نجات اور آخرت کی راحت کے حصول کا باعث ہو۔

امام طیبی فرماتے ہیں: اصلاح الدنیا عبارت ہے کہ آدمی کی احتیاج پوری ہوتی رہے، وہ حلال ہو، اللہ تعالیٰ کی طاعت کیلئے معین

و مددگار ہو، اور اصلاح معاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت کی توفیق مل جائے، اور طلب راحت بالموت میں نبی کریم ﷺ کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے: اذا اردت بقوم فتنۃ فتوفنی غیر مفتون۔ یہ نقصان قرینہ سابقہ کی زیادتی کے مقابل ہے۔

ہدایت اور تقویٰ مانگنا

۲۳۸۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْهُدَىٰ وَالْتَقَىٰ وَالْعَفَافَ وَالْغِنَىٰ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۸۷/۴ حدیث رقم (۷۲- ۲۷۲۱)۔ و الترمذی فی السنن ۴۸۸/۵ حدیث رقم ۳۴۸۹۔
وابن ماجہ ۱۲۶۰/۲ حدیث رقم ۳۸۳۲ واحمد فی المسند ۴۱۱/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے وہ کہتے تھے اے الہی تحقیق میں مانگتا ہوں تجھ سے ہدایت اور تقویٰ اور نفس کو حرام و مکروہ چیزوں سے باز رکھتا ہے اور بے پرواہی کا سوال کرتا ہوں یعنی دل کی اور ظاہر کی۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم انى اسئلك الهدى والتقى والعفاف والغنى:

”العفاف“ بیرون کلام، بمعنی کفاف، کہا جاتا ہے: عفت عن الحرام یعف عفا و عفة و عفا فای کف۔ (کذائی الصحاح)
عفاف کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں: (۱) معاصی سے حفاظت۔ (۲) قلب و نفس کی اصلاح۔

”الغنى“: اس کے دو مطلب بیان ہوئے ہیں: (۱) غنائے قلبی مراد ہے۔ (۲) لوگوں کے پاس موجود، سیم و زرد و دیگر اشیاء سے استغناء۔

امام طیبی فرماتے ہیں: ”ہدی“ اور ”تقی“ کو مطلق ذکر فرمایا تاکہ یہ ان امور و اشیاء کو شامل ہو جائے جن سے آگاہی ضروری ہے۔ مثلاً امر معاش، معاد، مکارم اخلاق، اور ان تمام امور کو بھی شامل ہو جن سے بچنا ضروری ہے۔ مثلاً شرک و معاصی، اخلاق رذیلہ۔ طلب عفاف و غنی یہ تخصیص بعد از تمیم ہے۔

افعال و گفتار کی درستگی کا سوال کرنا

۲۳۸۵: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قُلِ اللَّهُمَّ اهْدِنِي وَسَدِّدْنِي وَأَذْكُرْ بِالْهُدَىٰ هِدَايَتَكَ الطَّرِيقَ وَبِالسَّدَادِ سَدَادَ السُّبْحِ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۲۰۹۰/۴ حدیث رقم (۷۸- ۲۷۲۵) و أبو داؤد فی السنن ۱۳۰/۴ حدیث رقم ۴۲۲۵۔
ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مجھ کو ارشاد فرمایا کہ اے الہی! مجھ کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرما یعنی مجھ کو سیدھی راہ دکھا یعنی افعال و گفتار سیدھی کر دے اور مجھے سیدھا کر دے (آپ ﷺ نے فرمایا) جب تم اللہ سے ہدایت طلب کرو تو سیدھا راستہ طلب کرو تو تیر کی طرح درستی کا تصور کرو۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم اهدني وسددني: اس کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) اے اللہ مجھے ہدایت پر ثابت

قدم فرما۔ (۲) اے اللہ کمالات زائدہ کی طرف میری راہنمائی فرما۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا

وسددنی: ”سداد“ سے مأخوذ ہے۔ ”سداد“ سین کے فتح کے ساتھ ہے۔ کہا گیا ہے کہ ”سداد“ کے معنی ہیں: اصابة القصد فی الامر والعدل فیہ۔ چنانچہ اللہم اهدنی وسددنی کا مطلب ہے: اے اللہ میں تجھ سے غایت حدی اور نہایت سداد کا سوال کرتا ہوں۔

امام طیبی فرماتے ہیں: حدیث میں بیان کردہ مفہوم وہی ہے جو ان آیات میں ہے: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ [ہود: ۱۱۲] ﴿أَهْدِنَا الصِّرَاطَ﴾ [الفاتحة: ۶] یعنی اے اللہ! مجھے ایسی ہدایت عطا فرما کہ اس کے ہوتے ہوئے میں افراط و تفریط کی طرف مائل نہ ہونے پاؤں۔

قوله: واذکر بالهدی ہدایتک الطریق وبالسداد سداد السہام: اس کا عطف ”قل“ پر ہے۔ آخری جملہ کا مطلب یہ ہے تم ہدایت سداد کا سوال کرنے میں سہم سدا کی طرح ہو جاؤ، صراط مستقیم کی پشت کے سوار کی طرح ہو جاؤ۔ اس میں شی معقول کوٹھی محسوس کی تصویر میں پیش کیا ہے، چونکہ یہ ”واقع فی النفس“ ہے۔ تقریباً اسی مفہوم کو امام طیبی نے اپنے الفاظ میں یوں ذکر کیا ہے: امرہ بأن یسأل اللہ الہدی والسداد، وأن یکون فی ذکرہ مختطراً ببالہ۔ والمعنی: أن یکون فی سؤالہ طالبا غایة العدل ونہایة السداد، اذا المطلوب ہدایة کھدایة من ركب متن الطریق، وسدادا یشبہ سداد السہم نحو الغرض۔

جب تم اللہ رب العزت سے طلب ہدایت کرو تو تمہارے ذہن میں یہ بات رہنی چاہئے کہ مجھے وہی ہدایت حاصل ہو جو صراط مستقیم پر گامزن شخص کو حاصل ہوتی ہے اور جب تم راسی ماگو تو یہ خیال رکھو کہ مجھے ایسی ہی راسی حاصل ہو جس طرح تیر سیدھا ہوتا ہے۔

نئے مسلمان کو مذکورہ کلمات سکھایا کرتے تھے

۲۳۸۶: وَعَنْ أَبِي مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ كَانَ الرَّجُلُ إِذَا أَسْلَمَ عَلَّمَهُ النَّبِيُّ ﷺ الصَّلَاةَ ثُمَّ أَمَرَهُ أَنْ يَدْعُوَ بِهَذِهِ الْأَكْلِمَاتِ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَاهْدِنِي وَعَافِنِي وَارْزُقْنِي۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۲۰۷۳/۴ حدیث رقم (۳۵-۶۹۷)۔

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشجعی سے روایت ہے کہ اسنے اپنے باپ سے نقل کی کہ آدمی جب مسلمان ہوتا تو اس کو نبی کریم ﷺ نماز سکھلاتے تھے پھر اس کو حکم کرتے۔ کہ دعا کرے ان کلمات کے ساتھ کہ اے الہی میری بخشش فرما اور مجھ پر رحم کر۔ یعنی میرے عیبوں کو ڈھانکنے کے ساتھ اور مجھ کو ہدایت کر اور عافیت سے رکھ مجھ کو اور روزی دے مجھ کو۔ یعنی حلال اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: علمه النبي ﷺ الصلوة: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) مسائل نماز سکھاتے، نماز کے شرائط و ارکان بتاتے۔ (۲) وہ نماز سکھلاتے جس نماز کا وقت ہو رہا ہوتا تھا چونکہ یہ فرض عین ہے۔

۲۳۸۷: وَعَنْ أَنَسِ قَالَ كَانَ أَكْثَرُ دُعَايِ النَّبِيِّ ﷺ اللَّهُمَّ إِنَّا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۹۱/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۸۹۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۷۱/۴ حدیث رقم (۲۷)۔

۲۶۹۰۔ و الترمذی فی السنن ۴۸۷/۵ حدیث رقم ۳۴۸۷۔ و احمد فی المسند ۲۰۸/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اکثر دعایہ ہو کرتی تھی اے الہی! ہم کو دنیا میں نیکی

عظا فرنا یعنی نعتیں اور اچھی حالت عطا فرما اور آخرت میں یعنی موت کے بعد نیکی یعنی اچھے مراتب اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: کان اکثر دعا النبی ﷺ:

قولہ: اللهم اتنا فی الدنيا حسنة: قولہ: وفي الآخرة حسنة: قولہ: وقنا عذاب النار: آنحضرت ﷺ کثرت سے یہ دعا اس لئے پڑھا کرتے تھے کہ یہ ایک جامع دعا ہے جس میں دین و دنیا کے تمام مقاصد آجاتے ہیں پھر یہ کہ یہ دعا قرآن کریم میں نازل کی گئی ہے۔

طالب صادق اگر حضور و مناجات کے وقت خلوت میں بیٹھ کر باطن کی صفائی کے ساتھ دنیا و آخرت کے حسنات کے ہر ہر گوشے کا تصور کر کے دعا پڑھے تو وہ دیکھے گا کہ کیا کچھ ذوق و جمعیت، سکون و اطمینان اور نورانیت و سعادت حاصل ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ دعا مانگنے والا شخص اللہ جل شانہ کے ہاں ”ممدوح“ ہے۔

اس دعا کی متعدد تشریحات کی گئی ہیں:

(۱) کہا گیا ہے حسنه فی الآخرة کا مطلب یہ ہے کہ ”رفیق اعلیٰ“ کی موافقت مل جائے، اور آگ کے عذاب سے بچا کہ یہ مولیٰ سے حجاب ہے۔

(۲) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لفظ ”حسنہ“ کو کمر فرمایا، اور نکرہ ذکر فرمایا، علم معانی کا قاعدہ ہے کہ جب نکرہ کا اعادہ کیا جاتا ہے تو غیر اولیٰ مراد ہوتا ہے، چنانچہ پہلے حسنہ سے دنیاوی حسنات یعنی استقامت و توفیق، اکتساب طاعت کے وسائل اور عند اللہ مقبول نیکیاں مراد ہیں۔ اور حسنہ ثانیہ سے مراد مذکورہ بالا امور پر مرتب ہونے والا ثواب اور عقبیٰ کی رضامندی ہے۔ اسی آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں، تمام اقوال کا حاصل مذکورہ بالا معانی سے ”اعم“ ہے۔

(۳) فی الدنيا حسنه سے مراد طاعت و تقاعد ہے اور ”وفی الآخرة“ سے تخفیف حساب رفع عذاب، دخول جنت اور رویت باری تعالیٰ مراد ہے۔ اور صرف عذاب نار سے حفاظت طلب فرمانے پر اکتفاء کیا، اس میں اشارہ سے کہ اصل شکل تو بہ ہے۔ اس کے علاوہ تمام امور آسان ہیں۔ بلکہ وہ جو سینات اور رفع درجات کیلئے سبب کے درجہ میں ہیں۔ تو گویا کہ دعائوں ہے: وقنا کل سینة فی الدنيا سینة کو ”عذاب النار“ سے تعبیر فرمایا، سیدہ سے وہ سیدہ مراد ہے جس پر جہنم کے عذاب کا ترتب ہوتا ہے، اس سیدہ سے احتراز ہے کہ جس کو تو بہ یا شفاعت، یا مغفرت مٹاؤ الٰہی ہے۔ امام طیبی نے فرمایا: وقنا عذاب النار ”تتمیم“ ہے۔

گویا کلام یوں ہے: ان صدر منّا ما یوجہ من التقصر والعصیان فاعف عنا وقنا عذاب النار۔ ابن حجر فرماتے ہیں: عذاب النار اى الحسنة والمعنوية، وهى الحجاب ولشمول النار لهذا تغلبنا ومجازا مشهورا یعلم ان هذا لیس من باب التتمیم۔

یہ سراسر خطا ہے، اور اس خطا کا سبب یہ ہے کہ ”تتمیم“ کے معنی کو ٹھیک طور پر سمجھا نہیں، چونکہ تتمیم، حصول تعیم کے بعد ہی لائی جاتی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ حصول حسنہ فی الدنیا اور وصول حسنہ فی الآخرة کے بعد عذاب النار باقی نہیں رہتا۔ نہ بمعنی عذاب، اور نہ بمعنی حجاب۔ چنانچہ کلام میں تتمیم کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ بطور فرض و تقدیر کے، یعنی لو وقع الذنب والتقصیر، فلا تؤاخذنا بالتعذیب والتعزیر۔

تخریج: حسن کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: اللهم ربنا آتنا الخ۔ اور فرماتے ہیں: بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی ان تمام حضرات نے

اس روایت کو حضرت انسؓ سے ذکر کیا ہے۔

توضیح: مصنف نے جو الفاظ ذکر کئے ہیں ممکن ہے کہ کسی روایت یا نسخہ میں ہوں۔ البتہ ان کے درمیان جمع کرنا بلاشبہ بہتر ہے، اور کسی ایک پر اکتفاء کرنا بھی درست ہے، چونکہ مقصود بہر حال حاصل ہے۔

دین و دنیا کی نعمتوں کا سوال

۲۳۸۷: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ أَكْثَرُ دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ اللَّهُمَّ إِنَّا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۹۱/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۸۹۔ و مسلم فی صحیحہ ۲۰۷۱/۴ حدیث رقم (۲۷)۔
۲۶۹۰۔ و الترمذی فی السنن ۴۸۷/۵ حدیث رقم ۳۴۸۷۔ و احمد فی المسند ۲۰۸/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اکثر دعایہ ہوا کرتی تھی اے الہی ہم کو دنیا میں نیکی عطا فرمایا یعنی نعمتیں اور اچھی حالت اور آخرت میں یعنی موت کے بعد نیکی یعنی اچھے مراتب اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

الفصل الثانی:

اللہ تعالیٰ سے کفار پر فتح کا سوال کرنا

۲۳۸۸: عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَدْعُو يَقُولُ رَبِّ اعْنِي وَلَا تَعْنِ عَلَيَّ وَأَنْصُرْنِي وَلَا تَنْصُرْ عَلَيَّ وَأَمْكُرْ لِي وَلَا تَمْكُرْ عَلَيَّ وَاهْدِنِي وَيَسِّرْ لِي الْهُدَى لِي وَأَنْصُرْنِي عَلَى مَنْ بَغَى عَلَيَّ رَبِّ اجْعَلْنِي لَكَ شَاكِرًا لَكَ ذَاكِرًا لَكَ رَاهِبًا لَكَ مَطْوَعًا لَكَ مُحِبًّا إِلَيْكَ أَوْهَا مَنِيْبًا رَبِّ تَقَبَّلْ تَوْبَتِي وَأَغْسِلْ حَوْبَتِي وَأَجِبْ دَعْوَتِي وَبَسِّطْ حُجَّتِي وَسَدِّدْ لِسَانِي وَاهْدِ قَلْبِي وَأَسْلُبْ سَخِيمَةَ صَدْرِي۔

(رواه الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۱۷۵/۲ حدیث رقم ۱۵۱۰۔ و الترمذی فی السنن ۵۱۷/۵ حدیث رقم ۳۵۵۱۔ و ابن ماجہ ۱۲۵۹/۲ حدیث رقم ۳۸۳۰۔ و احمد فی المسند ۲۲۷/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دعا مانگا کرتے تھے اے میرے رب میری مدد کر۔ یعنی مجھ کو توفیق دے اپنے ذکر اور شکر کی اور اپنی حسن عبادت کی اور مجھ پر ان کو غالب نہ کر۔ کہ وہ منع کریں مجھ کو تیری اطاعت سے۔ خواہ شیاطین ہوں خواہ نفس خواہ کفار اور مجھ کو فتح دے اور نہ فتح دے مجھ پر یعنی کفار پر مجھے غالب کر اور ان کو مجھ پر غالب نہ کر اور میرے واسطے مکر کر اور میرے خلاف مکر نہ کر اور سیدھا راستہ دکھا مجھ کو اور سیدھی راہ چلانا آسان کر دے میرے واسطے اور میری مدد کر ان پر جنہوں نے زیادتی کی مجھ پر۔ اے میرے رب مجھ کو اپنے واسطے شکر کرنے والا بنا یعنی اپنے واسطے ہر وقت ذکر کرنے والا بنا۔ یعنی ہر حال میں اپنے واسطے ڈرنے والا اپنے واسطے بہت زیادہ فرمانبردار اپنے واسطے عاجزی کرنے والا اپنے طرف بہت زیادہ آہ کرنے والا یعنی درازی کرنے والا رجوع کرنے والا اے میرے پروردگار قبول کر میری توبہ اور میرے گناہ کو دھو دے اور میری دعا تو قبول کر اور میری دلیل ثابت رکھ۔ یعنی اپنے

دشمنوں پر دنیا اور آخرت میں اور سچی اور درست کر میری زبان بھی نہ بولے مگر سچ اور حق اور میرے دل کو سیدھی راہ دکھا اور میرے سینے کی سیاہی نکال دے اس کو امام ترمذی اور ابو داؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث باعتبار سند کے حسن غریب ہے۔

تشریح: قولہ: کان النبی ﷺ یدعو یقول:

”یقول“ میں دو ترکیبی احتمال ہیں۔ (۱) ”یدعو“ سے ”بدل“ ہے۔ (۲) یدعو کی ضمیر سے حال ہے۔ وامکر لی ولا تمکر علی: قولہ: امکر لی ولا تمکر علی:

امام طیبی فرماتے ہیں: مکر کے معنی ہیں ”خداع“

”مکر“ کے معنی فریب لیکن جب اس لفظ کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے (دشمنان دین اسلام پر ایسی جگہ سے بلاؤں کا اترنا جہاں سے انہیں گمان بھی نہ ہو)۔
”سینہ کی سیاہی“ سے مراد ہے کینہ، بغض، حسد اور اسی قسم کی دوسری خصالتیں۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے بندہ کے ساتھ طاعت میں استداج۔ چنانچہ آدمی کو وہم ہوتا ہے کہ اس کی عبادت مقبول ہے، حالانکہ اس کی وہ طاعت (عند اللہ) مردود ہوتی ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: المکر الحیلۃ، والفکر فی دفع عدو بحیث لا یشعر بہ العدو۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا: اللھم اھدنی الی طریق دفع اعدائی عنی، ولا تھد عدوی الی طریق دفعہ ایای عن نفسہ۔

بعض عارفین نے اس آیت مبارکہ: ﴿سنستدرجهم من حیث لا یعلمون﴾ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ان سے کرامات کا ظہور ہوگا، حتیٰ کہ انہیں یہ گمان ہوگا کہ وہ اللہ کے ولی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کی کپڑا فرمائیں درنحال یہ کہ وہ لوگ خواب غفلت و فریب خوری میں پڑے ہوں گے، اور ان کی موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔

قولہ: واھدنی ویسر الھدی لی:

”اھدنی“: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) مجھے بھلائی کے راستے سبھا دیجئے (۲) مجھے میرے نفس کے عیوب پر مطلع فرما دیجئے۔

”ویسر الھدی لی“: (۱) یعنی میرے لئے ہدایت کی اتباع کرنا آسان فرما دیجئے (۲) ... حتیٰ کہ میں طاعت میں ثقل محسوس نہ کرو، اور عبادت کو چھوڑ کر کسی اور چیز میں مشغول نہ ہوں۔

قولہ: وانصرنی علی من بغی علی: ابن حجر فرماتے ہیں: یہ جملہ، اعنی کیلئے ”تاکید“ ہے۔

عرض مرتب: یہاں ملا علی قاری نے ابن حجر کے کلام کے اگلے حصہ پر کچھ نقد کیا ہے، لیکن ابن حجر کا وہ کلام نقل نہیں کیا ہے، سو وہ نقد ذکر کیا جا رہا ہے۔ والصواب انہ لا تخصیص لقولہ وانصرنی فی الأول۔

قولہ: رب اجعلنی لك شاکراً، لك ذاکراً: اہتمام و اختصاص کی وجہ سے جار مجرور کو مقدم کیا ہے۔ یا تحقیق مقام اخلاص کی وجہ سے مقدم ذکر کیا ہے۔ حصن میں یہ اضافی ہے: لك شاکراً لك رہا با۔ بروزن ثواب، مبالغہ کے صیغے ہیں۔

قولہ: لك مطواعاً، لك مخبتاً: میم کے کسرہ کے ساتھ، بروزن مطلق، مبالغہ کا صیغہ ہے۔

أی: کثیر الطوع۔ وهو الانقیاد والطاعة۔ اور ابن ابی شیبہ کی روایت میں ”مطیعاً“ کا لفظ ہے۔ ای: منقاداً۔

”لک مخبتا“ میں افادۂ اختصاص کیلئے لام کو ”الی“ کے قائم مقام کیا گیا ہے۔ ”خبت“ سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے: أختب الرجل۔ إذا بزل الخبت، الخبت وهو المظمن من الأرض۔ (۱) پست دکشادہ زمین، نشیبی زمین جس میں ریت ہو۔ (۲) گہری اور دراز وادی جس میں نباتات ہوں۔ پھر لفظ ”خبت“ کا استعمال ”لین و تواضع“ کے معنی میں ہونے لگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ﴾ اے اللہ! انا اے اللہ! ذکرا، او سکت نفوسہم الی امرہ۔ دوسری جگہ ہے: ﴿وَبِشْرِ الْمُخْبِتِينَ﴾ الذین إذا ذکر اللہ وجلت قلوبہم والصابرین علیٰ ما أصابہم والمقیمین الصلاة ومما رزقناہم ینفقون ﴿﴾۔

قوله: إليك أو اها منيبا: ”أو اها“ اے متضرعا۔

بروزن ”اواب“ مبالغہ کا سینہ ہے۔ کہا جاتا ہے: اؤہ تاویہا، وتاؤ آہ تاؤہا۔ إذ قال: اؤہ ائی: قانلا کثیرا لفظ اؤہ۔ وهو صوت الحزين۔ اے اللہ مجھے تفریط پر حزین و متوجع بنا دیجئے۔ کہا گیا ہے کہ اؤاہ کے معنی ہیں بکاء۔

مینبا: اے راجعا۔

توبہ، انابت اور اوبہ میں فرق:

کہا گیا ہے کہ ”توبہ“ عبادت ہے رجوع میں المعصیۃ الی الطاعة سے، اور انابت نام ہے رجوع من الغفلة الی الذکر والفکرہ۔ ”اواب“ کا اور اوبہ کہتے ہیں ”رجوع من الغیبة الی الحضور والمشاہدہ کو۔ اہ۔

امام طیبی فرماتے ہیں: ”الیک أو اها منيبا“ میں ایک جملہ پر اکتفاء کیا ہے، چونکہ انابت، ”تاؤہ“ کو لازم ہے، اس کا ردیف ہے، گویا کہ شئی واحد ہیں۔ اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمًا أَوَّاهٌ مُنِيبٌ﴾ اہ۔ ابن حجر نے امام طیبی کے کلام پر ایسی گرفت کی ہے جس کا ذکر کرنا صحیح ہے۔

قوله: رب تقبل توبتي: یعنی میری توبہ کو ایسی بنا جو صحیح ہو، شرائط و آداب توبہ کو جامع ہو، کہ ایسی توبہ قبول ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَن عِبَادِهِ﴾

ابن حجر فرماتے ہیں: حتیٰ تکون نصحاً فلا أنکثها أبدا۔ ابن حجر کے اس کلام سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نصح توبہ کو ”عدم نکث“ لازم ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: ﴿تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ نصح نون کے فتح کے ساتھ۔ اے بالغة فی النصح، اصل کے اعتبار سے تائب کی صفت ہے چونکہ ہو ینصح نفسه بالتوبة اس کے ساتھ توبہ کو موصوف کرنا بطور اسناد مجازی کے ہے، مبالغہ مقصود ہے۔ ابو بکر نے نون کے ضم کے ساتھ پڑھا ہے، یہ مصدر ہے بمعنی ”النصح“۔ اور تقدیری عبارت ذات نصح یا تنصح نصحاً لأنفسکم ہے، نصحوا کی تفسیر ”صادقه خالصه“ کے ساتھ کی ہے، عوام میں یہ مشہور ہے کہ نصح سے مراد نصح (نامی) تائب ہے۔ مفسرین کے نزدیک بالاجماع یہ تفسیر مراد نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ عزم علی عدم العود صحت توبہ کی شرط ہے، لیکن مذہب صحیح یہ ہے کہ عدم النکث شرط نہیں ہے۔ اگرچہ بعض نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ حدیث مرفوعہ میں ہے: إن التوبة النصوح أن يتوب ثم لا يعود إلى الذنب حتی يعود اللین الی الضرع۔ اس حدیث کو کمال پر محمول کیا گیا ہے۔

قوله: واغسل حوبتي: چونکہ ”حوب“ اصل میں زجر الإبل کو کہتے ہیں۔ لفظ ”ائم“ کی جگہ ”حوب“ مصدر کو ذکر کیا چونکہ:

الاستبراء من فعل الذنب أبلغ منه من نفس الذنب۔ (کذا قیل) اور یہ بھی ممکن ہے رعایت تجح کیلئے یہ لفظ ارشاد فرمایا ہو۔ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿إِنَّ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا﴾ حوبہ کے ساتھ غسل ذکر فرمایا کہ ازالہ بالکلیہ مراد ہے، جیسا تڑھ اس قدر سے

کیا جاتا ہے کہ جس کی مجاورت سے ناگواری ہوتی ہو۔

ابن حجر: لکھتے ہیں: ای: ازل آٹامی بتبدیلہا حسنات۔ یہ بیان کردہ توضیح لغت اور مفہوم حدیث سے خارج ہے۔

قولہ: واجب دعوتی: ”دعوت“ سے مراد ”دعاء“ ہے اور ابن حجر لکھتے ہیں: ذکر لأنه من فوائد قبول التوبة اها اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ غیر تائب کی دعا قبول نہیں ہوتی، حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ صحیح روایت ہے کہ مظلوم کی دعا مقبول ہوتی ہے اگرچہ وہ فاجر ہی کیوں نہ ہو۔ اور ایک روایت میں (تو یہاں تک) آتا ہے: ولو كان كافرا۔

قولہ: وثبت حجتی: اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں (۱) میری دلیل و حجت کو اپنے دشمنوں پر دنیا و عقبی میں ثابت فرما۔ (۲) میرے قول و تصدیق کو دنیا میں اور حواب ملکین کے وقت ثابت فرما۔

قولہ: واسلل سخيمة صدری: امر کا صیغہ ہے، از باب نصر، بمعنی اخرج، سل السيف إذا اخرج من العمد سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ اس کے معنی ہوئے اخرجها ونق الصدر منها۔ سخيمة صدری: ابن ابی شیبہ کی روایت میں ”صدری“ کی بجائے ”قلبی“ آیا ہے۔ ”سخيمة“ کے مختلف معانی ذکر کئے ہیں۔

(۱) السخيمة: الضغن والحقد، من السخمة، وهو السواد، ومنه سخام القدر۔

(۲) قيل: السخيمة الضغينة، وإضافتها إلى الصدر لأن مبدأها القوة الغضبية التي في القلب الذي هو في الصدر۔ امام طیبی فرماتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ حرف عطف ترک کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ کہ رب اجعلنی الی نیامیں ذکر نہیں کیا، اور پچھلے جملوں کا ذکر کیا ہے۔ جواب یہ ہے: أما الترتك فللتعداد والإحصاء، لبدل علی أنه ما كان لله غير معدود، ولا داخل تحت محدود، فينعطف بعضها على بعض، ولذا قدم الصلة على متعلقاتها، وأما الإتيان بالعطف فيما كان للبعد فلا تضابطه اه۔ ابن حجر نے امام یحییٰ کے کلام پر بے فائدہ گرفت کی ہے۔ ابن حجر اگر فتاملہ کہہ دیتے تو ان کے فتاملہ پر توجہ دینا مناسب ہوتا۔

اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو

۲۳۸۹: وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى الْمُنْبَرِ ثُمَّ بَكَى فَقَالَ سَلُوا اللَّهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فَإِنَّ أَحَدًا لَمْ يُعْطَ بَعْدَ الْيَقِينِ خَيْرًا مِنَ الْعَافِيَةِ۔

(رواه الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۲۱۵ حدیث رقم ۳۵۰۸۔ وابن ماجہ ۱۲۶۰/۲ حدیث رقم ۳۸۴۹۔ واحمد فی المسند ۳/۱۔

ترجمہ: حضرت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے پھر روئے اور فرما اللہ سے بخشش مانگو اور عافیت اس لیے کہ کوئی یقین بعد نہیں دیا گیا۔ یعنی ایمان کی دولت کے بعد کوئی نعمت عافیت سے بہتر نہیں ہے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ نے کہا اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے باعتبار سند کے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث باعتبار سند کے غریب ہے۔

تشریح: قولہ: قام رسول اللہ ﷺ علی المنبر ثم بکی: آنحضرت ﷺ جانتے تھے کہ میری امت کے افراد خواہشات

نفس ہوں و حرص اور غلبہ شہوت کے فتنوں میں مبتلا ہوں گے اس لئے آپ ﷺ اس کے تصور سے بھی رونے لگے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے منبر رشد و ہدایت سے یہ حکم فرمایا کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت و بخشش کی طلب کریں اور عافیت مانگیں تاکہ پروردگار انہیں ان آفات

دبلاء سے محفوظ و مامون رکھے۔

قولہ: سلوا اللہ العفو والعافية: ”عفو“ یہ ہے کہ گناہ محو ہو جائیں، اور عیوب پر پردہ پڑ جائے۔ العافية: (۱) قیل: هو ان يعافيك الله من الناس و يعافيه منكم (۲) قیل: ان تعفوا عنهم و يعفوا عنكم۔ زیادہ واضح بات یہ ہے جو اوپر ذکر کی چونکہ بیان کردہ دونوں معانی، لفظ ”عافیت“ کے نہیں، بلکہ ”معافاة“ کے ہیں۔ جیسا کہ (اہل علم پر) مخفی نہیں۔

”عافیت“ کے معنی ہیں سلامتی حاصل ہونی دین میں فتنہ سے اور جسم و بدن کو بری بیماریوں، شدید مصائب اور سخت رنج و تکلیف سے۔ قولہ: فان احدا..... من العافية: سے مراد ”علم الیقین“ یعنی ایمان اور دین میں بصیرت ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: وہی السلامة من الآفات فيندرج فيها العفو۔ یعنی ”عافی“ کے معنی میں چونکہ عموم ہے چنانچہ ”عفو“ کو بھی شامل ہے، اسی لئے ثانیاً صرف ”عافیت“ کو ذکر فرمایا، ”عفو“ کا ذکر نہیں کیا، اور پہلے جملہ میں دونوں کو صراحتاً ذکر فرمانا اشارہ ہے کہ ”عفو“ عافیت کی اقسام و انواع میں سے اہم ہے۔ ابن حجر، امام طیبی کے کلام کا خلاصہ ذکر کرنے کے بعد ”نوکھی“ بات کہی ہے: فان قلت: كيف أفرد العافية بعد جمعها؟ قلت: لأن معنى العفو محو الذنوب، ومعنى العافية السلامة عن الأسقام والبلايا، فاستغنى عن ذكر العفوبها لشمولها له۔

ملا علی قاری و غیرت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ان أخذ الذنوب من البلايا ليس من كتاب اللغة، ولا من باب التعارف، وإن كانت الصوفية قد يعبرون عن المعصية بالبلية، ولكنه من أصحاب العبارات لا من أرباب الإرشادات۔

تخریج: میرک فرماتے ہیں: حاکم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: سلوا اللہ العفو والعافية والیقین فی الأولى والآخرۃ۔

سب سے بہتر دعا عافیت مانگنا ہے

۲۳۹۰: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَيُّ الدُّعَاءِ أَفْضَلُ قَالَ سَلْ رَبَّكَ الْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ثُمَّ آتَاهُ فِي الْيَوْمِ الثَّانِي فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَيُّ الدُّعَاءِ أَفْضَلُ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ آتَاهُ فِي الْيَوْمِ الثَّلَاثِ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ ذَلِكَ قَالَ فَإِذَا أُعْطِيتَ الْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَقَدْ أَفْلَحْتَ۔ (رواه الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۹۹/۵ حدیث رقم ۳۵۱۲۔ وابن ماجہ ۱۲۶۵/۲ حدیث رقم ۳۸۴۸۔ واحمد فی المسند ۱۲۷/۳ ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ تحقیق ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ کون سی دعا بہتر ہے فرمایا اپنے رب سے عافیت مانگ۔ یعنی دین میں سلامتی اور بدن میں اور معافات یعنی۔ تجھ کو اللہ تعالیٰ عافیت سے رکھے لوگوں سے اور عافیت سے رکھے ان کو تجھ سے دنیا میں اور آخرت میں۔ پھر وہ شخص نبی کریم ﷺ کے پاس دوسرے دن آیا پھر اس نے کہا اے اللہ کے رسول کون سی دعا بہتر ہے پس فرمایا اس کی مانند یعنی جو پہلے دن فرمایا تھا۔ پھر وہ تیسرے دن آیا پس فرمایا اس سے اسی کی مانند یعنی فرمایا جس وقت تو عافیت دیا جائے اور دنیا اور آخرت میں معافات پس تحقیق چھٹکارا پایا تو نے اور مقصد کو پہنچا اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ نے اور امام ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے سند کے اعتبار سے۔

تشریح: قولہ: سل ربك العافية..... الآخرة:

قوله: فقال له مثل ذلك: "منصوب على المصدريه"۔

قوله: فقد أفلحت: أي خلصت من خوفك وظفرت بمقصودك۔ کہا گیا ہے کہ شریعت میں اُفلاح سے زیادہ جامع

کوئی نہیں، سوائے عافیت کے اور اسی طرح نصیحت ہے۔

توضیح: هذا حديث حسن غريب إسنادا: ثانی سے تیز کرنا مقصود ہے، چونکہ "غرابت" کبھی متن میں ہوتی ہے اور کبھی اسناد میں۔ کما هو مقرر في أصول الفقه۔ "حسن" ہونا باعتبار سند ہی کے ہوتا ہے۔ لہذا اس میں ایسا کوئی ابہام نہیں کہ اس ابہام کو دور کرنے کیلئے تیز کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ ابن حجر کا یہاں اور اس جیسی دوسری جگہوں پر یہ کہنا: "تیمیز عن حسن وغریب"، کثرت غفلت یا قلت تیز کی وجہ سے ہے۔

تخریج: امام طبرانی حضرت عباسؓ سے نقل کرتے ہیں: انه قال، قلت، يا رسول الله! علمني شيئا أدعوا الله به، فقال:

سل ربك العافية، فمكثت أياما ثم جئت، فقلت: يا رسول الله! علمني شيئا أسأله ربي عز وجل، فقال: يا عم! سل الله العافية في الدنيا والآخرة۔ طبرانی کی ایک روایت میں یوں ہے: يا عم! اكفر الدعاء بالعافية۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کا سوال کرنا

۲۳۹۱: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ يَزِيدِ الْخَطْمِيِّ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ فِي دُعَائِهِ أَللَّهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يَنْفَعُنِي حُبَّهُ عِنْدَكَ أَللَّهُمَّ مَا رَزَقْتَنِي مِمَّا أَحْبَبْتُ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِي فِيمَا تُحِبُّ أَللَّهُمَّ مَا رَزَوْتَنِي عَنِّي مِمَّا أَحْبَبْتُ فَاجْعَلْهُ قَرَأَعًا لِي فِيمَا تُحِبُّ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۸۸۱۵ حدیث رقم ۳۴۹۱۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن یزید خطمیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے یہ کہ وہ اپنی دعا میں کہتے تھے اے الہی مجھے اپنی دوست نصیب کر اور اس شخص کی دوستی جو مجھ کو نفع دے اس کی دوستی جو تیرے نزدیک ہے اے الہی جو کچھ کہ تو نے مجھ کو دیا اس چیز سے کہ میں پسند کرتا ہوں پس تو اس کو میری قوت بنا، اس چیز میں جسے تو پسند کرتا ہے یعنی جو نعمتیں تو نے دی ہیں مال اور عافیت اور نعمت دنیویہ اور اس کو طاعت اور شکر کا سبب بنا کہ خرچ کروں ان کی تیری راہ میں اور تیری رضامندی میں۔ اے الہی جو کچھ سمیٹ رکھا ہے۔ مجھ سے اس چیز سے جس کو میں پسند کرتا ہوں پس اس کو میری فراغت کا سبب بنا دے اس چیز میں جس کو تو پسند کرتا ہوں۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم ارزقني حبك: اس اضافت میں دو احتمال ہیں (۱) مصدر کی اضافت اپنے فاعل کی طرف ہے۔

(۲) مصدر کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے۔ پہلا احتمال زیادہ یلغ ہے، اور اصل بھی یہی ہے، باوجودیکہ دونوں متلازم ہیں۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: ﴿يحبهم ويحبونه﴾ اور دوسرا احتمال زیادہ واضح ہے، چونکہ اول ازلی ہے، اور دعا کا تعلق حادث ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اگلے جملہ مناسبت سے بھی یہی واضح ہے۔

قوله: وحب من ينفعني حبه عندك: ظرف "ينفعني" کے متعلق ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: وهو من يتقرب إليك بحبه

من المقربين إليك۔ یہ عبارت "وہم" ہے۔ فتامل:

قوله: اللهم ما رزقتني..... فيما تحب: حسن کی روایت میں "کما رزقتني" ہے۔

قوله: اللهم ما زويت..... فيما تحب: حسن کی روایت میں اللهم وما زويت کے الفاظ ہیں۔ زویت، زئی سے ماخوذ

ہے: بمعنی ”قبض و جمع“ اسی معنی میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی ہے: اللھم اُزو لنا الأرض وھون علينا السفر۔ اسی اطوھا جیسا کہ دوسری روایت میں آیا ہے۔

دعا کے آخری جز کا مطلب یہ ہے کہ تو نے مجھے مال و زر میں سے جو کچھ نہیں دیا ہے اس کو میرے لئے اپنی عبادت میں مشغولیت کا سبب بنا کہ مجھے قناعت و توکل کی دولت حاصل رہے اور وہ مال و زر جو مجھے حاصل نہیں ہوا ہے اس سے بے پروا ہو کر بغیر مانع کے تیری عبادت میں مشغول رہوں اور حاصل دعا کے آخری دونوں جملوں کا یہ ہے کہ اگر تو مجھے دنیا کی نعمتیں عطا کرے تو پھر ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق بھی عطا فرماتا کہ میرا شمار شکر کرنے والے اغنیاء کے زمرہ میں ہو اور اگر مجھے وہ نعمتیں حاصل نہ ہوں تو میرے دل کو فارغ رکھ بائیں طور کہ میں ان سے بے پروا ہو جاؤں میرا دل ان میں نہ لگا رہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ تیری عبادت میں مشغول رہوں اور جزع و فزع، شکوہ و شکایت نہ کرو تا کہ میرا شمار صبر کرنے والے فقراء میں ہو۔ قاضی اور طیبی نے بھی اس سے ملتی جلتی تشریح کی ہے۔

قال القاضي: یعنی ما صرفت عنی من محابى فتحه عن قلبه واجعله سببا لفرغى لطاعتك ولا تشغل به قلبى فيشغل عن عبادتك۔ وقال الطيبى: اى اجعل ما نحيته عنى من محابى عوناً لى على شغلى بمحابتك وذلك ان الفراغ خلاف الشغل فاذا زوى عنه الدنيا ليتفرغ بمحابى ربه كان ذلك الفراغ عوناً له على الاشتغال بطاعة الله وفى الحديث قال عمر: عجبت لما زوى الله عنك۔

ایک جامع دعا

۲۳۹۲: وَعَنْ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَلَّمَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَفُومُ مِنْ مَجْلِسٍ حَتَّى يَدْعُو بِهٰؤُلَاءِ الدَّعَوَاتِ لِأَصْحَابِهِ اللَّهُمَّ أَقْسِمَ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُولُ بِهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تَبْلُغُنَا بِهِ جَنَّاتِكَ وَمِنَ الْيَقِينِ مَا تَهْوُونَ بِهِ عَلَيْنَا مُصِيبَاتِ الدُّنْيَا وَمَتَبَعَنَا بِأَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُوَاتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلَى مَنْ ظَلَمْنَا وَانصُرْنَا عَلَى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيبَتَنَا فِي دِينِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا تَبْلُغْ عَلْمَنَا وَلَا تَسْلُطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا۔

(رواہ الترمذی وقال حدیث حسن غریب)

احرجہ الترمذی فی السنن ۴۹۳/۵ حدیث رقم ۳۵۰۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی مجلس سے اٹھتے تھے یہاں تک کہ یہ دعائیں اپنے صحابہ کے لئے مانگتے تھے یعنی اس لیے کہ وہ اس میں داخل ہیں یا ان کی تعلیم کے لیے۔ اے الہی! ہمارے لیے اپنا خوف نصیب کر اس قدر کہ تو اس کی وجہ سے ہمارے اور ہمارے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے یعنی اس ڈر کے سبب سے تیرے گناہوں سے بچیں اور ہمیں اپنی طاعت نصیب فرما۔ اس قدر کہ تو ہم کو اس کی وجہ سے اپنی بہشت میں پہنچائے اور یقین سے نصیب اچھے کر اس قدر کہ جس کی وجہ سے ہم پر دنیا کی مصیبتیں ٹل جائیں اور بہرہ مند کر ہم کو ہماری سماعتوں کے ساتھ بہرہ مند فرما اور ہماری بے تابیوں کو ہماری قوت کے ساتھ بہرہ مند فرما جب تک کہ تو ہم کو زندہ رکھے اور بہرہ مندی کو ہمارا وارث بنا یعنی خیر عمر تک اس کو باقی رکھ۔ یعنی تمام عمر اعضاء اور ہمارے حواس کو سلامت رکھ۔ ہمارے کینہ و انتقال میں اس شخص کو مشغول کر جنہوں نے ہم پر ظلم کیا ہے ہم پر ظلم کیا ہے یعنی ہم کو ظالموں پر بدلہ لینے پر قادر کر دے۔ یا ہماری طرف سے بدلہ لے اور ہم کو فتح دے اس سے جو ہم سے دشمنی رکھے، دشمن دینی ہو یا دنیوی اور ہماری مصیبت

ہمارے دین میں شمار نہ کر یعنی ایسی چیزوں میں مبتلا نہ کر جو دین کے نقصان کا باعث ہوں اور دنیا کو ہمارے لئے بہت بڑا اندیشہ نہ کرو اور نہ ہمارے علم کو مطمع نظر بنا اور ہم پر اس کو مسلط نہ کر کہ جو ہم پر رحم نہ کرے۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قولہ: اللہم اقس من خشیتک..... معاصیک: ”خشية“ خوف مع التعظیم کو کہتے ہیں۔ ما تحول بہ: ای مقداراً تحجب أنت بسببہ۔ چونکہ معاصی اور ہمارے درمیان آپ کی خشیت سے بڑھ کر کوئی مانع نہیں، حدیث میں آتا ہے: نعم العبد صہیب لولم یخف اللہ لم یعصہ۔ ان کے کمال کو مبالغہ کے ساتھ بیان فرمایا، کہ ان میں ترک عصیان محبت سے پیدا ہوا ہے، ناکہ اس رعب مع الخشیہ سے جو خوف سے ”اخص“ ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ایک نسخہ میں ”یحول“ ہے، یعنی پائے تحتانیہ کے ساتھ، اور ”بہ“ مذکور نہیں ہے۔ ای: قدرا یمنع بیننا و بینہا۔ حال یحول حیلولۃ سے ماخوذ ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: ای بسببہ او ہی باء الالۃ، و کلاهما مجاز اھ۔ ابن حجر کا یہ کلام درست نہیں ہے، چونکہ حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، مزید یہ کہ اللہ جل شانہ کے حق میں ”آلہ“ کا اطلاق نطاً فاحش ہے۔ اور اگر مجاز سے مراد حقیقت کی ضد ہے باعتبار لغت، تو واضح رہے کہ ارباب لغت کا کہنا ہے کہ: انہما حقیقتان فی معنیہما۔ چنانچہ قاموس میں لکھتے ہیں: باء برائے سمیت ہے: ﴿فکلّا أخذنا بذنبہ﴾ (۲) ﴿انکم ظلمتم أنفسکم باتخاذکم العجل﴾ اور ”استعانت“ کیلئے ہے: ”کتبت بالقلم وتجرت بالقدوم اور اسی قبیل سے بائے ”بسملہ“ ہے اھ ان مثالوں کے ذکر کرنے میں ایک قسم کی تشبیہ بھی ہے اور اپنی کہی ہوئی بات کہ توجیہ وجیہ بھی کہ اللہ جل شانہ افعال پر سمیت کا اطلاق اور دوسروں کے افعال میں بھی۔ بخلاف آلہ و استعانت کے۔ چونکہ اللہ جل شانہ ان دونوں سے منزہ ہے۔ ”ما تبلغنا“: از باب تفعیل، واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔

قولہ: ومن طاعتک ما تبلغنا بہ جنتک: ابن حجر نے اس کی تشریح یہ بیان کی ہے: ای نصیباً و افراً یحصل لنا بتلغنا۔ اس کے ظاہر سے یوں لگتا ہے کہ تبلغنہ باب تفعیل کا مصدر ہے رواہ ائٹ اور ایضاً ہر اعتبار سے خطا ہے۔ مزید لکھتے ہیں ابان تدخلنا مع الناجین یہ تشریح اس مقام کے مناسب نہیں ہے۔

قولہ: ومن الیقین ما تھون بہ علینا مصیبات الدنیا:

ایک روایت میں ”مصائب الدنیا“ ہے۔

”ہمیں اتنا یقین عطا فرما“ کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنی ذات و صفات پر اور سرکارِ دو عالم ﷺ کے ارشادات و تعلیم پر ہمیں اس درجہ کا یقین و اعتماد عطا فرما کہ دنیا کی سختیاں اور یہاں کے مصائب و آلام ہمارے لئے آسان ہوں۔ مثلاً جس شخص کو یہ یقین ہوگا کہ اللہ تعالیٰ رزاق ہے ہر جاندار کی ضروریات زندگی پورا کرتا ہے تو اسے ہرگز کوئی فکر نہیں ہوگی اور وہ اس کی ذات پر بھروسہ و اعتماد کرے گا اسی طرح جسے اس یقین کی دولت حاصل ہو جائے گی کہ آخرت کی سختیاں اور وہاں کے مصائب زیادہ سخت ہیں۔ دنیا کی سختیاں بالکل ناپائیدار اور ختم ہو جانے والی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو اس کے لئے دنیا کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔

ہم دنیا کی بہت زیادہ فکر و تدبیر میں نہ لگے رہیں۔ بلکہ آخرت کی فکر و تدبیر میں کے اندیشہ کا زیادہ خیال رکھیں دنیا کی صرف اتنی ہی فکر اور اپنے معاش کا اتنا ہی خیال رکھیں جو ضروری ہے اور جس کے لئے نہ صرف ہمیں اجازت ہے بلکہ مستحب بھی ہے۔ اور اس بات کا یقین کہ کوئی آپ کی قضاء و قدر کو رد کرنے والا نہیں، جو کچھ آپ نے لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ آپ نے جس کو جو طاقت و قوت دی ہے، حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔

ایک روایت میں ”ما یھون علینا“ ہے اور ”بہ“ کا اضافہ بھی نہیں ہے۔ اس روایت کا تقاضا یہ ہے کہ آخر میں یا ہونا چاہئے اور ”بہ“ کے اثبات کا تقاضا یہ ہے کہ تائے مثلاً کے ساتھ ہو۔

قولہ: و متعنا بأسماعنا و أبصارنا و قوتنا ما حییتنا:

یعنی ہماری سماعت، بصارت و قوت سے نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرما کہ ہم ان کو آپ کی اطاعت میں صرف کریں۔

ابن الملک فرماتے ہیں: سمع و بصر سے نفع اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری موت کے وقت تک یہ تمام صحیح و سالم رہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ سمع سے مراد ما یسمع، اور بصر سے مراد ما یبصر ہے۔ باقی قوی کے بارے میں بھی اسی طرح مراد ہے۔

”ما أحييتنا“: (میں ”ما“ مصدر یہ ظریف ہے۔) ای مدۃ حیاتنا۔

امام طبری فرماتے ہیں: حواس میں سے سمع و بصر کی وجہ تخصیص یہ ہے کہ توحید اور معرفت باری تعالیٰ تک لے جانے والے دلائل انہی دو ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ چونکہ براہین آیات سے ماخوذ ہوتے ہیں، اور یہ بذریعہ سمع ہوتا ہے یا جہاں میں پھیلی ہوئی نشانیوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اور اس کا ادراک بذریعہ بصر ہوتا ہے۔ چنانچہ ان دو اعضاء سے متمتع ہونے کا سوال کیا۔ تاکہ جن لوگوں کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور انہی دو اعضاء سے معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسی معرفت پر ”عبادت“ کا ترتیب ہوتا ہے، چنانچہ ”قوت“ کا سوال بھی کیا تاکہ اپنے رب کی عبادت پر تمکن حاصل ہو سکے۔ اھ

آیت اور حدیث دونوں میں سمع کا ذکر بصر سے مقدم ہے۔ جمہور کا قول ہے کہ یہ تقدیم سمع کی افضلیت پر دلالت کر رہی ہے.... عرض مرتب: اس موضوع پر کلام ماقبل میں گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اھ

قوت سے مراد: اس سے مراد تمام اعضاء و حواس کی قوت ہے۔ یا تمام حواس کی قوت مراد ہے۔ اس صورت میں ”بہ“ تعیم بعد تخصیص کی قبیل سے ہوگا۔ ابن حجر لکھتے ہیں: و بما تقرر علی وجہ ذکر ہذین دون بقیۃ الحواس، ثم رأیت الشارح صرح بما ذکرته فقال: وإنما خص السمع والبصر الخ۔

ملا علی قاری اس کی تردید میں لکھتے ہیں: و أما قول ابن حجر: فمرود لأن مراد الطیبی أنه إنما خص السمع والبصر سابقا مع دخولهما فی تعمیم قوتنا لاحقا، لا أنه إنما خصا بالذکر بمعنی أنه لم یذکر غیرهما من القوى الظاهرية والباطنية فقال: لأن الفرق دقیق و بالتأمل حقیق۔

قولہ: و اجعلہ الوارث منا: ضمیر غائب ”ما متعنا بہ“ کی طرف عائد ہے۔ ای اجعل کل واحد منها یعنی اجعل ما متعنا بہ۔ زین العرب فرماتے ہیں: زختری نے ضمیر کو مصدر محذوف کی طرف لوٹایا ہے، ای اجعل الجعل، أو جعل الوارث من عشرینا۔ چنانچہ ”منا“ مفعول ثانی ہوگا، جعل کیلئے۔ امام طبری فرماتے ہیں: ضمیر مصدر کی طرف راجع ہے۔ ای اجعل الجعل۔ اور ”الوارث“ مفعول اول ہے۔ اور ”منا“ مفعول ثانی کی جگہ ہے۔ ای اجعل الوارث من نسلنا، لا کلالۃ فارجۃ عنا۔ صاحب کشف الکشاف لکھتے ہیں: عقلاء کے ہاں یہی معنی مقصود ہیں، اللہ جل شانہ حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿فهب لی من لدنک ولیا یرثنی و یرث من آل یعقوب﴾ اور یہ اولیٰ ہے....

اور اس وجہ سے بھی اصل عدم تاویل ہے کہ اس کی تائید اس آیت مبارکہ سے بھی ہو رہی ہے: ﴿رب لا تذرنی فردا و أنت خیر الوارثین﴾ ابن حجر نے اس قول پر بے سود گرفت کی ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہاں ابن حجر کا کلام ذکر نہیں کر رہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ضمیر مصدر التمتع کی طرف لوٹ رہی ہے، وہ اس کا مفعول اول ہے اور ”الوارث“ مفعول ثانی ہے، اور ”منا“ اس کا صلہ ہے۔ ای اجعل

التمتع باقیاسنا مآثورا فیمن بعدنا۔ اس کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے: وفقنا لحیازة العلم لا المال حتی یکون العلم هو الذی ینقی منا۔

کہا گیا ہے کہ ضمیر بتاویل ”مذکور“ اسما، البصار وقوت کی طرف راجح ہے۔ اے: اجعل المذكور باقیلا لازما عند الموت لزوم الوارث۔

صاحب ”الکشاف“ لکھتے ہیں: مراد یہ ہے کہ ان اعضاء کو ہماری موت تک ہمارے ساتھ صحیح و سالم رکھ اور اس میں مبالغہ کرتے ہوئے فرمایا ان کو ایسا بنا گویا کہ موت کے بعد بھی باقی رہیں۔ چونکہ وارث موت کے بعد باقی رہتا ہے اور کہا گیا ہے کہ ضمیر اس ”تمتع“ کی طرف راجح ہے جس پر ”تمتع“ دلالت کر رہا ہے۔ اور مطلب یہ ہے: اجعل تمتعنا باقیامنا محفوظا لنا الی یوم الحاجة۔ اور خطاب نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ جل شانہ سے یہ سوال کیا کہ جب میں بڑھاپے کو پہنچ جاؤں اور میرے تمام اعضاء کمزور پڑ جائیں تو سماع و بصر کو باقی رکھنا تاکہ یہ دونوں اعضاء میری تمام قوتوں اور تمام اعضاء کے وارث ہو جائیں۔ اھ یہ کلام محل نظر ہے چونکہ قوت سامعہ و باصرہ انفع القوی ہیں، اس لئے اولان دونوں کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا، اور پھر تعمیماً ذکر فرمایا۔ اور کہا ہے کہ یہ مراد اولیٰ ہے: لا ینقطع هذا الفیض الالہی عنه، وعن اتباعه لکونہ رحمة للعالمین وهدی للمتقین۔

قوله: واجعل ثارنا علی من ظلمنا:

”ثار“: بالهمز بعد المثناة المفتوحة۔ اس کے اصل معنی ”حق“ و ”غضب“ ہیں۔ کہا جاتا ہے: ثارت القتیل وبالقتیل اے قتلت قاتلی۔ ابن حجر فرماتے ہیں: ثوران سے مؤخوذ ہے کہا جاتا ہے: ثار اے ہاج غضبہ۔ از روئے لغت یہ کھلم کھلا خطا ہے۔ چونکہ ”ثار“ مہوز العین ہے، اور ثار معتل العین ہے۔ لہذا دونوں کا ماڈہ جدا ہے، جیسا کہ قاموس اور نہا یہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ابن حجر کے نسخہ میں ثارنا الف کے ساتھ ہو، یا انہوں نے الف کے ساتھ پڑھا ہو۔ لیکن بہر حال حجت نہیں۔ چونکہ ہمزہ ساکنہ کو سب ہی ابدال کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

قوله: ولا تجعل مصیبتنا فی دیننا یعنی ہمیں ایسی مصیبتوں میں مبتلا نہ کر جو دین کے نقصان کا باعث ہوں، کہ ہم سوء اعتقاد کا شکار ہو جائیں، یا حرام خوری میں مبتلا ہو جائیں، یا عبادت میں سستی دکھاتا ہی ہونے لگے وغیرہ۔

قوله: لا تجعل الدنیا اکبر ہمنا: دنیا کو ہماری سوچ اور فکر مت بنا، کہ ہم مال و جاہ کے چکر میں پڑ جائیں، اور اس کی تحصیل میں لگ جائیں، بلکہ ہماری سوچ اور فکر کا محور اعمال آخرت کو بنا۔ اس جملہ میں اشارہ ہے کہ معاش کی تھوڑی بہت سوٹ اور فکر نا صرف مرض و مستحب بلکہ واجب ہے۔ اور ابن حجر یوں لکھتے ہیں: وخرج باکبر ما لوساوی ہم الخیر و ہم الدنیا أو نقص الفانی، إذ صاحبہ من اهل الجنة۔ ابن حجر کی ذکر کردہ تشریح مقام دعا کے مناسب نہیں۔

قوله: ولا مبلغ علمنا: یعنی ہمیں ایسا فکر مند بنا دے کہ ہم ایسے علوم میں لگے رہیں کہ جو اللہ جل شانہ اور در آخرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مبلغ: الغایة التی ینلغہ الماشی و لمحاسب فیقف عنده۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فاعرض عنم تولی عن ذکرنا ولم یرد الا الحیاة الدنیا ذلک مبلغهم من العلم﴾ اور دو سری جگہ فرمایا: ﴿یعلمون ظاهرا من الحیاة الدنیا و هم عن الآخرة هم غافلون﴾ حدیث میں اس عالم کی مدح فرمائی ہے جس کا حال اس کے برعکس ہو۔ چنانچہ فرمایا: اکثر اهل الجنة البله۔ اے لا یعلمون امور الدنیا و هم بالآخرة عالمون موقنون۔ قوله: ولا تسلط علینا من لا یرحمنا: اس سے مرد کافر ہیں، یا ظالم امراء ہیں، یا بیوقوف جبلاء ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اللہ ان جیسے

لوگوں کو ہم پر مسلط نہ کرے اور امام طیبیؒ لکھتے ہیں: اٰی لا تجعلنا مغلوبین للکفار والظلمة ویمحتمل ان یراد: ولا تجعل الظالمین علینا حاکمین، فان الظالم لا یرحم لرعیة..... اولیٰ یہ ہے کہ اس سے مراد قبر کے ملائکہ ہوں۔ یہ مفہوم مراد لینے کی صورت میں ’وانصرنا علی من عادانا‘ کے ساتھ تکرار لازم نہیں آئے گا۔ اولیٰ یہ ہے کہ معنی اعم پر محمول کیا جائے۔ اس صورت میں تعیم بعداً تخصیص ہوگی۔ چونکہ تخصیص کی تقریر پر بھی تکرار سے خلاصی ممکن نہیں۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: من لا یرحمنا للکفر أو عتو أو بدعة أو محنة نحو ما یریده منا بأن تجعل له شوكة یتمكن بها علی ما یریده منا۔ یہ سارا مفہوم من عادانا کے تحت پہلے سے شامل ہے، لہذا مزید یہ کہنا درست نہیں: وبما قررته یعلم ان قوله: وانصرنا علی من عادانا لا یغنی عن هذا خلافا لمن زعمه۔ آگے لکھتے ہیں: وانما سألوا ذلك لضعفهم عن احتمال فتنة البصر عن الأذیة۔ یہ بھی خطا فاحش ہے، چونکہ یہ دعائے والا اللہ کا نبی ہے۔ اور اس کے ساتھ موجود لوگ صحابہ کرام ہیں، جو کالمین ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم یوں کہہ رہا ہے: ﴿والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس﴾ نبی کریم ﷺ کے اس سوال میں اظہار عبودیت ہے، اور اشارہ ہے کہ عافیت مصیبت میں مبتلا ہونے سے زیادہ وسیع ہے، وقوع یاء سے، پہلے کیلئے حکم یہی ہے۔ اور مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو حکم یہ ہے: ﴿وما صبرک الا باللہ﴾ اور ﴿واصبروا ان اللہ مع الصابریں﴾ چنانچہ اللہ کی طرف کامل رجوع کریں گے اور یہ مانگیں گے: ﴿ربنا أفرغ علينا ضرا ورتوفنا مسلمین﴾۔

علم کی زیادتی کا سوال کرنا

۲۴۹۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي وَزِدْنِي عِلْمًا الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ وَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ۔

(رواه الترمذی وابن ماجه وقال الترمذی هذا حدیث غریب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۴۰/۱۵ حدیث رقم ۳۵۹۹۔ وابن ماجه ۹۲/۱ حدیث رقم ۲۵۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الٰہی نفع دے مجھ کو اس چیز سے جو تو نے مجھ کو سکھائی یعنی عمل پر نصیب ہو اور مجھ کو وہ چیز سکھا جو نفع دے مجھ کو۔ یعنی ایسا علم دے کہ نفع دے مجھ کو۔ وہ اور عمل کرنا اس پر دین میں اور آخرت میں اور میرے علم کو زیادہ کر یعنی علم دین کا سب تعریف ہے اللہ تعالیٰ کے واسطے بہر حال اور میں پناہ مانگتا ہوں فوزخوں کے حال سے یعنی دنیا میں کفر و فسق سے بچوں اور آخرت میں عذاب سے۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ حدیث غریب ہے باعتبار سند کے۔

تشریح: قوله: اللهم انفعني..... وزدني علما: امام طیبیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اٰی اجعلنی عالما یعلمی، وعلمنی علما أعمل به۔ اس جملہ میں اس حدیث مبارکہ کی طرف اشارہ ہے۔ من عمل بما علم ورثه اللہ علم ما لم یعلم اور مزید علم کی طلب کرنا یہ ’سلوک‘ کی انتہاء ہے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو علم کے علاوہ کسی بھی شے کے مزید طلب کرنے کا حکم نہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وقل رب زدنی علما﴾

قوله: زدنی علما: علم ’لدنی‘ عطا فرما۔ جو آپ کی ذات، اسماء و صفات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جملہ سے پتہ چلا کہ علم کو عمل پر فضیلت حاصل ہے۔

قوله: الحمد لله على كل حال: یعنی مزید نعمتوں کے حصول کیلئے بندہ کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرے۔ ارشاد باری

تعالیٰ ہے: ﴿لَنْ شُكِرْتُمْ لِأَزِيدَنَّكُمْ﴾

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی اور حاکم نے حضرت انس سے بایں الفاظ نقل کیا ہے:
اللهم انفعنی بما علمتنی و علمنی ما ینفعنی، و ارزقنی علما تنفعنی بہ۔

وحی کی کیفیت کا بیان

۲۳۹۳: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ سَمِعَ عِنْدَ وَجْهِهِ دَوِيًّا كَدَوِيِّ النَّحْلِ فَإِنزَلَ عَلَيْهِ يَوْمًا فَمَكُنَّا سَاعَةً فُسِّرَ لِي عَنْهُ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ اللَّهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَآكْرِمْنَا وَلَا تِهِنَّا وَأَعْظِمْنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَإِثْرْنَا وَلَا تُؤَثِّرْ عَلَيْنَا وَأَرْضَنَا وَأَرْضَ عَنَّا ثُمَّ قَالَ أَنْزَلَ عَلَيَّ عَشْرَ آيَاتٍ مِّنْ أَقَامَهُنَّ دَخَلَ الْجَنَّةَ ثُمَّ قَرَأَ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ حَتَّى خَتَمَ عَشْرَ آيَاتٍ۔ (رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۰/۵ حدیث رقم ۳۱۷۳۔ واحمد فی المسند ۳/۱۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت وحی اترتی تھی حضور ﷺ کے منہ کے پاس سے شہید کی مکھی کی آواز کی طرح سنی جاتی پس ایک دن ان پر وحی اتاری گئی پھر ہم ایک ساعت ٹھہرے۔ یعنی منتظر رہے۔ پس سختی جو وحی کے اترنے کی وجہ سے وارد ہوئی، رفع ہو گئی پس وہ حالت حضور ﷺ سے دور کی گئی تو حضور ﷺ قبلہ کے سامنے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا اے الہی زیادہ کر ہم کو یعنی دنیا و آخرت کی نعمتیں یا مسلمان بہت ہوں اور ہمارے لیے دنیا و آخرت میں کمی نہ ہو۔ یا مسلمانوں کو کم نہ کرو اور ہمارا اکرام کرو۔ حاجت روائی کے ساتھ اور ہم کو ذلیل نہ کر۔ یعنی مذکورہ چیزوں کے نہ ہونے کی وجہ سے اور ہم کو دنیا و آخرت کی خیر دے اور ہم کو محروم نہ کر اور ہم کو برگزیدہ کر۔ یعنی رحمت و عنایت اپنی کے ساتھ اور برگزیدہ نہ کر ہم پر یعنی ہمارے علاوہ کو لطف و حمایت کے ساتھ اور دین کے دشمنوں کو غالب نہ کر ہم پر اور راضی کر ہم کو یعنی اپنی قضا پر صبر اور شکر کی توفیق دینے سے اور ہم سے راضی ہو جائے تھوڑی فرمانبرداری سے پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ پر ابھی دس آیتیں اتاری گئی ہیں اور جو شخص ان کو برپا رکھے یعنی پڑھا کرے۔ ان کو یعنی ان پر عمل کرتا رہے گا۔ تو وہ بہشت میں نیکیوں کے ساتھ داخل ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں تحقیق مومنوں نے فلاح پائی یہاں تک کہ دس آیتیں ختم کی۔ اس کو امام احمد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اذا انزل عليه: ایک نسخہ صحیحہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ آیا ہے۔ از باب افعال۔ سمع: بصیغہ مجہول کے

ساتھ ہے۔ عند وجہ: مضاف محذوف ہے۔ ای عند قرب وجہ۔ دوی: ناقابل فہم آواز کو کہتے ہیں۔ یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آواز مراد ہے۔ جو اس وقت رسول اللہ ﷺ کو وحی پہنچا رہے تھے۔ اور حاضرین مجلس کو ان کی آواز سمجھ نہیں آرہی تھی۔ امام طبری لکھتے ہیں: ای: سمع من جانب وجہ وجہ صوت خفی کان الوحي كان يؤثر فيهم وينكشف لهم انكشافا غير تام، فساروا كمن يسمع دوى صوته، ولا يفهمه أو أراد لما سمعوه من غطيته وشدة تنفسه عند نزول الوحي۔ ابن حجر لکھتے ہیں: ای: "عند القرب من وجه" وادعی أن هذا أوضح وهو غير واضح۔ فضلاً عن أن يكون أوضح۔ امام طبری نے یہاں حاصل معنی مراد لئے ہیں۔ وگرنہ تو حقیقت یہ ہے نبی کریم ﷺ کے رخِ زیبا کے قریب کوئی بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی آواز مکھی کی جھینسا ہٹ کی طرح سنائی دے۔ نبی کریم ﷺ جب وحی کے سماع میں مشغول ہوتے تو ہانڈی کے جوش مارنے، زور زور سے سانس لینے کی آواز آتی تھی، اور فرشتہ کی آمد کی وجہ سے سانس متواتر ہو جاتا، صلصلة الجرس کی مانند۔ اس لئے کہ قوت بشریہ اس کے تحمل کی قدرت

نہیں رکھتی، اور وحی کے نقل کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ نزول وحی کے وقت کی تفصیلی کیفیات کیلئے کتاب الایمان کا مطالعہ فرمائیے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: مبالغہ و تاکید کی غرض سے نواہی کا عطف اوامر پر کیا ہے، اور تعیم کی غرض سے مفعولات کو حذف کر دیا ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: انه أفاد بحذف المفعول الثاني هنا، وفيما يأتي اجراء لهذا مجرى فلان يعطى مبالغة وتعميما وه۔ قاله تبعاً للطيبی:

آنحضرت ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تھی اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کلام الہی کو آپ ﷺ تک پہنچاتے تھے تو صحابہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آواز کو سنتے تو تھے مگر اسے سمجھ نہیں پاتے تھے جیسا کہ شہد کی مکھی کی آواز سنی تو جانتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی اسی لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اس آواز کو حضرت عمر فاروق نے شہد کی مکھی کی آواز سے مشابہت دی۔ وہ دس آیتیں اس وقت آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی تھیں اور جن پر عمل کرنے والے کے لئے مذکورہ بالا حدیث میں آپ ﷺ نے بشارت عطا فرمائی یہ ہیں: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ مَن ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ بے شک وہ ایمان والے راستگار ہو گئے (یعنی انہوں نے فلاح پائی) جو نماز میں (باطنی و ظاہری طور پر) عجز و نیاز کرتے ہیں اور جو بے ہودہ چیزوں سے خواہ وہ کہنے کی ہوں یا کرنے کی منہ موڑتے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو حرام کاری سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا اپنی کنزوں سے صحبت کرتے ہیں تو ان پر کوئی ملامت نہیں۔ ہاں جو اس کے علاوہ کے طالب ہوں (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں سے اور کنزوں کے علاوہ دوسرے افعال بد میں مبتلا ہوں۔ مثلاً اغلام بازی، جلق یا متعہ وغیرہ کریں) تو وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے (یعنی دائرہ حلال سے) تجاوز کرنے والے (اور حرام میں مبتلا ہونے والے) ہیں اور جو امانتوں اور عہد و پیمان کی محافظت کرتے ہیں اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں (یعنی شرائط و آداب کے ساتھ نمازیں پابندی سے ادا کرتے ہی) یہی وہ لوگ ہیں جو وارث ہیں کہ یہی فردوس کے مالک ہوں گے (جو جنت کا اعلیٰ درجہ ہے) وہ لوگ (یعنی یہ مؤمنین جن کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں) اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

الفصل الثالث:

بینائی کی محرومی پر صبر کرنے سے جنت کا وعدہ

۲۳۹۵: عَنْ عُمَانَ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ إِنَّ رَجُلًا ضَرِبَ رَأْسَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ ادْعُ اللَّهَ أَنْ يُعَافِيَنِي فَقَالَ إِنَّ سِنَّتَ دَعْوَتِ وَإِنْ سِنَّتَ صَبَرْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ قَالَ فَادْعُهُ قَالَ فَامْرَأَةٌ أَنْ يَتَوَصَّأَ فَيُحْسِنَ الرُّضْوَاءَ وَيَدْعُوَ بِهَذَا الدُّعَاءِ اَللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ إِنِّي تَوَجَّهْتُ بِكَ إِلَىٰ رَبِّي لِيُقْضَىٰ لِي فِي حَاجَتِي هَذِهِ اَللَّهُمَّ فَشَقِّعْهُ فِي۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۴۴۱/۱ حديث رقم ۱۳۸۵۔ واحمد في المسند ۱۳۸/۴۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن حنیف سے روایت ہے کہ تحقیق ایک شخص کم سوجھ یا اندھانہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔ پس

اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ اللہ تعالیٰ عافیت دے مجھ کو یعنی آنکھ کے خلل سے۔ فرمایا اگر تو چاہے تو میں تیرے لیے دعا کروں۔ پس اگر تو چاہے تو صبر و رضا سے کام لے پس تیرے لیے صبر کرنا بہتر ہے اس نے کہا اللہ تعالیٰ کی جناب میں دعا کیجئے پس حضرت عثمانؓ نے کہا۔ پس آپ ﷺ نے حکم کیا اس کو یہ کہ وضو کرے۔ پس اچھا وضو کرے یعنی آداب اور سنتوں کے ساتھ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے در رکعت نماز پڑھنے کا حکم کیا اور یہ دعا مانگے اے الہی تحقیق میں سوال کرتا۔ تجھ سے اپنے مقصود کا اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہو تیرے نبی ﷺ کے ساتھ وسیلہ پکڑتے ہوئے کہ محمد ﷺ رحمت والے ہیں تحقیق میں متوجہ ہوتا۔ پس تمہارے وسیلے کے ساتھ اے الہی اپنے پروردگار کی طرف تاکہ وہ میری حاجت کے لیے حکم کرے۔ یہ ہے اے الہی! نبی کی شفاعت میرے حق میں قبول کر۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

راوی حدیث:

عثمان بن حنیف۔ یہ عثمان بن حنیف ”انصار“ میں سے ہیں۔ ”سہل“ کے بھائی ہیں۔ ان کو حضرت عمرؓ نے آبادی عراق کی پیمائش اور اس پر ٹیکس مقرر کرنے کا حاکم بنا دیا تھا۔ انہوں نے وہاں کے رہنے والوں پر خراج اور جزیہ مقرر فرمایا تھا حضرت علیؓ نے ”بصرہ“ کا حاکم بنایا تھا۔ پھر حضرت طلحہ اور زبیرؓ نے ان کو نکال دیا جب کہ یہ دونوں بصرہ آئے۔ واقعہ جنگ جمل کی وجہ سے ایسا ہوا۔ اس کے بعد یہ کوفہ میں مقیم رہے اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ تک زندہ رہے۔ ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے۔ ”حنیف“ حائے مہملہ کے ساتھ ہے ام مصغر ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

تشریح: قوله: فهو خير لك اس بنیاد پر فرمایا کہ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: ان الله تعالى قال: اذا ابتليت

عبدی بحبیثیہ ثم صبر عوضته منہما الجنة۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: ولو من عین واحدة۔ اھ۔ لیکن یہ محل کلام ہے، چونکہ اس میں نص کی مخالفت ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ ایک آنکھ نہ ہونے کی صورت میں بھی دوسری سے کام چلتا ہے، چنانچہ ضرورت کاملہ نہ رہی۔ فادعہ: اس میں دو احتمال ہیں۔ (۱) یہ ہائے ضمیر ہے۔ اس کا مرجع لفظ اللہ ہے۔ اے اللہ! یا ”عافیہ“ ہے۔ اے اللہ! العافیہ۔ (۲) ہائے سکتہ ہے۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: وانما اختار الدعاء لانه أيسر الأمرين مع امکان حصول الآخر، فانه ليس هناك ما يدل على

منع الجمع، بل فيه ما يشعر بأن هناك ما يدل على منع الخلو فيه ان من خير بين أمرين فأختار المفضل منهما لا حرج عليه، على أن يحتمل أن ذلك الرجل ظن أن في عود بصره اليه مصالح دينية يفوق ثوابها ثواب الصبر اھ۔ میں کہتا ہوں یہ ”علی“ برائے ضرر ہے، چونکہ ایسا گمان کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو فهو خير لك فرمایا۔ جو اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

﴿عسى أن تكرهوا شيئا وهو خير لكم﴾ [النساء: ۱۹] اور ہماری اس تقریر کی تائید امام طبریؒ کے کلام سے بھی ہوتی

ہے۔ فرماتے ہیں: أسند النبي ﷺ الدعاء الى نفسه، وكذا طلب الرجل أن يدعو هو ﷺ ثم أمره ﷺ أن يدعو هو أي الرجل، كانه لم يرض منه اختياره الدعاء لما قال: الصبر خير لك، لكن في جعله شفيعا له وسيلة في استجابة الدعاء ما يفهم أنه ﷺ شريك فيه۔ ابن حجرؒ نے اپنے کلام سابق کے بعد انوکھی بات لکھی ہے: وبهذا يندفع قول الشارح على أنه هو

ردہ بقولہ لکن فی جعلہ..... ابن حجرؒ کا یہ کلام عجیب و غریب تم کے ضبط و خیال پر مشتمل ہے۔ فامرہ: ایک صحیح نسخہ میں: قال ہے۔
ای قال عثمان: فامرہ۔

قولہ: ان یتوضاً فی حسن الوضوء: اس کا مطلب مختار تو حدیث کے ترجمہ میں ذکر ہو چکا ہے۔ ایک دوسرا انوکھا مطلب ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ان یأتی بواجباتہ او مکملاتہ۔ انوکھا پن ہونا بایں طور ہے کہ اگر پہلے معنی مراد ہوتے تو فیوضاً فرمانے پر اکتفاء فرماتے لہذا فی حسن الوضوء میں تحصیل مکملات مراد ہیں، تاکہ اس زیادت سے افادہ حسن ہو۔ ایک روایت میں: ویصلی رکعتین کا اضافہ بھی ہے۔

قولہ: اللہم انی أسألك..... الرحمة: مفعول مقدر ہے۔ ای اطلبك مقصودی بنیك: باء برائے تعدیہ ہے۔ انی توجہت بك: ایک نسخہ میں ”اتوجہ“ ہے۔ اور باء برائے استعانت ہے۔ (کذا ذکرہ الطیبی) اس باء اور پہلی باء میں وجہ فرق شاید یہ ہے کہ اس کو برائے تعدیہ قرار دیا، کہ پہلے جملہ میں ”متوجہ بہ“ نبی کریم ﷺ ہیں، لہذا تعدیہ کے معنی متعین ہیں، اور دوسرے جملہ میں ”اللہ جل شانہ مستعان ہے۔ جیسا کہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کا حصر اس پر دلالت کر رہا ہے، لہذا استعانت بغیر اللہ کا حقیقہ استعمال جائز نہیں۔ اگرچہ کبھی مجازاً استعمال ہو جاتا ہے۔ ابن حجرؒ پر یہ واضح فرق مخفی رہا جس کی وجہ سے وہ امام طیبیؒ پر اعتراض کر بیٹھے۔ اور اشارہ کیا کہ دونوں جگہ باء برائے تعدیہ ہے، اور خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے، علی طریق الالتفات۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ایک روایت میں یوں ہے، یا محمد انی توجہت الی ربی لیقضی: صیغہ غائب کے ساتھ ہے، اور فاعل ضمیر غائب ہوگی جو ”ربی“ کی طرف عائد ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ صیغہ حاضر کے ساتھ ہے۔ ای: لتوقع القضاء۔

قولہ: انی توجہت..... فی حاجتی ہذہ: ظرف ہے، اس کی نظیر یہ ہے: واصلح لی فی ذریعتی۔

ویجرح فی عراقیہا نصلی

لی: اجمال کیلئے ہے۔ یہ اشرح لی صدری کی طرح ہے۔ (کذا اتفقہ الطیبی)

ابن حجرؒ نے طیبیؒ کا کلام سمجھا نہیں، چنانچہ اعراض برتا، اور فرمایا: اللام للاختصاص، وفی للمکان المجازی مبالغۃ ان کا کلام صحیح نہیں، اولاً تو اس وجہ سے کہ اختصاص کے کوئی معنی نہیں ہیں چونکہ اس سے تفصیح واضح لازم آتی ہے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ ایک اعرابی نے یوں دعا مانگی: اللہم اغفر لی و محمد، ولا تغفر معنا أحدا۔ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: لقد تحجرت و اسعأ۔ (ای: ضیقت ما وسعہ اللہ فخصصت بہ نفسک دون غیرک۔ ثانیاً محل اشکال یہ ہے کہ ”قضاء“ متعدی بنفسہ ہے، تو ”فی“ کی زیادتی کی کیا حکمت ہے؟ تو اس مثال اور اس کے امثال کا جواب یہ ہے کہ ”فی“ کے ساتھ تعدیہ اس لئے کیا کہ وہ ”ایقاع“ کے معنی کو مضمّن ہے، اور ”ایقاع“ ”فی“ کے ساتھ ہی متعدی ہوتا ہے۔ مکان حقیقی میں ”قضا“ متصور نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ یہ مکان مجازی کیلئے ہے اور مکان مجازی کیلئے ہونے کی تقدیر پر، جیسا کہ آپ کا یہ قول: نظرت فی الکتاب اس میں کون سا مبالغہ ہے؟ فتأمل فیہ تنبیہ نبیہ۔

حسن کی اصل میں یوں ہے: و اتوجہ بک الی ربی فی حاجتی ہذہ لیقضی لی۔ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔
اللہم: التفات ثانی ہے۔

قولہ: اللہم فشفعہ فی: فاء کی تشدید کے ساتھ۔ ای: اقبل شفاعتہ۔ فی: ای: فی حقہ۔ امام طیبیؒ نے فرمایا: فاء کا عطف ”اتوجہ“ پر ہے۔ ”توجہت بک“ فرمانے میں وہی معنی ہیں جو اس آیت میں ہیں: ﴿من ذا الذی یشفع عنده الا باذنہ﴾ کہ

اللہ تعالیٰ سے اولاً بطریق خطاب سوال کیا، پھر نبی کریم ﷺ کے توسل سے بصیغہ خطاب، پھر اللہ سے خطاب کیا کہ نبی کے توسل سے ان کی دعا قبول فرما۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کا سوال کرنا

۲۳۹۶: وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَانَ مِنْ دُعَاءِ دَاوُدَ يَقُولُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِىْ يُّبَلِّغُنِىْ حُبَّكَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَىَّ مِنْ نَفْسِىْ وَمَا لِىْ وَاَهْلِىْ وَمِنْ الْمَاءِ الْبَارِدِ قَالَ وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اِذَا ذَكَرَ دَاوُدَ يُحَدِّثُ عَنْهُ يَقُولُ كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرَ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۸۸۱۵ حدیث رقم ۳۴۹۰۔

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی دعاؤں میں سے یہ تھی اے الہی! تحقیق میں تم سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اس شخص کی دوستی جو وہ تجھ کو دوست رکھے اور وہ عمل مجھ کو تیرے تک پہنچائے۔ اے الہی! اپنی دوستی و محبت کو زیادہ پسندیدہ بنا میرے نزدیک۔ میری طرف میری جان کی محبت سے اور میرے اہل سے اور میرے مال سے اور ٹھنڈے پانی سے راوی نے کہا کہ آپ ﷺ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کرتے اور پہلے ان کے بارے میں بات کرتے تو کہتے تھے داؤد علیہ السلام اپنے زمانے کے عابد لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت کرنے والے تھے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قولہ: کان من دعا داود يقول: اللهم انى اسألك حبك: (۱) مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے۔

(۲) مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ پہلا (احتمال) زیادہ واضح ہے، چونکہ اس میں آیت مبارکہ کی طرف ”تلمیح“ ہے: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا: ”أى: حبى اياك، فانه فاتحة كل كمال“ اور باب حال کی اصطلاح سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

قولہ: وحب من يحبك: اس میں بھی حسب سابق دو احتمال ہیں۔ (۱) یہاں فاعل کی طرف اضافت کا ہونا، واضح ہے۔ جیسا کہ آپ کا علماء و صلحاء سے محبت کرنا۔ (۲) اضافت الی المفعول ہو تو وہ بھی مطلوب ہے۔ جیسا کہ ایک دعا میں آتا ہے: وحبنا الی اهلها وحب صالحی اهلنا۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ مساکین کی محبت کا سوال مراد ہو، جیسا ایک دوسری حدیث میں آتا ہے۔

قولہ: والعمل الذى يبلغنى حبك: منصوب ہے، اس کا عطف مفعول ثانی پر ہو رہا ہے، اور ایک نسخہ میں مجرور ہے۔ أى: وحب العمل۔ اس صورت میں یہ صرف اضافت المصدر الی المفعول ہوگی۔ يبلغنى حبك: ”يبلغنى“ از با تفعیل ہے، اور ”حبك“ میں دونوں احتمال ہیں۔

قولہ اللهم اجعل حبك احب.....: یہاں اضافت المصدر الی المفعول ہے۔ أى حبى اياك۔ قاضیؒ فرماتے ہیں: اللهم اجعل نفسك سے (اللهم اجعل حبك کی طرف) عدول فرمانا، رعایت ادب کی وجہ سے ہے، کہ اپنے نفس کو اللہ جل شانہ کے نفس کے مقابلہ میں ذکر نہیں فرمایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وجہ عدول ممکن ہے یہ ہو کہ ”نفس“ کا اطلاق اللہ جل شانہ کی ذات مبارکہ میں نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں بلکہ یہ اطلاق صحیح ہے۔ قرآن کریم میں بطور ”مشاکلت“ کے آیا ہے: ﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ﴾ اس پر کلام ہے وہ یہ کہ ”مشاکلت“ ثانی میں ہوا کرتا ہے، نا کہ اول میں۔ (علیٰ ما ذكره البانيون) لیکن میں نے

”مشاکلت“ اول میں بھی پائی ہے، بخاری کی روایت ہے: وثبت علينا حبة، فقال النبي ﷺ: اقلطوها فذهبت، فقال النبي ﷺ: وقت شر کم کما وقتیم شرها۔ امام سیوطی فرماتے ہیں: کبھی مقدم بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ آیت مبارکہ: ﴿فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ مِثْلَ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ ہاں، حدیث میں بغیر مشاکلت کے بھی آیا ہے: أنت کما اثنت علی نفسک۔ لیکن تحقیق بات یہی ہے کہ ”نفس“ بمعنی ”ذات“ کا اطلاق اللہ جل شانہ کی ذات مبارکہ پر درست ہے۔ البتہ ”نفس“ بمعنی ”نفس“ کا اطلاق نہیں ہوتا، اور جہاں لفظ ”موہم“ ہو سو وہاں جواز اطلاق ”توفیقی“ ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ابن حجر لکھتے ہیں: وتجويز الشارح هذه المشاکلة غير صحيح، لأن ماورد في حقه تعالى موهم نقصا لا يجوز ذكره الا باللفظ الوارد فيه، وأما اختراع لفظ آخر وذكره فيه فلا يجوز، وان قلنا بما قاله الغزالي والباقلاني في أسماء الله تعالى وصفاته التي لم ترد، لأن محل الجواز عندهما فيما لا يوهم نقصا بوجه فممتنع باتفاق الكل، وهذا أبلغ راد الكلام الشارح فأعرض عنه ولا تلتفت اليه۔ ابن حجر کا یہ کلام بڑا عجیب و غریب ہے۔ اس کا منشا عدم فہم اور اپنی نقابت علمی پر اقتصار ہے۔ نبی کریم ﷺ کے کلام میں مقابلہ کا مقصود یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: ”اجعل حب نفسک أحب الی من نفسی۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اس اسلوب کلام سے بوجہ ادب عدول کیا۔ اور اپنے نفس کو اللہ جل شانہ کے نفس کے مقابلہ میں احتراز کیا۔ اگر یہ ملاحظہ نہ ہوتا اور بالفرض اطلاق ہو جاتا، تو یہ اطلاق نبی کریم ﷺ کی طرف سے جائز تھا، کیوں کہ آپ ﷺ شارح ہیں۔ چنانچہ اس وقت ”مشاکلت“ کے ساتھ کلام درست ہے، جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں: ﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ﴾ یہ ساری تفصیل معلوم ہو جانے کے بعد ابن حجر کا یہ کہنا ”لأن ما ورد في حقه تعالى.....“ تطویل عیب ہے، چونکہ یہ بحث محل کلام نہیں ہے۔ اور ابن حجر کا کہنا: ”أما اختراع لفظ آخر“ اگر ان کی مراد یہ ہے کہ ”شارح کیلئے یہ جائز نہیں“ تو یہ کفر محض ہے، چونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ جل شانہ کی ذات اقدس پر ”نفس“ کا اطلاق بغیر ”مشاکلت“ کے کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: أنت کما اثنت علی نفسک۔ تو علی سبیل المقابله کیوں کر جائز نہ ہوگا، اور اگر ابن حجر کی مراد یہ ہے کہ غیر شارح کیلئے جائز نہیں۔ تو یہ ”حشو“ ہے۔ چونکہ غیر کے بارے میں کلام ہی نہیں ہے۔ اور جہاں تک تعلق ہے اسماء وصفات کی بابت امام غزالی اور باقلانی کا مذہب ذکر کرنے کی تو یہ بھی خارج از بحث ہے، چونکہ ”مشاکلت“ کی بحث اسماء وصفات کی بحث سے ”عم“ ہے۔ نیز ان کا مذہب ”مخترع“ کے بارے میں ہے، ناکہ فی ما ورد عن الشارح کے بارے میں، اور اگر ان سے یہ علی سبیل الفرض صادر ہوا ہے تو یہ ان کے کلام اور فہم مرام کیلئے المبلغ ہے۔

قوله: ومن الماء البارد: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھنڈا پانی انتہائی محبوب ترین چیز ہے۔ ”من“ کا اعادہ فرمانا، دلالت کر رہا ہے کہ پانی کا ٹھنڈا ہونا مستقل ایک محبوب چیز ہے۔ اور ایسا بعض اوقات ہے، پانی روح کے برابر ہے، بعض فضلاء سے مروی ہے: ليس للماء قيمة لأنه لا يشتري اذا وجد، ولا يباع اذا فقد، کسی عارف کا کہنا ہے: اذا شربت الماء البارد أحمد ربی من صميم قلبی۔ اور ممکن ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ کہ روح سے کٹا یہ ہو، چونکہ اس کی حیات پانی سے متعلق ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ چنانچہ ”نفسی“ سے مراد اس کی مرادیں اور چاہتیں ہیں۔ ابن حجر کا یہ کہنا: عجيب قول الشارح، وعن بعض الفضلاء: ليس للماء قيمة.....، فانه ان أراد بذلك أن هذا حکم شرعی للماء كان باطلا بل هو منطلي تارة و متقومة أخرى، وان کنی بذلك عن نفاسة الماء كانت العبارة قاصرة، وکان یکفی فی ذلك أن يقول ما صرح به الفقهاء أن الشربة قد تساوی دنانیر، لا لكون ذلك قيمة له، بل لتوقف الحياة عليه۔ ان کے اس

زعم باطل پر مبنی ہے کہ معرفت فقط اس میں اور اس کے امثال میں منحصر ہے، چونکہ ”مثلی“ اور ”تمثیلی“ ہونے کا حکم مذکور فضلاء تو کیا جبلاء پر بھی مخفی نہیں، سو بلاشبہ فاضل نے اس سے پانی کا قیمتی ہونا بطریق مبالغہ مراد لیا ہے، بلکہ علی سبیل اکتھیفہ مراد ہے، چونکہ پانی کسی کے پاس موجود ہونے کی تقدیر پر اس کو کوئی خریدتا نہیں ہے، چنانچہ پانی کی کوئی قیمت نہ ہوئی، اور جب مفقود ہوتا ہے یعنی کسی کے پاس بھی نہیں ہوتا تو یہ بھی صحیح ہے کہ اس کی کوئی قیمت نہیں چونکہ وہ اس کے ساتھ خریدتا نہیں جاسکتا، اس سے فقہاء کی عبارت کا قصور واضح ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں: ان الشربة قد تساوی دنانیر لا لکون ذلك قيمة له، اس میں کھلم کھلا تعارض ہے، چونکہ جب کوئی شئی کسی شئی کے مساوی ہوتی ہے خواہ وہ پانی ہو، پتھر ہو، طعام ہو یا درخت ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ: ذلك لا یكون قيمة له۔ چنانچہ قیمت عادیہ کی نفی کی تقدیر پر فقہاء کا کلام صحیح ہے۔

قوله: وکان..... یحدث عنه یقول: ”یحدث“ سے بدل (کذا ذکرہ الطیبی، وتبعہ ابن حجر) اور زیادہ واضح یہ ہے کہ ”یحدث“ کی ضمیر سے ”حال“ ہے۔

قوله: وکان أعبد البشر: امام طیبی نے یہاں ”فی زمانہ“ کے ساتھ مقید کیا ہے۔ یعنی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے زمانہ کے آدمیوں میں بڑے عابد تھے۔ اہ۔ اگر یہ قید نہ لگائی جائے بلکہ مطابق رکھا جائے تو تب بھی کوئی محذور لازم نہیں آتا، چونکہ ”أعبد“ ہونے سے ”أعلم“ ہونا لازم نہیں آتا۔ چہ جائیکہ افضل ہونا لازم آئے۔ اور کہا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام ان میں سب سے شکر گزار تھے، اور دلیل یہ آیت مبارکہ ہے: ﴿اعملوا آل داود شکراً﴾ اسی: بالغ فی شکری وابدال سعیک فیہ (کذا ذکرہ الطیبی) اس پر اشکال یہ ہے کہ اس میں اکثر البشر شکراً علی الاطلاق ہونے کی دلیل نہیں ہے، چونکہ حضرت نوع علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿انہ کان عبداً شکوراً﴾ ہاں ان کے نبی ہونے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنے اہل زمانہ میں سب سے زیادہ شکر گزار تھے جیسا کہ یہ آیت دلالت کر رہی ہے: ﴿اعملوا آل داود شکراً﴾ کہ آل داؤد کی نسبت سے مطلق عمل شکر کے ذکر پر اکتفاء کیا، پھر اس کے ذیل میں بمنزلہ تلیل کے یہ فرمایا: ﴿وقلیل من عبادی الشکور﴾ اس میں اشارہ ہے کہ شکر کار تبا انبیاء ہی کیلئے ہے، چنانچہ اس تقریر کے ذریعہ ”بالغ فی شکرک“ بھی درست ہو جائے گا۔ وگرنہ وہ معنی اس آیت: ﴿اعملوا آل داود شکراً﴾ سے ماخوذ نہیں ہوتے۔

یحدث: امام طیبی فرماتے ہیں: یحدث مرفوع ہے شرط کی جزاء ہے، اور جب شرط ماضی اور جزاء مضارع ہو تو اس میں دونوں صورتیں جائز ہوتی ہیں۔ اہ۔ امام طیبی کی مراد یہ ہے کہ یحدث کو مرفوع پڑھنا متعین ہے۔

جامع دعا

۲۳۹۷: وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ صَلَّى بِنَا عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ صَلَاةً فَأَوْجَزَ فِيهَا فَقَالَ لَهُ بَعْضُ الْقَوْمِ لَقَدْ خَفَّفْتَ وَأَوْجَزْتَ الصَّلَاةَ فَقَالَ أَمَا عَلَيَّ ذَلِكَ لَقَدْ دَعَوْتُ فِيهَا بِدَعَوَاتٍ سَمِعْتُهُنَّ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَلَمَّا قَامَ تَبِعَهُ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ هُوَ أَبِي غَيْرِ أَنَّهُ كُنِيَ عَنْ نَفْسِهِ فَسَأَلَهُ عَنِ الدُّعَاءِ ثُمَّ جَاءَ فَأَخْبَرَ بِهِ الْقَوْمَ اللَّهُمَّ بَعْلِمِكَ الْغَيْبِ وَقَدْ رَزَقْتَ عَلَيَّ الْخَلْقِ أَحْسَنِي مَا عَلِمْتَ الْحَيَاةَ خَيْرًا لِي وَتَوَقَّيْ إِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِي اللَّهُمَّ وَأَسْأَلُكَ خَشْيَتِكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَأَسْأَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ وَأَسْأَلُكَ الْقُصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنَى وَأَسْأَلُكَ نَعِيمًا لَا يَنْفَدُ وَأَسْأَلُكَ قُوَّةَ عَيْنٍ لَا تَنْقَطِعُ وَأَسْأَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ

الْقَضَاءِ وَأَسْأَلُكَ بَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَأَسْأَلُكَ لَدَّةَ النَّظَرِ إِلَى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ إِلَى لِقَائِكَ فِي غَيْرِ
ضَرَاءٍ مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ اللَّهُمَّ زِينًا بَرِيئَةً الْإِيمَانِ وَاجْعَلْنَا هُدًى مُهْدِيَيْنِ - (سنن نسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ۵۴۱۳ حدیث رقم ۱۳۰۵ - واحمد فی المسند ۲۶۴/۴

ترجمہ: حضرت عطاء بن سائبؓ سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی ہے کہتے ہیں کہ ہم کو عمار بن یاسر
رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی پس اس میں کوتاہی کی یعنی لمبی قراءت اور تسبیحات وغیرہ زیادہ نہ پڑھیں پس ان کو بعض لوگوں
نے کہا تحقیق تم نے ہلکی نماز پڑھی اور نماز کو مختصر کر دیا۔ پس عمار رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اے فلا نے مجھ کو یہ تخفیف مضرب نہیں ہے۔
البتہ تحقیق میں نے اس نماز میں یعنی اس کے قعدے میں سجدے میں کئی دُعائیں مانگیں کہ میں نے ان کو نبی کریم ﷺ
سے سنا ہے پس جناب عمار گھڑے ہوئے ان کے ساتھ قوم سے ایک شخص کھڑا ہوا وہ میرا باپ (عطاء) تھا۔ راوی نے
کہا ہے کہ وہ شخص میرا باپ (سائب) تھا اس نے اپنے نفس سے کنایہ کیا ہے یعنی شخص نے اپنے کو کہا اور یوں نہ کہا کہ
میں نے عمار رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا پس اس شخص نے عمار سے دُعا کا حال پوچھا۔ پس اس نے دُعا بتادی۔ پھر وہ شخص آیا اور
دُعا کے ساتھ قوم کو خبر دی وہ یہ ہے: اے الہی! بحق اپنے جاننے کے غیب کو اور بحق اپنی مخلوق پر قدرت کے مجھ کو زندہ رکھ
جب تو زندگی کو میرے لیے بہتر جانے یعنی جب برائی بھلائی برائی پر غالب رہے تو زندگی بہتر ہے اور مجھ کو مار جب کہ تو
مرنے کو میرے لیے بہتر جانے یعنی جب برائی بھلائی پر غالب نہ آجائے اور ظاہری و باطنی فتنے ظاہر ہوں تو اس وقت
مرنا بہتر ہے اور اے الہی! میں تجھ سے تیرا ظاہر و باطن میں ڈر مانگتا ہوں اور خوشی میں اور خُشکی (یعنی پریشانی) میں کلمہ حق
کا کہنا مانگتا ہوں اور میں تجھ سے فقر اور دولت کی حالت میں میانہ روی مانگتا ہوں یعنی بہت زیادہ فقیر نہ ہو جاؤں اور رنج
اٹھاؤں اور یا نہایت مالدار ہو جاؤں کہ اسراف کروں اور میں تجھ سے جنت کی نعمتیں مانگتا ہوں جو ختم نہ ہوں اور میں تجھ
سے آنکھ کی ٹھنڈک مانگتا ہوں۔ جو ختم نہ ہو اور میں تجھ سے قضاء کے بعد رضا مانگتا ہوں اور میں تجھ سے مرنے کے بعد
والی زندگی کی ٹھنڈک مانگتا ہوں۔ یعنی ہمیشہ کی راحت کا سوال کرتا ہوں۔ قرض کے بعد رضا مانگتا ہوں اور میں تیرے چہرے
کے دیدار کی لذت مانگتا ہوں اور تیرے ملنے کے شوق کی طرف سخت حالت کے بغیر جو کہ ضرر پہنچائے اور نہ فتنے میں گمراہ
کرے۔ اے الہی! ہم کو ایمان کی زینت کے ساتھ زینت دے کہ ایمان پر ثابت رہیں اور بہت زیادہ نیکیاں کریں اور ہم
کو راہ راست دکھانے والے کی طرح راہ راست چلنے والے کی طرح کر دے۔ اس کو نسائی نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عطاء بن السائب۔ نام عطاء۔ ”سائب“ ابن یزید کے بیٹے ہیں۔ خاندان کے اعتبار سے ”ثقفی“ ہیں۔ ۱۳۶ھ یا تقریباً اس
زمانہ میں وفات پائی۔ سائب بن یزید کے حالات ما قبل میں گذر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: جلد دوم حدیث: ۳۷۶۔

تشریح: قولہ: صلی بنا فیہا:

قولہ: لقد خففت وأوجزت الصلاة: اس میں تنازع فعلین ہے۔

قولہ: فقال: أما علی ذلك: أما تخفیف کے ساتھ ہے، امام طیبی فرماتے ہیں: أما کا ہمزہ ”انکار“ کیلئے ہے، گویا کہ انہوں نے
یوں کہا: أنقول هذا أي اسکت ما علی ضرر من ذلك۔ یا برائے ندا ہے۔ اور ”منادی“ قوم کا کوئی فرد ہے۔ ای: یا فلان! لیس
علی فی ذلك نظر۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ برائے تشبیہ ہو۔ چنانچہ کلام یوں ہے۔ أما علی ذلك بیانہ۔

قوله: فلما قام..... هو أبى: یہ کلام ”عطاء“ کا ہے۔

غير أنه كنى عن نفسه: أى: برجل ولم يقل تبعته۔ طیبی فرماتے ہیں: استثناء کی تقریری عبارت یوں ہے: لم یصرح السائب الا أنه كنى عن نفسه بالرجل اه۔ عدم تصریح سے مراد یہ ہے کہ ریاء کے خوف سے انتہائی اخفاء سے کام لیا۔ اس توجیہ سے ابن حجر کی ذکر کردہ توجیہ کی تردید ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: انہوں نے تواضع کی وجہ سے کنایہ کیا، چونکہ اگر وہ یوں کہتے: فتبعته، اس میں اپنی مدحت کا وہم ہوتا۔ فاجبر: ایک نسخہ میں ”واخبر“ ہے۔

قوله: اللهم بعلمك..... خيرا لى: باء برائے ”استعطف“ ہے۔ أى: أنشدك بحق علمك المغيبات عن خلقك۔ وقدرتك: (اس کا عطف ”علمك“ پر ہو رہا ہے)۔ أى بقدرتك۔ ما علمت الحياة: ”ما“ مصدریہ ظرفیہ ہے۔

قوله: اللهم وأسألك..... فى الرضا والغضب: بظاہر اس کا عطف پہلے والے ”اللهم“ پر ہے۔ اور حرف عطف محذوف ہے، جیسا کہ احادیث میں وارد ہے بہت سی دعاؤں میں (حذف ہوا) ہے۔ اسی قبیل سے آیات قرآنیہ میں بغیر عطف کے ”ربنا“ کا تکرار ہے۔ وأسألك میں واؤ کی موجودگی بھی قابل حرج نہیں، یہ واؤ اس آیت میں وارد واؤ کی نظیر ہے: ﴿ربنا وآتنا﴾ وأسألك: اس کا عطف ”أنشدك“ مقدر پر ہو رہا ہے۔

”فى الرضا والغضب“: معنوی اعتبار سے عبارت میں دو احتمال ہیں۔ (۱) أى: فى حال رضا الخلق وغضبهم۔ (۲) فى حال رضائى وغضبى۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اے اللہ میں اپنے تمام اوقات و احوال میں کلمہ حق پر استمرار کا سوال کرتا ہوں۔ حسن کی روایت میں:

و كلمة الاخلاص كاضافه ہے۔ اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ”کلمہ حق“ کی تفسیر ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿دعوة الحق﴾ أى: دعوة التوحيد المطلق والشرع المحقق۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”کلمہ حق“ سے ”حکم بالعدل“ اور کلمہ اخلاص سے توحید، یا ریاء و سمعہ سے پاک صاف خالص نیت مراد ہے۔ چنانچہ اس صورت میں جار مجرور کی بابت تنازع ہوگا۔ ابن حجر نے ”کلمہ الحق“ کی تفسیر ”مالا اثم فيه“ سے کی ہے۔ اس تفسیر میں ناصر غایت بعد ہے۔ بلکہ نادرست ہے، چونکہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ تصور بھی ہو سکتا کہ کلام مباح پر مدامت کا سوال کریں۔ حالانکہ ایک طرف خود فرما رہے ہیں: من حسن اسلام أطراء تر کہ مالا یعنیه۔ اور دوسری طرف ارشاد گرامی ہے: ﴿والذین هم عن اللغو معرضون﴾

قوله: وأسألك القصد فى الفقر والغنى: یہ جملہ دلیل ہے ان حضرات کی جو یہ کہتے ہیں: الكفاف أفضل من الفقر والغنى۔ حسن کی روایت میں یہ جملہ چھوٹا ہوا ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں اس کے معنی ہیں: توفیق القصد۔ چونکہ غیر قصد مذموم ہے۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك﴾ بظاہر مقام کا سیاق و سباق اس معنی پر محمول کرنے سے انکار کر رہا ہے، چونکہ کلام اتثال او امر و اجتناب النواہی کے متعلق نہیں ہے، وگرنہ ذکر کرنا اولیٰ تھا، باوجودیکہ آپ سے مخالفت مامور اور مباشرت محظور کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

قوله: وأسألك نعيما لا ينفد: دال مہملہ کے ساتھ ہے۔ أى: لا يغنى ولا ينقص۔ جنت کی نعمتیں مراد ہیں، چونکہ: كل نعيم

لا محالة زائل۔

قوله: وأسألك قرة عين: اور حسن کی روایت میں و قرة عين واؤ کے ساتھ ہے، بغیر اعادہ مفعول کے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے انسان کامل لذت اٹھائے۔ بعض کا کہنا ہے کہ غیر مقطوع نسل مراد ہے، ممکن ہے کہ اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہو: ﴿ربنا هب

لنا من أزواجنا وذرياتنا قرۃ أعین ﴿﴾ کہا گیا ہے: نماز پر مداومت مراد ہے۔ چنانچہ مردی ہے: وقرة عینی فی الصلاة۔
 قوله: أسألك الرضا بعد القضاء: مقصور ہو تو محض مصدر ہوتا ہے، اور مردود ہو تو اسم ہوتا ہے۔ (کذا ذکرہ جوہری)۔
 أسألك الرضا بعد القضاء: بعض روایات میں ”وأسألك الرضا بالقضاء“ آیا ہے۔ گویا کہ تحقق و تقرر رضاء کے بعد طلب
 رضا کا سوال کیا ہے۔

ابو عثمان سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا گیا: أسألك الرضا بعد القضاء، عزم علی
 الرضا بعد القضاء ہے؟ فرمایا: لأن الرضا قبل القضاء عزم علی الرضا بعد القضاء وهو الرضا۔
 (كذا فی الغنیۃ للقطب الربانی الشیخ عبد القادر الجیلانی قدس اللہ سرۃ الباری)

قوله: وأسألك برد العیش بعد الموت: أى طیبہ وحسنہ۔ حسن کی روایت میں ”وبرد العیش“ آیا ہے۔ وأسألك
 لذة النظر: حسن کی روایت میں حرف عطف کے ساتھ، لیکن أسألك کے بغیر آیا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ”نظر“ کولذت کے ساتھ
 مقید کیا، چونکہ عرصات قیامت میں اللہ جل شانہ کی طرف ٹھنھے والی نظریا تو نظر بہت وجلال ہوگی یا جنت میں نظر لطف و جمال ہوگی۔
 قوله: وأسألك لذة النظر فتنۃ مضلة: حرف جار یا تو ”والشوق الی لقائک“ کے متعلق ہے۔ أى: أسألك شوقا
 لا یؤثر فی سیری وسلوکی، بحیث یمنعنی عن ذلك، وأن یضرنی مضرة۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”أحینی“ کے متعلق
 ہے۔ دوسرا احتمال معنی کے اعتبار سے زیادہ واضح ہے، اور پہلا احتمال لفظاً زیادہ قریب ہے۔ دوسرے احتمال کی تائید حسن کی روایت سے
 ہوتی ہے: أعوذ بك من ضراء مضرة۔

امام طیبی فرماتے ہیں: ظرف کا متعلق میں متعدد احتمال ہیں: (۱) آخری جملہ کے متعلق ہے۔ یعنی والشوق الی القائک اور
 مطلب یہ ہوگا: شوقا لا یؤثر فی سیری وسلوکی وإن ضرنی مضرة۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”أحینی ما عملت الحیاة خیر
 الی“ کے متعلق ہو، اور ضراء غیر مضرة سے مراد وہ ضرر ہے جس پر صبر کیا جائے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے، نبی کریم علیہ
 الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: عجباً

لأمر المؤمن إن أصابته سراء شكر فكان خیرا له۔ وإن أصابته ضراء صبر فكان خیرا له۔
 امام طیبی کا یہ کہنا: بحیث یكون ضراء غیر مضرة صحیح نہیں ہے، چونکہ ایسا شوق مطلوب نہیں جو ”ضراء“ ہو، اسی لئے اس پر
 ”غیر“ داخل ہے، اور پھر اس کو مضرة سے موصوف کیا تاکہ پتا چلے کہ کوئی بھی ضراء مضر نہیں جب مضرة نہ ہو۔ جیسا کہ اس پر وہاں
 ضرنی مضرة دلالت کر رہا ہے۔ امام طیبی کی عبارت کو ادنی عنایت سے ہمارے مذکورہ مفہوم پر محمول کیا جاسکتا ہے، اور حاصل معنی یہ
 ہے: اللہم إنی أسألك شوقا لا یضرنی فی بدنی بأن أفعل مالا طاقة لی به، ولا فی قلبی بأن تغلب علی الجذیة
 بحیث أخرج عن طور عقلی، فیفتونی مرتبة الجمع۔

قوله: اللہم زینا بزینۃ الایمان:

قوله: واجعلنا ہدایۃ مہدیین: ”ہدایۃ“ ہاد کی جمع ہے۔ مہدیین: حسن میں ”مہتدیین“ آیا ہے۔ أى: تابتین علی
 الہدایۃ وطریق البقین۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ہدایۃ کو مہدیین کے وصف سے متصف ذکر فرمایا، چونکہ جب تک ہادی بنفسہ ”مہدی“
 نہیں ہوگا، غیر کیلئے بھی ”ہادی“ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، چونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو مخلوق کو اس انداز سے گمراہی میں مبتلا کرے گا کہ
 خود اس کو شعور نہ ہوگا۔ اور میں کہتا ہوں لوگوں کو بھی شعور تک نہ ہوگا،

”اور مانگتا ہوں کلمہ حق“ کا مطلب یہ ہے کہ میرے اندر اتنی استقامت اور بے خوفی پیدا فرما کہ میں ہمیشہ کلمہ حق یعنی حق بات ہی کہوں چاہے مجھ سے لوگ خوش ہوں یا ناراض ہوں یا یہ کہ اپنی خوشی کی حالت میں بھی اور خفگی کی حالت میں بھی کلمہ حق ہی کہوں عوام کی طرح نہ ہو جاؤں کہ جب وہ خفگی کی حالت میں ہوتے ہیں تو برا کہتے ہیں اور جب خوش ہوتے ہیں تو خوش آمد کرتے ہیں۔

”آ نکھ کی ٹھنڈک“ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے جذبہ طاعت و عبادت کامل اور حقیقی لذت و کیف پاتا ہے۔ یا اس سے مراد دعا مانگنے والے کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کا باقی رہنا ہے اسی طرح آنکھ کی ٹھنڈک سے نماز پر پختگی اور اس کی پابندی بھی مراد ہو سکتی ہے اور اس کے مفہوم کو زیادہ وسعت دی جائے تو دونوں جہان کی بھلائیاں بھی مراد لی جاسکتی ہیں۔

ترجمہ سے ظاہر ہے شوق ملاقات سے ہے یعنی میں تیری ملاقات کا ایسا شوق چاہتا ہوں جو میری راہ سلوک میں راہ ادب پر میری استقامت میں اور احکام و اعمال کی بجا آوری اور ادائیگی میں نقصان نہ پہنچائے۔ چنانچہ اگلے جملہ ولا فتنۃ مضلکا بھی یہی مطلب ہے کہ ایسا شوق چاہتا ہوں جو راہ استقامت سے ہٹانے والی اور احکام و اعمال میں بے راہ روی پیدا کرنے والی آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔

یا پھر کہا جائے گا کہ اس جملہ کا تعلق دعا کے ابتدائی لفظ ”احمینی“ سے ہے تاکہ اس کا مفہوم دعا میں مذکور تمام چیزوں پر حاوی ہو جائے یعنی مجھ کو اس مذکورہ نعمتوں کے ساتھ اس طرح زندہ رکھ کہ ایسی بلاء و آزمائش میں گرفتار نہ ہو جاؤں جس میں صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور میں گمراہی میں پڑ جاؤں۔

”راہ راست پر چلنے والے بنا“ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم دوسروں کو اچھی راہ بتائیں اور دوسروں کو نیک زندگی اختیار کرنے کی تلقین کریں اسی طرح ہم خود بھی اس پر عمل کرتے ہوئے اچھی راہ اپنائیں اور نیک زندگی اختیار کریں۔ ہماری حالت ”خود را فضیلت و دیگر نصیحت“ والی نہ ہو بلکہ ہمارا عمل ہمارے قول کے مطابق ہو۔

فجر کی نماز کے بعد کی دعا

۲۳۹۸ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ فِي دُبْرِ الْفَجْرِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَعَمَلًا

مُتَقَبَّلًا وَرِزْقًا طَيِّبًا۔ (رواہ احمد وابن ماجہ والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

انترجہ ابن ماجہ فی السنن ۲۹۸/۱ حدیث رقم ۹۲۴۔ واحمد فی المسند ۲۹۴/۶۔

قولہ: کان یقول فی دبر صلاۃ الفجر: ای فی دبر صلوٰۃ الفجر۔ جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے اور ”اذکار“ میں ”اذا صلی الصبح“ آیا ہے۔

قولہ: اللہم انی اسالک..... رزقاً طیباً: ”متقبلاً“: بائے موحدہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ بمعنی ”مقبول“۔ مختصر الطیبی میں ہے کہ رزق طیب کا سوال اس لئے اہم ہے کہ یہ ان دونوں چیزوں کیلئے بمنزلہ راس کے ہے، اور اس کے بغیر علم و عمل کا بھی کوئی اعتبار نہیں اہ میں کہتا ہوں اسی لئے ایک روایت میں اس کا ذکر ابتداء میں آیا ہے، چنانچہ اس روایت کو طبرانی نے اوسط میں اور ابی السنی نے بھی روایت کیا ہے۔

شرح الطیبی میں لکھا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ بظاہر رزق حلال کو ”علم“ پر مقدم ذکر کرنا چاہئے تھا، چونکہ جب تک رزق طیب نہیں ہوگا علم نافع نہیں ہوگا، اور جب عمل بغیر علم نافع کے ہوگا تو مقبول بھی نہ ہوگا۔ میں کہتا ہوں اس کو مؤخر ذکر کیا تاکہ پتہ چلے کہ علم و عمل اسی وقت معتبر ہوں گے جب رزق حلال پر مبنی ہوں گے، اور یہی مرتبہ علیا ہے، اور اگر مقدم ذکر ہوتا تو یہ اشارہ نہ ہوتا۔ جیسا کہ آپ کسی آدمی کے بارے میں پوچھیں یہ بتایا گیا کہ وہ عالم باعمل ہے۔ چنانچہ آپ پوچھتے ہیں: اس کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ وہ بادشاہ کا ایک وزیر ہے تو یہ سن کر آپ کو ناگواری ہوگی، اور اس کا علم و عمل بیچ نظر آئے گا

سوال کا حاصل یہ ہے کہ ”رزق“ حاکم مقدم ہے، چونکہ تحصیل علم و عمل کیلئے سبب ہے۔ اسی وجہ سے اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں ”رزق“ کو مقدم ذکر فرمایا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ كُلْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنَّ كُنتُمْ لِيَاهِ تَعْبُدُونَ﴾ اسی وجہ سے سبکی بن معاذ رازی فرماتے ہیں: الطاعة مخزونة في خزائن الله ومفتاحها الدعاء،

وأسنانة الحلال۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے: لا يقبل الله صلاة امرئ في جوفه حرام۔ اور یہ واضح ہے کہ نافع اور عمل صالح رزق حلال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ ترتیب برائے ”ترقی“ ہے، ناکہ برائے ”تدلی“ اور اس کی دلیل یہ جملہ: ”وهي المرتبة العليا“ ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے سے پہلے کے کمال کیلئے قید ہے۔ ”من أين معاشه“ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ اس کا ایک جواب یہ بھی ممکن ہے کہ علم کو مقدم ذکر کرنے میں اس کے اساس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی پر دین کا مدار ہے، یعنی اعتقاد و احوال، صحت اعمال، معرفت حلال و حرام اسی پر موقوف ہے۔ علم کے بعد نتیجہ علم کا ذکر فرمایا کہ وہ عمل ہے، چونکہ اگر اپنے علم پر عمل نہ کیا تو گویا وہ جاہل ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت قرآنی ہے: ﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ﴾ امام بغویؒ لکھتے ہیں: أجمع السلف رحمهم الله تعالى على أن من عصى الله جاهل۔

اور میں کہتا ہوں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ چنانچہ سرکار کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: أشد الناس عذابا يوم القيامة عالم لم ينفعه الله بعلمه۔ مروی ہے: ويل للجاهل مرة وويل للعالم سبع مرات۔ بلکہ امام غزالیؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں: إن أقل العلم بل أدنى الإيمان أن يعلم أن الدنيا فانية والعقبى باقية، ونتجتة أن يؤثر الباقي على الفاني۔ چونکہ رزق حلال بھی جملہ اعمال میں سے ہے اس کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا، اس لئے رزق حلال نہ صرف نتیجہ علم اور صحت علم کے اعتبار سے اساس ظاہری ہے، بلکہ ترتیب عمل، اخلاص عمل اور قبول عمل کیلئے بھی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: قدمه إشارة إلى أن حكم الأول: أن ينور القلب، ويزيد في العلم۔ والثاني: أنه ربما أظلم القلب، ونقص من العلم۔ والثالث: أنه يظلم القلب ويوجد من الله ويوجب مقته وخذلاته۔ اول تو ان کے اس کلام میں ”رکاکة لفظی“ ہے، ثانی یہ کہ معنوی اعتبار سے ”مغلق“ ہے۔ جو ارباب عبارات کے مناسب نہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا خاص وظیفہ

۲۳۹۹: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ دُعَاءٌ حَفِظْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ لَا أَدْعُهُ إِلَيْهِمْ أَجْعَلْنِي أُعْظِمَ شُكْرَكَ وَأُكْثِرَ ذِكْرَكَ وَأَتَّبِعَ نُصْحَكَ وَأَحْفَظَ وَصِيَّتَكَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه احمد في المسند ۳۱۱/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے ایک دعا یاد کی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے میں اس کو چھوڑتا نہیں ہوں اے الہی مجھے ایسا بنا دے کہ تیرا زیادہ شکر کروں اور بہت زیادہ کروں تیرا ذکر اور تیری نصیحت کی پیروی کروں اور میں یاد رکھوں تیری وصیت کو۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: دعا حفظتہ من رسول اللہ ﷺ لا أدعہ: مبتدأ، اگرچہ کمرہ ہے، چونکہ کمرہ موصوفہ ہے۔ حفظتہ من رسول اللہ ﷺ: یہ جملہ صفت ہے۔ لا أدعہ: خبر ہے۔

قولہ: اللهم اجعلني اعظم شكرك: تخفيف وتشديد دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، مرفوع ہے۔ مفعول ثانی ہے، ان مقدر

ہے۔ یا معظما کے معنی میں ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ”أجعلني“ ”صیرنی“ کے معنی میں ہے، اسی لئے مفعول ثانی کو بصورت فعل لایا گیا، اور اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ”جعل“ جب بمعنی صار ہوگا تو مفعول ثانی بصورت فعل آئے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ بلکہ مراد یہ کہ ”جعل“ بمعنی ”خلق“ نہیں ہے، جیسا کہ کبھی کبھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اس آیت میں ﴿وَجَعَلِ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورِ﴾ کہ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے، اور کبھی بمعنی ”صار“ ہوتا ہے، چنانچہ اس وقت متعدی بد مفعول ہوتا ہے۔ اور ابن حجر کا یہ کہنا: ای اعدہ عظیمًا او آتی بہ عظیمًا اس کا غیر واضح ہونا مخفی نہیں۔ چونکہ بلا وہ ظاہر سے عدول کیا ہے۔
 قولہ: واكثر ذكرك: پچھلے اکثر کی طرح ہے۔ (۱) ممکن ہے کہ یہ جملہ تخصیص بعد المعمیم ہو اور (۲) زیادہ واضح یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ’عموم خصوص من وجہ‘ ہے۔ اور ابن حجر لکھتے ہیں: تصریح مما علم قبلہ اِطنانًا واستلذًا اذا بالحظاب۔

اھ ابن حجر کا

یہ کہنا صحیح نہیں ہے چونکہ یہ وہاں ہوتا ہے جہاں ثانی اول کے منطوق کا مفہوم ہو۔ فتامل۔

قولہ: واتبع نصحك، واحفظ وصيتك: از باب افعال واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ نصیحت و وصیت میں فرق۔

امام طیبی فرماتے ہیں: ”نصیحت“ و ”وصیت“ متقارب الفاظ ہیں اور ”اقترب“ یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔ چنانچہ نصیحت کہتے ہیں ارادة الخیر للمنصوح لہٰذا، اور اس سے مراد حقوق العباد ہوتے ہیں، اور وصیت سے مراد حقوق اللہ سے متعلقہ امر و نواہی کی متابعت ہے۔

نصیحت سے مراد بندوں کے حقوق ہیں اور ”وصیت“ سے مراد اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا یا! تو نے لوگوں کے حقوق ادا کرنے کا مجھے جو حکم دیا ہے اور اپنے حقوق کی ادائیگی کا جو فریضہ مجھ پر عائد کیا ہے اس پر محافظت کرو یعنی دونوں قسم کے حقوق ادا کرتا ہوں۔

جسمانی و روحانی صحت کا سوال کرنا

۲۵۰۰: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْأَمَانَةَ وَحَسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضَىٰ بِالْقَدْرِ -

اخرجه البزار ذكره في كنز العمال ۱۸۳/۲ الحديث رقم ۳۶۵۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الہی میں تجھ سے صحت مانگتا ہوں۔ یعنی بدن کی تندرستی بری بیماریوں سے یا احوال صحت اور افعال اور اعمال اور حرام سے بچنا اور امانت میں خیانت نہ کروں۔ لوگوں کے اموال میں یا شریعت کے تمام حقوق میں اور اچھا اخلاق ہونا اور تقدیر سے راضی ہونا۔
تشریح: قولہ: اللهم اني اسالك..... بالقدر:

نفاق، ریا کاری، جھوٹ وغیرہ سے پناہ مانگنا

۲۵۰۱: وَعَنْ أُمِّ مَعْبِدٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِي مِنَ الرِّيَاءِ وَلِسَانِي مِنَ الْكُذْبِ وَعَيْنِي مِنَ الْخِيَانَةِ فَإِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ -

(رواهما اليهفي في الدعوات الكبير)

اخرجه الخطيب ذكره في كنز العمال ۱۸۴/۲ الحديث رقم ۳۶۶۰۔

ترجمہ: ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے اے الہی میرے دل کو نفاق سے پاک کر دے اور میرے عمل کو ریاسے اور میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے یعنی نظر حرام سے پس تحقیق تو آنکھوں کی خیانت جانتا ہے اور اس چیز کو جو دل چھپاتے ہیں۔ یعنی خواہش اور گناہ یہ دونوں حدیثیں نبیؐ نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔

راوی حدیث:

ام معبد بنت کعب۔ یہ "ام معبد" ہیں۔ "کعب بن مالک" کی بیٹی ہیں۔ انصار میں سے ہیں۔ انہوں نے دونوں قبلہ (بیت المقدس و کعبۃ اللہ) کی طرف نماز پڑھی ہے۔ ان سے ان کے بیٹے معبد نے روایت کی۔ یہ ابن مندہؒ کا قول ہے۔ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ یہ ام معبد کعب بن مالک انصاری سلمیٰ کی بیوی ہیں۔ اور معبد بن کعب بن مالک انصاری کی ماں ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے معبد نے روایت کی۔ جو کچھ بخاریؒ کی تاریخ میں باب معبد میں مذکور ہے یہ ہے کہ معبد کعب بن مالک انصاری کے بیٹے ہیں۔ یہ ابن عبد البرؒ کے قول کی تائید کرتا ہے۔ "معبد" میم اور باء معجمہ دونوں کے فتنے کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله: اللهم طهر..... من الکذب :

"الریاء": ہمزہ کے ساتھ ہے اور کبھی ابدال کرتے ہیں۔ الکذب: علم و زبان کے معاصی کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا چونکہ اس کے معاصی عند اللہ و عند الخلق بہت بڑے اور قبیح ترین ہوتے ہیں۔

قوله: وعینی من الخیانة..... یعنی آنکھ سے ایسی چیز کو دیکھوں جیسے دیکھنا جائز نہ ہو، یا آنکھ سے ایسا کوئی اشارہ کروں کہ جس پر فساد برپا ہو جائے۔

فإنک تعلم خائنة الأعین: قاضی بیضاویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

الخائنة صفت ہے النظرۃ کی، جیسا کہ نظرة ثانیہ الی المحرم۔ استراق النظر الی مالا یحل جیسا کہ اہل ریب کرتے ہیں، اس سے خائنة من الاعین مراد لینا مستحسن نہیں چونکہ وما تخفی الصدور سے اس مفہوم کو مساعادت حاصل نہیں ہو رہی۔

صاحب مدارک "وما تخفی الصدور" کے بارے میں لکھتے ہیں: ای وما تسره من أمانة أو خیانة۔

ابن حجرؒ کا یہ کہنا بالکل مردود ہے: ای: الخائنة منها وہی التي تتعمد ذلك النظر المحرم مع استراقه حتی لا یفطن أحد له۔

مزید لکھتے ہیں: وقد یراد بخائنة الاعین أن یتظاهر الانسان خلاف ما یبطن كأن یشیر بطرف عینه الی قتل انسان، مع

أنه یتظاهر له الرضا عنه۔ ان کی یہ عبارت بھی عجیب و غریب ہے اور اشارہ بھی بڑا انوکھا ہے۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود یہ تقریر قضیہ

مذکورہ بالا کے مطابق نہیں ہے۔ اور یہی حال ان کی پیش کردہ اس دلیل کا ہے جو آگے آرہی ہے: ومن ذلك ما وقع یوم فتح مکة ای

ممن أهدر دمهم یومئذ جئ به الی النبی ﷺ مشفع فیہ عثمان رضی اللہ عنہ ، فکست ﷺ ہنیہة ، ثم شفع عثمان

فیہ، ثم قال لأصحابہ: ہلا بادر أحدکم الی قتله حین سکت۔ فقالوا: یا رسول اللہ! ہلا أشرت إلینا بقتله؟ فقال

النبی ﷺ: ما کان لنبی أن یکون له خائنة الأعین۔

اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے فرمایا: نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خصائص میں سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر خائنة الاعین کا حرام

ہونا بھی ہے، اور خائنة الاعین یہ ہے کہ ان یبطن خلاف ما یتظاهر إلا فی التوریة بالحرب أو فیہ اھ۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ نبی

کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے وجہ اختصاص واضح نہیں ہے۔ آگے لکھتے ہیں: "ما تخفی الصدور" ای تکنہ القلوب و تضمرة

الأفئدة من توالى خطراتها المتنافية- وفى ترقى لأن هذه الحظرات أقبح من تلك النظرات اه- میں کہتا ہوں ایسا نہیں ہے۔ چونکہ ”نظرات“ تو معفو عنہا ہیں، بخلاف ”نظرات المعتمد بہا“ کے۔ آگے لکھتے ہیں: أما قول الكشاف: ولا يحسن أن ير خائنة الأعين بما مرّ عن الفقهاء، فهو واضح لأن خائنتها حينئذ مما تخفيه الصدور، فيكون من عطف الأعم، وهو خلاف الأصل من التغيرات الحقيقية بين المعطوف والمعطوف عليه، أوسن تفسیرہا بما مرّ أولاً مندفعاً بما قررته من الترقى المذكور، وبهذا الفرق الذى قررت به كلامه من إيضاحه على الأول واندفاعه على الثانى يعلم ما فى كلام الشارح هنا فتأملہ اه۔

چنانچہ ہم نامل کیا تو صاحب کشف اور طبی کو عربیت و تفسیر میں امام محقق و مدقّق پایا۔ عطف العام علی الخاص کی معرفت رکھتے ہیں۔ عطف کی یہ قسم کتاب اللہ میں بکثرت واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے کلام کی مراد یہ ہے کہ ”وما تخفى الصدور“ کہ اللہ جل شانہ سینوں کے مختلف احوال کو جانتا ہے اور متعطفین کے درمیان حسن تقابل کا تقاضا ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں: خائنة الأعين الأحوال الكامنة الكائنة فى الأعين،

چونکہ ”صدر“ کے مقابلہ میں مذکور ذرات یہی ہے، اور ”علم“ کا ذوات میں سے ہونا واضح بات ہے، چنانچہ اس کا تعلق احوال مخفیہ سے ہونا ”ابلاغ و افید“ ہے۔ اس صورت میں ترقی دین سے ”أوق“ کی طرف ہوگی، جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں: ﴿يَعْلَمُ السِّرَّ وَمَا يَخْفَى﴾ و اللہ تعالیٰ اعلم۔

صحابی کی دعا، حضور ﷺ کا دنیا و آخرت کی عافیت مانگنے کی نصیحت کرنا

۲۵۰۲: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَادَ رَجُلًا مِّنَ الْمُسْلِمِينَ قَدْ خَفَتَ فَصَارَ مِثْلَ الْفُرْخِ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَلْ كُنْتَ تَدْعُو اللَّهَ بِشَيْءٍ أَوْ تَسْأَلُهُ آيَةً قَالَ نَعَمْ كُنْتُ أَقُولُ اللَّهُمَّ مَا كُنْتُ مَعْقِبِي بِهِ فِي الْآخِرَةِ فَعَجَلَهُ لِي فِي الدُّنْيَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سُبْحَانَ اللَّهِ لَا تَطْبِقُهُ وَلَا تَسْتَطِيعُهُ أَفَلَا قُلْتَ اللَّهُمَّ إِنِّي فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ قَالَ قَدَعَا اللَّهُ بِهِ فَشَفَاهُ اللَّهُ -

اخرجه مسلم فى صحيحه ۲۰۶۸۴/۴ حديث رقم (۲۳ - ۲۶۸۸)۔ والترمذى فى السنن ۴۸۷/۵ حديث رقم ۳۴۸۷۔
واحمد فى المسند ۱۰۷/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے ایک شخص کی عیادت کی مسلمانوں میں سے۔ کہ وہ پرندے کے پانچے کی طرح خفیف ہو گیا تھا پس اس کو نبیؐ نے ارشاد فرمایا کیا تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا تھا کسی چیز کے ساتھ یا یہ کہا کہ تو اللہ تعالیٰ سے کچھ چیز مانگتا تھا۔ کہا کہ ہاں مانگتا تھا۔ اے الہی جو کہ عذاب کرنے والا ہے تو میرے لیے آخرت میں تو اس کو میرے لیے دنیا میں جلدی کر دے۔ پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تو نے جب دعا مانگی تو اللہ کے عذاب کی طاقت نہیں رکھتا۔ یعنی دنیا میں اور تو اس کے عذاب کو دور نہیں کر سکے گا۔ پس تم نے کیوں نہ کہا۔ کہ اے الہی ہم کو دنیا میں بھلائی دے یعنی عافیت اور آخرت میں بھی بھلائی یعنی تقصیرات سے درگزر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ پس روایت کرنے والے نے کہا ہے پس اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی پس اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو شفا دے دی۔

تشریح: قوله: عاد رجلاً..... الفرخ: خفت، خفت يخفت إذا ضعف و سكن۔ سے ماخوذ ہے

او يسالہ ايأه: کہا گیا ہے کہ یہ راوی کا شک ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں: بظاہر یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام ہے، اے:

قوله: هل كنت تدعو..... اياه: بشئ من الأدعية التي يسئل فيها مكروهه، أو هل سألت الله البلاء الذي أنت فيه؟ اس تقریر پر ضمیر منصوب اس "بلاء" کی طرف راجع ہے جس پر حال دلالت کر رہا ہے، اور خفت اس کا پتہ دے رہا ہے، چنانچہ اولاً عموم رکھا اور پھر اس میں تخصیص فرمائی۔ ابن حجر نے "أُو" کو برائے توبیح قرار دیا ہے، دعا کو تلوخ کے ساتھ، اور سوال کو تصریح کے ساتھ مختص کیا ہے۔ یہ ایک اچھی توجیہ ہے۔

قوله قال: نعم..... الدنيا: یہ جملہ دلالت کر رہا ہے کہ "أُو" راوی کے شک کا بیان ہے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے تردید نہیں ہے۔ اللهم ما كنت: یہ "ما" شرطیہ بھی ہو سکتا ہے۔ موصولہ ہے۔ قوله: سبحان الله لا تطيقه ولا تستطيعه: "سبحان الله" اس کے یہاں دو معنی مراد ہو سکتے ہیں: (۱) اللہ جل شانہ ظلم و عجز سے منزہ ہے (۲) یہ برائے تعجب ہے۔ "لا تطيقه ولا تستطيعه": اس کا ایک مطلب ترجمہ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ تاکید کیلئے ہے۔ چنانچہ ابن حجر کا یہ کہنا باطل ٹھہرا کہ دونوں جملوں کا آل ایک ہے، چونکہ ان کا اختلاف ان کے تعلق کے اختلاف سے ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں: لا تطيقه اور كنت اقول یہ حکایت ہے حال ماضیہ کی جو مستمرہ الحال والاستقبال ہے۔ ابن حجر نے انوکھی بات کہی: أى: لا تطيق هذا العذاب الذى سألته لافى هذه الحالة التى أنت فيها، ولا فيما سواها، كما دل عليه عموم النفى، فاندفع قول الطيبى الخ- تأمل فرمائیے، عقل مند کیلئے اشارہ بھی کافی ہے اور غافل کیلئے کثرت عبارت بھی نافع نہیں۔ قوله: اللهم آتنا... عذاب النار: اس سارے کی تشریح ماقبل میں گزر چکی ہے۔

قوله قال: فدعا الله به: أى: بهذا الدعاء الجامع۔ اور ابن حجر لکھتے ہیں: أى: حال كونه ملتبساً بقوله هذا الدعاء۔ أو استغنى عنه، ابن حجر کی یہ توجیہ درحقیقت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس جملہ: "هل دعوت الله بشئ" سے غفلت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، چونکہ باء برائے تعدیہ ہے، یعنی مفعول ثانی ہے۔

بلاؤں میں گرفتار ہو جانا اپنے نفس کو ذلیل کرنے کے مترادف ہے

۲۵۰۳: وَعَنْ حَدِيثَةٍ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَذُلَّ نَفْسَهُ قَالُوا وَكَيْفَ يَذُلُّ نَفْسَهُ قَالَتْ يَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا يُطِيقُ۔

(رواه الترمذی وابن ماجه والبيهقى فى شعب الايمان وقال الترمذى هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذى فى السنن ۴۵۳/۴ حديث رقم ۲۲۵۴۔ واحمد فى المسند ۴۰۵/۵ والبيهقى فى شعب الايمان۔

ترجمہ: حضرت حدیث سے روایت کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کے لیے لائق نہیں ہے یہ کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے صحابہ نے عرض کیا ہے کس طرح اپنے نفس کو ذلیل کرتا ہے۔ فرمایا بلاؤں میں گرفتار ہو جائے اور اس کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ نے اور بیہقی نے شعب الايمان میں اور امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: لا يَنْبَغِي..... لما لا يطيق: حدیث باب اس کے منافی نہیں: المؤمنین لا یخولوا من علة أو قلة أو ذلة وجب استعجاب یہ تھی کہ اپنے نفس کے اعزاز کی محبت تو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، چنانچہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان اپنے آپ کو اپنے اختیار سے ذلت میں ڈالے۔

من البلاء: "من" بیانہ ہے۔ لما لا يطيق: بظاہر "لام" بمعنی "الی" ہے، اور ایک نسخہ میں یہ محذوف ہے۔ اور ابن حجر نے

یہاں انوکھی بات کہی کہ اُن یذل نفسہ کیلئے بیان ہے۔

ظاہر و باطن کی بہتری کے لیے دعا مانگنا

۲۵۰۴: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ عَلَّمَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ قُلِ اللَّهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرِيْ تَبِيْ خَيْرًا مِنْ عِلَانِيَّتِيْ
وَاجْعَلْ عِلَانِيَّتِيْ صَالِحَةً اللَّهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ صَالِحِ مَا تُؤْتِي النَّاسِ مِنَ الْآهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَالِدِ غَيْرِ
الصَّالِّ وَلَا الْمُضِلِّ - (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۳۴۱۵ حدیث رقم ۳۵۸۶۔

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے سکھایا کہ اے الہی میرے باطن کو بہتر بنا دے میرے
ظاہر سے اور میرے ظاہر کو شائستہ کر دے اے الہی تحقیق میں مانگتا ہوں تجھ سے اس چیز کی بہتری جو تو دیتا ہے لوگوں کو
اہل سے اور مال سے اور اولاد سے کہ نہ گمراہ ہوں اور نہ گمراہ کریں۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا۔

تشریح: قولہ: علمنی رسول اللہ ﷺ قال:

(کا مفعول یہ محذوف ہے) ای دعاء۔ قال: ”علمنی“ کا بیان ہے۔

قولہ: اللهم اجعل..... صالحه: واضح رہے کہ سریرہ اور سرہم معنی ہیں۔

علانیتی: تخفیف کے ساتھ ہے۔ پہلے یہ طلب کرنا کہ باطن کو ظاہر سے بہتر بنا اور پھر یہ کہنا کہ ظاہر کو باطن سے بہتر بنا۔ اس وہم کو
دور کرنے کیلئے ہے کہ بعض مرتبہ باطنی غیر صالح ظاہر سے بہتر ہوتا ہے۔ ابن حجرؒ نے یہاں بے سود گرفت کی ہے۔

قولہ: اللهم إني أسألك من صالح..... المضل:

کہا گیا ہے کہ انفس کے مذہب کے مطابق یہ ”من“ زائدہ ہے۔

من الاهل: ”ما“ کا بیان ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”تبعیضیہ“ ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ اسم نجور اہل، مال اور ولدان میں سے ہر ایک سے بدل ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”ضال“ میں معنی نسبتی

ہوں۔ ای: غیر ذی ضلال۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور سب سے جامع یہ دعا منقول ہے: اللهم إني أسألك من الخير كله عاجله و آجله ما علمت منه وما لم اعلم ،

واعوذ بك من الشر كله عاجله و آجله ما علمت منه وما لم اعلم ، اللهم اني اسالك من خير ما سالك عبدك و نبيك ،

واعوذ بك من شر ما عاذ منه عبدك و نبيك ، اللهم اني اسالك الجنة و ما قرب اليها من قول او عمل ، واعوذ بك

من النار و ما قرب اليها من قول او عمل ، و اسالك ان تجعل كل قضاء لي خيرا ۔

اس دعا کو ابن ماجہ اور ابن حبان دونوں حضرات نے صدیقہ کائنات بنت صدیق حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔

دعوات قرآنیہ کے بعد میں نے دعوات نبویہ کو بھی جمع کیا ہے اور اس کے آخر میں درود سلام کا مجموعہ ہے۔ میرا یہ مجموعہ دیگر تمام

اجزاب و اوراد و وظائف کے مقابلہ میں محافظت کا زیادہ حقدار ہے۔ میرا یہ مجموعہ حقیقت شامک سنیہ کو جامع اور اختلاف ردیہ کیلئے مانع

ہے۔ یہ رسالہ صوفیہ صوفیہ کے رسائل کا ”لب لباب“ ہے۔



کِتَابُ الْمَنَاسِكِ

یہ کتاب افعال حج کے بیان میں ہے

مناسک ، منسک کی جمع ہے۔ سین کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ ہے اور قراءت سب سے قبل یہ آیت: ﴿لِكُلِّ امَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسِكًا﴾ [الحج: ۶۷] دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ منسک، نسک، ينسک سے بمعنی تعبد مصدر مسمیٰ ہے، پھر حج کے تمام افعال کا نام ”مناسک“ رکھ دیا گیا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں، النسک، العبادة، والناسک العابد کہ نسک، عبادت کو کہتے ہیں اور ناسک اس عابد کو کہتے ہیں جو افعال حج ادا کر رہا ہو، اور مناسک حج کے افعال اور اعمال کے جگہوں کو کہتے ہیں اور انسیک، ذبیحہ کے ساتھ خاص ہے اور حج فتح اور کسرہ کے ساتھ قراءت سب سے قبل:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ [آل عمران: ۹۷] دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اور حج لغت میں قصد ارادہ کو کہتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کسی باعظمت چیز کی طرف قصد کرنے کو کہتے ہیں۔

اور قاموس میں ہے کہ مکہ کا قصد کرنا ادائے نسک کیلئے اس کو حج کہتے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حج کا اصطلاحی معنی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حج کا شرعی معنی ہے، بیت اللہ کا قصد کرنا دین کے ارکان میں سے ایک رکن کے ادا کیلئے، (اور ابن ہمام پھر فرماتے ہیں) کہ والظاهر انه عبادة عن الافعال المخصوصة، من الطواف، والوقوف في وقته محرماً بنية الحج سابقاً۔ لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ احرام نیت اور تلبیہ سے عبارت ہے۔ تو ابن ہمام کے تعریف میں بنية الحج مستدرک ہے اور سابقاً، حال ہے یعنی حال کون الاحرام المقرون بالنية متقدما على الافعال؛ احرام کا مقدم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ یہ ہمارے نزدیک شرط ہے۔

حج کا سبب:

حج کیلئے سبب بیت اللہ ہے اس لیے کہ حج کی اضافت اسی کی طرف ہوتی ہے۔

حج کا تاریخی پس منظر:

معالم التنزیل میں ہے کہ علماء کا اس آیت: ﴿ان اول بیت وضع للناس﴾ [آل عمران: ۹۶] کے تفسیر میں اختلاف ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو آسمان وزمین کے پیدائش کے وقت سب سے پہلے پانی کے اوپر بنایا گیا اللہ نے اس کو زمین کے خلقت سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا ہے۔ پانی کے اوپر سفید قسم کا جھاگ تھا اسی کے نیچے زمین کو بچھایا گیا، یہ عبد اللہ بن عمر، مجاہد، قتادہ اور سدیی کا قول ہے اور یہی مشہور قول ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو زمین کے اوپر بنایا گیا ہے۔

حضرت علی بن حسین سے روایت کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے ایک گھر بنایا اور وہ بیت المعمور ہے اور فرشتوں کو اس کا طواف کرنے کا حکم دیا۔ پھر زمین پر رہنے والے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ زمین پر اس گھر کی طرح ایک گھر بنائیں تو فرشتوں نے بنایا اور اس کا نام ضراح ہے اور زمین والوں کو اس کا طواف کرنے کا حکم دیا جیسا کہ آسمان والے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔

اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں نے بیت اللہ کو بنایا تھا اور پھر وہ بیت اللہ کا حج کرتے تھے جب آدم علیہ السلام نے اس کا حج کیا تو فرشتوں نے کہا، کہ تیرا حج قبول ہو، ہم نے آپ سے دو ہزار سال پہلے اس گھر کا حج کیا ہے۔

حج کی شرعی حیثیت:

حج کی فرضیت، کتاب، سنت اور اجماع سے ثابت ہے اور اس کا منکر بالاتفاق کافر ہے۔

پھر یہ بات جان لینی چاہیے کہ جنات انسانوں کے تابع ہے ان احکام میں جن کے وہ مکلف ہے تو آیت اور حدیث میں الناس کا لفظ جنات کو بھی شامل ہے۔ بعض ماخذ اشتقاق کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ قاموس میں ہے۔

سابقہ امم کے لئے حج کی حیثیت:

پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا حج ہم سے پہلے امتوں پر بھی فرض تھا یا اس کی فرضیت ہمارے امت کے کامل ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ مختص ہے؟ تو ثانی زیادہ ظاہر ہے اور ابن حجر نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اور اس نے استدلال کیا ہے اس حدیث سے جس میں ہے ما حسن نبی الا وحج البيت: تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ قدیم شرائع میں سے ہے اور روایت میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے چالیس سال تک پیدل حج کیا ہے اور جبریل نے ان سے کہا کہ فرشتے تجھ سے پہلے سات ہزار سال اس گھر کا طواف کرتے رہے۔

لیکن جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ روایت حج کے وجوب کے اثبات یا نفی پر دلالت نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حج ہم سے پہلے انبیاء علیہم السلام میں مشروع تھا اور اسکے مشروع ہونے سے اس کا واجب ہونا لازم نہیں آتا۔ علاوہ ازیں ہمارا کلام سابقہ امتوں کے بارے میں ہے نہ کہ انبیاء کے بارے میں، تو یہ بات کوئی بعید نہیں کہ ہم سے پہلے انبیاء پر تو واجب ہو مگر ان کے امتوں پر واجب نہ ہو۔ تو یہ خصوصیات انبیاء علیہم السلام میں سے ہوا۔ جیسا کہ باب الوضوء میں اس کی تحقیق گزری اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج الوداع کے موقع پر جب عسنان پہنچے تو فرمایا اسے ابو بکر یہ کونسی وادی ہے؟ ابو بکر نے کہا وادی غسیان ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لقد مر به هود و صالح علی بکرین احمرین خطمهما اللیف، وأزرهم العباء و اردیتهم النمار، یلبون یحجون البیت العتیق" (رواہ احمد) کہ اس وادی سے حضرت ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام دوسرے اور سرخ اونٹوں پر سوار ہو کر گزرے اونٹوں کی تکمیل کھجور کی چھال سے بنی ہوئی تھی اور ان کے ازاہ اور رداء اون کی موٹی چادریں تھی۔

اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج الوداع کے موقع پر فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وادی ازرق سے گزرے کہ گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف مٹی سے کہ وہ انگلیاں اپنے کانوں میں رکھے ہوئے وادی سے گزر رہے ہیں اور اس کیلئے گڑ گڑانا ہے اللہ کی طرف تلبیہ کے ساتھ۔

اس وادی اور مکہ کے درمیان ایک میل کا فاصلہ ہے۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے: لیهلن لن عیسیٰ بن مریم بفتح الروحاء۔

یہ دلالت کر رہا ہے کہ انبیاء برزخ میں حقیقتاً زندہ ہیں اور وہ اللہ کے ہاں قربت حاصل کرتے ہیں ان کو مکلف بنائے بغیر، جیسا کہ وہ قبروں میں نماز کے ذریعے اللہ کی قربت حاصل کرتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور بخاری کی روایت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے اور مسلم کے ایک اور روایت میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔

الفصل الاول:

حج کرنا زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے

۲۵۰۵: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمْ الْحَجُّ فَحُجُّوا فَقَالَ رَجُلٌ أَكَلُ عَامٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَسَكَتَ حَتَّى قَالَهَا ثَلَاثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوْ جَبَّتْ وَلَمَّا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكثيرة سؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأَتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَإِذَا نَهَيْتُمْكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۷۵/۲ حديث رقم (۴۱۲-۱۳۳۷) - والنسائي في السنن ۱۱۰/۵ حديث رقم ۲۶۱۹۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیا۔ پس فرمایا اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے پس حج کرو۔ پھر ایک شخص نے کہا ہم ہر سال حج کریں۔ پس حضور ﷺ خاموش رہے یہاں تک کہ اس شخص نے یہ بات تین بار کہی۔ پھر فرمایا اگر میں ہاں کہتا تو (مبادا) ہر سال حج فرض ہو جاتا اور تم طاقت نہ رکھتے۔ پھر فرمایا مجھ کو چھوڑ دو۔ جب تک کہ میں تم کو نہ چھوڑوں۔ پس وہ لوگ جو تم سے پہلے تھے یعنی یہود و نصاریٰ کثرت سوال کی وجہ سے اور اپنے انبیاء کے اوپر اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے جیسے بنی اسرائیل کی قوم سے منقول ہے پس جس وقت میں تم کو کسی چیز سے منع کروں، پس تم اس کو چھوڑ دو۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: قد فرض عليكم الحج فحجوا: ۸ھ کو جو فتح مکہ کا سال ہے عتاب بن اسید نے لوگوں کو حج کرایا اور

۹ھ کو ابو بکر نے کرایا اور خود آنحضرت ﷺ نے ۱۰ھ کو حج کیا، اسی طرح شمشی نے ذکر کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حج کی فرضیت ۹ھ کو ہوئی یا ۵ھ کو یا ۶ھ کو اور آپ ﷺ کا حج ۱۰ھ تک مؤخر کرنا اس میں حج فوت ہونے کا خطرہ نہیں تھا اگر حج فی الفور لازم ہوتا ہے اس لیے کہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ حج ادا کرنے تک زندہ رہیں گے اور لوگوں کو حج کے احکام اور افعال سکھائیں گے تکمیل تبلیغ کیلئے (انتھا)۔

اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو مؤخر کیا ۵ھ یا ۶ھ سے مکہ فتح نہ ہونے کی وجہ سے اور ۸ھ سے مؤخر کیا ہے وہ نسی کی وجہ سے اور ۹ھ سے جو مؤخر کیا ہے تو اس کی وجہ ہم نے اپنے رسالہ جس کا نام ”التحقیق فی موقف الصدیق“ ہے میں ذکر کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ حج ہجرت سے پہلے واجب ہوا ہے اور بعض نے اس کے علاوہ قول اختیار کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے فرضیت کے بارے میں گیارہ قول ہیں۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہجرت سے قبل ہر سال حج کیا کرتے تھے اور اسکے موافق ابن جوزی کا قول ہے کہ آپ

ﷺ نے اتنے حج کئے جن کی تعداد معلوم نہیں اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ ثوری سے نقل کیا ہے کہ آپ علیہ اسلام نے ہجرت سے پہلے کئی حج کیے ہیں۔

باقی جو ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ہجرت سے قبل دو حج کیے اور ابن ماجہ اور حاکم کی روایت میں تین کا ذکر ہے تو اس کی بنیاد ان کے علم پر ہے اور یہ دوسرے کی زیادہ کے اثبات کے منافی نہیں ہے۔

قوله: فقال رجل اكل عام؟ "اكل عام": فعل مقدر کے بناء پر منصوب ہے۔ یعنی اصل میں انا امرنا ان نحج كل عام ہے یا احوض علينا ان نحج كل عام ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ سوال انہوں نے اس لئے کیا کہ ان کے عرف میں حج کا معنی قصد بعد القصد کا تھا تو صیغہ سے تکرار کا وہم ہو رہا تھا، لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان کے سوال کی بنیاد حج کو باقی عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ پر قیاس کرنا تھا۔ اور ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہر سال حج کا فرض ہونا تمام مکلفین کے بنسبت محال ہے جیسا کہ اہل کمال پر واضح ہے۔

قوله: فسكت حتى قالها ثلاثا: "فسكت" جواب دینے سے سکوت فرمایا یا اس لیے کہ سکوت بے علم کیلئے جواب ہے۔ کیونکہ حسن سوال نصف علم ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے تنبیہا سکوت اختیار کیا کہ اس سوال کے کرنے سے خاموش رہنا بہتر تھا۔ کیونکہ نبی ﷺ اس بات سے سکوت نہیں فرماتے تھے جس کے وضاحت کی امت محتاج ہوتی تھی۔ پس اس طرح کا سوال رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش قدمی ہے اور مومنین کو کسی بھی قول و فعل میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش قدمی سے اس آیت میں منع فرمایا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدُمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ [الحجرات: 1]

اے ایمان والو! آگے نہ بڑھو اللہ سے، اور اس کے رسول سے، موضح القرآن۔ الحجرات

اور آپ ﷺ سے بات میں پیش قدمی کی جہالت کی ایک قسم ہے۔ لیکن جب آپ ﷺ نے دیکھ لیا کہ نہ تو وہ منع ہو رہا ہے اور نہ ہی صبر اور قناعت کر رہا ہے مگر صریح جواب پر تو آپ ﷺ نے صراحت فرمادی۔

قوله: لو قلت: نعم لوجبت ولما استطعتم:

"لو جبت": بعض روایات میں لوجب بغیر تاء کے ہے اگر تاء کے ساتھ ہو تو فاعل "العبادة" ہوگا یعنی لوجب هذه العبادة اور اگر بغیر تاء کے ہو تو فاعل الحج ہوگا یعنی لو جب الحج كل عام۔

اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا سکوت وحی یا اللہام کے انتظار کی وجہ سے ہو۔

علامہ طبری فرماتے ہیں: کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حج کا واجب کرنا یہ آپ ﷺ کو مفوض تھا لیکن اس قول کی تردید کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کا یہ قول "لو قلت نعم" عام ہے کہ اس کا ایجاب خود آپ ﷺ کی طرف سے ہو یا نازل شدہ وحی کے ذریعے ہو یا یا حضور ﷺ کے رائے اور اجتہاد سے ہوا، اگر ہم حضور ﷺ کیلئے اجتہاد جائز قرار دیں۔ یہ بات علامہ طبری نے ذکر کی ہے۔

لیکن اس میں یہ بات ہے کہ وہ تفویض بھی تو عام ہے لہذا اس کا رد درست نہیں اور اسکے ساتھ اس کا یہ لکھنا کہ ایجاب خود آنحضرت ﷺ کی طرف سے ہو یعنی جو وحی جلی اور حق سے بالکل خالی ہو تو یہ قول بھی مردود ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ [النجم: ۳-۳] اور نہیں بولتا اپنی نفس کی خواہش سے۔ یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔ موضح القرآن۔ النضو۔ لوجب: یعنی یہ عبادت یا فریضہ حج جس پر فرض دلالت کر رہا ہے یا ہر سال حج کرنا یا بہت سارے حج کرنا ہر ایک پر فرض ہو جاتا ہے۔

قوله: ذرّونی ماترکتکم، فانما هلك من كان قبلکم بکثرة سؤالهم:

ایک نسخہ میں (فانما هلك کے بجائے) اهلك همزه کے ساتھ بصیغہ مجہول ہے۔

”بکثرة سؤالهم“ جیسے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا سوال کیا۔ بقرہ (گائے) کے بارے میں

سوالات کیے۔

قوله: واختلافهم علی انبیائهم:

”واختلافهم“ اس کا عطف کثرت پر ہے نہ کہ سوال پر۔ کیونکہ بعض اختلاف بھی موجب ہلاکت ہے اگرچہ بغیر کثرت کے ہو۔

”علی انبیائهم“ یعنی جب انبیاء ان کو حکم دیتے سوال کرنے کے بعد یا قبل، اور ان نے انبیاء پر اختلاف کیا بس ہلاکت ہوئے اور ہلاکت کرنے کے مستحق ہو گئے۔

قوله: ”ما استطعتم“ کیونکہ جو چیز پوری حاصل نہیں کی جاسکتی وہ پوری چھوڑنی بھی نہیں چاہیے۔

فرماتے ہیں کہ یہ اسلام کے بڑے قواعد اور جوامع الکلم میں سے ہے اور اس کے تحت بے شمار احکام آجاتے ہیں جیسے نماز اپنے تمام انواع کے ساتھ کیونکہ جب کوئی نماز کے بعض ارکان کے ادائیگی سے اور بعض شروط سے عاجز ہو تو باقی ادا کر لے۔

قوله: واذانہتکم عن شیء فدعوہ: ”فدعوہ“ یعنی مکمل چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ کرنا درست نہیں۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ توبہ درست ہے۔

۲۵۰۶: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ إِيْمَانٌ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَيَلْتَمِ

مَاذَا قَالَ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَلْتَمِ مَاذَا قَالَ حَجٌّ مَبْرُورٌ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۷۷/۱۔ حدیث رقم ۲۶۔ و مسلم فی صحیحہ ۸۸/۱ حدیث رقم (۱۳۵-۸۳)۔ و الترمذی

فی السنن ۱۵۹/۴ حدیث رقم ۱۶۵۸۔ و النسائی ۱۱۳/۵ حدیث رقم ۲۶۲۴۔ و الدارمی ۲۱۴/۲ حدیث رقم ۲۳۹۳

واحمد فی المسند ۳۷۲/۶۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل بہتر ہے فرمایا اللہ پر ایمان لانا

اور اس کے رسول ﷺ کے کہا گیا پھر کونسا عمل بہتر ہے اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ای العمل افضل: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ افضل اعمال کے بارے میں مختلف احادیث ہیں کہ جن میں

تطبیق و توفیق مشکل ہے اور تطبیق کی صحیح وجہ وہی ہے جو ہم کتاب الصلاة کے شروع میں ذکر کر چکے ہیں اور ایمان دل کی تصدیق کو کہتے ہیں اور یہ باطنی اعمال میں سے ہے۔

قوله: الجهاد فی سبیل اللہ الجهاد: میں الف لام تعریف کیلئے ہے اور مراد اس سے خالص جہاد ہے۔ ”فی سبیل اللہ“

کیونکہ مجاہد نمازی اور روزہ دار ہوتا ہے۔

قوله: ”حج مبرور“ مبرور مقبول کے معنی میں ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں۔ بوہ، ای احسن الیہ، کہا جاتا ہے بر اللہ عملہ

یعنی اللہ نے اس کے عمل کو قبول کر لیا تو گویا کہ عمل کو قبول کر کے اللہ نے اسکے عمل کے ساتھ احسان کیا۔ ”ایمان“ تکمیل تکمیل کے ساتھ ہے۔

”حج مبرور“ یعنی جس نے حج کے ساتھ کوئی گناہ نہ ملایا ہو۔ علامہ سیوطی نے الدر میں لکھا ہے کہ اصہبانی نے حضرت حسن سے

یہ بات نقل کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ حج مبرور کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ وہ اس حالت میں لوٹے کہ دنیا سے زاہد اور آخرت کی

طرف راغب ہو۔

اور اس حدیث سے افضلیت میں ترتیب ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں کوئی نزاع نہیں ہے کہ ایمان مطلقاً سب سے افضل ہے۔ پھر جہاد افضل ہے کیونکہ عام عادت کے مطابق جہاد کے ساتھ اجتہاد فی العبادت بھی ہوتی ہے۔ اور آخرت کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے۔ شہادت کے سعادت کے حاصل کرنے کی کوشش کے ساتھ۔ پھر حج افضل ہے جو عبادت بدنہ اور مالیہ کو جمع کرنے والا ہے اور اپنے مانوس وطن کو چھوڑنا اور اپنے اہل و عیال کو چھوڑنا ہے۔ معروف طریقے پر یا یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے افضل اعمال کا ذکر اسکے فرضیت کے ترتیب سے کیا کہ ایمان کے بعد جہاد فرض ہوا ہے۔ پھر حج کو فرض کیا گیا ہے ارکان کے تملک کیلئے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿اليوم اكملت لكم دينكم﴾ [المائدة: ۳] آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا۔

(بیان القرآن)

حج کے دوران معصیت سے پرہیز کرے

۲۵۰۷۔ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ حَجَّ لِلَّهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ - (متفق علیہ)
 اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۸۲/۳۔ حدیث رقم ۱۵۲۱۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۸۳/۲۔ حدیث رقم (۴۳۸۔ ۱۳۵۰)۔
 والترمذی فی السنن ۱۷۶/۳۔ حدیث رقم ۸۱۱۔ والنسائی ۱۱۴/۵۔ حدیث رقم ۲۶۲۷۔ والدارمی ۴۹/۲۔ حدیث رقم ۱۷۹۶۔ وابن ماجہ ۹۶۴/۲۔ حدیث رقم ۲۸۸۹۔ واحمد فی المسند ۴۹۴/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص حج کرے اللہ کے واسطے اور وہ اپنی عورت سے صحبت نہ کرے اور نہ فسق کرے۔ تو گناہوں سے ایسے پاک صاف لوٹے گا جیسا کہ جس دن اس کی ماں نے اس کو جنم دیا تھا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: من حج لله فلم يرفث ولم يفسق:

”فلم يرفث“ فاء پر تینوں حرکات درست ہیں اور ضمہ زیادہ مشہور ہے۔ سیوطی فرماتے ہیں کہ رِفْث کا اطلاق جماع، تعریض اور فحش قول پر ہوتا ہے۔ اور یہاں مراد آخری ہے۔ اور فاء پر ماضی اور مضارع دونوں میں تینوں حرکات آسکتے ہیں۔ اور زیادہ فصیح ماضی میں فحش اور مضارع میں ضمہ ہے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ رِفْث، جماع کی تصریح ہے اور ازہری فرماتے ہیں کہ رِفْث ایک جامع کلمہ ہے جو ہر اس شے کو شامل ہے جو مرد عورت سے چاہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حج میں رِفْث کہتے ہیں عورتوں کے پاس آنا۔ اور فسوق، گالی کو کہتے ہیں۔ اور جدال دوستوں کے ساتھ جھگڑنے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں جدال کا ذکر نہیں ہے آیت پر اعتماد کرنے کی وجہ سے یا یہ فسق میں داخل ہے یا رِفْث میں داخل ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ مراد اس سے نہیں ہے نہ کہ نفی۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ رِفْث، فحش قول اور عورتوں کے سامنے جماع کے باتوں کو کہتے ہیں اور فسق، حداستقامت سے نکلنے کو کہتے ہیں۔ ”یفسق“ سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ امور نحویہ ”کیوم ولدته امہ“ یومئذی برحق ہے۔ مضاف ہے۔ مابعد جملے کی طرف۔ بعض نے کہا ہے کہ رِفْث، صرار کے معنی میں ہے اور کیوم اس کیلئے خبر ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ رِفْث اپنے معنی موضوع پر ہو اور کیوم حال ہو۔

”لم يفسق“ یعنی دوران حج گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو اور نہ ہی صغیرہ پر اصرار کیا ہو اور معاصی سے توبہ نہ کرنا بھی کبائر میں سے

قولہ: رجوع کیوم ولدتہ امہ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، یعنی اپنے گناہوں سے بری ہونے میں یہ اس دن کی طرح ہے جس دن والدہ نے اس کو جنما تھا۔

یعنی وطن کی طرف لوٹنا اس حال میں کہ مشابہ ہے اس کا یہ دن اس دن کے ساتھ جس دن اس کو والدہ نے جنما تھا۔ لیکن اس مطلب کے مطابق حدیث میں جو کچھ ذکر ہو اس سے کئی نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ حج کے اعمال سے فارغ ہو جائے۔ اس حدیث کی بنیاد اللہ کے اس ارشاد پر ہے: ﴿وَسَبْعَةٌ إِذَا رَجَعْتُمْ﴾ [البقرة: ۱۹۶] اور سات ہیں جب حج سے تم لوٹ آؤ۔ اس اختلاف کی بنیاد پر جو ہمارے اور امام شافعی کے درمیان رجوع کے معنی میں ہے اور وہ یہاں لازم نہیں ہے حدیث کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ وہ لوٹنا اپنے گھر کی طرف۔ پس کئی اس سے نہیں نکلے گا۔

یہ بات جان لیننی چاہیے کہ اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ کبیرہ اور صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن اس پر اجماع ہے کہ مکلفات خاص ہے ان صغائر کے ساتھ جن کا تعلق حقوق العباد سے نہ ہو کیونکہ ان کی بخشش بندوں کے رضامندی پر موقوف ہے۔ ہاں شرک کے علاوہ تمام گناہ مشیت کے تحت ہیں جس کیلئے جو گناہ اللہ چاہے معاف کر دے گا اور اس مسئلہ کی تحقیق میں، میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ پھر جان لیے کہ جس شخص نے حج کیا حج اور تجارت دونوں کے نیت سے تو اس کا ثواب اس سے کم ہوگا جس کی حج میں تجارت کی نیت نہ ہو۔ اور قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ تا جرح حاجی کو بالکل ثواب ہی نہ ملے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے ”من حج للہ“ مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح طور پر نقل ہے کہ لوگ دوران حج تجارت کرنے سے کتراتے تھے تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ﴾ [البقرة: ۱۹۸] تم کو اس میں ذرا گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ (بیان القرآن)

اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ان سے ایک آدمی نے پوچھا کہ ایک شخص اپنے اونٹوں کو کرایہ پر دے کر حج بھی کرنا چاہتا ہے اور لوگ اس کو کہتے ہیں کہ آپ کا حج نہیں ہوگا تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور یہی سوال کیا جو آپ نے مجھ سے کیا۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوگئی:

(لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ) تو آپ ﷺ نے اس شخص کے پاس پیغام بھیجا اور یہ آیت ان پر پڑھی اور فرمایا کہ تیرا حج درست ہے۔ اور سند حسن کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ اگر میں اپنے آپ کو ان لوگوں کو کرایہ پر دوں اور حج کرو تو کیا مجھے ثواب ملے گا، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿وَأَوْلَنْكَ لَهُمْ نَصِيبَ مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾ [البقرة: ۲۰۲] ایسے لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل کے اور اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب لینے والے ہیں۔ (بیان القرآن)

ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک کفارہ ہے

۲۵۰۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ - (متفق عليه)

اخرجه البحاری فی صحیحہ ۵۹۷/۳۔ حدیث رقم ۱۷۷۳۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۸۳/۲ حدیث رقم (۴۳۷-۱۳۴۹)۔

والترمذی فی السنن ۲۷۲/۳ حدیث رقم و ابن ماجہ ۹۶۴/۲ حدیث رقم ۲۸۸۸۔ و مالک فی الموطأ ۳۴۶/۱ حدیث

رقم ۶۵ من کتاب الحج۔ و احمد فی المسند ۲۴۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک عمرہ دوسرے عمرے تک کفارہ ہے۔ ان گناہوں کے لیے کہ ان دونوں کے درمیان میں ہوں۔ یعنی صغیرہ گناہ اور مقبول حج کا بدلہ صرف بہشت ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: العمرة إلى العمرة كفارة لما بينهما:

”العمرة“ عین کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ ہے جیسا کہ قداءت میں تو اتر سے ثابت ہے۔ اور لغات میں ثابت ہے۔ لیکن ابن حجر نے اس میں عجیب و غریب لغت ذکر کی ہے کہ یہ ضمہ اور سکون کے ساتھ ہے یا فتح اور سکون کے ساتھ ہے۔ لغت میں عمرہ زیارت کو کہتے ہیں اور شرعاً طواف اور سعی کے ارادہ کو کہتے ہیں۔

قوله: وال الحج المبرور ليس له جزاء الا الجنة:

”الجنة“: یہ رفع یا نصب کے ساتھ ہے اور یہ لیس الطیب الا المسک کی طرح ہے۔ کیونکہ بنی تمیم اس کو رفع دیتے ہیں اس کو حمل کرتے ہیں کہ لیس نفی کے ختم ہونے کی صورت میں مہمل ہو جاتا ہے جیسا کہ اہل جاز نے ”ما“ کو لیس پر حمل کیا ہے۔ جیسا کہ معنی اللیب میں ہے۔

رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت

۲۵۰۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ عُمْرَةَ فِي رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۰۳/۳۔ حدیث رقم ۱۷۸۲۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۱۷/۲ حدیث رقم (۲۲۱-۱۲۵۶)۔ والنسائی ۱۳۰/۴ حدیث رقم ۲۱۱۔ وابن ماجہ ۹۹۶/۲ حدیث رقم ۲۹۹۴۔ والدارمی ۷۳/۲ حدیث رقم ۱۸۵۹۔ واحمد فی المسند ۲۲۹/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تحقیق رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہوتا ہے یعنی ثواب میں اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان عمرة في..... الخ

”تعديل حجة“ ایک روایت میں ”حجة معی“ کے الفاظ ہیں۔ تو اس صورت میں یہ مبالغہ ہے الحاق ناقص باکامل کے ساتھ ترغیب کیلئے۔

اس حدیث میں دلالت ہے کہ عبادت کی فضیلت میں وقت کی فضیلت سے زیادتی ہوتی ہے اور یہ رمضان کے دن اور رات دونوں کو شامل ہے یا فضیلت میں زیادتی مشقت سے ہوتی ہے تو یہ رمضان کے دن کے ساتھ خاص ہوگا۔ واللہ اعلم

پھر بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مراد افاقی عمر ہے اور کسی عمرہ رمضان میں جائز نہیں ہے اور اس حدیث کا سبب ورود ان کی تائید کرتا ہے اور وہ سبب یہ ہے کہ ایک عورت نے آپ سے شکایت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرنے سے پیچھے رہنے کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا ”اعتمری“ کہ عمرہ کر لو۔ اور اس عورت کا میقات ذوالحلیفہ تھا اور یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رمضان میں عمرہ ادا کرنا منقول نہیں باوجود یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے کچھ دن مکہ میں فتح مکہ کے بعد گزارے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہوئے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمرے ذیقعدہ میں کیے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ابن عمر کی روایت کے مطابق ایک عمرہ رجب میں کیا ہے۔ اور حضرت عائشہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ سال میں ایک بار سے زائد

عمرہ جائز نہیں اور مزنی نے بھی اس کی اتباع کی ہے۔ مگر ہمارے علماء اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ واللہ اعلم

عمرہ کے افعال رمضان میں ہوں نہ کہ صرف احرام جیسا کہ اس کی طرف ابن حجر مائل ہیں۔

نابالغ کو نفلی حج کا ثواب ملتا ہے

۲۵۱۰: وَعَنْهُ قَالَ إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَ رَجُلًا بِالرُّوحَاءِ فَقَالَ مِنَ الْقَوْمِ قَالُوا الْمُسْلِمُونَ فَقَالُوا مَنْ أَنْتَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ فَرَفَعَتْ إِلَيْهِ امْرَأَةٌ صَبِيًّا فَقَالَتْ إِي هَذَا حَجَّ قَالَ نَعَمْ وَلَكِ أَجْرٌ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۷۴/۲ حدیث رقم (۴۰۹-۱۳۳۶)۔ وابن ماجہ ۹۷۱/۲ حدیث رقم ۲۹۱۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک قافلے سے روحاء میں ملاقات کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کونسی قوم ہیں؟ قافلہ والوں نے کہا۔ ہم مسلمان ہیں۔ پھر قافلہ والوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ حضور ﷺ کی طرف ایک عورت نے لڑکے کو بلند کیا یعنی آپ ﷺ کو دکھلایا کجاوے سے اونچا کر کے پھر کہا اس کے واسطے حج ہے یعنی حج کا ثواب فرمایا ہاں تیرے واسطے بھی ثواب ہے اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ان النبی ﷺ لقی رقبا بالروحاء:

”رکباً“: راء کے فتح اور کاف کے سکون کے ساتھ راکب کی جمع ہے یا اسم جمع ہے صاحب کی طرح اور یہ سفر کی حالت میں دس یا دس سے زائد اونٹ سواروں کو کہتے ہیں نہ کہ دوسرے چوپائیوں کو پھر ہر جماعت پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

”الروحاء“: راء کے فتح کے ساتھ ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور کتاب مسلم میں ہے کہ مدینہ سے ۳۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

قولہ: من القوم؟ قالوا: المسلمون: استفہام کے ساتھ ہے۔

قولہ: الہذا حج؟ قال: نعم، وولک اجر: یعنی تمہیں بھی ثواب ملے گا چونکہ تم اس کے حج کی سبب ہوگی اور افعال حج سکھلاؤ گی اگر وہ میتر ہے یا نیابت احرام کا ثواب ملے گا اور رمی اور وقوف کے نیابت کا اور طواف اور سعی میں اس کو اٹھانے کا ثواب ملے گا۔ اگر وہ میتر نہ ہو۔

دوسرے کی طرف سے حج کرنے کا مسئلہ

۲۵۱۱: وَعَنْهُ قَالَ إِنَّ امْرَأَةً مِنْ خُثَعَمَ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ قَرِيضَةَ اللَّهِ عَلَى عِبَادِهِ فِي الْحَجِّ أَدْرَكْتُ أَبِي شَيْخًا كَبِيرًا لَا يَبْتَئُ عَلَى الرَّاحِلَةِ أَفَأَحُجُّ عَنْهُ قَالَ نَعَمْ وَذَلِكَ فِي حَجَّةِ الْوُدَاعِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۷۸/۳۔ حدیث رقم ۱۰۱۳۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۷۴/۲ حدیث رقم (۴۰۸-۱۳۳۵)۔

وابوداؤد فی السنن ۴۰۰/۲ حدیث رقم ۱۸۰۹۔ والترمذی فی السنن ۲۶۷/۳ حدیث رقم ۹۲۸۔ والنسائی ۱۱۸/۵

حدیث رقم ۲۶۴۱ وابن ماجہ ۹۷۰/۲ حدیث رقم ۲۹۰۷۔ والدارمی ۶۱/۲ حدیث رقم ۱۸۳۱۔ ومالك فی الموطأ

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت ہے کہ کہا قبیلہ نثم کی ایک عورت نے کہا اے اللہ کے رسول! تحقیق اللہ تعالیٰ کا فرض اپنے بندوں پر ہے حج کے بارے میں میرا باپ بہت بوڑھا ہے۔ سواری پر نہیں ٹھہر سکتا۔ یعنی نہیں بیٹھ سکتا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں؟ فرمایا کہ ہاں! اور یہ سوال وجوب حَجَّةِ الْوَدَاعِ کے موقع پر تھا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان امرأة من النخعم:

”نخعم“ خاء اور عین کے فتح کے ساتھ بمعنی کے ایک قبیلے کے باپ کا نام ہے پھر اس کے نام سے قبیلہ کا نام رکھا گیا اور اس کا منصرف اور غیر منصرف ہونا دونوں جائز ہے۔

قوله: ان فريضة الله.....الراحلة:

”فی الحج“ فی بمعنی من بیان ہے۔

”ابی“ اور کت کیلئے مفعول ہے۔ شیخاً حال ہے کبیراً شیخاً کیلئے صفت ہے لا یثبت علی الراحلة صفت ثانی ہے یا جملہ متانفہ ہے بیان کیلئے۔

اس حدیث کے شروع میں ہے: ان الفضل بن عباس كان رديف النبي ﷺ، فجعل ينظر اليها، وتنظر اليه، وجعل رسول الله ﷺ يصرف وجه الفضل الى الشق الاخر۔ وقال يا ابن اخی هذا يوم من ملك فيه بصره الامن حق وسمعه الامن حق ولسانه الامن حق۔ غفر له۔

فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کے رديف تھے پس وہ اس عورت کو دیکھنے لگے اور عورت اس کو دیکھنے لگی اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے چہرے کو دوسرے طرف موڑ دیتے تھے اور فرمایا اے بھتیجے یہ ایسا دن ہے کہ اگر اس میں کسی نے اپنے نگاہ اپنے کان اور اپنی زبان حق کے علاوہ چیزوں سے بچا لیتے تو اسکے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اس کی تخریج بیہقی نے کی ہے جیسا کہ سیوطی نے الدر میں کیا ہے ”ادرت“ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ جب وہ بڑھا پے میں مسلمان ہوا اور اس کے پاس مال تھا جس کی وجہ سے اس پر حج فرض ہوا یا اس حالت میں اس کو مال حاصل ہوا جس کی وجہ سے اس پر حج فرض ہوا۔

ابن الملک فرماتے ہیں اس حدیث میں دلیل ہے کہ حج پانچ اور اس بوڑھے پر جو خود حج ادا کرنے سے عاجز ہو فرض ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ (انتھا)، یعنی اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اختلاف ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس کی طرف سے حج کرنا تب درست ہے جب حج کی فرضیت بڑھا پے سے پہلے نہ ہو یعنی وہ وسائل حج کا مالک بڑھا پے کے بعد ہوا ہو۔

اور صاحبین سے ”ظاہر الروایة“ کے مطابق اس پر حج واجب ہے جب وہ توشہ، سواری، اور اس شخص کے خرچے کا جو اس کو سواری پر بٹھائے اتارے اور حج کے اعمال ادا کرنے کے جگہوں کی طرف لیجائے۔ اور امام حسن نے امام ابوحنیفہ سے یہی قول نقل کیا ہے اور جب یہ عاجز ہو تو پھر اس پر دوسرے سے حج کرنا ضروری ہے کیونکہ اس پر اصل حج لازم ہے۔ اور وہ حج بالبدن ہے تو اس پر بدل بھی لازم ہے۔ اور وہ دوسرے سے حج کرانا ہے۔

صاحبین کی دلیل حدیث شعمیہ ہے کہ انہوں نے کہا میرے والد پر حج فرض ہے اور وہ بہت زیادہ بوڑھا ہے۔ سواری پر نہیں تک سکتا

تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ مجھے بتادے کہ اگر تیرے والد پر دین (قرض) ہو اور آپ اس کی طرف سے ادا کر دیں تو یہ اس کی طرف ادا ہو جائے گا؟ تو عورت نے کہا جی ہاں تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اللہ کا دین زیادہ حقدار ہے ادا نیگی کا۔

اور ہماری دلیل اللہ کا یہ ارشاد: ﴿مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ [آل عمران: ۹۷] کہ وجوب کو مقید کیا ہے استطاعت کے ساتھ اور مذکورہ امور کے ساتھ عجز لازم ہونا ہے نہ کہ استطاعت۔

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ عورت کا مرد کی طرف سے حج کرنا درست ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ درست نہیں ہے کیونکہ عورت حالت احرام میں وہ لباس پہنتی ہے جو مرد نہیں پہنتا۔ امام مالک اور امام احمد فرماتے ہیں کہ زندہ کی طرف سے حج کرنا درست نہیں ہے۔ خواہ مال عجز سے پہلے حاصل ہو، ہوا یا بعد میں جیسا کہ مظہر نے ذکر کیا ہے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت نے کہا کہ فریضہ حج میرے والد پر لازم ہے اور وہ خود اس کی ادا نیگی سے عاجز ہے تو کیا میرے لیے درست ہے کہ میں اس کی طرف سے شرعاً حج کروں تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ حج امر (حکم کرنے والے) کی طرف سے واقع ہوتا ہے اور یہی شمس الائمہ سرخسی کا مختار مذہب ہے اور محققین کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے اور یہی ظاہر مذہب ہے۔

قوله: وَذَلِكَ فِي حُجَّةِ الْمَوَدَاعِ: "الوداع" وَاذْكَ فَتَحَّجَّكَ سَاحْتَهُ هُوَ اَوَّلُ بَعْضِ نَعْمَ كَسَرَهُ كَسَرَهُ هُوَ۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس حج میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو الوداع کہا اور ہجرت کے بعد اسکے علاوہ آپ نے کوئی حج نہیں کیا اور یہ ۱۰ھ کو ہوا۔

حج بدل کا مسئلہ

۲۵۱۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ أَنِّي رَجُلٌ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ إِنَّ أُخْتِي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ وَانْهَى مَاتَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَوْ كَانَ عَلَيْهَا دَيْنٌ أَكُنْتُ قَاضِيَةً قَالَ نَعَمْ فَاقْضِ دَيْنَ اللَّهِ فَهُوَ أَحَقُّ بِالْقَضَاءِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی المسند ۵۸۴/۱۱۔ حدیث رقم ۶۶۹۹۔ واحمد فی المسند ۳۱۰۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا کہ میری بہن نے نذرمانی تھی کہ وہ حج کرے گی اب وہ مر گئی ہے۔ پس نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر اس پر قرض ہوتا کیا تو اس کو ادا کرتا کہا کہ ہاں تو لہذا اللہ کا دین بھی ادا کرو۔ وہ لائق تر ہے ادا کرنے کے ساتھ۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وانها ماتت: "انها" ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

قوله: اكنت قاضيه: قوله: فاقض دين الله فهو احق بالقضاء: کہ اس کو بہن کے ورثہ میں کچھ مال بلا ہوگا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حقوق اللہ کو حقوق عباد پر قیاس کرتے ہوئے اس کو بہن کا حج نذر کے ادا کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ اجمال ہمارے فقہی تفصیل کے منافی نہیں ہے۔ کہ وارث کی طرف حج کرنا تب واجب ہے جب وہ وصیت کر لے ورنہ یہ حج نفلی ہوگا۔

مسلم نے روایت کیا ہے کہ عورت نے کہا اللہ کے رسول ﷺ کہ میری والدہ وفات پا گئی ہیں اور اس نے حج نہیں کیا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کی طرف سے حج کر لو۔

اور یہ بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ قبیلہ ثعم کے ایک آدمی نے کہا اللہ کے رسول! کہ میرے والد مسلمان ہو گئے ہیں اور وہ بہت زیادہ بوڑھے ہیں سواری پر سوار ہونے کی طاقت نہیں رکھتا اور حج اس پر فرض ہے تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں؟ تو آپ ﷺ نے

فرمایا کہ مجھے بتا کہ آپ ان کے بڑے بیٹے ہیں؟ تو اس نے کہا ہاں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بتا اگر تیرے والد پر قرض ہو اور وہ تو اس کی طرف سے ادا کر دے تو وہ اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا؟ تو اس نے کہا ہاں تو آپ نے فرمایا تو پھر اس کی طرف سے حج کر دے۔

عورت کے ساتھ سفر میں محرم کا ہونا ضروری ہے

۲۵۱۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَخْلُونَ رَجُلٌ بِمَرْأَةٍ وَلَا تُسَافِرَنَّ امْرَأَةٌ إِلَّا وَمَعَهَا مُحْرَمٌ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَكْتَبْتُ فِي غَزْوَةٍ كَذَا وَكَذَا وَخَرَجَتْ امْرَأَتِي حَاجَةً قَالَ أَذْهَبُ فَاحْجُجْ مَعَ امْرَأَتِكَ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۴۲/۶ - حدیث رقم ۲۰۰۶ - و مسلم فی صحیحہ ۹۷۸/۲ حدیث رقم (۴۲۴ - ۱۳۴۱)۔
۲۵۱۴: اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۷۵/۶ - حدیث رقم ۲۸۷۵ - وابن ماجہ فی السنن ۹۶۸/۲ حدیث رقم ۲۹۰۱ -
واحمد فی المسند ۶۷/۶ -

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ خلوت نہ کرے یعنی اجنبی مرد و عورت تہا ایک مکان میں جمع نہ ہوں اور عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے پس ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ میرا نام فلانے غزوہ میں لکھا گیا ہے اور فلانے کے یعنی فلانا جہاد جو درپیش ہے اور وہاں لشکر جانا ہے اس میں میرا نام بھی لکھا گیا کہ میں ان کے ساتھ بیٹھ جاؤں اور میری بیوی نے حج کا ارادہ بھی کیا ہے یعنی میں کیا کروں آیا جہاد کے لیے جاؤں یا بیوی کو اکیلا حج کے لیے جانے دوں یا بیوی کے ساتھ جاؤں اور جہاد میں نا جاؤں۔ فرمایا اپنی عورت کے ساتھ حج کرو فرمایا کہ غازی بہت ہیں تیری بیوی کے ساتھ تیرے علاوہ کوئی محرم نہیں ہے اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: لا یخلون رجل..... الا ومعها محرم:

”الا ومعها محرم“ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صحیحین میں ”لا تسافر امرأة ثلاثاً الا ومعها ذورحم“ ہے اور صحیحین کے بعض روایات کے الفاظ میں ”فوق ثلاث“ ہے۔

بخاری کے الفاظ: ”ثلاثة ايام“ ہے اور بزار کی روایت میں لا تحج امرأة الا ومعها ذو محرم اور دارقطنی کی روایت میں لا تحجن امرأة الا ومعها ذو محرم“ ہے ”مع امراتك“ اور بزار کی روایت میں ”قال ارجع فحج معها“ ہے۔
حل لغات: ”لا یخلون“ ”نہی میں مبالغہ تاکید ہے۔

قولہ: اکتبت فی.....: ”اکتبت“ مجہول متکلم کا صیغہ ہے باب التبعال سے علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اکتبت کا مطلب ہے کہ میرا نام جہاد میں نکلنے والوں میں لکھا ہے کہا جاتا ہے اکتبت الکتاب، بمعنی کتبته، اکتبت الرجل کہتے ہیں جب آدمی اپنا اندراج بادشاہ کے دیوان میں کرے۔

”فاحجج“ جیم اول کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ابن مالک فرماتے ہیں کہ جب عورت کے ساتھ محرم نہ ہو تو اس پر حج لازم نہیں ہے۔ اور یہی امام ابو حنیفہ اور احمد کا مذہب ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جب اس کے ساتھ عورتوں کی ایک پوری جماعت ہے تو پھر حج فرض ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس پر حج لازم ہو جاتا ہے جب اس کے ساتھ قابل بھروسہ عورت ہو۔ (اتحی)

شہنی فرماتے ہیں: یہ امام مالک کا مذہب ہے کہ جب عورت کو پر امن مصاحب ملے تو اس پر حج لازم ہے۔ کیونکہ یہ سفر ہجرت کی طرح فرض ہے۔ اور امام شافعی کا مذہب ہے کہ اس کے ساتھ قابل بھروسہ عورتیں ہوں تو ان کے ساتھ اس پر حج فرض ہے۔ پھر امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ بات جان لیں کہ عورت کیلئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ معتدہ نہ ہو۔

محرم اصطلاح شریعت میں اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہو۔ خواہ قربات کے لحاظ سے ہو یا دودھ کے رشتہ سے یا سرال کے ناطے سے۔ نیز محرم کا عاقل و بالغ ہونا اور مجوسی و فاسق نہ ہونا بھی شرط ہے۔ علامہ طینی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اہم کام کو مقدم کرنا چاہیے کیونکہ جہاد میں کوئی اور اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔

عورتوں کا جہاد حج ہے

۲۵۱۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اسْتَأْذَنْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ جِهَادُ كُنَّ الْحُجَّ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۶۶/۲ - حدیث رقم ۱۰۸۸ - و مسلم ۹۷۵/۲ حدیث رقم (۴۱۳ - ۱۳۳۸) - و الترمذی فی السنن ۲۷۲/۳ حدیث رقم ۱۱۶۹ - وابن ماجہ ۹۶۸/۲ حدیث رقم ۲۸۹۸ - والدارمی ۳۷۴/۲ حدیث رقم ۲۶۷۸ - و مالک فی الموطأ ۱۷۹/۲ حدیث رقم ۳۷ من کتاب الاستئذان - احمد فی المسند ۱۳/۲ -

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے اجازت مانگی نبی کریم ﷺ سے جہاد کرنے کی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہارا جہاد حج ہے یعنی تم پر جہاد نہیں ہے اور اگر استطاعت ہو تو حج ہے اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ابن ملک فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ تم پر جہاد نہیں ہے بلکہ تم پر حج لازم ہے اگر اس کی استطاعت ہو۔

عورت کو بغیر محرم سفر کرنے کی اجازت نہیں ہے

۲۵۱۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تُسَافِرُ امْرَأَةٌ مَسِيرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو

مَحْرَمٍ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۶۶/۲ - حدیث رقم ۱۰۸۸ - و مسلم ۹۷۵/۲ حدیث رقم (۴۱۳ - ۱۳۳۸) - و الترمذی فی السنن ۲۷۲/۳ حدیث رقم ۱۱۶۹ - وابن ماجہ ۹۶۸/۲ حدیث رقم ۲۸۹۸ - والدارمی ۳۷۴/۲ حدیث رقم ۲۶۷۸ - و مالک فی الموطأ ۱۷۹/۲ حدیث رقم ۳۷ من کتاب الاستئذان - احمد فی المسند ۱۳/۲ -

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی عورت ایک دن اور ایک رات کی مسافت کی بقدر سفر نہ کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: لا تسافر امرأة بیئنی بمعنی نبی ہے اور ایک نسخہ میں صیغہ نبی کے ساتھ ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ عورت کیلئے مدت سفر سے کم مدت کیلئے بغیر محرم کے نکلنا جائز ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں یہ صحیحین کی حدیث سے اشکال ہوتا ہے کہ ابو سعید خدری سے مرفوع روایت ہے "لا تسافر المرأة یومین الا ومعها زوجها او ذو محرم منها" کہ عورت دو یوم کی سفر نہ کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ شوہر یا اس کا کوئی محرم ہو۔ اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع روایت ہے: "لا یحل لامرأة تؤمن بالله والیوم الآخر أن تسافر مسیرة یوم وليلة الا مع ذی محرم علیها" اور مسلم کی روایت میں "مسیرة لیلۃ کے الفاظ ہے

یعنی ایک رات کے سفر میں بھی بغیر محرم کے نہ جائے۔ اور ایک روایت میں ”یوم“ کا لفظ ہے۔ اور ابوداؤد کی روایت میں ”بریداً“ کا لفظ ہے۔ یعنی دور فرسخ یا بارہ میل، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور یہ حدیث صحیح ابن حبان میں بھی ہے اور حاکم کی کتاب میں بھی ہے۔ حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور طبرانی کے معجم میں تین میل کا ذکر ہے ان سے پوچھا گیا کہ لوگ کہتے ہیں یہ لفظ ثلاثاً ایام یعنی تین دن ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ لوگوں کو وہم ہوا ہے۔

منذری کہتے ہیں کہ ان الفاظ میں کوئی تباہی اور اختلاف نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ مختلف جگہوں پر سوالات کے مطابق فرمائے ہوں اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مثال پیش کی ہے اقل مدتوں کی تو ایک دن پہلا عدد اور اقل عدد ہے اور دو دن یہ پہلا کثیر ہے اور کثیر میں سب سے اقل ہے۔ اور تین دن پہلا جمع ہے، تو گویا کہ اس سے اشارہ کیا کہ کم مدت کیلئے بھی عورت بغیر محرم کے نہیں نکل سکتی تو زیادہ کیلئے کیسے نکل سکتی ہے (ابنہی)

حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مطلقاً نکلنے سے منع پر تشبیہ فرمائی ہے مگر محرم یا شوہر کے ساتھ۔ اور منع کی صراحت بھی ہے اگر سفر سے مراد لغوی ہو۔ صحیحین میں ابن عباس مرفوع روایت ہے: (لا تسافر المرأة الا مع ذی محرم) اور لغت میں سفر کا اطلاق اس سے کم مدت پر بھی ہوتا ہے۔ محقق ابن ہمام کا کلام مکمل ہوا۔

(لیکن اس تضاد و اختلاف کو دور کرنے کیلئے علماء فرماتے ہیں کہ حدیث مطلق طور پر جو یہ منقول ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند یا محرم کے بغیر سفر نہ کرے تو چونکہ شرعی طور پر سفر کا اطلاق تین دن سے کم پر نہیں ہوتا اس لیے فقہاء نے اس حدیث کو تین دن کی مسافت کے بقدر سفر پر محمول کیا ہے۔ اور جن حدیثوں میں دو دن یا ایک دن کی مسافت کے بقدر سفر سے منع کیا ہے تو اس کو فتنہ و فساد پر محمول کیا ہے)۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ محرم عورتیں جس کی طرف دیکھنا جائز ہو اور جن کے ساتھ سفر جائز ہو ہر وہ عورت ہے جس کے ساتھ ہمیشہ کیلئے نکاح حرام ہو۔ سبب مباح سے اس کی حرمت کی وجہ سے تو ہمیشہ کی قید سے بیوی کی بہن، پھوپھی اور خالہ نکل گئی اور سبب کی قید سے موطوءہ بالشہبہ کی ماں اور بہن نکل گئی، کیونکہ ان دونوں سے نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہے مگر یہ محرم نہیں ہے کیونکہ وہی بالشہبہ کو مباح نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ وہ فعل مکلف کے ساتھ نہیں ہے اور حرمت کی قید سے لعان والی عورت نکل گئی کیونکہ اسکے ساتھ نکاح کا حرام ہونا احرام کی وجہ سے نہیں بلکہ بطور تزنا ہے۔ اور مسیرۃ یوم و لیلۃ سے مراد تجدید نہیں ہے کیونکہ ہر وہ مسافت جس کو سفر کہا جائے تو اس میں عورت کے ساتھ شوہر یا محرم کا ہونا ضروری ہے۔ یا قابل بھروسہ عورتیں، خواہ عورت جوان ہو یا بوڑھی ہو، ہاں عورت کیلئے دارالکفر سے بغیر محرم کے ہجرت کرنا جائز ہے (ابنہی)

اور اسی پر محمول کیا جائے وہ حدیث جس میں ہے کہ قریب ہے کہ عورت حرہ سے اکیلے نکل کر بیت اللہ کا طواف کرے گی اور اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کو نہ ہوگا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

اور یہی حکم اس عورت کا ہے جو قید سے رہا ہو جائے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء کا اتفاق ہے کہ عورت حج اور عمرہ کے سفر کیلئے بغیر محرم کے نہ جائے۔ مگر دارالحرہ سے ہجرت کر سکتی ہے کیونکہ دارالحرہ میں رہنا جب دین کے قائم کرنے پر استطاعت نہ ہو حرام ہے اور اس میں جوان اور بوڑھی برابر ہے کیونکہ عورت محل شہوت ہے اور ہر گری بڑی چیز کو کوئی اٹھانے والا ہوتا ہے۔

مواقیت حج

۲۵۱۶: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ وَقَّتْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ وَلَا أَهْلَ الشَّامِ الْجُحْفَةَ وَلَا أَهْلَ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ لِأَهْلِ الْيَمَنِ يَكْتُمَنَّ فَهَنَّ لَهُنَّ وَلَمَنْ آتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِنَّ لِمَنْ كَانَ بِرَيْدِ الْحَجِّ

وَالْعُمْرَةَ فَمَنْ كَانَ دُونَهُنَّ فَمَهَلَّةٌ مِنْ أَهْلِهِ وَكَذَلِكَ وَكَذَلِكَ حَتَّىٰ أَهْلُ مَكَّةَ يَهْلُونَ مِنْهَا - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۸۷/۳ - حدیث رقم ۱۰۲۶ - ومسلم فی صحیحہ ۸۳۸/۲ حدیث رقم (۱۱ - ۱۱۸۱)
وابوداؤد فی السنن ۳۵۳/۲ حدیث رقم ۱۷۳۸ - والنسائی ۱۲۶/۵ حدیث رقم ۲۶۵۸ - والدارمی فی السنن ۴۷/۲
حدیث رقم ۱۷۹۲ - واحمد فی المسند ۳۳۲/۱

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے احرام باندھے کی جگہ مقرر کی۔ اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ اور شام والوں کے جگہ کو اور نجدیوں کے لیے قرن منازل کو اور یمن والوں کے لیے یلملم پس یہ تمام جگہیں احرام باندھنے کی ہیں ان شہر والوں کے لیے جو کہ مذکورہ ہوئے ہیں اور ان کے لیے بھی جو ان مقامات سے گزریں ان کے اہل کے علاوہ یعنی مثلاً ہندوستان والے جب یمن کے راستے پر پہنچے تو یلملم سے احرام باندھیں اور اسی طرح دوسرے شہر والوں کا حال ہے۔ کہ جب وہ احرام کی جگہ پر آئیں وہیں احرام باندھیں یہ جگہیں احرام کی ہیں اس لیے وہ حج کا ارادہ کرے اور عمرے کا۔ جو شخص ان مواضع کے اندر رہنے والا ہے۔ اس کے احرام کی جگہ اپنے گھر سے ہے اور اسی طرح اور اسی طرح یہاں تک کہ اہل مکہ کے سے احرام باندھیں۔

تشریح: قوله: وقت رسول اللہ ﷺ لاهل المدينة ذالْحَلِيفَةِ: ”وَقْتُ“ قاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔ کہا گیا ہے کہ وقت مفروضہ زمانہ کے استیفاء کو کہتے ہیں اور میقات کام کیلئے مقررہ وقت کو کہتے ہیں اور کام کی جگہ کو بھی کہتے ہیں، میقات اہل مدینہ اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں سے مدینہ والے احرام باندھتے ہیں۔

”وَقْتُ“ کا معنی ہے کہ اس جگہ کو احرام باندھنے کیلئے میقات مقرر کیا، یعنی احرام کا حد اور اس کیلئے جگہ کو بیان کیا۔
”ذالْحَلِيفَةِ“ مدینہ سے دوفرسخ پر واقع ایک مقام کا نام ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مکہ سے دس مراحل پر واقع ہے۔ یہ ابن الملک رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور یہ بنی شہم کے پانیوں میں سے ایک پانی ہے اور حلیفہ التصغیر ہے۔ حلیفہ قصبہ کی طرح اور یہ پانی کے اندر ایک قسم کی گھاس کا نام ہے۔ اس کی جمع حلفاء ہے۔ اور اب یہ بزرگی کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اس نام کا مسمی معلوم نہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اس میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جن سے لڑائی کی تھی تو یہ جھوٹ ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

قوله: ولاهل الشام الجحفة: ”الجحفة“ جیم کے ضم کے ساتھ اور حاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان شامی جانب سے ایک مقام کا نام ہے۔ ذوالحلیفہ کے محاذات میں ہے مکہ سے ”۵۰“ فرسخ پر ہے۔ ابن الملک نے جو ذکر کیا ہے اس کے مطابق اس کا نام مہبعة تھا۔ سیلاب یہاں کے رہنے والوں کو بہا گیا، تو اس کا نام جحفہ رکھا گیا، کہا جاتا ہے اجف، جب اس کو لیجائے۔ سیل جفاف کہتے ہیں۔ جب زمین میں گھڑا بنا دے اور زمین کو بہا کے لے جائے۔ اور اب یہ الرابیع کے نام سے مشہور ہے۔

”ولاهل الشام“ یعنی ان کے پرانے راستے کے مطابق ورنہ اب شام والے مدینہ سے گزرتے ہیں، ابن حجر فرماتے ہیں کہ جب وہ مدینہ کے راستے سے نہ گزرے ورنہ تو پھر ان پر ذوالحلیفہ سے احرام باندھنا لازم ہوگا اس پر اجماع ہے۔ امام نووی کے قول کے مطابق۔ لیکن امام نووی کا یہ قول بہت عجیب و غریب ہے کیونکہ امام مالک اور ابو ثور کے نزدیک ان کیلئے جگہ تک احرام مؤخر کرنا جائز ہے اور ہمارے احناف کے نزدیک مدینہ والے کیلئے بھی جگہ تک احرام میں مؤخر کرنا جائز ہے۔ تو اس اختلاف کے ہوتے ہوئے اجماع کا دعویٰ باطل ہے، اور امام شافعی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ اہل شام، مصر اور مغرب کیلئے جگہ ہے۔

قوله: ولاهل نجد قرن المنازل: ”قرن المنازل“ راء کے سکون کے ساتھ اور راء کے حرکت کے ساتھ خطا ہے۔ گول چکنا

پہاڑ ہے۔ گویا کہ انڈہ ہے عرفات کے اوپر ہے۔

قوله: ولاهل يمن يللملم: ”يَلْمَلْمُ“ تہامہ کے پہاڑوں کے درمیان ایک پہاڑ ہے۔ مکہ سے دورات کے مسافت پر واقع ہے۔ اور اس کو الملم، ہمزہ کے ساتھ بھی کہا گیا ہے۔

قوله: فھن لھن والعمرة: ”فھن“ یعنی یہ مواضع ”لھن“ ان مواضع کے لوگوں کیلئے ہے اور ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں علامہ طیبی کے اتباع میں، کہ یہ مواضع، ان مواضع کے رہنے والوں کیلئے ہے اور اس پر آنے والا قول دلالت کر رہا ہے ”ولمن اتی علیھن الخ“ کہ یہ میقات یہاں کے مقیم لوگوں کیلئے ہے اور ان لوگوں کیلئے ہے جو یہاں کے مقیمین کے علاوہ یہاں سے آئے۔ لیکن یہ دو وجہوں سے صحیح نہیں ہے۔

اولاً تو اس لیے کہ ”فھن“ میں فاء باء کو ماقبل پر تفریح کرنے کیلئے ہے کہ اس کو تفصیل کے بعد اجمالاً ذکر کیا تا کہ اس پر عطف کر دے ان مواضع کا حکم جو ذکر نہیں ہوئے استیفاء حکم کے خاطر۔ اس کا درست مطلب یہ ہے کہ یہ میقات یہاں کے لوگوں کیلئے ہے چاہے وہ یہاں مقیم ہوں یا مسافر ہوں۔ اور ان لوگوں کیلئے ہے جو یہاں سے گزرے اور ان علاقوں کے نہ ہو۔ ابن نہام فرماتے ہیں۔ ایک روایت میں ”ھن لھم“ کے الفاظ ہیں لیکن اول مشہور ہے اور وہ حذف مضاف کے ساتھ ہے یعنی ھن لا ھلھن ہے۔

اور ثانیاً: اس وجہ سے کہ مذہب یہ ہے کہ یہ مواضع باہر سے آنے والوں کیلئے ہے کہ ان پر واجب ہے کہ وہ ان سے بغیر احرام سے تجاوز نہ کرے حرم کے تعظیم کی وجہ سے، جس میں ان کے داخل ہونے کا ارادہ ہے۔ باقی ان مواضع کے رہائشی لوگ تو ان کا حکم وہی ہے جو اس شخص کا ہے جو حل سے اس میقات میں داخل ہوا ہو، کہ ان کا میقات حل ہے اور ان کیلئے احرام کے بغیر میقات سے تجاوز کرنا جائز ہے جب ان کا ارادہ حج و عمرہ کا نہ ہو۔ اگر ان کا ارادہ ہو تو پھر بغیر احرام کے ان کیلئے بھی جانا جائز نہیں ہے۔

”لمن كان“ ماقبل سے بدل ہے یعنی حج و عمرہ میں سے کسی ایک کی جگہ اور وہ ہمارے نزدیک حرم ہے اور امام شافعی کے اقوال میں تفصیل اور مختلف اقوال ہیں اور ابن حجر کا یہ قول بہت عجیب و غریب ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ احرام کو لازم کرنا ارادہ حج کے ساتھ ظاہر دلیل ہے کہ حج میں ترافعی جائز ہے اور اس میں وجہ غرابت ظاہر ہے۔

قوله: فمن كان دونھن فمھله من اھله:

”فمھله“ مفعول کا صیغہ ہے۔ معنی ہے احرام باندھنے کی جگہ۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جس کا گھر مکہ کے قریب ہو ان مواضع سے (اتنی)

اور صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مواضع اور حرم کے درمیان رہتے ہوں اور نفس مواضع کے لوگوں کا حکم آپ ﷺ نے ذکر نہیں کیا ہے۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ ان کا حکم وہی ہے جو داخل مواضع کا ہے۔ اور طحاوی کے نزدیک ان کا حکم آفاقی کا ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ کسی کیلئے بقات مکہ ہے حج اور عمرہ دونوں میں اور مذہب یہ ہے کہ عمرہ کرنے والا احرام کیلئے حل کی طرف نکلے گا۔ کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف نکلنے کا حکم دیا تھا۔ تو یہ حدیث حج کے ساتھ مخصوص ہے۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ حل کا سب سے افضل جگہ ہزارہ ہے اس لیے کہ آپ ﷺ نے یہی سے احرام باندھا تھا حنین سے واپسی کے وقت ۱۲، ذیقعدہ ۸ ہرات کے وقت، اور واپسی بھی رات کو ہوئی۔ تو یہ پوشیدہ اور غیر واضح ہے، اور اسی وجہ سے بعض صحابہ نے اس کا انکار

کیا ہے اور اس قول کی بنیاد امام شافعی کا اصول میں اس مذہب پر ہے کہ نفل، قول سے زیادہ قوی ہوتا ہے برخلاف ہمارے مذہب کے کہ ہمارے نزدیک بنیاد اس پر ہے کہ نفل تو کبھی اتفاق بھی ہوتا ہے برخلاف قول کے کہ صرف ارادۃ ہوتا ہے۔ اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ آپ ﷺ اطائف اور حیرانہ سے اسی کے راستے سے لوٹے تو وہاں سے آپ ﷺ کا احرام تو متعین ہے، ہاں اگر آپ ﷺ مکہ سے نکل کر حیرانہ سے احرام باندھ لیتے تو یہ اس کے افضلیت کی صحیح وجہ ہوتی۔

اور اس کی مثال حضرت علی کا احرام یلملم سے باندھا ہے جبکہ وہ یمن کے راستے سے آرہے تھے اور شیعہ مکہ سے نکل کر یلملم سے احرام باندھتے ہیں اور یہ عکس موضوع ہے بلکہ خلاف شرع اور جس نے یہ کہا ہے کہ ۷ھ کو عمرۃ القضاء میں آپ ﷺ نے احرام حیرانہ سے باندھا تھا تو وہ خطا میں پڑے ہیں بلکہ آپ ﷺ نے ذوالحلیفہ سے احرام باندھا تھا۔ اور اسی طرح حدیبیہ کے سال بھی آپ ﷺ کا احرام یلملم سے تھا۔

اور جس نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے یہاں سے عمرہ کرنے کا ارادہ کیا تھا تو ان کو وہم ہوا ہے۔
”یہلون“ یعنی حج کا احرام باندھتے ہیں، علامہ طبری فرماتے ہیں کہ ”مہل“ موضع اہلال کو کہتے ہیں اور اہلال تلبیہ کہتے ہوئے آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں۔

میقات احرام کا بیان

۲۵۱۷: وَعَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَهَلُّ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ وَالطَّرِيقِ الْآخِرِ الْجُحْفَةَ وَمَهَلُّ أَهْلِ الْعِرَاقِ مِنْ ذَاتِ عِرْقٍ وَمَهَلُّ أَهْلِ نَجْدٍ قُرُونٌ وَمَهَلُّ أَهْلِ الْيَمَنِ يَلْمَلُمٌ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۸۴۱/۲ حدیث رقم (۱۸ - ۱۱۸۳)۔ والنسائی فی السنن ۱۲۲/۵ حدیث رقم ۲۶۵۱۔
ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ مدینہ والوں کے لیے احرام باندھنے کی جگہ ذی الحلیفہ ہے اور دوسرا راستہ جحفہ ہے اور عراق والوں کی احرام باندھنے کی جگہ ذات عرق ہے جو ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے دو منزل کے فاصلے پر ہے اور نجد والوں کی جگہ قرن ہے اور یمن والوں کی احرام کی جگہ یلملم ہے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: مهل اهل المدينة من ذی الحلیفہ والطریق الآخر الجحفۃ: حل لغات: ”مهل“ اسم مکان ہے

بمعنی احرام کی جگہ اور ابن حجر کی یہ بات غرابت سے بھری ہے کہ وہ کہتے ہیں مهل اهل مدینہ کا مطلب ہے احرامہم یعنی ان کا احرام۔ اس کا اصل ہے اہلالہم ان کے احرام کی جگہ پھر اس کا اطلاق ظرف زمان اور مصدر پر ہونے اور اس کا معنی مصدری ہے تلبیہ کے ساتھ اور بلند کرنا، اور اس قول کی غرابت کی وجہ مخفی نہیں ہے کیونکہ مزید کا اسم مفعول مشترک ہوتا ہے، اسم زمان، مکان اور مصدر کے مابین جیسا کہ علم الصرف کے متون میں یہ ذکر ہے۔

”الجحفۃ“ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جب وہ جحفہ کے راستے سے آئے تو یہی جحفہ ان کا میقات ہے (انجلی)

لیکن یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ مذہب یہ ہے کہ جو شخص بغیر احرام کے اپنے میقات سے تجاوز کر لے پھر کسی اور میقات پر آ کر وہاں سے احرام باندھ لے تو یہ اس کیلئے جائز ہے اور اپنے میقات سے احرام باندھنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تاخیر مکروہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تاخیر مناسب ہے۔ اور اس مسئلہ میں امام شافعی کا اختلاف ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دوسرے میقات پر جانا

جائز نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ابن حجر نے اس حدیث کے حل کرنے میں تکلف سے کام لیا ہے کہا ہے کہ احرام باندھنے کی جگہ دوسرے راستے والوں کیلئے جو ذوالحلیفہ سے نہیں گزرتے اور نہ اس کے دائیں اور بائیں سے گزرتے ہیں اچھے ہے۔

قوله: مهمل اهل العراق من ذات عرق: ”عرق“ عین کے کسرے کے ساتھ مکہ سے دوسرا محل پر ایک مقام ہے اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔

اور علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ایک جگہ ہے جس میں عرق ہے اور عرق چھوٹے پہاڑ کو کہتے ہیں۔
”ذات عرق“ اور ایک نسخہ میں ”من ذات عرق“ ہے۔

”ذات عرق“ کہا گیا ہے کہ ذات عرق کا میقات ہونا حضرت عمرؓ کے اجتہاد سے ثابت ہے۔ امام شافعی نے الام میں ذکر کیا ہے اور اس پر بخاری کی روایت دلالت کر رہی ہے جو ابن عمرؓ سے ہے کہ جب بصرہ اور کوفہ فتح ہوئے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو وہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجد والوں کیلئے قرن کو مقرر کیا ہے اور ہم جب قرن آنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ ہم پر گراں گزرتا ہے تو حضرت عمر نے فرمایا کہ اپنے راستے سے قرن کے حدود تلاش کرو۔ پھر ان کیلئے ذات عرق مقرر کر دیا۔ امام شافعی نے ان دونوں روایتوں کی جمع اور تطبیق یوں کی ہے کہ حضرت عمرؓ تک یہ حدیث نہیں پہنچی تھی تو اس نے اجتہاد کیا اور اسی کا اجتہاد صحیح اور حدیث کے مطابق ہوا۔ اور یہ حضرت عمرؓ کے عادات میں سے ہے موافقات میں۔ اسی سے امام شافعی نے دونوں روایتیں ذکر کی ہے۔ اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ عراق تو آپ ﷺ کی وفات کے بعد فتح ہوا ہے (تو آپ ﷺ نے ان کیلئے میقات کیسے مقرر کی) کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ عراق فتح ہوگا تو اس لیے وہاں کے لوگوں کیلئے میقات مقرر فرمایا۔ جیسا کہ مصر اور شام والوں کیلئے ان کے فتح ہونے سے پہلے میقات مقرر فرمائے تھے۔ پھر اہل عراق کی طرح اہل خراسان بھی ہیں اور ان کے علاوہ جو ذات عرق سے گزرتے ہیں اور یہ ترمذی کی روایت کے بھی منافی نہیں اور اس کے حسن ہونے کے بھی منافی نہیں۔ اگرچہ اس پر بعض نے اعتراض کیا ہے کہ اس میں ضعیف راوی ہے کہ آپ ﷺ نے اہل مشرق کیلئے عقیق مقام کو میقات مقرر فرمایا تھا۔ کیونکہ عرق عقیق کے اوپر ایک پہاڑ ہے۔ اور ذات عرق کے قرب و جوار کا علاقہ خراب ہو چکا ہے اسی وجہ سے امام نووی نے فرمایا کہ اہل عراق پر لازم ہے کہ وہ سوچیں اور ذات عرق کے پرانے نشانات تلاش کریں تاکہ وہاں سے احرام باندھیں۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ جب وہ عقیق سے احرام باندھتے تو یہ زیادہ احوط ہے۔ کیونکہ یہ ذات عرق سے پہلے ہے اور اس کی نظیر جھہ اور رابع ہے کہ وہ جھہ سے مقدم ہے۔ پس احتیاط پہلے والے سے احرام باندھنے میں ہے۔

قوله: و مهمل اهل نجد قرن: ”قرن“ راء کے سکون کے ساتھ ہے اور جو ہری کو وہم ہوا ہے کہ انہوں نے اس کو راء کے فتح کے ساتھ کہا ہے کیونکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے جس کی طرف اویس قرنی کی نسبت ہے۔

آپ ﷺ کے عمروں کا بیان

۲۵۱۸: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ اعْتَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَرْبَعَ عُمَرٍ كُلَّهُنَّ فِي ذِي الْقَعْدَةِ إِلَّا الَّتِي كَانَتْ مَعَ حَجَّتِهِ عُمَرَةٌ مِنَ الْحُدَيْبِيَّةِ فِي ذِي الْقَعْدَةِ وَعُمَرَةٌ مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ فِي ذِي الْقَعْدَةِ وَعُمَرَةٌ مِنَ الْجِعْرَانَةِ حَيْثُ قَسَمَ عَنَانِمَ حُثَيْنَ فِي ذِي الْقَعْدَةِ وَعُمَرَةٌ مَعَ حَجَّتِهِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۳۹/۷ - حدیث رقم ۴۱۴۸ و مسلم فی صحیحہ ۹۱۶/۲ حدیث رقم (۲۱۷ - ۱۲۵۳)۔

و ابوداؤد فی السنن ۵۰۶/۲ حدیث رقم ۱۹۹۴۔ والترمذی ۱۷۹/۳ حدیث رقم ۸۱۵۔ والدارمی ۴۶۷/۲ حدیث رقم ۱۷۸۷۔ واحمد فی المسند ۱۳۴/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے چار عمرے کیے۔ سب ذی قعدہ میں تھے مگر وہ عمرہ جو حج کے ساتھ کیا وہ جو ذی الحجہ کے مہینے میں تھا اور ان چار عمروں کا بیان یہ ہے کہ ایک عمرہ حدیبیہ سے ذیقعدہ کے مہینے میں اور دوسرا عمرہ اس سے اگلے برس میں وہ بھی ذیقعدہ میں ہوا اور تیسرا عمرہ بھرانہ سے ہوا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں غزوہ حنین کی غنیمت بانٹی گئی۔ یہ عمرہ بھی ذیقعدہ کے مہینے میں ہوا اور چوتھا عمرہ ذی الحجہ کے مہینے میں حج کے ساتھ تھا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اعتمر رسول اللہ ﷺ..... مع حجتہ: ”عمر“ یہ عمر علم کے وزن پر ہے لیکن یہ منصوف ہے عمرۃ کی جمع ہے۔

”القعدة“: قاف کے فتح کے ساتھ ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی ہے اگر اس کی بناء ”مرۃ“ یا ”هنية“ کیلئے ہو۔
”حجة“: حاء کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

قولہ: بعمرة من الحديبية: فی ذی القعدة: ”الحديبية“ تخفیف کے ساتھ ہے اور تشدید کے ساتھ بھی ہے۔
حرم کے حدود میں سے ایک حد ہے مکہ سے (۹) میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

”عمرۃ من الحديبية“ نصب کے ساتھ بدل ہے اور رفع کے ساتھ مبتداء موصوف ہے۔ من الحديبية صفت ہے اور فی ذی القعدة خبر ہے۔

قولہ: بعمرة من الجعرانة: ”الجعرانة“ جیم کے کسرہ اور عین کے سکون کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں عین کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے اور یہ (۶) میل یا (۹) میل کے مسافت پر ہے دوسرا زیادہ صحیح ہے۔

قولہ: ”عمرۃ مع حجة“ یہ عمرہ بھی احرام کے اعتبار سے ذیقعدہ میں تھا تو ابن حجر کا یہ قول کہ یہ عمرہ ذی الحجہ میں کیا تھا محمول ہے افعال عمرہ کی ادائیگی پر لیکن اس وقت ان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ان کے مذہب کے مطابق قارن کیلئے تدخل افعال ہے تو ان کے مذہب کے مطابق افعال عمرہ حقیقہ نہیں ہوئے بلکہ حکماً ہوئے اور اس کے بعد ظاہر ہے۔

پھر حضرت انسؓ کا یہ قول کہ احرام حدیبیہ سے باندھا تھا۔ حالانکہ بخاری میں یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اس عمرے کا احرام ذوالحلیفہ سے باندھا تھا تو انسؓ کا قول محمول ہے اس پر کہ آپ ﷺ نے احرام کی حالت میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن پھر آپ کو روکا گیا تو فی الجملہ اس پر عمرہ کا اطلاق کیا گیا ہے باوجود یہ کہ افعال عمرہ ادا نہیں ہوئے تھے اس نیت کا اعتبار کرتے ہوئے جس پر ثواب مرتب ہوتا ہے اور حدیبیہ ایک کنواں ہے جدہ اور مکہ کے درمیان اب اس کو بئر شمیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے اور مکہ کے درمیان ۶ فرسخ کا فاصلہ ہے جیسا کہ ابن حجر نے اس کو ذکر کیا ہے۔

لیکن قابل اعتماد بات وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے کہ تین فرسخ کا فاصلہ ہے۔

اسی طرح عمرۃ القضاء کا احرام بھی ذوالحلیفہ سے باندھا تھا اور شوافع کا قضا کی تاویل قضیۃ مقاضات اور تقاضی سے کرنا جو مقافات اور تقاض جو بمعنی صلح کے ہے کرنا تعصب کا نتیجہ ہے اور اس کی بحث کافی طویل ہے تو ہم نے اس کو مکمل طور پر ترک کر دیا۔ باوجود یہ کہ ابن حجر کے اس قول میں کہ آپ ﷺ نے اہل مکہ کے ساتھ صلح حدیبیہ میں یہ شرط لگائی تھی کہ آپ ﷺ آئندہ سال احرام کی حالت میں

آئیں گے اور وہ آپ ﷺ کو مکہ میں تین دن تک قیام کی اجازت دیں گے۔ ابن حجر اور دوسروں پر واضح حجت اور دلیل ہے۔
باقی جو واقدی کے کاتب محمد بن سعد نے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ جب آپ ﷺ طائف سے واپس ہوئے تو جعرانہ میں ٹھہرے اور وہاں مال غنیمت تقسیم فرمایا پھر وہی سے عمرہ کیا اور یہ شوال کی ۲۶ تاریخ کو ہوا، تو یہ ضعیف ہے اور اہل سیر اور محدثین کے نزدیک معروف بات وہی ہے جو پہلے گزری۔ واللہ اعلم۔

آپ ﷺ کے عمروں کا ذکر

۲۵۱۹: وَعَنِ الْبُرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ اعْتَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي ذِي الْقَعْدَةِ قَبْلَ أَنْ يَحْجَّ مَرَّتَيْنِ .

الخرجه البحاری فی صحیحہ ۶۰۱۳۔ حدیث رقم ۱۷۸۱۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے ذیقعدہ کے مہینے میں حج سے پہلے دو مرتبہ عمرہ کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ”قبل ان یحج مرتین“ یہ ما قبل کے منافی نہیں ہے کیونکہ عمرہ حدیبیہ حقیقت میں شمار نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اس کا احرام باندھا تھا لیکن افعال ادا نہیں کیے تھے۔ کیونکہ آپ ﷺ حاضر تھے اور وہ عمرہ جو آپ ﷺ نے حج کے ساتھ ادا کیا وہ ذیقعدہ میں احرام کے اعتبار سے تھا باقی افعال ذی الحجہ میں ادا کیے تھے۔ اور ہماری یہ تاویل ابن حجر کے قول سے زیادہ بہتر ہے گویا کہ اس نے جعرانہ سے عمرہ کو یاد نہیں کیا کیونکہ پہلے گزرا کہ بعض صحابہ نے اس کا انکار کیا ہے اس کے فناء اور پوشیدگی کی وجہ سے۔

الفصل الثانی:

حج پوری عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے

۲۵۲۰: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَيْكُمْ الْحَجَّ فَقَامَ الْأَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ فَقَالَ أَيْ كَلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَوْ قُلْتُمْ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَوْ وَجَبَتْ لَمْ تَعْمَلُوا بِهَا وَلَمْ تَسْتَطِيعُوا وَالْحَجُّ مَرَّةً فَمَنْ زَادَ فَتَطَوُّعٌ۔ (رواه احمد والنسائی والدارمی)

الخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۴۴۱۲ حدیث رقم ۱۷۲۱۔ والنسائی ۱۱۱۵ حدیث رقم ۲۶۲۰۔ وابن ماجہ ۹۶۳۲ حدیث

رقم ۲۸۸۶۔ والدارمی ۴۶۱۲ حدیث رقم ۱۷۸۸۔ واحمد فی المسند ۲۵۵۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے لوگو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے۔ اقرع بن حابس گھڑے ہوئے کہا کہ ہر سال حج فرض ہے اے اللہ کے رسول! فرمایا اگر میں اس حج کے لیے ہاں کہہ دیتا یعنی حج واجب ہونے کے واسطے تو واجب ہو جاتا تو تم اس کو نہ کرتے اور نہ تم طاقت رکھتے لہذا حج ایک ہی بار فرض ہے تو جو ایک مرتبہ سے زیادہ کرے وہ نفل ہے۔ اس کو امام احمد اور نسائی اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: یا ایہا الناس ان اللہ کتب علیکم الحج: ”ان اللہ کتب.....“ یعنی اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے

اپنے اس قول کے ذریعے: ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِنْ اسْتِطَاعِ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ [آل عمران: ۹۷] اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے جو کہ طاقت رکھے وہاں تک کے راستے کی۔ (بیان القرآن)

قوله: أفي كل عام: صوم وزكوة پر قیاس کرتے ہوئے کیونکہ اول عبادت بدنی ہے اور ثانی عبادت مال ہے اور حج ان دونوں سے مرکب ہے۔

قوله: قال لو..... ولم تستطعوا: ”وَلَمْ تَسْتَطِعُوا“ یہ یا عطف تفسیر ہے اور خطاب اجمالی امت کو یا حاضرین کو ہے اور باقی کیلئے بالتبع ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ”وَلَمْ تَسْتَطِعُوا أَنْ تَعْمَلُوا بِهَا“ ہے اور یا عطف تغایر ہے اور عدم استطاعت ان کے ساتھ خاص ہے جو حرم سے دور ہے۔

باقی ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا: لو قلنا نعم؛ بدل ہے ضمیر سے جو ما قبل کی طرف راجع ہے بے فائدہ بات ہے۔ یہ ترکیب کے اعتبار سے اور نہ معنی کے اعتبار سے جیسا کہ ظاہر ہے۔

”لَمْ تَسْتَطِعُوا“ یعنی تم اس پر قدرت نہ رکھتے یہاں استطاعت سے مراد قدرت علی الفعل ہے اور آیت میں استطاعت سے مراد زاد و راحلہ ہے لہذا دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

قوله: والصح مرة فمن زاد تطوع:..... ”والصح مرة“ مبتداء، خبر ہے۔

اس حدیث میں رد ہے بعض شیعہ پر کہ وہ کہتے ہیں کہ حج فرض عین ادا کرنے کے بعد فرض کفایہ ہوتا ہے۔ حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ ہاں جو آدمی قدرت والا ہو تو اس کیلئے مستحب ہے کہ ہر پانچ سال میں ایک حج کرے۔

کیونکہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ بندہ جس کو جسمانی لحاظ سے صحت اور معاش کے اعتبار سے وسعت حاصل ہو اور اس پر پانچ سال گزر جائیں اور وہ میری طرف نہ آئے تو وہ محروم ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے ہر پانچ سال میں ایک مرتبہ حج کو واجب کہا گیا ہے۔

لیکن اس قول کو رد کیا گیا ہے کہ یہ اجماع کے خلاف ہے اور جن کا خیال ہے کہ ہر سال واجب ہے تو یہ مکان کے اعتبار سے محال ہے کیونکہ تمام لوگوں کیلئے وہاں ہیئت اجتماع کے ساتھ حج ممکن نہیں۔

حج کی فرضیت کے لیے شرائط

۲۵۲۱: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تَبْلُغُهُ إِلَى بَيْتِ اللَّهِ وَلَمْ يَحْجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا وَذَلِكَ أَنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى يَقُولُ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔

(رواہ الترمذی وقال هذا حدیث غریب وفي اسنادہ مقال وهلال بن عبد اللہ مجهول والحارث يضعف فی الحدیث)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۶۱۳ حدیث رقم ۸۱۲۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سواری اور توشہ کا مالک ہو کہ اس کو بیت اللہ تک پہنچا دے اور اس نے حج نہ کیا۔ پس اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے اور یہ جو کچھ مذکورہ ہوا ہے زاویر اور سواری کا یہ بطور شرط کے ہے اور اسی عبادت کے ترک پر وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ بابرکت و برتر نے فرمایا کہ اللہ کے واسطے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج کرنا واجب ہے اس پر کہ اس کی طرف طاقت رکھے۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں گفتگو ہے اور بلال بن عبد اللہ مجهول ہیں اور حارث حدیث میں خفیف شمار ہوتا ہے۔

تشریح: قولہ: ملک زاد ورا حلة تبلفہ..... ولم یحج؛ اگرچہ کرایہ کی ہو۔

واپس کے خرچ کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اس کی ضرورت بالکل ظاہر ہے یا اس وجہ سے کہ واپس لوٹنا کوئی ضروری نہیں ہے۔
’تبلفہ‘ لام کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔ ’ولم یحج‘ جیم شد کے فتح کے ساتھ ہے اور ضمہ اور کسرہ بھی جائز ہے اور یہ کلمہ ابن حجر کے نسخہ میں نہیں تھا اسی وجہ سے اس نے یہ عبارت مقرر نکالی ہے ’ثم ترك المعجى اليه للحج‘۔

قولہ: فلا عليه ان يموت يهوديا او نصرانيا؛ اگر اس نے قدرت کے باوجود حج اس لیے نہیں کیا کہ وہ اس کی فریضت کا منکر ہے تو پھر اس با بعد کا تعلق کفر سے ہوگا اور اگر فریضت کا منکر ہوئے بغیر حج نہ کیا تو اس مشابہت کا تعلق گناہ سے ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ وعید آپ ﷺ نے ازراہ تعلیظ فرمائی ہے۔

ابن الملک کہتے ہیں کہ یہاں ذکر میں یہود و نصاریٰ کو اس لیے خاص کیا کہ ان کے نزدیک حج کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے حج ان پر فرض نہیں تھا کیونکہ فریضت حج اس امت کا شعار ہے۔ (اتنی)

ابن الملک کے اس قول میں واضح مناقشہ ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان کے تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب ہیں اور کتاب پر عمل نہیں کرتے تو ان کے ساتھ تشبیہ دی۔ اس کی جس نے حج کو ترک کیا کہ اس نے بھی اللہ کی کتاب پر عمل نہیں کیا اور اس کو پیچھے پیچھے پھینکا، گویا کہ وہ اسے جانتا ہی نہیں۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ اس حالت میں مرنا اور یہودیت اور نصرانیت پر مرنا برابر ہے اور مقصود وعید میں تعلیظ ہے۔ جیسے کہ اس ارشاد میں ہے (ومن کفر.....) اس کو حج نہ کرنے کی جگہ ذکر کیا ہے۔

فان الله غنى عن العلمين [آل عمران: ۹۷] کہ یہاں عنہ سے عن العلمين کی طرف عدول کیا ہے مبالغہ کیلئے۔ یعنی اللہ اس سے اور تمام بندوں اور ان کی عبادتوں سے بے نیاز ہے بلکہ یہ بندے ہی اللہ کے محتاج ہیں ایجاد میں بھی اور امداد میں بھی اور اطاعت کا فائدہ ان ہی کی طرف لوٹتا ہے اور معبودیت کے ساتھ قائم رہنا ان پر واجب ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث میں مقدرات نکالے ہیں (جس کا مطلب یہ ہے) کہ کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ حج ترک کرنے کی حالت میں مرجائے یا یہودی اور نصرانی بن کر مرجائے۔ یعنی کافر بن کر ہی مرجائے کیونکہ یہ دونوں حالتیں برابر ہیں حقیقتاً اگر وہ حج کو ترک کرے قدرت کے باوجود اس کے وجوب کا ترک کرتے ہوئے اور ابن حجر نے اس کو اس آیت کی طرح قرار دیا ہے: ﴿فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر﴾ [الکہف: ۲۹] سو جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔ (بیان القرآن) تخریر اور وعید میں۔ لیکن ابن حجر کے قول کا صحیح نہ ہونا کوئی مخفی نہیں ہے اور اسکے تقریرات میں تکلف ہے۔ کیونکہ اگر یہ شخص اس کو حلال سمجھ کر چھوڑ رہا ہے تو جیسا کہ ابن حجر کے تحریر میں ہے تو پھر اس کی مقدرات نے کوئی فائدہ ہی نہیں دیا کیونکہ اس سے زیادہ حدیث کے اپنے الفاظ وعید اور تخریر ہے اور اس کے دل میں جو بات ہے اس کے ترک پر زیادہ ابھارنے والی اور حج جو اس کے کفر کا موجب بن رہی ہے اس کے انکار کے بعد اس کی طرف زیادہ توجہ دلانے والی ہے اور ایک روایت میں ہے فليمت ان شاء يهوديا او نصرانيا یہ ابن حجر کے تقریر کو باطل کر دیتی ہے، قائل۔ کیونکہ احادیث بعض، بعض کی تفسیر کرتی ہیں اور کلام میں اصل عدم تقدیر ہے اگر بغیر تفسیر کے کلام کا مطلب صحیح بننا ہو۔

”سبباً“، بمعنی راستہ۔ حضور ﷺ نے اس کی تفسیر زاد ورا حلة سے کی ہے حاکم وغیرہ نے اس کو روایت کیا ہے جیسا کہ جلالین میں ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ آیت پوری پڑھی ہوگی۔ کیونکہ استدلال تو پوری ہی آیت سے ہوتا ہے۔ لیکن راوی نے الیہ

سیلا تک آیت کو نقل کیا ہے۔ جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور وجہ بیان کی ہے۔
تخریج: کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ابوامامہ سے بھی روایت کی گئی ہے اور حدیث جب کئی طرق سے روایت کی گئی ہو تو وہ قوی ہو جاتی ہے
 اگرچہ وہ ضعیف ہو کیونکہ اس کے صدق کا احتمال راجح ہو جاتا ہے۔ یہ علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔
 علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اس کو ابن عدی نے حدیث ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔
 علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ یہ اس سند سے زیادہ صحیح سند کے ساتھ بھی آئی ہے۔ علامہ زرکشی فرماتے ہیں کہ اس کے موضوع قرار
 دینے میں خطاء ہوئی ہے۔ کیونکہ راوی کے وہم سے حدیث کی وضع لازم نہیں آتا۔
 قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ ابن جوزی کا اس حدیث کو موضوع قرار دینے کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ یہ موضوع کیسے ہو سکتی
 ہے حالانکہ امام ترمذی نے اس کی تخریج اپنے جامع میں کی ہے اور فرمایا ہے کہ میری کتاب کی تمام احادیث معمول بہ ہیں سوائے دو
 حدیثوں کے اور یہ ان دونوں میں سے نہیں ہے۔

اور ایک روایت میں ہے ”من لم یمنعه من الحج حاجة او مرض حابس او سلطان جائر فلیمت ان شاء یھودیا او
 نصرانیا“ اس کی سند ضعیف ہے لیکن حضرت عمر سے موقوف صحیح ثابت ہے اور یہ مرفوع کے حکم میں ہے لہذا اس اعتبار سے حدیث صحیح
 ہے۔

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے پر وعید

۲۵۲۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا صَرُورَةَ فِي الْإِسْلَامِ۔

اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۳۴۸/۲ حدیث رقم ۱۷۲۹۔ واحمد فی المسند ۳۱۲/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ صیرورت اسلام میں نہیں ہے اس کو
 ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم وغیرہ نے صحیح قرار دیا ہے۔

تشریح: ”صرورة“ صاء کے فتح کے ساتھ اس کو کہتے ہیں جس نے کبھی حج نہ کیا ہو، بمعنی جو شخص باوجود فرض ہونے کے بھی
 حج نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے جو حج کی استطاعت رکھے اور حج نہ کرے تو وہ کامل مسلمان
 نہیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ صرورة کا معنی ہے نکاح ترک کرنا یعنی نکاح ترک کرنا اسلام کا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ رہبانیت میں
 داخل ہے۔

باقی امام شافعی اور اس کے کچھ متبعین کا یہ کہنا کہ جو شخص حج نہ کرے اس کو صرورة کہنا مکروہ تنزیہی ہے تو امام نووی وغیرہ نے اس کا
 تعقب کیا ہے کہ یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت سے کوئی تعرض نہیں ہے بلکہ حدیث کا مفہوم وہی ہے جو اوپر گزرا۔

ارادہ حج کی تکمیل جلدی ہونی چاہے

۲۵۲۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ ارَادَ الْحَجَّ فَلْيُعَجِّلْ۔ (رواہ ابو داؤد و الدارمی)

اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۳۵۰/۲۔ حدیث رقم ۱۷۳۲۔ وابن ماجہ ۹۶۲/۲ حدیث رقم ۲۸۸۳۔ والدارمی ۴۵۲/۲ حدیث

رقم ۱۷۸۴۔ واحمد فی المسند ۲۱۴/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو حج کا ارادہ کرے اس کو چاہیے کہ جلدی کرے اس کو ابو داؤد اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: "فلیعجل"۔ جمیم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ جو حج کرنے پر قادر ہو جائے تو موقع کو غنیمت جانے اور بعض نے کہا ہے کہ امر استحباب کیلئے ہے (یعنی) ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حج علی الفور واجب ہے۔ یہ امام ابو یوسف اور امام مالک رحمہما اللہ کا قول ہے اور امام ابو حنیفہ کا ایک قول بھی اس پر دلالت کر رہا ہے اور وہ روایت ابن شجاع نے ان سے نقل کی ہے کہ ایک آدمی اتنا مال پالے کہ جس کے ذریعے وہ حج کر سکتا ہو اور وہ شادی کا بھی ارادہ رکھتا ہے تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ وہ حج کرے۔ امام محمد اور ایک قول میں امام ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ حج علی التراخی واجب ہے ہاں اگر تاخیر کی صورت میں فوت ہونے کا خطرہ ہو تو علی الفور لازم ہے۔ کیونکہ حج کا وقت پوری عمر ہے انسان کی بقاء کے ظاہر حال کو دیکھتے ہوئے تو یہ اپنے وقت میں نماز کی طرح ہے تو حج میں آخر عمر تک تاخیر جائز ہے جیسا کہ نماز کو آخر وقت تک مؤخر کرنا جائز ہے۔ مگر امام محمد کے نزدیک یہ تاخیر مشروط ہے کہ حج فوت نہ ہو جائے۔ یعنی اگر یہ شخص بغیر حج کیے مرے تو گنہگار ہوگا۔

امام ابو یوسف کی دلیل یہ ہے کہ حج سال میں ایک معین وقت میں ہوتا ہے اور سال کے اندر موت کا آنا نادر نہیں ہے۔ چنانچہ احتیاط کے پیش نظر اس پر تنگی ہے نہ کہ بالکل وسعت ختم کرنے کیلئے۔ اگر آنے والے سال وہ حج کر لے تو بالاتفاق وہ حج کو ادا کرنے والا ہوگا اور اگر دوسرے سال ادا کرنے سے پہلے فوت ہو گیا تو بالاتفاق گنہگار ہوگا۔ ثمرہ اختلاف اس شخص کے حق میں نکلتا ہے کہ جس نے حج کو مؤخر کر دیا ہو تو علی الفور کے جو قائل ہیں ان کے نزدیک یہ فاسق ہے اور اس کی گواہی قبول نہیں اور جو تراخی کے قائل ہیں ان کے نزدیک یہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ششی نے اس کی تحقیق کی ہے۔

تخریج: اور ایک روایت میں ہے: حجوا قبل ان لا تحجوا فکانی انظر الی حبشی اصمع افدع بیدہ معول یهدمہا حجرا حجرا۔

یعنی حج کرو قبل اس کے کہ ایسا باعث پیدا ہو جائے کہ تم حج نہ کر سکو گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں چھوٹے کانوں اور ٹیڑھی ناکوں والے جس کو کہ وہ اس بیت اللہ کو ایک ایک پتھر کر کے گرا رہا ہے۔

حج قرآن کرو

۲۵۲۳: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفُجْرَ وَالذُّنُوبَ كَمَا يَنْفِي الْكَبِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُورَةِ ثَوَابٌ إِلَّا الْحَنَّةُ۔

(رواہ الترمذی والنسائی ورواہ احمد وابن ماجہ عن عمر الی قولہ) خَبَثُ الْحَدِيدِ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۵/۳ حدیث رقم ۸۱۰۔ والنسائی ۱۱۵/۵ حدیث رقم ۲۶۳۰۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود سے روایت ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حج اور عمرہ کو پے در پے کرو۔ یہ دونوں فقر اور گناہوں کو دور کرتے ہیں جیسے بھٹی لوہے کی میل کو دور کرتی ہے اور سونے کا اور چاندی کا اور نہیں ہے حج مقبول کے واسطے ثواب سوائے بہشت۔ یہ ترمذی اور نسائی نے اور احمد اور ابن ماجہ نے خبث الحديد تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: تابعوا بین الحج والعمرة حج اور عمرہ دونوں ایک ساتھ کرو کا مطلب یہ ہے کہ حج قرآن کرو یا ایک کے بعد دوسرا کرو۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ جب تم غمرہ کر چکے تو اس کے بعد حج کرو اور جب حج کر چکے تو اس کے بعد عمرہ کرو۔
 قوله: فانهما ينفيان..... والذهب والفضة: ”الکبیر“ جس میں لوہا آگ بھڑکانے کیلئے چھوکتا ہے یعنی بھٹی۔
 فقر سے مراد ظاہری فقر بھی ہو سکتا ہے اور باطنی بھی یعنی حج و عمرہ کرنے سے اللہ تعالیٰ مال دولت کی نعمت سے نوازتا ہے یا یہ کہ دل غنی ہو جاتا ہے۔

قوله: وليس للحجة المبرورة ثواب الا الجنة ”رفع اور نصب دونوں کے ساتھ ہے۔

حج کے کچھ فضائل کا بیان

۲۵۲۵: وَرَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبْنُ مَاجَةَ عَنْ عُمَرَ إِلَى قَوْلِهِ خَبِثَ الْحَدِيدُ۔

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۹۶۶/۲ حديث رقم ۲۸۸۷۔ واحمد فى المسند ۳۸۷/۱۔

ترجمہ: ”اور امام احمد اور ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے لفظ خبث الحدید تک نقل کیا ہے۔“
تشریح: منذری نے حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو حج کیلئے آیا اور مقصد صرف اللہ کی خوشنودی ہو تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دے جاتے ہیں اور جس کیلئے یہ دعا کرے اس کے حق میں اس کی سفارش قبول ہو جاتی ہے۔
 اور ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے حج ادا کیا اور لوگ اس کے زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے تو اس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جب حاجی گھر سے نکل جائے تو وہ اللہ کی حفاظت میں ہوتا ہے پس اگر حج ادا کرنے سے پہلے مر جائے تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور حج میں ایک درہم خرچ کرنا اس کے علاوہ میں ایک لاکھ خرچ کرنے کے برابر ہے۔

حج کن چیزوں کی وجہ سے واجب ہوتا ہے

۲۵۲۶: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا يُوجِبُ الْحَجَّ قَالَ الزَّادُ

وَالرَّاحِلَةُ. (رواه الترمذی وابن ماجه)

اخرجه الترمذی فى السنن ۱۷۷/۳ حديث رقم ۸۱۳۔ وابن ماجه ۹۶۷/۲ حديث رقم ۲۸۹۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول! حج کو کونسی چیز واجب کرتی ہے؟ فرمایا تو زاد اور سواری اس کو امام ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ما يوجب الحج:

کون سی چیز حج واجب کرتی ہے؟ کا مطلب یہ ہے کہ حج واجب ہونے کی شرط کیا ہے ورنہ واجب کرنے والا تو اللہ ہے۔

قوله: قال: الزاد والراحلة چنانچہ آپ نے ایک چیز تو زاد راہ بتائی جس کی مراد یہ ہے کہ اتنا مال ہو جو سفر حج میں جانے اور آنے کیلئے کافی ہو دوسری چیز سواری بتائی جس پر سوار ہو کر بیت اللہ تک پہنچا جاسکے اگرچہ حج کے واجب ہونے کی شرطیں اور بھی ہیں مگر یہاں بطور خاص ان دو چیزوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ اصل میں یہی دو شرط لفظ ایسی ہیں جو حج کیلئے بنیادی اور ضروری اسباب کا درجہ رکھتی ہیں۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ان کے واجب ہونے کیلئے شرط ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے (اتنی)

اور یہ حدیث اپنے عموم کے ساتھ ہی اور غیر کی سب کو شامل ہے برخلاف ان لوگوں کے جن نے اس کے خلاف کہا ہے۔

اور یہ حدیث امام مالک کے مسلک کی تردید کرتی ہے ان کے ہاں اس شخص پر بھی حج واجب ہوتا ہے جو پیادہ چلنے پر قادر ہو اور

تجارت یا مزدوری کے ذریعے سفر کے اخراجات کے بقدر روپے پیسے حاصل کر سکتا ہو۔

تخریج: ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حاکم نے انسؓ سے اس آیت کے بارے میں (وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِنْ اسْتِطَاعِ الْيَه

سبیلًا) روایت نقل کی ہے قبیل یا رسول اللہ ما السبیل؟ قال: الزاد والراحلة، حاکم نے کہا ہے کہ تیخین کی شرط پر یہ حدیث صحیح

ہے اور مختلف طرق سے مرفوع روایت کی گئی ہے ابن عباس، ابن عمر، عائشہ، جابر، عبد اللہ بن عمرو، ابن مسعود کی حدیث سے اور ابن عباسؓ

کی حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور باقی احادیث اپنے طرق کے ساتھ ان صحابہ سے جو ہم نے ذکر کیے ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی

اور ابن عدی کے نزدیک ضعیف ہے۔ اگر کسی حدیث کی صحیح طرق نہ ہو تو کثرت طرق سے وہ درجہ حسن تک پہنچ جاتا ہے پھر اگر جب کہ اس

میں صحیح طرق بھی ہو: (اتنی)

اس سے ابن حجر کا یہ قول باطل ہوا کہ اس میں بالاتفاق ضعیف ہے۔ کیونکہ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور بیہقی، ابن صلاح

اور ع نووی نے ضعف کو ضعیف لہذا نہ پر بھی محمول کیا جاتا ہے اور یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔

اور حسن کو کبھی صحیح بھی کہا جاتا ہے لہذا نزاع ختم ہوا۔

حاجی کی صفات کا بیان

۲۵۲۷: وَعَنْهُ قَالَ سَأَلَ رَجُلٌ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ مَا الْحَاجُّ قَالَ الشَّعْتُ التَّغْلُ فَقَامَ آخَرَ فَقَالَ يَا

رَسُولَ اللَّهِ أَيُّ الْحَجِّ أَفْضَلُ قَالَ الْعَجُّ وَالسَّجُّ فَقَامَ آخَرَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا السَّبِيلُ قَالَ زَادٌ وَرَاحِلَةٌ -

(رواه فی شرح السنۃ وروی ابن ماجہ فی سننہ الا انہ لم یذکر الفصل الا خیر)

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۹۶۷/۲ حدیث رقم ۲۸۹۶۔ والبغوی فی شرح السنۃ ۱۴۱۷ حدیث رقم ۱۸۴۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا۔ کہ حاجی کی صفت کیا ہے

فرمایا سر غبار آلودہ پرانگندہ بالوں سے پینے اور میل کی وجہ سے بو آتی ہو۔ یعنی زینت کو چھوڑنے والا ہو۔ پھر ایک شخص

کھڑا ہوا اور کہا اے اللہ کے رسول حج میں کون سی چیزیں بہت زیادہ ثواب رکھتی ہیں۔ یعنی حج کے ارکان کے بعد فرمایا

۔ آواز کا بلند کرنا۔ لبیک کہنے کے ساتھ اور قربانی یا ہدی کا خون بہانا۔ پھر ایک اور شخص کھڑا ہوا اور کہا اے اللہ کے رسول

کیا ہے کوئی راستہ اللہ تعالیٰ کی کلام میں حج کی آیت میں جو آیا ہے من استطاع الیہ اسبیلًا سبیل سے کیا مراد ہے

فرمایا تو شہ اور سواری مراد ہے۔ اس کو شرح السنہ میں نقل کیا گیا ہے اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اپنی سنن میں مگر اخیر کی

عبارت ذکر نہیں کی۔

تشریح: قوله: ما الحاج: اس کا معنی ما صفة الحاج الذي يحج یا ما بمعنى من کے ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ

”ما“ کے ذریعے جنس اور وصف دونوں کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ اور یہاں مراد ثانی ہے۔

”الشعث“ عین کے کسرہ کے ساتھ یعنی غبار آلود سر غسل نہ کرنے کی وجہ سے اور بکھرے بال لنگھی نہ کرنے کی وجہ سے حاصل اس

کاتارك الزينة ہے۔

”التفل“: فاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی کبھی وہ تیل ہونا ہے جس سے بدبو پیدا ہو جاتی ہے یہ تفل الشی من فیہ سے ماخذ ہے جب کسی چیز کو کراہت کی وجہ سے منہ سے پھینکنا۔

قوله: ای الحج افضل؟.....: العج والنج: ”العج والنج“ دونوں تشدید کے ساتھ ہیں اول کا معنی ہے تلبیہ کے ساتھ اور بلند کرنا اور ثانی کا معنی ہے ہدی کا خون بہنا اور بعض نے کہا ہے کہ قربانی کے جانوروں کا خون بہانا۔ اس سے مراد استعیاب ہے کیونکہ اس میں حج کا اول جو کہ احرام ہے اور آخر جو کہ خون بہانا ہے ذکر کیا ہے یعنی تمام افعال کے ذکر کرنے کے بجائے ابتداء اور انتہاء پر اکتفاء کیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو حج کے تمام اعمال فرمائش، مستحبات وغیرہ ادا کرے تو اس کا حج ثواب کے اعتبار سے زیادہ افضل ہے۔

”الفصل“ سے مراد کلام کا فقرہ ہے۔

حج بدل کا ثبوت

۲۵۲۸ وَعَنْ أَبِي رَزِينٍ الْعُقَيْلِيِّ أَنَّهُ آتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ أَبِي شَيْخٌ كَبِيرٌ لَا يَسْتَطِيعُ الْحَجَّ وَلَا الْعُمْرَةَ وَلَا الظَّنَّ قَالَ حُجَّ عَنْ أَبِيكَ وَاعْتَمِرْ

(رواه الترمذی و ابو داؤد والنسائی وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۰۲/۲ حدیث رقم ۱۸۱۰۔ و الترمذی ۲۶۹/۳ حدیث رقم ۹۳۰۔ و النسائی ۱۱۱/۵ حدیث

رقم ۲۵۲۱۔ و ابن ماجہ ۹۷۰/۲ حدیث رقم ۲۹۰۶ و احمد فی المسند ۱۰/۴۔

ترجمہ: حضرت ابو رزین عقیلی سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا پھر اس نے کہا اے اللہ کے رسول! تحقیق میرا باپ بہت بوڑھا ہے حج کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ عمرے کی اور نہ سوار ہونے کی یعنی حج اور عمرے کے افعال نہیں کر سکتا اور نہ سوار ہو کر ان کے لیے جاسکتا ہے فرمایا حج کرو اپنے باپ کی طرف سے اور عمرہ کرو۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے، ابو داؤد اور نسائی نے اور امام ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

راوی حدیث:

ابورزین۔ ابورزین کا نام لقیط ہے یہ عامر بن صبرہ کے بیٹے ہیں۔ ”رزین“ بروزن ”جمیل“ ہے۔ ان کا ذکر دوسری جلد میں حدیث نمبر ۴۰۵ کے تحت گزر چکا ہے۔

تشریح: قوله: لا يستطيع الحج ولا العمرة ولا الظنن: ”الظنن“ عین کے سکون اور فتح کے ساتھ سفر کے معنی میں ہے۔

قوله: حج عن ابیک و اعتمر: ”حج“ جیم پر تینوں حرکات درست ہیں اور فتح معتمد ہے۔

یہ حدیث نیابت کے جواز کی دلیل ہے۔

پھر یہ جان لیے کہ عمرہ ہمارے نزدیک سنت ہے اور یہی امام مالک کا قول ہے اور امام شافعی کا قول جدید یہ ہے کہ عمرہ فرض ہے کیونکہ اللہ کے اس ارشاد میں عمرہ حج کے ساتھ ذکر ہے: ﴿وَاتَمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ﴾ [البقرة: ۱۹۶] اور دوسری دلیل ابورزین کی مذکورہ حدیث ہے جس کو حاکم نے علی شرط شیخین روایت کی ہے۔

اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو ترمذی نے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حسن صحیح ہے۔ جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ (سنن)

رسول اللہ ﷺ عن العمرة أواجبة؟ قال "لا" کہ آپ ﷺ سے عمرہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا واجب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔

اور آیت کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ: "قران فی الذکر" حکم میں مساوات کا تقاضا نہیں کرتا اور اگر آیت حج کے ساتھ عمرے کا قران مان بھی لیا جائے تو یہ اتمام کے لحاظ سے ہے جو شروع کرنے کے بعد لازم ہوتا ہے۔

حدیث ابی زرین کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرے اور والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرنا اس پر واجب نہیں تھا اور ابی زرین کا یہ قول "لا یستطیع الحج ولا العمرة" تقاضا کرتا ہے کہ ان کے والد پر یہ واجب نہیں تھے تو حدیث ابی زرین میں امر استحباب کیلئے ہے۔ اسی طرح ذکر کیا ہے شنی نے۔

ابن حجر کا یہ قول کہ یہ حدیث میت کی طرف سے نیابت کے جواز پر دلیل ہے درست وجہ نہیں بلکہ درست وجہ یہ ہے کہا جائے یہ حدیث زندہ کی طرف سے نیابت کے جواز پر دلیل ہے تو میت کی طرف سے بطریق اولیٰ ہوگا۔

حج بدل کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اپنا حج کرے

۲۵۲۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ لَيْسَكَ عَنْ شُبْرُمَةَ قَالَ مَنْ شُبْرُمَةُ قَالَ أَخِي أَوْ قَرِيبٌ لِي قَالَ أَحَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ قَالَ لَا قَالَ حَجَّ عَنْ نَفْسِكَ ثُمَّ حَجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ.

(رواه الشافعی وابو داؤد وابن ماجہ)

احرجہ ابو داؤد فی السنن ۴۰۳۱۲ حدیث رقم ۱۸۱۱۔ وابن ماجہ ۹۶۹۱۲ حدیث رقم ۲۹۰۳۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو سنا جو کہہ رہا تھا شبرمہ کی طرف بلیک! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شبرمہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ میرا بھائی ہے یا کہا کہ میرا قریبی ہے فرمایا کیا تو اپنی طرف سے حج کر چکا ہے؟ اس نے کہا نہیں فرمایا پہلے تو اپنی طرف سے حج کر پھر شبرمہ کی طرف کر!۔ اس کو امام شافعی اور ابو داؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: لبيك عن شبرمة: "شبرمة" شين وراء كعبه اور باء موحدہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ قوله: قال: اخ لي او قريب: راوي كوشك ہے۔

قوله: أحججت عن نفسك: "أحججت" کے شروع میں ہمزہ استفہامیہ ہے۔

علامہ طبري فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ جس شخص نے خود حج نہ کیا ہو وہ دوسرے کی طرف سے حج نہیں کر سکتا اور یہی امام اوزاعی، شافعی اور احمد کا مذہب ہے کیونکہ اگر یہ غیر کی طرف سے احرام باندھے تو خود بخود اس کی طرف سے ہو جائیگا اور امام مالک، ثوری اور احناف کے نزدیک دوسرے کی طرف سے حج کر سکتا ہے مگر اس طرح کرنا مکروہ ہے تو اس حدیث کو استحباب اور اولیٰ پر عمل کرنے پر محمول کریں گے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہی نے کہا ہے اس باب میں اس سند سے زیادہ صحیح اور کوئی سند نہیں ہے اور اس کی بنیاد پر امام شافعی ایسے شخص کیلئے جس نے خود حج نہ کیا ہو دوسرے کی طرف سے حج کو جائز قرار نہیں دیتا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث کے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف ہونے میں اضطراب ہے اور اس کے رفع میں بھی اضطراب ہے۔

ابن ہمام نے اس کو تفصیل کے ساتھ ذکر کر کے پھر کہا ہے کہ اور اس وجہ سے بھی کہ ابن مغلس نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ سعید بن ابی عروبہ نے اس کو بصرہ میں کرتے ہوئے ابن عباس کا کلام قرار دیا پھر کوفہ میں اس کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کی یہ سعید پر حالت کے مشتبه ہونے کا فائدہ دیتا ہے۔

اور اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ پہلے اپنی طرف سے حج کرے اور اس میں ندب کا احتمال ہے تو اس پر محمول کیا جائے گا اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے شعبیہ کو فرمایا ہے ”حجی عن ابیک“ آپ ﷺ نے ان سے ان کے حج کے بارے میں نہیں پوچھا کہ ان سے پہلے حج کیا ہے یا نہیں۔

اور حدیث شبرمہ اپنے حج کے مقدم کرنے کے استحباب کا فائدہ دیتا ہے تو اس کے ساتھ روایات جمع ہو گئی اور فرض کو نقل پر مقدم کرنے کی افضلیت ثابت ہوئی۔ مؤخر کرنے کے جواز کے ساتھ۔ (ابھی)

عرض مرتب: لیکن ہمارے قواعد کے مطابق اس پر پھر بھی اشکال باقی ہے کہ جب کوئی آدمی دوسرے کی طرف سے احرام باندھے تو اب وہ اس سے اپنے احرام کی طرف منتقل ہونے پر قادر نہیں ہے کیونکہ شروع کرنے سے لزوم شرعی آ گیا ہے اور از خود اس کا تبدیل ہونا بھی جائز نہیں۔ پس اس سے کوئی مخلص نہیں مگر حدیث کو ضعیف یا منسوخ قرار دینے کے ساتھ کیونکہ حدیث خشعمیہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمائی ہے یا مخاطب کی خصوصیت پر محمول ہے۔

اہل مشرق کا میقات

۲۵۳۰: عَنْهُ قَالَ وَقَت رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِأَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعُقَيْقُ۔ (رواه الترمذی و ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۵۵/۲ حدیث رقم ۱۷۴۰۔ و الترمذی فی السنن ۱۹۳/۳ حدیث رقم ۸۳۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ کہ آپ ﷺ نے احرام کی جگہ متعین کر دی۔ مشرق والوں کے لیے عقیق۔ اس کو امام ترمذی نے اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے لیکن اس کا تعقب کیا گیا ہے کہ اس حدیث میں ضعف ہے۔

تشریح: ”العقیق“ ایک جگہ کا نام ہے جو ذات العرق کے محاذات میں واقع ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ذات العرق کی حدود میں داخل ہے۔ عقیق اصل میں ہر اس نالے کو کہتے ہیں جسے سیلاب نے کاٹ کر گہرا کر دیا ہو ”عق“ سے ماخوذ ہے جو ”قطع“ اور ”شق“ کے معنی میں ہے۔

مشرق والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حرم سے باہر مکہ کے مشرقی جانب کے علاقوں میں رہنے والے ہیں یہی لوگ عراقی بھی کہلاتے ہیں۔

احرام کی جگہ کا تعین

۲۵۳۱: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَقَت لِأَهْلِ الْعِرَاقِ ذَاتِ عِرْقٍ۔ (رواه ابو داؤد والنسائی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۵۴/۲ حدیث رقم ۱۷۳۹۔ و النسائی ۱۲۵/۵ حدیث رقم ۲۶۵۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے عراق والوں کے لیے احرام کی جگہ ذات عرق متعین فرمائی۔ اس کو ابو داؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تخریج: و کذا دار قطنی وسنده صحیح علی شرط البخاری وهو موافق لخبر مسلم السابق فی الفصل

الاول -

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مشرق والوں کیلئے دو میقات مقرر کیے، عقیق اور ذات العرق۔ پس جس ذات العرق پہنچنے سے پہلے عقیق سے احرام باندھا تو یہ افضل ہے اور جس نے عقیق سے تجاوز کر کے ذات العرق سے احرام باندھا تو یہ جائز ہے اور اس پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ذات عرق کو میقات مقرر کرنے کے بارے میں مسلم میں حضرت جابر سے روایت ہے راوی کہتا ہے کہ میرا گمان ہے کہ حضرت جابر نے اس کو مرفوع ذکر کیا ہے اس حدیث میں ہے ”مہل اہل المدینة..... پھر ہے ”مہل اہل العراق ذات عرق“ اور اس کے مرفوع ہونے میں راوی کو شک ہے اور ایک جگہ روایت کیا ہے جو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اس میں شک نہیں ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں ”ومہل اہل الشرق ذات عرق“ مگر اس کی سند میں ابراہیم بن یزید الخوزی ہے جس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ اور ابوداؤد نے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے اہل عراق کیلئے ذات عرق میقات مقرر کیا ہے اور نسائی نے الفاظ کے زیادت کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور شافعی فرماتے ہیں کہ یہ عقیق یہ یہ کاوش ان کے طریق میں ہے ”لم یوقت النبی ﷺ ذات عرق ولم یکن اہل الشرق حینئذ فوقت الناس“ کہ آپ ﷺ نے ذات عرق کو میقات نہیں بنایا اور اس زمانہ میں مشرق والے نہ تھے۔ پس اس کو لوگوں نے میقات بنایا ہے۔

طاؤس کہتے ہیں کہ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو بخاری نے اپنی سند کے ساتھ نقل کی ہے ”عن نافع عن ابن عمر لما فتح المضران أتوا عمر فقالوا، یا امیر المؤمنین ان رسول اللہ ﷺ حد لاهل نجد قرنا وہی جور عن طریقنا وانا اذا اردنا قرنا شق علينا قال: انظروا حدوها من طریقکم“ تو حضرت عمر نے ان کیلئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا۔ شیخ تقی الدین الامام میں فرماتے ہیں کہ المصران سے مراد بصرہ اور کوفہ ہیں۔

اور حدوہا سے مراد اس کے قریب کا علاقہ ہے اور فرمایا کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ ذات عرق کا میقات ہونا اجتہادی ہے منصوص نہیں ہے۔ (آہنی)

اور حق یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو آپ ﷺ کا ذات عرق کو میقات بنانے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ آپ ﷺ کا اس کو میقات بنانے کی احادیث صحیح ہیں تو پھر حضرت عمر کا اجتہاد آپ ﷺ کے میقات مقرر کرنے کے موافق ہو اور نہ تو اس کا میقات ہونا اجتہادی ہے۔

حج انسان کے گناہوں کے بخشنے کا ذریعہ ہے

۲۵۳۲: وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ أَهَلَ بِحَجَّةٍ أَوْ عُمْرَةٍ مِنَ الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى إِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ أَوْ وَجِبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ.

(رواہ ابو داؤد وابن ماجہ)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۵۰۲/۲ حدیث رقم ۱۷۴۱۔ وابن ماجہ ۹۹۹/۲ حدیث رقم ۳۰۰۱ واحمد فی المسند ۲۹۹/۶۔
ترجمہ: ام سلمہ سے روایت ہے کہ کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص حج یا عمرہ کے احرام بیت المقدس سے باندھے مسجد الحرام تک یعنی کے تک اس کے واسطے گناہ بخشے جاتے ہیں جو اس نے پہلے کئے ہیں اور وہ گناہ جو بعد میں کرے گا یا فرمایا کہ اس کے لیے بہشت واجب ہو جاتی ہے یعنی ابتدا۔ اس کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل

کیا ہے۔ اسنادی حیثیت: حدیث متن کو نبی اور دوسرے حضرات نے روایت کیا ہے اور ان کے کلام کا مقتضایہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے۔ اھ۔ لیکن دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ ”حسن لغیرہ“ کو ”لیس لقوی“ کہا جاتا ہے۔
مسجد اقصیٰ کی وجہ تخصیص:

قولہ: من اهل بحجة..... المسجد الاقصیٰ:

کہا گیا ہے کہ مسجد اقصیٰ کو خاص کیا گیا ہے اس کے فضیلت کی وجہ سے اور اس ملت کو رد کرنے کی وجہ سے جن کے حج کی جگہ بیت المقدس تھی۔

قولہ: غفر له ماتقدم: ”او وجبت“ او شک کیلئے ہے۔

یعنی خاندان اور کبائند کی بھی امید کی جاسکتی ہے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ احرام باندھنے کی جگہ جتنی دور ہوگی ثواب بھی اتنا زیادہ ہوگا اور جان لو کہ احرام باندھنا میقات سے پہلے اور اپنے گھر سے ہمارے نزدیک افضل ہے اور یہی امام شافعی کا ایک قول ہے جس کو شافعی وغیرہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ جب ممنوعات احرام سے بچ سکے ورنہ میقات سے ہی احرام باندھنا افضل ہوگا۔

حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنا ہمارے نزدیک مکروہ ہے امام مالک اور امام احمد کراہت ہی کے قائل ہیں۔ امام شافعی کا ایک قول اگرچہ یہ بھی ہے کہ حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنے والوں کا احرام ہی درست نہ ہوگا۔ لیکن ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھے گا تو اس کا وہ احرام حج کے بجائے عمرہ کا ہو جائے گا۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن سلمہ المرئی سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس آیت: ﴿وَاتَمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ﴾ [البقرة: ۱۹۶] کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ”ان تحرم من دویرة اهلك“ کہ آپ اپنے گھر سے احرام باندھ لے۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیحین کی شرط پر صحیح ہے (اتھی)

اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”من اهل من المسجد الاقصیٰ بحجة او عمرة غفر له ما تقدم من ذنبه“ رواہ احمد و ابو داؤد۔

اور روایت کیا گیا ہے کہ ابن عمر نے بیت المقدس اور عمران بن معین نے بصرہ اور ابن عباس نے شام اور ابن مسعود نے قادیسیہ جو کوفہ کے قریب ہے سے احرام باندھا۔

باقی ابوداؤد کا یہ فرمانا کہ میقات سے پہلے احرام باندھنا صحیح نہیں ہے تو یہ مردود ہے کیونکہ اس پر پہلے سے اجماع ہے کہ یہ صحیح ہے۔

الفصل الثالث:

سفر کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنا تو کل کے منافی نہیں ہے

۲۵۳۳: عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ أَهْلُ الْيَمَنِ يَحْجُونَ فَلَا يَتَزَوَّدُونَ وَيَقُولُونَ نَحْنُ الْمُتَوَكِّلُونَ فَإِذَا قَدِمُوا

مَكَّةَ سَأَلُوا النَّاسَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۸۲/۳۔ حدیث رقم ۱۰۲۳۔ و ابو داؤد فی السنن ۳۴۹/۲ حدیث رقم ۱۷۳۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یمن والے حج کرتے تھے اور توشہ نہیں لیتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ ہم تو کل کرنے والے ہیں پس جب مکہ میں آئے تو لوگوں سے مانگتے پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی تو سوال کرنے کے بجائے توشہ اور پرہیز گاری اختیار کرو۔ اس لیے کہ بہترین توشہ پرہیز گاری ہے یعنی یہ سفر آخرت کا توشہ ہے اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: تزودوا: "تزوودوا" کا مفعول محذوف ہے اور وہ تقویٰ ہے اور جب اس کے مفعول کو حذف کیا تو اس کو ان کے خبر میں ظاہر کر دیا تاکہ محذوف پر دلالت کرے۔

یعنی وہ حج کرتے اور اسباب کو ترک کرتے یا تو مطلقاً اپنے ساتھ زاد راہ نہیں لیتے یا اتنا لیتے جو سفر کیلئے کافی ہو جائے اور توکل کا دعویٰ کرتے جس میں کوئی حقیقت نہیں تھی بلکہ صرف دعویٰ تھا اور حقیقت میں وہ متاکلیف تھے یا لوگوں پر اعتماد کرنے والے تھے۔

بغوی نے اس حدیث میں یہ الفاظ زاد ذکر کیے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے گھر کا حج کرتے ہیں اور وہ ہمیں کھلاتا نہیں۔

اور جب مکہ پہنچ جاتے تو، توشہ دان کے فارغ ہونے کی وجہ سے لوگوں سے یہ سوال کرتے یا مکہ میں بھی اسی طرح گداگری کرتے جس طرح راستہ میں کرتے تھے۔ اور بغوی نے ذکر کیا ہے کہ کبھی حالت ڈاکہ اور غضب تک پہنچ جاتی۔

"وتزوودوا" یعنی اپنے ساتھ کھانے میں سے زاد راہ کو اور گداگری اور لوگوں پر بوجھ بننے سے بچو۔

بغوی کہتے ہیں اتنے مقدار میں کہ جس کے ذریعے تم وہاں پہنچ جاؤ اور اپنے آپ کو لوگوں سے بچا لو اور اہل تفسیر نے زاد کی تفسیر کعک (کیک) کشمش، ستور اور کھجور وغیرہ سے کی ہے۔

قولہ: ﴿فان خیر الزاد التقوی﴾ [البقرہ: ۱۹۶] یعنی اعمال صالحہ کیلئے زاد راہ اختیار کرو جو کہ آخرت کے سفر کیلئے زاد راہ ہے۔ اور تقویٰ میں سے گداگری سے بچنا اور لوگوں کو ملال میں ڈالنے سے بچنا بھی ہے اس طرح ذکر کیا ہے سید معین الدین صفوی نے اپنی تفسیر میں۔

آیت اور حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسباب و وسائل اختیار کرنا باب الارباب پر توکل کے منافی نہیں ہے۔

اور جو شخص خالص توکل کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ وہ اپنے عزم و ارادہ پر مستحکم ہو اور اپنے مال میں مضطرب نہ ہو اور مخلوق کا کوئی پرواہ اس کے دل میں نہ ہو۔

اور جن لوگوں کی مذمت کی گئی ہے یہ اس لیے کہ انہوں نے توکل کا حق ادا نہیں کیا بلکہ ان کا اعتماد اپنے تھیلوں پر تھا اور اس بات سے غافل رہے کہ یہ تقسیم کرنے والی ذات کی تقسیم ہے۔

عورتوں کا جہاد

۲۵۳۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ قَالَ نَعَمْ عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِيهِ الْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ

اخرجه ابن ماجہ ۹۶۸/۲ حدیث رقم ۲۹۰۱۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کہا میں نے اے اللہ کے رسول! عورتوں پر جہاد ہے فرمایا کہ عورتوں پر ایسا جہاد ہے کہ اس میں لڑائی نہیں ہے وہ حج و عمرہ کریں اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: علی النساء جہاد؟ شروع میں حرف استفہام محذوف ہے۔

قوله بعليهن جهاد لا قتال فيه: الحج والعمرة: "الحج والعمرة" یہ بدل ہے "جهاد" سے یا خبر ہے مبتداء محذوف کی اور ان کو منسوب پڑھنا بھی جائز ہے اعمیٰ فعل مقدر کی وجہ سے۔

"لاقتال فيه" بلکہ اس میں محنت مشقت سفر ازادراہ کا بوجھ گھروالوں سے مفارقت وطن سے جدائی ہے جیسا کہ جہاد میں ہوتا ہے۔ اس حدیث سے امام شافعی نے عمرہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث گزر چکا ہے۔

وسعت کے باوجود حج نہ کرنے پر وعید

۲۵۳۵: وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ أَوْ مَرَضٌ حَاسِبٌ فَمَا تَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَيْمَتْ إِنْ شَاءَ يَهُودِيًّا وَإِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا۔

اخرجه الدارمی فی السنن ۴۵۱۲ حدیث رقم ۱۷۸۵۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کہ جس کو ظاہری حاجت نے حج سے منع نہ کیا ہو کہ سواری اور توشہ کا نہ ہونا۔ یا بادشاہ ظالم نے یا مرض روکنے والے نے پس وہ مر گیا اور حج نہ کیا۔ پس اگر وہ چاہے تو یہودی ہو کر مرے اور اگر چاہے تو نصرانی ہو کر مرے۔ اس کو دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: من لم يمنعه من الحج حاجة ظاهرة او سلطان جائر او مرض حابس:

حاجت ظاہری سے مراد ازادراہ اور سواری کا نہ ہونا ہے کیونکہ استطاعت بلا خلاف شرط وجوب ہے۔

"او سلطان جائر": اس میں اشارہ ہے کہ وہ روکنا معتبر ہے جب وہ اس کو ظلم اور سختی کے طور پر روکے۔ چنانچہ بطور محبت اور نرمی کے روکنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے اسی طرح وجوب حج کے موانع میں سے یہ بھی ہے کہ راستے میں ظالم بادشاہ سے جان یا مال کا خطرہ ہو۔ ان دونوں سے سلامتی کی شرط میں سے ہے اصح قول کے مطابق۔ ہاں اگر امن غالب ہو تو قول صحیح کے مطابق حج واجب ہوگا۔ "او مرض حابس" یعنی شدت مرض سفر کیلئے مانع ہو پس بیماریوں سے بدن کا سلامت ہونا وجوب کیلئے شرط ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شرط ادا ہے۔ قول اول کے مطابق اندھے، اپانچ، پاؤں کٹے، بیمار اور اس بوڑھے پر جو سواری پر تک نہ سکتا ہو نہ حج واجب ہے نہ دوسرے سے حج کرانا اور نہ وصیت کرنا لازم ہے۔

قوله: فليمت ان شاء يهوديا وان شاء نصرانيا۔

یعنی ان کے مشابہ ہو کر مرے، کہ انہوں نے اپنی کتاب پر عمل نہیں کیا باوجودیکہ وہ اپنی کتاب پر ایمان رکھتے تھے اس کی تلاوت کرتے تھے اور مواضع خطاب کا علم بھی رکھتے تھے اور اس پر مرتب ہونے والے عقاب کا بھی ان کو علم تھا۔
فائدہ: "رواہ الدارمی": ایک نسخہ میں اس کی جگہ "الترمذی" ہے۔

حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں

۲۵۳۶: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ الْحَاجُّ وَالْعُمَّارُ وَفَدَّ اللَّهُ إِنْ دَعَوْهُ آجَابَهُمْ وَإِنْ اسْتَفْفَرُوهُ عَفَّرَ لَهُمْ۔ (رواه ابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۹۶۶۲ حدیث رقم ۲۸۹۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے پیغمبر ﷺ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حج

کرنے والا اور عمرہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعاء قبول کرتا ہے اور اگر بخشش چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے۔ اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: الحاج والعمار وفد الله:

”والعمار“ عین کے ضم اور میم کی تشدید کے ساتھ ہے ”العامر“ کی جمع ہے ”معممر“ کے معنی میں ہے۔ علامہ زنجیری فرماتے ہیں کہ ہم نے ”عمر“ بمعنی ”اعتصم“ کے نہیں سنا ہے۔ لیکن عمر اللہ بمعنی عبدہ کے سنا ہے شاید ہمارے علاوہ دوسرے حضرات نے سنا ہو۔ اور اسکے بعض تعاریف مستعمل ہو اور بعض نہ ہو۔

”وفد الله“ میں اضافت تشریف کیلئے ہے۔ مراد وفد حرم ہے۔

یعنی اس جماعت کی طرح ہیں جو اللہ کے ہاں آئے ہوں اور اس کے ہاں ٹھہر کر اس کا تقرب حاصل کر رہے ہوں۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ الحاج کے مفرد ہونے اور اس کے مابعد کے جمع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اشارہ ہے حج کے تمیز اور مفرد ہونے کی طرف کہ حج کرنے والا اگرچہ اکیلا ہو تو وہ وفد کے قائم مقام ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ برخلاف عمرہ کے کہ اس کا مرتبہ کم ہونے کی وجہ سے عمرہ کرنے والا بہت سارے لوگوں کے مقام نہیں بن سکتا (آجی)

یہ بڑی عمدہ وجہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور اس میں ہمارے مذہب کی طرف اشارہ ہے کہ عمرہ سنت ہے ورنہ مذہب شافعی کے مقتضی کے مطابق فرضیت میں تفاوت کی وجہ ظاہر نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کے نزدیک قطعاً اور ظنی دلائل میں فرق نہیں ہے۔ اور ان کے اس آیت سے استدلال کی وجہ سے ”واتموا الحج والعمرة لله“ کہ اس میں حج اور عمرہ آمریت کے اقتضاء میں برابر ہے۔

۲۵۳۷: وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ وَقَدْ لَلَّ اللَّهُ ثَلَاثَةَ الْغَازِي وَالْحَاجِّ وَالْمُعْتَمِرِ (رواه النسائي)

ئی والبیہقی فی شعب الایمان)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۹۶۶/۲ حدیث رقم ۲۸۹۳۔ والبیہقی فی شعب الایمان۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے مہمان تین ہیں۔ جہاد کرنے والے اور حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے۔ اس کو امام نسائی نے نقل کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں۔

تشریح: قوله: وفد الله ثلاثة: نہا یہ میں ہے کہ ”وفد“ ان لوگوں کو کہتے ہیں جو جمع ہو کر ایک ساتھ مختلف شہروں میں

جاتے ہوں یا بڑوں اور رؤساکے پاس زیارت وغیرہ کے قصد سے جاتے ہوں۔ حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کا بڑے اور عظیم لوگوں کے ہاں رتبہ اور عزت ہو۔ کہ ان کے مطالبات مانے جاتے ہو اور ان کی ضروریات پوری کی جاتی ہوں۔

قوله: ”الغازی“ کفار کے ساتھ دین کی سر بلندی کیلئے جہاد کرنے والا۔

حاجی سے سلام و مصافحہ کا ثبوت

۲۵۳۸: وَعَنْ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا لَقِيتَ الْحَاجَّ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَصَافِحْهُ وَمَرَّةً أَنْ

يَسْتَغْفِرُ لَكَ قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ بَيْتَهُ فَإِنَّهُ مَغْفُورٌ لَكَ (رواه احمد)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت تو حاجی سے ملاقات کرے یعنی جو کہ حج کر چکے ہیں تو اس کو سلام کر اور اس سے مصافحہ کر اور اس سے کہہ کہ وہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار مانگے اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو۔ اس لیے کہ تحقیق وہ بخشا گیا ہے۔

تشریح: قولہ: ”مرہ“ امر سے امر کا صیغہ ہے ہمزہ تخفیف کے واسطے حذف کیا ہے۔

”ان یستغفروا لک“ اس میں عظیم مبالغہ ہے اس کے حق میں کہ اس کے استغفار کرنے سے دوسروں کی مغفرت کی امید ہے۔

”قبل ان یدخل بیتہ“ بیشتر اس کے کہ وہ دنیا میں ملوث ہو جائیں اور اہل وعیال کے ساتھ مشغول ہو جائیں۔ کیونکہ جس کیلئے مغفوردعا کر لے اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔

ایک موضوع حدیث:

واضح رہے کہ یہ حدیث: ”من اکل مع مغفوره غفوله“ موضوع ہے، یعنی من گھڑت ہے۔

”جس نے کسی ”مغفولہ“ شخص کے ساتھ کھانا کھایا اس کی بھی مغفرت کر دی جاتی ہے۔“

حج و عمرہ کرنے والے کو جہاد کرنے والے کے برابر ثواب ملتا ہے

۲۵۳۹: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ خَرَجَ حَاجًّا أَوْ مُعْتَمِرًا أَوْ غَازِيًا نُمَّ مَاتَ فِي

طَرِيقِهِ كَتَبَ اللَّهُ لَهُ أَجْرَ الْغَازِي وَالْحَاجِّ وَالْمُعْتَمِرِ - (رواه البيهقي في شعب الایمان)

اخرجه البيهقي في شعب الایمان ۴۸۴/۳ - حدیث رقم ۴۱۰۰ -

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حج کے ارادہ سے نکلا یا عمرے کے ارادے سے یا جہاد کے پھر اس کی راہ میں مر گیا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہاد کرنے والے کا ثواب لکھتا ہے اور حج کرنے والے کا اور عمرہ کرنے والے کا۔ اس کو بیہی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ”من خرج حاجا.....“ کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”ومن يخرج من بيته مهاجرا الى الله

ورسوله ثم يدرکه الموت فقد وقع اجره على الله- اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرونگا پھر اس کو موت آ پڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا۔ (بیان القرآن)

علامہ طیبی نے اس حدیث کے تحت یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ جس شخص پر حج واجب ہو اور اس کی ادائیگی میں تاخیر کی پھر ایک زمانہ

کے بعد حج کا ارادہ کیا اور راستے میں مر گیا تو وہ گنہگار ہوگا۔ تو یہ حدیث اس بات کے خلاف ہے؟

چونکہ حدیث میں اس کے مطلوب کی تصریح نہیں ہے کیونکہ حدیث مطلق ہے تو اس کو محمول کیا جائے گا اس شخص پر جو حج واجب

ہوتے ہی نکل جائے حج کیلئے اور جب اس کے علاقے کے لوگ حج کیلئے نکل جائے یا اس پر محمول ہے کہ جب وہ حج میں تاخیر کر دے کسی

عارض کے پیش آنے کی وجہ سے بیماری، قید، یا راستے کے امن نہ ہونے کی وجہ سے۔ پھر عارض کے ختم ہونے پر حج کیلئے نکلا اور مر اتویہ مطیع

ہو کر مر اور جس شخص نے بغیر عذر کے حج کی ادائیگی میں تاخیر کی اور پھر راستے میں مر اتویہ بغیر کسی اختلاف کے وہ گنہگار ہے۔ ہمارے

نزدیک باوجود اس اختلاف کے کہ حج کا وجوب علی الفور ہے یا علی التراخی اور صحیح یہ ہے کہ علی الفور ہے۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہم یہ کہیں کہ حاجی کوئی الجملہ اجر دیا جاتا ہے کیونکہ اللہ کسی نیکی کرنے والے کی نیکی ضائع نہیں کرتے اور اس

سے کوئی مانع نہیں ہے کہ من و وجہ عاضی ہو اور من و وجہ مطب ہو۔ پھر اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ یہ علامہ طیبی کا اپنے امام شافعی اور اپنے اہل مذہب اور مالک وغیرہ سلف اور خلف کے فضلاء کی طرف سوء ادب کی نسبت ہے۔

بَابُ الْإِحْرَامِ وَالتَّلْبِيَةِ

احرام باندھنے اور لبیک کہنے کا بیان

احرام کی حقیقت ”دخول فی الحرمۃ“ ہے اور مراد اس سے مخصوص حرمت کا التزام ہے اور ان کا التزام شرعاً کیلئے شرط ہے۔ اور حرام کا ثبوت بغیر نیت اور تلبیہ کے تحقق نہیں ہوتا یا جو ان کا قائم مقام ہو۔ پس تلبیہ کا عطف احرام پر عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے یا اس کی بنیاد تو اعدشافیہ پر ہے کہ احرام فقط نیت کا نام ہے یا تلبیہ سے مراد یہاں جو نیت سے ملا ہوا نہ ہو یعنی اس کے الفاظ، احوال اور فضائل کے بیان میں۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ یہ حج اور عمرہ کے ارکان میں سے ہے بالا جماع۔ لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں ایک قول اس کے شرط ہونے کا بھی ہے تو اجماع کیسے ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اجماع مطلق رکنیت پر نہیں ہے بلکہ وجوب پر ہے اور وہ حج میں داخل ہونے کی نیت ہے۔ کیونکہ نیت ہی ارکان میں سے ہے۔ ہر وجوب: انما الاعمال بالنیات حدیث کے (آہنی)۔

لیکن اس میں چند اباحت ہیں جو مخفی نہیں ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ احرام کے رکن ہونے پر اجماع ہے۔ اگر اجماع سے مراد اجماع سلف صحابہ اور تابعین میں سے ہو تو ان سے اس بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے بلکہ ان کے عادات میں سے رکن اور شرط کو لاگ کرنا ہی نہیں تھا۔ اور اگر اجماع خلف مراد ہے تو پھر اس میں آپ کیلئے کافی ہے امام اعظم ہمام کا یہ قول کہ یہ شرط ہے، پھر اس کا جواب یہ دینا کہ اجماع مطلق رکنیت پر نہیں بلکہ وجوب پر ہے۔ یہ شیخ الاسلام کی طرف سے انتہائی عجیب و غریب بات ہے کہ انہوں نے احکام میں رکن اور مطلق وجوب میں فرق نہیں کیا ہے۔ کیونکہ ہر رکن تو واجب ہے لیکن ہر واجب رکن نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ اصول میں ثابت ہے۔ پھر اس کی تفسیر نسک میں داخل ہونے کی نیت سے کرنا اور انما الاعمال بالنیات سے استدلال کرنا مردود ہے ان دلائل کی وجہ سے جس کی طرف ہم اس حدیث کے تحقیق میں شروع کتاب میں اشارہ کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فائدہ! احرام کو احرام اس لیے کہتے ہیں۔ کہ کتنی چیزیں احرام باندھنے والے کو اپنے اوپر حرام کرنی ہوتی ہیں چنانچہ ان کا بیان انشاء اللہ آگے ہوگا۔

الفصل الاول:

احرام کی حالت میں خوشبو لگانا

۲۵۴۰: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ أُطِيبُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ وَلِحِلِّهِ قَبْلَ أَنْ يَطُوفَ بِالْبَيْتِ بِطَيْبٍ فِيهِ مِسْكٌ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى وَابِئِصِ الطَّيْبِ فِي مَفَارِقِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ - (متفق علیہ)
 اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۳۹۶/۳ - حدیث رقم ۱۵۳۹ مسلم فی صحیحہ ۸۴۷/۲ حدیث رقم (۳۷ - ۱۱۸۹) -
 وابوداؤد فی السنن ۳۵۸/۲ حدیث رقم ۱۷۴۵ والترمذی ۲۵۹/۳ حدیث رقم ۹۱۷ والنسائی ۱۳۷/۵ - حدیث رقم

۲۶۹۳ وابن ماجہ ۹۷۶/۲ حدیث رقم ۲۹۲۶۔ ومالك في الموطأ ۳۲۸/۱۳۲۸ حدیث رقم ۱۷ من كتاب الحج، في السنن ۵۱۲ حدیث رقم ۱۸۳۔ واحمد في المسند ۹۸/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں خوشبو لگاتی تھی نبی کریم ﷺ کے احرام کو احرام باندھنے سے پہلے اور آپ ﷺ کے احرام سے حلال ہونے کے لیے پہلے طواف کعبہ سے پہلے خوشبو لگاتی تھی کہ اس میں مشک ہوتا تھا گویا کہ میں دیکھتی ہوں رسول کریم ﷺ کی مانگ میں خوشبو کی چمک اس حال میں آپ ﷺ محرم ہوتے تھے گویا کہ وہ چمک میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: كنت اطيب رسول الله ﷺ لاحرامه فيه مسك :

”لاحرامه“ یعنی حضور کے احرام باندھنے کے ارادہ کی وجہ سے یا اسکے حج کے احرام کی وجہ سے۔

قولہ: قبل ان يحرم: ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہاں سے ہمارے علماء نے اخذ کیا ہے کہ مرد و عورت چاہے جوان ہو یا غیر جوان کیلئے خوشبو لگانا سنت ہے غسل کرنے کے بعد، سوائے اس عورت کے جو حالت سوگ میں ہو۔ مگر بدن پر لگائے۔ عورتوں کیلئے جمعد اور جماعت کیلئے نکلنے وقت خوشبو لگانا جو مکروہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں زمان اور مکان دونوں کی تنگی ہوتی ہے۔ پس ان کیلئے مردوں سے اجتناب ممکن نہیں ہوتا بخلاف حالت احرام کے (آہنی)

لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو ابن حجر کے مدعا پر دال ہو۔
”بطیب“: اطیب کے ساتھ متعلق ہے۔

قولہ: كاني انظر الي وبيص الطيب في مفارق رسول الله ﷺ:

مسلم کے بعض طرق میں ”مفروق“ واحد کے لفظ کے ساتھ ہے، یہ بات ابن الملک نے ذکر کی ہے۔ ”مفارق“ میم کے فتح کے ساتھ جمع ہے مفروق را کے کسرہ کے ساتھ کی اور اس میں راء کا فتح بھی منقول ہے، اور یہ سر کے وسط کو کہتے ہیں جہاں سے بولوں میں مانگ نکالی جاتی ہے، اور اس کو جمع کے ساتھ ذکر کیا ہے تاکہ سر کے تمام اطراف کو شامل ہو گویا کہ وہ لوگ سر کے ہر حصہ کو مفروق کہتے تھے۔

”فيه مسك“ ایک روایت متفق علیہ میں ذریعہ کالفظ ہے لیکن اس میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ وہ مشک کے ساتھ ملاتے تھے۔

قولہ: ولحله قبل ان يطوف بالبيت بطيب فيه مسك: ”مراد طواف افاضہ ہے۔

”فيه مسك“ یہ مشک کے پاک ہونے کی دلیل ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ اگر خوشبو احرام سے پہلے لگائی جائے اور اس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے تو کوئی حرج نہیں اور اس پر کوئی فدیہ بھی لازم نہیں ہوتا جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے لیکن امام مالک کے نزدیک اس طرح خوشبو لگانا مکروہ ہے اور اس نے فدیہ کو لازم کیا ہے جو اثر باقی رہے اس پر (آہنی)

امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے اس مسئلے میں شافعی اور احمد سے سبقت لے گیا ہے اور یہی جمہور علماء سلف و خلف کا مذہب ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ حالت احرام میں خوشبو کے چمک سے مراد یہ ہے کہ اس خوشبو کے ٹکڑے احرام کے بعد اس پر باقی رہتے، اس طور پر کرو، اس میں چمکتے۔ لیکن قاضی کا تعقب کیا گیا ہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کیونکہ چمک محض اثر سے بھی ہوتا ہے اگرچہ عین باقی نہ ہو۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ قاضی کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے ”طیبہ طیباً لا یشبہ طیبکم“ کہ ان کی خوشبو عمدہ ہوتی تھی تمہاری خوشبو کی طرح نہ ہوتی تھی، تو ان کے اس قول کی وجہ غیر ظاہر ہے۔

اور حضرت عائشہ کی ایک روایت میں ”طیبہ عند احرامہ ثم طاف فی نسائی ثم اصبح محرماً ینضح طیباً“ اور ایک

روایت میں لاحرامہ حین یحرم کے الفاظ ہے۔

اور اس سے قبل ان یحرم والی روایت کی یہ تاویل غلط ہوگی کہ یہ خوشبو احرام کیلئے نہیں ہوتی تھی۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ تاویل ان الفاظ کی وجہ سے بھی غلط ثابت ہوتی ہے: کما فی انظر۔ تو یہ قول خود غلط ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

اس طرح ان کا یہ قول کہ وہ دیکھائی دینے والا خوشبو کا اثر ہوتا تھا نہ کہ عین کیونکہ عین غسل سے ختم ہو جاتا ہے، انتہائی دوراز کار ہے۔

پس اس پر اعتماد نہ کیا جائے (ابھی)

ابوداؤد نے سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے حضرت عائشہ سے کہ وہ فرماتی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ کی طرف نکلے اور ہم احرام کے وقت اپنے پیشانیوں پر خوشبو لگاتی بس جب ہم میں سے کسی کو پسینہ آتا تو خوشبو اس کے چہرے پر بہتی، اور نبی ﷺ اسے دیکھتے، پس اس حدیث میں اس پر دلالت ہے کہ احرام کے بعد خوشبو کا دوام سلبے ہوئے کپڑوں کے دوام کی طرح نہیں ہے۔ اس میں ان لوگوں کا اختلاف ہے جنہوں نے وارد نص کے خلاف کرتے ہوئے فاسد قیاس کیا، پھر اس حدیث سے عورتوں کیلئے خوشبو لگانے کے جواز پر استدلال درست ہے نہ کہ ما قبل والی حدیث سے۔ واللہ اعلم بالصواب

اور جو حضرات ایسی خوشبو لگانے کے قائل نہیں ہے کہ جس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے جو کہ امام محمد اور امام مالک کا قول ہے ان کے نزدیک اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ طیب سے مراد خوشبو دار تیل ہے یا وہ خوشبو مراد ہے جس کا عین باقی نہ رہتا ہو اور خوشبو باقی رہتی ہو، اور کپڑوں پر خوشبو لگانے کے بارے میں اختلاف ہے اور معتقد قول یہ ہے کہ یہ مندوب نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے تو اس کا ترک مؤکد ہوگا تا کہ اختلاف سے بچ جائیں جو کہ بالا جماع مستحب ہے کیونکہ بعض نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ امام محمد اور امام مالک کی دلیل وہ حدیث ہے جو بخاری اور مسلم نے علی بن امیہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا جو خوشبو میں لت پت تھا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا ”اما الطیب الذی بک فاعسله ثلاث مرات واما الحبة فانزعها ثم اصنع فی عمرتک ما تصنع فی حجتک“ کہ تجھ پر خوشبو لگی ہوئی ہے اسے تین بار دھولے اور جو جبہ ہے اسے اتارو، پھر اپنے عمرے میں وہی اعمال کر جو توجیح میں کر رہا ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے بعض حضرات نے کہا ہے کہ خوشبو کا حلال ہونا نبی ﷺ کے ساتھ خاص تھا کیونکہ خود آپ ﷺ نے لگائی ہے اور دوسرے کو منع فرمایا ہے۔

لیکن اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ شاید آپ ﷺ کا اس آدمی کو یہ حکم دینا حرمت خوشبو کی وجہ سے ہو یا یہ ممانعت اس خوشبو کے ساتھ خاص ہو کہ وہ خلوق تھا لہذا اس کو منع کرنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا جائز ہونا آپ ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔ پھر ہم نے صحیح مسلم میں حدیث مذکور میں دیکھا کہ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: ”وہو مصفر لحيته ورأسه“ کہ اس کے سر اور داڑھی پر زعفران لگا ہوا تھا۔ ”وقد نهوا عن التزعفر“ حالانکہ ان کو زعفران لگانے سے منع کیا گیا تھا اور مسلم کے الفاظ میں یہ بھی ہے ”نهى ان يتزعفر الرجل“ اور یہ ابوداؤد کے اس روایت سے مقدم ہے جس میں ہے کہ آپ ﷺ اپنی داڑھی کو اور زعفران سے زرد کرتے تھے۔

اگرچہ ابن قتان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کیونکہ صحیحین کی روایت زیادہ قوی ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ مانع ہے پس مقدم ہوگی اور سند احمد کی روایت میں صراحت آئی ہے: ”اغسل عنک هذا الزعفران“ کہ یہ زعفران اپنے آپ سے دھولے۔

اور اختلاف کی وجہ سے انہوں نے مستحب سمجھا ہے کہ وہ محرم خوشبو کے عین اور جسم کو ختم کر دے۔

بلند آواز سے تلبیہ کہنا

۲۵۴۱: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَهْلُ مُلْبِدًا يَقُولُ لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ

لَكَ لَيْبِكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ لَا شَرِيكَ لَكَ لَا يَزِيدُ عَلَى هُوَ لَاءِ الْكَلِمَاتِ - (متفق عليه)

اخرجه البحاری فی صحیحہ ۴۰۸/۳ حدیث رقم ۱۵۴۰ - و مسلم فی صحیحہ ۸۴۲/۲ حدیث رقم (۲۱ - ۱۱۸۴)۔
وابوداؤد ۳۶۰/۲ حدیث رقم ۱۷۷۴ - وابن ماجہ ۱۰۱۳/۲ حدیث رقم ۳۰۴۷ - والدارمی ۵۳/۲ حدیث رقم ۱۸۰۸ -
واحمد فی المسند ۱۳۱/۲ -

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ بلند آواز سے کہتے ہیں حاضر ہوں تیری خدمت میں اے الہی میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ تحقیق سب تعریف اور نعمتیں تیرے واسطے ہیں اور بادشاہت تیرے واسطے۔ ان کلمات پر زیادتی نہیں کرتے تھے اس بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: یہل ملبدا یقول: ”ملبدا“ باء کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ ہے۔

تلبید کرنا یہ ہے کہ محرم اپنے سر کے بالوں میں گوند یا عظمی یا مہندی یا اور کوئی چیز لگا لیتا ہے۔ قاموس میں ہے تلبید الصوف ونحوہ بمعنی تداخل و لزوج بعضہ لبعض، یعنی ایک دوسرے میں داخل ہونا اور ایک دوسرے کے ساتھ چپک جانا۔

”ملبدا“ ابن الملک فرماتے ہیں کہ تلبید کہتے ہیں سر کے بالوں کو گوند یا عظمی کے ساتھ آپس میں چپکانا تاکہ ان میں گرد و غبار نہ بیٹھیں اور جوڑوں سے محفوظ رہیں اور دھوپ سے بچے رہیں اور یہ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے اور ہمارے نزدیک اس پر ایک دم لازم ہوگا اگر تلبید ایسی چیز سے کی ہو جس میں خوشبو نہ ہو۔ کیونکہ یہ سر ڈھانپنے کی طرح ہے اور اگر اس میں خوشبو بھی ہو تو دو دم لازم ہوں گے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ رشید الدین بصری نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ احرام سے قبل تلبید کرنا اچھا ہے تو یہ اشکال سے خالی نہیں کیونکہ قبل از احرام کے ڈھانپنے ہوئے سر کو ڈھانپنا ہو اور کھنا جائز نہیں۔ برخلاف خوشبو کے (آہنی)

لیکن اس کے قول کو جمع حدیث کے تلبید لغوی پر محمول کرنا ممکن ہے کہ اس سے مراد بالوں کو اکٹھے رکھنا اور ان کو بکھرے ہوئے نہ چھوڑنا ہو۔

”یقول“ یہل سے بدل ہے اور یہ شاطبی کا مذہب ہے مسائل نحو میں۔

قولہ: لیبک اللهم لیبک: ”لیبک“ اس کی تقریر ہے البت یا رب بخدمتک البابا بعد الباب یہ ماخوذ ہے الب بالمکان سے بمعنی کسی جگہ اقامت اختیار کرنا، تو اس کا معنی ہے کہ میں تیری اطاعت پر قائم اور کھڑا ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اجبت اجابتک اجابة بعد اجابت اور اس کو ثننیہ ذکر کرنے سے مراد نکثیر ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿لَهُمُ الْبَصَرُ كَرْتَيْنِ﴾ [الملك: ۳] یعنی کمرہ بعد کمرہ کے معنی میں ہے۔ اور زوائد کا حذف تخفیف کیلئے ہے اور نون کا حذف اضافت کی وجہ سے ہے۔

”اللهم لیبک“ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دعا اور پکار کا جواب ہے لیکن اختلاف داعی کے بارے میں ہے کہ وہ کون ہے؟ پس بعض نے کیا ہے کہ داعی اللہ پاک خود ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں بعض کہتے ہیں کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ جواب میں جو خطاب ہے یہ اللہ کو ہے کیونکہ یا تو وہ حقیقتاً داعی ہے یا حکماً؛ پھر جو حضرات کہتے ہیں کہ منادی ابراہیم ہیں تو اس قول کے مطابق کہا گیا ہے کہ وہ مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر ندی دی یا حجون یہ یا جبل ابی قیس پر لیکن

اس کو جمع کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے۔

قوله: لبیک لا شریک لک لبیک:

”لبیک لا شریک.....“ پہلا تلبیہ جو مکہ بالثانیہ ہے اثبات الوہیت کیلئے ہے اور یہ تلبیہ اللہ کی ذات اور صفات ثبوتیہ میں شرک کی نفی کیلئے ہے۔

قوله: ان الحمد والنعمة لک والملك:

”ان الحمد“ اس میں ان کسرہ کے ساتھ ہے اور کسرہ ہی روایت اور درایت مختار ہے اور فتح کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ فتح روایت عامہ ہے اور محدثین کے ہاں دونوں مشہور ہیں اور ثعلب کہتے ہیں کہ کسرہ زیادہ عمدہ ہے کیونکہ فتح کی صورت میں معنی ہوگا لبیک بھذا لسبب اور کسرہ کی صورت میں مطلق تلبیہ ہے۔

اور ابن حجر کا یہ قول کہ النعمة نصب کے ساتھ ارفع قول کے مطابق اور رفع بھی جائز ہے اور معنی اس کا ہے کہ انعام یا اس کا اثر جو مخلوق تک پہنچنے والا ہے۔ تو یہ قواعد عربیت سے غفلت ہے کیونکہ ”ان“ کے اسم کے محل پر عطف خبر کے ذکر سے پہلے جائز نہیں ہے۔ ”والملك“ نصب کے ساتھ اس کا عطف ہے الحمد پر۔ اسی وجہ سے والملك پر وقف مستحب ہے اور پھر لا شریک لک سے ابتداء کرے اور اس سے بھی کوئی مانع نہیں کہ والملك مرفوع ہو اور لا شریک لک خبر ہو۔

قوله: لا شریک لک، یعنی حمد کے استحقاق اور ایصال نعمت میں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ﴾ [النحل: ۵۳] اور تمہارے پاس جو کچھ بھی نعمت ہے وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ (بیان القرآن) اور حمد کے نعمت پر مقدم کرنے میں اشارہ ہے حمد کے معنی کے عموم کی طرف اور اشارہ ہے کہ اللہ بالذات حمد کا مستحق ہے۔ چاہے انعام کرے یا نہ کرے اور ابن حجر کی یہ تعلیل کہ تھوڑا سا وقتہ جو لاکو ماقبل کے ساتھ ملانے سے ہو جائے تو کہیں اس سے نفی یا قبل کا وہم پیدا ہوتا ہے اور یہ کفر ہے تو یہ وہم ہے جو کے ماقبل اور مابعد کے ذہول سے پیدا ہوا ہے۔

تلبیہ کے بارے میں اختلاف ہے ہمارے نزدیک احرام کے صحیح ہونے کیلئے تلبیہ شرط ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ تلبیہ واجب نہیں لیکن تلبیہ ترک کرنے کی وجہ سے دم لازم آتا ہے۔ اور امام شافعی کے ہاں تلبیہ سنت ہے۔ اس کے ترک کرنے کی صورت میں دم لازم نہیں آتا۔ اور بعض اصحاب شافعی کہتے ہیں کہ تلبیہ واجب ہے ترک پر دم لازم ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ حج کے دوران تلبیہ واجب ہے۔

قوله: لا یزید علی ہؤلاء الکلمات: یہ غالب حالات پر محمول ہے جیسا کہ فصل ثانی میں ابن عمر کی مرفوع حدیث آرہی ہے پھر اس سے کم کرنا مکروہ ہے۔ بغیر کسی اختلاف کے۔ اور طحاوی کے ہاں زیادہ کرنا بھی مکروہ ہے اور مذہب مختار یہ ہے کہ زیادہ مکروہ نہیں ہے بلکہ اچھا یا مستحب ہے۔ کیونکہ صحابہ اور تابعین سے ثابت ہے اور زیادت میں یہ الفاظ کہے: ”لبیک و سعیدک والخیر کلہ ببیدک، والرغباء الیک۔ والعمل لک لبیک حقاً، لبیک تعبداً ورقاً، لبیک ان العیش عیش الأخرۃ“ یا اس طرح کے اور الفاظ کہے۔

جمہور کے ہاں تلبیہ کہتے ہوئے آواز بلند کرنا مستحب ہے اور داؤد نے مسلم کی حدیث نقل کیا ہے ”اذا توجهتم الی المنی فاهلوا بالحدج“ اور اہلال کہتے ہیں تلبیہ کے ساتھ آواز بلند کرنا، لیکن اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ فاهلوا سے مراد ہے حج کا احرام باندھو اور احرام نیت اور تلبیہ کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ احناف کا مذہب ہے یا صرف نیت سے ہوتا ہے جیسا کہ شافعی کا مذہب ہے۔

۲۵۳۲: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا ادْخَلَ رِجْلَهُ فِي الْغُرْزِ وَاسْتَوَتْ بِهِ نَاقَتُهُ قَائِمَةً أَهْلًا مِنْ

عِنْدِ مَسْجِدِ ذِي الْحَلِيفَةِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۹۱۶ - حدیث رقم ۲۸۶۵ - و مسلم فی صحیحہ ۸۴۵۱۲ حدیث رقم (۲۷ - ۱۱۸۷) - و ابو داؤد فی السنن ۳۷۵۱۲ حدیث رقم ۱۷۷۳ و النسائی ۱۶۲۱۵ حدیث رقم ۲۷۵۷ - و ابن ماجہ ۹۷۳۱۲ حدیث رقم ۲۹۱۶ - و الدارمی ۹۸۱۲ حدیث رقم ۱۹۲۹ - و مالک فی الموطأ ۳۳۲۱۱ حدیث رقم ۲۹ من کتاب الحج - و احمد فی المسند ۱۸۱۲ -

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جب آپ اپنا پاؤں رکاب میں داخل کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونٹنی اٹھاتی اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حرام باندھتے مسجد ذی الحلیفہ کے پاس اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اذا دخل رجله فی الغرز: "الغرز" عین کے فتح اور راء کے کسرہ کے ساتھ چڑے یا کڑی سے بنے

ہوئے رکاب کو کہتے ہیں۔

قولہ: واستوت به ناقته قائمة: "به ناقته" میں باء تعدیہ کیلئے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ بہ حال ہے اور اسی طرح قائمة بھی

حال ہے۔

قولہ: اهل من عند مسجد ذی الحلیفہ: ابن الملک فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ذی الحلیفہ سے تلبیہ کی ابتداء کی اور یہ ان سے خلاف مذہب روایت ہے کیونکہ مستحب یہ ہے کہ احرام کے دو رکعت نفل کے بعد بیٹھے ہوئے نیت کرے اور تلبیہ کہے، (اتنی) ابن الملک کا یہ کہنا کہ یہ خلاف مذہب ہے یہ رعایت اوب کے خلاف ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لبیک کہنے کے بارے میں روایات مختلف ہیں ابن قیم نے زاد المعاد میں ان سب کو یوں جمع کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصیلاً پر بیٹھ کر لبیک کہا پھر اونٹنی پر بیٹھے تو اس وقت بھی لبیک کہا، اور اس کے بعد جب میدان بیداء پر پہنچے تو پھر لبیک کہا (اتنی) چنانچہ علماء نے اسی لیے لکھا ہے کہ حالت اور وقت اور جگہ کے تبدیل ہونے کے وقت لبیک کی تکرار مستحب ہے۔

اور ایک حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں کے بعد لبیک کہا تھا۔ لیکن اس کو یہ بھی نے ضعیف قرار دیا ہے اور ان کا تعقب کیا گیا ہے کہ ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے۔ اور امام نووی بھی اسی کی طرف مائل ہے۔ اور اس کی تائید ابن عباس کے تلبیہ کے بارے میں مختلف روایات کی تطبیق جمع کرنے سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد تلبیہ کہا تو کچھ لوگوں نے سنا اور محفوظ کیا پھر جب سوار ہوئے اور اونٹنی پر سیدھے بیٹھے تو لبیک کہا تو کچھ لوگوں نے وہ سن کر محفوظ کر لیا اور یہ کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں سے لبیک کہا ہے۔

پھر جب بیداء پر پہنچے تو لبیک کہا تو کچھ لوگوں نے وہاں سنا اور کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں سے لبیک کہا ہے کیونکہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جماعت در جماعت آتے تھے۔ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے جس کے تحت کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پھر اپنے مذہب کیلئے مسلم کی روایت سے استدلال کیا ہے "اذا رحمتم الی منی متوجہین فاهلوا بالحج"۔ اور اس کے تقدیر میں یہ ہے کہ "اذا اردتم الرواح الیہا متوجہین الی عرفات یعنی کہ جب تم منیٰ کی طرف چل پڑو عرفات کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے۔"

بلند آواز سے تلبیہ کہنے کا ثبوت

۴۵۳۳: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ نَصْرُحُ بِالْحَجِّ صُرَاخًا

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۱۴۱۲ حدیث رقم (۲۱۱ - ۱۲۴۷) - و احمد فی المسند ۵۱۳ -

ترجمہ: حضرت ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اس حال میں کہ میں چلاتے تھے

ساتھ حج کے چلانا اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: نصرخ بالحج صراخا:

”نصرخ“ خاء کے ضمہ کے ساتھ حال ہے۔ ”صراخا“ بضم الصاد مفعول مطلق ہے۔

صرف حج کا ہی ذکر اس لئے کیا کہ حج ہی اصل اور مقصود اعظم ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ حالت راوی نے اپنے بارے میں کہی ہے زیادہ سے زیادہ اس کا تعلق ان لوگوں سے بھی ہو سکتا ہے جو راوی کی طرح صرف حج کے لئے تلبیہ کرتے تھے۔ یا زیادہ سے زیادہ وضاحت سے یوں کہتے ہیں کہ یہ حدیث صرف ان لوگوں کا حال بیان کر رہی ہے جنہوں نے افراد کا احرام باندھا تھا۔ جہاں تک آنحضرت ﷺ کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کے بارے میں یہ حدیث ساکت ہے کہ اس کی وضاحت دوسری روایت سے ہوگی اس لئے یہ روایت روایات آئندہ کے منافی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

بلند آواز سے تلبیہ کہنا

۲۵۳۳: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كُنْتُ رَدِيفَ أَبِي طَلْحَةَ وَانْتَهَمَ لَيْصِرُ خُونٍ بِيَهْمَا جَمِيعًا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ.

(رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۲۱/۳ حدیث رقم ۱۰۶۲۔ وخرجه مسلم فی صحیحہ ۸۷۳/۲ حدیث رقم (۱۱۸)۔

(۱۲۱۱)۔ وخرجه ابوداؤد ۳۸۱/۲ حدیث رقم ۱۷۷۹ وابن ماجہ ۹۹۸/۲ حدیث رقم ۳۰۰۰۔ ومالك فی الموطأ

۳۳۵/۱ حدیث رقم ۳۶ من کتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں ابو طلحہ کی سوازی کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور تحقیق صحابہ کرام

ﷺ یعنی اکثر صحابہ چلاتے تھے دونوں کے ساتھ یعنی حج اور عمرہ کے لیے اکٹھے۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: وانهم ليصر خون بهما جميعا: یہ انسؓ کا کلام ہے یا ان سے روایت کرنے والے راوی کا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن افضل ہے چنانچہ حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔ اس حدیث کو مستدل قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے وہ آنحضرت ﷺ کے خلاف عمل کرنا کب گوارا کر سکتے تھے۔ لہذا آنحضرت ﷺ نے قرآن کیا ہوگا اس لئے اکثر صحابہؓ نے بھی آپ ﷺ کی اتباع ہی میں قرآن کیا۔

قولہ: الحج والعمرة: ”الحج والعمرة“ جر کے ساتھ بدل ہے بہما کی ضمیر سے اور رفع کے ساتھ مبتداء محذوف جو کہ ہما ہے کہ خبر ہونے کی وجہ سے، اور نصب کے ساتھ ائنی فعل مقدر کی وجہ سے۔

حج کرنے والوں کی اقسام

۲۵۳۵: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ

أَهَلَ بِحَجٍّ وَعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِالْحَجِّ وَأَهَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْحَجِّ فَأَمَّا مَنْ أَهَلَ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ وَأَمَّا

مَنْ أَهَلَ بِالْحَجِّ أَوْ جَمَعَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَلَمْ يَحِلُّوا حَتَّى كَانَ يَوْمَ النَّحْرِ.

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۳۹/۳۔ حدیث رقم ۱۶۹۱۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۰۱/۲ حدیث رقم (۱۷۴)۔ (۱۲۲۷)

وابوداؤد فی السنن ۳۹۷/۲ حدیث رقم ۱۸۰۵ والنسائی ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۷۳۲۔ واحمد فی المسند ۱۳۹/۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے حجۃ الوداع کے موقع پر ہم میں سے بعض وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے محض عمرے کا احرام باندھا اور بعض وہ لوگ تھے جنہوں نے حج اور عمرے کا اکٹھے احرام باندھا اور بعض ہم میں وہ لوگ تھے جنہوں نے محض حج کا احرام باندھا اور نبی کریم ﷺ نے حج کا احرام باندھا۔ پس جس نے عمرے کا احرام باندھا چر حلال ہو گیا اور جس نے احرام باندھا حج کا اور یا جمع گیا حج اور عمرے کو پس وہ نحر کے دن تک حلال نہیں ہوگا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ”فمننا من اهل بعمرة“ شاید کہا اس نے حج پہلے ادا کیا ہو تو سفر کو صرف عمرہ کیلئے کیا، یا جواز پر عمل کیا، یا صرف عمرہ کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے۔

قولہ: ”واهل رسول الله ﷺ بالحج“ خطاب فرماتے ہیں کہ بعض نے آپ ﷺ سے لبیک بحجۃ سنا اور بعمرة نہ سنا۔ تو اس نے نقل کیا کہ آپ ﷺ مفرد تھے بعض نے بحجۃ و عمرة سنا تو کہا کہ آپ ﷺ قارن تھے۔ اس بارے میں اکثر احادیث ان دو جہوں کی طرف لوٹتی ہیں۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ قارن ہوں اور آپ ﷺ نے کبھی لبیک بحجۃ کہا اور کبھی کہا لبیک بعمرة اور کبھی لبیک بحجۃ و عمرة کہا۔ اور ہر ایک نے وہی نقل کیا ہے جو اس نے سنا تو اب اس تاویل کی ضرورت نہیں کہ اس نے و عمرة نہیں سنا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام شافعی کی قطعی دلیل ہے کہ افراد حج کے تمام انواع میں سے افضل ہے اور ابن حجر نے ان کا تعقب کیا ہے کہ اس طرح کے اشارات سے قطعی دلیل کیسے حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ ہم تو صریح عبارات میں بھی اس بارے میں غلیل ہیں۔

قولہ: فاما من اهل بعمرة فحل:

یعنی عمرہ سے نکل گیا طواف اوستی کرنے کے بعد اور اس کیلئے وہ تمام امور جو احرام کی وجہ سے ناجائز ہو چکے تھے حلال ہو گئے پھر اس کے بعد حج کا احرام باندھا۔

قولہ: واما من اهل حتى كان يوم النحر: ”فلم يحلوا“ حاء کے کسرہ کے ساتھ لم یخروا کے معنی میں ہے۔

پس یوم نحر کو حمرۃ العقبہ کے رمی اور سر مونڈانے سے ان کیلئے تمام مختورات حلال ہو گئے سوائے عورتوں کے ساتھ مباشرت کہ وہ طواف زیارت کے بعد حلال ہوئی۔

حج کو عمرے کے ساتھ داخل کرنا

۲۵۳۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ تَمَتَّعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوُدَّاعِ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ بَدَأَ فَاهَلَّ بِالْعُمْرَةِ ثُمَّ أَهَلَّ بِالْحَجِّ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۳۹/۳۔ حدیث رقم ۱۶۹۱۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۰۱/۲ حدیث رقم (۱۷۴۔ ۱۲۲۷)۔

وابوداؤد فی السنن ۳۹۷/۲ حدیث رقم ۱۸۰۵ والنسائی ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۷۳۲۔ واحمد فی المسند ۱۳۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تمہے ہیں کہ تمتع کیا یعنی فائدہ اٹھایا نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں

عمرے کا احرام باندھا اور پھر حج کا احرام باندھا یعنی حج کو عمرے میں داخل کیا۔ پس قارن ہونے اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: تمتع رسول الله ﷺ بالعمرة الى الی الحج:

”الی الحج“: من العمرة سے حال ہے تقدیر عبارت یوں ہے تمتع بالعمرة منضممة الی الحج۔

قوله: فاهل بالعمرة ثم اهل بالحج: ”تمتع کیلئے بیان ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ عمرہ کے نیت میں حج کو داخل کیا، ابن الملک فرماتے ہیں کہ پہلے میقات سے عمرہ کا احرام باندھا پھر عمرہ کے افعال ادا کر کے مکہ سے حج کا احرام باندھا۔ پھر ابن الملک نے کہا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حج افراد کیا تھا ایک میں ہے کہ آپ ﷺ حج تمتع تھا ایک میں قرآن کا ذکر ہے؟ تو ہم اس میں توفیق و تطبیق کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ابتداء میں عمرہ کا احرام باندھا اور اس کو حالت تمتع میں جاری رکھا پھر عمرہ کے طواف سے قبل حج کا احرام باندھا اور حج کیلئے احرام الگ اور مستقل باندھا تو اس کی وجہ سے قارن ہوئے۔ لیکن ابن الملک کے کلام کے اوائل اور آخر میں تناقص ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ عمرے سے فائدہ اٹھایا اس کے ساتھ حج ملاتے ہوئے اور بعض نے کہا کہ جب عمرہ سے نکل گئے تو جن چیزوں پر پابندی تھی ان کی اجازت سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ پھر حج کا احرام باندھا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور عثمان رضی اللہ عنہما تمتع سے منع کرتے تھے نبی تنزیہی کے طور پر اس بنیاد پر کہ افراد افضل ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمتع کیا مگر ہم ڈر رہے تھے۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مفرد تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں ہے بصر خون بہما اور مراد اس سے نبی ﷺ اور صحابہ ہیں، سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ قارن تھے اور عبد اللہ المزنی کی روایت میں ہے کہ: ”سمعت رسول الله ﷺ يقول لبيك عمرة و حجاً“ اور ابن عمر کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مفرد تھے اور یہ تمام روایات میں حج اور تطبیق کی صورت یہ ہے کہ نفل کی نسبت امر کی طرف کی جاتی ہے جیسا کہ عرب کا قول بنی فلان دارا۔ اس وقت بولتے ہیں جب کسی نے گھر بنانے کا حکم دیا ہو۔ آپ ﷺ نے بذات خود صرف ایک قسم کا حج کیا تھا اور آپ ﷺ کے صحابہ میں سے بعض قارن تھے اور بعض مفرد تھے اور بعض تمتع تھے۔ اور یہ سب نبی ﷺ کے حکم اور امر کی وجہ سے تھا لہذا سب کی نسبت نبی ﷺ کی طرف درست ہے۔

یہ امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے اور اس میں بحث ہے۔

کیونکہ آپ علیہ اسلام سے یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ ﷺ نے کسی کوچ کے انواع میں سے کسی خاص نوع کا حکم دیا ہو۔ ہاں جس نے جو نوع اپنایا اس کو اس پر برقرار رکھا۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ ﷺ پہلے مفرد تھے پھر اس کے بعد عمرہ کا احرام باندھا تو قارن ہو گئے۔

اور جس روایت میں تمتع منقول ہے وہاں نفوی معنی مراد ہے کیونکہ تمتع کا معنی ہے فائدہ اٹھانا اور یہ مفہوم قرآن سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ بایں طور کہ قارن عمرہ سے مشفق ہوتا ہے جو وہ حج کے ساتھ کرتا ہے یا ایک سفر میں کرتا ہے۔

شمینی کہتے ہیں کہ ابن حزم نے اس بارے میں کتاب قائم کی ہے کہ آپ ﷺ حجۃ الوداع میں قارن تھے اور باقی احادیث میں

تاویل کی ہے۔

ہمارے نزدیک قرآن مطلقاً افضل ہے اور امام مالک اور شافعی کے نزدیک افراد مطلقاً افضل ہے اور امام احمد کے ہاں تمتع افضل ہے مطلقاً۔

اور شوافع کا مشہور قول یہ ہے کہ افراد اس وقت افضل ہے جب اس کے بعد الگ طور پر عمرہ بھی ادا کر دے۔ اور ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے حج ادا کیا اور پھر تنعم سے عمرہ کیا تو انہوں نے بڑی فحش غلطی کی ہے اور اس طرح ان لوگوں کا قول بھی غلط ہے کہ آپ نے تمتع کا احرام باندھا تھا پھر اس سے حلال ہو کر آٹھ ذی الحجہ کوچ کا احرام باندھا۔ اور اس کے بارے میں صحیحین میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے بارے میں یہ بتایا کہ انہوں نے قربانی کا جانور ساتھ لایا ہے پس وہ احرام سے نہیں نکلیں گے یہاں تک کہ اس کو ذبح کر دیں۔ اور یہ آپ ﷺ نے اپنے بارے میں خبر دی ہے جس میں وہم اور غلطی کا دخل نہیں ہو سکتا برخلاف دوسروں کا آپ ﷺ کے بارے میں خبر دینے کے۔

الفصل الثالثی:

احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہننے کی اجازت نہیں ہے

۲۵۳۷: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ نَابِتٍ أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ تَجَرَّدَ لِأَهْلَالِهِ وَاعْتَسَلَ - (رواه الترمذی والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۲/۳ حدیث رقم ۸۳۰ والدارمی فی السنن ۴۸۱/۲ حدیث رقم ۱۷۹۴۔

ترجمہ: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ ننگے ہوئے اپنے احرام کے لیے یعنی سلے ہوئے کپڑے اتارے اور غسل کیا۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور دارمی نے نقل کیا ہے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قوله: انه رأى رسول الله ﷺ تجرد لاهلاله "مصاحح کے نسخوں میں "لا حرامه" ہے۔

"تجرد" یعنی سلے ہوئے کپڑوں اور ازار اور رداء سے۔

قوله: وَاغْتَسَلَ: غسل کرنا آپ ﷺ کے سنت میں سے ہے اور شاید کہ یہ فال ہو گا انہوں کے دھونے سے اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ غسل واجب ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اگر گھر سے احرام باندھ رہا ہے تو پھر چاہیے کہ بیوی سے صحبت بھی کر لے کہ اس (جماع) سے بعد میں اس کو یا بیوی کو فائدہ حاصل ہوگا اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہما نے ابراہیم بن المستنیر عن ابیہ عن عائشہ کی سند سے روایت کیا ہے: "قالت اطيب رسول الله ﷺ ثم يطوف في نسائه ثم يصبغ محرماً" کہ میں رسول اللہ کیلئے خوشبو تیار کرتی اور آپ ﷺ اپنی بیوی کے پاس چکر لگا کر پھر محرم بن جاتے۔

تلبید کرنے کی اجازت ہے

۲۵۳۸: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَبَّدَ رَأْسَهُ بِالْعُسَلِ - (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داود فی السنن ۳۶۰/۲ حدیث رقم ۱۷۴۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے سر کے بال جمائے ایسی چیزوں کے ساتھ جن سے سر دھویا جاتا ہے اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان النبي ﷺ ليد رأسه بالغسل:

”الغسل“: غین کے کسرہ کے ساتھ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سر وغیرہ دھویا جائے جیسے خطمی وغیرہ۔ اس حدیث پر پہلے بات ہو چکی ہے اور یہ حدیث اس بات پر دلالت نہیں کر رہی ہے کہ یہ احرام سے قبل تھا۔ اور مصنف کا اس کو یہاں ذکر کرنے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ اس کی بنیاد ان کا اپنا فہم اور سمجھ ہے اور اس کی تائید دارقطنی کی اس روایت سے ہوئی ہے جو سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے کہ آپ ﷺ جب احرام کا ارادہ فرماتے تو اپنے سر کو خطمی اور اشانان وغیرہ سے دھوتے۔

بلند آواز سے تلبیہ کہنا

۲۵۴۹: وَعَنْ خَلَادِ بْنِ السَّائِبِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ آتَانِي جَبْرِيلُ فَأَمَرَنِي أَنْ أُمَرُ

أَصْحَابِي أَنْ يَرَفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ بِالْأَهْلَالِ أَوِ التَّلْبِيَةِ۔ (رواه مالك والترمذی و ابو داود والنسائی وابن ماجه والدارمی) اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۴۰۵/۲ حدیث رقم ۱۸۱۴۔ والترمذی فی السنن ۱۹۱/۳ حدیث رقم ۸۲۹ والنسائی فی السنن ۱۶۲/۵ حدیث رقم ۲۷۵۳۔ وابن ماجه ۹۷۵/۲ حدیث رقم ۲۹۲۲۔ والدارمی ۵۳/۲ حدیث رقم ۱۸۰۹۔ و مالك فی الموطأ ۳۳۴/۱ حدیث رقم ۳۴ من كتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۵۵/۴۔

ترجمہ: حضرت خلاد بن سائب سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے مجھے حکم دیا کہ میں اپنے دوستوں کو حکم کروں کہ وہ اپنی آوازیں بلند کریں اہلال کے ساتھ یا تلبیہ کہنا۔ اس کو امام ترمذی اور ابو داؤد اور نسائی اور ابن ماجہ اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

خلاد بن السائب۔ یہ ”خلاد سائب ابن الخلد“ کے بیٹے ہیں۔ ”خزرجی“ ہیں۔ باپ بیٹا دونوں صحابی ہیں۔ یہ اپنے والد اور زید بن خالد سے روایت کرتے ہیں اور ان سے حیان بن واسع وغیرہ۔ سائب ابن الخلد کے حالات جلد دوم میں حدیث ۴۷۴ کے تحت گزر چکے ہیں۔

تشریح: قوله: فامرني ان امر اصحابي:

قوله: ان يرفعوا علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ تمام نسخوں میں یہ عبارت اسی طرح ہے اور مصابح کے نسخوں میں ”بالاحرام والتلبیة“ ہے اور یہ تعریف ہے۔

”ملا علی قاری فرماتے ہیں“ بلکہ تحریف ہے اور اس کے ہونے کی وجہ، کمزور وہم ہے کیونکہ ”اہلال“ اکثر ”احرام“ کے معنی میں آتا ہے تو ناخ کو وہم ہوا اور نقل بالمعنی کیا اور اس بات سے غافل رہے کہ یہ تلبیہ کے ساتھ اور بلند کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہاں بلند کرنے کے معنی سے خالی کیا ہے یا مبالغہ مراد ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ با آواز بلند لبیک کہنا سنت ہے اگر کسی نے اس کو ترک کر دیا تو وہ گناہگار ہوگا اور اس پر کوئی دل لازم نہ ہوگا۔ اور اس میں اتنا مبالغہ بھی نہ کرے کہ اپنے آپ کو تھکا دے اور تکلیف پہنچے۔

مزید فرماتے ہیں کہ یہ بات مخفی نہیں ہونی چاہیے کہ ہمارے اس قول ”بلند آواز سے اپنے آپ کو نہ تھکائے“ اور وہ روایات جو شدت کے ساتھ آواز بلند کرنے کے استحباب پر دلالت کرتی ہے، میں کوئی منافات نہیں ہے۔

ماجہ ۹۷۴/۲ حدیث رقم ۲۹۱۸۔ ومالك في الموطأ ۳۳۱/۱ حدیث رقم ۲۸ من كتاب الحج۔ واحمد في المسند

-۳/۲

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذی الحلیفہ میں دو رکعتیں پڑھتے تھے جس وقت کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذی الحلیفہ کے پاس کھڑی اونٹنی اٹھاتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتے یعنی مشہور تلبیہ پڑھتے اور اس پر اضافہ بھی فرماتے میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ اے الہی میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں اور تیری خدمت میں حاضر ہوں اور بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے میں تیری خدمت میں حاضر ہوں اور تیری طرف رغبت ہے اور عمل تیرے ہی لیے ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے اور اس کے لیے الفاظ مسلم کے ہیں۔

تشریح: قوله : اهل بهولاء الكلمات ويقول: "ويقول" ابن حجر نے بقول کی ضمیر ابن عمر یا ان کے والد کی طرف لوٹائی ہے اور شیخین نے دونوں کی تصریح کی ہے۔ شیخین کی ایک روایت میں ہے عن نافع اور اس کے الفاظ یہ ہیں "ان تلبیة رسول الله ﷺ ، لبيك لا شريك لك لبيك، ان الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك" نافع کہتے ہیں کہ ابن عمر اس میں یہ الفاظ: "لبيك وسعديك والخير بديك والرغباء اليك والعمل" زیادہ کرتے تھے۔ اور شیخین کی ایک روایت میں حدیث الباب کے ذکر کرنے کے بعد یہ ہے "اتى بهولاء الكلمات وكان ابن عمر يقول: كان عمر يهل باهلل رسول الله ﷺ من هولاء الكلمات ويقول لبيك"۔

ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مصنف کے اصل نسخہ سے تقریباً دو سطر کہیں ساقط ہوئے جو اس نسخہ کے موافق تھے جس کی میں نے شرح کی ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ نسخہ تمام اس کے موافق ہیں شاید مصنف نے ایسا اختصار کیا ہے جو محل ہے جس سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ زیادت مرفوع ہے۔

قوله : لبيك اللهم لبيك، لبيك وسعديك:

"لبيك اللهم لبيك، لبيك وسعديك" تکرار تاکید کیلئے ہے یا تاکہ اس پر عطف کیا جاسکے۔

"وسعديك": ای ساعدت علی طاعتك ساعدة واسعادة بعدا سعاد: یعنی تیری اطاعت سے نیک بختی حاصل کرتا ہوں ایک نیک بختی کے بعد دوسری۔ اور یہ دونوں (یعنی لبيك اور سعديك) بنا بر مصدریت منصوب ہے۔ جیسا کہ علامہ طیبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔

سعديك تشبیہ مضاف ہے اور مقصود اس سے تکرار ہے برائے بکثیر جیسا کہ لبيك میں ہے۔ یعنی اصل میں ہے اسعد اجابتك سعادة بعد سعديك منفرداً۔ بغیر لبيك کے نہیں سنا گیا ہے اور اسعد صرف نوحہ میں مدد کرنے کو کہتے ہیں۔

قوله : والخير في يدك: یعنی تیرے قبضہ میں منحصر ہے صفت قدرت و ارادہ میں سے یا صفت جمال و جلال میں سے، تو اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تمام افعال میں محمود ہے یا یہ باب الاكتفاء میں سے ہے ورنہ تو تمام امور اللہ کیلئے ہیں اور خیر و شر سب اللہ کے اندازے اور فیصلے سے ہیں یا یہ حسن ادب کے باب سے ہے اضافت اور نسبت میں، جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿واذا مرضت فهو يشفين﴾ [الشعراء: ۸۰] ترجمہ: اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفاء دیتا ہے۔ (بیان القرآن)

اور اسی کے قبیل سے یہ منقول ہے "والشمر ليس اليك" یعنی شر کی نسبت تیری طرف نہیں کی جاتی ادب کی وجہ سے۔

اور ابن حجر کا یہ قول عجیب و غریب ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ یدیک میں اور یداہ مسبو طتان میں تشبیہ سے مراد حقیقت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد تکثیر ہے جس کی کوئی انتہاء نہ ہو۔ جیسا کہ لیبک اور سعد یک میں ہے کیونکہ اللہ کی نعمتیں اور قدرت جن سے یہ الفاظ کنایہ ہیں وہ بے شمار ہیں ابن حجر کے اس قول کی غرابت محضی نہیں ہے کیونکہ ان کے کلام کا مآل تشبیہ کا اعتبار ہے حالانکہ محققین کا مذہب وہ ہے جو پہلے گزرا۔ ”واللہ اعلم“۔

قوله: لیبک والرغباء الیک والعمل: ”الرغباء“: اس کو راء کے فتح اور سد کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اور یہی مشہور ہے۔ اور اس کو رغیبی راء کے ضمہ اور قصر کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور اس کی نظیر العلیاء اور العلی، اور النعماء اور النعمی ہے۔ اور ابوعلی سے روایت ہے کہ یہ راء کے فتح اور بغیر مد کے ہے طلب اور سوال کرنے کے معنی میں ہے اور اس کی طرف راغب ہونا جس کے ہاتھ میں خیر و بھلائی ہو، کے معنی میں ہے۔

اور علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اسی طرح ”والعمل“ ہے کہ اس کا احسان اسی کی طرف ہے کیونکہ اس سے مقصود ہی یہی ہے (انتہی) لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کی تقریر یہ ہے ”والعمل لک“ یعنی عمل تیری رضا کیلئے ہے یا تقریر ہے والعمل بک یا باسرك وتوفیقك، یا اس کا مطلب ہے کہ عمل کا معاملہ تیری طرف ہے یعنی اس کے قبول کرنے اور رد کرنے میں۔

اور طحاوی کا یہ کہنا انتہائی عجیب و غریب ہے کہ حضرت سعد سے منقول مشہور تلبیہ پر زیادہ مکروہ ہے پھر کہا ہے کہ هذا اختیار الطحاوی کہ یہی ہمارا قول ہے۔ بحر میں ہے کہ هذا اختیار الطحاوی شاید کہ امام طحاوی کا مقصد یہ ہو کہ آدمی اپنی طرف سے منقول تلبیہ پھر زیادہ کرے تو وہ مکروہ ہے اس پر قرینہ امام طحاوی کا اس سے پہلے والا قول ہے جو انہوں نے ذکر کیا ہے یہ کہ کوئی حرج نہیں کہ آدمی زیادہ کرے اس میں اللہ کا ذکر میں سے جو پسند کرے۔

اور یہ امام محمد کا قول ہے یا ان کا مواد یہ ہے کہ مسنون تلبیہ کے درمیان میں زیادہ مکروہ ہے کیونکہ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اگر اس پر زیادہ کرے تو یہ مستحب ہے تو صاحب سراج الوہاج کہتے ہیں کہ یہ استحباب مسنون تلبیہ کہنے کے بعد ہے اگر درمیان میں زیادہ کرے تو وہ مستحب نہیں ہے۔

(متفق علیہ و لفظہ مسلم) نسائی میں ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز قصر کے ساتھ پڑھی پھر سوار ہوئے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حدیث میں دو رکعت نماز سے مراد یہی ہے اور بخاری میں ہے کہ صبح کی نماز پڑھی اور پھر سوار ہوئے۔

ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ تمام علماء نے اس کو مستحب سمجھا ہے کہ یہ نفل یا فرض نماز کے بعد ہو اور قاضی عیاض وغیرہ نے نفل کیا ہے حسن بصری سے کہ وہ فرماتے ہیں فرض نماز کے بعد مستحب ہے کیونکہ وارد ہے کہ یہ دو رکعت صبح کی نماز تھی۔ اور صحیح وہی ہے جو جمہور نے کہا ہے اور وہی ظاہر حدیث کا مطلب ہے تو یہ امام بغوی پر اعتراض ہے کہ ان کی اصطلاح صحیح اور حسن کے بارے میں مختلف ہے۔ لیکن شیخ الاسلام نے احادیث مشکوٰۃ کے تحریر میں کہا ہے کہ اس حدیث کو احمد نے لفظاً اور بخاری نے معنی ذکر کیا ہے مگر اس نے ”بہذہ الکلمات“ کے بعد کہا ہے یعنی التلبیۃ اس کے مطابق پھر کوئی اعتراض نہیں ہے اور ابن المنذر نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما یہ الفاظ: لیبک ذالنعماء والفضل الحسن لیبک مرغوبا ومدھوبا الیک زیادہ کرتے تھے۔

اور حضرت جابر سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ لوگ ذالمعارض زیادہ کرتے تھے اور نبی ﷺ ان کو سنتے اور ان کو کچھ نہ کہتے۔ اور ابن منذر نے مرفوع روایت کیا ہے: ”لیبک حقاً حقاً تعبد ورقاً“ اور حضرت انس سے یہ موقوف روایت ہے۔ اور آپ علیہ السلام سے یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے ”لیبک ان العیش عیش الاخرة“، کبھی وسعت اور خوشی کی حالت میں

جو کہ عرف میں تھی اور کبھی سختی کی حالت میں جو خندق کھودنے کے وقت تھی اور حکمت دونوں میں یہ تھی کہ دنیا کی آسانی اور خوشی پر غور نہ کرنا کیونکہ اعتبار اصل میں عقبی کا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ ذوالحلیفہ پہنچتے تو وہاں پہلے آپ ﷺ دو رکعت نماز پڑھتے جو احرام کیلئے مسنون ہے اور ان دونوں رکعتوں میں قل یا ایہا الکفرون اور قل هو اللہ احد کی قراءت کرتے اور پھر نیت کرتے اور اس کے بعد بلیک کہتے، اور پھر جب اونٹنی آپ کو لے کر کھڑی ہوتی تو اس وقت بھی آپ پہلے انہیں کلمات کے ذریعے تلبیہ کرتے جو مشہور ہیں۔ اور ابن حجر کا یہ قول بعید از صحت ہے کہ اس سے مراد وہ تلبیہ ہے جو فصل اول میں گزرا۔

اللہ تعالیٰ سے خوشنودی مانگنا اور طلب معافی کرنا

۲۵۵۲: وَعَنْ عُمَارَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ إِذَا قَرَعَ مِنْ تَلْبِيَّتِهِ سَأَلَ اللَّهَ رِضْوَانَهُ وَالْجَنَّةَ وَاسْتَعْفَاهُ بِرَحْمَتِهِ مِنَ النَّارِ - (رواه الشافعی)

اخرجه الامام الشافعی۔

ترجمہ: حضرت عمارہ بن خزیمہ بن ثابت سے روایت ہے کہ انہوں نے نقل کیا ہے اپنے باپ یعنی خزیمہ سے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ فارغ ہوتے اپنے بلیک کہنے سے اللہ تعالیٰ سے خوشنودی مانگتے اور جنت اور عافیت طلب کرتے اسی رحمت کے ساتھ آگ سے۔ اس کو امام شافعی نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

خزیمہ بن ثابت: یہ خزیمہ ثابت ہیں۔ ان کی کنیت ”ابوعمارہ“ ہے۔ یہ ”انصاری اوی“ ہیں۔ ”ذوالشہادتین“ کے لقب سے معروف ہیں۔ جنگ بدر اور مابعد کے غزوات میں حاضر ہوئے۔ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے۔ جب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو انہوں نے اپنی تلوار سونت لی اور مقاتلہ کیا یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے۔ آپ سے ان کے بیٹے عبداللہ اور عمارہ اور جابر بن عبداللہ نے روایت کی ہیں۔ ”خزیمہ“ بصیغہ تصغیر ہے، یعنی خانے معجمہ کے ضمہ اور زائے معجمہ کے فتح کے ساتھ ہے ”عمارہ“ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ نے ”الاکمال“ میں ابو خزیمہ کا نام ذکر نہیں کیا البتہ خزیمہ کے بیٹے عمارہ بن خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حالات فصل صحابہ رضی اللہ عنہم میں ذکر کیا اور کہا ہے کہ یہ اپنے والد وغیرہ سے روایت کرتے ہیں عمارہ کے صحابیت اصحاب صلاح کو تردد ہے اور بظاہر یہاں ”خزیمہ“ سے مراد عمارہ ہیں۔

تشریح: قوله: سال الله رضوانه والجنة واستغفاه برحمة من النار: ایک روایت میں ”استغفاره“ ہے اور حصن

میں ”استغفاه“ کا لفظ ہے۔

”رضوانہ“ راء کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ دنیا اور آخرت کی رضامندی اور خوشنودی مراد ہے۔

”استغفا“ اس کا عطف سأل پر ہے ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کو استغفادہ روایت کیا گیا ہے تو پھر اس کا عطف الفوانہ پر ہوگا۔

”برحمتہ“ یعنی اللہ کی رحمت کے سبب سے نہ کہ اپنے ذاتی کسب سے۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ تلبیہ سے فراغت کے بعد نبی ﷺ پر درود بھیجنا مستحب ہے اور یہ آہستہ آواز سے پڑھے اور اللہ سے اس کی خوشنودی اور جنت کا سوال کرے اور اس کے ساتھ جنم سے پناہ مانگے۔ اور اپنے لیے اور اپنے ساتھ جس کیلئے چاہے دعاء کرے جو چاہیے اور مستحب ہے کہ ہر مرتبہ تلبیہ تین بار تکرار کے ساتھ پڑھے،

اور پے در پے پڑھے درمیان میں کوئی کلام نہ کرے۔ اور اگر درمیان میں سلام کا جواب دیا تو جائز ہے۔ لیکن دوسرے کیلئے مکروہ ہے کہ اس حالت میں اس کو سلام کرے، اور جب کوئی چیز دیکھے جو اس کو اچھی لگے تو ”لبیک ان العیش عیش الاخرة“ کہے۔ ایک بار تلبیہ کہنا ہمارے نزدیک شرط ہے اور ایک سے زائد سنت ہے یہاں تک کہ ترک پر گنہگار ہوگا۔

تخریج: ”رواہ الشافعی“ اس کو دارقطنی نے بھی روایت کیا ہے ابن ہمام کے قول کے مطابق دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ تلبیہ کے بعد اپنے اوپر دو بھیجتے تھے اور باقی کی طرح جمہور نے اس کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ حدیث فضائل کی احادیث میں سے ہے اور مستحب یہ ہے کہ دو رو کو تلبیہ کی نسبت پست آواز سے پڑھے تاکہ مرتبہ میں فرق ظاہر ہو۔

الفصل الثالث:

آپ ﷺ کا حج کے لیے اعلان کرنا

۲۵۵۳: وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمَّا أَرَادَ الْحَجَّ أَذَّنَ فِي النَّاسِ فَاجْتَمَعُوا فَلَمَّا أَتَى الْبَيْدَاءَ

أَحْرَمَ۔ (رواہ البخاری)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۸۴۳/۲ حدیث رقم (۲۲-۱۱۸۵)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے جب حج کا ارادہ کیا تو لوگوں میں اعلان کروایا۔ پس لوگ جمع ہوئے اور میدان بیداء میں آئے اور احرام باندھا۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اذن فی الناس: اللہ کے اس ارشاد کی بناء پر: ﴿هُوَ أَذَّنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ [الحج: ۲۷] یعنی آپ ﷺ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ میں حج کا ارادہ کر رہا ہوں۔ یہ ابن الملک نے کہا ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے منادی کا حکم دیا کہ وہ اعلان کرے کہ آپ ﷺ حج کا ارادہ رکھتے ہیں جیسا کہ عنقریب حضرت جابر کی بھی حدیث میں آنے والا ہے۔ ”فاجتمعوا“ یعنی بہت سارے لوگ مدینہ میں جمع ہو گئے۔

قوله: فلما اتى البیداء احرم: ”البیداء“ اصل میں چٹیل میدان کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد ایک مخصوص جگہ کا نام ہے جو ذوالحلیفہ کے پاس ہے۔

”احرم“ یعنی احرام مکرر باندھا یا اس کا اظہار کیا اور یہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ نے ابتداء ذوالحلیفہ ہی میں احرام کیلئے دو رکعت نماز پڑھ کر احرام باندھا تھا۔

ابوداؤد کی روایت میں ہے عن انس انه عليه الصلاة والسلام صلى الظهر ثم ركب راحلته فلما علا على جبل البیداء اهل “کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھی پھر سواری پر سوار ہوئے اور جب بیداء پہاڑ پر چڑھے تو احرام باندھا۔ اور صحیحین میں ابن عمر سے روایت ہے: ما اهل الا عند المسجد یعنی مسجد ذوالحلیفہ کے پاس سے احرام باندھا۔

اور ایک روایت میں ہے: ما اهل الا عند المسجد حين قام به بغيره اور دوسری روایت میں ہے حين وضع رجله في الغرز واستوت به راحلته فانما اهل عند مسجد ذی الحلیفہ۔ کہ آپ ﷺ نے احرام نہیں باندھا مگر جب آپ نے رکاب میں پاؤں رکھا اور سواری پر بیٹھ کر سواری سیدھی ہوگی تو آپ نے مسجد ذوالحلیفہ سے احرام باندھا۔ اور ابوداؤد اور ترمذی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جب آپ نے حج کا ارادہ کیا تو لوگوں میں اعلان کرایا تو لوگ جمع ہو گئے جب بیداء مقام پر پہنچے تو آپ نے احرام باندھا۔

مشرکوں کا تلبیہ پڑھنا

۲۵۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ الْمُشْرِكُونَ يَقُولُونَ لَيْسَ لَكَ شَرِيكَ لَكَ فَيَقُولُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَيُكَلِّمُ قَدِ الْقِدِّ الْأَشْرِيكَ هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ يَقُولُونَ هَذَا وَهُمْ يَطُوفُونَ بِالْبَيْتِ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۴۳/۲ حديث رقم (۲۲ - ۱۱۸۵)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مشرک کہتے تھے ہم تیری خدمت میں حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ پس نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ تم پر افسوس ہے۔ بس اتنا ہی کہو (اس سے آگے نہ کہو لیکن وہ پھر بھی آگے یہ الفاظ کہتے تھے: پس معنی میں اتنا ہی کہو۔ اس سے زیادہ نہ کہو۔ مگر وہ مشرک اس سے زیادہ کہتے تھے مگر وہ بس شریک کہ ملک تیرے لیے ہے اور تو اس کا مالک کا یعنی بت کا اور مشرک کہتے تھے اور وہ شریک یعنی بت تیرا مالک نہیں ہے ان کلمات کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے کہتے تھے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وَيُكَلِّمُ قَدِ الْقِدِّ هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ يَقُولُونَ هَذَا: دونوں میں وال کے سکون کے ساتھ بھی ہے اور کسرہ مع تنوین بھی درس ہے۔ اسی کفا کہہ ہذا انکلام: مطلب ہے کہ تمہارے لیے یہ بات کافی ہے۔

قوله: الا شريكاً هو لك تملكه وما ملك: الا شريكاً“ اس میں ظاہر تو یہ ہے کہ یہ مرفوع ہے محل سے بدل ہونے کی سے جیسا کہ کلمہ التوحيد میں ہے تو سفلی کلمہ میں سفلی لغت اختیار کی گئی جیسا کہ عالی کلمہ میں لغت عال اختیار کی گئی۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ مشرکین کہتے تھے ”لیس لك شريك الا شريكاً هو لك تملكه وما ملك“۔ جب ان کی بات لا شريك لك تک پہنچ جاتی تو رسول اللہ ﷺ فرماتے بس اسی پر اکتفاء کرو اور اس سے مابعد کی طرف تجاوز نہ کرو۔ ”وما ملک“ میں ”ما“ نافیہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ موصولہ ہے۔

قوله: يقولون هذا: یہ ابن عباس کا قول ہے۔

بَابُ قِصَّةِ حَجَّةِ الْوَدَاعِ

حجۃ الوداع کے واقعہ کا بیان

الفصل الاول:

حجۃ الوداع کا ذکر

۲۵۵۵: عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَكَتَ بِالْمَدِينَةِ تِسْعَ سِنِينَ لَمْ يَحُجَّ ثُمَّ أَذَّنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ فِي الْعَاشِرَةِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَاجٌّ فَقَدِمَ الْمَدِينَةَ بَشَرٌ كَثِيرٌ فَخَرَجْنَا مَعَهُ حَتَّى إِذَا آتَيْنَا الْحَلِيفَةَ فَوَلَدَتْ أَسْمَاءُ بِنْتُ عَمَيْسٍ مُحَمَّدَ بْنَ أَبِي بَكْرٍ فَأَرْسَلَتْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَيْفَ أَصْنَعُ قَالَ اغْتَسِلِي وَاسْتَنْفِرِي بِتَوْبٍ وَأَحْرِمِي فَصَلِّي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ رَكَبَ

الْقُصْوَاءَ حَتَّى إِذَا اسْتَوَتْ بِهِ نَاقَتُهُ عَلَى الْبَيْدَاءِ أَهْلًا بِالتَّوْحِيدِ لَيْبِكَ اللَّهُمَّ لَيْبِكَ لَا شَرِيكَ لَكَ
لَيْبِكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ قَالَ جَابِرٌ لَسْنَا نَرَى إِلَّا الْحَجَّ لَسْنَا نَعْرِفُ الْعُمْرَةَ
حَتَّى إِذَا آتَيْنَا الْبَيْتَ مَعَهُ اسْتَلَمَ الرُّكْنَ فَطَافَ سَبْعًا فَرَمَلَ ثَلَاثًا وَمَشَى أَرْبَعًا ثُمَّ تَقَدَّمَ إِلَى مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ
فَقَرَأَ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى فَصَلُّوا رَكَعَتَيْنِ فَجَعَلَ الْمَقَامَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْبَيْتِ وَفِي رِوَايَةٍ أَنَّهُ قَرَأَ
فِي الرَّكَعَتَيْنِ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ وَقُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ثُمَّ رَجَعَ إِلَى الرُّكْنِ فَاسْتَلَمَهُ ثُمَّ خَرَجَ مِنَ الْبَابِ إِلَى
الصَّفَا فَلَمَّا دَنَا مِنَ الصَّفَا قَرَأَ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ أَيْدًا بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ فَبَدَأَ بِالصَّفَا فَرَفَعِي
عَلَيْهِ حَتَّى رَأَى الْبَيْتَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَوَحَّدَ اللَّهَ وَكَثَّرَهُ وَقَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ
الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ أَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَ
حْزَابَ وَحْدَهُ ثُمَّ دَعَا بَيْنَ ذَلِكَ قَالَ مِثْلَ هَذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ نَزَلَ وَمَشَى إِلَى الْمَرْوَةَ حَتَّى انْصَبَتْ
قَدَمَاهُ فِي بَطْنِ الْوَادِي ثُمَّ سَعَى حَتَّى إِذَا صَعِدْتَ مَشَى حَتَّى آتَى الْمَرْوَةَ فَفَعَلَ عَلَى الْمَرْوَةَ كَمَا فَعَلَ
عَلَى الصَّفَا حَتَّى إِذَا كَانَ آخِرُ طَوَافٍ عَلَى الْمَرْوَةَ نَادَى وَهُوَ عَلَى الْمَرْوَةَ وَالنَّاسُ تَحْتَهُ فَقَالَ لَوْ آتَى
اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمْ اسْقِ الْهُدْيَ وَجَعَلْتُهَا عُمْرَةً فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ لَيْسَ مَعَهُ هَدْيٌ
فَلْيَحِلْ وَلْيُجْعَلْهَا عُمْرَةً فَفَقَامَ سَرَّاقَةُ بْنُ مَالِكِ بْنِ جُعْشَمٍ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِيغَامِنَا هَذَا أَمْ لَا بَدِ فَشَبَّكَ
رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَصَابِعَهُ وَاحِدَةً فِي الْأُخْرَى وَقَالَ دَخَلَتِ الْعُمْرَةَ فِي الْحَجِّ مَرَّتَيْنِ لَا بَلَّ لَا بَلَّ لَا بَدِ أَبَدِ
وَقَدِمَ عَلَيَّ مِنَ الْيَمَنِ بِيَدِنِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ لَهُ مَاذَا قُلْتَ حِينَ فَرَضْتَ الْحَجَّ قَالَ قُلْتُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَهْلُ
بِمَا أَهْلٌ بِهِ رَسُولُكَ قَالَ فَإِنَّ مَعِيَ الْهُدْيَ فَلَا تَحِلُّ قَالَ فَكَانَ جَمَاعَةٌ الْهُدْيِ الَّذِي قَدِمَ بِهِ عَلَيَّ مِنَ
الْيَمَنِ وَالَّذِي آتَى بِهِ النَّبِيُّ ﷺ مِائَةً قَالَ فَحَلَّ النَّاسُ كُلَّهُمْ وَقَصَرُوا إِلَّا النَّبِيُّ ﷺ وَمَنْ كَانَ مَعَهُ
هُدْيٌ فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى مَنَى فَاهْتَلَوْا بِالْحَجِّ وَرَكِبَ النَّبِيُّ ﷺ فَصَلَّى بِهَا الظُّهْرَ
وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْمِشَاءَ وَالْفَجْرَ ثُمَّ مَكَتَ قَلِيلًا حَتَّى طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَأَمَرَ بِقَبْعَةٍ مِنْ شَعْرِ تَضْرِبُ
لَهُ بِنَمِرَةَ فَسَارَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَلَا تَشْكُ فَرِيشُ إِلَّا أَنَّهُ وَافَقَ عِنْدَ الْمُشْعَرِ الْحَرَامِ كَمَا كَانَتْ
فَرِيشُ تَضَعُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَاجْتَمَعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ حَتَّى آتَى عِرْقَةَ فَوَجَدَ الْقَبْعَةَ قَدْ ضَرَبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ
فَنَزَلَ بِهَا حَتَّى إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقُصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ فَأَتَى بَطْنَ الْوَادِي فَخَطَبَ النَّاسَ وَقَالَ إِنَّ
دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحَرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا الْأَكْلُ شَيْءٌ مِنْ
أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوعٌ وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعَةٌ وَإِنَّ أَوَّلَ دِمٍ أَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ
رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ وَكَانَ مُسْتَرْضِعًا فِي بَيْتِي سَعْدٍ فَفَتَلَهُ هَذِيلٌ وَرَبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ وَأَوَّلُ رَبَا أَضَعُ

مِنْ رِبَانَا رَبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَإِنَّهُ مَوْضُوعُ كُلِّهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ آخِذٌ تَمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللَّهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللَّهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يُؤْطِينَ فُرُوشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُنَّ فَإِنْ فَعَلْنَ ذَلِكَ فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبْرَحٍ وَهِنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَصْلُوهَا بَعْدَهُ إِنْ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ كِتَابُ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَسْتَلُونَ عَنِّي فَمَا أَنْتُمْ قَائِلُونَ قَالُوا نَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَغْتَ وَأَدَيْتَ وَنَصَحْتَ فَقَالَ يَا صَبِيحَةَ السَّبَّابَةِ يَرَفَعُهَا إِلَى السَّمَاءِ وَيُنْكِتُهَا إِلَى النَّاسِ اللَّهُمَّ اشْهَدِ اللَّهُمَّ اشْهَدِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ أَذِنَ لِإِلَّهِ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى العَصْرَ وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئًا ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى آتَى الْمُؤَقَفَ فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ الْقُصْوَاءِ إِلَى الصَّخْرَاتِ وَجَعَلَ حَبْلَ الْمَشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيلًا حَتَّى غَابَ الْقُرْصُ وَأَزْدَفَ أُسَامَةَ وَذَفَعَ حَتَّى آتَى الْمُرْدَلِفَةَ فَصَلَّى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَرَأْفَاتَيْنِ وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئًا ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتَّى طَلَعَ الْفَجْرُ فَصَلَّى الْفَجْرَ حِينَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ بِأَذَانٍ وَرَأْفَاتٍ ثُمَّ رَكِبَ الْقُصْوَاءَ حَتَّى آتَى الْمُشَعَرَ الْحَرَامَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَدَعَاهُ وَكَبَّرَهُ وَهَلَّلَهُ وَوَحَّدَهُ فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتَّى أَسْفَرَ جِدًّا فَذَفَعَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَأَزْدَفَ الْفُضْلَ بْنَ عَبَّاسٍ حَتَّى آتَى بَطْنَ مُحَسِّرٍ فَحَرَّكَ قَلِيلًا ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيقَ الْوُسْطَى الَّتِي تَخْرُجُ عَلَى الْجُمْرَةِ الْكُبْرَى حَتَّى آتَى الْجُمْرَةَ الَّتِي عِنْدَ الشَّجَرَةِ فَرَمَاهَا بِسَبْعِ حَصِيَّاتٍ يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ مِثْلَ حَصَى الْخَذْفِ رَمَى مِنْ بَطْنِ الْوَادِي ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَنْحَرِ فَتَحَرَ ثَلَاثًا وَسِتِّينَ بَدَنَةً بِيَدِهِ ثُمَّ أَعْطَى عَلِيًّا فَتَحَرَ مَا عَبَّرَ وَأَشْرَكَهُ فِي هَدْيِهِ ثُمَّ أَمَرَ مِنْ كُلِّ بَدَنَةٍ بِبَضْعَةٍ فَجَعَلَتْ فِي قَدْرِ فَطَبَخَتْ فَأَكَلَا مِنْ لَحْمِهَا وَشَرِبَا مِنْ مَرَقِهَا ثُمَّ رَكِبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَقْبَضَ إِلَى الْبَيْتِ فَصَلَّى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ فَآتَى عَلِيَّ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَسْقُونَ عَلِيٌّ زَمَزَمَ فَقَالَ أَنْزِعُوا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَلَوْلَا أَنْ يُغْلِبَكُمْ النَّاسُ عَلَيَّ سِقَاتِكُمْ لَنَزَعْتُ مَعَكُمْ فَنَا وَلَوْهُ دَلْوًا فَشَرِبَ مِنْهُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۸۶/۲ حديث رقم (۱۴۷-۱۲۱۸)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ مدینہ میں نو برس ٹھہرے رہے حج نہیں کیا لیکن عمرہ کیا جیسا کہ گزرا پھر لوگوں کو دسویں سال حضور ﷺ کے حکم سے خبر دی گئی کہ آپ ﷺ حج کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پس مدینہ میں بہت زیادہ آدمی آئے پس ہم حضور ﷺ کے ساتھ ظہر و عصر کے مابین نکلے یعنی جبکہ پانچ دن ذیقعدہ میں سے باقی رہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ ہم ذوالحلیفہ میں پہنچے۔ پس اسماء بنت عمیس نے محمد بن ابی بکر کو جنم دیا تو اسماء رضی اللہ عنہا نے کسی کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا یعنی کہ میں احرام کے بارے میں کیا کروں؟ یعنی احرام باندھوں یا نہیں اور باندھوں تو کیونکر باندھوں؟ فرمایا غسل کرو اور کپڑے کی لنگوٹ اور احرام باندھو۔ پس نبی کریم ﷺ نے مسجد ذی الحلیفہ میں نماز پڑھی اور پھر اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہوئے جو کہ حضور ﷺ کی اونٹنی کا نام ہے۔ یہاں تک کہ جب میدان بیداء پر حضور ﷺ کی اونٹنی کھڑی ہوئی۔ تو آپ ﷺ نے باواز بلند تلبیہ پڑھا یعنی اے الہی! میں تیری خدمت میں حاضر ہوں اے

الہی میں تیری خدمت میں حاضر ہوں تیری خدمت میں حاضر ہوں تیرے لیے کوئی شریک نہیں ہے میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ تحقیق نعمت، تعریف و بادشاہت تیرے ہی لئے ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہم اس سے پہلے حج کی نیت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ہم (حج کے مہینوں میں) عمرے کو جانتے تھے یہاں تک کہ جب ہم خانہ کعبہ کے نزدیک آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کو بوسہ دیا۔ یعنی اس پر ہاتھ رکھا اور بوسہ دیا پھر تین بار جلدی اور اکڑ کر خانہ کعبہ کے گرد طواف کیا اور چار بار آہستہ پھر مقام ابراہیم کے پاس تشریف لائے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا تم مقام ابراہیم کو یعنی اس کے حوالی کو جائے نماز بناؤ۔ پھر مقام ابراہیم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے درمیان اور خانہ کعبہ کے درمیان شمار کیا اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتوں میں قل ھو اللہ احد اور قل یا ایہا الکافرون پڑھی۔ پھر حجر اسود کی طرف لوٹے پس اس کو بوسہ دیا پھر مسجد کے دروازے سے نکلے یعنی باب الصفا سے صفا پہاڑ کی طرف نکلے۔ پس جب صفا پہاڑ کے قریب ہوئے تو یہ آیت تلاوت فرمائی۔ تحقیق صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ یعنی اللہ کے دین کی نشانیوں میں سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں شروع کرتا ہوں اس چیز کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ نے شروع کیا اس چیز کے ساتھ جیسے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ذکر صفا کا کیا اور پھر مروہ کا کیا۔ اس طرح میں بھی پہلے صفا پر چڑھتا ہوں اور پھر مروہ پر چڑھوں گا۔ پس صفا کے ساتھ شروع کیا پس اس پر چڑھے یہاں تک کہ خانہ کعبہ کو دیکھا پھر بیت اللہ کے سامنے ہوئے پس پھر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کی۔ یعنی لا الہ الا اللہ کہا اور اس کی بڑائی بیان کی یعنی اللہ اکبر کہا اور کہا کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے کوئی معبود نہیں مگر اللہ ایک ہے اس نے اپنا وعدہ پورا کیا یعنی اسلام کا بول بالا کرنے کا وعدہ کیا اور بندے کی مدد کی۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کافروں کے گروہ کو شکست دی۔ تنہا یعنی خندق کی لڑائی میں پھر اس کے درمیان دعا کی۔ اس طرح تین بار کہا۔ یعنی ذکر کیا اور دعا کی اور پھر ذکر کیا اور دعا کی اس طرح تین مرتبہ کیا اور صفا سے اترے اور مروہ پہاڑ کی طرف چلے۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک نشیبی میدان کی طرف پہنچے یعنی میدان کی بلندی سے پستی کی طرف آئے پھر دوڑے یہاں تک کہ جب چڑھنے لگے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں قدم نشیبی سے بلندی مروہ پر چڑھنے لگے۔ آہستہ چلے یعنی دوڑنا بند کر دیا یہاں تک کہ مروہ پر آئے پھر مروہ پر بھی ایسا ہی کیا جو صفا پر کیا تھا۔ یہاں تک جب آخری چکر مروہ پر ہوا۔ تو پکارا اس حالت میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مروہ پر تھے اور لوگ پہاڑ کے نیچے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر میں اپنے معاملے کے بارے میں پہلے جانتا ہوتا جو کہ میں نے بعد میں جانا تو میں اپنے ساتھ ہدی نہ لاتا اور میں حج کو عمرہ بنا دیتا۔ پس جو شخص تم میں سے ایسا ہو کہ اس کے پاس ہدی نہ ہو پس چاہیے کہ حلال ہو جائے یعنی حج کے احرام سے باہر ہو جائے اور حج کو عمرہ بنا ڈالے۔ پس سراقہ بن مالک بن جشم کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا اسی سال ہمارے لیے ہے یا یہ حکم ہمیشہ ہمارے لیے ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالیں اور فرمایا کہ عمرہ حج میں داخل ہو گیا ہے۔ دو مرتبہ فرمایا یعنی یہ حکم خاص اسی برس میں نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے۔ یعنی حج کے مہینوں ہمیشہ کے لیے عمرہ کرنا جائز ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے اکثر اونٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لے کر آئے۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن کے حاکم بن کر گئے تھے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا کیا تم پر احرام باندھتے وقت حج لازم تھا؟

جب تو نے حج کی نیت کی تھی تو کیا کہا تھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا اے الہی میں احرام باندھتا ہوں ابی چیز کے ساتھ کہ جس کے ساتھ تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میرے ساتھ ہدی ہے میں احرام سے نکل نہیں سکتا۔ یعنی جب تم نے نیت کی ہے۔ تو میں حج و عمرے کا احرام باندھے ہوئے ہوں اور میرے ساتھ ہدی احرام سے میں نہیں نکل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ عمرے اور حج سے فارغ نہ ہو جاؤں۔ پس تم بھی احرام سے نہ نکلو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا پس یہ تمام اونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے لائے تھے اور وہ اونٹ جن کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے ان کی تعداد سو (۱۰۰) تھی تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا پس سب لوگ حلال ہوئے اور اپنے بال کتروائے یعنی جن کے ساتھ ہدی تھی اور وہ عمرے سے فارغ ہونے کے بعد عمرے کے احرام سے نکل آئے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ لوگ کہ جن کے ساتھ ہدی تھی وہ حلال نہ ہوئے پس جب کہ ترویہ کا دن آیا یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ تو منیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ فرمایا پس صحابہ رضی اللہ عنہم نے حج کا احرام باندھا۔ یعنی وہ لوگ جو عمرے کے احرام سے نکل آئے تھے اپنے عمرے سے فارغ ہونے کے بعد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے یعنی جب آفتاب طلوع ہوا اور منیٰ میں پہنچے پس منیٰ میں نماز پڑھی۔ یعنی مسجد خیف میں ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء اور فجر تک ٹھہرے رہے یعنی نماز فجر ادا کرنے کے بعد تھوڑی دیر ٹھہرے رہے یہاں تک سورج نکل آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیمے لگانے کا حکم کیا جو بالوں کا بنا ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وادیٰ نمرہ میں خیمہ کھڑا کیا جائے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ سے عرفات کی طرف چلے اور قریش گمان نہیں کرتے تھے مگر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لیے مشعر حرام کے پاس ٹھہرے ہوئے جیسے کہ قریش زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ سے گزرے یہاں تک کہ میدان عرفات میں آئے پس خیمہ جو کہ وادیٰ نمرہ میں کھڑا کیا گیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اترے اور اس میں ٹھہرے یہاں تک کہ جب دو پہر ڈھلی۔ قصوا کو لانے کا حکم کیا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کا نام تھا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زین کسی گئی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار ہو کر وادیٰ نمرہ میں تشریف لائے پھر لوگوں کو خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا تمہارے خون اور تمہارے مال یعنی آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ کرو اور کسی کا مال چوری وغنا بازی سے نہ کھاؤ تمہارے اس دن یعنی عرفہ کی حرمت کی طرح اور تمہارے اس مہینے یعنی ذی الحجہ کی حرمت کی طرح اور تمہارے اس شہر یعنی مکہ کی حرمت کی طرح تم پر حرام قرار دیئے ہیں یعنی جسے تم حرام جانتے ہو کسی کا مال لینے سے اور اس دن میں خون کرنے سے اور اس مہینے میں اور اس شہر میں۔ اس طرح سے ہمیشہ اور ہر جگہ خون کرنا اور ناحق مال لینا۔ آپس میں حرام ہے خبردار امر جاہلیت کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے رکھی گئی ہے اور پست و پامال ہے یعنی باطل و موقوف ہے یعنی جو کچھ کسی نے کہا اسلام سے پہلے میں نے معاف کر دیا اور جو جاہلیت کی رسمیں تھیں موقوف کر دیں اور جاہلیت کے خون موقوف کر دیئے یعنی نہ اس میں قصاص ہے اور نہ دیت اور نہ کفارہ اور تحقیق سب سے پہلا خون میں اپنے خونوں میں سے معاف کرتا ہوں وہ خون ابن ربیعہ بن حارث کا ہے اور وہ بنی سعد کے ہاں دودھ پیتا تھا۔ اس کو ہذیل نے قتل کیا تھا اور جاہلیت کے سود کو موقوف کیا گیا اور سب سے پہلا سود اپنے سودوں میں حضرت عباس بن عبد المطلب کا ہے تحقیق وہ بالکل موقوف کر دیا گیا۔ پھر عورتوں کے حق کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ پس تحقیق تم نے ان کو اللہ کی امان کے ساتھ لیا۔ یعنی اس کے عہد کے ساتھ لیا ہے ان کے حقوق کی رعایت میں اور تم نے ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے حکم کے ساتھ حلال کیا۔ فانکحوا ہے اور تمہارا ان پر حق ہے کہ وہ تمہارے بچھونوں پر کسی ایسے

شخص کو نہ آنے دیں کہ تم جس کو ناپسند سمجھتے ہو۔ یعنی تمہاری مرضی کے بغیر کسی کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ پس اگر یہ کام کریں یعنی آنے کی اجازت دیں پس ان کو سختی کے بغیر مارو اور ان کا حق تم پر بھی ان کی روزی یعنی کھانا پینا اور اسی کے حکم میں داخل ہے اپنے مکان اور ان کا کپڑا اپنے وسعت کے مطابق دو اور تحقیق میں نے تم میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ تم ہرگز گمراہ نہیں ہوں گے جب تک اس کو مضبوط سے تھامے رکھو گے اور اس پر عمل کرتے رہو گے۔ اگر تم چنگل ماروں گے اس چیز کے ساتھ جو کتاب اللہ میں ہے اور تم سے میرے بارے میں دین کے احکامات کو پہنچانے اور نہ پہنچانے سے متعلق پوچھا جائے گا۔ پس تم کیا جواب دو گے؟ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دیں گے کہ تحقیق آپ نے پیغمبری پہنچادی اور آپ نے امانت ادا کر دی اور آپ نے خیر خواہی کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی انگلی کو آسمان کی طرف اٹھایا اور اس کو لوگوں کی طرف جھکایا اور تین مرتبہ فرمایا اے الہی گواہ رہ گواہ رہ۔ یعنی اپنے بندوں کے اقرار پر گواہ رہو پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی پھر تکبیر کہی پھر نماز پڑھی۔ پھر تکبیر کہی پھر عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کچھ نہیں پڑھا یعنی نہ سنت اور نہ نفل۔ پھر سوار ہوئے یہاں تک کہ میدان عرفات میں موقوف کی جگہ تشریف لائے۔ پس اپنی قصواء اونٹنی کا پیٹ پتھروں کی طرف کیا اور جبل مشافہ کو اپنے آگے کیا۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے اور قبیلے کے سامنے ہوئے پس مسلسل کھڑے رہے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوا اور زرودی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ آفتاب غائب ہوا اسامہ رضی اللہ عنہ کو پیچھے سوار کیا اور جلدی چلے یہاں تک کہ مزدلفہ میں آئے پھر اس میں ایک اذان اور دو تکبیروں کے ساتھ مغرب و عشاء کی نمازیں پڑھیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی نہ سنت اور نہ نفل پھر لیٹے رہے یہاں تک فجر طلوع ہوئی پھر فجر کی نماز پڑھی۔ اس وقت کہ ان کے واسطے فجر اذان اور تکبیر کے ساتھ ظاہر ہوئی پھر اونٹنی پڑ سوار ہوئے یہاں تک مشعر حرام پر آئے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور تکبیر کہی اور لا الہ الا اللہ کہا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کی۔ یعنی لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ..... پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل کھڑے رہے یہاں تک کہ صبح خوب روشن ہو گئی پھر آفتاب کے نکلنے سے پہلے چلے اور فضل بن عباس کو پیچھے سوار کیا اور وادی حمر میں پہنچے۔ پس سواری کو تھوڑی سی حرکت دی۔ پھر درمیان کے راستے میں سے جمرہ عقبہ کے پاس پہنچے یہاں تک کہ جمرہ کے پاس آئے جو کہ ایک درخت کے پاس ہے پس اس پر خذف کی کنکریوں کی طرح سات کنکریاں پھینکیں یعنی جو انگلیوں میں رکھ کر پھینکتے ہیں۔ ان کی مقدار کو بیان کرنا مقصود ہے وہ باقلا کے دانے کے برابر تھیں، ان کنکریوں میں سے ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں وادی کے اندر سے ماریں۔ پھر قربانی کی جگہ کی طرف لوٹ گئے جو کہ منیٰ میں ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ (۶۳) اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے، ماہی یعنی سینتیس حضرت علی نے ذبح کئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی ہدیٰ میں شریک کیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہراونٹ میں سے ایک ایک گوشت کا ٹکڑا لیا پھر یہ ٹکڑے ایک ہانڈی میں ڈالے گئے پس ٹکڑے پکائے گئے پس دونوں صاحبوں نے اس قربانی کے گوشت میں سے کھایا اور دونوں نے اس کا شور بہ پیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور خانہ کعبہ کی طرف چلے اور طواف کیا پس مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی پھر عبدالمطلب کی اولاد کے پاس آئے یعنی اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کے پاس تشریف لائے کہ وہ زمزم کا پلا تے تھے اور اولاد عبدالمطلب سے زمزم کا پانی کھنچواتے تھے اس لیے کہ یہ بہت ثواب کی بات ہے اگر مجھے

خوف نہ ہوتا اس کا کہ لوگ تم پر غلبہ کریں گے۔ تمہارے پانی پلانے پر تو البتہ میں بھی تمہارے ساتھ پانی کھینچتا۔ یعنی خوف صرف اس بات کا ہے کہ لوگ مجھے کھینچتا ہوا دیکھ کر میری اتباع کریں گے۔ اور ازدحام (بھیر) کریں گے اور یہ منصب تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اگر اس کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی تمہارے ساتھ کھینچتا تو اولاد عبدالمطلب نے آپ ﷺ کو ڈول دیا حضور ﷺ نے اس سے پیا اور اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: مکث بالمدينة تسع سنين لم يحج..... فخر جنا معہ: ”مکث“ کاف کے ضمیر اور فتح دونوں کے ساتھ ہے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ حج سنہ ۶ھ میں فرض ہوا تھا۔ بعض نے ۸ھ اور بعض نے ۹ھ ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزرا۔

ثم اذن فی الناس: اور ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ اذن ہے یعنی ایک منادی نے آپ ﷺ کے حکم سے اعلان کیا۔

ان رسول اللہ ﷺ حاج: ایک نسخہ میں ”حاج“ کسرہ کے ساتھ ہے تو پھر یہ بھی مقولہ میں سے ہوگا۔

قولہ: ”فقدّم المرینة بشر كثير“ تاکہ اللہ کے اس ارشاد کا تحقق ہو: ﴿يَا تَوَكُّرًا﴾ کہ تیرے پاس آئیں گے پیدل:

﴿وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ﴾ اور ہر کزور اونٹ پر، ﴿يَأْتُونَ مِنْ كُلِّ فِجٍّ عَمِيقٍ﴾ [الحج: ۲۷] دور راستے سے: ﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ [

الحج: ۲۸] تاکہ دنیوی دینی اور اخروی فائدوں کو حاصل کر سکے اور ایک روایت میں ہے کہ ہر ایک تلاش کرے گا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرے اور ان جیسے عمل کرے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس حج میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ توے ہزار آدمی تھے اور بعض حضرات نے ایک لاکھ تیس ہزار تعداد

بتائی ہے، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حج ایک بوسیدہ کجاوہ پر کیا جس کی قیمت چار درہم کے مساوی تھی۔

قولہ: فخر جنا معہ حتی اذا اتينا..... واحرمی واستفقری بنوب:

حتى اذا اتينا ذا الحليفة: ”یہاں تک کہ جب ہم ذی الحلیفہ آئے“ تو آپ ﷺ نے وہاں قیام فرمایا اور عصر کی نماز دو رکعت

پڑھی اور وہی رات گزاری اور مغرب، عشاء اور فجر اور ظہر کی نماز بھی وہاں پڑھی، اور آپ ﷺ کی تمام بیویاں آپ ﷺ کے ساتھ تھی، تو

اس رات آپ ﷺ نے ان سب کے پاس چکر لگایا پھر دوسری مرتبہ احرام کیلئے غسل فرمایا جو پہلے بار جماع کیلئے غسل کے علاوہ تھا۔ اور

مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز ذوالحلیفہ میں پڑھی پھر اپنی اونٹنی کو منگوا لیا اور اس کے کان کے دائیں جانب کو زخمی کیا

اور اپنے ہاتھ سے اس کے خون کا صاف کیا جیسا کہ ایک روایت میں ہے یا انگلی سے صاف کیا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے۔ اور اس

کے گلے میں دو جوتوں کا علاوہ باندھا، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اونٹنی کے بارے میں حکم دیا تو اس کے کوهان کے دائیں

جانب کو کاٹا گیا، (یعنی اس کا اشعار کیا گیا) اور اس سے خون صاف کیا اور قلاوہ باندھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اونٹنی کے بارے میں

حکم دیا تو اس کے کان کو دائیں جانب سے کاٹا گیا اور پھر اس کا خون صاف کیا گیا اور دو جوتوں کا قلاوہ باندھا اور اشعار یعنی کان کو زخمی کرنا

قلاوہ سے مقدم ہونا جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے زیادہ اولیٰ ہے قلاوہ کے مقدم ہونے سے اگرچہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اشعار کا

تقدیم ضروری ہے اور ابن عمر کے فعل سے بھی یہی ثابت ہے۔

قولہ فولدت اسماء بنت عمیس محمد بن ابی بکر: ”عمیس“ تصغیر کے ساتھ ہے۔

قولہ: فصلی رسول اللہ ﷺ فی المسجد ثم رکب القصواء:

یعنی احرام کی دو رکعت نفل نماز مسجد ذوالحلیفہ میں پڑھی، ابن اجمی، نسک میں فرماتے ہیں کہ اگر میقات میں مسجد ہو تو مسجد ہی میں یہ

دورکت پڑھنا زیادہ اولیٰ ہے ہاں اگر کوئی شخص مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ پڑھ لے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں اور اگر بغیر نماز کے احرام باندھ لیا تو بھی جائز ہے نیز اوقات مکروہ میں یہ نماز نہ پڑھی جائے اور تحیۃ المسجد کی طرح فرض بھی اس نماز کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی تھی ابن قیم کہتے ہیں کہ آپ ﷺ سے ظہر کی نماز کے علاوہ احرام کیلئے دورکت نماز منقول نہیں ہے۔ اور ابن حجرؒ کی یہ بات بوسیدہ اور عجیب ہے کہ انہوں نے ابن قیم کا تعقب کرتے ہوئے کہا ہے کہ بات اس طرح نہیں ہے جیسا کہ ابن قیم کا زم ہے صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ والحلیفہ میں دورکت نماز پڑھتے تھے اور پھر جب مسجد والحلیفہ کے پاس سواری پر آپ بیٹھ جاتے اور سواری سیدھی ہو جاتی تو آپ ﷺ تلبیہ کہتے (اتہمی) اور اس کے کلام کا اعجاب مخفی نہیں ہے کیونکہ اس حدیث میں ان کے مدعی پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

”القصواء“ قاف کے فتح اور مد کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں قاف کے ضمہ اور قصر کے ساتھ ہے جو کہ خطا ہے جیسا کہ شرح مسلم میں ہے آپ ﷺ کی: یعنی قاف کا نام ہے۔

کہا گیا ہے کہ جس کے کان کٹے ہوئے ہو اسکو جرد کہتے ہیں اور جب وہ کٹا ہوا ایک چوتھائی تک پہنچے تو اسکو قصو کہتے ہیں اور اگر اس سے زیادہ ہو جائے تو اسکو عصب کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ قصواء اسکو کہتے ہیں جس کے کان کے اطراف کٹے ہوئے ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس اونٹنی کو اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے قصواء کہتے تھے۔

محمد بن ابراہیم تمیمی التابعی کہتے ہیں کہ قصواء اور جرد عاء دونوں رسول اللہ ﷺ کے ایک ہی اونٹنی کے نام تھے۔

قوله بحتی اذا استوت اهل بالتوحيد: ”اهل بالتوحيد“ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ احرام باندھا صرف حج کا آواز بلند کرتے ہوئے، اور اس بات میں تکلف کا ہونا مخفی نہیں ہے اور ابن حجر کی یہ بات بھی عجیب ہے کہ انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ آپ علیہ السلام کا حج، حج افراد تھا: اور ظاہر یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ آپ ﷺ نے توحید یعنی تلبیہ پر آواز بلند کی اور اس کا بیان لبیک اللهم لبیک الخ ہے اور اس میں امام ابوحنیفہ کی دلیل ہے کہ احرام کی نیت کے صحت کیلئے تلبیہ کا ملانا شرط ہے پس تلبیہ، تکبیر تحریمہ کے بمنزلہ ہے جو نماز کی ادائیگی میں نیت سے ملا ہوتا ہے اسی وجہ سے ہر ذکر اس کا قائم مقام ہے۔

قوله: لبیک اللهم لبیک: ”لبیک“ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مصدر ثنی ہے اور ثنیہ سے مراد تکبیر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: ﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَوَيْحِ الْمَلِكِ﴾ یعنی کئی بار۔ اور یہ لازم النصب اور اضافت ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا اور ناصب اس کا من غیر لفظ ہے تقریر یوں ہے اجبت اجابتك اجابة بعد اجابة الما لانهاية له گویا کہ یہ الب بالمكان سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی جگہ قیام کرے۔ تو اس سے اس کا معنی معلوم ہو سکتا ہے لہذا یہ مصدر ہے بحذف الذوائد۔

”لبیک“ کا معنی ہے دعوت کو قبول کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور اعلان کو قبول کرنا ہے اور اس کا جواب ہے جیسا کہ حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو کہا اے رب میں تو فارغ ہو گیا ہوں تو اللہ نے فرمایا ﴿أَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ ترجمہ: اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ (بیان القرآن) ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ یارب میری آواز کیسے پہنچے گی ان تک، تو اللہ نے فرمایا آپ اعلان کرے اور آواز پہنچانا میرا کام ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ کیا کہوں؟ تو اللہ نے فرمایا کہ ہوا کے لوگوں اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے پرانے گھر کا حج۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا تو آسمان وزمین کے درمیان تمام لوگوں نے اس کو سن لیا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ لوگ زمین کے آخری کنارے سے تلبیہ کہتے ہوئے آتے ہیں۔

حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے اور حاکم نے اس کی ایک اور طریق سے تخریج کی

ہے اور ان کے علاوہ نے الفاظ کی کمی زیادتی کے ساتھ اس کی تخریج کی ہے۔ اور ازرقی نے تاریخ مکہ میں عبداللہ بن سلام سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ لوگوں میں اعلان کر دے تو قدام علی المقام حتی اشرف علی ما تحته الحدیث اور مجاہد سے روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگوں اپنے رب کے اعلان کو قبول کر لو تو لوگوں نے کہا لیبیک اللہم لیبیک پس جس نے حج کیا تو یہ ان لوگوں میں سے ہے جن نے اس دن ابراہیم علیہ السلام کے اعلان کو قبول کیا تھا۔

قوله: ان الحمد والنعمه لك و الملك: صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے نہ کہ فتح کے ساتھ۔ ابن ہمام فرماتے ہیں یعنی عمدہ وجہ یہی ہے۔ ورنہ نفس جواز کے طور پر فتح بھی جائز ہے۔ کسرہ کی صورت میں ثناء میں استیناف ہوگا اور تلبیہ ذات کیلئے ہوگا اور فتح کی صورت میں یہ تلبیہ کیلئے علت ہوگا۔

یعنی میں حاضر ہوں کیوں کہ تعریف اور نعمت تیرے لیے ہے اور ملک اور حکمرانی تیرے لیے ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اجابت جس کی کوئی انتہاء نہیں اس کو ذات کے ساتھ معلق کرنا اس صفت کے اعتبار سے اولیٰ ہے۔ اگرچہ کسرہ کے ساتھ استیناف ثناء متعین نہیں ہے کیونکہ جائز ہے کہ وہ علت مستانفہ ہو۔ جیسا کہ تیرے اس قول میں ”علم ابنک العلم ان العلم نافعہ“ اور اللہ کے اس قول میں: ﴿ووصل علیہم ان صلاتک سکن لهم﴾ [التوبہ: ۱۰۳] یہ علم اصول میں علت کے مسلکوں میں ثابت ہے لیکن جب دونوں میں سے ایک جائز ہے تو اس کو اول پر حمل کیا جائے گا اس کے اولیٰ ہونے کی وجہ سے برخلاف فتح کے کیوں کہ اس میں صرف علت ہی کا احتمال ہے۔

قوله: ”لا شریک لك“ یعنی ان میں سے کوئی آپ کا شریک نہیں اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت جابر فرماتے ہیں ”اہل الناس بهذا الذی یهلون بہ“ اور رسول اللہ ﷺ نے اس میں سے کسی بات کو رد نہیں کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے تلبیہ کو لازم پکڑا۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے اس روایت کی طرف جس میں لوگوں کے تلبیہ ہی میں ذکر و ثناء کے زیادہ کرنے کا بیان ہے جیسا کہ شرح مسلم میں ہے۔

قوله: ”لسنا نعرف العمره“ یہ جملہ پہلے جملہ لسنا ننفرو الا الحج کی تاکید کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم اشہار الحج میں عمرہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے زمانہ جاہلیت کی عادت کے مطابق، کہ لیا م جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ لوگ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اور بعض نے اس کا یہ مطلب ذکر کیا ہے کہ ہم حج کے ساتھ عمرہ کو ملا کر کرنے کو نہیں جانتے تھے یا حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرنے کو نہیں جانتے تھے۔

بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ صحابہ آپ ﷺ کے ساتھ نکلے اور وہ حج کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے۔ تو آپ ﷺ نے ان کیلئے احرام کے اقسام اور طریقے بیان کیے اور ان کیلئے حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرنے کو جائز قرار دیا۔ اور فرمایا جو عمرہ کا احرام باندھنا چاہیے تو وہ عمرہ کا احرام باندھے اور جو حج کا احرام باندھنا چاہیے تو وہ حج کا احرام باندھے۔

قوله: حتی اذا اتینا البیت معہ: یعنی جب ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ بیت اللہ پہنچے یعنی پہلے ہم ذی طویٰ میں اترے اور رات کو وہیں قیام کیا اور پھر ۳ ذی الحجہ کو نہادھو کر شینا علیا کی طرف سے مکر مکرمہ میں داخل ہوئے اور پھر باب السلام کی جانب سے مسجد احرام میں آئے اور وہاں تحسیمۃ المسجد کی نماز نہیں پڑھی کیونکہ بیت اللہ کا طواف ہی وہاں کا تہیہ ہے پھر برار، آپ ﷺ مسلسل چلتے رہے یہاں تک کہ حجر اسود کو بوسہ دیا۔

”استلم الرکن“ رکن سے مراد حجر اسود ہے۔ اور استلام، السلام سے استعمال کے وزن پر ہے ”التحیۃ“ کے معنی میں ہے اور اہل یمن رکن کو الحجیہ کا نام دیتے ہیں کیونکہ لوگ اس کو سلام کے ساتھ تحمید کرتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ السلام، سین کے کسرہ کے ساتھ

سے ماخوذ ہے، پتھر کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا استلم الحجر جب اس کو لمس کرے اور بوسہ لے۔ یہاں استلام کا معنی ہے کہ اس پر پیشانی بھی رکھنا۔

”فرمل ثلاثاً“: رمل کہتے ہیں کندھے ہلاتے ہوئے دوڑنا اور تیز چلنا۔

یعنی تین بار سات چکروں میں اور چار میں اپنے ہیئت پر چلے اور ان تمام چکروں میں آپ ﷺ اضطباع کئے ہوئے تھے۔

قوله: ثم تقدم الى مقام ابراهيم..... فقراً..... قل يا ايها الكافرون ﴿﴾:

”ثم تقدم“ اور مسلم کے ایک تصحیح شدہ نسخہ میں ”نفذ“ نون، ناء اور ذال کے ساتھ ہے جو توجہ کے معنی میں ہے۔

”مقام ابراهيم“ میم کے فتح کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ۔

”واتخذوا“ خاء کے کسرہ کے ساتھ امر ہے اور فتح کے ساتھ بھی ہے اس صورت میں یہ خبر ہوگا۔

”مصلیٰ“ تنوین کے ساتھ ہے نمازِ طواف کی جگہ مراد ہے۔

اور پھر آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی اور ان دو رکعتوں میں قل هو الله احد اور قل يا ايها الكافرون پڑھی اور کی عبارت

سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ قل هو الله احد پہلے پڑھی اور قل يا ايها الكافرون بعد میں، اس لیے علماء نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ

یہاں عبارت میں واؤ مطلق جمع کیلئے ہے نہ کہ ترتیب کیلئے لہذا کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں صحیح مسلم اور شرح السنہ میں یہ

حدیث اسی طرح ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ کافرون سورہ اخلاص مقدم ہے جیسا کہ مصابیح کی روایت میں ہے۔ اور اس میں یہ

نکتہ ہو سکتا ہے کہ سورۃ اخلاص اللہ کی وحدانیت کے اثبات اور اظہار کیلئے ہے اور سورۃ کافرون شرک سے بیزاری کیلئے ہے اسی لیے

توحید کی عظمت اور اس کی اہمیت کی سب سے زیادہ ہونے کی بناء پر اس کو مقدم کیا اور قل يا ايها الكافرون کو مقدم کرنے میں نکتہ یہ ہے

کہ اس میں مجبودانِ باطلہ کی نفی کو اثبات واجب الوجود پر مقدم کیا ہے جیسا کہ کلمہ توحید میں ہے۔

پھر یہ جان لیجئے کہ مقام ابراہیم کی جگہ اور محل اب بھی وہی ہے جو آپ ﷺ کے زمانہ میں تھا صحیح قول کے مطابق اور جو سالم بن عبد

اللہ نے حضرت عبداللہ ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ مقام ابراہیم اور بیت اللہ کے درمیان چار ذراع کا فاصلہ تھا پھر جب لوگ زیادہ ہو گئے اور

جگہ تنگ ہو گئی تو حضرت عمر نے اس کو موجودہ جگہ تک موخر کر دیا تو یہ حدیث غریب ہے اور بعض ائمہ نے اسی کو لیا ہے۔ نووی فرماتے ہیں

کہ حدیث کے مذکورہ جملے کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد قل يا ايها الكافرون پڑھی اور دوسری رکعت میں

فاتحہ کے بعد قل هو الله احد پڑھی۔

اور بیہی نے صحیح سند کے ساتھ مسلم کی شرط پر جعفر بن محمد عن ابیہ عن جابر کی سند سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے بیت اللہ کا طواف

کیا اور رمل کیا حضور اسود سے تین بار، پھر دو رکعت نماز پڑھی اور ان میں قل يا ايها الكافرون اور قل هو الله احد پڑھی۔

قوله: ”ثم رجع الى الركن“: یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب طواف سے فارغ ہو گئے تو حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر

دونوں ہاتھ رکھے اور ان کو اپنے چہرے پر ملا اور یہ کہ آپ ﷺ نے اگر کو بوسہ دیا اور اس پر بوجہ کیا بلکہ یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ

ﷺ حجر اسود کی طرف لوٹنے کے بعد مزمر پڑ گئے اور اسے پیا اور اس سے اپنے سر پر پانی ڈالا، پھر لوٹے اور حجر اسود کو بوسہ دیا۔

”شعائر اللہ“ شعیرة کی جمع ہے ان علامات کو کہتے ہیں جو مقرر ہے ان اطاعات کیلئے جن کا حج میں حکم ہے جیسے وقوف عرفہ، رمی،

سعی، طواف۔

”ابداً بما بدأ اللہ بہ“: ”ابداً“ صیغہ منکلم کے ساتھ ہے۔ ترتیب ذکر کی کا امر شرعی میں اعتبار ہوتا ہے استجابی طور پر یا وجوبی

طور پر، اگرچہ آیت میں واو مطلق جمع کیلئے ہے۔ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نسائی میں اس حدیث میں صحیح سند کے ساتھ ابد او اصیغہ جمع کے ساتھ ثابت ہے۔ بہر صورت یہ سعی کے وجوب پر دلالت کرتا ہے نہ کہ رکنیت پر، بلکہ صحابہ اور ان کے علاوہ نے اس کو ظاہر آیت کی وجہ سے نقل کیا ہے۔

آیت کا سبب نزول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ ذکر کیا ہے کہ جب عروہ بن زبیر نے ان سے پوچھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی کیونکہ انصار صفا اور مردہ کے درمیان سعی میں حرج محسوس کرتے تھے یعنی اس کے گناہ ہونے سے ڈرتے تھے۔ تو انہوں نے نبی ﷺ سے پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

باقی آپ ﷺ کا قول جو امام شافعی وغیرہ نے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے اور حاکم نے مستدرک میں اور ابن سکین نے صحاح میں نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے سعی کی جگہ میں لوگوں کا سامنا کیا تو فرمایا: ”یا ایہا الناس اسعوا فان الله کتب علیکم السعی“ اے لوگو سعی کرو کہ اللہ نے تم پر سعی لازم کی ہے۔

تو یہ وجوب کا فائدہ دیتا ہے نہ کہ رکن ہونے کا اور اس کی سند متکلم فیہ ہے اگرچہ ابن عبدالبر وغیرہ نے اس کا جواب دیا ہے، حاصل یہ ہے کہ آیت اور حدیث دونوں کی دلالت ظنی ہے رکن یہ ہے کہ آیت اور حدیث دونوں کی دلالت ظنی ہے رکن ہونے کا فائدہ نہیں دیتا۔ ”فرقی“ قاف کے کسرہ کے ساتھ صد کے معنی میں ہے۔ ”قال“ اذا کا جواب ہے اور ایک تصحیح شدہ نسخہ میں فقال، فاء کے زیادہ کے ساتھ ہے اور جن نسخوں میں ”نادی وهو علی المروة والناس تحته فقال“ ہے تو اسکی کوئی اصل نہیں ہے۔

”علی المروة“ کان کے متعلق ہے۔ ”فاستقبل القبلة“ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لا کراس بات کو واضح کیا کہ بیت اللہ ہی قبلہ ہے اور اس بات پر تنبیہ کی کہ مقصود بالذات قبلہ کی طرف توجہ ہے نہ کہ خصوصی طور پر بیت اللہ کا دیکھنا، اور بیت اللہ اب بغیر او پر زیادہ چڑھے بھی نظر آتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ پیدل آدمی کے قد کے بقدر چڑھنے سے نظر آتا ہے۔

قولہ: ”لا اله الا الله“ یہ یا تو سابق کیلئے تفسیر ہے اور تکبیر اس کے معنی سے مستفاد ہے اور یا سابق کے علاوہ قول ہے یہ علامہ طبری کا قول ہے اور ظاہر یہی ہے کہ یہ دوسرا قول ہے اور گویا کہ یہ وحدہ کیلئے اجمال اور تفصیل ہے۔ ”وحدہ“ حال مؤکدہ ہے یعنی منفردا بالالوهیة یا متوحدا بالذات کی تاویل میں ہے۔

”لا شریک له“ فی الالوهیة، تو یہ تاکید ہوگا یا فی الصفات تو پھر تائیس ہوگا اور یہ زیادہ اولیٰ ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ ”وله الحمد“ یعنی اچھی تعریف اسی کیلئے دنیا و آخرت میں ثابت ہے نہ کہ اس کے غیر کیلئے اور امام شافعی نے ایک صحیح روایت میں یہ الفاظ ”یحییٰ ویمیت“ زائد ذکر کیے ہیں۔

”نصر عبدہ“ یعنی مقام اختصاص میں اپنے بندہ خاص کی زیر دست مدد کی اور واضح فتح نصیب کی۔ ”وهزم الاحزاب وحده“ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لشکر ہیں جو خندق کے دن رسول اللہ ﷺ کے خلاف جمع ہوئے تھے اور اللہ نے ان کو بغیر لڑائی کے شکست دی (اہتمی) اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد کفار کے وہ مختلف انواع ہوں جو شکست اور فرار کے ساتھ مغلوب ہوئے۔

قولہ: ثم دعا بین ذلك، قال مثل ذلك ثلاث مرات :

”ثم دعا.....“ یہاں لفظ ”ثم“ محض ترتیب کیلئے ہے نہ کہ تراخی کیلئے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ ماقبل میں جو لا اله الا الله کہا تھا اس کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اس کے اور متصور کے درمیان واضح

بعد ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ لفظ ثم دلالت کر رہا ہے کہ دعاء اس ذکر سے مؤخر تھی اور کلمہ بین کا تقاضہ ہے کہ دعاء ذکر کے درمیان میں ہو جیسا کہ علی کل شیء کے بعد دعاء کرے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے وهزم الاحزاب وحده کے بعد دعاء کی جس طرح چاہا پھر ذکر کر کے لوٹے پھر تیسری بار پھر لوٹے (اتہنی) جواب کی صحیح وجہ ظاہر نہیں ہو رہی پس ہم کہتے ہیں واللہ اعلم بالصواب کہ یہ قول ”قال مثل هذا ثلاث مرات“ جملہ حالیہ ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: ”ثم دعا بین ذلك، والحال انه قد قال ﷺ مثل هذا الذكر ثلاث مرات: یا ہم کہتے ہیں کہ بین بمعنی وصل اور فرقتہ کے آیا ہے یعنی دعا کی اس حال میں کہ ذکر سابق کو دعاء لاحق کے ساتھ ملانے والے تھے یا جدا کرنے والے تھے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی بار ذکر سے فارغ ہونے کے بعد اور تیسری بار شروع کرنے سے پہلے دعا کی۔

قوله: ثم نزل ومشی الی المروة..... کما فعل علی الصفا:

”حتی انصبت قدماہ“ انحدرت کے معنی میں ہے اور یہ مجاز ہے عرب کے اس قول سے حب الماء فانصب۔

”بطن الوادی“ مراد دوڑنے کی جگہ ہے اور یہ اصل میں پہاڑوں کے درمیان راستہ کو اور ٹیلہ کو کہا جاتا ہے جیسا کہ قاموس میں ہے یعنی پاؤں آسانی سے زمین کے پست حصہ میں پہنچے۔

”ثم سغی“ یعنی تیزی کے ساتھ دوڑے۔ ”ثم سغی“ مصابیح اور مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں اسی طرح ہے اور اصول مصحح میں یہ موجود نہیں ہے اور اس پر علامہ طیبی کا قول جو قاضی عیاض سے نقل کیا ہے وہ دلالت کر رہا ہے کہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک کلمہ سا قاطع ہے جس کا ہونا ضروری ہے اور وہ کلمہ ”رَمَلٌ“ ہے ”فی بطن الوادی“ کے بعد جیسا کہ مسلم کے علاوہ کی روایت میں ہے۔ اسی طرح ذکر کیا ہے حمیدی نے، اور موطأ میں رَمَلٌ کی جگہ سغی ہے۔ نووی فرماتے ہیں کہ یہ رمل کے معنی میں ہے۔ اور مسلم کے بعض نسخوں میں بھی موطأ کی طرح واقع ہے۔ ”ملا علی قاری فرماتے ہیں“ کہ رمل بمعنی سغی کے ہے نہ کہ سغی بمعنی رمل کے۔

”حتی اذا صعدتا“ عین کے کسرہ کے ساتھ ہے جیسا کہ تصحیح شدہ نسخوں میں ہے: ای ارتفعت قدماہ اور جس نسخے میں جمع متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے تو وہ تصحیف ہے اور ایک نسخہ میں اصعدنا ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اور مصابیح میں ”اذا صعدت قدماہ“ ہے۔

شارح مصابیح کہتے ہیں کہ ”ای اخذت قدماہ فی الصعود“ اور اصعدہ زمین میں جانے اور چڑھنے یا اترنے میں دوری کو کہتے ہیں (اتہنی) اور قاموس میں ہے ”صعد فی السلم کسمع، و صعد فی الجبل وعلیہ، تصعدا اور صعد فیہ نہیں سنا گیا ہے۔ اور اصعد فی الارض کا معنی ہے زمین میں چلنا۔ اور فی الوادی کا معنی ہے اترنا۔ اور علامہ طیبی کہتے ہیں کہ اصعاد مطلقاً ذهاب فی الارض کو کہتے ہیں۔ حدیث میں اس کا معنی ہے قدمین کا بطن وادی سے اونچی جگہ کی طرف اٹھ جانا کیونکہ یہ انصبت قدماہ کے مقابلہ میں ہے جس کا معنی ہے اترائی میں داخل ہوئے اور اس کے مطابق ہم کہتے ہیں کہ اصعدنا ہمزہ کے ساتھ والانسخر راجع ہے۔ واللہ اعلم۔

”کما فعل علی الصفا“ یعنی اوپر چڑھے استقبال بیت اللہ کیا؛ ذکر اور دعا کی۔

حدیث کے الفاظ سے اور اس کے ما قبل کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سوار ہو کر سعی نہیں کی اور یہ وجوب کا فائدہ دیتا ہے جبکہ عذر نہ ہو آپ ﷺ کے اس اشارہ کی وجہ سے ”خذو عی مناسککم“ باقی جو مسلم کی روایت میں آپ ﷺ کے سوار ہونے کا ذکر ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ تیرے قوم کا خیال ہے کہ سعی میں سواری سنت ہے، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ انہوں نے سچ بولا ہے اور جھوٹ بولا ہے: آپ ﷺ پر لوگوں نے نجوم کر لیا اور کہنے لگے کہ یہ محمد ﷺ ہیں یہ محمد ﷺ ہیں۔ یہاں تک کہ دشیرائیں

گھروں سے باہر نکل گئی اور لوگ آپ ﷺ کے سامنے نہیں چلتے تھے۔ جب لوگوں کا رش بڑھ گیا تو آپ ﷺ سوار ہو گئے اور پیدل چلنا اور سعی کرنا افضل ہے۔ تو یہ روایت جو ہم نے پہلے ذکر کی اس کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ اس کو اور مضبوط کر رہی ہے کیونکہ یہ حدیث معمول ہے آپ ﷺ کے عمرۃ القضاء کے سعی پر جیسا کہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے عمرہ القضاء میں سوار ہو کر طواف کیا تاکہ لوگ آپ ﷺ کی بات سن لیں اور آپ کی جگہ دیکھ لیں اور لوگوں کے ہاتھ آپ کو لمس نہ کرنے کیونکہ لوگ آپ ﷺ سے منع نہیں کر رہے تھے۔

قولہ: ”قال“ اذا کا جواب ہے اور ایک تصحیح شدہ نسخہ میں فقال، فاء کی زیادتی کے ساتھ ہے اور جن نسخوں میں ”نادی و هو علی المروۃ والناس تحته فقال“ ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

”لم اسق“ سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ”الهدی“: نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”الهدی“ دال کے سکون کے ساتھ ہے اور دال کے کسرہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ بھی ہے اور دال کے فتح اور یاء کی تخفیف کے ساتھ بھی ہے۔

”فلیحل“ حاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی حلال ہو جائے اور احرام سے نکل جائے۔

”وليجعلها“ واو مطلق جمع کیلئے ہے کیونکہ ”جعل“ خروج سے مقدم ہے کیونکہ جعل سے مراد فسخ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ حج کی نیت فسخ کر کے اس کے افعال منقطع کر دے اور احرام عمرہ کیلئے کر دے یا واو عطف تفسیری ہے۔

”لو انی استقبلت من امری.....“: یعنی اگر میری یہ رائے جو اس وقت ہے اگر شروع میں اور حج کیلئے نکلنے وقت بنتی تو میں ساتھ قربانی کا جانور نہ لاتا اور نہ ہی اس کے گلے میں قلابہ باندھتا اور نہ ہی اس کا اشعار کرتا۔

کیونکہ جب آدمی قربانی کا جانور ساتھ لیجائے تو وہ احرام سے نہیں نکلتا یہاں تک کہ اس کو ذبح کر دے اور اس کو یوم النحر سے پہلے ذبح نہیں کر سکتا تو اس کیلئے عمرہ کے ذریعے حج فسخ کرنا درست نہیں برخلاف اس شخص کے جو قربانی کا جانور ساتھ لے کر نہ جائے کہ اس کیلئے حج فسخ کرنا جائز ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ بات آپ ﷺ نے صحابہ کی دلجوئی کیلئے فرمائی تھی کہ ان کیلئے افضل وہی ہے جس کی طرف آپ ﷺ نے ان کو بلایا ہے کیونکہ صحابہ پر آپ ﷺ کی متابعت کو ترک کرنا گراں گزرا تھا۔ اور یا اس وجہ سے کہ ان پر آپ ﷺ کی بات گراں گزری کہ وہ ان دنوں میں عورتوں کے پاس جانے کو حج ادا کرنے سے پہلے مناسب نہیں سمجھتے تھے، جیسا کہ حضرت جابر کی حدیث میں منقول ہے کہ صحابہ نے کہا کہ ہم عرفہ جائیں گے اس حال میں کہ ہمارے مذاکیر سے منی ٹپک رہی ہوگی۔ اس حدیث سے تمتع کو افضل کہنے والوں نے استدلال کہا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بارے میں صریح ہے کہ آپ ﷺ تمتع نہ تھے۔

اس حدیث سے اور اس کے ساتھ ایک اور حدیث جس میں ہے ”من احرم لعمرة واهلای فلا یحل حتیٰ ینحر ہدیہ“ ”کہ جس نے عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کا جانور ساتھ لے کر گیا تو وہ احرام سے نہیں نکلے گا یہاں تک کہ قربانی کو ذبح کرے۔“ سے امام ابو یوسف اور امام احمد نے استدلال کیا ہے کہ حج تمتع کرنے والا جب جانور ساتھ لے کر جائے تو وہ عمرہ کے احرام سے حلال نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ یوم النحر کو اس ہدی یعنی قربانی کے جانور کو ذبح کر دے: لیکن امام شافعی اور مالک کہتے ہیں کہ محض افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد احرام سے باہر آنا جائز ہے۔ خواہ ہدی ساتھ لایا ہو یا ساتھ نہ ہو۔ اور انہوں نے استدلال کیا ہے حاجی کے احرام سے باہر آنے پر قیاس کرتے ہوئے اگر چہ اس نے ہدی کا نحر نہ کیا ہو۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ نص کے مقابلہ میں قیاس کرنا تمتع ہے۔ باقی اس روایت کا جو انہوں نے جواب دیا ہے کہ یہ روایت، مسلم کی روایت جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے جو حضرت جابر کی اس روایت کے بعد آ رہی

ہے سے مختصر کی گئی ہے اس میں ہے ”من كان معه هدى فليهلل بالحج والعمرة. ثم لا يحل حتى يحل منهما جميعاً“ تو یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ واضح کر رہا ہے کہ اس روایت میں حذف ہے اور وہ یہ ہے ومن احرم العمرة فليهلل بحج ولا يحل حتى ينحر هديه ”یعنی کہ یہ مستحب ہے کیونکہ یہ اتفاقی مقام ہے“ لیکن یہ تاویل اس وقت متعین ہوگی جب دونوں روایتوں کا مضمون اور راوی ایک ہو۔ اور یہ واضح طور پر محل نظر ہے۔

کیونکہ امر اصل میں وجوب کیلئے ہے اور وجوب سے ندب کی طرف بغیر کسی صارف کے نہیں پھیرا جاسکتا پھر ان کے قول ”ومن احرم بعمرة فليهلل بحج“ سے عمرہ کا فسخ کے ذریعے لازم آتا ہے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اور نووی کا قول ہے کہ حج کے احرام کو عمرہ کی طرف فسخ کرنے میں علماء کا اختلاف ہے اور اکثر اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور اس روایت کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ اس سال کے ساتھ خاص تھا کیونکہ مقصود ان کو زمانہ جاہلیت کے طریقوں سے پھیرنا تھا اور ان کے دلوں میں حج کے مہینوں میں عمرہ کے جواز کو بٹھانا تھا اور اس کی تائید اور روایت سے ہوتی ہے جو بلال بن حارث سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ حج کا فسخ کرنا ہمارے لیے خاص ہے یا ہمارے بعد والوں کیلئے بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے لیے خاص ہے۔

قوله: فقام سراقه بن مالك بن جعشم..... لا بل لأبد أبد: ”سراقه“ سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

”جعشم“ جیم اور سین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور ان کو فتح بھی دیا جاتا ہے۔

”فی الاخری“ عامل مضموم کی وجہ سے منصوب ہے اور مال مؤکدہ ہے۔ اس کو ذکر کیا ہے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے۔ یا ایک ہاتھ کی انگلیاں مراد ہے نہ کہ ایک انگلی تو اس صورت میں بدل کل ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منصوب ہو اصابہ سے بدل بعض ہونے کی وجہ سے۔

”بل لأبد أبد“ اس کو تاکید کے واسطے مکرر ذکر کیا۔

کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا جائز ہونا قیامت تک ہے اور مقصود اس سے زمانہ جاہلیت کے اس گمان کو باطل کرنا تھا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہی مطلب جمہور کے نزدیک ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عمرہ کا حج میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کی فرضیت ساقط ہوگئی ہے حج کی فرضیت سے، لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ عمرہ فرض کب ہوا تھا کہ اس کی فرضیت ساقط ہوگئی۔ نووی فرماتے ہیں کہ حدیث کا سیاق اس مطلب کے بطلان کا تقاضا کر رہا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ قرآن جائز ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ”دخلت افعال العمرة في الحج الی یوم القيامة“ کہ عمرہ کے افعال قیامت تک کیلئے حج میں داخل ہو گئے اور اس پر آپ ﷺ کا انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کرنا دلالت کر رہا ہے، لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس مطلب کے مطابق سوال اور جواب کے درمیان کوئی مناسبت باقی نہیں رہتی۔ پس آپ غور کریں صحیح وجہ آپ کے سامنے ظاہر ہوگا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ حج کا فسخ کرنا عمرہ کیلئے درمخت ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ عمرہ کے ساتھ اس فسخ حج کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا یہ اس سال میں صرف صحابہؓ ہی کے لئے تھا یا ہمیشہ کے لئے دوسروں کو بھی ایسا جائز ہے؟ چنانچہ امام احمد اور اہل ظاہر کی ایک جماعت نے تو یہ کہا ہے کہ یہ فسخ حج صرف صحابہؓ ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ یہ حکم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔ لہذا اس شخص کے لئے جو حج کا احرام باندھے اور ہڈی اس کے ساتھ نہ ہو یہ جائز ہے کہ وہ حج کا احرام عمرہ کے ساتھ فسخ کر دے اور افعال عمرہ کی ادا کیگی کے بعد حلال ہو جائے یعنی احرام کھول دے جب کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور علماء سلف و خلف کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ یہ حکم صرف اسی سال میں صحابہؓ کے لئے تھا کہ زمانہ جاہلیت میں حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو حرام سمجھا جاتا تھا اس کی تردید ہو جائے۔

لیکن اس نسخ کے منع ہونے اور بیان تخصص کیلئے کلام دلیل کا محتاج ہے پھر میں نے ابو ذر کی وہ حدیث دیکھی جو جمہور کی دلیل ہے مسلم نے اس کو روایت کیا ہے: کانت المنعۃ فی الحج لاصحاب محمد خاصة“ کہ حج میں نسخ اصحاب محمد ﷺ کیلئے خاص تھا اور حدیث نسائی میں ہے:

”یا رسول اللہ فسخ الحج للعمرة لنا خاصة ام للناس عامة“ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”لنا خاصة“ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ جب سرف مقام پر پھرے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حیض آیا بعد اس کے کہ وہ آپ ﷺ سے سن چکی تھی کہ آپ ﷺ فرما رہے تھے: ”من لم یکن معہ ہدی فاحب ان یجعلہا عمرۃ فلیفعل، ومن کان معہ ہدی فلا“ تو عائشہ رونے لگی تو آپ ﷺ نے فرمایا ”ما بیکیک؟“ تو عائشہ نے وہ بات ذکر کی جو آپ ﷺ سے سن چکی تھی اور یہ کہ اس کے سبب سے اس کے حیض کی وجہ سے وہ عمرہ نہیں کر سکے گی، تو آپ ﷺ نے فرمایا ”لا یضرك انما انت من بنات آدم کتب اللہ علیک ما کتب عنہن فکونی فی حرجک“ شیخین نے یہ حدیث روایت کی ہے اور ایک روایت میں ہے ”فافلعی ما یفعلہ الحاج غیر ان لا تطوفی بالبيت حتی تطہری“ اس روایت میں جو تصریح ہے کہ حضرت عائشہ حج کا احرام باندھی ہوئی تھیں۔ یہ بخاری کی اس روایت کا معارض ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ”وکنت فیمن اهل بعمرة“ اور احمد کی روایت میں ”ولم اسق ہدیاً“ کے الفاظ زائد ہیں۔ اور ایک روایت حضرت عائشہ سے ہے: ”خرجنا مع رسول اللہ ﷺ نلبی لا نذکر حجاً لا عمرۃ“ ان روایات کو باس طور جمع کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف حج کا احرام باندھا تھا جیسا کہ بعض صحابہ نے کیا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ان کو حج کے ذریعہ عمرہ فتح کرنے کا حکم دیا تو حضرت عائشہ نے ایسا ہی کیا تو وہ تمتع ہو گیا پھر جب وہ مکہ میں حیض کی حالت میں داخل ہو گئی تو اس کیلئے طواف کرنا مشکل ہو گیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ حج کا احرام باندھے۔

اور امام مالک نے حضرت عائشہ کے عمرہ کے احرام باندھنے کی روایت کو رد کیا ہے۔ ابن عبدالبر مالکی نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ وہ اس طور پر ہے کہ عمرہ کو فتح کرنا اور اس کو حج بنانا اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔

برخلاف حج کو عمرہ کی طرف فتح کرنا کہ اس کے جواز میں اب تک اختلاف ہے اور عمرہ کو بالکل ترک کرنا غیر ثابت ہے پس علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس میں بہ احتمال ہے کہ آپ ﷺ کا ان کو عمرہ کے چھوڑنے کے حکم سے مراد عمرہ سے حلال ہونے کو ترک کرنا اور اس پر حج کو داخل کرنا تھا تا کہ وہ حج قرآن ہو جائے یہ بات ابن حجر نے ذکر کی ہے۔ لیکن یہ احتمال رد ہو جاتا ہے آپ ﷺ کے ان کو بال کھولنے اور ننگھی کرنے کے حکم دینے سے۔ اور مسلم کی روایت سے جس میں ہے ”فامسکی من العمرة“ یعنی عمرہ کو چھوڑنے کو وجہ سے اس کے اعمال سے رک جانا۔ باقی ابن حجر کا یہ کہنا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو یہ کہا تھا: ”وارجع بحج“ یہ اس لیے کہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ عمرہ حج سے الگ کرنا افضل عمل ہے۔ لیکن یہ تاویل مسند احمد کی روایت سے رد ہو جاتا ہے جس میں ہے ”وارجع أنا بحجة لیس معہا عمرۃ؟“ اور یہ ہمارے ائمہ کے قول کے بارے میں صریح ہے کہ حضرت عائشہ نے عمرہ چھوڑ کر صرف حج کیا تھا۔ اور اس سے ائمہ نے یہ اخذ کیا ہے کہ عورت نے اگر حج تمتع کیلئے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور طواف سے پہلے وہ حائضہ ہو گئی تو اس کیلئے جائز ہے کہ وہ عمرہ چھوڑ کر صرف حج کا احرام باندھے۔ اور اسی طرح جب وقت میں تنگی ہو اور قارن نے افعال عمرہ کی ادائیگی سے قبل وقوف عرفہ کیا تو وہ عمرہ کو چھوڑنے والا ہو اپس وہ اس کی قضاء کرے گا۔ اس پر ذم لازم ہوگا، اور یہ مسلم کی اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں ہے کہ حضرت عائشہ نے احرام باندھا عمرہ کا۔ بس سرف مقام میں ان کو حیض آیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا ”اہلی بالحج“ یعنی حج کا احرام باندھے۔

پس جب وہ پاک ہوگی اور طواف کیا اور سعی کی وقوف کے بعد تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا ”قد حللت من حجک و عمرتک“ تو آپ نے یہ اس لیے فرمایا تھا کہ اس نے عمرہ کے افعال کو ترک کر دیا تھا نہ کہ عمرہ کوچ کے ساتھ فتح کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے جیسا کہ امام مالک نے فرمایا ہے: پھر جب انہوں نے شکایت کی کہ وہ دل میں یہ وسوسہ پارہی ہے کہ میں نے صرف حج کے بعد طواف کیا اور باقی لوگ حج اور عمرہ کا مل دونوں کر کے لوٹ رہے ہیں تو آپ ﷺ نے تنعیم سے ان کو عمرہ کرایا۔

باقی جو مسلم کی روایت ہے ”طوافک یسعک لحجتک و عمرتک“ اس کا مطلب ہے کہ فی الجملہ آپ کا طواف دونوں کا قائم مقام ہے اور یہ کہ وہ عمرہ کے احرام سے نکل گئی ہے۔

قوله: وقد معی علی من الیمن..... فان معی الہدی فلا تحل:

”بدن النبى ﷺ“ باء کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ بدتہ کی جمع ہے یہاں اس سے مراد قربانی کے اونٹ ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ کو پایا کہ وہ عمرہ سے حلال ہو چکی ہے اور رنگے ہوئے کپڑے پہن چکی ہیں اور سرمہ لگایا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر نکیر فرمائی۔ نووی فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ یہ بنا جائز ہے: تو فاطمہ نے فرمایا کہ میرے والد نے مجھے یہ حکم دیا ہے۔ حضرت علی چونکہ ان دنوں عراق میں تھے تو وہ فرماتے ہیں کہ میں چلا رسول اللہ ﷺ کی طرف اس حال میں کہ مجھے فاطمہ کے کیے ہوئے پر غصہ تھا رسول اللہ ﷺ سے پوچھنے کیلئے اس بات کے بارے میں جو فاطمہ نے ذکر کی تھی۔ تو میں نے آپ ﷺ کو خبر دی کہ میں فاطمہ کیلئے پر نکیر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے حج بولا ہے حج بولا ہے۔

”حين فرضت الحج“ یعنی جب تو نے حج اپنے اوپر نیت اور تلبیہ کے ساتھ لازم کیا اللہ کا ارشاد ہے ﴿فمن فرض فيهن الحج﴾ ترجمہ: سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے۔ (بیان القرآن)

”اهل بما اهل به رسولك“ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دلالت کر رہا ہے آدمی کا اپنا احرام دوسرے کے احرام پر معلق کرنے کے جواز پر۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تو نے اپنا احرام میرے احرام پر معلق کر دیا ہے تو میں نے عمرہ کا احرام باندھا ہے اور میرے ساتھ قربانی کا جانور ہے تو میں عمرہ کے احرام سے نہیں نکل سکتا تو آپ بھی عمرہ سے نہ نکلے یہاں تک کہ حج اور عمرہ دونوں سے فارغ ہو جائیں۔

”فان معی“ یا کے سکون اور فتح دونوں کے ساتھ ہے۔

قوله: فحل الناس کلہم..... ومن كان معہ ہدی:

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ بعض کا کہنا ہے کہ یہ عام مخصوص ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے احرام نہیں کھولا تھا اور نہ ہی ان لوگوں میں سے تھی جو جانور ساتھ لے کر گئے تھے۔ ملا علی قاری کہتے ہیں شاید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کوچ، عمرہ کے ساتھ فتح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا یا وہ عمرہ کرنے والی تھی اور ان کو عمرہ پر حج داخل کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ قارن ہو جائے۔ جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔

”وقصروا“ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ انہوں نے بال کٹوائے حالانکہ حلق کرنا افضل ہے تاکہ ان کے کچھ بال باقی رہے جو حج میں حلق کر سکیں (اتنی) اور ان کے بال حج کے میزان میں بھی ان کے اجر کے زیادہ ہونے کا سبب بنے اور تاکہ وہ مقصرین اور مخلتین دونوں میں داخل ہو جائیں۔ اور رخصت و عزیمت دونوں کو جمع کرنے والے ہو جائیں۔

قوله: فلما كان يوم التروية..... فسار رسول الله ﷺ:

”يوم التروية“ آٹھ ذی الحجہ کو کہتے ہیں اس کا نام یہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس دن جحج سیراب ہوتے ہیں اور پانی پیتے ہیں اور

جانوروں کو پلاتے ہیں اور بعض نے وجہ تسمیہ یہ ذکر کی ہے کہ یہ ترؤی سے ہے بمعنی تفکر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دن حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کے بارے میں سوچ و فکر کی تھی کہ وہ کیا کریں یہاں تک کہ دس ذی الحجہ کو ان کا پختہ ارادہ بنا ذبح کرنے کا۔
 ”منیٰ“ تنوین کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بغیر تنوین کے ہے اور اس کو الف کے ساتھ لکھا جائے گا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان دنوں میں خون بھایا جاتا ہے یا اس وجہ سے اس کو منیٰ کہتے ہیں کہ حجاج کو افعال کے مکمل کرنے پر ان کے آرزو عطاء کیے جاتے ہیں۔ منیٰ آرزو کو کہتے ہیں۔

”نم مکت“ کان کے فتح اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ ”من شعر“ عین کے فتح اور سکون دونوں کے ساتھ ہے۔
 ”تضرب“ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

”بسمرة“ نون کے فتح اور یم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ غیر منصرف ہے۔ عرفہ کے دائیں طرف خارج میں واقع ایک جگہ کا نام ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ عرفات کے قریب ایک پہاڑ ہے جو عرفات میں سے نہیں ہے۔
 ”المشعر“ عین کے فتح کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کسرہ کے ساتھ ہے۔

قوله: ”ولا تشك قريش الا انه واقف عند مشعر الحرام“: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ قریش کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ آپ ﷺ مناسک حج میں ان کی مخالفت کریں گے سوائے وقوف کے کہ اس کے بارے میں ان کو یقین تھا کہ آپ ﷺ ان کی موافقت کریں گے، کیونکہ اہل حرم مشعر الحرام جو مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے جس کو تزح کہا جاتا ہے کے پاس وقوف کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ پورے مزدلفہ کا نام ہے یہی جمہور مفسرین اور محدثین کا قول ہے اور یہی مطلب ہے اس قول کا۔ (جیسا کہ قریش زمانہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے) اور کہتے تھے کہ ہم حرم کے محافظ ہیں پس ہم اس سے نکلنے نہیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بعثت سے قبل آپ ﷺ قریش ہی کی موافقت فرماتے تھے، لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے جیسا کہ بعض روایات میں صراحتہ آیا ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے قبل بھی عام لوگوں کے ساتھ وقوف فرماتے تھے۔ جیسا کہ درمنثور میں مذکور ہے۔

”فاجاز رسول الله ﷺ“ یعنی آپ ﷺ مزدلفہ سے آگے بڑھے اور وہاں وقوف نہیں کیا اور ضرب کے راستے سے چل پڑے ضرب کنویں کے متصل ایک پہاڑ کا نام ہے۔ عرفہ جاتے ہوئے دائیں طرف آتا ہے۔
 ”فنزول بها“ یہ دلالت کر رہا ہے کہ محرم کیلئے خیمہ وغیرہ کے ذریعے سایہ حاصل کرنا جائز ہے امام مالک اور احمد، کجاوہ وغیرہ سے سایہ کے حصول کو جائز نہیں کہتے۔

”فرحلت له“ مجہول اور مخفف ہے یعنی نبی ﷺ کیلئے اس پر کجاوہ باندھا گیا۔

”فاتى بطن الوادى“: ”بطن الوادى“ عرفات میں ایک جگہ ہے جس کو عترتہ کہا جاتا ہے۔

یہ عرفات کا حصہ نہیں ہے۔ اس میں امام مالک کا اختلاف ہے اور اس میں مسجد ابراہیم جو آج موجود ہے کا کچھ حصہ ہے۔ مسجد ابراہیم کے بانی کے بارے میں اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ اس کی نسبت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی طرف ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اس کو مصلیٰ بنایا۔ اور بعض نے کہا ہے ابراہیم قہسی ہے جس کی طرف مسجد کے ایک دروازے کی نسبت ہے یہ بنو عباس کے ابتدائی دور میں تھے اس کی طرف منسوب ہے کیونکہ وہ اس کے بانی ہے۔ یا نئے سرے سے بنانے والے ہیں۔

قوله: فنخطب الناس..... فى بلدکم هذا:

”تحت قدمی“ تثنیہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں مفرد ہے اور اول مبالغہ پر زیادہ دلالت کر رہا ہے۔

”موضوع“ یعنی اس شئی کی طرح جس کو پاؤں تلے رکھا جائے۔ یہ مجاز ہے اس کے ابطال سے۔ عرب اس چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس کا لونٹا اور اس کا ذکر پھر نہ ہو جعلت ذلك دبر اذنی وتحت قدمی۔

آپ ﷺ نے دو خطبے پڑھے پہلے خطبے میں توجیح کے احکام بیان کیے اور عرفات میں کثرت ذکر و دعا پر ترغیب دلائی، دوسرا خطبہ پہلے خطبے کے نسبت چھوٹا تھا اس میں صرف دعائیں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب امام اس دوسرے خطبہ کیلئے کھڑا ہو جائے تو مؤذن اقامت کیلئے کھڑا ہو جائے تاکہ دونوں ایک ساتھ فارغ ہوں۔ جیسا کہ یہ بھی نے بیان کیا ہے۔

”فی بلد کم هذا“ اس میں تاکید ہے کہ اموال اور ابدان کی حرمت کے تشبیہ میں حرمت زمان اور مکان کو جمع کیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ برف و نشر مشوش ہو، بایں طور کہ حرمت نفس، حرمت بلد کی طرح ہو کیونکہ یہ اپنی جگہ ثابت اور برقرار ہے اور حرمت مال، حرمت زمان کی طرح ہو کیونکہ مال آنے جانے والا ہے اور اس میں حرمت نفس کی قوت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حرمت بلد مؤید ہے اور حرمت زمان مؤقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے منسوخ ہونے سے نفس و مال کی حرمت کا نسخ لازم نہیں آتا۔ کیونکہ وہ اس کا تابع نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور تشبیہ من کل الوجوه لازم نہیں ہے۔ اسی لیے علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ تحریم کی تشبیہ عرفہ، ذی الحجہ اور شہر مکہ کے ساتھ دی ہے کیونکہ عرب اس میں کسی چیز کے استباحہ کو سخت حرام سمجھتے تھے۔

قوله: الا كل شيء من امر الجاهلية..... فقتله هذيل:

”تحت قدمی“ تشبیہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں مفرد ہے اور اول مبالغہ پر زیادہ دلالت کر رہا ہے۔

”موضوع“ یعنی اس شئی کی طرح جس کو پاؤں تلے رکھا جائے۔ یہ مجاز ہے اس کے ابطال سے۔ عرب اس چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس کا لونٹا اور اس کا ذکر پھر نہ ہو جعلت ذلك دبر اذنی وتحت قدمی۔

”من دماننا“ یعنی جس کا اہل اسلام استحقاق رکھتے ہیں یہ ایک قول ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ دماننا سے مراد اقارب کا خون ہے اسی لیے علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ قتل اور خون کے معاف کرنے میں اپنے اہل و اقارب سے ابتداء کی تاکہ سامعین کے دلوں میں بات مضبوطی سے بیٹھ جائے اور اس کی اجازت کے طمع کا دروازہ بند ہو جائے۔

”دم ابن ربیعہ“ ربیعہ کے بیٹے کا نام ایسا تھا یہ چھوٹا بچہ تھا گھروں کے درمیان گھٹنوں کے بل چلتا تھا اور سعد کی ہذیل کے ساتھ جنگ کے دوران ان کو روکا اور ہذیل نے اس طرح اس کو قتل کر دیا۔ حارث بن عبدالمطلب آپ ﷺ کے چچا تھے عمر میں آپ ﷺ سے بڑے تھے اور آپ ﷺ سے ان نے روایت بھی کی ہے حضرت عمرؓ کے خلاف میں وفات پائی۔

تصحیح روایت: بعض راویوں نے اس کو دم ابن ربیعہ بن الحارث روایت کیا ہے اور بخاری کی روایت بھی یہی ہے اور اسی طرح اہل علم کی بڑی جماعت اس روایت میں خطا کر گئی ہے کیونکہ درست دم ابن ربیعہ ہے اور اس میں تصحیح اس طور پر ممکن ہے کہ کہا جائے کہ دم کی اضافت ربیعہ کی طرف اس لیے کی ہے کہ ولی دم وہ تھے یا حذف مضاف کے ساتھ ہے قصہ کے شہرت پر اعتماد کرتے ہوئے مضاف کو حذف کیا ہے۔

”مستتر ضعاً“ مفعول کا صیغہ ہے ”یوطنن“ ہمزہ کے ساتھ اور ابدال ہمزہ کے ساتھ باب افعال سے ہے۔

قوله: وربا الجاهلية موضوع..... فانه موضوع كله:

”رباغبنا بن عبدالمطلب“ کہا گیا ہے کہ یہ بدل ہے ربانا سے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ خبر ہے۔

”موضوع كله“ تاکید بعد تاکید ہے۔

مرا داس سے ان کے غضب کیے ہوئے اور لٹے ہوئے اموال ہے اور ربا کو خاص کر ناذکر میں تاکید کیلئے ہے کیونکہ یہ شروع کی صورت میں فی الجملہ معقول نظر آتا ہے۔

قولہ: **ولکم علیہن ان لایوطنن فر شکم..... رزقہن وکسو تہن بالمعروف:** علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس جیلے کا مطلب ہے کہ وہ عورتیں، شوہروں کے گھروں میں کسی کو آنے کی اجازت نہ دیں اور ممانعت مردوں اور عورتوں دونوں کو شامل ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اجنبی مردوں کو اجازت نہ دیں کہ وہ ان کے پاس آکر باتیں کریں۔ عرب کی عادت یہ تھی کہ وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ جب آیت حجاب نازل ہوئی تو وہ اس سے منع ہو گئے، اور یہ زنا سے کنایہ نہیں ہے ورنہ تو پھر سزا رجم ہے نہ کہ مار۔

”مباح“ راء مسورہ کی شد کے ساتھ ہے یعنی زنجی کرنے والا یا زیادہ مشقت والا۔

قولہ: **”فاتقوا اللہ فی النساء“**

”فاتقوا اللہ فی النساء“: فاء فصیحہ ہے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح کی روایت میں واؤ کے ساتھ ہے اور یہ دونوں درست ہیں اور اس کا ما قبل پر عطف ہے معنوی طور پر، یعنی اللہ سے ڈرو خون کے مباح جاننے اور اموال لوٹنے اور عورتوں کے بارے میں۔

”بکلمۃ اللہ“ ایک نسخہ میں بکلمات اللہ ہے۔

قولہ: **”وقد ترکت فیکم ما..... اللہم اشہدہ ثلاث مرات:**

”فیکم ما“: ما موصولہ ہے یا موصوفہ ہے الذموا فعل مقدر کی وجہ سے ہے۔

”کتاب اللہ“ نصب کے ساتھ بدل ہے یا بیان ہے کیونکہ ابھام کے بعد تفسیر شان قرآن کی تعظیم ہے۔ اور رفع بھی جائز ہے کہ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہو جو کہ ہو ہے۔

”کتاب اللہ“ صرف کتاب پر اکتفاء اس لیے کیا کہ کتاب سنت پر عمل کرنے کو مشتمل ہے اللہ کے اس ارشاد کی وجہ سے ﴿اطیعوا

اللہ واطیعوا الرسول﴾ [النساء: ۵۹]

اور اللہ کا ارشاد ﴿وما آتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فانتہوا﴾ [الحشر: ۷] اور جو دے تم کو رسول، سولے لو، اور جس سے منع کریں سو چھوڑ دو، موضع القرآن (حشر)۔ پس کتاب پر عمل کرنے سے سنت پر عمل کرنا لازم آتا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ اصل اصیل کتاب اللہ ہے۔

”نسنلون عنی“ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

”السبابة“ جو، نصب اور رفع تینوں کے ساتھ ہے۔

”یرفعہا“ قال کے فاعل سے حال ہے تقریر ہے واقعاً ایسا یا السبابة سے حال ہے تو تقریر مرفوعہ ایسا ہوگی۔

”ینکتہا“ کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے اور تاء کے ساتھ ہے اور ”تکت“ کہتے ہیں انگلیوں کے پودوں کو زمین پر مارنا اور ایک تھنج

شدہ نسخہ میں باء کے ساتھ ہے یعنی لوگوں کی طرف جھکا رہا تھا۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح ہم نے اس کو تاء کے ساتھ ضبط کیا ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح روایت ہے اور یہ معنی کے اعتبار سے بعید ہے۔ قاضی فرماتے ہیں کہ کہا گیا ہے کہ اصل اس کا

ینکتہا، باء کے ساتھ ہے اور قاضی نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو سنن ابی داؤد میں روایت کیا ہے۔

”اللہم اشہد“ اس کا مطلب ہے کہ اسے اللہ اپنے بندوں پر گوارہ کہ وہ اقرار کر چکے ہیں کہ میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا چکا ہو،

اسی طرح کہا ہے ابن الملک رحمہ اللہ نے۔ اور مطلب ہے کہ اے اللہ تو ہی گوارہ کیونکہ آپ ہی کی گواہی کافی ہے۔
 قولہ: ”ثم اقام فصلى الظهر ثم اقام فصل العصر“ یعنی دونوں کو نظر کے وقت میں جمع کیا جس طرح مزدلفہ میں جمع کرتے ہیں۔ نیز ان دونوں نمازوں کے درمیان سنت و نوافل وغیرہ نہیں پڑھی جاتی تاکہ دونوں نمازوں کے درمیان وقفہ ہو جانے کی وجہ سے جمع باطل نہ ہو جائے کیونکہ ان نمازوں کو پے در پے پڑھنا واجب ہے۔

”الموقف“ سے مراد سرزمین عرفات ہے۔ یا لام عہد کیلئے ہے اور مراد اس سے آپ ﷺ کا خاص موقف ہے۔
 یہاں موقف مستحب ہے اگر یہاں وقوف سے عاجز ہو جائے تو پھر اس کے قریب بحسب الامکان وقوف کرے۔ اور جو عوام کے درمیان پہاڑ کے اوپر چڑھنے کا اہتمام مشہور ہے اور یہ وہم ہے کہ اس کے علاوہ میں وقوف درست نہیں ہے تو یہ غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ عرفات کی ہر چیز میں وقوف درست ہے اور وقوف کا وقت یوم عرفہ یعنی نو ذی الحجہ کے زوال کے وقت سے لے کر ذی الحجہ کے طلوع فجر تک ہے اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وقوف کا وقت نو ذی الحجہ کے فجر کے وقت سے داخل ہوتا ہے۔

”ناقة القصواء“ القصواء، رفع، نصب، حمر تینوں کے ساتھ درست ہے۔

”الصخرات“ صادر خاء کے فتح کے ساتھ بڑے پتھروں کو کہتے ہیں۔ صحرات سے مراد وہ پہاڑ ہے جو عرفات کے درمیان ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ جبل رحمت کے نیچے بچھے ہوئے پتھر ہیں اور یہ وہ پہاڑ ہے جو عرفات کے درمیان ہے۔

”جبل المشاة“ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو حاء کے ساتھ اور باء کے سکون کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اور جم اور باء کے فتح کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اول حدیث کے زیادہ مشابہ ہے:

جبل المشاة پیدل لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں اور جبل الرمل جو اس سے لمبا ہو اس کو کہتے ہیں اور جم کے ساتھ اس کا معنی ہے ان کا راستہ اور اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پیدل چلنے والے جاتے ہیں۔ علامہ طبری کہتے ہیں کہ حاء کے ساتھ کا معنی ہے ان کا راستہ جس پر وہ ریت میں جاتے ہیں۔ تو ریشمی فرماتے ہیں کہ جبل المشاہ جگہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ایک اونچی ریتلی جگہ کا نام ہے جیسا کہ ٹیلہ ہوتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جبل مستطیل ریت کو کہتے ہیں اور اس کی اضافت المشاة کی طرف اس لیے کی ہے کہ اس پر پیدل چلنے والوں کے علاوہ کوئی نہیں چڑھ سکتا ہے۔ یا ان کے وہاں اجتماع کی وجہ سے سواروں کے ٹھہرنے کی جگہ نہ بچتی ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ بھی یہی وقوف کا فکر کرتے تھے۔

”حتی غاب القرص“ تمام نسخوں میں اس طرح ہے بعض نے کہا ہے کہ صحیح حین غاب القرص ہے لیکن اس میں اشکال ہے کیونکہ ذہبت الصفرة قليلا حین غاب القرص کا کوئی مطلب نہیں بنتا تو گویا کہ قائل قید علت سے غافل رہا اور اس روایت سے ذہول کر گیا ہے جو روایت کے مطابق ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اپنے ظاہر پر ہو غیبوبہ کیلئے کیونکہ کہیں اس کا اطلاق معظم قرص پر بھی ہوتا ہے۔

”ودفع“ ایک روایت میں ہے ”ودفع رسول الله ﷺ وقد شفق“ نون کی تخفیف کے ساتھ ہے یعنی ملایا اور تنگ کیا قصواء کیلئے لگام کو۔ ”حتی ان رأسها ليصيب مورك رجله“ جم اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور حاء اور راء کے فتح کے ساتھ بھی ہے اور ”الموارك“ میم کے فتح اور راء کے کسرہ کے ساتھ۔ کجاوہ کا وہ حصہ جہاں سوار تھک کر ٹانگ پھیلا دے۔ اور قاضی نے اس کو راء کے فتح کے ساتھ ضبط کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ چڑے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس پر سوار سہارا لیتا ہے اس کو کجاوہ کے اگلے حصے میں رکھ لیتا ہے اور یہ چھوٹے ٹکڑے کے مشابہ ہوتا ہے۔ اس کو امام نووی نے ذکر کیا ہے۔

قوله: اردف اسامة ”المزدلفة“ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں لوگ رات کے شروع کی ساعات میں

آتے ہیں اور اسی سے ہے ﴿وَإِذِ الْجَنَّةِ اِزْلَفْتُمْ﴾ [التکویر: ۱۳]

یہی ائمہ ثلاثہ اور امام زفر رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور مغرب و عشاء کے درمیان سنت و نوافل نہیں پڑھی، لیکن معتمد یہ ہے کہ آپ ﷺ ان دونوں نمازوں کے بعد مغرب اور عشاء کی سنتیں اور وتر پڑھتے تھے ”اور پھر لیٹ گئے“، یعنی رواتب عشاء اور وتر کے بعد جیسا کہ ایک روایت میں ہے ”یہاں تک کہ فجر طلوع ہوئی“ اور یہ آرام بدن کی تقویت اور امت پر مہربانی کیلئے تھا اور چونکہ اس آنے والے دن میں بہت ساری عبادات ہیں جو کہ نشاط چاہتے ہیں اور یہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں ہے، ”من احیا لیلۃ العید احیا اللہ قلبہ یوم تموت القلوب“ کیونکہ رات کا احیاء ذکر و فکر کے ساتھ بغیر نوافل کے بھی ہو سکتا ہے اور ساتھ حدیث کا مرادنی الجملہ اس رات کا احیا ہے یا اکثر رات کا احیاء مراد ہے پھر رات گزارنا ہمارے نزدیک سنت ہے اور یہی بعض شوافع محققین کا مذہب ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ واجب ہے اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ رکن ہے و قوف کی طرح اس کے بغیر حج بھی درست نہیں ہو سکتا اور یہی بڑے علماء میں سے ایک جماعت کا مذہب ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ وہاں نزول واجب ہے اور رات گزارنا سنت ہے اور اسی طرح اس کے بعد و قوف اور پھر اکثر رات گزارنا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وجوب مزدلفہ میں ایک لحظہ کیلئے حاضر ہونے سے پورا ہو جاتا ہے۔

قوله: ثم ركب القصواء ”مشعر الحرام“ مزدلفہ میں ایک خاص جگہ کا نام ہے جہاں قیام کرنے کو حکم ہے اور مزدلفہ اور مشعر حرام میں مغایرت پر بخاری کی وہ روایت دلالت کر رہی ہے جس میں ہے ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے کمزور اہل و عیال کو پہلے بھیجتے تھے اور وہ مشعر الحرام کے پاس و قوف کرتے اور اللہ کو یاد کرتے اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ مشعر حرام، مزدلفہ ہی ہے۔

قوله: فدفع قبل ان تطلع الشمس حتی اتى بطن محسر، فحرك قليلا:

”بطن محسر“ سین کی شد اور کسرہ کے ساتھ ہے، مزدلفہ اور منی کے درمیان ایک گھاٹی کا نام ہے۔

تحسر تھکنے کو کہتے ہیں اور اسی سے ہے ﴿يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِنًا وَهُوَ حَسِيرٌ﴾ [الملك: ۴] اور اس کو محسر اس لیے کہتے ہیں کہ اصحاب فیل کا ہاتھی یہاں رک گیا تھا تھک کر۔ اس کو ذکر کیا ہے امام نووی نے لیکن اس قول کے مطابق ہے کہ وہ ہاتھی حرم میں داخل ہو گیا تھا اور یہی تمام علماء کا قول ہے اور بعض کے ہاں راجح یہ ہے کہ وہ حرم میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ حرم سے کچھ پہلے ان پر عذاب آیا تھا عرفہ کے قریب۔ پس ان میں سے کوئی نہیں بچا تھا سوائے ایک کے جس نے پچھلے لوگوں کو خبر دی۔

آپ ﷺ جب مشعر حرام سے روانہ ہوئے اور اس وادی میں پہنچے تو اپنی سواری تیز کر دی بعض کا کہنا ہے کہ یہاں سواری تیز کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہاں جو شخص شکار کرتا ہے اس پر آگ نازل ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اہل مکہ نے اس وادی کا نام وادی نار رکھا ہے اور صحیح طرف سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب دیا رشود سے گزرے تو اپنی سواری تیز کر دی اور صحابہ کو بھی سواریاں تیز کرنے کا حکم دیا اس ڈر سے کہ کہیں وہ عذاب جو قوم رشود پر آیا تھا وہ ان کو نہ پہنچے۔ یا نصاریٰ کی مخالفت کی وجہ سے کہ نصاریٰ وادی محسر میں و قوف کرتے تھے تو ہمیں ان کی مخالفت کا حکم دیا گیا ہے۔ شاید کہ نصاریٰ مزدلفہ کی جگہ یہاں ٹھہرے تھے یا مزدلفہ میں و قوف کرنے کے بعد یہاں بھی و قوف کرتے تھے۔ فی الجملہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وجہ تخصیص اسراع یعنی سواری تیز کرنے کا عرفات سے واپسی کے موقع پر ہے نہ کہ جاتے ہوئے۔ اور اور آپ عرفات صلب کے راستے سے گئے تھے اور یہ بات بھی بعید نہیں کہ یہاں پہنچ کر ہر شخص کیلئے چاہیے حاجی ہو یا نہ ہو آنے والا ہو یا جانے والا ہو مستحب ہے کہ وہ اپنی سواری تیز کر دے۔ اس کے نزول عذاب کے محل ہونے کی وجہ سے، ”واللہ اعلم“

ابن الملک فرماتے ہیں کہ سواری تیز کرنے میں پیدل چلنے والے بھی داخل ہیں کہ وہ بھی تیز چلے۔ اور اس کی وجہ اور اس میں اشکال ہے کہ یہ وجہ تسمیہ نہیں بن سکتا کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں تیز چلنا یہاں عذاب نازل ہونے کی وجہ سے ہے۔

”فحرك قليلا“ آپ ﷺ جب وادی حمر میں آئے تو آپ ﷺ نے سواری تیز کر دی یہاں تک کہ وادی سے نکل گئے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ پتھر پھینکنے کے مقدر وادی سے دور ہو گئے۔ باقی جو حضرت ابن عباسؓ اور اسامہ سے صحیح روایت ہے کہ آپ ﷺ نے عرفہ سے منیٰ تک اسراع کو ترک کیا تھا تو وہ محمول ہے از دحام کے وقت ترک پر۔ کیونکہ اثبات مقدم ہے خاص کر کے جب اس کے راوی زیادہ اور سند زیادہ صحیح ہے۔ اور کبھی اس پر محمول کیا جاتا ہے کہ بعض راستے میں سواری تیز کی تھی اور بعض میں ترک اسراع کیا تھا۔

اور سنت ہے کہ یہاں سے گزرنے والا وہ کلمات کہے جو ابن عمر کی روایت میں ہے اور طبرانی نے ان میں سے بعض کو مرفوع روایت کیا ہے۔

”الیک تعدو قلقاً وضینها - معترضاً فی بطنها جنینها۔ مخالفاً دین النصارى دینها۔ قد ذهب الشحم الذی یزینها“

اور مستحب ہے کہ یہ کلمات بھی کہے ”اللہم لا تقتلنا بغضبك، لا تهلکنا بعدابک، وعافنا قبل ذلک“۔

قولہ: ثم سلك الطريق الوسطی..... رمی من بطن الوادی:

”مثل حصی الخذف“ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ایک صحیح نسخہ میں مثل حصی الخذف ہے (ہمارے پاس موجودہ نسخہ میں بھی یہی ہے) نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول ”فرماھا بسبع حصیات یکبر مع کل حصاة منها حصی الخذف“ اسی طرح ہے نسخوں میں اور قاضی نے بھی اکثر نسخوں سے اسی طرح نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ درست مثل حصی الخذف ہے اور کہا ہے کہ اسی طرح مسلم کے بعض راویوں نے اس کو روایت کیا ہے۔ یہ قاضی کا کلام تھا۔

نووی کہتے ہیں کہ جن نسخوں میں لفظ مثل کے بغیر ہے وہ درست ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ کی کوئی توجیہ ہی نہیں ہو سکتی۔ اور کلام بھی صرف اسی صورت میں تمام ہو سکتا ہے اور حصی الخذف حصیات سے متعلق ہے اور اصل میں یوں ہے۔ رماھا بسبع حصیات حصی الخذف یکبر مع کل حصاة۔ پس حصی الخذف حصیات سے متصل ہے اور یہی صحیح ہے نووی کا کلام مکمل ہوا۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حصی الخذف کا مع کل حصاة سے تعلق ہونا لفظاً زیادہ قریب اور معنی زیادہ مناسب ہے اور اس صورت میں نہ ہی تو کوئی جملہ معترضہ ہوگا اور نہ ہی کسی ایک نسخے کا خطا ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ اس کا متعلق ہونا حصاة کے ساتھ یا حصیات کے ساتھ لفظ مثل کے لفظاً یا تقریراً وجود کے منافی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ جب لفظ مثل موجود ہوگا تو معنی واضح ہوگا ورنہ تو تشبیہ بلیغ کے باب سے ہوگا اور تشبیہ بلیغ کہتے ہیں اداۃ تشبیہ کو حذف کرنا، یعنی اصل میں ہے کحصی الخذف بلکہ اس کے علاوہ تعلق کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا۔ پس دونوں روایات صحیح ہیں اور جو عنقریب حدیث میں آ رہا ہے۔ حضرت جابر سے جس کو ترمذی نے روایت کیا ہے ”وامرهم ان یروا بمثل حصی الخذف“ کے الفاظ کے ساتھ اور مسلم نے ان سے روایت کیا ہے ”رمی الحمرۃ بمثل حصی الخذف“ کے لفظ کے ساتھ تو یہ لفظ مثل کے وجود کو راجح قرار دیتا ہے اور ایک نسخہ میں

”الخذف“ خاء کے ساتھ انگلیوں کے پوروں سے پھینکنے کو کہتے ہیں۔

”ذمی من بطن الوادی“ ”یہ بدل ہے۔ فرماھا سے یا استیناف میں ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

بخاری کی روایت میں ابن مسعود سے اور اسی طرح شافعی رحمہ اللہ کی عبارت سے اوپر سے رمی کے جواز پر دلالت ہو رہا ہے اور اس

طرح باقی جمرات پر قیاس کرتے ہوئے کہ ان کی رمی تمام جانبوں سے جائز ہے اگرچہ مستحب ایک جانب ہے باقی اس کی یہ تاویل کرنا کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے اس جمرہ کو اوپر سے نیچے کی طرف مارا نہ کہ پشت کی طرف تو یہ تاویل بعید ہے کیونکہ یہ ظاہر روایات اور درایت کے مخالف ہے تو ابن حجر کا قول: ”ان الرمی من فوقها“ باطل ہے جس کے تحت کوئی فائدہ کی بات نہیں ہے۔

قوله: ثم انصرف الی المنحر..... وشریبا من مرقها: ”المنحر“ میم کے فتح کے ساتھ ہے۔

یہ جمرہ عقبہ کے قریب ہے باقی جو مشہور ہے مسجد کی صورت جمرہ وسطیٰ کے قریب راستے سے دائیں طرف۔ اور اس کے سامنے مسجد بنی ہوئی ہے جس کو عام لوگ مسجد مخر کہتے ہیں تو یہ آپ ﷺ کا قربان گاہ نہیں ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آپ ﷺ کا مخر مسجد خیف کے قریب قبلہ کی جانب جہاں آپ ﷺ ٹھہرے تھے وہ ہے۔

”وستین بدنة بیده“ بظاہر مشکوٰۃ کے الفاظ دو روایتوں کا مجموع ہے کیونکہ صحیح روایت ثلاثاً وستین بیده ہے بغیر لفظ بدنة کے۔ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح ہے نسوں میں اور اسی طرح قاضی نے روایت کیا ہے تمام راویوں سے سوائے ابن ماہان کے کہ انہوں نے بدنة روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ دونوں صحیح ہے اور اول زیادہ صحیح ہے۔

”واشرك فی ہدیہ“ آنحضرت ﷺ نے اپنے قربانی کے جانوروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی شریک کر لیا تھا یعنی آنحضرت ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو کچھ اونٹ دے دیئے تاکہ وہ اپنی طرف ذبح کر لیں اب یا تو آپ ﷺ نے انہیں وہ اونٹ اپنے باقی اونٹوں میں سے ہے یا دوسرے اونٹوں میں سے دیئے ہوں گے۔

”ببضعة“ باء ثانی کے فتح کے ساتھ وشت کے مزے کو کہتے ہیں۔

”فاکلا من لحمها“ ضمیر مجرور قدری طرف راجع ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہدایا کی طرف راجع ہو یہ ابن الملک رحمہ اللہ نے

فرمایا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نفس قربانی میں ان کو شریک کر لیا تھا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقہ ان کو شریک نہیں کیا تھا بلکہ ان کو کچھ جانور ذبح کرنے کی غرض سے دیئے تھے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ وہ اونٹ جو مدینہ سے آئے تھے وہ آپ ﷺ نے خود ذبح کیے اور وہ تریٹھ تھے جیسا کہ ترمذی کی روایت میں آیا ہے اور وہ اونٹ جو یمن سے آئے تھے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دے دیئے تھے اور یہ سب ملا کر سوتھے۔

اور یہ بھی بعید نہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے قربانی کے ثواب میں شریک کیا ہو۔ کیونکہ حج کی ہدی کا وہی حکم ہوتا ہے جو عام قربانی کا ہوتا ہے کہ ثواب میں دوسروں کو شریک کر سکتا ہے۔

امام نووی نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کا جانور یوم نحر کو ذبح کرنا مستحب ہے اگرچہ وہ زیادہ ہوں۔ اور ان میں سے بعض کو ایام تشریق تک مؤخر نہ کریں۔

”وشریبا من مرقها“ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ نفلی قربانی کے گوشت میں سے کھانا جائز ہے۔ صحیح یہ ہے کہ

مستحب ہے اور بعض نے کہا ہے کہ واجب ہے۔ کیونکہ اللہ کا امر ہے ﴿فکلوا منها﴾ تو تم خود بھی کھاؤ۔ (بیان القرآن)

قوله: ”فأفاض الی البیت“ فصلی بمكة الظهر: یعنی پھر بیت اللہ پہنچے طواف فرض ادا کرنے پہنچے۔ اور اس طواف کو

طواف افاضہ اور رکن بھی کہتے ہیں۔ اکثر علماء جن میں سے امام ابوحنیفہ بھی ہیں طواف زیارت کو دوسری نیت سے جائز قرار نہیں دیتے اور

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے نذر یا طواف وداع وغیرہ کی نیت کی تو بھی اس نیت سے طواف افاضہ واجب ہوگا۔

”فصلی بمکة الظهر“ یہ ابن عمر کی اس حدیث کے خلاف ہے جس کو مسلم نے روایت کیا ہے احادیث طواف افاضہ میں کہ آپ نے زوال سے پہلے طواف افاضہ کیا اور پھر منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ دونوں روایتوں میں مطابقت یوں پیدا کی جائے کہ آپ نے طواف افاضہ زوال سے پہلے کیا اور پھر مکہ میں ظہر کی نماز اول وقت میں ادا کی پھر منیٰ کی طرف لوٹے اور وہاں صحابہ کے ساتھ دوبارہ ظہر کی نماز پڑھی جب انہوں نے اس بارے میں سوال کیا تو منیٰ میں آپ ﷺ نے ظہر کی نماز بطور نفل ادا کی۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے فعل کو ایسے قول پر محمول نہ کیا جائے جس کے جواز میں اختلاف ہے۔ پس اس کی یہ تاویل کی جائے گی کہ آپ ﷺ نے مکہ میں دو رکعت طواف کی نماز پڑھی اور پھر منیٰ میں ظہر کی نماز صحابہ کے ساتھ پڑھی۔ یا کہا جائے کہ جب دونوں روایتیں متعارض ہوئیں تو دونوں ساقط ہوگی اب ترجیح اس بات کو دی جانی گی کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی کیونکہ مکہ میں نماز پڑھنا افضل ہے اور اس کی تائید ضیق وقت... سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ مشعر حرام سے طلوع شمس سے کچھ دیر پہلے لوٹے اور منیٰ میں رمی اور سوانٹ ذبح کیے اور ان کا گوشت پکایا اور اس میں سے کھایا پھر مکہ گئے اور طواف کیا اور سعی کی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ نے ظہر کا وقت مکہ ہی میں پایا تھا اور آپ ﷺ وقت مختار سے بغیر ضرورت کے نماز مؤخر نہیں کرتے تھے اور وہاں کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اما نوموی فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ وغیرہ سے جو حدیث منقول ہے کہ آپ علیہ السلام نے یوم نحر کو زیارت رات تک مؤخر کر دی تھی؛ تو وہ محمول ہے اس پر کہ آپ ﷺ اپنی ازواج کے ساتھ زیارت کیلئے لوٹے تھے نہ کہ طواف افاضہ کیلئے اور اس تاویل کا ہونا احادیث کے مابین مطابقت کیلئے ضروری ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ تاویل ضروری ہے مگر یہ تاویل ضروری نہیں کیونکہ اس پر نہ لفظاً کوئی دلالت ہے نہ معنی اور نہ ہی حقیقہ اور نہ مجازاً، اور اس کے ساتھ ان کے کلام کے پیش کرنے میں غرابت بھی ہے کہ آپ ﷺ زیارت کیلئے لوٹے تھے۔ پس اچھا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ آپ ﷺ نے مطلقاً رات تک تاخیر زیارت کی اجازت دی تھی یا اپنے ازواج کی زیارت کو رات تک مؤخر کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور ابن حجر کا قول کہ آپ ﷺ ان کے ساتھ صحیح نہیں۔ کیونکہ رات کو آپ ﷺ کا لوٹنا ازواج کے ساتھ ثابت نہیں، واللہ اعلم۔

قوله یغاتی علی بنی عبد المطلب..... فشرب منه:

”بنی عبد المطلب“ حرف ندا کے حذف کے ساتھ ہے ”وامر بغیة“ ركب پر عطف ہے یا حال ہے۔

”دلوا“ قاموس میں ہے الدلو معروف وقد یدکر۔

”فشرب منه“ بعض حضرات نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر زمزم کا پینا مستحب ہے۔ لیکن یہ محل بحث ہے کیونکہ آپ ﷺ سے کھڑے ہو کر پینے سے منع ثابت ہے بلکہ جس نے کھڑے ہو کر پیا اس کو حکم دیا ہے کہ وہ فی کر لے، جو اس نے پیا ہے یہاں تک کہ بعض ائمہ نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا حرام ہے۔ اور آپ ﷺ نے یا بیان جواز کیلئے پیا تھا اور عذر کی وجہ سے کہ اس جگہ کچھ تھا یا ازدحام تھا۔

تخریج: ابن ہمام صحیح فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ان کے علاوہ نے بھی روایت کیا ہے جیسا کہ ابن ابی شیبہ، ابوداؤد، نسائی، عبد بن حمید، بزاز، داری نے اپنے مسانید میں جعفر بن محمد سے اور انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ ہم جابر بن عبد اللہ کے پاس گئے تو انہوں نے لوگوں کے بارے میں پوچھا یہاں تک کہ میری باری آگئی تو میں نے کہا کہ میں محمد بن علی بن حسین ہوں، تو اس نے میرے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا پس میرے اوپر والے ہن کو کھولا پھر نچلا ہن کھولا پھر اپنی ہتھیلی میرے سینے پر رکھی اور میں ان دنوں جوان مرد تھا تو انہوں نے کہا ”مرحباً بک یا ابن اخی، سل عما شئت“ تو میں نے ان سے پوچھا اور وہ ناپینا تھے اتنے میں نماز کا وقت ہوا پس وہ اپنی چادر میں لپٹے ہوئے کھڑے ہو گئے پس ہم نے نماز پڑھی۔ پس میں نے ان سے کہا رسول اللہ ﷺ کے حج کے بارے میں ہمیں بتا۔

تو انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: ان رسول اللہ ﷺ مکث تسع سنین لم یحج۔ الحدیث: یہ بہت بڑی اصل ہے اور اس باب میں سب سے جامع حدیث ہے۔

”نصر عبده“ یعنی مقام اختصاص میں اپنے بندہ خاص کی زبردست مدد کی اور واضح فتح نصیب کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حج کا واقعہ و احرام باندھنے کا طریقہ

۲۵۵۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوُدَاعِ فَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِحَجٍّ فَلَمَّا قَدِمْنَا مَكَّةَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ أَهَلَ بِعُمْرَةٍ وَلَمْ يَهْدِ فَلْيَحْلِلْ وَمَنْ أَحْرَمَ بِعُمْرَةٍ وَأَهْدَى فَلْيَهْلُ بِالْحَجِّ مَعَ الْعُمْرَةِ ثُمَّ لَا يَحْلِلُ حَتَّى يَحِلَّ مِنْهُمَا وَفِي رِوَايَةٍ فَلَا يَحِلُّ حَتَّى يَحِلَّ بِنَحْرِ هَدْيِهِ وَمَنْ أَهَلَ بِحَجٍّ فَلْيَتِمَّ حَجَّهُ قَالَتْ فَحِضْتُ وَلَمْ أَطْفُ بِالْبَيْتِ وَلَا بَيْنَ الصَّفَاءِ وَالْمَرَوَةِ فَلَمَّ أَزَلُ حَائِضًا حَتَّى كَانَ يَوْمَ عَرَفَةَ وَلَمْ أَهْلِلْ إِلَّا بِعُمْرَةٍ فَأَمَرَنِي النَّبِيُّ ﷺ أَنْ أَنْقُضَ رَأْسِي وَأَمْتَشِطُ وَأَهْلُ بِالْحَجِّ وَأَتْرُكُ الْعُمْرَةَ فَفَعَلْتُ حَتَّى قَضَيْتُ حَجِّي بَعَثَ مَعِيَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ وَأَمَرَنِي أَنْ أَعْتَمِرَ مَكَانَ عُمْرَتِي مِنَ التَّنْعِيمِ قَالَتْ فَطَافَ الْإِدِينَ كَانُوا أَهْلُوا بِالْعُمْرَةِ بِالْبَيْتِ وَبَيْنَ الصَّفَا وَالْعُمْرَةِ ثُمَّ حَلُّوا ثُمَّ طَافُوا بَعْدَ أَنْ رَجَعُوا مِنْ مِنَى وَأَمَّا الْإِدِينَ جَمَعُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَإِنَّمَا طَافُوا طَوَافًا وَاحِدًا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۱۹/۱ حدیث رقم ۳۱۹۔ و مسلم ۸۷۰/۲ حدیث رقم (۱۲۱۱/۱۱۱)۔ و اخرجه ابو داؤد

فی السنن ۳۸۱/۲ حدیث رقم ۱۷۸۱۔ والنسائی فی السنن ۱۶۵/۵ حدیث رقم ۲۷۶۴۔ و احمد فی المسند ۱۷۷/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع میں نکلے۔ پس بعض لوگ ہم میں سے وہ تھے جنہوں نے عمرے کا احرام باندھا تھا فقط اور بعض ہم میں سے وہ لوگ تھے جنہوں نے صرف حج کا احرام باندھا تھا۔ پس جب ہم مکہ میں آئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے فقط عمرے کا احرام باندھا ہے اور ہدی ساتھ نہیں لایا پس اس کو چاہیے کہ حلال ہو جائے یعنی سر منڈائے یا بال کترانے کے ساتھ احرام سے نکل آئے اور جس نے عمرے کا احرام باندھا ہے اور ہدی بھی ساتھ لایا ہے پس اسکو چاہیے کہ عمرے کے ساتھ حج کا بھی احرام باندھے یعنی حج کو عمرے کے ساتھ داخل کرے پس قارن ہو جائے پھر احرام سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ دونوں سے حلال ہو۔ یعنی حج اور عمرے کے افعال پورے کرے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ حلال نہ ہو جب تک اپنی ہدی کو ذبح نہ کر لے۔ یعنی عید کے دن اور جس نے حج کا احرام باندھا ہے چاہے وہ ہدی ساتھ لایا ہو۔ حج کے ساتھ عمرے کا احرام باندھا ہو یا نہ باندھا ہو۔ پس اس کو چاہیے کہ وہ اپنا حج پورا کرے مگر جس شخص کو حج کے ساتھ عمرہ کرنے کا حکم کیا گیا ہو وہ پورا نہ کرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حائضہ ہوئی اور میں نے عمرے کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف بھی نہیں کیا تھا اور نہ ہی میں صفا اور مروہ میں گئی تھی۔ اس لیے کہ سعی طواف سے قبل درست نہیں ہے۔ ورنہ حیض کی حالت میں سعی منع نہیں ہے پس میں حیض کی حالت میں مبتلا رہی۔ یہاں تک کہ عرفہ کا دن آ گیا اور میں نے عمرے کے علاوہ احرام نہیں باندھا تھا۔ پس مجھ کو نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا یہ کہ میں اپنا سر کھولوں اور میں کنگھی کروں یعنی میں عمرے کے احرام سے نکلوں اور ان چیزوں کو مباح کروں جو احرام کی وجہ سے مجھ پر حرام ہوئی تھیں اور حج کا احرام

باندھوں اور میں سمرے کو چھوڑ دوں پھر جب فارغ ہو جاؤں حج سے تو عمرے کے احرام کی قضا کروں پس میں نے یہ کام کیا یہاں تک کہ میں نے اپنا حج ادا کیا تو میرے ساتھ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمن رضی اللہ عنہ (میرے بھائی) کو اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے عمرے کے بدلے تعمیم سے عمرہ کروں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان شخصوں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا کہ جنہوں نے عمرے کا احرام باندھا تھا۔ یعنی عمرے کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ پھر احرام سے نکلے اور پھر اس کے بعد اور طواف کیا پھر منیٰ سے مکہ کی طرف تشریف لے آئے اور یہ طواف حج کے لیے کیا۔ اس کو طواف افاضہ کہتے ہیں اور جن شخصوں نے حج اور عمرے کو جمع کیا تھا۔ پس اس کے علاوہ انہوں نے ایک طواف نہیں کیا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: خرجنا مع رسول الله ﷺ في حجة الوداع:

قوله: فمننا من اهل بعمره..... بحج:

”فقال رسول الله ﷺ“ ایک نسخہ میں فقال ہے اور وہ ہی زیادہ ظاہر ہے۔

”ولم يهد“ یہ اهداء سے ہے یعنی ان کے پاس قربانی کا جانور نہ ہو۔

”فليحلل“ یاء کے فتح اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی احرام سے نکلے حلق یا قصر کرنے کے ساتھ۔

”فلا يحل“ نفی کے ساتھ ہے اور نہی کا بھی احتمال ہے۔

مکہ کے قریب ایک جگہ ہے مکہ اور اس کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ ہے۔

امور نحویہ: ”ففعلت حتى قضيتها“ بعض کا کہنا ہے کہ یہ جملہ استنافیہ ہے۔ یہ علامہ طیبی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”لما

قدمنا“ کیلئے جواب ہو اور ”فقال“ فاء کے ساتھ یا واو کے ساتھ عطف ہو۔

”عمرتی“ منصوب ہے بنا پر مصدریت۔ یہ ابن الملک کا قول ہے۔

”من التنعيم“ اعتمر کے متعلق ہے۔

”بالبيت“ طاف کے متعلق ہے۔

”وبين الصفا والمروة“ طواف سے مراد ”دور“ گھومنا ہے جو کہ سعی کو بھی شامل ہے تو عطف درست ہے پس عامل کے مقرر

ماننے اور اس کو ”علفنتها تبنا و ماء باردًا“ کی قبیل سے ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

”فليهل بالحج مع العمرة“ مطلب یہ ہے کہ حج کو عمرہ میں داخل کرے تاکہ قارن بن جائے۔

”ثم لا يحل الخ“ یعنی پھر احرام سے نہیں نکلے گا اور نہ ہی اس کیلئے ممنوع چیزوں میں سے کوئی چیز حلال ہوگی۔ یہاں تک کہ حج

اور عمرہ دونوں مکمل کر لے۔

”حتى يحل بنحر هديه“ یعنی عید کے دن کیونکہ اس سے پہلے قربانی کے جانور کو ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ، حدیث کے الفاظ، ومن احرم بعمره واهدى کو ان الفاظ کے ساتھ وفي رواية ”حتى يحل

بنحر هديه“ ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کا جانور ساتھ لے گیا تو وہ احرام سے نہیں نکل سکتا یہاں

تک کہ اس جانور کو ذبح کر دے۔

اور امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ احرام سے نکل جائے گا جب وہ طواف کر لے اور سعی کر لے اور سر منڈا لے۔

اور پہلی روایت یعنی جس میں فلیہل بالحج مع العمرة، دلالت کر رہی ہے کہ آپ ﷺ نے عمرہ ادا کرنے والے کو حکم دیا تھا کہ وہ حج کو عمرہ کے ساتھ ملائیں۔ پس وہ حلال نہ ہوگا مگر اس ہدی کے نخر کرنے کے ساتھ۔ پس لازم ہے اس دوسری روایت کو پہلی روایت پر محمول کرنا کیونکہ قصہ ایک ہے (انہی)۔ اور اگر وہی روایۃ افلا یحل، کوئم لا یحل کی جگہ رکھنا درست ہو جائے تو اشکال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور حنفیہ کیلئے استدلال کرنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں کہ پہلی روایت اس قابل ہے کہ اس کو دوسری پر حمل کیا جائے نہ کہ اس کا عکس جیسا کہ ظاہر ہے اور اس کی تحقیق پہلے نثر چکی ہے۔

”ولا بین الصفا والمروة“ یعنی زمین میں صفا اور مروہ کے مابین سعی کی کیونکہ سعی صحیح نہیں ہے مگر طواف کے بعد ورنہ حیض سعی سے مانع نہیں ہے۔

”فامرني النبي ﷺ“ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے عمرہ کے احرام سے نکلنے کا حکم دیا اور یہ کہ میں عمرہ چھوڑ دوں، عمرہ کے ممنوعات کو جائز کرنے کے ساتھ جیسے کٹھی وغیرہ کرنا۔ بوجہ عمرہ پر حیض کی وجہ سے قدرت نہ ہونے کے۔ اور علامہ طینی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا عمرہ کے احرام سے نکلنے اور منظورات احرام کے استباحہ کا اور یہ کہ اس کے بعد میں حج کا احرام باندھوں اور جب میں حج سے فارغ ہو جاؤں تو عمرہ کا احرام باندھوں عمرہ کے قضاء کرنے کیلئے۔ اور یہ مطلب زیادہ واضح ہے۔

اس حدیث سے استدلال کیا ہے امام ابو حنیفہ نے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کو عمرہ مکمل طور پر چھوڑنے کا حکم دیا، بلکہ عمرہ کے افعال کے ترک کا حکم دیا تھا یعنی طواف سعی وغیرہ کو۔ اور حج کو عمرہ میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا تا کہ قارن ہو جائے۔ ”ملا علی قاری فرماتے ہیں“ کہ قارن منظورات کو مباح نہیں بتاتا۔ پھر امام شافعی نے فرمایا ہے کہ حج سے فراغت کے بعد جو انہوں نے عمرہ کیا تھا تو وہ نفل تھا ان کے طیب نفس کیلئے تھا تا کہ وہ یہ گمان نہ کرتی کہ عمرہ کے ترک کرنے سے اس کے اعمال میں کمی آگئی ہے۔ ”ملا علی قاری فرماتے ہیں“ کہ حاشا وکلا کہ وہ یہ گمان کیسے کر سکتی تھی حالانکہ آپ ﷺ خود قارن تھے۔ اور اس کے ساتھ شوافع داخل افعال کے بھی قائل ہیں۔

”فانما طافوا طوافاً واحداً“ یعنی یوم نحر کو حج و عمرہ دونوں کیلئے ایک ہی طواف کیا اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے اور ہمارے نزدیک قارن کیلئے دو طواف لازم ہیں ایک وقوف عرفہ سے پہلے عمرہ کیلئے اور ایک اس کے بعد حج کیلئے۔ اسی طرح اس کو ذکر کیا۔ ہے ابن الملک رحمہ اللہ نے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ قارن تھے جیسا کہ نووی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور حدیث جابر میں صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب مکہ آئے تو طواف کیا اور طواف زیارت وقوف عرفہ کے بعد کیا۔ تو پھر صحابہ کا طواف دونوں کیلئے ایک سا ہوا حالانکہ وہ نبی ﷺ کی مخالفت نہیں کیا کرتے تھے؟

پس اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی ان خصوصیات میں سے ہے جو بعض صحابہ کے ساتھ متعلق ہے، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ منی سے واپسی پر انہوں نے حج کیلئے ایک ہی طواف کیا کیونکہ وہ اس سے پہلے ایک طواف کر چکے تھے۔ تو ”واحداً“ تاکید ہے وقوف کے بعد قارن کے متعدد طواف کرنے کے وہم کو دور کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔ پس حضرت عائشہ کا مراد اس طواف سے فرض طواف ہے اور اس سے پہلے جو طواف تھا وہ طواف قدوم اور تحیہ تھا جو کہ بالاتفاق سنت ہے، یا اس سے مراد عمرہ کا فرض طواف ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قارن دو طواف کرے گا اور دومرتبہ سعی کریگا۔ ہمارے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس حدیث کی وجہ سے: ان

النبی ﷺ کان قارناً فطاف طوافین وسعی سعیین اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس طرح اس کو روایت کیا ہے عمران بن حصین، علی اور عبداللہ ابن مسعود سے۔ القارن یطوف طوافین ویسعی سعیین اس کو علامہ طحاوی نے ذکر کیا ہے۔

حدیث مذکورہ میں حضور ﷺ کے متمتع اور قارن ہونے کا ذکر

۲۵۵۷: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ تَمَتَّعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوُدَّاعِ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَسَاقَ مَعَهُ الْهُدْيَ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ وَبَدَأَ أَهْلًا بِالْعُمْرَةِ ثُمَّ أَهَلَ بِالْحَجِّ فَتَمَتَّعَ النَّاسُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَكَانَ مِنَ النَّاسِ مَنْ أَهْدَى وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ يَهْدِ فَلَمَّا قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ قَالَ لِلنَّاسِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ أَهْدَى فَإِنَّهُ لَا يَحِلُّ مِنْ شَيْءٍ حَرَمٍ مِنْهُ حَتَّى يَقْضِيَ حَجَّهُ وَمَنْ لَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَهْدَى فَلْيُطْفِئِ بِالْبَيْتِ وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَلْيُقْصِرْ وَلْيَحْلِلْ ثُمَّ لِيَهْلِ بِالْحَجِّ وَلِيَهْدِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ هَدْيًا فَلْيُصِمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةَ إِذَا رَجَعَ إِلَى أَهْلِهِ فَطَافَ حِينَ قَدِمَ مَكَّةَ وَاسْتَلَمَ الرُّكْنَ أَوَّلَ شَيْءٍ ثُمَّ نَحَبَ ثَلَاثَةَ أَطْوَافٍ وَمَشَى أَرْبَعًا فَرَكَعَ حِينَ قَضَى طَوَافَهُ بِالْبَيْتِ عِنْدَ الْمَقَامِ رَكَعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَانْصَرَفَ فَاتَى الصَّفَاءَ وَالْمَرْوَةَ سَبْعَةَ أَطْوَافٍ ثُمَّ لَمْ يَحِلْ مِنْ شَيْءٍ حَرَمٍ مِنْهُ حَتَّى يَقْضِيَ حَجَّهُ وَنَحَرَ هَدْيَهُ يَوْمَ النَّحْرِ وَأَقَاضَ فَطَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ حَلَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ حَرَمٍ مِنْهُ وَقَعَلَ مِثْلَ مَا فَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَاقِ الْهُدْيِ مِنَ النَّاسِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۳۹۱۳ حدیث رقم ۱۶۹۱۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۰۱۲ حدیث رقم (۱۷۴-۱۲۲۷)۔

وابوداؤد فی السنن ۳۹۷۱۲ حدیث رقم ۱۸۰۵ والنسائی ۱۵۱۱۵ حدیث رقم ۲۷۳۲۔ واحمد فی المسند ۱۳۹۱۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع میں عمرے کے ساتھ حج میں فائدہ اٹھایا۔ یعنی سب سے پہلے عمرے کا احرام باندھا اور پھر حج کا اور پھر اپنے ساتھ ذی الحلیفہ سے ہدی لے کر چلے جو کہ ایک جگہ کا نام ہے۔ حضور ﷺ نے وہاں سے احرام باندھا تھا اور شروع فرمایا پھر احرام باندھا عمرے کا اور پھر حج کا احرام باندھا۔ پس لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ عمرے کو حج کے ساتھ کر کے متمتع کیا۔ یعنی عمرے کے ساتھ ملایا۔ پس بعض لوگوں میں یہ بھی تھے کہ جنہوں نے عمرے کا احرام باندھا تھا ان میں بعض ہدی لائے تھے اور بعض ان میں وہ تھے کہ وہ ہدی نہیں لائے تھے۔ پس جب کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں تشریف لائے تو لوگوں کے لیے حکم فرمایا یعنی عمرہ کرنے والوں کے لیے جو تم میں سے ہدی لے کر آیا ہے پس وہ حلال نہ ہو کسی چیز سے اور وہ باز رہے۔ یعنی احرام سے نہ نکلے یہاں تک کہ حج کر لے اور جو شخص تم میں سے ہدی لے کر نہ آئے ہو وہ جانہ کعبہ کا طواف کرے۔ یعنی عمرے کا طواف کرے اور صفا اور مروہ کی سعی کرے اور بال کتروائے اس کو چاہیے کہ وہ عمرے کے احرام سے نکلے یعنی جو چیزیں منع تھیں احرام میں اب وہ مباح ہو گئیں پھر حرم کی زمین سے حج کا احرام باندھے اور یوم نحر کو ہدی ذبح کرنے احرام کرے حج کے ساتھ یعنی حرم کی زمین سے اور ہدی ذبح کرے یعنی نحر کے دن رمی جمار کے بعد سر منڈانے سے پہلے کہ متمتع کے لیے شکرگزاری کے لیے واجب ہے۔ اس نعمت کی کہ حج اور عمرہ کو ادا کرنے کی توفیق ہوئی پس جو شخص ہدی نہ پائے پس چاہیے کہ حج کے ایام میں تین دن روزے رکھے یعنی حج کے مہینوں میں احرام کے بعد نحر کے دن سے پہلے تین روزے

رکھے اور افضل یہ ہے کہ ساتویں آٹھویں نوں کو رکھے اور سات دن جب کہ اپنے اہل والوں کی طرف پھرے یعنی لوٹے۔ یعنی صبح کے افعال سے فارغ ہو جائے اگرچہ مکہ میں ہوں پھر حضور ﷺ نے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ جب کہ مکہ میں آئے یعنی عمرے کا طواف کیا اور لہیک کہنے کے بعد حجر اسود کو بوسہ دیا پھر تین مرتبہ طواف میں جلدی جلدی اکڑ کر چلے اور چار مرتبہ اپنی چال چلے۔ یعنی ایک بار جو خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ اس کو شوط کہتے ہیں پس سات شوط بطور مذکور ہے اور سات شوط کا ایک طواف ہوتا ہے۔ پھر مقام ابراہیم کے نزدیک دو رکعت نماز پڑھی۔ اس وقت اس نے اپنا طواف پورا کیا پھر سلام پھیرا۔ یعنی صلوٰۃ الطواف پڑھی کہ وہ ہمارے نزدیک واجب ہے پھر خانہ کعبہ سے اور صفا پر آئے آپ نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے پھر کسی چیز سے حلال نہ ہوئے کہ باز رہے تھے اس چیز سے یعنی احرام سے نہ نٹے۔ یہاں تک کہ اپنا حج پورا کیا اور اپنی ہدی قربانی کے دن یعنی دس ذی الحجہ کو ذبح کی۔ پس اب حلق کے ساتھ حلال ہوئے ہر چیز سے سوائے جماع کے اور منی سے چل کر مکہ میں آئے پھر خانہ کعبہ کا طواف کیا یعنی طواف افاضہ پھر ہر چیز سے حلال ہو گئے کہ روکا ہوا تھا اپنے آپ کو اس چیز سے یعنی اب جماع کرنا بھی حلال ہو گیا اور اس چیز کی طرح کیا۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس شخص کی طرح کیا جو نبی کریم ﷺ کی طرح ہدی لے کر آیا تھا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

اختلاف نسخ: ”فاتی الصفا“ ایک نسخ میں والمرؤۃ بھی ہے۔

امور نحویہ: ”عند المقام“: زکع کے متعلق ہے۔

تشریح: اس حدیث میں تمتع سے مراد تمتع لغوی ہے جو کہ آخر میں قرآن ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے حج کا احرام باندھا پھر عمرہ کا احرام باندھا تو قارن ہو گئے۔ اور احادیث میں تطبیق کیلئے اس تاویل کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔ یہ علامہ طیبی نے ذکر کیا ہے۔ اور اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا اور پھر حج کا اور اس پر یہ الفاظ ”وبدا فاهل بعمرة الخ“ دلالت کر رہے ہیں اور یہ ادخال اس کے عکس سے افضل ہے مگر احادیث میں صراحتہ وارد ہے کہ آپ نے حج کا احرام باندھا پھر عمرے کا۔ پس اس ادخال کی طرف کیسے جایا جاسکتا ہے؟ اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو یہ معارض ہے۔ پس اس کا جواب یہ ہے کہ حج فرض ہونے کے بعد آپ ﷺ نے اول وھلہ میں عمرہ سے ابتداء نہیں کی کیونکہ آپ نے ہجرت کے بعد کئی مرتبہ عمرہ ادا کیا تھا۔ پس صحیح یہ ہے کہ آپ ﷺ اول ہی سے قارن تھے اور حضرت عائشہ کے اس قول فاهل بالعمرة کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جب دونوں عبادتوں کو جمع کیا تو ذکر میں عمرہ کو حج پر مقدم کیا۔ کیونکہ قرآن میں مسنون طریقہ یہی ہے نہ کہ اس کا عکس۔ پھر اکثر آپ کے احرام میں حج کا ذکر ہوتا ہے کیونکہ حج اصل اور فرض ہے اور عمرہ تابع اور سنت ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کے فعل کو دو عبادتوں پر حمل کرنا ایک عبادت پر حمل کرنے سے اولیٰ ہے۔

”ولیقصر“ یعنی حج سے حلال ہونے کیلئے کچھ بال کو باقی رکھتے ہوئے قصر کر لے۔

”ثلاثة ایام فی الحج“ یعنی حج کے مہینوں میں اور افضل یہ ہے کہ اس کا آخری دن یوم عرفہ ہے۔

”وسبعة اذا رجع الی اھله“ یہ توسعاً ہے ورنہ اگر ایام تشریق کے بعد مکہ میں یہ روزے رکھ لے تو بھی جائز ہے، ہمارے

نزدیک۔

”ثم خب“ یعنی تین چکروں میں رمل کیا ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ اپنے نفس اور اپنے صحابہ میں قوت اور مردانگی کے اظہار کیلئے

کیا تاکہ کفار یہ گمان نہ کریں کہ یہ لوگ عاجز اور کمزور ہیں۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کے فعل کی علت تھی۔ عمرۃ القضاء میں اور پھر زوال علت کے بعد یہ سنت مستمرہ ٹھہرا۔ مزید احادیث: ابو داؤد نے اسماء بنت ابی بکر سے روایت کی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کیلئے نکلے یہاں تک کہ جب ہم عرج میں تھے تو رسول اللہ ﷺ وہاں ٹھہرے اور ہم بھی ٹھہرے تو عائشہ، رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں بیٹھی اور میں ابو بکر کے پہلو میں بیٹھی۔ اور حضرت ابو بکر اور رسول اللہ ﷺ کی سواری ایک تھی جو ابو بکر کے غلام کے پاس تھی۔ پس ابو بکر اس کے آنے کے انتظار میں بیٹھے۔ پس وہ آگئے اور ان کے پاس اونٹ تھا تو ابو بکر نے پوچھا تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ تو اس نے کہا کہ وہ تو رات گوم ہو گیا ہے تو ابو بکر نے کہا کہ ایک ہی اونٹ تھا وہ بھی تو نے گم کر دیا۔ میں نے اس کو مارنا شروع کر دیا اور رسول اللہ ﷺ مسکرا رہے تھے اور فرما رہے ”انظروا الیٰ ہذا المحرم ما یصنع“ اور اس سے زائد کچھ نہیں کہہ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ اس میں ان لوگوں کی قول کی تقویت ہے جو کہتے ہیں ”تمام حج ضرب الجمال“۔

کیونکہ یہ صدیق کی سنت ہے حضور ﷺ کے سامنے کہ انہوں نے ابو بکر کو منع نہیں کیا، اور جب آپ ﷺ ابواء اور ودان مقام پر پہنچے تو صعب بن جشمہ نے آپ کو وحشی گدھا ہدیہ کیا تو آپ ﷺ نے ان کو واپس کر دیا جب آپ ﷺ نے ان کے چہرے پر تبدیلی کے آثار دیکھے تو آپ ﷺ نے فرمایا ”انا لم نرد علیک الا انا حرم“ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔ اور ایک اور روایت میں ہے کہ وہ وحشی گدھے کا بعض حصہ تھا جس سے خون نپک رہا تھا اور بعض نے اس حصہ کو متعین کیا ہے کہ وہ پچھلا حصہ تھا۔ اور ایک روایت میں ہے اس کا ایک ٹکڑا تھا۔ یہ بھی وغیرہ نے اس کی تطبیق یوں کی ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کو ایک گدھا ہدیہ کیا اور کچھ ذبح کیا ہوا گوشت ہدیہ کیا تھا۔ تمام روایت اس پر متفق ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو واپس لوٹایا تھا۔ سوائے اس روایت کے جو ابن وہب اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے کہ ”انہ اهدای لہ عجز حمار وحشی وهو بالجحفۃ، فاکل منہ“ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ محفوظ ہے تو شاید کہ آپ ﷺ نے گوشت کو قبول کیا ہوا اور زندہ کو لوٹایا ہو، کیونکہ وہ شکار تھا۔ اور گوشت کو کبھی اس لے لوٹایا کہ وہ ان کیلئے شکار کیا تھا اور کبھی قبول کیا کہ جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ یہ آپ ﷺ کیلئے شکار نہیں کیا ہے۔ اور اس کو اس پر بھی حمل کیا جاسکتا ہے کہ یہ آپ ﷺ نے مکہ سے واپس پر لوٹایا تھا اور واپسی کے وقت آپ محرم نہ تھے پس عدم قبول کا تصور نہیں ہو سکتا۔

قرطبی فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے ذبح شدہ گدھا حاضر کیا ہوا اور پھر آپ ﷺ کے سامنے اس سے ایک ٹکڑا کاٹا ہو، اور آپ کو پیش کیا ہو، پس جس نے کہا ہے کہ اهدای حمار تو انہوں نے ابتداء امر اولیا ہے اور جس نے کہا ہے بعضہ تو انہوں نے جو پیش کیا تھا وہ مراد لیا ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے زندہ گدھا دیا ہو لیکن جب آپ ﷺ نے اس کو واپس لوٹا دیا تو انہوں نے اس کو ذبح کر کے اس کا کچھ حصہ آپ ﷺ کے پاس لایا ہو اس خیال سے کہ واپس لوٹانا کسی خاص وجہ سے تھا جو اس پورے میں تھا تو آپ ﷺ نے اس کو منع کرنے سے ان کو بتلایا کہ جزء کا حکم وہی ہے جو کل کا ہے۔ اور جب تک روایت میں تطبیق ممکن ہو تو یہ بہتر ہے اس سے کہ اس کو بعض ردا ت کا وہم قرار دیا جائے (آئی)

لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ کل زندہ کا حکم جزء کے حکم کا مغایر ہے کیونکہ اول شکار ہے اس کا پکڑنا جائز نہیں ہے۔ اور جزء میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس کیلئے شکار کیا ہو تو پھر ناجائز ہے اور اگر اس کیلئے شکار نہ کیا ہو تو حلال ہے۔ صحابہؓ کی ایک جماعت نے فرمایا ہے کہ محرم کیلئے شکار کا گوشت کسی بھی طریقے سے جائز نہیں ہے ان کا استدلال صعب کے قصہ سے ہے اور جمہور نے مسلم کی حدیث کو لیا ہے کہ آپ

نے اس شکار کے بارے میں جو ابوقتادہ نے صحابہ کیلئے کیا تھا اور ابوقتادہ حلال اور دیگر صحابہ احرام میں تھے فرمایا تھا ”ہو حلال فکلوه“ اور ایک روایت میں ہے ”هل معکم منہ شیء؟“ تو صحابہ نے کہا کہ ہمارے پاس اس کی ٹانگ ہے تو آپ ﷺ نے وہ لے کر کھالی۔

حج کے مہینوں میں عمرے کا جواز

۲۵۵۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَذِهِ عُمْرَةٌ اسْتَمْتَعْنَا بِهَا فَمَنْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَهُ الْهَدْيُ فَلْيَحِلَّ الْحِلَّ كُلَّهُ فَإِنَّ الْعُمْرَةَ قَدْ دَخَلَتْ فِي الْحَجِّ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۱۱/۲ حدیث رقم (۲۰۳۔ ۱۲۴۱)۔ والنسائی فی السنن ۱۸۱/۵ حدیث رقم ۲۸۱۵۔
والدارمی ۷۲/۲ حدیث رقم ۱۸۵۶۔ واحمد فی المسند ۲۳۶/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ عمرہ ہے ہم نے اس کے ساتھ فائدہ اٹھایا پس وہ شخص جس کے پاس ہدی نہ ہو اس کو چاہیے کہ حلال ہو جائے اس لیے کہ عمرہ کرنا حج کے مہینوں میں قیامت کے دن تک داخل ہوا ہے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے اور یہ بات دوسری فصل سے خالی ہے۔

تشریح: قوله: هذه عمرة استمتعنا بها: یہاں استمتاع سے مراد عمرہ مقدم کر کے اس سے فارغ ہونا ہے ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ تمتع تھے۔ اور آپ ﷺ کے استمتاع کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حج پر عمرہ کو مقدم کیا اور عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد محظورات احرام کو مباح کیا یہاں تک کہ اس کے بعد حج کا احرام باندھا۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ مطلب خطاء ہے اور اجماع کا مخالف ہے اور اس کے ساتھ آپ ﷺ نے عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد محظورات احرام کو مباح بھی نہیں جانا تھا اور نہ ہی اس کا ارتکاب کیا تھا۔ پھر ابن الملک نے فرمایا ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ قارن تھے تو وہ استمتعنا کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ استمتاع آپ کے صحابہ میں سے کسی نے کیا تھا اور آپ نے ان کے فعل کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ آپ امر تھے (آئی) لیکن یہ ایسا تکلف ہے جس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں استمتاع سے مراد استمتاع لغوی ہے بمعنی انقاع کے جیسا کہ ما قبل میں گزرا۔

قوله:: ”فليحل“ یاء کے فتح اور حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں فليحل حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔
”الحل“ منضوب ہے بنا بر مصدریت اور ”كله“ اس کیلئے تاکید ہے۔

قوله: فان العمرة الى يوم القيامة:

ابن الملک فرماتے ہیں یعنی حج کے مہینوں میں عمرہ کا حج میں داخل ہونا اس سال کے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ ہر سال جائز ہے۔

وَهَذَا الْبَابُ خَالَ عَنِ الْفُصْلِ الثَّانِي: ”اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے۔“

الفصل الثالث:

احرام کی تبدیلی کے حکم پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تامل

۲۵۵۹: وَعَنْ عَطَاءٍ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ فِي نَاسٍ مَعِيَ قَالَ أَهْلَلْنَا أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ ﷺ

بِالْحَجِّ خَالِصًا وَحَدُّهُ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ صُبْحَ رَابِعَةٍ مَضَتْ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ فَأَمَرَنَا أَنْ نَحِلَّ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ حَلُّوْا وَأَصِيْبُوا النِّسَاءَ قَالَ عَطَاءٌ وَلَمْ يَزِمْ عَلَيْهِمْ وَلَكِنْ أَحَلَّهُنَّ لَهُمْ فَقُلْنَا لِمَا لَمْ يَكُنْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ عَرَفَةَ إِلَّا خَمْسٌ أَمَرْنَا أَنْ نُفِضِيَ إِلَى نِسَائِنَا فَنَأْتِيَ عَرَفَةَ نَقْطُرُ مَذَاكِيرُنَا الْمَنِيَّ قَالَ يَقُولُ جَابِرٌ بِيَدِهِ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى قَوْلِهِ يَحِرُّ كُهَا قَالَ فَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ فِينَا فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُمْ أَيَّ اتِّقَاكُمْ لِلَّهِ وَأَصَدَّكُمْ وَأَبْرُكُمْ وَلَوْ لَا هَذَا لَحَلَلْتُ كَمَا تَحِلُّونَ وَلَوْ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ لَهُ اسْقَى الْهَدْيَ فَحَلُّوْا فَحَلَلْنَا وَسَمِعْنَا وَأَطَعْنَا قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ عَلَيَّ مِنْ سَعَائِتِهِ فَقَالَ بِمِ اهْلَلْتُ قَالَ بِمَا أَهَلَّ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَهْدِ وَأَمْكُثْ حَرَامًا قَالَ وَأَهْدِي لَهُ عَلَيَّ هَدْيًا فَقَالَ سَرَّاقَةٌ بِنُ مَالِكِ بْنِ جُعْشَمٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ الْعَامِنَا هَذَا أَمْ لَا بَدَّ قَالَ لَا بَدَّ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۸۳/۲ حديث رقم (۱۴۱-۱۲۱۶)۔ والنسائي في السنن ۱۷۸/۵ حديث رقم ۲۸۰۵۔ وابن ماجه ۹۹۲/۲ حديث رقم ۲۹۸۰۔ واحمد في المسند ۱۷۵/۴۔

ترجمہ: حضرت عطاء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے سنا میرے ساتھ سننے میں بہت سے آدمی شریک تھے۔ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے یعنی نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے حج کا خالص تر یعنی صرف حج کا بغیر عمرے کے احرام باندھا۔ عطاء نے کہا کہ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ذی الحجہ کی چوتھی تاریخ کی صبح کو تشریف لائے۔ پس ہم کو حکم کیا کہ حلال ہو جائیں۔ عطاء کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حلال ہو جاؤ اور عورتوں کے پاس جاؤ یعنی ان سے صحبت بھی کرو۔ عطاء فرماتے ہیں کہ صحبت کرنی ان پر واجب نہیں ہے لیکن عورتیں ان کے لیے حلال ہیں امر و زوجہ کے لیے تھا اور صحبت کرنے کا حکم اباحت کے لیے ہے ہم نے بطور تعجب کے کہا جب کہ ہمارے درمیان اور عرفہ کے درمیان پانچ راتیں تھیں ہم کو حکم کیا کہ ہم اپنی بیویوں سے صحبت کریں پھر میدان عرفات میں حاضر ہوں۔ اس حالت میں کہ ہمارے عضو مخصوص منی کو پڑکار ہے ہوں۔ یعنی جماع کے قریب ہوئے ہوں اور اس کو جاہلیت میں عیب شمار کرتے تھے اور حج میں باعث نقصان سمجھتے تھے عطاء نے کہا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ کے ساتھ اشارہ کیا گویا کہ میں ان کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھ رہا ہوں اور وہ اپنے ہاتھ کے ساتھ ہلاتے تھے۔ پس جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان خطبہ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہاری نسبت خدا سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں اور تم میں سے زیادہ سچا ہوں۔ اور تم میں سے زیادہ نیک ہوں اور اگر میرے ساتھ ہدی نہ ہوتی البتہ میں حلال ہو جاتا جیسے کہ تم حلال ہوئے اور اگر میں اپنے کام کو پہلے سے جانتا ہوتا اس چیز کو جو میں نے بعد میں جانا تو میں ہدی کو نہ لاتا جینی اگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا احرام سے نکلنا ایسا شاق ہوگا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور میں بھی احرام سے نکل آتا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا حلال ہو جاؤ تو پھر ہم حلال ہوئے اور ہم نے سنا اور طاعت کی۔ عطاء کہتے ہیں کہ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے کام سے آئے جو یمن کے قاضی بن کر گئے تھے وہاں سے آئے پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کس چیز کے ساتھ تم نے احرام باندھا۔ کہا اس چیز کے ساتھ احرام باندھا جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے احرام باندھا تو حضور ﷺ نے ان کو ارشاد

فرمایا کہ یوم نحر کو ہدی ذبح کرنا جو کہ قارن کے لیے واجب ہے اور حالت احرام میں ٹھہرے رہو۔ اب جیسے کہ میں نے کہا ہے جابر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ حضور ﷺ کے لیے ہدی لے کر آئے یا اپنے لئے ہدی لے کر آئے پس سراقہ بن مالک بن عجم یعنی مالک کے بیٹے سراقہ نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا اس سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے؟ یعنی عمرے کا جائز ہونا حج کے مہینوں میں اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے۔

اختلاف نَحْ: ”امرنا“ ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

حل لغات: ”حلوا“ حاء کے کسرہ اور لام کے شد کے ساتھ ہے۔

تشریح: ”ذی الحجۃ“ حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے نہ کہ اس کے غیر کے ساتھ۔

”سعیۃ“ سین کے کسرہ کے ساتھ ہے ”نفضی“ افضاء سے ہے فصل کے معنی میں ہے۔

امور نحویہ: ”اصحاب محمد ﷺ“ منصوب بالا اختصاص ہے یا یہاں فعل مقرر کی وجہ سے منصوب ہے۔

”فنائی“ مرفوع ہے۔

”تقطر مذا کیرنا المنی“ جملہ حالیہ ہے۔

”ما استدبرت“ ما موصول ہے مفعول ہونے کی وجہ سے محلا منصوب ہے۔

امور بلاغۃ: ”وأصبوا النساء“ تخصیص بعدا تعمیم ہے اہتمام کیلئے اور تخصیص ہے ابھام سے دفع ایہام کیلئے۔

”بیدہ یحر کہا“ شاید کہ مذا کیر کے حرکت کو تشبیہ دینے کا ارادہ کیا ہو تو حرکت کے ساتھ یا ان کے اور عرفہ کے درمیان قلت مدت کی طرف اشارہ ہے۔ یا اشارہ ہے ان لوگوں پر نکیر کرنے اور ان پر اظہار افسوس کی طرف۔

”بالحج خالصاً وحده“ حضرت جابر کے گمان کے مطابق ہے ورنہ پہلے گزر چکا ہے کہ بعض صحابہ نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ یا اصحاب سے مراد اکثریت ہے یا بعض صحابہ مراد ہیں یا وہ مراد ہے جو ہدی ساتھ لے کر نہیں گئے تھے اور یہ وجہ زیادہ واضح ہے۔ اور حضرت جابر نے آپ ﷺ کے حج سے سکوت اختیار کیا ہے تو اس کو حمل کیا جائے گا کہ آپ ﷺ قارن تھے۔

”ولکن احلہن لہم“ یعنی جماع ان کیلئے عزیمت نہیں قرار دیا بلکہ رخصت قرار دیا برخلاف فسخ کے کہ وہ عزیمت تھا پس

”حلوا“ کا امر وجوب کیلئے ہے اور اصبوا کا امر اباحت یا استحباب کیلئے ہے۔

”ان نفضی الی نسائنا“ یہ کہنا یہ ہے جماع سے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وقد افضیٰ بعضکم الی بعض﴾ [النساء: ۲۱]

حالانکہ تم باہم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو۔

”تقطر مذا کیرنا.....“ قرب جماع سے کنایہ ہے اور زمانہ جاہلیت میں یہ عیب تھا کہ وہ لوگ اس کوچ میں نقصان کا باعث

سمجھتے تھے۔

”سعیۃ“ یعنی یمن میں قضاء وغیرہ کے عوض میں جو ملا تھا اس میں سے لے کر آئے تھے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ ارباب

صدقات سے صدقات وصول کرنے کے عوض جو کچھ ملا تھا اس میں سے ہدی لے کر آیا اور اسی سے ہے کہ عامل زکوٰۃ کو ساعی کہتے ہیں۔

اور دونوں باتیں جمع ہونے سے کوئی مانع نہیں ہے۔

”العامننا هذا.....“ یعنی عمرہ کا حج کے مہینوں میں جو از یاجح کا عمرہ کی طرف فسخ کرنا اس سال کے ساتھ خاص ہے یا ہمیشہ کیلئے

ہے؟ اور پہلا جمہور کا قول ہے اور ثانی امام احمد کا قول ہے۔

احرام کی تبدیلی حکم پر لوگوں کا متردد ہونا

۲۵۶۰: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَآ رُبْعَ مَضِينَ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ أَوْ خَمْسٍ فَدَخَلَ عَلَيَّ وَهُوَ غَضَبَانٌ فَقُلْتُ مَنْ أَغْضَبَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَدْخَلَهُ اللَّهُ النَّارَ قَالَ أَوْ مَا شَعَرْتُ أَنِّي أَمَرْتُ النَّاسَ بِأَمْرٍ فَإِذَا هُمْ يَتَرَدَّدُونَ لَوْ إِنِّي اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا سَقَّتْ الْهُدَىٰ مَعِيَ حَتَّىٰ اشْتَرَيْتَهُ ثُمَّ أَحَلَّ كَمَا حَلُّوا - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۷۹/۲ حديث رقم (۱۳۰ - ۱۲۱۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ذی الحجہ کی چوتھی تاریخ گزری تھی تو تشریف لائے یا پانچویں تاریخ پھر آئے میرے پاس اس حالت میں کہ غصے میں تھے پس میں نے کہا کس نے غصہ دلایا آپ ﷺ کو اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ اس کو آگ میں داخل کرے فرمایا کیا تو نہیں جانتی ہے کہ تحقیق میں نے حکم کیا لوگوں کو یعنی بعضوں کو ایک کام کا پھر وہ متردد کرتے ہیں اور اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتی وہ چیز جو میں نے بعد میں جانی تو میں اپنی ہدی اپنے ساتھ نہ لاتا۔ یہاں تک کہ میں اس کو کے میں خریدتا یا راستے سے پھر حلال ہو جاتا جس طرح لوگ حلال ہوتے اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: قدم رسول اللہ ﷺ لآ ربیع لاریع..... او خمس:

قولہ: وهو غضبان: "وہو غضبان" یعنی غصے سے بھرے ہوئے تھے جب بعض صحابہ نے حج کو عمرہ کی طرف فتح کرنے میں تاخیر کی۔ مشہور علتوں میں سے کسی علت کی وجہ سے۔

بَابُ دُخُولِ مَكَّةَ وَالطَّوَافِ

مکہ میں داخل ہونے اور طواف کرنے کا بیان

یعنی یہ باب مکہ میں داخل ہونے کے آداب کے بارے میں ہے۔ "والطواف" کا عطف "دخول" پر ہے۔

الفصل الاول:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دخول مکہ کے وقت معمول

۲۵۶۱: عَنْ نَافِعٍ قَالَ إِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ لَا يَقْدُمُ مَكَّةَ إِلَّا بَاتَ بِدِي طُوًى حَتَّىٰ يُصْبِحَ وَيَغْتَسِلَ وَيُصَلِّيَ فَيَدْخُلُ مَكَّةَ نَهَارًا وَإِذَا نَفَرَ مِنْهَا مَرَّ بِدِي طُوًى وَبَاتَ بِهَا حَتَّىٰ يُصْبِحَ وَيَذْكُرُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَفْعَلُ ذَلِكَ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری في صحيحه ۴۳۵/۳ حديث رقم ۱۷۷۳ - ومسلم في صحيحه ۹۱۹/۲ حديث رقم (۲۲۶ - ۱۲۵۹)۔

وابوداؤد في السنن ۴۳۵/۲ - حديث رقم ۱۸۶۵ والنسائي في السنن ۱۹۹/۵ حديث رقم ۲۸۶۲ - والدارمي ۹۷/۲

حدیث رقم ۱۹۲۷۔ ومالک فی الموطا ۳۲۴/۱ حدیث رقم ۲۰ من کتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت نافع سے روایت ہے کہ تحقیق ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ مکرمہ میں تشریف نہیں لاتے تھے مگر کہ رات گزارتے ذی طوی میں یہاں تک صبح کرتے اور نہاتے اور نماز پڑھتے پھر مکے میں داخل ہوتے دن کے وقت اور جس وقت نکلتے تو ذی طوی میں رات گزارتے اس میں صبح تک رہتے اور ذکر کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی کیا کرتے تھے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: لا یقدم مکة الابات بذی طوی..... یدخل مکة نہارا:

”لا یقدم“ دال کے فتح کے ساتھ لا یجسی کے معنی میں ہے۔

”بذی طوی“ طاء کے فتح اور ضمہ اور کسرہ تینوں کے ساتھ ہے۔ اور فتح زیادہ فصیح اور مشہور ہے پھر اس کے بعد ضمہ زیادہ ہے اور یہی جمہور قرآن کا مسلک ہے۔ اور یہ منصوب اور غیر منصوب دونوں ہے۔ مکہ میں حرم کے اندر ایک مقام ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ ایک کنویں کا نام ہے مکہ کے پاس اہل مدینہ کے راستے میں۔

”یدخل مکة نہارا“: ابن الملک فرماتے ہیں کہ افضل طریقہ یہ ہے کہ مکہ میں دن کے وقت داخل ہوتا کہ بیت اللہ کو دور سے دیکھ لے (اتنی)۔ اور بعض نے کہا ہے تاکہ مکہ میں نقصان پہنچانے والوں سے محفوظ رہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ وہ وہاں استراحت، غسل کرنے اور پاکی حاصل کرنے کیلئے ٹھہرتے تھے۔

قولہ: ویذکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یفعل ذلک:

”ویذکر“ کا عطف ”لا یقدم“ پر مطف ہے۔ یعنی جو کچھ ذکر ہوا یہ سب کچھ نبی کرتے تھے نکلتے وقت اور داخل ہوتے وقت۔ کسی صاحب حال نے کیا خوب کہا ہے:

وسنا برق نفی عنی الکری
منزل سلمیٰ بہ نازلة
لم یزل یلمع بی من ذی طوی
طیب الساحة معمور الفنا

نہایہ میں ہے کہ دن کو داخل ہو یا رات کو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس کی دلیل نساکی کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں دن اور رات دونوں کو داخل ہوئے حج کے موقع پر دن کے وقت داخل ہوئے اور عمرہ کے موقع پر رات کے وقت۔ باقی جو ابن عمر سے روایت ہے کہ وہ رات کے وقت داخل ہونے سے روکتے تھے تو وہ سنت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ حاجیوں پر مشقت کی وجہ سے کہ وہ چوروں سے محفوظ رہیں۔

ابن حبان نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام مکہ میں پیدل، برہنہ پاؤں داخل ہوتے تھے۔ بیت اللہ کا طواف کرتے اور اور حج کے افعال پیدل اور ننگے پاؤں ادا کرتے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سات لاکھ بنی اسرائیل نے بیت اللہ کا حج کیا ہے اور وہ لوگ اپنے جوتوں کو تعظیم میں رکھ کر مکہ میں ننگے پاؤں داخل ہوتے تھے بیت اللہ کی تعظیم کی وجہ سے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دخول مکہ کا ذکر

۲۵۶۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم لَمَّا جَاءَ إِلَى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلَاهَا وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۳۷/۳۔ حدیث رقم ۱۵۷۷۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۱۸/۲ حدیث رقم (۲۲۴۔ ۱۲۵۸)۔
 و ابو داؤد فی السنن ۴۳۷/۲ حدیث رقم ۱۸۶۹۔ و الترمذی فی السنن ۲۰۹/۳ حدیث رقم ۸۵۳۔ و النسائی ۲۰۰/۵
 حدیث رقم ۲۸۶۵۔ و ابن ماجہ ۹۸۱/۲ حدیث رقم ۲۹۴۰ و احمد فی المسند ۴۰/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ جب مکہ کی طرف تشریف لائے یعنی حجۃ الوداع میں بلندی کی طرف سے داخل ہوئے اور شیب کی طرف سے نکلے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔
تشریح: قولہ: دخلها من اعلاها: اس سے مراد ثنیۃ کداء ہے۔

”ثنیۃ کداء“ کاف کے فتح اور مد اور تنوین کے ساتھ ہے اور عدم تنوین کے ساتھ بھی ہے اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ یہ ایک جگہ کا نام ہے اور یہ وہ جگہ ہے جس سے مقبرہ کی طرف جس کو عام لوگ المعلات کے نام سے یاد کرتے ہیں اتراجاتا ہے اور خواص کے نزدیک اس مقبرہ کا نام الحجون ہے اور اس کا اس ثنیۃ پر بھی ہوتا ہے جو اس ست تھوڑا پہلے ہے۔ اور ثنیۃ دو پہاڑوں کے درمیان تک راستے کو کہتے ہیں۔ اور اس کے نیچے ثنیۃ کدی ہے کاف کے ضم اور قصر کے ساتھ اور تنوین کے ساتھ ہے اور ترک تنوین کے ساتھ بھی ہے۔ اور اب اس کا نام باب الشکیۃ ہے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شوافع کے نزدیک مکہ میں ثنیۃ العلیا سے داخل ہونا اور ثنیۃ السفلی سے نکلنا مستحب ہے۔ خواہ یہ ثنیۃ مکہ کے راستے میں ہو جیسے مدنی کیلئے یا نہ ہو جیسے یمنی کیلئے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے دخول اور خروج میں راستے کو تبدیل کیا تغیر حال پر فال لینے کیلئے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے عید میں کیا تھا۔ اور تاکہ دونوں راستے آپ ﷺ کیلئے گواہی دے اور تاکہ دونوں راستوں والے آپ ﷺ کے وہاں سے گزرنے سے برکت حاصل کر لیں۔ (آئینی)

یا ثنیۃ علیا کا دخول اور سفلی کا خروج کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے کیا۔ یا اس وجہ سے کہ مکہ میں آنے کے مناسب ظہور اور اعلان ہے اور مکہ سے خروج کے مناسب خفاء اور کتمان ہے کیونکہ مکہ میں دخول نیکی ہے اور اس سے خروج صورتاً بدی ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ ابراہیم علیہ السلام بلندی پر تھے جب انہوں نے فرمایا: ﴿فاجعل افئدة من الناس تهوى اليهم﴾ [ابراہیم: ۳۷] تو آپ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے۔

جیسا کہ سہیلی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب بیت اللہ کو بنا لیا تو اس پتھر پر جس کو مقام ابراہیم کہتے ہیں کھڑے ہو کر اور ثنیۃ علیا پر بھی کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اے لوگو اللہ نے تمہارے لیے گھر بنایا ہے پس تم اس گھر کا حج کرو۔ پس ان کو جواب دیا نطفون نے پیٹھ اور رحم میں ”لیبک“ کے الفاظ سے اور جس کے حق بیت اللہ کی زیارت مکرر لکھی گئی تھا انہوں نے مکرر جواب دیا اسی طرح ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔

اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ جواب ان ارواح اور اشباح نے دیا تھا جن کو اللہ نے مقرر کیا تھا اور یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ یہ بیت اللہ کے زیارت کا شرف حاصل کریں گے۔

طواف کرنے کے لیے پاکی شرط ہے

۲۵۶۳: وَعَنْ عُرْوَةَ ابْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَدْ حَجَّ النَّبِيُّ ﷺ فَأَخْبَرَنِي عَائِشَةُ أَنَّ أَوَّلَ شَيْءٍ بَدَأَ بِهِ حِينَ قَدِمَ مَكَّةَ أَنَّهُ تَوَضَّأَ ثُمَّ طَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ عُمْرَةٌ ثُمَّ حَجَّ أَبُو تَكْرِ فَكَانَ أَوَّلُ شَيْءٍ بَدَأَ بِهِ الطَّوْفُ بِأ

لَبِيتَ نَمَّ لَمْ تَكُنْ عُمْرَةً نَمَّ عُمَرُ نَمَّ عُمَانُ مِثْلَ ذَلِكَ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۹۶۱۳۔ حدیث رقم ۱۶۱۴۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۰۶۱۲ حدیث رقم (۱۲۳۵-۱۹۰)۔
ترجمہ: عمرو بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا۔ پس مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی کہ پہلی چیز جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی وہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آئے تو وضو کیا اور پھر خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ یعنی عمرے کا طواف کیا (اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے یا متمتع تھے) پھر عمرہ نہ ہوا پھر (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج کیا تو انہوں نے بھی خانہ کعبہ کے طواف سے حج کے مناسک کی ابتداء کی پھر عمرہ نہ کیا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کیا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اول شیء بدأ به..... تو ضاً:

”اول“ رفع کے ساتھ ہے۔ ”انہ تو ضاً“ یعنی تجدید وضوء کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کر چکے تھے۔ یا وضوء سے معنی لغوی مراد ہے۔

بہر صورت اس میں طہارت کا سحت طواف کیلئے شرط ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس کی مشروعیت پر اجماع ہے بلکہ اختلاف طہارت واجب ہے اور جمہور کے نزدیک شرط ہے باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے استدلال کرنا: ”الطواف بالبيت صلاة“ درست نہیں کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ کسی چیز کے ساتھ تشبیہ تمام چیزوں میں مشارکت کا مقتضی نہیں ہوتی کیا نہیں دیکھتے ہو کہ طواف میں کھانا پینا جائز ہے بالا جماع اور نماز میں بغیر کسی نزاع کے ناجائز ہے۔
 اور ابن حجر کا یہ قول غریب ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جمہور نے اس حدیث کے مرفوع ہونے کے ضعف کو نہیں دیکھا کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ قول صحابی ہوگا اور قول صحابی صحیح قول کے مطابق حجت ہے۔ وجز غرابت یہ ہے کہ اس جیسی روایات شرط ہونے کا فائدہ نہیں دیتی۔

قولہ: ثم طاف بالبيت: یعنی عمرے کا طواف کیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے یا متمتع تھے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ طواف قدم کیا کیونکہ شوافع کے نزدیک قارن کے حق میں تداعل افعال ہوتا ہے۔ لیکن یہ علامہ طیبی کا وہم ہے کیونکہ مفرد اور قارن میں سے ہر ایک کیلئے طواف قدم سنت ہے بالاتفاق بلکہ امام مالک نے واجب کہا ہے اور اس وقت اس سے طواف رکن متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ طواف رکن کا وقت ان کے حق میں وقوف کے بعد داخل ہوتا ہے بالا جماع اور طواف قدم بالاتفاق وقوف کرنے سے فوت ہو جاتا ہے۔
 قولہ: ثم حج ابو بکر فكان اول شیء: ”اول“ رفع کے ساتھ ہے۔

قولہ: ثم لم تكن عمرة:

”لم تكن“ تذکیر و تانیث دونوں کے ساتھ ہے۔

”ثم لم تكن عمرة“ یعنی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ نہیں کیا بلکہ اسی عمرہ پر اکتفاء کیا جو حج کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج افراد کیا۔ لیکن ان کے اس قول پر اشکال ہے کہ حج افراد کرنا اس طور پر کہ اس کے بعد عمرہ نہ کرے شافعی کے نزدیک بھی خلاف افضل ہے تو حدیث کو اس پر کیسے حمل کیا جا سکتا ہے؟

ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا یہ مطلب ذکر کیا ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمرہ کے افعال یعنی سعی، حلق وغیرہ ادا نہیں کیے بلکہ صرف طواف پر اکتفاء کیا۔ تو یہ دلالت کر رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طواف قدم کیلئے تھا اور اس کا تصور صرف مفرد کیلئے ہو سکتا ہے کیونکہ قارن کیلئے

انفعال میں داخل ہے جو کہ ہمارے نزدیک غیر معتبر ہے۔

ہمارے علماء میں سے مصابیح کے بعض شراح نے کہا ہے کہ یہ قول ”ثم لم تکن عمره“ جیسا کہ بخاری میں ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے اس احرام سے نہیں نکلے اور اس کو عمرہ نہیں بنایا۔ پھر اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حضرت عائشہ کا قول ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ عروہ کا قول ہو لیکن نسق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عروہ کا قول ہے پھر یہ قول ثم حج ابو بکر آخر حدیث تک یہ بغیر کسی تردد کے عروہ کا قول ہے کیونکہ مسلم کی حدیث کے سیاق میں ہے ثم حج عثمان اور مسلم کی اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے اول شیء بدأ به الطواف بالبيت ثم حججت مع ابی الزبیر بن العوام وکان اول شیء بدأ به الطواف کہ یہ عروہ کا قول ہے اور اس سے ابن حجر کا قول رد ہوا کہ انہوں نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ سب حضرت عائشہ کا قول ہے اور مسلم میں ثم لم تکن عمره کی جگہ ثم لم تکن غیرہ ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ پھر وہاں احرام سے حلال نہ ہوئے اور یہاں تک کہ اپنے ہدایا کو ذبح کیا۔

قولہ: ثم عثمان مثل ذلك: ”مثل“ نصب کے ساتھ ہے تقدیر عبارت یوں ہے ”فعلا مثل ذلك“ اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے پھر تقدیر عبارت یہ ہوگی ”فعلهما مثل ذلك“۔ حاصل یہ ہے کہ ان سب نے حج کے بعد عمرہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے بعض حفاظ نے کہا ہے کہ مکہ سے صرف عمرہ کیلئے خروج حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی سے ثابت نہیں ہے اور انہوں نے ضرورت کی وجہ سے کیا تھا کہ عمرہ چھوڑ چکی تھی۔ پھر اس کا قضا کیا۔ واللہ اعلم

طواف کی کیفیت کا ذکر

۲۵۲۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا طَافَ فِي الْحَجِّ أَوْ الْعُمْرَةِ أَوَّلَ مَا يَقْدُمُ مَعِيَ ثَلَاثَةَ أَطْوَافٍ وَمَشَى أَرْبَعَةً ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ يَطُوفُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۷۷/۳ - حدیث رقم ۱۶۱۶ - و مسلم فی صحیحہ ۹۲۰/۲ - حدیث رقم (۲۳۱) - (۱۲۶۱) - و ابو داؤد فی السنن ۴۴۹/۲ - حدیث رقم ۱۸۹۳ و النسائی فی السنن ۲۲۹/۵ - حدیث رقم ۲۹۴۱ - و احمد فی المسند ۱۲۵/۲ -

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب حج یا عمرے کا طواف کرتے تو آپ ﷺ تین شوٹ (چکروں) میں جلدی کرتے اور اپنی چال پر چلتے چار مرتبہ یعنی چکروں میں اپنی چال چلتے پھر طواف کی دو رکعتیں پڑھتے پھر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: كان رسول الله ﷺ إذا طاف في الحج..... ثلاثة طواف:

”فی الحج“: اور ایک نسخہ میں بالحج ہے۔

”او“: تنويع کیلئے ہے ”اول ما يقدم“ طرف ہے ”سعی“ جواب شرط ہے اور یہ بھی بعید نہیں کہ یہ طاف کیلئے ظرف ہو اور رمل کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے ”ثلاثة اشواط“ مفعول فیہ۔ ہونے کی وجہ سے منسوب ہے نہ کہ مفعول ہونے کی وجہ سے جیسا کہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے اور نہ اس وجہ سے کہ یہ مصدر محذوف کیلئے صفت ہے جیسا کہ علامہ طیبی نے کہا ہے اور رمل سے مراد جذب ہے یعنی بغیر دوڑنے اور کودنے کے تیز تیز چلنے کو کہتے ہیں۔

قولہ: ومشى اربعة..... ثم يطوف بين الصفا والمروة:

”يطوف“ مضارع سے تعبیر کیا ہے اس میں اور یقدم دونوں میں حال ماضی کی حکایت ہے۔

طواف میں چلنے کی کیفیت کا بیان

۲۵۶۵: وَعَنْهُ قَالَ رَمَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنَ الْحَجَرِ إِلَى الْحَجَرِ ثَلَاثًا وَمَشَى أَرْبَعًا وَكَانَ يَسْعَى بِيَطْنِ الْمَسِيلِ إِذَا طَافَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ. (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۷۷/۳۔ حدیث رقم ۱۶۴۴۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۲۰/۲ حدیث رقم (۲۳۰-۱۲۶۱)۔
و الترمذی فی السنن ۲۱۲/۳ حدیث رقم ۸۵۷ و مالک فی الموطأ ۳۶۵/۱ حدیث رقم ۱۰۸ من کتاب الحج۔ و الدارمی فی السنن ۶۴/۲ حدیث رقم ۱۸۴۱۔ و احمد فی المسند ۴۰/۲۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ طواف کے دوران حجر اسود سے حجر اسود تک تین چکروں میں جلدی چلے اور اپنی موافق چال چلے چار چکروں میں اور وطن میل میں دوڑتے تھے جس وقت صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: رمل رسول الله ﷺ من الحجر الى الحجر:

اس میں رو ہے ان لوگوں پر جو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے رکنیت کے درمیان رمل نہیں کیا ہے۔

قوله: وكان يسعى بطن المسيل..... والمروة: صفا مروہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔

سعی امام شافعیؒ کے نزدیک فرض اور ہمارے نزدیک واجب ہے اور دوڑنا بالاتفاق سنت ہے۔

جان لیجئے کہ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا حجر اسود سے حجر اسود تک رمل کرنا یہ حجۃ الوداع ۱۰ھ میں ہوا ہے اس لیے اس روایت کو مسلم کی اس روایت پر مقدم کیا جو عمرۃ القضاء کے بارے میں ہے۔ ۷ھ کو، کیونکہ جب صحابہ مکہ میں آئے تو کفار نے کہا یشرب (مدینہ) کے بخار۔ نے ان کو کمزور کر دیا ہے اور پھر حجر اسود کے پاس بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ صرف حجر اسود کی جانب میں رمل کرے تو مشرکین نے صحابہ کی قوت اور بہادری کے بقاء پر تعجب کیا۔ اسی لیے ابوداؤد کی روایت میں ہے کانہم الغدلان۔

پھر اس کی مشروعیت ہمیشہ کیلئے ہو گئی آپ ﷺ کے حجۃ الوداع کے موقع پر اس کے کرنے کی دلیل سے باوجود یہ کہ اس وقت اس کا سبب جو کہ کفار کے سامنے اظہار قوت تھا ختم ہو چکا تھا۔ تاکہ رمل کرنے والا اس سبب کو متحضر رکھے اور سبب کفار پر غلبہ ہے اور خاص کر کے اس شرف والی جگہ میں اور تاکہ اس کو صحابہ کی حالت اور ان کے دین کی خدمات میں سخت تکالیف برداشت کرنا یاد رہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے رمل اور اضطباع میں کندھوں کے کھولنے کے بارے میں فرمایا کہ ان کے اسباب اگرچہ ختم ہو چکے ہیں لیکن ہم اس کام کو جو ہم نے آپ ﷺ کے ہمراہ کیا ہو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

آپ ﷺ کا حجر اسود کا بوسہ لینا

۲۵۶۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ أَتَى الْحَجَرَ فَاسْتَلَمَهُ ثُمَّ مَشَى عَلَى يَمِينِهِ فَرَمَلَ ثَلَاثًا وَمَشَى أَرْبَعًا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۲۰/۲ حدیث رقم (۲۳۲-۱۲۶۱)۔ و الترمذی فی السنن ۲۱۱/۳ حدیث رقم ۸۵۶۔
و النسائی ۲۲۸/۵ حدیث رقم ۲۹۳۹۔ و الدارمی ۶۴/۲ حدیث رقم ۱۸۴۰۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ میں تشریف لائے تو حجر اسود کے پاس آئے

اس کو بوسہ دیا پھر اپنے دائیں طرف چلے۔ رٹل کیا یعنی جیسے کہ پہلوان چلتے ہیں تین مرتبہ اور اپنی چال چلے چار مرتبہ۔ یعنی چار چکروں میں۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مشہور روایات میں حجر اسود پر سجدہ کرنے اور اس کے پاس تثلیث ذکر نہیں ہے۔ یعنی اپنے دائیں طرف دروازے کی طرف سے اور بعض نے کہا ہے کہ حجر اسود کے دائیں طرف۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کعبہ کے گرد گھومتے تھے اپنے دائیں جانب سے تاکہ دل جو بیت الرب ہے بیت اللہ کے محاذات اور برابری میں ہو مقام قربت میں۔

آپ ﷺ کے حجر اسود کو بوسہ دینے کا ذکر

۲۵۶۷: وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَرَبِيِّ قَالَ سَأَلَ رَجُلٌ ابْنَ عُمَرَ عَنِ اسْتِلامِ الْحَجَرِ فَقَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَسْتَلِمُهُ وَيُقَبِّلُهُ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری۔ فی صحیحہ ۴۷۵/۳۔ حدیث رقم ۱۶۱۱۔ و الترمذی فی السنن ۲۱۵/۳ حدیث رقم ۸۶۱۔ والنسائی ۲۳۱/۵ حدیث رقم ۲۹۴۶۔

ترجمہ: حضرت زبیر بن عربی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے حجر اسود کو بوسہ دینے کے بارے میں پوچھا۔ فرمایا کہ میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ کو کہ حجر اسود کو ہاتھ لگاتے تھے اور بوسہ دیتے تھے۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

الزبیر العربی۔ یہ عربی نسبی اور تابعی بصری ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں اور ان سے معمر اور حماد بن زید روایت کرتے ہیں یہ ثقہ راوی ہیں۔

تشریح: قوله: سال رجل ابن عمر عن استلام الحجر:

آپ ﷺ کا رکن یمانی کا استیلام کرنا

۲۵۶۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمْ أَرَ النَّبِيَّ ﷺ يَسْتَلِمُ مِنَ الْبَيْتِ إِلَّا الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۷۳/۳۔ حدیث رقم ۱۶۰۹۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۲۵/۲ حدیث رقم (۲۴۷-۱۲۶۹)۔ و الترمذی فی السنن ۲۱۳/۳ حدیث رقم ۸۵۸۔ و احمد فی المسند ۱۱۴/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خانہ کعبہ کو ہاتھ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا مگر دو رکنوں کو جو یمن کی جانب ہیں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے

تشریح: قوله: الا الركنين اليمانيين:

”یمانیین“ یا اول کی تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ ہے علامہ طبری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ رکن ہے جس میں حجر اسود ہے اور رکن یمان اور باقی دو کو شامیین کہتے ہیں (یعنی) ان دونوں میں تغلیب ہے۔

نبی ﷺ نے ان کا استیلام اس لئے کیا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے بناء پر باقی ہے اور حجر اسود کا استیلام اسے چھونا ہے ہاتھ کے ساتھ یا چومنے کے ساتھ یا دونوں کے ساتھ اور رکن یمانی کا استیلام ہمارے مذہب میں صحیح قول کے مطابق ہاتھ کے ساتھ ہے۔

عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ میں چار رکن ہیں۔ پہلے رکن کی دو فضیلتیں ہیں نمبر (۱) حجر اسود کا اس میں ہونا نمبر (۲) ابراہیم علیہ السلام بنا پر باقی رہنا اور دوسرے رکن کی فضیلت صرف بناء ابراہیم پر بقاء ہے اور باقی دو کیلئے ان میں سے کوئی فضیلت ثابت نہیں ہے اسی وجہ سے پہلے کو بوسہ دیا جاتا ہے دوسرے کا استیلام کیا جاتا ہے اور آخری دو رکنوں کو نہ بوسہ دیا جاتا ہے اور نہ ان کا استیلام کیا جاتا ہے یہ جمہور کی رائے کے مطابق ہے اور بعض نے رکن یمانی کے بوسہ کو مستحب قرار دیا ہے (اتنی)۔ اور ہمارے ائمہ میں سے امام محمد کا بھی یہی قول ہے رکن پر قیاس کرتے ہوئے۔

آپ ﷺ کا عصا کے ذریعے حجر اسود کا استیلام کرنا

۲۵۶۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ طَافَ النَّبِيُّ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوُدَّاعِ عَلَيَّ بِعَيْرٍ يَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِصْحَنٍ -

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۷۲/۳۔ حدیث رقم ۱۶۰۷۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۲۶/۲ حدیث رقم (۲۲۳-۱۲۷۲)۔

وابوداؤد ۴۴۱/۲ حدیث رقم ۱۸۷۷۔ والنسائی ۱۲۳۳/۵ حدیث رقم ۲۹۵۴۔ وابن ماجہ ۹۸۳/۲ رقم ۲۹۴۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کیا۔ کہ نبی کریم ﷺ نے طواف کیا۔ حجۃ الوداع میں اونٹ پر عصا کے ذریعے حجر اسود کا استیلام کرتے تھے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: طاف النبي ﷺ في حجة الوداع على بعير: قوله:

یہ طواف افاضہ میں تھا آپ ﷺ کی خصوصیت تھی یا عذر کی وجہ سے کیونکہ طواف میں چلنا ہمارے نزدیک واجب ہے۔ اور علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے سوار ہو کر طواف کیا حالانکہ پیدل طواف افضل ہے، تاکہ سب لوگ آپ ﷺ کو دیکھ لیں اور یہ لوگوں کے کثرت اور ازدحام کی وجہ سے کیا۔

قوله: يستلم الركن بمحجن: "محجن": اس عصا کو کہتے ہیں جس کا سر ٹیڑھا ہو۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں میم زائد ہے۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں ترمذی کے علاوہ ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان النبي ﷺ طاف في الحجة الوداع على راحلته يستلم الحجر بمحجنه، لأن يراه الناس ويشرف ويسألوه، فان الناس عشيوه اور بخاری نے حضرت جابر سے لان يراه الناس تک روایت کیا ہے اور مسلم نے ابو طفیل سے روایت کیا ہے آیت النبي ﷺ يطوف بالبيت على راحلة يستلم الركن بمحجن معه، ويقبل المحجن۔

اب یہاں ایک نیا اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ بات کئی مواضع میں بغیر کسی شبہ کے ثابت ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں رمل کیا تھا اور ایسی بات حضرت جابر کی طویل حدیث میں گزری۔ پس اس کی طرف رجوع کریں اور رمل کرنا سواری پر طواف کرنے کے منافی ہے؟ اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ یہ حدیث عمرہ پر محمول ہے تو اس کو حضرت عائشہ کی حدیث رد کر رہا ہے جو کہ مسلم میں ہے طاف عليه الصلوة والسلام في حجة الوداع على راحلته يستلم الركن كراهية ان ينصرف الناس عنه - عنه کی ضمیر میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رکن کی طرف راجع ہو اور مطلب یہ ہو کہ اگر رسول اللہ ﷺ پیدل طواف کرتے تو لوگ حجر اسود سے ہٹ جاتے جب بھی آپ ﷺ اس کے پاس سے گزرتے آپ ﷺ کے تو قیام کی وجہ سے تاکہ ازدحام نہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ مرجع نبی ﷺ ہو۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ اگر آپ ﷺ سوار ہو کر طواف نہ کرتے تو لوگ آپ ﷺ سے واپس چلے جاتے کیونکہ جو بھی آپ تک پہنچنے کی کوشش کرتا

سوال کرنے کیلئے یاد کیلئے یا اقتداء کرنے کیلئے تو وہ قدرت نہ پاتا کثرت خلق کی وجہ سے۔ تو وہ منصود کے حصول کے بغیر چلا جاتا تو اس احتمال پر حمل کرنا لازم ہے کیونکہ اس احتمال کے موافق ابن عباسؓ کی حدیث ہے تو اجتماع حدیثیں ہو جائے گا نہ کہ تعارض حدیثیں۔

اشکال کا جواب یہ ہے کہ حج میں آفاقی کیلئے ایک طواف زائد ہوتا ہے پس ملن ہے کہ عوآپ ﷺ کا سوار ہونا روایت کیا گیا ہے یہ یوم نحر کو طواف فرض میں ہو اور پیدل طواف قدم میں ہو۔ اور یہی بات حضرت جابر کی گزری ہوئی طویل حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے نقل کیا ہے آپ ﷺ کا وہ طواف جس سے آپ ﷺ نے مکہ میں داخل ہوتے وقت ابتداء کی تھی۔

اگر آپ یہ کہیں کہ کیا تطبیق ہو سکتی ہے ابن عباس اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے سوار ہو کر طواف کیا تا کہ سب لوگ آپ ﷺ کو دیکھ سکیں اور سوال کر سکیں اور سعید بن جبیر کی روایت میں، جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے سوار ہو کر طواف بیماری کے عذر کی وجہ سے کیا تھا۔

جیسا کہ امام محمد نے فرمایا: اخبرنا ابو حنیفہ عن حماد بن ابی سلیمان، انه سعى بين الصفا والمروة مع عكرمة فجعل حماد يصعد الصفا وعكرمة لا يصعدھا، فقال حماد يا عبد الله الا تصعد الصفا والمروة؟ فقال هكذا كان طواف رسول الله ﷺ۔

حماد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں سعید بن جبیر سے ملا اور ان کے سامنے یہ بات ذکر کی تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے سواری پر طواف کیا اس حال میں کہ وہ بیمار تھے اور ارکان استلام کر رہے تھے۔ عصا کے ساتھ۔ پس صفا اور مروہ کے درمیان سعی بھی سواری پر کی بس اسی وجہ سے وہ صفامروا پر نہیں چڑھے (اتنی)۔ پس جواب یہ ہے کہ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو عمرہ پر حمل کیا جائے۔

اب اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ صحیح مسلم میں یہ ثابت ہے کہ ابن عباسؓ سے انما سعی رسول الله ﷺ ورمل بالبيت ليرى المشركون قوته اور اس کیلئے لازم ہے کہ یہ عمرہ میں ہو کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر کوئی مشرک نہیں تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ایک کو اس عمرہ پر حمل کیا جائے گا جو دوسرے کے علاوہ ہو۔ اور ابن عباسؓ کی حدیث کیلئے مناسب یہ ہے کہ اس کو عمرۃ القضاء پر حمل کیا جائے۔ کیونکہ ارءاء اس کا فائدہ دے رہا ہے اور بیماری کی وجہ سے سوار ہونا اس کے علاوہ میں ہو اور وہ عمرۃ الجعرانہ ہے۔ (اتنی)

اور کوئی مانع نہیں ہے آپ ﷺ کے سوار ہونے کی کئی علتیں اکٹھی ہو گئی ہیں یا ہم کہتے ہیں کہ بیماری پر مطلع نے رکوب کو عذر پر محمول کیا اور غیر مطلع نے اس کو اپنے رائی پر حمل کیا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں میرے نزدیک یہی جواب ہے۔ اور ان لوگوں کی توجہ بعید از قیاس ہے جنہوں نے رکوب کو حمل کیا ہے اس بات پر تا کہ لوگ آپ ﷺ سے چلے نہ جائیں۔ کیونکہ اس جیسی علت افضل امر سے مانع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو پھر واجب کے لئے نافع کیسے بن سکتی ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے دیکھا کہ ابن ہمام کی یہ تطبیق ابن عباسؓ کی آنے والی حدیث کے ظاہر پر منطبق نہیں ہو رہی ہے جس میں ہے ان رسول الله ﷺ واصحابه اعتمدوا من الجعرانة فهلوا بالبيت اور اس کا حمل کرنا فعل صحابہ پر ہے نہ کہ آپ ﷺ کے فعل پر بعید از قیاس ہے۔ پھر ابن حجر کا یہ قول عجیب و غریب ہے کہ آپ ﷺ نے سوار ہو کر طواف کیا اور آپ ﷺ کے ہاتھ میں جو کچھ تھا اس سے آپ ﷺ نے حجر اسود کو مس نہیں کیا بلکہ رکن کے اوپر کا حصہ جو آپ ﷺ کے برابر میں تھا اس کو مس کیا۔ اور آپ ﷺ اونٹنی کے اوپر تھے۔ وجہ غرابت یہ ہے کہ راکب کیلئے ہاتھ یا جو کچھ ہاتھ میں ہو اس کے ذریعے رکن کے محاذات کی طرف اشارہ کرنا حقیقتاً ممکن ہے۔ پس اگر تکاب مجاز کی کوئی ضرورت ہے۔ حالانکہ دونوں میں فرق صاف ظاہر ہے۔

آپ ﷺ نے بیت اللہ کا طواف اونٹ پر سوار ہو کر کیا

۲۵۷۰: وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ طَافَ بِالْبَيْتِ عَلَى بَعِيرٍ كَلَّمَا آتَى عَلَى الرَّكْنِ أَشَارَ إِلَيْهِ بِشَيْءٍ يَدِهِ وَكَبَّرَ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۹۰/۳ - حدیث رقم ۱۶۱۳ - والترمذی فی السنن ۲۱۸/۳ - حدیث رقم ۸۶۵ - والنسائی فی السنن ۲۳۳/۵ - حدیث رقم ۲۹۵۵ - والدارمی ۶۵/۲ - حدیث رقم ۱۸۴۵ -

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے طواف کعبہ اونٹ پر سوار ہو کر کیا؛ جب آپ ﷺ حجر اسود کے روبرو ہوتے تو اپنے ہاتھ میں موجود عصا سے اس کی طرف اشارہ کرتے اور اللہ اکبر کہتے۔

۲۵۷۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ لَا تَذْكُرُ إِلَّا الْحَجَّ فَلَمَّا كُنَّا بِرَفَاةٍ طَمَثْتُ فَدَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَنَا أَبْكِي فَقَالَ لَعَلَّكَ نَفَسْتِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَإِنَّ ذَلِكَ شِبْهُ كَنْبَةِ اللَّهِ عَلَى بَنَاتِ آدَمَ فَأَفْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لَا تَطُوفِي بِالْبَيْتِ حَتَّى تَطْهَرِي (متفق علیہ) -

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۰۰/۱ - حدیث رقم ۲۹۴ - ومسلم فی صحیحہ ۸۷۳/۲ - حدیث رقم (۱۲۰ - ۱۲۱) - وابوداؤد فی السنن ۳۸۲/۲ - حدیث رقم ۱۷۸۲ - والنسائی ۱۵۶/۵ - حدیث رقم ۲۷۴۱ - وابن ماجہ ۹۸۸/۲ - حدیث رقم ۲۹۶۳ والدارمی ۶۶/۲ - حدیث رقم ۱۸۴۶ - ومالك فی الموطأ ۴۱۱/۱ - حدیث رقم ۲۲۴ -

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے۔ تو صرف تلبیہ یعنی لبیک کہتے تھے اور بعضوں نے کہا کہ ہم سوائے حج کے اور کسی چیز کا قصد نہیں کرتے تھے۔ یعنی مقصود اصل حج تھا نہ کہ عمرہ۔ پس عمرے کا ذکر نہ کرتے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نیت میں بھی نہ تھا پس جب کہ ہم سرف میں پہنچے ذراں حائضہ ہو گئی۔ پس بنی کریم ﷺ تشریف لائے تو میں رورہی تھی یعنی اس گمان کے مطابق کہ حیض حج سے باز رکھے گا پس حضور ﷺ نے فرمایا شاید کہ تم حائضہ ہو گئی ہو؟ میں نے کہا ہاں! فرمایا یہ ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے مقدر میں کر دی ہے پس تو خانہ کعبہ کے طواف کے علاوہ ہر وہ عمل کر جو حاجی کرتے ہیں اور یہاں تک کہ تو پاک ہو جائے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے کیا ہے۔

تشریح: قوله: لا تذكروا الحج:

حج چونکہ اصل اور مطلوب ہے تو اس کا ذکر کیا اور عمرہ اور مستحب ہے تو لفظ میں اس کے ذکر نہ کرنے سے اس کا نیت میں موجود نہ ہونا لازم نہیں آتا۔

قوله: فلما كنا بسرف طمئت:

”سرف“ سین کے فتح اور راء کے کسرہ کے ساتھ منصرف بھی ہے اور غیر منصرف بھی بقعۃ یا مکان کی تاویل میں ایک جگہ کا نام ہے مکہ کے قریب ۶ میل یا ۷ میل یا ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہے اسی طرح کہا گیا ہے اور آخری دو قول صحیح نہیں ہیں۔

”طمئت“ میم کے فتح کے ساتھ ہے اور کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔

قوله: وانا ابکی - فقال لعلك نفست:

”نفس“ نون کے فتح اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے اور فتح زیادہ فصیح ہے حیض کے معنی میں ہے اور جو ولادت کے معنی میں ہے تو اس میں نفس ضمہ کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ (ذکرہ الطیبی)

قوله قال: فان ذلك شيء كتبه الله على بنات آدم:

”ذلك“ کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی حیضک۔

بنات آدم کی ماں حوا کی اتباع میں ان پر حیض کو مقرر کیا جب حوا نے درخت سے کھایا اور اس کو خون الود کیا تو اللہ نے فرمایا اگر تو اس کو خون آلود کیا تو میں تجھے اور تیری بیٹیوں کو قیامت تک خون آلود کر دوں گا۔ اس میں حضرت عائشہؓ کیلئے تسلی ہے کیونکہ مصیبت جب عام ہو جاتی ہے تو آسان ہو جاتی ہے۔

قوله: فافعلی..... غیر ان لا تطوفی بالبيت حتى تطهري: طیبی فرماتے ہیں کہ یہ مفعول بہ سے استثناء ہے ”لا“ زائدہ ہے۔

”حتى تطهري“ اور ایک صحیح روایت میں حتى تفتسلي ہے۔ یہ حدیث بظاہر حضرت عائشہؓ کے سابقہ قول ولم اهلل الا

بعمرہ کا منافی ہے۔ مگر یہ کہہ جائے کہ ان کا قول لا نذکر الا الحج کا مطلب ہے کہ اس سفر سے ہمارا مقصد اصلی انواع حج قرآن، تمتع، افراد میں سے کسی ایک نوع کا حج تھا۔ پس ہم میں سے بعض نے حج افراد کیا اور بعض نے قرآن کیا اور بعض نے تمتع کیا، اور میں نے تمتع کا قصد کیا تو میں نے عمرہ کا احرام باندھا پس جب مجھے حیض کا عذر پیش آیا اور وہ عرفہ کے دن اور قوف حج تک مستمر ہوا تو آپ ﷺ نے مجھے عمرہ چھوڑنے کا حکم دیا اور یہ کہ میں حج کے تمام افعال ادا کروں سوائے طواف کے، اور اسی طرح سعی کے کہ وہ طواف کے بعد ہی صحیح ہوتی ہے نہ کہ پہلے۔ واللہ اعلم

خمدار لکڑی کے سرے کو آپ ﷺ کو سوسہ دیتے تھے

۲۵۷۲: وَعَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ وَيَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِخْجَنٍ مَعَهُ وَيَقْبِلُ

المِخْجَنَ۔ (رواه مسلم)

اخر جہ مسلم فی صحیحہ ۹۲۷/۲ حدیث رقم (۲۵۷-۱۲۷۵)۔ و اخر جہ ابن ماجہ ۹۸۳/۲ حدیث رقم ۲۹۴۹۔

ترجمہ: حضرت ابی طفیلؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا۔ کہ نبی کریم ﷺ خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے

یعنی سوار ہو کر اور حجر اسود کی طرف اشارہ کرتے تھے خمدار لکڑی کے ساتھ جو آپ ﷺ کے پاس تھی اور آپ ﷺ اس لکڑی کو بوسہ دیتے ہیں۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اشار اليه: اس میں اشارہ ہے کہ رکن یمانی کی طرف استیلام سے عجز کے وقت اشارہ نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ

ہمارے مذہب کا صحیح قول ہے۔

تخریج: طبرانی میں سند جید کے ساتھ روایت کیا ہے:

كان اذا استلم الركن قال ”بسم الله والله اكبر“ وكان كلما اتى الحجر الاسود قال ”الله اكبر“۔

اور امام شافعیؒ نے الام میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: قولوا بسم الله والله اكبر ايمانا بالله وتصديقاً بما جاء به محمد

ﷺ اور حضرت علیؓ اور ابن عمرؓ سے صحیح طور پر ثابت ہے: بسم الله والله اكبر اللهم ايمانا بك وتصديقاً بكتابتك، ووفاء

بعهدك، واتباعاً لسنة نبيك محمد ﷺ۔ ”عہد سے مراد عہد میثاق ہے۔

اور طبرانیؒ کی حدیث میں ہے: انه كان يقول، بسم الله والله اكبر عند الركن اليماني، والله اكبر عند الحجر

الاسود مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ دونوں رکنوں میں تکبیر کہتے تھے۔

مشرک کو خانہ کعبہ کے طواف کرنے کی ممانعت

۲۵۷۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَعَثَنِي أَبُو بَكْرٍ فِي الْحَجَّةِ الَّتِي أَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ عَلَيْهَا قَبْلَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ يَوْمَ النَّحْرِ فِي رَهْطٍ أَمَرَهُ أَنْ يُؤَذِّنَ فِي النَّاسِ إِلَّا لَا يَحُجَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا يَطُوفَنَّ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ -

(متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۷۷/۱ - حدیث رقم ۳۶۹ - و مسلم فی صحیحہ ۹۸۲/۲ حدیث رقم (۴۳۵ - ۱۳۴۷) -
وابوداؤد فی السنن ۴۸۳/۲ حدیث رقم ۱۹۴۶ -

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع سے پہلے جس حج میں نبی کریم ﷺ نے ابو بکر صدیق امیر حج بنا کر بھیجا تھا اس حج میں بھی تھا قربانی کے دن ایک جماعت کو کہاں کو حکم کیا اس کو کہ لوگوں میں اعلان کر دیں۔ کہ خبردار ہو جاؤ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی ننگا طواف کرے کہ نہ کعبہ کا اس کا امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: امره النبي ﷺ عليها قبل حجة الوداع يوم النحر في رهط:

”امرہ“ میم کی شد کے ساتھ ہے یعنی نبی ﷺ نے ان کو قافلہ حج کا امیر بنا یا ۹ھ کو۔

”يوم النحر“ طرف ہے بعث کیلئے۔ ”عليها“ امرہ کے متعلق ہے۔

”امرہ“ ضمیر رهط کی طرف راجع ہے اور رهط کے لفظ کے اعتبار سے ضمیر کو مفرد لایا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر ابو ہریرہ کی طرف راجع ہو بطور اتفاقات کے۔ یہ علامہ طبری نے ذکر کیا ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمیر رهط کی طرف تجرید کے طور پر راجع ہو یا امر احد الرهط کی تقدیر کے طور پر راجع ہو۔

قوله: امره يؤذن في الناس: ”يؤذن“ ایک نسخہ میں ”أن يؤذن“ ہے۔ ”امرہ“ میم کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

”يؤذن“ تشدید کے ساتھ ہے۔

قوله: الا لا يحج بعد العام: ”الا“ تنبیہ کیلئے ہے۔

”لا يحج“ جیم کے ضمہ کے ساتھ نمی ہے یا نمی ہے بمعنی نمی کے جیم کو کسرہ اور فتح بھی دیا جاتا ہے نہی کی صورت میں۔ اور اس

کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے ”لا يحججن بعد العام“۔

”مشرک“ یعنی کوئی کافر حج نہ کرے اللہ کے اس ارشاد کی بناء پر ﴿انما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا﴾ [التوبة: ۲۸] مشرک لوگ نرے ناپاک ہیں، سو یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں۔

(بیان القرآن)

یعنی مطلقاً کسی ایک سال کے ساتھ مقید نہیں ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿يا بني آدم خذوا زينتكم عند كل مسجد﴾

[الاعراف: ۳۱] اے اولاد آدم کی تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔ (بیان القرآن)

ابن عباس رضی اللہ عنہما صحیح طور پر ثابت ہے کہ یہ آیت مشرکین کے اس فعل کے رد میں نازل ہوئی کہ وہ بیت اللہ کا طواف ننگا ہو کر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اللہ کی عبادت اس لباس میں نہیں کرتے جس میں ہم نے گناہ کیے ہیں، یا اشارہ کرنے کیلئے گناہوں سے

کامل طور پر فال ہونے کی طرف۔ یا اس سے فال لیتے تھے۔ تمام عیوب سے فال ہونے پر۔

خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں مانگنی چاہیے

۲۵۷۴: عَنْ الْمُهَاجِرِ الْمَكِّيِّ قَالَ سِئِلَ جَابِرٌ عَنِ الرَّجُلِ يَرَى الْبَيْتَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فَقَالَ قَدْ حَجَجْنَا مَعَ

النَّبِيِّ ﷺ فَلَمْ نَكُنْ نَفْعَلُهُ۔ (رواه الترمذی و ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۳۷/۲ حدیث رقم ۱۸۷۰۔ و الترمذی ۲۱۰/۱۳ حدیث رقم ۸۵۵۔ و النسائی ۲۱۲/۵ حدیث

رقم ۲۸۹۵۔

ترجمہ: حضرت مہاجر مکیؓ سے روایت ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا، اس شخص کے بارے میں کہ وہ خانہ کعبہ کو دیکھے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے یعنی یہ شروع ہے یا نہیں؟ پس جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہم نے نبی کریمؐ کے ساتھ حج کیا ہم ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے خانہ کعبہ کو دیکھ کر دعا کرنے میں۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

مہاجر بن زبیر۔ شمار۔ یہ ”مہاجر“ ہیں۔ ”شمار“ کے بیٹے ہیں۔ اور زہری ہیں یعنی ابن (بخوزہرہ) کے آزاد کردہ ہیں۔ انہوں نے عامر بن ابی وقاص سے اور ابن ابی ذؤبیب وغیرہ نے روایت کی ہے۔ یہ روایت میں ثقہ ہیں۔

تشریح: ”عن الرجل یری البیت“: ایک نسخہ میں ”عن الرجل الذی یری البیت“ ہے۔

قوله: فلم نكن نفعله:

یعنی ہم بیت اللہ کو دیکھ کر دعا کیلئے ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں یہی امام ابو حنیفہؒ، امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے۔ امام احمد اور سفیان ثوری رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔ لیکن امام ابو حنیفہ اور شافعی سے بھی یہ قول نقل کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ انہوں نے تصریح کی ہے جب بیت اللہ دکھائی دے یا ایسے مقام تک پہنچ جائیں کہ جہاں سے بیت اللہ دیکھا جاسکتا ہو۔ اندھے پن کی وجہ سے یا اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ پاتے تو سنت ہے کہ وہ کھڑا ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔

مزید روایات: ابن ہمام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی نے سعید ابن المسیب سے سند روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ سے ایک کلمہ سنا ہے اور ان سے سننے والوں میں سے میرے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا میں نے ان سے سنا کہ وہ فرما رہے تھے کہ جب بیت اللہ کو دیکھ لے تو یہ کہے: ”اللہم انت السلام ومنک السلام فحینا بالسلام“۔

اور شافعی نے ابن جریج سے ذکر کیا ہے ان النبى ﷺ کان رأى البیت رفع یدیه وقال ”اللہم زد هذا البیت تشریفاً وتعظیماً وتکریماً، ومہابة، وزد من شرفه وکرمه ممن حجه واعتمره تشریفاً وتکریماً وتعظیماً وبراً“۔

اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو یہی نے سند مرسل معصل کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کو مضبوط کر دیتا ہے وہ ضعیف حدیث جو استقبال البیت کے وقت فرع الایدی کے بارے میں ہے، اس کو ذکر کیا ہے ابن حجر نے، غیر محل میں۔

ترمذی نے جو حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے اور اس کو حسن بھی کہا ہے کہ حضرت جابر کہتے ہیں ”ما كنت ارى احدا يفعل هذا عند رؤية البیت الا اليهود، قد حججنا مع رسول الله ﷺ أفكنا نفعله۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رفع کو ثابت کرنے والے اولیٰ ہیں کیونکہ ان کے پاس علم زیادہ ہے اسی وجہ سے یہی نے کہا ہے کہ حضرت جابر کے علاوہ کی روایت اثبات رفع کے بارے میں اہل علم کے

ہاں زیادہ مشہور ہے اور ان جیسے مسائل میں ان کا قول معتبر ہوتا ہے جو مثبت ہو۔
ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اولیٰ یہ ہے کہ دونوں میں تطبیق پیدا کی جائے یاں طور کہ اثبات والی روایت پہلی بار دیکھنے کے بارے
میں ہو اور نفی کی روایات بار بار دیکھنے کے بارے میں ہو۔

خانہ کعبہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ اٹھانا

۲۵۷۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ أَقْبَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَدَخَلَ مَكَّةَ فَأَقْبَلَ إِلَى الْحَجَرِ فَاسْتَلَمَهُ ثُمَّ طَافَ
بِالْبَيْتِ ثُمَّ أَتَى الصَّفَا فَعَلَاهُ حَتَّى يَنْظُرَ إِلَى الْبَيْتِ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَجَعَلَ يَذْكُرُ اللَّهَ مَا شَاءَ وَيَدْعُو.

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۴۰۵/۳ حديث رقم (۸۴ - ۱۷۸۰) - وابوداؤد في السنن ۴۳۸/۲ حديث رقم ۱۸۷۲ -

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے میں داخل ہوئے پھر حجر اسود کی طرف متوجہ
ہوئے اس کو بوسہ دیا پھر خانہ کعبہ کا طواف کیا پھر صفا کے پاس آئے یعنی طواف کی نماز کے بعد۔ پس اس پر چڑھے
یہاں تک کہ خانہ کعبہ کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر پھر اللہ کا ذکر کرنا شروع کیا اور دعا مانگی۔ اس کو ابو داؤد نے نقل
کیا ہے۔

تشریح: مسلم میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفا پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ کو دیکھا اور پھر مردہ پر بھی
اسی طرح کیا۔ صفا پر چڑھنا اس زمانے کے اعتبار سے تھا اور نہ اب بیت اللہ باب الصفا سے دیکھائی دیتا ہے چڑھنے سے پہلے کیونکہ اب
وہاں زمین اونچی ہو چکی ہے اور صفا کی بہت ساری سڑھیاں زمین کے اندر دفن ہو چکی ہیں۔ اور بعض نے مطلقاً چڑھنے کو واجب کہا ہے۔
اور مردہ پر اب چڑھنا ہی ممکن نہیں جیسا کہ اس سے بیت اللہ کا دیکھنا ممکن نہیں ہے پس جتنا ممکن ہوتا چڑھنا مستحب ہے تاکہ اس
کے بارے میں وارد روایات پر عمل ہو جائے۔

قولہ: ”رفع یدیدہ“: یعنی دعاء کیلئے ہاتھ اٹھائے نہ کہ بیت اللہ کو دیکھنے کی وجہ سے جیسا کہ پہلے گزرا باقی جو عوام تکبیر کے ساتھ
ہاتھ اٹھاتے ہیں جیسا کہ نماز میں اٹھاتے ہیں تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

”فجعل یدکر اللہ ماشاء ویدعوا“: اس میں امام محمد کے مختار قول کی طرف اشارہ ہے کہ حج کے موقع پر دعائیں متعین نہیں
ہیں بلکہ جو بھی دعا کرے کیونکہ اس سے دعا کرنے والے میں خشوع پیدا ہوتا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ دعاؤں کا تعین رقت کو ختم کر
دیتا ہے اور دعا کرنے والا اس شخص کے طرح ہو جاتا ہے جو اپنے یاد کیے ہوئے کو دھرا رہا ہو اور اگر ماٹور دعاؤں سے تیرک حاصل کرے تو
اچھا ہے۔

طواف نماز کی طرح ہے

۲۵۷۶: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ الطَّوَّافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلَاةِ إِلَّا أَنَّكُمْ تَتَكَلَّمُونَ فِيهِ
فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيهِ فَلَا يَتَكَلَّمَنَّ إِلَّا بِخَيْرٍ -

(رواه الترمذی والنسائی والدارمی و ذکر الترمذی جماعة وقفوه علی ابن عباس)

اخرجه الترمذی في السنن ۲۹۳/۳ حديث رقم ۹۶۰ - والنسائی ۲۲۲/۵ حديث رقم ۲۹۲۲ - والدارمی ۶۶/۲ حديث

رقم ۱۸۴۷ - واحمد في المسند ۳۷۷/۵ -

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنا نماز کی طرح ہے مگر تحقیق تم اس میں بولتے ہو پس جو کوئی اس میں بولے اس کو چاہیے کہ نیکی ہی بولے اس کو امام ترمذی اور نسائی اور دارمی نے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے ایک جماعت سے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث ابن عباس پر موقوف ہے۔

تشریح: قوله: الطواف حول البيت مثل الصلوة الا انکم تتکلمون فيه:

”مثل“: مرفوع ہے خبریت کی بناء پر اور نصب کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔

”الا انکم“ استثناء متصل ہے یعنی طواف نماز کے مثل ہے ہر اس چیز میں جو نماز میں معتبر ہے وجود اور عرفا سوائے تکلم کے اور جو اسکے ہم معنی دیگر منافی چیزیں ہیں جیسے اکل و شرب اور دوسرے افعال کثیرہ۔ اور یا منقطع ہے یعنی تمہیں کلام کی اجازت دی گئی ہے۔ آپ کے فعل سے معلوم ہوا ہے کہ طواف میں نماز کی طرح استقبال قبلہ شرط نہیں ہے اور اصل طواف کیلئے کوئی وقت شرط نہیں ہے۔ رہے نماز کے باقی شروط طہارت حقیقی، حکمی، ستر عورت وغیرہ میں سے تو یہ امام شافعی کے نزدیک طواف میں بھی معتبر ہیں۔ اور ہمارے نزدیک واجب ہیں کیونکہ مثل شے ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز میں حقیقتاً اس شے کے ساتھ مشارک ہو۔ علاوہ اس کے یہ حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد ظنی ہوا کرتا ہے اس سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی۔ اور اس کے ساتھ اس بات پر اتفاق ہے کہ مطاف میں وہ نجاسات جس سے بچنا مشکل ہو وہ معاف ہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں اور ان کے بعد ائمہ اعلام کے زمانہ میں ہمیشہ پرندوں کی نجاست ہوا کرتی تھی اور اس کی وجہ سے کسی نے طواف سے منع نہیں کیا ہے اور نہ اس جگہ کے تطہیر کا حکم دیا ہے اور ”مثل الصلوة“ میں تشبیہ ہے کہ نماز طواف سے افضل ہے۔

فقوله: فمن تکلم فيه فلا يتكلمن الا بخير:

یعنی اللہ کا ذکر کرے علم کا افادہ اور استفادہ کرے اس طور پر کہ طواف کرنے والوں کو طواف میں تشویش نہ ہو اور آج کل عوام جو دنیاوی باتیں کرتی ہیں ان سے بالکل بچیں اور نبی مؤکد کراہت تحریمی یا تنزیہی پر محمول ہے۔

تخریج: ترمذی، نسائی اور دارمی نے اس حدیث کو مرفوعاً روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے: ”الا ان الله احل فيه النطق فمن نطق لا ينطق الا بخير“۔

حجر اسود جنت کا پتھر ہے

۳۵۷۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَزَلَ الْحَجَرُ الْأَسْوَدُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهُوَ أَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ

فَسَوَدَّتْهُ حَطَايَا بَنِي آدَمَ - (رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۲۶/۳ حدیث رقم ۸۷۷۔ واحمد فی المسند ۳۰۷/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حجر اسود بہشت سے اتر آیا ہے اور وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا اور اس کو بنی آدم کے گناہوں نے سیاہ کر دیا اس کو امام احمد اور ترمذی اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: قوله: وهو اشد بياضاً من اللبن: یہ جملہ حالیہ ہے۔

قوله: فسودته خطايا بني آدم:

یعنی بنی آدم جو حجر اسود کو چھوتے ہیں ان کے گناہ اس کے سوا (کالے ہونے) کا سبب بنے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ حدیث کو

حقیقت پر محمول کیا جائے کیونکہ اس سے نہ عقل مانع ہے اور نہ نقل۔

ہمارے علماء میں سے بعض شراح فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد حجر اسود کی تعظیم شان میں مبالغہ ہو اور خطا اور گناہوں کے معاملہ کی ہولناکی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حجر اسود میں چونکہ شرف، کرامت، یمن و برکت ہے تو اس کی وجہ سے یہ جنت سے آیا ہے اور بنی آدم کی خطا اور گناہ قریب ہے کہ جماد میں اثر کر دے اور سفید کو سیاہ بنا دے۔ پس ان کے دلوں کی کیا حالت ہوگی؟ یا اس طور پر کہ یہ گناہوں کو مٹاتا ہے گویا کہ یہ جنت میں سے ہے اور بنی آدم کے کثرت ذنوب کے اٹھانے سے گویا کہ یہ بہت زیادہ سفیدی والا تھا گناہوں نے اس کو سیاہ کر دیا اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس میں سفید نقطے تھے پھر برابر سیاہی اس پر چڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ ختم ہو گئے۔ اور حدیث میں ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے جب دوبارہ گناہ کر لیتا ہے تو ایک اور نکتہ لگ جاتا ہے اسی طرح ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے جن کے بارے میں ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ [المطففين: ۱۴]

حاصل یہ ہے کہ حجر بمنزلہ آئینہ کے غایت صاف اور شفاف تھا پھر نا مناسب اشیاء سے اس میں تغیر آیا یہاں تک کہ اس کے تمام اجزاء سیاہ ہو گئے اور فی الجملہ یہ ثابت ہوا کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے اس پر عقلاء کا اجماع ہے۔

مزید روایت: احمد کی روایت میں حضرت انسؓ سے اور نسائی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے:

الحجر الاسود من الجنة۔

اور میمونہ کی روایت میں ہے حضرت انسؓ سے: الحجر الاسود من حجارة الجنة۔ احمد، ابن عدی اور بیہقی کی روایت میں ابن عباسؓ سے منقول ہے: الحجر الاسود من الجنة وكان اشد بياضاً من اللبن حتى سودته خطايا اهل الشرك اور طبرانی کی روایت میں ابن عباسؓ سے وارد ہے: الحجر الاسود من حجارة الجنة وما في الارض من الجنة غيره وكان الابيض كالماء، ولولا مسه من رجس اهل الجاهلية مامسه ذو عاهة الابرئ۔

حجر اسود قیامت کے دن گواہی دے گا

۲۵۷۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي الْحَجَرِ وَاللَّهِ لَيُبْعَثَنَّهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَهُ عَيْنَانِ يُبْصِرُ بِهِمَا وَلِسَانٌ يَنْطِقُ بِهِ يَشْهَدُ عَلَىٰ مَنْ اسْتَلَمَهُ بِحَقِّهِ۔ (رواه الترمذی وابن ماجہ والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۹۴/۲ حدیث رقم ۹۶۱۔ وابن ماجہ ۹۸۲/۲ حدیث رقم ۲۹۴۴۔ والدارمی ۶۳/۲ حدیث رقم ۱۸۳۹۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کے حق میں فرمایا کہ اللہ کی قسم البتہ اٹھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اس کے واسطے دو آنکھیں ہوں گی ان کے ساتھ دیکھے گا ایک زبان ہوگی اس کے ساتھ وہ بولے گا اور اس شخص کے حق میں گواہی دے گا جس شخص نے اس کو بوسہ دیا ہوگا حق کے ساتھ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے ابن ماجہ اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ في الحجر يبصر بهما: باطل اور حق پرست اور با ادب اور بے ادب کو

پہچانے گا۔

قوله: ولسان ينطق به يشهد على من استلمه بحق: زياده ظاہر یہ ہے کہ حق سے مراد توحید ہے اور کپکے عہد کو پورا کرنا

ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے:

”اللهم ايماننا بك وتصديقا بكتابك، ووفاء بعهدك، واتباعا لسنة نبيك محمد ﷺ“

حجر اسود اور مقام ابراہیم جنت کے یا قوت ہیں

۲۵۷۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ الرُّكْنََ وَالْمَقَامَ يَاقُوتَانِ مِنْ يَاقُوتِ الْجَنَّةِ طَمَسَ اللَّهُ نُورَهُمَا وَلَوْ لَمْ يَطْمِسْ نُورُهُمَا لَأَضَاءَ أَمَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔

(رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تحقیق حجر اسود اور مقام ابراہیم بہشت کے یا قوتوں میں سے یا قوت ہیں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے نور کو دور کر دیا ہے اور اگر ان کا نور دور نہ کرتا تو البتہ روشن کر دیتا۔ اس چیز کو جو مشرق و مغرب کے درمیان میں ہے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان الركن والمقام الجنة:

قوله: طمس الله نورهما..... ”طمس الله نورهما“ ”مشرکین کا ان کو مس کرنے کے ذریعے ان کا نور ختم کر دیا گیا۔ شاید اس میں حکمت یہ ہو کہ ایمان غیبی ہو یعنی نہ ہو۔

”لم يطمس“ ”منی لفاعل ہے اور مبی للمفعول بھی جائز ہے۔

”لأضاء ا“ ”تشبیہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخ میں لأضاء مفرد ہے اور اضاءة متعدی ہے یا لازم ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے:

لا ستنار بهما ما بين المشرق والمغرب۔

اور یہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں ہے:

”ولو لاما مسهما من خطايا بني آدم لأضاء اما بين المشرق والمغرب“ ”کیونکہ جب ان کو بنی آدم کے گناہوں نے

مس کیا تو تب اللہ نے ان کے نور کو ختم کر دیا اور اس بات کی تائید کہ حجر اسود جنت کا پتھر ہے اس سے ہوتی ہے کہ جب قرامط نے مکہ پر غلبہ پایا اور مسجد حرام اور زمزم کو لاشوں سے بھر دیا اور حجر اسود کو۔ بعض نے آہنی گرز سے مارا اور کہا کب تک غیر اللہ کی عبادت کی جائی گی۔

پھر اس کو اپنے بلاد میں لے کر گئے مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کیلئے اور بیس سے زائد برس ان کے پاس رہا پھر ڈھیر سارے مال پر ان سے صلح ہوئی کہ وہ حجر اسود کو لوٹا دیں تو وہ کہنے لگے کہ وہ ہمارے ہاں دوسرے پتھروں کے ساتھ خلط ملط ہو گیا ہے اور اب ہم اس کی تمیز نہیں کر سکتے دوسرے پتھروں سے۔ اگر تمہارے پاس کوئی ایسی علامت ہو تو وہ علامت لے کر آؤ اور اس کو دوسرے پتھروں سے الگ کر دو۔

تو اہل علم سے اس کی تمیز کرنے کیلئے علامت کے بارے میں پوچھا گیا تو اہل علم نے فرمایا کہ آگ اس پر اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ جنت میں سے ہے، تو ان کے سامنے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے ازمایا اور جب بھی وہ کسی پتھر کو آگ میں ڈالتے تو وہ ٹوٹ جاتا یہاں تک کہ اس کو لے کر آئے تو آگ اس میں ادنیٰ اثر بھی نہ کر سکی تو وہ جان گئے کہ یہ وہی ہے اور اس کو واپس لوٹا دیا۔

اور کہا گیا ہے کہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ اس کو لیجاتے وقت اس کے نیچے کئی سارے اونٹ مرے اور واپسی کے وقت ایک کزور

اونٹ اس کو اٹھا کر مکہ لایا اور اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

طواف کرتے ہوئے واجبات و سنن و آداب کا لحاظ کرنا ضروری ہے

۲۵۸۰: وَعَنْ عُبَيْدِ بْنِ عُمَيْرٍ أَنَّ ابْنَ عَمْرٍو كَانَ يُزَاحِمُ عَلَى الرُّكْنَيْنِ زِحَامًا مَا رَأَيْتُ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يُزَاحِمُ عَلَيْهِ قَالَ إِنْ أَفْعَلْتُ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنْ مَسَحْتَهُمَا كَفَّارَةٌ لِلْخَطَايَا وَسَمِعْتُهُ يَقُولُ مَنْ طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ أُسْبُوْعًا فَاحْصَاهُ كَانَ كَعَتَقِ رَقَبَةٍ وَسَمِعْتُهُ يَقُولُ لَا يَضَعُ قَدَمًا وَلَا يَرْفَعُ أُخْرَى إِلَّا حَطَّ اللَّهُ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةً وَكُتِبَ لَهُ بِهَا حَسَنَةٌ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی سننہ ۲۹۲/۳ حدیث رقم ۹۵۹۔ والنسائی فی ۲۲۱/۵ الحدیث رقم ۲۹۱۹۔ واحمد فی المسند ۳۱۲۔
ترجمہ: حضرت عبید اللہ بن عمیر سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما لوگوں کے اوپر رکنوں کے ہاتھ لگانے پر غلبہ کرتے تھے رکنوں کے معنی حجر اسود اور رکن یمانی کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب رسول میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ اس پر یعنی ہر ایک پر ان دونوں رکنوں سے غلبہ کرتے ہو۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اگر میں غلبہ کروں تو میرا انکار نہ کرو۔ اس لیے کہ تحقیق میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تحقیق ان دونوں رکنوں کو ہاتھ لگانا گناہوں کے لیے کفارہ ہے اور میں نے سنا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے تھے جو کوئی خانہ کعبہ کا طواف سات مرتبہ کرے اور اس کی محافظت کرے۔ یعنی واجبات و سنن و آداب اس کے بجالاتے تو اس کو غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا تو میں نے سنا حضور ﷺ کو فرماتے تھے جب کوئی طواف میں قدم رکھتا ہے اور اٹھاتا ہے دوسری مرتبہ یعنی طواف میں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے گناہ دور کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے لیے نیکی لکھی جاتی ہے۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عبید بن عمیر۔ عبید نام، عمیر کے بیٹے اور کنیت ”ابوعاصم“ ہے۔ ”لیث“ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ حجاز کے باشندہ اور اہل مکہ کے قاضی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی زیارت بھی کی۔ ان کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی۔ اور ان سے کچھ تابعین نے روایت کی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پہلے وفات پائی۔ ”عبید“ اور ”عمیر“ دونوں تصغیر کے ساتھ ہیں۔

تشریح: قوله: ما رأيت أحدا..... يزاحم عليه:

یعنی ایسا مزاحمت اور زحام جو ایذا رسانی سے خالی ہوتا تھا۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ زحاما عظیمًا۔ یعنی زبردست قسم کی مزاحمت کرتے تھے۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ تمام پکروں میں ہو یا اول اور آخر میں ہو کیونکہ ان کی حالت زیادہ تاکید والی ہے۔ امام شافعی نے الام میں فرمایا ہے کہ میں استلام کے وقت لوگوں پر غالب آنے اور اژدحام کو پسند نہیں کرتا مگر طواف کی ابتداء اور آخر میں۔ لیکن اس سے ایسا اژدحام مراد ہے جس سے لوگوں کے مزاحمت اور اژدحام سے تکلیف نہ ہو کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عمر سے فرمایا ”انک رجل قوی لاتزاحم علی الحجر فتؤدی الضعیف ان وجدت خلوة فاستلمه والا فاستقلبه وهلل وکبر“ روایت کیا ہے اس کو شافعی اور احمد نے۔

بعض روایات میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما شدت زحام سے ناک زخمی کر دیتے تھے اور گویا کہ صحابہ نے اس کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس پر ایذا رسانی کا ترتب ہو رہا تھا پس صحابہ کے فعل کی اقتداء خاص کر کے اس زمانہ میں اولیٰ اور بہتر ہے۔

قوله: ان افعل فانی سمعت رسول الله ﷺ يقول: للخطايا:

”فان افعل“ ان شرطیہ ہے اور جزاء مقدر ہے یعنی فلا الام اور دلیل جواب فانی سمعت الخ ہے۔ ابن عمر اپنے فعل کیلئے بطور دلیل یہ کہا کرتے تھے اور علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اپنے عذر میں یہ پیش کرتے تھے۔

قوله: من طاف بهذا البيت كعتق رقبة:

”اسبوعاً“ یعنی سات چکر جیسا کہ ایک روایت میں سبعة اشواط کے الفاظ ہیں۔ اور مظہر کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے سات دن پے در پے کہ درمیان میں کوئی دن نہ چھوئے (انجمن) لیکن حدیث سے یہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا جیسا کہ ظاہر ہے۔

قوله: وسمعته يقول: ”وسمعته“ یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی سنا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ راوی کہتے ہیں کہ میں نے ابن حمد سے سنا اس صورت میں دوسری اور تیسری حدیث موقوف ہوگی اور مرفوع کے حکم میں ہوگی۔

”لا یرفع“ بظاہر لا یرفعها ہے اور اس کو آخری صفت رفع اور وضع کے اختلاف کی وجہ سے کہا ہے۔

”الا حط الله عنه بها الخ“ یعنی ہر قدم پر یا ہر بار قدم اٹھانے اور رکھنے پر، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لفظ نشر مرتب ہو کہ وضع قدم کے ساتھ وضع سیدہ ہو اور رفع قدم کے ساتھ اثبات حسنہ ہو جو جنت میں رفع درجہ کے مقتضی ہے۔ پھر یہ اجر و ثواب اس شخص کو ملتا ہے جو ادب کا لحاظ رکھے اور جو اب عوام زحام اور رش بنا لیتے ہیں جس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور جس میں دھکے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنا ہوتا ہے تو یہ زیادہ گناہ کا موجب ہے۔

دونوں رکنوں کے درمیان پڑھنے والی دعا

۲۵۸۱: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ رَبَّنَا إِنَّا فِي الدُّنْيَا

حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۴۸/۲ الحدیث رقم ۱۸۹۲۔ واحمد فی المسند ۴۱۱/۳

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سائب سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا فرماتے تھے دونوں رکنوں کے درمیان یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کے اے ہمارے رب دے ہم کو بھلائی دنیا میں اور آخرت میں بھلائی اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ربنا اتنا فی الدنيا حسنة: ”ربنا“ منصوب ہے حرف ندا کے حذف کے ساتھ۔

یعنی علم و عمل، عفو و عافیہ، اور اچھی روزی، یا اچھی زندگی یا قناعت یا نیک اولاد۔

قوله: وفي الآخرة حسنة: یعنی بخشش، جنت اور اونچے درجات یا انبیاء کی رفاقت یا رب کی رضا یا رویت باری تعالیٰ یا باری تعالیٰ کی ملاقات مراد ہے۔

قوله: وقنا عذاب النار: جہنم کی سختیوں، اس کی گرمی سردی، تپش، بھوک، پیاس، بدبو، تنگی، بچھو اور سانپوں سے بچا۔

حضرت علیؑ نے حسنة اولیٰ کی تفسیر نیک عورت سے کی ہے اور حسنة ثانیہ کی تفسیر حور عین سے کی ہے اور عذاب النار کی تفسیر مسلط ہونے والی عورت سے کی ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ سید زکریا نے اپنے شیخ قطب الباری ابوالحسن البکری سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں ستر قول ہیں جس میں سے زیادہ اچھا یہ ہے کہ حسنة اولیٰ سے مراد اتباع مولیٰ ہے اور ثانیہ سے مراد رفیق اعلیٰ ہے اور عذاب النار سے مراد

حجاب موٹی ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حسنه سے مراد ہر وہ چیز ہے جس پر حسنه کا اطلاق ہوتا ہے وہ کوئی بھی بھلائی اور حسنه ہو۔ اور کمرہ کبھی عموم کا فائدہ دیتی ہے۔ جیسے اللہ کے اس ارشاد میں ﴿عَلِمْتَ نَفْسَ مَا أَحْضَرْتَ﴾ [التکویر: ۱۴] اور عذاب سے مراد عقاب کے انواع اور اقسام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سعی کی اہمیت

۲۵۸۲: وَعَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ أَخْبَرْتَنِي بِنْتُ أَبِي تَجْرَةَ قَالَتْ دَخَلْتُ مَعَ نِسْوَةٍ مِّنْ قُرَيْشٍ دَارَ آلِ أَبِي حُسَيْنٍ نَنْظُرُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ يَسْعَى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ فَرَأَيْتُهُ يَسْعَى وَإِنْ مَنَزْرَةً لِيدُورُ مِنْ شِدَّةِ السَّعْيِ وَسَمِعْتُهُ يَقُولُ اسْعُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ۔

(رواہ فی شرح السنۃ وروی احمد مع اختلاف)

اخرجه الدارقطني ۲۵۶/۲ من كتاب الحج الحديث رقم ۸۷ من باب المواقيت والبغوي في شرح السنن ۱۴۰/۷ الحديث رقم ۱۹۲۱۔ واحمد في المسند ۴۲۱/۶۔

ترجمہ: شبیبہ کی بیٹی صفیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بنتی ہیں کہ مجھ کو ابو نجران کی بیٹی نے خبر دی کہ میں قریش کی عورتوں کے ساتھ آل ابی حسین کے گھر گئی تاکہ ہم نبی کریم ﷺ کی طرف دیکھیں اور وہ صفا اور مروہ کے درمیان پھرتے ہیں تاکہ ان کے جمال و کمال سے مشرف ہو جائیں اور ان کے عمل و برکت سے مستفید ہو جائیں۔ پس میں نے ان کو صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ تحقیق ان کا تہہ بندان کے پاؤں کے گرد زیادہ دوڑنے کی وجہ سے پھر رہا تھا اور میں نے ان کو فرماتے ہوئے سنا کہ سعی کرو۔ پس تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کر دی ہے۔ اس کو شرح السنۃ میں نقل کیا گیا ہے اور امام احمد نے اس کو اختلاف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

تشریح: قولہ: بنت ابی تجرۃ: تاء کے ضم اور جیم سکون کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ تاء کے فتح اور جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ (ذکرہ ابن الملک)

ابن حجر فرماتے ہیں تاء کے فتح اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے اور اول تصحیح شدہ نسخوں کے موافق ہے۔ مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور ابن ہمام کی روایت میں ہے کہ اس کا نام حبیبہ ہے بنی عبدالدار کی عورتوں میں سے ہے۔

قولہ: فرأیتہ یسعی وان منزرہ لیدور من شدۃ السعی: ”وان“ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور واو حالیہ ہے۔

”منزرہ“ میم کے کسرہ اور ہمزہ کے سکون کے ساتھ ہے اور ہمزہ یاء سے بدلا بھی جاتا ہے۔

”من شدۃ السعی“ یہ دلالت کر رہا ہے کہ آپ ﷺ پیدل تھے اور حدیث حسن میں اس کی تصریح آئی ہے اور یہ منافی نہیں ہے اس روایت کا جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں سوار ہو کر سعی کی کیونکہ تطبیق ممکن ہے۔ بایں طور کہ پیدل سعی کرنا کسی عمرہ میں ہو یا پیدل چلنے کے بعد اور سوار ہونا عمرہ میں ہو طواف قدم سواری پر کرنے کے بعد، اور ابن حجر کی تطبیق کہ آپ ﷺ نے پیدل سعی کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن جب لوگوں کا ازدحام بنا تو باقی چکروں میں آپ سوار ہوئے۔

درست نہیں ہے اور بعید ازہم ہے۔ اور ترمذی نے شافعی سے بلا عذر رکب کے کراہت کو نقل کیا ہے۔ اور ابن المنذر نے جمہور اہل علم سے یہ نقل کیا ہے۔ پس نووی کا قول کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ بلا عذر سوار ہونا خلاف اولیٰ ہے مکر وہ نہیں ہے اس کی کوئی توجیہ نہیں ہے۔

قوله: اسعوا فان الله كتب عليكم السعي. علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ فرض کیا ہے تم پر سعی، پس یہ دلالت کر رہا ہے کہ سعی فرض ہے اور جس نے سعی نہیں کی تو اس کا حج باطل ہوا امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک (اتھی)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ سعی واجب ہے اور اس طرح اس میں پیدل چلنا بھی واجب ہے اور حدیث ظنی ہے اور ترک واجب پر دم لازم ہوتا ہے۔ اور اس حدیث کو دارقطنی، شافعی اور بیہقی نے روایت کیا ہے سند حسن کے ساتھ ان الفاظ کے ساتھ ”انہ علیہ الصلاة والسلام استقبال الناس فی المسعی وقال یا ایہا الناس اسعوا فان الله كتب عليكم السعی اور صحابہ کی ایک جماعت جیسے ابن عباس، ابن زبیر، انسؓ اور ان کے علاوہ تابعین نے کہا ہے کہ سعی مستحب ہے اور دلیل میں اللہ کے اس ارشاد کو پیش کیا ہے: ﴿فلا جناح علیہ ان یطوف بہما ومن تطوع خیر﴾ [البقرة: ۱۵۸]

اور مبنی برانصاف قول یہ ہے سعی واجب ہے نہ کہ فرض۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو شافعی، ابن ابی شیبہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور صاحب تنقیح نے کہا ہے کہ جواب یہ ہے کہ ہم اس کے موجب کے قائل ہیں کیونکہ اس جیسی حدیث سے وجوب سے زائد کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اور وجوب کے ہم قائل ہیں۔ اور باقی رکن ہونا ہمارے نزدیک اس پر کسی دلیل کے ہونے سے ثابت ہوتا ہے اور اس حدیث سے ثابت کرنا اثبات بلا دلیل ہے۔

پھر جان لیجئے کہ سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سعی مکتوب سے مراد بطن وادی میں دوڑنا ہے۔ لیکن ہمارے علم کے مطابق بغیر کسی اختلاف کے یہ مراد نہیں ہے۔ پس اس کو حمل کیا جائے کہ اس سے مراد صفا، مروہ کے درمیان طواف اور چکر لگانا ہے کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو یہ بات اس وقت فرمائی کہ جب آپ ﷺ منون دوڑ شروع کر چکے تھے اور اس کے مقام یعنی بطن وادی تک پہنچ چکے تھے اور اس جگہ کے علاوہ میں دوڑ منون نہیں ہے برخلاف رمل کے کہ وہ چلنا ہے تیزی اور قوت کے ساتھ۔

پھر کہا گیا ہے بطن الوادی میں دوڑنے کے سبب کے بارے میں کہ حضرت ہاجرہؓ کو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھوڑا اور اس کو پیاس لگی تو وہ پانی کی تلاش میں نکلی اور وہ اسماعیل علیہ السلام کو بھی دیکھ رہی تھی اس پر خوف کی وجہ سے۔ جب وہ بطن الوادی میں پہنچ گئی تو اسماعیل ان سے غائب ہو گئے تو وہ دوڑی تاکہ جلدی سے صفا پر چڑھ جائے اور اسماعیل کو دیکھ لے پھر اس کو عبادت قرار دیا گیا ان کی شرافت کے اظہار کیلئے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو حج کا حکم ہوا تو سعی کے وقت شیطان ان کے سامنے آگئے اور ان کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرنے لگے تو ابراہیم علیہ السلام ان سے آگے نکلے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ یہاں دوڑے تھے۔ مشرکین کے سامنے قوت کے اظہار کیلئے اس وجہ کا مکمل عمرۃ القضاء کی سعی ہے پھر اس کے بعد یہ رمل کی طرح ہوا کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ میں کوئی مشرک باقی نہ تھا۔ محققین کا قول یہ ہے اس کا معنی اور مطلب تلاش نہ کیا جائے اور اس جیسے دوسرے احکام رمی وغیرہ میں بلکہ یہ تو فیہی امور ہیں ان کے علم کو اللہ کے حوالہ کیا جائے۔

اور سعی رمی کی جگہ وہ جگہ ہے جو آج کل معروف ہے سلف و خلف کے اس پر اجماع کی وجہ سے۔

نبی کریم ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر سعی فرمائی

۲۵۸۳: وَعَنْ قَدَامَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمَّارٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَسْعَى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ عَلَى

بَعِيرٍ لَا ضَرْبَ وَلَا طَرْدَ وَلَا إِلَيْكَ إِلَيْكَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

الحديث رقم ۳۰۳۵ - واحمد في المسند ۴۱۳/۳ -

ترجمہ: حضرت قدامتہ بن عبداللہ بن عمارؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے دیکھا۔ اونٹ پر نہ مارتا تھا اور نہ ہانکتا تھا اور نہ ہی کہتا تھا کہ ایک طرف ہو جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ اس کو شرح السنۃ میں نقل کیا گیا ہے۔

تشریح: قولہ: عن قدامتہ: "قدامة" قاف کے ضمہ اور وال کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

راوی حدیث:

قدامة بن عبد اللہ۔ اسم گرامی "قدامة" ہے۔ "عبد اللہ" کے بیٹے ہیں۔ "بنو کلاب" میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "بنو عامر" سے ہیں۔ پرانے مسلمان ہیں۔ مکہ میں ہی سکونت پذیر ہو گئے اور ہجرت نہیں کی۔ حجۃ الوداع میں حاضر تھے۔ بعد میں (بلا و نجد کے مقام) "بدر" میں ٹھہر گئے۔ ان سے ایمن بن نائل وغیرہ نے حدیث کی روایت کی۔ "قدامة" میں قاف پر ضمہ اور وال مہملہ بلا تشدید کے ہے۔
قولہ: رأیت رسول اللہ ﷺ یسعی..... بعیر: قولہ: "لا ضرب ولا طرد" دونوں فتح اور رفع دونوں کے ساتھ اور دونوں تنوین کے ساتھ ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگوں کو نہ مارتے تھے اور نہ جھڑکتے تھے اور نہ یہ کہتے تھے کہ راستے سے ہٹو جیسا کہ بادشاہوں اور جبارہ کا طریقہ اور عادت ہے مقصود اس حدیث سے ان لوگوں پر تعریض ہے جو یہ کرتے ہیں (انتہی) سیوطی نے ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلی بدعت جو ظاہر ہوئی ہے وہ الطریق الطریق (راستہ چھوڑ، راستہ چھوڑو) ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ہم اس زمانہ میں الطریق، الطریق۔ اور الیک الیک پر راضی ہیں کیونکہ اس زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جو ہاتھ اور پاؤں کے ذریعے لوگوں کو راستے سے ہٹاتے ہیں اور سواروں سے روندتے ہیں اور وہ خاموش ہوتے ہیں منہ سے کچھ نہیں بولتے، گویا وہ اس کا مصداق ہیں: ﴿اولئک کالانعام بل هم اضل.....﴾

اضطباع کا طریقہ

۲۵۸۳: وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ طَافَ بِالْبَيْتِ مُضْطَبِعًا بِيَرْدٍ أَخْضَرَ -

(رواه الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ و الدارمی)

اخرجه ابوداؤد في السنن ۴۴۳/۲ الحديث رقم ۱۸۸۳ - والترمذی في ۲۱۴/۳ الحديث رقم ۸۵۹ - وابن ماجه ۹۸۴/۲ الحديث رقم ۲۹۵۴ - والدارمی في سننه ۶۵/۲ الحديث رقم ۱۸۴۳ - واحمد في المسند ۲۲۳/۴ -

ترجمہ: حضرت یعلیٰ بن امیہ سے روایت ہے تحقیق آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اس حال میں کہ اضطباع کرنے والے تھے سبز چادر کے ساتھ یعنی سبز خطوط کی چادر تھی۔ اس کو امام ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور دارمی نے۔

تشریح: "مضطباعاً" باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ طیبی فرماتے ہیں کہ "ضبع" بازو کے درمیان کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق بغل پر بھی ہوتا ہے۔

"اضطباع" کہتے ہیں کہ چادر کے درمیانی حصہ کو دائیں بغل کے نیچے ڈال کر اس کے دونوں اطراف بائیں کندھے پر آگے اور

پیچھے کی طرف ڈال دیں۔ اس کو اضطباع اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں ضبعین یعنی بازو کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ اضطباع اظہار شجاعت کیلئے فرماتے تھے۔

اضطباع اور رمل دونوں سنت ہیں ہر اس طواف میں جس کے بعد سعی ہو۔ اور اضطباع تمام چکروں میں سنت ہے برخلاف رمل کے۔ اور طواف کے علاوہ اضطباع مستحب نہیں ہے اور جو عوام ابتداء احرام سے حج ہو یا عمرہ اضطباع کرتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہے بلکہ نماز کی حالت میں مکروہ ہے۔ طواف افاضہ میں اگر وہ کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اضطباع ساقط ہو جاتا ہے۔
تخریج: ابن ہمام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

اضطباع کرنا سنت ہے

۲۵۸۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَ أَصْحَابَهُ اعْتَمَرُوا مِنَ الْجِعْرَانَةِ فَرَمَلُوا بِالْبَيْتِ ثَلَاثًا وَ جَعَلُوا أَرْضِيَّتَهُمْ تَحْتَ آبَائِهِمْ ثُمَّ قَدَّ فَوْهَا عَلَى عَوَاتِقِهِمُ الْيُسْرَى۔ (رواہ ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۴۴/۲ الحدیث رقم ۱۸۸۴۔ واحمد فی المسند ۳۰۶/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بے شک نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھ صحابہ نے جعرانہ سے عمرہ کیا جو ایک جگہ کا نام ہے کہ سے اٹھ کوس کے فاصلے پر ہے پس جلدی چلے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے تین مرتبہ اور اپنی چادروں کو اپنی بغلوں کے نیچے کیا پھران کو اپنے بائیں کندھوں پر ڈالا۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔
تشریح: ”الجعرانہ“ نووی فرماتے ہیں کہ زیادہ فصیح تخفیف کے ساتھ ہے۔
”آباط“ الف ممدودہ کے ساتھ بط کی جمع ہے۔

شافعی رحمۃ اللہ کا یہ قول عجیب و غریب ہے کہ سعی میں اضطباع سنت ہے طواف پر قیاس کرتے ہوئے۔ حالانکہ آپ ﷺ نے سعی میں اضطباع ترک کیا ہے اور طواف میں بھی رمل اور اضطباع کی علت باعث معدوم ہے اور ان کا استدلال اس حدیث سے ”انہ علیہ الصلاة والسلام طاف بین الصفا والمروة طارحاً رداءہ“ انتہائی نا آشنا ہے اور مسلک عجیب ہے۔
تخریج: ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے بارے میں ابو داؤد نے نسکوت اختیار کیا ہے اور ان کے علاوہ نے اس کو حسن کہا ہے، اس کلام سے ابن حجر کے اس قول پر اعتراض ختم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کہا ہے رواہ ابو داؤد وسند صحیح۔

الفصل الثالث:

رکن یمانی اور حجر اسود کو ہاتھ لگانا

۲۵۸۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَا تَرَكَنَا إِسْتِيلَامَ هَلْدَيْنِ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَّ وَالْحَجَرِ فِي شِدَّةٍ وَلَا رَخَاءٍ مُنْذُ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَسْتَلِمُهُمَا (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۷۱/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۰۶۔ ومسلم فی ۹۲۴/۲ الحدیث رقم (۲۴۵ - ۱۲۶۸)۔ والنسائی فی ۲۳۲/۵ الحدیث رقم ۲۹۵۲۔ والدارمی فی ۶۳/۲ الحدیث رقم ۱۸۳۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نے ان دونوں رکنوں کو ہاتھ لگانا نہیں چھوڑا بھڑ میں بھی آسانی میں بھی جب سے میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ ہاتھ لگاتے تھے ان دونوں کو اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: بیہقی کی خبر میں سذضعیف کے ساتھ ہے انہ علیہ الصلاة والسلام اتی فقبلہ واستلم الیمانی فقبل یدہ، ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ احمد کی اس روایت کے معارض نہیں ہے جس میں ہے انہ علیہ الصلاة والسلام قبل رکن الیمانی ووضع خدہ الایمن علیہ، کیونکہ یہ یا تو غیر ثابت ہے جیسا کہ بیہقی نے کہا ہے اور یا ضعیف ہے اگرچہ حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے (اتحلی) لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ حدیث بیہقی باوجود ضعیف ہونے کے کیسے معارض نہیں ہو سکتی۔ حدیث احمد کا اور اس کے ساتھ حاکم کے اس کی سند کو صحیح قرار دینے سے وہ قوی ہو جاتا ہے پس اولیٰ یہ ہے کہ اس کو نادر حالت پر محمول کیا جائے۔

پھر ابن حجر کا یہ قول کہ رکن یمانی کے استلام کا کوئی قائل نہیں امام محمد کے قول سے غفلت ہے کہ وہ فرماتے ہیں رکنین کا حکم برابر ہے۔ پھر صحیحین میں ابن عمر کی روایت ہے: ما اری رسول اللہ ﷺ ترک استلام الرکنین اللذین یلیان الحجر الا ان البیت لم یتم علی قواعد ابراہیم علیہ الصلاة والسلام۔

باقی ایک جماعت جن میں سے ابن زبیر اور معاویہؓ ہیں کا ان دونوں کا استلام کرنا یہ ان کا مذہب ہے جس میں انہوں نے صحیح احادیث کی مخالفت کی ہے اس وجہ سے جمہور صحابہ نے ان کی مخالفت کی ہے۔

باقی حضرت معاویہ کا یہ قول: لیس شیء من البیت مہجورا تو اس کا جواب امام شافعیؒ نے دیا ہے کہ ان کا استلام بیت اللہ کے ہجران کی وجہ سے نہیں چھوڑا جاتا بلکہ جن کا استلام رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے ان کا استلام کیا جائے گا اور جن کا نہیں کیا ہے ان کا نہیں کیا جائے گا۔

یہ اختلاف اب ختم ہو چکا ہے اور اب اجماع ہے کہ ان کا استلام نہیں کیا جائے گا۔ اور اس اجماع میں اصولیین کا اختلاف ہے۔ (کذا

حققہ العسقلانی)

۲۵۸۷: وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا قَالَ نَافِعٌ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَسْتَلِمُ الْحَجَرَ بِيَدِهِ ثُمَّ قَبَّلَ يَدَهُ وَقَالَ مَا تَرَكَتُهُ مِنْذُ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَفْعَلُهُ۔

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۲۴/۲ الحديث رقم (۲۴۶) - (۱۲۶۸) - وابوداؤد في ۴۴۰/۲ الحديث رقم ۱۸۷۶۔

ترجمہ: بخاری اور مسلم شریف کی ایک روایت میں یوں ہے کہ نافع نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنا ہاتھ حجر اسود کو لگاتے تھے پھر اپنے ہاتھ کو بوسہ دیتے اور فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں چھوڑا جب سے میں نے حضور ﷺ کو دیکھا ہے یہ کرتے ہوئے۔

تشریح: قولہ: يستلم الحجر ثم قبل يده: شاید یہ ازدحام کے وقت ہو، بدایہ میں ہے کہ اگر ممکن ہو تو حجر اسود کو مس کرے ہاتھ سے یا اس چیز سے جو ہاتھ میں ہو۔ اور پھر ہاتھ یا اس چیز کو چومے اور فتاویٰ قاضیخان میں ذکر کیا ہے کہ ہاتھ کو چومنے کے بجائے چہرے پر ملے۔

قولہ: ماترکتہ منذ رأیت رسول اللہ ﷺ يفعله: یعنی مطلق استلام یا مخصوص استلام، کیونکہ آپ علیہ الصلاة والسلام سے استلام اور چومنا دونوں ثابت ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے اور بیہقی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے: ان ابن عباس رضی اللہ عنہما قبلہ اسجد علیہ، ثم قال: رأیت عمرو رضی اللہ عنہ قبلہ وسجد علیہ ثم قال: رأیت رسول اللہ ﷺ يفعل هكذا، ففعلت۔ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جب حجر اسود کو بوسہ دیا تو اس پر اپنی پیشانی سے بوسہ کیا۔ اور امام مالک نے شدوذا اختیار کیا ہے جیسا کہ قاضی عیاض نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے ہاتھ چومنے کے اور حجر اسود پر بوسہ

کرنے کو بدعت کہتے ہیں۔

عذر کی وجہ سے سوار ہو کر طواف کرنے کی اجازت ہے

۲۵۸۸: وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ شَكَّوْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِنِّي أَشْتَكِي فَقَالَ طُوفِي مِنْ وَرَاءِ النَّاسِ وَأَنْتِ رَاكِبَةٌ فَطُفْتُ وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّيَ إِلَيَّ جَنْبَ الْبَيْتِ يَقْرَأُ بِالطُّورِ وَكِتَابِ مَسْطُورٍ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۹۰۳۔ الحدیث قم ۱۶۳۳۔ ومسلم فی ۹۲۷/۲ الحدیث رقم (۲۵۸ - ۱۲۷۶)۔
وابوداؤد فی السنن ۴۴۳/۲ الحدیث رقم ۱۸۸۲۔ وابن ماجہ فی ۹۸۷/۲ الحدیث رقم ۲۹۶۱۔ والنسائی فی ۲۲۳/۵
الحدیث رقم ۲۹۲۶۔ ومالك فی الموطأ ۳۷۰/۱ الحدیث رقم ۱۲۳ من كتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت سلمہ سے روایت ہے کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی کہ میں بیمار ہوں یعنی پیدل چل کر طواف نہیں کر سکتی۔ فرمایا کہ لوگوں سے پرے پرے (یعنی دور ہو کر طواف کر اس حال میں کہ تو سوار ہو۔ پس میں نے طواف کیا اور رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے خانہ کعبہ کے پہلو میں یعنی خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ متصل پڑھ رہے تھے۔ سورۃ طور و کتاب مسطور۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: انی اشتکی: شکایۃ مرض کو کہتے ہیں۔

قولہ وانت راکبۃ: اس سے ثابت ہوا کہ سوار ہو کر طواف کرنا۔ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی خصوصیات میں سے نہیں ہے۔

قولہ: "یقراً": اس میں دو احتمال ہیں: (۱) یعنی سورۃ طور ایک رکعت میں پڑھ رہے تھے جیسا کہ آپ ﷺ کی عادت تھی۔
(۲) ادونوں رکعتوں میں یہ سورت پڑھی ہو۔

راوی کیلئے اولیٰ یہ تھا کہ یوں کہتے: یقرأ الطور اور الطور پراکتفا کرتے اور و کتاب مسطور نہ کہتے۔

حجر اسود کو بوسہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے

۲۵۸۹: وَعَنْ عَابِسِ بْنِ رَبِيعَةَ قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ يَقْبَلُ الْحَجَرَ وَيَقُولُ إِنِّي لَا أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ مَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ وَلَا أِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقْبَلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۶۲/۳۔ الحدیث رقم ۱۵۹۷۔ ومسلم فی ۹۲۵/۲ الحدیث رقم (۲۵۱ - ۱۲۷)۔
وابوداؤد فی ۴۳۸/۲ الحدیث رقم ۱۷۷۳۔ والترمذی فی ۲۱۴/۳ الحدیث رقم ۰۸۶۰۔ والنسائی فی ۲۲۷/۵ الحدیث
رقم ۲۹۳۷۔ وابن ماجہ فی ۹۸۱/۲ الحدیث رقم ۲۹۴۳۔ ومالك فی الموطأ ۳۶۷/۱ الحدیث رقم ۱۱۵ من كتاب
الحج۔ واحمد فی المسند ۵۴/۱۔

ترجمہ: حضرت عابس بن ربیعہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا اور کہتے تھے کہ تحقیق میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی تکلیف اور اگر میں نے نبی کریم ﷺ کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھ کو بوسہ نہ دیتا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عابس بن ربیعہ۔ عابس بن ربیعہ "دغظفی" ہیں۔ فتح مصر میں شریک ہوئے۔ ان سے ان کے بیٹے عبدالرحمن روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قولہ: ما تنفع: اور ایک نسخہ میں ”لا تنفع“ ہے۔

قولہ: ولولا انی رأیت رسول اللہ ﷺ ما قبلتک:

اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اشارہ ہے کہ یہ امر تعبیدی ہے ہم اس کو کر رہے ہیں اور اس کی علت کے بارے میں سوال نہیں کرتے اور اشارہ ہے تو حید حقیقی کی طرف جس پر عمل مراں ہے۔ اور علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ اس لیے فرمایا تاکہ وہ لوگ جو نئے مسلمان ہوئے ہیں اور پتھروں کی عبادت سے مانوس ہیں وہ اس سے دھوکے میں نہ پڑیں کہ یہ عقیدہ رکھ لیں کہ یہ پتھر بالذات نفع اور نقصان پہنچانے والا ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے بیان کر دیا کہ یہ بالذات نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگرچہ اس کے بارے میں حکم شرعی کا پورا کرنا جزاء کے اعتبار سے نافع ہے۔

اور تاکہ یہ بات موسم حج میں پھیل جائے اور مختلف ملکوں میں مشہور ہو جائے اور اس میں ترغیب ہے حجر اسود کے چومنے میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرنے کی (اتمی) اور اس میں اشارہ ہے کہ ارباب عقل کے بارے میں یہ خیال نہ کیا جائے اگرچہ وہ کافر ہو کہ وہ عقیدہ رکھے کہ پتھر بالذات نفع اور ضرر کا مالک ہے، اور وہ جو پتھروں کی تعظیم و عبادت کرتے تھے اس کی یہ علت بیان کرتے تھے کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں اور ہمیں اللہ کے نزدیک درجے کے اعتبار سے قریب کرنے والے ہیں۔ پس وہ پتھروں کو چھوتے اور بوسہ دیتے نفع کا سبب ہونے کی وجہ سے۔ ہمارے اور ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنی طرف سے کر رہے ہیں۔ اللہ کی طرف سے اس پر کوئی دلیل نہیں آئی ہے۔ برخلاف مسلمانوں کے کہ وہ کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں اس کی بنیاد اللہ کا امر اور حکم ہے۔ اور پتھر کو بوسہ دیتے ہیں اس کی بنیاد متابعت رسول ﷺ ہے ورنہ ذات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ موجودات کو جاننے والے کی نظر میں ایک گھر اور دوسرے گھر اور ایک پتھر اور دوسرے پتھر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس نے تعظیم بخشی اپنی مخلوقات میں سے جس کیلئے چاہے افراد انسانیت میں سے جیسے رسول ﷺ ہے اور افراد حیوانیہ میں سے جیسے ناقۃ اللہ ہے اور جمادات میں سے جیسے بیت اللہ ہے اور مکانات میں سے جیسے حرم اللہ ہے اور زمانہ میں سے جیسے لیلۃ القدر اور ساعتہ الجمعہ ہے اور اشیاء کے خواص کو اپنے مکتوبات میں پیدا فرمایا اور زمین و آسمان کے اجزاء میں تفاوت و تمایز رکھا۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حاکم نے حدیث عمر کو روایت کیا ہے اور اس میں زیادت کی ہے: فقال علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، بلی یا امیر المؤمنین یضر و ینفع، ولو علمت تاویل ذلك من کتاب اللہ لقلت کما اقول: ﴿واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظهورهم ذریعتهم واشہدہم علی انفسہم الست بربکم؟ قالوا: بلی﴾ [الاعراف: ۱۷۲] فلما اقرؤا انه الرب عزوجل وانہم العیید کتب میناقہم فی رق والقمہ فی هذا الحجز وانہ یبعث یوم القیامۃ، ولہ عینان ولسان وشفتان یشہد لمن وافاہ، فهو امین اللہ فی هذا الکتاب ز قال لہ عمرؓ: لا ابقانی اللہ بأرض لست بہا یا ابا الحسن، یعنی حضرت علی نے فرمایا ہاں اے امیر المؤمنین یہ فائدہ اور نقصان پہنچاتا ہے اور اگر اس کی تفسیر مجھے اللہ کی کتاب میں معلوم ہوتی تو میں یہ کہتا اور پھر آیت واذ اخذ ربک..... پڑھی اور فرمایا کہ جب ارواح نے اقرار کر لیا کہ وہ ان کا رب ہے اور یہ خود بندیں ہیں تو اللہ نے ان کے اس میثاق کو ورق میں لکھا اور اس ورق کو اس پتھر میں رکھا اور قیامت کے دن اس پتھر کو اٹھائے گا اس کی دو آنکھیں اور زبان ہوگی اور دو ہونٹ ہوں گے اور جس شخص نے اس عہد کو پورا کیا ہو اس کیلئے گواہی دے گا۔ پس یہ اللہ کا امین ہے اس کتاب پر۔ حضرت عمر نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اللہ مجھے اس زمین پر باقی نہ رکھے جس پر آپ نے ہواے ابوالحسن۔ اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ابوبارون العبیدی کو قابل احتجاج نہیں کہا ہے۔

اور غراب متون میں سے ہے وہ روایت جو ابن ابی شیبہ میں مسند ابی بکر کے آخر میں ہے قال رجل رأی النبی ﷺ انہ علیہ الصلاة والسلام وقف عند الحجر فقال: انی لا علم أنک حجر لا تضر ولا تنفع، ولولا امرنی ربی ان أقبلك ما قبلك“ پس اس کی سند کیلئے ابن ابی شیبہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو حاکم کی حدیث کے بطلان کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ بہت بعید ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ جواب ”بل یضرو ینفع“ صادر ہو، بعد اس کے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”لا یضرو ولا ینفع“ کیونکہ صورت معارضہ کی ہے اور ذہبی نے عبدی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ساقط ہے اور حضرت عمرؓ نے یا نبی ﷺ نے یہ جاہلیت کے وہم کو ختم کرنے کیلئے فرمایا تھا (اتہمی)۔

پس آپ ﷺ کے قول: انہ لولا امرنی ربی ان أقبلك لما قبلك کا مطلب یہ ہے کہ یہ اشارہ ہے کہ تعبدی طریقے پر عبودیت کی طرف اور احکام ربوبیت کے تحت تنزل اور تواضع کی طرف۔ ورنہ عقل حیران رہتا ہے سید الکونین صاحب لولاک کے پتھروں میں سے ایک پتھر کو بوسہ دینے پر جو پتھر جمادات کی جنس میں سے ہے وہ جمادات جو مخلوقات کے احقر الاجناس میں سے ہے اور یہ تو تنزلات الوہیہ اور تجلیات سبحانیہ ہے کہ اپنے بندوں کیلئے حرم بنایا جس کی طرف وہ ٹھکانا بناتے ہیں اور نمازوں اور دیگر عبادات میں اس کی طرف رخ کرتے ہیں اور اس کو بوسہ دیتے ہیں اور ہاتھوں سے مسح کرتے ہیں اور اس پر پیشانی رکھتے ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

”الحجر یمین اللہ فمن مسحه فقد بايع الله!“ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس میں یہ مسئلہ ہے کہ اس تقبیل کیلئے آواز نہیں ہے اور کیا بوسہ کے بعد حجر پر سجدہ کرنا مستحب ہے؟ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ حجر اسود کو بوسہ دیتے اور اس پر سجدہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے حضرت عمر کو دیکھا کہ وہ بوسہ دے کر سجدہ کرتے تھے اور فرماتے تھے میں رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے اس وجہ سے میں نے اس طرح کیا۔ اس کو مندری اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔

مگر شیخ توام الدین کا کہی فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ سجدہ نہ کیا جائے کیونکہ مشاہیر میں سجدہ کی روایت نہیں ہے۔ اور شیخ عز الدین نے اپنے مناسک میں ہمارے علماء سے سجدہ کرنے کو نقل کیا ہے۔ (اتہمی)

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ جب ہجوم نہ ہو تو بعض ایام میں سجدہ کرنا اولیٰ ہے یا اول اور آخر میں آپ ﷺ کے فعل سے تبرک کیلئے حدیث پر عمل کرنے کے جواز کی وجہ سے اگرچہ ضعیف ہو اور علماء نے حدیث کو صحیح بھی قرار دیا ہے؟ پھر ابن ہمام نے فرمایا ہے کہ ابن ماجہ کی روایت میں ہے: ”عن ابن عمر قال استقبل النبی ﷺ الحجر ثم وضع شفته علیہ بیکی طویلا، ثم التفت، فاذا هو بعمر بن الخطاب بیکی، فقال: یا عمر هنہا تسکب العبرات“۔

رکن یمانی پر ستر فرشتے متعین کیے گئے ہیں

۲۵۹۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ وَكَلَّ بِهِ سَبْعُونَ مَلَكًا يَعْنِي الرُّكْنَ الْيَمَانِيَّ فَمَنْ قَالَ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ رَبَّنَا إِنَّا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ قَالُوا آمِينَ - (رواه ابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه في سننه ۹۸۵/۲ الحدیث رقم ۲۹۵۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رکن یمانی پر ستر فرشتے متعین ہیں

پس جو شخص کہے کہ اے الہی! میں تجھ سے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور دنیا و آخرت میں عافیت مانگتا ہوں اے ہمارے رب ہمیں دنیا و آخرت میں بھلائی نصیب فرما اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔
تشریح: ”الیمانی“ قول صحیح کے مطابق تخفیف یا ع کے ساتھ ہے۔

یعنی الرکن الیمانی“ بہ کے ضمیر کے مرجع کو متعین کرنے کیلئے لایا ہے اور یہ ضد معترضہ ہے علی طریق التفسیر اور قائل ابو ہریرہ یا ان کے علاوہ کوئی ہے۔
 ”فی الدنيا والآخرة“ ممکن ہے کہ لف نشر مشوش کے طور پر ہو۔

اس روایت میں اور گزرے ہوئے روایت ”بین الرکنین“ میں منافات نہیں ہے کیونکہ جب وہ رکن یمانی تک پہنچے اور یہ دعا شروع کی اور وہ چل رہے تھے تو کو یہ شک نہیں یہ دونوں کے درمیان واقع ہوا ہو۔ کیونکہ دوران طواف دعا کیلئے کھڑا ہونا جائز نہیں ہے جیسا کہ جاہل عوام یہ کرتے ہیں۔

ابن ہمام علماء اعلام سے ادعیہ ماثورہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جان لے کہ اگر آپ منقول دعائیں اور اذکار جو طواف کے بارے میں ہیں سب پر عمل کرنا چاہیں اور سب پڑھنا چاہیں تو دوران طواف آپ کا کھڑا رہنا چلنے سے زیادہ ہوگا کیونکہ یہ اذکار اور دعائیں آرام اور مہلت کے ساتھ منقول ہیں نہ کہ دوڑنے کے ساتھ۔

پھر بعض سلف صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ انہوں نے فلاں جگہ یہ دعا پڑھی اور یہ پڑھی اور دوسرے سے منقول ہے کہ یہ پڑھی اور کسی اور سے کچھ اور منقول ہے تو متاخرین نے سب کو جمع کر دیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب ایک ہی روایت میں منقول ہیں اور ایک ہی موقع پر پڑھنا چاہیے بلکہ معروف طواف میں اللہ کا ذکر ہے اور ہمیں ایسی کوئی روایت نہیں معلوم جس میں قرآن پڑھنے کا ذکر ہو۔
 ملا علی قاری فرماتے ہیں شاید کہ آپ ﷺ نے طواف میں قرآن میں سے کچھ قراءت کے قصد سے نہیں پڑھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ قراءت ارکان طواف میں سے نہیں ہے اور یہ بھی الطواف کا الصلوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔

تخریج: ابن ماجہ نے اس حدیث کو سند ضعیف کے ساتھ نقل کیا ہے مگر فضائل اعمال میں یہ مقبول ہے۔

مزید روایات: اور حاکم نے روایت کیا ہے ”انہ علیہ الصلاة والسلام قال: ما انتهیت الی الرکن الیمانی قط الا وجدت جبریل عنده، قال: قل یا محمد! قلت: وما اقول؟ قال: قال: اللهم انی اعوذ بک من الکفر والفاقة ومواقف الخزی فی الدنيا والآخرة، ثم قال جبریل ان بینهما سبعین الف ملک، فاذا قال العبد هذا قالوا: آمین“ اور ایک روایت میں سبعون واو کے ساتھ ہے۔ ان کے اہمال کے ساتھ یا اس طور پر کہ لفظ ان میں ضمیر شان ہے اور اس کی نظیر ”ان کان فی امتی ملہمون“ نہیں ہے۔ جیسا کہ ابن حجر گوید وہ ہم ہوا ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہاں کان تامہ ہو اور اصل میں ان وجدنی امتی ملہمون ہو۔

اور ابو داؤد کی روایت میں ہے: ”ما مورت بالرکن الیمانی الا وعنده ملک ینادی بقول آمین، آمین؟ فاذا مورت بہ فقولوا: ربنا آتنا فی الدنيا حسنة، وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار“۔

اور ابن جوزی نے نقل کیا ہے کہ رکن یمانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جب سے اللہ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے پس جب تم رکن یمانی سے گزرو تو یہ کہو: ”ربنا آتنا.....“ کیونکہ وہ کہتا ہے آمین، آمین۔ اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے یمانی کے درمیان کہتے ”اللهم ربنا آتنا فی الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار“ پھر فرماتے ”اللهم قنعنی بما

رزقتنی وبارک لی فیہ واخلف علی کل غائبۃ لی بخیر۔“

اور اترتی نے حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ جب بھی رکن یمانی سے گزرتے تو کہتے: ”بسم اللہ واللہ اکبر، السلام علی رسول اللہ ورحمة اللہ وبرکاتہ، اللهم انی اعوذ بک من الکفر والفقر ومواقف الخزی فی الدنیا والاخرۃ یربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرۃ حسنة و قنا عذاب النار۔“

اور یہ حدیث نبی ﷺ سے مرسل بھی منقول ہے مگر سند ضعیف کے ساتھ اور بعض نے اس میں یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا اللہ کے رسول ﷺ میں یہ کہوں اگر چہ میں جلدی جلدی چلوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اگر چہ آپ ہانجھ بادل سے زیادہ تیز ہو۔

طواف کی فصیلت

۲۵۹۱: وَعَنْ أَيْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ طَافَ بِالنَّبِيِّ سَبْعًا وَلَا يَتَكَلَّمُ إِلَّا بِسُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ مُحِيتٌ عَنْهُ عَشْرُ سَيِّئَاتٍ كُتِبَ لَهُ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَرُفِعَ لَهُ عَشْرُ دَرَجَاتٍ وَمَنْ طَافَ فَتَكَلَّمَ وَهُوَ فِي تِلْكَ الْحَالِ خَاصٌّ فِي الرَّحْمَةِ بِرَجْلَيْهِ كَخَانِضِ الْمَاءِ بِرَجْلَيْهِ۔

اخرجه ابن ماجه فی سننه ۹۸۶/۲ الحیث رقم ۲۹۵۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص خانہ کعبہ کا طواف سات بار کرے اور کلام نہ کرے مگر سبحان اللہ اور الحمد للہ اور لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہے اس سے دس برائیاں دور کی جاتی ہیں اور اس کے واسطے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کے واسطے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں اور جو شخص کہ طواف کرے اور اس میں کلام کرے وہ اس حالت میں ہے یعنی حالت طواف میں وہ دریائے رحمت میں اپنے دونوں پاؤں کے ساتھ اس طرح داخل ہوتا ہے جس طرح اپنے پاؤں کے ساتھ کوئی شخص پانی میں داخل ہوتا ہے۔ اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”محیت“ تمام نگوں میں تاء تائید کے ساتھ ہے ”کتب“ تمام نگوں میں تذکیر کے ساتھ ہے۔

”سبحان اللہ“ یہ واجب النصب ہے محلا مجرور ہے۔

”والحمد للہ“ یہ مرفوع علی الحکایہ ہے۔

”ومن طاف فتکلم“ کلام کو مکرر لائے تاکہ معقول محسوس کی صورت میں ظاہر ہو جائے۔

ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اس کے ذکر کے علاوہ مباح کلام کیا اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ حاصل ہونے والا ثواب اول سے کم ہے بوجہ اس کلام کے جو دوران طواف ذکر کے علاوہ کیا ہے کیونکہ یہ کمال ادب کے منافی ہے۔ اور عبادت اس کے طریقے پر واقع نہ کرنا ہے (اتنی)۔

اول درجہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ پہلے آپ ﷺ کی حدیث فلا یتکلمن الا بخیر، میں کلام مباح سے ممانعت آئی ہے پس کلام مباح دوران طواف مکروہ ہے۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کلام مباح مسجد میں مکروہ ہے اور یہ نیکیاں کھاتا ہے (اتنی)۔

پس طواف میں کلام مباح کی کیا حالت ہوگی اور وہ نماز کے حکم میں ہے اور شوافع کے نزدیک کراہت اصل ثواب کے منافی ہے اور

اس سے کسی شے سے نبی اور اس کا برقرار رکھنے کا جمع ہونا لازم آتا ہے۔ بلکہ ثواب اس پر متفرع ہو رہا ہے حالانکہ ثواب اصل طواف کا ہے پس کلام کی تاویل کی جائے گی کہ جس نے طواف کیا اور دوران طواف کلام مباح تکلم کیا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کلام اس قید کا محتاج نہیں ہے بلکہ اطلاق، یا مطلق یعنی کلام اولیٰ ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کا ظاہر اور متبادر مطلب جو تکلف سے خالی ہے وہ یہ ہے کہ جس نے طواف کیا اور اعمیہ جو علماء سے منقول ہیں پر تکلم کیا۔ پس اس وقت اس قید کا فائدہ ہوگا بلکہ زیادت ثواب کا باعث ہوگا۔ کیونکہ یہ کلمات باقیات صالحات ہیں اور مجاہد سے روایت کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے پس فرشتے ان سے ملے اور ان سے مصافحہ کیا اور سلام کیا اور کہا تیرا حج قبول ہوا۔ اے آدم علیہ السلام، طواف کر اس گھر کا ہم آپ سے ۲ ہزار سال پہلے اس کا طواف کر چکے ہیں۔ آدم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم طواف میں کیا کہا کرتے تھے؟ فرشتوں نے کہا ہم کہتے تھے، سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اور میں اس میں زیادہ کر رہا ہوں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ اور عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس طرح کی روایت کی ہے۔

بَابُ الْوُقُوفِ بِعَرَفَةَ

وقوف عرفات کا بیان

یہ باب عرفہ میں حاضر ہونے کے بارے میں ہے اگرچہ ایک گھڑی کیلئے ہو۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ عرفہ ایک مشہور جگہ کا نام ہے (اتہنی)۔ پس اللہ کے اس ارشاد میں: ﴿فَإِذَا أَفْضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ﴾ [البقرہ: ۱۹۸] جمع باعتبار اجزاء اور اماکن کے ہے۔ وجہ تسمیہ میں مختلف اقوال ہیں، امام راغب فرماتے ہیں سُمیَ بِذَلِكَ لِتَعَزُّفِ الْعِبَادِ إِلَى اللَّهِ بِالْعِبَادَاتِ هُنَاكَ أَوْ لِبَعْضِ نَعْتِهَا کہ یہاں آدم اور حواء کا تعارف ہوا تھا۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ بعض نے کہا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے یوم عرفہ کو حضرت ابراہیم کو حج کے احکام سکھائے اور ان کی جگہ میں بتائیں۔ پس جبرائیل ہر موضع پر ابراہیم علیہ السلام سے کہتے اعرفت ہذا؟ تو ابراہیم کہتے نعم اس وجہ سے اس کو عرفہ کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے: ہو یوم اصطناع المعروف اهل الحج، اور بعض نے کہا ہے یحرفہم اللہ تعالیٰ یوم منذ بالمغفرة والكرامة اور اس اللہ کا یہ قول ہے ﴿عَرَفْتُمْ لَكُمْ﴾ [محمد: ۶]۔

ابن حاجب سے نقل کیا ہے کہ وہ غریب موطاً میں فرماتے ہیں کہ عرفہ کا نام اس وجہ سے رکھا ہے کہ اس دن لوگ عجز اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس دن لوگوں کا قیام اور دعا پر صبر کرنے کی وجہ سے کیونکہ عارف صبر کرتا ہے (اتہنی) کیونکہ جو کسی چیز کی قدر نہیں جانتا وہ اس کی مشقت پر صبر بھی نہیں کر سکتا۔

الفصل الاول:

عرفات کے دن تکبیر و تہلیل کہنا

۲۵۹۲: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ الثَّقَفِيِّ أَنَّهُ سَأَلَ بَنَ مَالِكٍ وَهُمَا عَادِيَانِ مِنْ مَنَى إِلَى عَرَفَةَ كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُونَ فِي هَذَا الْيَوْمِ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ كَانَ يَهْلُ مِنَّا الْمَهْلُ فَلَا يُنْكَرُ عَلَيْهِ وَيُكَبِّرُ

المُكَبِّرُ مِنَّا فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

احرجه البخاری فی صحیحہ ۵۱۰/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۵۹۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۳۳/۲ الحدیث رقم

(۱۲۸۵/۲۷۴)۔ ومالك فی ۳۳۷/۱ الحدیث رقم ۴۳ من كتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۱۱۰/۳۔

ترجمہ: محمد بن ابی بکر ثقفی سے روایت ہے کہ انہوں نے انس بن مالک سے پوچھا اس حال میں کہ دونوں صبح کے وقت منی سے عرفات کی طرف جا رہے تھے کہ تم اس دن کس طرح کرتے تھے یعنی عرفہ میں رسول خدا ﷺ کے ساتھ۔ پس انس نے کہا بلیک کہتا ہم میں سے بلیک کہنے والا پس انکار نہ کیا جاتا تھا اس پر اور تکبیر کہنے والا کہتا تھا ہم میں سے اور اس پر بھی انکار نہیں کیا جاتا تھا اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

محمد بن ابی بکر۔ یہ ”محمد“ ہیں۔ ابو بکر بن عوف ثقفی و جازی ہیں۔ تابعین میں سے ہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے انہوں نے اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ ”ثقفی“ طائف میں بسنے والے ایک قبیلہ ثقیف کی طرف منسوب ہے۔

تشریح: قولہ: وهما غاديان: ”وهما“ واو حال کیلئے ہے۔ ”غاديان“ الغدو سے اسم فاعل کا صیغہ ہے بمعنی ذاہبان

اول النهاء ہے۔

قولہ: فلا ينكر عليه: ”لا ينكر“ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ یہ آپ ﷺ کی طرف سے تقریر اور صحابہ کی طرف سے اجماع

سکتی ہے۔

قولہ: ويكبر المكبر منا فلا ينكر عليه: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ رخصت ہے اور تکبیر کہنے میں کوئی حرج نہیں

ہے بلکہ باقی ازار کی طرح یہ بھی جائز ہے، لیکن یوم عرفہ کو حجاج کیلئے تکبیر سنت نہیں ہے سنت تلبیہ ہے یوم النحر کو جرہ عقبہ کے رمی تک۔ اور حجاج کے علاوہ کیلئے تمام بلاد میں یوم عرفہ کے صبح سے نمازوں کے بعد ایام التشریق کے آخر تک تکبیرات مستحب ہیں۔ (اتہلی)

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ تکبیرات تشریق واجب ہیں یا سنت ہیں اکثر کی رائے واجب ہونے کی اور سنت کی دلیل واضح ہے اور وہ آپ ﷺ کی موافقت ہے اور اللہ کے اس قول سے استدلال کرنا ﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي

آيَاتٍ مَّعْلُومَاتٍ﴾ [الحج: ۲۸]

پس ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد یحییٰ پر اللہ کا نام لینا ہے زمانہ جاہلیت میں جو نام لیتے تھے اس کیلئے ناخ ہے اور اس پر دلیل غلی

مارز قہم من بهيمة الانعام ہے (اتہلی)۔ پس اولیٰ یہ ہے کہ اللہ کے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا جائے ﴿وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي

آيَاتٍ مَّعْلُومَاتٍ﴾ [البقرة: ۲۰۳]

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ صحابہ میں بھی مختلف فیہ رہا ہے پس صاحبین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو لیا ہے اور جو ابن ابی شیبہ

نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یوم عرفہ کے صبح سے لے کر ایام تشریق کے آخر تک تکبیر کہتے تھے۔ اور امام ابو حنیفہ نے ابن مسعود کے

قول کو لیا ہے اور ان کا قول بھی ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود یوم عرفہ سے یوم نحر کے عصر تک تکبیر کہتے تھے اور تکبیر اس

طرح کہتے تھے: اللہ اکبر، اللہ اکبر لا إله الا الله والله اكبر والله الحمد، ابن ہمام فرماتے ہیں کہ پہلے میں تکبیر تین بار

کہتا جیسا کہ امام شافعی کہتے ہیں تو یہ ثابت نہیں ہے۔ اور محرم تکبیر سے ابتداء کرے اور پھر تلبیہ کہے (اتہلی)، امام ابو حنیفہ کے نزدیک تکبیر

واجب ہے، اس شرط کے ساتھ کہ آدمی مقیم ہو، آزاد ہو، مرد ہو اور نماز فرض ہونا اور جماعت کے ساتھ شہر میں ہونا مستحب ہے اور صاحبین

کے نزدیک ہر اس شخص پر فرض ہے جو فرض نماز پڑھتا ہو۔

مسلم کی روایت میں ہے: ”غدونا مع رسول اللہ ﷺ من منى الى عرفات ، منا الملبى ومنا المکبّر۔“

وقوف کے مقامات کا ذکر

۲۵۹۳: وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ نَحَرْتُ هَهْنًا وَمَنْى كُلهَا مَنَحَرٌ فَانْحَرُوا فِى رِحَا لِكُمْ وَوَقَفْتُ هَهْنًا وَعَرَفَةَ كُلهَا مَوْقِفٌ وَوَقَفْتُ هَهْنًا وَجَمَعْتُ كُلهَا مَوْقِفٌ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۸۹۳/۲ الحديث رقم (۱۴۹-۱۲۱۸)۔ و ابو داؤد السنن ۴۷۸/۲ الحديث رقم ۱۹۳۶۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے نحر کیا اس جگہ پر اور منی کے مقام پر تمام جگہ نحر کرنے کی ہے پس نحر کرو اپنے ذیروں پر اور میں نے وقوف کیا ہے اس جگہ پر ویسے تمام جگہ وقوف کرنے کی ہے اور میں نے اس جگہ وقوف کیا ہے اور مزدلفہ تمام جگہ وقوف کرنے کی ہے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: نحر ت ههنا ومنى كلها منحر فانحروا فى رحالكم:

نحرت ههنا: ابن الملك رحمه الله فرماتے ہیں۔ منى کی طرف اشارہ ہے (اتمی) یہ بات درست نہیں صحیح یہ ہے کہ منى میں ایک مخصوص جگہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کے بعد ہے ”ومنى الخ“ ”ومنى مبتداء ہے۔ کلها اس کیلئے تاکید ہے اور منحر متبدا کیلئے خبر ہے۔

قوله: ووقفت ههنا..... وجمع کلها موقوف: بعض کا کہنا ہے کہ جمع مزدلفہ کا نام ہے کیونکہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور بعض نے کہا ہے منى کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ ازدلاف سے ہے بمعنی اقتراب کے اور دال تاء سے بدلہ ہوا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿وَإِذَا الْجَنَّةُ أُنزِلَتْ﴾ [التکویر: ۱۳] اور ﴿لِيَقْرَبُونَآلى اللہ زلفى﴾ [الزمر: ۳] قرآنی۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں ممکن ہے کہ یہ تمام اشارے الگ الگ جگہوں میں سادہ ہوتے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی جگہ میں صادر ہو اس لیے ههنا کہا ههناك ، ثم نہیں کہا (اتمی) اول زیادہ ظاہر ہے اور ثانی کے مطابق وہ بعقدہ اور جگہ منى ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ذبح کرنا۔ آپ ﷺ کے منحر (قربان گاہ) کے ساتھ خاص نہیں ہے اور وہ مسجد خیف کے قریب ہے جیسا کہ عنقریب آجائے گا۔

ابن حجر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کے مشہور قربان گاہ میں نحر کیا اور وہاں دو تعمیرات کیے ہیں ان میں سے ایک ہر ایک کا نام مسجد انحر ہے ایک راستے پر ہے اور ایک راستے سے ہٹ کر ہے اور کہا گیا ہے کہ وہی زیادہ قریب ہے ان اوصاف کے جو آپ ﷺ کے منحر کے ذکر کیے ہیں۔

عرفہ کے دن کی فضیلت

۲۵۹۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَا مِنْ يَوْمٍ أَكْثَرَ مِنْ أَنْ يُعْتَقَ اللّهُ فِيهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمٍ عَرَفَةَ وَأَنَّهُ لِكَيْدٍ نُؤْتُمْ يَآهِي بِهِمُ الْمَلَائِكَةُ فَيَقُولُ مَا أَرَادَ هَؤُلَاءِ ع۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۹۸۲/۲ الحديث رقم (۴۳۶-۱۳۴۸)۔ والنسائی فى ۲۵۱/۵ الحديث رقم ۳۰۰۳۔ وابن

ماجه ۱۰۰۳/۲ الحديث رقم ۳۰۱۴۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عرفہ کے دن سے زیادہ کوئی دن نہیں جس میں اللہ تعالیٰ بندوں کو

آگ سے آزاد کرتا ہے یعنی اس عرفہ کے دن عرفات میں سب دنوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ آزاد کرتا ہے بندوں کو آگ سے اور تحقیق اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت کے ساتھ نزدیک ہوتا ہے پھر حاجیوں پر فخر کرتا ہے فرشتوں کے سامنے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ لوگ کیا چاہتے ہیں یعنی جو کچھ چاہتے ہیں وہی دوں گا۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ما من یوم اکفر..... من یوم عرفہ:

”اکفر“ نصب کے ساتھ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ رفع کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ”ما“ بمعنی ”لیس“ کے ہے اور اس کا اسم ”یوم“ ہے اور من زائد ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: ما

من یوم اکفر اعتقاداً فیہ اللہ عبداً من النار من یوم عرفہ۔

”یباہی بہم الملائکة“ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ فرشتوں پر حجاج کی فضیلت اور شرف ظاہر ہیں یا ان کو

ایسے چیز کے بمنزلہ کر دیتے ہیں جس پر فخر کیا جاتا ہو۔

”ما اراد ہولاء“ یعنی یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ کہ اپنے گھربار کو چھوڑ رہے اور مال خرچ کیا ہے بدن تھکا چکے ہیں یعنی یہ نہیں

چاہتے مگر مغفرت رضا قرب اللہ کی ملاقات اور جو اس دروازے پر آتا ہے اس کو رد کرنے کا ڈر نہیں ہوتا۔ یا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ یہ

چاہتے ہیں وہ ان کو حاصل ہے اور ان کے درجات ان کے مراد اور نیت کے بقدر ہیں یا مطلب ہے کہ کسی آسان اور تھوڑی چیز کا ارادہ کیا

ہے کیونکہ بخشش اور مغفرت رب الارباب کے نزدیک کوئی بڑی اور مشکل چیز نہیں ہے۔

الفصل الثانی:

موقف عرفات کا ذکر

۲۵۹۵: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ خَالٍ لَهُ يَزِيدُ ابْنُ شَيْبَانَ قَالَ كُنَّا فِي مَوْفِقٍ لَنَا بِعَرَفَةَ يُبَاعِدُهُ عَمْرٌ وَمِنْ مَوْفِقِ الْإِمَامِ جِدًّا فَاتَانَا ابْنُ مَرْبَعٍ الْأَنْصَارِيُّ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْكُمْ يَقُولُ لَكُمْ قِفُوا عَلَيَّ مَشَا عِرْكُمْ فَإِنَّكُمْ عَلَىٰ إِرْثٍ مِنْ إِرْثِ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔

(رواه الترمذی و ابو داود و النسائی و ابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی سننہ ۴۶۹/۲ الحدیث رقم ۱۹۱۹۔ و الترمذی فی ۲۳۰/۳ الحدیث رقم ۸۸۳ [و النسائی فی ۲۵۵/۵

الحدیث رقم ۳۰۱۴]۔ و ابن ماجہ فی ۱۰۰/۱۲ الحدیث رقم ۳۰۱۱۔ و احمد فی المسند ۱۳۷/۴۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبد اللہ بن صفوان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے ماموں سے نقل کیا ہے اس کو

یزید بن شیبان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کہتے ہیں کہ ہم میدان عرفات میں اپنے ٹھہرنے کی جگہ پر تھے۔ عمرو اس

ٹھہرنے کی جگہ کو امام سے بہت دور بیان کرتا تھا۔ ہمارے پاس مربع انصاری کے بیٹے آئے پھر کہا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کا تمہاری طرف اپیلچی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اپنی عبادت کی جگہ پر ٹھہرو۔ پس تحقیق تم اوپر میراث کے ہو۔

یعنی متابعت کے لحاظ سے اپنے باپ کی میراث یعنی ابراہیم علیہ السلام کی میراث پر ہوں۔ اس کو امام ترمذی، ابو داؤد، نسائی

اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عمرو بن عبد اللہ۔ نام ”عمرو بن صفوان“ کے بیٹے اور جچی ہیں۔ قریش میں سے ہیں۔ تابعین میں سے ہیں۔ یزید بن شیبان سے روایت کی اور ان سے عمرو بن عثمانؓ ویناروغیرہ نے روایت کی ہے۔

یزید بن شیبان۔ یہ یزید صحابی ہیں۔ شیبان کے بیٹے ازوی نے ان سے روایت بھی نقل کی ہے۔ ان کا ذکر ”وحدان“ میں کیا جاتا ہے انہوں نے ابن مرلیجؓ سے روایت کی۔ (مرلیج میں میم مکسور ہے) اور ان سے عمرو بن عبد اللہ بن صفوانؓ نے روایت کی۔ ان کی حدیث حج کے بارے میں ہے۔

تشریح: قوله: كفا في موقف لنا بعرفة يباعدہ عمرو من موقف الامام جدا:

”موقف لنا“ یعنی ہمارے اسلاف کا موقف تھا جہاں زمانہ جاہلیت میں وہ وقوف کرتے تھے۔

”یباعدہ عمرو“ بعض کا کہنا ہے کہ یہ عمرو، راوی ہے۔ یزید سے اور یہ قول عمرو سے روایت کرنے والے راوی کا ہے اور وہ عمرو بن دینار ہے یعنی عمرو نے کہا ہے کہ اس موقف اور امام الحجاج کے موقف کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔

”جدا“ یہ یباعدہ سے متصل ہے اور اس کے متعلق سے مؤخر ہے اور منصوب ہے یا مصدریت کے بناء پر اصل میں یبعده، تبعیدا جدا ہے یا حال ہونے کی بناء پر۔

قوله: فاتانا ابن مربع الانصاری: ”ابن ربع“ میم کے کسر اور راء کے سکون اور باء کے فتح کے ساتھ ہے۔ ان کا نام بعض نے عبد اللہ، اور اول زیادہ ہے۔

”الانصاری“ مضاف کی صفت ہے ”من ارث“ من بیانہ ہے یا تعیض کیلئے ہے۔

قوله: فانکم علی ارث من ارث ابیکم ابراہیم: ”ابراہیم“ بدل ہے یا بیان ہے۔

اس حدیث میں اشارہ ہے اللہ کے اس ارشاد کی طرف:

﴿هو اجنباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملة ابیکم ابراہیم﴾ [الحج: ۷۸]

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث سے مقصود ان کے اس وہم کو ختم کرنا تھا کہ موقف وہی ہے جو آپ ﷺ نے اختیار کیا ہے، اور ان کی دل جوئی مقصود تھی کہ وہ اپنے باپ کی سیرت اور سنت پر ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

موقوفوں کا بیان

۲۵۹۶: وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ كُلُّ عَرَفَةَ مَوْفِقٌ وَكُلُّ مِنِّي مَنَحَرٌ وَكُلُّ الْمُزْدَلِفَةَ مَوْفِقٌ

وَكُلُّ فِجَاحٍ مَكَّةَ طَرِيقٌ وَمَنَحَرٌ - (رواه ابوداؤد والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی سننہ ۴۷۸/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۷۔ وابن ماجہ ۱۰۱۳/۲ الحدیث رقم ۳۰۴۸۔ والدارمی ۷۹/۲

الحدیث رقم ۱۸۷۹۔ واحمد فی المسند ۳۲۶/۳۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا عرفہ کا میدان ٹھہرنے کی جگہ ہے اور جو جگہ منیٰ میں سے ذبح کرنے کی ہے اور جو جگہ مزدلفہ میں ہے ٹھہرنے کی جگہ ہے اور تمام راہیں مکہ کی راہیں ہیں اور ذبح کرنے کی جگہیں ہیں اس کو ابوداؤد اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وكل فجاج مكة طريق ومنحر:

”فجاج“ فاء کے کسرہ کے ساتھ فح کی جمع ہے کشادہ راستے کو کہتے ہیں۔

اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ مکہ میں اس کے تمام راستوں سے داخل ہونا جائز ہے اگرچہ ثنیۃ الکراء سے داخل ہونا افضل ہے اور اس کے تمام نواحی میں ذبح جائز ہے کیونکہ یہ حرم میں سے ہے مقصود حرج ہے اس کو ذکر کیا ہے علامہ طیبی نے۔ اور تمام ہدایا کا ذبح حرم کی سرزمین پر ذبح کرنا بالاتفاق جائز ہے مگر منیٰ حرم حج کی قربانی کیلئے افضل ہے اور مکہ خاص کر کے مردہ عمرہ کی قربانی کیلئے افضل ہے۔

سواری پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا جائز ہے

۲۵۹۷: وَعَنْ خَالِدِ بْنِ هُوْدَةَ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَخْطُبُ النَّاسَ يَوْمَ عَرَفَةَ عَلَى بَعِيرٍ قَائِمًا فِي

الرِّكَابِينِ - (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داود في ۴۶۹/۲ الحديث رقم ۱۹۱۷ - واحمد في المسند ۳۰/۵ -

ترجمہ: حضرت خالد بن ہودہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ عرفہ کے دن لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے یعنی میدان عرفات میں اونٹ پر دونوں رکابوں پر کھڑے ہو کر اس کو ابو داود نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

خالد بن ہودہ - یہ ہودہ عامری کے بیٹے ہیں۔ ”ہودہ“ ہا کے فتح واؤ کے سکون اور ذال کے معجم کے ساتھ ہے۔ یہ خود اور ان کے بھائی ”حرمہ“ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ خزاہ کے پاس لوٹے اور اپنے اسلام کی بشارت ان کو دی۔ یہ مولفۃ القلوب میں سے تھے۔ یہ خالد بن ہودہ وہی ہیں جن سے آنحضرت ﷺ نے غلام اور باندی خریدی تھی اور ان کے لئے عہد نامہ لکھ دیا تھا۔

تشریح: قوله: خالد بن هودة: ”هودة“ هاء کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ ہے۔

قوله: يخطب الناس يوم عرفة..... الخ:

”يوم عرفة“ اس میں دونوں احتمال ہے کہ زوال سے پہلے ہو یا بعد میں ہو اور ثانی زیادہ ظاہر ہے۔ اور قائماً، واقفاً کے معنی میں ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ سواری پر کھڑے تھے بلکہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ ٹھہرے ہوئے تھے اس حال میں کہ آپ ﷺ کے پاؤں رکابوں میں تھے۔

”قائماً في الركابين“ دونوں حال مترادف ہیں یا حال متداخلہ ہیں۔

مسلم کی روایت میں ہے: ”انه عليه السلام أمر بالقصواء بعد الزوال، فرحلت له، فاتي بطن الوادي فخطب الناس“

بہترین دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے

۲۵۹۸: وَعَنْ عَمْرٍو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ خَيْرُ الدُّعَاءِ دُعَاءُ يَوْمِ عَرَفَةَ وَخَيْرُ مَا قُلْتُ أَنَا وَالنَّبِيُّونَ مِنْ قَبْلِي لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيرٌ - (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی في سننه ۵۳۴/۵ الحديث رقم ۳۵۸۵ -

ترجمہ: عمرو شعیب سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ یعنی شعیب سے نقل کیا ہے اس نے اپنے دادا سے یعنی عبد اللہ بن عمرو کو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا دعاؤں سے بہترین دعا عرفہ کی ہے یعنی میدان عرفات میں یا ہر جگہ اور بہترین چیز جو میں نے اور دوسرے انبیاء جو مجھ سے پہلے گزرے ہیں نے کی۔ کوئی معبود نہیں مگر اکیلا اللہ کوئی اس کا شریک نہیں ہے اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: خیر الدعاء دعاء یوم عرفہ: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں اضافت یا بمعنی لام کے ہے یعنی ایسی دعاء جو عرفہ کے ساتھ مختص ہو اور وخیر ما قلت انا الخ بیان ہے اس دعاء کیلئے اگر آپ کہیں کہ یہ تو ثناء ہے نہ کہ دعاء تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ثناء میں تعریض بالطلب بھی ہے اور اضافت بمعنی فی کے ہے تاکہ عام ہو جائے تمام دعاؤں کو جو اس میں واقع ہے (اتھی)۔ اس اشکال کا جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ جب ذکر، دعاء کے ساتھ حصول ثواب اور مطلوب کے حصول تک پہنچنے میں شریک ہے تو اس کو من جملہ دعاؤں میں سے شمار کرنا درست ہوا۔ پس یہ کنایات کے قبیل سے ہوگا جو قضاء حاجات میں زیادہ بلیغ ہوا کرتے ہیں کیونکہ تلویح تصریح سے اولیٰ ہوتا ہے جیسا کہ امیہ بن صلت نے ابن جذعان کے بارے میں کہا ہے:

اذا ذکر حاحتی ام قد کفانی
حیاء ک ان شیمتک الحیاء
اذا اثنی علیک المرء یوماً
کفاه من تعرضه الیاء

”کیا میں اپنی حاجت ذکر کروں، یا کافی ہے میرے لیے تیری حیاء، بیشک حیاء تیری عادت ہے،

جب آدمی تیری تعریف کر دے ایک دن، پس اُس کیلئے اس جملے سے وہ تعریف کافی ہو جاتی ہے۔“

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اشارہ ہو اس بات کی طرف کہ بندہ کو چاہیے کہ وہ مولیٰ کی یاد میں مشغول ہو جائے۔ اور اعراض کر لے مطالبات سے دنیا اور آخرت میں اس کے کرم و احسان اور انعام پر اعتماد کی وجہ سے۔ پس حدیث میں منقول ہے من شغلہ ذکری عن مسألتي اعطیتہ الفضل ما اعطى السائلین۔ جسکو میرا ذکر مانگنے سے مشغول کر دے تو میں اس کو مانگنے والوں سے بہتر عطاء کر دیتا ہوں۔

اور اس مقام میں کمال تقویض اور تسلیم بالقضاء علی وجہ الرضاء ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے:

و کلت الی المحبوب امری کلہ فان شاء احیانی وان شاء اتلفا

کہ میں نے اپنے تمام معاملات محبوب کے حوالے کیے ہیں پس اگر وہ چاہے تو مجھے زندہ رکھے یا چاہے تو مجھے ہلاک کر دے۔

حدیث میں منقول ہے: اللهم ان امسکت نفسی فاغفر لها، وان ارسلتها فاحفظها بما تحفظ به عبادک

الصالحین، واللهم احینی ما کانت الحیاء خیر الی، وتوفنی اذا کانت الوفاة خیر الی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کہا جائے کہ ذکر سے دعاء لازم آتی ہے کیونکہ دعاء کیلئے ضروری ہے کہ وہ اغراض میں سے کسی غرض کیلئے ہو اور بہتر یہ ہے کہ وہ غرض اللہ کی رضا اور بقاء کا قصد ہو۔ اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ کہا جائے: خیر ما قلت من الذکر پس یہ عطف مغایر ہو جائے گا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی: افضل الدعاء یوم عرفہ، بأی شیء کان، وخیر ما قلت من الذکر فیہ وفی غیرہ، انا والنبیون من قبلی لا الہ الا اللہ الخ۔

قولہ: لا شریک لہ: یعنی الوہبیت اور ربیت یا ذات و صفات میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ یا یہ تاکید ثانی ہے کیونکہ توحید

ذاتی ہی مقصودا عظم ہے۔

”لہ الملک“ یعنی جس ملک اس کیلئے خاص ہے جس کو چاہیے دے دیتا ہے اور جس سے چاہیے چھین لیتا ہے۔ اور دنیا اور آخرت کے ملک و حکومت کو شامل ہے اور علم و حکمت کی حکومت اور ملک کو شامل ہے اور عمل، زہد اور قناعت کے ملک کو شامل ہے۔

”ولہ الحمد“ یعنی اس کیلئے حمد و تعریف ہے دنیا اور آخرت میں یا حمد اس کیلئے ثابت ہے چاہے اس کی حمد کی جائے نہ کی جائے یا حامدیت اور محمودیت اس کیلئے ہے پس وہ حامد بھی ہے اور محمود بھی ہے۔

۲۵۹۹: وَرَوَى مَالِكٌ عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللَّهِ الْهَلَبِيِّ قَوْلَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ۔

اخرجه مالک فی الموطأ ۴۲۲/۱ الحدیث رقم ۲۴۶ من کتاب الحج۔

ترجمہ: اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے نیز مالک نے اس روایت کو طلحہ بن عبید اللہ سے الفاظ لَا شَرِيكَ لَهُ تک نقل کیا ہے۔

اختلاف نسخ:

”روی عن مالک“ اصل عقیف میں وردا، ضمیر کے ساتھ ہے اور وہ زیادہ ظاہر ہے۔ اور مشکوٰۃ روئی مالک ہے۔

اسکاوی حکایت: ترمذی نے کہا ہے کہ هذا حدیث حسن صحیح اور طبرانی نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے ”افضل ما قلت أنا والنبیون قبلی عشیة عرفة لا إله الا الله الخ“ اور اس کا سند حسن اور جمید ہے جیسا کہ اذری نے کہا ہے۔

عرفہ کے دن شیطان کی رسوائی

۲۶۰۰: وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ كَرِينٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَارَى الشَّيْطَانُ يَوْمًا هُوَ فِيهِ أَصْغَرُ وَلَا أَدْحَرُ وَلَا أَحْقَرُ وَلَا أَعْظُمُ مِنْهُ فِي يَوْمِ عَرَفَةَ وَمَا ذَاكَ إِلَّا لِمَا يَرَى مِنْ تَنْزُلِ الرَّحْمَةِ وَتَجَاوُزِ اللَّهِ عَنِ الذُّنُوبِ الْعُظَامِ إِلَّا مَا رَأَى يَوْمَ بَدْرٍ فَقِيلَ مَارَى يَوْمَ بَدْرٍ؟ قَالَ فَإِنَّهُ قَدْ رَأَى جِبْرِيلَ يَزَعُ الْمَلَائِكَةَ. (رواه

مالک منرسلا وفي شرح السنة بلفظ المصباح)

اخرجه مالک فی ۴۲۲/۱ الحدیث رقم ۲۴۵ من کتاب الحج والبعی فی شرح السنة ۱۵۸/۷ الحدیث رقم ۱۹۳۰۔

ترجمہ: حضرت طلحہ بن عبید اللہ بن کرین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان کو عرفہ کے دن کے برابر کسی اور دن نہیں دیکھا گیا کہ جس میں وہ بہت ذلیل اور راندہ ہوا اور بہت حقیر ہوا اور اپنے سے بہت غصے ہوا یعنی شیطان کو ہمیشہ نیکیاں دیکھ کر غصہ آتا ہے اور خوار ہوتا ہے اور عرفہ کے دن خاص طور پر سب دنوں سے زیادہ خوار و غضبناک ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ ہر خاص و عام پر رحمت کو اترتا ہوا دیکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا بڑے گناہوں کو معاف کر دینا اور بدر کے دن اس کو دیکھا گیا ہے کہ اس کی خواری عرفہ کے دن کی طرح تھی کیونکہ اسی دن مسلمانوں نے کافروں کو شکست دی اور ان کو عزت ملی اور شوکت اسلام حاصل ہوئی پس تحقیق شیطان نے دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی صفوں کو ترتیب دے رہے ہیں یعنی مشرکین سے لڑائی کرنے کے لیے صفوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ اس کو امام مالک نے بطریق ارسال نقل کیا ہے اور شرح السنۃ میں یہ حدیث لفظ مصباح کے ساتھ روایت کی ہے۔

راوی حدیث:

طلحہ بن عبد اللہ۔ یہ طلحہ بن عبد اللہ بن کریز خزامی ہیں۔ تابعی ہیں۔ اہل مدینہ میں سے ہیں۔ یہ ایک جماعت صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے بھی تابعین کی ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ”عبید“ صیغہ تصغیر کے ساتھ ہے۔ ”کریز“، کاف کے فتح، راء کے کسرہ، یاء کے سکون اور زاء کے ساتھ ہے۔ یہی ضبط اصح ہے۔ اس موقع پر شرح نے بہت طویل کلام کیا ہے۔

تشریح: ”فی یوم عرفہ“ مصباح میں یوم عرفہ ہے شارع مصباح کہتے ہیں کہ یہ منصوب ہے اصغر یا اغیظ کیلئے طرف ہونے کی بناء پر۔

”اصغر“ یعنی اذل اور احقر ہوگا یہ ماخوذ ہے الصغار جو الھوان اور الذل کے معنی میں آتا ہے۔

”ادحر“ اسم تفضیل ہے الدحر سے اور یہ طود اور ابعاد کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے ﴿من کل جانب دحورا﴾ [الصف: ۹] اور ﴿اخرج منها مذؤما مدحورا﴾ [الاعراف: ۱۸] طیبی فرماتے ہیں الدحر الدفع طعنف و اھانۃ۔

”یزع“ اصل میں یوزع تھا۔ یعنی یکفہم فیحبس اولہم علیٰ افرہم، اس سے الوازع ہے اس شخص کو کہتے ہیں جو صف سے آگے بڑھ کر اس کو درست کرے اور لشکر میں تقدیم و تاخیر کرے۔ اور اسی سے اللہ کا یہ قول ہے: ﴿فہم یوزعون﴾ [النحل: ۱۷] یعنی ان کو مرتب اور برابر کرتا ہے اور انتشار سے ان کو روک رہا ہے اور لڑائی کیلئے درست کر رہا ہے۔

تخریج: اور دیلمی نے اس حدیث کو سند متصل کے ساتھ روایت کیا ہے اور بیہقی نے مرسل اور متصل دونوں طرح روایت کیا ہے۔

”شعنا“ اشعت کی جمع ہے بکھرے بالوں والے کو کہتے ہیں۔

”غبرا“ اغبر کی جمع ہے جس کے اعضاء غبار آلود ہوں اس کو کہتے ہیں۔

”ضاجین“ جیم کی تشدید کے ساتھ ہے ضج سے ہے بمعنی آواز بلند کرنا اور ایک نسخہ میں جاء کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ مشارق میں اس کا معنی اصابعہم حد الشمس لکھا ہے اور قاموس میں ہے ضحی، برز للشمس، و کسعی و رضی اصابته الشمس۔

”یدھق“ ہاء کے شد اور فتح کے ساتھ ہے اور تخفیف کے ساتھ بھی پڑھتے ہیں۔ متہم بالسوء کے معنی میں آتا ہے۔

”عبادی“ اضافت تشریفی ہے۔

”شعنا، غبرا“ دونوں حال ہیں۔

”من کل فج“ اتونی کے متعلق ہے۔

”فما من یوم“ علامہ طیبی فرماتے ہیں یہ شرط محذوف کیلئے شرط ہے۔

”اکثر“ نصب کے ساتھ ما کا خبر ہے جو بمعنی نیس کے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ رفع کے ساتھ ہے لغت تمیمیہ کے مطابق۔

”عتیقا“ تیز ہے۔ ”من النار“ کے متعلق ہے۔ ”من یوم عرفہ“ اکثر کے متعلق ہے۔

”الی السماء دنیا“ شاید اس کی تخصیص اس لیے کی سے کہ اس آسمان والے اہل دنیا پر زیادہ مطلع ہوتے ہیں۔

عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر یعنی حاجیوں پر فرخ کرتا ہے

۲۶۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا كَانَ يَوْمُ عَرَفَةَ إِنَّ اللَّهَ يَنْزِلُ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَبَاهِي بِهِمُ الْمَلَائِكَةَ فَيَقُولُ انظُرُوا إِلَى عِبَادِي أَنُؤْنِي شُعْنًا غَبْرًا ضَاجِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ أُشْهِدُكُمْ إِنِّي قَدْ

عَفَرْتُ لَهُمْ يَقُولُ الْمَلَائِكَةُ يَا رَبِّ فُلَانٌ كَانَ يُرْهَقُ وَفُلَانٌ وَفُلَانَةٌ قَالَ يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ عَفَرْتُ لَهُمْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَمَا مِنْ يَوْمٍ أَكْثَرَ عَنِيْقًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمٍ عَرَفَـةَ۔

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۵۹/۷ الحدیث رقم ۱۹۳۱۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت عرفہ کا دن ہوتا ہے تحقیق اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف (اپنی رحمت و احسان و کرم کے ساتھ) نزول فرماتا ہے پھر حاجیوں کے ساتھ فرشتوں کے سامنے نحر کرتا ہے اور فرماتا ہے میرے بندوں کی طرف دیکھو کہ میرے پاس پرانگندہ بال اور گرد آلود ہونے کی حالت میں دور سے آئے ہیں یعنی لیک و ذکر کے ساتھ کہ میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ تحقیق میں نے ان کو بخش دیا ہے ان کو فرشتے کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار فلاں شخص گناہ کرتا ہے اور فلاں شخص اور فلاں عورت گناہ کرتی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق میں نے ان کو بھی بخش دیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ جس میں اللہ نے لوگوں کو آگ سے آزاد کیا ہو سوائے عرفہ کے دن کے۔ اس کو شرح السنہ میں نقل کیا گیا ہے۔

تشریح: ”الملائکة“ یعنی ملائکہ سے مراد آسمان دنیا کی ملائکہ ہے یا مقرب فرشتے ہیں یا تمام ملائکہ مراد ہے۔

”و فلان و فلانة“ یعنی وہ بھی اسی طرح معاصی میں گئے ہوئے تھے اور یہ بات وہ اس لیے کہیں گے کہ ان کو تعجب ہوگا اس کے بڑے ہونے اور اس جیسے مجرم کا شمار مغفورین میں بعید ہونے کی وجہ سے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ملائکہ کا قول یا تو مرتب کے حال جاننے کیلئے ہے اور یا بطور تعجب ہے۔ اور ملائکہ کے اس قول میں ادب کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ عیوب اور فجور کی تصریح نہیں کی ہے۔

”قد غفرت لهم“ یعنی سب کی مغفرت فرمائی ہے اور یہ لوگ بھی ان میں سے ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا نامراد نہیں ہوتا۔ فان الحج یهدم ما کان قبلہ اور اس میں تحقیق ہے جو ہم اس کے موقع پر ذکر کر چکے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ابی الدنیائے فضل عشر ذی الحجہ میں اور بزاز، ابن خزیمہ اور ابن منبج نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اپنے صحیح اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اور حاکم کی ایک روایت میں اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

اما الوقوف عشية عرفة فان الله يهبط الى السماء الدنيا، فيباهي بهم الملائكة فيقول، هولاء عبادى، جاؤونى شعنا يرجون رحمتى، فلو كانت ذنوبكم كعدد الرمل، و كعدد القطر، او الشجر لغفرتها لكم، أفيضوا عبادى مغفورا لكم، ولن شفعم له۔

الفصل الثالث:

نبی علی صلی اللہ علیہ وسلم کو وقوف عرفہ کا حکم

۲۶۰۲: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ قُرَيْشٌ وَمَنْ دَانَ دِينَهَا يَقْفُونَ بِالْمَزْدَلِفَةِ وَكَانَ يُسْمُونَ الْحُمْسَ فَكَانَ سَائِرُ الْعَرَبِ يَقْفُونَ بِعَرَفَةَ فَلَمَّا جَاءَ الْإِسْلَامَ أَمَرَ اللَّهُ تَعَالَى نَبِيَّهٗ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَأْتِيَ عَرَفَاتَ لِيَقِفَ بِهَا ثُمَّ يَفِضَ مِنْهَا فَذَلِكَ قَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ لَمَّا أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۱۸۶/۸۔ الحدیث رقم ۴۵۲۰۔ ومسلم فى ۸۹۳/۲ الحدیث رقم (۱۵۱)۔ (۱۲۱۹)۔ وابدوداؤد

فى ۴۶۶/۲ الحدیث رقم ۱۹۱۰۔ والترمذی فى ۲۳۱/۳ الحدیث رقم ۸۸۴۔ والنسائی ۲۵۴/۵ الحدیث رقم ۳۰۱۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرمایا کہ قریش اور ان کے تابعین مزدانہ میں کھڑے ہوتے تھے اور قریش جس نام رکھے جاتے تھے یعنی شجاع اور تمام عرب میدان عرفہ میں ٹھہرا کرتے تھے پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا یہ کہ عرفات میں آئیں اور اس میں ٹھہریں اور پھر وہاں سے لوٹیں پس اللہ تعالیٰ کے اس قول کے یہی معنی ہیں۔ پھر وہاں جگہ سے جہاں سے لوگ پھرتے ہیں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”الحمس“ جس کی جمع بمعنی شجاعت کے۔ ”یفیض منها“ علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الافاضة الذحف والدفع فی السیر، واصلها الصب ثم استعیر للدفع فی السیر، اور اس کا اصل افاض نفسہ اور ارحلتہ ہے، پھر اس کے مفعول کو بالکل ترک کر دیا گیا اور یہ لازم کی طرح ہو گیا۔

”یسمون الحمس“ اس میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ اپنے قوت و بہادری پر فخر کرتے تھے اور اپنے آپ کو اپنے جماعت اور اپنے نسب سے الگ اور ممتاز کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، ہم اس سے دیگر عوام کی طرح نہیں نکلیں گے۔

قوله: ﴿من حیث افاض الناس﴾ [البقرة: ۱۹۹]

یعنی جہاں سے عام لوگ لوٹتے ہیں اور وہ جگہ عرفہ ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ متکبرین، انسانوں سے خارج ہے فمن تواضع لله رفعه الله، ومن تکبر على الله وضعه۔

بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، آیت میں خطاب قریش کے ساتھ ہے اور ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کے ساتھ برابر کریں بعد اس کے کہ وہ اپنے آپ کو عام لوگوں سے بڑے سمجھتے تھے۔ اور ہم دونوں افاضوں کے درمیان تفاوت ظاہر کرنے کیلئے ہے کہ ایک صحیح اور دوسرا خطاء ہے (انتہی) اور حدیث سے ظاہر یہ ہے کہ خطاب آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے ساتھ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کیلئے کی وجہ سے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی عظمت کیلئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء امت کے حق میں قبول ہونے پر شیطان کا واولیہ کرنا

۲۶۰۳: وَعَنْ عَبَّاسِ بْنِ مَرْدَاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَعَا لِأُمَّتِهِ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ بِالْمَغْفِرَةِ فَأَجِيبَ إِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ مَا خَلَا الْمَطَالِمَ فَإِنِّي أَحَدٌ لِلْمَظْلُومِ مِنْهُ قَالَ أَيُّ رَبِّ إِنْ شِئْتَ أَعْطَيْتَ الْمَظْلُومَ مِنَ الْجَنَّةِ وَغَفَرْتَ لِلظَّالِمِ فَلَمْ يُجِبْ عَشِيَّتَهُ فَلَمَّا أَصْبَحَ بِالْمَزْدَلِفَةِ أَعَادَ الدُّعَاءَ فَأَجِيبَ إِلَى مَا سَأَلَ قَالَ فَضَحِكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَوْ قَالَ تَسَمَّ فَقَالَ لَهُ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ بَابِي أَنْتَ وَأُمِّي إِنْ هَلِذِهِ لَسَاعَةٌ مَا كُنْتُ تَضْحَكُ فِيهَا فَمَا الَّذِي أَضْحَكُكَ أَضْحَكَكَ اللَّهُ سَنَكَ قَالَ إِنْ عَدَّ وَاللَّهِ إِبْلِيسَ لَمَّا عَلِمَ أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ اسْتَجَابَ دُعَائِي وَغَفَرَ لِي مَتَى أَخَذَ التُّرَابَ فَجَعَلَ يَحْفُوهُ عَلَى رَأْسِهِ وَيَدْعُو بِالْوَيْلِ وَالْبُؤْرِ فَأَضْحَكَنِي مَا رَأَيْتُ مِنْ جَزَعِهِ - (رواه ابن ماجه روى البيهقي في كتاب البعث والنشور نحوه)

اخرجه ابن ماجه في ۱۰۰۲/۲ الحديث رقم ۳۰۱۳ - واحمد في المسند ۱/۴۱۴

ترجمہ: حضرت عباس بن مراد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے واسطے عرفہ کی شام کو بخشش کی دعا مانگی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول کی گئی اور فرمایا کہ تحقیق میں نے سوائے بندوں کے حقوق کے ان کو بخش دیا ہے۔ پس تحقیق میں مظلوم کے واسطے ظالم سے حق لوٹا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے میرے رب اگر تو چاہے تو

مظلوم کو جنت کی نعمتوں میں سے نوازا اس کے حق کے بدلے جو ظالم نے لیا ہے اور ظالم کو بخش دے پس عرفہ کی شام کو قبول نہ کی گئی پھر جب حضور ﷺ نے مزدلفہ میں صبح کی بھر دعا مانگی پس دعا قبول کی گئی اس چیز کی جو مانگی تھی پس راوی نے کہا کہ حضور ﷺ بنے۔ یا راوی نے کہا کہ مسکرائے پس حضور ﷺ کو حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں کہ یہ وقت ہنسنے کا وقت نہیں تھا۔ یعنی مقتضائے حال اس ساعت کا نہیں ہے کہ تم ہنسو۔ پس کس چیز نے آپ ﷺ کو ہنسایا؟ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کے دانتوں کو ہنسائے یعنی ہمیشہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تحقیق خدا نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق خدا کے دشمن ابلیس نے جب یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی ہے اور میری امت کو بخش دیا ہے پس اپنے سر پر مٹی ڈالنی شروع کی اور ہلاکت اور ویل کے ساتھ پکارنا شروع کر دیا تو کہنے لگا بالویل والنبور پس مجھے اس کے اضطراب نے ہنسایا۔ اس کو ابن ماجہ نقل کیا اور بیہقی۔ کتاب البعث والنشور میں اسی کی مانند نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عباس بن مرداس۔ یہ عباس بن مرداس ہیں ان کی کنیت ”ابو ابیہثم“ ہے سلمیٰ شاعر ہیں۔ ان کا شمار ”مؤلفۃ القلوب“ میں ہے فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام لائے۔ فتح مکہ کے بعد اسلام میں پختگی پیدا ہوگئی۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جاہلیت میں بھی شراب نوشی کو حرام سمجھتے تھے۔ ان سے ان کے بیٹے ”کنانہ“ روایت کرتے ہیں۔ ”کنانہ“ کاف کے کسرہ اور دو ”نون“ کے ساتھ ہے جس کے درمیان میں الف ہے۔

تشریح: ”آخذ“ متکلم یا اسم فاعل کا صیغہ ہے۔

”یجب“ صیغہ مجہول ہے۔

”عشیئہ“ یعنی فی عشیئہ عرفۃ اور ضمیر کا مذکر ہونا باعتبار زمان، یا مکان کے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضمیر آپ ﷺ کی طرف راجع ہو۔ پس اضافت ادنیٰ ملاہست کی وجہ سے ہوگی۔

”نبور“ ثاء کے ضمہ کے ساتھ بمعنی اھلاک کے ہے یعنی وہ کہہ رہا تھا یا ویلاہ یا نبورا۔ علامہ طبری کہتے ہیں کل من وقع فی ہیکۃ دعا بالویل والنبور۔

”او قال“: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل کرنے والے راوی کو شک ہے۔

”دعا لامتہ“ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد آپ ﷺ کے ساتھ حج کرنے والے امتی ہیں نہ کہ مطلق امت۔

”فاجیب الی ما سال“ یعنی جو کچھ آپ ﷺ نے طلب کیا تھا اسے علی وجہ العموم قبول کیا گیا۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے سن رہے تھے تو انہوں نے اس کو روایت کیا گویا کہ ان کو یہ سکھایا گیا ہے۔

”اضحک اللہ سنک“ یعنی اللہ آپ ﷺ کی وہ خوشی دائم رکھے جو آپ ﷺ کے ضحک کے سبب بنی۔

”یحنوہ علی رأسہ“ اس میں مٹی کے تعلیٰ، غلبہ اور فضیلت کی طرف اشارہ ہے۔

ظاہر حدیث عموم مغفرت پر دلالت کر رہا ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو شامل ہے۔ مگر اس قابل ہے کہ اس کو مقید کیا جائے ان لوگوں کے ساتھ جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے اسی سال۔ یا ان لوگوں کے ساتھ جن کا حج قبول ہوا ہو یا اس طور کہ انہوں نے کوئی گناہ اور فرق کا کام نہ کیا ہو۔

لیکن میں جملہ فسق میں سے معاصی پر اصرار اور توبہ نہ کرنا بھی ہے اور توبہ کی شرائط میں سے اللہ کے فوت شدہ حقوق کی ادائیگی بھی ہے۔ جیسے نماز، زکوٰۃ وغیرہ اور حقوق العباد کو ادا کرنا بھی ہے مالی ہو، بدنی ہو، عرضی ہو۔

ہاں اگر ان حقوق پر اس کو محمول کیا جائے کہ جن کا بندے کو علم نہ ہو یا وہ اس کی ادائیگی سے عاجز ہو۔ اور یہ بحث کتاب الایمان میں تفصیل سے گزری ہے پس اس کی طرف رجوع کریں اور حدیث کے اجمال سے دھوکہ نہ کھائیں اور ساتھ اللہ کے فضل کے وسیع ہونے کا عقیدہ بھی رکھیں اللہ کا ارشاد ہے ﴿ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء﴾ [النساء: ۱۱۶]

اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: ای رب! ان شئت فما شاء الله كان وما لم يشأ لم يكن ﴿ولا يستلن عما يفعل وهم يستلون﴾

اس مسئلہ کے بارے میں، میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور خطیب نے المتفق والمفترق میں روایت کیا ہے کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جب آپ ان تمام احادیث پر غور کر لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان احادیث میں ایسی حدیث نہیں ہے جو اس شخص کیلئے دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہو کہتا ہے کہ حج مکفر ہے حقوق العباد کیلئے کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ ابن جوزی نے اس کو موضوع قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ مدعی پر صریح نص نہیں ہے اس کے محتمل ہونے کی وجہ سے اور اسی وجہ سے بیہمتی نے کہا ہے کہ اس میں احتمال ہے کہ یہ مغفرت ان کو کچھ عذاب چکھانے کے بعد ہو اور وہ عذاب اس سے کم ہو جس کا یہ مستحق تھے۔ پس یہ حدیث خاص ہو جائے گی ایک وقت کے ساتھ، یعنی اس صورت میں حج کا فائدہ عذاب میں تخفیف ہو، بعض اوقات میں نہ کہ بالکل یہ نجات۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حدیث عام ہو، اور نص قرآنی دلالت کر رہی ہے کہ یہ اللہ کی مشیعت کے حوالے ہے۔

اس آخری مطلب کا حاصل یہ ہے کہ حدیث کو عام فرض کرنے کی صورت میں یہ محمول ہے کہ اللہ کا حقوق العباد کا ذمہ لینا اس آیت کے قبل سے ہے۔ ﴿ویغفر ما دون ذلك لمن يشاء﴾ اور اس میں کوئی تکفیر گناہوں کی معافی نہیں بلکہ فاعل معاصی تحت المشیعت ہے۔ اور تکفیر ذنب اور موقوف علی المشیعت میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی وجہ سے بیہمتی نے کہا ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس بات پر دھوکہ نہ ہو کہ حج حقوق العباد کیلئے مکفر ہے کیونکہ گناہ نحوست ہے اور جبار کی نوابی اور اموا میں خلاف کرنا بہت بڑی جرأت ہے اور ہم سے کوئی شخص ایک ان بخار، یا ایک گھڑی درد پر صبر نہیں کر سکتا۔ پس وہ سخت عقاب اور دردناک عذاب پر کیسے صبر کر سکتا ہے۔ وہ عذاب جس کی انتہاء اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اگرچہ احادیث اس کے نہایت کا بیان۔ ہے نہ کہ غایہ کا اگر وہ شخص مومن ہو۔

یہ ابن المنذر کے اس قول کے منافی نہیں ہے جو انہوں نے حدیث من قام لیلة القدر ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه کے تحت فرمایا ہے کہ یہ عام ہے امید ہے کہ اس کے تمام گناہ صغائر و کبائر معاف کر دیئے جائیں کیونکہ کلام اس وعدہ میں ہے جس سے تخلف نہیں ہو سکتا۔

اور اس مسئلہ کے بارے میں شیخ الاسلام عسقلانی رحمہ الباری نے کتاب لکھی ہے جس کا نام ”قوت الحجاج فی عموم المغفرة للحجاج“ رکھا ہے۔ اس میں ابن جوزی کے قول پر رد کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے کہ یہ حدیث صحابہ کے ایک جماعت نے روایت کیا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ضعیف ہے اور کثرت طرق اس کو قوی اور مضبوط کر دیتے ہیں۔

ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کے ایک طرق کو روایت کیا ہے اور اس پر سکوت اختیار کیا ہے امام ابوداؤد کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے اور حافظ ضیاء الدین قدسی رحمہ اللہ نے الاحادیث المختارة میں اس کی تخریج کی ہے ان راویوں سے جو دونوں حدیثوں میں نہیں ہیں۔ بیہمتی نے کہا ہے کہ شواہد کثیرہ اگر اس کے شواہد صحیح ہیں تو قابل حجت ہے اور اگر صحیح نہیں ہیں تو اللہ کا ارشاد ہے ﴿ویغفر ما

دون ذلك لمن يشاء ﴿﴾ اور ایک دوسرے پر ظلم کرنا شرک ہے (اتمی)

اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس بارے میں جو احادیث صحیحہ صریحہ ہیں وہ ظنی ہیں تو احادیث ضعیفہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسائل اعتقاد یہ صرف ادلیہ قطعیہ سے ثابت ہوتے ہیں۔ ہاں غالب گمان عموم مغفرت کا ہو سکتا ہے اس شخص کیلئے جس نے حج مقبول کیا اور کہاں ہے وہ شخص جو اپنے بارے میں یا غیر کے بارے میں جزم سے کہے اگرچہ وہ عالم اور صالح ہو بلند مرتبہ والا ہو کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ غیر معصوم کیلئے لازم ہے کہ وہ خوف اور رجاء کے درمیان ہو۔ پس ہم اللہ سے حسن خاتمہ کا سوال کرتے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو کئی سارے حفاظ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کو طبرانی نے کبیر میں ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں ایک راوی کا نام معلوم نہیں اور باقی رجال اس کے صحیح ہیں ان الفاظ کے ساتھ کہ آپ ﷺ یوم عرفہ کوفرا یا ان الله عز وجل يطول لكم في هذا اليوم، فغفر لكم الا التبعات فيما بينكم، ووهب مسينكم لمحسنكم، واعطى محسنكم ماسأل، فادعوا اور جب مزدلفہ میں تھے تو فرمایا "ان الله قد غفر لصالحكم وشفع صالحكم في طالحكم تنزل الرحمة فتعمهم، ثم يفرق الرحمة فيه فتقع على كل غائب ممن حفظ لسانه ويده، وابليس وجنوده على جبال عرفات ينظرون ما يصنع الله بهم، فاذا نزلت المغفرة دعا هو وجنوده بالويل والثبور يقول: كنت استغفهم حينما من الدهر، ثم جاءت المغفرة فغشيتهم فيتفرقون وهم يدعون بالويل والثبور" اور ابو یعلیٰ نے اس کو ایسے سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں ضعیف راوی ہے ان الفاظ کے ساتھ: "ان الله يطول على اهل عرفات يباهي بهم الملائكة يقول: يا ملائكتي! انظروا الى عبادي شعنا غبرا، اقبلوا الى من كل فج عميق، فاشهدكم اني قد اجبت دعاء هم، ووهبت مسينهم لمحسنهم، واعطيت محسنهم جميع ماسألوني غير التبعات التي بينهم، فاذا افاض القوم الى جمع ووقفوا وعادوا في الرغبة والطلب الى الله فيقول: يا ملائكتي! عبادي وقفوا وعادوا في الرغبة والطلب، فاشهدكم اني قد اجبت دعاء هم، وشفعت رغبتم، ووهبت مسينهم لمحسنهم، واعطيت جميع ماسألوني، وتحملت عنهم التبعات التي بينهم۔

(رواه الخطيب في المستوفى والمتفرق)

بَابُ الدَّفْعِ مِنْ عَرَفَةَ وَالْمَزْدَلِفَةِ

عرفات اور مزدلفہ سے واپسی کا بیان

الفصل الاول:

آپ ﷺ میدان عرفات سے کس طرح لوٹے تھے

۲۶۰۳: عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ سَأَلَ أَسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ كَيْفَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَسِيرُ فِي

حَجَّةِ الْوُدَا عِ حِينَ دَفَعَ قَالَ كَانَ يَسِيرُ الْعُنُقَ فَإِذَا وَجَدَ فَبَجْوَةَ نَصًّا - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی ۵۱۸/۳، الحدیث رقم ۱۶۶۶۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۳۶/۲ الحدیث رقم (۲۸۳-۱۲۸۶)۔

والنسائی فی سننہ ۲۵۸/۵ الحدیث رقم ۳۰۲۳۔ والدارمی فی ۸۰/۲ الحدیث رقم ۱۸۸۰۔ ومالک فی الموطأ ۳۹۲/۱ الحدیث رقم ۱۷۶۔ واحمد فی المسند ۲۱۰/۵۔

ترجمہ: حضرت ہشام بن عمروؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے یعنی عروہ سے عروہ نے کہا کہ اسامہ بن زیدؓ سے پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع میں کس طرح چلتے تھے جس وقت میدان عرفات سے لوٹے۔ فرمایا کہ جلدی چلتے تھے پس جب کشادہ راستہ پاتے تو اپنی سواری دوڑاتے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

ہشام بن عمروؓ۔ یہ ہشام ہیں عمروہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے بیٹے ہیں۔ کنیت ”ابومنزور“ ہے قریشی اور مدنی۔ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ مدینہ کے مشہور تابعین اور بکثرت روایت کرنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا شمار اکابر علماء جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے۔ عبداللہ بن زبیر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی ان میں ثوری، مالک بن انس اور ابن عیینہ جیسے حضرات بھی شامل ہیں خلیفہ منصور کے یہاں بغداد آئے۔ ۱۳۶ھ میں بمقام بغداد انتقال فرمایا۔

تشریح: قولہ: سئل اسامہ بن زید:

اسامہ بن زید سے سوال خصوصی طور پر اس لئے پوچھا کیونکہ وہ عرفہ سے مزدلفہ تک آپ ﷺ کے ردیف تھے۔

قولہ: کیف کان رسول اللہ ﷺ یسیر فی حجة الوداع:

قولہ: کان یسیر العنق، فاذا وجد فجوة نص:

شاید اس میں نکتہ ایک مستقل عبادت اور اطاعت کی طرف مبادرت اور مسازرت ہو۔

”العنق“: منصوب ہے مصدریت کی وجہ سے فقہروی کے نصب کی طرح ہے یا وصفیت کی بناء پر منصوب ہے: ای یسیر السیر

”عنق“ عین اور نون کے فتح کے ساتھ تیز چلنے کو کہتے ہیں۔

”فجوة“ فاء کے فتح کے ساتھ کشادگی اور گزرنے والوں سے خالی جگہ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ گزرنے والوں کے درمیان خالی جگہ

ہوتی ہے اور فجوة دو چیزوں کے درمیان خلا کو کہتے ہیں۔

”نص“ صاء کی تشدید کے ساتھ یعنی بہت تیز چلا۔

بعض کا کہنا ہے کہ نص اصل میں استقصا اور بلوغ الی الغایہ کو کہتے ہیں یعنی اپنی سواری کو اتنا تیز بنکایا کہ اس نے تیز چلنے میں اپنی

آخری قوت استعمال کی۔ طبری فرماتے ہیں کہ عنق، چلنے کو کہتے ہیں اور نص، عنق سے تیز چلنے کو کہتے ہیں۔

اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے مارنا منع ہے

۲۶۰۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ دَفَعَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ عَرَفَةَ فَسَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ وَرَأَاهُ زَجْرًا شَدِيدًا وَضَرْبًا

لِلْإِبِلِ فَأَشَارَ بِسَوْطِهِ إِلَيْهِمْ وَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ عَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ فَإِنَّ الْبِرَّ كَيْسَ بِالْإِيصَاعِ ع - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۲۳/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۷۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عرفہ کے دن میدان عرفات سے منیٰ

کی طرف لوٹے۔ پس حضور ﷺ نے اپنے پیچھے زجر شدید یعنی بلند آواز کے ساتھ جانوروں کا ہانکنا بلند آواز کے ساتھ

اور اونٹوں کو مارنا سنا۔ پس آپ ﷺ نے اپنے کوڑے کے ساتھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا یعنی تاکہ وہ حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہوں اور حضور ﷺ کی بات سنیں اور فرمایا اے لوگو! تمہارے لیے آرام سے چلنا لازم ہے اس لیے کہ تحقیق دوڑانا نیکی نہیں ہے۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: دفع مع النبي ﷺ يوم عرفه: واضح رہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عرفہ کے دن، عرفات سے منیٰ کی طرف واپسی میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے، نہ کہ منیٰ سے عرفہ کی طرف جاتے ہوئے، جیسا کہ ابن حجر کو وہم ہوا ہے۔ یا مطلب ہے خطبہ کی جگہ سے قوف کی جگہ کی طرف جاتے ہوئے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ ازدحام نہیں ہوتا مگر عرفہ سے رجوع کے بعد جیسا کہ مصنفین کے اس باب کو ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور گویا وہم یوم عرفہ کے لفظ سے پیدا ہوا ہے۔

قوله: فقال: أيها الناس عليكم بالسكينة، فان البر ليس بالايضاع:

”ایہا الناس“ ایک نسخہ میں یا ایہا الناس ہے۔

”الايضاع“ اونٹوں کو تیز چلنے پر ابھارنے کو کہتے ہیں۔

”فان البر ليس بالايضاع“: یعنی نیکی اور ثواب صرف اس پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ افعال حج کی ادائیگی محظورات سے اجتناب سے حاصل ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نیک کاموں کی طرف دوڑنا مطلوب ہے لیکن اس طور پر نہیں کہ وہ کمروہات اور ناپسندیدہ امور کے ارتکاب کی طرف لیجائے۔ پس اس حدیث میں اور حدیث سابق میں کوئی منافات نہیں ہے۔

آپ ﷺ بلیک کہتے رہے

۲۶۰۲: وَعَنْهُ أَنَّ أَسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ كَانَ رَدَفَ النَّبِيِّ ﷺ مِنْ عَرَفَةَ إِلَى الْمُزْدَلِفَةِ ثُمَّ أَرَدَفَ الْفُضْلَ مِنَ الْمُزْدَلِفَةِ إِلَى مَنَىٰ فَكِلَاهُمَا قَالَ لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يَلْبَسِي حَتَّىٰ رَمَى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۳۲/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۸۶-۱۶۸۷)۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۳۱/۲ الحدیث رقم (۲۶۶-۱۲۸۰)۔ والترمذی فی سننہ ۲۶۰/۳ الحدیث رقم ۹۱۸۔ والنسائی فی ۲۷۶/۵ الحدیث رقم ۳۰۸۱۔ وابن ماجہ ۱۰۱۱/۲ الحدیث رقم ۳۰۴۰۔ والدارمی فی ۸۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۰۴۔ واحمد فی المسند ۱۱۴/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے پیچھے عرفہ سے مزدلفہ تک سوار تھے، پھر فضل کو مزدلفہ سے منیٰ تک پیچھے بٹھایا۔ پس دونوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ہمیشہ بلیک کہتے رہے یہاں تک کہ جمرۃ العقبہ پر کنکریاں پھینکیں یعنی نحر کے دن جب جمرۃ العقبہ پر کنکریاں پھینکیں تو بلیک کہنا موقوف کیا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”ردف“ راء کے کسری اور دال کے سکون کے ساتھ پیچھے سوار ہونے کو کہتے ہیں۔

قوله: فكلاهما قال: قال کی ضمیر کلاهما کے لفظ کی طرف راجع ہے کیونکہ وہ لفظاً مفرد اور معنیٰ شثنیہ ہے یہ کلاهما قالا سے زیادہ فصیح ہے۔ ارشاد باری ہے ﴿كَلَّمْنَا الْجَنَّتَيْنِ اَتَتْ اَكْلَهُمَا﴾ [الكهف: ۳۳] یا کُلُّ واحد منهما مراد ہے۔

مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو مزدلفہ میں جمع کرنا

۲۶۰۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِجَمْعِ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهَا بِاقَامَةٍ وَلَمْ

يُسَبِّحُ بَيْنَهُمَا وَلَا عَلَىٰ آثَرِ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۲۳/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۷۳۔ و ابوداؤد فی سننہ ۴۷۴/۲ الحدیث رقم ۱۹۲۶۔ و احمد فی المسند ۵۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں پڑھی یعنی عشاء کے وقت میں دونوں اکٹھی پڑھیں ان میں سے ہر ایک کے لیے تکبیر کہی یعنی مغرب کے لیے علیحدہ تکبیر کہی اور عشاء کے لیے الگ تکبیر کہی اور ان دونوں کے درمیان نفل نہ پڑھے اور نہ ہی ان دونوں میں سے ہر ایک کے بعد۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: جمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم المغرب والعشاء بجمع کل واحد منهما باقمة:

”اثر“ ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں کسرہ کے ساتھ ہے اور تاء کے سکون کے ساتھ عقیب کل واحدہ کے معنی میں ہے۔

”کل واحدہ“ رفع کے ساتھ ہے جملہ حالیہ ہونے کی صورت میں اور نصب کے ساتھ ہے بدل ہونے کی صورت میں۔

”منہما“ بینہما کی نفی کیلئے تاکید ہے اور اس کے بعد نقل کے نفی کیلئے تصریح ہے۔

”باقامة“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں علیحدہ علیحدہ اقامت کے ساتھ ادا فرمائیں۔ یہی امام زفر کا قول ہے اور امام طحاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

قوله: ولم يسبح..... كل واحد منهما:

یہ حدیث ان نمازوں کے بعد سنت اور وتر پڑھنے کے منافی نہیں ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم میں سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ہم ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ عرفہ سے لوٹے پس جب ہم مزدلفہ پہنچے تو انہوں نے ہمیں مغرب کی تین اور عشاء کی دو رکعت نماز پڑھائی ایک اقامت کے ساتھ اور جب سلام پھیرا تو فرمایا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی۔ اور ابن ابی شیبہ نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے ”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی المغرب والعشاء بجمع باذان واحد واقامة واحدة“۔

پس آپ جان چکے ہیں اس میں تعارض کو پس اگر اس روایت کو جس پر صحیحین متفق ہیں ان کو ترجیح نہ دی جائے ان روایات پر جن کے ذکر میں امام مسلم اور امام داؤد منفرد ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں ساقط ہو جائیں۔ تو اصل کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اصل تعداد الصلوٰۃ کو تعداد اقامہ کے ساتھ لازم کرتا ہے جیسا کہ قضاء نوات میں ہوتا ہے بلکہ یہاں بطریق اولیٰ دو اقامتیں ہونی چاہیے کیونکہ یہاں دوسری نماز تو قتی ہے پس وہ پہلی نماز جو اپنے مقررہ وقت سے مؤخر کی گئی ہے اس کیلئے اقامت کہی گی تو قتی اور حاضر نماز کیلئے تو بطریق اولیٰ اقامت ہونی چاہیے۔

مغرب اور عشاء کی نمازوں کو مزدلفہ میں جمع کرنا

۲۶۰۸: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم صَلَّى صَلَاةً إِلَّا لِمِيقَاتِهَا إِلَّا صَلَاتَيْنِ

صَلَاةَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِجَمْعٍ وَصَلَّى الْفَجْرَ يَوْمَئِذٍ قَبْلَ مِيقَاتِهَا - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۳۰/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۸۲۔ و مسلم فی ۹۳۸/۲ الحدیث رقم (۲۹۲ - ۱۲۸۹)۔

وابوداؤد فی سننہ ۴۷۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۶۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نے نہیں دیکھا نبی کریم ﷺ نے کوئی نماز پڑھی ہو مگر اپنے وقت میں دو نمازوں کے علاوہ مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں یعنی مغرب کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھی اور فجر کی نماز پڑھی اس دن یعنی مزدلفہ میں نحر کے دن اس کے وقت سے پہلے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ما رایت رسول اللہ ﷺ..... المغرب والعشاء بجمع:

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے سفر میں جمع بین الصلوٰتین کے منع ہونے میں ابن مسعود کے قول کو لیا ہے۔ اور علامہ عینی فرماتے ہیں کہ احادیث میں سفر میں جمع بین الصلوٰتین منقول نہیں۔ اس کا مطلب جمع فعلاً ہے نہ کہ وقتاً، اسی طرح ذکر کیا علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے۔

”المغرب والعشاء بجمع“ یعنی مغرب کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھی اور اسی طرح ظہر اور عصر کی نماز عرفہ میں جمع کر کے پڑھی کیونکہ وہاں نماز عصر، ظہر کے وقت میں پڑھی۔ شاید یہ حدیث مزدلفہ میں روایت کی ہو اسی وجہ سے ظہر اور عصر کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ پس ان کا ذکر تقدیراً ضروری ہے۔ یا ان کا ذکر اس لیے چھوڑا کہ ان کا جمع ہر ایک کے ہاں ظاہر ہے کیونکہ یہ جمع بہت بڑے مجمع کے سامنے علمی رؤس الاشہاد دن میں واقع ہوئی پس استشہاد میں اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں برخلاف مزدلفہ میں جمع کے کہ وہ خاص ہوئے۔ حاصل یہ ہے کہ عبارت میں تاسیح ہے ورنہ الا الصلوٰتین سے مراد اگر مغرب وعشاء ہو تو یہ درست نہیں بنتا چاہے استثناء متصل ہو جیسا کہ ظاہر ہے یا منقطع ہو جیسا کہ ابن حجر نے اس پر بنیاد رکھی ہے۔ کیونکہ نماز عشاء اپنے اس مقررہ وقت میں پڑھی تھی جو شرعاً اور اجتماعاً اس کے لیے مقرر ہے لہذا دو نمازیں اپنے وقت کے نہیں پڑھی گئی۔

قوله: صلی الفجر قبل میقاتها: یعنی غلس (اندھیرے) میں پڑھی وقت معتاد سے پہلے اور وہ اسفار (روشنی) ہے لیکن فجر کے بعد پڑھی کیونکہ شرعی طور پر مقرر وقت سے پہلے پڑھنا بالاجماع ناجائز ہے۔ اور بخاری میں ابن مسعود سے ثابت ہے کہ انہوں نے صبح صادق کے بعد مزدلفہ میں فجر کی نماز پڑھی اور فرمایا، الفجر فی هذه الساعة۔

ضعفوں کو پہلے بھیج دینا مزدلفہ کی رات کو

۲۶۰۹. وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَنَا مِمَّنْ قَدَّمَ النَّبِيَّ ﷺ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ فِي ضَعْفَةِ اَهْلِهِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۲۶/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۷۸۔ و مسلم فی ۹۴۱/۲ الحدیث رقم (۳۰۱۔ ۱۲۹۳)

وابوداؤد فی السنن ۴۷۹/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۹۔ والترمذی فی ۲۴۰/۳ الحدیث رقم ۸۹۳۔ والنسائی ۲۶۱/۵

الحدیث رقم ۳۰۳۲۔ واحمد فی المسند ۳۴۴/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے ان شخصوں میں سے تھا کہ نبی کریم ﷺ نے مزدلفہ کی رات میں اپنے ضعفوں کے معاملے میں آگے بھیجا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”فمن قدم النبي ﷺ“ ایک نسخہ میں النبی ﷺ کے نصب کے ساتھ ہے اس صورت میں تقدیری عبارت: ممن

تقدمه ای علیہ ہوگی۔

”ضعفة“ ضاء اور عین کے فتح کے ساتھ ضعیف کی جمع ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مستحب ہے کمزور کورات کے وقت بھیجا جائے تاکہ بھیڑ میں ان کو تکلیف نہ ہو (اتقی) ظاہر یہ ہے کہ یہ عذر کی وجہ سے رخصت ہے۔ اور صحیحین میں بھی ہے کہ حضرت سودہ اپنے ثقل بدن

کی وجہ سے مزدلفہ سے رات کے نصف آخر میں لوٹی نبی ﷺ کے اجازت سے اور آپ ﷺ نے نہان کو اور نہان لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے دم ادا کرنے کا حکم دیا۔ تو یہ دلالت کر رہا ہے کہ عذر کی وجہ سے واجب کا ترک مقطوعاً ہے۔

ابن حجر کا یہ قول کہ ہمارے ائمہ نے اس حدیث سے اخذ کیا ہے کہ ضروری مزدلفہ میں نصف اللیل کے بعد ایک جزء میں موجود ہونا ہے اور رات گزارنا واجب ہے نہ کہ رکن ہے اور اس میں تابعین کی ایک جماعت اور ان کے علاوہ کا اختلاف ہے پس اس کی تلافی دم سے کی جانی گی۔ تو اس حدیث میں ان کے اس قول پر کوئی دلالت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

رمی جمار کے لیے کنکریاں مزدلفہ کے راستے اٹھائیں

۲۶۱۰: وَعَنِ الْفَضْلِ بْنِ عَبَّاسٍ وَكَانَ رَدِيفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ فِي عَشِيَّةِ عَرَفَةَ وَعَدَاةٍ جَمَعَ لِلنَّاسِ حِينَ دَفَعُوا عَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ وَهُوَ كَأَنَّ نَاقَتَهُ حَتَّى دَخَلَ مُحَسِّرًا وَهُوَ مِنْ مَنِي قَالَ عَلَيْكُمْ بِحَصَى الْخَذْفِ الَّذِي يُرْمَى بِهِ الْجَمْرَةَ وَقَالَ لَمْ يَزَلْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبِسِي حَتَّى رَمَى الْجَمْرَةَ۔

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۳۱/۲ الحديث رقم (۲۶۸-۱۲۸۲)۔ والنسائي في ۲۶۸/۵۔ الحديث رقم ۳۰۵۵۔

ترجمہ: حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پیچھے سوار تھے یعنی جب کہ مزدلفہ سے منیٰ کو چلے۔ کہ حضور ﷺ نے عرفہ کی شام کو اور مزدلفہ کی صبح کو لوگوں کو فرمایا کہ جس وقت کہ لوٹیں اور اپنی ساریوں کو ہانکا اور فرمایا تم کو کنکریاں کا ٹھکانا لازم ہے یعنی اس میدان سے مارنے والی کنکریاں کی طرح جمرہ پر ماری جائیں یعنی مناروں پر اور فضل نے کہا ہے رسول خدا ﷺ مسلسل لبیک کہتے رہے یہاں تک کہ کنکریاں جمرہ کو ماریں یعنی جمرہ العقبة کو جب پہلی کنکری ماری تو لبیک کہنا بند کر دی۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: عن الفضل بن عباس كان رديف النبي ﷺ:

”عن الفضل بن عباس“: ملا علی قاری کے نسخ میں وعنه عن الفضل بن عباس ہے۔

”كان رديف النبي ﷺ“: لبیک نسخ میں ”النبي“ کے بجائے رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

قوله: قال في عشيّة عرفة..... عليكم بحصى الخذف الذي يرمى به الجمره:

”كاف“ فاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔

”محسرا“ سین کسرہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

یہ منیٰ کے قریب مزدلفہ کے آخری حصے میں ایک جگہ کا نام ہے۔ ازرقی، جمرہ عقبہ اور وادی محسر کے درمیان منیٰ کی حدود بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جمرہ عقبہ اور وادی محسر منیٰ میں سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے آگے جو پہاڑ ہے وہ منیٰ میں سے ہے نہ کہ جو اس کے پیچھے ہے اور ایک گروہ کے نزدیک عقبہ منیٰ میں سے ہے۔

”الخذف“ چھوٹی چھوٹی کنکریاں جو پنے کے برابر ہوتی ہیں۔

”يرمى به الجمره“ الجمرہ رفع کے ساتھ ہے نائب فاعل ہونے کی وجہ سے اور نصب کے ساتھ ہے اعمیٰ فعل مقدر کی وجہ سے یا یعنی فعل مقدر کی وجہ سے۔

احمد بن حنبلہ میں ایک حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے: عن ابن عباس قال: قال لي رسول الله ﷺ

غدا جمع ”القط لی“ فلقطت له حصيات من هي الخذف فلما وضعتن فی یدہ قال: نعم بامثال هولاء فارموا وایاکم والغلو فی الدین فانما هلك قبلكم بالغلو فی الدین“ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یوم نحر کی صبح رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میرے لیے کنکریاں چن لے تو میں نے آپ ﷺ کیلئے سات چھوٹی کنکریاں چن لیں جب میں نے وہ کنکریاں آپ ﷺ کے ہاتھ میں رکھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: بہترین ہیں اور ان جیسی کنکریوں سے رمی کرو اور دین میں غلو کرنے سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں غلو کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔

لیکن یہ روایت محمول ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے بھائی فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہو۔ کیونکہ ایک صحیح روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے یوم نحر کی صبح فضل ابن عباس سے فرمایا ”التقط لی حصی قال ملقطت له سبع حصيات مثل حصی الخذف“۔

یہ حدیث صریح رد ہے شوافع کے اس قول پر کہ یہ کنکریاں فجر سے پہلے چننا سنت ہے اور انہوں نے اس کی بے فائدہ علتیں ذکر کی ہیں۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ خذف کنکری یا کھجور کی گٹھلی کو دونوں شہادت کی انگلیوں میں رکھ کر پھینکنے کو کہتے ہیں۔ اور اسی پر رافعی نے اعتماد کیا ہے۔ لیکن امام نووی نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ صحیحین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے خذف سے منع فرمایا ہے کیونکہ نہ تو شکار کو قتل کر سکتا ہے اور نہ دشمن کو زخمی کر سکتا ہے۔ اور یہ آنکھ کو چھوڑ دیتا ہے اور دانت کو توڑ دیتا ہے۔ اور یہ حدیث رمی جمار اور اس کے علاوہ سب کو شامل ہے اور انہوں نے خذف کی یہ صورت پسند کی ہے کہ کنکری انگوٹھے کی پشت پر رکھ کر اور شہادت کی انگلی کے ذریعے اس کو پھینکنے۔ اور ابن ہمام فرماتے ہیں کہ انگوٹھے اور شہادت والی انگلی کے سروں سے پھینکنے کیونکہ یہ زیادہ اچھا اور آسان ہے۔

اور ابن حجر کا یہ کہنا کہ یہ حدیث یوم نحر کے علاوہ رمی کے کنکریوں کے بارے میں ہے اور یوم نحر کے کنکریوں کو مزدلفہ سے اٹھانا سنت ہے تو یہ ان کا ایک عجیب و غریب وہم ہے کیونکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ یوم نحر کے علاوہ رمی انہی کنکریوں سے کی جائے جو ایک بار ماری جا چکی ہیں۔ کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ جو کنکریاں ماری جا چکی ہیں ان کو مارنا مکروہ ہے یوم نحر اور اس کے علاوہ سب کے رمی میں۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو ان میں سے قبول ہو جائے تو وہ یہاں سے اٹھالے جاتے ہیں ورنہ تم یہاں پہاڑ دیکھتے یا یہ دونوں پہاڑوں کے درمیان جگہ کو بھر دیتی۔

میدان محسر میں آپ ﷺ اونٹنی تیز چلایا کرتے تھے

۲۶۱۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ أَفَاضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ جَمْعٍ وَعَلَيْهِ السَّكِينَةُ وَأَمَرَهُمْ بِالسَّكِينَةِ وَأَوْضَعَ فِي وَادِي مُحَسَّرٍ وَأَمَرَهُمْ أَنْ يَرْمُوا بِمِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ وَقَالَ لِعَلِيٍّ لَا أُرَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هَذَا لَمْ أَجِدْ هَذَا الْحَدِيثَ فِي الصَّحِيحَيْنِ إِلَّا فِي جَمْعِ التِّرْمِذِيِّ مَعَ تَفْذِيرٍ وَتَأْخِيرٍ۔

اخرجه ابوداؤد فی سننہ ۴۸۲/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۴۔ والترمذی فی ۲۳۴/۳ الحدیث رقم ۸۸۶۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا نبی کریم ﷺ مزدلفہ سے چلے اور ان پر چلنے میں تسکین تھی اور لوگوں کو حکم کیا آہستہ چلنے کے ساتھ اور اپنی اونٹنی میدان محسر میں جلدی چلائی اور لوگوں کو خذف کی کنکریاں (یعنی پنے کے برابر) مارنے کا حکم دیا اور حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: شاید تم میں تم کو اس سال کے بعد نہ دیکھوں گا۔ صاحب مشکوٰۃ نے کہا ہے کہ میں نے یہ حدیث صحیحین (یعنی بخاری و مسلم) میں نہیں پائی مگر جامع ترمذی میں تقدیم و تاخیر کے ساتھ پائی ہے۔

تشریح: قوله: لعلى لا اراكم: لعل یہاں اشفاق کیلئے ہے۔ مظہر فرماتے ہیں کہ ”لعل“ ترجی کیلئے آتا ہے اور کبھی ظن اور عسی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (اتنی)۔

مطلب حدیث کا یہ ہے کہ مجھ سے دین کے احکام سیکھ لو کیونکہ میرا خیال ہے کہ میں آئندہ سال تمہیں نہ دیکھ سکوں گا اور اسی طرح ہوا جیسا کہ آپ ﷺ کا خیال تھا کیونکہ اسی سال دس ہجری بارہ ربیع الاول کو آپ ﷺ کا وصال ہوا۔

قوله: لم اجد هذا الحديث..... مع تقديم وتأخير:

صاحب مشکوٰۃ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مصابیح نے اس حدیث کو پہلی نفل میں نقل کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث صحیحین کی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ترمذی کی روایت ہے تو اس کو دوسری نفل میں نقل کرنا چاہیے تھا اگر یہ اس صورت میں تقدیم و تاخیر کا اعتراض پھر بھی باقی رہتا۔

الفصل الثانی:

آفتاب کو پگڑیوں کے ساتھ تشبیہ دینا

۲۶۱۲: عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ قَيْسٍ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ خَطَبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ إِنَّ أَهْلَ الْجَاهِلِيَّةِ كَانُوا يَدْفَعُونَ مِنْ عَرَفَةَ حِينَ تَكُونُ الشَّمْسُ كَأَنَّهَا عَمَائِمُ الرِّجَالِ فِي وُجُوهِهِمْ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ وَمِنَ الْمُزْدَلِفَةِ بَعْدَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ حِينَ تَكُونُ كَأَنَّهَا عَمَائِمُ الرِّجَالِ فِي وُجُوهِهِمْ وَأَنَا لَا نَدْفَعُ مِنْ عَرَفَةَ حَتَّى تَغْرُبَ الشَّمْسُ وَنَدْفَعُ مِنَ الْمُزْدَلِفَةِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ هَدَيْنَا مُخَالَفٌ لِهَدْيِ عَبْدِ الْأَوْثَانِ وَالشِّرْكَ.

(رواه البيهقي في شعب الایمان وقال خطبنا وساقه ونحوه)

اخرجه الحاكم في المستدرک ۲/۲۷۷۔

ترجمہ: حضرت محمد بن قیس بن مخرمہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیا پس فرمایا کہ تحقیق اہل جاہلیت عرفات سے اس وقت واپس آئے تھے گویا کہ آفتاب ایسا ہو گیا جیسا کہ مردوں کی پگڑیاں ان کے چہروں کے اوپر اور تحقیق ہم عرفات سے نہیں چلیں گے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو اور ہم مزدلفہ سے آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے چلتے۔ ہمارا طریقہ بت پونے والوں اور شرک کرنے والوں کے طریقے سے مختلف ہے۔

راوی حدیث:

محمد بن قیس۔ یہ محمد بن قیس بن مخرمہ کے بیٹے قرشی و حجازی ہیں۔ انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما و عائشہ رضی اللہ عنہما سے ان سے عبد اللہ بن کثیر وغیرہ نے روایت کی۔ ”مخرمہ“ میں میم پر فتح، خاء مجمہ کے سکون اور راء کے فتح کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله: حين تكون الشمس..... في وجوههم قبل ان تغرب:

”فی وجوہہم“: جار مجرور تكون کے متعلق ہے۔

”كانها عمائم الرجال في وجوههم“: یہ جملہ، جملہ معترضہ ہے۔

بعض شارحین فرماتے ہیں کہ یہاں تک کہ جب سورج ان کے چہروں پر پگڑیوں کی طرح نظر آئے اور یہ اس طور پر کہ سورج کی

روشنی اس طرف پڑتی جس طرف ان کا رخ ہوتا اور یہاں علی رؤوسہم نہیں فرمایا کہ سورج ان کے سروں پر پگڑیوں کی طرح نظر آتا، کیونکہ غروب کے وقت سورج کی طرف جب رخ کیا جائے تو اس کی روشنی اس کے سیدھ پر پڑتی ہے اور انحطاط کی وجہ سے سر تک تجاوز نہیں کرتی۔ اور اسی طرح طلوع کے وقت بھی اور مردوں کی پگڑیوں کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی ہے کہ جب انسان گھائیوں اور وادیوں کے درمیان ہوتا ہے تو سورج کی شعاع میں سے اس پر صرف اتنی پڑتی ہے جو اس کے پیشانی پر پگڑی کے سفیدی کی طرح چمکتی ہے اور سایہ اس کے باقی چہرے اور بدن کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ پس دیکھنے والا اس کے چہرے پر سورج کی روشنی کو پیشانی پر پگڑی کی طرح پاتا ہے۔ اور عمام کی اضافت مزید توضیح کیلئے ہے جیسا کہ علامہ طیبی نے فرمایا ہے اور یاد یہاں عورتوں سے احتراز کیلئے ہے کیونکہ ان کے سروں پر پگڑی کی مثل چادر ہوتی ہے جیسا کہ ابن حجر نے کہا ہے۔

بعض کے نزدیک غروب سے پہلے عرفات سے روانہ ہونا مکروہ ہے اور اکثر کے نزدیک عرفات میں دن و رات کا جمع کرنا واجب ہے اور طلوع شمس تک ٹھہرنا بالاتفاق مکروہ ہے۔

”قبل ان تغرب“: لیدفعون کیلئے طرف ہے یا حین سے بدل ہے۔

قولہ: ہدینا مخالف لہدی عبدۃ الاوثان: مصابیح میں ”لہدی الاوثان والشرك“ ہے۔ جملہ متفقہ ہے، ما قبل کیلئے علت ہے۔ شارح مصابیح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد بت پرستوں اور مشرکین کا طریقہ ہے۔

اور شاید مخالفت کی حکمت موقف اعظم میں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کا حصول ہو، کیونکہ قوف عرفہ بالا جماع رکن ہے برخلاف قوف مزدلفہ کے کہ وہ ہمارے نزدیک واجب اور امام شافعی کے نزدیک سنت ہے۔ واللہ اعلم۔

تخریج: (رواہ) مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں یہاں جگہ چھوٹی ہوئی ہے البتہ ایک دوسرے صحیح نسخہ میں یہ لکھا ہوا ہے رواہ البیہقی فی شعب الایمان وقال خطبنا وساق بنحوہ۔ اور جو ابن حجر نے کہا ہے کہ رواہ مسلم تو اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ صاحب مصابیح پر اعتراض ہے۔

رات میں رمی جائز نہیں

۲۶۱۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدَّمْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ أُغْلِمَةَ بِنْتُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ عَلَي حُمُرَاتٍ فَجَعَلَ يَلْطَحُ أَفْعَادَنَا وَيَقُولُ ابْنَتِي لَا تَرْمُوا الْجُمْرَةَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ.

(رواہ ابو داؤد والنسائی وابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی سننہ ۴۸۰/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۰۔ والنسائی فی ۲۷۰/۱۵ الحدیث رقم ۳۰۶۴۔ وابن ماجہ ۱۰۰۷/۲ الحدیث رقم ۳۰۲۵۔ واحمد فی المسند ۲۲۶/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہمیں مزدلفہ کی رات میں روانہ کیا اور عبدالمطلب کے خاندان کے ہم کنی بچے تھے اور گدھے پر ہماری سواری تھی۔ حضور اکرم ﷺ ہماری رانوں پر ہاتھ تارتے اور فرماتے تھے میرے چھوٹے بچو جب تک سورج نہ نکلے تم منارے پر نکریاں نہ پھینکنا۔ (ابوداؤد نسائی ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: قدمنا رسول اللہ ﷺ لیلۃ المزدلفۃ اغلیمۃ بنی عبدالمطلب علی حمرات:

”قدمنا.....“: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ دلالت ہے عورتوں و بچوں کو نصف رات کے بعد پہلے روانہ کرنے پر (اتنی)

رات کے بعد کا لفظ کل نظر ہے لہذا اس سے استدلال درست نہیں ہے۔

”اغلیمۃ“ یہ منصوب ہے اختصاص کی وجہ سے یا نغی فعل مقرر کی وجہ سے اور قد رنا کی ضمیر سے عطف بیان ہے۔

”اغیلمۃ“ سے مراد بچے ہیں۔ یہاں صبیان کونسوان پر غلبہ دیا گیا ہے، یہ تصغیر شاز ہے کیونکہ غلمۃ بکسر الغین کی تصغیر غلیمہ آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ غلمہ جمع غلام کی تصغیر قیاسی ہے اگرچہ غلمہ کا استعمال نہیں ہوتا اس کا استعمال قلت میں غلمہ اور کثرت میں غلمان ہے۔

”علی حمرات“ حاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ دلالت کر رہا ہے کہ قرہ بی سفر میں گدھے پر چر کرنا مکروہ نہیں ہے۔

قوله: فجعل یلطح افخاذنا ویقول یابنی لاترموا الجمرة حتی تطلع الشمس:

”یلطح“ حاء کی فتح کے ساتھ ہے۔

”ابیسی“ ہمزہ کے ضمہ اور باء کے فتح یا ء کے سکون اور نون کے کسرہ اور یا ء مشدہ کے فتح کے ساتھ ہے اور کھی یا ء کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے یہ ابن کی تصغیر ہے اور مضاف ہے ی کی طرف اور یا ابن کی جمع سالم کی تصغیر ہے مگر خلاف قیاس ہے کیونکہ اس کا ہمزہ وصلی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ تصغیر کو اصل کی طرف لوٹاتی ہے اور اسی سے ہے اللہ کا یہ قول: ﴿الذوالالبون﴾ اور ابن کی اصل بنو ہے یہ ان اسماء میں سے ہے جن کا آخر مخذوف ہے پس ظاہر تو یہ ہے کہ بنی کہتے مگر اس کا مفرد کے ساتھ التباس ہوتا تو اس سے بچنے کیلئے ہمزہ زیادہ کر دیا گیا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ ابن کی تصغیر ہے یعنی اس کا مفرد مقطوع الالف تھا اس کی تصغیر ابین بنائی گئی اور پھر اس کی جمع سالم بنائی گئی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ابینی، اعمی کے وزن پر تھا اس کے الف کو یا سے بدلا گیا یا ء تصغیر کے بعد مسکور ہونے کی وجہ سے اور یا ء متکلم کی طرف اس کی اضافت کی گئی ہے اور یہ اسم جمع ہے۔ اور ابن حجر کا یہ قول بہت عجیب ہے کہ یہ ابینی ہمزہ کے فتح بائی کے سکون اور نون کے فتح اور یا ء کے شد کے ساتھ ہے جیسا کہ اعمی کی تصغیر اعمی ہے۔ نھایہ میں ہے کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابن کی جمع بناء آتی ہے مقصود بھی اور معدود بھی اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ابن کی تصغیر ہے اور یہ محل نظر ہے (ابینی)۔ محل نظر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تصغیر لفظ کو اس کے اصل کی طرف لوٹاتا ہے جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور یا وجہ یہ ہے کہ یہ مفرد ہے اور ما بعد اس کا جمع ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ جنس ہے اور نداء اشرف کیلئے اصالت ہے اور بقیہ کیلئے تبعاً ہے جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿یا یھیا

النسی اذا طلقتم النساء﴾ [الطلاق: ۱]

حاصل یہ ہے کہ اس کے لفظ میں روایت متحد اور روایت مختلف ہے بہر صورت اس کا معنی ہے یا ولیداتی یا یا ابنائی اور یا ابینی ہے۔ ”لاترموا الجمرة حتی تطلع الشمس“: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رات میں رمی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے جبکہ امام شافعی کے ہاں آدھی رات کے بعد سے رمی جائز ہے اور طلوع شمس کے ساتھ اس لیے مقید کیا ہے کہ اس وقت رمی سنت ہے نیز طلوع فجر کے بعد اور سورج نکلنے سے پہلے رمی بالاتفاق جائز ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مستدل حدیث اور اس کی تاویل

۲۶۱۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ أُرْسِلَ النَّبِيُّ ﷺ بِأَمِّ سَلَمَةَ لَيْلَةَ النَّجْرِ فَرَمَتِ الْجُمْرَةَ قَبْلَ الْفَجْرِ ثُمَّ مَضَتْ

فَأَقَاصَتْ وَكَانَ ذَلِكَ الْيَوْمَ الَّذِي يَكُونُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عِنْدَهَا۔ (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی ۴۸۱۱۲ الحدیث رقم ۱۹۴۲۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بقر عید کی رات میں مزدلفہ بھیج دیا تھا چنانچہ انہوں نے نماز فجر سے پہلے جمرہ عقبہ پر کنکریاں ماریں پھر وہاں سے آئیں اور طواف افاضہ کیا اور یہ وہ دن تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ام سلمہ کے پاس تھے یعنی یہ ام سلمہ کی باری کا دن تھا اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

”بام الخ“ باء زائد ہے تاکید کیلئے ہے۔

”اليوم الذي.....“ منصوب ہے بنا بر خبریت کے۔

حدیث کے آخری الفاظ میں دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ حضور ﷺ نے ام سلمہ کو اس رات میں مٹی کیوں بھیجا۔ انہوں نے رات میں رمی کیوں کی اور دن ہی میں طواف افاضہ سے فارغ کیوں ہوئیں۔ جبکہ دیگر امہات المؤمنین نے اگلی رات میں طواف افاضہ کیا۔

امام شافعیؒ فجر سے پہلے رمی جمرہ کے جواز کیلئے اس حدیث کو دلیل قرار دیتے ہیں اگرچہ افضل فجر کے بعد ہے اور دیگر علماء فرماتے ہیں کہ یہ سہولت و رعایت صرف ام سلمہ کو دی گئی تھی دوسروں کیلئے ابن عباسؓ کی مذکورہ حدیث کے پیش نظر فجر سے پہلے رمی جائز نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں فجر سے مراد نماز فجر ہو کہ حضرت ام سلمہؓ نے نماز فجر سے پہلے اور طلوع فجر کے بعد رمی کی۔ ہدایہ میں ہے کہ امام شافعیؒ کی دلیل یہ روایت ہے ”انہ علیہ السلام رخص للرعاء ان یرمو الیلا“ کہ آپ ﷺ نے چرواہوں کو رات میں رمی کی اجازت دی تھی۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ اس روایت کی تخریج ابن ابی شیبہ نے کی ہے اور اپنے مصنف میں عطاء سے مرسل روایت کیا ہے اور دارقطنی نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں ”وایة ساعة شاء من النهار“ اور دن کی جس گھڑی میں چاہے اور مصنف نے اس کو دوسری اور تیسری رات پر محمول کیا ہے کیونکہ یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ رمی کا وقت ہر دن کے داخل ہونے سے لے کر اس دن کے بعد آنے والی رات کے آخر تک ہوتا ہے پس راتیں رمی میں سابقہ ایام کے تابع ہوتی ہیں نہ کہ لاحقہ کی اور اس کی دلیل سنن اربعہ کی وہ روایت ہے جو عطاء نے ابن عباسؓ سے نقل کی ہے:

”کان رسول اللہ ﷺ یقدم ضعفاء اہله بغلس و امرهم الایر مو الجمرۃ حتی تطلع الشمس“۔

رسول اللہ ﷺ اپنے کمزور اہل و عیال کو رات کے اندھیرے میں پہلے بھیجتے اور ان کو حکم فرماتے کہ طلوع شمس سے پہلے رمی جمار نہ کریں۔

اور طحاوی نے روایت کیا ہے عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ ﷺ امر ضعفة بنی ہاشم ان یرتحلوا من جمع بلیل ویقول ”ابینی لا ترموا الجمرۃ حتی تطلع الشمس

طحاوی کی ایک اور روایت ہے عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ ﷺ کان یأمر نساء، و ثقله صبیحة جمع أن یفیضوا مع أول الفجر بسواد ولا یرمو الجمرۃ الا مصبحین“ اور ایک روایت میں ہے: ان رسول اللہ ﷺ بعثه فی النقل وقال: لا ترموا الجمار حتی تصبحوا“ ہم نے جواز ان دونوں احادیث سے اور فضیلت بائیل والی حدیث سے ثابت کی ہے۔

مقیم یا عمرہ کرنے والا حجر اسود کو بوسہ دے

۲۶۱۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ يَلْبَسِي الْمَقِيمَ أَوْ الْمُعْتَمِرَ حَتَّى تَسْتَلِمَ الْحَجَرَ.

(رواہ ابوداؤد وقال وروی مو قوفا علی ابن عباس)

اخرجه ابوداؤد فی سننه ۴۰۶/۲ الحدیث رقم ۱۸۱۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ لپیک کہے مقیم یا عمرہ کرنے والا یہاں تک کہ بوسہ دے حجر اسود کو۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے یعنی مرفوع اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ جو روایت کی گئی ہے یہ موقوف ہے ابن

عباس رضی اللہ عنہ پر۔**تشریح:** قوله: یلبی المقیم او المعتمر حتی یستلم الحجر:

مصاحح میں یلبی المعتمر الی ان یفتتح ہے۔

”المقیم او المعتمر“: مقیم سے مراد وہ معتمرین ہیں جو مکہ میں مقیم ہوں اور معتمر سے مراد وہ معتمر ہے جو باہر سے آیا ہو۔
 ”او“ برائے تنوین ہے اور یہ بھی بعید نہیں کہ مراد مطلق معتمر ہو اور ”او“ راوی کی طرف سے شک ہو۔

شارح مصاحح فرماتے ہیں کہ عمرہ کرنے والا احرام کے وقت سے طواف شروع کرنے تک تلبیہ کہے اور پھر تلبیہ منقطع کر دے۔ ہدایہ میں ہے کہ امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمرہ کرنے والے کی نگاہ جیسے ہی بیت اللہ پر پڑے تو تلبیہ منقطع کر دے۔ اور ان سے ایک روایت ہے کہ جب مکہ کے گھروں پر نظر پڑے تو تلبیہ ختم کر دے۔ ابن ہمام کہتے ہیں کہ ہمارے دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو ترمذی نے روایت کی ہے: انه عليه الصلوة والسلام كان یمسك عن التلبیة فی العمرة اذا استلم وقال حدیث صحیح۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ اس وقت ختم کرتے عمرہ میں جب حجر اسود کو بوسہ دیتے۔

قوله: رواه ابو داود ”رواه ابو داؤد وقال“ ایک نسخہ میں قال بغیر واو کے ہے۔ ”وروی“ بصیغہ مجہول ہے۔

”موقوفاً علی ابن عباس“ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ابو داؤد نے اس کو مرفوع روایت کیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے ”وروی موقوفاً“ پس اختصار محل مصنف کی طرف سے ہے ان کو پہلے یوں ذکر کرنا چاہیے تھا عن ابن عباس رضی اللہ عنہ موقوفاً۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور بعض علماء نے اس کو مرفوع ذکر کیا ہے۔

اور اس کو ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں ”ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یلبی المعتمر حتی یستلم الحجر“ (بخاری)۔ اس سے واضح ہوا کہ کو تاہی صاحب مشکوٰۃ کی ہے ابو داؤد سے نقل کرنے میں واللہ اعلم۔

الفصل الثالث:

عرفات سے واپسی کا ذکر

۲۶۱۶: عَنْ يَعْقُوبَ بْنِ عَاصِمِ بْنِ عُرْوَةَ أَنَّهُ سَمِعَ الشَّرِيدَ يَقُولُ أَقْضَتْ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَمَا مَسَّتْ قَدَمَاهُ الْأَرْضَ حَتَّى آتَى جَمْعًا۔ (رواه ابو داود)

اخرجه احمد في المسند ۳۸۹/۴۔

ترجمہ: یعقوب بن عاصم بن عروہ تابعی سے روایت ہے کہ اس نے شریذ صحابی سے سنا کہ میں عرفات سے واپسی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں زمین پر نہ لگے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ میں آئے۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

یعقوب بن عاصم۔ یہ ”یعقوب“ ہیں۔ ”عاصم بن عروہ بن مسعود“ کے بیٹے ہیں۔ ثقفی و حجازی ہیں۔ انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث کی روایت کی۔

تشریح: علامہ طبری فرماتے ہیں اس روایت سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرفات سے مزدلفہ تک

کا پورا راستہ سواری پر طے کیا پیدل نہیں چلے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ نے پورے راستے میں زمین پر قدم ہی نہیں رکھے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ عرفات سے واپسی کے موقع پر راستے میں آپ ﷺ نے پیشاب کیا تو آپ ﷺ پر پانی پیش کیا گیا وضو کیلئے تو آپ ﷺ نے فرمایا نماز تو آگے آرہی ہے۔

ظہر و عصر کی نماز جمع کرنا آپ ﷺ کی سنت ہے

۲۶۱۷: وَعَنِ ابْنِ شَهَابٍ قَالَ أَخْبَرَنِي سَالِمٌ أَنَّ الْحَجَّاجَ بْنَ يُوْسُفَ عَامَ نَزْلِ بَابِ الزُّبَيْرِ سَأَلَ عَبْدَ اللَّهِ كَيْفَ نَصَنُ فِي الْمَوْقِفِ يَوْمَ عَرَفَةَ فَقَالَ سَالِمٌ إِنَّ كُنْتَ تُرِيدُ السُّنَّةَ فَهَجِرْ بِالصَّلَاةِ يَوْمَ عَرَفَةَ فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ صَدَقَ أَنَّهُمْ كَانُوا يَجْمَعُونَ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فِي السُّنَّةِ فَقُلْتُ لِسَالِمٍ أَفَعَلَ ذَلِكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ سَالِمٌ وَهَلْ يَتَّبِعُونَ ذَلِكَ إِلَّا سُنَّتَهُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۱۳۱۳۔ الحدیث رقم ۱۶۶۲۔

ترجمہ: حضرت ابن شہاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ مجھ کو سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ حجاج یوسف نے اس سال مکہ میں عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا، مکہ میں آ کر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ہم کس طرح عرفہ کے دن ٹھہریں؟ یعنی ظہر و عصر کی نماز و قوف سے پہلے پڑھیں یا درمیان میں یا پیچھے؟ پس سالم نے کہا اگر تو سنت کا ارادہ کرتا ہے تو ظہر و عصر عرفہ کے دن صبح سویرے پڑھ۔ پس عبد اللہ بن عمر نے کہا کہ سالم نے سچ کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت طریقہ ادا کرنے کے لیے ظہر و عصر کو جمع کرتے تھے۔ ابن شہاب نے کہا کہ میں نے سالم سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے اسی طرح کیا تھا؟ پس سالم نے کہا اس طرح نماز پڑھ، اس معاملے میں ہم نبی کریم ﷺ کے طریقے کی اتباع کرتے ہیں۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

حجاج بن یوسف۔ یہ حجاج بن یوسف ”ثقفی“ ہے۔ اس کے مظالم کے قصے انتہائی مشہور ہیں۔ انتہائی ظالم اور بے رحم شخص تھا۔ ”شر الناس“ کا مصداق تھا۔ سوا لاکھ مسلمانوں کو ظلماً قتل کیا۔ ان مقتولین میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ یہ عبد الملک بن مروان کی طرف سے عراق اور خراسان کا گورنر تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولید گورنر ہوا۔ مقام ”واسط“ میں شوال ۹۵ھ میں وفات پائی۔ اس کی عمر چون (۵۴) سال کی ہوئی۔ اس کا ذکر مناقب قریش کے باب اور قبائل کے ذکر میں آتا ہے اس کی موت کا قصہ عنقریب حرف سین کے ماتحت سعید بن جبیر کے تذکرہ میں آئے گا۔ ”حجاج“ کا مطلب ”کثیر الحج“، بکثرت حج کرنے والا۔

پھر اسی سال عبد الملک بن مروان نے اس کو حایوں کا امیر مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ تمام افعال حج میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے افعال و اقوال کی پیروی کرنا ان سے حج کے مسائل پوچھتے رہنا اور کسی معاملے میں ان کی مخالفت نہ کرنا چنانچہ حجاج نے اس وقت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت میں ذکر کردہ مسئلہ بھی پوچھا۔

تشریح: قوله: فقال سالم ان كنت تريد السنة فهجروا بالصلاة يوم عرفة:

”فقال سالم“: اس میں تجرید ہے ورنہ فقالت کہنا چاہیے تھا اور انہوں نے والد سے پہلے جواب والد کے آسانی کیلئے دیا کیونکہ وہ بہت بوڑھے تھے اور حجاج کے احانت کیلئے انہوں نے جواب دیا کیونکہ حجاج بہت متکبر تھا، بظاہر ابن عمر رضی اللہ عنہم اور ان کے بیٹے مقیم تھے تو یہ

جمع بین الصلوٰتین فی النسک تھانہ کہ جمع فی السفر۔

”فہجر“ تھایہ میں ہے التہجیر التکبیر فی کل شیء۔

قولہ: فقال عبد اللہ ابن عمر صدق انہم كانوا یجمعون بین الظهر والعصر فی السنة:

”انہم“ بکسر الہمزۃ ویفتح۔ قولہ: فقلت لسالم..... وهل یتبعون الا سنتہ:

”أفعل ذلك“ ہمزہ استفہام کے اثبات کے ساتھ ہے صحیح نسخوں میں برخلاف ابن حجر کے نسخہ میں جو واقع ہے کہ وہ فرماتے ہیں

ہمزہ استفہام کے حذف کے ساتھ ہے کیونکہ مقام سے اس کا ظہور ہو رہا ہے۔

”یتبعون“ تشدید کے ساتھ ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ”یتبعون“ تاء کی تشدید اور باء کے کسرہ کے ساتھ اتباع سے ہے اور

بخاری کی ایک روایت میں ’تبتعون‘ دو تاء اور درمیان میں باء ساکن کے ساتھ آیا ہے اور یہ مشکوٰۃ کے غالب نسخوں کے خلاف ہے اور

بخاری کی اکثر روایات کے خلاف ہے پس ابن حجر کا قول ”لا یطلبون“ یہ لیبغون کی تفسیر ہے۔ اور ان نسخوں میں ’فی‘ کی جگہ باء ہے۔

”الا سنة“: منصوب بزعر الخافض ہے۔

بَابُ رَمِي الْجِمَارِ

مناروں پر کنکریاں پھینکنے کا بیان

”الجمار“ جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے جمرۃ کی جمع ہے چھوٹی چھوٹی کنکریوں کو کہتے ہیں۔ اور ابن حجر کا اس کو یوم نحر کے ساتھ مقید

کرنا غیر محل میں ہے کیونکہ باب کی روایات عام رمی پر دلالت کر رہی ہے اور جمار کی تفسیر جمرات سے بھی نہیں کی جانی گی کیونکہ اس کیلئے

مستقل باب آرہا ہے۔

الفصل الاول:

حج کرنے سے پہلے حج کے احکامات سیکھنے ضروری ہیں

۲۶۱۸: عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَرُمِي عَلَى رَاحِلَتِهِ يَوْمَ النَّحْرِ وَيَقُولُ لِنَاخِدُوا مِنَّا سِكِّمُ فَإِنِّي

لَأَ ذُرِّي لَعَلِّي لَا أَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِي هَذِهِ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۴۳/۲ الحديث رقم (۳۱۰-۱۲۹۷)۔ و ابوداؤد فی سننه ۴۹۵/۲ الحديث رقم ۱۹۷۰۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میر نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی سواری پر سوار ہو کر

کنکریاں مارتے دیکھا قربانی کے دن اور آپ ﷺ ارشاد فرمایا: تمہے کہ افعال حج سیکھو اس لیے کہ تحقیق میں نہیں جانتا

۔ شاید میں اس حج کے بعد حج نہ کر سکوں۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: رايت رسول الله ﷺ يرمي على راحلته يوم النحر:

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جو شخص منیٰ میں سواری پر پہنچے تو اس کیلئے یہی مستحب ہے کہ وہ قربانی کے دن سوار ہو کہ جمرہ عقبہ پر کنکریاں

مارے اور جو شخص منیٰ میں پیدل پہنچے تو وہ پیدل رمی کرے اور ایام تشریق کے پہلے دو دنوں میں تینوں جمرات پر پیادہ رمی کرے اور

تیرہویں تاریخ کو سوار ہو کر کنکریاں مارے۔ امام احمد اور اہل حق فرماتے ہیں کہ قربانی کے دن پیادہ رمی کرنا مستحب ہے یہ قول علامہ طیبی نے ذکر کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ابراہیم ابن الجراح سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں امام ابو یوسفؒ کے پاس اس بیماری کے وقت گیا جس میں ان کی وفات ہوئی۔ تو انہوں نے آنکھیں کھولی اور فرمایا کہ رمی سوار ہو کر افضل ہے یا پیادہ؟ پس جس رمی کے بعد وقوف نہ ہو تو وہ سوار ہو کر افضل ہے۔ پس میں ان کے ہاں سے چلا اور ابھی دروازے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ ان کی موت کی آواز سنلگی۔ پس مجھے اس حال میں ان کی علمی حرص پر تعجب آیا۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد فرماتے ہیں کہ رمی سب کے سب سوار ہو کر افضل ہے (اتہلی) کیونکہ منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ساری رمی سوار ہو کر کی ہے۔

اور امام ابو یوسف اس حدیث کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں کہ آپ نے سوار ہو کر اس لیے رمی کی تاکہ لوگ آپ ﷺ کو دیکھ کر آپ ﷺ کی اقتدار کریں اور آپ ﷺ سے پوچھیں اور احکام حج سیکھ لیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے سوار ہو کر طواف کے بارے میں یہ ذکر کیا گیا ہے۔ ظہیر یہ نہیں مطلقاً پیادہ پا کو مستحب قرار دیا ہے اور اگر سوار ہو کر چلائے جائے تو کوئی حرج نہیں ہے اور پیادہ پا چلنا افضل ہے اور اس کی الویت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ جب ہم نے حدیث کو مذکورہ مطلب پر محمول کر لیا تو اب صرف عبادت کو ادا کرنا رہ گیا اور اس کی ادائیگی پیادہ پا خشوع اور بجز کے زیادہ قریب ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں کیونکہ عام مسلمان اس زمانے میں پیادہ پا ہوتے ہیں پس ان کے درمیان سوار ہو کر کرنے سے کوئی تکلیف سے نہیں بچ سکتا۔

قوله: ویقول: لتأخذوا مناسککم فانی لا ادری..... حجتی هذا:

”ویقول“ برمی پر عطف ہے پس اس صورت میں یہ ”علقت تبناً و ماء بارداً کے قبیل سے ہوگا۔ یا جملہ حالیہ ہے۔

”لتأخذوا“ میں لام، لام امر ہے یعنی خذوا۔ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لام تعلیل کیلئے اور معلل محذوف ہو اور تقریر یہ ہو ویقول انما فعلت لتأخذوا عنی مناسککم..... اور اول کی تائید خذوا عنی مناسککم والی روایت سے ہوتی ہے۔

”لا ادری“ اس کا مفعول محذوف ہے یعنی لا اعلم ماذا یكون۔

”حجتی“ حاء کے فتح کے ساتھ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مصدر ہو اور سال کے معنی میں ہو۔

تخریج: بیہقی اور ابن عبدالبر نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے انہ علیہ السلام رمی ایام التشریق ماشیاً۔ بیہقی میں یہ بھی ذکر ہے اگر یہ روایت ہے تو پھر اس کی اتباع زیادہ اولیٰ ہے۔ اور دیگر حضرات نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ترمذی وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ اور ابن عبدالبر کہتے ہیں: وفعلة جماعة من الخلفاء بعده، وعلیه العمل اور تیرے۔ لئے کافی ہے۔ قاسم ابن محمد کی روایت کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ ﷺ عرفہ کو کھڑے رہے، اور رمی سوار ہو کر کی اور یہ حدیث جابر سے لی گئی ہے (اتہلی)۔ اور اس سے قربانی کے پہلے دن رمی جمرہ عقبہ مستحب ہے۔ کما لا یخفی۔

کنکریاں پھینکنے کا طریقہ

۲۶۱۹: وَعَنْهُ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَمَى الْجُمْرَةَ بِمِثْلِ حِصْيِ الْحَدَافِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۴۴/۲ الحديث رقم (۳۱۳-۱۲۹۹)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا منارے کو مارتے تھے خذف کی

کنکریوں کی طرح۔ یعنی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے ساتھ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: رمى الجمرۃ بمثل حصی الخذف:

چھوٹی چھوٹی کنکریاں جو لو بیا یا بھجور کی کھٹلی کے برابر ہوتی ہیں پس اس سے چھوٹی اور بڑی مکروہ ہیں کیونکہ بڑی کنکریوں سے ایک حدیث میں نبی آئی ہیں کہ آپ ﷺ نے کنکری اٹھا کر فرمایا اس طرح کنکری سے رمی کرو اور دین میں غلو سے بچو۔ اسی وجہ سے ابن المنذر نے امام مالک کے اس قول الاکبر من حصی الخذف اعجب الی کہ میرے نزدیک بڑی کنکریاں زیادہ پسندیدہ ہیں۔ تعجب کا اظہار کیا ہے لیکن ابن المنذر کے تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ امام مالک رمی کی کنکریوں میں سے جو بڑی ہیں ان کو راجح قرار دیا ہے۔ اور حدیث میں غلو سے مراد اس رمی کی کنکریوں کے مقدار سے بڑی کنکریاں ہیں۔ پھر امام مالک کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ کنکریاں میزان میں زیادہ ثقیل ہوں گی اور یا شیطان کیلئے زیادہ سخت ثابت ہوتی ہیں اور شارع نے چھوٹی کنکریوں کو بڑی کنکریوں سے پسند کیا ہے حالت ازدحام میں امت پر شفقت کی وجہ سے۔

ہدایہ میں ہے کہ کنکری انگوٹھے کی پشت پر رکھ کر شہادت کی انگلی کی مدد حاصل کرے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر ان دونوں تفسیروں کا احتمال رکھتی ہے جو رمی کے بارے میں کی گئی ہے ایک تفسیر یہ ہے کہ دائیں انگوٹھے کا سر شہادت کی انگلی کے وسط پر رکھے اور کنکری انگوٹھے کی پشت پر رکھے یعنی ستر کی علامت بنائے اور پھر کنکری مارے اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ رمی دائیں ہاتھ سے مسنون ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ شہادت کی انگلی انگوٹھے سے ملا کر اس کے بند پر رکھے یعنی کہ دس کی علامت بنائے اور بعض نے یہ طریقہ بتایا کہ کنکری انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے سروں میں پکڑ کر مارے اور یہ طریقہ زیادہ صحیح اور آسان ہے، اور معنایہ طریقہ بھی یہی ہے۔ اور اس کی روایت کی دلیل آپ ﷺ کا یہ قول ہے: فادموا مثل حصی الخذف لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ رمی کی کیفیت، خذف کی کیفیت ہونی چاہیے بلکہ اس روایت کا مقصد کنکری کے مقدار کی تعیین ہے۔

اور اگر جمرات کے پاس بڑی ہوئی کنکریوں سے رمی کی تو جائز ہے کیونکہ رمی پتھر کی صفت بالکل تبدیل نہیں کرتی کیونکہ وہ کنکریاں ان لوگوں کی ہوتی ہیں جن کا حج قبول نہیں ہوتا۔ دارقطنی اور حاکم کی روایت میں ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کے رسول ﷺ کہ یہ جمرات جن کو ہر سال ہم کنکریاں مارتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ یہ کنکریاں کم ہو جاتی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے جو قبول ہو جاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں اگر اس طرح نہ ہوتا تو آپ یہاں کنکریوں کو پہاڑ کی طرح دیکھتے۔ جیسا کہ شرح نقالیہ للشمس میں ہے۔

چاشت کے وقت کنکریاں مارنا

۲۶۲۰: وَعَنْهُ قَالَ رَمَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى وَأَمَّا بَعْدَ ذَلِكَ فإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ -

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۷۹/۳۔ تعلقاً۔ وخرجه مسلم فی ۹۴۵/۲ الحدیث رقم (۳۱۴-۱۲۹۹)۔ وابدوؤد فی

سننہ ۴۹۶/۲ الحدیث رقم ۱۹۷۱ و الترمذی فی ۲۴۱/۳ الحدیث رقم ۸۹۴۔ و النسائی فی ۲۷۰/۵ الحدیث رقم ۳۰۶۳۔

و ابن ماجہ فی ۱۰۱۴/۲ الحدیث رقم ۳۰۵۳۔ و الدارمی ۸۵/۲ الحدیث رقم ۱۸۹۶۔ و احمد فی المسند ۳۱۹/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قربانی کے دن مناروں پر کنکریاں ماریں چاشت کے وقت اور قربانی کے دن جس وقت دو پہر ڈھلی، اس وقت کنکریاں پھینکی۔

تشریح: ہدایہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص کنکریاں پھینکتے نہیں بلکہ ڈال دے تو یہ کافی ہو جائے گا۔ ابن ہمام کہتے ہیں کیونکہ ڈال دینے میں اسم رمی کی نفی نہیں ہے بلکہ اس میں رمی ہے مگر نقصان اور کمی کے ساتھ ہے پس یہ غیر پسندیدہ ہے برخلاف رکھنے کے کہ اس طرح کافی نہ ہوگا کیونکہ اس میں حقیقت رمی بالکلیہ ختم ہو جاتی ہے۔ ”ضحیٰ“ ضحیٰ دن کے اس حصے کو کہتے ہیں جو طلوع آفتاب کے بعد سے زوال آفتاب سے پہلے تک ہو۔ ”ما بعد ذلک“ یعنی یوم نحر کے بعد اور وہ ایام تشریق ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے دن یعنی گیارہویں تاریخ کو رمی جمار کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہوتا ہے اس طرح تیسرے دن بھی۔

اور امام ابو حنیفہؒ سے غیر مشہور روایت میں منقول ہے کہ مجھے دوسرے اور تیسرے دن زوال آفتاب سے پہلے رمی جمار پسند نہیں، اگر کسی نے اس سے پہلے رمی کر لی تو جائز ہو جائیگی اور آپ ﷺ کے فعل کو افضلیت ہے کہ ہم انتظار کرتے تھے پس جب زوال آفتاب ہو جاتا تو ہم رمی کرتے۔ پس اس سے پہلے ایک دن کی رمی بھی جائز نہیں ہے بالا جماع جیسا کہ علامہ ماوردی کا خیال ہے لیکن اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ امام حریمین وغیرہ نے ائمہ سے اس کا جواز نقل کیا ہے۔

اور ابو داؤد نے ابن اسحاق کی حدیث نقل کی ہے جو ابن اسحاق نے عائشہؓ سے پہنچائی ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ یوم نحر کو لوٹے جب ظہر کی نماز پڑھی اور پھر منیٰ کی طرف لوٹے پس تشریق کے ایام وہاں ٹھہرے اور رمی جمار کرتے رہے زوال آفتاب کے بعد منذری کہتے ہیں کہ حدیث حسن ہے اور اس کو صحیح ابن حبان میں بھی روایت کیا ہے۔ اسی طرح ذکر کیا ہے ابن ہمام نے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دلیل ہے اس پر کہ آپ ﷺ نے یوم نحر کو ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی: فی الجملہ رمی نماز ظہر سے پہلے مسنون ہے اگر نماز کے فوت ہونے کا خطرہ نہ ہو جیسا کہ اس پر ابن عمر کی حدیث جو بخاری واہن ماجہ میں ہے دلالت کرتی ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ چوتھے دن زوال سے قبل رمی کرنا امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبین کے نزدیک جائز نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ابن عباسؓ سے منقول ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ بیہقی کی روایت میں ہے: اذا انتفخ النهار من يوم النفر فقد حل الرمي والصدور. انتفاخ بمعنی ارتفاع ہے اس حدیث کی سند میں طلحہ بن عمرو ہے جس کو بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رمی کے وقت کے تعیین میں پہلے دن شروع دن میں رمی کرے اور اس کے بعد والے ایام میں زوال کے بعد کرے۔ معتمد صرف آپ ﷺ کا فعل ہے باوجود یہ کہ یہ غیر معقول ہے۔ پس رمی کا وقت داخل نہیں ہوتا اس وقت سے پہلے جس میں آپ نے رمی کی ہے جیسا کہ رمی اس جگہ کے علاوہ میں جائز نہیں ہے جس جگہ آپ ﷺ نے رمی کی ہے۔ اور آپ ﷺ نے چوتھے دن زوال کے بعد رمی کی ہے پس اس سے پہلے رمی نہ کی جائے۔

اللہ اکبر کہہ کر کنکریاں پھینکنا

۲۶۲۱: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّهُ انْتَهَى إِلَى الْجُمُرَةِ الْكُبْرَى فَجَعَلَ الْبَيْتَ عَنْ يَسَارِهِ وَمَنِى عَنْ يَمِينِهِ وَرَمَى بِسَبْعِ حَصِيَّاتٍ يَكْبُرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ ثُمَّ قَالَ هَلْكَذَا رَمَى الْإِدْيُ انزَلَتْ عَلَيْهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ.

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۸۰/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۴۹۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۴۲/۲ الحدیث رقم (۳۰۵)۔
 (۱۲۹۶)۔ و ابوداؤد فی السنن ۴۹۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۷۴ و الترمذی ۲۴۵/۳ الحدیث رقم ۹۰۱۔ و النسائی فی
 ۲۷۴/۵ الحدیث رقم ۳۰۷۲ و ابن ماجہ فی ۱۰۰۸/۲ الحدیث رقم ۳۰۳۰۔ و احمد فی المسند ۴۵۸/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ وہ جمرہ کبریٰ کی طرف پہنچے۔ یعنی جمرۃ العقیقہ کے پاس اس
 طرح کہ خانہ کعبہ اپنے بائیں طرف کیا اور منیٰ کو اپنے دائیں طرف اور اللہ اکبر کہہ کر کنکریاں پھینکیں اور ہر کنکری کے
 ساتھ اللہ اکبر کہا۔ پھر ابن مسعود نے کہا کہ اسی طرح سے کنکریاں پھینکیں اس شخص نے کہ اتاری گئی ان پر سورۃ بقرہ یعنی
 آنحضرت۔ اس کی امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: انتهى الى الجمرۃ الكبرى مع كل حصاة: ”الجمرة الكبرى“: جمرہ کبریٰ سے مراد جمرہ
 عقبہ ہے اور علامہ طیبی کو وہم ہوا ہے کہ اس سے مراد وہ جمرہ ہے جو مسجد خیف کے پاس ہے۔ اور صحیح وہی ہے جو ہم نے کہا ہے۔
 دوسرے جمرات پر اس طرح کھڑا ہونا مستحب ہے کہ منہ قبلہ کی طرف ہو اور اس سے بعض شوافع کے اس قول کا جواب بھی ہوا کہ جمرہ
 کی طرف منہ اور کعبہ کی طرف پیٹھ کی جائے اور ان میں سے بعض کا قول ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کرے اور جمرہ دائیں طرف ہو ان کا
 استدلال ترمذی کی اس حدیث سے ہے جس کو ترمذی نے صحیح کہا ہے اور جمہور نے تثنیٰ کی مذکورہ حدیث کی ہے۔

”یکبر مع كل حصاة“: یہ بخاری کی روایت ”انه عليه الصلاة والسلام كان يکبر في رمي ايام التشريق على اثر
 كل حصاة کے منافی نہیں ہے کیونکہ تعقیب، معیت کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ ﴿اسلمت مع سليمان﴾ [النمل: ۴۴] میں ہے۔
 تثنیٰ کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ ہر کنکری کے ساتھ اس طرح تکبیر کہتے تھے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر، اللهم اجعله
 حجا مبرور، و ذنباً مغفوراً و عملاً مشکوراً۔

قوله: هكذا رمى الذي انزلت عليه سورة البقرة:

”رمي“: فعل ہے اور ایک نسخہ میں بالمصدر ہے۔

”عليه“: علیہ کی ضمیر سے مراد آپ ﷺ کی ذات ہے اور اس سے ضمیر کی طرف عدول اور دیگر اوصاف کا ذکر زیادہ تقریر اور اہتمام
 فعل کیلئے ہے جیسا کہ اللہ کے اس قول میں ہے ﴿ورادته التي هو في بيتها﴾ [يوسف: ۲۳] (انہی) لیکن یہ اس وقت درست ہو سکتا
 ہے جب قال کی ضمیر نبی ﷺ کی طرف راجع ہو حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔

”سورة البقرة“: سورہ بقرہ کا ذکر اس مناسبت سے کیا گیا ہے کہ اس سورت میں حج کے احکام و افعال زیادہ مذکور ہیں۔

کنکریاں پھینکنے کا طریقہ

۲۶۲۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: الْإِسْتِجْمَارُ تَوًّا وَرَمَى الْجِمَارِ تَوًّا وَالسَّعْيُ بَيْنَ الصَّفَا
 وَالْمَرْوَةِ تَوًّا وَالطَّوَّافُ تَوًّا وَإِذَا اسْتَجْمَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَجِرْ رِبْتَوًّا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۴۵/۲ الحدیث رقم (۳۱۵)۔ (۱۳۰۰)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ استجمار تَوًّا اور استجمار تَوًّا یعنی تین ڈھیلے کے ساتھ
 اور طاق عدد کنکریاں پھینکنے یعنی سات کنکریاں پھینکنے صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگائے اور خانہ کعبہ کے گرد چکر
 لگانا بھی طاق ہے یعنی سات بار چکر لگائے اور جس وقت تم میں سے کوئی دھونی لے تو اس کو چاہیے کہ طاق مرتبہ لے۔

یعنی تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ یا سات مرتبہ۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: الاستجمار تو..... والطواف تو:

”تو“ تاء کے فتح اور واو کی تشدید کے ساتھ، فرد کے معنی میں ہے۔

استنجاء میں فردیت یعنی طاق تین کے ساتھ ہے اور اس کے علاوہ سات کے ساتھ ہے۔ جمرات پر کنکریاں پھینکنا واجب ہے اسی طرح صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب ہے اور جمہور علماء کے نزدیک ایک طواف کیلئے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر فرض ہیں جبکہ حنیفہ کے ہاں چار چکر تو فرض ہیں اور باقی واجب ہیں۔

قوله: واذا استجمر احدکم: استجمار سے مراد دھونی لینا ہے۔ کیونکہ وہ بھی انگارے پر لکڑی رکھنے سے ہوتی ہے اور اس سے تکرار ختم ہو جاتا ہے اور یہ قاضی عیاض کے قول کہ دول سے مراد فعل ہے اور ثانی سے مراد پتھروں کی تعداد ہے سے بہتر ہے اور ابن حجر نے تکلف بلکہ تعسف سے کام لیا ہے کہ اس کی تقدیر یوں ہے: ”اذا استجمد احدکم وانقضى بشفع فليستجمر بتو، فليضم الي الشفع واحدة حتى يحصل فضيلة الوتر“ یعنی کہ جب تم میں سے کوئی استنجاء کرے اور محنت عدد سے صفائی کرے تو پھر طاق کی فضیلت حاصل کرنے کیلئے جفت کے ساتھ ایک اور پتھر ملائے اور پھر خوشی کا اظہار کیا کہ اس کی وجہ سے تکرار سے خلاصی ہوئی۔

الفصل الثالثی:

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے اُونٹنی پر سوار ہو کر رمی فرمائی (جمرة العقبة کی)

۲۶۲۳: وَعَنْ قُدَامَةَ ابْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمَّارٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَرْمِي الْجُمُورَةَ يَوْمَ النَّحْرِ عَلَيَّ نَاقَةَ

صَهْبَاءَ لَيْسَ ضَرْبٌ وَلَا طَرْدٌ وَلَيْسَ قَبْلَ الْيَكِّ الْيَكُّ - (رواه الشافعي والترمذي والنسائي وابن ماجه والدارمي)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۴۷/۳ الحدیث رقم ۹۰۳۔ والنسائی فی ۲۷۰/۵ الحدیث رقم ۳۰۶۲۔ وابن ماجه ۱۰۰۹/۲

الحدیث رقم ۳۰۳۵۔ والدارمی ۸۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۰۱۔ واحمد فی المسند ۴۱۲/۳۔ ۴۱۳۔

ترجمہ: قدامہ بن عبد اللہ بن عمار سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو دیکھا کہ وہ کنکریاں پھینکتے تھے قریانی کے دن جمرة العقبیٰ پر۔ صہباء اُونٹنی پر سوار ہو کر اس جگہ مارنا نہ تھا اور نہ ہانکنا اور نہ یہ کہنا کہ ایک طرف ہو جاؤ۔ اس کو امام شافعی نے نقل کیا ہے اور ترمذی اور نسائی نے ابن ماجہ اور دارمی نے۔

تشریح: ”صہباء“ جس کی رنگت کی سفید سرخی آمیز ہو یا اس طور کہ بالوں کے سرے اوپر سے سرخ اور نیچے کی طرف سفید

ہو۔ طبی کہتے ہیں: الصهباء كالشقرة۔

قوله: وليس قبل اليك اليك: ”قيل“ لام کے فتح کے ساتھ اور قاف، کہ سرہ کے ساتھ اليك اليك کی طرف مضاف ہے۔

”اليك اليك“ بمعنی تنح و تبعد، ابن حجر فرماتے ہیں کہ تکرار تاکید کیلئے ہے اور یہ اسم فعل ہے، بمعنی تنح عن الطريق پس

اس کیلئے متعلق کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ علامہ طیبی نے نقل کیا ہے اپنے اس قول سے: ضم اليك ثوبك وتنح عن الطريق۔

۲۶۲۳: وَعَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّمَا جُعِلَ رَمِي الْجِمَارِ وَالسَّعْيُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ لِإِقَامَةِ

ذِكْرِ اللَّهِ - (رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۴۷/۲ الحدیث رقم ۱۸۸۸۔ والترمذی فی ۲۴۶/۲ الحدیث رقم ۹۰۲۔ والدارمی فی ۷۱/۲

الحديث رقم ۱۸۵۳۔ واحمد في المسند ۱۳۹/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا مناہروں کا مارنا مقرر نہیں کیا گیا اور صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگانا مگر خدا کی یاد کو قائم کرنے کے لیے۔ یہ ترمذی اور دارمی اور امام ترمذی نے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ان بابرکت مواضع میں اللہ کا ذکر کیا جائے پس ان مواضع میں ذکر سے غافل رہنے سے بچنا چاہیے۔ تمام عبادات سے مقصود اللہ کے ذکر کا قیام ہے۔ پھر ان کو مخصوص اس لیے کیا کہ ظاہری طور پر یہ فعل ایسے ہیں کہ ان کا عبادت ہونا معلوم نہیں ہوتا اس لیے فرمایا کہ یہ دونوں فعل اللہ تعالیٰ کے ذکر کو قائم کرنے کیلئے مقرر ہوئے ہیں۔ بخلاف بیت اللہ کے گرد طواف اور دعاء کیلئے توقف کرنا کیونکہ ان میں عبادت کا اثر ظاہر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ رمی جمار اور صفا و مروہ کی سعی سنت قرآنی گئی ہے اللہ کے ذکر قائم کرنے کیلئے یعنی کہ تکبیر کہنا سنت ہے ہر کنکری پھینکنے کے ساتھ اور سعی میں وہ دعائیں جو ذکر ہوئیں سنت ہیں اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ رمی اور سعی میں سے ہر ایک کی ظاہری وجہ بھی ہو۔ علامہ طیبی نے حدیث ذکر کی ہے: ”ان آدم علیہ الصلاۃ والسلام رمی ابلیس بمنی فاجمر بین یدیه“

”آدم علیہ السلام نے ابلیس کو منیٰ میں پتھر سے مارا تو وہ ان کے سامنے بھاگا تو اس کا نام الجمار یہ رکھا گیا۔“

اور منقول ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کے ذبح کا ارادہ کیا تو ابلیس جبرہ اولیٰ کے پاس ان کے سامنے آیا اور ان کو پھسلانے کی کوشش کی تاکہ وہ ذبح نہ کریں تو ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں ماری یہاں تک کہ وہ جھٹس گیا۔ اس سے پہلے دن صرف جبرہ عقبہ پر اکتفاء کرنے کی حکمت ظاہر ہوتی ہے کہ رمی کرنے والے کا فعل اس پر حمل ہوگا کہ آدم علیہ السلام نے اس مقام پر رمی کی تھی اور باقی تین ایام میں ابراہیم علیہ السلام کی اتباع میں یا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اور بیوی باجبرہ کی اتباع میں رمی کرتے ہیں کہ ابلیس لعین نے مواضع ثلاثہ میں ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالے۔

اور سعی کے معقول المعنی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ام اسماعیل علیہا السلام حضرت ہاجرہ کے عمدہ کردار کا احیاء ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام جب ان دونوں کو مکہ لے کر آئے اور وہاں چھوڑ کر شام کی طرف روانہ ہونے لگے تو ہاجرہ نے ان سے کہا: ”الی من تترکنا اللہ امرک بذلک؟“ ہمیں کس کے پاس چھوڑ کر جا رہے ہو کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا جی ہاں، تو ہاجرہ نے کہا پس وہ اللہ ہمیں ضائع نہیں کریں گے۔ پھر ان کے پاس پانی ختم ہو گیا تو ہاجرہ کو پیاس کی وجہ سے اپنے بچے کے ہلاک ہونے کا خوف پیدا ہوا تو بچے کو زمزم کی جگہ چھوڑ کر پانی کی تلاش میں نکل گئی اور دیکھنے لگی کسی پانی بجانے والے کو پس صفا پر چڑھ گئی تو کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہاں سے اتر کر مروہ کی طرف دوڑی پس مروہ پر چڑھ کر بھی کچھ نظر نہیں آیا مروہ سے پھر اتری اور صفا کی طرف دوڑنے لگی اس طرح سات چکر لگائے۔ پھر بچے کے پاس گئی تو اس کے پاس پانی دیکھا جو جبریل علیہ السلام کے پر مارنے سے ظاہر ہوا تھا۔ یا اسماعیل علیہ السلام کے پاؤں مارنے سے ظاہر ہوا گیا تھا۔ پس ہاجرہ پانی کو جمع کرنا شروع ہو گئیں اور کہہ رہی تھی ”زم زم“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یرحم اللہ ام اسماعیل لو ترکتہ لصارعینا معیناً“ اللہ اسماعیل کی ماں پر رحم فرمائیں اگر وہ زم زم کو اپنے حال پر چھوڑ تو آج وہ جاری چشمہ ہوتا۔

منیٰ کی جگہ سب لوگوں کے لیے برابر ہے

۲۶۲۵: وَعَنْهَا قَالَتْ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَلَا نَبْنِي لَكَ بِنَاءً يَبْتَطِّكَ بِمَنِي قَالَ لَا مَنِي مَنَّا مِنْ سَبَقِ۔

(رواه الترمذی وابن ماجہ والدارمی)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۵۲۱/۲ الحديث رقم ۲۰۱۹۔ وابن ماجه في ۱۰۰۰/۲ الحديث رقم ۳۰۰۷۔ والدارمی

۱۰۰/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۷۔ واحمد فی المسند۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا ہم آپ ﷺ کے عمارت نہ بنا دیں کہ وہ آپ کو منیٰ میں سایہ کرے فرمایا نہیں۔ منیٰ اس شخص کے اونٹ بٹھانے کی جگہ ہے جو پہلے پہنچے۔ اس کو امام ترمذی اور ابن ماجہ اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”نبی“ متکلم کا صیغہ ہے۔ ”مناخ“ بضم المیم بمعنی موضع الإناخۃ۔

مطلب یہ ہے کہ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول ہم آپ ﷺ کیلئے کوئی ایسی عمارت نہ بنا میں جو آپ ﷺ کیلئے سایہ ہو اور وہ عمارت ہمیشہ کیلئے آپ کی ہو کیونکہ خیمے کا سایہ کمزور ہوتا ہے وہ دھوپ کو مکمل طور پر نہیں روکتا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ منیٰ میں پہنچنے کی خصوصیت سبقت کے ساتھ ہے مکان بنانا یا کوئی جگہ متعین کرنے کے ساتھ نہیں ہے یعنی منیٰ میں کسی کیلئے کوئی جگہ متعین نہیں ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے منیٰ میں تعمیر کی ممانعت کی علت یہ بیان فرمائی ہے کہ منیٰ افعال حج یعنی نحر، ری، جمار، حلق وغیرہ کی جگہ ہے جس میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں۔ اگر اس میں کوئی تعمیر کی جائے تو اس کی اقتداء میں تعمیرات زیادہ ہو جائیں گی اور لوگوں کیلئے احکام حج کی ادائیگی میں تنگی پیدا ہو جائی گی۔ اور یہی حکم سرزکوں اور بازاروں کا ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرم کی زمین وقف ہے اس کا کوئی مالک نہیں بن سکتا۔

علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے وہاں اپنے لیے اور مہاجرین کیلئے تعمیر کی اجازت اس لیے نہیں دی کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں سے آپ اللہ کیلئے ہجرت کر چکے تھے تو آپ یہ پسند نہیں کر رہے تھے کہ پھر وہاں لوٹے اور مکان بنائیں (اتھی) لیکن علامہ خطابی کی یہ تعلیل حضور ﷺ کی تعلیل کے خلاف ہے اور اس کے ساتھ منیٰ ایسی جگہ بھی نہیں ہے جہاں سے آپ ﷺ نے اور صحابہ نے ہجرت کی تھی۔

الفصل الثالث:

ابن عمر رضی اللہ عنہما کے وقوف کا ذکر

۲۶۲۶: عَنْ نَافِعٍ قَالَ إِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَقِفُ عِنْدَ الْجُمُرَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ وَقُوفاً طَوِيلًا يَكْبُرُ اللَّهُ وَيَسْبِحُهُ وَيَحْمَدُهُ وَيَدْعُو اللَّهَ وَلَا يَقِفُ عِنْدَ جَمْرَةِ الْعَقَبَةِ. (مالك الموطأ)

اخرجه مالك في الموطأ ۴۰۷/۱ الحدیث رقم ۲۱۲ من كتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت نافع سے روایت ہے کہ تحقیق ابن عمر رضی اللہ عنہما لمبا ٹھہرنے سے یعنی زیادہ دیر ٹھہرنے سے پہلے دو مناروں کے پاس ٹھہرتے اور اللہ اکبر کہتے اور سبحان اللہ کہتے اور الحمد للہ کہتے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے یعنی ہاتھ اٹھا کر اور جمرۃ العقبہ کے نزدیک نہ ٹھہرتے۔ اس کو امام مالک نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: كان يقف عند الجمرتين الاوليين وقوفاً طويلاً:

”الجمرتين الاوليين“: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ پہلے دو مناروں سے مراد عظمیٰ اور وسطیٰ ہے۔

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ صحیح اولیٰ اور وسطیٰ ہے کیونکہ آگے ”اولین“ ہے دونوں کو اولیٰ کہنا تغلیباً ہے۔ اور اولیٰ سے مراسم وہ منارہ ہے جو مسجد خیف کے قریب ہے اور باقی عظمیٰ اور کبریٰ، جمرہ عقبہ کے اوصاف میں سے ہے۔

”وقوفاً طويلاً“: مدت وقوف سورہ بقرہ جتنی دیر میں پڑھی جاتی ہے اتنی دیر ہے جیسا کہ بیہقی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل نقل کیا ہے۔

اور دعاء ہاتھ اٹھا کر کرے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ اس موقع پر دعاء میں رفع کا امام مالک کے علاوہ کوئی منکر نہیں ہے اور اتباع سنت اولیٰ ہے جیسا کہ بخاری نے روایت کیا ہے۔

قوله: ولا يقف عند جمرة العقبة: اور جمرہ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرنے سے دعاء کا بالکل ترک کرنا لازم نہیں آتا جیسا کہ عام لوگوں کا خیال ہے۔

بَابُ الْهُدَى

ہدی کا بیان

”ہدی“ ہاء کے فتح اور دال کے سکون کے ساتھ ہے۔ ان چوپایوں کو کہتے ہیں جو حرم لیجائے جاتے ہیں وہ بکری ہو یا گائے اور اونٹ ہو۔ اس کا واحد ہدیہ ہے۔ شیخین نے روایت کیا ہے آپ ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر سوانٹ بطور ہدی لے کر گئے تھے اور ایک روایت میں منقول ہے کہ عمرہ حدیبیہ میں ستر اور عمرۃ القضاء میں ساٹھ اونٹ لے کر گئے تھے۔

الفصل الاول:

ہدی کو قلا دہ پہنانا جائز ہے

۲۶۲۷: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الظُّهْرَ بِذِي الْحُلَيْفَةِ ثُمَّ دَعَا بِنَاقَتِهِ فَأَشْعَرَهَا فِي صَفْحَةِ سَنَامِهَا الْأَيْمَنِ وَسَلَّتِ الدَّمُّ عَنْهَا وَقَلَّدَهَا نَعْلَيْنِ ثُمَّ رَكِبَ رَاحِلَتَهُ فَلَمَّا اسْتَوَتْ بِهِ عَلَى الْبَيْدَاءِ أَهَلَ بِالْحَجِّ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۹۱۲/۲ الحديث رقم (۲۰۵-۱۲۴۳)۔ و ابو داؤد فى السنن ۳۶۲/۲ الحديث رقم ۱۷۵۲۔
والترمذى فى ۲۴۹/۳ الحديث رقم ۹۰۶ والنسائى فى ۱۷۰/۵ الحديث رقم ۲۷۷۴۔ والدارمى فى ۹۱/۲ الحديث رقم ۱۹۱۲۔ واحمد فى المسند ۲۱۶/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ظہر کی نماز ذی الحلیفہ میں پڑھی، پھر اونٹنی منگوائی پھر اونٹنی کو زخم کیا۔ داہنی کو بان کے کنارے میں اور خون صاف کر دیا اور گلے میں ہار ڈال دو جوتوں کا پھر اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے کہ اس کا نام قصوا تھا پس جب اونٹنی نے آپ ﷺ کو اٹھایا اور بیدار جبکہ پر پہنچی تو آپ ﷺ نے حج کے لیے لبیک کہا۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: صلى رسول الله ﷺ الظهر بذي الحليفة، ثم دعا بناقته، ثم دعا بناقته:

آپ ﷺ نے ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھی کیونکہ آپ ﷺ مسافر تھے اور احرام کی دو رکعتوں کیلئے بھی اس پر اتکفا کیا جیسا کہ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے یا یہ کہ آپ ﷺ نے احرام کیلئے الگ دو رکعت نماز پڑھی۔

قوله فاشعرها فى صفحة سنامها الايمن..... وقلدها نعلين: ”سنامها“ سین کے فتح کے ساتھ ہے۔

اشعار کہتے ہیں کہ کوهان کی ایک جانب کو زخمی کرنا اس طور پر کہ اس سے خون نکل جائے یہ اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ یہ ہدی کا

جانور ہے۔ تاکہ لوگ اس سے تعرض نہ کرے اور اگر یہ جانور راستہ بھٹک جائے تو لوگ اس کو اس کی جگہ پہنچادیں۔
یہ زمانہ جاہلیت کی عادت تھی چنانچہ شارع علیہ السلام نے بھی اس طریقے کو مذکورہ مقصد کے تحت جائز رکھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اشعار بدعت ہے کیونکہ یہ مثلہ ہے لیکن احادیث صحیحہ اس قول کو رد کرتی ہے۔ اور یہ مثلہ نہیں ہے بلکہ یہ نشتر لگانے، کھینچنے پیچھے لگوانے، ختنہ کرنے اور داغنے کی طرح ہے پس سنت طریقہ دائیں جانب میں اشعار کرنا ہے اور امام مالک فرماتے ہیں کہ بائیں جانب کرے اور یہ حدیث ان پر حجت ہے اور ایک روایت میں ”الایسر“ کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک اشعار مکروہ ہے علماء نے اس قول کی یہ تاویل کی ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کے اشعار کو مکروہ قرار دیا تھا کیونکہ اس وقت لوگ ہدی کو بہت زیادہ زخمی کر دیتے تھے جس سے زخم کے سرایت کر جانے کا خوف ہوتا تھا۔
قولہ: اهل بالحج: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ دونوں کیلئے لبیک کہا تھا۔ کیونکہ صحیحین میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حج اور عمرہ کیلئے لبیک کہتے سنا چنانچہ اس موقع پر راوی نے یلسی بالعمروہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اصل چونکہ حج ہی ہے اس لیے صرف حج پر اکتفا کیا یا یہ کہ راوی نے صرف حج کو سنا عمرہ نہیں سنا یا عمرہ کا ذکر بھول گیا تھا۔

ہدی کے گلے میں ہار ڈالنا جائز ہے

۲۶۲۸: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ أَهْدَى النَّبِيُّ ﷺ مَرَّةً إِلَى الْبَيْتِ عَنَّمَا فَكَلَدَهَا۔ (متفق علیہ)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۵۸/۲ الحدیث رقم (۳۶۷-۱۳۲۱)۔ وابن ماجہ فی السنن ۱۰۳۴/۲ الحدیث رقم ۳۰۹۶۔ واحمد فی المسند ۴۲/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی بھیجی ایک مرتبہ خانہ کعبہ کی طرف بکریاں پھر ان کے گلے میں ہار ڈالا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طبری کہتے ہیں کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ بکریوں میں اشعار کرنا مشروع نہیں ہے البتہ ان کے گلے میں ہار ڈالنا سنت ہے لیکن اس بارے میں امام مالک کا اختلافی قول ہے اور امام شافعی کے نزدیک گائے میں اشعار ہے۔

ہدی دینے کا جواز

۲۶۲۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ ذَبَحَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ عَائِشَةَ بَقْرَةً يَوْمَ النَّحْرِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۵۶/۲ الحدیث رقم (۳۵۶-۱۳۱۹)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ایک گائے قربانی کے دن ذبح کی۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ایک روایت میں: ”وضعیٰ من نساہہ بالبقرۃ“ ہے یعنی پاشت کے وقت ذبح کیا۔

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور تمام بیویوں کی طرف سے قربانی کی جیسا کہ آنے والی روایت میں ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ صرف حضرت عائشہ کی طرف سے ایک گائے ذبح کی ہو اور ایک گائے باقی ازواج کی طرف سے، حضرت عائشہ کا امتیاز ظاہر کرنے کیلئے۔

شاید گائے کو ترجیح اس لیے دی کہ فی الوقت میسر ہی یہ تھی ورنہ افضل اونٹ کی قربانی ہے یہ بات ابن حجر نے ذکر کی ہے اور زیادہ

ظاہر یہ ہے کہ یا تو یہ بیان جواز کیلئے کیا ہے اور یا بڑے اور چھوٹے کے درمیان فرق کیلئے۔

۲۲۳۰: وَعَنْهُ قَالَ نَحَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ نِسَائِهِ بَقْرَةً فِي حَجَّتِهِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۹۵۶/۲ الحدیث رقم (۳۵۷-۱۳۱۹)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے ایک گائے ذبح کی اپنے حجۃ الوداع میں اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج کی اجازت سے قربانی کی ہوگی کیونکہ دوسرے کی طرف سے قربانی اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نقلی قربانی ہو جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنی امت کی طرف سے قربانی کی تھی اور حدیث اس بات پر دلالت نہیں کر رہی ہے کہ یہ واجب قربانی تھی۔ علاوہ ازیں حاجی پر قربانی واجب بھی نہیں ہے خاص کر کے مسافر پر ہمارے نزدیک۔

بدنہ کو ہار پہنانا جائز ہے

۲۲۳۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ فَلَا يَدُّ بَدَنِ النَّبِيِّ ﷺ بِيَدِي نَمْ فَلَدَهَا وَأَشَعَرَهَا وَأَهْدَاهَا فَمَا حَرَّمَ عَلَيْهِ شَيْءٌ كَانَ أَحِلَّ لَهُ۔ (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۵۴۲/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۹۶۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۵۹/۲ الحدیث رقم (۳۶۹)۔

(۱۳۲۱)۔ والنسائی ۱۷۵/۵ الحدیث رقم ۲۷۹۳۔ ومانک فی الموطأ ۳۴۰/۱ الحدیث رقم ۵۱ من کتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے ہار بے نبی کریم ﷺ کے اونٹوں کے اور اپنے ہاتھ ان کے گلے میں ڈالے اور ان کو زخمی کیا یعنی ان کے کوہانوں کو داغا اور ان کو ہدی بنا کر خانہ کعبہ کی طرف بھیجا۔ یعنی جب نویں سال حج فرض ہوا۔ تو حضور ﷺ نے ابو بکر صدیق کو حاجیوں کا امیر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ ہدی کے اونٹ بھیجے۔ پس حضور ﷺ پر کوئی چیز حرام نہ ہوئی۔ جو چیز کہ حلال کی گئی تھی۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”القلائد“ قلادہ کی جمع ہے اس چیز کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔

”البدن“ بدنہ کی جمع ہے اس گائے یا اونٹ کو کہتے ہیں جسے مکہ میں ذبح کیا جائے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لوگ اس اونٹ کو خوب فریبہ کرتے تھے۔ ”حرم“ حاء کے فتح اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

حضرت عائشہ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ ان تک ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ فتویٰ پہنچ گیا تھا کہ وہ کہتے ہیں جو شخص خود حج کو نہ جائے اور اپنی طرف سے ہدی مکہ بھیجے تو اس پر وہ تمام چیزیں جو کہ محرم پر حرام ہوتی ہے اس وقت تک کیلئے حرام ہے جب تک کہ اس کی ہدی حرم میں پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔ تو حضرت عائشہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کی تردید میں یہ بات کی جیسا کہ ہمارے بعض علماء نے اس کو ذکر کیا ہے اور اسی طرح یہ رد ہے ابن عمر، عطاء، مجاہد اور سعید بن جبیر کے قول کا بھی۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں چونکہ ہدی بھیجنے والا محرم نہیں بنا لہذا اس وجہ سے اس پر کوئی چیز بھی حرام نہ ہوگی۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ مخطورات احرام سے اجتناب کیا کرتے تھے اور خطابی کا اس کی نسبت اصحاب رائے کی طرف کرنا غلط ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صحاح ستہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث منقول ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے اونٹ جو ہمارے پاس تھی اپنے ہاتھ سے ان اونٹوں کیلئے پٹے بنائے جو اونٹ آپ ﷺ نے مکہ بھیجے اور پھر آپ ہمارے پاس حلال ہو کر رہے وہ

فعل کرتے جو ایک مرد اپنی گھروالی سے کرتا ہے اور صحیحین کی روایت میں ہے کہ مسروق حضرت عائشہ کے پاس آئے اور ان سے کہا اے ام المؤمنین ایک آدمی کعبہ ہدی بھیجتا ہے اور خود اپنے شہر میں بیٹھ کر یہ وصیت کر لیتا ہے کہ اس کے ہدی کے گلے میں پٹہ ڈال دیا جائے اور پھر وہ برابر احرام کی حالت میں رہتا ہے یہاں تک کہ لوگ احرام سے نکل جائیں؟ مروق کہتے ہیں کہ میں نے پردے کے پیچھے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی آواز سنی پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہدی کیلئے پٹے بنائے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو کعبہ کی طرف بھیجا اور اس پر کوئی چیز حرام نہ ہوتی جو ایک مرد کیلئے اپنے گھروالی سے حلال ہوتا ہے یہاں تک کہ لوگ لوٹ آئے۔ (آئنی)

اور صحیحین میں ہے: ”عن ابن عباس من اهدى هديا حرم عليه ما يحرم على الحاج فقالت عائشة اليس كما قال انا فقلت قلنا هدى رسول الله ﷺ بيدي ثم قلدها ثم بعث بها مع ابي، فلم يحرم عليه ﷺ شيء احله الله له حتى نحر الهدى“۔ پس یہ دونوں حدیث عبد الرحمن بن عطاء کی حدیث کے صراحتہ خلاف ہیں۔ چنانچہ اس کے بطلان کا حکم لازمی ہے (آئنی) حدیث عبد الرحمن سے مراد ان کی وہ حدیث ہے جو انہوں نے پہلے ذکر کی ہے، فرمایا: ”عن سعيد بن جبیر، انه رأى رجلا قلده فقال: اما هذا فقد احرم“ کہ سعید ابن جبیر نے ایک شخص کو دیکھا کہ ہدی کو قلاہہ ڈالا ہوا ہے تو سعید نے کہا کہ یہ محرم بن گیا ہے۔ اور عبد الرزاق نے اس کے ہم معنی مرفوع روایت ذکر کی ہے:

جاہر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرماتے کہ اچانک اپنی قمیص پھاڑوں اور وہاں سے نکل گئے۔ جب آپ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج کے دن کا میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ہدی کو قلاہہ ڈالیں اور میں بھول گیا ہوں۔ (آئنی)

پھر (ابن ہمام) آگے فرماتے ہیں کہ حاصل یہ ہے کہ یہ ثابت ہے کہ صرف ہدی کے گلے میں قلاہہ ڈال کر بھیجنے سے آدمی حالت احرام میں نہیں ہو جاتا جب تک کہ خود اس کے ساتھ نہ جائے، اور جن آثار میں مطلق اثبات احرام کا ذکر ہے تو وہ ہم نے محمول کیے ہیں ہدی کے ساتھ جانے پر تا کہ روایات میں تطبیق پیدا ہو جائے۔

۲۶۳۲: وَعَنْهَا قَالَتْ قُلْتُ فَلَا يَدْهَاهَا مِنْ عَهْنٍ كَانَ عِنْدِي ثُمَّ بَعَثَ بِهَا مَعَ أَبِي۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۴۵۱۳۔ الحدیث رقم ۱۷۰۰۔ و مسلم ۹۵۹۱۲ الحدیث رقم (۳۶۹-۱۳۲۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے میں نے اونٹوں کے ہار بٹے اس اون سے جو کہ میرے پاس تھا۔ پھر اونٹوں کو ہدی کر کے میرے باپ کے ساتھ بھیجا۔ یعنی حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یہ واقعہ اس سال کا ہے جس سال حضرت ابو بکر صدیق امیر ج بنا کر بھیجے گئے تھے۔

ہدی پر سوار ہونا مطلقاً ممنوع نہیں ہے

۲۶۳۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَأَى رَجُلًا يَسُوقُ بُدْنَةً فَقَالَ ارْكَبْهَا فَقَالَ إِنَّهَا بُدْنَةٌ قَالَ

ارْكَبْهَا فَقَالَ إِنَّهَا بُدْنَةٌ قَالَ ارْكَبْهَا وَيَلْكَ فِي الثَّانِيَةِ أَوْ الثَّلَاثَةِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۳۶۱۳۔ الحدیث رقم ۱۶۸۹۔ و مسلم فی ۹۶۰۱۲ الحدیث رقم (۳۷۱-۱۳۲۲)۔

وابوداؤد فی السنن ۳۶۷/۲ الحدیث رقم ۱۷۶۰ والترمذی فی ۲۵۴/۳ الحدیث رقم ۹۱۱۔ والنسائی فی ۱۷۶/۵ الحدیث رقم ۲۷۹۹۔ ومالک فی الموطأ ۳۷۷/۱ الحدیث رقم ۱۳۹ من کتاب الحج واحمد فی المسند ۵۰۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اونٹ ہانکتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ تحقیق یہ ہدی ہے یعنی میں کیونکر اس پر سوار ہوں وہ یہ سمجھا کہ مطلقاً ہدی پر سوار ہونا درست نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوار ہو جاؤ اس نے کہا کہ یہ ہدی ہے فرمایا سوار ہو جاؤ میں تجھ کو کہتا ہوں اور پھر تو عذر کرتا ہے یہ بات دوسری مرتبہ فرمائی یا تیسری مرتبہ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: "فی الغایۃ": قال کے متعلق ہے۔

ہدی پر سوار ہونے کا مسئلہ

۲۶۳۳: وَعَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ سَيْلَ عَنْ رُكُوبِ الْهُدْيِ فَقَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ ارْكَبْهَا بِالْمَعْرُوفِ إِذَا الْجَنَّتْ إِلَيْهَا حَتَّى تَجِدَ ظَهْرًا۔ (رواه مسلم)

احرجہ مسلم فی صحیحہ ۹۶۱/۲ الحدیث رقم (۳۷۵۔ ۱۳۲۴)۔ وابدوداؤد فی السنن ۳۶۱/۲ الحدیث رقم ۱۷۶۱ والنسائی ۱۷۷/۵ الحدیث رقم ۲۸۰۲۔

ترجمہ: حضرت ابی زبیر سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا جبکہ ان سے ہدی پر سوار ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اس پر اچھی طرح سوار ہو یعنی اس طرح سوار ہو کہ ضرر نہ پہنچے اس کو جس وقت تو مضطر ہو اس کی طرف یہاں تک کہ دوسری سواری نہ ملے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

ابو الزبیر۔ یہ ابو زبیر ان کا نام "محمد بن مسلم" ہے مکہ کے رہنے والے ہیں۔ حکیم بن حزام کے آزاد کردہ ہیں طبقہ ثانیہ میں سے ہیں مکہ کے تابعین میں سے جابر بن عبد اللہ سے انہوں نے حدیث کو سنا ہے اور ان سے بہت لوگوں نے حدیث کا سماع کیا ہے۔ ۱۲۵ھ میں وفات پائی۔

تشریح: ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اونٹ ہانکتا ہوا جا رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس اونٹ پر سوار ہو جاؤ اس نے کہا کہ یہ تو ہدی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ اس پر سوار ہو جاؤ۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ سوار ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا۔

ابن عطار شرح عمدہ میں فرماتے ہیں کہ اس مبہم شخص کا نام معلوم نہ ہو۔ گا، اور ہدی پر سوار ہونے کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں۔ چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہدی پر سوار ہونا واجب ہے حدیث مذکور میں امر مطلق کی وجہ سے اور اس کے ساتھ اس میں زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی مخالفت بھی ہے کہ وہ سائبہ، وسیلہ اور ہام پر سوار ہونے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن اس قول کی تردید کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی اپنی ہدی پر سوار نہیں ہوئے اور نہ ہی لوگوں کو ہدی پر سوار ہونے کا حکم دیا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس پر مطلقاً سوار ہونا جائز ہے بغیر ضرورت کے۔ کیونکہ حدیث مذکور مطلق ہے۔ لیکن حنفیہ اور امام شافعی کے

نزدیک اگر ضرورت و مجبوری ہو تو سوار ہوا جا سکتا ہے ورنہ نہیں حدیث مذکور کو اس پر حمل کرتے ہوئے کہ وہ شخص مجبور تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعہ حال تھا پس اس میں ضرورت اور مجبوری کا بھی احتمال ہے اور عدم ضرورت کا بھی احتمال ہے۔

پس دونوں احتمالات میں سے جس پر کوئی دلیل پائی جائیگی تو اس پر روایت کو حمل کیا جائے گا۔ اور عقلی دلیل اس پر پائی جاتی ہے کہ یہ بامر مجبوری تھا اور وہ اس طرح کی ہدی مکمل طور پر اللہ کیلئے ہے۔ پس اس کو اپنی ذاتی منفعت کیلئے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ پھر ہم نے ضرورت کی شرط حدیث میں بھی پائی اور وہ صحیح مسلم میں ابو زبیر کی روایت ہے۔ (یعنی مشکوٰۃ کی یہ روایت جس کی تشریح کی جا رہی ہے از راقم)

پس عقل مطلقاً سوار ہونے کو منع کرتا ہے اور نقل نے بامر مجبوری اجازت دی ہے اور مجبوری کے علاوہ صورت میں منع ہی رہے گی جو کہ عقل کا تقاضا ہے نہ کہ مفہوم شرط کا۔ حاکم نے کافی میں لکھا ہے کہ اگر ضرورت کے دقت ہدی پر سوار ہو جائے یا اس پر سامان لاد لے تو اگر اس کی وجہ سے اس میں کوئی نقصان آجائے تو اس کا ضامن ہوگا۔

علامہ طیبی کا یہ قول کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص ہدی پر سوار ہو جائے تو یہ اس کیلئے جائز ہے اور اس میں ہدی کیلئے کوئی ضرر نہیں ہے اور اس طرح اس پر سامان لادنا بھی جائز ہے اور یہی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک بغیر ضرورت کے جائز نہیں ہے۔ یہ دو وجہوں سے باطل ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ روایت ہی میں قید ضرورت موجود ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ امام شافعی کے تصریح کے خلاف ہے وہ فرماتے ہیں ضرورت کی قید ضروری ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں ذکر کیا ہے۔

قریب المرگ ہدی کا مسئلہ

۲۶۳۵: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سِتَّةَ عَشَرَ بَدْنَةً مَعَ رَجُلٍ وَامْرَأَةٍ فِيهَا فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ أَصْنَعُ بِمَا أَبْدِعُ عَلَيَّ مِنْهَا قَالَ أَنْحَرَهَا ثُمَّ أَصْبَغُ نَعْلَيْهَا فِي دِمِهَا ثُمَّ أَجْعَلُهَا عَلَى صَفْحَتَيْهَا وَلَا تَأْكُلُ مِنْهَا أَنْتَ وَلَا أَحَدٌ مِنْ أَهْلِ رُقَيْتِكَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۶۲/۲ الحدیث رقم (۳۷۷-۱۳۲۵)۔ و ابو دناؤد فی السنن ۳۶۸/۲ الحدیث رقم ۱۷۶۳۔
واحمد فی المسند ۲۱۷/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص (ناجیہ سلمی) کے ساتھ سولہ اونٹ (بطور ہدی کے) بھیجے۔ یعنی وہ نگہبانی کرتا ہوا لے جائے اور مکہ پہنچ کر ذبح کرے۔ پس اس نے کہا اے اللہ کے رسول! کہ میں اس اونٹ کو کیا کروں جو ان میں سے تھکاؤٹ کی وجہ سے یا دبلا پن کی وجہ سے قریب المرگ ہو کر چل نہ سکے۔ فرمایا اس کو ذبح کرو اور اس کی دونوں پاؤں پائین کو اس کے خوز میں رنگ دو۔ یعنی وہ جوتیاں جو بطور ہار کے گلے میں ڈالی تھیں پر پھر تو ان پاؤں کو اس کے کوبان کے کناروں پر رکھ دے اور تو اور تیرے دوست اس میں سے نہ کھائیں۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: بعث رسول الله ﷺ ستة عشر بدنة مع رجل وامره فيها:

”ستہ عشر بدنة“: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مصابح کے نسخوں میں ”ست عشرہ“ ہے، اور دونوں صحیح ہیں کیونکہ ”بدنة“ کا

اطلاق مذکور اونٹ دونوں پر ہوتا ہے۔

”امر“: میم کی تشدید کے ساتھ یعنی اس کو امیر بنایا۔

قوله : كيف اصنع بما ابدع علي منها؟

”ابدع“ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ عرب کہتے ہیں ”ابدعت الراحلة“ جب سواری تھک جائے۔ اور کہا جاتا ہے ابداع بالرجل صیغہ مجہول کے ساتھ جب اس کی سواری تھکے اور کمزوری کی وجہ سے منقطع ہو جائے اور چل نہ سکے اسی وجہ سے ابداع بی نہیں کہا کیونکہ وہ اس پر سوار نہیں تھا۔ بلکہ وہ اس اونٹ کو ہانک رہا تھا۔ بلکہ ابداع علی کہا جو کہ جس کے معنی کو مضمّن ہے۔

علامہ طیبیؒ کہے ابداع، لمطب کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے ابداع ابلدجل ای انقطع به ووقفت دابة عن السير۔

قوله قال: انحرها ثم اصبع نعلها في دمها: ”اصبع“ باء موحده پر تینوں حرکتیں درست ہے۔ ”اغمس“ کے معنی میں ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں اس حدیث کے یہ الفاظ ہیں: كان ﷺ يبعث مع ابى قبيصة بالبدن معه ثم يقول، ان عطب منها شئ فخشيت عليه موتا فانحرها ثم اغمس نعلها في دمها، ثم اضربه صفحتها ولا تطعمها انت ولا احد من رفقتك۔

قوله : ولا تاكل انت ولا احد من رفقتك :

”اهل رفقتك“ : اہل زائد ہے اور اضافت بیان ہے۔ ”رفقتك“ راء کے ضمہ اور فاء کے سکون کے ساتھ ہے۔

جو تینوں کو خون میں رنگ کراونٹ کے کوہان پر نشان لگانے کیلئے اس لیے فرمایا تاکہ اغنیاء اس کے گوشت کھانے سے اجتناب کرے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آخر میں آپ ﷺ نے اس کی ہدایت فرمادی کہ اس کا گوشت نہ تم خود کھانا اور نہ اپنے رفقاء سفر کو کھانے دینا خواہ فقراء و مساکین ہوں یا اغنیاء ان کو گوشت کھانے سے منع اس لیے کیا کہ کہیں یہ لوگ اپنی ماندگی کا بہانہ کر کے اپنے کھانے کیلئے کوئی اونٹ ذبح نہ کر ڈالیں۔ یہ مسئلہ اس وقت ہے جب اس نے ہدی اپنے اوپر واجب کی ہو اور اگر ہدی نقلی ہو تو اس کو ذبح کر کے اس سے کھانا جائز ہے کیونکہ محض گلے میں ہاڑ ڈال لینے سے جانور ملکیت سے نہیں نکلتا۔

یہاں ایک بات محل اشکال ہے کہ ایسی صورت میں کہ گوشت کھانے سے خود محافظ کو بھی منع کیا جا رہا ہے اور اس کے رفقاء کو بھی تو پھر اس گوشت کا مصرف کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ وہ گوشت ضائع ہی ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں وہ اونٹ ذبح ہوگا وہاں آس پاس کے رہنے والے اسے اپنے استعمال میں لے آئیں گے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اصحاب سنن اربعہ نے ناجیہ خزاعی کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ہمراہ ہدی روانہ کی اور فرمایا کہ اگر یہ ہلاک ہو جائے تو اس کو ذبح کر کے اس کے ہار کے جوتے اس کے خون میں رنگ کر اس کو لوگوں کیلئے چھوڑ دے ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔ اس میں ”لا تاكل انت ولا رفقتك“ نہیں ہے۔

واقدی نے خزوہ حدیبیہ کے شروع میں یہ واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہدی پر ناجیہ بن جندب اسلمی کو محافظ بنایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ ان کو پہلے لے کر چلے۔ واقدی کہتے ہیں کہ وہ ستر اونٹ تھے۔ اس قصہ میں آگے ہے کہ ناجیہ بن جندب کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک اونٹ قریب المرگ ہو گیا تو میں ابواء مقام میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور ان کو خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کو ذبح کر دے اور اس کے ہار کو اس کے خون میں رنگ دے، اس کا گوشت نہ آپ کھائیں اور نہ آپ کے رفقاء کھائیں، اور لوگوں کیلئے چھوڑ دیں۔

مسلم اور ابن ماجہ نے ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے کہ ذویب خزاعی ابو قبیسہ نے ان کو بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے ہمراہ اونٹ روانہ کرتے اور پھر فرماتے کہ اگر ان میں سے کسی چیز کے مرنے کا خطرہ ہو تو اس کو ذبح کریں پھر اس کے جوتے اس کے خون

میں رنگ کر اس کے کوہان پر نشان لگا دے اور نہ تم خود اور نہ تیرے رفقاء میں سے کوئی اس سے کھائے۔ لیکن قتادہ کی سنان سے لقاء ثابت نہیں ہے اور حدیث مسلم اور ابن ماجہ دونوں میں معتصن ہے مگر مسلم نے اس کیلئے شاہد ذکر کیا ہے اور ذویب کا نام مسلم نے نہیں ذکر کیا ہے۔ بلکہ کہا ہے 'ان رجلاً حدثہ' 'ناجیہ اور دوسروں کو کھانے سے منع اس لیے کیا تھا کہ وہ اغنیاء تھے۔

شارح کفر فرماتے ہیں کہ حدیث ناجیہ میں مدعی پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ نے ان کو اس اونٹ کے گوشت کھانے سے منع فرمایا تھا جو راستے میں مرجائے اور کلام اس کے بارے میں ہے جو حرم پہنچ جائے کیا اس کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ (اٹھی)۔ اور ہم نے اس حدیث سے ثابت کیا ہے کہ اگر ہدیٰ نظلی راستے میں مرجائے تو اس سے کھانا ممنوع ہے اور جب محل تک پہنچ جائے تو اس سے کھانا جائز بلکہ مستحب ہے (اٹھی)۔

شمنی کہتے ہیں کہ جو ہدیٰ ہلاک ہو جائے یا اس میں عیب فاحش پیدا ہو جائے، عیب فاحش وہ ہوتا ہے جو قربانی کے جواز کیلئے مانع ہو جیسے ٹٹ کا کان کاٹ جانا آکھ کا ضائع ہونا تو اگر یہ ہدیٰ واجب ہے تو اس کو تبدیل کرے گا۔ کیونکہ یہ اس کے ذمہ لازم ہے اور یہ عیب دار سے ادا نہیں ہوتا۔ اور یہ عیب دار جانور اس کا ہو جائے گا۔ کیونکہ اس جہت کیلئے صرف تعین سے وہ جانور اس کی ملکیت سے نہیں نکلتا اور اب اس کا ہدیٰ کے طور پر صرف کرنا ممنوع ہوا تو اب اس کیلئے جائز ہے کہ اس کو سمجھیں اور صرف کر دے۔ اور اگر وہ ہدیٰ تطوع ہے تو اس کو ذبح کر کے اس پر جوتے سے خون کا نشان لگائے اور اس کا فائدہ لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ یہ ہدیٰ ہے تاکہ فقراء اس سے کھائیں اور اغنیاء اجتناب کریں۔

۲۶۳۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَحَرْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَامَ الْحُدَيْبِيَّةِ الْبَدْنَةَ عَنْ سَبْعَةِ وَالْبَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةِ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۵۵/۲ الحديث رقم (۳۵۰ - ۱۳۱۸)۔ وابوداؤد في السنن ۲۳۹/۳ الحديث رقم ۲۸۰۹۔
والترمذی فی السنن ۲۴۸/۳ الحديث رقم ۹۰۴ وابن ماجہ ۱۰۴۷/۲ الحديث رقم ۳۱۳۲۔ و مالک فی الموطأ ۴۸۶/۴
الحديث رقم ۹ من كتاب الضحايا۔ واحمد فی المسند ۲۹۳/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ ہم نے نحر کیا نبی کریم ﷺ کے ساتھ حدیبیہ کے سال۔ اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے اور گائے سات کی طرف سے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔
تشریح: "الحدیبیہ" صحیح قول کے مطابق باء کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ گائے پر بدنہ کا اطلاق نہیں ہوتا اور غالب استعمال یہی ہے۔ قاموس میں ہے البدنة محرکة من الابل والبقر، کالاضحية من الغنم تهدي الى مكة (شر فيها الله) للذکر والانثی۔
اور نھایہ میں ہے کہ بدنہ اہل کا واحد ہے۔ اور اونٹ کو بدنہ کہنے کی وجہ اس کی عظیم جسامت اور غربہ ہونا ہے اور اس کا اطلاق اونٹ اور اونٹنی دونوں پر ہوتا ہے اور کبھی اس کا اطلاق گائے پر بھی ہوتا ہے (اٹھی)۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ بدنہ کا اطلاق لغتاً اونٹ گائے، بکری پر ہوتا ہے تو یہ کتب لغت کا مخالف ہے۔

اس حدیث میں ہمارے مذہب کی دلیل ہے کہ اونٹ اور گائے میں سات آدمیوں کا شریک ہونا جائز ہے جبکہ ان ساتوں کو قربت یعنی ثواب مقصود ہو قربت خواہ ایک طرح کی ہو جیسا کہ سب کی نیت قربانی یا ہدیٰ کی نیت سے شریک ہوں اور بعض قربانی کے۔ اور امام شافعی کے نزدیک اس طرح بھی شرکت جائز ہے کہ بعض تو قربت کی نیت سے شریک ہوں اور بعض محض گوشت کی نیت سے اور امام مالک

کے نزدیک واجب قربانی یا ہدی میں مطلقاً شرکت جائز نہیں ہے۔ بکری و بھیر میں متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

نحر کرنے کا طریقہ

۲۶۳۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ آتَى عَلِيَّ رَجُلًا قَدْ آتَاخَ بَدْنَتَهُ يَنْحَرُهَا قَالَ ابْنُهَا قِيَامًا مَّقِيدَةً سَنَةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۴۶۱/۳ الحدیث رقم ۱۷۱۳۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۵۶۱/۲ الحدیث رقم (۳۵۸)۔
۱۳۲۰)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۷۱/۲ الحدیث رقم ۱۷۶۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ ایک شخص کے پاس آئے، جس نے اپنا اونٹ بٹھایا تھا اس حال میں کہ نحر کرتا تھا۔ اس کو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا۔ تم اس کو کھڑا کرو اور پاؤں باندھو۔ یعنی پاپایا پاؤں (محمد ﷺ) کے طریقے کو پڑے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ینحرھا: یہ جملہ حالیہ ہے۔ قولہ: قال ابنعنا قیامامقیدہ سنة محمد ﷺ:

”قیاماً“ حال مؤکدہ ہے اور تقریر قائمہ ہے اور اس کا عامل محذوف ہے اول کلام اس پر دلالت کر رہا ہے یعنی انحرھا قائمہ اس سے درایت درست ہو جاتی ہے نہ کہ ابنعنا ہے کیونکہ بعث قبل القیام ہوتا ہے۔

ہاں اگر اس کو حال مقدرہ بنایا جائے جیسے اللہ کے اس قول میں ہے ﴿فبشرناہ باسحق نبیاً﴾ یعنی ابنعنا مقدر ا قیامہا اور اس کو منسوب بناء بر مصدریت ماننا جائز نہیں ہے ابنعنا کیلئے۔ کیونکہ دونوں میں معنی تقارب ہے تو پھر گویا کہ اس طرح کہا ہوگا ”اقمھا قیاماً“ تو کلام مقصود سے خالی ہو جائے گا اور وہ مقصود نحر کو مقید بالقیام کرنا ہے۔

”مقیدہ“ حال ثانیہ ہے یا قائمہ کیلئے صفت ہے۔

”سنة“ منسوب ہے بنا پر مفولیت کے تقدیریوں ہوگی فاعلاً بها سنة محمد یا صبت سنة محمد۔

متبداء محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھنا بھی درست ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ اونٹ کو نحر کیا جائے اس کو کھڑا کر کے اور اس کی بائیں ٹانگ باندھی جائے (اور پھر اس کے سینے میں برچھی ماری جائے) گائے اور بکری کو دائیں پہلو پر لٹا کر اور ٹانگیں کھلی چھوڑ کر ذبح کیا جائے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے حضرت جابر کی روایت نقل کی ہے کہ نبی ﷺ اور ان کے صحابہ اونٹ کا نحر اس طرح کرتے تھے کہ اس کی بائیں ٹانگ باندھی جاتی تھی اور باقی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا تھا۔ پھر ابن ہمام فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے نحر قیام کی حالت میں اس آیت: ﴿فَاذْجِبْتِ جَنُوبَهَا﴾ [الحج: ۳۶] کے ظاہر پر عمل کرنے کی وجہ سے کیا کیونکہ وجوب کا معنی سقوط کے ہے اور اس کا تحقق کھڑے ہونے کی حالت میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اللہ کے ارشاد: ﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ﴾ [الحج: ۳۶] سے استدلال کرنا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ صواف کی تفسیر حضرت ابن عباس نے تین پاؤں کے کھڑے ہونے سے کی ہے اور یہ ایک پاؤں کے باندھنے سے ہوتا ہے اور بہتر یہ ہے کہ وہ بائیں ہو کہ اس میں اتباع حدیث ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے اونٹ کو نحر کیا کھڑے ہونے کی حالت میں تو وہ بدک گیا اور قریب تھا کہ کچھ لوگوں کو ہلاک کر دیتا پس میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں اونٹ کو ٹانگ باندھ کر بٹھا کر نحر کروں گا۔ حاصل یہ ہے کہ اونٹ کو کھڑا کر کے نحر کرنا افضل ہے اور اگر کھڑا نہ کیا جا سکے تو پھر بٹھا کر نحر کرنا افضل ہے۔

ہاں! اونٹ کو ذبح کرنا خلافِ اولیٰ ہے اگر امام مالک سے یہ قول صحیح ثابت ہے، جو ان سے نقل کیا گیا ہے کہ اونٹوں کو ذبح کرنا حلال نہیں ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ امام مالک سے ثابت نہیں ہے ابن منذر فرماتے ہیں کہ میں ایسا کوئی نہیں جانتا جس نے اس کو حرام کہا ہو بلکہ امام مالک نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور جو شوافع کے بعض کتب میں مذکور ہے کہ گائے اور بکری کا نحر بالا جماع حرام ہے۔ تو وہ غلط ہے اور صحیح وہ ہے جو عبدی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ بالا جماع جائز ہے۔

گوشت، جھول وغیرہ اور چمڑہ کو صدقہ کرنا چاہے

۲۶۳۸: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ أَمَرَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ أَقُومَ عَلَىٰ بَدَنِهِ وَأَنْ أَتَصَدَّقَ بِلَحْمِهَا وَجُلُودِهَا وَأَجْلَتِهَا وَأَنْ لَا أُعْطِيَ الْجَزَارَ مِنْهَا قَالَ نَحْنُ نَعْطِيهِ مِنْ عِنْدَانَا۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۵۶/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۱۶۔ واخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۵۴/۲ الحدیث رقم (۳۴۸)۔
۱۳۱۷)۔ وابدوؤد فی السنن ۳۷۱/۲ الحدیث رقم ۱۷۶۹ والدارمی ۱۰۱/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۰۔ وابن ماجہ
۱۰۳۵/۲ الحدیث رقم ۳۰۹۹۔

ترجمہ: حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ فرمایا مجھے نبی کریم ﷺ نے کہ میں خبر گیری کروں ان کے اونٹوں کی اور یہ کہ ان کے گوشت کو صدقہ کروں پوست (چمڑہ) اور جھولیں اور ان میں سے کہ قصاب کو نہ دوں یعنی انکی مزدوری ان میں سے نہ دوں فرمایا حضور ﷺ نے ہم اس کو مزدوری اپنے پاس سے دیں گے۔ اس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔
تشریح: ”بدنہ“ باء کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ بدینہ کی جمع ہے۔

”واجلتها“ جیم کے کسرہ اور لام کی تشدید کے ساتھ جلال کی جمع ہے اور جلال، جل کی جمع ہے جانوروں کے جھولے کو کہتے ہیں۔ اونٹوں سے مراد وہ اونٹ ہیں جو آنحضرت ﷺ جیمہ الوداع میں بطور ہدیٰ بکھ لے کر گئے تھے اور ان کی تعداد سو تھی۔ اس کی تفصیل پہلے گزری ہے اور اس حدیث سے نحر میں نیابت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ترمذی کے علاوہ اصحاب کتب صحاح نے یہ حدیث روایت کی ہے: ”امرني رسول الله ﷺ ان اقوم على بدنہ واقسم جلودها، وجلالها وامرني ان لا اعطى الجزار منها، وقال نحن نعطيها من عندنا“ اور بعض الفاظ میں ”ان اتصدق بجلودها وجلالها“ ہے اور بخاری کی روایت میں نحن نعطيها من عندنا نہیں ہے۔ بخاری کے الفاظ میں یہ ہے ”وامرہ انقسم بدنہ کلها لحومها وجلالها وجلودها في المسكين ولا يعطى في جزارتها منها شيتا“۔
”جزارتها“ سر قسطنی فرماتے ہیں کہ یہ جیم کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے۔ اتھ ہے۔ پس کسرہ کے ساتھ مصدر ہے اور ضمہ کے ساتھ نام ہے اگلے اور پچھلے ٹانگوں کا اور گردن کا۔ قہ کی ان کو اجرت میں لیتے تھے۔

ابن منذر نے ابن عمرؓ اور اسحق سے کایت کیا ہے کہ ہدیٰ کی کھال کو نروخت کر کے اس کے ثمن کو صدقہ کرنا جائز ہے۔ اور قصائی کو احسانا کھال دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بالاتفاق۔

قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنا جائز ہے

۲۶۳۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا لَا نَأْكُلُ مِنْ لَحْمِ بَدَنِنَا فَوْقَ ثَلَاثٍ فَرَحَّصَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ كُلُوا وَتَزَوَّدُوا فَآكَلْنَا وَتَزَوَّدْنَا۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۵۷/۳ الحدیث رقم ۱۷۱۹۔ و مسلم فی ۵۶۲/۳ الحدیث رقم (۳۰۔ ۱۹۷۲)۔ واحمد فی المسند ۳۸۸/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں ہم قربانی کا گوشت نہیں کھاتے تھے تین دن سے زیادہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت دے دی پس فرمایا کھاؤ اور توشہ کر رکھو یعنی تین دن کے بعد بھی پس ہم نے کھایا اور توشہ کیا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہدی اور قربانی کے گوشت تین دن سے زیادہ کھانے سے منع فرمایا تھا اور بعد میں اس کی اجازت دی۔ فرمایا کھاؤ اور مستقبل کیلئے توشہ بناؤ۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اگر دم واجب ہو جیسے دم تمتع، دم قران، دم افساد، شکار کے بدلے میں دم تو مالک کیلئے بعض اہل علم کے نزدیک اس سے کھانا جائز نہیں ہے اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے اور شنی میں ہے کہ مالک کو نفل، تمتع اور قران کی ہدی اور قربانی سے کھانا مستحب ہے فقط۔ کیونکہ حدیث جابر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اونٹ سے گوشت کے ایک ٹکڑے کا حکم دیا پس وہ ہانڈی میں ڈال دیا گیا تو ان کے گوشت کو دونوں نے کھایا اور شور بہ پیا۔ ان کے علاوہ دوسرے قسم کے ہدی کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ کفارات و جنایات کی ہوگی۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ راجح قول کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے اور سو کے سوا اونٹ ہدی قران کے نہ تھے پس معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدی قران اور نفل سے بھی کھایا۔ مگر نفل ہدی سے حرم پہنچنے کے بعد کھایا۔ کیونکہ اگر وہ حرم نہ پہنچے بلکہ راستے میں ہلاک ہو کر ذبح کیا جائے تو اس سے کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ حرم میں اس سے قربت خون بہانے سے میسر ہو جاتی ہے اور غیر حرم میں خون بہانے سے قربت حاصل نہیں ہوتی بلکہ صدقہ کرنے سے ہوتی ہے تو اس کا صدقہ کرنا لازم ہے۔ حصول قربت کیلئے اگر مالک نے نفل ہدی یا اس کے علاوہ ایسی ہدی جس سے کھانا اس کیلئے جائز نہ ہو کھالیا تو جو کھایا ہے اس کا ضامن ہوگا۔ یہی امام شافعی اور امام احمد کا مسلک ہے اور امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر ایک لقمہ بھی کھالیا تا کل کا ضامن ہوگا۔ اور ہدایا کے گوشت کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ اس کا کھانا جائز ہو اگر اس نے اس میں سے کچھ فروخت کر دیا یا قصائی کو مزدوری میں دیدیا تو اس کی بقدر قیمت کا صدقہ کرنا لازم ہوگا۔ اور جہاں ہدی سے مالک کیلئے کھانا جائز ہے وہاں اغنیاء کیلئے بھی کھانا جائز ہے اور مستحب یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کا ایک ٹکڑا صدقہ کر دے اور ایک ٹکڑا حد یہ کر دے۔

مسلم کی حدیث میں ہے: "كنت نهيتكم عن الادخار من اجل الرافعة وقد جاء الله بالسعة فادخروا ما بادلکم"۔ کیا قحط وغیرہ کے دور میں ذخیرہ کرنے کی حرمت پھر لوٹ سکتی ہے؟ اس میں امام شافعی کے دو قول ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ نہیں لوٹ سکتی ہے کیونکہ اس کا منسوخ ہونا ثابت ہے۔ خواہ نہی تحریمی ہو یا تنزیہی۔

الفصل الثانی:

۲۶۳۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَهْدَىٰ عَامَ الْحَيَّةِ فِي هَدَايَا رَسُولِ اللَّهِ ﷺ جَمَلًا كَانَ لِأَبِي جَهْلٍ فِي رَأْسِهِ بُرَّةٌ مِنْ فِضَّةٍ وَلِي رِوَايَةٌ مَنْ ذَهَبٌ يَغِيظُ بِذَلِكَ الْمُشْرِكِينَ۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۶۰/۲ الحدیث رقم ۱۷۴۹۔ وابن ماجہ ۱۰۳۵/۲ الحدیث رقم ۳۱۰۰ واحمد فی المسند ۲۴۴/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احد پیہ کے سال اپنے ساتھ ہدایا کے اونٹ لے کر گئے ابو جہل کے اونٹ کے ناک میں چاندی کی ایک تھنی تھی اور ایک روایت میں آیا ہے کہ سونے کی۔ اس کی وجہ سے

مشرکوں کو غصہ دلاتے تھے۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان النبی ﷺ اهدى عام حديبية في هدايا رسول الله ﷺ جملا كان لابي جهل: "جملاً" اهدى فعل نے نصب دیا ہے اور ہدایا میں اس کا صلہ ہے اور حق یہ تھا کہ یوں کہتے ہدایا ہ پس ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لے آئے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ابو جہل کے اونٹ کا خاتمہ ابو جہل سے اچھا ہوا کہ اللہ کے راستے میں اس کا خر ہوا اور اللہ کے رسول اور اولیاء نے اس کا گوشت کھایا، پھر اس حدیث کی نظیر میں اللہ کا یہ ارشاد ہے ﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح: ۲۹] "عام الحديبية" ۶ھ میں آنحضرت ﷺ ادا بیگی عمرہ کیلئے مکہ روانہ ہوئے مشرکین نے آپ کو حدیبیہ مقام میں روک دیا اور حدیبیہ کے صل کے اطراف میں ایک جگہ ہے اور اس کا قصہ بہت مشہور ہے۔

اور ابن حجر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اور مشرکین کے درمیان اس پر صلح ہوئی کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء حدیبیہ میں احرام سے نکل جائیں اور پھر اس کے بعد اپنے عمرہ کی قضاء کریں اور اس کے بعد آئندہ سال آئیں حج کریں اور عمرہ کریں۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ صلح اس پر ہوئی تھی کہ وہ آئندہ سال صرف عمرہ کی قضاء کریں گئیں نہ کہ حج کریں گے اور صلح میں یہ بات بھی طے پائی تھی کہ مشرکین تین دن کیلئے مکہ آپ ﷺ کیلئے خالی چھوڑیں گے۔ یہاں تک کہ جب تین دن گزر گئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے نکلنے کا مطالبہ کیا۔

قوله: في رأسه برة من فضة يغيب بذلك الكفار: مصابيح میں "وفي رأسه برة فضة" اضافت کے ساتھ ہے۔ "برة" باء کے ضمہ اور مخفہ کے فتح کے ساتھ ہے ابو علی کہتے ہیں کہ اس کا اصل "بروة" ہے کیونکہ اس کی جمع برات اور برون آتی ہے۔ جیسے ثبات اور ثبون، اس کا معنی ہے۔ نتھنی۔

شارح مصابيح کہتے ہیں یعنی اس کے ناک میں چاندی کی نتھنی تھی۔ کیونکہ برة پیتل وغیرہ کی نتھنی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی ناک میں ڈالی جاتی ہے۔ اصمعی کہتے ہیں ایک جانب کے نتھنے میں ڈالا جاتا ہے۔ چونکہ ناک، سر میں سے ہے تو سعة فی رأسه کہا۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ مجاز ہے مجاورۃ کی وجہ سے کہ ناک سر کے قریب ہے نہ کہ اطلاق الكل علی البعض کے قیاس سے ہے۔ "یغیظ" حرف مضارع کے فتح کے ساتھ ہے۔

ذبح ہونے والی ہدی کا حکم

۲۶۳۱: وَعَنْ نَاجِيَةَ الْخُزَاعِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَيْفَ اصْنَعُ بِمَا عَطَبَ مِنَ الْبَدَنِ قَالَ

انْحَرُهَا ثُمَّ اغْمِسْ نَعْلَهَا فِي دَمِهَا ثُمَّ خَلِّ بَيْنَ النَّاسِ وَبَيْنَهَا يَأْكُلُونَهَا . (رواه مالك والترمذی وابن ماجه)

اخرجه الترمذی فی ۲۵۳/۳ الحدیث رقم ۹۱۰ وابن ماجه ۳۶/۲ . الحدیث رقم ۳۱۰۶ . ومالك فی الموطأ ۳۸۰/۱

الحدیث رقم ۱۴۸ من کتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۳۳۴/۴۔

ترجمہ: حضرت ناجیہ خزاعی سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! میں اس جانور کے ساتھ کیا کروں جو مرنے کے قریب ہو ہدی کے جانور میں سے فرمایا کہ اس کو ذبح کر دو پھر اس کی پاپوش کو رنگ دو اس کے خون میں یعنی جو کہ اس کا ہار ہے اس کو خون میں رنگ کر۔ اس کی گردن پر چھاپ دیا جائے پھر لوگوں کے درمیان چھوڑ دے اور ہدی کے درمیان یعنی فقراء کو اس کے کھانے سے منع نہ کرو۔

تشریح: ”یا کلوٰنہا“ یعنی فہم یا کلوٰنہا ہے۔ اصل میں اس آیت کے طرز پر ﴿وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَدِرُونَ﴾

[المسرات: ۳۶] ورنہ تو فیا کلوٰنہا کہنا چاہیے تھا۔ جیسے: ﴿ذُرِّمُوا يَأْكُلُوا﴾ [الحجر: ۳]۔۔۔۔۔

عرض مرتب: اس روایت کی مکمل تشریح پہلے گزری ہے۔

۲۶۳۲: ورواہ ابو داؤد والدارمی عن ناجیة الاسلامی۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۶۸/۲ الحدیث رقم ۱۷۶۲ والدارمی فی ۹۰/۲ الحدیث رقم ۱۹۰۹۔

ترجمہ: ابو داؤد اور دارمی نے اس روایت کو حضرت ناجیہ سلمیؓ سے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

ناحیة بن جندب۔ یہ ”ناجیہ“ جندب کے بیٹے ہیں اور اسلمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضور ﷺ کے اونٹوں کے نگران تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عمرو کے بیٹے ہیں۔ اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا نام ”ذکوان“ تھا۔ حضور ﷺ نے ”ناجیہ“ نام رکھا۔ کیونکہ ان کو قریش سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ یہی وہ صحابی ہیں جو حدیبیہ کے موقع پر قلب میں آپ ﷺ کا تیر لے کر اترے تھے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے۔ ان سے عروہ بن زبیرؓ وغیرہ نے روایت کی۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں بمقام مدینہ وفات پائی۔

قوله: عن ناجیة الاسلامی: تقریب میں ہے کہ ناجیہ بن جندب بن عمیر اسلمی، صحابی ہے اور ناجیہ بن خزاعی بھی صحابی ہے ان سے روایت کرنے میں عروہ متفرد ہیں اور جس نے ان دونوں کو ملایا ہے اور غلط ملط کیا ہے تو یہ ان کو وہم ہوا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ناجیہ بن کعب بن عمیر بن عمیر اسلمی صاحب بدن رسول اللہ ﷺ ہے۔

اور امام احمد بن حنبل نے سند میں صاحب البدن ناجیہ بن الحارث خزاعی کو قرار دیا ہے لیکن مشہور اول ہے۔

مؤلف فرماتے ہیں کہ یہ ناجیہ بن جندب اسلمی صاحب بدن رسول اللہ ﷺ ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ ناجیہ بن عمرو ہے جس کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے ان کا نام ذکوان تھا آپ ﷺ نے ان کا نام ناجیہ ذکوان رکھا کیونکہ یہ قریش سے بچ نکلے تھے۔ اور یہی حدیبیہ میں کنوئیں میں اترے تھے۔

ان سے عروہ زہری وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت امیر معاویہ کے دور میں مدینہ میں وفات پائی (انھی) اور ناجیہ خزاعی کا ذکر نہیں کیا۔ پس صاحب مصابح نے احمد بن حنبل کی اتباع کی ہے اور مصنف نے جمہور کی۔ واللہ اعلم۔

قربانی کے دن کی فضیلت

۲۶۳۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ قُرْطِبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ أَعْظَمَ الْأَيَّامِ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ يَوْمَ الْقَرِّ قَالَ نُورٌ وَهُوَ الْيَوْمُ الثَّانِي قَالَ وَقَرَّبَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ بَدَنَاتٍ خَمْسُ أَوْسْتٍ فَطَفِقْنَ يَزِدْنَ لِفَنِّ إِلَهِ بَاتِهِنَّ يَبْدَأُ قَالَ فَلَمَّا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا قَالَ فَتَكَلَّمْتُ بِكَلِمَةٍ خَفِيَّةٍ لَمْ أَفْهَمْهَا فَقُلْتُ مَا قَالَ قَالَ مَنْ شَاءَ اقْتَطَعَ - (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۶۹/۲ الحدیث رقم ۱۷۶۵۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن قرطیبؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا دنوں میں بڑا دن اللہ کے نزدیک قربانی کا دن ہے ثور (جو کہ اس حدیث کا راوی ہے) نے کہا کہ اس کے بعد قرقر کا دن ہے اور وہ دوسرا دن ہے یعنی گیارہویں تاریخ کا دن ہے۔ راوی نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کے نزدیک پانچ دن آونٹ قریب کیے گئے۔

پس اونٹوں نے حضور ﷺ کے قریب ہونا شروع کیا تا کہ کسی کو ان میں پہلے ذبح کریں۔ راوی نے کہا۔ جب جانوروں کی گردنیں زمین پر گریں تو حضور ﷺ نے آہستہ سے کچھ فرمایا کہ میں سمجھ نہ سکا۔ پھر میں نے اس شخص کو کہا جو میرے پاس تھا کہ حضور ﷺ نے کیا فرمایا؟ اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا جی چاہے اس ہدی میں سے کاٹ کر لے جائے۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان اعظم الايام عند الله يوم النحر ثم يوم القر:

”ان اعظم الايام“ بڑے دن سے مراد عید الاضحیٰ کا دن ہے پس یہ اس کا منافی نہیں ہے جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ افضل الايام يوم عرفہ ہیں۔ یا ایام اشهر الحرم ہے اور یہ بات قابل بحث ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ دنوں میں بڑا دن قربانی کا دن ہے اس سے مراد یہ ہے کہ قربانی کا دن ان دنوں میں سے ایک دن ہے جو افضل ہے یہ مراد اس لیے لی گئی ہے کہ دوسرے احادیث میں عشرہ ایتام کو افضل قرار دیا ہے (اتمی)، دس دنوں سے مراد ان کا عشرہ ذی الحجہ ہے یا عشرہ رمضان ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے اللہ کے نزدیک ذی الحجہ کے دس دنوں میں عمل کرنے سے زیادہ کسی دن عمل کرنا محبوب نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات جس طرح احادیث سے عشرہ ذی الحجہ کا سب سے افضل ہونا ثابت ہے اسی طرح یہ بات بھی احادیث سے ثابت ہے رمضان کا آخر عشرہ افضل ترین ہے۔ تو اس تضاد کو یوں رفع کیا جائے کہ ان احادیث کو جن سے عشرہ ذی الحجہ کا افضل ہونا ثابت ہے اشہر حرم کے ساتھ مقید کیا جائے اور عشرہ رمضان مطلق طور پر تمام دنوں سے افضل ہے۔ تعارض کو دور کرنے کیلئے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ افضلیت باعتبار حیثیت کے مختلف ہے یا اضافی اور نسبتی ہے پس من تبعیضہ مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

”یوم نحر“ یعنی ایتام نحر کا پہلا دن کیونکہ عید اکبر ہے اور اس میں حج کے بڑے بڑے اعمال ادا کیے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس

کے بارے میں کیا گیا ہے ﴿یوم الحج الاکبر﴾ [التوبة: ۳]

”یوم القر“ قاف کے فتح اور راء کے شد کے ساتھ بمعنی قرار کا دن۔ کیونکہ اس دن حاجیوں کو قرار و سکون حاصل ہو جاتا ہے بخلاف اس سے پہلے اور بعد کے ایتام کے کہ ان میں انتشار ہوتا ہے بعض شراح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ایتام تشریق کا پہلا دن ہے اور اسکو یہ نام اس لیے دیتے ہیں کہ اس دن لوگ منیٰ میں منازل میں ٹھہرے ہوتے ہیں اور کہیں جاتے نہیں ہیں بخلاف آخری دو دنوں کے۔

قوله: وقرّب لرسول الله ﷺ..... من شاء اقتطعها: ”قرب“ راء کی تشدید کے ساتھ مجہول کا صیغہ ہے۔

”خمس او ست“، اور راوی کی طرف سے شک ظاہر کرنے کیلئے ہے یا عبد اللہ کی طرف سے تردید کیلئے ہے یعنی ان کی مراد قریبی

عدد بتاتا ہے۔

”طففقن“ دوسرے فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

”بایتن بیدا“ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہراونٹ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک کی برکت حاصل کرنے کیلئے

اس بات کا منتظر تھا کہ پہلے مجھ ذبح کریں (اتمی)۔ یہ دراصل آپ ﷺ مجرہ تھا۔

”فتکلم“ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں فاء زائدہ ہے اور ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک قال کی ضمیر آپ ﷺ کی

طرف راجع ہے اور فتکلم، قال کیلئے عطف تفسیر ہے اور علامہ طیبی کے نزدیک قال کی ضمیر سے مراد عبد اللہ ہے۔

الفصل الثالث:

قربانی کے گوشت کا مسئلہ

۲۶۳۳: وَعَنْ سَلْمَةَ بِنِ الْأَكْوَعِ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ ضَحَّى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَلَاثَةِ وَفِي بَيْتِهِ مِنْهُ شَيْءٌ فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَفَعَلُ كَمَا فَعَلْنَا الْعَامَ الْمَاضِيَ قَالَ كُلُوا وَأَطْعِمُوا وَاذْخِرُوا فَإِنَّ ذَلِكَ الْعَامَ كَانَ بِالنَّاسِ جُهْدٌ فَأَرَدْتُ أَنْ تُعِينُوا فِيهِمْ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۴۱۰۔ الحدیث رقم ۵۵۶۹۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۵۶۳/۳ الحدیث رقم (۳۴-۱۹۷۴)۔

ترجمہ: حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص کہ قربانی کرے تم میں سے پس وہ تیسرے دن کے بعد صبح نہ کرے اس حال میں اس کے گھر میں کچھ قربانی کا گوشت ہو۔ پس جب اگلا سال آیا تو بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا ہم ایسا ہی کریں جیسا کہ ہم نے گذشتہ سال کیا تھا۔ یعنی قربانی کا گوشت نہ رکھیں تین دن کے بعد فرمایا کھاؤ اور کھلاؤ اور ذخیرہ کرو۔ تحقیق اس سال لوگوں پر محنت و مشقت جتنا جگی تھی پس میں نے چاہا جمع کرنے سے منع کروں تاکہ تم ان کی مدد کرو۔ یعنی اب ضرورت نہیں رہی اگر رکھو گے تو اجازت ہے اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: پس منظر: ایک سال مدینہ میں اور آس پاس کے علاقوں میں شدید قحط پڑا تھا اس موقع پر باہر کے رہنے والے بڑی کثرت کے ساتھ مدینہ میں آگئے جن سے سارا مدینہ بھر گیا تھا اسی سال آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ لوگوں کے پاس جتنا گوشت ہو تقسیم کر دیں جمع کر کے نہ رکھیں اور جمع کو حرام کر دیا اس سال۔

قوله: من ضحى منكم فلا..... فلعنا العام الماضى:

”ضحى“ حاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ ”نفع؟“ ہمزہ استفہام مقدر ہے یعنی انفع؟۔

قوله: قال: كلوا واطعموا، وادخروا، وادخروا“ دال کی تشدید کے ساتھ امر اباحت ہے۔

قوله: فان ذلك العام كان بالناس جهد، فاردت ان تعينوا فيهم:

”فان ذلك العام“ گزشتہ سال جمع کرنے کی حرمت کی علت ہے اور اشارہ ہے کہ حکم علت کے ساتھ گھومتا ہے ثبوت اور عدم کے

اعتبار سے۔ اس حدیث کو اس باب میں لانے کی کوئی وجہ اور مناسبت نہیں ہے جیسا کہ ارباب عقل پر واضح ہے۔

شاید اس سے فصل اول کی آخری حدیث کی تفسیر مقصود ہو۔ ”جهد“ جیم کے فتح اور ضم دونوں کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ضم کے ساتھ بھوک کو کہتے ہیں اور فتح کے ساتھ مشقت کے معنی میں آتا ہے۔

”ان تعينوا فيهم“: یعنی تعينوا الفقراء متعدی کو بمنزلة لازم کے کر کے فی کے ساتھ متعدی کیا ہے۔ مبالغة علامہ طیبی

کہتے ہیں: ای توقعوا الاعانة فيهم (انہی) یعنی علامہ نے اس کو باب تفضیمن میں سے قرار دیا ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

بجرح فى عراقيها نصلى

اور اسی پر اللہ کا یہ قول ہے حکایت: ﴿واصلح لى فى ذريتى﴾ [الإحفاف: ۱۵] اور ممکن ہے کہ اس کی تقدیر ”ان تعينوا فى

حقهم“ ہو کیونکہ ان کا فقر آپ ﷺ کیلئے بہت مشکل تھا۔

۲۶۳۵: عَنْ نَبِيْشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اِنَّا كُنَّا نَهَيِّنَا كُمْ عَنِ لُحُومِهَا اَنْ تَاْكُلُوْهَا فَوْقَ ثَلَاثِ لَيْلٍ تَسَعُّكُمْ جَاءَ اللَّهُ بِالسَّعَةِ فَكَلُوا وَادْخُرُوا اِلَّا وَاِنَّ هَذِهِ الْاَيَّامُ اَيَّامُ اَكْلِ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللَّهِ - (رواه ابو داود) اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۲۴۳/۳ الحدیث رقم ۲۸۱۳ - وابن ماجہ مختصراً فی ۱۰۵۵/۲ الحدیث رقم ۳۱۶۰ - والدارمی ۱۰۸/۲ الحدیث رقم ۱۹۵۸ -

ترجمہ: حضرت نبیہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ہم کو منع کرتے تھے (جمع کرنے سے) گوشت قربانی یا ہدی کے ساتھ کہ تم اس کو تین دن سے زیادہ کھاؤ۔ تاکہ تم کو وسعت ہو۔ یعنی تمہارے فقراء کو بھی پہنچے اب اللہ تعالیٰ نے وسعت کر دی ہے پس کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور ثواب طلب کرو۔ یعنی تصدیق کرنے کے ساتھ اور تحقیق یہ دن یعنی منیٰ کے چاروں دن کھاتے اور پینے یعنی پس روزہ ان دنوں میں حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد کرنے کے ہیں۔

تشریح: قوله: انا كنا نهيناكم عن لحومها ان تاكلوها..... جاء الله بالسعة: "ان تاكلوها" بدل اشتمال ہے۔

"السعة" سین کے فتح کے ساتھ ہے اور اسی پر اللہ کا یہ ارشاد ﴿لَيَنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ﴾۔

قوله: فكلوا، وادخروا، واتجروا:

"اتجروا" علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ باب افعال سے ہے اور الاجر سے مشتق ہے یعنی صدقہ کرنے کے ساتھ اجر طلب کرو اور یہ تجارت سے نہیں ہے ورنہ تو شدد ہوتا۔ اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ قربانی کا گوشت فروخت کرنا جائز نہیں ہے بلکہ کھایا جائے اور صدقہ کیا جائے۔

قوله: الا وان هذه الايام، ايام اكل وشرب وذكر الله: "الا" تنبيه كليل ہے۔

"شرب" شین کے ضم کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں فتح کے ساتھ ہے اور قرأت سبعة میں ﴿فشاربون شرب الحميم﴾ کو ضمہ اور فتح دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور ایک روایت میں کسرہ بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔

اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق یہ ایام ذکر اللہ میں بہت زیادہ مشغول رہنے کے ہیں:

﴿فاذا قضيت مناسككم فاذكروا الله كذكركم اباؤكم او اشد ذكرا﴾ [البقرة: ۲۰۰]

"یعنی جب تم اپنے حج کے افعال کی ادائیگی سے فارغ ہو چکو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو یعنی بہت زیادہ یاد کرنا"۔ ﴿واذكروا الله في ايام معدودات﴾ [البقرة: ۲۰۳]

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان آیات میں ذکر سے مراد وہ ذکر ہو جو ہدایا کے ذبح کرنے کے وقت ہوتا ہے اللہ کے اس قول کے مطابق:

﴿ليشهدوا منافع لهم ويذكروا اسم الله في ايام معلومات على ما رزقهم من بهيمة الانعام فكلوا منها واطعموا

البائس الفقير﴾ [الحج: ۲۸]

اور شاید روزوں کی حرمت کا ماخذ یہی آیت ہو اور ممکن ہے کہ ذکر اللہ سے مراد رمی کے وقت کا ذکر اور تکبیر تشریح ہو۔ اس کی تحقیق

پہلے گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

بَابُ الْحَلْقِ

سرمنڈانے کا بیان

ترجمہ باب میں قصر کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا لیکن ان میں سے افضل پر اکتفا کرتے ہوئے قصر کو ذکر نہیں کیا۔

الفصل الاول:

سرمنڈانا افضل ہے

۲۶۳۶: عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَلَقَ رَأْسَهُ فِي حَجَّةِ الْوُدَاعِ وَأَنَاسٌ مِنْ أَصْحَابِهِ وَقَصَرَ بَعْضُهُمْ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۰۹/۸، الحدیث رقم ۴۴۱۱۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۴۵/۲ الحدیث رقم (۳۱۶)۔
۱۳۰۱)۔ وابوداؤد فی السنن ۵۰۰/۲ الحدیث رقم ۱۹۸۰ واحمد فی المسند ۱۲۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنا سرمنڈایا حجۃ الوداع میں اور بعض لوگوں نے صحابیوں میں سے منڈایا اور بعض بال صحابیوں نے کتروائے اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔
تشریح: ”حلق“ لام کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔ من اصحابہ میں ”من“ بیانہ ہے یا تعبیضیہ ہے۔
”قصر“ صاد کی تشدید کے ساتھ ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ تخفیف کے ساتھ ہے۔

صحیحین وغیرہما میں منقول ہے کہ حضور ﷺ نے عمرۃ القضاء میں بال کتروائے تھے۔ اور اللہ کا ارشاد ہے ﴿محلّین رؤوسکم ومقصرین﴾ [الفتح: ۲۷] اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں چیزیں جائز ہیں لیکن افضل سرمنڈانا ہے بغیر کسی اختلاف کے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ پورے سر کا منڈانا واجب ہے اور یہی امام مالک کا مسلک ہے اور امام نووی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور اجماع سے مراد صحابہ اور سلف رحمہم اللہ کا اجماع ہے اور اس کی تائید آپ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے، ”خذوا عنی مناسککم“۔

حضور ﷺ یا آپ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی سے بھی بعض سر کے منڈانے پر اکتفاء کرنا منقول نہیں ہے۔ اور اس کو بعض سر کے مسح پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ مسح والی آیت میں ”باء“ ہے جو فی الجملہ تعبیض پر دال ہے اور حدیث ناصیہ بھی بعض سر کے مسح کا جواز بتاتی ہے اور بعض سر کے مسح کرنے سے کسی میں ممانعت بھی نہیں آئی ہے۔ اور طلق کے باب میں یہ تمام باتیں اس کے برخلاف ہیں کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿محلّین رؤوسکم﴾ [الفتح: ۲۷] اور ﴿ولا تحلقوا رؤوسکم﴾ اس میں تعبیض پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ میں سے بعض سر کا منڈانا کتروانا بھی ثابت نہیں ہے۔ بلکہ قزع سے منڈانا کتروانا بھی منقول ہے یہاں تک کہ بچوں کیلئے بھی قزع ممنوع ہے اور قزع بعض سر کو منڈانا اور بعض کو چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ پس ظاہر یہ ہے کہ پورے سر کے منڈانے بغیر احرام سے نہیں نکل سکتا ہے جیسا کہ امام مالک فرماتے ہیں اور ابن ہمام نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میرے دل میں اس مقام پر یہ تحقیق آئی کہ ”محلّین“ کو صیغہ مبالغہ کے ساتھ لانے اور لا تحلقوا میں بغیر مبالغہ کے لانے میں حکمت اور راز یہ ہے کہ فعل طلق میں استیعاب ہونا چاہیے اور اس سے منہی قلیل اور کثیر دونوں کو شامل ہے مطلقاً۔

۲۶۲۷: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ لِي مُعَاوِيَةُ اِنِّي فَصَّرْتُ مِنْ رَأْسِ النَّبِيِّ ﷺ عِنْدَ الْمُرْوَةِ بِمَشْقَصٍ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۶۱۱/۳ - الحدیث رقم ۱۷۳۰ - و مسلم فی صحیحہ ۹۱۳/۲ الحدیث رقم (۲۰۹ - ۱۲۴۶) -

واخرجه ابوداؤد فی ۳۹۶۱/۲ الحدیث رقم ۱۸۰۲ والنسائی فی ۲۴۴۱/۵ الحدیث رقم ۲۹۸۷ - واحمد فی المسند ۹۶/۴ -

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کہا مجھ سے معاویہؓ نے تحقیق میں نے نبی کریم ﷺ کے بال کترے مردہ کے قریب تیر کی پیکان سے - اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے -

تشریح: ”مشقص“ میم کے کسرے اور قاف کے فتح کے ساتھ ہے - تیر کے کمان کو کہتے ہیں اور یہاں یہی معنی زیادہ مناسب ہے -

چونکہ یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے حج میں سر کے بال کتروائے نہیں بلکہ منڈوائے تھے اس لیے امیر معاویہؓ کے اس بیان کا تعلق حج سے نہیں بلکہ عمرہ سے ہے - چنانچہ حضرت امیر معاویہؓ کے یہ الفاظ ”عند المروة“ مردہ کے قریب بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کیونکہ اگر وہ آپ ﷺ کے بال حج میں کترتے تو وہ مردہ کے قریب نہ کہتے بلکہ کہتے کہ منیٰ میں کترے -

علامہ طبریؒ فرماتے ہیں کہ یہ عمرہ الجعرانہ کی بات ہے سنہ ۸ھ کو جب آپ نے مکہ کو فتح کیا اور واپسی کے ارادے پر عمرہ ادا فرمایا - اور یا عمرہ القضاء کی بات ہے اگر امیر معاویہؓ کی یہ بات صحیح ثابت ہو جائے جو انہوں نے فرمایا کہ میں عمرہ القضاء کے موقع پر اسلام قبول کر چکا تھا لیکن صحیح یہ ہے کہ امیر معاویہؓ فتح مکہ کے سال مسلمان ہوئے تھے -

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس روایت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ متعمم تھے اور آپ ﷺ عمرہ کے احرام سے اس وقت نکلے جب امیر معاویہؓ نے آپ ﷺ کے بال کترے فینچی سے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے اور فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ محرم نہ تھے تو اس سے لازم آیا کہ یہ جیزہ الوداع کی بات ہے اور اس بات پر دلیل کہ آپ ﷺ احرام عمرہ سے نکلے - ابوداؤد کی روایت ہے اور اس کی روایت میں ”عند المروة“ کے الفاظ ہیں - کیونکہ حج میں قصر منیٰ میں ہوتا ہے - تو ان کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے احرام سے نہ نکلے پر احادیث اتنی زیادہ مقدار میں منقول ہے کہ ان میں قدر مشترک حد شہرت کے قریب ہے جو کہ تو اتر کے قریب ہے جیسے ابن عمر کی گزری ہوئی حدیث اور جو فتح مکہ کے بارے میں احادیث گزری ہے - اور حضرت جابرؓ کی طویل حدیث جو مسلم وغیرہ میں ہے اور اگر صرف ابن عمر کی حدیث ہوتی تو وہ بھی امیر معاویہؓ کی حدیث پر مقدم ہوتی پھر سب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے -

پس امیر معاویہؓ کی حدیث میں جم غفیر کی طرف سے شد و ذل لازم آیا پس یا تو اس میں خفاء ہوئی ہے اور یا یہ محمول ہے - عمرہ الجعرانہ پر کیونکہ اس وقت امیر معاویہؓ مسلمان ہو چکے تھے - اور یہ عمرہ بعض لوگوں پر مخفی رہا کیونکہ یہ رات کے وقت ہوا تھا ترمذی اور نسائی کی روایت کے مطابق آپ ﷺ رات کے وقت جعرانہ کی طرف عمرہ کی نیت سے نکلے، پس رات کو مکہ میں داخل ہوئے اور پھر اسی رات مکہ سے نکلے ”الحدیث“ -

پس اس وجہ سے لوگوں پر یہ عمرہ مخفی رہا - اور اس کی وجہ سے سنن نسائی کی اس زیادت ”فی ایام العشر“ پر خطا کا حکم لگانا ضروری ہے - محقق ابن ہمام کے گزرے ہوئے کلام سے آپ جان چکے ہوں گے کہ ”عند المروة“ کے الفاظ صحیحین میں نہیں ہیں بلکہ ابوداؤد کی روایت میں ہیں -

سرمنڈانے والوں کو اللہ کے رسول ﷺ نے رحمت کی دعا فرمائی

۲۶۳۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَللّٰهُمَّ اَرْحِمِ الْمُحَلِّقِيْنَ قَالُوْا وَالْمُهَيَّبِيْنَ
يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَرْحِمِ الْمُحَلِّقِيْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَالْمُقَصِّرِيْنَ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۶۱۳ الحديث رقم ۱۷۲۷ - ومسلم فى صحيحه ۹۴۵۱۲ الحديث رقم (۳۱۷-۱۳۰۱)
ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا حجۃ الوداع کے مواقع پر اے
الہی! سرمنڈانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اور کتروانے والوں کے لیے بھی رحمت کی دعا کیجئے اے
اللہ کے رسول ﷺ فرمایا اے الہی! سرمنڈانے والوں پر رحم کر۔ صحابہ نے عرض کیا ہالوں کے کتروانے والوں کے لیے
بھی رحمت کی دعا کر دیجئے اے اللہ کے رسول حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اور کتروانے والوں پر بھی رحم کر۔ اس کو امام
بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان رسول الله ﷺ قال في حجة الوداع..... قال: اللهم ارحم المحلقين:

”قال في حجة الوداع“: علامۃ طیبیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دعا آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں کی تھی، مشہور قول کے مطابق جیسا کہ
حدیث میں مذکور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ حدیبیہ میں کی تھی جب آپ ﷺ نے صحابہ کو سرمنڈوانے کا حکم دیا تو انہوں نے عمل نہیں کیا۔
دخول مکہ کے طمع کی وجہ سے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ دونوں قولوں کے جمع سے کوئی مانع نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں مواقع میں دعا کی ہو۔

”والمقصرين يا رسول الله“ عطف تلتقيني ہے اور ﴿انى جاعلك للناس اماما﴾ [البقرة: ۱۲۴] کے بعد ”ومن ذريتي“
جو ہے یعنی واجعل بعض ذريتي ائمة باب تلتقين سے نہیں ہے جیسا کہ ابن حجر کو وہم ہوا ہے۔ بلکہ یہ مستقل دعا ہے کلام سابق سے
مترفع نہیں ہے۔

اور اس کی تقریر ”وجاعل بعض ذريتي“ کا عطف جاعلك کے كاف پر۔ تو اس کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں ﴿وارزق
اهله من الثمرات من آمن منهم بالله واليوم الآخر﴾ [البقرة: ۱۲۶] کے بعد ﴿قال ومن كفر﴾ باب تلتقين میں سے ہو سکتا
ہے۔ کیونکہ اس کی تقریر ”وارزق من كفر“ صیغہ امر کے ساتھ اور ”ارزق من كفر“ صیغہ منکلم کے ساتھ درست ہے یا ”ومن
كفر“ متبداء ہو اور خبر محذوف فامتحہ ہو۔

قوله قال: اللهم ارحم المحلقين: آپ ﷺ نے حلق کرنے والوں کیلئے دعا کئی بار اس لیے فرمائی کہ انہوں نے افضل پر
عمل کیا تھا کیونکہ ﴿محلقين رؤوسكم﴾ میں جس سے اللہ نے ابتداء کی ہے اس پر عمل کرنا زیادہ کامل ہے۔ اور حلق سے میل کچیل بھی
احسن طریقے سے دور ہو جاتا ہے تو ﴿ثم ليقضوا تفهم﴾ [الحج: ۲۹] (پھر چاہیے کہ ختم کر دیں اپنا میل کچیل) (تفسیر عثمانی) پر عمل بھی
اس میں زیادہ اچھے طریقے سے ہو جاتا ہے۔

قوله قالوا: والمقصرين يا رسول الله قال والمقصرين:

”قالوا“ تاکید ہے استدعا کیلئے جو کہ محلقين یا مقصرين یا دونوں کا قول ہے تینوں احتمالات ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ
دونوں قسموں میں سے بعض کا قول ہے۔

ابن ہمام نے ذکر کیا ہے کہ صحیحین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے تیسری بار ”والمقصرين“ کہا اور بخاری کی روایت میں

’فلما كانت الرابعة قال: والمقصيرين ہے۔‘ اتھی۔

پس جو مولف نے ذکر کیا ہے یہ ان سے کوتاہی ہوئی ہے یا یہ دوسری روایت ہے۔ واللہ اعلم
۲۶۳۹: وَعَنْ يَحْيَىٰ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ جَدِّتِهِ أَنَّهَا سَمِعَتِ النَّبِيَّ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوُدَّاعِ دَعَاَ لِلْمُحَلِّقِينَ
ثَلَاثًا وَلِلْمُقَصِّرِينَ مَرَّةً وَاحِدَةً۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۴۶/۲ الحديث رقم (۳۲۱-۱۳۰۳)۔

ترجمہ: حضرت یحییٰ بن حصین سے روایت ہے انہوں نے نقل کیا ہے اپنی دادی سے کہ جن کی کنیت ام الحصین ہے یہ
کہ اس نے حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ نے سر منڈانے والوں کے لیے دعا فرمائی تین مرتبہ اور
کتروانے والوں کے لیے ایک مرتبہ یعنی آخر میں۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

روائی حدیث:

ام الحصین۔ یہ ام الحصین ’اسحاق‘ کی بیٹی ہیں اور قبیلہ ’احمس‘ کی ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے یحییٰ بن حصین وغیرہ نے روایت حدیث
کی ہے۔ یہ حجۃ الوداع میں حاضر ہوئی تھیں۔ یحییٰ بن حصین کے حالات ۲۶۳۹/۵ کے تحت گذر چکے ہیں۔

تشریح: قوله: دعا للمحلقين ثلاثا وللمقصيرين مرة واحدة:

بخاری کی روایت ’فلما كانت الرابعة‘ کو عمرہ حدیبیہ پر محمول کیا جائے کہ تین بار وہاں حلق کرنے والوں کیلئے کی تھی تاکہ دونوں
آحادیث میں تطبیق پیدا ہو جائے یا ہر راوی کا کلام اس پر محمول ہے جو اس نے سنا ہے اور اسکے نزدیک ثابت ہے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے سر منڈوانے والوں کیلئے پہلے دعا کی نہ کہ بال کتروانے والوں کیلئے اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ
ﷺ کے ساتھ احرام باندھنے والوں کی اکثریت وہ تھی جن کے پاس ہدی نہیں تھی اور خود آپ ﷺ کے پاس ہدی تھی اور جن کے پاس
ہدی ہو تو وہ ہدی ذبح کرنے سے پہلے سر نہیں منڈواتے۔ پس جب آپ ﷺ نے ان لوگوں کو جس کے پاس ہدی نہ تھی حلق کر کے حلال
ہونے کا حکم دیا تو وہ اس پر غمگین ہوئے اور وہ چاہ رہے تھے کہ آپ ﷺ ان کو احرام میں رہنے کی اجازت دیں یہاں تک کہ وہ حج مکمل کر
لیں۔ حالانکہ نبی ﷺ کی اطاعت ان کیلئے زیادہ اولیٰ تھی۔ جب ان کیلئے سوائے احرام سے نکلنے کے کوئی چارہ نہیں رہا۔ تو ان کے دلوں
میں بال کٹوانا، منڈوانے سے آسان تھا تو اکثر اس کی طرف مائل ہو گئے اور بعض نے آپ ﷺ کی اطاعت کرنے میں جلدی کی اور سر
منڈوائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وجہ سے سر منڈوانے والوں کو دعائیں مقدم رکھا اور بال کتروانے والوں کو مؤخر رکھا (اتھی)۔

لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ آپ ﷺ نے ان کو احرام سے نکلنے کا حکم دیا تھا اور اس کو حلق کرنے کے ساتھ خاص نہیں کیا تھا۔ اور انہوں
نے بال کتروائے اس لئے کہ وقوف کا زمانہ قرب تھا تا کہ بعد میں حلق کرنے کیلئے بال باقی رہیں یا حج کے بعد کتروانے کیلئے بال باقی
رہیں۔ دونوں عملوں کو جمع کرنے کیلئے اور وہ عمل خصمت اور عزیمت ہیں اور عمرہ کے بعد رخصت پر عمل اولیٰ ہے اور حج میں بال کتروانے
والوں نے رخصت پر عمل کیا زینت کیلئے بال باقی رکھنے کی وجہ سے برخلاف حلق کرنے والوں کے کہ انہوں نے عزیمت پر عمل کرنا اختیار کیا
تو وہ فضیلت کے مستحق ہوئے اور چونکہ یہ صدق نیت پر اور مقام عبودیت میں اظہار عجز پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔

باقی امام نووی کا یہ کہنا انتہائی عجیب و غریب ہے کہ حلق کی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ بال کتروانے والا زینت باقی رکھتا ہے حالانکہ
حجاج کو ترک زینت کا حکم ہے۔

اسی طرح ابن حجر کا احتسان بھی عجیب ہے۔ کیونکہ حج و عمرہ سے فراغت کے بعد حجاج ترک زینت کے مامور نہیں ہوتے۔

پھر یہ تمام تفصیل اس بات کی منافی نہیں ہے جو قاضی عیاض نے بعض حضرات سے نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے جب حدیبیہ میں صحابہ کو حلق کروانے کا حکم دیا تو انہوں نے مکہ میں داخل ہونے کے طمع سے حلق نہیں کروایا۔

لیکن اس روایت میں ”امرہم بالحلّٰق“ کے الفاظ غیر محفوظ ہیں بلکہ آپ ﷺ نے مطلقاً احرام سے نکلنے کا حکم دیا تھا پھر بعض نے حلق اختیار کیا بوجہ افضل ہونے کے اور بعض نے قصر کیا یہاں تک کہ انہوں نے آنے والے سال حلق کروایا۔ دونوں قضیوں پر عمل کرنے کی وجہ سے اور دونوں فضیلتوں کے حصول کیلئے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حدیبیہ کے دن بعض لوگوں نے سرمٹہ واہے اور بعض نے بال کتر واہے تو آپ نے منڈوانے والوں کے لئے دعا فرمائی اس پر کسی نے کہا اللہ کے رسول! کیا بوجہ ہے کہ آپ ﷺ نے سرمٹہ واہنے والوں کیلئے دعا رحم میں مبالغہ کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس لیے کہ انہوں نے دخول مکہ کا طمع نہیں رکھا ﴿تندخلن المسجد الحرام ان شاء الله امنین محلّقین رؤوسکم ومقصرین﴾ [الفتح: ۲۷] سے استدلال کرتے ہوئے۔ ارباب تحقیق میں سے صدیق نے اس آیت کا جواب دیا ہے کہ آیت میں اسی سال کی قید نہیں ہے اور پھر آپ ﷺ نے اس مقام پر اس کی تصریح بھی کر دی۔

جمہور کا مذہب مشہور یہ ہے کہ حلق یا قصر افعال حج میں سے واجب ہے بارکن ہے اور حج و عمرہ کے احرام سے نکلنا ان کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور امام شافعی کا اس بارے میں شاذ قول ہے کہ کوئی بھی ممنوع کام کے ذریعہ احرام سے نکل سکتے ہیں۔ جیسے خوشبو لگانا، سلا ہوا لباس پہننا اور حج اول ہے۔

۲۶۵۰: وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى مِنْى فَاتَى الْجُمُرَةَ فَرَمَاَهَا ثُمَّ أَتَى مَنْزِلَهُ بِمِنَى وَنَحَرَ نَسْكَهُ ثُمَّ دَعَا بِالْحَلِاقِ وَنَاوَلَ الْحَالِقَ شِقَّهُ الْأَيْمَنَ فَحَلَقَهُ ثُمَّ دَعَا أَبَا طَلْحَةَ الْأَنْصَارِيَّ فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ ثُمَّ نَاوَلَ الشِّقَّ الْأَيْسَرَ فَقَالَ إِحْلِقْ فَحَلَقَهُ فَأَعْطَاهُ أَبَا طَلْحَةَ فَقَالَ أَقْسِمُ بَيْنَ النَّاسِ - (متفق عليه)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۹۴۸/۲ الحديث رقم (۳۲۶-۱۳۰۵)۔ و ابوداؤد فى السنن ۵۰۰/۲ الحديث رقم ۱۹۸۱۔
والترمذى فى السنن ۲۵۵/۳ الحديث رقم ۹۱۲۔ و اخرجه احمد فى المسند ۱۳۷/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نبی کریم ﷺ منیٰ میں آئے پھر جمرہ العقبہ کے پاس تشریف لائے۔ پس اس کو ننگریاں ماریں۔ پھر اپنے مکان میں تشریف لائے کہ جو منیٰ میں تھا اور اپنی ہدی ذبح کی۔ پھر موٹہ نے والے کو بلایا۔ اس کا نام عمر بن عبد اللہ تھا اور اپنے سر کی داہنی جانب سرموٹہ نے والے کے آگے کی پھر حضور ﷺ کا سرموٹہ۔ پھر حضور ﷺ نے ابو طلحہ انصاریؓ کو بلایا اور منڈے ہوئے بال ان کو دیے اور پھر اپنے سر کی بائیں طرف آگے کی اور فرمایا موٹہ پس اس نے سرموٹہ۔ پس منڈے ہوئے بال آپ ﷺ نے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو دیئے اور فرمایا کہ بالوں کو لوگوں کے درمیان تقسیم کر دو۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان النبى ﷺ اتى منى، ونحوه نك: .

”منزلہ“ اس کا نام اب مسجد خیف ہے۔ اور آپ ﷺ کی نحر کی جگہ عرفہ کی طرف جاتے ہوئے دائیں طرف ہے۔

”نسکہ“ سین کے سکون کے ساتھ ہے اور کبھی سین کو ضمہ بھی دیا جاتا ہے۔ ذبیحہ کو کہتے ہیں یہاں مراد آپ ﷺ کا اونٹ ہے اور آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ۶۳ اونٹ ذبح کیے اور باقی ۳۷ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ذبح کریں۔

قوله: ثم دعا للحلاق وناول الحالق شقه الايمن فحلّقه:

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ مستحب دائیں طرف سے ابتداء کرنا ہے اور بعض کے نزدیک بائیں طرف سے ابتداء کرنا مستحب ہے (آئینی) یعنی ان کا مطلب ہے کہ موٹڈنے والے کا دایاں طرف ہو۔ اور اس قول کی نسبت امام ابوحنیفہؒ کی طرف کی گئی ہے مگر انہوں نے اس سے رجوع کیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انہوں نے پہلے اس کو یمنین الفاعل پر قیاس کیا جیسا کہ قیاس سے متبادر الی الذہن یہی ہوتا ہے لیکن جب ان کو خبر پہنچی کہ آپ ﷺ نے مخلوق یعنی منڈوانے والے کے دائیں طرف کا اعتبار کیا ہے تو اس قول سے رجوع کیا جس کی بنیاد معقول پر تھی صریح منقول قول کی طرف کیونکہ حق اتباع کا زیادہ حقدار ہے اور اگر حالق، مخلوق کے پیچھے کھڑا ہو جائے تو دونوں کے دائیں طرف کا جمع ممکن ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ ابن ماجہ کے علاوہ صحاح میں یہ روایت ہے ”عن انس بن مالک ان رسول اللہ ﷺ اتی منی فاتی الجمرة فرماھا، ثم اتی منزله بمنیٰ فحمر ثم قال للحلاق: خذ، و اشار الی جانبہ الا یمن ثم الا یسر، ثم جعل یعطیہ الناس“۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ سرمنڈوانے میں سنت دائیں طرف سے ابتداء کرنا ہے اور معتبر منڈوانے والے کا دایاں طرف ہے یہ امام ابوحنیفہؒ کے ذکر کردہ مذہب کے خلاف ہے اور یہی صحیح ہے۔ (آئینی)

سروچی کہتے ہیں کہ مخلوق یعنی سرمنڈوانے والے کے دائیں طرف سے ابتداء کی جائے امام شافعیؒ کے نزدیک اور ہمارے بعض علماء نے بھی یہی ذکر کیا ہے لیکن کسی کی طرف منسوب نہیں کیا ہے اور امام صاحب نے حلاق کے دائیں طرف کو لیا اور اس پر تکیہ نہیں اگر ان کا مذہب اس کے خلاف ہوتا تو اس کی موافقت نہ کرتے۔

اور منک ابن عجمی اور بحر میں ہے کہ یہی مختار ہے۔ نخبہ میں ہے کہ یہی صحیح ہے اور امام صاحب کا جو قول ان سے ان کے شاگردوں نے نقل کیا ہے تو اس سے ان کا رجوع بھی منقول ہے۔

کیونکہ امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے حج میں فلاں فلاں موقع پر غلطی کی اور ان میں سے سرموٹڈنے والے کے دائیں طرف سے ابتداء کرنے کو بھی ذکر کیا ہے۔ پس ان کے آخری قول کو صحیح قرار دینا درست ہے۔ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ سرمنڈوانے یا بال کتروانے کے بعد ناخن کا ثنا بھی سنت ہے جیسا کہ آپ ﷺ سے صحیح طور پر منقول ہے اور ابن عمرؓ اپنی داڑھی اور مونچھوں کے زائد بال بھی کاٹتے تھے۔

ملا علی قاری کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے قول: ﴿ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفْتَهُمْ﴾ کے لائق ہے۔

قوله: ثم دعا ابا طلحة..... فحلقه:

”ابوطلحہ انصاری“ حضرت انسؓ کے چچا اور اس کی والدہ ام سلیم کے شوہر ہیں اور آپ ﷺ کی ابوطلحہ اور ان کے گھر والوں کے ساتھ زیادہ خصوصیت اور محبت تھی جو دیگر انصار کیلئے تھی اور بہت سارے مہاجرین کیلئے بھی اتنی نہ تھی۔ اور ابوطلحہ وہی ہے جنہوں نے آپ ﷺ کی قبر برف شریف کی کھدائی کی اور اس کو لحد بنایا اور اس کیلئے اینٹیں تیار کیں۔

قوله فاعطاه ابا طلحة، فقال: اقسامه بين الناس: یہ انسان کے بالوں کی طہارت پر دلیل ہے برخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اس بارے میں شاذ قول اختیار کیا۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بالوں اور باقی آثار سے برکت حاصل کی جائے۔

نحر کے دن خوشبو کا استعمال

۲۶۵۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ أُطِيبُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ وَيَوْمَ النَّحْرِ قَبْلَ أَنْ يُطَوَّفَ بِا

لَبَّيْتُ بِطَيْبٍ فِيهِ مِسْكٌ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۹۶/۳ - حدیث رقم ۱۰۳۹ - ومسلم فی ۸۴۹/۲ حدیث رقم (۴۶-۱۱۹۱)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۵۸/۲ الحدیث رقم ۱۷۴۵ - والترمذی فی ۲۵۹/۳ حدیث رقم ۹۱۷ - والنسائی فی ۱۳۷/۵ الحدیث رقم ۲۶۸۵ - وابن ماجہ فی ۹۷۶/۲ حدیث رقم ۲۹۲۶ - ومالك فی الموطأ ۳۲۸/۱ الحدیث رقم ۱۷ من کتاب الحج - واحمد فی المسند ۱۸۶/۶ -

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کو خوشبو لگاتی تھی احرام باندھنے سے پہلے یعنی حج کا احرام باندھنے یا عمرے کا یا دونوں کا قربانی کے دن خانہ کعبہ کا طواف کرنے سے پہلے یعنی سر منڈانے کے بعد اور کپڑے پہننے کے وقت خوشبو لگاتے کہ اس میں مشک ہوتا تھا اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔
تشریح: ”طیب“ اطیب کے متعلق ہے۔

اس حدیث میں ان لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں کہ خوشبو تابع جماع ہے۔

نحر کے دن ظہر کی نماز کہاں پڑھی جائے؟

۲۶۵۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَقَاضَ يَوْمَ النَّحْرِ نَمْرَجَ فَصَلَّى الظُّهْرَ بِيَمِينِي -

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۵۰/۲ الحدیث رقم (۳۳۵-۱۳۰۸)۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم کے میں تشریف لائے نحر کے دن بھی رمی کے بعد اور ذبح کرنے کے بعد اور فرض طواف کیا چاشت کے وقت پھر اسی روز واپس لوٹے اور منی میں ظہر کی نماز پڑھی اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں اس کے برخلاف ہے کیونکہ اس میں ہے کہ آپ

ﷺ نے ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی ہے۔ پس اس میں شک نہیں ہے کہ دونوں احادیث میں سے ایک میں وہم ہے۔ اب جب دونوں میں تعارض آیا اور یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز دونوں جگہوں میں سے کسی ایک میں پڑھی ہو۔ پس مکہ میں مسجد حرام میں پڑھی ہوگی جس میں فرائض کا ثواب دگنا ہے تو اس کو ترجیح دینا زیادہ اولیٰ ہے۔ (انتہی) اور یہ توجیہ کرنا کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز دوبارہ پڑھی مقتدی بن کر ہمارے مذہب کے مطابق اور امام بن کے امام شافعی کے مذہب کے مطابق اور آپ ﷺ نے صحابہ کو ظہر پڑھنے کا حکم دیا جب وہ آپ ﷺ کے انتظار میں تھے وہم پر حمل کرنے سے اولیٰ ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

اور اس کو کسی اور دن پر بھی حمل کیا جاسکتا ہے اس روایت کے مطابق جس میں ہے کہ آپ ﷺ ہر دن بیت اللہ کی زیارت فرمایا کرتے تھے اور اس تعارض کا حل پہلے گزر چکا ہے اور ترمذی کی روایت جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے طواف کورات تک مؤخر کیا تھا تو اس سے مراد اپنے ازواج کا طواف ہے یا اس سے مراد کورات تک طواف کو مؤخر کرنے کا جواز ہے۔

یا وہ طواف ہے جو آپ ﷺ نے اپنی ازواج کے ساتھ کرنا تھا جیسا کہ حدیث میں ہے زار مع نسائه لیلاً -

اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ آپ ﷺ کا رمی اور حلق دونوں ظہر سے قبل واقع ہوئے تھے۔ بالاتفاق اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ مکہ اور منی میں ہونے کا اختلاف ہے کیونکہ حلق اور افاضہ میں ترتیب معتبر ہے تو باب اور حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں مناسبت ظاہر ہوگی۔

الفصل الثانی:

عورت کو سرمنڈوانا ممنوع ہے

۲۶۵۳: وَعَنْ عَلِيٍّ وَعَائِشَةَ قَالَا نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ تَحْلِقَ الْمَرْأَةُ رَأْسَهَا۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۷۵/۳ الحدیث رقم ۹۱۴۔

ترجمہ: حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے دونوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے عورت کو سرمنڈوانے سے منع فرمایا ہے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عورت جب احرام سے باہر آئے تو اپنا سر نہ منڈائے اور اس حدیث سے عورتوں کو مطلقاً سرمنڈوانے کی ممانعت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ عورتوں کا سرمنڈانا مثلہ کے زمرے میں آتا ہے جس طرح مرد کو داڑھی منڈانا حرام ہے ہاں کسی ضرورت کی بنا پر عورت سرمنڈوا سکتی ہے۔

۲۶۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ الْحَلْقُ إِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ۔

(رواه ابو داؤد و الترمذی و الدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۵۰۲/۲ الحدیث رقم ۱۹۸۵۔ و الدارمی فی ۸۹/۲ الحدیث رقم ۱۹۰۶۔ و الدارقطنی فی ۲۷۱/۲ الحدیث رقم ۱۶۵ من کتاب الحج۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورتوں کے لئے سرمنڈوانا نہیں بلکہ انہیں تو فقط اپنے بال کتروانے چاہئیں۔ (ابوداؤد ترمذی داری)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عورتیں جب احرام سے باہر آئیں تو سرمنڈانا ان پر واجب نہیں ہے بلکہ یہ ان کیلئے حرام ہے ہاں بال کتروانا ان پر واجب ہے بخلاف مردوں کے کہ ان پر دونوں چیزوں میں سے کوئی ایک واجب ہے۔ البتہ سرمنڈانا افضل ہے۔ علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ بال کتروانے کی کم از کم مقدار تین بال ہے اور ہمارے نزدیک ایک انگلی کے برابر بال کتروانا ہے مرد ہو یا عورت اور جو تھائی سر کے بالوں کو کتروانا واجب ہے ہمارے مذہب کے مطابق۔ لیکن علامہ ابن ہمام نے اس قول کو اختیار کیا ہے جو امام مالک کا مسلک ہے کہ پورے سر کے بالوں کو کتروانا واجب ہے۔

قوله: رواه ابو داؤد و الدارمی:

سید کے نسخہ میں داری کی جگہ و الترمذی و اعطف کے ساتھ ہے اور عقیف کے نسخہ میں بغیر و اعطف کے الترمذی ہے۔
و هذا الباب خال عن الفصل الثالث: اور اس باب میں تیسری فصل نہیں ہے۔

بَابُ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

باب تنوین اور سکون دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے ایک نسخہ میں باب جواز التقديم و التأخیر فی بعض امور الحج ہے۔ اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ یہ باب چونکہ مسائل حلق سے متعلق ہے اس وجہ سے ترجمہ الباب ذکر نہیں کیا۔ یہ انتہائی عجیب ہے کیونکہ باب

حلق، رمی، ذبح اور افاضہ سب کے مسائل پر مشتمل ہے۔

الفصل الاول:

افعال حج میں تقدیم و تاخیر سے کوئی گناہ نہیں ہے

۲۶۵۵: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِمِنَى لِلنَّاسِ يَسْأَلُونَهُ فَجَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ لَمْ أَشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ فَقَالَ اذْبَحْ وَلَا حَرَجَ فَجَاءَ آخَرَ فَقَالَ لَمْ أَشْعُرْ فَتَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أُرْمِيَ فَقَالَ إِرْمِ وَلَا حَرَجَ فَمَا سَبَّلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ شَيْءٍ قَدِمَ وَلَا أُخِّرَ إِلَّا قَالَ أَفْعَلُ وَلَا حَرَجَ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) آتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ حَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أُرْمِيَ قَالَ إِرْمِ وَلَا حَرَجَ وَأَتَاهُ آخَرَ فَقَالَ أَقْضْتُ إِلَى الْبَيْتِ قَبْلَ أَنْ أُرْمِيَ قَالَ إِرْمِ وَلَا حَرَجَ -

اخرجه البخاری فی ۵۶۹۳ الحدیث رقم ۱۷۳۶ - ومسلم فی ۹۴۸۱۲ الحدیث رقم (۳۲۷ - ۱۳۰۶) - وابوداؤد فی السنن ۵۱۶۱۲ الحدیث رقم ۲۰۱۴ - والترمذی فی ۲۵۸۱۳ الحدیث رقم ۹۱۶ - وابن ماجہ فی ۱۰۱۴۱۲ الحدیث رقم ۳۰۵۱ مالک فی الموطأ ۴۲۱/۱ الحدیث رقم ۲۴۲ - واحمد فی المسند ۱۰۹۱۲ -

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ حجۃ الوداع میں منیٰ کے مقام پر لوگوں کے لیے ٹھہرے اس لیے تو وہ آپ ﷺ سے مسائل پوچھتے تھے پس حضور ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا میں نے اپنا سر ذبح کرنے سے پہلے منڈایا۔ پس فرمایا کہ ذبح کر لے اب کوئی گناہ نہیں ہے پھر ایک اور شخص آیا اس نے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا پس میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے نخر کیا فرمایا اب کنکریاں پھینکو اور کوئی گناہ نہیں ہے پس نبی کریم ﷺ سے کسی چیز کی تقدیم یا تاخیر کے بارے میں سوال کیا، مگر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے اور مسلم کی ایک روایت میں آیا کہ حضور ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں نے کنکریاں پھینکنے سے پہلے سر منڈایا فرمایا پھینکو کوئی گناہ نہیں ہے اور ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے کنکریاں پھینکنے سے پہلے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ فرمایا اب کنکریاں پھینک لے کوئی گناہ نہیں ہے۔

تشریح: قوله: ان رسول الله ﷺ وقف في حجة الوداع بمنى للناس يسألونه:

”حجۃ الوداع“ جاء اور اوداع کے فتح کے ساتھ ہے۔

”یسألونہ“ وقف کے فاعل یا الناس سے حال ہے یا استیفاء ہے وقوف کے بیان کیلئے۔ اور آخری احتمال کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے ”وقف علی راحلۃ فطفق الناس یسألونہ“۔

قوله: فجاءه ورجل، فقال افععل ولا حرج:

”فجاء“ ایک نذر میں فجاءہ ضمیر کے ساتھ ہے۔ ””قدم“: صحیح قول کے مطابق صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

”ولا اخر“ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اول میں لا کا مقدر ماننا ضروری ہے کیونکہ یہ کلام سیاق نفی میں ہے اور اس کی نظیر ﴿ما

ادری ما یفعل بی ولا یحکم﴾ [الاحقاف: ۹] ہے (اتہمی)۔ لیکن علامہ طیبی کی بات کئی وجوہ سے قابل بحث ہے:

① کہ حدیث اس قاعدہ میں کہ لا کا مابعد اگر فعل ماضی ہو تو تکرار ’لا‘ واجب ہے جیسے: ﴿فلا صدق ولا صلی﴾ [القیامۃ: ۳۱]

داخل نہیں ہے۔

۴ بلکہ یہ آیت جو نظیر میں پیش کی گئی ہے یہ بھی اس قاعدہ سے خارج ہے کیونکہ معنی وغیرہ میں ہے کہ لا جس پر داخل ہے اگر وہ فعل مضارع ہے تو تکرار لا واجب نہیں ہے۔ جیسے ﴿لَا يَحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ [النساء: ۱۴۸] اور ﴿قُلْ لَا اسئلكم عليه اجرا﴾ [هود: ۵۱] اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتا تو کہہ میں نے مانگنا نہیں تم سے اس پر کچھ بدلہ۔

۵ کبھی اس آیت کو لانے سے متبادر الی الفہم یہ ہوتا ہے کہ یہ تکرار میں ہونے کے وجود کی نظیر ہے جیسا کہ علامہ طیبی کی عبارت سے یہ وہم پیدا ہو رہا ہے حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔

۶ ”لا شلت يدك“ اور ”لا فض الله فاك“ میں بغیر تکرار کے ساتھ آیا ہے۔

کیونکہ ان مثالوں میں مقصد دعا ہے تو فعل مستقبل کے معنی میں ہوا۔

۷ ان تغفر اللهم فاعفر جما: وای عبدلك لا ألما میں بغیر تکرار کے آیا ہے۔

۸ اول یا آخر میں تقدیر لا غیر معروف ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ نحر کے دن چار چیزیں ہوتی ہیں: ۱۔ جمرہ عقبہ پر کنکریاں مارنا۔ ۲۔ پھر اسکے بعد جانور ذبح کرنا۔ ۳۔ پھر اس کے بعد سر منڈوانا۔ ۴۔ اور پھر مکہ میں طواف افاضہ کرنا۔ اس ترتیب کے ساتھ افعال کی ادائیگی بعض علماء کے نزدیک سنت ہے۔ چنانچہ امام شافعی، امام احمد، اٹحن بھی ان میں شامل ہیں۔ مذکورہ حدیث کی وجہ سے۔ پس ان کے نزدیک ترتیب کے ترک پر دم واجب نہیں ہوتی۔ ابن جبیر فرماتے ہیں کہ ان افعال میں ترتیب واجب ہے اور علماء کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے جن میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک شامل ہیں یہ حضرات کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ اس میں کوئی حرج نہیں کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس میں ناواقفیت کی وجہ سے گناہ نہیں ہے لیکن جزاء کے طور پر دم واجب ہوگا (انتہی) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایسی ہی ایک حدیث روایت کی ہے جبکہ خود انہوں نے مذکورہ افعال کی تقدیم و تاخیر میں دم واجب کیا ہے اگر وہ حدیث کے معنی نہ سمجھتے جو امام اعظم رضی اللہ عنہ نے سمجھے ہیں تو وہ خود دم واجب کیوں کرتے۔

اب یہ بات سمجھ لیں کہ رمی، ذبح اور حلق میں ترتیب ابوحنیفہ کے نزدیک قارن اور متمتع کیلئے واجب ہے اور صاحبین کے نزدیک سنت ہے اور یہی اختلاف ذبح کا یوم نحر کے ساتھ خاص ہونے میں ہے اور ذبح کا حرم کے ساتھ خاص ہونا بالاقفاق شرط ہے اگر غیر حرم میں کسی نے جانور ذبح کر دیا تو اس کا ذمہ بری نہ ہوگا جب تک کہ حرم میں ذبح نہ کریں۔ حلق اور طواف میں ترتیب واجب نہیں ہے اور اسی طرح رمی اور طواف میں بھی ترتیب واجب نہیں ہے۔ پس یہ جو کہا گیا ہے کہ ترتیب رمی، حلق اور طواف کے درمیان واجب ہے صحیح نہیں ہے۔

۲۶۵۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُسْتَلُّ يَوْمَ النَّحْرِ بِمَنْى فَيَقُولُ لَا حَرَجَ فَسَأَلَهُ رَجُلٌ فَقَالَ

رَمَيْتُ بَعْدَ مَا أَمْسَيْتُ فَقَالَ لَا حَرَجَ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۵۹۱۳ الحدیث رقم ۱۷۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے نحر کے دن پوچھا گیا منیٰ میں۔ فرماتے ہیں کوئی گناہ نہیں پس آپ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں نے کنکریاں ماری ہیں شام ہونے کے بعد پس فرمایا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ”شام ہونے کے بعد“ سے مراد بعد عصر ہے اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہے بلکہ اس وقت رمی کرنا بالاتفاق جائز ہے یہاں تک کہ یوم نحر کو بھی جائز ہے۔ اور جب سورج غروب ہو جائے تو رمی کا وقت فوت ہو جاتا ہے اس کے بعد رمی کرنے والے پر دم واجب ہوگا۔ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق۔

حنفیہ کے ہاں اس بارے میں تفصیل ہے۔ شیخ الاسلام بسوط میں فرماتے ہیں کہ دسویں ذوالحجہ کو طلوع فجر کے بعد کا وقت کنکریاں مارنے کیلئے وقت جواز ہے مگر اسات کے ساتھ طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک کا وقت مسنون ہے زوال کے بعد سے غروب تک وقت جواز ہے بغیر اسات کے اور رات کا وقت جواز ہے۔ مگر کراہت کے ساتھ۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اسات کیلئے ضروری ہے کہ یہ تاخیر بلا عذر ہو چنانچہ کمزوروں کا طلوع شمس سے پہلے رمی کرنا اور چرواہوں کارات کے وقت رمی کرنا موجب اسات نہیں ہے اور ہوگا کیسے جبکہ ان کو اجازت حاصل ہے (اتھلی)۔ ابن ہمام کی یہ بات چرواہوں کے بارے میں درست اور کمزوروں کے بارے میں کمزور ہے۔ بموجب حدیث صحیح لائتموا الجمرۃ حتی تطلع الشمس پھر ابن ہمام فرماتے ہیں اگر کوئی شخص بلا عذر رمی میں اتنی تاخیر کرے کہ صبح ہو جائے تو وہ رمی کرے مگر اس پر دم واجب ہوگا یہ امام صاحب کا قول ہے۔ صاحبین کا اس سے اختلاف ہے (اتھلی)۔

یوم نحر کے بعد دونوں میں کنکریاں مارنے کا وقت مسنون زوال آفتاب کے بعد سے غروب آفتاب تک ہے اور غروب آفتاب کے بعد سے فجر طلوع ہونے تک کا وقت مکروہ ہے۔ لہذا فجر طلوع ہوتے ہی امام اعظم کے نزدیک وقت ادا ختم ہو جاتا ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک ادا طلوع فجر کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور وقت قضا بالاتفاق باقی رہتا ہے اور چوتھے دن کو آفتاب غروب ہوتے ہی بالاتفاق رمی کا وقت ادا اور قضاء فوت ہو جاتا ہے۔

الفصل الثانی:

افعال حج میں تقدیم و تاخیر معاف ہے

۲۶۵۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ آتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِنِّي أَقْضْتُ قَبْلَ أَنْ أَحْلِقَ قَالَ إِحْلِقْ أَوْ قَصِّرْ

وَلَا حَرَجَ وَجَاءَ آخَرَ فَقَالَ ذَبَحْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ قَالَ إِرْمِ وَلَا حَرَجَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۵۸/۳ الحدیث رقم ۹۱۶۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ تحقیق میں نے طواف افاضہ کیا ہے یعنی فرض طواف سرمنڈانے سے پہلے آپ ﷺ نے اس کو فرمایا سرمنڈالے یا کتر والے اور کوئی گناہ نہیں ہے اور ایک اور شخص آیا۔ اس نے کہا کہ میں نے کنکریاں پھینکنے سے ذبح کیا ہے فرمایا کنکریاں پھینکو اور کوئی گناہ نہیں ہے۔ امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ولا حرج: یعنی مفرد پر نہ گناہ ہے اور نہ فدیہ لازم ہے اور اگر قارن یا متمتع ہو تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے جب

تک کہ عمدانہ ہو لیکن ان پر کفارہ لازم ہوگا۔

الفصل الثالث:

۲۶۵۸: وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ شَرِيكٍ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ حَاجًّا فَكَانَ النَّاسُ يَأْتُونَهُ فَمِنْ قَائِلِ

يَا رَسُولَ اللَّهِ سَعَيْتَ قَبْلَ أَنْ أَطُوفَ أَوْ أَخْرْتُ شَيْئًا أَوْ قَدَّمْتُ شَيْئًا فَكَانَ يَقُولُ لَا حَرَجَ إِلَّا عَلَى رَجُلٍ
اِقْتَرَضَ عَرَضَ مُسْلِمٍ وَهُوَ ظَالِمٌ فَذَلِكَ الَّذِي حَرَجَ وَهَلَكَ - (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داود فی ۵۱۷/۲ الحدیث رقم ۲۰۱۵۔

ترجمہ: حضرت اسامہ بن شریک سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کرنے کے لیے نکلا۔ پس لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے پس بعض کہنے والوں میں سے کسی نے کہا اے اللہ رسول ﷺ میں نے طواف کرنے سے پہلے صفا و مروہ میں چکر لگایا میں نے ایک چیز بعد میں کی۔ یا ایک چیز پہلے کی۔ منی کے ایام کے افعال میں۔ حضور ﷺ فرماتے تھے کہ کوئی گناہ نہیں ہے لیکن گناہ اس شخص کو ہے کہ وہ آبروریزی کرے مسلمان کی۔ اس حال میں کہ وہ شخص ظالم ہے پس یہ شخص گنہگار رہے اور ہلاک ہوا۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

اسامہ بن شریک - یہ اسامہ بن شریک الذبیانی ثعلبی ہیں۔ شرف صحابیت سے فیض یاب ہوئے۔ اہل کوفہ میں ان کی احادیث زیادہ پھیلیں ان کا شمار کوفین میں ہی ہوتا ہے۔ ان سے زیادہ بن علاقہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ”شریک“ شین معجمہ کے فتح اور راء ہملہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: قولہ: سعیت قبل ان اطوف:

یعنی طواف افاضہ کرنے سے پہلے سعی کی یہ ظاہر آفاقی اور مکہ دونوں کو شامل ہے۔ اور یہی ہمارا مذہب ہے تقدیم و تاخیر میں افضلیت کے اختلاف کے ساتھ اور امام شافعی نے اس کو آفاقی کے ساتھ مقید کیا ہے۔

قولہ: افترض عرض مسلم وهو ظالم فذلك الذي حرج وهلك: ”افترض“: قاف کے ساتھ قطع کے معنی میں ہے۔ ”حرج“: راء کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی وقع من حرج۔ ”وهلك“: یہ عطف تفسیری ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ کعبہ کے اندر ۳۶ مرتبہ ماں کے ساتھ زنا کرنا مسلمان کی آبروریزی سے کم گناہ رکھتا ہے۔

﴿﴿﴾ بَابُ خُطْبَةِ يَوْمِ النَّحْرِ وَرَمِي أَيَّامِ التَّشْرِيقِ وَالتَّوْدِيعِ ﴿﴿﴾

قربانی کے دن خطبہ ایا م تشریق میں رمی اور طواف رخصت کا بیان

قولہ: خطبہ مراجعت فی الکلام کو کہتے ہیں۔ خطبہ ضمہ کے ساتھ وعظ کیلئے اور کسرہ کے ساتھ عورت طلب کرنے کیلئے آتا ہے۔

(ذکرہ طیبی)

”ورمی ایام التشریق“ خطبہ پر عطف ہے۔ ”والتودیع“ طیبی فرماتے ہیں کہ التشریق پر عطف ہے اور مراد ایام النفر ہیں جو طواف وداع کے بعد ہوتے ہیں (انتہی) اور صحیح یہ ہے کہ اس کا عطف رمی یا خطبہ پر ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کا طواف رخصت ایام نفر والی رات میں واقع ہوتا تھا۔ اور اس بات پر اتفاق ہونے کی وجہ سے کہ طواف رخصت ایام نفر اور اسکے ایام میں بھی جائز ہے بلکہ سب کے ہاں مکہ سے خروج تک مؤخر کرنا اولیٰ ہے تو ایام نفر کے ساتھ مقید کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی اور اس کے ساتھ یہ تکرار محض ہے جس کے اعادہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

الفصل الاول:

منیٰ کے مقام پر خطبہ

۲۶۵۹: عَنْ أَبِي بَكْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِيُّ ﷺ يَوْمَ النَّحْرِ قَالَ إِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ السَّنَةُ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ثَلَاثٌ مَتَوَالِيَاتٌ ذُو الْقَعْدَةِ وَذُو الْحِجَّةِ وَالْمَحْرَمُ وَرَجَبُ مَضَرَ الدُّمَى بَيْنَ جِمَادَى وَشَعْبَانَ وَقَالَ أَيُّ شَهْرٍ هَذَا قُلْنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ فَقَالَ الْيَسَّ ذَا الْحِجَّةِ قُلْنَا بَلَى قَالَ أَيُّ بَلَدٍ هَذَا قُلْنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ قَالَ الْيَسَّ الْبَلَدَةُ قُلْنَا بَلَى قَالَ أَيُّ أَيُّ يَوْمٍ هَذَا قُلْنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ فَسَكَتَ حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ قَالَ الْيَسَّ يَوْمَ النَّحْرِ قُلْنَا بَلَى قَالَ فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا وَاسْتَلْقُون رِبَكُمْ فَيَسْأَلُكُمْ عَنْ أَعْمَالِكُمْ إِلَّا فَلَا تَرْجِعُوا بَعْدِي ضَلَالًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ إِلَّا هَلْ بَلَغْتُ قَالُوا نَعَمْ قَالَ اللَّهُمَّ اشْهَدْ فَلْيَبْلُغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ قُرْبٌ مُبْلَغٌ أَوْطَى مِنْ سَامِعٍ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۷۳/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۴۱۔ و مسلم فی ۱۳۰۷/۳ الحدیث رقم (۳۱-۱۶۷۹) وابن

ماجہ فی السنن ۸۵۱ الحدیث رقم ۲۳۳۔ والدارمی ۹۳/۲ الحدیث رقم ۱۹۱۶۔ واحمد فی المسند ۴۰/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوبکر ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو قربانی کے دن خطبہ دیا۔ فرمایا: تحقیق زمانہ اپنی وضع کی طرح اللہ تعالیٰ کے آسمان و زمین کو پیدا کر کے دن سے پھر گیا ہے یعنی سال بارہ مہینے کا ہو گیا ان میں سے چار مہینے باحرمت ہیں تین تو پے درپے ذیقعدہ ذی الحجہ اور محرم اور رجب مضر کا کہ جب وہ جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان میں ہو اور حضور ﷺ نے فرمایا کونسا مہینہ ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پھر سکوت فرمایا یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ اس کا نام ذی الحجہ کے علاوہ رکھیں گے پھر فرمایا گیا ذی الحجہ نہیں ہے ہم نے کہا ذی الحجہ مقرر ہے۔ فرمایا تو کونسی بستی ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ جانتے ہیں۔ پھر سکوت فرمایا یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ وہ اس کے نام کے علاوہ نام رکھیں گے فرمایا کہ کیا بلدہ نہیں ہے جو مکہ کا نام ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ بلدہ مقرر ہے۔ فرمایا کہ یہ کونسا دن ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں پھر سکوت کیا یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ وہ نام رکھیں گے۔ پھر فرمایا: کیا یہ نجر کا دن نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا ہاں! یوم نجر ہے۔ تحقیق تمہارا خون تمہارے اموال و تمہاری عزت تم پر اس دن کے حرام ہونے کی طرح۔ تمہاری اس بستی کے حرام ہونے کی طرح اور تمہارے اس مہینے کے حرام ہونے کی طرح حرام ہیں اور البتہ تم اپنے پروردگار سے ملو گے پس تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا پس خبردار میری وفات کے بعد گمراہ ہو کر پھر نہ جانا کہ بعض تمہارا بعض کی گردن مارے خبردار کیا میں نے احکام الہی تم تک پہنچا دیے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہاں پہنچا دیئے حضور ﷺ نے کہا اے الہی تو ان کے اقرار پر گواہ رہ تا کہ قیامت کے دن منکر نہ ہوں پس چاہیے کہ حاضر غائب کو پہنچا دے

پس بعض زیادہ پہنچائیں گے جو کہ زیادہ سننے والے ہیں۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: خطبنا النبی ﷺ یوم النحر بشافعیہ کے نزدیک ایام نحر کے پہلے دن خطبہ پڑھنا مستحب ہے جبکہ حنفیہ کے ہاں دوسرے دن مستحب ہے۔ جن احادیث صحیحہ میں خطبہ کو دوسرے دن کے ساتھ مقید کیا ہے وہ حنفیہ کی مؤید ہیں۔ اسی وجہ سے امام نووی نے شوافع کے اس مسئلے پر اشکال کیا ہے کہ اصحاب شوافع کہتے ہیں سنت ہے کہ امام یا اس کو نائب یوم نحر کو نماز ظہر کے بعد ایک خطبہ دے جس میں لوگوں کو احکام حج سکھائیں: امام نووی پھر فرماتے ہیں کہ نماز ظہر کے بعد کا قول مخالف ہے ان احادیث صحیحہ کا جن میں وقت چاشت کا ذکر ہے (انہی)۔ پس صحیح بات یہ ہے کہ حدیث میں مذکور خطبہ سے مراد وعظ و نصیحت کا خطبہ ہے اور جو معروف خطبہ ہے تو وہ یوم نحر کے دوسرے دن ارشاد فرمایا تھا۔

قولہ: ان الزمان قد استدار کھینتہ یوم خلق السموات والارض: ایک نسخہ میں ”کھینتہ یوم“ اضافت کے ساتھ ہے جو کہ روایت اور درایت دونوں طرح درست نہیں ہے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ ہیئت کسی چیز کی صورت شکل اور حالت کو کہتے ہیں اور کاف مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر یوں ہے استدار استدارۃ مثل حالہ۔

”الزمان“: زمان نام ہے وقت کا قلیل ہو یا کثیر ہو۔ اس حدیث میں الزمان سے مراد السنۃ یعنی سال ہے۔ یعنی زمانہ اپنی تقسیم میں سالوں کی طرف اور سال مہینوں کی طرف اصل حساب اور وضع جس کو اللہ نے آسمان و زمین پیدا کرتے وقت مقرر کیا تھا، کی طرف لوٹا۔

ہمارے علماء میں سے بعض محققین فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ زمانہ اس ترتیب کی طرف لوٹا جس ترتیب کو اللہ نے آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت مقرر کیا تھا اور وہ ترتیب یہ ہے کہ ہر سال بارہ مہینوں کا ہو اور مہینہ آنتیس یا تیس دنوں کا ہو: ایام جاہلیت میں عرب نے سال کے مہینوں میں تغیر کر دیا تھا ایک سال کو بارہ مہینے کا رکھتے تو ایک سال کو تیرہ مہینوں کا اسی طرح وہ حج کی ادائیگی کو ہر دو برس بعد ایک مہینہ مؤخر کر دیتے تھے۔ اور مؤخر کیا ہوا مہینہ ملغی ہو جاتا یہاں تک کہ یہ سال تیرہ مہینوں کا ہو جاتا اور سال کے مہینے تبدیل ہو جاتے وہ اشہر حرم کو حلال قرار دیتے اور جو مہینے اشہر حلال ہوتے ان کو حرام بنا لیتے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿انما النسبیۃ زیادۃ فی الکفر﴾ [التوبة: ۳۷] یہ ہٹا دینا کفر میں اور ترقی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے حساب کو باطل قرار دیا اور سال کے ہر مہینے کو اس کے اصل پر برقرار رکھا۔

چنانچہ حضور ﷺ نے جس سال حجۃ الوداع کیا ہے اس سال ذوالحجہ کا مہینہ اپنے اصل پر تھا اس لیے نبی ﷺ نے ”ان الزمان قد استدار کھینتہ“ ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو آگاہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مہینہ ماہ ذوالحجہ ہے اور حج کا یہی مہینہ ہے لہذا اس مہینے کو یاد رکھو اور زمانہ جاہلیت کی عادت کے مطابق ایک مہینہ دوسرے سے تبدیل نہ کرو (انہی)۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ اہل عرب جب ماہ حرام آتا اور ان کو اس مہینے میں لڑنا منظور ہوتا تو وہ اس ماہ کو حلال قرار دیتے اور اس کے بعد کسی اور مہینے کو حرام قرار دیتے اس طرح مہینوں کی جو اصل خصوصیت تھی اسے انہوں نے ترک کر دیا تھا صرف عدد کا اعتبار کر رکھا تھا (انہی) تو گویا کہ عرب نسی کے بارے میں مختلف رواج رکھتے تھے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فلا تظلموا فیہن انفسکم﴾ سوان میں ظلم مت کرو اپنے اوپر۔

بیضاوی فرماتے ہیں یعنی ان مہینوں کی جتنی حرمت اور ان میں ارتکاب حرام کے ساتھ۔ لیکن علماء کی اکثریت کہتی ہے کہ ان مہینوں

میں قتل و قتال کی حرمت منسوخ ہے ان کے نزدیک مذکورہ بالا آیت میں ظلم سے مراد ارتکاب معاصی ہے ان مہینوں میں کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے جیسا کہ حرم اور حالت احرام میں اس کا ارتکاب بہت بڑا گناہ ہے۔ عطاء کہتے ہیں کہ لوگوں کیلئے حرم اور اشہر الحرم میں لڑنا حلال نہیں الا یہ کہ ان سے لڑا جائے۔ اکثر علماء کے قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے شوال اور ذوالقعدہ میں طائف کا محاصرہ اور ہوازن کے ساتھ جہاد کیا تھا۔

عرب محرم کو صرف تک مؤخر کرتے تاکہ اس میں لڑائی کریں اور یہی وہی ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے اور یہ وہ ہر سال کیا کرتے تھے تو محرم تمام مہینوں میں گھومتا تھا۔ پس حجۃ الوداع کے سال محرم اپنے اصل کی طرف لوٹ آیا۔ جس اصل پر پہلے سے تھا اسی وجہ سے نبی ﷺ نے حج اس سال تک مؤخر کر دیا۔ لیکن اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ابو بکر کو حجۃ الوداع سے پہلے حج کرنے کا حکم فرمایا تھا حالانکہ بالاتفاق ذوالحجہ کے علاوہ کسی ماہ میں حج کرنا صحیح نہیں ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ میں نے اس مسئلے پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے پھر میں نے دیکھا کہ ابن حجر بھی اس قضیہ میں میرے موافق ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ حج جو سنہ ۸ھ کو امیر مکہ عتاب بن اسید کے امارت میں ہوا اور اس طرح وہ حج جو سنہ ۹ھ کو ابو بکر کے امارت میں ہوا تھا یہ ذوالحجہ میں تھے۔ اور زمانہ کی گردش ان سالوں میں پوری ہو گئی تھی کیونکہ یہ بات محال ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو ذوالحجہ کے علاوہ کسی مہینے میں حج کرنے کا حکم دیا ہو اور یہ حدیث اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ قد استدار اس حج اور اس سے پہلے پر صادق آتا ہے لہذا اس کا صل اس سال اور اس سے پہلے دو سالوں پر متعین ہوا۔

قوله: السنة اثنا عشر شهرا..... وشعبان:

”السنة اثنا عشرة شهرا“ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ جملہ متنافہ ہے جو کہ جملہ اولیٰ کیلئے بیان ہے۔

”منها اربعة حرم“ جس میں سے چار مہینے باحرمت ہے۔ ”ثلاث متواليات“: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مہینوں کی ابتداء کا اعتبار اس سے کیا گیا ہے پس ثلاث سے تاؤ کو حذف کر دیا اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں لیالیٰ کو تغلیب دی گئی ہے جیسا کہ اربعہ میں لیا تم کو تغلیب دیا ہے۔

”ذوالقعدة“ قاف کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

”ذوالحجة“ حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور کبھی اس سے ذو حذف کیا جاتا ہے۔

”والمحرم“ ذوالقعدہ پر عطف ہے۔

”و رجب مضر“ اس کا عطف ثلاث پر ہے اور الذی بین جمادی و شعبان سے جو اس کی تعریف بیان کی ہے تو یہ اس میں نسبتی سے پیدا ہونے والے شک او وہم کے ازالے کیلئے ہے۔ اور علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ زیادہ بیان کیلئے ہے۔

”مضر“ عمر کے وزن پر غیر منصرف ہے عرب کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے رجب کی نسبت اس قبیلے کی طرف کرتے ہیں اس لیے کہ یہ قبیلہ باقی مہینوں کے نسبت اس کو تعظیم زیادہ کرتے تھے اور باقی عرب۔ یہ بھی زیادہ کرتے تھے۔

”جمادی“ جم کے ضمہ اور دال کے فتح جس کے بعد الف رسم الخط میں یاء کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

قوله: ای شهر هذا: استفہام سے مقصود مکہ اور مہینہ کی حرمت ان کے دلوں میں راسخ کرنی تھی تاکہ اس پر ان باتوں کی بنیاد رکھے جن کا آپ ﷺ نے ادارہ فرمایا تھا۔

قوله: ای بلد هذا..... ایس البلدة: ”البلدة“ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ البلدة کا اطلاق مکہ پر غالب ہو گیا ہے کہ اب

البلدۃ بول کر مکہ بھی مراد ہوتا ہے جیسا کہ بیت کا اطلاق کعبہ پر ہے (آنحلی)۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ البلدۃ الی تعلمونها مکہ اور بعض نے البلدۃ کو نام قرار دیا ہے (آنحلی) اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ البلدۃ سے مراد الارض یعنی زمین ہے مٹی میں ہذا کے ساتھ اشارہ کرنے کے قرینہ سے۔ اور البلدۃ اگرچہ مکہ کا نام ہے لیکن کبھی بلدۃ بول کر مردار حرم ہوتا ہے اطلاق الککل وارۃ الجزء کے قبیل سے ہے۔ اور اسی سے ہے اللہ کا قول:

﴿انما امرت ان اعبد رب هذه البلدۃ الذی حرمها﴾ ”مجھ کو یہی حکم ہے کہ ہندگی کروں اس شہر کے مالک کی جس نے اس کو حرمت دی۔“

اور اس میں شک نہیں کہ تحریم پورے حرم کو شامل ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے مہینے، دن اور شہر کا نام اس لیے پوچھا کہ تاکہ لوگوں کے ذہن میں اس مہینے دن اور شہر کی حرمت جاگزیں ہو اور اس پر عمل کرنے کا پورا عزم و یقین پیدا کریں جیسے بعد میں بیان کرنا مقصود تھا۔ آپ ﷺ کے سوال کے جواب میں لوگوں کا یہ کہنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں نہ صرف ازراہ ادب تھا بلکہ اس سے یہ جاننا بھی مقصود تھا کہ اس سوال سے آپ ﷺ کی غرض کیا ہے۔

قوله: فان دمانکم و اموالکم و اعراضکم..... فی شہرکم هذا:

مکہ میں ارتکاب معاصی بہت بڑا جرم ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اور اس کے متعین کی ایک جماعت نے کہا کہ مکہ میں معاصی دگنا ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اس میں حسنات دگنا ہو جاتے ہیں لیکن قابل اعتبار بات یہ ہے کہ مکہ میں گناہ کا دگنا ہونا کیفیت کے لحاظ سے ہے نہ کہ کیت کے لحاظ سے۔ تاکہ یہ اللہ کے اس قول کے مخالف نہ ہو ﴿ومن جاء بالسنیۃ فلا یجزی الا مثلها﴾ [الانعام: ۱۶۰] اور جو شخص برا کام کرے سوا سوا کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی۔ اور اللہ کا قول ﴿ومن یرد فیہ بالحداد بظلم نذقه من عذاب الیم﴾ [الحج: ۲۰] اور جو اس میں چاہے بیڑھی راہ شرارت سے اسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک (تفسیر عثمانی)۔ یہ تعدد کے دعویٰ کرنے والوں کیلئے دلیل نہیں بن سکتی بلکہ اس سے مراد گناہ کا عظیم ہونا ہے جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے۔

قوله: فلا ترجعوا بعدی ضلالا:

”ضلالا“ ضاء کے ضمہ لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔ ضال کی جمع ہے۔

”یضرت بعضکم الخ“ استناف میں ہے یا حال ہے اور ایک نسخہ میں حزم کے ساتھ ہے تو اس صورت میں یہ جواب نہیں ہے۔ بعض روایات میں لفظ ضلالا کے بجائے کفارا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میرے وفات کے بعد تم اعمال میں کافروں کے مشابہ نہ ہونا کہ تم بھی ایک دوسرے کے گردن مارنے لگو۔

قوله: اللهم اشهد..... فرب مبلغ او علی من سامع: ”الا“ برائے تنبیہ ہے۔

”مبلغ“ لام مفتوحہ کے ساتھ جس تک حدیث پہنچائی جائے۔ ”بلغت“ لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔

”فلیبلغ“ تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔

”فرب مبلغ او علی من سامع“: اس جملے میں غائبین کیلئے تسلی اور تابعین کیلئے تقویت اور اشارہ ہے کہ اللہ کا درس لکھیں کیلئے کھلا ہے اور اس کے درس سے دھتکارے نہیں جاتے مگر ہالکین۔

رمی کے وقت کا بیان

۲۶۶۰: وَعَنْ وَبْرَةَ قَالَ سَأَلْتُ ابْنَ عُمَرَ مَتَى أَرْمِي الْجِمَارَ قَالَ إِذَا رَمَى إِمَامُكَ فَأَرْمِهِ فَأَعَدْتُ عَلَيْهِ

الْمَسْأَلَةَ فَقَالَ كُنَّا نَتَحَيَّنُ لَهَا إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ رَمِينًا - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۷۹/۳ الحدیث رقم ۱۷۴۶ - وابوداؤد فی السنن ۴۹۶/۲ الحدیث رقم ۱۹۷۲ -

ترجمہ: حضرت وبرةؓ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عمرؓ سے پوچھا کہ میں کس وقت کنکریاں پھینکوں مناروں پر یعنی گیارہوں بارہویں ذی الحجہ کو فرمایا جس وقت تیرا امام پھینکے یعنی تو بھی رمی میں پیروی کر۔ کہ وہ نسبت تیرے زیادہ جانتا ہے رمی کے وقت کو پھر میں عرض کیا مسئلہ یعنی میں نے تحقیق چاہی رمی کے وقت کی۔ پس فرمایا کہ ہم انتظار کرتے تھے یعنی رمی کے وقت کا جس وقت دو پہر ڈھلے تو ہم رمی کرتے یعنی کنکریاں پھینکتے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا۔

راوی حدیث:

وبرة بن عبد الرحمن - یہ وبرہ ہیں۔ عبد الرحمن کے بیٹے ہیں۔ کنیت ابو خزیمہ ہے۔ ”بنو حارث“ میں سے ہیں۔ انہوں نے ابن عمر اور سعید بن جبیر سے روایت حدیث کی ہے۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ”وبرہ“ میں واؤ اور باء دونوں مفتوح ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ باء ساکن ہے۔

تشریح: قولہ: اذا رمى امامك فارمه: ”فارمہ“ ہاء ضمیر کے ساتھ ہے یا ہاء سکتہ کی ہے پہلے کے مطابق تقریر ’ارم موضع الجمرة يارم الرمي يا الحصى‘ ہوگی۔

یعنی رمی میں اس شخص کی پیروی کر جو رمی کے وقت کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہو۔ اور اس کی تائید بعض حضرات کے اس قول سے ہوتی ہے ”من تبع عالمًا لقي الله سالمًا“ جس نے جاننے والے کی پیروی کی تو اللہ سے سلامتی کی حالت میں ملے گا۔ باقی ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ امام اعظم یعنی وقت کا حکمران اگر حج میں موجود ہو تو اس کی پیروی کرے ورنہ امیر حج کی کرے۔ تو اس کے بارے میں بات یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں ان کی پیروی کرنا جائز نہیں ہے۔

فقوله: فقال كنا نتحین فاذا زالت الشمس رمينا:

”رمینا“ بغیر ضمیر کے ہے اور ایک نسخ میں رمینا ہے۔

ابن ماجہ کی روایت میں بعد صلوة الظهر کی تصریح ہے اور وہ زیادہ مناسب ہے تقدیم الہم فالہم کے اعتبار سے۔

حضرت ابن عمرؓ کا کنکریاں مارنے کا طریقہ

۲۶۶۱: وَعَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ يَرْمِي جَمْرَةَ اللَّهِ نِيَابَسِجٍ حَصِيَّاتٍ يَكْبُرُ عَلَىٰ إِنْزَالِ كُلِّ حَصَاةٍ ثُمَّ يَتَقَدَّمُ حَتَّىٰ يُسَهِّلَ فَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ طَوِيلًا وَيَدْعُوا وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ ثُمَّ يَرْمِي الْوُسْطَىٰ بِسِجِّ حَصِيَّاتٍ يَكْبُرُ كَلِمًا رَمَىٰ بِحَصَاةٍ ثُمَّ يَأْخُذُ بِذَاتِ الشِّمَالِ فَيُسَهِّلُ وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ثُمَّ يَدْعُو وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ وَيَقُومُ طَوِيلًا ثُمَّ يَرْمِي جَمْرَةَ ذَاتِ الْعُقْبَةِ مِنْ بَطْنِ الْوَادِي بِسِجِّ حَصِيَّاتٍ يَكْبُرُ عِنْدَ كُلِّ حَصَاةٍ وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا ثُمَّ يَنْصَرِفُ فَيَقُولُ هَكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقْعَلُهَا - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۸۲/۳ الحدیث رقم ۱۷۵۲ -

ترجمہ: حضرت سالمؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ منارے کے نزدیک سات کنکریاں پھینکتے تھے اور وہ ہر کنکری پر اللہ اکبر کہتے تھے پھر آگے بڑھتے یہاں تک کہ نرم زمین پر آتے پھر قبلے کے

سامنے دیر تک سورہ بقرہ پڑھنے کی بقدر کھڑے رہتے اور دعا مانگتے اور ہاتھ اٹھاتے پھر سات کنکریاں اللہ اکبر کہہ کر درمیانی برجی پر پھینکتے۔ جب کنکری پھینکتے تو پھر بائیں طرف چلتے یہاں تک کہ نرم زمین پر آتے اور قبلے کے سامنے کھڑے ہوتے۔ پھر دعا مانگتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے اور دیر تک کھڑے رہتے اور پھر جمرہ عقبہ پر نالے کے اندر سے سات کنکریاں پھینکتے۔ ہر کنکری پر اللہ اکبر کہتے تھے اور اس کے نزدیک نہ ٹھہرتے پھر لوٹتے اور کہتے کہ اس طرح سے میں نے نبی کریم ﷺ کو کرتے دیکھا ہے۔

تشریح: قوله: انه كان يرمى جمره الدنيا بسبع حصيات..... حتى يسهل:

جمرة الدنيا سے مراد قرہی جمرہ جو کہ جمرة العقبہ ہے اور یہ پہلا جمرہ ہے اور اس کو قریب اس لیے کہا ہے کہ یہ مسجد خیف کے پاس ٹھہرنے والوں کے منازل کے قریب ہے اور یہاں نبی ﷺ کے اونٹ بٹھانے کی جگہ بھی تھی۔
”بسع حصيات“ یعنی ایام تشریق کے ہر دن۔

”یکبر“ ابن ہمام کہتے ہیں عبد اللہ ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ اور حضرت جابر وغیرہ کی حدیث میں بھی اسی طرح ہے۔ روایات کے ظاہر سے لگتا ہے کہ اللہ اکبر پر اکتفا کرنا چاہیے لیکن بعض روایات میں ”بسم اللہ“ کی زیادت ہے بعض میں ”رغما للشيطان ورضا للرحمن، اللهم اجعله حجاً مبروراً وسعياً مشكوراً وذنباً مغفوراً“ ہے۔

”علی اثر کل حصاة“: ایک روایت میں ”کل حصاة“ ہے۔ اور ایک روایت میں عند کل حصاة ہے اور وہ زیادہ عام ہے۔
”حتی يسهل“ یاء کے ضم اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی مکان سہل میں داخل ہو جاتے۔
قوله: فيقوم مستقبل القبلة..... بسبع حصيات: ”فيقوم“ مرفوع ہے بتقديم پر عطف ہے۔

”مستقبل القبلة“ اور ایک صحیح نسخہ میں فیستقبل القبلة ہے۔ ”طويلاً“ موصوف محذوف ہے یعنی قیاماً طويلاً۔ (دیر تک ٹھہرتے)۔

”ويدعو“ بخاری کی روایت میں ”قدر سورة البقرة“ ہے۔ ”جمرة ذات العقبة“ جمرہ کی اضافت کے ساتھ ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ اگر اوپر کی جانب سے جمرہ عقبہ پر کنکریاں پھینکی جائے تو اس طرح بھی جائز ہے مگر خلاف سنت ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا شیبی حصے سے کنکری پھینکنا یہ سنت ہے نہ کہ واجب ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے صحابہ کی رمی اوپر کی جانب سے ثابت ہے مگر ان کو اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ اور نہ ہی لوگوں میں اس کا اعلان کیا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ابن مسعود سے منقول ہے کہ انہوں نے بطن داوی سے جمرہ عقبہ پر کنکریاں پھینکی اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔

ان سے پوچھا گیا کہ لوگ اوپر کی طرف سے کنکریاں پھینکتے ہیں؟ عبد اللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں یہ وہ مقام ہے جہاں سورہ بقرہ نازل ہوئی اور آپ ﷺ کا رمی کیلئے اس جگہ کو پسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اوپر سے کنکریاں پھینکی جائے تو اس میں نیچے سے گزرنے والوں کو تکلیف اور ایذا کا خطرہ ہے۔ برخلاف نیچے کی طرف سے پھینکنے کے کہ اس میں یہ خطرہ نہیں ہے کہ اوپر والوں کو تکلیف پہنچ جائے (انتہی) اور اس کی تائید تمام جہات سے رمی کی جواز سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے صرف ایک ہی جہت سے رمی کی ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں، جمرہ عقبہ کے علاوہ جمرہ اولیٰ اور جمرہ وسطیٰ کے بعد پاس ٹھہرنے اور دعا کرنے کی تخصیص کی حکمت واضح نہیں ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ پہلے دن مشاغل کی کثرت یعنی ذبح، حلق، مکہ کی طرف لوٹنے کی وجہ سے جمرہ عقبہ کے بعد یہ نہیں ہے تو یہ

امور یوم اول کے بعد والے ایام میں منع ہے تو وہاں بھی اس کے بعد وقوف اور دعائیں ہیں۔ مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حجرہ عقبہ کے بعد وقوف راستے میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کیلئے وہاں سے گزرنا ممکن نہیں ہوتا اور وقوف کرنے والوں کا نجوم ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے لوگ بہت بڑے ضرر میں پڑ جاتے ہیں برخلاف باقی جمرات کے کیونکہ وہ راستے میں نہیں ہے بلکہ راستے سے ہٹ کر ہیں۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ مذکورہ ترتیب واجب ہے یا سنت ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے میرے نزدیک ترتیب کا مسنون ہونا قوی ہے نہ کہ واجب۔ واللہ اعلم

نلا علی قاری فرماتے ہیں کہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس ترتیب کو ترک نہ کیا جائے کیونکہ یہ ترتیب امام شافعی وغیرہ کے نزدیک واجب ہے۔ پھر پے در پے رمی کرنا سنت ہے جیسا کہ وضوء میں ہے جبکہ امام مالک کے مسلک میں واجب ہے۔

منی میں رات ٹھہرنے کا حکم

۲۶۶۲: وَعَنْ بِنِ أَعْمَرَ قَالَ اسْتَأْذَنَ الْعَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَبِيتَ بِمَكَّةَ لَيْلَىٰ مَنَىٰ مِنْ أَجْلِ سِقَايَتِهِ فَأَذِنَ لَهُ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۹۰/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۴۵۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۵۳/۲ الحدیث رقم (۳۴۶)۔ (۱۳۱۵)۔ و ابوداؤد فی السنن ۴۹۱/۲ الحدیث رقم ۱۹۵۹ و ابن ماجہ فی ۱۰۱۹/۲ الحدیث رقم ۳۰۶۵۔ والدارمی فی ۱۰۲/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۳ واحمد فی المسند ۱۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب نے حضور ﷺ سے اجازت مانگی رات کو مکے میں رہنے کی اور مناک کی راتوں میں سبیل زمزم کی خدمت کے لیے۔ پس حضور ﷺ نے ان کو اجازت دے دی۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: طواف افاضہ کے بعد آب زمزم پینا مستحب ہے اگر ازدحام کی وجہ سے کنویں سے پانی نہ پی سکے تو وہ ان حوضوں سے پی لے۔ یہ آب برکت ہے۔

ان حوضوں کی نگرانی قصی کے ہاتھ میں تھی پھر ان کے بعد ان کے بیٹے عبدمناف کے ہاتھ پھر ان کے بعد ان کے بیٹے ہاشم کے ہاتھ پھر ان کے بیٹے عبدالمطلب کو حاصل ہوئی پھر ان سے ان کے بیٹے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ پھر ان کے بعد ان کے بیٹے عبد اللہ کو یہ نگرانی ملی اور ان کے بعد ان کے بیٹے علی کو ملی اور اسی طرح اب تک جاری ہے لیکن ان کے ساتھ ان کے مددگار رہتے تھے جن کے ذریعے وہ اس خدمت کو سرانجام دیتے۔ علماء کہتے ہیں کہ اب یہ خدمت ہمیشہ کیلئے آل عباس کو حاصل ہے۔

بعض حنفی علماء کہتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی طرح جس شخص کے سپرد زمزم پلانے کی خدمت ہو یا جس کو شہید عذر للاحق ہو تو اس کیلئے جائز ہے کہ جو راتیں منی میں گزاری جاتی ہیں وہ ان میں منی کا قیام ترک کر دے۔ گویا اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ بلا عذر سنت کو ترک کرنا جائز نہیں ہے اور کسی عذر کی بناء پر سنت ترک کرنے میں کوئی اساعت بھی نہیں ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک اکثر راتیں منی میں گزارنا واجب ہے۔

اعذار میں سے جان کا خطرہ، مال کا خطرہ اور مریض کے ضیاع کا خطرہ یا ایسی بیماری کا خطرہ ہے جس کے ساتھ منی میں رات گزارنا عادی مشقت کے علاوہ مشقت کے بغیر ممکن نہ ہو۔ ہے۔

آبِ زَمْزَمِ پِلَانَا ثَوَابُ هِيَ

۲۶۶۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ جَاءَ إِلَى السِّقَايَةِ فَاسْتَسْقَى فَقَالَ الْعَبَّاسُ يَا فَضْلُ اذْهَبْ إِلَى أُمِّكَ فَأَنْتِ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بِشَرَابٍ مِنْ عِنْدِهَا فَقَالَ اسْقِنِي فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّهُمْ يَجْعَلُونَ أَيْدِيَهُمْ فِيهِ قَالَ اسْقِنِي فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ أَتَى زَمْزَمَ وَهُمْ يَسْقُونَ وَيَعْمَلُونَ فِيهَا فَقَالَ اعْمَلُوا فَإِنَّكُمْ عَلَى عَمَلٍ صَالِحٍ ثُمَّ قَالَ لَوْلَا أَنْ تَغْلَبُوا لَنَزَلْتُ حَتَّى أَضَعَ الْحَبْلَ عَلَى هَذِهِ وَأَشَارَ إِلَى عَاتِقِهِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۹۱۱۳۔ الحدیث رقم ۱۶۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ کی سبیل کی طرف تشریف لائے پس زَمْزَمِ کا پانی مانگا پس عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو کہا: اے فضل! تو اپنی ماں کے پاس جا اور نبی کریم ﷺ کے لیے پانی لے کر آ۔ یعنی وہ پانی مستعمل نہ ہو۔ پس حضور ﷺ نے فرمایا مجھ کو اس میں سے پلا۔ پس حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ کے رسول! لوگ اپنے ہاتھ اس میں ڈالتے ہیں۔ فرمایا مجھ کو اسی میں سے پلا پس حضور ﷺ نے اس پانی میں سے پیا پھر زَمْزَمِ کے کنویں کے پاس آئے اور لوگ یعنی اولاد عبدالمطلب لوگوں کو پانی پلاتے تھے اور پلانے میں محنت کرتے تھے پھر فرمایا کام کیے جاؤ تم ایک نیک کام کے اوپر ہو فرمایا اگر مجھے خوف نہ ہوتا لوگ غلبہ کریں گے یعنی لوگ میری اتباع سنت سے پانی کھینچنے میں تم پر غالب آ جائیں گے اور تم لوگوں کو پانی کھینچنے نہیں دیں گے اور یہ کام تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے گا یعنی میں اترتا اپنی اونٹنی پر سے کہ حضور ﷺ سوار تھے اس پر تا کہ لوگ دیکھیں اور احکام سیکھیں یہاں تک میں اس پر رتی رکھتا اور اپنے کندھے کی طرف اشارہ فرمایا۔

تشریح: ”اسقنی“ ہمزہ وصلی کے ساتھ ہے یا قطعی کے ساتھ ہے۔ ”حتی اضع“ رفع اور نصب دونوں کے ساتھ ہے۔

قولہ: يَجْعَلُونَ اَيْدِيَهُمْ فِيهِ: حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اس بات کا مطلب یہ تھا کہ اکثریت لوگوں کی ایسی ہوتی ہے کہ جن کے ہاتھ صاف نہیں ہوتے۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اسی حوض سے پانی پیا گویا کہ یہ بات اس روایت کے مانند ہے جس میں منقول ہے کہ آپ ﷺ بوضوء کا بچا ہوا پانی ازراہ تبرک پینا پسند فرماتے تھے اور دارقطنی نے حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ یہ چیز تو واضح میں داخل ہے کہ آدمی اپنے بھائی کا جھوٹا پئے۔ لوگوں میں یہ حدیث مشہور ہے: ”سور المؤمن شفا“ مؤمن کا جھوٹا شفا ہے۔ لیکن یہ حدیث غیر معروف ہے۔

مسند احمد اور مجمع طہرانی میں روایت ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ نبی ﷺ زَمْزَمِ کے پاس آئے تو ہم نے ان کیلئے ایک ڈول پانی نکالا تو آپ ﷺ نے پیا اور اس ڈول میں کلی کی پھر ہم نے اس کو زَمْزَمِ کے کنویں میں ڈال دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آ جائیں گے تو میں اپنے ہاتھ سے پانی نکالتا۔

ایک روایت میں جو عطاء سے منقول ہے یہ بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ جب طواف افاضہ کر چکے تو آپ ﷺ نے زَمْزَمِ کے کنویں سے ڈول میں پانی کھینچا اور اس کھینچنے میں آپ ﷺ کے ساتھ کوئی اور شریک نہ تھا پھر آپ ﷺ نے اسے پیا اور جو بیچ گیا اسے کنویں میں ڈال دیا۔

ان روایات اور حدیث الباب میں مطابقت ظاہر ہے کہ پہلے از وحام کی وجہ سے نہیں اترے ہوں گے اور بعد میں پانی کھینچا تو ان

روایات کا تعلق دوسری مرتبہ کے ساتھ ہے۔

۲۶۶۳: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالْمَحْصَبِ

ثُمَّ رَكِبَ إِلَى النَّبِيِّ فَكَفَّافٍ بِهِ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۸۵۱۳۔ الحدیث رقم ۱۷۵۶۔ والدارمی فی السنن ۷۷/۲ الحدیث رقم ۱۸۷۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی اور عصر اور مغرب کی اور عشاء کی پھر سو رہے تھوڑا سا سونا محصب میں پھر سوار ہو کر خانہ کعبہ کی طرف تشریف لائے اور اس کا طواف کیا یعنی طواف الوداع۔

اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ثم رقد رقدة بالمحصب: ”بالمحصب“: جار مجرہ میں ”تنازع“ ہے۔

”المحصب“: صاع کی تشدید کے ساتھ ہے اصل میں ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کنکریاں زیادہ ہو۔ یہاں وہ گھائی مراد ہے جس کے ایک طرف منیٰ ہے اور دوسری جانب ابلح کے ساتھ متصل ہے اس سے راوی نے دونوں میں فرق نہیں کیا اس روایت میں ”صلی بالمحصب“ ذکر کیا ہے اور ایک اور روایت میں بالا بطح ذکر کیا ہے اور اس کو بطحاء بھی کہتے ہیں۔ ابن ہمام کہتے ہیں کہ یہ مکہ اور منیٰ کے درمیان ایک جگہ ہے جو کہ منیٰ کے زیادہ قریب ہے لیکن اس کی تحدید ثابت نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فناء مکہ ہے اور اس کی حدود ان دو پہاڑوں کے درمیان سے جو مقابر کے متصل ہے اس کے مقابل پہاڑوں تک ہے لیکن مقبرہ محصب میں شامل نہیں ہے۔ اس جگہ کو خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ تحصیب یہ ہے کہ آدمی منیٰ سے مکہ رخصت کرنے کیلئے آئے اور اس گھائی میں ٹھہرے جس سے ابلح کی طرف نکلتے ہیں اور رات کو تھوڑی دیر کیلئے وہاں سوئے پھر مکہ داخل ہو اور ابن عمر اس کو سنت سمجھتے تھے۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس سے ان لوگوں کے قول سے احتراز ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ ارادۃ نہیں تھا لہذا یہ سنت نہ ہو۔ کیونکہ بخاری میں ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ”لیس التحصیب بشئ انما هو منزل نزلہ رسول اللہ ﷺ“ کہ تحصیب کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ایک جگہ ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایا تھا۔

اور مسلم میں ابورافع کا قول منقول ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے ابلح میں قیام کا حکم نہیں تھا جب منیٰ سے نکلے لیکن میں آیا اور خیمہ وہاں لگایا تو آپ ﷺ وہاں آ کر ٹھہرے۔ قول مختار کی دلیل وہ روایت ہے جو محدثین کی ایک جماعت نے اسامہ بن زیدؓ سے روایت کی ہے کہ اسامہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ کے رسول! آپ ﷺ کل حج کے موقع پر کہاں ٹھہریں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عقیل نے ہمارے لیے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟ پھر فرمایا ہم خیف بنی کنانہ جہاں کفار قریش نے قسمیں اٹھائی تھی۔ میں اتریں گے۔ یعنی محصب میں۔

صحیحین میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم منیٰ میں تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کل ہم خیف بنی کنانہ جہاں کفار قریش نے قسمیں اٹھائی تھیں میں قیام کریں گے۔ اس جگہ میں قریش اور بنی کنانہ نے آپس میں قسمیں اٹھائی اس بات پر کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب سے نکاح اور معاملات نہیں کریں گے، یہاں تک کہ وہ اس جگہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے حوالہ نہ کریں۔ (انہی)

پس اس سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ وہاں ارادتا ٹھہرے تھے تا کہ اللہ کی مہربانی جو اس نے آپ ﷺ پر کی ہے وہ دیکھ لیں اور وہ نعمت یاد کر لیں جو اللہ نے آپ ﷺ پر کی۔ اس حال اور کفار کے آپ ﷺ کو محصور کرنے کے درمیان موازنہ نہ کر کے۔ اور یہ سارا کام

عبادت ہی ہے۔ پھر یہ نعمت جو آپ ﷺ کو نصراور آپ ﷺ کو اقامت توحید کی قدرت دیتا اور قواعد الہی کی مضبوطی جس کی طرف اللہ نے اپنے بندوں کو بلایا تاکہ اس کی وجہ سے ان کو دنیا و آخرت میں فائدہ ہو، کو شامل ہے بغیر کسی شک کے امت پر بہت بڑی نعمت ہے۔ پس اس کے بارے میں ہر ایک کیلئے سوچنا اور اس پر شکر ادا کرنا مناسب ہے تو یہ کام کرنا ان کیلئے بھی سنت ہے کیونکہ ان کے حق میں بھی یہ عبادت ہے اور اسی وجہ سے خلفاء راشدین نے تھیب کی۔

مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ، ابو بکر، عمر، طلحہ میں قیام فرماتے تھے اور ابن عمر تھیب کو سنت سمجھتے تھے۔ اور منی سے جانے والے دن کی نماز ظہر ابن عمر تھیب میں ادا کرتے تھے۔ نافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد خلفاء نے تھیب کی ہے۔

۲۶۶۵: وَعَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ رَفِيعٍ قَالَ سَأَلْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قُلْتُ أَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ عَقَلْتَهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ آيِنَ صَلَّى الظُّهْرَ يَوْمَ التَّرْوِيَةِ قَالَ بِمِنَى قَالَ فَآيِنَ صَلَّى الْعَصْرَ يَوْمَ النَّفْرِ قَالَ بِالْأَبْطَحِ ثُمَّ قَالَ أَفْعَلُ كَمَا يَفْعَلُ أَمْرًاؤُكَ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۰۷/۳ - الحديث رقم ۱۷۶۳ - ومسلم فى صحيحه ۹۵۰/۲ الحديث رقم ۳۳۶ - (۱۳۰۹) - وابوداؤد فى السنن ۶۷۱/۲ الحديث رقم ۱۹۱۲ - والترمذى فى ۲۹۶/۳ الحديث رقم ۹۶۴ - والنسائى فى ۲۴۹/۵ الحديث رقم ۲۹۹۷ -

ترجمہ: حضرت عبدالعزیز بن رفیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ مجھ کو اس چیز کی خبر دو کہ جو آپ نے جانی کہ پیغمبر ﷺ نے ظہر کی نماز آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو کہاں پڑھی؟ انس رضی اللہ عنہ نے کہا منیٰ میں عبدالعزیز نے کہا یعنی میں نے انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ ﷺ نے نفر کے دن نماز کہاں پڑھی؟ تو انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابطح میں نماز پڑھی پھر انس نے کہا کہ تو ایسا کر جیسا کہ تیرے سردار کرتے ہیں۔ اسکو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: سالت انس بن مالک قلت:..... قال بمنی:

”قلت“ ”سئلت“ سے بدل ہے۔ قولہ: قال فاین صلی الظهر يوم التروية: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی نماز جو آپ ﷺ نے ابطح میں پڑھی تھی وہ عصر کی نماز تھی اور حضرت انس کی سابق حدیث میں تصریح ہے کہ وہ ظہر کی نماز تھی لیکن یہ اس بات کا مخالف ہے کہ آپ ﷺ تمام ایام کے رمی پر ظہر کو مقدم کرتے تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی رمی زوال کے بعد ہوتی تھی۔ اگرچہ امام ابوحنیفہ نے چوتھے دن میں دن کے شروع سے رمی کو جائز قرار دیا ہے مگر کراہت کے ساتھ اور باقی تمام ائمہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ لیکن کوئی بعید نہیں کہ یوم نفر کو آپ ﷺ نے ظہر کو مؤخر کر دیا ہو اظہار رخصت کیلئے عزیمت کے بیان کے بعد۔

قولہ: افعَلُ کَمَا یَفْعَلُ امراتک: مطلب یہ ہے کہ تم اس بارے میں اپنے امیروں کی پیروی کرو کہ جس طرح وہ کریں اسی طرح تم کرو تاکہ ان کی مخالفت کرنے کی وجہ سے کوئی فتنہ انگیزی نہ ہو تو اس سے معلوم ہوا کہ عذر کی وجہ سے ان کو ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، نہ کہ وہ بات ہے جو ابن حجر نے کہ ہے کہ یہ یورسول اللہ ﷺ کے بارے میں مذکور ہوا یا احکام میں حج میں سے نہیں ہے۔

ہاں واجب بالاتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف سنت ہونے اور نہ ہونے میں ہے۔

۲۶۶۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ نَزُولُ الْأَبْطَحِ لَيْسَ بِسُنَّةٍ إِنَّمَا نَزَلَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِأَنَّهُ كَانَ أَسْمَحَ لِحُرُوجِهِ إِذَا حَرَجَ۔

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۹۱/۳ - الحديث رقم ۱۷۶۵ - ومسلم فى ۹۵۱/۲ الحديث رقم ۳۳۹ - (۱۳۱۱)۔

وابوداؤد فی السنن ۵۱۳/۲ رقم الحدیث ۲۰۰۸ والترمذی ۲۶۴/۳ الحدیث رقم ۹۲۳۔ وابن ماجہ ۱۰۱۹/۲ الحدیث رقم ۳۰۶۷ واحمد فی المسند ۲۳۰/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اٹح میں اترنا سنت نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ اس لیے اترتے تھے کہ اس میں اترنا بہت آسان تھا نکلنے کے لیے اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: لیس بسنتہ: تھیب کی تفصیل پہلے گزر گئی ہے۔ اور سنت نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ سنت قصدی نہیں ہے یا سنن حج میں سے نہیں ہے اور اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک اور روایت ہے جس میں ہے ”لیس من المناسک“ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ ہو کہ یہ واجبات میں سے نہیں ہے یا سنت مؤکدہ میں سے نہیں ہے علامہ طبری فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اٹح میں اس غرض سے ٹھہرے تھے تاکہ وہاں سامان وغیرہ چھوڑ کر مکہ جائیں اور وہاں طواف وداع کریں اور جب مکہ سے مدینہ واپس ہوں تو آسانی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمرۃ القضاء کا بیان

۲۶۶۷: وَعَنْهَا قَالَتْ أَحْرَمْتُ مِنَ التَّعْمِيمِ بِعُمْرَةٍ فَدَخَلْتُ فَفَقَصَيْتُ عُمْرَتِي وَانْتَظَرَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْأَبْطَحِ حَتَّى فَرَعْتُ فَأَمَرَ النَّاسَ بِالرَّحِيلِ فَخَرَجَ فَمَرَّ بِالْبَيْتِ فَطَافَ بِهِ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَدِينَةِ هَذَا الْحَدِيثُ مَا وَجَدْتُهُ بِرِوَايَةِ الشَّيْخَيْنِ بَلْ بِرِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ مَعَ اخْتِلَافٍ يَسِيرٍ فِي آخِرِهِ.

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۱۲/۲ الحدیث رقم ۲۰۰۵۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے تعمیم سے عمرے کا احرام باندھا۔ پس میں مکہ میں داخل ہوئی اور میں نے اپنا عمرہ ادا کیا یعنی جو کہ حیض کی وجہ سے رہ گیا تھا اس کی قضا کی جیسا کہ حجۃ الوداع کے باب میں آیا ہے اور رسول خدا ﷺ نے اٹح میں میرا انتظار کیا یہاں تک کہ میں فارغ ہوئی پھر لوگوں کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا پھر حضور ﷺ اٹح سے نکلے اور خانہ کعبہ کے پاس آئے پھر فجر کی نماز سے پہلے طواف (الوداع) کیا پھر مدینے کی طرف نکلے۔ مؤلف نے کہا ہے یہ حدیث میں نے بخاری اور مسلم کے علاوہ نہیں پائی بلکہ ابوداؤد نے اس روایت کو آخر میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: قالت احرمت من التعميم..... حتی فرغت:

”وانتظرنی“ نون کے ساتھ ہے۔ ابن حجر کے نسخہ میں لام کے ساتھ ہے، جو اصول معتمدہ سے مخالف ہے اور اس کے ساتھ میں ”لا جلی“ کی تاویل کی احتیاج بھی ہے۔

قولہ: هذا الحديث ما وجدته برواية الشيخين: اس جملے کے ذریعے مؤلف نے صاحب مصابیح پر دو اعتراض کیے ہیں: ایک اعتراض تو یہ کہ انہوں نے اس روایت کو نصل اول میں نقل کیا ہے حالانکہ یہ بخاری و مسلم میں نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کہ نقل حدیث میں ابوداؤد کی مخالفت کی بائیں طور کہ حدیث کا آخری جزو یعنی نہ وہ نقل نہیں کیا جو ابوداؤد میں ہے۔

طواف وداع افاقی کے لیے ضروری ہے

۲۶۶۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّاسُ يَنْصَرِفُونَ فِي كُلِّ وَجْهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَنْفِرَنَّ أَحَدٌ

كُم حَتَّىٰ يَكُوْنَ اٰخِرُ عَهْدِهِ بِالْبَيْتِ اِلَّا اَنَّهُ خَفِيَ عَنِ الْحَائِضِ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۸۵/۳ - الحديث رقم ۱۷۵۵ - ومسلم فى ۹۶۳/۲ الحديث رقم (۳۷۹ - ۱۳۲۷) -
وابوداؤد فى السنن ۵۱۰/۲ الحديث رقم ۲۰۰۲ وابن ماجه ۱۰۲۰/۲ الحديث ۳۰۷۰ - والدارمى ۹۹/۲ الحديث رقم
۱۹۳۲ - واحمد فى المسند ۲۲۲/۱ -

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آدمی ہر طرف پھرتے تھے یعنی حج کرنے کے بعد اپنے ملک کی طرف چلے جاتے تھے خواہ طواف کرتے نہ کرتے یعنی اس کے مقید نہیں تھے۔ کہ مکے میں آئیں اور طواف وداع کریں پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں کوئی نہ نکلے یعنی افاقی یہاں تک کہ اس کا آخری وقت خانہ کعبہ کے ساتھ ہو۔ یعنی طواف کریں مگر حائضہ سے طواف وداع موقوف کیا گیا ہے اور اسی طرح نفاس والی عورت سے بھی اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”خفف“ صیغہ مجہول ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں طواف وداع واجب ہے اور مستحب ہے کہ اس کو آخری طواف بنا لے۔

حاکم نے الکافی میں لکھا ہے اگرچہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اس طواف کے بعد جتنے دن چاہیں مکہ میں مقیم رہا جائے لیکن افضل یہی ہے کہ مکہ سے روانگی کے وقت ہی یہ طواف کیا جائے۔

امام ابو یوسف اور حسن بصری سے منقول ہے کہ جب آدمی مکہ میں طواف وداع کے بعد کسی کام میں مشغول ہو جائے تو روانگی کے وقت اس کو لوٹا کر آیا کیونکہ اس کا اعتبار تب ہے کہ جب یہ طواف مکہ سے واپسی کے وقت ہو۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مکہ وہ افعال حج کی ادائیگی کیلئے آیا ہے تو جب افعال سے فارغ ہو جائے تو اس کے واپسی کا وقت آ گیا پس اس وقت اس کا طواف واپسی ہی کیلئے ہے۔ کیونکہ وہ رجوع کا عزم کیے ہوئے ہے۔ ہاں امام ابو حنیفہ سے روایت منقول ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص طواف وداع کرے اور پھر عشاء تک مکہ میں مقیم رہے تو میرے نزدیک پسندیدہ یہی ہے کہ وہ مکہ سے روانگی کے وقت دوسرا طواف کرے تاکہ اس کے طواف اور روانگی میں حائل نہ آئے۔ لیکن یہ بطور احتیاط کے ہے واجب نہیں ہے۔ کیونکہ عرف میں وداع کے بعد سفر میں تاخیر کو برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ کبھی تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔

یہ طواف نہ تو اہل مکہ پر واجب ہے، نہ اس شخص پر واجب ہے جو میقات کے اندر رہتا ہو اور نہ اس شخص پر جو مکہ میں آ کر رہ گیا ہو اور پھر وہاں سے چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اسی طرح یہ طواف نہ تو اس شخص پر واجب ہے جس کا حج فوت ہو گیا ہو اور نہ عمرہ کرنے والے پر واجب ہے، اور عمرہ کرنے والے پر اس کے اثبات کے بارے میں جو حدیث ہے، وہ ضعیف ہے جسکو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ بدائع میں ہے کہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ مکہ میں رہنے والا طواف صدر کرے کیونکہ اس طواف کا مقصد وضع افعال حج کا مکمل ہونا ہے اور یہ سب اہل مکہ میں بھی پایا جاتا ہے۔

حائضہ کے لیے طواف وداع کی ضرورت نہیں ہے

۲۶۶۹. وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ حَاضَتْ صَفِيَّةُ لَيْلَةَ النَّفْرِ فَقَالَتْ مَا آرَانِي اِلَّا حَابَسْتَكُمْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ

عَقْرَى حَلَقَى اَطَاقَتْ يَوْمَ النَّحْرِ قَبْلَ نَعْمُ قَالَ فَاَنْفِرِي - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۹۵/۳ - الحديث رقم ۱۷۷۱ - ومسلم فى ۹۶۵/۲ الحديث رقم (۳۸۷ - ۱۲۱۱) وابن

ماجہ فی السنن ۱۰۲۱/۲ الحدیث رقم ۳۰۷۲۔ واحمد فی المسند ۸۵/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نذر کے دن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حیض والی ہوئیں پس کہنے لگیں کہ میں اپنے کو نہیں گمان کرتی کہ تم لوگوں کو مدینہ سے کوچ کرنے سے روکو گی۔ اس لیے کہ میں حائضہ ہوگی ہوں اور میں نے طواف وداع نہیں کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے اور زخمی کرے کیا اس نے قربانی کے دن طواف زیارت کیا ہے؟ فرمایا ہاں۔ فرمایا پھر چلو (اب رکنے کی ضرورت نہیں ہے)۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: فقالت ما ارانی الا حابستکم: ”ارانی“ صیغہ مجہول ہے الإراءۃ سے ”اظن نفسی“ کے معنی میں

ہے۔

”حابستکم“: تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور تاء کے فتح کے ساتھ اور ایک نسخہ میں صیغہ متکلم کے ساتھ ہے۔

”حابستکم“ تاء کے فتح کے ساتھ منصوب بناء بر مفعولیت ہے۔

قولہ: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: عقری حلقی..... فانفری: ”عقری حلقی“: علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ان الفاظ کو فعلی کے وزن پر بغیر تنوین کی روایت کیا گیا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ عقر اور حلقاً تنوین کے ساتھ ہے تقدیر عقرها وحلقها اللہ حلقاً ہے یعنی اللہ اسے ہلاک و زخمی کر دے۔

یہ جملہ اگرچہ بددعا یہ ہے مگر یہ بددعا کے ارادے سے استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اہل عرب کی عادت ہے کہ وہ ایسے جملے ازراہ محبت و بے تکلفی استعمال کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں عورت کے صفات ہیں یعنی اس کی نحوست اس کے قوم کو ہلاک اور زخمی کر دیتی ہے۔ (اتہلی)

بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں مصدر ہیں اور العقر کا معنی ہے ”الجرح والقتل وقطع العصب“ اور الحلق کا معنی ہے حلق میں درد ہونا یا حلق پر مارنا یا سر کے بالوں کا موٹنا۔ کیونکہ یہ کام عورتیں سخت مصیبت کے وقت کرتی ہیں۔

اور حق یہ ہے کہ ان دونوں کو تنوین دیا جائے لیکن تنوین کو الف سے تبدیل کیا جاتا ہے وصل کو وقف کا قائم مقام بنا کر (اتہلی)۔

اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ ان کو یاء کے ساتھ لکھنا اچھا نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ فعلان کی تانیف ہے۔ یعنی جعلها عقری یعنی عاقراً بمعنی بانجھ اور حلقی یعنی جعلها صاحبة وجع الحلق۔ یہ جملہ اور اس کے ہم مثل جملے تربت یداہ اس کے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ نکلنا اور اس کی ماں روئے یا اس کی ماں اس کو گم کرے کی طرح ہے یہ کلام عرب میں خبر کی ہولناکی بتانے کیلئے واقع ہوتے ہیں اس سے مقصود دن کا مدلول اصلی نہیں ہوتا۔

”فانفری“ فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ حضرت صفیہ نے یہ گمان کیا کہ جس طرح طواف زیارت عذر کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا اسی طرح عذر کے سبب طواف وداع کا ترک بھی جائز نہیں اس لیے نہوں نے کہا کہ جب تک میں پاک نہ ہو جاؤں اور طواف نہ کروں، مکہ سے روانگی جائز نہیں ہوگی۔ آپ یہ سمجھے کہ انہوں نے طواف زیارت نہیں کیا ہے۔ مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ صفیہ نے یہ بات طواف وداع کیلئے کہی ہے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طواف وداع کے بغیر ہی مدینہ روانہ ہو جاؤ۔ کیونکہ عذر کی وجہ سے طواف ساقط ہو جاتا ہے۔

الفصل الثانی:

حج اکبر کے دن کا ذکر

۲۶۷۰: عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَحْوَصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ فِي حَجَّةِ الْوُدَاعِ أَيُّ يَوْمٍ هَذَا قَالُوا يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ قَالَ فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَعْرَاصَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا أَلَا لَا يَجْنِي جَانٍ إِلَّا عَلَى نَفْسِهِ أَلَا لَا يَجْنِي جَانٍ عَلَى وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٍ عَلَى وَالِدِهِ أَلَا وَإِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ آسَى أَنْ يُعْبَدَ فِي بَلَدِكُمْ هَذَا أَبَدًا وَلَكِنْ سَتَكُونُ لَهُ طَاعَةٌ فِيمَا تَحْتَقِرُونَ مِنْ أَعْمَالِكُمْ فَسَيَرَضِي بِهِ -

(رواه ابن ماجه و الترمذی و صححه)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۰۱/۴ الحدیث رقم ۲۱۵۹۔ وابن ماجه فی ۱۰۱۵/۲ الحدیث رقم ۳۰۵۵۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے حجۃ الوداع کے موقع پر سنا فرماتے تھے یہ کونسا دن ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یہ دن حج اکبر کا ہے پس تحقیق تمہارے خون اور تمہارے مال اور آبرو تمہارے درمیان حرام کی گئیں ہیں۔ تمہارے اس دن کی حرمت کی طرح خبردار کوئی ظلم کرنے والا ظلم نہیں کرتا۔ مگر اپنی جان پر جو کوئی کسی پر ظلم کرتا ہے اس کا وبال اس پر پڑتا ہے وہ اس کے آنے کی وجہ سے ماخوذ ہوتا ہے پکڑا نہیں جاتا خبردار رہو شیطان نا امید ہو اس سے کہ تمہارے شہر مکہ میں اس کی عبادت کی جائے لیکن شیطان کی فرمانبرداری ان چیزوں میں ہوگی کہ جن کو تم اپنے عملوں سے حقیر جانو گے پس وہ اس کے ساتھ خوش ہوگا یعنی گناہوں کے حقیر جاننے کی وجہ سے۔ اس کو ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

راوی حدیث:

عمرو بن الاحوص۔ یہ عمرو بن احوص کلابی ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے سلیمان روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله: قال: يوم الحج الاكبر:

حج اکبر مطلق حج کو کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد بانی ہے: ﴿وَإِذْ أُنزِلَ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولُهُ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرُّهُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ﴾ [التوبة: ۳] اور سناد دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو بڑے حج کے دن کی کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ حج اکبر سے مراد یوم عید ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ اسی دن حج مکمل ہوتا ہے۔ بلکہ حج کے تمام بڑے بڑے افعال اسی دن میں ادا کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اب روایت میں اس کی تصریح بھی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع میں قربانی کے دن ہجرات کے قریب کھڑے ہوئے اور فرمایا یہ حج اکبر کا دن ہے اور بعض کہتے ہیں کہ حج اکبر سے مراد یوم عرفہ ہے کیونکہ حدیث میں ہے ”الحج عرفہ“ کہ حج عرفہ کا نام ہے اور حج کو صفت اکبر کے ساتھ موصوف اس لیے کیا جاتا ہے کہ عمرہ حج اصغر کہلاتا ہے، یا اس لیے کہ حج سے مراد اس دن کے اعمال ہے اور وہ باقی اعمال سے بڑے ہوتے ہیں یا اس وجہ سے کہ اس حج میں مسلمان اور مشرکین سب جمع تھے۔ یا اس وجہ سے کہ اس حج میں مسلمانوں کے عزت اور مشرکین ذلت کا ظہور ہوا تھا (انہی)۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حج اکبر یوم عرفہ ہے کیونکہ جس نے وقوف عرفہ پالیا تو اس نے حج پالیا۔ یا اس کو حج اکبر اس لیے کہتے ہیں کہ یوم عرفہ یوم جمعہ سے بڑا ہے اور یوم جمعہ سے مراد صرف وہ حج ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک تھے کیونکہ اس حج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان جمع تھے۔ یا اس وجہ سے حج اکبر کہتے ہیں کہ اس دن یوم عرفہ جمعہ کے دن تھا اور حج اکبر کے بارے میں مشہور یہی ہے۔ اور اس کے بارے میں حدیث ہے کہ جس سال یوم عرفہ جمعہ کو ہو اس سال کا حج ستر حجوں کے برابر ہوتا ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں اس بارے میں، میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔

اس سے پہلے حدیث گزری ہے اس میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ سے پوچھا کہ یہ کونسا دن ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں جبکہ یہاں ذکر ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ حج اکبر کا دن ہے بظاہر دونوں میں تضاد نظر آتا ہے حالانکہ کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے بعض نے وہ جواب دیا ہو اور بعض نے یہ۔ اور یہاں جواب ایام حُر کے آخری دن دیا ہو۔

قوله: الا لا یجنى جان الا علی نفسه: "الا" برائے تشبیہ ہے۔ "لا یجنى جان" اس جملے میں کئی احتمال ہیں:

(۱) یہ جملہ نفی بمعنی نہیں ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، جیسے ﴿لا تقتلوا انفسکم﴾ ہے۔ یعنی تم میں سے بعض بعض کو قتل نہ کریں۔ کیونکہ جو شخص کسی پر ظلم کرتا ہے وہ اس کے اپنے جان پر ظلم کا سبب بنتا ہے۔

(۲) اس جملے میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ نہیں ہے بیٹے پر ظلم کرنے سے کیونکہ یہ زیادہ قبیح ہے۔

(۳) یہ جملہ، لا یجنى جان الا علی نفسه کیلئے تاکید ہے۔ کیونکہ عرب کی عادت تھی کہ وہ مجرم کے رشتہ داروں کو اس کے جرم میں پکڑ لیتے تھے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ ظلم ایک اور ظلم کو جنم دیتا ہے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جملہ نفی کو ظاہر کر رہا ہے چنانچہ یہ اس آیت کے مانند ہے ﴿ولا تزر وازرة وزر اخرى﴾ [الاسراء: ۱۵] اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا بوجہ دوسرے کا۔

(۴) بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ جیسا کہ بعض جاہلوں سے اس کا صدور ہوا ہے۔

یہ نفی ہے نبی کے معنی میں ہے۔ جیسے: ﴿لا یمسه الا المطہرون﴾ [الواقعة: ۷۹] ہے جیسا کہ مفسرین نے یہ ذکر کیا ہے اور اس کی نظیر "غفر اللہ اور رحم اللہ وغیرہ کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ کیونکہ یہ "اغفرہ وارحمہ" سے زیادہ بلغ ہے۔

یہاں باپ بیٹے کو بطور خاص محض اس مقصد سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ دونوں سب سے زیادہ قریبی اقرباء ہیں جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے جرم میں ماخوذ نہیں ہوں گے تو دوسرے بطریق اولیٰ نہ ہوں گے۔

قوله: وان الشیطان قد ایس: "ینس" ایک نسخہ میں ایس ہے۔

اسکا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس بات سے ناامید ہو گیا ہے کہ اس شہر میں غیر اللہ کی عبادت سے اس کی فرمانبرداری ہو۔ باقی یہ بات کہیں سے معلوم نہیں ہوئی کہ کفار میں سے کسی نے شیطان کی عبادت کی ہو۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی غیر مسلم چوری چھپے آ کر اس شہر میں غیر اللہ کی عبادت کر لے۔ لیکن علانیہ نہیں کر سکتا۔

ہاں تمہارے گناہ کے اعمال میں شیطان کی فرمانبرداری ہوگی جیسے: حق قتل کرنا، کسی کا مال لوٹنا۔

یا اس طرح دوسرے کبار کرا کر تکاب اور صغیرہ گناہوں کو اہمیت نہ دینا۔

اسی وجہ سے معاصی یعنی جھوٹ، خیانت وغیرہ مسلمانوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں اور کفار میں کم کیونکہ شیطان کفار سے ان کے کفر کی وجہ سے خوش ہے تو ان کے دلوں میں جزئیات کے دوسو نہیں ڈالتے اور مسلمانوں سے چونکہ خوش نہیں ہے کیونکہ انہوں نے کفر نہیں کیا ہے تو ان کو معاصی میں مبتلا کر رہی ہے۔

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ وہ نماز جس میں وسوسہ نہ ہو وہ یہود و نصاریٰ کی نماز ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے کہ چور اس گھر میں داخل ہوتا ہے جس میں کوئی قیمتی مال و متاع ہو۔

قوله: ولکن ستکون له طاعة فیما تحتقرون من اعمالکم فسیرضی به:

’فسیر ضی‘: صینہ معلوم کے ساتھ ہے اور ایک نسخ میں مجہول کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وسوسے جو وہ تمہارے دلوں میں ڈالتا ہے اور وہ صغائر جس کا تم ارتکاب کرتے ہو جب مبتلا ہونے والا ان کو حقیر سمجھتا ہے تو شیطان اس سے خوش ہو جاتا ہے اور پھر یہ بڑے فتنہ و فساد کا باعث بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے ’ان الشیطان قد ینس من ان یعبده المصلون فی جزیرۃ العرب ولکن فی التحریش بینہم‘۔

منیٰ میں آپ ﷺ نے سوار ہو کر خطبہ دیا

۲۶۷۱: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ عَمْرٍو الْمُزَنِّيِّ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَخْطُبُ النَّاسَ بِمِنَى حِينَ ارْتَفَعَ

الصُّحْلَى عَلَى بَعْغِهِ شَهْبَاءٌ وَعَلِيٌّ يَعْبُرُ عَنْهُ وَالنَّاسُ بَيْنَ قَائِمٍ وَقَاعِدٍ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۸۹۱۲ الحدیث رقم ۱۹۵۶۔

ترجمہ: حضرت رافعؓ سے روایت ہے کہ کہا میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ کو خطبہ دیتے تھے منیٰ میں لوگوں کو۔ جبکہ چاشت کا وقت ہو چکا تھا۔ یعنی نحر کے دن اول وقت نحر کے اوپر سوار ہو کر۔ اس کے بالوں کے سرے سرخ تھے اور اندر سے سفید اور حضرت علیؓ بیان کرتے تھے حضور ﷺ کی طرف سے یعنی جو لوگ کہ دور تھے ان کو حضرت ﷺ سمجھاتے جو کچھ حضور ﷺ فرماتے تھے اور بعض لوگ کھڑے تھے اور بعض بیٹھے تھے۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

رافع بن عمرو مزنئی: عرض مرتب: ان کے بارے میں میں ملا علی قاری اور مؤلف نے کچھ بھی تحریر نہیں فرمایا۔ یہ بھی صحابی ہیں۔

بصرہ کے رہنے والے تھے۔ حجۃ الوداع میں حاضر ہوئے تھے۔ سیدنا حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت تک حیات رہے۔

تشریح: قوله: وعلیٰ یعبُرُ عنہ:

لوگ چونکہ بہت زیادہ تھے یعنی ان کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے سب تک آپ ﷺ کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی تو حضرت علیؓ آپ ﷺ کی آواز بغیر کی ویش کے آگے پہنچا رہے تھے۔

۲۶۷۲: وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَخْرَجَ ذَوَافَ الزِّيَارَةِ يَوْمَ النَّحْرِ إِلَى اللَّيْلِ۔ (رواه

الترمذی و ابو داؤد وابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۵۰۹۱۲ الحدیث رقم ۲۰۰۰۔ والترمذی ۲۶۶۲۳ حدیث رقم ۹۲۰۔ وابن ماجہ فی

۱۰۱۷/۲ الحدیث رقم ۳۰۵۹۔ واحمد فی المسند ۳۰۹/۱۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے طواف زیارۃ کو مؤخر کیا

قربانی کے دن رات تک۔ یہ حدیث ترمذی اور ابو داؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں کیلئے یا سب کیلئے قربانی کے دن طواف زیارت رات تک مؤخر کرنے کو جائز

قرار دیا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے طواف زیارت میں رات تک تاخیر کی کیونکہ آپ ﷺ کے بارے میں تو یہ صراحت کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ نے قربانی کے دن طواف زیارت کیا اور اس کے بعد مکہ میں یامنیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ علامہ طبری کہتے ہیں کہ طواف زیارت کا وقت امام شافعیؒ کے نزدیک بقرعید کی نصف رات کے بعد شروع ہوتا ہے جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک بقرعید کے دن طلوع فجر کے بعد شروع ہوتا ہے اور آخری وقت کا کوئی تعین نہیں۔ جب بھی کیا جائے جائز ہو جائے گا۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طواف زیارت کی ادائیگی ایام نحر میں واجب ہے اگر کوئی شخص اتنی تاخیر کرے کہ ایام نحر پورے گزر جائیں اور پھر طواف زیارت کرے تو اس پر دم واجب ہوگا۔

۲۶۷۳: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَرْمِلْ فِي السَّبْعِ الَّذِي أَفَاضَ فِيهِ۔ (رواه ابو داؤد وابن ماجه)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۵۰۹/۲ الحديث رقم ۲۰۰۱۔ وابن ماجه في ۱۰۱۷/۲ الحديث رقم ۳۰۶۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ طواف زیارت میں رمل نہیں کیا اس کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”رمل“ میم کے ضمنہ کے ساتھ ہے۔

مسئلہ: جو شخص طواف قدم میں سعی اور رمل کر چکا ہو تو وہ طواف زیارت میں رمل اور سعی نہیں کرے گا۔

۲۶۷۴: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ إِذَا رَمَى أَحَدُكُمْ جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ فَقَدْ حَلَّ لَهُ كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا النِّسَاءَ۔ (رواه في شرح السنة وقال اسناد ه ضعيف)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۴۹۹/۳ الحديث رقم ۱۹۷۸۔ والدارقطنی في ۲۷۶/۲ الحديث رقم ۱۸۵ من باب المواقيت۔ واحمد في المسند ۱۴۳/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کنکریاں مارے حجرۃ العقبہ پر اس کے لیے ہر چیز حلال ہوئی، سوائے عورتوں کے یعنی عورتوں سے صحبت کرنا ابھی حلال نہیں ہوا۔ یہ طواف زیارت کے بعد حلال ہوں گی یہ صاحب مصابیح نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے اور کہا کہ اس کی اسناد ضعیف ہیں۔

تشریح: ”الا النساء“: بناء بر استثناء منصوب ہے۔

۲۶۷۵: وفي رواية احمد والنسائي عن ابن عباس قال اذا رمى الجمره فقد حل له كل شيء الا النساء۔ اخرجه النسائي في ۲۷۷/۵ الحديث رقم ۳۰۸۴۔

ترجمہ: اور احمد و نسائی نے اس روایت کو حضرت ابن عباسؓ سے یوں نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے رمی حجرۃ عقبہ کر لی تو (سرمنڈوانے یا بال کتروانے کے بعد) اس کے لئے عورت کے علاوہ ہر چیز حلال ہو جاتی ہے۔

تشریح: یعنی بالا جماع اس کیلئے عورتوں سے جماع کرنا حلال ہو جاتا ہے یہاں تک کہ طواف زیارت کر لے اگرچہ سعی سے پہلے ہو ہمارے نزدیک اور اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ابو داؤد نے روایت کی ہے ایسی سند کے ساتھ جس میں حجاج بن ارطاة ہے اور دارقطنی نے ایک اور سند کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن اس میں بھی ابن ارطاة ہے۔ اور اس حدیث میں ہے: ”اذا رميتم وحلقتم

وذبحتہم“ جب تم رمی حلق اور ذبح کر لو۔ دارقطنی کہتے ہیں کہ یہ الفاظ صرف حجاج ابن ارطاة نے روایت کیے ہیں۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”طیبت رسول اللہ ﷺ لآحرامہ قبل ان یحرم ویوم النحر قبل ان یطوف بالبيت بطیب فیہ مسک“

”میں نے رسول اللہ ﷺ کیلئے احرام سے پہلے اور یوم کو طواف زیارت کرنے سے پہلے خوشبو لگائی، جس میں مشک ملا ہوتا۔“

اور اس حدیث کی معارض نہیں بن سکتی وہ روایت جو حاکم نے امام مالک کیلئے بطور استدلال مستدرک میں عبد اللہ ابن زبیرؓ سے روایت کی ہے کہ عبد اللہ ابن زبیرؓ نے فرمایا کہ سنن حج میں سے یہ بات ہے کہ اگر کسی نے جمرہ کبریٰ کی رمی کر لی تو اس کیلئے عورتوں اور خوشبو کے علاوہ ہر چیز حلال ہوگی یہاں تک کہ طواف کر لے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح علی شرط صحیحین ہے (اتہنی)۔ اگرچہ صحابی کا قول ”من السنة“ حدیث مرفوعہ کے حکم میں ہوتا ہے اور اسی طرح وہ روایت جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے طریق منقطع کے ساتھ منقول ہے کہ جب تم رمی کر لو تو تمہارے لیے ہر وہ چیز حلال ہو جاتی ہے جو حرام ہو گئی تھی سوائے عورتوں اور خوشبو کے۔

پھر ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ جو ہم نے دلائل ذکر کیے ان سے معلوم ہوتا ہے حلت اول کیلئے سبب رمی ہے اسی وجہ سے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حلق واجب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک حلق کرنا واجب ہے کیونکہ حلل واجب اس کے بغیر نہیں ہو سکتا اور ہم نے جو روایات ذکر کیں احناف ان کو اضمار حلق پر محمول کرتے ہیں۔ یعنی تقدیر عبارت اذا رمی و حلق ہے تاکہ ان روایات اور ان روایات کے درمیان جو بعض نسخوں میں عطف علی الشرط ہے، تطبیق پیدا ہو جائے۔

اور دارقطنیؒ کی روایت میں ہے اور اللہ کا قول ﴿ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفْهَمًا﴾ [الحج: ۲۹] اس سے مراد سرمنڈانا اور لباس تبدیل کرنا ہے۔ ابن عمر کے قول کے مطابق اور اہل تفسیر کے قول کے مطابق سرمنڈانا اور ناخن کاٹنا ہے۔

اور اسی طرح اللہ کا قول ﴿لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ﴾ [الفتح: ۲۷] میں سرمنڈائے ہونے کی خبر دی ہے پس تخلیق کا وقوع ضروری ہوا۔ اگرچہ حالت دخول عمرہ میں نہ ہو۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ وہی ایام تشریق سے مؤخر کرنا مسنون ہے تو یہ محل نظر ہے کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

”ایام منیٰ اکل و شرب و بحال“ کہ ایام تشریق کھانے پینے اور جماع کے دن ہیں۔

کنکریاں مارنے کے اوقات

۲۶۷۶: وَعَنْهَا قَالَتْ اَفَا ضَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ اٰخِرِ يَوْمِهِ حِيْنَ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَجَعَ اِلَىٰ مِنِي فَمَكَتْ

بِهَا لَيْلِيَ اَيَّامَ التَّشْرِيقِ يَوْمِي الْجُمُرَةَ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ كُلُّ جُمُرَةٍ بِسَبْعِ حَصِيَّاتٍ يَكْبُرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ

وَيَقِفُ عِنْدَ الْاَوَّلِي وَالثَّانِيَةِ فَيُطِيلُ اَنْهِيَامَ وَيَتَضَرَّعُ يَوْمِي الثَّالِيَةِ فَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۹۷/۲ الحدید ۱۹۷۳۔ والدارقطنی فی ۲۷۴/۲ الحدیث رقم ۱۷۹ من باب المواقیب۔

واحمد فی المسند ۹۰/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے نحر کے دن آخر میں طواف افاضہ کیا یعنی عید

قربان کے آخری روز میں اس وقت کہ ظہر کی نماز پڑھی پھر منیٰ کی طرف تشریق کے دن کی راتوں میں ٹھہرے یعنی

گیارہویں بارہویں تیرہویں ذی الحجہ کو ہر جمرہ کو کنکریاں مارتے تھے جس وقت دو پہر ڈھل جاتی یعنی سات

کنکریاں مناروں کو تکبیر کے ساتھ مارتے اور پہلے مینار کے پاس ٹھہرتے اور دوسرے یعنی وسطی کے پاس اور ٹھہرنا لبا

کرتے اذکار کے لیے اور طرح طرح کی دعاؤں کے ساتھ اور عرض حاجات کے ساتھ آہ و زاری کرتے اور تیسرے منار کو مارتے اور اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”فمکت“ کاف کے فتح اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔

”کل جمرة“ نصب کے ساتھ ہے بناء بر مصدریت کے اور رفع کی صورت میں مبتداء ہوگا۔

یہ حدیث دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی اور پھر طواف افاضہ کیا۔ لیکن یہ باقی احادیث سے جو ثابت ہوتا ہے اس کے خلاف ہے کیونکہ احادیث اس پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ نے نماز ظہر طواف کے بعد پڑھی تھی اختلاف اس میں ہے کہ مکہ میں پڑھی تھی یا منیٰ میں۔

لیکن یہ بعید نہیں ہے کہ یہ آپ ﷺ نے ایام نحر میں سے کسی اور دن کیا ہو کہ منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی ہو اور پھر آخری دن اپنے ازواج کے ساتھ ان کو طواف زیارت کرانے کیلئے مکہ آئے ہوں۔

قوله: فلا يقف عندها:

یعنی دعا اور اذکار کیلئے جمع عقبہ کے پاس کھڑے نہیں ہوئے تھے جگہ تک ہونے کی وجہ سے یا لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ورنہ اختتام پر دعا زیادہ مناسب تھی۔

نخربوم (مناوی) حبیبی: منذری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اس کو ابن حبان نے اپنے صحیح میں روایت کیا ہے یہ بات ابن ہمام نے ذکر کی ہے۔

۲۶۷۷: وَعَنْ أَبِي الْبَدَاحِ بْنِ عَاصِمِ بْنِ عَدِيِّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ رَخَّصَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِرِعَاءِ الْإِبِلِ فِي

الْبَيْتَوَاتِ أَنْ يَرْمُوا يَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ يَجْمَعُوا رَمَى يَوْمَيْنِ بَعْدَ يَوْمِ النَّحْرِ فَيَرْمُوهُ فِي أَحَدِهِمَا۔

(رواه مالك والترمذی والنسائی وقال الترمذی هذا حديث صحيح)

اخر ابو داؤد فی السنن ۴۹۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۷۵۔ والترمذی فی ۲۸۹/۳ احادیث ۹۵۵۔ والنسائی ۲۷۳/۵

الحدیث رقم ۳۰۶۹۔ وابن ماجہ فی ۱۰۱/۲ الحدیث رقم ۳۰۳۷۔ ومالك فی الموطأ ۴۰۸/۱ الحدیث رقم ۲۱۸ من

کتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۴۵۰/۵۔

ترجمہ: حضرت ابو البداح بن عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ نبی

کریم ﷺ نے اونٹوں کے چرانے والوں کو منیٰ میں شب باشی یعنی رات گزارنے کو ترک کرنے پر اجازت مرحمت

فرمائی اور جمرة العقبة کو نحر کے دن کنکریاں ماریں پھر دو دن کے مارنے کو قربانی کے دن کے بعد جمع کیا۔ پس ماریں

دونوں دن کا مارنا ان دونوں میں سے ایک میں۔ اس کو امام مالک، اور ترمذی اور نسائی اور کہا ہے امام ترمذی نے یہ حدیث

صحیح ہے۔

راوی حدیث:

ابو البداح۔ یہ ”ابو البداح“ ہیں ان کے نام میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کا نام ”عاصم بن عدی“ ہے۔ ایک قول یہ ہے

کہ یہ ”عاصم بن عدی“ کے بیٹے ہیں۔ یہ ایک لقب ہے جس سے مشہور ہو گئے۔ اور ان کی کنیت ”ابو عمر“ ہے ان کے صحابی ہونے میں

اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ان کو صحبت نبی ﷺ حاصل ہوئی۔ ابن عبد البر کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ صحابی تھے۔ ”بداح“ میں باء موحدہ

مفتوح ہے اور دال مہملہ مشدداور حاء مہملہ ہے۔ ۱۱ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی عمر چوراسی (۸۳) سال ہوئی۔ انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے اور ان سے ابو بکر بن عبدالرحمن روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قولہ: رخص رسول اللہ ﷺ لرعاء الابل:

”رعاء“: را کے کسرہ اور مد کے ساتھ ”راع“ کی جمع ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے چرواہوں کو یہ اجازت فرمادی تھی کہ وہ ایام تشریق کی راتوں میں منیٰ میں نہ رہیں کیونکہ وہ اپنے جانوروں کی دیکھ بھال اور ان کے چرانے میں مشغول رہتے ہیں اور انہیں اس بات کی بھی اجازت دی کہ وہ صرف بقرعید کے دن حجرہ عقبہ پر کنکریاں ماریں اس کے بعد دوسرے دن رمی نہ کریں۔ بلکہ تیسرے دن دونوں دنوں کی ایک ساتھ رمی کریں دوسرے دن کی قضاء ہوگی اور تیسرے کی ادا ہوگی۔ امام شافعی دوسرے دن کی رمی کی تقدیم کو جائز قرار نہیں دیتے (انتہی) اور یہی ہمارے ائمہ کے نزدیک بھی ہے۔

اختلاف روایت: ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

انه عليه الصلوة السلام رخص لرعاء الابل أن يتركوا المبيت بمنى، وان يرموا يوماً ويدعوا يوماً ثم يتداركونه۔

بَابُ مَا يَجْتَنِبُهُ الْمُحْرِمُ

جن چیزوں سے محرم کو بچنا چاہئے ان کا بیان

الفصل الاول:

محرم کن کن چیزوں سے پرہیز کرے

۲۶۷۸: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ فَقَالَ لَا تَلْبَسُوا الْقُمُصَ وَلَا الْعَمَائِمَ وَلَا السَّرَاوِيْلَاتِ وَلَا الْبُرَانِسَ وَلَا الْخِيفَاتِ إِلَّا أَحَدًا لَا يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَيَلْبَسُ خُفَّيْنِ وَيَقْطَعُهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ وَلَا تَلْبَسُوا مِنَ الثِّيَابِ شَيْئًا مَسَّهُ زَعْفَرَانٌ وَلَا وَرْسٌ۔ (متفق عليه وزاد البخاری فی روایة) وَلَا تَنْتَقِبُ الْمَرْأَةُ الْمُحْرِمَةَ وَلَا تَلْبَسُ الْقَفَازِينَ۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۰۱۳۔ الحدیث رقم ۱۵۴۲۔ مسلمہ فی ۸۳۴۱۲ الحدیث رقم (۱۱۷۷)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۱۰۱۲ الحدیث رقم ۱۱۲۳ والترمذی فی ۱۹۴۱۳ الحدیث رقم ۸۳۳۔ والنسائی فی ۱۲۹۱۵ الحدیث رقم ۲۶۶۷۔ وابن ماجہ ۹۷۷۲ الحدیث رقم ۲۹۲۹۔ والدارمی فی ۴۹۱۲ الحدیث رقم ۱۷۹۸۔ ومالك فی الموطأ ۳۲۴۱۱ الحدیث رقم ۸ من کتاب الحج واحمد فی المسند ۳۲۱۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ محرم کپڑوں کی کونسی قسم پہنے اور کیا نہ پہنے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کرتے پہنو اور پگڑیاں نہ باندھو اور نہ پانچاے اور بارانیاں اور ڈھو اور موزے نہ پہنو۔ مگر وہ شخص کہ جو جوتے نہ پائے۔ پس وہ موزے پہنے اور چاپیے کہ وہ موزے دونوں ٹخنوں کے نیچے

سے کاٹ ڈالے اور نہ ان کپڑوں کو پہنوں جن کو زعفران لگی ہو اور نہ وہ کپڑا پہنوں جن کو ورس لگی ہوئی ہو۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کی ہے اور امام بخاریؒ نے اور ایک روایت میں زیادہ کیا ہے اور احرام والی عورت نہ نقاب ڈالے اور دستاں نہ پہنے۔

تشریح: قوله: ان رجلا سأل رسول الله ﷺ: ما يلبس المحرم من الثياب:

”ما يلبس المحرم“: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اصل میں عبارت یوں ہے: أي عما يلبس او عن رسول الله ﷺ۔ یعنی عن حرف جرمقدر ہے۔ چونکہ سال متعدی بدو مفعول ہے، اور مفعول دوم کی طرف بواسطہ ”عن“ کے متعدی ہوتا ہے۔ اور مفعول اول کی طرف براہ راست متعدی ہوتا ہے اور کبھی برعکس ہوتا ہے، البتہ پہلا استعمال مشہور ہے۔ چنانچہ ان آیات میں یہی اسلوب ہے: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهْلَةِ﴾ [البقرة: ۱۸۹] ﴿عَنِ الْمَحِيضِ﴾ [البقرة: ۲۲۲] ﴿عَنِ الْإِنْفَالِ﴾ [الأنفال: ۱] اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”ما“ استفہامہ ہو۔ ای: سألتہ ما هذه المسئلة۔ چنانچہ یہ آیت کریمہ اسی قبیل سے ہے۔ ﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ﴾ [البقرة: ۲۱۹]

”یلبس“: باب سمع سے ہے، اس کا مصدر لُبَسَا (بروزن ظلم) آتا ہے، اور باب ضرب سے اس کا مصدر ”لبس“ (بروزن شمس) بمعنی ”خلط“ آتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں یہی معنی ہیں ﴿وَلَا تَلْبَسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ [البقرة: ۴۲] طلبہ کو اکثر اس کے استعمال میں التباس پیش آتا ہے۔

من الثياب: ”من“ بیانہ ہے ای: من أنواع الثياب،

قوله: وَلَا تَلْبَسُوا الْقَمِيصَ، وَلَا الْعِمَامَةَ، وَلَا السَّرَاوِيلاتَ، وَلَا الْبِرَانِسَ:

”القميص“ قاف اور میم دونوں پر ضمہ ہے، قمیص کی جمع ہے۔

اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ قمیص و کرتہ اور پاجامہ پہننے سے مراد ان کو اس طرح پہننا ہے جس طرح کہ عام طور پر یہ چیزیں پہنی جاتی ہیں جیسے قمیص و کرتہ کو گلے میں ڈال کر پہننے ہیں یا پاجامہ ٹانگوں میں ڈال کر پہننا جاتا ہے چنانچہ احرام کی حالت میں ان چیزوں کو اس طرح پہننا ممنوع ہے۔ ہاں اگر کوئی محرم ان چیزوں کو مردجہ طریقہ پر پہننے کی بجائے بدن پر چادر کی طرح ڈالے تو یہ ممنوع نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے قمیص و کرتہ پہنا ہے یا پاجامہ پہنا ہے۔

”العمائم“ عمامہ۔ بکسر العين۔ کی جمع ہے۔

”البرانس“: ”برنس“ اس لمبی ٹوپی کو کہتے ہیں جو عرب میں اورھی جاتی تھی اور برنس وہ لباس بھی ہوتا ہے جس کا کچھ حصہ ٹوپی کی جگہ کام دیتا ہے جیسے برساتی وغیرہ۔ چنانچہ ”نہ برنس اورھو“ سے مراد یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز نہ اورھو جو سر کو ڈھانپ لے خواہ وہ ٹوپی ہو یا برساتی اور خواہ کوئی اور چیز۔ ہاں جو چیز ایسی ہو جس پر عرف عام میں پہننے یا اورھنے کا اطلاق نہ ہوتا ہو مثلاً سر پر کوئٹا یا گھڑا وغیرہ رکھ لینا یا سر پر گھڑا اٹھالینا تو اس صورت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

قوله: وَلَا الْخِخْفَ إِلَّا أَحَدًا لَا يَجِدُ: ”الخخفاف“ خاء کے کسرہ کے ساتھ ”خف“ کی ہے۔ علامہ طیبیؒ برنس کے تحت لکھتے ہیں ہو قلنسوة طويلة كان يلبسها النساك في صدر الاسلام، قال الجوهرى، وفي النهاية: ثوب يكون رأسه ملتزقا من جبة أو درعه اه۔

الاحد: مرفوع ہے، واو ضمیر سے بدل ہے۔

من الکعبین: یہاں ٹخنے سے مراد امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ بڑی ہے جو پیر کی پشت پر بیچ میں ہوتی ہے جب کہ امام شافعیؒ کے ہاں وہی متعارف ٹخنہ مراد ہے جس کو وضو میں دھونا فرض ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ موزوں کو کعبین سے کائے بغیر جوں کے توں پہننا جائز ہے۔ اور نعلین نہ ملنے کی صورت میں نھین کو کاٹنا واجب نہیں ہے، اور دلیل ابن عباسؓ کی حدیث ہے۔ ان کے اصحاب کا زعم کے مطابق ابن عمرؓ کی روایت منسوخ ہے، نیز یہ کہ قطع نھین میں اضاعت مال لازم آتا ہے۔ جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ موزوں کو کعبین کے نیچے سے کائے بغیر پہننا جائز نہیں، ابن عمرؓ کی روایت مقدم ہے، اور مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔ اور زیادة من الفقة مقبول ہے۔ اور جہاں تک تعلق ہے اضاعة المال کا، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اضاعت مال تو تمنھی عنہ میں لازم آتی ہے۔ اور مامور بہ میں اضاعت لازم نہیں آتی۔ بلکہ یہ حق شرعی ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ جس شخص کے پاس جوتے نہ ہوں اور وہ موزے پہن لے تو آیا اس پر فدیہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ تو یہ کہتے ہیں کہ اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر فدیہ واجب ہوتا ہے۔ جس طرح یہ مسئلہ ہے کہ اگر احرام کی حالت میں کسی کو سر منڈانے کی احتیاج و ضرورت لاحق ہو جائے تو وہ سر منڈالے اور فدیہ ادا کرے۔

امام مالک، امام شافعی اور ان کی موافقت کرنے والے حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اس صورت میں اگر فدیہ کا لزوم ہوتا تو شارع ﷺ اس کو بیان فرماتے۔

قوله: ولا تلبسوا من الثياب مسه زعفران والاورس :

”من الثياب“: بیان مقدم ہے شینا کیلئے،

”ورس“: بیک قسم کی گھاس کا نام ہے جو زرد رنگ کے اور زعفران کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس گھاس سے رنگائی کا کام لیا جاتا ہے۔ زعفران اور اس کے رنگ آلود کپڑوں کو پہننے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

”زعفران“: شینا کی صفت ہے۔ قوله: ولا تنتقب المائة المحرمة :

”محرمة عورت نقاب نہ ڈالے“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے منہ کو برقع اور نقاب سے نہ ڈھانکے ہاں اگر وہ پردہ کی خاطر کسی ایسی چیز سے اپنے منہ کو چھپائے جو منہ سے الگ رہے تو جائز ہے اسی طرح حنفیہ کے ہاں مرد کو بھی عورت کی طرح احرام کی حالت میں منہ ڈھانکنا حرام ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک بھی ایک روایت کے مطابق یہی ہے جب کہ امام شافعیؒ کا مسلک اس کے برخلاف ہے۔

ابن ہمامؒ لکھتے ہیں: اصحاب صحاح ستہ نے ابن عمرؓ سے یوں نقل کیا ہے: قال رجل: يا رسول الله ﷺ! ما تأمرنا ان نلبس من الثياب في الاحرام؟ قال: لا تلبسوا القميص، ولا السراويلات، ولا العمائم، ولا البرانس، ولا الخفاف، إلا أن أحد ليس له نعلان فيلبس الخفين، فليقطع أسفل من الكعبين، لا تلبسوا شيننا مسه زعفران ولاورس۔ مسلم اور ابن ماجہ کے علاوہ کی روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے: ولا تنتقب المرأة المحرمة ولا تلبس القفازين۔

کہا گیا ہے کہ ”ولا تنتقب المرأة.....“ ابن عمرؓ کا درج ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خلاف ظاہر ہے۔ معترض نے گویا کہ وقف و رفع کا اختلاف ہی دیکھا کہ بعض نے اس روایت کو موقوفاً نقل کیا ہے، لیکن یہ موقوفاً نقل کرنا قاصر نہیں۔ چونکہ بسا اوقات راوی فتویٰ دیتا ہے لیکن اپنی روایت کی سند بیان نہیں کرتا۔ بایں ہمہ اس روایت کے مرفوع ہونے کا قرینہ موجود ہے وہ یہ کہ بعض روایات میں نقاب کے سلسلہ میں علیحدہ سے نہی موجود ہے۔ چنانچہ امام ابو داؤد نے نافع عن ابن عمر عن النبیؐ سے نقل کیا ہے: قال: المحرمة لا تنتقب ولا

تلبس القفازین اور اس وجہ سے بھی کہ صدر حدیث میں ان دونوں کا منہی عنہما ہونا مذکور ہے۔ فصل ثانی کی ابتداء میں اس کا ذکر آئے گا۔
 قوله: ولا تلبس القفازین: "القفازین" قاف کے ضمہ، فاء کی تشدید، اور زاء کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: شئیں لبسہ نساء العرب فی أیدیہن، يعطی الأصابع والكف والساعدين من البرد یكون فیہ قطب محشو اور بعض کا کہنا ہے کہ ان کے ساتھ گھنڈیاں ہوتی تھیں جن کے ذریعہ سے دستاں کو کلائیوں پر باندھا جاتا تھا۔
 تحریم لباس کی حکمت:

امام نووی فرماتے ہیں: لباس مذکورہ کی تحریم اور ازارد و رداء کی اباحت میں حکمت یہ ہے کہ حاجی ترفد سے دور ہو جائے، اور اپنے آپ کو متصف کرے خشوع و تذلل سے، اس کا ہر ہر لمحہ اسے یاد دلائے کہ وہ محرم ہے، دعا کی کثرت کرے، ذکر اذکار سے اکتائے نہ۔ اپنے نفس کو مخطورات کا ارتکاب کرنے سے بچائے، اس سے موت کو یاد کرے، کفن پوشی کو یاد کرے اور یہ کہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھائے جائیں گے کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن ہوں گے۔ داعی کی طرف منہ اوپر کی طرف اٹھائے ہوئے عاجزی کے ساتھ۔
 خوشبو اور عورتوں کی تحریم میں حکمت:

اس میں حکمت یہ ہے کہ حاجی تنعم و تعیش اور زینت دنیا سے دور ہو، چوں کہ حاجی پراگندہ حال پراگندہ بال ہوتا ہے، اور یہ کہ اپنی ہمت کو مقاصد آخرت کیلئے جمع رکھے۔

تحریم صید میں حکمت: اس میں حکمت یہ ہے کہ بیت اللہ اس کے حرم یعنی اس کے شکار، اور قطع شجر کی تعظیم ہے۔
 ابن المنذر فرماتے ہیں: أجمع العلماء علی منع المحرم من لبس لشیء مما ذکر فی هذا الحدیث۔

محرم کے لیے رخصت کا ذکر

۲۶۷۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَخْطُبُ وَهُوَ يَقُولُ إِذَا لَمْ يَجِدِ الْمُحْرِمُ نَعْلَيْنِ لِبَسَ خَفَيْنِ وَإِذَا لَمْ يَجِدْ إِزَارًا لَبَسَ سَرَاوِيلَ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۷/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۴۱۔ و مسلم فی صحیحہ ۸۳۵/۲ الحدیث رقم ۱۱۷۸/۴۔
 و ابوداؤد فی السنن ۴۱۳/۲ الحدیث رقم ۱۸۲۹۔ والنسائی فی ۱۳۲/۵ الحدیث رقم ۱۶۷۱۔ وابن ماجہ فی ۹۷۷/۲ الحدیث رقم ۲۹۳۱۔ والدارمی فی ۵۰/۲ الحدیث رقم ۱۷۹۹۔ واحمد فی المسند ۲۱۵/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا ہے کہ جس وقت محرم جوتے نہ پائے تو وہ موزے پہن لے اور جس وقت تہہ بندنہ پائے۔ تو پانچامہ پہن لے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اذا لم يجد المحرم نعلين لبس خفين: موزوں کے استعمال کے بارے میں تو گزشتہ حدیث میں بتایا جا چکا ہے کہ جوتے میسر نہ ہوں تو محرم خفین پہن سکتا ہے۔ اس صورت میں امام شافعی کے نزدیک اس پر کوئی فدیہ واجب نہیں ہوگا۔

قوله: واذا لم يجد ازارا لبس سراويل:

لیکن امام اعظم کا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ اگر تہہ بندنہ ہو تو پانچامہ کو پھاڑ کر اسے تہہ بند کی صورت میں باندھ لیا جائے اور اگر کوئی شخص اسے پھاڑ کر استعمال نہ کرے بلکہ پانچامہ ہی پہن لے تو اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔

امام رازی فرماتے ہیں: نہ بندہ ہونے کی صورت میں پاپیچامہ کو پھاڑے بغیر بھی پہننا جائز ہے۔ لیکن اس سے دم کا واجب نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ چونکہ ضرورت کی وجہ سے کبھی فعل مخطور کا ارتکاب بھی جائز ہوتا ہے باوجودیکہ کفارہ بھی لازم آتا ہے۔ جیسا کہ تکلیف کی وجہ سے حلق کرنا۔ عذری وجہ سے سلا ہوا کپڑا پہننا۔ امام طحاوی نے ”آثار“ میں صراحت کی ہے کہ یہ مباح ہے البتہ کفارہ واجب ہوگا۔ اس حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ذہب الیٰ ہذہ الآثار قوم رحمہم اللہ تعالیٰ اھ۔

نسک ابن حنبلہ میں لکھا ہے: وإن شاء قطع الخفين من الكعبين ولبسهما ولا فدية عند الأربعة اھ۔ امام طبری، نووی، قرطبی اور ابن حجر رحمہم اللہ نے عجیب کام کیا کہ امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کر کے بیان کرتے ہیں: انہ یحب علیہ الفدیۃ إذا لبس الخفين بعد القطع عند عدم التعلين۔ حالانکہ یہ بات خلاف مذہب ہے۔ بلکہ مطلب الفائق میں تو یہ لکھا ہے: وهذه الروایة لیس لها وجود فی المذہب بل ہی منتقدہ۔ اور شافعیہ کا یہ اعتراض کرنا کہ اس صورت میں اضاعت مال لازم آتی ہے تو اس کا جواب ماقبل میں گزر چکا ہے۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پھاڑنے کے بعد اگر ستر عورت حاصل نہیں ہوتا تو بغیر پھاڑنے بھی پہننا جائز ہے۔ بلکہ یہی صورت متعین و واجب ہے۔ ہاں البتہ فدیہ ادا کرنا پڑے گا۔ ابن حجرؒ کا امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کی بابت امتناع لبس السراويل علیٰ ہنیۃ مطلقاً کی نسبت کرنا درست ہے۔

محرم کو خوشبو لگانا منع ہے

۲۶۸۰: وَعَنْ يَعْلَى ابْنِ أُمِيَّةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ بِالْجِعْرَانَةِ إِذْ أَجَانَهُ رَجُلٌ أَعْرَابِيٌّ عَلَيْهِ جُبَّةٌ وَهُوَ مُتَضَمِّخٌ بِالْخُلُوقِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَحْرَمْتُ بِالْعُمْرَةِ وَهَذِهِ عَلَيَّ فَقَالَ أَمَا الطِّيبُ الَّذِي بَكَ فَاعْسَلْهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَأَمَا الْجُبَّةُ فَانزِعْهَا ثُمَّ اصْنَعْ فِي عُمُرَتِكَ كَمَا تَصْنَعُ فِي حَجَّكَ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۹۳/۳۔ الحدیث رقم ۱۵۳۶۔ ومسلم فی ۸۳۶/۲ الحدیث رقم (۶- ۱۱۸۰)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۰۷/۲ الحدیث رقم ۱۸۱۹۔

ترجمہ: یعلیٰ بن امیہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس جعرانہ میں تھے۔ کہ اچانک ایک گوار شخص یعنی دیہاتی آیا کہ اس پر کرتہ تھا اور وہ شخص خلوک میں لتھرا ہوا تھا جو ایک قسم کی خوشبو ہے زعفران وغیرہ سے بنتی ہے پس اس نے کہا اے اللہ کے رسول تحقیق میں نے عمرے کا احرام باندھا تھا اس حال میں کہ یہ کرتہ میرے بدن پر تھا۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خوشبو کو تو دھو ڈال تین مرتبہ اور کرتے کو اتار دو۔ پھر اپنے عمرے میں اس طرح کر جس طرح تو اپنے حج کے احرام میں کرتا ہے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ”الجعرانہ“: اس کی تحقیق ماقبل میں گزر چکی ہے۔

قولہ: وهو متضامخ بالخلوق: ”الخلوق“ ایک قسم کی خوشبو ہے وزعفران سے بنائی جاتی ہے۔

زعفران کا استعمال چونکہ مردوں کے لئے حرام ہے اور خلوک زعفران ہی سے تیار ہوتی تھی اس لئے آپ ﷺ نے اس شخص کو یہ حکم دیا کہ وہ اسے دھو ڈالے نیز تین مرتبہ دھونے کا حکم صرف اس لئے دیا تاکہ وہ خوب اچھی طرح چھوٹ جائے ورنہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ خلوک کو بالکل صاف کر دو خواہ وہ کسی طرح اور کتنی ہی مرتبہ میں صاف ہو۔

ابن حجرؒ نے اس موقع پر بڑی عجیب بات کہی ہے وہ یہ کہ اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ جس نے جہالت کی وجہ سے خوشبو لگائی، (یا سلا ہوا) لباس پہن لیا تو اس پر فدیہ نہیں۔ ابن حجرؒ کی یہ بات نادرست ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس مفہوم پر روایت کی دلالت نہ نفیاً ہے اور نہ

اثباتا ہے۔ البتہ یہ ایک اور دلیل سے سمجھ آرہی ہے۔ فانزعها میں امام شعیبؒ کے قول کی تردید ہو رہی ہے وہ یہ فرماتے ہیں کہ جو شخص قمیض یا جامہ کے ساتھ احرام باندھے تو اس کا یہ لباس پھاڑ دیا جائے۔ ابن حجرؒ عذر خواہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں ان کا یہ فرمانا ”عمد“ کے بارے میں ہے، اور روایت نہیں چونکہ: العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب،

قوله: ثم اصنع في عمرتك كما تصنع في حجك:

ایک نسخہ میں تاء کے ساتھ ہے اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ۱- ای اجتنب فی العمرة ما تجتنب منه فی الحج۔

۲- ای: افعل الطواف والسعی والحلق۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں حج کے احرام کی حالت میں ممنوع ہیں وہی عمرہ کے احرام کی حالت میں بھی ممنوع ہیں اسلئے تم عمرہ کے احرام کی حالت میں ان تمام چیزوں سے پرہیز کرو جن سے حج کے احرام کی حالت میں پرہیز کیا جاتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حج و عمرہ کے افعال مشترکہ، افعال حج کی مانند ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعرابی اعمال حج سے واقف تھا، اور عمرہ سے ناواقف تھا۔ (کما ذکر الطیبیؒ) تشبیہ سے مراد زیادت افادہ ہے اور یہ کہ احرام حج میں ان چیزوں سے اجتناب کرے کہ جن سے احرام عمرہ میں اجتناب برتا جاتا ہے۔ چونکہ تشبیہ بعض مرتبہ محض اشتراک کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ خواہ مشبہ بہ اتوی نہ ہو بشرطیکہ مخاطب کو معلوم ہو۔ چنانچہ اسی قبیل سے علماء کی یہ عبارت بھی ہے: یغسل فمه بمیاء کأنفه۔

اس موقع پر ایک خاص بات یہ جان لینی چاہئے کہ جو چیزیں احرام کی حالت میں حرام ہو جاتی ہیں ان کا ارتکاب اگر قصداً ہوگا تو متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک اس کی وجہ سے مرتکب پر فدیہ لازم ہوگا۔ ہاں بھول چوک سے ارتکاب کرنے والے پر فدیہ واجب نہیں ہوگا جیسا کہ امام شافعیؒ، ثوریؒ، احمد اور اسحاق کا قول ہے البتہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی فدیہ واجب ہوگا۔

عرض مرتب: ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی شرح کے ذیل میں محرم کیلئے سرمہ لگانے کی بابت کلام ذکر کیا تھا، ہم نے وہ کلام یہاں سے حذف کر کے اس کے مناسب مقام پر ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے: حدیث: ۲۶۸۷۔ اھ

محرم آدمی نکاح نہ کرے اور نہ کسی کا نکاح کرائے

۲۶۸۱: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ وَلَا يَنْكَحُ وَلَا يَخْطُبُ۔

اخر حرحہ مسلم فی صحیحہ ۱۰۳۰/۲ الحدیث رقم (۴۱۔ ۱۴۰۹)۔ و ابو داؤد فی السنن ۴۲۱/۲ الحدیث رقم ۱۸۴۱۔
و الترمذی فی ۱۹۹/۳ الحدیث رقم ۸۴۰ و النسائی فی ۱۹۲/۵ الحدیث رقم ۲۸۴۴۔ و ابن ماجہ ۶۳۲/۱ الحدیث رقم ۱۹۶۶۔ و الدارمی ۱۸۹/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۸۔ و مالک فی الموطأ ۳۴۸/۱ الحدیث رقم ۷۰ من کتاب الحج۔ و احمد فی المسند ۵۷/۱۔

ترجمہ: حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ محرم کے لیے درست نہیں ہے۔ کہ نکاح کرے اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ محرم کسی کا نکاح کروائے۔ یعنی بولایت یا بوکالت اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ محرم منگنی کرے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”لا ینکح“: بیاء کے فتح، کاف کے کسرہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ، حاء کا کسرہ التقائے ساکنین کی وجہ سے ہے، صحیح

ترین نسخوں میں اسی طرح ضبط کیا گیا ہے۔ نکح، ینکح، اپنا نکاح کرنا۔

”لا ینکح“: بیاہ کے ضمہ اور کاف کے کسرہ کے ساتھ، حالت جزئی میں ہے۔ اُنکح ینکح اِنکاحا؛ نکاح کرانا۔

”ولا یخطب“: طاء کے ضمہ کے ساتھ، خطبۃ بکسر الخاء سے ماخوذ ہے، پیغام نکاح بھیجنا۔

یہ تینوں کلمات صیغہ نئی اور صیغہ نبی ہر دو کے ساتھ ضبط کئے گئے ہیں۔ خطاباً فرماتے ہیں: صیغہ نبی کے ساتھ ہونا، صیغہ نئی کے مقابلہ میں اصح ہے، اور صیغہ نئی کی صورت میں بھی ”نبی“ کے معنی میں ہے۔ بلکہ بلغ ہے۔

امام شافعیؒ اور اکثر علماء کے نزدیک خود اپنا نکاح کرنے یا کسی کا نکاح کرانے کی ممانعت مکروہ تحریمی کے طور پر ہے اور منگنی کرنے کی ممانعت مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے۔ چنانچہ ان حضرات کے نزدیک حالت احرام میں نہ تو خود اپنا نکاح کرنا درست ہے اور نہ کسی کا نکاح کرانا جائز ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں تینوں کی ممانعت صرف مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے اپنا نکاح کیا تھا۔

تخریج: علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بخاریؒ کے علاوہ محدثین کی جماعت نے نقل کیا ہے۔ مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں ”ولا یخطب“ کا اضافہ ہے۔ اور ابن حبان نے اپنی ”صحیح“ میں ”ولا یخطب“ کی زیادتی نقل کی ہے۔ اور علامہ طبریؒ لکھتے ہیں: اس حدیث کو مسلم، ابوداؤد، ابوعیسیٰ اور ابوعبدالرحمن نے اپنی اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ اور معتمد علیہ روایات میں صیغہ اثبات مروی ہے۔

۲۶۸۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَزَوَّجَ مَيْمُونَةَ وَهُوَ مُحْرِمٌ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۱/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۳۷۔ و مسلم فی صحیحہ ۱۰۳۱/۲ الحدیث رقم (۴۶)۔
۱۴۱۰)۔ و ابوداؤد فی السنن ۴۲۳/۲ الحدیث رقم ۱۸۴۴۔ و الترمذی فی ۲۰۱/۳ الحدیث رقم ۸۴۲۔ و النسائی فی ۱۹۱/۵ الحدیث رقم ۲۸۴۰۔ و ابن ماجہ فی ۶۳۲/۱ الحدیث رقم ۱۹۶۵۔ و الدارمی فی ۵۸/۲ الحدیث رقم ۱۸۲۲۔
و احمد فی المسند ۲۶۶/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے میمونہؓ سے نکاح کیا حالت احرام میں کہ آپ ﷺ احرام باندھے ہوئے یعنی عمرۃ القضاء کا اس کو امام بخاریؒ اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یہ بتایا جا چکا ہے کہ ”سرف“ ایک مقام کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے تقریباً چھ میل اور مقام تنعیم سے جانب شمال تین یا چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے اسی موقع پر ایک تاریخی اتفاق بھی ذکر گیا تھا کہ آنحضرت ﷺ حضرت میمونہؓ کا نکاح بھی سرف میں ہوا (جب کہ آپ ﷺ عمرۃ القضاء کے لئے مکہ تشریف لارہے تھے اور اس وقت حالت احرام میں تھے) اور ان کی شب زفاف بھی یہیں گزری (جب کہ آپ ﷺ عمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس ہو رہے تھے) اور پھر بعد میں ان کا انتقال بھی یہیں ہوا۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: اس حدیث کو ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے۔ بخاریؒ نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے: و بنی بہا وهو حلال وماتت بسرف..... حالت احرام میں نکاح و انکاح: امام نوویؒ لکھتے ہیں: واحتلف العلماء فی هذا الحدیث، والذی قبلہ فقال مالک، والشافعی، وأحمد وجمهور العلماء من الصحابة ومن بعدهم: إنه لا یصح نکاح المحرم، واعتمدوا علی أحادیث. وقال ابو حنیفہ والکوفیون: یصح نکاحہ لحدیث میمونہ ۱ھ۔

محرم کیلئے جماع اور دوامی جماع بالاتفاق حرام ہیں، خطبہ نکاح بالاتفاق جائز ہے، نکاح اور انکاح میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نکاح و انکاح ناجائز ہے، اور نکاح باطل ہے۔ جبکہ ائمہ حنفیہ کے نزدیک نکاح و انکاح دونوں جائز ہیں۔ البتہ حالت احرام میں ایسے کاموں کی طرف مشغول ہونا مکروہ تنزیہی ہے۔

منشائے اختلاف: پہلا منشائے اختلاف: حضور ﷺ نے حالت احرام میں نکاح و انکاح سے منع فرمایا ہے، یہ نبی کیسی ہے؟ حنفیہ کے نزدیک یہ نبی تزیبی ہے، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تحریمی ہے۔

دوسرا منشائے اختلاف:

یہ ایک واقعہ کی تحقیق پر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے سنہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا۔ یہ نکاح حالت احرام میں کیا تھا؟ یا حالت احرام سے فارغ ہو کر حلال ہونے کی صورت میں کیا تھا؟ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ ائمہ ثلاثہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حلال ہونے کی حالت میں نکاح کیا تھا، اور حنفیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حالت احرام میں نکاح کیا تھا۔

دلائل: ائمہ ثلاثہ کی پہلی دلیل حضرت عثمانؓ کی حدیث ہے: لا ینکح المحرم ولا ینکح۔ دوسری دلیل خود حضرت میمونہؓ کی حدیث ہے: تزوجنی رسول اللہ ﷺ ونحن حلالن بسرف۔ تیسری دلیل ابورافعؓ کی حدیث ہے: تزوج رسول اللہ ﷺ میمونہ و هو حلال و بنی بہا و هو حلال و کنت انا الرسول فیما بینہما۔ چوتھی دلیل یزید بن اسلمؓ کی حدیث ہے: تزوج رسول اللہ ﷺ میمونہ و هو حلال۔

حنفیہ کے دلائل:

حنفیہ کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ہے (جو اسی باب کی فصل اول کی روایت ہے):

عن ابن عباسؓ: أن النبی ﷺ تزوج میمونہ و هو محرم۔

وجوہ ترجیح: ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت میمونہؓ کی ذات سے متعلق ہے، ابورافعؓ جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے وہ درمیان میں قاصد تھے، اور یزید بن اسلمؓ حضرت میمونہؓ کے بھانجے ہیں۔ لہذا ان خصوصیات کی بناء پر ابن عباسؓ کی روایت کا مقابلہ میں ان حضرات کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ لہذا رسول اللہ ﷺ کا حضرت میمونہؓ سے نکاح کرنا حلال ہونے کی حالت میں مانا جائے گا۔ اور حضرت عثمانؓ کی روایت: لا ینکح المحرم ولا ینکح کے ساتھ فعل رسول اللہ ﷺ کا کوئی تعارض نہ ہوگا۔ برخلاف ابن عباسؓ کی روایت کے کہ اس سے حضرت عثمانؓ کی روایت کا تعارض لازم آ رہا ہے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ کی روایت میں جو نبی ہے وہ برقرار رہے گی۔ چونکہ محرم کو میبوح پر ترجیح ہوتی ہے اور ابن عباسؓ کی روایت کو یا تو مرجوح ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا جائے گا۔ یا پھر اس میں تاویل کی جائے گی۔ تاویل یہ ہے کہ: تزوج رسول اللہ ﷺ میمونہ و هو حلال و ظہر امر تزویجہا و هو محرم۔

حضرات حنفیہ اپنے مذہب کی مندرجہ ذیل وجوہ ترجیح بیان کرتے ہیں:

① اصح فی الباب: حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی روایت بالاتفاق اصح ما فی الباب ہے۔ چنانچہ ائمہ ستہ نے اس کی تخریج کی ہے، بلکہ تمام محدثین اس کی تخریج و تصحیح پر متفق ہیں۔ امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ کی حدیث کو کتاب الحج اور کتاب النکاح میں روایت کیا ہے۔ دونوں جگہ یہی حدیث پیش کی ہے۔ معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک ثبوتاً یہی روایت راجح ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی طرف سے پیش کی جانے والی احادیث (سوائے حضرت عثمانؓ کی روایت کے) ابن عباسؓ کی حدیث سے قوت میں کم ہیں۔ چنانچہ یزید بن اسلمؓ اور حضرت میمونہؓ کی روایت کو نہ امام بخاریؒ نے ذکر کیا ہے اور نہ امام نسائیؒ نے۔ ابورافعؓ کی حدیث کو نہ شیخین نے ذکر کیا اور نہ امام نسائیؒ نے۔ اگرچہ ابن حبان نے نقل کیا ہے۔ لیکن وہ درجہ صحت کو نہیں پہنچی، اسی وجہ سے امام ترمذیؒ ان کی اس حدیث کے بارے میں سوائے ”حسن“ کے کچھ نہیں لکھا اور فرمایا: ولا نعلم أحدا أسندہ غیر حماد عن

مطرف۔ اس لئے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ترجیح حاصل ہوگی۔

❖ تفقہ فی الرواۃ: حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہم معنی روایت دوسرے صحابہ کرام سے بھی مروی ہیں چنانچہ امام طحاوی نے اپنی کتاب میں ذکر کی ہیں۔ ۱- حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے: تزوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض نسانہ وهو محرم۔ ۲- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: تزوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض نسانہ وهو محرم۔ یہاں بعض نساء سے حضرت میمونہ ہی مراد ہو سکتی ہیں۔ چونکہ ان کے علاوہ کسی کے نکاح کا بحالت احرام ہونا منقول نہیں۔ یہ تینوں صحابی تفقہ میں ان ممتاز ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت میمونہ سے ممتاز ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس، یزید بن اہم سے ممتاز ہیں۔ چنانچہ عمرو بن دینار زہری سے فرماتے ہیں: وما یدری ابن الاصم الأعرابی کذا وکذا بشیء۔ قال أتجعلہ مثل ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ ابورافع سے ممتاز ہیں۔ اس لئے تفقہ رواۃ کی بناء پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن عباس اور ابو ہریرہ کو ترجیح دی جائے گی۔ ائمہ ثلاثہ کی طرف سے ایک وجہ ترجیح ان ”رواۃ“ کی اپنی اپنی خصوصیات تھیں، جو پیچھے ذکر ہوئیں۔ سوان خصوصیات کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابورافع کا کام پیغام پہنچانا تھا۔ سو پیغام پہنچانا کہ ان کا کام ختم ہو گیا۔ حضرت میمونہ نے اپنا معاملہ حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ کر دیا تھا۔ گویا انہوں نے بھی معاملہ کا بوجھ اپنے اوپر سے اتار دیا تھا، سارا معاملہ حضرت عباس کے سپرد ہو گیا اس لئے حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اور ان کے گھرانہ کو زیادہ علم ہوگا اور یزید بن اہم اس معاملہ میں شریک ہی نہیں تھے۔ مزید یہ کہ ان کے بارے میں عمرو بن دینار کا قول پیچھے گزر رہی چکا ہے۔ اس لئے معاملہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر کرنا چاہیے۔

❖ ضبط رواۃ: مستدلات حنفیہ کے رواۃ، مستدلات ائمہ ثلاثہ کے رواۃ سے فائق و ممتاز ہیں۔ مثلاً حنفیہ کے رواۃ یہ حضرات ہیں: سعید بن جبیر، طاؤس، عطاء، مجاہد، عکرمہ، جابر بن زید رحمہم اللہ۔ جبکہ مستدلات ائمہ ثلاثہ کے رواۃ فقہت و ضبط کے اعتبار سے ان جیسے نہیں۔

❖ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ”ثبت زیادت“ ہے۔ بایں طور کہ حضرت میمونہ اور ابورافع کی روایات حلال ہونے کی حالت سے تزوج فی حالۃ الاحرام کا جواب معلوم ہوتا ہے، اور احرام ”حالت طارۃ“ ہے، جس میں تزوج کا جواز ہر ایک کو معلوم نہیں، لہذا یہ روایت ”ثبت زیادت“ ہے۔ اسی کو ترجیح دی جائے گی۔

❖ موافقت قیاس: نکاح محرم میں روایات متعارض ہیں، اس لئے قیاس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ محرم کا نکاح صحیح ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ نکاح عقود میں سے ایک عقد ہے۔ جس طرح باقی عقود جائز ہیں اسی طرح نکاح بھی جائز ہے۔ مثلاً محرم کے لئے خوشبو کا خریدنا جائز ہے، لیکن اس کا استعمال ناجائز ہے، سراویل اور قمیص کا خریدنا جائز ہے، مگر ان کا استعمال ناجائز ہے۔ حالت احرام میں وطی کے لئے باندی خریدنا جائز ہے لیکن اس کے ساتھ جماع کرنا ناجائز ہے۔ معلوم ہوا کہ عقود کا جواز احرام کی وجہ سے ختم نہیں ہو جاتا۔ لہذا عقد نکاح بھی جائز ہوگا اور وطی ناجائز ہوگی۔ شافعیہ کے ہاں تو عقد نکاح بطریق اولیٰ جائز ہونا چاہیے، چونکہ وہ اس کو ”عقد مالی“ کہتے ہیں۔

حدیث عثمان کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے تیسرے جملہ سے بالاتفاق خلاف اولیٰ مراد ہے، چنانچہ حنفیہ پہلے دونوں جملوں کو بھی خلاف اولیٰ پر محمول کرتے ہیں کہ نکاح وانکار خلاف اولیٰ ہے۔

امام ترمذی نے ائمہ ثلاثہ کی طرف سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ تاویل ذکر کی ہے: تزوجھا حلالا، مظهر امر تزویجھا وهو محرم۔ شیخ امام محی السنہ نے بھی اس سے ملتی جلتی تاویل ذکر کی ہے: والا کثرون علیٰ أنه تزوجھا حلالا وظہر

امر تزویجہا وهو محرم، ثم بنی بها وهو حلال بسرف فی طریق مکة۔ یہ تاویلات ناقابل قبول ہیں، اس لئے کہ اہل سیر اور محدثین نے نقل کیا ہے: ان رسول اللہ ﷺ تزوج میمونہ بسرف، وبنی بها سرف، وتوفیت بسرف ودفنت بسرف۔ نکاح سرف میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ نکاح مکہ جاتے وقت ہوا تب تو یقیناً آپ ﷺ محرم تھے۔ اس لئے کہ ”سرف“ داخل میقات ہے اور تجاوز عن المیقات بغیر احرام ناجائز ہے، تو اس صورت میں حنفیہ کی تائید ہوگی اور تزویجہا وهو حلال کے معنی تزویجہا محرما وظهر امر تزویجہا وهو حلال ہوں گے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ سرف میں نکاح مکہ سے واپسی پر ہوا تو اس صورت میں محرم ہونے کا کوئی سوال نہیں، یقیناً آپ ﷺ واپسی میں سرف پہنچنے پر طلال تھے۔ لہذا تزویجہا حلالاً تو ٹھیک ہوگا، مگر ظہر امر تزویجہا وهو محرم کسی طرح درست نہیں ہو سکتا، چونکہ ”سرف“ کے بعد آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ مدینہ آنے کیلئے احرام نہیں ہے۔ چنانچہ ظہر امر تزویجہا وهو محرم کو درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے امام ترمذی اور حنفی السنہ کے کلام میں تاویل ضروری ہے: تزویجہا وهو محرم فی طریقہ الی مکة بسرف وظهر امر تزویجہا بعہ الفراغ عن العمرة ممکة وهو حلال۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا جواب دیتے ہوئے امام ابن حبان نے یہ تاویل کی ہے کہ وهو محرم کے معنی داخل حرم کے ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ کا جب حضرت میمونہ سے نکاح ہوا تو آپ ﷺ حرم کے اندر تھے۔ لیکن آپ ﷺ حلال تھے۔ اور اس پر انہوں نے بطور استدلال یہ شعر پیش کیا ہے:

قتلوا ابن عفان الخليفة محرما ☆ ودعا فلم ار مثله مخذولا

یہاں ظاہر ہے ”محرما“ کے معنی احرام حج سے کرنا صحیح نہیں ہے، چونکہ حضرت عثمان کی شہادت مدینہ میں ہوئی ہے، اس لئے کہا جائے گا کہ ”محرما“ کے معنی داخل حرم کے ہیں، اور ”حرم“ سے حرم مدینہ ہے۔ لیکن کی یہ تاویل بوجہ درست نہیں:

◇ ”حرم“ کے یہ معنی ”داخل حرم“ اس مادہ میں اہل لغت سے ثابت نہیں۔

◇ دوسرے معنی کا بھی احتمال ہے۔ لہذا صرف اس معنی میں منحصر ہونا بھی درست نہیں، چنانچہ ”حرم“ کے ایک معنی ”محقون الدم“ اور ”ذو حرمت“ کے بھی ہیں۔ مذکورہ بالا شعر میں ”محرما“ کے یہی معنی (یعنی محقون الدم اور ذو حرمة) مراد ہیں۔

حالت احرام میں ہم بستر ہونا ممنوع ہے

۲۶۸۳: وَعَنْ يَزِيدَ بْنِ الْأَصَمِّ ابْنِ أُخْتِ مَيْمُونَةَ عَنْ مَيْمُونَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَهُوَ حَلَالٌ (رواه مسلم) قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مَعِي السُّنَّةُ وَالْأَكْفَرُونَ عَلَى أَنَّهُ تَزَوَّجَهَا حَلَالًا وَظَهَرَ أَمْرُ تَزَوُّجِهَا وَهُوَ مُحْرَمٌ ثُمَّ بَنَى بِهَا وَهُوَ حَلَالٌ بِسَرَفٍ فِي طَرِيقِ مَكَّةَ۔

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۰۳۲/۲ الحديث رقم (۴۸ - ۱۴۱۱ - وابوداؤد في السنن ۴۲۲/۲ الحديث رقم ۱۸۴۳ -

والترمذی فی ۲۰۳/۳ الحديث رقم ۸۴۵ وابن ماجہ فی ۶۳۲/۱ الحديث رقم ۱۹۶۴ - واحمد فی المسند ۳۳۵/۶ -

ترجمہ: اصم بن یزید جو کہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں انہوں نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، اس حال میں کہ وہ احرام میں تھے اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔ شیخ امام حنفی السنہ نے کہا ہے کہ اکثر تینوں امام اور ان کے تابعین کے نزدیک یہ ہے کہ حضور ﷺ نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام کے بغیر

نکاح کیا اور ان کے نکاح کا امر اس وقت ظاہر ہوا کہ وہ حالت احرام میں تھے پھر ان کے ساتھ ہم بستر ہوئے۔ یعنی ان کے ساتھ حالت احرام کے بغیر مقام سرف میں مکہ کے راستے میں صحبت کی۔

راوی حدیث:

یزید بن الاصم۔ یہ یزید ہیں جو "اصم" کے بیٹے تھے۔ حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہمشیرہ زادہ ہیں۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔

عرض مرتب: اس حدیث پر سیر حاصل بحث ماقبل میں گزر چکی ہے، ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۲۶۸۲۔

حالت احرام میں سردھونا جائز ہے

۲۶۸۲: وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ رَأْسَهُ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۰/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۴۰۔ ومسلم فی ۸۶۴/۲ الحدیث رقم (۹۱-۱۲۰۵)۔ وابدوؤد فی السنن ۴۲۰/۲ الحدیث رقم ۱۸۴۰ والنسائی فی ۱۲۸/۵ الحدیث رقم ۲۶۶۵۔ وابن ماجہ ۹۷۸/۲ الحدیث رقم ۲۹۴۳۔ واحمد فی المسند ۴۱۸/۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنا سردھوتے تھے۔ حالت احرام میں۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: بغیر کسی اختلاف کے محرم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنا سردھوئے مگر اس طرح کہ سر کا کوئی بال ٹوٹنے نہ پائے ہاں اگر کوئی عظمیٰ سے سردھوئے گا تو امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا کیونکہ نہ صرف یہ کہ عظمیٰ خوشبو کی قسم سے ہے بلکہ اس کے لگانے سے جوئیں مر جاتی ہیں۔ البتہ (بغیر خوشبو کے) صابون یا پیری کے پتوں اور یا اسی قسم کی دوسری چیزوں سے سردھونے کی صورت میں متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ اس پر صدقہ ہے۔ اگر کسی شخص نے ایسے شیمپو وغیرہ کے ساتھ سردھویا کہ جس میں خوشبو تھی تو دیکھنے والے کی رائے کا اعتبار ہوگا۔ یعنی اگر دیکھنے والا اس کو صابن یا شیمپو وغیرہ کا نام دیتا ہے تو اس پر صدقہ لازم ہے، اور اگر خوشبو کہتا ہے تو اس پر دم واجب ہے۔ (کذا فی قاضی خان) ایک روایت میں ہے کہ کان یغتسل وهو محرم۔ سند ضعیف کے ساتھ ابن عباس کی بابت مروی ہے کہ وہ حالت احرام میں مقام بجمہ کے کسی حمام میں داخل ہوئے اور فرمایا: ما یعبأ اللہ باو ساخنا شینا۔ یعنی اس صورت میں فدیہ نہیں ہے، چنانچہ اس سے امام مالکؒ کی تردید ہو جاتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: بل کچیل دور کرنے کی صورت میں صدقہ لازم ہے۔ اس سلسلہ میں تحقیق بات یہ ہے کہ محرم غسل کرنے وقت ازالہ وسخ کی نیت نہ کرے۔ چونکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: المحرم اشعت اغبر۔ محرم بکھرے بالوں والا غبار آلود ہوتا ہے۔

۲۶۸۵: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ احْتَجَمَ النَّبِيُّ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۲/۴ الحدیث رقم ۱۸۳۵۔ ومسلم فی صحیحہ ۸۶۲/۲ الحدیث رقم (۸۷-۱۲۰۲)۔ وابدوؤد فی السنن ۴۱۸/۲ الحدیث رقم ۱۸۳۵ والترمذی فی ۱۹۸/۳ الحدیث رقم ۸۳۹۔ والنسائی فی ۱۹۳/۵ الحدیث رقم ۲۸۴۵۔ وابن ماجہ فی ۱۰۲۹/۲ الحدیث رقم ۳۰۸۱۔ والدارمی فی ۵۷/۲ الحدیث رقم ۱۸۱۹۔ واحمد فی المسند ۲۱۵/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپنے لگوائے، حالت احرام میں اس کو امام بخاری اور مسلم رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طبری فرماتے ہیں: اکثر علماء کے نزدیک احرام کی حالت میں سنگی کھینچنا ناجائز ہے بشرطیکہ کوئی بال نہ ٹوٹے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ محرم اپنا جسم کھلا سکتا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: فلیحک ویلسد۔

احرام کی حالت میں آنکھوں پر لپ کرنے کی اجازت ہے

۲۸۶۲: وَعَنْ عُمَانَ حَدَّثَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي الرَّجُلِ إِذَا اشْتَكَى عَيْنَيْهِ وَهُوَ مُحْرِمٌ صَمَدًا هَمًا

بالصَّبْرِ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۶۳/۲ الحديث رقم (۸۹- ۱۲۰۴) - وابوداؤد في السنن ۴۱۹/۲ الحديث رقم ۱۸۳۸ -
والترمذی فی ۲۸۷/۳ والحديث رقم ۹۵۲ - والنسائی فی السنن ۱۴۳/۵ الحديث رقم ۲۷۱۱ - والدارمی ۹۸/۲
الحديث رقم ۱۹۳۰ -

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے حق میں بیان کیا کہ جب اس کی آنکھیں دکھیں یا ضعف بصارت ہو اس حال میں کہ وہ محرم ہو تو وہ ان کو ایلوے کے ساتھ لپ کرے۔ اس کو امام مسلم رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حدیث میں مسئلہ اگرچہ محرم کے بارے میں بتایا گیا ہے لیکن محرمہ کا بھی یہی حکم ہے۔

”صمدہا“ بصیغہ ماضی از باب تفصیل ہے۔ ایک نسخہ میں بصیغہ امر مروی ہے۔ یہ امر اباحت کیلئے ہوگا۔

صمد الصرح بضمده، اور صمدہ شدہ بالضماد پڑا کہتے ہیں۔

تاج المصادر میں ”تضمید“ کے معنی ”لپ کرنا“ ہی لکھتے ہیں۔ لیکن کچھ علماء نے اس کے معنی ”آنکھوں کے اندر لگانا“ لکھے ہیں۔ یعنی جس طرح سرمہ لگایا جاتا ہے اسی طرح وہ آنکھوں میں ایلو لگائے۔

اور علامہ طبری نے یہ لکھا ہے کہ تضمید ”زخم پر پٹی باندھنے کو کہتے ہیں“ اسی طرح زخم پر دو لگانے کو بھی تضمید کہتے ہیں۔

”الصبر“ باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: صبر وزن کشف ہے اور ضرورت شعری کی بناء پر باء کو ساکن بھی پڑھا جاتا ہے۔

احرام کی حالت میں بغیر خوشبو کا سرمہ لگانا ناجائز ہے بشرطیکہ اس سے زیب وزینت مقصود نہ ہو۔ اگر کوئی شخص زیب وزینت کے بغیر خوشبو کا بھی سرمہ لگائے تو مکروہ ہوگا۔

اس موقع پر خوشبودار سرمہ کے بارے میں یہ تفصیل جان لیجئے کہ اگر سرمہ میں کم خوشبو ہو تو اس کو لگانے سے صرف صدقہ واجب ہوگا اور اگر خوشبو زیادہ ہوگی تو ایسے سرمہ کو لگانے سے دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔ ایسے ہی یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی محرم اپنے سر اور منہ کے علاوہ کسی اور عضو پر پٹی باندھے تو اس پر اگرچہ بطور جزاء کچھ واجب نہیں ہوتا لیکن یہ مکروہ ہے اور اگر کوئی محرم اپنے سر یا منہ کے چوتھائی حصہ یا اس سے زیادہ کو کسی کپڑے وغیرہ سے ڈھانکنے کا تو اس پر دم لازم ہوگا اور چوتھائی حصہ سے کم کو ڈھانکنے کا تو صرف صدقہ واجب ہوگا۔

امام بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ وہ اشد اور کالے سر سے کو زینت قرار دیتی ہیں۔ ہم اس کو مکروہ سمجھتے ہیں، حرام قرار

نہیں دیتے۔ امام مالک، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی یہی فرماتے ہیں، البتہ حاجت مستثنیٰ ہے۔ اس صورت میں حلت پر تمام علماء کا اتفاق ہے بشرطیکہ اس میں خوشبو نہ ہو۔ البتہ مہندی ہمارے علماء کے نزدیک خوشبو ہے۔ امام بیہقی روایت کرتے ہیں: ان نساء النبی ﷺ یختصبن بالحناء وھن محرمات یہ مؤول ہے اور تاویل اس کی یہ ہے: ای: مریدات للإحرام۔ یعنی جب احرام باندھنا ہوتا تھا۔

احرام کی حالت میں سورج کی گرمی سے سایہ کرنا جائز ہے

۲۶۸۷: وَعَنْ أُمِّ الْحُصَيْنِ قَالَتْ رَأَيْتُ أَسَامَةَ وَبِلَالَ وَأَحَدَهُمَا أَخَذَ بِحِطَامِ نَاقَةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَالْآخَرَ رَافِعَ ثُوبَهُ يَسْتُرُهُ مِنَ الْحَرِّ حَتَّى رَمَى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۴۴/۲ الحدیث رقم (۳۱۲-۱۲۹۸)۔ و ابو داؤد فی السنن ۴۱۶/۲ الحدیث رقم ۱۸۴۳۔ النسائی فی ۲۶۹/۵ الحدیث رقم ۳۰۶۰۔

ترجمہ: حضرت ام حصینؓ سے روایت ہے کہتی ہیں کہ میں نے اسامہؓ اور بلالؓ کو دیکھا اس حال میں کہ ان میں سے ایک حضور ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے تھا اور دوسرا اپنا کپڑا اٹھائے ہوئے تھا سورج کی گرمی سے سایہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے جمرة العقبة کو نکٹریاں ماریں اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: وَاَحَدُهُمَا اخَذَ بِحِطَامِ نَاقَةِ: "وَاَحَدُهُمَا اخَذَ": یہ جملہ حالیہ ہے۔ "اخذ": بصیغہ اسم فاعل ہے۔ "حطام" خاء کے کسرہ کے ساتھ، بروزن کتاب بمعنی زمام و مہار یعنی لگام۔ قولہ: وَالْآخَرَ رَافِعَ ثُوبَهُ يَسْتُرُهُ مِنَ الْحَرِّ: "رافع": تنوین کے ساتھ ہے۔

حضرت اسامہؓ نے آپ ﷺ کے سر مبارک پر کپڑے سے اس طرح سایہ کر رکھا تھا کہ وہ کپڑا اونچا ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے سر مبارک سے لگتا نہیں تھا اور ایک روایت یہ ہے کہ "وہ سایہ کے لئے آنحضرت ﷺ کے مبارک سر پر چھتری کی مانند ایک چیز اٹھائے ہوئے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محرم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے سر پر کسی چیز سے سایہ کر لے بشرطیکہ سایہ کرنے والی چیز اس کے سر کو نہ لگے چنانچہ اکثر علماء کا یہی قول ہے لیکن امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے اسے مکروہ کہا ہے۔

اس مسئلہ پر حدیث کی دلالت محل نظر ہے۔ چونکہ احتمال یہ ہے کہ صورت حال حلال ہونے کے بعد پیش آئی ہو۔

ودج میں بیٹھنا ممنوع ہے بشرطیکہ سر ہودج میں لگتا ہو اگر سر ہودج میں نہ لگتا ہو تو پھر اس میں بیٹھنا ممنوع نہیں ہے اسی طرح اگر کعبہ کا پردہ یا خیمہ سر میں لگتا ہو تو ان کے نیچے کھڑا ہونا ممنوع ہے اور اگر سر میں نہ لگتا: و تو ممنوع نہیں۔

امام مالکؒ اور امام احمدؒ سایہ حاصل کرنے کو منع فرماتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ نصوص ہیں: حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے: ما ضرب فسطاطا فی سفر حجه۔ نیز ان کے صاحبزادہ کے بارے میں مزوری ہے: انه امر من استظل علی بعیر بان یبرز للشمس۔ علاوہ ازیں ایک حدیث میں آتا ہے: ما من محرم یضحی لشمس حتی تغرب إلا غربت بذنوبہ حتی یعود کما ولدتہ امہ۔

حقیقہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایات سے استدلال بوجہ درست نہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ علماء کا اجماع ہے کہ خیمہ میں چھت کے نیچے بیٹھنا جائز ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ کی روایات میں کسی قسم کی کوئی "نہی" موجود نہیں ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ کسی صحابی کا یہ مذہب نہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ حدیث ضعیف ہے باوجود فضائل اعمال سے تعلق رکھتی ہے۔

ابن حجر نے فرمایا: خیر مسلم مقدم علی کل ما مخالفه، وهو أنه عليه الصلوة والسلام ستر بثوب من الحر حتی رمی جمرة العقبة، اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی دلالت صریحا موجود نہیں کہ آنحضرت ﷺ حالت احرام میں تھے۔ اور قامت مشہور ہے: مع الاحتمال لالصح الاستدل،

قولہ: حتی رمی الجمرة: یہ جملہ اول ایام پر نص نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں اس روایت سے استدلال اولیٰ ہے کہ جس میں مقام عرفہ میں قبہ سے سایہ حاصل کرنے کا ذکر ہے یہ روایت ماقبل میں گزر چکی ہے۔

مجبوری کی بنا پر سرمنڈانا جائز ہے

۲۶۸۸: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَرَّ بِهِ وَهُوَ بِالْحُدَيْبِيَّةِ قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ مَكَّةَ وَهُوَ مُحْرِمٌ وَهُوَ يُوقِدُ تَحْتِ قِدْرِهِ وَالْقَمْلُ تَنَهَّأَتْ عَلَيَّ وَجْهَهُ فَقَالَ أَتُؤْذِيكَ هُوَ أَمْلَكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاحْلِقْ رَأْسَكَ وَأَطِمْ فَرَقًا بَيْنَ سِتَّةِ مَسَاكِينٍ وَالْفَرْقُ ثَلَاثَةُ أَصْعٍ أَوْ صَمٌ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ أَوْ نُسْكَ نَسِيكَةً۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۲/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۱۴۔ ومسلم فی ۸۶۱/۲ الحدیث رقم (۸۳۔ ۱۲۰۱)۔ والترمذی فی

السنن ۲۸۸/۳ الحدیث رقم ۹۵۳۔ ومالك فی الموطأ ۴۱۷/۱ الحدیث رقم ۳۸ من كتاب الحج واحمد فی المسند ۲۴۱/۱۔

ترجمہ: کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ان پر گزر ہوا اور وہ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے حدیبیہ میں تھے اور کعب رضی اللہ عنہ محرم تھے اور وہ ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے تھے اور جو میں ان کے منہ یعنی چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا جو میں تجھے ایذا دیتی ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنا سر منڈا لو اور ایک فرق کے برابر کھانا چھ مسکینوں کو کھلا دو اور فرق تین صاع کا ہوتا ہے یا تین دن روزے رکھ جا جو روزہ رکھ کر جو ذبح کرنے کے لائق ہو۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ان النبي ﷺ مرّ به وهو بالحديبية..... علی وجہہ:

”مرّ به“: اس میں تین احتمال ہیں: ۱- اس میں تجرید ہے۔ ۲- اس میں التفات ہے۔ ۳- یہ نقل بالمعنی ہے۔

”یوقد“: ایقاد مصدر سے مضارع معروف کا صیغہ ہے۔ ”یؤذیک“: صیغہ مذکر مؤنث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

قولہ: اتؤذیک هو امک:..... ثلاثة اصع:

”هو امک“: میم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ ہامہ کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق سکون کے ساتھ چلنے والے ”دابہ“ پر ہوتا ہے، جیسا کہ

چینٹی اور جوں۔ ”فاحلق رأسک وأطعم“: پہلا امر ”اباحت“ کیلئے ہے اور دوسرا واجب کیلئے ہے۔

”والفرق ثلاثة اصع“: یہ جملہ معترضہ ہے کسی راوی کی تفسیر ہے۔

”والفرق ثلاثة اصع“: صحیح مسلم کتاب الحمیدی اور شرح السنہ میں اسی طرح ہے اور مصابیح کے نسخوں میں اصوع ہے۔

”اصع“ اور ”اصوع“ دونوں ہی ”صاع“ کی جمع ہیں۔ اور یہ کہنا خالی از خطا نہیں کہ ”اصوع“ لُحْن ہے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں: یہ لفظ

حدیث میں صحیح طور پر ثابت ہے، یہ قلب کے قبیل سے ہے، اس کی اصل ”اصوع“ ہے۔ قلب سے مراد قلب مکانی ہے، کہ واؤ کو صاد کی

جگہ لے گئے اور صاد کو واؤ کی جگہ لے گئے، واؤ کی حرکت صاد کی طرف منتقل ہو گئی اور پھر واؤ کو الف سے بدل دیا گیا۔ چونکہ واؤ اصل میں

مفتوح تھی، اور ما قبل مفتوح تھا۔

”فرقا“: اس کی وضاحت میں علامہ طیبی لکھتے ہیں: بالتحريك مكیال یسع ستة عشر رطلا، وهي اثنا عشر مدا أو ثلاثة أصع۔ مفتاح میں لکھتے ہیں: قال الأزهري: المحدثون على السكون، وكلامه العرب على التحريك، فرق بينهما القتيبي۔ فقال: الفرق بسكون الرءاء من الأواني والمقادير ستة عشر رطلا، وبالفتح مكیال یسع ثمانين رطلا ۵۱۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں: چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا اس طور کہ ہر مسکین کو آدھا آدھا صاع دے۔ کھانے کے سلسلہ میں کوئی تفریق نہیں۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں یہ مطلق ہے، لہذا اس کو فردا مکمل پر محمول کیا جائے گا اور فردا مکمل ”بز“ ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے۔
 قوله: او صم ثلاثة أيام او انسك نسكية: أي اذبح ذبيحةً ايك رواية میں یوں ہے: اذبح ثم اذبح نسكًا، أو صم ثلاثة أيام، أو اطعم ستة مساكين ثلاثة أصع من تمر اور ايك رواية میں یہ ہے: لكل مسكين نصف صاع۔
 یہ حدیث درحقیقت اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے: ﴿وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَأْسِهِ فَفَدِّهِ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نَسْكَ﴾ [البقرة: ۱۹۶] دونوں جگہ ”أو“ تخریر کیلئے ہے۔
 بہر کیف اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی محرم کسی عذر مثلاً جوں زخم اور درد سر وغیرہ کی وجہ سے اپنا سر منڈوائے تو اسے اختیار ہے کہ بطور جزا چاہے تو چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا اس طور کہ ہر مسکین کو آدھا آدھا صاع گیہوں دے دے چاہے تین روزے رکھ لے اور چاہے جانور ذبح کرے۔ چنانچہ یہ حدیث اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے کہ ﴿وَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَأْسِهِ فَفَدِّهِ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نَسْكَ﴾ (ترجمہ) ”اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ اپنا سر منڈوا دے) تو وہ بطور فدیہ یا تو روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔“

الفصل الثاني:

عورت کے مخطورات احرام

۲۶۸۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَنْهَى النِّسَاءَ فِي أَحْرَامِهِنَّ عَنِ الْقَفَّازِينَ وَالنِّقَابِ وَمَا مَسَّ الْوُرُسَ وَالزُّعْفَرَانَ مِنَ الْيَبَابِ وَالْتَبَسُ بَعْدَ ذَلِكَ مَا أَحَبَّتْ مِنَ الْوَأَنِ الْيَبَابِ مَعْصُفٍ أَوْ خِرَاءٍ وَمِحْلَى أَوْ سَرًا وَيَلٍ أَوْ قَمِيصٍ أَوْ خُفٍّ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داود في السنن ۴۱۲/۲ الحدیث رقم ۱۸۲۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ عورتوں کو احرام کی حالت میں دستاں پہننے اور نقاب کے ڈالنے سے منع فرماتے تھے یعنی اس طرح کے نقاب سے جو منہ کو لگے اور اس کپڑے کے پہننے سے کہ جس کو ورس اور زعفران لگی ہو اور چاہیے کہ اس کے بعد (یعنی احرام سے نکلنے کے بعد) وہ کپڑوں کی اقسام سے پہنے جو بھی قسم ہو۔ کسی ہوا حر ہو یا زچور ہو یا پانجام ہو یا کرتہ ہو یا موزہ۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ينهى النساء.... والزعفران من اليباب:

عرض مرتب: اس حصہ سے متعلقہ احکام ماقبل میں گزر چکے ہیں، ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۲۶۷۸۔

قوله: وتلبس بعد ذلك ما احبت او خف :

علامہ طیبی فرماتے ہیں: یہ اسلوب کلام ایسا ہے گویا کہ راوی نے یوں کہا ہے: سمعته يقول: لا تلبس النساء القفازین

وتلبس بعد ذلك: مشارالیه مذکور ہے۔

”معصفر“: مجرور ہے، ألوان الثیاب سے بدل ہے۔ آی المصبوغ بالعصفر۔

حدیث کے ظاہر سے یوں لگتا ہے کہ معصفر و معصفر کے درمیان فرق ہے۔ اور مذہب سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عموم ہے۔ ابن حجر کا کہنا ہے کہ ”عصفر خوشبو نہیں ہے“۔ لیکن اس کی خوشبو ابن حجر کے کلام کی تردید کر رہی ہے۔

بَعْدَ ذَلِكَ: (اس کے بعد) کا مطلب شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تو ”احرام سے نکلنے کے بعد“ ہی لکھا ہے لیکن ملا علی قاری نے یہ معنی لکھے ہیں کہ ”ان مذکورہ چیزوں کے بعد“ یعنی حدیث میں جن چیزوں کے استعمال سے منع کیا گیا ہے ان کے علاوہ اور جس قسم کا بھی کپڑا چاہے پہنے۔

نیز ملا علی قاری نے یہ بھی لکھا ہے کہ (بعد ذلك سے یہ معنی مراد لینے کی صورت میں) حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی حالت میں زعفران کا رنگا ہوا کپڑا پہننا تو ممنوع ہے لیکن کم کارنگا ہوا کپڑا پہننا ممنوع نہیں ہے جب کہ حنفیہ کے مسلک میں حالت احرام میں جس طرح زعفرانی کپڑا پہننا ممنوع ہے اسی طرح کم کارنگا کپڑا منع نہیں ہے چنانچہ خزانة الاکمل اور ولولہ الجی اور فقہ کی دوسری کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ اگر کسی محرم نے زعفران یا کم میں رنگا ہوا کپڑا ایک دن پہنا تو اس پر بطور جزا دم واجب ہوتا ہے اور اگر ایک دن سے کم پہنا تو صدقہ لازم ہوگا لہذا اول تو یہی بہتر ہے کہ بعد ذالک کے وہی معنی مراد لئے جائیں جو شیخ عبدالحق نے لکھے ہیں یا پھر یہ تاویل کی جائے کہ حدیث میں کم کا وہ رنگا ہوا کپڑا مراد ہے جو دھل چکا ہو اور جس میں خوشبو باقی نہ رہ گئی ہو۔

”خز“: خاء معجمہ کے فتح اور زائے مشدہ کے ساتھ، ریشم اور صوف سے مرکب کپڑے کی قسم ہے، اور مغرب میں لکھا ہے کہ ”خز“ ایک کپڑے کا نام ہے، اس کے ”دیر“ (روئیں اور بال) سے بنے ہوئے کپڑے کو بھی ”خز“ کہا جاتا ہے۔

”حلی“: خاء کے ضمہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ عورتوں کے زیب زینت کے زیورات، مثلاً بالیاں، پازیب وغیرہ۔

طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث کے آخر میں کپڑوں کے ساتھ زیور کا ذکر مجازاً کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ”حلی“ پر لباس کا اطلاق کیا ہے:

﴿وَتَسْتَخْرِجُونَ حُلِيَةً تَلْبَسُونَهَا﴾ [الفاطر: ۱۲]

سندی حیثیت: منذری فرماتے ہیں: اس حدیث کے سارے رجال، رجال صحیحین ہیں، سوائے ابن اسحاق کے اہ معلوم ہونا

چاہیے کہ ابن ہمام نے ابن اسحاق کو ”حجت“ قرار دیا ہے۔ لہذا یہ حدیث حسن ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا احرام کی حالت میں چہرہ کھولنے کا طریقہ

۲۶۹۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ الرَّجُلُ إِذَا بَدَأَ يَتَوَضَّأُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مَحْرَمَاتٍ فَإِذَا جَاوَزُوا

بَنَاءً سَدَلَتْ أَحَدَانَا جَلْبَابَهُمَا مِنْ رَأْسِهِمَا عَلَى وَجْهِهَا فَإِذَا جَاوَزُوا كَشَفْنَاهُ - (رواه ابو داؤد وابن ماجہ معناه)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۱۶۱۲ الحدیث رقم ۱۸۲۳۔ وابن ماجہ ۹۷۹۱۲ الحدیث رقم ۲۹۳۵۔ واحمد فی المسند ۳۰۱/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم حالت احرام میں (سفر کے دوران) نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے

اور (حالت حرام کے باعث ہمارے چہرے کھلے ہوئے تھے) اور قافلے ہمارے قریب سے گزرتے تھے جب کوئی

قافلہ ہمارے پاس سے گزرتا تو ہم میں ہر عورت اپنی چادر (پردے کی غرض سے) اپنے سر پر (اس طرح) ڈالتی کہ وہ چادران کے منہ کے ساتھ نہ لگتی۔ اس کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے اس معنی میں ذکر کیے ہیں۔

تشریح: قولہ: کان الرکبان یمرّون بنا ونحن مع رسول اللہ ﷺ محرمات: ”الرکبان“: راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ”راکب“ کی جمع ہے۔

محرمات: مرفوع ہے خبر ہونے کی بناء پر۔

قولہ: فإذا جاووزوا بنا سدلت احدانا جلبابها:

”جاووزونا“: ایک نسخہ میں جاووزنا ہے۔ سید نے ہامش میں اسی طرح لکھا ہے، اور اس کو ظاہر قرار دیا ہے، حالانکہ معنوی اعتبار سے یہ غیر طاہر ہے، چونکہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ارسال بوقت مجاوزة ہوتا تھا۔ الایہ کہ یوں کہا جائے کہ مجاوزت مرد کے معنی میں ہے ایک اور نسخہ میں جاووزانا (جب وہ ہمارے مقابل ہو جاتے) کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ یہ الفاظ بالکل واضح ہیں اور ایک نسخہ میں فإذا جاووزنا ہے۔ اس کی بالکل کوئی توجیہ ممکن نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں: قولہ: فإذا جاووزوا بنا، هكذا لفظ أبي داؤد، وفي المصابيح حاذونا هـ، وهو بفتح الذال من المحاذاة بمعنى المقابلة، وهو اظهر من الكل، والله تعالى اعلم۔

قولہ: جلبابها: ”جلباب“: جیم کے کسرہ کے ساتھ۔

سدلت: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: سدلت کے الفاظ نہ ابو داؤد کے ہیں اور نہ ابن ماجہ کے، تو گویا کہ ان دونوں کی روایت کے الفاظ ”دلت“ ہیں، تبدیلی سے ماخوذ ہے، جیسا کہ مصابیح کی روایت میں ہے۔ لہذا یہ روایت بالبعنی ہے۔

قولہ: فإذا جاووزونا كشفناه: كشفناه: کی ضمیر غائب کا مرجع قرینہ مقام کے سبب ”الوجه“ بھی ہو سکتا ہے۔

احرام کی حالت میں خوشبو کا استعمال ممنوع ہے

۲۶۹۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَدَّهْنُ بِالزَّيْتِ وَهُوَ مُحْرِمٌ غَيْرَ الْمُقْتَتِ يَعْنِي غَيْرَ الْمُطَيَّبِ۔

(رواہ الترمذی)

احرجہ الترمذی فی السنن ۲۹۶۳/۱ الحدیث رقم ۹۶۲۔ وابن ماجہ فی ۱۰۳۰/۲ الحدیث رقم ۳۰۸۳۔ واحمد فی المسند ۱۴۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بغیر خوشبو کے تیل استعمال کرتے تھے احرام کی حالت میں اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: يدھن بالزیت وهو محرم غیر المقتت: ”یا،ھن“: بوال کی تشدید کے ساتھ ہے۔

”المقتت“: پہلی تاء مشدوہ ہے۔ اس تیل کو کہتے ہیں جس میں خوشبو کے پھول ڈال کر اسے پکا لیا جائے تاکہ وہ تیل خوشبودار ہو جائے یا اس تیل میں کوئی خوشبودار تیل وغیرہ ملا دیا جائے۔

احرام کی حالت میں خوشبودار تیل استعمال کرنا مکروہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی محرم کسی ایک عضو کے پورے حصہ پر یا کئی یا سب اعضاء پر روغن بنفشہ، روغن گلاب، روغن موتیا یا اسی قسم کا کوئی بھی خوشبودار تیل لگائے گا تو حنفیہ کے ہاں بالاتفاق اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا اور اگر زیتون یا تیل کا ایسا تیل کہ جس میں خوشبو نہ ملی ہوئی ہو زیادہ مقدار میں لگائے گا تو امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک

اس صورت میں بھی دم واجب ہوگا جب کہ صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ صدقہ واجب ہوگا۔ لیکن یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ یہ دونوں تیل خوشبو سے بالکل خالی اور کسی خوشبودار پھول کے ساتھ پکائے ہوئے نہ ہوں، کیونکہ اگر زیتون کے یا تل کے تیل میں خوشبو ملی ہوگی یا اس میں خوشبودار پھول ڈال کر پکایا گیا ہو تو پھر سب ہی کے نزدیک اس کو استعمال کرنے کی وجہ سے دم واجب ہوگا۔ اسی طرح یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ یہ تیل زیادہ مقدار میں لگائے جائیں اور اگر کم لگایا جائے تو متفقہ طور پر سب کے نزدیک اس کے استعمال کرنے سے صرف صدقہ واجب ہوگا۔

اور پھر ایک بات یہ جان لیجئے کہ ان تیلوں کے استعمال کی وجہ سے دم یا صدقہ اسی وقت واجب ہوگا جب کہ ان کو محض خوشبو کی خاطر استعمال کیا جائے اور اگر انہیں دوا کے طور پر استعمال کیا جائے گا تو پھر علی الاطلاق کچھ بھی واجب نہیں ہوگا۔ جب کہ مشک یا دوسری خوشبوؤں کے استعمال کا مسئلہ اس سے مختلف ہے کہ ان کے استعمال سے بہر صورت دم واجب ہوتا ہے خواہ بطور خوشبو استعمال ہوں خواہ بطور دوا۔

الفصل الثالث:

سلا ہوا کپڑا پہننا محرم کے لیے منع ہے

۲۶۹۲: وَعَنْ نَافِعٍ أَنَّ ابْنَ عَمْرٍو وَجَدَ الْقُرْقُقَالَ أَلْبِي عُلَى ثَوْبًا يَا نَافِعُ فَأَلْقَيْتُ عَلَيْهِ بُرْنَسًا فَقَالَ تَلْقَى عَلِيَّ هَذَا وَقَدْ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَلْبَسَهُ الْمُحْرِمُ۔ (رواہ ابو داؤد)

اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۴۱۳/۲ الحدیث رقم ۱۸۲۸۔

ترجمہ: حضرت نافع سے روایت ہے کہ ابن عمرؓ سے نے سردی محسوس کی اور کہا کہ مجھ پر کپڑا ڈال دوا سے نافع! پس میں نے ان پر بارانی ڈال دی تو فرمایا تو مجھ پر یہ ڈالتا ہے اور تحقیق نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ اس کو محرم پہننے اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: وجد القرقرقال علی ثوبا: "القر": قاف کے ضم، نیز فتح کے ساتھ اور راء کی تشدید کے ساتھ، مطلقاً ٹھنڈا کہا جاتا ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ موسمِ شتاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ "القی": القاء مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔

قولہ: بقال: تلقی علی وقد نہی رسول اللہ ﷺ: کلمۃ استفہام محذوف ہے، اور استفہام انکاری ہے۔

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سلعے ہوئے کپڑے کو اس طرح استعمال کرنا محرم کے لئے ممنوع ہے جس طرح اسے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے بصورت دیگر ممنوع نہیں ہے مثلاً برساتی عام طور پر پہنی جاتی ہے۔ اگر کوئی محرم اسے پہنے نہیں بلکہ ایسے ہی جسم پر ڈال لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ اس بارے میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے برساتی کو اپنے جسم پر ڈال لینے سے بھی منع کیا تو اس لئے فرمایا کہ وہ اپنے خیال کی بنا پر سلعے ہوئے کپڑے کو مطلقاً کسی بھی استعمال کرنے سے اجتناب کرتے ہوں گے یا پھر یہ کہ نافع نے ان کا سر بھی ڈھا تک دیا ہوگا۔ اس وجہ سے انہوں نے منع فرمایا۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: لبس المخیط کا مطلب یہ ہے کہ سلائی کی وجہ سے سلا ہوا کپڑا جسم پر ٹھہر جائے۔ چنانچہ جو بھی قید منشی ہونے سے لبس المخیط منشی ہو جائے گا۔ چنانچہ اگر کسی شخص نے قبا کو اپنے شانوں پر ڈال لیا، لیکن بازو داخل نہیں کئے، یا طیلسان پہنا لیکن اس کے ٹٹن بند نہ کئے تو اس شخص پر کوئی شی لازم نہیں، چونکہ ان صورتوں میں استمساک بنفسہ موجود نہیں ہے، چنانچہ اگر طیلسان یا

قباء کے بن بند کئے رہا ایک دن تو اس شخص پر دم واجب ہوگا، چونکہ خیاطت کے ساتھ ساتھ، گھنڈی/بٹن کی بنا پر پٹھراؤ پایا جا رہا ہے، بخالف اس صورت کے اگر چادر کو گرہ لگالی، یا ازار کو کبھی رستی وغیرہ کے ذریعہ باندھ لیا تو ایسا کرنا مکروہ ہے۔ چونکہ اس ہیئت کے اختیار کرنے میں 'تشبیہ بالمخیط' لازم آتا ہے۔ لیکن اس شخص پر کوئی شیء بھی لازم نہیں ہوگی۔ چونکہ اشتمال بواسطہ الخیاط یہاں منشی ہے اھ۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے کلام کا مطلب یہ ہوگا: أتلقى هذا الإلقاء، والحال أنه ﷺ هي المحرم عن ستر الرأس وتغطية، والله تعالى أعلم۔

حالت احرام میں سینگی لگوانا جائز ہے

۲۶۹۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ مَالِكِ ابْنِ بَحِيْنَةَ قَالَ احْتَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ بِلَحْيٍ جَمَلِيٍّ مِنْ طَرِيقِ مَكَّةَ فِي وَسْطِ رَأْسِهِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۰۱/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۳۶۔ ومسلم فی صحیحہ ۸۶۲۲/۲ الحدیث رقم ۱۸۳۶۔ ومسلم فی صحیحہ ۸۶۲۲/۲ الحدیث رقم (۸۸-۱۲۰۳)۔ والنسائی فی السنن ۱۹۴/۵ الحدیث رقم ۲۸۵۰۔ والدارمی ۵۷/۲ الحدیث رقم ۱۸۲۰۔ ومالك فی الموطأ ۳۴۹/۱ الحدیث رقم ۴۷ من کتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ مالک جو حنینہ کے بیٹے ہیں ان سے روایت ہے کہ کہتے ہیں کہ سینگی کھنچوائی نبی کریم ﷺ اپنے سر کے درمیان حالت احرام میں لگی جمل میں مکہ کے راستے میں اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: عبد اللہ بن مالک ابن بحینہ: مالک حضرت عبد اللہ کے باپ کا نام ہے اور حنینہ ان کی ماں کا نام ہے گویا ابن حنینہ حضرت عبد اللہ کی دوسری صفت ہے اسی لئے "عبد اللہ بن مالک ابن حنینہ" میں مالک کو توین کے ساتھ پڑھتے ہیں اور "ابن حنینہ" میں الف لکھا جاتا ہے۔

قولہ: احتجم رسول اللہ ﷺ بلحی جملی من طریق مکة فی وسط رأسه: "لحی": لام کے فتح، حاء کے سکون کے ساتھ، ایک جگہ کا نام ہے۔

"وسط": آنحضرت ﷺ نے جب سر کے پچوں بیچ چھپنے لگوائے تو سر مبارک کے بال کچھ نہ کچھ ضرور نولے ہوں گے لہذا یہ حدیث ضرورت پر محمول ہے کہ آپ ﷺ نے کسی عذر و ضرورت کی بناء پر سر میں چھپنے لگوائے تھے چنانچہ اگر محرم کسی ایسی جگہ چھپنے لگوائے جہاں بال نہ ہوں تو اس پر فدیہ واجب نہیں ہوتا۔

ابن عمر اور امام مالک سے مروی ہے کہ حالت احرام میں چھپنے لگوانا مکروہ ہے، اگر چہ قطع شعر کو متضمن نہ ہو۔ اور حسن بصری سے مروی ہے کہ اس صورت میں فدیہ واجب ہے۔

احرام کی حالت میں چھپنے لگوانا

۲۶۹۳: وَعَنْ أَنَسِ قَالَ احْتَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ عَلَى ظَهْرِ الْقَدَمِ مِنْ وَجَعِ كَأَن يَه۔

(رواه ابو داؤد والنسائی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۱۸/۲ الحدیث رقم ۱۸۳۷۔ والنسائی فی السنن ۱۹۴/۵ الحدیث رقم ۲۸۴۹۔

ترجمہ: حضرت انس سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے سینگی کھنچوائی اور آپ ﷺ محرم تھے قدم کی پشت پر درد کی وجہ

سے اس کو ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: چیر کی پشت پر چونکہ بال نہیں ہوتے اور وہاں چھپے لگوانے سے بال ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے اس حدیث میں کوئی اشکال نہیں ہے اور پھر یہ کہ آپ ﷺ نے ایک عذر یعنی درد کی وجہ سے یہ چھپے لگوائے تھے۔ ممکن ہے کہ چھپے لگوانے کے یہ دونوں واقعات ایک ہی احرام کے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں واقعات علیحدہ علیحدہ احرام میں پیش آئے ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس حدیث سے ابن عمر، امام مالک اور حسن بصری کے موقف کی تردید ہو رہی ہے۔

آپ ﷺ نے بغیر احرام کی حالت کے نکاح فرمایا

۲۶۹۵: وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ تَزَوَّجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَيْمُونَةَ وَهُوَ حَلَالٌ وَبَنَىٰ بِهَا وَهُوَ حَلَالٌ وَكُنْتُ أَنَا الرَّسُولَ بَيْنَهُمَا۔ (رواه احمد والترمذی وقال هذا حدیث حسن)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۰۰/۱۳ الحدیث رقم ۸۴۱۔ والدارمی فی ۵۹/۲ الحدیث رقم ۱۸۲۵ واحمد فی المسند ۳۳۳/۶۔

ترجمہ: ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت نکاح کیا جب کہ آپ ﷺ بغیر احرام کے تھے اور ان کے ساتھ شب زفاف گزاری اس وقت بھی آپ ﷺ احرام کی حالت میں نہ تھے اور میں حضور ﷺ اور میمونہ رضی اللہ عنہا کے درمیان پیغام پہنچانے والا تھا۔ اس کو ابام احمد اور ترمذی کے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

تشریح: قولہ: بنی بہا: ”زفاف“ سے کنایہ ہے۔

عرض مرتب: اس حدیث پر سیر حاصل بحث ماقبل میں گزر چکی ہے، ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۲۶۸۲۔

بَابُ الْمَحْرَمِ يَجْتَنِبُ الصَّيْدَ

محرم کے لئے شکار کی ممانعت کا بیان

لفظ باب کو ساکن علی الوقف بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اور ”هو“ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں، اور یہ احتمال بھی ہے کہ اضافت کے ساتھ ہو۔

متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک شکار یا شکار میں کسی کی اعانت محرم کے لئے حرام ہے۔ چنانچہ کسی شکار کے جانور کو قتل کرنے یا اس کے قتل میں اعانت کرنے سے محرم پر جبر لازم آتی ہے۔

شکار کی جزا یا کفارہ:

شکار کی وجہ سے محرم پر جو جزا یا کفارہ لازم ہوتا ہے اس سے مراد وہ قیمت ہے جو دو عادل و تجربہ کار شخص اس شکار کی تجویز کریں اور یہ قیمت یا تو اس مقام کے اعتبار سے ہو جہاں وہ شکار مارا گیا ہے یا اگر اس مقام پر کوئی قیمت نہ ہو تو اس مقام کے اعتبار سے ہو جو شکار کے مقام سے قریب تر ہو کیونکہ ایک چیز کی قیمت مختلف مقامات کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ اس قیمت سے غلہ خرید کر ہر فقیر کو اگر گے ہوں

ہوں تو نصف نصف صاع اور اگر جو یا کھجور ہو تو ایک ایک صاع تقسیم کر دے کسی فقیر کو اس تعداد سے کم نہ دے اور چاہے ہر فقیر کی تعداد صدقہ (یعنی نصف گے ہوں یا ایک صاع جو) کے عوض ایک ایک روزہ رکھ لے۔

اگر کوئی محرم کسی شکار کو زخمی کر دے اور وہ اس زخم سے مرے نہیں یا شکار کے بال اکھاڑ ڈالے یا اس کا کوئی عضو توڑ دے تو اس شکار کی حالت صحت کی قیمت میں اس کی وجہ سے جس قدر کی آگئی ہو وہ اس محرم کو دینا چاہئے۔

اگر کوئی محرم کسی شکار کے ہاتھ پیر کاٹ دے یا اس کے پر نوچ اکھاڑ دے کہ جس کی وجہ سے وہ اپنی حفاظت سے معذور ہو جائے تو اس شکار کی پوری قیمت دینا پڑے گی اور اس کا دودھ دوہے تو اس دودھ کی قیمت اس پر واجب ہوگی اسی طرح اگر اس کا انڈا توڑ دے تو اس کی قیمت دینی پڑے گی۔

محرم شکار کھائے یا نہ کھائے؟ اس بارے میں تفصیل ہے اس بات میں تو بالاتفاق تمام علماء کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی محرم خود شکار کرے یا کوئی دوسرا محرم شکار کرے تو وہ شکار کھانا محرم کے لئے حرام ہے ہاں اگر صورت یہ ہو کہ کوئی غیر محرم اپنے لئے شکار کرے یا محرم کے لئے اس کی اجازت سے یا اس کی اجازت کے بغیر شکار کرے تو اس کے کھانے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال و مسلک ہیں چنانچہ بعض صحابہ و تابعین کہ جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں کا قول تو یہ ہے کہ محرم کے لئے مطلق شکار کھانا حرام ہے ان کی دلیل حضرت صعب بن جشمہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو اس باب کی پہلی حدیث ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر محرم خود شکار کرے یا کوئی دوسرا شخص اس کے لئے یا اس کی اجازت سے یا اس کی اجازت کے بغیر شکار کرے تو اس کے لئے اس شکار کو کھانا حرام ہے۔ ہاں اگر کوئی غیر محرم اپنے لئے شکار کرے اور اس میں سے کچھ بطور ہدیہ محرم کو بھیجے تو اس کا کھانا اس کے لئے حلال ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین علماء کا مسلک یہ ہے کہ محرم کے لئے شکار کا گوشت کھانا حلال ہے خواہ وہ شکار اس کے لئے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو بشرطیکہ وہ شکار نہ تو اس نے خود کیا ہو نہ اس شکار کرنے کا کسی کو حکم دیا ہو نہ اس شکار کی راہ کسی کو دکھائی ہو نہ اس شکار کی طرف کسی کو متوجہ کیا ہو اور نہ اس شکار میں خود اس نے یا کسی اور محرم نے اعانت کی ہو۔ حنفیہ کی دلیل حضرت ابوقحادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

شکار سے کونسے جانور مراد ہیں؟

محرم کے لئے جس شکار کی ممانعت ہے اس سے مراد جنگلی شکار کو قتل کرنا ہے۔ جنگلی ان جانوروں کو کہتے ہیں جن کا توالد و تناسل خشکی یا جنگل میں ہوتا ہو گوان کی بود و باش پانی میں ہو جیسے مرغابی وغیرہ۔ اسی طرح شکار اس جانور کو کہتے ہیں جو اصل خلقت میں وحشی ہو خواہ وہ کسی وجہ سے مانوس ہو گیا ہو جیسے ہرن کہ وہ پالنے والے سے مانوس ہو جاتا ہے مگر چونکہ وہ دراصل وحشی ہے اس لئے شکار کہلائے گا۔ خواہ وہ جنگل میں رہتا ہو یا پلا ہو یا بہر صورت اس کا شکار کرنے سے جزا واجب ہوگی۔ جو جانور دراصل وحشی نہ ہو اس کا ذبح کرنا حالت احرام میں بھی جائز ہے چنانچہ بکری، دنبہ، بھیڑ، گائے، اونٹ اور گھر کی پلی ہوئی بلیخ کو ذبح کرنا محرم کے لئے جائز ہے۔ کہتو کو فقہاء نے وحشی الاصل قرار دیا ہے اس لئے اس کے شکار پر جزا واجب ہوتی ہے۔ در ربائی جانوروں کا شکار آیت کریمہ: ﴿أَحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ﴾ [المائدہ: ۹۶] کے پیش نظر محرم اور غیر محرم دونوں کے لئے حلال ہے خواہ وہ جانور کھائے جانے والے ہوں یا کھائے جانے والے نہ ہوں۔

جو جنگلی جانور کھائے جاتے ہیں ان کا شکار تو متفقہ طور پر حرام ہے ہاں جو جانور کھائے نہیں جاتے ان کی صاحب بدائع نے دو قسمیں کی ہیں ایک قسم تو ان جانوروں کی ہے جو طبعاً ایذا پہنچاتے ہیں اور اکثر و بیشتر ایذا پہنچانے میں خود ابتدا کرتے ہیں جیسے شیر، چیتا اور بھیڑیا چنانچہ ان جانوروں کو قتل کرنا محرم کے لئے جائز ہے اور ان کو قتل کرنے سے محرم پر جزا واجب نہیں ہوتی۔ دوسری قسم ان جانوروں کی ہے جو

ایذا پہنچانے میں ابتدا نہیں کرتے جیسے بچو (شکرہ کی ایک قسم وغیرہ) ایسے جانوروں کے بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر یہ جانور محرم پر پہلے حملہ کریں تو وہ ان کو مار سکتا ہے اور اس کی وجہ سے اس پر جزاء واجب نہیں ہوگی اور اگر وہ حملہ نہ کریں تو پھر محرم کے لئے یہ مباح نہیں ہے کہ وہ ان کو مارنے میں ابتدا کرے اگر ابتدا کرے گا تو اس پر جزاء واجب ہوگی۔

الفصل الاول:

احرام کی حالت میں گورخر کا ہدیہ قبول نہ کرنا

۲۶۹۶: عَنِ الصَّعْبِ بْنِ جُنَّامَةَ أَنَّهُ أَهْدَى لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ حِمَارًا وَحَشِيًّا وَهُوَ بِالْأَبْوَاءِ أَوْ بِوَدَانَ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَلَمَّا رَأَى مَا فِي وَجْهِهِ قَالَ إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكَ إِلَّا أَنَا حُرْمٌ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۱/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۲۵۔ ومسلم فی ۸۵۰/۲ الحدیث رقم (۵۰-۱۱۹۳)۔ والترمذی فی السنن ۲۰۶/۳ الحدیث رقم ۸۴۹۔ والنسائی فی ۱۸۳/۵ الحدیث رقم ۲۸۱۹۔ وابن ماجہ فی ۱۰۳۲/۲ الحدیث رقم ۳۰۹۰ والدارمی فی ۶۰/۲ الحدیث رقم ۱۸۳۰۔ ومالک فی الموطأ ۳۵۳/۱ الحدیث رقم ۸۳ من کتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۳۷/۴۔

ترجمہ: حضرت صعّب بن جنامہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس بطریق تحفہ گورخر بھیجا حالانکہ اس وقت آپ ﷺ مقام ابواء یا ودان میں تھے۔ پس نبی کریم ﷺ نے ان پر پھیر دیا۔ پس جب کہ حضور ﷺ نے وہ چیز دیکھی کہ جو اس کے چہرے پر تھی یعنی قبول نہ کرنے کی وجہ سے آپ ﷺ نے ناخوشی اور غم کو محسوس کیا۔ ارشاد فرمایا ہم نے واپس نہیں کیا مگر یہ کہ ہم احرام کی حالت میں تھے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

الصعب بن جنامة۔ یہ صعّب بن جنامہ "دلیش" ہیں ودان اور ابواء میں جو کہ سر زمین حجاز میں واقع ہے ان کا قیام تھا۔ ان کی حدیث بھی اہل حجاز ہی میں پائی جاتی ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے روایت کرتے ہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کے زمانہ خلافت میں انتقال ہوا۔ "جنامہ" جیم کے زبر اور ثائے مثلث کی تشدید کے ساتھ ہے۔

تشریح: ابواء: ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ مدینہ سے دس فرسخ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ ایک قدیم راستہ تھا، نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کا سفر بھی اسی راستہ پر ہوتا تھا، لیکن آج کل ان راستوں پر سفر متروک ہے۔ یہ دونوں راستے جھگھ کے قریب جدا ہو جاتے ہیں اور مدینہ کے قریب اکٹھے ہوتے ہیں۔

ودان: دال مہملہ کی تشدید کے ساتھ ہے، ابواء سے ۸ میل کے فاصلہ پر ایک بہت بڑی بستی تھی۔ ابواء اور جھگھ کے درمیان واقع ہے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں یہ دونوں جگہیں مکہ و مدینہ کے درمیان میں واقع ہیں۔

لم نردہ: دال مشدّدہ کے فتح نیز ضمہ کے ساتھ بمعنی "صدید"

حرم: پہلے دونوں حرفوں پر ضمہ ہے۔ بمعنی "محرّم" حرم، حرام کی جمع ہے۔ حج کا احرام باندھنے والے کو "حرام" کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس واقعہ کے بارے میں وارد روایات کے الفاظ میں شدید اختلاف ہے چنانچہ ایک روایت میں وضاحت کے ساتھ یہ منقول ہے کہ گورخر کا گوشت بھیجا گیا تھا، ایک روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گورخر کی ران بھیجی گئی تھی اسی طرح ایک روایت یہ بتاتی ہے کہ اس کا ایک ٹکڑا بھیجا گیا تھا۔

لہذا ان روایتوں کے پیش نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندہ گورخر نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ یہاں حدیث میں بھی گورخر سے اس کا گوشت ہی مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ کی خدمت میں زندہ گورخر ہی بھیجا گیا ہوگا جسے آپ ﷺ نے قبول نہیں کیا، پھر بعد میں دوسرے گورخر کی ران بھیجی گئی اسی کو کسی نے تو گوشت سے تعبیر کیا اور کسی نے اسے اس کا ٹکڑا کہا۔

ابن حجرؒ ان روایات میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں: فروایۃ لحمہ: اى بعضہ ورجلہ اى مع العجز وهو الشق المذکور فى الآخرى، وروایۃ: عضو هو الرجل وما اتصل بها، فاجتمعت الروایات۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ محرم کیلئے زندہ شکار قبول کرنا جائز نہیں، اگرچہ اس کا گوشت قبول کرنا جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت اقدس میں حمار وحشی کا گوشت پیش کیا گیا تھا، آپ ﷺ نے وہ گورخر اس گمان کی بنا پر واپس کر دیا تھا کہ وہ بطور خاص آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے شکار کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی تائید ابوقادہ اور حضرت جابرؓ کی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ ان دونوں روایتوں پر کلام غفریب آئے گا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حمار وحشی کا گوشت ہدیہ کیا گیا، ایک روایت میں ہے حمار وحشی کی ٹانگ ہدیہ کی گئی، ایک روایت میں عجز حمار کے الفاظ ہیں، اور ایک میں ہے کہ ”شق حمار“ بطور ہدیہ لائی گئی۔ اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ محرم کیلئے شکار کا گوشت مطلقاً حرام ہے، خواہ شکار اس کیلئے ہو، خواہ اس کے حکم سے کیا گیا ہو، خواہ کچھ بھی ہو۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ حضرت علیؓ اسی کے قائل تھے۔

ہمارا مذہب ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے موقف کے موافق ہے: حضرت عمر، ابو ہریرہ، طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت عائشہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ان حضرات کا یہ مذہب امام طحاویؒ نے نقل کیا ہے۔ ابن عباس، طاؤس اور ثوری رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور شافعیہ کا مذہب وہ ہے کہ جس کی تصریح ابوقادہؒ کی روایت میں آرہی ہے: انه يحرم، ويكون ميتة إن صاده وصيدله، أو دل أو أعان عليه أو أشار إليه۔ فرماتے ہیں: ان کا زعم یہ ہے کہ حدیث صعب کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے۔ لہذا یہ حدیث ابوقادہؒ کی اگلی حدیث کیلئے ناخ ہے۔ لیکن ان کا یہ زعم درست نہیں۔ چونکہ شخ کی ایک شرط یہ ہے کہ حج حعدز رہو، اور ہدیہ کو رد کرنے کی علت یہ تھی کہ وہ حالت احرام میں تھے۔ اور آپ کا گمان یہ تھا کہ یہ شکار خصوصی طور پر آپ کیلئے کیا گیا ہے۔ حدیث ابوقادہؒ میں آرہا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے شکار کا گوشت ایک مرتبہ تناول فرمایا ہے، اور ایک مرتبہ تناول نہیں فرمایا، اگر یہ صحیح ہے تو..... نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ حالت احرام میں مقام عرج پر تشریف لائے آپ کی خدمت میں ”حمار عقیرہ“ پیش کیا گیا تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابو بکرؓ کو حکم دیا کہ رفقاء میں تقسیم کر دیں اور یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ اس شکار کے گوشت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ جس کو کسی حلال نے شکار کیا ہو؟ تو آپ نے اس کی حلت کا فتویٰ صادر فرمایا، پھر حضرت عمرؓ کو بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا: أفتیۃ بغير ذلك لأوجعتک!؟

حقیقہ کا استدلال

۲۶۹۷: وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ أَنَّهُ خَرَجَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَتَخَلَّفَ مَعَ بَعْضِ أَصْحَابِهِ وَهُمْ مُحْرِمُونَ وَهُوَ غَيْرُ مُحْرِمٍ فَرَأَى وَحْشِيًّا قَبْلَ أَنْ يَرَاهُ فَلَمَّا رَأَوْهُ تَرَكُوهُ حَتَّى رَأَاهُ أَبُو قَتَادَةَ فَرَكِبَ فَرَسًا لَهُ فَسَأَلَ لَهُمْ أَنْ يَنَالُوهُ سَوْطَهُ فَأَبَوْا فَتَنَالَهُ فَحَمَلَ عَلَيْهِ فَعَقَرَهُ ثُمَّ أَكَلَ فَكَلُّوا فَنَدِمُوا فَلَمَّا أَدْرَكُوا رَسُولَ اللَّهِ

سَأَلُوهُ قَالَ هَلْ مَعَكُمْ مِنْهُ شَيْءٌ قَالُوا مَعَنَا رَجُلُهُ فَأَخَذَهَا النَّبِيُّ ﷺ فَكَالَهَا (متفق عليه وفي رواية لهما) فَلَمَّا أَتَوْا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ أَمِنْكُمْ أَحَدٌ أَمْرَةٌ أَنْ يَحْمِلَ عَلَيْهَا أَوْ أَشَارَ إِلَيْهَا قَالُوا لَا قَالَ فَكُلُوا مَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِهَا)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۹۱۴۔ الحدیث رقم ۱۸۲۴۔ و مسلم فی صحیحہ ۸۵۱۲/۲ الحدیث رقم (۵۶-۱۱۹۶)۔
وابوداؤد فی السنن ۴۲۸/۲ الحدیث رقم ۱۸۵۲۔ والترمذی فی ۲۰۴/۳ الحدیث رقم ۸۴۷۔ والنسائی فی ۱۸۲/۵
الحدیث رقم ۲۸۱۶ وابن ماجہ فی ۱۰۳۳/۲ الحدیث رقم ۳۰۹۲۔ ومالك فی الموطأ ۳۵۰/۱ الحدیث رقم ۷۶ من کتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت ابو قتادہ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ (حدیبیہ کے سال) نکلے پس وہ اپنے بعض دوستوں سے پیچھے رہ گئے اور ان کے دوست محرم تھے اور ابو قتادہ غیر محرم تھے پس ان کے دوستوں نے گورخر کو ان کے دیکھنے سے پہلے دیکھا پس جب ان کے دوستوں نے دیکھا تو چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کو ابو قتادہ نے دیکھا پس وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے پھر اپنے دوستوں سے اپنا کوڑا مانگا مگر انہوں نے کوڑا دینے سے انکار کر دیا پھر ابو قتادہ نے کوڑا لیا یعنی گھوڑے سے اتر کر پھر گورخر پر حملہ کیا پس اس کو مارا اور کھایا اور ساتھ والوں نے بھی کھایا پھر اس کی وجہ سے پریشان ہوئے کہ محرم کو مطلقاً شکار درست نہیں ہے پس جب حضور ﷺ سے ملاقات ہوئی۔ تو اس کا حکم پوچھا۔ کہ آیا اس کا کھانا ہمارے لیے درست تھا یا نہیں؟ فرمایا کہ کیا تمہارے پاس اس میں سے کچھ ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس اس کا پاؤں ہے پس اس کو نبی کریم ﷺ نے لیا اور کھایا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے اور ایک روایت ان دونوں میں سے یہ ہے کہ جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کو حکم کیا تھا یہ کہ گورخر پر حملہ کرے یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا نہیں پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کھاؤ جو اس کے گوشت میں سے باقی ہے۔

تشریح: وہم محرمون وهو غیر محرم: مانگی کی روایت میں یوں ہے: أحرموا کلہم إلا أبو قتادۃ لم یحرم، واضح رہے کہ ”ابو قتادہ“ مبتدا ہے، اور ”ولم یحرم“ اس کی خبر ہے، اور ”إلا“ بمعنی ”لکن“ ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرَانِكَ﴾ اور کثیر اور ابو عمر کی روایت رفع کے ساتھ ہے۔ ”أمرانک“ / ”أحد“ سے ”بدل“ قرار دینا صحیح نہیں۔ چونکہ وہ ان کے ساتھ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ جیسا کہ قراءت نصب اس پر دلالت کر رہی ہے۔

اس حدیث کے بارے میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں تو بتایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس گورخر میں سے بچا ہوا پاؤں تیار کرنا کر کھایا جب کہ ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے کھایا نہیں؟ لہذا اس اشکال کو دور کرنے کے لئے علماء ان دونوں روایتوں میں یہ مطابقت پیدا کرتے ہیں کہ آپ ﷺ خود چونکہ حالت احرام میں تھے اس لئے ابتدا میں آپ ﷺ نے یہ گمان کیا ہوگا کہ اس گورخر کے شکار میں کسی محرم کے حکم یا اس کی اعانت کو دخل رہا گا اس لئے آپ ﷺ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا ہوگا مگر جب صحیح صورت حال سامنے آ گئی اور آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ اس کے شکار میں کسی محرم کے حکم یا اس کی اعانت کا کوئی دخل نہیں تھا تو آپ ﷺ نے اسے کھایا۔

محرم کے لئے جس طرح یہ ممنوع ہے کہ وہ شکار کے لئے کسی کو حکم دے اسی طرح دلالت اور اشارہ بھی ممنوع ہے دلالت اور اشارہ

میں فرق یہ ہے کہ دلالت کا تعلق زبان سے ہوتا ہے اور اشارے کا تعلق اعضاء سے گے مثلاً محرم کو کسی ہاتھ سے اشارہ سے شکار کی طرف متوجہ کرے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ دلالت کا تعلق اس شکار سے ہوتا ہے جو نظر کے سامنے نہ ہو اور اشارہ کا تعلق اس شکار سے ہوتا ہے جو نظر کے سامنے ہو۔

اس موقع پر یہ بات جان لیجئے کہ محرم کے لئے تو دلالت حدود حرم میں بھی حرام ہے اور حدود حرم سے باہر بھی لیکن غیر محرم کے لئے حدود حرم میں تو حرام ہے اور حدود حرم سے باہر حرام نہیں ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ محرم کو شکار کا گوشت کھانا حلال ہے بشرطیکہ وہ شکار نہ تو خود اس نے کیا ہو اور نہ اس شکار میں اس کی دلالت اشارت اور اعانت کا قطعاً دخل ہو۔ چنانچہ یہ حدیث حنفیہ کے اس مسلک کی دلیل ہے اور ان حضرات کے مسلک کی تردید کرتی ہے جو محرم کو شکار کا گوشت کھانے سے منع کرتے ہیں۔

فاخذها النبي ﷺ فاكلها: اس میں اشارہ ہے، الجواب بالفعل أقوى من القول۔ اور ایک صحیح روایت میں ہے: انه عليه الصلوة والسلام لم ياكل منه۔ تو یہ اس احتمال کے منافی نہیں کہ ابوقادہ کو اس سفر میں یہ واقعہ دوسرے پیش آیا ہو۔
أو اشار اليها: بعض کا کہنا ہے کہ اشارہ و دلالت دونوں ہم معنی ہیں۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: اصحاب صحاح ستہ نے حضرت ابوقادہ سے روایت نقل کی ہے کہ صحابہ کرام سفر میں تھے، ان میں سے بعض محرم تھے اور بعض غیر محرم تھے۔ ابوقادہ فرماتے ہیں میں نے ایک حمار وحشی دیکھا پس میں گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ پکڑا، اور سا اپنے ساتھیوں سے مدد طلب کی، پس انہوں نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ پس میں نے کسی سے کوڑا چھین لیا، اور حمار وحشی کو مارا، اور اسے شکار کر لیا، تو سب نے اس کا گوشت کھایا، اور کچھ بچا لیا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس شکار کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا پوچھا کہ کیا تم نے اس کو دیا تھا کہ اس پر حملہ کرے، یا کسی نے اشارہ کیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فكلوا ما بقى من لحمها اور مسلم کی روایت میں ہے کہ: هل اشترتم، هل اعنتم؟ قالوا: لا۔ قال فكلوا ما اهدا اور ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرام نے اس حمار کو دیکھا تو ہنس پڑے۔ پس انہوں نے بھی اس کو دیکھ لیا اور اپنے ساتھیوں سے مدد طلب کی، انہوں نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ابوقادہ نے صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ کسی چیز کی طرف دیکھ رہے ہیں، پس آپ نے بھی اس کی طرف دیکھا تو حمار وحشی تھا۔ تو ان کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا، پس ساتھیوں نے کہا کہ اس سلسلہ میں ہم تمہاری کچھ بھی مدد نہیں کریں گے۔ چونکہ ہم محرم ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ پس انہوں نے حمار وحشی کو دیکھا اور میں مشغول تھا اور اپنے جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا پس انہوں نے مجھے خبر نہ دی۔ اور میری خواہش تھی کہ کاش میں اسے دیکھ لیتا۔ پس میں پلٹا تو میں نے اسے دیکھ لیا۔ پس میں نے کہا مجھ کو میرا کوڑا اور نیزہ پکڑا دو، تو ساتھیوں نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم اس مسئلہ میں تیری کچھ بھی مدد نہ کریں گے۔

یہ تمام کی تمام روایات بالکل صحیح ہیں، ان سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ صحابہ کے ہنسنے اور دیکھنے کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ شکار سے آگاہ کریں ان حضرات کا ارادہ اعلام صید کا نہیں تھا، وگرنہ تو حرام ہوتا۔ شرح المہذب میں لکھا کہ دلالت ظاہرہ اور خفیہ کے درمیان فرق کا نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

احرام کی حالت میں موذی جانوروں کو مارنا گناہ نہیں ہے

۲۶۹۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ خَمْسٌ لَا جُنَاحَ عَلَيَّ مَنْ قَتَلَهُنَّ فِي الْحَرَمِ وَالْأَحْرَامِ الْفَارَّةُ

وَالغُرَابُ وَالْحِدَاةُ وَالْعُقْرَبُ وَالْكَلْبُ الْعُقُورُ۔ (منفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۵۵/۶۔ الحدیث رقم ۳۳۱۵۔ ومسلم فی ۸۵۷/۲ الحدیث رقم (۷۲۔ ۱۱۹۹)۔
وابوداؤد فی السنن ۴۲۴/۲ الحدیث رقم ۱۸۴۶۔ والنسائی فی ۱۸۷/۵ الحدیث رقم ۲۸۲۸۔ وابن ماجہ ۱۰۳۱/۲
الحدیث رقم ۳۰۸۸۔ ومالک فی الموطأ ۳۵۶/۱ الحدیث رقم ۸۹ من کتاب الحج واحمد فی المسند ۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پانچ جانوں کو حرم میں مارنا گناہ نہیں ہے نہ احرام کی حالت میں چوہا اور کوا اور چیل اور بچھو اور کاٹنے والا کتا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: خمس: ایک روایت میں ”خمس من الدواب“ کے الفاظ ہیں، الفأرة: ہمزہ کے ساتھ نیز ابدال کے ساتھ بھی۔
الغراب: ایک روایت میں ”الأبقع الأبلق“ کے الفاظ ہیں۔ الحدأة: برون عنبہ۔ بعض تحقیقین فرماتے ہیں: حدأة حائے مہملہ کے کسرہ کے ساتھ اور اسی طرح الحدأ، اور کبھی فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ مشہور و معروف پرندہ ہے۔ اور ”الحدیا“ مصغر ہے الحدأ کی یا ”حدأة“ کی۔ یا ئے تصغیر کے بعد واقع ہونے والے ہمزہ کو یا ء سے بدل کر، یا ء کا ہاء میں ادغام کر دیا گیا، حدیة ہو گیا۔ پھر تاء کو حذف کر دیا گیا اور اس کے عوض میں الف لے آئے تاکہ وہ دلالت کے معنی پر بھی دلالت کرے۔

الغراب (کوا) سے مراد الغراب الابقع (البلق کوا) یعنی وہ سیاہ سفید کوا ہے جو اکثر مردار اور نجاسات کھاتا ہے۔ چنانچہ اگلی روایت میں اس کی وضاحت بھی ہے اس لئے وہ کوا مارنا جائز نہیں ہے جو کھیت کھلیان کھاتا ہے اور جس کے پورے جسم کا رنگ تو سیاہ اور چونچ و پاؤں کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔

کٹ کھنے کتے کے حکم میں وہ تمام درندے جانور شامل ہیں جو حملہ آور ہوتے ہیں ایسے تمام جانوروں کو حرم میں اور احرام کی حالت میں مارنا جائز ہے۔

تخریج: اس روایت کو ابن ہمام نے صحیحین کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: خمس من الدواب ليس على المحرم في قتلهن جناح، العقرب، والفأرة، والكلب العقور، والغراب، والحدأة اه۔ اور یہ بھی صحیح ہے: امر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بقتل الوزغ وسماء فويسقا۔

موزی جانوروں کو مارنے کا حکم

۲۶۹۹: عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ خَمْسٌ فَوَاسِقٌ يُقْتَلْنَ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ الْحَيَّةُ وَالْغُرَابُ الْأَبْقَعُ وَالْفَأْرَةُ وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ وَالْحُدْيَا۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۵۵/۶۔ الحدیث رقم ۳۳۱۴۔ ومسلم فی ۸۵۶/۲ الحدیث رقم (۶۶۔ ۱۱۹۸)۔
والترمذی فی السنن ۱۹۷/۳ الحدیث رقم ۸۳۷۔ والنسائی فی ۱۸۸/۵ الحدیث رقم ۲۸۲۹۔ وابن ماجہ فی ۳۱/۲۔
الحدیث رقم ۳۰۸۷۔ واحمد فی المسند ۱۶۴/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پانچ موزی جانور صل میں بھی مارے جائیں اور حرم میں بھی مارے جائیں یعنی مارنے والا بغیر احرام کے ہو یا احرام باندھے ہوئے ہو۔ سانپ، سیاہ و سفید کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا اور چیل۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: خمس فواسق: خمس تنوین کے ساتھ ہے، مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور صفت ہے ”خمس“ کی نیز غیر منصرف ہے۔ چنانچہ ابن حجر کا اس کو منون قرار دینا خطا ہے اور اس کو منسوب علی الذم پڑھنا بھی درست نہیں، خلاف روایت ہے اور ضعف

درايت بھی لازم آتا ہے۔ اور مبتدا کی خبر یقتلن ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں: جس کو اضافت کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ مفتاح میں لکھتے ہیں: الأول هو الصحيح۔ الحدیث: حداً کی تصغیر ہے۔ اس کا واحد ”حداء“ آتا ہے، اور حداء کی تصغیر حدیاء آتی ہے۔ عرض مرتب: اس کتے کو مارنا حرام ہے جس سے فائدہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح اس کتے کو بھی مارنا حرام ہے جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو تو اس سے کوئی ضرر نقصان بھی نہ پہنچتا ہو۔

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں جن جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے مارنے کی اجازت صرف انہیں پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہی حکم ان تمام جانوروں کا بھی ہے جن سے ایذا پہنچتی ہو جیسے چیونٹی، پوسو، چمڑی اور کھٹل وغیرہ۔ ہاں اگر جوئیں ماری جائیں گی تو پھر حسب استطاعت و توفیق صدقہ دینا واجب ہوگا۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: صحیحین کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: خمس من الفواسق یقتلن فی الحل والحرم: الغرب والحداء والعقرب والفأرة والکلب العقوی۔ اور مسلم کی ایک روایت میں حیة کے بجائے عقرب کے الفاظ ہیں نیز ”الغراب الابقع“ کے الفاظ ہیں۔

الفصل الثانی:

محرم کو شکار کرنے کا ممانعت

۲۷۰۰: وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَحْمُ الصَّيْدِ لَكُمْ فِي الْإِحْرَامِ حَلَالٌ مَا لَمْ تَصِيدُوهُ أَوْ يُصَادَ

لَكُمْ۔ (رواه ابو داود و الترمذی و النسائی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۲۷/۲ الحدیث رقم ۱۸۵۱۔ و الترمذی فی ۱۰۳/۳ الحدیث رقم ۸۴۶۔ و النسائی فی ۱۸۷/۵ الحدیث رقم ۲۷۲۸۔ و الدارقطنی فی ۲۹۰/۲ الحدیث رقم ۲۴۳ من باب المواقیب۔ و احمد فی المسند ۳۶۲/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا شکار کا گوشت تمہارے حلال ہے جب تک

تم نے شکار نہ کیا ہو یا تمہارے لیے نہ کیا گیا ہو۔ اس کو ابو داؤد و ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: او یصاد لکم: اس کو مرفوع و منصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں: بظاہر مجزوم ہے، اور غایت

توجیہ یہ ہے کہ یہ عطف علی المعنی ہے، ای: ما لم تصیدوه او یصاد لکم اھ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ان مضمربے، چنانچہ منصوب ہے، اور ”او“ بمعنی ”الا“ ہے۔ گویا عبارت یوں ہے: لحم صید ذبحہ حلال میں غیر دللۃ المحرم و اعانته حلال لکم، إلا ان یصاد لأجلکم۔

حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ اگر حالت احرام میں تم خود شکار کرو گے یا کوئی دوسرا تمہارے لئے شکار کرے گا، اگرچہ وہ شکاری حالت احرام میں نہ ہو تو اس شکار کا گوشت کھانا تمہارے لئے درست نہیں ہوگا۔ امام مالک اور امام شافعی اس حدیث کو اپنے اس مسلک کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ محرم کے لئے اس شکار کا گوشت کھانا حرام ہے جسے کسی غیر محرم نے اس کے لئے شکار کیا ہو۔

لیکن حنفیہ اس حدیث کے یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ اگر حالت احرام میں زندہ شکار تمہارے لئے بطور تحفہ بھیجا جائے تو اس کا گوشت کھانا تمہارے لئے حرام ہوگا۔ ہاں اگر اس شکار کا گوشت تحفہ کے طور پر تمہارے پاس بھیجا جائے اس کا کھانا حرام نہیں ہوگا۔ گویا اس

صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ اگر تمہارے حکم کی بنا پر کوئی شکار کیا جائے گا تو اس کا کھانا تمہارے لئے درست نہیں ہوگا لہذا اس شکار کا گوشت محرم کے لئے حرام نہیں ہے جسے کوئی غیر محرم اس کے لئے ذبح کرے بشرطیکہ اس شکار میں محرم کے حکم یا اس کی اعانت اور اشارت و دلالت کا کوئی دخل نہ ہو۔

منسوب پڑھنے کے سلسلہ میں تحقیقی بات وہ ہے جو مفاہیح میں مذکور ہے، کہ ”او“ بمعنی ”الا“ ان ہے۔ اور ”مالم تصیدوہ“ استثناء کے معنی میں ہے گویا کہ یوں اور شاد فرمایا گیا: لحم الصيد لك في الاحرام حلال إلا ان تصيدوه إلا ان يصاد لكم اه استثناء ثانی۔ استثناء اول کے مفہوم سے ہے۔ فتامل۔ ابن حجر فرماتے ہیں: زیادہ واضح یہ ہے کہ لغت مشہورہ ہے۔ یہ اس آیت کریمہ کی قبیل سے ہے:

﴿إِنَّهُ مِنْ يَتَقَى وَيَصْبِرُ﴾ [یوسف: ۹۰] یاء کے اثبات اور یصر کے رفع کے ساتھ، اور شاعر کا یہ قول بھی اسی قبیل سے ہے: الم یاتیک والأخبار تنمی اه۔

ابن حجرؒ یہ تحقیق دو وجود سے خطاً فاحش پڑی ہے۔ اول تو اس وجہ سے کہ لغت مشہورہ کا تعلق ”ناقص“ سے ہے، جب کہ ہمارا موضوع سخن کلمہ اجوف ہے۔ دوسرا اس وجہ سے کہ یصبر کو مرفوع پڑھنا قراءت شاذہ ہے۔ اس صورت میں ”من“ موصولہ ہوگا۔ نہ کہ جازمہ اور ہمارا کلام مجزوم پڑھنے کے بارے میں ہے۔ سب سے بعض کی قراءت متواترہ یاء کے اثبات اور ”یصبر“ کے جزم کے ساتھ ہے۔ سو وہ بھی اسی لغت پر محمول ہے، یا پھر ”یاء“ کسرہ کے اشباع سے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ ضریبتیہ واحد مؤنث کے صیغہ میں پڑھا جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

علماء فرماتے ہیں: اس بات پر اتفاق بلکہ اجماع ہے کہ اگر محرم نے شکار کو ذبح کیا، یا حلال نے حرم کے شکار کو ذبح کیا تو وہ شکار مردار شمار ہوگا۔

ٹڈی

۲۷۰۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْجَرَادُ مِنْ صَيْدِ الْبَحْرِ - (رواه ابو داود و الترمذی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۲۹/۲ الحدیث رقم ۱۸۵۳۔ و الترمذی فی ۲۰۷/۳ الحدیث رقم ۸۵۰۔ و ابن ماجہ فی

۱۰۷۴/۲ الحدیث رقم ۳۲۲۲۔ و احمد فی المسند ۳۰۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ ٹڈی دریا کے شکار سے ہے اس کو ابو داؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علماء کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ٹڈی کو دریا کے شکار کی مانند صرف اس اعتبار سے فرمایا کہ ٹڈی دریائی شکار یعنی مچھلی کے مشابہ ہے کہ جس طرح مچھلی بغیر ذبح سے ہونے کھائی جاتی ہے اسی طرح ٹڈی کو بھی بغیر ذبح کئے کھانا درست ہے۔ چنانچہ محرم کے لئے ٹڈی مارنا جائز نہیں ہے اگر کوئی محرم ٹڈی مارے گا تو اس پر صدقہ (بقدر قیمت) لازم ہوگا۔ نیز ہدایہ میں بھی یہ لکھا ہے کہ ٹڈی خشکی کے شکار کے حکم میں ہے اور ابن ہمام کے قول کے مطابق اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے لئے ٹڈی کا شکار یعنی ٹڈی پکڑنا جائز ہے کیونکہ یہ دریائی شکار کی مانند ہے اور اس آیت کریمہ: **وَاحِلٌ لَّكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ مَا دُمْتُمْ حُرْمًا** اور احرام کی حالت میں تمہارے لئے دریائی شکار حلال رکھا گیا ہے کے پیش نظر محرم کے لئے دریا کا شکار جائز ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: سنن ابوداؤد اور جامع الترمذی میں مروی ابو ہریرہؓ کی روایت سے اشکال پیدا ہوتا ہے۔ وہ روایت یہ ہے: عن ابی ہریرۃ قال: خرنا مع رسول اللہ ﷺ فی حجة أو غزوة، فاستقبلنا رحل من جراد، فجعلنا نضربه بسيطانا وقسينا، فقال ﷺ، كلوه فإنه من صيد البحر..... مؤطا میں مروی ہے: أنبانا يحيى بن سعيد، أن رجلا سأل عمر عن جراد قتلها وهو محرم، فقال عمر لكعب: تعال حتى تحكم، فقال كعب: درهم، فقال عمر: إنك لتجد الدرهم لعمرة خير من جرادة۔ ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو قصہ سمیت ذکر کیا ہے۔ اصحاب مذاہب نے حضرت عمرؓ کی پیروی کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اھ۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ابوداؤد و ترمذی کی روایت صحیح ہے تو مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرح کی روایات کو جمع کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ ٹڈی دو طرح کی ہوتی ہے: ۱۔ بحری، ۲۔ بری۔ چنانچہ ہر ایک کے بارے میں اس کے مناسب معاملہ کیا جائے۔ اسنادی حیثیت: اس روایت کا سند اضعیف ہونا متفق علیہ ہے۔

حملہ کرنے والے درندے کو مار ڈالنے کا حکم

۲۷۰۲: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ يَقْتُلُ الْمُحْرِمُ السَّبْعَ الْعَادِيَّ۔

(رواہ الترمذی و ابو داؤد ابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۲۵/۲ الحدیث رقم ۱۸۴۸۔ و الترمذی فی السنن ۱۹۸/۳ و ابن ماجہ فی السنن ۱۰۳۲/۲ الحدیث رقم ۳۰۸۹۔ و احمد فی المسند ۳/۳۔

ترجمہ: حضرت ابی سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ فرمایا محرم حملہ کرنے والے درندے کو مار ڈالے۔ اس کو امام ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: العادی: یائے مخفف کے ساتھ ہے۔ عادی سے مراد شیر، چیتا اور بھٹی یا جیسے جانور ہیں۔ ”حملہ کرنے والے“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ جان لینے یا زخمی کرنے کے لئے چڑھ دوڑے جیسے شیر، بھٹی یا اور چیتا وغیرہ کہ یہ درندے انسان کو دیکھتے ہی اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

بجو کے شکار کا حکم

۲۷۰۳: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي عَمَّارٍ قَالَ سَأَلْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ الصَّبُعِ أَصِيدَ هِيَ فَقَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ أَيُّوْكُلُ فَقَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ نَعَمْ۔

(رواہ الترمذی و نسائی و الشافعی و قال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۲۲/۴ الحدیث رقم ۱۷۹۱۔ و النسائی فی ۲۰۰/۷ الحدیث رقم ۴۳۲۳۔ و الدارقطنی فی الحدیث رقم ۲۴۶/۲ من باب المواقیب و احمد فی المسند ۳/۳۱۸۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن عمارؓ سے روایت ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہؓ سے بجو جانور کے بارے میں پوچھا کہ کیا اس کا شکار ہے؟ پس انہوں نے کہا کہ ہاں۔ پس میں نے کہا کیا کھایا جائے؟ فرمایا کہ ہاں! پھر میں نے کہا کہ تم نے پیغمبر ﷺ سے سنا ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ اس کو امام ترمذی اور نسائی اور امام شافعی نے اور امام ترمذی

نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: اُبو کل: مذکور و مؤنث دونوں طرح پڑھا گیا ہے، بصیغہ ثانی پڑھنا زیادہ واضح ہے۔ سمعته میں رسول اللہ

ﷺ: یہاں حرف استفہام محذوف ہے۔ ای: اسمعته.....

سائل کا مطلب یہ تھا کہ بجوشکار ہے کہ محرم کے لئے اس کا کھانا حرام ہو یا یہ کہ شکار نہیں ہے بہر کیف اس موقع پر محرم سے قطع نظر بجو کے بارے میں بنیادی اختلاف تو یہ ہے کہ اس کا گوشت ویسے بھی حلال ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام شافعیؒ تو اس حدیث کے پیش نظر یہ فرماتے ہیں کہ بجوحلال جانور ہے اس کا گوشت کھانا درست ہے جب کہ امام مالکؒ اور امام اعظمؒ ابوحنیفہؒ کے نزدیک حلال جانور نہیں ہے اس لئے اس کا گوشت کسی کو بھی کھانا درست نہیں ہے۔ ان کی دلیل جو آگے آرہی ہے۔

بجو کے شکار کرنے پر جزا

۲۷۰۴: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنِ الضَّيْعِ قَالَ هُوَ صَيْدٌ وَيَجْعَلُ فِيهِ كَبْشًا إِذَا أَصَابَهُ الْمُحْرَمُ۔ (رواہ ابو داؤد وابن ماجہ والدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۱۵۸/۴ الحدیث رقم ۳۸۰۱۔ وابن ماجہ فی ۱۰۷۸/۲ فی الحدیث رقم ۳۲۳۶۔ والدارمی فی ۱۰۲/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۱۔ والدارقطنی فی ۲۴۶/۲ الحدیث رقم ۴۸ من باب المواقب۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے۔ کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے بجو کا حال پوچھا فرمایا کہ وہ شکار ہے اور جس وقت محرم اس کو پینچے تو اس کے بدلے دنبہ یا مینڈھا دے۔ اس کو ابو داؤد اور ابن ماجہ اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ہو صید: ضمیر کو مذکر لانا یا تو خبر کے اعتبار کی وجہ سے ہے، یا اس سے جنس مراد ہے۔ چنانچہ اس کو مذکور و مؤنث دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ ایک روایت میں: ہی صید کے الفاظ ہیں۔ ویجعل: ایک نسخہ میں صیغہ جمہول کے ساتھ ہے۔ إذا أصابه المحرم۔ ایک روایت میں إذا صاده المحرم کے الفاظ ہیں۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: وانفرد بزيادة فيه كس، والباقون رووه ولم يذكرها فيه۔ امام حاکم نے اس زیادت کے ساتھ اس کو جابرؓ سے روایت کیا ہے: قال: قال رسول الله ﷺ: الضيغ صيد، فإذا أصابه المحرم ففيه كبش مسن ويوكل۔ یہ روایت ہمارے خصم کی دلیل ہے کہ جو اس کو ماکول اللحم سمجھتے ہیں۔ یہ حدیث باب ہمارے خلاف حجت نہیں چونکہ حرام ہونا اور صید ہونا کوئی امر متضاد نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے احرام کی حالت میں بجو کا شکار کیا اسے خرید تو اسکی جزا کے طور پر ایک دنبہ یا ایک مینڈھا واجب ہوگا۔

بجو اور بھیڑیے کا مسئلہ

۲۷۰۵: وَعَنْ خُوَيْمَةَ بِنِ جَزِيٍّ قَالَ سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنِ أَكْلِ الضَّيْعِ قَالَ أَوْ يَأْكُلُ الضَّيْعَ أَحَدٌ وَسَأَلْتَهُ عَنِ أَكْلِ الذِّئْبِ قَالَ أَوْ يَأْكُلُ الذِّئْبَ أَحَدٌ فِيهِ خَيْرٌ۔ (رواہ الترمذی وقال لیس اسنادہ بالقوی)

اخرجه الترمذی فی ۲۲۲/۴ الحدیث رقم ۱۷۹۲۔ وابن ماجہ فی ۱۰۷۷/۲ الحدیث رقم ۳۲۳۵۔ (۱) الحدیث رقم ((النصب لست آكله ولا احرمه)) و لیس ((الضیغ)) اخرجہ البخاری فی ۶۶۲/۹ الحدیث رقم ۵۰۳۶۔ و مسلم فی

۵۴۲/۳ الحدیث رقم (۴۰-۱۹۴۳)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: حضرت خویمہ بن جزئیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے بجو کھانے کے بارے میں

پوچھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا بچو کو کوئی کھاتا ہے (یعنی کسی کو کھانا نہیں چاہیے) اور میں نے حضور ﷺ سے بھیڑیے کے کھانے کا پوچھا فرمایا کیا بھیڑیے کو کوئی کھاتا ہے کہ اس میں بھلائی ہو (یعنی ایمان تقویٰ) اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔

راوی حدیث:

خزیمۃ بن جزئی۔ یہ خزیمہ ”جزء“ کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ”ابو عبد اللہ سلمی“ ہے۔ ان سے ان کے بھائی ”حبان ابن جزئی“ روایت حدیث کرتے ہیں۔ ان کا شمار عرب کے یکتا لوگوں میں کیا جاتا ہے۔

تشریح: ”جزء“ حیم زبرزائے معجم کے سکون اور اس کے بعد ہمزہ کے ساتھ ہے اصحاب حدیث جزئی حیم کے زبر اور زائے معجم کے کسرہ اور آخر میں یائے تختانی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ عبدالغنی نے بیان کیا ہے۔ اور حافظ دارقطنی نے حیم کے کسرہ اور زائے معجم کے سکون کے ساتھ ضبط کیا ہے حبان حائے مہملہ کے کسرہ اور بائے موحدہ کی تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

او یا کل الضبع احد: یہ جملہ ”بجو“ کے گوشت کی حرمت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک فرماتے ہیں، بخلاف امام احمد اور امام شافعی کے۔ الذنب: ہمزہ کے ساتھ، نیز ابدال کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ احد فیہ خیر: ”احد“ کی صفت ہے۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے: افی الذنب خیر؟ و هو من الضواری۔ ہمزہ استفہام مجذوف ہے۔ یہ کہنا تکلف و تعسف ہے۔

جیسا کہ امام ترمذی نے فرمایا ہے یہ روایت اگرچہ باعتبار سند کے ضعیف ہے لیکن بذات خود یہ حدیث بالکل صحیح ہے جس کی دلیل ابن ماجہ کی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ومن یا کل الضبع نیز اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہر ذی ناب (کو چلی والا) درندہ کھانے سے منع کیا ہے (ذی ناب درندہ اس درندہ کو کہتے ہیں جو انت سے شکار کرتا ہے) اور بجوذی ناب درندہ ہے بہر کیف بجو کے مباح اور حرام ہونے کی دلیلوں میں تعارض ہے اس لئے امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے کہ اس کا گوشت نہ کھانا چاہئے۔

سعید ابن مسیب، سفیان ثوری اور علماء کی ایک جماعت کا موقف بھی یہی ہے۔ اور جہاں تک تعلق ہے اس حدیث: الضبع لست آکلہ ولا احرمه، کا سو یہ متدل ہے امام مالک کا، جو اس کی کراہت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک وہ چیز مکروہ ہے جس کا کھانا گناہ ہو، اور اس کی حرمت قطعی نہ ہو۔ اور ہمارے ائمہ کے قواعد کا منقہی کا یہ ہے کہ اس کا کھانا مکروہ تحریمی ہے، حرام محض نہیں ہے، چونکہ دلیل قطعی معدوم ہے اور اختلاف فقہی ہے۔

الفصل الثالث:

محرم کے لیے شکار کا گوشت کھانے کا حکم

۲۷۰۶: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عُمَانَ التَّمِيمِيِّ قَالَ كُنَّا مَعَ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللَّهِ وَنَحْنُ حُرْمٌ فَأُهْدِيَ لَهُ طَيْرٌ وَطَلْحَةُ رَاقِدٌ فِيمَا مِنْ أَكْلٍ وَمِنَّا مَنْ تَوَرَّعَ فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ طَلْحَةُ وَآفَقَ مَنْ أَكَلَهُ قَالَ فَاكَلْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواه مسلم)

والدارمی فی ۶۰/۲ الحدیث رقم ۱۸۲۹۔ واحمد فی المسند ۱/۱۶۱۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن عثمان تمیمی سے روایت ہے کہ ہم طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ صحابی کے ساتھ تھے اور ہم محرم تھے پس پرندہ جانور ہدیہ بھیجا گیا اور طلحہ سوئے ہوئے تھے پس ہم میں سے بعض آدمیوں نے کھایا یعنی اس لیے کہ محرم کے لیے کھانا جائز ہے شکار کا گوشت اگر حکم نہ کیا ہو اور بعضوں نے ہم میں سے پرہیز کیا یعنی اس گمان پر کہ محرم کو اس کا کھانا درست نہیں ہے حضرت طلحہ جاگے تو کھانے والوں کی موافقت کی پس طلحہ نے کہا ہم نے کھایا یعنی اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عبدالرحمن بن عثمان۔ یہ عبدالرحمن بن عثمان تمیمی قریشی ہیں جو طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ صحابی کے بھائی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے لیکن روایت نہیں کی ان سے بہت لوگ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: گشت کھانے والوں سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی موافقت کا تعلق قول سے بھی ہو سکتا ہے اور فعل سے بھی، یعنی یا تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ان سے زبانی یہ کہا ہوگا کہ تم نے گوشت کھالیا اچھا کیا اس میں کوئی حرج نہیں یہ قولی موافقت ہے پھر یہ کہ خود انہوں نے بھی باقی بچا ہوا گوشت کھایا ہوگا یہ فعلی موافقت ہے۔

طیر سے مراد جنس ہے کہ متعدد پرندے تھے، یا یہ کہ ایک ہی پرندہ تھا لیکن اتنا بڑا تھا کہ پوری جماعت کیلئے کفایت کر لیا۔ فاکلنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ایک نسخہ میں ”فاکلناہ“ ہے۔

بَابُ الْإِحْصَارِ وَفَوْتِ الْحَجِّ

احصار اور حج کے فوت ہو جانے کا بیان

- احصار کے معنی: احصار کے معنی لغت کے اعتبار سے تو ”روک لیا جانا“ ہیں اور اصطلاح فقہ میں ”احرام باندھ لینے کے بعد حج عمرہ سے روکا جانا“ احصار کہلاتا ہے۔
- ① کسی دشمن کا خوف ہو! دشمن سے مراد عام ہے خواہ کوئی آدمی ہو یا درندہ جانور۔ مثلاً یہ معلوم ہو کہ راستہ میں کوئی دشمن بیٹھا ہے جو حجاج کو ستاتا ہے یا لوٹتا ہے یا مارتا ہے آگے نہیں جانے دیتا یا ایسے ہی کسی جگہ شیر وغیرہ کی موجودگی کا علم ہو۔
- ② بیماری! احرام باندھنے کے بعد ایسا ہو جائے کہ اس کی وجہ سے آگے نہ جاسکتا ہو یا آگے جا تو سکتا ہے مگر مرض بڑھ جانے کا خوف ہو۔
- ③ عورت کا محرم نہ رہے! احرام باندھنے کے بعد عورت کا محرم یا اس کا خاوند مر جائے یا کہیں چلا جائے یا آگے جانے سے انکار کر دے۔
- ④ خرچ کم ہو جائے! مثلاً احرام باندھنے کے بعد مال و اسباب چوری ہو جائے یا پہلے ہی سے خرچ کم لے کر چلا ہو اور اب آگے کی ضروریات کے لئے روپیہ پیسہ نہ رہے۔
- ⑤ عورت کے لئے عدت! احرام باندھنے کے بعد عورت کا شوہر مر جائے یا طلاق دے دے جس کی وجہ سے وہ پابند عدت ہو جائے یہ احصار ہو جائے گا۔ ہاں اگر وہ عورت اس وقت مقیم ہے اور اس کے جانے قیام سے مکہ بقدر مسافت سفر نہیں ہے تو احصار نہیں سمجھا

جائے گا۔

◇ راستہ بھول جائے اور کوئی راہ بتانے والا نہ ہو۔

احصار کی یہ تمام صورتیں حنفیہ کے مسلک کے مطابق ہیں۔ بقیہ تینوں ائمہ کے ہاں احصار کی صرف ایک ہی صورت یعنی دشمن کا خوف ہے۔ چنانچہ ان حضرات کے نزدیک دیگر صورتوں میں احصار درست نہیں ہوتا بلکہ احرام کی حالت برقرار رہتی ہے۔

احصار کا حکم:

جس محرم کو احصار کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آجائے تو اسے چاہئے کہ وہ اگر مفرد ہو تو ایک ہدیٰ کا جانور (مثلاً ایک بکری) اور اگر قارن ہو تو دو ہدیٰ کے جانور (مثلاً دو بکری) کسی شخص کے ذریعہ حرم میں بھیج دے تاکہ وہ اس کی طرف سے وہاں ذبح کر دے یا قیمت بھیج دے کہ وہاں ہدیٰ کا جانور خرید کر ذبح کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ذبح کا دن اور وقت بھی متعین کر دے یعنی جس شخص کے ذریعہ جانور حرم بھیج رہا ہو اس کو یہ تاکید کر دے کہ یہ جانور وہاں فلاں دن اور فلاں وقت ذبح کیا جائے پھر وہ اس متعین دن اور وقت کے بعد احرام کھول دے۔ سرمنڈانے یا بال کتروانے کی ضرورت نہیں! اور پھر آئندہ سال اس کی قضا کرے یا اس طور کہ اگر اس نے احصار کی وجہ سے حج کا احرام اتارا ہے تو اس کے بدلہ ایک حج اور ایک عمرہ کرے اور اگر قارن کا احرام اتارا ہے تو اس کے بدلہ ایک حج اور دو عمرے کرے جب کہ عمرہ کا احرام اتارنے کی صورت میں صرف ایک عمرہ کیا جائے گا۔

اگر ہدیٰ کا جانور بھیجنے کے بعد احصار جاتا رہے اور یہ ممکن ہو کہ اگر محصر روانہ ہو جائے تو قربانی کے ذبح ہونے سے پہلے پہنچ جائے گا اور حج بھی مل جائے گا تو اس پر واجب ہوگا کہ وہ فوراً روانہ ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس پر فوراً جانا واجب نہیں ہوگا۔ تاہم اگر وہ حج کو روانہ ہو جائے اور وہاں اس وقت پہنچے جب کہ ہدیٰ کا جانور بھی ذبح ہو چکا ہو اور حج کا وقت بھی گزر چکا ہو تو اس صورت میں وہ عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے۔

حج فوت ہو جانے کے سلسلہ کا ایک پیچیدہ مسئلہ:

جس شخص کا حج فوت ہو رہا ہو اس کے بارے میں ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں بقر عید کی رات کے بالکل آخری حصہ میں اس حال میں پہنچے کہ اس نے ابھی تک عشاء کی نماز نہ پڑھی ہو اور اسے اس بات کا خوف ہو کہ اگر عرفات جاتا ہوں تو عشاء کی نماز جاتی رہے اور اگر عشاء کی نماز میں مشغول ہوتا ہوں تو وقوف عرفات ہاتھ نہیں لگے گا؟ اس صورت میں وہ کیا کرے؟ اس کے متعلق بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ اسے عشاء کی نماز میں مشغول ہو جانا چاہئے اگرچہ وقوف عرفات فوت ہو جائے۔ جب کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ عشاء کی نماز چھوڑ دے اور عرفات چلا جائے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی کتاب درمختار میں بھی لکھا ہے کہ اگر عشاء کا وقت بھی تنگ ہو اور وقوف عرفات بھی نکلا جا رہا ہو تو اس صورت میں نماز چھوڑ کر عرفات چلے جانا چاہئے۔

الفصل الاول:

احصار کا حکم

۲۷۰۷: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدْ أَحْصَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَحَلَقَ رَأْسَهُ وَجَامَعَ نِسَاءَهُ وَنَحَرَ هَدْيَتَهُ حَتَّى

أَعْتَمَرَ عَامًا قَابِلًا - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۱۷ - الحدیث رقم ۱۸۰۹۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو روک لیا گیا پس آپ ﷺ نے اپنا سر منڈوا یا اور صحبت کی اپنی عورتوں سے یعنی کامل حلال ہونے کے بعد اور اپنی ہدی ذبح کی اور اگلے سال عمرہ کیا اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”روکا گیا“ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ کو روانہ ہوئے مگر حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو مع رفقائے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔

وجامع نسانہ میں حرف ”واو“ مطلقاً ظہار جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے یعنی سر منڈانا وغیرہ یہاں ترتیب کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ اصل ترتیب کے مطابق آپ ﷺ نے نحر کے بعد احرام کھولا اور اس کے بعد اپنی ازواج سے ہمبستر ہوئے چنانچہ بخاری و مسلم کی ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ”نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقائے حدیبیہ میں احرام کھولا جب کہ ان کو مشرکین مکہ نے (مکہ جانے سے) روکا چنانچہ آنحضرت ﷺ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے نحر کیا یعنی ہدی کا جانور ذبح کیا پھر سر منڈایا اور پھر اپنے رفقائے سفر مایا کہ کھڑے ہو جاؤ اور نحر کرو اور پھر سر منڈاؤ ہدایہ میں اس کے بعد یہ نقل کیا ہے کہ ”پھر (سر منڈانے کے بعد) انہوں نے احرام کھول دیا“۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ہدایہ کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ محصر ہدی کا جانور ذبح ہونے سے پہلے احرام نہیں کھولتا اسی لئے یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی محصر نے ہدی کا جانور حرم روانہ کیا اور اس جانور کو لے جانے والے سے یہ تاکید کی کہ اس جانور کو فلاں دن اور فلاں وقت ذبح کر دینا اور پھر اس نے اس متعین دن میں یہ سمجھ کر کہ اب جانور ذبح ہو گیا ہوگا اپنے کو احرام سے باہر سمجھ لیا اور کوئی ایسا فعل کیا جو حالت احرام میں ممنوع ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ہدی کا وہ جانور اس متعین دن میں ذبح نہیں ہوا تھا یا ذبح تو اسی دن ہوا تھا مگر حرم میں ذبح ہونے کی بجائے حرم سے باہر ذبح ہو گیا تھا تو اس صورت میں اس نے خلاف احرام جس قدر فعل کئے ہوں گے ہر فعل کے عوض جزا دینی پڑے گی۔

احصار کی ہدی کہاں ذبح کی جائے؟

احصار کی ہدی کے علاوہ ہدایہ کے بارے میں تو حنفیہ اور شوافع کا اتفاق ہے کہ وہ حرم کے علاوہ اور کہیں ذبح نہ کی جائیں مگر حج یا عمرہ کے احصار کی ہدی کہاں ذبح کی جائے؟ اس بارے میں دونوں کے اختلافی اقوال ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ احصار کی ہدی اسی جگہ ذبح کی جائے جہاں احصار کی صورت پیش آئی ہو جب کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ احصار کی ہدی حرم میں بھیجی جائے اور وہاں ذبح ہو حرم کے علاوہ اور کہیں ذبح نہ کی جائے کیونکہ خاص دنوں میں اور خاص موقع پر ہدی کا ذبح ہونا عبادت ہے اور جب یہ بات ہے کہ ایک خاص وقت اور خاص جگہ ہدی کا ذبح کرنا عبادت شمار کیا جاتا ہے تو اگر اس کے خلاف کیا گیا یعنی اس ہدی کو ذبح کرنے کی جو خاص جگہ (یعنی حرم) ہے اگر وہاں یہ ہدی ذبح نہ کی گئی تو عبادت کہاں رہی اور جب عبادت ندر ہی تو اس کی وجہ سے حلال ہونا (یعنی احرام کھولنا) کس طرح درست ہوگا“۔

امام شافعی کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے اپنی ہدی حدیبیہ میں ذبح کی جو حل میں یعنی حرم سے باہر ہے۔ اس کا جواب حنفیہ کی جانب سے یہ دیا جاتا ہے کہ اس موقع پر ہدی کے جانوروں کا حرم میں پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا اس مجبوری کی بنا پر آپ ﷺ نے اور صحابہ نے اپنی ہدی وہیں ذبح کر دی۔ نیز بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ تو حل میں ہے اور

کچھ حصہ حرم میں ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ نے ہدی کے جانور حدیبیہ کے اس حصہ میں ذبح کئے ہوں جو حرم میں شامل ہے۔

محصر پر قضا واجب ہے:

جیسا کہ حدیث بالا سے معلوم ہوا آنحضرت ﷺ جب احصار کی وجہ سے عمرہ ادا نہ کر سکتے تو آپ ﷺ نے آئندہ سال یعنی ۷ھ میں اس عمرہ کو پورا کیا چنانچہ اس عمرہ کو عمرۃ القضاء کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی محصر ہو جائے یعنی اسے حج یا عمرہ سے روک دیا جائے تو وہ اس کی قضا کرے اسی لئے حنفیہ کے مسلک میں اس کی قضا واجب ہے جب کہ امام شافعیؒ کے ہاں محصر پر اس کی قضا واجب نہیں ہوتی آنحضرت ﷺ نے ۷ھ میں جو عمرہ کیا اس کا نام ”عمرۃ القضاء“ ہونا حنفیہ کے مسلک کی تائید کرتا ہے۔

ابن حجرؒ نے عجیب بات فرمائی: عدم وجوب قضا کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اہل حدیبیہ کی تعداد ”۱۴۰۰“ تھی، اور بعض کا کہنا ہے کہ اس سے زیادہ تھی، اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمراہ تقریباً نصف تعداد نے عمرہ نہیں کیا اگر قضا واجب ہوتی تو سارے اہل حدیبیہ کرتے یا اکثر حضرات کرتے اھ۔ وجہ غرابت مخفی نہیں، چونکہ وجوب قضا علی الفور کا کوئی قائل نہیں ہے، اور نہ اس بات کا کہ اس کی قضا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معیت ہی میں ضروری تھی۔ اکثر ”کل“ کے قائم مقام نہیں ہو سکتے، لہذا اس کا وقوع برابر ہے خواہ پہلے ہوا ہو کہ بعد میں۔ فتاامل وتدبر۔

حدیبیہ کا واقعہ

۲۷۰۸: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَحَالَ كُفَّارُ قُرَيْشٍ دُونَ الْبَيْتِ فَسَحَرَ النَّبِيُّ ﷺ هَذَا يَأْتِي وَحَلَّقَ وَقَصَّرَ أَصْحَابَهُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیح ۴/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۱۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے عمرہ کے لیے پس کفار قریش نے خانہ کعبہ کے پیچھے روک لیا پس نبی کریم ﷺ نے اپنے ہدی کے جانور کو ذبح کیے اور سر منڈایا اور ان کے اصحاب نے بال کتروائے اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: شرح آثار میں امام طحاویؒ فرماتے ہیں: علماء نے اس مسئلہ میں کلام کیا ہے کہ محصر جب اپنی ہدی نحر کر چکے تو کیا وہ حلق کرائے یا نہ کرائے؟ چنانچہ علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ حلق کرانا ضروری نہیں۔ اس قول کے قائلین میں ابوحنیفہؒ و امام محمدؒ بھی شامل ہیں۔ جہاں تک آنحضرت ﷺ کا تعلق ہے تو آپ ﷺ نے اور صحابہؓ نے حلق یا تقصیر اس مقصد سے کیا تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بس اب واپسی کا پختہ ارادہ ہو گیا ہے اور عمرہ کی ادائیگی کی صورت نہیں رہی ہے امام یوسفؒ کے نزدیک محصر کو اگرچہ سر منڈانا یا کتروانا چاہئے لیکن اگر وہ سر نہ منڈوائے یا بال نہ کتروائے تو اس صورت میں بھی احرام سے باہر ہو جائے گا اور اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

امام طحاویؒ کا میلان اس قول کی طرف ہے، جب اس پر حلق واجب نہیں اور وہ حلال ہونے کا ارادہ کرے تو وہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل کا ارتکاب کر گزرے جو حالت احرام میں اس کے لئے ممنوع تھا۔ کذا فی البحر الزاخر۔ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ حلق کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ﴾ [البقرہ: ۱۹۶] اور دوسری دلیل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا فعل ہے۔

۲۷۰۹: وَعَنِ الْمُسَوِّرِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَحَرَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ وَأَمَرَ أَصْحَابَهُ بِذَلِكَ -

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۰/۴ الحدیث رقم ۱۸۱۱ - واحمد فی المسند ۴/۳۲۷ -

ترجمہ: حضرت مسور بن مخزمہ سے روایت ہے کہ تحقیق آپ ﷺ نے نحر کیا، سر منڈوانے سے پہلے اور اپنے صحابیوں کو حکم کیا اس کا یعنی نحر کا، سر منڈوانے سے پہلے اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

احضار کی وجہ سے حج قضاء کرے

۲۷۱۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ أَلَيْسَ حَسْبُكُمْ سُنَّةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِنْ حُبِسَ أَحَدُكُمْ عَنِ الْحَجِّ طَافَ بِالْبَيْتِ وَبِالضَّمَا وَالْمَرُورَةَ ثُمَّ حَلَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى يَصِحَّ عَامًا قَابِلًا فَيُهْدَى أَوْ يَصُومَ إِنْ لَمْ يَجِدْ هَدْيًا -

(رواه البخاری)

اخرجه النسائی فی السنن ۱۶۹/۵ الحدیث رقم ۲۷۶۹ -

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ کیا نبی کریم ﷺ کی سنت تم کو کافی نہیں ہے یعنی انکا قول کہ اگر تم میں سے کسی کو حج کرنے سے روک لیا جائے (یعنی حج کے بڑے رکن سے کوئی عذر مانع ہو جیسے کہ وقوف عرفہ ہے اور طواف اور سعی سے مانع نہ ہو) تو خانہ کعبہ کا طواف کرے اور صفا اور مروہ کی سعی کرے پھر ہر چیز سے حلال ہو جائے (جو کچھ احرام میں کرنا حرام تھا وہ درست ہوا) یہاں تک کہ اگلے سال حج کرے پھر ہدی ذبح کرے یا روزہ رکھے اگر پیدی نہ پائے اس کو امام بخاری نے مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: الیس: استفہام انکاری ہے۔ ان حبس: ان شرطیہ ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنا چاہئے کہ: ”فانت الحج“ اور ”محصر“ کے حکم میں تھوڑا سا فرق ہے ”فانت الحج“ کے لئے تو یہ حکم ہے کہ اگر وہ مفرد ہو (یعنی اس نے صرف حج کا احرام باندھا ہو) تو طواف وسعی کر کے احرام کھول دے اس پر صرف سال آئندہ اس حج کی قضا واجب ہے، عمرہ اور ہدی اس کے لئے واجب نہیں ہے۔

محصر کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر وہ مفرد ہو اور اسے حرم پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں احضار کی کوئی صورت پیش آ جائے تو وہ پہلے ہدی کا جانور حرم بھیجے جب وہ جانور حرم میں پہنچ کر ذبح ہو جائے تو وہ احرام کھول دے اور آئندہ سال اس حج کی قضا کرے اور اس کے ساتھ ہی ایک عمرہ بھی کرے۔

اور اگر محصر قارن ہو (یعنی اس نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا ہو) تو وہ بھی ہدی کا جانور حرم میں بھیجے اور وہاں اس جانور کے ذبح ہو جانے کے بعد احرام کھول دے، لیکن سال آئندہ اس پر اس حج کی قضا اور اس کے ساتھ دو عمرے واجب ہوں گے اس پر ایک حج اور دو عمرے واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایک حج اور عمرہ تو اصلی حج و عمرہ کے بدلہ ادا کرنا ہوگا اور دوسرا عمرہ اس واسطے کہ اس سے حج اور عمرہ فوت ہوا اس لئے اس کی جزا کے طور پر ایک عمرہ ادا کرنا ہوگا۔

اور اگر احضار کی صورت حرم پہنچنے سے پہلے راستہ میں پیش نہ آئے بلکہ حرم پہنچ کر پیش آئے کہ وہ کسی عذر کی وجہ سے وقوف عرفات سے تو جا کر رہے مگر طواف اور سعی کر سکتا ہو تو وہ طواف وسعی کرنے کے بعد یعنی عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے اور پھر آئندہ سال

اس حج کی قضا کرے اور ہدیٰ کا جانور ذبح کرے اور اگر ہدیٰ کا جانور ذبح نہ کر سکتا ہو تو روزہ رکھے مذکورہ حدیث میں یہی صورت بیان فرمائی گئی ہے۔

”فائت الحج“ اگر قارن ہو تو پہلے وہ عمرہ کے لئے طواف سعی کرے پھر حج فوت ہو جانے کے بدلہ میں طواف سعی کرے اس کے بعد سر منڈوائے یا بال کتروائے اور احرام کھول دے اس کے ذمہ سے قرآن کی قربانی ساقط ہو جائے گی اور اگر وہ متمتع ہوگا تو اس کا تمتع باطل ہو جائے گا اور اس کے ذمہ سے تمتع کی قربانی بھی ساقط ہو جائے گی اگر وہ اس کی قربانی کا جانور اپنے ساتھ لایا ہو تو اس کو جو چاہے کرے۔

جس طرح مفرد کا حج فوت ہو جانے کی صورت میں اس پر آئندہ سال صرف حج کی قضا ہی واجب ہوتی ہے اسی طرح قرآن اور تمتع کی صورت میں بھی اس پر آئندہ سال صرف حج کی قضا واجب ہوگی۔

احصار کی وجہ سے احرام کھولنا جائز ہے

۲۷۱۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَيَّ صُبَاعَةَ بِنْتُ الزَّيْبِرِ فَقَالَ لَهَا لَعَلَّكَ أَرَدْتِ الْحَجَّ وَاللَّهِ مَا أَحْدَثَنِي إِلَّا وَجَعًا فَقَالَ لَهَا حُجِّي وَأَشْتَرِطِي وَقَوْلِي اللَّهُمَّ مَحَلِّي حَيْثُ حَبَسْتَنِي۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۳۲/۹۔ الحدیث رقم ۵۰۸۹۔ ومسلم فی ۸۶۷/۲ الحدیث رقم (۱۰۴۔ ۱۲۰۷)۔ والنسائی فی السنن ۶۸/۵ الحدیث رقم ۲۷۶۸۔ واحمد فی المسند ۱۶۴/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ ازبیر کی بیٹی صباعہ کے پاس آئے۔ فرمایا کہ شاید توج کا ارادہ رکھتی ہے؟ (ہمارے ساتھ اس نے کہا ہاں ارادہ رکھتی ہوں)۔ لیکن اللہ کی قسم میں اپنے آپ میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ مگر بیمار ہوں اور اپنے آپ میں ضعف پاتی ہوں بیماری کی وجہ سے میں نہیں جانتی کہ بیماری کی وجہ سے حج پورا کر سکوں گی یا نہیں۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا کہ توج کر۔ یعنی حج کا احرام باندھ اور شرط کر لو اور تو کہہ اے الہی میرا احرام سے نکلنے کا مکان اس جگہ ہوگا جہاں توجھ کو روکے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: صباعہ: ضاء معجمہ کے ضمہ، بائے موحدہ اور عین مہملہ کے ساتھ ہے۔ یہ حضرت مقداد کی اہلیہ تھیں۔ ان کو اسلامیہ کہنا غلط فاحش ہے۔ وجعہ: جیم کے کسرہ کے ساتھ۔ واشترطی وقولی: عطف تفسیری ہے۔ محلی: میم کے فتح اور حاء کے کسرہ کے ساتھ۔ ہمارے بعض علماء نے فرمایا: (وقولی: اللہم محلی حیث حبستنی) اشتراط کی تفسیر ہے۔ ای: اشتراطی ان اخرج من الاحرام حیث مرضت وعجزت عن اتمام الحج۔

”میرے احرام سے نکلنے کی جگہ وہ ہے جہاں میں روک دی جاؤں“ کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ مجھ پر مرض غالب ہو جائے اور وہاں سے میں خانہ کعبہ کی طرف آگے نہ چل سکوں اسی جگہ میں احرام کھول دوں گی۔

جن ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ احصار کی صورت یعنی دشمن کا خوف ہے اور بیماری سے احصار نہیں ہوتا ان کی دلیل یہی حدیث ہے کہ اگر مرض کی وجہ سے احرام کھول دینا مباح ہوتا تو آنحضرت ﷺ حضرت صباعہ کو مذکورہ بالا شرط کرنے کا حکم نہ دیتے کیونکہ جب مرض کی وجہ سے احصار ہو ہی جاتا تو پھر شرط کا کیا فائدہ حاصل ہوتا۔

امام اعظم ابو حنیفہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ محرم کے لئے احرام کھولنا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک کہ اس کی ہدیٰ حرم میں ذبح نہ ہو جائے۔ ہاں اگر وہ احرام باندھتے وقت شرط کر لے کہ جس جگہ بھی مجھے احصار کا صورت پیش آ جائے گا، میں ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶

دوں گا تو وہ محض احصار کی صورت پیش آ جائے پڑہدی کا جانور ذبح ہوئے بغیر احرام سے باہر ہو سکتا ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں: یہ اس بات پر دال ہے کہ احصار مرض کے سبب سے تحلیل جائز نہیں، نہ شرط کے ساتھ، نہ بغیر شرط کے۔ کہا گیا ہے کہ تحلیل جائز نہیں، اور یہ حکم حضرت ضباعہ کے ساتھ ہی مخصوص تھا۔ جیسا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے کو رخصت حج کی اجازت دی تھی۔ اور یہ بات ان حضرات کیلئے نقصان دہ نہ تھی اور اس سے بھی ہمارے ہی مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ کما لایخفی۔

الفصل الثانی:

جانوروں کو بدلنے کا حکم

۲۷۱۲: عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَ أَصْحَابَهُ أَنْ يَبْدُلُوا الْهَدْيَ الَّذِي نَحَرُوا عَامَ الْهُدَيْبِيَةِ فِي عُمْرَةِ الْقَضَاءِ - (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۴۳۴/۲ الحديث رقم ۱۸۶۴۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کو حکم کیا کہ وہ ہدی کے جانوروں کو بدلیں وہ جانور جو حدیبیہ کے سال میں ذبح کیے گئے تھے عمرۃ القضاء میں نقل کیا گیا ہے۔

تشریح: ان بیدلو: تخفیف و تشدید ہر دو کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ الحدیبیہ: مشدود و مخفف دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔

اس حکم گرامی کا مطلب یہ تھا کہ صحابہؓ نے واقعہ حدیبیہ کے موقع پر عمرہ سے احصار کی صورت پیش آ جانے کی وجہ سے ہدی کے جو جانور ذبح کئے تھے سال آئندہ عمرۃ القضاء کے موقع پر ان جانوروں کے بدلے دوسرے جانور حرم پہنچ کر ذبح کریں تاکہ ہدی کا حرم میں ذبح ہونا واقع ہو جائے کیونکہ احصار کی ہدی کا جانور حرم ہی میں ذبح کیا جاتا ہے جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا مسلک ہے۔ لیکن مذکورہ بالا حکم کا یہ مطلب اس صورت میں ہے جب کہ یہ بات ثابت ہو کہ واقعہ حدیبیہ کے موقع پر ہدی کے جانور حرم سے باہر ذبح کئے گئے تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ ہدی کے وہ جانور حرم ہی میں ذبح ہوئے تھے کیونکہ حدیبیہ کا اکثر حصہ حدود حرم میں واقع ہے (جیسا کہ باب کی پہلی حدیث کی تشریح کے ضمن میں ایک قول نقل کیا گیا تھا) تو پھر واقعہ حدیبیہ کے موقع پر ذبح کئے گئے جانوروں کے عوض دوسرے جانور ذبح کرنے کے اس حکم کا تعلق صرف احتیاط اور حصول فضیلت سے ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ حکم محض استحباب کے طور پر ہے۔

مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف مشکوٰۃ کو اس حدیث کے اصل ماخذ کی تحقیق نہیں ہو سکتی تھی، لیکن ایک دوسرے نسخہ میں رواہ کے بعد ابوداؤد لاحق کیا گیا ہے یعنی اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ نیز ایک اور نسخہ میں رواہ ابوداؤد کے بعد ان الفاظ کا بھی اضافہ ہے: وفيه قصة وفي سننه محمد بن اسحق۔

یہ غلط ہے، چونکہ المصاحیح میں آگے جو حدیث آرہی ہے اس میں ”کسر او عرج او مرض“ کے الفاظ ہیں۔ اور فصل ثالث کا اضافہ تو صاحب مشکوٰۃ کی طرف سے ہے۔

احصار دشمن کے علاوہ بھی ممکن ہے

۲۷۱۳: وَعَنِ الْحَتَّاجِ بْنِ عَمْرٍو وَالْأَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ كَسِرَ أَوْ عُرِجَ فَقَدْ حَلَّ

وَعَلَيْهِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ - (رواه الترمذی و ابوداؤد والنسائی وابن ماجه والدارمی وزاد ابو داؤد فی رواية اخرى أو

مَرَضٌ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ وَفِي الْمَصَابِيحِ ضَعِيفٌ

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۳۳/۲ الحدیث رقم ۱۸۶۲۔ و الترمذی فی ۲۷۷/۳ الحدیث رقم ۹۴۰۔ والنسائی فی ۱۹۸/۵ الحدیث رقم ۲۸۶۱۔ وابن ماجہ فی ۱۰۲۸/۲ الحدیث رقم ۳۰۷۷۔ والدارقطنی فی ۲۷۷/۲ الحدیث رقم

۱۹۱ من باب المواقیب۔ واحمد فی المسند ۴۵۰/۳۔

ترجمہ: حجاج بن عمرو انصاریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا پاؤں ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے پس تحقیق حلال ہو گیا یعنی جائز ہے اس کو ترک کرے احرام کو اور پھر اپنے وطن کی طرف آئے اور اس پر حج لازم ہے آئندہ سال اسکو امام ترمذیؒ اور ابوداؤد اور نسائی اور ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا اور زیادہ کیا ہے ایک روایت میں ابوداؤد نے یا بیمار ہو جائے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث حسن ہے اور مصابیح میں کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔

راوی حدیث:

حجاج بن عمرو۔ یہ حجاج بن عمرو انصاری مازنی ہیں۔ ان کا شمار مدینہ والوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی حدیث حجازیوں کے یہاں مروج ہے۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔

تشریح: کسر: صیغۂ جمہول کے ساتھ ہے۔ سین کے کسرہ کے ساتھ، اور فتح بھی پڑھا جاتا ہے۔ قاموس میں لکھتے ہیں: اصابہ شئی فی رجله و لیس بخلقۃ فاذا کان خلقۃ فخرج کفروح او ثیلث فی غیر الخلقۃ۔ مصابیح کی روایت میں ”او مرض“ کے الفاظ ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو احرام باندھ لینے کے بعد دشمن کے خوف کے علاوہ بھی اور کوئی مانع پیش آ جائے اس کے لئے جائز ہے کہ وہ احرام کھول دے چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دشمن کے خوف کے علاوہ احصاری اور صورتیں بھی ہیں مثلاً بیماری وغیرہ جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔

وفی المصابیح ضعیف کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کو بغوی نے جس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ سند ضعیف ہے لہذا بغوی کی سند ضعیف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ترمذی وغیرہ کی سند بھی ضعیف ہو اور اگر اس بارے میں تعارض تسلیم بھی کر لیا جائے تو ترمذی کے قول ہذا حدیث حسن (یہ حدیث حسن ہے) کو بغوی کے اس کہنے پر کہ ”یہ حدیث ضعیف ہے“ تو ترجیح حاصل ہوگی، پھر یہ کہ ایک نسخہ میں ترمذی کے قول میں لفظ ”حسن“ کے بعد لفظ ”صحیح“ بھی ہے نیز توشیحی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ضعیف کہنا بالکل غلط ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: جب اس کا ذکر ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ سے کیا گیا تو دونوں نے فرمایا: صدق۔ شرح الآثار میں علقمہ سے مروی ہے: قال: لدغ صاحب لنا وهو محرم بعمرة، فذكرناه لابن مسعود رضى الله عنه فقال: بيعت بهدى ويواعد اصحابه موعدا فاذا نحر عنه حل۔ اور ایک روایت میں ہے کہ: ثم عليه عمرة بعد ذلك۔

حج کارکن اعظم و قوف عرفہ ہے

۲۷۱۳: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ يَعْمَرَ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ الْحَجَّ عَرَفَةٌ مَنْ أَدْرَكَ عَرَفَةَ

لَيْلَةَ جَمْعٍ قَبْلَ طُلُوعِ الْفَجْرِ فَقَدْ أَدْرَكَ الْحَجَّ أَيَّامَ مِنِّي ثَلَاثَةً فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمٍ فَلَا ائْتَمَّ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ

فَلَا ائْتَمَّ عَلَيْهِ۔ (رواه الترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجہ و الدارمی و قال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۸۵/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۹۔ والترمذی فی ۲۳۷/۳ الحدیث رقم ۸۸۹۔ وابن ماجہ فی ۱۰۰۳/۲ الحدیث رقم ۳۰۱۵ وخرجه الدارمی فی ۸۲/۲ الحدیث رقم ۱۸۸۷۔ والنسائی فی ۲۶۴/۵ الحدیث رقم ۳۰۴۴ واحمد فی المسند ۳۳۵/۴۔

ترجمہ: عبدالرحمن بن یحییٰ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے حج عرفہ ہے یعنی حج کا بڑا رکن ذی الحجہ کی نوں تاریخ توف عرفہ ہے۔ کہ جس نے توف عرفہ پایا مزدلفہ کی رات میں یعنی ذی الحجہ کی دسویں رات میں فجر کے طلوع ہونے سے پہلے پس تحقیق اس نے حج پانیا منیٰ کے دن تین ہیں یعنی گیا رہوئیں بارہوئیں تیرہوئیں کہ جن کو ایام تشریق کہتے ہیں۔ ان تین دنوں میں منامیں رہتے ہیں اور رمی کرتے ہیں پس جو شخص کہ دودن میں جلدی کرے پس اس پر گناہ نہیں ہے اور جو شخص کہ تاخیر کرے پس اس پر گناہ نہیں ہے۔ اس کو امام ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی اور ابن ماجہ اور دارمی اور امام ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

راوی حدیث:

عبدالرحمن بن یحییٰ۔ یہ عبدالرحمن بن یحییٰ "دیلمی" ہیں ان کو آنحضرت ﷺ سے شرف صحبت و روایت حاصل ہے۔ کوفہ میں آئے پھر خراسان پہنچے۔ ان سے صرف بکیر بن عطاء روایت کرتے ہیں ان کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا۔ "یحییٰ" غیر منصرف ہے۔
تشریح: "اس نے حج کو پالیا" کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حج فوت نہیں ہوا اور وہ حج میں کسی خرابی اور فساد سے مامون رہا بشرطیکہ اس نے احرام کا وقت پورا ہونے سے پہلے بیوی سے ہم بستری کی یا کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہ کیا ہو جو احرام کی حالت میں ممنوع ہے اور یہ بات تو پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ جس شخص کا حج فوت ہو جائے یعنی وہ ذی الحجہ کی دسویں رات کی طلوع فجر تک ایک منٹ کے لئے بھی توف عرفات نہ کر سکے تو اس پر یہ واجب ہوگا کہ وہ عمرہ کے افعال یعنی طواف و سعی کے بعد احرام کھول دے آئندہ سال کے حج تک مسلسل احرام باندھے رہنا اس کے لئے حرام ہے۔

"جو شخص جلدی کرے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بارہوئیں تاریخ کو ظہر کے بعد تینوں مناروں پر کنکریاں مار کر مکہ چلا آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور تیرہوئیں رات میں قیام منیٰ اور تیرہوئیں تاریخ کو کنکریاں مارنا اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح "جو شخص تاخیر کرے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بارہوئیں تاریخ کو رمی جمرات کے بعد منیٰ ہی میں ٹھہرا رہے تا آنکہ تیرہوئیں رات کو بھی رمی جمرات کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں گویا جواز کے اعتبار سے تو دونوں صورتیں برابر ہیں البتہ کثرت ذکر کے پیش نظر تاخیر افضل ہے۔

منقول ہے کہ اہل جاہلیت میں دو فریق تھے ایک فریق تو تعجیل کو گناہ کہتا تھا اور دوسرا فریق تاخیر کو چنانچہ یہ حکم نازل ہوا کہ تعجیل اور تاخیر دونوں برابر ہیں ان میں سے کسی میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

بَابُ حَرَمِ مَكَّةَ حَرَسَهَا اللَّهُ تَعَالَى

حرم مکہ کا بیان اللہ تعالیٰ اس کو آفات سے محفوظ رکھے

مکہ سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: باب حرمة حرم مکہ۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ کی حرمت کو ہر قسم کی آفات حسیہ و معنویہ سے محفوظ رکھے۔

الفصل الاول:

حرم کے احرام کا بیان

۲۷۱۵: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ لَا هَجْرَةَ وَلَكِنْ جِهًا ذُو وَبَيْتَةٍ وَإِذَا اسْتَفْتَرْتُمْ فَانْفِرُوا وَقَالَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ إِنَّ هَذَا الْبَلَدَ حَرَمَةٌ اللَّهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَإِنَّهُ لَمْ يَحِلَّ الْقِتَالُ فِيهِ إِلَّا حِدِّ قَبْلِي وَلَمْ يَحِلَّ لِي إِلَّا سَاعَةٌ مِنْ نَهَارٍ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا يُعْضَدُ شَوْكُهُ وَلَا يَنْفَرُ صِيدُهُ وَلَا يَلْتَقِطُ لُقُطَتُهُ إِلَّا مَنْ عَرَفَهَا وَلَا يُخْتَلَى خَلَاهَا فَقَالَ الْعَبَّاسُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِلَّا إِذَا ذُخِرَ فَإِنَّهُ لَفَيْهِمْ وَلِيَوْتِهِمْ فَقَالَ إِلَّا إِذَا ذُخِرَ۔

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۶/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۴۳۔ ومسلم فی ۹۸۶/۲ الحدیث رقم (۴۴۵۔ ۱۴۵۳)۔ والنسائی فی ۲۰۳/۵ الحدیث رقم ۲۸۷۴۔ وابن ماجہ فی ۱۰۳۸/۲ الحدیث رقم ۲۸۷۴۔ واحمد فی المسند ۲۵۹/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا فتح مکہ کے دن کہ ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت خالص کرنا عمل میں باقی ہے اور جس وقت جہاد کے لیے بلاے جاؤ۔ یعنی امام جہاد کا حکم کرے تو جہاد کے لیے نکلنا اور فتح مکہ کے دن فرمایا تحقیق یہ شہر زمین حرم ہے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اس کو لوگوں پر اس کی بے حرمتی اور اس کی تعظیم ان پر واجب کی ہے اس دن سے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے یعنی اس کی حرمت اس کی قدیم سے ہے پس وہ حرام کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ قیامت تک اور تحقیق قتال اس میں ہرگز حلال نہیں ہے کسی کے لیے مجھ سے پہلے اور میرے لیے قتال حلال نہیں ہے مگر دن سے ایک گھڑی۔ یعنی فتح مکہ کے دن پس وہ حرام کیا گیا یعنی ہر ایک پر بعد اس ساعت کے اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ قیامت کے دن تک یعنی پہلے فتح تک اس کا خاردار درخت نہیں کاٹا جائے گا۔ اگر چہ اس سے تکلیف ہو اور اس کے شکار کو بھگایا نہیں جائے گا یعنی معترض نہ اس کو شکار کرے اور وحشت دلائے اور برا بھیت کرنے کے اور اس کے لقطے کو نہ اٹھایا جائے مگر جو شخص کہ اس تعریف کرے یعنی اس کو اس کا اٹھانا جائز ہے اور اس کی گھاس نہ کاٹی جائے۔ پس ابن عباس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! مگر اذخر یعنی اذخرا ایک گھاس کا نام ہے اس لیے کہ وہ لوہاروں اور سناروں کے واسطے: دوتا ہے کیونکہ ان کو ضرورت ہوتی ہے۔ لوہے سونے اور چاندی کے گلانے میں اور ان کے گھروں کے کام آتی ہے یعنی لھروں کی چھتوں پر کام آتی ہے پس فرمایا مگر اذخر یعنی اس کو اکھاڑنا جائز ہے اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ يوم فتح مكة لا هجرة فانفروا:

”یوم“: ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ”لا ہجرۃ“:

یعنی پہلے کی طرح اب مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرض نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہجرت ارکان ایمان میں سے تھی۔

ولکن جہاد و نیتہ یعنی جہاد اور ہجرت وغیرہ ہر عمل خیر میں اخلاص نیت ضروری ہے۔ بعض نے اس کا ایک دوسرا مطلب بیان کیا ہے وہ یہ کہ ہجرت عن المعاصی کے ذریعے اعلاء دین کا قصد و عزم اب بھی باقی ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ (ایک وقت تھا کہ جب) مکہ سے مدینہ ہجرت (ضروری) تھی۔ پھر جب مکہ فتح ہو گیا تو اس ہجرت کا سلسلہ منقطع ہو گیا جو فرض تھی (کیونکہ اس کے بعد مکہ دار الحرب نہیں رہا تھا) پس اگر اب کوئی ہجرت کرے تو اسے وہ درجہ حاصل نہیں ہوگا جو مہاجرین کو حاصل ہو چکا ہے البتہ جہاد اور اعمال میں حسن نیت کا اجراء بھی باقی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا اسی طرح وہ ہجرت بھی باقی ہے جو اپنے دین کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے اور اس کا اجر بھی ملتا ہے۔ یہ حدیث پیشین گوئی ہے کہ مکہ ہمیشہ دارالاسلام رہے گا۔ لہذا یہاں سے ہجرت کر کے جانے کا کبھی بھی تصور نہیں ہو سکتا۔

”وإذا استنفرتم“: بصیغہ مجہول ہے۔ أى إذا طلبتم للنفر وهو الخروج إلى الجهاد۔

اور ابن حجرؒ کی اصل میں یوں ہے: فإذا استنفرتم۔ یہ ”اصول معتمدہ“ کے مخالف ہے۔ چنانچہ ابن حجرؒ نے تقدیری عبارت کا تکلف

کیا ہے: وإذا وجب الجہاد مع النیتہ الصالحة فإذا استنفرتم

”فانفروا“: فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اس خروج کی اصل الاصل یہ آیت ہے: ﴿انفروا خفافا وثقالا وجاهدوا بأموالکم وأنفسکم فی سبیل اللہ ذلکم

خیر لکم إن کنتم تعلمون﴾ [التوبة: ۴۱]

قولہ: وقال يوم فتح مكة إن هذا البلاد حرمه الله يوم خلق السموات والأرض:

”وقال يوم فتح مكة“: اس جملہ کے اعادہ میں دو احتمال ہیں:

(۱) یہ اعادہ برائے تاکید ہے۔

(۲) اس میں اشارہ ہے کہ اگلا کلام بھی اسی دن مگر کسی اور وقت ارشاد فرمایا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک شبہ اور اس کا جواب: شبہ یہ ہوتا ہے کہ حدیث میں آتا ہے: إن إبراہیم حرم مكة فجعلها حراما إنى حرمت المدينة۔ اور حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بوقت خلق سموات وارض اس کو حرم بنا دیا تھا۔ شبہ خلاصہ یہ ہے کہ مکہ کو حرم کب اور کس نے بنایا؟

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ کو حرم قرار دیں گے۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حرم مکہ کو ظاہر کیا تھا، اس کی حدود مقرر کیں اور اس بقعہ مبارک کی تجدید کی تھی، اور کعبہ کو بلند کیا تھا، چونکہ طوفان (طوفان نوح) کے سبب آدم علیہ السلام کے دست اقدس سے لباس تعمیر کو زیب تن کرنے والے کعبہ کی عبارت منہدم ہو چکی تھی۔ خلاصہ کلام یہ کہ تحریم مکہ کا بیان چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے ہوا تھا، اس لئے ان کی طرف نسبت کر دی گئی۔

قولہ: فهو حرام بحرمه الله الی يوم القيامة:

اس جملہ میں اشارہ ہے کہ مکہ کی حرمت فتح اولیٰ تک برقرار رہے گی، یہ ابدی ہے، ناقابل منسوخ ہے۔

قولہ: وإنه لم يحل القتال فيه:

www.KitaboSunnat.com

”إنه“: یہ ضمیر شان ہے۔

یہ جملہ امام ابوحنیفہؒ اور جمہور کے مذہب کی دلیل ہے کہ فتح مکہ عنوة اور قہراً ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ اس خاص گھڑی میں بھی صرف خون

ریزی ہی حلال ہوئی تھی، شکار اور قطع شجر اس وقت بھی حلال نہیں ہوا تھا۔

قوله: لا يعصد شوكة:

بعض شواہخ کا قول ہے کہ موذی خاردار کو کاٹا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ قول اطلاق نص کے مخالف ہے۔ چنانچہ متاخرین کی ایک جماعت حرمت قطع مطلقاً کی قائل ہے۔ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کو صحیح قرار دیا ہے، نیز اپنی کئی کتابوں میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ خطابؒ فرماتے ہیں: کل اهل العلم على إباحة قطع الشوك، ويشبه أن يكون المحظور منه الشوك الذي يرواه الإبل، وهو ماديق دون الصلب الذي لا ترعاه، فإنه يكون بمنزلة الحطب۔ اھ شاید کہ ”اہل علم“ سے یہاں مراد علمائے مالکیہ ہیں۔

قوله: ولا ينفر صيده ولا يلتقط لقطته إلا من عرفها:

”لا ينفر“ فائے مفتوحہ مشدودہ کے ساتھ۔

یعنی کوئی بھی شخص شکار کی غرض سے یا محض بھڑکانے ستانے کے لئے یہاں کے کسی جانور کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔

”لا يلتقط“: بصیغہ مجہول ہے۔ ای لا یؤخذ

”لقطة“: لام کے ضم اور قاف کے فتح کے ساتھ بمعنی ساقطہ۔

”لقط“ اس چیز کو کہتے ہیں جو کہیں گری پڑی پائی جائے اور اس کا مالک معلوم نہ ہو۔

الا من عرفها: تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ استثناء منقطع ہے۔ اور ایک نسخہ میں بصیغہ معلوم ہے۔ یہ واضح ہے، چونکہ تقدیری عبارت

یوں ہوگی: لا يلتقطها احد الا من عرفها۔

عام لقط کا حکم یہ ہے کہ ملتقط (لقط اٹھانے والا شخص) اس کو مالک تک پہنچانے کی نیت سے اٹھائے۔ اس کو اپنے پاس رکھنے کیلئے نہ اٹھائے کہ اس سے نفع حاصل کرے گا۔ (بلکہ ملتقط عام لوگوں میں یہ اعلان کراتا رہے کہ مجھے ایک چیز ملی ہے جس شخص کی ہو وہ مجھ سے لے لے۔ اگر اس اعلان کے بعد بھی اس چیز کا مالک نہ ملے تو وہ شخص اگر خود ضرورت مند ہے تو اسے اپنے استعمال میں لے آئے ورنہ کسی نادار کو صدقہ کر دے۔ پھر اگر کسی وقت اس کا مالک مل جائے تو اس کو اس کی قیمت ادا کرے۔)

سرزمین حرم کے لقط کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک اس کے مالک کا پتہ نہ لگے اس وقت تک اس کا اعلان کیا جاتا رہے، اور بس (یعنی مالک نہ ملنے کی صورت میں اس کو نہ تو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے نہ کسی کو بطور صدقہ دیا جاسکتا ہے اور نہ اپنی ملکیت بنایا جاسکتا ہے۔) چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ کہا گیا ہے کہ حرم اور غیر حرم کے لقط کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے حنفیہ کا مسلک یہی ہے۔

اس حدیث میں سرزمین حرم کے لقط کے بارے میں اس غلط فہمی و گمان کو دور کرنا مقصود ہے کہ اعلان کو صرف ایام حج کے ساتھ مخصوص نہ کرے۔ (بلکہ عام لقط کی طرح سال بھر اس کا اعلان کراتا رہے۔)

قوله: ولا يختلي خلاها، فقال العباس يارسول الله إلا الاذخر..... - ”لا يختلي“ بصیغہ مجہول ہے۔

”خلا“: خاء کے فتح کے ساتھ، مقصور ہے۔

”إلا الاذخر“: اکثر نسخوں میں منصوب ہے۔ بعض نسخوں میں مرفوع ہے، اس کو ”التلقين والتماس“ پر محمول کیا ہے۔ ای قل: إلا

الاذخر۔

الاذخر: ہمزہ کے کسرہ، ذال معجمہ ساکنہ، خائے معجمہ، اور رائے مہملہ کے ساتھ۔ چوڑے پتوں والا ایک پودا

عرض مرتب: صاحب مصباح اللغات لکھتے ہیں: الاذخر: سبز گھاس، ایک قسم کی خوشبودار گھاس۔ اھ۔ دیکھئے: مادہ: ذرخ
قصہ مختصر یہ کہ اذخر نفع بخش گھاس ہے، لوگوں کو حیا دیتا اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ لوہاروں اور سناروں کے لئے لوہا اور سونا گلانے
کے کام میں آتی ہے، وہ سختی لکڑی اور کونلہ کے بجائے یہ گھاس استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں گھروں اور قبروں کی چھتیں بنانے میں
بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے اس کو کائے کی اجازت دے دیجئے۔

عرض مرتب: حضرت عباسؓ کی اس درخواست کا قبول ہونا درحقیقت حضرت عباسؓ کا اس امت مسلمہ پر بہت بڑا احسان ہے۔ کہ
اس کا استثناء ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اھ۔

ممانعت کا حاصل یہ ہے کہ اس مقدس سرزمین کی گھاس اور نباتات کا ثنا ممنوع ہے۔ ہمارے بعض ائمہ فرماتے ہیں الخلا۔ قصر کے
ساتھ۔ سبز گھاس کو کہتے ہیں۔ اور حشیش خشک گھاس کو کہتے ہیں۔ گھاس خواہ خشک ہو، خواہ تر ہو، حرمت قطع میں دونوں برابر ہیں۔ اکثر علماء
اس کے قائل ہیں۔ اھ۔ یہ بات مشہور مذہب کے خلاف ہے۔ شنی فرماتے ہیں: اور اسی طرح اگر کسی حلال (غیر محرم) آدمی نے حرم کا
شکار ذبح کیا۔ یعنی اس شخص پر اس کی قیمت لازم آئے گی، اور وہ اسے ہدیہ کر دے، یا کھلا دے، بطور جزاء کے روزہ رکھنا کافی نہیں
، یا حشیش کائی، یا درخت کاٹا، الا یہ کے قاطع کا مملوک تھا، یا نبت تھا، یا خشک تھا۔

۲۷۱۶: وفی رواية أبي هريرة لا يعصد شجرها ولا يلتقط ساقطها الا منشد

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۸۸/۲ الحديث رقم (۴۴۷ - ۱۳۵۵) وابوداؤد في السنن ۵۱۸/۲ الحديث رقم ۲۰۱۷۔
واحمد في المسند ۲۳۸/۲۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ”نہ یہاں کا درخت کاٹا جائے اور نہ یہاں کی لکڑی
پڑی کوئی چیز اٹھائی جائے البتہ اس (کے مالک) کو تلاش کرنے والا اٹھا سکتا ہے“۔
”لا يعصد“: بصیغہ مجہول ہے۔

”لا يلتقط“: بصیغہ معروف ہے۔ ائی: لا یاخذ۔

شنی فرماتے ہیں: اصحاب کتب ستہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

قال: لما فتح الله على رسول الله ﷺ مكة قام فحمد الله وأثنى عليه، ثم قال: إن الله حبس عن مكة الفيل، وسلط
عليها رسوله والمؤمنين، وانها أحلت لي ساعة من نهار، ثم هي حرام إلى يوم القيامة، لا يعصد شجرها، ولا
ينفر صيدها، ولا يختلي خللاها، ولا تحل ساقطتها، الا لمنشد، فقال العباس: إلا الإذخر فإنه لقبورنا وبيوتنا فقال
عليه الصلوة والسلام إلا الإذخر۔ والخلايا بالقصر: الحشيش الرطب، واختلاءه قطعته، ولا يرعى الحشيش،
وجوزة أبو يوسف رحمه الله دفعاً للحرج عن الزائرين والمقيمين۔ اھ۔ كلامه۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: یہ تعلیل معرض نص میں ہے، لہذا اس سے مقصود (یعنی استدلال) تام نہیں ہو سکتا۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: حرم مکہ کے نباتات و اشجار سے جانوروں کو چرانا جائز ہے، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں اور صحابہ کرام
کے زمانہ میں جانور یہاں کھلے منہ ہنکائے جاتے تھے۔ اھ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جانور تو مکلف نہیں، لیکن راعی تو مکلف ہے۔ اس کی تائید استثناء الدواب کی بابت مروی روایت سے ہوتی

ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

شوافع کے نزدیک اصح یہ ہے کہ حرام ہے، اور اکثر حضرات کراہت کے قائل ہیں۔ حرم کی مٹی، یہاں کا پتھر، حرم سے باہر لے جانا حتیٰ کہ حرم مکہ میں لے جانا بھی ممنوع ہے۔ جیسا کہ حرم مدینہ کی مٹی اور پتھر کسی اور جگہ لے جانا منع ہے حتیٰ کہ حرم مکہ کی طرف بھی لے جانا منع ہے اور حل کی مٹی کو منتقل کرنا بھی مکروہ ہے۔

بلاء فرماتے ہیں: فرق یہ ہے کہ شریف کی اہانت، کمینہ کی رفعت سے زیادہ قبیح ہے؛ البتہ زم زم کو تبرک کی خاطر لے جانا مندوب ہے، اس پر علماء کا اتفاق ہے۔ دلیل یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ منورہ میں تھے، آپ ﷺ نے حدیبیہ کے سال سہیل بن عمرو سے زمزم بطور ہدیہ مانگا، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کی طرف دو مشکیزے روانہ کئے۔ اس کو امام بیہقی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ایک روایت میں ہے: انه عليه الصلوة والسلام حملہ فی الاداوی والقرب، وکان یصب علی المرضی، ویستشفیہم بہ۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ وہ بھی پانی منگواتی تھیں، اور فرمایا کرتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ بھی منگواتے تھے۔

بغیر ضرورت کے مکہ مکرمہ میں ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے

۲۷۱۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ لَا يَحِلُّ لَآ حَدِ كُمْ اَنْ يَحْمِلَ بِمِخْلَةِ السَّلَاحِ

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۸۹/۲ الحديث رقم (۴۴۹ - ۱۳۵۶)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کسی کے لیے حلال نہیں ہے تم میں سے یہ کہ اٹھائے مکہ میں ہتھیار اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مکہ میں بلا ضرورت ہتھیار اٹھانا درست نہیں اور حسن فرماتے ہیں کہ مکہ میں ہتھیار اٹھانا مطلقاً درست نہیں ہے۔

جمہور کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام عمرہ القضاء کے سال ہتھیاروں سمیت داخل ہوئے تھے، نیز فتح مکہ کے سال قتال کی تیاری کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ (کذا ذکرہ عیاض رحمہ اللہ)۔ علامہ طیبی اور ابن حجر دونوں نے انکی اتباع کی ہے۔ لیکن یہ مقام بحث سے خالی نہیں۔

حمل سلاح سے مراد یہ ہے کہ اسلحہ کو اس طرح کھلم کھلا اٹھایا جائے کہ جس سے کسی مسلمان پر رعب پڑے یا کسی کو تکلیف ہوئی ہو، جیسا کہ آج کل مشاہدہ ہے۔ اور اس کی تائید ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ایام حج میں اس سے منع فرماتے تھے۔ فتح مکہ کا سال اس حکم سے مستثنیٰ ہے چونکہ اسلحہ وغیرہ اٹھانا تو کسی کیلئے بھی جائز نہیں تھا لیکن اس موقع پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے مباح قرار دیا گیا تھا۔

حرم پاک میں قصاص کا مسئلہ

۲۷۱۸: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلَى رَأْسِهِ الْبِغْفَرُ فَلَمَّا نَزَعَهُ جَاءَ رَجُلٌ وَقَالَ

إِنَّ ابْنَ حَظَلٍ مُتَعَلِّقٌ بِأَسْتَارِ الْكُعْبَةِ فَقَالَ أَقْتُلْهُ۔ (متفق علیہ)

اخرجه فی صحيحه ۴۶/۴ - الحديث رقم ۱۸۴۶ - ومسلم فی ۹۸۹/۲ الحديث رقم (۴۵۰ - ۱۳۵۷)۔ والترمذی فی

۱۷۴/۴ الحديث رقم ۱۶۹۳ - والنسائی فی ۲۰۰/۵ الحديث رقم ۲۸۶۷ - والدارمی ۱۰۱/۲ الحديث رقم ۱۹۴۸ -

ومالک فی الموطا ۴۲۳/۱ الحدیث رقم ۲۴۷ من کتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۱۶۶/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے فتح مکہ کے دن اور ان کے سر مبارک پر خود تھا۔ پس جب کہ اتارا اس کو۔ ایک شخص آیا یعنی فضل بن عبید اور کہا کہ تحقیق ابن نطل کعبہ کے پردے کو پکڑے ہوئے ہے۔ فرمایا اس کو مار ڈال۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”المغفر“: بیم کے کسرہ اور فاء کے فتح کے ساتھ ہے۔ ”خود“ کو کہتے ہیں۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا خود پہن کر مکہ میں داخل ہونا امام شافعی کے مسلک کی دلیل ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کا ارادہ نہ رکھتا ہو وہ احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ امام شافعی کے دو قولوں میں سے صحیح ترین قول یہی ہے۔ شنی فرماتے ہیں ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے:

ان النبی ﷺ قال: لا تجاوزوا الميقات بغير احرام۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”کوئی شخص احرام باندھے بغیر میقات سے آگے نہ بڑھے“۔

نیز یہ کہ احرام اس مقدس جگہ کی تعظیم کے لئے باندھا جاتا ہے اس لئے خواہ کوئی حج یا عمرہ کے لئے مکہ جائے یا کسی اور غرض سے سب برابر ہیں۔ (کہ خانہ کعبہ کی تعظیم کے پیش نظر احرام کے بغیر مکہ میں کوئی بھی داخل نہ ہو۔) اور فتح مکہ کے دن اس خاص ساعت میں بغیر احرام مکہ میں داخل ہونا آپ ﷺ کے لئے حلال ہو گیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا:

اِنَّهَا لَا تَحِلُّ لَّا حِدٍ قَبْلِي وَلَا تَحِلُّ لِحَدِّ بَعْدِي ، وَاِنَّمَا احلَّت لِي سَاعَةٌ مِنْ نَهَارٍ لَمْ عَادَتْ حَرَامًا لِعَنِي بغير احرام کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا حکم پھر سے لوٹ آیا ہے۔ (لہذا آئندہ کوئی شخص بغیر احرام کے یہاں نہ آئے۔)

قوله بجاء رجلٍ وقال ان ابن خطلٍ متعلقٍ بآستار الكعبة فقال اقتله:

علامہ طبری فرماتے ہیں یہ خبر لانے والے صاحب فضل بن عبید ابو برزہ اسلمی تھے۔ اور ابن نطل یہ مرتد ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ایک مسلمان خدمت گار کو قتل کر دیا تھا۔ نیز اس نے دو پیشہ ورگانے والی لڑکیاں رکھی ہوئی تھیں جو آنحضرت ﷺ آپ کے صحابہ کرامؓ اور اسلام کے احکام کی جو کرتی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو قصاصاً مار ڈالنے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص خارج حرم میں کوئی جنایت کرے، اور حرم میں پناہ لے لے تو حرم مکہ اقامت قصاص و حدود میں مانع نہیں۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ نے ابن نطل کے قتل کا حکم محض اس لئے دیا کہ وہ مرتد ہو گیا تھا۔ یا یہ کہ مرتد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ قاتل بھی تھا۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ آپ ﷺ نے اس کو قصاص کے طور پر قتل کرایا تو پھر یہ کہا جائے گا کہ اس کا قتل اس خاص ساعت میں ہوا ہوگا جس میں آنحضرت ﷺ کے لئے سر زمین حرم مباح کر دی گئی تھی۔ اس بات کی دلیل یہ کہ قتل قصاصاً نہیں تھا، یہ ہے کہ یہاں شرائط قصاص مطالبہ، دعویٰ، شہادت نہیں پائی جارہی ہیں۔ اس تقریر سے ابن حجر کے قول کا بطلان بھی ہو گیا، وہ فرماتے ہیں: وتاويل ابى حنيفة له بان هذا كان فى الساعة التى احلّت له وحينئذ مكة كغيرها بخلافها بعدها مردود.....

دخول مکہ کے وقت آپ ﷺ مسیاحہ عمامہ باندھے ہوئے تھے

۲۷۱۹: وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَخَلَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ بِغَيْرِ احْرَامٍ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۹۹۰/۲ الحدیث رقم (۴۰۱-۱۳۵۸)۔ والنسائی فى السنن ۲۰۱/۵ الحدیث رقم ۲۸۶۹۔

والدارمی فی ۱۰۱/۲ الحدیث رقم ۲۸۶۹۔ والدارمی فی ۱۰۱/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۹۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے میں داخل ہوئے فتح مکہ کے دن بغیر احرام کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سیاہ پگڑی تھی۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ بحمامۃ بین کے کسرہ کے ساتھ۔ اس حدیث کے ظاہر سے اور ما قبل سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سر پر خود پہن کر اس کے اوپر سیاہ عمامہ باندھ رکھا ہوگا بغیر احرام مکہ میں داخل ہونے کے بارے میں کلام ما قبل میں گذر چکا ہے۔
تعارض: حضرت جابر کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ فتح مکہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔ جبکہ حضرت انس کی پچھلی روایت میں گزرا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر خود تھا۔ (دیکھئے: حدیث: ۲۳۱۸)
قاضی عیاض نے اس تعارض کا جواب یہ دیا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ابتداءً داخل ہوئے تو خود پہن رکھا تھا، اور پھر اس کے بعد سیاہ عمامہ باندھ لیا۔ اس پر انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے: خطب الناس وعلیہ عمامۃ سوداء۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باب کعبہ کے پاس خطبہ دیا تھا اھ۔ (نقلہ النووی عن عیاض واقره منہ وتبعہما الطیبی)
ان دونوں کو جمع کرنے کی یہ صورت اشکال سے خالی نہیں۔

اور یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر پر خود پہن کر اس پر سیاہ عمامہ باندھا ہو، اور بعد میں ”خود“ کو اتار کر صرف عمامہ کو باقی رکھا ہو۔

فی الجملہ کالے کپڑا کا استعمال عمامہ وغیرہ کے طور پر درست ہے۔ سفید عمامہ باندھنا افضل ہے، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم علیہ الصلوٰۃ والسلام اکثر سفید عمامہ باندھتے تھے، شافعیہ بہت عجیب بات کہتے ہیں کہ خطیب کیلئے کالا عمامہ باندھنا بدعت ہے، چاہے کہ اس عادت کو ترک کیا جائے اور سفید باندھا جائے۔ مگر میں اس کو ناپسند سمجھتا ہوں خاص طور پر جیسا کہ عباسی کیا کرتے تھے۔ علامہ طیبی کی یہ عبارت بہت اچھی ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سیاہ رنگ کی پگڑی خطبہ میں استعمال کرنا جائز ہے اگرچہ سفید افضل ہے۔

تخریب کعبہ لشکر کا ذکر

۲۷۲۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَغْزُو جَبِشَ الْكُعبَةِ فَإِذَا تَكَانُوا بَبِيدَاءَ مِنَ الْأَرْضِ يُخَسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَآخِرِهِمْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَكَيْفَ يُخَسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَآخِرِهِمْ وَفِيهِمْ أَسْوَأُهُمْ وَمَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ قَالَ يُخَسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَآخِرِهِمْ ثُمَّ يَبْعَثُونَ عَلِيَّ بْنَ أَبِي تَالِبٍ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۳۸/۴ الحدیث رقم ۲۱۱۸ کتاب الحج باب هدم الكعبة ومسلم فی صحیحہ ۲۲۱/۴ الحدیث رقم (۲۸۸۴/۸) بلفظ مختلف۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک لشکر خانہ کعبہ کو خراب کرے گا۔ پس جس وقت ایک زمین میں پہنچے گا دھنسا یا جائے گا۔ اپنے اول حصے کے ساتھ اور آخر کے ساتھ بھی یعنی تمام لوگوں کو دھنسا دیا جائے میں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح دھنسا یا جائے گا اپنے اول اور اپنے آخر کے ساتھ اور ان میں ان کے بازار ہو گئے اور وہ شخص کہ نہیں ہے ان میں سے یعنی کفر میں اور خانہ کعبہ کو خراب کرنے میں شریک نہیں ہے بلکہ کمزور اور ان کے قیدی ہو گئے۔ فرمایا ان کو بھی دھنسا یا جائے گا اپنے اول اور اپنے آخر کے ساتھ پھر ان کو اپنی نیتوں پر اٹھایا جائے گا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: يغزو جيش..... باولهم و آخرهم:

يخسف: صيغة مجہول کے ساتھ ہے۔

جيش: اس کی توین برائے تعظیم ہے۔ ای عسکر عظیم

فاذا كانوا ببيداء من الارض: یہاں بیداء سے مراد بیابان ہے۔ اور ابن حجر نے اس بات پر جزم کیا ہے کہ اس سے مراد وہ معروف جگہ ہے جو مدینہ کے قریب واقع ہے۔ لیکن حدیث اس پر دلالت نہیں کر رہی ہے۔

يخسف باولهم و آخرهم“ یہ کنایہ ہے کہ وہ سارے کے سارے ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

قوله: و كيف يخسف..... ثم يعنون على نياتهم: ”و كيف يخسف“: یہ جملہ حالیہ ہے۔

وفيهم اسواقهم: یہ جملہ حالیہ ہے۔ ”اسواقهم“: علامہ طیبی فرماتے ہیں: اگر یہ ”سوق“ کی جمع ہے تو تقدیری عبارت یوں ہوگی:

أهل اسواقهم اور اگر ”سوقہ“ کی جمع ہے معنی الرعايا ہے، اس صورت میں تقدیری عبارت کی ضرورت نہیں۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ قرب قیامت میں ایک بہت بڑا لشکر خانہ کعبہ کو نقصان پہنچانے کے ناپاک ارادہ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوگا۔ چنانچہ جب وہ لشکر زمین کے ایک میدانی حصہ میں پہنچے گا تو وہ سارے کا سارا لشکر پہلے ہی زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ ان ہلاک شدگان میں کمزور اور قیدی بھی شامل ہوں گے جو نہ سب لشکر والوں کی طرح کافر ہوں گے اور نہ کعبہ کو نقصان پہنچانے میں ان کے ہمواد شریک ہوں گے بلکہ ان کو زبردستی لشکر میں شامل کر لیا ہوگا۔ ان کی نیت اگرچہ تخریب کعبہ کی نہیں تھی مگر چونکہ اہل باطل کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنے، اور ان کے ساتھ فتنہ پردری میں شریک تھے اس لئے یہ بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاتقوا فتنه لا تصيبن الذين ظلموا منكم﴾

پھر قیامت میں سب کو ان کی نیتوں کے مطابق اٹھایا جائے گا کہ جس کی نیت میں اسلام تھا وہ جنت میں داخل کیا جائے گا، اور جس کی نیت کفر کی تھی اس کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔

خانہ کعبہ کی خرابی حبشی کے ہاتھوں ہوگی

۲۷۲۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُخَرَّبُ الْكُعْبَةَ ذُو السُّوَيْفَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ - (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی ۶۶۰۱۳ الحدیث رقم ۱۰۹۶۔ ومسلم فی ۲۲۲/۴ الحدیث رقم (۵۷۔ ۲۹۰۹) و اخرجه النسائی فی السنن ۲۱۶/۵ الحدیث رقم ۲۹۰۴ واحمد فی المسند ۳۱۰/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خانہ کعبہ کو خراب کرے گا دو چھوٹی اور تپتی پنڈلیوں والا حبشیوں میں سے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”یخرب“: راء کی تشدید و تخفیف کے ساتھ بڑھا گیا ہے۔

”السویقتین“: تصغیر کے ذریعہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسکی ٹانگیں چھوٹی چھوٹی اور تپتی تپتی ہوں گی۔ یہ شخص کافروں میں سے ہوگا۔

خانہ کعبہ کو خراب کرنے والے شخص کا ذکر

۲۷۲۲: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ كَانِي بِهِ أَسْوَدَ أَفْحَجَ يَفْلَعُهَا حَجْرًا حَجْرًا - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۶۰۱۳۔ الحدیث رقم ۱۰۹۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں۔ خانہ کعبہ کے خراب کرنے والے کو وہ ایک شخص ہو گا سیاہ رنگ والا پھندا خانہ کعبہ کا پتھر پتھر اکھاڑے گا۔ اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: کانی بہ اسود افحج:

”کانی بہ“: تقدیری عبارت یوں ہے: کانی متلبس الیہ۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گویا کہ پہلے یہ فرمایا: ویخرب الکعبۃ احد اور پھر (کسی اور موقع پر مزید وضاحت فرماتے ہوئے) اس کا یہ حلیہ بیان فرمایا۔

مظہر فرماتے ہیں: ضمیر مجرور، حدیث ابو ہریرہؓ میں مذکور (حششی شخص) کی طرف راجع ہے۔ اھ۔ یہ مفہوم غیر واضح ہے، چونکہ ان دونوں حدیثوں کا اتصال معروف نہیں، خصوصاً جب کہ دونوں روایات بھی مختلف ہیں۔

اور پھر فرمایا: یہ کہنا اولیٰ ہے کہ وہ ضمیر مبہم ہے، اس کی تفسیر مابعد کلام کر رہا ہے اھ۔ یہ بھی محل اشکال ہے۔ چونکہ مابعد کلام تفسیر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، الا یہ کہ تقدیری عبارت یوں ہو: کانی برجل اسود افحج ”اسود“: مصانع میں یہ قید موجود نہیں ہے، اس میں ترکیبی دو احتمال ہیں: (۱) ”بہ“ کی ضمیر مجرور سے بدل ہے۔ (۲) بہ کی ضمیر مجرور سے ”حال“ ہے۔

”افحج“ میں بھی یہی ترکیبی احتمالات ہیں۔

افحج: میں پہلے حا اور پھر جیم ہے۔ وہ شخص کہ جس کے پیر کے اگلے حصے قریب اور ایڑیاں دور ہوں دونوں ناگوں کو کھول کر چلتا ہو۔ اور ”فجیح“ دو ہری جیم کے ساتھ۔ اس شخص کو کہتے ہیں ناگلیں پھیلا کر چلتا ہو۔ فجیح ”افحج“ سے زیادہ قبیح ہوتا ہے۔

قولہ: یقلعہا حجرا حجرا:

”حجرا حجرا“: یہ دونوں اسم ”حال“ ہیں، یہ ”بوہنتہ بابا بابا“ کی نظیر ہے (ذکرہ ابن حجر) اور زیادہ واضح یہ ہے کہ یہ دونوں ضمیر کعبہ سے ”بدل“ ہیں۔ مزید یہ کہ ”حجر“ جامد ہے، اور باب مشتق ہے، چنانچہ ایک کا اطلاق دوسرے پر نہیں ہو سکتا۔ فتدبیر اس سے مراد یہ کہ وہ شخص کعبہ کی عمارت کو ڈھائے گا۔ کہا گیا ہے کہ وہ اسے سمندر میں ڈال دیں گے۔ محدثین کا اتفاق ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کا اتنے طویل عرصہ تک برقرار رہنا خوارق عادیہ میں سے ہے۔

الفصل الثانی:

حرم میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت

۲۷۲۳: عَنْ يَعْلَى بْنِ أُمِيَّةَ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ أَحْتِكَارُ الطَّعَامِ فِي الْحَرَمِ الْحَادُّ فِيهِ. (رواه ابو داود)

احرجہ ابو داؤد فی السنن ۵۲۲/۲ الحدیث رقم ۲۰۲۰۔

ترجمہ: حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا حرم میں غلہ کا بند کرنا کجروی ہے۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”احتکار“ کا مطلب یہ ہے کہ گراں بازاری کے دور میں غلہ اس نیت سے خرید کر رکھنا کہ جب گرانی اور زیادہ بڑھے

گی تو اسے فروخت کیا جائے گا۔ یہ فعل ویسے تو ہر جگہ حرام ہے لیکن حرم میں اس کا ارتکاب حرمت کے اعتبار سے، بہت ہی زیادہ سخت ہے۔ چنانچہ اس پر ”کجروی“ (یعنی حق چھوڑ کر باطل کی طرف مائل ہونا) کا اطلاق فرمایا گیا ہے اور حرم میں کجروی کے بارے میں حق

تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِالْحَادِ بِظُلْمٍ نَذَقَهُ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ﴾

”اور جو شخص حرم میں ظلم کے ساتھ کجروی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھادیں گے۔“

مکہ کی فضیلت

۲۷۲۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِمَكَّةَ مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَأَحَبَّكَ إِلَيَّ وَكَوْلَا أَنْ قَوْمِي

أَخْرَجُوا جُونِي مِنْكَ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكَ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۷۹/۵ الحدیث رقم ۳۹۲۶۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مکہ سے۔ یعنی جب فتح مکہ کے دن وہاں سے رخصت ہوئے کیا خوب شہر ہے اور میرے نزدیک بہت زیادہ محبوب ہے اگر میری قریش قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں تیرے علاوہ کہیں نہ رہتا۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے سند کے اعتبار سے۔

تشریح: قوله: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِمَكَّةَ مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَأَحَبَّكَ إِلَيَّ:

”ما اطیبک“: تعجب کا صیغہ ہے۔ و احبک کا عطف ماقبل پر ہو رہا ہے۔

پہلی قید اس کی ذات کی نسبت سے ہے، یا مطلق ہے، اور دوسری قید تخصیص کیلئے ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن مکہ سے الوداع ہوتے وقت یہ کلمات مکہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا مکہ سے خطاب فرمانا دلیل ہے کہ اس کو بھی فہم و سماعت حاصل ہے۔

قوله: وَكَوْلَا أَنْ قَوْمِي أَخْرَجُوا جُونِي مِنْكَ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكَ:

قریش کی طرف اخراج کی نسبت بایں طور ہے کہ وہ آپ ﷺ کے خروج کا سبب بنے تھے۔

یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے کہ مکہ مکرمہ مدینہ منورہ سے افضل ہے، بخلاف امام مالک کے۔ امام مالک مدینہ کے مکہ سے افضل ہونے کے قائل ہیں۔ امام سیوطی نے اس پر مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے۔

قوله: رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب اسنادا اسنادا: ترکیبی اعتبار سے یہ تیسرا واقع ہو رہا ہے۔

زمین میں سب سے زیادہ محبوب مقام مکہ ہے

۲۷۲۵: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ بَنِ حَمْرَاءَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَإِقْفَاءَ عَلَى الْحَزْوَرَةِ فَقَالَ وَاللَّهِ إِنَّكَ

لَخَيْرُ أَرْضِ اللَّهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللَّهِ إِلَيَّ وَكَوْلَا إِنِّي أَخْرَجْتُ مِنْكَ مَا خَرَجْتُ۔ (رواه الترمذی وابن ماجه)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۷۹/۵ الحدیث رقم ۳۹۲۵۔ وابن ماجه فی ۱۰۳۷/۲ الحدیث رقم ۳۱۰۸۔ والدارمی فی

الحدیث رقم ۲۵۱۰۔ واحمد فی المسند ۳۰۵/۴۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عدی بن حمراء سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو حزورہ مقام کے اوپر کھڑے ہوئے دیکھا۔ پس فرمایا اللہ کی قسم تحقیق تو خدا کی زمین میں سب سے بہتر ہے اور بہت محبوب ہے خدا کی زمین

میں خدا کے نزدیک۔ اگر میں تجھ سے نہ نکالا جاتا تو نہ نکلنا میں تجھ سے اس کو امام ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عبداللہ بن عدی۔ یہ عبداللہ بن "عدی قریشی" زہری ہیں۔ یہ اہل حجاز میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ "قدید" اور "عسفان" کے درمیان رہتے تھے۔ ان سے ابوسلمہ عبدالرحمن اور محمد ابن جبیر روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قولہ: رايت رسول الله ﷺ واقفا على الحزورة:

"الحزورة": علامہ طیبی فرماتے ہیں: بروزن قسورۃ مکہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اور بعض نے حزورة کو مشدود پڑھا ہے۔ حزورة اصل میں چھوٹے ٹیلے کو کہا جاتا ہے۔ اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے، چونکہ یہاں ایک چھوٹا ٹیلا تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ "جرہم" کے بعد خانہ کعبہ کا متولی و کعب بن سلمۃ بن زہیر بن ایاد بنا، تو اس نے یہاں ایک محل تعمیر کرایا اور وہاں ایک قوم کو آباد کیا، جس کو حزورہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کو جزوی مکہ کہا جانے لگا۔ اھ بعض کا کہنا ہے کہ حزورة، مکہ میں واقع ایک بازار کا نام تھا، یہ بازار آج کل "غزورۃ" کے نام سے معروف ہے۔ یہی "باب الوداع" ہے۔

قولہ بحقال: والله..... منک ماخرجت:

یہ جملہ دلالت کر رہا ہے کہ مؤمن کو چاہیے کہ وہ حتی الامکان مکہ سے نہ نکلے، الا یہ کہ حقیقۃً یا حکماً کسی ضرورت دینی یا دنیوی کی وجہ سے نکلنے پر مجبور ہو۔ چنانچہ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونا سعادت ہے، اور باہر نکلنا شقاوت ہے۔

فقہاء حنفیہ اس جملہ سے استیناس کے طور پر فرماتے ہیں کہ "مودع" کیلئے مستحب ہے کہ وہ اپنے پیچھے کی طرف یوں ملتفت ہو جیسا کہ وہ شخص کہ جو یہاں سے جانے پر سخت شرمندہ ہو، بلکہ اس شخص کی طرح کی جس کو زبردستی یہاں سے نکالا جا رہا ہو، اس میں ایک پہلو تنظیم کا بھی ہے کہ بیت اللہ سے جدا ہو رہا ہے۔ الٹے پاؤں لوٹنا اگرچہ بدعت ہے، لیکن سنت سے متزامم نہیں، یہ بدعت حسنہ ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں بلکہ مرفوعاً بیان کرتے ہیں: ما راہ المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔

انک لخیر ارض الله واحب ارض الله: اس میں تصریح ہے کہ مکہ مدینہ منورہ سے افضل ہے، جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے، البتہ زمین کا وہ ٹکڑا کہ جس پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جسم مبارک ہے مکہ مکرمہ سے افضل ہے۔ بلکہ کعبہ سے افضل ہے، بلکہ بالاجماع عرش سے بھی افضل ہے۔ مبنی ومعنی ہر اعتبار سے حضرات مالکیہ نے اس حدیث کا رد کیا ہے جیسا کہ ائمہ مالکیہ میں سے ابن عبدالبر بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ان حضرات نے اس حدیث ثابت کا معارضہ ایسی روایات سے کیا ہے جو نہ صرف ضعیف بلکہ موضوع بھی ہیں۔ چنانچہ اسی قبیل سے یہ روایت پیش کی جاتی ہے: اللهم انهم اخر جونی من احب البلاد الی فاسکنی فی احب البلاد ایلک۔ اس روایت کے موضوع ہونے پر محدثین کا اجماع ہے۔ جیسا کہ ابن عبدالبر اور ابن دبیہ فرماتے ہیں، بلکہ امام مالک سے بھی منقول ہے۔ اس طرف التفات نہ کیا جائے کہ امام حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی تخریج کی ہے۔ چونکہ ائمہ فرماتے ہیں: من کمال تساهله فی کتابه عطل تمام النفع له، بالفرض یہ روایت ثابت بھی ہو تو "بعد مکہ" مقدر مانا جائے گا۔ چونکہ زمین کا جو حصہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین ہوگا، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی وہی حصہ محبوب ترین ہوگا۔ علاوہ ازیں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ آپ ﷺ مکہ سے مدینہ، بحرین یا قسریں جہاں چاہیں تشریف لے جائیں۔ چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دعا فرمائی کہ ان شہروں میں سے جو شہر سب سے بہتر ہے اور فتنہ فساد سے مأمون و محفوظ ہے میرے لئے پسند فرمائیے۔

طبرانی کی روایت ہے: المدینة خیر من مکة۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ منکر و واهی ہے۔ اور اگر اس کو صحیح تسلیم کر بھی کیا جائے تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ پر محمول ہوگی، کہ آنحضرت ﷺ کے وجود اقدس کے باعث مدینہ منورہ کثیر الفوائد تھا۔ چونکہ مدینہ منورہ کا یہ شرف و فضل اپنی ذات کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ سرکارِ عالم ﷺ کے وجود بابرکت کے یہاں موجود ہونے کی وجہ سے ہے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر برکات الہیہ کے نزول کی وجہ سے ہے۔

نیز واضح رہے کہ ان دونوں مقامات مقدسہ کیلئے سفر کرنے کے مسئلہ میں بھی فرق ہے۔ مکہ کا سفر کرنا واجب ہے اور مدینہ منورہ کی حاضری مسنون ہے بلانزاع۔ اور یہ بھی مجمع علیہ ہے کہ نفس مدینہ، مکہ مکرمہ سے افضل نہیں ہے۔ چونکہ یہاں اصلاً تضاعف نہیں ہے، بلکہ مضاعفت کا تعلق دونوں مسجدوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ ایک حدیث صحیح میں آتا ہے: صلاة فی مسجدی هذا افضل من الف صلاة فی غیره من المساجد الا المسجد الحرام، وصلاة فی مسجد الحرام افضل من الصلاة فی مسجدی هذا بمائة الف صلاة۔ بعض حفاظ کا فرمانا ہے کہ یہ حدیث شخبین کی شرط پر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: صلاة واحدة بالمسجد الحرام افضل من مائة الف صلاة بمسجد النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے، لیکن مرفوع کے حکم میں ہے، چونکہ اس جیسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جاسکتی۔ ابن ہمام فرماتے ہیں: علماء مکہ مکرمہ کی مجاورت کے بارے میں کراہت و عدم کراہت کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض شافعیہ نے ذکر کیا ہے کہ مختار یہ ہے کہ یہاں کی مجاورت مستحب ہے۔ الایہ کہ کسی محذور میں مجتہبی ہونے کا ظن غالب ہو۔ یہ قول صاحبین کا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ فرماتے تھے: إنها لیست بداز ہجرة۔ امام مالک سے اس بابت استفسار کیا گیا تو فرمایا: ما كان الناس إلا علی الحج والرجوع۔ پہلا قول ”عجب“ اور یہ دوسرا قول ”احوط“ ہے۔ چونکہ اس کے برعکس میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والی بات ہے۔

اور اسی وجہ سے بھی کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: کل ابن آدم خطوه المضاعف مضاعف۔ ای کمیہ۔ ایسا ہی ابن مسعود سے مروی ہے، اگر وہ صحیح طور پر ثابت ہو۔ وگرنہ تو بلاشبہ اس اللہ کے حرم میں اس کا ارتکاب ”انفخ وانفط“ ہے۔ سخت عذاب کا موجب ہے اور یہ سارے امور اللہ کی ناراضگی کا سبب ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسا محبت رسول ﷺ کہتے ہوئے طائف کو اپنا وطن بنا بیٹھا:

لأن أذن خمسين ذنبا بركية۔ وهو موضع بقرب الطائف۔ أحب إلى أن أذن ذنباً واحداً بمكة۔

حضرت ابن مسعود سے مروی ہے: ما من بلدة يؤخذ العبد فيها بالهمة قبل العمل إلا مكة اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَمَنْ يَرِدْ فِيهَا بِالْحَادِ بِظِلْمٍ نَذَقَهُ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ﴾ [الحج: ۲۵]

مدینہ سے ایک شخص طلب علم کیلئے آیا، سعید ابن المسیب نے اس سے فرمایا: ارجع إلى المدينة، فإننا نسمع أن ساكن مكة لا يموت حتى يكون الحرم عنده بمنزلة لحل لما يستحل من حردها۔

حضرت عمر فاروق سے مروی ہے: خطيئة أصيبها بمكة أعزّ على من سبعين خطيئة بغيرها۔

ہاں اللہ کے کچھ ایسے بندے بھی ہیں کہ جن کو اللہ جل شانہ نے طابع کے تقاضوں سے سنوار لیا ہے، یہی لوگ اہل جوار ہیں، یہی وہ لوگ ہیں کہ جو مضاعف حسنات کی فضیلت سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

ایک حدیث میں آتا ہے: صلاة فی مسجدی هذا افضل من ألف صلاة فيما سواه من المساجد إلا المسجد

الحرام، وصلاة في المسجد الحرام أفضل من مائة الف في مسجده۔

امام احمدی ایک روایت میں ابن عمر سے مروی ہے میں نے ان کو سنا یعنی نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے:

من طاف أسبوعا يحصيه وصلى ركعتين كان كعدل رقية۔ وقال: سمعته يقول: ما رفع رجل قدمًا ولا وضعها إلا كتب الله له عشر حسنات، وحط عنه عشر سيئات، ورفع له عشر درجات۔

ابن ماجہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں:

من أدرك رمضان بمكة وصامه وقام منه ما تيسر كتب له مائة ألف شهر رمضان فيما سواه، وكتب

الله له بكل يوم عتق رقبة، وبكل ليلة عتق رقبة، وكل يوم حملان فرس في سبيل الله۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے:

لا يصبر على لأواء المدينة وشدتها أحد من امتي إلا كتبت له شفيعا يوم القيامة أو شهيدا۔

ترمذی وغیرہ نے ابن عمر سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے:

من استطاع أن يموت بالمدينة فليمت، فإني أشفع لمن يموت بها اه۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (سورة الروم: ٤١) لا حول ولا قوة إلا بالله العظيم۔

دوسری جگہ فرمایا: ﴿يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لَا

تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ﴾ (سورة الرحمن: ٣٣)

تخریج: اس حدیث کو اور محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔ سندی اعتبار سے یہ حدیث صحیح ہے۔

والله المستعان وعليه التكلان، ولعله لا يؤاخذنا بالفضل والإحسان۔

الفصل الثالث:

حرمت مکہ کا بیان

٢٤٢٦: عَنْ أَبِي شُرَيْحٍ الْعَدَوِيِّ أَنَّهُ قَالَ لِعَمْرِ بْنِ سَعِيدٍ وَهُوَ يَبْعَثُ الْبُعُوثَ إِلَى مَكَّةَ إِذْ ذَنَّبَ لِي أَبُوهَا

الْأَمِيرُ أَحَدِيكَ قَوْلًا قَامَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْعَدْنُ مِنْ يَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعْتُهُ أذْنًاى وَوَعَاهُ قَلْبِي وَأَبْصَرْتُهُ

عَيْنًاى حِينَ تَكَلَّمَ بِهِ حَمْدُ اللَّهِ وَأَنْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللَّهُ وَلَمْ يَحْرَمَهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ

لِأَمْرِي يَوْمَ بِلَالٍ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا وَلَا يَعْضُدَ بِهَا شَجَرَةً فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ بِقِتَالِ رَسُولِ

اللَّهِ ﷺ فِيهَا فَقُولُوا لَهُ إِنَّ اللَّهَ قَدْ آذَنَ لِرَسُولِهِ وَلَمْ يَأْذَنَ لَكُمْ وَأَنْتُمْ آذَنَ لِي فِيهَا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ وَقَدْ

عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ وَلْيَبْلُغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَقِيلَ لَأَبِي شُرَيْحٍ مَا قَالَ لَكَ عَمْرُو قَالَ

قَالَ أَنَا أَعْلَمُ بِذَلِكَ مِنْكَ يَا أَبَا شُرَيْحٍ إِنَّ الْحَرَمَ لَا يُعِيدُ عَاصِيًا وَلَا قَارًا بِدَمٍ وَلَا قَارًا بِخَرِيْبَةٍ۔

(متفق عليه وفي البخارى الْخَرِيْبَةُ الْجِنَايَةُ)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤١/٤۔ الحديث رقم ١٨٣٢۔ ومسلم فى ٩٨٧/٢ الحديث رقم (٤٤٦ - ١٣٥٤)۔

والترمذی ۱۷۳/۳ الحدیث رقم ۸۰۹ واحمد فی المسند ۳۸۵/۶۔

ترجمہ: حضرت ابوشریح عدوی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے عمرو بن سعد سے اس وقت جبکہ وہ مکہ کی طرف لشکر بھیج رہے تھے یہ عرض کیا کہ اے میرے سردار! مجھے اجازت دیں میں آپ کے سامنے وہ حدیث بیان کروں جس کو رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے اگلے روز ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ میرے کانوں نے اس کو سنا اور میرے دل نے اسے یاد رکھا اور میری آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف اور ثنا کی پھر فرمایا تحقیق مکہ کو اللہ نے بزرگی دی ہے اور اس کو لوگوں نے بزرگی نہیں دی۔ پس مکہ اس شخص کے واسطے حلال نہیں ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے کہ اس میں خونریزی کرے یعنی اگر چہ قتل کے لائق ہو اور جو قتل کے لائق ہے اس کو ہر جگہ قتل کرنا حرام ہے خواہ حرم میں ہو خواہ غیر حرم میں اور حلال نہیں ہے کہ اس میں درخت کاٹے۔ اگر کوئی مکہ میں قتال کے لئے رسول اللہ ﷺ کے عمل سے رخصت تلاش کرے تو اس کو کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اجازت دی تھی تمہیں اجازت نہیں دی۔ چنانچہ مجھے بھی صرف ایک ساعت کے لئے اس شہر میں قتال کی اجازت دی گئی تھی۔ آج کے دن اس شہر کی قدر و عظمت گزشتہ روز کی طرح ہی ہے اور چاہیے کہ حاضر غائب کو پہنچائے۔ پس ابوشریح سے کہا گیا کہ عمرو نے تجھ کو کیا جواب دیا؟ ابوشریح نے کہا عمرو نے کہا کہ میں اس حدیث کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں اے ابوشریح! تحقیق حرم گنہگار کو خون کے ساتھ بھاگنے والے کو اور تفسیر کے ساتھ بھاگنے والے کو پناہ نہیں دیتا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم اور بخاری نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

ابوشریح۔ یہ ”ابوشریح“ خویلد بن عمرو کعمی عدی خزاعی ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے۔ ۶۸ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ اور یہ اپنی کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ اہل حجاز میں ان کا شمار ہے۔ ”شریح“ تفسیر کے ساتھ ہے۔

تشریح: بخاری کی روایت میں ”الخریبة کے معنی ”قصور“ ہیں۔

قوله: عن ابی شریح العدوی انه قال لعمرو بن سعید العدوی: عین اور دال کے فتح کے ساتھ ہے۔ عمرو بن سعید بن عاص اموی قریشی اپنے چچا زاد بھائی خلیفہ عبد الملک بن مروان کی جانب سے مدینہ کے حاکم تھے ان کو حضرت عبد اللہ بن زبیر سے قتال کیلئے بھیجا گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مکہ، اس کے مضافات، اور عراق وغیرہ پر حضرت عبد اللہ بن زبیر کی برحق خلافت قائم تھی، اور شام میں عبد الملک کا غلبہ تھا۔

قوله: وهو یبعث البعوث الی مكة..... وائنی علیہ:

”البعث“: جماعة من الجند یرسلها الامیر الی قتال فرقة وفتح بلاد۔ (نوح)

”اِذْنُ“: زوال کے فتح، ہمزہ ثانی کو ابتداء یا سے بھی بدلا جاتا ہے۔ ”اِذْنُ“ مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔

”أُحْدِثُكَ“: مجرم ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ مرفوع ہے۔

”أَذْنَى“: زوال کے ضمہ، نیز سکون کے ساتھ۔

”حمد اللہ“: جملہ متانفہ بیان ہے۔

ولا یعضد: ضاد مجہ کے کسرہ کے ساتھ ہے، ضمہ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

أَحَدُكَ قَوْلًا قَامَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْغَدَّ مِنْ يَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعْتُهُ إِذْ نَأَى وَوَعَاهُ قَلْبِي وَأَبْصَرْتُهُ عَيْنَايَ حِينَ تَكَلَّمْتُ بِهِ حَمْدَ اللَّهِ وَأَنْشَى عَلَيَّ، اس کلام میں پے درپے کئی تاکیدات ہیں، جو بالکل عیاں ہیں۔

قوله: قَالَ: إِنَّ مَكَّةَ حَرَمَهَا اللَّهُ..... أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا وَلَا يَعْضُدُ بِهَا شَجَرَةً:

إِنَّ مَكَّةَ حَرَمَهَا اللَّهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ: یعنی مکہ کو اللہ تعالیٰ نے عظمت بخشی ہے اور یہاں کے باسیوں کو بھی جمعاً حرمت حاصل ہے۔ مکہ کو لوگوں نے اپنی طرف سے بزرگی نہیں دی ہے۔ یہ مطلب مراد لینے کی صورت میں یہ اس بات کے منافی نہیں کہ اس شہر کو حرمت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی ہے۔

قوله: فَلَا يَحِلُّ لِأَمْرِي يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ..... وَلَا يَعْضُدُ بِهَا شَجَرَةً:

”يَوْمٌ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ“: مؤمن بہ کے صرف دو اطراف کو ذکر کیا، چونکہ یہ بقیہ مؤمن بہ کی طرف سے کفایت کرتے ہیں۔

”أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا“:

یعنی کسی مسلمان کیلئے اس شہر میں خون ریزی حلال نہیں ہے، خواہ وہ خون ریزی کسی کو زخمی کرنے کی صورت میں ہو، خواہ کسی کو قتل کرنے کی صورت میں ہو اگرچہ وہ مقتول و مجروح لائق قتل ہی کیوں نہ ہو، اور کسی کو ناحق قتل یا زخمی کرنا تو ہر جگہ حرام ہے خواہ حرم مکہ کے اندر ہو خواہ حرم کے باہر ہو۔

”وَلَا يَعْضُدُ بِهَا شَجَرَةً“: یہاں اگرچہ شجر کا ذکر ہے مگر نباتات و وحشیش کا بھی یہی حکم ہے۔ یہاں تک تو عمرو بن سعید کی بات کا جواب تھا۔ آگے نیا کلام ہے۔

قوله: فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ..... وَلِيَبْلُغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ:

”إِنْ“: شرطیہ ہے۔ ”أحد“ قائل ہے فعل محذوف و جو با کا، اور ما بعد ترخص اس کی تفسیر کر رہا ہے۔ ترکیبی اعتبار سے اس کی نظیر یہ آیات کریمہ ہیں: ﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ﴾۔ ﴿إِذَا السَّمَاءُ انشقت﴾۔

”وانما أذن لي“: یہ جملہ بتدائیہ ہے، اس کا عطف جملہ شرطیہ پر ہے۔ اس کلام میں صنعت التفات ہے۔ ابن حجر کو یہاں وہم ہوا ہے۔

قوله: وَقَدْ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ وَلِيَبْلُغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ:

”اليوم“: سے مراد خطبہ والادن ہے۔

”الامس“: سے مراد اس وقت کے علاوہ دوسری گھڑی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد زمانہ ماضی ہو۔

”وليبلغ“: لام اذل کو ساکن و مسکور دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے اور دوسرا لام مشدود و مسکور ہے۔ اور مخفف بھی درست ہے۔

قوله: ما قال لك عمرو؟..... ولا فارا بخربة:

”ما“: یہ ما استفہامیہ ہے۔

”بذلك“: اس کا مشارالیه حدیث یا حکم محذوف ہے۔

”یا ابا شریح“: اس نداء میں دو احتمال ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ ماقبل کا تتمہ ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مابعد کیلئے تمہید ہے۔

”الحرم“: حرم سے مراد مکہ ہے، جیسے کہ ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

”لا يعيد عاصيا ولا فارا بدم“:

عمر بن سعید کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ زمین حرم اس شخص کو پناہ نہیں دیتی جو خلیفہ سے بغاوت کر کے نافرمانی کا مرتکب ہوا ہو۔ گویا عمر بن سعید کے زعم کے مطابق عبد الملک بن مروان خلیفہ برحق تھا اور حضرت عبد اللہ بن زبیر اس کے باغی تھے۔ حالانکہ عبد الملک بن مروان خلیفہ برحق نہیں تھا کہ اس کی خلافت کا انکار کرنے والا شرعی اعتبار سے باغی قرار دیا جاتا۔

”خربة“: ایک نسخہ میں الخيانة ہے، خیانة امانة کی ضد ہے۔ شرح مسلم میں عند الخربة البلية کے الفاظ ہیں۔

”الخربة“: خانے مجھ کے فتح اور راء کے سکون کے ساتھ۔ خاء پر ضمہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں جنایت، اور اس کے

اصل معنی ”سرقة الابل“ ہیں۔

اگر کوئی شخص خارج حرم میں جنایت قتل کے علاوہ کوئی جرم کر کے حرم میں پناہ حاصل کر لے تو ایسے شخص کا حقہ پانی بند کر دیا جائے، یعنی اس پر تنگی کی جائے، اس کو نہ کھانا دیا جائے، نہ پانی پلایا جائے، اس کو اشیائے خورد و نوش فروخت نہ کی جائیں، تاکہ وہ باہر نکلنے پر مجبور ہو جائے، اس کے بعد اس سے قصاص (بدلہ) لیا جائے۔ ابن حجر نے اس روایت کو اپنے مذہب کی دلیل قرار دیا ہے کہ حرم میں حدود و قصاص کا نفاذ ہوگا۔

تعظیم مکہ کا بیان

۲۷۲۷: وَعَنْ عِيَّاشِ بْنِ أَبِي رَبِيعَةَ الْمَخْزُومِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَزَالُ هَذِهِ الْأُمَّةُ بِخَيْرٍ مَا

عَظَّمُوا هَذِهِ الْحُرْمَةَ حَقَّ تَعْظِيمِهَا فَإِذَا ضَيَعُوا ذَلِكَ هَلَكُوا۔ (رواه ابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۳۸۱/۲۔ الحديث رقم ۳۱۱۰۔

ترجمہ: حضرت عیاش بن ربیعہ مخزومیؓ سے روایت ہے کہتے ہیں۔ کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ امت ہمیشہ بھلائی کے ساتھ قائم رہے گی جب تک اس حرمت کی تعظیم کرے گی۔ یعنی مکہ اور اس کے حرم کی جیسے تعظیم کا حق ہے اور جس وقت اس تعظیم کو ضائع کریں گے۔ ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

عیاش بن ابی ربیعہ۔ عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی قریشی ”ابو جہل“ کے ماں شریک بھائی ہیں۔ آنحضور ﷺ کے ”دار ارقم“ میں داخل ہونے سے پہلے ہی شروع میں اسلام لے آئے۔ ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پھر انہوں نے اور حضرت عمرؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ان کے پاس ”ہشام“ کے دونوں بیٹے ”ابو جہل“ اور ”حارث“ آئے اور کہا کہ تمہاری ماں نے تم کھائی ہے کہ میں جب تک کہ تم کو نہ دیکھ لوں گی اس وقت تک نہ سر میں تیل ڈالوں گی اور نہ سائے میں آرام کروں گی۔ اس لئے یہ ان کے ساتھ اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پس ان دونوں نے ان کو ایک رسی سے باندھ دیا اور مکہ میں قید کر دیا۔ اس پر آنحضور ﷺ ان کے لئے قنوت میں دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! ”عیاش بن ابی ربیعہ“ کو کافروں کی قید سے خلاصی دے۔ جنگ یرموک میں شہید ہوئے۔ ان سے عمرؓ بن خطاب وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: ”عیاش“ دونوں والی یا کے مشدد اور شین مجھ کے ساتھ ہے۔

”لا تزال“: بصیغہ مذکر مؤنث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ”بخیر“: تنوین برائے تعظیم ہے۔

”ما عظموا“: یہ ماظرفیہ ہے۔ ای: ممدۃ تعظیمہم۔ ”ذلک“: اس کا مشار الیہ تعظیم ہے یا مذکورہ حرمت ہے۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ امت اجابت اس وقت تک بہت ہی بھلائی کے ساتھ رہے گی جب تک کہ حرمت مکہ اور حرم مکہ کی تعظیم کرتی رہے گی جیسا کہ اس کی تعظیم کا حق ہے اور اہل عرب کے ہاں مسلم ہے۔ اس کی تعظیم نہ کرنا اس کی اہانت کے مترادف ہے۔ چنانچہ جب لوگ اس تعظیم کو ترک کر دیں گے تو وہ اپنے اس فعل بد کی بدولت ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

بَابُ حَرَمِ الْمَدِينَةِ حَرَسَهَا اللَّهُ تَعَالَى

حرم مدینہ کا بیان (اللہ اس کو آفات سے محفوظ رکھے)

مدینہ اور اس کے گرد گرد زمین کی حرمت کے بارے میں بھی احادیث منقول ہیں، لیکن اس سلسلہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، چنانچہ حنفی علماء کے نزدیک مدینہ اور اس کے گرد گرد زمین کی حرمت کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر مقدس اور اس کے چاروں طرف کی زمین کی تعظیم و تکریم کی جائے نہ یہ کہ اس کا بھی وہی حکم ہے جو مکہ اور اس کی گرد گرد زمین کا ہے لہذا حنفی مسلک کے مطابق مدینہ اور اس کی اطراف کی زمین میں درخت وغیرہ کا ثنا اور شکار کرنا حرام نہیں ہے لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چونکہ حرم مکہ اور حرم مدینہ کا ایک ہی حکم ہے اس لئے ان کے مسلک میں مدینہ اور اس کے اطراف کی زمین میں وہ تمام چیزیں حرام ہیں جو مکہ اور اس کے اطراف کی زمین میں حرام ہیں تاہم ان ائمہ کے ہاں بھی حرم مدینہ میں ان چیزوں کے ارتکاب سے جزا واجب نہیں ہوتی۔

چنانچہ علامہ طیبی فرماتے ہیں: المشہور من مذهب مالک والشافعی، انه لا ضمان فی صید المدینة و قطع شجرها، بل ذلك حرام بلا ضمان، وقال بعض العلماء: يجب الجزاء كحرم مكة، وقال بعضهم: لا یخرم ایضا۔ اور توریستی لکھتے ہیں: قوله عليه الصلوة والسلام: حرمت المدینة، اراد بذلك تحريم التعظیم، دون ما عداه من الأحكام المتعلقة بالحرم۔ ہمارے بعض اصحاب نے لکھا ہے: قوله عليه الصلوة والسلام فی الحدیث السابق: أحرم من الحرمة لامن التحريم بمعنى أعظم المدینة جمعا بين الدليلین بقدر الإمكان، وله نقول فنعظمها ونوقرها أشد التوقیر والتعظیم، لكن لا نقول بالتحريم لعدم القاطع احترازا عن الجرة علی تحريم ما أحل الله تعالى۔

دلائل ائمہ ثلاثہ: ائمہ ثلاثہ کا متدل حضرت سعدؓ کی حدیث ہے۔ یہ حدیث اسی باب کی فصل اول میں آئے گی۔ ”عن سعد رضی اللہ عنہ: قال: قال رسول اللہ ﷺ انی..... الا كنت له شفيعا او شهيدا يوم القيامة“۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان کو حرام (باعظمت) قرار دیتا ہوں، لہذا نہ تو اس زمین کے (جو ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ہے) خاردار درخت کاٹنے جائیں اور نہ اس میں شکار مارا جائے (حنفیہ کے نزدیک یہ ممانعت نبی تنزیہی کے طور پر ہے) مدینہ ان (لوگوں) کے لئے (جو مدینہ میں رہتے ہیں) بہتر ہے (یعنی مدینہ کا قیام دنیا و عقبیٰ کی بھلائی کا ضامن ہے) بشرطیکہ وہ (اس کی بھلائی و بہتری کو جانیں) تو اس شہر کی اقامت کو ترک نہ کریں اور دنیا کے آرام و راحت کے لئے اس کو چھوڑ کر اور کہیں نہ جائیں جو بھی شخص بے رغبتی کے ساتھ (یعنی بلا ضرورت) اس شہر کو چھوڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ کسی دوسرے ایسے شخص کو مقیم کر دے گا جو اس سے بہتر ہوگا (یعنی بے رغبتی کے ساتھ مدینہ کو چھوڑنا مدینہ کے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے مفید ہی ہوگا کہ اس شخص کی جگہ کوئی اس سے بہتر شخص آ کر مقیم ہوگا کہ ضرورت و مجبوری کے تحت مدینہ کو چھوڑنا اس حکم میں داخل نہیں) اور جو بھی شخص مدینہ میں سختیوں اور بھوک پر ثابت قدم رہے گا (یعنی وہاں کی ہر تنگی و پریشانی پر صبر کرے گا) تو میں قیامت کے

دن اس کی شفاعت کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس (کی اطاعت) کا گواہ ہوں گا۔“

ان حضرات کا دوسرا متدل فصل ثانی کی پہلی حدیث سے بھی ہے: عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَقَاصٍ رَسُوْلُ اللَّهِ ﷺ وَلٰكِنْ اِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُ اِلَيْكُمْ ثَمَنَهُ“ - حضرت سلیمان بن ابوعبداللہ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو پکڑا جو اس حرم مدینہ (یعنی مدینہ کے اطراف) میں شکار مار رہا تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے حرام (یعنی قابل تعظیم) قرار دیا ہے چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے کپڑے (زجر و تنبیہ کے طور پر) چھین لئے پھر اس شخص کے مالک آئے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں گفتگو کی حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حرم کو حرام قرار دیا ہے۔ نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ایسے آدمی کو پکڑے جو اس میں شکار مار رہا ہو تو وہ اس کا سامان چھین لے۔ لہذا جو چیز رسول اللہ ﷺ نے مجھے دلوائی ہے (یعنی جو چیز میں نے آپ ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے حاصل کی ہے) وہ تو میں (کسی حال میں بھی) واپس نہیں کروں گا ہاں اگر تم چاہو تو میں اس کی قیمت (ازراہ مروت و احسان) تمہیں دے دوں۔“

دلائل حنفیہ: (۱) عن أنس قال: كان لأبي طلحة ابن أم سليم، يقال له أبو عمير، وكان رسول الله ﷺ يباحكه إذا دخل، وكان له طير، فدخل رسول الله ﷺ فراى أباه عمير حزيناً. فقال: ما شأن أبي عمير؟ فقیل: يا رسول الله: مات نغيره، فقال رسول الله ﷺ: يا أبا عمير! ما فعل النغير؟

اس حدیث کے بارے میں ابن اثیر لکھتے ہیں: هذا حدیث صحیح قد أخرجه البخاری، ومسلم فی کتابیہما، وكذا الإمام أحمد، والترمذی، والنسائی، وابن ماجه۔ امام طحاوی فرماتے ہیں یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے۔ اگر مدینہ منورہ بھی (ہر اعتبار سے) مکہ کی طرح حرم ہوتا، اور اس میں شکار ناجائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ان کو پرندہ قید رکھنے کا اجازت نہ دیتے، اور پرندہ پکڑا ہوا دیکھ کر چھوڑ دینے کا حکم صادر فرماتے جیسا کہ مکہ میں یہی حکم ہے، اور اس کے ساتھ کھیلنے کی اجازت بھی نہ مرحمت فرماتے۔ اھ
خلاصہ کلام یہ کہ اگر حرم مدینہ کا حکم حرم مکہ کی طرح ہوتا تو پھر رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں پرندے کو قید میں رکھنا کیوں کر درست ہو سکتا تھا؟۔

تورپشتی فرماتے ہیں: اگر حدود مدینہ میں پرندہ کو قید کرنا حرام ہوتا تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام (اس) موضع حاجت میں سکونت نہ فرماتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ممکن ہے کہ یہ (واقعہ) قباء میں پیش آیا ہو۔ اور قباء حرم کا حصہ نہیں ہے تو اس کو جواب یہ ہے کہ ایسا کہنے سے ڈرنا چاہیے۔ آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ قباء حرم کا حصہ نہیں ہے۔ چونکہ متعدد حضرات نے مدینہ کے حرم کی حدود ”بریدی بريد“ بیان کی ہے، اور ”برید“ چار فرسخ کا ہوتا ہے، اور قباء سے مدینہ کی مسافت ایک فرسخ سے بھی کم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث غیر کا یہ واقعہ تحریم مدینہ سے پہلے کا ہو یا یہ کہ یہ پرندہ ”حل“ سے شکار کر کے لایا گیا ہو۔ اس احتمال کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال تاویل ہے۔ اور (جب) راوی کی تاویل حجت نہیں، تو دوسرے کی تاویل کیسی ہوگی؟ مزید یہ کہ اگر حل سے شکار کر کے لایا گیا تھا تو تب بھی ہمیں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا، چونکہ حل کا شکار جب حرم میں داخل ہو جائے تو اس کا حکم حنفیہ کے نزدیک صید حل کا ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ بات ہمارے خلاف نہیں جاتی، بلکہ خود ان کے خلاف حجت ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں: ولكن اصلهم هذا ضعيف فيرد عليهم اھ۔ امام نووی کا یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے جب کہ ہمارا استدلال نص سے ہے، اور ان کا متدل قیاس ہے۔ چنانچہ بلاشبہ نص کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا۔

کافی میں لکھتے ہیں: لأن حل الاصطياد عرف بالنصوص القاطعة، فلا يحرم الابراهيم ساطعة، ومرويهم محتمل وهو لا يصلح حجة۔

کہ ہر جگہ شکار کرنے اور درخت کاٹنے کی اجازت دلائل قطیعیہ سے ثابت ہے، کسی مقام پر حرمت اصطیاد اور حرمت قطع اشجار کیلئے بھی نصوص قطیعیہ کی ضرورت ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ محتمل ہیں، اس لئے محض ان معتمل نصوص کے پیش نظر مدینہ کے شکار اور درخت کاٹنے کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

صحیحین کی حدیث ہے: أن النبی ﷺ لما أخذہ کان نخل وقبوی لمشرکین وخرّب۔ فأمر النبی ﷺ بالنخل فقطع۔ وقولہ، أخذہ أی مکان المسجد۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت مدینہ کے کھجوروں کے درخت کٹوا کر مسجد کی چھت کا انتظام فرمایا، اگر حرم مدینہ کے احکام حرم مکہ جیسے ہوتے تو دربار نبوی سے قطع نخل کی اجازت نہ دی جاتی۔

حنفیہ کا استدلال حضرت ابن مسعود اور ابن زبالہ وغیرہ کی روایت سے بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلمہ سے فرمایا تھا: أما انک لو کنت تصیدہ بالعقیق لشیعتک اذا ذہبت و تلقیتک اذا جنت فانی أحب العقیق۔

حضرت سلمہ بن اکوع فرماتے ہیں کہ میں نے وحشی جانوروں کا شکار کر کے گوشت نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں بطور ہدیہ پیش کیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا اگر تم شکار کرنے کیلئے وادی عقیق جاتے تو جاتے وقت میں تمہارے ساتھ مشالیت کرتا (یعنی رخصت کرنے کیلئے باہر تک ساتھ جایا) اور جب تم واپس آتے تو میں تمہارا استقبال کرتا۔ چونکہ میں وادی عقیق کو پسند کرتا ہوں۔ واضح رہے کہ وادی عقیق مدینہ کا ایک حصہ ہے، یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت سعد نے درخت کاٹنے والے غلام سے سامان سلب کر لیا تھا۔ مقام عقیق سے شکار کی ترغیب خود رسول اللہ ﷺ فرماتے رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ حرم مدینہ اور اس کے شکار کا حکم حرم مکہ اور اس کے شکار کے حکم کی طرح نہیں ہے۔

اسی باب کی فصل اول میں حضرت ابوسعید کی حدیث مذکور ہے: ولا تحبط فیہا شجر إلا لعلف، کہ مدینہ کے اشجار سوائے چارے کے نہ کاٹے جائیں۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے حرم مدینہ کے درختوں کے پتے چارے کیلئے جھاڑنے کی اجازت دی ہے۔ جبکہ حرم مکہ کے اشجار کے پتوں کو جانوروں کے چارہ کیلئے بھی کاٹنا جائز نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرم مدینہ کے نباتات کا حکم، حرم مکہ کے نباتات کے حکم کی طرح نہیں ہے۔

امام طبرانی نے اپنی اوسط میں حضرت انسؓ سے حدیث نقل کی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: احد جبل یحبنا ونحبہ، فإذا جنتموہ فکلوا من شجرہ ولو من عصابہ۔ کہ احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے، اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں، جب تم احد آؤ تو اس کے درخت سے کچھ کھاؤ۔

اس حدیث کے راوی کثیر بن زید ہیں، امام احمد نے ان کی توثیق کی ہے۔ مزید یہ کہ اس سے ملتی جلتی روایت ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ درخت سے کچھ کھانے کیلئے اس کو درخت سے توڑنے کی اجازت کو مستلزم ہے۔ اور احد حرم مدینہ کا ایک حصہ ہے، حرم مکہ میں خود درخت کے پتے توڑنے کی اجازت نہیں، جبکہ حرم مدینہ کے درختوں کے پتے اور پھل توڑنے کی اجازت اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام احد کے علاوہ وغیرہ میں ممانعت استجابی ہے، ناکہ تحریمی۔ یا یہ ممانعت برائے بیع تھی، برائے اکل نہ تھی تاکہ تنگی لازم نہ آئے۔ نیز یہاں شکار بھی بکثرت ہوتا ہے۔ چنانچہ نہیں میں شدید کا اسلوب اختیار کیا، لیکن اصطیاد و انتفاع کے معاملہ میں توسع برتا۔ اس کی نظیر وہ تاویل ہے جو حدیث صید میں ذکر کی گئی۔

الفصل الاول:

احترام مدینہ کا بیان

۲:۲۸: عَنْ عَلِيٍّ قَالَ مَا كَتَبْنَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِلَّا الْقُرْآنَ وَمَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمَدِينَةُ حَرَامٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلَى ثَوْرٍ فَمَنْ أَحَدَثَ فِيهَا أَوْ أَوَى مُحَدِّثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ ذِمَّةُ الْمُسْلِمِينَ وَاحِدَةٌ يَسْعَى بِهَا آذَانُهُمْ فَمَنْ أَخْفَرَ مُسْلِمًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ وَمَنْ وَالِيَ قَوْمًا بِغَيْرِ إِذْنِ مَوْلَاهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ (متفق عليه) (روى في رِوَايَةٍ لَهُمَا مَنْ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ أَوْ تَوَلَّى غَيْرَ مَوْلَاهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ).

اخرجه البخارى فى صحيحه ۸۱/۴ - الحديث رقم ۱۸۷۰ - ومسلم فى صحيحه ۹۹۴/۲ الحديث رقم (۴۶۷- ۱۳۷۰) - وابوداؤد فى السنن ۵۲۹/۲ الحديث رقم ۲۰۳۴ - والترمذى فى ۳۸۱/۴ الحديث رقم ۲۱۲۷ - والدارمى فى ۳۱۷/۲ الحديث رقم ۲۵۲۹ - واحمد فى المسند ۸۱/۱.

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوائے ان باتوں کے یا اس چیز کے کہ جو صحیفہ میں ہے کچھ نہیں لکھا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ صحیفہ میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مدینہ عیر اور ثور کے درمیان حرم ہے پس جو شخص مدینہ میں بدعت پیدا کرے یا وہ چیز کہ جو کتاب و سنت کے مخالف ہو یا بدعتی کو ٹھکانا دے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ اس کے فرض قبول نہیں کیے جاتے یعنی اس کے فرائض و نوافل کامل قبول نہیں ہوتے۔ مسلمانوں کا عہد ایک ہے اس کو شش کو ان کا ادنیٰ حاصل کر سکتا ہے۔ پس جو شخص مسلمانوں کے عہد کو توڑے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور سب آدمیوں کی لعنت ہے اس سے فرائض و نوافل قبول نہیں کیے جاتے اور جو شخص ایک قوم سے سوال کرے اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر تو اس پر خدا کی اور فرشتوں کی اور سب آدمیوں کی لعنت ہے۔ اس کے فرض و نوافل قبول نہیں کئے جائیں گے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے بخاری اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو شخص اپنے باپ کے علاوہ کی طرف دعویٰ کرے یعنی یہ کہے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں اور حقیقت میں اس کا بیٹا نہیں ہے یا اپنے کو غیر مالک کی طرف نسبت کرے پس اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے اس سے فرائض اور نوافل قبول نہیں کئے جائیں گے۔

تشریح: قوله: ما كتبنا عن رسول الله ﷺ إلا القرآن وما في هذه الصحيفة:

یہ حدیث دلیل ہے کہ علیؓ نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے قرآن کریم اور صحیفہ مذکورہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں لکھی تھی۔

مسند احمد میں ابوحسان سے مروی ہے: أن عليا كان يأمر بالا مرفيوتي، فيقال: قد فعلنا كذا، فيقول: صدق الله ورسوله. قال: فقال له الأشر: إن هذا الذي تقول تفسخ في الناس أهو شى عهده إليك رسول الله ﷺ؟ قال: ما عهد إلى رسول الله ﷺ دون الناس إلا شى سمعته منه فهو في صحيفة في قراب سيفي. قال: فلم يزلوا به حتى

اخرج الصحیفة، فاذا فيها: من احدث حدثا۔ الحدیث۔ تفشع: فاء، شین اور پھر غین، بمعنی ظہور و انشور۔ (کذا فی النہایة) امام نووی فرماتے ہیں: یہ حدیث شیعہ حضرات کے زعم اور اس بہتان تراشی کی تردید کر رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک وصیت نامہ مرتب کرایا تھا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ اول مقرر کرنے کی ہدایت بھی تھی۔ اس میں کچھ خاص راز کی باتیں بھی تھی، اور اس وصیت نامہ میں اہل بیت کیلئے کچھ مخصوص امور تھے جن کا علم اہل بیت کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔ یہ ساری باتیں باطل دعوے ہیں، اختراعات فاسدہ ہیں، ان کی کوئی اصل نہیں۔ اور اس کے ابطال کیلئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول (ما کتبنا عن رسول اللہ ﷺ الا القرآن وما فی هذه الصحیفة) کافی ثانی ہے۔ اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ علم کی باتوں کو لکھنا مستحب ہے۔

قوله قال: قال رسول الله ﷺ: المدينة حرام ما بین عمیر الی ثور: قال: یہ اس صحیفہ کی تفسیر ہے۔

”المدينة حرام“ ہمارے نزدیک یہاں ”حرام“ بمعنی محترم ممنوع کے ہے۔ (یعنی مدینہ منورہ اور اس کے اطراف زمین کا وہ حصہ جو عمیر اور ثور کے درمیان ہے بزرگی اور عظمت والا ہے۔ اس میں ایسی چیزوں کا ارتکاب ممنوع ہے جو شہر مقدس اور اس کی باعظمت زمین کی توہین و حقارت کا سبب ہوں) اور شافیہ کے نزدیک حرام ”حرم“ کے معنی میں ہے۔ (یعنی مدینہ منورہ اور اس کے اطراف زمین کا وہ حصہ جو عمیر اور ثور کے درمیان ہے حرم کہہ کر کی مانند ہے کہ جو چیزیں مثلاً شکار وغیرہ حرم مکہ میں حرام ہیں وہ یہاں میں بھی حرام ہیں۔)

”عمیر“: عین کے فتح اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ”عمیر“ اور ”ثور“ یہ دونوں پہاڑ مدینہ کے اطراف میں واقع ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ عمیر مدینہ کے ایک مشہور پہاڑ کا نام ہے، البتہ ”ثور“ مدینہ میں نہیں بلکہ مکہ کا ایک پہاڑ ہے، اور وہ غار بھی اسی میں ہے جہاں رسول اللہ ﷺ بوقت ہجرت روپوش ہوئے تھے۔ اور ایک روایت میں ”ما بین عمیر و احد“ کے الفاظ ہیں۔ (چونکہ حدیث میں حرم مدینہ کی حدود بیان کرنا مقصود تھا) چنانچہ ثور کا ذکر باعث اشکال ہے۔ (شاید یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے ”عمیر“ کا ذکر تو کیا ہے، لیکن ثور کا ذکر نہیں کیا اور اس کو مبہم رکھا ہے۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں اس طرح ہے: المدينة حرام ما بین عائر الی کذا۔) اس لئے بعض علماء نے تو یہ جواب دیا ہے کہ اگرچہ پہلی روایت زیادہ مشہور ہے مگر راوی سے غلطی ہوئی ہے کہ اس نے ”احد“ کے بجائے ثور نقل کر دیا۔ (بعض نے یہ کہا ہے کہ جبل احد کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جو غیر مشہور ہے، اسے ”ثور“ کہا جاتا ہے، اور حدیث میں یہی مراد ہے۔ اس لئے حدیث میں ثور کا ذکر صحیح ہے، باقی جن علماء نے اس کا انکار کیا ہے وہ اس کی عدم شہرت کی وجہ سے ہے۔)

بعض نے یہ کہا ہے کہ مکہ معظمہ میں ”جبل ثور“ کی طرح ایک ”جبل عمیر“ بھی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان مکہ میں جتنا فاصلہ ہے اتنی ہی جگہ مدینہ کی حرم ہے۔ مکہ میں ایک پہاڑ ہے جس کو عمیر عدوی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور پہاڑ ہے جسے ثور اطل کہا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد حرتین ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث صحیح میں مروی ہے: فہ قال حرم ما بین لابتی المدينة علی لسانی۔ حرتین میں سے ایک کو عمیر سے تشبیہ دی، اور دوسرے کو ثور سے تشبیہ دی۔ یا ان سے مراد مازمی المدینہ (مدینہ کی دونگ جگہیں) ہیں ان کو عمیر و ثور سے تشبیہ دی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے: حرام ما بین مازمیہا۔

قوله: فمن احدث فيها حدثا او آوی محدثا:

”احدث فیہا حدثا“: یعنی ایسی بات کہے یا رائج کرے جو قرآن و حدیث کے خلاف ہو یا منکر ہو۔
”آوی“: کو مد و تصر دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

”محدث“: وال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو کسی بدعتی کو پناہ دے، یا جانی کو پناہ دے یا اس طور

کہ جانی اور اس کے خصم کے درمیان قصاص لینے کی راہ میں حائل ہو جائے۔

ایک روایت صحیحہ میں ”محدث“ دال کے فتح کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو بدعت کے کام کو جگہ دے، بایں طور کہ اس پر راضی ہو، تو ان دونوں پر خدا کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ ا۔ لُح

قوله: لا يقبل منه صرف ولا عدل:

یہ اس صحیفہ علی کے پہلے حکم کا بیان ہے۔

”صرف“: کے کئی معنی آتے ہیں، یہاں اس کے مندرجہ ذیل تمام معنی مراد لئے جاسکتے ہیں:

(۱) فرض۔ (۲) نفل۔ (۳) توبہ۔ (۴) شفاعت

”عدل“: کے بھی کئی معانی آتے ہیں، یہاں اس کے مندرجہ ذیل معانی مراد ہو سکتے ہیں:

(۱) نفل۔ (۲) فرض۔ (۳) نذیہ۔ (۴) شفاعت۔ (۵) توبہ

عدم قبولیت سے مراد قبولیت تامہ ہے۔ عدل اور نذیہ میں مناسبت یہ ہے کہ نذیہ ”مفدی“ کا معادل (مساوی) ہوتا ہے۔

قوله: فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين:

”فعليه“: ای کل واحد منهما یعنی ان دونوں میں سے ہر ایک پر۔ دونوں سے مراد ایک وہ شخص جو مدینہ میں بدعت پیدا کرے، اور دوسرا وہ شخص جو کسی بدعت کو پناہ دے۔ اور جو شخص بھی ان کاموں میں ان کی (یعنی ان ملعون افراد کی) اتباع کرے گا، یا ان کے افعال مذکورہ پر راضی ہوگا اس پر بھی لعنت ہوگی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

”لعنة الله“: یعنی اس شخص پر اللہ کی پھٹکار ہے، وہ راندہ درگاہ ہے، رسوا ہے، اللہ کی رحمت سے دور ہے۔

”الملائكة“: سے مراد کراما کا تین ہیں، یا تمام ملائکہ مراد ہیں چونکہ وہ عاصیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور ملائکہ کے لعنت کرنے

کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس عاصی کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کی بددعا کرتے ہیں۔

”والناس اجمعين“: یعنی مذکورہ بالا دو اشخاص کے علاوہ ہر شخص ان پر لعنت بھیجتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں بھی ان

لعنت بھیجنے والوں میں شامل ہوں بایں طور کہ یہ بددعا کرتے ہوں: الا لعنة الله على الظالمين۔ اور ظلم کہتے ہیں شیء کو اس کے غیر موقع محل میں رکھنے کو،

قوله: ذمة المسلمين واحدة يسهى بها اذناهم، فمن اخفر مسلماً..... ولا عدل:

یہ اس صحیفہ کا دوسرا حکم ہے۔

”اخفر“: خائے مجھ کے ساتھ ہے۔ بمعنی ”نقض“، یہ خفرا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں عہد و پیمان، اور باب افعال

میں اس کے معنی ہیں ”ازالة الخفرة“ (یعنی عہد و پیمان کو زائل کرنا)

مسلمانوں کے عہد و پیمان شیء واحد کی طرح ہیں۔ اس میں اختلاف مرتب کا فرق نہیں ہے۔ اس کو توڑنا جائز نہیں ہے، اگرچہ عاقد فرد واحد ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو شخص اپنے بھائی کے ذمہ کو توڑے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جو کسی سے عہد کر کے توڑ دے۔ چنانچہ ایسا شخص اضاعت عہد و پیمان کے باعث مذموم ہے۔ گویا کہ سب مسلمان جسم واحد ہیں، جب اس کے کسی ایک حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے۔ پس ایفائے عہد کے لئے ان میں سے ادنیٰ مرتبہ کا شخص بھی کوشش کر سکتا ہے۔ یعنی تمام مسلمانوں کا ذمہ ایک ہی ہے، خواہ ایک سے صادر ہوا ہو، یا افراد کثیرہ سے، خواہ عہد کسی معزز آدمی نے کیا ہو، خواہ کسی گھنیا آدمی نے کیا ہو۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں

جب مسلمانوں میں سے کسی ایک مسلمان نے کسی کافر کو امان دے دی تو کسی کیلئے بھی جائز نہیں کہ اس کے ذمہ کو توڑے۔ اگر چہ وہ مسلمان غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اہ، البتہ ہمارے امام اعظم نے غلام کی امان کا اعتبار نہیں کیا۔ (کما هو مقرر فی محلہ)

لہذا جو شخص کسی مسلمان کے عہد کو توڑے، بایں طور کہ جس کافر کو امان دی گئی تھی اسے قتل کر دیا، یا اس کا مال لوٹ لیا، اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے نہ تو اس کے فرض قبول کئے جاتے ہیں اور نہ نفل۔

قوله: من والی قوما بغیر اذن موالیہ: یہ اس صحیفہ علی کا تیسرا حکم ہے۔ یعنی جو شخص اپنی آزادی کی نسبت آزاد کرنے والے کی بجائے کسی دوسرے کی طرف کرے تو وہ مستحق لعنت ہے۔ بایں طور کی اپنے مولیٰ کے علاوہ کسی اور کو اپنا مولیٰ کہے یا قرار دے۔ "بغیر اذن موالیہ" کی قید کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حکم عدم اذن کے ساتھ متقید ہے۔ (یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر مالک اجازت دے دے تو پھر غیر مالک کی طرف نسبت کرنا درست ہو جائے گا۔) بلکہ یہ قید اکثر کے اعتبار سے ہے (کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے) کہ اگر آزادی یافتہ غلام اپنے مالک سے اس بات کی اجازت چاہتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کی نسبت اس کی بجائے کسی دوسرے کی طرف کرے تو وہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ کہا گیا ہے کہ یہاں ولاء موالات مراد ہے۔ ولاء حقیق مراد نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی اور شخص کو اپنا باپ بتلائے۔ اور "بغیر اذن موالیہ" کی قید درحقیقت مانع کی طرف اشارہ ہے، اور وہ ہے ان کا حق اور انکی امانت۔ یہ کلام باعتبار غالب کے ہے بطور قید کے نہیں ہے، چنانچہ انتساب کی اجازت ہو تو تب بھی غیر کی طرف انتساب درست نہیں ہوگا۔

قوله: من ادعی الی غیر ابیہ الخ: "ادعی": انتساب کے معنی میں ہے "او تولی غیر ابیہ": اس عطف سے ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جنہوں نے "موالات" کی تفسیر "ولاء عتاقہ" کے ساتھ کی ہے۔ اس آخری حکم میں دو افراد کیلئے ایک ہی وعید ذکر فرمائی، چونکہ حقیق اس حیثیت سے کہ وہ "لحمۃ کلحمۃ النسب" ہے، تو جب وہ اصل شخص سے ہٹ کر کسی غیر کی طرف نسبت کرے گا تو یہ اس شخص کی مانند ہوگا جو اپنے اصل (یعنی اصل باپ) سے براءت کا دعویٰ کرے۔ اور اپنے آپ کو کسی غیر کی طرف منسوب کرے۔ چنانچہ یہ شخص بدو کا مستحق ہوگا۔

حرمت مدینہ کا بیان

۲۷۲۹: وَعَنْ سَعْدِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنِّي أُحْرِمُ مَا بَيْنَ لَا بَنِي الْمَدِينَةِ أَنْ يَفْطَعَ عِضَاهَا أَوْ يُقْتَلَ صِيدُهَا وَقَالَ الْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ لَا يَدْعُهَا أَحَدٌ رَغْبَةً إِلَّا أَبَدَلَ اللَّهُ فِيهَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنْهُ وَلَا يَنْبُتُ أَحَدٌ عَلَى لَأْوَانِهَا وَجَهْدِهَا إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا أَوْ شَهِيدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۹۹۲/۲ الحدیث رقم (۴۵۹-۱۳۶۳) واحمد فی المسند ۱/۱۸۱۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق میں مدینہ کے پہاڑوں کے دونوں کناروں کے درمیان حرام کرتا ہوں کہ اس کے خاردار درخت، کاٹے جائیں یا مارا جائے اس کا شکار اور فرمایا مدینہ بہتر ہے ان کے واسطے یعنی اس کے مومنین کے رہنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں اگر اس کی بھلائی کو جان لیں۔ تو اس کو نہ چھوڑیں اور نہ وہاں سے جائیں اور نہ چھوڑے گا۔ اس کو کوئی بے رغبتی سے بلکہ اللہ تعالیٰ اس میں اس شخص کو بدلے گا کہ وہ بہتر ہوگا اس سے یعنی مدینہ کو اس کے نہ ہونے سے ضرر نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے لیے مفید ہوگا یعنی کوئی اس کی سختی اور بھوک پر صبر نہیں کرے گا اور اس کی مشقت پر مگر میں اس کے واسطے شفاعت کرنے والا ہوگا۔ فرمایا کہ گواہ ہوگا یعنی اس کی اطاعت کا قیامت کے دن، اور اس کا امام مسلمؒ نقل فرمایا۔

تشریح: قوله: انى احرم ما بين لابتى المدينة، ان يقطع او يقتل صيدها:

”انى احرم“: یعنی میں مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان کو قابل تعظیم یا ممنوع قرار دیتا ہوں۔
 ”ان يقطع“: مفعول سے ”بدل الاشمال“ ہے۔ ”عضاء“: عضۃ کی جمع ہے، حروف اصلہ میں سے ”حاء“ محذوف ہے۔ ہر وہ بڑا درخت جو کانٹے دار ہو۔

قوله: المدينة خیر لهم: اگر فتح سے قبل ہو تو مطلق مراد ہے، اور اگر فتح مکہ کے بعد ہے تو غیر مکہ کی قید کے ساتھ مقید ہوگا۔ یا معیشت میں برکت کے اعتبار سے ”خیر“ ہونا مراد ہے۔ چنانچہ یہ فضیلت مکہ مکرمہ کو حاصل فضیلت زائدہ کے منافی نہیں۔

قوله: لا يدعها احد رغبة عنها الا ابدل الله فيها من هو خير منه: ”لا يدعها“: جملہ مستأنفہ مبینہ ہے۔
 الا ابدل الله فيها: مطلب یہ ہے کہ اس غیر صابر کے مدینہ منورہ میں نہ ہونے سے مدینہ منورہ کو کوئی نقصان نہیں ہے، بلکہ اس جیسے شخص کا نہ ہونا مفید ہے، کہ چلو اس کا شر اس بقعہ مبارکہ سے کہیں اور منتقل ہو گیا۔ حدیث مبارکہ کے اس جملہ کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے:
 ﴿وان تتولوا يستبدل قوما غير کم ثم لا یكونوا امثالکم﴾ اور کہا گیا ہے کہ یہ ”ابدال“ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا۔ بظاہر یہ مطلق ہے، تمام احوال و ایام کو شامل ہے۔

قوله: ولا یثبت احد علی لاوائها وجهدھا الا کنت شفیعا او شهیدا یوم القیامة:

لا واء: پہلا، ہمزہ ساکن ہے، اور ابدال کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں سخت قسم کی بھوک۔
 جہد: جیم کے فتحہ نیز ضم کے ساتھ، بمعنی مشقت یعنی یہاں کی گرمی شدت، پردیس کی مشقت، اور یہاں رہنے والے بدعتی لوگوں سے اہل سنت کو بچانے والی اذیتیں۔

لا یثبت احد علی لاوائها: جو ہرئی فرماتے ہیں: ”اللا واء“ کے معنی ہیں ”الشدة“۔ اور یہاں لا واء سے مراد یہاں قحط اور معیشت کی تنگی ہے۔ جیسا کہ اکثر روایات میں علی لا واء ہا و شدتها کے الفاظ ہیں۔ لہذا ان دونوں کے معنی میں قدرے اختلاف ضروری ہے، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عطف تفسیری و تاکیدری ہو چونکہ: الناسیں اولیٰ، و الاصل فی العطف التغایر۔

شفیعا او شهیدا: کہا گیا ہے کہ ”او“ راوی کے شک کا بیان ہے۔ یہ بات انتہائی مستبعد ہے چونکہ بہت سارے صحابہؓ نے اس حدیث کو اسی طرح روایت کیا ہے، اور متعدد صحابہ کا شک پر متفق ہونا بعید معلوم ہوتا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ بیان تقسیم کیلئے ہے۔ اسی شفیعا للعاصی شہیدا للمطیع او شہیدا لمن مات فی زمانہ شفیعا لمن مات بعدہ۔ اور کہا گیا ہے کہ ”او“ بمعنی ”واو“ ہے۔

اس جملہ میں اشارہ ہے کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔ قاضی فرماتے ہیں: آنحضرتؐ کا گناہگاروں کیلئے عمومی شفاعت فرمانا، اور ساری امت پر گواہی دینا وہ تو ہے ہی، حدیث باب میں مذکور یہ فضیلت ایک اضافی خصوصیت ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شہداء احد کے بارے میں فرمایا: انا شہید علی ہوا۔ چنانچہ ان حضرات کی تخصیص ان کی قدر و منزلت کی رفعت کو بیان کر رہی ہے۔

اس حدیث میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ مومن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ صبر کا مظاہرہ کرے، بلکہ حرمین شریفین (یعنی مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ) کی اقامت پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا رہے نیز یہ کہ وہ ان مقدس شہروں کے علاوہ کی ظاہری نعمتوں پر نظر نہ کرے۔ چونکہ اصل اعتبار تو آخرت کی حقیقی نعمتوں کا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

اللہم لا عیش الا عیش الاخرة۔

”اے اللہ! آخرت کی راحت و آرام کے علاوہ اور کوئی راحت و آرام نہیں ہے۔“

اور ایک حدیث میں آیا ہے: من صبر علی حر مکة ساعة تباعد من نار جهنم مائتي سنة۔
کسی کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا:

إِذَا لَمْ يَطْبُ فِي طَيِّبَةٍ عِنْدَ طَيِّبٍ تَطْيِبُ بِهِ الدُّنْيَا فَأَيْنَ تَطْيِبُ

اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿اَلَمْ يَرَوْا اَنَا جَعَلْنَا حَرَمًا مَّأْمُونًا وَيَتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿فَلْيُعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ الَّذِي اَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ﴾ [قریش: ۲۷] حیات طیبہ کی اصل یہ ہے کہ رزق پہنچتا ہے اور امن حاصل ہو۔ امن ہی درحقیقت کمال رفق ہے۔

مدینہ منورہ کی سکونت کی فضیلت

۲۷۳۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَصْبِرُ عَلَى الْأَوَائِ الْمُدِينِيَّةِ وَشِدَّتِهَا أَحَدٌ مِنْ أُمَّتِي إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۰۰۴/۲ الحديث رقم (۴۸۴ - ۱۳۷۸)۔ وملك في الموطأ ۸۸۵/۲ الحديث رقم ۳ من كتاب المدينة۔ واحمد في المسند ۲۸۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص مدینہ کی سختی اور بھوک پر اور محنت پر میری امت میں سے صبر کرے گا میں اس کیلئے شفاعت کروں گا قیامت کے دن اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔
عرض مرتب: تشریح کیلئے پچھلی حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

نیک پھل دیکھ آپ ﷺ مدینہ کے لیے دعا فرماتے

۲۷۳۱: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّاسُ إِذَا رَأَوْ أَوَّلَ الثَّمَرَةِ جَاءُوا بِهِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَإِذَا أَخَذَهُ قَالَ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مُدِنَا اللَّهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَبْدَكَ وَخَلِيلَكَ وَنَبِيَّكَ وَرَأَى عَبْدُكَ وَنَبِيَّكَ وَإِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَأَنَا أَدْعُوكَ لِمَدِينَةٍ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَمَلَأْتَهُ مَعَهُ ثُمَّ قَالَ يَدْعُو أَصْغَرَ وَلِيدٍ لَهُ فَيُعْطِيهِ ذَلِكَ الثَّمَرَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۰۰۰/۲ الحديث رقم (۴۷۳ - ۱۳۷۳) والترمذی في السنن ۴۷۲/۵ الحديث رقم ۳۴۵۴۔ وابن ماجه في ۱۱۰۵/۲ الحديث رقم ۳۳۲۹۔ والدارمی في ۱۴۵/۲ الحديث رقم ۲۰۷۲۔ وملك في الموطأ ۸۸۵/۲ الحديث رقم ۲ من كتاب المدينة، واحمد في المسند ۳۳۰/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ لوگ جس وقت نیا پھل دیکھتے تو حضور ﷺ کے پاس لے کر آتے تھے تو جس وقت حضور ﷺ لیتے تو کہتے اے الہی ہمارے واسطے ہمارے میوے ہمارے شہر ہمارے صاع اور ہمارے مد میں برکت دے۔ اے الہی تحقیق ابراہیم تیرا بندہ ہے اور تیرا گہرا دوست ہے اور تیرا نبی ہے اور تحقیق میں تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں اور ابراہیم نے تجھ سے مکہ کے لئے دعا کی تھی جو کہ اس آیت میں مذکور ہے: ﴿فَاجْعَلْ أَهْلَهُ مِنْ النَّاسِ﴾ اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے واسطے کی تھی اور مثل اس کے اس کی دعا کے

ساتھ یعنی اس کی دعا کے دو گنا ہونے کے ساتھ پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل بیت میں سے سب سے چھوٹے بچے کو بلا تے اور اس کو پھل دیتے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: كان الناس اذا راوا اول ثمره جاءوا به الى النبي ﷺ:

”اول ثمره“: اس کو باکورہ اور انموزج بھی کہتے ہیں۔ جاؤ وا بہ: ضمیر اول ثمر کی طرف راجع ہے اور ایک نسخہ میں جاؤ وا بہا ہے۔ اس صورت میں توجیہ یہ ہے کہ یہاں مضاف الیہ سے اکتساب ثانیث کیا ہے۔

قوله: اللهم بارک فی ثمرنا..... وبارک لنا فی مدنا:

”اللهم بارک فی ثمرنا“: یعنی اے اللہ! ہمارے پھلوں میں حسی اور معنوی برکت عطا فرما۔

”و بارک لنا فی مدینتنا“: ہمارے شہر میں برکت عطا فرما، یعنی شہر کی ذات میں از روئے وسعت برکت عطا فرما، یہاں کے رہنے والوں کو وسعت عطا فرما۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اس طرح قبول ہوئی کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں توسیع ہوئی، اس کے اطراف میں توسیع ہوئی، مسلمان کثیر تعداد میں یہاں آباد ہوئے، حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں جب مدینہ میں موجود ان گھوڑوں کو شمار کیا گیا جو جہاد کیلئے تیار کئے تھے ان کی تعداد چالیس ہزار تھی۔

بارک لنا فی صاعنا..... مدنا بصاع ایک پیانہ کا نام تھا اور مد بھی ایک پیانہ کا نام تھا۔ مد صاع سے کم ہوتا ہے۔ صاع اور مد میں برکت سے مراد یہ ہے کہ ان کے ذریعے تولے جانے والے رزق میں کیمت و کیفیت کے اعتبار سے فراخی عطا فرما۔

عرض مرتب: ملا علی قاری نے یہاں نبی در رسول کے درمیان فرق کی طویل بحث چھیڑی ہے۔ ہم نے وہ بحث یہاں سے حذف کر دی ہے۔

قوله: وانی عبدک و نیک: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حبیب ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں:

- (۱) بسبب تو اوضح اپنی یہ صفت ذکر نہیں کی۔ (۲) ممکن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کی ہو لیکن راوی اس کا ذکر بھول گئے ہوں۔
- (۳) ممکن ہے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہو اس وقت تک آپ کو اپنے حبیب ہونے کا علم نہ ہوا ہو۔

قوله وانه دعاک لمکة..... ومثله معه:

ثم قال: يدعو اصغر وليد فيعطيه ذلك الصمر:

سید جمال الدین مصابیح میں لکھتے ہیں: قال: ثم يدعو ا۔ میں اسی کو درست سمجھتا ہوں۔

”ولید“: بکتر ہے، اور کہا گیا ہے کہ تصغیر کے ساتھ ہے۔ اوی ولد صغیر۔ مفتح میں لکھا ہے کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام دعا مانگ کر فارغ ہو جاتے تو اپنے اہل بیت میں سے سب سے چھوٹے بچے کو بلواتے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مطلق مراد ہے۔ یعنی کسی چھوٹے بچے کو بلواتے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں: ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ثم يعطيها اصغر وليد يحضره من الولدان اھ۔ اس میں تقید و اطلاق دونوں کا احتمال ہے۔ اور تعدد پر حمل کرنا بھی ممکن ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ صغیر کی تخصیص اس وجہ سے تھی کہ چھوٹے بچے نیا چھل دیکھ کر بہت ہی خوش ہوتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ اس میں تنبیہ ہے کہ نفوس کاملہ کیلئے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ انواع باکورہ میں سے کچھ بھی اس وقت تک استعمال کریں کہ جب تک وہ چیز عام نہ ہو جائے اور ہر شخص اس کے کھانے پر قادر نہ ہو جائے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں: یہ روایت مطلق ہے، اور متن کی روایت مقید ہے۔ چنانچہ متن کی روایت میں تاویل کی جائے۔ ”یہ“ ”نسب“ ہے۔ یا مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے۔

عصام الدین شرح شمائل میں فرماتے ہیں: وقوله: يدعو أصغر وليد يستمد بسرور قلبه على إجابة دعائه: اس جملہ کے بابت ذکر کردہ اقوال میں یہ توجیہ سب سے لطیف ہے، چونکہ باکورہ اور ولید میں گہری مناسبت ہے، وہ یہ کہ دونوں ہی قرب عہد بالا ایجاد ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ محل نظر ہے، باوجود یہ کہ جمع میں کوئی مانع نہیں۔

فرمایا: بعض روایات میں: ثم يدعو أصغر وليد له آیا ہے، ہو سکتا ہے کہ لہ، يدعو کے متعلق ہو، ولید کیلئے قید نہ ہو۔ اسی: يدعو للشمر۔ چنانچہ یہ روایت اطلاق و تقید کے مخالف نہ ہوگی اھ۔ اس توجیہ کا بعید ہونا مخفی نہیں۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ دونوں روایتیں دو الگ الگ حالتوں پر محمول ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ جب آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آس پاس کہیں کوئی اپنا بچہ ہوتا تو اس کو عنایت فرماتے، اور اگر کسی اور کا بچہ ہوتا تو اس کو عنایت فرمادیتے، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جب کوئی اپنا بچہ بھی پاس ہوتا ہوگا، اور کسی اور کا بچہ بھی پاس ہوتا ہوگا تو دونوں کو عنایت فرمادیتے ہوں گے۔ ہاں جب پاس کوئی بھی بچہ نہ ہوتا ہوگا تو بلاشبہ ایسی صورت میں اپنے اہل میں سے کسی بچہ کو بلا لیتے ہوں گے۔ چونکہ وہ اس حسن سلوک کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہے۔

حرمت مدینہ کا بیان

۲۷۳۲: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَامًا وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ حَرَامًا مَا بَيْنَ مَا زَمِيهَا أَنْ لَا يُهْرَاقَ فِيهَا دَمٌ وَلَا يُحْمَلُ فِيهَا سِلَاحٌ لِقِتَالٍ وَلَا تُخْبَطُ فِيهَا شَجَرَةٌ إِلَّا لِعَلْفٍ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۰۰۱/۲ الحديث رقم (۴۷۵ - ۱۳۷۴) واحمد في المسند۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا کہ ابراہیم نے مکہ کو بزرگی دی۔ یعنی ظاہری بزرگی۔ پس اس کو حرام گھر دانا یعنی شمار کیا اور تحقیق میں نے مدینہ منورہ کو بزرگی دی۔ اس کی دونوں طرفوں کے درمیان اس کے ساتھ کہ خون ریزی نہ کی جائے اس میں اور نہ اس میں ہتھیار اٹھایا جائے لڑائی کے لیے اور نہ اس میں درخت کو جھاڑا جائے یعنی درخت کے پتے مگر جانوروں کے کھانے کے واسطے اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان ابراهيم حرم مكة فجعلها حراما واني حرمت المدينة حراما بين ما زامها من ما يهرق فيها دم ولا يحمل فيها سلاح لقتال ولا تخبط فيها شجرة الا لعلف: منسوب على المصدر ہے۔ حرمت فعل کیلئے بغیر لفظ اور یہ بھی ممکن ہے کہ علی حذف الزوائد ہو، یعنی فعل مقدر کیلئے مفعول مطلق ہو۔ اسی حرمت فحرمت۔

ما بين: کہا گیا ہے کہ مفعول ثانی ہے، اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ما زام: میم کے فتح، ہمزہ کے سکون اور زاء کے کسرہ کے ساتھ، ہمزہ کو ابدال کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اسی الموضع الضیف بين الجبال، حيث يلتقى بعضها ببعض ويستمتع ما وراءه، اس سے مدینہ کی دونوں جانبیں مراد ہیں۔

قوله: أن لا يهرق فيها دم، ولا يحمل فيها سلاح:

”لا يهرق“: ہاء کے فتح و سکون کے ساتھ، اور حرف جرم حذف ہے: اسی: بأن لا يراق۔

فيها دم: کہا گیا ہے کہ یہ حدیث کا مفعول ہے اور لازائدہ ہے۔ اس کی مثال یہ آیت کریمہ ہے: ﴿لئلا يعلم أهل الكتاب﴾

ای لکی یعلم۔ یا مفعول لہ ہے۔ ای: لئلا یهراق۔ یا ما حرم کی تفسیر ہے۔ ای: ان لا یسفلک بها دم۔
 قوله: و لا تخبط فیہا شجرة الالعلف: "لا تخبط": اس کو بصیغہ مذکر مؤنث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔
 لعلف: لام کو ساکن و متحرک دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ صاحب التھیاب لکھتے ہیں: باسکان اللام مصدر علقت علفا،
 وبالفتح اسم الحشیش والتبن والشعر ونحوها۔
 عرض مرتب: ملا علی قاری نے اس حدیث کے تحت مدینہ کے حرم ہونے پر طویل بحث کی ہے۔ ہم نے اس بحث کو یہاں سے حذف
 کر کے آغاز باب میں ذکر کیا ہے، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

مدینہ منورہ کے درخت کاٹنے کی ممانعت

۲۷۳۳: وَعَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ أَنَّ سَعْدًا رَكِبَ إِلَى قَصْرِهِ بِالْعَقِيقِ فَوَجَدَ عَبْدًا يَقْطَعُ شَجْرًا أَوْ يَخِطُّهُ
 فَسَلَبَهُ فَلَمَّا رَجَعَ سَعْدٌ جَاءَهُ أَهْلُ الْعُبَيْدِ فَكَلَّمُوهُ أَنْ يَرُدَّ عَلَى غَلَامِهِمْ أَوْ عَلَيْهِمْ مَا أَخَذَ مِنْ غَلَامِهِمْ
 فَقَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ أَرُدَّ شَيْئًا نَفَلْنِيهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَأَبِي أَنْ يَرُدَّ عَلَيْهِمْ۔ (رواہ مسلم)۔

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۹۳/۲ الحدیث رقم (۴۶۱ - ۱۳۶۴) واحمد فی المسند ۱/۱۶۸۱۔

ترجمہ: حضرت عامر بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ اپنے محل کی طرف سوار ہوئے جو کہ عقیق مقام پر
 واقع تھا پس ایک غلام کو پایا کہ اس کے درخت کاٹتا تھا یا پتے جھاڑتا تھا۔ پس سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے کپڑے چھین
 لے۔ پس جب سعد رضی اللہ عنہ مدینہ کی طرف آئے تو غلام کے مالک ان کے پاس آئے اور گفتگو کی یہ کہ جو چیز آپ نے اس
 غلام سے لی ہے (یعنی اس کے کپڑے) وہ اس کو واپس کر دیں یا اس کے مالکوں کو واپس کر دیں یعنی اس کے کپڑے
 پس سعد نے کہا۔ خدا کی پناہ یہ کہ میں لوٹا دوں اس کی طرف اس چیز کو جو مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوائی ہے سعد نے مانے۔
 اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان سعدا ركب الى قصره ما اخذ من غلامهم:

"العقيق": مدینہ کے قریب واقع ایک جگہ کا نام ہے اور ابن حجر کا کہنا ہے کہ ذوالحلیفہ کی حدود میں ہے۔ اس کے ایک راستہ کی
 مانند ہے۔

"يخبطه": باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ (پتھر وغیرہ مار کر پتے جھاڑنا)

"فسلبه": (بصیغہ فعل ماضی معروف ہے۔) اور "سلب" سین اور لام کے فتنے کے ساتھ بمعنی "مسلوب" آتا ہے۔

قوله: فكلموه ان يرد على وأبى أن يرد عليهم:

"على غلامهم او عليهم": راوی کو شک ہے (کہ کیا الفاظ ارشاد فرمائے تھے)۔

"معاذ الله": میم کے فتنے کے ساتھ ہے۔ فعل مقدر کا مصدر (یعنی مفعول مطلق) ہے۔ ای اعوذ بالله معاذ

"نفلني": ای جعلني نفلا أو أعطانيه نفلا ای غنيمه۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس شخص کو سلب لینے کی اجازت دی تھی
 کہ جو کسی کو یہاں شکار کرتا ہوادیکھے یا درخت کاٹتا ہوادیکھے۔

وَأبَى أَنْ يَرُدَّ: اور ایک روایت میں یوں ہے: فلا أَرُدَّ عَلَيْكُمْ طَعْمَةَ أَطْعَمَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، وَلَكِنْ إِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُ

إِلَيْكُمْ ثَمَنَهُ۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: انه كان يخرج فيجد الحاطب معه شجر رطب فيسأله فيكلم فيه

فیقول: لا ادع غنیمة غنمہا رسول اللہ ﷺ، وانی لمن اکثر الناس مالا۔ یہ حدیث منسوخ ہے، یا مؤول ہے جیسا کہ ما قبل میں گزرا۔

علامہ طبری فرماتے ہیں کہ امام مالک اور امام شافعی کا مشہور مذہب یہ ہے کہ مدینہ میں شکار کرنے یا درخت کاٹنے کی وجہ سے بدلہ (کفارہ) واجب نہیں ہوتا البتہ ایسا کرنا حرام ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح مکہ میں (ان چیزوں کے ارتکاب سے) جزاء واجب ہوتی ہے اسی طرح مدینہ میں بھی (ان چیزوں کے ارتکاب سے) جزا واجب ہوتی ہے، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں حرام بھی نہیں ہیں۔ اھ۔ یہ ہمارا مذہب ہے، البتہ مکروہ ہیں، جیسے کہ ما قبل میں گذرا۔

مدینہ منورہ کے لیے برکت کی دعا

۲۷۳۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمَدِينَةَ وَعِكَ أَبُو بَكْرٍ وَبِلَالٌ فَجَنَّتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَأَخْبَرَتْهُ فَقَالَ اللَّهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحَبِّبْنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ وَصَحِّحْهَا وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِهَا وَمِدَّهَا وَأَنْقُلْ حُمَّاَهَا فَجَعَلَهَا بِالْحُحْفَةِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۹۹/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۸۹۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۰۰۳/۲ الحدیث رقم (۴۸۰)۔ (۱۳۷۶)۔ ومالک فی الموطأ ۸۹۰/۲ الحدیث رقم ۱۴ من کتاب الجامع۔ واحمد فی المسند ۵۶/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو ابو بکر رضی اللہ عنہما وبلال رضی اللہ عنہما بخار میں مبتلا ہو گئے پھر میں نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور میں نے ان کو خبر دی۔ پس فرمایا اے الہی تو مدینہ منورہ کو ہمارا محبوب بنا دے، جس طرح تو نے مکہ کو ہمارا محبوب بنایا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب بنا دے تو مدینہ کی آب و ہوا کو درست کر اور ہمارے واسطے اس کے صاع اور مد میں برکت ڈال دے اور اس کی تپ (یعنی بخار) کو نکال یعنی تپ کی شدت و کثرت کو نکال کر جھہ میں منتقل فرما۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وعك ابو بكر وبلال فاجبرته: "وعك" صيغة مجہول کے ساتھ ہے۔ بمعنی: حُم۔ علامہ طبری فرماتے ہیں: الوعك: الحمى۔ اور کہا گیا ہے کہ بخار کے درد و تکلف کو کہتے ہیں۔

"فاخبرته": اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما شدت بخار میں مبتلا ہوئے تو حضرت عائشہ ان کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئیں اور ان سے پوچھا ابا جان کیا حال ہے؟ تو آپ نے یہ شعر کہا:

كل امریء مصبح في أهله والووت أدنی من شراك نعله

اور جب حضرت بلال رضی اللہ عنہما بخار کا بخار ٹوٹا تو انہوں نے باواز بلند یہ شعر کہے:

ألا ليت شعری هل أبتن ليلة بوادر عندی أذخر و جلیل

و هل أردن یوما میاه مجنة و هل تبدون لی شامة و طفیل

شامہ اور طفیل دو پہاڑ تھے۔ جلیل اور میاہ مجنة مکہ کے قریب چشمے تھے۔ آپ مکہ کو یاد کرتے، مکہ کی صحت افزا آب و ہوا یاد آتی، مکہ کے میٹھے پانیوں کی یاد ستانی، مکہ کے پہاڑوں کی لطافت اور نباتات یاد آتے اور مکہ کی نبات کی ہواؤں کے جھونکے جو بمنزلہ ان کے نپے بچوں کے تھے، رہ رہ کر یاد آتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ نے آنحضرت ﷺ سے ان حضرات کا حال ذکر کیا تو آپ ﷺ نے مذکورہ بالا دعا فرمائی۔

قوله: اللهم حبب الينا المدينة..... في صاعها ومدها:

”او اشد“: (او بمعنی ”بل“ ہے) ای: بل اکثر و اعظم۔ اور اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں ”واشد“ کے الفاظ ہیں۔ ابن حجر وغیرہ نے اس ”او“ کا برائے شک ہونا بھی جائز قرار دیا ہے، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اس صورت میں کلام گویا ہو جائے گا: کحبنا اشد: اہل علم کیلئے یہ تکلف مخفی نہیں۔

یہ روایت کجھلی روایت کے منافی نہیں، کہ آپ نے مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: انک أحب البلاد الی، وانک أحب ارض اللہ الی اللہ۔ اور ایک روایت میں ہے: لقد عرفت انک أحب البلاد الی اللہ واکرمها علی اللہ۔ اس سے مبالغہ مراد ہے۔ یا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے مہاجرین پر مدینہ کی مجاورت، ترک وطن کو لازم قرار دیا، اور مکہ کے سکون کو خیر باد کہنے کا حکم دیا تو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ ﷺ کے اصحاب کے قلوب میں مدینہ کی محبت مزید بڑھ جائے، تاکہ کسی بھی غرض کے پیش نظر وہ (کسی اور جانب) ادنیٰ سا بھی میلان رکھیں۔ چونکہ یہاں محبت سے مراد محبت زائدہ ہے، وہ محبت مراد نہیں ہے جو کثرت محو بہ پر مرتب ہوتی ہے۔ چنانچہ حیثیت مختلف ہے۔

”بارک لنا فی صاعها ومدھا“: اور ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: اللهم اجعل بالمدينة ضعفی ما بمكة من البركة۔ یہاں بھی باہمی کوئی تضاد نہیں، چونکہ مکہ کیلئے جو مضاعفہ محو بہ مخصوص ہے وہ اہل مدینہ کیلئے نہیں ہے۔

فقوله: وانقل حماها فاجعلها جحفة:

خطابی وغیرہ فرماتے ہیں اس وقت ”جھہ“ میں یہود آباد تھے۔

اللہ جل شانہ نے آپ کی اس دعا کو بھی شرف قبولیت بخشا، چنانچہ بخاری کی وباء وہاں منتقل ہوگئی، حتیٰ کہ جو شخص جھہ کا پانی پیتا اسے بخار چڑھ جاتا، مزید یہ کہ اگر کوئی پرندہ جھہ کی فضا سے گزر جاتا تو اس کو بھی بخار ہو جاتا تھا۔

مدینہ کی وباء کا ذکر

۲۷۳۵: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو فِي رُؤْيَا النَّبِيِّ ﷺ فِي الْمَدِينَةِ رَأَيْتُ امْرَأَةً سَوْدَاءَ ثَائِرَةَ الرَّأْسِ خَرَجَتْ مِنَ الْمَدِينَةِ حَتَّى نَزَلَتْ مَهْبِيعَةً فَأَنَّهَا أَنْ وَبَاءَ الْمَدِينَةَ نُقِلَ إِلَى مَهْبِيعَةٍ وَهِيَ الْجُحْفَةُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۲۶/۱۲ الحدیث رقم ۷۰۳۹۔ والترمذی فی السنن ۴۶۹/۴ الحدیث رقم ۲۲۹۰۔ وابن

ماجہ فی ۱۲۹۳/۲ الحدیث رقم ۳۹۲۴۔ والدارمی فی ۱۷۴/۲ الحدیث رقم ۲۱۶۱۔ واحمد فی المسند ۱۰۷/۲۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے نبی کریم ﷺ کے خواب دیکھنے کے بارے میں مدینہ کی بابت کہ میں نے ایک کالی عورت پر اگندہ بالوں والی دیکھی مدینہ منورہ سے نکلی۔ یہاں تک کہ وہ مہبیعہ میں اتری۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے پس تعبیر ٹھہرائی میں نے اس کی اور تحقیق مدینہ کی وباء ہے کہ مہبیعہ کی طرف گئی جو کہ جحفہ کا نام ہے اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال: رأيت امرأة سوداء..... حتى نزلت مهبية:

علامہ طبری فرماتے ہیں اصل عبارت یوں ہے قال فی حدیث رؤیا النبى ﷺ فی شأن المدينة: رأيت الخ، چنانچہ

”رأيت“ حکایت خواب ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے نقل فرما رہے ہیں۔

”مهبیعة“: ہاء ساکن ہے۔ البقعة الأرض المبسوطة الواسعة۔

قوله: فتأولتها ان وباء المدينة..... وهى الجحفة: "تاویل": کے معنی ہیں: تفسیر الشیء بما يؤول إليه۔
 "وباء": مدّ وقصر، مرض عام کو بھی کہتے ہیں، اور عام ہلاکتوں کو بھی۔ اور کبھی اس کا اطلاق اس زمین پر بھی ہوتا ہے کہ جس میں
 امراض کی کثرت ہو۔ خصوصاً پڑوسیوں کیلئے کہا جاتا ہے۔
 "أرض مہیعة": ای مبسوطة۔ یہ جگہ اسی نام سے معروف تھی، جب سیلاب لوگوں کو بھی بہا کر لے گیا تو اس جگہ کو جھہ کہا
 جانے لگا۔

وهى الجحفة: یہ جملہ کسی راوی کی طرف سے بیان کردہ تفسیر ہے۔ اصمعیٰ فرماتے ہیں: لم یولد بغدیر خم أحد فعاش إلى
 أن يحتلم إلا أن يتحوّل منها۔ غدر خم جھہ میں واقع ہے۔

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ مدینہ ایک و بائی مقام تھا۔ مسلمان وہاں قدم برنجاں کیوں ہوئے؟ حالانکہ حدیث صحیح میں وباء
 والی جگہ پر جانے کی ممانعت آئی ہے۔ امام نووی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مدینہ تشریف آوری اس نہی سے پہلے ہو چکی تھی۔ دوسرا
 جواب یہ دیا کہ حدیث نہی میں وباء سے مراد ایسی وباء ہے جو پھیلی ہو، جیسا کہ طاعون وغیرہ، چنانچہ مدینہ میں اس قسم کی کوئی وباء نہیں تھی کہ
 وہاں جانا حدیث نہی کے مخالف سمجھا جائے۔ مدینہ مسئلہ صرف اتنا تھا کہ بخار شدید ہو جاتا تھا اور پھر طول پکڑ جاتا تھا۔ نیز یہ معاملہ بیرون
 سے آنے والوں کے ساتھ پیش آتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بخار ایسا بھی نہیں ہوتا تھا کہ جس کے سبب سے موت واقع ہو جائے۔

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی اہل مدینہ کے بارے میں پیشین گوئی

۲۷۳۶: وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ أَبِي زُهَيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ يَفْتَحُ الْيَمَنُ قِبَا تَيْ قَوْمٍ يَسُونُ
 فَيَتَحَمَّلُونَ بِأَهْلِيهِمْ وَمَنْ أَطَاعَهُمْ وَالْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ وَيَفْتَحُ الشَّامُ قِبَا تَيْ قَوْمٍ يَسُونُ
 فَيَتَحَمَّلُونَ بِأَهْلِيهِمْ وَمَنْ أَطَاعَهُمْ وَالْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ وَيَفْتَحُ الْعِرَاقُ قِبَا تَيْ قَوْمٍ يَسُونُ
 فَيَتَحَمَّلُونَ بِأَهْلِيهِمْ وَمَنْ أَطَاعَهُمْ وَالْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۹۰۱۴۔ الحديث رقم ۱۸۷۵۔ ومسلم فى صحيحه ۱۰۰۹۱۲ الحديث رقم (۴۹۷)۔

(۱۳۸۸)۔ ومالك فى الموطأ ۸۸۷۱۲ الحديث رقم ۷ من كتاب الجامع۔ واحمد فى المسند ۲۲۰۱۵۔

ترجمہ: حضرت سفیان بن ابی زہیر سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے سنا فرماتے تھے کہ۔
 یمن فتح کیا جائے گا پس ایک قوم ہوگی پس اپنے اہل والوں کے ساتھ کوچ کریں گے اور اپنے تابعداروں کے اور مدینہ
 ان کے واسطے بہتر ہوگا اگر مدینہ کا بہتر ہونا جان لیں تو وہ اس کو نہ چھوڑیں اور شام فتح کی جائے پھر ایک قوم آہستہ چلیں
 گے۔ وہ اپنے اہل والوں کے ساتھ کوچ کریں گے اور اپنے تابعداروں کے اور مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا ان کے لیے
 اگر وہ جان لیں تو مدینہ کو نہ چھوڑیں اور عراق فتح کیا جائے گا پس ایک قوم آئے گی چلیں گے پس وہ اپنے اہل و عیال
 کے ساتھ کوچ کریں گے اور اپنے تابعداروں کے اور مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا اگر وہ جان لیں تو مدینہ کو نہ چھوڑیں اس کو
 امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

سفیان بن ابی زہیر۔ یہ "سفیان" ہیں "ابوزہیر" کے بیٹے ہیں۔ ازدی ہیں قبیلہ شنوہ سے تعلق رکھتے ہیں حجازیوں میں ان کی

حدیث مروج ہے ابن الزبیر وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله: يفتح اليمن فيأتي قوم ييسون فيتحملون..... والمدينة خير لهم لو كانوا يعلمون:

”يفتح اليمن“: اس فعل کو بصیغہ تذكیر و تانیث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

”فيأتي قوم“: اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مدینہ میں ایسے لوگ ہونگے جو آہستہ روہونگے جو محنت و مشقت سے دور رہ کر دنیا کی راحت و آرام کے طالب ہوں گے، چنانچہ وہ لوگ جب یمن پہنچیں گے تو بلاد یمن، اور وہاں کی عیش و عشرت ان کا دل موہ لے گی، اور انہیں مدینہ سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ یمن ہجرت پر ابھارے گی، چنانچہ وہ لوگ اپنے اہل و عیال سمیت مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لئے ہر جگہ سے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ مدینہ کے بہتر ہونے کو جانیں تو مدینہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ کو ترجیح نہ دیتے۔

اور کوئی بعید نہیں کہ ”لو“ تمنا یہ ہو۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان علاقوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ لوگ مدینہ آ کر آباد ہوں گے، حتیٰ کہ اہل مدینہ کی تعداد بہت بڑھ جائے گی، اور مدینہ ان کیلئے یمن، شام اور عراق سے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ جانیں۔

”ییسون“: کوہ و طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ ۱۔ مجرد سے، یا کفے فتح اور باء ضمہ کے ساتھ، ۲۔ مزید فیہ سے یا ء کے ضمہ، باء کے کسرہ کے ساتھ۔ سین دونوں صورتوں میں مشدد ہے۔ کہا جاتا ہے: أبست الدابة، وبستها۔ أي: سقتها أي يسيرون سيرا شديدا

”والمدينة خير لهم لو كانوا يعلمون“: یہ جملہ حالیہ ہے۔ مدینہ اس اعتبار سے بہتر ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا حرم ہے، نزول وحی کا مستقر ہے، اور یہاں دنیوی اور اخروی برکات کا نزول ہوتا ہے۔

قوله: يفتح الشام..... يفتح العراق..... والمدينة خير لهم لو كانوا يعلمون:

قوله: يفتح الشام: اس فعل کو بھی بصیغہ تذكیر و تانیث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

قوله: يفتح العراق: اس فعل کو فقط بصیغہ تذكیر پڑھا گیا ہے۔

یہ حدیث بھی مدینہ کے مکہ سے افضل ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ مزید یہ کہ اس حدیث میں بعض اخبار غیب کا بیان ہے۔

مدینہ منورہ کی دوسری بستیوں پر فضیلت

۲۷۳۷: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَمْرٌ بِبَقْرِيَّةٍ تَأْكُلُ الْقُرَى يَقُولُونَ يَثْرُبُ وَهِيَ الْمَدِينَةُ تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكَبِيرُ حَبَّتَ الْحَدِيدُ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۸۷/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۷۱۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۰۰۶/۲ الحدیث رقم (۴۸۸)۔ (۱۳۸۲) والترمذی فی السنن ۶۷۷/۵ الحدیث رقم ۳۹۲۰ ومالك فی الموطأ ۸۸۶/۲ الحدیث رقم ۵ من کتاب الجامع۔ واحمد فی المسند ۳۸۴/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ہجرت کرنے کا حکم کیا گیا ہے ایسی بستی میں کہ وہ سب بستیوں پر غالب آتی ہے اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ منورہ ہے مدینہ برے آدمیوں کو دور کرتا ہے جیسے بھٹی لوہے کی میل کو دور کرتی ہے اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: بقريّة تأكل القرى:

”بقريّة“: یہاں مضاف محذوف ہے۔ أي ينسرو لها، أو استيطانها۔

”تاکل القری“: فائق میں لکھتے ہیں: یہاں تاکل سے مراد فتح ہے۔ اسی یفتح اہلہا القری۔ کہ اس بستی کے رہنے والے تمام بستیوں پر غالب رہتے ہیں۔ ان کے اموال باہم تقسیم کرتے ہیں۔ پس قری کی طرف اکل کی نسبت علی سبیل التمثیل ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس بستی کی دوسری بستیوں پر فضیلت بتانا مقصود ہو۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: هذا حدیث یا کل الاحادیث۔ اسی بفضلہا۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں: ”اکل“ کے اصل معنی کسی شے کو فناء کرنے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ فتوح بلاد اور سلب اموال کیلئے بطور استعارہ استعمال ہونے لگا۔ جو گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے: یا کل اہلہا القری۔ یا یہ کہا جائے کہ ”قوی“ کی طرف ”اکل“ کی نسبت اس لئے کی گئی ہے کہ اموال ان شہروں میں جمع اور فناء ہوں گے۔

”جو تمام بستیوں پر غالب رہتی ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مدینہ میں رہتے ہیں وہ دوسرے لوگوں پر غالب رہتے ہیں اور دوسرے شہروں کو فتح کرتے ہیں چنانچہ تاریخی طور پر اس عظیم الشان شہر کی یہ خصوصیت ثابت ہے کہ مدینہ میں آ کر بسنے والے دوسروں پر غالب اور بیشتر شہروں کے فاتح رہے ہیں پہلے قوم عمالقد آ کر شہر میں آباد ہوئی اس نے غلبہ حاصل کیا اور کتنے ہی شہروں اور علاقوں کو فتح کیا پھر یہود آئے تو وہ عمالقد پر غالب ہوئے پھر انصار پہنچے تو انہوں نے یہودیوں پر اپنا اقتدار قائم کیا یہاں تک کہ جب سرکارِ دو عالم ﷺ اور مہاجرین کرامؓ نے اس شہر کو اپنا مسکن بنایا تو ان کو جس طرح غلبہ حاصل ہوا اور جس طرح انہوں نے مشرق سے لے کر مغرب تک پورے عالم کو اپنے زیر اثر کیا وہ سامنے کی بات ہے۔

قوله: یقولون یثرب، وہی المدینة:

اس شہر کا نام پہلے یثرب اور اثرب تھا جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اس شہر کی مدینت اور کثرت آبادی کے پیش نظر اس کا نام ”مدینہ“ رکھا نیز آپ ﷺ نے حکم دیا کہ آئندہ اس شہر کو یثرب نہ کہا جائے کیونکہ اول تو یہ زمانہ اسلامی سے قبل کا نام تھا جس سے عہد جاہلیت کی بو آتی تھی دوسرے یہ کہ معنوی طور پر بھی یہ نام بالکل نامناسب تھا اس لئے کہ یثرب کے معنی ہیں ”ہلاک و فساد“ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یثرب ایک بت یا ایک بڑے ظالم شخص کا نام تھا۔

”تثرب“ کے معنی ”لوم“ اور ”توبیخ“ کے آتے ہیں۔ حکایت حال کرتے ہوئے فرمایا: (لا تعریب علیکم الیوم) امام نوویؒ فرماتے ہیں: عیسیٰ بن دینار سے مروی ہے کہ جو شخص ”مدینہ کو“ یثرب“ کا نام دیتا ہے اس پر ایک خطیہ لکھ دی جاتی ہے۔ اور قرآن کریم میں لفظ یثرب کا استعمال ان منافقین کے قول کی حکایت کے طور پر آیا ہے کہ جن کے دلوں میں روگ ہے۔ بعض سلف مروی ہے کہ مدینہ کو یثرب کہنا حرام ہے۔ اس کی تائید مسند احمد کی روایت سے ہوتی ہے۔ حضرت براؤ سے مروی ہے: من سمی المدینہ یثرب فلیستغفر اللہ وہی طابۃ ہی طابۃ۔ ”جو شخص ”مدینہ منورہ“ کو ”یثرب“ کہے وہ استغفار کرے، یہ طابہ ہے، یہ طابہ ہے۔“

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص اس چیز کی تحقیر کرے کہ جن کو اللہ جل شانہ نے عظمت شان عطا فرمائی ہو اور جس کو اللہ جل شانہ نے ایمان کا وصف دیا ہو اس کو اس کے نامناسب اوصاف سے متصف کرے، ایسا کرنے والا شخص ”عاصی“ کہلانے کا حقدار ہے، بلکہ وہ کافر ہے۔ ابن حجرؒ نے اس کلام پر گرفت کی ہے۔ فائق میں لکھتے ہیں: أسند تسميتها بیثرب إلى الناس تحاشيا عن معنى التثريب، وكان یسمیها طابۃ مطیبة، ویقولون: صفة للقریة، والراجع منها إليها محذوف والأصل یقولون لها۔

قوله: تنفی الناس کما ینفی الکبیر خبث الحدید:

”الناس“: اسی شرار ہم و ہم جہم۔ برے آدمیوں سے مراد اہل کفر و شرک ہیں جو اسلام کا غلبہ ہو جانے کے بعد اس شہر سے

نکال دیئے گئے تھے چنانچہ کفار و مشرکین پر اس شہر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں۔
 ”کبیر“ کے ساتھ تشبیہ دینا اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے، چونکہ بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکالتی ہے۔
 ”خبث“: خفاء کے فتح، باء کے سکون اور تاء مشابہ کے ساتھ: دینہ۔

۲۷۳۸: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ سَمَّى الْمَدِينَةَ كَابَةً۔

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۰۰۷/۲ الحديث رقم (۴۹۱-۱۳۸۵)۔ واحمد فى المسند ۱۰۸/۵۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کا نام طابہ رکھا اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: سَمَى الْمَدِينَةَ طَابَةَ: اور ایک روایت میں ”طیبہ“ ہے۔ اسماء کی کثرت مسمیٰ کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اللہ جل شانہ نے لوح محفوظ میں مدینہ کا نام طیبہ رکھا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو حکم دیا کہ اس کا نام طیبہ رکھیں تاکہ منافقین پر رد ہو۔ اس کو ثرب کہنے میں اشارہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ یہ اپنی ذات کے اعتبار سے طیبہ ہے، یہاں آنا اور یہاں سے جانا برابر ہے۔ اس پر طاری ہونے والے مختلف احوال سے اس کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

مدینہ میں رہنا آپ ﷺ کو محبوب تھا

۲۷۳۹: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ أَعْرَابِيًّا بَايَعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَاصَبَ الْأَعْرَابِيِّ وَعَكَ بِالْمَدِينَةِ فَاتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَقْلِنِي بَيْعَتِي فَأَبَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ أَقْلِنِي بَيْعَتِي فَأَبَى ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ أَقْلِنِي بَيْعَتِي فَأَبَى فَخَرَجَ الْأَعْرَابِيُّ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّمَا الْمَدِينَةُ كَالْكَبِيرِ تَنْفِي خَبَثَهَا وَتَنْصَعُ طَيْبَهَا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۹۶/۴۔ الحديث رقم ۱۸۸۳۔ ومسلم فى صحيحه ۱۰۰۶/۲ الحديث رقم (۴۸۹)۔

(۱۳۸۳)۔ والنسائى فى السنن ۱۵۱/۷ الحديث رقم ۴۱۸۵ ومالك فى الموطأ ۸۸۶/۲ الحديث رقم ۴ من كتاب

الجامع واحمد فى المسند ۳۰۶/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ تحقیق ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ سے بیعت کی یعنی حضور ﷺ کے پاس رہے پھر اس اعرابی کو مدینہ میں بخارہوا اور شدید بخارہوا۔ اس نے مدینہ میں رہنا پسند کیا اور وہاں سے نکلنا چاہا۔ پس وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا اے محمد ﷺ میری بیعت مجھے لوٹا دو۔ پس نبی کریم ﷺ نے انکار کیا پھر حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ لوٹا دو مجھ کو میری بیعت پس نبی کریم ﷺ نے انکار کیا پھر وہ حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ لوٹا دو میری بیعت۔ پس حضور ﷺ نے انکار کیا۔ پھر وہ اعرابی مدینہ سے نبی کریم ﷺ کی اجازت کے بغیر نکل گیا۔ پس نبی کریم ﷺ ارشاد فرمایا یہ مدینہ بھٹی کی مانند ہے اپنی میل کو دور کرتا ہے اور اپنے اچھے کو بے خالص کرتا ہے یعنی برے آدمی کو نکال دیتا ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: أن أعرابياً بايَعَ رسول الله ﷺ، فأصاب الأعرابى وعك بالمدينة:

”أن أعرابياً“: علامہ طیبی فرماتے ہیں: یہ شخص مہاجرین میں سے تھا۔

”وعك“: واؤ کے فتح اور عین مہملہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ اس کے معنی ہیں تیز بخار اور اس سے ہونے والا سخت قسم کا درد

قولہ: یا محمد اقلنی بیعتی..... فخرج الاعرابی: ”اقلنی بیعتی“: اقالہ بیع سے استعارہ ہے۔

”فابی“: علامہ طیبی فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ نے اس کی بیعت کو فسخ کرنے سے اس لئے انکار فرمایا کہ جس طرح اسلام کی بیعت کو فسخ کرنا جائز نہیں تھا اسی طرح آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کی بیعت کو بھی فسخ کرنا جائز نہیں تھا۔ اھ۔

بیعت اسلام کا اقالہ تو اس وجہ سے جائز نہیں کہ ایسا کرنا رضا بالکفر اور تسیب للکفر کو متضمن ہے۔ اور بیعت اقامہ مع النبی ﷺ کا اقالہ اس وجہ سے جائز نہیں کہ یہ ”ہجران مہاجرہ“ کو متضمن ہے۔ اس شخص کا اقالہ بیعت پر اصرار کرنا ممکن ہے کہ اس نے اس کو اقالہ بیع پر قیاس کیا ہو کہ اقالہ بیع، بیع کے مکارم اخلاق میں سے ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اقالہ بیع کی فضیلت بیان فرمائی ہے:

من اقال نادما اقال الله عشرته يوم القيامة۔

قولہ: انما المدينة كالکبر تنفی خبثها وتنصع طيبها:

خبثها: خاء اور باء دونوں مفتوح ہیں۔ حَبْتٌ کے معنی ہیں: ما تبرزه النار من الجواهر المعدنية التي تصلح للطبع فتخلصهما بما تبرزه عنها من ذلك یعنی جواہر معدنیات کا وہ میل کچیل جو بھٹی میں تپانے یا کوٹنے کے وقت نکلتا ہے۔ ”خبثها“ خاء کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ”الشمی الخبیث“ علامہ طیبی فرماتے ہیں: ”کیر“ کی مناسبت سے پہلا ضبط ”اشبہ“ ہے۔

وتنصع: مرتب عرض کرتا ہے ہمارے نسخہ میں بصیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ یعنی تاء کے فتح اور صاد مہملہ کے ساتھ۔ اور ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ روایت صحیحہ کا ضبط بصیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ بمعنی یصفوا ویخلص ویتمیز۔ بعض شراح فرماتے ہیں (تنصع) تاء کے ضمہ اور نون کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔ لفظاً ومعنی یہ روایت بہت ہی سخت ہے۔ نصح لو نہ نصعا سے ماخوذ ہے بمعنی اشتد بياضه وخلص۔ وأنصعه غیرہ۔ لغت قیاسیہ ہے، اور منصع صاد کی تشدید کے ساتھ، وہ بھی اس کے ہم معنی ہے۔ اکثر حضرات نے تشدید کے ساتھ روایت کیا ہے۔

طیبا: صحیح روایت کے مطابق طاء کے فتح اور یاء مشددة کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک روایت میں طاء کے کسرہ اور باء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں: معنی کے اعتبار سے پہلا (ضبط) اقوم ہے، چونکہ خبیث کے مقابلہ میں مذکور ہے اور دوسری بات یہ کہ ”کیر“ اور ”طیب“ کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے مدینہ کو شل بھٹی کے قرار دیا ہے، اور اہل مدینہ کو بچنے والی جہد و بلاء کو بھٹی کے میل کچیل کی مانند قرار دیا ہے۔ کہ جس طرح بھٹی کے ذریعہ خبیث و طیب میں امتیاز کیا جاتا ہے کہ خبیث کو نکال باہر کرتی ہے اور طیب، خالص و صاف ستھرا ہو کر باقی رہ جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے دور میں ہوا کہ آپ نے اہل کتاب کو مدینہ سے نکالا، اور مدینہ میں عدل و احسان کا چرچا ہوا۔ قرآن کریم نے حق و باطل کی تمثیل بیان کرتے ہوئے اس تاویل کی طرف اشارہ کیا ہے: ﴿وَأَمَّا الزُّبَدُ فَيُهْدَبُ جَفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ﴾

۲۷۴۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَنْفِي الْمَدِينَةَ شَرَّارَهَا كَمَا

يَنْفِي الْكَبِيرُ حَبَّتَ الْحَدِيدِ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت قائم نہیں ہوگی۔ قیامت تک یہاں تک کہ مدینہ اپنے شریروں کو دودر کر دے گا۔ جیسے کہ بھٹی لوہے کے میل کو دودر کرتی ہے اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبی فرماتے ہیں: ممکن ہے اس خاصیت کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ کے ساتھ خاص ہو، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس خاصیت کا تعلق خروج دجال کے ساتھ ہو، کہ جب وہ مدینہ کا رخ کرے گا۔ (تو اس وقت مدینہ میں بسنے والے اشرار یہاں سے نکل کر دجال کی اتباع کریں۔)

مدینہ منورہ میں دجال اور طاعون کا داخلہ ممنوع ہے

۲۷۴۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى أَنْقَابِ الْمَدِينَةِ مَلَائِكَةٌ لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُونُ وَلَا الدَّجَالُ.

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۹۵/۴ الحدیث رقم ۱۸۸۰۔ ومسلم فی ۱۰۰۵/۲ الحدیث رقم (۴۸۵-۱۳۷۹) والترمذی فی السنن ۴۴۶/۴ الحدیث رقم ۲۲۴۲۔ ومالك فی الموطأ ۸۹۲/۲ الحدیث رقم ۱۶ من کتاب الجامع۔ واحمد فی المسند ۳۹۳/۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ کے دروازوں یا راستوں پر فرشتے تمہیں مقرر ہیں اس میں طاعون کی بیماری اور دجال داخل نہ ہو سکے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: علی انقَاب المدینة ملائكة: ”انقَاب“: بقب۔ بسكون القاف۔ کی جمع ہے۔ دو پہاڑوں کے درمیانی راستہ کو ”قب“ کیا جاتا ہے (قالہ الطیبی) زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس سے بطلاق طریق مراد ہے یا ”انقَاب“ سے مراد ”ابواب“ ہیں۔ اور ملائکہ سے مراد حفاظت پر مامور فرشتے ہیں۔

قولہ: لا يدخلها الطاعون ولا الدجال: اس میں دو احتمال ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ حکم مستقل ہو، اور ملائکہ کا انقَاب مدینہ پر کھڑا ہونا تعظیماً ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ حکم پہلے پر مرتب ہو رہا ہے۔ یہ ملائکہ ان کفار جنات کو مدینہ میں داخل نہ ہونے دیں گے جن کے اثرات و طعن سے طاعون ظاہر ہوتا ہے۔ بطور آزمائش مسلمان ابتداء میں دجال کیلئے مسخر کر دیئے جائیں گے، لیکن اللہ جل شانہ ان دونوں مقدس مقامات کی برکت سے اہل حریم شریفین کی حفاظت فرمائے گا۔

۲۷۴۲: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيْسَ مِنْ بَلَدٍ إِلَّا سَيَّطَاهُ الدَّجَالُ إِلَّا مَكَّةَ وَالْمَدِينَةَ لَيْسَ نَقَبٌ مِنْ أَنْقَابِهَا إِلَّا عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ صَافِّينَ يَحْرُسُونَهَا فَيَنْزِلُ السَّبِيحَةَ فَتَرْجُفُ الْمَدِينَةَ بَاهِلِهَا ثَلَاثَ رَجَفَاتٍ فَيَخْرُجُ إِلَيْهِ كُلُّ كَافِرٍ وَمُنَافِقٍ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۹۵/۴ الحدیث رقم ۱۸۸۱۔ ومسلم فی صحیحہ ۲۶۶۵/۴ الحدیث رقم (۱۲۳)۔ (۲۹۴۳) واحمد فی المسند ۱۹۱/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مکہ اور مدینہ کے سوا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس کو دجال پامال نہ کرے گا اور مکہ اور مدینہ کے راستوں میں سے کوئی راستہ ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اس پر فرشتے صف

باندھے کھڑے ہوئے ہیں اور اس کی نگہبانی کرتے ہیں پس دجال مدینہ سے باہر زمین شور میں اترے گا۔ پس اپنے رہنے والوں کے ساتھ تین مرتبہ بلے گا۔ اس زلزلے کے نتیجے میں ہر کافر اور منافق مدینہ سے نکل کر دجال کے پاس چلا جائے گا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا گیا ہے۔

تشریح: قوله: ليس من بلد الا سبطاه الدجال إلا مكة والمدينة: "إلا مكة": منصوب ہے مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے۔ قوله: ليس نقب من انقابها إلا عليه الملائكة: "عليه": أي على ذلك النقب۔ ابن حجرؒ کی اصل میں "عليها" ہے۔ یہ مخالف "اصول" ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں تکلیف سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کو مؤنث لانا باعتبار "طریق" کے ہے، چونکہ طریق مذکر مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے۔

قوله: فينزل سبخة فترجف المدينة باهلها ثلاث رجفات: "سبخة": باء کے کسرہ کے ساتھ، شوریلی زمین اور باء کے فتح کے ساتھ مدینہ کے قریب واقع ایک جگہ کا نام ہے۔

فترجف: جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ باہلها: اس باء کے بارے میں چار احتمال ہیں:

(۱) یہ باء برائے سبیت ہے۔ أي تنزل وتضطرب بسبب أهلها لينفض إلى الدجال الكافر والمافق (طیبی)

(۲) (مخروف سے متعلق ہو کر حال ہے)۔ "حال" ہے۔ أي ترجف ملتبسة بهم۔ (طیبی)

(۳) مظهر فرماتے ہیں: ترجف المدينة بأهلها أتحركهم وتلقى ميل الدجال في قلب من ليس بمؤمن خالص

العقل۔ فرمایا: اس تقریر پر "باء" فعل کا صلہ ہے۔

(۴) کہا گیا ہے کہ یہ باء برائے تعدیہ ہے۔ أي تحركهم وتنزل لهم۔

میرک فرماتے ہیں: بظاہر یہ باء برائے تعدیہ ہے۔ میں کہتا ہوں اس ظاہر کے علاوہ کچھ بھی ظاہر نہیں ہے، یا اس بات کے منافی نہیں کہ باء کا صلہ ہو۔ جیسا کہ واضح سی بات ہے۔ "رجفات": جیم کے فتح کے ساتھ ہے۔

مدینہ والوں سے مکرو فریب کرنا ناممکن ہے

۲۷۴۳: وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَكِيدُ أَهْلَ الْمَدِينَةِ أَحَدٌ إِلَّا انَّمَا عَمَّا يَنْمَاعُ الْمِلْحُ

فِي الْمَاءِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۹۴/۱ الحدیث رقم ۱۸۷۷۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۰۰۸/۲ الحدیث رقم (۴۹۴)۔

(۱۳۸۷)۔ وابن ماجہ فی السنن ۱۰۳۹/۲ الحدیث رقم ۳۱۱۴۔

ترجمہ: حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ والوں سے کوئی مکر نہیں کرے گا مگر کہ گھل

جائے گا۔ جیسا کہ نمک پانی میں گھلتا ہے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: گھلنے سے مراد یہ ہے کہ وہ گھل کر ہلاک ہو جائے گا۔

آپ ﷺ کو مدینہ بہت زیادہ محبوب تھا

۲۷۴۴: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَنظَرَ إِلَى جُدُرِ الْمَدِينَةِ أَوْضَعَ رَأْسَهُ وَأَنَّ

كَانَ عَلَى ذَاتِهِ حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۹۸/۴ الحدیث رقم ۱۸۸۶۔ والترمذی فی السنن ۴۶۵/۵ الحدیث رقم ۳۴۴۱۔ واحمد فی المسند ۱۵۹/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ یہ کہ تحقیق نبی کریم ﷺ جس وقت کے سفر سے آتے تو مدینہ کے دیواروں کی طرف دیکھتے اپنے اونٹ کو دوڑاتے اور اگر دباہ پر ہوتے یعنی گھوڑے پر یا نچر پر یا ان کے مانند۔ مدینہ کی محبت کی وجہ سے اس کو تیز چلاتے۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ”جُدْران“: جیم اور دال دونوں پر ضمہ ہے۔ جدار۔ جدر۔

”اوضع“: ایضاً سے ماخوذ ہے۔ یہ اونٹ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (اوضع البعیر: اونٹ کا تیز دوڑنا)

راحلة، نجیبة، نجیب، یہ سب اونٹ کے نام ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے: الناس کابل مائة لاتجد فیہا راحلة حركها من حبها: اس میں تنازع فعلین ہے۔ ای: من اجل حبه ﷻ اباہا أو اهلها۔ أو من اجل حبها له ﷻ۔ اسی (حدیث شریف کے) معنی میں یہ کلام ہے:

إذا دنت المنازل زاد شوقی ☆ فلمح العين دون الحجر شهر
ولا سيما إذا بدت الخيام ☆ فرجع الطرف دون الشهر عام
وأعظم ما يكون الشوق يوما ☆ إذا دنت الخيام من الخيام

أحد پہاڑ سے آپ ﷺ کی اظہار محبت

۲۷۳۵: وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ طَلَعَ لَهُ أَحَدٌ فَقَالَ هَذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ اللَّهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَرَأَى أَحْرَمًا مَا بَيْنَ لَا بَيْنَهَا۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۰۴/۱۳ الحدیث رقم ۷۲۳۳۔ ومسلم فی صحیحہ ۹۹۳/۲ الحدیث رقم (۴۶۴)۔ (۱۳۶۵)۔ وابن ماجہ فی السنن ۱۰۴۰/۲ الحدیث رقم ۳۱۱۵۔ ومالك فی الموطأ ۸۸۹/۲ الحدیث رقم ۱۰ من كتاب الجامع۔ واحمد فی المسند ۱۴۹/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو احد پہاڑ ظاہر ہوا پس فرمایا یہ پہاڑ ہمیں دوست رکھتا ہے اور رہم اس کو پسند کرتے ہیں اے الہی ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کیا۔ یعنی ظاہر کیا اس کا حرام ہونا اور تحقیق میں اس جگہ کو حرام کرتا ہوں جو مدینہ کے سستان کے دونوں طرف ہے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: هذا جبل يحبنا ونحبه: کہا گیا ہے کہ کسی جی کا جمادات سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اس کو اچھی لگتی ہے اور نفس کو اس سے سکون حاصل ہوتا ہے، اور اس چیز میں دکھائی دینے والی منفعت سے موافقت ہوتی ہے اور جمادات کا کسی جی سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ مجاز ہے اس بات سے کہ یہ اس کیلئے نافع ہے، اور اس کے اور ایذا رساں شئی کے درمیان حائل ہے۔ خطاب فرماتے ہیں: (احد سے) احد کے اطراف کے شہداء و احياء مراد ہیں۔

محی السنہ فرماتے ہیں: یہ بلاشبہ اپنے ظاہری معنی ہی پر محمول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جمادات میں بھی انبیاء، اولیاء اور اہل طاعت کی محبت رکھی ہے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کی مفارقت کی وجہ سے کھجور کے تنے کے رونے کا واقعہ ہے کہ لوگوں نے بھی اس کے رونے کی آواز سنی، علاوہ از س نبی کریم ﷺ نے خبر دی کہ مکہ میں ایک پتھر مجھے قتل لایا نبوت سلام کیا کرتا تھا۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں اس بات کا انکار

نہ کیا جائے کہ جبل احد اور مدینہ کے تمام اجزاء آنحضرت ﷺ سے محبت کیا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں آپ ﷺ کی ملاقات کیلئے مشتاق رہا کرتے تھے۔

قوله: اللهم ان ابراهيم حرم مكة، واني احرم ما بين لابتيها:

”وانی احرم ما بین لابتیھا“: کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کے حرم ہونے کو ظاہر کیا اور میں اس قطعہ زمین کو قابل تعظیم قرار دیتا ہوں جو سنگلاخ مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان ہے۔ یہاں حرام قرار دینے کا ایک دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ میں سنگلاخ مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان تخریب اور اس کی زینت ضائع کرنے کو حرام قرار دیتا ہوں۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اس سے مکہ کی طرح کی حرمت مراد نہیں ہے۔ (یعنی یہ مراد نہیں ہے کہ مکہ کی طرح مدینہ اور اس کے اطراف میں بھی درخت کاٹنا اور اس میں شکار وغیرہ حرام ہے۔)

۲۷۲: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَحَدُ جَبَلٍ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ۔

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۴۴/۳۔ الحدیث رقم ۱۴۸۲۔ ومسلم فی ۱۰۱۱/۲ الحدیث رقم (۵۰۴-۱۳۹۳)۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس کو پسند کرتے ہیں اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اس کو خصوصی طور پر شاید اس وجہ سے ذکر کیا ہے کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے تین اصحاب کے ساتھ اس پر چڑھے تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر اس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اثبت أحد فانما عليك نبی و صديق و شهدان۔

تخریج: اس حدیث کو امام ترمذی نے حضرت انسؓ سے، احمد طبرانی اور ضیاء نے حضرت سید بن عامر انصاری وغیرہ سے روایت کیا ہے۔ امام طبرانی نے الأوسط میں ابو عیمر بن جبیر سے سند ضعیف کے ساتھ ان الفاظ میں روایت کیا ہے: أحد هذا جبل يحبنا ونحبه، وانه على باب من أبواب الجنة، وهذا غير جبل بيغضنا ونبغضه، وانه على باب من أبواب النار۔ سہل بن سعد سے مروی طبرانی کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: أحد ركن من أركان الجنة۔

الفصل الثاني:

حرمت مدینہ کا بیان

۲۷۳: عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ قَالَ رَأَيْتُ سَعْدَ بْنَ أَبِي وَقَّاصٍ أَخَذَ رَجُلًا يَصِيدُ فِي حَرَمِ الْمَدِينَةِ الَّذِي حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَسَلَبَهُ نِيَابَهُ فَجَاءَ مَوْلَاهُ فَكَنَّمُوهُ فِيهِ فَقَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَرَّمَ هَذَا الْحَرَمَ وَقَالَ مَنْ أَخَذَ أَحَدًا يَصِيدُ فِيهِ فَلْيُسَلَبْ فَلَا أَرَدَ عَلَيْكُمْ طُعْمَةً أَطْعَمْنِيهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَلَكِنْ إِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُ إِلَيْكُمْ تَمَنَّهُ۔ (رواه بوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۳۳/۲ الحدیث رقم ۲۰۳۷۔ واحمد فی المسند ۱۷۰/۱۔

ترجمہ: حضرت سلیمان بن ابی عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ میں نے سعد بن ابی وقاصؓ کو دیکھا کہ انہوں

نے ایک شخص کو پکڑا کہ جو حرم میں شکار کرتا تھا یعنی مدینہ کے گرد۔ وہ حرم کہ جس کو نبی کریم ﷺ نے حرم ٹھہرایا ہے پس سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے کپڑے چھین لیے پس اس کے مالک آئے اور سعد رضی اللہ عنہ سے اس کے مقدمہ کے بارے میں کلام کیا۔ پس سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تحقیق نبی کریم ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے یہ حرم اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی شکار کرنے والے کو اس میں پکڑے پس چاہیے کہ اس کا سامان چھین لے۔ پس میں وہ بخشش تم پر نہیں لوٹاؤں گا جو مجھ کو نبی نے دلوائی ہے لیکن اگر تم چاہو تو بطور احسان کے تمہیں اس کی قیمت دے دوں۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

راوی حدیث:

سلیمان بن ابی عبداللہ۔ یہ سلیمان ابن ابی عبداللہ ”تابعی“ ہیں۔ ان انہوں نے مہاجرین صحابہ کا زمانہ پایا ہے۔ یہ سعید بن ابی وقاص اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابو داؤد رضی اللہ عنہ نے ان کی حدیث ”فضائل مدینہ“ میں ذکر کی ہے۔

تشریح: قوله: اخذ رجلا..... فسلبه ثیابہ فجاء موالیہ فکلموہ فیہ:

فسلبہ ثیابہ: بدل اشمال ہے۔

قوله: إن رسول اللہ ﷺ حرم هذا الحرام..... فلیسلبہ:

علامہ طیبی فرماتے ہیں: یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ ان کا اعتقاد یہی تھا کہ اس کی حرمت بھی مکہ کی طرح ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: یہ دلالت نہ تو لفظ تحریم سے ثابت ہو رہی ہے، اور نہ اخذ سلب سے، چونکہ تحریم یعنی تعظیم ہے، اور ”حرم“ بمعنی ”المحترم المعظم“ کے ہے۔ اور اخذ سلب اس بات کے منافی ہے کہ اس کی حرمت، تحریم مکہ کی طرح ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ حرم میں کوئی بھی جزاء بصورت سلب ثیاب کی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس میں جمہور صحابہ کی مخالفت لازم آتی ہے۔

قوله: فلا رد علیکم طعمہ..... دفعت الیکم ثمنہ: طعمہ: طاء کے ضمہ کے ساتھ ہے، بمعنی رزق۔

”إن شئتم دفعت الیکم ثمنہ“: یعنی اگر تم چاہو تو میں اس کی قیمت از روئے تبرع تمہیں دے دوں۔ (قاله الطیبی) یہ دفع ثمن احتیاط کے پیش نظر ہے، چونکہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

مدینہ کے درخت کاٹنے کی ممانعت

۲۷۲۸: وَعَنْ صَالِحِ مَوْلَى لِسَعْدِ أَنْ سَعِدًا وَجَدَ عَبِيدًا مِنْ عَبِيدِ الْمَدِينَةِ يَقْطَعُونَ مِنْ شَجَرَةِ الْمَدِينَةِ فَأَخَذَ مَتَاعَهُمْ وَقَالَ يُعْنَى لِمَوْلَاهُمْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَنْهَى أَنْ يُقْطَعَ مِنْ شَجَرِ الْمَدِينَةِ شَيْءٌ وَقَالَ مَنْ قَطَعَ مِنْهُ شَيْئًا فَلِمَنْ أَخَذَهُ سَلْبُهُ۔ (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۳۱۲ ۵ الحدیث رقم ۲۰۳۸۔

ترجمہ: صالح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو کہ حضرت سعد کے غلام تھے، تحقیق سعد رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے غلاموں میں سے کچھ غلام پائے کہ جو مدینہ کے درخت کاٹ رہے تھے۔ پس سعد رضی اللہ عنہ نے ان کا سامان لے لیا اور غلاموں کو کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ منع فرماتے تھے کہ مدینہ کا درخت کاٹا جائے اور فرمایا جو اس میں سے کچھ کاٹے پس اس کا سامان اس شخص کے لیے ہے جو شخص اس کو پکڑے۔ اس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وعن صالح مولى لسعد:

یہاں ”عن صالح مولی لسعد“ کی بجائے صحیح اس طرح ہے ”عن صالح عن مولی لسعد“۔

شیخ جزری فرماتے ہیں: اس حدیث کو تو آمد کے مولی صالح نے حضرت سعد کے موئی سے نقل کیا ہے اور سعد کے مولی جہول ہیں۔ اور صالح موثق ہیں۔ ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے۔ ابوحاتم فرماتے ہیں: لیس بالقوی، اور امام احمد نے ان کو ”صالح الحدیث“ قرار دیا ہے۔ اہ چنانچہ اس روایت میں صالح کے بعد ”عن“ یا مشکوٰۃ کے کاتبین سے رہ گیا ہے۔ یا خود مصنف سے سہو ہوا ہے امام میرک فرماتے ہیں: اس کی تائید شیخ کی بات سے بھی ہوتی ہے کہ کتب اسماء رجال کے مصنفین میں سے کسی نے بھی حضرت سعد کے کسی صالح نامی مولی کا ذکر نہیں کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ: یعنی لئمو الیہم: یہ جملہ راوی کی تفسیر ہے۔ ان یقطع من شجر المدینہ: یہ ”من“ تعبیضیہ ہے۔ ای بعض اشجارھا۔

مقام و ج کی فضیلت و اہمیت

۲۷۳۹: وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ صَيْدَ وِجٍّ وَعِضَاهَهُ حَرَمٌ مُحَرَّمٌ لِلَّهِ (رواہ ابو داؤد)

وَقَالَ مُحَى السَّنَةِ وَجٌّ ذَكَرُوا أَنَّهَا مِنْ نَاحِيَةِ الطَّائِفِ وَقَالَ الْخَطَّابِيُّ أَنَّهُ بَدَلُ أَتْهَا -

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۵۲۸/۲ الحدیث رقم ۲۰۳۲۔ واحمد فی المسند ۱۶۵/۱۔

ترجمہ: حضرت زبیرؓ سے روایت ہے۔ کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا شکار و ج کا اور اس کے خار درخت حرام ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے حرام کئے گئے ہیں اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور محی السنہ نے کہا ہے کہ علماء نے تحقیق کی ہے وہ طائف کی جانب ایک جگہ ہے اور خطاب نے کہا ہے کہ اندک لفظ اٹھا کے بدل ہے۔

تشریح: قولہ: ان صید و ج وعضاھہ حرم محرم للہ: ”وج“: واؤ کے فتنہ اور جیم مشدہ کے ساتھ ہے، صاحب

انہیہ لکھتے ہیں: طائف میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اور قاموس میں لکھتے ہیں: ”وج“ طائف کی ایک وادی کا نام ہے، اس مسئلہ میں جوہری سے غلطی ہوئی ہے۔ یہ جبل محترق اور احمدین کے درمیان واقع ہے۔ اور اسی معنی میں یہ بھی ہے: آخر و طاء و طاء اللہ بوج۔ غزوہ حنین مراد ہے، تاکہ طائف اور جوہری سے غلطی ہوئی ہے۔ اور حنین ایک وادی ہے جو ج سے پہلے واقع ہے۔ اور جہاں تک بات ہے غزوہ طائف کی سوا اس غزوہ میں قتال نہیں ہوا تھا۔

”حرم“: سید جمال الدین فرماتے ہیں: حرم و حرام، دو لغات ہیں، جیسا کہ حل و حلال۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: اس آیت کریمہ

میں دونوں طرح پڑھا گیا ہے: ﴿وَحُرَامٌ عَلَىٰ قَرِيْبَةٍ أَهْلِكُنَّهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ﴾ [الانبیاء: ۹۵]

”محرم“: ”یہ“ ”حرم“ کی تاکید ہے۔ ”للہ“: محرم کے متعلق ہے۔ ای: لامرہ، او لاجل اولیائہ۔ مروی ہے کہ اس کی حرمت

غازیوں کے گھوڑوں کی چراگاہ ہونے کے باعث ہے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ حرمت کا تعلق ایک مخصوص زمانہ کے ساتھ ہو اور بعد میں منسوخ ہوگئی ہو۔ امام شافعی نے ذکر کیا ہے کہ یہاں (یعنی مقام و ج میں) نہ شکار کیا جائے، نہ یہاں کا درخت کاٹا جائے، اس میں انہوں نے ضمان (یعنی بطور جزاء و کفارہ کسی چیز کے واجب ہونے) کا ذکر نہیں کیا۔ اور فقہ بھی اسی حکم میں ہے۔

شرح السنہ کی عبارت قابل میں گزر چکی ہے۔ اس کا حاصل ہمارے مذہب کے موافق ہے۔ کہ نفع کی چراگاہ کو نبی کریم ﷺ نے صدقہ کے اونٹوں اور جزیہ کے جانوروں کیلئے ”حی“ قرار دیا تھا، اور فقہاء یہاں کے شکار، اور قطع اشجار کی حلت پر متفق ہیں۔ چونکہ اس سے مقصود عام لوگوں کو منع کرنا تھا، نہ نفع کی بیع جائز ہے، اور نہ یہاں کے درختوں کی بیع جائز ہے، اس کی بیع موقوف کی بیع کی طرح ہے۔ ایک

شارح لکھتے ہیں ممکن ہے کہ یہ تحریم برسیل حرمت و تعظیم ہو۔ تاکہ مسلمانوں کی حمی کے طور پر برقرار رہے۔ یعنی مجاہدین کے گھوڑوں کی چراگاہ کے طور پر ہے۔ دوسرے لوگ اپنے جانور نہ چرائیں۔ بعض شروح میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ غزوہ طائف کا ارادہ رکھتے تھے، اللہ جل شانہ نے آپ ﷺ کو آگاہ فرمادیا کہ عنقریب آپ کے ساتھ جم غفیر ہوگا، پس اس کے پیش نظر آپ ﷺ نے تحریم کا فیصلہ فرمادیا تاکہ مسلمان اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

قوله زواہ ابو داود:

امام میرک فرماتے ہیں: حدیث زیر کو امام ابو داؤد نے ذکر کیا ہے اور اس میں ایک قصہ ہے۔ اس کی سند میں محمد بن سنان طائفی اور اس کے والد ہیں۔ امام حاتم رضی اللہ عنہ سے محمد (بن سنان طائف) کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: لیس بالقوی، وفي حدیثه نظر امام بخاری نے اپنی التاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے، اور ان کی یہ حدیث ذکر کر کے فرمایا: لم يتابع عليه ان کا ذکر امام مسلم نے بھی کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: لم يصح حدیثه اور اسی طرح ابن حبان فرماتے ہیں۔ اھ۔ اصل سارے کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس حدیث سے حرمت جیسے عظیم الشان حکم کے مسئلہ پر استدلال درست نہیں ہے۔

قوله: وقال محی السنه وج ذکر و انھا من ناحیة الطائف:

”من ناحیة الطائف“: ابن حجر فرماتے ہیں: بظاہر یہ اضافت بیان ہے، اسی ناحیہ ہی الطائف۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سارا طائف حرم ہے۔ میرے گمان کے مطابق اس بات کا کوئی ایک شخص بھی قائل نہیں ہے۔ مزید یہ کہ یہ تحقیق اہل لغات کے اقوال کے بھی مخالف ہے۔ نیز حرم کی ہیئت کے بیان کے بھی معارض ہے، جیسا کہ طائف کی وجہ سے کہی بات منقول ہے: ان جبریل اقتلع تلك الارض من اهل الشام، ثم حملها على جناحه وأتى بها مكة، فطاف بها بالبيت سبعا، ثم وضعها ثمة، اور اس میں بھی کوئی بعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قطعہ ارض کو اس لئے حرام قرار دیا ہوتا کہ اس کا سبب تحریم تازہ ہوتا ہے۔ اور پورے ہی طائف کی تعظیم مستقل برقرار ہے، اور سارے کا سارا حرام قرار نہیں دیا، چونکہ ایسا کرنے میں لوگوں کیلئے مشقت ہے، اس وجہ سے کہ لوگوں کو اس کے بنات و صید کی بہت زیادہ حاجت رہتی ہے۔ اھ اس سارے کلام میں مناقضہ بالکل واضح ہے۔ نیز تحریم مکہ اجماعاً اور تحریم مدینہ عندہم میں بھی معارضہ ہے چونکہ مشقت تو عام ہے، بلکہ حریم شریفین میں زیادہ ہے۔

قوله: وقال الخطابی انه بدل انها: ”أنه“: ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ تذکیر باعتبار ”موضع“ کے ہے۔ اور ”انھا“ میں تائید باعتبار ”بقعة“ کے ہے۔

مدینہ منورہ کی فضیلت

۲۷۵۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَمُوتَ بِالْمَدِينَةِ فَلَيْمَتْ بِهَا فَايْتِي

أَشْفَعُ لِمَنْ يَمُوتُ بِهَا۔ (رواه احمد و الترمذی وقال هذا حديث حسن. صحيح غريب اسناداً)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۷۶/۵ الحدیث رقم ۳۹۱۷۔ وابن ماجہ فی ۱۰۳۹/۲ الحدیث رقم ۳۱۱۲۔ واحمد فی

المسند ۷۴/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کہ طاعت رکھے مدینہ میں مرے۔ پس چاہے کہ مدینہ میں مرے پس تحقیق میں شفاعت کروں گا اس شخص کے واسطے جو مرے مدینہ میں اس کو نقل کیا ہے احمد اور ترمذی نے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے غریب ہے سند کے اعتبار سے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہ سکے تو اسے چاہئے کہ وہ مدینہ ہی میں رہے تا آنکہ اس کی موت اسی مقدس شہر میں واقع ہو اور میں اس کی شفاعت کروں بایں طور کہ اگر وہ گنہگار ہوگا تو میں اسے بخشاؤں گا اور اگر نیکوکار ہوگا تو اس کے درجات بلند کرواؤں گا۔

واضح رہے کہ یہاں شفاعت سے مراد وہ خاص شفاعت ہے جو صرف مدینہ میں رہنے والوں ہی کو حاصل ہوگی اور کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ افضل یہ ہے کہ جس کی عمر زیادہ ہو جائے یا کشف وغیرہ کے ذریعہ اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ مدینہ منورہ میں جا رہے تاکہ وہاں کی موت نصیب ہو جائے اور وہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت خاص کی اس عظیم سعادت کا حق دار ہو جائے۔ اس کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس دعا سے بھی ہوتی ہے۔

اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي شَهَادَةَ فِي سَبِيلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي بِلَدِ رَسُولِكَ

”اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا فرما اور اپنے رسول ﷺ کے شہر میں مجھے موت دے۔“

واضح رہے کہ یہ حدیث بھی افضلیت مدینہ علی الملکہ مطلقاً کے مسئلہ میں صریح نہیں ہے، چونکہ کبھی مفضول کو کسی خاص حیثیت سے فاضل پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ بقیح کو جو پر فضیلت حاصل ہے، یا تو اس وجہ سے کہ اکثر صحابہ کرام کی قبریں یہاں ہیں، یا اس وجہ سے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آرام گاہ قریب میں واقع ہے۔ اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ اس سے مہاجرین مراد ہوں، چونکہ (ان کے حق میں) مکہ کی موت کا ارادہ مذموم ہے۔ (کما قرر فی محلہ)

۲۷۵۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اٰخِرُ قَرْيَةٍ مِنْ قُرَى الْاِسْلَامِ خَرَابَانِ الْمَدِيْنَةُ رَوَاهُ

الترمذی وقال۔ (هذا حدیث یث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۷۶/۵ الحدیث رقم ۳۹۱۹۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسلام کی بستیوں میں سے آخری بستی جو خراب ہونے والی ہوگی وہ مدینہ ہوگا اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قولہ: اٰخِرُ قَرْيَةٍ... المدینة: اس میں ترکیبی دو احتمال ہیں:

(۱) ”آخر“ مبتدا، اور ”المدینة“ اس کی خبر ہے۔ (۲) ”المدینة“ مبتدا مؤخر اور ”آخر“ خبر مقدم ہے۔

اس حدیث میں اشارہ ہے کہ اسلام کی عمارت مدینہ کی عمارت پر قائم ہے۔ (جب قیامت قریب ہوگی تو تمام آبادیاں اور شہر ویران ہو جائیں گے اور ان میں مدینہ سب سے آخر میں ویران ہوگا۔) اور یہ اس وجہ سے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود بابرکت یہاں ہے۔

۲۷۵۲: وَعَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلَيَّ اَيَّ هٰؤُلَاءِ الْفَلَاةِ نَزَلَتْ فِيْهَا

دَارُ هَجْرَتِكَ الْمَدِيْنَةُ اَوْ الْبُحْرَيْنِ اَوْ قَنِسْرَيْنِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۷۸/۵ الحدیث رقم ۳۹۲۳۔ فی المخطوطة ((محررة))۔

ترجمہ: حضرت جریر بن عبد اللہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی جو کسی ان تین بستیوں میں سے اترے گا تم یعنی رہنے کے لیے پس وہ بھی تمہاری ہجرت کا گھر ہے مدینہ یا بحرین یا قنسرین اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ان اللہ اوحی الی ای ہؤلاء الثلاثة: ”ای“: منصوب علی الظرفیہ ہے ”نزلت“ کیلئے۔ ابن حجر کا کہنا

ہے کہ کہ استفہام کی وجہ سے مقدم ذکر کیا ہے۔ ایک شارح اس بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اُغْرِبَ فِی قَوْلِهِ۔ وجہ تَجْبِیْہِ ہے کہ ”اُی“ یہاں استفہام نہیں ہے۔

قولہ: المدینة او البحرین او قنسرین: ”المدینة“: ثلاثة سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ بعض نسخوں میں لفظ مدینہ کو منصوب ضبط کیا گیا ہے۔ اس صورت میں اُعْنِی مَقْدَرٌ ہُوْگا۔ ایک دوسرے نسخہ میں رَفْع کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں صی مَبْتَدَا مَحْذُوفٌ کیلئے خبر ہوگا۔

”البحرین“: لفظ بحرین میں کئی لغات ہیں، جو ماقبل میں گذر چکی ہیں۔ یہ جگہ آج بھی مشہور ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ بصرہ اور عمان کے درمیان واقع ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یمن میں ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ بحر عمان کا ایک جزیرہ ہے۔

”قنسرین“: قاف کے کسرہ، اور نون اولیٰ مشدودہ کے فتح کے ساتھ ہے، کسرہ بھی درست ہے۔ واضح رہے کہ قنسرین غیر منصرف ہے۔ ملک شام کے ایک شہر کا نام ہے۔

تعارض: ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کو جو جگہ دکھائی گئی تھی وہ مکہ تھی یہ آپ کا دارِ ہجرت ہے اور مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا تھا جیسا کہ اس روایت سے زیادہ صحیح روایات میں مروی ہے۔

جواب یہ ہے کہ اولاً نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف وحی کی گئی کہ آپ ان تینوں مقامات میں جو جگہ چاہیں پسند کر لیں، پھر ان مقامات میں سے مدینہ کی تعیین کر دی گئی، مدینہ ان تینوں مقامات میں افضل ہے۔

الفصل الثالث:

دجال مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہوگا

۲۷۵۳: وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْمَدِينَةَ رُعْبُ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ لَهَا يَوْمَئِذٍ سَبْعَةٌ
أَبْوَابٍ عَلَى كُلِّ بَابٍ مَلَكَانٍ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی ۹۵/۴ الحدیث رقم ۱۸۷۹۔ واحمد فی المسند ۴۷/۵۔

ترجمہ: حضرت ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا کہ لے دجال کا رعب جو مدینہ میں داخل نہیں ہوگا اور اس دن مدینہ کے دجال کے خروج کے وقت سات دروازے ہو گئے یعنی سات راہیں ہوں گی ہر دروازے پر دو فرشتے ہو گئے یعنی دائیں بائیں محافظت کے لیے اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: لا یدخل المدینة رعب المسیح الدجال: رعب کے معنی ہیں خوف۔

”رعب“: راء کے ضمہ اور عین کے سکون کے ساتھ ہے۔ عین پر ضمہ بھی پڑھا گیا ہے۔ رعب کے معنی ہیں خوف۔

قولہ: لها یومئذ سبعة ابواب علی کل باب ملکان:

”لها“: یہاں اصل میں مضاف محذوف ہے۔ ای لسورھا ”سبعة ابواب“: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

(۱) اس کے سات دروازے ہو گئے۔ (۲) اس کے سات پہاڑی راستے ہو گئے۔

”علی کل باب ملکان“ سے اس کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں:

(۱) ہر دروازہ پر دائیں بائیں دو فرشتے مدینہ کی حفاظت پر مامور ہوں گے۔

(۲) ہر روز اذہ پر دائیں بائیں دو طرح کے فرشتے مدینہ کی حفاظت پر مامور ہوں گے۔

۲۷۵۳: وَعَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اللَّهُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِينَةِ ضِعْفِي مَا جَعَلْتَ بِمَكَّةَ مِنَ الْبِرِّ كَثَةً۔ (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۹۷/۴ الحدیث رقم ۱۸۸۵۔ و مسلم فی صحیحہ ۹۹۴/۲ الحدیث رقم (۶۶۶-۱۳۶۹)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا کہ اے الہی تو مدینہ میں دو چند (دوہری برکت) دے جیسے تو نے مکہ میں کی۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: دعا کا مطلب یہ ہے کہ "اے اللہ! یعنی (اہل) مدینہ کی روزی میں (اور یہاں کی پیداوار میں) اس برکت سے دو گنی

برکت عطا فرما جو تو نے مکہ کو عطا کی ہے۔ یہ دعا مدینہ پر مکہ کی فضیلت کے منافی بائیں اعتبار نہیں ہے کہ مکہ کی وجہ تریح حسنات کی زیادتی کے اعتبار سے ہے۔ اس لئے کہ پہلا ارتقا (مد ظلی) حسی و دینی ہے، اور دوسرا اخروی معنوی ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث مبارکہ کھجلی ایک حدیث: بمثل ما دعاك بمكة ومثله معه کے موافق ہے۔

۲۷۵۵: وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ آلِ الْخَطَّابِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ زَارَ نَبِيَّ مَتَعَمِدًا كَانَ فِي جِرَارِي يَوْمَ

الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَكَنَ الْمَدِينَةَ وَصَبَرَ عَلَى بَلَائِهَا كُنْتُ لَهُ شَهِيدًا وَسَفِيحًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ مَاتَ فِي أَحَدِ الْحَرَمَيْنِ بَعَثَهُ اللَّهُ مِنَ الْأَمِينِينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان۔

ترجمہ: ایک شخص سے روایت ہے جو کہ خطابؓ کی اولاد میں سے تھا نقل کی اس سے نبی کریم ﷺ سے کہ جس شخص نے قصد امیری زیارت کی وہ قیامت کے دن میرے پڑوس میں ہوگا اور میری پناہ میں ہوگا اور جو شخص مدینہ منورہ میں رہا اور اس کی سختیوں پر صبر کیا میں اس کی طاعت پر گواہ رہوں گا اور شفاعت کرنے والا یعنی اس کے گناہوں کی قیامت کے دن اور جو شخص کمرے گا دونوں حرموں میں سے ایک مکہ و مدینہ کے اس کو اللہ تعالیٰ امن والوں میں سے اٹھائے گا یعنی قیامت کے دن بڑے خوف سے ہوگا۔

قولہ: من آل الخطاب: "الخطاب": خاء معجم کے فتح اور طاء مشدہ کے ساتھ ہے۔ میرک حاشیہ میں لکھتے ہیں: آل حاطب،

حاء مہملہ اور طاء کے کسری کے ساتھ۔ اور اس پر ظاہری نشان ڈالا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے: کذا فی الترغیب للمندری۔

قولہ: من زارنی متعمدا کان فی جوارئ یوم القیامۃ:

"جوار": جیم کے کسرہ کے ساتھ، ای فی مجاورتہ أو محافظتی۔

یہ فضیلت اسی صورت میں حاصل ہوگی کہ صرف آنحضرتؐ کی زیارت کا قصد ہو، مدینہ آنے میں جن امور کا قصہ ہوتا ہے وہ نہ ہو۔

مثلاً تجارت، شہرت، دکھلاوایا اسی طرح کی اور کسی غرض فاسد کے لئے نہ ہو، بلکہ ثواب کی امید اور خالص ثواب حاصل کرنے کیلئے آئے۔

کسی عارف کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے حج کیا، لیکن نبی کریم ﷺ کی زیارت نہیں کی، اور فرمایا تمام کاموں سے فارغ

ہو کر علیحدہ سے زیارت کروں گا۔ تو گویا کہ انہوں نے اس حدیث کے ظاہر کو لیا، تمام علماء عارفین نے خلاصہ المعنی کی طرف نظر کی۔ چنانچہ

زار کیلئے مستحب ہے کہ وہ مسجد نبوی، مقبرہ بقیع، قبور شہداء اور تمام "مشاہد" کی زیارت کی نیت کرے۔ چونکہ عبارات اور امور دینہ ایک

دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ جس طرح کے دو رکعتیں مختلف نیتوں مثلاً شکر و ضو، تحیۃ المسجد، سنت یا فرض کی نیت کے ساتھ ادا کی جاتی

ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان: نية المؤمن خیر من عمله (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے) کا ایک

مطلب یہی بیان کیا گیا ہے جو اوپر گزرا۔ ابن ہمام بھی اسی عارف کے قول کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: الاولیٰ تجرید النیۃ للزیارۃ، ثم إن حصل له إذا قدم زیارة المسجد أو یستفتح فضل اللہ سبحانہ وتعالیٰ فی مرۃ أخری ینویہما فیہا۔

قولہ: من سكن المدینة وصبر علی بلائها كنت له شهيدا شفيعا يوم القيامة: یعنی جس شخص نے مدینہ میں اقامت اختیار کی یا اس کو اپنا وطن بنا لیا اور یہاں پہنچنے والی تکلیفوں مثلاً گرمی، تنگ گذران، اور یہاں رہنے والے روائض وغیرہ سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کیا۔ یہ روائض نظیر ہیں منافقین کی، کہ جن سے صحابہ کو تکالیف پہنچیں۔ تو ایسے صابر شخص کو مذکورہ فضیلت حاصل ہوگی۔

”شہیدا وشفیعا“: ایک احتمال یہ بھی ہے کہ واو بمعنی ”او“ ہو۔

روضہ اطہر کی زیارت کی فضیلت

۲۷۵۶: وَعَنِ ابْنِ عَمْرٍو مَوْفُوعًا مِّنْ حَجِّ فَرَازٍ قَبْرِی بَعْدَ مَوْتِی كَأَنَّ كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي۔

(رواهما البيهقي في شعب الايمان)

انحرجه البيهقي في شعب الايمان۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت ہے کہ جس شخص نے حج کیا پھر میری قبر کی زیارت کی۔ میرے مرنے کے بعد اس شخص شخص نے میری زندگی میں زیارت کی تبہتی نے شعب الايمان یہ دونوں حدیثیں نقل کیا ہیں۔

تشریح: قولہ: من حج فزار قبری بعد موتی:

”فزار“: فاء تعقیب کیلئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت حج کے بعد کرنا چاہیے، جیسا کہ قواعد شرعیہ کا یہی تقاضا ہے کہ فرض سنت پر مقدم ہے۔ البتہ امام حسن بن زیاد نے امام ابوحنیفہ سے بڑی اچھی تفصیل نقل کی ہے۔ وہ یہ کہ اگر حج فرض ہو تو پھر افضل یہ ہے کہ حج سے ابتداء کرے، اور اگر نفل حج ہے تو پھر اسے اختیار ہے جس سے چاہے ابتداء کرے۔ اہ اطہر یہ ہے کہ ہر صورت میں حج سے ابتداء کرے۔ او یک تو اس وجہ سے کہ حدیث مطلق ہے اس میں فرض یا نفل کی کوئی قید نہیں ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق پر مقدم ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تحیۃ المسجد النبوی کو زیارت قبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مقدم کیا جاسکتا ہے۔

کان کمن زارنی فی حیاتی: یعنی جس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہوگا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رزق دیا جاتا ہے۔

اس باب میں بہت سی احادیث وارد ہیں، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضہ اقدس کی زیارت کے فضائل مشہور و معروف ہیں۔ جو شخص اس سلسلہ کی بعض فضیلتوں کا منکر ہو اس وجہ سے کہ اس میں سے اکثر ایسی بدعات پر مشتمل ہیں جو گناہ کبیرہ ہیں۔

عرض مرتب: اس مقام پر مطہر حق میں بہترین کلام کیا ہے۔ افادہ کی خاطر پیش خدمت ہے:

روضہ اطہر کی زیارت کرنے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرنے والے کی مانند اس لئے ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں! یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روضہ اطہر کی زیارت حج کے افعال سے فراغت کے بعد کی جائے۔

ایک اور روایت میں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص میری قبر کی زیارت کرتا ہے اس کے لئے میری شفاعت واجب و لازم ہوتی ہے۔“ نیز ایک روایت میں یہ ہے کہ ”جس شخص نے حج بیت اللہ کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ پر ظلم کیا۔“ اسی طرح ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ ”جس شخص نے مکہ (یعنی حج) کا قصد کیا اور پھر میری زیارت اور میری مسجد میں شرف حاضری کے حصول

کا قصد کیا تو اس کے لئے یعنی اس کے نامہ اعمال میں دو مقبول حج لکھے جاتے ہیں۔ اھ۔

سرزمین مدینہ کی فضیلت بوجہ روضہ اطہر کے

۲۷۵۷: وَعَنْ يَحْيَىٰ بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ جَالِسًا وَقَبْرُ يُحْفَرُ بِالْمَدِينَةِ فَاطَّلَعَ رَجُلٌ فِي الْقَبْرِ فَقَالَ بِنَسَمِ مَضْجَعِ الْمُؤْمِنِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِنَسَمًا قُلْتَ قَالَ الرَّجُلُ إِنِّي لَمْ أَرِدْ هَذَا إِنَّمَا أَرَدْتُ الْقَتْلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا مِثْلَ الْقَتْلِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ مَا عَلَى الْأَرْضِ بُقْعَةٌ أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ يَكُونَ قَبْرِي بِهَا مِنْهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ رواه مالك مرسلًا

اخرجه مالك في الموطأ ۴۶۲/۲ الحديث رقم ۳۳ من كتاب الجهاد۔

ترجمہ: یحییٰ بن سعید سے روایت ہے۔ کہ تحقیق نبی کریم ﷺ بیٹھے ہوئے تھے اور ایک قبر کھودی جا رہی تھی مدینہ منورہ میں پس ایک شخص نے قبر میں جھانکا اور کہا مومن کی خوابگاہ بری ہے یعنی قبر۔ پس فرمایا کہ بری وہ چیز ہے کہ جو تو نے کہی۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے ارادہ نہیں کیا اس کا سوائے اس کے کہ میں نے قتل فی سبیل اللہ کا پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قتل فی سبیل کی طرح کوئی چیز نہیں ہے میرے نزدیک زمین میں کوئی جگہ محبوب تر نہیں ہے میرے نزدیک کہ میری قبر اس میں ہو مدینہ سے آٹھ میل نے تین مرتبہ یہ دعا ارشاد فرمائی۔ مالک علیہ السلام نے یہ بات بطریق ارسال کے روایت کی۔

تشریح: قوله: فاطلع رجل في القبر فقال بنس مضجع المؤمن:

”اطلع“: طاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ بنس مضجع المؤمن: علامہ طبری فرماتے ہیں: ای: هذا القبر، یعنی مخصوص بالذم محذوف ہے۔ اور اس کی بات کا مطلب یہ تھا کہ مومن کو اس کی موت کے بعد اس جیسی جگہ میں لٹانا اچھا نہیں ہے۔

”مضجع“: جیم کے فتح کے ساتھ ہے۔ بمعنی مرقد ودفن۔

قوله: فقال بنس ماقلت..... اردت القتل في سبيل الله:

یعنی تمہاری یہ بات بری ہے کہ قبر مومن کے لئے بری خوابگاہ ہے، حالانکہ مومن کی قبر جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ چنانچہ اس شخص نے اپنی بات کی وضاحت کی کہ میری مراد یہ نہیں تھی، یا یہ اطلاق مراد نہیں تھا، بلکہ میرا مطلب تو یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونا گھر میں بستر پر مرنے سے بہتر ہے۔

قوله: لا مثل القتل في سبيل الله..... ثلاث مرات: ”مثل“: منصوب ہے۔ ای لیس شیء مثل القتل۔

”أحب“: مرفوع ہے، اور کہا گیا ہے کہ حالت نصی میں ہے۔ ”ثلاث مرات“: مکمل مقولہ ثانی کیلئے ظرف ہے۔

یعنی اللہ کے راستے میں قتل کئے جانے کی مانند تو کوئی بھی چیز نہیں۔ اور پھر آپ ﷺ نے اس شخص کی فضیلت ذکر فرمائی جو مدینہ میں مرے اور مدینہ ہی میں دفن کیا جائے خواہ وہ شہید ہو یا غیر شہید۔ کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے لیکن یہ بات بھی ہے کہ روئے زمین کا کوئی بھی ٹکڑا ایسا نہیں ہے جس میں میری قبر بنے اور وہ مجھے مدینہ سے زیادہ محبوب ہو۔

علماء کا اجماع ہے کہ مدینہ کی موت، مکہ میں فوت سے افضل ہے۔ مکہ و مدینہ میں سے کس کی مجاورت افضل و اکمل ہے سو یہ مسئلہ

اختلافی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللهم ارزقني شهادة في سبيلك واجعل موتي في بلد رسولك۔

علامہ طبری فرماتے ہیں: معناه اني ما اردت ان القبر بنس مضجع المؤمن مطلقاً بل، اردت ان موت المة من فـ

الغربة شهيداً خيراً من موته في فراشه وبلده وأجاب رسول الله ﷺ بقوله: لا مثل القتل أي ليس الموت بالمدينة مثل القتل في سبيل الله أي الموت في الغربة، بل هو أفضل وأكمل، فوضع قوله: ما على الأرض بقعة الخ موضع قوله: بل هو أفضل وأكمل، فإذا "لا" بمعنى "ليس" واسمه محذوف والقتل خبره اهـ۔ اس کلام کا ظاہر خلاف اجماع ہے، چونکہ شہادت فی سبیل اللہ، مدینہ کی ہجر موت سے افضل ہے، بلکہ ما قبل میں حدیث گزری جو دلالت کرتی ہے کہ پردیس کی موت، مدینہ کی موت سے افضل ہے۔ پس فضیلت کاملہ یہ ہے کہ پردیس کی موت کا ثواب بھی حاصل ہو جائے اور مدینہ کا مدفن مل جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ یہ حدیث بھی افضلیت مدینہ کی دلیل نہیں ہے۔

قوله: رواه مالك مرسلاً: اس کی تفصیل و توضیح یہ ہے کہ امام مالک نے اس حدیث کو یحییٰ بن سعد انصاری مدنی سے روایت کیا ہے، وہ اکابر تابعین میں سے ہیں، انہوں نے انس بن مالک، سائب بن یزید اور ان کے علاوہ حضرات سے سماع کیا ہے، ان سے روایت کرنے والوں میں ہشام بن عروہ، مالک بن انس، شعبہ، ثوری، ابن عیینہ، اور ابن مبارک وغیرہ شامل ہیں۔ (ذکرہ المؤلف) جب تابعی کا نام محذوف ہو اور صحابی کا نام مذکور ہو تو حدیث مرسل کہلاتی ہے۔ اس حدیث میں مدینہ کی افضلیت کی کوئی دلیل نہیں ہے حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ مدینہ مکہ سے بلکہ عرش اعظم سے بھی افضل ہے۔

وادی عقیق کی فضیلت

۲۷۵۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ بَوَادِي الْعَقِيقِ يَقُولُ
آتَانِي اللَّيْلَةَ آتٍ مِنْ رَبِّي فَقَالَ صَلِّ فِي هَذَا الْوَادِي الْمُبَارَكِ وَقُلْ عُمْرَةً فِي حَجَّةٍ وَفِي رِوَايَةٍ وَقُلْ عُمْرَةً
وَحَجَّةً - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۹۱۱/۳۔ الحدیث رقم ۱۰۳۴۔ وابود اؤد فی السنن ۳۹۴/۲ الحدیث رقم ۱۸۰۰۔ وابن ماجہ ۹۹۱/۲ الحدیث رقم ۲۹۷۶۔ واحمد فی المسند ۲۴/۱۔ (۱) وہی قراءۃ شاذہ۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عمر بن خطابؓ نے کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا اور آپ ﷺ اور وادی عقیق میں تھے فرمایا میرے پاس آ جاتی رات آنے والا آیا ہے میرے پروردگار کی طرف سے یعنی فرشتہ اور کہا کہ نماز پڑھو اس مبارک جنگل میں اور کہہ عمرہ حج میں اور ایک روایت میں آیا ہے کہ کہو عمرہ اور حج۔ یعنی اس میں نماز عمرہ اور حج کے لیے اس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وقوله: سمعت رسول الله يقول وهو بوادي العقيق:

”وادی عقیق“ ذوالخلیفہ کے قریب واقع ایک جگہ کا نام ہے۔ (ذکرہ ابن حجر)

قاموس میں لکھتے ہیں: مدینہ میں ایک جگہ کا نام ہے، ایک اور وادی عقیق بھی ہے جو مدینہ کے علاوہ کسی اور جگہ واقع ہے۔

التصانیف میں لکھتے ہیں: مدینہ کی ایک وادی ہے اور ذات عرق کے قریب ایک جگہ ہے۔

وقوله: يقول اتاني الليلة من ربي آت وقل: عمره في حجة:

”عمرہ“: رفع کے ساتھ ہے اور ایک نسخ میں نصب کے ساتھ ہے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں: أي احب صلاتك هذه واعدلها

بعمره داخله في حجة، والقول يستعمل في جميع الأفعال كما مر، ويحتمل أن يقال: المعنى صل في هذا الوادي المبارك الاحرام وقارن بين العمرة والحجة اهـ۔ یہ احتمال بعید ہے چونکہ انبیاء کرام کے خواب وحی ہوتے ہیں اور نبی

کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہاں سے عمرہ کا احرام باندھنا ثابت نہیں، چہ جائیکہ ان دونوں کو جمع فرمایا ہو۔

لہذا اس کا درست مطلب یہ ہے: ان ثواب الصلوٰۃ فیہ يعدل ثواب عمرۃ فی ضمن حجة۔ اس میں اشارہ ہے کہ جب عمرہ مقرون باحرام ہوگا بایں طور کہ دونوں ایک ہی سفر میں، بجائے جائیں تو عمرہ مفردہ سے بہتر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”فی“ بمعنی ”مع“ ہو۔ اس کی دلیل یہ اگلا جملہ ہے۔

وقوله: وفي رواية: وقيل: عمرۃ وحجة: ”عمرۃ و حجة“ برقع کے ساتھ ہے، اسی صلوٰۃ فیہ لعمرۃ و حجة۔ (یعنی اس وادی میں نماز پڑھنا حج و عمرہ ہے، یعنی ان کے مترادف ہے۔) یہ تشبیہ بلوغ کے قبیل سے ہے۔ نصب پڑھنے کی صورت میں یہ منصوب علی نزع الخافض ہے۔ اس صورت میں یہ تشبیہ ناقص کو کمال کے ساتھ ملحق کرنے کے باب سے ہوگا۔

اس مقام پر نماز پڑھنے کی فضیلت کی وجہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی جانتے ہیں، بظاہر یہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس مقام کی خصوصیت کے پیش نظر ہے۔ اور گویا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ جل شانہ سے تعیل عمرہ و حج کا ارادہ ظاہر فرمایا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا گیا: صل، فإن الصلاة معراج الانبياء عليهم الصلوات والتسليمات ولك في مقابلتها ثواب العمرة والحج نبيك علي وجه التمام۔ ہماری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام اور علمائے انام میں سے کسی سے یہ بات ثابت نہیں کہ اس مقام کو ان ”مشاہد عظام“ میں شمار کیا ہو کہ جس کی عوام و خواص زیارت کرتے ہیں۔

فارس نے نمک میں ذکر کیا ہے ابن جریر طبری ”تہذیب الاخبار“ میں فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ متبع نہیں تھے، چونکہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: لو استقبلت من امری ما استبدت ماسقت الهدی ولجعلتها عمرۃ اور نہ آپ ﷺ مفرد تھے، اس لئے کہ اس صورت میں آپ ﷺ کے ساتھ ہدی ضروری تھی، جیسا کہ فرماتے ہیں۔ اور وہ نہیں ہوتی مگر قارن کیلئے، اور اس لئے کہ روایات صحیحہ بکثرت اس بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ آپ ﷺ نے حج و عمرہ دونوں کیلئے تلبیہ کہا تھا۔ تو گویا کہ جس نے اضافہ کیا وہ اولیٰ ہے۔ فرمایا وجہ اختلاف یہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے حج عقدا حرام کیا تو کبھی آپ تلبیہ میں حج کا ذکر فرماتے، کبھی عمرہ کا ذکر فرماتے، اور گاہے دونوں کا ذکر فرماتے، اس امید پر کہ دونوں میں سے کسی کا معاملہ واضح ہو جائے، اس سارے عمل میں آپ حج کی نیت کئے ہوئے تھے، اور عمل کی کیفیت طلب کرتے تھے حتیٰ کہ جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: قل: عمرۃ فی حجة یوں یہ پردہ اٹھا، اور مطلوب واضح ہوا۔ یہ کلام کئی اعتبار سے محل نظر ہے:

① وجوب ہدی اس شخص کیلئے ہے جس کی مفرد ہونا ممنوع ہو۔ بلکہ فتح حج بالعمرة ممنوع ہو اس لئے ہوا اس کا مقتضی خروج من الاحرام

ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا يَحِلُّ فِرَاقُ رُؤُوسِكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ﴾

② طبری کا یہ کہنا: ”لعله أن يتبين“ معلول ہے، چونکہ کیفیت میں تردد کے ہوتے ہوئے نیت درست نہیں۔ حالانکہ نبی کو حج کا حکم دیا گیا، اور آپ نے عمرہ کئی بار ادا کیا، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یا تو ابتداء ان دونوں کی نیت کی تھی یا پہلے حج کی نیت کی، پھر

عمرہ۔ اس ارشاد باری تعالیٰ پر عمل کرتے ہوئے: ﴿وَأَتَمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ﴾ [البقرة: ۱۹۶] اقیموا کی قرأت کی بناء پر۔

③ وادی عقیق بالاتفاق مدینہ کے قریب ہے، اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذوالکلیفہ سے احرام باندھنا بھی مجمع علیہ ہے، لہذا تحقیق

بات وہی ہے جو ما قبل میں گزری۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

ترجمۃ الباب سے حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ یہ وادی مدینہ کے قریب واقع تھی اور مدینہ کا ارد گرد بھی مدینہ کی فضیلت میں شامل

ہے اس لئے مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کِتَابُ الْبِیُوعِ

خرید و فروخت کا بیان

امام زہری فرماتے ہیں کہ عرب کے ہاں ”بعث“ یہ فروخت کرنے اور خریدنے پر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح لفظ شراء بھی دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ اس لئے کہ ”شمن“ اور ”مشمئن“ ہر ایک پر ”بیع“ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ شارع کے احکامات کا تعلق متعدد چیزوں سے ہے:

﴿خالص حقوق العباد۔﴾

﴿خالص حقوق اللہ۔﴾

﴿اس کا برعکس۔﴾

﴿جس میں دونوں کا حق ہو لیکن اللہ کا حق غالب ہو۔﴾

اللہ کے حقوق عبادات، سزائیں اور کفارات ہیں۔

مصنف نے ابتداء ان حقوق سے کی جو خالصاً اللہ کا حق ہیں یہاں تک کہ اس کی آخری نوع تک پہنچے، پھر معاملات کو ذکر کیا جو کہ حقوق العباد میں سے ہیں۔

بیع مصدر ہے، کبھی مفعول کے معنی میں ہوتا ہے اسی اعتبار سے اس کی جمع لائی جاتی ہے جیسے بیع کی جمع۔

کبھی مصدری معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور یہی اصل ہے اس صورت میں جمع لانا باعتبار بیع کی انواع کے ہے اس لئے کہ بیع کی

متعدد انواع ہیں۔ مثلاً

(۱) بیع سلم: پیشگی رقم ادا کر کے بیع متعین کرنا۔ (۲) اگر اس کا الٹ ہو کہ بیع دیکر شمن وصول کرے تو اس کو بیع مطلق کہتے ہیں۔

(۳) بیع صرف: نقد کا تبادلہ نقد سے (۴) بیع مقاضہ: بیع بھی مال ہو اور شمن بھی مال ہو۔ (۵) بیع مراہمہ (۶) بیع تولیہ (۷) بیع

وضیعیہ (۸) بیع نیسہ۔

بیع کا اطلاق خرید و فروخت دونوں پر ہوتا ہے اس لئے یہ اضداد کے قبیل سے ہے۔ کہا جاتا ہے: باعہ، یہ اس وقت کہتے ہیں جب بائع بیع کو اپنی ملکیت سے نکال کر مشتری کی ملکیت میں داخل کر دے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: باعہ اس موقع پر کہ جب کوئی شخص کوئی چیز خرید لے۔

کبھی بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے اور کبھی حرف جر کے واسطے سے، جیسے: باع زید الثوب و باعہ منہ

بیع کا لغوی معنی: فخر الاسلام فرماتے ہیں کہ مال کے ساتھ مال بدلنا ”بیع“ کہلاتا ہے۔

بیع کا شرعی معنی: آپس کی رضامندی سے مال کا مال سے تبادلہ کرنا۔

بیع کی مشروعیت کتاب و سنت دونوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿احل اللہ البیع﴾ [بقرہ: ۲۷۰]

حدیث میں مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اے تاجروں کی جماعت! بیشک تمہاری اس بیع میں فضول اور جھوٹی باتیں ہوتی ہیں، پس اس کو صدقہ کے ساتھ ملاؤ۔ حضورؐ کو معوثؓ کیا گیا تو لوگ پہلے سے آپس میں بیع شراہ کرتے تھے تو حضورؐ نے اس پر تقریر ثبت فرمائی۔ نیز بیع کی مشروعیت پر اجماع بھی ہے۔

بیع کی مشروعیت کا سبب: اس کے ساتھ انسانی بقا کا تعلق ہے۔ وہ یوں کہ اگر انسان اپنی بعض ضروریات کو پیدا کرنے میں مستقل ہو جائے کہ زمین کو جوگتے پھر اس میں گندم بوئے اور اس کی خدمت اور چوکیداری کرے اس کو کائے گا ہے۔ اس کو اڑائے اور صاف کرے اپنے ہاتھ سے پیسے اور گوندھے تو اس پر وہ قادر نہیں، اور پٹ سن اور اون اور اس کا پہننا اور اس سے ایسا لباس بنانا جو اس کو گرمی اور سردی سے بچائے وغیرہ۔ پس ضروری ہے کہ وہ اپنی ضرورت کو پورا کرے کسی کی چیز کو خرید کرے۔ پس اگر بیع مشروع نہ ہوتی دونوں عوضوں کی تملیک کیلئے سبب کے طور پر تو پھر انسان اس کو زبردستی اور طاقت کے ساتھ لینے پر مجبور ہوتا یا مانگنے اور گداگری کے ساتھ لینے پر مجبور ہوتا۔ یا صبر کرتا یہاں تک کہ مر جاتا اور ان میں سے ہر ایک میں وہ فساد اور برائی ہے جو کسی سے مخفی نہیں ہے اور دوسرے میں ذلت اور خواری ہے جس پر ہر ایک قادر نہیں ہوتا اور اس کے لئے عیب اور عار کی بات ہوتی ہے۔ پس بیع کی مشروعیت میں ضرورت مند مکلف انسانوں کی بقاء ہے، اور ان کی ضروریات کو ایک بہترین نظام کے ساتھ پورا کرتی ہے۔

بَابُ الْكَسْبِ وَطَلْبِ الْحَلَالِ

کسب اور طلب حلال کا بیان

اس باب میں کمائی کی فضیلت اور حلال و حرام کمائی کی تعیین کا بیان ہے۔

حرام سے بچنا طلب حلال کے لوازمات میں سے ہے۔ طلب حلال نماز کے بعد اہم فریضہ ہے۔ جب کہ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی فریضت نماز سے مقدم ہے۔ دوسرا قول زیادہ ظاہر ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿كَلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَعَمَلُوا صَالِحًا﴾ [المؤمنون - ۵۱] ”اے پیغمبر تم (اور تمہاری امتیں) نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک کام (یعنی عبادت) کرو۔“

الفصل الاول:

۲۷۵۹: عَنِ الْمُقَدِّمِ بْنِ مَعْدِيكَرَبَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ أَنْ يَأْكُلَ

مِنْ عَمَلٍ يَدِيهِ وَإِنَّ نَبِيَّ اللَّهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلٍ يَدِيهِ۔ (رواه البخاری)

احرجہ البخاری فی صحیحہ ۳۰۳/۴ الحدیث رقم ۲۰۷۲۔

ترجمہ: ”حضرت مقدم بن معدی کرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کبھی کسی شخص نے اپنے ہاتھ کی محنت کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا (اور یہی وجہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمائی ہوئی روزی کھاتے تھے۔“ (بخاری)

تشریح: قط: قاف کے فتح اور طاء کی تشدید کیساتھ،

خیرا: کے یہاں تین مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) افضل زیادہ فضیلت والا (۲) أحل زیادہ حلال (۳) اطیب زیادہ پاکیزہ
یدیہ: تشبیہ کا صیغہ لایا گیا اس لئے کہ کام عام طور پر دونوں ہاتھوں سے ہوتا ہے۔

وان نبی اللہ داود علیہ السلام: لفظ داؤد منسوب ہے بدل یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے۔
حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر بطور خاص اس لئے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کی تعلیم دی تھی جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَعَلَّمْنَاهُ صِنْعَةَ لُبُوسٍ لِّكُمْ﴾

کان یا کل من عمل یدیه :

مظہر فرماتے ہیں کہ اس میں کسب حلال پر ابھارنا مقصود ہے چونکہ اس میں بہت فوائد ہیں:

۱) اگر کسی دوسرے کیلئے کام کیا تو اس سے اجرت اجرت ملے گی۔ ۲) اگر عمل تجارت ہو تو اصل مال بڑھے گا۔ ۳) کسب سے عام لوگوں کو بھی نفع پہنچتا ہے کہ بایں طور کہ لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں جیسے کپڑا اس کی سلامتی اور وہ چیزیں جو محنت سے حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً درخت لگانا، بھیت باڑی کرنا، اناج اور پھل۔ ۴) کسب کی وجہ سے کمائی کرنے والا بے ہودہ کاموں سے محفوظ رہتا ہے۔ ۵) کسب میں کس نفس بھی ہے جس کی وجہ سے نافرمانی بہت کم ہوتی ہے۔ ۶) کمائی کی وجہ سے آدمی مانگنے اور احتیاج کی ذلت سے محفوظ رہتا ہے۔

کمائی کرنے والے کیلئے یہ شرط ہے کہ وہ رزق کا اعتقاد کسب سے وابستہ نہ کرے۔ بلکہ یہ اعتقاد رکھے کہ رزق اللہ کریم کی طرف سے ہے جو رزاق اور ذی القوتہ العتین ہے

”وان نبی اللہ“ تاکید و تحریر ہے یہ اس بات کا بیان ہے کہ کسب حلال انبیاء کی سنت ہے۔ حضرت داؤد اپنے ہاتھ سے زرہ بناتے تھے اور اپنی گزراوقات کیلئے فروخت کرتے تھے۔ لہذا انبیاء کی سنت کو اختیار کرو۔

حضرت داؤد کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی حکومت میں لوگوں سے اپنے بارے میں رائے حاصل کرتے رہتے تھے، چنانچہ جو شخص ان کو نہ پہچانتا اس سے دریافت کرتے کہ بتاؤ داؤد کیسا ہے۔ ایک دن اللہ نے فرشتہ کو انسان کی صورت میں بھیجا۔ داؤد علیہ السلام اس کی طرف بڑھے اور اس سے بھی اسی قسم کے سوال کئے۔ اس نے جواب میں کہا کہ داؤد علیہ السلام تو مجھے آدمی ہیں مگر اتنی بات ضرور ہے کہ وہ بیت المال سے کھاتے ہیں چنانچہ داؤد علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے بیت المال سے مستغنی کر دے۔ اللہ نے دعا قبول کی اور زرہ بنانے کا ہنر سکھایا وہ ایک زرہ چار ہزار درہم میں فروخت کرتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام ہر روز اک زرہ بناتے اور اس کو چھ ہزار درہم میں فروخت کرتے تھے پھر اس چھ ہزار کو اس طرح صرف کرتے کہ دو ہزار اپنے اور اپنے اہل و عیال کیلئے اور چار ہزار درہم بنی اسرائیل کے فقرا مساکین میں بطور صدقہ و خیرات تقسیم فرمادیتے تھے۔

اکثر علماء کے نزدیک اتنا کمانا واجب ہے جو کمانے والے اور اس کے اہل و عیال کی معاشی ضروریات کیلئے کافی ہو ضروریات سے زائد کمانا مباح ہے جبکہ نیت اپنی شان و شوکت نہ ہو۔ جبکہ ایک قول ہے کہ کمائی میں مشغول ہونا مکروہ ہے اس لئے کہ عبادت الہی میں مشغول ہونا ہر ایک پر واجب ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (ذاریات: ۵۶: ۲۷) ہم کہتے ہیں کہ عبادت سے مراد معرفت ہے جو کہ کسب حلال کے منافی نہیں۔ اور اگر عبادت ہی مراد ہو تو عبادت مفروضہ مراد ہوں گی، ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی کسب حلال اس کے منافی نہیں۔ چونکہ سارا وقت نہیں گھیرتیں۔

۲۷: ۲۶ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا وَإِنَّ اللَّهَ أَمْرًا الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَهُ الْمُرْسَلِينَ فَقَالَ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا وَقَالَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلُ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَعُجْدِي بِالْحَرَامِ فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۷۰۳/۲ الحدیث رقم (۶۵-۱۰۱۵)۔ والترمذی فی السنن ۲۰۵/۵ الحدیث رقم ۲۹۸۹۔
والدارمی فی ۳۸۹/۲ الحدیث رقم ۲۷۱۷۔ واحمد فی المسند ۳۲۸/۲۔ (۱) اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۶۶۰/۳
الحدیث رقم ۳۳۲۶۔ والترمذی فی ۵۱۴/۳۔ (۱) فی المخطوطۃ ((المال))۔ (۱) سورۃ المؤمنون آیہ ۵۲۔ (۱) سورۃ
البقرۃ۔ آیہ رقم ۱۷۲۔ (۱) البخاری فی صحیحہ ۸۱/۶ الحدیث رقم ۲۸۸۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ (تمام کی اور عیوب سے) پاک ہے
اس پاک ذات کی بارگاہ میں صرف وہی (صدقات و اعمال) مقبول ہوتے ہیں جو (شرعی عیوب اور نیت کے فساد سے) پاک
ہوں۔ (یاد رکھو!) اللہ تعالیٰ نے جس چیز (یعنی حلال مال کھانے اور اچھے اعمال) کا حکم اپنے رسولوں کو دیا ہے اسی چیز کا حکم تمام
مؤمنوں کو بھی دیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (یعنی اے رسولو! حلال و
پاکیزہ روزی کھاؤ اور اچھے اعمال کرو) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (یعنی اے
مؤمنو! تم صرف وہی پاکیزہ و حلال رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے) پھر آپ ﷺ نے (بطور مثال) ایک شخص کا حال ذکر کیا
کہ وہ طویل سفر اختیار کرتا ہے پر آگندہ بال اور غبار آلود ہے وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے
پروردگار! اے میرے پروردگار! (یعنی وہ اپنے مقاصد کے لئے دعا مانگتا ہے) حالانکہ اس کا کھانا حرام اس کا لباس حرام اور اس کا پینا
حرام (شروع سے اب تک) اس کو حرام غذا دی گئی پھر ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو؟ (مسلم)

تشریح: قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طیب ”خبیث“ کی ضد ہے۔ جب ”طیب“ اللہ کی صفت بنے تو مراد تمام عیوب
و نقائص اور آفات سے پاک ہونا ہوتا ہے۔ اور جب اس کا تعلق بندے کے ساتھ ہو تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ آدمی اخلاق رذیلہ اور اعمال
قبیحہ سے برابہ اور اس کے برعکس اخلاق و اعمال سے مزین ہے۔ اور اس صفت کا تعلق مال سے ہو تو حلال اور اچھا مال مراد ہوتا ہے۔
حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمام عیوب سے پاک ہے پس وہ حرام مال قبول نہیں کرتا۔ پھر اصل یہی ہے کہ اللہ کا قرب اس صفت کے
ذریعہ حاصل کیا جائے کہ اچھا حلال مال تلاش کیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ﴾ [آل
عمران ۹۲] ”تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے، یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔“

قوله: وان الله امر المؤمنين بما امر به المرسلين: ماموصولہ ہے مراد اکل حلال اور تحسین اموال ہے

قوله: ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ [المؤمنون: ۵۱] ”اے پیغمبر تم (اور
تمہاری امتیں) نفیس چیزیں کھاؤ اور نیکو کارو (یعنی عبادت) کرو (اور) تم سب کے کئے ہوئے کام کو خوب جانتا ہوں“ یہ خطاب تمام
انبیاء کو ہے لیکن ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ ہر ایک کو اس کے زمانہ نبوت میں اس لئے کہ انبیاء کو مختلف اوقات میں مبعوث کیا گیا۔ یہ بھی ممکن
ہے کہ بیشاق کے دن یہ خطاب خصوصی طور پر تمام انبیاء کو ہوا ہو، یا یہ اس اعتبار سے ہے کہ اللہ کیلئے کوئی صحیح نہیں ہے اور نہ کوئی شام ہے اس
میں اس پر بھی تشبیہ ہے کہ حلال مال پہلے سے مشروع ہے، اور رہبانیت پر اعتراض ہے کہ انہوں نے لذتوں کو چھوڑ دیا اور ساتھ ساتھ اس
بات کی طرف اشارہ بھی کہ حلال مال سے نیک اعمال وجود میں آتے ہیں جن کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

قوله: وقال: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا...﴾: ”اے ایمان والو! جو پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائیں ان میں سے کھاؤ
اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو، اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو۔“ اس امر میں کئی احتمال ہیں: (۱) امر اباحت کیلئے ہے۔
(۲) وجوب کیلئے ہے جیسے کوئی ہلاکت کے قریب ہو تو اس کیلئے کھانا واجب ہے۔ (۳) امر استحباب کیلئے ہے جیسے مہمان کے ساتھ کھانا اور

عبادت پر استعانت کے لئے کھانا مستحب ہے۔ طیبات“ سے مراد حلال اشیاء ہیں یا لذیذ اشیاء مراد ہیں

واشكروا الله ان كنتم اياه تعبدون [البقرة: ۱۷۲] اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے تمام اشیاء اپنے
بندوں کے لئے پیدا کی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ [بقرہ: ۲۹۰] ”وہ ذات پاک ایسی

ہے جس نے پیار کیا تمہارے فائدے کے لیے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے، وہ لیکن بندے کو اپنی معرفت اور عبادت کیلئے پیدا کیا جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ مَا أُرِيدُ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُوا﴾ [ذاریات ۵۶] اور میں نے جن وانس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں، میں ان سے (مخلوق کی) رزق رسائی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ ہی یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں۔“

قولہ: ثم ذكر الرجل: منصوب ہے مفعول ہونے کی وجہ سے بعض نسخوں میں مرفوع بھی پڑھا گیا بنا بر مبتدا کے اور ما بعد اس کے لئے خبر ہے پھر پورا جملہ محلاً منصوب مفعول ہوگا۔

يطيل السفر: لمبا سفر کرتا ہے اور عباد مثلاً حج، عمرہ، جہاد، تعلیم و تعلم اور دیگر نیکی کے کام بکثرت کرتا ہے۔

اشعث اغبر يمد يديه: یہ حال مترادف یا متداخلہ ہیں ”یمدیدیدہ“ اسم فاعل ”مارا“ کی تاویل میں ہے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے، اس لئے کہ آسمان دعا کیلئے قبلہ ہے اور یہ بار بار کہتا ہے۔

يارب يارب: لفظ رب کے ذکر کرنے میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس لفظ کا دعا کی قبولیت میں بڑا اثر ہے اس لئے کہ اس میں اعتراف ہے کہ اس بندہ کا وجود اللہ کی تربیت، احسان اور سخاوت سے کسب فیض کرتا ہے۔ اسی لئے جعفر صادق فرماتے ہیں کہ جس کو کوئی اہم معاملہ پیش آئے اور پانچ مرتبہ کہے: ربنا، تو اللہ اس کو خوف سے نجات دیں گے اور مراد بھی پوری ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں ان کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے پانچ مرتبہ ”ربنا“ کہا۔

مطعمه: مصدر میمی ہے بمعنی مفعول یا ظرف مکان یا زمان ہے۔ اور پورا جملہ حال ہے اسی طرح ”ومشربہ حرام“

اور ”ملبسہ حرام“ بھی حال ہیں۔

غذی: غنن کے فتح اور ذال معجمہ مخففہ کے کسرہ کیساتھ۔ امام نووی نے ایسے ہی ضبط کیا ہے۔ مصابیح کے بعض نسخوں میں ذال کی

تشدید کے ساتھ بھی مروی ہے۔ امام طیبی نے بھی ایسے ہی ذکر کیا۔ اسی طرح مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بچپن سے بڑھا پے تک تربیت حرام سے کی گئی۔ اشرف فرماتے ہیں کہ ”غذی بالحرام“ کو ”مطعمہ حرام“

کے بعد ذکر کیا کہ حرام کھانے سے غذائیت کا حاصل ہونا ضروری نہیں، یا اس بات پر تشبیہ ہے کہ دونوں حال برابر ہیں کہ وہ خود بڑھا پے

میں خرچ کرے یا بچپن میں اس پر خرچ ہوا ہو جبکہ حرام اس کے پیٹ تک پہنچا ہو۔ ”مطعمہ حرام“ سے اشارہ بڑے ہونے کی حالت کی

طرف اور ”غذی بالحرام“ سے اشارہ بچپن کی طرف ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ واؤ ترتیب کیلئے نہیں ہوتی۔ مظہر نے دوسری وجہ جبکہ

امام طیبی نے پہلی وجہ کو ترجیح دی ہے لیکن دونوں مراد لینے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔ پس اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ دعا کا قبول نہ ہونا

حرام کے پہننے اور کھانے پر اصرار کی وجہ سے۔

اشرف فرماتے ہیں کہ ”یطیل“ کا مکمل نصب ہے، اس لئے کہ ”الرجل“ کی صفت ہے اور ”الرجل“ جنس کے اعتبار سے مکمرہ ہے

جیسے شعر میں جنس معرفہ کی صفت مکمرہ آئی ہے۔ ولقد أمر علی اللیم ینسی کہ میں ایسے کینے آدمی کے پاس سے گزرا جو مجھے گالی دے

رہا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿کمثل الحمار یحمل اسفارا﴾ [الجمعة: ۵] ”ان کی حالت اس گدھے کی سی ہے

جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہے۔“

امام طیبی فرماتے ہیں کہ راوی کی مراد ثم ذکر الرجل“ سے یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے کلام میں اس کا ذکر آخر میں کیا (یہ بتانے کے

لئے) کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ حرام کھانے والے کی دعا قبول کرے، اس لئے کہ حرام اللہ کے ہاں انتہائی مبغوض ہے، اور

اللہ کی پاک ذات سے اس کی مناسبت انتہائی بعید ہے۔

پس فعل ”الرجل“ کے اوپر واقع کیا اور اس کو منصوب کر دیا ہے۔ اور اگر حضور ﷺ سے ”الرجل“ مرفوع منقول ہو تو پھر بنا بر ابتداء

کے مرفوع ہوگا اور ”یطیل“ اس کی خبر ہوگا۔ ”اشعت اغبر یمد“ فعل کے فاعل سے حال مترادفہ ہیں۔ اسی یمد یدیدہ فائلا یا رب یعنی اس نے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے اس حال میں کہ کہہ رہا تھا اے میرے رب۔ مطعمہ مسربہ ملبسہ اور غذی یہ فائلاً کے فاعل سے حال ہیں۔

یہ تمام احوال اس بات پر دال ہیں کہ دعا کرنے والا اس چیز کا مستحق ہے کہ اس کی دعا قبول کی جائے۔ لیکن ناکامی دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ مانع انتہائی سخت اور قوی ہے۔ (انتھی) پھر مطعمہ وغیرہ جو حال ہیں ان کا تقاضا یہ بھی ہے دعا کرنے والا اجابت کا مستحق نہیں، جیسا کہ اگلے کلام سے واضح ہے۔

فانی یہ ”کیف“ یا ”من آین“ کے معنی میں ہے، کہ کیسے اور کہاں سے اس کی دعا قبول ہو۔ استفہام بعد کیلئے ہے۔ کہ دعا کا قبول ہونا بہت بعید ہے۔

یستجاب لذلك اس کے مشارالہ میں دو احتمال ہیں: (۱) الرجل (۲) لاجل ما ذکرہ من حال الرجل (اس مرد کیلئے یا ان حالات میں جو اس مرد کے بیان ہوئے ہیں)

اشرف فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بتلایا ہے کہ حلال کھانا پینا ان چیزوں میں سے ہے جن پر دعا کی قبولیت موقوف ہے، اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ دعا کے دوہرہ ہیں حلال کھانا اور سچ بولنا۔

امام تورپشتی فرماتے ہیں کہ رحل سے مراد حاجی ہے جس پر سفر کے آثار ہوں جو مشقت سے پہنچا ہو اور پراگندہ حال ہو گیا پھر اسی حالت میں دعا مانگنے لگا کہ اس کے ہاں مشقت اور پراگندہ حال ہونا اجابت دعا کیلئے معاون ہے لیکن اس کی دعا قبول نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کی مشقت کو لائق اعتبار سمجھا گیا اس لئے کہ وہ حرام پہننے والا تھا حلال حرام میں بغیر تمیز کے خرچ کرنے والا تھا۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ جب حاجی جو کہ اللہ کے راستے میں ہوتا ہے کی یہ حالت ہے تو دوسروں کی کیا ہوگی۔ مجاہد کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد کہ خوشخبری ہے اس کیلئے جو گھوڑے کی لگام پکڑے پراگندہ بال گرد آلود پاؤں لئے اللہ کے راستے میں نکلے۔ حلال کھانے کی عظیم خاصیت یہ ہے کہ معرفت کا نور لینے کی استعداد کو مومکد کرنا ہے۔

تقویٰ کے درجات: تقویٰ کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ علماء جس کو حرام قرار دیں اس سے رک جائے یہ عام لوگوں کا تقویٰ ہے پھر اس کے بعد ان امور سے بچنا جن میں تحریم کا احتمال ہو اگرچہ جائز ہی کیوں نہ قرار دے۔ یہ صالحین کا تقویٰ ہے۔ متیقن کا تقویٰ یہ ہے کہ جن چیزوں میں کوئی حرج نہ ہو ان کو چھوڑ دینا اس خوف سے کہ کہیں حرج والی چیزوں میں پڑنا لازم آجائے۔

پھر ہر اس چیز سے بچنا جس کے استعمال سے مقصود اللہ کی طاعت پر قوت نہ ہو یا یہ کہ استعمال اس کا بعض اوقات معصیت یا مکروہ ہوتا ہے یہ صدیقین کا تقویٰ ہے۔

اس زمانہ میں اکثر اوقات حلال نہیں ملتا، پس سالک اس چیز پر اکتفاء کہے جس سے تقویٰ محفوظ رہے تاکہ بھوک سے موت واقع نہ ہو۔ بعض عقلاء کہتے ہیں: یقول لی الجهول بغیر علم دع المال الحرام وکن قنوعاً فلما لم أحد حلالاً ولم آکل حراماً مت جو عاً ”جاہل کہتے ہیں کہ حرام مال چھوڑ دو اور قناعت اختیار کرو“۔

پس جب میرے پاس حلال مال نہ ہو اور حرام بھی نہ کھاؤں تو میں بھوک سے مر جاؤں گا۔

لیکن حرام اور مشتبہ چیزوں کے درجات کا لحاظ رکھنا واجب ہے، پس جب جو چیز حلال کے زیادہ قریب ہو تو اس چیز کو نہ استعمال کیا جائے جو اس سے دور ہو یہاں تک کہ بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ اضطرابی حالت میں اگر مضطر کو مردار بکری اور مردار گدھا ملے تو بکری استعمال کرے، اسی طرح مردار گدھے کو مردار کتے پر ترجیح دے، اور مردار کتے کو خنزیر پر ترجیح دے۔ تمام اشیاء کو برابر رکھنا کسی طور پر مناسب نہیں جیسا کہ بعض بے وقوف فقہاء کہتے ہیں کہ حلال وہ ہے جسے ہم حلال کہیں اور حرام وہ ہے جس کو ہم حرام کہیں۔

۲۷۶: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالَى الْمَرْءُ مَا أَخَذَ مِنْهُ مِنَ الْحَلَالِ أَمْ مِنَ الْحَرَامِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۹۶/۴۔ الحدیث رقم ۲۰۵۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو جو مال ملے گا اس کے بارے میں وہ پرواہ نہیں کرے گا کہ وہ مال حلال ہے یا حرام۔“ (بخاری)

تشریح: قولہ: یأتی علی الناس زمان لا یبالی المرء ما اخذ منه امن الحلال ام من الحرام: (”زمان“ موصوف ہے اور مابعد جملہ اس کی صفت ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔) ای لا یبالی المرء فیہ۔ اور منہ کی ضمیر کا مرجع ”زمانہ“ ہے اور مضاف مقدر ہے۔ ای من اهل الزمان۔ اور ”ما“ سے مراد مال ہے۔ اس کو تم رکھا گیا تاکہ یہ ماخوذ کی تمام انواع بہ، صدقہ وغیرہ کو شامل ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ”منہ“ کی ضمیر کا مرجع ”شیء“ ہے جو مذکور نہیں اور ”شیء“ سے مراد مال ہے کیونکہ یہ دوسری روایت میں لفظ مال مذکور ہے۔ اور مطلب یہ ہوا کہ وہ یہ پرواہ کئے بغیر کہ مال حلال ہے یا حرام لے لیگا۔ بہر حال دونوں میں کوئی تفاوت نہیں۔ (میرک نے ایسے ہی ذکر کیا۔)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ”ما“ کو موصولہ یا موصوفہ قرار دینا جائز ہے اور ضمیر مجرور اسی طرف عائد ہے اور ”من“ زائدہ ہو جیسا کہ امام انفس کا مذہب ہے اور ”ما“ منصوب بزرع الخائض ہو ای لا یبالی بما اخذ من المال۔ ”ام“ متصل ہے اور ”من“ کا متعلق محذوف ہے ہمزہ استفہام سے استفہام کے معنی سلب ہیں اور استواء کے معنی کی وجہ سے تجرید کی گئی ہے۔ پس ”من الحلال اخذام من الحرام“ مرفوع ہے موضح مبتدا میں ہے۔ اور ”لا یبالی“ ضمیر مقدم ہے۔

یعنی حلال حرام دونوں برابر ہیں کسی کے لینے میں کوئی پرواہ نہیں اور نہ ہی توجہ حلال اور حرام کے درمیان فرق کرنے کی طرف گئی۔ جیسے ارشاد باری ہے: ﴿سواء علیہم اندرتہم ام لم تندرہم﴾ (بقرہ پ) آپ کا ڈرنا اور نہ ڈرانا ان کے لئے برابر ہے۔

۲۷۷: وَعَنِ النَّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنَ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ فَمِنْ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَرْتَعَ فِيهِ أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمَى أَلَا وَإِنَّ حِمَى اللَّهِ مَحَارِمَهُ أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱/ الحدیث رقم ۵۲۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۲۱۹/۳ الحدیث رقم (۱۰۷ - ۱۰۹۹)۔

وابوداؤد فی السنن ۲۶۳/۳ الحدیث رقم ۳۳۲۹۔ الترمذی فی ۵۱۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۰۵۔ والنسائی فی ۲۴۱/۷

الحدیث رقم ۴۴۵۳۔ وابن ماجہ فی ۱۳۱۸/۲ الحدیث رقم ۳۹۸۴۔ والدارمی فی ۳۱۹/۲ الحدیث رقم ۲۵۳۱

واحمد فی المسند ۲۶۷/۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت نعمان بن بشیرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حلال ظاہر ہے، حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، لہذا جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچالیا۔ (یعنی مشتبہ چیزوں سے بچنے والے کے نہ تو دین میں کسی خرابی کا خوف رہے گا اور نہ کوئی اس پر طعن و تشنیع کرے گا) اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو گیا تو وہ حرام میں مبتلا ہو گیا اور اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو ممنوعہ چراگاہ کے آس

پاس (جانوروں کو) چراتا ہے تو قریب ہے یہ بات کہ وہ (اپنے جانوروں کو) اس (منوعہ چراگاہ) میں چرائے۔ جان لو! ہر بادشاہ کی منوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی منوعہ چراگاہ حرام چیزیں ہیں اور اس بات کو بھی ملحوظ رکھو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست حالت میں رہتا ہے (یعنی جب وہ ایمان و عرفان اور یقین کے نور سے منور رہتا ہے) تو (اعمال خیر اور حسن اخلاق و احوال کی وجہ سے) پورا جسم درست حالت میں رہتا ہے اور جب اس ٹکڑے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور یاد رکھو! گوشت کا وہ ٹکڑا دل ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: الحلال بین:

بین میں ”یا“ کسورہ مشدود ہے، کہ بالکل واضح ہے جس کی حلت میں کسی قسم کا خفا نہیں، اس کا حلال ہونا منصوص ہے یا اس کی اصل موجود ہے جس سے جزئیات کے احکام نکالے جاسکتے ہیں جیسے ارشاد باری ہے: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ [بقرہ] ”لام“ نفع کیلئے ہے پس معلوم ہوا کہ اشیاء میں اصل حلت ہے الایہ کہ جس میں مضرت ہو۔
قولہ: الحرام بین: بالکل واضح ہے اس کی حرمت میں کوئی شک نہیں اس لئے کہ منصوص ہے جیسا کہ فواحش، محارم اور وہ چیزیں جن کی وجہ سے حد لازم آتی ہو مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور اس جیسی دیگر اشیاء۔ یا جن کی اصل موجود ہو اور اس سے استخراج ممکن ہو۔
جیسے: کل مسکر حرام۔

قولہ: و بینہما مشتبهات باء موحده کے کسرہ کیساتھ، وہ امور جن کے حلال یا حرام ہونے میں التباس ہو معاملہ واضح نہ ہو اس لئے کہ حلال والی بھی جہت ہوتی ہے اور حرام والی جہت بھی ہوتی ہے۔

قولہ: لا یعلمہن کثیر من الناس: مراد حقیقت ہے کہ دلائل کے تعارض کی وجہ سے اکثر لوگ ان کی حقیقت نہیں جانتے لیکن مجتہدین اور علم میں رسوخ رکھنے والے ان چیزوں کو پہچان سکتے ہیں قوت دلیل کی بناء پر۔ علامت حلت و علامت حرمت میں سے کسی ایک دوسرے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔

شرح السنہ میں ہے کہ اوامر مشتبهات دو قسم پر ہیں، (۱) جن کی حلت اور حرمت بالکل معلوم نہ ہو ایسی اشیاء کو از روئے ورع چھوڑنا بہتر ہے۔ (۲) جن کے حلال اور حرام ہونے کی اصل موجود ہے تو پھر اصل کو دیکھتے ہوئے عمل کیا جائے گا اس سے اعراف بغیر یقینی علم کے نہیں کیا جائے گا۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علماء کا اس حدیث کے عظیم اور فوائد کثیرہ پر مشتمل ہونے پر اتفاق ہے۔ یہ ان احادیث میں سے ایک ہے جن پر اسلام کی بنیاد ہے، اور وہ تین احادیث ہیں:

(۱) حدیث: انما الاعمال بالنیات۔ (۲) من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعینہ۔ (۳) مذکورہ حدیث۔

اس میں حضور ﷺ نے اس پر تنبیہ فرمائی کہ بندہ اپنے کھانے، پینے اور لباس وغیرہ کی اصلاح کرے کہ یہ حلال ہوں اور حلال کی پہچان کی طرف رہنمائی چراگاہ کی مثال دے کر واضح فرمائی۔ اس میں صلاح و فساد اور ان کی بنیادوں کا بیان کامل ہے۔

”الحلال بین کا مطلب یہ ہے کہ تین طرح کی چیزیں ہوتی ہیں

پہلی وہ جو واضح طور پر حلال ہوں۔ جیسے روٹی، پھل اور دیگر مطعومات اسی طرح بات کرنا، نکاح کرنا، دیکھنا، چلنا اور دیگر تصرفات۔ دوسری جن کا حرام ہونا بالکل واضح ہو جیسے شراب، خنزیر، مردار، بننے والا خون، اسی طرح زنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، چغلی خوری، امر داور اجنبیہ کو دیکھنا۔

تیسری تشابہ جس میں دونوں احتمال ہوں، پس دیکھنے والا اشتباہ میں ہوتا ہے کہ اس کو کس کے ساتھ ملحق کرے ”لا یعلمہن کثیر من الناس میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بہت کم علماء ان چیزوں کا حکم نص، قیاس یا استحباب حال

کے ذریعے جانتے ہیں۔ پس جب کوئی چیز حلال اور حرام کے درمیان دائر ہو اور کوئی نص یا اجماع موجود نہ ہو تو مجتہد اجتہاد کے ذریعے اس کو کسی ایک کے ساتھ دلیل شرعی کی روشنی میں لاحق کرے گا۔ پس اس کے الحاق کے بعد وہ حلال یا حرام ہو جائے گی، اور جب اس کو یہ دلائل نہ ملیں تو پھر درع کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے اس لئے اس صورت میں یہ شبہات میں داخل ہے۔ (استبصار: براءت میں مبالغہ کرنا۔

علماء کے اس میں تین مذاہب ہیں۔ بنیاد اختلاف کی کہ اشیاء میں شریعت کے وارد ہونے سے پہلے حلت تھی یا حرمت۔ اول مذہب راجح یہ کہ نہ حلت کا حکم لگایا جائے نہ حرمت کا اور نہ اباحت کا اس لئے کہ مکلف ہونا شریعت سے ہوتا ہے۔ ثانی مذہب: یہ کہ حرمت کا حکم لگایا جائے۔ ثالث مذہب: یہ کہ اباحت کا حکم لگایا جائے

قولہ: من وقع فی الشبهات وقع فی الحرام: علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ کبھی چیز کے اندر وقوع کا مطلب اس کے اندر گرنا ہوتا ہے اور ہر سقوط شدید کو اس (یعنی وقوع) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس میں دو صورتیں ممکن ہیں جو شبہات میں اکثر پڑتارے تو نہ چاہتے ہوئے بھی حرام میں پڑ جائے گا اور بھی کھار گنہگار ہوتا ہے جب وہ تحری میں کوتاہی کرتا ہے دوسری صورت یہ کہ اس سے سستی کی عادت پڑتی ہے اور شبہ در شبہ میں پڑنے کی ہمت ہو جاتی ہے اور پھر اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے یہاں تک عمد احرام کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ یہ مطلب ہے فقہاء کی اس بات کا: المعاصی تسوق الی الکفر۔ گناہ کفر کی طرف لیجاتے ہیں۔

قولہ: کالرعی یوعی حول الحمی: ضرب المثل ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ معقولی باتیں محسوسات کی صورت میں واضح ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ محسوس چیزوں کی حقیقت انتہائی واضح ہوتی ہے اظہار حقائق میں اور دقائق کے چہروں سے کشف نقاب میں (۱) ضرب الامثال کی عجیب شان ہے۔ اسی لئے ضرب الامثال کثیر تعداد میں قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی مشبہات میں پڑ جاتا ہے تو حرام میں پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے جیسا کہ چرواہے کا حال ہوتا ہے۔

یوعی: ”الرعی“ کی صفت ہے جو کہ معنی تکرہ ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ ”الرعی“ سے حال ہو۔ الحمی: حاء کے کسرہ اور میم مخففہ کے فتح معنی کساتھ، (اس چرواہے کو کہتے ہیں جس کو بادشاہ اپنے جانوروں کیلئے خاص کر دے اور دیگر چرواہوں کو روک دے) لیکن اس طرح روکنے کا حق صرف حضور ﷺ کیلئے تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: لا حمی الا للہ ورسولہ ان یرتع فیہ حفاظت میں سستی، چرنے پر جرأت اور چرواہے اور غیر چرواہے میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے وہ ”حمی“ میں جا پڑے لہذا یہ بادشاہ کی سزا کا مستحق ہوگا۔ بعض روایات میں ”یرتع“ کی جگہ ”یقع“ آیا ہے، جب کہ ایک روایت میں ”ان یواقعه باب مفاعله سے مروی ہے اس صورت میں راعی متعدی ہوگا یعنی جواوٹ اور بکریاں وغیرہ چرائے۔

الا: ہمزہ استفہام اور حرف نہی سے مرکب ہے جو آنے والی بات کے وجود پر تنبیہ کرنے کیلئے آتا ہے۔ وان لکل ملک: یعنی زمانہ جاہلیت کے ہر بادشاہ کی مخصوص چرواہے ہوتی تھی۔ یا یہ پیشینگوئی ہے زمانہ اسلام کے ظالم مراد ہیں۔ ”وان“ میں ”واو“ ابتدائیہ ہے جس کو نحوی استینافیہ کہتے ہیں۔ جس سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ مابعد ما قبل سے منقطع ہے جیسا کہ صاحب معنی نے فرمایا ہے۔ راجح یہ ہے کہ یہ عاطفہ ہے جیسا کہ لفظ ”او“ سے سمجھا جا رہا ہے، اور ”ان لکل ملک“ کا بھی تقاضا یہی ہے۔ پس اس تاویل پر عطف درست ہو اس لئے کہ مفرد کا عطف جسمہ پر اس وقت درست ہوتا ہے جب مفرد کفعل کے معنی میں کر دیا جائے جیسا کہ قرآن میں ﴿فالق الاصبح وجعل اللیل سکنا﴾ [الانعام: ۹۶]

قولہ: الا وان حمی اللہ محارمہ: محارم، معصیت کی مختلف اقسام ہیں۔ پس جو جرم کا مرتکب ہو کر اس میں داخل ہوگا وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ بعض معاصی ایسے ہیں کہ جن پر بالکل مغفرت نہیں ہوتی اور وہ شرک ہے اور بعض معاصی اللہ کی مشیت کے تحت ہیں چاہے معاف کرے، چاہے پکڑ لے۔ لیکن حقیقی توبہ سے سب معاف ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ محارم کو تشبیہ دی اس حیثیت سے کہ ان میں تہبط

ممنوع ہے بادشاہ کی چراگاہ سے۔ معصیت کا ارتکاب اور تقویٰ کا حصول چونکہ دل کے میلان کے ساتھ جزا ہوا ہے آگے اس پر تنبیہ کی ہے۔
 قوله: الا وان فی الجسد لمضعۃ: ”مضعہ“ گوشت کے ٹکڑے کی وہ مقدار جو چبائی جاسکے۔ اور دل کو مضغہ اس لئے کہا
 کہ یہ جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔ علماء فرماتے ہیں (لفظ مضغہ کے ذریعہ) قلب کی تصغیر مراد ہے باقی جسم کی نسبت سے باوجود یکہ جسم کا صحیح یا
 خراب ہونا دل کے تابع ہوتا ہے۔
 اذا صلحت: لام کے فتح اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے، فتح فصیح ہے۔ فسدت: سین کے فتح کے ساتھ جب کہ ضمہ کے ساتھ بھی
 پڑھا گیا ہے۔

فسد الجسد کله: اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر عاقل بالغ کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل کی طرف متوجہ رہے اور اس کو خواہشات
 نفسانی میں مہمک ہونے سے روکے تاکہ وہ آگے بڑھ کر مشتبہ چیزوں کی حد میں داخل نہ ہو اور اپنے اعضاء کو محرمات میں ملوث نہ کرے۔
 قوله: الا وهی القلب: پس دل بادشاہ کی طرح ہے اور اعضاء رعایا کی طرح ہیں۔ پس اس کی رعایت رکھنا اہم امور میں سے
 ہے۔ پس اگر اس کا ارادہ صالح ہو تو جسم کی حرکت بھی صالح ہوتی ہے اور اس کے برعکس (یعنی اگر اس کا ارادہ بُرا ہو تو جسم کی حرکت بھی
 بُری ہوتی ہے۔) اور یہی مطلب ہے اس کا جو کہا گیا ہے: ”الناس علی دین ملوکہم“ کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے
 ہیں۔ اور اس کا بھی یہی مطلب ہے: ”الاناء یترشح بما فیہ“ برتن وہی چھلکا تا ہے جو اس میں ہو۔ اور قلب لغت میں کہتے ہیں کسی چیز
 کا اس کے عکس کی طرف پھیرنا، اور دل کے زیادہ پھرنے کی وجہ سے اس کا نام ”قلب“ رکھا گیا ہے، جیسا کہ اس کی طرف ایک حدیث
 میں اشارہ ہے ان القلوب بین اصبغین من اصابع الرحمن یقلبها کیف یشاء کہ بیشک دل رحمن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں
 کے درمیان ہے وہ جیسے چاہے اس طرف پھیر دیتا ہے، اور ایک اور حدیث میں ہے مثل القلب کر بشة بأرض فلاة تقلبها
 الریاح ظہر البطن دل کی مثال اس پر کی طرح ہے جو خالی زمین میں پڑا ہو، اور اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے:
 ”یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک“ اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ شاعر نے کہا:۔

دل کا نام قلب رکھا گیا ہے اس کے پھرنے کی وجہ سے

پس ڈر دل سے اس کے پھرنے اور پھرنے سے

دل کا ایک ظاہر ہے، وہ صنوبری شکل کا ٹکڑا جو سینہ میں بائیں جانب رکھا ہوا ہے۔ وہ لطیفہ انسانی کا محل ہے اور اسی وجہ سے اس کی
 طرف صلاح اور فساد کی نسبت کی جاتی ہے، اور اس دل کا ایک باطن ہے، وہ نورانی ربانی جاننے والا لطیفہ ہے، جہاں اللہ کے انورات کا
 نزول ہوتا ہے اسی کی وجہ سے انسان انسان ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے امتثال اوامر اور اجتناب نواہی کے لئے مستعد ہوتا ہے اور اسی کے
 ساتھ بدن کی اصلاح اور فساد کا تعلق ہے، وہ ایک خلاصہ ہے جو پیدا ہوتا ہے روحانی روح سے اور اس کو تعبیر کیا جاتا ہے نفس ناطقہ سے، اللہ
 تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ونفس وما سواھا﴾ [الشمس۔ ۷] [اور جان کی اور اس کی جس نے اس کو درست بنایا] فاخذ علی القلب من
 قلب وحویل اور روح کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے: ﴿قل الروح من امر ربی﴾ [الاسراء ۷۵] اور روح ایمان کا مستقر ہے،:
 [اولئک کتب فی قلوبہم الایمان] [المجادلہ۔ ۲۲] یہی ہیں جن کے دلوں میں لکھا گیا ہے ایمان جیسا کہ سینہ محل ایمان ہے: [افمن
 شرح صدرہ للإسلام] اور دل مشاہدہ کا مستقر ہے: [وما کذب الفؤاد ما رأى] [النجم۔ ۱۱] (قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی
 غلطی نہیں کی) اور ”لب“، یعنی عقل مقام توحید ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[انما یتذکر اولوالالباب] [آل عمران: ۷] (وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل ہیں) ”اولوالالباب“ وہ ہیں جو جازی
 وجود کے چھلکے سے نکلے اور حقیقی وجود کے مغز ساتھ باقی رہے لیکن اس کی حقیقت کی پہچان مشکل ہے۔ اور اس کی حقیقت کی طرف اشارہ
 کرنا رباب حقائق کیلئے گراں ہے، اور حدیث میں اشارہ ہے کہ جسم کی اصلاح یہ ہے کہ وہ حلال غذا استعمال کرے گا تو صاف ہو جائے

گا۔ اور اس کی صفائی کا اثر دل پر ہوتا ہے اور وہ (نور ہدایت سے) منور ہو جاتا ہے اور اس کا نور پھر جسم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ پس اس سے اعمال صالحہ صادر ہوتے ہیں، اور یہی مطلب ہے دل کی صلاح گا، اور جب حرام کی غذا سے پلنا ہے تو وہ شیطان اور نفس کو چرانے والا ہے، چنانچہ (اس جسم) میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے دل میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے، اس میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس دل کی ظلمت و تاریکی جسم کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، چنانچہ اس سے صرف گناہ ہی صادر ہوتے ہیں اور یہی مطلب ہے دل کے فساد کا۔ یہ بعض محققین اور بعض باریک بین لوگوں کے کلام کا خلاصہ ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ یہ حدیث تقویٰ کا ایک اصل اور قانون ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب کسی معاملے کے حلال اور حرام ہونے میں اشتباہ پیدا ہو جائے اور پہلے سے اس کی کوئی اصل معلوم نہ ہو، تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے اور اس سے اجتناب کیا جائے، اس لئے کہ اگر وہ چھوڑے گا نہیں اور اس پر مستمر رہے گا اور اس کا عادی بن جائے گا تو یہ اس کو حرام میں واقع ہونے کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے گھر میں کوئی چیز پاتا ہے اور اس کو معلوم نہیں کہ یہ چیز اس کی ہے یا کسی اور کی تو تقویٰ یہ ہے کہ اس سے گریز کرے، لیکن اگر اس نے لے لی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اس لئے کہ یہ چیز اس کے قبضہ میں ہے، اور اس باب میں یہ معاملہ بھی داخل ہے کہ جس کے مال میں شبہ ہو یا سودی مال کی ملاوٹ ہو، تو بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کرے اور اس کو چھوڑ دے۔ اور اس کے فساد کا فیصلہ نہ کرے جب تک یقین نہ ہو کہ اس کی عین اور اصل حرام ہے، اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے اپنی ایک زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھی تھی اس جو کے بدلے میں جو گھر والوں کے خرچ کیلئے لیے تھے باوجودیکہ وہ سودی معاملات کرتے تھے اور شراب کی قیمت کو حلال سمجھتے تھے۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا، تو بادشاہوں سے کوئی چیز نہ مانگ، اگر بغیر مانگے وہ تجھے دیں تو قبول کر لے، اس لئے کہ ان کے پاس حلال مال اس سے زیادہ مقدار میں ہوتا ہے جو وہ تجھے دے رہے ہیں۔

ابن سیرین سے روایت ہے کہ عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بادشاہوں کے عطایا قبول کرتے تھے اور قاسم بن محمد، ابن سیرین، اور ابن مسیب بادشاہوں کے عطایا قبول نہیں کرتے تھے۔ ابن مسیب سے پوچھا گیا؟ تو فرمایا کہ ان عطایا کو رد کیا ہے اس نے جو مجھ سے بہتر ہے ان پر جو ان سے بہتر تھے۔ یعنی صحابہ نے اپنے دور کے سلاطین و امراء کے ہدیئے قبول نہیں کیے چنانچہ ہم بھی نہیں کریں گے۔

ابو حامد غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے بادشاہ ظالم ہیں یہ بہت کم کسی چیز کو جائز طریقے سے لیتے ہیں لہذا ان کے ساتھ اور ان کے متعلقین کے ساتھ معاملات کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ قاضی کے ساتھ بھی اور نہ ان بازاروں میں تجارت جائز ہے جو بازار انہوں نے ناجائز طریقے سے بنائے ہیں۔ اور تقویٰ تو یہ ہے کہ اجتناب کرے ان مکانات سے جو فقراء کیلئے بنائے گئے ہوں اور مدارس سے اور پلوں سے جو غصب کے اس مال سے بنائے گئے ہوں، جن کا مالک معلوم نہ ہو۔

ابن اثیر کتاب المناقب میں ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ ابن شہاب نے فرمایا کہ میں ایک رات سفیان ثوری کے ساتھ تھا، تو انہوں نے دور سے آگ دیکھی، پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ ”صاحب الشرط“ کی آگ ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ ہمیں کسی اور راستے سے لیکر چلو اس لئے کہ یہ آدمی ان کی آگ سے روشنی کر رہا ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس کے مناسب اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَرَوْنَا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَمَسْكُمُ النَّارُ﴾ [ہود: ۱۱۳]

۲۷۶۳: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَمَنَّ الْكَلْبُ حَبِيبًا وَمَهْرُ الْبُعْيِ حَبِيبًا

وَكَسَبُ الْحَجَّامِ حَبِيبًا (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۱۹۹/۳ الحديث رقم (۴۱- ۱۰۶۸)۔ و ابو داؤد فى السنن ۷۰۶/ الحديث رقم ۳۴۲۱۔

والترمذى فى ۵۷۴ الحديث رقم ۱۲۷۵۔ والدارمى فى ۳۵۱/۲ الحديث رقم ۲۶۲۱۔ واحمد فى المسند ۴/۳۶۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت رافع ابن خدیج کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کتے کی قیمت بدکار کی اجرت، سینگی کھینچنے والے کی کمائی ناپسندیدہ و خبیث مال ہے۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: ثمن الکلب خبیث: اس سے امام شافعی رحمہ اللہ نے کتے کی بیع کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے چاہے وہ کتا معلم (سدھایا ہوا ہو) یا غیر معلم (یعنی سدھا ہوا نہ ہو) اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اور حدیث کا جواب دیا ہے کہ لفظ ”خبیث“ حرمت پر دلالت نہیں کرتا اس لئے کہ حدیث میں ہے: ”کسب الحجام خبیث“ حالانکہ (سینگی کھینچنے والے کی اجرت) بالاتفاق حرام نہیں ہے۔ تو خبیث کا مطلب ہے ناپاک، پس وہ مکروہ نہ کہ حرام۔ اور حدیث کا اطلاق اس پر اس اعتبار سے ہے کہ یہ کمائی کا گھٹیا طریقہ ہے۔

البغی: یا کی تشدید کے ساتھ یہ اصل میں فاعل بمعنی ”فاعلة“ ہے، یہ مشتق ہے بغت المرأة بغاء (زنا کرنا) سے ”بغاء“ کسرہ کے ساتھ ہے، اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَكْرَهُوا فِیَاتِكُمْ عَلٰی الْبَغَاءِ﴾ [النور-۳۳] (اور اپنی لونڈیوں کو زنا کرنے پر مجبور مت کرو)۔

”مہر البغی خبیث“: کا مطلب یہ ہے کہ زانیہ کا مہر حرام ہے بالا جماع، اس لئے کہ وہ عوض بنتی ہے زنا کا جو کہ حرام ہے، اور حرام کا ذریعہ بھی حرام ہوتا ہے، اور اس کو مہر کہا گیا ہے، مجازاً اس لئے کہ یہ بیع (شرم گاہ) کے عوض میں ہوتا ہے۔

قولہ: کسب الحجام خبیث: یعنی مکروہ ہے بوجہ اس کے گھٹیا ہونے کے۔ قاضی فرماتے ہیں کہ خبیث درحقیقت اس چیز کو کہتے ہیں جس کو اس کے گھٹیا اور خسیس ہونے کی وجہ سے ناپسند سمجھا جاتا ہو اور یہ لفظ ”حرام“ کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اس حیثیت سے کہ شارع نے اس کو ناپسند کیا ہے اور زایل سمجھا ہے، جیسا کہ لفظ ”طیب“ حلال کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیْبِ﴾ [النساء-۲] (اور تم اچھی چیز سے بری چیز کو مت بدلو)۔ یعنی حرام کو حلال سے۔ اور زانیہ جو زنا کے عوض مہر ہے وہ حرام ہے۔ لہذا ”خبیث“ کی نسبت اس کی طرف بمعنی ”حرام“ ہے۔

اور سینگی کھینچنے والے کی اجرت چونکہ حرام نہیں ہے، کیونکہ آپ نے سینگی لگوائی اور جہاں کمزوری دی، تو اس کی طرف (خبیث کی) نسبت دوسرے معنی میں ہوگی۔ اور کتے کی بیع کی جو ممانعت ہے، پس جس نے اس کو صحیح قرار دیا ہے جیسے احناف تو انہوں نے ”خبیث“ کی تفسیر گھٹیا سے کی ہے اور جن حضرات نے اس کو صحیح قرار نہیں دیا، جیسے ہمارے اصحاب (شوافع) تو انہوں نے اس کی تفسیر ”حرام“ سے کی ہے۔

۲۴۶۲: وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغِيِّ وَحُلْوَانِ

الْكَا هِنِ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۶۱۴۔ الحدیث رقم ۲۲۳۷۔ ومہلم فی ۱۱۹۸/۳ الحدیث رقم (۳۹-۱۰۶۷) وابوداؤد فی السنن ۷۱۰/۳ الحدیث رقم ۳۴۲۸۔ والترمذی ۵۷۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۶ والنسائی فی ۳۰۹/۷ الحدیث رقم ۴۶۶۶۔ وابن ماجہ ۷۳۰/۲ الحدیث رقم ۲۱۵۹ والدارمی فی ۳۳۲/۲ الحدیث رقم ۲۵۶۸۔ ومالک فی الموطا ۶۵۶/۲ الحدیث رقم ۶۸ من کتاب البیوع۔ واحمد فی المسند ۱۱۸/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابومسعود انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت بدکار عورت کی اجرت اور کابھن کی شیرینی (یعنی نیاز) کو استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: نهی عن ثمن الکلب: یہ حکم حنفی علماء کے ہاں اس وقت تھا جب کہ آنحضرت ﷺ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ نیز آپ نے کتوں سے فائدہ حاصل کرنے کی بھی ممانعت کی تھی، بعد میں آپ نے یہ اجازت دے دی تھی کہ کتوں سے فائدہ

اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص نے ایک شکاری کتے کو مار ڈالا تو آپ نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ کتے کے مالک کو چالیس درہم ادا کرے۔ اسی طرح ایک شخص نے ایک ریوڑ کے گنہبان کتے کو مار ڈالا تھا تو آپ نے اس کو حکم دیا کہ وہ مالک کو اس کتے کے بدلے میں ایک دنبہ دے۔ (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے۔)

امام طیبی فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ نہ تو کتے کی خرید و فروخت جائز ہے اور نہ کسی کتے کو قتل کرنے والے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کتے کی قیمت اس کے مالک کو ادا کرے، کتا خواہ معلم ہو یا غیر معلم ہو اسی طرح خواہ اس کتے کا پالنا جائز ہو یا ناجائز ہو، امام اعظم ابو حنیفہ نے اس کتے کی خرید و فروخت جائز قرار دی ہے، جس سے فائدہ اٹھانا مقصود ہو، اگر کوئی شخص ایسے کتے کو مار ڈالنے تو اس کیلئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس کتے کی قیمت اس کے مالک کو ادا کرے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے اس بارے میں مختلف روایات ہیں، پہلی روایت ان سے یہ ہے کہ ناجائز ہے اور (مار ڈالنے والے پر) قیمت لازم ہوگی۔ دوسری روایت امام ابو حنیفہ کی طرح ہے، اور تیسری روایت امام شافعی کی طرح ہے۔

قولہ: ومهر البغی: اس کی تشریح پہلے بیان ہو چکی ہے۔

وحلوان الکاهن: حاء کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ، وہ چیز جو کاہن کو اس کی کہانت پر دی جائے۔ ہر وہی فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں ”حلاوة“ سے ہے، دی ہوئی چیز کی تشبیہ دی گئی ہے مٹھی چیز کے ساتھ اس لئے کہ وہ اس کو آسانی کے ساتھ لیتا ہے نہ کوئی کلفت نہ کوئی مشقت اور کاہن وہ ہے جو کائنات کے بارے میں مستقبل کی خبریں بتائے، اور چھپی ہوئی باتوں کی معرفت کا دعویٰ کرے۔ عرب کے کاہن کائنات کے بہت سارے امور کی معرفت کا دعویٰ کرتے تھے، اور وہ گمان کرتے تھے کہ کچھ جنات ان کے تابع ہیں جو (غیب) کی خبریں ان تک پہنچاتے ہیں، اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو امور کی معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں اپنی سمجھ سے جو ان کو دی گئی ہے۔ اور بعض لوگ ”نجوی“ کو ”کاہن“ کہتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ (آئندہ) امور کی خبر دیتا ہے، جیسے بارش کا آنا، کسی بواء کا آنا، قتل و غارت کا ظہور، کسی کا نخوس یا خوش قسمت ہونا، اور اس جیسی اور مثالیں۔ اور حدیث میں کاہنوں کے پاس آنے سے جو منع ہے وہ ان سب کو شامل ہے، اور ان کی تصدیق کرنے اور ان کی باتوں کی طرف رجوع کرنے کی ممانعت بھی ان سب کو شامل ہے۔

۲۷۶۵: وَعَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ ثَمَنِ الدِّمِّ وَثَمَنِ الْكَلْبِ وَكَسْبِ الْبَغِيِّ وَلَعَنَّ اِكْلَ

الرِّبَا وَمُؤْكَلَهُ وَالْوَأْسِمَةَ وَالْمُسْتَوِ شِمَةَ وَالْمُصَوِّرَ (رواه البخاری)

احرجہ البخاری فی صحیحہ ۳۱۴/۴۔ الحدیث رقم ۲۲۳۸ واحمد فی المسند ۳۰۹/۲۔

توجہ: اور حضرت ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ نہ نماز، نہ خیر، نہ خون کی قیمت کتے کی قیمت اور بدکار عورت کی اجرت (کے طور پر حاصل ہونے والے مال کے استعمال) سے منع فرمایا ہے نیز آپ ﷺ نے سوکھانے والے اور سوکھلانے والے گوند نے والی اور گوند والے والی اور مصور پر لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری)

تشریح: قولہ: نهی عن ثمن الدم: شرح السنہ میں ہے کہ خون کا بیچنا جائز نہیں ہے کیونکہ خون نجس ہوتا ہے اور بعض حضرات نے ”نهی عن ثمن الدم“ (خون کی قیمت) کو سنگی کھینچنے والے کی اجرت پر محمول کیا ہے۔ اس صورت میں ممانعت کا تعلق مکروہ تزکیہ سے ہوگا۔

قولہ: وثمان الكلب: اس کا بیان گذر چکا ہے۔ وکسب البغی: یہاں ”کسب“ بمعنی ”کسب“ ہے۔ یعنی بدکاری سے کمایا ہوا۔ اس کی تفصیل ماقبل میں تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے۔

قولہ: اکل الربا ومؤكله: ہمزہ کے ساتھ ہے، اور ہمزہ کو واؤ سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی دینے والا اور لینے والا اور کھانے والا اور کھلانے والا، اس لئے کہ یہ دونوں فعل میں مشترک ہوتے ہیں۔ اگر چنانچہ میں ایک معتبط ہے، اور دوسرا ظلم کرنے والا ہے۔

والواشمة: یعنی گودنے والی عورت۔ نہایہ میں ہے کہ ”وشم“ (گودنے) کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جلد کو سوتی سے گود کر سرمہ یا نیل بھر دیتے ہیں جس سے وہ گودی گئی جگہ نیلی یا سبز ہو جاتی ہے۔

والمستوشمة آپ نے اس سے منع اس لئے فرمایا ہے کہ یہ فاسقوں اور غیر مسلموں کا کام ہے، نیز یہ اللہ کی خلقت کو تبدیل کرنا ہے، اور ”روضہ“ میں ہے کہ جس نے اپنے بدن کے کسی حصے کو چیرا اور اس میں کوئی چیز رکھی یا ہاتھ کو گودا یا اس کے علاوہ کسی عضو کو، تو یہ گودنے کے وقت نجس ہو جاتا ہے۔ اور ”تعلیق القراء“ میں میں لکھا ہے کہ وشم کو علاج کے ذریعے مٹایا جائے، اور اگر زخم و خراش کے بغیر ممکن نہ ہو تو زخم کی تکلیف برداشت کرنے کی ضرورت نہیں، اور تو بہ کرنے کے بعد اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔

والمصور منور سے مراد وہ ہے جو جاندار کی تصویر بنائے نہ کہ وہ جو درختوں اور دوسرے نباتات کی تصویر بنائے، اس لئے کہ وہ بت جن کی پوجا ہوتی تھی جانداروں کی صورت پر بنے ہوتے تھے۔ خطابی نے لکھا ہے کہ اس نبی میں ہر وہ تصویر داخل ہے جو کسی چیز سے یا کاغذ پر بنی ہو اور مقصود بالذات تصویر اور چیز اس کا تابع، اور برتنوں اور پیالوں پر بنی ہو تصویر (مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ) ان برتنوں کے تابع ہوتی ہے جیسے وہ تصویر جو گھر دیواروں چھتوں، قالین اور پردوں پر بنی ہوتی ہے، اس کا بیچنا صحیح ہے۔

۲۷۶: وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ عَامَ الْفَتْحِ وَهُوَ بِمَكَّةَ إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيرِ وَالْأَصْنَامِ فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَرَأَيْتَ شُحُومَ الْمَيْتَةِ فَإِنَّهُ تَطْلَى بِهَا السُّفْنُ وَيُدَّ هُنَّ بِهَا الْجُلُودُ وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ فَقَالَ لَا هُوَ حَرَامٌ ثُمَّ قَالَ عِنْدَ ذَلِكَ قَاتَلَ اللَّهُ الْيَهُودَ إِنَّ اللَّهَ لَمَّا حَرَّمَ شُحُومَهَا أَجْمَلُوهَا ثُمَّ بَا عَوْهَ فَأَكَلُوا ثَمَنَهُ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۲۴/۴۔ الحدیث رقم ۲۲۳۶۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۲۰۷/۳ الحدیث رقم (۷۱)۔ (۱۵۸۱)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۵۶/۳ الحدیث رقم ۳۴۸۶ والترمذی فی ۵۹۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۹۷۔ والنسائی ۱۷۷/۷ الحدیث رقم ۴۲۵۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر سے روایت ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال مکہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ جب آپ ﷺ نے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں مردار کی چربی کا حکم بھی بتائیے؟ کیونکہ اس کے ذریعے کشتیوں کو روغن کیا جاتا ہے نیز اس سے چڑوں کو چکنا کیا جاتا ہے اور لوگ (گھروں میں) اس کے ذریعے چراغ جلاتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مردار کی چربی بھی حرام ہے (اس لئے اس سے یہ فائدے اٹھانے جائز نہیں)۔ پھر آپ ﷺ نے اسی وقت یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو غارت کرے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے مردار کی چربی کو حرام قرار دیا تو یہود نے مردار کی چربی کو پکھلا کر فروخت کیا اور پھر اس کی قیمت کو کھالیا۔ (بخاری و مسلم)

سمع النبی: صحیح شدہ نسخہ میں (نبی کی جگہ) ”رسول اللہ“ ہے۔

يقول عام الفتح وهو بمكة: امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”عام الفتح“ کے بعد ”وهو بمكة“ لانا ایسا ہے، جیسا عرب کا یہ قول ہے: ”رأيتہ بعیني واخذته بیدی“ اھ لیکن امام طیبی کا فرمانا درست نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے، اس لئے کہ ”عام الفتح“ سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مکہ میں ہوں، اس احتمال کی بناء پر کہ ممکن ہے کہ وہ اسی سال مدینہ میں ہوں یا اس کے علاوہ کسی اور جگہ ہو ہاں مقصود (دونوں کلمات) سے سننے کی تحقیق اور تاکید ہے۔

قوله: ان الله ورسوله حرم بيع الخمر: مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں شراب کی حرمت بیان کی ہے اور اس کو ناپاک قرار دیا ہے اور اس کی خرید و فروخت کو حرام ٹھہرایا ہے، اور اس کے رسول نے بھی اپنی احادیث میں اس کی حرمت بیان کی ہے، اگلی چیزوں کی حرمت کا بھی یہی مطلب ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں رسول کے ذکر سے پہلے اللہ کا ذکر کرنا ضروری ہے کیلئے بطور تمہید ہے، اور بتانا یہ مقصود

ہے کہ رسول کا مذکورہ اشیاء کی خرید و فروخت کو حرام ٹھہرانا درحقیقت اللہ کے حرام کرنے کی وجہ سے ہے، اس لئے کہ وہ اللہ کے رسول اور خلیفہ ہیں۔

ہاں ضمیر کا مرجع شحوم ہے، یا ہاں ضمیر قصہ ہے۔ اور اس کی تائید کرتا ہے وہ تصحیح شدہ نسخہ کہ جس میں، ”انہ“ مذکر کی ضمیر کے ساتھ، یعنی ضمیر شان کے ساتھ ہے۔

السفن : سین اور فا کے ضمہ کے ساتھ جمع ہے ”سفینۃ“ کی

یدھن : دال کی تشدید کے ساتھ اور ایک نسخہ میں ہا کی تشدید کے ساتھ ہے۔

یستصبح : با کے کسرہ کے ساتھ، ”یستصبح“ میں سین طلب کیلئے ہے اور مراد اس طلب سے یہ کہ لوگوں کی اس روشنی کی طرف شدت احتیاج ہے اس لئے وہ اس کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، اور یہ بھی جائز ہے کہ سین صرف تاکیدی کیلئے ہو۔

ہو حرام : ضمیر کا مرجع انتفاع ہے۔ یعنی ممنوع ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ضمیر مرفوع اس مقدر کی طرف راجع ہے جو کلمہ استخبار ”ارایت“ کے بعد ہے، اور ”لا“ اس مقدر کے رد کیلئے ہے۔ اور اس مقدر عبارت میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ ہے کہ تقدیری عبارت یہ ہو:

”اخبرنی ایحل انتفاع شحوم المیتۃ“ یعنی مجھے بتائے کہ کیا مردار کی چربی سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، یہاں دوسرا احتمال مراد ہے امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”لا ہو ہرام“ کا مطلب ہے کہ تم اس کو نہ بیچو اس لئے کہ اس کا بیچنا حرام ہے، پس ”ہو“ ضمیر بیع کی

طرف راجع ہے نہ کہ انتفاع کی طرف۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب کے ہاں یہی صحیح ہے، اور جمہور کے ہاں اس سے کسی بھی قسم کا فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے نہ ہی کے عموم کی وجہ سے، سوائے اس کے کہ جس کی تخصیص کی گئی ہے (نص کے ذریعے) اور وہ دباغت شدہ چمڑا ہے۔ پس ہمارے مسلک صحیح کے مطابق جو تیل ناپاک ہوں ان سے خارجی فائدہ اٹھانا جائز ہے جیسے تیل اور گھی جو نجس ہو اس سے چراغ

جلانا اور اس طرح تیل سے صابن بنانا امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے تابعین علماء نے نجس زیت کو بیچنے کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ اس کو بیان کرے کہ یہ نجس ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ مردار کی خرید و فروخت کی تحریم کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ مردار کا فریغ کا بیچنا حرام ہے، اور حدیث میں ہے کہ نول مخزومی خندق کے دن قتل ہوا، تو کفار نے اس کی نعش کے حصول کیلئے دس ہزار درہم دینا چاہے تو آپ نے

قبول نہیں کئے۔

عند ذلک کا مشارالہ قول مذکور: ارایت..... ہے۔ قاتل اللہ الیہود : یعنی ان کو ہلاک کرے اور لعنت ان پر کرے، اس

میں ایک احتمال ہے کہ یہ خبر ہو اور ایک احتمال یہ ہے کہ یہ بدوعا ہو اور یہ ”عاقبت اللص کے باب سے ہے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے: ”عادا ہم“ کہ اللہ نے ان سے دشمنی کی، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بمعنی قتلہم ہے اور ”مغالہ“ کی صورت میں لایا گیا ہے۔

ان اللہ لما حرم شحومہا : مشکاة کے نسخے میں واحد کی ضمیر کے ساتھ ہے اور ”مفاتح“ میں ”شحومہما“ تثنیہ کی ضمیر کے ساتھ ہے، اور ضمیر غیر مذکور کی طرف لوٹ رہی ہے اور مراد گائے بکری ہے جیسے اللہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ومن البقر والغنم حرمنا

علیہم شحومہما﴾ [الانعام: ۱۱۶] (اور گائے اور بکری میں سے ان دونوں کی چربیاں ان پر ہم نے حرام کر دی تھی) اور ”شحومہما“ بھی روایت کیا گیا ہے، پس اس صورت میں ضمیر ”کل واحدہ“ کی طرف لوٹے گی۔ ”البقر“ اور ”الغنم“ اسم جنس ہے، معنی کے اعتبار سے اس کو مؤنث لانا جائز ہے۔

اجملوہ : جیم کے ساتھ اور ضمیر منصوب ”شحوم“ کی طرف راجع ہے ”مذکور“ کی تاویل کے ساتھ، (اس کو امام طیبی رحمہ اللہ نے

ذکر کیا ہے۔) اور ظاہر یہ ہے کہ یہ راجع ہے ”شحوم“ کی طرف جو ”شحوم“ سے مفہوم ہو رہا ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر ”شحوم“ کے ہم معنی کی طرف راجع ہے، اس لئے کہ اگر کہا جائے ”حرم شحومہما“ تو معنی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا یہ

اللہ کے اس فرمان کی طرح ہوگا ﴿فاصدقواکن﴾۔

نہا یہ میں ہے: اجملت الشحم واجملته بمعنى اذبتہ ہے (یعنی میں نے پگھلایا)۔ اور قاموس میں ہے: جمل الشحم اذابہ کا اجملہ واجتملہ۔ امام طبری فرماتے ہیں ”جملت“ بنسبت ”اجملت“ کے زیادہ فصیح ہے ”اجملت“ جمیل سے مشتق نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں فصیح ہیں، بلکہ زیادہ اچھا یہ ہے کہ کہا جائے، کہ ”اجمل“ زیادہ بلیغ ہے کیونکہ یہ مبالغہ کا فائدہ دے رہا ہے، اس لئے کہ الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔ پس مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے اس کام میں مبالغہ سے کام کیا اور اس پر ستم رہے اور اس سے منع نہ ہوئے۔

ثم باعوه : اس کو بیع کہنا صورتاً ہے ورنہ حقیقت میں تو وہ معاملہ باطل تھا۔ ”فاكلوا ثمنه“ میں زیادہ چھڑک ہے۔ شرح السنن میں ہے کہ اس حدیث میں ہر اس حیلے کے بطلان پر دلیل ہے جس کے کرنے سے حرام کے ارتکاب تک پہنچنا ہو، اور اس میں دلیل ہے کہ کسی چیز کی ہیئت اور نام کے تبدیل ہونے سے اس کا حکم تبدیل نہیں ہوتا۔

۲۷۶۷: وَعَنْ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ قَاتَلَ اللَّهُ الْيَهُودَ حَرَمَتْ عَلَيْهِمُ الشُّحُومُ فَجَمَلُوها فَبَاعُوهَا (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۱۴/۴۔ الحدیث رقم ۲۲۳۳۔ و مسلم فی ۱۲۰۷/۳ الحدیث رقم (۷۲-۱۰۸۲)۔ والنسائی فی السنن ۱۷۷/۷ الحدیث رقم ۴۲۵۷ والداری فی ۱۵۶/۲ الحدیث رقم ۲۱۰۴۔ واحمد فی المسند ۲۵/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ یہودیوں کو ہلاک کرے ان پر (مردار کی) چربیوں کو حرام کی گئیں تو انہوں نے اس کو پگھلایا (تا کہ چربی کا نام باقی نہ رہے) اور پھر اس کی خرید و فروخت شروع کر دی (اس کی وضاحت حدیث بالا میں کی جا چکی ہے)۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: فجملوها: (تخفيف کے ساتھ) یعنی اس کو آگ سے پگھلایا تا کہ اس سے ”شحم“ (چربی کا نام ختم ہو جائے اور ”ودك“ پگھلی ہوئی چربی) بن جائے۔

۲۷۶۸: وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَالسَّنُورِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۹۹/۳ الحدیث رقم (۴۲-۱۰۶۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۵۲/۳ الحدیث رقم ۳۴۷۹۔ والترمذی فی ۵۷۷/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۹ وابن ماجہ فی ۷۳۱/۲ الحدیث رقم ۲۱۶۱۔ والدارقطنی فی ۷۲/۳ الحدیث رقم ۲۷۱ من کتاب البیوع۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے اور بلی کی قیمت (کو استعمال میں لانے) سے ممانعت فرمائی ہے۔“ (مسلم)

تشریح: قوله: نهى عن ثمن الكلب والسنور: سین کے کسرہ اور تشدید اور نون کے فتح کے ساتھ، بلی کو کہتے ہیں۔

شرح السنن میں ہے کہ یہ ممانعت محمول ہے اس بلی پر جس میں کوئی منفعت نہ ہو یا کراہت تزیہی پر محمول ہے، کہ لوگوں میں بلی بہہ کرنے عاریت پر دینے اور سخاوت کرنے کی عادت ہو، جیسا کہ عام طور پر ہے۔ اگر وہ بلی نافع ہے اور اس کو بیچا تو بیع صحیح ہو جائے گی، اور اس کی قیمت حلال ہوگی، یہ جمہور علماء کا مذہب ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور تابعین کی ایک جماعت اس کو ناجائز سمجھتی ہے اور یہ لوگ حدیث کے ظاہر سے دلیل پکڑتے ہیں۔ جو علامہ خطابؓ اور ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، تو ایسا نہیں ہے جیسا انہوں نے کہا ہے، بلکہ یہ حدیث صحیح ہے۔

ابن عبد البر کا یہ کہنا کہ اس کو ابو زبیر سے حماد بن سلمہ کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا ہے، تو یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ مسلم نے اس کو اپنی صحیح میں عن معقل بن عبد اللہ عن ابی الزبیر سے روایت کیا ہے یہ دونوں ثقہ ہیں، (آٹھلی) اس حدیث سے امام ابو حنیفہؒ اور ان کے

اصحاب کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کتے کی بیچ کے جواز میں۔ اسلئے کہ نبی میں دو معظوفات کے درمیان مناسبت، اس کو لازم کرتی ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ ظاہر حدیث کی وجہ سے بعض حضرات نے گھریلو اور وحشی بلی کے بیچنے کو مکروہ جانا ہے، اور اکثر نے اس ممانعت کو وحشی بلی پر محمول کیا ہے، چونکہ مائع ایسی بلی مشتری کے حوالہ کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کو باندھے تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، چونکہ اس کا فائدہ چوہے کا شکار کرنا ہے۔ اور اگر اس کو نہ باندھے تو وہ بھاگ جاتی ہے تو وہ مال جو اس کے ثمن میں صرف کیا تھا وہ ضائع ہو جائے گا۔

۲۷۶۹: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ حَبَمَ أَبُو طَيْبَةَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَأَمَرَ لَهُ بِصَاعٍ مِّنْ تَمْرٍ وَأَمَرَ أَهْلَهُ أَنْ يَخْفِقُوا عَنْهُ مِنْ خَرَجِهِ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی ۳۲۴/۴۔ الحدیث رقم ۲۱۰۲۔ ومسلم فی ۱۲۰۴/۳ الحدیث رقم (۶۴-۱۰۷۷) وابوداؤد فی

۷۰۸/۳ الحدیث رقم ۳۴۲۴۔ والترمذی فی ۵۷۶/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۸۔ ومالک فی الموطأ ۹۷/۲

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ابو طیبہ نے رسول اللہ ﷺ کے چھینے لگائے تو آپ ﷺ نے اس کو ایک صاع کھجوریں (تقریباً ڈھائی کلو کھجوریں) دیئے جانے کا حکم فرمایا نیز آپ ﷺ نے اس کے مالکوں کو اس کے خراج میں تخفیف کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: خراج: خاء کے فتح کے ساتھ۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ غلام کو اس کے رضامندی سے کمائی پر لگانا جائز ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ مالک اپنے غلام سے کہے کہ تم کما کر لاؤ اور اپنی کمائی میں سے ہر روز مجھے اتنا دو اور باقی تمہارا ہے۔ اور غلام کم دے کہ میں اس پر راضی ہوں۔ اور اس سے چھینے لگوانے کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ افضل ترین دوا ہے، اور یہ کہ علاج کرنا مباح ہے، اور علاج پر طیب کیلئے اجرت لینا جائز ہے۔ اور یہ کہ صاحب حق اور صاحب دین سے تخفیف کی سفارش کرنا جائز ہے۔

الفصل الثانی:

۲۷۷۰: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ وَإِنَّ أَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ (رواه الترمذی والنسائی وابن ماجہ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۳۹/۳ الحدیث رقم ۱۳۵۸۔ والنسائی فی ۲۴۰/۷ الحدیث رقم ۴۴۵۰۔ وابن ماجہ فی

۷۶۸/۲ الحدیث رقم ۲۲۹۰ والدارمی فی ۳۲۱/۲ الحدیث رقم ۲۵۳۷۔ واحمد فی المسند ۱۶۲/۶۔

ترجمہ: ”حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے زیادہ پاکیزہ چیز وہ ہے جو تم اپنی کمائی سے حاصل کر کے کھاتے ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی میں سے کمائی ہے۔“ (ترمذی نسائی ابن ماجہ)

ابوداؤد اور دارمی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ”سب سے زیادہ پاکیزہ کھانا آدمی کا اپنی کمائی سے کھانا ہے اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی میں سے ہے۔“

تشریح: ان اطیب ما اکلتم: ”طیب“ بمعنی ”احل“ ہے زیادہ حلال۔ ما موصولہ ہے، یا موصوفہ ہے، یا مصدر یہ ہے، اور مصدر (ما اکلتم) مفعول (ما کول) کے معنی میں ہے۔

قوله: وان اولادکم من کسبکم:

یعنی من جملہ (کسب میں سے) اولاد بھی ہے۔ اس لئے کہ وہ تمہارے نکاح کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے لہذا تمہارے لئے اولاد کی کمائی سے کھانا جائز ہے جب تم محتاج ہوں ورنہ تو نہیں، مگر یہ کہ وہ اپنے طیب نفس کے ساتھ دے، یہی قول ہمارے علماء کا ہے۔ امام طیبی کہتے ہیں کہ اگر والدین محتاج ہوں اور کمائی سے عاجز ہوں تو ان کی ضروریات زندگی پورا کرنا لڑکے پر واجب ہے، امام شافعی کے مسلک میں اس وجوب کی شرط یہ ہے کہ وہ کمانے سے معذور ہوں جبکہ دوسرے علماء کے ہاں یہ شرط نہیں ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”ولد“ کو ”کسب“ مجازاً کہا ہے۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں، کہ (اس کو) ابن ماجہ نے روایت کیا ہے حضرت جابر سے سند صحیح کے ساتھ، ابن قطان اور منذری نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسول! میرے پاس مال ہے اور اولاد بھی ہے اور میرا والد مجھ سے میرا مال لینا چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ”انت و مالک لا یبیک“، تُو اور تیرا مال تیرے والد کا ہے طبرانی نے ”الاصغر“ میں اور بیہقی نے ”دلائل النبوة“ میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا اللہ کے رسول! میرا باپ مجھ سے میرا مال لینا چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو میرے پاس بلا لینا۔ پس جب وہ آیا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: کہ آپ کے بیٹے کا خیال یہ ہے کہ آپ اس کا مال لینا چاہتے ہیں۔ تو والد نے کہا کہ آپ ان سے پوچھئے کہ میں اس کی پھوپھی کے لئے لینا چاہتا ہوں یا اس کے قرابت داروں کیلئے لیتا ہوں یا میں اپنے اوپر اور اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہوں۔

راوی کہتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا یا رسول اللہ! اس بوڑھے نے اپنے دل میں شعر کہے ہیں جو خود اس کے کانوں نے بھی نہیں سنے، تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تُو نے اپنے دل میں شعر کہے ہیں جو تیرے کانوں نے بھی نہیں سنے، تو وہ سنا دے۔ اس نے کہا کہ اللہ ہمارا آپ پر ایمان اور یقین مسلل بڑھاتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے یہ اشعار سنائے:

غذوتک مولودا ومنتک یافعا

تعلم بما اجنی علیک وتنهل

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا۔

اذا لیلۃ ضاقتک بالسقم لم ابت

لسقمک الا سامرا اتململ

جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کے سبب بیداری اور بیقراری میں گزاری۔

تخاف الوری نفسی علیک وانها

لتعلم ان الموت حق موکل

میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے پہلے بچھے نہیں ہو سکتی۔

کانی انا المطروق دونک بالذی

طرقت بہ دونی فعیناک تھمل

گویا کہ تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے تمہیں نہیں، جس کی وجہ سے میں تمام شب دوڑتا رہا۔

فلما بلغت السن والغایۃ التی

الیک مرأماً فیک قد کنت آمل

پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

جعلت جزائی غلظۃ وفظاظۃ

كانك انت المنعم المتفضل

تو تم نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنا دیا گویا کہ تم مجھ پر احسان و انعام کر رہے ہو۔

فلینک اذا لم ترع حق ابوتی

فعلت کما جار المجاور یفعل

کاش! اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے جیسا ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ آپ علیہ السلام رونے لگے اور پھر اس کے بیٹے کے گریبان کو پکڑا اور فرمایا: (اذھب انت ومالك لا ینک) کہ چلے جاؤ اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی پہلی حدیث کئی طرق سے روایت کی گئی ہے۔

۴۷۱: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلُ مِنْهُ وَلَا يَنْفِقُ مِنْهُ فَيَبَارِكُ لَهُ فِيهِ وَلَا يَتْرُكُهُ خَلْفَ ظَهْرِهِ إِلَّا كَانَ زَادَهُ إِلَى النَّارِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئِ وَلَكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَةَ بِالْحَسَنِ إِنَّ الْخَبِيثَ لَا يَمْحُو الْخَبِيثَ

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَكَذَا فِي شَرْحِ السَّنَةِ)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۰۸ الحدیث رقم ۲۰۳۰۔ واحمد فی المسند ۳۸۷/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ حرام مال کما کر اس میں سے صدقہ و خیرات کرتا ہے اور اس کا وہ صدقہ قبول کر لیا جاتا ہے (یعنی اگر کوئی شخص حرام ذرائع سے کمایا ہو مال صدقہ و خیرات کرے تو اس کا صدقہ قطعاً قبول نہیں ہوتا اور نہ اس پر کوئی ثواب ملتا ہے) اور نہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص اس حرام مال کو (اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر) خرچ کرتا ہے اور اس میں اسے برکت حاصل ہوتی ہے (یعنی حرام مال میں سے جو بھی خرچ کیا جاتا ہے اس میں بالکل برکت نہیں ہوتی) اور جو شخص اپنے (مرنے کے بعد) حرام مال ترکہ میں چھوڑ جاتا ہے تو وہ اس شخص کے لئے (جہنم کی) آگ میں اضافہ کا سبب بنتا ہے اور (یہ بات یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعہ مٹاتا بلکہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ دور کرتا ہے اسی طرح ناپاک مال ناپاک مال کو نہیں مٹاتا (یعنی حرام مال برائی کو دور نہیں کرتا بلکہ حلال مال برائی کو دور کرتا ہے)۔“ (احمد شرح السنہ)

تشریح: فیتصدق منہ: رفع کے ساتھ ”یکسب“ پر عطف ہے۔

فینفق منہ) مجہول کے صنغے کے ساتھ ہے یہ بھی مرفوع ہے، اور اس کا عطف ”فیتصدق“ پر ہے۔

فیقبل: اور ایک صحیح نسخہ میں (فیقبل) نصب کے ساتھ ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ نصب میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ جواب نفی ہو اور ”ان“ مقدر ہو۔ ای فلا یکون اجتماع الکسب والتصدق سبباً للقبول یعنی اس کی کمائی اور صدقہ کی اجتماع قبولیت کا سبب نہیں ہو سکتا۔

فلا ینفق منہ برفع کے ساتھ ”فیتصدق“ پر عطف ہے۔ فیبارک لہ فیہ: صنغہ مجہول کے ساتھ، جواب ہونے کی وجہ سے

منسوب ہے۔ ولا یتروک“ کا عطف فیتصدق پر ہے۔ خلف ظہرہ: موت سے کنایہ ہے

اس لئے کہ جب وہ حرام طریقے سے مال جمع کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہو اور پھر مر گیا اور مال ورثاً کیلئے چھوڑا، تو قیامت تک اس پر اس کا گناہ ہوگا یعنی جو دوسرے کے گناہ کے ارتکاب کا ذریعہ بنے وہ بھی اس وعید کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور لفظ ”زادہ“ زاء مجہ کے ساتھ ہے، تقدیری عبارت یوں ہے: حال کو نہ موصلاً لہ الی النار۔

ابن الملک فرماتے ہیں اس کو راء مہملہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے، یعنی یہ مشتق ہے ”رود“ سے ای مانعہ عن الجنة و ملجنہ الی النار یعنی اس کو جنت سے روکنے والا اور جہنم کی طرف پہنچانے والا ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تقسیم حاصر میں سے ہے اس لئے کہ جو شخص مال کماتا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ آخرت کیلئے ذخیرہ کرتا ہے تو اس میں سے صدقہ کرتا ہے، یا صدقہ نہیں کرتا۔ دوسری صورت پھر دو حال سے خالی نہیں کہ وہ اپنے نفس پر اور عیال پر خرچ کرتا ہے یا نہیں کرتا دوسری صورت یہ ہے کہ وہ مال کو ذخیرہ کرتا ہے اپنی دنیا کیلئے اور اس کو اپنے نفس کیلئے خزانہ بنا کر رکھتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ حرام نہ تو اس کے کام آتا ہے اور نہ اس کو نفع دیتا ہے اس میں جو اس نے ارادہ کیا ہے۔

قوله: ان الله لا يمحوا السي با لسي: یہ جملہ مستاتھ ہے، یعنی مال حرام سے صدقہ قبول نہ ہونے کی علت کو بیان کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مال حرام کا صدقہ کرنا گناہ ہے۔ اور اللہ بڑے اعمال کو برائی سے نہیں مٹاتا، بلکہ بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے اگر کوئی مال حرام میں سے صدقہ و خیرات کرے اور پھر اس پر ثواب کی امید کر لے تو وہ کافر ہو جاتا ہے نیز اگر کسی فقیر کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کو صدقہ دینے والا بطور صدقہ جو مال دے رہا ہے وہ حرام ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے اور اس کے باوجود صدقہ دینے والے کیلئے دعا کرے وہ بھی کافر جاتا ہے۔

قوله: ولكن يمحوا السنن بالحسن: اس میں اللہ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: [ان الحسنات يذهبن السيئات] [ہود۔ ۱۱۵] ”بے شک نیک کام مٹادیتے ہیں برے کاموں کو“۔ اور یہ سب جملے تمہید اور مقدمہ کے طور پر ہیں اس جملے کے لئے: ”ان الخبيث لا يمحوا الخبيث“ یعنی ناپاک چیز ناپاک کو پاک نہیں کرتی بلکہ پاک ہی اس کو پاک کرتا ہے، اور امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ مال حرام کبھی فائدہ نہیں دیتا عدم نفع کو ”خبث“ سے تعبیر کیا ہے۔

۲۷۷۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ

مِنَ السُّحْتِ كَانَتْ النَّارُ أَوْلَىٰ بِهِ - (رواه احمد والدارمي والبيهقي في شعب الايمان)

اخرجه الدارمي في السنن ۴۰۹۱۲ الحديث رقم ۲۷۷۶ - واحمد في المسند ۳۲۱/۳ -

ترجمہ: ”اور جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ گوشت جس نے حرام مال سے پرورش پائی ہے جنت میں داخل نہیں ہوگا اور ہر وہ گوشت جو حرام مال سے نشوونما پائے جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ (احمد دارمی، بیہقی)

تشریح: قوله: لا يدخل الجنة: اس میں متعدد تاویلات کی گئی ہیں: (۱) دوزخ میں داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص شروع میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہوگا بلکہ اس نے جتنا مال حرام کھایا ہوگا اس کے بقدر سزا بھگتے گا جب تک اس کو معاف نہ کیا جائے (۲) ایسا شخص جنت کے اعلیٰ درجات میں داخل نہیں ہو سکے گا، (۳) مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جو حرام مال کو حلال سمجھ کر کے کھاتے ہیں۔ اور اس کا ضروریات دین میں سے ہونا معلوم ہے۔ (۴) اس سے زجر شدید اور سخت وعید مراد ہے اسی وجہ سے۔ اس کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے۔

لحم: (یہاں مضاف محذوف ہے۔) اذ، صاحب لحم یعنی صاحب لحم مراد ہے۔

السحت: سین کے ضمہ اور حا کے سکون کے ساتھ، بمعنی حرام

جنت میں نہ داخل ہونے کی نسبت ”لحم“ گوشت کی طرف کی ہے نہ کہ صاحب لحم کی طرف تاکہ علت معلوم ہو جائے۔ اور یہ ناپاک ہے تو یہ پاک (یعنی جنت) میں داخل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے کہ خبیث خبیث کیلئے ہوتا ہے۔ اس لئے اگلا جملہ ارشاد فرمایا:

قوله: وكل لحم نبت من السحت كانت النار اولیٰ به: اور ایک نسخہ میں ”کان النار“ ہے۔ جنت کے مقابلے میں

(جہنم اس کے لئے بہتر ہے) تاکہ آگ اس کو جلا کر حرام سے پاک کر دے۔ ظاہر میں تو وہ اسی سزا کا مستحق ہے لیکن اگر وہ توبہ کر لے یا بغیر توبہ کے اللہ اس کو بخشش دے یا خصم کو راضی کر دے اور یا اسے کسی کی شفاعت حاصل ہو جائے تو وہ شخص اس وعید سے مستثنیٰ ہوگا۔

۲۷۷۳: وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ دَعْوَا يُرِيْبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيْبُكَ فَإِنَّ

الصِّدْقَ طَمَآنِيْنَةٌ وَإِنَّ الْكُذْبَ رِيْبَةٌ۔ رواه احمد والترمذی والنسائی وروی الدارمی الفصل الاول

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۷۶/۴ الحدیث رقم ۲۵۱۸۔ والنسائی فی ۳۲۷/۸ الحدیث رقم ۵۷۱۱۔ والدارمی فی ۳۱۹/۲ الحدیث رقم ۲۵۳۲۔ واحمد فی المسند ۲۰۰/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت حسن بن علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی کو (خود سنا ہے اور اسے یاد رکھا ہے کہ جو چیز تم کو شک میں مبتلا کر دے اس کو چھوڑ دو اور اس چیز کی طرف میلان رکھو جو تم کو شک میں مبتلا نہ کرے کیونکہ سچائی دل کے اطمینان کا باعث ہے اور جھوٹ شک و تردید کا موجب ہے (احمد ترمذی نسائی اور دارمی نے حدیث کا صرف پہلا حصہ (یعنی دَعْوَا يُرِيْبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيْبُكَ) نقل کیا ہے۔“

تشریح: یاربک: یاربک کے فتح اور ضمہ دونوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے، لیکن فتح زیادہ مشہور ہے۔ ”ریب“ شک کو کہتے ہیں، بعض کا کہنا ہے کہ ”ریب“ اس شک کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تہمت بھی ہو۔

تو پستی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی جس چیز میں آپ کو شک ہو جائے تو اس کو چھوڑ کر اس کی طرف پھر جانا جس میں شک نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: دَعْوَا يُرِيْبُكَ إِلَى ذَلِكَ أَيْ اسْتَبْدَلَهُ بِهِ، (اتنی)۔ اور مطلب یہ ہے کہ جن اقوال و اعمال میں آپ کو شک ہو جائے کہ وہ ممنوع ہیں یا ممنوع نہیں ہیں یا سنت ہیں کہ بدعت ہیں؟ تو اس کو چھوڑ کر اس کی طرف میلان رکھیں جس میں شک نہ ہو۔ مقصود حدیث سے یہ ہے کہ مکلف کو اپنے ہر معاملے کی بنیاد یقین اور حق پر رکھنی چاہئے اور اپنے دین کے معاملے میں بصیرت پر ہونا چاہئے۔

قوله: فان الصدق طمأنينة وان الكذب: کاف کے فتح اور ذال کے کسرہ کے ساتھ، سید کے نسخے میں کاف کے کسرہ اور ذال کے سکون کے ساتھ ضبط کیا ہے، لیکن پہلا والا ضبط زیادہ صحیح ہے اور قرآن میں واقع ہے۔ اور دوسرا ضبط مض ایک لغت ہے۔ کہا گیا ہے کہ کذب کا تقابل صدق کے ساتھ تو یہ زیادہ بہتر ہے چونکہ دونوں کے درمیان موازنہ ہے

(ریبہ: راء کے کسرہ کے ساتھ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ دل کو کھٹکا ہوتا ہے اور مضطرب ہو جاتا ہے۔ اور کسی چیز کا مشکوک ہونا یہ ہے کہ نفس اس کے بارے میں کھٹکے اور کسی چیز کا صحیح اور سچا ہونا یہ ہے کہ نفس اس کے بارے میں مطمئن ہو اور اسی سے ہے: [ریب المنون] یعنی زمانے کے حوادث جو نفس میں کھٹکیں اور بعض کہتے ہیں کہ ”ریب“ کا معنی ہے موت۔

علامہ توبیشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول ناقبل کے کلام کیلئے بطور تمہید آیا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں تیرا نفس شک میں پڑ جائے تو اس کو چھوڑ دے۔ چونکہ کہ مومن کا نفس سچ سے مطمئن ہوتا ہے اور جھوٹ سے شک میں پڑ جاتا ہے، پس تیرا شک کرنا کسی چیز کے بارے میں یہ اس کے باطل ہونے پر مبنی ہے یا اس کے باطل ہونے کا گمان ہے۔ پس اس سے بچنا اور تیرا کسی چیز کے بارے میں مطمئن ہونا اس کے حق ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پس آپ اس کو لازم پکڑنا، صدق اور کذب اقوال اور افعال دونوں کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور حق ہو یا باطل اعتقاد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، یہ وصف مخصوص ہے ان شریف اور پارسہ نفوس کے ساتھ جو ہر قسم کے گناہوں کے ضرر اور میل پچیل سے پاک ہوں۔ (اتنی)۔

بعض عارفین کا کہنا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تو صحیح دل کا مالک ہوگا یا کبیرہ باطن ہوگا غیب کا مراقبہ کرنے والا ہوگا فرشتہ کے الہام اور شیطان کے وسوسہ کے درمیان امتیاز کر سکے اور الہام اور حدیث انفس میں فرق کر سکے، اور نور فرست اور صفائی دل سے حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے والا بن جائے، تو جو اغلوطات شہادت نفسانیہ اور شبہات شیطانیہ تجھ میں ڈالیں تو تو اس کی طرف

مائل ہو جا جو تجھ کو شک میں نہ ڈالے جس کا تیرے دل تیری عقل اور تیری روح پر نزول ہوتا ہے اور وہ ہے الہام الہی اور وہ علم لدنی جو کتاب اور حدیث نبوی کے مطابق ہو۔

تو جیسے اس چیز کا ترک مامور ہے جو تجھے شک میں ڈالے تو اسی طرح ہر شک میں ڈالنے والی ہر چیز کا ترک مامور ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو چیز عام لوگوں کیلئے سمجھنا مشکل ہو اور وہ ان کو شک میں مبتلا کرنے والی ہو تو اس کا چھوڑنا بطریق اولیٰ مامور ہے۔ جیسا کہ اس کی طرف حسن بن علی کرم اللہ وجہہ نے اشارہ کیا ہے:

انی لا کتم من علمی جواہرہ

کیلا یری الحق ذوجہل فیفتننا

میں اپنے علم کے بعض جواہرات چھپاتا ہوں، تاکہ جاہل اس کو حق سمجھ کر فتنہ میں نہ پڑے۔

یا رب جوہر علم لو ابوح بہ

لقیل لی انت ممن تعبد الوثنا

بہت سارے علمی جواہرات ایسے ہیں اگر میں ان کو ظاہر کروں تو مجھے کہا جائے گا کہ تو بتوں کی پوجا کرنے والوں میں سے ہے۔

ولا ستحل رجال مسلمون دمی

یرون اقبح ما یأتونہ حسناً

اور مسلمان مرد میرے خون کرنے کو حلال سمجھیں گے، اور وہ اپنے سب سے برے کام کو جو وہ کرتے ہیں، اچھا سمجھیں گے

قولہ: رواہ احمد والترمذی والنسائی وروی الدارمی الفصل الاول :

یعنی امام احمد ترمذی اور نسائی نے مکمل حدیث روایت کی ہے، اور دارمی نے حدیث کا صرف پہلا حصہ (یعنی دَعَا مَا يُرِيْبُكَ اِلٰی مَا لَا يُرِيْبُكَ) نقل کیا ہے۔ اور اس کو فصل کہا ہے اس لئے کہ آخری جملہ کی تفریع پہلے والے جملے پر ہے تو یہ جملے کلام کی دو کھیلوں کی طرح ہوئے۔ اگر چہ ان کے درمیان مکمل ربط ہے۔

۲۷۷۴: وَعَنْ وَاِبْصَةَ بْنِ مَعْبُدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يَا وَاِبْصَةُ جِئْتُ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِيْمِ قُلْتُ نَعَمْ

قَالَ فَجَمَعَ اَصَابِعَهُ فَضْرَبَ بِهَا صَدْرَهُ وَقَالَ اسْتَفْتِ نَفْسَكَ وَاسْتَفْتِ قَلْبَكَ ثَلَاثًا الْبِرُّ مَا اَطْمَآنَتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ

وَاطْمَآنَ اِلَيْهِ الْقَلْبُ وَالْاِيْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ وَاِنَّ اَفْئَاكَ النَّاسُ - (رواه احمد والدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۳۲۰/۱۲ الحدیث رقم ۲۵۳۳۔ واحمد فی المسند ۲۲۸/۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت وایبصہ بن معبد کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: تم نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کرنے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ وایبصہ نے کہا (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو اکٹھا کیا اور میرے سینے پر مار کر فرمایا کہ اپنے نفس سے دریافت کرو۔ اپنے دل سے پوچھو آپ ﷺ نے یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا اور پھر فرمایا کہ ”نیکی وہ ہے جس سے انسان کا نفس اور اس کا دل مطمئن ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھلے اور تیرے سینے میں تردد پیدا کرے اگرچہ لوگ فتویٰ دیں تمہیں۔ (احمد داری)

تشریح: البر: کسرہ کے ساتھ بمعنی ”احسان“ (نیکی) یہ لفظ تمام بھلائیوں کو جامع ہے۔ اور اسی سے اللہ جل شانہ کا یہ

فرمان ہے: ﴿وَلٰكِن الْبِرُّ مِّنْ اِتْقٰنٍ﴾ [البقرہ: ۱۸۹] ”لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے۔“

اور حاصل دونوں کا طاعت اور محصیت ہے۔

فقلت نعم : یہ اعجاز نبوت میں سے ہے اس لئے کہ آپ نے اس کے ضمیر کے اندر کی بات اس کے بات کرنے سے پہلے بتادی۔
فضرب بها صدره : اس میں احتمال ہے کہ ”صدره“ کی ضمیر وابصہ کی طرف بطور التفات لوٹ رہی ہو۔ اور اسی کو امام طیبی نے
یقین کے ساتھ نقل کیا ہے، اور پھر کہا ہے کہ بعض کا کہنا یہ ہے کہ ”صدره“ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے ان کو اس بارے
میں وہم ہوا ہے، کہا ہے کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ وابصہ کے علاوہ کسی اور راوی کا کلام ہو، اور یہ سیاق کے زیادہ موافق ہے، جیسا کہ
گزر ا۔ (اتہلی)۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ انگلیوں کو سینہ پر رکھتا کہ یہ واضح ہو جائے کہ دل سینے میں ہے یعنی اس کے بائیں جانب ہے، اور تاکہ
آپ ﷺ کے دست مبارک کے گلنے سے ان کو آپ کے کلام کی پوری سمجھ حاصل ہو جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ضمیر نبی ﷺ کی طرف
لوٹ رہی ہے، (اتہلی)۔

پس اس صورت میں یہ نظیر ہوگی اس حدیث کی : (ان التقویٰ ہلہنا) یعنی آپ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تقویٰ کا
مقام یہ ہے، واللہ اعلم۔

قوله : استفتت نفسک، استفت قلبک : امام نووی رحمہ اللہ نے صرف دوسرے جملے پر اکتفاء کیا ہے، پس یہاں دونوں کا
یکجا مذکور ہونا تاکید کیلئے ہے، یعنی اپنے دل سے فتویٰ طلب کر۔ اس لئے کہ وہ سلوک میں درجہ کمال تک پہنچ چکا ہے، اور اس نے ”وصول“
کو طلب کیا وصال کی آنکھ سے مقام قلب تک۔

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان کا حق کی طرف چلنا یہ باطن کے ذریعے ہوتا ہے، اگرچہ یہ ظاہر کی مدد سے ہوتا ہے، چونکہ بینات
بدنیہ کا چڑھنا نفس اور دل کے خیر کی طرف اور بینات نفسانیہ اور قلبیہ کا اترنا ظاہر کی طرف، دونوں کے درمیان علاقہ کی وجہ سے۔ ”فتویٰ“
مشتق ہے ”الفتو“ سے اس لئے کہ یہ کسی حادثہ کے جواب میں ہوتا ہے۔ یا کسی حکم کا احداث ہوتا ہے، یا کسی مشکل کا حل ہوتا ہے، (جیسا
کہ مغرب میں ہے) یعنی وہ فتویٰ میں ملاحظہ کرتا ہے وہ چیز جو قوت اور حدوٹ حکم کی خبر دیتی ہے۔

ثالثا : ظرف ہے، قال کیلئے تاکید، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ظرف ہو ”استفت“ کیلئے، اس صورت میں یہ بمنزلہ تکرر استخارہ کے ہوگا۔

قوله : والبر ما اطمأنت الیہ النفس واطمأن الیہ القلب : قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب
سا لک کیلئے کوئی چیز مشکل ہو جائے اور ملتبس ہو جائے اور یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ کس قبیل سے ہے، پس اگر وہ اہل اجتہاد میں سے ہے تو غور و فکر
کرے اور اگر مقلدین میں سے ہے تو مجتہدین سے پوچھے، پس اگر وہ ایسا جواب پائے جس سے اس کے نفس کو سکون حاصل ہو اور دل کو
اطمینان ہو اور اس پر اس کا شرح صدر ہو۔ تو چاہئے کہ اس کو لے لے اور اپنے نفس کیلئے اس کو اختیار کرے، ورنہ تو اس کو چھوڑ دے اور وہ
لے لے جس میں شک و شبہ نہ ہو، یہی تقویٰ اور حقیاط کا راستہ ہے۔ اور اس کا حاصل بھی حسن بن علیؑ کی حدیث سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

اور ممکن ہے کہ ”اطمینان قلب“ کا عطف ”اطمینان نفس“ پر تقدیر اور تاکید کیلئے ہو، چونکہ جب نفس کو کسی معاملے میں تردد ہو اور نفس
اس معاملے میں حیران ہو اور اس کا قرار ختم ہو جائے تو اس کے پیچھے دل دھڑکنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے نفس اور دل جو نفس کا اول
متعلق ہے کے درمیان علاقہ ہے، پس اس ہیئت سے علاقہ دل کی طرف اثر منتقل کر دیتا ہے۔ چنانچہ دل میں دھڑکن اور اضطراب پیدا ہو
جاتا ہے اور پھر کبھی یہ اثر تمام توئی کی طرف سرایت کر جاتا ہے پس یہ اس کے ذریعے حلال اور حرام کو محسوس کرتا ہے، اور جب نفس سے یہ
حالت ختم ہو جائے اور اس میں قرار اور اطمینان پیدا ہو جائے تو معاملہ الٹ ہو جاتا ہے اور حالت تبدیل ہو جاتی ہے اس کے فروغ و اعضاء کی۔

بعض کہتے ہیں اپنے دل سے دریافت کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق ان ارباب بصیرت کے ساتھ ہے جو صحیح غور و فکر کرنے
والے ہیں اور صاحب فراست ہیں پاکیزہ نفوس اور قلوب سلیمہ کے مالک ہیں۔ اس لئے کہ ان کی طبائع خیر و بھلائی کی طرف مائل اور
برائی سے بیزار ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ ہر چیز اپنے مناسب چیز کو جذب کرتی ہے اور مخالف سے نفرت کرتی ہے۔ اور ان کے نفوس اکثر

احوال میں ان کو درست بات کا الہام کرتے ہیں۔ علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ قول اگرچہ مستبعد نہیں، لیکن حدیث کو اس کے عموم کے اعتبار سے ان پر محمول کرنا حاق و اہدی ہے جن میں تقویٰ ہے اور دین کے دائرہ نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں ”نفس“ لغت میں ”حقیقۃً لشیء کو“ کہتے ہیں۔ اور اصطلاح میں وہ جو ہر لطیف جو جسم میں روح کے بدن کے ساتھ ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور دونوں کا اتصال معاً ہوتا ہے۔

حاک: یہ حاک بیحک سے ہے، اور زختری فرماتے ہیں کہ ”حک“ کاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یعنی اس میں اثر کرے اور قرآن پکڑے، اور ”مفاتیح“ میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے دل میں اثر کرے یا تجھے پریشان کرے کہ یہ گناہ ہے، اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: ان الاثم ما حاک فی نفسک و کرہت ان یطلع علیہ الناس“ بیشک گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور تو اس پر لوگوں کے مطلع ہونے کو ناپسند کرتے۔“
و تردد فی الصدر: یعنی اس کیلئے سینہ نہ کھلے۔ یہ حالت اس شخص کی ہوتی ہے جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کیلئے کھولا ہو۔ وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر ہوتا ہے۔

وان افناک الناس: یعنی اگرچہ لوگ آپ سے کہیں کہ یہ حق ہے، تو آپ ان کی بات کو نہ لیں اس لئے کہ یہ کبھی غلطی اور اکل مشتبہ میں مبتلا کر دیتی ہے جیسا کہ آپ کسی شخص کو دیکھیں جس کے پاس حلال اور حرام مال ہو، پس آپ اس سے کچھ نہ لیں اگرچہ مفتی آپ کو فتویٰ دے دے، کہ کہیں آپ حرام کھالیں، اس لئے کہ فتویٰ اور چیز ہے اور تقویٰ اور چیز ہے۔ یہ جملہ شرطیہ ہے اس کو جزاء سے کاٹا گیا ہے، کلام سابق کو تمام کرنے اور مضبوط کرنے کیلئے مبالغہ کے طور پر۔ حدیث اربعین میں یہ لفظ زیادہ ہے: ”وافتوک“ یہ تاکید کے طور پر ہے، اور اسی مضمون کے بارے میں بعض ارباب معنی نے یہ اشعار پڑھے ہیں:

اتخذ	طاعة	الاله	سیلا
تجد	الفوز	بالجنان	وتنجو
”تواللہ کی فرمانبرداری کو راستہ بنا، جنت کی کامیابی اور نجات پالے گا۔“			
واترك	الاثم	والفواحش	طرا
یؤتک	الله	ما	یدوم
وینجو			

”اور چھوڑ دے گناہ اور فواحش سب کے سب اللہ تجھے وہ دے دیگا جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اور نجات دے گا۔“

اسنادی حیثیت: امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

۴۷۷۵: وَعَنْ عَطِيَّةِ السَّعْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهِ حَذْرًا لِمَا بِهِ بَأْسٌ (رواه الترمذی وابن ماجہ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۰۷/۴ الحدیث رقم ۲۴۵۱۔ وابن ماجہ ۱۴۰۹/۲ الحدیث رقم ۴۲۱۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت عطیہ سعدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”بندہ اس وقت تک (کامل) متقی و پرہیزگاروں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو ترک نہ کر دے جن میں کوئی قباحت نہیں ہے تاکہ اس طرح وہ ان چیزوں سے بچ سکتے جن میں قباحت ہے۔“ (ترمذی ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

عطیہ بن قیس۔ یہ عطیہ بن قیس ”سعدی“ ہیں۔ ”سعدی“ قبیلہ بنو سعد کی طرف منسوب ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے

آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ احادیث مبارکہ سنیں اور آگے بھی پہنچائیں۔ اہل یمن اور اہل شام ان سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: لا یبلغ العبد ان یکون۔ حذراً: مفعول لہ ہے، امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”ان یکون“ ظرف ہے ”یبلغ“ کیلئے بقدر مضاف الی ”درجہ المتقین“ اور ”متقی“ ازروئے لغت صیغہ اسم فاعل ہے، عرب کے اس قول سے مشتق ہے: وقاہ فاتقی۔ اور ”الوقایہ“ انتہائی حفاظت کو کہتے ہیں۔ اور شریعت میں متقی کہتے ہیں جو اپنے آپ کو دوسرے ایسی چیزوں سے جن کے کرنے یا نہ کرنے سے عذاب کا مستحق ہو، بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں:

اول: شرک ہے اجتناب۔ چنانچہ جو بندہ شرک سے بچتا ہے وہ دائمی عذاب سے نجات پاتا ہے۔ اس آیت کریمہ: ﴿والز مهم کلمۃ النقی﴾ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا، میں یہی درجہ مراد ہے۔

دوم: ہر وہ کام جس کے کرنے یا نہ کرنے سے آدمی گناہ گار ہوتا ہو اس سے بچنا یہاں تک کہ بعض کے ہاں صغیرہ گناہوں سے بھی اجتناب اس میں داخل ہے، چنانچہ تقویٰ کی جو مشہور شرعی اصطلاح ہے اس کا اطلاق اسی درجہ پر ہوتا ہے، اور اس آیت کریمہ: ﴿ولو ان اهل القرى امنوا واتقوا﴾ [الاعراف - ۹۶] اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے، میں یہی درجہ مراد ہے۔ سوم: ہر اس چیز سے جس میں پڑنے سے اس کا باطن حق سے مشغول ہو جائے، پرہیز کرنا اور مکمل توجہ کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہونا یہی حقیقی تقویٰ ہے، اور اللہ کے اس فرمان میں یہ مطلوب ہے: ﴿اتقوا الله حق تقاته﴾ [آل عمران - ۱۰۲] ”اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو، جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔“

حدیث سے اگرچہ تقویٰ کے دوسرے درجے کیلئے استشہاد کیا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس سے درجہ سوم مراد ہو، واللہ تعالیٰ اعلم۔ اور یہ حدیث تقویٰ کے بارے میں پہلی دو حدیثوں کے مقابلے میں زیادہ بلیغ اور جامع ہے۔

۲۷۷۶: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي الْخَمْرِ عَشْرَةَ عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمُحْمُولَةَ إِلَيْهِ وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَآكِلَ ثَمَنِهَا وَالْمُسْتَرَى لَهَا وَالْمُسْتَرَى لَهَا۔ (رواه الترمذی وابن ماجہ)

احرجہ الترمذی فی السنن ۵۸۹۱۳ الحدیث رقم ۱۲۹۵۔ وابن ماجہ فی ۱۱۲۲/۲ الحدیث رقم ۳۳۸۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کے معاملہ میں ان دس قسم کے آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے (۱) شراب کشید کرنے والے پر (۲) شراب کشید کرانے والے پر (۳) شراب پینے والے پر (۴) شراب اٹھانے والے پر یعنی وہ شخص جو کسی کو شراب اٹھا کر دے (۵) شراب اٹھوانے والے پر جو کسی کو شراب اٹھالانے کا حکم دے (۶) شراب پلانے والے پر (۷) شراب بیچنے والے پر (۸) شراب کی قیمت کھانے والے پر (۹) شراب خریدنے والے پر (یعنی وہ شخص جو کسی دوسرے کے پینے کے لئے یا اس کی تجارت کے لئے بطریق وکالت یا بطریق ولایت شراب خریدے) (۱۰) جس کے لئے شراب خریدی جائے یعنی وہ شخص جو کسی دوسرے سے اپنے پینے یا اپنی تجارت کے لئے شراب خرید کر منگوائے۔“ (ترمذی ابن ماجہ)

تشریح: قوله: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الخمر: ظرفیت مجازی ہے، یا تعلیلیہ ہے، ای فی شأنها أو لأجلها ”عشرة“ اس کی تیز محذوف ہے۔ ای عشرة اشخاص۔

عاصرها: نصب کے ساتھ مفعول بہ سے بدل ہے،

المحمولة اليه: اصل میں یہ عبارت ”المحمولة هي“ تھی۔ لیکن ”هي“ کو حذف کیا ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ اس کا حذف جائز ہے جب التباس کا خطرہ نہ ہو۔

بائعها: ہمزہ کے ساتھ یعنی اس کا سودا کرنے والا، اگرچہ وہ کسی کا وکیل یا دلال ہو۔

والمسترى له: یعنی پینے کیلئے، یا تجارت کیلئے وکالت کے ساتھ ہو یا اس کے علاوہ خریدے۔

لام تعد یہ کیلئے ہے، یا لام زائد ہے مفعول میں تقویت پیدا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔

والمشترای له: صیغہ مفعول کے ساتھ ہے، یعنی جس کیلئے خریدا جائے وکالت کے طور پر، اور ظاہر میں تو ”والمشترای له“ کہنا چاہیے تھا لیکن ”مشرای له“ سے تا کا حذف کرنا ایک لغت ہے جیسا کہ تسہیل وغیرہ میں ذکر ہے:

اور اسی سے ہے انارة العقل مکسوف بطوع ہوی۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ شمر کو مذکر لانا اس کے مترادفات کے اعتبار سے ہو کہ وہ مذکر ہیں۔ مثلاً العقار، الراح اور المدام وغیرہ یا معنی کے اعتبار سے اس کو مذکر لایا گیا ہے، یعنی مشروب کے معنی میں ہونے کی وجہ سے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ تذکیر شمر بھی ایک لغت ہے۔ لیکن تعجب ہے شرح پر کہ انہوں نے اس کی طرف کسی قسم کی توجیہ ہی نہیں دی حالانکہ صحیحہ اور اصول معتدہ میں اس کو اسی طرح ضبط کیا ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ نے لعنت فرمائی ہے اس شخص پر جس نے کسی بھی قسم کی سعی کی اس میں اس طریقے پر جو اوپر گئے گئے ہیں کشید کرنے والا اور کشید کروانے والا اور جوان کے بعد ذکر کئے ہیں۔ اور اس کو تفصیل سے اس لئے ذکر کیا تا کہ یہ شامل ہو ہر اس شخص کو جس نے کسی بھی قسم کی کوشش کی۔ اور جس نے شراب نچوڑنے والے کو انگور بیچے اور جس نے اس کی قیمت لی وہ زیادہ حقدار ہے لعنت کے، اسلئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جب ان پر شراب حرام کی گئی تو انہوں نے شراب کی اصل یعنی انگور کو بیچا ان لوگوں پر جن کے بارے میں انکو معلوم ہے کہ یہ اس سے شراب کشید کریں گے اور کوئی بعید نہیں کہ یہ بھی انکی طرح ہوں جن کے بارے میں کہا گیا ہے: قاتل اللہ الیہود حرمت علیہم الشحوم فجملوها و باعوها ”اللہ تباہ کر دے یہود کو کہ ان پر چربی حرام کی گئی تو انہوں نے اس کو پگھلا کر بیچا۔

۲۷۷۷: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَعَنَ اللَّهُ الْخُمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا

وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُولَةَ إِلَيْهِ. (رواه ابو داود وابن ماجه)

اخرجه ابو داود في السنن ۸۱/۴ الحديث رقم ۳۶۷۴ وابن ماجه في ۱۱۲۱/۲ الحديث رقم ۳۳۸۰ واحمد في المسند ۲۵/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے شراب پر شراب پینے والے پر شراب بیچنے والے پر شراب خریدنے والے پر شراب کشید کرنے والے پر شراب کشید کرانے والے پر شراب اٹھانے والے پر شراب اٹھوانے والے پر لعنت فرمائی ہے“۔ (ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: قوله: لعن الله الخمر: یعنی شراب کی ذات پر اس لئے کہ یہ ام الخبائث ہے۔ یہ مبالغہ گہا ہے اس سے نفرت پیدا کرنے کیلئے تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں شراب سے مراد وہ شخص ہو جو شراب کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال کھاتا ہو۔

وشاربها وساقیها: ساتی کو مؤخر ذکر کیا ہے چونکہ شراب پینے میں اس کا رتبہ آخری ہوتا ہے۔

۲۷۷۸: وَعَنْ مُحَيِّصَةَ أَنَّهَا سَأَلَتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فِي أُجْرَةِ الْحَجَّامِ فَهَاهُ فَلَمْ يَزَلْ يَسْتَأْذِنُهَا حَتَّى قَالَ

أَعْلَفَهُ نَاصِحَكَ وَأَطْعَمَهُ رَقِيقَكَ (رواه مالك والترمذی و ابو داود وابن ماجه)

اخرجه ابو داود في السنن ۷۰/۳ الحديث رقم ۳۴۲۲۔ والترمذی في ۵۷۵/۳ الحديث رقم ۱۲۷۷۔ واحمد في المسند

۔ ۴۳۵/۵

ترجمہ: ”اور حضرت محیصہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پچھنے لگانے والے کی کمائی کے بارے میں کھانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے انہیں منع فرمایا چنانچہ وہ آپ ﷺ سے بار بار اجازت طلب کرتے رہے تو یہاں تک کہ آپ ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا کہ اس کمائی کا مال اپنے اونٹ کو کھلا دیا اپنے بردہ (غلام یا لونڈی) کو کھلا دو۔“

(مالک ترمذی، ابو داؤد ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

حویصتہ - یہ حویصہ مسعود بن کعب انصاری حارثی کے بیٹے اور حویصہ کے بھائی ہیں۔ ”حویصہ“ اپنے بھائی حویصہ سے عمر میں بڑے ہیں۔ لیکن اسلام ”حویصہ“ کے بعد لائے ہیں۔ غزوہ احد، غزوہ خندق اور ان کے بعد غزوات میں شریک رہے ہیں۔ محمد بن سہل وغیرہ محدثین نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔ ”حویصہ“ حاء کے پیش واؤ کے زبر بڑے تھائی مشد مکسور اور صاد غیر منقوٹہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ نبی تنزیہی ہے، گھٹیا پیشہ کے ختم کرنے کیلئے یہ نبی فرمائی اور وکرام اخلاق اور کمال ہستی کی ترغیب دی، کیونکہ اگر یہ حرام ہوتا تو پھر اس میں آزاد اور غلام کا فرق نہ کرتے۔ اس لئے کہ آقا کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے غلام کو حرام مال کھلائے۔

فلم یزل یستأذنه: کہ اکثر صحابہ کی ملکیت میں غلاموں کی ایک بڑی تعداد تھی اور وہ ان کی کمائی کھایا کرتے تھے، اور اس کو سب زیادہ پاک کمائی شمار کرتے تھے، پس جب حویصہ نے اس نبی کے بارے میں سنا تو ان پر یہ بات بہت دشوار گزری۔ کیونکہ اس کو بچھنے لگانے کی اجرت استعمال کرنے کی بہت ضرورت تھی، اس لئے انہوں نے بار بار آپ سے اجازت طلب کی۔

اعلفه: ہمزہ وصل کے ساتھ اور لام کے کسرے کے ساتھ مطلب یہ ہے کہ اس کا چارہ بنا دو۔

”ناضح“: اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے ذریعے پانی لایا جاتا ہو۔

واطمعہ رقیقک: یعنی اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو کھلانے کی اجازت مرحمت فرمائی کیونکہ لونڈی اور غلام ایسا شرف نہیں رکھتے جو اس پیشہ کی اناء کے منافی ہو، بخلاف آزاد لوگوں کے۔ آزاد لوگوں کیلئے اس کمائی کی حرمت کے بارے میں یہ حدیث ظاہر ہے، لیکن اجماع اس بات پر ہے کہ آزاد کیلئے اس کا استعمال جائز ہے، لہذا اس نبی کو مکروہ تنزیہی پر حمل کیا جائے گا۔ (اس طرح ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔)

۲۷۷۹: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَكَسْبِ الزَّمَارَةِ.

(رواہ فی شرح السنۃ)

اخرجه البغوی فی شرح السنۃ ۲۲۱۸ الحدیث رقم ۲۰۳۸۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت اور گانے والیوں (گلوکارہ یا بدکارہ عورت) کی کمائی (کھانے) سے منع فرمایا ہے۔“ (شرح السنۃ)

حالاتِ راوی:

حویصتہ بن مسعود - یہ ”حویصہ“ ہیں۔ مسعود کے بیٹے ہیں۔ اور انصاری و حارثی ہیں۔ اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان میں ہی ان کی حدیثیں ملتی ہیں۔ غزوہ احد، غزوہ خندق اور اس کے بعد دیگر غزوات حاضر و شریک ہوئے ان سے ان کے بیٹے ”سعد“ نے روایت کی۔ حویصہ میں میم پر پیش اور حاء غیر منقوٹہ پر زبر اور یاء مشد کے نیچے زبر اور صاد غیر منقوٹہ پر زبر ہے۔

تشریح: قاموس میں لکھتے ہیں حویصہ اور حویصہ میں صاد مشد ہے۔ یہ دونوں مسعود کے بیٹے ہیں۔ دونوں صحابی ہیں۔ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ مؤطا کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ یاء مکسورہ کے ساتھ پڑھنا زیادہ مشہور لغت ہے۔ ”القریب“ میں ہے کہ ان دونوں اسماء میں یاء مشد مکسور اور ساکن مخفف دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ البتہ تشدید زیادہ مشہور ہے۔ تصحیح شدہ متن کے نسخوں اور اصول میں بھی اسی طرح ضبط کیا گیا ہے۔

قولہ: نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ثمن الكلب وکسب الزمارۃ:

”الزمارۃ“ زاء کے فتح اور میم کے شد کے ساتھ بدکار عورت کو کہتے ہیں۔ یہ مشتق ہے: ”زمرت فلانا بكذا ای اغربته سے۔ اس لئے کہ بدکار عورت مردوں کو فحاشی کے لئے درغلائی ہے اور ان کو اپنے آپ پر فریفتہ کرتی ہے یا یہ مشتق ہے ”زمرت القربة ای ملائتها سے، جا کا مطلب ہے بھرنّا، پس زانیہ بھی اپنے رحم کو مختلف نطفوں سے بھرتی ہے، یا اس لئے کہ وہ لوگوں کی ایک جماعت سے مباشرت کرتی ہے۔ (اسی طرح میرک نے زین العرب سے نقل کیا ہے۔)

اور اس سے ابو عبید کا وہ اعتراض بھی ختم ہو گیا جو انہوں نے اس حدیث کی تفسیر میں کیا ہے۔ ”زمارۃ“ بمعنی زانیہ ہے اور یہ میں نے اس حدیث کے علاوہ کہیں نہیں سنا ہے۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس چیز سے لیا گیا ہے۔

ہروی نے ازہری سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے یہ نبی گانے والی عورت کی کمائی سے ہو۔ کہا جاتا ہے ”غناء زمیر“ ای حسن۔ اور کہا جاتا ہے ”زمر ای غنی اور کہا جاتا ہے: ”زمر الرجل“، جب وہ بانسری بجائے۔ اور عورت کو ”زمارۃ“ کہا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ”زمارۃ“ سے مراد وہ عورت ہے جو بانسری بجاتی ہے اور یہ حرام ہے، اسلئے کہ بانسری بجانا شرابیوں کا شیوہ ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ ”زانیہ“ کا نام ”زمارۃ“ رکھا اس لئے کہ اس برے فعل میں مشہور پیشہ ور بدکار عورتیں عام طور پر لگوا کر بھی ہوتی ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس لفظ میں صحیح یہ ہے کہ زاء معجم سے پہلے رائے مہملہ ہے یعنی ”رمازۃ“ ہے، وہ عورت جو ہونٹوں اور آنکھوں سے اشارہ کرتی ہے۔ اور بدکار عورتیں بھی اس طرح کرتی ہیں شاعر کہتا ہے:

رمزت الی مخافة من بعلها
من غیر ان یبدو هناك کلامها

میری طرف آنکھوں سے اشارہ کیا بوجہ شوہر سے ڈرنے کے، بغیر اس کے کہ وہاں اس کا کلام ظاہر ہو۔

۲۷۸۰: وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَبِيعُوا الْقَيْنَاتِ وَلَا تَشْتَرُوهُنَّ وَلَا تَعْلَمُوهُنَّ وَتَمْنَهُنَّ حَرَامٌ وَفِي مِثْلِ هَذَا أَنْزَلْتُ وَمَنْ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهُوَ الْحَدِيثِ (رواه احمد والترمذی وابن ماجه وقال الترمذی هذا حدیث غریب وعلی بن یزید الراوی یضعف فی الحدیث و مستذکر حدیث جابر) نَهَى عَنْ أَكْلِ الْهَبْرِ فِي بَابِ مَا يَحِلُّ أَكْلُهُ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى . (احمد بن حنبل، مسند)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۷۹/۳ الحدیث رقم ۱۲۸۲ وابن ماجه فی ۷۳۳/۲ الحدیث رقم ۲۱۶۸۔ واحمد فی المسند ۲۶۴/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گانے والی لونڈیوں کو نہ بیچو نہ ان کو خریدو اور نہ لونڈیوں کو (گانا سکھانے کی تربیت دو) اور ان (گانے والی لونڈیوں) کی قیمت حرام ہے، اور اسی سلسلہ میں (یعنی گانے والیوں کو خریدنے کی مذمت میں) یہ آیت نازل ہوئی: وَمَنْ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهُوَ الْحَدِيثِ، یعنی اور انسانوں میں بعض ایسے (نادان و غلط کار) لوگ بھی ہیں جو بیبہودہ باتیں خریدتے ہیں“۔ (احمد ترمذی ابن ماجہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی علی بن یزید روایت حدیث کے سلسلہ میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔ ہم جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث آپ ﷺ نے بلی کھانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ باب ما یحل اکلہ میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ

تشریح: ”القینات“: قاف کے فتح اور یاء کے سکون کے ساتھ۔ صحاح میں ہے کہ ”قین“ لونڈی کو کہتے ہیں چاہے گاتی ہو یا نہ گاتی ہو۔ علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ حدیث میں مراد گانے والی ہے اس لئے کہ اگر وہ گانے والی نہیں ہے تو اس کی خرید و فروخت سے

منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

و ثمنہن حرام : بعض علماء نے حدیث کے ظاہری الفاظ کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ گانے والی لونڈیوں کو بیچنا جائز نہیں ہے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی مقصود ہے اس خرید و فروخت پر جو گانے کی وجہ سے ہو، اور اس کی قیمت کی حرمت اس کی بیع کے فاسد ہونے کی دلیل ہے اور جمہور نے اس کی بیع صحیح قرار دی ہے۔ اور حدیث بوجہ طعن اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ ان کے گانے سے حاصل ہونے والی اجرت مال حرام ہے، جیسا کہ کسی شراب بنانے والے کے ہاتھ لگو فروخت کئے جائیں تو اس سے حاصل ہونے والی اجرت مال حرام کے حکم میں ہے اس لئے کہ یہ حرام کے حصول کی طرف پہنچاتا ہے اور مدد کرنا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ اس کا بیچنا صحیح نہیں ہے (انتہی) اب ملک نے بھی اس کے مطابق ہی مطلب بیان کیا ہے۔

نزلت : اور ایک نسخہ میں ”انزلت“ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ : اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو ان باتوں کے خریدار بنتے ہیں جو غافل کرنے والی ہیں۔ یعنی خریدتے ہیں گانے، گیت اور حرام آوازیں جو ذکر اللہ سے باز رکھیں۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ”لہو“ کی اضافت بمعنی ”من“ بیان کیلتے ہے، جیسے ”جبة خنز و باب ساج“ میں ہے۔ آیت کے تقدیری عبارت یوں ہے: يشتري اللہو من الحدیث۔ اس لئے کہ کھیل باتوں کے قبیل سے بھی ہوتا ہے اور اس کے علاوہ سے بھی اور ”الحدیث“ سے مراد بری باتیں ہیں۔ پس اس میں داخل ہیں، جھوٹی کہانیاں بے اصل باتیں اور خرافات، ٹھٹھے کی باتیں گانا، موسیقی سیکھنا اور اس قسم کے دیگر فضول و لغو کلام۔ اس آیت کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ ایک شخص نصر بن حارث تھا جو گانے والی لونڈیاں اس مقصد سے خریدتا تھا کہ ان کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ کرے اس کی مذمت میں یہ آیت نازل ہوئی۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اضافت بمعنی ”من“ ہے اور یہ ”من“ تبیینیہ ہے اگر ”الحدیث“ سے مراد ”الممکنر“ ہو، اور تبعیضیہ ہے اگر ”الحدیث“ سے مراد عام ہو۔ کہا گیا ہے کہ نصر بن حارث نے عجیبوں کی لکھی ہوئی کتابیں خریدی تھی جن کو پڑھ کر قریش کو سنایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ محمد، تو تمہارے سامنے قوم عاد و ثمود کے قصص بیان کرتے ہیں اور میں تمہارے سامنے رستم اور اسفندیار بادشاہوں کی کہانیاں سناتا ہوں، تو اللہ نے یہ آیت اس کی مذمت میں نازل فرمائی۔

بعض کہتے ہیں وہ گانے والی لونڈیاں خریدتا تھا اور ان کو ان لوگوں کے ساتھ معاشرت پر ابھارتا تھا جو اسلام لانے کا ارادہ کرتے اور اس طرح ان کو اسلام سے روکتا لیصل عن سبیل اللہ یعنی اللہ کے دین سے یا اللہ کی کتاب کے پڑھنے سے۔ ابن کثیر ابو عمرو نے ”لیصل“ یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے تو اس صورت میں معنی ہوگا تاکہ وہ اپنی گمراہی پر برقرار رہے اور گمراہی میں اور زیادہ بڑھ جائے لیصل میں لام ”بغیر علم“ کی عاقبت کیلتے ہے۔

یعنی جو خرید رہا ہے اس کی حالت پر یا تجارت کی حالت کا علم اس کو نہ تھا، کہ اس نے قرآن پڑھنے کے مقابلے میں کھیل لیا۔ ”وینخذھا“ میں ضمیر منسوب کا مرجع ”سبیل“ ہے۔

”هزوا“ بمعنی سخریہ ہے۔ اور اس کا عطف ”یشتري“ پر ہے حمزہ، کما فی اور حفص نے لیصل پر عطف کرتے ہوئے اس کو منصوب پڑھا ہے [اولئك لهم عذاب مهين] [القمان: ۶۷] ”ایسے لوگوں کے لئے ذلت کا عذاب ہے“ بوجہ حق کی توہین کرنے اور باطل کو حق پر ترجیح دینے کے۔

www.KitaboSunnat.com

قوله: قال الترمذی هذا حدیث غریب و علی بن یزید الراوی ویضعف فی الحدیث :

یضعف : تشدید کے ساتھ ہے یعنی اس کو ضعف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

قوله: و سنذکر حدیث جابر : نَهَى عَنْ أَكْلِ الْهَبْرِ فِي بَابِ مَا يَحِلُّ أَكْلُهُ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى :

یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث: ”نہی عن اکل الہر کو صاحب مصابیح نے اس باب میں ذکر کیا ہے، ہم اس حدیث کو ”باب ما یحل اکلہ“ میں ذکر کریں گے، اس لئے کہ وہ حدیث معنی کے اعتبار سے اس باب کے زیادہ مناسب ہے۔

الفصل الثالث:

۲۷۸۱: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان ۶/ ۴۴۰ الحدیث رقم ۸۷۴۱۔

ترجمہ: ”عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: حلال روزی کما فرض کے بعد ایک فرض ہے۔“ (تبیحی)

تشریح: عن عبد اللہ بن مسعود: ملا علی قاریؒ نے نسخہ میں صرف ”عبداللہ“ ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ سے مراد

ابن مسعود ہیں جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے۔

کسب الحلال فریضہ: یعنی کمانا اس شخص پر فرض ہے جو اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کی کفالت کیلئے کمانی کا محتاج ہو، اور حلال کمانی سے مراد وہ روزی ہے جس کا حرام نہ ہونا یقینی ہوتا کہ یہ مال مشتبہ کو بھی شامل ہو جائے کیونکہ احادیث میں مشتبہ سے پرہیز کا حکم محض احتیاط کے طور پر ہے، فرض ہونے کے طور پر نہیں ہے، نیز اس حدیث میں جو حلال روزی کمانے کو فرض کہا گیا ہے اس کا مخاطب ہر شخص بذات نہیں ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں کی ضروریات زندگی کی کفالت دوسروں پر واجب ہوتی ہے۔

بعد الفریضہ: یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ حلال روزی کا کمانا نماز، روزہ، حج وغیرہ کی طرح فرض نہیں ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ یہ فرض ہے اس عام فرض کے بعد جو ہر مکلف پر بعد لازم ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فرض متعاقب ہے کہ بعض فرائض بعض کے بعد آتے ہیں اس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ اس لئے کہ حلال کمانی ورع کی اصل اور تقویٰ کی بنیاد ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے، اور دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت انسؓ سے مروعا یوں روایت کیا ہے: ”طلب الحلال واجب علی کل مسلم“۔

۲۷۸۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ سئِلَ عَنْ أُجْرَةِ كِتَابَةِ الْمُصْحَفِ فَقَالَ لَا بَأْسَ إِنَّمَا هُمْ مُصَوِّرُونَ وَإِنَّهُمْ إِنَّمَا

يَاكُلُونَ مِنْ عَمَلِ آيِدِيهِمْ - (رواہ رزین)

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے کتابت قرآن کی اجرت سے متعلق حکم دریافت کیا گیا (کہ کتابت قرآن کی اجرت کھانا جائز ہے یا نہیں؟) تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ کاتب لوگ تو صرف نقش

کھینچنے والے ہیں اور وہ تو اپنے ہاتھوں کی کمانی ہی کھاتے ہیں۔“ (رزین)

تشریح: قوله: عن ابن عباس انه سئل عن اجرة كتابة المصحف: یعنی کتابت قرآن کی اجرت کے لینے کے

بارے میں پوچھا باوجودیکہ قرآن اللہ کی صفت قدیم ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ قرآن کا اطلاق جیسے اس صفت پر ہوتا ہے اسی طرح اس کا اطلاق دو گتوں کے درمیان موجود نقوش پر بھی ہوتا ہے۔ پس وہ ان نقوش کی اجرت لیتے ہیں جو اس صفت پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی لئے تو عبداللہ بن عباس نے اگلی بات نرمائی کہ وہ محض حروف کے نقش بنانے والے ہیں۔ امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ ”صورة“ ہیئت اور نقش کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد نقش ہے، اور ”انما“ مجموع پر دلالت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ اس نے نقش کو ثابت کیا اور منقوش کی نفی کی، قرآن قرآۃ اور مقروء کے مجموعہ کا نام ہے، یا کتابت اور مکتوب کے مجموعہ کا نام ہے۔ پس ”مکتوب“ اور ”مقروء“ قدیم ہے، اور کتابت اور قرآۃ قدیم نہیں ہے، اس لئے کہ یہ قاری اور کاتب کے افعال ہیں، پس جب سائل نے دیکھا مقروء اور مکتوب کے معنی میں باہم تمیز کو اور اس بات کو کہ بیشک وہ دونوں انسان کی صفات میں سے ہیں، تو اس کو جائز قرار دیا۔

٢٤٨٣: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَيُّ الْكُسْبِ أَطْيَبُ قَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ
وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ - (رواه احمد)

اخرجه احمد في المسند ١٤١/٤ -

ترجمہ: ”اور حضرت رافع بن خدیج راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ کوئی کمائی پاکیزہ ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور ہر وہ تجارت جو مقبول (یعنی شرعی اصول و قواعد کے مطابق) ہو۔“ (احمد)

تشریح: ای الکسب: یہاں مضاف محذوف ہے۔ ای ای انواع الکسب یعنی اس کی انواع میں سے کوئی نوع زیادہ اچھی اور پاکیزہ ہے۔ زراعت، تجارت، کتابت، اور صنعت۔

وکل بوع مبرور: جر کے ساتھ صفت ہے ”بوع“ کی۔ اور ”کل“ کا عطف ”عمل“ پر ہے۔ اور مبرور سے مراد یہ ہے کہ وہ دھوکے اور خیانت سے پاک ہو، یا مراد یہ ہے کہ جو شریعت میں مقبول ہو، یاں طور کہ نہ فاسد ہو، نہ خبیث ہو یعنی ردی نہ ہو قصہ مختصر یہ کہ شرعی اصول و ضوابط کے مطابق ہو۔ یا مطلب یہ ہے کہ عند اللہ مقبول ہو یاں طور کہ باعث ثواب ہو۔

٢٤٨٣: وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ بْنِ أَبِي مَرْيَمَ قَالَ كَانَتْ لِمَقْدَامِ بْنِ مَعْدِي كَرِبَ جَارِيَةٌ تَبِيعُ اللَّبَنَ وَيَقْبِضُ
الْمِقْدَامُ ثَمَنَهُ فَقِيلَ لَهُ سُبْحَانَ اللَّهِ أَتَبِيعُ اللَّبَنَ وَتَقْبِضُ الثَّمَنَ فَقَالَ نَعَمْ وَمَا بَأْسَ بِذَلِكَ سَمِعْتُ رَسُولَ
اللَّهِ ﷺ يَقُولُ لِيَا تَيْنَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَنْفَعُ فِيهِ إِلَّا الدِّينَارُ وَالدِّرْهَمُ -

اخرجه احمد في المسند ١٣٣/٤ -

ترجمہ: ”اور حضرت ابوبکر بن مریم (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت مقدام بن معدی کرب (صحابی) کی ایک باندی (ان کے گھر کے جانوروں کا) دودھ پچا کرتی تھی اور مقدام اس سے (دودھ کی حاصل ہونے والی) قیمت لے لیا کرتے تھے۔ چنانچہ (ایک روز) مقدام سے کسی نے کہا کہ سبحان اللہ! (کتنی عجیب بات ہے کہ) وہ باندی دودھ پچتی ہے اور تم اس کی قیمت لے لیتے ہو؟ مقدام نے کہا جی ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں درہم و دینار کے علاوہ کوئی چیز نفع نہیں دے گی۔“ (احمد)

تشریح: قیل له، سبحان اللہ: یہ تعجب، اور تنزیہ کے طور پر کہا۔ (اور یہ آپ جیسے کی شان کے لائق نہیں ہے۔) تبیع: ضمیر مستتر ”الجارية“ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اللبن یعنی وہ آپ کی موجودگی میں دودھ پچ رہی ہے اور آپ اس کے پاس چوکیدار کی طرح کھڑے ہیں۔ تقبض: فاعل اس میں مستتر ضمیر ”انت“ ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہو سکتا ہے کہ حدیث میں ”تبیع“ کی نسبت لونڈی کی طرف حقیقہً ہو (اس صورت میں مطلب یہ ہوگا) کہ کہنے والے نے لونڈی کے بیچنے اور مقدام کے اس کی قیمت کو قبضہ کرنے کو برا سمجھا۔ تو یہاں اس کی نکیر اس پیشہ کے گھٹیا ہونے کے اعتبار سے ہے، یعنی آپ ایک گھٹیا لونڈی کے ایک گھٹیا کام کرنے پر راضی ہے کہ تو اس کی قیمت لیتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ تبیع کی نسبت مقدام کی طرف ہو مجازاً اس صورت میں کہنے والی کی نکیر اس بیچنے اور ان کے قیمت وصول کرنے پر ہوگی۔

فقال نعم: یعنی بات ایسے ہی ہے۔ (وما بأس: اور اس میں کوئی مضا نفعہ نہیں ہے۔ چونکہ کہ اس میں شرعی اعتبار سے کوئی نقص نہیں ہے، اس لئے کہ نہ تو یہ حرام ہے اور نہ مکروہ ہے، یہ مطلب اس وقت ہوگا کہ جب ”وما بأس“ حرمت اور کراہت دونوں کی نفی کیلئے ہو، اور ”ما“ بمعنی ”لیس“ ہو، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ بأس اس کی وجہ سے مرفوع ہو، اور ”ما“ بمعنی ”لا“ نفی جنس کے لئے نہ ہو۔

قوله: لیا تین علی الناس زمان لا ینفع فیہ الا الدینار و الدرهم: یعنی مال جس کو دینار اور درہم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس لئے کہ یہ دونوں اصل ہیں، اور مراد یہاں اس کی کمائی اور جمع کرنا ہے جس طریقے سے بھی ہو۔ اس لئے کہ جب اس زمانے کے لوگوں پر دین کے اعتبار سے نقص غالب ہوگا تو وہ اہل علم و کمال کی قدر و منزلت کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے بلکہ مالداروں کی خدمت کریں گے، اور اہل اللہ ان سے بالکل یہ اعراض کریں گے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ لوگوں کو صرف کمائی فائدہ دے گی اگر اس کو چھوڑ دیں تو حرام میں پڑ جائیں گے، جیسا کہ بعض علماء سے مروی ہے۔ چنانچہ کسی عالم سے کہا گیا کہ یہ کمائی تجھے دنیا کے قریب کر رہی ہے، فرمایا مجھے دنیا کے قریب نہیں کر رہی ہے بلکہ دنیا سے بچا رہی ہے اور سلف آپس میں ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ تجارت کرو اور کماد اس لئے کہ تم ایک ایسے زمانے میں ہو کہ جب تم سے کوئی محتاج اور تنگ دست ہوگا تو سب سے پہلے اپنے دین کو کھاجائے گا۔

اور سفیان ثوریؒ سے روایت کیا گیا ہے کہ ان کے پاس کچھ پونجی تھی وہ اس کو الٹ پلٹ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو بنو عباس مجھے رومال بنا کر مجھ سے اپنا میل کچل صاف کرتے۔

۲۷۸۵: وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ أَجْهَظُ إِلَى الشَّامِ وَالِي مِصْرَ فَجَهَّزْتُ إِلَى الْعِرَاقِ فَأْتَيْتُ أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ عَائِشَةَ فَقُلْتُ لَهَا يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ كُنْتُ أَجْهَظُ إِلَى الشَّامِ فَجَهَّزْتُ إِلَى الْعِرَاقِ فَقَالَتْ لَا تَفْعَلِ مَالِكُ وَلَمْتَجَرِكُ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِذَا سَبَّ اللَّهُ لِأَحَدِكُمْ رِزْقًا مِنْ وَجْهِ فَلَا يَدْعُهُ حَتَّى يَتَغَيَّرَ لَهُ أَوْ يَتَنَكَّرَ لَهُ. (رواه احمد وابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۷۲۷/۲ الحدیث رقم ۲۱۴۸۔

ترجمہ: ”اور حضرت نافع کہتے ہیں کہ میں (اپنی تجارت کا) مال و اسباب تیار کر کے (اپنے ملازموں اور وکیلوں کی سپردگی میں) شام اور مصر بھیجا کرتا تھا پھر بعد میں (ایک مرتبہ) میں نے اپنا تجارتی سامان عراق کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا۔ میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ اے ام المؤمنین! میں (پہلے تو) اپنا تجارتی سامان شام بھیجا کرتا تھا مگر اب میرا ارادہ ہے کہ اپنا تجارتی سامان عراق بھیجنے کا ارادہ کیا۔ (یہ سن کر) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو تمہیں اور تمہاری تجارت کو کیا ہوا ہے؟ (کہ تم شام کے سلسلہ تجارت کو منقطع کرتے ہو) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے رزق کو کوئی سبب کی صورت میں پیدا کر دے تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے یہاں تک کہ (منافع نہ ہونے کی وجہ سے) اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے یا نقصان پہنچنے لگے۔“ (احمد ابن ماجہ)

تشریح: اجہز: ہمارے تشدید کے ساتھ، مطلب ہے سامان تیار کرنا۔

والی مصر: دوسری مرتبہ، اور میں ان دونوں سے تجاویز نہیں کرتا تھا۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اجہز کا مفعول محذوف ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: کنت اجہز و کلانی ببضاعتی و متاعی الی الشام والی مصر، فجهزت الی العراق: یعنی اس کے سفر کی طرف مائل ہوا۔
فأتیت ام المؤمنین: اور ایک نسخہ میں ”الی ام المؤمنین“۔

عائشہ، فقلت لہا اجہز الی الشام: وضاحت کی وجہ سے اختصار کیا اور مصر کا ذکر نہیں کیا یا اس طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ مصر کی طرف ان کا سامان تجارت بھیجنا قلیل ناورد تھا۔

فقال، لا تفعل: اس کا مفعول یہ محذوف ہے۔ ای ہذا التجهيز والتبديل۔ اس لئے کہ اللہ کسی قوم کی (اچھی حالت) اس وقت تبدیل نہیں فرماتے جب تک وہ اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے خاص کر کے جب دور کی مسافت ہو جو بری حرص پر دلالت کرتا ہے۔

لمتجرک: تجارت سے اسم مکان ہے۔ (تجارت کی جگہ یا تجارت کا عمل)

یعنی کیا واقعہ پیش آیا ہے اور کیا باعث ہے تجھے تیری تجارت گاہ سے دوسری جگہ کی طرف لے جانے کا، کیا تجھے وہاں سے کوئی خسارہ ہوا ہے؟ جو تجھے تیری اس تجارت گاہ سے روک رہا ہے جہاں سے اللہ نے تجھے نفع حاصل کرنے کا عادی بنایا تھا۔ اور جب تک وہ اپنی حالت پر ہے تو اس سے عدول درست نہیں ہے۔

قوله: اذ سبب الله واحد کم رزقا من وجه: مثلاً تم میں سے کسی کی روزی کے حصول کا سبب تجارت بنایا ہے تو وہ اس سبب یا اس روزی کو نہ چھوڑے۔ جب تک یہاں سے فائدہ حاصل ہو۔

او یتنکر له یہاں ”او“ تنویج کیلئے ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ”او“ شک کیلئے ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص ازہم مباح کسی اچھی چیز کو حاصل کر لے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو برقرار رکھے اور بغیر کسی قوی عذر کے اسے چھوڑ کر کسی غیر کی طرف مائل نہ ہو، اس لئے کہ آدمی کیلئے وہ کام آسان کیا گیا ہے، جس کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

۲۷۸۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ لِأَبِي بَكْرٍ غُلَامٌ يُخْرِجُ لَهُ الْخِرَاجَ فَكَانَ أَبُو بَكْرٍ يَأْكُلُ مِنْ خِرَاجِهِ فَبَجَاءَ يَوْمًا بِشَيْءٍ فَأَكَلَ مِنْهُ أَبُو بَكْرٍ فَقَالَ لَهُ الْغُلَامُ تَدْرِي مَا هَذَا فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ وَمَا هُوَ قَالَ كُنْتُ تَكْهِنُتُ لِإِنْسَانٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا أَحْسِنُ الْكُهَانَةَ إِلَّا أَنِّي خَدَعْتُهُ فَلَقِينِي فَأَعْطَانِي بِذَلِكَ فَهَذَا الَّذِي أَكَلْتُ مِنْهُ قَالَتْ فَأَدْخَلَ أَبُو بَكْرٍ يَدَهُ فَفَاءَ كُلَّ شَيْءٍ فِي بَطْنِهِ -

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۷/۷۔ الحدیث رقم ۳۸۴۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس ایک غلام تھا آپ کو خراج دیا کرتا تھا (یعنی اپنی کمائی میں سے ایک مقررہ حصہ حضرت ابو بکرؓ کو دیا کرتا تھا) حضرت ابو بکرؓ کو دیا کرتا تھا (جیسا کہ اہل عرب کا معمول تھا کہ وہ اپنے غلاموں کو کمائی پر لگا دیتے تھے اور ان کو حاصل ہونے والی اجرت میں سے کچھ حصہ اپنے لئے مقرر کر لیتے تھے) چنانچہ حضرت ابو بکرؓ اس غلام کی لائی ہوئی چیز کو کھا لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ غلام کوئی چیز لایا جس میں سے حضرت ابو بکرؓ نے بھی کھایا، ان کے کھانے کے بعد غلام نے کہا کہ آپ جانتے بھی ہیں یہ کیا چیز ہے؟ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ (مجھے کیا معلوم) تم ہی بتاؤ یہ کیا چیز ہے؟ غلام نے کہا کہ میں ایام جاہلیت میں (یعنی حالت کفر میں) ایک شخص کے لئے کہانت کی تھی (یعنی اس غیب کی باتیں بتاتی تھیں) حالانکہ میں کہانت کافر (یعنی پوشیدہ باتیں بتانے کافر) اچھی طرح نہیں جانتا تھا بلکہ میں نے اس کو (غلط سلط باتیں بتا کر) فریب دیا تھا (اتفاقاً آج) اس شخص سے میری ملاقات ہوگئی تو اس نے مجھے یہ چیز دی یہ وہی چیز ہے جو آپ نے کھائی ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ (یہ سنتے ہی) حضرت ابو بکرؓ نے اپنے منہ (یعنی حلق) میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ پیٹ میں تھا (ازراہ احتیاط) تھے کر کے سب باہر نکال دیا۔“ (بخاری)

تشریح: یخرج: راء کی تشدید کے ساتھ، نکالنا، لانا، پیش کرنا۔

له الخراج: امام طیبی فرماتے ہیں کہ مضاف مقدر ہے۔ ای کی یکسب له مال الخراج۔

ما هذا؟: مشارالیه ”شئی ماکول“ ہے

کنت تکھنت الانسان فی الجاہلیة: یعنی میں نے اس کو موہوم غیب کی خبر بتائی تھی اور ان خبروں کے دینے کی وجہ میری نسبت کہانت کی طرف کی جاتی تھی۔

وما احسن الکھانة: کاف کے فتح کے ساتھ ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی آیا ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔

الا انی خدعته: امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ استثناء منقطع ہے۔ ای لم اکن احمید الکھانة لکن خدعته یعنی

مطلب یہ ہے کہ میں کہانت اچھی طرح نہیں جانتا تھا بلکہ میں نے اس کو فریب دیا ہے۔

فا عطانی بذلک : یہ بآرائے مقابلہ ہے ای بمقابلہ کھانسی یعنی اس کہانت کے بدلے مجھے یہ چیز دی، اور بعض کہتے ہیں کہ ”بذلک“ میں ”با“ زائدہ ہے۔ اس کی حرمت شدید ہونے کی وجہ سے ابو بکر نے قے کر دی۔ کہ اس میں کہانت اور فریب جمع تھے، اور امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں قے کا بن کے معاوضہ کی وجہ سے کی تھی نہ کہ فریب کی وجہ سے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر کے اس فعل سے امام شافعی نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی حرام چیز کھالی ہو، یا علمی میں کھائی ہو، اور بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ چیز حرام تھی تو اس پر لازم ہے کہ فوراً قے کر کے اس چیز کو پیٹ سے نکال دے۔ (اتہلی) امام غزالی نے ”منہاج العابدین“ میں حضرت ابو بکر کے اس فعل کو ”ورع“ قرار دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ ورع کا حکم یہ ہے کہ تم کسی سے کوئی چیز اس وقت تک نہ لو جب تک کہ اس کے بارے میں پوری تحقیق نہ کر لو پھر تحقیق کے بعد یہ یقین بھی حاصل کر لو کہ اس چیز میں کسی بھی درجے کا اشتباہ نہیں ہے، اگر اس چیز کے بارے میں پوری تحقیق نہ ہو سکے تو اس چیز کو نہ لو اور اگر لے لی ہے تو واپس کر دو۔ ہم سے حضرت ابو بکر صدیق کی روایت نقل کی گئی ہے، کہ ان کا غلام ان کے پاس دودھ لایا تو حضرت ابو بکر نے وہ پی لیا پھر غلام نے کہا، کہ میں جب آپ کے پاس کوئی چیز لاتا ہوں تو آپ اس چیز کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہیں، لیکن اس دودھ کے بارے میں آپ نے نہیں پوچھا؟ حضرت ابو بکر نے فرمایا، کہ کیا قصہ ہے اس کا، غلام نے کہا کہ میں زمانہ جاہلیت کے دوران ایک قوم کیلئے کہانت کرتا تھا، انہوں نے مجھے یہ دودھ دیا، تو حضرت ابو بکر نے فوراً قے کر دی، پھر حضرت ابو بکر نے فرمایا، اے اللہ میری قدرت میں تو یہ تھا باقی جو میری رگوں میں رہ گیا ہے تو اس کے معاملے میں تو ہی میرے لئے کافی ہے۔

۲۷۸۷: عَنْ أَبِي بَكْرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غَدِيَ بِالْحَرَامِ۔

اخرجه البيهقي في شعب الایمان۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو بکر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس بدن نے حرام مال سے پرورش پائی ہو وہ (شروع ہی میں) نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ اور بڑا بھگتے بغیر) جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“ (بیہقی)

تشریح: بالحرام: اور ایک نسخہ میں بحرہم ہے، یعنی الف لام کے بغیر۔

۲۷۸۸: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّهُ قَالَ شَرِبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَبَنًا وَأَعْجَبَهُ وَقَالَ لِلَّذِي سَقَاهُ مِنْ أَيْنَ لَكَ هَذَا اللَّبَنُ فَأَخْبَرَهُ أَنَّهُ وَرَدَ عَلَى مَا ءِ قَدْ سَمَاهُ فَإِذَا نَعَمٌ مِنْ نَعَمِ الصَّدَقَةِ وَهُمْ يَسْقُونَ فَحَلَبُوا إِلَيَّ مِنْ أَلْبَانِهَا فَجَعَلْتُهُ فِي سِقَائِي وَهُوَ هَذَا فَادْخُلْ عَمْرُ يَدَهُ فَاسْتَقَاءَهُ۔

اخرجه البيهقي في شعب الایمان ۶۰/۵ الحدیث رقم ۵۷۷۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت زید بن اسلم (جو حضرت عمر فاروقؓ کے آزاد کردہ غلام تھے) کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت عمر بن خطابؓ نے دودھ پیا جو ان کو خوشگوار معلوم ہوا انہوں نے اس شخص سے پوچھا کہ جس نے دودھ لاکر پلایا تھا کہ یہ دودھ تمہیں کہاں سے ملا؟ تو اس نے ان کو بتایا کہ وہ (یعنی میں) پانی کے ایک چشمے یا کنویں پر گیا تھا اس نے چشمے یا کنویں کا نام بھی بتایا وہاں زکوٰۃ کے کچھ جانور (یعنی اونٹ و بکری وغیرہ پانی پینے کے لئے آئے ہوئے) تھے اور وہ (یعنی ان جانوروں کے گران) ان کا دودھ نکال کر لوگوں کو پلارہے ہیں چنانچہ انہوں نے میرے لئے بھی دودھ دو دیا۔ جسے میں نے لے کر اپنی مشک میں ڈال لیا وہ وہی دودھ تھا (یہ سن کر) حضرت عمرؓ نے (اپنے حلق میں) ہاتھ ڈال کر قے کر دی (اور اس دودھ کو پیٹ سے باہر نکال دیا کیونکہ وہ زکوٰۃ کا مال تھا جو ان کے لئے جائز نہیں تھا) ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔“

تشریح: فاذا: مفاجات کیلئے ہے۔ نعم: ہون اور عین کے فتح کے ساتھ، سقائی: پہلے حرف کے کسرہ کے ساتھ۔

قولہ: رواہما: ایک صحیح نسخہ میں ”رواہ“ ہے۔

توضیح: سید جمال الدین نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ ہمارے سماع کے مطابق یہ حدیث اس کے حاشیہ میں لکھی ہوئی ہے، اس لئے درست بات یہی ہے کہ اس حدیث کا اس باب سے حذف ہے۔ (آئنی) اس لئے کہ بعینہ یہ حدیث ”کتاب الزکوٰۃ“ میں گزری ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ امام طیبی نے اس حدیث کو اس فصل کی احادیث میں شمار نہیں کیا ہے، بلکہ حدیث عائشہ کو چھٹی، حدیث ابی بکر کو ساتویں، اور حدیث ابن عمر کو آٹھویں حدیث کے طور پر ذکر کیا ہے۔ پس جب اس کا حذف کرنا زیادہ صحیح ہے۔ تو وہ نسخہ زیادہ صحیح ہے جس میں رواہ البیہقی لکھا ہے۔

۲۷۸۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَنْ اشْتَرَى ثَوْبًا بِعَشْرَةِ دَرَاهِمٍ وَفِيهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللَّهُ تَعَالَى لَهُ صَلَاةٌ مَا دَامَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَدْخَلَ اِصْبَعِيهِ فِيْ اُذُنِيْهِ وَقَالَ صُمْتَا اِنْ لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ سَمِعْتَهُ يَقُوْلُهُ -

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان وقال اسنادہ ضعیف)

اخرجه البیہقی فی شعب الایمان ۱۴۲/۵ الحدیث رقم ۶۱۱۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جس شخص نے مثلاً ایک کپڑا اس درہم میں خریدا اور ان میں ایک درہم بھی حرام مال کا شامل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس شخص کی نماز قبول نہیں فرمائے گا جب تک کہ آدمی کے جسم پر وہ کپڑا ہوگا۔ اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے اپنی (شہادت کی) دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالیں اور کہا کہ اگر اس نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے نہ سنی ہو تو یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں۔ (احمد بیہقی) اور تبہی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے۔“

تشریح: لم يقبل الله تعالى له صلاة: اس کو نماز کا کامل ثواب نہیں ملے گا، اگرچہ اصل ثواب مل جائے گا، باقی نفس نماز بغیر کسی کلام کے صحیح ہو جائے گی۔ (اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔) امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر تو یہی ہے کہ وہ صحیح نہ ہو لیکن مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کیلئے مقبول نماز نہیں لکھتے باوجودیکہ وہ نماز جائز ہو جائے گی، اور قضاء کو ساقط کر دے گی، جیسے مقصود گھر میں نماز کا حکم ہے۔ (آئنی) اور یہی زیادہ ظاہر ہے اللہ کے اس ارشاد کی بنیاد پر: ﴿انما يتقبل الله من المتقين﴾ [المائدہ: ۲۷] ”اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں“ اور ثواب قبولیت پر مرتب ہوتا ہے، جیسا کہ نماز کی صحت، شرائط اور ارکان کے حصول پر مرتب ہوتی ہے، اور اہل سنت والجماعت کے ہاں صحت طاعات کیلئے تقویٰ شرط نہیں ہے۔

فی اذنیہ: اک نسخہ میں ”اذنیہ“ ہے ضمتمین اور سکون ثانی کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔

صمتا: صادمہملہ کے ضمہ اور میم کے شد کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں صادمہملہ کے فتح کے ساتھ ہے، اور ضمیر ”اذنیہ“ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ صادمہملہ کے ساتھ زیادہ ظاہر ہے، اگرچہ ضمہ کے ساتھ بھی صحیح ہے، پس معنی ہوگا ”صدتاً“ کہ بند ہو جائیں یہ ماخوذ ہے ”صمت القارورة“ بمعنی ”سد دتھا“ (میں نے شیشے کی بوتل بند کی) یہ اپنے کانوں کیلئے بددعا ہے۔ اور یہ اپنے سماع کے ثابت کرنے کے لئے تاکید اور تقدیر کے طور پر کہا ہے عرب کی عادت کے مطابق، کہ وہ کہتے ہیں۔ سمعته باذنی (آئنی)۔ (ملا علی قاری فرماتے ہیں) کہ یہ ان کے قول کی نظیر ہے نہ کہ مثل ہے، پس غور فرما لیجئے۔

قوله: ان لم يكن النبي صلى الله عليه وسلم سمعته يقول: امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”کان“ کا اسم ”النبي“ ہے اور خبر ”سمعته“ ہے جیسے ”زيد ضربته“ اور ”زيد انطلق ابوه“ میں ہے اور یہ اسناد سہمی میں سے ہے، اس لئے کہ خبر کا اسناد مبتدأ کے متعلق کی طرف ہے یا جواب شرط محذوف ہے، اور ما قبل کا کلام ”صمتا“ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور یہ زیادہ مبلغ ہے اس سے کہ وہ یوں کہتے ”ان لم يكن سمعت النبي ﷺ يقول۔“

ابن جنی فرماتے ہیں کہ وہ (یعنی علما نے سخا) کہتے ہیں ”زيد ضربته“ زیادہ مبلغ ہے بنسبت ”ضربت زيدا“ کے۔ اس لئے کہ انہوں نے مفعول کو مقدم کیا ہے، اس لئے کہ یہاں فاعل کا ذکر کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ مفعول کا ذکر کرنا مقصود ہے، پس مفعول کو مقدم کیا

پھر اسی پر قناعت نہیں کیا، یہاں تک کہ اس کو لفظ کے فضلہ ہونے سے بھی زائل کیا اور لفظ اس کو جملے میں عمدہ بنایا۔ پس اس کو رفع دیا مبتدا ہونے کی وجہ سے اور ”ضربتہ“ کو اس کا آخری حصہ بنایا اور فضلہ بنایا جو اس کے ساتھ ملتی ہے۔ (اتنی کلامہ)
اسی طرح حدیث میں مقصود اس قول کا نبی ﷺ سے صادر ہونا ہے اور یہی مہتمم بالشان ہے، اور ابن عمر کا سماع اس کے تابع ہے، اور اس کا عکس ہوتا اگر وہ یوں کہتے: سمعت النبی ﷺ یقولہ
اسنادی حیثیت: امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔

بَابُ الْمُسَاهَلَةِ فِي الْمُعَامَلَةِ

معاملات میں نرمی کرنے کا بیان

الفصل الاول :

۴۷۹۰: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَحِمَ اللَّهُ رَجُلًا سَمَحًا إِذَا بَاعَ وَإِذَا اشْتَرَى وَإِذَا اقْتَضَى

(رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۰۶/۴ الحدیث رقم ۲۰۷۶۔ وابن ماجہ فی السنن ۷۴۲/۲ الحدیث رقم ۲۲۰۳۔

ترجمہ: ”حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو بیچتے خریدتے اور تقاضا کرتے وقت نرمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ (بخاری)

تشریح: قولہ: رحم اللہ: یہ دعا ہے یا خبر ہے۔ رجلاً سمحاً کے معنی میں ہے۔

سمحاً: پہلے حرف کے فتح اور دوسرے کے سکون کے ساتھ، مراد وہ نرم اور سخی شخص ہے جو اپنا بعض حق چھوڑ دیتا ہے۔

اذا باع واذا اشترا، واذا اقتضى: یعنی جب وہ مقروض سے ہے مانگتا ہے اپنا قرض، تو نرمی اور آسانی کے ساتھ طلب کرتا ہے، سختی اور تندگی کے مظاہرہ نہیں کرتا۔

تخریج: امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ”الجامع الصغیر“ میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام بخاری اور ابن ماجہ نے حضرت جابرؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ”رحم اللہ عبدا سمحاً اذا اشترا سمحاً اذا اقتضى سمحاً اذا اقتضى“۔

۴۷۹۱: وَعَنْ حَدِيثِهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ رَجُلًا كَانَ فِيمَنْ كَانَ نَقَبُكَمُ اتَاهُ الْمَلِكُ لِيَقْبِضَ رُوحَهُ فَقِيلَ لَهُ هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ قَالَ مَا أَعْلَمُ قِيلَ لَهُ أَنْظِرْ قَالَ مَا أَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ أَنِّي كُنْتُ أَبَايُعُ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا وَأَجَارِيهِمْ فَأَنْظِرُ الْمُؤَسَّرَ وَآتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعَسَّرِ فَأَدْخَلَهُ اللَّهُ الْجَنَّةَ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۹۴/۶ الحدیث رقم ۳۴۵۱۔ ومسلم فی ۱۱۹۴/۳ الحدیث رقم (۲۶)۔ (۱۵۶۰)۔

والدارمی فی ۳۲۴/۲ الحدیث رقم ۲۵۴۶۔ واحمد فی المسند ۳۹۵/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت حدیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں (یعنی گزشتہ امتوں) میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ جب اس کے پاس موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو نے کوئی نیک کام کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے یاد نہیں ہے (کہ میں نے کوئی نیک کام کیا ہو) اس سے پھر پوچھا گیا کہ ابھی طرح سوچ لے۔ اس نے کہا کہ مجھے قطعاً یاد نہیں آ رہا ہے سوائے اس عمل کے کہ میں دنیا میں جب لوگوں سے (خرید و فروخت کے) معاملات کیا کرتا تھا تو

تقاضا کے وقت (یعنی مطالبات کی وصولی میں) ان پر احسان کیا کرتا تھا بایں طور کہ میں مالدار شخص کو تو مہلت دے دیتا تھا اور جو نادار ہوتے ان کو معاف کر دیتا تھا (یعنی اپنے مطالبات کا کوئی حصہ یا پورا مطالبہ ان کے لئے معاف کر دیتا تھا) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس کے اسی عمل سے خوش ہو کر) اس کو جنت میں داخل فرمادیا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: کان فیمن قبلکم: صدر صلہ کے حذف کے ساتھ ہے، اور صحیح شدہ نسخہ میں ”فیمن کان قبلکم“ ہے اصل کے مطابق اس لئے کہ صلہ صرف جملہ ہی ہوا کرتا ہے۔

اتاہ ملک خود عزرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام یا ان کے ماتحت بعض فرشتے آئے، اس بارے میں جو احادیث میں ظاہری طور پر تعارض ہے اس کی تطبیق یوں ہے کہ مقتدمات (یعنی روح قبض کرنے) کی ذمہ داری کبھی خود عزرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پوری کرتے ہیں اور کبھی ان کے ماتحت فرشتے لیکن صحیح یہ ہے کہ ارواح عزرائیل ہی قبض کرتے ہیں، پھر ان کے قبض کرنے کے بعد رحمت یا عذاب کے فرشتے ان سے لے لیتے ہیں اور یہی مطلب اللہ کے اس فرمان کا ہے: ﴿قُلْ يَتُوفَكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ﴾ [السجدة: ۱۱] آپ فرمادیتے ہیں کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر متعین ہے۔

اور حقیقت میں روح قبض کرنے والا اور موت طاری کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے جو معبود برحق ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہی مطلب ہے اس آیت کا: ﴿اللَّهُ يَتُوفِي الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا﴾ [الزمر: ۴] اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے، جانوں کو انکی موت کے وقت۔ قولہ: فقيل له: یعنی اللہ پاک نے خود اس سے کہا یا بعض فرشتوں نے پوچھا، اور یہ قول بھی بعید نہیں ہے یہ بعض لوگوں نے اس سے پوچھا ہوا اور زیادہ واضح بات تو یہ ہے کہ اس شخص سے یہ سوال روح قبض کرنے سے پہلے کیا گیا تھا، جیسا کہ حدیث کے ابتدائی الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے، اور شیخ مظہر کہتے ہیں کہ یہ سوال اس سے قبر میں کیا گیا تھا۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سوال قیامت میں ہو۔

هل عملت من شئ: اور ایک نسخہ میں ”لام“ کی تقدیم کے ساتھ ہے یعنی ”هل عملت من خیر عملت به“

فانظر الموسر: انظار سے ہے اس کا معنی ہے مالدار کو مہلت دینا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تنگ دست کو مہلت دینے اور اس سے اپنے حق کو معاف کرنے تھوڑا ہوا یا زیادہ ہو فضیلت کا بیان ہے، اور مال دار سے تقاضا کے وقت مساحت سے کام لینے کی فضیلت ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ خیر اور بھلائی کے کام کو تھیر نہیں سمجھنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ وہ نیک بختی اور رحمت کا سبب بن جائے۔

۲۷۹۲: وفي رواية لمسلم نحوه عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ وَأَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ فَقَالَ اللَّهُ أَنَا أَحَقُّ بِدَا مِّنْكَ تَجَاوَزُوا عَنْ عَبْدِئِي .

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۱۹۵/۳ الحديث رقم (۲۶) - (۱۵۶۰) - واحمد في المسند ۱۱۸/۴ -

ترجمہ: اور مسلم کی ایک اور روایت میں جو عقبہ بن عامر اور ابو مسعود انصاری نے اسی کے مثل (یعنی کچھ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ) نقل کی ہے یہ الفاظ ہیں کہ (جب اس شخص نے اپنا یہ عمل بیان کیا) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس کا (یعنی معاف کرنے کا) تجھ سے زیادہ حقدار ہوں (اور پھر فرشتوں سے کہا کہ) میرے اس بڑے سے درگزر کرو۔

تشریح: عن عقبہ بن عامر وابی مسعود الانصاری:

توضیح: شیخ جزری فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں اس حدیث کو ”مسلم“ نے موقوف روایت کیا ہے حضرت حذیفہ پر، اور مرفوع روایت کیا ہے عقبہ ابن عامر اور ابو مسعود انصاری سے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ لیکن یہ وہم ہے امام دارقطنی اور دیگر حفاظ حدیث نے اس پر تہنیک کی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عقبہ ابن عامر کی اس باب میں کوئی روایت نہیں ہے اور حفاظ حدیث کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صرف ابو مسعود عقبہ بن عامر انصاری سے محفوظ ہے، اور شاید یہ (اوپر والی بات) کا تہوں کا تصرف ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ذکرہ میرک شاہ)

فقال انا احق بهذا: اور ایک نسخہ میں ”بذلك“ ہے

تجاوز و اعن عبدی: (اس اسلوب میں اشارہ ہے کہ) میری صفت سے موصوف ہے اور میرے اخلاق سے آراستہ ہے، جیسا کہ اضافت تشریفیہ سے معلوم ہو رہا ہے۔

۲۷۹۳: وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِيَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الْحَلْفِ فِي الْبَيْعِ فَإِنَّهُ يَنْفِقُ ثُمَّ يَمْحَقُ.

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۲۲۸/۳ الحدیث رقم (۱۶۰۷-۱۳۲)۔ وابن ماجہ فی السنن ۷۴۵/۲ الحدیث رقم

۲۲۰۹۔ واحمد فی المسند ۱۱۸/۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو قتادہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تجارت میں زیادہ قسمیں کھانے سے بچو کیونکہ اس سے تجارت کو فروغ تو ملتا ہے لیکن پھر وہ ختم ہو جاتی ہے۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: ایاکم و کثرة الحلف فی البیع: یعنی زیادہ قسمیں کھانے سے بچو اگرچہ تم اس میں سچے کیوں نہ ہو، اس لئے کہ زیادہ قسموں کی وجہ سے کبھی وہ جھوٹی قسموں میں پڑ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں وارد ہے: ”کفنی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع“ کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو آگے بیان کر دے، اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ”الواعی حول حمی“ یہاں قسموں کو کثرت کے ساتھ مقید کرنا احتراز ہے قلت سے اس لئے کہ قلیل یعنی کبھی کبھار قسم کی ضرورت پڑتی ہے لہذا وہ اس وعید کے تحت داخل نہیں ہے، اور اس وجہ سے بعض طرق میں یوں آیا ہے رجل جعل اللہ بضاعته لا یشتري الا بیمنه ولا بیع الا بیمنه کہ ایک آدمی ہے جس کی پونجی کو اللہ نے اس طرح بنایا ہے کہ وہ جب خریدتا ہے تو بھی اللہ کے قسم کے ساتھ اور فروخت کرتا ہے تو بھی اس کی قسم کے ساتھ۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”ایاکم“ منسوب ہے بنا برتحدیر، تو مطلب اس کا یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو زیادہ قسموں سے بچاؤ اور زیادہ قسموں کو اپنے آپ سے بچاؤ۔ مکرر ذکر کیا تاکید کیلئے اور نفرت پیدا کرنے کیلئے، اور یہاں زیادہ قسموں کے کھانے سے منع کرنا کم قسموں کے جائز ہونے پر دلالت نہیں کرتا اس لئے کہ یہاں ممانعت بازار والوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور ان کی عادت زیادہ قسمیں کھانے کی ہوتی ہے۔ جیسے کہ اللہ کے اس فرمان میں وارد ہے: ﴿لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً﴾

سچ یہ ہے کہ اس میں کم قسموں کے کھانے کا جواز ہے بشرطیکہ وہ سچ ہو اور اس پر اجتماع ہے۔

ینفق: فاء مسکورہ کی تشدید کے ساتھ اور ایک نسخہ میں تخفیف کے ساتھ ہے۔ سید جمال الدین نے زین العرب سے اس کی شرح میں نقل کیا ہے کہ شارح کہتے ہیں کہ ینفق، تینفق سے ہے بمعنی تدریج، نہ کہ ”انفاق“ سے ہے اور شارح نے پہلی لغت کو بیان کیا ہے اس روایت کے مطابق جس میں یاء کے ضمہ نون کے سکون اور فا کی تخفیف کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ یعنی سامان کو رواج دیتا ہے اور اس میں رغبت کو زیادہ کرتا ہے۔

یمحق: پہلے فتح ہے پھر سکون پھر فتح ہے، اور ”نم“ تراخی فی الزمان کیلئے ہے۔ یعنی وقتی طور پر تو اس کو رواج دیتا ہے لیکن مستقبل میں اس کو مٹا دیتا ہے، جیسا کہ عبداللہ ابن مسعود اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ﴿یَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا﴾ [البقرة-۲۷۶] اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں) اگرچہ وہ زیادہ ہو یا کم ہو یا جس حالت میں ہو، یعنی اس کا مٹانا زیادہ بلیغ اور قوی ہے، اور مٹانے سے مراد دینی اور دنیوی اعتبار سے اس کے فائدے کا نہ ہونا ہے۔

۲۷۹۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ الْحَلْفُ مَنْفَقَةٌ لِلْبَيْعِ مُمَحَقَةٌ لِلرِّبَا

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری ۳۱۵/۴۔ الحدیث رقم ۲۰۸۷ و مسلم فی ۱۲۲۸/۳ الحدیث رقم (۱۳۱-۱۶۰۶) و ابوداؤد فی السنن ۶۳/۱۳ الحدیث رقم ۳۳۳۵۔ والنسائی فی ۲۴۶/۷ الحدیث رقم ۴۴۶۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قسم (شروع میں تو) مال و اسباب کو رواج دیتی ہے لیکن (انجام کار) برکت کے خاتمے کا سبب بن جاتی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: بقول: ”الحلف“: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) قسم کی زیادتی (۲) جھوٹی قسم،

منفقة: پہلے اور تیسرے حرف کے فتح اور دوسرے کے سکون کے ساتھ ہے اور یہی ضبط حرکات ”مصحقة“ کا ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے میر کرنے۔)

للسعلة: سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی قسم کھانے والے کے گمان میں یہ قسم سامان کو رواج دینے کا سبب ہے۔

قوله: ”مصحقة للبركة“: یعنی کمائی کی برکت ختم ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے۔ بایں طور کہ مال تلف ہو جاتا ہے، یا ایسی جگہ میں خرچ ہو جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ نہ تو اسے دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور نہ اخروی طور پر اسے کچھ اجر و ثواب ملتا ہے۔ یا وہ اس کے پاس باقی رہتا ہے مگر وہ اس کی منفعت سے محروم ہوتا ہے۔ یا ایسا شخص اس کا وارث بن جاتا ہے جو اس کی کوئی اچھائی ہی بیان نہیں کرتا۔ اور میم کے ضمہ اور تیسرے حرف کے کسرہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔

۲۷۹۵: وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ ثَلَاثَةٌ لَا يَكْلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُنْظَرُ إِلَيْهِمْ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ قَالَ أَبُو ذَرٍّ خَابُوا وَخَسِرُوا مَنْ هُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ الْمُسْبِلُ وَالْمَنَانُ وَالْمَنْفِقُ بِلَعْنَتِهِ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحہ ۱۰۲/۱ الحدیث رقم (۱۷۱-۱۰۶)۔ والنسائی فی السنن ۲۴۵/۷ الحدیث رقم ۴۴۵۸۔

وابن ماجہ ۷۴۴/۲ الحدیث رقم ۲۲۰۸۔ والدارمی فی ۳۴۵/۲ الحدیث رقم ۲۶۰۵۔ و احمد فی المسند ۱۵۸/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ذرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین شخص ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو ان سے (مہربانی و عنایت کا) کلام کرے گا نہ (بنظر رحمت و عنایت) ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو (گناہوں

سے) پاک کرے گا اور ان تینوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ابو ذرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو نا کام و نامراد ہو گئے۔ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک تو پانچ (نخنوں سے نیچے) لٹکانے والا دوسرا (کسی کو کوئی چیز دے کر) احسان

جتانے والا اور تیسرا جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی تجارت بڑھانے والا۔“ (مسلم)

تشریح: ثلثة: اس کی تیسرے محذوف ہے۔ ای ثلثہ اشخاص۔

ولا يزكيهم: یعنی نہ تو ان کے نیک اعمال بڑھائے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا۔

وخسرو: یعنی اپنے نفس اور اہل و عیال کے اعتبار سے ٹوٹے میں ہیں۔

قال المسبل: یعنی اپنی ازار کو نخنوں سے نیچے لٹکانے والا اور شلواری کو زمین کی طرف دراز کرنے والا، تکبر کے طور پر،

المنان: اس سے مراد وہ شخص ہے جو چیز احسان کے طور پر دیتا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ مراد وہ شخص ہے جو دینے کے بعد دوسروں کے سامنے احسان جتاتا ہے اگرچہ ایک کے سامنے ہی کیوں نہ ہو، لہذا

اس میں مبالغہ شرط نہیں ہے، مثلاً وہ یوں کہے میں نے فلاں کو یہ چیز دی ہے اور حال یہ ہے کہ فلاں اس بات کو ناپسند کرتا ہے۔ (انتہی)

بئس یہ اس منت اور احسان میں سے ہے جس میں اچھائی جتائی جاتی ہے، اگر یہ احسان جتنا کسی صدقہ میں ہو تو اس کے ثواب کو باطل کر دیتا ہے اور اگر کسی اچھائی میں ہو تو اس اچھائی اور بھلائی میں کدورت پیدا کر دیتا ہے۔

و المنفق: ہمارے اصول نسخ میں تشدید کے ساتھ ہے۔ اور امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تخفیف کے ساتھ ہے، بمعنی رُوَج ہے، یہ مشتری کو کہتا ہے کہ بخدا یہ میں نے سودینار کی خریدی ہے اور تا کہ مشتری یہ گمان کر لے کہ یہ سامان سودینار کا ہے یا اس سے زیادہ کا ہے، پس وہ اس سامان کے خریدنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

الفصل الثانی:

۲۷۹۶: عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ . (رواه الترمذی والدارمی والدارقطنی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۱۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۰۹۔ والدارمی فی ۳۲۲/۲ الحدیث رقم ۲۵۳۹۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (قول و فعل میں) سچا اور اماندار تاجر (قیامت کے دن) انبیاء کرام صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی دارمی و دارقطنی)

تشریح: التاجر: یعنی جو خرید و فروخت اور تجارت میں مشغول ہو جس طریقے سے بھی ہو، اور پہلے گزرا ہے کہ سب سے بہتر تجارت کپڑے کی تجارت ہے اس کے بعد عطاری ہے۔

الصدوق: وہ شخص جو قول و فعل میں زیادہ سچا ہو۔

الامین: جو صفت امانت کے ساتھ موصوف ہو اور خیانت اور بددیانتی سے محفوظ ہو۔

صدوق اور امین دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں، پس جو شخص ان دو صفات کے ساتھ متصف ہو گیا وہ تمام صفات کمالیہ سے متصف ہو گیا، پس وہ مستحق ہے کہ اس کا حشر ان معزز بستیوں کے ساتھ ہو یا وہ جنت میں ان کے ساتھ ہو۔

مع النبیین: بوجہ ان کی فرمانبرداری کرنے کے، و الصدیقین: ان کے ساتھ ان کے خاص وصف صدق میں موافقت کی وجہ سے، و الشهداء: بوجہ ان کے صفت صدق اور امانت پر گواہی دینے کے۔

۲۷۹۷: ورواه ابن ماجہ عن ابنِ عُمَرَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ وَهَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ.

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۷۴۲/۲ الحدیث رقم ۲۱۳۹۔

ترجمہ: اور ابن ماجہ نے یہ روایت ابن عمر سے نقل کی ہے۔ نیز ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: روایات باب: اس حدیث کو امام حاکم اور ابن ماجہ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ”التاجر الامین الصدوق المسلم مع الشهداء يوم القيامة“ اور دیلمی نے حضرت انسؓ سے اس طرح روایت کیا ہے: ”التاجر الصدوق تحت ظل العرش يوم القيامة“۔

۲۷۹۸: وَعَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِي عَزْرَةَ قَالَ قَالَ كُنَّا نَسْمِي فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ السَّمَا سِرَةَ فَمَرَّبْنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَسَمَانًا بِاسْمِ هُوَ أَحْسَنُ مِنْهُ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ التَّجَارِ إِنَّ الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ الْغُورُ وَالْحَلْفُ فَشُوبُوهُ بِالصَّدَقَةِ . (رواه ابو داؤد و الترمذی والنسائی وابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۶۲۰/۳ الحدیث رقم ۳۳۲۶۔ و الترمذی فی ۵۱۴/۳ الحدیث رقم ۱۲۰۸۔ والنسائی فی

۲۴۷/۷ الحدیث رقم ۴۴۶۳۔ وابن ماجہ فی ۷۲۶/۲ الحدیث رقم ۲۱۴۵۔

ترجمہ: ”اور قیس بن ابوغزہ (جو سوداگری کرتے تھے) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم تاجروں کو (یعنی سوداگروں کو) ”سامرہ“ (یعنی دلال) کہا جاتا تھا چنانچہ (ایک دن کا ذکر ہے کہ) رسول اللہ ﷺ نے ہمارے پاس سے گزرے تو

آپ ﷺ نے ہمارے طبقے کو ایک ایسا نام عطا فرمایا جو ہمارے پہلے نام سے کہیں بہتر تھا چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے تاجروں کی جماعت! تجارت میں اکثر لغو باتیں اور (بہت زیادہ) قسم (یا کبھی کبھی جھوٹی قسم) کھانے کی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں لہذا تم تجارت کے ساتھ صدقہ و خیرات کو شامل کر لیا کرو۔ (ابوداؤد ترمذی نسائی ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

قیس بن ابی غرزہ۔ نام قیس ابوغرزہ کے بیٹے ہیں۔ خاندانی اعتبار سے ”غفاری“ ہیں۔ ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے۔ ان سے ابوداؤد شقیق ابن سلمہ نے روایت کی ہے۔ ان سے صرف ایک ہی روایت مروی ہے جو تجارت کے بیان میں آئی ہے۔

تشریح: ”غرزہ“ میں غین مجھ پر فحشہ راء مہملہ پر فحشہ اور اس کے بعد ذرائع معجمہ پر فحشہ ہے۔

تسمی: مجہول کے صیغہ کے ساتھ

السماصرة: نصب کے ساتھ مفعول ثانی ہے۔ پہلے سین کے فتح اور دوسرے کے کسرہ کے ساتھ، صیغہ جمع ہے۔ آج کل بائع اور مشتری کے درمیان بیع کو نافذ کرنے کیلئے جو لوگ واسطہ بنے ہوئے ہوتے ہیں ان کو کہتے ہیں۔ یہ جمع ہے سمسار کی سمسار کسرہ کے ساتھ ہے۔ اصل میں سمسار کہتے ہیں کسی چیز کے منتظم اور محافظ کو پھر یہ دلال کیلئے استعمال ہونے لگا، اور کبھی اس کا اطلاق قیمت لگانے والے پر بھی ہوتا ہے۔

قوله: فمر بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسمانا باسم وهو احسن منه: بعض حضرات کہتے ہیں کہ ”تاجر“ عرف عام میں اچھا اور اشرف سمجھا جاتا ہے سمسار سے اور شاید اچھا ہونے کی وجہ یہ ہو کہ اب ”سماصرة“ کا اطلاق ٹیکس وصول کرنے والوں پر ہوتا ہے، یا شاید اس وجہ سے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں اس کا اطلاق اس پر ہوتا تھا جس میں کوئی نقص ہو۔ (اتحلی)

سب سے بہتر سلام وہ ہے جو امام طبری نے ذکر فرمایا ہے کہ ”تجارت“ عبارت ہے رأس المال میں تصرف کرنے سے، جو فائدے کے طلب کیلئے ہو اور ”سماصرة“ کا بھی یہی مطلب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ”تجارت“ کا ذکر کئی مرتبہ قرآن میں بطور مدح کیا ہے، (۱) ﴿هل ادلكم على تجارة تنجيكم﴾ [الصف-۱۰] (اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تمہیں نجات دے) (۲) ﴿تجارة عن تراض﴾ [النساء-۲۹] (۳) ﴿تجارة لن تبور﴾ [فاطر-۲۹] (ایسی تجارت جو کبھی ماند نہ ہوگی)، (اتحلی)۔

اور شاید علامہ کی مراد یہ آیت بھی ہو: ﴿رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله واقام الصلوة وابتاء الزكاة يخافون يوما تتقلب فيه القلوب والابصار﴾ [النور-۳۷] (ایسے لوگ جن کو اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں ڈالے پاتی ہے اور نہ فروخت، وہ ایسے دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی)۔

اس نام کے ساتھ ان کو تنبیہ مقصود ہے کہ وہ ان صفات کے ساتھ خصوصیت سے متصف ہوں، اور اس نام میں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف: ﴿ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة﴾ [التوبة] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مال کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی)۔

قوله: فقال يا معشر التجار ان البيع يحضره اللغو ”لغو“ بے فائدہ کلام کو کہا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں وہ باتیں بغیر کسی غور و فکر کے کہی جائیں لغو کلام کے قائم مقام ہوتی ہیں۔ ”لغو“۔ چڑیا کی آواز کو کہا جاتا ہے، اس کو ذکر کیا ہے امام طبری نے، اور ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ کلام ہے جو لایعنی ہو، جس کے تحت کوئی فائدہ نہ ہو، اور جس کا کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿والذين هم عن اللغو معرضون﴾ (اور جو لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں)۔ اور کبھی اس کا اطلاق قول قبیح پر بھی ہوتا ہے جیسے گالی وغیرہ اور اسی سے اللہ کا یہ قول ہے: ﴿واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه﴾ (اور جب کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اس کو

نال جاتے ہیں)۔ اور باطل کام پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور اس سے اللہ کا یہ قول ہے: ﴿وَإِذَا مَرُوا بِاللُّغَمِ مَرُوا كِرَامًا﴾ (اور اگر بے ہودہ مشغلوں کے پاس کوہر گزریں تو سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں)۔

(فشو بوہ : شین کے ضمہ کے ساتھ: اس لئے کہ یہ اللہ کے غصے کو بجا دیتا ہے، اور بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹاتی ہیں اسی طرح کہا گیا ہے، اور اس میں اشارہ ہے اللہ کے اس فرمان کی طرف: ﴿وَآخِرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخِرَ سَيِّئًا عَسَىٰ اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ [التوبة-۱۰۲] (اور کچھ لوگ ہیں جو اپنی خطا مقرر ہو گئے جنہوں نے ملے جملے عمل کیے تھے کچھ بھلے اور کچھ برے اللہ سے امید ہے کہ ان پر توجہ فرمادیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں)۔

امام طبری فرماتے ہیں گری پڑی باتوں سے اور زیادہ قسموں سے اکثر نفس میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے، پس اس کی صفائی اور ازالے کی ضرورت پڑتی ہے، اس کدورت کی صفائی اور ازالے کیلئے صدقہ کرنے کا حکم دیا امام طبری فرماتے ہیں کہ اس میں علامت ہے زیادہ صدقہ کرنے کی اس لئے کہ تھوڑا سا صاف پانی گدے پانی سے گدلا پن ہی لے سکتا ہے۔ (آنحلی)

اور قرآن میں ہے: ﴿وَإِن تَكَ حَسَنَةً يُّضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ [النساء ۴۰] (اور اگر نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کر دینے اور اپنے پاس سے اور اجر عظیم دینے)

اور مشہور یہ ہے کہ تھوڑا سا صدقہ زیادہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، اور مدار اصل قبولیت پر ہے اور اللہ کا فضل عقل کے تصور سے بھی زیادہ کثادہ ہے۔

۲۷۹۹: وَعَنْ عَبْدِ بْنِ رِفَاعَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ التَّجَارُ يُحْشَرُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَجَارًا إِلَّا مَنْ

اتَّقَى وَبَرَّ وَصَدَّقَ. (رواه الترمذی وابن ماجہ والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۱۵۳ الحدیث رقم ۱۲۱۰۔ وابن ماجہ فی ۷۲۶۱۲ الحدیث رقم ۲۱۴۵ والدارمی فی

۳۲۲۱۲ الحدیث رقم ۲۵۳۸۔ واحمد فی المسند ۴۲۸/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبید ابن رفاعہ (تابعی) اپنے والد محترم (حضرت رفاعہ بن رافع انصاری صحابی) سے اور وہ نبی کریم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن تاجروں کا حشر تاجروں (یعنی دروغ گو اور نافرمان لوگوں) کے ساتھ ہوگا“ سوائے ان تاجروں کے ساتھ ہوگا یعنی (وہ تاجر اس سے مستثنیٰ ہوں گے) جنہوں نے تقویٰ پر ہیزگاری کو اختیار کیا (یعنی خیانت اور فریب دہی وغیرہ میں مبتلا نہ ہوئے) اور نیکی کی (یعنی اپنے تجارتی معاملات میں لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا یا یہ کہ عبادت خداوندی کرتے رہے) اور سچ پر قائم رہے۔ (ترمذی ابن ماجہ دارمی)

حالاتِ راوی:

عبید اللہ بن رفاعہ: یہ عبید اللہ رفاعہ بن رافع کے بیٹے ہیں ”عبید“ تصغیر کے ساتھ ہے۔ اور ”رفاعہ“ میں راء مہملہ مکسور ہے۔ انصار میں سے زرقی ہیں۔ مشہور تابعی ہیں۔ اپنے والد ”رفاعہ“ رضی اللہ عنہ اور ”اسماء بنت عمیس“ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں اور ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

تشریح: التجار: تاء کے ضمہ اور جیم کی تشدید کے ساتھ جمع ہے ”تاجر“ کی۔

فجارا: جمع ہے فاجر کی فجور سے مشتق ہے، اور فجور کہتے ہیں ارادے سے پھرنے کو اور جھوٹا بھی فاجر ہوتا ہے بوجہ سچ سے جھوٹ کی طرف پھرنے کے۔

قاضی (عیاض) رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سودا گروں کی عادت معاملات میں دھوکہ کی ہوتی ہے اور سامان کی ترویج اور مشہوری کی خواہش ہوتی ہے جو ان کیلئے آسان ہو جھوٹی قسموں وغیرہ کے ساتھ اسی وجہ سے ان پر فجور کا حکم لگایا اور اس سے مستثنیٰ ہے جو حرام سے بچا

اور اپنی قسم میں بری ہوا اور باتوں میں سچا ہوا، اور اسی مطلب کی طرف شارحین گئے ہیں اور فوراً کلام اور قسم پر محمول کیا ہے۔

۲۸۰۰: وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ عَنِ الْبُرَاءِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۱۴/۳ الحدیث رقم ۱۲۰۸۔

ترجمہ: اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس روایت کو حضرت براءؓ سے نقل کیا ہے نیز امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: وقال: اور ایک نسخہ میں (بغیر واؤ کے قال ہے۔

بَابُ الْخِيَارِ

خيار کا بیان

نہایہ میں ہے کہ یہ ”اختیار“ کا اسم ہے، اس کے معنی ہیں دو چیزوں میں سے کسی ایک اچھی چیز کا انتخاب کرنا یعنی بیع کو نافذ کرنے یا فسخ کرنے کا نام ”خيار“ ہے۔

الفصل الاول:

۲۸۰۱: عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمَتَابِعَانِ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ عَلَى صَاحِبِهِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا إِلَّا بَيْعَ الْخِيَارِ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) إِذَا تَبَايَعَا فِكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ مِنْ بَيْعِهِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا أَوْ يَكُونَ بَيْعُهُمَا عَنْ خِيَارٍ فَإِذَا كَانَ بَيْعُهُمَا عَنْ خِيَارٍ فَقَدْ وَجِبَ وَفِي رِوَايَةٍ لِلتِّرْمِذِيِّ أَلْبَيْعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا أَوْ يَخْتَارَا (وَفِي الْمَتَفَقِّ عَلَيْهِ) أَوْ يَقُولُ أَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ اخْتَرْتَبَدَلْ أَوْ يَخْتَارَا.

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۲۶/۴۔ الحدیث رقم ۲۱۰۷۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۱۶۳/۳ الحدیث رقم ۱۵۳۱/۴۳۔

وابوداؤد فی السنن ۷۳۲/۳ الحدیث رقم ۳۴۵۴ والترمذی فی ۵۴۷/۳ الحدیث رقم ۱۲۴۵۔ والنسائی فی ۲۴۸/۷

الحدیث رقم ۴۴۶۵ وابن ماجہ فی ۷۳۶/۲ الحدیث رقم ۲۱۸۱۔ ومالك فی الموطأ ۶۷۱/۲ الحدیث رقم ۷۹ فی

کتاب البيوع۔ واحمد فی المسند ۵۲/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خرید و فروخت کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے دوسرے صاحب معاملہ پر اختیار رکھتا ہے اس بات کا کہ چاہے تو وہ خرید و فروخت کے معاملے کو باقی رکھے اور چاہے تو ختم کر دے۔ جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں (یعنی جس مجلس میں وہ معاملہ طے پایا ہوگا جب وہ ختم ہو جائے گی بایں طور کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے تو ان میں سے کسی کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں رہے گا)۔ ہاں بیع اختیار اس سے مستثنیٰ ہے (یعنی جس بیع میں خریدار نے اس اختیار کی شرط طے کر لی، تو اگر میں چاہوں تو اس خریدی ہوئی چیز کو رکھوں گا اور اگر نہ چاہوں گا تو واپس کر دوں گا اس بیع میں ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد بھی اختیار باقی رہتا ہے)۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ”جب دو بیع کرنے والے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کرتے ہیں تو ان میں سے ایک کو (معاملے کو باقی رکھنے یا فسخ کرنے والے) اختیار حاصل ہوگا جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں یا یہ کہ ان کی خرید و فروخت کا معاملہ بشرط اختیار ہو اگر وہ اختیار شرط کے ساتھ کوئی تجارتی معاملہ کریں گے تو اس صورت میں (جدائی کے بعد بھی) اختیار کا حق حاصل رہے گا۔ ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ خرید و فروخت کرنے والے دونوں جب تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں انہیں اختیار حاصل ہے الا یہ کہ وہ (اپنے

تجارتی معاملے میں) خیار کی شرط طے کریں (یعنی اگر وہ اپنا تجارتی معاملہ مذکورہ بالا خیار شرط کے ساتھ طے کریں گے تو انہیں جدائی کے بعد بھی اختیار حاصل رہے گا)۔ لیکن بخاری و مسلم کی ایک روایت میں (ترمذی کی اس روایت کے آخری الفاظ) او یختار: (الا یہ کہ وہ خیار کی شرط طے کریں) کی بجائے یہ الفاظ ہیں اُخْتَرُوْا کہ الایہ کہ ان دونوں میں سے ایک اپنے دوسرے صاحب معاملہ سے یہ کہہ دے کہ اختیار کی شرط طے کر لو (اور وہ دوسرا کہہ دے کہ مجھے یہ منظور ہے)۔

تشریح: کل واحد منہما بالخیار: ”بالخیار“ خبر ہے ”کل واحد“ کیلئے، ای کل واحد محکوم بالخیار اور

پورا جملہ خبر ہے ”المتبايعان“ کیلئے

اس خیار سے خیار قبول مراد ہے نہ کہ خیار مجلس، امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں خیار مجلس مراد ہے۔

علمی صاحبہ جار مجرور ”الخیار“ کے متعلق ہے۔ شرح طحاوی میں ہے کہ خیار سے مراد وہ (وقت) ہے جو بائع کے قول ”بعثک“ اور مشتری کے قول ”قبلت منک“ کے درمیان ہوتا ہے۔ (انتہی) تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب متعاقدین میں سے کوئی ایک بیع کا ایجاب کرے تو دوسرے کو اختیار ہے چاہے بیع قبول کرے اور چاہے تو قبول نہ کرے، اور ایجاب کرنے والے کو اختیار ہوگا۔ اپنی بات سے رجوع کرنے کا جب تک کہ دوسرے نے قبلت نہ کہا ہو اور اختیار کی یہ صورت ثابت ہے۔

ما لم یتفرقا: یعنی گفتگو کے اعتبار سے، پس اگر گفتگو کے اعتبار سے جدا ہو گئے کہ ایک نے کہا ”بعث“ میں نے بیجا اور دوسرے نے کہا ”اشتریت“ میں نے خرید اتو اب خیار باقی نہیں رہے گا۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ”المتبايعان بالخيار ما لم یتفرقا عن بیعہما“ کہ بیچنے والے اور خریدنے والے کو اختیار ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنی بیع سے جدا نہ ہوئے ہوں، اور یہ جو کہا گیا ہے کہ راوی حدیث حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اس حدیث کو دوسروں سے زیادہ جاننے والے ہیں انہوں نے جدائی کو جسموں کی جدائی پر محمول کیا ہے لہذا جو تاویل اس کے مخالف ہے اس کو چھوڑنا متعین ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ راوی کی تاویل اس کے غیر پر حجت نہیں ہوتی، لہذا یہ اس احتمال کو رد نہیں کر سکتی باوجودیکہ اس کو تائید حاصل ہے: ”ما لم یتفرقا عن بیعہما“ والی حدیث سے، اور اس تاویل سے تمام روایات کے درمیان جمع اور تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

”الابیع الخیار“ یہ استثناء ہے اس سے جو مفہوم ہو رہا ہے ما لم یتفرقا سے یعنی ہر ایک کو اختیار ہے جب تک جدا نہ ہوئے ہوں، پس اگر وہ جدا ہو گئے تو بیع لازم ہو جائے گی، سوائے اس بیع کے جس میں معاملے کے وقت تین دن یا اس سے کم کی خیار شرط لگائی ہو، تو وہ خیار شرط جدائی کے بعد بھی باقی رہے گا۔ (اسی طرح اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے۔)

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ ”ما لم یتفرقا“ کے مطلب کے بارے میں علماء میں اختلاف ہوا ہے، پس ایک جماعت تو اس طرف گئی ہے کہ اس سے مراد تفرق بالابدان (یعنی جسموں کی جدائی) ہے۔ انہوں نے متعاقدین کیلئے خیار مجلس کو ثابت کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ حدیث میں ان دونوں کو متعاقدین کہا ہے اس لئے کہ بیع ان اسماء مشفقہ میں سے ہے جو افعال فاعلین سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ان کے فعل کے حصول کے بعد واقع ہوتی ہے۔ اور عقد کے بعد کوئی جدائی نہیں ہے، سوائے جسموں کے الگ ہونے کے۔

دوسرے بعض اس طرف گئے کہ جب وہ عقد کر لیں تو اب کسی کو اختیار نہیں ہوگا، سوائے ان کے جنہوں نے خیار کی شرط لگائی ہو، اور یہ کہتے ہیں کہ جدائی سے مراد گفتگو کی جدائی ہے۔ اور اس کی نظیر اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَان یتفرقا یغن اللہ کلاما من سعته﴾ [النساء ۱۳۰] (اور اگر دونوں میاں بیوی جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے احتیاج کر دیگا) باقی ان کا نام متبايعین رکھنا، پس اس میں یہ بھی صحیح ہے کہ یہ بمعنی ”متساویین“ ہو اور یہ ”قیمۃ الشئی باسم ما یوول الیہ او یقر ب منہ“ کے قبیل سے ہو۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہاں استثناء مفہوم غایت سے ہے، اور معنی اس کا یہ ہے کہ بائع اور مشتری کو اختیار ہے جب تک جدا نہ ہوں، پس جب وہ جدا ہو جائیں گے تو خیار ساقط ہو جائے گا اور بیع لازم ہو جائے گی سوائے بیع خیار کے یعنی ایسی بیع جس میں خیار کی شرط

لگائی گئی ہو، اس لئے کہ اس میں اختیار کا جواز باقی رہتا ہے اس وقت کے گزرنے تک جو خیار شرط کیلئے متعین کیا گیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ استثناء اصل حکم سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ متعاقدین کو اختیار ہے سوائے اس بیع میں جس میں خیار کو ساقط کیا ہو یا نئی خیار کی شرط لگائی گئی، تو اس میں خیار نہیں ہوتا تو یہاں مضاف کو حذف کیا ہے اور مضاف الیکو اس کے قائم مقام بنایا ہے اصل میں یوں ہے: الا بیع نفی الخیار اور ان ہی دو احتمالات کی وجہ سے خیار مجلس کے قائلین میں نفی خیار مجلس کے صحیح ہونے کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ پہلا زیادہ ظاہر ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے، الا بیعا جبری التخیار فیہ۔ یعنی سوائے اس بیع کے جس میں تخایر چلا ہو، اور اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے، ”اختر“ کہ تو اختیار کر، تو وہ کہے ”اخترتہ“ میں نے اختیار کیا، پس اس صورت میں عقد لازم ہو جائے گا اور اس میں خیار ساقط ہو جائے گا، اگرچہ ابھی تک ان میں جدائی نہ ہوئی ہو۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہوا کہ آنے والے قول ”او یختار“ میں ”او“ لالزمنک او تعطینی حقی کے ”او“ کی طرح ہے (یعنی او بمعنی ”الا ان“ کے ہے) ای ”الا ان یختار“۔

علامہ توربشتی فرماتے ہیں ”الا بیع الخیار“ کا مطلب ان لوگوں کے ہاں جو خیار مجلس کے قائل نہیں ہیں خیار شرط ہے۔ علامہ خطابی نے اس تاویل پر نکیر کی ہے اور اس کے فاسد ہونے کی تصریح کی ہے اور کہا ہے کہ استثناء اثبات سے نفی ہوتی ہے اور نفی سے اثبات ہوتا ہے۔ اور اول اثبات الخیار ہے تو یہ جائز نہیں ہے کہ مستثنیٰ بھی اسی طرح کا اثبات ہو۔ لیکن علامہ خطابی سے یہ بات گویا بغیر غور و فکر کے صادر ہوئی ہے اس لئے کہ ”ما لم یتفرقا“ میں واضح دلیل ہے وجوب بیع کے بعد نفی خیار کی، لہذا یہاں استثناء معنی نفی سے واقع ہوا ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ یہی حق ہے اس لئے کہ کلام آخری جملے سے تمام ہوتا ہے۔ اور یہ سب من حیث الاجتهاد ہے باقی حدیث میں تو صرف وجوب بیع اور نفی اختیار ہے یا شرط لگانے کے ذریعہ یا لفظ اختر کے ذریعہ اس لئے کہ آنے والی روایات اس کیلئے بیان ہیں۔

فکل واحد منہما بالخیار من بیعہ: (ما لم یتفرقا: گفتگو کے اعتبار سے یا بدن کے اعتبار سے۔

او یكون بیعہما عن خیار یكون منسوب ہے ”او“ مقدر کی وجہ سے جو بمعنی الّا کے ہے۔ اور یكون رفع کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اگر ”او“ اپنے اصلی معنی پر ہو (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے سید جمال الدین نے)۔ اور قول اول معتمد ہے روایت اور درایت اور یہی امام طبری کی شرح سے مفہوم ہو رہا ہے۔ اور وجہ رفع غیر ظاہر ہے، الّا یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ معطوف ہے ”یتفرقا“ کا اور پہلے کے جزم کے بعد دوسرے کو جزم نہیں دیا، دونوں لغتوں کو جمع کرتے ہوئے یا پورے ”ما لم یتفرقا“ پر عطف ہے، یا اس کو محمول کیا جائے اس پر کہ ”ان“ مصدر یہ مقدر ”ان“ کے بعد والے فعل کو کبھی رفع بھی دیتا ہے۔ جیسا کہ ابن حجرین کی قرآۃ اس آیت میں ہے ﴿لَمَنْ ارَادَ انْ یَتِمَّ الرِّضَاعَةَ﴾ [البقرۃ- ۲۳۳] ”یہ مدت اس لئے ہے کہ جو کوئی شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے“ یتم رفع کے ساتھ ہے جیسا کہ معنی میں ہے۔ (فاذا كان بیعہما عن خیار فقد وجب) یعنی عقد لازم ہو جاتا ہے یا یہ کہ خیار شرط ثابت ہو جاتا ہے اور جدائی سے ساقط نہیں ہوتا۔

او یقول: نصب کے ساتھ اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے، اس طریقے کے مطابق جو اوپر گزرا۔

(احدہما لصاحبہ اختر: نصب کے ساتھ ہے۔ ای موقع فی المتنق علیہ او یقول.....

قولہ: فی روایۃ للترمذی: اس عبارت میں اشارہ ہے صاحب مشکوٰۃ کی جانب سے صاحب مصابیح پر اعتراض کی طرف کہ انہوں نے اس حدیث کو فصل اول میں ذکر کیا ہے بوجہ ان کو وہم ہونے کے، کہ ”او یختار“ والی روایت صحیحین میں ہے یا کسی ایک میں ہے حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔ (اتمی)

۲۸۰۲: وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْبَيْعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَّا

بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَّتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۰۹/۴۔ الحدیث رقم ۲۰۷۹۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۱۶۴/۳ الحدیث رقم (۴۷)۔
 (۱۵۳۲)۔ والترمذی فی ۵۴۸/۳ الحدیث رقم ۱۲۴۶ واحمد فی المسند ۴۰۳/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت حکیم بن حزامؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: خرید و فروخت کرنے والوں کو (اپنے تجارتی معاملہ کو باقی رکھنے یا بیچ کر دینے کا) اختیار حاصل رہتا ہے۔ (لیکن یہ اختیار اس وقت تک حاصل رہتا ہے) جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں اور (یاد رکھو) جب خرید و فروخت کرنے والے (فروخت کی جانے والی چیز اور اس کی تعریف میں) بیچ بولتے ہیں اور (اس چیز میں جو عیب و نقصان ہوتا ہے اس کو) ظاہر کر دیتے ہیں (تا کہ کسی دھوکہ اور فریب کا دخل نہ رہے) تو ان کے تجارتی معاملے میں برکت ڈال دی جاتی ہے اور جب وہ عیب چھپاتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں تو ان کی خرید و فروخت میں برکت ختم کر دی جاتی ہے۔“
 (بخاری و مسلم)

تشریح: محقق: مجہول کے صیغہ کے ساتھ بمعنی ازبلیت۔

۲۸۰۳: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ اِنِّي اخْدَعُ فِي الْبَيْوعِ فَقَالَ اِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ فَكَانَ الرَّجُلُ يَقُولُهُ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی ۳۹۵/۴ الحدیث رقم ۲۱۱۷۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۱۶۵/۳ الحدیث رقم (۴۸)۔ (۱۵۳۳)۔
 وابوداؤد فی السنن ۷۶۵/۳ الحدیث رقم ۳۵۰۰۔ والنسائی فی ۲۵۲/۷ الحدیث رقم ۴۴۸۴۔ ومالك فی المؤطا ۶۸۵/۲ الحدیث رقم ۹۸ من کتاب البیوع۔ واحمد فی المسند ۸/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ ”میں خرید و فروخت کے معاملے میں دھوکہ کھا جاتا ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم جب خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کرو تو اس وقت یہ کہہ دیا کرو کہ (دین میں) فریب (کی) کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ چنانچہ وہ شخص اسی طرح کہہ دیا کرتا تھا۔“ (بخاری و مسلم)
تشریح: اخذع: واحد تشکلم مجہول کا صیغہ ہے۔

البیوع: باء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ آدمی حبان بن منقذ بن عمرو الانصاری المازنی تھے۔ اور بعض روایات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

قوله: فقال: اذا بايعت فقل لا خلابة: جاء مجيء كسر اللام في تخفيف اور اس کے بعد باء کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس بیع میں مجھے کوئی نقصان اور دھوکہ نہ ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ جس شخص نے بیع کے وقت یہ الفاظ کہے تو غبن کی صورت میں اس کو بیع ٹوٹانے کا حق ہوگا اور جمہور کے ہاں مطلقاً اس کو ٹوٹانے کا حق نہیں ہے۔

ان الفاظ سے مقصود تنبیہ کرنی ہے کہ وہ آدمی کہے مجھے خرید و فروخت میں واقفیت نہیں ہے۔ پس یعنی اس کے ساتھ معاملہ کرنے والا اس کو نقصان پہنچانے سے احتراز کرے اور اس کیلئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور اس زمانے میں لوگ اپنے بھائیوں کے ساتھ رعایت کا معاملہ زیادہ کرتے تھے، اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے)۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ثم انت بالخيار في كل سلعة ابتعتها۔ پھر تجھے اختیار ہوگا اس مال میں جو تو نے خرید اہو۔

تو حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ ”لا خلابة“ کے لفظ کو شرعاً وضع کیا ہے تین دن تک اختیار شرط لگانے کیلئے اور اگر اس کا معنی مجہول ہو تو پھر بیع باطل ہو جاتی ہے۔ اور گمان یہ ہے کہ یہ صرف اس شخص کے ساتھ خاص ہے جس کو آپ علیہ السلام نے مخاطب کیا تھا، لیکن یہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ خصوصیت کیلئے کسی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ (اتقی)

لفظ ”لا خلاۃ“ کا شرعاً موضوع ہونا جیسا کہ پہلے گزرا اہل بحث ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ غنم نہ تو بیع کو فاسد کرتا ہے اور نہ ہی اختیار کو ثابت کرتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس سے بیع فاسد ہوتی یا اختیار ثابت ہوتا، تو آپ اس پر تنبیہ فرماتے اور اس صحابی کو اس شرط لگانے کا حکم نہ دیتے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ غنم فاحش بیع کو فاسد کرتا ہے اور خیار کو ثابت کرتا ہے اس کے قائلین کے ہاں، اور ان صاحب نے مطلقاً غنم کے بارے میں کہا تھا جیسا کہ ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر (قاضی عیاض) آگے فرماتے ہیں کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر مشتری کو معاملات میں واقفیت نہ ہو تو اس کو لوٹانے کا اختیار ہوگا، اور ابو ثور فرماتے ہیں کہ اگر غنم فاحش ہو کہ اس جیسا غنم عام طور پر لوگ نہ کرتے ہوں، تو بیع فاسد ہو جائے گی اور یہ کہ جب یہ کلمہ ”لا خلاۃ“ عقد میں ذکر کیا جائے اور پھر اس میں غنم ظاہر ہو جائے تو اس کو اختیار ہوگا، تو گویا کہ اس نے شرط لگائی ہے کہ بیع کی قیمت، قیمت مثلی سے زیادہ نہ ہوگی تو یہ مشابہ ہو جائے گا اس صورت کے کہ جب مشتری بیع میں کسی مقصودی وصف کی شرط لگائے اور بعد میں اس کے خلاف ظاہر ہو جائے تو اس کو لوٹانے کا اختیار ہوتا ہے۔ اور یہی امام احمد کا قول ہے۔ اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ صرف یہ لفظ غنم کی وجہ سے خیار کو لازم نہیں کرتا، پس ان میں سے بعض نے تو حدیث کو ”حبان“ کے ساتھ خاص کیا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ آپ نے ان کو خیار شرط لگانے کا حکم دیا تھا اور شرط کو اس کلمہ کے ساتھ صادر کرنا یہ معاملہ کرنے والے کو امانت کی حفاظت اور دھوکہ سے بچنے پر ابھارنے کیلئے ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ آپ نے اس سے کہا تھا: ”قل لا خلاۃ“ و اشتراط الخیار ثلاثہ ایام۔ تو اس صورت میں خیار غنم کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ شرط لگانے والے کو متعین مدت کے اندر فسخ کرنے کا اختیار ہوگا چاہے اس میں غنم ہو یا نہ ہو، اور مدت گزرنے کے بعد اس کو فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا اگرچہ ظاہر ہو جائے۔ علامہ تورپشینی فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو اس بات کی تلقین کی تھی تاکہ ان کے ساتھ معاملہ کرنے والے شخص کو یہ تہیہ ہو جائے کہ یہ صاحب شیئی کی معرفت مقدار اور قیمت کے بارے میں اصحاب بصیرت میں سے نہیں ہیں چنانچہ وہ ان کو نقصان پہنچانے اور دھوکہ دینے سے احتراز کرے گا اور اس کیلئے وہی پسند کرے گا جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور اس زمانے میں لوگ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے اور اپنے نفس کے خیال سے زیادہ ان کا خیال رکھتے تھے۔

امام طبری نے بھی اس وجہ کو پسند کیا ہے، اور ”لا خلاۃ“ کی ترکیب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”لا“ نفی جنس کیلئے ہے اور اس کی خبر محذوف ہے حجازیوں کے نزدیک۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہمارے دین میں فریب کی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ دین سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔

الفصل الثالثانی :

تجارتی معاملات میں فریقین کی رضامندی اور طمانیت ضروری ہے

۲۸۰۳: عَنْ عَمْرٍو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ أَلْبَيْعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا إِلَّا أَنْ يَكُونَ صَفْقَةً خِيَارٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يُفَارِقَ صَاحِبَهُ خَشِيَةً أَنْ يَسْتَقِيلَهُ - (رواه الترمذی و ابوداؤد و النسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۳۶/۳ الحدیث رقم ۳۴۵۶۔ و الترمذی فی ۵۵۰/۳ الحدیث رقم ۱۲۴۷۔ و النسائی فی

الحدیث رقم ۴۴۸۳۔ و احمد فی المسند ۱۸۳/۲۔

ترجمہ: ”حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خرید و فروخت کرنے والے (اسی وقت تک بیع کو باقی رکھنے یا اس کو فسخ کرنے کا) اختیار رکھتے ہیں جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں مگر یہ کہ ان کی بیع خیار ہو (تو اس میں جدائی کے بعد بھی اختیار باقی رہتا ہے) اور ان دونوں میں سے کسی کے لئے (ازروئے تقویٰ) یہ

حلال نہیں ہے کہ وہ معاملہ کرتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو اس خوف سے کہیں دوسرا فریق معاملے کو فسخ کرنے کا اختیار نہ مانگ لے (یعنی جب تک کسی معاملے میں دونوں فریق پوری طرح مطمئن نہ ہو جائیں ایجاب و قبول میں ان میں سے کوئی محض اس لئے جلد بازی نہ کرے کہ مبادا فریق ثانی معاملے کو فسخ کر دے یا معاملہ طے کرتے ہی ان میں سے کوئی محض اس وجہ سے نہ بھاگ کھڑا ہو کہ کہیں دوسرا فریق بیع کو فسخ کرنے کے اختیار کی شرط نہ چاہنے لگے۔ (ابوداؤد نسائی)

تشریح: قوله: البيعان بالخيار ما لم يتفرقا، الا ان يكون صفقة خيار: یعنی جب جدا ہو جائے تو ان کا اختیار باطل ہو جائے گا۔ مگر یہ کہ عقد بیع خیار ہو، یعنی ایسی بیع جس میں اختیار کی شرط لگائی گئی ہو۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں اضافت بیان کیلئے ہے اس لئے کہ ”صفقة“ بیع کیلئے بھی ہوتا ہے اور عہد کیلئے بھی۔ نہایہ میں ہے: وہ یہ ہے کہ ایک آدمی اپنا عہد و میثاق دوسرے کو دے اور اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں رکھے جیسا کہ عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اور ”صفقة“ اسم مرآۃ ہے تصفیق بالیدین سے اور مطلب یہ ہے کہ بیچنے اور خریدنے والے کا اختیار ان کی جدائی سے ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ ایسی بیع ہو جس میں اختیار کی شرط لگائی گئی ہو، جیسا کہ پہلے گزرا۔ (انتہی)

حاصل یہ ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ میں رکھنا یہ امر اعلیٰ اور عربی ہے شریعت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں اور شاید جدائی سے مراد ہاتھوں کا جدا ہونا ہو، اس لئے کہ یہ عقد کے تمام ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اس سے ہمارے مذہب کو تقویت پہنچتی ہے۔ کہ وہ تفریق قولی اور بدنی دونوں کو شامل ہے اور اس سے اس بات کا بھی جواب ہو جاتا ہے جو قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جدائی کا مفہوم جسموں کی جدائی ہے اور اس پر اہل لغت کا اجماع ہے۔ اس آیت میں طلاق کو بھی جدائی کہا ہے ﴿وان يتفرقا يعن الله كلا عن سعة﴾ النساء ۱۳۰۔ اس وجہ سے کہ یہ جسموں کی جدائی کو لازم کر دیتی ہے۔ (انتہی)

اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گفتگو کے ساتھ عقد کا تمام ہونا یہ بھی تفرق بالابدان کو لازم کرتا ہے۔ اور بائع اور مشتری کیلئے اس کا جواز ثابت کرتی ہے۔ باقی ایجاب شرعی کا معنی لغوی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله: ولا يحل ان يفارق صاحبه خشية ان يستقبله: اقاله بیع کو باطل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ ہمارے مذہب کی صریح دلیل ہے اس لئے کہ اقالہ عقد کے تمام ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے، ورنہ اگر اس کو خیار مجلس کا حق ہوتا تو وہ اپنے ساتھی سے اقالہ کیوں طلب کرے۔ شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ بیع کو منقذ ہونے کے بعد باطل کرنے کو فسخ کہتے ہیں عاقد بیع کے لازم ہونے کے بعد دونوں کے رضا مندی سے بیع کو ختم کرے تو اس کیلئے اقالہ استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر مدت خیار میں بیع کو ختم کرے تو اس کو ”فسخ“ کہتے ہیں۔ تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ متقی کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ عقد کے بعد فوراً مجلس سے کھڑا ہو کر نکل جائے اس خوف سے کہ دوسرا عاقد خیار مجلس کی وجہ سے بیع کے فسخ کرنے کا مطالبہ نہ کر دے، اس لئے کہ یہ دھوکہ کے مشابہ ہے (انتہی)۔

اقالہ کی تاویل فسخ مفید کے ساتھ غیر ظاہر ہے، اور یہ جو روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ جب کسی آدمی سے بیع کرتے اور ارادہ یہ ہوتا کہ وہ ان سے اقالہ نہ کرے تو آرام سے کھڑے ہو کر چلنے لگتے۔ اور امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ مفارقت سے مراد مفارقت بالابدان ہے۔ (انتہی) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا اعتبار ایک صحابی کی رائے میں ہے جو دوسروں پر حجت نہیں ہے۔

۲۸۰۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا يَتَفَرَّقَنَّ اثْنَانِ إِلَّا عَنْ تَرَاضٍ - (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی ۷۳۷/۳ الحدیث رقم ۳۴۵۸۔ والترمذی فی ۵۵۱/۳ الحدیث۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (بائع و مشتری) دونوں آپس کی رضا مندی کے بغیر ایک

دوسرے سے جدا نہ ہوں۔“ (ابوداؤد)

تشریح: لا يتفرقان الا عن تراض: اور یہ اللہ کے اس قول سے اقتباس ہے: ﴿لا تأكلوا أموالكم بينكم

بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منكم﴾ [النساء-۹] (آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو، تو مضا لقتہیں)۔

ایجاب و قبول کے بعد تجارت رضامندی کے ساتھ ہوتی ہے تو تخمیر پر موقوف نہیں ہوتی، پس اللہ نے مباح کر دیا ہے مشتری کیلئے تخمیر سے پہلے کھانا، پس مراد حدیث سے (واللہ اعلم) یہ ہے کہ دونوں صاحب معاملہ کوئی تجارتی معاملہ طے کرنے کے بعد اس وقت تک ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں جب تک قیمت کی ادائیگی اور خرید کردہ چیزوں کی حوالگی میں دونوں کی رضا و رغبت نہ پائی جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر ضرر و ضرار کا احتمال رہے گا جو شریعت میں ممنوع ہے۔

یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب معاملہ طے ہو جائے اور دونوں اصحاب معاملہ میں سے کوئی ایک وہاں سے اٹھ کھڑا ہونے کا ارادہ کرے تو دوسرے فریق سے پہلے پوچھ لے کہ کیا اس معاملے پر تم راضی ہو گئے ہو؟ اس کے بعد اگر دوسرا فریق معاملے کو فسخ کرنا چاہے تو وہ بھی معاملے کو فسخ کر دے، اس صورت میں یہ حدیث معنی کے اعتبار سے پہلی حدیث کے موافق ہوگی، نیز یہ ممانعت نبی تنزیہی کے طور پر ہے کیونکہ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ایک دوسرے کی اجازت اور علم کے بغیر جدا ہونا حلال ہے۔ اور ہمارے مذہب کی تائید اس آیت کے اطلاق سے بھی ہوتی ہے: ﴿يا ايها الذين امنوا اوفوا بالعقود﴾ [المائدة: ۱] (اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو)۔

اور یہ عقد قبل از تخمیر ہے، اور اسی طرح اس آیت سے بھی ہمارے مذہب کی تائید ہوتی ہے: ﴿واشهدوا اذا تباعتم﴾ [البقرة-۲۸۲] (اور خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو)۔ اس میں حکم دیا ہے معاملے کو گواہی کے ساتھ مضبوط کرنے کا تاکہ بیع کا انکار نہ ہو، اور بیع صحیح ہو جاتی ہے خیار سے پہلے اور ایجاب و قبول کے بعد، پس اگر خیار ثابت ہو اور بیع اس سے پہلے لازم نہ ہو تو اس سے ان تمام نصوص کا ابطال لازم آئے گا۔

ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حبان بن مہذک حدیث جس میں آپ نے ان سے فرمایا تھا: اذا ابتعت فقل: لا خلاية ولى الخيار۔ اس حدیث میں آپ نے ان کیلئے خیار شرط کو ثابت کیا ہے اور اس کو تین دن تک مؤخر کیا ہے، پس یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ تین دن تک اختیار ثابت نہیں ہوتا مگر اصل عقد میں شرط لگانے کے ساتھ نہ کہ اصل خیار (کہ وہ بغیر شرط کے ثابت ہوتا ہے)۔ پس اس صورت میں تفرق سے جو قبول خیار کیلئے غایت ہے، تفرق اقوال مراد ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ دوسرا فریق ایجاب کے بعد کہے کہ میں نہیں خریدتا، یا موجب قبول سے پہلے اپنی بات سے رجوع کر لے، اور ”تفریق“ کی اسناد ”ناس“ کی طرف کر کے اس سے تفرق اقوال مراد ہونا شرع اور عرف میں کثرت کے ساتھ وارد ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے ﴿وما تفرق الذين اتوا الكتاب الا من بعد ما جاءتهم البينة﴾ [البینہ- ۴] (اور جو لوگ اہل کتاب تھے وہ اس واضح دلیل کے آنے ہی کے بعد مختلف ہو گئے)۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا: افتوت بنو اسرائيل على ثنتين وسبعين فرقة، وستفترق امتي على ثلاث وسبعين فرقة۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت بہتر فرقوں میں بٹے گی۔

نکاح، خلع، اور مال کے بدلے عتق پر قیاس کرنا، پس ان دونوں میں سے ہر ایک عقد معاوضہ ہے جو بغیر خیار مجلس کے تمام ہو جاتا ہے، بلکہ صرف ایسے لفظ سے تمام ہو جاتا ہے جو رضامندی پر دلالت کرے۔ پس اسی طرح بیع ہے۔ (آپنی ملخصاً)

امام طیبی فرماتے ہیں کہ عن تراض یہ صفت ہے مصدر محذوف کیلئے اور استثناء متصل ہے، ای لا يتفرق اثنان الا تفرقا صادرا عن تراض یعنی دو معاملہ کرنے والے ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں مگر ایسی جدائی کے ساتھ جو باہم رضامندی سے ہو۔ اشرف فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ عاقدین کی جدائی خیار مجلس کے ختم کرنے کیلئے جائز نہیں ہے مگر باہم رضامندی سے، (آپنی)۔

پہلے گزرا ہے کہ بغیر رضامندی کے جدا ہونا اجماعی طور پر جائز ہے اور ممانعت تنزیہی ہے، اور اشرف کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں متعاقدین کیلئے خیار مجلس کے ثبوت کی دلیل ہے، ورنہ تو پھر اس قول (الا عن تراض) کا کوئی معنی نہ ہوگا۔ (آپنی)

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ آپ اس قول کا مطلب اور تحقیق پہلے جان چکے ہیں۔

الفصل الثالث :

عقد بیع کے بعد فسخ کا اختیار

۲۸۰۶: عَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ خَيَّرَ أَعْرَابِيًّا بَعْدَ الْبَيْعِ -

(رزقہ الترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح غریب)

الترمذی فی السنن ۵۵۱۳ الحدیث رقم ۱۲۴۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی کو خرید و فروخت کا معاملہ ہو جانے کے بعد (دوسرے فریق کی رضامندی سے اس معاملے کو فسخ کرنے کا) اختیار دیا تھا۔ ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: امام طبری فرماتے ہیں کہ حدیث کا ظاہر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر دلالت کر رہا ہے، اس لئے کہ اگر خیار مجلس عقد کرنے کے ساتھ ثابت ہوتا تو پھر یہاں اس کو اختیار دینا عیب ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مطلق ہے اس کو حمل کیا جائے گا مقید پر جیسا کہ باب کی پہلی حدیث میں ہے، (اتمی) لیکن ظاہر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ حدیث نص ہے اور اس تنازع فیہ کے لئے رافع جو اول باب میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بعض نسخوں میں ”حسن“ کا اضافہ موجود نہیں ہے۔

بَابُ الرَّبْوِ

سود کا بیان

”ربا“ رأس المال پر زیادتی کو کہتے ہیں، لیکن شریعت میں اس کو ایک مخصوص زیادت کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور ”زیادۃ“ کے معنی میں یہ آیت ہے:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رَبَا لِيُرْبُو فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يُرْبُو عِنْدَ اللَّهِ﴾ [الروم-۳۹]

(اور جو چیز تم اس غرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے، تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا)

اور اس آیت: ﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ [البقرة-۲۷۶] (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں)۔ میں اس پر تنبیہ کی ہے اصل اور معقول زیادتی جس کو ”برکت“ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ”ربا“ سے اٹھالی گئی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”ربا اسم“ مقصور ہے، ربا یربو سے، لہذا اس کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس کے تشبیہ کو یاء کے ساتھ لکھا جاتا ہے حرف اول کے کسرہ کی وجہ سے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ”ربا“ کو قرآن میں واؤ کے ساتھ لکھا ہے فراء فرماتے ہیں کہ واؤ کے ساتھ اس لئے لکھا ہے کہ اہل حجاز نے خط اہل حیرہ سے سیکھا ہے، اور ان کی لغت میں ”ربو“ واؤ کے ساتھ ہے تو انہوں نے خط کی صورت اپنی لغت کے مطابق ان کو سکھائی۔ فراء فرماتے ہیں کہ ابو سلیمان العدونی نے اسی طرح اس کو پڑھا ہے اور ابو حمزہ اور کسائی نے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے بوجہ راء کے کسرہ کے۔ اور باقی حضرات نے ”تفخیم“ کے ساتھ پڑھا ہے بوجہ با کے فتح کے۔ فراء فرماتے ہیں لہذا اس کو واؤ، الف، اور یاء تینوں کے ساتھ جازز ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ عبد اللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ ربا میں بہتر ۲۷ گناہ ہیں۔ سب سے چھوٹا یہ ہے کہ آدمی اسلام کی حالت میں

اپنی ماں سے زنا کرے، اور ربا کے ایک درہم کا گناہ، تینتیس ۳۳ مرتبہ زنا سے زیادہ ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ قیامت کے دن نیک و فاجر کو کھڑے ہونے کی اجازت دیں گے سوائے سوڈو خور کے۔ پس وہ کھڑا نہ ہوگا مگر اس شخص کی طرح جس کو جنات کے اثر کے اثر نے مجبوط الحواس کر دیا ہو۔

الفصل الاول:

سوڈ لینے دینے والے پر لعنت

۲۸۰۷: عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اِكْلَ الرِّبَا وَمُؤْكَلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدِيَهُ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ (رواه مسلم)

اخر جہ مسلمہ فی صحیح ۱۲۱۹۳ الحدیث رقم (۱۰۶-۱۰۹۸)۔ و الترمذی فی السنن ۵۱۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۰۶۔
ترجمہ: ”حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سوڈ کھانے والے پر سوڈ کھلانے والے پر (سوڈ لین دین کا کاغذ) لکھنے والے پر اور اس کے گواہوں پر سب ہی پر لعنت فرمائی ہے نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سب (اصل گناہ میں) برابر ہیں (اگرچہ مقدار کے اعتبار سے مختلف ہوں)۔“ (مسلم)

تشریح: اکل الربا: سے مراد سوڈ لینے والا ہے اگرچہ وہ نہ کھائے۔ کھانے کے ساتھ خاص اس لئے کیا کہ کھانا نفع اٹھانے کی بڑی انواع میں سے ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ان الذين ياكلون اموال اليتامى ظلماً﴾ [النساء: ۱۰] (بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے ہیں)۔

و مؤكله: ہمزہ کے ساتھ ہے اور ہمزہ کو واؤ سے بھی تبدیل کیا جاتا ہے۔ مراد سوڈ لینے والا ہے اس شخص کو جو سوڈ لے رہا ہو، اگرچہ وہ اس میں سے نہ کھائے۔ ”اکل“ کی تعبیر اس لئے اختیار فرمائی کہ یہی زیادہ غالب ہے یا عظیم منافع میں سے ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔
خطابی فرماتے ہیں آپ نے سوڈ کھانے والے اور کھلانے والے کو برابر قرار دیا ہے، اس لئے کہ ہر ایک دوسرے کی معاونت اور شرکت سے ہی سوڈ کھانے تک پہنچتا ہے۔ پس یہ دونوں گناہ میں بھی شریک ہوں گے جیسے کہ فعل میں شریک ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ایک اچھی حالت والا ہے بوجہ بیع میں زیادتی وصول کرنے کے اور دوسرا بری حالت والا ہے بوجہ نقصان کرنے کے، پس اللہ پاک کی حدود ہیں ان سے تجاوز کرنا کسی بھی حالت میں جائز نہیں، یعنی نفع کے وجود کے وقت نفع نہ ہونے کے وقت تنگی کی حالت میں، آسانی کی حالت۔ اور ضرورت بھی کسی درجے میں اس کی نہیں پڑتی کہ وہ کسی کو سوڈ کھلائے اسی لئے کہ وہ اپنی حاجات کو اس کے راستوں سے پورا کر سکتا ہے دوسرے معاملات اور بیع وغیرہ کے ذریعے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اضطرار دینے والے کو لاحق ہو، پس اس کو جائز ہے کہ وہ صریح سوڈ سے احتراز کرے اور معاملات کی کسی اور قسم سے اپنی ضرورت کو پورا کرے اللہ کے اس ارشاد کی وجہ سے: ﴿واحل الله البيوع وحرم الربا﴾ [البقرة: ۲۷۵] (اور اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سوڈ کو حرام کر دیا ہے) مگر شدید خوف اور ڈر کے ساتھ، کہ شاید اللہ پاک اس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرمائیں، لیکن سوڈ خور ایسا نہیں ہے۔

و کاتبہ و شاہدہ: امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ تصریح ہے کہ سوڈ لینے دینے کے معاملہ کی کتابت اور گواہی دونوں حرام ہیں چونکہ اس میں باطل کی اعانت ہے۔ اور یہ لوگ بنیادی طور پر گناہ میں برابر کے شریک ہیں اگرچہ مقدار کے لحاظ سے مختلف ہوں۔

تخریج: مسلم کے علاوہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ نے بھی اس کو ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ اور مسلم نے ابن مسعود سے صرف ”اکل الربا و مؤكله“ روایت کیا ہے۔ اور طبرانی نے ابن مسعود سے یوں روایت کیا ہے: ”لعن اللہ الربا و اكله و مؤكله و کاتبہ و شاہدہ و ہم يعلمون“۔

۲۸۰۸: وَعَنْ عِبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ **الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ وَالنَّمْرُ بِالنَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلِ سِوَاءٍ بِسِوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هَذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ.** (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۲۱۱/۳ الحدیث رقم (۸۱-۱۵۸۷)۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبادہ ابن صامت کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”سونا سونے کے عوض اور چاندی چاندی کے عوض اور گندم گندم کے عوض اور جو جو کے عوض اور نمک نمک کے عوض اگر لیا دیا جائے تو ان کا لین دین (مقدار) میں مثل بمثل یعنی مساوی و دست بدست ہونا چاہئے اگر یہ قسمیں مختلف ہوں (مثلاً گیہوں کا تبادلہ جو کے ساتھ یا جو کا تبادلہ کھجور کے ساتھ ہو) تو پھر (اجازت ہے کہ) جس طرح چاہو خرید و فروخت کرو (یعنی برابر برابر ہونا ضروری نہیں ہے) البتہ لین دین کا دست بدست ہونا (اس صورت میں بھی) ضروری ہے۔“ (مسلم)

تشریح: الذہب: الذہب کے ساتھ پڑھا جائے تو ”بیاع“ فعل مقدر ہوگا اور نصاب کے ساتھ ہو تو ”بیعوا“ فعل مقدر ہوگا البر: باء موحده کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی حنطۃ

امام نووی فرماتے ہیں کہ وہ علت جو ان چھ اشیاء میں حرمت رہا کیلئے سبب ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی کے نزدیک سونے اور چاندی میں رہا کی علت شمنیت ہے، پس ان کے مسلک کے مطابق سونے، چاندی کے علاوہ موزونی چیزوں میں مثلاً لوہا، تانبا وغیرہ میں رہا کا حکم جاری نہ ہوگا، بوجہ معنی ”شمنیت“ کے نہ ہونے کے، لیکن باقی چار چیزوں میں رہا کی علت محض ”مطعمویت“ (یعنی صرف غذائیت) ہے۔ لہذا ان کے مسلک میں تمام مطعموات میں خواہ وہ غذا ہوں، خواہ میوہ جات ہوں خواہ ادویہ ہوں مثلاً اہلیج اور سقمونیا رہا کا حکم جاری ہوگا۔ اور وہ چیز جو اکیلی کھائی جاتی ہو، یا کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر کھائی جاتی ہو، پس زعفران میں بھی صحیح قول کے مطابق رہا کا حکم جاری ہوگا۔

امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں سونے اور چاندی میں امام شافعی کی طرح شمنیت علت ہے اور باقی چار چیزوں میں رہا کی علت قوت مدخر (محمفوظ رہنے والی غذا) ہونا ہے۔ اس لئے امام مالک کے ہاں کشمش اور بغیر چھلکے کے جو میں رہا کا حکم جاری ہوگا اس لئے کہ یہ بھی گندم اور جو کی طرح ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں سونے اور چاندی میں رہا کی علت وزن ہے اس لئے ہر اس چیز کے باہمی لین دین میں رہا کا حکم جاری ہوگا جو موزون ہو، جیسے تانبا، لوہا، وغیرہ۔ اور باقی چار چیزوں میں رہا کی علت کیل ہے اس لئے ہر اس چیز میں رہا کا حکم جاری ہوگا جو مکمل ہو جیسے چونا، اشنان وغیرہ۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ہاں، اور امام شافعی کے قول قدیم میں، آخری چار چیزوں میں رہا کی علت غذائیت، وزن اور کیل ہے۔ پس ان کے ہاں تربوز اور بی وغیرہ میں رہا کا حکم جاری نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مماثلت عام ہے قدر کو بھی شامل ہے بخلاف مساوات کے، یعنی عوضین کا مساوی ہونا مقدر اور قبضہ میں۔

یدا بیید: اس سے معلوم ہوتا ہے عوضین کا کافی الحال اور مجلس عقد ہی میں قبضہ کرنا کرنا ضروری ہے۔ اور یہ دونوں ان تین شرطوں میں سے ہیں کہ پہلی شرط وزن اور کیل میں مماثلت ہے دوسری شرط عوضین پر قبضہ کرنے کی مجلس ایک ہو جس میں تفرق ابدان نہ ہو، تیسری شرط حلول (نقد) ہے کہ نہ بیخا (ادھار) نہ ہو۔

فاذا اختلفت هذه الاصناف : امام تورپشٹی فرماتے ہیں کہ ہم نے مصابیح کے بہت سارے نسخوں میں پایا ہے کہ لفظ ”اصناف“ کو کراس کی جگہ ”اجناس“ لکھا ہوا ہے۔ اور اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور اس میں ”الاصناف“ کا لفظ ہے نہ کہ اس

کے علاوہ۔ میں اس کو بعض کاتبوں کا تصرف سمجھتا ہوں، کہ ان کے گمان میں لفظ ”اجناس“ زیادہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک چیز ایک علیحدہ جنس ہے۔ اور صنّف، جنس سے خاص ہوتی ہے، لیکن ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس مقام پر اصناف زیادہ اچھا ہے، اس لئے کہ آپ کا ارادہ اس جنس کو بیان کرنا ہے، جس میں ربا کا حکم جاری ہوتا ہے، پس آپ نے اس کی مختلف اصناف ذکر فرمادیں، علاوہ ازیں عرب بعض قریب المعنی الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ (انتھی) مطلب یہ ہے کہ جس کسی چیز کو مخالف جنس کے بدلے بیچا جائے اگرچہ وہ علت میں مشترک ہو مثلاً گندم کو جو کے بدلہ میں بیچنا کہ اس کو تفاضل کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔ اور یہی مطلب ہے اس قول کا ”فبیعوا کیف شئتم“ لیکن گزری ہوئی شرطوں میں سے آخری دو شرطوں کا بیان بھی ہونا ضروری ہے، بوجہ اگلے قول کے۔

اذا كان : اسم كان ”بیع“ ہے۔

یذا! بید: یعنی فی الحال ہو اس مجلس میں قبضہ ہو، ایک کی دوسرے سے جدائی سے پہلے۔

۲۸۰۹: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مَثَلًا بِمَثَلٍ يَدًا بِيَدٍ فَمَنْ زَادَ أَوْ اسْتَرَادَ فَقَدْ آرَبَى الْآخِذَ وَالْمُعْطَى فِيهِ سَوَاءٌ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۲۱۱/۳ الحديث رقم (۸۲)۔ (۱۰۸۴)

ترجمہ: ”اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”سونا سونے کے عوض اور چاندی چاندی کے عوض اور گندم گندم کے عوض اور جو جو کے عوض اور کھجور کھجور کے عوض اور نمک کے عوض میں اگر دیا جائے تو ان کا لین دین مساوی اور درست بدست ہونا ضروری ہے۔ لہذا جس نے (ایسا نہیں کیا بلکہ) زیادہ دیا یا زیادہ طلب کیا تو گویا اس نے سود لیا لینے والا اور دینے والا اس (گناہ میں) برابر ہیں۔“ (مسلم)

تشریح: قوله: الذهب بالذهب..... یذا بید: زین العرب کہتے ہیں کہ اس حدیث میں چھ ۶ سودی چیزوں کا ذکر ہے،

لیکن ربا صرف ان چھ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ان کو اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ دیگر اشیاء کو ان پر قیاس کر لیا جائے۔

فمن زاد: کو مقدم کیا اس لئے کہ معاملہ اس کے اختیار میں اولیٰ ہوتا ہے

فقد آربی: یعنی اپنے آپ کو سودی معاملہ میں واقع کر دیا، تو ریشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ ربا کا معاملہ کیا اور سود دیا،

اور لفظ کا معنی یہ ہے کہ اس کو دینے ہوئے سے زیادہ لیا۔ ”ربا الشئنی یروبو“ سے ماخوذ ہے، بمعنی زاد۔

یطبی فرماتے ہیں کہ شاید یہ کہنے کی وجہ یہ ہو کہ اس نے ایک فعل حرام کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے کہ جس نے دس مثقال چاندی ایک

مثقال سونے کے بدلے خریدی تو اس نے زیادہ لیا اور یہ ربا نہیں ہے۔

۲۸۱۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلِ وَلَا تُشْفُوا بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ وَلَا تَبِيعُوا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلِ وَلَا تُشْفُوا بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ وَلَا تَبِيعُوا مِنْهَا غَائِبًا بِنَاجِزٍ (متفق عليه وفي رواية) لَا تَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ وَلَا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ إِلَّا وَرْزَانًا بَوْرْزَانًا.

اخرجه البخاری في صحيحه ۳۷۹/۴ الحديث رقم ۲۱۷۷۔ و مسلم في (۱۲۰۸/۳) الحديث رقم (۱۰۸۴۰۷۵)۔

والنسائی في السنن ۲۷۸/۷ الحديث رقم ۴۵۷۰۔ ومالك في الدعوات ۶۳۲/۲ الحديث رقم ۳۰ من كتاب البيوع۔

واحمد في المسند ۹۳/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونے کو سونے کے عوض فروخت نہ کرو مگر یہ کہ

دونوں وزن میں مساوی ہوں اور دونوں میں کمی بیشی نہ کرو اسی طرح چاندی کو چاندی کے عوض میں فروخت نہ کرو مگر یہ کہ دونوں

مساوی ہوں اور دونوں میں کسی بیشی نہ کرو نیز ان (سونے اور چاندی) میں سے کسی غیر موجود چیز کو موجود چیز کے عوض نہ بیچو۔ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ سونے کو سونے کے عوض اور چاندی کو چاندی کے عوض باہم مساوی وزن میں بیچو۔
تشریح: ولا تشفوا: پہلے حرف کے ضمہ دوسرے کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ، ما قبل کیلئے تاکید ہے۔
 بعضها: امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ضمیر ذہب کی طرف راجع ہے، اور ذہب ایک معروف جوہر ہے، اور کبھی اس کو مؤنث بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ (انتہی)

قاموس میں ہے کہ ”ذہب“ تبر (سونے کے ڈھیلے) کو کہا جاتا ہے یہ مؤنث ہے اور اس کا واحد تاء کے ساتھ ”ذہبہ“ آتا ہے۔
 حدیث میں ”ذہب“ سے مراد وہ ہے جو ”تبر“ اور اس کے علاوہ سب کو شامل ہو، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ تائید جس کیلئے ہے، یہ بتانے کیلئے کہ شرعاً سونے کی مختلف اقسام کی تمیز کا کوئی اعتبار نہیں ہے، یا مطلب یہ ہے: لاتزید وافی البیع بعض العین البیعة التی ہی الذہب علی بعض کہ تم زیادہ نہ کرو بیع میں بعض متعین بیع کو جو کہ سونا ہے بعض پر۔
 شرح السنہ میں ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے جو شخص سونے کے زیور کا سونے کے ساتھ تبادلہ کرے تو یہ جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وزن میں برابر برابر ہو، زیور کی بنائی یعنی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سونے کو سونے کے بدلے میں بیچنا ہے (اور اس میں زیادتی جائز نہیں ہے)۔ الورق: راء کے کسرہ کے ساتھ، اور سکون کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، چاندی کو کہتے ہیں۔
 ورق کو مؤنث ذکر کیا ہے اس لئے کہ یہ بمعنی ”فضة“ ہے۔ ولا الورق ”لا“ کی زیادتی تاکید کیلئے ہے۔
 الا وزنا بوزن: اى موزونين وزنا مقابلا و مماثلا بوزن۔

۲۸۱۱: وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ الطَّعَامُ بِالطَّعَامِ مَثَلًا بِمَثَلٍ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۲۱۴/۳ الحديث رقم (۹۳-۱۰۹۲)۔

ترجمہ: ”اور حضرت معمر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ غلہ کے عوض غلہ باہم مساوی ہونا چاہیے (یعنی غلہ کو ہم جنس غلہ کے بدلے میں اگر لیا دیا جائے تو یہ لین دین برابر برابر ہونا چاہئے)۔ (مسلم)
تشریح: الطعام: ہر کھانے کی چیز کو طعام کہا جاتا ہے، اور کبھی اس کا اطلاق گندم پر بھی ہوتا ہے، اگر یہاں مراد گندم ہو تو دوسری اشیاء کو اس پر قیاس کیا جائے گا جنس کے متحد ہونے کے وقت اور اگر مراد اس سے کھانے کی چیز ہو تو پھر یہ مشروبات کو بھی شامل ہو گا، پس اگلے الفاظ ”مثلاً بمثل“ کی بناء پر اس کو جنس کے متحد ہونے پر محمول کیا جائے گا۔

۲۸۱۲: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْذَّهَبُ بِالذَّهَبِ رَبًّا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رَبًّا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رَبًّا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رَبًّا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ. (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۴۷/۴ الحديث رقم ۲۱۳۴۔ و مسلم فى صحيحه (۱۲۰۹/۳) الحديث رقم (۷۹)۔

(۱۰۸۶)۔ و ابوداؤد فى السنن ۶۴۳/۳ الحديث رقم ۳۳۴۸۔ و الترمذى فى ۵۴۵/۳ الحديث رقم ۱۲۴۳۔ و النسائى فى

۲۷۳/۷ الحديث رقم ۴۰۵۸۔ و ابن ماجه فى ۷۵۹/۲ الحديث رقم ۲۲۵۹۔ و الدارمى فى ۳۳۶/۲ الحديث رقم ۲۵۷۸

ومالك فى الموطأ ۶۳۶/۲ الحديث رقم ۳۸ من كتاب البیوع۔

ترجمہ: ”اور عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونے کو سونے کے عوض چاندی کو چاندی کے عوض، گندم کو گندم کے عوض، جو کو جو کے عوض، بھجور کو بھجور کے عوض اور خارخارید و فروخت کرنا سود ہے لیکن اگر دست بدست ہو تو جائز ہے۔ (بخاری و مسلم)
تشریح: هاء: مد اور قصر، دونوں کے ساتھ ہے، اسم فاعل، بمعنی ”خذوا“ ہے، لیکن مد کے ساتھ زیادہ فصیح اور مشہور ہے، اور ہمزہ مفتوح ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی کہا گیا ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے امام نووی نے) سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی اصل ”هاك“

ہے بمعنی خذ، کاف کو حذف کیا اور اس کے عوض میں مذاور ہمزہ کو لایا گیا (اتحییٰ)۔ لیکن اس میں تسامح ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔
 و ہاء: یعنی قبضہ کیا جائے اور لیے جائیں اسی مجلس میں، جدائی سے پہلے اس طور پر کہ ایک کہے یہ لے اور دوسرا بھی یہی کہے اور
 بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے ”لے اور دے“۔ اس حدیث میں دلیل ہے بیع تعاطی کے صحیح ہونے کی یہاں تک کہ قیمتی اشیاء میں بھی۔
 ابن الہمام کی شرح میں ہے کہ! ابو معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ انار والے کے پاس آئے، اس
 کے پاس پیسے رکھے انار لیا اور کوئی بات کہنے بغیر چلے گئے۔

فائق میں ہے کہ ”ہاء“ اسم صوت ہے بمعنی غذا، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ﴿ہاء م اقرؤا کتابیہ﴾ [الحاقہ- ۱۹]
 مانگی فرماتے ہیں ”ہاء“ کا حق یہ ہے کہ یہ ”الآ“ کے بعد واقع نہ ہو، جیسے ”خذ“، الآ کے بعد واقع نہیں ہوتا، اور اس حدیث میں
 اس سے پہلے تقدیری عبارت ماننا ضروری ہے، وہ اس کے ساتھ جھکی ہوگا۔ تو گویا تقدیری عبارت یوں ہوں گی: ولا الذهب بالذهب
 الا مقولا عنده من المتبايعين هاء و ہاء۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے، اور
 مشتق منہ مقرر ہے، تقدیری عبارت یوں ہے: بیع الذهب بالذهب وباقي جميع الحالات الا حال الحضور والتقابض۔ تو
 ہاء و ہاء کنا یہ ہے تقابض سے اس لئے کہ یہ اس کا لازم ہے۔

۲۸۱۳: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلَى خَبِيرٍ فَجَاءَهُ بِتَمْرٍ جَنِيْبٍ
 فَقَالَ أَكُلْ تَمْرٍ خَبِيرٍ هَكَذَا قَالَ لَا وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هَذَا بِالصَّاعِينَ وَالصَّاعِينَ بِالثَّلَاثِ
 فَقَالَ لَا تَفْعَلْ بِعِ الْجُمُعِ بِالذَّرَاهِمِ نُمِ اتَّبِعْ بِالذَّرَاهِمِ جَنِيْبًا وَقَالَ فِي الْمِيزَانِ مِثْلُ ذَلِكَ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۹۹/۴۔ الحديث رقم ۲۲۰۱۔ ومسلم فى (۱۲۱۵/۳) الحديث رقم (۹۵-۱۵۹۳)۔
 والنسائى فى السنن ۲۷۱/۷ الحديث رقم ۴۵۵۳۔ والدارمى فى ۳۳۵/۲ الحديث رقم ۲۵۷۷۔ ومالك فى
 الموطأ ۶۲۳/۲ الحديث رقم ۲۱ من كتاب البيوع۔

ترجمہ: ”حضرت ابو سعید اور ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خبیر کا گورنر بنا کر بھیجا چنانچہ جب وہ
 شخص وہاں سے واپس آیا تو آپ ﷺ کی خدمت میں بہت عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے وہ کھجوریں دیکھ کر اس
 سے پوچھا کہ کیا خبیر کی سب کھجوریں ایسی ہی اچھی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا کہ نہیں! یا رسول اللہ! اللہ کی قسم (سب کھجوریں ایسی نہیں
 ہوتیں) بلکہ ہم ایسا کرتے ہیں کہ دو صاع (خراب) کھجوروں کے عوض میں ایک صاع اچھی کھجوریں اور تین صاع (خراب)
 کھجوروں کے عوض دو صاع اچھی کھجوریں لے لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ کرو بلکہ پہلے تمام (خراب) کھجوروں کو ملا
 کر درہموں کے عوض فروخت کرو اور پھر ان درہموں کے عوض اچھی کھجوریں خریدو۔ اور پھر فرمایا جو چیزیں ترازو (یعنی وزن) کے
 ذریعے لی دی جاتی ہیں ان کا بھی حکم ہے“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: بتمر جنیب: اضافت کے ساتھ بھی ہے اور عدم اضافت کے ساتھ بھی ہے، ثانی زیادہ صحیح ہے۔
 جنیب: جیم کے فتح ”نون“ کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے، اور آخر میں باء ہے۔ کھجور کی انواع میں سے عمدہ قسم ہے۔
 والصاعین بالثلاث: ممکن ہے کہ یہ اختلاف اس کے وجود کی قلت و کثرت کی وجہ سے ہو، یا نوع اور جنس کے اختلاف کی وجہ
 سے ہو۔

فقال لا تفعل: یعنی اس طرح نہ کرو، اور جو ہوا تھا اس پر آپ نے ان کا مواخذہ نہیں کیا، اس لئے کہ وہ اس کی حرمت سے
 ناواقف تھے۔ صحابہ آپ ﷺ کی زندگی میں تھے، جو شریعت کے افشاء کا وقت تھا اس لئے وہ معذور تھے بعض فروعات کے بارے میں جو
 جن سے وہ واقف نہ تھے، جیسا کہ اس مسئلہ میں ہے۔

مطلب حدیث یہ ہے کہ آپ عمدہ کھجور کو دوسری کھجور کے بدلے میں نہ خریدیں مگر برابر برابر، اگر چہ ان میں سے ایک دوسرے سے عمدہ ہو، بلکہ جب آپ ایک قسم کو دوسری کے بدلے میں زیادتی کے ساتھ بیچنا چاہتے ہوں، تو الجمع: کھجور کی ہر وہ قسم جس کا نام معلوم نہ ہو، یا ردی کھجور کو یا ان کھجوروں کو کہتے ہیں جس میں مختلف قسم کی کھجوریں ملی ہوئی ہوں اور اس میں رغبت نہ ہو، اور جو ملائی گئی ہوں آپس میں اس کے گھنٹیا ہونے کی وجہ سے۔ بالدر اہم مطلب یہ ہے کہ اس چیز کے بدلے لیتے جو اموال ربویہ میں سے نہ ہو۔

مثل ذلك: رفع کے ساتھ متبداء مؤخر ہے۔ اور بعض نسخوں میں نصب کے ساتھ ہے۔ مصدر محذوف کیلئے صفت ہے۔ ای قال فیہ قولاً مثل ذلك، یعنی جس طرح کمیل کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس میں جو غیر جید ہے اس کو بیچا جائے پھر اس کی قیمت سے عمدہ کھجور خرید لیں، لیکن عمدہ کو ردی کے بدلے نہ لیا جائے وزن میں کمی و زیادتی اور جس کے متحد ہونے کے ساتھ۔

شرح السنۃ میں ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس شخص کا ارادہ اموال ربویہ میں سے کسی چیز کو اس کی جنس سے تبدیل کرنے کا ہو اور اس کے بدلے زیادہ لے تو یہ جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کی جنس کو تبدیل کر لے اور جو اس نے خریدا ہے اس کو قبض کر کے پھر اس کو زیادہ قیمت پر بیچے اس قیمت سے جو اس نے دی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے حنفیہ نے اپنے مذہب پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ اس حدیث میں کیل اور وزن کا ذکر کیا ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کا طریقہ استدلال اس طرح ہے کہ حدیث عبادہ میں اصناف مذکورہ میں علت ربا کیل، اور وزن بیان کی ہے، نہ کہ غذا نیت اور ثمنیت، اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے کھجور کا حکم بیان کیا جو ملکیتی ہے، اور اس کے ساتھ حکم میں وزن کی جانے والی اشیاء کو ملایا، اور اگر علت ربا غذا نیت اور ثمنیت ہوتی تو آپ اس طرح فرماتے: وفي النقد مثل ذلك، کہ نقدی میں بھی اس طرح ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اس حدیث میں درحقیقت راہ نمائی ہے اس شخص کیلئے جو راہ راست کھو چکا، اور سود میں بڑ گیا ہو۔ پس اس حدیث میں اس کی راہ نمائی کی ہے سود سے چھٹکارے کیلئے عمل کے طریقہ کے ساتھ، اور مفہوم اس حدیث میں بالکل مسدود ہے۔ (اتہلی)

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ جب آپ غور کریں گے اس جواب پر تو آپ پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ یہ راہ راست سے انحراف اور عدول ہے، یہ حدیث ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جس پر فروعات کی بنیاد ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ہمارے اصحاب نے استدلال کیا ہے، کہ سود کے مقصد تک پہنچنے کیلئے لوگ جو حیلہ کرتے ہیں وہ حرام نہیں ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے کو سو رو۱۰۰ اور ہم دینا چاہتا ہو، دوسو کے بدلے، تو یہ اس کو ایک کپڑا دو سو کا بیچے اور پھر وہی کپڑا اس سے سو رو۱۰۰ کا خرید لے، اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہے: "بع هذا واشتر بضمنه من هذا" کہ یہ بیچ دے اور اس کی قیمت سے یہ خرید لے، یہ حیلہ امام شافعیؒ کے ہاں حرام نہیں ہے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ (اتہلی)

قول اول امام اعظم رحمہ اللہ اور ان کے تبعین علماء امت کا مذہب ہے۔ واللہ اعلم

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک اور امام احمد کے قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو رزین بن ارقم نے اپنی کتاب میں روایت کیا ہے، حضرت ام انس سے کہ وہ کہتی ہیں کہ رزین بن ارقم کی ام ولد حضرت عائشہ کے پاس آئی، اور بونی کہ میں نے زید کو آٹھ سو رو۱۰۰ کی لونڈی بیچی عطاء (یعنی تنخواہ) تک، اور مدت پوری ہونے سے پہلے پھر میں نے اس سے چھ سو کی خرید لی، میں نے اس کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ اگر تم اس کو فروخت کرو گے تو میں اس کو تمھارے خریدوں گی، حضرت عائشہ نے فرمایا، کہ بہت برا ہے جو تو نے بیچا اور بہت برا ہے جو تو نے خرید اور زید بن ارقم کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ اس نے اپنا وہ جہاد باطل کر دیا جو اس نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں کیا تھا اگر اس معاملہ سے تو بہ نہیں کی، تو اس عورت نے حضرت عائشہ سے کہا، تو پھر وہ کیا کرے؟ وہ عورت کہتی ہے کہ حضرت عائشہ نے

اس سے فرمایا ”فمن جاءه موعظة من ربه فانتهى فله ما سلف وامره الى الله“ پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے وہ اسی کا رہا۔ حضرت عائشہ کے اس قول پر کسی نے رد نہیں کیا حالانکہ اس وقت صحابہ وافر مقدار میں موجود تھے۔

شرح السنہ میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس روایت کے جواب میں فرمایا ہے کہ اگر یہ روایت ثابت ہو تو حضرت عائشہ نے اس بیع کو مدت عطاء کی وجہ سے براجانا، اس لئے کہ مدت غیر معلوم تھی۔ (اتہمی) اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیع اور شرط کو جمع کرنے کی وجہ سے حضرت عائشہ نے اس کو ناپسند کیا ہو، یا اس وجہ سے کہ یہ بیع قبل القبض تھی۔ واللہ اعلم

پھر امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت زید یحیابی ہیں، اور جب صحابہ کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو۔ تو ہمارا مذہب قیاس ہوتا ہے، اور قیاس حضرت زید کے ساتھ ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عائشہ نے مدت کے مجہول ہونے کی وجہ سے اس بیع کو درست قرار نہ دیا ہو، اس لئے کہ ”عطاء“ اس کو کہتے ہیں جو بیت المال سے سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دی جاتی ہے، لیکن عام طور پر یہ ایک مقرر وقت پر دی جاتی ہے۔ اور اس پر حدیث میں ان دونوں کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے: قبل حلول الاجل۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود بھی اس میں ایک قسم کی جہالت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے زمانے میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ (امام طیبی) فرماتے ہیں کہ حضرت زید کے فعل کو قیاس کی وجہ سے ترجیح دینا مشکل ہے، چونکہ قیاس اور حضرت زید کے قول کے درمیان جامعیت اور مناسبت میں بعد ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ کا قول حضرت زید کے فعل کے مقابلے میں راجح ہے۔ اور اس روایت کی وجہ سے بھی۔ احمد، ابوداؤد، نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اذا تبايعتم العينة واخذتم اذ ناب البقر“ ورضيتم بالورع، وتركتم الجهاد، سلط الله عليكم ذلا، لا ينزعه حتى ترجعوا الى دينكم۔ یعنی کہ جب تم بیع عینہ کرنے لگو، گائیوں کی دم پکڑ لو گے، اور کھیتی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ پاک تم پر ذلت مسلط کر دے گا اور اس وقت تک تم سے نہیں ہٹائے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف نہ لوٹ آؤ گے۔

العینہ: عین کے فتح یا کے سکون اور نون کے فتح کے ساتھ ہے۔ اس بیع کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کسی کو سامان فروخت کر دے، معلوم ثمن کے ساتھ معلوم وقت تک، پھر اس قیمت سے کم پر خرید لے جس قیمت پر اس نے بیچا تھا۔

۲۸۱۲: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ جَاءَ بِلَالٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ بِنَمْرٍ بُرْنِي فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ أَيْنَ هَذَا قَالَ عِنْدَنَا تَمْرٌ رَدِيٌّ فَبَعْتُ مِنْهُ صَاعَيْنِ بِصَاعٍ فَقَالَ أَوْ هُ عَيْنُ الرَّبَا لَا تَفْعَلْ وَلَكِنْ إِذَا أَرَدْتَ أَنْ تَشْتَرِيَ فَبِعِ التَّمْرَ بَبِعٍ آخَرَ ثُمَّ اشْتَرِهِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۹۰/۴ الحدیث رقم ۲۳۱۲۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۲۱۵۰/۳ الحدیث رقم (۱۵۹۴/۹۶) والنسائی فی السنن ۲۷۳/۷ الحدیث رقم ۴۵۵۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوسعید کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت بلالؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اچھی قسم کی کھجور لے کر تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ ”یہ کہاں سے لائے ہو؟“ انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس کچھ خراب کھجوریں تھیں اس سے میں نے دو صاع کھجوریں دے کر اس کے عوض میں ایک صاع یہ (اچھی) کھجوریں لے لی ہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”افسوس! یہ تو بالکل سود ہے، ایسا نہ کرؤ البتہ جب تم (اچھی کھجوریں) خریدنا چاہو تو (یہ طریقہ اختیار کرو کہ پہلے) اپنی (خراب) کھجوریں (درہم یا روپیے کے عوض) فروخت کر دو پھر ان درہموں یا روپیوں کے ذریعے اچھی کھجوریں خریدو۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: برونی: باکے فتح اور اراء کے سکون کے ساتھ ہے اور آخر میں یا مشدہ ہے۔ عمدہ کھجور کو کہتے ہیں۔

ردی ء: ”فعیل“ کے وزن پر ”رداء ء“ سے مشتق ہے، اس میں ہمزہ بھی پڑھا جاتا ہے ”ردی ء“ اور ادغام کے ساتھ ”ردی

”بھی پڑھا جاتا ہے دغام کے ساتھ مشہور ہے۔“

اوہ : اصول معتمدہ میں ہمزہ کے فتح واؤ کی تشدید اور ہاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ کلمہ حسرت اور ندامت کیلئے کسی کو تکلیف اور ملامت پہنچنے کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ بعض نسخوں میں واؤ کے سکون اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نہایت میں ہے کہ آدمی یہ کلمہ ہے تکلیف اور درد کے وقت کہتا ہے۔ یہ واؤ کے سکون اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور کبھی واؤ کو الف سے تبدیل کرتے ہیں، اور کہتے ہیں: ”آہ من کذا“ اور کبھی اس کو واؤ کی مشددہ کے کسرہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ بولتے ہیں۔ اور بعض واؤ کے فتح اور تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ عین الربا تا کیا اور تشدید کیلئے مکرر ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث بھی پہلے والی حدیث کی طرح صریح ہے اس حیلہ کے جواز پر جس کے امام ابوحنیفہ اور امام شافعی قائل ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ نے ان کو حکم دیا ردی کھجور کے فروخت کرنے کا دراہم کے ساتھ اور ان دراہم سے عمدہ کھجور خریدنے کا، آپ کے اس حکم، اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے کہ دوبارہ اسی مشتری سے خریدے یا کسی اور سے، بلکہ کلام کے سیاق سے ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہی ہے جو اس مشتری کے ذمہ تھا، ورنہ تو آپ اس کو بیان کرتے، اس لئے کہ گفتگو کے ایسے مواقع میں تفصیل کو ترک کرنا، بات کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔ (ذکرہ ابن الملک)

۲۸۱۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ عَبْدَ قُبَايَعِ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى الْهَجْرَةِ وَكَمْ يَشْعُرُ أَنَّهُ عَبْدٌ فَجَاءَ سَيِّدُهُ بِرِيْدُهُ فَقَالَ لَهُ

النَّبِيُّ ﷺ بَعِيْنِهِ فَاشْتَرَاهُ بِعَبْدَيْنِ أَسْوَدَيْنِ وَكَمْ يَبِيعُ أَحَدًا بَعْدَهُ حَتَّى يَسْأَلَهُ عَبْدٌ هُوَ أَوْ حُرٌّ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۲۲۵/۳ الحديث رقم (۱۲۳ - ۱۶۰۲)۔ والترمذی في السنن ۵۴۰/۳ الحديث رقم ۱۲۳۹۔ وابن ماجه ۹۵۸/۲ الحديث رقم ۲۸۶۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ ایک غلام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے ہجرت پر بیعت کی (یعنی اس نے آپ ﷺ سے عہد کیا کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر باش رہوں گا) حالانکہ آپ ﷺ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ غلام ہے (کچھ دنوں کے بعد) جب اس کا مالک اس کو تلاش کرتا ہوا آیا تو نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ ”اس غلام کو میرے ہاتھ بیچ دو“۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس غلام کو دو سیاہ فام غلاموں کے عوض خرید لیا اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ کسی شخص سے بیعت نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ یہ معلوم نہ کر لیں کہ وہ غلام ہے یا آزاد۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: فبايع النبي صلى الله عليه وسلم على الهجرة: ”بايع“ عاهد کے معنی کو متضمن ہے، اس لئے

اس کو ”علی“ کے ساتھ متعدی کیا۔

فجاء سيده يريده: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: اس کو تلاش کر رہا تھا، یا اس سے خدمت لینا چاہتا تھا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں آپ ﷺ کے مکارم اخلاق اور آپ کے احسان عام کا ذکر ہے، کہ آپ نے اس کو ناپسند کیا کہ اس غلام کو ناکام و نامراد واپس لوٹا دیا جائے جس نے ہجرت کرنے اور آپ ﷺ کی صحبت میں رہنے کا ارادہ کیا تھا۔

قولہ: فاشتراه بعبدین أسودین :

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں مال رباً میں داخل نہیں ان کا لین دین اس طرح کرنا کہ ایک طرف کم اور دوسری طرف زیادہ ہو جائز ہے۔ شرح السنہ میں لکھا ہے کہ علماء نے اسی بنیاد پر یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ ایک جانور دو جانوروں کے بدلے میں دست بدست لینا دینا جائز ہے خواہ دونوں طرف سے ایک ہی جنس کے جانور ہوں یا دو جنس کے۔

رافع بن خدیج نے ایک اونٹ کو دو اونٹوں کے بدلے خرید، پس ایک اونٹ اس کو (اسی وقت) دے دیا اور کہا کہ دوسرا ان شاء اللہ کل تیرے پاس لاؤں گا۔ سعید بن المسیب کے ہاں اگر دو نون جانور ماکول اللحم ہوں اور ذبح کرنے کیلئے خریدے جا رہے ہوں تو اس

صورت میں زیادتی کے ساتھ ان کا لین دین جائز نہیں ہے، اگرچہ جنس مختلف ہو۔

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا جانور کا جانور کے بدلے میں ادھار لین دین جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ صحابہ میں سے ایک جماعت اس کے عدم جواز کی قائل تھی، کہ نبی ﷺ نے جانور کو جانور کے بدلے ادھار فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ خطابی فرماتے ہیں کہ اس نبی کی توجیہ میرے ہاں یہ ہے کہ آپ نے اس بیع سے منع فرمایا جس میں دونوں طرف سے ادھار ہو، چونکہ یہ بیع الکاٹی بالکاٹی کے قبیل سے ہو جائے گا جو کہ ناجائز ہے اور دلیل عبد اللہ بن عمرو بن العاص کا قول ہے جو اس باب کے آخر میں آ رہا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حیوان کو حیوان کے بدلے ادھار فروخت کرنا اس وقت منع ہے کہ جب دونوں طرف سے ادھار ہو، اور اس سے دونوں حدیثیں جمع ہو جاتی ہیں۔

اور بعض صحابہ نے اس کی اجازت دی ہے، اور یہ منقول ہے، حضرت علیؓ اور ابن عمرؓ سے اور یہی امام شافعی کا قول ہے، اور انہوں نے دلیل پکڑی ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی روایت سے کہ نبی ﷺ نے ان کو لشکر کی تیاری کا حکم دیا، پس اونٹ ختم ہو گئے چنانچہ آپ نے ان کو حکم دیا کہ صدقہ کے اونٹوں میں سے لے لیں وہ ایک اونٹ دو اونٹوں کے بدلے لے رہے تھے۔ اور اس حدیث میں حیوان میں بیع سلم کے جواز کی دلیل بھی ہے۔

اعبد هو او حر : ان الفاظ کی زیادتی مسلم حمیدی اور جامع الاصول میں نہیں ہے، لیکن شرح السنہ میں ”او حر“ کے لفظ کے اور مصابیح کے بعض نسخوں میں ”ام حر“ ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں یہاں لفظ ”او“ کا بیان کے لئے ہونا زیادہ اچھا ہے، اس لئے کہ ”ام“ وہاں لایا جاتا ہے کہ جہاں دو امور میں سے کوئی ایک ثابت ہو، لیکن ان کے تعین میں تردد ہو، اور ”او“ نفس ثبوت کے بارے میں سوال کیلئے آتا ہے، ای عبد نیتہ ثابتہ او حر یتہ۔ یعنی کہ اس کا غلام ہونا ثابت ہے، یا آزاد ہونا۔

ہم جنس اشیاء کا تبادلہ

۲۸۱۶: وَعَنْهُ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ بَيْعِ الصُّبْرَةِ مِنَ التَّمْرِ لَا يَعْلَمُ مَكِيلَتَهَا بِالْكَيْلِ الْمُسَمَّى مِنَ التَّمْرِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۶۲۳ الحدیث رقم (۴۲ - ۱۵۳۰)۔ والنسائی فی السنن ۲۶۹/۷ الحدیث رقم ۴۵۴۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے معلوم شدہ وزن کے ڈھیر کے عوض کھجوروں کے غیر معلوم شدہ وزن کے ڈھیر کے عوض بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

تشریح: الصبرۃ: صاد کے ضمہ اور با کے سکون کے ساتھ غلے کے ڈھیر کو کہتے ہیں جیسے مٹی کا ڈھیر ہوتا ہے۔ من التمر: یہ حال ہے ”بیع الصبرۃ“ سے۔

لا یعلم مکیلتها: یہ حال ثانی ہے۔ بالکیل: ”البيع“ کے متعلق ہے۔ المسمی: بھفت ہے ”الکیل“ کی۔

من التمر: ”الم سمنی“ سے حال ہے۔ یعنی آپ نے لین دین کی اس صورت سے منع فرمایا ہے کہ ایک طرف تو کھجوروں کی غیر معین مقدار کا ڈھیر ہو اور دوسری طرف کھجوروں کی ایک معین مقدار کا ڈھیر ہو، اور جنس ایک ہو۔ شرح السنہ میں ہے اموال ربوہ اپنی جنس کے بدلے انکل سے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، چونکہ حالت عقد میں برابری جہول ہے، پس اگر وہ اس طرح کہے، میں آپ کے ساتھ بیچ رہا ہوں اپنی گندم کا یہ آپ کی اس گندم کے ڈھیر کے بدلے جو اس کے مقابل ہو یا کہے کہ اپنے دینار کو آپ کے اس دینار کے بدلے میں جو اس کے برابر ہو، تو یہ جائز ہے، جب دونوں طرف سے اس مجلس میں قبضہ ہو، اور بڑے دینار اور بڑے ڈھیر کی زیادتی بائع کے لئے ہوگی ہاں جب جنس مختلف ہو تو پھر بعض کو بعض کے بدلے انکل کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ ان میں کمی بیشی حرام نہیں ہے۔

سونے کے خرید و فروخت کا مسئلہ

۲۸۱۷: وَعَنْ فَصَّالَةَ بْنِ أَبِي عُبَيْدٍ قَالَ اشْتَرَيْتُ يَوْمَ خَيْبَرَ قِلَادَةً بِائْتِي عَشْرَ دِينَارًا فِيهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيهَا أَكْثَرَ مِنْ اثْنَيْ عَشَرَ دِينَارًا فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ لَا تَبَاعُ حَتَّى تَفْصَلَ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۲۱۳/۳ الحديث رقم (۱۰۹۱/۹۰) - وابوداؤد في السنن ۶۴۹/۳ الحديث رقم ۳۳۰۲ -

والترمذی فی ۵۵۶/۳ الحديث رقم ۱۲۵۵ - والنسائی فی ۲۷۹/۷ الحديث رقم ۴۵۷۳ - واحمد فی المسند ۲۱/۶ -

ترجمہ: ”اور حضرت فضالہ بن عبید کہتے ہیں کہ میں نے خیبر کے دن ایک ہار بارہ دینار میں خریدا جو سونے کا تھا اور اس میں گننے جڑے ہوئے تھے پھر جب میں نے اسے کھول دیا (یعنی گننے کو سونے سے نکال ڈالا) تو وہ سونا بارہ دینار سے زائد قیمت کا پایا میں نے اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (ایسا ہار) اس وقت تک فروخت نہ کیا جائے جب تک کہ سونا اور گننے الگ الگ نہ کر لئے جائیں“۔ (مسلم)

تشریح: قِلَادَةُ: قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ وہ چیز جس کو گردن میں لٹکایا جائے۔ خَرَزٌ: خاء معجمہ اس کے بعد راء اور پھر زاء ہے۔ فَصَّلْتُهَا: تشدید کے ساتھ فقال: لا تباع: یہاں نفی بمعنی نہیں ہے۔

حتمی تفصیل: شرح السنن میں ہے کہ بعض روایات میں ”حتی تمیز“ کے الفاظ ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ عقد میں گننے اور سونے کی تمیز ہو جائے نہ کہ بعض بیع کو بعض سے الگ کرنا، اور اس میں دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص اموال ربویہ میں سے کوئی چیز اس کی جنس کے بدلے فروخت کرے یا ان دونوں کے ساتھ یا کسی ایک کے ساتھ کوئی اور چیز بھی ہو، مثال کے طور پر اگر وہ فروخت کرتا ہے ایک درہم اور ایک کپڑا اور ۲ درہم یا دو دیناروں کے بدلے یا ایک درہم اور ایک کپڑا اور درہم اور ایک کپڑے کے بدلے، تو یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ معاملہ کی طرفین میں سے کسی ایک طرف میں اختلاف جنس یہ لازم کرتا ہے اس کے مقابل کی تقسیم کو اس پر باعتبار قیمت کے۔ اور قیمت اندازہ ہے اور یہ جہل معرفت کا فائدہ نہیں دیتا (اتمی) نہی کی علت سونے کا سونے کے مقابلے میں ہونا ہے اور فضل ربا کے حصول کو لازم کرنے والی ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب بیع کا سونا قیمت کے سونے سے کم ہو، چونکہ اس صورت میں زیادت کا سونے کے علاوہ کے مقابلے میں ہونا متعین ہو، جیسا کہ ہمارے مذہب کے قواعد کا تقاضا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے ہاں درہم کو آدھے درہم اور کچھ پیسوں کے بدلے یا کچھ کھانے کے بدلے فروخت کرنا جائز ہے، چونکہ یہ ضرورت کے درجہ میں ہے اور اس سے زائد کو وہ منع کرتے ہیں۔ (اتمی)

ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اشیاء خورد و نوش کو فروخت کرنا جائز ہے، کیل کر کے بھی اور انکل سے بھی۔ یعنی بغیر ناپ و تول کے بلکہ صرف ڈھیر دکھا کر فروخت کرنا بھی جائز ہے۔

اور ”جزف“ لینے میں زیادتی کے معنی کیلئے مستعمل ہے جیسا کہ عرب کا قول ہے: جزف له في الكيل اذا كثر۔ اور اس کا مرجع مساحلہ ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ انکل سے کسی چیز کو فروخت کرنا یہ مقید ہے ان اموال کے ساتھ جس میں ربا کا حکم جاری نہیں ہوتا جب اس کو اس کی جنس کے بدلے فروخت کیا جائے، باقی اموال ربا جب ان کو فروخت کیا جائے اس کی جنس کے بدلے تو وہ انکل سے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ربا کا احتمال ہے، اور یہ حقیقی ربا کی طرح منع ہے۔ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ یہ بھی مقید ہے اس کے ساتھ جو کیل کے تحت داخل ہو، اور جو کیل کے تحت داخل نہ ہو جیسے ایک لپ کو دو لپ کے بدلے فروخت کرنا تو یہ جائز ہے۔ فتاویٰ صغریٰ میں امام محمد سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک کھجور کو دو کے بدلے فروخت کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور فرمایا کہ جو کثیر میں حرام ہے وہ قلیل میں بھی حرام ہے۔

الفصل الثالثی:

سود کے بارے میں آپ ﷺ کی پیشگوئی

۲۸۱۸: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَيَاتَيْنَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى أَحَدٌ إِلَّا أَكَلَ الرِّبَا فإِنْ

لَمْ يَأْكُلْهُ أَصَابَهُ مِنْ بَخَارِهِ وَيُرْوَى مِنْ عُبَّارِهِ. (رواه ابوداؤد والنسائی وابن ماجه)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۷۴۱۷ الحدیث رقم ۴۵۶۰ وابن ماجه فی ۷۵۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۵۴۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب سود کھانے والوں کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہے گا اور اگر کوئی شخص سود نہیں بھی کھائے گا تو اس تک سود کا اثر ضرور پہنچے گا۔ نیز (بعض کتابوں میں لفظ من بخارہ کی بجائے) من غبارہ (یعنی اس تک سود کا گرد و غبار ضرور پہنچے گا) نقل کیا گیا ہے۔“ (احمد ابوداؤد نسائی ابن ماجہ)

تشریح: قوله: لا یبقی احد الا اکل الربا: ”آکل“ صیغہ اسم فاعل ہے، یا ماضی کا صیغہ ہے، اور مستثنیٰ ”احد“ کی

صفت ہے اور مستثنیٰ منہ محذوف ہے۔ اور تقدیری عبارت یوں ہے: ولا یبقی احد منهم له وصف کونہ اکل الربا۔ پس یہ کنایہ ہے کہ سود لوگوں میں اس طرح پھیل جائے گا کہ ہر ایک سود خور ہوگا۔

اصابہ من بخارہ: اور ایک روایت میں ”من غبارہ“ ہے۔ یعنی اس تک سود کا اثر پہنچے گا اس طور پر کہ وہ سودی معاملے کا گواہ ہوگا، یا لکھنے والا ہوگا، یا سود خور کی ضیافت کو کھانے والا ہوگا، یا اس کا ہدیہ لینے والا ہوگا، یعنی اگر کوئی شخص سود کی حقیقت سے محفوظ ہوگا تو اس کے اثر سے محفوظ نہ رہے گا، اگرچہ وہ بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں مستثنیٰ منہ تمام اوصاف کو عام اور شامل تھا، تو تمام اوصاف کی نفی فرمادی، سوائے کھانے کے۔ ہم بہت سارے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے حقیقی طور پر سود نہیں کھایا تو چاہئے کہ اس سے مراد عموماً مجاز ہو۔ پس یہ شامل ہوگا حقیقت اور مجاز دونوں کو اسی لئے اس کے بعد اس کی تفصیل ذکر فرمائی کہ اگر وہ حقیقتاً نہیں کھائے گا مجازاً تو بہر حال کھائے گا ہی۔ ”بخار“ اور ”غبار“ کو بطور استعارہ لائے ہیں ربا کو آگ اور مٹی سے تشبیہ دی ہے۔

مختلف الجنس چیزوں کا دست بدست باہمی لین دین

۲۸۱۹: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا تَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ وَلَا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ

وَلَا الْبُرَّ بِالْبُرِّ وَلَا الشَّعِيرَ بِالشَّعِيرِ وَلَا التَّمْرَ بِالتَّمْرِ وَلَا الْمِلْحَ بِالْمِلْحِ إِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ عِنَابًا بَعِينًا يَدًا بِيَدٍ

وَلَكِنْ بَبِعُوا الذَّهَبَ بِالْوَرِقِ وَالْوَرِقَ بِالذَّهَبِ وَالْبُرَّ بِالشَّعِيرِ وَالشَّعِيرَ بِالْبُرِّ وَالتَّمْرَ بِالْمِلْحِ وَالْمِلْحَ

بِالتَّمْرِ يَدًا بِيَدٍ كَيْفَ شِئْتُمْ. (رواه الشافعی)

اخرجه النسائی فی السنن ۲۸۴/۷ الحدیث رقم ۴۵۶۰ وابن ماجه فی ۷۵۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۵۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونا سونے کے عوض چاندی چاندی کے عوض

گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کو کھجور کے عوض اور نمک کو نمک کے عوض فروخت نہ کرو مگر یہ کہ وہ مساوی اور دست بدست

ہوں۔ جس طرح چاہو خرید و فروخت کرو۔ (نسائی)

تشریح: یداً بیداً: یعنی مجلس میں قبضہ کیا گیا ہو جسموں کی جدائی سے پہلے،

کیف شئتم: امام طبری فرماتے ہیں کہ لفظ لکن کا حق یہ ہے کہ دو ایسے کلاموں کے درمیان واقع ہو، جو نفی اور اثبات کے اعتبار سے

متغایر ہو، ای لا تبیعوا النقدین ولا المطعومات اذا كانا متفقین لکن بیعو ہما۔ اذا اختلفا۔ یعنی تم نقدی اور اشیاء خورد و نوش کو نہ بیچو جب وہ جنس کے اعتبار سے متفق ہوں، لیکن ان کو بیچو جب وہ جنس کے اعتبار سے مختلف ہوں، اور اس قول میں ”الاسواء بسواء“ کا استثناء بیان رخصت کے طور پر ہے۔

اور ”یدا بید“ یہ تاکید ہے ”عینا بعین“ کے لئے، جیسا کہ حدیث سابق میں ”سواء بسواء“ کا تکرار تھا ”مثلاً بمثل“ کیلئے۔

خشک اور تازہ پھلوں کا تبادلہ

۲۸۲۰: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَاصٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ شِرَاءِ التَّمْرِ بِالرُّطْبِ فَقَالَ
اَيَنْقُصُ الرُّطْبُ اِذَا يَسَّ فَقَالَ نَعَمْ فَتَنَاهَا عَنْ ذَلِكَ

اخرجه ابو داود فی السنن ۳/۶۵۴ الحدیث رقم ۳۳۵۹، والترمذی فی ۳/۵۲۸ الحدیث رقم ۱۲۲۵، والنسائی فی ۲۶۸/۷ الحدیث رقم ۴۵۴۵، وابن ماجہ ۲/۷۶۱ الحدیث رقم ۲۲۶۴ ومالك فی الموطأ ۲/۶۲۴ الحدیث رقم ۲۲ من کتاب البیوع واحمد فی المسند ۱/۱۷۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ سے تازہ کھجور کے عوض (خشک) کھجور خریدنے کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”کیا تازہ کھجور خشک ہونے کے بعد کم ہو جاتی ہے“۔ عرض کیا گیا کہ جی ہاں! چنانچہ آپ ﷺ نے اس طرح لین دین سے منع فرمایا۔“

(مالک ترمذی ابو داؤد نسائی ابن ماجہ)

تشریح: ”ینقص“ نقص سے مشتق ہے، فعل لازم ہے، اور متعدی بھی جائز ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں استفہام سے مراد قضیہ کی حقیقت جاننا نہیں ہے (یعنی کہ وہ کم ہوتا ہے یا نہیں) اس لئے کہ یہ تو بالکل واضح سی بات ہے جو وضاحت سے مستغنی ہے۔ بلکہ استفہام سے مراد تنبیہ کرنی ہے کہ خشک ہونے کی حالت میں مماثلت شرط ہے۔ پس تر اور خشک کھجور کا تماثل کافی نہیں ہے تر ہونے کی حالت میں اور نہ خشک فرض کرنے کی حالت میں، کیونکہ یہ تو صرف ایک تخمینہ اور اندازہ ہے اس میں کوئی تعین نہیں ہے، پس اس حالت میں ایک کو دوسرے کے بدلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اور یہی اکثر علما کا مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے تر کھجور کو خشک کے بدلے فروخت کرنے کو جائز قرار دیا ہے جب کہ وہ کیل میں برابر ہوں۔ اور حدیث کو ادھار بیچنے پر محمول کیا ہے۔ اس لئے کہ اسی راوی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تر کھجوروں کو خشک کے بدلے ادھار فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (اتہمی) اور اسی پر قیاس ہے، انگور کو بیچنا کشمش کے بدلے میں اور تر گوشت کو بیچنا خشک گوشت کے بدلے میں۔

گوشت اور جانور کے باہمی تبادلے کا مسئلہ

۲۸۲۱: وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيْبِ مَرْسَلًا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ اللَّحْمِ بِالْحَيَوَانِ قَالَ سَعِيدٌ
كَانَ مِنْ مَيْسِرِ أَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ.

اخرجه مالك فی الموطأ ۲/۶۵۵ الحدیث رقم ۶۴ من کتاب البیوع۔

ترجمہ: ”اور حضرت سعید ابن مسیب بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کے عوض میں گوشت کا لین دین کرنے سے منع فرمایا ہے۔ نیز حضرت سعید کا بیان ہے کہ یہ (جانور کے عوض گوشت کا لین دین) زمانہ جاہلیت کے جوئے کی ایک قسم تھی۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قولہ: نهی عن بيع اللحم بالحيوان: حرکات کے ساتھ ہے، ”حيوان“ اصل ”حيان“ تھا جیسا کہ قاموس

میں ہے، مراد نوع حیوان ہے۔ میسر: سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ قاموس میں ہے کہ ”میسر“ یا زرد سے کھیلنے کو کہتے ہیں یا ہر جوے کو کہتے ہیں۔ اور سین کے فتح کے ساتھ بھی ہے۔

مراد یہ ہے کہ ان سب میں لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے کھائے جاتے ہیں۔ اگرچہ کھانے کا طریقہ ان میں مختلف ہوتا ہے، کہ وہ کھیل کے ساتھ کھایا جاتا ہے، اور یہ ایک عقد اور کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ خطاب نبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب حیوان کی بیع حیوان کے بدلے ادھار منع ہے تو یہ ہے یہ امام شافعی کے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں حیوان میں ربا کا حکم جاری ہی نہیں ہوتا، جیسا کہ پہلے گزرا۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ ”میسر“ میسر سے مشتق ہے۔ اس لئے کہ اس میں کسی آدمی کا مال آسانی اور سہولت کے ساتھ لیا جاتا ہے بغیر کسی کوشش اور تھکاؤ کے، یا ”یسار“ سے مشتق ہے، اس لئے کہ یہ اس کے یسار (تو نگر) کو سلب کر لیتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جانور کے عوض گوشت کا لین دین حرام ہے، خواہ گوشت اس جانور کی جنس کا ہو یا کسی اور جنس کے جانور کا ہو، نیز چاہے وہ جانور کھایا جاتا ہو، یا نہ کھایا جاتا ہو۔ امام شافعی کا یہی قول ہے۔ (انتہی)

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں یہ جائز ہے، اور حدیث میں ممانعت کا علق دراصل گوشت اور جانور کے باہم لین دین کی اس صورت سے ہے کہ جب لین دین دست بدست نہ ہو بلکہ ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار ہو، اس لئے کہ جو بعد میں دے گا اس کا ضبط ممکن نہیں ہے۔

۲۸۲۲: وَعَنْ سَعْدَةَ بِنِ جُنْدُبٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِالْحَيَوَانِ نَسِيئَةً.

(رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجہ و الدارمی)

اخرجه ابود اود فی السنن ۵۳۸/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۷، و الترمذی فی ۵۳۸/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۷، و النسائی فی ۲۹۲/۷ الحدیث رقم ۶۶۲۰، و ابن ماجہ فی ۷۶۳/۲ الحدیث رقم ۲۲۷۰، و الدارمی فی ۳۳۱/۲ الحدیث رقم ۲۵۶۴، و احمد فی المسند ۱۲/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت سعدہ بن جندب کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جانور کو جانور کے عوض ادھار لین دین کرنے سے منع فرمایا ہے۔“ (ترمذی ابوداؤد نسائی ابن ماجہ دارمی)

تشریح: نسیئہ: نون پر فتح، سین پر کسرہ یا ہر سکون پھر ہمزہ، اور آخر میں ہاء ہے۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

غیر مثلی چیز کے عوض لینے کا مسئلہ

۲۸۲۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهُ أَنْ يُحْتَمَرَ جَيْشًا فَفَعَدَتِ الْإِبِلُ فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ عَلَى فَلَانِصِ الصَّدَقَةِ فَكَانَ يَأْخُذُ الْبُعِيرَ بِالْبُعِيرِ إِلَى إِبِلِ الصَّدَقَةِ. (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابود اود فی السنن ۶۵۲/۳ الحدیث رقم، و احمد فی المسند ۱۷۱/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کے بارے میں مروا ہے کہ (ایک غزوہ کے موقع پر) نبی کریم ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ لشکر کا سامان درست کر لو۔ (یعنی لشکر میں شامل ہونے کے لئے سواری اور ہتھیار وغیرہ تیار رکھو) چنانچہ اونٹ کم پڑ گئے (یعنی جتنے اونٹ تھے وہ اکثر لوگوں میں تقسیم ہو گئے اور کچھ لوگ کہ جن میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص بھی شامل تھے اونٹ حاصل نہ کر سکے) تو آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ ”وہ زکوٰۃ کے اونٹ کے عوض میں اونٹ (بطور قرض) لے لیں۔“ چنانچہ وہ زکوٰۃ کے اونٹ آنے تک (کے وعدے پر) دو اونٹ کے عوض ایک اونٹ لیا کرتے تھے۔“ (ابوداؤد)

تشریح: فعدت: نون کے فتح، فاعل کسرہ کے اور دال کے ساتھ ہے، بمعنی ”فیت“ اور ”نقصت“۔ اور مصابح کے نسخوں

میں ”فبعدت“ ہے، بآء کے فتح اور عین کے ضمہ کے ساتھ معنی دونوں کا قریب ہے۔

”فلائص“ جمع ”قلوص“ کی ہے۔ جو ان اونٹ کو کہتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ انہوں نے اونٹ قرض لے کر لشکر کو مکمل کیا، اور اس کی ادائیگی زکوٰۃ کے اونٹوں سے کی۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں دو اشکال ہیں:

(۱) کہ حیوان کو حیوان کے بدلے ادھار فروخت کرنا۔ (۲) مدت کا معلوم نہ ہونا۔ (اتہمی)

ابن الملک فرماتے ہیں کہ ان کے ہاں مدت معلوم ہوتی تھی۔ اور یہ حدیث حیوان میں بیع مسلم کے جواز پر دلالت کر رہی ہے زیادتی کے ساتھ، اور یہی امام شافعی اور امام احمد کا مسلک ہے۔ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث اور حضرت سمرہ کی پچھلی حدیث میں تطبیق ان حضرات کے ہاں جو حیوان میں سلم کے جواز کے قائل ہیں، یہ ہے کہ ممانعت اس صورت پر محمول ہے کہ جب دونوں طرف سے جانور ادھار ہوں، اور جو حضرات جانور میں بیع مسلم کے جواز کے قائل نہیں ان کے ہاں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حیوان کو حیوان کے بدلے ادھار فروخت کرنا یہ ربا کی حرمت سے پہلے تھا، بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ (اتہمی)

دونوں طرح سے ادھار ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ ایک شخص کہے میں نے آپ کو گھوڑا بیچا جس کے اوصاف یہ ہیں، گھوڑے یا اونٹ کے بدلے، جس کے اوصاف یہ یہ ہیں۔

الفصل الثالث :

ادھار لین دین میں سود کا مسئلہ

۲۸۲۳: عَنْ أَسَمَةَ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ الرَّبَا فِي النَّسِيئَةِ (وَفِي رِوَايَةٍ) قَالَ لَأَرَبَا فِيمَا كَانَ بَدًا

بیکیڈ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۸۱/۴ الحدیث رقم ۲۱۷۹، و مسلم فی ۱۲۱۸/۳ الحدیث رقم (۱۰۶۶-۱۰۲)

والنسائی فی السنن ۲۷۱/۷ الحدیث رقم ۴۵۸۰، وابن ماجہ فی ۷۵۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۵۷، والدارمی فی ۳۳۶/۲

الحدیث رقم ۲۵۸۰ واحمد فی المسند ۲۰۰/۵۔

ترجمہ: ”حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ادھار لین دین میں سود ہے۔“ ایک اور روایت میں

یوں ہے کہ اس لین دین میں سود نہیں جو دست بدست ہو۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: الربا: الف لام عہد کیلئے ہے، مراد وہ ربا ہے جس کا ہونا معلوم ہے، نقدی میں، اشیاء خورد و نوش میں، کیلی اور

موزونی اشیاء میں اس اختلاف کے ساتھ جو ثابت ہے۔

اس لفظ کو امام طبری نے ذکر کیا ہے۔

لا ربا: تنوین کے ساتھ بھی ہے اور بغیر تنوین کے بھی ہے۔ پہلی صورت میں لاء ملغا ہوگا اور مابعد مبتدا ہے اور دوسری صورت

میں لاء کا اسم ہے۔

کان یدابید: امام طبری فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اتحاد جنس کی صورت میں برابری کی شرط کے ساتھ، اور کی بیشی کی صورت

میں اختلاف اجنس کی شرط کے ساتھ۔ (اتہمی)

حاصل یہ ہے کہ سود کی صورت نہیں ہوگی اگر ایسی دو چیزوں کا باہمی تبادلہ کیا جائے جو ایک جنس کی ہوں اور برابر برابر ہوں، نیز

دونوں فریقین اپنی چیز اسی مجلس میں اپنے اپنے قبضے میں کر لیں، یہ جائز ہے۔ اور اگر دونوں چیزیں ایک جنس کی نہ ہوں تو پھر کی بیشی

کے ساتھ بھی یہ معاملہ جائز ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہاں حصر سے مراد حصر اضافی ہے، اور قرینہ اس پر یہ ہے کہ یہ اس شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا ہے جس نے دو ۲ جنسوں میں کمی بیشی کے بارے میں پوچھا تھا، تو گویا کہ اس کو یہ کہا کہ جس چیز کے بارے میں تم نے پوچھا ہے اس میں سو نہیں ہے، بلکہ سو دو ادھار کی صورت میں ہے۔ لہذا یہ منافی نہیں ہے اس کے کہ مثلیں میں کمی بیشی کی صورت میں اور ادھار جو زمانہ جاہلیت میں مشہور تھا، میں بھی رہا ہے۔

اسیجائی فرماتے ہیں کہ علماء کا اتفاق ہے کہ جو شخص رباء نسیہ کا منکر ہو وہ کافر ہے اور ربانفس کے بارے میں اختلاف ہے، اس لئے کہ عبد اللہ ابن عباسؓ صرف ربانسیہ کو ”ربا“ کہتے تھے، لیکن ان کا اس سے رجوع ثابت ہے، جب ابی بن کعب نے سختی کے ساتھ ان سے فرمایا کہ کیا تو نے رسول اللہ ﷺ سے وہ سنا ہے اور وہ دیکھا ہے جو ہم نے نہیں سنا اور نہیں دیکھا؟ اور پھر ان کے سامنے ان سب کی حرمت پر صریح حدیث بیان کی، اور فرمایا، کہ سب گواہ رہو، کہ میں اس کو حرام قرار دیتا ہوں اور اللہ کی طرف براءت کا اعلان کرتا ہوں اس سے، (ذکرہ ابن الملک)

سود کھانے پر وعید

۲۸۲۵: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ حَنْظَلَةَ غَسِيلِ الْمَلَأِ نَحْجَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ دِرْهَمٌ رَبًّا يَا كُمَّهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ زِينَةً رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالذَّارِقُطْنِيُّ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَزَادَ وَقَالَ مَنْ نَبَتَ لِحُمَةِ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ أَوْلَىٰ بِهِ -

اخرجه احمد في المسند ۲۲۵/۵

ترجمہ: ”اور حضرت عبد اللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ (ان کا لقب ہے) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص سود کا ایک درہم یہ جاننے کے باوجود کھاتا ہے کہ یہ سود ہے تو یہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے۔“ (احمد دارقطنی) اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ نیز بیہقی نے اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ کے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ ”آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص کا گوشت حرام مال سے پیدا ہوا ہو (یعنی جس شخص کی جسمانی نشوونما حرام مال مثلاً سود و رشوت وغیرہ سے ہوئی ہو) تو دوزخ کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے۔“

تشریح: قولہ: وهو يعلم: اسی طرح اگر وہ نہیں جانتا لیکن اس نے ”تعلّم“ (جاننے) میں کوتاہی کی ہے۔ اس لئے کہ ائمہ کرام نے فرض عین علم میں کوتاہی کرنے والے کو عالم کے ساتھ ملایا ہے، کہ وہ (غیر عالم) گناہ میں اس (عالم) کی طرح ہوتا ہے۔ زنیۃ: زنا کے کسرہ اور نون کے سکون کے ساتھ ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد مبالغہ ہے، حرام کھانے پر زجر کیلئے اور حلال کے طلب پر ابھارنے کیلئے اور حقوق العباد میں کوتاہی سے بچنے کیلئے، اور چھتیس کے عدد کو بطور خاص ذکر کرنے کی حکمت شارح ہی بہتر جانتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ یہ سخت وعید اپنی حقیقت پر ہو، تو پس ایک مرتبہ کا سود گناہ میں چھتیس بار زنا سے زیادہ ہے۔ اس حکمت کا علم اللہ ہی کو ہے، اور کبھی وہ اپنے بعض خاص بندوں کو بھی اس حکمت سے آگاہ کر دیتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ سخت وعید اس وجہ سے ہے کہ سود، سود خور کو برے خاتمہ کی طرف لیجاتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ، جیسا کہ علماء نے اس حکم کو اللہ کے اس ارشاد سے اخذ کیا ہے: ﴿فَان لَّمْ تَفْعَلُوا فَاذْنُو بِحُرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ﴾ [البقرہ۔ ۵۹] (پھر اگر تم نہ کرو گے تو اعلان سن لو جنگ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے)۔ اور جس شخص کے خلاف اللہ اور اس کا رسول اعلان جنگ کرے، یا جو شخص اللہ اور اس کے رسول سے برسر جنگ ہو، تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پس جس شخص کی موت کا وقت قریب آ جائے اور

وہ سود پر مصر ہو تو یہ شیطان کا اس کو گمراہ کرنے میں مددگار ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ شیطان کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا ہے اور کفر پر مروجاتا ہے، تاکہ اس کے بارے میں وہ اعلان جنگ ثابت ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی سود خور کے کفر کا خطرہ معلوم ہوتا ہے ﴿یا ایہا الذین آمنوا لا تاكلوا الربوا﴾ [آل عمران - ۱۳۱] (اے ایمان والو! سود مت کھاؤ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے)۔

السحت : سین کے ضمہ اور حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور سکون کے ساتھ بھی درست ہے مراد اس سے حرام ہے جو سود رشوت اور اس کے علاوہ جس کے ساتھ بندوں کا حق متعلق ہو سب کو شامل ہے، یا اس سے بھی عام ہے۔

فالنار اولیٰ بہ : ضمیر مجرور کا مرجع ”نار“ بھی ہو سکتا ہے اور صاحب اللحم“ بھی۔ یعنی اس کے گوشت کیلئے، یا سود خور کیلئے،۔ اس میں خفی اشارہ ہے وعید کے سخت اور شدید ہونے کی وجہ کی طرف، کہ ربا سے جب انسان کے بدن کی نشوونما ہوگی تو یہ انسان کو بہت سارے اور گناہوں کی طرف لے جائے گی، یا اس وجہ سے کہ ربا کی پہچان مشکل ہونے کی وجہ سے عموماً جاہل لوگ اس کو حلال سمجھنے لگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کافر ہو جاتے ہیں، برخلاف زنا کے کہ اس کا گناہ ہونا جاہلیت اور اسلام دونوں میں معروف و مشہور ہے۔

۲۸۲۶: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الرَّبَا سَبْعُونَ جُزْءًا اِيسْرُهَا اَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ امَةً۔

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۷۶۴/۲ الحدیث رقم ۲۲۷۴۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کے گناہ کے ستر درجے ہیں اور ان میں جو سب سے کمتر درجہ ہے وہ یہ ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنی ماں سے صحبت کرے۔

تشریح: سبعون جزءاً ۱: بعض روایات میں ”جزءاً“ کے بجائے ”باباً“ اور بعض میں ”حوباً“ آیا ہے۔

ایسرھا اثماً : کہ ایک روایت میں ”ادناھا“ ہے۔ ان ینکح الرجل امه اور ایک روایت میں ہے: الربا ثلاثة وسبعون بابا ایسرھا مثل ان ینکح الرجل امه، وان اربی الربا عوض الرجل المسلم، کہ سود کے گناہ کے بہتر درجے ہیں اور ان میں جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنی ماں سے صحبت کرے۔ اور سب سے بڑا سود مسلمان آدمی کی پردہ دری ہے، اس کو مالک نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے ”الربا اثنان وسبعون باباً ادناھا مثل اتیان الرجل امه وان اربی الربا استطالة الرجل فى عوض اخیه“ ”سود کے بہتر درجے ہیں اور ان میں جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ آدمی اپنی ماں سے صحبت کرے، اور سب سے بڑا سود آدمی کا اپنے بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ اس کو امام طبرانی نے حضرت براء بن عازب سے روایت کیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں میں اس بات پر دلالت پائی جاتی ہے کہ سود کے گناہ کا زنا سے زیادہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے کہ زنا عام طور پر زانیہ کی رضا مندی سے ہی ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس آیت میں زانیہ کے ذکر کو پہلے لایا ہے: ﴿الزانیة والزانی﴾ [النور - ۲] ورنہ تو تک حرمیت سے بڑھ کر کوئی عصمت دری ہے، اور تہمت زنا کا درجہ زنا سے کم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۲۸۲۷: وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اِنَّ الرَّبَا وَاَنْ كَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَهُ تَصِيْرُ اِلَى قَلْبِ رَوْا

هُمَا ابْنُ مَاجَةَ وَابْنُ هُرَيْرَةَ فِي شُعْبِ الْاِيْمَانِ وَرَوَى اَحْمَدُ الْاَخِيْرَ۔

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۷۶۵/۲ الحدیث رقم ۲۲۷۹ واحمد فى المسند ۳۹۵/۱

ترجمہ: اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود (سے حاصل شدہ مال) خواہ کتنا ہی کثیر ہو مگر آخر کار اس میں کمی (یعنی بے برکتی) آ جاتی ہے۔ ان دونوں روایتوں کو ابن ماجہ نے اور بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے نیز دوسری روایت کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

تشریح: قل : قاف کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ ہے، بمعنی نفرو ذلت۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”القل“ اور ”القلة“ الذل اور ذل کی طرح ہے، مطلب ہے کہ اس کی برکت ختم کر دی جاتی ہے۔

۲۸۲۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ آتَيْتُ لَيْلَةَ أُسْرَى بِيْ عَلِيٍّ قَوْمٌ بَطُونُهُمْ كَالْبَيُوتِ فِيهَا الْحَيَاتُ تَرَى مِنْ خَارِجٍ بَطُونَهُمْ فَقُلْتُ مَنْ هَؤُلَاءِ يَا جَبْرِيلُ قَالَ هَؤُلَاءِ أَكَلَةُ الرَّبَا - (رواه احمد وابن ماجه)
اخرجه ابن ماجه فى السنن ۷۶۳/۲ الحديث رقم ۲۲۷۳، و احمد فى المسند ۳۶۳/۲۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: معراج کی رات میں ایک قوم کے پاس آیا جن کے پیٹ گھروں اور مکانوں کی مانند (بڑے بڑے) تھے اور ان کے پیٹوں میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو پیٹوں کے باہر سے بھی نظر آ رہے تھے میں نے (انہیں دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ جبرئیل علیہ السلام سے) پوچھا کہ اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ سودخور ہیں۔ (احمد ابن ماجہ)

تشریح: آیت : صیغہ معروف کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں مجہول کے ساتھ ہے۔ لیلۃ اسری بی : صحیح قول کے مطابق اضافت کے ساتھ ہے علی قوم : آیت کا متعلق ہے نہ کہ اسری کا، جیسا کہ گمان کیا گیا ہے۔ بطونہم کالبیوت : با کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی درست ہے۔ یہ جملہ ”قوم“ کی صفت ہے۔ فیہا : ضمیر کا مرجع ”بطون“ ہے۔ الحیات : حیہ کی جمع ہے۔ تری : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ قولہ : تری من خارج بطونہم : ان کے حال کی برائی اور مستقبل کی رسوائی کیلئے ہوگی۔ قال : ہؤلاء آکلۃ الربا : اور ایک روایت میں ”من امتک“ کے الفاظ بھی ہیں۔

سودخور پر لعنت

۲۸۲۹: وَعَنْ عَلِيٍّ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَعَنَ أَكْلَ الرَّبَا وَمَوْلَاهُ وَكَاتِبَهُ وَمَانِعَ الصَّدَقَةِ وَكَانَ يَنْهَى عَنِ النَّوْحِ - (رواه النسائي)

اخرجه النسائي فى السنن ۱۴۷/۸ الحديث رقم ۵۱۰۳۔

ترجمہ: اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے سود لینے والے پر سود کھلانے والے پر سود کا حساب کتاب لکھنے والے پر اور صدقہ سے منع کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ نیز آپ ﷺ نوحہ کرنے سے منع فرمایا کرتے۔ (نسائی)

تشریح: قولہ : لعن اکل الربا ومولاه، وکاتبہ، ومانع الصدقہ : یعنی مطلقاً صدقہ مراد ہے، یا واجب صدقہ کو ترک کرنے والا مراد ہے۔

النوح : با آواز بلند روتے ہوئے زمانہ جاہلیت کے اس جیسے الفاظ کہنا و اکھفاہ و اجبلاہ اے پہاڑ وغیرہ

ربا کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد

۲۸۳۰: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ إِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرَّبَا وَأَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَبِضَ وَكَمْ يَفْسِرُهَا لَنَا قَدْ عَوَّا الرَّبَا وَالرَّيْبَةَ - (رواه ابن ماجه والدارمي)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۷۶۴/۲ الحديث رقم ۲۲۷۶۔

ترجمہ: اور حضرت عمر فاروق کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جو چیز سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے وہ آیت الربا ہے۔ چنانچہ رسول

اللہ ﷻ اس دنیا سے اس حالت میں تشریف لے گئے کہ آپ ﷺ نے ہمیں اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی لہذا سود کو اور جو چیز سود کے مثل ہو اسے ترک کر دو۔ (ابن ماجہ داری)

تشریح: قوله: عنہ آخر ما نزلت آية الربا: یعنی وہ آیت جس کا تعلق معاملات کے ساتھ ہے نہ کہ مطلق آیت، اس لئے کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت علی الاطلاق یہ ہے: ﴿اليوم اكملت لكم دينكم﴾ [المائدہ-۳] ”آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا“۔

وان رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان کے کسرہ کے ساتھ، ہو تو جملہ متنافہ یا جملہ حالیہ ہوگا اور ان کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا عطف پہلے والے اُن پر ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ آیت ربا نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں بہت کم عرصہ تشریف فرما رہے، اور اس مدت میں اس آیت کی تفسیر سے زیادہ اہم دینی ضروریات میں مشغول رہے، خاص کر کے جب کہ آیت کا مقصود بھی واضح تھا، آیت پر عمل آپ کی تفسیر پر موقوف نہ تھا، بلکہ آپ کی تفسیر پر وہ لظائف اور باریکیاں موقوف تھیں جس کی طرف آیت سے اشارہ ہو رہا ہے، لیکن اس طرح کے معارف اور علوم اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی طرف سے اپنے رسول کو اس کی زندگی اور اس کے ورثاء کو اگرچہ رسول کی وفات کے بعد ہو، عطا فرما دیتے ہیں۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو آیت سود کی حرمت کے بارے میں نازل ہوئی وہ یہ ہے ﴿الذین یاکلون الربا۔۔۔ لا تظلمون ولا تظلمون﴾ [البقرہ-۲۷۹] یہ ثابت ہے نہ کہ منسوخ ہے، صریح اور واضح ہے نہ کہ مشتبہ ہے اس لئے آپ ﷺ نے اس کی مزید تفسیر بیان نہیں کی بلکہ ان آیات کو ان کے ظاہر پر چھوڑا۔ پس تم اس میں شک نہ کرو، اور سود کے حلال ہونے کے حیلے چھوڑ دو، اور یہی مطلب ہے حضرت عمر کے اس قول کا فدعو الربا والربیۃ۔ یعنی ربا کے شبہ کو چھوڑ دو یا اس چیز میں شک و شبہ کرنا چھوڑ دو جس کو یہ آیات اور احادیث مشتمل ہیں، اس لئے کہ اس میں سے کسی چیز میں شک کرنا کبھی کفر کی طرف لے جاتا ہے۔

قرض خواہ کا مقروض سے تحفہ وصول کرنا

۲۸۳۱: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَقْرَضَ أَحَدُكُمْ قَرْضًا فَأَهْدَى إِلَيْهِ أَوْ حَمَلَهُ عَلَى الدَّابَّةِ

فَلَا يَرْكَبُهُ وَلَا يَقْبَلُهَا إِلَّا أَنْ يَكُونَ جَرَى بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ قَبْلَ ذَلِكَ - (رواه ابن ماجة والبيهقي في شعب الایمان)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۸۱۳/۲ الحديث رقم ۲۴۲۳، والبيهقي في شعب الایمان۔

ترجمہ: اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو قرض دے اور پھر وہ (قرض لینے والا) اس (قرض دینے والے) کے پاس کوئی تحفہ بھیجے یا سواری کے لئے کوئی جانور دے تو وہ (قرض دینے والا) نہ اس جانور پر سواری کرے اور نہ اس کا تحفہ قبول کرے مگر یہ کہ ان دونوں قرض دینے والے اور قرض لینے والے کے درمیان پہلے سے یہ کام (تحفہ یا سواری کے جانور کا لینا دینا) جاری ہو تو پھر اس کو قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (ابن ماجہ بیہقی)

تشریح: قرضا: اسم مصدر ہے، اور مصدر درحقیقت ”الاقراض“ ہے، اور قرضا ”کایہا“ مقروض کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے، اس صورت میں یہ مفعول ثانی ہوگا، اور مفعول اول مقدر ہوگا۔ جیسا کہ اس آیت میں ”قرضا“ مفعول ثانی ہے: ﴿من الذى یقرض الله قرضا حسنا﴾ [البقرہ-۲۴۵] ”یہ ایسا شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر“۔

او حملہ علی الدابة: یعنی اپنی سواری پر، یا قرض خواہ کے سواری پر۔

فلا یرکبہ: ضمیر منصوب ”مرکوب“ کی طرف راجع ہے، اور ایک نسخہ میں ”فلا یرکبہا“ ہے، اس صورت میں ضمیر مؤنث ”دابة

”کی طرف راجع ہوگی،

فلا یرکبه ولا یقبلها اس عبارت میں لف نثر غیر مرتب ہے، فہم سامع پر اعتماد کرتے ہوئے۔
امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”فاہدی“ میں ضمیر فاعل مفعول مقدر کی طرف لوٹ رہی ہے، اور ”لا یقبلها“ کی ضمیر ”اھدی“ کے مصدر کی طرف راجع ہے، اور ”فاہدی“ کا عطف شرط پر ہے، اور اس کا جواب ”فلا یرکبه ولا یقبلها“ ہے۔
الا ان یكون : کی ضمیر مذکور کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ای المذکور من المعروف او الالاء
قبل ذلك : اس ممانعت کی وجہ یہ روایت ہے: ”کل قرض جر منفعه فهو ربا“
امام مالک فرماتے ہیں کہ قرض دار کا تحفہ قبول نہ کیا جائے، جب تک کہ قرض سے پہلے بھی اس جیسے تحفے کا رواج نہ ہو، یا اس تحفہ دینے کا کوئی موجب پیدا نہ ہو۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلے کی نظیر قاضی کو تحفہ دینے کا مسئلہ ہے، اور اولیٰ اس کیلئے یہ ہے کہ اس سے بچے۔
اگر یہ کہا جائے کہ اولیٰ یہ ہے کہ وہ اس کے تحفے کے برابر یا اس سے زائد کوئی چیز اس کو بدلے میں دے دے۔
اور متقین کے امام امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے زمانے میں اس میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے، چنانچہ ایک دن وہ اپنے قرض دار کے ہاں اپنے قرض کے تقاضے کیلئے گئے، اس وقت بڑی سخت گرمی تھی، اور اس کے گھر کی دیوار کا سایہ بھی تھا، امام صاحب دھوپ میں کھڑے رہے یہاں تک کہ بہت دیر کے بعد وہ قرض دار گھر سے نکلا، اور امام صاحب اس وقت تک اسی دھوپ میں کھڑے رہے، اور اس تکلیف پر صبر کرتے رہے لیکن اس سایہ سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ تاکہ مقروض کی طرف سے کسی منفعت کا حصول لازم نہ آئے۔
امام صاحب کا مذہب یہ ہے کہ قرض دار کا فائدہ اٹھانا حرام ہے سو دکی طرح۔ ہمارا مذہب عام اور اکثر علماء کی طرح ہے کہ یہ حرام نہیں ہے الا یہ کہ جس عقد کی وجہ سے یہ قرض لازم ہوا ہے اگر صاحب عقد قرض دار کے ساتھ کسی منفعت کی شرط لگائی۔
۲۸۳۲: وَعَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِذَا أَقْرَضَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلَا يَأْخُذْ هَدِيَّةً۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۲۹/۷ الحدیث رقم ۳۸۱۴

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی کو قرض دے تو وہ اس (قرضدار) سے بطور تحفہ بھی کوئی چیز قبول نہ کرے۔ امام بخاری نے اس روایت کو اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے نیز المنتقی میں بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے۔

تشریح: قولہ: اذا اقرض الرجل احدکم : اور ایک نسخہ میں ”الرجل“ نصب کے ساتھ ہے مفعولیت کی بناء پر۔
فلا ياخذ: ایک نسخہ میں نفی کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ ہدیۃ: اس کی تئوین برائے تکبیر ہے۔

قولہ: رواہ البخاری فی تاریخہ، هكذا فی المنتقی:

المنتقی: ہمیم کے ضمہ، نون کے سکون، تاء منقوطة اور قاف دونوں کے فتح کے ساتھ ہے۔

یہ احادیث کی ایک کتاب کا نام ہے جس کو امام احمد کے اصحاب میں سے کسی نے کی فقہ کے ترتیب پر مدون کیا ہے۔

۲۸۳۳: وَعَنْ أَبِي بُرْدَةَ بْنِ أَبِي مُوسَى قَالَ قَدِمْتُ الْمَدِينَةَ فَلَقَيْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ سَلَامٍ فَقَالَ إِنَّكَ بَارِضٌ فِيهَا لَرَبًّا فَاشِ فَإِذَا كَانَ لَكَ عَلَى رَجُلٍ حَقٌّ فَأَهْدِي إِلَيْكَ حِمْلَ بَيْنٍ أَوْ حِمْلَ شِعْبٍ أَوْ حِمْلَ قَيْتٍ فَلَا تَأْخُذْهُ فَإِنَّهُ رِبَاٌ۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۲۹/۷ الحدیث رقم ۳۸۱۴

ترجمہ: ”اور حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰ (تابعی) کہتے ہیں کہ جب میں مدینہ آیا اور میں نے حضرت عبداللہ بن سلام (صحابی) سے ملاقات کی تو انہوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسی زمین پر ہو جہاں سود کا بہت رواج ہے لہذا اگر کسی تمہارا حق ہو (یعنی کوئی تمہارا

قرض دار ہو) اور وہ تمہیں بھوسے کا ایک گٹھرایا جو کی ایک گٹھری یا گھاس کا ایک گٹھا بھی تھخہ کے طور پر دے تو تم ہرگز اسے قبول نہ کرنا کیونکہ وہ سود (کا حکم رکھتا) ہے۔ (بخاری)

تشریح: حمل تبین: اتنی مقدار جو گلہ سے یا خچر وغیرہ کا بوجھ بنے۔

حبل: جاء ہملہ اور بائے موحدہ دونوں کے فتح کے ساتھ ہے، ”فعل“ بمعنی ”مفعول“ ہے۔ ای مشدود الحبل۔

القت قاف کے فتح اور تاء کی تشدید کے ساتھ ہے، ایک معروف گھاس ہے، جانوروں سب سے عمدہ چارہ ہے، اس کو ”رطبہ“ کہتے ہیں۔

نہایہ میں ہے کہ ”حبل“ حرکات کے ساتھ رہے، بمعنی مفعول ہے۔ (اتحلی)

اور ایک نسخہ میں باء کے سکون کے ساتھ ہے، یہ ظاہر ہے، ای المربوطہ یعنی رسی کے ساتھ بندھا ہوا۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہاں ہدیہ کو جانوروں کے چارے کے ساتھ خاص کیا ہے، تحائف کے قبول کرنے سے ممانعت میں مبالغہ کیلئے، اس لئے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ جانوروں کو حرام کا چارہ کھلایا جائے۔

بَابُ الْمَنْهِيِّ عَنْهَا مِنَ الْبَيْعِ

جن بیعوں سے منع کیا گیا ہے ان کا بیان

الفصل الاول:

۲۸۳۳: عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْمُرَابَنَةِ أَنْ يَبِيعَ ثَمَرَهَا بِطَهْ إِنْ كَانَ نَخْلًا بِتَمْرٍ كَيْلًا وَإِنْ كَانَ كَرْمًا أَنْ يَبِيعَهُ بِزَبِيبٍ كَيْلًا أَوْ كَانَ (وَعِنْدَ مُسْلِمٍ) وَإِنْ كَانَ زُرْعًا أَنْ يَبِيعَهُ بِكَيْلِ طَعَامٍ نَهَى عَنْ ذَلِكَ كَيْلَهُ (متفق عليه وفي رواية لهما) نَهَى عَنِ الْمُرَابَنَةِ قَالَ وَالْمُرَابَنَةُ أَنْ يَبِيعَ مَا فِي رُؤُوسِ النَّخْلِ بِتَمْرٍ بِكَيْلِ مَسْمِيٍّ إِنْ زَادَ قَلِيًّا وَإِنْ نَقَصَ فَعَلَى - (رواه البخاری ومسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۰۳/۴ الحدیث رقم ۲۲۰۵، ومسلم فی ۱۱۷۲/۳ الحدیث رقم (۷۶-۱۵۴۲) والترمذی فی السنن ۵۹۳/۳ الحدیث رقم ۱۳۰۰ والسنائی فی ۲۷۰/۷ الحدیث رقم ۴۵۴۹، وابن ماجہ فی ۷۶۱/۲ الحدیث رقم ۲۲۶۵ ومالک فی الموطأ ۶۲۴/۲ الحدیث رقم ۲۳ من کتاب البیوع، واحمد فی المسند ۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مزانہ سے منع فرمایا ہے اور وہ (مزانہ) یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باغ کا پھل (تازہ پھل) اگر وہ کھجور ہو تو خشک کھجوروں (چھوڑوں) کے عوض پیمانہ سے، ذریعہ (مثلاً دس پیمانے کے بقدر) بیچے (یعنی ایک شخص کے باغ میں تازہ کھجوریں لگی ہوئی ہوں اور ایک دوسرے شخص کے پاس خشک کھجوریں رکھی ہوئی ہوں تو باغ والا شخص اس دوسرے شخص سے دس پیمانے بھر خشک کھجوریں لے لے اور اس کے عوض اپنے درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوریں اسی پیمانے کے مطابق اندازہ کر کے دے) اور اگر میوہ انور ہو تو اس کو خشک انور (کشمش) کے عوض پیمانے کے ذریعہ فروخت کرے۔ (حاصل یہ کہ بیع مزانہ کا مطلب ہے درخت پر لگے ہوئے تازہ پھل کو خواہ وہ کھجور ہو یا کوئی اور پھل رکھے ہوئے خشک پھل کے عوض بیچنا) اور مسلم میں ہے کہ اگر کھیتی ہو تو اس میں بیع مزانہ کی شکل یہ ہے کہ اس کو غلہ کے عوض پیمانہ سے ذریعہ بیچے (یعنی گندم کی فصل کھیت میں کھڑی ہے اور ایک دوسرے شخص کے پاس گندم رکھی ہوئی ہے تو پہلا شخص اپنے کھیتی میں کھڑی ہوئی گندم کا اندازہ کر کے اس کو دوسرے شخص کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے عوض اس شخص سے وہ رکھا ہوا گیہوں اپنے اندازے کے مطابق پیمانہ بھر کے لے لے)

آپ ﷺ نے بیع کی ان تمام قسموں سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم ہی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے نیز فرمایا کہ بیع مزابنہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوروں کو کسی شخص کے ہاتھ اس کے پاس رکھی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض معین پیمانہ کر کے فروخت کرے اور خریدار سے کہہ دے کہ اگر درخت کی کھجوریں (معین پیمانہ سے) زائد ہوں گی تو میری ہیں (یعنی میں اسے لے لوں گا) اور اگر کم نکلیں تو اس کا میں ذمہ دار ہوں گا) (کہ اس کی کو میں پورا کر دوں گا)۔

تشریح: قوله: :: نهی رسول الله ﷺ عن المزابنة :

شرح السنہ میں ہے کہ ”مزابنہ“ کہتے ہیں درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو فروخت کرنا اس کی جنس کے بدلے جو زمین پر رکھی ہوئی ہو یہ ”زمین“ سے مشتق ہے، اور ”زمین“ کا معنی ہے دفع کرنا اس لئے کہ متعاقبین میں سے جب کوئی خریدی ہوئی چیزیں کسی نقصان پر واقف ہوتا ہے اور عقد کے فسخ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور دوسرے کا ارادہ عقد کو جاری رکھنے کا ہوتا ہے، اور ہر ایک اپنے ساتھی کو اس کے حق سے دفع کرتا ہے بوجہ اس کے جو اس نے اپنے ساتھی سے زیادہ لیا ہے۔

کھجور کو درخت کے اوپر اس کی جنس کے بدلے فروخت کرنے کو ”مزابنہ“ کے ساتھ خاص کیا ہے، اس لئے کہ ان کے درمیان مساوات شرط ہے، اور درخت کے اوپر لگے ہوئے پھلوں کو کیل اور وزن کے ساتھ معلوم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ مقدار انکل کے ساتھ ہوتا ہے جو محض ایک اندازہ اور گمان ہے، جس میں کمی بیشی سے نہیں بچا جاسکتا اور تازہ کھجوروں کو خشک کھجور کے بدلے، اور انگور کو خشک انگور کے بدلے بیچنا جائز ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں۔ اور امام شافعی، مالک اور احمد رحمہم اللہ کے ہاں جائز نہیں ہے نہ کیل کے ساتھ اور نہ وزن کے ساتھ، جب تازہ پھل درخت کے اوپر نہ لگا ہو، باقی جب تازہ کھجور درخت پر لگے ہوں اور اس کو اس کے جنس کے بدلے بیچنا ہو تو یہ عرایا ہے، اور اس پر بحث آئندہ آئے گی۔

ان بیع نمر حائظہ بدل ہے یا بیان ہے ”مزابنہ“ کیلئے۔ ان کان ضمیر مستتر ”نمر“ کی طرف راجع ہے۔

نخلًا: سے مراد ”رطب“ ہے یا مضاف محذوف ہے، ای نمر نخل۔ ان بیعہ بزبیب کیلا: امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام شرط بیان کیلئے تفصیل ہیں اور شرط ثانی کی جزاء مقدر ہے، جو نہی ہے سیاق اس پر فرینہ ہے اس لئے کہ مذکورہ عبارت میں جزاء بننے کی صلاحیت نہیں ہے، اور اسی طرح شرط اول کی جزاء بھی مقدر ہے جو ”نہی ان بیعہ“ ہے شرط ثانی کے فرینہ کی وجہ سے۔

او کان وعند مسلم وان کان: یعنی ”او کان“ کی جگہ ”ان کان“ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بخاری کی روایت ”وکان ذرعا“ ہے اور مسلم کی روایت ”وان کان“ ہے۔

ذرعا ان بیعہ بکیل طعام) اضافت کے ساتھ ہے، اور ”طعام“ سے مراد ندم ہے۔ کلہ: تاکید ہے۔ تمام افراد کو شامل ہے اور یہ جملہ تاکید ہے پہلے والی نہیں کیلئے۔ بتمر: متعلق ہے ”بیاع“ کیلئے۔ بکیل: بدل ہے، اعادہ جار کے ساتھ۔ (مسمی) بمعنی ”معین“ ہے صفت ہے ”کیل“ کیلئے۔

ان زاد: حال ہے بائع کے قول مقدر سے، جو ”بیاع“ سے مفہوم ہو رہا ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: ای بیع قانلا ان زاد النمر علی ذلك الكيل المسمی۔ فلی: ای فالزائد لی تو وہ زائد میری ہے میں اسے لوں گا۔

۲۸۳۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْمُخَابَرَةِ وَالْمُحَافَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَافَلَةَ أَنْ يَبِيعَ الرَّجُلُ الزَّرْعَ بِمِائَةِ فَرْقٍ حِنْطَةٍ وَالْمُزَابَنَةَ أَنْ يَبِيعَ التَّمْرَ فِي رُوُوسِ النَّخْلِ بِمِائَةِ فَرْقٍ وَالْمُخَابَرَةَ كَرَاءِ الْأَرْضِ بِالثُّلُثِ وَالرُّبْعِ. (رواه مسلم)

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مغابرة اور مزانہ سے منع فرمایا ہے اور محافلہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی کھیتی کو سو فریق (وزن کا پیمانہ) گندم کے عوض فروخت کر دے اور مزانہ یہ ہے کہ کوئی شخص درختوں پر لگی ہوئی کھجوروں کو سو فریق رکھی ہوئی کھجوروں کے عوض فروخت کرے اور مغابرة یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو ایک حصہ جیسے تھائی یا چوتھائی پر کاشت کے لئے دے دے۔“ (مسلم)

تشریح: مغابرة: خاء کے ساتھ ہے، بعض فرماتے ہیں کہ ”مغابرة“ کہتے ہیں اپنی زمین کسی دوسرے کو بٹائی پر کاشت کیلئے دیدینا معین حصہ پر جیسے تھائی، چوتھائی وغیرہ۔ بعض کہتے ہیں کہ ”مغابرة“ خیبر سے ہے، اس لئے کہ نبی ﷺ نے اہل خیبر کو خیبر کی زمین پر برقرار رکھا آدھا محصول دینے کی شرط پر۔ چنانچہ کہا گیا: خابروہم ای عاملہم فی خیبر۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ”خبار“ سے مشتق ہے، یہ نرم زمین کو کہتے ہیں جیسا کہ شرح السنہ میں ہے، اور نہایت میں بھی ہے۔ علامہ ابن البہمام نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ”کنا نخابر اربعین سنة ولا نواى بذلك باسأ حتى اخبرنا رافع بن خديج انه ﷺ نہی عن المغابرة، فترکناہ“ ”ہم چالیس برس تک مغابرة کرتے رہے یہاں تک کہ رافع بن خدیج نے ہمیں خبر دی کہ آپ ﷺ مغابرة سے منع فرماتے تھے۔ پس ہم نے اسے چھوڑ دیا۔“

المحاقلة: حاء مہملہ اور قاف کے ساتھ۔ فائق میں ہے کہ یہ حقل سے ہے۔ حقل کے معنی ہیں ”قرواح من الارض“ وہ اچھی مٹی جو کھاری پانی سے پاک ہو اور کاشت کے قابل ہو، اور اسی سے ہے: حقل يحقل بمعنى زرع۔ اور محاقلة، مفاعلة: سے ہے فرق: فاء اور راء کے فتح کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں راء کے سکون کے ساتھ ہے، اور فرق کا ذکر محض مثال کے طور پر ہے نہ کہ متعین مقدار بتانے کیلئے ہے۔

حنطة: نصب کے ساتھ ہے بناؤ برتیز اور ایک نسخہ میں ما قبل کی اضافت کے ساتھ ہے اس سے ممانعت اس لئے ہے کہ خشک گندم اور تازہ گندم کے درمیان برابری معدوم ہوتی ہے۔

نہایت میں ہے کہ ”فرق“ راء کی حرکت کے ساتھ ایک پیمانہ کا نام ہے، جس میں سولہ رطل آتے ہیں، اور سولہ رطل بارہ اور تین صاع کے برابر ہوتے ہیں، اہل حجاز کے ہاں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ فرق میں پانچ اقساط ہوتے ہیں، اور ایک قسط آدھے صاع کے برابر ہے، اور فرق راء کے سکون کے ساتھ ایک سو بیس ۱۲۰ رطل کا ہوتا ہے۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ روایت میں محافلہ کی یہ تفسیر کس نے کی ہے؟ مگر اس کی تفسیر ”مائة فرق“ کے

ساتھ ساقط ہے، اور اس طرح باقی تفسیر بھی۔ بلاغت کا حق تو یہ تھا کہ ایسی مثال لائے جس میں عدد معین نہ ہوتا، اس لئے کہ ”بماعة فرق“ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے، کہ اگر اس مخصوص مقدار سے کم یا زیادہ ہوگا تو وہ محافلہ نہیں ہوگا۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عرب کبھی مثال میں ایسی عبارت ذکر کرتے ہیں کہ جس سے مثال کی صورت سامع کے سامنے بن جاتی ہے، زیادت تو توضیح کیلئے۔ ہاں اگر صرف مثلاً ”مائة“ کا لفظ ذکر کرتے تو اس پر کوئی اشکال نہ ہوتا، اور اس قدر ذکر کرنے میں اہل بلاغت کے ہاں کوئی حرج نہیں ہے۔

فی بمعنى ”علی“ ہے۔ کراء الارض: اجارے پر دینا۔

الثلت: خاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ ہے، اور لام کے سکون کے ساتھ بھی ہے، اور اسی طرح ضبط ”الرابع“ کا ہے۔ واو بمعنی ”او“ ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی اپنی زمین کسی دوسرے کو کاشت کیلئے دیدے کہ بیج اور عمل کاشت کرنے والے کی طرف سے ہوگا، اور جو کچھ اس میں پیدا ہوگا اس کا چوتھائی یا تہائی زمین کا مالک لے گا۔ خیبر، بالضم سے مشتق ہے، بمعنی ”نصیب“، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے اول تو اس لئے کہ اس میں اجرت مجہول ہوتی ہے، دوسرے حاصل ہونے والی چیز معدوم

ہوتی ہے۔ (اتحیٰ)

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں مزارعت جائز نہیں ہے اور صاحبین کے ہاں جائز ہے۔ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے اس لئے کہ اس کی طرف لوگوں کی احتیاج زیادہ ہے۔

۲۸۳۶: وَعَنْهُ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْمُخَاَقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُخَابَرَةِ وَالْمَعَا وَمَةِ وَعَنِ الثَّنِيَا وَرَخَّصَ فِي الْعَرَايَا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۱۷۵/۳ الحديث رقم (۸۵-۱۵۳۶)، والترمذى فى السنن ۶۰۵/۳ الحديث رقم ۱۳۱۳، واحمد فى المسند ۳۱۳/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے محافلہ، مزبانہ، مخابره، معاومہ (یعنی باغ کو کئی سال کے لئے ٹھیکے پر دینا) اور ثنیا سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ نے عرایا کی اجازت دی ہے۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُخَاَقَلَةِ، وَالْمُزَابَنَةِ، وَالْمُخَابَرَةِ: ان سب کا مطلب پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

والمعاومة: اور ایک نخڑ میں عن المعاومة ہے، اور یہ ”مفاعلتہ“ کے وزن پر ہے ”عام“ سے ماخوذ ہے جیسے ”مسانهتہ“ سنۃ اور ”مشاہرۃ“ شہر سے مشتق ہے۔

نہا یہ میں ہے ”معاومت“ کے معنی یہ ہیں کہ درختوں کے پھلوں کو نمودار ہونے سے پہلے دو سال یا تین سال یا زیادہ مدت کیلئے فروخت کر دیا جائے یہ بیع باطل ہے، اس لئے کہ یہ ایسی چیز کی بیع ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ پس یہ کسی بچے کو پیدا ہونے سے پہلے بیچنے کی طرح ہے۔

کہا جاتا ہے: ”عومت النخلۃ“ جب وہ ایک سال پھل دے اور دوسرے سال نہ دے۔ یہ ”عام“ بمعنی سنۃ (سال)۔ سے ”مفاعلتہ“ کے وزن پر ہے

الثنیا: ثناء مثلثہ کے ضمہ نون کے سکون اور یائے تختیہ کے ساتھ اسم ہے استثناء سے، اور استثناء کیا جاتا ہے اس سے ایک معلوم مقدار کا جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ حدیث میں آیا ہے: ”من استغنى فله ثنياه“، ”ثنیا“ ”دنیا“ کے وزن پر ہے یعنی جو اس نے مستغنی کیا۔

حی السنۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ثنیا کا مطلب ہے کہ باغ کے پھلوں کو فروخت کیا جائے اور اس سے ایک غیر معین مقدار کا حصہ مستغنی کیا جائے۔ یہ بیع فاسد ہے، جہالت بیع کی وجہ سے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی ممانعت کا مقتضی یہ ہے کہ ”مفضی الی جہالۃ قدر المبیع“ ہے۔ اسی لئے توفقیہاء فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص دوسرے سے یہ کہہ دے کہ میں تجھ کو یہ ڈھیر فروخت کرتا ہوں سوائے ایک صاع کے اور اس ڈھیر کے کل صاع مجہول تھے تو یہ عقد فاسد ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے بیع معلوم القدر ظاہر آیا تقدیراً ہونے سے خارج ہوگئی ہاں اگر وہ بیچے اور اس سے ایک متعین حصہ مستغنی کرے جیسے تہائی، چوتھائی وغیرہ تو یہ عقد صحیح ہو جائے گا، بوجہ اس کی مقدار کے معلوم ہونے کے۔

قولہ: رخص فی العرایا: عریۃ کی جمع ہے یاء کی تشدید کے ساتھ۔ فائق میں ہے کہ ”عریۃ“ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو کسی محتاج کو بطور عاریت دیا جائے یعنی اس کے پھل کو اس کے لئے خاص کر دے۔ عاریت پر دینے والے کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اس کے پھل کو خرید لے رکھے ہوئے پھل کے بدلے، بوجہ معری کی طرف سے ضرورت پڑنے کے، اس کا نام ”عریۃ“ رکھا، اس لئے کہ جب اس درخت کا پھل چلا جاتا ہے، تو گویا کہ اس نے اس کو اس کے پھل سے خالی اور ننگا کر دیا پھر اسی سے الاعراء مشتق کیا گیا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”عریۃ“ کا مطلب ہے کہ ایک اندازہ لگانے والا درختوں کا اندازہ لگالے پھر کہے کہ یہ تازہ کھجور جب یہ خشک ہو جائے گی تو اس سے مثلاً تین ۳۱۳۱ وقت کھجور حاصل ہوں گی۔ پس وہ کسی دوسرے کے ہاتھ تین وقت کھجور کے بدلے فروخت کر دیتا ہے، اور اسی مجلس میں دونوں قبضہ کر لیتے ہیں، مشتری کھجور حوالہ کر دیتا ہے اور بائع درخت حوالہ کر دیتا ہے یہ پانچ وقت سے کم میں جائز ہے اور اس سے زیادہ میں جائز نہیں ہے۔ پانچ وقت میں جواز کے بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں، ان میں سے قول اصح یہ ہے کہ یہ جائز ہے اس لئے کہ اصل میں تو خشک کھجور کو تازہ کے بدلے فروخت کرنا حرام ہے، اور عرایا کے بارے میں رخصت وارد ہے۔ اور صحیح تر قول کے مطابق یہ اغنیاء اور فقراء دونوں کیلئے جائز ہے، اور تازہ کھجور اور انگور کے علاوہ پھلوں میں بھی جائز ہے۔ اور ایک ضعیف قول کے مطابق یہ فقراء کے ساتھ خاص ہے۔ (اتہمی)

روایت کیا گیا ہے کہ فقراء مدینہ آپ کے پاس آئے اور کہا اللہ کے رسول، آپ نے تازہ کھجور کو خشک کھجور کے بدلے فروخت کرنے سے منع کیا ہے اور ہمارے پاس سونا اور چاندی نہیں ہے کہ ہم تازہ کھجور خرید لیں، اور ہمیں اس کی خواہش ہے، پس آپ نے ان کو اس کی اجازت دی اس کی، چنانچہ وہ تازہ کھجور خریدتے تھے اس خشک کھجور کے بدلے جو ان کے پاس سال کے خرچ سے بچی ہوتی تھی۔ لیکن اصولیین کے ہاں معتد یہ ہے کہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص کا۔

۲۸۳۷: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَنْمَةَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ التَّمْرِ بِالتَّمْرِ إِلَّا أَنَّهُ رَخَّصَ فِي الْعُرْيَةِ أَنْ تُبَاعَ بِخَرِّصِهَا تَمْرًا يَأْكُلُهَا أَهْلُهَا رُطْبًا - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۸۷/۴ الحدیث رقم ۲۱۹۱، ومسلم فی صحیحہ ۱۱۷۰/۳ الحدیث رقم (۷-۱۵۴۰) والنسائی فی السنن ۲۶۸/۷ الحدیث رقم ۴۵۴۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت سہل بن ابی حنمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو خشک کھجوروں کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ نے عریہ (کسی محتاج کو دیئے گئے درخت) کے متعلق یہ اجازت دی کہ اس درخت پر لگے ہوئے پھل کو اس کے خشک ہونے (کے بعد کی مقدار) کا اندازہ کر کے فروخت کیا جائے (یعنی یہ اندازہ کر لیا جائے کہ اس درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوریں خشک ہونے کے بعد کتنی رہیں گی اور پھر اتنی ہی مقدار میں خشک کھجوریں اس محتاج شخص کو دے کر اس درخت پر لگی ہوئی کھجوریں خرید لی جائیں) اس طرح اس کے مالک اس درخت کا تازہ پھل کھائیں“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع التمر بالتمر: ثناءً مثلثہ کے ساتھ ہے۔ زرکشی فرماتے ہیں کہ مراد اس سے رطب ہے۔ التمر: ثناء کے ساتھ ہے اسی طرح اس کو ضبط کیا ہے سید کے نسخہ میں اور اس کے علاوہ اصول مصحح میں پہلا لفظ ثناء کے ساتھ اور دوسرا ثناء کے ساتھ، اور اسی طرح ضبط کیا ہے زرکشی نے۔ اور عسقلانی فرماتے ہیں کہ پہلا لفظ ثناءً مثلاً کے ساتھ (تمر) ہے اور دوسرا ثناءً مثلثہ کے ساتھ (ثمر) ہے اور اس کا عکس بھی ہے اور دلیل اگلا کلام ہے۔

الا انه رخص فی العریۃ: عین کے فتح، راء کے کسرہ اور یاء کے شد کے ساتھ ”تعری“ سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں ”تجزؤ“ لغت میں ”عریۃ“ کھجور کے درخت کو کہتے ہیں، اور ”عریۃ“ فعلیۃ بمعنی ”فاعلة“ ہے، جمہور کے نزدیک۔ اس لئے کہ اس کو خالی کر دیا ہے مالک کے خالی کرنے باقی درختوں سے۔ امام طہیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دلالت کر رہا ہے اس بات پر کہ ”عریۃ“ کو ”مزابنہ“ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، اس لئے کہ ”بیع التمر بالتمر“ اسی کا نام ”مزابنہ“ ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ ”عریۃ“ فعلیۃ بمعنی ”مفعول“ ہے اور ثناءً لفظ کو وصفیت سے اسمیت کی طرف نقل کرنے کے لئے ہے۔ پس اس کو نقل کیا، اس عقد کی طرف جو اس پر وارد ہوتا ہے، اور اس کے خالی کرنے کو متضمن ہوتا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس کا نام ”عریۃ“ رکھا گیا ہے اس لئے کہ یہ حرمت سے خالی کیا گیا ہے۔ یعنی حکم حرمت سے نکل گیا ہے،

پس یہ ”فعیلة“ بمعنی ”فاعلة“ ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ باغ سے خالی کیا گیا ہے اس کے پھلوں کا اندازہ کرنے اور فروخت کرنے کے ساتھ، یعنی نکالا گیا ہے باغ سے۔

ان تباع: ضمیر ”عویة“ کی طرف راجع ہے،

بخروصھا: خاء معجمہ کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، یعنی اس کے اندازہ کے ساتھ، یہاں خروص بمعنی ”مخروص“ ہے

ای بمخروصھا کیلا حال کون المخروص

تمرا: امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”تمرا“ تمیز ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حال مقدرہ ہو۔ اور اس احتمال کی تائید اگلے قول سے ہوتی ہے: ”یا کلھا اھلھا رطبا“ کہ یہاں ”رطبا“ حال ہے۔ اور اس سے تائید ہوتی ہے ان لوگوں کے مذہب کی جو کہتے ہیں کہ واجب ہے کہ حال مشتق ہو چاہے ہیئت ہو یا تاویلاً ہو۔ اس لئے کہ مطلوب یہاں وصف ہے نہ کہ ذات ورنہ تو آپس میں تبدیل کرنا عبث ہوگا۔ (انتہی) تمرا کی تمیز ہونے کے احتمال کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ”بخروصھا من التمر“ اور خروص ”حرز“ کے معنی میں ہے۔ اور خاء کے کسرے کے ساتھ یہ اسم ہے، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور مشارق میں ہے کہ ”خروص“ خاء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے اس چیز کا جس کا اندازہ لگایا گیا ہو، اور خاء کے فتح کے ساتھ اسم فعل ہے، اور یعقوب فرماتے ہیں کہ ”خروص“ بالکسر اور بالفتح دونوں لغتیں ہیں ”شئ مخروص“ میں۔ اور حاشیہ زکشی میں ہے کہ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، لیکن فتح کے ساتھ زیادہ مشہور ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ روایت کسرہ کے ساتھ ہے، اس طور پر کہ یہ ”شئ مخروص“ کا نام ہے، اور جنہوں نے فتح دیا ہے تو انہوں نے اس کو اسم فعل بنایا ہے۔

۲۸۳۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَرْخَصَ فِي بَيْعِ الْعُرَايَا بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْ سُقَىٰ أَوْ فِي خَمْسَةِ أَوْ سُقَىٰ شَكَ دَاوُدُ بْنُ الْحَصِينِ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۸۷/۴ الحدیث رقم ۲۱۹۰، ومسلم فی ۱۱۸۱/۳ الحدیث رقم (۷۱-۱۰۴۱) وابو داؤد فی السنن ۶۶۲/۳ الحدیث رقم ۳۳۶۶، والترمذی فی ۵۹۵/۳ الحدیث رقم ۱۳۰۱ ومالک فی الموطأ ۲/۲۶۲ الحدیث رقم ۱۴ من کتاب البیوع۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عاریا (مخارجوں کو دیئے گئے درختوں کے پھلوں) کو خشک کھجوروں کے ساتھ اندازہ کر کے بیچنے کی اجازت دے دی ہے۔ یعنی اگر عاریا پر لگی ہوئی کھجوروں کو خشک کھجوروں کے عوض خریدنا ہو تو پہلے یہ اندازہ کر لیا جائے کہ یہ تازہ کھجوریں خشک ہونے کے بعد کتنی رہیں گی پھر اتنی ہی مقدار میں خشک کھجوریں لے کر وہ تازہ کھجوریں دے دی جائیں مگر اس اجازت کا تعلق اس صورت سے ہے جبکہ وہ پانچ وقت سے کم ہوں۔ یہ حدیث کے ایک راوی داؤد بن ابن حصین کا شک ہے (کہ آپ ﷺ کے ارشاد میں پانچ وقت سے کم کا تذکرہ تھا یا پانچ وقت کا تذکرہ تھا)۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: ارخص: اور ایک نسخہ میں ”رخص“ تشدید کے ساتھ ہے، فائدہ: یہ جواز بطور رخصت کے تھا نہ کہ بطور عزیمت

کے۔ فی بیع العرایا: یہاں مضاف محذوف ہے۔ ای فی بیع تمر العرایا۔ بخروصھا: یہ باء ہسبیت کے لئے ہے۔ من التمر: ظاہر یہ ہے کہ متن بیان یہ ہے، اور تمیز ہے مخروص کیلئے، اور امام طیبی فرماتے ہیں کہ متعلق ہے ”عرایا“ کے اور بخروصھا میں باسبیت کیلئے ہے یعنی اجازت دی ہے درخت پر لگے ہوئے کھجوروں کو پڑی ہوئی کھجوروں کے بدلے فروخت کرنے کی، اس کے اندازہ کرنے کے واسطے۔

اوسق: وقت کی جمع ہے، واؤ کے فتح اور سین کے سکون کے ساتھ ہے۔ ایک وقت ساٹھ صاع کا ہوتا ہے، اور ایک صاع پانچ رطل اور ثلث رطل کا ہوتا ہے، بغدادی رطل کے ساتھ (اس کو ذکر کیا ہے امام طیبی رحمہ اللہ نے۔)

او فی خمسۃ وسق: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راوی کی طرف سے شک ہے، پس اس صورت میں کم کو لینا ضروری ہے، اور وہ پانچ وسق سے کم ہے، اور پانچ وسق حرمت ہی کے حکم پر باقی رہیں گے، احتیاط اسی میں ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔
 قوله: شك داود بن الحصين: امام مالک کے شیخ ہیں اس حدیث کے رواۃ میں سے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ داؤد بن ابی الہند ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ داؤد بن قیس ہے۔

پھل ظاہر ہونے سے پہلے بیچنے کی ممانعت

۲۸۳۹: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْيَمَارِ حَتَّى يَبْدُوَ صَلاَحَهَا نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُسْتَرَى (متفق عليه وفي رواية لمسلم) نَهَى عَنْ بَيْعِ النَّخْلِ حَتَّى تَزْهُوَ وَعَنِ السُّنْبَلِ حَتَّى يَبْيَضَ وَيَا مِنَ الْعَاثَةِ. (رواه بخاری ومسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۹۴/۴ الحدیث رقم ۲۱۹۴ ومسلم فی ۱۱۶۵/۳ الحدیث رقم (۱۵۳۴-۴۹) وابو داؤد فی السنن ۶۶۳/۳ الحدیث رقم ۳۳۶۷ وابن ماجہ فی ۷۴۶/۲ الحدیث رقم ۲۲۱۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کی بیچ سے اس وقت تک منع فرمایا ہے جب تک کہ ان کی صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ نے بائع اور مشتری دونوں کو منع فرمایا ہے۔ (بخاری ومسلم) مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے کھجور کے پھل کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سرخ و زرد نہ ہو جائیں نیز آپ ﷺ نے کھیتی کے خوشوں (باہیوں) کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سعید نہ ہو جائیں اور کسی آفت سے محفوظ نہ ہو جائیں۔“

تشریح: الیمار: ثناء مثلاًشہ کے کسرہ کے ساتھ جمع ہے ”نمر“ کی، ثمر میں دونوں حرفوں پر فتح ہے۔
 يبدو: دال کے ضمہ کے ساتھ ہے اور اس کے بعد واؤ ہے، بمعنی بظہر۔
 صلاحها: اور اس سے فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو جائے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اہل علم کے ہاں عمل اس پر ہے کہ پھلوں کو درخت کے اوپر لگے ہوئے پختگی ظاہر ہونے سے پہلے مطلقاً بیچنا جائز ہے۔ اس کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ حضرت جابرؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت زید بن ثابتؓ حضرت ابوسعید الخدریؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایات مروی ہیں اور یہی امام شافعی کا قول ہے، اس لئے کہ اس میں پھل ہلاک ہونے سے محفوظ نہیں ہوتے کسی آفت کے نازل ہونے کی وجہ سے بوجہ پھلوں کے چھوٹے اور کمزور ہونے کے اور جب پھل ہلاک ہو جائے گا تو مشتری کیلئے کچھ نہ رہے گا۔
 قوله: نهى البائع والمشتري: یعنی اس بیچ سے منع فرمایا تاکہ وہ خریدار کے مال کو بغیر کسی عوض کے لینے والا نہ ہو۔ اور خریدنے سے اس لئے منع فرمایا تاکہ اس کا ثمن ہلاک نہ ہو پھلوں کے ہلاک ہونے کی صورت میں۔

قوله: وفي رواية لمسلم نهى عن بيع النخل

حتى تزهُو: تانیث کے ساتھ اس لئے کہ لفظ نخل مؤنث اور مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿نخل

خاوية﴾ [الحاقۃ-۷] صفت مؤنث لائی گئی ہے۔

[نخل منقوع] [القدر-۲۰] صفت مذکر ذکر فرمائی ہے، ”زھا النخل“ سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کا پھل ظاہر ہو جائے۔ خطاب فرماتے ہیں کہ اسی طرح اس کو روایت کیا گیا ہے لیکن صحیح عربیت میں ”تزھلی“ ازھلی النخل“ سے ہے بمعنی احمر و اصفر، اور یہ علامت ہوتی ہے اس کے پھولوں کی پختگی کی۔ اور آفت سے بچنے کی۔ (انتہی)

یہ کل نظر ہے چونکہ لغت میں ”زہت النخل و ازہت“ بھی آیا ہے۔ چنانچہ قاموس میں ہے: زہا النخل، طال کا زہی، والبسرتلوت کا زہی وزہی کعنی وکدعا قلیلة۔

قولہ: وعن السنبل: جنس ہے مفرد اس کا ”سنبلۃ“ ہے یعنی اس کے دانے کی بیج سے منع فرمایا۔

حتی بیض: ضاد کی تشدید کے ساتھ۔ ویأ من العامة یہ سب عطف تفسیری ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے خوشوں کے اندر دانے کے فروخت کا جواز معلوم ہوتا ہے، اور یہی ہمارا مذہب ہے۔
اخروث اور بادام کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے کہ ان دونوں کو ان کے پھلکوں کے اندر بیچا جاتا ہے۔

۲۸۳۰: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ اللَّيْمَارِ حَتَّى تَزْهَى قِيلَ وَمَا تَزْهَى قَالَ حَتَّى تَحْمَرَّ وَقَالَ أَرَأَيْتَ إِذَا مَنَعَ اللَّهُ الْفَمْرَةَ بِمَ يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ مَالَ أَخِيهِ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۹۸/۴ الحدیث رقم ۲۱۹۸ و مسلم فی ۱۱۹۰/۳ الحدیث رقم (۱۵-۱۰۵۰) والنسائی فی السنن ۲۶۴/۷ الحدیث رقم ۵۲۶، واملک فی الموطأ ۶۱۸/۲ الحدیث رقم ۱۱ من کتاب البیوع۔

ترجمہ: اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کو درختوں پر اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ پختہ ہو جائیں۔ عرض کیا گیا کہ پختہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہاں تک وہ سرخ ہو جائیں (یعنی پکنہ جائیں) اور پھر فرمایا تم ہی بتاؤ جب اللہ تعالیٰ پھلوں کو (پکنے سے) روک دے تو تم میں سے کوئی کیسے اپنے مسلمان بھائی کا مال حاصل کرے گا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: حتی تزہی: ازہی سے ہے۔

قیل وما تزہی: یاء کے فتح کے ساتھ ہے اور یک نسخ میں سکون کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ آپ ﷺ کے قول کی حکایت ہو، یعنی تقدیری عبارت یوں ہو: ما معنی قولک حتی تزہی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ”تسمع بالمعیدی“ کے باب سے ہو۔ یعنی کہا گیا کہ ”زہو“ کیا چیز ہے۔ اگلے کلام کے پیش نظر اول ہی صحیح

وقال: یہ بھی ممانعت کی علت اور قلت اور حکمت کی طرف اشارہ ہے امت پر رحم کے بناء پر، ارایت میں، خطاب عام کے۔ ہم یاخذ: ما استفہامیہ کے الف کو حذف کیا ہے، مال اخیه: استفہام انکاری ہے یعنی یہ کیسے جائز ہے۔ یعنی یہ لینا اس کیلئے جائز نہیں ہے۔

پھلدار درختوں کو کئی سالوں کے لئے پیشگی بیچ ڈالنے کی ممانعت

۲۸۳۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ السِّنِينِ وَأَمَرَ بِوَضْعِ الْجَوَانِحِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی قسمین فی ۱۱۷۸/۳ الحدیث رقم ۱۰۱-۱۰۳۶) وفی ۱۱۹۱/۳ الحدیث رقم (۱۷-۱۰۵۴) و ابوداؤد فی السنن ۶۸۰/۳ الحدیث رقم ۳۳۷۴ والنسائی فی ۲۶۶/۷ الحدیث رقم ۴۰۳۱، وابن ماجہ فی ۷۴۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۱۸ واحمد فی المسند ۳۰۹/۳۔

ترجمہ: اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چند سالوں کیلئے پھل بیچنے سے منع فرمایا ہے (یعنی ایک سال یا دو سال یا تین سال یا اس سے زائد سالوں کے لئے درختوں کا پھل پیشگی نہیں بیچنا چاہیے) نیز آپ ﷺ نے آفت زدہ کے ساتھ رعایت کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ (مسلم)

تشریح: عن بیع السنین: سین کے کسرہ کے ساتھ، جمع ہے سنہ کی سین کے فتح کے ساتھ، اس سے مراد بیع معاومتہ ہے

جس کا ذکر پہلے ہو چکا،۔

قولہ: و امر بوضع الجوانح: جیم کے فتح کے ساتھ جمع ہے جانحة کی۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ حکم استنباطی ہے اکثر کے

زردیک، اسلئے کہ قبضہ و ملکیت میں آجانے کے بعد بیع کے ہر نفع و نقصان کا ذمہ دار خریدار ہی ہوتا ہے، اس میں اختلاف ہے مالک کا۔ طحاوی فرماتے ہیں کہ یہ حکم خراجی زمین کے بارے میں ہے، اور یہ حکم امام کی صواب دید پر ہے، اس لئے کہ اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہے۔
 ۲۸۳۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَوْ بَعْتَ مِنْ أُخَيْكَ ثَمْرًا فَأَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ فَلَا يَحِلُّ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا بِمِ تَأْخُذَ مَالَ أُخَيْكَ بِغَيْرِ حَقٍّ - (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۱۹۰/۳ الحديث رقم (۱۴-۱۵۵۴) وابو داؤد فى السنن ۷۴۶/۳ الحديث رقم ۳۴۷۰، والنسائى فى ۲۶۴/۷ الحديث رقم ۴۵۲۷ وابن ماجه فى ۷۴۷/۲ الحديث رقم ۲۲۱۹۔

ترجمہ: اور حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم نے اپنے مسلمان بھائی کے ہاتھ پھل فروخت کیا اور اس پر کوئی آفت آجائے (پھر وہ پھل ضائع ہو جائے) تو تمہارے لئے اس میں سے کچھ لینا حلال نہیں ہے (تم خود سوچو کہ ایسی صورت میں) ایک بھائی کا مال ناحق کیسے لوگے۔ (مسلم)

تشریح: ثمرا: ثناء، مثلثہ کے ساتھ ہے۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اگر بیع خریدار کی سپردگی میں جانے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا نقصان بیچنے والے کو برداشت کرنا ہوگا، اس صورت میں حدیث میں کوئی تاویل کرنے کی ضرورت نہیں، اور اگر بیع خریدار کے قبضے میں جانے کے بعد ضائع ہو تو پھر ”کچھ لینا حلال نہیں ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ از روئے تقویٰ و ورع کچھ لینا حلال نہیں ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام تہدید پر محمول ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”فلا یحل“ کو جواب اور ”لو“ بمعنی ”ان“ ہے۔ یا جواب مقدر ہے اور ”فلا یحل“ اس پر عطف ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: ’لو بعت من اخیک ثمرا فہلک لا تأخذ منہ شیاً فلا یحل لک‘ اور تکرار برائے تقریر ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿كذبت قبلهم قوم نوح فكدبوا عبدنا﴾ [القمر۔ ۹۰]

بم تأخذ مال اخیک بغیر حق: حق تو یہ ہے کہ ظاہر حدیث امام مالک کے ساتھ ہے، اور ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہاں ایک قید مقدر ہے اور اصل عبارت یوں ہے: (لو بعت من اخیک ثمرا قبل الزہوا۔ اگر تو نے پھل پکنے سے پہلے اپنے بھائی کو بیچے تو پھر یہ حکم اتفاقی ہوگا۔

اشیاء منقولہ میں قبل قبضہ دوسری بیع جائز نہیں ہے

۲۸۳۳: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانُوا يَتَاعُونَ الطَّعَامَ فِي أَعْلَى السُّوقِ فَيَبِيعُونَهُ فِي مَكَانِهِ فَتَنَاهَا هُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِهِ فِي مَكَانِهِ حَتَّى يَنْقُلُوهُ . (رواه ابو داؤد ولم اجده فى الصحيحين)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۷۵/۴ الحديث رقم ۲۱۶۷ و مسلم فى صحيحه ۱۱۶۰/۳ الحديث رقم (۳۳-۱۵۲۷) وابو داؤد فى السنن ۷۶۰/۳ الحديث رقم ۳۴۹۳ والنسائى فى ۲۸۷/۷ الحديث رقم ۴۶۰۶ ومالك فى الموضئ ۶۴۱/۲ الحديث رقم ۴۲ من كتاب البیوع۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ بازار کے اس حصے میں جو بلندی کی جانب واقع تھا لوگ غلہ خریدتے اور پھر اسی جگہ قبضہ میں لینے سے قبل (غلہ کو) فروخت کر دیتے تھے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس بات سے منع فرمایا کہ جب تک غلہ (خریدنے کے بعد) وہاں سے منتقل نہ کیا جائے اس (غلہ) کو اسی جگہ فروخت نہ کیا جائے۔ اس روایت کو ابو داؤد نے نقل کیا اور مجھے یہ روایت بخاری و مسلم میں نہیں ملی ہے۔

تشریح: قولہ: ”فأ“ تعقیب یہ بیع قبل قبض کا فائدہ دے رہی ہے، اور آنے والی حدیث قبل از استیفاء پر دلالت کر رہی ہے۔

جب ممانعت یہ ہے کہ اشیاء منقولہ میں قبضہ اس کو اپنی جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے ساتھ ہوتا ہے، (اس کو امام طہی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔) ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء منقولہ کا قبضہ اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل کرنے سے ہوتا ہے۔

قوله: رواه ابو داود ولم اجده في الصحيحين: یہ دراصل صاحب مصابیح امام بغویؒ پر اعتراض ہے کہ انہوں نے یہ حدیث پہلی فصل میں ذکر کی ہے، حالانکہ یہ روایت نہ بخاری میں ہے اور نہ مسلم میں ہے۔

۲۸۴۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنِ ابْتِئَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعُهُ حَتَّى يَسْتَوْفِيَهُ۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۴۴۴ الحدیث رقم ۲۱۲۶ و مسلم فی ۳/۱۱۶۰ الحدیث رقم (۳۲-۱۵۲۶) ابو داؤد فی السنن ۳/۷۶۰ الحدیث رقم ۳۴۹۲ والنسائی فی ۷/۲۸۶ الحدیث رقم ۶۷۰۴ وابن ماجہ فی ۲/۷۴۹ الحدیث رقم ۲۲۲۶ والدارمی فی ۲/۳۲۹ الحدیث رقم ۲۵۰۹ ومالك فی الموطأ ۲/۶۳۰ الحدیث رقم ۴۰ من کتاب البیوع واحمد فی المسند ۲/۲۲۔
ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص غلہ خریدے تو اس کو اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک کہ اسے پوری طرح نہ لے لے۔

تشریح: فلا بیعہ: نفی بمعنی نہیں ہے۔ حتی یستوفیہ: یعنی مکمل طور پر قبضہ کر لے، وزن کر کے یا کیل کر کے۔

۲۸۴۵: وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ حَتَّى يَكْتَالَهُ. (متفق علیہ)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۳/۱۱۶۰ الحدیث رقم (۳۲-۱۵۲۵) ابو داؤد فی السنن ۳/۷۶۲ الحدیث رقم ۳۴۹۶ والترمذی فی ۳/۵۸۶ الحدیث رقم ۱۲۹۱ والنسائی فی ۷/۲۷۵ الحدیث رقم ۴۵۹۷، وابن ماجہ فی ۲/۷۴۹ الحدیث رقم ۲۲۲۷۔
ترجمہ: اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب تک کہ اس کو ناپ لے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں کہ جس نے غلہ خریدا ناپ کر، تو وہ اس کو فروخت نہ کرے یہاں تک کہ اس کو دوبارہ ناپ

لے، اور خریدنے کو ہم نے مفید کیا کیل کے ساتھ اس لئے کہ اگر وہ اٹکل کے ساتھ خرید لے گا تو اس میں ناپنا شرط نہیں ہے، اور اشتراء کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر ایک آدمی کسی مکیلی چیز کا مالک ہو جائے ہے یا میراث کے ذریعہ یا اس کے علاوہ کسی ذریعے سے، تو اس کے لئے بیع قبل از کیل جائز ہے، اور ”فلا بیعہ“ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اس نے ہبہ کیا تو جائز ہے یہی امام محمد رحمہ اللہ قول ہے۔ اور ناپنے سے پہلے بیچنے سے جو منع فرمایا ہے یہ اس لئے کہ جو چیزیں مکیلی ہوں تو ان کو کیل کر کے بیچنا اتمام قبضہ میں سے ہے۔ اس لئے کہ یہ ناپ ہی کے ذریعے متعین ہوتا ہے، پس جس طرح بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو بیچنا ممنوع ہے اسی طرح قبضہ تمام ہونے سے پہلے بھی بیع کو بیچنا ممنوع ہے۔

بعض علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اگر بیچنے والا خریدار کے سامنے غلہ کو ناپ کر دے۔

اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ آپ نے جو بات ذکر کی یہ تو اس حدیث کی مخالف ہے کہ آپ نے غلہ کو بیچنے سے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ اس میں دو صاع چلیں ایک صاع بائع کا اور دوسرا صاع مشتری کا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث محمول ہے اس پر کہ جب دو (۲) سوئے ”باب سلم“ میں جمع ہو جائیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب ”مسلم الیہ“ یعنی بائع کسی آدمی سے کوئی چیز خریدے ناپ کر اور ”رب السلم“ یعنی مشتری کو حکم دے اس کو قبضہ کرنے کا۔ تو یہ صحیح نہیں جب تک کہ اس میں دو صاع نہ چلیں چونکہ اس میں، دو معاملات جمع ہو گئے ہیں ناپ کی شرط کے ساتھ۔ ایک ”مسلم الیہ“ کا خریدنا اور دوسرا ”رب السلم“ کا قبضہ کرنا اور یہ بیع جرید کی طرح ہے۔

۲۸۴۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَمَا الَّذِي نَهَى عَنْهُ النَّبِيُّ ﷺ فَهُوَ الطَّعَامُ أَنْ يَبَاعَ حَتَّى يُقْبَضَ قَالَ ابْنُ

عَبَّاسٍ وَلَا أَحْسِبُ كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا مِفْلَهُ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۴۹/۴ الحدیث رقم ۲۱۳۵ و مسلم فی ۱۱۵۹/۳ الحدیث رقم (۳۰-۱۰۲۵)۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جس چیز کو بیع کیا ہے وہ غلہ ہے کہ اس کو قبضے میں لانے سے قبل فروخت کرنا ممنوع ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ میرا گمان ہر چیز کے بارے میں یہی ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: یقبض: مجہول کے صیغہ کے ساتھ، ولا أحسب: سین کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ ہے "لا اظن" کے معنی

میں ہے۔ کل شئی الا مثله: یعنی غلہ کی طرح ہے کہ خریدار کیلئے اس کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے قبضہ کرنے سے پہلے۔

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں ابن عباسؓ کا قول ہے۔

۲۸۲۷: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا تَلْقُوا الرُّكْبَانَ لِبَيْعٍ وَلَا يَبِيعُ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ وَلَا تَنَاجَشُوا وَلَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَائِدٍ وَلَا تُصَرُّوا لِإِبِلٍ وَالْغَنَمِ فَمَنْ ابْتَاعَهَا بَعْدَ ذَلِكَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَحْلِبَهَا إِنْ رَضِيَهَا أَمْسَكَهَا وَإِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) مَنِ اشْتَرَى شَاةً مُصْرَاةً فَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فَإِنْ رَدَّهَا رَدَّمَعَهَا صَاعًا مِنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَاءَ.

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۶۱/۴ الحدیث رقم ۲۱۵۰ و مسلم فی ۱۱۵۵/۳ الحدیث رقم (۱۱-۱۰۱۵) و ابو داؤد

فی ۷۲۲/۳ الحدیث رقم ۳۴۴۳ والنسائی فی ۲۵۳/۷ الحدیث رقم ۴۴۸۷ و ابن ماجہ فی ۷۵۳/۲ الحدیث رقم

۲۲۳۹ و مالک فی الموطأ ۶۸۳/۲ الحدیث رقم ۹۶ من کتاب النبوع۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم (شہر سے باہر جا کر) قافلے والوں سے خرید و فروخت کے لئے ملاقات نہ کرو اور تم میں سے کوئی شخص کسی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نجش (یعنی قیمت بڑھانے کی غرض سے بولی دینا) نہ کرے اور شہر کا آدمی کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے اور اونٹ و بکری کے تھنوں میں دودھ جمع نہ کرو اور اگر کوئی شخص ایسا جانور خریدے جس کے تھنوں میں دودھ جمع کیا گیا ہو تو دودھ دوہنے کے بعد اسے اس جانور کو رکھ لینے یا واپس کر دینے کا اختیار ہوگا کہ اگر اس کی مرضی ہو تو اس جانور کو رکھ لے اور اگر مرضی ہو تو اس کو پھیر دے اور اس کے ساتھ ہی صاع (ساڑھے تین سیر) کھجوریں دے دے۔ (بخاری و مسلم) مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ جو شخص ایسی بکری خریدے جس کے تھنوں میں دودھ جمع کیا گیا ہو تو اس شخص کو بکری کو رکھ لینے یا واپس کر دینے کا تین دن تک اختیار رہتا ہے چنانچہ اگر وہ (ان تین دنوں میں) اس بکری کو واپس کرے تو اس کے ساتھ ایک صاع کھجوریں دے دے گندم نہ دے۔

تشریح: قال لا تلقوا: تاء اور لام کے فتح کے ساتھ، اور واؤ کے سکون کے ساتھ حالت وقف میں اور واؤ کے ضمہ کے ساتھ

حالت وصل میں اور اس کی اصل "لا تلتقوا"۔

الركبان: راء کے ضمہ کے ساتھ "راکب" کی جمع ہے، بمعنی قافلہ۔

قوله: البيع مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں کسی قافلے کے آنے کی خبر ملے تو تم ان سے اس غرض سے نہ ملو کہ تم ان سے سامان

تجارت ستے داموں خرید لو، ان کے بازار میں آنے اور وہاں کے بھاؤ معلوم کرنے سے پہلے۔ اس سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے دھوکہ اور نقصان سے بچا جاسکے۔

قوله: ولا يبيع بعضكم على بيع بعض: مثلاً کوئی شخص کسی سے کوئی چیز بشرط اختیار خریدے اور تیسرا آدمی جا کر مشتری سے کہہ

دے کہ آپ اس معاملے کو بیع کر دیں میں آپ کو ایسی چیز اس سے ستے داموں دیدوں گا، یا اس سے اچھی چیز اتنی ہی قیمت پر دے دوں گا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ممانعت خاص ہے اس صورت کے ساتھ جب اس میں غبن نہ ہو، اور اگر اس میں کوئی غبن ہو تو پھر اس

کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے یہ معاملہ فسخ کرنے کی دعوت دے اور اس سے ستے داموں اس کو بیچتا ہے کہ اس کو نقصان سے بچالے۔

قولہ: ولا تناجشوا: ایک تاء کے حذف کے ساتھ ”بخش“ کے معنی ہیں سامان کی قیمت کو بڑھانا، اس کو خریدنے میں رغبت نہ ہو تاکہ خریدار کو فریب اور ترغیب دے اور مالک سامان کو نفع ہو۔

قولہ: ولا یبع حاضر جیسا کہ کوئی دیہاتی شہر میں سامان لیکر آئے تاکہ اس دن کے رائج قیمت پر اس کو بیچ کر واپس لوٹ جائے اور شہری اس کی طرف سے وکیل بن جائے کہ اس کو منگے داموں بتدریج بیچے گا یہ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں حرام ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں مکروہ ہے۔ اس سے آپ نے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں بیوپاریوں پر زنی کا دروازہ بند کرنا ہے۔ (اور مخلوق خدا کو نفع سے باز رکھنا ہے)۔

قولہ: ولا تصروا الابل والغنم: تاء کے ضمہ اور را کی تشدید کے ساتھ ہے۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ تاء کے ضمہ اور راء کے فتح کے ساتھ ”نزکوا“ کے وزن پر ہے اور بعض نے اس کو پہلے کے ضمہ اور ثانی کے فتح کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ اور اول زیادہ صحیح ہے۔ (اتھلی) یہ ”صریت الشاة“ سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بکری کو کئی دن تک دوہا نہ جائے تاکہ اس کے تھنوں میں دودھ جمع ہو جائے (اسی طرح ذکر کیا ہے بعض حضرات نے)، اور یہ قول ثانی کی تائید کر رہا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ ”تصریۃ“ سے ماخوذ ہے، اور ”تصریۃ“ کہتے ہیں کہ بیچنے سے پہلے اس کے تھنوں کو بانداھا جائے تاکہ خریدار یہ گمان کرے کہ یہ زیادہ دودھ دینے والی ہے، تو وہ قیمت زیادہ کر دیتا ہے، اور اس کی ممانعت دھوکہ کی وجہ سے ہے۔

سخطها: خاء کے کسرہ کے ساتھ۔ قولہ: ردھا وصاعاً: (یہ واؤ بمعنی ”مع“ ہے)۔ ای مع صاع۔

من تمر: کھجور اس دودھ کے عوض میں دے جو اس نے دوہا ہے، اس لئے کہ خریدار نے جو دودھ دوہا ہے اس میں کچھ حصہ تو وہ ہے جو خریدار کی ملکیت میں آنے کے بعد پیدا ہوا ہے اور کچھ وہ ہے جو خریداری کے وقت جانور کے تھنوں میں تھا اور بیچ کا حصہ تھا اس صورت میں دودھ کے ان دونوں حصوں کا تعین وایتناز ناممکن ہونے کی وجہ سے نہ تو دودھ واپس کیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی اس کی قیمت متعین کر کے دی جاسکتی ہے، لہذا شارح نے اس کا حل یہ نکالا کہ طرفین میں فتنہ وفساد کے دفعیہ کیلئے ایسے دودھ کا عوض ایک صاع کھجوریں متعین کر دیں اور اس سلسلے میں دودھ کی کمی بیشی کو بنیاد نہیں بنایا، چنانچہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ شارح نے خون ناحق کی دیت ایک سواونٹ مقرر کی ہے، حالانکہ مراتب و حیثیت کے اعتبار سے ہر جان اور ہر خون یکساں نہیں ہوتا، لیکن اس بارے میں شریعت نے اس تفاوت کو بنیاد نہیں بنایا۔ اس حدیث پر امام شافعی نے عمل کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس طرح کے جانور کی بیع میں خیار حاصل ہوتا ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ اس میں خیار نہیں ہوتا، ان کے نزدیک حدیث میں مذکورہ حکم متروک ہے۔ اس لئے کہ یہ اس اصول کے مخالف ہے جو اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے ﴿فمن اعتدى علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدى علیکم﴾ (سو جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے زیادتی کی)۔

یہ اصل عین کے فوت ہونے کی صورت میں اس کی مثل یا قیمت کو لازم کرتا ہے، یا یہ حکم ربا کے حرام ہونے سے پہلے تھا جبکہ معاملات میں اس قسم کی چیزیں جائز تھیں، اب یہ منسوخ ہو گیا ہے۔ (جیسا کہ میر میں ہے اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے شرح المشرق میں)۔

قولہ: من اشتراى شاة مصراة فهو بالخيار ثلاثة ايام فان ردھا رد معها صاعاً من طعام: طعام سے مراد ترہے۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جانور واپس کرنے ہوئے اس کے دودھ کے عوض میں کھجوروں کے علاوہ اور کچھ دینا جائز نہیں ہے، اگرچہ بیچنے والا کوئی بھی چیز لینے پر راضی ہو چونکہ ان کی غذا زیادہ تر کھجور اور دودھ ہی تھا اس لئے دودھ کی بجائے کھجور دینا مقرر کیا گیا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اگر بیچنے والا راضی ہو تو کھجور کے علاوہ اور کوئی چیز بھی دی جاسکتی ہے، تو گویا کہ اس نے اپنے حق کو اس سے تبدیل کیا۔

فَهُوَ بِالْخِيَارِ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۵۷/۳ الحدیث رقم (۱۷-۱۵۱۹) وابو داؤد فی ۷۱۸/۳ الحدیث رقم ۳۴۳۷ والترمذی فی ۵۲۴/۳ الحدیث رقم ۱۲۲۱، والنسائی فی ۲۵۷/۷ الحدیث رقم ۴۵۰۱ وابن ماجہ فی ۷۳۵/۲ الحدیث رقم ۲۱۷۸ والدارمی فی ۳۳۱/۲ الحدیث رقم ۲۵۶۶۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (شہر سے باہر جا کر غلہ لینے کے لئے) قافلے والوں سے نہ ملو اگر کوئی شخص جا کر ملا اور کچھ سامان خرید لیا اور پھر سامان کا مالک بازار میں آیا تو اس کو اختیار ہوگا (کہ چاہے بیع کو قائم رکھے چاہے فسخ کر دے)۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: لا تلقوا الجلب: جیم اور لام کے فتح کے ساتھ بمعنی ”محبوب“ ہے یعنی وہ اونٹ گائے بکری غلام جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں تجارت کیلئے لائے جاتے ہیں۔
قولہ: فمن تلقاه فاشترى منه فاذا اتى سیده)۔ السوق فهو بالخيار: یہ دلیل ہے بیع کی صحیح ہونے کی اس لئے کہ بیع فاسد میں خیار نہیں ہوتا۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کے بھاؤ شہر کے بھاؤ سے گراں یا اس کے برابر ہوں تو اس میں دو صورتیں ہیں، ایک صورت میں تو خیار ثابت ہوگا اس لئے کہ حدیث مطلق ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کو اختیار نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں عین نہیں ہوا ہے۔

۲۸۴۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَلْقُوا السَّلْعَ حَتَّى يُهْبَطَ بِهَا إِلَى السُّوقِ . (متفق علیہ)
اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۲۷۳ الحدیث رقم ۲۱۶۵ ومسلم فی ۳/۱۱۵۶ الحدیث رقم (۱۴-۱۵۱۷) وابو داؤد السنن ۳/۷۱۶ الحدیث رقم ۳۴۳۶، والترمذی فی ۳/۵۲۴ الحدیث رقم ۱۲۲۰ والدارمی فی ۲/۳۳۲ الحدیث رقم ۲۵۶۷، واحمد فی المسند ۲/۹۱۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم سامان تجارت کو شہر سے باہر جا کر نہ ملو یہاں تک کہ ان کا سامان بازار میں آ کر نہ اتر جائے (یعنی شہر پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں سامان لانے والے قافلے سے نہ ملو جب تک کہ سامان تجارت بازار میں نہ آجائے)۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: لا تلقوا السلع: سین کے کسرہ اور لام کے فتح کے ساتھ یہ جمع ہے ”سلعة“ کی سین کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ، سامان اور ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی تجارت کی جاتی ہو۔
یہبط: صیغہ مجہول کے ساتھ بمعنی نینزل۔

بها الى السوق: ”با“ تعدیہ کیلئے ہے، اور معنی اس کا ہے، یہاں تک کہ اس کو جانوروں کی پیٹھ سے اتارا جائے بازار میں۔
۲۸۵۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَبِيعُ الرَّجُلُ عَلَى بَيْعِ آخِيهِ وَلَا يَخْطُبُ عَلَى آخِيهِ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَ دَنْ لَهُ (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۹/۱۹۸ الحدیث رقم ۵۱۴۲ ومسلم فی ۳/۱۱۵۴ الحدیث رقم (۸-۱۴۱۲) ابو داؤد فی ۲/۵۶۵ الحدیث رقم ۲۰۸۱ والنسائی فی ۶/۷۳ الحدیث رقم ۳۲۴۳، وابن ماجہ فی ۱/۶۰ الحدیث رقم ۱۸۶۸ والدارمی فی ۲/۱۸۱ الحدیث رقم ۲۱۷۶ ومالك فی الموطأ ۲/۵۲۳ الحدیث رقم ۲ من کتاب النکاح واحمد فی المسند ۲/۴۲۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور

نکوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کے نکاح کے پیغام پر اپنے نکاح کا پیغام بھیجے مگر یہ کہ اس کو اس کی اجازت دے دی جائے۔

(مسلم)

تشریح: لا بیع الرجل: صیغہ نہی کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ”لا بیع“ ہے صیغہ نفی کے ساتھ، ”رجل“ سے مراد شخص ہے جو عورت کو بھی شامل ہے۔

علی بیع اخیہ: اس طور پر کہ بائع اور مشتری کے درمیان قیمت طے پا چکی ہو کوئی آدمی آ کر قیمت کو بڑھا دے، (کہ میں اس سے زیادہ قیمت پر لینے کو تیار ہوں) بیع کا اطلاق اس پر مجاز ہوا ہے

ولا یخطب: جزم کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”بیع“ اور ”یخطب“ میں رفع والی روایت ہے خبر بمعنی انشاء کے ہے اس لئے کہ یہ زیادہ بیع ہے اور یہ ممانعت تب ہے کہ جب مہر پر موافقت اور رضامندی ہو چکی ہو۔
- خطبة: خاء کے کسرہ کے ساتھ، الا ان یاذن له: یعنی اسکا بھائی، یہ استثناء ماقبل کے دونوں حکموں سے ہے یا صرف آخری سے ہے۔

۲۸۵۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَسْمُ الرَّجُلُ عَلَى سَوْمِ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۵۴/۳ الحدیث رقم (۹-۱۰۱۰) وابن ماجہ فی ۷۳۴/۲ الحدیث رقم ۲۱۷۲ واحمد فی المسند ۵۲۹/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے (یعنی کسی سے خرید و فروخت کا معاملہ ہو رہا ہو تو اس میں دخل اندازی نہ کرے اور چیز کی زیادہ قیمت نہ لگائے)۔“ (مسلم)

تشریح: لا یسم: باء کے فتح، سین کے ضمہ اور میم کے جزم کے ساتھ اور حالت وصل میں میم کے کسرہ کے ساتھ التقاء سائنین کی وجہ سے۔

مساموۃ کہتے ہیں کہ جب بائع اور مشتری کسی قیمت پر راضی ہو چکے ہوں تو ان کے درمیان میں داخل ہو کر بات کرنا قیمت بڑھانے کی۔ یہ مکروہ ہے، اگر چہ صحیح ہو جائے گی۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں مسلمان کے حکم میں ذمی، معاہد اور متامن بھی داخل ہے اور مسلمان بھائی کا ذکر رقت کیلئے ہے نہ کہ مقید کرنے کیلئے جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے، اور ابن عبدالبر نے اس پر اجماع کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے

۲۸۵۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ دَعَا النَّاسَ يَرْزُقُ اللَّهُ بَعْضَهُمْ مِنْ

بَعْضٍ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۵۷/۳ الحدیث رقم (۲۰-۱۰۲۲) وابو داؤد فی السنن ۷۲۱/۳ الحدیث رقم ۳۴۴۲ والترمذی فی ۵۲۶/۳ الحدیث رقم ۱۲۲۳ والنسائی فی ۷/۲۵۶ الحدیث رقم ۴۹۵ وابن ماجہ فی ۷۳۴/۲ الحدیث رقم ۲۱۷۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہری آدمی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔ لوگوں کو (ان کے حال پر) چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کے ذریعہ بعض کو رزق پہنچاتا ہے۔“ (مسلم)

تشریح: لا بیع: صیغہ نفی کے ساتھ۔

دعوا الناس: لوگوں کو چھوڑ دتا کہ وہ اپنے سامان کو سستے داموں بیچیں۔

یزوق اللہ: قاف کے کسرہ کے ساتھ جواب امر کی وجہ سے مجرور ہوگا۔ اور قاف کے ضمہ کے ساتھ مرفوع بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

بیع ملامسہ اور منابذہ کی ممانعت

۲۸۵۳: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ لِبْسَتَيْنِ وَعَنْ بَيْعَتَيْنِ نَهَى عَنْ الْمَلَامَسَةِ وَالْمُنَابَذَةِ فِي الْبَيْعِ وَالْمَلَامَسَةُ لَمَسُ الرَّجُلِ ثَوْبَ الْآخَرِ بِيَدِهِ بِاللَّيْلِ أَوْ بِالنَّهَارِ وَلَا يَقْلِبُهُ إِلَّا بِذَلِكَ وَالْمُنَابَذَةُ أَنْ يُبَدَّ الرَّجُلُ إِلَى الرَّجُلِ بَثْوَبِهِ وَيُنْبَذَ الْآخَرُ ثَوْبَهُ وَيَكُونُ ذَلِكَ بَعْضُهُمَا عَنْ غَيْرِ نَظَرٍ وَلَا تَرَاضٍ وَاللِّبْسَتَيْنِ اشْتِمَالُ الصَّمَاءِ وَالصَّمَاءُ أَنْ يَجْعَلَ ثَوْبَهُ عَلَى أَحَدٍ عَاتِقَيْهِ فَيَبْدُو أَحَدُ شِقَيْهِ لَيْسَ عَلَيْهِ ثَوْبٌ وَاللِّبْسَةُ الْآخْرَى اِحْتِيَاءُ هُ بَثْوَبِهِ وَهُوَ جَالِسٌ لَيْسَ عَلَى فَرْجِهِ مِنْهُ شَيْءٌ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی ۲۷۸/۱۰ الحدیث رقم ۵۸۲۰ و مسلم فی ۱۱۵۲/۳ الحدیث رقم (۳-۱۵۱۲) و ابو داؤد فی السنن ۶۷۳/۳ الحدیث رقم ۳۳۷۷ و النسائی فی ۲۶۱/۷ الحدیث رقم ۴۵۱۵ و ابن ماجہ فی ۷۳۳/۲ الحدیث رقم ۲۱۷۰ و الدارمی فی ۳۳۰/۲ الحدیث رقم ۲۵۶۲ و احمد فی المسند ۹۵/۳۔

ترجمہ: اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دو طرح کے لباس سے اور دو طرح کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے بیع ملامسہ اور بیع منابذہ سے منع فرمایا ہے۔ ملامسہ یہ ہے کہ ایک شخص (یعنی خریدار) دوسرے شخص (یعنی تاجر) کے کپڑے کو (جسے وہ لینا چاہتا ہے) دن میں یا رات میں صرف ہاتھ سے چھو لے اسے الٹ پلٹ کرنے دیکھے اور اس کا یہ چھونا بیع کے لئے ہو اور منابذت یہ ہے کہ معاملہ کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے کپڑے کو دوسرے کی طرف پھینک دے اور اس طرح بغیر دیکھے بھالے اور بغیر اظہار رضامندی کے بیع ہو جائے اور جن دو طرح کے پہناوے سے منع فرمایا ہے ان میں سے ایک کپڑے اشتمال الصماء وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ایک کندھے پر اس طرح کپڑا رکھے کہ اس کی دوسری سمت کہ جس پر کپڑا نہ ہو ظاہر و برہنہ رہے اور دوسرا پہناوا (جس سے منع کیا گیا ہے) یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے گرد اس طرح کپڑا پیٹ لے کہ جب وہ بیٹھے تو اس کی شرم گاہ پر بالکل کپڑا نہ ہو۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: لبستین: لام کے کسرہ کے ساتھ۔

وعن بيعتين: باء کے فتح کے ساتھ، اور اعادہ جار اس افادہ کیلئے ہے کہ نہی دونوں امور میں سے ہر ایک کی طرف متوجہ ہے۔
نهى عن الملامسة والمنابذة في البيع: وضاحت اور بیان ہے، دونوں بیوع کیلئے، اور اسلوب بیان اس آیت کی طرح

ہے: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ﴾ [آل عمران-۱۰۶]

بالليل او بالنهار: اعادہ جار کے ساتھ۔ ولا يقلبه: تخفیف کے ساتھ،

الا بذلك: یعنی اس کا یہ چھونا بیع کیلئے ہو، نہ تو آپس میں تو لی ایجاب و قبول ہوتا تھا اور نہ فعلی ایجاب و قبول ہوتا تھا (جسے اصطلاح فقہ میں تعاطی کہتے ہیں)۔ امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کپڑے کو علاوہ چھونے کے نہ لائے نہ کھولے، یعنی چاہئے تو یہ کہ کپڑے کو کھولا جائے، اور اچھی طرح دیکھا بھالا جائے، مگر ملامسہ کرنے والے صرف چھونے پر اکتفاء کرتے تھے۔

باء موحده کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور سید کے نسخ میں اس کو ضمہ کے ساتھ ضبط کیا ہے سرخ قلم کے ساتھ، لیکن یہ سہو قلم ہے، اس لئے کہ یہ کتب لغت کے مخالف ہے۔

بثوبه: باء زائدہ ہے تعدیہ کی تاکید کیلئے ہے۔ وینبذ الاخر: خاء کے فتح کے ساتھ۔ ثوبه: باء جان کے بغیر ہے۔

ويكون ذلك: یعنی ان میں سے ہر ایک کا اپنا کپڑا دوسرے کی طرف پھینکنا۔ بيعهما: نصب کے ساتھ ہے اس بناء پر کہ یہ خبر

ہے کان کی، اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے اس صورت میں خبر کان ذلك ہوگا۔

عن غیر نظر: اور ایک نسخہ میں ”من نظر“ ہے، یعنی دوسرے کے کپڑے کو بغیر دیکھے، اور بعض کہتے ہیں کہ بغیر غور و فکر کے۔
ولا تراض: یعنی ایجاب و قبول، اور تعاطی کے بغیر، اور لا کی زیادتی تاکید کیلئے ہے۔

واللبستین: یاہ کے ساتھ ہے اعراب حکائی ہے، اور اللبستان بھی روایت کیا گیا ہے، قاعدہ کے مطابق۔

الصماء: صاد کے فتر کے ساتھ اور میم ممدودہ کی تشدید کے ساتھ۔ احد شقیہ: شین کے کسرہ کے ساتھ بمعنی جانبیہ۔ لیس علیہ
ثوب: حال ہے، یا جملہ متانفہ ہے بیان کیلئے لایا گیا ہے۔ واللبسة الاخری: مرفوع ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے اور اس کی خبر آنے
والاکلمہ ہے۔ احتیاذہ بثوبہ وهو جالس: حال ہے اور اسی طرح اگلا جملہ بھی حال ہے۔ لیس علی فرجہ: فرج سے مراد عورت
ہے جو ران کو بھی شامل ہے۔ منہ: ضمیر کا مرجع ثوب ہے۔

بیع حصاة اور بیع غرر کی ممانعت

۲۸۵۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرْرِ۔ (رواہ مسلم)

اخر جہ مسلم فی صحیحہ ۱۱۵۳/۳ الحدیث رقم (۴-۱۰۱۳) وابو داؤد فی ۶۷۲/۳ الحدیث رقم ۳۳۷۶ والترمدی فی
۵۳۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۰ والنسائی فی ۲۶۲/۷ الحدیث رقم ۴۵۱۸ وابن ماجہ فی ۸۳۹/۲ الحدیث رقم
۲۱۹۴ والدارمی فی ۳۳۰/۲ الحدیث رقم ۲۵۶۳ واحمد فی المسند ۲۵۰/۲

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع حصات اور بیع غرر سے ممانعت فرمائی ہے۔“ (مسلم)

تشریح: بیع الحصاة: اس کی صورت یہ ہے کہ خریدار بیچنے والے سے کہے جب میں تیری اس چیز پر کنکری ماروں تو سمجھ
لینا کہ بیع واجب ہوگی ہے، یا بائع خریدار سے کہے میں نے اپنے سامان میں سے وہ چیز تمہیں بیچی جس پر تمہاری پھینکی ہوئی کنکری آ
گرے۔ یا میں نے یہ زمین وہاں تک تمہارے ہاتھ فروخت کی جہاں تک تمہاری پھینکی ہوئی کنکری جاگرے۔ بیع کا یہ طریقہ ایام
جاہلیت میں رائج تھا۔

وعن بیع الغرر: غین اور راء اول کے فتر کے ساتھ ہے، یعنی جس کا انجام معلوم نہ ہو خطرے کی وجہ سے، جس سے معلوم نہ ہو کہ یہ
ہونے والا ہے یا نہیں ہونے والا ہے، جیسے مفرور غلام کو بیچنا، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے کو، اور پانی کے اندر مچھلی کو، اور غائب مجہول چیز کا
بیچنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز پر عقد ہو رہا ہے وہ یا تو مجہول ہو یا بیچنے والے کے قبضہ قدرت سے باہر ہو، یعنی بعینہ وہ چیز اس سے لپیٹ لی
گئی ہو۔

”غرر الغوب“ سے ماخوذ ہے بمعنی پیٹنا، یا ”غرة“ غین کے کسرہ کے ساتھ، سے ماخوذ ہے بمعنی غفلت کے آتا ہے، یا غرور سے
مشتق ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بیع فاسد ہے، بیع کے مجہول ہونے کی وجہ سے یا اس کے تسلیم سے عجز کی وجہ سے۔ (اتحلی)
شوائف کے ہاں باطل اور فاسد ایک چیز ہے، اور حنفیہ کے مذہب کی تفصیل یہ ہے کہ اگر عوضین بیع کے قابل ہی نہ ہوں تو بیع باطل
ہے، اور اگر عوضین بیع کے قابل ہوں لیکن عدم صحت کے مقتضی کو شامل ہوں جیسے ربا، تو بیع فاسد ہے۔ اور بیع فاسد قبضے کے بعد ملک خمیث
کا فائدہ دیتی ہے۔ صرف اور اگر بیع قابل نہ ہو یا شمس قابل نہ ہو فقط تو (ز) یہ ہے کہ اول کو اول کے ساتھ اور ثانی کو ثانی کے ساتھ ملحق کیا
جائے گا۔

بیع حبیل الحبلہ کی ممانعت

۲۸۵۵: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ حَبْلِ الْحَبْلَةِ وَكَانَ بَيْعًا يَتَّبَعُهُ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ كَانَ

الرَّجُلُ يَتَّاعُ الْجَزُورَ إِلَى أَنْ تَنْتَجِ النَّاقَةُ ثُمَّ تَنْتَجِ الْبَيْتَ فِي بَطْنِهَا۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۵۶/۴ الحدیث رقم ۲۱۴۳ ومسلم فی ۱۱۵۳/۳ الحدیث رقم (۵-۱۵۱۴) وابو داؤد فی السنن ۶۷۵/۳ الحدیث رقم ۳۳۸۰ والترمذی فی ۵۳۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۲۹ والنسائی فی ۲۹۳/۷ الحدیث رقم ۴۶۲۵، وابن ماجہ فی ۷۴۰/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۷ ومالك فی الموطأ ۶۵۳/۲ الحدیث رقم ۶۲ من کتاب البیوع واحمد فی المسند ۱۵/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع جبل الحبلہ (یعنی جانور کا حمل) بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ (حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں) کہ اہل جاہلیت اس طرح کی بیع کیا کرتے تھے جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی شخص اس وقت تک کے وعدے پر اونٹنی خریدتا تھا کہ یہ اونٹنی بچہ جنے گی اور پھر وہ بچہ جنے گا (یعنی وہ اس وعدے پر اونٹنی خریدتا تھا کہ جب اس اونٹنی کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوگا تب اس کی قیمت ادا کرے گا)۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: جبل الحبلہ: دونوں الفاظ حاء اور با کے فتح کے ساتھ ہیں، مصدر ہے اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے ایک مجہول چیز کا، تاہم بالغہ کیلئے ہے اور اس کی تائیف تانے کیلئے ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ بیچ اونٹنی کے پیٹ میں موجود حمل کو، بشرطیکہ اونٹنی کا حمل مؤنث ہو۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ قیمت کو مؤجل کرنا یہاں تک کہ اس اونٹنی کے پیٹ میں جو حمل ہے وہ حاملہ ہو جائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے اس وجہ سے کہ راوی حدیث عبد اللہ ابن عمر نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جب اس اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ بچے جنے تو وہ اس کو بیچ رہا ہے، تو یہ بیع معدوم ہے اور پہلی صورت میں مدت مجہول ہے۔

وکان : ضمیر کا مرجع بیع ہے اور اس کا عطف ہے ”نبی“ پر۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقدیری عبارت یوں ہے: نبی عن بیع کان۔ تنتج : صیغہ مجہول کے ساتھ۔ اور ایک نسخہ میں پہلی تاء کے فتح اور دوسری کے کسرہ کے ساتھ ہے، یعنی تلد۔ الناقہ ثم تنتج : رفع کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے دونوں طرح ضبط ہے۔ یہ بیع اور اسکے دوسرے نظائر بیع غریس داخل ہیں، لیکن اس کو الگ ذکر کیا، اس لئے کہ یہ ایام جاہلیت کی بیوعات میں سے ہے۔ توضیح وخریج: پہلے جملے کو احمد اور اصحاب کتب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

نرکو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت کی ممانعت

۲۸۵۶: وَعَنْهُ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ . (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۶۱/۴ الحدیث رقم ۲۲۸۴ وابو داؤد فی السنن ۷۱۱/۳ الحدیث رقم ۳۴۲۹ والترمذی فی ۵۷۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۳ واحمد فی المسند ۱۴/۲۔

ترجمہ: ”اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نر سے جفتی کروانے پر اجرت وصول کرنے سے منع فرمایا ہے۔“ (بخاری)

تشریح: نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن عسب الفحل : عین کے فتح اور سین کے سکون کے ساتھ، اس کے جست کرنے اور اس کے پانی کی اجرت کو لیتے ہیں۔ اور اس سے منع فرمایا ہے بوجہ غرر اور دھوکہ کے، اس لئے کہ نر جانور کبھی جست کر جاتا ہے اور کبھی جست نہیں کرتا اور اسی طرح مادہ بھی بار آور ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ اس لئے اکثر صحابہ اور فقہاء نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ بان نر جانور کو مادہ پر جست کرنے کیلئے عاریہ دینا مستحب ہے، البتہ اگر مستحیر اپنی طرف سے اسے کچھ بطور انعام دے تو اس کو قبول یہ نادرست ہے۔

پانی بیچنے کی ممانعت

۲۸۵۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ ضِرَابِ الْجَمَلِ وَعَنْ بَيْعِ الْمَاءِ وَالْأَرْضِ لِتَحْرَتِ .

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۹۷/۳ الحدیث رقم (۱۰۶۵-۳۵) والنسائی فی السنن ۳۱۰/۷ الحدیث رقم ۴۶۷۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹنی کو جفتی کے لئے کرایہ پر دینے اور (کھیتی باڑی کے لئے) پانی تو زمین کو کاشت کے لئے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔“ (مسلم)

تشریح: ضراب الجممل: ضاد کے کسرہ کے ساتھ کہ اونٹ کے جفتی کرنے پر کچھ لینا۔

لتحرت: صیغہ مجہول کے ساتھ لتزوع کے معنی میں ہے،

مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین اور وہ پانی جو اس زمین سے متعلق ہو کسی شخص کو اس شرط کے ساتھ دے کہ یہ زمین اور پانی تو میرا ہے، تخم اور محنت تمہاری ہے، زمین کو جو تو، اس میں سے جو کچھ پیدا ہوگا اس کا اتنا حصہ میں لے لوں گا اس کو ”مخارت“ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ضرورت سے زائد پانی کو بیچنے کی ممانعت

۲۸۵۸: وَعَنْهُ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ فَضْلِ الْمَاءِ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۹۷/۳ الحدیث رقم (۱۰۶۵-۳۴) ابن ماجہ فی ۸۲۸/۲ الحدیث رقم ۲۴۷۷۔

ترجمہ: ”اور جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ضرورت سے زائد پانی کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔“ (مسلم)

تشریح: پانی خود پینا چاہتا ہو، یا جانوروں کو پلانا چاہتا ہو، (تو اس کیلئے اس پانی کا بیچنا جائز نہیں)۔ اور اگر کوئی شخص اپنے

کھیتوں یا درختوں کو سیراب کرنے کیلئے وہ پانی چاہے تو پھر مالک کیلئے جائز ہے کہ وہ اس پانی کو بغیر معاوضہ کے نہ دے۔

۲۸۵۹: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَبِيعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِيَبَاعَ بِهِ الْكَلَاءُ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۱/۵ الحدیث رقم ۲۳۵۳۔ و مسلم فی ۱۱۹۸/۳ الحدیث رقم (۱۰۶۶-۳۸) و ابو داؤد

فی ۷۴۷/۳ الحدیث رقم ۳۴۷۳ و الترمذی فی ۵۷۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۲ و ابن ماجہ فی ۸۲۸/۲ الحدیث رقم

۲۴۷۸ و مالک فی لموطا ۷۴۴/۲ الحدیث رقم ۲۹ من کتاب الأفضیة۔ و احمد فی المسند ۲۷۳/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنی ضرورت سے زائد پانی کو فروخت نہ کیا جائے کہ

اس کی وجہ سے گھاس فروخت کی جائے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: لا یباع فضل الماء لیباع به الكلاء: کاف اور لام کے فتح کے ساتھ اسم

مقصود ہے۔ قاموس میں ہے کہ ”کلا ازروئے وزن ”جبل“ کی طرح ہے خشک و تر گھاس کو کہتے ہیں۔

یعنی کنویں کا مالک اپنی حاجت سے زائد پانی کو نہ بیچے اس لئے کہ پانی کا خریدار اس پانی کی وجہ سے مویشی والوں پر سختی کرے گا جو

گھاس چرانے کے محتاج ہوتے ہیں اس زمین میں پس یہ مجبور کر دے گا ان کو علیحدہ سے پانی خریدنے پر یا پانی اور گھاس دونوں خریدنے پر

مجبور کر دے گا اور یہ پانی والے کا ظلم تجاوز کر جائے گا، یہاں تک وہ پانی اور گھاس دونوں کے خریدنے پر مجبور ہوں گے، تو یہ ظلم اور تعدی

میں مبالغہ ہوگا۔ یا پانی کے خریدنے کو بمنزلہ گھاس کے خریدنے کے قرار دیا ہے، اس لئے کہ مویشی کے مالکان پانی کے بدلے جو مال خرچ

کر رہے ہیں وہ اس لئے کہ ان کے مویشیوں کو پانی پینے پر قدرت حاصل ہوگی تو قادر ہوں گے۔

علامہ خطاب فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی آدمی، کسی بنجر زمین میں کنواں کھود لیتا ہے تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے، اس کے احیاء کے ساتھ، پس جب کوئی اس کے پاس اس بنجر زمین میں اترے اور اس کے نباتات کو چرائے اور وہاں پانی نہ ہو، سوائے اس کنویں کے، تو اس کیلئے جائز نہیں ہے کہ یہ منع کرے اس قوم کو اس پانی کے پینے سے اس لئے کہ اگر یہ ان کو منع کرے گا تو پھر ان کیلئے اس زمین چرانہ ممکن نہ ہوگا، اور یہ منع کرنا ضد اور عناد کی وجہ سے ہوگا، اور یہ جائز نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ زائد پانی کو نہ بیچے کہ اس کا ارادہ پانی کے بیچنے سے اور اس کو خرچ نہ کرنے سے اس گھاس کو بیچنا ہے جو اس پانی کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ پھر علماء کا اختلاف ہے کہ یہ ممانعت تحریمی ہے، یا تنزیہی ہے۔ لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ یہ ممانعت تنزیہی ہے۔
قولہ: متفق علیہ:

ایک نسخہ میں ہے ”رواہ مسلم“ لیکن پہلے والے کی تائید اس سے ہوتی ہے جو جامع الاصول میں ہے: رواہ البخاری ومسلم۔

فریب دہی سے بچو

۲۸۶۰: وَعَنْ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَرَّ عَلَى صُبْرَةٍ طَعَامٍ فَادْخَلَ يَدَهُ فِيهَا فَنَالَتْ أَصَابِعُهُ بَلَلًا فَقَالَ مَا هَذَا يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ قَالَ أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتَّى يَرَاهُ النَّاسُ مَنْ عَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۹/۱ الحديث رقم ۱۶۶۴-۱۰۲) والترمذی فی السنن ۶۰۷/۳ الحديث رقم ۱۳۱۵ وابن ماجه فی ۷۴۹/۲ الحديث رقم ۲۲۲۴۔

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ غلہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے اور اپنا ہاتھ اس ڈھیر میں داخل کیا تو آپ ﷺ کی انگلیوں کو کچھ تری محسوس ہوئی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے غلے کے مالک! یہ کیا ہے؟ (یعنی ڈھیر کے اندر یہ تری کہاں سے پہنچی اور تم نے غلہ کو تری کیوں کیا؟) اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس پر بارش ہو گئی تھی (جس کی وجہ سے غلہ کا کچھ حصہ تر ہو گیا ہے میں نے قصد از نہیں کیا ہے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو پھر تم نے غلہ کو اوپر کی جانب کیوں نہیں رکھا تا کہ لوگ اس کو دیکھ لیتے (اور کسی دھوکے میں مبتلا نہ ہوتے) یاد رکھو! جو شخص دھوکہ دے وہ مجھ سے نہیں ہے (یعنی میرے طریقہ پر نہیں ہے)۔ (مسلم)

تشریح: صبرۃ طعام: صاد کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ ہے۔ غلے کے اس ڈھیر کو کہتے ہیں جو بغیر ناپ اور وزن کے جمع کیا گیا ہو، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ طعام سے مراد کھانے دانوں کی جنس ہے بللا: با اور لام کے فتح کے ساتھ تری کے معنی میں ہے۔

قال اصابتہ السماء: سماء سے مراد بارش ہے، اس لئے کہ سماء بارش کی جگہ ہے، بایں طور کہ بارش اس سے نازل ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

اذا نزل السماء بارض قوم
رعینا وان كانوا غصبا

جب کسی قوم کی زمین پر بارش ہوتی ہے، ہم اس زمین کو چراتے ہیں اگرچہ وہ قوم غصہ ہو۔
یا رسول اللہ: یہ ایمان کا اعتراف اور تصدیق کا اقرار ہے۔

فوق الطعام حتى يراه الناس : اس میں خبر ہے کہ محتسب کو چاہئے کہ وہ بازار کے سامان کی جانچ پڑتال کیا کرے تاکہ ملاوٹ وغیرہ کا پتہ چل سکے غش خیانت۔ یہ ضد ہے نصیح کی۔

قوله : فليس مني : یعنی وہ میرے سنت اور میرے طریقہ پر نہیں ہے۔

امام طہی فرماتے ہیں کہ ”منی“ میں ”من“ اتصالیہ ہے جیسے اس آیت میں ہے: ﴿المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض﴾ [النوبة: ۶۷] (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں)۔

تخریج و ہدایات باب: ترمذی نے آخری جملہ کو اس طرح روایت کیا ہے: ”من غش فليس مني“۔

اس حدیث کو طبرانی نے ”الکبیر“ میں اور ابو نعیم نے ”حلیہ“ میں ابن مسعود سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

”من غشنا فليس منا والمكرو الخداع في النار“۔

الفصل الثاني :

بیع ثنیا کی ممانعت

۲۸۶۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنِ الثَّنِيَا إِلَّا أَنْ يُعْلَمَ (رواه الترمذی)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۱۷۵/۳ الحديث رقم (۸۵-۱۵۳۶) وابو داؤد في السنن ۶۹۳/۳ الحديث رقم ۳۴۰۴

والترمذی في ۵۸۵/۳ الحديث رقم ۱۲۹۰ والنسائی في ۲۹۶/۷ الحديث رقم ۴۶۳۳ واحمد في المسند ۳۶۴/۳۔

ترجمہ: ”حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع ثنیا (یعنی غیر معین چیزوں میں استثناء کرنے) سے منع فرمایا مگر یہ کہ وہ چیز معلوم ہو تو جائز ہے۔“ (ترمذی)

تشریح: قوله: عن جابر قال ان: اور ایک نسخ میں ”عن جابر ان“ ہے۔ (یعنی ”قال“ کا اصناف نہیں ہے۔)

نهى عن الثنیا: یعنی ایسے استثناء سے جو مضیٰ الی الجہالہ ہو۔ اس کا ذکر پہلے کر چکا ہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ثنیا کا معنی ہے مثلاً باغ وغیرہ کے پھل کو بیچا جائے اور ایک غیر معلوم جزء اس سے مستثنیٰ کر لیا جائے

اس کے بطلان کا سبب غرز ہے بیع کے مجہول ہونے کی وجہ سے، چنانچہ اگر کوئی شخص معلوم مقدار کو مستثنیٰ کرتا ہے جیسا کہ چوتھائی وغیرہ یا متعین درختوں کے پھل کو، تو یہ جائز ہے جبکہ انشاء کی وجہ سے۔

پھل اور کھیتی پکنے کے بعد ہی فروخت کی جائے

۲۸۶۲: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْعِنَبِ حَتَّى يَسْوَدَ وَعَنْ بَيْعِ الْحَبِّ حَتَّى يَشْتَدَّ

هَكَذَا (رواه الترمذی وابو داؤد عن أَنَسٍ وَالزِّيَادَةُ اللَّيْ فِي الْمَصَابِيحِ وَهِيَ قَوْلُهُ) نَهَى عَنِ بَيْعِ التَّمْرِ حَتَّى

تَزْهُوَ إِنَّمَا ثَبَتَتْ فِي رِوَايَتِهِمَا عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهَى عَنِ بَيْعِ النَّخْلِ حَتَّى تَزْهُوَ۔

(و قال الترمذی هذا حديث حسن غريب)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۶۶۸/۳ الحديث رقم ۳۳۷۱ والترمذی في ۵۳۰/۳ الحديث رقم ۱۲۲۸ وابن ماجه في

۷۴۷/۲ الحديث رقم ۲۲۱۷ واحمد في المسند ۲۲۱/۳۔

ترجمہ: اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انگور کو اس وقت تک فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سیاہ

نہ ہو جائے (یعنی پک نہ جائے) اسی طرح آپ ﷺ نے غلہ کو بھی اس وقت تک فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ

سخت نہ ہو جائے (یعنی قابل انتفاع نہ ہو جائے) اس روایت کو ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت انسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے اور صاحب مصابیح نے اس روایت میں یہ الفاظ ”آپ ﷺ نے کھجور کو اس وقت تک فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سرخ نہ ہو جائے“۔ جو مزید نقل کئے ہیں وہ ترمذی و ابوداؤد میں (حضرت انسؓ سے منقول نہیں ہیں بلکہ) حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہیں اور وہ بھی اس طرح ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ ”آپ ﷺ نے کھجور کو اس وقت تک فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سرخ نہ ہو جائے“۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: یسود: دال کی تشدید کے ساتھ

نہی عن بیع التمر: تائے فوقاتیہ کے ساتھ ہے، اور صحیح نسخہ میں ثاء مثلثہ کے ساتھ ”ثمر“ ہے۔

حتی تز هو: شاید تانیث باعتبار جنس کے ہو۔ ثبت کی خیر فاعل ”زیادہ“ کی طرف راجع ہے۔

فی روایتہما عن ابن عمر: اس عبارت میں امام بغوی اعتراض ہے۔ جب مضاف کو حذف کیا، تو مضاف الیہ کی نسبت فعل کی طرف کرتے ہوئے فعل کو مؤنث لایا گیا۔

وحتی: یہ غایت ہے نبی مخصوص کیلئے (اس کو ذکر کیا امام طبری نے) اس میں امام بغوی پر ایک اور اعتراض ہے، حدیث کے لفظ اور معنی کے نقل کرنے میں۔

تز هو: ابن حجر فرماتے ہیں تز هو بمعنی ”تحمیر“ کے ہے، اس روایت سے اور ”تبیض او تحمر“ والی روایت ”حتی تسود“ والی روایت اور ”حتی یسند“ کے الفاظ والی روایت میں ان الفاظ سے بدو صلاح مراد ہے جس پر بیع کا جواز موقوف ہے، شرط قطع کے بغیر۔

ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے کی ممانعت

۲۸۶۳: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْكَالِيِ بِالْكَالِيِ. (رواه الدارقطني)

اخرجه الدارقطني في ۷۱/۳ الحديث رقم ۲۶۶۹ من كتاب البيوع

ترجمہ: اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ (دارقطنی)

تشریح: کالیء: ہمزہ کے ساتھ بھی ہے بغیر ہمزہ کے بھی۔

لفظ بیع اصل نسخہ میں موجود ہے اور اکثر نسخوں سے ساقط ہے۔

شرح طبری میں ہے کہ عقیف الدین الصنفی کے نسخہ اور نور الدین الاصبی کے نسخہ میں بھی ساقط ہے۔ نہا یہ میں ہے کہ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی کسی سے کوئی چیز ایک متعین مدت کے وعدے پر خرید لے اور جب وہ مدت آجائے اور خریدار قیمت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو بیچنے والے سے یہ کہے کہ اس چیز کو ایک اور مدت کیلئے مجھے زیادہ قیمت پر فروخت کر دو اور وہ بیچنے والا اس کو بیچ دے اس طرح یہ معاملہ آپس کے قبضہ کے بغیر طے ہو جائے۔

بعض راوی ”الکالیء“ کو ہمزہ کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسکی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے اس دین کو بیچ دے جو مشتری پر لازم ہے اس کو بیچے اس دین کے بدلے جو مشتری کا کسی تیسرے آدمی پر لازم ہے، (اسکو ذکر کیا ہے امام طبری نے۔)

بیعانہ کا مسئلہ

۲۸۶۳: وَعَنْ عُمَرَو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْعُرْبَانِ.

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۶۸/۳ الحدیث رقم ۳۵۰۲ وابن ماجہ فی ۷۳۸/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۲ ومالک فی الموطا ۶۰۹/۲ الحدیث رقم ۱ من کتاب البيوع

ترجمہ: اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا ہے۔ (مالک ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ: یعنی ابن عمرو سے جیسا کہ سیوطی کی جامع صغیر میں ہے۔

قولہ: قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع العربان: عین کے ضمہ راء کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد باہے۔ یہ نام ہے اس چیز کا جو دی گئی ہو۔ یہ عرب کی بیع میں ہوتا تھا۔ بعض شارحین فرماتے ہیں کہ اس لفظ میں چھ ۶ لغات ہیں: عربان، اربان، عربون، اربون، پہلے لفظ کے ضمہ اور دوسرے کے سکون کے ساتھ سب میں، اور آخری دو میں پہلے لفظ کے فتح کے ساتھ بھی ہے، تو یہ کل چھ لغات ہو گئیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس معاملے سے منع فرمایا ہے جس میں ”بیعانہ“ ہو۔

نہا یہ میں ہے کہ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی سے کوئی چیز خریدے اور بیچنے والے کو کچھ رقم پیشگی دے اور یہ طے کر دے کہ اگر یہ معاملہ مکمل ہو گیا تو یہ رقم قیمت میں محسوب ہو جائے گی اور اگر معاملہ نہ ہو، تو یہ رقم اس چیز کے مالک کی ہوگی مشتری واپسی کا مطالبہ نہ کرے گا۔

فقہاء کے ہاں یہ بیع باطل ہے، اس لئے کہ اس میں شرط اور غرر ہے۔ ابن عمر اور امام احمد اس کے جواز کے قائل ہیں، اور ممانعت کی حدیث منقطع ہے۔

بیع مضطر کی ممانعت

۲۸۶۵: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْمُضْطَرِّ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَّارِ وَعَنْ بَيْعِ الْقَمَرَةِ قَبْلَ أَنْ تَذْرُكَ. (رواہ ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۶۷۶/۳ الحدیث رقم ۳۳۸۲، واحمد فی المسند ۱۱۶/۱

ترجمہ: اور حضرت علیؑ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع مضطر (یعنی مجبور اور بے بس شخص کی بیع) سے دھوکہ و فریب کی بیع اور پھلوس کی ”بیع“ سے اس سے قبل کہ وہ پک جائیں منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: المضطر: مفتعل کے وزن پر ”ضر“ سے ماخوذ ہے۔ اصل ”مضتور“ تھا، راء کو راء میں مدغم کیا اور تاء کو طاء سے تبدیل یا ضاد کی وجہ سے۔ نہا یہ میں ہے کہ مضطر دو طرح کا ہوتا ہے:

ایک وہ ہے کہ جس کو عقد پر مجبور کیا جائے۔ اس کی بیع فاسد ہے، منعقد نہیں ہوتی۔

دوسرا وہ ہے کہ جس کو بیچنے پر مجبور کیا جائے بوجہ دین کے جو اس پر لازم ہے، یا خرچ جو اس پر چڑھا ہوا ہے۔ پس وہ اپنے ہاتھ میں موجود چیز کو بیچ دیتا ہے کم قیمت پر ضرورت کی وجہ سے، یہ دین کے وصول کرنے کا راستہ ہے۔ لیکن مروت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو اس طرح بیچنے پر مجبور نہ کیا جائے، بلکہ اس کو عار دلایا جائے، یا اس کو قرض دیا جائے، یا مالدار ہونے تک۔ یا اس سے وہ چیز پوری قیمت پر خریدی جائے، لیکن اگر ضرورت کی وجہ سے اس طریقے پر اس کے ساتھ یہ عقد اور معاملہ ہوا تو یہ بیع صحیح ہو جائے گی، باوجودیکہ اہل علم اس کو ناپسند اور مکروہ سمجھتے ہیں۔

یہاں حدیث میں بیع سے مردا، شراہ ہے، یا مایعہ ہے یا قبول بیع ہے۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”مکرہ“ سے مراد وہ مکرہ ہے جس کو باطل طریقے سے مجبور کیا گیا ہو باقی جس کو کسی حق کی وجہ سے مکرہ کیا ہو تو وہ مردا نہیں ہے۔ جیسا کہ قاضی کسی کو دین کے ادائیگی پر

مجبور کرے اس کے مال میں سے کسی چیز کے بیچنے کے ذریعہ۔

بیع الغرور: اس بیع کو کہتے ہیں کہ جس کے ظاہر کو دیکھ کر مشتری دھوکہ میں پڑ جائے اور اس کا باطن مجہول ہو۔ شیخ الازہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں غرور وہ ہے جو بغیر کسی عہد و اعتماد کے ہو، اور اس میں وہ تمام بیوعات داخل ہیں جن کی حقیقت کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، متعاقدین میں سے ہر اک مجہول ہو۔ اس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔

نرکو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت لینا ممنوع ہے

۲۸۶۶: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَجُلًا مِّنْ كِلَابٍ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ عَسْبِ الْفُحْلِ فَتَهَاهُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا نَطْرُقُ الْفُحْلَ فَتُكْرَمُ فَرَخَّصْ لَهُ فِي الْكِرَامَةِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۷۳/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۴۔

ترجمہ: اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ قبیلہ کلاب کے ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے بے جفتی کرانے کی اجرت کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کو منع فرمایا (کہ اجرت نہ لو) پھر اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ہم نرکو عاریتہ دیتے ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں بطور انعام کچھ دیا جاتا ہے (یعنی ہم کوئی اجرت مقرر کر کے اپنا نرکو جانور نہیں دیتے بلکہ عاریتہ دیتے ہیں مگر جانور لے جانے والا باطل ہے ہمیں بطور انعام کچھ دیتا ہے تو کیا ہم پھر بھی نہ لیں! آپ ﷺ نے اسے انعام قبول کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔)۔ (ترمذی)

تشریح: جمہور کے نزدیک ممانعت تحریمی ہے۔ ”نطرق“ نون کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ۔ نہایہ میں ہے کہ حدیث میں ہے: ”ومن حقها اطراق فحلها“ یعنی جفتی کیلئے عاریتہ دینا۔ اور طرق اصل میں نر کے پانی (یعنی مادہ منویہ) کو کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں جست کو کہتے ہیں، پھر یہی نام اس کے مادہ منویہ کا رکھ دیا گیا۔

فنکرم: متکلم مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے (یعنی ہمارا اکرام کیا جاتا ہے)۔ اشرف فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دلیل ہے کہ اگر کوئی جفتی کے لئے نرکو نرکو عاریتہ دے اور عاریت پر لینے والا کوئی چیز اس کو بطور انعام دے دے، تو اس کا قبول کرنا جائز ہے، اگرچہ اجرت لینا جائز نہیں ہے۔

جو چیز اپنے پاس نہ ہو اس کی بیع نہ کر

۲۸۶۷: وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حَزَامٍ قَالَ نَهَانِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ أبيعَ مَا لَيْسَ عِنْدِي (رواه الترمذی وفي رواية له ولا بی داود والنسائی) قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ يَا تَبْنِي الرَّجُلُ فَيُرِيدُ مِنِّي الْبَيْعَ وَلَيْسَ عِنْدِي فَأَبْتَأُ لَهُ مِنَ السُّوقِ قَالَ لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ.

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۶۸/۳ الحدیث رقم ۳۵۰۳ والترمذی فی ۵۳۴/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۳ والنسائی فی

۲۸۹/۷ الحدیث رقم ۶۱۱۳ وابن ماجہ فی ۷۳۷/۲ الحدیث رقم ۲۱۸۷ واحمد المسند ۴۰۲/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت حکیم بن حزامؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایسی چیز کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جو میرے پاس نہیں ہے (ترمذی) ”ترمذی ابو داؤد اور نسائی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت حکیمؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ایک شخص میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے ایک ایسی چیز خریدنے کا ارادہ کرتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی تو میں اس چیز کو اس کے لئے بازار سے خرید لاتا ہوں (یعنی میں اس چیز کا معاملہ اس سے کر لیتا ہوں پھر وہ چیز بازار سے خرید لاتا ہوں اور اس شخص کے حوالے کر دیتا ہوں) آپ ﷺ نے (بے سن کر) فرمایا کہ ”تم کسی ایسی چیز کو نہ فروخت کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے۔“

تشریح: قوله: نهانى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان ابيع ما ليس عندى :

جیسے مفرو غلام جس کی جگہ معلوم نہ ہو، اور ہوا میں اڑتا ہوا پرندہ، اور پانی کے اندر مچھلی۔

قلت يا رسول الله يأتينى الرجل فيريد منى البيع: مصدر بمعنى مفعول ”بيع“ ہے، جیسے الصيد بمعنى مصيد، جیسا کہ اس

آیت میں ہے: ﴿احل لكم صيد البحر﴾ ای مصيدہ۔

ليس عندى: حال ہے ”البيع“ سے، شرح السنہ اور مصابیح کے بعض نسخوں میں واؤ کے ساتھ ”وليس عندى“ ہے۔

فاتباع: اشتراک کے معنی میں ہے۔

له من السوق: ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس میں دو احتمال ہیں: ایک تو یہ ہے کہ یہ کسی سے اس کیلئے سامان خریدے تو اس

صورت میں یہ صرف دلال ہوگا، اور یہ صحیح ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اس کے ہاتھ ایسا سامان فروخت کرے جو اس کی ملکیت میں

نہیں ہے اور اس کے بعد پھر مالک سے وہ سامان خریدے اور اس کو دیدے۔ یہ صورت باطل ہے اس لئے کہ ایسی چیز کو بیچا ہے جو بیع کے

وقت اس کے پاس نہیں ہے، اور یہی مطلب اگلے جملہ قول کا ہے۔

لا تبع ما ليس عندك۔ شرح السنہ میں ہے کہ یہ ممانعت اعیان کی بیوع میں ہے نہ کہ صفات کی بیوع میں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ

ایسی چیز میں سلم کرنا جس کے اوصاف بیان کئے گئے ہو اور مشروط جگہ میں عمومی طور پر پائی جاتی ہو جائز ہے۔ اگرچہ عقد کے وقت اس کی

ملکیت میں نہ ہو۔ جو چیز اس کے پاس نہ ہو اس کی بیع کے فاسد ہونے میں مفرو غلام کی بیع اور قبل القبض بیع بھی داخل ہے اور اسی طرح

اس کے معنی میں اس مال غیر کی بیع بھی شامل ہے جو اس کی اجازت کے بغیر ہوئی ہو اس لئے کہ معلوم نہیں کہ مالک اس بیع کو جائز قرار دیتا

ہے یا نہیں امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک یہ بیع اجازت مالک پر موقوف رہے گی۔ یہ امام مالک اور اصحاب ابی حنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ

کا قول ہے۔

ایک بیع میں دو بیع نہ کرو

۲۸۶۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ

(رواه مالك والترمذى وابوداود والنسائى)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ۷۳۸/۳ الحديث رقم ۳۴۶۱ والترمذى فى ۵۲۳/۳ الحديث رقم ۱۲۳۱ والنسائى فى

۲۹۵/۷ الحديث رقم (۴۶۳۲)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔“

(مالک ترمذی ابوداؤد نسائی)

تشریح: یہاں بیع سے مراد معاملہ اور عقد ہے۔ شیخ مظہر فرماتے ہیں اور اسی طرح شرح السنہ میں ہے۔ ”ایک بیع“ میں دو بیع

کی علماء نے دو طرح تفسیر کی ہے:

ایک قول تو یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں اپنا کپڑا تمہارے ہاتھ دس روپے نقد میں اور بیس روپے ادھار میں بیچتا ہوں۔

تو یہ اکثر اہل علم کے نزدیک فاسد ہے اس لئے کہ اس میں یہ معلوم نہیں کہ ان دونوں میں سے کس کو قیمت قرار دیا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے یوں کہے کہ میں اپنا یہ غلام دس دینار کے عوض تمہارے ہاتھ بیچتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنی

باندی اتنے کے عوض میرے ہاتھ فروخت کر دو، یہ بھی فاسد ہے، اس لئے کہ اس میں بیع اور شرط ہے اور دوسرا یہ کہ یہ جہالت ثمن کی طرف

ليجاتا ہے، اس لئے کہ اس عقد کا پورا کرنا اونڈی بیچنے کے ساتھ ضروری نہیں ہے، حالانکہ اس نے اس کو شمن کا حصہ بنایا ہے اور اس شرط کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ پس یہ شرط غیر لازم ہے، اور جب اس شرط کا پورا کرنا لازم نہیں تو شمن کا بعض حصہ باطل ہوا تو بیع کا باقی حصہ شمن کے دوسرے حصے کے عوض میں ہوا اور وہ مجہول ہے۔

۲۸۶۹: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي صَفْقَةٍ وَاحِدَةٍ -

اخرجه البغوی فی شرح المسنة ۸ / ۱۴۴ الحدیث رقم ۲۱۱۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (شعیب) سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک معاملے پر دو بیع کرنے کی ممانعت فرمائی ہے“۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قوله: نهى عن بيعتين في صفقة واحدة:

صفقہ سے مراد بیع ہے اور بیع کا نام ”صفقہ“ اس لئے رکھا ہے کہ عرب کی عادت تھی کہ بیع کے وقت متعاقدین میں سے ہر ایک اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ پر مارتا تھا۔

بیع کو قرض کے ساتھ نہ ملاؤ

۲۸۷۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَحِلُّ سَلْفٌ وَبَيْعٌ وَلَا شَرْطَانٍ فِي بَيْعٍ وَلَا رِبْعٌ مَا لَمْ يُضْمَنْ

وَلَا يَبْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ (رواه الترمذی و ابو داود و النسائی و قال الترمذی هذا جدید صحیح)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳ / ۷۷۵ الحدیث رقم ۳۵۰۴ و الترمذی فی ۳ / ۵۳۵ الحدیث رقم ۱۲۳۴ و النسائی فی

۷ / ۲۸۸ الحدیث رقم ۶۱۱۴ و ابن ماجہ فی ۲ / ۷۳۷ الحدیث رقم ۲۱۸۸ و احمد فی المسند ۲ / ۱۷۸

ترجمہ: ”اور حضرت عمرو بن شعیب ناہل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرض اور بیع (ایک ساتھ) حلال ہیں نہ ایک بیع میں دو شرطیں نہ ہی اس چیز سے نفع اٹھانا درست ہے جو ابھی اپنے ضمان (قبضہ) میں نہیں آئی اور اس چیز کو بیچنا جائز نہیں جو تمہارے پاس (یعنی تمہاری ملکیت میں) نہیں آئی“۔ (ترمذی، ابو داؤد و نسائی اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے)۔

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ لا يحل سلف وبيع: ”سلف“ عین اور لام کے فتح کے ساتھ۔

یعنی قرض بیع کے ساتھ، اس طور پر کہ ایک دوسرے کے ساتھ مشروط ہوں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”سلف“ کا اطلاق سلم اور قرض دونوں پر ہوتا ہے، یہاں مراد قرض کی شرط ہے، حذف مضاف کے ساتھ تقدیری عبارت یوں ہے: لا يحل بيع مع شرط سلف، مثلاً کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ میں تیرے ہاتھ اپنا یہ کپڑا اس روپے کا فروخت کر رہا ہوں اس شرط پر کہ تو مجھے دس روپے قرض دے۔ روایت میں اس حلت کی لٹی ہے جو صحت بیع کو لازم ہے، تاکہ یہ فساد بیع پر دلالت کرے بطریق ملازمت، باقی علت حلال نہ ہونے کی اس بیع میں اور ہر اس بیع میں جو شرط کو متضمن ہو ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے ساتھ غرض متعلق ہے، جیسا کہ پہلے حدیث میں گزرا۔

بعض کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی کو کچھ روپے بطور قرض دے اور اس کے ساتھ اپنی کوئی چیز اس قرض دار کے ہاتھ اصل قیمت سے زائد پر بیچے، یہ حرام ہے۔ اس لئے کہ اس کے قرض نے اس کے سامان کو اس قیمت کے ساتھ رائج کیا ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ جو بھی قرض کوئی نفع چھین کر لائے وہ حرام ہے۔

قوله: ولا شرطان في بيع: اسکی ایک تفسیر تو وہی ہے جو اوپر بیعتین (یعنی ایک بیع میں دو بیع نہ کرے) کی وضاحت میں گزری۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیچنے والا اپنی کوئی چیز دو در ۲ شرطوں کے ساتھ نہ بیچے مثلاً وہ خریدار سے یوں کہے کہ

میں نے یہ کپڑا تمہارے ہاتھ اتنے روپے میں بیچا، بایں طور کہ میں اس کپڑے کو دھلا بھی دوں گا، اور سی بھی لوں گا، اور اسی طرح کسی چیز کا اس شرط پر بیچنا کہ وہ خریدار اپنا گھر اس کو کرایہ پر دے گا، اور اپنا غلام اس کو عاریضہ دے گا۔ اس تفسیر کو امام احمد نے اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اس کے مفہوم پر بنا کی ہے اس مسئلے کی کہ ایک شرط کے ساتھ بیع درست ہے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے، اس لئے کہ معنی کے لحاظ سے ایک شرط اور دو شرطوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے منع کیا ہے بیع اور شرط سے، باقی دو شرطوں کی تخصیص اس روایت میں شاید اس وجہ سے ہو کہ عرب کی عادت دو شرطوں کی تھی۔

مفہوم مخالف کا اعتبار ہمارے ہاں نہیں ہے مطلقاً اور مفہوم عدد و حجت نہیں ہے جمہور کے ہاں جو مفہوم مخالف کو جائز قرار دیتے ہیں۔ پھر مراد یہاں شرط ہے جس کا عقد تقاضا نہ کرتا ہو، جیسا کہ ظاہر ہے۔

قولہ: ولا ربح ما لم یضمن: نفع سے مراد اس چیز کا نفع ہے جو اس نے خریدی ہو، اور اس پر قبضہ نہ کیا ہو اور نہ ہی وہ بیچنے والے کے ضمان سے اس کے ضمان میں منتقل ہوئی ہو۔ اس کا بیچنا فاسد ہے۔ شرح السنہ میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فائدہ اٹھانا کسی بھی چیز سے اس وقت حلال ہوتا ہے جب اس چیز کا نقصان بھی اس پر لازم ہو، اگر اس پر اس کا ضمان لازم نہیں جیسا کہ بیع قبل القبض میں جب بیع ہلاک ہو جائے تو اس کا ضمان بیچنے والے پر ہے، تو مشتری کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ ان منافع کی واپسی کا مطالبہ کرے جو بائع کے قبضہ کرنے سے پہلے حاصل کیے ہیں، اس لئے کہ بیع قبضہ کرنے سے پہلے خریدار کے ضمان میں داخل نہیں ہوتی تو خریدار کیلئے قبضہ سے پہلے اس سے فائدہ اٹھانا حلال نہیں ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ”ربح“ سے مراد اس چیز کا بیچنا ہو، اور اس کو ربح سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ بیچنا ہی اس کا سبب ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ حقیقت ربح مراد ہو، جو ان تمام زائد چیزوں کو شامل ہے جو بیع سے حاصل ہوتی ہیں جیسے دودھ، انڈے وغیرہ۔

قولہ: ولا تبع ما لیس عندک: اس کی تفصیل پہلے گزری ہے۔

ادائیگی قیمت میں سکہ کی تبدیلی جائز ہے

۲۸۷۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنْتُ ابْنِعُ الْإِبِلَ بِالنَّقِيعِ بِاللَّذَانِيْرِ فَأَخَذْتُ مَكَانَهَا الدَّرَاهِمَ وَابَيْعُ بِاللَّذَاهِمِ فَأَخَذْتُ مَكَانَهَا الدَّذَانِيْرَ فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لَهُ فَقَالَ لَا بَأْسَ أَنْ تَأْخُذَ هَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا مَا لَمْ تَفْتَرِ قَا وَيَبِيْنَكُمَا شَيْءٌ ۝ (رواه الترمذی و ابو داود و النسائی و الدارمی)

اخرجه ابو داود فی السنن ۳/۶۵۰ الحدیث رقم ۳۳۵۴ و الترمذی فی ۳/۵۴۴ الحدیث رقم ۱۲۴۲ و النسائی فی

۷/۲۸۱ الحدیث رقم ۵۸۲۴ و ابن ماجہ فی ۲/۷۶۰ الحدیث رقم ۲۲۶۲ و الدارمی فی ۲/۳۳۶ الحدیث رقم ۲۵۸۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نقیع میں (جو مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے) اونٹوں کو دیناروں کے عوض بیچا کرتا تھا

اور ان کے عوض درہم لے لیا کرتا تھا اسی طرح جب (اونٹوں کو) درہم کے عوض بیچتا تو درہم کے عوض دینار لے لیا کرتا تھا۔ پھر

(جب) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اس

میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ (تم) دینار کے بدلے درہم اور درہم کے بدلے دینار لے لو) جب تم خرچ اسی دن کے مطابق وصول کرو

اور تم دونوں ایک دوسرے سے اس حال میں جدا ہو کہ تمہارے درمیان کوئی لین دین باقی نہ ہو“۔ (ترمذی ابو داؤد و نسائی)

تشریح: النقیع: نہایہ اور اسی طرح شرح تورپشتی میں ہے کہ ”نقیع“ نون کے ساتھ، مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے، جس

میں پانی جمع ہوتا تھا (اتنی)۔

بعض کہتے ہیں کہ پھر وہ جگہ بھرنی تھی اس میں گھاس اگتا ہے۔ اور بعض حضرات کا فیصلہ ہے کہ یہ ”باء“ کے ساتھ بقیع ہے، اس لئے کہ عرب اکثر ایام غرقہ میں بازار میں قیام کرتے تھے، اور ”کنت ابيع“ بھی استمرار پر دلالت کر رہا ہے۔ اور ”نقیع“ نون کے ساتھ، ایک چراگاہ ہے، مدینہ سے بیس فرسخ کی دوری پر۔ وہاں استمرار مناسب نہیں۔ (اتہنی)

اس کا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ ”نقیع“ بعض ایام میں وہاں بازار لگا کرتا ہو تو پھر یہ دوام اور استمرار کے منافی نہیں ہوگا۔

فاخذ: متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

فاتیت النبى صلى الله عليه وسلم فذکرت ذلك له: بعض نے یہاں یہ اعتراض کیا ہے کہ مناسب یہ تھا کہ وہ اس کام کا ارادہ کرنے کے بعد اور کام کرنے سے پہلے آپ علیہ السلام کے پاس آتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عبد اللہ ابن عمرؓ فقہاء و مجتہدین صحابہ میں سے تھے، انہوں نے پہلے اپنی رائے کے ساتھ اجتہاد کیا اس کے جواز کا پھر یہ معاملہ کیا، پھر آپ سے پوچھا، تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ان کا اجتہاد نفس الامر اور حقیقت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے زمانہ میں اجتہاد جائز تھا بلکہ آپ کی موجودگی میں بھی جائز تھا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ظنی پر عمل جائز ہے یقین پر قدرت کے باوجود، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یقین کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے ظنی پر استمرار سے (ان کو ذکر کیا ہے ابن حجر رحمہ اللہ نے۔)

ان تاخذها: ایک نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ اس صورت میں ہے کہ جب ”ان“ شرطیہ ہو۔ ضمیر منصوب نقدین میں سے کسی ایک کی طرف لٹے گی بدلیت کے طور پر۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا امام طہی رحمہ اللہ نے۔)

ما لم تفتقر فا:

وبینکما شنی: یعنی ایسا کوئی عمل جو عقد صرف کی رو سے سے واجب ہو، اور وہ قبضہ کرنا ہے عوضین پر یا کسی ایک پر مجلس میں جدائی سے پہلے، (اس کو ذکر کیا ہے ہمارے بعض علماء نے۔)

ابن الملک فرماتے ہیں یعنی اس تبدیل کرنے کے متعلق کوئی چیز نہ ہو، اور وہ قبضہ کرنا ہے مجلس میں نقدی کو نقدی کے بدلے بیچنے میں، اگرچہ جنس مختلف ہو۔ (اتہنی)

علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ درہم چونکہ غیر متعین ہے، اس لئے اگر کوئی شخص کسی کو ایک درہم دکھا کر کہے کہ اس کے عوض فلاں چیز میرے ہاتھ بیچ دو، پھر جب وہ اسے وہ چیز بیچ دے تو اس درہم کے بجائے دوسرا درہم دینا جائز ہے، بشرطیکہ دونوں درہم مالیت میں یکساں ہوں۔

امام طہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں لفظ ”شنی“ کو کمرہ لایا گیا ہے، اور مبہم چھوڑا ہے اس لئے کہ اس کی مراد معلوم ہے اور مجلس میں نقدین پر قبضہ کرنا ایسا مشہور ہے کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں التباس نہیں ہوتا۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: لا باس، اور پھر اس کو مقید کیا ”ان تاخذها.....“ کے ساتھ، یہ ”قول بالواجب“ کے باب سے ہے، گویا کہ آپ ﷺ نے اس طرح فرمایا ہے لا باس ان تاخذ بدل الدينار الدرهم.....، کہ کوئی حرج نہیں ہے کہ تم دنانیر کے بدلے درہم لویا اس کا عکس کرو مجلس میں قبضہ کرنے کی شرط کے ساتھ، اور اس دن کے نرخ کے ساتھ مقید کرنا یہ قید استحبالی ہے امام شافعیؒ کے نزدیک۔

شرح السنہ میں ہے کہ نقدین کو آپس میں تبدیل کرنے کی صورت میں مجلس میں قبضہ شرط ہے، پھر یہ برابر ہے کہ وہ جس کے ساتھ تبدیل کر رہا ہے وہ علت ربا میں اس کے موافق ہو یا نہ ہو، اور نبی ﷺ نے قبضہ کی شرط اس لئے لگائی کہ درہم اور دنانیر علت ربا میں موافق ہیں، اور نقدین میں سے ایک کو دوسرے کے بدلے بیچنے میں قبضہ کرنا مجلس میں شرط ہے، اور اگر کوئی دین کے بدلے تبدیل کرے کسی شئی مؤجل کو تو یہ جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ ادھار کو ادھار کے بدلے بیچنا ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

آپ ﷺ سے متعلق ایک بیع کا ذکر

۲۸۷۲: وَعَنِ الْعَدَاءِ بْنِ خَالِدِ بْنِ هُوْدَةَ اَخْرَجَ كِتَابًا هَلْدًا مَا اشْتَرَى الْعَدَاءُ بْنُ خَالِدِ بْنِ هُوْدَةَ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اشْتَرَى مِنْهُ عَبْدًا اَوْ اَمَةً لَا دَاءَ وَلَا عَائِلَةَ وَلَا خَبْثَةَ بَيْعِ الْمُسْلِمِ الْمُسْلِمِ.

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۰۹/۴ معلقا فی کتاب البیوع باب اذابت لبائعات (۱۹) و الترمذی فی السنن ۵۲۰/۳ الحدیث رقم ۲۵۸۱ وابن ماجہ ۷۵۶/۲ الحدیث رقم ۲۲۵۱

ترجمہ: "اور حضرت عداء بن خالد بن ہوڈہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک تحریر نکال کر دکھائی جس میں یہ لکھا تھا کہ "یہ بیع نامہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور عداء بن خالد بن ہوڈہ کی خریداری کے بارے میں ہے۔ عداء نے محمد ﷺ سے ایک غلام یا لونڈی خریدی، جس میں نہ کوئی بیماری ہے نہ کوئی بدی ہے اور نہ ہی کوئی اخلاقی برائی ہے یہ ایک مسلمان کی ایک مسلمان سے بیع ہے۔" (امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریح: قولہ العداء: یہ کلام اجمال کے بعد تفسیر ہے۔ عبداً او امةً: یہ شک ہے کسی راوی کی طرف سے۔

غانلة: جیسے زنا، چوری، شراب نوشی جیسی اخلاقی برائیاں۔ خبثة: خاں معجمہ کے کسرہ اور باء موحدہ کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد ثاء ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کی خلقت و جبلت میں کوئی ایسی برائی نہیں ہے جس سے افعال قبیحہ اور اخلاق شنیعہ پیدا ہوں جیسے اس کا دلہا الزنا ہونا، فاسق ہونا، جھوٹا یا جواری ہونا، اور نہ ہی اس کی ملکیت میں کوئی برائی ہے جس سے شبہ پیدا ہو اس کی ملکیت میں، جیسے قیدی ہونا ان لوگوں میں سے جن کے قیدی بنانے میں شک ہو، یا ان کے قیدی بنانے کی حرمت کا یقین ہو، جیسے مسلمان، معاہدہ وغیرہ، (اس کو ذکر کیا ہے ابن حجر رحمہ اللہ نے۔)

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیماری سے مراد وہ عیب ہے جو خیار عیب کو لازم کرنے والا ہو، اور "غانلة" سے مراد وہ عیب ہے جو خریدار کے مال کے نقصان کا باعث بنے جیسے غلام کا چور ہونا یا بھگوزا ہونا۔ اور "خبثة" سے مراد یہ ہے کہ اس کی خلقت میں خبثت اور برائی ہو جو مالک کیلئے کبھی اچھی نہیں ہو سکتی، یا اس کا مملوک بنانا حرام ہو، جیسے معاہدین وغیرہ کی اولاد میں سے کسی کو قیدی کرنا، جن کو قیدی بنانا جائز نہ ہو۔ حرمت کو خبثت سے تعبیر کیا جیسے حلال ہونے کو طیب سے تعبیر کرتے ہیں۔

قولہ: بیع المسلم المسلم: بیع منصوب ہے بناء بر مصدریت: ای انما باعه بیع المسلم من المسلم "بیع" کی اضافت "المسلم" کی طرف اضافت الی الفاعل ہے، اور یہ منصوب ہے مفعول ہونے کی بناء پر، (اس کو ذکر کیا ہے امام طیبی نے)۔ اور ایک نسخہ میں "بیع" کے رفع کے ساتھ ہے، یہ خبر ہے مبتدا محذوف کی جو کہ ہوتی ہے۔ یا "هذا" ہے، یا مبتدا ہے خبر محذوف کا۔

امام توریشتی فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات پر کوئی دلالت نہیں پائی جاتی کہ جب ایک مسلمان، کسی مسلمان سے معاملہ کرتا ہے تو وہ اس کے ساتھ زیادہ خیر خواہی سے پیش آتا ہے، ہنسبت غیر کے ساتھ خیر خواہی کے، بلکہ اس سے مراد مسلمانوں کے آپس میں معاملہ اور عقد کرنے کی حالت بیان کرنا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ ہر معاملہ میں خیر خواہی اور ایک دوسرے کے حقوق کا پورا لحاظ رکھیں کہ دونوں ایک دوسرے سے سچ بولیں اور جو عیب کسی ایک سے چھپا ہوا ہو وہ اس کے سامنے بیان کریں، اور تقدیری عبارت ہے:

"باعہ بیع المسلم المسلم، و اشتراہ شراء المسلم المسلم"، عقد کے دو اطراف میں سے ایک کے ذکر پر اکتفاء کیا۔ (اتحیی) حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ اس کی مراد ایسی بیع ہے جس میں تمام شرائط جمع ہو، جیسے ایک مسلمان کی بیع دوسرے مسلمان کے ساتھ تمام شرائط سمیت، اور اس میں اشارہ ہے کہ اس بیع میں حقوق اسلام کی مکمل رعایت رکھی گئی، باقی اس (حدیث) میں کسی غیر مسلم کے ساتھ معاملہ کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔

ابن الملک نے فرمایا ہے کہ ”بیع“ مفعول مطلق ہے ”اشتري“ کیلئے اس لئے کہ شراء کا اطلاق بیع پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ بیع کا اطلاق شراء پر ہوتا ہے اور یہ تاکید ہو جائے گا اشتري والے پہلے جملہ کے مضمون کیلئے۔ اور شارح نے جو یہ تقدیری عبارت نکالی ہے: ”باعه بیع المسلم المسلم او اشتراه شراء المسلم المسلم“ اس کا جواب بھی ہو جائے گا۔ ابن الملک کی یہ بات حقیقت سے در رہے۔ اور اللہ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

بطریق نیلام بیع جائز ہے

۲۸۷۳: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بَاعَ جِلْسًا وَقَدْ حَا فَقَالَ مَنْ يَشْتَرِي هَذَا الْجِلْسَ وَالْقَدْحَ فَقَالَ رَجُلٌ أَخَذَهُمَا بِدَرَاهِمٍ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ يَزِيدُ عَلَي دَرَاهِمٍ فَأَعْطَاهُ رَجُلٌ دِرْهَمَيْنِ فَبَا عَهُمَا مِنْهُ

(رواه الترمذی و ابو داؤد وابن ماجه)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۹۲/۲ الحدیث رقم ۱۶۴۱ و الترمذی فی ۵۲۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۱۸ و النسائی فی

۲۵۹/۷ الحدیث رقم ۴۵۰۸، و ابن ماجه فی ۷۴۰/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۸ و احمد فی المسند ۱۱۴/۳

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ بیچا تو ارشاد فرمایا کہ اس ٹاٹ اور پیالہ کو کون خریدے گا؟ (جو خریدنا چاہتا ہو وہ اس کی قیمت لگائے) ایک شخص نے عرض کیا کہ ”میں ان دونوں چیزوں کو ایک درہم کے عوض لے سکتا ہوں۔“ نبی کریم ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا: ایک درہم سے زائد قیمت کون دے گا؟ چنانچہ ایک دوسرے شخص نے آپ ﷺ کو دو درہم پیش کئے اور آپ نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کے ہاتھ (دو درہم کے عوض) فروخت کر دیں۔“ (ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ)

تشریح: جلسا: حاء کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے، وہ چادر جو اونٹ کی پیٹھ پر پالان کے نیچے ڈالی جاتی ہے جو

اس سے جدا نہیں ہوتی (اس کو ڈکریا ہے نہا یہ میں)۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک بچھونا ہے جو بچھایا جاتا ہے۔

اس بیع کا اصل واقعہ یوں ہے، کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے صدقہ مانگا، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ

سامان بھی ہے؟ اس نے عرض کیا میرے پاس کوئی سامان نہیں سوائے ایک چادر اور ایک پیالہ کے، آپ ﷺ نے فرمایا: کہ ان دونوں کو

بیچ دو اور اس کی قیمت کے طور پر جو کچھ وصول ہو اس کو کھاؤ اس کے بعد جب تمہارے پاس کچھ نہ رہے ہو تب صدقہ و خیرات مانگو۔ آپ

نے ان دونوں چیزوں کو بیچ ڈالا۔ من یزید علی درہم: اس سے معلوم ہوا کہ قیمت میں زیادتی جائز ہے جب بیچنے والا اس قیمت

پر راضی نہ ہو جو خریدنے والے نے متعین کی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کسی کے دام پر دام لگانا نہیں ہے، اس لئے کہ دام پر دام لگانا اس وقت ہوتا ہے کہ جب بیچنے والا

اور خریدنے والا ایک قیمت پر متفق ہو جائیں اور ابھی تک عقدہ ہوا نہیں کہ ایک تیسرا شخص آکر کہے کہ میں اس کو اتنے پر خریدنے کیلئے تیار

ہوں، یہ حرام ہوتا ہے قیمت مقرر ہونے کے بعد اور باقی سامان پر دام لگانا بیچنے کیلئے کہ جو آخری بولی بولے اس کو دوں گا، تو یہ حرام نہیں ہے۔

اس حدیث کا ظاہر اس بات کی دلیل ہے کہ معاملات میں بیچنے والے کا چیز دینا اور خریدار کا قیمت دینا کافی ہے، اگرچہ زبانی

ایجاب و قبول نہ ہو۔

الفصل الثالث:

عیب دار چیز دھوکہ سے بیچنے والے کیلئے وعید

۲۸۷۴: عَنْ وَائِلَةَ بِنِ الْأَسْعَمِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يَنْبَهُ لَمْ يَزَلْ فِي مَقْتٍ

اللَّهُ أَوْلَمَ تَنْزِلِ الْمَلَائِكَةِ تَلْعَنَهُ. (رواه ابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۷۵۵/۲ الحدیث رقم ۲۲۴۷

ترجمہ: ”حضرت وائلہ بن اسحقؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے کسی عیب دار چیز کو اس طرح بیچا کہ ”اس کے عیب سے خریدار کو باخبر نہ کیا تو وہ ہمیشہ اللہ کے غضب میں گرفتار رہے گا یا یہ فرمایا کہ اس پر فرشتے ہمیشہ لعنت بھیجتے رہیں گے۔“ (ابن ماجہ)

تشریح: عیبا: عیب دار چیز۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مصدر جب فاعل یا مفعول کی جگہ ذکر کیا جاتا ہے، تو وہ مبالغہ کیلئے ہوتا ہے، جیسے جو حل عدل یعنی وہ مجہول عدل ہے، تو یہاں بھی معیوب چیز کو نفس عیب قرار دیا ہے، یہ اس معاملہ کی زیادہ شاعت پر اور اس بات پر دلالت کرنے کیلئے ہے یہ بذات خود عیب ہے اور یہ مسلمانوں کی شان کے لائق نہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: من غش فلیس منی۔ جس نے فریب کیا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے۔ ای ذا عیب اور تکمیل تقریر کیلئے ہے۔
لم ینبہ: بآء مشدودہ کے کسرہ کے ساتھ۔ لم یزل فى مقت اللہ: اس میں دو مبالغے ہیں، ایک تو یہ کہ ”مقت“ سخت غصے کو کہتے ہیں، دوسرا مبالغہ یہ کہ اس کو ”مقت اللہ“ ظرف بنایا ہے۔ اولم تنزل الملائکة تلعنہ: او شک کیلئے ہے، یا تلوخ کیلئے ہے۔

بَابُ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

الفصل الاول:

پھلدار درخت کی بیع کا مسئلہ

۲۸۷۵: عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ ابْتَاعَ نَخْلًا بَعْدَ أَنْ تَوَبَّرَ فَتَمَرَتُهَا لِلْبَائِعِ إِلَّا يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ وَمَنْ ابْتَاعَ عَبْدًا وَكَأَنَّ مَالَ فَمَا لَهُ لِلْبَائِعِ إِلَّا أَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ. (رواه مسلم وروى البخارى المعنى الاول وحده).

اخرجه البخارى فى صحيحه ۴۹/۵ الحدیث رقم ۲۳۷۹ و مسلم فى ۱۱۷۳/۳ الحدیث رقم (۸۰-۱۵۴۳) والترمذی فى السنن ۵۴۶/۳ الحدیث رقم ۱۲۴۴ والنسائی فى ۲۹۷/۷ الحدیث رقم ۴۶۳۶ و ابن ماجه فى ۷۴۶/۲ الحدیث رقم ۲۲۱۱ واحمد فى المسند ۷۸/۲

ترجمہ: ”حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے تاجر (بیوند کاری) کیا ہوا کھجور کا درخت خرید اتو اس کا پھل بیچنے والے کا ہے مگر یہ کہ خریدنے والا پھل مشروط کر دے اسی طرح جس شخص نے کوئی ایسا غلام خریدا جس کے پاس مال ہو تو اس کا مال بیچنے والے کا ہے۔ ”رہ یہ کہ خریدنے والا مشروط کر دے۔“ (مسلم) بخاری نے اس حدیث کا صرف پہلا جزو یعنی مَنْ ابْتَاعَ نَخْلًا نقل کیا ہے۔“

تشریح: قوله: مَنْ ابْتَاعَ نَخْلًا بَعْدَ أَنْ تَوَبَّرَ فَتَمَرَتُهَا لِلْبَائِعِ إِلَّا يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ

ابتاع: اشتري کے معنی میں ہے۔ ان توبر: بآء کے فتح اور تشدید کے ساتھ، ”تاجر“ کی صورت یہ ہے کہ کھجور کے زرد درخت کا پھول کھجور کے مادہ درخت میں رکھ دیا جائے اس کے پھنسنے کے بعد، تو اللہ کے حکم سے اس کا پھل زیادہ اور اچھا ہو جاتا ہے۔
ان يشترط المبتاع: مبتاع سے مراد مشتری ہے۔ یعنی وہ خریدار کہے کہ میں اس درخت کو اس کے پھل سمیت خریدتا ہوں۔

حنفیہ کے نزدیک ”غیر مؤثر“ درخت کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کا مسلک یہ ہے کہ ”غیر مؤثر“ درخت کا پھل مشتری کا ہوتا ہے مگر یہ کہ بائع پر شرط لگانے کے یہ میرے ہوں گے، تو پھر یہ پھل بائع کے ہوں گے، وہ حدیث کے مفہوم مخالف کو لیتے ہیں (اسی طرح ذکر کیا ہے ابن الملک رحمہ اللہ نے)۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے پھل دار مؤثر درخت بیچا تو اس کا پھل بیچنے والے کا ہوگا یہ کہ شرط لگائی جائے کہ یہ پھل بھی عقد میں داخل ہے، اور یہی اکثر اہل علم کا مسلک ہے، اور اسی طرح یہی حکم اس درخت کا بھی ہے جس میں انشفاق ہو، لیکن اس کی ابھی تاخیر نہ ہوئی ہو، اس لئے کہ پھل کو درخت سے جدا کرنے کا موجب وہ پھلوں کا ظہور ہے، جو کہ مماثل ہے حمل کی جدائی کے اور شاید کہ حدیث میں پھل کے ظہور کو تاخیر سے تعبیر کیا ہو، اس لئے کہ عام طور پر پھلوں کا ظہور تاخیر سے خالی نہیں ہوتا، اور اگر وہ درخت کو بیچنے والوں کے ظاہر ہونے کے زمانہ سے پہلے تو پھر پھل اصل کے تابع ہیں، اور مشتری کی طرف منتقل ہوتے ہیں، جنہیں یعنی حمل پر قیاس کرتے ہوئے اور مفہوم حدیث کو لیتے ہوئے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھل ہر حال میں بائع کے ہوتے ہیں۔ اور ابن ابی یعلیٰ فرماتے ہیں کہ پھل ہر حال میں اصل کے تابع ہوتے ہیں اور مشتری کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

قولہ مال: لہ لام اختصاص کیلئے ہے، اس لئے کہ غلام کی ملکیت نہیں ہوتی اس میں امام مالک کا اختلاف ہے۔

لہما لہ: لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ للبايع: یعنی اپنی اصل پر باقی رہے گا اور وہ ہے بیچنے سے پہلے بائع کی ملک میں ہونا ہے

الا ان يشترط المبتاع: شرح السنہ میں ہے کہ اس میں بیان ہے اس بات کا کہ غلام کسی حال میں کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا،

اگرچہ مالک اس کو کسی چیز کا مالک بنا دے اس لئے کہ غلام خود مملوک ہے تو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مالک ہو جائے، جیسے چوپائے ہوتے ہیں۔

”لہ مال“ میں اضافت مجاز اور ظاہر کے اعتبار سے ہے، نہ کہ اضافت ملک ہے جیسا کہ زین کی نسبت گھوڑے کی طرف پالان کی

نسبت گدھے کی طرف اور بکریوں کی نسبت چرواہے کی طرف ہوتی ہے۔ اور ”لہما لہ للبايع“ بھی اس بات پر دلالت کر رہا ہے، کہ ایک

ہی حالت میں ملک کی اضافت غلام اور بائع دونوں کی طرف کی ہے، اور یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز پوری کی پوری ایک ہی وقت میں دو

آدمیوں کی ملک ہو، پس ثابت ہوا کہ مال کی اضافت ”غلام“ کی طرف مجاز ہے یعنی اختصاص کیلئے ہے، اور مولیٰ کی طرف حقیقہ ہے یعنی

اضافت ملک ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک اور امام شافعی کا قدیم مذہب یہ ہے کہ جب مولیٰ اپنے غلام کو کسی مال کا مالک بنا دے تو وہ

اس کا مالک ہو جاتا ہے، لیکن جب مولیٰ اس غلام کو فروخت کر دے تو اس کا مال بائع کا ہوگا، الا یہ کہ خریدار اس کی شرط لگائے کہ میں غلام کو

مال سمیت خریدتا ہوں۔ ظاہر حدیث اس کی دلیل ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر غلام کے پاس مال درہم ہو، تو جائز نہیں ہے اس غلام اور ان درہم کو فروخت کیا جائے درہم کے عوض،

اور اسی طرح اگر وہ مال دینار ہے یا گندم ہے تو جائز نہیں ہے غلام اور دینار کو فروخت کرنا سونے کے عوض یا غلام اور گندم کو گندم کے عوض۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے اگر خریدار نے اس کی شرط لگائی ہو اگرچہ وہ مال درہم کی صورت میں ہو اور قیمت بھی

درہم ہوں اس لئے کہ حدیث مطلق ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غلام کی بیع کے وقت وہ کپڑے جو اس کے جسم پر ہوں

بیع میں داخل نہیں ہوتے، الا یہ کہ خریدار ان کپڑوں سے بیع کو مشروط کر دے، اس لئے کہ کپڑے بھی من جملہ مال ہیں۔

حنفیہ کے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ کپڑے بیع میں داخل ہوتے ہیں۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ صرف اس قدر بیع میں داخل

ہوتے ہیں جو ستر پوشی کے لئے کافی ہوں۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ حدیث کے ظاہر مفہوم کے مطابق اس کا کوئی بھی سامان بیع میں

داخل نہیں ہوتا، اور لفظ ”عبد“ کپڑوں کو شامل نہیں ہوتا۔

قوله: روی البخاری.....: امام بخاری نے اس حدیث کا صرف پہلا جزو معنا نقل کیا ہے، اور دوسرا حصہ نہ لفظاً نقل کیا ہے اور نہ معنی۔

مشروط بیع کا مسئلہ

۲۸۷۶: وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّهُ كَانَ يَسِيرُ عَلَى حِمَلٍ لَهُ قَدْ أَعْيَى فَمَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِهِ فَصَرَبَهُ فَمَسَّ سِيرًا لَيْسَ يَسِيرٌ مِثْلَهُ ثُمَّ قَالَ بَعْضُهُمْ بَرُوقِيَةَ قَالَ لَبِئْتُهُ قَالَ فَبَعْتُهُ فَأَسْتَنْبَيْتُ حُمَلَانَهُ إِلَى أَهْلِي فَلَمَّا قَدِمْتُ الْمَدِينَةَ أَتَيْتُهُ بِالْحِمَلِ وَنَقَدْتَنِي ثَمَنَهُ وَفِي رِوَايَةٍ فَأَعْطَانِي ثَمَنَهُ وَزَادَهُ عَلَيَّ (متفق عليه وفي رواية للبخاری) أَنَّهُ قَالَ لِبَلَالٍ أَفْضِهِ وَزَادَهُ فَأَعْطَاهُ وَزَادَهُ قِيرَاطًا.

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۱۴/۵ الحدیث رقم ۲۷۱۸ و مسلم فی ۱۲۲۱/۳ الحدیث رقم (۱۰۹-۷۱۵)

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ (ایک سفر کے دوران جب کہ وہ مدینہ آ رہے تھے) اپنے اونٹ پر سوار تھے اور وہ (اتنا) تھک گیا تھا (کہ چلنے سے معذور ہو رہا تھا) چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب جابرؓ کے قریب سے گزرے تو آپ ﷺ نے ان کے اونٹ کو (کھڑی سے یا اس چابک سے جو آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھا) مارا پھر تو وہ (آپ ﷺ کے دست مبارک کی برکت سے) اتنی تیز رفتاری سے چلنے لگا کہ پہلے کبھی اتنی تیز رفتاری سے نہ چلا تھا پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے (حضرت جابرؓ سے) فرمایا کہ تم اس اونٹ کو میرے ہاتھ ایک اوقیہ (چاندی) کے عوض بیچ دو! حضرت جابرؓ نے کہا کہ میں نے یہ اونٹ آپ ﷺ کے ہاتھ فروخت کر دیا لیکن میں نے اپنے گھر تک اس پر سواری کو مستثنیٰ کر دیا (یعنی میں اس شرط کے ساتھ اس کو فروخت کرتا ہوں کہ اپنے گھر تک اسی اونٹ پر سوار ہو کر جاؤں گا۔) چنانچہ (حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ) جب میں مدینہ آیا تو وہ اونٹ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے مجھے اس کی قیمت ادا کر دی۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے قیمت عطا فرمائی اور اونٹ واپس کر دیا یعنی اس کی قیمت بھی ادا کی اور اونٹ بھی عطا فرما دیا۔ (بخاری و مسلم)۔ بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ”جب حضرت جابرؓ نے آپ ﷺ کو اونٹ دیا تو“ آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ جابرؓ اونٹ کی قیمت ادا کر دو اور کچھ زیادہ بھی دے دو چنانچہ حضرت بلالؓ نے انہیں اونٹ کی قیمت بھی ادا کر دی اور ایک قیراط (جو درہم کا چھٹا حصہ ہوتا تھا) اس سے زیادہ بھی ادا کیا۔“

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں کہ ”اعبایا“ لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔

بو قیہ: واؤ کے ضمہ قاف کے سکون اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے، ایک وقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے، اس کا وزن ”افعولۃ“ ہے اور الف زائدہ ہے۔ اس کی جمع ”اواقی“ ہے تشدید کے ساتھ، اور تخفیف کے ساتھ بھی آتی ہے۔ (ابن جی)

ایک درہم چودہ قیراط کا ہوتا ہے اور ایک قیراط سات درمیانہ جو کا ہوتا ہے اور قاموس میں ہے کہ ”اوقیہ“ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ سات مشقال کا ہوتا ہے، جیسا کہ ”وقیہ“ واؤ کے ضمہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ، چالیس درہم کا ہوتا ہے، اور اس کی جمع ”اواقی“ ”اواق“ اور ”وقایا“ آتی ہے۔ مصباح میں ہے کہ ”اوقیہ“ ہمزہ کے ضمہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ، عرب کے ہاں چالیس درہم کا ہوتا ہے، اس کا وزن ”افعولۃ“ ہے جیسے ”احدولۃ، اعجوبۃ“، اور اس کی جمع ”اواقی“، تشدید کے ساتھ آتی ہے، اور تخفیف کے ساتھ بھی آتی ہے۔ ثعلب فرماتے ہیں کہ دراصل پہلے حرف کے ضمہ کے ساتھ لفظ ”اوقیہ“ ہے اور ”وقیہ“ اسی میں ایک لغت ہے یہ واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے، اسی طرح اس کو اسکیت کی کتاب میں ضبط کیا ہے۔ شیخ زہری فرماتے ہیں کہ لیف کہتا ہے کہ ”وقیہ“ سات مشقال کا ہوتا ہے اور اسکو بھی ضبط کیا گیا ہے ضمہ کے ساتھ۔ مطرزی فرماتے ہیں کہ اسی طرح شرح السنہ میں متعدد مقامات پر اس کو ضبط کیا گیا ہے، اور لوگوں کی زبان پر یہ فتح کے ساتھ جاری ہے، اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ بعض حضرات نے اس کو حکایت کیا ہے، اور اس کی جمع ”وقایا“

ہے جیسے ”عطیہ“ کی جمع ”عطایا“ ہے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ مال کے مالک سے مال کے بیچنے کا مطالبہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگرچہ اس نے مال کو بیچنے کیلئے پیش نہ کیا ہو۔

حملانہ : حاء کے ضمہ کے ساتھ ”رکوب“ کے معنی میں ہے، حمل یحمل حملانا کا مصدر ہے، یعنی میں نے ان کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ میں اس اونٹ پر اپنا کجاوہ اور سامان لادوں گا اور آپ ﷺ اس شرط پر راضی ہو گئے۔

اس حدیث سے امام احمد نے استدلال کیا ہے کہ اگر جانور کو فروخت کیا جائے اور ایک مدت تک اس پر سواری اپنے لئے مستثنیٰ کی جائے، دیگر شرائط کی رعایت کے ساتھ، تو یہ جائز ہے، ہمارے اور امام شافعی کے ہاں یہ حضرت جابر کے ساتھ خاص تھا دوسروں کیلئے جائز نہیں ہے یا یہ ہے کہ یہ استثناء بیع کرنے کے بعد تھا کہ حضرت جابر نے اس پر سواری کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اس سے وعدہ کر لیا دینے کا، یا یہ کہ ان کے درمیان حقیقت میں بیع نہیں ہوئی اس لئے کہ نہ اس میں قبضہ ہے اور نہ حوالہ کرنا، بلکہ آپ ﷺ کا ارادہ تھا حضرت جابر کو کوئی فائدہ پہنچانے کا، پس اونٹ کی بیع کو اس کیلئے ذریعہ بنایا۔ اور اس کی دلیل ہے جب اس کو وقیہ دے رہے تو اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ”ما كنت لا آخذ جملك فخذ جملك“۔ (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک رحمہ اللہ نے)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد اور جن لوگوں نے ان کی موافقت کی، استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جانور کو بیچے اس شرط پر کہ ایک مدت تک یہ جانور اس کے زیر سواری رہے گا تو یہ جائز ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ اس وقت جائز ہے کہ جب مسافت قریب ہو۔ امام شافعی ابو حنیفہ اور دوسرے علماء کے ہاں یہ جائز نہیں ہے، چاہے مسافت قریب ہو یا بعید ہو، اور ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو پہلے گزری، جس میں بیع ثیاب سے منع کیا گیا ہے۔ اور وہ حدیث جس میں بیع اور شرط سے منع کیا گیا ہے۔ اور حدیث جابر کا جواب ان کی طرف سے یہ ہے کہ یہ ایسا قضیہ ہے کہ جس میں بہت زیادہ احتمالات ہیں، اس لئے کہ آپ کا ارادہ صرف ثمن دینے کا تھا حقیقت بیع کا ارادہ نہیں تھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ شرط دوران عقد نہ ہو وہ شرط مضربہ جو دوران عقد لگائی گئی ہو۔ اور شاید کہ یہ شرط پہلے کی ہو، پس یہ مؤثر نہیں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے تبرعاً ان کو سواری کیلئے دیدیا۔

فلما قدمت المدينة اتيته بالحمل ونقدني : یعنی مجھے دیا۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے ادائیگی دین میں وکالت جائز ہے اور حقوق کے ادا کرنے میں وکالت کے جواز پر، اور دین کے ادا کرنے کے استحباب پر اور وزن کو جھکتا ہوا رکھنے پر۔

فَاعطاه وزاد قيراطا : اک قیراط آدھے وانق کا ہوتا ہے اور ایک وانق درہم کا چھ حصہ ہوتا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس میں جواز ہے مشاع چیز کے ہبہ کرنے کا، اس لئے کہ ایک قیراط کا زیادہ کرنا یہ ہبہ تھا اور اس کو کل قیمت سے الگ نہیں کیا تھا۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس بات میں بحث ہے اس لئے کہ ”فَاعطاه قيراطا“ اس بات کی تائید نہیں کرتا، اور اسی طرح حضرت جابر سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا یہ قیراط جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے زیادہ دیا ہے یہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہوگا، پس اس کو میں نے تھیلی میں رکھا، پس وہ میرے پاس ہی رہا یہاں تک کہ حرہ کے دن جب اہل شام آئے تو انہوں نے جو سامان لیا اس میں وہ تھیلی بھی لے گئے۔

حق ولاء آزاد کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے

۲۸۷۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ بَرِيرَةَ فَقَالَتْ إِنِّي كَاتِبْتُ عَلَى تِسْعِ أَوَاقٍ فِي كُلِّ عَامٍ وَرِقِيَّةَ فَأَعْبَسَنِي

فَقَالَتْ عَائِشَةُ إِنَّ أَحَبَّ أَهْلِكَ أَنْ أَعِدَّهَا لَهُمْ عِدَّةً وَاحِدَةً وَأُعِثِّقَكَ فَعَلْتُ وَيَكُونُ وِلَاءٌ لِي لِي فَدَهَبَتْ إِلَيَّ

أَهْلِيهَا فَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ الْوَلَاءَ لَهُمْ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خُذِيهَا وَأَعِيقِيهَا ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي النَّاسِ فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ أَمَا بَعْدُ فَمَا بَالُ رِجَالٍ يَشْتَرِطُونَ شُرُوطًا لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللَّهِ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَهَوَ بَاطِلٌ وَإِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ فَقَضَاءُ اللَّهِ أَحَقُّ وَشَرْطُ اللَّهِ أَوْفَى وَانَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ - (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۷۶/۴ الحديث رقم ۲۱۶۸ ومسلم فى ۱۱۴۱/۲ الحديث رقم (۶-۱۰۰۴) وابو داؤد فى السنن ۲۴۵/۴ الحديث رقم ۳۹۲۹، والترمذى فى ۵۵۷/۳ الحديث رقم ۱۲۵۶ وابن ماجه فى ۸۴۲/۲ الحديث رقم

۲۵۲۱ ومالك فى الموطأ ۷۸۰/۲ الحديث رقم ۱۷ من باب كتاب العتق واحمد فى المسند ۲۱۳/۶

ترجمہ: ”اور حضرت عائشہؓ جتنی ہی کہ (ایک دن) بریرہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں نے نواوقیہ پر مکاتبیت اس شرط کے ساتھ کی ہے کہ ہر سال ایک اوقیہ ادا کیا کروں گی لہذا آپ میری مدد کیجئے! حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ یہ سن کر میں نے کہا کہ ”اگر تمہارے مالوں کو یہ پسند ہو کہ میں سب کے سب اوقیہ ایک ہی مرتبہ میں انہیں ادا کر دوں اور پھر تجھے آزاد کر دوں تو ایسا کر سکتی ہوں لیکن اس صورت میں حق ولاء مجھے حاصل ہوگا۔ (بریرہ نے یہ سن کر کہا کہ) میں اپنے مالک کے پاس گئی (اور ان کے سامنے یہ صورت رکھی) مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم صرف اس شرط کے ساتھ (تجھے) فروخت کر سکتے ہیں کہ حق ولاء ہمیں حاصل ہو، رسول اللہ ﷺ (کو جب اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے) حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تم اسے لے کر آزاد کر دو اس کا حق ولاء تمہیں ہی حاصل ہوگا۔“ پھر رسول اللہ ﷺ لوگوں کے سامنے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی شرطیں کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں (یعنی مشروع نہیں ہیں) جو شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے وہ باطل ہے اگرچہ وہ سو شرطوں ہوں (یعنی جو شرط ناجائز و نامشروع ہے اسے چاہے کوئی سو۰۰ بار ہی کیوں نہ عائد کرے وہ باطل ہی رہے گی اور اس کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی) اور خدا ہی کا حکم سب سے زیادہ اس لائق ہے (کہ اس پر عمل کیا جائے) اور اللہ تعالیٰ ہی کی شرط سب سے زیادہ مضبوط ہے (یعنی خرید و فروخت کے معاملات میں خدا نے جو احکام دیئے ہیں بہر صورت ان ہی کی تعمیل ضروری ہے اور خدا نے جو شرائط مقرر کی ہیں صرف انہی کا لحاظ ضروری ہے اپنی طرف سے عائد کردہ کوئی شرط بھی قابل عمل نہیں ہوگی) جان لو! حق ولاء اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو آزاد کرے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: جاءت بوریة: یہ جشن تھیں یا باندی تھیں شرف صحابیت رکھتی ہیں۔ ان اعدھا: ہمزہ کے فتح اور سین کے ضم کے ساتھ، اعطی کے معنی میں ہے اور ہاضمیر تسع اواق کی طرف راجع ہے۔ اعتقت: ہمزہ کے ضم کے ساتھ ہے۔ یکون: رفع کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے۔ ولاء: واؤ کے فتح کے ساتھ۔

الا ان تكون الولاء لهم: امام طبری فرماتے ہیں کہ استثناء مفرغ ہے اس لئے کہ ابی میں نفی کا معنی ہے۔ صاحب کشف نے اس آیت: ﴿وَيَأْتِي اللَّهُ الْإِنَانَ بِإِيمَانٍ نوره﴾ میں ”ابی“ کو ”لم يرد“ کی جگہ بتلایا ہے، کیا دیکھتے نہیں کہ کیسے تقابل کیا گیا ہے اس آیت میں: [يريدون ليظفوا نور الله] [الصف-۸] [وَيَأْتِي اللَّهُ] [التوبة-۳۲] کے ساتھ، اور اس کو لم يرد کی جگہ لایا ہے۔

ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مکاتب غلام کا بیچنا جائز ہے اور یہی امام اور احمد کا مسلک ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بریرہ کی بیع ان کی رضامندی کے ساتھ ہوئی تھی، اور یہ کتابت کو فسخ کرنا ہے، (یہ جواب ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔) یا یہ کہ وہ بدل کتابت کے ادا کرنے سے عاجز ہو گئی تھی، لہذا یہ عقد لونڈی محض پر واقع ہوا ہے نہ کہ مکاتبہ پر۔ اور اس کی تائید بریرہ کے اس قول سے ہوتی ہے: فا عينيني۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ظاہری مقدمہ مکاتب غلام کی بیع کے جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نخعی، مالک،

اور احمد کا مذہب یہی ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ مکاتب کا بیچنا درست ہے، لیکن اس کی کتابت فسخ نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اگر یہ مکاتب غلام بدل کتابت کی قسطیں مشتری کو ادا کر دے تو یہ آزاد ہو جائے گا، اور اس کی ولاء اس کے بائع کی ہوگی، جس نے اس کو مکاتب بنایا تھا۔ امام شافعی نے اس حدیث میں تاویل کی ہے کہ یہ فروخت کرنا بریرہ کی رضامندی سے تھا، یہ ان طرف سے کتابت کا فسخ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ بریرہ بدل کتابت کے ادا کرنے سے عاجز آگئی ہو تو ان کے مالکوں نے اسے عاجز قرار دے کر فروخت کر دیا ہوں۔ مکاتب کا بدل کتابت قسطوں میں ہو تو اس کو بیچنے کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اس کو منع کرتے ہیں، اور امام مالک اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اور حدیث بریرہ میں حضرت عائشہؓ کے اس قول سے دلیل پکڑتے ہیں: "اعدها لهم" اور یہاں "ھا" ضمیر "نواوقیہ" کی طرف لوٹ رہی ہے جن پر بریرہ کی کتابت واقع ہوئی تھی اور اس طرح وہ استدلال کرتے ہیں جو بعض روایات میں آتا ہے: فان احبوا ان اقصی عنک کتابتک، لیکن اس کو رد کرتا ہے حضرت عائشہؓ کا بریرہ کو آزاد کرنا، اور جو روایت کیا ہے ابن شہاب نے عروہ سے اور انہوں نے عائشہؓ سے کہ آپ نے فرمایا: "ابناعی و اعتمقی" اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اشتریہا و اعتمیہا"۔ باقی انہوں نے جس بات سے استدلال کیا ہے تو وہ ان کے خلاف حجت ہے۔ اس لئے کہ بدل کتابت کی قسطوں کو خریدنے والا، قسطوں کو نہ شمار ہے اور نہ ادا کرتا ہے بلکہ وہ اس کا بدل ادا کرتا ہے۔ باقی غلام کو خریدنے والا جب وہ غلام کو خرید لے اس مقدار کے عوض جس مقدار پر اس کی کتابت واقع ہوئی تھی، تو وہ ہوتا ہے اس عوض کو دینے والا اور ادا کرنے والا، اور اس کیلئے لفظ اعدها استعمال کیا ہے، اور مضمون حدیث دلالت کرتا ہے آزادی کی شرط کے ساتھ غلام کی بیع کے جواز پر، اس لئے کہ انہوں نے ولاء کی شرط اپنے لئے لگائی تھی اور شرط ولاء بغیر شرط محقق متصور نہیں ہو سکتی۔ اور آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو اجازت دی تھی ان سے اس شرط کے ساتھ خریدنے کی، اگر یہ عقد فاسد ہوتا تو آپ ﷺ اس کی اجازت نہ دیتے اور نہ ہی عقد پر تقریر فرماتے یہ مسلک ہے نفعی، شافعی، ابن ابی یعلیٰ، اور ابو ثور رحمہم اللہ کا۔ اور اصحاب ابی حنیفہ اس کے فساد کے قائل ہیں۔

اس عقد کے صحیح ہونے کے قائلین کا شرط میں اختلاف ہے۔ پس بعض شرط کو صحیح قرار دیتے ہیں اور یہی امام شافعی کا قول جدید ہے، اس لئے کہ آپ نے اس شرط کی اجازت دی تھی۔ اور اس لئے بھی کہ اگر یہ شرط فاسد ہوتی تو عقد بھی فاسد ہوتا اس لئے کہ یہ ایسی شرط ہے جس کے ساتھ غرض متعلق ہے۔ اور یہ ثابت نہیں ہے کہ پس نص کی وجہ سے اور ان دونوں وجوہ کی وجہ سے بعض شرط کو ملغیٰ قرار دیتے ہیں جیسے ابن ابی یعلیٰ ابو ثور،

شرط ولاء کے ساتھ بیع کے صحیح ہونے اور شرط کے فاسد ہونے پر یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس عقد کو صحیح قرار دیکر نافذ کیا اور شرط کے باطل ہونے کا فیصلہ کیا اور فرمایا: "انما الولاء لمن اعتمق" اور یہی ابن ابی یعلیٰ اور ابو ثور کا قول ہے اور امام شافعی کا قول قدیم ہے، اکثر حضرات اس عقد کے فساد کے قائل ہیں اس نص اور معنی کی وجہ سے جو پہلے گزری ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ بریرہ کے بیچنے میں کوئی شرط جاری نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس شرط کا اس قوم نے ولاء کی طمع میں کیا تھا اور وہ ناواقف تھے اس بات سے کہ ولاء تو صرف متعلق کیلئے ہوتی ہے،

ہشام بن عروہ عن ابی عن عائشہؓ کی سند سے ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "خذیہا و اشترطیہا" تو یہ زیادت ہے، اور ہشام اس میں متفرد ہیں۔ اور اس زیادت کو ترک کرنے والے ابن شہاب عن عروہ عن عائشہؓ اور قاسم بن محمد سے غلطی ہونے کے تعداد کے لحاظ سے، لہذا یہ زیادت نہیں سنی جائے گی اس لئے کہ ایک سے غلطی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے نسبت جماعت کے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول کا اللہ کے ہاں اتنا بڑا مرتبہ ہونے کے باوجود یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں پر تکبیر کریں شرط باطل کی وجہ سے اور اپنے اہل کو اس شرط باطل کے قبول کرنے کا حکم دیں، حالانکہ وہ اللہ کے احکام کے بارے میں اپنے اہل پر زیادہ

نخت تھے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس تقدیر اور احتمال پر منہدم ہو جاتے ہیں وہ استدلالات جو ہم نے ذکر کئے۔ اور اس حدیث میں شرط عتق کے ساتھ عقد اور شرط کے صحیح ہونے پر کوئی دلالت نہیں ہے۔

ثم قال اما بعد : یہ فصل خطاب، اور عتاب کے قصد سے۔ ارشاد فرمایا۔

فما بال رجال : صحیح شدہ نسخہ اور اصول معتمدہ مشکاۃ کے، میں ”فا“ ہی کے ساتھ ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بخاری میں بغیر ”فا“ کے ہے۔ ماکلی فرماتے ہیں ”اما“ حرف ہے یہ اور اس کے ساتھ ملا ہوا فعل اداۃ شرط کا قائم مقام ہوتا ہے، اس وجہ سے نحوی اس کی تقدیر ”مہما یکن من شیء“ نکالتے ہیں، اور اس کے ساتھ متصل کلمہ کے ساتھ متصل فعل کا حق یہ ہے کہ اس پر ”فا“ داخل ہو، جیسے: [فا ما عاد فا ستکبر وا فی الارض] [فصلت - ۱۵] اور عام طور پر یہ ”فاء“ حذف نہیں کیا جاتا مگر شعر میں یا ایسے قول سے جس کے ذکر سے اس کے مقولہ نے مستغنی کر دیا ہو، جیسے: [فا ما الذین اسودت وجوہم اکفرتم] ای فیقال لهم اکفرتم، اور آپ ﷺ کا قول: ”اما موسیٰ فکانی أنظر الیہ“ اور حضرت عائشہ کا قول: واما الذین جمعوا بین الحج والعمرة طافوا طوافا واحدا، اس حدیث میں قاعدہ کے خلاف کیا گیا ہے، پس تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کے حذف میں تنگی نہیں ہے، اور جن لوگوں نے اس کو خاص کیا ہے شعر کے ساتھ یا بشرکی معین صورت کے ساتھ سو وہ فتویٰ میں کوتاہی ہیں، اور اپنے دعویٰ کی نصرت کرنے سے عاجز ہیں۔

فی کتاب اللہ : کتاب اللہ سے مراد حکم اللہ ہے نہ کہ قرآن مراد ہے، اس لئے کہ ”الولاء لمن اعتق“ قرآن میں نہیں ہے، یا

کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور اس کی نظیر ابن مسعود کا قول ہے واشمۃ (بال جوڑنے والی) کے بارے میں: ”مالی لا العن من لعن رسول اللہ ﷺ وهو فی کتاب اللہ“، پھر اللہ کی کتاب میں ہونے پر انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا: ﴿وما اتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فانتہوا﴾ (اور رسول تم کو جو کچھ دیدیا کرے وہ لے لیا کرو، اور جس چیز سے تم کو روک دے تم رُک جایا کرو)۔

ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ : ”ما“ شرطیہ ہے اور ”من“ زائدہ اس لئے کہ کلام غیر موجب ہے، اور جزاء یہ قول ہے: فہو باطل وان کان مائة شرط : ان، وصلیہ ہے مبالغہ کیلئے ہے اور مفہوم عدد معتبر نہیں ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ اگرچہ سورہ ۱۰۰ بار شرط لگائے، اس شرط کو کلام سابق کے پیچھے لایا گیا ہے بغیر جزاء کے مبالغہ اور تقریر کی غرض سے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں ”فاء“ بتا رہا ہے کہ یہ شرط محذوف کا جواب ہے، اور لفظ قضاء بتا رہا ہے کہ ”لیست فی کتاب اللہ“ میں ”کتاب اللہ سے مراد“ اللہ کا حکم اور فیصلہ ہے۔

و شرط اللہ اوثق : یعنی اس پر عمل کرنے میں۔ اس سے مراد یہ ارشاد ہے: (وانما الولاء لمن اعتق) الولاء میں الف لام عہد کیلئے ہے نہ کہ جنس کیلئے، اس سے جواب ہوا امام شافعی کا کہ وہ فرماتے ہیں کہ ”ولاء مولاة“ باطل ہے، اس لئے کہ یہاں الف لام جنس کیلئے ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہاں جو لاء کی شرط لگائی ہے اس میں اشکال ہے، اس لئے کہ بیع کا فائدہ دے رہا ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ دھوکہ اور فریب کو متضمن ہے۔ یا آپ ﷺ نے کیسے اپنے اہل کو ایسی چیز کی اجازت دی جو صحیح نہیں ہے۔ اسی اشکال کی وجہ سے بعض علماء نے اس پوری حدیث کا انکار کر دیا ہے اور اس کے ہم معنی دوسری روایات کہ جس میں ہے: ”واشترطی لهم الولاء فان الولاء لم اعتق“۔

لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ حدیث صحیح ہیں، اس کے تاویل میں ان کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ لہم بمعنی علیہم کے ہے۔ جیسا کہ آیت میں ہے: لہم اللعنة [غافر- ۵۲] ای علیہم اللعنة اور وان اُستام فلہا ای فعلیہا۔ لیکن یہ جواب کمزور ہے اس لئے کہ آپ ﷺ نے ان پر شرط لگانے کا انکار کیا ہے اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ انکار نہ کرتے۔ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ ﷺ نے جس شرط کا انکار کیا ہے اس سے مراد وہ شرط ہے جس کا ارادہ انہوں نے ابتداء امر میں کیا تھا۔ صحیح جواب اس کا وہی ہے جو ہمارے علماء نے کتب فقہ میں ذکر کیا ہے کہ یہ شرط خاص ہے حضرت عائشہؓ کے اس قضیہ کے ساتھ، اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے آپ نے اس کی اجازت دی اور پھر بعد میں اس کو باطل کر دیا ہو اور یہ ایک خاص قضیہ ہے اور معین قضیہ میں ہوا ہے جس میں عموم نہیں ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس کے اجازت دینے اور پھر اس کے بعد اس کو باطل کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اس بارے میں ان کی عادت ختم کرنے میں مبالغہ سے کام لینا تھا، اور اس جیسے معاملہ پر انکو زبرد مقصود تھا جیسا کہ نبی کریمؐ نے حج کے حرام میں اجازت دی تھی اور پھر ان کو حکم دیا کہ وہ اس کو عمرہ سے بدل دیں۔ ان کی عادت ختم کرنے کے لئے جو اشہر حج میں عمرہ سے منع کرنے کی تھی۔ اور کبھی بڑے فائدے اور مصلحت کیلئے چھوٹے فساد اور نقصان کو برداشت کیا جاتا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ بیع میں شرط لگانے کی کئی اقسام ہیں، ان میں سے بعض وہ ہیں کہ جن کا تقاضا عقد کرتا ہے جیسا کہ بیع کو مشتری کے حوالہ کرنے کی شرط، یا پھل کو درخت پر چھوڑنے کی شرط پھل چننے اور کاٹنے کے وقت تک اور بعض ان میں سے وہ شرط ہیں جن میں مصلحت ہوتی ہے اور اس کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے شرط تضمین شرط خیار وغیرہ۔ پس یہ دو قسم کی شرطیں جائز ہیں اور عقد کی صحت پر یہ اثر انداز نہیں ہوتیں بغیر کسی اختلاف کے، اور بعض ان شرائط میں سے یہ ہیں کہ مثلاً غلام اور لونڈی کی شرط آزادی میں ترغیب کیلئے۔

حق و لاء کو بیچنا یا اس کو بہہ کرنا ناجائز ہے

۲۸۷۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَعَنْ هَيْبَةَ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۶۷/۵ الحدیث رقم ۲۵۳۵ ومسلم فی صحیحہ ۱۱۴۵/۲ الحدیث رقم

(۱۵۰۶-۱۶) وابو داؤد فی السنن ۳۳۴/۳ الحدیث رقم ۲۹۱۹ والترمذی فی ۵۳۷/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۶ وابن ماجہ

فی ۱۹۱۸/۲ الحدیث رقم ۲۷۴۷ والدارمی فی ۴۹۰/۲ الحدیث رقم ۳۱۵۶ ومالك فی الموطأ ۷۸۲/۲ الحدیث رقم

۲۰ من کتاب العتق

ترجمہ: ”اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ولاء کو فروخت کرنے یا اس کو بہہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وجہ ممانعت یہ ہے کہ حق و لاء یہ نسب کی طرح ہے تو جس طرح نسب غیر کی طرف منتقل نہیں ہوتا اسی طرح حق و لاء بھی

منتقل کے علاوہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ عتق کے حقوق میں سے ہے، (اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ولاء کو بیچنا اور بہہ کرنا دونوں درست نہیں ہیں اس لئے کہ ولاء اپنے مستحق سے منتقل نہیں ہوتا، چونکہ

یہ قرابت نسب کی طرح اک قرابت ہے، اور سلف اور خلف میں سے جمہور علماء کا مذہب ہے۔ اور بعض سلف نے اجازت دی ہے اس کے

منتقل کرنے کی، شاید ان کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، احمد ارج، اور طبرانی نے عبداللہ بن اوفی سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ”الولاء لحمۃ

کلحمۃ النسب لا یباع ولا یوہب“ اور اسی طرح اس حدیث کو امام حاکم نے مستدرک میں، اور بیہقی نے سنن میں روایت کیا ہے۔

الفصل الثالثی:

جو نقصان کا ذمہ دار ہے وہی نفع کا بھی حقدار ہے

۲۸۷۹: عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حُفَّابٍ قَالَ ابْتَعْتُ غُلَامًا فَاسْتَعْلَلْتُهُ ثُمَّ ظَهَرْتُ مِنْهُ عَلَى عَيْبٍ فَخَاصَمْتُ فِيهِ إِلَى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَقَضَى لِي بِرَدِّهِ وَقَضَى عَلَيَّ بِرَدِّ عَالِيَتِهِ فَاتَيْتُ عُرْوَةَ فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ أَرَوْحُ إِلَيْهِ الْعَشِيَّةَ فَأُخْبِرُهُ أَنَّ عَائِشَةَ أَخْبَرْتَنِي أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَضَى فِي مِثْلِ هَذَا أَنَّ الْخِرَاجَ بِالضَّمَانِ قَرَّاحَ إِلَيْهِ عُرْوَةَ فَقَضَى لِي أَنْ اخُذَ الْخِرَاجَ مِنَ الَّذِي قَضَى بِهِ عَلَيَّ لَهُ - (رواه فی شرح السنۃ)

اخرجه أبو داؤد فی السنن ۷۷۹/۳ الحدیث رقم ۳۵۰۹ والترمذی فی ۵۸۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۸۵ والنسائی فی ۲۵۴/۷ الحدیث رقم ۴۴۹۰ واحمد فی المسند ۴۹/۶۔

ترجمہ: ”حضرت محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خریداجس کی کمائی میں وصول کرتا رہا پھر مجھے اس کے ایک ایسے عیب کا علم ہوا (جو اس میں خریداری سے پہلے تھا اور بیچنے والے نے مجھے اس سے مطلع نہیں کیا تھا) چنانچہ اس غلام کے معاملہ کو میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز (خلیفہ وقت) کی خدمت میں پیش کیا انہوں نے مجھے یہ فیصلہ سنایا کہ غلام کو واپس (پہلے مالک کی طرف لوٹا دیا جائے) اور اس کے ساتھ ہی اس کی کمائی بھی واپس کوٹا دی جائے۔ پھر میں حضرت عروہ بن زبیر کی خدمت میں حاضر ہوا (جو ایک جلیل القدر تابعی اور فقہاء میں سے تھے) اور انہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فیصلہ سے آگاہ کیا۔ حضرت عروہ نے ارشاد فرمایا کہ میں شام کے وقت حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور ان کو مطلع کروں گا کہ حضرت عائشہ نے مجھے بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی قسم کے ایک معاملہ میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ ”منفعت“ ضمان (یعنی تاوان) کے ساتھ ہے چنانچہ حضرت عروہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس تشریف لے گئے (اور ان کو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے مطلع کیا) حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (یہ ارشاد گرامی سننے کے بعد) پھر مجھے یہ حکم دیا کہ میں غلام کی کمائی اس شخص سے وصول کروں گا جسے دینے کے لئے مجھے پہلے حکم دیا گیا تھا۔“ (شرح السنۃ)

تشریح: فاستغللته یعنی میں نے اس کی کمائی لی یعنی اس کا کرایہ اور اجرت لی۔ نہایہ میں ہے کہ ”غلة“ اس داخلی چیز کو کہتے

ہیں جو حاصل ہو سکتی، پھل، وودھ، کرایہ، بچہ وغیرہ کی صورت میں۔

خاصمت فیہ: یعنی میں اس غلام کے حق قضیہ لے گیا۔ یا اس کے بیچنے والے کا اس کے عیب کو چھپانے کے بارے میں۔

العشیة: دن کا آخری یارات کا پہلا حصہ۔ الخراج: خاء کے فتح کے ساتھ۔

بالضمان: امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بالضمان میں با محذوف سے متعلق ہے، تقدیری عبارت یوں ہے: ”الخراج

مستحق بالضمان“ یعنی ضمان (تاوان) کے سبب سے ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ بمقابلہ کیلئے ہے اور مضاف محذوف ہے، ای منافع

المبیع بعد القبض تبقی للمشتري فی مقابلة الضمان..... یعنی بیع کے منافع قبضہ کے بعد مشتری کے ہوتے ہیں اس ضمان

(تاوان) کے مقابلہ میں جو بیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر لازم آتا ہے اور اس بیع کے نقصان کی صورت میں اس پر لازم آتا

ہے۔ اور یہی مطلب ہے: من علیہ غرمہ فعلیہ غنمہ کا، اور خراج سے مراد خریدی ہوئی چیز سے حاصل ہونے والے منافع ہیں

چاہے وہ چیز غلام ہو یا باندی ہو، یا اس کے علاوہ کوئی اور مملوکہ چیز، اور اس کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی چیز خریدی اور ایک وقت

تک اس کے منافع حاصل کئے اور پھر وہ اس میں ایک ایسے عیب پر مطلب ہوا جو بیع سے پہلے کا تھا اور بائع نے اس کو اس عیب کی اطلاع

نہیں دی تھی یا پتہ نہیں چل سکتا تھا، تو اب اس کو اختیار ہے کہ یہ عیب دار چیز واپس کر دے اور قیمت لے لے اور جو منافع اس نے اس بیع

سے حاصل کئے ہیں وہ اس مشتری کیلئے ہیں ان کا واپس کرنا لازم نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر یہی بیع مشتری کے ہاتھ میں ہلاک ہو جاتی تو اس کا ضمان اسی مشتری پر لازم آتا نہ کہ بائع پر۔

شرح السنہ میں ہے کہ امام شافعی فرماتے ہیں ان چیزوں کے بارے میں جو مشتری کے پاس پیدا ہوں مثلاً جانور کے بچے لونڈی کی اولاد، بھیڑ بکری کا دودھ اور اون، درخت کے پھل، یہ سب کے سب خریدار کے ہوں گے اور وہ اصل چیز کو عیب کی وجہ سے لوٹانے کا حق رکھتا ہے۔

ائمہ احناف فرماتے ہیں کہ مشتری کے پاس بچہ پیدا ہونے یا پھل پیدا ہونے سے یہ اصل کو واپس کرنے سے مانع چونکہ عیب پیدا ہوا چکا ہے۔ بلکہ وہ بائع سے رجوع کرے گا، تاوان کا۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل کے ساتھ بچے کو بھی لوٹانے گا، اور اون کو نہیں لوٹائے گا، اگر کسی شخص نے باندی خریدی، اور پھر اس باندی کے ساتھ شہ کی وجہ سے ہمبستی کی گئی خریدار کے ہاتھ میں یا اس نے خود ہمبستی کی اور پھر عیب پر مطلع ہوا، اب اگر وہ باندی شہ تھی تو یہ اس کو عیب کی وجہ سے واپس کر دے گا۔ اور اس کا مہر اس مشتری کیلئے ہوگا، اور اگر ہمبستی اس نے خود کی ہے تو اس کی وجہ سے اس پر کچھ بھی لازم نہیں، اور اگر وہ باکرہ ہے، تو اس کی بکارت چاک ہو چکی ہے، تو اب اس کو واپس لوٹانے کا حق نہیں ہے، اس لئے کہ بکارت کا زائل ہونا عیب ہے جو مشتری کے پاس پیدا ہوا ہے، بلکہ یہ عیب کے بقدر بائع سے قیمت واپس لے لے۔ یہی امام مالک اور شافعی کا قول ہے۔

قوله: فقضى لى ان اخذ الخراج من الذى قضى به على له: ابن الملك فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اگر قاضی فیصلہ کرنے میں غلطی کر لے اور پھر اس کو یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ یہ فیصلہ غلط ہے تو اس فیصلے کا توڑنا ضروری ہے، جیسے عمر بن عبد العزیز نے عروہ کے خبر دینے سے کیا۔

بائع اور مشتری کے درمیان نزاع کی صورت میں کس کا قول معتبر ہوگا

۲۸۸۰: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اختلفَ البَّيْعَانِ فَالْقَوْلُ قَوْلُ الْبَائِعِ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ (رواه الترمذى وفى رواية ابن ماجه والدارمى) قَالَ الْبَّيْعَانِ إِذَا اختلفَا وَالْمَبِيعُ قَائِمٌ بَعِيْبِهِ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ أَوْ يَتَرَدَّانِ الْبَيْعَ. (ترمذى)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ۷۸۰/۳ الحدیث رقم ۳۵۱۱ والنسائی فى ۳۰۲/۷ الحدیث رقم ۴۶۶۸ وابن ماجه فى ۷۳۷/۲ الحدیث رقم ۲۱۸۶ والدارمى فى ۳۲۵/۲ الحدیث رقم ۲۵۴۹ واحمد فى المسند ۱/۴۶۶۔

ترجمہ: "اور حضرت عبد اللہ بن مسعود راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب بائع اور مشتری میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس صورت میں بائع کا قول معتبر ہوگا اور مشتری کو بیع فسخ کر دینے یا باقی رکھنے کا اختیار حاصل ہوگا۔" (ترمذی) ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب مشتری اور بائع یعنی بیچنے والے کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے اور بیع (بیچنی یا خریدی جانے والی چیز) جنوں کی توں باقی ہو اور ان دونوں کے درمیان کوئی گواہ نہ ہو تو اس صورت میں بائع کا قول معتبر ہوگا یا پھر وہ دونوں بیع کو فسخ کر دیں۔" (ترمذی)

تشریح: قوله: إِذَا اختلفَ البَّيْعَانِ فَالْقَوْلُ قَوْلُ الْبَائِعِ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ

البیعان: باء کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ، یعنی بائع اور مشتری کا اختلاف ہو قیمت کی مقدار میں، یا خیار شرط میں، یا مدت میں یا اس کے علاوہ عقد کی شرائط و صفات میں ہو۔

چاہے تو بیچنے والے کی اس بات پر راضی ہو جائے جو اس نے قسم کھا کر کہی ہے اور چاہے وہ بھی قسم کھائے اور کہے میں نے یہ چیز اس قیمت پر نہیں خریدی ہے بلکہ اس قیمت پر خریدی ہے، اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے، اور پھر جب دونوں اپنی اپنی بات پر قسم کھائیں گے تو ان کا معاملہ اسی صورت میں باقی رہے گا جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی بات کو تسلیم کر لے گا، ورنہ تو قاضی معاملہ کو فسخ کر دے گا، بیع باقی ہوا اپنی حالت پر یا نہ ہو۔

امام ابو حنیفہ اور امام مالک کہتے ہیں کہ اگر بیع ہلاک ہو جائے تو پھر دونوں فریق قسم نہیں کھائیں گے بلکہ اس صورت میں خریدار کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوگا، اور حدیث کے الفاظ ”المبیع قائم“ ان دونوں کے مذہب کی تائید کرتے ہیں، (اسی طرح ذکر کیا ہے ابن الملک نے۔
 قوله: البیعان اذا..... یعنی اس کی قسم کے ساتھ، پس جب بائع قسم کھالے تو مشتری کو اختیار ہوگا، جیسا کہ پہلے گزرا۔
 او یترا دان البیع: اور اگر نزاع کے وقت بیع یعنی باقی نہ ہو، تو پھر اس صورت میں قسم کے ساتھ خریدار کا قول معتبر ہوگا بائع قسم نہیں اٹھائے گا کو قسم نہیں، یہی امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے۔ (مظہر)

اقالہ بیع کا مسئلہ

۲۸۸۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللَّهُ عَشْرَةَ يَوْمٍ الْقِيَامَةِ.

(رواہ ابو داؤد وابن ماجہ وفی شرح السنة بلفظ المصباح عن شریح الشامی مرسلًا)

اخرجه ابو داؤد فی ۸۳۸/۳ الحدیث رقم ۳۴۶۰ وابن ماجہ فی ۸۴۱/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۹ واحمد فی المسند ۲/۲۵۲
ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص مسلمان کی بیع کو واپس کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی خطائیں بخش دے گا۔ (ابوداؤد ابن ماجہ) اور شرح السنۃ میں یہ روایت ان الفاظ میں ذکر کی گئی ہے جو مصابیح میں شرح شامی سے مرسل منقول ہیں۔“

تشریح: قوله: مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللَّهُ عَشْرَةَ يَوْمٍ الْقِيَامَةِ:

من اقال مسلماً: مضاف محذوف ہے۔ ای بیع مسلم ہے۔ یوم القیامۃ: اس میں اس بات کی خبر ہے کہ اقالہ کرنا مستحب ہے اگر بیچنے والا اور خریدار راضی ہوں۔ شرح السنۃ میں ہے اقالہ بیع اور مسلم میں قبل از قبضہ اور بعد قبضہ جائز ہے۔ اقالہ بیع فسخ کرنے کو کہتے ہیں۔
 قوله: رواہ ابو داؤد وابن ماجہ:

یعنی امام ابوداؤد اور ابن ماجہ نے سند متصل کے ساتھ روایت کیا ہے، اور حاکم نے بھی حضرت ابو ہریرہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ البتہ بیہقی نے ان سے روایت کیا ہے: ”من اقال نادماً اقال اللہ یوم القیامۃ۔“

قوله: وفی شرح السنة بلفظ المصباح عن شریح الشامی مرسلًا:

شرح السنۃ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ”من اقال أخاه المسلم صفقة کرهها اقال اللہ تعالیٰ عشرته یوم القیامۃ۔“

فانذار: شرح تصغیر کے ساتھ ہے۔ (یعنی شین پر پیش اور راء پر زبر ہے)

اس عبارت میں مصنف نے امام بغوی پر اعتراض کیا ہے۔ کہ اولاً کو چھوڑ کر ترک اولیٰ کا ارتکاب کیا ہے، بایں طور کہ مرسل روایت کو ذکر کیا ہے اور متصل روایت کو ذکر نہیں کیا۔

الفصل الثالث:

ایک سبق آموز واقعہ

۲۸۸۲: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اشترى رجل مَمَّنْ كَانَ قَبْلَكُمْ عَقَارًا مِنْ رَجُلٍ فَوَجَدَ

الَّذِي اشْتَرَى الْعَقَارَ فِي عَقَارِهِ جَرَّةً فِيهَا ذَهَبٌ فَقَالَ لَهُ الَّذِي اشْتَرَى الْعَقَارَ خُذْ ذَهَبَكَ عَنِّي إِنَّمَا اشْتَرَيْتُ الْعَقَارَ وَلَمْ آتِنَعْ مِنْكَ الذَّهَبَ فَقَالَ بَانِعُ الْأَرْضِ إِنَّمَا بَعْتُكَ الْأَرْضَ وَمَا فِيهَا فَتَحَاكَمَا إِلَى رَجُلٍ فَقَالَ الَّذِي تَحَاكَمَا إِلَيْهِ الْكُفْمَا وَلَكِنَّ فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِي غُلَامٌ وَقَالَ الْآخَرُ لِي جَارِيَةٌ فَقَالَ انْكُحُوا الْعُلَامَ الْجَارِيَةَ وَانْفِقُوا عَلَيْهِمَا مِنْهُ وَتَصَدَّقُوا. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۱۲/۶ الحدیث رقم ۳۴۷۲ و مسلم فی ۱۳۴۵/۳ الحدیث رقم (۲۱-۱۷۲۱) وابن ماجہ فی السنن ۸۳۹/۲ الحدیث رقم ۲۵۱۱ واحمد فی المسند ۳۱۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ تم سے پہلے (زمانہ کے) لوگوں میں سے ایک شخص نے ایک دوسرے شخص سے زمین خریدی (اور اس کو اپنے تصرف میں لایا) اتفاق کی بات کہ جس شخص نے زمین خریدی تھی اس نے اپنی اس خرید کردہ زمین میں ایک ایسا گھڑ پایا جس میں سونا بھرا ہوا تھا اس نے زمین بیچنے والے سے کہا کہ تم اپنا یہ سونا لے لو کیونکہ میں نے تو صرف زمین خریدی تھی یہ سونا میں نے نہیں خریدا تھا۔ بیچنے والے نے کہا کہ میں نے تمہارے ہاتھ صرف زمین ہی نہیں بیچی تھی بلکہ ہر وہ چیز فروخت کر دی تھی جو اس زمین میں موجود ہے۔ (اس لئے یہ سونا بھی تمہارا ہے اسے تم ہی رکھو مگر خریدار اس پر تیار نہیں ہوا) یہاں تک کہ دونوں اپنا معاملہ ایک شخص (حکم و ثالث) کے پاس لے گئے (بعض کہتے ہیں کہ وہ حکم حضرت داؤد ہیں) اس حکم نے (واقعہ کی تفصیل سن کر) ان دونوں سے پوچھا کہ کیا تم دونوں کی اولاد ہے؟ ان میں سے ایک نے تو کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا ہے اور دوسرے نے کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکی ہے۔ حکم نے (یہ سن کر) کہا کہ اس لڑکے کا نکاح لڑکی سے کر دو اس سونے کو ان دونوں پر خرچ کر دو اور (پھر جو کچھ بچے اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں) صدقہ کر دو۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: عقار: عین کے فتح کے ساتھ۔ زمین اور جو اس سے متصل ہو، لفظی مطلب جائیداد ہے۔

من رجل: "اشتری" کا متعلق ہے، پہلے والا "من" بیان ہے، باعضیت کیلئے ہے۔

جوة: جیم کے فتح اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ مطلب گھڑا ہے۔ خذ ذہبک عنی: "عن" بمعنی "من" کے ہے یا "مولیا عنی" ہے۔ ولم ابتع: اشتری کے معنی میں ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بائع اور مشتری کے درمیان صلح صفائی کرانے کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ نیز مخالف اشخاص میں صلح کرانا قاضی و حاکم کیلئے اسی طرح مستحب ہے جس طرح غیر قاضی کیلئے مستحب ہے۔

بَابُ السَّلْمِ وَالرَّهْنِ

بیع سلم اور رہن کا بیان

"سلم" سین اور لام کے فتح کے ساتھ ہے، کسی معلوم کام کیلئے معلوم چیز کے عوض سونا یا چاندی دینا، اس کو "سلم" کہتے ہیں۔ تو گویا کہ قیمت سپرد کر دی جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

امام راغب کہتے ہیں کہ "رہن" وہ ہے جو دین کیلئے بطور وثیقہ کے رکھا جائے، اور "رہان" کا بھی یہی مطلب ہے۔ اصل میں یہ دونوں مصدر ہیں۔ کہا جاتا ہے: "رہنت الرهن وارہنتہ رھانا فھو رھین مرھون" اور "رہن" کی جمع میں رھان رھن اور رھون آتی ہے اور ارہنت کا معنی ہے: اخذت الرهن۔ (یعنی میں نے رهن لیا)

الفصل الاول:

بیع سلم کی شرائط صحت

۲۸۸۳: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمَدِينَةَ وَهُمْ يُسْلِفُونَ فِي الْبَيْعِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ وَالثَّلَاثَ فَقَالَ مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مَّعْلُومٍ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۴۲ الحدیث رقم ۲۲۳۹ ومسلم فی ۳/۱۲۲۷ الحدیث رقم (۱۶۰۴-۱۲۷) وابو داؤد السنن ۳/۷۴۱ الحدیث رقم ۳۴۶۳ والترمذی فی ۳/۶۰۲ الحدیث رقم ۱۳۱۱ والنسائی فی ۷/۲۹۰ الحدیث رقم ۴۶۱۶ وابن ماجہ فی ۲/۷۶۵ الحدیث رقم ۲۲۸۰ والدارمی فی ۲/۳۳۷ الحدیث رقم ۲۵۸۳ واحمد فی المسند ۱/۲۱۷۔

ترجمہ: ”حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (جب مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لائے تو وہ لوگ (اہل مدینہ) پھلوں میں ایک سال، دو سال، تین سال کی بیع سلم کیا کرتے تھے (یعنی پیشگی قیمت دے کر کہہ دیا کرتے تھے کہ ایک سال یا دو سال یا تین سال کے بعد پھل پہنچا دینا) چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی چیز کی بیع سلم کرے اسے چاہئے کہ معین بیانہ معین وزن اور معین مدت کے ساتھ بیع سلم کرے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: وہم یسلفون فی البیوع: یہ جملہ حالیہ ہے۔

اسلاف کہتے ہیں ٹھن دینا بیع کے عوض ایک مدت تک یعنی وہ قیمت فی الحال دیتے تھے اور بیع کو بعد میں لیتے تھے۔

السنة والسنتين والثلاث: تینوں منصوب ہیں۔ اس کی وجہ اعراب میں دو احتمال ہیں: (۱) منصوب بزعم الخافض ہیں ای

یشترون الی السنة، (۲) بناء برصد ریت منصوب ہیں۔ تقدیری عبارت یہ ہے اسلاف لسنہ۔

قوله: فقال من..... یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ مکملی اور موزونی چیزوں میں ناپ، وزن، اور مدت کا متعین کرنا ضروری

ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک کا مجہول ہونا یہ بیع کو فاسد کر دیتا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مکملی چیز میں سلم کر رہا ہے تو اس کا کیل اور ناپ معلوم ہونا

چاہئے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بیع سلم موزن ہی ہوتی ہے بلکہ سلم کافی الحال اور مجمل ہونا بھی جائز ہے اس لئے کہ جب یہ موزن

جائز ہے تو فی الفور کا جائز ہونا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ یہ ”غرض“ سے دور ہے۔

حدیث میں اجل اور مدت کا ذکر یہ مدت کے شرط ہونے کیلئے نہیں ہے، بلکہ اس کا معنی ہے کہ اگر سلم موزن ہے تو پھر مدت تاخیر

معلوم ہونی چاہئے، اور سلم کے فی الحال جائز ہونے میں اختلاف ہے، امام شافعی اور دیگر علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اور مالک امام ابو

حنیفہ اور دوسرے ائمہ نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے اس کے اشتراط وصف پر اجماع کیا ہے جس طرح اس کو ضبط کیا جاسکے۔

ادھار خریدنا اور گروی رکھنا جائز ہے

۲۸۸۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اشْتَرَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَطَعَامًا مِنْ يَهُودِيٍّ إِلَىٰ أَجَلٍ وَرَهْنَهُ دِرْعًا لَهُ مِنْ

حَدِيدٍ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۳۰۲ الحدیث رقم ۲۰۶۸ ومسلم فی ۳/۱۲۲۶ الحدیث رقم (۱۶۲-۱۶۰۳) والنسائی

فی السنن ۷/۲۸۸ الحدیث رقم ۴۶۰۹ وابن ماجہ فی ۲/۸۱۵ الحدیث رقم ۲۴۳۶ واحمد فی المسند ۶/۱۶۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ غلہ ایک معینہ مدت کے ادھار پر خریدا اور اپنے

لو ہے کی ایک زرہ اس کے پاس بطور گروی رکھی۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: شرح السنہ میں ہے کہ اس حدیث سے چند مسائل معلوم ہوئے۔ یہ کہ کوئی چیز ادھار قیمت پر خریدنا، اور دین کے بدلے کسی چیز کا رہن رکھنا جائز ہے۔ اور یہ کہ سفر کے علاوہ میں بھی رہن رکھنا جائز ہے اگرچہ قرآن کریم نے اس کو سفر کے ساتھ مقید کیا ہے، اور اہل ذمہ کے ساتھ معاملات کرنا جائز ہے، اگرچہ ان کا مال سود اور شراب کی قیمت سے خالی نہیں ہوتا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ کو دنیا کا مال و متاع بہت کم رکھتے تھے اور فقر کو لازم تھا مے ہوئے تھے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل ذمہ کے پاس مسلمانوں کا سامان جنگ گروی رکھنا جائز ہے۔ اور جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس میں ان کی ملکیت ثابت ہے، اور آیت: ﴿وَأَنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانَ مِقْبُوٰضَةٍ﴾ [البقرہ- ۲۸۳] کیلئے یہ حدیث تفسیر ہے، اس لئے کہ آیت میں جو خطاب ہے وہ متروک ہے، (یعنی یہ آیت خاص نہیں ہے سفر کے ساتھ)۔

سوال: باقی گروی رکھنے کا یہ معاملہ آپ ﷺ نے ایک یہودی سے کیا، صحابہؓ سے نہیں کیا۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شاید بیان جواز کی خاطر تھا، اور بعض کہتے ہیں یہ یہودی سے یہ معاملہ اس لئے کیا تھا کہ اس وقت اپنی حاجت و ضرورت سے زائد غلہ یہودیوں کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اس لئے کیا تھا کہ صحابہؓ تو آپ ﷺ سے رہن رکھواتے اور نہ ہی قیمت کا مطالبہ کرتے، تو آپ ﷺ نے یہودی کی طرف رجوع کیا تاکہ صحابہؓ پر تنگی کا باعث نہ بنیں۔

مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ اہل ذمہ اور کفار کے ساتھ معاملات جائز ہیں جب تک یقین کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ ان کے پاس جو کچھ ہے یہ خالص حرام ہے۔ لیکن مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کافر ہتھیار بیچے یا ایسی چیز بیچے جس سے کفار کے مذہب کو تقویت پہنچتی ہو، نیز کسی کافر کے ہاتھ قرآن بیچنا مطلقاً جائز نہیں ہے اور نہ کوئی مسلمان غلام کسی کافر کو بیچنا جائز ہے مطلقاً۔

علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ بیع نقد اور ادھار قیمت کے ساتھ جائز ہے اس لئے کہ یہ آیت مطلق ہے: ﴿وَاحِلَ اللّٰهِ الْبَيْعَ﴾ [البقرہ- ۲۷۵] اور جو مؤجل قیمت کے ساتھ ہو وہ بیع ہے، اور صحیح بخاری میں عن عائشہ اور آگے حدیث ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ صحیحین میں ”طعاماً بنسینۃ“ ہے اور سنن بیہقی میں اس یہودی کا نام ذکر کیا ہے۔ حضرت جابر سے روایت نقل کی ہے کہ آپ علیہ السلام نے اپنی زرہ کو رہن کے طور پر رکھانی ظفر میں سے ایک آدمی ابواحم کے پاس جو کے بدلے

مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے اس لئے کہ جہالت مدت حوالہ کرنے اور مطالبہ کرنے میں نزاع کی طرف مفضی ہے کہ ایک قریب کے زمانہ میں مطالبہ کرے گا، اور دوسرا اور کا زمانہ بتائے گا، اور اس وجہ سے بھی کہ آپ نے ایک جگہ مدت کو شرط قرار دیا ہے، اور وہ جگہ سلم ہے کہ آپ نے اس میں تعین مدت کو لازم قرار دیتے ہوئے فرمایا: ”من اسلف فی ثمر فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم“۔ اور ان سب پر اجماع بھی منعقد ہے۔

۲۸۸۵: وَعَنْهَا قَالَتْ تُوَفِّي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَذُرْعُهُ مَرْهُونَةٌ عِنْدَ يَهُودِيٍّ بِلَاثَيْنِ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۹۹/۶ الحدیث رقم ۴۴۶۷۔

ترجمہ: اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا اس حال میں وصال ہوا ہے کہ آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس ۳۰ صاع جو کے عوض بطور گروی رکھی ہوئی تھی۔ (بخاری)

تشریح: توفی: تاہ اور او راؤ کے ضمہ اور ارفا کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ، بمعنی قبض۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ وہی واقعہ ہو جو پچھلی حدیث میں گزرا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دوسرا واقعہ ہو۔

باقی یہ جو روایت میں آتا ہے ”نفس المؤمن معلقة بدينه حتى يقضى عنه“ کہ مؤمن کے نفس کو رد کا جاتا ہے دین کی وجہ

سے یہاں تک کہ وہ اس کی طرف سے ادا کیا جائے۔ اس کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو اس کے اعلیٰ مقام سے روکا جاتا ہے۔ علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اس کا معاملہ موقوف کیا جاتا ہے نہ اس کی نجات کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور نہ ہلاکت کا یہاں تک کہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا اس پر جو دین ہے وہ ادا کیا جاتا ہے یا نہیں۔ (اتحی)

اور اس میں برابر ہے کہ میت نے ”مال وفاء“ چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو، جیسا کہ ہمارے جمہور علماء نے اس کی تصریح کی ہے، اور ماوردی نے شدوذ اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث محمول ہے اس پر جس نے ”مال وفاء“ نہ چھوڑا ہو، (جیسا کہ سیوطی نے حاشیہ ترمذی پر ذکر کیا ہے) لیکن صحیح یہ ہے کہ ماوردی نے کوئی شدوذ اختیار نہیں کیا ہے، اس لئے کہ علماء کی ایک جماعت نے اس کی موافقت کی ہے، کہ انہوں نے حدیث کو محمول کیا ہے اس شخص پر جس نے صاحب دین کے پاس اتنا کچھ نہ چھوڑا ہو جس سے حق وصول ہو سکے، اور انبیاء اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث محمول ہے اس شخص پر جس نے معصیت اور گناہ کیلئے دین لیا ہو، یا اس نیت سے لیا ہو کہ واپس نہیں لوٹائے گا۔ اور یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپ کے تمام وعدے پورے کئے اور حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کے تمام دیون ادا کئے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپ ﷺ کی زرہ کو رہن سے چھڑا کر حضرت علیؓ کے حوالے کر دیا تھا۔

انتفاع رہن کا مسئلہ

۲۸۸۶: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الظَّهْرُ يَرْكَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا وَلَكِنَّ الدَّرَّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا وَعَلَى الَّذِي يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ النَّفَقَةُ. (رواه البخاری)

صحیح بخاری، کتاب الرهن، باب الرهن مرکوب ومحلوب، ح ۲۰۱۲۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۴۳/۵ الحدیث رقم ۲۵۱۲ و ابو داؤد فی السنن ۷۹۵/۳ الحدیث رقم ۳۵۲۶ و الترمذی فی ۵۵۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۵۴ و ابن ماجہ ۸۱۶/۲ الحدیث رقم ۲۴۴۰ و احمد فی المسند ۷۲/۲

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب سواری کا جانور گروی ہو اس پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کے عوض میں اس پر سواری کی جاسکتی ہے اور اگر دودھ والا جانور گروی ہو تو اس پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کے عوض اس کا دودھ پیا جائے اور جو شخص سواری کرے اور دودھ پئے وہی اس کے خرچہ کا ذمہ دار ہے۔ (بخاری)

تشریح: قوله: الظَّهْرُ يَرْكَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا:

الظھر: بعض کہتے ہیں قومی اونٹ کی پیٹھ مراد ہے، اس میں واحد اور جمع برابر ہے۔ جانور کو ”ظھر“ شاید اس وجہ سے کہتے ہیں کہ جانور پر سوار ہونے سے مقصود پیٹھ ہوتی ہے۔ یرکب: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

بنفقته: یعنی اس کے سبب سے اس کی مقدار کے برابر۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ راہن کیلئے جائز ہے کہ وہ مرہون جانور پر سواری کرے اور اسے بار برداری کے کام میں لائے اس لئے کہ اس کا چارہ وغیرہ اس پر ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر مرہون غلام مر جائے تو اس کا کفن مالک پر لازم ہے۔

قوله: وَلَكِنَّ الدَّرَّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا وَعَلَى الَّذِي يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ النَّفَقَةُ:

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ”شئ، مرہونہ“ پر قبضہ کا دوام شرط نہیں ہے رہن میں اس لئے کہ مالک جب اس پر سوار ہوگا تو یہ مرتہن کے قبضہ سے خارج ہوگا۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ”شئ، مرہونہ“ کو مجہول

نہ چھوڑا جائے اور اس کے منافع معطل نہیں ہونے چاہئیں بلکہ چاہئے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور اس پر خرچ کیا جائے اور اس میں اس بات پر کوئی ولالت نہیں ہے کہ ”من له غنمہ علیہ غرمہ“ کہ جس چیز کا فائدہ جس کیلئے ہونقصان بھی اس پر ہوگا۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ اکثر کا مذہب یہ ہے کہ رہن کے منافع راہن کیلئے ہوتے ہیں اور اس کے خرچ کا ذمہ دار بھی راہن ہوتا ہے، اس لئے کہ اصل چیز راہن کی ہے اور فروغ اصل کے تابع ہوا کرتی ہیں، اور اسی طرح یہ اصول ہے: ”الغرم بالغنم“۔ اور دلیل یہ ہے کہ اگر یہ غلام رہن ہو اور وہ مر جائے تو اس کا کفن راہن پر ہوگا۔

ابن المسیب نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لا یغلق المرهن المرهن من صاحبه الذی رہنہ له غنمہ و علیہ غرمہ)۔ امام احمد اور اسحق فرماتے ہیں کہ مرتہن مرہون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، مثلاً مرہون جانور تو اس کا دودھ دوینا اور اس پر سواری کرنا۔ ان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔ اور یہ (فائدہ بھی) خرچ کے بقدر اٹھائے گا۔ ان دونوں نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اور وجہ استدلال یہ ہے کہ حدیث اپنے منطوق کے اعتبار اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ انفاق کے بدلے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔ اور راہن کا فائدہ لینا اس طرح نہیں ہے بلکہ اس کے انتفاع کی اجابت اس چیز پر ملکیت کی وجہ سے ہے۔ اور (یہ حدیث) اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ فائدہ حاصل کرنا منفعت کی مذکورہ دو قسموں پر مقصور ہے۔ اور راہن کے لئے انتفاع جواز ان دو قسموں پر مقصور نہیں ہے۔ لہذا اس سے مراد یہ ہے کہ مرتہن کیلئے جائز ہے کہ وہ اس شئی مرہون سے دودھ دوہے اور سواری کرنے کے ذریعہ نفع حاصل کرے نفقہ اور خرچ کرنے کے بدلے اور جب وہ یہ فائدہ حاصل کرے گا تو اس کا نفقہ اس مرتہن پر لازم ہوگا۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے اس لئے کہ یہ سود ہے، چونکہ اس طرح مرتہن فائدہ اٹھائے گا شئی مرہون سے اپنے دین کے بدلے، جو قرض نفع لائے وہ حرام ہے۔ اس کا بہترین جواب یہ ہے کہ کہا جائے کہ ”بنفقتہ“ میں بابدلیت کیلئے نہیں ہے بلکہ معیت کیلئے ہے، اور معنی یہ ہے کہ جانور پر سواری کی جاتی ہے اور خرچ کیا جاتا ہے، پس رہن راہن کو شئی مرہون سے فائدہ اٹھانے سے منع نہیں کرتا اور نہ ہی راہن سے اس کا خرچ ساقط ہوتا ہے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

الفصل الثانی:

شئے مرہون راہن کی ملکیت سے جاہر نہیں ہوتی

۲۸۸۷: عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيْبِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَغْلِقُ الرَّهْنُ الرَّهْنَ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِي رَهَنَهُ لَهُ غَنْمَةً وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ (رواه الشافعی مرسلًا)

اخرجه الدارقطني في السنن ۳۳/۳ الحدیث رقم ۱۳۳ من کتاب البیوع۔

ترجمہ: حضرت سعید بن مسیب (تابعی) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی چیز کو گروی رکھنا مالک کو کہ جس نے وہ چیز بطور گروی رکھی ہے (ملکیت سے) نہیں روکتا (یعنی کسی چیز کو گروی رکھ دینے سے راہن کی ملکیت مرہونہ چیز سے ختم نہیں ہوتی) اس لئے اس گروی رکھی ہوئی چیز کے ہر نفع و بڑھوتری کا حقدار راہن ہے اور وہی اس کے نقصان کا ذمہ دار بھی ہے۔ اس روایت کو امام شافعی نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔

تشریح: لا یغلق: یاہ اور لام دونوں کے فتح اور غین کے سکون کے ساتھ لا یمنع کے معنی میں ہے۔

پہلے لفظ ”راہن“ سے عقد رہن مراد ہے اور دوسرے لفظ ”الرهن“ شئے مرہون مراد ہے۔

اس طور پر کہ اس کے منافع ختم ہو جائیں بلکہ شئے مرہون تو ایسی ہوتی ہے جیسا کہ راہن کی ملکیت میں باقی ہے۔ اور نہ ہی اس میں

کہ اس کا معنی ہے کہ مالک اس کی رہائی طلب نہ کرے۔

یہ زمانہ جاہلیت کا رواج تھا کہ راہن پر جو لازم ہوتا تھا اگر وہ وقت مقررہ تک اس کو واپس نہ کرتا تو مرتہن شے مرہونہ مالک بدجاتا تھا۔ اسلام نے اس رواج کو باطل کر دیا۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث میں ”رہن اول“ مصدر ہے اور ”رہن ثانی“ مفعول ہے۔

غریبین میں ہے کہ مرتہن شے مرہون کا مستحق نہیں ہوتا جب راہن وہ چیز جس کے بدلے رہن رکھ ہے نہ لوٹائے۔

فائق میں ہے کہ کہا جاتا ہے ”غلق الوهن غلوقاً“۔ جب وہ مرتہن کے ہاتھ میں باقی رہے اور راہن اس کے حصول پر قادر نہ ہو۔ ابراہیم نخعی سے غلق دھن کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا، ”اگر کل تک میں نے اس کو نہیں چھڑایا تو یہ تیرا ہے۔“ نہایت یہ اضافہ ہے کہ شیخ ازہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: ”غلق الباب وانغلق واستغلق“، جب اس کا کھولنا مشکل ہو، ”رہن“ میں ”غلق“ فک (چھوڑنے) کی ضد ہے۔ جب راہن مرہون کو چھڑا لیتا ہے، تو وہ اس کو (یعنی اپنے آپ کو) اس شے مرہونہ کے معاہدے سے آزاد کر لیتا ہے۔

لہ: ضمیر راہن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ غنمہ: پہلے حرف کے ضمہ کے ساتھ، اس کے فوائد اور بڑھوتری۔

غرمہ: غین کے ضمہ کے ساتھ، یعنی جس چیز سے شے مرہون کو چھڑایا جائے اس کا اداء کرنا، اور جو حضرات راہن کے ضمان کو مرتہن پر نہیں سمجھتے وہ اس کی تفسیر کرتے ہیں کہ مرہون کا فقہ اور ضمان (راہن کے ذمہ ہے) جب وہ ہلاک ہو جائے مرتہن کے ہاتھ میں، (جیسا کہ ذکر کیا ہے اس کو ہمارے علماء نے۔)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”غنمہ“ سے مراد اس کی زیادت ہے اور ”غرمہ“ سے مراد اس کی ہلاکت اور نقصان ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زوائد جو مرہون سے حاصل ہوں وہ راہن کیلئے ہیں اور جب یہ مرتہن کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے تو یہ راہن کے ضمان سے ہلاک ہوگا۔ اور اس کی ہلاکت سے مرتہن کے حق میں سے کچھ بھی ساقط نہ ہوگا۔ اور جب حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ منافع رہن راہن کیلئے ہیں تو اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ رہن میں شے مرہونہ پر قبضہ میں دوام شرط نہیں ہے، اس لئے کہ راہن اس پر سواری نہیں کر سکتا مگر اس وقت کہ جب وہ مرتہن کے قبضہ سے خارج ہو۔

مغرب میں ہے کہ ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ شے مرہون راہن پر لوٹے گی تو اس کا فائدہ اس کیلئے ہوگا، اور مرتہن اپنے حق کا رجوع راہن سے کرے گا، تو اس کا نقصان بھی اس پر ہوگا۔

شرح السنہ میں ہے کہ حدیث میں ”من صاحبہ“ سے مراد ”لصاحبہ“ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ”من ضمان صاحبہ“ ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے ”غلق“ منع کے معنی کو متضمن ہے اور مطلب یہ ہے کہ رہن شے مرہون کو مالک کے تصرف سے منع نہیں کرتا۔ پھر اس کے بعد اس کا بیان لایا گیا، اور تحقیق کی غرض سے خبر کو مبتدا پر مقدم کر دیا گیا۔ یعنی اس کے تصرف میں مانع نہیں ہے پس اس کا نفع اس کے مالک کیلئے ہوگا نہ کہ کسی غیر کیلئے اور اس کا نقصان اس کے مالک پر ہوگا نہ کہ کسی غیر پر، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتہن کے لئے رہن میں صرف اپنے دین کا وثیقہ ہے، اگر وہ رہن ہلاک ہو جائے یا اس میں کوئی نقص پڑ جائے تو راہن سے رجوع کرے۔

قولہ: رواہ الشافعی مرسلًا: امام شافعی نے صحابی کے واسطے کو حذف کرتے ہوئے حضرت سعید تابعی سے روایت کیا ہے۔

۲۸۸۸: وروی مثله او مثل معناه لا یخالفه عنہ عن ابی ہریرۃ متصلاً۔

اخرجه الحاكم في المستدرک ۵۱/۲۔

ترجمہ: اور اس قسم کی ایک اور حدیث (یعنی ہم معنی بھی اور ہم لفظ بھی) حضرت سعید بن مسیب سے روایت کی گئی ہے جسے سعید

بن سائب نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بطریق اتصال نقل کیا ہے یا وہ روایت ہم معنی ہے اور اس کے الفاظ مختلف ہیں مگر الفاظ کا یہ اختلاف ایسا نہیں ہے جو اس کے ہم معنی ہونے کے منافی ہو۔

تشریح: روی: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں روئی صیغہ معروف کے ساتھ ہے پس ضمیر فاعل شائعی کی طرف لوٹے گی، اور لفظ ”مثل“ منصوب ہی ہے گا۔

لا یخالفہ: اور ایک نسخہ میں ولا یخالفہ ہے۔

عن ابی ہریرۃ: ”روی“ کے متعلق ہے، اور ”یخالفہ“ کی ضمیر مستتر ”روی“ کے فاعل متروک کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ۔

تقریر ”روی“ کے مجہول ہونے کی صورت میں ہے،

اور بر تقدیر ”روی“ کے معروف ہونے کے ”لا یخالف“ حال مؤکدہ ہے ”مثله او مثل معناه“ سے، اور ”عنه“ کی ضمیر دونوں صورتوں میں سعید کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور لا یخالف کی ضمیر مستتر فاعل متروک کی طرف لوٹ رہی ہے، جیسا کہ گزرا اور دوسرے احتمال کے مطابق (یعنی روی کے معروف ہونے کی صورت میں) ”لا یخالف“ کی ضمیر مستتر شائعی کی طرف لوٹے گی، جیسا کہ بعض کا کہنا ہے۔

اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہے: ”لا یخالف المروی او الراوی المروی“

متصلاً“ یہ حال ہے حدیث سے یا اس کی سند سے۔ تو ریشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ہم نے کتاب یعنی مصابیح السنہ میں متصل، پایا ہے حضرت ابو ہریرہ سے سنداً مروی ہے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یہ اس کے ساتھ ملایا گیا ہے، اس لئے کہ اس کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ سعید بن المسیب کی مراسیل میں سے ہے اور اسی طرح سے پرابوداؤد نے اس کو اپنی کتاب میں روایت کیا ہے اور ابن ابی امیہ کے علاوہ کسی نے اس کو متصل ذکر نہیں کیا۔

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کیلئے وعید

۲۸۸۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ الْمِكْيَالُ مِكْيَالُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ وَالْمِيزَانُ مِيزَانُ أَهْلِ مَكَّةَ .

(رواہ ابو داؤد و النسائی)

اخرجه ابو داؤد من السنن ۶۳۳/۳ الحدیث رقم ۳۳۴۰ و النسائی فی ۲۸۴/۷ الحدیث رقم ۲۵۹۴

ترجمہ: اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پیمانہ اہل مدینہ کا معتبر ہے جبکہ اور وزن اہل مکہ کا معتبر ہے۔ (ابوداؤد نسائی)

تشریح: قوله: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ والميزان ميزان اهل مكة :

وعن ابن عمر ان النبي: اور ایک نسخہ میں ”رسول اللہ“ ہے۔

اس لئے کہ وہ زراعت پیشہ ہیں، پس وہ پیمانوں کے بارے میں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔

والميزان ميزان اهل مكة: اس لئے کہ وہ تجارت پیشہ ہیں اور موازن سے ان کا تعلق اور اوزان کے بارے میں ان کی

واقفیت زیادہ تھی جیسا کہ قاضی عیاض نے فرمایا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ حدیث حقوق شرعیہ سے متعلق ہے جو مثلاً زکوٰۃ، کفارات صدقہ فطر، وغیرہ یہاں تک کہ دراہم میں اس وقت

تک زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب تک کہ وہ مکہ کے وزن کے مطابق دو سو درہم تک نہ پہنچ جائیں، اور صدقہ فطر میں ایک صاع، اہل مدینہ کے صاع کے مطابق، ہر صاع پانچ رطل اور ایک تہائی رطل کا ہوتا ہے۔

۲۸۹۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا صُحَابَ الْكَيْلِ وَالْمِيزَانَ إِنَّكُمْ قَدْ وَلَّيْتُمْ أَمْرَيْنِ هَلَكَتَ فِيهِمَا الْأُمَّمُ السَّابِقَةُ قَبْلَكُمْ. (الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۲۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۱۷۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ناپ تول کرنے والوں سے ارشاد فرمایا کہ تمہارے ذمہ ایسے دو کام ہیں (یعنی ناپنا اور تولنا) جن میں (کمی و بیشی) کے سبب تم سے پہلی قومیں ہلاک کی جا چکی ہیں۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَلَكَتَ فِيهِمَا الْأُمَّمُ السَّابِقَةُ قَبْلَكُمْ:

لاصحاب الكيل والميزان انکم: اس کلام کا مخاطب کون ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) یہ خطاب دونوں گروہوں یعنی اہل مکہ اور اہل مدینہ سے ہے، اور خطاب ایک ساتھ ہوا۔

(۲) اصحاب کیل سے مراد اہل مدینہ ہیں اور اصحاب میزان سے مراد اہل مکہ ہیں۔ اور ہر ایک سے ان کے مقام پر خطاب کیا۔ اور

ابن عباس نے دونوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا، سامع کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے، پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ وَلَا يَتَّبِعُوا السَّابِقِينَ﴾۔ قد وليتم: داؤ کے ضمہ اور لام کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ۔

امرین: یعنی دو کاموں کے تم حاکم بنائے گئے ہو۔ ”امرین“ کو ہم اور نکرہ ذکر کیا تم شان پر دلالت کرنے کیلئے، اور اسی وجہ سے

ان کے حق میں کہا گیا ہے: [ویل للمطففين] [المطففين-۱]

هَلَكْتَ فِيهِمَا الْأُمَّمُ السَّابِقَةُ قَبْلَكُمْ: جیسے قوم شعیب کہ وہ لوگوں سے چیز قوم لیتے تھے اور جب لوگوں کو دیتے تھے تو کمی کر

کے دیتے تھے۔

بیع سلم میں میع کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت

۲۸۹۱: عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَلَا يَصْرِفُهُ إِلَى غَيْرِهِ قَبْلَ أَنْ يَقْبِضَهُ. (رواه ابو داؤد وابن احة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۴۴/۳ الحدیث رقم ۳۴۶۸ وابن ماجہ فی ۷۶۶/۲ الحدیث رقم ۲۲۸۳۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی چیز کے بارے میں بیع سلم کا معاملہ کرے تو اس چیز کو قبضہ میں کرنے سے قبل اس کو کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ کرے۔ (ابو داؤد ابن ماجہ)

تشریح: قوله: مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَلَا يَصْرِفُهُ إِلَى غَيْرِهِ قَبْلَ أَنْ يَقْبِضَهُ:

فلا يصرفه: صیغہ نبی کے ساتھ ہے بعض کہتے ہیں کہ صیغہ نفی کے ساتھ ہے، اور ضمیر ”بارزہشی“ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

غیرہ کی ضمیر کے مرجع میں کئی احتمال ہیں: (۱) ”من اسلف“ میں ”من“ کی طرف راجع ہو، یعنی کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت

نہ کرے قبضہ کرنے سے پہلے۔ (۲) ”شئی“ کی طرف راجع ہو، یعنی بیع کو دوسری چیز سے تبدیل نہ کرے قبضہ کرنے سے پہلے۔

بَابُ الْإِحْتِكَارِ

احتکار کا بیان

”احتکار“ کا معنی ہے، غلہ کو رد کرنا جب لوگوں کو اس کی ضرورت ہو، یہاں تک کہ وہ مہنگا ہو جائے۔

الفصل الاول:

اختکار کرنے والا گنہگار ہے

۲۸۹۲: عَنْ مَعْمَرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ اَحْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِيٌّ ۚ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۲۲۷/۳ الحديث رقم (۱۲۹-۱۶۰۰) وابو داؤد في السنن ۷۲۸/۳ الحديث رقم ۳۴۴۷ وابن ماجه في ۷۲۸/۲ الحديث رقم ۲۱۵۴ والدارمي في ۳۲۳/۲ الحديث رقم ۲۵۴۳ واحمد في لمسند ۴۰۰/۶۔

ترجمہ: حضرت معمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اختکار (ذخیرہ اندوزی) کرے وہ گنہگار ہے۔ (مسلم) اور ہم حضرت عمرؓ سے روایت کردہ حدیث ”بنو نضیر کے اموال“ کو باب الفسی میں ذکر کر دیں گے ان شاء اللہ۔

تشریح: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو اختکار حرام ہے وہ صرف غذائی چیزوں میں ہے اس طور پر کہ ایک آدمی غلہ خریدے مہنگائی کے دور میں اور فی الحال اس کو فروخت نہ کرے بلکہ ذخیرہ کریں، تاکہ وہ مہنگا ہو جائے۔ البتہ جو اس کے گاؤں سے آئے یا وہ ارزانی کے وقت میں خرید لے اور ذخیرہ کر لے اور گرانی کے وقت فروخت کرے تو یہ اختکار نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی حرمت ہے۔ البتہ

غذائی اشیاء کے علاوہ میں کسی بھی حال میں اختکار حرام نہیں ہے۔ (پتلی)

امام مالک نے حدیث کے عموم سے استدلال کیا ہے کہ اختکار حرام ہے غذائی اشیاء میں اور اس کے علاوہ میں بھی۔ (جیسا کہ ابن الملک نے مشارق میں ذکر کیا ہے۔)

تخریج: اس کو روایت کیا ہے احمد اور مسلم، اور ابو داؤد اور ترمذی، ابن ماجہ سے ”لا یحتکر“ کے لفظ کے ساتھ۔ اس حدیث کی مناسبت ”فی“ کے ساتھ زیادہ ظاہر ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے اس کو یہاں ذکر کیا ہے باب کے ساتھ اس کے تعلق کو دیکھتے ہوئے اس طور پر کہ اس میں بیان ہے کہ اہل وعیال کے خرچ کیلئے غلہ کو روکنا اختکار نہیں ہے۔ واللہ اعلم

الفصل الثاني:

اختکار کرنے والے کیلئے وعید

۲۸۹۳: عَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْجَالِبُ مَرْزُوقٌ وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُونٌ (رواه ابن ماجه والدارمي)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۷۲۸/۲ الحديث رقم ۲۱۵۳ والدارمي في ۳۲۴/۲ الحديث رقم ۲۵۴۴

ترجمہ: حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (بازار میں) اغلہ لانے والے کو رزق دیا جاتا ہے اور اختکار کرنے والا (ذخیرہ اندوز) ملعون ہے۔ (ابن ماجہ رو)

تشریح: یعنی تاجر کو بغیر کسی گناہ کے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اور اختکار کرنے والا ملعون ہے، یعنی گناہ گار ہے بھلائی سے دور ہے جب تک وہ اس فعل میں مبتلا ہے اور اس کو کوئی برکت بھی حاصل نہیں ہوتی۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں ”ملعون“ کو ”مرزوق“ کے مقابل ذکر کیا ہے اور مقابل حقیقی ”مرحوم“ ہے یا ”محموم“ ہے تاکہ عام ہو۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ”التاجر مرحوم مرزوق“ ہے تاجر بوجہ لوگوں پر وسعت اور کشادگی لانے کے محمود ہے اور اختکار کرنے والا ملعون و محروم ہے بوجہ لوگوں پر تنگی لانے کے۔ امام حاکم نے ابن عمر سے روایت کیا ہے: ”المحتکر ملعون“

حاکم اپنی طرف سے نرخ مقرر نہ کرے

۲۸۹۳: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ عَلَاءُ السَّعْرُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَعَرْنَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَإِنِّي لَا رَجُوعَ أَنَّ الْقِيَّ رَبِّي وَلَيْسَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلَمَةٍ يَدِّمْ وَلَا مَالٍ - (رواه الترمذی و ابوداؤد وابن ماجه)

احرحه ابوداؤد فی السنن ۷۳۱/۳ الحدیث رقم ۳۴۵۱ و الترمذی فی ۶۰۵/۳ الحدیث رقم ۱۳۱۴ وابن ماجه فی ۷۴۱/۲ الحدیث رقم ۲۲۰۰ و الدارمی فی ۳۲۴/۲ الحدیث رقم ۲۵۴۵ و احمد فی المسند ۱۵۶/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں غلہ کا نرخ مہنگا ہو گیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے لئے نرخ مقرر فرما دیجئے یعنی تاجروں کو حکم دے دیجئے کہ وہ اس نرخ سے غلہ فروخت کیا کریں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا اللہ ہی تنگی پیدا کرنے والا ہے اللہ ہی فراخی دینے والا ہے اور اللہ ہی رزق دینے والا ہے میں اس بات کا امیدوار اور خواہش مند ہوں کہ میں اپنے پروردگار سے اس حال میں ملوں کہ مجھ پر تم میں سے کوئی خون اور مال کے بارے میں مطالبہ نہ کرے۔“ (ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: ”سعر“: تسعیر سے امر کا صیغہ ہے اور ”تسعیر“ کہتے ہیں اشیاء کی قیمت مقرر کرنا۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”سعر“ قیمت کو کہتے ہیں تاکہ اسی کے ساتھ بازار میں خرید و فروخت عام ہو۔

قوله: إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ: المسعر: عین مسورہ کی تشدید کے ساتھ۔

القابض الباسط: ان کا معنی اسماء حسنیٰ میں گزر چکا ہے۔ الرزاق: اور ایک نسخہ میں ”الرزاق“ صیغہ مبالغہ کے ساتھ ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ ”ان اللہ المسعر.....“ یہ جواب ہے نرخ مقرر کرنے کی ممانعت کے لئے علت کے طور پر، یہاں ”ان“ کو لایا گیا ہے اور ”ان“ کے اسم کے بعد ضمیر فصل لائی گئی ہے اور خبر کو معرف باللام ذکر کی ہے تاکہ یہ تاکید اور تخصیص پر دلالت کرے۔ پھر اس حکم کو تین پے در پے خبروں پر مرتب کیا حکم کا وصف مناسب پر مرتب ہونے کی طرح اور اللہ یہ علت ہے نرخ کے مہنگا ہونے کی اور اللہ کا ”باسط“ ہونا یہ علت ہے نرخ کی ارزانی کی، اور اللہ کا ”رازق“ ہونا بندوں پر روزی تنگ اور کشادہ کرتا ہے۔

پس جس نے نرخ میں تصرف کیا تو اس نے اللہ کے ساتھ معارضہ اور جھگڑا کیا اس چیز میں جس کا اللہ نے ارادہ کیا ہے اور وہ بندوں کے حقوق کو منہج کرتا ہے ان حقوق میں جن کا اللہ پاک نے ان کو ذمہ دار بنایا ہے گرانی اور ارزانی کا، اور اس آخری معنی کی طرف آپ ﷺ نے اگلے جملہ میں اشارہ کیا ہے۔

قوله: وليس احد منكم يظلمني: یہ جملہ حالیہ ہے۔

مظلمة: لام کے کسرہ کے ساتھ، ”جو تجھ سے کوئی ظلم کر کے لے“ اور ”مغرب“ میں ہے ”مظلمة“ ظلم کو کہتے ہیں، اور محمد کا قول ”وهذا مظلمة للمسلمين“ اسم ہے۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: عند فلان مظلمتی وظلامی ای حقی الذی خدمنی ظلما، یعنی میرا وہ حق جو مجھ سے ظلم کے ساتھ لیا ہے۔

دم: بدل ہے ”مظلمة“ سے۔

ولا مال: امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو لانا فیہ کے ساتھ لایا تاکہ کید کے واسطے بغیر تکرار، اس لیے کہ معطوف علیہ سیاق نفی میں ہے، اور مال سے مراد یہ ”تسعیر“ ہے اس لئے کہ یہ مظلوم سے لیا گیا ہے یہ جنایت کے تاوان کی طرح ہے۔ اور ”مظلمة“ اس کیلئے تمہید کے طور پر لایا ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ ’وانی لا رجوا الخ‘۔ اس میں اشارہ ہے کہ آپ کو نرغ مقرر کرنے سے منع کرنے والی بات لوگوں کے اموال میں ظلم کا خوف ہے۔ اس لئے کہ نرغ مقرر کرنا یہ مال میں مالک کی اجازت کے بغیر تصرف ہے، پس یہ ظلم ہو جائے گا۔ اور نرغ مقرر کرنے کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ یہ رعیتوں میں تیزی پیدا کر دیتا ہے اور بیع سے رکنے پر ابھارتا ہے اور پھر یہ بسا اوقات قحط کی طرف لیجاتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو احمد، ابن حبان اور بیہقی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ”ان الله هو الخالق القابض الباسط الرازق المسعر، وانی لا رجوا الله ان القی ولا یطلبنی احد بظلمة ظلمتها اباہ فی دم ولا مال“۔ واللہ اعلم

الفصل الثالث:

غلہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کیلئے موعظت و عبرت

۲۸۹۵: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ اَحْتَكَرَ عَلَي الْمُسْلِمِينَ طَعَامَهُمْ ضَرَبَهُ اللَّهُ بِالْجَذَامِ وَالْاَفْلَاسِ. (رواه ابن ماجه والبيهقي في شعب الايمان ورزين في كتابه (ابن ماجه) لبيهي رزين)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۷۲۹/۲ الحديث رقم ۲۱۵۵ واحمد في المسند ۲۱/۱

ترجمہ: ”حضرت عمر بن خطابؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرمائے ہوئے سنا کہ جس شخص نے غلہ روک کر گراں نرغ پر مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کیا اللہ تعالیٰ اسے جذام کے مرض اور افساس میں مبتلا کر دیتا ہے“۔ (ابن ماجہ بیہقی رزین)

تشریح: قوله: يَقُولُ مَنْ اَحْتَكَرَ عَلَي الْمُسْلِمِينَ طَعَامَهُمْ ضَرَبَهُ اللَّهُ بِالْجَذَامِ وَالْاَفْلَاسِ:

طعامهم: ”طعام“ کی اضافت ”مسلمین“ کی طرف کی ہے اگرچہ ”محتکر“ کی ملکیت ہے یہ بتانے کیلئے کہ یہ غلہ مسلمانوں کی غذا ہے جیسے اور اسی سے ان کی زندگانی ہے اس آیت میں ”اموال“ کی اضافت ہے: ﴿وَلَا تَتَوَاتَا السَّفَهَاءُ اَمْوَالِكُمْ﴾ [النساء: ۵] اسلئے کہ یہ اس چیز کی جنس میں سے جس کے ذریعے لوگ اپنے معاش کو قائم کرتے ہیں۔

الجذام: جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ ”جذام“ ایک بیماری ہے جس میں جلد پھٹ جاتی ہے اور گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جاتا ہے۔
اَفْلَاسٌ: حدیث سے معلوم ہوا کہ جو مسلمانوں کو ادنیٰ سا بھی نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے گا اللہ اس کو جسمانی اور مالی بلاؤں میں مبتلا کر دیتا ہے اور جو مسلمانوں کو نفع پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے جسم و مال میں خیر و برکت عطا کرتا ہے۔

۲۸۹۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ اَحْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِينَ يَوْمًا يُرِيدُ بِهِ الْعَلَاءَ فَقَدْ بَرِيَ مِنَ اللَّهِ وَبَرِيَ اللَّهُ مِنْهُ (رواه رزين)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۵۲۵/۷ الحديث رقم ۱۱۲۱۵۰

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے چالیس دن تک قیمت بڑھانے کے خیال سے ذخیرہ اندوزی کی تو گویا وہ اللہ سے بیزار ہوا اور اللہ اس سے بیزار ہوا“۔ (رزین)

تشریح: قوله: مَنْ اَحْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِينَ يَوْمًا چالیس دن سے مراد خاص وقت کی تحدید نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ احتکار کو اپنی حرفت بنالے۔ اور اس سے اس کا ارادہ اپنا فائدہ اور دوسرے کا نقصان۔ اگلے جملہ کا بھی یہی مطلب ہے۔ کم از کم مدت جس میں آدمی اپنی حرفت میں مالدار بن جاتا ہے وہ یہ مدت ہے۔

فقد برى من الله وبرى الله منه: یعنی اس نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے بیثاق اور وعدہ کو توڑ دیا۔ یہاں اس کی براءت کو اللہ

کی براءت پر مقدم کیا ہے یہ اس لئے کہ اس کا اللہ کے ساتھ اس وعدہ کو پورا کرنا مقدم ہے اللہ کے اس کے ساتھ وعدے کو پورا کرنے سے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿أَوْفُوا بعهدي أوف بعهدكم﴾ [البقرة-۴۰] (اور پورا کرو تم میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو)۔ یہ بہت سخت وعید اور بہت بڑی دھمکی ہے احتکار ذخیرہ اندوزی کے بارے میں۔

اس حدیث کو امام احمد و حاکم نے یوں روایت کیا ہے:

من احتكر حكرة يريد ان يغلي بها على المسلمين فهو خاطيء وقد برئت منه ذمة الله ورسوله،
”جس نے ذخیرہ اندوزی کی اس ارادے سے کہ اس کے ذریعے مسلمانوں پر گرانی کرے تو یہ شخص گنہگار ہے اور اللہ اور رسول کا ذمہ اس سے بڑی ہے۔“

۲۸۹۷: وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ بِنَسِ الْعَبْدِ الْمُحْتَكِرِ اِنْ اَرْخَصَ اللَّهُ الْاَسْعَارَ حَزْنَ وَاِنْ اَعْلَاهَا فِرْحًا. (رواه البيهقي في شعب الايمان ورزين في كتابه)

احرجه البيهقي في شعب الايمان ۵۲۵/۷ الحديث رقم ۱۱۲۱۵۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غلہ وغیرہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والا بندہ بہت برا ہے اگر اللہ تعالیٰ ترخوں میں کمی کرتا ہے تو وہ غمگین ہو جاتا ہے اور اگر ترخوں کو بڑھاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔“ (بیہقی رزین)

تشریح: حزن: زاء کے کسرہ کے ساتھ لازم ہے اور فتح کے ساتھ متعدی ہے۔ یہاں مراد اول ہے۔

۲۸۹۸: وَعَنْ أَبِي اُمَامَةَ اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ اَحْتَكِرَ طَعَامًا اَرْبَعِينَ يَوْمًا ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهِ لَمْ يَكُنْ لَهُ كَفَّارَةٌ.

رواه رزين

ترجمہ: ”اور حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے چالیس دن تک ذخیرہ اندوزی کی اور پھر اسے (اللہ کی راہ میں) خیرات کر دیا تو وہ اس کے لئے کفارہ نہیں ہوگا۔“ (رزین)

تشریح: قوله: قال من احتكر طعاما یعنی اس غلے کو فرض صدقہ کی ملد میں اداء کرے یا مطلب یہ ہے کہ وہ پورا صدقہ کر دے۔

کفارۃ: نصب کے ساتھ ہے اور ”لہ“ ظرف لغو ہے اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے، اس صورت میں ’کان‘ ناقصہ ہوگا۔ امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”بہ“ کی ضمیر ’طعام‘ کی طرف راجع ہے۔ ذخیرہ کیا ہو غلہ صدقہ نہیں کیا جاتا، پس لازم ہے کہ یہاں ”ارادۃ“ کو مقدر مانا جائے تو یہ مبالغہ کا فائدہ دے گا کہ جس نے احتکار کا ارادہ اور نیت کی تو اس کا حال یہ ہے، تو جس نے اس فعل کا ارتکاب کیا اس کا کیا حال ہوگا؟

روایات باب: ابن عساکر نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

”من احتكر طعاما على امتي اربعين يوماً وتصدق به لم يقبل منه“۔

بَابُ الْاَفْلَاسِ وَالْاِنْظَارِ

افلاس اور مہلت دینے کا بیان

نہایہ میں ہے: ”افلس الرجل“ اس وقت کہتے ہیں کہ جب آدمی کے پاس مال میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے، یا اس کے دراہم، پیسوں سے بدل جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی حالت ہو جائے کہ کہا جائے کہ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ اور ”انظار“ ”تاخیر“

اور مہلت کو کہتے ہیں۔

الفصل الاول:

مفلس ہو جانے والے کے بارے میں ایک مسئلہ

۲۸۹۹: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَيُّمَا رَجُلٍ أَفْلَسَ فَأَدْرَكَ رَجُلٌ مَالَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ حَقٌّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ ۵ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۲/۵ الحدیث رقم ۲۴۰۲ ومسلم فی صحیحہ ۱۱۹۴/۳ وابو داؤد فی السنن ۷۹۱/۳ الحدیث رقم ۳۵۲۰ والترمذی فی ۵۶۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۶۲ والنسائی فی ۳۱۱/ الحدیث رقم ۴۶۷۶ وابن ماجہ فی ۷۹۰/۲ الحدیث رقم ۲۵۹۰ ومالك فی لموطأ ۶۷۸/۲ الحدیث رقم ۸۸ من کتاب البیوع واحمد فی المسند ۴۶۸/۲۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص مفلس ہو جائے اور کوئی شخص (کہ جس نے اس کے ہاتھ اپنا مال بیچا تھا اس کے پاس) اپنا مال اسی صورت میں پائے تو وہ (مال والا) شخص کسی دوسرے کے مقابلے میں اس مال کا زیادہ حقدار ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: أَيُّمَا رَجُلٍ أَفْلَسَ : مراد یہ ہے کہ نہ اس میں حسی تبدیلی آئی ہو اور نہ معنوی طور پر تصرفات شرعیہ کے ساتھ جیسے ہبہ اور وقف وغیرہ ہے۔

یہی امام شافعی اور مالک کا مسلک ہے، اور ہمارے نزدیک نہ اس کو فسخ کرنے کا اختیار ہے اور نہ مال واپس لینے کا حق پہنچتا ہے۔ بلکہ وہ باقی تمام قرض خواہوں کی طرح ہے۔ ہم حدیث کو محمول کرتے ہیں کہ جب بیع میں خیار شرط ہو، یعنی خیار شرط بائع کی طرف سے ہو اور مدت خیار کے اندر اس کو معلوم ہو جائے کہ مشتری دیوالیہ ہے، تو اب اس کیلئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ بیع کو فسخ کر دے۔ (جیسا کہ ذکر کیا ہے ابن الملک نے۔)

شرح السنہ میں ہے کہ اکثر اہل علم کا عمل اس پر ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب خریدار دیوالیہ ہو جائے قیمت اداء نہ کر سکتا ہو، اور بیچنے والا اپنا مال بیع نہ اس کے پاس پالے تو اس کو چاہئے کہ بیع کو فسخ کر لے اور مال اپنا بیع نہ لے لے، اور اگر اس نے قیمت لی تھی کہ باقی کی ادائیگی سے پہلے ہی مفلس ہو گیا تو یہ قیمت کے بقدر اپنا مال لے لے، یہی فیصلہ حضرت عثمانؓ نے کیا ہے اور حضرت علیؓ سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ صحابہ میں سے کسی نے ان دونوں کی مخالفت کی ہو، اور یہی امام مالکؓ اور شافعیؒ کا مسلک ہے۔

مفلس ہو جانے والے کی امداد کرنے کا حکم

۲۹۰۰: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ أُصِيبَ رَجُلٌ فِي عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ فِي تِمَارٍ ابْتَاعَهَا فَكُثِرَ دَيْنُهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَصَدَّقُوا عَلَيْهِ فَتَصَدَّقَ انْثَاسُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَبْلُغْ ذَلِكَ وَقَاءَ دَيْنَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَعْنُ مَانِهِ خُذُوا مَا وَجَدْتُمْ وَلَيْسَ لَكُمْ إِلَّا ذَلِكَ. (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحہ ۱۱۹۱/۳ الحدیث رقم (۱۸-۱۵۵۶) والترمذی فی السنن ۴۴/۳ الحدیث رقم ۶۵۵ والنسائی فی ۳۱۲/۷ الحدیث رقم ۴۶۷۸ وابن ماجہ فی ۷۸۹/۲ الحدیث رقم ۲۳۰۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص کو پھلوں کی تجارت میں نقصان ہوا (جو اس نے خریدے تھے) اور اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ مقررہ ہو گیا (اس کی حالت دیکھ کر) رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ اس پر

صدقہ کرو (تاکہ یہ قرض کے بوجھ سے ہلکا ہو) لوگوں نے صدقہ کے ذریعہ اس کی مدد کی، مگر لوگوں کی مدد بھی اس کے قرض کی پوری ادائیگی کے لئے کافی نہ ہو سکی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ تم اس سے جو کچھ بھی پاؤ بس اس سے وہ لے لو تمہارے لئے بس یہی کچھ ہے۔ (مسلم)

راوی حدیث:

امیہ بن صفوان۔ یہ امیہ بن صفوان ہیں جو "امیہ بن خلف جہمی" کے بیٹے تھے۔ یہ اپنے والد صفوان سے روایت کرتے ہیں اور اپنے بھتیجے عمرو وغیرہ سے عاریت کے مسئلہ میں روایت کی ہے۔ امیہ تصغیر کے ساتھ ہے "صفوان" میں صادمہملہ مفتوح اور فاء ساکن ہے۔

تشریح: ر.جل: اکمل کہتے ہیں یہ معاذ بن جبل تھے۔ ثمار: اصیب کا متعلق ہے۔

فکشر دینہ: ثاء کے ضمہ کے ساتھ، یعنی وہ پھل بیچنے والے نے اس کے قیمت کا مطالبہ کیا اور اسی خرچ دوسرے قرض خواہوں نے بھی مطالبہ کیا اور اس کے پاس مال نہیں تھا کہ ان کا قرض ادا کرتا۔

ولیس لكم الا ذلك: یعنی جو تم نے پایا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے نہیں مگر جو تم نے پایا اس کا لینا اور باقی میں اس کو مہلت دینا مالدار کی تک۔

مظہر فرماتے ہیں تمہارے لئے مناسب نہیں ہے اس کو تنگ کرنا اور قید کرنا، اس لئے کہ اس کا افلاس ظاہر ہو چکا ہے، اور جب ایک آدمی کا افلاس ثابت ہو جائے تو اب اس کو دین کی وجہ سے قید کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کو چھوڑا جائے اور اس کو مہلت دی جائے یہاں تک کہ اس کے پاس مال آجائے، تو قرض خواہ وہ لے لیں، اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو تم نے پایا یہی ہے تمہارے لئے بس یہی ہے اور اسکے علاوہ جو تمہارے قرض ہے وہ ساقط ہو گیا۔ چونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَانْكَانَ ذُو عَسْرَةٍ فَنظَرَ نَاظِرًا﴾ [البقرہ: ۲۸۰]

وصولی قرض میں درگزر کرنے کا اجر

۲۹۰۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يَدَّيْنِ النَّاسَ فَكَانَ يَقُولُ لِفَتَاهُ إِذَا آتَيْتَ مُعْسِرًا تَجَاوَزْ عَنْهُ لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يَتَجَاوَزَ عَنَّا قَالَ فَلَقِيَ اللَّهَ فَتَجَاوَزَ عَنْهُ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۰۸/۴ الحدیث رقم ۲۰۷۸ و مسلم فی ۱۱۹۶/۳ الحدیث رقم (۳۱-۱۰۶۲) واحمد فی

المسند ۲/۲۶۳

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک شخص تھا جو لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اس نے اپنے ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ جب کسی تنگ دست کے پاس (قرض وصول کرنے) جاؤ تو اس سے درگزر کرو شاید اللہ تعالیٰ ہم سے درگزر فرمائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جب اس نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی (یعنی اس کا انتقال ہوا) تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرمایا (اور اس کے گناہوں پر مواخذہ نہیں فرمایا)"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: فكان يقول لفتاه: امام نووی فرماتے ہیں کہ اپنے غلام کو کہا کرتا تھا، جیسا کہ دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے۔ تجاوز عنه: یعنی اس سے قرض کا مطالبہ کرنے اور حق وصول کرنے اور اس چیز کے قبول کرنے میں جس میں کچھ عیب ہو، چشم پوشی اور تسامح سے کام لے۔

لعل الله ان يتجاوز عنا: امام طیبی فرماتے ہیں کہ "لعل" یہاں بمعنی "عسی" ہے، اسلئے اس کو "ان" کے ساتھ لائے ہے یعنی اصل میں "عسی الله ان يجاوز عنا" ہے، اسلئے کہ "لعل الله ان يجاوز" نہیں کہا جاتا بلکہ بغیر "ان" کے "يجاوز" کہا جاتا ہے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ آپ ﷺ نے "يتجاوز عنا" صیغہ جمع کے ساتھ کہنے کے بعد فتجاوز عنه کیسے کہا۔ جواب یہ ہے کہ قائل کی

مراد اپنا ہی نفس تھا، لیکن اس نے ضمیر جمع کو ذکر کیا، اس ارادے سے کہ جو اس طرح کا کام کرے اس سے بھی اللہ درگزر فرمائے اور یہ اس میں داخل ہو دخول اولیٰ کے ساتھ، اسی لئے تو دعا کرنے والے کے لیے یہ مستحب ہے کہ وہ دعاء عام کرے صرف اپنے آپ کو خاص نہ کرے، شاید کہ اللہ پاک دوسروں کی برکت سے اس کی دعا قبول فرمائے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تنگ دست کو مہلت دینے اپنا پورا دین یا بعض دین چھوڑنے کی فضیلت ہے اور قرض اور دین کے مطالبہ کرنے اور وصول کرنے میں چشم پوشی کرنے کی فضیلت ہے، اس میں تنگ دست اور مالدار برابر ہے، اور بھلائی کے کسی کام کو حقیر نہیں سمجھا جائے شاید کہ یہی کام کامیابی اور سعادت کا سبب ہو، اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غلام کو وکیل بنانا اور اس کو تصرفات کی اجازت دینا جائز ہے۔ اور یہ ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ ہم سے پہلی شریعتوں کے احکام ہمارے لئے بھی ہیں۔ (اتحییٰ کلامہ)

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس بات کی ضرورت نہیں ہے چونکہ جب شارع نے اس کو اچھا جانا، اور برقرار رکھا اور تکبیر نہیں فرمائی تو یہ ایک مستقل دلیل ہے۔

۲۹۰۲: وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُنَجِّهَهُ اللَّهُ مِنْ كُرْبٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَلْيَنْقِسْ عَنْ مُعْسِرٍ أَوْ يَضَعْ عَنْهُ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۹۶/۳ الحدیث رقم (۳۲-۱۰۶۳)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے تو اسے چاہئے کہ وہ مفلس و تنگ دست کو اپنا قرض وصول کرنے میں مہلت دے یا اس کو معاف کر دے (یعنی اپنا پورا قرض یا جس قدر ممکن ہو معاف کر دے)۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُنَجِّهَهُ اللَّهُ مِنْ كُرْبٍ: ان ینجیہ اللہ: اور ایک نسخہ میں جیم کی تشدید کے ساتھ ہے کرب: کاف کے ضمہ اور واؤ کے فتح کے ساتھ جمع ہے ”کربۃ“ کی سخت آزمائش اور مشقت کو کہتے ہیں۔ فلینقس: فاء کی تشدید کے ساتھ۔ عن معسر: یعنی اتنی مدت تک جس میں وہ مال پالے۔ یضع: جزم کے ساتھ۔

یعنی اتنی مدت تک جس میں وہ مال پالے۔ یضع: جزم کے ساتھ۔

پہلی حدیث: یوں تو فرض اعمال نفل اعمال سے ستر درجے زیادہ فضیلت کے حامل ہیں لیکن بعض مسائل میں نفل اعمال فرض اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں:

اول: تنگ دست کو اپنا حق معاف کر دینا یا اگر چہ مستحب ہے لیکن مفلس و تنگ دست کو مہلت دینے سے افضل ہے جو واجب ہے۔

دوم: دوسرے کو سلام کرنا سنت ہے لیکن یہ افضل ہے سلام کے جواب دینے سے جو فرض ہے۔

سوم: وقت سے پہلے وضوء کرنا مستحب ہے لیکن یہ افضل ہے وقت شروع ہو جانے کے بعد وضوء کرنے سے جو فرض ہے۔

۲۹۰۳: وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا أَوْ وَضَعَ عَنْهُ أَنْجَاهُ اللَّهُ مِنْ كُرْبٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحہ ۲۳۰۲/۴ الحدیث رقم (۷۳-۳۰۰۶)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس شخص (اپنا مطالبہ وصول کرنے میں) مفلس کو مہلت دی یا اس کو (اپنا پورا مطالبہ یا اس کا کچھ حصہ) معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کی سختیوں سے نجات عطا فرمائے گا“۔ (مسلم)

۲۹۰۴: وَعَنْ أَبِي الْبَسْرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا أَوْ وَضَعَ عَنْهُ أَظَلَّهُ اللَّهُ فِي

ظِلِّهِ . (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحہ ۲۳۰۲/۴ الحدیث رقم (۷۳-۳۰۰۶)۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوالیسر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، جس شخص نے منگدست کو مہلت دی یا اس کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا (یعنی قیامت کے دن اسے گرمی کی تپش اور اس دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے گا)۔“ (مسلم)

تشریح: اظلمہ اللہ فی ظلہ: اس کی توضیح میں علماء کی مختلف آراء ہیں:

(۱) قیامت کی گرمی کے تپش سے اسے محفوظ رکھے گا۔ اس صورت میں ”فی ظلہ“ بطور کنایہ ہے۔

(۲) حقیقۃً اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عرش کے سائے تلے کھڑا کریں گے، (اس کو امام طیبی نے ذکر کیا ہے۔)

(۳) ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اس کی عزت اور اکرام ہے، اور بری جگہ میں کھڑا ہونے سے بچانا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے:

فلان فی ظل فلان۔ یعنی اس کی حفاظت اور رعایت میں ہے۔

تخریج: امام احمد، ابن ماجہ، اور حاکم نے حضرت بریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

”من تنظر معسراً فله بكل یوم مغلہ صدقته قبل ان یحل الدین فاذا حل الدین فانظره فله بكل یوم مغلہ

صدقة“

”جو شخص مفلس و منگدست کو مہلت دے تو ادائیگی کا دن آنے تک اس کو ہر دن کے بدلے اس کے قرض کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور پھر جب ادائیگی کا دن آئے اور پھر وہ اسے مہلت دے دے تو اس کو ہر دن کے بدلے اس کے قرض کی دگنی مقدار کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔“

خوبی کے ساتھ قرض ادا کرنے والا بہترین شخص ہے

۲۹۰۵: وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ اسْتَسْلَفَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَكْرًا فَجَاءَتْهُ اِبْلٌ مِّنَ الصَّدَقَةِ قَالَ ابُو رَافِعٍ فَاَمْرِي اَنْ اُقْضَى الرَّجُلَ بَكْرًا فَقُلْتُ لَا اَجِدُ اِلَّا جَمَلًا خِيَارًا رَّبَاعِيًّا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطِهِ اَيًّا هُوَ فَاِنَّ خَيْرَ النَّاسِ اَحْسَنُهُمْ قَضَاءً . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۲۲۴/۳ الحدیث رقم (۱۱۸-۱۶۰۰) و ابوداؤد فی السنن ۶۴۱/۳ الحدیث رقم ۳۳۴۶ والترمذی فی ۶۰۹/۳ الحدیث رقم ۱۳۱۸ والنسائی فی ۷۹۱/۷ الحدیث رقم ۴۶۱۷ و ابن ماجہ فی ۷۶۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۸۵ والدارمی ۳۳۱/۲ الحدیث رقم ۲۵۶۵

ترجمہ: اور حضرت ابورافع کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے ایک جوان اونٹ بطور قرض لیا اور پھر جب آپ ﷺ کے پاس زکوٰۃ کے اونٹ آئے تو ابورافع کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس شخص کو (کہ جس سے آپ ﷺ نے اونٹ بطور قرض لیا تھا) ایسا ہی ایک جوان اونٹ دے دوں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس جیسا کوئی اونٹ نظر نہیں آ رہا ہے البتہ ایک اونٹ ہے جو اس کے اونٹ سے اچھا ہے اور سات سال کی عمر کا ہے (لہذا میں اس کے اونٹ سے اچھا اونٹ کیسے دیدوں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسے اچھا ہی اونٹ دے دو کیونکہ لوگوں میں بہترین شخص وہی ہے جو قرض کی ادائیگی میں سب سے اچھا ہو۔“ (مسلم)

تشریح: بکرا: باء کے فتح اور کاف کے سکون کے ساتھ، جوان اونٹ کو کہتے ہیں، جیسا کہ انسانوں میں غلام ”لڑکا“ ہوتا ہے۔

قال ابو رافع فامرني أن قضى الرجل بكرة فقلت لا اجد الا جملا خيارا :

کہا جاتا ہے: جمل خيار و ناقة خيارا ای مختاراً

رباعیا: راء کے فتح باء اور یاء کی تخفیف کے ساتھ، وہ اونٹ جس کی عمر چھ سال ہو کر ساتواں سال شروع ہو، اس وقت اس کے رباعی دانت ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں۔

قال رسول اللہ ﷺ اعطه اياه فان خير الناس احسنهم قضاء :

صاحب شرح السنہ نے اس حدیث کے تحت چند فقہی مسائل تحریر فرمائے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) امام بادشاہ کیلئے جائز ہے کہ وہ فقراء کیلئے قرض لے جب وہ دیکھے کہ ان کو ضرورت ہے اور پھر اس کو زکوٰۃ کے مال سے اداء کرے اگر وہ قرض محتاجوں تک پہنچایا ہو۔ (۲) جانور کا قرض لینا جائز ہے اور پھر اس کا قرض دار کے ذمہ میں ثابت ہونا بھی معلوم ہوا۔ یہ اکثر اہل علم کا قول ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ (۳) جس نے کوئی چیز قرض لی تو وہ اس کی مثل لوٹائے گا جو اس نے قرض لی تھا، چاہے وہ ذوات القیم میں سے ہو نبی ﷺ نے اس کا مثل لوٹانے کا حکم دیا تھا۔ (۴) جس نے کوئی چیز بطور قرض کے لی اور پھر اس سے اچھی یا زیادہ لوٹائی بغیر شرط کے تو یہ اچھا ہے، اور قرض خواہ کیلئے یہ حلال ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرض خواہ کیلئے زیادت جائز ہے چاہے وہ زیادہ صفت کے اعتبار سے ہو یا عدد کے اعتبار سے، اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ عدد کے اعتبار سے زیادہ لینا منع ہے اور ہمارے علماء کی دلیل آپ ﷺ کی اس حدیث کا عموم ہے: ”فان خیر الناس احسنهم قضاء“۔ حدیث میں دلیل ہے کہ قرض میں یا دین میں اچھی چیز لوٹانا سنت ہے اور مکارم اخلاق میں سے ہے، اور یہ اس قرض میں سے نہیں ہے جو: ”کل فرض جمر نفعاً فهو ربو“ ہو اس لئے کہ زیادہ لینا اس وقت ناجائز ہے جب عقد قرض کے وقت زیادت کی شرط لگائی ہو۔

اس حدیث میں ایک اشکال ہے کہ وہ صدقات اور زکوٰۃ کی دیکھ بھال کرنے والے کیلئے اس میں سے کوئی چیز بطور تبرع دینا جائز نہیں ہے تو پھر آپ علیہ السلام نے قرض خواہ کو اس کے حق سے بڑھ کر کیسے دیا؟

یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے یہ اونٹ اپنے لئے قرض لیا تھا اور پھر ادائیگی قرض کیلئے زکوٰۃ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ خریدا، اور قرض اداء کیا۔ اور اس پر ابو ہریرہ کی حدیث دلالت کرتی ہے: ”اشتروا له بعیرا فاعطوه اياه“ اس حدیث میں دلیل ہے ہر قسم کے جانور قرض لینا جائز ہے۔ امام مالک شافعی اور جمہور علماء سلف و خلف کا مذہب یہی ہے، البتہ باندی کو قرض کے طور پر دینا جائز نہیں ہے۔

اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جانوروں کا قرض لینا جائز نہیں ہے، اور احادیث صحیحہ اس کے خلاف ہیں اور منسوخ ہونے کا دعویٰ بغیر دلیل کے قبول نہیں۔

اکمل الدین کہتے ہیں کہ اس حدیث سے جانوروں کے قرض لینے کا جواز اور اس کا ذمہ میں ثابت ہونا معلوم ہوتا ہے، اور یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ لیکن یہ محل نظر ہے اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ وہ ادائیگی ہو جس کے ساتھ وہ اونٹ خریدا گیا تھا، اس لئے کہ حدیث میں اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ یہ اونٹ بطور قرض کے لیا تھا۔

تخریج: امام ابن ماجہ نے حضرت عمر باض بن ساریہ سے آخری جملہ یوں روایت کیا ہے: ”خیر الناس خیر ہم قضاء“۔

قرض خواہ تقاضا کر سکتا ہے

۲۹۰۶: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَجُلًا تَقَاضَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَأَغْلَطَ لَهُ فَمَهَّمْ أَصْحَابُهُ فَقَالَ دَعُوهُ فَإِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا فَاسْتَرَوْا لَهُ بَعِيرًا فَأَعْطَوْاهُ آيَاهُ قَالُوا لَا نَجِدُ إِلَّا أَفْضَلَ مِنْ سِنِّهِ قَالَ اسْتَرَوْهُ فَأَعْطَوْهُ آيَاهُ فَإِنَّ خَيْرَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۸۳ الحدیث رقم ۲۳۰۶ و مسلم فی ۳/۲۲۵ الحدیث رقم (۱۲۰-۱۶۰) والترمذی فی ۳/۸۰ الحدیث رقم ۱۳۱۷ واحمد فی المسند ۲/۴۱۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے ”قرض کی واپسی کا تقاضا کیا وہ آپ ﷺ سے سخت کلامی سے پیش آیا۔ آپ ﷺ کے صحابہؓ نے (جب اس کو ”اس سخت کلامی اور آداب نبوت کے خلاف اس کی حرکت پر) اس کو سزا دینے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اسے چھوڑ دو کیونکہ صاحب حق (قرض خواہ) کو کہنے کا اختیار ہے البتہ ایسا کرو کہ ایک اونٹ خرید کر اسے دے دو (تا کہ اس کا حق ادا ہو جائے اور اسے پھر کچھ کہنے کا اختیار نہ رہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ ”اس نے آپ ﷺ کو بطور قرض جو اونٹ دیا تھا) ہم اس کی عمر سے زیادہ عمر کے سوا کوئی اونٹ نہیں پاتے (یعنی اس کا اونٹ چھوٹا اور کتر تھا اور تمہیں جو اونٹ مل رہا ہے وہ اس کے اونٹ سے بڑا اور اچھا ہے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (جو اونٹ تمہیں مل رہا ہے) اسی کو خرید لو (اگر وہ اس کے اونٹ کی بہ نسبت بڑا اور اچھا ہے) اور اسے دے دو کیونکہ تم میں بہتر وہ شخص ہے جو قرض ادا کرنے میں اچھا ہو۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: ان رجلا تقاضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نہایہ میں ہے کہ تقاضی کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ سے اس چیز کا مطالبہ کیا، اور اپنے دین کے لینے کا ارادہ کیا۔ (اتھلی)۔ اور شاید یہ تاخیر اس لئے ہوئی ہو کہ اس جیسا اونٹ یا اس کی قیمت نہیں تھی۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اغلاظ سے مراد یہاں مطالبہ کرنے میں سختی ہے جس میں کوئی بری بات نہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ کہنے والا کوئی کافر یا کوئی یہودی۔ وغیرہ ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شاید یہ تقاضا کرنے والا گنوار دیہاتی تھا، یا ان لوگوں میں سے تھا جن کے دل میں ایمان ابھی تک راسخ نہیں تھا۔

فہم اصحابہ: یعنی ارادہ کیا کہ اس کو ڈانٹا دیا جائے اور کوئی سزا دی جائے لیکن آپ آداب کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

فان لصاحب الحق مقالا:

ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہاں حق سے مراد قرض ہے یعنی اگر کسی شخص کو کسی پر قرض ہو اور وہ ادائیگی قرض میں تاخیر کرے تو قرض خواہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ تقاضا کرے، اس پر اظہار ناراضگی کرے اور حاکم وعدالت کی طرف رجوع کرے۔ اور یہی مراد ہے ”مقال“ اور ”صاحب“ کے اختیار سے۔ (جیسا کہ شرح المشارق میں ہے۔)

شرح مصابح میں ہے کہ اس حدیث سے جو معلوم ہوتا ہے صاحب حق قرض دار سے نرمی کے ساتھ بات کرنے کا بجائے سختی سے بات کرے اس طور پر کہ اس پر زبان کھولے اور اس کو ظلم کی طرف منسوب کرے اور ناجائز طریقے سے لوگوں کے مال کھانے کی طرف منسوب کرے جب اس کی طرف سے ٹال مٹول اور ممالطت ثابت ہو جائے۔ (اتھلی)

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا تصور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ قرض دار کے بارے میں کیا جاسکتا ہے۔ اس حدیث کی بنیاد درحقیقت آپ کی دوسری حدیث ”مطل الغنی ظلم“ ہے۔ اور شاید یہ اللہ پاک کے اس ارشاد سے اقتباس ہو: ﴿لَا يَحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ﴾ الآية (اللہ تعالیٰ بُری بات کو زبان پر لانا پسند نہیں کرتا)۔

قالوا لا نجد الا فضل من سنه: اس کا اونٹ چھوٹا اور بے کارتھا اور جو موجود تھا وہ رباعی اور بہت ہی اچھا تھا۔

اور روایت کیا ہے اس کو طبرانی اور ابن حبان، اور حاکم، بیہقی نے حضرت زید بن سعید سے، ”سعید“ عین اور نون کے فتح کے ساتھ جیسا کہ اس کو مقید کیا ہے اس کے ساتھ عبد الغنی نے اور دارقطنی نے اس کو یاء کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اور یہ شخص وہی ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ یہود کے بڑے علماء میں سے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، جس نے کہا تھا کہ علامات نبوت میں سے کوئی چیز ایسی نہیں رہی جس کو میں نے نہ دیکھا سوائے دو علامات کے ان کے بارے میں مجھے خبر نہیں ہو سکی کہ اس کا حکم اور بردباری اس کے غصہ اور جہل سے سبقت کرے گی اور غصہ اور جہل کی زیادتی اس پر زیادہ نہیں کرے گی مگر حکم اور بردباری۔ پس میں آپ کے ساتھ نرمی سے پیش آتا تھا تاکہ میرا آپ کے ساتھ اختلاط ہو اور میں آپ ﷺ کی بردباری اور غصہ کو پہچانوں۔ پس میں نے آپ علیہ السلام کے ہاتھ کھجور فروخت کیں ایک مدت تک کے لئے، میں نے کھجور آپ علیہ السلام کو دیدیں اور مدت پوری ہونے سے دو تین دن پہلے میں آپ ﷺ کے پاس آیا، میں آپ کو قیص کے گریبان اور چادر سے پکڑا اور آپ ﷺ کی طرف سخت چہرہ سے دیکھا، پھر میں نے کہا کہ اے محمد! کیا تو میرا حق مجھے نہیں دیتا؟ خدا کی قسم تم اے بنی عبدالمطلب! انال مثل کرنے والے ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اے اللہ کے دشمن کہ تو رسول اللہ ﷺ کو یہ کہہ رہا ہے جو میں سن رہا ہوں، پس خدا کی قسم اگر نہ ہوتی چیز جس کے فوت ہونے کا مجھے ڈر ہے تو میں تیرے سر کو تلوار کے ساتھ الگ کر دیتا۔ اور رسول اللہ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو سکون و محبت اور قسم سے دیکھ رہے تھے پھر فرمایا: ”کہ میں اور یہ تجھ سے اس کے علاوہ محتاج ہیں اے عمر! کہ تو مجھے اچھی طرح ادا نیگی کا حکم دے، اور اس کو اچھی طرح پہنچا کرنے کا، اس کو لے جاؤ اے عمر، اور اس کا قرض اداء کر دے اور اس کو بیس صاع زیادہ دے اس بات کے عوض جو تم نے اس سے پس حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ایسا ہی کیا، میں نے کہا اے عمر! جب میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرے کی طرف دیکھا تو تمام علامات نبوت کو میں نے پہچان لیا، سوائے دو کے جن کی مجھے خبر نہ ہوئی کہ ان کا حکم ان کے غصہ پر سبقت کرے گا اور غصہ اور جہل کی زیادتی اس پر زیادہ نہیں کرے گی، مگر بردباری، پس مجھے ان دونوں کی بھی خبر ہو گئی، پس تو گواہ رہ کہ میں راضی ہوں اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمدؐ کے نبی ہونے پر۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب واقعات ہوئے ہیں، جو آپ ﷺ کی سخاوت، کرم اور اپنے نفس اور مال کے بارے میں تکالیف پر صبر اور بردباری کی انتہا پر دلالت کرتے ہیں اور ان لوگوں کی جفا اور گنوار پن سے درگزر کرنے پر جن کا ارادہ تھا اسلام سے الفت اور محبت مال کی وجہ سے

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا، اور آپ کے جسم پر نجرانی چادر تھی جس کے کنارے موٹے تھے۔ ایک دیہاتی نے آپ ﷺ کو پایا تو آپ ﷺ کو چادر سے پکڑ کر کھینچا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی گردن کے کنارے کو دیکھا کہ اس پر چادر کے کناروں کے نشانات پڑ گئے تھے زیادہ کھینچنے کی وجہ سے، پھر اس نے کہا اے محمد! حکم دے دیرے لئے اللہ کے اس مال میں سے جو تیرے پاس ہے، پس آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ہنس پڑے اور اس کو دینے کا حکم دیا۔ (بخاری)

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن آپ نے ہمیں بیان فرمایا اور پھر کھڑے ہو گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، پس ہم نے دیکھا ایک دیہاتی کو کہ اس نے آپ ﷺ کو پکڑ کر چادر سے کھینچا، آپ کی گردن سرخ ہو چکی تھی آپ ﷺ کی چادر کھر دری تھی۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو گئے، وہ دیہاتی کہنے لگا: میرے ان دو اونٹوں پر میرے لئے سامان لا دو، اس لئے کہ تو نہ اپنے مال سے اور نہ اپنے باپ کے مال سے میرے لئے لا دو گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں استغفر اللہ نہیں استغفر اللہ، میں نہیں لا دوں گا جب تک تو میری گردن کے کھینچنے کا قصاص نہ دے“ اور دیہاتی ہر مرتبہ کہتا تھا کہ میں آپ ﷺ کو بدلہ نہیں دوں گا۔ پس حدیث ذکر کی یہاں تک کہ کہا پھر آپ ﷺ نے ایک آدمی کو بلایا اور اسے کہا کہ ”اس کے اونٹوں پر لا دو اس کے ایک اونٹ پر کھجور اور ایک پر جو لا دو“۔ اور شفاء کے بہت سے نسخوں میں جو انہ جاذبہ بازارہ کے الفاظ ہیں صحیح نہیں ہے۔

ادائیگی قرض پر قادر ہونے کے باوجود قرض اداء نہ کرنا ظلم ہے

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤/٤٦٤ الحديث رقم ٢٢٨٧ ومسلم فى ٣/١١٩٧ الحديث رقم (٣٣-١٥٦٤) وابو داؤد
نى السنن ٣/٦٤٠ الحديث رقم ٣٣٤٥ والترمذى فى ٣/٦٠٠ الحديث رقم ١٣٠٨ والنسائى فى ٧/٣١٧ الحديث رقم
٤٦٩١ وابن ماجه فى ٢/٨٠٣ الحديث رقم ٢٤٠٣ والدارمى فى ٢/٣٣٨ الحديث رقم ٢٥٨٦ ومالك الموطأ ٢/٦٧٤
الحديث رقم ٨٤ من كتاب البيوع واحمد فى المسند ٢/٧١-

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مالدار شخص کا (ادائیگی قرض میں) مال منول کرنا ظلم ہے اور جب تم میں سے کسی کو کسی مالدار شخص کے پیچھے لگا دیا جائے (تاکہ اس سے قرض وصول کرو) تو اس کے پیچھے لگ جانا چاہیے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: قَالَ مَطْلُ الْغَيْبِيِّ ظُلْمٌ فَإِذَا اتَّبَعْتَ أَحَدَكُمْ عَلَى مَيْلِيٍّ فَلْيَتَّبِعْ:

”مطل“ کہتے ہیں جس کی ادائیگی کا حق ہو اس کی ادائیگی نہ کرنا اور یہ حرام ہے، اگر قاذر شخص یوں کرے، اور اگر مالدار ہے لیکن ادائیگی پر قاذر نہیں ہے تو اس کیلئے ادائیگی پر قدرت تک تاخیر جائز ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے امام نووی نے) امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ فسق ہے اور اس کی وجہ سے ایسے شخص کی گواہی رد ہو جاتی ہے، اگرچہ یہ نادہندگی ایک ہی مرتبہ کیوں نہ ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جب بار بار نادہندگی میں مبتلا ہو، اور یہی قول اولیٰ ہے۔

فاذا اتبع: ہمزہ قطعی کے ضمہ تاء کے سکون اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ہمزہ وصل اور تاء مشدودہ کے ضمہ کے ساتھ۔

ملی: میم پر فتح لام پر کسرہ یاء پر سکون اور اس کے بعد ہمزہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں ادغام کے ساتھ ہے، بمعنی مالدار ہے۔ نہایہ میں ہے ’ملی‘ ہمزہ کے ساتھ ثقہ مالدار کو کہتے ہیں، اور لوگ اس میں ہمزہ کے ترک اور تاء کی تشدید بہت گرویدہ ہیں۔

فليتبع: یاء کے فتح تاء کے سکون اور باء کے فتح کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں تاء کی تشدید اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے، یعنی حوالہ کو

قبول کر لے۔ کہا جاتا ہے: اتبع فلاں بفلان، صیغہ مجہول کے ساتھ، یعنی اس کے حوالے کیا گیا۔ اور اتبع تاء کی تشدید کے ساتھ کسی کے پیچھے چلا اور اس کی اقتداء کی۔ اور مغرب میں ہے: ”اتبع زيدا عمرو فتبعه، یعنی میں نے اس کو تابع بنایا اور اس پر اس کو ابھارا۔ اور حدیث بھی اسی سے ہے۔ عسقلانی شرح بخاری میں فرماتے ہیں کہ مشہور لغت میں اور روایت میں جیسا کہ امام نووی نے فرمایا ”اتبع“ میں تاء کا سکون ہے اور ”فليتبع“ مجہول ہے، جیسے ”اذا علم فاعلم“ ہے۔

اور قرطبی فرماتے ہیں ”اتبع“ ہمزہ کے ضمہ اور تاء کے سکون کے ساتھ صیغہ مجہول ہے اتفاقاً، اور ”فليتبع“ اکثر کے نزدیک تاء کی

تخفیف کے ساتھ ہے اور بعض نے اس کو مقید کیا ہے تشدید کے ساتھ، اور اول زیادہ بہتر ہے۔ اور مقدمہ میں کہا ہے کہ پہلے لفظ میں تاء

ساکن ہے اور دوسرے میں تشدید کے ساتھ ہے، اور بعض کہتے ہیں دونوں میں سکون کے ساتھ ہے اور علامہ خطابی نے تشدید کو خطا کہا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ہمارا اور جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم استجابی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بطریق اباحت ہے اور بعض

کہتے ہیں یہ حکم بطریق وجوب ہے۔

قرض خواہ و قرض دار کا تنازعہ ختم کرانا

٢٩٠٨: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ تَقَاضَى ابْنَ أَبِي حَذْرَةَ دَيْنًا لَهُ عَلَيْهِ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي

الْمَسْجِدِ فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا حَتَّى سَمِعَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ فِي بَيْتِهِ فَحَرَجَ إِلَيْهِمَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

حَتَّى كَشَفَ سَجْفَ حُجْرَتِهِ وَنَادَى كَعْبُ بْنُ مَالِكٍ قَالَ يَا كَعْبُ قَالَ لَيْتَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

فَأَشَارَ بِيَدِهِ أَنْ ضَعِ الشُّطْرَ مِنْ دَيْنِكَ قَالَ كَعْبُ قَدْ فَعَلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ قُمْ فَأَقْضِهِ . (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۵۵۱/۱ الحديث رقم ۴۵۷ ومسلم فی صحيحه ۱۱۹۲/۳ الحديث رقم (۲۰-۱۵۵۸) وابوداؤد فی السنن ۲۰/۴ الحديث رقم ۳۵۹۵ والنسائی فی ۳۳۵/۸ الحديث رقم ۵۴۰۸ وابن ماجه فی ۸۱۱/۲ الحديث رقم ۲۴۲۹ واحمد فی المسند ۳۹۰/۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت کعب بن مالک کے بارے میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں (ایک دن) انہوں نے مسجد میں ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے اپنے قرض کی واپسی کا تقاضا کیا تو ان دونوں کی آوازیں بلند ہوئیں یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے جو اس وقت اپنے حجرہ مبارک میں تشریف فرما تھے۔ ان دونوں کی آوازیں سنیں تو رسول اللہ ﷺ نے حجرہ سے باہر آنے کا ارادہ فرمایا چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے حجرہ کا پردہ ہٹایا اور کعب بن مالک کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”اے کعب! کعب بن مالک نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں حاضر ہوں“ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کے ذریعے ان کی طرف اشارہ کیا کہ اپنے قرض کا نصف حصہ معاف کر دو۔ کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ! میں نے معاف کر دیا“۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے (ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے) فرمایا کہ ”کھڑے ہو جاؤ اور باقی قرض ادا کر دو“۔ (بخاری)

تشریح: حدرد: جاء کے فتح اور دال کے سکون کے ساتھ۔

فار تفتت اصواتهما: ”اصوات“ کی جمع یہ اپنی پر حقیقت پر ہے نہ کہ [صفت فلوبکما] کے قبیل سے ہے جیسا کہ بعض کو وہم ہے، اس لئے کہ مراد ان کے کلمات اور اقوال کی آوازیں ہیں۔

حتى سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”حتی“ غایت ہے آوازوں کی بلندی کیلئے۔

فی بیتہ: جملہ حالیہ ہے۔ سجف، سین کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ ہے اور جیم کے سکون کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں اور اول زیادہ صحیح ہے، پردے کو کہتے ہیں، بعض کہتے کہ پردے کی ایک طرف کو کہتے ہیں، اور راوی فرماتے ہیں کہ سجف دروازے کو کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ”سجف“ اس پردے کو کہتے ہیں جس کے درمیان میں شق ہو جیسے پٹ ہوتے ہیں۔

قال یا کعب: بیان نداء کیلئے استیناف ہے۔ اور نداء سے مقصود بات قبول کرنے کیلئے توجہ دلانا تھا۔ ”یا رسول اللہ“ یہ حکم پورا کرنے میں مبالغہ ہے۔

قم فا قضہ اور ایک نسخہ میں ہاء سکتہ کے ساتھ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کرنا اور تاخیر کرنا، دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

امام طیبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا: (۱) مسجد میں کسی سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

(۲) حقدار سے سفارش کرنا جائز ہے۔ (۳) جھگڑنے والوں میں صلح صفائی کرنا، ان کے درمیان اچھا واسطہ اور ثالث بننا چاہئے۔ (۴)

کسی کی سفارش قبول کرنا، بشرطیکہ اس سفارش کا تعلق کسی معصیت سے نہ ہو، جائز ہے۔ (۵) اشارہ پر اعتماد کرنا اور اس کو قول کے قائم

مقام بنانا جائز ہے جیسا کہ یہاں ہے: فاشار بیدہ ان اضع الشطر، اسلئے کہ حدیث میں اسکی تفسیر ہے کہ اشارہ میں قول کا معنی ہے۔

ادائیگی قرض میں تاخیر کرنے والوں کیلئے ایک عبرتناک واقعہ

۲۹۰۹: وَعَنْ سَلْمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ قَالَ كُنَّا جُلُومًا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ إِذَا أُتِيَ بِجَنَازَةٍ فَقَالُوا صَلِّ عَلَيْهَا فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قَالُوا لَا فَصَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ أُتِيَ بِجَنَازَةٍ أُخْرَى فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قِيلَ نَعَمْ قَالَ فَهَلْ تَرَكَ شَيْئًا قَالُوا ثَلَاثَةَ دَنَانِيرٍ فَصَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ أُتِيَ بِالْقَالِيَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قَالُوا ثَلَاثَةَ دَنَانِيرٍ قَالَ هَلْ تَرَكَ شَيْئًا قَالُوا لَا قَالَ صَلُّوا عَلَيَّ صَاحِبِكُمْ قَالَ أَبُو قَتَادَةَ صَلَّى عَلَيْهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَعَلَى دَيْنِهِ فَصَلَّى عَلَيْهِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۶۶/۴ الحدیث رقم ۲۲۸۹ و ابو داؤد فی السنن ۳/۶۳۸ الحدیث رقم ۳۳۴۳

ترجمہ: ”اور حضرت سلمہ بن اکوع کہتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ لایا گیا، صحابہؓ نے (آپ ﷺ سے) عرض کیا کہ جنازہ کی نماز پڑھ لیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اس میت کے ذمہ قرض ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ نہیں! چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”کیا اس میت کے ذمہ قرض ہے؟“ عرض کیا گیا ”ہاں“ ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اس نے کوئی چیز بطور ترکہ چھوڑی ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ”تین دینار اس نے چھوڑے ہیں“ (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی! پھر ایک تیسرا جنازہ لایا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کیا اس میت کے ذمہ قرض ہے؟“ صحابہ نے عرض کیا کہ ”ہاں تین دینار اس پر قرض ہیں“۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا اس نے کوئی چیز بطور ترکہ چھوڑی ہے؟“ صحابہ نے عرض کیا کہ ”کچھ نہیں“۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو پھر تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو“۔ ابوقادہؓ نے (جب یہ سنا تو) کہا کہ ”یا رسول اللہ! آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھا دیجئے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے (یعنی میں اس کا قرض ادا کروں گا) تب آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی“۔ (بخاری)

تشریح: جلوسا: مصدری للفاعل ہے۔ ای جالسین یا مضاف محذوف ہے۔ ای ذوی جلوس۔
 هل علیہ دین: یعنی حقوق العباد میں سے کوئی مالی حق تو نہیں ہے۔

فصلی علیہا: اور ایک نسخہ میں علیہ ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے آپ ﷺ کو الہام کر دیا کہ اس نے جو مال چھوڑا ہے وہ اس کے قرض کی ادائیگی کیلئے کافی ہے یا اس سے زیادہ ہے۔ (اتحلی)

سوال کرنے سے مراد یہ نہیں تھا کہ کیا اس نے اتنا مال چھوڑا ہے جس سے اس کا قرض پورا اداء ہو جائے گا اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ جواب دیتے ”نعم“ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ مقدار مسطور دین مذکور سے زیادہ تھی تو پھر یہ جواب من اسلوب الحکیم کی ایک نوع ہوگا۔
 ثم اتی بعالفة: ہو سکتا ہے یہ تینوں جنازے ایک ہی دن اور ایک ہی مجلس میں لائے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ الگ الگ دن اور الگ الگ مجلس میں لائے گئے ہوں، اور راوی نے درایت کی وضاحت کے لئے۔ سب کو جمع کیا ہے روایت میں
 قالوا لا: اس میں دو احتمال ہیں ایک تو یہ کہ اس نے کچھ بھی نہ چھوڑا ہو اور دوسرا یہ کہ چھوڑا ہو لیکن قرض کیلئے کافی نہ ہو۔
 قال: صلوا علی صاحبکم: اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ فرض کفایہ ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس قرض دار کی کیا جس نے اتنا مال بھی نہیں چھوڑا تھا جس سے اس کا قرض اداء ہو پر کی کیا شاید اس وجہ سے ہو کہ لوگوں کو قرض لینے سے ڈرانا مقصود ہو اور اگر بدرجہ مجبوری قرض لیں تو اس کی ادائیگی میں تاخیر و تقصیر سے باز رہیں، یا اس وجہ سے کہ میں اس کیلئے دعا کروں اور دعاء قبول نہ ہو کیونکہ اس پر لوگوں کا حق تھا، اور اس نے لوگوں پر مظالم کئے تھے۔

قال ابو قتادۃ صل علیہ یا رسول اللہ و علی دینہ: شرح السنہ میں ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ میت کی طرف سے ضامن ہونا جائز ہے خواہ میت نے ادائیگی کیلئے مال چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو، چنانچہ امام شافعی اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کفالت صحیح نہیں ہے۔ اور یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی آزاد بندگان سے شخص کی طرف سے ضامن بنا اور پھر وہ قرض دار مر گیا تو یہ ضامن اپنے حال پر رہے گا، تو جب بندگان کی موت دوام ضامن کے منافی نہیں تو ابتداء بھی اس کے منافی نہیں۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ حدیث سے استدلال کرنا اس قیاس سے اولیٰ ہے۔ ہمارے بعض علماء کہتے ہیں کہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اس میت کی طرف سے کفالت جائز ہے

جس نے کچھ بھی مال نہ چھوڑا ہو اور اس پر قرض ہو، یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر میت کی طرف سے کفالت جائز نہ ہوتی تو نبی ﷺ اس میت پر جنازہ نہ پڑھتے،

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفلس میت کی طرف سے کفالت صحیح نہیں ہے، کیونکہ مفلس میت کی طرف سے کفالت دراصل دین ساقط کی کفالت ہے اور یہ بالکل صاف مسئلہ ہے کہ دین ساقط کی کفالت باطل ہے۔ اور حدیث میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوقادہ نے سابقہ کفالت کا اقرار کیا ہو، اس لئے کہ لفظ اقرار اور انشاء کفالتہ میں برابر ہیں۔ اور حکایت فعل میں عموم نہیں ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوقادہ نے میت کی طرف سے کفالت نہ لی ہو بلکہ ازراہ احسان قرض اداء کرنے کا وعدہ کیا ہو۔ اور آپ ﷺ کا اس پر نماز جنازہ پڑھانے سے انکار بھی اس لئے تھا تا کہ اس کے قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، جب یہ صورت ظاہر ہوئی، تو تب آپ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

قرض کو ادا کرنے کی نیت رکھنے والے کی اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے

۲۹۱۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيدُ آدَاءَ هَا آذَى اللَّهُ عَنْهُ وَمَنْ أَخَذَ يُرِيدُ اتِّلَافَهَا آتَلَفَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵۳/۵ الحدیث رقم ۲۳۸۷ واحمد فی المسند ۱/۳۶۱۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص لوگوں کا مال لے اور اس کے ادا کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو (یعنی کسی ضرورت و احتیاج کی بناء پر لوگوں سے قرض لے اور قرض کی ادائیگی کا ارادہ بھی رکھتا ہو اور اس کو ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہو) تو اللہ تعالیٰ اس سے وہ مال ادا کر دیتا ہے (یعنی قرض کو ادا کرنے کی نیت رکھنے والے کی اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے) بایں طور کہ یا تو دنیا میں قرض ادا کرنے کی استطاعت دے دیتا ہے یا آخرت میں حقدار کو راضی کر دیتا ہے (اور جو شخص لوگوں کا مال لے اور اس کو ضائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو) (یعنی احتیاج و ضرورت کے بغیر کسی سے قرض لے اور پھر اس قرض کی ادائیگی کی نیت بھی نہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے مال کو ضائع فرما دیتا ہے) (یعنی جو شخص کسی سے قرض لے اور اس قرض کو نساہت کرے اور ندادا کرنے کی نیت رکھے تو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ ادائیگی قرض پر اس کی مدد نہیں فرماتا اور اس کے رزق میں وسعت و فراخی عطا نہیں فرماتا بلکہ اس کا مال تلف و ضائع بھی کر دیتا ہے کیونکہ وہ ایک مسلمان کا مال ضائع کرنے کی نیت رکھتا ہے)۔“ (بخاری)

تشریح: قوله: قال من اخذ اموال الناس يريد اداءها: یعنی کسی ضرورت و احتیاج کی بناء پر قرض لے اور اس کی ادائیگی کا ارادہ بھی رکھتا ہو اور اس کو ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہو۔

اذی اللہ عنہ: یعنی اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے، بایں طور کہ یا تو دنیا میں اس کو ادا کرنے کی استطاعت دیتا ہے یا آخرت میں حقدار کو راضی کر دیتے ہیں۔

ومن اخذ يريد اتلافها: یعنی بغیر ضرورت کے قرض لے اور اس کی ادائیگی کی نیت نہ رکھتا ہو۔

اتلفه الله عليه: یعنی نہ تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور نہ اس کے رزق میں وسعت اور فراخی عطا کرتا ہے، بلکہ اس کے مال کو ضائع کر دیتا ہے کیونکہ وہ ایک مسلمان کے مال کو ضائع کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ اور ایک مطلب یہ ہے کہ (یہاں مضاف محذوف ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کا مال تلف کر دیتا ہے۔

اتلفه اس لئے کہا ہے کہ مال کا تلف ہونا جان کے تلف ہونے کی طرح ہے، زیادت زجر کیلئے ”اتلف“ کہا ہے اس لئے کہ ”اتلف“ کا معنی ہے اھلک، (ہلاک کرنا) یہ جملہ جزائیہ ہے اور اس سے پہلا جملہ خبریہ ہے لفظاً و معنی اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ جملہ انشائیہ ہو معنی اور اس کو اس کیلئے بطور دعاء کے لایا گیا ہو۔

تخریج: اسی طرح احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے جیسا کہ جامع صغیر میں ہے لیکن اس میں لفظ ”علیہ“ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ حقوق العباد معاف نہیں کرتا

۲۹۱۱: وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَرَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ صَابِرًا مُحْتَسِبًا مُقْبِلًا غَيْرَ مُدْبِرٍ يَكْفُرُ اللَّهُ عَنِّي خَطَايَايَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَعَمْ فَلَمَّا أَذْبَرَ نَاذَاهُ فَقَالَ نَعَمْ إِلَّا الدِّينَ كَذَلِكَ قَالَ جَبْرِئِيلُ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۵۰۱/۳ الحديث رقم (۱۱۷-۱۸۸۵) (والترمذی فی السنن ۱۸۴/۴ الحديث رقم ۱۷۱۲ والنسائی فی ۳۴/۶ الحديث رقم ۳۱۵۶ والدارمی فی ۲۷۳/۲ الحديث رقم ۲۴۱۲ ومالك فی المطاۃ ۴۶۱/۲ الحديث رقم ۳۱ من كتاب الجهاد واحمد فی المسند ۲۹۷/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بتائیے اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں اس حال میں کہ میں صبر کرنے والا اور ثواب کی امید رکھنے والا ہوں (یعنی میں ریاکاری کی غرض سے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر اور ثواب کی طلب میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں) اور اس طرح جہاد کروں کہ میدان جنگ میں دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤں بلکہ ان کے سامنے سینہ سپر رہوں (یہاں تک کہ میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں) تو کیا اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف فرمادے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ ”ہاں!“ پھر جب وہ شخص (اپنے سوال کا جواب پا کر) واپس ہوا تو آپ ﷺ نے اسے آواز دی اور فرمایا کہ ”ہاں! اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ یقیناً معاف کر دے گا) مگر قرض کو معاف نہیں کرے گا“ مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے اسی طرح کہا ہے۔“ (مسلم)

تشریح: قال: ”قال“ کے تکرار کے ساتھ ہے، تصحیح شدہ نسخہ میں یعنی قال ابو قتادہ قال۔

غیر مدبر: حال مؤکدہ ہے اور مترادف میں چنگی اور مضبوطی پیدا کرنے کیلئے ہے، جیسا یہ قول ہے: امس الدابر لا یعود۔
یکفر عنی خطایای: ہمزہ استفہام کے حذف کے ساتھ ہے۔

فقال نعم الا الدين: استثناء ہے اس سے جو ”نعم“ کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے یعنی ای نعم یکفر اللہ خطایاک الا الدين۔
دین خطایا کے جنس میں سے نہیں ہے تو پھر اس کو اس سے کیسے مستثنیٰ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہے لکن الدین لم یکفر ہے اس لئے کہ یہ حقوق العباد میں سے ہے، پس جب اس کو اداء کرے گا یا خصم کو راضی کرے گا تو اس کے ذمہ سے بری گا۔

اور احتمال یہ بھی ہے کہ مستثنیٰ متصل ہو اور مضاف محذوف ہو: ”الا خطیئۃ الدین“ یا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے باب سے ﴿یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتى اللہ بقلب سلیم﴾۔ پس جنس خطیئۃ کے افراد دو قسم کے ہیں: (۱) متعارف (۲) غیر متعارف، تو استثناء کے ذریعے ایک قسم نکل گئی، یہ مبالغہ ہے قرض لینے سے ڈرانے میں اور اس کی ادائیگی میں تاخیر اور تقصیر سے زجر ہے۔
فوائد حدیث: اشرف بسید فرماتے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوا:

(۱) حقوق اللہ میں آسانی ہے کہ اللہ اپنے حقوق معاف فرمادے۔ بچے ہیں۔ (۲) حقوق العباد کا مسئلہ بڑا سخت اور کٹھن ہے۔
(۳) جبرئیل آپ علیہ السلام تک قرآن کے علاوہ بھی اللہ کے پیغامات پہنچاتے تھے۔

۲۹۱۲: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلِّ ذَنْبٍ إِلَّا الدِّينَ۔

(رواه مسلم)

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہید کے تمام (صغیرہ اور کبیرہ) گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں سوائے قرض کے (یعنی حقوق العباد) کی معافی نہیں ہوتی۔“ (مسلم)

تشریح: عبد اللہ بن عمرو: ”عمرو“ واؤ کے ساتھ ہے۔

”دین“ سے مراد حقوق العباد ہیں، خواہ اس کے ذمہ کسی کا مال ہو، یا اس نے کسی کا ناحق خون کیا ہو یا کسی کی آبروریزی کی ہو، تو یہ شہادت سے معاف نہیں ہوتے جیسا کہ بعض شراح نے اس کو ذکر کیا ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس حدیث کا لعلق بری جنگ کے شہداء سے ہے، کیونکہ ابن ماجہ نے ابوامامہ کی یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

”بحری جنگ میں شہید ہونے والوں کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں حتیٰ کہ دین بھی بخش دیا جاتا ہے۔“

قرض دار کی جنازہ پڑھنے سے آنحضرت ﷺ کا اجتناب

۲۹۱۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُؤْتِي بِالرَّجُلِ الْمُتَوَقِّفِ عَلَيْهِ الدِّينَ فَيَسْتَأَلُ هَلْ تَرَكَ لَدَيْهِ قِضَاءً فَإِنْ حَدَّثَ أَنَّهُ تَرَكَ وَفَاءً صَلَّى وَالْأَقَالَ لِلْمُسْلِمِينَ صَلُّوا عَلَيَّ صَاحِبِكُمْ فَلَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْفُتُوحَ قَامَ قَالَ أَنَا أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ فَمَنْ تَوَقَّفَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَتَرَكَ دِينًا فَعَلَىٰ قِضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَهُوَ لَوَرَثَتِهِ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۴۷۷ الحدیث رقم ۲۲۹۸ و مسلم فی ۱۲۳۷/۳ الحدیث رقم (۴-۱۶۱۹) وابو داؤد فی السنن ۳/۶۳۸ الحدیث رقم ۳۳۴۳، والترمذی فی السنن ۳/۳۸۲ الحدیث رقم ۱۰۷۰ والسنانی فی ۴/۶۶ الحدیث رقم ۱۹۶۳ وابن ماجہ فی ۲/۸۰۷ الحدیث رقم ۲۴۱۵ واحمد فی المسند ۲/۵۳۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے کسی ایسے شخص کا جنازہ لایا جاتا جس پر قرض ہوتا تو آپ ﷺ پہلے پوچھتے کہ کیا یہ شخص اپنا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ مال چھوڑ کر مرا ہے؟ اگر یہ بتایا جاتا کہ یہ شخص اتنا مال چھوڑ کر مرا ہے جس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہے تو آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھ لیتے ورنہ مسلمانوں سے فرماتے کہ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر فتوحات کے دروازے کھول دیئے (اور مشرکین و کفار سے جنگ کے بعد غنیمت کی صورت میں مال وزر میں وسعت و کشادگی نصیب ہوئی تو) آپ ﷺ (ایک دن) خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور (مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ میں (دین و دنیا کے تمام امور میں) مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں لہذا جو مسلمان اس حالت میں مرے کہ اس کے ذمہ قرض ہو (اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا جو جس سے اس کا قرض ادا ہو سکے) تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور جو شخص مال چھوڑ کر مرا (تو اس مال سے اس کا قرض ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے) وہ اس کے ورثاء کا حق ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: علیہ الدین: جملہ حالیہ ہے۔۔۔ حدث: صیغہ مجہول کے ساتھ بمعنی اخبر ہے۔ انہ ترک و فاء صلی: ایک نسخہ میں ”علیہ“ ہے۔ والا: اس میں گزرے ہوئے دونوں احتمال ہے۔

فقال انا اولیٰ بالمؤمنین من انفسهم: یہ حدیث مبارکہ درحقیقت اللہ جل شانہ کے اس ارشاد گرامی سے اقتباس ہے: ﴿النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسهم﴾ [الاحزاب-۸] یعنی دین و دنیا کے تمام امور میں مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔ اسی لئے کہ اس کو مطلق ذکر کیا مقید نہیں کیا، پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کو اپنی جانوں سے زیادہ محبوب رکھیں

آپ ﷺ کے حکم اور آپ ﷺ کی خواہش اپنے نفس کے حکم اور اپنے نفس کی خواہش پر مقدم رکھیں اور آپ ﷺ کے حق کو اپنی جانوں کے حق سے مقدم جانیں اور ان کے قلوب اپنی جانوں کی محبت و شفقت سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی شفقت و محبت سے لبریز ہوں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کی شانِ رحمت بھی یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی ذات پر جتنا شفیق و مہربان ہو سکتا ہے، آنحضرت ﷺ اس کے حق میں اس سے کہیں زیادہ شفیق و مہربان ہیں، پس جب آپ کے پاس غنیمت کا مال حاصل ہو تو آپ ﷺ زیادہ حق دار تھے ان کے قرضوں کی اداء کرنے کے۔

فمن توفی: ما قبل کما سبب ہے، یعنی جو مر گیا۔ اس مسئلہ میں علماء کی مختلف آراء ہیں۔

پہلی رائے: بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہر دوں کے قرض کی ادائیگی بیت المال سے فرمایا کرتے تھے، اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آپ ان کا قرض اپنے مال میں سے اداء کرتے تھے۔

اسی طرح بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ قرض کی ادائیگی آپ ﷺ پر واجب تھی۔

بعض کہتے ہیں کہ آپ تبرعاً قرض اداء کرتے تھے۔ یہ دونوں قول پہلے دو قولوں پر متفرع ہیں۔

الفصل الثانی:

دیوالیہ کا حکم

۲۹۱۳: عَنْ أَبِي خَلْدَةَ الزُّرْقِيِّ جُنْنَا أَبَا هُرَيْرَةَ فِي صَاحِبٍ لَنَا قَدْ أَفْلَسَ فَقَالَ هَذَا الَّذِي قَضَى فِيهِ رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ أَيَّمَا رَجُلٍ مَاتَ أَوْ أَفْلَسَ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ أَحَقُّ بِمَتَاعِهِ إِذَا وَجَدَهُ بَعِيْنِهِ - (رواه الشافعی وابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۹۳/۳ الحدیث رقم ۳۵۲۳ وابن ماجہ فی ۷۹۰/۲ الحدیث رقم ۲۳۶۰

ترجمہ: ”حضرت ابوخلدہ زرقی کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس اپنے ایک ایسے ساتھی کا معاملہ لے کر آئے جو مفلس ہو گیا تھا (مگر اس کے پاس لوگوں کا وہ سامان موجود تھا جس کی قیمت اس نے ادا نہیں کی تھی۔ ہم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟) حضرت ابو ہریرہؓ نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کا معاملہ بالکل اس شخص جیسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ جو شخص مر جائے یا مفلس ہو جائے (اور اس کے ذمے لوگوں کے حقوق ہوں) تو مال کا مالک اس مال کا زیادہ حقدار ہے جبکہ وہ مال کو بالکل اسی حالت میں پائے بشرطیکہ وہ مال جو ان کا توں موجود ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے اسی باب کی پہلی فصل میں حدیث نمبر ادا کیجئے۔“ (شافعی ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

ابوخلدہ - ابوخلدہ خالد بن دینار تمیمی سعدی بصری ہیں جو درزی کا کام کرتے تھے۔ ”خلدہ“ خائے مجھے کے فتح اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ ”زرقی“ میں زائے مجھے کے ضمہ رائے مہملہ کے فتح اور قاف کے ساتھ ہے۔ انفار کے ایک بطن بنو زریق کی طرف منسوب ہے۔ ثقات تابعین میں سے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں ان سے و کعب بن علقمہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ”خلدہ“ خائے مجھے کے فتح اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔

الزرقی: زاء پر ضمہ راء کے فتح اور اس کے بعد قاف ہے۔ بنی زریق کی طرف نسبت ہے جو انصار میں سے ایک قبیلہ ہے۔

تشریح: قضی فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: پھر اس معاملہ اور شان کی تفسیر کی اپنے اگلے جملے میں فرمائی۔

ایما رجل مات او اشرف کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ بعینہ ایسا فیصلہ آپ ﷺ نے کسی شخص کے بارے میں کیا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فیصلہ کیا ہے ہر اس شخص کے بارے میں جس کی افلاس میں حالت یہ ہو۔ امام طہی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے مشار الیہ الامر والشان ہو اور اسکی تائید ایما رجل... سے بھی ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ بیان ہے اور مبہم کیلئے بطور استیناف کے ہے اور اسی طرح اسکی تائید اس قول سے بھی ہوتی ہے: جننا فی صاحب لنا ای فی شان صاحب لنا۔ ”بعینہ“: ”وجدہ“، بمعنی ”علم“ کا مفعول ثانی نہیں ہے، پس یہ حال ہے۔ ای صادفہ حاضر بعینہ اور اس پر تفصیلی کلام ”باب الافلاس“ کے شروع میں ہو چکا ہے۔

قرض دار کی روح قرض کی ادائیگی تک معلق رہتی ہے

۲۹۱۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتَّى يُقْضَى عَنْهُ.

(رواه الشافعی واحمد والترمذی وابن ماجہ والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۸۹/۳ الحدیث رقم ۱۰۷۸ واہن ماجہ فی ۸۰۶/۲ الحدیث رقم ۲۴۱۳ والدارمی فی

۳۴۰/۲ الحدیث رقم ۲۵۹۱ واحمد فی المسند ۴۴۰/۲

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مؤمن کی روح اپنے قرض کی وجہ سے اس وقت تک معلق رہتی ہے جب تک کہ اس کا قرض اس کی طرف سے ادا نہ کر دیا (یعنی جب کوئی شخص مقرض ہونے کی حالت میں قرض دار مرتا ہے تو اس کی روح اس وقت تک بندگانِ صالح کی ارواح کی جماعت میں داخل نہیں ہوتی جب تک کہ اس کا قرض اس کی طرف سے ادا نہ کر دیا جائے۔“ (شافعی احزاب ابن ماجہ دارمی)

تشریح: حتیٰ یقضیٰ عنہ: صیغہ مجہول کے ساتھ،

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے ساتھ کامیاب نہیں ہوتا جنت میں داخل ہونے یا اونچے مرتبہ تک پہنچنے یا بندگانِ صالح کی جماعت میں داخل کے ساتھ اور اس کی تائید آنے والے حدیث ”یشکو الی ربہ الوحده“ سے ہوتی ہے۔ یا اس کی روح لذت نہیں پائے گی جب تک اس پر قرض ہو۔

پھر علماء کہتے ہیں کہ قرض دار جس کو جنت سے روکا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ قرض ادا ہو جائے۔ یہ وہ قرض دار ہے جس نے قرض لے کر بیوقوفی اور اسراف میں خرچ کیا ہو، ہاں جس شخص نے حقوق و واجبات کی تکمیل کیلئے قرض لیا ہو جیسا کہ فاقہ ہے اور قرض ادا کرنے کیلئے کچھ مال نہ چھوڑا ہو، تو اللہ اس کو جنت سے نہیں روکے گا انشاء اللہ۔ اس لئے کہ سلطان وقت کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اس کا قرض ادا کرے اور اگر اس نے ادا نہیں کیا، تو پھر اللہ پاک اس کا قرض ادا کر دے گا، قرض خواہوں کو راضی کر دے گا، اس لئے کہ ابن ماجہ نے مرفوع روایت نقل کی ہے:

قرض دار سے بدلہ لیا جائے گا قیامت کے دن مگر جس نے تین خصلتوں کی وجہ سے قرض لیا ہو: ایک وہ آدمی جو اللہ کے راستہ (جہاد) میں ہو اور اس کی قوت کمزور ہو رہی ہو اور اس نے قرض لیا تاکہ اس کی قوت دشمن کے مقابلے میں بڑھ جائے۔ اور ایک وہ آدمی کے جس کے پاس کوئی مسلمان مر رہا ہو اور اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کی چھینڑ و تکلیفیں کر سکے، بغیر قرض کے۔ اور ایک وہ آدمی جس کو گناہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اور وہ قرض لیکر نکاح کر دیتا ہے، اپنے دین پر ڈرنے کی وجہ سے۔ تو اللہ پاک ان سب کی طرف سے ان کا قرض قیامت کے دن ادا کر دے گا۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ابن الملک نے شرح المشرق میں۔)

قوله: رواه الشافعی واحمد وابن ماجہ والدارمی :

ایک نسخہ میں ہے: "وقال الترمذی هذا حدیث غریب"۔ اس کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔
 ۲۹۱۲: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ صَاحِبُ الدِّينِ مَا سُورَ بِدِينِهِ يَشْكُوَ إِلَى رَبِّهِ
 الْوَحْدَةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَوَاهُ فِي شَرْحِ السَّنَةِ۔

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۲۰۳/۸ الحدیث رقم ۲۱۴۸

ترجمہ: "اور حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرض دار اپنے قرض کی وجہ سے قید ہے (یعنی جنت میں داخل ہونے اور بندگان صالح کی ارواح کی صحبت میں پہنچنے سے روک دیا جائے گا) چنانچہ وہ قیامت کے دن اپنے پروردگار سے اپنے اکیلے پن کی شکایت کرے گا"۔ (شرح السنہ)

تشریح: قوله: صَاحِبُ الدِّينِ مَا سُورَ بِدِينِهِ پس مناسب یہ ہے کہ اصل حدیث میں "فی قبرہ" مقدر مانا جائے اور "یوم القیامۃ" منصوب بزعر الخافض ہو، ای الی یوم القیامۃ۔

یعنی اس کی تھکاوٹ اور عذاب تنہائی کی وجہ سے ہوگا اور اس کو کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آئے گا جو اس کی طرف سے قرض اداء کر دے اور اس کو ادائیگی قرض سے چھڑا دے، چنانچہ جب تک وہ اس قرض کے ذمہ سے چھٹکارا نہیں پائے گا وہ اسی تنہائی میں رہے گا، بایں طور کہ یا تو وہ اس قرض کے بقدر اپنی نیکیاں قرض خواہوں کو دے دے، یا قرض خواہوں کے گناہوں کو ان کے قرض کے عوض اپنے اوپر لاد لے، یا اللہ تعالیٰ اس کے قرض خواہوں کو اپنے فضل و کرم سے راضی کر دے۔

اس کو طبرانی نے الاوسط میں اور ابن نجار نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

"صاحب الدین مأسور بدینہ فی قبرہ یشکوا الی اللہ الوحده"۔

اور دیلمی نے مسند فردوس میں ابوسعید سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

"صاحب الدین مغلول فی قبرہ لا یفکھ الا قضاء دینہ"

۲۹۱۷: وَرَوَى أَنْ مَعَادًا كَانَ يَدَانُ قَاتِي غُرْمَاوَهُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَبَاعَ النَّبِيُّ ﷺ مَالَهُ كُلَّهُ فِي دِينِهِ حَتَّى
 قَامَ مَعَادٌ بِغَيْرِ شَيْءٍ مُرْسَلٍ هَذَا لَفْظُ الْمَصَابِيحِ وَلَمْ أَجِدْهُ فِي الْأُصُولِ إِلَّا فِي الْمُنتَقَى۔

ترجمہ: روایت کی گئی ہے کہ حضرت معاذؓ (لوگوں سے) قرض لیا کرتے تھے (ایک دن) ان کے قرض خواہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے (اور حضرت معاذؓ کے قرض کا تقاضا کرنے لگے) نبی کریم ﷺ نے ان کے قرض کی ادائیگی کے لئے ان کا سارا مال و متاع فروخت کر دیا یہاں تک کہ حضرت معاذؓ کے پاس کوئی چیز بھی نہ بچی یہ روایت مرسل ہے۔ یہ الفاظ مصابیح کے ہیں۔ میں نے اس روایت کو اصول کی تمام کتب میں سوائے منتقی کے اور کسی کتاب میں نہیں پایا۔

تشریح: زروی: صیغہ مجہول کے ساتھ۔

یدان: ملا علی قاری کے نسخہ میں "یدان" ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: مضارع کا صیغہ ہے ادان لئے تشدید کے ساتھ باب افعال ہے۔ یعنی قرض لیا کرتا تھا۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ دال کی تشدید کے ساتھ باب افعال، دان فلان یدین دینا سے ہے، جب وہ قرض لے اور اس کے ذمہ دین ہو جائے اور اس قرض دار کو "دان" کہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

ندین ویقضى الله عنا وقد نرى

مصارع قوم لا یدینون ضیعا

ہم قرض لیتے ہیں اور اللہ پاک ہمارا قرض اداء فرمادیتے ہیں، اور ہم کھڑی ہوئی تو م کو دیکھتے ہیں کہ وہ قرض نہیں لیتے، ضائع ہونے کے ڈر سے۔

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ارسال کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ یہ معنی کے اعتبار سے درست نہیں ہے اسلئے کہ اس میں ذکر ہے کہ نبیؐ نے معاذ کے مال کو بیچ ڈالا نہ انکو قید کیا نہ انکو اسکا مکلف بنایا یا اس سے ادائیگی قرض کا مطالبہ کرتے اور وہ منع کرتے۔ حق تو یہ تھا کہ معاذ کو قید کرتے یہاں تک کہ وہ اپنا مال فروخت کرتے اس قرض میں، اس لئے کہ حاکم کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر بیچے۔

میں کہتا ہوں حدیث میں یہ نہیں ہے کہ یہ بیچنا اجباری تھا اور معاذ کی رضامندی کے بغیر تھا، باوجودیکہ مرسل حدیث ہمارے علمائے اور جمہور کے نزدیک حجت ہے، خاص کر کے جب اس کی تائید آنے والی متصل حدیث سے بھی ہو رہی ہے۔ اور قاضی عیاض نے اس کا جواب دیا ہے کہ حدیث اگرچہ مرسل ہے اور ہمارے ہاں مرسل حجت نہیں ہے لیکن اس پر عمل کیا جائے گا اس لئے کہ مرسل کو قبول کیا جاتا ہے، اور اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ قاضی کیلئے جائز ہے کہ وہ مفلس پر پابندی کے بعد اس کا مال قرض خواہوں کے مطالبہ کرنے پر فروخت کر دے۔

۲۹۱۸: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ ثَابِتًا سَخِيًّا وَكَانَ لَا يُمَسِّكُ شَيْئًا فَلَمْ يَزَلْ يَدَّانُ حَتَّى أَغْرَقَ مَالَهُ كُلَّهُ فِي الدِّينِ فَاتَى النَّبِيَّ ﷺ لِكَلِمَةٍ لِيُكَلِّمَ غَرَمَاءَهُ هُ فُلُو تَرَ كُوَ لِأَحَدٍ لَتَرَ كُوَ الْمَعَاذِ لِأَجْلِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَبَاعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَهُمْ مَالَهُ حَتَّى قَامَ مَعَاذٌ بِغَيْرِ شَيْءٍ .

(رواہ سعید فی سننہ مرسلہ)

اخرجه الدار قطنی فی السنن ۴/ ۲۳۰ الحدیث رقم ۹۵ من باب المرأة تقتل اذا ارتدت

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بڑے صابر اور سخی تھے۔ وہ کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھتے تھے اور ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا سارا مال ان کے قرض کی ادائیگی میں ڈوب گیا۔ چنانچہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ آپ ان قرض خواہوں سے سفارش کریں اگر وہ (قرض خواہ) کسی کو چھوڑتے تو رسول اللہ ﷺ کی خاطر معاذ کو چھوڑتے۔ رسول اللہ نے حضرت معاذ کے مال و متاع کو ان کے قرض خواہوں کے لئے فروخت کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی چیز نہ بچی۔ سعد نے اس روایت کو اپنی سنن میں مرسل روایت کیا ہے۔

تشریح: مذکورہ عبدالرحمن یہ تابعی ہیں مصنف کہتے ہیں کہ یہ انصاری ہیں اور مدینہ کے تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے زہری نے روایت کی ہے۔ کان معاذ بن جب ثابتاً: یعنی قوی بردبار اور صبر کرنے والے تھے۔

سخیا: یعنی سخی شریف اور قدردان تھے۔ فلو تر کو الاحد: فاء محذوف پر مرتب ہے تقدیری عبارت یوں ہے: النبی صلی اللہ علیہ وسلم غرماء ہ لان یتر کو مطالبہ لہ فلم یتر کو اولو تر کو الاحد لتر کو المعاذ لاجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا مطالبہ یہ صرف سفارش تھی نہ کہ حکم تھا ورنہ ان کیلئے سوائے چھوڑنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

مالہ: یعنی حضرت معاذ کا مال، ان کے اختیار سے یا جبراً اس کو حکم کے بناء پر۔ قولہ: رواہ سعید فی سننہ مرسلہ یعنی صورتاً مرسل ہے ورنہ ظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے صحابی سے سنی ہے۔ کس سے سنی ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں: (۱) حضرت معاذ سے سنی ہے۔ (۲) حضرت معاذ کے علاوہ کسی اور سے سنا ہو۔

بلا عذر قرض اداء نہ کرنے والا مستطیع شخص قابل ملامت ہے

۲۹۱۹: وَعَنِ الشَّرِيدِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَأِي الْوَأَجِدِ يَحِلُّ عَرْضَهُ وَعَقُوبَتَهُ قَالَ ابْنُ الْمُبَارَكِ يَحِلُّ

جنازہ: نہایہ میں ہے کہ یہ فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ میت کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کسرہ کے ساتھ چارپائی اور فتح کے ساتھ میت کو کہتے ہیں۔ (اتہلی)۔ پس یہاں فتح اولیٰ ہے اگلے جملے کی وجہ سے۔

اس لئے کہ ضمیر "جنازہ" کی طرف راجح ہے اور مراد اس سے میت ہے، پہلے قول کے مطابق اس میں استخدا م ہے، اور اگر اس سے مراد صرف چارپائی لی جائے تو پھر اس میں مجاز ہے کہ "محل" کو ذکر کر کے مراد اس سے حال ہے۔

من وفاء: من زندہ ہے اس لئے کہ یہ سیاق استفہام میں ہے۔ یعنی کیا اس نے کچھ چھوڑا ہے جس سے اس کا قرض پورا اداء ہو؟ قال صلوا: اور صحیح شدہ نسخہ میں "فصلوا" ہے۔

رہانك: راء کے کسرہ کے ساتھ۔ کما فککت رہان اخیک المسلم:

تو رپشتی فرماتے ہیں کہ "فلک الہن" کا معنی رہن کا چھڑانا ہے، اور فلک الانسان نفسہ، کا معنی ایسے اعمال کی کوشش کرنا جس کے ذریعے وہ اللہ کے عذاب سے آزاد ہو، اور "رہان" رہن کی جمع ہے، مطلب یہ ہے کہ قرض دار آدمی کا نفس مرنے کے بعد قرض کے بدلے گروی ہوتا ہے جیسا کہ وہ دنیا میں قرض کی وجہ سے قید تھا، اور انسان اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿کُلْ نَفْسٌ مَّا كَسَبَتْ رَهِيْنَةً﴾ [المائدہ: ۳۸] (ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں مجبوس ہوگا)۔ یعنی رکا ہوا ہوتا تھا آگے بھیجے ہوئے اعمال کی جزاء میں، پس جب یہ اپنے مؤمن بھائی کے چھڑانے کیلئے کوشش کرتا ہے اس سے جس میں وہ قرض کی وجہ سے قید ہے، تو آپ نے اس کیلئے دعاء کی ہے اس کے نفس کے چھڑانے کی جو اعمال کے بدلے گروی ہے۔

الافلک اللہ رہانہ یوم القیامۃ: اور شاید رہان کو صیغہ جمع کے ساتھ اسلئے ذکر کیا ہے کہ یہ تشبیہ ہے کہ انسان کا ہر جزا اسکی کمائی کے بدلے گروی ہے یا اس وجہ سے کہ نفس نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے یکے بعد دیگرے تو اسکے بدلے اپنے نفس کو کوئی بارگروی رکھا ہے۔

قرض کے بوجھ سے ہلکا ہو کر مرے والے کیلئے بشارت

۲۹۲۱: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ مَاتَ وَهُوَ بَرِيٌّ مِنَ الْكِبْرِ وَالْغُلُولِ وَالذَّيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ.

(رواہ الترمذی وابن ماجہ والدارمی)

احرجہ الترمذی فی السنن ۱۱۷/۴ الحدیث رقم ۱۰۷۲، وابن ماجہ فی ۸۰۶/۳ الحدیث رقم ۲۴۱۲ والدارمی فی

۳۴۱/۲ الحدیث رقم ۲۵۹۲ واحمد فی المسند ۲۷۶/۵۔

ترجمہ: "اور حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اس حالت میں مرا کہ وہ تکبر، خیانت اور قرض سے

بری یعنی پاک ہو تو وہ (مقبول بندوں کے ساتھ) جنت میں داخل ہوگا"۔ (ترمذی ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: قولہ: مَنْ مَاتَ وَهُوَ بَرِيٌّ مِنَ الْكِبْرِ: "بری" بتعلیل کے وزن پر مبنی لفظا عمل ہے

الکبر: بعض کہتے ہیں کہ کبر کہتے ہیں حق کو ٹھکرانا کہ اس کو قبول ہی نہ کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے کہ لوگ اس کو نظر ہی نہ آئیں۔

والغلول: غین کے ضمہ کے ساتھ، نہایہ میں ہے کہ "غلول" غنیمت میں خیانت کرنے اور غنیمت کے مال میں سے تقسیم سے قبل

چوری کرنے کو کہتے ہیں اس کو "غلول" اس لئے کہتے ہیں کہ ہاتھ اس سے بندھے ہوئے ہیں۔

والدین: دین کو سب سے قبیح جنایات اور شنیع برائیوں کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرض بھی انہی میں سے

ہے، اور اس سے مراد وہ قرض ہے جو آدمی پر اس کے اختیار سے لازم ہو اور وہ اس کے اداء کرنے کی نیت نہ رکھتا ہو۔

بالکل مفلسی کی حالت میں قرض دار مرنا ایک بڑا گناہ ہے

۲۹۲۲: وَعَنْ أَبِي مُوسَى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنْ أَعْظَمَ الذُّنُوبَ عِنْدَ اللَّهِ أَنْ يَلْقَاهُ بِهَا عَبْدٌ بَعْدَ الْكِبْرِ

الَّتِي نَهَى اللَّهُ عَنْهَا أَنْ يَمُوتَ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ ذَيْنٌ لَا يَدْعُ لَهُ قَضَاءً. (رواه احمد وابوداود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۶۳۷/۳ الحديث رقم ۳۳۴۲، واحمد في المسند ۴/۳۹۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابوموسیٰ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کبیرہ گناہوں کے بعد اللہ کے نزدیک سب سے عظیم گناہ جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے یہ ہے کہ بندہ مرنے کے بعد اپنے پروردگار سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس کے ذمہ قرض ہو اور وہ (دنیا میں) قرض کی ادائیگی کے لئے کوئی چیز چھوڑ نہ گیا ہو۔“ (احمد ابوداؤد)

تشریح: قوله: قَالَ إِنَّ أَعْظَمَ الذُّنُوبِ عِنْدَ اللَّهِ..... رَجُلٌ وَعَلَيْهِ ذَيْنٌ لَا يَدْعُ لَهُ قَضَاءً:

ان اعظم الذنوب عند الله ان يلقاه: یہ خیر ہے ”ان“ کی۔

عبد: یلقى کا فاعل ہے۔

بعد الکبائر التي نهى الله عنها: یہ ”اعظم الذنوب“ سے بمنزلہ استثناء کے ہے۔

ان يموت الرجل: ان يلقاه سے بدل ہے۔ اس لئے کہ بندہ کی ملاقات اپنے رب سے وہ موت کے بعد ہوتی ہے، ای ان اعظم

الذنوب عند الله موت الرجل جب آپ کہیں کہ سب سے بڑا گناہ اللہ کے ہاں آدمی کا مرنے ہے۔

وعليه دين: ”رجل“ اسم ظاہر ہے جو ”عبد“ کی ضمیر کی جگہ لایا گیا ہے، اور پہلے لفظ ”عبد“ کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس

عیب کے ساتھ اپنے مالک اور رب کے ساتھ ملاقات کا بعد اور دوری بتانا ہے، پھر اس کو لفظ ”رجل“ کے ساتھ مکرہ ذکر کیا تحقیر شان اور اس

امر کے اہانت کیلئے۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ کہیں کہ اس سے پہلے ”یغفر للشہید کل ذنب الا الدين“ کے تحت گزرا کہ حقوق

اللہ کا مبنی چشم پوشی پر ہے لیکن حقوق العباد کا معاملہ ایسا نہیں ہے اور یہاں اس کو کبیرہ سے کم قرار دیا ہے تو دونوں کے درمیان وجہ توفیق کیا ہو

گی؟ جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ ہم نے بیان کیا ہے کہ وہاں بطور مبالغہ کے تھا قرض لینے سے لوگوں کو ڈرانے اور بچانے کیلئے اور یہاں

اس کے ظاہر پر جاری ہے۔ (اتحییٰ)۔

”وعليه دين“ حال ہے۔ ”لا يدع له قضاء“ صفت ہے ”دين“ کیلئے

یعنی اس قرض کیلئے اتنا کچھ نہ چھوڑے جس سے وہ قرض اداء ہو، اور اس میں تخریر ہے زیادہ قرضوں کے لینے سے اور اس کے اداء کرنے

میں کوتاہی برتنے سے۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ کبار کا ارتکاب اللہ کی نافرمانی ہے اور قرض لینا گناہ نہیں ہے بلکہ قرض لینا اور دین التزام جائز ہے۔ آپ نے

اس شخص پر سختی کی ہے جو مر اس حال میں کہ اس پر قرض ہو اور قرض اداء کرنے کیلئے مال بھی نہ چھوڑا ہو، تا کہ لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ قرض بذات خود منع نہیں ہے بلکہ مستحب ہے جیسا کہ بعض احادیث میں اس کا ذکر ہے

بلکہ یہ ایک عارض جو کہ لوگوں کے حقوق کا ضائع کرنا ہے کی وجہ سے منع ہے، بخلاف کبیرہ کے کہ وہ بذات خود ممنوع ہے۔

حرام چیزوں میں صلح ناجائز ہے

۲۹۲۳: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ الْمَرْزَبِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ إِلَّا صُلْحًا حَرَمًا

حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا وَالْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ إِلَّا شَرَطًا حَرَمًا حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا۔

(رواه الترمذی وابن ماجہ و ابوداؤد وانتہت روايته عند قوله) عَلَى شُرُوطِهِمْ۔

اخرجه ابو داؤد في السنن ۱۹/۳ الحديث رقم ۳۵۹۴ والترمذی في السنن ۶۳۴/۳ الحديث رقم ۱۳۵۲ وابن ماجه في

۷۸۸/۲ الحدیث رقم ۲۳۵۳

ترجمہ: ”اور حضرت عمرو بن عوف مزنی نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے ہاں ایسی صلح جائز نہیں ہے جو حلال چیز کو حرام کر دے یا حرام چیز کو حلال کر دے اور مسلمان اپنی شرطوں پر قائم ہیں (یعنی مسلمان صلح و جنگ یا ان کے علاوہ دوسرے معاملات میں آپس میں جو شرطیں یعنی عہد و پیمانہ کرتے ہیں ان کی پاسداری و پابندی ضروری ہے) سوائے اس شرط کے جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال کر دے۔ (ترمذی ابن ماجہ ابوداؤد) ابوداؤد نے اس روایت کو لفظ علی شروظہم تک نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: قال الصلح جائز بین المسلمین الا صلحا جیسا کہ کوئی اس بات پر صلح کرے کہ وہ بیوی کی سوکن سے جماع نہیں کرے گا، یا شراب اور خنزیر پر صلح کرے۔ الا شرطا حرم حلالاً: مثلاً کوئی اپنی بیوی سے یہ شرط لے کہ وہ اپنی لونڈی سے جماع نہیں کرے گا۔ او احل حراماً۔ مثلاً کوئی یہ شرط لگائے کہ میں اپنی بیوی کی موجودگی میں اسکی بہن سے شادی کروں گا۔ توضیح و تخریج: احمد، ابوداؤد، اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے صرف پہلا حصہ روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

آنحضرت ﷺ کا پانچواں خریدنا

۲۹۲۳: عَنْ سُوَيْدِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ جَلَبْتُ أَنَا وَمَخْرَفَةُ الْعَبْدِيُّ بَرَّامُنْ هَجْرٍ فَأَتَيْنَاهُ بِه مَكَّةَ فَبَعَا نَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَمْشِي فَسَاوَمَنَا بِسَرَاوِيلَ قَبِعَانَهُ وَكَمْ رَجُلٌ يَزِنُ بِالْأَجْرِ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ زِنْ وَارْجِعْ۔

(رواہ احمد و ابوداؤد و الترمذی و ابن ماجہ و الدارمی و قال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۶۳۱/۳ الحدیث رقم ۳۳۳۶ و الترمذی فی ۵۹۸/۳ الحدیث رقم ۱۳۰۵ و النسائی فی

۲۸۴/۷ الحدیث رقم ۲۵۹۲ و الدارمی فی ۳۳۸/۲ الحدیث رقم ۲۵۸۵ و احمد فی المسند ۳۵۲/۴

ترجمہ: ”حضرت سويد بن قيس کہتے ہیں کہ میں اور مخرفہ عبدی نے مقام ہجر سے (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) فروخت کرنے کے لئے کپڑا لیا، ہم اسے لے کر مکہ میں آئے، رسول اللہ (کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم بیچنے کے لئے کپڑا لے کر مکہ آئے ہیں) تو رسول اللہ ﷺ چل کر (بغیر سواری کے) ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے ایک شلوار کی قیمت طے کی چنانچہ جب ہم نے وہ شلوار آپ ﷺ کو فروخت کر دی تو آپ ﷺ نے اس شخص سے کہ جو اس جگہ اجرت پر لوگوں کے اسباب تو لاکرتا تھا فرمایا کہ تم (میرے چاندی کے پیکڑے) تول دو (تاکہ میں یہ پیکڑے اس پانچواں کی قیمت کے طور پر دے دوں) اور (جتنے ٹکڑوں کی بات طے ہوئی ہے اس سے) کچھ زیادہ ہی تول دو۔ (احمد ابوداؤد ترمذی ابن ماجہ دارمی) اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔“

تشریح: و مخرفہ: میم پر فتح، خاء پر سکون کے ساتھ، اس کے بعد راء اور پھر فاء ہے، بعض کہتے ہیں کہ فاء کی جگہ میم ہے یعنی ”مخرمہ“ ہے، لیکن صحیح اول ہے جیسا کہ ”استیاناب“ میں ہے، اور مصنف نے ان کو صحابہ میں ذکر کیا ہے، اور ”واؤ“ عاطفہ ہے یا معیت کے معنی میں ہے۔ بز: زاء کی تشدید کے ساتھ۔ یعنی کپڑے۔

هجر: خاء اور جیم کے فتح کے ساتھ۔ مدینہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔

”بز“ کپڑوں میں سے کپڑا فروش کے سامان کو کہا جاتا ہے اور مغرب میں ہے کہ ”بز“ کپڑے کی ایک قسم ہے، امام محمد میر میں فرماتے ہیں کہ ”بز“ اہل کوفہ کے ہاں پٹن اور روئی کے کپڑے کو کہا جاتا ہے نہ کہ اون اور ریشم کے کپڑے کو۔

فجاء نا رسول اللہ اللہ علیہ وسلم یمشی: ”یمشی“ حال ہے ای جاء نا ماشیا۔

ئم : ثاء کے فتح کے ساتھ یعنی وہاں۔ زن : زاء کے کسرہ کے ساتھ۔ ارجح : ہمزہ کے فتح اور جیم کے کسرہ کے ساتھ۔ اور قاموس میں ہے: ”رجح ال میزان ی رجح“ تینوں حرکات کے ساتھ جو حاً و رجحانا بمعنی مائل ہونا، جھکنا، ارجح لہ و رجح بمعنی اعطاء راجحاً، یعنی اس کو زیادہ دیا اور پلہ جھکا کر دیا۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کی تواضع و انکساری کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کے پاس چل کر آئے نہ سوار ہو کر اور ان کے پیچھے پانچامہ کا بھاد لگایا، اور اس میں آپ ﷺ کے اخلاق اور کرم فرمائی کا اظہار بھی ہوتا ہے، کہ آپ ﷺ نے قیمت سے زیادہ دیا، اور اس سے وزن کرنے والے کا وزن پر اجرت لینے کا جواز بھی معلوم ہے، (اتہنی) یہ آخری بات محل نظر ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں آپ کے پانچامہ پہننے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے جزم کے ساتھ نہ پہننے کا کہا ہے، اور حضرت عثمان نے صرف شہادت کے دن پہننا تھا اور آپ علیہ السلام کا پانچامہ خریدنا صحیح طور پر ثابت ہے۔ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے پہننا ہے اور آپ کے زمانہ میں لوگ پانچامہ پہنتے تھے۔

قرض کی واپسی میں غیر مشروط زیادتی جائز ہے

۲۹۲۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ لِي عَلَى النَّبِيِّ ﷺ دَيْنٌ فَقَضَانِي وَزَادَنِي. (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۶۴۲/۳ الحدیث رقم ۳۳۴۷ والنسائی فی ۲۸۳/۷ الحدیث رقم ۴۵۹۱۔
ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ذمہ میرا کچھ قرض تھا چنانچہ جب آپ ﷺ نے وہ قرض مجھے ادا کیا اور مجھے کچھ زیادہ دیا۔“ (ابوداؤد)
تشریح: یہ حدیث ما قبل میں گزر چکی۔

ادائیگی قرض کا جلد انتظام کرو

۲۹۲۶: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي رَبِيعَةَ قَالَ اسْتَقْرَضَ مِنِّي النَّبِيُّ ﷺ اَرْبَعِينَ اَلْفًا فَجَاءَهُ مَالٌ فَدَقَّقَهُ اِلَيَّ وَقَالَ بَارَكَ اللهُ تَعَالَى فِي اَهْلِكَ وَمَالِكَ اِنَّمَا جَزَاءُ السَّلْفِ الْحَمْدُ وَالْاَدَاءُ. (رواه النسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ۳۲۴/۷ الحدیث رقم ۴۶۸۳ وابن ماجہ فی ۸۰۹/۲ الحدیث رقم ۲۴۲۴۔
ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ایک موقع پر چالیس ہزار (درہم) قرض لئے تھے پھر جب آپ ﷺ کے پاس (ایک بڑی مقدار میں) مال آیا تو آپ ﷺ نے مجھے (وہ سب مال یا اس مال میں سے میرے قرض کے بقدر دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اہل و عیال اور تمہارے اموال میں برکت عطا فرمائے! قرض کا بدلہ یہی ہے کہ شکر یہ ادا کیا جائے اور قرض کی ادائیگی کا انتظام کیا جائے۔“ (نسائی)

حالاتِ راوی:

عبداللہ بن ربیعہ کے بارے میں ملاحظہ فرماتے ہیں کہ ”مؤلف“ بیہید نے ”الاکمال“ میں ان کا اسم گرامی ذکر نہیں فرمایا۔
تشریح: اربعین الفا: اور کاشف میں ہے کہ تیس ہزار تھے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ دراہم تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ غزوہ حنین کے موقع پر لئے تھے۔ وقال: اور ایک نسخہ میں ”فقال“ ہے۔ بارک اللہ فی مالک واهلک: اصل کی زیادتی دعاء میں زیادتی ہے۔ السلف: دو فتوح کے ساتھ قرض کو کہتے ہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اگر آپ کہیں کہ اس سے یہ وہم ہو سکتا ہے کہ قرض کی مقدار سے زیادہ دینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس

سے حکم مذکور ثابت ہوتا ہے اور اس کے سوا کی نفی ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں جس کا ذکر ہے یہ بطریق و جواب کے ہے کہ منعم کا شکر اداء کرنا اور اس کا حق دینا دونوں واجب ہیں اور واجب مقدار سے زیادہ دینا فضل اور احسان ہے۔

مہلت دینے والے کو ثواب ملتا ہے

۲۹۲۷: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ كَانَ لَهُ عَلَى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ أَخْرَهُ كَانَ لَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ. (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۴/۴۲۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمر بن حصین کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کا کسی پر کوئی حق (یعنی قرض وغیرہ) ہو اور وہ اس حق (کو وصول کرنے) میں تاخیر کرے (یعنی قرض دار کو مہلت دے) تو اسے (وہی ہوئی مہلت کے) ہر دن کے بدلے صدقہ کا ثواب ملے گا۔“ (احمد)

تشریح: قوله: من كان له على رجل حق فمن اخره كان له بكل يوم صدقة: تا کہ یہ صاحب حق اور اس کے علاوہ جو تاخیر کے سبب بنے سب کو شامل ہو۔

دین میراث پر مقدم ہے

۲۹۲۸: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ الْأَطْوَلِ قَالَ مَاتَ أَبِي وَتَرَكَ ثَلَاثِمِائَةَ وَتَرَكَ وَلَدًا صِغَارًا فَأَرَدْتُ أَنْ أَنْفِقَ عَلَيْهِمْ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ أَخَاكَ مَحْبُوسٌ بِدَيْنِهِ فَأَقِضْ عَنْهُ قَالَ فَذَمَّتْ فَقَضَيْتُ عَنْهُ ثُمَّ جِئْتُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَدْ قَضَيْتُ عَنْهُ وَلَمْ تَبَقْ إِلَّا امْرَأَةٌ تَدْعِي دِينَارَيْنِ وَلَيْسَتْ لَهَا بَيْنَةٌ قَالَ أَعْطَاهَا فَإِنَّهَا صَادِقَةٌ. (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۴/۱۳۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت سعد بن اطول کہتے ہیں کہ جب میرا بھائی فوت ہوا تو اس نے تین سو دینار اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے تھے چنانچہ میں نے چاہا کہ ان (تین سو دیناروں) کو اس کے چھوٹے بچوں پر خرچ کر دوں (اور اس کا قرض ادا نہ کروں) لیکن رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا بھائی اپنے قرض کی وجہ سے (عالم برزخ میں) قید ہے (جس کے سبب وہ وہاں کی نعمتوں اور صلحاء کی ارواح کی صحبت سے محروم ہے) لہذا تم اس کی طرف سے اس کا قرض ادا کرو۔ حضرت سعد کہتے ہیں کہ (یہ سنتے ہی) میں گھرا آیا اور اپنے بھائی کا قرض ادا کیا۔ پھر میں (آپ ﷺ کی خدمت میں) حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنے بھائی کا قرض ادا کر دیا ہے اب کوئی قرض خواہ باقی نہیں ہے۔ سوائے ایک عورت کے جو دو دینار کا دعویٰ کر رہی ہے لیکن اس کا کوئی گواہ نہیں ہے آپ ﷺ نے فرمایا ”اس کو بھی دو دینار دے دو وہ سچی عورت ہے۔“ (احمد)

تشریح: ولدا: واؤ اور لام دونوں کے فتح کے ساتھ ہے اول کے ضمہ اور دوسرے کے سکون کے ساتھ بھی ہے۔

صغارا: پہلے حرف کے کسرہ کے ساتھ۔ جوہری کا کہنا ہے کہ ”ولد“ کبھی واحد ہوتا ہے اور کبھی جمع اور اسی طرح ”ولد“ ہے۔

ولم تبق الا المرأة تدعی دینارین: معنوی اعتبار سے ”قضیت“ پر عطف ہے۔ ای قضیت دیون من کانت له بینة ولم أقض لهذه المرأة۔ اور یہ بھی جائز ہے، کہ یہ حال ہو قضیت کی ضمیر فاعل سے، (اس کو ذکر کیا ہے امام طہی نے۔)

ولیسَتْ لَهَا بَيْنَةٌ: اس میں بھی گزشتہ دونوں احتمالات ہیں۔ (جو پچھلے جملے میں تھے۔)

قال اعطها فانها صادقة:

سعد کے بھائی کے قرض کا حال آپ ﷺ کو کیسے معلوم ہوا؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) آپ کو بغیر وحی کے معلوم تھا اس لئے آپ نے سعد کو قرض اداء کرنے کا حکم دیا، کیونکہ حاکم کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی معلومات پر اعتماد کرتے ہوئے حکم جاری کر دے۔

(۲) آپ ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہوا۔ تو یہ آپ کی خصوصیت ہوئی۔ (اس کو ذکر کیا ہے امام طیبی نے۔)

بار بار کی شہادت بھی قرض کا کفارہ نہیں ہو سکتی

۲۹۲۹: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَحْشٍ قَالَ كُنَّا جُلُوسًا بِفِنَاءِ الْمَسْجِدِ حَيْثُ يُوَضَّعُ الْجَنَائِزُ وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ جَالِسٌ بَيْنَ ظَهْرَيْنَا فَرَفَعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَصْرَهُ قِبَلَ السَّمَاءِ فَنَظَرَ نَمَّ طَا طَابَصْرَهُ وَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى جَبْهَتِهِ قَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ مَاذَا نَزَلَ مِنَ التَّشْدِيدِ قَالَ فَسَكُنْنَا يَوْمَنَا وَلَيْلَتَنَا فَلَمْ نَرِ إِلَّا خَيْرًا حَتَّى أَصْبَحْنَا قَالَ مُحَمَّدٌ فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا التَّشْدِيدُ الَّذِي نَزَلَ قَالَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ نَفْسٌ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ عَاشَ مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتَّى يُقْضَى دَيْنُهُ۔

اخرجه احمد في المسند ۵/۲۸۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت محمد بن عبد اللہ بن جحش کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ مسجد نبوی ﷺ کے اس صحن میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں جنازے لا کر رکھے جاتے تھے ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما تھے، اچانک آپ ﷺ نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف بلندی اور دیکھا پھر اپنی نگاہ جھکالی اور اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ کر (انتہائی تعجب کے عالم میں) فرمایا کہ ”سبحان اللہ! سبحان اللہ! کس قدر سختی نازل ہوئی ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ ”ہم ایک دن اور ایک رات خاموش رہے (یعنی ہم نے آپ ﷺ سے کوئی سوال نہیں کیا) اور ہمیں اچھائی کے علاوہ کوئی سخت بات نظر نہیں آئی (یعنی صحابہ آپ ﷺ کے اس ارشاد سے یہ سمجھے کہ شاید اس وقت کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے یا کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے مگر وہ پورا دن گزر گیا، پوری رات گزر گئی نہ کوئی عذاب نازل ہوا اور نہ کوئی مصیبت پیش آئی) یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ حدیث کے راوی محمد بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ”اس کے بعد میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ وہ کیا سختی ہے جو نازل ہوئی ہے“ (اور جس کا اظہار آپ ﷺ نے اتنی حیرانگی کے ساتھ کل فرمایا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا ”دین (یعنی قرض وغیرہ) کے بارے میں وہ سختی نازل ہوئی ہے، قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر کوئی شخص اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کرتے ہوئے) قتل کیا جائے اور پھر زندہ ہو، پھر اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے اور پھر زندہ ہو، پھر اللہ کی راہ میں مارا جائے اور پھر زندہ ہو اور اس پر قرض ہو تو وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے (یعنی اگر کوئی قرض دار بار بار بھی اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے تو یہ بار بار کی شہادت بھی اس کے قرض کا کفارہ نہیں ہو سکتی) اس روایت کو امام احمد نے نقل کیا ہے۔ نیز شرح السنۃ میں بھی اسی طرح کی حدیث منقول ہے۔“ (جس کا مضمون تو یہی ہے مگر الفاظ دوسرے ہیں)

تشریح: قال كنا جلوسا: مصدر مبنی للفاعل ہے، ای جالسين۔

بفناء المسجد: فاء کے کسرہ کے ساتھ گھر کے سامنے صحن کو کہتے ہیں، جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام مسجد کے اندر جنازے نہیں پڑھتے تھے، اور لفظ ظہرین کو تاکید کیلئے زیادہ کیا ہے تاکہ زیادہ قریب ہونے اور ملے ہوئے ہونے پر دلالت کرے۔

قبل: قاف کے کسرہ اور باء کے فتح کے ساتھ۔ طاطا: دو ہمزوں کے ساتھ، قال: سبحان اللہ: یہ تعجب کے طور پر فرمایا اور

دوسرا "سبحان الله" تاکیداً کہا۔ ما نزل من التشديد: یعنی سختی اور وعید۔

فلم نر الا خیرا: یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی خاموشی صرف اس وجہ سے تھی کہ ان کو یقین تھا کہ جو چیز نازل ہوئی ہے وہ عذاب ہے۔ حتیٰ اصبحنا: میں دو احتمال ہے کہ یہ غایت ہے "سکتنا" کیلئے یا "لم نر" کیلئے۔

فسألت رسول الله صلى الله عليه وسلم ما التشديد يد الذي نزل قال في الدين: سوال کیا تقدیر یوں ہے: "ما التشديد النازل" تو آپ ﷺ نے جواب دیا: فی الدين حتى يقضى دينه: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور "دین" رفع کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں فعل صیغہ معلوم کے ساتھ اور دینہ کے نصب کے ساتھ ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ معروف اور مجہول دونوں جائز ہیں۔ معروف پڑھنے کی صورت میں یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس کے ورثہ اداء کریں مضاف کو حذف کر کے فعل کی اسناد مضاف الیہ کی طرف کی ہو۔ اور یہ مراد بھی ہو سکتا ہے کہ قرض دار حساب کے دن اپنا قرض اداء کرے گا۔ راوی کہتا ہے میری عمر کی قسم! ہم اس سے زیادہ سخت نص دین کے باب میں نہیں پاتے۔

بَابُ الشَّرِكَةِ وَالْوَكَالَةِ

شرکت اور وکالت کا بیان

المشركة: شین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ، الو کالۃ: واؤ کے فتح کے ساتھ اور کبھی اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ (جیسا کہ قاموس میں ہے۔)

شرکت کی اقسام: شرح السنہ میں ہے کہ شرکت کی کئی قسمیں ہیں: اول: عین اور منفعت دونوں میں شرکت ہو۔ اس طور پر کہ ایک جماعت کو مال وراثت میں ملایا وہ خریدنے سے اس کے مالک ہو گئے، یا ہبہ کے ذریعے یا وصیت کے ذریعے مالک ہو گئے، یا وہ مال آپس میں ایسے ملا لیں کہ اس میں امتیاز نہ ہو سکے۔

ثانی: شرکت اعیان میں ہونہ کہ منافع میں۔ مثلاً ایک آدمی نے وصیت کی کہ میرے گھر کے منافع کسی آدمی کیلئے ہیں تو گھر ورثہ کا ہو گا اور منافع موصیٰ لہ کیلئے ہوں گے، یا اس کا عکس ہو، بایں طور کہ ایک جماعت نے کوئی گھر کرایہ پر لیا، یا کوئی چیز کسی جماعت کیلئے وقف کر دی کہ منافع ان کو حاصل ہوں گے، عین حاصل نہ ہوگی۔

ثالث: ابدان کے حقوق میں شرکت ہے۔ جیسا کہ حد قذف اور قصاص کہ کوئی جماعت اس کی وارث ہو جائے۔

رابع: اموال کے حقوق میں شرکت ہے۔ جیسا کہ حق شفع ایک جماعت کیلئے ثابت ہوتا ہے۔

جو شرکت مال کو ملانے کے اعتبار سے ہو، تو جب ہر ایک شریک اپنے ساتھی کو تصرف کرنے کی اجازت دیدے، تو جو منافع حاصل ہو گا وہ مال کے بقدر ان کے درمیان تقسیم ہوگا۔ اس کو "شرکت عنان" کہا جاتا ہے۔

الفصل الاول:

عقود میں شرکت جائز ہے

۲۹۳۰: عَنْ زُهْرَةَ بْنِ مَعْبُدٍ أَنَّهُ كَانَ يَخْرُجُ بِهِ جَدُّهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ هِشَامٍ إِلَى السُّوقِ فَيَشْتَرِي الطَّعَامَ فَيَلْقَاهُ

ابْنُ عَمْرٍوَ ابْنُ الزُّبَيْرِ قَبِلُوا لَنْ لَهُ أُشْرُ كُنَّا فَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَدْ دَعَا لَكَ بِالْبُرْكََةِ فَيُشْرِكُهُمْ فَرُبَّمَا أَصَابَ الرَّاحِلَةَ كَمَا هِيَ فَيَبْعُثُ بِهَا إِلَى الْمَنْزِلِ وَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ ابْنُ هِشَامٍ ذَهَبَتْ بِهِ أُمُّهُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَمَسَحَ رَأْسَهُ وَدَعَا لَهُ بِالْبُرْكََةِ . (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۳۶/۵ الحدیث رقم ۲۵۰۱ (۲) فی المخطوطہ (والشركة)

ترجمہ: ”حضرت زہرہ بن معبد تابعی کے بارے میں منقول ہے کہ ان کو ان کے دادا حضرت عبداللہ بن ہشامؓ بازار لے جایا کرتے تھے جہاں وہ غلہ خرید کرتے تھے چنانچہ (جب وہ غلہ خرید لیتے تو) وہاں ان سے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن زبیرؓ ملاقات کرتے اور وہ دونوں ان سے کہتے کہ ہم کو بھی اپنا شریک بنا لو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تمہارے لئے برکت کی دعا کی ہے (حضرت زہرہ کہتے ہیں کہ) میرے دادا ان کو شریک کر لیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی دعا کی برکت سے) ان کو بسا اوقات ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ کا فائدہ ہوتا تھا جسے وہ اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے (اور ان کے حق میں آنحضرت ﷺ کے دعا کا واقعہ یہ ہے کہ) حضرت عبداللہ بن ہشامؓ کی والدہ انہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئیں تو آپ ﷺ نے ان کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور ان کے لئے برکت کی دعا کی تھی۔“ (بخاری)

حالاتِ راوی:

زہرہ بن معبد۔ یہ زہرہ بن معبد کے بیٹے۔ ان کی کنیت ”ابوعقیل“ (عین کے زبر کے ساتھ) ہے۔ یہ قریشی ہیں اور وطن مصری ہیں۔ انہوں نے اپنے دادا عبداللہ بن ہشامؓ وغیرہ سے حدیث سنی ہے۔ ان سے روایت کرنے والی بھی ایک بڑی جماعت ہے اور ان کی حدیث کا بڑا حصہ اہل مصر کے یہاں ہے۔

تشریح: زاء معجمہ کے ضمہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ”معبد“ میں میم مفتوح، عین مہملہ ساکن، بائے موحده مفتوح اور آخر میں وال مہملہ ہے۔

یخرج بہ جدہ عبد اللہ بن ہشام: ”بہ“ میں باء تعدیت کیلئے ہے یا مصابحت کیلئے ہے۔ ”عبد اللہ بن ہشام“: یہ بدل ہے یا عطف بیان ہے ”جدہ“ کیلئے۔

الی السوق: یخرج کا متعلق ہے۔ اشروکنا: ہمزہ کے فتح کے ساتھ،

قاموس میں ہے: شرکہ فی البیع والمیراث، علمہ کی طرح ہے، ”شرکہ“، شین کے کسرہ کے ساتھ ہے، اور مصباح میں ہے شرکہ فی الامر باب ”تعب“ سے ہے شرکا وشرکہ بوزن کلم اور کلمۃ پہلے حرف کے فتح اور دوسرے کے کسرہ کے ساتھ، شریک ہونا۔

اور اشروکتہ فی الامر کا معنی ہے: جعلتہ شریکا۔ علامہ قسطلانی شرح بخاری میں فرماتے ہیں کہ ”اشروکنا“ ہمزہ وصل کے ساتھ ہے، اور ”الفرع“ ایک کتاب کا نام ہے، اس میں ہے کہ یہ راء کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، اور اس کے علاوہ کتابوں میں ہمزہ قطعی کے ساتھ اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے

یشروکہم: پہلے حرف کے ضمہ اور تیسرے کے کسرہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں دونوں فتح کے ساتھ ہے۔ علامہ قسطلانی بھی فرماتے ہیں کہ یاء اور راء کے فتح کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ”فیشرکہما“ ہے۔ صاحب مفاتیح فرماتے ہیں کہ راوی کے قول ”فیشرکہم“ کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کو شریک کر دیتے تھے، اور فیشرکہما بھی روایت کیا گیا ہے۔ (اتحلی)۔

اس سے معلوم ہوا کہ عقد میں شرکت جائز ہے۔

فریما اصاب الراحلة: فعل کی ضمیر مستتر ابن ہشام کی طرف راجع ہے۔
یہ ذکر ”حائل“ اور مراد ”محمول“ کے قبیل ہے۔

ای حال کو نہا بنتہ علی وصف ہی مخلوقہ علیہ۔

ایک حدیث میں ہے: الناس کابل مائة لا تجدد فیہا راحلة۔ نہا یہ میں ہے کہ ”راحلة“ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو سفر کرنے اور بار برداری کی طاقت رکھتا ہو، اور نہ کر اور اونٹ اس میں برابر ہے، اور آخر میں تاء مبالغہ کیلئے ہے۔ یہ وہ اونٹ ہوتا ہے جس کو آدمی اپنی سواری کیلئے پسند کرتا ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو اونٹ کے بار برابر غلہ کا فائدہ ہوتا ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ بار بردار اونٹ کا فائدہ ہوتا ہو، یعنی راحلہ سے مراد حائل ہو، لیکن پہلا احتمال زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ ما قبل کلام غلہ کے بارے میں وارد ہے، اور شیخ مظہر نے مجموعہ مراد لیا ہے کہ آپ ﷺ کی دعاء کی برکت سے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ نفع کے ذریعہ سے پورا الدا ہوا اونٹ بھی خرید لیتے تھے۔

عبد اللہ بن ہشام: قرشی النبی ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ ان کی والدہ کا نام زینب بنت حمید تھا اور یہ چھوٹے تھے۔ مصنف کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ بیعت نہیں کی اور ان سے ان کے بیٹے زہرہ نے حدیث روایت کی ہے۔

انصار کے مال میں مہاجرین کی شرکت

۲۹۳۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَتْ الْأَنْصَارُ لِلنَّبِيِّ ﷺ أَقْسِمُ بَيْنَنَا وَبَيْنَ إِخْوَانِنَا النَّخِيلِ قَالَ لَا تَكْفُونَنَا الْمُونَةَ وَنُشِرْ كُكْمُكُمْ فِي الثَّمَرَةِ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا . (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۸/۵ الحدیث رقم ۲۳۲۵

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ (جب مکہ سے مہاجرین مدینہ آئے تو) انصار (یعنی مدینہ کے لوگوں) نے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے گھجوروں کے درختوں کو ہمارے اور ہمارے مہاجرین بھائیوں کے درمیان تقسیم فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں (انصار نے مہاجرین کو کہا کہ) تم محنت کرو اور ہمیں (گھجوروں کی) پیداوار میں شریک کر لیں گے۔ انصار نے کہا: ہم نے سن لیا اور ہم نے مان لیا۔“ (بخاری)

تشریح: اقسام: ہمزہ وصلی مسورہ اور سین کے کسرہ کے ساتھ۔ قال لا ای لا اقسام بینکم و بینہم۔ تکفوننا المونۃ: خبر بمعنی امر کے ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ”مونۃ“ یہ ”فعولۃ“ کے وزن پر ہے۔ اس پر عرب کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے: مانہم امانہم مانا، محنت مشقت برداشت کرنا۔ اور بعض کہتے ہیں یہ ”مفعلة“ ضمہ کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ”اون“ سے ہے۔ یہ جرح کو کہتے ہیں اس لئے کہ انسان پر بھاری ہوتا ہے۔

نشر ککم: نون اور راء کے فتح کے ساتھ، (یعنی ہم تمہارے شریک ہوں گے) اور ایک نسخہ میں نون کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے (یعنی ہم تمہیں شریک بناؤں گے)۔

حاصل یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے تقسیم سے انکار کیا، تا کہ ان کے درخت ان ہی کے پاس باقی ہیں کہ جس سے ان کا معاش قائم ہے۔ اور آپ ﷺ نے کلام اس طور پر پیش کیا کہ ان کو یہ خیال دیا کہ گویا کہ آپ کا ارادہ اپنے آپ اور اپنے مہاجرین ساتھیوں پر آسانی اور تخفیف کا ہے، اور شرکت اختیار کی اس لئے کہ یہ دونوں قبیلوں کیلئے آسان اور فائدہ مند تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ

مہاجرین درختوں کے آباد کرنے کی یعنی ان کی تائیر کرنے اور سیراب کرنے وغیرہ کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ اپنے درختوں کی خود حفاظت کرو اور ان کی اصلاح کرو، اور ان میں حسب ضرورت کام کرو ان کو آباد کرنا وغیرہ پس جو پھل حاصل ہوں گے وہ تمہارے درمیان تقسیم کریں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنا اور ان کی طرف سے محنت و مشقت کرنا مستحب ہے۔ یہ حدیث بھی شرکت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ ایک حدیث میں ہے: "المعونة تأتي على قدر المؤنة۔"

معاملات میں وکیل بنانا جائز ہے

۲۹۳۲: وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ الْبَارِقِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَعْطَاهُ دِينَارًا لِيَشْتَرِيَ لَهُ شَاةً فَاشْتَرَى لَهُ شَاتَيْنِ فَبَاعَ إِحْدَاهُمَا بِدِينَارٍ وَأَتَاهُ بِشَاةٍ وَدِينَارٍ فَدَعَا لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَبِيعَهُ بِالْبَرَكَةِ فَكَانَ لَوْ اشْتَرَى تَرَابًا لَرَبِحَ فِيهِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۳۲/۶ الحدیث رقم ۳۶۶۲ و ابو داؤد فی السنن ۳/۶۷۷ الحدیث رقم ۳۳۸۴ و الترمذی فی ۳/۵۵۹ الحدیث رقم ۱۲۵۸ و ابن ماجہ فی ۲/۸۰۳ الحدیث رقم ۲۴۰۲ و احمد فی المسند ۴/۳۷۵۔

ترجمہ: "اور حضرت عروہ بن الجعد باریقی کے بارے میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک دینار دیا تاکہ وہ آپ ﷺ کے لئے ایک بکری خرید لائیں، چنانچہ انہوں نے ایک دینار میں دو بکریاں خرید لیں اور پھر ان میں سے ایک بکری کو ایک دینار کے بدلے (کسی کے ہاتھ) فروخت کر دیا اس طرح انہوں نے آپ ﷺ کو ایک بکری دی اور ایک دینار بھی دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے (ان کی اس ذہانت سے خوش ہو کر) ان کے لئے خرید و فروخت کے معاملات میں برکت کی دعا فرمائی جس کا اثر یہ ہوا کہ اگر وہ مٹی خرید لیتے تو اس میں بھی وہ نفع حاصل کرتے تھے۔" (بخاری)

حالاتِ راوی:

عروہ بن ابی الجعد۔ عروہ بن ابی "الجعد" باریقی ہیں۔ "جعد" میں جیم مفتوح اور عین مہملہ ساکن ہے۔ "بارقی" باریق کی طرف منسوب ہے۔ "بارق" ایک پہاڑ کا نام ہے جہاں "ازد" کے کچھ لوگ آ کر آباد ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو "کوفہ" کا قاضی بنایا تھا۔ یہ کوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی حدیث کوفیوں میں پائی جاتی ہے بعضوں نے کہا ہے کہ یہ "عروہ جعد" کے بیٹے ہیں۔ ابن مدینی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جو ان کو "ابن جعد" کہتا ہے وہ غلطی کرتا ہے۔ "عروہ" تو "ابو جعد" کے بیٹے ہیں۔ ان سے شععی رضی اللہ عنہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تجارتی معاملات میں وکالت جائز ہے، اسی طرح ان تمام چیزوں میں بھی کسی کو اپنا وکیل بنانا درست ہے جس میں نیابت چلتی ہو۔ اگر کوئی شخص کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر بیچے تو بیع منعقد ہو جاتی ہے، لیکن اس کا صحیح ہونا مال کے مالک کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر مالک اجازت دیدے تو بیع صحیح ہو جائے گی یہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

امام شافعی کے نزدیک ایک قول میں مالک کی اجازت کے بغیر اس کا مال بیچنا سراسر سے جائز ہی نہیں ہے، اگرچہ بعد میں مالک کی اجازت بھی حاصل کیوں نہ ہو جائے۔ اور حدیث میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ وکالت مطلق تھی اور وکیل مطلق کو بیچنے اور خریدنے کا اختیار ہوتا ہے، لہذا اس کے تصرفات مالک کی اجازت سے صادر ہوتے ہیں۔

الفصل الثانی:

امانت دار شرکاء کا اللہ تعالیٰ محافظ رہتا ہے

۲۹۳۳: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَفَعَهُ قَالَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ مَا لَمْ يَخُنْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ
فَإِذَا خَانَهُ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا (رواه ابو داؤد و زاد ارزين) وَجَاءَ الشَّيْطَانُ .

اخرجه ابو داؤد في السنن ۶۷۷/۳ الحديث رقم ۳۳۸۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جب دو شرکاء میں سے ایک شریک دوسرے کے ساتھ خیانت والا معاملہ نہیں کرتا تو میں ان کا تیسرا ہوتا ہوں اور جب وہ خیانت و بددیانتی پر اتر آتے ہیں تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔“ (ابو داؤد) اور رزین نے اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ ”اور پھر (ان کے درمیان) شیطان آجاتا ہے۔“

تشریح: يقول انا ثالث الشريكين: یعنی ان دونوں کے ساتھ حفاظت اور برکت کے ساتھ ہوتا ہوں۔ ان دونوں کے مال کی حفاظت کرتا ہوں ان دونوں کو رزق دیتا ہوں اور ان کے معاملات میں خیر و بھلائی عطا کرتا ہوں۔ یعنی ان کی مدد کرتا ہوں جب تک ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے ساتھ مدد کرتا ہے۔

فاذا خانا خرجت من بينهما: یعنی برکت ختم ہو جاتی ہے حفاظت کا کٹنے کی وجہ سے۔

زاد رزين وجاء الشيطان: یعنی ان کے درمیان داخل ہو جاتا ہے اور ان میں سے تیسرا بن جاتا ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شرکت عبارت ہے اس سے کہ بعض لوگ اپنا مال بعض لوگوں کے مال کے ساتھ اس طور پر ملائیں کہ اس میں امتیاز نہ ہو سکے۔ اور اللہ کی شرکت ان دونوں کے ساتھ یہ استعارہ ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے برکت، فضل اور فائدے کو بمنزلہ مال مخلوط (ملا یا ہوا) کے قرار دیا، اور اپنے آپ کو ان کا تیسرا کہا۔ اور شیطان کی خیانت اور برکت کے مٹنے کو بمنزلہ مال مخلوط کے قرار دیا، اور شیطان کو ان کا تیسرا قرار دیا، اور ”خرجت من بينهما“ یہ استعارہ ترشیحیہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ معاملات میں شرکت مستحب ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ برکت نازل ہوتی ہے جو تنہا کاروبار کرنے والے کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے دوسرے شریک کے مال کی حفاظت و نگرانی میں کوشاں رہتا ہے۔

اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ کوئی بندہ جب تک اپنے مسلمان بھائی کی مدد اور خیر خواہی میں لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال رہتی ہے۔

خائن سے انتقام کا جذبہ تمہیں خیانت پر نہ اُکسداے

۲۹۳۳: وَعَنْ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِذَا آتَا مَانَةً إِلَىٰ مَنِ اتَّمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مِنْ خَانَكَ .

(رواه الترمذی و ابو داؤد و الدارمی)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۸۰۵/۳ الحديث رقم ۳۵۳۵ و الترمذی في ۵۶۴/۳ الحديث رقم ۱۲۶۴ و الدارمی في

۲۴۳/۲ الحديث رقم ۲۵۹۷

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص تمہارے پاس

امانت رکھوئے اس کی امانت کو ادا کرو جو شخص تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اس کے ساتھ خیانت مت کرو۔ (ترمذی ابو داؤد)

(داری)

تشریح: ”اد امر ہے: ”ادی یودی تادیہ سے۔

ولا تخن: خائن کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

قاضی کہتے ہیں کہ خائن نے تمہارے ساتھ جو معاملہ کیا ہے وہی معاملہ تم اس کے ساتھ نہ کرو اور خیانت کا مقابلہ خیانت کے ساتھ نہ کرو، پس تم بھی اس کی طرح خائن قرار دے جاؤ گے۔ اور اس (حکم) میں وہ شخص داخل نہیں ہے، جو جاحد (مکر جانے والے) سے اپنے حق کے بقدر اس کا مال لے لے، کیونکہ یہ تو اس سے اپنا حق لے رہا ہے جو کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہے، جبکہ خیانت ظلم ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ: بہتر یہ ہے کہ اس حدیث کو اس آیت کے معنی پر اتارا جائے: ﴿وَلَا تَسْوَى الْحَسَنَةَ وَلَا السَّيِّئَةَ اَدْفَعْ بِلْتَىٰ هِيَ اِحْسَنُ﴾ [فصلت- ۳۴] (اور نیکی اور بدی کو برابر نہیں ہوئی، آپ نیک برتاؤ سے سے ٹال دیا کیجئے)۔ یعنی جب تیرا ساتھی خیانت کرے تو اس کا بدلہ خیانت کے ساتھ مت دے، اگرچہ یہ اچھا ہو، بلکہ آپ اس کو بدلہ دیں اس طریقے سے جو زیادہ اچھا ہے اور وہ عدم مکافاة (یعنی برابری نہ کرنا) ہے، اور احسان ہے اس کے ساتھ جس نے تیرے ساتھ برائی کی ہے۔

آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا وکیل

۲۹۳۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَرَدْتُ الْخُرُوجَ اِلَىٰ خَيْبَرَ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ اِنِّي اَرَدْتُ الْخُرُوجَ اِلَىٰ خَيْبَرَ فَقَالَ اِذَا اَتَيْتَ وَكَيْلِي فَخُذْ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ وَسَقًا فَاِنْ اَبْتَعِيَ مِنْكَ اَيَّةَ لُصْعٍ يَدَكَ عَلٰى تَرْقُوْتِهِ (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴/۴۷ الحدیث رقم ۳۶۳۲ (۳) فی المخطوطة (الوداع) (۴) فی المخطوطة (خبر)۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے خیبر جانے کا ارادہ کیا تو (رخصت ہونے کے ارادہ سے) میں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو سلام کیا اور عرض کیا کہ میں نے خیبر جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم خیبر میں میرے وکیل کے پاس جاؤ تو اس سے پندرہ وسق (کھجوریں) لے لینا اگر وہ تم سے کوئی نشانی کا مطالبہ کرے تو اپنا ہاتھ اس کے حلق پر رکھ دینا۔“ (ابو داؤد)

تشریح: خیبر: مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے۔ یہ غیر منصرف ہے۔

وقلت: اور ایک نسخہ میں فقلت ہے۔

وسقا: پہلے فتح اور پھر سکون ہے، ایک وسق ساٹھ ۶۰ صاع کا ہوتا ہے۔

ترقوة: تاء کے فتح راء کے سکون، قاف کے ضمہ اور واؤ کے فتح کے ساتھ۔ مغرب میں ہے ”ترقوة“، ہنسی اور کندھے کے درمیان والی ہڈی کا نام ہے دونوں جانبوں سے، اور فارسی میں اس کو ”خیر کردن“ کہتے ہیں۔ اور قاموس میں ہے حلق کے آگے اور سینہ کے اوپر کی طرف جہاں سے سانس چڑھتا ہے اس کو ”ترقوة“ کہتے ہیں۔

الفصل الثالث:

شرکت مضاربت میں خیر و بھلائی ہے

۲۹۳۶: عَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثٌ فَيَهِنُ الْبُرْكَاءُ الْبَيْعُ اِلَىٰ اَجَلٍ وَالْمُقَارَضَةُ وَالْاِحْلَاطُ

الْبُرِّ بِالشَّعِيرِ لِلْبَيْتِ لَا لِلْبَيْعِ . (رواه ابن ماجہ)

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۲/۷۶۸ الحدیث رقم ۲۲۸۹۔

ترجمہ: ”حضرت صہیبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن میں برکت ہے (یعنی بہت زیادہ خیر و بھلائی) ایک (معینہ) مدت تک (ادھار) بیچنا (۲) مضاربت کرنا (۳) (گندم میں جو ملنا گھر میں استعمال کے لئے بیچنے کے لئے نہیں)۔ (ابن ماجہ)

تشریح: ثلاث: اس کی تیز محذوف ہے اسی خصال۔ یعنی خریدار کو قیمت ادا کرنے میں مہلت دینے میں برکت ہے چونکہ اس پر بہت زیادہ ثواب اور ثناء جمیلہ مرتب ہوتی ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مضاربت کہتے ہیں کہ آدمی اپنے اموال میں سے ایک حصہ لگ کر کے دوسرے کو دے تاکہ وہ اس سے کام کرے اور منافع کو آپس میں تقسیم کریں۔ اس میں اشارہ ہے قاعدت پر اور اس پر کہ پونجی کی زیادتی کیلئے حرص نہ ہونی چاہئے۔
البر: براء کے ضمہ کے ساتھ گندم کو کہتے ہیں۔ آخری حکم کی بنیاد معاش کے علم پر ہے، جو کہ اللہ کے اس ارشاد سے: مستفاد ہے ﴿وَالَّذِينَ إِذَا انْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ [الفرقان۔ ۶۷] (اور وہ جب خرچ کرنے لگتے ہیں، تو فوضو لخریجی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے)۔ ان تینوں خصلتوں میں اپنے حق کو توڑنا ہے پہلے دونوں میں فائدہ غیر کو جاتا ہے اور تیسرے میں اپنے نفس کی طرف جاتا ہے کہ یہ شہوات کو توڑتا ہے اس لئے فرمایا: ”للبيوع لا لبيع“ اگر یہ کام بیع میں ہوگا تو اس میں مسلمانوں کے ساتھ ایک قسم کا فریب ہے۔

ایک واقعہ

۲۹۳۷: وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بَعَثَ مَعَهُ بَدِينَارٍ لِيَشْتَرِيَ لَهُ بِهِ أَصْحِيَّةً فَأَشْتَرَى كَيْشًا بَدِينَارٍ وَبَاعَهُ بَدِينَارَيْنِ فَرَجَعَ فَأَشْتَرَى أَصْحِيَّةً بَدِينَارٍ فَجَاءَ بِهَا وَبِالْبَدِينَارِ الَّذِي اسْتَفْضَلَ مِنَ الْأُخْرَى فَتَصَدَّقَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْبَدِينَارِ فَدَعَا لَهُ أَنْ يُبَارَكَ لَهُ فِي تِجَارَتِهِ۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۶۸۹ الحدیث رقم ۳۳۸۶ والترمذی فی ۳/۵۵۸ الحدیث رقم ۱۲۵۷

ترجمہ: ”اور حضرت حکیم بن حزامؓ کے بارے میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک دینار دے کر بھیجا تاکہ وہ اس دینار سے آپ ﷺ کے لئے قربانی کا جانور خرید لیں؛ چنانچہ انہوں نے اس دینار کے بدلے ایک مینڈھایا دنبہ خرید اور پھر اسے دو دینار میں فروخت کر دیا (اس سے فارغ ہو کر) وہ پھر واپس گئے اور انہوں نے قربانی کا جانور ایک دینار میں خرید اور اس جانور کے ساتھ وہ دینار بھی لا کر آپ ﷺ کو دے دیا جو پہلے خریدے گئے جانور کی وصول شدہ قیمت میں سے بیچ گیا تھا رسول اللہ ﷺ نے اس دینار کو صدقہ کر دیا اور حکیم بن حزامؓ کے حق میں یہ دعا فرمائی کہ ان کی تجارت میں برکت ڈال دی جائے۔“ (ترمذی ابوداؤد)

تشریح: قوله: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث معه بدینار: امام طبری فرماتے ہیں کہ مفعول پر براء زائد

ہے، جیسا کہ اس آیت میں: ﴿وَلَا تَلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرة۔ ۱۹۵] اس قول کی بنیاد پر کہ آیت میں ”ایدی“ سے مراد ”نفس“ ہے، یعنی کہ تم اپنے نفسوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں مفعول محذوف ہے اور تقدیر یوں ہے: وَلَا تَلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ أَنْفُسَكُمْ الْيَهُدَى۔

بَابُ الْغُصْبِ وَالْعَارِيَةِ

غصب اور عاریت کا بیان

امام نووی فرماتے ہیں کہ ”عاریۃ“ یا عی کی تشدید کے ساتھ ہے۔ خطابی ”غریب“ میں کہتے ہیں کہ کبھی اس کی یا ع کو مخفف بھی پڑھا جاتا ہے۔ تو ریشی فرماتے ہیں کہ یہ ”عار“ کی طرف منسوب ہے، اس لئے کہ عرب اس کے مانگنے کو عار اور عیب سمجھتے تھے۔ شاعر کہتا ہے:

انما انفسنا عاریة ☆ والعواری قصارها ان ترد

بے شک ہمارے نفس عاریۃ ہے، اور عاریت کی آخری کوشش یہ ہے کہ وہ لوٹائی جائے۔

اور ”العیاری“ بھی ”عاریۃ“ کی طرح ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ ”تعاور“ سے (ماخوذ) ہے، بمعنی تداول (باری باری لینا) یہ (ماخذ) بھی بعید نہیں ہے۔

الفصل الاول:

۲۹۳۸: عَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ مَنْ أَحَدَ شَيْبًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا فَإِنَّهُ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ . (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۹۳/۶ الحدیث رقم ۳۱۹۸ ومسلم فی ۱۲۳۱/۳ الحدیث رقم (۱۶۱۰-۱۶۱۱) والترمذی فی السنن ۲۰/۴ الحدیث رقم ۱۴۱۸ والدارمی فی ۳۴۶/۲ الحدیث رقم ۲۶۰۶ واحمد فی المسند ۱۸۷/۱۔

ترجمہ: حضرت سعید بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص (کسی کی) باشت بھر زمین بھی ازراہ ظلم لے لگا قیامت کے دن ساتوں زمینیں اس کے گلے میں بطور طوق ڈالی جائیں گی۔ (بخاری و مسلم)۔

تشریح: اخذ شبرا: یہاں مضاف محذوف ہے۔ ای قدر شبر یعنی باشت کی مقدار۔

”ظلماً“ مفعول لہ ہے یا حال ہے یا مفعول مطلق ہے۔ فانہ: ضمیر ”شبر“ کی طرف عائد۔ يطوقه: صیغہ جنہوں کے ساتھ ہے۔

ارضین: راء کے فتح اور سکون دونوں کے ساتھ ہے۔ کشاف میں ہے: ارضون، راء کی حرکت کے ساتھ ہے، اس لئے کہ قیاس کے مطابق (اس کی جمع) ”ارضات“ (آنی چاہئے تھی) ثمرات کی طرح۔ جب تاء کے عوض واو اور نون لائے گئے، تو زاء کا فتح اپنی حالت پر باقی رہا، اور کبھی اس کو ساکن بھی کر دیا جاتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ زمینیں سات (۷) ہیں اور یہ اس آیت کے موافق ہے: ﴿سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِن

الارض مثلهن﴾ [الطلاق-۱۲]

اور ان لوگوں کا قول ظاہر کے خلاف ہے جو کہتے ہیں کہ سات سے مراد سات اقلیم ہیں، اس لئے کہ جس نے زمین میں سے ایک باشت غصب کی تو اس کے گلے میں ہر ایک اقلیم سے ایک باشت کو طوق نہیں بنایا جائے گا، بخلاف زمین کے طبقات کے، کہ وہ اس باشت کے تابع ہیں ملک کے اعتبار سے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ”کلفہ اللہ ان يحفره حتى يبلغ آخر سبع ارضين“۔ شرح السنہ میں ہے کہ طوق ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کو زمین میں دھنساے گا چنانچہ زمین کا وہ قطعہ جو اس نے غصب کیا ہوگا اس کے گلے کو طوق کی مانند جکڑے گا۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ قیامت کے دن اس کو اس زمین کے اٹھانے کا مکلف بنایا جائے گا لہذا یہاں طوق تکلیف مراد ہے نہ کہ طوق تقلید، اس وجہ سے کہ سالم نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جس نے کسی کی زمین میں سے کچھ بغیر حق کے لیا تو قیامت کے دن اس کو ساتویں زمین تک دھنسا یا جائے گا“۔ (اتمی)

یہ بخاری کی روایت ہے احمد سے،

ان دونوں روایتوں کے درمیان جمع اور تطبیق یوں ممکن ہے کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جائے گا یا اشخاص کے اختلاف سے ظالم اور مظلوم کا عذاب بھی سخت اور کم ہونے کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔

کسی جانور کا دودھ مالک کی اجازت کے بغیر نہ دوھو

۲۹۳۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَجْلِبِنَ أَحَدٌ مَا شِئَةَ امْرِيٍّ بِغَيْرِ إِذْنِهِ أَيَحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يُؤْتِيَ مَشْرُبَتَهُ فَتُكْسِرُ خِزَانَتَهُ فَيَنْقُلُ طَعَامَهُ وَانَّمَا يَخْزَنُ لَهُمْ ضُرُوعُ مَوَاشِيهِمْ أَطْعَمًا تِيهِمْ - (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۸۸/۵ الحدیث رقم ۲۴۳۵ ومسلم فی ۱۳۵۲/۳ الحدیث رقم (۱۳-۱۷۲۶) وابوداؤد فی ۹۱/۳ الحدیث رقم ۲۶۲۳ وابن ماجہ فی ۷۷۲/۲ الحدیث رقم ۲۳۰۲ ومالک فی الموطأ ۹۹۷۱/۲ الحدیث رقم

۱۷ من کتاب الاستیذان

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے جانور کا دودھ اس کی اجازت (یعنی اس کے حکم و رضا) کے بغیر نہ دوھے! کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ کوئی شخص اس کے خزانہ (یعنی اس کے غلہ کے گودام میں آئے اور اس کے گودام کا تالا توڑ دیا جائے اور اس کا غلہ (گودام سے) نکال لیا جائے اسی طرح (جان لو کہ) ان کے جانوروں کے تھن ان کی غذا (یعنی دودھ) کی حفاظت کرتے ہیں“۔ (مسلم)

تشریح: لا یجلبن: لام کے ضمہ کے ساتھ ہے اور کسرہ بھی جائز ہے جیسا کہ قاموس میں ہے۔ ماشیہ: بکری، اونٹ، اور گائے مراد ہے۔ ایحب احدکم: استفہام انکاری ہے۔ ان یؤتی: صیغہ مجہول کے ساتھ، بصیغہ مؤنث اور مذکر دونوں طرح ہے، مشربۃ: میم کے فتح اور راء کے ضمہ کے ساتھ راء کو فتح بھی دیا جاتا ہے بمعنی کمرہ وہ بالا خانہ جس میں سامان رکھا جاتا ہو۔ خزانته: خاء کے کسرہ کے ساتھ جیسے ”کتابۃ“ ہے، خز: اچی کا پیشہ مال جمع کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں، اور اس کو کھولا نہیں جاتا جیسے خزانہ اور قضاء حاجت کا برتن نہیں کھولا جاتا۔

فیئشل: شرح السنہ میں نہایہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”فیئقل متاعہ“ یاء، نون اور ثاء مثلثہ کے ساتھ اس کا معنی ہے: یستخرج ویؤخذ۔

یخزن: بصیغہ مذکر مؤنث دونوں طرح ہے، اور راء کے ضمہ کے ساتھ۔
أطعمتہم: یہ جمع الجمع ہے ”طعام“ کی اور برائے مبالغہ لائی گئی ہے مفعول ہے ”یخزن“ کا، مطلب یہ ہے کہ ان کے موشیوں کے تھن دودھ کی حفاظت میں بمنزلہ تمہارے خزانے اور گودام کے ہیں جو تمہارے غلہ وغیرہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس جس نے ان کے جانوروں کا دودھ دوھایا چوری کی تو ایسا ہے جیسا کہ ان کے خزانے کو توڑا ہو۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اکثر علماء نے اس ارشادِ گرامی پر عمل کرتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ کسی کے جانور کا دودھ مالک کی اجازت کے بغیر دوھنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص بھوک سے بے حال ہو رہا ہو، تو اس کیلئے اجازت ہے کہ وہ کسی کے جانور کا دودھ پی لے، پھر اس کی قیمت ادا کرے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس پر ضمان نہیں ہے اس لئے کہ شریعت نے اس کیلئے یہ مباح کیا ہے۔

امام احمد اور اسنن وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ مضطر کے علاوہ کیلئے بھی یہ مباح ہے، جب مالک وہاں موجود نہ ہو۔ پہلی دلیل: مدینہ ہجرت کے وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ کیلئے قریش کے ایک آدمی کی بکریوں کا دودھ دوھا تھا اور وہ بکریاں اس مالک کا غلام چرا ہاتھا اور مالک خود غائب تھا۔ دوسری دلیل: حضرت سمرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کہ ”جب تم میں سے کوئی جانوروں کے پاس آئے اور ان کا مالک موجود نہ ہو، تو تین آوازیں لگائیں، پس اگر کسی نے جواب دے دیا تو اس سے اجازت لے لے اور اگر کسی نے بھی جواب نہیں دیا تو دودھ دوہ لے اور پی لے اور ساتھ لے کر نہ جائے۔“

بعض نے مسافر کیلئے کسی دوسرے کے پھل کھانے کی اجازت دی ہے، اس روایت کی وجہ سے جو ابن عمر سے سند غریب کے ساتھ نقل کی گئی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جو کسی کے باغ میں کھانے کے لئے داخل ہو جائے اور چھپا کر نہ لے جائے تو اس پر کچھ نہیں ہے۔“ لیکن اکثر علماء کے ہاں مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے مگر بھوک کی ضرورت کی وجہ سے جیسا کہ پہلے گزرا۔ علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ بعض نے ان احادیث کو بھوک اور ضرورت پر محمول کیا ہے، اس لئے کہ یہ ان نصوص کے قائم مقام نہیں ہو سکتیں جو مسلمان کے مال کی حرمت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اگر غیر مضطر کو مالک کے بارے میں معلوم ہو، یا گمان ہو کہ اس کی اجازت کے بغیر کھانے سے اس کا دل خوش ہوگا نہ کہ ناراض تو پھر اس کیلئے کھانا جائز ہے۔ مضطر اگر پاتا ہو مردار اور کھانا جو کسی غیر کا ہو، تو دونوں میں سے کیا کھائے؟ تو اس میں اختلاف ہے ہمارے ہاں زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ مردار کھائے۔

ایک واقعہ

۲۹۴۰: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ عِنْدَ بَعْضِ نَسَائِهِ فَأَرْسَلَتْ إِحْدَى أُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِينَ بِصَحْفَةٍ فِيهَا طَعَامٌ فَضَرَبَتِ النَّبِيَّ ﷺ فِي بَيْتِهَا يَدَ الْخَادِمِ فَسَقَطَتِ الصَّحْفَةُ فَأَنْفَلَقَتْ فَجَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ فَلَقَّ الصَّحْفَةَ ثُمَّ جَعَلَ يَجْمَعُ فِيهَا الطَّعَامَ الَّذِي كَانَ فِي الصَّحْفَةِ وَيَقُولُ غَارَتْ، أُمَّكُمْ ثُمَّ حَبَسَ الْخَادِمَ حَتَّى أُبَيِّصَ صَحْفَةً مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ ﷺ هُوَ فِي بَيْتِهَا فَدَفَعَ الصَّحْفَةَ الصَّحِيحَةَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ كَسَّرَتْ صَحْفَتُهَا وَأَمْسَكَ الْمَكْسُورَةَ فِي بَيْتِ النَّبِيِّ ﷺ كَسَّرَتْ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۲۰/۹ الحدیث رقم ۵۲۲۵ والنسائی فی السنن ۷۰/۷ الحدیث رقم ۳۹۵۵ واحمد فی المسند ۲۶۳/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ اپنی کسی زوجہ مطہرہ (یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ) کے ہاں قیام فرماتھے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے (یعنی حضرت زینبؓ یا حضرت صفیہؓ اور یا حضرت أم سلمہؓ نے) ایک پلیٹ بھیجی جس میں کھانے کی کوئی چیز تھی (اسے دیکھتے ہی) ان زوجہ مطہرہ نے کہ جن کے ہاں آپ ﷺ قیام فرماتے تھے (یعنی حضرت عائشہؓ نے) خادم کے ہاتھ پر (اس طرح) مارا کہ وہ پلیٹ گر بڑی اور ٹوٹ گئی۔ نبی کریم ﷺ نے رکابی کے وہ (ٹوٹے ہوئے) ٹکڑے اکٹھے کئے اور پھر ان ٹکڑوں میں کھانے کی وہ چیز جمع کی جو پلیٹ میں موجود تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”تمہاری ماں کو غیرت آگئی تھی“ بہر کیف آپ ﷺ نے (کچھ دیر) خادم کو روک رکھا یہاں تک کہ جن زوجہ مطہرہ کے گھر آپ ﷺ قیام فرماتے تھے (یعنی حضرت عائشہؓ) ان کے ہاں سے دوسری پلیٹ مہیا کی گئی اور پھر آپ ﷺ نے (اسی خادم کے ذریعہ) ان زوجہ مطہرہ کے ہاں جن کی پلیٹ ٹوٹ گئی تھی وہ صحیح و سالم پلیٹ بھیج دی اور وہ ٹوٹی ہوئی پلیٹ ان زوجہ مطہرہ کے گھر رکھی جنہوں نے اس پلیٹ کو توڑا تھا۔“ (بخاری)

تشریح: تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس روایت کے دوسرے طرق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جس نے خادم کے ہاتھ پر مارا تھا وہ

حضرت عائشہ تھیں۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس نے اپنے اس قول ”عند بعض نساہہ“ میں ابہام رکھا ہے اور مراد حضرت عائشہ تھیں، یہ تعظیم شان کیلئے تھا اور اس وجہ سے کہ اس میں کوئی خفا نہیں تھا اور نہ التباس تھا کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں، اسلئے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوا اور تحائف اس وقت آتے تھے جب آپ حضرت عائشہ کے گھر میں ہوتے تھے۔ (اتحالی)

ظاہر یہ ہے کہ یہ مبہم ذکر کرنے کی علت نہیں ہے، بلکہ اس نے جو اس کو مبہم ذکر کیا تھا وہ بھولنے کی وجہ سے تھا، یا تردد کی وجہ سے یا تعدد واقعہ کی وجہ سے، ہاں یہ قرآن مجمل کو واضح اور مبہم کو متعین کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

ارسلت احدی امہات المؤمنین: بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت صفیہ تھیں، بعض کہتے ہیں کہ زینب تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ تھیں۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ بھیجنے والی کو ”ام المؤمنین“ کی صفت کے ساتھ ذکر کیا اس کی شفقت اور اس کی کسر غیرت کے اظہار کے لئے کہ اس نے اپنی سوکن کے گھر یا لہ میں ہدیہ بھیجا تھا۔

فلق: فاء کے کسرہ اور لام کے فتح کے ساتھ جمع ہے ”فلقۃ“ کی۔ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ جعل: بمعنی شرع ہے۔

یہ فعل آپ ﷺ کے کمال تحمل، انتہائی تواضع، حسن معاشرت، اور اپنے رب کی نعمت کی بہت زیادہ تعظیم کا مظہر ہے۔

قولہ: ویقول غارت امکم: امام طبری فرماتے ہیں آپ ﷺ کا یہ خطاب عام ہے دراصل واقعہ کو سننے پڑھنے والوں سے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کی طرف سے عذر بیان کیا تا کہ لوگ حضرت عائشہ کے اس فعل کو برائی پر محمول نہ کریں، بلکہ یہ سوکنوں کی اس طبیعت کی وجہ سے ہوا جو ان کی عادت ہے جو ہر عورت کی جبلت و سرشت میں داخل ہے اور اس کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اپنے نفس کو اس سے محفوظ رکھ سکے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خطاب ان مؤمنین سے ہے جو اس حاضر تھے۔

حتی اتمی: صیغہ مجہول کے ساتھ۔ کسرت: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

بیت التی کسرت: صیغہ معلوم کے ساتھ ہے، تو رپشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا تعلق نہ تو غضب سے ہے اور نہ ہی عاریتہ سے ہے بلکہ مناسب یہ تھا کہ اس کو ”باب ضمان المتلفات“ میں ذکر کرتے۔

قاضی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو اس باب میں نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے رکابی کو مارنے والی پر رکابی کے بدل کا تاوان لازم کیا اس لئے کہ وہ رکابی اس کے خادم کے ہاتھ کو مارنے کی وجہ سے ٹوٹی تھی اور غضب کے اقسام میں سے کسی کے مال کو تلف کرنا ہے خواہ برادہ راست تلف کیا جائے یا کسی اور سبب سے زیادتی کے طور پر تلف کیا ہو۔

ابن الملک شرح المشارق میں فرماتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا رکابی کا ضمان قیمت کے ساتھ لازم تھا اس کے لئے کہ یہ ذوات الامثال میں سے نہیں تھی تو پھر آپ علیہ السلام نے رکابی کے بدلے رکابی کیوں دی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ آپ ﷺ نے بطور مروت کے دیا تھا نہ کہ ضمان کے طور پر، اس لئے کہ رکابیاں دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس وقت رکابیاں ایک جیسی ہوتی تھیں تو یہ عدویات متقار بہ کی طرح تھی، ان میں سے ایک کو دوسری کی جگہ دینا جائز تھا، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ نے ان دونوں کی رضامندی کے ساتھ کیا تھا لہذا قیمت کا دعویٰ باقی نہ رہا۔

کسی مسلمان کا مال لوٹنا حرام ہے

۲۹۳۱: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ يَزِيدَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ نَهَى عَنِ النَّهْبَةِ وَالْمُغْلَبَةِ (رواه البخاری)

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ڈاکر ڈالنے اور مثلاً کرنے (یعنی مروے کے اعضاء کاٹنے) سے منع فرمایا ہے۔“ (بخاری)

تشریح: النهیۃ: نون کے ضمہ کے ساتھ۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں وارد نہیں کی یہ تاویل کی جائے گی کہ یہ اس جماعت کے بارے میں ہے کہ جو غنیمت کا مال لوٹے اور اس کو تقسیم میں شامل نہ کرے، یا اس قوم کے بارے میں کہ ان کے پاس کہیں سے غلہ آجائے اور وہ اس کو لوٹ لیں اور اس طرح کی اور صورتیں، ورنہ مسلمانوں کا مال لوٹنا ہر ایک پر حرام ہے۔

المثلة: میم کے ضمہ کے ساتھ۔ نہیہ میں ہے کہ کہا جاتا ہے: مفلت بالحویان أمثل بہ مغلًا، جب اس کے اطراف کاٹے جائیں، اور اس کو بدنما اور بدرو کیا جائے، اور بعض کہتے ہیں اس سے مراد تخلیق میں بدنمائی پیدا کرنا ہے، ناک، کان کاٹنے اور آنکھوں کے پھوڑنے کے ساتھ۔ (انتہی)

بعض کہتے ہیں مثلاً مقتول کے اعضاء ”قصاصاً“ یا کفر کی وجہ سے، یا حد (بطور حد) کاٹنے کو کہتے ہیں اس لئے کہ غرض حیاۃ کا ختم کرنا ہے اور وہ حاصل ہو چکا ہے تو اس کے بعد اس کے کاٹنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

حاجیوں کا سامان چرانے والے کا عبرتناک شتر

۲۹۳۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ مَاتَ اِبْرَاهِيمُ ابْنُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَصَلَّى بِالنَّاسِ سِتَّ رَكَعَاتٍ بَارُبِعَ سَجَدَاتٍ فَاَنْصَرَفَ وَقَدْ اَضَتْ الشَّمْسُ وَقَالَ مَا مِنْ شَيْءٍ تُوَعِدُونَهُ اِلَّا قَدَّرَ اَيُّهُ فِي صَلَاتِي هَلِذِهِ لَقَدْ جِئْتُ بِالنَّارِ وَذَلِكَ حِيْنَ رَاَيْتُمُونِي تَاَخَّرْتُ مَخَافَةَ اَنْ يُصِيبَنِي مِنْ لَفْحِهَا وَحَتَّى رَاَيْتُ فِيهَا صَاحِبَ الْمِحْجَنِ يَجُرُّ قَصْبَهُ فِي النَّارِ وَكَانَ يَسْرِقُ الْحَاجَّ بِمِحْجِنِهِ فَاِنْ فُطِنَ لَهُ قَالَ اِنَّمَا تَعَلَّقَ بِمِحْجِنِي وَاِنْ غُفِلَ عَنْهُ ذَهَبَ بِهِ وَحَتَّى رَاَيْتُ فِيهَا صَاحِبَةَ الْهَرَّةِ الَّتِي رَبَطْتَهَا فَلَمْ تَطْعَمْهَا وَلَمْ تَدْعُهَا تَاْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ حَتَّى مَاتَتْ جُوعًا نَمَّ جِئْتُ بِالْجَنَّةِ وَذَلِكَ حِيْنَ رَاَيْتُمُونِي تَقَدَّمْتُ حَتَّى قُمْتُ فِي مَقَامِي وَلَقَدْ مَدَدْتُ يَدِي وَاَنَا اُرِيدُ اَنْ اَتَنَاوَلَ مِنْ نَمْرَتِهَا لِتَنْظُرُوا اِلَيْهِ نَمَّ بَدَا لِي اَنْ لَا اَفْعَلَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحہ ۶۲۳/۲ الحدیث رقم (۱۰-۹۰۴) واحمد فی المسند ۳/۳۱۸

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کی وفات کے دن سورج گرہن ہوا چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو (سورج گرہن کی) نماز چھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ پڑھائی (یعنی دو رکعتیں پڑھیں اور ہر رکعت میں تین تین رکوع اور دو سجدے کئے) اور جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو سورج پہلے کی طرح روشن ہو چکا تھا پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس چیز کا (یعنی جنت اور دوزخ کا) تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ میں نے آج اپنی اس نماز میں دیکھ لی ہے چنانچہ دوزخ کو میرے سامنے لایا گیا اور یہی وہ وقت تھا جب (نماز کے دوران) تم نے مجھے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا تھا اور میں اس خوف سے پیچھے ہٹ گیا تھا کہ کہیں اس کی گرمی مجھے اپنی لپیٹ میں نہ لے لے (میں نے) اس وقت (دوزخ میں خمدار لکڑی والے شخص (یعنی عمرو بن لکھی) کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اس میں اپنی انتڑیوں کو گھسیٹ رہا تھا یہ شخص اپنی خمدار لکڑی کے ذریعہ حاجیوں کا سامان چرایا کرتا تھا (جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ وہ چلتے چلتے کسی کوئی چیز اپنی خمدار لکڑی میں الجھا لیتا تھا) اگر کوئی اس کی یہ حرکت دیکھ لیتا تو وہ یہ کہہ دیتا کہ یہ چیز خود بخود میری لکڑی میں الجھ آئی ہے اور اگر کسی کو اس حرکت کے بارے میں معلوم نہ

ہوتا تو وہ اس چیز کو غائب کر دیتا تھا۔ نیز میں نے اس وقت دوزخ میں اس بی بی والی عورت کو بھی دیکھا جس نے ایک بی بی باندھ رکھی تھی جسے نہ وہ کچھ کھلاتی تھی اور نہ اسے چھوڑتی تھی کہ وہ حشرات الارض یعنی چوہے وغیرہ کھالے یہاں تک کہ وہ بی بی بھوکی مر گئی۔ پھر میرے سامنے جنت کو پیش کیا گیا اور یہی وہ وقت تھا جب تم نے مجھے (نماز کے دوران) آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تھا یہاں تک مگر پھر میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں اس کے پھل کو توڑنا چاہتا تھا جسے تم بھی دیکھ لو لیکن پھر مجھے ظاہر ہوا کہ میں ایسے نہ کروں (تا کہ تمہارے ایمان بالغیب میں رخنہ نہ پڑے)۔ (مسلم)

تشریح: علی عہد رسول اللہ: اور ایک نسخہ میں ”فی عہد النبی“ ہے۔

ابراہیم ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خطا اثبت الف کے ساتھ ہے اور لفظ انون کے ساتھ ہے۔
رکعات: کاف کی حرکت کے ساتھ یہاں رکعت سے مراد رکوع ہے۔

اضت الشمس: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”اضت“ ہمزہ ممدودہ کے ساتھ ہے اسی طرح اس کو ضبط کیا ہے تمام راویوں نے ہمارے بلاد میں، یعنی اپنی پہلے والی حالت کی طرف لوٹا، اور اسی سے ”ایضاً“ ہے جو مصدر ہے آض یض کا۔

لفحها ایامی۔ نہایہ میں ہے ”لفح النار“ فاء اور حاء کے ساتھ، آگ کے بھڑکنے اور اس کی گرمی کو کہتے ہیں۔
المحجن: میم کے سرہ حاء کے سکون اور جیم کے فتح کے ساتھ۔ لاطھی کو کہتے ہیں جس کا سر ٹیڑھا ہو، جیسے ٹیڑھی لکڑی ہوتی ہے، اور میم زائد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس بی بی لکڑی کو کہتے ہیں جس کے سر پر ٹیڑھا لوہا لگا ہو، محجن اسم ہے ”حجن“ سے حاء جیم پر مقدم ہے، اور ”حجن“ کسی چیز کو اپنی طرف کھینچنے کو کہتے ہیں۔

”صاحب“ سے مراد عمرو بن لُحی ہے۔ ”لُحی“ لام کے ضمہ حاء کے فتح اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔
القصب: انتزی کو کہتے ہیں اور اس کی جمع ”اقصاب“ آتی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں ”قصب“ تمام انتزیوں کو کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں پیٹ کے نیچے والے حصے کی انتزیوں کو کہتے ہیں۔

لفطن له: صفحہ مجہول کے ساتھ۔ فطم تطعمها: پہلے حرف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ولم تدعها: لم تترك کے معنی میں ہے۔
خشاش الارض: حاء کے فتح کے ساتھ کبھی اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ زمین کے کیڑے مکوڑے۔ بعض کہتے ہیں کہ خشاش، حاء پر تینوں حرکات درست ہیں، کیڑوں مکوڑوں کو کہا جاتا ہے اور حاء کے ساتھ خشک گھاس کو کہا جاتا ہے۔

لی ان لا افعل بدا: نہایہ میں ہے کہ ”بدا“ کسی چیز کو درست پانے اور نہ جاننے کے بعد جاننے کو کہتے ہیں۔
امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شاید ان کو یہ بات درست نظر آئی ہو کہ جنت کے پھل صحابہ کے سامنے ظاہر نہ کریں، تا کہ ایمان نبیؐ؛ شہودی سے نہ بدل جائے، یا یہ کہ اگر ان کو جنت کے پھل دکھاتے تو پھر یہ بھی لازم تھا کہ جہنم کے شعلے بھی دکھاتے، اور اس وقت پھر خوف اُمید پر غالب ہو جاتا، تو انکے معاش کے امور باطل ہو جاتے اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اگر تم جان لو وہ جو میں جانتا ہوں تو تم زیادہ روو گے اور کم ہنسو گے۔“ واللہ تعالیٰ اعلم

امام نووی فرماتے ہیں کہ علماء فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ علیہ السلام نے جنت اور دوزخ کو آنکھوں سے دیکھا ہو، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو متکشف کر دیا ہو اور آپ ﷺ اور ان کے درمیان پردوں کو ہٹا دیا ہو، جیسا کہ مسجد اقصیٰ کو آپ ﷺ کیلئے ظاہر کیا گیا تھا، اور پردے ہٹا دیئے گئے تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ روایت علم اور وحی ہو، بطور تفصیل اور تحریف کے کہ اس سے پہلے آپ کو ان کے بارے میں اتنی زیادہ معرفت نہیں تھی۔ تو اس سے آپ ﷺ کو وہ خشیت حاصل ہوئی جو پہلے نہ تھی، لیکن پہلی والی تاویل زیادہ بہتر ہے اور الفاظ حدیث کے ساتھ زیادہ مشابہہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسے امور ہیں جو آنکھوں سے دیکھنے پر دلالت کر رہے ہیں جیسا کہ آپ کا

چھپے ہناتا کہ دوزخ کی گرمی آپ ﷺ کو نہ پہنچے اور آگے بڑھنا جنت کے پھل کے خوشہ لینے کیلئے۔

اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

۱ جنت اور دوزخ عالم وجود میں آچکی ہیں، اور موجود ہیں

۲ جنت کے پھلوں کا وجود اور عین ہے جیسا کہ دنیا کے پھل ہیں، اور یہی اہل سنت کا مسلک ہے۔

۳ عذاب اور ہلاکت کی جگہ سے ہٹ جانا سنت ہے،

۴ تھوڑا سا عمل نماز کو باطل نہیں کرتا۔

۵ بعض لوگ اس وقت بھی دوزخ کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

۶ اس عورت کو دوزخ کا عذاب ہونا بلبی کو باندھنے کی وجہ سے تھا، یہ دلالت کر رہا ہے کہ اس کا یہ فعل گناہ کبیرہ تھا۔ اس لئے کہ بلبی کا

باندھنا اور پھر اس پر اصرار کرنا یہاں تک کہ وہ مرگئی یہ گناہ صغیرہ پر اصرار ہے، اور صغیرہ پر اصرار اس کو کبیرہ بنا دیتا ہے۔

جانور کا عاریتہ مانگ لینا جائز ہے

۲۹۴۳: وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ سَمِعْتُ أَنَسًا يَقُولُ كَانَ فِرْعَوْنُ بِالْمَدِينَةِ فَاسْتَعَارَ النَّبِيَّ ﷺ فَرَسًا مِنْ أَبِي طَلْحَةَ

يَقَالُ لَهُ الْمُنْدُوبُ فَرَكَبَ فَلَمَّا رَجَعَ قَالَ مَا رَأَيْنَا مِنْ شَيْءٍ وَإِنْ وَجَدْنَاهُ لَبَحْرًا. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵/۲۴۰ الحدیث رقم ۲۶۲۷ و مسلم فی ۴/۱۸۰۳ الحدیث رقم (۴۹-۲۳۰۷) و ابو داؤد

فی السنن ۵/۲۶۳ الحدیث رقم ۴۹۸۸ و الترمذی فی ۴/۱۷۲ الحدیث رقم ۱۶۸۶ و احمد فی المسند ۳/۱۷۱ (۱ فی

المخطوطہ) و استجلاب۔

ترجمہ: ”اور حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک دن (اس خیال سے کہ کفار کا

لشکر مدینہ کے قریب آ گیا ہے) مدینہ میں شور برپا ہو گیا (یہ دیکھ کر) نبی کریم ﷺ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا گھوڑا کہ جسے مندوب یعنی

ست کہا جاتا تھا عاریتہ مانگا اور اس پر سوار ہو کر (تحقیق حال کے لئے مدینہ سے باہر) نکلے پھر جب آپ واپس تشریف لائے تو فرمایا

کہ ہم نے خوف و گھبراہٹ کی کوئی چیز نہیں دیکھی نیز ہم نے اس گھوڑے کو (تیز رفتاری میں) سمندر پایا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: ”یقول:“ حال ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مفعول ثانی ہے۔

فزع: فاو رزاء دونوں کے فحشہ کے ساتھ، خوف چیخ۔ المنسوب: اس کی سستی کی وجہ سے کہا جاتا تھا۔

اور نہ یہ میں ہے کہ ”مندوب“ سے مراد ”مطلوب“ ہے۔ یہ ”الندب الرهن“ سے ہے، جس کو مقابلہ میں شرط کیلئے رکھا جائے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے جسم میں نشان کی وجہ سے اس کو مندوب کہتے ہیں۔ ”لذوب“ یہ نشان زخم کو کہتے ہیں۔

فلما قال ما رأینا من شیء: یعنی خوف و گھبراہٹ میں سے یا اس سستی میں سے جو مندوب کے بارے میں کہی جاتی تھی۔

وان وجدناه: ”فرس“ مذکر اور مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قاموس میں ہے۔

بحر: یعنی کشادہ قدم۔ جیسا کہ سمندر کشادہ ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ”بحر“ تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں، کشادہ چال کی وجہ

سے اس کو بحر کہتے ہیں یعنی وہ چلنے میں سمندر کے پانی کے چلنے کی طرح ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”ان وجدنا“ میں ”ان“ محققہ من المشقلہ ہے اور ”وجدنا“ کی ضمیر ”فرس“ کی طرف راجع ہے۔

جو عاریتہ لیا تھا۔ (آہنی) پس ”ان“ کا اسم محذوف ہے اور وہ ضمیر نشان ہے اور ”لبحر“ کا لام ”ان“ نافیہ اور ”ان“ محققہ کے درمیان فرق

کیلئے ہے۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ ”ان“ یہاں ”ما“ نافیہ کے معنی میں ہے۔ اور لام ”الا“ کے معنی میں ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہے: ما وجدناہ الا بحرا۔ اور عرب کہتے ہیں: ان زید لعافل ای ما زید الا عافل، (اتھی)۔ یہ کوفیین کے مذہب کے مطابق ہے جیسا کہ مغنی میں ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا:

- ۱۔ جانور عاریۃ مانگنا جائز ہے۔
- ۲۔ کلام میں توسع اور کشادگی مباح ہے۔
- ۳۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ تشبیہ دینا اس کے معانی میں سے کسی معنی میں جائز ہے، اگرچہ تمام صفات میں برابر نہ ہو۔
- ۴۔ کسی جانور کو کسی نام سے موسوم کرنا جائز ہے، اور یہ عرب کی عادات میں سے ہے۔
- ۵۔ اسی طرح سامان جنگ کا نام رکھنا بھی جائز ہے، تاکہ طلب کے وقت جلدی مل جائے۔
- ۶۔ کسی انسان کا اکیلے خبر کی تحقیق اور ٹوہ لگانے کیلئے جانا جائز ہے، جب تک ہلاکت متحقق نہ ہو۔
- ۷۔ ازالہ خوف کے بعد، خوف کے خاتمہ کی خوشخبری لوگوں کو دینا مستحب ہے۔
- ۸۔ آپ ﷺ کی کس قدر شجاع اور قوی القلب تھے۔

الفصل الثانی:

بجز زمین کو آباد کرنے والا اس زمین کا مالک ہے

۲۹۴۴: وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ مَنْ أَحْيَىٰ أَرْضًا مَيِّتَةً فَهِيَ لَهُ وَلَيْسَ لِعَرَبٍ ظَالِمٍ حَقٌّ۔
(رواہ احمد و الترمذی و ابوداؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۵۳/۳ الحدیث رقم ۳۰۷۳ و الترمذی فی ۶۶۲/۳ الحدیث رقم ۱۳۷۸

ترجمہ: ”حضرت سعید بن زیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے مردہ زمین کو زندہ کیا وہ زمین اسی کی ہے اور ظالم کی رگ کا کوئی حق نہیں ہے۔“ اس روایت کو احمد ترمذی ابوداؤد نے (بطریق اتصال) نقل کیا ہے۔

تشریح: من احيى ارضا ميتة: کہ پہلے سے وہ کسی مسلمان کی ملکیت نہ ہو، اور نہ کسی شہر و گاؤں کی کسی ضرورت و مصلحت سے متعلق ہو، مثلاً جانوروں کے بیٹھنے کی جگہ ہو۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حکومت وقت کی اجازت بھی شرط ہے۔ صاحبین نے ان سے اختلاف کیا ہے امام شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا مسلک بھی یہی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث مطلق ہے۔

(امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ حدیث ہے) آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ”آدی کیلئے جائز نہیں ہے مگر وہ جس پر حاکم کا دل خوش ہو۔“ یہ اجازت کے شرط ہونے پر دلالت کرتا ہے، پس اس مطلق کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی حادثہ کے بارے میں ہیں۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے)

قاضی فرماتے ہیں کہ ”ارض میتة“ سے مراد بجز زمین ہے جو غیر آباد ہو، اور اس کا زندہ کرنا اس کی آبادی اور تعمیر ہے۔ زمین کی تعمیر کو بدن کی حیات سے تشبیہ دی ہے اور زمین کے بجز ہونے اور تعمیر سے خالی ہونے کو زندگی کے مفقول و ذراکل ہونے سے تشبیہ دی ہے۔

عروق: عین کے کسرہ کے ساتھ ”عراق“ اور ”ظالم: دونوں توین کے ساتھ ہے اور موصوف صفت ہیں۔

یعنی دوسرے کی آبادی ہوئی زمین میں کاشت کرے یا درخت لگائے اس سے وہ اس زمین کا مستحق نہیں بن جائے گا۔ اور ”عروق“

سے مراد لگائے گئے درخت ہیں۔ یہ نام اس لئے رکھا ہے کہ ظلم اس کے ساتھ حاصل ہوا ہے، تو یہ اسناد مجازی ہے۔ اور اس کو اضافت کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد درخت لگانے والا ہوگا جس کو ظالم کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ دوسرے کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ہے۔ اور یہ معنی زیادہ موافق ہے حکم سابق کے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے درخت لگائے یا کاشت کی دوسرے کی زمین میں بلا اجازت تو اس کے درختوں اور کھیتی کا باقی رہنے کا حق نہیں ہے بلکہ مالک کو اختیار ہے اس کے اکھیرنے کا بغیر ضمان کے (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے امام طیبی کے اتباع میں) اور سیوطی مختصر النہایہ میں فرماتے ہیں کہ ”العرق“ کی روایت تینوں کے ساتھ ہے، اور مضاف محذوف ہے۔ ای لذی عرق ظالم، کہ اس میں نفس رگ کو ظالم قرار دیا ہے اور یہ وصف صاحب رگ کا ہے اور وہ درخت کی ایک جڑ ہے۔

۲۹۳۵: ورواه مالک عن عروۃ مرسلًا وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب۔

اخرجه مالک فی الموطأ ۷۴۳/۲ الحدیث رقم ۲۶ من کتاب الاقضية۔

ترجمہ: جب کہ مالک نے اس روایت کو عروہ سے بطریق ارسال روایت کیا ہے۔ نیز امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: پس یہ حدیث ایک وجہ سے مرسل ہے۔

قاضی کہتے ہیں تبج کی بات ہے کہ مصاصح میں اس حدیث کی نسبت سعید بن زید کی طرف ہے اور وہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور اس کو مرسل بھی کہا ہے، اور شاید یہ ناسخ نے کیا ہو۔ اور شیخ نے متصل اور مرسل میں سے ایک روایت متن میں ذکر کی ہو اور کسی اور نے دوسری حدیث حاشیہ میں لکھی۔ تو ناسخ کو التباس ہوا ہے اور اس نے یہ گمان کیا کہ یہ دونوں متن کی روایتیں ہیں تو اس نے دونوں کو متن میں لکھ دیا ہو۔

امام طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ بھی جائز ہے کہ صحابی نے حدیث مرسل روایت کی ہو، اس طور پر کہ اس نے کسی اور صحابی سے سنی ہو اور پھر اس کی طرف نسبت نہ کی ہو لیکن یہ حدیث اس میں سے نہیں ہے، بوجہ مصنف کے اس قول کے ”وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب“، (آہنی)۔ لیکن اس میں یہ بات ہے کہ مصنف کے قول ”رواہ مالک عن عروۃ مرسلًا“ سے معلوم ہوتا ہے کہ عروہ نے صحابی کے واسطہ کو حذف کیا ہے، اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ صحابی سعید ہوں یا کوئی اور ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مرسل صحابہ معتبر ہیں اجماعاً، بخلاف مرسل تابعی کے کہ وہ جمہور کے ہاں حجت ہے، اور امام شافعی کے ہاں حجت نہیں ہے۔ اور اس کی حجت کیلئے کم از کم اتنا ضروری ہے کہ اس کی سند حسن ہو۔ امام طیبی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اس میں سے نہیں بوجہ مصنف کے قول..... یہ غیر ظہر ہے۔ واللہ اعلم۔

اور روایت کیا ہے احمد، اور نسائی، اور ابن حبان اور ضیاء نے حضرت جابر۔ ۷:

”من احیا ارضا میتة فله فیہا اجر، و ما اكلت العافیة منه فهو له صدقة“۔

اور یہی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عائشہ سے مرفوع روایت کیا ہے:

”العباد عباد اللہ، و لبلاد بلاد اللہ، فمن احیا من موات الارض شیئا فهو له و لیس لعرق ظالم حق“۔

جب کہ مالک نے اس روایت کو عروہ سے بطریق ارسال کیا ہے۔ نیز امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

کسی دوسرے کا مال بغیر اجازت حلال نہیں ہے

۲۹۳۶: وَعَنْ أَبِي حُرَّةَ الرَّقَاشِيِّ عَنْ عَمِّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَا لَا تَظْلِمُوا أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ

الْأَبْطِيبُ نَفْسٍ مِنْهُ (رواه البيهقي في شعب الايمان والدارقطني في المحتبي)

احمد في المسند ۷۲/۵ والبيهقي في شعب الايمان -

ترجمہ: ”اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: خبردار کسی پر ظلم نہ کرنا! جان لو! کسی بھی شخص کا مال (لینا یا استعمال کرنا) اس کی خوشدلی کے بغیر حلال نہیں۔ اس روایت کو تینہی نے شعب الايمان میں اور دارقطنی نے بحیثی میں نقل کیا ہے۔“

تشریح: الا: تخفیف کے ساتھ تشبیہ کیلئے ہے۔

لا تظلموا: یعنی تم میں سے بعض، بعض پر ظلم نہ کریں، کذا قبل اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو۔ یہ ظلم قاصر (یعنی اپنے نفس تک محدود) اور متعدی دونوں کو شامل ہے۔

الا: یہ بھی تشبیہ کیلئے ہے، اور اس کو مکرر ذکر کیا اس بات پر تشبیہ کیلئے کہ یہ دونوں جملے ایک مستقل حکم ہیں، اس پر متنبہ ہونا چاہئے اور دوسرے کے ساتھ چونکہ حقوق العباد متصل ہیں تو یہ زیادہ لائق ہے کہ اس کی طرف اشارہ کیا جائے اور اس کو خاص کیا جائے۔

کسی کا مال لوٹنے والا اسلامی برادری کا فرد بننے کے قابل نہیں ہے

۴۹۴: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ لَا جَنْبَ وَلَا شِغَارَ فِي الْإِسْلَامِ وَمِنْ أَنْتَهَبَ نُهْبَةً

فَلَيْسَ مِنَّا - (رواه الترمذی)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۳/۶۷ الحدیث رقم ۲۵۸۱ والترمذی فی ۳/۴۳۱ الحدیث رقم ۱۱۲۳ والنسائی فی ۶/۱۱۰

الحدیث رقم ۳۳۳۴ واحمد فی المسند ۴/۴۳۹

ترجمہ: ”اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام میں جلب، جب اور شغار (جائز) نہیں ہے اور یاد رکھو جو شخص لوٹ مار کرے وہ ہم میں سے نہیں (یعنی وہ ہماری جماعت میں سے نہیں ہے یا ہمارے طریقہ پر نہیں ہے حاصل ہے کہ ایسا شخص اس قابل نہیں کہ اسے اسلامی برادری کا ایک فرد سمجھا جائے)۔“ (ترمذی)

حالاتِ راوی:

عمران بن حصین: ان کی کنیت ابو نجد تھی، نون کے ضمہ اور جیم کے فتح کے ساتھ، خیبر کے سال مسلمان ہوئے اور اپنی وفات تک بصرہ میں ہی مقیم رہے۔ ان کی وفات ۵۲ھ میں ہوئی۔ یہ فقہاء صحابہ میں سے تھے۔

تشریح: جلب، جنب، دونوں میں پہلے دو حرف مفتوح ہیں۔ شغار: پہلے حرف کے کسرہ کے ساتھ۔

فی الاسلام: ظاہر تو یہ ہے کہ اسلام کی قید سب کے ساتھ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ صرف آخری کے ساتھ ہو۔

قاضی کہتے ہیں کہ ”جلب“ گھوڑ دوڑ میں یہ ہے کہ گھوڑا دوڑانے والا شخص ایک آدمی کو اپنے گھوڑے کے پیچھے رکھے کہ وہ گھوڑے کو دوڑائے اور دھتکارے۔ اور ”جنب“ یہ ہے کہ اپنے گھوڑے کے ساتھ ایک خالی گھوڑا رکھے تاکہ سواری کا گھوڑا اگر تھک جائے تو یہ اس دوسرے گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ جلب اور جنب زکوٰۃ میں بھی ہوتا ہے ان کی تفسیر ”کتاب الزکوٰۃ“ میں گزر گئی ہے۔ ”شغار“ یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بہن کا نکاح کسی سے اس شرط کے ساتھ کرے کہ وہ اپنی بہن کا نکاح اس کے ساتھ کر دے اور مہر کچھ نہ مقرر ہو، بلکہ یہ شرط ہی مہر کے قائم مقام ہو۔ یہ ”شغار البلد“ سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب شہر لوگوں سے خالی ہو جائے، چونکہ یہ عقد بھی مہر سے خالی ہوتا ہے اور حدیث اس عقد کے فساد پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو یہ اسلام میں ہوتا۔ اور یہ اکثر علماء کا قول ہے، اور فساد کا متقاضی بضع میں شرکت ہے اس کو مہر بنانے کی وجہ سے۔

امام ابوحنیفہ اور ثوری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عقد صحیح ہے اور ہر ایک کیلئے مہر مثل ہوگا۔ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات کو جان لو کہ نفی کا متعلق مسمیٰ شغار ہے اور مہر سے خالی ہونا، اور بیع کو قرار دینا اس کے مفہوم سے ماخوذ ہے۔ اور ہم اس ماہیت اور حقیقتِ نفی کے قائل ہیں اور جو اس پر صادق آئے شرعاً، پس نکاح اس طرح برقرار نہیں رہا بلکہ ہم اس کو باطل کر رہے ہیں، اور باقی رکھ رہے ہیں ایسا نکاح جس میں ایسی چیز مقرر کی گئی ہے جو مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی وایسا نکاح منعقد ہو جائے گا جو مہر مثل کو لازم کرنے والا ہے۔ جیسا کہ وہ نکاح جس میں شراب کو مہر مقرر کیا ہو، پس جو نفی کا متعلق ہے، ہم اس کو ثابت نہیں کرتے اور جس کو ہم ثابت کر رہے ہیں اس کے ساتھ نفی کا تعلق نہیں ہے۔

نہیۃ: نون کے ضمہ اورحاء کے سکون کے ساتھ، قاموس میں ہے کہ ”نہب“ غنیمت کو کہتے ہیں اور اسم ”نہیۃ“ ہے۔ تخریج: اسی طرح نسائی اور ضیاء نے حضرت انس سے ”فی الاسلام“ تک روایت کیا ہے۔ احمد اور ترمذی نے حضرت انس سے ”من انتہب فلیس منا“ روایت کیا ہے۔ اور اسی طرح اس کو احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، اور ضیاء نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

کسی کی کوئی چیز ہنسی مذاق میں لیکر ہڑپ نہ کر جاؤ

۲۹۳۸: وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ عَصَا آخِيهِ لِأَعْبَا جَادًا فَمَنْ

أَخَذَ عَصَا آخِيهِ فَلْيُرِدْهَا إِلَيْهِ (رواه الترمذی و ابوداؤد و روایۃ الی قولہ حادا)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۷۳/۵ الحدیث رقم ۵۰۰۳ و الترمذی فی ۴/۴۰۲ الحدیث رقم ۲۱۶۰ و احمد فی المسند

۲۲۱/۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت سائب بن یزید اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کا عصا (لاٹھی) ہنسی مذاق میں اور اس کو غصہ دلانے کے لئے نہ لے جو شخص اپنے کسی بھائی سے عصا لے تو اسے چاہیے کہ اس کو واپس کر دے۔ (ترمذی، ابوداؤد) لیکن ابوداؤد کی روایت لفظ جادا تک ہے۔

تشریح: لا یاخذ: صیغہ نہی کے ساتھ اور بعض کہتے ہیں کہ نفی کا صیغہ ہے۔

احدکم عصا آخیه: یعنی مثال کے طور پر۔

لا عبا جادا: دونوں ”یاخذ“ کے فاعل سے حال ہیں۔ اگر یہ دونوں حال مترادف ہوں تو پھر دونوں میں تناقض ہوگا اور اگر متداخل ہو تو پھر صحیح ہے۔ (اس کو امام طیبی نے ذکر کیا ہے یعنی کہ ”جادا“ اول سے حال ہوگا۔ لیکن ظاہر یہ ہے دوسرا حال مقدر ہے تاکہ تناقض لازم نہ آئے خواہ دونوں حال مترادف ہوں یا دونوں متداخل ہوں، اتنی بات ہے کہ اول کو ظاہر پر محمول کیا جائے گا اور دوسرے کو باطن پر، یعنی ”لا عبا ظاہر“ جادا باطناً، یعنی اس کو مذاق کے طور پر لے لے اور مقصد اس کو اپنے پاس روکے رکھنا ہو، تاکہ مذاق اور حقیقت دونوں ایک وقت میں نہ ہوں، اسی لئے شیخ مظہر نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس چیز کو لے لے بھروسہ اور مزاح کے طور پر اور پھر اپنے پاس رکھے اور واپس نہ کرے تو یہ حقیقت میں لینا ہو جائے گا۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے، کہ وہ کسی کا سامان لے لے اور چوری کا ارادہ نہ ہو بلکہ اس کو غضبناک کرنا مقصود ہو، تو یہ چوری کرنے میں مزاح کر رہا ہے اور اس کو غصہ دلانے ڈرانے اور تکلیف دینے میں سنجیدہ ہے۔ (اتنی) اور پہلے قول کی تائید اگلے جملہ سے ہوتی ہے

قولہ: فمن اخذ عصا آخیه فلیر دھا الیہ: علامہ تورپوشمی فرماتے ہیں کہ یہاں مثال کے طور پر لاٹھی کا ذکر اسلئے کیا کہ لاٹھی حقیر

چیزوں میں سے ہے کہ مالک کے نزدیک جس کی کوئی بڑی قدر و عظمت نہیں ہے، تو جو چیز اس سے اچھی ہو تو وہ اس حکم کے زیادہ لائق ہے۔

اپنا چوری کا مال جس کے پاس دیکھو اس سے لے لو

۲۹۴۹: وَعَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ وَجَدَ عَيْنَ مَالِهِ عِنْدَ رَجُلٍ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ وَتَبِعُ الْبَيْعَ مَنْ بَاعَهُ .

(رواہ احمد و ابو داؤد و النسائی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۰۲/۳ الحدیث رقم ۳۵۳۱ و النسائی فی ۳۱۳/۷ الحدیث رقم ۳۶۱ و احمد فی المسند ۱۳/۵۔

ترجمہ: ”اور سمرہؓ نبی سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنا مال بیع میں کسی شخص کے پاس دیکھے تو وہ ”اس کا زیادہ حقدار ہے اور اس کو خریدنے والا اس شخص کا پیچھا کرے جس نے اسے فروخت کیا ہے“۔ (احمد، ابو داؤد، نسائی)

تشریح: من وجد عين ماله: تو رپشتی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد غصب کی ہوئی چیز یا چوری کی ہوئی چیز یا گمشدہ مال ہے۔ بیع: تاء کی تشدید اور باء کے کسرہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں تاء کی تخفیف اور باء کے فتح کے ساتھ ہے۔ البیع: یاء کی تشدید کے ساتھ بمعنی مشتری۔

جس سے کوئی چیز لو اس کو واپس کر دو

۲۹۵۰: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ عَلَى الْيَدِ مَا أَخَذْتَ حَتَّى تُؤَدِّيَ - (رواہ الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۲۲/۳ الحدیث رقم ۳۵۶۱ و الترمذی فی ۵۶۶/۳ الحدیث رقم ۱۲۶۶ و ابن ماجہ فی

۸۰۲/۲ الحدیث رقم ۲۴۰۰ و الدارمی فی ۳۴۲/۲ الحدیث رقم ۲۵۹۶ و احمد فی المسند ۸/۵

ترجمہ: ”اور حضرت سمرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاتھ پر لازم ہے کہ اس نے جو چیز لی ہے وہ (اس چیز کو) واپس کرے“۔ (ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ)

تشریح: علی الید ما اخذت: یعنی ہاتھ پر اس چیز کا لوٹانا واجب ہے جو اس نے لی ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”ما“ موصولہ مبتدأ ہے، اور ”علی الید“ اس کی خبر ہے۔ اور راجع محذوف ہے۔ ای ما اخذتہ الید، یعنی ہاتھ نے جو چیز لی ہے اس کا ضمان اس ہاتھ والے پر لازم ہے اور ہاتھ کی طرف نسبت مبالغہ کیلئے ہے اس لئے کہ ہاتھ ہی تصرف کرنے والا ہے۔

حتی تؤدی: مضارع معروف واحد مؤنث کا صیغہ ہے اور ضمیر مستتر ”ید“ کی طرف راجع ہے۔

یعنی یہاں تک کہ وہ چیز اس کے مالک کی طرف واپس کر دی جائے۔ لہذا چھینا ہوا مال اس کے مالک کو واپس کر دینا واجب ہے اگرچہ مالک اس کا مطالبہ نہ کرے، اسی طرح عاریتہ لی ہوئی چیز وہ مدت پوری ہو جانے کے بعد مالک کو واپس کر دینا ضروری ہے اگر مدت مقرر کی گئی ہو، اگرچہ مالک مطالبہ نہ کرے، اور جو چیز بطور امانت رکھی ہوئی ہو اس کا واپس کرنا لازم نہیں ہے جب تک مالک مطالبہ نہ کرے۔ (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے)۔ اور یہ بہترین تفصیل ہے جو شیخ مظہر کے کلام کو واضح کر دیتی ہے۔ (وہ فرماتے ہیں) کہ جس نے کسی کا مال لیا غصب کر کے یا عاریتہ یا امانت کے طور پر اس کا واپس کرنا اس پر لازم ہے۔

تخریج: اس طرح احمد، نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے، انہوں نے ضمیر کے ساتھ ”حتی تؤدیہ“ کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

کسی کے باغ وغیرہ کو جانور کے نقصان پہنچانے کا مسئلہ

۲۹۵۱: وَعَنْ حَرَامِ بْنِ سَعْدِ بْنِ مَحْصَةَ أَنَّ نَاقَةَ لِبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ دَخَلَتْ حَائِطًا فَأَسَدَتْ فَقَضَى رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ أَنَّ عَلَى أَهْلِ الْحَوَائِطِ حِفْظَهَا بِالنَّهَارِ وَأَنَّ مَا أَفْسَدَتِ الْمَوَاشِي بِاللَّيْلِ ضَامِنٌ عَلَى أَهْلِهَا .

(رواہ مالک و ابوداؤد و ابن ماجہ)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۲۸/۳ الحدیث رقم ۳۵۶۹ وابن ماجہ فی ۷۸۱/۲ الحدیث رقم ۲۳۳۲ ومالک فی الموطا ۷۴۷/۲ الحدیث رقم ۳۷ من کتاب الاقضية واحمد فی المسند ۴۳۶/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت حرام بن سعد بن محیصہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت براء بن عازبؓ کی اونٹنی ایک باغ میں گھس گئی اور باغ کو خراب کر ڈالا (جب یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا) تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ دن میں باغات کی حفاظت باغ والوں کے ذمہ ہے اور جو جانور رات میں باغات کو خراب کریں تو اس کا ضمان یعنی تاوان جانوروں کے مالکوں پر ہے۔“ (مالک ابوداؤد ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

یہ حرام بن سعد ہیں: حرام جو ضد ہے حلال کا۔ یہ اپنے والد اور براء بن عازب سے روایت کرتے ہیں جیسا کہ جامع الاصول میں ہے اور مصنف نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

تشریح: محیصہ: یا مکسورہ کی تشدید کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں سکون کے ساتھ ہے۔

حائطا: نہایہ میں ہے حائط اس باغ کو کہتے ہیں جس پر حائط ہو۔

ضامن: اسم فاعل بمعنی مفعول، ”مضمون“ کے ہے جیسے ”کاتم“ بمعنی ”مکتوم“ کے یا مضاف محذوف ہے یعنی ذو ”ضمان“۔

شرح السنہ میں ہے کہ اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ اگر کوئی جانور دن میں کسی کے باغ کو خراب کر دے تو اس کا تاوان جانور کے مالک پر نہیں آتا۔ اور اگر رات کو نقصان پہنچائے تو اس کا تاوان جانور کے مالک پر واجب ہوگا۔ اس لئے کہ عرف میں دن میں باغ کی حفاظت کرنا باغ والے کی ذمہ داری ہے اور جانوروں کی حفاظت رات میں ان کے مالک کی ذمہ داری ہے۔ پس جس نے اس عادت کی خلاف ورزی کی تو وہ حفاظت کرنے کے رسم و رواج سے خارج ہے۔ یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ جانور کا مالک جانور کے ساتھ نہ ہو۔ اگر مالک جانور کے ساتھ ہوگا خواہ وہ جانور پر سوار ہو یا اسے سمجھنے لے جا رہا ہو، یا پیچھے سے ہکار رہا ہو، یا جانور کھڑا ہو، تو تاوان جانور کے مالک پر ہوگا۔ چاہے وہ جانور اپنے ہاتھ پاؤں سے نقصان پہنچائے چاہے منہ سے۔ اور یہی امام مالک اور امام شافعی کا مسلک ہے۔ اس بارے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر جانور کا مالک جانور کے ساتھ نہ ہو تو پھر اس پر نقصان کا تاوان واجب نہیں ہوتا خواہ وہ جانور دن میں نقصان پہنچائے خواہ رات میں۔

۲۹۵۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ الرَّجُلُ جُبَّارٌ وَقَالَ النَّارُ جُبَّارٌ . (رواہ ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۱۴/۴ الحدیث رقم ۴۵۹۲ وابن ماجہ فی ۸۹۱/۲ الحدیث رقم ۲۶۷۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جانور کے) پاؤں کا روندنا ہوا معاف ہے اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ کا جلایا ہوا معاف ہے (یعنی اگر کسی نے اپنی زمین میں آگ جلائی اور پھر آندھی میں آگ کو اڑا کر کسی اور جگہ لگی اور وہاں آگ لگ گئی تو یہ نقصان بھی معاف ہے)۔“ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: الرَّجُلُ جُبَّارٌ: الرجل: راء کے کسرہ کے ساتھ، یعنی جانور کا پاؤں۔ یہ ”تسمیۃ السبب باسم المسبب“ کے

قبیل سے ہے۔ یعنی جو جانور کسی چیز کو پاؤں سے روندے یا مار دے راستے میں۔ جبار: جیم کے ضمہ اور باء کی تخفیف کے ساتھ یعنی رائے گاہ و باطل۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی جانور پر سوار ہو اور وہ جانور بچھلے پاؤں سے کسی انسان کو مار دے تو یہ معاف ہے اور اگر

اگلے پاؤں سے مار دے تو اس کا تاوان مالک پر لازم ہوگا۔ یہ اس لئے کہ سوار کے اختیار میں جانور کے اگلے پاؤں کا تصرف ہوتا ہے نہ کہ پچھلے کا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تاوان لازم ہونے میں اگلے اور پچھلے پاؤں برابر ہیں۔
 قوله: وَقَالَ النَّارُ جَبَّارٌ: وقال: ضمیر نبی ﷺ کی طرف راجع ہے۔ اور قال کا اعادہ اس لئے کیا کہ اس سے اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ قول پہلے قول سے الگ صادر ہوا اور اس پر دلالت کر رہا ہے کہ حدیث کے پہلے حصہ کو روایت کیا ہے ابوداؤد نے اور دوسرے کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے، جیسا کہ جامع لصغیر میں ہے۔

حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جو آگ کی چنگاری نے جلایا بغیر زیادتی کے، اس طور پر کہ اس نے آگ جلائی ہو اپنی ضرورت کیلئے نہ کہ ایذا رسانی کیلئے۔

شرح السنن میں ہے اگر کوئی آدمی اپنی ملکیت میں آگ جلاتا ہے اور ہوا میں کوئی چنگاری اڑ کر کسی دوسرے کے مال پر جا کر پڑے اور اس کا لوٹانا بھی ممکن نہ ہو، تو اس کا ضمان واجب نہ ہوگا بلکہ یہ معاف ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب وہ آگ جلا رہا ہو تو اس وقت ہواڑ کی ہوئی ہو اور بعد میں ہوا چلے۔

حالت اضطرار میں دوسرے کے جانور کا دودھ پینے کی اجازت

۲۹۵۳: وَعَنِ الْحُسَيْنِ عَنْ سَمُرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ إِذَا أَتَى أَحَدَكُمْ عَلَى مَا شِيبَةٍ فَإِنْ كَانَ فِيهَا صَاحِبُهَا فَلْيَسْتَأْذِنْهُ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهَا فَلْيُصَوِّتْ فَلَا تَأْذِنُ فَإِنْ أَجَابَهُ أَحَدٌ فَلْيَسْتَأْذِنْهُ وَإِنْ لَمْ يَجِبْهُ أَحَدٌ فَلْيُحْتَلَبْ وَلْيُشْرَبْ وَلَا يَحْمَلْ. (رواه ابو داؤد)

اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۸۹/۳ الحدیث رقم ۲۶۱۹ و الترمذی فی ۵۹۰/۳ الحدیث رقم ۱۲۹۶۔

ترجمہ: "اور حضرت حسن حضرت سمرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص (دودھ کے) جانوروں کے پاس آئے تو اگر وہاں ان جانوروں کا مالک موجود ہو تو اس سے (دودھ پینے کی) اجازت مانگے اور اگر وہاں مالک موجود نہ ہو تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ تین مرتبہ آواز دے۔ اس کی آواز سن کر اگر کوئی جواب دے تو اس سے اجازت مانگے اور اگر کوئی جواب نہ دے تو وہ بقدر ضرورت دودھ دوہ کر پی لے مگر وہ اپنے ساتھ بالکل نہ لے جائے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: قَالَ إِذَا أَتَى أَحَدَكُمْ: امام طیبی فرماتے ہیں کہ اتی متعدی بنفسہ ہے اور یہاں اس کو "علی" کے ساتھ متعدی کیا ہے اس لئے کہ یہ "نزل" کے معنی کو متضمن ہے۔ اور جانوروں کو بمنزلہ میزبان بنایا ہے، اور اس میں معنی اچھی تغلیل ہے اور یہ اس وقت ہے کہ جب اترنے والا مہمان مضطر ہو۔

فلیستأذنه: لام کے سکون کے ساتھ اور کسرہ بھی جائز ہے۔ فلیصوت: واؤ کی تشدید کے ساتھ۔

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ضرورت کی وجہ سے جائز ہے یعنی بھوک کے مارے مرا جا رہا ہو، یا سفر کرنے سے عاجز ہو رہا ہو، اور اس کی قیمت مالک کو لوٹانے قدرت کے وقت۔ اور بعض کہتے ہیں کہ قیمت لوٹانا ضروری نہیں ہے۔ (اتہلی)

اور امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ بغیر مجبوری کے بھی جائز ہے اور اس کی تفعیل پہلے گزر چکی ہے۔

دوسرے کے باغ کا پھل مالک کی اجازت کے بغیر کھانے کا مسئلہ

۲۹۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ دَخَلَ حَائِطًا فَلْيَأْكُلْ وَلَا يَتَّخِذْ حُبْنَةً.

(رواه الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص (کسی دوسرے شخص کے) باغ میں داخل ہو جائے تو اسے چاہئے کہ (بقدر ضرورت) وہ وہاں کے پھل کھائے (لیکن) جیب اور جھولے میں بھر کر نہ لے جائے۔ (ترمذی ابن ماجہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔“

تشریح: خبثہ: خاؤ پر ضمہ باء پر سکون اور اس کے بعد نون ہے۔ کپڑے کے کنارے کو کہتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اس میں سے کچھ بھی کپڑے میں ڈال کر نہ لے جائے۔ اور یہ اجازت بھی اس مسافر کو ہے جو مضطر ہو ورنہ یہ احادیث ان نصوص کے برابر نہیں ہیں جو مسلمانوں کے مال کے حرام ہونے کے بارے میں وارد ہے۔ (ذکرہ ابن الملک) یہ روایت متن اور سند دونوں کے اعتبار سے پہلے گزری ہے،

مستعار لی ہوئی چیز امانت کے حکم میں ہے

۲۹۵۵: وَعَنْ أُمِّيَّةَ بِنِ صَفْوَانَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَعَارَ مِنْهُ أَدْرَاعَهُ يَوْمَ حُنَيْنٍ فَقَالَ أَعْصَبًا يَا مُحَمَّدُ قَالَ بَلْ عَارِيَةٌ مَضْمُونَةٌ. (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۲۲/۳ الحدیث رقم ۳۵۶۲ واحمد فی المسند ۶/۶۶۵

ترجمہ: ”اور حضرت امیہ بن صفوان اپنے والد (صفوان) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حنین کی جنگ کے دن ان (صفوان) سے کئی زرہیں عاریتہ لیں انہوں نے پوچھا کہ اے محمد (ﷺ) کیا آپ (ﷺ) یہ زرہیں غصب کے طور پر لے رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عاریتہ لے رہا ہوں جو واپس کر دی جائیں گی۔“ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: وَعَنْ أُمِّيَّةَ بِنِ صَفْوَانَ ادراع: درع کی جمع ہے

ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ زرہوں کے مالک تھے اور کافر تھے، آپ علیہ السلام کی اجازت سے مدینہ آئے تاکہ قرآن وحدیث سنیں اور دین کے احکام سیکھیں اس شرط کے ساتھ کہ اگر ان کو دین اسلام پسند آیا تو یہ مسلمان ہو جائیں گے ورنہ تو اپنے وطن کی طرف لوٹیں گے مسلمانوں کی طرف سے بغیر کسی تکلیف پہنچنے کے، انہوں نے گمان کیا کہ آپ ﷺ مجھ سے زرہیں لے رہے ہیں اور واپس نہیں لوٹائیں گے۔

فقال اغصبا: اس کی ترکیب میں معتدبات وہی ہے جو ہم پہلے مصنف سے نقل کر چکے ہیں۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ ”غصبا“ معمول ہے ہمزہ کے مدخول کا۔ تقدیری عبارت یوں ہے اناخذها غصبا لا تردھا علی۔ یا محمد: بعض کہتے ہیں کہ یہ نداء کسی مؤمن سے صادر نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَا تَجْعَلُوا دَعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدَعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ (تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسے مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے)۔

اور امام طبری نے یہاں اللہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: ﴿وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾ تو یہ اس مقام کے مناسب نہیں ہے اور مقصد کے لائق نہیں۔ تو رپشتی فرماتے ہیں کہ اس وقت یہ کافر تھے اور جاہلیت کی نفرت ان کے دل میں بیوست تھی۔

عاریة: بیاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور کبھی تنقیف کے ساتھ ہوتا ہے یہ منسوب ہے اور مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور یہی وجوہ اعراب ”مضمونہ“ میں بھی ہیں۔

مضمونہ: بمعنی ”مردودہ“ کے ہے یعنی میں یہ عاریتہ لے رہا ہوں اور واپس کروں گا، تو ضمان کو رد کی جگہ رکھا۔ لوٹانے میں مبالغہ کیلئے یعنی میں یہ کیسے واپس نہیں کروں گا، حالانکہ ان کا واپس کرنا مجھ پر لازم ہے۔ پس جس نے کہا ہے مستعار لی ہوئی چیز کا ضمان لازم نہیں ہے تو انہوں نے ظاہر کلام کو دیکھا ہے اور جو کہتے ہیں کہ ضمان لازم ہے انہوں نے اس باریکت کو دیکھا ہے (جیسا کہ اس کی تحقیق

کی ہے امام طیبی نے۔)

ابن الملک فرماتے ہیں کہ ”مضمونہ“ کی تاویل ”ضمان رد“ کے ساتھ کی جائے گی یعنی ”مستعیر“ پر اس چیز کا مالک کی طرف لوٹانا لازم ہے اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر شے مستعار بیعہ موجود تو اس کا لوٹانا واجب ہے۔

قاضی کہتے ہیں کہ یہ حدیث دلیل ہے اس بات پر کہ ”مستعیر“ پر شے مستعار کا تاوان واجب ہے۔ پس اگر وہ اس کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان لازم ہوگا اور یہی حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے۔ اور یہی عطاء، شافعی اور احمد کا مسلک ہے۔ شرح، حسن بصری، نخعی، امام ابو حنیفہ اور ثوری کا مسلک یہ ہے کہ شے مستعار مستعار لینے والے کے پاس بطور امانت ہوتی ہے تلف کی صورت میں اس کا بدلہ دینا واجب نہیں، ہاں اگر اس کو تعدی کے ساتھ تلف کیا تو بدلہ دینا واجب ہوگا۔ اور یہ مروی ہے حضرت علی اور ابن مسوّد سے۔

”مضمونہ“ کی تاویل کرتے ہیں ”ضمان رد“ کے ساتھ، لیکن یہ تاویل ضعیف ہے، اس لئے کہ وہ اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا چنانچہ کہا جاتا ہے ”الودیعة مردودة“ لیکن ”الودیعة مضمونة“ نہیں کہا جاتا۔ اور اگر لفظ ”ضمان“ کا ”رد“ کی جگہ استعمال صحیح بھی ہو، تو یہاں لفظ ”ضمان“ کو ”رد“ پر محمول کرنا ظاہر سے عدول ہے بلا دلیل۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر اس چیز کی ہلاکت نخعی ہو یعنی مستعیر کے پاس اس کے تلف ہونے پر گواہ نہ ہو تو بدلہ دینا لازم ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

مستعار چیز کو واپس کر دینا واجب ہے

۲۹۵۶: وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ الْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مُرْدُودَةٌ وَالذَّيْنُ مُقْضَىٰ وَالزَّرْعِيمُ غَارِمٌ . (رواه الترمذی و ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۲۴/۳ الحدیث رقم ۳۵۶۵ و الترمذی فی ۵۶۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۶۵ و ابن ماجہ فی ۸۰۱/۲ الحدیث رقم ۲۳۹۸ و احمد فی المسند ۲۶۷/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ عاریہ لی ہوئی چیز واپس کی جائے (یعنی کسی کی کوئی چیز عاریہ لینے والے پر واجب ہے کہ وہ اس چیز کو اس کے مالک کے پاس واپس پہنچا دے) منحہ کا واپس کرنا ضروری ہے (یعنی عطاء کے طور پر ملے ہوئے دودھ دہنے والے جانور واپس کر دیئے جائیں) قرض کو ادا کیا جائے (یعنی قرض کو ادا کرنا واجب ہے) اور ضامن ضمانت پوری کرنے پر مجبور ہے (یعنی اگر کوئی شخص کسی کے قرض وغیرہ کا ضامن ہو تو اس کی ادائیگی اس پر لازم ہے)۔“ (ترمذی ابو داؤد)

تشریح: قوله: الْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مُرْدُودَةٌ: العارِية: تشدید کے ساتھ ہے اور مخفف بھی پڑھا جاتا ہے۔ مؤداة: ہمزہ کے ساتھ ہے اور ہمزہ کو ادا سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ تو ریشتی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ وہ مالک کی طرف واپس کی جائے گی۔ اور اس کی تاویل میں وہی اختلاف ہے جو اوپر ”مضمونہ“ کے بارے میں تھا۔ پس جو لوگ ضمان دینے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ عین کو واپس کرنا لازم ہے اگر وہ موجود ہو اور قیمت ادا کرنا لازم ہے تلف ہونے کی صورت میں۔ اور جو ضمان دینے کے قائل نہیں ہیں ان کے ادا کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ ”مستعیر“ پر شے مستعار کے واپس لوٹانے کا بوجھ لازم کرنا ہے، کہ یہ اس پر لازم ہے۔

المنحة: میم کے کسرہ اور نون کے سکون کے ساتھ، ”منحہ“ اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو اپنا جانور دودھ پینے کیلئے دیدے۔ یا کسی کو اپنی زمین یا باغ پھل کھانے کیلئے دیدے، یا کاشت کرنے کیلئے دے دے۔ اور ایک روایت میں ”المنحة“ ہے۔

مردودہ: اس بات کا اعلان ہے کہ اس میں صرف منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے نہ کہ اصل چیز کا مالک بنایا جاتا ہے۔
قوله: وَالزَّرْعِيمَ غَارِمٌ: غرم کہتے ہیں ایسے چیز کا اداء کرنا جو اس پر لازم ہو، تخریج: اسی طرح احمد، ابن ماجہ و ضیاء نے روایت کیا ہے۔

درخت سے گرے ہوئے پھل اٹھانے کا مسئلہ

۲۹۵۷: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْغِفَارِيِّ قَالَ كُنْتُ غُلَامًا أَرْمِي نَخْلَ الْأَنْصَارِ فَأَتَى بِي النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ يَا غُلَامُ لِمَ تَرْمِي النَّخْلَ قُلْتُ أَكَلْتُ قَالَ فَلَا تَرْمِ وَكُلْ مِمَّا سَقَطَ فِي أَسْفَلِهَا ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ فَقَالَ اللَّهُمَّ اشْبِعْ بَطْنَهُ۔

(رواه الخرجه ابو داؤد فی السنن ۹۰/۳ الحدیث رقم ۲۶۲۲ و الترمذی فی ۵۸۴/۳ الحدیث رقم ۱۲۸۸ وابن ماجہ فی ۷۷۱/۲ الحدیث رقم ۲۲۹۹ واحمد فی المسند ۳۱/۵۔)

ترجمہ: ”اور حضرت رافع بن عمرو وغفاری کہتے ہیں کہ جب میں بچہ تھا تو انصار کے کھجوروں کے درختوں پر پتھر مارا کرتا تھا (ایک دن) مجھے پڑ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے جایا گیا، آپ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: ”اے لڑکے! تو کھجوروں پر پتھر کیوں مارتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ کھجوریں کھانے کے لئے (یعنی کھجوریں کھانے کے لئے ان کے درختوں پر پتھر مارتا ہوں کسی اور مقصد سے پتھر نہیں پھینکتا) آپ ﷺ نے فرمایا ”پتھر نہ مارا کرو وہاں جو کھجوریں درخت کے نیچے گری پڑی ہوں ان کو کھالیا کرو“۔ پھر آپ نے اس کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور فرمایا کہ ”اے اللہ! تو اس کا پیٹ بھر“۔ (ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

رافع بن عمرو۔ یہ رافع بن عمرو وغفاری ہیں۔ ”غفاری“ میں غین معجمہ پر کسرہ ہے۔ ان کا شمار بصریوں میں کیا جاتا ہے۔ ان سے عبد اللہ بن صامت نے روایت کی ہے ”اکل تمر“ کے بارے میں ان کی حدیث ہے۔

تشریح: اُتی: صیغہ مجہول کے ساتھ۔ ہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ”نبی“ منصوب ہے
وقال: اور ایک نسخہ میں ”فقال“ ہے اور ایک نسخہ میں صرف ”قال“ ہے۔

وکل مما سقط فی اسفلها: اس لئے کہ عام طور پر درختوں سے گرے ہوئے پھل اٹھانے والے کو کوئی منع نہیں کرتا خاص طور پر چھوٹے بچے جو پھلوں کے زیادہ شوقین ہوتے ہیں۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کو گھر لے ہوئے پھلوں کے کھانے کی اجازت دی ان کے اضطراب اور مجبوری کی وجہ سے ورنہ تو ان کیلئے درختوں سے گرے ہوئے پھلوں کا کھانا بھی جائز نہ تھا اس لئے کہ وہ غیر کا مال ہے جیسا کہ درختوں پر لگی ہوئی کھجور ہے۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ اگر وہ مضطر اور مجبور ہوتے تو پھر ان کیلئے جائز تھا کہ اگر زمین پر کچھ نہ ہوتا تو وہ پتھر مار کر پھل گرا کر کھاتے لیتے۔

قوله: فقال اللهم اشبع بطنه: بعض کہتے ہیں کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ وہ مضطر نہیں تھے۔
اللقطة: لام کے ضمہ اور قاف کے فتح، ساتھ، اور قاف کو ساکن بھی کیا جاتا ہے۔ اس میں فعلی اعتراض ہے۔

الفصل الثالث:

زمین غصب کرنے کی سزا

۲۹۵۸: عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ أَخَذَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ حُسِفَ بِهِ يَوْمَ

الْقِيَامَةِ إِلَى سَبْعِ أَرْضِينَ - (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۰۳/۵ الحدیث رقم ۲۴۵۴ واحمد فی المسند ۹۹/۲۔
ترجمہ: ”حضرت سالم اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بیان کیا کہ ”جس شخص نے زمین کا کوئی حصہ ناحق وصول کیا (یعنی کسی کی زمین کا کوئی بھی قطعہ ازراہ ظلم و زبردستی لے گا) تو قیامت کے دن اسے سات زمینوں تک دھندا دیا جائے گا۔“ (بخاری)

تشریح: من اخذ من الارض شیئاً: اور ایک نسخہ میں ”شبرا“ ہے۔
 خسف بہ: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، اور باء متعدی کرنے کیلئے ہے۔ جملہ خبریہ ہے، یا انشائیہ ہے بمعنی دعاء کے، اور اول زیادہ ظاہر ہے۔ ارضین: راء کی حرکت کے ساتھ، اور سکون کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔ اس میں خبر ہے کہ آخرت میں بھی زمین کے سات طبقات ہوں گے۔

۲۹۵۹: وَعَنْ يَعْلَى بْنِ مُرَّةٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ أَخَذَ أَرْضًا بِغَيْرِ حَقِّهَا كَلَّفَ أَنْ يَحْمِلَ تَرَابَهَا الْمَحْشَرِ. (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۱۷۲/۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت یعلیٰ بن مرہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے زمین کا کوئی بھی حصہ ناحق (یعنی ازراہ ظلم) وصول کیا اسے حشر کے دن اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس زمین کی (ساری) مٹی اپنے سر پر اٹھائے۔“ (احمد)

حالاتِ راوی:

یعلیٰ بن مرہ۔ یہ ”یعلیٰ مرہ“ کے بیٹے ہیں۔ ”بنو ثقیف“ میں سے ہیں۔ حدیبیہ اور اس کے بعد کے تمام غزوات۔ غزوہ خیبر۔ فتح مکہ۔ حنین۔ طائف اور تبوک میں حاضر تھے۔ ان سے ایک جماعت نے حدیث روایت کی ہے۔ ان کا شمار اہل کوفہ میں ہوتا ہے۔

تشریح: قوله: مَنْ أَخَذَ أَرْضًا بِغَيْرِ حَقِّهَا كَلَّفَ أَنْ يَحْمِلَ تَرَابَهَا الْمَحْشَرِ:

المحشر: شین کے فتح کے ساتھ ہے اور اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے اور ایک نسخہ میں ”الی المحشر“ ہے۔ ”محشر“ جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور قاموس میں ہے ”المحشر“ بمعنی جمع ہے بحشر و یحشر شین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ، اور ”محشر“ میں شین کو فتح دیا جائے گا۔ اتنی۔

صاحب قاموس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کسرہ قوی ہے، لیکن لغت قرآنی جو کہ زیادہ فصیح ہے مضارع میں شین کے ضمہ کے ساتھ ہے قراءت متواترہ میں اور قراءت شاذہ کسرہ کے ساتھ ہے، پس محشر میں فتح زیادہ فصیح زیادہ ہلکا اور مشہور ہے۔ اور یہی اکثر کا قول ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ نہ کہا جائے کہ قیامت کا دن تکلیف (یعنی مکلف بنانے) کا زمانہ نہیں ہے؟ اس لئے کہ ہم کہتے ہیں کہ تکلیف سے مراد تکلیف تجزیہ ہے جو ایذا رسانی کیلئے ہے تکلیف ابتلا مراد نہیں ہے جو جزاء اور ثواب کیلئے ہوتی ہے، اور اسی میں سے ہے تصویر بنانے والوں کو قیامت کے دن تصویروں میں روح پھونکنے کا مکلف بنانا۔

تخریج: بطرانی اور نسیاء نے یہ حدیث حکیم بن حارث سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے:

”من اخذ من طریق المسلمین شیئاً جاء به یوم القیامۃ یحملہ من سبع ارضین“۔

۲۹۶۰: وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ أَيُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ كَلَّفَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ

أَنْ يَحْفَرَهُ حَتَّىٰ يَكْفُؤَ أَخْرَجَ سَبْعَ أَرْضِينَ ثُمَّ يَطْوِقُهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ حَتَّىٰ يَقْضَىٰ بَيْنَ النَّاسِ

اخرجه احمد في لمسند ۱۷۳/۴

ترجمہ: ”اور حضرت یعلیٰ بن مرہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ”جو شخص (کسی کی) باشت بھر بھی زمین ازراہ ظلم لے گا اسے (اس کی قبر میں) اللہ عزوجل اس بات پر مجبور کرے گا کہ وہ اس زمین کو ساتویں طبقہ زمین تک کھودتا رہے پھر وہ زمین اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دی جائے گی (اور وہ قیامت تک اسی حال میں رہے گا) یہاں تک کہ (قیامت کے دن) لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے“۔ (احمد)

تشریح: قولہ: يَقُولُ أَيُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شَيْئًا..... يَطْوِقُهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ حَتَّىٰ يَقْضَىٰ بَيْنَ النَّاسِ :

ایما رجل ظلم: علاہ طبیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفعول بہ محذوف ہے اور ”شیرا“ مطلق ہو یا مفعول فیہ ہو دونوں جائز ہیں، اور تقدیری عبارت: ”مقداراً“ یا ”ظلم شبر“ ہے۔

من من لا يقطع بغيره ليعانيه ہے، یا تجزیہ ہے۔ عز: یعنی وہ غالب ہے اپنے حکم فیصلے اور انداز پر۔

وجل: یعنی بہت اونچا اور بڑا ہے اس سے کہ اس کا کوئی کام بغیر حکمت کے ہو۔ یطوقہ: ضیغہ مفعول کے ساتھ، یہ مرفوع ہے اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ یقضیٰ: بنی للمفعول ہے۔ اور ایک نسخہ میں مبنی للفاعل ہے اور فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ اس میں اشارہ ہے عذاب کے استمرار کی طرف اور عذاب سے خلاصی نہ پانے کی طرف۔

امام طبیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ کہیں گے کہ ”ثم يطوقه الى يوم القيامة“ اور ”حتى يقضى بين الناس“ کے درمیان کیسے موافقت اور مطابقت ہوگی؟

امام طبیبی فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ ”الی“ مطلق غایت کا فائدہ دیتا ہے، باقی اس کا حکم داخل ہونا اور حکم سے خارج ہونا یہ ایک الگ امر ہے جو دلیل کے ساتھ گھومتا ہے۔ پس جس میں حکم سے خروج کی دلیل ہو اس کی مثال یہ ہے: [فنظرة الی ميسرة] [البقرة- ۲۸۰] کیونکہ ”اعسار“ یہ علت ہے ”انظار“ کیلئے، اور ”ميسرة“ کے وجود کے ساتھ علت ختم ہو جاتی ہے، اس لئے کہ یہاں کلام مکمل قرآن حفظ کرنے کیلئے لایا گیا ہے (جیسا کہ کشف میں ہے)۔ اور اسی طرح یہاں اس حدیث میں بھی ہے کہ ”يوم القيامة“ یہ غایت ہے اور ما قبل کے حکم میں داخل ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کیا جائے، ”حتى يقضى“ غایت کیلئے بیان کی طرح ہے۔ (انہی)۔ اور اس میں کلام ہے جو حقیقی نہیں ہے۔

بَابُ الشُّفْعَةِ

ملانے کا بیان

”شفعة“ حرف اول کے ضمہ کے ساتھ۔ مغرب میں ہے: الشفعة اسم للملك المشفوع بملكك۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: كان وترا فشفعته باخو، یعنی میں اس کو اس کا جفت بنایا۔ اور اس کی نظیر ”الا كلمة“ اور ”اللقمة“ ہے کہ ان میں سے ہر ایک ”فعلة“ بمعنی ”مفعول“ ہے یہ اس کی اصل ہے۔ پھر اس کو عمارت بنایا گیا تمک سے، یعنی جس کے ساتھ مشتری مالک بنا تھا اسی کے ساتھ اس چیز کا مالک بنا، اور شعی نے اپنے اس قول میں ان دونوں معنوں کو جمع کیا ہے: من بيعت شفعتہ وهو حاضر فلم يطلب بذلك فلا شفعة له۔

الفصل الاول :

حق شفعہ صرف شریک کو حاصل ہوتا ہے یا ہمسایہ کو بھی

۳۹۶۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَضَى النَّبِيُّ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ مَالٍ يُقْسَمُ فَإِذَا وَقَعَتِ الْهُدُودُ وَصُرِفَتِ الطَّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۰۷/۴ الحدیث رقم ۲۲۱۳ و ابو داؤد فی السنن ۳/۷۸۴ الحدیث رقم ۳۵۱۴ و الترمذی

فی ۳/۶۵۲ الحدیث رقم ۱۳۷۰ وابن ماجہ فی ۲/۹۳۵ الحدیث رقم ۲۴۹۹ و احمد فی المسند ۳/۳۹۹

ترجمہ: ”حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس (غیر منقول) چیز میں حق شفعہ ثابت ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا ہے جو (شرکت میں ہو اور) شرکاء کے درمیان تقسیم نہ کی گئی ہو لہذا جب حدود مقرر ہو جائیں (یعنی مشترک ملکیت کی زمین یا مکان باہم تقسیم ہو جائے) اور (ہر ایک حصہ کے) راستے علیحدہ کر دیئے جائیں تو پھر شفعہ کا حق باقی نہیں رہتا (یعنی اس صورت میں چونکہ شرکت باقی نہیں رہتی اس لئے کسی کو بھی حق شفعہ حاصل نہیں ہوتا)۔“۔ (بخاری)

تشریح: قولہ: قضی النبی صلی اللہ علیہ: اس میں شریک کیلئے شفعہ کا ثبوت ہے ان چیزوں میں جو تقسیم نہ کی گئی

ہو۔ پھر یہ عام ہے چاہے وہ تقسیم ہو سکتی ہو جیسے گھر اور زمین وغیرہ یا نہ ہو سکتی ہو۔ اور امام شافعی کے ہاں جو چیز تقسیم نہ ہو سکتی ہو اس میں شفعہ جائز نہیں ہے۔ یہ حدیث اپنے عموم کے ساتھ ان کے خلاف حجت ہے (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے)۔ نیز ”مالہم یقسم“ (یعنی جس کو تقسیم نہ کیا گیا ہو) کو خصوصی طور پر ذکر کرنا یہ دوسری چیزوں سے حکم کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔

قولہ: فَإِذَا وَقَعَتِ الْهُدُودُ وَصُرِفَتِ الطَّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ

حدود واقع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب خریدی ہوئی ملکیت باہم تقسیم ہو جائے اور حدود مقرر ہو جائیں۔

ابن الملک فرماتے ہیں یعنی متعین ہو جائے اور ہر ایک حصہ اس میں سے تقسیم و افراز کے ذریعہ ظاہر ہو جائے۔

صرفت: صیغہ مجہول کے ساتھ۔ یعنی بیان ہو جائیں یا اس طور کہ راستے متعدد ہو جائیں اور ہر ایک کو مخصوص راستہ مل جائے۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ شفعہ صرف شریک کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ ہمسایہ کو، اور یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔ اور بعض حضرات ہمسایہ

کو شفعہ کا حق دینے کے قائل ہیں ان احادیث کی وجہ سے جو اس بارے میں وارد ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے، یہ

حضرات کہتے ہیں کہ فاذا وقعت الحدود و صرِفَتِ الطَّرُقُ یہ حدیث کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کو حضرت جابر نے زیادہ کیا ہے، اور اس کو حدیث کے

ساتھ ملا دیا ہے۔ اور اس کو اس تو جہ پر حمل کرنا اولیٰ ہے تاکہ احادیث کے درمیان موافقت پیدا ہو جائے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہما جو

روایت کیا ہے کہ رسول نے فرمایا: ”اذا وقعت الحدود تو اس کا مطلب یہ ہے: لاحق فی المبیع لارتفاعها بصرف الطرق۔

(جیسا کہ اس کی تحقیق کی ہے ہمارے بعض علماء نے مصابیح کے شرح میں سے۔) مالکی فرماتے ہیں کہ ”صرفت الطرق“ کا معنی

ہے کہ خالص کر دیا جائے اور بیان کر دیا جائے۔ یہ ”صرف“ سے مشتق ہے اور جو ہر چیز کے سے خالص حصہ کو کہتے ہیں۔

توضیح و تخریج: تو روایت فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری نے ان الفاظ یعنی مصابیح کے الفاظ کے ساتھ نقل نہیں کی ہے۔ یعنی ”

الشفعة فیما لم یقسم.....“ ہے، اور مسلم نے بھی یہ حدیث نقل نہیں کی ہے بلکہ مسلم نے اس حدیث کے بعد والی حدیث نقل کی ہے۔

اور مؤلف مصابیح پر لازم تھا کہ جب وہ تقسیم کے بارے میں ایسی حدیث نقل کر رہے تھے جس کو شیخین یا کسی ایک نے روایت کیا ہے تو

حدیث کے الفاظ میں بخاری سے عدول نہ کرتے اس لئے کہ دونوں صیغوں کے درمیان بہت دوری ہے، اور جس کو علم حدیث سے لگاؤ ہو

وہ اس میں تسامح اور سے کام نہ لے سکے۔

قاضی کہتے ہیں کہ یہ مسند امام ابو عبد اللہ محمد الشافعی میں اس طرح حدیث مذکور ہے ”الشفعة فیما لم یقسم فاذا وقعت الحدود فلا شفعة“۔ اور صحیح بخاری میں اس طرح ہے: ”قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالشفعة“ الخ۔ تو شیخ نے بخاری کی عبارت اختیاری کی، لیکن ”قضی بالشفعة فیما لم یقسم“ کو الشفعة فیما لم یقسم کے ساتھ تبدیل کر دیا۔ چونکہ انہوں نے معنی میں زیادہ تفاوت نہیں پایا اور اس عبارت کے ساتھ بھی صحیح روایت وارد ہے، پس اس سے ان لوگوں کا اعتراض ختم ہو گیا جنہوں نے مصنف پر تشنیع کی ہے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ دونوں عبارتوں میں برابری کیسے ہے، جبکہ مصنف کی عبارت حصر عرفی کا تقاضا کرتی ہے اور جو بخاری نے ذکر ہے وہ اس کا تقاضا نہیں کرتی ہے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ حکایت ہو کسی واقعہ کے حال کی یا کسی مخصوص قضیہ میں فیصلہ ہو؟ میں کہتا ہوں کہ اس احتمال کو دفع کرنے کیلئے روایت میں ان الفاظ کے بعد والا جملہ کافی ہے، اور اس کو حرف تعقیب کے ساتھ اس پر مرتب کیا ہے، اور یہ بات صحیح نہیں ہے کہ ”یہ روایت کا حصہ نہیں ہے بلکہ راوی نے زیادہ کیا ہے، روایت کے ساتھ“۔ اسلئے کہ ایسا کرنا یہ تلمیس اور تدلیس ہے۔ اور اس راوی اور ان ائمہ کا منصب بہت اعلیٰ ہے جنہوں نے اس حدیث کی تدوین کی اور اس روایت کو اس عبارت کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں اس جیسا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور حدیث جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اپنے منطوق کے ساتھ صراحتہ دلالت کر رہی ہے کہ مشترک چیز جو ابھی تک تقسیم نہ ہوئی ہو اس میں شفعة کا حق حاصل ہوتا ہے اور جب وہ چیز تقسیم ہو جائے اور حقوق الگ الگ ہو جائیں تو پھر شفعة کی اس میں مجال نہیں ہے، اس طرح شفعة کا حق صرف شریک کو حاصل ہے نہ کہ ہمسایہ کو۔

اور یہ اکثر علماء کا مذہب ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اور تابعین میں سے ابن المسیب، سلیمان بن یسار، عمر بن عبد العزیز، زہری، یحییٰ بن سعید انصاری، ربیعہ بن عبد الرحمن۔ اور یہی مسلک ہے امام اوزاعی، مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ابو ثور اور ان کے بعد والوں میں کا صحابہ اور بعد والوں میں سے بہت کم لوگ، ہمسایہ کیلئے ثبوت شفعة کی طرف مائل ہیں اور انہوں نے استدلال کیا ہے اس سے جو بخاری نے ابورافع سے روایت کیا ہے: الجار احق بسقبہ۔

امام طیبی کہتے ہیں کہ توریشتی کا کہنا کہ جب مصنف نے معنی میں زیادہ تفاوت نہیں پایا..... یہ مصنف پر نکیر کو ختم نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس صفت کے لوگوں نے تصریح کی ہے کہ جب قائل یہ کہے ”رواہ البخاری“ یا ”رواہ مسلم“ مثلاً تو پھر اس کے لئے روایت بالسنی کرنا جائز ہے۔ لیکن جب وہ کہے کہ فلاں کی کتاب میں ایسا ہے تو پھر اس کے لئے اس کے صریح الفاظ سے عدول کرنا جائز نہیں ہے اور شیخ نے کتاب کے خطبہ میں ذکر کیا ہے: و اعنی بالصحاح ما اورده الشيخان فی جامعہما او احدہما۔

باقی توریشتی کا کہنا کہ ”اس احتمال کو دفع کرنے کیلئے یہ کافی ہے الخ“۔ تو اس میں بحث ہے اس لئے کہ یہاں حصر اداۃ حصر اور تقدیم اور خبر کے معرفہ ذکر کرنے کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ مفہوم کے اعتبار سے ہے اور ”الشفعة فیما لم یقسم“ کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز تقسیم ہوگئی ہو اس میں شفعة نہیں ہے، اس صورت میں ما بعد اس کے لئے بیان اور تقریر ہے۔ اور ”قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی کل ما لم یقسم“ کا مفہوم لم یقسم فیما قسم ہے ان دونوں کے درمیان بہت بعد ہے۔

تخریج: اس حدیث کو بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر حضرات نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اس طریقے پر روایت کیا ہے جس طرح بخاری نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

حق شفعة صرف زمین اور مکان کے ساتھ مخصوص ہے

۲۹۶۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْشَفْعَةِ فِي كُلِّ شَيْءٍ لَمْ تُقَسِّمْ رِبْعَةً أَوْ حَابِطًا لَا يَجِلُّ لَهُ أَنْ يَبِيعَ حَتَّى يُؤْذِنَ شَرِيكُهُ فَإِنْ شَاءَ أَخَذُوا نِشَاءً تَرَكَ فَإِذَا بَاعَ وَلَمْ يُؤْذِنْهُ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ. (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحہ ۱۲۲۹/۳ الحدیث رقم (۱۶۰۸-۱۳۴)

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ ہر ایسی مشترک زمین میں شفعہ ثابت ہے جو تقسیم نہ کی گئی ہو خواہ وہ گھر ہو یا باغ ہو۔ نیز ایسی مشترک زمین کے کسی بھی شریک کو اپنا حصہ فروخت کرنا حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اپنے دوسرے شریک کو مطلع نہ کر دے (اطلاع کے بعد) وہ دوسرا شریک چاہے تو وہ حصہ خود خرید لے اور چاہے چھوڑ دے (یعنی کسی دوسرے کو بیچنے کی اجازت دے دے) اور اگر کسی شریک نے اپنے دوسرے شریک کو اطلاع دیے بغیر اپنا حصہ فروخت کر دیا تو وہ دوسرا شریک اس (بات) کا حقدار ہے (کہ وہ اس فروخت شدہ حصہ کو خرید لے)۔“ (مسلم)

تشریح: قوله: قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِاللَّشْفَعَةِ..... لَا يَحِلُّ لَهُ..... شُرَكَةٌ: شین کے کسرہ اور راء کے سکون کے

ساتھ، اس کا مضاف محذوف ہے۔ ای ذی شُرَكَةٌ یعنی ”مشترکہ“۔

لم تقسم: ”شُرَكَةٌ“ کی صفت ہے۔ ربعة: راء کے فتح اور باء کے سکون کے ساتھ، گھر، مکان، زمین۔

او حائط: یہ دونوں (یعنی ربحہ اور حائط ”شُرَكَةٌ“ سے بدل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں مرفوع ہیں مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے، اور وہ مبتدا ”ہی“ ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حق شفعہ صرف غیر منقولہ جائیداد جیسے زمین، گھر، باغات، کے ساتھ مخصوص ہے۔ اشیاء منقولہ جیسے سامان، جانوروں وغیرہ میں حق شفعہ نہیں ہوتا۔ تمام علماء کا متفقہ طور پر یہی مسلک ہے۔

علاوہ یہی فرماتے ہیں کہ علماء کہتے ہیں کہ حق شفعہ کے حاصل ہونے میں حکمت شریک کو ضرر سے بچانا ہے۔ اور پھر اس حق کو زمین کے ساتھ خاص کیا ہے اسلئے کہ اس میں ضرر سب سے زیادہ ہے۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ زمین یعنی غیر منقولہ جائیداد کے علاوہ جانوروں، کپڑوں، متاع اور تمام منقولہ اشیاء میں شفعہ نہیں ہے۔ ہمارے علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ شفعہ صرف اس زمین میں ہے جو قابل تقسیم ہو، بخلاف حمام، چکی وغیرہ کے۔ پھر حق شفعہ صرف مسلمان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مسلمان اور ذمی کے درمیان بھی شفعہ جاری ہوتا ہے، اور یہی جہور کا مسلک ہے۔ شعی، حسن، اور احمد کا مسلک یہ ہے کہ ذمی کو مسلمان پر حق شفعہ حاصل نہیں ہے۔

حتى يؤذن: ہمزہ کے سکون کے ساتھ ہے، ہمزہ کو واؤ سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی اپنا حصہ بیچنے کا ارادہ کرے پہلے اپنے دوسرے شریک پر پیش کرنا واجب ہے۔

قوله: فَإِنْ شَاءَ أَخَذُوا نِشَاءَ تَرَكَ فَإِذَا بَاعَ وَلَمْ يُوْذَنْهُ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ:

بعض کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغیر اطلاع کے بیع باطل ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اس لئے کہ یہ بیع بغیر اطلاع کے صحیح ہے، لیکن یہ خریداری کی جانب سے شفعہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اگلے جملہ کا مطلب یہی ہے۔

اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں ”حلال“، بمعنی ”مباح“ ہے۔ اور بیع مذکور مکروہ ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے مکروہ پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ حلال نہیں ہے۔ اس لئے کہ مباح اس کو کہتے ہیں جسمیں دونوں اطراف برابر ہوں، اور مکروہ میں جانب ترک راجح ہوتا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ علماء کا اختلاف ہے کہ اگر بیچنے والا شریک کو بیع کی اطلاع دیدے اور وہ اس کو اجازت دیدے، اور پھر یہ شریک اس کو شفعہ کے ساتھ لینے کا ارادہ کرے، تو امام شافعی مالک، ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، اور ان کے علاوہ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ شریک کو اختیار ہے کہ وہ اس چیز کو شفعہ کے ذریعے لے لے۔ اور ثوری اور محمد شین کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کو لینے کا اختیار نہیں ہے۔ اور امام احمد سے دو روایتیں ہیں، دونوں مذہبوں کی طرح۔

ہمسایہ کو حق شفعہ حاصل ہونے کی دلیل

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۳۷ الحدیث رقم ۲۲۵۸

ترجمہ: ”اور حضرت ابو رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہمسایہ اپنے قرب کی وجہ سے (شفعہ کا) زیادہ حقدار ہے۔“ (بخاری)

تشریح: سقبہ: سین اور قاف کے فتح کے ساتھ۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ قاف میں فتح اور سکون دونوں جائز ہیں۔ اس کے معنی ہیں قرب اور ملاصقت (چپکانا)۔ (آئلی)

بعض کہتے ہیں کہ یہ سین اور صاد دونوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اور دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی قرب۔ مطلب یہ ہے کہ ہمسایہ قریب ہونے کے سبب سے شفہ کا زیادہ حقدار ہے غیر ہمسایہ سے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سقبہ سے مراد شفہ ہے۔ اور دلیل اگلی حدیث ہے: الجار احق بشفعتہ۔ اس حدیث سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ہمسایہ کیلئے ثبوت شفہ پر استدلال کیا ہے۔

اور حدیث کو اس پر محمول کرنا کہ جار سے مراد شریک ہے۔ سو ممکن ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جائے کہ شریک کیلئے حق شفہ دوسری حدیث سے ثابت ہے اتفاقاً اگر اس حدیث کو بھی شریک پر حمل کیا جائے تو اعادہ لازم آئے گا۔ اور افادہ اعادہ سے بہتر ہے، اور امام شافعی کی حدیث کو حمل کیا جائے گا اس مطلب پر کہ تقسیم کی وجہ سے شفہ کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ تاکہ دونوں حدیثیں جمع ہو جائیں۔ مقام کے مناسب اس پر کلام پہلے ہو چکا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ہمسایہ کو شفہ کا حق اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ ملاصق (یعنی ملا ہوا) ہو۔ اور ”سقبہ“ میں باء ”احق“ کا صلہ ہے، اس لئے کہ یہ باء سبب کیلئے ہے، اور ”سقب“ سے مراد ”ساقب“ ہے، ای ذو سقب من دارہ: یعنی گھر کے قریب۔ عمر بن شریک کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے جب یہ فرمایا تو آپ سے پوچھا گیا: وما سقبہ؟ آپ نے فرمایا: ”شفعتہ“ یعنی اس کا شفہ مراد ہے۔

خطابی فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ سقبہ سے مراد نیکی اور امداد اور اس کے ہم معنی امور ہوں۔ تو ریشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ رحم کرے ابوسلمان پر کہ وہ اس تعسف کے لائق نہیں تھے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ حدیث صحابی سے مروی ہے، ایک قصہ میں کہ جس کا بیان بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے علماء نقل نے اس کو کتب احکام میں باب شفہ میں ذکر کیا ہے۔ اور ان میں سے سب سے اول و افضل امام بخاری ہیں انہوں نے اس قصہ کو شریک سے آخر تک نقل کیا ہے۔ (آئلی)

تخریق: جامع الصغیر میں ہے: الجار احق بصقبہ۔ صاد کے ساتھ۔ اور روایت کیا ہے بخاری، ابوداؤد، اور نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو رافع سے اور آخری دونوں نے شریک بن سوید سے بھی روایت کیا ہے۔

ہمسائیگی کا حق

۲۹۶۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَمْنَعُ جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَغْرِزَ خَشْبَةً فِي جِدَارِهِ. (منفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۱۰/۵ الحدیث رقم ۲۴۶۳ ومسلم فی ۳/۱۲۳۰ الحدیث رقم (۳۶-۱۶۰۹) وابو داؤد فی السنن ۴۹/۴ الحدیث رقم ۳۶۳۴ والترمذی فی ۳/۶۳۵ الہدث رقم ۱۳۵۳ وابن ماجہ فی ۲/۷۸۳ الحدیث رقم

۲۳۳۵ ومالك فی الموطأ ۲/۷۴۵ الحدیث رقم ۳۲ من کتاب الاقضية واحمد فی المسند ۲/۴۶۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی ہمسایہ اپنے دوسرے ہمسایہ کو اپنی دیوار میں شہتیر رکھنے سے منع نہ کرے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: لا یمنع: جزم کے ساتھ ہے اگر یہ صیغہ نہی کا ہو۔ اور ابو ذر کی روایت میں رفع کے ساتھ ہے اس صورت میں یہ خبر بمعنی نہی ہوگی۔ اور احمد کی روایت میں ”لا یمنع“ نون تاکید کی زیادتی کے ساتھ ہے۔ یہ روایت جزم کی تاکید کر رہی ہے۔ (اس کو

عسقلانی نے نقل کیا ہے۔) مطلب یہ ہے کہ مروت اور استحباب کے طور پر نہ کرے۔

يعزز: راء کے کسرہ کے ساتھ۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطلب میں علماء کا اختلاف ہے کہ پڑوسی کو جگہ دینا اور اس کی لکڑی کو دیوار پر رکھنے سے منع نہ کرنا یہ حکم مستحب ہے یا بطور وجوب کے ہے۔ اس میں دو قول ہیں امام شافعی کے اور اصحاب مالک کے۔ صحیح قول استحباب کا ہے۔ اور یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے اور دوسرا قول وجوب کا ہے اور یہی امام احمد اور محدثین کا قول ہے۔ اور ظاہر بھی یہی ہے حضرت ابو ہریرہ کے قول کی بناء پر جو اس اس روایت کے بعد فرماتے تھے: ”ما لی اراکم عنہا معرضین واللہ لارمین بہا بین اکتافکم“۔ حضرت ابو ہریرہ نے یہ اس لئے کہا کہ انہوں نے اس روایت پر عمل کرنے میں توقف کیا تھا اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ انہوں نے سر جھکا لئے تو حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: ما لی اراکم اعرضتم، یعنی اس سنت سے یا خصلت سے یا نصیحت سے یا ان کلمات سے۔ تم اعراض کر رہے ہو حضرت ابو ہریرہ کے اس قول ”لارمین بہا بین اکتافکم“ کا معنی یہ ہے کہ میں یہی فیصلہ کروں گا اور اسکو واضح کر کے بیان کروں گا اور تمہیں یہ سنا سنا کر تکلیف دوں گا، جیسا کہ کسی انسان کو مارا جائے کسی چیز کے ساتھ کندھوں کے درمیان۔ اور پہلے قول والے کہتے ہیں کہ ان کا اعراض کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ اس کو مستحب سمجھ رہے تھے نہ کہ واجب اور اگر یہ واجب ہوتا تو پھر ان کو اعراض کرنے کی طاقت نہ تھی۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ”لارمین بہا“ کی ضمیر ”خشبة“ کی طرف راجع ہو۔ اور یہ کنایہ ہو ان پر حجت قاطعہ کے لازم کرنے سے جس کا انہوں نے دعویٰ کیا ہے، ای لا اقول ان الخشبة ترمی علی الجدار بل بین اکتافکم..... یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ لکڑی دیوار پر رکھی جائے گی بلکہ تمہارے کندھوں پر رکھی جائے گی۔ چونکہ آپ ﷺ نے ہمسایہ کے حق کے بارے میں وصیت کی تھی نیکی اور احسان کرنے کی اور اس کا بوجھ برداشت کرنے کی۔

راستے کے سلسلے میں ایک ہدایت

۲۹۶۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِي الطَّرِيقِ جُعِلَ عَرْضُهُ سَبْعَةَ أَذْرُعٍ۔

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۱۸/۵ الحدیث رقم ۲۴۷۳ و مسلم فی ۱۲۳۲/۳ الحدیث رقم (۱۶۱۳-۱۴۳) و ابو داؤد فی

السنن ۴۸/۴ الحدیث رقم ۳۶۳۳ و الترمذی فی ۶۳۷/۳ الحدیث رقم ۱۳۵۶ و ابن ماجہ فی ۷۸۴/۲ الحدیث رقم ۲۳۳۸

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب راستہ کی چوڑائی کے بارے میں تم میں اختلاف

پیدا ہو جائے تو اس کی چوڑائی سات ہاتھ متعین کر دی جائے گی۔“ (مسلم)

تشریح: جعل: صیغہ مجہول کے ساتھ ”طریق“ مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی۔

سبعة اذرع: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر نسخوں میں ”سبع اذرع“ ہے، اور دونوں روایتیں صحیح ہیں اس لئے کہ ذراع

مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (آئی)

مطرزی کہتے ہیں کہ ذراع کہنیوں سے لیکر انگلیوں کے سروں تک ہوتا ہے۔ پھر یہ نام رکھا گیا مجازاً اس لکڑی کا جس کے ذریعے پیمائش کی جاتی ہے، اور یہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے لیکن تانیث زیادہ فصیح ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ راستہ کی مقدار کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی مملو کہ زمین میں گزرنے والوں کیلئے راستہ بناے تو اس کی مقدار اس کی صواب دید پر ہے۔ پس افضل یہ ہے کہ وہ راستہ کشادہ رکھے۔ اور اس حدیث سے یہ صورت مراد نہیں ہے، پس اگر راستہ کسی قوم کی زمین میں ہو اور وہ اس زمین کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور راستہ کے بارے میں کسی مقدار پر اتفاق کر لیں تو وہی راستہ ہو گا اور اگر راستہ کی مقدار کے متعین کرنے میں

اختلاف پیدا ہو جائے تو پھر راستہ کی چوڑائی سات ہاتھ متعین ہوگی۔ اور حدیث سے یہی مراد ہے، ہاں جب ہم کسی جاری راستہ کو سات ہاتھ سے زیادہ چوڑا پائیں تو اس صورت میں کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ اس زائد حصے پر قابض ہو جائے، لیکن اس کے ارد گرد بجز زمین کو آباد کر سکتا ہے اور اس کے آباد کرنے سے وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی، جبکہ اس سے گزرنے والوں کو تکلیف اور نقصان نہ پہنچے۔

شرح السنہ میں ہے یہ حدیث عام اور کشادہ زمین کے بارے میں ہے، پس اگر راستہ کسی بندگلی میں ہو تو وہ گلی والوں کی ملکیت ہے لہذا نہ اس میں تعمیر کی جائے گی اور گلی کو تنگ نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف دروازہ کھولا جائے گا، مگر اس جماعت کی اجازت سے اور اگر گلی کھلی ہو تو پھر اس میں عام مسلمانوں کو گزرنے کا حق ہے۔

اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی کھلی گلی میں تعمیر کرے یا فروخت کرنے کیلئے تیار کرے اس طور پر کہ گزرنے کیلئے راستہ چھوڑے تو اس کو منع نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ اس قدر سے گزرنے والوں کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دیہات کی زمینوں میں جن کو کاشت کیا جاتا ہے جب وہ (یعنی لوگ) زمینوں کی حدود سے اطراف کی طرف نکلیں تو ان کو نہیں روکا جائے گا۔ جب وہ گزرنے کیلئے سات ہاتھ راستہ چھوڑیں۔

باقی گھروں کا راستہ جو ایک مکان میں تقسیم کیے گئے ہوں اور ان کا اندر جانے کا راستہ بھی اسی میں ہو تو اس کو اس مقدار میں بنایا جائے گا کہ وہ ان کے ضروری مقاصد سے تنگ نہ ہو جیسے پانی کا نالہ، سامان لانا، جنازہ لیجانا وغیرہ۔ (انجلی)۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ متعین مقدار راستہ کی عام اور غالب بنا پر ہے ورنہ یہ معاملہ مختلف ہے شہروں، لوگوں، زمانہ اور جگہ کے اختلاف کے ساتھ، جیسا کہ اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے مکہ کی گلیوں میں اور اس کے بازاروں میں موسم حج وغیرہ کے دوران۔

جامع صغیر میں سیوطی کے ان الفاظ کے ساتھ ہے: "اذا اختلفتم فی الطريق فاجعلوه سبعة اذرع"۔ اس کو روایت کیا ہے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے۔ اور احمد، ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے۔

شاید مصنف نے کتاب کے الفاظ کو بالمعنی نقل کیا ہے۔ اور امام طیبی نے جواب میں حیلہ سے کام لیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الفصل الثالثانی:

غیر منقولہ جائیداد کو بلا ضرورت بیچنا مناسب نہیں ہے

۲۹۶۶: عَنْ سَعِيدِ بْنِ حَرْبٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ بَاعَ مِنْكُمْ دَارًا أَوْ عَقَارًا فَمِنْ أَنْ لَا يَبَارَكَ لَهُ إِلَّا أَنْ يَجْعَلَهُ فِي مِثْلِهِ - (رواه ابن ماجه والدرمی)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۸۳۲/۲ الحدیث رقم ۲۴۹۰ والدرمی فی ۳۵۳/۲ الحدیث رقم ۲۶۲۵ واحمد فی المسند ۳۰۷/۴

ترجمہ: حضرت سعید بن حربؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "تم میں سے جو شخص اپنا مکان یا زمین فروخت کرے تو مناسب یہ ہے کہ اس (کی قیمت) میں برکت نہ رکھی جائے مگر یہ کہ وہ اس (قیمت) کو اس ہی جیسی جائیداد کی خریداری میں خرچ کر دے"۔ (ابن ماجہ واری)

تشریح: قوله: مَنْ بَاعَ مِنْكُمْ دَارًا أَوْ عَقَارًا فَمِنْ أَنْ لَا يَبَارَكَ لَهُ إِلَّا أَنْ يَجْعَلَهُ فِي مِثْلِهِ:

دارا او عقارا: عقار زمین کو کہتے ہیں یا ہرا مال کو کہتے ہیں جس کی اصل گویا زمین ہو، جیسا کہ مغرب میں ہے اور "او" تنوین کیلئے ہے۔ فمن: قاف کے فتح اور میم کے کسرہ کے ساتھ یعنی۔ ہے، فقار۔ ان لا یبارک: راء کے فتح کے ساتھ۔

له: ضمیر بائع کی طرف راجع ہے۔

شیخ مظہر فرماتے ہی کہ زمینوں اور گھروں کو فروخت کر کے ان کی قیمت منقولی اشیاء میں صرف کرنا غیر مستحب کام ہے، اس لئے کہ

غیر منقولی جائیداد کے منافع زیادہ ہیں اور نقصان کم ہے کہ نہ تو چور اس کو چوری کر سکتا ہے اور نہ لیر اس کو لوٹ سکتا ہے، بخلاف منقولی اشیاء کے، پس بہتر یہ ہے کہ ان کو نہ بیچا جائے اور اگر بیچے تو پھر بہتر یہ ہے کہ اس کی قیمت گھریا زمین پر صرف کی جائے۔

ابن ماجہ اور ضیاء نے حضرت حذیفہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

”من باع دارا ثم لم يجعل ثمنها في مغلها لم يبارك له فيها“۔

طبرانی نے سند حسن کے ساتھ معقل بن یسار سے روایت کیا ہے، ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

”من باع دارا من غير ضرورة سلط الله على ثمنها تلفا يتلفه“۔

ہمسایہ کو حق شفعہ حاصل ہوتا ہے

۲۹۶۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْبَجَارُ أَحَقُّ بِشَفْعَتِهِ يُنْتَظَرُ لَهَا وَإِنْ كَانَ غَائِبًا إِذَا كَانَ طَرِيقَهُمَا وَاحِدًا. (رواه احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجه والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۸۷۳ الحدیث رقم ۳۵۱۸ والترمذی فی ۶۵۱/۳ الحدیث رقم ۱۳۶۹ وابن ماجه فی

۸۳۳/۲ الحدیث رقم ۲۴۹۴ والدارمی فی ۳۵۴/۲ الحدیث رقم ۲۶۲۸ واحمد فی المسند ۳۰۳۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہمسایہ اپنے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے اگر وہ غائب ہو تو اس کے شفعہ کی وجہ سے اس کا انتظار کیا جائے (اور ہمسایہ شفعہ کا اس صورت میں حق دار ہے) جب کہ دونوں کا راستہ ایک ہو“۔

(احمد ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: الجار احق بشفעתه: یعنی ہمسایہ کے شفعہ کا جیسا کہ جامع الصغیر کی روایت میں ہے: شفیعہ حارہ

وان كان غائبا: واؤ کے ساتھ اور ان وصلیہ ہے اور مصابیح کے نسخوں میں واؤ کے حذف کے ساتھ ہے یہ اصول معتمدہ اور تصحیح شدہ نسخوں کے خلاف ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ دارمی جامع الاصول اور شرح السنہ میں واؤ کے اثبات کے ساتھ ہے۔ اور مصابیح کے نسخوں میں اسقاط واؤ کے ساتھ ہے۔ اول زیادہ صحیح ہے۔

سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جامع الصغیر میں اس کو روایت کیا ہے احمد اور اصحاب کتب اربعہ نے۔ شرح السنہ میں ہے اس کو عبد الملک بن ابی سلیمان کے علاوہ کسی نے بھی عطاء عن جابر کی سند سے نقل نہیں کیا ہے اور شعبہ نے اس حدیث کی وجہ سے عبد الملک پر کلام کیا ہے۔ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے غیر محفوظ ہونے کا خوف ہے

شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ لوگ جو تقسیم کی گئی چیز میں شفعہ ثابت کرتے ہیں جب ان کا راستہ مشترک ہو۔ اور اس طرح استدلال کرتے ہیں: فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق سے اور مراد وہ راستہ ہے جو مشترک چیز میں ہو اس لئے کہ اس کا راستہ بھی شرکاء میں مشترک ہوتا ہے تو ان میں سے ہر ایک جہاں سے چاہتا ہے داخل ہوتا ہے پس جب اس کو تقسیم کیا جائے تو پھر ہر ایک کو دوسرے کے حق میں راستہ بنانے سے روکا جائے گا۔ تو تقسیم میں راستہ بھی الگ ہوگا۔

قاضی کہتے ہیں یہ حدیث اگر طعن سے سالم بھی ہو، تو معارض نہیں ہو سکتی ان احادیث کے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ چہ جائیکہ یہ راجع ہو یہ لوگ اس حدیث کے مستحلی کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ پہلے گزرا۔

شفعہ کا تعلق ہر غیر منقول جائیداد سے ہے

۲۹۶۸: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الشَّرِيكُ وَشَفِيعُ وَالشَّفْعَةُ فِي كُلِّ شَيْءٍ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (وہ شخص جو فروخت کی جانے والی جائیداد میں) شریک ہو شفعہ کا حق رکھتا ہے اور شفعہ ہر چیز میں ہو سکتا ہے (جو غیر منقولہ جائیداد ہو جیسے زمین اور باغ وغیرہ) اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: الشريك شافع والشفعة في كل شيء:

یعنی غیر منقول میں یا ہر اس چیز میں جو شفعہ کا احتمال رکھتی ہو۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور بعض لوگوں نے شذوذ اختیار کیا ہے کہ وہ اسباب اور جانوروں میں بھی شفعہ ثابت کرتے ہیں۔

۲۹۶۹: وقد روی عن ابن ابی ملیکہ عن النبی ﷺ مرسلًا وهو اصح۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۵۴/۳ الحدیث رقم ۱۳۷۱۔

ترجمہ: یہ حدیث حضرت ابن ابی ملیکہؒ سے بھی نبی کریم ﷺ سے بطریق ارسال مروی ہے اور وہی زیادہ صحیح ہے۔

بیری کا درخت کاٹنے پر وعید

۲۹۷۰: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ حَبِيشٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَطَعَ سِدْرَةَ صَوَّبَ اللَّهُ رَأْسَهُ فِي النَّارِ (رواه ابو داؤد وقال هذا الحديث مختصر يعنى مَنْ قَطَعَ سِدْرَةَ فِي فَلَاقٍ يَسْتِظِلُّ بِهَا ابْنُ السَّبِيلِ وَالْبَهَائِمُ غَشْمًا وَظَلْمًا بغيرِ حَقِّ يَكُونُ لَهُ فِيهَا صَوَّبَ اللَّهُ رَأْسَهُ فِي النَّارِ.

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۰۴/۵ الحدیث رقم ۵۲۳۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن حبیشؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے بیری کا درخت کاٹا اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل دوزخ میں ڈالے گا۔ امام ابو داؤد نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث مختصر ہے جس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص نے ازراہ ظلم اور ناحق جنگل میں بیری کے کسی ایسے درخت کو کاٹا جس کے سایہ میں مسافر اور جانور پناہ حاصل کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل دوزخ میں ڈالے گا۔“

تشریح: قوله: مَنْ قَطَعَ سِدْرَةَ صَوَّبَ اللَّهُ رَأْسَهُ فِي النَّارِ: تخفيف کے ساتھ۔

سدرة: سین کے کسرہ اور دال کے سکون کے ساتھ، ”سبق“، ”ببق“، ”نون کے فتح اور باء کے کسرہ کے ساتھ،

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد مکہ کی بیری کا درخت ہے اس لئے کہ وہ حرم ہے اور بعض علماء کہتے ہیں کہ مدینہ کی بیری کا درخت مراد ہے کہ اس کے کاٹنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس سے سایہ حاصل کریں، اور وہ لوگ جو مدینہ کی طرف ہجرت کریں وہ وحشت محسوس نہ کریں، اور شاید تخصیص کی وجہ یہ ہو کہ مدینہ کے بیری کے درختوں کا سایہ دوسروں سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے ورنہ حکم اس کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے ہر اس درخت کا حکم یہی ہے جس کے سایہ میں لوگ اور جانور راحت پاتے ہیں۔

صوب اللہ: داؤد کی تشدید کے ساتھ، بمعنی نکس و خفض۔

علماء نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا سرا بتداء جہنم میں پھینکے گا یا (صرف) سر پھینک دے گا، یا مراد تمام بدن ہے اور اسی طرح ضیاء نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

قوله: وقال هذا الحديث مختصر۔ يعنى صَوَّبَ اللَّهُ رَأْسَهُ فِي النَّارِ: قال: ضمير ابوداؤد کی طرف راجع ہے۔

هذا الحديث مختصر: مطلب یہ ہے کہ اس کا معنی مختصر ہے یا مؤول ہے اسی لئے ہذا الحدیث ”مقتصر“ نہیں کہا۔

فلاة: فاء کے فتح کے ساتھ۔ جنگل۔ غشما: نین کے فتح اور شین کے سکون کے ساتھ ظلم کو کہتے ہیں۔

و ظلما : یہ عطف تفسیری ہے اور دونوں کو تاکید کے واسطے جمع کیا ہے۔

بغیر حق یکون له فیہا : ”یکون له فیہا“ یہ ”حق“ کی صفت ہے۔

حق سے مراد نفع اور فائدہ ہے۔ اس لئے کہ کبھی آدمی کوئی کام ازراہ ظلم کرتا ہے اور اس میں اس کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اور یہ اس کے برخلاف ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿و یبعون فی الارض بغیر الحق﴾ (اور ناحق دنیا میں سرکشی کرتے ہیں)۔

الفصل الثالث:

ہر غیر منقول جائیداد میں شفعہ ہے خواہ وہ تقسیم ہو سکتی ہو یا ناقابل تقسیم ہو

۲۹۷۱: عَنْ عُمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ إِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ فِي الْأَرْضِ فَلَا شُفْعَةَ فِيهَا وَلَا شُفْعَةَ فِي بَشْرِ وَلَا فِحْلِ النَّخْلِ. (رواه مالك)

اخرجه مالك في الموطأ ۲/۷۱۷ الحديث رقم ۴ من كتاب الشفعة۔

ترجمہ: ”حضرت عثمان بن عفان فرماتے ہیں کہ جب زمین میں حدود قائم ہو جائیں (یعنی مشترک زمین شرکاء میں باہم تقسیم ہو جائے اور ہر ایک کے حصے الگ الگ ہو جائیں) تو (شریک کا) شفعہ باقی نہیں رہتا اور نہ کنویں میں شفعہ کا حق حاصل ہوتا ہے اور نہ پیوندگی کجھور کے درخت میں“۔ (مالک)

تشریح: قولہ: اذا وقعت الحدود في الارض فلا شفعة فيها :

عرض مرتب: اس پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ: ولا شفعة في بشر: امام طیبی فرماتے ہیں اس وجہ سے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ شفعہ صرف اس زمین میں ہے جو تقسیم ہو

سکے۔ ولا فحل النخل: نہایت میں ہے ”فحل النخل“ نہ کجھور کو کہتے ہیں۔ کہ اس کا شگونہ مادہ کجھور میں ڈالتے ہیں۔ اور اس میں شفعہ اس لئے ثابت نہیں ہوتا کہ مثلاً چند لوگوں کو کچھ کجھور کے درخت مشترک طور پر وراثت میں حاصل ہوئے جنہیں انہوں نے آپس میں تقسیم کر لیا، لیکن ان میں ایک نہ درخت بھی تھا جس کا شگونہ لیکر سب ہی لوگ اپنے اپنے کجھور کے درختوں پر ڈالتے تھے، اب انہی میں سے کوئی شخص اپنے حصہ کے کجھور کے درختوں کے ساتھ اس نہ درخت کے حقوق بھی فروخت کرے تو شرکاء کو اس فروخت میں شفعہ کا حق حاصل نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس کو تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔

بَابُ الْمَسَاقَاةِ وَالْمُزَارَعَةِ

مساقات اور مزارعت کا بیان

مساقات کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے درخت کسی کو اس شرط پر دے کہ وہ ان کو سیراب کرے، ان کی دیکھ بھال کرے، اللہ

پاک جو پھل عطا فرمائے گا وہ ان دونوں کے درمیان متعین مقدار سے تقسیم ہوگا۔ اور زمینوں میں مزارعت کی صورت بھی یہی ہے۔

الفصل الاون:

خیبر کی زمین کا بندوبست

۲۹۷۲: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَفَعَ إِلَى يَهُودِ خَيْبَرَ نَخْلَ خَيْبَرَ وَأَرْضَهَا إِلَى أَنْ

يَعْتَمِلُوهَا مِنْ أَمْوَالِهِمْ وَلِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ شَطْرُ ثَمَرِهَا (رواه مسلم وفي رواية البخاري) إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَعْطَى خَيْبَرَ الْيَهُودَ أَنْ يَعْمَلُوهَا وَيَزْرَعُوهَا وَلَهُمْ شَطْرُ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا .

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۲۶/۴ الحدیث رقم ۲۲۸۵ و مسلم فی صحیحہ ۱۱۸۷/۳ الحدیث رقم (۵-۱۰۰۱) و ابو داؤد فی السنن ۶۹۷/۳ الحدیث رقم ۳۴۰۹ و الترمذی فی ۶۶۶/۳ الحدیث رقم ۱۳۸۳ و ابن ماجہ فی ۸۲۴/۲ الحدیث رقم ۲۴۶۷ و الدارمی فی ۳۴۹/۲ الحدیث رقم ۲۶۱۴ و احمد فی المسند ۱۱۷/۲ و سیاتی فی الحدیث الثانی الہذا

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی کھجوروں کے درخت اور وہاں کی زمین اس شرط پر خیبر کے یہودیوں کے حوالہ کر دی کہ وہ اس میں اپنے اموال سے کام کریں گے اور اس کا آدھا پھل (یعنی پیداوار کا آدھا حصہ) رسول اللہ ﷺ کے لئے ہوگا۔" (مسلم) اور بخاری کی روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کو (یعنی وہاں کی زمین اور درخت کو) اس شرط پر یہودیوں کے حوالہ کر دیا تھا کہ وہ اس میں کام کریں اور کاشت کاری کریں اور پھر اس کی پیداوار کا آدھا حصہ یہودیوں کا حق ہوگا (اور آدھا حصہ رسول اللہ ﷺ کا حق ہوگا)۔"

تشریح: "خیبر مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے، اور یہ غیر منصرف ہے۔

عنوان فتح کیا گیا تھا، وہاں کے لوگ آپ ﷺ کے غلام بن چکے تھے۔ آپ ﷺ نے اہل خیبر کو وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن انہوں نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ وہ ان کو وہی پر برقرار رکھیں۔

اس شرط پر کہ وہ اس میں زمین کو آباد کرنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کریں گے اور کام کے تمام ضروری آلات استعمال کریں گے۔ جیسے کلہاڑا، درانتی وغیرہ۔ من اموالہم میں نسبت مجازی ہے۔

قولہ: ولر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شطر ثمرها: شرط کا معنی ہے آدھا، اور "ثمر" سے مراد عام ہے جو کھیتی کو بھی شامل ہے، اس لئے صرف اس کے ذکر پر اکتفا کیا، یا اس کے مقابل ذرع کو قیاس کرتے ہوئے چھوڑا ہے۔

(فقال صلی اللہ علیہ وسلم نقر کم علی ذلک ما اقر کم اللہ علیہ) پس وہ اسی معاہدہ پر تھے نبی ﷺ کے زمانہ میں حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت کی ابتداء تک، یہاں تک کہ حضرت عمر نے ان کو شام کے شہر "اریحا" اور "اذرعات" کی طرف ملک بدر کر دیا۔ ویزر عوہا: یہ تخصیص بعد از تعیم ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ اگر آپ ﷺ معاملہ اور مزدور کے حصہ کو بیان کرتے اور اپنے حصہ کے بیان کرنے سے سکوت اختیار کرتے تو یہ جائز تھا۔ اور اگر اس کا عکس کرتے بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی جائز تھا، عکس پر قیاس کرتے ہوئے۔

قاضی فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا علماء میں سے کسی کو جو مساقات کو مطلقاً منع کرتا ہو سوائے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے۔ اور مساقات کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ یہ آپ ﷺ سے ثابت ہے اور اتنا عام ہوا ہے اس کا ثبوت حد تو اترا تک پہنچا ہے کہ آپ ﷺ نے اہل خیبر کی ساتھ خیبر کی کھجوروں پر مساقات کا معاملہ کیا آدھے کی شرط پر۔ جیسا کہ اس پر یہ حدیث دلالت کر رہی ہے۔ اور حدیث کی یہ تاویل کرنا کہ آپ ﷺ نے یہود کو خیبر میں کام پر لگایا یہ جزیہ کے بدلے میں تھا اور جو آدھا ان کو دیا کرتے تھے یہ آپ ﷺ کی طرف سے عطیہ اور ان کی مدد تھی۔ اس لئے کہ ان کو کام کرنے کا مکلف بنایا تھا۔ یہ بعید ہے، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ تاویل تو ہر ایک بعید ہوتی ہے جہاں بھی دکھائی دے، باقی اس کا سہارا اس لئے لیا جاتا ہے تاکہ مختلف احادیث مرویہ کو جمع کیا جاسکے فرمایا مزارعت کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کے حوالہ کر دے تاکہ وہ زمین کاشت کرے اور بیج مالک کی طرف سے ہوگا، اس شرط پر کہ جو نکلے نکلے گا وہ دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا حصص کے اعتبار سے۔ ہمارے ہاں مزارعت، مساقات کے ضمن میں جائز ہے، کہ خالی زمین درختوں کے درمیان میں ہے بایں طور کہ اس کو الگ کرنا محنت اور کام کے اعتبار سے ناممکن

یا مشکل ہو، جیسا کہ خیبر میں تھا یہ اس حدیث کی وجہ سے جائز ہے اور مستقل مزارعت جائز نہیں ہے اس حدیث کی بناء پر کہ جو ابن عمر نے روایت کی ہے کہ ہم مزارعت میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے یہاں تک کہ میں نے رافع بن خدیج سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ امام مالک اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ اس کو مطلق ممنوع قرار دیتے ہیں، اور اکثر اہل علم اس کو مطلقاً جائز سمجھتے ہیں صحابہ میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور سعد بن مالکؓ اور تابعین میں سے ابن مسیب، قاسم بن محمد، محمد بن سیرین، طاوس اور ان کے علاوہ جیسے زہری، عمر بن عبد العزیز، ابن ابی یعلیٰ، احمد، اسحاق، ابو یوسف، محمد بن الحسن رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ظاہر حدیث کی وجہ سے، اور قیاس بھی اس جواز کی تائید کرتا ہے، مساقات اور مضاربت پر قیاس کرتے ہوئے (اتحلی) فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے (یعنی مزارعت جائز ہے)۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ احادیث سے مساقات کا جواز معلوم ہوتا ہے اور یہی جمہور محدثین اور فقہاء کا مسلک ہے۔ (اور امام ابو حنیفہ نے) احادیث کی یہ تاویل کی ہے کہ خیبر کو عنوة فتح کیا تھا تو آپ ﷺ نے ان سے جو لیا تھا وہ آپ ﷺ ہی کا تھا۔ اور جمہور نے اس قول سے استدلال کیا ہے: ”علی ان یعتملوها من اموالہم“، اور اس قول سے ”اقرکم ما اقرکم اللہ علیہ“۔ اور یہ تصریح ہے اس بات کی کہ وہ غلام نہیں تھے۔ (اتحلی)

امام نووی کا یہ کہنا ہے کہ یہ ”صریح“ ہے یہ صریح محل نظر ہے، اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ خیبر عنوة فتح ہوا تھا یا صلح کے ساتھ فتح ہوا تھا، یا اہل خیبر کو بغیر قتال کے جلا وطن کر دیا تھا، یا بعض کو اور بعض صلح کے ساتھ اور بعض کو وہاں سے جلد وطن کر کے فتح کیا تھا۔ یہ سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔ (اتحلی)

اب اس بات کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ مزارعت اس زمین میں واقع ہوئی تھی جو عنوة نہیں لی گئی تھی تاکہ یہ امام ابو حنیفہ کے خلاف دلیل ہو، ورنہ احادیث میں کئی احتمالات کے موجود ہونے کی وجہ سے ان سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

امام شافعی اور ان کے موافقین کا مسلک یہ ہے کہ مزارعت، مساقات کے ضمن میں جائز ہے اور الگ سے جائز نہیں ہے، جیسا کہ خیبر میں جاری تھا۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مزارعت نہ الگ جائز ہے اور نہ مساقات کے تابع ہو کر مگر صرف اس زمین میں جو درختوں کے درمیان میں ہو۔ امام ابو حنیفہ اور زفر فرماتے ہیں کہ مزارعت اور مساقات دونوں مطلقاً فاسد ہیں۔ اکثر علماء مساقات اور مزارعت کے جواز کے قائل ہیں الگ الگ بھی اور ایک ساتھ بھی۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ حدیث خیبر کی وجہ سے یہ مذہب ظاہر اور پسندیدہ ہے۔ اور یہ دعویٰ قبول نہیں ہے کہ خیبر میں مزارعت، مساقات کے تابع تھی، بلکہ وہ مستقل تھی۔ اور اس وجہ سے کہ مساقات کو جائز قرار دینے والا معنی مزارعت کے اندر موجود ہے۔ اور قیاس کرتے ہوئے مضاربت پر اس لئے کہ وہ بالا جماع جائز ہے اور وہ تمام چیزوں میں مزارعت کی طرح ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ مسلمانوں کا عمل مزارعت پر ہمیشہ رہا ہے ہرزمانہ اور ہر شہر میں۔ اور مخاربت سے نبی کی احادیث بمجمول کیا جائے گا اس صورت پر کہ جب اس میں شرط لگائی جائے ہر ایک کیلئے ایک زمین کے ایک متعین حصہ کی۔ اور ابن خزیمہ نے مزارعت کے جواز کے بارے میں کتاب لکھی ہے اور اس میں دلائل کی انتہا تک پہنچے ہیں۔ اور ممانعت کی احادیث کا جواب دیا ہے۔ (اتحلی کلام)

شرح السنہ میں بھی السنۃ کے کلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ مزارعت کے جواز کی طرف مائل ہیں مطلقاً۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے امام طیبی نے)۔

مخاربت کی ممانعت

۲۹۷۳: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نَخَابِرُ وَلَا نَرَى بِذَلِكَ بَأْسًا حَتَّى زَعَمَ زَالِعُ بْنُ خَدِيجٍ أَنَّ النَّبِيَّ

نَهَىٰ عَنْهَا فَتَرَ كُنَّا هَا مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۷۹/۳ الحدیث رقم (۱۰۶-۱۰۷) وابن ماجہ فی ۸۱۹/۲ الحدیث رقم ۲۴۵۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ مزارعت کیا کرتے تھے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے یہاں تک کہ جب حضرت رافع بن خدیجؓ نے یہ بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے تو ہم نے اس وجہ سے اسے چھوڑ دیا۔“ (مسلم)

تشریح: قال کنا نغابہ: یعنی مزارعت کرتے تھے یا ہم مزارعت کو جائز کہتے تھے اور اس کے صحیح ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔ زعم یہاں ”زعم“ بمعنی ”قول“ ہے۔ رافع بن خدیج یہ غزوہ اُحد اور اس کے بعد اکثر غزوات میں شریک ہوئے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عہا فترکنا ہا من اجل ذلك: مشارالہ یہ ممانعت ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ ”مخابره“ جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ ”مساقاۃ“ کی طرح نہیں ہے اس لئے کہ ”مخابره“ میں تخم عامل کی طرف سے ہوتا ہے۔ پس مزارعت کہتے ہیں عامل کو کرایہ پر لینا بعض پیداوار کے بدلے، اور مخابره کہتے ہیں عامل کا زمین کو کرایہ پر لینا بعض پیداوار کے عوض۔ اور اکثر فقہاء مزارعت کے جواز کے قائل ہیں جیسا کہ پہلے گزرا۔ (انتہی)

شمسی کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں مزارعت اور مساقات جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مزارعت، مخابره کو کہتے ہیں اور مخابره سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ اور جو آپ علیہ السلام نے اہل خیبر سے لیا تھا وہ خراج مقاسمہ تھا جو بطور احسان اور صلح کے لیا تھا اور یہ جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے ان کیلئے مدت مقرر نہیں کی تھی اور مزارعت کے جواز کے قائلین کے ہاں بھی مدت کے معین کرنے کے بغیر مزارعت جائز نہیں ہے۔ ابو بکر رازی فرماتے ہیں کہ اس بات کی دلیل کہ آپ علیہ السلام اہل خیبر سے جو کھجوریں اور غلہ لیا کرتے تھے وہ بطور جزیہ کے تھا یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے وفات تک اہل خیبر سے جزیہ نہیں لیا، نہ حضرت ابو بکر نے لیا یہاں تک کہ وہ وفات پا گئے اور نہ حضرت عمر نے لیا یہاں تک کہ ان کو جلا وطن کر دیا، اگر یہ جزیہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ ان سے جزیہ لیتے جب آیت جزیہ نازل ہوئی۔

اجرت یا لگان پر زمین دینے کا ذکر

۲۹۷۴: وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَيْسٍ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ اخْبَرَنِي عَمَّايَ اَنَّهُمْ كَانُوا يَكْرُونَ الْاَرْضَ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بِمَا يَنْبَغُ عَلٰى الْاَرْضِ بَعَاءً اَوْ شَيْءٍ يَسْتَنْبِغُهَا صَاحِبُ الْاَرْضِ فَهَآنَا النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذَلِكَ فَقُلْتُ لِرَافِعٍ فَكَيْفَ هِيَ بِالذَّرَاهِمِ وَالذَّنَانِيرِ فَقَالَ لَيْسَ بِهَا بَأْسٌ وَكَانَ الَّذِي نَهَىٰ عَنْ ذَلِكَ مَا لَوْ نَظَرَ فِيهِ دَوًّا اَلْفَهُم بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ لَمْ يُجِزُوهُ لِمَا فِيهِ مِنَ الْمُخَاطَرَةِ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۵/۵ الحدیث رقم ۲۳۴۶ احمد فی المسند ۱۴۲۴

ترجمہ: ”حضرت حنظلہ بن قیس (تابعی) حضرت رافع بن خدیج سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی رافع نے) فرمایا کہ مجھے میرے دو چچاؤں نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ ٹالیوں پر ہونے والی پیداوار کے عوض اپنی زمین اجرت پر دیا کرتے تھے (یعنی صحابہؓ اپنی زمین کو کسی دوسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ اجرت پر دے دیا کرتے تھے کہ وہ شخص اپنی محنت اور اپنا تخم لگا کر اس میں کاشت کرے اور اس زمین کی پانی کی ٹالیوں کے کناروں پر جو کچھ پیدا ہوگا وہ اس زمین کی اجرت میں مالک کا حق ہوگا اور اس کے علاوہ باقی زمین کی پیداوار کاشت کرنے والے کا حق ہوگا) یا اپنی زمین کو اس قطعہ (کی پیداوار) کے عوض اجرت پر دیتے تھے جسے مالک اپنے لئے علیحدہ کر لیتا تھا (یعنی زمین کو اجرت پر دینے کی دوسری صورت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی زمین جب کسی کو کاشت کے لئے دیتے تو اس کا کوئی قطعہ اپنے لئے علیحدہ متعین کر دیتے تھے اور یہ طے ہو جاتا تھا کہ کاشت کرنے والا اپنی محنت اور

اپنا تخم لگا کر پوری زمین پر کاشت کرے پھر اس متعین قطعہ کی جو کچھ پیداوار ہوگی وہ تو مالک لے لے گا اور باقی زمین کی پیداوار کاشت کرنے والا لے گا) چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرمایا (کیونکہ اس میں نقصان اور فریب میں مبتلا ہونے کا خوف رہتا تھا) حدیث کے راوی حضرت حنظلہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت رافعؓ سے پوچھا کہ درہم و دینار کے عوض مزارعت کا کیا حکم ہے (یعنی اپنی زمین کسی کو کاشت کرنے کے لئے دے دی جائے اور اس کے عوض بطور لگان روپے لئے جائیں تو کیا حکم ہے؟) حضرت رافعؓ نے فرمایا کہ ”اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور جس چیز سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ (یعنی مزارعت کی مذکورہ دونوں صورتیں) وہ ایسی چیز ہے کہ اگر حرام و حلال کی سمجھ رکھنے والا شخص اس میں غور کرے تو نقصان پہنچنے کے خوف سے اسے پسند نہ کرے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: ”عمای“: میم کی تشدید کے ساتھ ”عم“ کا شنیہ ہے یا ئے ضمیر کی طرف مضاف ہے۔

یکرون: باء کے ضمہ کے ساتھ۔ اجارہ پر دینا۔ علی عہد النبی: اور ایک نسخہ میں ”رسول اللہ“ ہے۔

بما ینبت: باء کے ضمہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں بمعنی للمفعول ہے۔

الاربعاء: ہمزہ کے فتح اور باء کے فتح کے ساتھ اسم ممدود ہے، ”ربیع“ کی جمع ہے، چھوٹی نہر کو کہتے ہیں جس کو کاشت کار سیراب

کرے۔ کہا جاتا ہے: ربیع و اربعاء و اربعة جیسے نصیب و انصاء و انصبة۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ صحابہ اپنی زمین کسی دوسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ اجرت پر دیا کرتے تھے کہ وہ شخص اپنا تخم لگا کر اس میں کاشت کرے اور اس زمین کی پانی کی تالیوں کے کنارے پر جو کچھ پیدا ہوگا وہ اس زمین کی اجرت میں مالک کا حق ہوگا اور اس کے علاوہ باقی زمین کی پیداوار کاشت کرنے والے کا حق ہوگا اس کی محنت اور تخم کے بدلے میں۔ یعنی گویا کہ وہ کہتے تھے کہ جو اس متعین قطعہ میں پیدا ہوگا وہ مالک کیلئے ہوگا۔ اور جو اس قطعہ زمین کے علاوہ زمین میں پیدا ہوگا وہ کاشتکار ہوگا۔

فہنا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلك: شاید ممانعت کا مقتضی یہ ہو کہ اس میں ہے۔ اس لئے کہ کبھی اس متعین حصہ میں پیداوار ہو جاتی ہے اور دوسرے میں نہیں ہوتی، تو ایک کل پیداوار لے جاتا ہے اور دوسرے کا حق بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ مساقات میں کوئی متعین درختوں کے پھلوں کی اپنے لیے شرط لگا لے اور باقی کی عامل کیلئے۔

فیکف ہی: ضمیر مخابرة کی طرف راجع ہے۔ کان: تشدید کے ساتھ۔ نہی: صیغہ مجہول کے ساتھ۔

عن ذلك ما: ”ما“ بمعنی الذی اسم موصول ہے۔ لو نظر فیہ ذووا الفہم بالحلال والحرام: ”ذوو“ دو (۲) واؤ کے ساتھ ہے اور صحیح نسخہ میں ایک واؤ کے ساتھ ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ روایہ ایک واؤ کے ساتھ ہے جیسا کہ مصابیح کے نسخوں میں ہے۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ ”ذووا الفہم“ دو (۲) واؤ کے ساتھ ہے اور مراد اس سے جمع ہے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ علامہ تورپشتی کو اس توجیہ پر جس نے ابھارا ہے وہ یہ قول ہے: لم یجیزوہ۔

اس کے جواب میں ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ذو الفہم میں باعتبار جنس کے عموم ہے لہذا ”لم یجیزوہ“ میں ضمیر کو جمع لانا جائز ہے (آئنی)۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ سلفی اور ابن سیویہ کی روایت میں ”ذو الفہم“ بلفظ مفرد ہے جنس مراد ہونے کی وجہ سے اور آگے ”لم یجیزوہ“ ہے۔

قوله: لما فیہ من المخاطرة: یعنی غرر اور ہے ایسی چیز حلال نہیں ہے اس لئے کہ ہر ایک شریک کا حصہ مجہول ہے۔ اور ”مخاطرة خطر“ سے ہے ہلاکت پر مطلع ہونے کو کہتے ہیں اور کلام کے سیاق سے ظاہر یہ ہے کہ یہ رافع کا کلام ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ زیادہ حدیث رافع بن خدیج میں مدرج ہے لیکن اسی طریقے پر بخاری کی روایت بھی ہے اور مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کسی راوی کا قول ہے یا امام بخاری کا قول ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”کان“ کا اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر ہے اور خبر اسم موصول ثانی ہے اور ”وکان“ میں واؤ ”لیس“ کی خبر سے حال ہے۔

اس لئے کہ رافع سے جب پوچھا گیا دراہم کے بدلے زمین کرایہ پر دینے کے بارے میں تو ان کے پاس کوئی نص نہیں تھی اور ان دونوں کے درمیان انہوں نے کوئی جامع علت بھی نہیں دیکھی کہ اس پر قیاس کر دیتے تو انہوں نے اپنے اس قول کے ساتھ اس کو بیان کر دیا ”وکان الذی نہی.....“ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ امام بخاری کا قول ہے تو اس کا ما قبل کے ساتھ کوئی ربط پیدا نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے قاضی نے کہا کہ سیاق کلام سے ظاہر یہ ہے کہ یہ رافع کا کلام ہے اور اس کی تائید آگے آنے والی دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے: ”فربما اخرجت ذہ ولم تخرج ذہ فنہا ہم النبی صلی اللہ علیہ وسلم“۔

مزارعت کی ایک ممنوع صورت

۲۹۷۵: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ كُنَّا أَكْثَرَ أَهْلِ الْمَدِينَةِ حَقْلًا وَكَانَ أَحَدُنَا يُكْرِى أَرْضَهُ فَيَقُولُ هَذِهِ الْقِطْعَةُ لِي وَهَذِهِ لَكَ فَرُبَّمَا أَخْرَجْتَ ذِهِ وَلَمْ تُخْرِجْ ذِهِ فَنَهَى هُمُ النَّبِيُّ ﷺ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۵/۵ الحدیث رقم ۲۳۳۲ و اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۱۸۳/۳ الحدیث رقم (۱۱۷-۱۵۴۷)

ترجمہ: اور حضرت رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ ہم اکثر مدینہ والے کھیتوں کے مالک تھے اور ہم میں سے کوئی اپنی زمین (کسی کو) کرایہ پر دیتا تو یوں کہہ دیتا (کہ تم اس پوری زمین پر کاشت کرو اس کے عوض میں) اس زمین کا یہ قطعہ مکر ا میرے لئے ہے (یعنی زمین کے اس قطعہ کی پیداوار میں لوں گا) اور یہ مکر ا تمہارے لئے ہے (یعنی اس دوسرے قطعہ کی پیداوار تم لے لینا) اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک قطعہ میں پیداوار ہو جاتی تھی لیکن دوسرے قطعہ میں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے (مزارعت کی اس صورت سے) منع فرما دیا۔ (کیونکہ اس کی وجہ سے ایک شخص کو تو اپنے حصہ کی پیداوار مل جاتی تھی اور دوسرے شخص کا حق تلف ہو جاتا تھا)۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قال كنا اكثر اهل المدينة حقلاً: حاء کے فتح اور قاف کے سکون کے ساتھ۔ مغرب میں ہے کہ ”حقل“ بھیتی کو کہتے ہیں۔ ”محاقلہ“ کی کئی تفسیریں کی گئی ہیں: ۱) خوشے کے اندر غلہ کو گندم کے بدلے بیجے کو کہتے ہیں۔ ۲) بعض کہتے ہیں بھیتی کو گندم کے بدلے فروخت کرنے کو کہتے ہیں۔ ۳) بعض کہتے ہیں کہ تہائی یا چوتھائی پر بٹائی کو کہتے ہیں وغیرہ۔ ۴) بعض کہتے ہیں گندم کے بدلے زمین کو کرایہ اور بٹائی پر دینے کو کہتے ہیں۔

”ذہ“: حاء کے سکون کے ساتھ اور بعض کہتے ہیں اشباع کے ساتھ ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے قطعہ زمین کی طرف اشارہ ہے اور یہ اسماء مہمہ میں سے ہے جس سے اشارہ کیا جاتا ہے مؤنث کی طرف۔ اس میں ”ذی“ اور ”ذہ“ حاء کے سکون کے ساتھ بھی کہا گیا ہے۔

یہ حضرت رافع کا قول ہے عدم جواز کیلئے اس خطرے کے پائے جانے کی وجہ سے جمع ہے۔ یعنی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس علیحدہ کئے ہوئے قطعہ میں تو پیداوار ہو جاتی ہے اور اس کے علاوہ زمین میں نہیں ہوتی یا اس کے برعکس ہو جاتا ہے، پس ایک تو کل پیداوار لے کر کامیاب ہو جاتا ہے، اور دوسرے کا حق بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔

کسی کو اپنی زمین بطور عاریت دینا بہتر ہے

۲۹۷۶: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قُلْتُ لِمَاؤُسِ لَوْ تَرَكَتِ الْمُخَابِرَةَ فَإِنَّهُمْ يَزْعُمُونَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْهُ قَالَ

أَيُّ عَمْرُو آتَىٰ أُعْطِيَهُمْ وَأَعْيَنَكُمْ وَإِنَّ أَعْلَمَهُمْ أَخْبَرَنِي يَعْنِي ابْنَ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَنْهَ عَنْهُ وَلَكِنْ قَالَ أَنْ يَمْتَحَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَأْخُذَ عَلَيْهِ خَرْجًا مَعْلُومًا. (متفق عليه)

اخرجه البخاری صحیحہ ۱۴/۵ الحدیث رقم ۲۳۳۰ ومسلم فی ۱۱۸۴/۳ الحدیث رقم (۱۲۰-۱۵۰) وابوداؤد فی ۶۸۲/۳ الحدیث رقم ۳۳۸۹ والنسائی فی ۳۶/۷ الحدیث رقم ۳۸۷۳ واحمد فی المسند ۱/۲۳۴ (۲) المخطوطہ (ریعا) (۲) اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۶۸۹/۳ الحدیث رقم ۳۳۹۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمرو بن دینار (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت طاؤس (تابعی) سے کہا کہ کاش آپ مخابره کو چھوڑ دیتے کیونکہ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ طاؤس نے کہا کہ اے عمرو! میں (اپنی زمین کاشت کرنے کے لئے) لوگوں کو دیتا ہوں اور ان کی مدد بھی کرتا ہوں اور ان میں سب سے بڑے عالم یعنی حضرت ابن عباس نے مجھے بتایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا لیکن آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو (کاشت کاری کے لئے) بغیر کسی عوض زمین دے یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ اس سے معینہ لگان وصول کرے۔“ (بخاری و مسلم)

حالاتِ راوی:

عمرو بن دینار۔ یہ عمرو دینار کے بیٹے ہیں۔ کنیت ”ابویحییٰ“ ہے۔ سالم بن عبداللہ وغیرہ سے روایت کی اور ان سے دونوں ماؤد اور معتز نے روایت کی ہے۔ کئی محدث ان کو روایت میں ”ضعیف“ کہتے ہیں۔

تشریح: لو ترکت المخابرة: اس ”لو“ میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”لو“ تمنیٰ کیلئے ہے۔ یزعمون: یعنی کہتے ہیں اور گمان کرتے ہیں، یقین سے نہیں کہتے۔ نہی عنہ: ضمیر مخابره کی طرف راجع ہے، اور کی تاویل یہ ہوگی: نہی عن الزرع فی ارض غیرہ۔ واعینہم: ”اعانة“ سے ماخوذ ہے۔

وإن أعلمهم: امام طبری فرماتے ہیں أعلمہم کی ضمیر اس کی طرف راجع ہے جس کی طرف ”یزعمون“ کی ضمیر راجع ہے اور وہ علماء کی ایک جماعت ہے کہ ان کا مسلک مخابره کے بارے میں طاؤس کے خلاف تھا اس لئے اس کو لفظ ”زعم“ کے ساتھ ذکر کیا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ ان سے زیادہ علم والے ہیں۔

اخبرنی یعنی: یعنی طاؤس کی مراد أعلمہم سے ابن عباس تھے۔

ابن عباس ان النبى ﷺ لم ينه عنہ: یعنی زمین کو بٹائی پر دینا اس طریقے پر جو کہ حدیث رافع میں مذکور ہے۔

ولكن قال: ضمیر نبی ﷺ کی طرف رافع ہے۔

ان ینمّح: ہمزہ اور جاء کے فتح کے ساتھ اس بنیاد پر کہ ”ان“، تعلیلیہ ہو، اور ہمزہ کے کسرہ اور جاء کے سکون کے ساتھ ہے اگر ”ان“ شرطیہ ہو، لیکن اول زیادہ مشہور ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے مستقلانی نے)۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ”ان“ مصدر یہ ہے اور محلا مرفوع ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے۔ اور ”ینمّح“ یا اور نون کے فتح کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں یاء کے ضمہ اور نون کے کسرہ کے ساتھ ہے، اور اس کا فاعل آنے والا قول ”احدکم“ ہے، معنی یہ ہے کہ دے تم میں سے کوئی اپنی زمین اجرت پر۔

اس وجہ سے کہ اس میں احتمال ہے کہ بارش نہ بر سے یا زمین سے پیداوار نہ نکلنے۔ تو اس صورت میں اس کا مال بغیر کسی عوض کے چلا جائے گا۔ (یعنی ضائع ہو جائے گا۔)

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ مزارعت کے بارے میں احادیث جو مؤلف نے ذکر کی ہیں یا جو کتب حدیث میں موجود ہیں ان میں بظاہر بہت بڑا تباہی اور اختلاف ہے، اور من جملہ جامع قول یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ رافع بن خدیج نے ممانعت کے بارے میں احادیث سنیں اور ان کی علل مختلف تھیں، پس انہوں نے ان سب کو ایک ایک لڑی میں پرو دیا اس لئے کبھی وہ کہتے ہیں: سمعت ۱ سے ل

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کبھی کہتے ہیں: حدثنی عمومی، اور کبھی کہتے ہیں: اخبرنی عمای۔ ان احادیث میں سے بعض میں علت یہ ہے کہ وہ فاسد قسم کی شرائط لگاتے تھے اور غیر معلوم اجرت پر معاملات کرتے تھے تو ان کو اس سے منع کیا گیا۔ بعض میں علت یہ ہے کہ وہ زمین کی اجرت کے بارے میں آپس میں لڑتے تھے یہاں تک تقابل کی نوبت آ جاتی۔ پس نبی ﷺ نے فرمایا: ان کان هذا اشناکم فلا تکروا المزراع ”اگر تمہاری یہ حالت ہے تو پھر تم بھائی پر کاشت نہ کرو“ اس کو زید بن ثابت نے اپنی حدیث میں بیان کیا ہے۔

اور بعض میں علت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ناپسند کیا کہ ایک آدمی اپنے مسلمان بھائی سے زمین پر معلوم مقدار میں اجرت لے لے۔ اور پھر بارش نہ ہو یا زمین سے پیداوار نہ ہو اور اس کا مال بغیر کسی چیز کے چلا جائے۔ اس سے آپس میں نفرت اور بعض پیدا ہوتا ہے۔ یہ ابن عباس کی حدیث ”من کانت له ارض فلیزرعها.....“ سے واضح ہے۔ تو یہ بطور مروت اور مواسات کے فرمایا۔ اور بعض میں علت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ناپسند کیا کہ یہ لوگ کھیتی باڑی کے فتنہ اور لالچ میں پڑ جائیں اور اسی کے ہو جائیں، اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے رہ جائیں، اور مال غنیمت اور فنی میں ان کا حصہ فوت ہو جائے۔ اس پر ابوامامہ کی حدیث دلالت کر رہی ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ اسی معنی پر اس اضطراب کو محمول کرنا چاہئے جو شرح السنہ میں امام احمد سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رافع بن خدیج کی حدیث میں اضطراب ہے کہ کبھی تو وہ فرماتے ہیں: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کبھی کہتے ہیں: حدثنی عمومی، اس اضطراب کو محدثین کے اصطلاحی اضطراب پر محمول نہ کیا جائے اس لئے کہ وہ اضطراب ضعف کی اقسام میں سے ایک قسم ہے اور جناب شیخین کی شان بہت بلند و بالا ہے وہ اپنی کتابوں میں اس قسم کی احادیث کیسے ذکر کر سکتے ہیں۔

اپنی زمین کو بیکار نہ چھوڑو

۲۹۷۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزِرْهَا أَوْ لِيَمْنَحُهَا أَخَاهُ فَإِنَّ ابْنِي فَلْيُمِسِّكَ أَرْضَهُ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۲/۵ الحدیث رقم ۲۳۴۰ و مسلم فی ۱۱۷۶/۳ الحدیث رقم (۱۵۳۶-۸۹) والنسائی فی

السنن ۳۶/۷ الحدیث رقم ۳۸۷۴ وابن ماجہ فی ۸۱۹/۲ الحدیث رقم ۲۶۵۱ و احمد فی المسند ۳۷۳/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے پاس زمین ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس میں خود کاشت کرے یا (خود کاشت نہ کر سکے تو) اپنے کسی بھائی کو عاریتہ دے دے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو پھر اسے چاہئے کہ اپنی زمین اپنے پاس ہی رکھے“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: فلیزرعها: امر اباحت کیلئے ہے۔ فلیمسک ارضہ: یہ حکم توبیخ اور تنبیہ کیلئے ہے۔

بعض کہتے ہیں معنی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی زمین عاریتہ قبول کرنے سے انکار کر دے، تو اپنی زمین اپنے پاس رہنے دے اس صورت میں یہ حکم اباحت کے طور پر ہوگا۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں اس کی کوئی کوتاہی نہیں ہے۔

شیخ منظر فرماتے ہیں کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے مال سے نفع حاصل کرے۔ پس جس شخص کے پاس زمین ہو اسے چاہئے کہ وہ اس میں خود کھیتی باڑی کرے تاکہ اس کی وجہ سے اسے نفع ہو، یا اپنے مسلمان بھائی کو عاریتہ دیدے تاکہ اسے ثواب ملے، لیکن اگر وہ ان دو صورتوں میں سے کوئی صورت پسند نہ کرے تو پھر اپنی زمین اپنے پاس رہنے دے۔ اس میں تنبیہ ہے ایسے شخص کیلئے جس کے پاس مال ہو اور وہ اس سے فائدہ حاصل نہ کرے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ یہ حکم گویا ان دونوں صورتوں کو ترک کرنے اور مزارعت، اور مخاربه وغیرہ کو اختیار کرنے پر ازراہ تنبیہ دیا گیا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے سونے چاندی کے بدلے زمین کو اجارہ پر دینے کی اجازت دی ہے، اور حدیث میں یہ دو تاویلیں کی گئی ہیں۔ پہلی تاویل یہ ہے کہ ممانعت اس صورت میں ہے کہ وہ اجارہ پر دے اس شرط کے ساتھ کہ جو پیداوار ”ماذیانات“ پر ہوگی وہ مالک کی ہوگی زمین کے عوض میں۔ ”ماذیانات“ یہ ذال معجمہ پر کسرہ اور اس کے بعد یاء ہے۔ پانی بننے کی جگہوں (مثلاً نالی، کھال) کو کہتے ہیں۔

دوسری تاویل: بعض کہتے ہیں کہ اس شرط پر کہ جو پانی کی نالیوں اور چھوٹی ندی کے کناروں پر پیدا ہو، وہ مالک کا ہوگا۔ یہ لفظ معرب ہے۔

زراعت میں مشغولیت کی وجہ سے جہاد ترک کرنے پر وعید

۲۹۷۸: وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ وَرَأَى سَكَّةً وَشَيْئًا مِنْ آلَةِ الْحَرْبِ فَقَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ لَا يَدْخُلُ هَذَا بَيْتَ قَوْمٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللَّهُ الدَّلَّ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۵ الحدیث رقم ۲۳۲۱۔

ترجمہ: ”حضرت ابو امامہ سے روایت ہے کہ انہوں نے (ایک جگہ) تل اور کھیتی باڑی کا کچھ سامان دیکھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ سامان کسی قوم کے جس گھر میں داخل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس گھر میں ذلت داخل فرمادیتا ہے۔“ (بخاری)

تشریح: وراعی سکتہ: واؤ حالیہ ہے۔ ”سکتہ“ سین کے کسرہ اور کاف کی تشدید کے ساتھ ہے، اس لوہے کو کہتے ہیں جس

کے ذریعے زمین کو جو تاجائے۔ (اس کو ”تل“ کہا جاتا ہے۔ از مرتب)

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اور ایک نسخہ میں ”نبی“ ہے۔

يقول لا يدخل هذا: یعنی جو ذکر ہوئے کھیتی باڑی کے آلات میں سے۔

بيت قوم الا ادخله: ”اللہ“ جیسا کہ صحیح نسخہ میں ہے۔

الدل: ذال کے ضمہ کے ساتھ یعنی ذلت ٹیکس اور شرکی ادنیگی۔ مقصود جہاد کی ترغیب ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ کھیتی باڑی کے آلہ کو ذلت کا آلہ اس لئے قرار دیا ہے کہ کھیتی باڑی کرنے والے اس کو اختیار کرتے ہیں بزدلی

کی وجہ سے، یا کم ہمتی کی وجہ سے۔ پھر ان میں سے اکثر سرکاری حقوق کے پابند ہوتے ہیں، خراجی زمین میں اور اگر یہ جہاد کو ترجیح دیتے تو

ان کا رزق بڑھ جائے اور راہیں کشادہ ہو جائیں، اور مال ان کے پاس بطور ٹیکس کے آئے بجائے اس کے کہ ان سے ٹیکس وصول کیا

جائے۔ اور اسی معنی کے قریب یہ حدیث ہے: ”عزت گھوڑوں کی پیشانیوں میں ہے اور ذلت گائیوں کی دموں میں ہے۔“

ہمارے بعض شارحین فرماتے ہیں کہ زراعت کی وجہ سے ذلت آتی ہے لیکن بات ایسی نہیں ہے اس لئے کہ زراعت مستحب ہے اور

اس میں لوگوں کیلئے منافع ہیں اور حدیث میں ہے: ”اطلبوا الارض من جناباھا“۔ یہ آپ ﷺ نے اس لئے فرمایا تاکہ صحابہ زمینوں

آباد کاری میں لگ کر جہاد کو ترک نہ کر دیں اور کفران پر غالب آجائیں اور اس سے بڑھ کر کوئی ذلت ہوگی۔

بعض علما فرماتے ہیں اس وعید کا تعلق ان دو گوں سے ہے جو دشمنان دین کے قریب اقامت پذیر ہوں، اگر ایسے لوگ اپنی تمام تر توجہ

زراعت کی طرف مبذول کر کے جہاد کو فراموش کر دیں گے تو دشمن ان پر غالب آجائیں گے۔

الفصل الثانی:

کسی کی زمین میں بلا اجازت کاشت نہ کرو

۲۹۷۹: عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ زَرَعَ فِي أَرْضِ قَوْمٍ بغيرِ اِذْنِهِمْ فَلَيْسَ لَهُ مِنَ الزَّرْعِ

شِئْءٌ وَ لَهٗ نَفَقَتُهُ. (رواه الترمذی و ابوداؤد و قال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۶۹۲/۳ الحدیث رقم ۳۴۰۳ و الترمذی فی ۶۴۸/۳ الحدیث رقم ۱۳۶۶ وابن ماجہ فی ۸۲۴/۲ الحدیث رقم ۲۴۶۶ و احمد فی المسند ۴۶۵/۳۔

ترجمہ: ”حضرت رافع بن خدیج نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر (یعنی مالک کی رضا اور اس کے حکم کے بغیر) کاشت کرے تو اس کو زمین کی پیداوار میں سے کچھ نہیں ملے گا وہ شخص صرف اس چیز کا حقدار ہے جس کو اس نے (زمین کی کاشت میں) خرچ کیا۔ (ترمذی ابوداؤد) امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: فلیس له من الزرع شیء: یعنی زمین کی ساری پیداوار زمین کے مالک کو ملے گی اور کاشت کرنے والے کو صرف اس کا تخم ملے گا جو اس نے لگایا ہے، یہ امام احمد کا مسلک ہے۔ دوسرے علماء یہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں زمین کی پیداوار کاشت کرنے والے ہی کو ملے گی، البتہ اس کیلئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ زمین کا نقصان مالک کو اداء کرے، ابن الملک نے یہ کہا ہے کہ ایسے شخص پر زمین پر قبضہ کے دن سے زمین کے خالی ہونے کے دن تک اس زمین کا معاوضہ واجب ہوگا۔ (کذا ذکرہ مظہر) ولہ نفقته: یعنی اس کو محنت کی اجرت ملے گی اور بعض کہتے ہیں کہ اس نے جو خرچ کیا ہے پیداوار کے حاصل ہونے کے بعد وہ اس کو ملے گا۔

شرح السنہ میں ہے کہ بعض اہل علم نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام احمد سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ”بغیر اذنبہم“ کے الفاظ اسختی نے زیادہ کئے ہیں اس کے علاوہ کسی نے یہ ذکر نہیں کئے اور ابواحق وہی ہے جس نے یہ حدیث رافع بن خدیج سے روایت کی ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ جب کسی کی زمین کاشت کی جائے تو پیداوار زمین کے مالک کی ہوگی اور کاشت کرنے والے کیلئے اجرت ہوگی۔

الفصل الثانی:

مزارعت کا ثبوت

۲۹۸۰: عَنْ قَيْسِ بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ قَالَ مَا بِالْمَدِينَةِ أَهْلٌ بَيْتِ هَجْرَةَ إِلَّا يَزْرَعُونَ عَلَى الثَّلْثِ وَالرُّبْعِ وَزَارَعَ عَلِيُّ وَسَعْدُ بْنُ مَالِكٍ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَالْقَاسِمُ وَعُرْوَةُ وَالْأَبِيُّ بَكْرٌ وَالْأَبِيُّ عَلِيٌّ وَأَبْنُ سَبْرِينَ وَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْأَسْوَدِ كُنْتُ أَشَارِكُ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ يَزِيدَ فِي الزَّرْعِ وَعَامَلَ عُمَرُ النَّاسَ عَلَى أَنْ جَاءَ عُمَرُ بِالْبَدْرِ مِنْ عِنْدِهِ فَلَمَّا الشَّطْرُ وَأَنْ جَاءَ وَالْبَدْرُ فَلَهُمْ كَذَا۔

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۴/۵ معلقا عناب الحرث و المزارعة باب المزارعة بالشطر۔

ترجمہ: ”حضرت قیس بن مسلم (جدلی) حضرت ابو جعفر یعنی امام محمد باقر سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: مدینہ میں مہاجرین کو کوئی ایسا گھر نہ تھا جو تہائی اور چوتھائی (کی بنائی پر) کھیتی باڑی نہ کرتا ہو اور حضرت علیؑ حضرت سعد بن مالک (یعنی سعد بن ابی وقاص) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم حضرت عمر بن عبدالعزیز، قاسم عروہ، حضرت ابوبکرؓ کی اولاد، حضرت علیؑ کی اولاد اور ابن سیرین ان سب نے کھیتی باڑی کی۔ حضرت عبدالرحمن بن اسود تابعی کا بیان ہے کہ میں کھیتی باڑی میں حضرت عبدالرحمن بن یزید کے ساتھ شراکت کیا کرتا تھا۔ نیز حضرت عمرؓ نے لوگوں سے اس شرط پر (مزارعت کا) معاملہ کیا تھا کہ اگر عمرؓ اپنے پاس سے دیں گے تو (پیداوار کا) نصف حصہ ان کا ہوگا اور اگر وہ لوگ خود بیچ لائیں گے تو پیداوار میں اس کے مطابق ان کا اتنا حصہ ہوگا

(یعنی نصف یا تہائی یا چوتھائی جو بھی مقرر ہوتا ہو)۔“ (بخاری)

حالاتِ راوی:

قیس بن مسلم - نام قیس ہے۔ مسلم کے بیٹے ہیں۔ ”بنو جلدیلہ“ میں سے ہیں۔ کوفہ کے باشندہ ہیں۔ طبقہ تابعین سے تعلق رکھتے ہیں۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت حدیث کی اور ان سے ثوری اور شعبہ وغیرہ حدیث کی روایت کرتے ہیں۔

تشریح: ”الجدلی“ میں جیم اور دال مہملہ دونوں پر زبر ہے۔ ۱۲۰ء میں وفات پائی۔

الثالث: ثناء اول اور لام دونوں کے ضمہ کے ساتھ اور لام کے سکون کے ساتھ اور اسی طرح لفظ ”ربع“ بھی ہے۔

والربع: واؤ بمعنی او ہے۔ اگلا کلام تخصیص بعد از تعمیم ہے۔ سعد بن مالک: ان کے حالات مصنف نے ذکر نہیں کئے۔

عمر بن عبد العزیز: خیار تابعین میں سے ہیں۔ عروہ سے مراد عرف ابن زبیر بن العوام ہیں۔ یہ اکابر تابعین میں سے ہیں۔ مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے تھے۔ وال ابی بکر: یہ تعمیم بعد از تخصیص ہے۔

ابن سیرین: رفع کے ساتھ ہے۔ یہ فضلاء تابعین میں سے ہیں۔ عبد الرحمن بن الاسود: قرشی زہری حجازی مدینہ کے مشہور تابعین میں سے ہیں اور ان کے ثقات میں سے ہیں اور ”عزیز الحدیث“ ہیں۔

عبد الرحمن بن یزید: سلمی مدنی و علماء نے ضعیف قرار دیا ہے۔ مصنف نے ان کو تابعین میں ذکر کیا ہے۔

علی ان: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ البذر: باء کے فتح کے ساتھ۔

فلہم کذا ”کذا“ کنایہ ہے مقدار معروف سے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ یہ ”علی ان جاء“ یہ حال ہے ”عامل“ کے فاعل سے اور یہ جملہ شرطیہ ہے محلا مجرور ہے اور اعراب چکائی ہے: ای عاملہم بناء علی هذا الشرط۔ یعنی ان کے ساتھ معاملہ کیا اس شرط کی بناء پر۔

توضیح: میرک شاہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خود بخاری اور اس کی شروع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو جعفر کی عبارت لفظ ”والربع“ پر ختم ہو گئی ہے، اور باقی عبارت خود بخاری کا کلام ہے۔ یہ سب آثار ہیں جن کو بخاری نے چونکہ بغیر سند کے نقل کیا ہے اس لئے معلق ہیں۔ چنانچہ مؤلف کیلئے ضروری تھا کہ وہ روایت کے آخر میں ”رواہ البخاری تعلیقا“ فرماتے۔

بَابُ الْإِجَارَةِ

اجارہ کا بیان

”اجارہ“ ہمزہ کے کسرہ ضمہ دونوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں: ”اثابہ“ کہا جاتا ہے: آجرتہ، اذا اثبتہ مد کے ساتھ اور بغیر مد کے بھی، (اس کو ذکر کیا ہے عسقلانی نے۔)

مغرب میں ہے ”اجارہ“ کہتے ہیں کسی چیز کی منفعت کا کسی کو مالک بنانا عوض کے بدلے شرعاً۔ اور لغت میں ”اجرة“ کا اسم ہے۔

اجرة“ مزدور کی مزدوری کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں: فقد اجرہ اذا اعطا اجرہ، مزدوری دینا۔

الفصل الاول:

اجارہ کا جواز

۲۹۸۱: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَعْقِلٍ قَالَ زَعَمَ ثَابِتُ بْنُ الضَّحَّاكِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُرَارَعَةِ وَأَمَرَ

بِالْمَوْجَرَةِ وَقَالَ لَا بَأْسَ بِهَا . (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحہ ۱۱۸۴/۳ الحدیث رقم (۱۱۹-۱۰۴۹)۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن مقفلؓ کہتے ہیں کہ حضرت ثابت بن ضحاکؓ نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا ہے اور مواجرہ (ٹھیکے) کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“ (مسلم)

تشریح: المواجرۃ: ہمزہ کے ساتھ ہے اور ہمزہ کو واو سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”المزارعۃ“ اور المواجرۃ دونوں میں الف لام عہد کیلئے ہے۔ پس مزارعت سے مراد وہ ہے جو ناجز ہے اور ”مواجرۃ“ سے مراد جو اسکے برعکس ہے۔

وقال لا باس بها: ظاہر یہ ہے کہ ضمیر ثابت کی طرف راجع ہے۔ امام احمد نے پہلے حصہ کو روایت کیا ہے۔

۲۹۸۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَحْتَجَمَ فَأَعْطَى الْحَجَّامَ أَجْرَهُ وَاسْتَعَطَّ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۴۷/۱۰ الحدیث رقم ۵۶۹۱ و مسلم فی ۱۲۰۵/۳ الحدیث رقم (۶۵-۱۲۰۲) وابو داؤد

فی ۷۰۸/۳ الحدیث رقم ۳۴۲۳ وابن ماجہ فی ۷۳۱/۲ الحدیث رقم ۲۱۶۲ واحمد فی لمسنۃ ۲۵۸/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) بھری ہوئی سیگی کھینچوائی اور سیگی کھینچنے والے کو اجرت عطا فرمائی نیز آپ ﷺ نے اپنی ناک میں دوا ڈلوائی۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: الحجام: جیم کی تشدید کے ساتھ۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ سیگی کھینچنے کی اجرت مباح ہے۔

استعط: تاء کے فتح کے ساتھ۔ ناک میں دوا ڈالنا۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”السعوط“ فتح کے ساتھ اس دوا کو کہتے ہیں جو ناک میں ڈالی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: استعط الرجل واستعط هو بنفسه اور استعط۔ یعنی للمفعول استعمال نہیں ہوتا۔ اس سے اجارہ پر لینے کا جواز اور دواء کے استعمال کا جواز معلوم ہوا۔

سرکارِ دو عالم ﷺ نے اجرت پر بکریاں چرائی ہیں

۲۹۸۳: وَعَنِ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَا بَعَثَ اللَّهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ فَقَالَ أَصْحَابُهُ وَأَنْتَ فَقَالَ

نَعَمْ كُنْتُ أَرْعَى عَلَى قَرَارِيطٍ لِأَهْلِ مَكَّةَ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۴۱/۴ الحدیث رقم ۲۱۴۹ وابن ماجہ فی السنن ۷۲۷/۲ الحدیث رقم ۲۱۴۹

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں“ (یہ سن کر) آپ ﷺ کے صحابہؓ نے پوچھا کہ ”کیا آپ ﷺ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں! میں چند قیراط کے عوض اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔“ (بخاری)

تشریح: قوله: ما بعث الله نبيًّا الا رعى الغنم: شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ انبیاء کے بکریوں کو چرانے کی علت یہ ہے کہ جب وہ بکریوں کے ساتھ اختلاط کرتے ہیں تو ان کی محل اور شفقت بڑھ جاتی ہے، اس لئے کہ جب وہ بکریاں کی چرانے میں مشقت سہتے ہیں اور ان کی دندنوں اور اچکوں سے حفاظت کرتے ہیں اور ان کی طبیعتوں کے اختلاف کو سمجھتے ہیں چراگاہ اور گھاٹ میں ان کے متفرق ہونے کے بعد ان کو جمع کرتے ہیں ان کے ضعف اور کمزوری اور ان کی ایک چراگاہ سے دوسرے چراگاہ کی طرف منتقل کرنے کی ضرورت اور چراگاہ سے واپس لانے کا طریقہ جان لیا۔ تو اس نے لوگوں کے ساتھ باہمی ربط و تعلق کو جان لیا ان کی طبیعتوں اور قسموں کے مختلف ہونے کے باوجود اور ان میں سے بعض کے عقل و شعور کم ہونے کے پھنود، اور سنجیدگی کے کم ہونے کے باوجود۔ پس امتوں کی طرف سے ملنے والی تکالیف پر صبر کیا اور ان کی طبیعتیں امتوں سے متفرق نہیں ہوتیں اور ان کے دل اکتاتے نہیں ان کو دین کی طرف دعوہ دینے

سے ان کی مشقت اور تکالیف کو برداشت کرنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور اسی طریقہ سے ایک بادشاہ کو اپنے قوم اور رعایا سے پیش آنا چاہئے۔

قراریط: قیراط کی جمع ہے اور قیراط نصف دانق کا ہوتا ہے اور دانق درہم کا چھٹا حصہ ہوتا ہے۔ اہل مکہ نے مجھے اجرت پر رکھا بکریاں چرانے کیلئے ہردن ایک قیراط پر۔ قیراط کو جمع ذکر کیا اس لئے کہ آپ کی مراد مہینہ کی قسط تھی چرانے کی اجرت میں سے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ ”قیراط“ دینار کی مقدار تک نہیں پہنچتے تھے۔ یا آپ ﷺ اس کی مقدار کو ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے جلدی جلدی ملنے والے حصہ کو بیچ سمجھنے کی وجہ سے۔ یا یہ کہ آپ ﷺ اس کی قیمت بھول چکے تھے، بہر حال جو بھی ہو لیکن آپ ﷺ نے یہ بات تو واضح اور اللہ کے آپ ﷺ پر احسانات کی تصریح کرنے کے طور پر فرمایا۔ (اس کو ذکر کیا ہے تو رپشتی نے)

ابن الملک کی شرح المشارق میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ آزاد کو اجرت پر لینا جائز ہے۔ اور جو کہتے ہیں کہ ”قیراط“ مکہ میں ایک جگہ کا نام ہے اور ”علی“ بمعنی ”فی“ ہے اس لئے کہ آپ علیہ السلام بہت اونچی شان والے تھے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کا پر اجرت لینے۔ ان فاکلین کا یہ کلام تصحیف ہے۔ اس لئے کہ انبیاء اس کام پر اجرت لینے سے بچتے تھے جو اللہ کیلئے ہوئے نہ کہ اپنے نفس کیلئے کسی کام پر۔ اور مصنف نے یہ حدیث امام بغوی کی اتباع میں ”باب الاجارہ“ میں ذکر کی ہے۔ اس توجیہ کے مطابق یہ حدیث اس باب میں ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

مزدور کو اس کی مزدوری نہ دینے والے کیلئے وعید

۲۹۸۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ أَعْطَى بِي نَمِّ

عَدْرٍ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَكَلَّ ثَمَنَهُ وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ آجِرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۱۷/۱ الحدیث رقم ۲۲۲۷، وابن ماجہ فی ۸۱۶/۲ الحدیث رقم ۲۴۴۲ واحمد فی المسند ۳۰۸/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کا تین شخص ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا ایک تو وہ شخص ہے جس نے میرا نام لے کر (لوگوں سے) عہد کیا اور پھر اس کو توڑ ڈالا دوسرا شخص وہ ہے جس نے کسی آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھا گیا اور تیسرا شخص وہ ہے جس نے کسی مزدور کو اجرت پر لگایا اور اس سے پورا کام لیا (یعنی جس کام کے لئے لگایا تھا وہ پورا کام اس سے کرایا) لیکن اس کو اس کی اجرت نہ دی۔“ (بخاری)

تشریح: ثلاثہ: اس کی تیسرے محذوف ہے اسی رجال او اشخاص۔ خصم قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”الخصم“ خصمته و اخصمه، کا مصدر ہے اس کے ساتھ صفت لانا، مبالغہ کیلئے ہے جیسے ”عدل“ ہے۔ ابن ماجہ نے اس روایت میں یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں: ”ومن كنت خصمه خصمته، یعنی میں جھگڑے میں اس پر غالب آ جاؤں گا۔“

رجل اعطى بهی: یعنی میرے نام پر عہد کیا اور میرے نام کی قسم کھائی، یا میرے نام کے ساتھ کسی کو امان دی، یا اس طریقے پر جو میرے دین میں شروع ہے۔ ثم عدل: یعنی اس کو توڑا۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قرینہ ہے خصوصیت کے ساتھ عہد کی پاسداری کرنے کا۔ اور ”بہی“ حال ہے ”موقفاً بہی“ کیونکہ عہد ان امور میں سے جس کے ذریعے اللہ کے نام کی قسموں کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿الذین ینقضون عہد اللہ من بعد میثاقہ﴾ (جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اس کے بعد)۔
ورجل باع حراً فاکل ثمنه: ”اکل ثمن کی قید کو تو بیچ میں زیادتی کے لئے کیا ہے۔“

قولہ: ورجل استاجر جيرا فاستوفى منه: ”جو کام اس سے لینا چاہتا تھا وہ پورا لیا۔“ اس کو ذکر کیا اس کام کو براتنا کیلئے، اور زیادتی کیلئے۔

ولم يعطه اجرہ : اور ابن ماجہ کی روایت میں ”تم یوفہ“ ہے یعنی اس کی مزدوری پوری نہیں دی۔

جھاڑ پھونک کرنے والا اجرت لے سکتا ہے

۲۹۸۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ نَفْرًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ مَرُّوا بِمَاءٍ فِيهِمْ لِدَيْغٍ أَوْ سَلِيمٍ فَعَرَضَ لَهُمْ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْمَاءِ فَقَالَ هَلْ فِيكُمْ مِنْ رَاقٍ إِنْ فِي الْمَاءِ رَجُلًا لِدَيْغًا أَوْ سَلِيمًا فَانطَلَقَ رَجُلٌ مِنْهُمْ فَقَرَأَ بِقَاتِحَةَ الْكِتَابِ عَلَى شَاءٍ فَبَرَأَ جَاءَ بِالشَّاءِ إِلَى أَصْحَابِهِ فَكَبَّرُوا ذَلِكَ وَقَالُوا أَخَذْتَ عَلَيَّ كِتَابَ اللَّهِ أَجْرًا حَتَّى قَدِمُوا الْمَدِينَةَ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَخَذَ عَلَيَّ كِتَابَ اللَّهِ أَجْرًا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنْ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابَ اللَّهِ (رواه البخاری وفي رواية) أَصَبْتُمْ أَفْسُمُوا وَاضِرِبُوا لِي مَعَكُمْ سَهْمًا.

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۹۸/۱۰ الحدیث رقم ۵۷۳۷ وابن ماجہ فی السنن ۷۲۹/۲ الحدیث رقم ۲۱۵۶ واحمد فی المسند ۸۳/۳

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ کی ایک جماعت کا گزر پانی (کے ایک گھاٹ) کے پاس سے ہوا۔ وہاں ایک ایسا شخص تھا جس کو بچھونے یا سانپ نے ڈس لیا تھا۔ چنانچہ پانی کے پاس رہنے والے لوگوں میں سے ایک شخص ان صحابہؓ کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں میں کوئی شخص جھاڑ پھونک کرنے والا بھی ہے؟ کیونکہ ہماری بستی میں ایک شخص کو بچھو یا سانپ نے ڈس لیا ہے؟ (اگر ایسا کوئی شخص ہے تو وہ میرے ساتھ چل کر اس شخص پر دم کر دے) چنانچہ ان میں سے ایک صحابی تشریف لے گئے اور انہوں نے چند بکریوں کے عوض اس شخص پر سورہ فاتحہ پڑھی۔ (یعنی انہوں نے کہا کہ میں اس شخص پر اس شرط کے ساتھ جھاڑ پھونک کروں گا کہ میں اس کے عوض اتنی بکریاں لوں گا اسے بستی والوں نے منظور کر لیا لہذا صحابی نے سورہ فاتحہ پڑھ کر اس شخص پر دم کیا کیونکہ منقول ہے کہ فاتحہ الكتاب شفاء من السم یعنی سورہ فاتحہ زہر کے لئے شفاء ہے۔ لہذا وہ شخص اچھا ہو گیا) پھر جب وہ صحابی بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آئے تو ان ساتھیوں نے اس کو تاپسند کیا اور کہا کہ (بڑے تعجب کی بات ہے کہ) تم نے کتاب اللہ (پڑھنے) پر اجرت لی؟ یہاں تک کہ وہ سب صحابہؓ مدینہ پہنچے اور انہوں نے (رسول اللہ ﷺ سے) عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! فلاں صحابی نے کتاب اللہ (پڑھنے) پر اجرت لی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جس چیز پر اجرت لینے کے تم زیادہ حقدار ہو وہ کتاب اللہ ہے۔“ (بخاری) ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ”تم نے اچھا کیا“ ان (بکریوں) کو آپس میں تقسیم کر لو اور اپنے ساتھ میرا حصہ بھی لگاؤ۔“ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ”تم نے اچھا کیا“ ان بکریوں کو (آپس میں) تقسیم کر لو اور اپنے ساتھ میرا حصہ بھی لگاؤ۔“

تشریح: مروا بماء : قاضی کہتے ہیں کہ یہاں ”ماء“ سے مراد ”اہل الماء“ ہیں یعنی وہ قبیلہ جن کے پاس انہوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

فیہم : ضمیر (”ماء“ کے) مضاف محذوف کی طرف راجع ہے۔

لديغ او سليم : راوی کو شک ہے۔ ”لديغ“ بمعنی ”ملدوغ“ ہے۔ ”لديغ“ کا اطلاق اکثر اس شخص پر ہوتا جس کو بچھو کاٹ لے اور ”سليم“ کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جسے سانپ ڈس لے۔ ایسے ڈسے ہوئے شخص کو ”سليم“ تقاؤلا کہا جاتا ہے۔

راقی: اسم قائل ہے رقی برفی سے، ماضی میں قاف کے فتح اور مضارع میں کسرہ کے ساتھ ہے۔ ”راقی“ اس کو کہتے ہیں جو دم در دو کرے، منتر پڑھے۔

ان فی الماء رجلا لدیغا او سلیمان: جملہ متانفہ ہے علت بیان کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔

قوله: فامطالق رجل منهم: بعض کہتے ہیں کہ یہ ابوسعید خدریؓ تھے۔ ”شاء“: شاة کی جمع ہے۔

برأ: راء کے فتح کے ساتھ ہے راء کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ نہایہ میں ہے: برأ المريض بيرا فتح کے ساتھ فهو بارىء و ابراه اللہ اور غیر اہل جواز ”برى“ کسرہ کے ساتھ ”برأضمة“ کے ساتھ کہتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ تیس بکریاں لی تھیں، اور یہ تیس آدی تھے۔

قوله: وقالوا اخذت على كتاب الله اجرا: حتى قدموا: امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ ”قالوا: اخذت على كتاب الله“ کا متعلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ راستے میں اس پر مسلسل نکیر کر رہے تھے یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گئے۔

فقالوا يا رسول الله: غایہ میں مغیا میں داخل ہے جیسا کہ ”سمکتہ“ کے مسئلہ میں ہے۔

قوله: ان احق ما اخذتم عليه اجرا كتاب الله:

قاضی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پڑھنے کیلئے اور اس کے ذریعے دم کرنے کیلئے کسی کو اجرت پر لینا جائز ہے اور تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے، اور ایک جماعت اس کی حرمت کی قائل ہے۔ یہ زہری، امام ابوحنیفہ، اور احنق رحمہم اللہ کا قول ہے۔ انہوں نے عبادہ بن الصامت کی اگلی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی آیتوں اور ذکر اللہ کے ذریعے جھاڑ پھونک کرنا اور اس کی اجرت لینا جائز ہے، اس لئے کہ قراءت مباح کاموں میں سے ہے، اور اسی سے استدلال کیا ہے جنہوں نے قرآن کریم کو بیچنے، خریدنے اور اس کی کتابت پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اور یہی حسن، شعبہ اور عکرمہ کا مسلک ہے اور یہی امام مالک، شافعی، سفیان ثوری اور اصحاب ابی حنیفہ کا مسلک ہے۔

وفی رواية: بظاہر یہ بھی بخاری کی روایت ہے۔ اقساموا: ہمزہ وصل اور سین کے کسرہ کے ساتھ۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تقسیم کرنا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مروت، احسان اور برابری کے طور پر تھا۔ ورنہ تو تمام بکریاں دم کرے والے کی ملکیت تھیں۔

”اپنے ساتھ میرا بھی حصہ لگاؤ“ یہ فرمانا ان صحابہ کے دلوں کی صفائی اور ان کی تعریف میں مبالغہ کیلئے تھا، کہ یہ حلال ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہے۔

الفصل الثاني:

جس طرح غیر شرعی جھاڑ پھونک ناجائز ہے اسی طرح اس کی اجرت بھی حرام ہے

۲۹۸۶: عَنْ خَارِجَةَ بِنِ الصَّلْتِ عَزَّ عَمَّهَ قَالَ أَقْبَلْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَتَيْنَا عَلَى حَيٍّ مِنَ الْعَرَبِ فَقَالُوا إِنَّا أَنْبِئُكَ أَنْكُمْ قَدْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِ هَذَا الرَّجُلِ بِخَيْرٍ فَهَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ دَوَاءٍ أَوْ رُقِيَةٍ فَإِنَّ عِنْدَنَا مَعْتُوها فِي الْفَيْوَدِ فَلَقْنَا نَعَمْ قَالَ فَجَاءَ وَابِعْتُوها فِي الْفَيْوَدِ فَقَرَأَتْ عَلَيْهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ غُدُوَةً وَعَشِيَّةً أَجْمَعُ بَرَأَقِي ثُمَّ أَتْفَلُ قَالَ فَكَأَنَّمَا أَنْشَطَ مِنْ عِقَالٍ فَأَعْطُونِي جُعَلًا فَقُلْتُ لَا حَتَّى أَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ كُلُّ فَلَعْمَرِي لَمَنْ أَكَلَ بِرُقِيَّةٍ بَا طِلٍ لَقَدْ أَكَلْتُ بِرُقِيَّةٍ حَقِّي. (رواه احمد وابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۰۶/۳ الحدیث رقم ۳۴۲۰ واحمد فی المسند ۲۱۰/۵ (۲) فی المخطوطه (الناقص)

ترجمہ: ”حضرت خارجہ بن صلت اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ (انہوں نے کہا کہ) ہم لوگ رسول اللہ ﷺ سے رخصت ہو کر (اپنے وطن کی طرف) روانہ ہوئے تو راستے میں ہمارا گزر عرب کے ایک قبیلے پر ہوا جس (کے کچھ لوگوں) نے ہم سے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے تم اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے پاس سے بھلائی (یعنی قرآن کریم اور ذکر اللہ) لے کر آئے ہو تو کیا تمہارے پاس کوئی دوا یا جھاڑ پھونک بھی ہے؟ کیونکہ ہمارے ہاں ایک شخص پاگل دیوانہ ہو گیا ہے جو (رسیوں میں) جکڑا پڑا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں (ہمارے پاس ایسا عمل ہے جس سے ہم اس کا علاج کر سکتے ہیں) چنانچہ وہ اس پاگل کو (رسیوں میں) جکڑے ہوئے ہمارے پاس لائے اور میں نے اس پر تین دن تک صبح و شام سورہ فاتحہ اس طرح پڑھی کہ (پڑھتے وقت) اپنا لعاب جمع کر تا رہتا اور پھر (پڑھنے کے بعد) اس پر تھوک دیتا۔ راوی کہتے ہیں کہ (میرے چچا نے فرمایا کہ) اس کے بعد (وہ اتنی جلدی اچھا ہو گیا) گویا اسے بندھی ہوئی رسی سے کھول دیا گیا ہو پھر انہوں نے مجھے اس کی اجرت (کے طور پر کوئی چیز) دی تو میں نے کہا کہ یہ چیز اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک کہ میں اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے نہ پوچھ لوں چنانچہ (میں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو کچھ تمہیں ملا ہے اسے کھا لو کیونکہ میری عمر کی قسم! کوئی شخص باطل منتر کی اجرت کھاتا ہے (وہ برا کرتا ہے) تم نے تو حق اور سچے منتر کی اجرت کھائی ہے۔“ (احمد ابو داؤد)

تشریح: دواء اور رقیۃ: ”او“ تنویع کیلئے ہے یا شک کیلئے ہے۔

معنہ: یعنی پاگل۔ مغرب میں ہے ”ناقص العقل“ کو کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں اس مدہوش کو کہتے ہیں جو جنون کے علاوہ کسی اور سب سے مدہوش ہو۔

فلقنا: نعم فحاء وا: اور ایک نسخہ میں ہے ”قال“ (یعنی اس کے چچا نے)

اجمع: استیناف ہے بیان کیلئے، صیغہ متکلم کے ساتھ ہے۔ بزاق: بقاء کے ضمہ کے ساتھ۔ ”تھوک“ کو کہتے ہیں۔

اتفل: فاء کے ضمہ کے ساتھ۔ اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے، تھوکتا۔ جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور اقطاف میں ہے کہ ”نفل“ بزاق کے مشابہ ہے، کہا جاتا ہے: بزق ثم نفل ثم نفث ثم نفع، اور نہایہ میں ہے کہ ”نفل“ اس پھونکنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تھوک ہو، یہ نفث سے زیادہ ہوتا ہے۔

انشط: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ عقال: عین کے کسرہ کے ساتھ

مراد یہ ہے کہ اس کا وہ جنون اور پاگل پن فوراً ختم ہو گیا۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: نشط الحبل انشطه نشطا وانشطه، یعنی میں نے اس کو باندھا اور کھولا۔ اور یہ قول یعنی ”انشط من عقال“، اس کو عرب اس وقت بولتے ہیں جب بندھے ہوئے شخص کو خلاصی اور ناپسندیدہ چیز تھوڑے وقت میں زائل ہو جائے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کلام میں تشبیہ ہے جنون سے بواسطہ قراءت فاتحہ اور پھونکنے بہت جلد اچھا ہونے کو۔ باندھے ہوئے اونٹ کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو رسی سے نکل جائے تو آپ اس کو دیکھیں گے اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ اٹھتا ہے۔

جعل: جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ ”یہ فقال: کل“ کا عطف کلام محذوف پر ہے ای ذہبت الی رسول اللہ ﷺ فاخبرته باخبر رسالت فقال یعنی میں آپ علیہ السلام کے پاس گیا اور آپ کو اس معاملہ کی خبر دی، تو آپ نے فرمایا: کھا لو۔ لعمری: عین کے فتح کے ساتھ ہے، لام لام ابتداء ہے۔

”لمن اکل بوقیۃ باطل“ جو اب قسم ہے۔ یعنی بعض لوگ باطل منتر کی اجرت کھاتے ہیں، جس میں ستاروں اور جنات وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے اور ان سے مدد مانگی جاتی ہے۔

آپ ﷺ نے اپنی زندگی کی قسم کھائی اس لئے کہ اللہ نے بھی اس کی قسم کھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لعمرك انهم لفي

سکر تھم یعمھون [الحجر-۷۲] (آپ کی جان کی قسم! وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے)۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ ”عمری“ عین کے فتنے اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ یعنی میری زندگی، اور قسم میں صرف عین کے فتنے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اور ”لمن اکل“ میں لام جواب قسم ہے: ای من الناس من یرقی باطل ویأخذ علیہا عوضاً، أما أنت فقد رقیق برقیة حق۔ اھ یعنی لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو باطل طریقے پر جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور اس پر اجرت لیتے ہیں، البتہ آپ نے تو حق طریقہ سے جھاڑ پھونک کی ہے۔ (اتحلی)۔ یہ حاصل معنی ہے، پس یہ گمان نہ کیا جائے کہ حدیث میں تو صرف فاء ہے، بلکہ لام بھی ہے جیسا کہ عنقریب آنے والا ہے۔ اگر یہ اشکال کیا جائے کہ اللہ کے نام اور صفات کے علاوہ غیر اللہ کی قسم آپ ﷺ نے کیسے کھائی؟ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں ”عمری“ سے مراد قسم نہیں ہے بلکہ عرب کی رسم اور عادت کے مطابق آپ ﷺ کے کلام میں یہ لفظ استعمال ہوا۔

امام طبری یہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کو اس قسم کی اجازت ہو اور آپ کی خصوصیات میں سے ہو۔ قولہ: لقد اکلت برقیة حق: یعنی جس میں اللہ کا ذکر اور اس کا کلام تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے: [لعمرك انهم لفي سكرتهم يعمهون] [الحجر-۷۲] بعض حضرات کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے صرف آپ کی زندگی کی قسم کھائی ہے آپ کے علاوہ کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی ہے یہ آپ ﷺ کی کرامت ہے۔

لمن اکل میں ”من“ شرطیہ ہے لام قسم کیلئے تمہید ہے اور لام ثانی جواب قسم ہے جو قائم مقام ہے جزاء کا۔ ای عمری لمن کان ناس یا کلون برقیة باطل لانت اکلت برقیة حق۔ یعنی ”اپنی زندگی کی قسم کہ اگر لوگ باطل منتر کی اجرت کھاتے ہیں تو تو نے حق منتر کی اجرت کھائی ہے“۔

اس کو صیغہ ماضی کے ساتھ لایا ہے تاکہ یہ دلالت کرے ان کے استحقاق پر اور اس پر کہ یہ حق ثابت ہے، اور اس کی اجرت صحیح ہے۔

مزدور کو اس کی مزدوری دینے میں تاخیر نہ کرو

۲۹۸۷: وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ **اَلَا جَبْرٌ اَجْرُهُ قَبْلَ اَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ**

(رواہ ابن ماجہ)

اخرجه ابن ماجه فى فى السنن ۸۱۷/۲ الحديث رقم ۲۴۴۳ (۳) لم اجده عند ولا غيره والله تعالى اعلم۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مزدور کو اس کی اجرت اس کا پسینہ خشک

ہونے سے قبل ادا کر دو (یعنی جب مزدور اپنا کام پورا کر چکے تو اس کی مزدوری فوراً ادا کر دو اس میں تاخیر نہ کرو)۔“ (ابن ماجہ)

تشریح: ان یجف: یاء کے فتنے، جیم کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے: جف الثوب ضرب، کے وزن پر،

بمعنی بیس خشک ہونا، مراد جلدی دینے میں مبالغہ ہے اور پورا دینے میں ٹال مٹول کو ترک کرنا ہے۔ عرقہ: کے ساتھ

اسنادی حیثیت: اس کی سند حسن ہے۔

اس حدیث کو ابو یعلیٰ نے حضرت ابو ہریرہ سے، طبرانی نے اوسط میں حضرت جابر سے اور حکیم ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا

ہے۔ عرض مرتب: صاحب تخریج کا کہنا ہے کہ ان کو یہ روایت نہ ترمذی شریف میں ملی اور نہ کسی دوسری کتاب میں۔ اھو واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۹۸۸: وَعَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ **اَلَا جَاءَ عَلِيٌّ قَرَسًا**

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۳۰۶/۲ الحديث رقم ۱۶۶۵ ومالك فى الموطأ ۹۹۶/۲ الحديث رقم ۳ من كتاب الصدقة

ترجمہ: ”اور حضرت حسن بن علیؑ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سائل کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ”وہ (بہر صورت دیئے جانے کا) مستحق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔“ (احمد ابوداؤد) اور مصابیح میں کہا گیا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔“
تشریح: قولہ: وعن الحسين: اور ایک نسخہ میں ”الحسن“ دو فتحوں کے ساتھ ہے۔

قولہ: قال رسول الله ﷺ: للسائل حق وان جاء على فرس:

یعنی آپ اس کو واپس نہ کریں اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور آپ سے اپنے لئے کھانا اور سواری کیلئے چارہ مانگ رہا ہو۔ ابن اثیر نہایہ میں فرماتے ہیں کہ سائل سے مراد ”طالب“ ہے اور معنی یہ ہے کہ سائل پر حسن ظن کا حکم ہے کہ آپ اس کو ناکام واپس نہ کریں کہ آپ اس کی تکذیب کریں اور واپس لوٹادیں، حالانکہ ممکن ہے کہ وہ سچا ہوا (اور واقعی ضرورت مند ہو)۔ یعنی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کریں اگرچہ اس کی ظاہری حالت تجھے دھوکہ میں ڈال رہی ہو اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر تیرے پاس آئے، اس لئے کہ کبھی اس کے پاس گھوڑا بھی ہوتا ہے اور اس کے پیچھے اس کے اہل و عیال ہوتے ہیں یا قرض ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے اس کو صدقہ وغیرہ لینا جائز ہوتا ہے یا وہ مجاہدین میں سے ہوتا ہے یا قرض داروں میں سے ہوتا ہے اور اس کا صدقہ اور زکوٰۃ میں حصہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ضیاء نے بھی، اور ابوداؤد نے حضرت علیؑ سے طبرانی نے کبیر میں ہر ماں بن زیاد سے ہے اور ابن عدی نے کامل میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور الفاظ یہ ہیں: ”اعطوا السائل وان جاء على فرس“۔ اور سیوطی نے ابوداؤد پر اپنی تعلیقات میں ذکر کیا ہے: منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ”سائل کا حق ہے اگرچہ وہ ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے جس کی گردن میں چاندی کا طوق ہو۔“ (اتھلی)۔

قاضی نے کہا ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ نہ پھیرو، اگرچہ ایسی حالت میں تمہارے پاس مانگنے آئے جو اس کے مستغنی ہونے پر دلالت کرنے کیونکہ تمہیں یہ سوچنا چاہئے کہ اگر اسے سوال کرنے کی حاجت نہ ہوتی تو وہ تمہارے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کیوں کرتا۔

قولہ: وفي المصابيح مرسل: تو رپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مصابیح میں اس حدیث کو ارسال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ ارسال اصل میں ہے، یا ملحق ہے۔ میں نے اس کو ابن عمر سے مندرج پایا ہے۔ اور باقی حدیث کو ابوداؤد نے اپنی کتاب میں اس کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے: ”عن الحسين بن علي قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للسائل حق“۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ اس میں لازمی طور پر خبط ہے اس لئے کہ دونوں حدیثیں متصل اور مستقل ہیں اور مصابیح ان دونوں کو ایک مستقل مرسل حدیث قرار دیا ہے اور مستقل ہونے کی صورت میں دوسری حدیث اس باب کے تحت داخل نہیں ہو سکتی۔ اور ممکن ہے کہ بطور تنزل اور بطور ثبوت ارسال کے صاحب مصابیح کی طرف سے یہ کہا جائے کہ انہوں نے دوسرے طریق سے یہ حدیث مرسل روایت کی ہے اور اس طریق میں یہ دونوں حدیثیں ایک ہی حدیث کے طور پر ہوں۔

الفصل الثالث:

مزدوری کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر

۲۹۸۹: عَنْ عُثْبَةَ بْنِ الْمُنْذِرِ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَرَأَ طَيْسَمَ حَتَّى بَلَغَ قِصَّةَ مُوسَى قَالَ إِنَّ

مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ اجْرَ نَفْسَهُ ثَمَانِ سِنِينَ أَوْ عَشْرًا عَلَى عِفَّةٍ فَرَجِهَ وَطَعَامٍ بَطْنِهِ. (رواه احمد وابن ماجه)

احرجہ ابن ماجہ فی السنن ۸۱۷/۲ الحدیث رقم ۲۴۴۴۔

ترجمہ: ”حضرت عتبہ بن منذر کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ ﷺ نے طسم پڑھی یہاں تک کہ جب آپ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کے

لئے اور شکم سیری کے لئے اپنے آپ کو آٹھ سال یا دس سال کی اجرت پر دے رکھا تھا۔ (احمد ابن ماجہ)
تشریح: عبتہ: عین کے ضمہ اور تاء کے سکون کے ساتھ۔

المنذر: اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ ہے ”انذار“ سے۔ معجمہ کے ذال ساتھ، اور صحیح نسخہ میں نون کے ضمہ وال ہملہ کے فتح اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ میرک شاہ نے کہا ہے کہ اسی طرح بعض نسخوں میں واقع ہے اور یہی صحیح ہے۔ (آٹھلی) مؤلف اور صاحب مغنی نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔

قوله: ان موسیٰ اجر نفسه ثمان سنین او عشرا: بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے دونوں مدتوں میں سے لمبی مدت پوری کی تھی اور اس کے بعد پھر دس سال مزید ان کے پاس رہے پھر اس کے بعد واپس لوٹنے کا عزم کیا۔
 عفة: عین کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ نکاح سے کنایہ ہے۔ ادب کی وجہ سے ایسا کیا اور تشبیہ ہے اس بات پر کہ اپنے نفس کی عفت کیلئے مال کی تیاری کرنا مناسب ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ حنفی علماء فرماتے ہیں یہ جائز نہیں ہے کہ کسی عورت کا نکاح اس کے عوض کیا جائے کہ خاوند ایک ماں تک اس کی خدمت کرے گا۔ ہاں یہ جائز ہے کہ عورت کا نکاح اس کے عوض کیا جائے کہ شوہر کا غلام ایک سال تک اس کی خدمت کرے گا۔ اور حضرت موسیٰ کے معاملہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ممکن ہے ان کی شریعت میں یہ جائز ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کا مہر تو کچھ اور مقرر کیا ہو اور اتنا عرصہ بکریاں چرانے کی خدمت بطور احسان قبول کی ہو۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بعض کاموں کی مزدوری و خدمت کے عوض نکاح کرنا درست ہے۔ بشرطیکہ ”مستاجر بلہ“ دے گا یا ”مخدوم فیہ“ معلوم و متعین ہو۔

دین کی تعلیم پر اجرت لینے کا مسئلہ

۳۹۹۰: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ رَجُلٌ أَهْدَى إِلَيَّ قَوْمًا مَّمَّنْ كُنْتُ أَعَلِمَهُ الْكِتَابَ وَالْقُرْآنَ وَوَلَّيْتُ بِمَالٍ فَأَرَمِي عَلَيْهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ إِنْ كُنْتَ تُحِبُّ أَنْ تَطْوِقَ طَوْقًا مِنْ نَارٍ فَاقْبَلْهَا.

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۰۱/۳ الحدیث رقم ۳۴۱۶ وابن ماجہ فی ۷۳۰/۲ الحدیث رقم ۲۱۰۷ واحمد فی المسند ۳۱۰/۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! ایک شخص نے مجھے بطور تحفہ ایک کمان بھیجی ہے اور وہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جنہیں میں کتاب و قرآن کی تعلیم دیا کرتا تھا اور (میں سمجھتا ہوں کہ اس کمان کو قبول کر لینے میں اس لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ) کمان کوئی مال کی قبیل میں سے نہیں ہے۔ اس کمان کے ذریعے میں راہ خدا (یعنی جہاد) میں تیر اندازی کروں گا“۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”اگر تمہیں یہ پسند ہو کہ (قیامت کے دن) تمہارے گلے میں آگ کا طوق پہنایا جائے تو اسے قبول کر لو“۔ (ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: ابن حاجب نے اپنے قصیدہ میں ”قوس“ کو ان اسماء میں شمار کیا ہے جو واجب التامیث ہیں۔

كنت اعلمه الكتاب: یعنی قرآن لکھاتا تھا اور کتابت کا بھی احتمال ہے کہ میں اسے کتابت سکھاتا تھا۔ اور اس کا ”قوس“ سے حال بننا درست نہیں ہے اس لئے کہ وہ مکہ ہے، پس یہ حال ہوگا ”اہدی“ کے فاعل سے یا ضمیر متکلم سے۔
 حضرت عبادہ کی مراد یہ تھی کہ کمان عرف میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے اجرت شمار کیا جائے، یا مراد یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا مال نہیں ہے جو میں بیچنے کے لئے لے رہا ہوں بلکہ لڑائی کا ایک سامان ہے۔

ان تطوق: واؤ مشدودہ کے فتح کے ساتھ۔ ”طوق پہنانا“۔

یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی واضح دلیل ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عبادہ بتعلیم قرآن پر اجرت لینے کو درست نہیں سمجھتے تھے اس لئے آپ ﷺ سے پوچھا کہ یہ جو اس نے کیا ہے یہ تعلیم قرآن پر اجرت ہے یا نہیں ہے؟ تاکہ وہ اس سے بچیں اور اگر اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے تو میں اسے لے لوں۔ تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ یہ اگرچہ تمہیں کلام اللہ کی تعلیم کی اجرت کے طور پر نہیں ملی ہے اور نہ ہی یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے اجرت شمار کیا جائے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ تمہارے اس اخلاص کو ختم کر دے گی جس کی نیت تم نے تعلیم دینے میں کی تھی، پس تم اسے قبول نہ کرو۔ (اتحیٰ کلامہ)۔ یہ کلام ظاہر حدیث اور اس کے مقصد سے مناسب نہیں رکھتا۔

ابو نعیم نے حلیہ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں یوں روایت کیا ہے:

”من أخذ علی تعلیم القرآن قوسا قلده اللہ مکانها قوسا من نار جہنم یوم القيامة“

بَابُ اِحْيَاءِ الْمَوَاتِ وَالشَّرْبِ

غیر آباد زمین کو آباد کرنے اور پانی پلانے کے حق کا بیان

”موات“ میم کے فتح کے ساتھ ہے۔ ”شرب“ حرف اول کے کسرہ کے ساتھ۔ مغرب میں ہے ”موات“ خراب اور بنجر زمین کو کہتے ہیں اور اس کے برعکس (زمین کے خطلہ) کو ”عامر“ کہتے ہیں۔ طحاوی سے منقول ہے کہ ”موات“ اس زمین کو کہتے ہیں جو نہ کسی کی ملکیت میں ہو اور نہ اس کے ساتھ شہر کے منافع متعلق ہوں اور شہر سے باہر ہو چاہے شہر قریب ہو یا دور ہو۔ اور ”شرب“ کسرہ کے ساتھ اس کا معنی ہے پانی کا حصہ، اور اصطلاح شریعت میں ”شرب“ پانی سے فائدہ اٹھانے کے اس حق کو کہتے ہیں جو اپنے کھیتی کو سیراب کرنے اور جانوروں کو پلانے کیلئے حاصل ہو۔

الفصل الاول:

افتادہ و بنجر زمین کو آباد کرنے والا اس زمین کا مالک ہوتا ہے

۲۹۹۱: عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ عَمَرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لَاحِدٍ فَهَوَّ اَحَقُّ قَالَ عُرْوَةُ قَطِي بِهٖ عُمَرُ

فِي خِلَافَتِهِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۸/۵ الحدیث رقم ۲۳۳۵ واحمد فی المسند ۱۲۰/۶

ترجمہ: ”حضرت عائشہؓ ہی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی ایسی (افتادہ و بنجر) زمین کو آباد کرے جس کا کوئی مالک نہ ہو تو وہ (آباد کرنے والا شخص) ہی اس زمین کا سب سے زیادہ حق دار ہے؟“ حضرت عروہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے دور میں اسی کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا تھا۔“ (بخاری)

تشریح: قولہ: مَنْ عَمَرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لَاحِدٍ فَهَوَّ اَحَقُّ قَالَ عُرْوَةُ قَطِي بِهٖ عُمَرُ فِي خِلَافَتِهِ:

عمر ارضا: میم کی تخفیف کے ساتھ اور ایک نسخہ میں تشدید کے ساتھ ہے۔ اور مصاحح کے بعض نسخوں میں الف کی زیادت کے

ساتھ ہے، لیکن وہ درست نہیں ہے اس لئے کہ ”اعمرت الارض“ کا معنی ہے ”وحدتھا عامرة“ میں نے اس کو آباد پایا۔ اور یہ

”عمر“ کے معنی میں نہیں ہے۔ اور بخاری کی کتاب میں ”عمر“ سے ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا جواب یہ ہے کہ حرب: اعد۔

بلك منزلک بمعنی ”عمر“ استعمال کرتے ہیں۔ تو اس لئے جواز ہے ”اعمرت الارض“ کو ”عمرتھا“ کے معنی میں استعمال کرنے کا۔ اس لیے کہ استعمال میں اصل حقیقت ہے اور حقائق میں اصل ان کا چھوڑنا ہے۔ اشرف کہتے ہیں کہ بات ایسی نہیں ہے اس لئے کہ جوہری نے ”اعمر اللہ منزلک“ اور ”عمر اللہ بلك“ کو ذکر کرنے کے بعد ابو زید سے یہ ذکر کیا ہے کہ نہیں کہا جاتا: ”اعمر الرجل منزله“ الف کے ساتھ، اور عسقلانی کی شرح بخاری میں ہے کہ قاضی عیاض نے کہا ہے ”من اعمر“ ہمزہ اور میم دونوں کے فتح کے ساتھ ہے رباعی سے ہے جیسا کہ واقع ہے لیکن صحیح عمر ثلاثی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَعَمَّرُوْهَا اَكْثَرَ مِمَّا عَمَّرُوْهَا﴾ ہاں اگر مراد یہ ہو کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس میں ”عمار“ بنایا ہو۔ ابن بطال کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس کی اصل اعتمر ارضا ہو، ای ”اتخذھا“۔ اصل سے تاء ساقط ہوئی ہو، دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس میں رباعی بھی سنا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: اعمر اللہ بلك منزلک، پس ”اعمر ارضا“ سے مراد اس کو آباد کرنا ہے۔

احق: ای بھا، جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے یعنی اس زمین کا حاکم وقت کی اجازت کی شرط کے ساتھ۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس حدیث کی بناء پر جس میں منقول ہے: ”لیس للمراء الا ما طابت به نفس امامہ“۔ پس مطلق کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ سکت کو ناطق پر حمل کیا جائے، جب وہ ایک ہی حادثہ میں ہوں۔ (ذکرہ ابن الملک) عسقلانی فرماتے ہیں کہ ”احق“ کے متعلق کو اس کے معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کیا ہے، اور اسماعیلی نے اضافہ نقل کیا ہے: فہو احق بھا، ابو ذریٰ روایت میں ”من اعمر“ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ واقع ہے، یعنی اس کا غیر اس کو آباد کرے اور غیر سے مراد حاکم اور امام ہے۔ اور حمیدی نے اپنی جامع میں لفظ ”عمر“ ثلاثی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور اسی طرح اسماعیلی کے نزدیک ہے دوسرے طریق سے جس میں امام بخاری کے شیخ یحییٰ بن بکیر ہیں۔

قاضی کہتے ہیں کہ منطوق حدیث دلالت کرتا ہے کہ تملک کے لئے آباد کاری کافی ہے اذن امام کا محتاج نہیں ہے اور مفہوم حدیث دلالت کرتا ہے کہ صرف تجیر اور نشانی سے مالک نہیں بنتا بلکہ اس کا آباد کرنا ضروری ہے اور آباد کرنا مقاصد کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہے۔

قوله: قال عمروة قضی به عمر فی خلافتہ: یعنی اس کے مطابق فیصلہ کیا تھا، اس پر کسی نے تکیہ نہیں کی تھی، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ حدیث منسوخ نہیں ہے۔

چراگاہ کو اپنے لئے مخصوص کرنے کی ممانعت

۲۹۹۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ الصَّعْبَ بْنَ جَعْفًا مَةً قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ لَا حِمَىٰ إِلَّا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴/۵ الحدیث رقم ۲۳۷۰ و احمد فی المسند ۴/۳۸۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت صعّب بن جعّامہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ چراگاہ تو صرف اللہ اور اس کے لئے ہے۔“ (بخاری)

تشریح: قوله: لَا حِمَىٰ إِلَّا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ: حِمَى: حاء کے کسرہ اور میم مفتوحہ کی تخفیف کے ساتھ، بمعنی محمی۔ اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی حفاظت کی جاتی ہو لوگوں اور جانوروں سے، تاکہ اس کا گھاس زیادہ ہو۔ یعنی کسی کیلئے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے اللہ اور رسول کی اجازت کے بغیر۔ نبی ﷺ جہادی گھوڑوں اور زکوٰۃ کے اونٹوں کیلئے چراگاہ مخصوص کرتے تھے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کے سرداریوں کرتے تھے کہ جس زمین میں گھاس اور پانی ہوتا اسے اپنے گھوڑوں، اونٹوں اور تمام جانوروں کیلئے مخصوص چراگاہ بنا لیتے تھے۔ تو آپ ﷺ نے اس کو باطل کر دیا اور اس سے منع کیا کہ اللہ اور رسول کی اجازت کے بغیر چراگاہ مخصوص نہ کی جائے۔

شرح السنہ میں ہے کہ آپ ﷺ کے لئے جائز تھا کہ وہ اپنے لئے چراگاہ مخصوص کرتے، لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ اور نفع کو آپ ﷺ نے مخصوص چراگاہ بنایا تھا، مسلمانوں کے مصالح اور ان گھوڑوں کیلئے جو اللہ کے راستے میں جہاد کیلئے تیار کیے جاتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس شہر میں جائز نہیں ہے جو کشادہ نہ ہو اور اس کی وجہ سے اہل مویشی کو تکلیف اور تنگی ہو۔ اور آنحضرت ﷺ کے بعد کسی حاکم کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص کرے۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے، کہ مسلمانوں کے مصالح کیلئے چراگاہ مخصوص کرنا جائز ہے یا ناجائز ہے۔ بعض تو اس حدیث کی وجہ سے اسے ناجائز کہتے ہیں اور بعض اس کو جائز قرار دیتے ہیں، جیسی آپ ﷺ نے مسلمانوں کے مصالح کیلئے مخصوص کی تھی۔ بشرطیکہ اس کا ضرر واضح نہ ہو۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اپنے لئے چراگاہ مخصوص کرنا تو جائز نہیں ہے لیکن مصالح المسلمین کیلئے جائز ہے۔ اور نہ یہ میں ہے کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی سردار اپنے قبیلہ کی کسی زمین میں اترتا تو کتے کو بھوکواتا۔ جہاں تک کتے کے بھونکنے کی آواز پہنچتی وہاں تک اس زمین کو مخصوص چراگاہ بنا لیتا، اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہوتا اور وہ قوم کے ساتھ تمام چراگاہوں میں شریک ہوتا۔ تو نبی ﷺ نے اس سے منع کیا۔

چراگاہ کی اضافت ”اللہ“ اور ”رسول“ کی طرف کی یعنی سوائے اس کے کہ چراگاہ مخصوص کی جائے ان گھوڑوں کیلئے جو جہاد کیلئے تیار کیے جاتے ہوں اور ان اونٹوں کیلئے جن پر اللہ کے راستے میں بوجھ لادا جائے اور زکوٰۃ کے اونٹوں وغیرہ کیلئے جیسے عمر بن الخطابؓ نے نفع کو زکوٰۃ کے اونٹوں کیلئے اور جہاد کیلئے تیار کیے جانے والے گھوڑوں کیلئے مخصوص چراگاہ بنایا تھا۔ اسی طرح احمد اور ابو داؤد نے بھی۔

کھیتوں میں پانی لے جانے کا ایک تنازعہ

۲۹۹۳: وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ خَاصَمَ الزُّبَيْرُ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ فِي شِرَاحٍ مِنَ الْحَرَّةِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنْ سَقَى يَا زُبَيْرُ نَمَّ أَرْسِلَ الْمَاءَ إِلَى جَارِكَ فَقَالَ الْأَنْصَارِيُّ أَنْ كَانَ ابْنُ عَمَّتِكَ فَتَلَوْنَ وَجْهَهُ ثُمَّ قَالَ إِنْ سَقَى يَا زُبَيْرُ نَمَّ أَحْبَسَ الْمَاءَ حَتَّى يَرْجِعَ إِلَى الْجِدَارِ ثُمَّ أَرْسِلَ الْمَاءَ إِلَى جَارِكَ فَاسْتَوْطَى النَّبِيُّ ﷺ لِلزُّبَيْرِ حَقَّهُ فِي صَرِيحِ الْحُكْمِ حِينَ أَحْفَظَهُ الْأَنْصَارِيُّ وَكَانَ أَشَارَ عَلَيْهِمَا بِأَمْرٍ لَهُمَا فِيهِ سَعَةٌ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۴/۵ الحدیث رقم ۲۳۵۹ و مسلم فی ۱۸۲۹/۱ الحدیث رقم (۱۲۹-۲۳۵۷) و ابو داؤد فی السنن ۵۱/۴ الحدیث رقم ۳۶۳۷ و الترمذی فی ۶۴۴/۳ الحدیث رقم ۱۳۶۳ و النسائی فی ۲۳۸/۸ الحدیث رقم

۵۴۰۷ و ابن ماجہ فی ۸۲۹/۲ الحدیث رقم ۲۴۸۰ و احمد فی المسند ۵/۴

ترجمہ: ”اور حضرت عروہ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت زبیر کا ایک انصاری شخص سے حرہ کے برساتی نالوں کے بارے میں تنازعہ ہو گیا (جب وہ معاملہ بارگاہ رسالت میں پہنچا تو) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”زبیر! پہلے تم اپنے کھیتوں کو سیراب کر پھر اپنے ہمسایہ (یعنی اس انصاری) کے کھیتوں میں پانی چھوڑ دو“۔ (یہ فیصلہ سن کر) اس انصاری نے کہا کہ (آپ ﷺ نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے) کیونکہ زبیر آپ ﷺ کی چھوٹے کے بیٹے ہیں (یہ سنتے ہی) آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ (غصہ کی وجہ سے) متغیر ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے زبیر! (اپنے کھیت کو) پانی سے سیراب کر اور پھر پانی کو روک رکھو (یعنی پانی کو اس انصاری کے کھیت میں نہ جانے دو) یہاں تک کہ (تمہارا پورا کھیت اچھی طرح سیراب ہو جائے) اور پانی کھیت کی منڈریر تک پہنچ

جائے اس کے بعد اس نالی کا رخ اپنے ہمسایہ (یعنی اس انصاری) کے کھیت کی طرف کر دو۔ گویا آپ ﷺ نے اس صریح حکم کے ذریعے حضرت زبیر گوان کا پورا حق دے دیا۔ جبکہ اس انصاری نے آپ ﷺ کو (آپ کے فیصلہ پر اعتراض کر کے) غضب آمیز کر دیا تھا حالانکہ آپ ﷺ نے ابتداء میں ان دونوں کے بارے میں جو فیصلہ صادر فرمایا تھا اس میں دونوں ہی کے لئے آسانی و وسعت تھی۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: شراج: امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ شین کے کسرہ اور آخر میں جیم کے ساتھ ہے، پانی کی نالیوں کو کہتے ہیں اور اس کا واحد شرجہ ہے۔

الحرة: یعنی کالی کنکریوں والی زمین۔ جب یہ دونوں ایک بیٹنے والے پانی سے اپنی کھیتوں کو سیراب کرتے تھے، پس ان کا تنازعہ ہوا پہلے پانی لے جانے کے بارے میں تو فیصلہ آپ ﷺ کے پاس لے کر آئے۔ اسق یا زبیر: ہمزہ قطعی کے فتح کے ساتھ اور ہمزہ وصلی کے کسرہ کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔ ثم ارسل الماء الی جارك: اس لئے کہ حضرت زبیر کی زمین بلندی پر تھی انصاری کی زمین سے۔ فقال الانصاری ان: ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے۔

قاضی نے کہا ہے کہ ”هو“، ”غیر مقدر ہے“ ”بان“ کے ساتھ یا ”لان“ کے ساتھ۔ اور حرف جر کو اس کے ساتھ حذف کیا جاتا ہے تخفیف کے ساتھ اکثر۔ اس لئے کہ اس میں اس کے صلہ کے ساتھ طوالت پائی جاتی ہے، یعنی یہ تقدیم اور ترجیح اس وجہ سے اور سبب سے ہے کہ وہ آپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں۔ اور اسی طرح یہ آیت ہے: ﴿ان كان ذا مال وبنین﴾ [القم: ۱۴] یعنی آپ ﷺ ان کی اطاعت و فرمانبرداری نہ کریں اور عیوب کے ساتھ اس وجہ سے کہ وہ مالدار اور بیٹوں والا ہے۔ اور یہ بات (کہنے) کی وجہ سے اس آدمی کو نفاق کی طرف منسوب کیا گیا۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ مفسرین کی بہت بڑی جماعت نے اس آدمی کو کبھی نفاق اور کبھی یہودیت کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کی ہے اور دونوں قول حق سے پھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ یہ انصاری تھے اور انصار من جملہ یہود میں سے نہیں تھے اور اگر اس آدمی کے دین میں عیب تھا تو اس کو انصاری کے وصف کے ساتھ متصف نہ کرتے اس لئے کہ یہ مدح کا وصف ہے۔ اور انصار میں سے اگرچہ کچھ لوگ ایسے تھے جن پر نفاق کا الزام تھا، لیکن قرن اول کے لوگوں اور ان کے بعد سلف نے احتراز کیا ہے کہ جس شخص کا ذکر نفاق کے ساتھ کیا گیا ہو اس کو انصاری کے ساتھ مشہور کرے اور اس پر انصاری کا اطلاق کریں۔

اور اپنے دین پر حریص کیلئے لائق یہ ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات شیطان کے پھسلانے کی وجہ سے صادر ہوئی کہ غصہ کے وقت شیطان نے اس پر قابو پایا۔ اور اس جیسی باتوں اور گستاخی میں جتلا ہونا بشری صفات کی وجہ سے کوئی نئی بات نہیں ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض نے کہا ہے داودی نے نقل کیا ہے کہ یہ آدمی مناقق تھا اور حدیث میں اس کو انصاری کہنا یہ اس کا منافی نہیں ہے اس لئے کہ وہ انصار کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا نہ کہ انصار مسلمین میں سے تھا۔ اور حدیث کے آخر میں جو ہے کہ زبیر نے فرمایا کہ میرا گمان ہے کہ یہ آیت ﴿فلا وربك لا يؤمنون﴾ [النساء: ۶۵] اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے ایک جماعت علماء کی اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں کہتی ہے کہ اگر یہ کلام کسی انسان سے صادر ہوا تو وہ کافر ہے اور اس کے کہنے والے پر مرتدوں کے احکام جاری ہوں گے یعنی قتل وغیرہ، تو پھر آپ ﷺ نے اس کو قتل کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو اس لئے چھوڑا کہ ابتداء اسلام میں آپ لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرتے تھے اور ان کو بدلہ احسان سے دیا کرتے تھے اور منافقین کی تکالیف پر صبر کرتے تھے، اور فرماتے تھے: لوگ یہ طعن نہ دیں کہ محمد تو اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

فقلون وجہہ: یعنی حرمت نبوت کی ہتک اور اس آدمی کے بیعت کلام کی وجہ سے آپ ﷺ کا چہرہ غصہ سے متغیر ہو گیا۔ اور فرمایا پانی

کو رو کے رکھو اور جانے نہ دو۔

الجدد: جیم کے فتح اور دال مہملہ کے سکون کے ساتھ اور ایک نسخہ میں جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جیم اور دال کے ضمہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے کہ یہ جمع ہے "جدار" کی، اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد منڈیر ہے۔ یہ زمین کیلئے ایسے ہیں جیسے گھر کیلئے دیوار یعنی زمین اور کھیت کے درمیان حائل۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مراد دیوار ہی ہے، اور بعض کہتے ہیں دیوار کی بنیاد مراد ہے۔ اور علماء نے اس کی مقدار کی بات یہ طے کیا ہے کہ پانی پوری زمین میں بلند ہو جائے یہاں تک کہ انسان کے پاؤں کے ٹخنے تک پہنچ جائے۔

ثم ارسل الماء الی جار۔ فاستوعی "وعاء" سے ماخوذ ہے۔ اس برتن کو کہتے ہیں جس میں بہت ساری اشیاء جمع ہوں، گویا کہ اس کے حق کو اس کے برتن میں جمع کیا

شرح السنۃ میں ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فرمانا: "اسق یا زبیر ثم ارسل الی جارک" اس میں حضرت زبیر کو یہ حکم تھا بھلائی اور مساحت کا، اور پڑوسی کے ساتھ اچھائی کا اپنے بعض حق کے چھوڑنے کے ساتھ نہ کہ یہ آپ ﷺ کی طرف سے فیصلہ تھا، پس جب انصاری کو دیکھا کہ اس نے یہ فیصلہ قبول نہیں کیا تو پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت زبیر کو اپنا پورا اوراق حاصل کرنے کا حکم دیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تعزیر کو معاف کرنا جائز ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے انصاری پر تعزیر قائم نہیں کی جب اس نے ایسی بات کی جس نے آپ ﷺ کو غصہ آمیز کر دیا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی آخری بات یہ اس کیلئے عقوبت مالی تھی اور اس وقت بعض عقوبتیں مال میں بھی واقع ہوتی تھیں، قول اول زیادہ صحیح ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انصاری کے خلاف فیصلہ غصے کی حالت میں کیا حالانکہ حاکم اور قاضی کو غصہ کی حالت میں فیصلہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ چونکہ آپ ﷺ کو معصوم تھے۔ سخط و رضاً ہر حال میں صرف حق بنی کہا کرتے تھے۔ اور حدیث میں ہے کہ ندیوں اور نالیوں کا پانی جس کے چشمے کا کوئی مالک نہ ہو یہ مباح ہیں اور لوگ سب اس میں برابر ہیں اور جو اس ماء مباح کی طرف سبقت کرے گا وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہوگا۔ اور بلندی پر واقع زمین والا پانی کے حق میں مقدم ہے نیچے والوں سے بوجہ ان سے پہلے ہونے کے اور اس کو نیچے والوں سے روکنے کا حق نہیں ہے اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد۔

جو پانی تمہاری ضرورت سے زائد ہو اسے جانوروں کے پلانے سے نہ روکو

۲۹۹۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَمْنَعُوا فَضْلَ الْمَاءِ لِتَمْنَعُوا بِهِ فَضْلَ الْكَلَاءِ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۱/۵ الحدیث رقم ۲۳۵۴ ومسلم فی ۱۱۹۸/۳ الحدیث رقم (۳۷-۱۰۶۶) وابوداؤد فی

السنن الحدیث رقم ۷۴۷/۳ الحدیث رقم ۳۴۷۳ فی والترمدی فی ۵۷۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۲ وابن ماجہ فی ۸۲۸/۲

الحدیث رقم ۲۴۷۸ واحمد فی المسند ۲/۲۴۴۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو گھاس ضرورت سے زائد ہو اس کو روکنے کے لئے اس پانی کو مت روکو جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث کی تشریح "باب النهی عنہ من البیوع" کے فصل اول میں گزر چکی ہے۔

۲۹۹۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَا يَكْلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ رَجُلٌ حَلَفَ

عَلَى سَلْعَةٍ لَقَدْ أُعْطِيَ بِهَا أَكْثَرَ مِمَّا أُعْطِيَ وَهُوَ كَاذِبٌ وَرَجُلٌ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ كَاذِبَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ

لِيَقْتَطِعَ بِهَا مَا لَ رَجُلٍ مُسْلِمٍ وَرَجُلٌ مَنَعَ فَضْلَ مَا يَفِيْقُولُ اللَّهُ الْيَوْمَ أَمْنَعَكَ فَضْلِي كَمَا مَنَعْتَ فَضْلَ

مَاءٍ لَمْ تَعْمَلْ يَدَاكَ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۳/۵ الحدیث رقم ۲۳۶۹ ومسلم فی ۱۰۳/۱ الحدیث رقم (۱۷۳-۱۰۳) وابوداؤد فی

السنن ۷۴۹/۳ الحدیث رقم ۳۴۷۴ والنسائی فی ۲۴۶/۷ الحدیث رقم ۴۴۶۲ وابن ماجہ فی ۷۴۴/۲ الحدیث رقم ۲۲۰۷ واحمد فی المسند ۲/۲۵۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (رحم و کرم کی) کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ہی ان کی طرف (بنظر عنایت) دیکھے گا، ایک تو وہ (تاجر) شخص ہے جو قسم کھا کر (خریدار سے) کہتا ہے کہ اس چیز کی جو قیمت تم نے مجھے دی ہے اس سے زائد قیمت اسے مل رہی تھی (یعنی جب وہ کسی کو اپنی کوئی چیز فروخت کرتا ہے اور خریدار اس کی قیمت دیتا ہے تو وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ مجھے اس چیز کی اس سے زیادہ قیمت مل رہی تھی) حالانکہ وہ شخص (اپنی قسم میں) جھوٹا ہوتا ہے (کیونکہ درحقیقت اس سے زیادہ قیمت اسے نہیں مل رہی تھی) دوسرا شخص وہ ہے جو عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائے تاکہ اس کے ذریعے وہ کسی مسلمان شخص کا مال کھا جائے اور تیسرا شخص وہ ہے جو زائد پانی (پینے پلانے) سے لوگوں کو روکتا ہو ایسے شخص سے (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جس طرح تو نے (دنیا میں) اپنے زائد پانی سے لوگوں کو روک رکھا تھا باوجودیکہ وہ پانی تو نے اپنے ہاتھ سے نہیں نکالا تھا اسی طرح میں بھی آج تجھے اپنے فضل سے روک رکھوں گا۔“ (بخاری)

تشریح: لا یکلمہم اللہ یوم القیامۃ: یعنی رحم و کرم کی بات، نہ کہ ہمیشہ کا کلام مراد ہے۔
ولا ینظر الیہم: یعنی بنظر عنایت نہ، کہ بنظر قہر اور غضب کے۔

سلعة: کسرہ کے ساتھ ہے۔ لقد اعطی بہا اکثر مما اعطی: دونوں فعل صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ اور یہ اس کا حلف کا مفہوم ہے۔ اور اگر اس کے قول کو نقل کرتے، تو پھر اس طرح کہتے: لقد اعطیت بہا اکثر اعطیتہ۔ پہلا فعل مجہول اور دوسرا معروف ہوتا۔ یعنی یہ سامان مجھ سے اس سے پہلے زیادہ دام کے ساتھ مانگا جا رہا تھا جس دام سے آپ مانگ رہے ہیں۔
بعد العصر: عصر کے بعد کی تخصیص فرمائی، اس کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی گئی ہیں:

(۱) اس وجہ سے ہے کہ مغالظتیں اسی وقت کھائی جاتی ہیں۔

(۲) کہ چونکہ یہ وقت بغیر منافع کے گھر کی طرف لوٹنے کا تھا، پس اس نے منافع پر جھوٹی قسم کھائی۔

(۳) اس وجہ سے کہ عصر کے بعد کا وقت چونکہ زیادہ بانفضلیت اور بابرکت ہے اس لئے اس وقت جھوٹی قسم کھانا زیادہ شہنچ اور گناہ

کی بات ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ فیصلہ کیلئے عصر کے بیٹھتے تھے۔

بہا مال رجل مسلم: اور یہی حکم ذمی کے مال کا ہے۔

ورجل منع فضل ماء: اور ایک روایت میں ”فضل ما نہ“ ہے اور احمد، بخاری اور مسلم، اور کتب اربعہ کی روایت میں ہے

”ورجل علی فضل ماء بافلاۃ یمنعہ من ابن سبیل۔“

ماء: ہمزہ کے ساتھ ہے۔

لم تعمل یداک: ”ماء“ کی صفت ہے اور راجع محذوف ہے ای فیہ۔ مظہر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی میرے

قدرت سے نکلا تھا نہ کہ تیری محنت سے۔

الفصل الثانی:

اُفتادہ زمین کی دیوار کے ذریعے حد بندی کر دینے سے ملکیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

۲۹۹۶: عَنْ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى الْأَرْضِ فَهُوَ لَهُ۔

مخرجہ ابو داؤد فی السنن ۴۵۶/۳ الحدیث رقم ۳۰۷۷ واحمد فی المسند ۲۱/۵۔

ترجمہ: "حضرت حسن بصریؒ حضرت سمرہؓ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص (افتادہ وغیر) زمین پر چار دیواری کر دے تو وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: یعنی اسکی ملکیت ہو جاتی ہے جب تک یہ اس میں ہو، جیسے کوئی شخص مباح چیز کے لینے کیلئے سب سے پہلے چلا جائے۔ تو رپشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ لوگ جو صرف تجیر (حد بندی) کے ذریعے ملکیت کے ثبوت کے قائل ہیں اور اس حدیث سے ان کی حجت قائم نہیں ہوتی اس لئے کہ ملکیت کے ثبوت کیلئے آباد کرنا شرط ہے اور زمین کی (حد بندی) اور دیوار کھینچنا آباد کرنے کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ پھر یہ قول "علمی ارض" محتاج بیان ہے اس لئے کہ ہر زمین پر آباد کرنے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ بیان کیلئے "من احاط" کافی ہے اس لئے کہ یہ دلالت کرتا ہے کہ اس نے جو دیوار بنائی ہے اس نے زمین کے اندر کی تمام اشیاء کا احاطہ کیا ہوا ہوگا۔ جیسے وہ بکریوں کے باڑہ یا مویشیوں کے باڑہ کیلئے دیوار بنائے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ جانوروں کیلئے باڑہ یا پھل سکھانے کیلئے یا لکڑی اور گھاس رکھنے کیلئے باڑہ بنانے کا ارادہ کرے تو اس کے گرد دیواروں کا کرنا ضروری ہے، صرف لکڑی کھڑی کرنا اور پتھر رکھنا بغیر تعمیر کے یہ کافی نہیں ہے۔

آپ ﷺ کی طرف سے صحابہ کو افتادہ زمین کا جاگیری عطیہ

۲۹۹۷: وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَقْطَعَ لِلزُّبَيْرِ نَخِيلاً. (رواہ ابو داؤد)

مخرجہ ابو داؤد فی السنن ۴۵۱/۳ الحدیث رقم ۳۰۶۹۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کے لئے جاگیری میں کھجوروں کے درخت عطا فرمائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اقطاع، کہتے ہیں قطعہ زمین کو کسی غیر کیلئے متعین کرنا۔

شرح السنہ میں ہے کہ محل کے اعتبار سے جاگیر دو قسم کی ہے: (۱) جاگیر تملک۔ جس کا آدمی آباد کرنے کی وجہ سے مالک بن جاتا ہے۔ (۲) جاگیر ارفاق، جس کا آدمی کسی بھی حالت میں مالک نہیں بن سکتا۔ جیسے کہ حاکم بازار میں بیٹھنے کی جگہ کسی کو جاگیری میں دے تاکہ وہ وہاں بیٹھ کر معاملات وغیرہ کرے۔ حضرت زبیرؓ کی جاگیر پہلی قسم کی تھی۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ کھجور کے درخت ایسا مال ہیں جس کا نفع حاضر ہے، جیسے معارف ظاہرہ تو ہو سکتا ہے کہ حضرت زبیرؓ کو جو دیئے تھے وہ دراصل اس نرس میں سے ہوں جو ان کا حق تھا، یا اس غیر آباد زمین میں سے تھے جس کا کوئی مالک نہیں تھا تو حضرت زبیرؓ کو آباد کرنے کے ذریعے اس کے مالک بنے۔

۲۹۹۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَقْطَعَ لِلزُّبَيْرِ حَضْرًا قَرِيبَهُ فَاجْرَى حَتَّى قَرَسَهُ فَأَمَّ نَمَّ رَمَى بِسَوْطِهِ فَقَالَ أُعْطُوهُ مِنْ حَيْثُ بَلَغَ السَّوْطُ. (رواہ ابو داؤد)

مخرجہ ابو داؤد فی السنن ۴۵۳/۳ الحدیث رقم ۳۰۷۲ واحمد فی المسند ۱۵۶/۲۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو ان کے گھوڑے کی دوڑ کے بقدر مسافت کا رقبہ بطور جاگیر (یعنی ایک دوڑ میں گھوڑا جہاں تک پہنچ کر ٹھہر جائے وہاں تک کی زمین) عطا کر دی چنانچہ (اس مقصد کے لئے) حضرت زبیرؓ نے اپنا گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ ان کا گھوڑا کھڑا ہو گیا پھر حضرت زبیرؓ نے اپنا کوڑا پھینکا اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

(زیر کا) کوڑا جہاں جا کر گروا ہاں تک کی زمین اسے (بطور جاگیر) دیدی جائے۔ (ابوداؤد)

تشریح: حضر : جاء کے ضمہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ، یعنی گھوڑے کی دوڑ اور اس کا نصب حذف مضاف کی وجہ سے ہے۔ اسی قدر حضر فرسہ یعنی گھوڑے کی ایک دوڑ کی مقدار کے برابر۔

بسوطہ : ”با“ زائدہ ہے،

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ امام اور حاکم کا بیت المال کی مملوکہ زمین کسی کو جاگیر کے طور پر دینے کے جواز پر جس کا کوئی مالک نہیں ہو سکتا کبھی مصلحت کی وجہ سے اصل زمین ہی کو جاگیر میں دے دیتا ہے اور وہ انسان اس کا مالک بن جاتا ہے، اس کا مالک بننا جائز ہے، جیسا کہ مالک بن جاتا ہے ان دراہم و دنانیر وغیرہ کا جو حاکم اس کو دے اور کبھی اس جاگیر کی منفعت اس کو دے دیتا ہے تو مدت جاگیر تک وہ اس سے فائدہ اٹھانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اور ”موات“ کا ہر ایک مالک بن سکتا ہے آباد کرنے کے ذریعے اور اس میں حاکم کی اجازت کی ضرورت نہیں، یہ امام مالک اور شافعی اور جمہور کا مذہب ہے۔ (اتہلی)

اور بغوی اور شیخ مظہر کے کلام میں گزر چکا ہے کہ حضرت زیری کی جاگیر وہ غیر آباد زمین میں سے تھی۔ پس وہ دلیل ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اور مطلق احادیث اسی پر محمول ہیں۔

۲۹۹۹: وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَإِبْنِ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَقْطَعَهُ أَرْضًا بِحَضْرٍ مَوْتٍ قَالَ فَأَرْسَلَ مَعِيَ مُعَاوِيَةَ

قَالَ أَعْطَهَا أَبَاهُ. (رواه الترمذی والدارمی)

احرجہ ابو داؤد فی السنن ۴۴۳/۳ الحدیث رقم ۳۰۵۸ و الترمذی فی ۶۶۵/۳ الحدیث رقم ۱۳۸۱ والدارمی فی ۳۴۷/۲ الحدیث رقم ۲۶۰۹ واحمد فی المسند ۳۹۹/۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت علقمہ بن وائل اپنے والد (حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان (وائل بن حجر) کو حضرموت میں کچھ زمین بطور جاگیر عطا فرمائی چنانچہ حضرت وائل بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاویہ کو میرے ساتھ بھیجا (تا کہ وہ اس زمین کی پیمائش کر دیں) اور معاویہ سے فرمایا کہ وہ زمین (ناپ کر) وائل کو دے دو۔“ (ترمذی والدارمی)

تشریح: ”حضرموت“ یمن میں ایک شہر کا نام ہے یہ دو اسم ہیں جن سے ایک نام بنایا گیا ہے اور یہ غیر منصرف ہے، علیت اور

ترکیب کی وجہ سے۔ یہ جاء مہملہ راء اور میم کے فتح اور ضاد مجمہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور قاموس میں ہے میم کے ضمہ کے ساتھ ایک شہر اور ایک قبیلہ کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے حضرموت، اور اضافت کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے: هذا حضر موت، راء کے ضمہ کے ساتھ اور اگر آپ چاہیں تو دوسرے کو تو یمن نہ دیں۔ سیوطی فرماتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم جب ہلاک ہو گئی تو وہ مؤمنین کے ساتھ یہاں آ گئے جب وہ یہاں پہنچے تو وفات پانگے تو (اس موقع پر) کہا گیا: حضر موت۔ اور برورد نے ذکر کیا ہے کہ یہ عامر کا لقب ہے، جو جدا اہل یمن تھے، یہ جس لڑائی میں بھی حاضر ہوتے اس میں مقتولین بہت زیادہ ہوتے جو بھی ان کو دیکھتا تو کہا ”حضر موت“ ضاد کی حرکت کے ساتھ پھر کثرت استعمال کی وجہ سے ہا دسا کن ہو گیا۔

قوله: فَأَرْسَلَ مَعِيَ مُعَاوِيَةَ قَالَ أَعْطَهَا أَبَاهُ :

ظاہر یہ ہے کہ معاویہ سے مراد ابن الحکم سلمی ہیں یا ابن جاہمہ سلمی ہیں۔ معاویہ بن ابی سفیان اور ان کے والد فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے ہیں اور مؤلفۃ القلوب میں سے تھے جیسا کہ مؤلف نے ذکر کیا ہے۔ وہ یہاں مراد نہیں ہیں اگرچہ مطلقاً یہ نام میں معاویہ بن ابی سفیان ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔

۳۰۰۰: وَعَنْ أَبِيصَ بْنِ حَمَّالِ الْمَارَبِيِّ أَنَّهُ وَقَدَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَاسْتَقَطَعَهُ الْمِلْحَ الَّذِي بِمَارِبَ

فَأَقْطَعَهُ إِيَّاهُ فَلَمَّا وَرَى قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللهِ إِنَّمَا أَقْطَعْتُ لَهُ الْمَاءَ الْعِدَّةَ قَالَ فَرَجَعَهُ مِنْهُ قَالَ وَسَأَلَهُ مَاذَا يُحْمِي مِنَ الْأَرَاكِ مَا لَمْ تَنْلَهُ أَخْفَافُ الْإِبِلِ. (رواه الترمذی وابن ماجه والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۶۴/۳ الحدیث رقم ۱۳۸۰ وابن ماجه فی ۸۲۷/۲ الحدیث رقم ۲۴۷۵ والدارمی فی ۳۴۷/۲ الحدیث رقم ۲۶۰۸۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابیض بن حمال ماربئی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے مارب میں نمک کی کان جاگیر کے طور پر طلب کی، چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں نمک کی وہ کان بطور جاگیر عطا فرما دی، جب ابیض واپس مڑے تو ایک شخص (یعنی اقرع بن حابس تمیمی رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے ابیض کو تیار پانی (یعنی کان میں بالکل تیار نمک) دے دیا ہے؟“ راوی کہتے ہیں کہ (جب آپ ﷺ کو حضرت اقرع سے یہ معلوم ہوا کہ ابیض کو ایک ایسی نمک کی کان دے دی گئی ہے جس میں نمک بالکل تیار ہے تو) آپ ﷺ نے وہ کان ابیض سے واپس لے لی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی حضرت اقرع رضی اللہ عنہ) نے آپ ﷺ سے یہ بھی دریافت کیا کہ پیلو کے درختوں کی کون سی زمین گیری جائے؟ (یعنی کون سی افتادہ وغیر آباد زمین کو آباد کر کے اپنی ملکیت بنایا جائے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”وہ زمین جہاں اونٹوں کے پاؤں نہ پہنچ سکیں“۔ (ترمذی ابن ماجہ داری)

حالاتِ راوی:

ابیض۔ یہ ابیض حمال کے بیٹے ہیں۔ قوم سباء کے شہر مارب میں سے۔ حضرت ﷺ کی خدمت میں ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوئے اور صحبت سے مشرف ہوئے یمن میں رہتے تھے ان سے کم حدیثیں مروی ہیں۔ حمال میں حاء مفتوح اور میم مشدّد ہے۔ مارب کے میم پر فتح ہے اور ہمزہ ساکن اور راء مکسور ہے۔ آخر حرف باء ہے ایک شہر ہے یمن صفاء کے قریب۔ السبائی میں سین مہملہ مفتوح اور واء موحده فتح ہے اور ہمزہ (بعد الف)۔

تشریح: مارب : یمن میں ایک جگہ ہے۔ یہ غیر منصرف ہے،

العد: یمن کے کسرہ اور وال کی تشدید کے ساتھ، ہمیشہ رہنے والا جس کا مادہ منقطع نہ ہو۔ ”عد“ تیار کو کہتے ہیں۔

قال: ضمیر ”رجل“ کی طرف راجع ہے، ابن الملک فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ راوی حدیث ابیض کی طرف راجع ہے۔

منہ: ضمیر ”ابیض“ کی طرف راجع ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ قال کی

ضمیر مرفوع ”رجل“ کی طرف راجع ہے، ورنہ تو پھر مناسب یہ تھا کہ ”رجعه منی“ کہتے۔

حاصل یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ اس میں نمک تیار ہو چکا ہے جیسے تیار پانی ہو تو آپ ﷺ نے اس سے واپس لے لی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کی طرف سے کوئی کان کسی شخص کو بطور جاگیر عطا ہو سکتی ہے، بشرطیکہ وہ زیر زمین پوشیدہ ہو اور اس سے محنت

و مشقت کے بغیر کچھ حاصل نہ ہو سکتا ہو، جیسے نمک کی کان، تیل، فیروز گندھک کے کان وغیرہ۔ ہاں جو کانیں برآمد ہو چکی ہوں اور ان سے

نکلنے والا مال کسی محنت و مشقت کے بغیر حاصل ہو سکتا ہو تو انہیں کسی کی جاگیر بنا دینا جائز نہیں ہے، بلکہ تمام لوگ اس میں شریک ہوں گے

جیسے گھاس ٹندیوں کا پانی وغیرہ۔ اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاکم اگر کوئی فیصلہ صادر کرے، اور پھر ظاہر ہو کہ یہ فیصلہ حقیقت کے

منافی ہے، تو وہ اس فیصلے کو منسوخ کر دے اور اس سے رجوع کرے۔

یحملی: صیغہ مجہول کے ساتھ۔ اس میں موجود ضمیر مستتر ”ذی“ کی طرف عائد ہے۔ من الاراک: یہ بیان ہے کیلئے قطعہ زمین۔

جیسا کہ قاموس میں ہے اور شاید اس سے مراد وہ زمین ہو کہ جس میں پیلو کی درخت ہوں۔

مظہر فرماتے ہیں کہ یہاں ”حملی“ سے مراد آباد کرنا ہے، حملی متعارف اس کو مخصوص کرنا کسی کیلئے بھی جائز نہیں ہے۔

لم تنله : نون کے فتح کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ چراگا ہوں اور آبادی سے دور ہو۔ اس سے معلوم ہوا اس افتادہ زمین کا آباد کرنا جائز نہیں ہے جو آبادی کے قریب ہو کیونکہ وہ جانوروں کو چرانے اور اہل ہستی کی دیگر ضروریات کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ اس کی طرف آپ نے اس قول اشارہ کیا ہے ”ما لم تنله اخفاف الابل“ یعنی احياء اور آباد کرنا ایسے دور زمین میں ہو جہاں تک چرنے والے اونٹ نہ پہنچیں۔

فائق میں ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ ”اخفاف“ بوڑھے اونٹوں کو کہتے ہیں۔ اصمعی کہتے ہیں کہ ”خف“ بوڑھے اونٹ کو کہتے ہیں معنی یہ ہے کہ جو چراگاہ قریب ہو اس کا آباد نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو بوڑھے اونٹوں کیلئے چھوڑا جائے گا اور جوان کی طرح دوسرے کمزور جانور ہوں جو چرنے کیلئے مسافت طے کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس جگہ کو مخصوص چراگاہ نہیں بنایا جائے گا جہاں اونٹوں کے پاؤں پہنچتے ہوں اور اونٹوں کے پاؤں ہر جگہ تک پہنچتے ہیں۔

خدا کی تین عام نعمتیں

۳۰۰۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمُسْلِمُونَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ فِي الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ -

(رواہ ابو داؤد وابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۷۵۰ الحدیث رقم ۳۴۷۷ وابن ماجہ فی ۲/۸۲۶ الحدیث رقم ۲۴۷۲ واحمد فی المسند

۳۶۴/۵

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان تین چیزوں یعنی پانی، گھاس اور آگ میں شریک ہیں۔“ (ابو داؤد ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: الْمُسْلِمُونَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ فِي الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ :

ثلاث : قاضی فرماتے ہیں کہ اسماء ثلاث جمع کے معنی میں تھے اس اعتبار سے ”ثلاث“ کہا۔

فی الماء : بدل ہے اعادہ جار کے ساتھ۔

مراودہ پانی ہے جو کسی کے نکالنے اور محنت سے پیدا نہ ہوا ہو جیسے تالاب اور کنویں کا پانی۔ اور وہ پانی مراد نہیں جو کسی نے برتن ہاں وغیرہ میں بھرا ہو، یا نالی جو نہر سے نکالی ہو۔

الكلأ : جو ”موت“ میں اُگی ہو۔ والنار : علماء نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں:

(۱) آگ میں اشتراک سے مراد یہ ہے کہ کسی کو آگ لینے سے یا چراغ جلانے سے نہیں روکا جائے گا۔ لیکن آگ جلانے والے کیلئے جائز ہے کہ روکے اس شخص کو جو اس آگ سے وہ لکڑی لینا چاہے جو اس میں جل رہی ہو، کیونکہ اس سے آگ میں کمی آجائے گی اور ہوتے ہوتے بجھ جائے گی۔ (۲) بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے سنگ چھماق (وہ پتھر جس کے مارنے سے آگ نکلتی ہے) مراد ہے، کسی شخص کو اس کے لینے سے نہ روکا جائے گا جب وہ ”ارض موت“ میں ہو۔

کسی مباح چیز کو جو شخص پہلے حاصل کرے گا وہ اسی کی ہوگی

۳۰۰۲: وَعَنْ أَسْمَرَ بْنِ مُضَرِّسٍ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَبَايَعْتُهُ لَقَالَ مَنْ سَبَقَ إِلَى مَاءٍ لَمْ يَسْبِقْهُ إِلَيْهِ مُسْلِمٌ

فَهُوَ لَهُ. (رواہ ابو داؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳/۳۵۲ الحدیث رقم ۳۰۷۱

ترجمہ: ”اور حضرت اسمر بن مغزیس کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپ ﷺ سے بیعت کی (یعنی اسلام قبول کیا) چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص کسی ایسے پانی کی طرف جہاں پہلے کوئی مسلمان نہ پہنچا ہو سبقت لے جائے سبقت کرے (یعنی اس پانی کو حاصل کرے) تو وہ اسی کا ہے“۔ (ابوداؤد)

حالاتِ راوی:

اسمہ۔ یہ اسمہ مغزیس طائی صحابی کے بیٹے ہیں۔ ان کا شمار بصرہ کے اعرابیوں میں ہے۔ مغزیس میں میم مضموم اور ضاد معجمہ مفتوح اور راء مسکورہ مشدّد ہے۔

تشریح: قولہ: مَنْ سَبَقَ إِلَى مَاءٍ: اس طرح دیگر مباحات کا حکم ہے۔ جیسے گھاس، کٹڑی وغیرہ۔ اور ایک روایت میں ہے ”الی مایہ“ ماموصلہ ہے۔ یعنی جو اس نے لے لیا وہ اس کی ملکیت ہو جائے گا اور جو اس جگہ میں باقی ہے وہ اس کی ملکیت نہیں ہوگا۔ اس طرح ضیاء نے حضرت ابن جنذب سے روایت کیا ہے۔

جس قوم میں کمزور لوگوں کے حقوق محفوظ نہ ہوں وہ برائیوں سے پاک نہیں ہوتی

۳۰۰۳: وَعَنْ طَاوُسٍ مَرْسَلًا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ أَحْيَا مَوَاتًا مِنَ الْأَرْضِ فَهُوَ لَهُ عَادِي الْأَرْضِ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ هِيَ لَكُمْ مَنَى زَوَاهُ الشَّافِعِيُّ۔

اخرجه الشافعی فی الام ۴/۴ کتاب احکام الہیۃ باب عمارة مالیس معمورا۔

ترجمہ: حضرت طاؤس سے یہ حدیث مرسلہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی بجز زمین کو آباد کیا تو وہ اسی کی ہے۔ قدیم اقامہ و بجز زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ پھر زمین میری جانب سے تمہارے لئے ہے۔

تشریح: قولہ: مَنْ أَحْيَا مَوَاتًا مِنَ الْأَرْضِ فَهُوَ لَهُ: اس پر کلام مکرر چکا ہے۔

قولہ: عَادِي الْأَرْضِ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ هِيَ لَكُمْ مَنَى زَوَاهُ الشَّافِعِيُّ: عادی الارض: یاہ مضمومہ کی تشدید کے ساتھ، وہ عمارتیں اور زمین جو قدیم ہو جس کے مالک کا کوئی علم نہ ہو۔ اس میں زمین کی لفظی نسبت ”عاد“ یعنی قوم یہود علیہ السلام کی طرف محض ایسی زمین کی قدامت کے اظہار میں مبالغہ کیلئے ہے کیونکہ قوم عادی یہاں بہت زیادہ پرانی تھی۔ مراد اقامہ زمین ہے۔

للہ رسولہ: یعنی اس میں تصرف کرتا ہے اللہ کا رسول ﷺ جیسے چاہے اور جس طرح صحیح سمجھے۔ اور میں اجازت دیتا ہوں اور جائز قرار دیتا ہوں تمہارے لیے اس کا آباد کرنا، اور تعمیر کرنا۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر اس کی عظمت شان اور آپ کے ذکر کیلئے بطور تمہید کے ہے۔ اور آپ ﷺ کا حکم و فیصلہ اللہ کا حکم و فیصلہ ہے، اس لئے ”الی“، بتکلم سے ”الی رسولہ“ کی طرف عدول کیا، اور اس میں التفات ہے۔

۳۰۰۴: وَرَوَى فِي شَرْحِ السُّنَنِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ الْفَقَّاعَ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ الدُّوْرَ بِالْمَدِينَةِ وَهُوَ بَيْنَ ظَهْرَيْنِ عِمَارَةَ الْأَنْصَارِ مِنَ الْمَنَازِلِ وَالنَّخْلِ فَقَالَ بَنُو عَبْدِ بْنِ زُهْرَةَ نَجَبٌ عَنَّا ابْنُ أُمِّ عَبْدِ اللَّهِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَلِمٌ ابْتَعَيْنِي اللَّهُ إِذَا إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْدِسُ أُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيفِ فِيهِمْ حَقُّهُ۔

اخرجه الشافعی فی المسند ۲/۱۳۳ کتاب الجهاد باب ما جاء فی الحما والقطائع۔

ترجمہ: ”اور شرح السنہ میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو مدینہ میں چند مکانات بطور جاگیر دیئے۔“

وہ انصار کی آبادی یعنی ان کے مکان اور ان کے گھور کے درختوں کے درمیان واقع تھے چنانچہ عبد بن زہرہ کے بیٹوں نے کہا کہ آپ ام عبد کے بیٹے (یعنی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) کو ہم سے دور کر دیں (اس کے جواب میں) رسول اللہ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ”پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں بھیجا ہے (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اس قوم کو پاکیزگی عطا نہیں فرماتا جس میں ان کے کمزور لوگوں کو ان کا حق نہ دلا یا جائے۔“

تشریح: وروی: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ بعض کہتے ہیں بصیغہ معلوم ہے۔ اس صورت میں ضمیر امام بغوی یعنی صاحب مصابیح کی طرف لوٹے گی۔

قوله: اقطع لعبد الله بن مسعود الدور بالمدينة:

قاضی کہتے ہیں کہ ”دور“ سے مراد ”منازل“ ہیں اور وہ خالی زمین ہے جو رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن مسعود کو دی تھی تاکہ وہ اس میں مکان بنائیں اور ایک حدیث میں ہے: ”انه صلى الله عليه وسلم اقطع للمهاجرين الدور بالمدينة“۔ اس کی تاویل یہ کی ہے کہ عرب ”منازل“ کو بھی ”دار“ کہتے ہیں اگرچہ ابھی تک اس میں گھر بنا نہ ہو، اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو یہ گھر عاریہ دئے تھے اور اسی طرح تمام مہاجرین کو ان کے گھر عاریہ دئے تھے۔ لیکن یہ ضعیف ہے اس لئے کہ آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ مہاجرین کے گھروں کے وارث ان کی عورتیں ہوں گی اور عاریت میں وراثت نہیں چلتی۔

بین ظہر انی عمارة الانصار: اصل میں ظہری عمارة تھم ”تھا الف اور نون کو مبالغہ کیلئے زیادہ کیا ہے، من المنازل والنخل: یہ بیان ہے ”دور“ کیلئے۔ اس میں دلیل ہے کہ وہ افتادہ زمین جس کو تعمیرات نے گھیرا ہو، اس کو جاگیر کے طور پر دینا تاکہ اس کو آباد کیا جائے یہ جائز ہے۔

بنو عبد بن زهرة: زاء کے ضمہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ یہ قریش کا ایک قبیلہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی والدہ بھی اسی قبیلے سے تھیں۔ اور یہ مہاجرین میں سے تھے۔

نكب: كاف مسوره کی تشدید کے ساتھ بمعنی ”بعد“ و اصرف کے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اشد ہے: ﴿انهم عن الصراط لنا كبون﴾ یعنی سیدھے راہ سے پھرنے والے ہیں۔

”ابن ام عبد سے مراد عبد اللہ بن مسعود ہیں۔ یہ نام انہوں نے ان کی قربت کی حقارت اور ملال کے باعث کہا۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ان سے وہ قطعہ زمین واپس لے لیں۔

ابتعنى الله: از باب افعال ہے ”بعث“ سے بمعنی ”ارسلنى الله“

اذا: تنوین کے ساتھ ہے یعنی جب میں صاحب حق کو اس کا حق دلانے میں کمزور اور طاقتور کے درمیان برابری نہ کر سکوں تو اللہ نے مجھے کس لئے بھیجا ہے، اور ابن مسعود ایک کمزور انسان ہیں۔

قاضی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے مجھے کمزور اور قوی کے درمیان انصاف اور برابری قائم کرنے کیلئے بھیجا ہے، پس جب میری قوم کمزور کو اس کے حق سے ہٹائے اور منع کرے تو میرے بھیجنے کا کیا فائدہ ہوا۔

نہر وغیرہ سے کھیتوں کو سیراب کرنے کا ضابطہ

۳۰۰۵: وَعَنْ عَمْرٍو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَضَى فِي السَّبِيلِ الْمَهْزُورِ أَنْ يُمْسَكَ حَتَّى يَبْلُغَ كَعْبَيْنِ ثُمَّ يُرْسَلِ الْأَعْلَى عَلَى الْأَسْفَلِ. (رواه ابوداؤد وابن ماجه)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۵۳/۴ الحديث رقم ۳۶۳۹ وابن ماجه فى ۸۳۰/۲ الحديث رقم ۲۴۸۲ ومالك فى الموطا

۸۴۴/۲ الحدیث رقم ۲۸ من کتاب الافضیة

ترجمہ: ”اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور وہ اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سیل مہزور کے پانی کے بارے میں یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ (جب اس کا پانی کھیت وغیرہ میں) ٹنٹوں تک بھر جائے تو اسے بند کر دیا جائے اور پھر اوپر والے حصے سے نشیبی حصے کی جانب پانی چھوڑا جائے۔“ (ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: قوله: قَضَى فِي السبيل المہزور: دونوں (کلمے) لام تعریف کے ساتھ ہیں، اور زاء راء پر مقدم ہے۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہ مدینہ میں ایک مشہور وادی ہے۔ اور نہایہ میں ہے کہ ”مہزور“، زاء مجمرہ کا اراء غیر مجمرہ پر تقدیم کے ساتھ حجاز میں بنو قریظہ کے علاقہ میں ایک وادی ہے، اور راء کی زاء پر تقدیم کے ساتھ مدینہ میں ایک جگہ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر صدقہ کیا تھا اور اسی طرح فائق میں ہے البتہ اتنا اضافہ ہے کہ ”مہزور“ لام کے ساتھ ”جبل یشرب کے قریب وادی کا نام ہے۔“

تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس لفظ کو ہم نے اس کی اصل سے پھرا ہوا پایا ہے، پس بعض نسخوں میں ”السبيل المہزور“ ہے اکثر میں یہی ہے۔ اور بعض میں ”سبيل المہزور“ اضافت کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں خطا ہیں اور صحیح یہ ہے کہ دونوں بغیر الف لام کے ہیں علم کی طرف اضافت کے ساتھ۔

قاضی کہتے ہیں کہ ”مہزور“ علم منقول ہے صفت سے ہیں جو شتیق ہے ”ہزورہ“ سے بمعنی ”غمضہ“ (باریک اور دقیق کرنا) اس پر الف لام داخل کرنا اور نہ کرنا دونوں جائز ہیں۔ (اتہلی)

اور حاصل یہ ہے کہ اس میں الف لام اصل کی طرف اشارہ کرنے کیلئے ہے اور وہ صفت ہے۔ اور اس کے باوجود سبیل المہزور میں یہ ظاہر ہے، پس ”مہزور“ بدل ہے ”سبیل“ سے حذف اضافت کے ساتھ ای ”سبیل مہزور“۔

ان یمسک: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

حتى يبلغ الکعبین ثم یوسل: نصب کے ساتھ اور بعض کہتے ہیں کہ رفع کے ساتھ ہے۔

اپنی جائیداد کے ذریعے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ

۳۰۰۶: عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ أَنَّهُ كَانَتْ لَهُ عُضْدَةٌ مِنْ نَخْلٍ فِي حَائِطِ رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ وَمَعَ الرَّجُلِ أَهْلُهُ فَكَانَ سَمُرَةٌ يَدْخُلُ عَلَيْهِ فَيَأْتِي بِهِ فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ فَطَلَبَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ لِيَبْعَهُ فَأَبَى فَطَلَبَ أَنْ يَبْأَقِلَّهُ فَأَبَى قَالَ فَهَبْهُ لَهُ وَلَكَ كَذَا أَمْرًا رَغِبَ فِيهِ فَأَبَى فَقَالَ أَنْتَ مُضَارٌّ لِلْأَنْصَارِ يَأْتِيهِمْ فَاقْطَعْ نَخْلَهُ (رواه ابو داود و ذکر حدیث جابر من احیى ارضا فی باب الغصب بروایة سعید بن زید)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۰/۴ الحدیث رقم ۳۶۳۶ (۲) فی المخطوطة تناظره (۳) فی المخطوطة سمر (۴) فی المخطوطة القاضی (رحمہ اللہ)۔

ترجمہ: ”اور حضرت سمرہ بن جندب کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے کھجوروں کے چند درخت ایک انصاری (جن کا نام بعض علماء نے مالک بن قیس لکھا ہے) کے باغ میں تھے اور اس کے اہل و عیال بھی اس شخص کے ساتھ تھے۔ چنانچہ جب سمرہؓ اپنے درختوں کی وجہ سے (باغ میں داخل ہوتے تو ان سے تکلیف محسوس کرتا۔) وہ انصاری نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، نبی کریم ﷺ نے سمرہؓ کو اپنی مجلس میں طلب کیا تا کہ (ان سے یہ فرمائیں کہ) وہ اپنے کھجور کے ان درختوں کو (انصاری کے ہاتھ فروخت کر دیں) تا کہ ان درختوں کی وجہ سے انصاری کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس سے نجات پائے) لیکن سمرہؓ نے (اپنے درختوں کو فروخت کرنے سے) انکار کر دیا، پھر آپ ﷺ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سمرہؓ اپنے

ان درختوں کو انصاری کے (ان) درختوں سے بدل لیں (جو کسی دوسری جگہ واقع تھے) مگر سمرہؓ اس پر بھی انکار کر دیا، تب آپ ﷺ نے سمرہؓ سے یہ فرمایا کہ اچھا اپنے درخت انصاری کو بطور ہدیہ دے دو تمہیں اس کا اتنا اجر (بہشت کی نعمتوں کی صورت میں) مل جائے گا۔ گویا آپ ﷺ نے (بطور سفارش) اور رغبت دلانے کے لئے یہ حکم دیا (یا امر ارغیبہ کا ترجمہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سمرہ سے ترغیب کی ایک بات فرمائی یعنی اپنے درخت کو بطور ہدیہ دے دینے کا ثواب ذکر فرمایا) لیکن سمرہؓ نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ (آخر میں) آپ ﷺ نے (سمرہؓ سے) فرمایا کہ ”تم (واقعی اس انصاری کو) تکلیف پہنچانے والے ہو اس لئے آپ ﷺ نے انصاری سے فرمایا کہ ”تم جاؤ اور اس کے کھجوروں کے درختوں کو کاٹ پھینکو“۔ (ابوداؤد) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے ”جس نے بجز زمین کو یاد کیا“ سعید بن زید کی روایت سے باب الغضب میں ذکر کی گئی ہے اور ابو صرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ”جس نے کسی کو ایذا پہنچائی تو اللہ سے ایذا پہنچائے گا“ ہم اس روایت کو ”باب ما ینہی عن النہاجر“ میں ذکر کریں گے۔

تشریح: عضد: دو درختوں کے ساتھ حرف ثانی کے ضمہ کے ساتھ اور اس کو ساکن بھی کیا جاتا ہے۔

من نخل: بعض کہتے ہیں اس کا معنی ہے چند چھوٹے پے در پے کھجور کے درخت تھے اور ایک لمبا راستہ تھا کھجوروں میں، اور بعض کہتے ہیں ایک طرف کے راستے کو کہتے ہیں اور قاموس میں ہے کھجوروں کی قطار کو کہتے ہیں اور حرکت کے ساتھ پے در پے درختوں کو کہتے ہیں۔ (اتہنی)

تومن نخل میں تجرید ہے اور فائق میں ہے: قالوا للطریقہ من النخل عضد لانہا متناضرة فی جہۃ۔

رجل من النصار: بعض کہتے ہیں کہ یہ انصاری بنی نجار میں سے تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام مالک بن قیس تھا اور بعض کہتے ہیں لبا بن قیس تھا اور بعض کہتے ہیں ملاک بن أسعد تھا۔ یہ شاعر تھے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”اہل“ اور ”نادی“ کا ذکر دونوں دلالت کرتے ہیں کہ انصاری کو ان کے گزرنے سے تکلیف پہنچتی تھی۔

لیبیہ: امام طیبی فرماتے ہیں کہ طلب کو انہی کے ساتھ متعدی کرنا دلالت کر رہا ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے بیچنے کی سفارش کی تھی

اور اس طرح باقی میں بھی۔

فاہی قال فہبہ لہ: تور پستی فرماتے ہیں کہ الفاظ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت ایک تھا۔ اس لئے کہ پے در پے اس کی

طرف مذکر کی ضمیر لوٹائی ہے، لیبیہ اور یناقلہ، فہبہ وغیرہ میں۔ اور یہ بھی ہے کہ اگر کھجور کے درختوں کی قطار ہوتی تو اس کے کاٹنے کا

آپ حکم نہ دیتے۔ اس لئے کہ اس میں انصاری سے زیادہ ضرر سمرہ کو پہنچتا، لیکن پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ قطار تھی اور ضمیر مفرد اس لئے لائی

گئی ہے کہ لفظ مفرد ہے۔ (ولک کذا: کہ تیری جنت میں باغات، حوریں، مہلات اور خوشیاں ہوں گی۔)

امرا رغبہ فیہ حکم اور امر میں۔ اور اس کا نصب اختصاص کی وجہ سے ہے اور فہبہ کیلئے تفسیر ہے، یعنی گویا کہ آپ ﷺ نے بطور سفارش

اور رغبت دلانے کے لئے یہ حکم دیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو ”قال“ کے فاعل سے ای قال امر ارغیبہ یعنی ایک بات فرمائی جس

میں ترغیب تھی اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا نصب مصدریت کی بناء پر ہو اس لئے کہ ”امر“ قول کے معنی میں ہے۔ ای قال تو لامر ارغیبہ یعنی

ترغیب کی ایک بات فرمائی اور یہ تمام وجوہ اعراب اللہ کے اس قول میں بھی جاری ہوتے ہیں: ﴿لہبہا یفرق کل امر حکیم امرا من

عندنا﴾ [الدخان: ۴-۵] (جیسا کہ اس کی تحقیق کی ہے امام طیبی نے۔)

فقال انت مصار: شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ان چیزوں کو قبول نہیں کرتے تو آپ کا ارادہ سوائے

لوگوں کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے اور کچھ نہیں، اور جس کا ارادہ لوگوں کو تکلیف پہنچانے کا ہو، تو اس کے تکلیف اور نقصان کو رفع کرنا

ضروری ہے اور تیرے ضرر و نقصان کا دفع کرنا تیرے درختوں کا کاٹنا ہے۔

فقال للانصاری اذهب فقطع نخلہ: اور شاید انصاری کو سمرہ کے درختوں کو کاٹنے کا حکم اس لئے دیا کہ آپ ﷺ کو معلوم تھا

کہ اس کا مقصد صرف ضرر پہنچانا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ سمرہ نے یہ درخت عاریہ لگائے تھے۔

صرمة: صاد کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔

من ضار اضر الله به: جیسا کہ یہاں مشکوٰۃ کے اصل میں ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ ”ضار الله به ومن شاق شاق الله عليه“ اور ظاہر یہ ہے کہ اول سہو قلم ہے۔

الفصل الثالث:

پانی، نمک اور آگ دینے سے انکار نہ کرو

۳۰۰۷: عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا الشَّيْءُ الَّذِي لَا يَحِلُّ مَعَهُ قَالَ الْمَاءُ وَالْمِلْحُ وَالنَّارُ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَذَا الْمَاءُ قَدْ عَرَفْنَاهُ فَمَا بِالْمِلْحِ وَالنَّارِ قَالَ يَا حُمَيْرَاءُ مَنْ أَعْطَى نَارًا فَكَانَتْ تَصَدَّقُ بِجَمِيعِ مَا أَنْضَجَتْ تِلْكَ النَّارُ وَمَنْ أَعْطَى مِلْحًا فَكَانَتْ تَصَدَّقُ بِجَمِيعِ مَا طَبَّخَتْ تِلْكَ الْمِلْحُ وَمَنْ سَقَى مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَاءٍ حَيْثُ يُوْجَدُ الْمَاءُ فَكَانَتْ مَاءً أَعْتَقَ رَقَبَةً وَمَنْ سَقَى مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَاءٍ حَيْثُ لَا يُوْجَدُ الْمَاءُ فَكَانَتْ مَاءً أَحْيَا هَا (رواه ابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۸۲۶/۲ الحديث رقم ۲۴۷۴

ترجمہ: ”ام المؤمنین حضرت عائشہ کے بارے میں روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ کون سی چیز ہے جس کو دینے سے انکار کرنا حلال نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پانی، نمک اور آگ۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! پانی کی اہمیت کا تو ہمیں علم (کہ یہ خدا کی ایک ایسی عام نعمت ہے جو کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے اور چونکہ کیا انسان اور کیا حیوان ساری ہی مخلوق کی ضرورتیں اس سے وابستہ ہیں اس لئے اس سے منع کرنا بہت زیادہ تکلیف و ضرر کا باعث بن سکتا ہے) لیکن نمک اور آگ میں ایسی بات نہیں ہے (کہ یہ دونوں چیزیں پانی کے مثل نہیں ہیں اور بظاہر بالکل حقیر و کمتر چیزیں ہیں جن کا دیا جانا اور نہ دیا جانا کیا حیثیت رکھ سکتا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: حمیراء (یہ مت سمجھو کہ ان دونوں چیزوں کے دینے یا نہ دینے کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ) جس شخص نے کسی کو آگ دی تو گویا اس نے اس آگ پر پکھنے والی تمام چیزیں بطور صدقہ دیں۔ اسی طرح جس نے کسی کو نمک دیا تو گویا اس نے وہ تمام چیزیں جنہیں اس نمک نے ذائقہ دار بنایا بطور صدقہ دیں اور (پانی کی اہمیت تو تم جانتی ہو۔ لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ) جس شخص نے کسی کو اس جگہ کہ جہاں پانی دستیاب نہ ہو ایک بار پانی پلایا تو گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا اور جس شخص نے کسی کو اس جگہ کہ جہاں پانی دستیاب نہ ہو ایک بار پانی پلایا تو گویا اس نے اس کو (یعنی ایک مسلمان کو) زندہ کر دیا۔“ (ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: ما الشیء الذى لا یحل معہ: شیء سے مراد جنس شے ہے۔

قولہ: قلت یا رسول اللہ هذا الماء قد عرفناه فما بال الملح والنار:

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ”قد عرفناه“ جملہ حال ہے اور اس میں عامل ہذا میں موجود اشارہ کا معنی ہے اور ذوالحال میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسم اشارہ میں مقدر ہے اور وہ مجرور ہے اور بعض کہتے ہیں خبر ہے۔ حضرت عائشہ کی مراد یہ تھی کہ پانی کی حالت تو ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگوں اور جانوروں کی ضرورت ہے اور اس سے روکنے میں ان کو تکلیف پہنچتی ہے۔ نمک اور آگ کا معاملہ تو ایسا نہیں ہے۔ قولہ: قال یا حمیراء: حمیراء کی تفسیر ہے، مراد ”بیضاء“ ہے۔ ابن جریر امام جمال الدین یوسف المروزی سے نقل کرتے ہیں کہ ہر وہ

حدیث جس میں ”یا حمیراء“ ہو، وہ موضوع ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ لیکن یہ بات علی العموم درست نہیں ہے اس لئے کہ صرف حدیث کا ”یا حمیراء“ پر مشتمل ہونا موضوع ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ ہاں اگر اس کے ساتھ دوسرے اسباب ہوں جو وضع پر دلالت کرتے ہوں تو پھر وضع کا حکم لگایا جائے گا ورنہ تو نہیں۔ (انتہی)۔ شاید ان کی مراد ہر وہ حدیث ہو جس کے شروع میں ”یا حمیراء“ ہو۔ اور علماء نے ایسی احادیث کا تتبع کیا تو ان کو موضوع پایا، اور اس کی نظیر وہ ہے جو سمنانی نے کہا ہے کہ احادیث موضوعہ میں سے وہ حدیث بھی ہے جس میں حضرت عائشہ کا نام ”یا حمیراء“ ہو۔

آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کو جواب برسبیل اسلوب حکیم انتہائی وضاحت کے ساتھ دیا۔ یعنی آپ اس کو چھوڑیں اور یہ دیکھیں کہ اتنے بڑے ثواب سے محرومی ہو رہی ہے اس حقیر چیز کو روکنے سے جس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اسی وجہ سے ”ملح“ کی طرف ضمیر مؤنث کی لوٹائی ”طیبت“ اور ”تلك“ میں کہ اس سے مرا وقت و ندرت ہے۔

قوله: ومن سقى مسلما شربة من ماء حيث لا يوجد الماء فكأنما احياها :

ہاء ضمیر مسلم کی طرف راجع ہے، بتاویل نفس کے یا نسمة کے۔ یہ ارشاد گرامی اقتباس ہے اللہ کے اس ارشاد سے: ﴿وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾ [المائدة: ۳۲] (اور جو شخص کسی شخص کو بچالے، تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچالیا)۔ جواب میں پانی کا ذکر کیا حالانکہ سوال پانی کے بارے میں نہیں تھا۔ پانی کے بارے میں حضرت عائشہ کی بات رد کرنے کیلئے کہ تم اس کو اس تفصیل کے ساتھ نہیں جانتی۔ اسی لئے اس کو ذکر میں مؤخر کیا۔

بَابُ الْعَطَايَا

عطايا کا بیان

”عطايا“ عطیہ کی جمع ہے، عطا یا سے مراد امراء کے انعام ہیں۔

امام غزالی نے منہاج العابدین میں لکھا ہے کہ اگر آپ یہ سوال کریں کہ آپ اس زمانہ کے سلاطین کے انعامات کے قبول کرنے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو جان لیجئے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

(۱) بعض علماء تو یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ بخشش و انعام کسی ایسے مال کی صورت میں ہو جس کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو تو اسے قبول کر لینا درست ہے۔ (۲) بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ جب تک اس مال کے حلال ہونے کا یقین نہ ہو تو اسے قبول نہ کرنا ہی اولیٰ ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں سلاطین کے پاس غالب اموال حرام کے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں حلال مال معدوم و نادر ہے۔ (۳) بعض یہ فرماتے ہیں کہ غنی اور فقیر دونوں کیلئے امراء و سلاطین کے ہدایا اور تحفے حلال ہیں بشرطیکہ ان کا حرام ہونا تحقیقی طور پر ثابت نہ ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس کا تحفہ قبول فرمایا تھا اور ایک یہودی سے قرض لیا تھا، باوجود یہ کہ یہود کے بارے میں قرآن نے [الاکالون للمسحت] [المائدة: ۴۲] [حرام مال کھانے والے] فرمایا ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت ظالموں کے ایام پائے ہیں اور اس وقت انہوں نے تحفے قبول کیے ہیں۔ ان میں سے حضرت ابو ہریرہ، ابن عباس، ابن عمر اور ان کے علاوہ صحابہ ہیں۔ (۴) بعضوں نے یہ کہا ہے کہ ان کے اموال میں سے کچھ بھی حلال نہیں ہے غنی کے لئے اور نہ فقیر کیلئے۔ اس لئے کہ وہ لوگ ظلم کے ساتھ موسوم ہیں، اور ان کے اموال کا غالب اور زیادہ حصہ مردار اور حرام ہے اور حکم غالب اور اکثر پر لگتا ہے، پس اس سے اجتناب لازم ہے۔ (۵) بعضوں نے یہ کہا ہے کہ جس مال کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو وہ فقیر کے لئے حلال ہے، لیکن غنی کے لئے حلال نہیں ہے، الا یہ کہ فقیر جان لے کہ یہ بیعہ وہی غضب کا مال ہے تو پھر اس کے لئے لینا حلال نہیں ہے مگر اس نیت سے کہ اسے مال لے

لوٹائے گا اور فقیر کے لئے بادشاہ کا مال لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسلئے کہ اگر وہ مال بادشاہ کی ملکیت ہے اور اس نے فقیر کو دیدیا ہے تو اس کیلئے بغیر کسی شک کے لینا جائز ہے، اور اگر وہ فی مخرج یا عشر کا مال ہے تو پھر فقیر کا اس میں نکت ہے اور یہی حکم اہل علم کیلئے بھی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جو اسلام میں خوشی سے داخل ہوا اور ظاہر آقرآن بھی پڑھا، اس کے لئے بیت المال سے سالانہ دو سو سو ۲۰۰ درہم ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ دو سو دینار ہیں، اگر اس نے دنیا میں نہیں لیے تو آخرت میں لے لے گا۔ پس جب ایسا ہے تو پھر فقیر اور عالم اپنا ہی حق لے رہے ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں کہ جب مال میں غضب شدہ مال ملا ہوا ہو یا اس طور کہ اس کا امتیاز نہ ہو سکے یا صرف غضب شدہ مال ہے۔ جس کو مالک یا اس کے وارث کی طرف لوٹنا ناممکن نہیں ہے تو بادشاہ کیلئے کوئی مجلس نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ مال صدقہ کر دے اور اللہ پاک نے اس کو وہ مال فقیر پر صدقہ کرنے کا حکم نہیں دیا ہے اور نہ ہی فقیر کو اس کے قبول کرنے سے روکا ہے اور نہ قبول کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ اس پر حرام ہے۔ پس اس صورت میں فقیر کے لئے اس کا لینا جائز ہے مگر معینہ غضب اور حرام مال کا لینا جائز نہیں ہے۔

الفصل الاول:

۳۰۰۸: عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ عُمَرَ أَصَابَ أَرْضًا بِخَيْبَرَ فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَصَبْتُ أَرْضًا بِخَيْبَرَ لَمْ أُصِبْ مَالًا قَطُّ أَنفَسَ عِنْدِي مِنْهُ فَمَا تَأْمُرُنِي بِهِ قَالَ إِنْ شِئْتَ حَبَسْتُ أَصْلَهَا وَتَصَدَّقْتَ بِهَا فَتَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُ أَنَّهُ لَا يَبَاعُ أَصْلُهَا وَلَا يُوهَبُ وَلَا يُورَثُ وَتَصَدَّقَ بِهَا فِي الْفُقَرَاءِ وَفِي الْقُرْبَىٰ وَفِي الرِّقَابِ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَالضَّيْفِ لَا جُنَاحَ عَلَيَّ مَنْ وَكَيْهَا أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوفِ أَوْ يُطْعِمَ غَيْرَ مَتَمَوْلٍ قَالَ ابْنُ سِيرِينَ غَيْرَ مُتَأْتِلٍ مَالًا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۵۴/۵ الحدیث رقم ۲۷۳۷ و مسلم فی صحیحہ ۱۲۵۵/۳ الحدیث رقم (۱۶۳۲-۱۵)

والنسائی فی السنن الحدیث رقم ۳۵۹۷ و ابن ماجہ فی ۸۰۱/۲ الحدیث رقم ۲۳۹۶ أحمد فی المسند ۱۲/۲

ترجمہ: ”حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ خیبر کی کچھ زمین (کہ جس میں کھجوریں پیدا ہوتی تھیں) حضرت عمرؓ کو (مال غنیمت کے طور پر) حصہ میں آئی تو وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! مجھے خیبر کی جو زمین (بطور غنیمت) حصہ میں آئی کہ اس سے زیادہ بہتر و عمدہ مال مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ملا ہے (اور اب میں چاہتا ہوں کہ اس زمین کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی میں دے دوں اس لئے) آپ ﷺ مجھے اس بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں، حکم فرمائیے (کہ میں اس بارے میں کیا کروں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم چاہو اس کا اصل مال تم رکھ لو اس سے جو کچھ پیدا ہوا ہے صدقہ کر دو۔“ چنانچہ حضرت عمر نے اس زمین کو اس شرط کے ساتھ اللہ کی راہ میں دے دیا (یعنی اسے وقف کر دیا) کہ اصل زمین کو نہ تو فروخت کیا جائے نہ ہیہ کیا جائے اور نہ اسے کسی کی میراث قرار دی جائے اور اس کی پیداوار کو فقراء و ایتداروں کو نفع پہنچانے غلاموں کو آزاد کرانے (یعنی جس طرح مکاتب کو زکوٰۃ دے دی جاتی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے مالک کو بدل کتابت دے کر آزاد ہو جائے اسی طرح اس زمین کی پیداوار سے بھی مکاتب کی اعانت کی جائے) اللہ کی راہ میں (یعنی غازیوں اور حاجیوں پر خرچ کیا جائے) مسافروں کی ضرورتیں پوری کی جائیں (باوجودیکہ وہ اپنے وطن میں مال و زر کے مالک ہوں) اور مہمانوں کی مہمانداری میں خرچ کیا جائے اور اس زمین کے متولی پر بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اچھے طریقے سے اس میں سے کھائے یا اپنے اہل و عیال کو (کہ جو مستطیع نہ ہونے کی وجہ سے اس کے زیر کفالت ہوں) کھلائے بشرطیکہ وہ متولی (اس وقف کی آمدنی سے) مالدار نہ بنے (یعنی جو شخص اس زمین کی دیکھ بھال کرنے اور اس کی پیداوار کو مذکورہ بالا لوگوں پر خرچ کرنے کی ذمہ داری پر بطور متولی مامور کیا جائے اگر وہ بھی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے اس زمین کی پیداوار اور آمدنی میں سے کچھ لے لیا کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہاں اسے اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اس زمین کے ذریعے مالدار و متمول بن جائے۔ چنانچہ ابن سیرینؒ نے (غیر

متولی کا مطلب یہی بیان کیا ہے کہ وہ متولی اس زمین کو اپنے مال و زرع کرنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ (بخاری و مسلم)
تشریح: قوله: اَنَّ عَمَرَ اَصَابَ اَرْضًا بِخَيْرٍ..... قَالَ اِنْ شِئْتَ..... انفس: بہترین عمدہ۔ اور اسی سے اللہ کا یہ
 ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ [التوبة-۱۳۸] فاء کے فتح کے ساتھ قراءت شاذہ میں۔ اور امام نووی رحمہ اللہ
 فرماتے ہیں ”انفس“ بمعنی ”اجود“ ہے، اور یہ نفس نفاسۃ سے ہے از باب کرم، اور اس مال کا نام ”نمغ“ ثاء کے ساتھ میم کے
 سکون کے ساتھ اور عین کے ساتھ ہے۔

فما تامرني به: بمعنی ”فی“ ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ وہ زمین اللہ کی رضا اور خوشنودی میں دیدوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ کس
 طریقے سے دیدوں۔

حبست: باء کی تشدید کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ بھی درست ہے، فی الفقراء: یعنی فقراء مدینہ پر یا صفہ پر۔
 القربی: ”اقرب“ کا مؤنث ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ زیادہ ظاہریہ ہے کہ یہ بمعنی ”قربانہ“ ہے اور مضاف مقدر ہے اور اس کی
 تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: ﴿واتى ذا القربى حقه﴾ [الاسراء-۲۶] اور مراد اس سے رسول اللہ ﷺ کے قریب ہونے یا حضرت
 عمر کے اپنے قریب ہونے اور ظاہریہ ہے کہ یہ ان کے محتاج اور غنی دونوں قسم کے قریب ہونے کو شامل ہے۔
 الرقاب: راء کے کسرہ کے ساتھ ”رقبہ“ کی جمع ہے اور مراد اس سے مکاتب ہیں۔ یعنی ان کے بدل کتابت کی ادائیگی میں خرچ
 کیا جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس کے ذریعے غلاموں کو خریداجائے اور آزاد کیا جائے۔
 لا جناح: یعنی کوئی گناہ نہیں ہے۔ غیر متمول: ”ولہا“ کے فاعل سے حال ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث وقف کے صحیح ہونے کی دلیل ہے اور اس میں طریقہ جاہلیت کی مخالفت ہے۔ اور تمام مسلمانوں کا
 بالاتفاق یہ مسلک ہے، نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وقف جائیداد نہ فروخت کی جاسکتی ہے نہ ہبہ ہو سکتی ہے اور نہ کسی کی
 میراث بن سکتی ہے۔ اور واقف کی شرائط کے مطابق اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور اس میں دلیل ہے واقف کے شرائط لگانے کے
 صحیح ہونے کے۔ یہ حدیث وقف کی فضیلت کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ وقف ایک صدقہ جاریہ ہے، اور اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی
 ظاہر ہوتی ہے۔ اور امور میں فضیلت والے اور نیک لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم
 ہوا کہ خیر ”عنوة“ فتح ہوا تھا۔ اور مال غنیمت لینے والے اس کے مالک قرار پائے اور انہوں نے آپس میں تقسیم کیا، اور ان کی ملکیت ان
 کے حصوں پر ہمیشہ رہی۔ اور اس حدیث میں صلہ رحمی کی فضیلت اور قریب ہونے پر وقف کرنے کی فضیلت ہے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے کوئی چیز وقف کی اور اس کے لئے کوئی متعین ذمہ دار مقرر نہیں
 کیا تو یہ جائز ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ولا جناح علی من ولیہا ان یا کل منها“ اور متولی کو متعین نہیں کیا۔ اور اس
 میں دلیل ہے کہ وقف کرنے والے کیلئے جائز ہے کہ وہ اپنے وقف سے بقدر ضرورت نفع حاصل کرے کیونکہ آپ ﷺ نے بقدر ضرورت
 اس شخص کیلئے مباح قرار دیا جو اس کا متولی ہو اور واقف اپنے وقف کا متولی ہوتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص
 سے جو بدی جانور ساتھ لایا تھا فرمایا کہ اس پر سوار ہو جا، نیز اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا کوئی شخص ہے جو بئر
 رومہ (مدینہ کا ایک کنواں تھا) خریدے؟ اس کو میں اس شخص کا ڈول مسلمانوں کے ڈول کی طرح ہوگا۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس
 کنویں کو خرید اور مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔ اور حضرت انس نے ایک گھر کو وقف کیا تھا۔ اور حضرت انس جب وہاں آتے تو اس میں
 رہتے تھے۔

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ”باب الوقف“ میں ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اخرجه فی صحیحہ ۲۳۱/۵ الحدیث رقم ۲۶۲۶ و مسلم فی صحیحہ ۲۴۸/۳ الحدیث رقم (۱۶۲-۳۲) و ابوداؤد فی

السنن ۸۱۶/۳ الحدیث رقم ۳۵۴۸ و النسائی فی ۲۷۷/۶ الحدیث رقم ۳۵۴۸ و احمد فی المسند ۳۴۷/۲

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمری (ساری عمر کا عطیہ) جائز ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: العمری: عین پر ضمیمہ پر سکون راء پر فتح اور اس کے بعد الف مقصورہ ہے۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ میم کا ضمیمہ بھی نقل کیا گیا ہے حرف اول کے ضمہ کے ساتھ، اور حرف اول کا فتح بھی نقل کیا گیا ہے میم کے سکون کے ساتھ۔ ماخوذ ہے ”العمر“ سے اور ”رقی“ اس کے وزن پر ہے ماخوذ ہے ”المراقبہ“ سے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”عمری“ قائل کا یہ قول ہے: اعمرتك هذه الدار او جعلتها لك عمرک او حیاتك او ما عشت، کہ میں نے یہ مکان تمہیں تمہاری زندگی تک کیلئے دیدیا ہے، یا وہ الفاظ جو اس معنی کا فائدہ دیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ ”عمری“ کہتے ہیں گھر ”معمور لہ“ (جس کو کوئی چیز بطور ”عمری“ دی جائے) کو اس کی زندگی تک دینا اس شرط کے ساتھ کہ جب وہ مرجائے تو یہ گھر ”واہب“ کی طرف لوٹے گا۔ یہ شرط باطل ہے کیونکہ حدیث میں ہے: ”فہی لہ حال حیاتیہ ولورثتہ بعدہ“ یعنی ”معمور لہ“ کے زندگی تک اس کا ہوگا اور اس کے بعد اس کے ورثاء کا۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ عمری کی تین صورتیں ہیں:

اول: کوئی شخص کسی کو مکان دے دے اور یہ کہے کہ میں نے اپنا یہ مکان تمہیں دیا، جب تک تم زندہ رہو گے یہ تمہارا ہے، تمہارے مرنے کے بعد تمہارے وارثوں کا ہو جائے گا، اس صورت کے بارے میں تمام علماء کا بالاتفاق مسلک یہ ہے کہ یہ ہبہ ہے اور یہ جس شخص کو دیا گیا ہے اس کی ملکیت میں آجاتا ہے اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء اس مکان کے مالک ہو جاتے ہیں، اگر ورثاء نہ ہوں تو بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے ”واہب“ کی ملک میں کبھی نہیں لوٹے گا۔

دوم: وہ صرف اپنے اس قول پر اکتفا کریں کہ یہ مکان تمہاری زندگی تک تمہارا ہے اور اس کے سوا کوئی بات نہ کریں۔ اس صورت کے بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں اور ان میں سے زیادہ صحیح قول جدید ہے، کہ ”عمری“ کی یہ صورت درست ہے اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی صورت کا حکم ہے۔

سوم: دینے والا کہے کہ یہ مکان تمہاری زندگی تک تمہارا ہے، تمہارے مرنے کے بعد میری اور میرے وارثوں کی ملکیت میں آ جائے گا۔ اس کے صحیح ہونے میں اختلاف ہے۔ ہمارے ہاں صحیح یہ ہے کہ یہ صورت بھی درست ہے اور اس کا حکم بھی وہی ہے جو پہلی صورت کا ہے۔ انہوں نے احادیث مطلقہ پر اعتماد کیا ہے اور قیاس کی شرائط سے عدول کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ عمری مطلق صحیح ہے جس میں کوئی قید و شرط نہ ہو اور مؤقت فاسد ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ ”عمری“ کی تمام صورتوں میں منافع کی تملیک ہے۔ مثلاً منافع دار کی تملیک ہے۔ اور ”عمر لہ“ عین کا کسی بھی حالت میں مالک نہیں بنتا۔ اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہمارے مذہب کی طرح ہے۔

ہمارے علماء میں سے بعض شراح فرماتے ہیں کہ ”عمری“ نام ہے اس کا کہ میں نے یہ چیز تمہاری زندگی تک تمہیں دیدی۔ اور یہ بالاتفاق جائز ہے اور قبضہ کرنے کے ساتھ مالک ہو جاتا ہے جیسے ہبہ کی دیگر تمام اقسام میں ہوتا ہے۔ اور ”عمری“ کے طور پر دی ہوئی چیز کی عمر لہ کی طرف سے وارث بھی بنتے ہیں جیسا کہ اس کے باقی تمام اموال میں ہوتا ہے، یہ اکثر علماء کا مسلک ہے، اس حدیث کے بعد متصل آنے والی دو حدیثوں کی وجہ سے۔ اور اس میں اختلاف ہے امام مالک کا کہ ان کے نزدیک ”معمور“ کی طرف لوٹے گا۔ انہوں نے استدلال کیا ہے حضرت جابر کی حدیث سے جو اگلی دو حدیثوں کے بعد آ رہی ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک تاویل ہے جو حضرت جابر نے اپنی طرف سے بیان کی ہے اور حضرت جابر کی وہ احادیث جو انہوں نے نبی ﷺ سے نقل کی ہیں اس کے خلاف پر

دلالت کر رہی ہیں۔

تخریج: سیوطی کی الجامع الصغیر میں ہے: "العمری جائزۃ لاهلہا"۔ اور اس کو روایت کیا ہے احمد، بخاری اور مسلم، نسائی نے حضرت جابر سے اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی، اور روایت کیا ہے احمد ابو داؤد، اور نسائی نے حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور روایت کیا ہے مسلم، ابو داؤد، اور نسائی نے حضرت جابر سے ان الفاظ کے ساتھ: "العمری لمن و ہبت لہ"۔

عمری، معمولہ کے ورثاء کی ملکیت بن جاتا ہے

۳۰۱۰: وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ الْعُمْرَى مِيرَاثٌ لَّا هِلْهًا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱۲۴۷/۳ الحدیث رقم (۱۶۲۵-۳۱)۔

ترجمہ: "اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمری اپنے مالک (یعنی معمر لہ) کے ورثاء کی میراث ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: ان العمری میراث لاهلہا:

یہ حدیث دلیل ہے کہ عمری کو کہتے ہیں۔ یہ مالک کے خلاف حجت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عمری میں صرف منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے، نہ کہ اصل چیز کا۔

قولہ: رواہ مسلم: یعنی حضرت جابر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے جیسے کہ الجامع الصغیر میں ہے۔ اور طبرانی نے روایت کیا ہے صحیح سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابت سے اور اس کے الفاظ یہ ہیں: "العمری والرقبی سبیلہا سبیل المیراث"۔ رقبی کا معنی اور حکم عنقریب آ رہا ہے۔

۳۰۱۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَيُّمَا رَجُلٍ أَعْمَرَ عُمْرَى لَهُ وَلَعَقِبَهُ فَإِنَّهَا لِلَّذِي أُعْطِيَهَا لَا يَرْجِعُ

إِلَى الَّذِينَ أُعْطَاهَا لِأَنَّهُ أُعْطِيَ عَطَاءً وَقَعَتْ فِيهِ الْمَوَارِيثُ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۳۸/۵ الحدیث رقم ۲۶۲۵ و مسلم فی ۱۲۴۵/۳ الحدیث رقم (۱۶۲۵-۲۰) و ابو داؤد فی السنن ۸۱۹/۳ الحدیث رقم ۳۵۰۳ و الترمذی فی ۶۳۲/۳ الحدیث رقم ۱۳۵۰ و ابن ماجہ فی ۷۹۶/۲ الحدیث رقم ۲۳۸۰۔

ترجمہ: "اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اگر کسی شخص اور اس کی اولاد کو کوئی چیز بطور عمری دی گئی تو وہ عمری انہی کا ہو جاتا ہے جنہیں وہ دیا گیا ہے (یعنی وہ چیز اس کی ملکیت ہو جاتی ہے) عمری دینے والے کی ملکیت میں واپس نہیں آئے گی کیونکہ دینے والے نے ایسا عطیہ دیا ہے کہ اس میں میراث واقع ہو گئی ہے"۔ (بخاری مسلم)

تشریح: قولہ: أَيُّمَا رَجُلٍ أَعْمَرَ عُمْرَى لَهُ وَلَعَقِبَهُ فَإِنَّهَا لِلَّذِي أُعْطِيَهَا:

اعمر: صیغہ مجہول کے ساتھ۔ عمری: مفعول مطلق ہے۔ لہ: اعمر کا متعلق ہے اور ضمیر "رجل" کی طرف راجع ہے۔ عقبہ: قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ بعض کہتے ہیں کہ سکون کے ساتھ ہے۔

فانہا: ضمیر عمری کی طرف راجع ہے۔ للذی اعطیہا: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

لا ترجع: صیغہ مؤنث کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صیغہ مذکر کے ساتھ ہے۔

لأنه اعطى: صیغہ فاعل کے ساتھ ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ ذی للمفعول ہے۔

معنی یہ ہے کہ جو چیز کسی شخص کو بطور عمری دی جاتی ہے وہ اس شخص (یعنی معمر لہ) کی ہو جاتی ہے، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے

وارثوں کی ہو جاتی ہے، جیسے اس کی باقی تمام املاک وارثوں کی ملکیت میں چلی جاتی ہے اور ”معمّر“ کی ملکیت میں واپس نہیں آتی۔ جیسا کہ ہبہ کی ہوئی چیز میں رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ اور شافعی کا مسلک ہے خواہ اس نے عقبہ کا لفظ ذکر کیا ہو، یا نہ کیا ہو۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ دینے والے کی ملکیت میں واپس آ جاتی ہے اگر وہ زندہ ہو اور اس کے ورثاء کے ملکیت میں آ جاتی ہے، اگر وہ مر گیا ہو بشرطیکہ اس نے عقبہ کا ذکر نہ کیا ہو۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے دلالت کر رہی ہے کہ مطلق عمری میں وراثت نہیں چلتی، بلکہ وہ ”معمّر“ کی طرف واپس آ جاتی ہے۔ اور حضرت جابر سے منقول قول میں بھی اس کی تصریح ہے مگر وہ غیر مرفوع ہے۔

مسلک جمہور کے خلاف حضرت جابر کی روایت اور اس کی تاویل

۳۰۱۲: وَعَنْهُ قَالَ إِنَّمَا الْعُمْرَى الَّتِي أَحْجَازَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَقُولَ هِيَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ فَإِنَّمَا إِذَا قَالَ هِيَ لَكَ مَا عَشْتُ فَإِنَّهَا تَرْجِعُ إِلَى صَاحِبِهَا. (متفق عليه)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۲۳۶/۳ الحديث رقم (۱۶۲۵-۲۳) و ابو داود في ۸۲۰/۳ الحديث رقم ۳۵۵۱ واحمد في المسند ۲۹۴/۳

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عمری کی جس صورت کو جائز قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ مالک (یعنی دینے والا) یوں کہے کہ ”یہ چیز (تمہاری زندگی تک) تمہاری اور (تمہارے مرنے کے بعد) تمہارے ورثاء کی ہے۔ اگر صرف یوں کہے کہ ”یہ عمری اس وقت تک تمہارے لئے ہے جب تک تم زندہ ہو تو اس صورت میں (اس شخص کے مرنے کے بعد) وہ عمری مالک (یعنی دینے والے) کی ملکیت میں واپس لوٹ آئے۔“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: إِنَّمَا الْعُمْرَى الَّتِي أَحْجَازَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَقُولَ هِيَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ :

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمری بالاتفاق جائز ہے اور قبضہ کرتے ہی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے جیسے ہبہ کے تمام اقسام کا حکم ہے۔ اور بطور عمری دی ہوئی چیز کا ”معمّر“ کی طرف سے وارث بھی بن جاتے ہیں جیسا کہ اس کے باقی تمام اموال میں ہوتا ہے خواہ اس نے مطلق ذکر کیا ہو یا اس کے بعد یہ بھی کہا ہو کہ تیرے بعد یہ تیرے ورثاء کی ہوگی۔ اور یہ اکثر علماء کا مذہب ہے۔ حضرت جابر کی اس روایت کی وجہ سے کہ جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”العمری میراث لاهلها“۔ یعنی ”معمّر“ کے اہل کی۔ اور چونکہ عمری کو مطلق ذکر کیا ہے نہ کہ مقید کیا ہے۔

ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اگر دینے والے نے مطلق ذکر کیا کہ یہ تیرے لئے تمہاری زندگی تک اور اس کے بعد یہ نہیں کہا کہ تیرے بعد تیرے ورثاء کیلئے ہے تو پھر اس میں وراثت نہیں چلے گی، بلکہ یہ دینے والے کی طرف واپس آ جائے گا اور اس میں صرف منفعت کا مالک بنانا ہوگا۔ یہ زہری اور امام مالک کا قول ہے۔ ان کی دلیل حضرت جابر کی دوسری حدیث ہے جس میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ”ایما رجل عمر“۔ کیونکہ مفہوم شرط جس کو ”ایما“ متضمن ہے اور مفہوم تعلیل یہ دلالت کرتے ہیں کہ جس کو یہ چیز بطور عمری نہیں دی گئی ہے وہ عمری کو بطور میراث بھی نہیں لے سکتا بلکہ دینے والے کی طرف واپس آ جائے گا۔ اور دوسری دلیل حضرت جابر کی تیسری روایت ہے وہ فرماتے ہیں: انما العمری التي اجاز.....

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ آپ کی دلیل کی بنیاد تین امور پر مبنی ہے: (۱) مفہوم پر (۲) عموم پر (۳) منطوق میں تخصیص کے جواز

اور دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک تاویل اور قولی ہے جو حضرت جابر کی اپنی رائے اور اجتہاد سے صادر ہوا ہے، پس یہ جمہور

کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے۔

الفصل الثالثی:

عمری اور قحلی سے آنحضرت ﷺ کی ممانعت اور اس کی وضاحت

۳۰۱۳: عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا تُرْقَبُوا وَلَا تُعْمَرُوا فَمَنْ ارْقَبَ شَيْئًا أَوْ أُعْمِرَ فَهِيَ لَوْرَثِهِ .

(رواہ ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۲۰/۳ الحدیث رقم ۳۰۵۶، والنسائی فی ۲۷۳/۶ الحدیث رقم ۳۷۳۱۔

ترجمہ: ”حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم بطور قحلی کوئی چیز دو نہ بطور عمری کوئی چیز دو جس شخص کو بطور قحلی یا بطور عمری کو کوئی چیز دی گئی تو وہ اس کے ورثاء کی (ملکیت میں) ہے۔“ (ابو داؤد)

تشریح: قولہ: لا ترقبوا: ”ارقاب“ سے ہے بمعنی ”مراقبہ“۔ اور اسم ”رقمی“ آتا ہے۔

قحلی کی صورت یہ ہے کہ میں نے اپنا یہ گھر تمہیں ہبہ کر دیا، پس اگر تو مجھ سے پہلے مرا تو یہ میری ملکیت میں آ جائے گا اور اگر میں تجھ سے پہلے مر گیا تو یہ گھر تمہاری ملکیت میں رہے گا۔

اس تشریح کی روشنی میں ”رقمی“ مراقبہ سے ماخوذ ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی موت کے انتظار میں ہوتا ہے جیسا کہ تخیص النہایہ میں ہے۔ ”رقمی“ امام ابو حنیفہ اور محمد کے نزدیک جائز نہیں ہے اور امام ابو یوسف کے ہاں جائز ہے۔

قولہ: ولا تعمروا: اعمار سے ہے۔ بعض حنفی شارحین حدیث نے اس حدیث کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ نبی ارشاد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا مال ایک مدت تک کیلئے ہبہ نہ کرو کہ جب وہ مدت پوری ہو جائے تو اپنا مال واپس لے لو بلکہ جب تم کوئی چیز ہبہ کر دو تو وہ تمہاری ملکیت سے نکل گئی اب وہ تمہاری ملکیت میں نہیں آئے گی، خواہ تم وہ چیز ہبہ کے طور پر دیا عمری اور قحلی کے طور پر دو۔

اور قحلی اسم ہے۔ ”ارقب الرجل“ سے ماخوذ ہے۔ جب وہ کسی کو کہے کہ میں نے چیز تجھ ہبہ کر دی اس شرط پر کہ اگر میں تم سے پہلے مر گیا تو یہ چیز تیرے ہی پاس رہے گی اور اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے، تو چیز واپس میری طرف لوٹے گی۔ اس کی اصل ”مراقبہ“ ہے اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی موت کا انتظار کرتا ہے۔

ارقب شیئا او اعمر: دونوں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

فہمی: یہ ضمیر اس عمری یا قحلی کی طرف لوٹ رہی ہے جو فعلوں سے مفہوم ہورہے ہیں۔ اور ایک نسخہ میں ”وہی“ ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ”فہو“ ہے شئی کی تاویل میں ہے۔

لورثتہ: امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضمیر ”معمور لہ“ کی طرف راجع ہے اور اسی طرح اہلہا میں ہے، اور ”فمن ارقب میں“ فاء نہی کا سبب اور علت بیان کرنے کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم قحلی اور عمری کے طور پر کوئی چیز نہ دو کہ تم اس گمان اور دھوکے میں پڑے ہو کہ ان میں سے ہر ایک ”معمور لہ“ کی ملکیت میں نہیں جاتا بلکہ اس کی موت کے بعد تمہاری ملکیت میں واپس آ جائے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جس نے کوئی چیز کسی کو بطور قحلی یا عمری دے دی تو وہ ”معمور لہ“ کے ورثاء کی ہوگی اس کے بعد۔ پس اس معنی کے اعتبار سے جمہور کے مذہب کا صحیح ہونا متحقق ہو جاتا ہے کہ عمری ”معمور لہ“ کی ہوتی ہے اور وہ ملک تام کے ساتھ اس کا مالک بن جاتا ہے وہ اس میں بیع وغیرہ جیسے تصرف کر سکتا ہے اور اس کے بعد یہ اس کے ورثاء کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔ اور اس تاویل کی تائید فصل ثالث میں آنے والی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

نہایہ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اس طرح کرتے تھے تو شارع نے اس کو باطل قرار دیا، اور ان کو بتا دیا کہ جو کسی کو کوئی چیز

اس کی زندگی تک بطور عمری یا قحلی دیدے تو وہ اس کی موت کے بعد اس کے ورثاء کی ہو جاتی ہے۔ بہت ساری روایات اس پر متفق ہیں۔ اور فقہاء کا اس میں اختلاف ہے، پس بعض تو ان میں سے حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں اور اس کو تملیک قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو عاریت کی طرح قرار دیتے ہیں اور حدیث میں تاویل کرتے ہیں۔

عمری اور قحلی جائز ہے

۳۰۱۳: وَعَنْ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْعُمْرَى جَائِزَةٌ لِأَهْلِهَا وَالرُّقْبَى جَائِزَةٌ لِأَهْلِهَا

(رواه احمد والترمذی وابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۲۱/۳ الحدیث رقم ۳۵۵۷ والترمذی فی ۶۳۳/۳ الحدیث رقم ۱۳۵۱ والنسائی فی

۲۷۴/۶ الحدیث رقم ۲۸۳۹ وابن ماجہ فی ۷۹۷/۲ الحدیث رقم ۲۳۸۳ واحمد فی المسند ۳۰۳/۳

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”عمری، معمرہ کے گھروالوں کے لئے جائز ہے (یعنی جس شخص کو کوئی چیز بطور عمری دی گئی وہ اس کے لئے جائز ہے) اور قحلی، مرقبہ کے گھروالوں کے لئے جائز ہے (یعنی جو چیز بطور قحلی کسی کو دی گئی وہ اس کے لئے جائز ہے)۔“ (احمد ترمذی ابوداؤد)

تشریح: اسی طرح نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے احمد، اور نسائی نے حضرت ابن عباس سے ان الفاظ کے ساتھ: ”العمری جائزۃ لمن اعمرها والرقبی جائزۃ لمن ارقبها والعائد فی ہبتہ کالعائد فی ہبتہ“۔

الفصل الثالث:

جواز عمری کی بظاہر مخالف ایک اور حدیث

۳۰۱۵: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَمْسِكُوا أَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ لَا تَفْسِدُوا مَا فَانَتْ مِنْ أَعْمَرَ عُمْرَى فَبَيَّ لِلَّذِي أَعْمَرَ حَيًّا وَمَيِّتًا وَلِعَقِبِهِ. (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحہ ۱۲۴۶/۳ الحدیث رقم (۲۶-۱۶۲۵) واحمد فی المسند ۳۱۲/۳۔

ترجمہ: ”حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنے مال اپنے پاس رکھو انہیں خراب مت کرو کیونکہ جس کسی کو اپنی کوئی چیز عمری کے طور پر دی تو وہ چیز (یعنی مکان یا زمین) کہ جو عمری کے طور پر دی گئی ہے زندگی و موت دونوں حالتوں میں اس شخص کی ملکیت رہتی ہے جسے وہ چیز بطور عمری دی گئی ہے (بایں طور کہ جب تک وہ زندہ رہتا ہے تو خود اس چیز کا مالک رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد) پھر اس کی اولاد مالک بنے۔“ (مسلم)

تشریح: قولہ: ”أَمْسِكُوا أَمْوَالَكُمْ..... مَنْ أَعْمَرَ عُمْرَى..... لَا تَفْسِدُوا مَا فَانَتْ.....“ یہ نبی امر کیلئے تاکید ہے۔ فانہ: ضمیر شان ہے۔ للذی اعمر: بصیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

حیا: یہ دلالت کرتا ہے کہ ”معمر لہ“ اس کا مالک بن جاتا ہے اور اس کے لئے اس کو فروخت کرنا اور دیگر تمام تصرفات جائز ہیں۔ خواہ وہ اس کے ذریعے قرض اداء کرے یا وصیت کرے کسی کیلئے یا وقف کر دے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کو بتا دیا کہ عمری ایک صحیح ہبہ ہے اور جس کو ہبہ کیا جائے اس کو ملک تمام حاصل ہو جاتی ہے و اہب کی طرف کبھی بھی واپس نہیں لوٹے گی۔ اور جب یہ بات جان لی، پس جو چاہے کوئی چیز بطور عمری کے دے اور اس میں بصیرت کے ساتھ داخل ہو اور جو چاہے تو چھوڑ دے اس لئے کہ وہ اس کو عاریت کی طرح سمجھتے تھے اور اس میں رجوع کرتے تھے یہ امام شافعی اور ان کے موافقین کی دلیل ہے، (اتہمی) حق یہ تھا کہ اس طرح کہتے کہ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تبعین کی دلیل ہے۔

بَابُ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

الفصل الاول :

خوشبودار پھول کا تحفہ واپس نہ کرو

۳۰۱۶: عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ عَرِضَ عَلَيْهِ رِيحَانٌ فَلَا يَرُدُّهُ فَإِنَّهُ خَفِيفُ الْمَحْمَلِ طَيْبُ الرِّيْحِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۱۷۶۶/۴ الحديث رقم (۲۰-۲۲۵۳) وابو داؤد في ۴/۴۰۰ الحديث رقم ۴۱۷۲ والترمذی فی السنن ۵/۱۰۰ الحديث رقم ۲۷۹۱ والنسائی ۸/۱۸۹ الحديث رقم ۵۲۵۹

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو خوشبودار پھول (تحفہ کے طور پر) پیش کیا جائے تو وہ اسے واپس نہ کرے کیونکہ (اول تو) وہ بلکا سا احسان ہے اور (دوسرے یہ کہ) وہ ایک اچھی خوشبو ہے۔“ (مسلم)

تشریح: قوله: مَنْ عَرِضَ عَلَيْهِ رِيحَانٌ فَلَا يَرُدُّهُ :

ریحان: اُگنے والی خوشبودار چیز جو سونگھے جانے والی چیزوں کی انواع سے ہو۔ جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

فلا یردہ: دال مشد کے ضمہ کے ساتھ ہے فتح کے ساتھ بھی منقول ہے اور اول تصحیح شدہ نسخوں میں منقول ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محدثین کی روایت اس حدیث میں دال کے فتح کے ساتھ ہے، اور فرمایا کہ اہل عربیت میں سے ہمارے محققین شیوخ نے اس پر تکیہ کی ہے، اور فرمایا ہے کہ یہ روایت کی طرف سے غلطی ہے، اور درست دال کے ضمہ کے ساتھ ہے، فرمایا میں نے بعض مشائخ کے خط کے ساتھ بضم الدال پایا ہے۔ اور یہی ان کے نزدیک درست ہے سیبویہ کے مذہب کے مطابق۔ اور یہ مضاعف میں ہے کہ جب اس پر ہاء داخل ہو تو امر میں اس کے ماقبل کو ضمہ دیا جاتا ہے، اور اس طرح مجزوم ہو (تو تب بھی اس کے ماقبل کو ضمہ دیا جاتا ہے) میں اس واؤ کی رعایت کرتے ہوئے جس کو لازم کرتا ہے اس کے بعد ہاء کا ضمہ اور واؤ کا ماقبل ہمیشہ مضموم ہوتا ہے۔ یہ کلام تو مذکر کے صیغہ میں ہے، اور جو مؤنث ہے جیسے ردھا، و حدها، دال کے فتح کے ساتھ ہے الف کی رعایت کرتے ہوئے، (یہ قاضی کا آخری کلام ہے)۔ باقی ردھا اور اس کی نظیر مؤنث میں تو اس میں دال کا فتح لازم ہے بالافتاق۔ اور ردہ وغیرہ مذکر میں تین وجوہ ہیں: سب سے فصیح و جوب ضمہ ہے (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے قاضی نے) دوسری وجہ کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ ضعیف ہے، اور تیسری وجہ فتح کے ساتھ ہے۔ یہ اضعف ہے۔ (اتہلی کلام)

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ شرح زنجانی میں فرماتے ہیں کہ جب مجزوم کے ساتھ حالت ادغام میں ہاء ل جائے تو اس میں ایک ہی وجہ لازم ہے، جیسا ”ردھا“ وغیرہ میں فتح کے ساتھ اور ”ردہ“ وغیرہ میں ضمہ کے ساتھ۔ فصیح ہے اور ”ردہ“ کو کسرہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ یہ ضعیف ہے۔ (اتہلی)

اور ظاہر یہ ہے کہ فتح فصیح ہے جو فصیح کا مقابل ہے، لیکن یہ مخالف ہے اس کا جو شافیہ میں ہے کہ کسرہ ایک لغت ہے اور ثعلب نے غلطی کی ہے فتح کے جواز میں، (اتہلی)

اور شاید محققین نے فتح کو جو منسوب کیا ہے غلطی کی طرف، باوجودیکہ یہ عربیت میں ایک وجہ ہے۔ آپ ﷺ کے کلام کو غیر افصح پر محمول کرنے سے بچانے کیلئے، حالانکہ آپ ﷺ نے فرمایا: "انا افصح العرب بیدانی من قریش"۔ اور محدثین کا فتح کو اختیار کرنے میں یہ عذر پیش کرنا کہ قطع نظر اس کے کہ فتح اخف الحركات ہے، کہ تا کہ نصب نہ ہوئی کی بناء پر اس لئے کہ ضمہ میں نفی اور نہی دونوں کا احتمال ہے بلکہ زیادہ ظاہر نفی ہے فتنامل اور اس کے باوجود رفع ارفع ہے محققین کے نزدیک بر تقدیر نہی موافقت عربیت کی وجہ سے اور بر تقدیر نفی زیادہ بلوغ طریقہ کی وجہ سے اس لئے کہ مقام نہی میں شارع کی طرف سے نفی، صریح نہی سے زیادہ مؤکد ہے۔

فانہ: یعنی ریحان، یا اس کا دینا، یا اس کا قبضہ کرنا اور لینا۔ "خفیف المحمل" کا مطلب یہ ہے کہ یہ کم احسان والی ہے۔ طیب الریح: اس لئے کہ اس سے جنت کی خوشبو سونگھی جاتی ہے۔ چونکہ منقول ہے کہ یہ جنت سے نکلا ہے جیسے کہ حدیث میں عنقریب آنے والا ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں تحفہ کو واپس نہ کرنے کی علت یہ ہے کہ تحفہ جب کتر ہونے کی وجہ سے زیادہ احسان نہیں رکھتا اور مفید زیادہ ہے تو اسے واپس نہ کرنا کہ جس شخص نے وہ تحفہ دیا ہے اس کی دل شکنی نہ ہو، (انتہی)۔ اس میں اشارہ ہے لوگوں کے دلوں کا خیال رکھنے کی طرف ان کے تحفوں کو قبول کرنے کے ساتھ اور حدیث میں وارد ہے: "تهادوا واحباوا"۔

۳۰۱۷: وَعَنْ أَنَسِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَرُدُّ الطَّيِّبَ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۰/۳۷۰ الحدیث رقم ۵۹۲۹۔ والنسائی فی السنن ۸/۱۸۹ الحدیث رقم ۵۲۵۸۔

ترجمہ: "اور حضرت انس کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خوشبو (کے تحفے) کو واپس نہیں لوٹایا کرتے تھے"۔ (بخاری)

تشریح: الطیب: طاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

کسی کو کوئی چیز دے کر پھر واپس لے لینا ایک بری مثال ہے

۳۰۱۸: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْعَائِدُ فِي هَيْبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَعُودُ فِي فَيْهٍ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ

السَّوءِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۵/۲۳۴ الحدیث رقم ۲۶۲۲ و مسلم فی ۳/۱۲۴۰ الحدیث رقم (۵/۱۶۲۲) وابو داؤد فی

السنن ۳/۸۰۸ الحدیث رقم ۳۵۳۸ والنسائی فی ۶/۲۶۶۷ الحدیث رقم ۳۷۰۱ وابن ماجہ فی ۲/۷۹۷ الحدیث رقم

۲۳۸۵

ترجمہ: "اور حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے تحفہ کو واپس لینے والا (یعنی کسی کو کوئی چیز بطور

بدیہ و تحفہ دے کر پھر اسے واپس لینے والا) اس کے تے کی مانند ہے جو اپنی تے کر کے چاٹتا ہے اور ہمارے لئے بری مثال نہیں ہے (کہ

ہم کسی بری مثال سے تشبیہ دیئے جائیں)۔"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: الْعَائِدُ فِي هَيْبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَعُودُ فِي فَيْهٍ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوءِ :

اس جملہ میں قبیح طبعی کو تشبیہ قبیح حسی کے ساتھ دی ہے۔

السوء: حرف اول کے فتح کے ساتھ، اور ضمہ کے بھی درست ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ملت اور قوم کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسا کام کرے جس کی وجہ سے ان

کو بری تشبیہ دی جائے۔ اور قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لئے مناسب نہیں ہے، مراد آپ ﷺ کا اپنا نفس

اور مؤمنین ہیں، کہ ہم ایسی بری صفات کے ساتھ متصف ہوں جس میں خسیس حیوانات اپنی خسیس حالت میں ہمارے برابر ہوں۔ اور

معل " کا اطلاق اس صفت میں ہوتا ہے جس کی شان غریب اور عجیب ہو خواہ وہ صفت مدح ہو یا ذم ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَعَلُ السُّوءِ لِلَّهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی﴾ [النحل-۶۰]

اس سے استدلال کیا گیا ہے بہہ کی ہوئی چیز میں رجوع کے عدم جواز پر جس شخص پر بہہ کیا گیا ہے اس کے قبضہ کرنے کے بعد۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مثال ظاہر ہے بہہ اور صدقہ میں ان پر قبضہ کرنے کے بعد رجوع کرنے کی حرمت میں اور یہ محمول ہے اجنبی کے بہہ پر نہ کہ جو بیٹے یا پوتے پر بہہ کیا گیا ہو، جیسا کہ نعمان بن بشیر کی حدیث میں اس کی تصریح ہے اور یہ امام شافعی، مالک اور اوزاعی کا مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر فقہاء فرماتے ہیں کہ ہر بہہ کرنے والا رجوع کر سکتا ہے، سوائے بیٹے کے اور ہر قرہبی رشتہ دار کے۔ تور پشتی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاں اجنبی سے بہہ میں رجوع کرنا جائز ہے ان کے ہاں یہ حدیث کراہت ترمذی پر محمول ہے نہ کہ رجوع کی حرمت پر اور حضرت عمرؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جب انہوں نے اس گھوڑے کو خریدنے کا ارادہ کیا جو انہوں نے اللہ کے راستے میں صدقہ کیا تھا، تو اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، آپ نے فرمایا کہ "اسے نہ خریدو اگرچہ وہ تمہیں ایک درہم کے عوض دے اور اپنے صدقہ میں نہ لو" اس لئے کہ صدقہ میں رجوع کرنے والا اس کتے کی طرح ہے جو اپنی تے چاٹتا ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ جب اس قول سے صدقہ کی ہوئی چیز کے خریدنے کی حرمت لازم نہیں اسی طرح یہ حدیث بھی بہہ میں رجوع کی حرمت کو لازم نہیں۔ (اتحلی)

اس پر امام طیبی نے گرفت کی ہے جو قابل تعجب ہے۔

تخریج: "الجامع الصغیر" میں لکھتے ہیں: "العائد فی ہبتہ کالعائد فی قبضہ" اس حدیث کو امام احمد، شیخین، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

کوئی چیز دینے میں اولاد کے درمیان فرق و امتیاز نہ کرو

۳۰۱۹: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ أَنَّ اَبَاهُ اَتَى بِهِ اِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اِنِّي نَحَلْتُ ابْنِي هَذَا غُلَامًا فَقَالَ اَكْلًا وَكَدِكَ مِعْلَةً قَالَ لَا قَالَ فَاَرْجَعُهُ (وَفِي رِوَايَةٍ) اَنَّهُ قَالَ اَيْسُرُكَ اَنْ يَكُونُوا اِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً قَالَ بَلَى قَالَ فَلَا اِذَا وَفِي رِوَايَةٍ اَنَّهُ قَالَ اَعْطَانِي اَبِي عَطِيَّةً فَقَالَتْ عَمْرَةَ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا اَرْضِي حَتَّى تُشْهَدَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَاتَى رَسُولَ اللّٰهِ فَقَالَ اِنِّي اَعْطَيْتُ ابْنِي مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِيَّةً فَاَمْرِي اَنْ اَشْهَدَكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ اَعْطَيْتَ سَائِرَ وَكَدِكَ مِعْلًا هَذَا؟ قَالَ لَا قَالَ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ قَالَ فَرَجَعَ فَرَدَّ عَطِيَّتَهُ (وَفِي رِوَايَةٍ) اَنَّهُ قَالَ لَا اَشْهَدُ عَلٰى جَوْرٍ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۲۱۱/۵ الحدیث رقم ۲۵۸۷ و مسلم فی صحیحہ ۱۲۴۱/۳ الحدیث رقم (۱۶۲۳/۹) و الترمذی فی السنن ۶۴۹/۳ الحدیث رقم ۱۳۶۷ و نسائی فی ۲۵۸/۶ الحدیث رقم ۳۶۷۲ و ابن ماجہ فی ۷۹۵/۲ الحدیث رقم ۲۳۷۵ و مالک فی الموطأ ۷۵۱/۲ الحدیث رقم ۳۹ من کتاب الاحکام و احمد فی المسند ۲۶۹/۴

ترجمہ: "اور حضرت نعمان بن بشیرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ (ایک دن) ان کے والد (حضرت بشیر) انہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے اور عرض کرنے لگے کہ میں نے اپنے اس بیٹے (نعمان) کو ایک غلام عطا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کو اسی طرح ایک ایک غلام دیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تو پھر (نعمان سے بھی) اس غلام کو واپس لے لو"۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (نعمان کے والد سے) فرمایا کہ کیا تم یہ پسند

کرتے ہو کہ تمہارے سب بیٹے تمہاری نظر میں نیکی کے اعتبار سے برابر ہوں (یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے سب بیٹے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں اور سب ہی تمہاری فرمانبرداری اور تمہاری تعظیم کریں؟) انہوں نے عرض کیا کہ ہاں کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس صورت میں (جب کہ تم اپنے تمام بیٹوں سے اپنے بارے میں مساوی سلوک کے خواہشمند ہو تو) پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ ایک اور روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ ”حضرت نعمانؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میرے والد نے مجھے ایک چیز دی تو عمرہ بنت رواحہ (میری والدہ) نے (میرے والد حضرت بشیرؓ سے) کہا کہ میں اس پر اس وقت تک رضامند نہیں ہوں جب تک کہ تم اس (ہبہ) پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ بنا لو چنانچہ وہ (حضرت بشیر رضی اللہ عنہ) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ ”یا رسول اللہ! میں نے اپنے بیٹے (نعمانؓ) کو جو عمرہ بنت رواحہ کے بطن سے ہے ایک چیز دی ہے یا رسول اللہ! اور عمرہ بنت رواحہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس ہبہ پر آپ ﷺ کو گواہ بنا لوں۔ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا کہ ”تم نے اپنے سب بیٹوں کو اسی طرح کا ایک ایک غلام دیا ہے؟“ انہوں نے کہا کہ ”نہیں“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کا برتاؤ کرو!“ حضرت نعمانؓ کہتے ہیں کہ میرے والد (آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سن کر) واپس آئے اور اپنا عطیہ (مجھ سے) واپس لے لیا۔“ ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ ”آپ ﷺ نے (حضرت بشیرؓ کی یہ بات سن کر) فرمایا کہ ”میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔“ (بخاری و مسلم)

راوی حدیث:

نعمان بن بشیر مسلمانوں میں سے انصار کا پہلا بچہ جو ہجرت کے بعد پیدا ہوا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر آٹھ سال سات مہینے تھی اور ان کے والدین صحابی تھے۔
تفسیر بیع: نحلہ اور حاء کے فتح کے ساتھ۔ نہایہ میں کہا ہے کہ ”نحلہ“ عطیہ اور ہبہ کو کہتے ہیں جو ابتداء میں بغیر کسی عوض اور استحقاق کے ہو۔

لقال اکل ولدك: ”کل“ کے نصب کے ساتھ ہے۔

نحلہ مغلہ: یہ دلالت کر رہا ہے کہ کسی چیز کے دینے میں بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان برابری کرنا مستحب ہے۔

قال لا قال فارجمہ: ابن الملک فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس غلام کو واپس لے لو اور یہ حکم اولیٰ پر تنبیہ کیلئے ہے۔

البك في البر سواء: یعنی تیرے ساتھ اچھا سلوک کرنے، ففرماں برواری، آداب و احترام اور تعظیم کرنے میں برابر ہوں۔
 اذا: تنوین کے ساتھ ہے،

عمرة بنت رواحة: پہلے دو حرفوں کے فتح کے ساتھ نعمان کی والدہ ہے۔

لا ارض: یعنی میرے بیٹے کو یہ عطیہ دینے پر۔

حتى تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم: یعنی اس قضیہ پر اس کو گواہ بنا دے۔

قال اعطيت سائر ولدك مغل هبدا: یعنی اپنے باقی سب بیٹوں کو اس طرح کا دیا ہے۔ ہمزہ استفہام کے حذف کے ساتھ

ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو ہمزہ ممدودہ کے ساتھ پڑھا جائے۔

واعدلوا بين اولادكم: اور خطاب عام حکم کے عموم کی طرف اشارہ ہے۔

فرد عطية: اس سے معلوم ہوا کہ والد کا بیٹے سے ہبہ واپس لے لینا جائز ہے۔

جو حضرات اولاد کے درمیان فرق و امتیاز کو جائز قرار نہیں دیتے وہ جو رک کی تفسیر ظلم کے ساتھ کرتے ہیں، اور جو حضرات جائز قرار

دیتے ہیں کراہت کے ساتھ وہ اس کی تفسیر ”میل“ کے ساتھ کرتے ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے درمیان ہبہ میں برابری کرنا مستحب ہے، پس بعض کو بعض پر فضیلت اور فوقیت نہ دی جائے خواہ بیٹے ہوں یا بیٹیاں ہوں۔ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے کہ ایک بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر دینا چاہئے، لیکن ظاہر حدیث کی وجہ سے صحیح اول ہے۔ پس اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں بعض کو دے اور بعض کو نہ دے، تو امام شافعی، امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے، حرام نہیں ہے اور یہ ہبہ صحیح ہو جائے گا۔ اور امام احمد، ثوری، اور اسحاق رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ انہوں نے استدلال کیا ہے: ”لا أشهد علی جور“ اور ”واعدوا بین اولادکم“ سے۔ اور اول الذکر نے ان الفاظ سے استدلال کیا: ”فاشهد علی هذا غیری، یعنی تم اس بارے میں میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنا لو، اگر یہ ہبہ حرام یا باطل ہوتا تو آپ ﷺ یہ نہ فرماتے۔ اور اس طرح اس قول سے بھی استدلال کیا ہے ”فارجعہ“ اگر یہ ہبہ نافذ نہیں ہوا تھا، تو پھر رجوع کی ضرورت کیوں پڑی۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے اس کو بطور تنبیہ اور تہدید کے فرمایا تھا؟ تو ہم کہتے ہیں کہ اصول اس کے خلاف ہے کہ صیغہ افعل جب مطلق ذکر ہو تو اس کو وجوب یا استحباب پر حمل کیا جاتا ہے۔ اور اگر اس پر حمل کرنا معتذر ہو تو اباحت پر حمل کرتے ہیں۔

باقی ”جور“ کا معنی حرام کا نہیں ہے، اس لئے کہ ”جور“ برابری اور اعتدال سے پھرنے اور میلان کو کہتے ہیں اور جو بھی حد اعتدال سے نکل جائے تو وہ ”جور“ ہے خواہ وہ حرام ہو یا مکروہ ہو۔

شرح السنہ میں ہے کہ حدیث سے معلوم ہوا کہ اولاد کے درمیان برابری کرنا کسی چیز کے دینے اور اس کے علاوہ بھلائی کی تمام اقسام میں حتیٰ کہ بوسہ لینے میں مستحب ہے۔ اور اگر کسی نے اس کے خلاف کیا تو نافذ ہو جائے گا۔ اور ترجیح دی تھی حضرت ابو بکرؓ نے اپنی اولاد میں حضرت عائشہؓ کو اکیس وسق کے ساتھ کہ اس کو دیئے تھے نہ کہ تمام اولاد کو اور حضرت عمر بن الخطاب نے عامم کو دینے میں ترجیح دی تھی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف نے ام کلثوم کے بیٹے کو ترجیح دی تھی۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تقریر اور کسی نے ان پر تکیہ نہیں کی ہے، پس اس پر اجماع ہوا۔

الفصل الثانی:

ہبہ واپس لے لینا مناسب نہیں ہے

۳۰۲۰: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يُرْجَعُ أَحَدٌ فِي هَبْتِهِ إِلَّا الْوَالِدُ مِنْ وَكِدِهِ .

(رواه النسائی وابن ماجہ)

اخرجه النسائی فی السنن ۶/۲۶۶ الحدیث رقم ۳۶۸۹ وابن ماجہ فی ۲/۷۹۶ الحدیث رقم ۲۳۷۸ واحمد فی المسند ۱۸۲/۲۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص اپنا تحفہ واپس نہ لے (یعنی تحفہ واپس لے لینا مناسب نہیں ہے) ہاں باپ بیٹے سے تحفہ واپس لے سکتا ہے۔“ (نسائی ابن ماجہ)

تشریح: قوله: لَا يُرْجَعُ أَحَدٌ فِي هَبْتِهِ إِلَّا الْوَالِدُ مِنْ وَكِدِهِ :

لا يرجع: رفق کے ساتھ ہے۔ یعنی ہے اور معنی نبی کا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کا معنی ہے لا یسغنی ان یرجع یعنی مناسب نہیں ہے رجوع کرنا۔

ہبتہ: ہاء کے کسرہ کے ساتھ اس کی اصل ”وہبہ“ ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ہبہ واپس لینے کی حرمت پر دلالت کر رہی ہے اور بیٹے سے لینا جائز ہے اس لئے کہ بیٹا اور اس کا مال اس کے والد کے ہیں اور اس کو امام شافعی نے لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہبہ میں رجوع درست نہیں ہے، سوائے والد کیلئے۔ اور اس

میں یہ بھی جائز ہے کئی انفرادی طور پر اور نہ مستقل طور پر بہہ میں بغیر فیصلہ اور رضامندی کے رجوع کرنا جائز نہیں ہے، سوائے والد کے کہ اس کو انفرادی طور پر ضرورت کے وقت یہ اختیار حاصل ہے۔

کسی کوئی چیز دے کر پھر واپس لے لینا مروت کے خلاف ہے

۳۰۲۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ أَنْ يُعْطِيَ عَطِيَّةً ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا إِلَّا الْوَالِدُ فِيمَا يُعْطِي وَلَدَهُ وَمَثَلُ الَّذِي يُعْطِي الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا كَمَثَلِ الْكَلْبِ أَكَلَ حَتَّى إِذَا شَبِعَ قَاءَهُ ثُمَّ عَادَ فِي قَيْئِهِ. (رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجه وصححه الترمذی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۰۳/۳ الحدیث رقم ۳۵۳۹ والترمذی فی ۳۸۴/۴ الحدیث رقم ۲۱۳۲ والنسائی فی

۲۶۵/۶ الحدیث رقم ۳۶۹۰ وابن ماجه فی ۷۹۵/۲ الحدیث رقم ۲۳۷۷ واحمد فی المسند ۱/۲۳۷

ترجمہ: ”حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی شخص کے لئے یہ حلال نہیں ہے (یعنی ازراہ مروت یہ بات مناسب نہیں ہے) کہ وہ کسی کو اپنی کوئی چیز (بطور تحفہ) دے اور پھر اس کو واپس لے لے البتہ باپ اپنی اس چیز کو واپس لے سکتا ہے جو وہ اپنے بیٹے کو (بطور تحفہ) دے اور مثال اس شخص کی جو کسی کو کچھ دے کر پھر واپس لے لیتا ہے اس کتے کی سی ہے جس نے (پیٹ بھر کر) کھایا اور جب وہ سیر ہو گیا تو اس نے تے کر ڈالی اور پھر اس تے کو چائے لگا“۔ (ابوداؤد نسائی ابن ماجہ) امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

تشریح: قوله: لَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ أَنْ يُعْطِيَ عَطِيَّةً ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا إِلَّا الْوَالِدُ فِيمَا يُعْطِي وَلَدَهُ:

ثم يرجع: ظاہر تو یہ ہے کہ اس پر نصب ہے لیکن ہمارے اصل سماع اور سننے میں رفع ہے (اس کو ذکر کیا ہے ہمارے مشائخ کے شیخ میرک شاہ نے) اور شاید رفع کی وجہ ”ہو“ کا مقدر ہونا ہو اور یہ ضمیر ”رجل“ کی طرف راجع ہو۔

الا الوالد: نصب کے ساتھ ہے استثناء کی وجہ سے، اس لئے کہ ”رجل“ سے مراد جس ہے، گویا کہ اس طرح کہا ہے لا يحل الرجل.....

اس حدیث کے ظاہر پر امام شافعی اور ان کے تبعین نے عمل کیا ہے یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ حلال نہیں ہے دیانت اور مروت کے طور پر۔ پس یہ مکروہ ہوگا نہ کہ یہ مراد ہے کہ اس کے لئے قضاء اور حکماً حلال نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ”لا يحل لرجل يؤمن بالله واليوم الآخر ان يبيت شعبان وجاره طابوا“۔ حلال نہیں کسی آدمی کیلئے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو کہ وہ رات گزارے اس حال میں کہ اس کا پیٹ بھرا ہو اور اس کا ہمسایہ خالی پیٹ اور بھوکا ہو، یعنی اس کے لئے یہ لائق نہیں ہے دیانت اور مروت کے طور پر اگرچہ قضاء اور حکماً یہ جائز ہے۔

قوله: وَمَثَلُ الَّذِي يُعْطِي الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا كَمَثَلِ الْكَلْبِ أَكَلَ حَتَّى إِذَا شَبِعَ.....

ومثل الذي يعطي العطية: اس سے باپ مستثنیٰ ہے۔

شبع: بآء کے کسرہ کے ساتھ۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں صریح نص ہے کہ بہہ میں رجوع کا جواز مقصور ہے اس میں جو والد نے بہہ کیا ہو بیٹے کو۔ اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے۔ ثوری اور اصحاب ابو حنیفہ اس کے برعکس کے قائل ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ رجوع جائز نہیں ہے بہہ کرنے والے کے لئے جو اس نے بہہ کیا ہو اپنے بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کے لئے یا زوجین میں سے ایک نے دوسرے کے لئے بہہ کیا ہو۔ اور اس کے لئے واپس لینا جائز ہے جو اس نے بہہ کیا ہو اجنبی لوگوں پر۔ امام مالک نے مطلقاً رجوع کو جائز

قراردیا ہے، سوائے اس ہبہ کے جو زوجین میں سے ایک نے دوسرے پر کیا ہو۔

بعض احناف نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ ”لا یحل“ سے مراد ہبہ میں رجوع سے ڈرانا ہے نہ کہ جواز کی نفی کرنا ہے جیسا کہ تیسرے اس قول میں ہے: لا یحل للواجدرد السائل، اور ”الا الوالد لولدہ“ کا مطلب یہ ہے کہ والد کیلئے جائز ہے کہ وہ لے لے جو اس نے بیٹے پر ہبہ کیا ہے اور اس کو خرچ کرے اپنے نفع میں اور ان تمام ضروریات میں جو بیٹے پر لازم ہیں ضرورت کے وقت جیسا کہ اس کے باقی تمام اموال میں والد کو اپنے حق کے وصول کرنے کی وجہ سے تصرف کرنے کا حق حاصل ہے نہ کہ ہبہ میں رجوع کرنے اور ہبہ کو توڑنے کی وجہ سے۔ یہ تاویل بعید ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہر سے بلا دلیل عدول ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ مجتہد دلیل کا قیدی ہوتا ہے جب تک اس کے پاس دلیل نہ ہو اس کو تاویل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قاضی نے کہا ہے کہ ان حضرات نے حضرت عمرؓ کے قول سے استدلال کیا ہے: ”من وهب وهبة لذي رحم جازت ومن وهب لغير ذی رحم فهو احق بها مالم یשב منها“ (جس نے قرابت دار کو کوئی چیز ہبہ کے طور پر دی تو یہ جائز ہے اور جس نے کسی غیر قرابت دار کو کوئی چیز ہبہ کے طور پر دی تو یہ زیادہ حقدار ہے اس چیز کا۔ جب تک کہ اس کا عوض حاصل نہ کیا ہو۔

باوجود یہ کہ یہ ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو تاویل کو قبول کرنے اور اولیٰ یہ ہے کہ اس کی تاویل یہ کی جائے کہ حضرت عمرؓ نے اجانب اور محارم کے ہبہ میں فرق بیان کیا ہے عوض کے تقاضے میں، کہ جس نے کسی اجنبی کو کوئی چیز ہبہ کے طور پر دی بدلہ کی طبع پر اور اس کو کوئی عوض نہیں ملا تو اس کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حضرت عمرؓ سے صراحتاً بھی منقول ہے اور امام شافعی کا قول قدیم بھی اس کے قریب ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ تو عوض کو بالکل لازم نہیں سمجھتے تو پھر اس سے کیسے استدلال کریں گے؟

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ کوئی انوکھی نہیں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ رجوع کے عدم جواز کے قائل ہیں حصول عوض کے وقت باوجود یہ کہ وہ عوض کو لازم نہیں سمجھتے۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حدیث ابن عباسؓ میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہبہ سے رجوع کرنا مذموم ہے اور صحیح نہیں ہے، یا اچھا نہیں ہے مؤمنین کے لئے کہ وہ اس بری مثال کے ساتھ متصف ہو جائیں، اور پہلے گزرا کہ حدیث عمرؓ کے لئے تاکید کے طور پر ہے، کہ مناسب یہ ہے کہ اولاد سے بھی ہبہ میں رجوع نہ کیا جائے اور جو جائز قرار دیا ہے تو وہ درحقیقت رجوع نہیں ہے اس لئے کہ بیٹا اور اس کا مال والد کے لئے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کی دلیل ہے: ﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ زَرْقَهُنَّ﴾ [البقرة - ۲۳۳] (اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے اس کا کھانا)۔ یعنی جس کے لئے یہ جنا گیا ہے گویا کہ یہ اس کی ملکیت ہے، اور آپ کا ارشاد ہے کہ سب سے پاک جو تم نے کھایا وہ تمہاری کمائی میں سے ہے۔ اور کبھی مصلحت یہ تقاضا کرتی ہے کہ رجوع کیا جائے بیٹے کے لئے تا دیب اور سیاست کے طور پر اس لئے کہ کبھی والد بیٹے سے ایسے امور دیکھتا ہے جو ہاب کو پسند نہیں ہوتے۔

تخریج: اصحاب کتب اربعہ نے بھی اس کو مختصر طور پر روایت کیا ہے۔

تحفہ کا بدلہ تحفہ

۳۰۲۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ أَعْرَابِيًّا أَهْدَى لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ بَكْرَةً فَعَوَّضَهُ مِنْهَا بَسْتًا بَكْرَاتٍ فَتَسَخَّطَ فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ ﷺ فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ فُلَانًا أَهْدَى إِلَيَّ نَاقَةً فَعَوَّضْتُهُ مِنْهَا بَسْتًا بَكْرَاتٍ فَلَطَّلَ سَاحِطًا لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَا أَلْبَلَّ هَدِيَّةً إِلَّا مِنْ قُرَيْشِي أَوْ أَنْصَارِي أَوْ لَقَيْمِي أَوْ دَوْسِي .

(رواه الترمذی و ابوداؤد و النسائی)

الحدیث رقم ۳۷۰۹ (۳) کذا مرره فی المعطوطه۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ کو بطور ہدیہ ایک جوان اونٹنی پیش کی چنانچہ آپ ﷺ نے بھی اس (دیہاتی) کو اس (ایک اونٹنی) کے بدلے میں چھ جوان اونٹنیاں عطا فرمائیں لیکن وہ دیہاتی پھر بھی خوش نہ ہوا۔ جب یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے پہلے خدا کی حمد و ثنایاں کی (جیسا کہ آپ ﷺ کا معمول تھا آپ ﷺ جب خطبہ دیتے یا کوئی بات شروع کرتے تو پہلے خدا کی حمد و ثنایاں فرماتے) اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فلاں شخص بطور ہدیہ میرے لئے ایک اونٹنی لایا تھا میں نے بھی اس کے بدلے میں اس کو چھ اونٹنیاں عنایت کیں مگر وہ پھر بھی ناخوش رہا چنانچہ میں نے یہ ارادہ کیا کہ اب میں قریشی، انصاری، ثقفی اور دوسے کے علاوہ اور کسی کا کوئی ہدیہ قبول نہ کروں“۔ (ترمذی ابوداؤد نسائی)

تشریح: قولہ: ان اعرابیا اهدای لرسول اللہ..... فحوضتہ منها بست بکرات فظلاً ساخطاً:

بکرة: باء کے فتح اور کاف کے سکون کے ساتھ جوان اونٹ کو کہتے ہیں جیسے غلام لوگوں میں سے نوجوان کو کہتے ہیں۔ اور اس کا مؤنث ”بکرة“ ہے جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

بکرات: باء اور کاف کے فتح کے ساتھ۔

فسخط: یعنی دیہاتی نے ناراضگی اور غصے کا اظہار کیا اور آپ ﷺ کے اس دینے کو کم سمجھا۔ اس لئے کہ اس کی طمع اس سے زیادہ کی تھی اس لئے کہ اس نے آپ علیہ السلام کی سخاوت اور فیاضی کے بارے میں سنا تھا۔

فلانا: اس کے نام سے کہنا یہ ہے اور شاید اس کے نام کی تصریح اس کے تحفہ قبول کرنے سے احتراز کرنے کے لئے کی۔

فظل: اصبح یاصار کے معنی میں ہے۔

قولہ: لقد هممت ان لا اقبل هديئة الا من قريشي او انصاري او ثقفي او دوسي

لقد هممت: قسم مقدر کا جواب ہے

قريشي: قریش کی طرف نسبت ہے زوائد کے حذف کے ساتھ۔

انصاري: ایک قوم کی طرف منسوب ہے جسے ”انصار“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک

مراد ہے۔

ثقفی: ثاء اور قاف کے فتح کے ساتھ ”ثقیف“ کی طرف نسبت ہے جو ایک مشہور قبیلہ ہے۔

دوسي: دال کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ، ”دوس“ کی طرف نسبت ہے، ”ازد“ میں سے ایک قبیلہ ہے،

تو ریشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے ان لوگوں سے تحفہ قبول کرنے کو ناپسند کیا ہے جو اس ہدیہ کے باعث زیادہ کا طلب گار تھا۔ اور ان قبیلوں کو بطور خاص اس لئے ذکر کیا کہ آپ ان کی سخاوت نفس عالی ہمتی، اور عوض قطع نظری کو جان چکے تھے۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ جان لے کہ یہ خصلت (یعنی عوض اور زیادتی کا ملن) اخلاق رذیلہ حسیہ میں سے ہے۔ اس لئے آپ علیہ السلام نے قبائل اور ان کے اچھے اخلاق کو پیش کر کے یہ ظاہر کیا کہ اس دیہاتی کا قبیلہ اس کے برخلاف ہے۔ اور اللہ پاک نے اپنے حبیب کو اس رذیل خصلت سے منع فرمایا ہے: ﴿ولا تمنن تستكثر﴾ [المندثر]

کشف میں ہے کہ نہ دیں اس حال میں کہ آپ زیادتی کے طلب گار ہوں، اور آپ کو ”استعوار“ سے منع فرمایا ”استعوار“ یہ ہے کہ کوئی کسی کو کوئی چیز ہبہ کے طور پر دے اس طمع اور لالچ سے کہ جس کو ہبہ دیا ہے وہ ہبہ کی ہوئی چیز سے زیادہ بدلہ دیدے گا اور یہ جائز ہے۔ اور اسی سے ہے: المستعور ثياب منی ہبتہ اور یہ ممانعت یا تو تحریمی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے یا ممانعت تنزیہی ہے جو آپ اور آپ کی امت کے لئے ہے۔

شرح السنن میں ہے کہ علماء کا اختلاف ہے اس ہبہ کے بارے میں جو مطلق ہو یعنی اس میں بدلہ کی شرط نہ ہو تو فقہاء میں سے ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ عوض کا تقاضا کرتی ہے اس حدیث کی وجہ سے۔ اور فقہاء میں سے بعض نے ہبہ کے بارے میں لوگوں کے تین طبقے بتائے ہیں: ایک آدمی کا ہبہ کرنا ہوتا ہے اپنے سے کم درجے والے کو تو یہ اس کی طرف سے اکرام اور مہربانی ہے، یہ عوض کا تقاضا نہیں کرتا۔ اور اسی طرح آدمی کا ہبہ کرنا ہے اپنی نظیر اور برابر والے کو۔ اور تیسرا آدمی کا ہبہ کرنا ہے اپنے سے بڑے کو تو یہ عوض کا تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ دینے والے کا ارادہ بخشش اور بدلے کا ہوتا ہے، عوض کی مقدار عرف و عادت پر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ موبوب کی قیمت کی مقدار ہو۔ اور بعض کہتے ہیں اتنا ہو جس سے واہب خوش ہو جائے۔ امام شافعی کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ ہبہ مطلقاً عوض کا تقاضا نہیں کرتا، چاہے وہ اپنے برابر کو یا کمتر کو یا اپنے سے بڑے کو ہبہ کرے، اور جو عوض کو لازم کرتے ہیں تو جب اس ہبہ کا عوض نہ ملے تو واہب کو رجوع کا حق حاصل ہے۔

۳۰۲۳: وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ أُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيَجْزِ بِهِ وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُفِنْ فَإِنَّ مَنْ أَنْتَى فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ وَمَنْ تَحَلَّى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبِي زُورٍ .

(رواہ الترمذی و ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۵۸/۵ الحدیث رقم ۴۸۱۳ و الترمذی فی ۴/۳۳۲ الحدیث رقم ۲۰۳۴۔
ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو کوئی چیز (بطور ہدیہ) دی جائے اور وہ اس کا بدلہ ادا کرنے پر قادر ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس کا بدلہ ادا کرے اور جو شخص بدلہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ ہدیہ دینے والے کی تعریف و توصیف کرے (اور اس کے دینے ہوئے ہدیہ کا اظہار کرے) کیونکہ جس شخص نے (اپنے محسن کی) تعریف کی اس نے گویا (اس کا) شکر ادا کیا (یعنی فی الجملہ اس کا بدلہ ادا کیا) اور جس شخص نے (کسی کا احسان) چھپایا (یعنی نہ تو اس نے کچھ دے کر اور نہ تعریف کر کے اس کا بدلہ ادا کیا) تو اس نے کفرانِ نعمت کیا اور (یاد رکھو) جو شخص اپنے آپ کو کسی ایسی چیز سے مزین کرے جو اسے نہیں دی گئی ہے تو اس کی مثال جھوٹ موٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی مانند ہے“۔ (ترمذی ابوداؤد)

تشریح: قولہ: مَنْ أُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ..... فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ:

اعطى: صیغہ مجہول کے ساتھ ”عطاء“: مفعول مطلق ہے اور ایک روایت میں شنبہ ہے اس صورت میں یہ مفعول ثانی ہے۔
فلیجز: جیم کے سکون کے ساتھ۔

فلیفن: یاء کے ضمہ کے ساتھ متعلق محذوف ہے ای علیہ، اور ایک روایت میں ”بہ“ ہے۔

فان من انٹی: اور ایک روایت میں ”فان انٹی بہ“ ہے۔

فقد شکر: اور ایک روایت میں ”شکرہ“ ہے

فقد کفر: یعنی کفرانِ نعمت کیا، یعنی اس کے حق کو اداء کرنا ترک کر دیا، اور ایک روایت میں ہے: ان کتمہ فقد کفرہ۔

قولہ: وَمَنْ تَحَلَّى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبِي زُورٍ:

لم يعط: طاء کے فتح کے ساتھ۔

كان کلابس ثوبی زور: اور ایک روایت میں ”فانہ کلابس ثوبی زور“ ہے یعنی جس نے دو جھوٹ بولے یا دو جھوٹے

چیز ظاہر کیے۔

آپ ﷺ نے یہ اس عورت کے جواب میں کہا تھا جس نے کہا اللہ کے رسول میری ایک سوکن ہے کیا مجھ پر گناہ ہوگا کہ میں اپنے

آپ کو ایسی چیز کے ساتھ سیر ظاہر کروں جو مجھے میرے شوہر نے نہ دی ہو۔ تو ایک جھوٹ اس کا یہ کہنا تھا کہ مجھے شوہر نے یہ دیا ہے اور دوسرا جھوٹ یہ ظاہر کرنا تھا کہ میرا شوہر مجھ سے میری سوکن سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

خطابی فرماتے ہیں کہ عرب میں ایک شخص تھا جو مشہور لوگوں کے لباس کی طرح دو کپڑے پہنتا تھا، تاکہ لوگ اس کو مشہور اور محترم آدمی خیال کریں۔ اس لئے کہ مشہور و محترم لوگ جھوٹ نہیں بولتے، پس جب لوگ اس ہیئت پر دیکھتے تو اس کی بات پر اعتماد کر لیتے اور اس کی جھوٹی گواہی پر اعتماد کر لیتے بوجہ اس کے اپنے آپ کو چھوٹوں کے ساتھ مشابہ بنانے کے، اور اس کے یہ کپڑے اس کے جھوٹ کے سبب بنے تھے اس لئے ان کا نام جھوٹ کے دو کپڑے رکھا گیا۔ یا اس وجہ سے کہ اس نے یہ کپڑے جھوٹ کے لئے پہنے تھے۔ اور چادر اور تہ بند کے اعتبار سے اس کو تشبیہ ذکر کیا، پس اس عورت کو تشبیہ اس آدمی کے ساتھ دی۔

اور نہایہ میں ہے کہ ”حلمی“ ہر اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے اپنے آپ کو آراستہ اور مزین کیا جائے۔ ابو سعیدہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ دکھلاوے والے ہیں جو صلحاء کا لباس پہن کر اپنے آپ کو صالح ظاہر کریں۔ اور اس کے علاوہ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ایسا پیراہن پہنے جس کی آستینوں کے نیچے مزید آستینیں لگائے، تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ اس نے دو پیراہن پہن رکھے ہیں۔ گویا کہ وہ اپنے آپ سے مذاق کرتا تھا۔ معنی یہ ہے کہ بمنزلہ اس جھوٹے کے ہے جو ایسی بات کرنے والا ہے جو ہوئی نہ ہو۔

اور بعض کہتے ہیں کہ دو کپڑوں کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ ان کے ساتھ اپنے آپ کو آراستہ کرنے والے نے دو جھوٹ بولے کہ اپنے آپ کو ایسی صفت کے ساتھ متصف کیا جو اس کے اندر موجود نہیں ہے اور دوسرے اس کو اس صفت کے ساتھ متصف کرے کہ اس کو صلہ رحمی کے ساتھ خاص کریں۔ تو اس بات کے ساتھ اس نے دو جھوٹ جمع کئے۔ ملاطفت قاری فرماتے ہیں کہ اس قول سے حدیث کے دونوں جملوں میں مناسبت ظاہر ہوگئی، اور سبب ورود کے ساتھ موافقت بھی ہوگئی۔ گویا کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے کچھ نہیں دیا اور وہ ظاہر یہ کرتا ہے کہ اس نے دیا ہے تو یہ دومرتبہ جھوٹا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”الادب المفرد“ میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

محسن کے لئے دعاء اجر و خیر

۳۰۲۳: وَعَنْ أَسْمَةَ بِنِ زَيْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ صُنِعَ إِلَيْهِ مَعْرُوفٌ فَقَالَ لِفَأِ عَلَيْهِ جَزَاكَ اللَّهُ

خَيْرًا فَقَدْ أَبْلَغَ فِي السَّنَاءِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۳۳/۴ الحدیث رقم ۲۰۳۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت اسماء بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے ساتھ بھلائی کی جائے اور وہ بھلائی کرنے والے کے حق میں یہ دعا کرے جزاک اللہ خیراً (یعنی اللہ تعالیٰ تجھے اس کا بہتر بدلہ دے) تو اس نے (اپنے محسن کی) بہت اچھی تعریف کی۔“ (ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غر: ب ہے۔

تشریح: قولہ: مَنْ صُنِعَ إِلَيْهِ مَعْرُوفٌ فَقَالَ لِفَأِ عَلَيْهِ جَزَاكَ اللَّهُ خَيْرًا فَقَدْ أَبْلَغَ فِي السَّنَاءِ :

صنع الیہ: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

معروف: ایک نسخ میں ”معروفا“ نصب کے ساتھ ہے۔

حاصل یہ کہ جس شخص کے ساتھ کوئی احسان کیا جائے اور وہ احسان کرنے والے کے حق میں یہ دعا کرے یعنی اللہ تعالیٰ تجھے بہتر

بدلہ دے، یا اللہ تجھے دنیا و آخرت کی بھلائی اور خیر دے۔ تو اس نے اپنے محسن کی کامل تعریف کی، خواہ یہ دعا اس کا بدلہ دینے سے عاجز آنے کے بعد کرے یا مطلقاً کرے اس نے ادائیگی شکر کا حق اداء کر دیا۔ کیونکہ اس نے اپنے محسن کا بدلہ اتارنے اور اس کی تعریف کرنے میں اپنے تصور کو تباہی کا اعتراف کیا اور اپنے عاجز ہونے کا اقرار کر کے اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سوچ دیا کہ اللہ تعالیٰ اس کو پورا پورا اجر عطا فرمائے۔

تخریج: اسی طرح نسائی اور ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

انسان کا شکر نہ اداء کرنے والا اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا

۳۰۲۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللَّهَ

(رواه احمد والترمذی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۰۷/۵ الحدیث رقم ۴۸۱۱ والترمذی فی ۲۹۹/۴ الحدیث رقم ۱۹۰۰ واحمد فی المسند

۲۰۸/۲

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔“ (احمد ترمذی)

تشریح: قال رسول اللہ ﷺ من لم يشكر الناس لم يشكر الله :

قاضی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے ادائیگی کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی تابعداری کی جائے اور اس کے اوامر کو بجالایا جائے۔ اور اس کے اوامر میں سے لوگوں کا شکر اداء کرنا ہے۔ جو اس تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے پہنچنے کا واسطہ بنتے ہیں۔ پس جس شخص نے اس میں اللہ تعالیٰ کی تابعداری نہیں کی، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے لوگوں میں سے اُس شخص کے شکر اداء کرنے میں کوتاہی کی، جس نے اس کے ساتھ احسان کیا۔ باوجود یہ کہ انسان تعریف پر اور نعمت کا شکر ادا کرنے پر حریص ہوتا ہے۔ اور اعراض اور کفرانِ نعمت پر اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ تو یہ زیادہ لائق ہے کہ اس ذات کا شکر اداء کرنے میں کوتاہی کرے جس کے ہاں شکر اور کفرانِ نعمت برابر ہے۔

تخریج: حدیث الجامع الصغیر میں ہے کہ احمد ترمذی، اور ضیاء نے حضرت ابوسعیدؓ سے روایت کیا ہے۔

شکرانِ نعمت کی اہمیت

۳۰۲۶: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمَدِينَةَ آتَاهُ الْمُهَاجِرُونَ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا رَأَيْنَا قَوْمًا أَبَدَلُوا مِنْ كَيْبَرٍ وَلَا أَحْسَنَ مَوَاسَاةٍ مِنْ قَلِيلٍ مِنْ قَوْمٍ نَزَلْنَا بَيْنَ أَظْهُرِهِمْ لَقَدْ كَفَرْنَا الْمُؤَنَّةَ وَأَشْرَكُونَا فِي الْمُهَنَّا حَتَّى لَقَدْ خَفْنَا أَنْ يَذْهَبُوا بِالْأَجْرِ كُلِّهِ فَقَالَ لَا مَادَعَوْتُمْ اللَّهَ لَهُمْ وَأَنْتُمْ عَلَيْهِمْ۔

(رواه الترمذی وصححه)

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ (مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لائے تو (ایک دن) مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! ہم نے ایسی کوئی قوم نہیں دیکھی جو زیادہ مالداراری میں بہت زیادہ خرچ کرنے اور کم مالداراری میں اچھی خدمت اور مدد کرنے کے وصف میں اس قوم سے بہتر ہو جس میں ہم آ کر اترے ہیں، انہوں نے (یعنی انصاریوں نے) ہمیں محنت کرنے سے روک دیا ہے اور تمام تر منفعات میں ہمیں شریک کر لیا ہے اور اب (ان کے اس جذبہ بخاوت و ایثار کو دیکھتے ہوئے) ہمیں تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ سارا اجر و ثواب کہیں

انہی کے حصہ میں نہ آجائے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”نہیں (تمام تر ثواب انہی کے حصہ میں نہیں آئے گا) جب تک کہ تم ان کے لئے اللہ سے دعا کرو ہو گے اور ان کی تعریف (یعنی شکرانہ نعمت ادا) کرتے رہو گے۔“ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔

تشریح: اتاہ المہاجرون: یہ اس وقت کی بات ہے جب انصار نے ان کی خدمت کی تھی اور اپنے مکانات اور باغات آدھے آدھے تقسیم کئے تھے۔ یہاں تک کہ بعض نے اپنی بیویوں میں سے سب زیادہ خوبصورت کو طلاق دے دی۔ تاکہ مہاجر اس سے شادی کر لے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس ایثار کی خبر اپنے اس ارشاد میں دی ہے: ﴿وَالَّذِينَ تَبَوؤْا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يَحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْتُونَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ حَصَاصَةٌ﴾ [الحشر۔ ۹]

معنی یہ ہے کہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا چاہے وہ مالدار ہو یا کم مال والا اور محتاج ہو۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں: کہ دونوں جار یعنی ”من قلیل“ اور ”و کثیر“ دونوں متعلق ہیں بدل اور موساسا کے اور ”من قوم“ صلہ ہے ”ابدل“ اور ”احسن“ کے لئے علی سبیل تنازع اور ”قوم“ مفصل ہے۔ اور قوم سے مراد انصار ہیں۔ اور انصار سے ”قوم“ کی طرف عدول کیا تاکہ تنگی دلالت کرے خیم شان پر۔ پس ممکن ہو جائے گا آنے والے اوصاف کا جاری کرنا اس پر ابہام کے بعد تاکہ یہ واقعہ فی انفس ہو۔ اس لئے کہ ابہام کے بعد وضاحت واقعہ فی انفس ہوتی ہے اور زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔

المؤنتہ: یعنی انہوں نے ہمیں خدمت کرنے سے باز رکھا۔ بایں طور کہ گھروں کی تعمیر اور باغات آباد کرنے وغیرہ کی مشقت، و محنت انہوں نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔

المہنءاء: میم اور نون کے فتح کے ساتھ یعنی جو ضرورت اور اصلاح معاش کے لئے کافی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں، جو تجھے بغیر کسی محنت و مشقت کے حاصل ہو۔ ابن الملک فرماتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے درختوں کے پھلوں میں ہمیں برابر کا شریک بنایا اور ان کو سیراب کرنے اور دیکھ بھال کی مشقت اپنے ذمہ لے لی۔ اور ہمیں آدھا پھل بھی دیا۔
لقد: اور ایک صحیح نسخہ میں حق لقد ہے۔ خفنا ان یذہبوا: ضمیر مرفوع انصار کی طرف راجع ہے۔

بالاجر کلہ: یعنی کہ اللہ تعالیٰ ہماری مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے اور تمام عبادات کا اجر و ثواب ان کو دیدے ان کے زیادہ احسان کی وجہ سے ہمارے ساتھ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ وہ تمہارے سارے اجر و ثواب کو نہیں لے سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و و کرم بہت وسیع ہے۔ تمہیں تمہاری عبادت کا ثواب ملے گا اور ان کی مددگاری کا اجر ملے گا۔

ما دعوتکم اللہ لہم و انیتم علیہم: یعنی جب تک ان کیلئے بھلائی کی دعا کرتے رہو گے۔ کیونکہ ان کے حق میں تمہاری یہی دعا ان کے احسان کا بدلہ ہو جائے گی۔ اور تمہاری عبادتوں کا ثواب تم ہی کو ملتا رہے گا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ جب انہوں نے محنت و مشقت کی ذمہ داری خود لے لی، اور ہمیں آرام اور آمدنی میں شریک بنایا، تو پس سارا اجر و ثواب انہوں نے محفوظ کر لیا۔ ہم ان کو بدلہ کیسے دیں۔ تو آپ ﷺ نے جواب دیا، کہ ایسا معاملہ نہیں ہے، جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ اس لئے کہ تم نے ان کی تعریف کی ہے ان کے احسان کا شکر اداء کرنے کے لئے اور اس پر قائم ہو۔ پس تم نے ان کا بدلہ دے دیا ہے۔

آپس میں تحفہ لین دین عداوتوں کو دور کرتا ہے

ترجمہ: ”اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دوسرے کو تحفہ دیا کرو کیونکہ تحفہ کینہ و عداوت کو دور کرتا ہے۔“ (ترمذی)

تشریح: تہادوا: دال کے فتح کے ساتھ ہے امر ہے ”تہادی“ بمعنی ”مہاداة“۔

فان الهدیة تذهب الضغائن: جمع ہے ضعیفہ کی۔ کینہ کو کہتے ہیں۔ یعنی بغض و عداوت کو ختم کر دیتا ہے اور الفت و محبت کو بڑھا دیتا ہے۔ جیسا کہ منقول ہے، کہ تم آپس میں تحفہ دیا کرو، ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے۔ اور آپس میں مصافحہ کرو۔ تمہارے آپس میں کینہ کو ختم کر دے گا۔ جیسا کہ ابن عساکر نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور ان کی ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے بھی منقول ہے: تہادوا تذداد حبا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں، یہ اس لئے کہ ناراضگی حسد، کینہ لاتی ہے۔ اور تحفہ رضامندی لاتا ہے۔ پس جب رضامندی کا سبب آ جائے گا تو ناراضگی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

رواہ: یہاں اصل میں بیاض ہے۔ بعد میں کسی نے ”الترمذی“ بڑھا دیا ہے۔ میرک شاہ فرماتے ہیں: اسی طرح جزری نے کہا ہے، اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ جزری نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

کمتر چیز کے تحفہ کا لینا دینا حقیر نہ سمجھو

۳۰۲۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ تَهَادُوا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تَذُهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ وَلَا تَحْقِرَنَّ جَارَةً لِحَارَتِهَا وَلَوْ شِقَ فَرَسٍ شَاةٍ . (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۸۳/۴ الحدیث رقم ۲۰۳۰ واحمد فی المسند ۲/۲۶۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دوسرے کو تحفہ دیا کرو کیونکہ تحفہ سینے کی کدورت کو دور کرتا ہے اور (یا رکھو) کوئی ہمسایہ اپنے دوسرے ہمسایہ کے (کسی کمتر چیز کے) تحفہ کو حقیر نہ جانے اگر چہ وہ بکری کے کھر کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔“ (ترمذی)

تشریح: ”وحر“ واؤ کے فتح اور حاء کے ساتھ۔ دل کی کدورت اور وسوسوں کو کہتے ہیں۔ اور بغض کہتے ہیں، کہ اس کا معنی ہے، کینہ اور غصہ اور بغض فرماتے ہیں، کہ سخت غصے کو کہتے ہیں۔ اور بغض کہتے ہیں کہ عداوت کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

ولا تحقرن جارة لجارته: جار مجرور محذوف کا متعلق ہے، جو ”تحقرن“ کا مفعول ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: لا تحقرن جارة هدية مهددة لجارته، اور یہ کلام سابق کیلئے تہہ ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے) اور نہایہ میں ہے کہ ”جارة“ سے مراد سوکن ہے، دوسوکنوں کے درمیان مجاورۃ (ہمسائیگی) کی وجہ سے اس کو ”جارة“ کہا ہے۔ اور اسی سے حدیث ام زرع کے الفاظ ہیں: و غیظ جار تہا یعنی وہ اس کے حسن کو دیکھ کر غصہ ہو جاتی تھی۔

قوله: ولو شق فرس بشاة:

”شق“، شین کے کسرہ کے ساتھ۔ یعنی اس کا آ ہا یا بعض حصہ۔ جیسا کہ منقول ہے اتقوا النار ولو بشق تمرة۔ کہ آگ سے بچو! اگر چہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ہو۔

”فرس“ فاء اور سین کے کسرہ کے ساتھ کم گوشت والی ہڈی کو کہتے ہیں۔ بکری اور اونٹ کا کھر۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے دوسرے جانوروں کیلئے ”حافر“ ہوتا ہے اس طرح بکری اور اونٹ کیلئے ”فرسن“ بمنزلہ ”حافر“ کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ہمسایہ اپنے ہمسایہ کے دیئے ہوئے تحفہ کو حقیر نہ سمجھے اگر چہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔

اور بعض روایات میں ’و لو بشق فرسن شاة‘ آیا ہے حرف جر کی زیادہ کے ساتھ، تقدیری عبارت یوں ہے: ولو ان تبعت الیہا اور فقدها۔ طیبی فرماتے ہیں، کہ ترمذی کی روایت میں باء کے بغیر ہے، اور اسی طرح جامع الاصول میں ہے۔ اس حدیث میں آپ علیہ السلام نے لوگوں کی راہنمائی کی اس بات کی طرف کہ آپس میں ہدیہ کیینہ اور بغض کو ختم کرتا ہے۔ پھر آپ علیہ السلام نے اس میں مبالغہ فرمایا، یہاں تک کہ سب سے کتر اور حقیر چیز کا ذکر کیا۔ آپس میں سب سے زیادہ بغض رکھنے والوں میں سے ایک کی طرف سے۔ یہ مطلب اس وقت ہوگا جب جمارہ کو وضو یعنی سوکن پر محمول کیا جائے۔ اور ظاہر بھی یہی ہے، اس لئے کہ اس میں تمیم کا معنی ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑون کو چاہئے کہ وہ اپنی پڑون کو جو اس کے پاس کھانے کی چیزیں ہیں ان میں سے بھیجے اگر چہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں، کہ اس کی تائید اس روایت سے ہوئی ہے، جو ابن عدی نے کامل میں حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے: تهادوا الطعام بینکم۔ فان ذلك توسعة فی ارزاقکم۔ کہ تم آپس میں کھانے کی چیزیں بطور تحفہ دیا کرو کہ اس سے تمہاری روزی میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوگی۔ اس طرح امام احمد نے بھی اور بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے تهادوا فان الهدیۃ تذهب بالسخیمۃ یعنی کینہ کو۔ اور طبرانی نے حضرت ام حکیم سے روایت کیا ہے فان الهدیۃ تضعف الحب۔ وتذهب بغوائل الصدر یعنی اس کے دوسے۔

۳۰۲۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثٌ لَا تَرُدُّ الْوَسَائِدَ وَالذَّهْنَ وَاللَّبْنَ (رواه الترمذی

وقال هذا حدیث غریب) قَبِلَ ارَادَ بِالذَّهْنِ الطَّيِّبِ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۰۰/۵ الحدیث رقم ۲۷۹۰۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جنہیں واپس نہیں کرنا چاہیے (یعنی ان کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے) (۱) تکیہ (۲) تیل (۳) دودھ۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ ”تیل“ سے آپ ﷺ کی مراد خوشبو تھی۔“

تشریح: لا ترد: یعنی ان کے قبول کرنے سے انکار مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کا احسان کم ہے اور انکار سے تحفہ دینے والے کو تکلیف پہنچتی ہے۔

الوسائد والذہن واللبن: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، مراد یہ ہے کہ مہمان کی تواضع اور اس کا اکرام کیا جائے تکیہ، خوشبو اور دودھ کے ساتھ۔ اور یہ تحفہ ہے جس کا احسان کم ہے۔ اس سے انکار مناسب نہیں ہے۔ (انتہی)

گویا کہ انہوں نے ”ذہن“ سے مراد خوشبولیا ہے، اور اس کو ”طیب“ سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد مطلقاً تیل ہے، اس لئے کہ عرب تیل کو اپنے سر کے بالوں میں استعمال کرتے ہیں۔ باقی ابن الملک کا کہنا ہے کہ تکیہ سے مراد وہ تکیہ ہے جس کی بھرائی کھجور کی چھال یا اون کی ہو۔ اس لئے کہ تکیہ کی بھرائی عام طور پر ان سے ہوتی تھی۔ اھ۔ ان کا یہ قول مردود ہے: اس لئے کہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے۔

قبیل اراد بالذہن الطیب: اور اس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے، اور شاید اس کے قائل کی مراد اس حدیث اور اس حدیث کے درمیان جو باب کے شروع میں گزری ہے، اور جو اس فصل کے آخر میں ہے، ان کو جمع کرنا اور ان میں تطبیق پیدا کرنا ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

خوشبودار پھول کا تحفہ واپس نہ کرو

۳۰۳۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ النَّهْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أُعْطِيَ أَحَدُكُمْ الرِّيحَانَ فَلَا يَرُدُّهُ فَإِنَّهُ

خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ (رواه الترمذی مرسلًا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۰۰/۵ الحدیث رقم ۲۷۹۱

ترجمہ: ”اور حضرت ابو عثمان نہدی (تابعی) کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کو خوشبودار پھول (بطور تحفہ و ہدیہ) دیا جائے تو وہ اسے واپس نہ لوٹائے (یعنی قبول کرنے سے انکار نہ کرے) کیونکہ وہ پھول جنت سے آیا ہے۔“ اس روایت کو امام ترمذی نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔“

تشریح: اذا اعطی: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

الریحان: منصوب ہے مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے۔

یردہ: وال مشدد کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور وال کو فتح بھی دیا جاتا ہے۔

قوله: فانہ خرج من الجنة: یعنی اس کی جڑ جنت سے آتی ہے۔

یعنی اس سے جنت کی خوشبو آتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ بہت کم احسان رکھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزرا ہے، یعنی بوجہ اور احسان کے اعتبار سے قلیل ہے۔ اس لئے اس کو رد نہیں کرنا چاہئے۔ اور بھی بہت ساری چیزوں کی جڑ جنت سے نکلی ہے۔

قوله: رواہ الترمذی مرسلًا: مفعول سے حال ہے۔ اور معنی اس کا یہ ہے کہ اس میں صحابی کا واسطہ حذف ہے۔ اور ابوداؤد نے بھی اس کو اپنی مراسیل میں روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

۳۰۳۱: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَتْ امْرَأَةٌ بِشِيرٍ أَنْحَلِ ابْنِي غَلَامَكَ وَأَشْهِدْ لِي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَاتِي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ إِنَّ ابْنَةَ فُلَانٍ سَأَلْتَنِي أَنْ أَنْحَلَ ابْنَهَا غَلَامِي وَقَالَتْ أَشْهِدْ لِي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ أَلَهُ إِخْوَةٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ أَفَكُلُّهُمْ أَعْطَيْتَهُمْ مِثْلَ مَا أَعْطَيْتَهُ قَالَ لَا قَالَ فَلَيْسَ يَصْلُحُ هَذَا وَإِنِّي لَا أَشْهِدُ إِلَّا عَلَى حَقٍّ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱۲۴۴/۳ الحدیث رقم (۱۹-۱۶۲۴) واحمد فی المسند ۳۲۶/۳

ترجمہ: ”حضرت جابر کہتے ہیں کہ (ایک صحابی) حضرت بشیرؓ کی زوجہ نے ان سے کہا کہ تم ”میرے بیٹے (نعمان) کو اپنا غلام ہیہ کہ دو اور اس پر میرے اطمینان کے لئے رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنا لو چنانچہ بشیرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ فلاں کی بیٹی (یعنی عمرہ بنت رواحہ) نے (جو میری بیوی ہے) مجھ سے یہ خواہش کی ہے کہ میں اس کے بیٹے (نعمان) کو اپنا غلام ہیہ کر دوں نیز اس نے یہ بھی کہا ہے کہ (اس بارے میں میرے اطمینان کے لئے) رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنا لوں! آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ”کیا اس بیٹے کے اور بھائی بھی ہیں؟“ انہوں نے عرض کیا کہ ”ہاں“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم نے ان سب کو اسی طرح (ایک ایک غلام) دیا ہے جس طرح اس (نعمان) کو دیا ہے۔“ انہوں نے عرض کیا کہ ”نہیں“۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ درست نہیں ہے اور میں حق بات کے سوا کسی پر گواہ نہیں بنتا۔“ (مسلم)

تشریح: انحل: ہمزہ وصل اور نون کے سکون اور جاء کے فتح کے ساتھ۔

ابنی غلامک: یہ ”انحل“ کے لئے مفعول ہے۔ قاموس میں ہے: انحلہ ماء اعطاه و مالا خصه بشيء منه کنحلہ فیہا سألنی ان أنحل: اس کو ”ان“ مصدر یہ اور صیغہ مضارع کے ساتھ ضبط کیا ہے۔

ابنہا غلامی: یہ عبارت ضبط اول کی تائید کر رہی ہے۔ اور سید کے نسخہ میں ہے: فعدلت عنه اس ضبط اول کی تائید اگلے کلام

سے بھی ہوتی ہے۔

وقالت) ”سالتنی“ پر عطف ہے۔ ای ”وقالت لی ایضاً۔ اخوة: اخ کی جمع ہے۔
کلمہ: نصب کے ساتھ اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔ اعطیتهم مثل ما اعطیتہ.....! استفہام فعل اول پر نصب ہے۔
اور مثل منصوب ہے مفعول ثانی ہونے بنا پر۔ وانی لا اشهد الا علی حق اس کے متعلق کلام پہلے گزر چکا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے پھل کا ہدیہ کس طرح قبول کرتے

۳۰۳۲: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا أُتِيَ بِبَاكُورَةِ الْفَاكِهَةِ وَضَعَهَا عَلَى عَيْنَيْهِ وَعَلَى

شَفْتَيْهِ وَقَالَ اللَّهُمَّ كَمَا أَرَيْتَنَا أَوْلَهُ فَارِنَا آخِرَهُ ثُمَّ يُعْطِيهَا مَنْ يَكُونُ عِنْدَهُ مِنَ الصَّبِيَّانِ۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی نیا پھل پیش کیا جاتا تو (پہلے) اس پھل کو (قبول فرما کر) اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے لگاتے پھر یہ فرماتے ”اے اللہ! جس طرح تو نے ہمیں اس پھل کا آغاز دکھایا ہے اسی طرح اس کا اختتام بھی ہمیں دکھا“۔ اسکے بعد آپ وہ پھل کسی ایسے بچے کو دیتے جو آپ ﷺ کے پاس موجود ہوتا۔“ (بخاری)

تشریح: بیا کورۃ الفاکہۃ: نہایہ میں ہے ہر چیز کے اول ”با کورۃ“ کہا جاتا ہے۔

قولہ: وضعہا علی عینہ وعلی شفٹیہ: اللہ کی نعمت کی تعظیم کی وجہ سے اور اس نعمت کے شکر میں

قولہ: وقال: اللهم كما أريتنا اوله فارنا آخره: دنیا میں تو یہ دعا درازی عمر کے لئے ہے۔ اور عقبی میں ہو تو اشارہ ہے، کہ

آخرت کے آگے دنیا کی کیا حقیقت ہے۔ اور دنیا کی نعمتیں ختم ہونے والی ہے اور یہ آخرت کی نعمتوں کا ایک نمونہ ہیں۔

ثم يعطيها من يكون عنده۔ من الصبيان: اس لئے کہ بچوں کا میلان اس کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ اور موافقت ان کے

درمیان تم ہے۔ اور علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ آپ نے پھل کو بچوں کو اس لئے دیتے تھے کہ بچہ دل کا پھل اور انسان کا نیا پھل ہوتا ہے۔

جزیٰ نے حسن میں ذکر کیا ہے کہ آپ جب نیا پھل دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے ”اللهم بارک لنا فی ثمرنا وبارک لنا فی منابتنا

وبارک لنا فی صاعنا وبارک لنا فی مدنا“۔ اور جب آپ ﷺ کے پاس کوئی نیا پھل لایا جاتا، تو وہاں حاضر بچوں میں سے سب سے

چھوٹے کو بلاتے اور یہ پھل اس کو دیتے۔ اس کو روایت کیا ہے مسلم، ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ سب نے حضرت ابو ہریرہؓ سے۔

بَابُ اللَّقْطَةِ

لقطہ کا بیان

”لقطۃ“ لام کے ضمہ اور قاف کے فتح کے ساتھ، اور قاف کو ساکن بھی کیا جاتا ہے۔ مغرب میں ہے کہ ”لقطہ“ وہ چیز جو تم کو (راستہ

میں) پڑی ہوئی ملے اور تم اٹھا لو۔ از ہری کہتے ہیں کہ ”لقطۃ“ کو قاف کے سکون کے ساتھ میں نے لیث کے علاوہ کسی سے نہیں سنا ہے۔

ہمارے علماء میں سے بعض شرح فرماتے ہیں کہ قاف کے فتح کے ساتھ گے ہوئے مال کو کہتے ہیں۔ لقطہ الہیء والنقط سے

ہے بمعنی اخذہ من الارض ”زمین سے اٹھانا“۔ اور یہی اکثر کی رائے ہے۔ اور ظلیل فرماتے ہیں، کہ ”لقطۃ“ قاف کے فتح کے ساتھ ”

ملتقط“ (اٹھانے والے) کو کہتے ہیں۔ اسم فاعل کے دوسرے نظائر پر قیاس کرتے ہوئے جیسے ”ہمزۃ“ اور لمزۃ، اور گے ہوئے

مال کو ”لقطۃ“ قاف کے سکون کے ساتھ کہتے ہیں۔

الفصل الاول:

۳۰۳۳: عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَسَأَلَهُ عَنِ اللَّقْطَةِ فَقَالَ أَعْدِفْ عِهَا صَهَا وَوَكَاءَ هَا ثُمَّ عَرَفَهَا سَنَةً فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَإِلَّا فَشَانُكَ بِهَا قَالَ فَصَالَةَ الْغَنَمِ قَالَ هِيَ لَكَ أَوْلَىٰ حَيْثُ أَوْلَدْتَنِي قَالَ فَصَالَةَ الْإِبِلِ قَالَ مَالِكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاءُ هَا وَحِدَاءُ هَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتَّىٰ يَلْقَاهَا رَبُّهَا (متفق عليه وَفِي رِوَايَةِ لِمُسْلِمٍ) فَقَالَ عَرَفَهَا سَنَةً ثُمَّ أَعْرِفْ وَكَاءَ هَا وَعِفَا صَهَا ثُمَّ اسْتَفِيقْ بِهَا فَإِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَأَدِّهَا إِلَيْهِ.

اخرجه البخارى فى صحيحه ۹۱/۵ الحديث رقم ۲۴۲۹ ومسلم فى صحيحه ۱۳۴۶/۳ الحديث رقم (۱-۱۷۲۲) وابو داؤد فى السنن ۳۳۱/۲ الحديث رقم ۱۷۰۴ والترمذى فى ۶۵۰/۳ الحديث رقم ۱۳۷۲ وابن ماجه فى ۸۳۶/۲ الحديث

رقم ۲۵۰۴ ومالك فى الموطأ ۷۵۷/۲ الحديث رقم ۴۶ من كتاب الاقضية واحمد فى المسند ۱۱۶/۴

ترجمہ: ”حضرت زيد بن خالد کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے لقطہ کے بارے میں دریافت کیا (کہ اگر کوئی گری پڑی چیز پائی جائے تو کیا کیا جائے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پہلے تو اس کی تھیلی اور اسے باندھنے والی رتی کو پہچان لو (یعنی اگر وہ چیز کسی کپڑے یا چمڑے کے تھیلے وغیرہ میں ہے تو اسے شناخت میں رکھو) پھر ایک سال تک اس کا اعلان کرو (ایک سال کی مدت میں) اگر اس کا مالک آجائے تو وہ چیز اس کے حوالہ کرو اور اگر (ایک سال کی مدت میں) وہ نہ آئے تو پھر اسے اپنے استعمال میں لے آؤ۔ پھر اس شخص نے گمشدہ بکری کے بارے میں دریافت کیا (کہ اگر کسی کی گم شدہ بکری کوئی شخص پکڑ لائے تو اس کا کیا کرے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وہ تمہاری ہے یا تمہارے بھائی کی ہے اور یا بھیڑیے کی ہے“۔ اس کے بعد اس شخص نے گمشدہ اونٹ کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کا کیا حکم ہے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تمہیں اس سے کیا مطلب ہے (یعنی اسے نہ پکڑو کیونکہ وہ ضائع ہو جانے والی چیز نہیں ہے اس لئے اس کو پکڑ کر لانے کا ضرورت نہیں) اس کا (پانی کا) مشکیزہ اور اس کے موزے اس کے ساتھ ہیں۔ جب تک اس کا مالک اس کے پاس نہ پہنچ جائے وہ (پیس لگنے پر) پانی کے گھاٹ تک جا سکتا ہے اور درخت کے پتے کھا سکے گا“۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ ”(جب اس شخص نے لقطہ کے بارے میں دریافت کیا تو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک سال تک اس کا اعلان کرو اور اس کی رتی اور تھیلے کو پہچان لو (اس مدت تشہیر میں اگر اس کا مالک نہ آئے تو) پھر اسے اپنے استعمال میں لے آؤ اور اگر اس کے بعد اس کا مالک آجائے۔ اس چیز کی قیمت ادا کرو“۔

تشریح: قال: جاء رجل الى رسول الله ﷺ فسأله عن اللقطة:

عفاصها: عین کے کسرہ کے ساتھ برتن۔

وکاء: واؤ کے کسرہ کے ساتھ یعنی جس کے ذریعے باندھا جاتا ہے۔ فائق میں ہے کہ ”عفاص“ اس برتن کو کہتے ہیں جس میں لقطہ ہو۔ خواہ چمڑے کپڑے وغیرہ۔ اور نہایہ میں ہے کہ ”وکاء“ اس دھاگے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے تھیلی، اور بوٹہ وغیرہ کو باندھا جاتا ہے۔

ابن الملک کہتے ہیں، کہ آپ نے اس چیز کا ظرف اور سر بند پہچان لینے کا حکم اس لئے دیا، کہ جو شخص اس کی ملکیت کا دعویٰ کر لے گا اس پہچان کی وجہ سے اس کا سچا یا جھوٹا ہونا معلوم ہو جائے۔

شرح السنۃ میں ہے کہ ”اعرف عفاصها“ میں علماء کا اختلاف ہے، کہ اگر کوئی شخص لقطہ اٹھانے والے کے پاس آئے اور ظرف اور اس کے سر بند کی پہچان کر دے اور اس لقطہ کا مالک ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ لقطہ اسے دیدینا واجب ہے یا نہیں؟

چنانچہ امام مالک اور امام احمد تو یہ کہتے ہیں، کہ اس صورت میں وہ لفظ اسے بغیر کسی گواہی کے دیدینا واجب ہے۔ کیونکہ ظرف اور اسکے سر بند کی پہچان رکھنے کا یہی مقصد ہے۔ لیکن امام شافعی اور حنفیہ کہتے ہیں، کہ اگر کوئی شخص لفظ کے ظرف اور اسکے سر بند کی پہچان اور اس لفظ کا وزن یا عدد بتا دے، نیز لفظ اٹھانے والے کے دل میں یہ بات آ جائے کہ یہ شخص سچا ہے تب وہ لفظ اس شخص کو دیدینا جائز ہے، ورنہ تو گواہ پیش کرنے کے بعد دے۔ اسلئے کہ کبھی وہ لفظ کی صفات کو صحیح بیان کر دیتا ہے چونکہ لفظ اٹھانے والے کو لفظ کا وصف بیان کرتے ہوئے سنا ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں ظرف اور سر بند کی پہچان رکھنے کا مطلب یہ ہوگا، ملتقط اس لفظ کی نشانیاں اچھے طریقہ سے پہچان لے تاکہ وہ اسکے مال میں اس طرح خلط ملط نہ ہو جائے، کہ جب لفظ کا مالک آئے تو وہ اپنے مال و اسباب اور لفظ کے درمیان امتیاز نہ کر سکے۔
عرفہا: راء مشدده کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں، کہ ظاہر میں ایک سال اس کی تشبیر کرنے کا حکم تکرار کا تقاضا کرتا ہے عرف اور عادت کے طور پر۔ اگرچہ ”سنہ“ کی ظرفیت تعریف کیلئے۔ ایک مرتبہ واقع ہونے پر بھی صادق آتا ہے، لیکن لازم ہے، اس کو حمل کرنا ”معتاد“ طریقے پر۔ کہ گاہے بگاہے اس کا اعلان کرے۔ اور بارہا اس کا اعلان کرے جب بھی اس کے مالک کے وجود کا گمان ہو۔

ابن الملک فرماتے ہیں، کہ پہلے ہفتے میں ہر روز دو مرتبہ اعلان کرے، ایک مرتبہ صبح اور ایک مرتبہ شام کو۔ اور دوسرے ہفتے میں ہر روز ایک مرتبہ اعلان کرے، پھر ہر ہفتے میں ایک مرتبہ اعلان کرے۔ اور امام محمد نے اصل میں تشبیر کی مدت ایک سال متعین کی ہے کم اور زیادہ کی تفصیل کے بغیر۔ ان کی دلیل یہی حدیث ہے اور یہی امام مالک، شافعی اور احمد کا قول ہے۔

صحیح یہ ہے کہ مذکورہ بالا مقدار میں سے کوئی بھی لازم نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ اٹھانے والے کی رائے پر موقوف ہے حدیث مسلم کے اطلاق کی وجہ سے کہ آپ ﷺ نے لفظ کے بارے میں فرمایا: ”عرفہا فان جاء احدہم بعددہا و عانہا و وکانہا فاعطہ ایاہا و الا فاستمتع“ (اس میں ”سنہ“ کی قید نہیں ہے)۔ اور اس حدیث میں جو ”سنہ“ کی قید ہے، یہ شاید اس وجہ ہو کہ جس لفظ کے بارے میں آپ ﷺ سے سوال کیا گیا تھا، اس کا تقاضا یہی تھا۔ اور اس لئے کہ غالب یہی ہے کہ لفظ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔

فان جاء صاحبہا: شرط ہے، جزاء معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کر دی۔ ای فردھا الیہ أو فبہا و نعمت أو أخذھا۔
فشأنك بها: ہمزہ کے ساتھ ہے، اور ہمزہ کو الف سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ یہ منصوب ہے، مصدریت کی بناء پر۔ کہا جاتا ہے: شأنت شأنہ ای قصدت قصدہ، و شان شأنك یعنی وہ عمل کر جس کو تو اچھا سمجھے۔ (اس کو ذکر کیا ہے علامہ طبری رحمہ اللہ نے)۔
اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ای خذ شأنك ہے۔ یعنی اس کے ساتھ وہ معاملہ کریں جو آپ چاہیں، صدقہ کرنا بیچنا، کھانا وغیرہ۔

حاصل یہ ہے کہ اگر لفظ اٹھانے والا اور محتاج ہے، تو وہ اس سے خود فائدہ اٹھائے ورنہ صدقہ کر دے۔ قاضی فرماتے ہیں، کہ اس سے معلوم ہوا کہ جس نے لفظ اٹھایا اور پھر ایک سال تک اس کی تشبیر کی، اور اس کا مالک ظاہر نہ ہوا، تو یہ اس کا مالک بن جاتا ہے، چاہے یہ مالدار ہو یا فقیر ہو۔ چنانچہ اکثر صحابہ تابعین، امام شافعی، امام احمد اور اسحق کا یہی مسلک ہے۔

اور حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ مالدار آدمی لفظ کو صدقہ کرے، اور خود اس سے فائدہ نہ اٹھائے، اور اس کا مالک نہ بن جائے۔ ثوری، ابن المبارک اور حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ مسلک اول کی تائید ابی بن کعب کی اس روایت سے ہوتی ہے۔ و وجدت صرة۔
الی قوله، فان جاء صاحبہا و الا فاستمتع بها، اور حضرت ابی انصار کے مالداروں میں سے تھے۔

قال: ضمیر مرفوع الرجل کی طرف راجع ہے۔

فضالة الغنم؟ لام کی تشدید کے ساتھ، گمشدہ یا چھوڑی ہوئی۔ یہ مبتدا ہے۔ اور اس کی خبر محذوف ہے۔ ای ما حکمہا؟ یعنی اس کا کیا حکم ہے؟

قال هی لك : یعنی اگر آپ نے اس کو لیا اس کی تشبیہ کی، اور اس کے مالک کو نہیں پایا، تو پھر آپ اس کے مالک بن سکتے ہیں۔
اولا خیک : مراد اس سے مالک ہے، یعنی اگر آپ نے اس کو لیا اور پھر اس کا مالک ظاہر ہوا، تو یہ اس کی ہے۔ یا آپ نے اس کو
چھوڑ دیا، اور اتفاق سے مالک نے اس کو پایا، تو پھر بھی اس کی ہے۔ بعض کہتے ہیں، کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر آپ اس کو بطور لفظ نہیں لیں
گے، تو تیرے علاوہ کوئی اور اس کو بطور لفظ لے گا۔ (أو للذنب : ہمزہ کے ساتھ ہے، اور ہمزہ کو یاء سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی
اگر آپ اس کو چھوڑ دیں گے، تو بھیر یا اسے پکڑ لے گا۔ اس میں اس کے لینے پر ترغیب ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اس کو چھوڑ دیں اور آپ کے علاوہ کسی اور کو بھی اس کے لینے کا اتفاق نہیں
ہوا، تو پھر غالب یہ ہے کہ اس کو بھیر یا کھا لے گا۔ گویا کہ آپ ﷺ نے تشبیہ کی، اس کے پکڑنے اور مالک بننے کے جواز پر اور اس کے
پکڑنے کی علت پر تشبیہ کی، اور وہ اس کا ضائع ہونا ہے، تا کہ یہ دلالت کرے اس حکم کے مطرد ہونے پر ہر اس جانور میں جو بغیر چرواہے اور
نگہبان کے اپنی حفاظت نہ کر سکتا ہو۔

مالک لها : کہا گیا ہے، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا اس سے کیا کام ہے، یعنی آپ اسے چھوڑ دیں، اور مت پکڑیں۔

سقاؤ : سین کے کسرہ کے ساتھ یعنی اس کا معدہ، یہ سیراب کرنے میں مشک کے مانند ہے، اس لئے کہ اونٹ جب پانی پیتا ہے، تو
وہ اتنا پیتا ہے، جو کئی دن تک اس کی پیاس کیلئے کافی ہوتا ہے۔ حذا : حاء کے کسرہ کے ساتھ، کھر۔
معها سقائھا وحذاؤھا : ظاہر یہ ہے کہ جملہ مستانفہ ہے، علت بیان کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔

بعض شرح فرماتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اونٹ کے پاس اپنے اسباب معاش ہوتے ہیں جس کے ذریعے وہ زندہ رہ سکتا
ہے۔ یعنی اس کے پیاس سے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے، اس لئے کہ وہ پیاس پر صبر کر سکتا ہے۔ اور چراگاہ تک جانے کی طاقت رکھتا
ہے۔ ”سقاء“ دودھ اور پانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد اس کی اوڑھی کے اندر کا پانی ہے۔ اس لئے کہ وہ سیراب کرنے
میں مشک کے مانند ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ وہ پیاس کو برداشت کر سکتا ہے اس لئے کہ اونٹ تمام جانوروں میں پیاس کو زیادہ برداشت
کرنے والا جانور ہے۔

ترد الماء : یعنی آتا ہے اور اس سے پیتا ہے۔ اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿ولما ورد ماء مدین﴾ ترجمہ: ”اور جب مدین
کے پانی پر پہنچے“۔

وتاکل الشجر حتی یلقھا ربھا : یہاں رب سے مراد ”مالک“ ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ سقاء سے مراد یہ ہے
کہ یہ جب پانی پر جاتا ہے تو اتنا پیتا ہے، کہ وہ پیاس بچھا لیتا ہے، اور یہ سب سے زیادہ پیاس برداشت کرنے والا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ
اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹ ضرورت کے وقت پانی کی طرف جاتا ہے۔ پس آپ ﷺ نے اس کے پیاس برداشت کرنے کو یا پانی پر
اترنے کو بمنزلہ مشک قرار دیا۔ اور ”حذاء“ سے مراد اس کے کھر ہیں جس کی وجہ سے چلنے اور دور مسافت کو قطع کرنے اور دور پانی تک
جانے کی طاقت رکھتا ہے۔

اس ارشاد گرامی میں آپ ﷺ نے اونٹ کو اس مسافر سے تشبیہ دی ہے، جس کے پاس جوتے اور مشک وغیرہ ہوں۔ اور رب کی
اضافت اس کی طرف کی ہے اس لئے کہ جانور نہ عبادت پر مامور ہیں، اور نہ ہی مخاطب ہیں۔ پس یہ بمنزلہ ان اموال کے ہیں، کہ جن کی
طرف مالک کی اضافت جائز ہوتی ہے۔ اور مالک کو ان کیلئے ”رب“ قرار دینا درست ہوتا ہے (جیسے رب المال)۔

قاضی فرماتے ہیں کہ ”معها سقاءھا“ کی قید سے اشارہ کیا ہے، کہ اونٹ کو بطور لفظ لینے سے مانع اور اونٹ اور بکری کے درمیان
فرق وہ اونٹ کا ”استقلال بالنعیش“ ہے، یہ صورت ان اونٹوں میں متحقق ہے جو صحراء میں پائے جاتے ہیں۔ باقی جو کسی بستی یا شہروں میں
پایا جائے، تو اس کو بطور لفظ پکڑنا جائز ہے کسی مانع کے نہ ہونے کی وجہ سے اور موجب کے وجود کی وجہ سے اور وہ موجب اس کے تلف

سے اٹھا رہا ہوں۔ اگر اس نے اس طرح کیا اور پھر اس کا اعلان نہیں کیا، تو بھی کافی ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ ”فہو ضال“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ پانے والا راہ راست پر نہیں ہے، گروہ اس کا اعلان نہ کرے۔ یا جو چیز اس نے پائی ہے وہ اسی طرح گمشدہ ہے جس طرح تھی۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ”ضال“ سے مراد گمشدہ اونٹ وغیرہ ہو جن کو بطور تملک پکڑنا جائز نہیں ہے، بلکہ ان کو حفاظت کی نیت سے پکڑا جاتا ہے۔ پس وہ شخص گمراہ ہے جس نے اس کی حفاظت کی اور اعلان نہیں کیا۔

تخریج: اسی طرح احمد نے بھی۔

حنفیہ کے ہاں زمین حل اور زمین حرم کا لفظ برابر ہے

۳۰۳۵: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّمِيمِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ لُقْطَةِ الْحَاجِّ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱۳۵۱/۳ الحدیث رقم (۱-۱۷۲۴) و ابوداؤد فی ۳۴۰/۲ الحدیث رقم ۱۷۱۹ و احمد فی

المسند ۴۹۹/۳

ترجمہ: ”اور حضرت عبدالرحمن بن عثمان تیمیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجاج کرام کی گری پڑی چیز اٹھانے سے منع فرمایا ہے۔“ (مسلم)

حالاتِ راوی:

عبد الرحمن بن عثمان تیمی صحابی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو پایا ہے لیکن ان سے کوئی روایت نہیں ہے۔ اور ان سے علماء کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ اس کو مؤلف نے ذکر کیا ہے۔ پس ان کی یہ حدیث مراہیل صحابہ میں سے ہوگی اور وہ سب کے ہاں حجت ہے۔

تشریح: قولہ: ان رسول اللہ ﷺ نہی عن لُقْطَةِ الْحَاجِّ: یعنی ان کے لفظ کے مالک بننے سے یا مطلقاً اٹھانے سے یا حرم میں اٹھانے سے فرمایا ہے۔ قاضی کہتے ہیں، کہ یہ حدیث اس بات کا احتمال رکھتی ہے، کہ اس سے مراد حرم میں حاجیوں کے لفظ اٹھانے سے ممانعت ہو۔ حدیث میں حرم اور غیر حرم کے لفظ میں فرق آیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مطلقاً اس کے اٹھانے سے ممانعت ہو، کہ اسی جگہ پر اس کو چھوڑ دیا جائے اور بلند آواز سے اسی جگہ اس کا اعلان کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ طریقہ سب سے زیادہ قریب ہے اس کے مالک کے ظاہر ہونے کے لئے۔ اس لئے کہ حجاج ایک ساتھ بہت کم دنوں تک جمع رہتے ہیں پھر الگ ہو جاتے ہیں، تو ان کے منتشر ہونے کے بعد اعلان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ (انہجی)۔ ہمارے بعض علماء نے قاضی کی اس بات کی اتباع کی ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں، کہ یہاں لفظ سے مراد حرم مکہ کا لفظ ہے، یعنی حرم مکہ کی حدود میں پائے جانے والے لفظ کا اعلان ہونے کے بعد بھی مالک ہونا جائز نہیں ہے بلکہ اٹھانے والے کیلئے واجب ہے کہ وہ اس کو ہمیشہ کیلئے محفوظ رکھے مالک کے واسطے۔ چنانچہ امام شافعی کا یہی مسلک ہے، اور ہمارے نزدیک حرم اور غیر حرم کا لفظ برابر ہے۔ ابن ہمام کی شرح ہدایہ میں ہے کہ ابن وہب فرماتے ہیں، کہ اس وقت تک اس کو چھوڑے رکھے جب تک کہ اس کا مالک نہ آئے۔ لیکن اس زمانہ میں اس پر عمل نہیں ہے، چوری کے عام ہونے کی وجہ سے مکہ میں کعبہ کے ارد گرد چہ جائیکہ متروک چیز کو کوئی چھوڑ دے۔

اور احکام کی مشروعیت جب معلوم ہو جائے باعتبار شرط کے۔ پھر اسکی ضد کا ثبوت معلوم ہو جائے جو کئی فساد کو متضمن ہو، اسکی مشروعیت کے ساتھ تو وہ احکام منقطع ہو جاتے ہیں۔ برخلاف ان احکام کے جن کی مشروعیت معلوم ہو کسی سبب کی وجہ سے جب سبب کا انتفاء معلوم ہو جائے، اور بقاء حکم میں کوئی مفسدہ نہ ہو تو اسکا منقطع ہونا لازم نہیں۔ جیسے ریل اور طواف میں اضطباع طاقت کے اظہار کے لئے۔

اسی طرح احمد اور ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثالثی:

ویران وغیر آباد زمین کے لفظ اور دینہ کا حکم

۳۰۳۶: عَنْ عُمَرُو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْقَمْرِ الْمُعْلَقِ فَقَالَ مَنْ أَصَابَ مِنْهُ مِنْ ذِي حَاجَةٍ غَيْرَ مُتَّخِذٍ حُبْنَةً فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ وَمَنْ حَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ فَعَلَيْهِ غَرَامَةٌ مِثْلِيهِ وَالْعُقُوبَةُ وَمَنْ سَرَقَ مِنْهُ شَيْئًا بَعْدَ أَنْ يُؤْوِيَهُ الْبَحْرَيْنُ فَلَعَنَ مَنْ الْمَجْنُونِ فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ وَذَكَرَ فِي صَلَاةِ الْإِبِلِ وَالْفَنَمِ كَمَا ذَكَرَ غَيْرُهُ قَالَ وَسُئِلَ عَنِ اللَّقْطَةِ فَقَالَ مَا كَانَ مِنْهَا فِي الطَّرِيقِ الْمَيْتَاءِ وَالْقَرْيَةِ الْجَامِعَةِ فَعَرَّ فَهَا سَنَةٌ فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا فَادْفَعَهَا إِلَيْهِ وَإِنْ لَمْ يَأْتِ فَهُوَ لَكَ وَمَا كَانَ فِي الْغُرَابِ الْعَادِي فَبِهِ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمْسُ (رواه النسائي وروى ابوداود عنه مِنْ قَوْلِهِ) وَسُئِلَ عَنِ اللَّقْطَةِ (إلى آخره)۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۳۶/۲ الحدیث رقم ۱۷۱۰ و الترمذی فی ۵۸۴/۳ الحدیث رقم ۱۲۸۹ و النسائی فی ۸۵/۸

الحدیث رقم ۴۹۵۸ و ابن ماجہ فی ۸۶۵/۲ الحدیث رقم ۲۵۹۶ و احمد فی المسند ۲۸۰/۲

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور شعیب اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے (درختوں پر) لگے ہوئے پھلوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی حاجت مند کچھ پھل (توزکر) کھالے مگر اپنی جھولی میں بھر کر نہ لے جائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (کھائے بھی اور) جھولی بھر کر نہ لے بھی جائے تو اس پر دو گنا تاوان اور سزا ہے اور جو شخص ان پھلوں میں سے کچھ چرائے جو کھلیان میں رکھے جا چکے ہوں اور وہ چرائی ہوئی مقدار ایک سیر (ڈھال) کی قیمت کے بقدر ہو تو اس کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ راوی نے گمشدہ اونٹ اور بکری کے بارے میں اس سوال و جواب کا تذکرہ کیا جو دوسروں نے بیان کیا ہے (اور جو پہلے گزر چکا ہے) اس کے بعد راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ ﷺ سے لفظ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لفظ کسی ایسے راستے پر پایا جائے جس پر آمد و رفت رہتی ہو اور گاؤں و آبادی کے قریب ہو تو اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اس کا ایک سال تک تشہیر و اعلان کرو اور پھر جب (اس کا) مالک آجائے تو وہ لفظ اس کے حوالہ کر دو اور اگر مالک نہ آئے تو وہ لفظ تمہارا ہے (کہ تم اسے اپنے استعمال میں لا سکتے ہو) اور وہ لفظ ویران قدیم جگہ میں پایا جائے اس کا اور زمین سے برآمد ہونے والے دینے کا یہ حکم ہے کہ اس میں ٹرس (یعنی پانچواں حصہ) لازم ہے (یعنی اس چیز کا یا دینہ کا پانچواں حصہ اللہ کی راہ میں دے دیا جائے) (نسائی) اور ابوداؤد نے اس روایت کو عمر بن شعیب سے وَسُئِلَ عَنِ اللَّقْطَةِ تک نقل کیا۔

تشریح: نمبر: ثاء اور ميم کے فتح کے ساتھ ہے۔

حیث: خاء کے ضم اور باء کے سکون کے ساتھ ہے۔ وہ خوراک جو چوپایا کے یجائی جائے۔

العقوبة: رفع کے ساتھ۔ یہاں اس سے ”تعزیر“ مراد ہے۔

ان یؤویہ: حاضر تمام نسخوں میں یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ تو ریشمی فرماتے ہیں۔ آوی اور آوی، ایک معنی میں ہے۔ اور مقصور

دونوں سے متعدی اور لازم دونوں استعمال ہوتا ہے۔ اور متعدی میں سے یہ حدیث ہے۔ اس کا معنی ہے ملانا اور جمع کرنا۔

الجورین: جیم کے فتح اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ پھل کھانے کی جگہ کو کہتے ہیں، یہ پھلوں کیلئے ایسا ہے، جیسے گندم کیلئے کھلیان

ہوتا ہے۔ اور عادات اس کو ”حرز“ سمجھا جاتا ہے۔

المجن: میم کے کسرہ جیم کے فتح اور نون کے شد کے ساتھ ”ڈھال“ کو کہتے ہیں۔ اسکو عربی میں ”درقہ“ بھی کہتے ہیں۔
الطریق المیتاء: جامع الاصول میں اسی طرح ہے، اور مصابیح کے نسخوں میں اور مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں ”طریق المیتاء“
”اضافت کے ساتھ ہے۔ ”میتاء“ میم کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ عام آمد و رفت والا راستہ اس کو ”الجادة“ بھی کہا جاتا ہے۔
تو ریشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”میتاء“ عام راستے کو کہتے ہیں، اور ”مجتمع الطرق“ (جہاں بہت سارے راستے ملتے ہوں) اس کو
بھی ”میتاء“ کہتے ہیں۔ اور ”الحداد“ اس راستے کو کہتے ہیں جس پر راہ گیر چلتے ہوں۔ یہ ”اتیان“ سے ”مفعال“ کے وزن پر ہے۔
یعنی جس پر لوگوں کی آمد و رفت ہو۔ (اتقی)۔

پس ”میتاء“ میں یاء اصل میں ہمزہ ہے، اس کو یاء سے تبدیل کیا ہے، جوازاً اور اس میں ہمزہ اصل میں یاء ہے، جس کو ہمزہ سے
تبدیل کیا ہے وجوباً۔ فتا مل۔

العادی: یاء کی تشدید کے ساتھ۔ بمعنی قدیم۔ خمس: خاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ من ذی حاجة: من کیلئے بیان ہے۔
غیر متخذ: ”غیر“ نصب کے ساتھ ہے۔ ”اصاب“ کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر۔ اور ایک نسخہ میں جر کے ساتھ ہے ذی
حاجة کی صفت ہونے کی بناء پر۔

وان لم یأت: ضمیر مرفوع ”صاحبها“ کی طرف راجع ہے۔ اور اس کلام میں تفضن ہے۔

ذی حاجة: ضرورت مند سے مراد فقیر ہے، یا مضطر ہے

غیر متخذ حینہ فلا شیء علیہ: اس پر کلام باب الغصب میں گزر چکا ہے۔ ابن ملک فرماتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ
اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن اس پر تاوان لازم ہے۔ یا یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا، اور امام احمد نے اس کو بغیر ضرورت کے
بھی جائز قرار دیا ہے۔

قوله: ومن خرج بشیء فعلیہ غرامة مثلیہ: یعنی دو گنی قیمت اس پر لازم ہوگی۔

والعقوبة: ابن الملک فرماتے ہیں، کہ یہ زجر اور وعید کے طور پر ہے۔ ورنہ تلف کرنے والے پر قیمت مثلی سے زیادہ لازم نہیں
ہے۔ اور حضرت عمرؓ اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے، ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے۔ اور یہی امام احمد کا مسلک ہے۔ اور بعض کہتے ہیں
کہ یہ ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

شرح السنہ میں ہے کہ یہ لازم کرنا تاوان اور تعزیر کے طور پر ہے، اس چیز میں جو اس نے نکالی ہے۔ اس لئے کہ یہ اس ضرورت کے تحت
نہیں آتا جس کی رخصت دی گئی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ مالکان اس میں چشم پوشی بھی نہیں کرتے۔ برخلاف اس تھوڑی سی مقدار کے
جس کو کھایا جائے۔ اور شاید دو گنا تاوان زجر میں مبالغہ کیلئے ہو یا اس وجہ سے کہ ابتداء اسلام میں اسی طرح سخت حکم تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ اور
اس میں ہاتھ کاٹنے کو لازم نہیں کیا، بلکہ اس پر لازم کیا اس میں جو پایا جائے جو کھلیان میں جمع ہو

ومن سرق منه شیءاً: الی آخرہ۔ اس لئے کہ باغات مدینہ میں اس زمانہ میں محفوظ اور (چار دیواری میں گھرے ہوئے نہیں
ہوتے تھے۔ اسی لئے اس کو مقید کیا ہے

بعد أن یؤویہ العرین: جرین پھلوں کے لئے ایسا ہوتا ہے، جیسا کہ بکریوں کے لئے باڑہ ہوتا ہے۔ اور اشیاء کی حفاظت عادت
کے مطابق ہوتی ہے۔

فبلغ ثمن المجن: قیمت سے مراد نصاب سرقہ ہے۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں ڈھال چوتھائی دینار کے برابر تھی۔ بعض کہتے
ہیں، کہ دس درہم کے برابر ہوتی تھی جو چوری کا نصاب ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں۔

فعلیہ القطع: اور شرح السنہ میں ہے کہ ڈھال کی قیمت سے مراد تین درہم ہیں، اور اس کی شہادت اس روایت سے ملتی ہے، جو

ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈھال جس کی قیمت تین دراهم تھی اس کے چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا۔

قوله: سنل عن اللقطة، فقال ما كان في الطريق الميئاء۔۔۔ فادفعها اليه، وان لم يأت فهو لك يعني تيري ملكيت ہے، یا تیرے لیے خاص ہے، اس میں تصرف کر۔ حاصل یہ ہے کہ جو لفظ کسی ایسے راستے پر پایا جائے، جو آبادی کے قریب ہونے کی وجہ سے گزرگاہ عام و خاص ہو، تو اس کی تشہیر و اعلان واجب ہے، کیونکہ غالب گمان ہے کہ وہ کسی مسلمان کا ہوگا۔

قوله: وما كان في الخراب العادي ففیه وفي الرکاز الخمس: اس سے مراد یہ ہے کہ جو لفظ کسی ویران گاؤں یا قدیم زمین جہاں مسلمانوں کی عمارت نہ ہوں، اور نہ کسی مسلمان کی ملکیت میں داخل ہوں، خواہ وہ چیز سونا یا چاندی ہو یا برتن اور فرنیچر وغیرہ۔ اس کو دینہ کا حکم دیا، اس لئے کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ اس کی ملکیت نہیں ہے۔

”الرکاز“ راء کے کسرہ کے ساتھ جاہلیت کے دینہ کو کہتے ہیں، گویا کہ اس کو زمین میں گاڑا گیا ہے۔

لقطه استعمال میں آجانے کے بعد اس کا مالک طلب کرے تو اس کا بدل دینا چاہئے

۳۰۳۷: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ وَجَدَ دِينَارًا فَاتَى بِهِ فَاطْمَأَنَّ عَنْهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَذَا رِزْقُ اللَّهِ فَاکْلَ مِنْهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَاکْلَ عَلِيٌّ وَفَاطْمَأَنَّ فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذَلِكَ آتَتْ امْرَأَةٌ تَنْشُدُ الدِّينَارَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا عَلِيُّ إِذَا الدِّينَارَ. (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۳۷/۲ الحدیث رقم ۱۷۱۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت علی بن ابی طالب نے (کسی راستہ میں بطور لقطہ) ایک دینار پایا۔ حضرت علیؓ اسے حضرت فاطمہؓ کے پاس لے آئے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”یہ اللہ کا رزق ہے“۔ پھر اس دینار (سے خریدی ہوئی چیز) کو آپ ﷺ نے بھی کھایا اور حضرت علیؓ و حضرت فاطمہؓ نے بھی کھایا اس کے بعد جب ایک عورت اپنا دینار ڈھونڈتی ہوئی آئی تو آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ ”اے علی! اس عورت کو دینار دے دو“۔ (ابو داؤد)

تشریح: تشدد: شین کے ضمہ کے ساتھ بمعنی طلب کرنا۔

اکل منہ رسول اللہ واکل علی: اس میں عامل مکرر لایا گیا ہے مبالغہ کیلئے یا تعظیم کیلئے۔

یہ حدیث اعلان نہ کرنے پر دلالت نہیں کرتی، اور نہ عدم پر دلالت کر رہی ہے۔ کہ اس وقت تک کہ جب غالب گمان یہ ہو کہ اب مالک اس چیز کو نہیں ڈھونڈے گا۔ اس لئے کہ فاء کبھی صرف ”بعديت“ بتانے کیلئے آتا ہے، تو ترتیب کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اگر فاء تعقیب کیلئے بھی ہو، تو اس صورت میں تعقیب ہر چیز میں اس کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: تزوج فلان فولد له۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے، جب نکاح اور ولادت کے درمیان صرف مدت حمل گزری ہو۔ اگرچہ مدت لمبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿الم تر ان الله انزل من السماء ماء فتصبح الارض مخضرة﴾ [الحج - ۳]۔ ”اور اے مخاطب! کیا تجھ کو یہ خبر نہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے زمین سرسبز ہوئی“۔

پس صاحب شرح السنہ کا یہ قول کہ ”یہ دلیل ہے کہ شئی قلیل کیلئے اعلان نہیں کیا جائے گا“ تو یہ محل بحث ہے۔

اور اسی طرح ابن الملک کا یہ قول کہ آپ ﷺ نے ان کو اپنے پاس رکھنے اور اس کی تشہیر کرنے کا حکم نہیں دیا اس لئے کہ لقطہ جب شئی

قلیل ہو، تو اس کی تشہیر نہیں کی جاتی۔ (انتہی)

لیکن یہ مذہب محفوظ کے خلاف ہے، اس لئے کہ دینار شئی قلیل نہیں ہے، کہ جس کے اعلان کی ضرورت نہ ہو۔ جیسا کہ اس قاضی

خان اور ان کے علاوہ علماء نے تصریح کی ہے۔ اشرف کہتے ہیں، کہ اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ غنی لفظ کا مالک بن سکتا ہے، جیسا کہ فقیر بن سکتا ہے، اور یہ کہ لفظ استعمال کرنا ان لوگوں کیلئے بھی حلال ہے، جن کیلئے صدقہ حلال نہیں ہے اس لئے کہ نبی علیہ السلام غنی تھے چونکہ اللہ نے آپ ﷺ کو مال فنی عطاء کیا تھا۔ اور آپ اور علیؓ اور فاطمہؓ ان لوگوں میں سے تھے جن کیلئے صدقہ کا مال حلال نہیں تھا۔ (اتحلی)

ابن الملک نے ان کی پیروی کی ہے، اور اس لئے کہ یہ ان کے مذہب کے خلاف ہے، کہ مالدار لفظ کا مالک نہیں بن سکتا۔ باوجود یہ کہ یہ بات بھی محل بحث ہے کہ آپ علیہ السلام مال فنی کی وجہ سے مالدار تھے۔ اس لئے کہ غنی سے یہاں مراد وہ ہے، جو سونے چاندی وغیرہ نصاب کا مالک ہو۔

قوله: یا علی أد الدینار: اس سے معلوم ہوا کہ لفظ اٹھانے والے پر مالک کو لفظ کا بدلہ دینا واجب ہے، جب مالک ظاہر ہو جائے۔ یہ اشرف نے کہا ہے۔ اور اسی طرح اگر مالک صدقہ کرنے کے ثواب پر راضی نہ ہو اگر ملتقط نے صدقہ کر دیا ہو۔

لقطہ بری نیت سے نہ اٹھاؤ

۳۰۳۸: وَعَنِ الْجَارُودِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ صَالَةَ الْمُسْلِمِ حَقُّ النَّارِ. (رواه الدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴/۲۶۵ الحدیث رقم ۱۸۸۱ والدارمی فی ۲/۳۴۴ الحدیث رقم ۲۶۰۱ واحمد فی المسند ۵/۸۰ ترجمہ: ”اور حضرت جارود کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان کی گم شدہ چیز (اگر بغیر تشہیر و اعلان کے اٹھالی جائے تو وہ دوزخ کی آگ کا ایک شعلہ ہے)۔ (دارمی)

تشریح: صالۃ المسلم: نہایت میں ہے ہی الضانعة من کل ما یقتنی من الحيوان وغيره۔ کہا جاتا ہے: ضل الشيء ضائع ہونا۔ اور یہ اصل میں ”فاعلة“ ہے۔ پھر اس میں توسع ہوا تو صفات غالبہ میں سے ہو گیا۔ یہ مذکر، مؤنث، مشنہ، جمع، سب پر بولا جاتا ہے۔ اور اس کی جمع ”ضوال“ آتی ہے۔ حرق: حاء اور راء کے فتح کے ساتھ ہے، اور کسی راء کو ساکن بھی کیا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ لفظ کا لینا اس شخص کو جنم کے شعلوں کی طرف لے جاتا ہے جو اس کا اعلان و تشہیر نہ کرے اور اس میں خیانت کی نیت ہو۔ تخریج: اس حدیث کو احمد، ترمذی، نسائی اور ابن حبان نے۔ عبد اللہ بن شہیر سے اور طبرانی نے عاصم بن مالک سے روایت کیا ہے۔

جب لقطہ اٹھاؤ تو کسی کو گواہ بناو

۳۰۳۹: وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ وَجَدَ لُقْطَةً فَلْيُشْهِدْ دَاعِدًا أَوْ ذَوِي عَدْلٍ وَلَا يَكْتُمُ وَلَا يَغِيبُ فَإِنْ وَجَدَ صَاحِبَهَا فَلْيُرُدَّهَا عَلَيْهِ وَإِلَّا فَهُوَ مَالُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

(رواه احمد و ابو داؤد و الدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/۳۳۵ الحدیث رقم ۱۷۰۹۔ وابن ماجہ فی ۲/۸۳۷ الحدیث رقم ۲۵۰۵ واحمد فی المسند ۴/۱۶۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت عیاض بن حمار کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز پائے تو چاہئے کہ وہ کسی عادل شخص کو یا فرمایا کہ دو عادل شخصوں کو گواہ بنا لے اور (اس کی تشہیر و اعلان نہ کر کے) اس لفظ کو نہ چھپائے اور نہ اسے (کسی دوسری جگہ بھیج کر) غائب کرے۔ پھر اگر (اس کا) مالک آجائے تو وہ لفظ اس کے حوالہ کر دے ورنہ وہ اللہ کا مال ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے (غیب سے) مال عطا فرماتا ہے۔“ (احمد ابو داؤد دارمی)

تشریح: عیاض: عین کے کسرہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ۔

حمار: حاء کے کسرہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ بعض نسخوں میں جو حاء کے فتح اور میم کے شد کے ساتھ ضبط کما ہے، نہ تحف

ہے۔ اس کی طرف معنی نے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: عیاض بن حمار بلفظ حیوان ناہق۔ اھ
لا یغیب: غین معجمہ کے فتح اور یا تجزیہ کے شد کے ساتھ ہے۔ ”ولایکنم“ کا تعلق ”لقطہ“ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور ”تغیب“ کا
تعلق ”ضالۃ“ کے ساتھ ہے۔

او ذوی عدل: راوی کو شک ہے۔ یا او بمعنی بل ہے۔ یا او تنویح کیلئے ہے۔
شرح السنہ میں ہے کہ یہ حکم تا ذہبی اور ارشادی ہے۔ یہ حکم دو وجہ سے دیا ہے: ایک تو اس لئے تاکہ شیطان اس کو وہ لفظ اپنے پاس
رکھے اور امانت اداء کرنے کے ترک پر نہ ابھارے۔ دوسرا اس وجہ سے تاکہ وہ لفظ کے مال کو باقی ترکہ میں چھوڑے ہوئے مال کے ساتھ
نملادے۔ اور بعض حضرات نے حدیث کے ظاہر مفہوم کی وجہ سے گواہ بنانے کو واجب کہا ہے۔

قولہ: فہو مال اللہ یوتیہ من یشاء: شرح طبری میں ہے: قولہ: فہو مال اللہ اور حدیث سابق میں ”رزق اللہ“ ہے۔ یہ
دونوں عبارت ہیں حلت سے اور یہ محترمہ کیلئے دلیل نہیں بن سکتا کہ حرام رزق نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ مقام لفظ کی مدح کا ہے، نہ کہ حلال
وحرام بیان کرنے کا مقام ہے۔ اور ”فہو مال اللہ“ میں فاء جواب شرط کیلئے ہے۔ اور اس کا گرانا جائز ہے۔ جیسا کہ بخاری کی روایت
میں ہے: والوا استمتع بها۔ مالکی فرماتے ہیں کہ حدیث میں جواب شرط سے فاء اور مبتدا دونوں کو ایک ساتھ حذف کیا ہے۔

لقطہ کی وہ مقدار جس میں اعلان و تشہیر کی ضرورت نہیں

۳۰۴۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ رَخَّصَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي الْعَصَا وَالسُّوْطِ وَالْحَبْلِ وَأَشْبَاهِهِ يَلْتَقِطُهُ الرَّجُلُ
يَنْتَفِعُ بِهِ. (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داود فی السنن ۳۳۹/۲ الحديث رقم ۱۷۱۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لاشی، کوڑے، رسی اور اسی کی مانند اشیاء کے بارے میں (کہ جو
عام طور پر کم تر بھی جاتی ہیں) یہ رخصت دی تھی کہ آدمی اسے اپنے استعمال میں لا کر فائدہ حاصل کرے۔“ (ابوداؤد)
تشریح: الف مقصورہ کے ساتھ ہے۔

يلتقطه الرجل: یہ صفت ہے یا حال ہے۔

ينتفع به: اس کا حکم یہ ہے کہ اسے اٹھانے والا فقیر ہو تو بغیر تشہیر کے اپنے استعمال میں لے آئے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے، کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے، کہ اکثر لفظ شی قلیل ہو تو اس کی تشہیر نہ کی جائے۔ بعض علماء نے یہ کہا
ہے کہ اگر وہ لفظ دس درہم سے کم ہو تو وہ قلیل ہے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں، کہ جو لفظ ایک دینار اور اس سے کم ہو، تو وہ کمتر مال ہے
جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول حدیث سے معلوم ہوا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ کمتر اور حقیر مال جس کی تشہیر نہ کی جاتی ہو، وہ جوتا، لاشی، اور
جراب وغیرہ ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے لفظ کو مالک کے لئے حفاظت کی نیت سے اٹھانا اس کے چھوڑنے سے افضل ہے۔ اگر علماء کے
نزدیک۔ اور بعض فرماتے ہیں، کہ اس کا اٹھانا حلال ہے اور چھوڑنا افضل ہے۔ اور منصف حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا اٹھانا بھی جائز
نہیں ہے۔ لیکن صحیح قول ہمارے علماء کا قول ہے خصوصاً ہمارے زمانہ میں۔

اور جب کوئی لفظ اٹھالے، تو اس کا اعلان کرے اور کہے کہ میں نے لفظ اٹھایا ہے، یا کوئی گمشدہ چیز پائی ہے یا میرے پاس کوئی چیز
ہے۔ پس جس کو تم سنو کہ وہ اس کو طلب کر رہا ہے، تو میری طرف اس کی راہنمائی کرو۔ اور اس تشہیر کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔
امام محمد رحمہ اللہ کتاب میں فرماتے ہیں، کہ ایک سال تک اس کی تشہیر کرے، اور انہوں نے لفظ کے کم اور زیادہ کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی

ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں، ایک روایت میں ہے کہ اگر وہ لفظ دو سو درہم یا اس سے زیادہ مالیت کا ہو، تو ایک سال تک اس کا اعلان کرے۔ اور اگر دو سو درہم سے کم کا ہو اور دس درہم یا اس سے زیادہ ہو کا تو ایک ماہ تک اعلان کرے اور اگر دس درہم سے کم مالیت ہو تو تین دن تک اس کا اعلان کرے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اگر پانچ درہم تک کی مالیت کی چیز ہو، تو ایک دن اس کا اعلان کرے۔ اور اگر پانچ سے دس تک کی ہو، تو دو سے زیادہ دن تک اس کا اعلان کرے۔ اور اگر دس سے پچاس درہم کی مالیت کا ہو، تو ایک ہفتہ اس کی حفاظت کرے۔ اور پچاس سے سو تک کی ایک ماہ تک تشہیر و اعلان کرے۔ اور سو سے دو سو تک کا چھ ماہ تک اعلان کرے۔ اور دو سو سے ہزار تک اور اس سے زیادہ کا ایک سال تک اعلان کرے۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں، کہ ایک درہم کی تین دن تک حفاظت کرے، اور دابق یا اس سے زیادہ کی ایک دن حفاظت کر لے اور اعلان کرے۔ اور اگر اس سے کم ہو تو دائیں بائیں دیکھ کر صدقہ کر دے۔

امام اہل ابو بکر محمد بن ابی ہبل سرخی فرماتے ہیں، کہ مدت کی مقدار میں یہ کوئی بھی لازم نہیں ہے، بلکہ لفظ اٹھانے والے کی رائے کے حوالہ کیا جائے، کہ وہ اس کا اعلان کرے اس وقت تک کہ جب اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اب مالک اس کے بعد اس کو طلب نہیں کرے گا۔ پس اگر اس کے بعد مالک آئے تو اس کے حوالہ کر دے۔ اور اگر نہ آئے تو پھر اس کو اختیار ہے، چاہے تو اس کو مالک کے آنے تک پاس رکھے اور چاہے تو صدقہ کر دے۔ اور اگر صدقہ کرنے کے بعد مالک آجائے، تو پھر مالک کو اختیار ہے چاہے تو صدقہ کو جائز قرار دے دے اور ثواب اس کیلئے ہو جائے اور اگر صدقہ کو جائز قرار نہیں دیتا، تو پھر اگر وہ لفظ فقیر کے پاس محفوظ ہے، تو اس سے لے لے۔ اور اگر وہ فقیر کے پاس موجود نہیں ہے، تو پھر اس کو اختیار ہے، چاہے تو فقیر سے تاوان لے اور چاہے تو لفظ اٹھانے والے سے تاوان لے۔ اور جس سے بھی تاوان لے لے وہ دوسرے سے رجوع نہیں کر سکتا۔

لفظ اٹھانے والے کو چاہئے کہ وہ لفظ اٹھاتے وقت کسی کو گواہ بنا لے، کہ وہ یہ لفظ مالک کیلئے حفاظت کی نیت سے اٹھا رہا ہے۔ پس اگر اس نے گواہ بنایا تو لفظ اس کے ہاتھ میں امانت ہوگا۔ اور اگر گواہ نہیں بنایا، تو وہ گنہگار ہوگا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور محمد کے قول کے مطابق۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ہاں ہر حال میں امانت ہوگا جب اس کا ارادہ اپنے لئے رکھنے کا نہ ہو۔

لفظ اٹھانے والا ضامن نہیں ہوگا، مگر اس پر ظلم اور تعدی کرنے کی صورت میں یا مانگتے وقت روکنے کی صورت میں یہ اس صورت میں ہے کہ جب کسی کو گواہ بنانا ممکن ہو۔ اور اگر وہ کسی کو گواہ بنانے کیلئے نہ پائے یا اس کو خوف ہو کہ اگر وہ کسی کو گواہ بنائے گا تو ظالم آدمی اس سے یہ لفظ لے لے گا، تو اس نے گواہ نہیں بنایا تو تلف ہونے کی صورت میں یہ ضامن نہ ہوگا۔

معدی کرب: غیر منصرف ہے۔

یہ مکمل روایت یوں ہے: **الا لایحل الحمار الاہلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لفظة معاہد الا ان یتغنی عنہا صاحبہا الا لایحل ظمن میں جس کا اکثر حصہ اس باب کے مناسب ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب**

بَابُ الْفَرَائِضِ

فرائض کا بیان

”فرائض“ ہمزہ کے ساتھ ”فریضة“ کی جمع ہے۔ چھوڑے ہوئے مالیت میں شریعت کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حصوں کو کہتے ہیں۔ شرح السنۃ میں ہے کہ ”فرائض“ اصل میں ”قطع“ کرنے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ”فرضت لفلان“ جب کسی کیلئے مال

میں سے کوئی چیز الگ کی جائے۔ اور مغرب میں ہے کہ فریضہ نام ہے ہر اس چیز کا جو مکلف پر مقرر کی جائے۔ اور مقرر کی ہوئی چیز کو بھی ”فریضہ“ کہا جاتا ہے۔ میراث کے حصوں کو بھی ”فرائض“ کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ وراثت کیلئے مقرر ہوتے ہیں۔ مگر میراث کے مسائل کے علم کو ”علم الفرائض“ کہا جاتا ہے اور اس کے جاننے والے یعنی عالم کو ”فرضی“ اور ”فارض“ کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: ”افرضکم زید“ تم میں سے میراث کو تم میں سب سے زیادہ جاننے والا زید ہے۔

الفصل الاول :

۳۰۴۱: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ أَنَا أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ فَمَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ وَلَمْ يَتْرُكْ وَقَاءَ فَعَلَىٰ قَضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَا لَا قَلْبَورْتَبِهِ (وَفِي رِوَايَةٍ) مَنْ تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضِيَاعًا فَلْيَاتِنِي فَإِنَّا مَوْلَاهُ (وَفِي رِوَايَةٍ) مَنْ تَرَكَ مَا لَا قَلْبَورْتَبِهِ وَمَنْ تَرَكَ تَكَلًّا فَلْيَاتِنَا. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۶۱/۵ الحدیث رقم ۳۹۹۹ و مسلم فی ۱۲۳۷/۳ الحدیث رقم (۱۰۵-۱۶۱۹) و ابوداؤد فی السنن ۳۶۱/۳ الحدیث رقم ۲۹۵۵ و النسائی فی ۶۶/۴ الحدیث رقم ۹۶۳ و ابن ماجہ فی ۸۰۷/۲ الحدیث رقم ۲۴۱۵ و احمد فی المسند ۵۶/۲

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں مسلمانوں کا ان کی جانوں سے بھی زیادہ حقدار ہوں (یعنی دین و دنیا کے ہر معاملہ میں ایک مسلمان اپنے اوپر جتنا شفیق و مہربان ہو سکتا ہے میں اس پر اس سے بھی زیادہ شفیق و مہربان ہوں۔ اسی لئے ان کے قرضوں کو ادا کرنے میں زیادہ حق دار ہوں) لہذا جو شخص (یعنی مسلمان) انتقال کر جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔ اور جو شخص (اتنا) مال چھوڑ جائے (جو اس کے قرض کی ادائیگی اور اس کی ہوائی وصیت کی شرعی تکمیل کے بعد بھی بچ جائے) تو وہ اس کے ورثہ کا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ”جو شخص مقروض ہونے کی حالت میں یا اہل و عیال چھوڑ کر مر جائے (اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کے قرض کی ادائیگی ہو سکے یا اس کے اہل و عیال کی ضرورت پوری ہو سکے) تو (اس کا وکیل یا وصی) میرے پاس آئے میں ان کا حامی و مددگار ہوں (یعنی میں اس کا قرض ادا کروں گا اور اس کے عیال کی نگہداشت و غم خواری کروں گا)۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ مال اس کے ورثہ کا ہے اور جو بھاری چیز (یعنی قرض اور عیال) چھوڑ کر مرے تو اس (کے وکیل یا وصی) کو چاہیے کہ ہمارے پاس آئے۔ (یعنی میں اس کا قرض ادا کروں گا اور اس کے اہل و عیال کی نگہداشت و غم خواری کروں گا)۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: ضیاعاً: ضاد کے فتح کے ساتھ کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ ”عیال“ کے معنی میں ہے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ ”ضیاع“ فتح کے ساتھ ہے، اور مراد اس سے ”عیال“ ہے۔ ”العالتہ“ مصدر ہے اسم فاعل کی جگہ اس کو ذکر کیا ہے مبالغہ پیدا کرنے کیلئے۔ جیسے ”عدل“ اور ”صوم“ ہے اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ بھی روایت کیا ہے یہ جمع ہے ”ضائع“ کی جیسے ”جیاع“ جمع ہے ”جانع“ کی شرح السنہ میں ہے کہ ”ضیاع“ نام ہے اس چیز کا جس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اگر اس کی نگہبانی اور غور نہ کیا جائے، جیسے چھوٹے بچے اور اپنا بچ جو اپنے امور کو نہیں سنبھال سکتے اور وہ لوگ جو ان کی طرح ہوں۔

کلا : کاف کے فتح اور لام کے شد کے ساتھ اس کے معنی میں نقل۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ﴾

[النحل- ۱۷۶] ”اور وہ اپنے مالک پر ایک وبال جان ہے“۔ یہ دین اور عیال دونوں کو شامل ہے۔

ترك : اسی سے ”التركة“ ہے۔ فائق میں ہے، کہ ”تو کہہ“ نام ہے ”متروک“ کا جیسا کہ ”طلبیہ“ اسم مطلوب ”کا“ اور تركة الحب ”اسی سے ہے۔

انا اولی بالمؤمنین من انفسهم: یعنی دین و دنیا کے ہر معاملہ میں ایک مسلمان اپنے اور پر خود جتنا شفیق و مہربان ہو سکتا ہے میں اس پر اس سے بھی زیادہ مہربان و شفیق ہوں۔ اس لئے ان کے قرضوں کو اداء کرنے میں زیادہ حق دار ہوں۔

وفی روایۃ من ترک مالا فلورثۃ ومن ترک کلا فالینا: یعنی اس ٹھکانہ ہم ہیں وہ ہمارے پاس آئے۔ ان کی وفات کے بعد میں ان کے امور کا ذمہ دار ہوں ان کی مدد اس مدد سے پڑھ کر کروں گا جو مدد وہ مرنے والا ان کی کرتا اگر وہ زندہ ہوتا۔

پس اگر انہوں نے کچھ مال چھوڑا ہو، تو میں اس سے ناجائز طریقے سے کھانے والوں کو دفع کروں گا، کہ وہ اس کے ارٹھار نہ پھریں تاکہ وہ مال وراثت کیلئے خالص رہے۔ اور اگر انہوں نے مال نہیں چھوڑا، اور عیال اور اولاد کا بوجھ چھوڑا ہو تو میں ان کی کفالت کروں گا، اور میں ان کا ٹھکانہ ہوں، اور اگر انہوں نے قرض چھوڑا ہو، تو اس کا اداء کرنا میری ذمہ داری ہے۔ اور اسی وجہ سے تو اللہ پاک نے اس آیت میں آپ ﷺ کا یہ وصف بیان کیا ہے: ﴿بالمؤمنین رؤف رحیم﴾ [التوبہ: ۱۲۸]

اور آیت میں فرمایا: ﴿النبی اولی بالمؤمنین من انفسهم﴾ [الاحزاب: ۶] ترجمہ: ”نبی مؤمنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں“۔ اور مناسب یہ ہے کہ آیت کی یہی تفسیر کی جائے اس لئے کہ اس آیت: ﴿واذوا جہ امہاتہم﴾ ترجمہ: ”اور آپ ﷺ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں“ کا مطلب اس وقت میل کھاتا ہے کہ جب ہم کہیں کہ آپ ﷺ شفیق باپ کی طرح ہیں، بلکہ زیادہ نرم دل اور مہربان ہیں۔

اس حدیث کو احمد، نسائی، اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

۳۰۳۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اَلْحَقُّوْا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِوَلِيِّ رَجُلٍ ذَكَرُوْا . (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۹/۱۲ و الحدیث رقم ۶۷۳۲ و مسلم فی صحیحہ ۱۲۳۳/۳ الحدیث رقم (۲-۱۶۱۵) و ابو داؤد فی السنن ۳۱۹/۴ الحدیث رقم ۲۸۹۸ و الترمذی فی السنن ۳۶۴/۴ الحدیث رقم ۲۰۹۸ و الدارمی فی الحدیث رقم ۶۶۴/۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میراث کے مقررہ حصے (جو قرآن کریم میں متعین کئے گئے ہیں) حصہ داروں کو دے دو پھر جو کچھ بچے وہ میت کے ایسے مرد و مرثاء (عصب) کا حق ہے جو رشتہ میں میت کا سب سے قریبی ہو“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: الحقو: ہمزہ کے فتح اور حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

بقی: قاف کے کسرہ کے ساتھ۔

الاولی: ”اقرب“ کے معنی میں ہے۔ شرح طبری میں ہے کہ علماء فرماتے ہیں کہ ”اولی“ سے مراد ”اقرب“ ہے یہ ”ولی“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ”قرب“

فما بقی فهو لاولی رجل ذکر: ”ذکر“ کی قید تاکہ قید کیلئے ہے۔ یا ”خشی“ سے احتراز ہے۔ اور بعض کہتے ہیں، کہ اس سے مراد ہے کہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اور ”رجل“ کو یہاں ”ذکر“ کے ساتھ متصف کرنا اس بات پر تنبیہ ہے، کہ اس کی میراث کے استحقاق کا سبب ”ذکورہ“ ہے جو سبب ”عصبوبہ“ ہے۔ جو میراث میں ترجیح کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے تو مرد کیلئے دو عورتوں کے برابر حصہ مقرر کیا ہے۔

اس کی حکمت یہ ہے کہ مردوں پر خرچ کا بوجھ زیادہ پڑتا ہے، اہل و عیال کیلئے انتظام کرنا، مہمانوں کیلئے انتظام کرنا آنے والوں کی مدد کرنا مانگنے والوں کے ساتھ مواسات کرنا اور نادان وغیرہ۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”اولی“ یہاں ”احق“ کے معنی میں نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ہم نہیں جانتے کہ کون زیادہ حقدار ہے،

بلکہ یہ ”اقرب“ کے معنی میں ہے۔ اور اس سے معلوم ہوا کہ ”اقرب“ ہی وہی ہے جو زیادہ مقدر ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ذوی الفروض کو متعین کرنے کے بعد فرمایا: ﴿أَبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا﴾ [النساء - ۱۱] ترجمہ: ”تمہارے اصول و فروع جو ہیں، تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں کونسا شخص نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے۔“

اور ”رجلا“ کے بعد ”ذکر“ کا ذکر کرنا تاکید کیلئے ہے، اس لئے کہ ”رجل“ مشہور (استعمال) کے مطابق بنی آدم میں سے ”بالغ نر“ کو کہتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ”خنثی“ مشکل سے اختر از کرنے کیلئے ہے۔ اس لئے کہ اس کو نہ تو عصبہ بنایا جاتا ہے، اور نہ ذوی الفروض میں شمار ہوتا ہے یقینی طور پر بلکہ اس کیلئے میراث میں ایک متعین اور حتمی مقدار مقرر ہے، اور وہ مقدار اس کو مرد اور عورت فرض کرنے کی صورت میں جو کم ہو وہ ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ”ذکر“ کی قید یہ اس بات کے بیان کیلئے ہے کہ عصبہ کو میراث میں حصہ ملتا ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ برخلاف زمانہ جاہلیت کی عادت کے کہ وہ میراث صرف اس کو دیتے تھے جو حد ”رجولیت“ تک پہنچا ہو۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ مجاز کی نفی کیلئے ذکر کیا ہے، اس لئے کہ کبھی قوی اور طاقتور عورت کو بھی ”رجل“ کہا جاتا ہے مجازاً۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہاں موصوف کو صفت کے ساتھ ”عصبہ“ کی جگہ لایا گیا ہے، گویا کہ اصل میں اس طرح کہا گیا ہے: فیما بقی فهو لأقرب: کہ جو مال بچ جائے وہ عصبات میں سے زیادہ قریبی رشتہ دار کیلئے ہے۔ اور ان کا نام ”عصبہ“ رکھا ہے، اس لئے کہ وہ اس کا احاطہ کرتے ہیں اور یہ ان کی وجہ سے مضبوط ہوتا ہے۔ ”عصبہ“ باپ کی طرف سے قریبی رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے، کہ جو مال ذوی الفروض سے بچ جائے وہ عصبات کیلئے ”الأقرب فالأقرب“ کے اعتبار سے ہوگا۔ پس عصبہ نسبی کی موجودگی میں عصبہ بعید کو میراث نہیں ملے گی اور عصبات نسب باپ بیٹا، اور جوان کے قریب ہو۔ ان میں سے بیٹوں کو مقدم کیا جائے گا پھر پوتوں کو مقدم کیا جائے گا۔ اگرچہ نیچے کے درجے کے ہوں۔ پھر باپ مقدم ہے پھر دادا پھر ماں باپ شریک بھائی یا باپ شریک بھائی یہ ایک درجہ میں ہیں۔ شرح السنہ میں ہے کہ ارشاد گرامی اس بات کی دلیل ہے کہ بعض وارث بعض دوسرے وارثوں کے حق میں حاجب ہوتے ہیں، چنانچہ جب دو طرح کا ہوتا ہے: اول حجبت نقصان دوم حجبت حرمان۔

۳۰۳۳: وَعَنْ أَسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ .

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۱۱/۱۲ الحدیث رقم ۶۷۶۴ و مسلم ف ۱۲۳۳/۳ الحدیث رقم (۱/۱۶۱۴) و ابوداؤد فی السنن ۳۲۶/۳ الحدیث رقم ۲۹۰۹ و الترمذی فی ۳۶۹/۴ الحدیث ر ۲۱۰۷ و ابن ماجہ فی ۶۱۰/۲ الحدیث رقم ۲۷۲۹ و الدارمی فی ۴۶۶/۲ الحدیث رقم ۳۰۰۰ و مالک فی الموطأ ۵۱۹/۲ الحدیث رقم ۱۰ من کتاب الفرائض

و احمد فی المسند ۲۰۹/۵

ترجمہ: ”اور حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہ تو مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس بات پر تو تمام

مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے یا نہیں؟

چنانچہ جمہور صحابہ و تابعین اور ان کے بعد والے علماء کہتے ہیں، کہ مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ معاذ بن جبل، سعید بن

مسیب، اور مسروق رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے۔ انہوں نے آپ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے: ”

الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ“ کہ اسلام غالب ہوتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔

جمہور کی دلیل یہ صحیح حدیث ہے۔ ان کی ذکر کردہ حدیث میں اسلام سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو غیر ادیان پر فضیلت حاصل ہے۔

اس میں میراث کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ پس اس کی وجہ سے صریحاً نص کو نہیں چھوڑا جائے گا۔

اسی طرح اس بات پر بھی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کافر کی طرح مرتد بھی مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، لیکن اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ مسلمان، مرتد کا وارث ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام مالک، امام شافعی، ربیعہ اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی مرتد کا وارث نہیں ہوتا۔ امام ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں، کہ مرتد نے اپنے ارتداد کے دور میں جو کچھ کمایا ہے وہ بیت المال میں جائے گا، اور حالت اسلام میں جو کمایا ہے، وہ اس کے مسلمان ورثاء کو ملے گا۔ امام محمد رحمہ اللہ اپنی موطا میں فرماتے ہیں کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور کفر ایک ہی ملت ہے، اسی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی ملتیں مختلف ہوں۔ پس یہودی نصرانی کا وارث ہوتا ہے اور نصرانی یہودی کا وارث ہوتا ہے۔ اور یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ہمارے اکثر فقہاء کا قول ہے۔

۳۰۳۴: وَعَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۸/۱۲ الحدیث رقم ۶۷۶۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قوم کا مولیٰ (یعنی قوم کا آزاد کردہ غلام) اسی قوم میں سے ہوتا ہے۔“ (بخاری)

تشریح: معنی غلام کا وارث ہوتا ہے عصبہ بننے کی وجہ سے، جب اس (غلام) کا عصبہ نسبیہ نہ ہو۔

بعض کہتے ہیں، یہاں ”مولیٰ“ سے مراد آزاد شدہ غلام ہے۔ یعنی غلام کو جس قبیلہ و قوم نے آزاد کیا ہو، اس (غلام) کا وہی حکم ہے، جو حکم اس قبیلہ کا ہے، جیسے قرشی کے آزاد کردہ غلام کیلئے صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے ہمارے علماء میں سے بعض شرح نے۔)

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ یہ حدیث دلیل ہے ان لوگوں کی جو بنی ہاشم اور بن عبدالمطلب کے آزاد کردہ غلام کیلئے صدقہ لینے کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے (بھی دلیل ہے) جو کہتے ہیں کہ اگر کسی نے وصیت کی بنی فلان (یعنی فلان کے بیٹوں) کیلئے تو اس میں اس کے آزاد کردہ غلام بھی داخل ہوں گے۔

شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ ”مولیٰ“ کا اطلاق لغت میں ”معتق“ (آزاد کرنے والے) اور ”عتیق“ آزاد کردہ دونوں پر ہوتا ہے۔ علماء نے یہاں ”مولیٰ“ کی تفسیر آزاد کرنے والے کے ساتھ کی ہے۔ یعنی معتق اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے، جب اس کا نسبی عصبہ میں سے کوئی نہ ہو۔ آزاد کردہ غلام اپنے آقا کا وارث نہیں ہوتا۔ صرف طاؤس کے نزدیک ہوتا ہے۔

۳۰۳۵: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ابْنُ أُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۳۹/۱۲ الحدیث رقم ۶۷۶۲ و مسلم فی صحیحہ ۷۳۵/۲ الحدیث رقم (۱۰۰۹-۱۳۳)۔

ترجمہ: ”اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قوم کا بھانجا اسی قوم میں شمار ہوتا ہے۔“

(بخاری و مسلم)

تشریح: ابن اُخت القوم منهم: شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ بھانجا ذوی الارحام میں سے ہے۔ چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ذوی الارحام میت کے وارث ہوتے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ذوی الارحام کو میت کے ترکہ میں سے میراث اس صورت میں ملتی ہے، جب میت کے ذوی الفروض اور عصباء موجود نہ ہوں۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ”منہم“ میں ”من“ اتصالیہ ہے، یعنی بھانجا ملا ہوا ہے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تمام ان چیزوں میں جن میں ان کے ساتھ متصل ہونا ضروری ہے۔ ولی بننے مدد کرنے، میراث اور اس طرح کے دوسرے امور میں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: ﴿و اولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ﴾ [الاحزاب-۶] ”اور رشتہ دار کتاب اللہ میں ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔“

اس کے احکام اور فرائض ہیں۔ ”کتاب“ اکثر فریضہ کے معنی میں آتا ہے۔ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب نے ذوی الارحام کے وارث ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اور اس کی تائید فصل ثانی میں حدیث مقدم سے ہوئی ہے۔ والخال وارث من لا وارث له۔

تخریج: اور اس کو روایت کیا ہے احمد، ترمذی، اور نسائی نے حضرت انسؓ سے ابو داؤد نے حضرت ابوموسیٰ سے طبرانی نے جبیر بن مطعم، ابن عباس ابی مالک اشعری کی سند سے۔

قولہ: و ذکر حدیث عائشة انما الولاء فی باب قبل ”باب المسلم: طویل حدیث کے درمیان میں اس کو ذکر کیا ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث اور حضرت انسؓ کی حدیث کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس میں دلیل ہے، کہ آزاد کرنے والا ولاء کی وجہ سے وارث ہوتا ہے، جب آزاد کردہ غلام کا عصبانہ سمیہ میں سے کوئی نہ ہو۔

قولہ: و سنذکر حدیث البراء: الخالة بمنزلة الام فی باب بلوغ الصغیر و حضانتہ: یعنی میراث میں خالہ ماں کی طرح ہے۔ پس اگر خالہ اور پھوپھی جمع ہو جائیں تو دو ٹولٹ پھوپھی کیلئے اور ایک ٹولٹ خالہ کیلئے ہوگا۔ اس حدیث کو باب بلوغ الصغیر میں جو ذکر کیا ہے، باوجودیکہ اس کی مناسبت اس باب کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ یہ ٹکڑا ایک لمبی حدیث کے ضمن میں واقع ہے۔ جو اسی باب کے مناسب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہاں سیوطی نے یہ جملہ الجامع الصغیر میں ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس کو شیخین اور ترمذی نے حضرت براء سے اور ابو داؤد نے حضرت علی سے روایت کیا ہے۔

الولاء: واد کے فتح کے ساتھ ہے۔ المسلم: سین اور لام دونوں کے فتح کے ساتھ ہے۔ البراء: باء اور راء کے فتح کے ساتھ ہے۔ حضانتہ: حاء کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔ بمعنی کم سنی میں تربیت کرنا۔

الفصل الثانی:

۳۰۳۶: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ الْمِلَتَيْنِ شَتَّى .

(رواہ ابو داؤد و ابن ماجہ)

اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۳۲۷/۳ الحدیث رقم ۲۹۱۱ و ابن ماجہ فی ۹۱۲/۲ الحدیث رقم ۲۷۳۱ و احمد فی المسند ۱۹۵/۲۔
ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو مختلف مذہب کے حامل افراد کے درمیان وراثت قائم نہیں ہو سکتی۔“ (ابو داؤد ابن ماجہ)

تشریح: شتئی: شین کے فتح اور تاء کی تشدید کے ساتھ بمعنی متفرق

ابن الملک فرماتے ہیں کہ ”شتئی“ اہل کی صفت ہے۔ اور علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ”لا يتوارث“ کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: لا يتوارث اهل ملتین متفرقین مختلفین۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ صفت ہو ”ملتین“ کی اور تقدیریوں ہو: ملتین متفرقتین۔

ابن الملک فرماتے ہیں، کہ حدیث کا ظاہری مفہوم دلالت کر رہا ہے، اس بات پر کہ کفر میں بھی اختلاف مذاہب ایک دوسرے کے وارث ہونے سے مانع ہے۔ جیسے یہود، نصاریٰ، مجوسی اور بت پرست۔ اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حدیث میں ”ملتین“ سے مراد اسلام اور کفر ہے۔ اس لئے کہ کفر سب کا سب ایک ہی ملت ہے، جب ان کا مقابلہ مسلمانوں کے ساتھ ہو۔ اگرچہ وہ اپنے عقائد کے اعتبار سے مختلف ملتوں اور مذہبوں میں بنے ہوں۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ کافر بغض بعض کے وارث بنتے ہیں، جیسے یہودی کا نصرانی، اور اس کے برعکس، مجوسی کا ان دونوں سے وارث ہونا اور ان کا مجوسی سے ہونا، اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے۔ لیکن حربی کافر ذمی کا کفر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اور ذمی حربی کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح اگر دونوں حربی ہوں دونوں الگ الگ دارالحرب میں ہوں تو ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ (جیسا کہ شرح مسلم میں ہے۔)

۳۰۳۷: روواہ الترمذی، عن جابر۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۴/۳۷۰ الحدیث رقم ۸۲۱۰۸۔

ترجمہ: امام ترمذی نے اس روایت کو حضرت جابر سے نقل کیا ہے۔

۳۰۳۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْقَاتِلُ لَا يَرِثُ - (رواه الترمذی وابن ماجہ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴/۳۷۰ الحدیث رقم ۲۱۰۹ وابن ماجہ فی ۲/۹۱۳ الحدیث رقم ۲۷۳۵

ترجمہ: ”اور ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قاتل (مقتول کا) وارث نہیں بن سکتا۔“

(ترمذی ابن ماجہ)

تشریح: قولہ: القاتل لا یراث: ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ اس قتل میں ہے جس قتل کی وجہ سے قاتل پر قصاص یا کفارہ لازم ہو۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں قتل بالسبب کے ساتھ میراث سے محروم ہونے کا تعلق نہیں ہے۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں، کہ علماء کے ہاں عمل اس حدیث پر ہے۔ خواہ قتل عمد ہو یا خطا ہو، قاتل خواہ بچہ ہو یا مجنون ہو یا ان کے علاوہ کسی سے بھی سرزد ہوا ہو۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ قتل خطا میراث سے محروم نہیں کرتا۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اگر نافع بچہ اپنے مورث کو قتل کرے، تو وہ میراث سے محروم نہیں ہوتا۔ (انہی) اور اسی طرح مجنون بھی ہے اس لئے کہ یہ دونوں مکلف نہیں ہیں۔ پس ان کا یہ فعل، فعل نہ ہونے کی طرح ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ اگر علت نفس قتل کو بنایا جائے جو منصوص علیہ ہے، تو پھر یہ حکم عام ہے۔ اور اگر علت معنی اور اس سے جو تعلق کا ختم ہونا پیدا ہوا ہے۔ اس کو قتل دیا جائے تو پھر پہلے قول کے مطابق القاتل میں الف لام جنس کیلئے ہوگا۔ اور دوسرے قول کے مطابق عہد کیلئے ہوگا۔ اور اسی پر متفرع ہے وہ کلام جو نووی نے روضہ میں ذکر کیا ہے، کہ جب حاکم اپنے مورث کو قتل کر دے تو منع میراث میں کئی صورتیں ہیں۔ تیری صورت یہ ہے کہ اگر ثبوت بینہ کے ذریعہ ہے تو نافع ہے اور اگر اقرار کے ذریعہ تو عدم تہمت کی وجہ سے مانع نہیں ہوگا۔

زیادہ صحیح یہ ہے کہ میراث سے منع مطلق ہے اس لئے کہ وہ قاتل ہے، اور سید شریف کی شرح الفرائض میں ہے کہ ہمارے ہاں قاتل اس وقت میراث سے محروم ہوتا ہے جب قتل میں وہ حق پر نہ ہو۔ اور جب وہ اپنے مورث کو قصاص یا حد کی وجہ سے یا اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل کر دے تو محروم نہ ہوگا۔ اسی طرح سلطان عادل کا اپنے باغی مورث کو قتل کرنا بھی ہے۔ اور اس کے برعکس میں امام ابو یوسف کا اختلاف ہے۔

ترمذی کی روایت میں ہے: ”لیس للقاتل شیء“۔ اور یہی نے ابن عمرؓ سے یوں روایت کیا ہے: ”لیس للقاتل من المیراث

شیء“ ابوداؤد نے بھی ابن عمر سے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے: ”لیس للقاتل شیء وان لم یکن له وارث فوارثه اقرب الناس ولا یراث القاتل شیاً“۔

اگر مقتول کا کوئی وارث نہ ہو، تو لوگوں میں سے جو اس کے زیادہ قریب ہو وہ اس کا وارث ہوگا۔ لیکن کسی چیز کا وارث نہ ہوگا۔“

۳۰۴۹: وَعَنْ بُرَيْدَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَعَلَ لِلْجَدَّةِ السُّدُسَ إِذَا لَمْ تَكُنْ دُونَهَا. (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۱۷/۳ الحدیث رقم ۲۸۹۵ والدارقطنی فی ۹۱/۴ الحدیث رقم ۷۴ من کتاب الفرائض
ترجمہ: ”اور حضرت بريدہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (میت کی) ماں نہ ہونے کی صورت میں دادی یا نانی کا چھٹا حصہ مقرر کیا ہے۔“ (ابوداؤد)

تشریح: ”جدہ“ سے مراد دادی اور نانی دونوں ہے۔

سدس: وال کے ضمہ اور ساکن کے ساتھ ہے۔

یعنی دادی کا چھٹا حصہ ہے اگر میت کی ماں نہ ہو۔ اگر میت کی ماں وہاں موجود ہے، تو پھر نہ دادی وارث ہوگی اور نہ نانی۔ (اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔) علامہ طبری فرماتے ہیں، کہ ”دون“ یہاں بمعنی ”قدام“ ہے۔ اس لئے کہ حاجب، وارث اور میراث کے درمیان آڑ کی طرح ہوتا ہے۔

علامہ سیوطی نے ”نقایہ“ میں جدہ کو بالاتفاق وارثوں میں شمار کیا ہے۔ اور فرمایا، کہ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے جدہ کیلئے چھٹا حصہ مقرر کیا ہے۔ اس کو ابوداؤد نے مغیرہ سے اور حاکم نے عبادہ سے روایت کیا ہے۔ اور انہوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ آپ ﷺ نے دادی اور نانی کیلئے میراث میں سے چھٹے حصے کا فیصلہ کیا، جو دونوں میں برابر تقسیم ہو۔

۳۰۵۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اسْتَهَلَ الصَّبِيُّ صَلَّى عَلَيْهِ وَوَرِثَ -

(رواه ابن ماجہ والدارمی)

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۹۱۹/۲ الحدیث رقم ۲۷۵۰ والدارمی فی ۴۸۵/۲ الحدیث رقم ۳۱۲۶۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر بچہ نے (پیدائش کے وقت) کوئی آواز نکالی ہو (اور اس کے بعد وہ فوت ہو جائے) تو اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی اس کی وراثت بھی تقسیم ہوگی۔“ (ابن ماجہ دارمی)

تشریح: استہل: آواز بلند کرنا، مرد، زندگی کی علامت ہے۔ (یعنی کوئی بھی ایسی حرکت جس سے اس کا زندہ ہونا معلوم ہو)۔ ورث: واؤ کے ضمہ اور راء مکسورہ کے شد کے ساتھ ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ اذا استهل الصبي صلي عليه: یعنی اس کو غسل اور کفن دینے کے بعد پھر کو دفن کیا جائے گا۔ جیسا کہ مسلمانوں کے تمام مردوں کو دفن کیا جاتا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے، اور اس کا وارث ماں کے پیٹ میں ہو، تو اس کی میراث رکھ چھوڑی جائے گی۔ پھر اگر وہ زندہ پیدا ہوا تو وہ وارث قرار پائے گا۔ اگر وہ زندہ پیدا نہ ہوا، تو وارث نہیں ہوگا اور وہ میراث دوسرے وارثوں کو مل جائے گی۔ پس اگر وہ زندہ پیدا ہوا اور پھر مر، تو اس کا حصہ دوسرے ورثاء کو اس کی میراث میں مل جائے گا۔ خواہ اس نے آواز نکالی ہو، یا نہ نکالی ہو۔ بعد اس کے کہ اس میں زندگی کی کوئی علامت پائی گئی ہو مثلاً چھینکنا یا سانس لینا یا ایسی حرکت کرنے جو زندگی پر دلالت کرے۔ شرمگاہ سے نکلنے کی حرکت کے سوا۔ یہ ٹورٹی، اوزاعی، اور امام شافعی اور اصحاب ابوحنیفہ کا یہی مسلک ہے۔ اور ایک قوم کا مسلک یہ ہے کہ وہ اس وقت تک وارث نہ ہوگا جب تک کہ وہ آواز نہ نکالے۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اور ”استہلال“ آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں۔ دوسرے علماء کے ہاں اس سے مراد علامت زندگی ہے۔ اور اس کو ”استہلال“ سے تعبیر کیا ہے چونکہ عام طور پر بچہ پیدا ہونے وقت

آواز نکالتا ہے، اور اسی سے اس کا زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ زہریٰ فرماتے ہیں، کہ میں چھینک کو ”استہلال“ سمجھتا ہوں۔

۳۰۵۱: وَعَنْ كَثِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَحَلِيفُ الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَابْنُ أُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ. (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۳۱۷/۲ الحدیث رقم ۲۵۲۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت کثیر بن عبد اللہ اپنے والد (حضرت عبد اللہ تائبی) سے اور وہ کثیر کے دادا (یعنی اپنے والد حضرت عمرو بن عوف مزی رضی اللہ عنہ) صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قوم کا مولیٰ (یعنی اس قوم کا آزاد کردہ غلام) اسی قوم میں شمار ہوتا ہے، قوم کا حلیف اسی قوم میں شمار ہوتا ہے اور قوم کا بھانجا اسی قوم میں شمار ہوتا ہے۔“ (دارمی)

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ مولى القوم منهم: اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

وحلیف القوم منهم: ابن الملک فرماتے ہیں، کہ حلیف سے مراد ”عہد“ (معاهدہ کرنے والا) ہے۔ اور اس سے مراد ”مولیٰ موالاة“ ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں وہ وارث ہوتا ہے جب میت کا اس کے سوا کوئی وارث نہ ہو۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ حلیف کی وضاحت یہ ہے کہ پہلے عرب میں یہ دستور تھا، کہ وہ آپس میں قسم و حلف کے ذریعہ باہمی اقرار کر لیتے تھے، اور کہتے تھے کہ میرا خون تیرا خون ہوگا، میری عزت تیری عزت ہوگی، میری صلح تیری صلح ہوگی، میری جنگ تیری جنگ ہوگی، میں تیرا وارث بنوں گا، اور تم میرے وارث بنوں گے۔ پس آیت میراث کے ذریعہ یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ بیضاوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ﴿والذین عقدت ایمانکم﴾ ”اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں“۔ کہ اس سے مراد مولیٰ مولات ہے ﴿فاتوہم نصیبہم﴾ [النساء: ۳۳] ”ان کو ان کا حصہ دیدو“۔ حلیف اپنے حلیف کا وارث ہوتا تھا چھٹے حصے میں اس کے مال میں سے۔ پھر یہ منسوخ ہوا اور ناخ یہ آیت ہے: ﴿واولو الارحام بعضهم اولیٰ ببعض﴾ [الاحزاب: ۶۰]۔ (اتہلی)

لیکن یہ بات محل نظر ہے۔ اس لئے کہ آیت میں حلیف کی میراث کی نفی پر کوئی دلالت نہیں ہے، اس کے قائل حضرات کہتے ہیں کہ یہ وارث ہوں گے اس وقت جب میت کیلئے عصبات اور اولوالارحام نہ ہوں۔ بیضاوی فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے، کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لے اور آپس میں یہ عہد و اقرار کر لیں، کہ وہ ایک دوسرے کے تاوان میں شریک ہوں گے، اور ایک دوسرے کے وارث ہوں گے تو یہ درست ہے، اور وہ وارث ہوگا۔ سید شریف رحمہ اللہ شرح فرائض میں فرماتے ہیں ہیں کہ ”مولیٰ موالاة“ کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص جس کا نسب مجہول ہے، دوسرے سے کہتا ہے، کہ آپ میرے مولیٰ ہیں جب میں مروں تو آپ میرے وارث ہوں گے اور آپ میری طرف سے تاوان اداء کریں گے جب میں کوئی جنایت کروں۔ اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا۔ تو ہمارے نزدیک یہ عقد درست ہے وہ اس کا وارث اور عاقلہ ہوگا اور اس کو ”مولیٰ موالاة“ کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر یہ دوسرا شخص بھی مجہول النسب ہے اور یہ پہلے شخص سے اسی طرح کی بات کہہ دے اور پہلا شخص قبول کر لے۔ تو ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کا وارث ہوگا اور اس کی طرف سے تاوان اداء کرے گا۔

ابراہیم نخعی فرماتے تھے، کہ جب کوئی شخص کسی شخص کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لے اور اس کو اپنا مولیٰ بنا دے، تو یہ درست ہے۔ شمس اللامہ سرخسی فرماتے ہیں کہ عقد موالات کے صحیح ہونے کیلئے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا شرط نہیں ہے اور اس میں جو ذکر کیا ہے یہ بطور عادت کے ہے۔ اور شععی فرماتے تھے کہ ”ولاء عتاقہ کے علاوہ کوئی ولاء نہیں ہے۔ اور اسی کو امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے اور زید بن ثابت کا مذہب بھی یہی ہے۔ جس کو ہم نے اختیار کیا وہ حضرت عمر، حضرت علی، اور ابن مسعود کا مذہب ہے۔

وابن اُخت القوم منهم اس کا بیان ما قبل میں گزر چکا ہے۔

تخریج: طبرانی نے یہ حدیث عمرو بن عوف سے یوں روایت کی ہے: ”حلیف القوم منهم وابن اُخت القوم منهم“۔

۳۰۵۲: وَعَنِ الْمِقْدَامِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنَا أَوْلَىٰ بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ فَمَنْ تَرَكَ ذَيْنًا أَوْ ضِعْعَةً فَايْتَنَا وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلْيُورَثْهُ وَأَنَا مُوَلَّىٰ مَنْ لَا مُوَلَّىٰ لَهُ أَرِثَ مَا لَهُ وَأَفْلُكُ عَانَةٌ وَالنَّحَالُ وَارِثٌ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ يَرِثُ مَا لَهُ وَيَفْلُكُ عَانَةٌ (وَفِي رِوَايَةٍ) وَأَنَا وَارِثٌ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ أَعْقِلُ عَنْهُ وَارِثُهُ وَالنَّحَالُ وَارِثٌ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ يَعْقِلُ عَنْهُ وَيَرِثُهُ. (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۲۰/۳ الحدیث رقم ۲۹۰۰ وابن ماجہ فی ۹۱۴/۲ الحدیث رقم ۲۷۳۸

ترجمہ: ”اور حضرت مقدم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں ہر مومن کے حق میں خود اس سے زیادہ عزیز و خیر خواہ ہوں لہذا جو شخص اپنے ذمہ عیال یا قرض چھوڑ جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی اور اس کے عیال کی پرورش ہمارے ذمہ ہے اور جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ اس کے ورثاء کا ہے اور جس شخص کا کوئی مددگار نہیں میں اس کا مولیٰ و مددگار ہوں۔ جس کا کوئی کارساز نہیں چنانچہ میں اس کے مال کا میں وارث ہوں گا اور اس کے قیدی کو نجات دلاؤں گا (یعنی اس کی زندگی میں اس پر جو خون بہا لازم ہوا تھا اور وہ خون بہا ادا کرنے سے پہلے مر گیا تو اس کی وجہ سے چونکہ اس کا نفس عالم برزخ میں ایک قیدی کی طرح تختیوں میں مبتلا ہے اس لئے میں اس کا خون بہا اپنے پاس سے ادا کر کے اسے عالم برزخ کی تختیوں سے نجات دلاؤں گا) اور ماموں اس شخص کا وارث ہوتا ہے جس کا کوئی وارث نہیں وہ میت کے مال کا وارث ہوگا اور اس کے قیدی کو نجات دلائے گا (یعنی جس شخص کے ذوی الفروض اور عصبی ورثاء نہیں ہوتے اس کا ماموں کہ جو اس کے ذوی الارحام میں سے ہے اس کا وارث ہوتا ہے چنانچہ وہ میت کا ترکہ پاتا ہے اور اس پر جو خون بہا وغیرہ لازم تھا اس کو ادا کر کے اس کی روح کو عالم برزخ کے عذاب سے نجات دلاتا ہے) ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں اس شخص کا وارث ہوتا ہوں جس کا کوئی وارث نہیں چنانچہ میں اس کی طرف سے اس کا خون بہا ادا کروں گا اور اس کا وارث بھی بنوں گا (یعنی اس کا ترکہ اپنی نگرانی میں لے کر بیت المال میں داخل کروں گا) اور جس شخص کا (ذوی الفروض و عصباء میں سے) کوئی وارث نہیں ہوتا تو (ذوی الارحام میں سے) اس کا ماموں اس کا وارث ہوتا ہے جو اس کی طرف سے خون بہا ادا کرے گا اور اس کی میراث کا وارث بنے گا۔“ (ابو داؤد)

تشریح: ضیععة: عیال کے معنی میں ہے۔

عانہ: اس کی اصل عانیہ ہے۔ یا عکوف کیا ہے تخفیف کیلئے جیسے ”ید“ میں کیا ہے۔ کہا جاتا ہے ”عنا یعنی“ بمعنی خضع، وذل، یعنی ذلیل ہونا۔

یہ گزری ہوئی حدیث کے ہم معنی ہے، جس میں ہے: أَنَا أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ۔ یہ اس کی تشریح گزر چکی ہے۔ یعنی ان کا رجوع کرنا۔ یا ان کا معاملہ ہمارے حوالے ہے۔

قوله: وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلْيُورَثْهُ: یعنی اس کا قرض ادا کرنے اور وصیت پوری کرنے کے بعد۔

ارث مالہ: قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا مال مسلمانوں کے بیت المال میں صرف کیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔

و افلک عانہ: یعنی اس کی طرف سے فدیہ دیکر اس کے قیدی کو چھڑاتا ہوں۔ اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ حقوق متعلق ہوں جنایات کی وجہ سے۔

قوله: وَالنَّحَالُ وَارِثٌ مَنْ لَا وَارِثَ لَهُ، يَرِثُ مَا لَهُ: یعنی اگر کسی کا بھانجا مر جائے اور وہ اپنے پیچھے سوائے ماموں کے کوئی نہ چھوڑے تو یہ ماموں اس کا وارث ہوگا۔ یہ ذوی الارحام کے وارث ہونے کی دلیل ہے دوسرے ورثاء کے نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور جو لوگ ماموں کو وارث نہیں مانتے انہوں نے اس حدیث کی تاویل کی ہے کہ ”النحال وارث من لا وارث له“ عرب کے اس قول کی

طرح ہے: الجوع زاد من لا زاد له کہ بھوک تو شہ ہے جس کیلئے کوئی تو شہ نہ ہو۔ اور ”یوث مالہ“ کو الخال وارث“ کے لئے بمنزلہ تقریر قرار دیا ہے۔ اور تقریر وہاں لائی جاتی ہے جہاں معنی سابق میں مجاز کا کوئی وہم ہو، یہاں اس کو تقریر قرار دینا کیسے صحیح ہے اللہ رحم کرے ان لوگوں پر جو حق کے تابع ہوئے انصاف کیا تعصب کو چھوڑ اور تعسف سے کام نہیں لیا۔

جان لے کہ ذورحم ہر اس قرہبی رشتہ دار کو کہتے ہیں، جو نہ ذوی الفروض میں سے ہو اور نہ عصبات میں سے ہو۔ پس اکثر صحابہ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، علیؑ، ابن مسعودؓ، ابو عبیدہ بن الجراح، معاذ بن جبل، ابو درداء، ابن عباس، رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے علاوہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ یہ ذوی الارحام کے وارث ہونے کے قائل ہیں۔ اور ان کی اتباع کی ہے تابعین میں سے علقمہ، نجعی، شریح، حسن، ابن سیرین، عطاء، مجاہد وغیرہ نے۔ اور یہی ہمارے علماء احناف، ابو حنیفہ ابو یوسف، محمد، زفر، اور ان کے تابعین کا مسلک ہے۔ زید بن ثابت اور ابن عباس سے شاذ روایت ہے کہ ذوی الارحام کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ ذوی الفروض اور عصبات کے نہ ہونے کی صورت میں میت کا مال بیت المال میں دے دیا جائے گا۔ اور اس میں ان کی اتباع کی ہے تابعین میں سے سعید بن المسیب، سعید بن جبیر نے اور یہی امام مالکؒ اور شافعی کا مسلک ہے۔

پہلا استدلال: ذوی الارحام کی میراث سے نفی کرنے والوں نے استدلال کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آیت میراث میں ذوی الفروض اور عصبات کے حصص بیان کئے ہیں اور ذوی الارحام کیلئے کچھ بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر ان کا وارث ہونا حق ہوتا، تو اللہ اس آیت میراث میں اس کو بیان فرماتے۔ اور تیرا رب بھولنے والا نہیں۔

دوسرا استدلال: انہوں نے اس سے بھی استدلال کیا کہ جب آپ علیہ السلام سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اخیبری جبرائیل ان لاشی لهما جبرائیل نے خبر دی ہے کہ ان کیلئے میراث میں کچھ بھی نہیں ہے۔
حنیفہ وغیرہ کے دلائل:

اور ہماری دلیل یہ آیت ہے: ﴿و اولوا الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب اللہ﴾ [الاحزاب-۶] ”اور رشتہ دار کتاب اللہ میں ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں“۔

اس کا معنی یہ ہے کہ وہ زیادہ حقدار ہے ان میں سے بعض کی میراث کا اس میں جو اللہ نے لکھا ہے، اور اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے کہ اس آیت نے موالات کے ذریعے تو ارث کو منسوخ کر دیا۔ جیسا کہ مدنی دور کی ابتداء میں یہی رواج تھا۔ تو جو حصہ اس زمانہ میں ”مولیٰ مولاة“ یا ”مواخاة“ کیلئے تھا۔ اس کو ذوی الارحام کی طرف پھیر دیا اور مولیٰ موالات کیلئے میراث میں جو حصہ باقی تھا وہ ذوی الارحام کی وارثت سے مؤخر ہو گیا۔ پس ان کیلئے میراث مشروع ہے بلکہ تفصیل اور فرق بایں طور کیا ان ذوی الارحام کے درمیان کے ذوی الفروض اور عصبات ہو، اور جس کے دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہو۔ پس میراث سب کیلئے اسی آیت سے ثابت ہوئی۔ آیت مواریث میں سب کی تفصیل ضروری نہیں ہے۔

دوسری دلیل: اسی طرح ہماری ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ایک آدمی نے سہل بن حنیفہ کی طرف تیر پھینکا اور ان کو قتل کر دیا۔ ان کے ماموں کے علاوہ ان کا کوئی وارث نہ تھا۔ ان کے بارے میں ابو عبیدہ بن الجراح نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا، نبی ﷺ نے فرمایا ہے: اللہ ورسولہ مولیٰ من لا مولیٰ له، والخال وارث من لا وارث له۔

یہ نہ کہا جائے کہ اس طرح کے کلام سے مقصود نفی ہوتی ہے نہ کہ اثبات جیسے ”الصبر حیلۃ من لا حیلۃ له“ چونکہ صبر حیلہ نہیں ہے۔ پس گویا کہ اس طرح کہا گیا ہے: من کان وارثہ الخال فلا وارث له کہ جس کا وارث ماموں ہو تو اس کا کوئی وارث ہی نہیں ہے۔ چونکہ ہم کہتے ہیں حدیث کے شروع کے الفاظ اس تاویل کا انکار کرتے ہیں۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ کسی حکم شرعی کو اثبات کے لفظ کے

ساتھ بیان کرنا اور نفی مراد لینا یہ تو التباس کی طرف لیجاتا۔ پس صاحب شریعت تو کاشف شریعت ہوتا ہے اس کی طرف سے ایسا کلام جائز نہیں ہے۔

تیسری دلیل: کہ جب ثابت بن دحداح وفات پا گئے تو آپ علیہ السلام نے قیس بن عاصم سے فرمایا، کہ کیا تم اس کے سب کے بارے میں جانتے ہو، تو انہوں نے کہا کہ یہ ہم میں اجنبی تھے، ہم نہیں جانتے ان کا کوئی رشتہ دار سوائے ایک بھانجے کے جو ابولبابہ ابن عبد المذرہ ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے میراث ان کو دے دی۔

ہماری مروایات قرآن کے موافق ہے اور جو تم نے روایت بیان کی ہے وہ قرآن کے مخالف ہیں۔ یہ ہے کہ جو تم نے روایت کی ہے اس کو آیت کریمہ کے نزول سے پہلے پر محمول کیا جائے۔ یا یہ کہ حمل کیا جائے اس بات پر کہ خالہ اور پھوپھی، عصبات اور ذوی الفروض کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتی بلکہ وہ مال ذوی الفروض پر لوٹا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ذوی الفروض پر رد مقدم ہے ذوی الارحام کو وارث بنانے سے۔ اگرچہ یہ وارث ہوتے ہوں ان کے ساتھ جن پر رد نہیں ہوتا، جیسے زوج اور زوجہ ہے۔ محقق سید شریف جرجانی رحمہ اللہ نے شرح الفرائض میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

وفیك عانه: یعنی اس طریق سے دیت اداء کرنے کے ساتھ یا اس کے قید ہونے کے وقت اس کا فدیہ اداء کرے۔

أعقل عنه: یعنی میں اداء کروں گا اس کی طرف سے جو اس پر جنایات اور نقصان کرنے کی وجہ سے لازم ہو گیا ہو۔ جس کو عاقلہ برداشت کرتے ہیں۔ اور مصابیح کے نسخوں میں "اعقلہ" ہے۔ کہا جاتا ہے عقلت لہ دم فلان۔ جب قصاص کو دیت کی وجہ سے چھوڑا جائے۔ لیکن حدیث میں اس کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ میں اس کو دوں گا اور اس کی طرف سے اداء کروں گا۔

والخال وارث من لا وارث له، یعقل عنه:

تخریج: امام مذہبی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے: الخال وارث من لا وارث له.

۳۰۵۳: وَعَنْ وَائِلَةَ بْنِ الْأَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَحْوِزُ الْمَرْأَةُ فَلَئِنْ مَوَارِيثَ عَجِيقَهَا وَلَقِيَطَهَا وَوَلَدَ هَا الْأَيْدَى لَا عَنَتَ عَنَهُ. (رواه الترمذی وابوداؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۳۲۵ الحدیث رقم ۲۹۰۶ و الترمذی فی السنن ۴/۳۷۳ الحدیث رقم ۲۱۱۵ وابن ماجہ فی ۲/۹۱۶ الحدیث رقم ۲۷۴۲ واحمد فی المسند ۳/۴۹۰ (۲) الم احدہ بهذا اللفظ وقدورد بمعناه (الولاء لمن اعتق) (۳) فی المخطوطة (احوازة)

توجہ: "اور حضرت وائلہ بن اسقعؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورت وراثتیں لے سکتی ہیں، ایک تو اپنے آزاد کئے ہوئے غلام کی دوسرے اپنے لقیط (یعنی اپنے پالے ہوئے بچے) کی اور تیسرے اپنے اس بچے کی جس کی وجہ سے لعان ہوا۔" (ترمذی، ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: تحوز: جمع کرنا، اور احاطہ کرنا۔ موارث: میراث کی جمع ہے۔ لقیط: بمعنی ملقوطہ ہے۔

اس لئے کہ جب عورت کسی غلام کو آزاد کر دے اور وہ مر جائے، اور اس کا کوئی وارث نہ ہو، تو وہ گا۔

ولقیطها: کی میراث اس لئے کہ "ملقط" کا وارث ہوتا ہے اسلئے بن راہویہ کے مذہب کے مطابق اور اکثر علماء کا مسلک یہ ہے کہ "ملقط" وارث نہیں ہوتا اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے اس کو خاص کیا ہے معنی کے ساتھ اور فرمایا: لا ولاء الا ولاء العتاقہ کہ کوئی ولاء نہیں ہے سوائے ولاء عتاقہ کے۔ ممکن ہے یہ حدیث ان کے نزدیک منسوخ ہو۔

ولدها الذی لا عنت عنہ: شرح السنہ میں ہے، یہ حدیث اہل نقل کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ وہ عورت اپنے آزاد کردہ غلام کی میراث لے گی۔ اور وہ بچہ جس کی نفی کی ہو آدمی نے لعان کے ساتھ تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان

میں سے ایک دوسرے کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وارث ہونا نسب کی وجہ سے ہوتا ہے اور لعان کی وجہ سے نسب کی نفی ہو گئی ہے، باقی اس کا نسب ماں کی طرف سے ثابت ہے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ ملقط کا لفظ کی میراث کو جمع کرنا یہ محمول ہے اس پر کہ اس مال کا جو اس نے پیچھے چھوڑا رہا ہے، اس کو اس ملقط کی طرف پھیرنا اس کے غیر کی طرف پھیرنے والی ہے جیسے بیت المال کے مال کو مسلمان افراد کی طرف پھیرا جاتا ہے، بیت المال کا ترکہ مسلمانوں کیلئے ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کی وارث ہوگی، جیسے آزاد کرنے والی اپنے آزاد کردہ غلام کی وارث ہوگی۔ باقی ولد الزنا کا حکم وہی ہے، جو ”منفی“ (یعنی جس کی نسب کی نفی کی گئی ہے) کا حکم ہے دونوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۰۵۴: وَعَنْ عُمَرُو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ أَيُّمَا رَجُلٍ عَاهَرَ بِحُرِّةٍ أَوْ أَمَةٍ فَلَوْلَدٌ وَوَلَدٌ زِنًا لَا يَرِثُ وَلَا يُوْرَثُ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۷۲/۴ والحديث رقم ۲۱۱۳ وابن ماجه فی ۹۱۷/۲ والحديث رقم ۲۷۴۵۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد حضرت شعیب اور حضرت شعیب اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص کسی آزاد عورت یا لونڈی سے زنا کیا تو (اس کے نتیجہ میں) جو بچہ پیدا ہوگا وہ ولد الزنا (حرامی بچہ) ہے، وہ بچہ کسی کا وارث ہوگا اور نہ کوئی اس (کے مال) کا وارث بنے گا۔“ (ترمذی)

تشریح: (عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده): یعنی ابن عمرو بن العاص جیسے کہ اس کی تصریح کی ہے سیوطی۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده: یعنی ابن عمرو بن العاص سے جیسا کہ سیوطی نے الجامع الصغیر میں اسکی تصریح کی ہے۔ نہایہ میں ہے کہ ”عاهر“ زانی کو کہتے ہیں۔ اور قد عہر اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی مرد رات کے وقت کسی عورت کے پاس زنا کرنے آئے۔ پھر اس کا غلبہ مطلقاً زانی پر ہوا۔

ولد زنا: ایک نسخ میں ”ولد الزنا“ معرّف باللام ہے۔

ولا يورث: راء کے فتح کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کسرہ کے ساتھ ہے۔

ولا يورث: ابن الملک فرماتے ہیں کہ حرامی زانی کا وارث ہوتا ہے، اور نہ اس کو زانی کے اقرباء کی کوئی میراث ملتی ہے۔ کیونکہ وارثت نسب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب کہ ”حرامی“ اور زانی کے درمیان نسب کا کوئی وجود نہیں ہوتا، اسی طرح زانی اور اس کے اقرباء اس حرامی کے وارث نہیں ہوں گے۔

۳۰۵۵: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ مَوْلَى لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ مَاتَ وَتَرَكَ شَيْئًا وَكَمْ يَدْعُ حَمِيمًا وَلَا وَلَدًا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَعْطُوا مِيرَاثَهُ رَجُلًا مِنْ أَهْلِ قَرْبَتِهِ. (رواه ابوداود و الترمذی)

اخرجه ابوداود فی السنن ۳۲۲/۳ والحديث رقم ۲۹۰۲ وابن ماجه فی ۹۱۱/۲ والحديث رقم ۲۷۳۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک آزاد کردہ غلام مر گیا اور اس نے کچھ مال چھوڑا لیکن نہ تو اس نے کوئی قریبی رشتہ دار چھوڑا اور نہ ہی کوئی بیٹا جو (اس کے ترکہ کا وارث ہوتا)۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی میراث اس کی بستی کے کسی آدمی کو دے دو۔“ (ابوداؤد ترمذی)

تشریح: اعطوا میراثہ رجلا من اهل قریۃ: اس لئے کہ دیگر مسلمان افراد سے وہ زیادہ حقدار ہے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس کی بستی کے کسی آدمی کو دینے کا حکم دیا، ممکن ہے کہ اس کی طرف سے صدقہ کے طور پر ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بطور ”ترقیہ“ دیا ہو۔ یا اس لئے کہ اس ترکہ کا حقدار بیت المال تھا اور بیت المال کا مصرف مسلمانوں کی ضروریات پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے اس مال کو اس کے بستی والوں کو دیا، کہ آپ ﷺ نے ان کو دینے میں مصلحت سمجھی۔ چونکہ جیسے کوئی شخص

انبیاء کا وارث نہیں ہوتا اسی طرح انبیاء بھی کسی کے وارث نہیں ہوتے بعض شرّاح فرماتے ہیں انبیاء صلوات اللہ وسلام علیہم نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ کوئی ان کا وارث ہوتا ہے۔ چونکہ ان کی شان بہت بلند و بالا ہے وہ اس گھٹیا دنیا کے ساتھ اپنے آپ کو مشغول نہیں کرتے وہ اسباب دنیا سے منقطع ہوتے ہیں۔ پہلے ایک حدیث میں گزرا: ”انا مولیٰ من لا مولیٰ اور ارث ما لہ“ تو اس سے مراد حقیقی میراث نہیں ہے۔ بلکہ آپ ﷺ کی مراد اس سے یہ ہے کہ ان کی میراث کا معاملہ میرے حوالہ ہے۔ میں اس کو صدقہ کر دوں مسلمانوں کے مصالح اور ضروریات میں خرچ کر دوں کسی اور کو اس کا مالک بناؤں۔

دیلی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا آزاد کردہ غلام مجبور کے درخت سے گرا اور مر گیا، تو رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کی میراث لائی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار تلاش کر لو۔ تو صحابہ نے کہا کہ اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اس کے کسی بستی والے کو تلاش کر لو، اور اس کی میراث اس کو دے دو۔ (جیسا کہ سیوطی کی الجامع الکبیر میں ہے۔)

۳۰۵۶: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ مَاتَ رَجُلٌ مِّنْ خُرَاعَةَ فَاتَى النَّبِيَّ ﷺ بِمِثْرَانِهِ فَقَالَ اِتِمُّسُوا لَهُ وَاِرثًا اَوْ ذَارِحِمَ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُ وَاِرثًا وَلَا ذَارِحِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَعْطُوْهُ الْكُبْرَ مِنْ خُرَاعَةَ .

(رواہ ابو داؤد وفی رواية له قال انظروا اکبر رجل من خزاعة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۲۲۴ الحدیث رقم ۲۹۰۴ واحمد فی المسند ۵/۳۴۷۔

ترجمہ: ”اور حضرت بريدہ کہتے ہیں کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص مر گیا تو اس کی میراث نبی کریم ﷺ کے پاس لائی گئی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کا کوئی وارث یا کوئی قریبی رشتہ دار تلاش کرو۔ (یعنی پہلے تو ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی وارث تلاش کرو اگر ان میں سے کوئی وارث نہ ملے تو) چنانچہ (تلاش کے بعد) انہوں نے نہ تو (ذوی الفروض اور عصبات میں سے) کوئی وارث پایا اور نہ ہی کوئی قریبی رشتہ دار تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی میراث قبیلہ خزاعہ کے کسی بوڑھے شخص کو دے دو (ابو داؤد) اور ابو داؤد ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قبیلہ خزاعہ کے کسی بوڑھے شخص کو دیکھو (اور اس کو یہ میراث دے دو)۔“

تشریح: قولہ: اعطو الکبر من خزاعة: ہمارے علماء میں سے بعض شرّاح فرماتے ہیں، کہ اس سے مراد قوم کا بڑا اور رئیس ہے۔ اور آپ علیہ السلام کا اس کو میراث کا یہ مال دنیا بطور تفضل اور احسان کے تھا نہ کہ بطور میراث کے۔ اور بعض کہتے ہیں اس سے مراد ان میں سے بڑا ہے جو پردادا کے زیادہ قریب ہو، اور یہ بھی بطور احسان کے تھا نہ کہ بطور میراث کے۔

تشریح: قولہ: قال: انظروا اکبر رجل من خزاعة:

نہا یہ میں ہے کہ کہا جاتا ہے: ”فلان کبر قومہ“ کاف کے ضمہ کے ساتھ۔ جب وہ نسب میں بہت دور کا رشتہ دار ہو۔ یہ وہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی نسبت کرے اپنے آباء میں سے پردادا کی طرف۔ ”اکبر رجل“، بمعنی ”کبیر ہم“ ہے، یہ ان میں سے پردادا کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ (اتہنی)

حاصل یہ ہے کہ اس سے مراد مطلقاً سن رسیدہ بوڑھا نہیں ہے۔ (بلکہ دور پار کا کوئی رشتہ دار ہی مراد ہے)

۳۰۵۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اِنَّكُمْ تَقْرُونَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ تَوْصُونَ بِهَا اَوْ دِيْنٍ وَاَنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضَىٰ بِالَّذِيْنَ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ رَانَ اَعْيَانِ بَنِي الْاُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِي الْعَلَاتِ الرَّجُلُ يَرِثُ اَخَاهُ لَا بِيْهٍ وَاُمِّهٖ دُوْنَ اَخِيْهِ لَا بِيْهٍ (رواہ الترمذی وابن ماجہ: وفی رواية الدارمی) قَالَ الْاُخُوْرَةُ مِنَ الْاُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِي

العَلَاتِ إِلَىٰ آخِرِهِ .

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۱۹/۴ الحدیث رقم ۲۰۹۵ وابن ماجہ فی ۹۱۵/۲ الحدیث رقم ۲۷۳۹ والدارمی فی ۴۶۴/۲ الحدیث رقم ۲۹۸۴ واحمد فی المسند ۱۴/۱

ترجمہ: ”اور حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ (ایک دن) انہوں نے (لوگوں سے) کہا کہ تم اس آیت کی تلاوت کرتے ہو: من بعد وصیة تو صون بها او دین : (وصیت پوری کرنے کے بعد جو تم وصیت کرتے ہو یا قرض ادا کرنے کے بعد) بے شک نبی کریم ﷺ نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض کی ادائیگی کا فیصلہ فرمایا ہے اور (آپ ﷺ نے یہ حکم بھی صادر فرمایا ہے) کہ حقیقی بھائی وارث ہوتے ہیں نہ کہ سوتیلے بھائی (یعنی حقیقی بھائیوں کی موجودگی میں سوتیلے بھائیوں کو وراثت میں سے کچھ نہیں ملتا) اور یہ کہ آدمی اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے نہ کہ سوتیلے بھائی کا (یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید کے طور پر استعمال کیا گیا ہے) (ترمذی ابن ماجہ) اور دارمی کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا: وہ بھائی جو ماں شریک ہوں (یعنی باپ اور ماں دونوں میں شریک ہوں) کہ جنہیں حقیقی بھائی کہتے ہیں) وارث ہوتے ہیں نہ کہ وہ بھائی جو صرف باپ شریک ہوں (یعنی سوتیلے بھائی) وارث نہیں ہوں گے آگے حدیث کے وہی الفاظ ہیں جو اوپر نقل ہوئے ہیں۔“

تشریح: وان : ان کے فتح کے ساتھ ہے اور اواد عطف کیلئے ہے۔ ای وقضی بان ۔

وان اعیان : ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے اور حرف جارہ حذف ہے اور اس کا عطف ہے ”بالدین“ پر۔ مصابیح کی یہ روایت اس پر دلیل ہے: قضی رسول اللہ ﷺ ان اعیان بنی الام ۔

یہ جملہ مستانفہ ہے اور ما قبل کیلئے بمنز لہ تفسیر کے ہے۔ ”اعیان“ عین الشمسی سے ہے۔ نفیس شئی کو کہتے ہیں۔

بنی العلات : جن کے باپ ایک اور ماںیں مختلف ہوں۔ ہمارے علماء حنفیہ میں سے بعض محققین نے فرمایا ہے کہا ”اعیان القوم“ قوم کے اشراف کو کہتے ہیں۔ اور ”اعیان“ ان بھائیوں کو کہتے ہیں جو ماں باپ شریک ہوں اور ان بھائیوں کو ”معاینہ“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں ماں کا ذکر حقیقی بھائیوں کی سوتیلے بھائیوں پر ترجیح کے بیان کیلئے ہے۔ اور ”علاقاتی بھائی“ آدمی کے ان بیٹوں کو کہا جاتا ہے جو مختلف نسبتوں سے ہوں۔ اور ان کا نام ”علات“ رکھا گیا ہے اس لئے کہ شوہر پہلی سے سیراب ہونے کے بعد، بعد والی پر چڑھائی کر چکا ہوتا ہے (یعنی صحبت کر چکا ہوتا ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ جب حقیقی بیٹے علاقاتی بیٹوں کے ساتھ جمع ہو جائیں۔ تو میراث حقیقی بیٹوں کو ملے گی قوت قرابت کی بناء پر۔ (اتنی)۔ اور اگر ماں ایک ہو اور باپ الگ الگ ہوں تو ان کو ”اخانی“ کہتے ہیں۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ”انکم تقر اون“ یہ اخبار ہے اور اس میں معنی استفہام کا ہے یعنی تم یہ آیت پڑھتے ہو کیا تم اس کا معنی سمجھتے ہو؟ پس وصیت مقدم ہے قرض پر قراءۃ میں، اور مؤخر ہے ادائیگی میں۔ اور آیت میں بھائیوں، اور بہنوں کا ذکر مطلق ہے جس سے برابری کا وہم ہو سکتا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے قرض کی ادائیگی کو وصیت پر تعیل سے مقدم کرنے کا فیصلہ کیا، اور بھائی، بہنوں میں فرق کا فیصلہ کیا۔

الرجل یوث اخاه لابیہ وامہ دون اخیه لابیہ : پس اگر آپ یہ کہیں کہ جب ادائیگی قرض وصیت پر تعیل سے مقدم ہے، تو پھر قرآن میں وصیت کو قرض پر کیوں مقدم کیا ہے؟ ملا علی قاری فرماتے ہیں، کہ یہ ہتہام شان کیلئے۔ (الکشاف) وصیت مشابہ تھی میراث کے، بغیر عوض کے حاصل ہونے میں، تو اس کی تعیل و رثاء پر گراں گزر سکتی تھی اور وہ دل کی خوشی سے اس کو ادا نہ کرتے، اس کے ادائیگی میں کوتاہی کا خطرہ تھا برخلاف قرض کے۔ کہ دل اس کی ادائیگی پر مطمئن ہوتے ہیں۔ پس اسی وجہ سے وصیت کو دین پر مقدم کیا۔ اس کے وجوب اور قرض کے ساتھ اس کے جلدی اداء کرنے پر آگاہی کیلئے، اسی لئے کلمہ ”او“ کے ساتھ لایا گیا وجوب میں دونوں کی برابری کی وجہ سے۔

۳۰۵۸: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَتْ امْرَأَةٌ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ بِابْنَتَيْهَا مِنْ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَاتَانِ ابْنَتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ قُتِلَ أَبُوهُمَا مَعَكَ يَوْمَ أُحُدٍ شَهِيدًا وَإِنَّ عَمَّهُمَا أَخَذَ مَالَهُمَا وَلَمْ يَدْعُ لَهُمَا مَالًا وَلَا تَنْكَحَانِ إِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ قَالَ يَقْضِي اللَّهُ فِي ذَلِكَ فَزَلْتِ آيَةَ الْمِيرَاثِ فَبَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى عَمَّهُمَا فَقَالَ أَعْطِي لَابْنَتَيْ سَعْدِ الثَّلَاثِينَ وَأَعْطِي أُمَّهُمَا الثَّمْنَ وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَكَ . (رواه الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ و قال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۱۶/۳ الحدیث رقم ۲۸۹۲ و الترمذی فی ۴/۳۶۱ الحدیث رقم ۲۰۹۲ و ابن ماجہ فی ۲/۹۰۸ الحدیث رقم ۲۷۲۰ و احمد فی المسند ۳/۳۵۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت سعد بن ربیع کی زوجہ اپنی دونوں بیٹیوں کو جو حضرت سعد بن ربیع سے تھیں لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کرنے لگیں کہ ”یا رسول اللہ! یہ دونوں بیٹیاں سعد بن ربیع کی ہیں ان کا باپ غزوہ احد کے دن آپ کے ساتھ شریک ہو کر میدان جنگ میں شہید ہو گیا۔ ان کا مال ان کے چچا نے لے لیا ہے (یعنی ان کے باپ کا جو ترکہ ان لڑکیوں کو ملنا تھا وہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق سعد کے بھائی نے لے لیا ہے) اور ان کے لئے کچھ بھی مال نہیں چھوڑا ہے جب تک ان کے پاس مال نہ ہوگا ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (کچھ دنوں کے لئے صبر کرو) ان لڑکیوں کے معاملہ کا اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا (یعنی ان کے بارے میں جب کوئی وحی نازل ہوگی تو فیصلہ ہوگا) چنانچہ (کچھ دنوں کے بعد) آیت میراث یعنی: (یوصیکم اللہ فی اولادکم نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے کسی کے ہاتھ ان لڑکیوں کے چچا کے پاس پیغام بھیجا (اور بلا کر) کہا کہ سعد کی بیٹیوں کو (سعد کے ترکہ میں سے) دو تہائی اور ان دونوں لڑکیوں کی والدہ کو آٹھواں حصہ دے دو اور جو کچھ باقی بچے وہ تمہارا ہے۔ (احمد ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ) اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔“

تشریح: علامہ طبری فرماتے ہیں، کہ جائز نہیں ہے کہ ”معلک“ قتل کا متعلق ہو۔ کشف میں اس آیت کے تحت لکھا ہے:

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السَّجْنُ فِتْيَانًا﴾ [یوسف-۳۶] کہ ”مع“ مصاحبت کے لئے ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: خرجت مع الامیر ای

مصاحبہ اس سے مراد اس کا ہمراہ ہونا ہوتا ہے۔ تو لازم ہے کہ ان دونوں کا دخول (یعنی یوسف علیہ) کے ہمراہ ہو۔ اور اس آیت:

﴿فلما بلغ معه السعی﴾ میں ”معہ“ کا ”بلغ“ کا متعلق ہونا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا تقاضا ہوگا کہ وہ دونوں ایک ساتھ چلنے کو

حد کو پہنچے۔ پس یہ بیان ہے، گویا کہ تقدیری عبارت اس طرح ہے کہ جب کہا ”فلما بلغ السعی“ یعنی اس حد تک جس حد تک وہ سعی پر

قادر تھا تو کہا گیا مع من؟ یعنی کس کے ساتھ؟ کہا گیا مع ایہ۔ یعنی اپنے ابا کے ساتھ۔ یہی تقدیری عبارت یہاں بھی ہے یعنی جب کہا گیا

کہ قتل یوم احد، کہ وہ احد کے دن شہید کئے گئے، تو کہا گیا، مع من؟ کس کے ہمراہ؟ کہا گیا معلک یعنی آپ ﷺ کے ہمراہ۔

شہیدا: یہ تیز ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال مؤکدہ ہو اس لئے کہ سابق لفظ ”شہادا“ کے معنی میں ہے۔ اور کلمہ ”فوق“ صلہ

ہے۔ جیسے اس آیت میں ہے: ﴿فاصر بوا فوق الاعناق﴾

شہیداً وان عمهما اخذ ما لهما: یعنی زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق کہ عورتوں کو میراث سے محروم رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے

چچا نے ان کیلئے کوئی مال نہیں چھوڑا جو ان پر خرچ کیا جائے۔ یا ان کی شادی کی تیاری کی جائے۔ اور عادت کے مطابق ان سے کوئی

نکاح نہیں کرے گا یا غالباً ان سے نکاح کیلئے کوئی تیار نہیں یا عزت کے ساتھ ان کی شادی نہ ہوگی۔

فنزلت آية الميراث ﴿یوصیکم اللہ فی اولادکم﴾

فبعث رسول اللہ ﷺ الی عمھما فقال: اعطی لابنتی سعد الثلثین واعطی امھما الثمن: اور یہ اس آیت کی بناء پر ہے:

﴿فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترککم﴾ [النساء-۱۳] ترجمہ: ”اور اگر تمہارے کچھ اولاد ہو تو ان کو تمہارے ترکہ سے

آٹھواں حصہ ملے گا۔“

وما بقی فهو لك : یعنی عصبہ ہونے کی وجہ سے، یہ اسلام میں میراث کا اول حکم تھا۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں، کہ دو بیٹیوں کی میراث میں حصہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں، کہ دو کا حکم ایک ہی کا حکم ہے، یعنی ان کا حکم جمع کا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے دو لکھتے دو سے زائد کیلئے مقرر کئے ہیں۔ اور باقی حضرات کہتے ہیں کہ دو بیٹیوں کا حکم دو سے زیادہ کا حکم ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ جب اس کے ساتھ ایک عورت ہو تو اس کا حصہ دو لکھتے ہوگا، تو یہ تقاضا کرتا ہے، کہ دو عورتوں کیلئے دو لکھتے مقرر کئے گئے ہیں، پھر جب یہ وہم ہو سکتا تھا، کہ عدد کے زیادہ ہونے کے ساتھ حصہ بھی زیادہ ہو گا، تو اس قول کے ساتھ وہم کو دور کیا [فان کن نساء فوق الثلثین] اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب ایک بیٹی اپنے بھائی کے ساتھ ایک تہائی کی مستحق ہوتی ہے تو اپنی بہن کے ساتھ بطریق اولیٰ ایک تہائی کی مستحق ہونی چاہئے۔ اور دو بیٹیاں دو بہنوں سے زیادہ حقدار ہیں، اور دو بہنوں کیلئے دو لکھتے مقرر کیا ہے: ﴿فلهما الثلثان مما ترك﴾ [النساء۔ ۷۶] ترجمہ: ”تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔“ (آئین)

اور یہ حدیث قول جمہور کے موافق ہے، اور شاید ابن عباس کو یہ حدیث پہنچی نہ ہو، یا ان کے نزدیک صحیح نہ ہو۔

۳۰۵۹: وَعَنْ هُزَيْلِ بْنِ شُرْحَبِيلَ ۲ قَالَ سَأَلَ أَبُو مُوسَى عَنْ ابْنَةِ وَبْنِ ابْنٍ وَأُخْتٍ فَقَالَ لِلْبَيْتِ النَّصْفُ وَلِلْأُخْتِ النَّصْفُ وَأْتِ ابْنَ مَسْعُودٍ فَسَيَتَا بِعْنِي فَسَيَلَّ ابْنُ مَسْعُودٍ وَأُخْبِرَ بِقَوْلِ أَبِي مُوسَى فَقَالَ لَقَدْ ضَلَّكَ إِذَا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ أَقْضَى فِيهَا بِمَا قَضَى النَّبِيُّ ﷺ لِلْبَيْتِ النَّصْفُ وَلِابْنَةِ الْإِبْنِ السُّدُسُ تَكْمِلَةً لِلْعُلَاقِ وَمَا بَقِيَ فَلِلْأُخْتِ فَاتَيْنَا أَبَا مُوسَى فَأُخْبِرَنَا بِقَوْلِ ابْنِ مَسْعُودٍ فَقَالَ لَا تَسْأَلُونِي مَا دَامَ هَذَا الْجَبْرُ فِيكُمْ. (رواه البخاری)

ترجمہ: ”اور حضرت ہزیل بن شرحبیل (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ (صحابی) سے یہ سوال کیا گیا کہ (مثلاً زید مر گیا اور اس کے ورثاء میں) ایک بیٹی اور پوتی اور ایک بہن ہے (تو زید کی میراث کو کس طرح ان تینوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا؟) حضرت ابو موسیٰ نے جواب دیا کہ (زید کا ترکہ) آدھا بیٹی کو اور آدھا بہن کو ملے گا (پوتی زید کی وراثت سے محروم رہے گی) پھر حضرت ابو موسیٰ نے سائل سے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس جاؤ (اور ان سے بھی یہی مسئلہ دریافت کرو) وہ بھی میرے مطابق جواب دیں گے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی یہ مسئلہ دریافت کیا گیا اور اس کا جو جواب حضرت ابو موسیٰ نے دیا تھا وہ بھی انہیں بتایا گیا، حضرت عبداللہ بن مسعود نے (مسئلہ اور حضرت ابو موسیٰ کا جواب سن کر) کہا کہ ایسی صورت میں (یعنی ابو موسیٰ نے جو فتویٰ دیا ہے وہی فتویٰ اگر میں بھی دیدوں تو) میں گمراہ تصور کیا جاؤں گا اور اپنے آپ کو راہ ہدایت پر نہ پاؤں گا لہذا اس مسئلہ میں میں وہی فیصلہ دوں گا جو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ہے اور وہ یہ ہے کہ بیٹی کو آدھا ملے گا اور دو تہائی پورا کرنے کے لئے پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا (یعنی میت کے ترکہ میں سے دو یا دو سے زائد بیٹیوں کو تہائی ملتا ہے اب چونکہ بیٹی ایک ہے اس لئے اس کو نصف حصہ ملا ہے تو پوتی کو چھٹا حصہ دے کر دو تہائی پورا کر دیا جائے گا) اور جو کچھ باقی بچے (یعنی ایک تہائی) وہ بہن کا حصہ ہے (یعنی اس حدیث بیٹوں کی موجودگی میں بہن کو عصبہ قرار دو) کے مطابق بہن عصبہ ہو کر باقی ماندہ ترکہ لے لے گی چنانچہ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے) راوی کہتے ہیں کہ (حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ جواب سن کر) ہم حضرت ابو موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں حضرت عبداللہ بن مسعود کے جواب سے آگاہ کیا۔ حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا کہ (مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کیونکہ ابن مسعود نے جو فتویٰ دیا ہے وہی صحیح اور حق ہے لہذا) جب تک تمہارے درمیان یہ عالم (یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ) موجود ہیں مجھ سے کوئی مسئلہ دریافت نہ کیا کرو۔“ (بخاری)

حالاتِ راوی:

ہزیل بن شرحبیل: مولف فرماتے ہیں کہ یہ ازدی و کوفی اور نابینا تھے، انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے حدیث سنی ہے، اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

تشریح: ”ہزیل“: ہزل کی تصغیر ہے، زاء کے ساتھ، اور ”ہزل“ جد کی ضد ہے۔

شرحبیل: شین کے ضمہ زاء کے فتح، حاء کے سکون اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے، اور غیر منصرف ہے، اور تہذیب الاءاء میں ہے کہ شرحبیل، شین کے ضمہ کے ساتھ عجمی نام ہے، اور غیر منصرف ہے۔ اور کبھی ”ہزلیل“ میں تصحیف کی جاتی ہے۔ ”ہذی“ ”ذال“ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ یہ صریح طور پر غلط ہے۔

السدس: سین اور دال کے ضمہ کے ساتھ ہے اور کبھی دال کو ساکن کیا جاتا ہے۔

لا تسالونی: نون کی تخفیف کے ساتھ ہے، اس لئے کہ ”لا“ ناہیہ ہے۔

تکملة الثلثین: حاضر تمام نسخوں میں اضافت کے ساتھ ہے، اور نصب مفعولیت کے بناء پر ہے۔ ای التملیل الثلثین علامہ طبری فرماتے ہیں، کہ یہ مصدر مؤکدہ ہے، اس لئے کہ جب آپ سدس کو نصف کے ساتھ ملا دیتے ہیں، تو دو ثلث مکمل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے، کہ یہ حال مؤکدہ ہو۔

وللاخت النصف: اللہ کے اس قول کی وجہ سے ہے: ﴿ان امرؤ هلک لیس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترک﴾ [النساء: ۱۷۶]: ”اگر کوئی شخص مر جائے جس کے اولاد نہ ہو اور اس کے ایک بہن تو ہو اس کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا“۔ اس میں محل نظریات یہ ہے کہ ”ولد“ بیٹی کو بھی شامل ہے، لیکن گویا وہ اس سے غافل رہے، یا یہ سمجھا کہ ”ولد“ خاص ہے مذکر کے ساتھ۔ یا یہ کہا کہ بہن کیلئے عصبہ ہونے کی وجہ سے آدھا ہے۔

وات ابن مسعود: اس لئے کہ وہ مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں، یا اس وجہ سے کہ دو علم ایک علم سے بہتر ہیں۔

فقال، لقد ضللت اذا: یعنی اگر اس جواب میں میں ان کی موافقت کروں۔

وما انا من المهتدين: سیوطی فرماتے ہیں کہ ان کا یہ قول، اقتباس کے جواز کے دلائل میں سے ہے۔

اقضى فيها بما قضى النبي ﷺ: یعنی اس جیسے مسئلہ میں۔ للبت نصف: اس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے۔

لابنة الابن السدس تکملة الثلثین وما بقی فلاخت: اس لئے کہ بہن، بیٹیوں کے ساتھ عصبہ ہے، اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ بیٹیوں کا حق دو تہائی ہے، جیسا کہ پہلے گزرا، تو ایک بیٹی نے آدھا لے لیا تو قرابت کی بناء پر، تو بیٹیوں کے حق میں سے ایک سدس حصہ رہ گیا، وہ پوتیاں لے لیں گی، خواہ ایک ہو یا متعدد ہوں، اور جو ترکہ باقی رہ گیا وہ قریبی عصبات کیلئے ہے۔ پس پوتیاں ایک بیٹی کے ساتھ ذوی الفروض میں سے ہیں، جیسا کہ اس کو سید نے شرح الفرائض میں ذکر کیا ہے۔

اکثر صحابہ کا مذہب یہی ہے، کہ بیٹیوں کی موجودگی میں بہنیں عصبہ ہوتی ہیں۔ اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے، آپ علیہ السلام کی اس حدیث کی وجہ سے: ”اجعلوا الاخوات مع البنات عصبہ“۔ کہ بیٹیوں کے موجودگی میں بہنوں کو عصبہ بناؤ۔ اور ابن عباس فرماتے ہیں، کہ بہنیں، بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ نہیں بنتیں، اور بیٹی اور بہن جب جمع ہو جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ بیٹی کیلئے آدھا ہوگا، اور بہن کیلئے کچھ نہ ہوگا۔ تو ان سے کہا گیا کہ حضرت عمر فرماتے تھے، کہ ترکہ میں سے جو باقی بچے وہ بہن کیلئے ہے، تو ابن عباس غصہ ہو گئے، اور فرمایا کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ یعنی ان کی مراد یہ آیت تھی: ﴿ان امرؤ هلک لیس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترک﴾ [النساء: ۱۷۶] ترجمہ: ”اگر کوئی شخص مر جائے جس کے اولاد نہ ہو اور اس کے ایک بہن ہو تو اس کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے

گا۔ پس یہاں ”ولد“ کو بہن کیلئے حاجب قرار دیا ہے۔ اور لفظ ”ولد“ مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ”ولد“ سے مراد یہاں صرف مذکر ہے، اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ﴾ [النساء: ۱۷۶] یہاں ولد سے مراد بالاتفاق بیٹا ہے، اس لئے کہ بھائی، بیٹی کے ساتھ وارث ہوتا ہے، اور اس کی تائید صریح کی حدیث سے ہوتی ہے، کہ وہ دلالت کر رہی ہے کہ آپ ﷺ نے بہن کو بیٹی کے ساتھ عصبہ قرار دیا ہے۔

۳۰۶۰: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ إِنَّ ابْنِي مَاتَ فَمَالِي مِنْ مِيرَاثِهِ قَالَ لَكَ السُّدُسُ فَلَمَّا وَتَى دَعَاهُ قَالَ لَكَ سُدُسٌ آخَرَ فَلَمَّا وَتَى دَعَاهُ قَالَ إِنَّ السُّدُسَ الْآخَرَ طُعْمَةٌ لَكَ. (رواه حمد والترمذی وابدوداود وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه ابدوداود فی السنن ۳/۳۱۸ الحدیث رقم ۲۸۹۶ والترمذی فی ۴/۳۶۵ الحدیث رقم ۲۰۹۹۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ میرا پوتا مر گیا ہے اس کی میراث میں سے میرا کتنا حصہ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تمہارے لئے (اس کی میراث میں سے) چھٹا حصہ ہے۔“ جب وہ (یہ جواب سن کر) واپس مڑا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا کہ ”تمہیں چھٹا حصہ اور ملے گا) پھر جب وہ واپس مڑا تو آپ ﷺ نے (دوبارہ) بلایا اور کہا کہ ”یہ دوسرا چھٹا حصہ (زیادہ ورثاء نہ ہونے کی وجہ سے) تمہارا رزق ہے۔“ (احمد ترمذی ابدوداود) اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔“

تشریح: الآخر: آخر کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں خاء کے فتح کے ساتھ ہے، لیکن یہاں کسرہ کے ساتھ مراد ہے۔ یعنی اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں، جن کا حصہ میراث میں دو تہائی تھا، لیکن یہ ان کو معلوم تھا۔

قوله: ان السدس الآخر طعمة: ایک نسخہ میں ”لك“ ہے۔ ذوی الفروض کے زیادہ نہ ہونے کے سبب سے۔ اور یہ آخر کا چھٹا حصہ ذی فرض ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے اس لئے کہ اگر ذوی الفروض زیادہ ہو جائیں تو یہ آخر کا چھٹا حصہ ختم ہو جائے گا۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ اس مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ میت نے اپنے وارثوں میں دو بیٹیاں اور ایک یہ سائل یعنی دادا چھوڑے۔ چنانچہ میت کے ترکہ میں بیٹیوں کو دو تہائی ملا، اور ایک تہائی باقی رہ گیا، تو آپ علیہ السلام نے سائل کو چھٹا حصہ ذی فرض ہونے کی حیثیت سے دیدیا اس لئے کہ وہ میت کے دادا تھے۔ پھر وہ چلا گیا، تو آپ ﷺ نے اس کو بلایا اور آخری چھٹا حصہ بھی اس کو دیدیا، تاکہ وہ یہ گمان نہ کرے کہ ذی فرض ہونے کی حیثیت سے دادا کا حصہ تہائی ہے۔ اور طعمہ کا معنی یہاں ”تعصیب“ ہے، یعنی یہ تیری روزی ہے، فرض نہیں ہے اور سدس آخر کے ساتھ ”طعمہ“ ”کھا، سدس کا اول کے ساتھ ”طعمہ“ نہیں کہا۔ اس لئے کہ سدس اول فرض ہے اور فرض میں تبدیلی نہیں آتی بخلاف عصبہ ہونے کے، تو جب عصبہ ہونا کوئی مستقل چیز نہیں ہے جو ہمیشہ کیلئے ثابت ہو تو اس کو ”طعمہ“ کہا۔

۳۰۶۱: وَعَنْ قَبِيصَةَ بِنِ دُوَيْبٍ قَالَ جَاءَتِ الْجَدَّةُ إِلَى أَبِي بَكْرٍ تَسْأَلُهُ مِيرَاثَهَا فَقَالَ لَهَا مَا لَكَ فِي كِتَابِ اللَّهِ شَيْءٌ وَمَا لَكَ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ شَيْءٌ فَأَرْجِعِي حَتَّى أَسْأَلَ النَّاسَ فَسَأَلَ فَقَالَ الْمَغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ حَضَرَتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَأَعْطَاهَا السُّدُسَ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ هَلْ مَعَكَ غَيْرُكَ فَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ مِثْلَ مَا قَالَ الْمَغِيرَةُ فَأَنْفَذَهُ لَهَا أَبُو بَكْرٍ ثُمَّ جَاءَتِ الْجَدَّةُ الْآخْرَى إِلَى عُمَرَ تَسْأَلُهُ مِيرَاثَهَا فَقَالَ هُوَ ذَلِكَ السُّدُسُ فَإِنْ اجْتَمَعْتُمَا فَهُوَ بَيْنَكُمَا وَإِن كُنتُمَا حَلَّتْ بِهِ فَهُوَ لَهَا۔

(رواه مالك واحمد والترمذی وابدوداود والدارمی وابن ماجه)

اخرجه ابدوداود فی السنن ۳/۳۱۶ الحدیث رقم ۲۸۹۴ والترمذی فی ۴/۳۶۵ الحدیث رقم ۲۱۰۰ و اخرجه ابن ماجه

فی ۹۰۹/۲ الحدیث رقم ۲۸۲۴ والدارمی فی ۴۵۶/۲ الحدیث رقم ۲۹۳۹ ومالك فی الموطأ ۵۱۳/۲ الحدیث رقم

۴ من کتاب الفرائض واحمد فی المسند ۲۲۵/۴

ترجمہ: ”اور حضرت قبیصہ بن ذویبؓ کہتے ہیں کہ (ایک متونی شخص کی) دادی یا نانی حضرت ابو بکر صدیق کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان سے اپنی میراث دلوائے جانے کا مطالبہ کرنے لگی حضرت ابو بکرؓ نے اس سے فرمایا کہ کتاب اللہ میں تمہارے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں ہے اور نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں تمہارے لئے کوئی حصہ مقرر کیا گیا ہے (یعنی مجھے جو حدیثیں یاد ہیں ان میں سے کسی حدیث میں دادی نانی کا کوئی حصہ مقرر نہیں کیا گیا۔ اس لئے اب تم واپس جاؤ یہاں تک کہ میں لوگوں سے (یعنی علماء صحابہؓ سے) پوچھ لوں گا (شاید ان میں سے کسی کو دادی نانی کے بارے میں آپ ﷺ کا کوئی ارشاد معلوم ہو) چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ میں (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا (تو میں نے دیکھا کہ) آپ ﷺ نے دادی نانی کو چھٹا حصہ دلوایا۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت مغیرہؓ سے کہا کہ تمہارے علاوہ کوئی اور شخص بھی تمہارے ساتھ تھا؟ (یعنی حضرت ابو بکرؓ نے بطور احتیاط ان سے پوچھا کہ تمہارے علاوہ کسی اور شخص نے بھی رسول اللہ ﷺ سے یہ حکم سنایا دیکھا ہے؟) چنانچہ (ایک اور صحابی) حضرت محمد بن ابن مسلمہؓ نے (حضرت مغیرہ کے قول کی تائید کی یعنی انہوں نے) وہی کہا کہ حضرت مغیرہؓ نے کہا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ (جب اطمینان ہو گیا کہ میت کے ترکہ میں سے دادی نانی کا بھی حصہ ہے تو انہوں نے) اسے دادی نانی کو (میت کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ دیئے جانے کا فیصلہ کر دیا۔ پھر دوسری دادی نانی حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے ان سے اپنی میراث دلوائے جانے کا مطالبہ کیا حضرت عمرؓ نے کہا وہی چھٹا حصہ تمہارے لئے بھی ہے اگر تم دو ہو تو وہ چھٹا حصہ تم دونوں کے درمیان مشترک ہے اور اگر تم میں سے کوئی ایک ہے تو وہ چھٹا حصہ اس ایک کے لئے ہوگا۔“ (مالک احمد ترمذی ابو داؤد دارمی ابن ماجہ)

تشریح: ذلك: کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں کاف کے فتح کے ساتھ ہے، اس صورت میں خطاب عام ہوگا۔
السدس: یہ صفت ہے، ذلك کے لئے، یا اس کیلئے عطف بیان ہے۔

قال جاء ت الجدة: ”الی ایہی بکر تسالہ میراثہا“۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ کہہ رہی تھی اعطنی میراث ولدانتی، کہ میرے نواسے کی میراث مجھے دو۔

فار جمعی حتی اسال الناس: اس لئے کہ جس نے یاد کیا وہ حجت ہے، اس پر جس نے یاد نہیں کیا۔ اور ایک روایت میں ہے، کہ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ تم صبر کرو تا کہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لوں۔ اس لئے کہ تیرے بارے میں نہ اللہ کی کتاب میں کوئی نص پاتا ہوں اور نہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے تیرے مسئلہ کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ پھر صحابہ سے پوچھا۔
ثم جاء ت الجدة الاخرى: یعنی اسی میت کی دادی تھی اگر پہلے والی نانی ہو، اور یا نانی تھی اگر پہلے والی دادی ہو۔ جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے یہ کہا ہے۔ اور سید شریف کی روایت میں ہے: ثم جاء ت أم الاب کہ پھر دادی آگئی۔

فان اجتمعنا: یہ صراحت ہے اس کا جو پہلے ضمناً معلوم ہوا، اور منطوق کی وضاحت ہے، جو پہلے مفہوماً سمجھا گیا۔ اور خطاب دادی اور نانی دونوں کو ہے۔

یہ فیصلہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے کیا۔ اور کسی نے اس پر تکیہ نہیں کی لہذا یہ اجماع ہوا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، ”فان اجتمعنا.....“ یہ بیان مسئلہ ہے۔ اور ”فان اجتمعنا“ اور ”ایتکما“ میں خطاب جنس کو ہے، ان دو جہات کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ پس حضرت ابو بکرؓ نے اس چھٹے حصے کو تمہا نانی کو دینے کا حکم دیا، کیونکہ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ میت کی دادی بھی ہے۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسری جدہ بھی ہے تو انہوں نے حکم دیا، کہ اس چھٹے حصے میں دونوں شریک ہیں۔ واللہ اعلم

تخریج: ایک روایت میں ہے کہ میت کی دادی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آگئی اور کہنے لگی کہ میں میراث کی زیادہ مقدار ہوں میت

کی نانی سے۔ اس لئے کہ اگر یہ نانی مر جائے تو اس کی بیٹی کی اولاد اس کی وارث نہ ہوگی اور اگر میں مر جاؤں تو میرے پوتے وارث ہوں گے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ وہی چھٹا حصہ تم دونوں کا ہے۔ تو تین تین کا اجماع ہے کہ جدات صحیحہ چھٹے حصے میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ اور ابن عباس فرماتے ہیں، کہ نانی، ماں کے قائم مقام ہے ماں کے ہونے کی صورت میں یہ میراث میں ایک تہائی لے گی جب میت کی اولاد اور بھائی نہ ہوں، اور چھٹا حصہ لے گی جب ان میں سے کوئی موجود ہو۔

۳۰۶۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ فِي الْجَدَّةِ مَعَ ابْنَيْهَا أَنَّهَا أَوْلُ جَدَّةٍ أَطْعَمَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سُدْسًا مَعَ ابْنَيْهَا وَابْنَيْهَا حَتَّى . (رواه الترمذی والدارمی و الترمذی ضعفه)

اخرجه الترمذی فی ۳۶۷/۴ الحدیث رقم ۲۱۰۲ والدارمی فی ۴۵۵/۲ الحدیث رقم ۲۹۳۲۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے اس دادی نانی کے بارے میں جس کا بیٹا موجود ہو یہ کہا کہ (میراث دلوائی جانے والی) وہ پہلی دادی نانی تھی جسے رسول اللہ ﷺ نے اس کے بیٹے کی موجودگی میں چھٹا حصہ دیا تھا حالانکہ اس کا بیٹا زندہ تھا۔“ (ترمذی داری) اور امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔“

تشریح: انہا: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”انہا اول جدۃ“ یہ قول کا مقولہ ہے۔ اور ضمیر جدہ کی طرف راجع ہے جو مسئلہ میں مذکور ہے۔ یعنی ابن مسعود نے اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دادی اور باپ چھوڑا، یہ بات کہی۔ شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میت کی دادی کو میت کے باپ کی موجودگی میں چھٹا حصہ دیا۔ حالانکہ باپ کی موجودگی میں دادی میراث سے محروم ہوتی ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ جدات کیلئے میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ وہ روزی ہے، جو ان کو دی جاتی ہے، اور اس میں قریب اور بعید برابر ہیں۔

ابن الملک کی شرح میں ہے کہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس کو بطور احسان دیا تھا نہ کہ بطور میراث کے۔ اور ابن مسعود کا مذہب ہے کہ دادی اور نانی کا میراث میں حصہ نہیں ہے، خواہ اس کے ساتھ میت کے زیادہ قریب کا وارث ہو، یا نہ ہو۔ اور سید کی شرح الفرائض میں ہے، کہ دادی، باپ کی وجہ سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور یہ حضرت عثمان، علی، اور زید بن ثابت کا قول ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ابن مسعود اور ابو موسیٰ اشعری سے نقل کیا گیا ہے، کہ میت کی دادی میت کے باپ کی موجودگی میں بھی وارث ہوتی ہے۔ اور اس کو شریح حسن اور ابن سیرین نے اختیار کیا ہے۔ بوجہ اس روایت کے جو ابن مسعود نے نقل کی ہے کہ آپ علیہ السلام نے باپ کی موجودگی میں دادی کو میراث میں سے چھٹا حصہ دیا تھا۔ اور اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ اس میں احتمال ہے کہ اس میت کا باپ غلام یا کافر تھا۔

۳۰۶۳: وَعَنِ الصَّحَّاحِ بْنِ سَفْيَانَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَتَبَ إِلَيْهِ أَنْ وَرِثَ امْرَأَةً أَشِيمَ الصَّبَابِيِّ مِنْ دِيَّةِ

رَوْحِيهَا (رواه الترمذی و ابو داؤد و قال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۳۹/۳ الحدیث رقم ۲۹۲۷ و الترمذی فی السنن ۳۷۱/۴ الحدیث ۲۱۱۰ و ابن ماجہ فی

۸۸۳/۲ الحدیث رقم ۲۶۴۲ و مالک فی الموطأ ۸۶۶/۲ الحدیث رقم ۹ من کتاب العقول و احمد فی المسند ۴۵۲/۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت صحاح بن سفیان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام خط لکھا کہ اشیم صبابی کی زوجہ کو اس کے خاوند کے خون بہا میں سے میراث دو۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔“ (ترمذی ابو داؤد)

حالاتِ راوی:

مصنف فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ صحاح بن سفیان اپنی بہادری کی وجہ سے سوشہ سواروں کے برابر شمار کیے جاتے تھے۔ اور نبی ﷺ

کی حفاظت کیلئے تلوار لے کر ان کے سر پر کھڑے رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں ان کی قوم کے مسلمان افراد پر نگران مقرر کیا تھا۔
تشریح: ورت: راء مکسرہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

اشیم: ہمزہ کے فتح، شین کے سکون اور یاء کے فتح کے ساتھ ہے۔

کتب ان: میں ’ان‘ مصدریہ، یا تفسیر یہ ہے اس لئے کہ کتابت میں ’قول‘ کا معنی پایا جاتا ہے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے، کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دیت پہلے تو مقتول کیلئے واجب ہوتی ہے، پھر اس دیت میں حاصل ہونے والا مال مقتول کی دوسری املاک کی طرح اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، چنانچہ اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ دیت میں سے ماں شریک بھائی، شوہر، اور بیوی کو بالکل کوئی میراث نہیں ملے گی۔

۳۰۶۳: وَعَنْ تَمِيمِ الدَّارِيِّ قَالَ سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا السُّنَّةُ فِي الرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ الشِّرْكِ يُسَلِّمُ عَلَى يَدَي رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ هُوَ أَوْلَى النَّاسِ بِمَحْيَاهُ وَمَمَاتِهِ -

(رواه الترمذی وابن ماجه والدارمی)

اخرجه البخاری فی صحیحہ ۴۵/۱۲ معلقا فی کتاب الفرائض باب اذا اسلم علی یدہ ابوداؤد فی السنن ۳۳۳/۳ الحدیث رقم ۲۹۱۸ والترمذی فی ۳۷۲/۴ الحدیث رقم ۲۱۱۲ وابن ماجه فی ۹۱۹/۲ الحدیث رقم ۲۷۵۲ والدارمی فی ۴۷۱/۲ الحدیث رقم ۳۰۳۳ واحمد فی المسند ۱۰۳/۴

ترجمہ: ”اور حضرت تميم داریؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اس مشرک کے بارے میں کیا حکم ہے جو مسلمانوں میں سے کسی ایک شخص کے ہاتھ پر شرف باسلام ہوا ہو؟ (یعنی وہ مسلمان اس نو مسلم کا مولیٰ ہوتا ہے یا نہیں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ مسلمان (جس کے ہاتھ پر وہ مشرک اسلام لایا ہے) اس کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ (یعنی وہ مسلمان اس نو مسلم کا مولیٰ ہے)۔“ (ترمذی ابن ماجه داری)

تشریح: اولیٰ الناس بمحیاءہ ومماتہ: شیخ مظہر فرماتے ہیں، کہ امام ابو حنیفہ امام شافعی، امام مالک اور ثوری رحمہم اللہ کے

نزدیک وہ مولیٰ نہیں بنتا اور عمر بن عبدالعزیز، سعید بن المسیب اور عمرو بن اللیث کے نزدیک اس حدیث کی بناء پر وہ مولیٰ بن جاتا ہے۔ امام شافعی اور ان کے تبعین کی دلیل آپ علیہ السلام کی یہ حدیث ہے: الو لاء لمن اعتق، اور تميم داری کی حدیث میں احتمال ہے۔ کہ یہ ابتداء اسلام کی بات ہو کہ مولیٰ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے اسلام اور نصرت کی وجہ سے۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اور حدیث کے الفاظ ”وہ سب سے زیادہ حقدار ہے اس کی زندگی میں اور مرنے کے بعد“ سے مراد اعانت ہو اس کی زندگی میں اور اس پر نماز جنازہ پڑھنا ہے مرنے کے بعد۔ لہذا یہ حدیث ان کی حجت نہیں بن سکتی۔ (آپنی)

امام ابو حنیفہ اور امام مالک کو امام شافعی کے اتباع میں سے قرار دینا بہت عجیب و غریب ہے۔

۳۰۶۵: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَجُلًا مَاتَ وَلَمْ يَدَعْ وَاِرثًا إِلَّا غُلَامًا كَانَ أَعْتَقَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ هَلْ لَهُ أَحَدٌ قَالُوا لَا إِلَّا غُلَامٌ لَهُ كَانَ أَعْتَقَهُ فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِيرَاثَهُ لَهُ . (رواه ابوداؤد والترمذی وابن ماجه)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۵۴/۳ الحدیث رقم ۲۹۰۵ والترمذی فی ۳۸۶/۴ الحدیث رقم ۲۱۰۶ وابن ماجه فی ۹۱۵/۲ الحدیث رقم ۲۷۴۱ واحمد فی المسند ۲۲۱/۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص مر گیا جس نے اپنے ایک غلام کے علاوہ کہ جسے وہ آزاد کر چکا تھا اور کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا اس کا کوئی وارث ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ سوائے ایک غلام کے جسے وہ آزاد کر چکا تھا کوئی وارث نہیں ہے، البتہ ایک غلام ہے جسے اس نے آزاد کر دیا تھا۔ لہذا نبی کریم ﷺ نے اس میت کی میراث

اس (کے آزاد کردہ غلام) کو دیدی۔ (ابوداؤد ترمذی ابن ماجہ)
تشریح: الا غلاما: مستثنیٰ منقطع ہے۔

فجعل النبی ﷺ میراثہ لہ: اور یہ میراث دینا اس طرح تھا جیسا کہ اس سے پہلے حضرت عائشہ کی حدیث میں گذرا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک لا وارث میت کی میراث کے بارے میں فرمایا کہ اس کی میراث اس کے سستی کے کسی شخص کو دے دو۔ یہ بطور تبرع تھا اس لئے کہ اس کا مال بیت المال کیلئے ہو گیا تھا۔ شیخ مظہر فرماتے ہیں، کہ شرح اور طاؤس نے کہا ہے کہ جس طرح آزاد کرنے والا اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے، اسی طرح آزاد شدہ غلام بھی اپنے آزاد کرنے والے کا وارث ہوتا ہے۔

۳۰۶۶: وَعَنْ عُمَرَو بْنِ شُعْبَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ يَرِثُ الْوَلَاءُ مَنْ يَرِثُ الْمَالَ .

(رواہ الترمذی وقال هذا حدیث اسنادہ لیس بالقوی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴/۳۷۳ الحدیث رقم ۲۱۱۴۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمر بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص مال کا وارث ہوتا ہے وہ ولاء کا بھی وارث ہوتا ہے۔“ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے۔

تشریح: الولاء: واؤ کے فتح کے ساتھ، مراد آزاد کردہ غلام کا مال ہے۔

یہاں اس وارث سے مراد عصبہ بنفیسہ ہے۔ شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ یہ مخصوص ہے یعنی جو عصبہ وارث بنفیسہ ہونے کی حیثیت سے میت کے مال کا وارث ہوتا ہے، وہی عصبہ ولاء کا وارث ہوگا۔ اور عورت اگر چہ وارث ہوتی ہے مگر عصبہ نہیں ہوتی۔ عصبہ تو صرف مرد ہی ہوتے ہیں، عورتیں عصبہ نہیں ہوتیں۔ اور ولاء بیت المال کی طرف منتقل نہیں ہوتی، اور نہ ہی عورتیں ولاء کی وارث ہوتی ہیں۔ عورت ایسے آزاد شدہ غلام کے مال کی وارث ہوتی ہے، جسے اس نے خود آزاد کیا ہو، یا اس کو اس کے آزاد کردہ غلام نے آزاد کیا ہو۔
 قولہ: هذا حدیث اسنادہ لیس بالقوی: اور ایک نسخہ میں ”لیس بقوی“ ہے۔

الفصل الثالث:

۳۰۶۷: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَا كَانَ مِنْ مِيرَاثٍ قَسِمَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ عَلَى قِسْمَةِ الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا كَانَ مِنْ مِيرَاثٍ أَدْرَكَهُ إِلَّا سَلَامٌ فَهُوَ عَلَى قِسْمَةِ الْإِسْلَامِ . (رواہ ابن ماجہ)

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۲/۹۱۸ الحدیث رقم ۲۷۴۹۔

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو میراث زمانہ جاہلیت میں تقسیم کی گئی ہے وہ زمانہ جاہلیت ہی کی تقسیم کے مطابق رہے گی اور جس میراث نے اسلام کا زمانہ پایا وہ اسلام ہی کی تقسیم کے مطابق ہے۔“ (ابن ماجہ)
تشریح: قسم: تخفیف کے ساتھ ہے۔

۳۰۶۸: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ بْنِ حَزْمٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَاهُ كَثِيرًا يَقُولُ كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَقُولُ عَجَبًا لِلْعَمَةِ تَوَرَّثَتْ وَلَا تَرِثُ . (رواہ مالک)

اخرجه مالک فی الموطأ ۲/۵۱۷ الحدیث رقم ۹ من کتاب الفرائض۔

ترجمہ: ”اور حضرت محمد بن ابی بکر بن حزم سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے سنا جو اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما چھوٹے کے بارے میں تعجب سے فرمایا کرتے تھے کہ اس کا بھتیجا تو اس کا وارث بنتا ہے مگر وہ اپنے بھتیجے کی وارث

نہیں بنتی۔ (ماک)

تشریح: قولہ: کان عمر بن الخطاب یقول: عجا للعمة تورث ولا تورث: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، حضرت عمر کا یہ تعجب محض عقل و قیاس کی بنیاد پر تھا، ورنہ اگر بجا آوری حکم کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی حکمت و مصلحت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

۳۰۶۹: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَزَادَابُنْ مَسْعُودٍ وَالطَّلَاقَ وَالْحَجَّ فَإِنَّهُ مِنْ دِينِكُمْ۔

(رواہ الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۴۴۱/۲ الحدیث رقم ۲۸۵۱

ترجمہ: ”اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: فرائض کے احکام و مسائل سیکھو۔ نیز حضرت ابن مسعودؓ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ ”طلاق اور حج کے احکام و مسائل (بھی) سیکھو۔“ ان دونوں نے کہا کہ (ان علوم کا سیکھنا اس لئے ضروری ہے کہ یہ علم تمہارے اہم دینی امور میں سے ہے۔) (داری)

تشریح: فانہ: ضمیر ”علم“ کی طرف راجع ہے اور ایک نسخہ میں ”فانہا“ ہے اس صورت میں ضمیر فرائض، یا مذکورات کی طرف عائد ہے۔

من دینکم: یعنی دین کی ضروریات میں سے ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ اس بارے میں یہ روایت بھی ہے: ”تعلموا الفرائض وعلموها الناس؛ فانها نصف العلم“۔ اور اس کو نصف علم یا تو کلام میں توسع کی بناء پر کہا گیا ہے۔ یا دونوں حالات یعنی زندگی، اور مرنے کے اعتبار سے کہا ہے۔ واللہ اعلم۔

سید شریف فرماتے ہیں، کہ اسی طرح ہے فقہاء کی روایت، پس فرائض جمع ہے فریضۃ کی۔ ”فریضۃ“ میراث کے مقررہ حصص کو کہتے ہیں۔ اس کو نصف علم قرار دیا ہے اس لئے کہ یہ انسان کی دو حالتوں میں سے ایک کے ساتھ خاص ہے، اور وہ موت ہے۔ نہ کہ دوسرے دینی علوم کے وہ زندگی کے ساتھ خاص ہیں

یا اس وجہ سے کہ یہ خاص ہے، ملکیت کے دو سببوں میں سے ایک سبب کے ساتھ، یعنی سبب ضروری کے ساتھ نہ کہ اختیاری کے ساتھ جیسے خریدنا، ہدیہ قبول کرنا، وصیت قبول کرنا وغیرہ۔

یا اس کو سیکھنے کی ترغیب کیلئے کہا ہے۔ اسلئے کہ یہ بہت اہم امور کے ساتھ متعلق ہے۔ داری اور دارقطنی کی روایت میں ہے: ”تعلموا العلم وعلموہ الناس، تعلموا الفرائض وعلموہا الناس“۔ اس روایت کے مطابق فرائض سے مراد وہی مذکورہ یعنی میراث مراد ہے۔ اور یا اللہ کے بندوں پر فرض کردہ احکام ہیں۔ اور اس کا ذکر تقسیم کے بعد خصوصیت کے ساتھ مزید اہتمام کی وجہ سے کیا۔ (آئینی)

پہلے احتمال کی تائید حدیث مذکور کے آخر سے ہوتی ہے: ”تعلموا القرآن وعلموہا الناس فانی امرء مقبوض، والعلم سیقبض ویظہر الفتن حتی یختلف اثنان فی فریضۃ لا یجدان احدا یفصل بینہما“۔

اگر کہا جائے کہ اس کی تقدیر یوں کیوں نہیں نکالتے کہ کتاب یعنی قرآن میں مقرر حصص کو سیکھو، اور لوگوں کو سکھاؤ۔ اس لئے کہ علم میراث کا آدھا ہے۔ اس لئے کہ علم میراث کی دو قسمیں ہیں: (۱) ذوی الفروض کا علم: (۲) عصبات کا علم۔ تو اس صورت میں تکلف کی حاجت نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں، کہ ایک مانع اس کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اور وہ مانع آپ علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے: فرائض کو سیکھو، اور لوگوں کو سکھاؤ، اس لئے کہ یہ سب سے پہلے بھلایا جائے گا، تو سب سے پہلے ذوی الفروض کے حصص کو نہیں بھلایا جائے گا، اس لئے کہ اس کا بھولنا موقوف ہے قرآن کے بھلانے پر، اور قرآن کائنات کے ختم ہونے تک باقی رہنے والا ہے۔ تو سب سے پہلے بھلایا جانے والا

قضیہ یہ نہیں ہے، مگر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اس کی معرفت کو بھلا دی جائے گی۔ یا اس پر سب سے پہلے عمل کرنا چھوڑا جائے گا، جیسا کہ ہمارے زمانہ میں اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اللہ ہی اپنے دین کا محافظ اور مددگار ہے۔

بَابُ الْوَصَايَا

وصیتوں کا بیان

”وصایا“ وصیت کی جمع ہے، اسم ہے مصدر کے معنی میں ہے۔ ازہرئی فرماتے ہیں، کہ یہ مشتق ہے ”وصیت الشیء“ سے یعنی جب اس کو ملایا جائے۔ اس کا نام وصیت اس لئے رکھا ہے کہ اس میں ملانا ہے، اس چیز کا جو زندگی میں ہونے کی بعد کے ساتھ۔ اور کہا جاتا ہے ”وصی اوصی“۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں، کہ یہ آیت ان دونوں لغات کے ساتھ پڑھی گئی ہے: ﴿وصی بہا ابراہیم لبنیہ ویعقوب﴾ [البقرہ-۱۳۲] اور کبھی ”وصیت“ بمعنی ”نہیحت“ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿لقد وصینا الذین اوتوا الكتاب من قبلکم وایاکم ان اتقوا اللہ﴾ [النساء: ۱۳۱]

الفصل الاول:

۳۰۷۰۔ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا حَقَّ امْرِءٌ مُسْلِمًا لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحہ -/ ۳۵۵ الحدیث رقم ۲۷۳۸ و مسلم فی صحیحہ ۱۲۴۹/۳ الحدیث رقم (۱۶۲۷/۱) و ابوداؤد فی ۲۸۲/۳ الحدیث رقم ۲۸۶۲ و الترمذی فی السنن ۳۷۵/۴ الحدیث رقم ۲۱۱۸ و النسائی فی ۲۳۸/۶ الحدیث رقم ۳۶۱۵ و ابن ماجہ فی ۹۰۲/۲ الحدیث رقم ۲۷۰۲ و الدارمی فی ۴۹۵/۲ الحدیث رقم ۳۱۷۵ و مالک فی الموطأ ۷۶۱/۲ الحدیث رقم ۱ من کتاب الوصیہ و احمد فی المسند ۴/۲

ترجمہ: ”حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس مسلمان مرد کے (مال یا آپسی تعلقات کے) معاملے میں کوئی بات وصیت کے قابل ہو تو اس کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ دو راتیں بھی یوں گزارے کہ اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔“۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: یوصی فیہ: صادقہ فتنہ، اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

بیت لیلین: اس میں حذف ہے اور تقدیری عبارت یہ ہے ان بیت اور یہ اللہ کے اس ارشاد کی طرح ہے: ﴿ومن آیاتہ یریکم البرق﴾ یعنی ان یریکم اس کو ذکر کیا ہے عسقلانی نے۔

یعنی احتیاط اور موت کے تشبیہ کے پیش نظر اس کو یہ حق نہیں ہے، کہ وہ وصیت لکھنا چھوڑ دے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ ”ما“ بمعنی لیس کے ہے۔ اور بیت تیسری صفت ہے امرء کے لئے، اور یوصی فیہ، شیء کی صفت ہے۔ اور مستغنی، لیس کی خبر ہے، پھر شمشیر مظهر کے قول کے مطابق لیلین کا قید تاکید ہے، نہ کہ تحدید ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کیلئے مناسب نہیں، کہ اس پر کسی بھی حل میں کوئی زمانہ اگرچہ کم کیوں نہ ہو، گزرے مگر یہ کہ وہ اس حال میں رات گزارے کہ اس کی وصیت نامہ اس کے پاس رکھا ہو۔ اس لئے کہ اس کو کچھ معلوم نہیں کہ موت کب اس کو آئے گی۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ دو راتوں کی تخصیص میں تسامح ہے، مبالغہ کے ارادہ سے یعنی اس کو ایک رات گزارنا بھی درست نہیں ہے،

لیکن ہم نے اتنی مقدار میں چشم پوشی کی ہے، لہذا اس سے تجاوز کرنا مناسب نہیں ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں، کہ ایک رات کی تخصیص میں بھی چشم پوشی اور تسامح ہے، اس لئے کہ موت کا تصور تو لمحہ غفلت میں ہو سکتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں، کہ اس حدیث میں دلیل ہے، وصیت کے واجب ہونے پر، اور جمہور علماء کے نزدیک وصیت مستحب ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ مسلمان کیلئے احتیاط یہ ہے کہ وصیت نامہ اس کے پاس لکھا ہوا ہو، اور اہل ظواہر میں داؤد وغیرہ کہتے ہیں، کہ وصیت واجب ہے، اس حدیث کے بنیاد پر۔ اور اس میں وجوب پر کسی قسم کی دلیل نہیں ہے۔ لیکن اگر انسان پر قرض ہو، یا اس کے پاس کسی کا امانت ہو، تو اس کی وصیت اس پر لازم ہے، اور جلد سے جلد وصیت لکھنا مستحب ہے، نیز یہ ضروری ہے کہ وصیت نامہ لکھ کر اس پر کسی گواہ بنا لے، پھر اگر کوئی نیا امر پیش آ جائے، اور اس کی وصیت کی ضرورت ہو، تو یہ بھی اس کے ساتھ ملا دے۔ اور یہ جو ہم نے کہا کہ اس پر گواہ بنا لے، اس لئے کہ بغیر گواہی کے وصیت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں، کہ بعض حضرات نے حدیث کے ظاہری مفہوم کی وجہ سے وصیت کو واجب کہا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک مستحب ہے۔ اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے اس کو مسلمان کیلئے حق اور لازم کیا ہے، نہ کہ اس پر لازم کیا ہے۔ اگر وصیت واجب ہوتی تو پھر لہ کی جگہ علیہ فرماتے، اور لفظ جس پر دلالت کر رہا ہے، وہ اس کے برخلاف ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ یہ مستحب وصیت کے بارے میں ہے، باقی قرض، اور امانت کے واپس کرنے جو اس پر لازم ہے، تو اس کی وصیت واجب ہے۔ پھر ظاہر حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے، کہ صرف لکھنا بغیر گواہی کے کافی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ اکثر علماء کے ہاں دو گواہ بنا نا ضروری ہے۔ اس لئے کہ غیر کا حق اس کے ساتھ متعلق ہے، تو اس کے ازالہ کیلئے حضرت شریعی کا ہونا ضروری ہے، اور یہ بھی کافی نہیں ہے کہ ان کو لکھے ہوئے پر گواہ بنا دے ان کو وصیت پر مطلع کرنے کے بغیر۔ (اتہنی)

اور یہ حدیث اس وصیت کے بارے میں جو کسی نے ازراہ تبرع کیا ہو۔ اور اس کی تائید شیعہ یوحسی فیہ سے ہوتی ہے۔ کہ یہاں علیہ شیعہ نہیں کہا۔ اور ایک روایت میں ہے لہ شیعہ یویر ان یوحسی فیہ۔

تخریج: اس کو روایت کیا ہے مالک، احمد اور ابن ماجہ نے۔

سیوطی کی شرح صدور میں ہے کہ ابن عساکر نے زید بن الم، عن ابیہ کے طریق سے یہ روایات کی ہے۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں، کہ مجھے وہ روایت یاد آگئی جو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے، کہ ”ما حق امرء مسلم بیعت ثلاث لیلال الاء وصیتہ لکتوبۃ عند رأسہ“ پس میں نے دواۃ اور کاغذ منگوا یا، تاکہ میں اپنی وصیت لکھ لوں، اور مجھ پر نیند کا غلبہ تھا، پس میں سو گیا اور وصیت نامہ نہیں لکھا۔ پس اس دوران کہ میں سویا ہوا تھا، اچانک ایک سفید لباس والا خوبصورت چہرے والا جس سے بہترین خوشبو آ رہی تھی، داخل ہوا، پس میں نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ آپ کو کس نے یہاں آنے دیا؟ وہ کہنے لگا مجھے اس گھر کے مالک نے یہاں آنے کی اجازت دی ہے، میں نے کہا تم کون ہو؟ اس نے کہا، میں موت کا فرشتہ ہوں۔ پس میں اس سے خوف زدہ ہوا، وہ کہنے لگا کہ آپ مت ڈرے، مجھے آپ کے روح قبضہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ پس میں نے کہا کہ آپ میرے لئے آگ سے براءت لکھ دے۔ اس نے کہا کہ دواۃ اور کاغذ لے آؤ۔ پس میں نے ہاتھ بڑھایا اس دواۃ اور کاغذ کی طرف جس پر میں سویا تھا، اور وہ میرے سر ہانے کے پاس تھے۔ پس میں نے وہ اس کو پکڑا دیئے، تو اس نے لکھا: ”بسم اللہ الرحمن الرحیم، استغفر اللہ، استغفر اللہ“۔ یہاں تک کہ کہ کاغذ کو دونوں طرف بھر دیا، پھر مجھے پکڑا دیا، اور کہا یہ تیری براءت ہے، اللہ تجھ پر رحم کرے۔ تو میں خوف کے حالت میں بیدار ہو، اور چراغ کو منگوا یا، پس جب میں نے اس کاغذ کو دیکھا جو میرے سوتے وقت میرے سر کے پاس رکھا ہوا تھا، تو اس میں دونوں طرف سے لکھا ہوا تھا استغفر اللہ۔ (اتہنی)

شاید اس میں اشارہ تھا اس حدیث کی طرف جس میں منقول ہے، کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اس کا نامہ اعمال اس کو خوش کرے تو وہ کثرت سے استغفار کرے۔ اس کو روایت کیا ہے طبرانی نے اوسط میں زبیر ابن عوام سے مرفوع۔

۳۰۷۱: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ مَرِضْتُ عَامَ الْفَتْحِ مَرَضًا أَشْفَيْتُ عَلَى الْمَوْتِ فَاتَانِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَعُودُنِي فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ لِي مَالًا كَثِيرًا وَلَيْسَ يَرُونِي إِلَّا ابْنَتِي أَفَأُوصِي بِمَالِي كُلِّهِ قَالَ لَا قُلْتُ فَمَالِي قَالَ لَا قُلْتُ فَالْشَطْرُ قَالَ لَا قُلْتُ فَالْفُلْتُ قَالَ الْفُلْتُ وَالْفُلْتُ كَثِيرًا إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ وَإِنَّكَ لَنْ تَنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللَّهِ إِلَّا أُجِرْتَ بِهَا حَتَّى اللَّقْمَةَ تَرَفَعَهَا إِلَى فِيٍّ أَمْرَاتِكَ. (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳۶۳/۵ الحديث رقم ۲۷۴۲ ومسلم فى صحيحه ۱۲۵۰/۳ الحديث رقم ۱۶۲۸/۵ والترمذى فى ۳۷۴/۴ الحديث رقم ۲۱۱۶ والنسائى ۲۴۱/۶ الحديث رقم ۳۶۲۶ وابن ماجه فى ۹۰۳/۲ الحديث رقم ۲۷۰۸۔

ترجمہ: ”اور سعد بن ابى وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں فتح مکہ کے سال اتنا شدید بیمار ہوا یہاں تک کہ میں موت کے کنارہ پر پہنچ گیا چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لئے میرے پاس تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس بہت مال ہے اور ایک بیٹی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے تو کیا میں اپنے سارے مال کے بارے میں وصیت کر جاؤں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”نہیں۔“ میں نے عرض کیا کہ ”کیا دو تہائی مال کے بارے میں وصیت کر جاؤں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نصف مال کی؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ایک تہائی مال کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتے ہو اگر چہ تہائی مال بھی بہت ہے اور یاد رکھو اگر تم اپنے در ثاء کو مال دار اور خوش حال چھوڑ جاؤ گے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو مفلس و تنگ دست چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھر میں (جان لو) تم اپنے مال کا جو بھی حصہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے خرچ کرو گے تو تمہیں اس کا اجر و ثواب دیا جائے گا یہاں تک کہ تمہیں اس لقمہ کا بھی ثواب دیا جائے گا جو تم اپنی بیوی کے منہ تک لے آتے ہو۔“ (بخاری و مسلم)

تشریح: عام الفتح: میرک شاہ کے نسخہ کے حاشیہ میں ہے کہ صحیح عام حجۃ الوداع ہے۔

اشفیت: کہا جاتا ہے: اشفی علی کذا، یعنی اس کے قریب ہوا، اور اس کے کنارے پروہا۔ اور اس کا استعمال صرف شر کے امور میں ہوتا ہے۔

کثیر: حاضر تمام نسخوں میں ”ثاء“ کے ساتھ ہے۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں، کہ اس کو ثاء اور باء دونوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ اور وہ دونوں روایت صحیح ہے۔

أفاوصی: تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ ہے۔ أن تذر: ہمزہ اور راء کے فتح کے ساتھ ہے۔ اور ایک صحیح نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ان تترك کے معنی میں ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ان تذو، ہمزہ کے فتح اور کسرہ کے ساتھ دونوں روایات صحیح ہیں۔ (اجحوت بھا: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ یعودنی: رسول اللہ سے حال ہے۔

فالشطر: جر کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں بالصف ہے۔ اور ایک دوسرے نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں، کہ نصب کے ساتھ جائز ہے، اور اس کا عطف ہوگا جار، مجرور پر اور رفع بھی جائز ہے۔ اور تقدیر یہ ہوگی: ”فالشطر کاف“ اور جر کے ساتھ عطف ہوگا، باء کے مجرور پر۔

فالثلث: جر کے ساتھ ہے اور نصب اور رفع بھی جائز ہے، گزرے ہوئے تفصیل کے مطابق۔

قال الثلث: نصب کے ساتھ ہے، اور ایک صحیح نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں، کہ ثلث اول میں نصب اور رفع دونوں جائز ہے۔ پس نصب انہاء کی وجہ سے ہوگا۔ یا فعل محذوف کی وجہ سے ہوگا۔ تقدیر یہ ہوگی: اعط الثلث. اور رفع فاعل ہونے کی وجہ سے ہوگا، تقدیر یوں ہوگی یکفیک الثلث. یا اس وجہ سے کہ یہ مبتدا ہے، اور خبر محذوف ہے یا اس کا عکس ہے۔

والثلث: یہ صرف رفع کے ساتھ ہے نہ کہ اس کے غیر کے ساتھ۔ اور یہ مبتدا ہے اور خبر اس کی ”کثیر“ ہے۔ ان تذر: یہ جملہ پورا خبر ہے انک کے لئے۔ اور فائق میں ہے کہ ان تذر محلاً مرفوع ہے۔ مبتدا ہونے کی وجہ سے۔ یعنی تقدیر یوں ہوگی تو کلک اولادک اغنیاء خیر. اور پھر یہ پورا جملہ انک کے لئے خبر ہے۔ اشرف کہتے ہیں، ”ان“ کو صرف شرط بنانا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس صورت شرط بلا جزاء ہوگی۔ اس لئے کہ ”خیر“ کو اس کے لئے جزاء بنانا جائز نہیں ہے۔ اور اس زمانہ کے لوگ اس میں اکثر تحیف کرتے ہیں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ روایت صحیح ہو، تو پھر اس قول کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی کہ جملہ اسمیہ سے فاء کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ یہ روایت حذف فاء پر دلیل ہوگی۔ پھر ایک زمانہ کے بعد میں نے امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن مالک الطائی سے یہ نقل کیا ہوا پایا: کتاب: ”شواہد التوضیح والتصحیح لمشکالت جامع الصحیح“ میں کہ انہوں نے حدیث میں اس کو شرط لایا ہے، اور کہا ہے کہ یہ اصل میں ان توکت ورتثک اغنیاء فہو خیر، ہے۔ تو فاء اور مبتدا کو حذف کیا گیا ہے۔ اور اس کی نظیر آپ علیہ السلام کا یہ قول ہے ابی بن کعب سے ”فان جاء صاحبها ولا استمتع بها“ اور آپ ﷺ کا قول ہلال بن امیہ سے ”البنیۃ والاحد فی ظہورک“ اور اس کے بارے میں حویلوں کا گمان ہے، کہ یہ ضرورت کے ساتھ مخصوص ہے۔ حالانکہ یہ ضرورت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا استعمال شعر میں زیادہ ہے، اور اس کے علاوہ میں کم ہے۔ اور جس نے اس حذف کو خاص کیا ہے، شعر کے ساتھ۔ اس نے تحقیق سے دشمنی کی ہے۔ اور بے جا تنگی کی ہے۔ نفاقہ: مفعول بہ ہے، یا مفعول مطلق ہے۔

حتی اللقمة: نصب کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں جر کے ساتھ ہے۔ اور رفع کے ساتھ بھی حکایت کیا گیا ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، انک لن تنفق کا عطف ہے۔ وانک ان تذر پر۔

ولیس یروئی: یعنی ذوی القروض میں سے۔ الا ابتی: اس لئے کہ ان عصبہ بہت سارے تھے، اس کو مظہر ٹیڈ کر کیا ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس تاویل کی تائید ورتثک سے بھی ہوتی ہے۔ اور بیٹی کے ذکر کو خاص شاید اس کے عجز اور کمزور کے بناء پر کیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ میرا ایسا کوئی وارث نہیں جس پر مجھے خوف ہو، سوائے ایک بیٹی کے۔

والثلث کثیر: ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ تہائی کا وصیت کرنا جائز ہے، اور اس سے کم کا کرنا بہتر ہے۔ انک ان تذر ورتثک اغنیاء: یعنی لوگوں سے مستغنی ہوں۔

خیر من ان تذرہم عالة یتکفون الناس: یعنی ان سے مانگے ہاتھ پھیلا کر۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس کے ورثاء مفلس اور فقیر تھے۔ اور وہ صدقہ کے زیادہ لائق تھے دوسروں سے۔

حتی اللقمة تو تعھا الی فی امراتک: اور ایک روایت میں ہے حتی ما تجعل فی فی امراتک. مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رضامندی کے لئے خرچ کرنے والے کو اجرد یا جاتا ہے۔ اگرچہ خرچ کرنے کا محل خواہشات کا پورا کرنا اور طبیعت کی خوشی ہو، اس لئے کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے، اور مؤمن کا نیت اس کے کام کرنے سے بہتر ہے۔

اور انک ان تذر اور انک من نفق، یہ علت ہے ایک تہائی سے زیادہ وصیت کی ممانعت کی۔ گویا کہ کہا گیا کہ آپ ایسا نہ کریں اس لئے کہ اگر آپ مرجائیں اور اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ جاؤ یہ بہتر ہے اس سے کہ ان کو مفلس چھوڑ جاؤ۔ اور اگر آپ زندہ رہے اور جو ثلث یعنی تہائی میں سے باقی ہے وہ صدقہ کر دیں اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کریں، تو یہ تیرے لئے بہتر ہوگا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس سے معلوم ہوا کہ مریض کا اپنے درد جو وہ محسوس کر رہا ہو، اس کا ذکر کسی کے سامنے جائز ہے،

صحیح غرض کی وجہ سے، یعنی دوا، دما یا وصیت وغیرہ میں سے۔ اور یہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ جب بطور ناراضگی کے ہو۔ اس لئے کہ اس سے مریض کے اجر میں کمی آجاتی ہے۔ (اتہلی)

اور اس میں یہ ہے کہ حدیث میں صرف یہ بات بیان کی ہے کہ وہ بیمار ہوئے خطرناک مرض کے ساتھ۔ اور کہا ہے کہ یہ حدیث جہاں اس بات کی دلیل ہے کہ مال جمع کرنا مباح ہے وہیں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وارثوں کے حق میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس میت کے وارث موجود ہوں تو اس کی وصیت اس کے تہائی مال سے زائد می جاری نہیں ہوتی۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اس کے تبعین اس کو جائز قرار دیتے ہیں، اور اسحق اور احمد کا بھی ایک ہی ہے۔

اس حدیث میں اس بات کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ اور وراثت کے ساتھ شفقت کا معاملہ کیا جائے۔ اس لئے کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک اور ان کے ساتھ احسان کرنا زیادہ افضل ہے غیروں سے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیر کے کاموں میں خرچ کرنا مستحب ہے، اور یہ کہ آدمی کو اس کے عمل کا ثواب نیت پر ملتا ہے۔

اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے سے ثواب ملتا ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے پیش نظر ہو۔ اور مباح چیز میں جب اللہ کی رضا کا ارادہ کیا جائے، تو وہ طاعت بن جاتی ہے، چنانچہ بیوی اگر چہ جسمانی و دنیاوی لذت و راحت کا ذریعہ ہے اور خوش اور مسرت کے وقت اس کے منہ میں نوالہ دینا محض ایک خوش طبعی ہے، جس کا عبادت و طاعت اور امور آخرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے یہ بتایا کہ اگر بیوی کہ منہ میں نوالہ دینے میں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی طلب کی نیت ہو، تو اس میں ثواب ملتا ہے۔ لہذا اس کے علاوہ دوسری حالتوں میں بطریق اولیٰ ثواب ملے گا۔ (اتہلی)

ملاطی قاری رماتے ہیں، کہ نودی کا یہ کہنا کہ اس کا طاعت اور امور آخرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس میں تسامح ہے، اور شاید انہوں نے طاعت سے عبادت مراد لی ہو، ورنہ طاعت جو بمقابلہ معصیت کے ہے اس کا یہاں لانا درست نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ مخفی نہیں ہے۔
تخریج: اس کو مالک، احمد، اور کتب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

۳۰۷۲: عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ عَادَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا مَرِيضٌ فَقَالَ أَوْصَيْتَ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ بِكُمْ قُلْتُ بِمَالِي كَيْلَهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ فَمَا تَرَكْتِ لَوْلِكَ قُلْتُ هُمْ أَغْنِيَاءُ بِخَيْرٍ فَقَالَ أَوْصِ بِالْعَشْرِ فَمَا زِلْتُ أَنَا قِصَّةً حَتَّى قَالَ أَوْصِي بِالْفُلْتِ وَالْفُلْتُ كَثِيرٌ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/۳۰۵ الحدیث رقم ۹۷۵ والنسائی فی السنن ۶/۲۴۳ الحدیث رقم ۳۶۳۱

ترجمہ: ”حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ جب میں بیمار تھا تو خود رسول اللہ ﷺ میری عیادت کی چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کتنے مال کی وصیت کا تم نے ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ”میں نے تو اللہ کی راہ میں اپنے سارے مال کی وصیت کرنے کا ارادہ کیا ہے۔“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اولاد کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ میں نے عرض کیا وہ خود مال دار خوشحال ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”(اگر وصیت کرنا ہی چاہتے ہو تو) اپنے مال کے دسویں حصہ کی وصیت کر دو۔“ (حضرت سعد کہتے ہیں کہ جب میں آپ ﷺ کی بتائی ہوئی اس مقدار کو) میں اس مقدار کو اصرار کر کے بار بار کم ہتا رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اچھا تہائی مال کے بارے میں وصیت کر دو اگرچہ یہ تہائی بھی بہت ہے۔“ (ترمذی)

تشریح: عادنہ: بمعنی زادنی کے ہے اور اس میں تجرید ہے انا مریض کی وجہ سے۔

لولدك : واؤ اور لام دونوں کے فتح کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہٴس واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور اس میں دلیل ہے کہ ولد کا اطلاق بنت یعنی بیٹی پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔
بالعشر : عین کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ ہے۔

أنا قصه : صاد کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہٴس ضاد کے ساتھ ہے۔ (بخیر : خیر سے مراد مال ہے۔
وانا مریض : یہ حال ہے۔ (بخیر : یہ خبر ثانی ہے یا صفت ہے تقدیر یوں ہے ملتبسوں بخیر۔
فام ترکت لولدك قلت ہم : اس میں تغلیب ہے عصب کو بنت یعنی بیٹی پر۔
اغنیاء : یعنی مجموعی طور پر نہ کہ سب کے سب تو یہ گزرے ہوئے کا منافی نہیں ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں، کہ حضرت سعد نے فرمایا، کہ فلما زلت انا قض النبی یہ مناقضہ سے ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے بات کو توڑنا، یعنی آپ علیہ السلام میری بات کو توڑ رہے تھے، کہ میں بار بار رجوع کرتا تھا۔ زیادہ مال کی وصیت کرنے کے حرص کے بناء پر، اور اس کو صاد کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے، تو پھر یہ قصان سے ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں، یعنی میں بار بار آپ ﷺ سے کمی کے بارے میں رجوع کرتا رہا، یعنی جس مقدار کا آپ ﷺ نے ذکر کیا تھا اس کو میں کم سمجھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ ای تہائی کی وصیت کر لو۔ اور اگر اس کو صاد کے ساتھ روایت کیا جائے، تو پھر مناقضہ سے ہوگا۔ نہایہ میں ہے کہ نقلی روزے کے بارے میں ہے، فناقیجی و ناقضینہ یعنی وہ میری بات کو توڑ رہا تھا، اور میں اس کی بات کو توڑ رہا تھا۔ نقض البناء سے ہے یعنی عمارت کو توڑنا۔ مراد اس سے رجوع کرنا، اور لوٹنا ہے۔

پہلے گزرا ہے، جن نے ترمذی کی موافقت کی ہے اصحاب سنن میں سے، اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ”ان الله يصدق عليكم عند وفاتكم بغلت اموالکم زیادة لکم فی اعمالکم“۔

۳۰۷۳: وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ فِي خُطْبَتِهِ عَامَ حَجَّةِ الْوُدَّاعِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ
أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِرِثَةٍ (رواه ابو داود وابن ماجه وزاد الترمذی) وَالْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ
وَاللَّعَاهِرِ حَجَرٌ وَحَسَا بُهُمُ عَلَى اللَّهِ۔

انحرجه ابو داؤد فی السنن ۲۹۰/۳ الحدیث رقم ۲۸۷۰ و الترمذی فی ۳۷۶/۴ الحدیث رقم ۲۱۲۰ وابن ماجه فی

۹۰۵/۲ الحدیث رقم ۲۷۱۳ و انحرجه احمد فی المسند ۲۶۷/۵

ترجمہ: ”اور حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبہ میں یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ”اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ لہذا وارث کے لئے وصیت نہیں ہے“۔ (ابو داؤد ابن ماجہ) اور امام ترمذی نے یہ مزید نقل کیا ہے کہ بچہ صاحب فراش (یعنی بیوی کے مالک) کا ہے اور زنا کرنے والے کے لئے (بطور سزا کے) پتھر ہے نیز ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور امام ترمذی نے یہ مزید نقل کیا ہے کہ بچہ صاحب فراش کے لئے ہے اور زنا کرنے والے کے لئے پتھر ہے نیز ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

تشریح: الوداع : واؤ کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

للفراش : فاء کے فتح کے ساتھ ہے۔ ماں کو کہتے ہیں۔ نہایہ میں ہے کہ عورت کو فراش کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مرد اس کو چھونا، بنانا ہے۔
ان الله قد اعطى كل ذي حق حقه : یعنی اس کا وہ حصہ جو اس کیلئے مقرر کیا ہے وہ بیان کر دیا ہے۔

فلا وصية لوراث : شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ آیت میراث کے نزول سے قبل اقرباء کیلئے وصیت واجب تھی، جب آیت میراث نازل ہوگئی، تو وصیت منسوخ ہوگئی۔ پس اگر کسی نے وصیت کی اور دیگر ورثاء نے اس کو جائز قرار دیا تو یہ وصیت صحیح ہو جائے گی۔

الولد للفراش: یعنی بچہ صاحب فراش کی طرف منسوب ہوتا ہے، خواہ وہ عورت کا خاوند ہو یا لونڈی کا آقاء ہو، یا وہ شخص جس نے شہ میں مبتلا ہو کر عورت سے صحبت کر لی تھی اور زانی کا اس کے نسب میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کیلئے اس کے فعل کے استحقاق میں حد مقرر کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ قول ہے ”وللعاهر الحجر“۔

تورپشتی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ اس سے مراد محرومی ہے۔ جیسے کہ عام بول چال میں جس کو کچھ نہیں ملتا، کہہ دیا کرتے ہیں، کہ اس کو خاک پتھر ملے گا، اور جن نے اس سے مراد سنگسار کرنا لیا ہے، تو اس نے غلطی کی ہے، اس لئے کہ سنگسار کرنا زانی پر جاری نہیں ہوتا۔ اور کل ذی حق حقہ، دلالت کرتا ہے، کہ جب اللہ پاک نے جسے بیان کر دیئے تو اس کے بعد میت کے مال میں کسی کا حصہ لازم نہیں ہے، سوائے اس اجنبی کے جس کے حق میں وصیت کی جائے۔ اس لئے کہ لوگ دو قسم پر ہے ایک وہ جو میت کی طرف منسوب ہوتے ہیں، دوم وہ جو اس کی طرف منسوب نہیں ہوتے۔ اور جو منسوب ہوتے ہیں، یا تو وہ حقیقتاً ہوتے ہیں یا صرف نسبت کا، عویٰ ہوتا ہے۔ تو اول کیلئے کوئی حصہ نہیں ہے تو دوسرے کیلئے کیا ہوگا۔ اور ظاہر میں تو اس طرح کہنا چاہئے تھا۔ کہ لا حق للعاهر ثم له التراب، لیکن یہاں ثواب یعنی مٹی کی جگہ حجر کہہ رکھا تاکہ یہ اشارۃً انص کے طور پر دلالت کرے اور عبارتۃً انص کے طور پر محرومی پر دلالت کرے، تو یہ زیادہ جامع ہے، اس سے کہ اگر کہتے لہ التراب۔

وحسابہم علی اللہ: شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو زنا کرنے والوں پر حد قائم کرتے ہیں، اور ان کا حساب اللہ پر ہے چاہے تو آخرت میں ان کو معاف فرمادے اور چاہے تو ان کو سزا دے۔ یہ حدیث کا مفہوم ہے۔ اور منقول ہے کہ جس پر دنیا میں حد قائم کی گئی تو اس گناہ کی وجہ سے قیامت میں اس کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ کریم ہے اس بات سے کہ وہ دوبارہ سزا دے اس شخص کو جس پر حد قائم کی گئی ہے۔ اور اس کے مطلب میں یہ بھی احتمال ہے کہ جو شخص زنا کرے یا کسی اور گناہ میں مبتلا ہو۔ اور اس پر حد قائم نہ ہو یعنی دنیا میں اسے کوئی سزا نہ دی جائے۔ تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے تو اسے بخش دے اور چاہے تو عذاب میں مبتلا کرے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں، کہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم تو ظاہر پر شریعت کے احکام جاری کرتے ہیں، اور دل کے باتوں کو جاننے والا اللہ تعالیٰ ہے، تو ان کا حساب اللہ پر ہے، اور ان کا جزاء اللہ کے ہاں ہے۔ یا ان کا باقی محاسبہ اور بدلہ اس گناہ پر اصرار کرنے اور باقی تمام گناہوں کے ارتکاب کا اللہ کے مشیت کے تحت ہے۔

علامہ طبری فرماتے ہیں، کہ حسابہم کی ضمیر جب عاھر کی طرف لوٹائی جائے جس کے اعتبار سے تو درست ہے۔ جب حجر سے مراد حد ہو۔ اور جب حجر سے مراد صرف محرومی ہو تو پھر جائز نہیں اور ممکن ہے کہ کہا جائے کہ یہ ضمیر راجع ہے وراثت اور عاھر کی طرف جو حدیث سے مفہوم ہو رہے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے خود وراثت کے حصے تقسیم کئے ہیں۔ پس ہم میں سے بعض کو زیادہ حصہ دیا ہے اور بعض کو کم، اور بعض کو حاجب بنایا ہے اور بعض کو محروم کر دیا ہے۔ اور اس کا حساب اور حکمت اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ پس تم نص کو نصب کو تبدیل نہ کرو۔ وراثت اور زانی کیلئے وصیت کرنے کے ساتھ تو اس مطلب کے مطابق وحسابہم علی اللہ حال ہوگا۔ اعطی کے مفعول سے اور پہلے مطلب کے مطابق وللعاهر الحجر میں خبر میں ضمیر مستتر۔ سے حال ہوگا۔

اور سیوطی کی الجامع الصغیر میں ہے ”الولد للفراش، وللعاهر الحجر“ اس کو روایت کیا ہے شیخین نے اور ابوداؤد اور نسائی نے ابن مسعود اور ابن زبیر سے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت عمر سے، اور ابوامامہ رحمہ اللہ سے، اور اس حدیث کو متواتر میں سے شمار کیا گیا ہے۔

۳۰۷۴: وَرَوَى عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا وَصِيَّةَ لِرَاثٍ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْوَارِثَةُ مُنْقَطِعٌ هَذَا لَفْظُ الْمَصَابِيحِ وَفِي رِوَايَةِ الدَّارِ الْقُطَيْبِيِّ قَالَ لَا تَجُوزُ وَصِيَّةُ لِرَاثٍ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْوَارِثَةُ۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباسؓ نے نبی کریم ﷺ سے یہ نقل کیا ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) ”وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے مگر جب کہ ورتاء چاہیں“ یہ حدیث منقطع ہے اور یہ مصاحح کے الفاظ ہیں، اور دارقطنی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) ”وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہوتی مگر جب کہ ورتاء چاہیں“۔

تشریح: ان یشاء: فعل مذکر اور مؤنث دونوں کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں، کہ منقطع اس کو کہتے ہیں، کہ جس سند میں تابعی تک پہنچ سے پہلے ایسا راوی ہو جس نے اوپر والے سے حدیث نہ سنی ہو۔ اور ان کے درمیان میں ساقط راوی مذکور نہ ہو، اور اس میں وہ سند بھی داخل ہے جس میں بعض راویوں کو بینہم لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے رجل، شیخ وغیرہ۔ (اتہنی)۔ اس لئے کہ مجہول معدوم کے حکم میں ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم
ہذا یعنی یہ جو حدیث کے الفاظ ذکر ہوئے۔

لا یحوز: یا اور ورتاء دونوں کے ساتھ ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں، کہ دارقطنی نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ بھی روایت کیا ہے ”لا وصیۃ لوارث“ جیسا کہ الجامع الصغیر میں ہے۔

۳۰۷۵: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللَّهِ سِتِينَ سَنَةً ثُمَّ يَحْضُرُهَا الْمَوْتُ فَيُضَارُّانَ فِي الْوَصِيَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ ثُمَّ قَرَأَ أَبُو هُرَيْرَةَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ يُوْصَىٰ بِهَا أَوْ دِينٍ غَيْرِ مُضَارٍّ إِلَىٰ قَوْلِهِ تَعَالَىٰ وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ. (رواه احمد والترمذی و ابو داؤد وابن ماجہ)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۸۸/۳ الحدیث رقم ۲۸۶۷ والترمذی فی ۳۷۵/۴ الحدیث رقم ۲۱۱۷ وابن ماجہ فی

الحدیث رقم ۲۷۰۴

ترجمہ: ”اور حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک مرد اور عورت ساٹھ برس تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں نیک عمل کرتے ہیں اور جب ان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ دونوں وصیت کے ذریعہ (وارثوں کو) نقصان پہنچاتے ہیں۔ لہذا ان دونوں کے لئے دوزخ واجب ہو جاتی ہے“۔ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی: وَصِيَّةٌ يُوْصَىٰ بِهَا أَوْ دِينٍ غَيْرِ مُضَارٍّ۔ یعنی وراثت کی تقسیم وصیت کے نافذ ہو جانے اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہے بشرطیکہ وہ وصیت (یعنی وصیت کرنے والا) کسی کو نقصان پہنچانے والی نہ ہو۔“ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ آیت ارشاد فرمائی وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (اور یہ بڑی کامیابی ہے) تک تلاوت فرمائی۔ (ترمذی ابو داؤد ابن ماجہ)

تشریح: والمرأة: نصب کے ساتھ ہے ان کے اسم پر عطف ہے۔ اور معطوف کی خبر معذوف ہے جس پر معطوف علیہ کی خبر دلالت کر رہی ہے۔ اور اس میں بھی رفع جائز ہے اور خبر اس کی کذلک ہے۔ اور ”بطاعة اللہ“ میں تنازع ہے۔ فعل مذکور اور معذوف کا۔ غیر مفار: ’غیر‘ حال ہے۔ یوصی کے اعل سے اور ایک صحیح نسخہ میں ہے کہ یوصی صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور یہ قراءۃ متواترہ ہے تو پھر یہ حال ہوگا، یوصی مقدر سے، اس لئے کہ جب کہا گیا یوصی تو معلوم ہوا کہ یہاں موصی بھی ہے۔
من بعد وصیۃ: یہ متعلق ہے ما قبل مورریت کے تقسیم سے۔

ان الرجل ليعمل: یعنی اللہ کی عبادت کرتے ہیں علم و عمل کے ساتھ۔ والمرأة بطاعة اللہ ستین سنة: یعنی مثال کے طور پر یا مرد نکثیر اور زیادتی بتلانا ہے۔ ثم يحضرهما الموت: یعنی موت کے علامات۔

فیعاران فی الوصیۃ: یہ مفارۃ سے ہے یعنی وارث کو نقصان پہنچاتے ہیں، کہ وہ اپنے مال میں تمہاری سے زیادہ کی وصیت کسی غیر شخص کے حق میں کر جاتے ہیں، یا اپنا سارا مال کسی ایک وارث کو بہہ کر دیتے ہیں۔ تاکہ دوسرے وارثوں کو کچھ نہ ملے۔ تو یہ مکروہ اور ناجائز ہے اور اللہ کے حکم سے روگردانی ہے۔ اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔

اس میں یہ ہے کہ ان دونوں وجہوں سے تو کسی کو بھی ضرر اور نقصان نہیں ہوتا؟ تو اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے، کہ مطلب یہ ہے کہ ضرر اور نقصان کا ارادہ کرتے ہیں۔ اور بعض نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ وصیت کر جاتا ہے اس شخص کیلئے جو وصیت کا اہل نہ ہو یا وصیت کر جاتا ہے جس چیز کی وصیت اس پر لازم تھی اس کے نافذ نہ کرنے کی اس طور پر کہ وہ پشیمان ہو جائے وصیت پر۔ یا بعض وصیت کو توڑ دے۔

فستجب لهما النار : مطلب یہ ہے کہ وہ سزاء کے مستحق ہو جاتے ہیں، لیکن وہ مشیت کے تحت ہوتے ہیں۔ ﴿معم بعد وصیة یوصی بها او دین غیر مفار﴾ یعنی اپنے ورثاء کو تکلیف اور نقصان پہنچانے والا نہ ہو، وصیت کرنے کے سبب سے۔ الا قوله : ﴿وذلك الفوز العظيم﴾ یعنی اللہ کی طرف سے وصیت ہے اور جاننے وال بردبار ہیں۔ یہ اللہ کے مرر کے ہوئے حدود ہیں اور جس نے اطاعت کی اللہ اور اس کے رسول کی، تو اس کو داخل کر دے گا ایسے باغات میں جن کے درمیان میں نہریں جاری ہیں، ہمیشہ کیلئے اس میں رہیں گے۔ آیت کے آخر تک استشہاد تو صرف پہلے والی آیت سے ہے اور دوسری آیت پہلے والی کیلئے بطور تاکید کے پڑھی۔ اور اس طرح اس کے بعد تیسری آیت آیات میں سے۔ گویا کہ دوسری آیت کو کافی سمجھاتیسری کے پڑھنے سے۔

الفصل الثالث:

۳۰۷۶: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ مَاتَ عَلِيٍّ وَصِيَّةً مَاتَ عَلِيٍّ وَسُنَّةً وَسُنَّةً وَمَاتَ عَلِيٌّ تَقَىٰ وَشَهَادَةٌ وَمَاتَ مَغْفُورًا لَهُ. (رواه ابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۹۰۲/۲ الحدیث رقم ۲۷۰۱

ترجمہ: ”حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص وصیت کر کے مرا (یعنی جس شخص نے اپنی موت کے وقت اپنے مال کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں مثلاً فقراء کو دینے کی وصیت کی) تو وہ سیدھے راستے اور پسندیدہ طریقہ پر مرا اور پرہیزگاری اور شہادت پر مرا (یعنی متقیوں اور شہیدوں میں شامل ہوا) اور اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش کی گئی“۔ (ابن ماجہ)

تشریح: و سنۃ: علامہ طبری فرماتے ہیں کہ تنوین نکثیر کیلئے ہے۔ اور چونکہ یہ ماقبل کیلئے تفسیر ہے اسلئے جارہ کا اعادہ نہیں کیا۔

تقی: تاء کے ضمہ اور تنوین کے ساتھ ہڈی کے وزن پر ہے۔

مات علی سبیل: یعنی راہ مستقیم اور مضبوط دلیل پر۔ علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ سبیل یعنی راستے کو مبہم رکھا، تاکہ یہ عظیم المرتبت پر بلوغ طریقے سے دلالت کرے۔ یعنی راہ پر اور کس عظیم راہ۔ پھر اس قول سے اس کی تفسیر کی ”وسنۃ“ یعنی پسندیدہ طریقے پر، سنت حسنہ پر۔

ومات علی تقی: یعنی اللہ سے ڈر پر طاعات پر عمل کرنے اور معاصی سے اجتناب کے ساتھ، اس میں اشارہ ہے حسن خاتمہ کی طرف علم و عمل کے اعتبار سے۔

وشہادۃ: یعنی شہادت حکمی پر، یا اللہ کے حضور میں شہید ہے اور اس کے علاوہ سے شہادۃ چھپی ہوئی ہے۔

ومات مغفوراً لہ: علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ یہاں موت کو مکرر ذکر کیا ہے، اور اس کا اعادہ کیا ہے تاکہ یہ صفت تقویٰ اور شہادۃ کے استقلال پر دلالت کرے، پھر اس کے بعد تیسرے مرتبہ غفران کی صفت ذکر کی ہے، یہ بطور ترقی ہے اس لئے کہ غفران یعنی مغفرت اور بخشش انتہائی مطلوب اور مقصود ہے۔ اس لئے تو اللہ نے اپنے رسول کو تمام نعمت سے پہلے استغفار کا حکم دیا اس قول میں: ﴿اذا جاء نصر الله والفتح﴾ اور قرینہ ظنیہ میں اعادہ جار نہیں کیا، اس لئے کہ سابقہ حالات وہ ہیات ہیں جو بندہ سے صادر ہوتے ہیں، اور آخری وہ ہیبت ہے جو اللہ تعالیٰ سے صادر ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے دونوں میں فرق کا۔

۳۰۷۷: وَعَنْ عَمْرٍو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ الْعَاصَ بْنَ وَائِلٍ أَوْضَىٰ أَنْ يُعْتَقَ عَنْهُ مِائَةٌ رَقَبَةً فَأَعْتَقَ ابْنَهُ هِشَامَ خَمْسِينَ رَقَبَةً فَأَرَادَ ابْنُهُ عَمْرٍو أَنْ يُعْتَقَ عَنْهُ الْخَمْسِينَ الْبَاقِيَةَ فَقَالَ حَتَّىٰ أَسْأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِنَّ أَبِي أَوْضَىٰ أَنْ يُعْتَقَ عَنْهُ مِائَةٌ رَقَبَةً وَإِنَّ هِشَامًا أَعْتَقَ عَنْهُ خَمْسِينَ وَبَقِيَتْ عَلَيْهِ خَمْسُونَ رَقَبَةً أَفَأُعْتِقُ عَنْهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّهُ لَوْ كَانَ مُسْلِمًا فَأَعْتَقْتُمْ عَنْهُ أَوْ تَصَدَّقْتُمْ عَنْهُ أَوْ حَجَّجْتُمْ عَنْهُ بَلَغَهُ ذَلِكَ. (رواه ابوداؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۰۲/۳ الحدیث رقم ۲۷۰۱۔

ترجمہ: ”اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور شعیب اپنے دادا (حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں کہ عاص بن وائل نے یہ وصیت کی تھی کہ میری طرف سے سو غلام آزاد کئے جائیں۔ چنانچہ پچاس غلام تو ان کے بیٹے ہشام نے آزاد کر دیئے پھر جب ان کے (دوسرے) بیٹے عمرو نے یہ ارادہ کیا کہ باقی پچاس غلام آزاد کرنے کا ارادہ کیا تو یہ کہا کہ میں اس وقت تک ان غلاموں کو آزاد نہیں کروں گا یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت نہ کر لوں (کہ آیا یہ پچاس غلام اس وقت آزاد کرنا جائز اور مفید بھی ہے یا نہیں؟) چنانچہ عمرو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! میرے باپ (عاص) نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کی طرف سے سو غلام آزاد کئے جائیں۔ لہذا ہشام نے پچاس غلام تو آزاد کر دیئے ہیں ان پر (یعنی ہشام ہی کے ذمہ یا میرے ذمہ) پچاس غلام باقی رہ گئے ہیں۔ تو کیا میں اپنے باپ کی طرف سے (وہ باقی پچاس غلام آزاد کر دوں؟) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وہ (تمہارے والد عاص) اگر مسلمان ہوتے اور تم ان کی طرف سے غلام آزاد کرتے یا ان کی طرف سے صدقہ دیتے یا ان کی طرف سے حج کی ادائیگی کرتے تو ان کو اس کا ثواب پہنچتا۔“ (ابوداؤد)

تشریح: اوصی بان یعق عنہ مائۃ رقبۃ: یعنی اس کے ورثاء اس کی طرف سے آزاد کرے،

اس کے وفات کے بعد، سو غلام۔ یا باندھیاں۔

فقال: یعنی اپنے دل میں یا اپنے بھائی سے یا اپنے ساتھیوں سے۔ حتی: یعنی میں آزاد نہیں کرتا، یہاں تک کہ۔

اسأل رسول اللہ ﷺ: یعنی اس بارے میں کہ اس کی طرف سے آزاد کرنا جائز ہے یا نہیں۔

خمسین: یعنی غلام، جیسے کہ ایک نسخہ میں ہے۔ وبقیت علیہ: یعنی اس کے وصیت پر۔

فقال رسول اللہ ﷺ: انہ: یعنی نہیں، دلیل سے مدلول پر اکتفاء کیا، یعنی اس دلیل سے کہ ”لو کان مسلما فأعتقتم عنہ“۔

یعنی اے ورثاء یا اے مومنوں! پس مفرد سے جمع کی طرف عدول کیا افادہ عموم کیلئے۔

او تصدقتم عنہ، او حججتم عنہ، بلغه ذلك: لیکن جب وہ مسلمان نہیں ہوئے تو اس کا ثواب اس کو نہیں پہنچ سکتا شرائط کے نہ ہونے کے اور وہ شرط اسلام ہے۔ لیکن آزاد کرنے کا ثواب آزاد کرنے والے کی طرف لوٹتا ہے، اگر وہ مسلمان ہو، اور یہی نکتہ

باعث بنا کہ آپ ﷺ نے جواب میں ”لا“، یعنی نہیں، نہیں فرمایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۳۰۷۸: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ قَطَعَ مِيرَاثَ وَارِثِهِ قَطَعَ اللَّهُ مِيرَاثَهُ مِنَ الْحَيَاةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ - (رواه ابن ماجہ)

اخرجه ابن ماجہ فی السنن ۹۰۲/۲ الحدیث رقم ۲۷۰۳۔

ترجمہ: ”اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اپنے وارث کی میراث کاٹی تو اللہ تعالیٰ

قیامت کے دن اس کی جنت کی میراث کاٹے گا۔ (ابن ماجہ)

تشریح: میراث: امام راغب فرماتے ہیں، کہ وراثت کہتے ہیں تیرے ملکیت کی طرف اونٹنی یا بکری کا منتقل کرنا غیر کے ملکیت سے بغیر عقد، اور جو اس کے قائم مقام ہو۔ اور اسی کے ساتھ میت سے منتقل ہونے والے مال کا نام رکھا گیا ہے اور جس شخص کو بغیر کسی تھکاؤ و محنت کے کوئی چیز حاصل ہو جائے تو کہا جاتا ہے ورث کذا۔ اور جس شخص کو کوئی چیز مفت میں عطاء کی جائے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے، اورث۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا﴾

من قطع میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة يوم القيامة: علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ قیامت کی تخصیص اور اس کے جنت کی میراث کو کاٹنے کی تخصیص زیادہ نقصان اور خسارے پر دلالت کرنے کے لئے ہے، اور وجہ مناسبت یہ ہے کہ جیسا کہ وارث نے انتظار کیا مورث سے میراث کے وصول ہونے کا عاقبت اور آخر میں تو اس نے اس کے میراث کو کاٹ ڈالا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کے مال اور کامیابی تک پہنچنے کے وقت محروم کر دے گا۔ (اتہلی)

۳۰۷۹: وَرَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ -

ترجمہ: اور بیہقی نے اس روایت کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔





